اہرامِ مصر سے فرار

عاطون

اے حمید

کراچی شہر کی ہنگامہ پرور پر شور زندگی سے دور ... ساحل سمندر پر پتھروں سے بنا ہوا ایک چھوٹا سا دو کمروں والا کاٹج۔ پام کے درختوں میں گھرے ہوئے اسی کاٹج میں' کھڑکی کے پاس بیٹھا' میں اپنی زندگی کی طلسم ہوش ربا قلمبند کر رہا ہوں۔

میرا نام عاطون ہے۔ میری عمر پینتیس برس ہے مگر میں پانچ ہزار سات سو بہتر سالوں سے زندہ ہوں۔ جو کوئی بھی' کبھی' میری اس داستان عجب کو پڑھنا شروع کرے گا تو میرے اس جملے پر آ کر حیرت کا اظہار کرے گا۔ وہ اس میرے جملے کی سچائی پر شک کرے گا۔ اسے یقین نہیں آئے گا کہ کوئی انسان اس زمین پر ہزاروں برس تک زندہ رہ سکتا ہے۔ پہلے پہل مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا لیکن جب میری خوبصورت بیوی سمارا جس سے میں بے حد محبت کرتا تھا۔

میری آنکھوں کے سامنے بوڑھی ہوتی گئی اور اس کے حسین ارغوانی رخساروں پر وقت کے نقوش پا کی لکیریں جھریوں میں بدلتی گئیں اور میں اسی طرح پینتیس برس کا جوان رہا اور میرے سارے دوست' عزیز اور شاہی محل کے رشتے داروں کے بال بڑھاپے میں برف کی طرح سفید ہو گئے اور میرے سیاہ گھنگریالے بالوں میں سفیدی کی ایک لکیر بھی نہ چمکی اور جب اس زہر ہلاہل کا میرے جسم پر کوئی اثر نہ ہوا جو مجھے فرعون مصر کے شاہی محل میں ایک مشروب لذت افروز کی شکل میں پلایا گیا تھا تو مجھے یقین ہونے لگا کہ میں وقت کے رعشہ زدہ بوڑھے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد ہو چکا ہوں' میری آنکھوں کے سامنے میری خوبصورت بیوی سمارا بوڑھی ہو کر مر گئی' ہم اپنی بوڑھی بیوی کو صرف اس صورت میں دیکھ کر گوارہ کر سکتے ہیں کہ جب ہم خود بھی بوڑھے ہوں

لیکن جب ... ہماری عمر پینتیس برس سے آگے نہ بڑھی ہو اور ہماری بیوی اسی برس کی ہو جائے تو اسے دیکھنا شاید زندگی کا سب سے بڑا عذاب ہے۔ میں اپنی بیوی سمارا سے بے پناہ محبت کرتا تھا مجھے اس کے سیاہ بالوں میں دریائے نیل کے کنول کے پھولوں کی مہک آتی تھی

اور اس کے سرخ ہونٹوں میں خرطوم کے سچے گلاب سانس لیتے تھے' اور پھر جب میں نے سچے گلاب کے ان پھولوں کی پنکھڑیوں کو وقت کے صحرا میں ریت کے سیاہ ذروں میں بدلتے اور کنول کے پھولوں کو دریائے نیل کی دلدل میں دم توڑتے دیکھا تو میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ پھر ایک روز میں نے اپنی بیوی کو بھی فراعنہ مصر کے شاہی غلاموں کے ویران قبرستان میں اپنی والدہ کی قبر کے پاس دفن کر دیا۔ اور تاریخ کے صفحات پر میرا حیرت انگیز ہزاروں برس کا سفر شروع ہو گیا۔

سمندر میری آنکھوں کے سامنے حد نگاہ تک پھیلا ہوا ہے۔ ہلکے سبز سمندر کی دیو پیکر لہریں دور دور سے آ کر میرے کاٹج کے آگے پھیلے ہوئے ریتلے ساحل پر بجھ جاتی ہیں اور میری زندگی کی تحیر افزا داستان کے ایک ایک ورق کو میرے سامنے کھول کر واپس چلی جاتی ہیں۔

آسمان پر بادل گھرے ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ شاید آج موسلا دھار بارش ہو۔ میری گھڑی سہ پہر کے چار بجا رہی ہے۔ میں اس کاٹج میں بالکل تنہا رہتا ہوں' میں نے ابھی ابھی چائے کی ایک پیالی بنا کر اپنے پاس میز پر رکھی ہے' چائے کا رنگ گہرا ارغوانی ہے جیسے سورج غروب ہو رہا ہو' اس کی خوشبو مجھے دریائے نیل کے کنارے اگی ہوئی مہندی کی جھاڑیوں کی یاد دلاتی ہے جہاں میں بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔ آج سے پونے چھ ہزار برس پہلے دریائے نیل کی مہندی کی جھاڑیوں کی خوشبو... یہی وجہ ہے کہ میں صرف چائے شوق سے پیتا ہوں حالانکہ میں بغیر کچھ کھائے پئے بھی زندہ رہ سکتا ہوں۔ کیونکہ موت کو میری زندگی سے ایک خاص عرصے کے لئے جدا کر دیا گیا ہے۔ یہ عرصہ کتنے ہزار برس پر محیط ہے؟ یہ میں نہیں جانتا۔ پونے چھ ہزار برس گزر گئے ہیں اور میں صدیوں کی مسافت طے کرتا' سلطنتوں کے عروج و زوال دیکھتا' قوانین خداوندی سے انحراف پر قوموں پر قہر نازل ہوتے دیکھتا' اس شہر تک پہنچ گیا ہوں' یہاں سے میرا واپسی کا سفر شروع ہو رہا ہے۔ مجھے ایک بار پھر ہزاروں برس کی تاریخ کے بوسیدہ اوراق میں سے گزرنا ہو گا۔

لیکن اپنی واپسی کا سفر شروع کرنے سے پہلے میں اپنی زندگی کی طلسم ہوشربا کو قلم بند کر دینا چاہتا ہوں۔ میرا کوئی بیٹا بیٹی نہیں تھی۔ اگر ہوتی بھی تو وہ اپنے باپ کی داستان حیات کے یہ اوراق پڑھنے کے لئے زندہ نہ ہوتی۔ پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ نسل انسانی کے سارے بچے میرے بیٹے' بیٹیاں ہیں اور میں یہ داستان ان ہی کے لئے لکھ رہاہوں۔ یہ اگرچہ ایک ناچیز ورثہ ہے مگر میرے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

شروع شروع میں جب انسانی تہذیب کی تاریخ کی اونچی نیچی پر پیچ گھاٹیوں میں میرے

حیرت انگیز سفر کا آغاز ہوا تو مجھے راتوں کو خواب میں آوازیں آتیں۔

"عاطون! ایک لاتناہی مدت تک تمہاری موت روک دی گئی۔ تم انسانی تاریخ کے ساتھ ساتھ زندہ رہو گے۔"

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا اور سوچتا۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک فانی انسان ہزاروں سال تک زندہ رہے؟ اس وقت میرا ذہن اس معمے کو حل کرنے میں ناکام اور بے بس تھا... لیکن جب اپنے تاریخی اور لازوال سفر کے دوران لگ بھگ 480 سن عیسوی کے زمانے میں میں نے ایک عیسائی پادری جیمس سروجی کے سریانی زبان میں لکھے ہوئے مواعظ میں اصحاب کہف کے ایک غار میں تقریباً ایک سو چھیانوے برس تک زندہ رہنے کی روایت کو پڑھا تو میرے دل کو ذرا حوصلہ ہوا مگر اس کے بعد جب میں نے مسلمانوں کی دینی کتاب مقدس قرآن حکیم میں اصحاب کہف کے تاریخی واقعے کو پوری تفصیل کے ساتھ پڑھا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ پھر مجھے یقین ہو گیا کہ اگر خدا چاہے تو ایک انسان کو جب تک چاہے زندہ رکھ سکتا ہے۔

... اور پھر قرآن حکیم میں بیان کردہ اس واقعہ نے میری حیرت کو یقین میں بدل دیا۔

میں جس قوم میں پیدا ہوا تھا۔ وہ مظاہر فطرت اور بتوں کی پوجا کرتی تھی۔ سورج ان کا سب سے بڑا معبود تھا لیکن میرے دل میں بچپن ہی سے جیسے کوئی مجھ سے آہستہ سے کہا کرتا تھا کہ سجدہ صرف خدائے واحد کو زیبا ہے جو کل کائنات کا خالق ہے اور یہ سارے بت جھوٹے ہیں۔ چنانچہ میں نے کبھی کسی بت کے آگے سر نہیں جھکایا تھا۔ مجھے زہر دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں فراعنہ مصر کے دیوتاؤں کو تسلیم نہیں کرتا تھا اور ان کے آگے سر جھکانے کے بجائے راتوں کو اٹھ کر خدائے واحد کو یاد کرتا تھا اور اسی کی عبادت کرتا تھا۔

میں نے پہلی بار خلفائے عباسیہ کے دور اول میں قرآن حکیم پڑھا تو خدائے واحد کی حقانیت پر ایمان لے آیا۔ میرے دل کو تسکین ہوئی اور میں خدائے واحد کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔

میرے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ شاید میرا ہزاروں برس تک زندہ رہنا لوگوں کے لئے ایک درس عبرت ہو کیونکہ میں نے اپنی آنکھوں سے ان قوموں کو تباہ و برباد ہوتے دیکھا ہے جنھوں نے اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے سے انحراف کیا۔ میں نے نیکی اور سچائی کی خاطر اللہ کے برگزیدہ بندوں کو تخت و تاج چھوڑتے اور سولی چڑھتے بھی دیکھا ہے اور دنیا پرست لالچی بندوں کو تخت و تاج کی خاطر اپنے بھائیوں کا خون کرتے بھی دیکھا ہے۔ میں نے سینا' دجلہ اور فرات کی وادی کے عقوبت خانوں میں اللہ کا نام بلند کرنے والوں کے عزم و

ہمت کو بھی دیکھا اور مصر و یونان کے نخلستانوں اور کاروان سراؤں میں چاندنی راتوں کو بیٹھ کر داستان گوؤں سے گزری تہذیبوں کے عبرت انگیز افسانے بھی سنے اور میرا صدیوں کا سفر جاری رہا۔

میں پہلی بار اپنی طویل ترین زندگی کی داستان رقم کر رہا ہوں۔ یہ داستان خون آشام محلاتی سازشوں' ہلاکت آفریں محبتوں' منصوبوں' قہربار عداوتوں' خون ریز رقابتوں' شعلہ صفت حسن کی حشر سامانیوں' عدیم النظیر قربانیوں الم انگیز عبرتوں اور انسانی تاریخ کی لہو میں ڈوبی ہوئی بھیانک جنگوں اور قوموں کے عروج اور زوال کے سچے واقعات کی عکاسی کرے گی۔ اس لئے کہ میں تاریخ کے تمام انقلابات اور تہذیب کے ارتقاء و زوال کا عینی شاہد ہوں۔ آج جب کراچی میں بیٹھ کر انسانی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہوں تو مجھ پر یہ افسوس ناک حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تاریخ کے بعض واقعات کو مورخین نے یکسر بدل ڈالا ہے اور بعض واقعات کو غلط رنگ دے کر پیش کیا گیا ہے۔

لیکن میں آپ کو چھ ہزار برس سے لے کر آج تک تاریخ او تہذیب کے ہر اس دور کے سچے اور من و عن واقعات سناؤں گا۔ جس دور میں میں خود موجود تھا اور میں نے اپنی آنکھوں سے تلواروں کو بے نیام ہوتے' سروں کو کٹتے' آدھی رات کے اندھیروں میں بادشاہوں کے سینوں میں خنجر اترتے اور شہزادیوں کو خواب گاہوں سے فرار ہوتے دیکھا ہے۔

میں اس سچی داستان کا ایک ایک ورق' ایک ایک لفظ آپ کو سناؤں گا۔ میں آپ کو مصر و یونان اور بابل و نینوا اور دجلہ و فرات کے شاہی محلوں میں اپنے ساتھ لے چلوں گا اور آپ اپنی آنکھوں سے ان واقعات کو وقوع پذیر ہوتے دیکھیں گے جنہیں بعد میں آنے والے مورخوں نے مسخ کر دیا۔

بارش شروع ہو گئی ہے۔

کھڑکی میں سے سمندر کی جو ہوا آ رہی ہے۔ اب اس میں ساحل کی گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک بھی شامل ہو گئی ہے۔ موسلا دھار بارش نے سمندر کے ہیجانی سینے پر دھند کی ایک باریک چادر پھیلا دی ہے میں چائے کا آخری گھونٹ پی کی کھڑکی سے باہر سمندر کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ سورج بادلوں کے پیچھے ہی پیچھے سفر کرتا ہوا مغرب کی طرف کافی جھک گیا ہے اور دن کی روشنی شام کی ہلکی سیاہی میں تبدیل ہو رہی ہے۔

مجھے صرف اپنے لباس' بجلی اور گیس کے معمولی سے بل اور شہر میں آنے جانے کے اخراجات کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرا کھانے پینے کا خرچ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یونہی چائے کی خوشبو کے لئے کسی وقت چائے پی لیتا ہوں۔ شہر میں لوگوں کے درمیان

ہوتا ہوں تو ان کو دکھانے کے لئے کھانا کھا لیتا ہوں۔ ورنہ مجھے نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس تنگ کرتی ہے کچھ کھا پی لوں تو ٹھیک ہے۔ مہینوں کچھ نہ کھاؤں پیوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

آپ کو یہ ساری باتیں عجیب لگیں گی لیکن جب آپ میری زندگی کی طلسم ہوش ربا کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھ جائیں گے تو آپ کو بھی میری طرح یہ ساری باتیں میری زندگی کا حصہ محسوس ہونے لگیں گی۔

میں کراچی شہر کے ایک خاص حلقے میں جڑی بوٹیوں کے تاجر کے طور پر مشہور ہوں۔ میں ہفتے میں دو تین دن سمندر کے قریب پھیلے ہوئے ریتلے ویران اور اونچی نیچی سنگلاخ ٹیکریوں میں گھوم پھر کر جڑی بوٹیاں تلاش کرتا ہوں اور پھر انہیں شہر لے جا کر فروخت کر دیتا ہوں۔ یہ کام مجھے اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ میرا باپ فراعنہ مصر کے شاہی خاندان کا سب سے بڑا شہزادہ بھی تھا اور جڑی بوٹیوں کا ماہر بھی تھا۔ وہ مجھے آج سے ہزاروں سال قبل شاہی رتھ پر بٹھا کر نیل کے کنارے جنگلوں میں لے جاتا اور قیمتی جڑی بوٹیاں اکٹھی کیا کرتا تھا۔ وہ مجھے ہر بوٹی کے خواص بتاتا اور شاہی محل میں لا کر ان کی ادویات تیار کرتا۔ وہ شاہی محل میں طبیب شہزادہ اخناطون کے نام سے مشہور تھا۔ اس وقت جس فرعون کی حکمرانی تھی اس کا نام کفروتی تھا اور میرے باپ شہزادہ اخناطون کا بڑا بھائی تھا۔ اس کی موت کے بعد میرے باپ کو اور پھر مجھے مصر کے تخت کا وارث بننا تھا۔ مگر میرے باپ نے شاہی محل کی ایک ادنیٰ کنیز سے بیاہ کر لیا تھا جو میری ماں تھی اور فرعون مصر کفروتی کو یہ ہرگز گوارہ نہ تھا کہ اس کی موت کے بعد مصر کے تخت کی وراثت ایک ادنیٰ کنیز کی اولاد میں منتقل ہو۔ پھر کیا ہوا؟ میرا شہزادہ باپ فرعون مصر بننے کی بجائے ایک رات پراسرار حالات میں کیوں مر گیا؟ میری ماں کو کس نے ہلاک کیا اور میں اپنے معدے میں زہر ہلاہل کا سیال لے شاہی محل سے کیوں بھاگا؟

یہ میری داستان عبرت کا حرف آغاز ہے۔

میں اپنی زندگی کی سچی اور ناقابل یقین کہانی اس پراسرار چاندنی رات سے شروع کرتا ہوں جب میرے والد کی میت کو فراعنہ مصر کے شاہی قبرستان میں دفن کیا جا رہا تھا۔ میری والدہ کی قبر شاہی قبرستان کے عقب میں کنیزوں اور غلاموں کے قبرستان میں تھی۔ اس لیے کہ میری والدہ کا تعلق شاہی خاندان سے نہیں تھا اور وہ ایک کنیز تھی۔ اگرچہ میرے والد کی خواہش یہی تھی کی اسے میری والدہ کے پہلو میں غلاموں کے قبرستان میں دفن کیا جائے مگر فرعون کفروتی کے حکم سے میرے باپ کو شاہی خاندان کے ایک اہرام میں دفن کر دیا گیا کیونکہ وہ ایک شہزادہ تھا۔ اس رات چاند کا رنگ زرد تھا اور وہ دارالحکومت ایتھنز کے

مشرقی آسمان پر صحرائی ٹیلوں پر جھکا ہوا تھا۔ میرے والد کی حنوط شدہ میت لکڑی کے تابوت میں بند اہرام کے اندر ایک چبوترے پر پڑی تھی اور قبر تیار کی جا رہی تھی۔ صرف دو ایک شہزادے اور دربار کے چند درباری اور کاہن اعظم قہران وہاں موجود تھا۔

یہ ایک پراسرار تدفین تھی۔ اگرچہ یہ بات کسی کے آگے کھلی نہیں تھی مگر وہاں موجود ہر شخص جانتا تھا کہ میرے باپ شہزادہ اخناطون کو کھانے میں ایک ایسا زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے جس کے بعد کے اثرات جسم پر بالکل ظاہر نہیں ہوتے اور انسان چند ثانیوں میں ہمیشہ کی نیند سو جاتا ہے۔ جس وقت میرا باپ مر رہا تھا تو میں اس کے پاس موجود تھا۔ اس نے دم توڑتے ہوئے کہا تھا۔

"بیٹا عاطون مجھے بھی تمہاری ماں کی طرح زہر دے کر ہلاک کیا جا رہا ہے۔ اب میرا فرعون بھائی تمہاری جان کا دشمن ہو گا۔ تم اپنی بیوی کو لے کر اس سنگدل شہر سے جس قدر دور جا سکو چلے جانا"

اور پھر اس کی روح پرواز کر گئی تھی۔ میرے باپ کے تابوت کے اوپر اس کی ممی کا تابوت بنا کر لٹا دیا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر اس قدر رنگ روغن کیا گیا تھا کہ وہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ تابوت کو قبر میں اتار دیا گیا۔ پھر سب لوگ واپس چل پڑے۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میرے باپ کو مجھ سے بڑی محبت تھی۔ اس نے بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ مجھے جڑی بوٹیوں کا علم سکھایا تھا۔ وہ کبھی کبھی چاندنی راتوں میں مجھے ساتھ لے کر دریائے نیل کے کنارے گھنے نرسوں کے قریب ٹہلنے نکل جاتا تھا اور مجھے اسوریہ اور نوبیہ تہذیبوں سے متعلق حیرت انگیز کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ وہ بہت دانا اور نیک دل انسان تھا۔ شاید جڑی بوٹیوں کے علم نے اس کے دل و دماغ میں فطرت کے اسرار کھول دیئے تھے۔ وہ مجھے کہا کرتا تھا۔

"میرے بیٹے پہلے روح بیمار ہوتی ہے۔ اس کے بعد جسم بیمار ہوتا ہے۔ ہم جسم کی بیماری جڑی بوٹیوں سے دور کر سکتے ہیں مگر روح کی بیماری کا علاج پاکیزہ فکر اور دوسروں کا بھلا سوچنے سے ہوتا ہے۔ اپنے خیالوں کو پاکیزہ رکھنا۔ کسی کو اپنے آپ سے کمتر مت سمجھنا۔ حسد اور جھوٹ کو اپنے قریب بھی نہ بھٹکنے دینا۔ راتوں کو کبھی کبھی آ کر دریائے نیل کے کنارے ستاروں کا مشاہدہ کیا کرنا اس سے تمہارا ذہن روشن ہو گا"۔

میں سر جھکائے اہرام سے باہر نکل رہا تھا اور مجھے اپنے باپ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کاہن اعظم پجاریوں کے جلو میں دونوں بازو اپنے سینے پر رکھے میرے قریب سے گزرا تو مجھے دیکھ کر رک گیا۔ اس کا چہرہ ہلکی زرد چاندنی میں سنولائے ہوئے پتھر کی طرح لگ رہا

تھا۔ کہنے لگا۔

"عاطون تمہیں اب اپنے باپ کی روایات کو نبھانا ہو گا۔ رب شمس عظیم فرعون کفروتی نہیں چاہتا کہ تم اپنی بیوی کے کمتر حیثیت رشتہ داروں کے پاس جا کر ان کا علاج کرو"۔

میں نے جواب میں کہا۔

"کاہن اعظم قہرون میرے باپ کی روایت یہی ہے کہ میں اپنے سے کسی کو کمتر نہ سمجھوں۔ میں اس روایت کو ضرور نبھاؤں گا"۔

کاہن اعظم قہرون نے ایک قہر بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور اپنی نخوت بھری گردن اٹھائے پجاریوں کے اہرام سے باہر نکل گیا۔

قدیم ترین مصر کے نئے دارالحکومت ایتھنز کے قرب و جوار میں یہ پہلا بہت بڑا اہرام تھا جو میرے تایا فرعون کفروتی نے خود اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے لئے تعمیر کروایا تھا۔ اس سے پہلے کہ فراعنہ نے مصر کے قدیم دارالحکومت لکر کے قریب کچھ اہرام بنوائے تھے۔ نئے اہرام کے باہر شاہی گورستان تھا جہاں فرعون کے دور و نزدیک کے رشتہ دار اور شہزادیوں اور شہزادوں کی اولادوں کو دفن کیا جاتا تھا۔ شاہی گورستان کے عقب میں وہ قبرستان تھا جہاں شاہی غلاموں اور کنیزوں کو دفنا دیا جاتا تھا۔ اسی قبرستان میں میری والدہ کی قبر تھی۔ میں اپنے عظیم باپ کو سپرد اہرام کرنے کے بعد والدہ کی قبر پر آ گیا۔ غلاموں اور کنیزوں کی دوسری قبروں کی طرح میری والدہ کی قبر بھی بے نام و نشان تھی۔ میرے باپ نے اس پر ایک کتبہ لگوانے کی درخواست کی تھی مگر اس کے بڑے بھائی فرعون مصر کفروتی نے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ غلاموں اور کنیزوں کی قبروں پر کتبے نہیں لگوائے جاتے۔

صرف سیاہ انگور کی ایک بیل تھی جو میری والدہ کی نشانی تھی۔ میں اپنی والدہ کی قبر پر کچھ دیر بیٹھا آنسو بہاتا رہا۔ پھر بوجھل دل کے ساتھ اٹھا اور قبرستان سے باہر آ گیا۔ میرا رتھ بان باہر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں رتھ میں سوار ہو گیا اور وہ رتھ کو لے کر شاہی محل کی طرف روانہ ہوا۔

میری بیوی ستارا محل میں نہیں تھی۔ وہ میرے والد کی روح کے لئے دعا کرنے رب شمس میں گئی ہوئی تھی۔ میں نے سیاہ انگوروں کا تھوڑا سا مشروب پیا اور محل کی کھڑکی میں آ کر نیچے شاہی پائیں باغ میں دیکھنے لگا۔ چاندنی رات میں فرعون مصر کے شاہی محل کا پائیں باغ ایک پراسرار آسیبی باغ کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ دریائے نیل کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی جس میں دریا میں اگے ہوئے نرسلوں اور کنول کے پھولوں کی نامعلوم سی مہک تھی۔ میں نے کھڑکی کے آگے پردہ کر دیا اور اپنا سرخ لبادہ اتار کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ شمع دان

کی روشنی خوابگاہ کی کنیز نے مدھم کر رکھی تھی۔ سرخ بانات کا بھاری پردہ ہٹا اور میری خوبصورت بیوی سارا داخل ہوئی۔ اس کا حسین چہرہ اداس تھا اور اس کی سانولی پیشانی پر پجاری کے ہاتھ کی لگی ہوئی زاعفران کی لکیر نظر آ رہی تھی۔ وہ میرے قریب آ گئی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”میں نے رب شمس کے حضور تمہارے والد کی روح کے سکون کے لئے دعا مانگی ہے۔“

میں نے سارا کی سیاہ پژمردہ آنکھوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

”سارا رب شمس میرے باپ کی روح کی تسکین کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔“

سارا نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

”عاطون! تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

میں نے شمع دان میں جلتی ہوئی موم بتی پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”سارا! میرے دل میں کیا ہے‘ تم نہیں جانتیں۔“

سارا کے ریشمی لباس میں سے عود و لوبان کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے اپنی بیوی کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نرم ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

”سارا! ایسا لگتا ہے کہ اب اس محل میں سوائے تمہارے میرا کوئی نہیں رہا۔“

میری وفا شعار بیوی مجھے تسلی دیتی رہی لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اب شاہی محل میں میرے خلاف ایک خونی سازش کا آغاز ہو گا کیونکہ فرعون کی کوئی اولاد نہیں تھی اور اس کی موت کے بعد میں ہی شاہی تخت کا وارث تھا۔ مگر فرعون کفروتی مصر کا تخت ایک کنیز کے بیٹے کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہی سازش کر کے میری ماں کو اور پھر میرے باپ کو مروایا تھا اور اب اس کی نظریں مجھ پر تھیں۔ اگر وہ مجھے اپنے راستے سے ہٹا دے تو اس کی موت کے بعد مصر کا تخت اس کے دوسرے چھوٹے بھائی کے بیٹے کے پاس جاتا.... اور یہی وہ چاہتا تھا۔

لیکن فرعون کفروتی بڑا زیرک اور دور اندیش فرعون تھا۔ اس نے اپنے رویے کو ایسا بنایا کہ مجھے خواب میں بھی یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ وہ میری جان کا دشمن ہے۔ وہ مجھے دربار میں اپنے قریب رکھتا۔ شاہی ضیافتوں میں بھی خاص طور پر مجھے اپنے ساتھ بٹھاتا۔ اس نے ایک بہت بڑی سرکاری ضیافت میں شاہی خاندان کے تمام افراد اور غیر ملکی سفیروں کے سامنے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ عاطون اس کے بعد تخت شاہی کا وارث ہو گا۔

فرعون کفروتی کا طرز عمل اس قدر گہرا‘ دھیما اور پراعتماد تھا کہ اب میرے دل میں بھی

یہ خیال آنے لگا کہ کفروتی نے میرے ماں باپ کو ہلاک کروانے کے بعد مجھے قتل کروانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے اور شاید وہ مجھ ہی کو اپنے بعد مصر کے تخت پر دیکھنا چاہتا ہے۔ میرے ساتھ سرکاری اور غیر سرکاری تقریبات میں ولی عہد ایسا سلوک روا رکھا جاتا۔ میرے لئے ایسے اتالیق مقرر کر دیئے گئے جو مجھے فن حرب و ضرب کے علاوہ امور سلطنت اور آداب شاہنشاہی سے بھی آگاہ کرتے۔ میری سارا بہت خوش تھی کیونکہ فرعون کفروتی بوڑھا ہو رہا تھا اور میری بیوی کے خیال میں اس کے بعد میں ہی وارث تخت تھا اور وہ میری ملکہ بننے والی تھی۔ مگر یہ طلسم ایک روز ٹوٹ گیا۔

میں کبھی کبھی شاہی خدام کے ہمراہ شکار پر جاتا تو جڑی بوٹیوں کی تلاش بھی جاری رکھتا۔ کسی وقت چاندنی راتوں میں دریائے نیل کے کنارے نکل جاتا کیونکہ میرے باپ نے مجھے بتایا تھا کہ بعض بوٹیاں صرف چاندنی راتوں میں اپنا آپ ظاہر کرتی ہیں اور ان کے پتے اور ڈنٹھل چاندنی میں سرخی مائل ہو جاتے ہیں۔ ایک روز میں شکار سے واپس آیا۔ ہم اپنے ساتھ بہت سا شکار مار کر لائے تھے۔ شاہی مطبخ میں شکار کا گوشت بھونا گیا۔ رات کے کھانے پر فرعون کفروتی بھی موجود تھا اور شاہی افراد خانہ کے آگے... بار بار میری بہادری‘ سپہ گری اور عالی ہمتی کی تعریف کر رہا تھا۔

شاہی ضیافت شروع ہوئی تو غلام‘ رواج کے مطابق ایک مردے کی حنوط شدہ ممی ہاتھوں میں اٹھا کر لائے اور اسے باری باری سب مہمانوں کو دکھایا اور کہا۔ ”کھاؤ پیو اور زندگی کے ہر لمحے کو غنیمت جانو کیونکہ ایک وقت آئے گا جب تمہارا بھی یہی حال ہو گا۔“ ضیافت شروع ہو گئی۔ یمن اور ہند کی رقاصاؤں نے رقص پیش کیا۔ چین کے بازی گر اپنے کرتب دکھانے لگے۔ نیل کے موسیقاروں نے سریلی دھنیں بجائیں۔ ضیافت آدھی رات تک جاری رہی۔ جب میں اور میری بیوی اپنے محل کی طرف جانے لگے تو فرعون کفروتی نے مجھے سینے سے لگایا اور کہا۔

”میرے بھتیجے! میں اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں جب تم مصر کے شاہی تخت پر تاج فرعونی پہن کر براجمان ہو گے۔“

میں نے جھک کر فرعون کی تعظیم کی پھر اپنی بیوی اور محل کے غلاموں کے ساتھ اپنے محل میں آ گیا۔ میں اور میری بیوی اپنی خواب گاہ میں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ اچانک مجھے چکر آیا اور میں دیوان پر بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا عاطون؟“

میری بیوی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں چکر سا آ گیا تھا۔"

اتنے میں میرا حبشی رتھ بان زال بدحواسی کے عالم میں اندر آ گیا اور آداب ملحوظ رکھے بغیر چلا اٹھا۔

"عالی جاہ آپ کو زہر دے دیا گیا ہے' کھانے میں۔"

"کیا...؟" میری بیوی چیخ اٹھی۔

میں نے اسے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور مہاگنی کی الماری میں سے چمپاوتی بوٹی کا زرد سفوف نکلوا کر پانی سے نگل لیا۔ مگر بہت جلد مجھے یقین ہو گیا کہ وقت گزر چکا ہے اور زہر اپنا کام کر چکا ہے۔ میں نے جس بوٹی کو سفوف کھایا تھا وہ مجھے زہر کی ہلاکت سے' اب نہیں بچا سکتی تھی۔ لیکن میری موت کو چند لمحوں کے لئے روک سکتی تھی۔

"میرا بستر لگا دو۔"

وہ خواب گاہ میں گئی تو میں نے رتھ بان زال سے پوچھا کہ اسے کیسے پتہ چلا' مجھے کھانے میں زہر دیا گیا ہے۔ رتھ بان زال ایک ادھیڑ عمر حبشی غلام تھا اور میرے باپ کا وفادار رتھ بان تھا۔ وہ مجھ سے بچوں کی طرح پیار کرتا تھا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا اور آواز کانپ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"عالی جاہ! میں نے اپنے کانوں سے فرعون کو کاہن اعظم قہرون کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہم نے عاطون کو اس کے کھانے میں زہر دلوا دیا ہے اور صبح اس کی لاش' اس کے محل کی خواب گاہ میں پڑی ہو گی۔"

سارا خواب گاہ سے باہر نکل رہی تھی۔ اس نے زال کی یہ بات سن لی تھی۔ وہ بدحواس ہو کر بولی۔

"تم جھوٹ کہتے ہو۔ فرعون ایسا نہیں کر سکتا۔ اس نے خود عاطون کے ولی عہد ہونے کا اعلان کیا ہے۔"

میں نے اپنی بیوی کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"سارا میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میری ہدایات کو غور سے سنو۔ میری جڑی بوٹیوں کا تھیلا اور میرے والد مرحوم کی کتاب طب اور کچھ زیورات اور جواہرات جلدی سے نکال کر میرے ساتھ محل کے باہر آ جاؤ۔"

پھر میں نے رتھ بان زال سے کہا۔

"تم رتھ لے کر محل کے عقبی دروازے پر میرا انتظار کرو۔"

"جو حکم عالی جاہ!"

رتھ بان زال پلک جھپکتے میں باہر نکل گیا۔ میری بیوی آنسو بہاتے ہوئے میری ہدایت کے مطابق چیزیں سمیٹنے لگی۔ اپنے والد کی کتاب طب' جڑی بوٹیوں کا چمڑے کا تھیلا اور کچھ جواہرات و زیورات لے کر ہم دونوں محل کی سیڑھیاں اتر کر عقبی دروازے پر آ گئے۔ یہاں مہندی کی جھاڑیوں میں اندھیری رات میں جگنو چمک رہے تھے۔ رتھ بان زال رتھ لئے بالکل تیار کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے سہارا دینا چاہا۔ میں نے کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں نے جو دوائی پی ہے۔ وہ زہر کا اثر زائل کر دے گی۔ شاہی قبرستان کی طرف چلو۔"

سارا بے حد پریشان تھی۔ ہمارا رتھ محل کے بڑے عقبی دروازے سے نکل کر زیتون کے درختوں کے درمیان سے گزرنے والی کچی سڑک پر سے ہوتا ہوا شاہی قبرستان کی طرف دوڑنے لگا۔ قدیم مصر کے گہرے نیلے آسمان پر چمکتے ستارے میرے ساتھ ساتھ رواں تھے۔ قبرستان شاہی موت کے عمیق سناٹے کی گرفت میں تھا۔ میں نے زال کو رتھ ... شاہی قبرستان کے پہلو میں اپنے باپ کے اہرام کے باہر کھڑا کرنے کو کہا اور خود اہرام کے اندر چلا گیا۔ میری پریشان حال حسین بیوی میرے ساتھ ساتھ تھی۔

میرے پیارے اور شفیق باپ کی قبر کے اوپر سنگی تابوت پر اس کی ممی کا چہرہ خاموش تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے اپنے باپ کی قبر کے پاس کھڑا ہو گیا۔ زہر میرے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور ہونے لگا تھا۔ میری بیوی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بے تابی سے بولی۔

"رب شمس تمہارا نگہبان ہو۔ کسی طبیب کے پاس چلو۔ میرا سہاگ نہ اجاڑو عاطون!؟"

مجھے اس کی آواز جیسے بہت دور خواب کی دنیا سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میری زبان سوکھ رہی تھی۔ ہونٹ لکڑی کی طرح سخت ہونے لگے تھے۔ میری بیوی رونے لگی۔ اس کی سسکی کی آواز پر میں نے آنکھیں کھول دیں اور اسے ساتھ لے کر اہرام سے باہر آ گیا۔

رتھ بان زال بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

یہاں سے میں اپنی والدہ کی قبر پر گیا لیکن اب مجھ میں کھڑے ہونے کی بھی سکت نہیں تھی۔ رتھ بان زال اور میری بیوی نے مجھے سہارا دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور مراقبے میں چلا گیا۔ پھر جیسے میری بند آنکھوں کے اندھیروں میں جگنو چمکنے لگے اور جیسے میری والدہ کی شبیہہ نمودار ہوئی۔ اس نے سفید بے داغ لباس پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں سفید کنول پھول کی چھڑی تھی۔ اس نے کنول کی چھڑی باری باری میرے کندھوں سے لگائی اور میرے کانوں میں اس کی آواز آئی۔

"میرے بیٹے! تم جس خدائے واحد کی دل سے عبادت کرتے ہو۔ اس نے تمہارے گناہوں کو بخش دیا۔ یہاں سے اپنی بیوی کو لے کر ملک شام کی طرف چلے جاؤ۔ خدائے واحد کے حکم سے تمہارے جسم کا زہر بے اثر ہو گیا ہے۔"

میری پیاری والدہ کی شبیہہ غائب ہو گئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اپنے بدن کی توانائی واپس آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی بیوی سارا سے پانی مانگا۔ اس نے چھاگل میں سے پانی نکال کر دیا۔ پانی پینے کے بعد مجھے نیند آنے لگی۔ میں نے اپنے رتھ بان زال سے کہا۔

"یہاں سے ملک شام کی طرف نکل چلو۔"

اور پھر میں گہری نیند سو گیا۔ جب میں جاگا تو ہم اپنے وطن مصر کی سرحدوں سے نکل کر شام کی سرحد میں داخل ہو چکے تھے۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا نیلے آسمان پر روشنی ہی روشنی تھی۔ شام کے صحرا ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے تھے اور ہمارا رتھ اڑا چلا جا رہا تھا۔ میری بیوی میرے چہرے پر زندگی کی چمک دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئی۔ اس نے میری پیشانی چوم کر کہا۔

"عاطون! آج سے میں بھی تمہارے خدائے واحد کا شکر ادا کرتی ہوں تم سو رہے تھے اور میں تمہارے رب واحد کے حضور دست بہ دعا تھی۔ اس نے میری دعا قبول کر لی اور زہر کا اثر زائل کر دیا۔"

میں اپنے جسم میں ایک نئی توانائی اور تازگی محسوس کر رہا تھا۔ رتھ بان زال بھی بہت مسرور تھا۔ اس کی جھریوں بھری آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلک رہے تھے۔ دور ملک شام کے قدیم شہر دمشق کے سوار نظر آنے لگے اور ہمارا رتھ بان آگے بڑھتا چلا گیا۔ شہر کے دروازے پر پہرے داروں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور دمشق میں میری آمد کی غرض و غایت کیا ہے۔ میں نے کہا۔

"میرا نام عاطون ہے۔ میں مصری طبیب ہوں اور جڑی بوٹیوں کی تجارت کرتا ہوں۔ یہ میری بیوی سارا ہے۔ ہم دمشق میں کچھ عرصہ قیام کریں گے۔"

ہمیں شہر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔

دمشق میں ہم اپنی نئی زندگی کا آغاز کر چکے تھے۔ میں نے اپنی بیوی کے زیور اور جواہرات فروخت کر کے شہر کنارے ایک پختہ اینٹوں والا مکان خرید لیا تھا۔ میں صحرا میں گھوم پھر کر جڑی بوٹیاں تلاش کرتا اور اس سے مریضوں کا علاج کرتا۔ میرے والد کی دی ہوئی کتاب طب میں ایسے ایسے قدیم نسخے تھے کہ میرے ہاتھوں بے حد تشویش ناک امراض

میں مبتلا مریضوں کو شفا ہوئی۔ دمشق میں میری شہرت عام ہو گئی۔ اس وقت دمشق پر حموربی کی تیسری اولاد میں سے ایک کاہل اور عیاش بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ میں امیروں اور وزیروں کے محلوں میں بھی جا کر علاج کرتا۔ میں نے اپنے لئے دریا کے کنارے ایک حویلی بنوا لی۔ ایک بار مجھے شاہی محل میں بھی بلوایا گیا۔ ایک عمر رسیدہ کنواری شہزادی پیٹ کے مرض کہنہ میں مبتلا تھی۔ میں نے اس کا علاج کیا۔ اسے شفا ہو گئی۔ بادشاہ نے مجھے دربار میں کرسی پیش کی۔ میں خوب جانتا تھا کہ اگر میں نے انکار کیا تو میرا سر قلم کر دیا جائے گا۔ اگرچہ میرا دل شاہی محلات سے بے زار ہو چکا تھا مگر اپنی جان بچانے کے لئے میں نے دربار کی کرسی قبول کر لی۔

دربار کے شاہی طبیب کو یہ بات سخت ناگوار لگی۔ اس نے میرے خلاف باقاعدہ سازش کا آغاز کر دیا۔ مجھے ان درباری جھمیلوں میں پڑ کر کیا لینا تھا۔ میں اپنے گھر میں اپنی پیاری بیوی کے ساتھ بہت خوش و خرم تھا مگر میں دربار بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ آپ آج کے پاکستان میں رہ کر ایک جمہوری دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ آج سے چھ ہزار برس پہلے کی شہنشاہیت کا صحیح تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آپ نے بادشاہوں کے عہد کی تاریخی کہانیاں ہی پڑھی ہیں مگر میں خود اس دور میں سے گزر کر آپ کے عہد تک پہنچا ہوں۔ اس لئے آپ کو حرف بحرف سچے اور اپنے اوپر بیتے ہوئے واقعات اور تجربات بیان کر رہا ہوں۔ شاہی دربار کی زندگی سے وابستہ ہونے کے بعد آپ کے وہاں سے نکلنے کے دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ پہلی یہ کہ بادشاہ آپ کو زہر دے کر ہلاک کروا دے اور دوسری یہ کہ آپ خود زہر کھا کر خود کشی کر لیں۔ تیسری کوئی صورت نہیں ہوا کرتی تھی۔ میں نے شاہی محلات میں آنکھیں کھولی تھیں۔ میں محلات کی پرخطر زندگی اور خون آشام سازشوں سے خوب واقف تھا لیکن اب خواہش کے باوجود شاہی محل نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ دربار کے خوشامدی ماحول اور شاہی محل کی سازشوں سے دامن چھڑانے کی ایک ہی صورت تھی کہ میں اپنی بیوی سارا کو لے کر دمشق سے فرار ہو جاؤں۔ میں نے تمام حالات سے اپنی بیوی کو باخبر کرنے کے بعد اس سے مشورہ طلب کیا تو اس نے بھی یہی رائے دی کہ ہمیں اس پراگندہ درباری ماحول سے دامن چھڑا کر کسی دوسرے ملک کی طرف کوچ کر جانا چاہئے۔ میں نے فرار کے منصوبے پر غور کرنا شروع کر دیا۔ میں نے انگور کا ایک باغ خریدا ہوا تھا۔ وہ فروخت کر دیا۔ میں فرار کی دوسری تفصیلات میں لگا ہوا تھا کہ اچانک شاہی طبیب نے بھرپور وار کر دیا۔

اس نے پہلے ہی سے بادشاہ کے کان میرے خلاف خوب بھر رکھے تھے۔ مجھے اس کی خبر نہیں تھی کیونکہ دربار میں میرا کوئی مخبر نہیں تھا۔ دوسری جانب شاہی طبیب ایک ایسی

حکمت عملی پر چل رہا تھا جس نے مجھے دھوکے میں رکھا۔ میرے ساتھ اس کا سلوک بڑا مشفقانہ ہو گیا تھا اور وہ اکثر بعض جڑی بوٹیوں کے خواص کے بارے میں مشورہ لینے میری حویلی بھی آ جایا کرتا تھا۔ اس نے مجھے یہ تاثر دے رکھا تھا کہ وہ مجھے طب میں اپنے سے بڑھ کر سمجھتا ہے لیکن اندر ہی اندر وہ میرے خلاف ایک خطرناک سازش کے تانے بانے بن رہا تھا جب سازش کا جال پوری طرح تیار ہو گیا تو ایک رات جبکہ میں روغن زیتون کے چراغ کی روشنی میں کتاب طب کا مطالعہ کر رہا تھا تو حویلی کے دروازے پر ایک گھڑ سوار آیا۔ پہرے دار نے مجھے اطلاع بھجوائی کہ چھوٹی شہزادی کی طبیعت اچانک ناساز ہو گئی ہے اور مجھے شاہی محل طلب کیا گیا ہے۔ میری بیوی خواب گاہ میں سو رہی تھی - رتھ بان زال بھی اپنی کوٹھڑی میں محو خواب تھا۔ میں نے چند ضروری ادویات تھیلے میں ڈالیں اور نیچے آ گیا۔ میں نے رتھ بان کو جگانا چاہا تو معلوم ہوا کہ گھڑ سوار میرے لئے شاہی گھوڑا ساتھ لایا ہے۔ میں اس کے ساتھ محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

دمشق کی قدیم پراسرار گلیاں آدھی رات کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں چراغوں کی روشنی بھی ہو رہی تھی۔ گھڑ سوار مجھے محل کے عقبی حصے کی جانب لے گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ محل کے صدر دروازے کی طرف کیوں نہیں گیا۔ اس نے کہا کہ شہزادی اپنی بیماری کا بادشاہ اور ملکہ سے ذکر نہیں کرنا چاہتی۔ اس لئے یہ ان کا حکم ہے کہ آپ کو خفیہ راستے سے ان کی خواب گاہ تک لایا جائے۔ میں خاموش ہو گیا۔ محل کے عقب میں خاموشی اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ محل کے ایک خفیہ راستے سے مجھے شہزادی کی خواب گاہ کی کھڑکی کے پاس لایا گیا۔

"آپ اس کھڑکی میں سے شہزادی کی خواب گاہ میں تشریف لے جائیے کیونکہ خواب گاہ کے دروازے پر خواجہ سراؤں کا پہرہ ہے اور شہزادی اپنی بیماری کو راز میں رکھنا چاہتی ہیں۔ جلدی کیجئے۔ شہزادی کی طبیعت سخت ناساز ہے۔"

یہ کہہ کر گھڑ سوار چلا گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی کو ذرا سا دھکیلا تو وہ کھل گئی۔ میرے خلاف کی گئی بھیانک سازش کا یہ بھی ایک حصہ تھا۔ شاہی طبیب نے ایک کنیز خاص سے مل کر شہزادی کی خواب گاہ کی کھڑکی کی زنجیر اندر سے کھلی رکھوائی تھی۔ میں جھکتے ہوئے کھڑکی میں سے اندر داخل ہو گیا۔ شہزادی کی خواب گاہ میں افریقی آبنوس کی جالی کے قریب سے گزر کر میں آگے بڑھا۔ میرے پاؤں ریشمی قالین میں دھنس رہے تھے۔ خواب گاہ میں کافوری شمعوں کی خواب انگیز دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور فضا میں عود و عنبر کی خیال افروز مہک رچی ہوئی تھی۔ مجھے شہزادی کے کراہنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں آبنوس

کے جالی دار پردے کی اوٹ سے نکل کر سامنے آیا تو دیکھا کہ شاہی پلنگ پر شہزادی محو خواب ہے۔ اس کے سیاہ بال ریشمی تکیوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہاں کوئی آثار ایسے نہ تھے کہ جس سے یہ پتہ چلے کہ شہزادی بیمار ہے۔

میرے قدم وہیں رک گئے۔ اب میری چھٹی حس بیدار ہو گئی اور مجھے احساس ہوا کہ کہیں میرے خلاف کوئی سازش تو نہیں کی گئی؟ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ خواب گاہ کی کھڑکی میں سے چار خواجہ سرا ننگی تلواریں لئے داخل ہو گئے اور انہوں نے مجھے اپنے نرغے میں لے کر شور مچا دیا۔ شہزادی خوف زدہ ہو کر بیدار ہو گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ اپنا شب خوابی کا لباس سمیٹتے ہوئے بولی۔

"تم ... تم یہاں کیسے آ گئے؟"

میرے سامنے پورا کھیل بے نقاب ہو گیا تھا لیکن سانپ نکل چکا تھا۔ مجھے اسی وقت گرفتار کر کے شاہی محافظ دستے کے حوالے کر دیا گیا۔ دوسرے دن مجھے پابہ زنجیر دربار میں پیش کیا گیا۔ بادشاہ غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس کے نکتہ نظر کے مطابق میں اس کی شہزادی بیٹی کی خواب گاہ میں بری نیت سے داخل ہوا تھا۔ میں نے اپنی صفائی کے لئے زبان کھولی ہی تھی کہ بادشاہ غصے سے لرزتا ہوا تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"لے جاؤ.... اسے زمین میں زندہ دفن کر دو۔"

مجھے گھسیٹ کر دربار سے باہر لے جایا گیا اور زنداں میں ڈال دیا گیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میری بیوی سارا پر کیا گزر رہی ہے اور وہ کس حال میں تھی۔ میں زنجیروں میں جکڑا زنداں میں پڑا تھا مگر بادشاہ کے ہلاکت خیز شاہی احکام کی تکمیل میں دیر نہیں ہوا کرتی تھی۔ جلاد میرے گلے میں رسی ڈال کر مجھے کھینچتے ہوئے شاہی محل سے دور کچے ٹیلوں کے درمیان کھجوروں کے ایک جھنڈ میں لے گئے۔ وہاں میرے لئے پہلے ہی سے زمین میں ایک گڑھا کھدا ہوا تھا۔ موت کے خوف سے میرے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں ابھی جوان تھا۔ میری حسین بیوی سارا بھی ابھی جوان تھی۔ ہم ابھی ہنسی خوشی زندگی کی بہاروں سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے مگر میں اپنی بیوقوفی اور بھولپن کی وجہ سے شاہی طبیب کی ہولناک سازش کا شکار ہو گیا تھا۔ اپنی بیوی سارا کو یاد کر کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی بیوی کو الوداع کیا اور میرا دل خدائے واحد کے حضور اپنی بخشش کے لئے سجدہ ریز ہو گیا۔ جلادوں نے میری زنجیریں اتار دیں اور مجھے گڑھے میں دھکا دے کر گرا دیا۔ یہ گڑھا کافی گہرا تھا اور میں اس میں پورے قد سے چھپ گیا۔ جلادوں کے اشارے پر سپاہیوں نے میرے اوپر مٹی گرانی شروع کر دی۔ میں مٹی

اور پتھروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ میں نے ایک بار ہاتھ پیر مار کر باہر نکلنے کی کوشش کی تو جلادوں نے میرے اردگرد تیر مارے۔ تیر مٹی میں آ کر دھنس گئے۔ باہر بھی موت تھی اور گڑھے میں بھی موت تھی۔ موت نے میرے پاؤں مٹی کے اندر جکڑ لئے تھے۔ اب میں کوشش کے باوجود اپنے پاؤں مٹی سے باہر نہیں کھینچ سکتا تھا۔ مٹی میرے کاندھوں تک پہنچ گئی۔

میں نے جان بچانے کی ساری کوششیں اور خواہش ترک کر دی اور خدائے واحد کو یاد کر کے اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا۔ ایک بار پہلے میری ماں کی دعا نے میری جان بچا لی تھی مگر اب وہ بھی شاید مجبور تھی کیونکہ میں زمین میں زندہ دفن ہو رہا تھا اور مٹی میری گردن سے اوپر آ چکی تھی۔ مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے میرے سر کے اوپر بارش کی طرح گرنے لگے۔ میں نے منہ بند کر کے ہونٹ بھینچ لئے کیونکہ مٹی میرے منہ میں داخل ہونے لگی تھی۔ جب مٹی کی سطح میری ناک کے پاس پہنچی تو میں نے ایک لمبا سانس اندر کو کھینچ کر آخری بار دمشق کی وادی میں سورج کی روشنی میں کھجور کے جھنڈوں کو لہراتے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

میں زمین کے اندر زندہ دفن ہو چکا تھا۔ میرے اوپر دو فٹ تک گڑھا پر کر کے لکڑی کا تختہ پھروا دیا گیا۔ مجھے لکڑی کے تختے کے پھرنے اور سپاہیوں کے باتیں کرنے کی دھیمی دھیمی کمزور سی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز گونجی اور دور ہوتے ہوتے غائب ہو گئی اور ہر طرف موت کی خاموشی چھا گئی۔ میرے کانوں سے شائیں شائیں کی آوازیں نکلنے لگیں۔ تازہ ہوا کا جو آخری طویل سانس میں نے اپنے اندر کھینچا تھا۔ اس کی آکسیجن اب ختم ہو رہی تھی اور میرے پھیپھڑے پھٹنے لگے تھے۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ مٹی میں دبا ہوا میرا سارا جسم ایک بار زور سے کانپا اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں روشنی کے ایک غار میں سے اڑتے ہوئے گزر رہا ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ خدائے واحد نے مجھے بخش دیا ہے اور مرنے کے بعد میری روح جنت کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ روشنی کا غار آگے جا کر بند ہو گیا۔ میرا جسم دیوار سے ٹکرایا اور میں چھوٹے چھوٹے سرخ، زرد اور نیلے ستاروں کی پھلجھڑی میں تحلیل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے جسم کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو ہلانا چاہا۔ میری انگلیاں منوں مٹی کے اندر دفن تھیں۔ وہ ذرا سی بھی حرکت نہیں کر سکتی تھیں مگر مجھے محسوس ہوا کہ میری انگلیوں تک حرکت کرنے کا حکم پہنچ چکا ہے۔ میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں کھولنا چاہیں میری آنکھوں کے پپوٹوں کے آگے مٹی کی دیوار تھی، میری آنکھوں کے پپوٹے نہ کھل سکے۔ لیکن میرا دماغ زندوں کی طرح سوچ رہا تھا۔ کیا میں مر چکا ہوں؟ کیا میں ابھی

نہیں مرا؟ میں نے سانس لینا چاہا۔ میں سانس نہیں لے سکتا تھا مگر میں زندہ تھا۔ مجھے اپنے جسم میں ایک نئی توانائی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ مٹی کے ذروں کے اندر سے تھوڑی تھوڑی تازہ ہوا میرے پھیپھڑوں تک پہنچ رہی تھی جس نے مجھے زندہ رکھا تھا۔

میں ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کو آہستہ آہستہ حرکت دیتے ہوئے آگے سے مٹی کو ہٹانے لگا۔ مٹی پرے پرے ہونے لگی۔ میرے ہاتھوں اور پاؤں میں کسی نے طاقت بھر دی تھی۔ میں مٹی کو پیچھے ہٹاتا چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میرے بازوؤں کے آگے کافی مٹی پرے ہٹ چکی تھی۔ میں نے اوپر کی جانب کہنیاں اٹھا کر اپنے منہ کے آگے سے مٹی ہٹانی شروع کی۔ کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد میرے سر کے اوپر مٹی میں ایک سوراخ ہو گیا۔ اور اس میں سے تازہ ہوا اندر آنے لگی لیکن میں نے ایک حیران کر دینے والی تبدیلی یہ محسوس کی کہ میرے پھیپھڑوں نے تازہ ہوا کا زیادہ گرم جوشی سے خیر مقدم نہیں کیا تھا۔ وہ بڑے سکون اور ست انداز میں سانس اندر کھینچ کر چھوڑ رہے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اس وقت زندگی بچانا تھی۔ میں نے اپنے اردگرد کی ساری مٹی کھود ڈالی اور گڑھے کے اندر ہی کچھ دیر کے لئے چھپا بیٹھا رہا۔ میں نے دیکھا کہ باہر رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور آدھی رات کو دمشق کے باغوں میں چلنے والی ہوا میں کھجور کے درختوں کی شاخیں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔

میں گڑھے سے باہر نکل آیا۔ اندھیری رات، خاموش اور سنسان تھی۔ خدا نے مجھے موت کے منہ سے نکال لیا تھا۔ شاہی جلاد مجھے زندہ دفن کر گئے تھے مگر میں خدائے واحد کی رحمت سے مٹی کے اندر دب کر بھی زندہ رہا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ مجھے زمین میں دفن ہوئے چند ہی گھنٹے ہوئے ہیں۔ دوپہر کو شاہی جلاد مجھے دفن کر کے گئے ہیں اور آدھی رات کو میں زندہ قبر سے باہر نکل آیا ہوں۔ میرے کپڑوں پر مٹی لگی تھی۔ میں نے کپڑے جھاڑے۔ اندھیرے میں اپنی تیز نگاہوں سے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ کہیں کوئی پہرے دار تو وہاں پر موجود نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے آس پاس کوئی انسان نہیں تھا۔ میں کھجور کے درختوں کے جھنڈ میں سے نکل کر کچے ٹیلوں کے پیچھے سے ہو کر اپنی حویلی کی طرف چلنے لگا۔

آسمان روشن ستاروں سے جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ دمشق نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ دور دریا کے پل کی طرف سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے شاہی محل کی طرف نگاہ ڈالی۔ شاہی محل کے برجوں میں شب کے فانوس روشن تھے۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کچی پگڈنڈی پر آ گیا جو صحرائی ٹیلوں میں سے گزر کر میری حویلی کے عقبی

دروازے کی طرف چلی گئی تھی۔ ایک ٹیلے کے عقب سے نکلا تو سامنے مجھے اپنی حویلی دکھائی دی۔ حویلی میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میری بیوی سارا میری زندگی سے مایوس ہو کر روتے روتے چراغ گل کر کے شاید سو گئی تھی یا شاید میری یاد میں اندھیرے میں آنسو بہا رہی تھی۔ میں سوچنے لگا جب وہ مجھے اپنے سامنے زندہ سلامت دیکھے گی تو کس قدر خوش ہو گی۔ اسے تو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آئے گا۔

میری حویلی کا عقبی دروازہ بند تھا۔ میں نے دیکھا کہ اندر کی بجائے اس کے باہر تالا پڑا تھا۔ میں حیران سا ہوا کہ کیا میری بیوی میرے زندہ دفن کئے جانے کے چند گھنٹے بعد ہی حویلی چھوڑ کر چلی گئی ہے؟ کیونکہ حویلی کے عقبی دروازے کے باہر ہم نے کبھی تالا نہ ڈالا تھا۔ میں دیوار پھاند کر حویلی کے پچھلے صحن میں آ گیا۔ میں نے اندھیرے میں دیکھا کہ پتھریلی روشوں پر ... سوکھے ہوئے پتے بکھرے پڑے تھے۔ میں فوارے کے گول حوض کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ فوارہ بند پڑا ہے اور حوض کے اندر پانی سوکھ گیا ہے۔ میں نے حوض میں ہاتھ ڈالا۔ میرا ہاتھ خشک پتوں کی ڈھیری سے ٹکرایا اور ایک خرگوش پھدک کر باہر آ گیا۔ حویلی کا دروازہ آدھا کھلا تھا اور دوسرا دروازہ ہوا کی وجہ سے جھول رہا تھا۔ میں حویلی کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ ہر طرف گہری خاموشی اور تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ نہ کوئی دربان ہے' نہ کوئی نوکر چاکر ہے کسی بھی کمرے اور کھڑکی میں روشنی نہیں ہو رہی تھی۔ تمام چراغ گل تھے۔ سب شمعیں بجھ چکی تھیں۔ میں خواب گاہ میں گیا تو دیکھا کہ وہاں پلنگ اور تخت خالی پڑے ہیں۔ کہیں کوئی بستر نہیں بچھا ہوا۔ کہیں کوئی سامان نہیں ہے۔ میں ساری حویلی میں گھوم لیا۔ میری بیوی کہیں بھی نہیں تھی۔ کسی جگہ کوئی سامان نہیں تھا۔ پانی پینے کو ایک پیالہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں سناٹے میں آ گیا کہ میرے مرنے کے چند گھنٹے بعد یہ کیسا انقلاب آ گیا کہ حویلی خالی ہو گئی۔ میری بیوی یہاں سے سامان اٹھا کر کوچ کر گئی۔ ویران روشیں سوکھے پتوں سے اٹ گئیں اور پانی کا حوض سوکھ گیا اور وہاں خرگوشوں نے بسیرا کر لیا۔ میں اپنے وفادار رتھ بان زال کی کوٹھری میں گیا۔

زال کی کوٹھری بھی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ایک موی شمع دان بجھا پڑا تھا۔ میں نے شمع دان روشن کیا اور دیکھا کہ کوٹھری میں بچھا ہوا تخت خالی ہے اور اس پر مٹی اور گرد کی تہ جمی ہوئی ہے۔ میں شمع ہاتھ میں پکڑے اصطبل میں آ گیا۔ یہاں بھی وہی ویرانی ہی ویرانی تھی۔ اصطبل خالی پڑا تھا۔ یہاں سے نکل کر میں ایک بار پھر اپنی بیوی کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ شمع کی روشنی میں مجھے جگہ جگہ ہر شے پر مٹی کی موٹی تہ جمی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے انگلی سے گرد ہٹائی تو احساس ہوا کہ یہ گرد چند گھنٹوں میں نہیں جم سکتی۔ مجھے

ایسا لگ رہا تھا کہ میں ایک عرصے بعد اپنے گھر آیا ہوں۔

مجھے آہٹ کی آواز آئی۔ میں نے جلدی سے شمع بجھا دی اور دروازے کے پیچھے چھپ گیا کسی کے قدم کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے - میرا دل دھڑکنے لگا۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ کیا بادشاہ کو میرے فرار کا علم ہو گیا ہے اور اس نے مجھے قتل کرانے کے لئے کوئی سوار بھیجا ہے؟ میں دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ دم سادھے کھڑا تھا۔ آنے والے پراسرار اجنبی کے قدم دروازے کے پاس آ کر رک گئے۔ ایک جگر خراش گہری خاموشی چھا گئی۔ پھر کسی نے دھیمی آواز میں پکار کر کہا۔

"کون ہے؟"

یہ کسی بوڑھے آدمی کی آواز تھی۔ پراسرار اجنبی کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں دروازے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ مجھے اندر آنے والے اجنبی کا سایہ نظر آیا۔ جو قدرے خمیدہ تھا۔ لگتا تھا کہ یہ کوئی بوڑھا آدمی ہے۔ اس اجنبی نے دیوار کے طاق میں رکھی ہوئی شمع روشن کی۔ ویران کمرے کی بوسیدگی اور نمایاں ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خمیدہ کمر آدمی جس کی سفید داڑھی تھی' شمع ہاتھ میں لئے دروازے کے اس پٹ کی طرف بڑھ رہا تھا جس کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا۔ شاید اس نے میرے پاؤں دیکھ لئے تھے۔ قریب آ کر اس نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔

"اگر تم کوئی چور ہو تو غلط جگہ پر آ گئے ہو۔ یہاں سوائے تباہی اور بربادی کے اور کچھ نہیں ہے۔"

آواز میری جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ میں اس کے سامنے آ گیا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ میری شکل دیکھتے ہی بوڑھے کے ہاتھ کانپے' ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے اور شمع اس کے ہاتھ سے گر کر بجھ گئی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ میں نے بے ہوش بوڑھے کو اٹھایا اور ویران خواب گاہ میں لا کر اسے پلنگ پر لٹا دیا۔ شمع روشن کی اور بوڑھے کو غور سے دیکھا۔ وہ بے ہوش تھا۔ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا لیکن شکل جانی پہچانی تھی۔ اتنے میں بوڑھے کو ہوش آ گیا۔ اس کی نظر ایک بار پھر مجھ پر پڑی تو اس کے حلق سے ایک خوفزدہ چیخ سی نکل گئی اور اس نے اپنا جھریوں بھرا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔

"حضور عاطون کی روح مجھے معاف کر دینا۔ میں نے اس حویلی کی ہر طرح حفاظت کی ہے۔"

میں اب اسے پہچان گیا تھا۔ وہ میری بیوی سارا کی کنیز خاص کا بیٹا حباش تھا مگر وہ تو بہت ہی ضعیف ہو گیا تھا۔ یہ ایک رات میں وہ اتنا بوڑھا کیسے ہو گیا؟ یہ ایک ہی رات میں

میری جیتی جاگتی حویلی اس قدر ویران کھنڈر میں کیسے تبدیل ہو گئی؟ جب میں شاہی گھڑ سوار کے ساتھ شہزادی کا علاج کرنے شاہی محل کی طرف روانہ ہوا تھا تو سارا کی کنیز خاص کے اس بیٹے حباش کی عمر پچیس تیس برس کے قریب تھی اور وہ میرے اصطبل کی رکھوالی کیا کرتا تھا۔ یہ پچیس تیس برس کے بھرپور جوان سے بوڑھا کھوسٹ کیسے بن گیا؟ میں ان خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ بوڑھا حباش بولا۔

"حضور عاطون کی روح! تم پر رب شمس مہربان ہو تمہارے زندہ دفن ہو جانے کے بعد ہم تمہاری لاش کو حنوط کر کے شاہی قبرستان مصر میں دفن نہیں کر سکے۔ ہمیں معاف کر دے۔"

"کیا تم حباش ہو؟"

"ہاں حضور عاطون! میں حباش ہوں ... آپ کا نمک خوار حباش آپ کے شاہی گھوڑوں کا محافظ۔ مجھے معاف کر دینا۔ میرے عظیم مالک کی روح! پچاس برسوں میں سارے گھوڑے ایک ایک کر کے مجھ سے جدا ہوتے گئے۔"

پچاس برس؟ مجھ پر جیسے بجلی کا کوندا سا لپکا۔ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا مجھے اپنی حویلی سے نکلے پچاس برس گزر گئے تھے؟

"حباش ! سنو میں عاطون کی روح نہیں ہوں بلکہ میں خود عاطون ہوں۔ اس حویلی کا مالک عاطون۔"

بوڑھا حباش اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں۔

"حضور عاطون! مگر... مگر آپ کو تو بادشاہ کے حکم پر زمین میں زندہ دفن کر دیا گیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "ہاں... مگر میں مٹی کے اندر کسی نہ کسی طرح زندہ رہا اور اب چار پانچ گھنٹے گزرنے کے بعد زمین میں سے نکل کر واپس آ گیا ہوں مگر میری بیوی سارا کہاں ہے؟ یہ حویلی کھنڈر میں کیوں بدل گئی ہے؟ تم اس قدر بوڑھے کیسے ہو گئے ہو؟ یہ سب کچھ کیا ہے؟ کہیں میں کوئی بھیانک خواب تو نہیں دیکھ رہا؟"

بوڑھا حباش مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ شمع کی دھیمی روشنی میں اس کے ضعیف چہرے کی جھریاں اور نمایاں ہو گئی تھیں۔ کانپتی آواز میں کہنے لگا۔

"لیکن حضور عاطون! آپ کو زمین کے اندر دفن ہوئے پچاس برس گزر چکے ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے حباش! اگر پچاس برس گزر گئے ہوتے تو میں بوڑھا کیوں نہیں ہوا۔ میں کیوں ویسے کا ویسا جوان رہا؟"

"میں خود حیران ہوں میرے آقا! ایک تو آپ زمین کے اندر پچاس برس تک دفن

رہنے کے بعد زندہ نکل آئے اور دوسرے آپ پر عمر نے کوئی اثر نہیں کیا۔ وقت کے کانپتے ہاتھوں نے آپ کے چہرے پر بڑھاپے کی ایک ... لکیر بھی نہیں ڈالی۔"

اب مجھے وہ آواز یاد آئی جو کبھی کبھی میرے خواب میں آ کر کہا کرتی تھی۔

"تم زندہ رہو گے۔ تم مر نہیں سکو گے۔ یہ ایک رحمت بھی ہو گی اور ایک عذاب بھی ہو گا۔"

میں نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ میرے ہاتھ ویسے ہی ایک جوان آدمی کے ہاتھ تھے۔ میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ میرا چہرہ بھی جوان آدمی کا چہرہ تھا۔ میں نے حباش سے کہا۔

"میری بیوی سارا کا کیا بنا؟ وہ کہاں ہے؟ کیا وہ..."

"نہیں میرے آقا! شہزادی صاحبہ زندہ ہیں۔ آپ کی موت کے بعد ان کی جان کو بھی خطرہ تھا۔ میں اور میری ماں انھیں یہاں سے نکال کر شام کی سرحد پر اپنے گاؤں کے مکان پر لے گئے اور انہیں وہیں چھپائے رکھا تا وقتیکہ بادشاہ بوڑھا ہو کر مر گیا۔ شاہی طبیب بھی مر گیا۔ ہم نے شہزادی صاحبہ کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ واپس اپنی حویلی میں آ جائیں مگر انہوں نے کہا کہ جہاں انہیں ایک ایک شے آپ کی یاد دلائے گی' وہ وہاں نہیں جائیں گی۔"

"کیا میری پیاری بیوی اب بھی اسی سرحدی گاؤں والے مکان میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں میرے آقا! میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ پھر میں ان کی خدمت کرتا رہا۔"

میرا ذہن عجیب قسم کے ناقابل بیان خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں زمین کے اندر پچاس برس تک دفن رہنے کے بعد زندہ باہر نکل آیا ہوں۔ یہ ایک ناممکن اور انہونی بات تھی۔ آج تک کسی کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔ بوڑھا حباش بھی حیرت زدہ تھا۔ میں نے حباش سے کہا۔

"حباش! مجھے میری پیاری بیوی کے پاس لے چلو۔"

وہ میرا منہ تکنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔ میرے آقا! آپ اسی طرح جوان نہیں مگر آپ کی بیوی جو کبھی چاند کی طرح خوبصورت اور پھولوں کی طرح شگفتہ اور حسین تھی' اب ایک بوڑھی کھوسٹ عورت میں بدل چکی ہے۔ کیا آپ اسے دیکھ سکیں گے؟ میں نے حباش کے دلی خیالات کو پڑھتے ہوئے کہا۔

"مجھے میری پیاری بیوی کے پاس لے چلو' ابھی ... میں ابھی یہاں سے روانہ ہونا چاہتا ہوں۔"

"جو حکم میرے آقا! میں سواری کے لئے گھوڑے لاتا ہوں۔ آپ تشریف لے چلئے۔"

بوڑھا حباش مجھے لے کر حویلی کے صحن میں آ گیا۔ یہ پائیں باغ کا صحن تھا۔ اس کے پاس اپنا ایک گھوڑا تھا۔ میرے لئے وہ کسی دوست کے گھر سے دوسرا گھوڑا لے آیا۔ ہم گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور قدیم ترین شہر دمشق کی ٹھنڈی اندھیری رات کی گہری خاموشی میں سرحدی گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔

صبح کے سورج کی سنہری روشنی صحرا میں پھیل چکی تھی کہ ہم زیتون کے درختوں کے جھنڈ میں ایک کچے مکان کے باہر پہنچ کر رک گئے۔ حباش نے اپنا بوڑھا ہاتھ اٹھا کر مکان کی طرف اشارہ کیا۔

"میرے آقا! شہزادی صاحبہ اسی مکان میں قیام پذیر ہیں۔"

میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں اپنی حسین بیوی کو ایک بوڑھی عورت کی شکل میں کیسے دیکھ سکوں گا؟ اور پھر مجھے جوان حالت میں دیکھ کر کہیں وہ دہشت زدہ نہ ہو جائے...... میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات کی موجیں تلاطم برپا کر رہی تھیں۔

بوڑھا حباش ہاتھ باندھے خاموش کھڑا تھا۔ میں نے مکان پر ایک نگاہ ڈالی۔ کچی دیوار پر انگور کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ صحن میں پانی کے بڑے مٹکے کے اوپر نیلا آب خورہ اوندھا پڑا تھا۔ سامنے کوٹھری کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان کنیز باہر نکلی۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کی رکابی تھی جس میں لکڑی کا چمچ رکھا تھا۔ اس نے حباش کو دیکھا تو آگے بڑھ کر تعظیم دی۔ وہ مجھے نہیں جانتی تھی۔ اس نے حباش سے کہا۔

"آپ اندر تشریف لے چلئے آقا۔"

"کیا شہزادی صاحبہ جاگ رہی ہیں؟" حباش نے پوچھا۔

"ہاں میرے آقا۔" کنیز نے کہا۔

"تم جا سکتی ہو۔"

کنیز چلی گئی۔ حباش نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"میرے آقا عاطون! آپ شہزادی صاحبہ سے مل لیجئے۔ وہ پچاس برس سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

میں نے بوڑھے حباش کو وہیں ٹھہرنے کو کہا اور بوجھل بوجھل قدم اٹھاتا کوٹھری کے دروازے میں سے اندر داخل ہو گیا۔ کوٹھری کی عقبی کھڑکی میں سے دن کی روشنی آ رہی تھی۔ کھڑکی کے پاس ایک چارپائی بچھی تھی جس پر ایک عورت لیٹی تھی۔ اس کا چہرہ چھت کی طرف تھا اور جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی۔ یہ میری بیوی سارا

تھی جس کے عارض بہار آفرین سے کبھی خرطوم کے سرخ گلاب کی کرنیں پھوٹا کرتی تھیں۔ اس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ یہ وہ بال تھے جن کی سیاہی کبھی افریقہ کی سیاہ گھٹاؤں کو شرماتی تھی اور جن کے جوڑے میں سے کبھی دریائے نیل کے دریائی کنول پھولوں کی مہک اڑا کرتی تھی۔ وقت اور میری موت کے غم نے اسے بے حد بوڑھا کر دیا تھا۔ یہ سارا تھی۔ ستر برس کی بوڑھی عورت ... ضعیف' جھریوں بھری' ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے نحیف آواز میں پوچھا۔

"مجھے اٹھا کر بٹھا دو شالیان!"

میں سمجھ گیا' وہ مجھے اپنی کنیز سمجھ رہی تھی جو ابھی ابھی اسے دودھ اور شہد پلا کر گئی تھی۔ میں دو قدم چل کر اپنی بیوی کی چارپائی کے قریب آ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے آہستہ سے اس کی کمر کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے اٹھانا چاہا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ شاید اس نے کسی اجنبی مرد کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کر لیا تھا۔

"کک... کون ہو تم..."

اس نے اپنی کمزور اور ادھ کھلی آنکھوں سے میرے چہرے کو دیکھا اور اس پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ میرے ہاتھوں میں تھامے ہوئے جسم نے ایک جھرجھری سی لی اور اس کے ہونٹ اپنے آپ کھلتے چلے گئے۔

"عاطون!"

"ہاں سارا۔ میں ہوں عاطون۔ تمہارا خاوند... تمہارا محبوب شوہر!!"

اس کے چہرے پر محبت کا ایک نور سا پھیل گیا۔ کانپتے ہونٹ ایک بار پھر ہلے۔

"تم جنت سے مجھے لینے آئے ہو۔ میں آ رہی ہوں۔ میں آ رہی ہوں۔"

اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ کہتا .... اس کا سفید بالوں والا بوڑھا سر آہستہ آہستہ ڈھلک کر میرے سینے سے لگ گیا۔

"سارا ..."

میں نے چیخ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ اس کی گردن پیچھے کو ڈھلک گئی۔ سارا مر چکی تھی۔ میری دل دوز چیخ سن کر بوڑھا حباش اندر آ گیا۔ سارا کا مردہ جسم میرے بازوؤں میں تھا اور کھلی کھڑکی میں سے سورج کی سنہری روشنی اس کے جھریوں بھرے پرسکون نورانی چہرے کو اور زیادہ منور کر رہی تھی۔ حباش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میرے آقا! عمر بھر کا طویل انتظار ختم ہو گیا۔ شہزادی صاحبہ کی روح کو سکون مل

گیا۔"

اور وہ آنسو پونچھتا باہر نکل گیا۔ میں نے اپنی پیاری بیوی کے بوڑھے سر کو اپنے سینے سے لگالیا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک طوفان اُمڈ پڑا۔ جانے میں کب تک اپنی وفا شعار بیوی کے مردہ چہرے کو اپنے سینے سے لگائے روتا رہا۔ جب میرے دل کا غبار ہلکا ہوا تو میں نے حباش کو آواز دے کر اندر بلایا اور نم آلود آواز میں کہا۔

"میں اپنی پیاری سمارا کو مصر میں اپنی والدہ کی قبر کے ساتھ دفن کرنا چاہتا ہوں۔"

"میرے آقا! اس وقت مصر میں آپ کے تایا کفروتی کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے کی حکومت ہے۔ کہیں وہ آپ کو گرفتار کرواکر زندان میں نہ ڈال دے۔"

"مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے اب جینے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرا اس دنیا میں اب کون رہ گیا ہے جس کے لئے زندہ رہوں گا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں اپنی بیوی کو مصر کے قبرستان میں اپنی والدہ کی قبر کے پہلو میں ہی دفن کروں گا۔"

میں نے اپنی بیوی کی لاش کو دمشق کے ایک ماہر حنوطی سے حنوط کروا کر ایک خوبصورت قیمتی تابوت میں رکھا اور ایک قافلے کے ساتھ اپنے وطن مصر کی طرف روانہ ہو گیا۔ حباش میرے ساتھ تھا۔ میری بیوی کے صندوق میں سے اس کے زیور' جواہرات اور میری کتاب طب بھی مل گئی۔ جس میں میرے اور میرے باپ کے انمول طبی نسخے اور نادر جڑی بوٹیوں کے خواص درج تھے۔ یہ ایک بے حد قیمتی ورثہ تھا جسے میری پیاری بیوی نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ زیورات' کپڑے اور جواہرات میں نے اسی زمانے کے رواج کے مطابق اپنی بیوی کی ممی کے ساتھ تابوت میں ہی بند کر دیئے۔ اگرچہ میں خدائے واحد پر یقین رکھتا تھا اور میرا یہ اعتقاد نہیں تھا کہ یہ جواہرات اور زیورات اور کپڑے اگلی دنیا میں میری بیوی کے کام آئیں گے لیکن میری بیوی ان باتوں پر اعتقاد رکھتی تھی' اس لئے میں نے اس کے اعتقاد کے مطابق اس کی ساری چیزیں اس کے تابوت میں رکھ دی تھیں۔

تین راتوں کے سفر کے بعد پو پھٹے یہ قافلہ آج سے پانچ ہزار برس سے بھی زیادہ قدیم مصر کے دارالحکومت ایتھنز کی ایک کارواں سرائے میں پہنچ گیا۔ پچاس برس گزر چکے تھے۔ شہر بہت تبدیل ہو چکا تھا۔ بابل بادشاہوں کے حملوں نے اسے دوبار تاخت و تاراج کیا تھا اور شہر ایک بار پھر آباد کیا گیا تھا۔ میرے جاننے والے نوجوان اب بوڑھے ہو چکے تھے اور بوڑھے مر کھپ چکے تھے۔ نہ وہ کفروتی فرعون رہا تھا اور نہ میرے خلاف سازش کر کے مجھے زندہ دفن کروانے والا شاہی طبیب زندہ تھا۔ ہم نے تابوت اتروا کر کارواں سرائے کی ایک کوٹھری میں رکھوا لیا۔ حباش نے کہا۔

"میرے آقا عاطون! میں آپ سے ایک بار پھر عرض کروں گا کہ آپ دن کے وقت فرعون کے محل کی طرف مت جائیں۔ نیا فرعون آپ کو اس حلیے میں بہت جلد پہچان لے گا کیونکہ آپ کی شکل و صورت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔"

"حباش!" میں نے کہا۔ "میرا خدائے واحد تمہاری حفاظت کرے۔ یہ میرا وطن ہے میں اس شہر کے دریائے نیل کے ساحل پر کھیل کود کر بڑا ہوا ہوں۔ یہاں کے قبرستانوں میں میرے ماں باپ کی ہڈیاں دفن ہیں۔"

"میرے آقا!" حباش بولا۔ "آپ بجا فرما رہے ہیں لیکن آپ کی موجودگی سے فرعون کے تاج و تخت کو خطرہ محسوس ہو سکتا ہے اور وہ آپ کو قتل کروانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم رات کی تاریکی میں تابوت لے کر قبرستان میں داخل ہوں۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرا دل اپنی بیوی سمارا کی موت کے غم سے ابھی تک بوجھل تھا۔ اگر میں بھی اس کے ساتھ بوڑھا ہوتا ہوا سال خوردگی کی عمر تک پہنچا ہوتا تو شاید اس کی موت مجھے اس قدر غمزدہ نہ کرتی لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا تھا۔ میں جوان رہا تھا۔ میرے جذبات اور احساسات جوان اور متحرک رہے تھے لیکن میری بیوی بوڑھی ہو کر مر گئی تھی۔ اس کی ہمیشہ کی جدائی کا غم مجھے بالکل جوان ہو کر لگا تھا اور میں اس عظیم غم کی شدت کو بھرپور انداز اور احساس کے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔

میں نے رات کی تاریکی میں سمارا کے تابوت کو اپنی والدہ کی قبر کے پہلو میں دفن کر دیا تھا۔ اب یہاں سوائے چھوٹے بڑے بکھرے ہوئے پتھروں اور خار دار جھاڑیوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ یہی حال شاہی گورستان کا تھا۔ وہاں بھی خار دار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں جن میں سیاہ کالے ناگ صحرائی دھوپ سے بچ کر آرام کر رہے تھے۔ میں اور حباش واپس کارواں سرائے میں آ گئے۔ اگلے دن میں نے ہلکے نیلے گاڑھے رنگ کا ایک لمبا کرتہ اور صافہ خرید کر باندھ لیا اور کاندھوں پر ایک نیلی چادر ڈال لی۔ اس زمانے کے طبیب اسی قسم کا لباس پہنا کرتے تھے۔ ایک تھیلا خرید کر اس میں اپنے والد محترم کی قیمتی کتاب طب اور کچھ جڑی بوٹیاں اور دوائی کی چند ایک چمڑے کی چھوٹی شیشیاں ڈال کر رکھ لیں اور حباش سے کہا۔

"میرے وفادار بزرگ! اب یہاں سے تمہارا اور میرا ساتھ ختم ہوتا ہے۔ میں ایک ان دیکھی منزل کی طرف اپنا سفر کرتا رہوں گا۔ تم واپس اپنے گاؤں جا کر زندگی کے دن بسر کرو۔ یہاں سے شاید ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں۔"

میرا وفادار غلام حباش آبدیدہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"میرے آقا! کیا آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھیں گے؟"

"نہیں حباش! میں زندگی کی خار دار راہوں پر جانے والا ہوں۔ مجھے خود اپنی منزل کا کچھ علم نہیں۔ اس عمر میں تم میرے ساتھ کہاں مارے مارے پھرو گے۔ یہ میرا حکم ہے کہ تم واپس چلے جاؤ۔ تم نے جس طرح اپنی والدہ کے بعد میری بیوی کی بڑھاپے تک خدمت کی ہے۔ اس کا بدلہ میں تمہیں نہیں دے سکتا۔ لیکن مجھے جب بھی تمہاری یاد آئے گی' میرا دل تمہاری سپاس گزاری کے احساس سے بھر آئے گا۔"

میرے پاس میری بیوی کے صندوق میں سے نکلا ہوا اپنا ایک قیمتی ہیروں کا جڑاؤ کنگن تھا جو اس زمانے میں شاہی دربار کے امرا پہنا کرتے تھے۔ میں نے وہ کنگن حباش کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اسے قبول کرو۔ انکار مت کرنا۔ مجھے دکھ ہو گا۔ یہ میری خواہش ہے کہ اسے تم اپنے پاس رکھو۔"

بوڑھے حباش کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کنگن لے لیا اور پھر میرے قدموں پر گر کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔

اسی روز' رات کے اندھیرے میں حباش ملک شام کی طرف جانے والے ایک قافلے میں شامل ہو کر اپنے وطن کی طرف چل دیا۔ اسے رخصت کر کے میں اپنی کوٹھری میں آ کر لیٹ گیا۔ میں نے اپنے اندر دو بڑی تبدیلیاں محسوس کی تھیں۔ پہلی تبدیلی یہ آئی تھی کہ مجھے بھوک اور پیاس لگنا بند ہو گئی تھی۔ میں صرف عادت کے طور پر کچھ کھا پی لیتا تھا ورنہ نہ تو مجھے پیاس لگتی تھی اور نہ ہی بھوک کا احساس ہوتا تھا۔ دوسری تبدیلی جو میرے اندر آئی' وہ یہ تھی کہ مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ میں رات کو بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر کے نیند کا انتظار کرتا رہتا مگر نیند نہ آتی۔ نہ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتیں اور نہ مجھ پر غنودگی طاری ہوتی تھی۔ میں ساری رات جاگتا رہتا لیکن پھر بھی صبح کو ہشاش بشاش اور تازہ دم ہوتا۔ میں نے ان تبدیلیوں کا ذکر حباش سے نہیں کیا تھا۔ حباش کو رخصت کرنے کے بعد' میں بستر پر لیٹا' نیند کا انتظار کر رہا تھا مگر نیند نہیں آئی تھی۔ میں ان تعجب خیز' غیر انسانی تبدیلیوں کو حیرت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے اس زمانے کے تانبے کے آئینے میں اپنے چہرے کے ایک ایک نقش کو گہری نگاہ سے دیکھا تھا۔ میرے چہرے کا ہر نقش جوان اور زندگی کی حرارت سے بھرپور تھا۔ میں تیس پینتیس برس کا چوڑے شانوں اور اونچے قد کا بھرپور جوان تھا اور میری صحت قابل رشک تھی۔

کیا میں کبھی بوڑھا نہیں ہوں گا؟ کیا میں بہت عرصے تک زندہ رہوں گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وقت کے کسی مقام پر میں اچانک بوڑھا ہو کر مٹی کا ڈھیر بن جاؤں۔ اس نوع کے خیالات بھی مجھے پریشان کر رہے تھے۔ مجھے بار بار اپنی بیوی سارا کا خیال آ رہا تھا۔ کاش! وہ بھی میرے ساتھ اسی طرح جوان رہتی اور کبھی بوڑھی نہ ہوتی... مگر قدرت کو جو منظور تھا' وہ ہو رہا تھا اور میں اس میں ذرا سا بھی دخل نہیں دے سکتا تھا۔

میں اپنے وطن عزیز قدیم مصر کے دارالحکومت ایتھنز سے نامعلوم مدت کے لئے جدا ہو رہا تھا... میں پچاس برس بعد اپنے پیارے وطن لوٹا تھا۔ میں' وطن عزیز سے رخصت ہونے سے پہلے' میں اس کے گلی کوچوں' بازاروں' کھیت کھلیانوں اور باغوں کی سیر کرنا چاہتا تھا جہاں میرا بچپن اور جوانی گزری تھی۔ میں دریائے نیل کے ساحل پر بھی گھومتا رہا۔ دریا میں شاہی بجرا چلا آ رہا تھا۔ بجرے کی سونے کی چھت اور کنیزوں کے زیور مصر کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی شہزادی' شاہی محل سے دریا کی سیر کے لئے نکلی ہے۔ میں دوسری طرف نکل گیا کیونکہ میں جان بوجھ کر کسی شاہی فرد کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ اسی خیال سے میں نے شاہی محل کی طرف رخ بھی نہیں کیا تھا۔ میں اونچی نرسلوں کی اوٹ سے شاہی بجرے کو دریا کی پرسکون نیلی لہروں پر گزرتا دیکھتا رہا۔ کبھی میں اپنی والدہ کے ساتھ اسی شاہی بجرے پر سوار گزرتا تھا۔

میں ایتھنز کے گنجان بازاروں میں آ گیا۔ میرا حلیہ طبیبوں والا تھا اور اس حلیے میں کوئی بھی مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔ ویسے بھی پچاس برس کے عرصے میں میرے جاننے والے مر کھپ چکے تھے۔ میں ایک عجمی عطر فروش کی دکان کے قریب سے گزرا۔ یہاں کبھی ایک ادھیڑ عمر کا عطر فروش بیٹھا کرتا تھا۔ اب اس کی جگہ' اس کا بیٹا بیٹھا تھا جو میرے بچپن کے زمانے میں جوان تھا لیکن اب خود ضعیف ہو چکا تھا۔ ایک بار میرا شہزادہ باپ' مجھے ساتھ لے کر' اس دکان پر کوئی نادر عطر خریدنے آیا تھا جو اسے ایک خاص دوا میں ڈالنے کے لئے مطلوب تھا۔ عطر فروش نے غور سے میری طرف دیکھا۔ شاید اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اگرچہ میرا لباس شاہانہ نہیں تھا لیکن میری شکل میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میں جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ بازار کا موڑ گھومتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا۔ عطر فروش ابھی تک مجھے ٹکٹکی باندھے تک رہا تھا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔

میں واپس کارواں سرائے میں آ گیا۔ میرا قافلہ اگلی صبح منہ اندھیرے ملک سندھ کی طرف روانہ ہونے والا تھا۔ میں نے ملک سندھ میں جا کر جڑی بوٹیوں کا کاروبار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کارواں سرائے میں' کارواں تیار ہو رہا تھا۔ مسافر رخت سفر باندھ رہے تھے۔ آپ تو آج کل ہوائی جہازوں' مرسیڈیز گاڑیوں اور تیز رفتار ریل گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں اور جیٹ طیاروں میں بیٹھ کر ایک دن میں ہزاروں کوس کا فاصلہ طے کر لیتے ہیں مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اور جس زمانے میں زندگی گزار چکا ہوں۔ اس زمانے میں اونٹوں کے قافلے' ریتلے صحرائی راستوں پر' ستاروں کی روشنی میں چیونٹی کی رفتار سے سفر کرتے تھے۔ راستے میں ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا تھا۔ دس فرسنگ کا فاصلہ' بمشکل ایک رات میں طے ہو پاتا تھا۔

دن کی شدید صحرائی گرمی میں قافلے کسی سایہ دار مقام پر آرام کرتے اور سورج غروب ہوتے ہی پھر سفر شروع کر دیتے۔ راستے میں کئی بار ڈاکے پڑتے' مسافروں کا سامان لوٹ کر انہیں قتل کر دیا جاتا۔ صحرائی راستوں کی بندھی ٹکی راہ تھی۔ قافلے' اسی راستے پر سفر کرتے تھے۔ اگر صحرائی آندھی کے طوفان میں کوئی قافلہ راستے سے بھٹک جاتا تو پھر اس کا ساری زندگی کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔

اگر کبھی راتوں کو صحرا میں کسی نخلستان میں کوئی قافلہ پڑاؤ ڈالتا ہے تو وہاں جگہ جگہ مسافر الاؤ روشن کر لیتے ہیں اور ان کے گرد بیٹھ کر' دارچینی کا مشروب پیتے ہوئے قصے کہانیاں سنانا شروع کر دیتے ہیں۔

آج کے زمانے کی طرح جنگیں' اس زمانے میں بھی ہوا کرتی تھیں۔ فاتح فوجیں' مفتوح شہروں کو لوٹ کر آگ لگا دیتیں اور شہریوں کو بے دریغ قتل کر دیتی تھیں۔ نوجوان اور خوبصورت عورتوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر لے جاتے تھے ... لیکن یہ قتل و غارت اور عورتوں پر ظلم و ستم تو آج بھی ہوتا ہے۔ میں نے 1947ء میں پاکستان بنتے وقت اپنی آنکھوں سے بچوں کو نیزوں میں پروئے جاتے اور لاکھوں عورتوں کو اغوا ہوتے دیکھا ہے...

ہٹلر کے وی۔ ٹو اور بمبار طیاروں نے لندن اور چیکوسلواکیہ کے گلی کوچوں میں' روسی اور امریکی بمبار طیاروں نے برلن اور ہمبرگ ایسے گنجان شہروں پر بمباری کر کے لاکھوں بے گناہ بچوں اور عورتوں کو موت کی نیند سلا دیا۔

آپ مجھے جھٹلا نہیں سکتے' میری کسی دلیل کو رد نہیں کر سکتے اس لئے کہ میں نے انسانی تاریخ کے ہر دور کو اپنی تمام تر حشر سامانیوں اور درندگیوں کے ساتھ اپنی آنکھوں کے سامنے گزرتے دیکھا ہے لیکن اس زمانے میں لوگ' آج کے زمانے کی طرح' امن کے دور میں بھی ... یوں بے چین' پریشان حال' سکون اور مسرت کی شادمانیوں سے محروم نہیں ہوا کرتے تھے۔ جب جنگ ہوتی تھی تو بھرپور جنگ ہوتی تھی لیکن جب امن ہوتا تھا تو لوگ' شاخ گل

کے سائے میں بے فکر ہو کر سوتے تھے۔

میں اپنی زندگی کی داستان بیان کرتے کرتے کہاں سے کہاں نکل گیا ہوں۔ میں واپس' قدیم مصر کے دارالحکومت کی اس رات کی طرف آتا ہوں۔ جب صبح دم کارواں سرائے میں قافلے کے سندھ کی جانب کوچ کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مجھے بھی اس قافلے کے ساتھ سفر کرنا تھا۔ ابھی قافلے کے روانہ ہونے میں ایک پہر باقی تھا۔

میرے دل میں خیال آیا کہ جانے سے پہلے ایک بار اپنی والدہ اور والد کی قبروں پر ہو آؤں' ان کے مرقدوں کو ایک نظر دیکھ لوں پھر نہ جانے' زندگی میں ادھر کا پھیرا لگے یا نہ لگے۔ چنانچہ میں نے اپنا تھیلا... کارواں سرائے کے مالک کے حوالے کیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر' پچھلی رات کی سحر انگیز تاریکی میں اہرام کی طرف روانہ ہو گیا۔

فرعون کفروتی کا دیو پیکر اہرام' دور سے ایک تکونی پہاڑی کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ صحرا کی ٹھنڈی ٹھنڈی شبنمی ریت پر میرا گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا' اہرام کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

مجھے بار بار ایتھنز کے بازار میں اس دکاندار کا خیال آ رہا تھا جس نے مجھے گھور کر دیکھا تھا... انہی خیالوں میں گم' اہرام کے قریب پہنچ کر' میں نے گھوڑے کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود' اہرام کے اندر چلا گیا۔ اہرام کے اندر جانے والے راستے میں اندھیرا تھا۔ میرے والد کی قبر پہلے ہی چبوترے پر تھی۔ وہاں سرہانے کی جانب ایک طاق میں سرکاری طور پر' روغن زیتون کا چراغ روشن تھا۔ میرے والد کے چہرے کا بت ممی کے سنگی تابوت پر خاموش اور موت کے دبیز سکوت میں غرق تھا۔ میں نے رسم کے مطابق اپنے باپ کے چہرے پر ہاتھ رکھ کر' اسے اپنے دل سے لگایا ... اور وہاں کی رسم کے خلاف' رب شمس کا نام لے کر دعا مانگنے کی بجائے' اپنے دل میں خدائے واحد کے حضور' اپنے والد کی بخشش کے لئے دعا مانگی اور اہرام سے باہر آ گیا۔

اہرام کے تاریک سرنگ نما راستے سے نکلتے ہوئے میں نے ایک سائے کو دیکھا جو تیزی سے ایک طرف ہو کر اندھیرے میں غائب ہو گیا تھا۔ میں اسے اپنا وہم سمجھتے ہوئے باہر آیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر' غلاموں کے قبرستان میں اپنی والدہ کی قبر پر آ گیا۔

میں نے یہاں بھی اپنی والدہ کی قبر کے پتھر کو چھو کر' ہاتھ اپنے دل سے لگایا اور خدائے واحد کے حضور دعا مانگنے لگا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور میں گویا ایک طرح سے مراقبے میں تھا کہ مجھے ایک بار پھر اپنی والدہ کی شبیہہ دکھائی دی۔ وہی سفید لباس' نورانی چہرہ اور ہاتھ میں سفید کنول پھول کی چھڑی۔ میری آنکھیں بند تھیں لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا

جیسے میں کھلی آنکھوں سے اپنی والدہ کی روح کو دیکھ رہا ہوں... میں نے بولنا چاہا تو جیسے میری قوت گویائی سلب ہو گئی۔ میری والدہ کی شبیہہ نے کنول کی چھڑی والا ہاتھ تھوڑا اوپر اٹھایا اور پھر مجھے ان کی آواز سنائی دی۔

"میرے لخت جگر! ہمیشہ ایک خدا کی عبادت کرنا' اسی کی بندگی کرنا۔ اس نے نامعلوم مدت کے لئے تیری موت کو ٹال دیا ہے۔ یہ مدت کتنی ہے' کوئی نہیں جانتا۔ اب واپس چلے جاؤ۔ اپنے باپ کی روح کے لئے بھی دعا کرتے رہنا۔ خدا تمہارا نگہبان ہو۔"

پھر میری والدہ کی شبیہہ' میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گئی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ قبر کے پتھروں پر ستاروں کی مدھم روشنی پڑ رہی تھی اور پچھلے پہر کی ٹھنڈی ہوا میں ان پتھروں کے درمیان اگے ہوئے خشک گھاس کے نازک خوشے غیر محسوس انداز میں لہرا رہے تھے۔

میری موت کو خدائے واحد نے غیر معینہ مدت کے لئے ٹال دیا تھا۔ اپنی والدہ کی روح کا یہ جملہ میرے ذہن میں ابھی تک گونج رہا تھا۔ اس کا مطلب کیا تھا؟ ایسا کیوں ہوا تھا اور کیا یہ سزا تھی یا جزا؟ میں اسی ادھیڑ بن میں والدہ کی قبر سے اٹھا اور غلاموں اور کنیزوں کی قبروں کے درمیان سے گزرتا ہوا قبرستان سے باہر نکلا ہی تھا کہ ... اندھیرے میں سے چھ سات سپاہی نکل کر مجھ پر جھپٹ پڑے۔ میں سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ انہوں نے مجھے زنجیروں سے جکڑ کر' گھوڑے پر ڈال دیا اور روانہ ہو گئے۔ میں نے بہت احتجاج کیا مگر میری کسی نے نہ سنی۔ میرے لئے ان سپاہیوں کو پہچاننا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ لیکن انہوں نے زرہ بکتر پہن رکھی تھی اور وہ فرعون کی شاہی فوج کے خاص دستے کے سپاہی تھے۔ مجھے' فرعون کے حکم پر گرفتار کیا گیا تھا۔

اب مجھے اس دکاندار کا خیال آیا جس نے مجھے بازار سے گزرتے دیکھ کر گھورا تھا۔ یقیناً اس نے میری مخبری کی تھی۔ ابھی مجھے اپنی طاقت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ مجھ پر میری خفیہ طاقت ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ یہ مجھ پر بعد میں انکشاف ہوا کہ اگر میں چاہتا تو بڑی ... آسانی سے ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو سکتا تھا اور فرعونی سپاہیوں کی تلواریں اور نیزے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اس وقت تک تو مجھے صرف اتنا علم تھا کہ خدائے واحد کے حکم سے میری موت کو ٹال دیا گیا ہے۔

سپاہیوں نے مجھے فرعون مصر کے شاہی قلعے کے زنداں میں ڈال دیا۔ میں سارا دن اور پھر ساری رات وہاں پڑا رہا۔ اگرچہ مجھے بھوک اور پیاس کا ذرا سا بھی احساس نہ ہوا لیکن وہاں کسی نے مجھے پوچھا بھی نہیں۔ دوسری رات کا پچھلا پہر تھا کہ چھ سپاہیوں کا ایک دستہ'

زنداں میں داخل ہوا اور مجھے نکال کر' قلعے سے دور' صحرا سے دور' ایک خشک و بنجر ٹیلے کے پاس لے گیا۔ میرے دونوں ہاتھ پہلے ہی زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہاں مجھے ایک پتھر کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے ہلاک کرنے کے لئے یہاں لایا گیا ہے۔ اب میں شعوری طور پر اپنی موت کو خود سے گریزاں دیکھنے والا تھا لیکن دل میں موت کا خوف بھی تھا۔

سپاہیوں نے چلے چڑھا کر نشانے باندھے اور پھر اپنے سردار کے اشارے پر تیر چھوڑ دیئے۔ چھ کے چھ تیر' تنی ہوئی کمانوں سے نکل کر سیدھے میرے سینے میں آ کر کھب گئے۔ ان تیروں کے دھچکوں اور موت کے خوف سے شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا... جب دوبارہ میں نے آنکھیں کھولیں تو صحرا کی تیز دھوپ' چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں اسی طرح پتھر کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ میری گردن ڈھلکی ہوئی تھی اور چھ تیر' آدھے سے زیادہ' میرے سینے میں پیوست تھے لیکن کہیں سے خون کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا تھا۔ میں نے گردن اٹھا کر اردگرد دیکھا۔ صحرا کے ٹیلوں پر ریت کے ذرے' آفتاب کی تمازت سے چمک رہے تھے۔ میرے سینے میں ہلکا سا درد بھی نہ تھا۔

مجھے یقین ہو گیا کہ میری موت کو سچ مچ ٹال دیا گیا ہے اور میں مرا نہیں بلکہ زندہ ہوں۔ میرے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے تھوڑا سا زور لگایا تو مجھ پر ایک اور حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ میرے ہاتھوں کی زنجیریں ٹوٹ کر گر پڑی تھیں۔ میں نے ایک جھٹکا دیا اور میرے پاؤں بھی آزاد ہو گئے۔ پھر میں نے اپنے جسم کے گرد بندھا ہوا رسہ بھی توڑ دیا۔ میں آزاد تھا مگر میرے سینے میں چھ تیر لگے ہوئے تھے۔ یہ ایک دہشت ناک منظر تھا۔ میں نے ایک ایک کر کے اپنے سینے کے سارے تیر باہر نکال ڈالے مگر ان کے ساتھ ذرا سا بھی خون نہیں لگا ہوا تھا۔ یہ بات خود میرے لئے بھی بڑی حیرت انگیز اور کسی حد تک دہشت ناک تھی۔ میں نے اپنے سینے کے زخموں کو دیکھا وہ تیروں کے باہر نکلتے ہی اس طرح مندمل ہو گئے تھے جیسے وہاں کبھی کوئی تیر نہیں لگا تھا۔ صرف میری سفید عبا میں چھ سوراخ موجود تھے۔ خوشی سے میرا دل بھر آیا۔ میں اسی وقت خدائے واحد کا تصور کر کے سجدے میں گر گیا اور اس کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے پھر سے نئی زندگی عطا کی تھی۔ میں ٹیلے کی دوسری جانب سے ہو کر شہر کی طرف چل پڑا۔ میں اس سارے علاقے سے اچھی طرح واقف تھا۔ اب میں اس ظالم شہر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ دور مجھے اپنے والد کا اہرام اور والدہ کے قبرستان والے کھجور کے درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی والدہ اور والد کی روحوں کو سلام کیا اور ریت پر شہر کی طرف چلتا چلا گیا۔ ایک اور بات بڑی عجیب ہو

رہی تھی صحرا تیز دھوپ کی تپش میں جل رہا تھا مگر مجھے کوئی گرمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے پسینہ بھی نہیں آ رہا تھا۔

شہر میں پہنچ کر میں کونے والے زیتون کے ایک باغ میں ایک چشمے پر بیٹھ گیا۔ میں کاروان سرائے' رات کے اندھیرے میں جانا چاہتا تھا۔ وہیں چشمے پر بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی۔ پھر شام کا سرمئی اندھیرا جب رات کی تاریکی میں بدل گیا تو میں زیتون کے باغ سے نکل کر شہر کی خاموش گلیوں میں سے گزرتا ہوا کاروان سرائے پہنچ گیا۔ سرائے کے مالک سے اپنا تھیلا واپس لیا۔ تھیلے میں سے چند دینار نکال کر اسے دیئے اور کہا کہ مجھے ایک گھوڑا چاہئے۔ میرا گھوڑا گم ہو گیا ہے۔ سرائے کے مالک نے مجھے اپنے اصطبل میں سے ایک گھوڑا لا کر دے دیا۔ میں گھوڑے پر سوار ہو کر کارواں سرائے سے باہر آ گیا اور گھوڑے کو صحرائی بولوں میں سے گزرتے اس کچے راستے پر ڈال دیا جس پر سے دو دن پہلے ایک قافلہ مصر سے ملک سندھ کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔

ستاروں کی روشنی سے منور خاموش اور ٹھنڈے صحرا میں میرا گھوڑا آدھی رات تک سفر کرتا رہا۔ یہ وہ راستہ تھا جس پر قافلے سفر کرتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ کھجوروں کے جھنڈ میں ٹھنڈے پانی کا چشمہ مل گیا۔ یہاں میں نے گھوڑے کو پانی پلایا۔ کچھ دیر اسے آرام کرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا۔ میں چشمے کے پاس پتھروں پر بیٹھ کر اپنی شروع ہونے والی نئی زندگی پر غور کرنے لگا۔ رات تھوڑی باقی رہ گئی تھی کہ میں پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دو دن اور دو راتوں کے سفر کے بعد میں نے مصر کی سرحد سے بہت دور قافلے کو جا لیا۔ اب میں بھی باقاعدہ طور پر اس قافلے میں شامل ہو گیا جس کی منزل ملک سندھ یعنی آج کا پاکستان تھا ... اس قافلے میں کوئی ستر کے قریب مسافر سفر کر رہے تھے۔ پندرہ اونٹ تھے۔ پچاس گھوڑے اور کچھ ایسے اونٹ تھے جن پر صرف سامان لدا ہوا تھا۔ میر کارواں ایک عجمی تھا مگر مصری اور دوسری مشرقی زبانوں کا ماہر تھا۔ ساعتی' یعنی وہ آدمی جد کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ ہر ساعت گزرنے پر بہ آواز بلند وقت کا اعلان کرے' ایک اونٹنی پر سوار تھا اور اس کی اونٹنی پر ریت گھڑی موجود تھی۔ اس ریت گھڑی میں سے ہر ایک ساعت گزر جانے پر ریت اوپر کے خانے سے نکل کر نیچے کے خانے میں جمع ہو جاتی تھی۔ جس کے ساتھ ہی ساعتی اسے دوبارہ الٹا کر دیتا تھا اور ریت ذروں کی صورت میں نچلے خالی خانے میں گرنا شروع ہو جاتی تھی۔ یہ گھڑی مصریوں کی ایجاد نہیں تھی بلکہ اسے ان سے بھی بہت پہلے دجلہ و فرات کی وادی میں رہنے والی سمری قوم نے بنایا تھا۔ مصریوں نے اس میں مفید رد و بدل ضرور کیا تھا اور یہ رد و بدل میرے سامنے فرعون کفروتی کے شاہی محل میں ہوا تھا۔ اہل بابل اور اہل

مصر نے اس سلسلے میں حیرت انگیز کام کیا اور بعد میں بنو عباس اور بنو امیہ کے عہد میں مسلمان ہیئت دانوں نے اس ضمن میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ تاریخ کے اوراق آج بھی ان کے کارناموں سے روشن ہیں۔ مثال کے طور پر بنو عباس کے ایک خلیفہ کے دور میں ایک ایسا شمع دان بنایا گیا جو رات کے وقت روشنی دینے کے ساتھ ساتھ وقت بھی بتاتا تھا۔ ہر ساعت کے گزر جانے پر اس شمع کا دروازہ کھلتا اور اس میں سے ایک شخص کا پتلا نکل کر بڑے ادب سے تعظیم بجا لاتا۔ فجر کے وقت یہی پتلا شمع دان کی چوٹی پر کھڑا ہو جاتا اور اعلان کرتا۔

اللہ تعالیٰ خلیفہ وقت پر صبح خیر و برکت کے ساتھ طلوع کرے' میں اسی عباسی خلیفہ کے دربار میں کچھ دیر شاہی طبیب رہا ہوں۔ میں نے اس شمع دان والی گھڑی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ شمع دان پورے کا پورا سونے کا تھا اور اس پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس شمع دان پر بعد میں قاہرہ کے امام شہاب الدین ابوالعباس احمد بن ادریس القرانی نے مزید کام کیا۔ امام القرانی ساتویں صدی ہجری کے ایک مقتدر بزرگ اور نامور فقیہہ گزرے ہیں۔ وہ ریاضی اور فلکیات کے ماہر اور جید سائنس دان اور مکینیکل انجینئر بھی تھے۔ انہوں نے ایک ایسا شمع دان بنایا جس کی شمع کا رنگ ہر ایک گھنٹے کے بعد تبدیل ہو جاتا تھا۔ اس کے اندر شیر کا ایک مجسمہ بھی تھا جس کی سیاہ آنکھیں ہر ساعت پوری ہو جانے کے بعد پہلے سفید اور پھر سرخ ہو جاتی تھیں۔ ہر ساعت کا رنگ مختلف ہوتا تھا۔ اس شمع دان میں دو پرندے بھی تھے جو ایک گھنٹہ ختم ہونے پر دو کنکریاں گرا دیتے تھے جس سے آواز پیدا ہوتی تھی۔ شمع دان کے دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ کھلتا ایک آدمی اندر سے نکلتا اور دوسرے دروازے سے ایک دوسرا آدمی اندر داخل ہو جاتا اور دروازہ بند ہو جاتا۔ نماز کا وقت قریب آتا تو ایک آدمی کا پتلا شمع دان کی چوٹی پر کھڑا ہو جاتا اور اپنے کانوں میں اس طرح انگلیاں دے دیتا جیسے اذان دے رہا ہو۔

بنو عباس کے عہد خلافت کے ساتھ کچھ ناخوشگوار واقعات بھی وابستہ ہیں جن کا ذکر میں اپنے طویل تاریخی سفر کی داستان بیان کرتے ہوئے ساتھ ساتھ کرتا جاؤں گا لیکن اس دور نے ایسے ایسے علماء بھی پیدا کیے کہ جن کی زبان ان کے دل کی رفیق تھی اور انہوں نے اسلام کے خلاف اٹھنے والے ہر فتنے کو نابود کرنے کے لئے اپنی جانوں کی قربانی سے بھی گریز نہ کیا۔ مجھے خوب اچھی طرح سے یاد ہے کہ تیسری صدی ہجری کے دوسرے عشرے میں جب بغداد کے تخت خلافت پر عباسی شہنشاہ مامون الرشید جلوہ افروز تھا اور اس کی حکومت افریقہ اور ایشیا کے ایک وسیع تر علاقے پر پھیلی ہوئی تھی بغداد اس وقت علوم و فنون کا

سرچشمہ تھا۔ بغداد کی علمی مجلسوں میں یونانی فلاسفی اور افکار کو نئے نئے رنگ دیئے جا رہے تھے معتزلہ کے گروہ نے ان ہی مجالس میں جنم لیا تھا۔ اس گروہ کے افراد سلطنت کے بڑے بڑے منصب پر فائز تھے اور یوں اس وقت ملک کی سیاسی اور فکری رہنمائی ان لوگوں کے پاس تھی۔ خلق قرآن کے فتنے کو ان ہی افراد نے پیدا کیا اور مامون الرشید بھی ان لوگوں کی عقلی موشگافیوں کے دام میں آ گیا۔ چنانچہ اس نے بغداد کے گورنر اسحاق بن ابراہیم کے نام ایک فرمان روانہ کیا جس میں درج تھا۔

"شہر کے تمام علماء کو طلب کرو۔ جو علماء خلق قرآن کا اقرار کریں' انہیں کچھ نہ کہو۔ جو انکار کریں ان کے بارے میں دربار خلافت کو خبردار کرو۔"

اس کے ساتھ ہی مامون الرشید نے ایک اور فرمان بھیج دیا جس میں لکھا تھا۔

"بشیر بن ولید الکندی قاضی القضاۃ اور ابراہیم بن مہدی اگر خلق قرآن سے انکار کریں تو انہیں قتل کر دو۔ باقی علماء جو انکار کریں' زندان میں ڈال دو۔"

یوں اس زمانے میں در زنداں کھل جاتا ہے۔ تلواریں حرکت میں آ جاتی ہیں۔ بڑے بڑے علماء کے پاؤں میں لغزش آ جاتی ہے مگر مردان حق ثابت قدم رہتے ہیں اور شرک و کفر کے آگے سیسہ پلائی دیوار بن کر ڈٹ جاتے ہیں۔ ان ہی مردان حق میں شیخ عبدالعزیز بن یحییٰ الکنانی بھی تھے۔ مجھے دو ایک بار ان کے حلقہ درس میں باریاب ہونے کی سعادت نصیب ہو چکی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مجھ پر (جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں) اسلام کی عظمت اور قرآن کی حقانیت کا انکشاف ہوا اور میں نے بے اختیار ہو کر اسلام قبول کرتے ہوئے خدائے ذوالجلال کے آگے سر جھکا دیا۔ میرا یہی ذوق و شوق مجھے شیخ عبدالعزیز بن یحییٰ الکنانی کی مجلس بابرکت میں لے گیا تھا۔ شیخ بڑے عظیم عالم حق اور محدث تھے۔ وہ بغداد سے دور مکہ معظمہ میں قیام پذیر تھے اور وہیں درس دیا کرتے تھے۔ ان کے چہرے پر اللہ کا نور تھا۔ دنیوی نمائش و ظاہر داریوں سے بے نیاز تھے۔ درس قرآن دیتے وقت ان پر ایک جلال کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ پہلے روز میں ان کی مجلس میں گیا تو جوتیوں میں جا کر بیٹھ گیا۔ شیخ نے نگاہ پرجمال مجھ پر ڈالی اور کہا۔ "واللہ تم تاریخ کے گواہ ہو اور گواہ رہنا کہ اللہ ایک ہے۔ حضور نبی ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور قرآن اللہ کا کلام ہے۔" جب انہیں فتنہ معتزلہ کی خبر ملی تو اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر بغداد کی طرف چل پڑے۔

بغداد میں جمعتہ المبارک کا دن تھا۔ مسجد اصافہ نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ایک ستون کے پاس میں بھی ادب سے بیٹھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ شیخ عبدالعزیز بن یحییٰ الکنانی

نمازیوں کی پہلی صف میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ سامنے والے ستون کے پاس ان کا بیٹا دوزانو قبلہ رو ہو کے بیٹھا تھا۔ آپ نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور پکار کر پوچھا۔

"میرے بیٹے! قرآن کے بارے میں تم کیا جانتے ہو...؟"

بیٹے نے جواب دیا۔ "اللہ جل شانہ کا کلام ہے۔ اللہ جل شانہ کا نازل کردہ ہے اور غیر مخلوق۔"

مسجد میں لوگ دم بخود ہو کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ کچھ لوگ وہاں سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ لیکن شیخ اپنی جگہ پر کھڑے تھے۔ گورنر کے سپاہیوں نے ان باپ بیٹے کو گرفتار کر کے بغداد کے کوتوال عمرو بن سعدہ کے سامنے پیش کیا۔

کوتوال نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"عبدالعزیز بن الکنانی۔"

"کس شہر سے آئے ہو؟"

"مکہ معظمہ سے۔"

"مسجد میں تم نے اور تمہارے بیٹے نے جو کچھ کہا' اس سے تمہاری کیا مراد تھی؟"

شیخ بن عبدالعزیز یحییٰ الکنانی نے بے خوف ہو کر کہا۔

"اللہ جل شانہ کی خوشنودی اور اس کے قرب کی خواہش۔"

شیخ عبدالعزیز بن یحییٰ کو مامون الرشید کے دربار میں پیش کیا گیا۔ بڑے بڑے علماء وہاں موجود تھے۔ میں بھی اس وقت خلیفہ وقت کے دربار میں تھا۔ مامون الرشید تخت پر جلوہ افروز تھا۔ شیخ عبدالعزیز بن یحییٰ الکنانی پہلے دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں۔ پھر چہرے پر جلال لئے دربار میں داخل ہوتے ہیں۔ شاہی خدام انہیں پکڑ کر آگے کرنا چاہتے ہیں کہ مامون الرشید خدام کو پرے ہٹ جانے کا اشارہ کرتا ہے۔ مامون الرشید نے شیخ عبدالعزیز بن یحییٰ سے کہا۔

"تم نے ایک دینی حکم سے انحراف کیا اور خدا کی صفات میں شرک کیا ہے۔"

میری نگاہیں دربار میں کھڑے شیخ کے پرجلال چہرے پر تھیں۔ انہوں نے گرج دار آواز میں کہا۔

"امیرالمومنین! میں ایک غریب الدیار طالب علم ہوں۔ مجھے خانہ خدا کے جوار میں رہنے کا شرف حاصل ہے۔ میں نے سنا کہ حق دب گیا ہے اور سنت رسولؐ کی روشنی کو بجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بدعت ہوا پکڑ رہی ہے اور ایک شخص ہر مسلمان کے لئے ایک ایسی شرط کو جزو ایمان قرار دے رہا ہے جس کا اقرار نہ خدا نے امت مسلمہ سے کرایا خدا کے رسول نے اس کی گواہی دی جس کا اعلان نہ خلفائے راشدین نے کیا نہ کسی صحابی

رسولؐ نے کیا۔ اور اس شرط کا اعلان وہ شخص کر رہا ہے جو ہارون الرشید کے گھر پیدا ہوا۔
اس نے اصحاب رسولؐ کو دیکھا نہ تابعین کو اور نہ عہد نبوت کی برکتوں سے فیض یاب ہوا۔
اس کے باوجود وہ اس مخفی راز کو جاننے کا داعی ہے جس کا علم نہ تابعین کو تھا نہ صحابہ کرام کو
حالانکہ وہ دنیا سے ایک مومن کی حیثیت سے رخصت ہوئے اور نہ ہی رسول اللہؐ نے اس
کے بارے میں کچھ فرمایا حالانکہ حضورؐ صاحب ولی رسالت تھے ... امیر المومنین! تم ہوا کا وہ
جھونکا ہو جس سے شریعت کی شمع تو روشن نہ ہو سکی مگر جس نے سنت کے چراغ کو بجھانے
کی جسارت کی ہے۔ اے ہارون کے بیٹے! اللہ سے ڈر۔ اس کے عذاب کی پکڑ سے لرز کہ
جس کی ڈھیل ضرور ہے مگر جس سے چھٹکارا ہرگز نہیں۔"

میں نے دربار پر ایک نظر ڈالی۔ ہر طرف ایک سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ مامون الرشید
خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے معتزلہ کے سرخیل بشیر مریسی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے شیخ
سے سوال کیا۔ "قرآن نے کئی مقامات پر اللہ کو خالق کل شئی کہا ہے۔ یعنی اللہ ہر شے کا
خالق ہے۔"

شیخ نے جواب دیا۔ "ہاں اللہ ہی ہر شے کا خالق ہے۔"

"قرآن بھی شے ہے کہ نہیں۔" بشیر مریسی نے پوچھا۔

شیخ نے کہا۔ "اچھا میں تسلیم کرتا ہوں۔ قرآن بھی اشیاء میں داخل ہے۔"

مامون الرشید اور بشیر بے اختیار پکارے۔ "تو پھر قرآن مخلوق ہوا۔"

شیخ عبدالعزیز بن یحییٰ الکنانی کی بے باک آواز دربار میں گونجی۔

"اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ قرآن بھی شے ہے۔ قرآن میں آیا ہے۔
ولیحذرکم اللہ نفسہ یعنی اللہ تم کو اپنے "نفس" سے ڈراتا ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوتا
ہے کہ اللہ کا بھی نفس ہے۔ پھر قرآن کہتا ہے۔ کل نفس ذائقۃ الموت (ہر نفس کو موت کا
ذائقہ چکھنا ہے) پس اگر اشیا میں داخل ہو کر موت کا مزا چکھے گا؟؟"

ساری مجلس پر ایک مہیب خاموشی چھا گئی۔ معتزلہ کے علماء بغلیں جھانکنے لگے۔ شیخ
عبدالعزیز اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر دربار سے تشریف لے گئے۔ سارا بغداد ان کے خیر مقدم
کے لئے امڈ پڑا تھا۔ میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام کو فتنہ معتزلہ سے بچانے
کے لئے ان کے جہاد برحق پر انہیں مبارک باد پیش کی۔ شیخ نے خندہ فرمایا اور کہا۔

"تم گواہ رہنا کہ اللہ کے اس بندے نے سنت رسولؐ کا اتباع کیا ہے۔"

تاریخ کا یہ زندہ جاوید جہاد مجھے آپ کو آگے چل کر بیان کرنا تھا۔ جب میں تاریخ کا
عہد بہ عہد سفر کرتے ہوئے عہد بنو عباس میں داخل ہوا تھا لیکن جذبات کی روانی میں اسے

شروع میں ہی قلم بند کر گیا۔ لیکن ابھی اسلام اور قبل اسلام کی پوری تاریخ میرے سامنے
کھلی پڑی ہے اور مجھے ابھی ان گنت ایسے زندہ و جاوید واقعات آپ کو سنانے ہیں کہ جن
میں بعد کے مورخوں نے بعض مصلحتوں کی بنا پر تحریف کر دی لیکن میں آپ کو یہ سارے
واقعات من و عن اور پوری صحت کے ساتھ سناؤں گا کیونکہ میں تاریخ کا عینی شاہد ہوں۔
اس کا گواہ ہوں۔ میں نے تاریخ کے عظیم انقلابوں کو اپنی چشم حیرت آں کے سامنے برپا
ہوتے دیکھا ہے۔ ابھی تو میرے سفر کا آغاز ہے۔ ابھی تو مجھ پر میری قوتوں کے انکشاف کا
پہلا روز ہی ہے اور میں ایک قافلے کے ساتھ قدیم مصر سے نکل کر ملک سندھ کی طرف سفر
کر رہا ہوں۔

منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہمارا قافلہ بصرے پہنچ گیا۔ آج سے پانچ ہزار برس پہلے کا بصرہ
کیسا تھا؟ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن اس زمانے میں اس کا نام بصرہ نہیں بلکہ
یکال تھا۔ یہ عبرانی نام تھا۔ یہاں سے بادبانی جہاز تجارت کا مال اور مسافروں کو لے کر ملک
ندھ کی طرف جاتے تھے۔ بصرہ یعنی ایکال میں کچھ روز بسر کرنے کے بعد میں ایک بادبانی
ہاز میں سوار ہو کر سمندری سفر پر سندھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ سفر بڑا سخت جان اور
صائب سے پر تھا۔ ہم ہواؤں کے رحم و کرم پر تھے۔ کھلے سمندر میں ایک مقام پر پہنچ کر
ا رک گئی۔ ہمارا جہاز بھی رک گیا۔ تین روز تک ہم ہوا کے دوبارہ چلنے کا انتظار کرتے
ہے۔ چوتھے روز ہوا چلی تو بادبان کھول دیئے گئے اور ہمارا سمندری سفر ایک بار پھر شروع
گیا۔ راستے میں طوفان بھی آئے ہمارا لکڑی کا ایک چھوٹا سا بادبانی جہاز طوفانی لہروں پر
لونے کی طرح اچھلتا رہا۔ خدا خدا کر کے ایک طویل تھکا دینے والے سمندری سفر کے بعد
ا جہاز ملک سندھ کے ایک ساحل کے ساتھ جا لگا۔ کراچی شہر میں آنے کے بعد میں نے
ہفتہ لگا کر پاکستان کے اس ساحل کی شروع سے آخر تک بادہ پیمائی کی مگر کوشش کے
ود میں اس جگہ کی نشان دہی نہ کر سکا جہاں سے پانچ سوا پانچ ہزار برس پہلے میرا بادبانی جہاز
ر لگا تھا۔ اور اس میں سے تھکے ہارے مسافر نکل کر افتاں و خیزاں اپنی اپنی منزل کی طرف
نہ ہو گئے تھے۔

یہ اسلام سے بہت پہلے کا سندھ تھا۔ اور یہاں شمال میں آریاؤں نے دور دور آباد
ں میں اپنی اپنی راج دھانیاں بنا کر حکومتیں قائم کر رکھی تھیں۔ اس وقت سارے
ستان کو سندھ کے نام سے جانا اور پکارا جاتا تھا۔ اندرون سندھ موہن جودوڑو کی تہذیب
زوال پر تھی اور آریا راجہ اس شہر اور اس کے ہم تہذیب شہر ہڑپہ پر بار بار حملے کرتے
تھے۔

سندھ کی جس چھوٹی سی بارونق بندرگاہ پر میں آج سے پانچ ہزار برس پہلے آ کر اترا تھا اس کا نام اب میرے ذہن سے اتر گیا ہے۔ میرا گمان ہے کہ یہ کہیں گوادر کے آس پاس ہو گی۔ مگر اب تو اس کا نشان تک کہیں نظر نہیں آتا۔ میں پہلی بار سندھ کے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان کے رنگ سانولے تھے۔ وہ قد کاٹھ میں اونچے لمبے اور مصریوں کے مقابلے میں زیادہ تنومند اور خوش حال لگتے تھے ۔ ان کے لباس صاف ستھرے تھے۔ سینہ اور کندھے چوڑے چکلے تھے۔ بندرگاہ کے قریب ہی ایک کارواں سرائے تھی ۔ میں اس میں اتر گیا۔ اتنے لمبے اور تکلیف دہ سمندری سفر کے باوجود مجھ پر تکان کے کوئی اثرات نہیں تھے۔ میرا ارادہ موہن جودوڑو میں جا کر طبابت کرنے کا تھا۔ میں نے بعض قافلے والوں سے اس شہر کے عروج و ترقی کی بہت سی داستانیں سن رکھی تھیں لیکن بادبانی جہاز میں مجھے سندھی مسافروں نے بتایا کہ اب اس شہر کا زوال شروع ہو چکا ہے اور آریہ راجاؤں کے حملوں کی وجہ سے اس عظیم الشان شہر کا سکون برباد ہو چکا ہے۔

آج اندرون سندھ، اس عظیم الشان تہذیب کے صرف کھنڈر ہی باقی رہ گئے ہیں۔ آج کے ماہرین آثار قدیمہ اس کھنڈر کی ہموار گلیوں اور کنوؤں کو دیکھ انگشت بدنداں ہیں لیکن اس وقت سوائے میرے اور کوئی نہیں جانتا کہ اس شہر موہن جو دوڑو کے وسط میں ایک پختہ اینٹوں کا بنایا ہوا اونچا مینار تھا جو فلکیات کی لیبارٹری تھی اور جہاں سے موہنجو دوڑو کے قدیم سندھی سائنس دان اور ماہرین فلکیات ستاروں کی چال کا مشاہدہ کرتے تھے۔ اس لیبارٹری میں سورج اور چاند گرہن کا اور بروج و سیارگان کی تقویم کا پورا ریکارڈ موجود تھا۔ کراچی شہر میں پہنچنے کے بعد میں سب سے پہلے موہن جودوڑو کے کھنڈرات دیکھنے گیا تھا۔ یہاں کے ایک مندر کی دیوداسی رقاصہ روکاش کے ساتھ میری زندگی کا ناقابل فراموش ڈرامہ کھیلا گیا تھا لیکن مجھے اس دیو پیکر معبد کے کہیں کھنڈر بھی دکھائی نہ دیئے۔ کچھ گلیوں کو میں نے پہچان لیا۔ حیرت کی بات ہے کہ ان گلیوں کی اینٹیں پانچ ہزار سال کے انقلابات زمانہ کو برداشت کر گئیں اور ان کی بناوٹ ویسی کی ویسی ہی رہی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے موہن جوڈرو کے مزدوروں کو ان گلیوں، مکانوں اور نئے معبدوں کی دیواروں میں اینٹیں لگاتے دیکھا ہے۔ میں نے خوش لباس دمکتے سانولے چہروں والی دوشیزاؤں کو معبدوں میں عبادت کرتے اور دریا پر نہاتے، قہقہے لگاتے دیکھا ہے۔ آج ان کے روشن خوبصورت چہرے وقت کی گرد میں ہمیشہ کے لئے گم ہو گئے ہیں اور ان کے زندگی سے بھرپور قہقہے تاریخ کے نہاں خانوں کی تاریکیوں میں اتر گئے ہیں۔ تاریخ کے اوراق وقت کی سب سے بڑی عبرت گاہ ہیں اور میں ان اوراق کو ایک ایک کر کے آپ کے سامنے کھول رہا ہوں اس لئے کہ میں

ہزاروں برس کی تاریخ کا عینی گواہ ہوں اور انسانی تاریخ کے عظیم قافلے کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا ہوں۔ وہ کون سے فطرت کے قوانین تھے جن کی خلاف ورزی موہن جو دڑو کے لوگوں نے کی اور ان پر قدرت خداوندی کا عذاب نازل ہوا اور یہ جیتی جاگتی زندہ تہذیب دیکھتے دیکھتے صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔ یہ بھی میں آپ کو ضرور بتاؤں گا کیونکہ یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ میں انسانی تاریخ کی سچی داستان بیان کر رہا ہوں۔ انسانی تہذیبوں کے عروج و زوال کی کہانی نہیں بلکہ سفر نامہ قلمبند کر رہا ہوں۔ تاریخ کی یہ کہانی حرف بہ حرف سچی ہو گی۔ غلطی، مبالغے اور مروجہ تاریخ کے واقعاتی اغلاط سے پاک ہو گی کیونکہ میں مورخ نہیں ہوں بلکہ خود تاریخ ہوں۔ ایک طویل، عظیم اور حیرت و استعجاب سے لبریز انسانی تاریخ ... ایک فتح سے دوسری فتح کی طرف دوڑتے ہوئے بادشاہوں کی فوجوں کے رتھ اور فاتح بادشاہوں کے سینوں میں اترتے ہوئے سازشی خنجر اور چاندنی راتوں میں قلعے کی دیواروں سے اتر کر فرار ہوتی شہزادیاں اور بابلی مندروں کے چبوتروں پر بیٹھی جسم فروش حسینائیں جن کے گھروں کے چراغ ان کی حرام کی کمائی سے روشن ہوتے تھے اور صلیب کی طرف لے جاتے پیغمبروں کے لرزا دینے والے جلوس اور شاہی رقاصاؤں کے ایک اشارے پر نیک انسانوں کی کٹتی ہوئی گردنیں اور فاتح فوجوں کی زد میں آئے ہوئے شہروں کے بلند ہوتے شعلے اور آسمانوں سے نازل قہر خداوندی ... یہ میرے عظیم سفر نامے کی چند روشن و تاریک جھلکیاں ہیں کراچی کے ساحل پر اپنے دور افتادہ تنہا کاٹج میں بیٹھا تاریخ کا انوکھا سفر نامہ لکھ رہا ہوں۔ ابھی تو صرف اس مقام پر پہنچا ہوں کہ جب میں آج سے پانچ ہزار سال پہلے کے سندھ کے شہر موہنجو دڑو کی ایک کارواں سرائے میں اترا اور اسی شہر کے ایک عظیم مندر کی رقاصہ دیوداسی روکاش حسن و عشق کی خون آشامیوں کے ساتھ میرا انتظار کر رہی تھی۔

اس وقت بھی جب میں کراچی کے ساحل سمندر والے اپنے تنہا کاٹج میں بیٹھا ا
طویل ترین زندگی کا حیرت انگیز سفر نامہ قلمبند کر رہا ہوں تو دیوداسی اور شاہی رقاصہ روکا
کی مورتی کا ایک ماڈل میری میز پر رکھا ہے کانسی کا یہ بت ٹھنڈا اور بے جان ہے۔ لیکن کب
اس مورتی کی حقیقی حرارت سے برف زاروں میں شعلے بھڑک اٹھتے تھے اور اس کی حش
سامانیاں قیامت ڈھاتی تھیں۔ میں اپنی زندگی کی قدیم ترین کہانی لکھنے بیٹھا ہوں تو میں سار
سچے واقعات ترتیب و تواتر کے ساتھ بیان کروں گا۔ میں آپ کو وہ باتیں بھی بتاؤں گا ج
سے تاریخ کے اوراق ناآشنا ہیں لیکن میں انہیں جانتا ہوں۔ میں آپ کو بتاؤں گا ک
موہنجودڑو کا جیتا جاگتا تہذیب و تمدن کی ہماہمی سے لبریز شہر کس طرح اچانک تباہ ہو گیا۔
کیوں کہ میں اس کا گواہ ہوں۔ میں نے اس شہر کو تباہ ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔
بات سوائے میرے دوسرا کوئی بیان کرنے کے لئے زندہ نہیں ہے۔

جس روز میں موہنجودڑو کے شہر کی ایک کارواں سرائے میں اترا تو میرا لباس اس زما
کے مطابق اپنے آپ تبدیل ہو چکا تھا اور اس شہر کے معاشرے میں میری حیثیت کا تعین
چکا تھا۔ وہاں کے لوگ مجھے ایک خاص نام اور ایک خاص عہدے کی وجہ سے پہلے ہی
جانتے تھے۔ یہ میرے لئے ایک نئی بات تھی اور اس کا مجھے پہلی بار تجربہ ہو رہا تھا۔ اس
بعد تو میں اس کا عادی ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب میں کارواں سرائے کی چھت پر پہلی رات ب
کرنے کے بعد جاگا تو اپنے لباس کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ میرا لباس قدیم مصریوں جیسا نہ
تھا بلکہ موہنجودڑو کے لوگوں جیسا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ یہ لباس ریشمی ہے اور قیم
ہے۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ کسی نے سوتے میں میرا لباس اتار کر دوسرا لباس پہنا دیا
لیکن ایسا بے وقوف چور کون ہو سکتا تھا جو میرے معمولی کپڑے اتار کر اپنے ریشمی کپڑ
پہنا گیا ہو۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سرائے کا مالک کسی کام سے چھت پر آیا تو م
دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مجھے دیکھ کر حیران کیوں ہوا ہے؟ ا

مجھے اچانک محسوس ہوا کہ میں ان کی زبان میں بڑی روانی سے بات کر سکتا ہوں۔ گویا ان
لوگوں کی زبان بھی خودبخود مجھے آ گئی تھی۔ یہ کایاپلٹ میرے لئے بھی حیرت انگیز تھی۔
سرائے کے مالک کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ وہ گھبرا کر نیچے چلا گیا۔ تھوڑی دیر
بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ اس کے غلام بھی تھے۔ وہ سارے کے سارے ایک دم میرے
سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ یا خدا یہ کیا معمہ ہے؟ میں سوچنے لگا۔ میں نے انہیں اٹھنے کے
لئے کہا۔ وہ ادب سے سروقد کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔
اس سے پہلے کہ میں ان سے کوئی سوال کرتا۔ سرائے کے مالک نے اپنے خشک ہونٹوں پر
زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"عظیم دیوتا! بعل کے مقدس معبد کے کاہن اعظم عاطون آپ
کو اپنی سرائے کی چھت پر دیکھ کر ہماری زبانیں گنگ ہو گئی ہیں لیکن
ہم اپنی قسمت کی سربلندی پر جس قدر ناز کریں کم ہے کہ آپ نے
اپنے قدموں سے ہمارے غریب خانے کو زینت بخشی۔"

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ یہ حقیقت مجھ پر پہلے سے عیاں ہو چکی تھی کہ مجھے
ایک خاص مدت کے لئے موت کے پنجہ ستم آفریں سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس
پراسرار تجربے سے پہلی بار متعارف ہوا کہ تہذیب کے جس قدیم دور میں میرا ورود ہوا ہے
وہاں میں دیوتا بعل کے کاہن اعظم کے روپ میں نمودار ہوا ہوں۔ جو ان دیکھی طاقت مجھے
زندہ رکھے ہوئے تھی اس نے میرے دماغ کی تہوں میں اس عہد کی ساری باتیں' ساری
یادداشتیں' ساری جزئیات اور تفصیلات اور لوگوں کی شکلیں' ان کے نام ابھارنے شروع کر
دیئے۔ ہر چیز کھل کر میرے سامنے آ گئی اور میرے شعور نے کام کرنا شروع کر دیا۔ میرا نام
نہیں بدلا تھا۔ شکل نہیں بدلی تھی باقی سب کچھ بدل گیا تھا۔ میں موہنجودڑو کے سب سے
بڑے اور سب سے مقدس معبد کا کاہن اعظم عاطون تھا اور لوگ حیران ہو رہے تھے کہ جو
معبد میں سونے کی چوکی پر بیٹھ کر دیوتا بعل کے لئے نذرانے وصول کرتا ہے اور جس کے
آگے موہنجودڑو کا حکمران بادشاہ سومر بھی تعظیم سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ ایک پرانی
سرائے کی چھت پر کیسے آ گیا؟ میرے ساتھ تقدیر نے پہلا مذاق یہ کیا تھا کہ مجھے موت سے
بے نیاز کر دیا تھا اور اب دوسری ستم ظریفی یہ کی تھی کہ موہنجودڑو میں بادشاہ کے بعد مجھے
ملک کی سب سے باعزت و باوقار شخصیت یعنی عظیم الشان معبد کا کاہن اعظم بنا دیا تھا۔ میں
نے سرائے کے مالک سے کہا۔

"تعجب کرنے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے مقدس دیوتا بعل نے تم

لوگوں کے حالات سے آگاہ کرنے کے لئے یہاں بھیجا تھا۔ اب میں
واپس اپنے معبد جا رہا ہوں۔"

اتنا سنتے ہی وہ سب لوگ ایک بار پھر سجدے میں گر پڑے۔ میں ان کے اوپر پاؤں رکھتا ہوا سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ بازار میں بھی لوگ ہکا بکا ہو کر مجھے دیکھنے لگے اور پھر ہر کوئی تعظیم سے جھک گیا۔ میرے اندر کی غیبی طاقت کام کر رہی تھی۔ اس نے مجھے مقدس معبد کا راستہ بتایا اور میں بازار کی ایک طرف چل پڑا۔ دوکانوں پر بیٹھے' مکانوں کی ڈیوڑھیوں میں کھڑے اور بازار میں آتے جاتے لوگ مجھے دیکھتے ہی سر بسجود ہو جاتے۔ بڑھئی نے اپنا تیشہ روک لیا۔ لوہار کے ہاتھ دھونکنی پر ہی رہ گئے۔ میں تیز تیز چلتا' بازاروں سے گذرتا' بعل کے عظیم و باجبروت معبد کی سیڑھیوں کے سامنے آ کر رک گیا۔ معبد کے جاہ و جلال اور سنگ مرمر کی کشادہ سیڑھیوں اور اوپر دروازے پر دونوں جانب کھڑے بیلوں کے دیوپیکر مجسموں نے مجھ پر سحر طاری کر دیا۔ پجاری نیلے لبادوں میں دوڑتے ہوئے معبد کے دروازے سے نکلے اور سیڑھیوں کی دونوں جانب ادب و تعظیم سے ہاتھ باندھ کر سر بہ گریباں کھڑے ہو گئے میں بھی بڑے وقار اور بڑی شان کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے معبد کے بلند محراب والے دروازے میں داخل ہو گیا۔ مندر میں عود و لوبان سلگ رہے تھے۔ فضا قسم قسم کی خوشبوؤں سے بوجھل ہو رہی تھی۔ شوخ چشم حسین دیوداسیاں نیلے اور زرد لباس پہنے دیوتا بعل اور دیوی اشتر کے بتوں کے آگے بھجن گا رہی تھیں۔ میری آمد پر دیوداسیاں اور پجاری تعظیم بجا لائے اور مندر کے بلند ستونوں کے پاس قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے گوشہ چشم سے دیکھا کہ بعل دیوتا کا بت ایک بہت بڑے سرخ پتھر کے بیل کی شکل میں تھا اور دیوی اشتر کا بت ایک عورت کے روپ میں تھا جس کی گردن میں کنول کا ایک پھول سانپ کی طرح لٹکا تھا۔ یہ دریائے سندھ کی دیوی تھی۔ اس مندر کی دیو مالا کے تمام اسرار خود بخود میرے شعور پر منکشف ہوتے چلے جا رہے تھے۔ بعل کے بت کے پاس سنگ مرمر کے چبوترے پر سونے کی چوکی پڑی تھی۔ یہ میرے بیٹھنے کی جگہ تھی... یعنی یہاں بعل عظیم الشان مندر کا باجبروت کاہن اعظم بیٹھ کر بعل دیوتا کی پوجا کرتا تھا اور شاہی خاندان افراد سے قیمتی نذرانے وصول کرتا تھا۔

میں چبوترے کی سیڑھیاں چڑھتا اپنی مسند پر آ کر بیٹھا تو مندر کی فضا سنکھ اور نفیریوں کی صداؤں سے گونج اٹھی۔ دیوداسیاں نیم دائرے کی شکل میں میرے چبوترے کے آگے کر دست بستہ کھڑی ہو گئیں اور ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔ وہ شاید میری زبان سے ادا کئے جا والے افتتاحی اشلوکوں کا انتظار کر رہی تھیں۔ غیبی طاقت نے میرے شعور کو ہوا دی اور

سب کچھ یاد آنے لگا۔ میں نے اپنے سونے کے کرمنڈل میں سے دریا کا مقدس پانی لے کر بت کے پاؤں پر چھڑکا اور پہلا اشلوک پڑھا۔ اس کے ساتھ ہی دیوداسیوں اور پجاری لڑکوں نے بلند آواز میں اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔ اشلوک جاری تھے کہ ایک جانب سے گھنگروؤں کے چھناکے سنائی دیئے اور پھر ایک شعلہ رو' شوخ چشم رقاصہ پاؤں میں گھنگرو باندھے' بازوؤں پر ہیرے موتیوں کے جڑاؤ بازو بند سجائے' بالوں میں کنول کے پھولوں کا گجرا باندھے شعلہ جوالہ کی طرح رقص کرتی ہوئی نیم روشن ستونوں کے پیچھے سے نکلی اور میرے چبوترے کے سامنے آ کر کھڑتالوں اور ڈھول تاشوں کی لے پر رقص کرنے لگی۔ یہ بے حد حسین اور مہ جبین رقاصہ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا دل پہلے ہی سے اس کی الفت میں سرشار ہے۔ اسے دیکھ کر میری نبض کی رفتار تیز ہو گئی۔ وہ بھی دیوتا بعل کے حضور رقص کرتی ہوئی کبھی کبھی گوشہ چشم سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔ مگر اس کے ناز و ادا میں ایک وقار' دبدبہ اور جلال کے ساتھ ساتھ پاس ادب کا جذبہ بے پناہ بھی تھا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کو فراموش کئے ہوئے نہیں تھی کہ وہ دیوتا بعل اور دیوی اشتر کے حضور میں رقص کر رہی ہے اور اس کی ذرا سی لغزش اور بے ادبی اسے فنا کر سکتی ہے۔ اس کے باوصف وہ والہانہ رقص کے دوران کسی کسی وقت مجھ پر ایک نگاہ التفات ڈال لیتی تھی۔

رقص کے اختتام پر اس نے ہاتھ جوڑ کر دونوں دیوی دیوتا کی تعظیم کی' ساز رک گئے۔ ... دیوداسیاں سجدے میں گر پڑیں۔ پجاری لڑکے دھیمی آواز میں پھر وہی اشلوک دہرانے لگے اور یہ رقاصہ جس کا نام روکاش تھا سر جھکائے ادب سے چلتی میرے چبوترے کے سامنے آئی اور اس نے دونوں ہتھیلیاں آگے پھیلا دیں۔ میں نے دیکھا کہ اس کی ہتھیلیوں پر زعفران کی مہندی لگی تھی۔ مجھے کاہن اعظم کے منصب پر رہتے ہوئے جو کچھ کرنا تھا سب یاد آ چکا تھا۔ میں نے سونے کے کرمنڈل میں سے مقدس پانی اس کی ہتھیلی پر چھڑکا اور چنگیر میں سے گلاب کے دو سرخ پھول اٹھا کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

رقاصہ روکاش نے آہستہ آہستہ اپنا چہرہ اٹھا کر اپنی بڑی بڑی پراسرار سرمگیں آنکھوں سے مجھے دیکھا اور ذرا سا مسکرا کر سرگوشی میں بولی۔

"آدھی رات۔ تہہ خانہ..."

پھر وہ تیزی سے واپس پلٹی اور بڑی شان سے صراحی دار گردن اٹھائے' گھنگروؤں کی چھن چھن میں نیم روشن ستونوں کی جانب چلی گئی۔ دیوداسیاں سجدے سے اٹھیں اور باری باری مجھ سے پھول لے کر دیوی دیوتا کے آگے سر جھکاتی جدھر رقاصہ روکاش گئی تھی ادھر چلی گئیں۔ پوجا کی رسم ختم ہوئی تو میں سونے کی چوکی سے اٹھا۔ میری خدمت پر مامور دو

دیوداسیاں لپک کر چبوترے کے پاس آئیں اور میرے بازو تھام کر مجھے نیچے اتارا۔ میں اس مندر کی تمام رسوم و آداب سے غیبی طور پر واقف ہو چکا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ میں اس مندر کا پرانا کاہن اعظم بن چکا تھا جس کو اس مندر کی ایک ایک بات کا علم تھا جو وہاں کے تمام رموز سے آشنا تھا اور جسے سارے خفیہ راستے آتے تھے۔ میں اپنی شاندار کوٹھری میں آ کر سنجاب و سمور کے بستر پر لیٹ گیا۔

میرے سامنے صندل کی صندوقچی پر شمع دان میں شمع روشن تھی اور ایک ریت گھڑی رکھی تھی جو ظاہر کر رہی تھی کہ ابھی آدھی رات میں ایک ساعت باقی ہے۔ گھڑی کے اوپر نیچے کے دونوں خانوں کی ریت مساوی نہیں ہوئی تھی۔ گھڑی کے اوپر کے خانے سے ریت کے ذرے آہستہ آہستہ ایک نامعلوم سی پتلی لکیر کی شکل میں نیچے کے خانے میں گر رہے تھے۔ میں بے تاب نگاہوں سے بار بار گھڑی کی طرف دیکھتا۔ جب دونوں خانوں کی ریت برابر ہو گئی تو میں کوٹھری سے باہر نکل کر تہہ خانے کی طرف چلا۔ مندر کے بڑے دالان میں فانوس روشن تھے اور ساگریوں میں عود و لوبان سلگ رہا تھا پستہ قد ستونوں کی جس راہ داری میں سے میں گذر رہا تھا وہاں نیم اندھیرا اور نیم روشنی تھی میرے قدم اپنے آپ تہہ خانے کو جانے والے راستے کی جانب اٹھ رہے تھے۔

تہہ خانے میں اندھیرا تھا۔ لیکن سیڑھیوں کے آخر میں ایک کونے کی جانب رقاصہ روکاش نے ایک موم بتی روشن کر رکھی تھی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ یہ روکاش رقاصہ کی محبت کی وجہ بھی تھی اور اس احساس کا خوف بھی تھا کہ میں ملک کے سب سے بڑے مندر کا سب سے بڑا پجاری ہوں اور وہاں کی رسم کے مطابق کاہن اعظم نہ تو کسی عورت سے شادی کر سکتا تھا اور نہ کسی سے محبت کر سکتا تھا۔ اس کا کسی عورت کی طرف محبت کی نظر سے دیکھنا بھی ایک ایسا جرم تھا جس کی سزا موت تھی۔ یہ حقیقت بھی میری غیبی طاقت نے میری شناخت کے ساتھ ہی مجھ پر منکشف کر دی تھی۔

تہہ خانے کی سیڑھیاں اتر کر میں آخری ستون کی طرف گیا تو رقاصہ روکاش ایک گلابی شعلے کی طرح ستون کے عقب سے نکل کر میرے سامنے آ گئی۔ اس نے اپنا جسم سیاہ لبادے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ مگر اس کا گلابی خوبصورت چہرہ موم بتی کی روشنی میں چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ میں اس کے قریب جانے کے لئے بے تاب تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جس طرح اس کے تیر نگاہ کا گھائل ہوں اسی طرح وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے اور اس نے مندر کی ہزاروں سالہ قدیم دیومالائی روایات کو میری محبت میں ٹھکرا دیا ہے۔ اس کے سیاہ لبادے اور سیاہ بالوں کی گھٹاؤں میں سے صندل و زعفران کے عطریات کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ میں

اس کی چاند جیسی دمکتی پیشانی قریب سے دیکھنے آگے بڑھا تو اس نے بڑی عقیدت سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہا۔

"مقدس باپ! تو نے مجھے اپنی بیٹی بنایا ہے تجھے رب بعل اور دیوی اشتری کی قسم ہے مجھے بادشاہ سومر کے ظلم و ستم سے نجات دلاؤ اور مندر سے باہر جا کر مجھے اپنے محبوب شاہی بت تراش موگاش سے ملنے اور اس کے ساتھ فرار ہو جانے کا موقع دو۔"

مجھ پر گویا بجلی سی گر پڑی۔ رقاصہ روکاش نے ایک ہی سانس میں میری محبت کو کئی تیروں سے ہلاک کر دیا تھا۔ پہلا تیر تو مجھے یہ لگا کہ وہ مجھے اپنا محبوب نہیں بلکہ باپ سمجھتی تھی۔ دوسرا تیر اس نے یہ کہہ کر چلایا کہ وہ موہنجوڈرو کے بادشاہ سومر کے شاہی بت تراش موگاش سے محبت کرتی تھی جس نے اس کی ڈانسنگ گرل والی مورتی خاص طور پر بادشاہ کے محل کی زینت بننے کے لئے بنائی تھی اور تیسرا تیر میری محبت کے سینے پر یہ لگا کہ وہ موگاش کے ساتھ میرے رقیب کے ساتھ فرار ہونے کے لئے مجھ ہی سے مدد طلب کر رہی تھی۔ میں اس کا منہ تکنے لگا۔

مجھے احساس تھا کہ میں مندر کا کاہن اعظم ہوں اور رقاصہ روکاش سے والہانہ محبت کرتا ہوں مگر یہ نہ بتایا کہ میں اسے اس سے پہلے بیٹی کہہ چکا ہوں۔ میری محبت ہلاک کر دی گئی تھی۔ مجھے تو یہ علم تھا کہ میں کاہن اعظم کی حیثیت سے کسی عورت سے نہ تو شادی کر سکتا ہوں اور نہ محبت کر سکتا ہوں۔ مگر جب پوجا کے بعد روکاش نے گلاب کے پھول لیتے وقت میری طرف مسکرا کر دیکھا تھا اور سرگوشی میں مجھ سے تہہ خانے میں آدھی رات کو ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو میں یہ سمجھا تھا کہ اس نے میری محبت میں دیومالائی روایات سے بغاوت کر دی ہے اور وہ میری محبت میں سرشار ہے لیکن اب یہ بساط الٹ گئی تھی۔ وہ مجھ سے آدھی رات کو صرف اس لئے ملنے آئی تھی کہ میں اسے کسی طرح مندر سے فرار ہونے کا موقع فراہم کروں۔ کیوں کہ وہ بادشاہ سومر کی منظور نظر رقاصہ دیوداسی تھی۔ بادشاہ مذہبی روایات کے خلاف ایک قدم نہیں اٹھا سکتا تھا لیکن روکاش سے الگ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اب ایک ایک بات میرے سامنے کھلتی جا رہی تھی۔ بادشاہ سومر نے مجھے یعنی مندر کے کاہن اعظم کو اعتماد میں لے رکھا تھا اور میں ہر دوسری رات کے اندھیرے میں رقاصہ روکاش کو مندر کے خفیہ راستے سے باہر بھجوا دیتا تھا۔ جہاں بادشاہ کا جانثار فوجی دستہ سیاہ نقاب پہنے کھڑا ہوتا۔ وہ رقاصہ روکاش کو بادشاہ کے محل میں پہنچا دیتے اور صبح ہونے سے پہلے اپنی زبردست نگرانی میں واپس مندر چھوڑ جاتے لیکن رقاصہ روکاش کو بادشاہ سومر سے نفرت تھی اور وہ شاہی بت تراش موگاش پر فدا تھی اور اس کے ساتھ کسی طرح مندر سے فرار ہو کر

ملک سے نکل جانا چاہتی تھی۔ یہ کام وہ میری مدد کے بغیر نہیں کر سکتی تھی۔ کیوں کہ مندر کے باہر جلاد قسم کے شاہی سپاہیوں کا پہرہ لگا رہتا تھا۔ صرف میری اجازت سے ہی کوئی دیوداسی مندر سے باہر قدم رکھ سکتی تھی۔

رقاصہ روکاش جس کو میں دل و جان سے چاہتا تھا ہاتھ باندھے میرے سامنے کھڑی گڑگڑا رہی تھی کہ میں کسی طرح اسے مندر سے باہر نکلوا دوں تاکہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ ملک سے ہمیشہ کے لئے فرار ہو جائے۔ موم بتی کی روشنی میں اس کا حسین چہرہ شعلے کی طرح دمک رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں آنسو تھے۔ میرے دل پر ایک اور تیر لگا۔ کاش! یہ آنسو وہ میری محبت میں بہا رہی ہوتی لیکن وہ میرے رقیب روسیاہ اور اپنے محبوب موگاش کی محبت میں بے قرار ہو کر رو رہی تھی۔ میں ایک عجیب جہنم کی آگ میں دھکیل دیا گیا تھا۔

”مقدس باپ عاطون! کیا تم اپنی دکھی بیٹی کی فریاد نہیں سنو گے؟ کیا تم میری مدد نہیں کرو گے؟ میں بادشاہ سے نفرت کرتی ہوں۔ میں اس کے محل کا کھلونا نہیں ہوں۔ میں اپنے محبوب موگاش کی امانت ہوں۔ میرے دل میں صرف اس کی اور اسی کی شمع محبت روشن ہے۔ تم رحم دل باپ ہوں۔ تم پر دیوتاؤں کی لاکھوں برکتیں نازل ہوں گی۔ کیا تم دو محبت کرنے والے دلوں کو سندھ کی خاک میں پامال ہوتے دیکھتے رہو گے؟؟“

”خاموش!“

میرے منہ سے غصے کی حالت میں نکل گیا۔ رقاصہ روکاش سہم کر ذرا پیچھے ہٹ گئی۔ لگتا تھا کہ اسے مجھ سے اس قسم کے تخاطب کی ہرگز امید نہیں تھی۔ میں نے جلدی سے سنبھلتے ہوئے کہا۔

”میرا مطلب ہے روکاش کہ میں۔۔ میں تمہاری مدد کرنے کا وعدہ نہیں کرتا۔ مگر.... مگر کوشش کروں گا۔“

اور اس سے پہلے کہ وہ گڑگڑاتے ہوئے میرے قدموں پر گر پڑتی۔ میں اپنے دل میں غصے، نفرت، حسد اور رقابت کے شعلوں کو لئے تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر باہر نکل گیا۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ رقاصہ روکاش کی محبت میں ناکامی اور ذلت کے صدمے نے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا.... میں اس سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا لیکن جب اس کی موہنی صورت میری آنکھوں کے سامنے آتی تو میں اس ارادے سے ہاتھ کھینچ لیتا۔ میں بڑی آسانی سے بادشاہ سومر کو سارا حال بتا کر روکاش رقاصہ کو ہاتھی کے پاؤں تلے کچلوا سکتا تھا لیکن جانے کیوں اس کی محبت مجھے اس خیال سے باز رکھے ہوئے تھی۔ میں نے ساری رات

جاگ کر گزار دی۔

دوسرے روز مندر میں پوجا کے جشن کی رات تھی کیونکہ اس رات خود بادشاہ کو مندر میں پوجا کے لئے آنا تھا اور اسی رات رقاصہ روکاش کو بادشاہ کے محل میں پہنچایا جانا تھا۔ مجھے بادشاہ سے بھی نفرت ہو گئی تھی مگر میں اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ پوجا کی رات تھی۔ جشن کی رات تھی۔ مندر میں بادشاہ اپنی ملکہ اور امرائے دربار کے ساتھ موجود تھا۔ سنکھ بج رہے تھے۔ ڈھول پیٹے جا رہے تھے۔ دیوداسیاں رنگ برنگ لباس پہنے، سیاہ بال لہراتیں دیوتا بعل اور دیوی اشتر کے حضور رقص کر رہی تھیں۔ میں سونے کی چوکی پر ریشمی لباس میں ملبوس ساگری ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ ساگری میں مشک و عنبر سلگ رہا تھا۔ نفیریوں نے اپنی لے کو بلند کر کے شاہی دیوداسی رقاصہ روکاش کی آمد کا اعلان کیا۔ سب کی نظریں مندر کے نیم روشن ستونوں کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے کنکھیوں سے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر بے تابی سے پہلو بدلنے لگا تھا۔ رقاصہ روکاش شعلہ جوالہ بنی رقص کرتی، گھنگرو چھنکاتی ستونوں کے پیچھے سے بجلی کی طرح نکل کر دیوتا اور دیوی کے بتوں کے سامنے آکر جھک گئی۔ پھر وہ بادشاہ کی تعظیم بجا لائی۔ اس کے بعد میرے پاس آئی۔ میں نے سونے کے کرمنڈل میں سے پانی لے کر اس کے سر پر چھڑکا۔ رقاصہ روکاش کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر کنول کے پھولوں کا زرد گل سونے کے ذروں کی طرح دمک رہا تھا۔ اس کی پھولوں میں گندھی ہوئی زلفیں ناگنوں کی طرح اس کے جسم پر لٹک رہی تھیں۔ اس نے رقص شروع کر دیا۔ رقص کیا تھا ایک شعلہ سا تھا جو کبھی بھڑک کر اپنے دشمن کو خس و خاشاک کی طرح جلا ڈالنے کے لئے آگے بڑھتا اور کبھی رنگ و بو کا ستون بن کر اپنی جگہ پر ساکت ہو جاتا۔ ڈھول اور مردنگ کی تال، رقص کے گھنگروؤں کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ روکاش رقاصہ کی زلفیں طوفانی لہروں کی طرح لہرا رہی تھیں اور ان میں گندھے ہوئے پھول ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

اب دیوداسیاں بھی رقص میں شامل ہو گئی تھیں۔ انہوں نے چاند کے ہالے کی طرح رقاصہ روکاش کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ پجاری لڑکے بلند آوازوں میں مقدس اشلوک پڑھنے لگے تھے۔ بادشاہ کے چہرے پر حرص و ہوس کے سائے اڈ رہے تھے۔ اسے خوب معلوم تھا کہ یہ رقص کرتا ہوا شعلہ جوالہ آج رات اس کے محل کی زینت ہو گا۔ رقص اور پوجا کا جشن اپنے عروج پر تھا کہ بڑے دروازے میں سے شاہی بت تراش موگاش اندر داخل ہوا۔ یہ اونچا لمبا نوجوان مردانہ وجاہت کا مثالی نمونہ تھا۔ اس کا لباس زرد سلک کا تھا جس میں سونے کی تاروں سے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ اس کے گھنگریالے بال شانوں پر لہرا رہے

تھے۔ بلند پیشانی پر ذہانت اور اعلیٰ کردار کی چمک تھی۔ بادشاہ سومر اور اس کے امراء نے ا
نظر اس نوجوان پر ڈالی۔ شاہی بت تراش موگاش بادشاہ سومر کا منظور نظر تھا اور بادشاہ
طرف سے اسے ہر شاہی دعوت اور جشن میں بلا روک ٹوک آنے کی اجازت تھی لیکن ا
وقت جب کہ بادشاہ کی محبوب رقاصہ اپنے شعلہ صفت رقص کے عروج پر تھی اسے ب
تراش موگاش کی آمد اچھی نہیں لگی تھی۔ لیکن اس نے چہرے سے ناراضی کا کوئی اظہار
کیا۔ اب روکاش رقاصہ نے بھی اپنے محبوب موگاش کو دیکھ لیا تھا اور اس کے رقص
فریفتگی اور والہانہ جذبہ بیدار ہو گیا۔ بت تراش موگاش نے دیوی دیوتا کے بتوں کے آ
ذرا سا جھک کر تعظیم بجا لائی اور پھر اس کے جی میں کیا آئی کہ بڑی بے باکی سے قدم ا
ہوا.... رقاصہ روکاش کی طرف بڑھا اور اس کے رقص کرتے بازوؤں کو تھام لیا۔

محفل میں سناٹا چھا گیا۔ سنکھ خاموش ہو گئے۔ کھڑتالوں اور مردنگوں پر سکتہ طاری
گیا۔ نفیریوں کی آواز جیسے اچانک دب گئی۔ اشلوک پڑھتے پجاری لڑکوں کے لب وہیں ر
گئے۔ ہر کوئی دم بخود ہو گیا۔ میں بھی حیران تھا کہ بت تراش موگاش کو کیسے جرات ہوئی
بادشاہ کے حضور میں مقدس دیوی دیوتا کے آگے رقص کرتی شاہی دیوداسی روکاش کو ر
کرنے سے روک کر اس کے ہاتھوں کو محبت سے تھام لے۔ بادشاہ غصے سے کانپتا ہوا
جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ امرائے دربار بھی ایستادہ ہو گئے۔ فضا میں ایک ہیبت سی چھا
تھی۔ ہر کوئی دم بخود تھا۔ رقاصہ روکاش بھی لرزتے ہونٹوں اور خوف سے کپکپاتی نظ
سے سنگ تراش کا منہ تک رہی تھی جس کی محبت نے آداب شہنشاہی مذہبی روایات
دیوتاؤں کے تقدس کا بھی خیال نہ کیا تھا۔

روکاش اس کی گرفت سے نکل گئی۔ اسے اپنی اور اپنے محبوب کی موت سامنے ک
نظر آ رہی تھی۔ بادشاہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

مقدس دیوتاؤں کی اس سے زیادہ توہین نہیں ہو سکتی تھی کہ پوجا کے رقص کے دو
میں کوئی شخص شاہی دیوداسی اور رقاصہ کا بازو تھام لے ...... اگرچہ وہ روکاش سے اپنی
کا کھلم کھلا اظہار نہیں کر سکتا تھا مگر مذہبی قوانین کی پامالی کے علاوہ وہ بت تراش موگاش
اس حرکت کو اپنی ملکیت پر جارحانہ حملہ سمجھ رہا تھا اور پوجا کی مقدس رسوم سے بغاوت
بادشاہ کے حضور گستاخی کی آڑ لے کر شاہی بت تراش کی گردن قلم کرنے کا حکم جاری
چاہتا تھا لیکن مندر میں سرزد ہونے والی کسی بھی قانون شکنی کی سزا میری منظوری کے
نہیں دی جا سکتی تھی۔ میں خاموش تھا مگر میرے اندر جذبات کا ایک طوفان برپا تھا۔
بات بار بار میرے ذہن میں ابھر رہی تھی کہ بت تراش موگاش نے یہ حرکت وفور محبت

تحت کی ہے اور یہی وہ محبت کا جذبہ بے اختیار ہے جو میرے سینے میں بھی موجزن ہے۔
...مگر اس نے غیر شعوری طور پر مجھے دھتکار دیا تھا اور شاہی بت تراش موگاش کی والہ و
شیدا ہو چکی تھی۔ اس نے میری انا کو ٹھیس پہنچائی تھی اور مجھے جوان ہوتے ہوئے ایک
بوڑھا باپ بنا دیا تھا۔ اس نے یہ نہ جانتے ہوئے وہ تمام راہیں مسدود کر دی تھیں جن پر
چل کر میں اسے اپنا بنا سکتا تھا۔ میرے اندر انسانی ہمدردی کے تمام جذبے تھے لیکن روکاش
کی محبت نے میرے اندر ایک آگ سی لگا رکھی تھی اور میں اس سے تو نہیں لیکن اس سنگ
تراش سے ضرور انتقام لینا چاہتا تھا۔ میرے دل کے ایک خفیہ گوشے میں یہ خواہش بیدار ہو
چکی تھی کہ میں روکاش کے محبوب بت تراش موگاش کو اپنے راستے سے ہمیشہ کے لئے ہٹا
دوں۔ یہ بات مجھ پر عیاں تھی کہ میں روکاش کو اپنا نہیں بنا سکتا۔ لیکن میں اسے کسی
دوسرے کی بنتا بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بادشاہ سومر نے میری طرف دیکھا۔ رقاصہ روکاش تھر
تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے اپنا دایاں بازو اٹھایا اور بت تراش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
پر جلال آواز میں کہا۔

"تم نے بادشاہ اور ہمارے مقدس دیوی دیوتا کے سامنے اس
ناپاک حرکت سے ایک ایسی گستاخی کی ہے جس کی سزا موت ہے۔"

بت تراش موگاش نے کمال جرات سے جواب دیا۔

"محبت کرنے والے موت سے نہیں ڈرا کرتے۔ میں رقاصہ
روکاش کی محبت کے سحر میں ہوں۔ اس کی محبت نے مجھے جو کہا میں
نے وہی کیا۔ آپ مجھے جو سزا دیں گے میں اسے قبول کروں گا۔"

اب میں نے رقاصہ روکاش کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیوی اشتر اور دیوتا بعل کی رقاصہ روکاش! کیا تم بھی اس
گستاخ بت تراش کی محبت کا دم بھرتی ہو؟"

رقاصہ روکاش کے چہرے پر عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف
دیکھا اور آگے بڑھ کر بت تراش کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی اس حرکت سے بادشاہ کا چہرہ سرخ
ہو گیا۔ اس نے مجھے مخاطب کر کے گرج دار آواز میں کہا۔

"کاہن اعظم عاطون! میں ان دونوں ناپاک جسموں کو موت کی
سزا کا حکم سناتا ہوں۔"

کہنے کو تو میں یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ اے بادشاہ تم ان دونوں سے زیادہ ناپاک جسم رکھتے
ہو۔ مگر میں بھی انسانی کمزوریوں، عہدے کے لالچ، منصب کی کشش اور مصلحت کوشی کا شکار

تھا۔ میں نے سچی بات کہنے کی بجائے کہا۔

"میں بھی ان کی موت کی سزا کا حکم دیتا ہوں لیکن میں ایک گزارش کروں گا کہ موت کی سزا ایک ماہ بعد دی جائے۔ کیوں کہ اگلا مہینہ دیوی اوہنی کا مقدس مہینہ ہے۔"

بادشاہ نے فضا میں ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

"ایک ماہ بعد ان دونوں گستاخ انسانوں کو ہاتھی کے پاؤں تلے کچلوا دیا جائے۔"

بادشاہ کے اس حکم کے ساتھ ہی زرہ بکتر پہنے ہوئے سپاہی تلواریں لے کر آگے بڑھے اور بت تراش موگاش اور رقاصہ روکاش کو گرفتار کر کے لے گئے۔ روکاش نے جاتے ہوئے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جن میں حیرانی اور گلہ مندی تھی۔ گویا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں بھی اس کی موت کے پروانے پر مہر ثبت کر سکتا ہوں۔ بادشاہ اپنے امراء کے جلو میں جانے لگا تو میرے نائب پجاری نے جو مجھ سے زیادہ عمر کا اور مذہبی تھا۔ بادشاہ کے روبرو جا کر ادب سے جھکا اور بولا۔

بادشاہ سلامت! اگر آپ نے گستاخ بت تراش موگاش اور گناہ گار روکاش کو مقدس دیوی دیوتا کی توہین کے گھناؤنے جرم میں جو موت کی سزا کا حکم صادر فرمایا اس سے آسمان کے سبھی دیوتا خوش ہوئے ہیں لیکن میں سفارش کروں گا کہ آسمان کے دیوتاؤں کو مزید خوش کرنے کے لئے ان دونوں مجرموں کو ایک ماہ بعد دیوی اشتر اور دیوتا بعل کے استھان کے سامنے قربان کو کے ان کے دل دیوی دیوتا کے حضور پیش کئے جائیں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "ہم تمہاری تجویز قبول کرتے ہیں' ان دونوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔"

بادشاہ اپنے امراء کے ساتھ مندر سے باہر نکل گیا۔ پجاریوں نے دیوی اشتر اور دیوتا بعل کی تعریف میں نعرے لگائے اور میرے نائب کاہن پجاری کو مبارک باد دی کہ اس نے آسمان کے دیوتاؤں کی خوشی کے لئے ایک بہترین تجویز پیش کی۔ ان سب نے اپنی نظریں میری طرف اٹھائیں شاید انہوں نے میرے چہرے سے اندازہ کر لیا تھا کہ میں اس سزا سے خوش نہیں ہوں۔ میرے نائب نے تعظیم کے ساتھ پوچھا۔

"کیا کاہن اعظم کو میری تجویز سے اختلاف ہے؟"

ان سے اختلاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس شخص نے موگاش اور رقاصہ روکاش کو قربان گاہ پر ذبح کرنے کی جو بھیانک تجویز پیش کی تھی بادشاہ نے اس کی منظوری دے دی تھی۔ میں نے بھی دل سے نہ چاہتے ہوئے اس کی تائید کر دی تھی۔ میرا دل اداس اور بوجھل ہو گیا تھا۔ میں روکاش کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرا غم میرے چہرے سے عیاں ہو رہا تھا۔ میں نے دیوتا بعل کے بت کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کوئی مقدس کاہن اس تجویز سے اختلاف نہیں کر سکتا جو دیوی اشتر اور دیوتا بعل کی حرمت و عزت بحال کرنے کے لئے پیش کی گئی ہو۔ تم نے بہت خوب تجویز پیش کی۔ ہم تمہیں مبارک باد دیتے ہیں۔"

پجاریوں اور دیوداسیوں نے دیوی اشتر' دیوتا بعل کی فتح ہو' کے نعرے لگائے۔ میں نے جلدی جلدی اشلوک پڑھ کر پوجا کی رسم ختم کی اور دیوداسیوں اور پجاریوں کو رخصت کر کے خود بھی اداس دل کے ساتھ اپنی کوٹھری میں آ گیا۔ میرا دل غم کے ساگر میں ڈوبا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں متضاد جذبے ایک دوسرے سے متصادم تھے۔ میں روکاش کو بچانا چاہتا تھا۔ میں اگر چاہتا تو بڑی آسانی سے اسے وہاں سے نکال کر کسی دوسرے ملک کی جانب فرار ہو سکتا تھا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ میری محبوبہ کبھی نہیں بن سکے گی۔ وہ جب تک میرے پاس رہے گی۔ مجھے اپنا مقدس بزرگ اور بت تراش موگاش کو ہی اپنا محبوب سمجھتی رہے گی۔ اس لئے میں غمزدہ ہونے کے باوجود خاموش تھا اور ان دونوں عاشقوں کو بھیانک موت کے منہ سے بچانے کے لئے کسی منصوبے پر غور نہیں کر رہا تھا لیکن میں اس اندوہناک المیے کا ایک خاموش تماشائی بھی نہیں بننا چاہتا تھا۔ میں نے اسی رات فیصلہ کر لیا کہ میں مقدس جنگل میں روہنی کے متبرک مہینے میں عبادات اور ریاضت میں مشغول رہنے کا بہانہ بنا کر موہنجودوڑو سے ہڑپہ چلا جاؤں گا جو اس ملک کا ہی ایک سیارچہ اور ہم مذہب و ہم تمدن ملک تھا۔

دوسرے دن ہی میں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی عرضی پیش کر دی کہ میں روہنی کے مقدس ایام میں ہڑپہ کے جنگل میں جا کر عبادت کرنا چاہتا ہوں تا کہ ملک موہنجودڑو اور اپنے بادشاہ کی اقبال مندی کے لئے دعا کر سکوں۔ بادشاہ نے مجھے اجازت دے دی۔ جب میں آداب بجا لا کر واپس جانے لگا تو بادشاہ میرے قریب آ گیا اور بولا۔

"ہمیں توقع ہے کہ ہمارے مقدس مندر کا کاہن اعظم روکاش اور موگاش کی سزا کے روز ہمارے قریب ہمارے پاس ہو گا۔"

میں نے سر جھکا کر کہا۔ "مجھے اس دن اپنے پاس پائیں گے۔"

اور میں محل سے نکل آیا۔ میں اسی قیامت کے دن سے بچنے کے لئے ہڑپہ جا رہا تھا
اب بادشاہ کے حضور اقرار کر چکا تھا اور مجھے ہر حالت میں اس روز واپس آنا ہی تھا۔ کیا
سکتا تھا؟ بادشاہ کے حکم سے انکار ناممکن تھا۔ میری اپنی عاطون کی شخصیت کا زیادہ ح
موہنجوداڑو کے کاہن اعظم کی شخصیت کے رنگ میں رنگا ہوا تھا اور مجھ پر مندر کا تقدس
مذہبی رسومات و قوانین کا احترام غالب تھا۔ میں روکاش اور اس کی صورت دیکھے بغیر اسی
شام کو ہڑپہ کی جانب روانہ ہو گیا۔

میرے بعد پیچھے کیا کیا تحیر افزوں واقعات پیش آئے اور بظاہر کیسی قیامت گذر گئی؟
کا میں عینی شاہد نہیں ہوں لیکن میرے واپس آنے کے بعد اس کی ساری تفصیل دیود
الکندہ نے مجھے سنائی جو میں اپنی زبان میں آپ کو سناؤں گا۔ پہلے میں الکندہ کے بارے
تھوڑا سا تعارف کرا دوں۔ رقاصہ روکاش کے بعد مندر کی یہ دیوداسی سب سے ز
خوبصورت اور چنچل تھی۔ بات کرنے میں بڑی ہوشیار، معاملہ فہم اور چالاک تھی لیکن م
کی مقدس فضا اور مذہبی ادب، آداب و رسومات کی سختی سے پابند تھی اور ان کا ہر حالت
خیال رکھتی تھی۔

میری عدم موجودگی میں میرا نائب پجاری قائم مقام کاہن اعظم بن گیا تھا۔ یہ
القلب، سنگ دل اور مذہبی رسومات پر سختی سے کاربند رہنے والا اور اس پر عمل کرانے
انسان تھا۔ اسے بڑی خوشی تھی کہ دو ایسے گستاخ انسانوں کو اب قربان گاہ پر ذبح کیا جا
جنہوں نے پوجا کی مقدس رات کو دیوی دیوتاؤں کی توہین کا ارتکاب کیا تھا۔ یہ شخص ا
پسند بھی تھا چنانچہ وہ موگاش اور روکاش کو مزید ذہنی اذیت پہنچا کر خوش ہونے کی خاطر
رات قید خانے میں ان سے الگ الگ ملنے گیا۔ وہ انہیں یہ خبر سنانا چاہتا تھا کہ اب ا
دیوی دیوتا کے سامنے ذبح کیا جائے گا۔ پہلے وہ بت تراش موگاش کے تہہ خانے میں
موگاش زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ قائم مقام کاہن اعظم کے ساتھ شاہی گارڈ کے مسلح
بھی تھے۔ اس نے موگاش پر ایک حقارت بھری نظر ڈالی اور کہا۔

"کیا تمہیں احساس ہے کہ تم نے اپنی گستاخانہ حرکت سے ہمارے مقدس دیوی دیو
کس قدر توہین کی ہے؟"

بت تراش موگاش نے بڑی شان بے نیازی سے سر اٹھا کر کہا۔

"میں نے وہی کیا جو ایک محبت کرنے والے کو اپنی محبوبہ کے حسن و جمال کی
رعنائیوں کو دیکھ کر کرنا چاہئے تھا۔"

اس جواب سے سنگ دل کاہن کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اسے یہ توقع تھ

شاہی بت تراش اسے اپنے سامنے دیکھ کر اس کے پاؤں پر گر پڑے گا اور اپنے قصور کی معافی
مانگے گا لیکن اس نے تو کاہن اعظم کو ہرکارہ کی بھی وقعت نہ دی تھی۔ کاہن نے زہریلے
سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔

"لیکن شاید تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اب تم دونوں کو ہاتھی کے پاؤں تلے نہیں کچلا
جائے گا بلکہ دیوی دیوتا کے استھان پر لٹا کر تمہارا پیٹ چاک کر کے تمہارے سینے سے تمہارا
دھڑکتا ہوا زندہ دل نکال کر دیوتا کے حضور پیش کیا جائے گا اور پھر تم دونوں کے دل لوہے
کی گرم سلاخوں میں پرو کر دیوتا بعل کے قدموں میں لٹکا دیئے جائیں گے۔"

شاہی بت تراش کے چہرے کے سکون میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ اس کے ہونٹوں پر تبسم
نمودار ہوا اور بولا۔

"اگر میرے ایک ہزار دل بھی ہوں تو میں اپنی محبوبہ روکاش کی محبت میں انہیں ہنسی
خوشی قربان کرنے کو تیار ہوں۔"

کاہن کے حلق میں جیسے زہر کا تلخ ذائقہ گھل گیا۔ اس نے اپنی طرف سے ایک اور تیر
چلایا جو بت تراش کے لئے اذیت کا باعث بن سکتا تھا۔

"لیکن کیا تمہیں اپنی محبوبہ کا دل چیر دیئے جانے کا بھی دکھ نہیں؟ میرے حکم سے
روکاش رقاصہ کو سب سے پہلے تمہاری آنکھوں کے سامنے قربان کیا جائے گا۔ تم اپنی بے
بس آنکھوں سے اپنی محبوبہ کو گھائل ہوتے اور اس کے دھڑکتے ہوئے دل کو لوہے کی گرم
سلاخ میں پروتا دیکھو گے مگر کچھ نہ کر سکو گے۔"

بت تراش موگاش کا چہرہ غم آلود ہو گیا۔ اس نے بوجھل اور خشک آوز میں کہا۔

"کاش میرے ساتھ میری محبوب کو موت کی سزا نہ دی جاتی۔"

سنگ دل اور اذیت پسند کاہن نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا اور بولا۔

"اسے تو تم سے پہلے ذبح کیا جائے گا اور میں خود خنجر اس کے سینے میں اتاروں گا لیکن
فکر نہ کرو میں تمہیں ایک دم اس اذیت سے نجات نہیں دوں گا۔ تمہاری موت کے عرصے
کو ایک ماہ تک لمبا کر دیا ہے تاکہ تم دونوں ہر روز ہر رات مرتے رہو اور اپنی آنے والی
اذیت ناک موت کے تصور سے کانپتے رہو۔"

یہ کہہ کر سنگ دل کاہن مسلح محافظوں کے ساتھ تہہ خانے سے چلا گیا۔ اس کے بعد وہ
سیدھا دوسرے تہہ خانے میں آیا جہاں رقاصہ روکاش زنجیروں میں جکڑی موت کے انتظار
میں زرد ہو رہی تھی۔ یہ دونوں تہہ خانے عظیم الشان مندر کے نیچے تھے اور خاص طور پر
ان مجرموں کے لئے بنائے گئے تھے جنہیں موت کی سزا دی جاتی تھی۔ رقاصہ روکاش اگرچہ

اپنے محبوب موگاش کی محبت میں ثابت قدم تھی لیکن آخر عورت تھی۔ اس کا چہرہ موت کے خوف سے اترا ہوا تھا اور آنکھوں میں ایک ہی دن میں حلقے پڑ چکے تھے۔ اذیت پسند کاہن نے اسے آنے والی الم انگیز موت سے اس قدر ڈرایا کہ وہ رونے لگی۔ اس نے روتے روتے اپنی آنسو بھری پلکیں اٹھا کر کہا کہ اس کے محبوب موگاش پر رحم کیا جائے۔

کاہن نے غرا کر کہا۔

”خاموش گستاخ! تم دیوی اشتر اور دیوتا بعل کے مجرم کی جان بخشی کی خواہش کے ساتھ ایک اور گھناؤنا گناہ کر رہی ہو اور یہ گناہ تمہیں موت کے بعد بھی جہنم کے شعلوں میں جلاتا رہے گا۔“

روکاش نے کہا۔ ”کیا کاہن اعظم عاطون کی بھی یہی خواہش ہے؟“

قائم مقام کاہن کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ وہ دانت پیس کر کہنے لگا۔

”کاہن اعظم عاطون کی کیا مجال ہے کہ وہ دیوی دیوتا کے گستاخ مجرموں کو اپنی پناہ میں لینے کی جرات کرے۔ اگر وہ عبادات و ریاضت کے لئے ہڑپہ نہ گیا ہوتا تو اس وقت میری جگہ وہ ہوتا اور تمہیں خوشخبری سناتا ہوں کہ اب تمہیں اس دیوتا کے سامنے ذبح کیا جائے گا جس کے آگے تم ساری زندگی مقدس رقص کرتی رہی ہو۔“

رقاصہ روکاش نے اپنا کمزور و دکھی چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔ کاہن طنزیہ انداز میں ہنستا ہوا تہہ خانے سے باہر نکل گیا اور رقاصہ روکاش دیر تک اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے روتی رہی۔

دیوداسی الکندہ کو مندر کی رقاصہ روکاش اور اس کے عاشق موگاش کو موت کی سزا سنائے جانے کا سخت دکھ تھا اور صبح و شام ان دونوں کے فرار کے منصوبوں پر غور کرتی رہتی تھی۔ وہ خود موہنجوڈرو کے ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو صرف اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے کبھی کبھی مندر میں عبادت کرنے آیا کرتا تھا مگر وہ دونوں ایک دوسرے کے نہ ہو سکتے تھے۔ مندر کے قوانین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کی راہ میں حائل تھے۔ اب وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی پیاری سہیلی اور حسین ترین رقاصہ روکاش محض محبت کرنے کے جرم میں اپنے محبوب کے ساتھ قتل کر دی جائے۔ وہ شب و روز بے چینی سے سوچ بچار کرتی رہی۔ آخر اس نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ تیار کیا اور کمال جرات سے کام لیتے ہوئے خود اپنی موت سے کھیلتے ہوئے ان سپاہیوں پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے جو مندر کے تہہ خانے میں روکاش کی کال کوٹھری کے باہر پہرہ دیتے تھے۔ یہ دونوں سپاہی ہر وقت مسلح رہتے اور اپنے فرض کی سختی سے پابندی کرتے مگر الکندہ کے تیر نیم کش اور اس کی چنچل اداؤں کے

سامنے انہوں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور ایک رات انہوں نے الکندہ کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی سہیلی روکاش سے چند لمحوں کے لئے ملاقات کر سکتی ہے۔ رقاصہ روکاش نے کال کوٹھری میں اپنی سہیلی دیوداسی الکندہ کو آتے دیکھا تو اسے خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ ”الکندہ! تم؟“ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”شی!“ الکندہ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”روکاش! میری پیاری سہیلی! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں تم سے صرف اتنا پوچھنے آئی ہوں کہ کیا تم اپنے محبوب کے ساتھ یہاں سے فرار ہونے کو تیار ہو؟“

روکاش تو الکندہ کا منہ دیکھتے رہ گئی۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں ...... پر زبان پھیر کر کہا۔ ”الکندہ! تم موت کی دہلیز پر میرا دل خوش کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔“

الکندہ نے کہا۔ ”روکاش! مجھے صرف اتنا بتا دو کہ کیا تم یہاں سے فرار ہونا چاہتی ہو یا نہیں؟“

روکاش نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”الکندہ! مگر۔۔مگر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس تہہ خانے میں آیا ہوا کوئی انسان زندہ نہیں بچ سکا؟“

الکندہ نے روکاش کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

”پیاری بہن! مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ اس کے باوجود میں تمہیں یہاں سے فرار ہونے میں مدد دوں گی۔ میں نے ایک ترکیب سوچ رکھی ہے۔ اگر تم ہاں کہہ دو تو میں اس ترکیب پر آج ہی سے عمل شروع کر دوں گی اور اس سے پہلے کہ تمہیں دیوتا کے حضور قربان کیا جائے تم اپنے محبوب موگاش کے ساتھ کسی دوسرے ملک کی طرف سفر کر رہی ہو گی۔“

روکاش نے کہا۔ ”الکندہ! میں اسی وقت اپنے موگاش کو لے کر اس پتھر دل شہر سے بھاگ جانا چاہتی ہوں مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اس خطرناک منصوبے میں کامیاب ہو سکو گی۔“

الکندہ نے کہا۔ ”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اگر میں آدھی رات کو تم سے ملاقات کرنے تمہاری کال کوٹھری میں آ سکتی ہوں تو تمہیں یہاں سے نکال بھی سکتی ہوں۔ اب تم اطمینان سے یہاں بیٹھو۔ میں موگاش سے ملاقات کر کے اسے بھی اپنے منصوبے سے آگاہ کر دوں گی اور پھر ایک روز تم دونوں کو اس جہنم سے نکال دوں گی۔ دیوتا تمہارے نگہبان ہوں۔“

اور اس سے پہلے کے پہرے دار سپاہی الکندہ کو ملاقات ختم کرنے کے لئے کہتے وہ خود ہی کال کوٹھری سے باہر نکل آئی اور دونوں سپاہیوں کو ایک نگاہ دلبرانہ سے تکتی ہوئی وہاں

سے رخصت ہو گئی۔ اب اس نے ان پہرے دار سپاہیوں پر اپنا جادو جگانا شروع کیا جو بت تراش موگاش کے تہہ خانے پر پہرہ دیتے تھے۔ ایک حسین اور پرکشش لڑکی کے لئے اس عہد کے موہنجودوڑو کے کسی بھی نوجوان پر اپنا جادو چلانا کوئی مشکل امر نہیں تھا۔

الکندہ بہت جلد پہرے داروں کا دل اپنی مٹھی میں لینے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے ان پہرے داروں کو بھی وہی کہانی بیان کی کہ وہ موگاش سے پیار کرتی ہے اور اسے مرنے سے پہلے ایک نظر دیکھنا اور اس سے اپنی زندگی کی آخری باتیں کرنا چاہتی ہے۔ پہرے داروں نے الکندہ کو اجازت دے دی کہ وہ چند سیکنڈ کے لئے موگاش کی کال کوٹھری میں جا سکتی ہے۔ رات کے اندھیرے میں پہرے داروں کے پہلو سے اٹھ کر الکندہ کال کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ شاہی بت تراش موگاش دیوار سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ اس کی داڑھی بڑھ آئی تھی اور مردانہ حسن و جمال ماند پڑنے لگا تھا۔ طاق میں موم بتی روشن تھی جس کی روشنی نے تہہ خانے کی کال کوٹھری کی فضا کو اور زیادہ آسیبی بنا دیا تھا۔ الکندہ نے موگاش کے شانے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھیں کھول دیں اس کی آنکھوں میں موت کے خوف کی بجائے لازوال محبت کی چمک تھی۔ اس نے الکندہ کو دیکھ کر کہا۔

"تم کیسے آ گئیں؟ تمہیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟ مگر۔۔ مگر باہر تو کڑا پہرہ ہے۔"

اس نے مسکرا کر موگاش کو اپنی ساری سکیم سمجھائی اور اسے بتایا کہ وہ روکاش سے مل آئی ہے اور وہ بھی اس کے ساتھ فرار ہونے پر تیار ہے۔ پہلے تو موگاش کو یقین نہ آیا کہ الکندہ انہیں اس جگہ سے فرار کرا سکتی ہے جہاں قدم قدم پر پہرہ لگا ہے اور کوئی مکھی بھی اڑ کر باہر نہیں جا سکتی لیکن پھر اس نے سوچا کہ جو لڑکی شاہی گارڈ کے معتمد ترین پہرے داروں کو الو بنا سکتی ہے وہ انہیں موت کے منہ سے فرار ہونے میں مدد بھی دے سکتی ہے۔ اس نے الکندہ کے فرار کے منصوبے کو غور سے سنا۔ اس میں خطرہ بہت تھا مگر وہ دونوں مندر کی چار دیواری سے باہر جا سکتے تھے۔ موگاش کو یہی چاہئے تھا۔ ایک بار وہ روکاش کو ساتھ لے کر اس ستم آفریں مندر کی سنگین اور منحوس چار دیواری سے باہر نکل جائے۔ پھر جو ہو گا وہ دیکھ لے گا۔ موگاش کو سب کچھ سمجھا کر الکندہ واپس چلی گئی۔

فرار کی رات موہنجودڑو کے آسمان کو سیاہ بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ان کالی گھٹاؤں نے رات کی سیاہی کو تاریک بنا دیا تھا۔ بارش نہیں ہو رہی تھی۔ مگر بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی۔ رات کا پہلا پہر گزرا تو مندر میں پوجا کی رسم شروع ہو گئی۔ روکاش کی جگہ اب الکندہ نے مذہبی رقص کیا اور قائم مقام کاہن اعظم سے گلاب کے پھولوں اور زعفران کا تبرک وصول کیا۔ اذیت پسند کاہن بڑا خوش تھا کیوں کہ مورگاش اور روکاش کی قربانی کا دن بہت

قریب آ گیا تھا۔ اس نے الکندہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"الکندہ جس روز تمہاری پیاری سہیلی اور اس کے عاشق کے سینے چیرے جائیں گے اور ان کے دل گرم لوہے کی سلاخوں میں پروئے جائیں گے اس روز بھی تم ہی رقص کرو گی۔ کیا تم خوش ہو گی؟"

الکندہ نے دل پر پتھر رکھ کر کہا۔ "ہاں کاہن اعظم! میں دیوی دیوتا کی خوشیوں میں شریک ہوں۔" سنگ دل کاہن اعظم مکروہ ہنسی ہنسنے لگا اور الکندہ اس کے آگے تعظیم بجا لا کر گھنگروؤں کی چھن چھن میں نیم روشن ستونوں کی طرف چلی گئی۔ الکندہ آدھی رات گزر جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اپنی کوٹھری میں بستر پر لیٹی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ شمع دان کی روشنی دیوار کے طاق میں رکھی ریت گھڑی پر پڑ رہی تھی۔ الکندہ کی نگاہیں بار بار اس گھڑی پر جاتیں۔ جب آدھی رات گذر گئی تو الکندہ ایک چٹان جیسا عزم لے کر بستر سے اٹھی۔ اس نے اپنے تخت کے نیچے سے لکڑی کی صندوقچی نکال کر کھولی اور اس میں سے ایک چھوٹی سی چمڑے کی شیشی نکال جس میں زہریلا سفوف تھا۔ اس شیشی کو اس نے اپنے کپڑوں میں چھپا کر سیاہ لبادہ اوڑھا اور جام اور صراحی ساتھ لئے اور نیم تاریک راہ داریوں میں سے گذرتی اس تہہ خانے کے پہرے داروں کے پاس آئی جو روکاش کے تہہ خانے کے باہر پہرہ دے رہے تھے۔ آج الکندہ نے ان سے اپنی ملاقات پکی کر رکھی تھی۔ اندھیرے میں ہی جام و سبو کا دور شروع ہو گیا ------ اس نے کمال ہوشیاری سے زہریلی سفوف شراب میں حل کر کے دونوں سپاہیوں کو پلا دیا۔ جتنا زہر ان کے جسموں میں داخل ہوا وہ ان کو موت کے سپرد کرنے کے لئے کافی تھا۔ دونوں سپاہی جہاں بیٹھے تھے وہیں کے وہیں لڑھک گئے۔ زہر اتنا سریع الاثر تھا کہ اس نے ان کی ہڈیوں کو گلانا شروع کر دیا۔ الکندہ وہاں سے اٹھ کر اگلی راہ داری میں موگاش کے تہہ خانے کے باہر پہرہ دینے والے سپاہیوں کے پاس آ گئی۔ ان کو بھی اس نے اسی رات کا وقت دے رکھا تھا اور ان سپاہیوں کا بھی وہی انجام ہوا جو پہلے سپاہیوں کا ہوا تھا۔ الکندہ نے باری باری دونوں تہہ خانوں کی کال کوٹھریوں کے دروازے کھول کر روکاش اور موگاش کو باہر نکالا اور سرگوشی کی۔

"خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلتے آؤ۔ تمہارے قدموں کی چاپ بھی سنائی نہ دے۔"

روکاش کے ہونٹ خوف کے مارے خشک ہو رہے تھے۔ موگاش نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور ایک مرے ہوئے سپاہی کے نیام سے تلوار کھینچ کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔ الکندہ ایک قدم آگے آگے چل رہی تھی۔ راہ داریاں بالکل تاریک تھیں جن میں سے گذر کر وہ

ایک جگہ سے سیڑھیاں اترنے لگے۔ آخری سیڑھی پر ہلکی ہلکی روشنی پڑ رہی تھی۔ اس کے آگے لوہے کا ایک مضبوط دروازہ تھا جو ایک ایسی خفیہ سرنگ میں کھلتا تھا جو مندر کے تہہ خانوں سے نکل کر شہر کے نیچے سے ہوتی ہوئی شہر کی فصیل سے باہر کھائی میں نکل جاتی تھی۔ الکندہ نے آخری سیڑھی کی روشنی کو دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے روکاش اور موگاش کو وہیں روک لیا پھر وہ دبے پاؤں شاہی بت تراش موگاش کے بالکل قریب آئی اور اس کے کان میں بغیر آواز لگائے سرگوشی کی۔

"یہ آخری دروازہ ہے۔ اس کے آگے آزادی ہے۔ ایک آخری سپاہی اس دروازے پر پہرہ دے رہا ہے۔ کیا تم اسے ہلاک کر سکتے ہو؟"

موگاش نے کوئی جواب نہ دیا اور سیڑھی کی دیوار کے ساتھ لگ کر ایک ایک سیڑھی اترنے لگا۔ سپاہی کو آہٹ ہوء تو اس نے چلا کر کہا "کون ہے؟" موگاش نے جواب دینے بجائے سیڑھیوں پر سے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس کی تلوار کا رخ پہرے دار کی طرف تھا یہ تلوار سیدھی اس کے سینے میں اتر گئی اور وہ ایک گھٹی ہوئی چیخ کے ساتھ دروازے کے پاس گر کر ڈھیر ہو گیا۔ الکندہ اور روکاش لپک کر نیچے آ گئیں۔ الکندہ نے تڑپتے ہو پہرے دار سپاہی کے تھیلے سے دروازے کی چابی نکالی اور دروازہ کھول دیا۔ پھر بولی۔

"میں نے اپنی جان پر کھیل کر تم دونوں کے لئے آزادی کا در کھول دیا ہے۔ ایک سہیلی اور دوست کی حیثیت سے میرا جو فرض بنتا تھا وہ میں نے پورا کر دیا۔ پیچھے جو ہو گا اسے سنبھال لوں گی۔ مجھے خوشی ہے کہ دو محبت کرنے والے دل آج سے محبت کی کش فضاؤں میں پرواز کرنے کے لئے آزاد ہو رہے ہیں۔ محبت کے دیوتا تمہاری نگہبانی کریں۔"

رقاصہ روکاش کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے اپنی جانثار سہیلی کو اپنے سینے لپٹا لیا اور کہا۔ "الکندہ! اگر گمنام محبت کرنے والوں کی کوئی تاریخ لکھی گئی تو اس کا پہلا تمہارے نام سے شروع ہو گا۔" بت تراش موگاش نے الکندہ کا ہاتھ چوم لیا اور کہا۔ "می بہن! آج تم نے محبت کے دیوتاؤں کا دل جیت لیا ہے۔" الکندہ نے سپاہی کی تڑپتی ہ لاش کے قریب جلتی شمع کو اٹھا کر موگاش کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ "یہ وقت باتوں میں ض کرنے کا نہیں ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔ یہ سرنگ تم دونوں محبت کر والوں کو شہر کی فصیل کے باہر لے جائے گی۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے اس ظالم شہر سے دور جا سکو چلے جانا۔ دیوتا تمہاری حفاظت کریں۔" اتنا کہہ کر الکندہ تیزی سے سیڑھیاں کر راہ داری کے اندھیروں میں غائب ہو گئی۔

موگاش نے اپنی محبوبہ روکاش کو ساتھ لیا اور دونوں شمع کی روشنی میں تیز تیز قد

سے سرنگ میں سے گذرنے لگے۔ جب وہ اندھیری سرنگ سے باہر نکلے تو سیاہ بادلوں میں لپٹی ہوئی تاریک رات بادلوں بھرے آسمان پر بجلیوں کے کوندھے لپکاتی انہیں کسی آنے والے خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا تھا۔ فصیل شہر کے آگے کھائی تھی جس میں زہریلے سانپوں اور بچھوؤں کی پرورش کرنے والی جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ موگاش نے شمع سرنگ میں ہی پھینک دی تھی۔ ایک جگہ انہوں نے کھائی عبور کی اور اب ان کے سامنے ریت کے ٹیلوں کا سلسلہ تھا جو اندھیری رات میں مہیب عفریتوں کی طرح دور تک پھیلا ہوا تھا۔ رقاصہ روکاش نے کہا۔

"ہمیں گھوڑوں کی ضرورت ہے۔ کاش ہمیں گھوڑے مل جاتے۔"

موگاش نے جواب میں روکاش کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "ہمیں گھوڑے کہیں سے نہیں مل سکتے اس لئے جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے پیدل ہی دور نکلنا ہو گا۔"

محبت کرنے والے ایک جذبہ بے اختیار کے تحت عشق کے پر لگا کر دیوانہ وار صحرا میں نکل کھڑے ہوئے۔ شاہی بت تراش موگاش اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ وہ انہی ریت کے ٹیلوں میں کھیل کود کر جوان ہوا تھا۔ وہ ملک شام کو جانے والے صحرائی راستے سے واقف تھا۔ اسی راستے پر شام کے ملک کو جانے والے قافلے سفر کیا کرتے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ اب بوندا باندی بھی شروع ہو گئی تھی صحرا کی ٹھنڈی ریت پر وہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

وہ کافی دور نکل گئے۔ موگاش نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شہر کی قدیم فصیل کی برجیوں میں جلنے والی مشعلیں ستاروں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔

روکاش تھک گئی تھی۔ اس کے نازک پاؤں درد کرنے لگے تھے۔ موگاش نے اسے حوصلہ دیا۔ روکاش نے موگاش کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ رات کے اندھیرے میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ بارش کی بوندیں اس کے سیاہ بالوں سے ٹپکنے لگی تھیں۔ ریت کے دیوپیکر ٹیلوں کا سلسلہ صحرائی شاہراہ پر ان کی دونوں جانب پھیلا ہوا تھا۔ پھر وہ شاہراہ سے ہٹ کر ٹیلوں کے درمیان سے ہو کر گذرنے لگے۔ نازک اندام رقاصہ روکاش تھک گئی تھی اور اس سے چلا نہیں جاتا تھا۔ موگاش نے اس کو کاندھے پر اٹھا لیا مگر چند قدم چلنے کے بعد وہ بھی تھک گیا۔ گیلی اور نرم ریت میں اس کے پاؤں دھنس دھنس جاتے تھے۔ اس وقت موگاش کو دور ایک ٹیلے کے پاس روشنی جھلملاتی دکھائی دی۔ جب وہ اس روشنی کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ ٹیلے کے پاس کھجوروں کے چند درخت اندھیری رات میں سر اٹھائے جھکے کھڑے ہیں اور پاس ہی ایک جھونپڑے کے پاس شمع جل رہی ہے۔ جس شے

کو دیکھ کر اس کے تھکے ہارے جسموں میں پھر سے طاقت اٹھ آئی وہ ایک گھوڑا تھا جو کھجور کے درختوں کے نیچے کھڑا تھا۔ موگاش نے روکاش کو آہستہ سے کہا۔ "محبت کے دیوتاؤں نے ہماری مدد کے لئے یہ گھوڑا بھیجا ہے۔" موگاش آہستہ آہستہ گھوڑے کی طرف بڑھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر گھوڑے نے کوئی آواز نکالی تو اس کا مالک جھونپڑے میں سے نکل آئے گا۔ مگر گھوڑا خاموش کھڑا رہا۔ موگاش نے سب سے پہلے اپنی محبوبہ روکاش کو گھوڑے پر بٹھایا اور پھر خود سوار ہوا اور گھوڑے کو قدم قدم چلاتا جھونپڑی سے دور لے گیا پھر اس نے ایڑ لگائی اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ وہ بہت خوش تھے کہ قسمت ان کا ساتھ دے رہی ہے۔ دیوتا ان کی مدد کر رہے ہیں لیکن قدرت کو جو منظور تھا وہ ظاہر ہونے والا تھا۔ پردہ غیب سے ظہور میں آنے والے خونی المیے کو کڑکتی بجلیوں نے دیکھ لیا تھا۔ اس کی آتشیں کوندے صحرا میں لپک رہے تھے۔ بادل گرجتا تو رقاصہ روکاش کا دل دہل جاتا اور وہ اپنے محبوب کے کندھے سے اپنا سر لگا دیتی۔ گرجتی' کڑکتی طوفانی رات' محبت کی ماری روکاش کو کسی ناگزیر سانحے سے خوفزدہ کر رہی تھی۔ موگاش نے گھوڑے کی باگیں ڈھیلی کر رکھی تھیں اور وہ صحرا میں سرپٹ دوڑا جا رہا تھا کہ اچانک بادلوں کی ہیبت ناک گرج کے ساتھ ہی قرنے کی تیز آواز گونجی۔ موگاش نے روکاش کو اپنے قریب کر لیا وہ اس کی آواز کو خوب پہچانتا تھا۔ یہ موہنجوڈرو کے مطلق العنان جابر بادشاہ سومر کے دستہ خاص کی آمد کی آواز تھی۔ جو ان محبان صادق کا تعاقب کرتا ان کے سر پر آن پہنچا تھا۔ آن واحد میں گرانڈیل مسلح سپاہیوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ ان سپاہیوں کے پلے ہوئے گھوڑے برق رفتاری سے سندھ کے ویران ٹیلوں کو عبور کر کے ایک ناگہانی آفت بن کر ان تک پہنچ گئے تھے۔ موگاش نے تلوار سونت لی۔ سپاہی اس پر ٹوٹ پڑے۔ روکاش گھوڑے سے گر پڑی۔ وہ قسمت کی ستم ظریفی پر گریہ کناں تھی اور پو پھٹے کی کافوری روشنی میں موگاش کو شاہی جیش کے تنومند گرانڈیل سپاہیوں سے لڑتا دیکھ رہی تھی مگر اکیلا موگاش کہاں تک اتنے سپاہیوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ ایک سپاہی نے پیچھے سے آ کر تلوار لہرائی۔ روکاش کی چیخ نکل گئی۔ تلوار موگاش کی گردن پر پڑی اور اس کا سر کٹ کر بارش میں بھیگتی صحرائی ریت پر گر پڑا۔ روکاش بے ہوش ہو گئی۔ جیش کے سردار نے موگاش کے سر کو نیزے پر چڑھا لیا۔ بے ہوش رقاصہ روکاش کو گھوڑے پر باندھا اور شاہی محل کی طرف واپسی کا حکم دیا۔

حکمران سومر کا حکم تھا کہ موگاش کا سر کاٹ کر لایا جائے اور روکاش رقاصہ کو زندہ پکڑ کر شاہی محل کے قید خانے میں ڈال دیا جائے اور شاہی احکام پر پوری طرح عمل کیا گیا۔ رقاصہ روکاش قید خانے میں پڑی تھی کہ مجھے ہڑپہ میں اس واقعہ کی خبر پہنچ گئی۔ میرا خیال تھا

کہ رقاصہ روکاش کو دیوی اشتر اور دیوتا بعل کے حضور قربان کیا جائے گا لیکن یہ سن کر کہ بادشاہ کے خاص حکم پر روکاش کو شاہی قید خانے میں رکھا گیا ہے میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ بادشاہ نے رقاصہ کو مندی کی تحویل سے واپس لے لیا ہے اور یقیناً اس نے یہ الزام لگایا ہو گا کہ مندر کا عملہ شاہی مجرموں کی نگہبانی کرنے میں ناکام رہا ہے۔ میں خاموش رہا اور واپس موہنجوڈرو نہ گیا۔ میں رقاصہ روکاش کے انجام کا منتظر تھا۔ میرے اندر اس عہد کی ساری اچھائیاں' برائیاں' کمینگیاں' کدورتیں' حسد' رقابتیں اور نفرتیں موجود تھیں۔ میں اس عہد کی تصویر تھا۔ اس عہد کے انسانی معاشرے کا مزاج میرے مزاج میں رچا ہوا تھا۔ میں رقاصہ روکاش کی محبت میں پاگل ہو گیا تھا مگر اس نے مجھے چھوڑ کر موگاش کا بازو تھام لیا تھا۔ خواہ اس کی وجہ کچھ ہی تھی۔ مجھے اس وجہ سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہ اس عہد کے انسانی معاشرے کی خود غرضی تھی جو میرے کردار کا ایک ناگزیر حصہ تھی۔ میں موگاش کے قتل پر اندر سے خوش تھا اور اب یہ خبر سننے کے انتظار میں تھا کہ رقاصہ روکاش کو دیوتا بعل کے سامنے قربان کر دیا گیا ہے لیکن بادشاہ سومر اسے شاہی محل کے قید خانے میں لے گیا تھا جس سے میں شک میں پڑ گیا تھا۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ میرے خاص جاسوس نے مجھے آ کر خبر دی کہ بادشاہ نے میرے نائب کاہن کو زر و جواہر کی رشوت دے کر راضی کر لیا ہے کہ وہ مندر میں جا کر یہ اعلان کر دے کہ دیوتاؤں نے اپنی خوشی سے رقاصہ روکاش کو بادشاہ کے حوالے کر دیا ہے تاکہ وہ مقدس رقاصہ جو صرف دیوتاؤں کے آگے رقص پیش کیا کرتی تھی' اب بھرے دربار میں امراء وزراء کے سامنے رقص کرے اور دیوتاؤں کی نگاہوں میں ذلیل و رسوا ہو۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ آخر موہنجوڈرو کا عیش پرست حکمران حسین روکاش کو اپنی خوشیوں کے لئے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب میرے لئے رقاصہ روکاش کا وجود ایک سانپ تھا جسے میرے سینے پر لوٹتے رہنا چاہئے تھا۔ اور یہ بات میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ میری راتوں کی نیند اڑ گئی۔ مجھے کسی کل چین نہیں پڑتا تھا۔ عبادات و ریاضت سے جی اکھڑ گیا تھا۔ ہر گھڑی' ہر پل ایک تصویر میری آنکھوں کے سامنے رہتی اور میں روکاش کو بادشاہ کے محل میں رقص کرتے ... دیکھتا تو میں تڑپ اٹھتا۔ آخر میں نے روکاش کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ایک روز ہڑپہ سے موہنجوڈرو کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہڑپہ سے موہنجوڈرو تک کا سفر ایک طویل سفر تھا اور جنگلوں اور صحراؤں میں سے گذرنا پڑتا تھا۔ ہڑپہ کی تہذیب و ثقافت موہنجوڈرو کی ہمشیر تہذیب و ثقافت تھی۔ دونوں ملکوں کے معاشرے کی اچھائیاں ' برائیاں اور عقیدے ایک جیسے تھے۔ دونوں تہذیبیں لہو و لعب اور

عیش کوشیوں کے نکتہ عروج پر تھیں۔ مذہبی رسوم نام کی تھیں اور حکمرانوں کی لذت پرستیاں مذہبی رسومات میں بھی سرایت کر گئی تھیں۔ امراء پرستی نے ایک گھناؤنے اور ناقابل علاج مرض کی شکل اختیار کر رکھی تھی۔ یہ دونوں تہذیبیں میرے وطن مصر کی ہم عصر تھیں مگر دونوں کا ایک دوسرے پر کوئی اثر نہیں تھا۔ ہڑپہ اور موہنجوڈرو کے لوگ بھی قدیم مصریوں سے مختلف تھے۔ یہ لوگ اپنا ناتا وسط ایشیا سے ہجرت کرنے والے آریہ قافلوں سے جوڑتے تھے جن کی ایک شاخ قدیم افغانستان سے الگ ہو کر گندھارا میں آباد ہو گئی تھی اور دوسری شاخ ایران کی شمالی سطح مرتفع اور جنوبی ایران میں جا کر بس گئی تھی۔ یہ وہی جنوبی شاخ والی آریہ نسل تھی جو بعد میں میڈی قوم سے مشہور ہوئی۔ میں ان لوگوں کی تاریخ و ثقافت' تہذیب و تمدن اور مذہبی دیومالا پر غور کرتا سفر کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ میں کاہن اعظم کے جلیل القدر مرتبے پر فائز تھا۔ چنانچہ ہڑپہ سے ہی میرے ساتھ ایک خاص حفاظتی دستہ تعینات کر دیا گیا تھا جو مجھے اپنے جلو میں لئے موہنجوڈرو کی جانب رواں تھا۔ کسی وقت رقاصہ روکاش کی تلخ یاد میرے دل پر حملہ کر دیتی اور میں اس کی جگر پاش محبت میں ناکامی کے باعث تڑپ تڑپ اٹھتا اور میں اسے قتل کرنے کے ارادے پر اور مضبوطی سے جم جاتا۔ موہنجوڈرو سے ایک کوس باہر پجاریوں کے ہجوم نے میرا خیر مقدم کیا۔ بادشاہ سومر نے شاہی گارڈرز کا ایک دستہ بھی میرے استقبال کے لئے بھیجا تھا۔ میں بڑی شان و شکوہ کے ساتھ بعل کے عظیم الشان مندر میں داخل ہوا۔ مندر کے دروازے پر میرا نائب کاہن چاندی کے طشت میں مقدس زعفران اور صندل لئے ادب سے کھڑا تھا۔ اس نے زعفران و صندل میرے قدموں میں چھڑکا اور مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

ضروری مذہبی رسومات سے فارغ ہو کر میں نے روکاش کی قائم مقام رقاصہ دیوداسی الکندہ کو اپنے کمرہ خاص میں بلایا اور روکاش اور موگاش کے ساتھ بیتے ہوئے المیے کے بارے میں پوچھا۔ الکندہ شروع ہی سے میرے کردار کی ایک خصوصیت کی معترف تھی کہ میں رازوں کی پاسبانی کرتا ہوں اور دوسروں کا راز اپنے دل کی گہرائیوں میں دفن کر دیا کرتا ہوں۔ میں نے اسے دیوتا بعل اور دیوی اشتر کی قسم دے کر کہا کہ وہ مجھے روکاش اور موگاش کے فرار کے بارے میں بتائے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اس کا راز میرے سینے میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے گا۔ پھر الکندہ نے اپنی جان کی امان کا مجھ سے حلف لیا اور مجھے شروع سے لے کر آخر تک پوری تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ میں خاموشی سے سنتا چلا گیا۔ جب اس نے پرنم آنکھوں سے موگاش کے قتل اور روکاش کے شاہی محل میں منتقل ہونے کی داستان الم بند کی تو مجھ سے ایک بار پھر وعدہ لیا کہ میں یہ راز

کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ میں نے اسے تسلی دی اور رخصت کر دیا۔ دوسرے روز مجھے شاہی دربار میں طلب کیا گیا اور بادشاہ سومر میری تعظیم بجا لانے کے بعد حجلہ خاص میں لے گیا۔ اس نے مجھے قیمتی دوشالوں کا تحفہ دیا اور روکاش کے معاشقے کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

''کاہن اعظم عاطون! شاہی بت تراش نے دیوی دیوتاؤں کی منظور نظر رقاصہ کو اغواء کر کے جس گھناؤنی گستاخی اور بے ادبی کی جسارت کی تھی اس کی اسے سزا مل گئی۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن اے شہنشاہ عالی مقام! رقاصہ روکاش بھی اسی گستاخانہ فعل کی مرتکب ہوئی ہے وہ سزا سے کیوں محفوظ رکھی گئی؟''

بادشاہ نے اپنا چہرہ اوپر اٹھا کر چھت میں لگے جواہرات کو دیکھا اور بولا۔

''قائم مقام کاہن اعظم نے مجھ تک دیوی دیوتاؤں کا یہ پیغام پہنچایا تھا کہ وہ اس مرتد رقاصہ کو قتل کر کے اس کی زندگی کی سزا کی اذیت سے نجات نہیں دلانا چاہتے۔ ان کی خواہش ہے کہ رقاصہ روکاش شاہی محل کے بھرے دربار میں ملکی اور غیر ملکی شخصیتوں کے آگے رقص کا مظاہرہ کر کے ذلیل و رسوا ہو اور جب تک زندہ رہے یہ ذلت برداشت کرتی رہے۔''

میرے مخبروں نے ہڑپہ ہی میں مجھے اصل واقعات سے باخبر کر دیا تھا اور میں خوب جانتا تھا کہ میرے لالچی اور مکار نائب کاہن اعظم کا یہ دیومالائی پیغام ان بیش قیمتی زر و جواہر کا مرہون منت تھا جو بادشاہ کی جانب سے اسے پیش کئے گئے تھے۔ میں چونکہ رقاصہ روکاش کو قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا اس لئے مجھے اب اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ مندر میں رقص کرتی ہے کہ شاہی دربار میں ناچتی ہے۔ میں نے بادشاہ سے یہی کہا کہ میرے نائب کاہن نے جو کچھ کیا درست تھا اور دیوتاؤں کی یہی مرضی تھی کہ گستاخ اور مرتد رقاصہ روکاش بھرے دربار میں رقص کرے اور اس رسوائی کو زندگی کی آخری گھڑیوں تک برداشت کرے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے اس انداز فکر سے بادشاہ کو بے حد خوشی ہوئی ہے۔ اس نے مجھے اپنے اعتماد میں لینے کے لئے حجلہ خاص میں بلا کر تحائف پیش کئے تھے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مجھے ابھی اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تھی اور یہ مقصد تھا روکاش کا قتل!

میں نے صبح و شام روکاش کے قتل کے منصوبے پر غور کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران میری روکاش سے کوئی ملاقات نہ ہوئی۔ میں شاہی محل میں نہیں جاتا تھا اور وہ مقدس بعل کے مندر میں داخل نہیں ہو سکتی تھی لیکن میرا مخبر شاہی محل کی ایک ایک پل کی خبر لا کر مجھے دے رہا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ رقاصہ روکاش نے شاہی

محل کے ایک حبشی کی طرف متوجہ ہو گئی ہے ... اور وہ راتوں کو چھپ چھپ کر ملتے ہیں۔
میرے دل پر ایک اور گھاؤ لگا۔ نازک اندام، سرگیں آنکھوں اور گلاب ایسے رخساروں والی
رقاصہ روکاش کی محبت جو کبھی میرے دل میں نرم سوز شمع بن کر جگمگایا کرتی تھی اب ایک
شعلہ بن کر بھڑک اٹھی تھی اور ہوس رقابت اور حسد کی یہ آگ ہر شے کو خس و خاشاک
کی طرح جلا کر راکھ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے قتل کا ایک منصوبہ دل میں طے کر لیا۔ قتل کی
اس خونی سازش کا سوائے میرے اور کسی کو علم نہیں تھا۔ میں نے اس سازش پر عمل شروع
کیا ہی تھا کہ ایک بھیانک حادثہ گذر گیا۔ ایک رات رقاصہ روکاش اپنے حبشی محبوب کے
ساتھ محل سے فرار ہو گئی مگر ایک رات پھر پکڑ لی گئی۔ بادشاہ کے حکم سے حبشی غلام کا سر
قلم کر دیا گیا۔ بادشاہ نے اس واقعے کو راز میں رکھنا چاہا۔ کیوں کہ وہ ایک بار پھر رقاصہ
روکاش کو موت کے منہ میں جانے سے بچانا چاہتا تھا مگر میں نے اس واقعے کو اپنے مخبروں
کے ذریعے شہر میں عام کر دیا۔ رعایا میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ لوگ پہلے ہی دیوتاؤں کی
توہین کے الزام میں ملوث ہونے والی رقاصہ کی جان بخشی اور شاہی محل میں اس کی موجودگی
پر کبیدہ خاطر تھے۔ اب انہوں نے رقاصہ کا شہر کے چوک میں سر قلم کرنے کا مطالبہ کر دیا۔
مندر کے کاہن اور پجاری بھی عوام کے ساتھ تھے۔ بادشاہ کو وہ بے حد عزیز تھی لہٰذا وہ اسے
قتل نہیں کرنا چاہتا تھا مگر مذہبی پیشواؤں اور عوام کے سامنے اسے بھی جھکنا پڑ گیا۔ اس نے
ایک بار پھر مجھے تخلیہ خاص میں بلایا اور مجھے رازداری میں لیتے ہوئے اس دبی ہوئی خواہش کا
اظہار کیا کہ وہ رقاصہ روکاش کو مذہبی پیشواؤں اور عوام کے مطالبے کے مطابق موت کے
حوالے نہیں کرنا چاہتا بلکہ درون پردہ اسے صحراؤں میں کسی خفیہ مقام پر پہنچا دینا چاہتا ہے۔
میرے سینے میں روکاش سے اپنی محبت کا انتقام لینے کی آگ دوچند ہو چکی تھی۔ میں نے
دیوتاؤں اور مذہبی قوانین کے حوالے سے بادشاہ کو صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس نے
روکاش کو عوام کے حوالے نہ کیا تو رعایا اس کے خلاف بغاوت کر دے گی اور ہڑپہ کے
حکمران کو حملے کی دعوت دے دے گی۔ بادشاہ خاموش ہو گیا۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔
اس نے رقاصہ روکاش کا سر شہر کے سب سے بڑے چوک میں قلم کرنے کی تاریخ کا
اعلان کر دیا۔ اب میری نفسیات نے ایک عجیب رنگ میں پہلو بدلا۔ جب تک میں نے خود
اپنے ہاتھ سے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا میرے دل کو اپنے اس فیصلے پر بھرپور سکون
تھا لیکن جوں ہی میں نے تصور کی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا کہ ہزاروں تماشائیوں کے سامنے
شاہی جلاد رقاصہ روکاش کا سر قلم کر رہا ہے تو میرے دل و دماغ میں روکاش سے ہمدردی کا
جذبہ بیدار ہو گیا۔ جانے کیوں مجھے یہ گوارہ نہیں تھا کہ کوئی دوسرا روکاش کو قتل کرے لیکن

میں اس قتل کو رکوا بھی نہیں سکتا تھا اور خود بھی اسے قتل نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ رقاصہ
روکاش کو پابہ زنجیر کر کے پھانسی گھر میں ڈال دیا گیا تھا اور اس پر کڑا پہرہ لگا تھا۔ آخر بادشاہ کو
اپنی سلطنت عزیز تھی اور وہ رقاصہ روکاش کو ہاتھ سے گنوا کر اپنی سلطنت اور شاہی محل
سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتا تھا۔ میں ایک عجیب کرب ناک ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو گیا۔
جوں جوں روکاش کے قتل کا دن قریب آ رہا تھا میرے دل میں رقاصہ روکاش کو حاصل
کرنے کا خیال شدت اختیار کر رہا تھا۔ مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ اگر میں روکاش سے محروم
ہو گیا تو یہ محرومی کا احساس ایک جلتا ہوا انگارہ بن کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے دل میں اتر
جائے گا اور میں ساری زندگی جو خدا جانے کتنے ہزار سال لکھی ہے تڑپتا اور پچھتاتا رہوں
گا۔ میرے ذہن پر طاری موہنجوڈرو کے کاہن اعظم کا قابوس سرکنے لگا اور میری اصلی
شخصیت سامنے آنا شروع ہو گئی۔ روکاش کی محبت نے ہر قسم کے جذبہ رقابت و حسد کو پس
پشت ڈال کر مجھے ایک بار پھر اپنی جنون خیز گرفت میں جکڑ لیا اور میں ننگ و ناموس اور خرقہ
سالوس کی پروا کئے بغیر اپنی محبوبہ روکاش کو موت کے منہ سے نکال کر اپنے ساتھ بھگا لے
جانے کا فیصلہ کر لیا۔

جس دن میں نے یہ ستم ایجاد اور بلا تاخیر فیصلہ کیا اسی رات کے پراسرار اندھیروں میں
میں نے الکندہ سے ملاقات کی۔ میں جانتا تھا کہ میرے اس فرار کے منصوبے کو کامیاب بنانے
میں الکندہ ہی میری مدد کر سکتی ہے۔ جب میں نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تو ایک
بار تو اس کا بھی رنگ اڑ گیا۔ اسے ہرگز ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ عظیم مندر کا کاہن اعظم
ایک مرتد اور شاہی اسیر رقاصہ کی خاطر دیوی دیوتاؤں کی منشا کے خلاف اتنا بڑا قدم بھی اٹھا
سکتا ہے۔ وہ میرے مقدس حجلہ خصوصی میں میرے سامنے چوکی پر بیٹھی مجھے پھٹی پھٹی
آنکھوں سے تک رہی تھی۔ میں اپنی مسند سے اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ میں نے
صرف اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"الکندہ! محبت کا جذبہ دیوی دیوتاؤں کی عظمتوں سے بھی بلند ہوتا ہے۔ کل تک میں
تمہارا رازدار تھا۔ آج میں نے تمہارے آگے دل کی کتاب کھول دی ہے۔ میں اپنے دل کے
ہاتھوں مجبور ہو گیا ہوں شاید اس لئے کہ میں کاہن اعظم ہوتے ہوئے بھی ایک انسان ہوں۔
اب تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ جس طرح تم نے ایک بار روکاش کو موگاش کے ساتھ
فرار ہونے میں مدد دی تھی اسی طرح میری بھی مدد کرو۔ کیا تم تیار ہو؟"

الکندہ کی حیرت فرو ہو چکی تھی اور اس میں اندر کی خطر پسند اور مہم جو عورت بیدار ہو
گئی تھی۔ اس نے تین بار میرے آگے تعظیم کی اور بولی۔

"دیوتاؤں کے جاہ و چشم کے وارث کاہن اعظم اس وقت میری عزیز ترین سہیلی روکاش کو تمہاری محبت کی ضرورت ہے۔ میں تم دونوں کے لئے دیوتا بعل کی دہکتی آگ میں بھی کودنے کو تیار ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ میں کس طرح تمہارے لئے مددگار ثابت ہو سکتی ہوں۔"

میں بڑا خوش ہوا۔ میں نے الکندہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں لے کر شفقت آمیز لہجے میں کہا۔"

"سنو! میں کسی بہانے ایک شاہی فرمان کے تحت رقاصہ روکاش کو اپنے مندر میں ایک رات کے لئے بلوا رہا ہوں۔ اس رات میں تمہیں موقع دوں گا کہ تم اسے اپنے ساتھ لے کر مندر کے خفیہ راستے سے باہر نکل جاؤ۔ شہر کی فصیل کے باہر دو تازہ دم گھوڑے تمہارے منتظر ہوں گے۔ تم روکاش کو لے کر یہاں سے سو کوس دور صحرا کے وسط میں منوچہر جھیل کے جنگل میں جا کر چھپ جاؤ اور جب تک میں نہ آؤں اسی جگہ چھپی رہو۔"

الکندہ کہنے لگی - "لیکن اے کاہن اعظم! مندر کے جس خفیہ راستے سے میں ایک بار روکاش اور اس کے محبوب کو نکال کر لے گئی تھی۔ اسے بادشاہ کے حکم سے پتھروں کی دیوار سے بند کروا دیا گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس مندر سے باہر نکلنے کا ایک دوسرا خفیہ راستہ بھی ہے جس کا صرف مجھے اور میرے نائب کاہن کو علم ہے۔ تم روکاش کو لے کر اس خفیہ راستے سے باہر نکلو گی۔"

الکندہ نے پوچھا۔ "کیا روکاش کو اس فرار کے منصوبے کا علم ہے؟"

"نہیں ابھی نہیں۔" میں نے کہا - "مگر جب میں اس رات روکاش کو تمہارے پاس روانہ کروں گا تو تم اسے سب کچھ بتا دو گی۔ یاد رکھنا، منوچہر جھیل کے آس پاس جو جنگل ہیں وہاں اینٹیں پکانے کے کچھ پرانے اور بے آباد بھٹے ہیں۔ تم ان میں سے کسی ایک بھٹے میں روکاش کو لے کر چھپو گی۔ میں موقع ملتے ہی یہاں سے فرار ہو کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

الکندہ نے سوال کیا کہ میں روکاش کو مندر کس بہانے بلواؤں گا؟"

میں نے اسے بتایا کہ اسے خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ ایک دن چھوڑ کر جب اوہنی دیوی کا مقدس دن طلوع ہوا تو میں مندر سے نکل کر صندل کے تخت پر بیٹھ کر غلاموں کے کاندھوں پر سوار شاہی محل کی طرف چل پڑا۔ پجاری گھوڑوں پر سوار میرے جلو میں تھے اور غلام سفید مورچھل اٹھائے مجھے ہوا دے رہے تھے۔ آگے آگے دیوداسیاں اشلوک پڑھتیں اور صندل و زعفران چھڑکتی جا رہی تھیں۔ بادشاہ کو پہلے سے اطلاع دی جا چکی تھی کہ میں

رسمی طور پر اس سے ملاقات کرنے آ رہا ہوں۔ جب میں اس جاہ و جلال کے ساتھ محل کے شاہی احاطے میں داخل ہوا تو بادشاہ سومر خود میرا خیر مقدم کرنے سونے چاندی کے مرصع دروازے پر آ گیا۔ مجھے سرکاری عزت و تکریم کے ساتھ مہمان خانے کے ہاتھی دانت کے بنے ہوئے تخت پر بٹھایا گیا جس کے اوپر جواہرات کی لڑیوں سے مزین چاندی کا چھتر تھا۔ بادشاہ نے سرد اور شیریں مشروب پیش کیا جس میں سفید گلاب کی پنکھڑیاں تیر رہی تھیں۔ پھر اس نے مجھ سے تشریف آوری کی وجہ دریافت کی تو میں نے گردن بلند کرتے ہوئے کاہن اعظم کے بھرپور وقار سے کہا۔

"سرزمین سندھ کے مہر عالم تاب بادشاہ عالی قدر! میں اس وقت دیوی اشتر اور دیوتا بعل کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے تمہارے پاس آیا ہوں۔"

بادشاہ نے بڑی نیاز مندی سے پوچھا کہ دیوی اشتر اور دیوتا بعل کا کیا حکم ہے؟ میں نے پہلے سے بھی زیادہ باوقار اور بارعب آواز میں کہا۔

"اے بادشاہ! کل دیویوں کی دیوی اوہنی کا مقدس دن ہے۔ اس دن کے تقدس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دیوی اشتر اور دیوتا بعل نے میری وساطت سے تمہیں حکم دیا ہے کہ گردن زدنی رقاصہ روکاش کو کل کے مقدس دن رات ان کے حضور رکھا جائے تاکہ اس سے پہلے کہ یہ مرتد مجرمہ دوزخ کے شعلوں کے سپرد ہو دیوی دیوتا ساری رات اس کے منحوس جسم پر لعنت ملامت بھیج سکیں۔ اس لئے کہ اگر اس کے واصل جہنم ہونے میں کوئی کسر باقی رہ گئی ہو تو وہ بھی پوری ہو جائے۔"

بادشاہ ایک لمحے کے لئے کچھ بے چین سا ہوا۔ میں نے فوراً ہی دوسرا وار کر دیا۔

"اور دیوی اشتر اور دیوتا بعل نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر ان کے حکم پر عمل کیا گیا تو بادشاہ اپنے ملک پر ہمیشہ شادمانی و کامرانی سے حکومت کرتا رہے گا اور اگر ان کی حکم عدولی کی گئی تو اس شہر پر ناگہانی بلاؤں کا نزول شروع ہو جائے گا۔"

بادشاہ نے فوراً بڑی تکریم و سپاس گزاری سے کہا۔

"میری کیا مجال ہے کہ میں دیوی دیوتا کی حکم عدولی کروں لیکن میں چاہوں گا کہ روکاش رقاصہ کو پابہ زنجیر رکھا جائے کیوں کہ وہ اب میری نہیں بلکہ میری رعایا کی مجرمہ ہے اور وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے شہر کے چوراہے پر قتل ہوتے دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اب یہ عورت عوام کی امانت ہے۔ میں چاہوں گا اس کی زبردست انتظامات کے تحت حفاظت کروں۔"

میں جانتا تھا کہ بادشاہ یہ سب کچھ رعایا کی خوشنودی طبع کے لئے نہیں بلکہ اپنی سلطنت

کو بغاوت کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لئے کر رہا ہے۔ میں نے کہا۔

"مجرمہ روکاش مقدس مندر کے دروازے تک پا بہ زنجیر ہو کر جائے گی مگر مندر میں دیوتا بعل اور دیوی اشتر کے حضور اس کی زنجیریں کھول دی جائیں گی۔ پھر دیوی دیوتا خود اس کے ہاتھ پاؤں میں نظر نہ آنے والی زنجیریں پہنا دیں گے۔ اس لئے کہ معبد بعل میں کسی فانی انسان کا دنیاوی زنجیروں میں بندھ کر چلے آنا ان کی توہین ہے۔"

بادشاہ لاجواب ہو گیا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب واپس لوٹا۔ میں نے رات الکندہ کو اپنی پہلی کامیابی سے آگاہ کر دیا۔ دن چڑھا تو میں نے اپنے مخبر خاص کو حکم دیا کہ وہ آدھی رات کو مندر کے خفیہ دروازے کے باہر فصیل شہر کے مشرقی کنارے پر دو تازہ دم گھوڑوں کو باندھ کر آ جائے اور ان پر کھانے پینے کا ایک ماہ کا سامان بھی لاد دیا جائے۔ ان کاموں سے فارغ ہوتے ہوئے شام ہو گئی۔ میں نے مقدس اوہنی کے متبرک جشن کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مندر کی فضائیں جھاڑ فانوس کی روشنیوں سے جگمگا اٹھیں۔ ستونوں کے پاس رکھی چاندی کی سانگریوں میں عود و لوبان سلگنے لگے۔ دیوداسیوں نے دیوی اوہنی کی مقدس رات میں رقص کے لئے آراستہ ہونا شروع کر دیا۔ پجاریوں اور دیوداسیوں میں سرگوشیاں بھی ہو رہی تھیں۔ اس لئے کہ آج رات ان کی دیرینہ ساتھی اور شاہی رقاصہ مظلوم روکاش آنے والی تھی جس کا سر ایک دو روز میں قلم کیا جانے والا تھا۔ میں نے مقدس ریشمی لباس پہن کر اپنے کپڑوں کو عطر خاص میں بسایا اور سونے کے تخت پر دیوی اشتر اور دیوتا بعل کے سامنے چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا۔ میرے دل سے ان بتوں کی مصنوعی اور خود ساختہ ہیبت کا اثر زائل ہو چکا تھا اور میں کاہن اعظم کی نفسیات سے آزاد ہو کر مصر کے شاہی خاندان فراعنہ کے ایک فرد کی حیثیت سے آزاد ہو چکا تھا۔ مصر میں بھی میرا دل کبھی بتوں کی پوجا کی طرف مائل نہیں ہوا تھا۔ میں ان بتوں کو محض پتھر اور لوہا پیتل سمجھتا تھا اور ان کی دعاؤں اور بددعاؤں کو بے اثر جانتا تھا۔ میں ہمیشہ سے مظاہر فطرت کا پرستار رہا تھا اور ان ہی میں خدائے واحد کی حاکمیت و جبروت کا نظارہ کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں تاریخ کے ادوار میں عہد بہ عہد سفر کرتا ہوا عباسی خلفا کے دور میں پہنچا تو قرآن کی حقانیت اور نبی آخرالزماں ﷺ کی تعلیمات پر ایمان لاتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا اور توحید پرستی کا شعار اختیار کیا۔ اس وقت دیوتا بعل اور دیوی اشتر کے بتوں کے آگے استھان پر بیٹھا میں حقارت سے ان بتوں کو دیکھ رہا تھا۔ اگر کوئی جذبہ میرے دل میں اس خیال سے بار بار دھڑک اٹھتا کہ آج رات نازک ادا روکاش موت کے منہ سے نکل کر ہمیشہ کے لئے میری ہو جائے گی اور میں اس کی زندگی کے آخری سانس تک اس سے محبت کرتا رہوں گا۔

معبد بعل میں میری وہ تاریخی رات تھی۔ دیوی اوہنی کی پوجا شروع ہو گئی۔ پجاری بھجن گانے لگے۔ ڈھول سنکھ اور نفیریاں بجنے لگیں۔ دیوداسیوں نے رقص شروع کر دیا۔ دیوی اوہنی کے پتلے کو دیوتا بعل کے قدموں میں سجا دیا گیا جس کو اس کی بیٹی کہا جاتا تھا۔ یہ جشن پوجا رات کے پہلے پہر تک جاری رہا۔ پھر شور بلند ہوا کہ بادشاہ نے پانچ سو تلوار بردار شاہی سپاہیوں کی معیت میں مجرمہ روکاش کو بھیجا ہے اور شاہی دستہ مندر کے دروازے پر کاہن اعظم کا منتظر ہے۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں سونے کے تخت سے اتر آیا۔ میرا نائب کاہن میرے ساتھ ساتھ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نے روکاش کو دیوی دیوتاؤں کے حضور رات بھر لعنت ملامت کے لئے کیوں بلایا ہے لیکن وہ خاموش تھا۔ وہ ایک راسخ العقیدہ بت پرست کافر تھا اور میری رہبانیت پر اسے مکمل اعتماد تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ یہ دیوتاؤں کا حکم ہے تو اس نے سر جھکا دیا۔ ہم مندر کے بڑے دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ رقاصہ روکاش پتھر کے فرش پر زنجیروں میں جکڑی کھڑی بے بسی کے عالم میں تک رہی ہے اور اس کے گرد نصف دائرے میں شاہی سپاہی تلواریں سونتے گھوڑوں پر سوار ہیں۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو میں نے محسوس کیا کہ رقاصہ روکاش کے خشک ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اسے اس کی بے کسی کی حالت میں دیکھ کر میرے دل کو سخت صدمہ ہوا لیکن میں نے اپنے احساسات کو اپنے چہرے سے عیاں نہ ہونے دیا۔ میں نے مصنوعی نفرت و حقارت کی بھرپور نگاہ روکاش پر ڈالی اور شاہی دستے کے سالار سے کہا کہ اس بدنصیب مجرمہ کی زنجیریں کھول دی جائیں جیسا کہ بادشاہ کا حکم ہے۔ کیوں کہ وہ مندر میں زنجیریں پہن کر داخل نہیں ہو سکتی۔ اس کی حفاظت کی ذمے داری دیوی اشتر اور دیوتا بعل پر عائد ہوتی ہے اس لئے کہ یہ ان ہی کی مجرمہ ہے۔ سپاہیوں اور دستے کے سالار کو بھی بادشاہ کا یہی حکم تھا کہ قیدی عورت کی زنجیریں مندر میں داخل ہونے سے پہلے کھول دی جائیں اور صبح ہونے تک مندر کے تمام دروازوں اور چھتوں پر ننگی تلواریں ہاتھوں میں لے کر سخت پہرہ دیا جائے۔ سالار نے اشارہ کیا۔ دو سپاہیوں نے آگے بڑھ کر روکاش کے جسم سے زنجیریں اتار دیں۔ میں نے غصیلی آواز میں اپنے نائب کاہن کو حکم دیا۔

"اس ناپاک اور دیوتاؤں کی درگاہ سے روندی گئی عورت کو مقدس بعل کے آگے جا کر لٹا دیا جائے تاکہ دیوی دیوتا اس پر رات بھر اپنی بددعائیں اور ملامتیں نازل کرتے رہیں۔ انہوں نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ رقاصہ روکاش کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے کہہ رہی ہو کہ مقدس عاطون! مجھے کم از کم تم سے اس سلوک کی امید نہیں تھی۔ میں تیزی سے مندر

میں واپس آ کر استھان کے تخت پر بیٹھ گیا۔ نائب کاہن نے دوسرے پجاریوں کی مدد سے روکاش کو اٹھایا اور اسے میرے پاس ہی بعل دیوتا کے بت کے آگے چبوترے پر سیدھا لٹا دیا۔ ساری دیوداسیاں ساکت کھڑی اپنی دیرینہ ساتھی کو چشم پرنم سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کی سہیلی روکاش نے محبت کی ہے اور کوئی جرم نہیں کیا۔ ان کے اپنے دلوں میں خدا جانے کن کن نوجوانوں کی محبتوں کے ممنوعہ شجر اپنی پھولوں بھری شاخ سے لہرا رہے تھے لیکن وہ اس شجر ممنوعہ کا پھل کھانے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی انہیں ہاتھ نہیں لگا رہی تھیں لیکن رقاصہ روکاش نے آگے بڑھ کر اس پھول کو توڑ کر کھا لیا تھا اور اب وہ اس مقدس بغاوت کے جرم کی پاداش میں اپنا سر قلم کروا رہی تھی۔ میری آنکھیں بند تھیں اور اب میں یوں ہی بے دلی سے اشلوک پڑھ رہا تھا۔ ایک بار میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو رقاصہ روکاش آنسو بھری آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں جذبہ عشق سے لرز اٹھا۔

رات گذرتی جا رہی تھی۔ پجاری اور دیوداسیاں ایک ایک کر کے اپنی اپنی کوٹھریوں کی طرف جا رہی تھیں۔ استھان کے چبوترے پر روکاش اسی طرح چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے سر اور پاؤں کی جانب انسانی کھوپڑیوں پر دو سرخ موم بتیاں روشن کر دی گئی تھیں جن کے شعلے خون کے رنگ جیسے تھے۔ مندر کی دیومالا کے اعتبار سے یہ ملامت اور عذاب آخرت کے شعلے تھے۔ میری دائیں جانب نائب کاہن بیٹھا دیوی دیوتا کی خوشنودی کے لئے اشلوک پڑھ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے کسی طرح چلا جائے تا کہ میں روکاش پر حقیقت حال واضح کر کے اس کی پریشانیوں کو دور کر سکوں۔ مگر وہ اس انہماک سے اشلوک پڑھ رہا تھا کہ میں اسے وہاں سے چلے جانے کے لئے نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نائب کاہن کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے رقاصہ روکاش کی طرف نظریں اٹھائیں اور اس کی جانب دیکھ کر مسکرایا۔ روکاش کو میری مسکراہٹ پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ یوں بار بار اپنی بھیگی ہوئی پلکیں جھپکنے لگی جیسے کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ میں ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی مجھے مسکراتا ہوا نہ دیکھ لے۔ لیکن وہاں اس وقت سوائے نائب کاہن کے اور کوئی نہیں تھا اور نائب کاہن آنکھیں بند کئے اشلوک پڑھ رہا تھا۔ اس کی کرخت آواز میرے کانوں میں چھید کر رہی تھی۔ میں دوسری بار پھر روکاش کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور ایک ہاتھ کو ذرا سا اوپر اٹھا کر پھیلایا اور پھر اپنے دل پر رکھ دیا۔ گویا میں اسے اشاروں ہی اشاروں میں کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی فکر نہ کرے۔ کوئی غم نہ کرے۔ میں اس کے ساتھ ہوں لیکن روکاش کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو موت کی دہلیز پر کھڑی تھی اور کل یا پرسوں

بھرے چوک میں اس کا سر قلم ہونے والا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ میں اس کی جان بچانے والا ہوں۔

رات آدھی سی زیادہ گذر گئی تو میرے عمل کا وقت آ گیا۔ میں نے پوری آنکھیں کھول کر اپنے نائب کاہن کی طرف دیکھا اور جلال بھری آواز میں کہا۔ "اس ناپاک عورت کو یہاں سے لے جا کر میرے ساتھ والی کوٹھری میں بند کر دو۔ دیوی اشتر اور دیوتا بعل نے ابھی ابھی مجھے میرے مراقبے میں آ کر حکم دیا ہے کہ وہ اس عورت کے وجود کو اب زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے اسے یہاں سے اٹھا کر کسی کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔"

نائب کاہن بڑا مطیع اور ثابت قدم مرید تھا۔ میرے حکم پر فوراً ایمان لے آیا اور بدنصیب روکاش کے پاؤں کی طرف کھڑے ہو کر ترش لہجے میں بولا۔

"اٹھو بدبخت عورت اور میرے ساتھ چلو۔ دیوتا بھی اب تمہاری صورت ایک پل کے لئے برداشت نہیں کر سکتے - چلو۔"

روکاش نے میری طرف دیکھا۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ وہ اٹھی اور نائب کاہن کے ساتھ میری کوٹھری کی طرف بوجھل قدموں سے چلنے لگی۔ جب میرا نائب روکاش کو میری ساتھ والی کوٹھری میں بند کر کے واپس آیا تو اس نے چابی میرے آگے رکھ دی اور سر جھکا کر بولا۔

"عظیم کاہن! دیوتاؤں کے حکم کی تعمیل کر دی گئی ہے۔"

میں نے نائب کاہن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"آج تم نے ایک ایسا کام کیا ہے کہ جس کے لئے میں اور تمام دیوتا تمہیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔"

نائب کاہن منہ کھولے میری طرف تکنے لگا۔ میں نے آج تک کبھی اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بات نہیں کی تھی۔ میں بھی فوراً سنبھل گیا۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا۔ "آج سے تم دیوتاؤں کے منظور نظر ہو گئے ہو اور تم بہت جلد میری جگہ لے لو گے۔ اسی لئے میں نے تمہارے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ میں تمہیں اس مقدس فرض کی بجا آوری کے لئے دیوی دیوتا کی جانب سے ہدیہ خوشنودی پیش کرتا ہوں۔"

نائب نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لئے اور تعظیم بجا لا کر بولا۔

"دیوتا آپ کی عمر دراز کریں۔ میں آپ کے زیر سایہ رہ کر دیوتاؤں کی خدمت کرنے کو ہی اپنے لئے باعث افتخار سمجھتا ہوں۔"

میرے پاس اس کی فضول باتوں کا جواب دینے کے لئے وقت نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ

میرے معتمد جاسوس نے دونوں گھوڑے شہر کی مشرقی فصیل کی جانب کھڑے کر دیئے ہوں گے اور الکندہ بھی اپنی کوٹھری میں میری راہ دیکھ رہی ہو گی۔ دوسری طرف وقت بھی گذرتا جا رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اب وہ اپنے حجرے میں جا کر آرام کر سکتا ہے۔ جب وہ جا چکا تو میں دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی جائے رہائش سے ملحقہ کوٹھری میں آ گیا جہاں میری محبوبہ رقاصہ روکاش سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ طاق میں دیا جل رہا تھا۔ میں کوٹھری میں داخل ہوا تو روکاش نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ وہ پہلے سے کمزور ہو گئی تھی۔ اس کے رخساروں کے شعلے زرد پڑنے لگے تھے اور آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ میری طرف ٹکٹکی باندھے تک رہی تھی جیسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے اس کوٹھری میں کیوں پہنچایا گیا ہے اور میں اکیلا اس کے پاس کیوں آیا ہوں۔ کیا میں بدل گیا ہوں؟ کیا میں اب بھی اس سے ہمدردی رکھتا ہوں؟ اس کو تو کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا ہو گا کہ میں اس سے ٹوٹ کر پیار کرتا ہوں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ باندھ کر کہنے لگی۔

"عظیم کاہن! مجھے معافی نہیں ملے گی؟ مجھے قتل ہونے سے بچا لو۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ تم مقدس..."

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آگے کچھ نہ کہنا روکاش۔ میں جانتا ہوں تم مجھے کس القاب سے پکارنے والی ہو۔ مگر میں تمہیں یہ کہنے آیا ہوں کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔"

وہ حیرت اور خوشی سے میری باتیں سن رہی تھی۔ لگتا تھا کہ میری باتوں پر اسے یقین بھی آ رہا ہے اور نہیں بھی آ رہا۔

میرے ضبط کا بند ٹوٹ گیا تھا۔ محبت کے انمول ہیجان خیز الفاظ نہ جانے کہاں سے آ کر میری زبان سے ادا ہو رہے تھے۔ جب میں نے روکاش کو بتایا کہ میں اسے وہاں سے فرار کروا رہا ہوں اور اس کی سہیلی الکندہ اپنی کوٹھری میں اس کی راہ دیکھ رہی ہے تو وہ میرے قدموں پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا۔

"تمہاری جگہ میرے قدموں میں نہیں۔ میرے دل میں ہے۔ روکاش اب جلدی سے میرے ساتھ الکندہ کی کوٹھری میں چلو۔"

میں اسے لے کر الکندہ کی کوٹھری میں آ گیا۔ وہ بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ دونوں پرانی سہیلیاں ایک دوسری کے گلے لگ کر ملیں۔ اور آنسو بہانے لگیں۔ میں نے اتنی دیر میں راہ داری میں جا کر دیکھا کہ وہاں کوئی پہرے دار تو نہیں چل پھر رہا۔ راہ داری

سنسان تھی۔ اب میں نے الکندہ اور روکاش کو ساتھ لیا اور تاریک شہ نشینوں اور راہ داریوں سے نکل کر مندر کے تہ خانے کی ایک خفیہ سرنگ میں آ گیا۔ یہ خفیہ راستہ اسی لئے بنایا گیا تھا کہ اگر کبھی ملک دشمن قبضہ کر لے تو مندر کا کاہن اپنی پسندیدہ دیوداسی کے ساتھ شہر سے فرار ہو سکے۔ تعجب کی بات تھی کہ اس وقت بھی مندر کا کاہن اعظم اپنی پسندیدہ دیوداسی کے ساتھ فرار ہو رہا تھا۔

سرنگ تنگ و تاریک تھی۔ میں نے ایک شمع جلا کر الکندہ کو دی اور کہا۔ "میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے' پیچھے جو ہو گا میں سنبھال لوں گا۔ اب تم جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔ یہ سرنگ تمہیں فصیل شہر کے مشرقی جانب لے جائے گی۔ وہاں تمہیں دو گھوڑے تیار ملیں گے اور کھانے پینے کا سامان بھی ان پر موجود ہو گا۔ میں بہت جلد تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ تم منوچہر جھیل کے جنگل میں چھپی رہنا۔

روکاش کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ جلاد کی تلوار کے نیچے سے نکل کر محبت بھری زندگی سے دوبارہ ہم آغوش ہو رہی ہے۔ میں نے اس کے کان کے پاس ہونٹ لے جا کر کہا۔ "فکر نہ کرنا میں تمہارے پاس بہت جلد پہنچ جاؤں گا اور پھر ہم کسی دوسرے ملک میں چلے جائیں گے اور ہنسی خوشی زندگی بسر کریں گے۔" روکاش کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک رہے تھے۔ شمع کی روشنی میں یہ آنسو ہیرے لگ رہے تھے۔ وہ مسکرائی۔ ایک مدت کے بعد میں نے اپنی محبت کی دنیا کو مسکراتے دیکھا تھا۔ میں اس مسکراہٹ کو روکاش کی طرف سے اعتراف محبت ہی سمجھ سکتا تھا۔ میرا دل روکاش کی محبت اور اس کے لئے اپنی جان تک قربان کر دینے کے جذبے سے لبریز ہو گیا۔ میں نے اسے رخصت کر دیا۔ بھلا اس وقت کبھی مجھے یہ خیال آ سکتا تھا کہ میں اپنی محبوبہ کو آخری بار دیکھ رہا ہوں؟ نہیں۔ یہ ناقابل یقین خیال میرے ذہن کے قریب بھی نہیں بھٹک سکتا تھا مگر ہونی ہو کر رہتی ہے۔ تاریخ کے ہزاروں سال کے ادوار میں عہد بہ عہد سفر کرتے ہوئے میں نے دوسرے تجربوں کے ساتھ یہ علم بھی سیکھا کہ کچھ رونما ہونے والے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ ہم انہیں اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود وقوع پذیر ہونے سے نہیں روک سکتے اور ہم ان سے بے خبر ہوتے ہیں۔ آپ اسے مقدرات کی ستم ظریفی کہیں گے مگر میرا ایمان ہے کہ کچھ واقعات ہماری محنت اور کوششوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان کے حسن و قبح پر ہمارا اختیار ہوتا ہے یعنی ہماری جدوجہد کے نتیجے میں ہی وہ اچھی یا بری شکل اختیار کرتے ہیں لیکن کچھ واقعات ہماری پیدائش سے پہلے ہی کائنات کی لوح مقدر پر ثبت ہوتے ہیں۔ یہ منشائے فطرت ہوتا ہے اور وہ اپنے وقت پر ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ مجھے معلوم ہی

نہیں تھا کہ لوح مقدر کے حروف مقسوم حرکت میں آ چکے ہیں اور گردش سیارگان نے ازل سے جو حکم دے دیا تھا۔ اس پر عمل شروع ہونے ہی والا ہے۔

میں نے بھیگتی پلکوں سے اپنی محبوبہ کو رخصت کیا اور سرنگ کے دروازے کو بند کر کے واپس ہوا۔ میں اندھیری راہ داریوں سے چھپ کر گزرتا اپنی کوٹھری میں آ کر بستر پر گر پڑا۔ میرا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے اپنی محبوبہ' اپنی زندگی کو موت سے آزاد کر کے ہمیشہ کے لئے اپنا لیا تھا۔ اس سے بڑھ کر میرے لئے مسرت کا اور کونسا مقام ہو سکتا تھا۔ میں آئندہ کے لائحہ عمل پر غور و فکر کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ صبح جب دیوتا بعل کی مرتد مجرمہ روکاش کے فرار کی خبر مندر' شاہی محلات اور سارے شہر میں پھیل جائے گی تو کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس کے فرار کا الزام کاہن اعظم پر لگایا جائے گا۔ کیوں کہ وہ میری حفاظت میں دی گئی تھی۔ وہ شاہی مجرمہ تھی۔ اسے بادشاہ کی طرف سے موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ ایک روز بعد شہر کے چوک میں ہزاروں لوگوں کے سامنے اس کا سر قلم کیا جانے والا تھا۔ یہ ایک قیامت خیز حادثہ تھا اور میں نے ان حالات سے نمٹنے کے لئے اپنی سب سے بڑی طاقت سے کام لینے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

میں نے باقی ساری رات جاگ کر گزار دی۔

دن چڑھا تو بادشاہ کی طرف سے متعین شاہی گارڈز کے دستے کا سالار شاہی مجرمہ کو وصول کر کے پابہ زنجیر لے جانے کے واسطے مندر میں میرے پاس آیا تو میں اسے لے کر ساتھ والی کوٹھری میں لے گیا۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا پڑا تھا اور روکاش غائب تھی۔ میں نے مصنوعی حیرت د تعجب سے سپہ سالار کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ہم نے اسے اس کوٹھری میں بند کیا تھا۔" مندر میں شور مچ گیا تھا کہ روکاش فرار ہو گئی ہے۔ بادشاہ کو اس سانحے کا علم ہوا تو اسی وقت مندر میں آ گیا اور میری طرف شعلے برساتی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا روکاش کو بھگانے میں میرا ہی ہاتھ تھا۔ مگر میں مندر کا سب سے بڑا پجاری تھا۔ وہ میری شان میں کوئی نازیبا لفظ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے نائب کاہن کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ ہم نے شاہی مجرمہ کو کاہن اعظم عاطون کے حوالے کیا تھا کہ دیوی دیوتا اس پر اپنی بددعائیں بھیج سکیں لیکن وہ فرار ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ مندر کی ایک دیوداسی بھی غائب ہے۔ میں رموز سلطنت کے علاوہ رموز مذہبی کو بھی خوب جانتا ہوں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس گھناؤنے جرم کی سزا کیا ہو سکتی ہے؟؟"

اس سے پہلے کہ نائب کاہن کچھ بولے میں نے بڑے باوقار انداز میں اپنا چہرہ اٹھا کر

بادشاہ سومر کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اے بادشاہ میں جانتا ہوں دیوتا بعل کے عظیم مندر کے سب سے بڑے پجاری سے جب کسی مذہبی غفلت کا ارتکاب ہوتا ہے تو اس کا قتل واجب ہو جاتا ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اسے خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا پڑتا ہے۔"

بادشاہ نے اپنی آواز کی غراہٹ اور کڑک کو دباتے ہوئے کہا۔

"پھر تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟ اے..... عظیم کاہن عاطون!"

میں نے اسی شان سے جواب دیا۔

"میں دیوتاؤں کی مرضی کا پالن کروں گا۔ میں زہر کھا کر اپنی زندگی کا اپنے ہاتھوں خاتمہ کرنے کو تیار ہوں۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ مجھے شاہی مطب خاص سے خطرناک ترین زہر فراہم کیا جائے۔"

اس وقت میرے سامنے مندر کے تمام پجاری' دیوداسیاں اور اہل کار کھڑے تھے۔ میرے فیصلے پر سبھی دم بخود ہو کر رہ گئے۔ بادشاہ کو یقیناً بڑی خوشی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ اس خوشی سے چمک اٹھا تھا کیوں کہ شاید وہ جان گیا تھا کہ یہ میری سازش تھی اور میں نے اپنی محبت کی وجہ سے اس کی محبوبہ دل نواز کو فرار کروا دیا تھا اور وہ یہ کبھی گوارہ نہیں کر سکتا تھا کہ روکاش اگر قتل نہیں ہوتی تو میری تحویل میں آ جائے۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ شاہی مطب سے وہ زہر ہلاہل لایا جائے جس کے پینے سے ایک سیکنڈ کے اندر اندر موت واقع ہو جاتی ہے۔ میں نے بادشاہ سے کہا۔

"مجھے اجازت دی جائے کہ مرنے سے پہلے میں دیوتاؤں کے حضور اپنی آخری عبادات سرانجام دے سکوں۔"

بادشاہ نے پہلی بار مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اجازت ہے۔"

میں سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر بچھے ہوئے سونے کے تخت پر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے جھوٹ موٹ اشلوک بڑبڑانے لگا۔ میری منشا ان لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر کے روکاش اور الکندہ کو موہنجوڈرو سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانے کا موقع دینا تھا۔ مجھے خبر ہی نہیں تھی کہ روکاش کے غائب ہو جانے کی خبر سنتے ہی بادشاہ نے اپنے جانباز سپاہیوں کو اس کی تلاش میں چاروں طرف دوڑا دیا تھا۔

میں استھان پر بیٹھا اشلوک پڑھ رہا تھا۔ بادشاہ نائب کاہن دیوداسیاں اور پجاری خاموش کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیوداسیوں کی آنکھوں میں میرے لئے آنسو تھے۔ برق رفتاری شاہی گھڑسوار زہر ہلاہل کا سفوف لے کر آ گیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ بادشاہ

کے حکم سے سونے کے ایک پیالے میں چار گھونٹ پانی ڈال کر میرے سامنے رکھ دیا گیا۔ ساتھ ہی چمڑے کی وہ کپی بھی رکھ دی گئی جس میں زہر کا سفوف بھرا ہوا تھا۔ یہ بڑا خطرناک زہر تھا اور بادشاہ نے اپنے ان سازشی غداروں کو دینے کے لئے رکھا ہوا تھا جنہیں وہ آن واحد میں ہلاک کرنا چاہتا ہو۔ میں نے کپی کو کھول کر زہر کا سارا سفوف پانی میں ڈال دیا۔ بادشاہ نے کہا۔ "کاہن اعظم کے لئے اس زہر کی ایک چٹکی ہی کافی تھی۔"

"اے شہنشاہ! میں اپنی موت میں تھوڑی سی بھی کسر نہیں چھوڑنا چاہتا۔ میں یہ سارا زہر پیوں گا۔" میں نے کہا۔

میں نے آنکھیں بند کر کے یوں ہی کچھ اشلوک پڑھے اور پھر زہر بھرا پیالہ اٹھا لیا۔ میں نے دیکھا کہ دیوداسیاں اور پجاری پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے تک رہے تھے۔ مجھے ایک دیوداسی کی دھیمی سی سسکی بھی سنائی دی۔ میں نے ان سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دیوتا تمہارے نگہبان ہوں۔ میں نے جس طرح مذہبی قوانین کا پالن کیا ہے تم بھی انہیں اسی طرح نبھانا۔"

اور سب کی آنکھوں کے سامنے میں نے پیالہ منہ سے لگایا اور سارا زہر فٹافٹ کر کے پی گیا۔ وہ مجھے سخت کڑوا لگا۔ اب میں جب کہ آپ کے شہر کراچی میں اپنے دور افتادہ کاٹج میں ساحل سمندر کے پاس اکیلا بیٹھا اپنی داستان لکھ رہا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ اس وقت مجھے خیال آیا تھا کہ پہلی بار جب مجھے فرعون مصر نے کھانے میں زہر دیا تھا تو میں بچ گیا تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ مقدس آواز نے مجھے موت سے آزاد ہونے کی خبر بھی دی ہوئی ہے اور میری آنکھوں کے سامنے میری پیاری بیوی بوڑھی ہو کر مر گئی تھی اور میں زندہ رہا تھا لیکن کیا معلوم اس بار یہ خطرناک زہر کام کر جائے اور میں سچ مچ مر جاؤں۔ یہ سوچ کر ایک پل کے لئے میرے جسم پر کچھ گھبراہٹ سی طاری ہو گئی تھی مگر جب میں نے محسوس کیا کہ زبان اور حلق سے نیچے اترنے کے بعد زہر نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی تھی اور میری انتڑیوں میں کسی قسم کا درد نہیں ہوا تھا تو میں بہت حد تک مطمئن ہو گیا۔

میں پوری اداکاری کر رہا تھا۔ میں نے زہر پینے کے بعد ایک ایک کو نظر بھر کر الوداعی انداز میں دیکھا۔ دونوں ہاتھ بلند کر کے جوڑے اور یوں ظاہر کیا جیسے میرا گلا بند ہو گیا ہے اور میں آواز نہیں نکال سکتا۔ پھر میں نے وہیں سونے کے تخت پر چت لیٹ گیا۔ میں نے جان بوجھ کر ایک جھرجھری سی لی اور آنکھیں بند کر کے جسم کو ساکت کر لیا۔ اپنی سانس روک لی اور دل کی دھڑکن کو کچھ دیر کے لئے موقوف کر دیا۔ بادشاہ نے خصوصی اہلکاروں اور امراء کے ساتھ میری طرف آیا۔ پھر مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

"دیوتاؤں کی خواہش پوری ہو گئی۔ دیوی اشتر اور دیوتا بعل کے نام کا بول بالا ہوا۔ کاہن عاطون مر چکا ہے اور اس کی لاش کو مندر کے قبرستان میں رسوم کے مطابق دفن کر دیا جائے۔"

بادشاہ اپنے امراء اور اہل کاروں کے ساتھ واپس چلا گیا۔ میں نے اپنی پلکوں کی باریک سی جھریوں میں سے دیکھا کہ دیوداسیاں ہتھیلیوں میں منہ چھپائے سسکیاں بھر رہی تھیں۔ پجاری لڑکے سر جھکائے اداس کھڑے تھے۔ مگر نائب کاہن پر میری موت کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ وہ خوش تھا کہ میری موت کے بعد اب اسے مندر کے سب سے بڑے کاہن بننے کا موقع فراہم ہو گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ بلند کر کے کہا۔

"عاطون نے دیوتاؤں کے احکام کی خلاف ورزی کی تھی۔ دیوتاؤں نے اسے غفلت اور قانون شکنی کی سزا دے دی ہے۔ خبردار! کوئی اس دیوتاؤں کے حقوق غصب کرنے والے کی لاش پر آنسو نہ بہائے۔ آج سے میں کاہن اعظم ہوں لیکن ہم اس غاصب کی مذہبی رسومات ضرور ادا کریں گے۔ کیوں کہ یہ ہمارا کاہن اعظم رہ چکا ہے۔ اس لئے میں حکم دیتا ہوں کہ اس کی لاش کو آج رات تمام مذہبی رسومات کے ساتھ مندر کے قبرستان میں زمین کے اندر اتار دیا جائے۔"

میں خاموش لیٹا اپنے نائب کی گوہر افشانیاں سنتا رہا۔ اس کے تو دن پھر گئے تھے۔ میرے ہوتے ہوئے تو وہ زندگی میں کبھی میرا منصب حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ میری موت نے اسے اس منصب جلیلہ پر فائز کر دیا تھا جس کے وہ خواب دیکھا کرتا تھا۔ میری لاش سارا دن مندر میں پڑی رہی۔ پجاری اور دیوداسیاں میری لاش پر پھول چڑھاتی اور اشلوک گاتی رہیں۔ میں دل ہی دل میں خدائے واحد سے صرف یہی دعا مانگ رہا تھا کہ اے بحر و بر اور تمام عالموں کے مالک! میری روکاش کو حفاظت سے منوچہر جھیل کی خفیہ کمین گاہ تک پہنچا دینا۔ جب رات کا اندھیرا چاروں طرف اتر آیا اور شہر میں اور شہر کی فصیل کی برجوں میں دروازوں کے اوپر فانوس اور مشعلیں روشن ہو گئیں تو میری لاش کو ارتھی پر ڈال دیا گیا۔ یوں میرا جنازہ رات کی تاریکی اور خاموشی میں روایتی تزک و احتشام کے بغیر خاموشی سے مندر کے باہر اور اس سے ملحق قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ قبرستان میں میری قبر پہلے ہی سے تیار کی جا چکی تھی۔ نائب کاہن اور اب کاہن اعظم نے مجھے اپنے سامنے قبر میں اتروایا اور اس بات کی پوری تسلی کر لی کہ میں قبر میں جا چکا ہوں۔ اس نے آخری بار بھی میرے منہ سے کفن کا کپڑا ہٹا کر میرے چہرے کو جھک کر دیکھا تھا۔ میرے اوپر قبر میں پتھروں کی چوڑی سلوں کی چھت ڈال کر قبر کو مٹی سے بھر دیا گیا۔ میں نے قبر میں بند ہوتے ہی آنکھیں کھول

دی تھیں اور اپنی قوت ارادی سے دل کی دھڑکنوں کو پھر سے جاری کردیا تھا۔ قبر کے اندر صرف میرا آدھا دھڑ ہی اٹھ کر بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے اپنے جسم کے اندرونی نظام کو دو تین بار سانس لے کر محسوس کیا۔ زہر نے کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ میں اسی طرح زندہ تھا۔ مقدس آواز نے ٹھیک کہا تھا۔ موت کو مجھ سے دور بہت دور کر دیا گیا تھا۔

میں چاہتا تھا کہ جب سب لوگ چلے جائیں اور قبرستان خالی ہو جائے تو میں قبر سے باہر نکلوں۔ کچھ دیر تک مجھے قبر کے اوپر لوگوں کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ جب مجھے پوری تسلی اور اطمینان ہو گیا کہ جو لوگ مجھے دفن کرنے آئے تھے وہ جا چکے ہیں تو میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنی ہتھیلیاں پتھریلی سلوں کی چھت کے ساتھ لگائیں اور سانس روک کر زور لگایا۔ میں اپنی ناقابل یقین اور زبردست طاقت پر حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔ اس وقت پتھر کی ان سلوں پر منوں مٹی کا بوجھ پڑا ہوا تھا لیکن میرے زور لگانے پر وہ سلیں اوپر اٹھنا شروع ہو گئیں اور ان کے کنکروں پر سے مٹی میرے اوپر گرنے لگی۔ پتھریلی سلوں کا چاک میری قبر سے اٹھ رہا تھا اور اس کی ہلکی ہلکی گڑگڑاہٹ کی آواز بھی مجھے سنائی دے رہی تھی۔ مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر اتفاق سے کوئی میرا عقیدت مند یا قبرستان کا کوئی گورکن میری قبر کے پاس کھڑا ہوا تو میرا راز فاش ہو جائے گا جو میں نہیں چاہتا تھا۔ قبر کی چھت اوپر ہی اوپر اٹھتی چلی جا رہی تھی۔ پھر میرے چہرے کو باہر کی تازہ ہوا لگی۔ پتھر کی سلوں کی چھت مٹی کے بہت بڑے تودے کو لے کر میری قبر کے گڑھے سے ایک فٹ اونچی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے ایک طرف ذرا سا ٹیڑھا کیا اور خود تیزی سے باہر نکل آیا اور تودے کو واپس اسی طرح قبر میں گرا دیا اور وہاں پھر سے اپنی قبر بنا دی تاکہ کسی کو شک نہ پڑے۔ اب میں قبر سے باہر قبرستان کی ٹھنڈی ہوا میں کھڑا تھا۔

زہر ہلاہل پینے کے بعد ایک بار پھر اپنے آپ کو زندہ پا کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی۔ خوش قسمتی سے اس وقت قبرستان میں کوئی نہیں تھا۔ گہری خاموشی اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں قبروں کے درمیان سے ہوتا اپنے کفن پر سے جو گیروے رنگ کے ایک لبادے کی صورت میں تھا اور جسے کاہن زندہ حالت میں بھی پہنا کرتے تھے جھاڑتا ہوا درختوں کی طرف چل پڑا۔ آگے قبرستان کا دروازہ تھا۔ میں نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ دروازہ بند تھا۔ آس پاس کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں دروازہ کھول کر قبرستان سے باہر نکل آیا۔ مجھے دور مندر کے کلس اور شاہی محل اور شہر کی فصیل پر جھلملاتی مشعلیں دکھائی دیں۔ اب شہر سے باہر نکلنے کا مرحلہ میرے سامنے تھا۔ میں شہر کے دروازے سے نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ وہاں رات کے سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ میں درختوں کے جھنڈوں سے ہوتا ہوا شہر کی فصیل کے پاس

ایک ایسی جگہ پر آ گیا۔ جہاں کھجور کے ایک بلند درخت کی شاخیں فصیل کے اوپر لٹک رہی تھیں۔ یہ جگہ شہر سے فرار ہونے کے لئے بڑی موزوں تھی۔ میں درخت پر چڑھ گیا اور پھر شاخوں سے لٹک کر فصیل کے کنگروں پر آ گیا۔ یہاں سے میں نے اندھیرے میں دوسری طرف جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی۔ میں اگرچہ سر کے بل جھاڑیوں میں گرا تھا۔ مگر میری تمام ہڈیاں سلامت رہیں۔ معمولی سی خراش بھی نہ آئی۔ آسمان چمکیلے ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ کسی جانب سے کوئی ہلکی سی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ آپ اس خاموشی کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو آج سے پانچ چھ ہزار برس پہلے آدھی رات کو قدیم شہروں کے قرب و جوار میں طاری ہوا کرتی تھی۔ اگر آپ کو آج کے پرشور اور ہنگامہ پرور کراچی شہر سے نکال کر ایک دم آج سے پانچ ہزار پہلے کی آدھی رات کی خاموش فضاؤں میں پہنچا دیا جائے تو یقیناً آپ خوف کے مارے بے ہوش ہو جائیں۔ اس عہد کی آدھی راتوں کے سناٹے دم بخود ہوا کرتے تھے۔ محسوس ہوتا تھا کہ خاموشی نے اپنا سانس روک لیا ہے اور انسان کو اپنے سانس کی آواز سے بھی ڈر آنے لگتا تھا۔ میری منزل اب موہنجودڑو سے میلوں دور منوچھر جھیل کے جنگل تھے اور میں یہ دشوار گزار راستہ تیزی سے طے کرنا چاہتا تھا جس کے لئے ایک برق رفتار گھوڑے کی اشد ضرورت تھی مگر گھوڑا میرے پاس نہیں تھا۔ میں چلتے چلتے اندھیری رات میں شہر سے کافی دور نکل آیا۔ ستاروں کی مدھم چمک میں مجھے صحرا میں ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے دور دور تک پھیلے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ منوچھر جھیل کے جنگلوں کی طرف جو راستہ جاتا تھا میں اس سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ ہڑپہ کی طرف جانے والے قافلوں کے راستوں سے ہٹ کر دس کوس کے فاصلے پر تھا لیکن جہاں سے یہ ریتلا راستہ صحرا کے ویرانے میں جاتا تھا وہ جگہ ابھی پونے دو سو کوس سے بھی کچھ زیادہ فاصلے پر تھی اور یہ راستہ میں گھوڑے کے بغیر طے نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک اور بات میں آپ کو اپنے بارے میں بتاتا چلوں کہ جب سے میرا جسم موت کے چنگل سے آزاد ہوا تھا میں بھوک اور پیاس سے بھی بے نیاز ہو گیا تھا۔ نہ مجھے بھوک محسوس ہوتی تھی نہ پیاس لگتی تھی نہ مجھ پر تھکاوٹ طاری ہوتی تھی۔ نہ میرے ناخن بڑھتے تھے اور نہ میرے بال بڑے ہوتے تھے مجھ پر کوئی بھی ایسی علامت باقی نہیں رہتی تھی جو میری عمر کے ارتقا کو ظاہر کرتی۔ گویا میں ایک جگہ آ کر ٹھہر گیا تھا۔ میری عمر ایک مقام پر ساکت کر دی گئی تھی۔ میں جوان اور صحت مند تھا اور کئی برسوں سے ایسا ہی چلا آ رہا تھا اور اس وقت بھی ویسا ہی ہوں جب کہ مجھے اس سرزمین پر زندہ رہتے ہوئے ساڑھے پانچ ہزار سال گزر چکے ہیں۔ مجھ پر نیند بھی طاری نہیں ہوتی تھی۔ ہاں میں اپنی مرضی سے کچھ کھا پی

سکتا تھا اور اگر دل چاہتا تو تھوڑی بہت نیند بھی کر لیتا تھا۔ آسمان پر ستاروں کی چمک ماند پڑنے لگی۔ پو پھٹ رہی تھی۔ رات ڈھل رہی تھی۔ دور مشرقی آسمان پر سفید گلاب کے بڑے پھول ایسا ستارہ صبح صحرا کی دم توڑتی رات کے کافوری اندھیرے میں بھڑک بھڑک کر جھلملا رہا تھا۔ پھر مشرقی افق سے سورج کا سرخ تھال ابھرنے لگا۔ صحرا میں گلابی روشنی پھیل گئی اور ریت کے ذرے چمک اٹھے۔ دن کا اجالا ہوتے ہی ایک اور مشکل میرے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ میں کاہن اعظم کے ریشمی لبادے میں تھا۔ شہر کے لوگ میری شکل سے بھی شناسا تھے۔ میں پہچانا جا سکتا تھا۔ اگرچہ میں اس فکر سے آزاد تھا کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہو گا۔ کیوں کہ ان سب کے لئے میں مر چکا تھا اور مجھے دفن بھر کر دیا گیا تھا لیکن اگر کوئی راہ گیر آتا جاتا مل گیا..... یا پیچھے سے آنے والا کوئی قافلہ میرے قریب پہنچا تو ہو سکتا ہے میں پہچان لیا جاؤں۔ اس طرح سے میں ایک نئی مشکل میں پھنس کر اپنی محبوبہ روکاش سی اور دور ہو سکتا تھا۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ سب سے پہلے تو میں اپنا لباس تبدیل کر کے جس قدر جلد ہو سکے اپنا حلیہ بدل لوں اور پھر کہیں سے کوئی گھوڑا حاصل کرنے کی کوشش کروں تا کہ یہ لمبی مسافت جلدی طے ہو سکے۔ جس صحرائی راستے سے ہٹ کر ریت کے ٹیلوں کے عقب سے ہوتا ہوا میں چلا جا رہا تھا۔ وہ قافلوں کی شاہراہ تھی اور آگے یا پیچھے سے آتا ہوا کوئی بھی قافلہ مجھے مل سکتا تھا۔ جس سے میں ہر حالت میں بچنا چاہتا تھا۔ اس زمانے میں قافلے عام طور پر منہ اندھیرے سے سفر پر روانہ ہوا کرتے تھے اور منہ اندھیرے ہی اپنی منزل پر پہنچا کرتے تھے۔ البتہ مصر اور عرب کے صحراؤں میں شدت کی گرمی اور تپش کی وجہ سے قافلے راتوں کو سفر کرتے تھے۔ رات کو صحرا کی ریت شبنم سے ٹھنڈی تھی اور فضا کافی خنک تھی مگر سورج کے نکلتے ہی ایکدم صحرا کی ریت گرم ہو گئی۔ شبنم بھاپ بن کر اڑ گئی اور صحرا تیز دھوپ میں گرم ہو کر شیش محل کی طرح جگمگا اٹھا۔

مجھے چلتے چلتے آدھا دن گزر گیا۔ نہ مجھے صحرا کی قیامت خیز تپش تنگ کر رہی تھی اور نہ پیاس لگ رہی تھی۔ نہ ہی مجھے کسی قسم کی تھکاوٹ محسوس ہوئی تھی۔ میری رفتار ایک عام انسان کے چلنے کی رفتار تھی اور میں جلد سے جلد اپنی محبوبہ روکاش کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اسی طرح سفر کرتا رہا تو شاید ایک مہینے کے بعد منوچہر جھیل کے جنگل میں پہنچ سکوں۔ اگر میرے پاس گھوڑا یا اونٹ ہوتا تو میں یہ فاصلہ دو تین دنوں میں طے کر سکتا تھا۔

دھوپ اس قدر تیز ہو گئی تھی کہ اب کسی قافلے کے مل جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اسی ادھیڑ بن میں چلا جا رہا تھا کہ مجھے سامنے کچھ فاصلے پر ایک انسانی ہیولہ

صحرائی راستے کے کنارے کنارے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ قریب آیا تو دیکھا کہ وہ ایک سپیرا تھا جو پسینے میں شرابور سر پر تنکوں کا چھاج رکھے چلا آ رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں اس کو اپنے کپڑے دے کر اس کے کپڑے پہن لوں۔ سپیرے نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ کہیں یہ مجھے پہچان نہ لے مگر اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ وہ شاید کسی دور دراز گاؤں کا رہنے والا تھا اور سانپوں کا تماشا دکھانے شہر جا رہا تھا۔ جب میں نے اس سے بات کی تو وہ بولا۔ تم مجھے کوئی امیر کبیر پجاری لگتے ہو۔ تم نے پجاریوں جیسے ریشمی کپڑے پہن رکھے ہیں۔ میں نے اسے کہا کہ وہ میرے کپڑے لے کر اپنے کپڑے مجھے دے دے۔ پہلے تو وہ اسے مذاق سمجھا مگر جب میں ن بہت اصرار کیا تو وہ راضی ہو گیا۔ میری کپڑے قیمتی تھے اور وہ انہیں بیچ کر پیسے کما سکتا تھا۔ ہم نے آپس میں لباس تبدیل کر لئے۔ وہ پجاری بن گیا اور میں سپیرا لیکن اس نے سانپوں کی پٹاری والا جھولا اپنے پاس ہی رکھا اور اس کی مجھے ضرورت بھی نہیں تھی۔ بین بھی اس کے پاس ہی رہی۔ اس نے مجھ سے بعد میں پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور اپنا لباس میں نے کیوں تبدیل کیا ہے؟ میں نے اس سے کہا کہ میں ایک پجاری ہوں اور شہر میں میرا مکان بھی ہے مگر اب میں دیوتاؤں کی عبادت غریب آدمی بن کر کرنا چاہتا ہوں۔ میں دولت اور مندروں کے چکر سے نکل کر ایک فقیر بن کر صحراؤں میں اپنا ٹھکانہ بنانا چاہتا ہوں۔ وہ کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا۔ وہ تو بار بار میرے ریشمی لبادے کو دیکھ رہا تھا جو اس نے پہن رکھا تھا۔ پھر وہ چلا گیا۔ میں بھی سپیرے کے بھیس میں اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے سر پر بڑا سا پگڑ بندھا تھا اور کمر میں کالی رسی لٹک رہی تھی۔ ایک نظر میں مجھے کوئی نہیں پہچان سکتا تھا۔ تپتے ہوئے صحرا میں میرا سفر جاری رہا۔ سپیرے نے ازراہ ہمدردی مجھے بتایا تھا کہ آگے راستے میں مجھے کوسوں دور تک پانی نہیں ملے گا اس لئے میں کسی قافلے کے ساتھ ہو لوں لیکن مجھے پانی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں سفر کرتا رہا۔ اسی طرح شام ہو گئی۔ سورج مغربی افق میں اتر گیا اور صحرا میں ایک بار پھر ٹھنڈ اتر آئی اور پھر آسمان ستاروں سے بھر گیا اور ان کی روشنی میں صحرا کی ریت کے ذرے چمکنے لگے۔ میں رکا نہیں چلتا گیا۔ اب ریت کے ٹیلے پیچھے رہ گئے تھے اور چھوٹی چھوٹی سنگلاخ ٹیکریوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ککروندے اور آک کی زہریلی جھاڑیاں اگی ہوئی مل جاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ ریت بھی سخت ہوتی گئی۔ اس ریت کی سختی نے مجھے حوصلہ دیا کہ میں ٹھیک سمت کو سفر کر رہا ہوں۔ اب میں قافلوں کے راستے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا تا کہ بھٹک جانے کا ذرا سا بھی امکان باقی نہ رہے۔ ویسے بھی میں اب سپیرے کے لباس میں تھا اور آسانی سے کوئی مجھے پہچان نہیں سکتا تھا۔

چلتے چلتے جب رات آدھی سے زیادہ بیت گئی اور دب اکبر کے برج کے ستارے مشرق کی طرف کافی جھک گئے تو میں نے سوچا تھوڑی دیر رک کر جانا چاہئے کہ شاید پیچھے سے آتا ہوا کوئی قافلہ مل جائے جو شہر سے میرے فرار ہونے کے بعد کارواں سرائے سے چلا ہو۔ میں ایک ٹیلے کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ میرا دل بے چین تھا اور میں اڑ کر اپنی محبوبہ روکاش کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن میرے پاس اس بے تاب خواہش کو پورا کرنے کے لئے کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ میں ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ مجھے صحرائی رات کی ساکت خاموشی میں گھنٹیوں کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ میرے وہم اور تخیل کی کارستانی ہے۔ کیوں کہ میں جانتا تھا کہ صحرا کی خاموشیاں اپنے اندر کئی اسرار لئے ہوئے ہیں اور کبھی کبھی رات کے سکوت میں ریت کے بھنور گہرے گڑھوں میں گرتے ہیں تو عجیب قسم کی پراسرار آسیبی آوازیں پیدا ہوتی ہیں لیکن گھنٹیوں کی آواز قریب آ رہی تھی۔ میں ٹیلے کی اوٹ سے نکل کر پیچھے دیکھنے لگا۔ مجھے نیم روشن رات میں ایک اونٹ آتا نظر آیا جس پر ایک آدمی سوار تھا۔ یہ اکیلا شتر سوار کون ہو سکتا ہے؟ یا تو کوئی ڈاکو ہے۔ یا سرکاری ہرکارہ ہے۔ میں نے اپنا چہرہ پگڑ کے پلو میں آنکھوں تک چھپا لیا۔ جیسے صحرا میں سفر کرنے والے مسافر اکثر کیا کرتے ہیں۔ شتر سوار میرے قریب آ گیا تھا۔ اب اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اس کے لباس سے اندازہ لگا لیا کہ یہ شاہی ہرکارہ نہیں ہے۔ اس نے دیوتاؤں کا نام لے کر مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں؟ مین نے اسے بتایا کہ مسافر ہوں۔ قافلے سے بچھڑ گیا ہوں۔ منوچہر جھیل کے علاقے میں رہتا ہوں۔ وہاں جانا چاہتا ہوں۔ شتر سوار نے کہا۔ میں ہڑپہ جا رہا ہوں۔ تمہیں راستے میں اتار دوں گا۔ اس نے مجھے اپنے اونٹ پر پیچھے بٹھا لیا وار روانہ ہو گیا۔ اونٹ کے گلے میں گھنٹیاں بندھی تھیں جو چلتے وقت راگنیاں بکھیر رہی تھیں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں صحرا میں سانپ پکڑنے آیا تھا؟ کیوں کہ میرا لباس سپیرے کا تھا۔ میں نے یوں ہی کہہ دیا کہ ہاں -- گاؤں سے سانپ پکڑنے ہی قافلے کے ساتھ نکلا تھا کہ ایک جگہ اتر کر ذرا دور چلا گیا۔ واپس آیا تو قافلہ جا چکا تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے قافلے کے ساتھ سفر کرتے ہوئے کبھی قافلے سے دور نہیں جانا چاہئے۔ میں نے اسے بہانہ بنا کر کہا کہ گاؤں میں میری والدہ گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ مجھے اس کی بہت فکر ہے - ذرا اونٹ کی رفتار تیز کر دو تو مہربانی ہو گی۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے اونٹ سے محبت کرتا ہے اور اسے کبھی نہیں دوڑاتا۔ لمبا سفر ہے۔ یہ اسی رفتار سے چلے گا۔ میں چپ ہو گیا۔ جب میں قبرستان سے چلا تھا تو میرے شاہی لبادے کی جیب میں سونے کے چند سکے تھے جو میں نے قصداً رکھ لئے تھے کہ راستے میں کام آئیں گے۔ میں نے جیب سے سونے کا ایک سکہ نکال کر اسے دیا

اور کہا کہ اگر وہ مجھے جلدی پہنچا دے گا تو میں اسی طرح کا ایک اور سونے کا سکہ دوں گا۔ یہ موہنجوداڑو کا سب سے قیمتی سکہ تھا اور اس زمانے میں اس سکے کے عوض ایک اونٹ خریدا جا سکتا تھا۔ شتر سوار بڑا خوش ہوا اور یہ کہہ اس نے اونٹ کو دوڑانا شروع کر دیا کہ تمہاری والدہ کے خیال سے رفتار تیز کئے دیتا ہوں ورنہ دولت کا مجھے اتنا لالچ نہیں ہے۔

اونٹ کی رفتار تیز ہونے سے سفر جلدی طے ہونے لگا۔ اسی رفتار سے دوڑتے ہوئے بھی ابھی دو دن کا سفر باقی تھا۔ رات ڈھل گئی صبح کا اجالا چاروں طرف پھیل گیا۔ چوں کہ ہم قافلے والی شاہراہ پر سفر کر رہے تھے اس لئے جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ ایک چھوٹا سا نخلستان آ گیا ہے جہاں کھجوروں کے ٹھنڈے جھنڈوں کے نیچے ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ شتر سوار نے یہاں اونٹ بٹھا دیا۔ ہم ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہوئے۔ میرے ہم سفر نے جھولے میں سے خشک مچھلی اور مکی کی روٹی نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ مجھے نہ بھوک تھی نہ پیاس۔ پھر بھی اس کا دل رکھنے اور اپنا بھوک پیاس نہ لگنے کا راز چھپانے کے خیال سے اس کے ساتھ کھانے لگا۔ سورج کے طلوع ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد انتہائی گرم لو چلنے لگی اور صحرا کی ریت اور ٹیلوں کی ڈھلانوں سے سینک اٹھنے لگا۔ نخلستان کی ٹھنڈی چھاؤں میں میرا ساتھی لمبی تان کر سو گیا۔ اونٹ لمبی گردن اٹھائے جگالی کر رہا تھا اور میں بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ میں بڑی آسانی سے اس آدمی کا اونٹ بھگا کر لے جا سکتا تھا لیکن یہ بددیانتی تھی مگر یقین کریں کہ میں اپنی محبوبہ روکاش سے ملنے کی تمنا میں یہ بددیانتی بھی کر گزرتا اگر مجھے اس بات کا خیال نہ ہوتا کہ اس جہنم کی تپش میں اونٹ دوڑتے دوڑتے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو سکتا ہے۔ ناچار مجھے شام ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔ شام ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے جب دھوپ کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور ریت کے ٹیلوں کے سائے لمبے ہو گئے تو ہم نے ایک بار پھر اپنا سفر شروع کر دیا۔ خدا خدا کر کے آخر وہ مقام آ گیا۔ جہاں سے مجھے منوچہر جھیل کے جنگل کی طرف جانے کے لئے الگ ہونا تھا۔ میں نے سونے کا دوسرا سکہ بھی اپنے محسن کو دے دیا اور اس کا شکریہ ادا کر کے صحرائی کارواں کے راستے سے ہٹ کر جھیل منوچہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ سارا دس کوس کا فاصلہ تھا اور میں تیز تیز چلا جا رہا تھا۔ ابھی سورج طلوع ہی ہوا تھا اور رات کی ٹھنڈک باقی تھی۔ میں ریت کے اونچے اور دور تک گئے ہوئے ٹیلے کے سائے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ راستہ میرا جانا پہچانا تھا۔ اس سے پہلے بھی دو ایک بار میں ہڑپہ کے کاہن اعظم کے ساتھ یہاں سے گزر چکا تھا۔ ٹیلہ ختم ہوا تو چھوٹی چھوٹی جنگلی جھاڑیوں اور سخت ریت کی ٹیکریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں تیز دھوپ میں بھی دن بھر سفر کرتا رہا اور جب دھوپ ڈھلنے لگی تو دور سے مجھے منوچہر جھیل کے جنگلوں کے جھنڈ دکھائی دیے۔

میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ ان جھنڈوں میں کسی جگہ میری روکاش بے چینی سے میری راہ دیکھ رہی ہو گی۔ میں دیوانہ وار دوڑنے لگا۔ ریت سخت تھی۔ میرے پاؤں اس میں دھنس نہیں رہے تھے مگر میری چمڑے کی جوتی ٹوٹ گئی۔ میں نے اسے ایک جھاڑی میں پھینک دیا اور ننگے پاؤں ہی دوڑنے لگا۔ نہ میرا سانس پھولا اور نہ میرے پاؤں میں چھالے پڑے اور میں منوچھر جھیل کے جنگل میں داخل ہو گیا۔ یہ کریٹر اور مختلف قسم کے کانٹے دار درختوں کا جنگل تھا۔ میرے قدم تیزی سے منوچھر جھیل کی طرف اٹھ رہے تھے۔ یہ جھیل گھنے درختوں والے جنگل کے بیچ میں کوسوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ جھیل پر پہنچ کر میں جنوب مشرق کی جانب ان ویران بھٹوں کی طرف آیا جہاں میں نے الکندہ کو روکاش کے ساتھ چھپنے کے لئے کہا تھا۔ یہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنائے گئے تین بھٹے تھے..... جہاں کسی زمانے میں مٹی کی ٹائیل نما اینٹوں کو پختہ کیا جاتا تھا مگر جھیل کے کنارے ایک بیماری پھیلنے کی وجہ سے ان بھٹوں میں کام کرنے والے مزدور بھاگ گئے اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ بھٹے کھنڈر بن گئے۔ ان کے اندر وہ زمین دوز بھٹیاں اب بھی تنگ گڑھوں اور سرنگوں کی شکل میں موجود تھیں جہاں کبھی آگ دہکائی جاتی تھی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ان تمام سرنگوں کو کھنگال ڈالا مگر الکندہ اور روکاش کہیں دکھائی نہ دیں۔ میں نے انہیں جگہ جگہ آوازیں دیں لیکن مجھے سوائے خاموشی کے کوئی جواب نہ ملا۔ میری حالت اس ہرن کی سی تھی جو اپنی ہرنی کی تلاش میں جنگل میں بھٹکتا پھر رہا ہو۔

کریٹر کے درختوں کی گھنی شاخوں میں سے دھوپ چھن چھن کر آ رہی تھی۔ میں نے ایک بھٹے کے کھوہ کے باہر گھوڑوں کے سموں کے نشان بھی دیکھے جو بھٹے کے کھوہ میں جا رہے تھے۔ کھوہ کے اندر گہرا اندھیرا تھا۔ میں ننگے پاؤں تھا۔ میرا ایک پاؤں اندھیرے میں کسی سخت چیز پر پڑا۔ میں اسے اٹھا کر کھوہ سے روشنی میں لے آیا۔ میرا دل اچھل کر حلق کے قریب آ گیا۔ یہ روکاش کا موتیوں کا ہار تھا جو اس روز اس نے اپنے گلے میں پہن رکھا تھا۔ جب میں نے اسے الکندہ کے ساتھ مندر سے فرار کروایا تھا۔ تو کیا روکاش؟ اس سے آگے میں نہ سوچ سکا۔ میں وہیں آ کر جھاڑی کے پاس بیٹھ گیا اور روکاش کے موتیوں کے ہار کی طرف تکنے لگا۔ یہ اس کے گلے کا ہار تھا اور اسے بادشاہ سومر کی دستہ خاص کے سپاہی گرفتار کر کے لے گئے تھے اور جاتے ہوئے اس نے میرے لئے یہ ہار وہاں گرا دیا تھا۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس وقت میں رقاصہ روکاش کی محبت میں اس قدر دیوانہ ہو رہا تھا کہ مجھے اپنی دنیا اندھیر ہوتی نظر آئی۔ میرا خون کھول اٹھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی مجھے موت سے ہمکنار نہیں کر سکتی۔ میں نے فیصلہ

کر لیا کہ میں --- موہنجوڈرو جاؤں گا اور بادشاہ سمیت سارے شاہی خاندان اور ساری فوج کو تباہ و برباد کر دوں گا اور اپنی محبوبہ کو نکال کر لے آؤں گا۔ میں نے گھوڑوں کے سموں کو غور سے دیکھا۔ ان کھروں کے نشانوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ گھوڑوں کو وہاں سے گذرے دو تین دن ہو گئے ہیں۔ یہ تازہ نشان نہیں تھے۔ جس کا صاف صاف مطلب یہ تھا کہ بادشاہ سومر روکاش کا سر قلم کروا چکا ہو گیا۔ میرے ذہن میں اندھیرا سا چھانے لگا۔ میں اٹھا اور دیوانہ وار موہنجوڈرو جانے والے کچے راستے پر دوڑنے لگا۔ خدا جانے کب اور کس وقت میں صحرا میں بڑی شاہراہ پر پہنچا اور ایک قافلے میں شامل ہو کر ٹوٹے ہوئے دل اور خون روتی آنکھوں اور جذبہ انتقام سے کھولتے ہوئے ذہن کے ساتھ موہنجوڈرو شہر کی کارواں سرائے میں پہنچا۔ وہیں کارواں سرائے ہی میں مجھے لوگوں کی زبانی معلوم ہو گیا کہ ایک روز پہلے عظیم محل کے مندر کی رقاصہ روکاش کی گردن قلم کر دی گئی تھی اور اس کا سر شہر کے سب سے بڑے چوراہے میں ابھی تک لٹک رہا ہے۔ الکندہ کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروا کر اسے ہاتھی کے پاؤں تلے کچل دیا تھا۔ میں ٹوٹے ہوئے خون رنگ دل کو لئے ایک طرف مٹی کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ شدت غم سے میری آنکھوں کے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔ نازک اندام روکاش کا حسین چہرہ رہ رہ کر میری آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اب میں اس سے کبھی نہیں مل سکوں گا میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میں چبوترے سے اٹھ کر کارواں سرائے کی کوٹھری میں آ گیا۔ میں سپیرے کے حلیے میں تھا۔ مجھے ابھی تک کسی نے نہیں پہچانا تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور رات کا اندھیرا ہو جانے کا انتظار کرنے لگا۔ میری روکاش اب واپس نہیں آ سکتی تھی لیکن میں بادشاہ سے اس کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ میں اس کا بھی سر کاٹ کر شہر کے چوراہے میں لٹکانا چاہتا تھا۔

دن غروب ہو گیا۔ شام کا اندھیرا ہوتے ہی مشعلیں روشن ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی میں اٹھا اور کوٹھری سے نکل کر شاہی محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرا دل انتقام کی آگ سے بھڑک رہا تھا۔ میں بادشاہ کی گردن قلم کرنے جا رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ میرے اس ارادے میں کوئی مزاحمت حائل نہیں ہو سکتی۔ سڑکوں پر رات کا اولین اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور مکانوں کی چھتوں اور چوباروں میں مشعلیں اور شمعیں روشن ہو گئی تھیں۔ میں اپنے اندر اس چوک کی طرف جانے کا حوصلہ نہیں پا رہا تھا جہاں میری محبت' میری روکاش کا سر لٹک رہا تھا۔ میں اسی چوک میں اب بادشاہ سومر کا سر لٹکا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ میں ابھی شاہی محل سے دور تھا اور قلعے کے بڑے دروازے کے جنوب کی جانب والے ٹیلے کے قریب تھا کہ شہر کے دروازے کی جانب شور و غوغا بلند ہوا اور کچھ گھڑ سوار تیزی سے میرے قریب سے قلعے کی

جانب روانہ ہو گئے۔ میں نے گھوم کر دیکھا شہر کے دروازے کی طرف آگ کے شعلے بلند ہونے لگے ساتھ ہی ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے فصیل شہر پر منجنیقوں کے بھاری پتھر پھینکے جا رہے ہوں۔ کیا کسی دشمن کی فوج نے دارالحکومت پر حملہ کر دیا ہے؟ میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح لہرا گیا۔ میں نے قلعے کی جانب دیکھا۔ قلعے کا بڑا دروازہ بیلوں کی مدد سے بند کیا جا رہا تھا اور برجوں کی مشعلیں بجھائی جا رہی تھیں۔ پھر قلعے کی جانب مسلح سپاہیوں کے دستے شہر کے دروازے کی طرف سرپٹ گھوڑے دوڑاتے جانے لگے۔ شہر میں افراتفری مچ گئی۔ لوگ گھروں کی طرف بھاگنے لگے چوباروں اور چھتوں کے فانوس اور مشعلیں گل کر دی جانے لگیں۔ عورتوں کی چیخوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔

آپ نے قدیم عہد کی جنگوں اور شہروں میں دشم کی فوج کے حملوں کے واقعات تاریخ کے صفحات پر پڑھے ہیں جو خاموش بے جان لفظوں میں ان ہلاکت خیز واقعات کی داستان سناتے ہیں۔ آپ نے قدیم تاریخی دور میں حملہ آور فوجوں کو کسی شہر پر دھاوا بولتے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ اس مقولے پر ہمارے جدید ایٹمی دور کی جنگوں میں بھی عمل ہوتا ہے۔ امریکیوں نے ویت نام میں، جاپانیوں نے جنوب مشرقی ایشیا میں اور جرمنوں نے آسٹریا اور چیکوسلواکیہ میں کیا کیا ظلم نہیں ڈھائے۔ میں نے آپ کے جدید عہد میں آنے کے بعد ان جنگوں کی پوری تاریخ پڑھی ہے لیکن آج سے سینکڑوں سال پہلے عہد قدیم کی جنگوں میں کس قدر گھناؤنے ظلم غریب عوام پر توڑے جاتے تھے؟ اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جن غریب لوگوں کا جنگ کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا تھا۔ ان کے سر کاٹ کر کھوپڑیوں کے مینار بنائے جاتے تھے۔ خاندانوں کے خاندان شیر خوار بچوں سمیت کولہو میں پلوا دیئے جاتے تھے۔ کھڑے کھڑے کھال اتروا کر اس میں بھس بھر دی جاتی تھی۔ آج کے ماڈرن زمانے میں جنگ بندیاں ہیں۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل ہے، دوست ممالک ہیں جو ایک ہی دھمکی سے جنگ رکوا سکتے ہیں۔ اگرچہ ان کا عمل پورے اور مکمل طور پر موثر نہیں ہے پھر بھی غنیمت ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم مار کر لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا لیکن اس بات کو چالیس سال سے بھی زائد کا عرصہ گذر چکا ہے اور اس ہمہ گیر قتل عام کو پھر نہیں دہرایا گیا۔ مگر ہینی بال، چنگیز خان اور اشوری جرنیل کیٹو کے حکم سے ہر روز لاکھوں انسانوں کا قتل عام کیا جاتا رہا ہے۔ آپ شاید یہ کہیں کہ اس زمانے میں آبادیاں ہی کہاں تھیں اور اتنے لوگ کہاں ہوا کرتے تھے مگر میں کہوں گا کہ آپ نے ان شہروں کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا یا پھر وہ تاریخ نہیں پڑھی جو مستند کہی جا سکتی ہے۔

میں صرف آج سے چار ہزار سال پہلے کے شہر بابل کا ذکر کروں گا جس پر اشوری شہنشاہ جمورابی کی حکومت تھی۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ یہ شہر آپ کے حساب سے ساٹھ ستر مربع میل میں پھیلا ہوا تھا اور شہر میں سڑکوں کا جال بچھا تھا۔ کوئی مکان ایسا نہیں تھا جس کی کم از کم چار پانچ منزلیں نہ ہوں۔ اس زمانے میں اس شہر کی آبادی ساٹھ لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی اور جب ایرانی آریاؤں نے اس شہر پر حملہ کیا تو اس کی ساری آبادی تہ تیغ کرنے کے بعد شہر میں آگ لگا دی۔ دس روز تک بابل جلتا رہا۔ جب یہ تہذیب و تمدن کا گہوارہ شہر راکھ کا ڈھیر بن گیا تو اس میں دجلہ کا پانی چھوڑ دیا گیا۔ شہر کی بچی کھچی باقیات بھی بہا دی گئیں۔ پھر اس جگہ ہل چلا دیئے گئے۔

اس رات بھی جب کہ میں اپنی محبوبہ کا انتقام لینے شاہی محل کی طرف جا رہا تھا تو آریاؤں نے آج کے آذر بائیجان کے علاقوں میں آباد ہو جانے والی شاخ کے خونخوار قبائل نے موہنجودڑو پر حملہ کر دیا تھا۔ آپ یہ ہرگز تصور میں نہ لائیں کہ جب آریاؤں نے موہنجودڑو پر حملہ کیا تو وہ کوئی جنگلی قوم تھی۔ نہیں ایسا نہیں تھا۔ آریاؤں کے ترک وطن کا عہد چار پانچ سو سالوں میں پھیلا ہوا ہے اور بابل کی اشوری سلطنت پر قبضہ کرنے اور اسے تہس نہس کرنے سے پہلے ایک مدت تک ان کا ہمسایہ متمدن قوموں سے ربط و ضبط رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ ہندوستان میں آئے تو محض ڈاکو اور لٹیرے نہیں تھے بلکہ تہذیب و تمدن کے لوازمات سے آراستہ تھے۔ ان کی زبان سنسکرت جو اوستا کی زبان سے ملتی جلتی تھی بہت ترقی یافتہ تھی وہ بارش کے دیوتا اندر اور آگ کی دیوی اگنی کی تعریف میں منتر پڑھتے تھے قدیم وید ان ہی منتروں پر مشتمل ہیں۔ خود موہنجودڑو میں آباد قوم کا تعلق قدیم آریاؤں کے ایک قبیلے سے تھا مگر یہ قبیلہ سینکڑوں برس پہلے دریائے سندھ کے کناروں پر آ کر بس گیا تھا اور انہوں نے اپنی محنت اور ذہانت سے اس خطہ ارضی کو انتہائی ترقی یافتہ بنا دیا تھا۔ ہر طرف سرسبز کھیتیاں لہراتی تھیں۔ پختہ اینٹوں سے بنی سڑکیں اور گلیاں تھیں۔ علم کیمیا اور علم ہیئت میں ان لوگوں کا پلہ اپنی ہم عصر بابلی اور مصری تہذیب سے بھاری تھا مگر اس شہر کو اس طرح تباہ و برباد کیا گیا کہ اس کا سارا علم، ساری مہارت اور فنون پیوند زمین ہو کر رہ گئے پھر کوئی اس تہذیب کا نام لینے والا بھی نہ رہا۔ یہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ دولت کی اس فراوانی کو دیکھ کر شمالی آریاؤں کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ کیوں کہ وہ ابھی ترکمانستان اور تاجکستان کے علاقوں میں کھیتی باڑی کرتے اور خیموں میں زندگی گزارتے تھے۔ موہنجودڑو کی ترقی اور دولت کی فراوانی نے ان سے بہادری اور دلیری کی صفت چھین لی تھی۔ جب کہ شمالی آریا ابھی تک تلوار کے دھنی تھے اور خونخواری ان کا سب سے بڑا وصف

تھا۔

میں موہنجوڈرو کے شاہی محل والے قلعے کے دروازے سے کچھ دور سڑک پر حیران و پریشان کھڑا شہر کے دروازے پر بھڑکتی آگ کو دیکھ رہا تھا۔ موہنجوڈرو کے لوگ شمالی آریاؤں کو گاتھارا کہا کرتے تھے۔ لوگ گاتھارا آ گئے گاتھارا آ گئے پکارتے ہوئے بھاگے جا رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ شمالی آریا قبیلوں نے حملہ کر دیا ہے لیکن میرے دل میں بادشاہ سے اپنی محبوبہ روکاش کے قتل کا بدلہ لینے کی آگ آریا سپاہیوں کی لگائی ہوئی آگ سے زیادہ تندی اور سرکشی سے بھڑک رہی تھی۔ میں قلعے کی طرف چلنے لگا قلعے کی فصیل پر کھولتے ہوئے تیل کے بڑے بڑے کڑاؤ لا کر رکھ دیئے گئے تھے۔ اگرچہ میں سپیرے کے بھیس میں تھا مگر شہر کے لوگ میری شکل و صورت سے شناسا تھے اور میں پہچانا جاؤں گا تو کیا ہو گا اور دوسرے لوگوں کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔ کسی کو میری طرف غور سے دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ لوگ شہر کے گنجان علاقے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ جس طرف میں جا رہا تھا ادھر کوئی نہیں آ رہا تھا۔ میں قلعے کے قریب جا کر ایک ڈھلان میں درختوں کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اور شاہی محل تک پہنچنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ اتنے میں سپاہیوں کا ایک دستہ گھوڑوں پر سوار قلعے کی طرف برق رفتاری سے آتا دکھائی دیا۔ میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی مگر اس کے لئے ایک اتفاقی حادثے کی ضرورت تھی۔ جس کی مجھے بہت کم امید تھی لیکن میری یہ امید اس طرح بر آئی کہ میں نے دیکھا کہ ایک سپاہی ان گھڑ سواروں سے کافی پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ میں ڈھلان سے ذرا اوپر آ کر تاک میں بیٹھ گیا۔ میں اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھا کہ نہ تو مجھے کوئی چوٹ لگے گی اور نہ میں کسی سے ہلاک ہو سکوں گا۔ گھڑ سواروں کا دستہ تیزی سے گھوڑے دوڑاتا گذر گیا۔ میں اندھیرے میں تھا۔ جب پیچھے رہ جانے والا سپاہی میرے قریب سے گذرنے لگا تو میں نے اچھل کر اس کی ایک ٹانگ کو پکڑ کر نیچے گرا لیا۔ اس نے تلوار نکال کر حملہ کرنا چاہا مگر میرے ایک ہی طاقتور مکے نے اس کی گردن کو توڑ ڈالا۔ میں نے انتہائی تیزی سے اپنے لباس پر ہی سپاہی کا زرہ بکتر پہنا۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے دوڑاتا قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔ بادشاہ سومر کا شاہی محل اس قلعے کے اندر تھا اور میں اس محل تک جانے کے سارے ظاہر اور پوشیدہ راستوں سے واقف تھا۔ قلعے میں بھی افراتفری کا عالم تھا۔ شاہی محل کی اکثر روشنیاں گل تھیں۔ میں گھوڑا دوڑاتا شاہی محل کی عقبی دیوار کی طرف آ گیا۔ چوں کہ میں ایک سپاہی وردی میں تھا اس لئے کسی نے مجھے نہ روکا۔ یہاں محل کے اندر جانے کا ایک خفیہ راستہ تھا۔ اس جگہ ایک حبشی غلام پہرہ دے رہا تھا۔ میں گھوڑے سے اتر کر اس کے پاس گیا تو اس نے مجھے اندر جانے سے روکا اور میرے اصرار

کرنے پر تلوار سونت کر حملہ کر دیا۔ اس کی تلوار کا بھرپور وار میرے بازو پر لگا مگر میرا جسم تو پتھر بن چکا تھا۔ اس کی تلوار ٹوٹ گئی۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا اور ایک ہاتھ سے پیچھے دھکیل کر محل کو جانے والے خفیہ راستے کی سیڑھیاں چڑھ کی محل کے دوسرے تختے پر آ گیا۔

محل پر ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا راہ داریوں، نیم روشن برآمدوں اور شہ نشینوں سے گذرتا اس برج کی طرف بڑھا جس میں سے بادشاہ سومر کی خواب گاہ کو راستہ جاتا تھا۔ یہاں دو حبشی غلام ننگی تلواریں لئے پہرہ دے رہے تھے مگر مجھ پر دیوانگی سوار تھی اور ویسے بھی وہ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ میں مر نہیں سکتا تھا۔ میں نے انہیں تہ تیغ کیا اور برج کی سیڑھیاں طے کر کے بادشاہ کی خواب گاہ کے سامنے پہنچ گیا۔ صندل کے اونچے دروازے کے آگے سونے کا کافوری فانوس روشن تھا۔ بادشاہ کی خواب گاہ میں سے آدمیوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر قدموں کی چاپ بند دروازے کی طرف بڑھتی سنائی دی۔ میں جلدی سے ستون کے عقب میں ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور فوج کے جرنیل تیز تیز باتیں کرتے باہر نکلے اور دوسری طرف چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی میں ستون سے نکل کر شاہی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ بادشاہ سومر ایک اونچی تپائی پر جھکا شمع کی روشنی میں چمڑی کی کوئی دستاویز کھولے ہوئے تھا میرے قدموں کی آواز سن کر اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ وہ مجھے سپاہی سمجھا اور گرج دار آواز میں بولا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہارا پہرہ کہاں پر ہے؟“

میں ایک ایک قدم اٹھاتا اس کے قریب آ گیا اور اپنے سر سے لوہے کا خود اتار کر بولا۔

”بادشاہ سومر! کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا؟“

اب جو اس نے غور سے دیکھا تو دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹا اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور بولا۔ ”عاطون!؟“

”ہاں عاطون! تمہارے شاہی مندر کا کاہن اعظم جو تمہارا دیا ہوا زہر ہلاہل پی کر زمین کے اندر دفن کر دیا گیا تھا اور جس کی محبوبہ روکاش کا سر کاٹ کر تم نے شہر کے چوراہے میں لٹکا دیا تھا۔“

بادشاہ سومر ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ میں عاطون کا بھوت ہوں۔ اس کی بدروح ہوں۔ اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیا کہہ رہا ہوں۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا جا رہا تھا اور ایک ایک قدم پیچھے ہٹ رہا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ اس کے منہ سے چیخ نکلے میں نے اس کی گردن کو

دبوچ کر کمخواب و اطلس کے شاہی بستر پر گرا دیا۔ مجھ پر روکاش کی محبت کا جنون سوار تھا۔ میرے اندر جس قدر طاقت بھر دی گئی تھی اس حساب سے بادشاہ کی گردن کو تھوڑا سا دبانا ہی کافی تھا مگر میں پوری طاقت سے اس کی گردن کو دبا رہا تھا اور بادشاہ کب کا مرچکا تھا۔ مگر میں روکاش کے قتل کا انتقام لیتے ہوئے ابھی تک اس کی گردن کو دبائے جا رہا تھا۔ جب میرے انتقام کی آگ تھوڑی ٹھنڈی ہوئی تو میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ بادشاہ سومر کی گردن پچک کر ایک طرف کو ڈھلک گئی تھی۔ جب میں محل سے باہر نکلا تو دیکھا کہ حملہ آور آریاؤں کی سپاہ کے جلتے ہوئے تیر قلعے کی فصیل سے اوپر ہو کر اندر گر رہے تھے جس کا مطلب صاف تھا کہ دشمن کی فوجیں شہر کی فصیل کو توڑ کر شہر میں داخل ہو چکی ہیں۔ میں قلعے کے دروازے کی طرف جانے کی بجائے محل کے عقبی تختے کی طرف آ گیا۔ میں شاہی محل اور قلعے کے تقریباً تمام راستوں سے واقف تھا۔ ایک راستہ محل کے عقب میں بارہ دری کے پہلو سے نکلا تھا جو زمین دوز سرنگ میں سے ہوتا ہوا شہر کے مغرب کے جانب نکل آتا تھا۔ میرے لئے اب اس شہر میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ اس شہر نے میرے دل پر گھاؤ ہی لگائے تھے۔ میں اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ میں نے اس شہر کے ایک سپاہی کا لباس پہن رکھا تھا جو مجھے پسند نہیں تھا۔ میں نے جوتا اپنے پاؤں میں رہنے دیا اور سپاہی کی وردی اتار کر باغ میں پھینک دی۔ نیچے سے میرا وہی سپیرے والا لباس نکل آیا۔ میں بارہ دری کے پہلو میں سنگ سرخ کے تنگ سے دروازے میں داخل ہو کر سرنگ میں سے گزرتا شہر کی فصیل سے کافی فاصلے پر خندق کے آگے ایک جگہ جنگلی جھاڑیوں میں نکل آیا۔ میں نے مڑ کر شہر پر نگاہ ڈالی۔ شہر میں جگہ جگہ آگ لگی ہوئی تھی اور چیخ و پکار کی صدائیں آ رہی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وحشی قبائل کی فوجیں بے گناہ شہریوں کو بے دریغ قتل کر کے ان کے گھروں کو آگ لگا رہی ہیں۔ مگر میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

فوج گھوڑوں کو ایڑ لگاتی شہر کی ٹوٹی ہوئی فصیل میں سے اندر گھس رہی تھی۔ اندر گھمسان کا رن پڑ رہا تھا مگر موہنجودڑو کی فوج کے حوصلے اس طوفان کے آگے پست ہو چکے تھے۔ میں نے ان سب کی طرف سے منہ موڑا اور توران کی طرف جانے والی صحرائی شاہراہ پر روانہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر چلنے کے بعد اندھیری رات میں مجھے کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ پھر میں نے ایک گھوڑے کو دیکھا جو میدان جنگ سے نکل کر وہاں ایک گول دائرے میں چکر لگا رہا تھا۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ گھوڑے پر زین کسی ہوئی ہے اور اس میں ایک سپاہی کی ٹانگ پھنسی ہے جو مرچکا ہے اور جس کے سینے میں چھ سات تیر کھبے ہوئے ہیں۔ میں

نے بڑی مشکل سے گھوڑے کو قابو میں کیا۔ مردہ سپاہی کی لاش کو زین کے شکنجے سے آزاد کر کے وہیں پھینکا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے نامعلوم سفر اور ان جانی منزل کی طرف چل دیا۔ میری منزل دجلہ و فرات کی وادی میں اس عہد کا سب سے متمدن اور تہذیب یافتہ شہر بابل تھا جس پر تاریخ قدیم کے مثالی بادشاہ حمورابی کی حکومت تھی۔ حمورابی ایک وسیع مشرب' عالی نظر اور روشن خیال حکمران تھا۔ اس نے دو سو بیاسی ابواب پر مشتمل ایک ضابطہ قوانین جاری کیا جو سخت پتھر کے ایک آٹھ فٹ اونچے ستون پر پیکانی رسم الخط میں کندہ تھا۔ حمورابی کا قانون ایک ایسے معاشرے کے لئے تھا جو طبقاتی معاشرہ تھا۔ اعلیٰ طبقے کو نقصان پہچانے کی سزا عام آدمیوں کو نقصان پہنچانے سے زیادہ تھی۔ ایسا ہی امتیاز عام آدمیوں اور غلاموں کے درمیان رکھا گیا تھا۔ بہرحال اس میں کوئی بھی طبقہ بھی قانون کی نگاہ میں کم تر نہ تھا اور اسے پورے پورے معاشرتی حقوق حاصل تھے۔ غلاموں کا تحفظ قانوناً واجب تھا اور بعض شرائط پوری کرنے کے بعد وہ آزادی حاصل کر سکتے تھے۔ عائلی قوانین کی کئی ایک دفعات تھیں۔ میں نے حمورابی کے قانون کی دفعات کو خود اس ستون پر کندہ پڑھا ہے۔ ایک دفعہ یوں تھی۔ "اگر کوئی عورت اپنے شوہر کو پسند نہ کرتی ہو اور اس سے نفرت کرتی ہو اور کہہ دے کہ میں تیری بیوی نہیں رہ سکتی تو اس کے گذشتہ حالات کی تحقیقات کی جائے۔ اگر وہ احتیاط کرنے والی بیوی ثابت ہو اور اس میں کوئی خراب نہ پائی جائے نیز اس کا شوہر غیر ذمے دار آوارہ منش ہو تو عورت پر الزام نہیں۔ اسے اس کا جہیز دے دیا جائے اور وہ اپنے باپ کے گھر چلی جائے" ضابطہ حمورابی دفعہ 142 - 143 دجلہ اور فرات کی وادی میں رہنے والے لوگ مختلف کاموں کے لئے مختلف دیوتاؤں کو پوجتے تھے۔ جنگ کے لئے 'الگ' کاروبار کے لئے الگ اور جنسیات کے لئے الگ دیوتا تھا۔ ایک دیوتا ان سب دیوتاؤں کا سردار تھا۔ بابل میں یہ حیثیت دیوتا مرروخ کو حاصل تھی۔ حمورابی شاہ بابل نے اپنے ضابطہ قوانین کو ان تمام دیوتاؤں کے احکامات کے تحت کر دیا تھا۔ یہ قوانین عائلی تعلقات' حقوق ملکیت' قرض' اجرت اور کمزوروں' بیواؤں اور غریبوں کی نگہداشت کے لئے وضع کئے گئے تھے۔ جب پانچ سو برس بعد یروشلم کی یہودی سلطنت قائم ہوئی تو ان کا نظام اخلاق حموربی کے ضابطہ قوانین کی روشنی میں مرتب کیا گیا۔ اہل بابل اور ابتدائی سمیریوں کے مذہب اور ثقافت کے بارے میں آپ کی تاریخ محض قیاس آرائیوں اور آثار قدیمہ کے بیلچوں تک ہی محدود ہے۔ مگر میں خود چوں کہ اس تاریخ کا عینی شاہد ہوں اس لئے آپ کو حقیقت حال بیان کروں گا۔ اس تہذیب کی ابتداء اور انتہا کے بارے میں کوئی دوسرا زندہ انسان مجھ سے بڑھ کر نہیں جانتا۔ کیوں کہ میں اس تہذیب کے دور میں سے گزرا ہوں اور میں نے اپنی آنکھوں سے ایک

ایک تفصیل کا مشاہدہ کیا ہے۔

سمیری قوم آج سے کوئی پانچ ہزار سال قبل جنوب مغربی عربستان کی ایک پہاڑی بستی سے نکل کر بابل کے قرب و جوار میں آ کر آباد ہو گئی۔ اس قوم نے یہاں زراعت کو اپنا پیش بنایا۔ اس نے مکانوں اور معبدوں کو پکی ہوئی اینٹوں سے تعمیر کیا۔ یہ لوگ پتھر کی سلوں پر تصویریں' مورتیاں اور مجسمے بناتی تھی۔ تحریر کا فن سب سے پہلے انہوں نے ہی ایجاد کیا۔ یہ لوگ اہم واقعات کو الواح یعنی مٹی کی تختیوں پر لکھ دیا کرتے تھے۔ یہ قوم موسیقی سے بھی شناسا تھی اور میں نے بابل میں بڑے بوڑھوں سے اپنے کانوں انکے قدیم گیت سنے ہیں۔ انہوں نے دریائے دجلہ اور فرات سے نہریں نکال کر بنجر زمینوں کو کاشت کے قابل بنایا۔ اگر میں آپ کو بتاؤں تو آپ یقین نہیں کریں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہل' چار پہیوں والی گاڑی اور کمہار کا چاک اسی سمیری قوم کی ایجاد ہے۔ چمڑا رنگنے' اشیاء کی پیمائش کے آلات بنانے' عطر تیار کرنے اور طب و جراحت میں یہ قوم بڑی ماہر تھی۔ ان کی زندگیوں کا مقصد معبد ہوتا تھا۔ ہر شہر میں ایک بلند مینار اور ایک معبد ہوتا تھا۔ مینار کی چوٹی پر اس حیریا ملک کے سردار دیوتا کا عظیم الشان معبد ہوتا۔ آپ حیران ہوں گے کہ اس قوم نے آج سے پانچ ہزار سال پہلے دجلہ و فرات کی وادی میں کوئی پچاس لاکھ کے قریب شہری آباد کیے۔ اگرچہ ان شہروں کی آبادی کراچی شہر جتنی نہیں تھی مگر یہ بڑے کشادہ بارونق اور زندگی کے ہنگاموں سے جگمگاتے شہر تھے۔ شمال میں ان کی سلطنت کا پایۂ تخت نینوا تھا۔ سمیری قوم نے ایک ہزار برس تک وادی دجلہ وفرات میں حکومت کی۔ 1800ء ق م میں قبیلہ اموری کے سردار حمورابی نے اہل سومر کا تختہ الٹ کر بابلی حکومت کی بنیاد رکھی۔ بابلیوں کے بعد اشوریوں نے اس وادی کو اپنی تہذیب اور صنعت و حرفت کا گہوارہ بنایا۔ جب یہ دونوں قومیں اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو گئیں تو ایران نے حملہ کر کے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ یہ سارے انقلابات میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ آپ کی تاریخ کو اشوریوں کے بارے میں یقینی معلومات حاصل نہیں ہیں لیکن میں نے ان لوگوں کو دیکھا ہے۔ میں ان کے ساتھ رہا ہوں۔ وہ بڑے سخت جان اور عسکریت پسند تھے لیکن سنگ تراشی اور دیگر فنون لطیفہ میں بھی ماہر تھے۔ وہ شیروں کا شکار کرتے اور اپنے اسیروں کے ساتھ بہتر برتاؤ کرتے۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں ان کا ایک نامور بادشاہ اشور بنی پال گذرا ہے۔ وہ اپنے کارناموں کو خشتی تختیوں پر لکھوا کر محفوظ کر لیتا تھا۔ ان کارناموں کی چند ایک تختیوں کو میں نے خود اپنی آنکھوں سے پڑھا ہے۔ ان میں لکھا تھا۔

اشور' شمس' بعل' نینوا کی اشتر اور نیرگل کے حکم سے میں منائیون کی سرزمین میں

داخل ہوا اور اسے فتح کرتا ہوا گذر گیا۔ اس کے تمام چھوٹے بڑے شہر جن کا کوئی شمار نہیں تھا میں نے تباہ و برباد کر دیئے۔ انہیں لوٹ کر آگ لگا دی۔ میں نے ان شہروں میں سے عورتوں اور مردوں' گھوڑوں گدھوں اور بھیڑ بکریوں کو ساتھ لیا کیوں کہ وہ مال غنیمت تھے۔ اخشیری نے میری فوجوں کی فتح کی خبر سنی تو وہ پایۂ تخت ازرتو کو چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اس نے جہاں پناہ لی میں نے اسے بھی فتح کر لیا اور پندرہ روز تک کی مسافت کے علاقے کو تباہ کر ڈالا۔ ہر جگہ بربادی پھیلا دی۔ اخشیری میری حاکمیت سے خوف زدہ نہ ہوا۔ حالانکہ اربیلا کی دیوی اشتار نے اسے بتا دیا تھا کہ میں منائیون کے بادشاہ کو مروا دوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اخشیری کی لاش شہر کی گلی میں پھینک دی گئی اور وہ وہیں پڑی رہی۔ میں نی اپنی تلوار سے اس کے بھائی' اس کے خاندان اور اس کے باپ کے گھرانے کے سارے افراد کو قتل کر ڈالا۔

اشوری بادشاہ بخت نصر کے عہد میں ہی یہودیوں کو اسیر بنا کر بابل لے جایا گیا اور ان کے علماء اور فلاسفر کو بدنام زمانہ چاہ بابل میں پھینک دیا گیا۔ یہ کہانی میں آپ کو آگے چل کر سناؤں گا۔ اس وقت میں بابلی بادشاہ حمورابی کے عہد حکومت کا ذکر کروں گا۔ کیوں کہ موہنجوڈرو کی تباہی کے بعد بابل ہی کی طرف روانہ ہوا تھا۔

جس زمانے میں بابل کے قدیم شہر کے قرب و جوار میں داخل ہوا تو یہ زمانہ پانچ ہزار قبل مسیح کا تھا۔ دو ایک روز کا فرق ہو گا تو ہو گا۔ بابل زیادہ تر کچی اینٹوں کا شہر تھا۔ پختہ اینٹیں اور پتھر صرف بادشاہ کے محل قلعہ اور مروروخ کے معبد میں ہی استعمال کیا گیا تھا۔ یہ شہر بہت بڑا تھا اور اس میں بڑے کشادہ باغ تھے۔ شہر کے وسط میں مینار بابل تھا جو ایک کچی پہاڑی کی طرح اوپر کو اٹھتا چلا گیا تھا۔ اس کے گرد ایک کشادہ سڑک گھومتی ہوئی اوپر تک چلی گئی تھی جہاں معبد تھا۔ اس سڑک پر چار رتھ ساتھ ساتھ دوڑ سکتے تھے۔ یہ شہر قدیم مصر کے دارالحکومت تھینبز سے زیادہ ترقی یافتہ تھا اور میں نے اس شہر کے عالموں سے جب ملاقات کی تو مجھے احساس ہوا کہ لوگ علم کیمیا' علم ہیئت اور ریاضی میں مصریوں سے بہت آگے ہیں۔ حسن اور زینت کے اعتبار سے دنیا کا کوئی شہر بابل کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے دفاع کے انتظامات بھی میں نے دیکھے جو غیر معمولی تھے یعنی شہر کی فصیل دوہری تھی۔ اس شہر کی وسعت کا اندازہ آپ یوں لگا سکتے ہیں کہ اس فصیل کی بیرونی دیوار کا محیط آپ کے ساٹھ میل سے بھی زیادہ تھا اور اس کی چوڑائی سو فٹ تھی اور یہ دیوار ساڑھے تین سو فٹ اونچی تھی۔ اس فصیل میں کانسی اور تانبے کے ایک سو دروازے تھے۔ اندرونی دیوار زیادہ چوڑی نہیں تھی مگر مضبوطی میں بیرونی دیوار کے مقابلے میں کم نہیں تھی۔ شہر کو چار

بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک حصے میں شاہی قلعہ تھا اور دوسرے میں شاہی
محل، تیسرے میں بابل کے دیوتا مردوخ کا معبد اور چوتھے حصے میں مینار بابل تھا۔ چاہ بابل شہر
کے ایک دورافتادہ علاقے میں تھا جہاں ان لوگوں کو پھینک دیا جاتا جن کے بارے میں بادشاہ
یہ سمجھتا تھا کہ قتل یا ان کی کھال کھنچوا دینے کی سزا ان کے جرم کے مقابلے میں بہت کم
حیثیت کی ہے۔ چاہ بابل کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی تفصیلات بھی میں آپ کو آگے چل
کر بیان کروں گا۔

آپ کے ماڈرن عہد میں آ کر جب میں نے قدیم بابل کی کھدائی کے بارے میں
دستاویزات پڑھیں تو مجھے معلوم ہوا کہ 1899ء میں جب آپ کے ماہرین آثار قدیمہ نے
بابل کی دیوار کو کھود نکالا تو اس کی چوڑائی صرف بائیس فٹ تھی اور اس کا محیط بھی بہت کم
تھا۔ ماہرین آثار قدیمہ گڑے مردے کھودتے ہیں مگر بابل کے زندہ لوگوں کی تعمیر کی ہوئی
دیوار میں نے خود دیکھی ہے وہ اپنے حجم اور کشادگی میں ویسی ہی تھی جیسی کہ میں اوپر بیان کر
چکا ہوں۔ یہ ماہرین قیاس کے اندھے گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ جس دیوار کو انہوں نے بابل کے
شہر میں سے کھود کر نکالا تھا وہ شہر کی نہیں بلکہ اندروں شہر سمیریوں کے بنائے ہوئے ایک
احاطے کی دیوار تھی۔ بابل شہر کی دہری فصیل کو تو میری آنکھوں کے سامنے ایرانی فوجوں نے
زمین کے ساتھ ملا دیا تھا اور اس کے کانسی اور تانبے کے بڑے بڑے دروازے اکھاڑ کر اپنے
ساتھ لے گئے تھے۔

اب میں اپنے حیرت انگیز سفرنامے کی طرف آتا ہوں جس وقت میں فصیل بابل کے
ایک کانسی کے دروازے میں سے گزر کر شہر میں داخل ہوا تو سورج شہر کی عمارتوں اور مینار
بابل کے عقب میں غروب ہو رہا تھا۔ کچی اینٹوں اور ہموار چھتوں والے مکانوں کے سائے
لمبے ہو رہے تھے۔ میں گھوڑے پر سوار سپیرے کے بھیس میں بازاروں میں سے گزر رہا تھا۔
دن بھر کی تپش کچھ کم ہو گئی تھی اور بعض لوگوں نے اپنے مکانوں اور دکانوں کے آگے پانی
کا چھڑکاؤ کر رکھا تھا۔ ایک مکان کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے عورتوں کے قہقہوں کی
آواز سنائی دی۔ آج پانچ ہزار سال کے بعد میں آپ کے شہر کراچی میں ساحل سمندر کے
اپنے تنہا مکان میں اپنے سفرنامے کی طلسم ہوش ربا لکھتے ہوئے ان عورتوں کے بارے میں
سوچ رہا ہوں - کتنی پیاری اور خوبصورت ہوں گی وہ عورتیں! ان کے قہقہوں میں نقرئی
گھنٹیوں کی آواز تھی۔ آج ان کی ہڈیوں کی مٹی بھی باقی نہ رہی ہو گی لیکن شاید ان کے
قہقہوں کی نقرئی آواز توانائی کے روپ میں کسی دور دراز نظام شمسی کی سمت رواں دواں ہو۔
میں سر شام بابل کے شہر کی سڑکوں پر سے گزرتا ہوا چلا گیا۔ کچھ لوگ اپنی دکانوں کے

سائبان سمیٹ رہے تھے۔ عورتیں اور مرد شام کے کھانے کی چیزیں خرید کر اپنے اپنے گھروں
کی طرف جا رہے تھے۔ عورتوں کے بال سیاہ اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ یہ لوگ موہنجوڈرو
کے لوگوں کے مقابلے میں تنومند اور صاف رنگت کے تھے۔ ان کا لباس زیادہ تر ریشمی اور
صاف ستھرا تھا۔ عورتوں نے بالوں کو سنوار رکھا تھا اور کانوں میں سفید پھول پروئے
ہوئے تھے۔ میں اس شہر میں اجنبی تھا۔ جیسا کہ مصر سے موہنجوڈرو میں داخل ہونے کے بعد
میرے ساتھ ہوا تھا۔ یہاں میری حیثیت کا ابھی تک کوئی تعین نہیں کیا گیا تھا۔ میرا خیال تھا
کہ یہاں میں کسی ایسی حیثیت اور شناخت کے ساتھ داخل ہوں گا کہ لوگ مجھے کسی راہب،
امیر سوداگر یا کاہن کی حیثیت سے پہچان لیں گے مگر کوئی ایسا حادثہ میرے ساتھ ابھی تک
نہیں ہوا تھا۔ میں عاطون ہی تھا اور لوگ مجھے سپیرا سمجھ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید
صبح سو کر اٹھوں تو میری حیثیت بدل چکی ہو۔ کیوں کہ موہنجوڈرو کی سرائے میں بھی میں صبح
سو کر اٹھا تھا تو مندر کا کاہن اعظم بن چکا تھا۔ ویسے میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے ساتھ ایسا ہو
اور میری کوئی حیثیت متعین کی جائے۔ میں ایک سیاح کی حیثیت سے ہی ان شہروں کی
تہذیب و ثقافت کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔

میں چلتے چلتے ایک سرائے کے باہر گھوڑے سے اتر گیا۔ میرے پاس صرف سونے کا
ایک سکہ تھا جو موہنجوڈرو کا تھا۔ یہاں میں نے سرائے کے مالک کے پاس یہ سکہ فروخت کیا
اور اس کے عوض بابل کے چند سکے وصول کر لئے۔ پھر ہاتھ منہ دھو کر سرائے کے اندر
دالان میں بچھے ہوئے قالین کے فرش پر ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہاں کوئی
میرا شناسا نہ تھا۔ کچھ شام کا کھانا کھانے کے بعد قہوہ پی رہے تھے۔ کسی نے میری طرف توجہ
بھی نہ دی۔ ان کے نزدیک میں کوئی سپیرا تھا جو رات بسر کرنے کارواں سرائے آ گیا تھا۔
طاقوں میں موی شمعیں جل رہی تھیں۔ پھر لوگ باتیں کرتے کرتے وہیں پڑ کر سو گئے۔ میں
دیر تک جاگتا رہا اور اپنی محبت کے المناک انجام پر غور کرتا رہا۔ روکاش کی حسین شکل رہ رہ
کر میری آنکھوں میں آ جاتی تھی۔ اگرچہ میں نے اس کے قاتل بادشاہ سومر سے روکاش کے
قتل کا بدلہ لے لیا تھا لیکن میرے دل پر روکاش کے دردناک انجام کا گہرا اثر تھا۔ سرائے
کے ایک ملازم نے آ کر سوائے ایک کے باقی ساری شمعیں گل کر دیں۔ اس نے سمیری زبان
میں مجھ سے کہا کہ میں بھی سو جاؤں۔ رات زیادہ ہو گئی ہے۔ اس زبان میں آریائی سنسکرت
کے لفظ زیادہ تھے۔ میں اندازے سے اس کا مطلب سمجھ گیا۔ میں قالین پر لیٹ کر آنکھیں
بند لیں۔ مجھے نیند کی حاجت نہیں تھی لیکن میں کچھ دیر کے لئے سو جانا چاہتا تھا۔ کیوں کہ
روکاش کا خیال میرے احساسات کو کچوکے لگا رہا تھا۔ میں نے نیند کا تصور ذہن میں جمایا اور

پھر مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور میں سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا اور طاق سے صبح کی سفید روشنی دالان پر پڑ رہی تھی۔ میں اٹھا اور سرائے پر آ گیا۔ میرا ارادہ شہر بابل کی گلیوں کی سیر کا تھا۔

میں نے اپنا گھوڑا وہیں سرائے میں چھوڑا اور قدیم بابل کے پراسرار گلی کوچوں میں نکل آیا۔ میں نے سب سے پہلی تبدیلی محسوس کی کہ پہلے روز کے برعکس لوگ اب مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ قدرت کی طرف سے یا اس غیبی طاقت کی جانب سے جس نے مجھے دنیا میں شاید ہمیشہ کی زندگی دی ہے۔ یہاں میری کسی نہ کسی حیثیت کا تعین ہو چکا ہے اور یہ لوگ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں محتاط ہو کر چلنے لگا۔ ایک سانولے رنگ کا سفید بالوں والا میرا راستہ کاٹ کر تیزی سے میرے سامنے آ گیا اور میرے کاندھے پر جھک کر بولا۔

”بیٹا عاطون! اپنے بوڑھے ماں باپ پر رحم کرو - تمہاری مہلت کا آج آخری دن ہے۔ اگر تم نے اپنے آپ کو بادشاہ کے دربار میں پیش نہ کیا تو بادشاہ کے حکم سے تمہارے ماں باپ کی آنکھیں نکلوا کر انہیں آگ میں ڈال دیا جائے گا۔“

سفید بالوں والا آدمی اتنا کہہ کر چلا گیا۔ میں وہاں دم بخود کھڑا سوچنے لگا کہ یہ کیا کہہ گیا ہے مجھے؟ یقیناً میری یہاں ایک حیثیت کا تعین ہو گیا تھا مگر اس بار معاملہ خطرناک تھا۔ پہلی دفعہ موہنجوڈرو میں جب میں کاہن اعظم کے روپ میں نمودار ہوا تھا تو میری نفسیات میں بھی تبدیلی آ گئی تھی اور مجھے سب باتیں ایک کاہن اعظم کی حیثیت سے یاد آ گئی تھیں لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا تھا۔ کسی خطرناک انسان کے روپ میں ظاہر ہو چکا تھا۔ مگر مجھے اپنی اس نئی حیثیت کے بارے میں نہ تو کچھ یاد آ رہا تھا اور نہ میں اس سے آگاہ تھا۔ میں دوسری گلی میں گھوم گیا۔ جوں ہی میں ایک حویلی کے قریب پہنچا تو ایک نوجوان لپک کر میری طرف آیا اور مجھے کھینچتا ہوا حویلی کے اندر لے گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ میں اس گستاخی پر اسے اٹھا کر فرش پر پٹخنے ہی والا تھا کہ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

”عاطون بھائی! رب مروخ تم پر اور ہمارے ماں باپ پر رحم کرے۔ آج ان بوڑھوں کی زندگیوں کا آخری دن ہے جنہوں نے ہمیں پال پوس کر جوان کیا۔ تم میرے بڑے بھائی ہو۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ بادشاہ کے سپاہی تمہیں گرفتار کر کے ہلاک کرنے کے لئے لے جائیں لیکن میں اپنے بوڑھے ماں باپ کو آنکھیں نکلوا کر مینار بابل سے گرائے جاتے کیسے دیکھ سکوں گا؟؟“

اور وہ سانولی رنگت والا نوجوان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پھر اس کی زبانی مجھے کچھ

معلوم ہوا۔ اس نے شہر بابل میں میری حیثیت ظاہر کر دی۔ میرا نام عاطون ہی تھا لیکن وہاں میں شمالی حبشہ کے شہر ملاکا کے ایک بوڑھے رتھ بان کے بڑے بیٹے کی حیثیت سے نمودار ہوا تھا۔ میں حمورابی کے شاہی محل میں ایک کفش بردار تھا اور میری حیثیت ایک غلام کی سی تھی لیکن یہاں بھی میرا عاشقانہ مزاج رنگ لایا تھا اور میں خدا جانے کس عالم میں حمورابی کی بھانجی شہزادی اسارا کی خواب گاہ میں جا گھسا تھا اور شہزادی سے اظہار محبت کر بیٹھا تھا۔ خواجہ سرا تلواریں سونت کر مجھے قتل کرنے کو بڑھے تو میں کھڑکی میں سے کود کر فرار ہو گیا تھا۔ بادشاہ حمورابی نے میرے بوڑھے ماں باپ کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا تھا اور اعلان کروا دیا تھا کہ اگر دس روز کے اندر اندر کفش بردار عاطون نے اپنے آپ کو شاہی دربار کے حوالے نہ کیا تو میرے بوڑھے ماں باپ کی آنکھیں نکلوا کر انہیں مینار بابل سے نیچے پھینک دیا جائے گا اور جس روز میں بابل کی ایک گلی میں اپنے مکان کے آگے سے گزر رہا تھا تو میرے ماں باپ کی موت کے عوض مجھے دی گئی مہلت کا آخری دن تھا۔ پہلے تو یہ کہانی سن کر میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا پھر سوچا کہ اگرچہ یہ نوجوان میرا بھائی نہیں ہے اور میرے دل میں اس کے لئے خون کا جوش نہیں ہے پھر بھی یہاں دو بوڑھے انسانوں کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ مجھے خود کو بادشاہ کے سامنے پیش کر دینا چاہئے میرا کیا بگڑے گا۔ وہ مجھے ہلاک نہیں کر سکے گا اور نہ میں مر سکوں گا لیکن دو عمر رسیدہ بے گناہ انسانوں کی جانیں بچ جائیں گی۔ میں نے اپنے بھائی کو تسلی دی اور کہا کہ میں خود کو بادشاہ کے حضور پیش کرنے جا رہا ہوں میرے ساتھ جو ہو گا دیکھا جائے گا لیکن ہمارے ماں باپ کی جان بچ جائے گی۔ میرے اس فیصلے سے بھی میرا بھائی سخت رنجیدہ ہوا اور سسکیاں بھرنے لگا۔ میں نے اسے کہا کہ تم فکر نہ کرو۔ میں مروں گا نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ یہ کہہ کر میں اپنے مکان سے نکلا اور سرائے میں آ کر گھوڑے پر بیٹھا اور شاہی محل کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ہی کچھ سپاہیوں نے مجھے پہچان کر گرفتار کر لیا اور زنجیروں میں جکڑ کر حمورابی کے دربار میں پیش کر دیا۔ میں پہلی بار سمیری عہد کے اس عظیم الشان بادشاہ کو دیکھ رہا تھا جو اپنے ضابطہ قوانین اخلاق پر سختی سے عمل کرتا تھا۔ اس نے مجھ پر ایک قہر بھری نظر ڈالی اور حکم دیا۔

”اس بدکردار کفش بردار کو اگر میں نے قتل کی سزا دی تو یہ فوراً مر جائے گا۔ میں نے اس کی کھال کھنچوا دی تو بھی اسے جلد موت آ جائے گی۔ اس نے جس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا ہے اس کے آگے اس کی آنکھیں نکلوا دینے کی سزا بھی کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ میں اسے چاہ بابل میں پھینکوانے کا حکم دیتا ہوں جہاں یہ تاریک زمین کے اندر کوڑھی بن کر سسک سسک کر مرے گا۔ اس کے ماں باپ کو رہا کر دیا جائے لیکن اسے ذلیل کفش بردار

تمہیں معلوم ہو کہ چاہ بابل میں جو بھی ڈالا گیا اس کی لاش بھی باہر نہیں نکل سکی۔ لیکن اگر کسی ترکیب سے تم نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تو تمہارے ماں باپ اور بھائی کے جسموں کے ٹکڑے کر کے محل کے شکاری کتوں کو کھلا دیئے جائیں گے۔"

میں زنجیروں میں جکڑا خاموش سر جھکائے کھڑا بادشاہ حمورابی کا حکم سن رہا تھا۔ مجھے ایک ناکردہ گناہ کی سزا مل رہی تھی اور میں اپنے ان دیکھے بوڑھے ماں باپ کے لئے چاہ بابل کی تاریک موت کے حوالے کیا جا رہا تھا۔ میں اگر چاہتا تو بڑے آرام سے اپنی زنجیریں توڑ کر آزاد ہو سکتا تھا اور دنیا میں کوئی تیر' کوئی نیزہ' کوئی تلوار ایسی نہیں تھی جو مجھے ہلاک کر سکتی لیکن میں اپنی مرضی کے خلاف بابل کے ایک بوڑھے رتھ بان اور اس کی بوڑھی بیوی کا بیٹا بنا دیا گیا تھا اور یہ دو بے گناہ انسانوں کی زندگیوں کا مسئلہ تھا۔ اس لئے میں اپنے بارے میں شاہی دربار میں یہ ہرگز نہیں بتانا چاہتا تھا کہ اصل میں میں کون ہوں اور جس جرم کی پاداش میں مجھے ایک ہولناک سزا دی جا رہی ہے وہ مجھ سے کبھی سرزد نہیں ہوا۔ میری زنجیریں کھول کر مجھے لوہے کے ایک پہیوں والے پنجرے میں ڈال دیا گیا اور چاہ بابل کی طرف روانہ ہو گیا۔

لوہے کا پنجرہ جس میں میں بند تھا چاہ بابل کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ تاریخ کی اس قدیم ترین دہشت افروز عقوبت گاہ کے دروازے کو میں حیرت کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ عہد بربریت کے ہزاروں سالہ سفر کے نشیب و فراز میں میں نے ہزاروں عقوبت گاہیں دیکھیں مگر چاہ بابل کی عقوبت گاہ کی اذیت اور بربریت کی وحشت انگیز مثال کہیں نہ ملی۔ یہی وہ چاہ بابل تھا جس میں خدا کے دو برگزیدہ بندوں ہاروت ماروت کو احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی پاداش میں ڈال دیا گیا تھا۔

چاہ بابل کوئی اندھا کنواں نہیں تھا۔ یہ ایک سینکڑوں فٹ گہرا اور کشادہ گڑھا تھا جس کی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک چوڑا ہموار زینہ ڈھلان کی صورت میں نیچے چاہ بابل کی تہہ تک اترتا چلا گیا تھا۔ اس ہموار ڈھلانی زینے کی ہر منزل پر چھوٹے چھوٹے گول برج بنے ہوئے تھے جن میں مسلح سپاہی ہر وقت پہرہ دیتے تھے۔ یہ کنواں تہہ میں جا کر ختم نہیں ہو جاتا تھا بلکہ یہاں سے اس کے زمین کے اندر ہی اندر کھود کر بنائے گئے تہہ خانے شروع ہو جاتے تھے جو زمین کے نیچے نصف مربع میل کے قطر میں بنے ہوئے تھے۔ ان کی چھت اتنی نیچی تھی کہ آدمی کو جھک کر چلنا پڑتا تھا۔ یہاں اتنی ہی روشنی اور تازہ ہوا کافی سمجھی گئی تھی جو کنویں کے اوپر سے اندر داخل ہوتی تھی۔ اور یہ تہہ خانوں کے تھوڑی دور آ کر دم توڑ دیتی تھی۔ نم زمین سے اٹھتے ہوئے عجیب عجیب قسم کے ناگوار بخارات فضا کو مسموم کرتے رہتے اور تاریک اذیت ناک ماحول میں بدقسمت معتوب انسانوں کے پیروں کی آہنی بیڑیوں کی آواز دلوں کو دہلایا کرتی تھی۔

مجھے پنجرے سے باہر نکال کر میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ ان بیڑیوں میں آہنی نوکیلے کانٹے ابھرے ہوئے تھے جو پاؤں کے ساتھ چھو جانے سے ٹخنوں کو زخمی کرتے تھے۔ میرے گلے میں لوہے کا ایک بھاری طوق ڈال دیا گیا۔ چار سمیری سپاہیوں کا دستہ مجھے پنجرے سے نکال کر جانور کی طرح ہنکاتا چاہ بابل کے ڈھلانی ہموار زینے پر نیچے کی طرف لے

چلا۔ کنوئیں کی پانچ منزلیں تھیں۔ ہر منزل کے برج میں سے سمیری سپاہی مجھے دیکھتے اور اپنی زبان میں گالیاں دیتے اور قہقہے لگاتے تھے۔ ڈھلانی زینے کے کنارے کہیں کہیں میں نے انسانی کھوپڑیاں اور ہڈیاں بکھری ہوئی دیکھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ ان قیدیوں کی کھوپڑیاں ہیں جنہوں نے آج سے بیس برس پہلے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ چاہ بابل کی آخری منزل کی تہہ میں پہنچتے ہی دن کی روشنی ماند پڑ گئی اور زمین دوز تہہ خانوں کی نم آلود ناگوار ہوا نے میرا خیر مقدم کیا۔ کنوئیں کی تہہ میں بھی ایک تنگ دروازہ تھا جو تہہ خانوں کی تنگ و تاریک بیمار اور منحوس دنیا میں کھلتا تھا۔ یہ دروازہ لوہے کا تھا اور اس کے باہر دو اسلحہ پوش دربان پہرہ دے رہے تھے۔ دروازے کا ایک پٹ کھول کر مجھے اندر دھکیل دیا گیا۔ دروازے کے اوپر لوہے کی جالی دار پٹی تھی۔ اس پٹی کی جالی میں سے کنوئیں میں پھیلی ہوئی دن کی نم آلود دھیمی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں اس بیمار پھیکی روشنی کی رہنمائی میں آگے بڑھا۔ میں جھک کر چل رہا تھا کیوں کہ طویل اور عریض تہہ خانے کی چھت بہت نیچی تھی۔ فضا میں بیماری اور گندگی کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ کسی کسی تہہ خانے کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے انسان کے کراہنے کی آواز سنائی دیتی۔ ان تہہ خانوں کے در کھلے تھے اور اندھیرے میں مقہور و معتوب انسان گندے چیتھڑوں کے ڈھیر کی طرح پڑے تھے۔ نصف مربع میل میں پھیلے ہوئے اس تنگ و تاریک زمین دوز تہہ خانے میں گول دیوار کے ساتھ ساتھ بے شمار کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں جہاں صبح اور شام اندھیرا چھایا رہتا۔ وسط کے پتھریلے ستونوں میں جگہ جگہ پانی کے بڑے بڑے لکڑی کے کپے رکھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی لکڑی کے بڑے مرتبان بھی تھے جو خشک سوکھی روٹیوں کے ٹکڑوں سے بھرے ہوئے تھے۔ قیدی جانوروں کی طرح رینگتے ہوئے آتے اور ان کپوں میں سے پانی نکال کر اپنے لکڑی کے پیالے بھرتے اور ان میں خشک ٹکڑے ڈبو کر کھاتے اور جانوروں کی طرح رینگتے ہوئے واپس اپنے تہہ خانوں میں چلے جاتے۔ وہ کئی کئی سالوں سے وہاں پڑے تھے اور اب ایک دوسرے سے بات کرنا بھی بھول چکے تھے۔ ان کا حافظہ ختم ہو گیا تھا۔ اور وہ اپنی زبان بھی بھول چکے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا کہ جو برص اور کوڑھ کے مرض میں مبتلا نہ ہو۔ ہفتے میں ایک بار حمورابی کے سپاہی منہ سر پر کپڑا لپیٹ کر یہاں آتے اور مرتبانوں میں سوکھے ٹکڑے اور پانی بھر کر واپس چلے جاتے۔ اگر انہیں کسی قیدی کی لاش لالٹین کی روشنی میں نظر آتی تو اسے رسے کی مدد سے کھینچ کر باہر لے جا کر جلا ڈالتے۔

مجھے چاہ بابل کی اس ننگ انسانیت عقوبت گاہ میں سوائے اس کے اور کوئی تکلیف

نہیں تھی کہ میری آزادی سلب کر لی گئی تھی اور میں کھلی فضاؤں اور سورج کی روشنی میں سانس لینے سے محروم ہو گیا تھا۔ میں اس حقیقت سے بھی باخبر تھا کہ میں ابھی مر نہیں سکتا۔ سمیری سپاہیوں کی تلواریں اور بھالے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور میں جب چاہوں یہاں سے نکل سکتا ہوں۔ لیکن میری آزادی ان چار انسانوں کے لئے اذیت ناک موت کا پیغام لے کر آتی جو ایک ستم ظریفانہ اتفاق سے میرے ماں باپ اور بہن بھائی بن چکے تھے۔ اس لئے مجھے یا تو اس وقت تک اس عقوبت گاہ میں رینگتے ہوئے آفت زدہ کیڑے مکوڑوں کی طرح زندہ رہنا تھا جب تک کہ میرے مصنوعی ماں باپ اور بہن بھائی بابل سے بحفاظت نکل کر اپنے آبائی ملک ملاکہ نہیں چلے جاتے اور یا پھر مجھے انتہائی رازداری اور خفیہ طریقے سے کچھ اس انداز سے فرار ہونا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ میں نے ایک خالی تہہ خانے میں اپنا ٹھکانہ بنا لیا تھا اور سارا سارا دن ٹھنڈے نم دار پتھروں کی دیوار کے ساتھ لگا مرض آلود تاریکی میں اپنی مقتول محبوبہ روکاش..... اور اپنی بیوی کی یاد میں گم رہتا جو مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئی تھی۔ کبھی میں فرعون مصر کے شاہی محلات کی خوشبو اڑاتی فضاؤں میں سانس لیتا تھا اور اپنی حسین بیوی اور دوستوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کیا کرتا تھا اور پھر ایک وقت وہ تھا کہ میں موہنجودڑو کے کاہن اعظم کے روپ میں صندل و عنبر کی خوشبوؤں میں اپنی محبوبہ روکاش کو ..... رقص کرتے دیکھتا تھا اور آج یہ عالم ہے کہ چاہ بابل کے تاریک نہاں خانے میں بے یار و مددگار پڑا تھا جہاں نہ کبھی سورج طلوع ہوتا تھا اور نہ کبھی آسمان پر ستارے چمکتے تھے۔ ایک تاریک ترین طویل ترین اندھیری رات تھی جس کا کوئی ستاروں بھرا آسمان نہ تھا۔ کوئی آغاز اور انجام نہ تھا۔ میں بیڑیوں کی جھنکاریں اور مرتے ہوئے انسانوں کی کراہیں سنتا۔ چھپکلیاں اور زہریلے بچھو میری ٹانگوں سے ہوتے ہوئے گزر جاتے۔

چونکہ میں بھوک' نیند' بیماری اور موت سے بے نیاز تھا اس لئے کبھی کبھی اٹھ کر جھکے جھکے اندھیرے تہہ خانوں کے قریب سے گزرتا اور بد قسمت قیدیوں کی اندھیرے میں چمکتی ہوئی زرد بیمار آنکھیں دیکھتا اور ان کی کراہیں سنتا رہتا تھا۔

چاہ بابل کے عقوبت خانے میں آئے مجھے نہ جانے کتنے دن گزر چکے تھے۔ میں وہاں سے خفیہ طور پر فرار ہونے کے منصوبے بناتا رہتا مگر میں کوئی ایسا منصوبہ نہ بنا سکا کہ جس پر عمل کرتے ہوئے میں چاہ بابل سے فرار بھی ہو جاؤں اور کسی کو کانوں کان خبر پتہ بھی نہ چل سکے۔ اندھیرے میں گویا ایک تاریک سرنگ میں سے گزر رہا تھا۔ کچھ خبر نہ تھی کہ کب باہر دن نکلا اور کب رات آئی اور کتنا وقت گزر گیا؟ ایک دن یا ایک رات کو خدا جانے کیا وقت تھا کہ مجھے آہنی بیڑیوں کی دھیمی دھیمی جھنکار کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز میرے تہہ خانے

سے کچھ دور چھت کے نیچے آ کر رک گئی۔ میں رینگتا ہوا اپنے تہہ خانے سے باہر نکل آیا اور اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میری آنکھوں میں ایسی طاقت تھی کہ اندھیرے میں بھی مجھے چیزیں دھندلی دھندلی دکھائی دے جاتی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ پندرہ بیس قدموں کے فاصلے پر پتھریلے ستون کے پاس ایک انسانی سایہ جھکا ہوا اور لکڑی کے کپے میں سے پانی نکال کر پی رہا تھا۔ میں نے کوئی اہمیت نہ دی کیوں کہ قیدی کسی نہ کسی وقت ان کپوں کے پاس آ کر پانی پیا کرتے تھے لیکن مجھے انسانی آواز سنائی دی۔ میں نے غور سے دیکھا کہ یہ اجنبی قیدی پانی کے دو گھونٹ پینے کے بعد چھت کی طرف اپنا چہرہ اٹھائے گڑگڑائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"اے رب ذوالجلال! میرے گناہ معاف فرما دے۔ میں نے تیرے احکام کی خلاف ورزی کی - میں سیدھے راستے سے بھٹک گیا تھا۔ میرے نفس نے مجھے دھوکہ دیا۔ تو مجھے معاف کر دے۔"

میں نے محسوس کیا کہ یہ قیدی دوسرے قیدیوں سے مختلف تھا۔ اس کے حواس قائم تھے اور اس کی آواز میں خدائے ذوالجلال کے حضور ایک عاجزی تھی اور وہ بڑی صاف اور سادہ زبان میں دعا مانگ رہا تھا۔ میں اپنے بیڑیوں میں جکڑے ہوئے پاؤں آہستہ آہستہ اٹھاتا اس کی طرف بڑھا۔ جب اس اجنبی قیدی کے قریب پہنچا تو اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک باریش حسین ترین نوجوان ہے جس کی آنکھوں میں ابھی تک ملکوتی چمک اور مقناطیسی کشش باقی ہے۔ اس کے گھنے سیاہ بال اس کے چوڑے شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں اور اس زبوں حالی میں بھی چہرے پر ایک جلال ہے۔ وہ میری طرف شفقت بھری مہربان نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے بڑے ادب سے سوال کیا۔ "آپ کا تعلق کس قوم سے ہے اور آپ اس عقوبت گاہ میں کیسے آئے؟؟"

اس مرد پر جلال نے ایک پل کے لئے مجھے اپنی چمکیلی روشن آنکھوں سے گھور کر دیکھا۔ پھر یوں گویا ہوا۔

"اے نوجوان میرا نام ہاروت ہے - میرا ایک ساتھی بھی اسی چاہ بابل میں تصور عبرت بنا زندگی کے تاریک دن بسر کر رہا ہے۔ اس کا نام ماروت ہے۔ ہم دونوں خداوند کریم کے برگزیدہ اور عبادت گزار بندے تھے۔ ہم علائق دنیا سے بے نیاز صبح و شام اپنے رب کی عبادت میں محو رہتے تھے۔ اس شبانہ روز عبادت سے ہمارے دل میں ایک احساس برتری پیدا ہو گیا۔ ہم دنیا والوں سے دور رہ کر پہاڑ کی چوٹی پر خدا کی عبادت کیا کرتے تھے۔ ہم نے اپنے آپ سے کہا کہ دنیا کا کوئی لالچ کوئی گناہ ہمیں اپنی طرف راغب نہیں کر سکتا۔ پھر ایسا

ہوا کہ خداوند کریم کی طرف سے ہمیں حکم ملا کہ ہم دنیا والوں کے درمیان جائیں اور انہیں گناہ سے باز رہنے کی تلقین کریں اور نیکی کی راہ دکھلائیں۔ ہم بہت بڑے عبادت گذار تھے اور ہمیں یقین تھا کہ دنیاوی لالچ اور نفسانی خواہشات پر ہم نے فتح حاصل کر لی ہے لیکن شاید بڑائی اور برتری کا جو احساس ہمارے اندر پیدا ہو گیا تھا خدا کو پسند نہیں آیا تھا۔ جب ہم دنیا والوں کے درمیان آئے تو ہم نے دیکھا کہ لوگ فسق و فجور میں مبتلا تھے اور گناہ کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے۔ ہم ان کی زبوں حالی کو ایک نگاہ تحقیر سے دیکھتے اور گناہوں سے بچنے کی تلقین بھی کرتے۔ پھر ایسا ہوا کہ عبادت کا غرور ہمارے سامنے آ گیا اور ہم خود ان لوگوں کے گناہوں کی دلدل میں دھنستے چلے گئے۔ ہماری پارسائی کا دامن آلودہ ہو گیا اور ہم احکام خداوندی کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے اور ہم پر عذاب خداوندی نازل ہوا اور ہمیں چاہ بابل میں پھینک دیا گیا۔ اب ہم اپنی الگ الگ کوٹھریوں میں پڑے ہر لمحہ خداوند کریم سے اپنے گناہ اور تکبر کی معافی مانگتے رہتے ہیں اور گڑگڑا کر دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم پر رحم فرمائے اور ہمارے گناہ بخش دے۔"

ہاروت مجھے اپنے ساتھی ماروت کی کوٹھری میں لے گیا۔ ماروت بھی ایک وجیہہ اور شکیل نوجوان تھا مگر چاہ بابل کے عذاب میں گرفتار ہو کر خدا سے عفو و درگذر کا طالب تھا۔ ان دونوں کے روشن چہروں پر اب بھی پارسا اور عبادت گذار انسانوں کی چمک اور نور تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے خداوند کریم نے ان کے گناہوں کو معاف کر دیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور کس جرم کی پاداش میں مجھے چاہ بابل کے تاریک نہاں خانوں میں جھونک دیا گیا ہے۔ میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کس وجہ سے' ہو سکتا ہے اپنے گناہوں کی پاداش کے باعث میری صحیح شناخت نہیں کر سکے تھے اور انہیں کشف کے ذریعے علم نہ ہو سکا تھا کہ میں خدا کا ایسا بندہ ہوں جس کو کچھ عرصے کے لئے خدا کے حکم سے موت سے بے نیاز کر دیا گیا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں ملک مصر کا رہنے والا ہوں بابل میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ میں بادشاہ کے محل میں کفش بردار غلام ہو گیا اور پھر میری عقل پر پردہ پڑ گیا اور ایک رات بادشاہ حمورابی کی بھانجی شہزادی اسارا کی خواب گاہ میں جا نکلا اور پکڑا گیا۔ ہاروت نے پوچھا۔

"کیا تم نے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی؟؟"

میں نے ہاروت اور ماروت کو اپنی وہی بابل میں داخل ہونے کے بعد کی کہانی بیان کر دی اور بتایا کہ اگر میں یہاں سے فرار ہو گیا تو بادشاہ میرے بوڑھے ماں باپ اور میری بہن اور چھوٹے بھائی کو پکڑ کر بہت بری طرح سے ہلاک کروا دے گا۔ اس لئے میں اس اذیت

گاہ میں رہنے پر مجبور ہوں۔

"تمہارے ماں باپ بابل شہر سے کسی دور دراز ملک میں کیوں نہیں چلے جاتے۔ پھر تم یہاں سے فرار ہونے کے لئے آزاد ہو گے" ماروت نے کہا

میں نے جواب دیا۔ "میرے پاس یہاں ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے مجھے یہ پتہ چل سکے کہ میرے ماں باپ اور بہن بھائی بھی بابل چھوڑ کر اپنے وطن واپس جا چکے ہیں۔"

ہاروت اور ماروت خاموش ہوگئے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں - دونوں ہاتھ جوڑ کر اوپر اٹھائے اور منہ ہی منہ میں خداوند کریم سے اپنی لغزشوں کی معافی طلب کرتے ہوئے آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگے۔ میں بھی خاموش تھا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ کس طریقے پر عمل کروں کہ بڑی خاموشی کے ساتھ چاہ بابل سے فرار ہو جاؤں۔ اس کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ تھا کہ میں غائب ہو جاؤں۔ مگر غائب نہیں ہو سکتا تھا اور ویسے اگر سمیری سپاہیوں سے لڑ بھڑ کر اور انہیں ہلاک کرتے ہوئے چاہ بابل سے فرار ہوتا ہوں تو سب کو میرے فرار کا علم ہو جائے گا اور میرے بعد چار انسانوں کو بے دردی سے قتل کرا دیا جائے گا۔ یہ چار بے گناہ انسان میرے پاؤں کی زنجیر بن گئے تھے اور مجھے چاہ بابل سے باہر قدم نہیں رکھنے دیتے تھے۔

اس ہولناک مقام پر وقت یوں گذر رہا تھا جس طرح کوئی کالا سانپ جگہ جگہ سے زخمی ہونے کے بعد کھیت میں رینگ رہا ہوتا ہے۔ اور اپنی موت کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے۔ چاہ بابل کے قیدی بھی اسی زخمی سانپ کی طرح وقت کی تاریک بھیانک سرنگ میں رینگتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے اور یہ منزل تھی ان کی موت۔ ان کی زندگی کے دکھوں کی نجات دہندہ موت! لیکن میری منزل موت نہیں تھی۔ میں صدیوں سے زندہ تھا اور ابھی کئی صدیوں تک مجھے زندہ رہنا تھا۔ شاید ایک برس گذر گیا۔ اس عرصے میں کئی قیدی موت کی نیند سو گئے اور ان کی کوڑھ زدہ لاشوں کو رسیوں سے کھینچ کر باہر لے جا کر سپرد آتش کر دیا گیا۔ ایک روز میرے ساتھ والے تہہ خانے میں ایک بدقسمت قیدی نے داعی اجل کو خوشی خوشی لبیک کہا۔ تین دن گذر گئے - میں نے جب وہ مرا تو تھوڑی دیر بعد زمین پر پتھر سے لکیریں کھینچنا شروع کر دیں۔ میرے اندازے کے مطابق ہر ایک لکیر کے درمیان آدھی ساعت کا وقفہ تھا۔ میرے حساب سے جب تین دن گذر گئے تو لاش سے عفونت اٹھنے لگی پھر دو سمیری سپاہی منہ سر لپیٹے رسے ہاتھ میں لئے آئے۔ انہوں نے لاش کے پاؤں میں رسے باندھے اور اسے گھسیٹتے ہوئے زمین دوز تہہ خانے کے دروازے سے باہر لے گئے۔

میں انہیں لوہے کے بڑے دروازے کے اوپر والی پتھریلی جالی سے لگا دیکھ رہا تھا۔ لاش

کو وہ چاہ بابل کی دیوار کے ساتھ گول چکر کی شکل میں اوپر جاتے ہموار زینے پر کھینچے لئے جا رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لاش کو چاہ بابل سے باہر جا کر جلاتے تھے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح چمکا۔ یہ خیال اس سے پہلے میرے ذہن میں نہیں آیا تھا اور میں حیران تھا کہ اس قدر اچھوتا خیال مجھے پہلے کیوں نہیں سوجھا۔ میں پاؤں کی بھاری بیڑیاں گھسیٹتا واپس اپنی کوٹھری میں آ گیا۔ میں نے دروازے کی جالیوں میں سے دیکھ لیا تھا کہ باہر دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اب میں ساعتوں کو اندازے کے مطابق شمار کرتے ہوئے ایک خاص وقت کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ تین دن بعد دو سپاہی مرتبان میں سوکھے ٹکڑے اور مٹکوں میں پانی ڈالنے آئیں گے - میں نے ایک ایک ساعت کا حساب رکھنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہاروت اور ماروت کے پاس گیا اور انہیں اپنی ترکیب بتائی اور کہا کہ میں اس جہنم سے فرار ہو رہا ہوں۔۔

"مگر اس ترکیب پر عمل کرو گے تو تم آگ میں جل کر راکھ ہو جاؤ گے۔" ہاروت نے کہا

میں نے کہا "یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں کہ میرا انجام کیا ہو گا۔ بہرحال میں آپ سے یہ عرض کرنے کے لئے آیا تھا کہ باہر جاتے ہی میں آپ کو بھی اس جہنم سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔"

ماروت نے آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور کہا "اے دوست!! ہم بادشاہ حمورابی کی گرفت میں نہیں ہیں بلکہ ہم خدا کے عذاب کی گرفت میں ہیں۔ جب ہماری گرفت کی مدت پوری ہو جائے گی تو خداوند کریم ہمیں معاف کر دے گا اور وہ خود ہمیں اس جہنم سے نجات دلا دے گا۔ ہمیں کسی دنیاوی مدد کی حاجت نہیں ہو گی۔"

...میں خاموش رہا۔ کیوں کہ ان راسخ العقیدہ نوجوانوں کو قائل کرنا بہت مشکل تھا اور ان کی زندگیوں کے طریق کار کو سامنے رکھا جائے تو وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔

بہرحال میں نے اپنی ترکیب پر عمل کرنے کے لئے ساعتوں کے حساب سے ایک خاص وقت چن لیا اور ایک ستون کے پاس آ کر پانی کے آدھے خالی مٹکے کے پاس آ کر یوں لیٹ گیا جیسی میں نے دم توڑ دیا ہو۔ میں دیر تک وہاں پڑا رہا۔ ایک دو کوڑھی قیدی رینگتے ہوئے پانی لینے کے لئے میرے قریب سے گذر کر مٹکے کے پاس گئے۔ انہوں نے ایک پل کے لئے رک کر میرے چہرے کو اپنی اداس سیاہ حلقوں والی ویران آنکھوں سے دیکھا۔ ایک دوسرے سے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر نقاہت اور بیماری کی شدت کے باعث ان کے حلق سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ صرف ایک خرخراہٹ کی ڈراؤنی آواز بلند ہوئی اور وہ جانوروں کی طرح پانی

پی کر رینگتے ہوئے اپنی بیڑیوں کو جھنجھناتے ہوئے واپس چلے گئے۔

مجھے معلوم تھا کہ میرے حساب کے مطابق سمیری سپاہیوں کو ایک دن بعد سر شام پانی اور روٹی کے سوکھے ٹکڑے رکھنے آنا تھا اور میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ صرف دو ایک ساعتوں کا فرق رہا۔ میں سیدھا چت لیٹنے کی بجائے کسی ایسی لاش کی طرح ٹیڑھا ہو کر پڑا تھا جس کی جان بڑی اذیت کے عالم میں نکلی ہو۔ سمیری سپاہی سیدھے پانی والے خالی مٹکے کی طرف آئے۔ میری لاش ان کے راستے میں ہی پڑی تھی۔ انہوں نے مجھے پاؤں کی ٹھوکر ماری اور میری گردن پر پاؤں رکھ کر میرا چہرہ اوپر کیا۔ میں نے سانس روک رکھا تھا۔ وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔

"کم بخت اس غلیظ کیڑے کو ہمارے راستے میں ہی دم توڑنا تھا۔"

"اسے یہیں پڑا رہنے دو۔ تین روز پہلے ایک لاش لے جا کر جلائی ہے۔ کچھ اور غلیظ کیڑے دم توڑیں گے تو اکٹھی لاشیں لے جائیں گے۔"

"نہیں بھائی! لاش کی عفونت بہت جلد پھیل جاتی ہے۔ باہر والوں کو بدبو آ گئی تو وہ ہمیں بھی اس جہنم میں پھینک دیں گے۔ تم جا کر رسی لاؤ ..... اس کو ابھی لے جا کر آگ میں پھینک دیتے ہیں۔"

میں ان کی گفتگو سن رہا تھا او چپ تھا اور دل میں خوش ہو رہا تھا کہ انہوں نے میری لاش کو وہاں سے ہٹانے میں دیر نہیں کی تھی۔ ایک سپاہی مٹکے میں پانی ڈالنے لگا اور دوسرا رسی لینے چلا گیا۔ بہت جلد وہ رسی کا گچھا لے کر آ گیا۔

پہلا کہنے لگا۔ "بدبخت ابھی ابھی مرا لگتا ہے۔ اس کے جسم سے ابھی بدبو اٹھنا شروع نہیں ہوئی۔"

انہوں نے دونوں ٹخنوں کی بیڑیوں میں رسی باندھی اور مجھے گھسیٹتے ہوئے چاہ بابل کے تہہ خانے کے آہنی دروازے کی طرف بڑھے۔ میری "لاش" پتھروں پر سے اچھلتی ہوئی گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔ مگر مجھے ذرا سی بھی چوٹ نہیں آ رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ پھر میری "لاش" آہنی دروازے کے قریب پہنچی تو مجھے دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ذرا سی آنکھ کھول کر دیکھا۔ دروازے میں سے روشنی نکل کر میرے جسم پر پڑنے لگی تھی۔ میں نے جلدی سے آنکھ بند کر لی اور دم سادھ لیا۔ میری لاش تہہ خانے کی جہنمی تاریکی سے نکل کر چاہ بابل کی تہہ کی دھندلی دھندلی روشنی میں آ گئی۔ مجھے اپنے بند پپوٹوں کے اندر خدا جانے کتنی مدت کے بعد خون کی سرخی جھلکتی دکھائی دی۔ میری لاش کو ایک گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ دیا گیا اور گھوڑا کشادہ ہموار زینے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔

دوسرا سپاہی گھوڑے پر سوار آگے آگے جا رہا تھا۔ میری لاش کشادہ زینے کی مٹی پر گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔ گرد او مٹی نے میرے چہرے کو چھپا دیا تھا۔ میں نے راستے میں ایک بار تھوڑی سی آنکھ کھول کر دیکھا۔ میرا سارا جسم مٹی اور گرد و غبار میں اٹا ہوا تھا اور میں بانہیں پیچھے پھیلائے پاؤں کی طرف سے چڑھائی پر گھسٹتا جا رہا تھا۔ میرا سر اچھل اچھل کر زمین سے ٹکرا رہا تھا۔ اگر موت نے مجھے معاف کرنے کے بعد اکیلا نہ چھوڑ دیا ہوتا تو میں چاہ بابل کی چڑھائی کی پہلی منزل پر ہی موت کی وادی میں اتر گیا ہوتا۔

گھوڑا چاہ بابل کی پانچویں منزل پر دروازے پر آ کر رک گیا۔ یہاں دربان نے اپنی نگرانی کے برج میں سے نکل کر میری شکل و صورت کو غور سے جھک کر دیکھا اور میری گردن پر زور سے ٹھوکر مار کر کہا۔ "اس غلیظ پلے کو لے جا کر آگ لگا دو۔" چاہ بابل سے پچاس قدم کے فاصلے پر ایک گڑھا تھا جس میں سوکھی لکڑیاں اور جھاڑ جھنکار پڑا ہوا تھا۔ میرے پاؤں کی رسی کاٹ کر میری "لاش" کو اس میں پھینک دیا گیا۔ میں سوکھی شاخوں اور جھاڑ جھنکار کے اوپر گر پڑا۔ اور خدا کا شکر ادا کیا کہ چاہ بابل کے دوزخ سے باہر نکل آیا تھا۔۔۔ سپاہیوں نے میرے اوپر لکڑیاں اور شاخیں ڈال دیں پھر ایک مرتبان میں سے رال میرے اوپر انڈیل دی اور ایک مشعل کو آگ لگا کر جو پھینکی تو جھاڑ جھنکاڑ اور سوکھی شاخوں نے ایک دم سے آگ پکڑی اور وہ دھڑا دھڑ جلنے لگیں۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے دیکھا کہ میں آگ کے سرخ بادل میں گھرا ہوا تھا اور سرخ زرد نیلے شعلے کڑکڑاتے شور مچاتے پھنکارتے میرے جسم کو چاٹ رہے تھے۔ میرے جسم پر جو چیتھڑے باقی رہ گئے تھے سارے جل گئے میں اب آگ کی سیج پر چت لیٹا ہوا تھا۔ آگ میں زندہ نہ جلنے کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا۔ آگ میرے سارے جسم کو چاٹ رہی تھی مگر مجھے ایک پل کے لئے بھی گرمی، تپش یا معمولی سی آنچ بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میرے سر کے بال اور آنکھوں کی پلکیں تک اپنی جگہ پر قائم تھیں۔ بس مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں روشنیوں کے کسی بگولے کے اندر غوطہ زن ہوں اور تیز ہوا چل رہی ہے۔

جس وقت مجھے سپرد آتش کیا گیا تھا اس وقت شام غروب ہو رہی تھی۔ میں یہی چاہتا تھا اور اسی ساعت کے حصول کے لئے میں نے چاہ بابل کے اندر ایک ایک پل لکیریں کھینچ کھینچ کر حساب لگا رکھا تھا۔ اب میں آگ کے سمندر میں غرق شعلوں کے تھپیڑے سہتا رات کی تاریکی کے چھا جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ گڑھے کے اندر بھڑکتے بھڑکتے آگ کافی حد تک مدھم پڑ چکی تھی۔ میرے نیچے اور اوپر اب دہکتے ہوئے انگارے اور سرخ راکھ تھی۔ میں نے ہاتھ ہلا کر ادھر ادھر ٹٹولا۔ وہاں انسانی ڈھانچوں کی ہڈیاں اور کھوپڑی کو بھی ان ہی میں شمار

کر لیا جائے گا اور یہی میری اسکیم تھی۔ آگ کچھ اور مدھم ہوئی تو مجھے اوپر آسمان پر ستارے چمکتے نظر آنے لگے۔ دہکتی آگ اور بچے کچھے شعلوں کی وجہ سے گڑھے کے اوپر تک روشنی تھی۔ اس روشنی میں مجھے باہر نکلتے دیکھا جا سکتا تھا۔ میں آگ کے بجھنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب رات کافی گہری ہو گئی تو آگ بجھ گئی۔ اب راکھ کے اندر ہی انگارے دبے ہوئے رہ گئے تھے۔ میں نے آگ کی سیج پر سے سر اٹھا کر دیکھا۔ میرے سارے جسم کو راکھ آلود انگاروں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ گڑھے کے باہر گہری خاموشی اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

میں نے ایک جھرجھری سی لی۔ میرے جسم پر سے ساری راکھ اور انگارے جھڑ گئے۔ میں آہستہ سے آگ کے بستر پر سے اٹھا اور انگاروں پر گھٹنوں کے بل چلتا گڑھے کے کنارے پر آ گیا۔ یہ جگہ مسلسل آگ میں پکنے کی وجہ سے سخت ہو گئی تھی اور کھنگروں کے کنارے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ میں ان نوکیلے پکے ہوئے کھنگروں کو پکڑتا اور ان پر پاؤں رکھتا گڑھے سے باہر آ گیا۔ باہر نکلتے ہی میں زمین پر لیٹ گیا اور سر ذرا سا اٹھا کر چاہ بابل کے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے کے برج کے باہر دو مشعلیں روشن تھیں اور سپاہی چل پھر کر پہرہ دے رہے تھے۔ میری طرف کسی کی توجہ نہیں تھی۔ میں نے ریتلی بنجر زمین پر رینگنا شروع کر دیا۔ میرا رخ چاہ بابل سے پرے بہتے ہوئے دریا کی جانب تھا۔ ستاروں کی نیلی دھندلی روشنی میں دور دریا کا پاٹ نظر آ رہا تھا۔ کنارے پر کہیں کہیں زیتون کے درختوں کے جھنڈ رات کی تاریک خاموشی میں ساکت کھڑے تھے۔ میں کافی دور تک زمین پر رینگتا چلا گیا۔ میرے پاؤں میں جو لوہے کی بیڑیاں تھیں وہ لوہے کی جہنمی آگ کی شدت میں پگھل کر بہہ چکی تھیں۔ دریا مجھ سے کوئی نصف فرلانگ کے فاصلے پر ہو گا کہ میں اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے دریا کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ اس سنسان علاقے میں کوئی پرندہ تک نہیں بول رہا تھا۔ دریائے فرات کی وادی موت کے سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دریا پر پہنچ کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دو اونچے نیچے ٹیلوں پر بابل کے مکان سیاہ دھبوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ شاہی محل کے برجوں میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

میں نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ دریائے فرات کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ وہ آج کے پاکستان کی کسی بڑی نہر جتنا تھا۔ میں تیرتا ہوا دریا کے دوسرے کنارے پر نکل آیا۔ کنارے کی جھاڑیوں اور نرسلوں میں بیٹھ کر میں نے ایک بار پھر اپنے سارے جسم کو دیکھا۔ کسی جگہ پر جلنے کا ذرا سا بھی نشان نہیں تھا۔ نہ کہیں کوئی آبلہ پڑا تھا۔ مجھے پورا پورا یقین ہو گیا کہ خواہ کچھ عرصے کے لئے ہی سہی مگر میں موت کی گرفت سے نکل چکا ہوں۔ دیر تک دریائی جھاڑیوں میں بیٹھا میں اپنی حالت اور آنے والے واقعات و حادثات کے امکانات

پر غور کرتا رہا۔ اس وقت میرے لئے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ میں فطری لباس میں تھا۔ مجھے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ مجھے کچھ گھڑسوار دریا کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ شاید یہ رات کو پہرہ دینے والا دستہ تھا۔ میں نے دریا میں چھلانگ لگا دی اور لہروں کے بہاؤ پر تیرنے لگا۔ میں نے اپنے آپ کو دریا کی سرد لہروں کے حوالے کر دیا۔ رات ڈھلنا شروع ہو گئی۔ ستاروں کی چمک ماند پڑتی گئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دریا کے دونوں کناروں پر کوئی آبادی نہیں تھی۔ آج سے سوا تین ہزار سال پہلے آبادی صرف شہروں اور ان کے آس پاس چند ایک دیہات تک ہی محدود ہوا کرتی تھی۔ کوسوں تک زمین ویران اور بے آباد ہوتی تھی۔ دن نکل آیا۔ دھوپ میں میدانوں کی ریت چمکنے لگی۔ میں دریائے فرات کی لہروں پر بہا چلا جا رہا تھا۔ اب مجھے واپس بابل جانے کی حاجت نہیں تھی کیوں کہ شاہ حمورابی اور اپنے فرضی ماں باپ اور بہن بھائی کے لئے میں مر چکا تھا اور میری لاش جلا دی گئی تھی۔

دریا کا پاٹ ایک ریتلی وادی میں سے گذرتے ہوئے چھوٹا ہو گیا تھا وہ ریت کے ٹیلوں کے درمیان سے ایک طرف مڑ گیا تھا۔ یہاں کنارے پر ایک جگہ زیتون اور کھجور کے جھنڈ تھے۔ میں نے ایک چرواہے کو دیکھا جو بھیڑوں کو لئے سرسبز میدان کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی۔ وہ رک گیا اور پلٹ کر مجھے تکنے لگا پھر وہ دریا کے کنارے پر آ کر ٹھہر گیا۔ میں تیرتا ہوا کنارے کے قریب آیا اور کہا کہ میں دریا میں نہانے کے لئے اترا تھا کہ چور میرے کپڑے چرا کر لے گئے۔ کیا تم مجھے کپڑے کہیں سے لا کر دے سکتے ہو؟ چرواہے نے کہا۔ میں ابھی گھر جاتا ہوں اور تمہارے لئے ایک جوڑا لاتا ہوں۔ میں دریا میں کمر تک ڈوبا رہا۔ کچھ دیر بعد چرواہا واپس آیا۔ اس نے مجھے ایک لمبا کرتہ اور تہبند دیا۔ میں تہبند باندھ کر دریا سے باہر آ گیا اور چرواہے کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اس سے راستے کے بارے میں پوچھا کہ آگے کونسا شہر ہے۔ اس نے بتایا کہ آگے یروشلم کا شہر ہے جو بنی اسرائیل کا دارالحکومت ہے۔ میں پیدل ہی یروشلم کی طرف روانہ ہو گیا۔ تین دن اور تین راتیں میں سنگلاخ ریتلے میدانوں اور صحراؤں میں سفر کرتا رہا اور چوتھے روز مجھے دور سے قدیم تاریخی اور مذہبی شہر یروشلم کے ہیکل سلیمانی کا گنبد دکھائی دیا۔ یروشلم ایک وسیع و عریض شہر تھا جس کو بلند فصیل نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ فصیل کے بارہ دروازے تھے اور ہر دروازے پر ایک نگران برج تھا جہاں فوجی دستے دن رات پہرہ دیتے تھے۔ ہیکل سلیمانی شہر کے وسط میں تھا۔ ایک مستطیل نما عمارت تھی جس کے چار دروازے تھے اور کونوں پر مینار بنے ہوئے تھے۔ شہر میں کچھ بے چینی کے آثار پائے جاتے تھے۔ ایک بوڑھا یہودی سرائے کے باہر بیٹھا تخت پر تسبیح پھیر رہا تھا۔ اس سے باتیں کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ بیت

المقدس پر اشوری بادشاہ بخت نصر کے حملے کا خطرہ ہے۔ میں چونکا کیوں کہ ابھی تین دن پہلے بابل پر اشوری بادشاہ حمورابی حکمران تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے تین دنوں میں تاریخ کی شاہراہ پر دو سو برس کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ حمورابی کا عہد ختم ہو چکا تھا اور اب بابل پر بخت نصر حکومت کرتا تھا۔ جو یہودی قوم کا دشمن تھا اور جس نے بابل میں معلق باغات کی بنیاد رکھی تھی۔ میرے پاس اس ملک کا ایک بھی سکہ نہیں تھا۔ اگرچہ میں کھانے پینے اور سونے سے بے نیاز تھا پھر بھی شہر میں رہنے کے لئے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔ میں نے سرائے میں سامان ڈھونے اور اونٹوں پر لادنے کا کام شروع کر دیا۔ اس نئے شہر اور نئے عہد میں میری شخصیت کا کوئی تعین نہیں ہوا تھا۔ یعنی میں یروشلم میں عاطون ہی کی حیثیت سے وارد ہوا تھا اور یہاں مجھے ایک یہودی پردیسی کے طور پر جانا جاتا تھا۔ میں نے کچھ دن یروشلم میں رہنے کے بعد دیکھا کہ قرآن حکیم میں بعد میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی جن بداعمالیوں اور نفاق اور احکام الہیہ سے انحراف کا ذکر فرمایا یہ قوم ان کا شکار تھی۔ قبیلے آپس میں برسرپیکار تھے۔ دولت کا حصول ہی زندگیوں کا مقصد اعلیٰ تھا۔ نوجوان نسل بے حیائی اور فسق و فجور میں مبتلا تھی۔ برگزیدہ پیغمبروں کے دیئے ہوئے اخلاقی ضابطوں کو پس پشت ڈال کر دولت اور دنیاوی آسائش کو ترجیح دی جا رہی تھی۔ ہر کوئی دولت کی لوٹ کھسوٹ میں مشغول تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس قوم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہلاکت آفریں لعنت مسلط ہونے والی تھی کیوں کہ ان کے اعمال ایسی ہلاکت کے متقاضی تھے۔

ایک روز شام کے وقت کام سے فارغ ہو کر میں ہیکل سلیمانی کے عقب والے زیتون کے باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ ہیکل سلیمانی سے مناجات پڑھنے کی صدائیں آ رہی تھیں ... باغ ویران ویران سا تھا۔ کچھ گھڑ سوار باغ کے پہلو سے گزرتی کچی سڑک پر سے گھوڑے دوڑاتے گذر گئے۔ پھر کچھ پریشان حال عورتوں اور آدمیوں کو میں نے دیکھا کہ روتے گڑگڑاتے ہوئے ہیکل کے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ سورج یروشلم کی پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا اور فصیل شہر اور ہیکل سلیمانی کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ ہیکل کے اندر سے مناجات کی آوازوں میں آہ و زاری کا رنگ غالب آ گیا تھا۔ میں واپس سرائے میں جانے کے لئے پلٹا ہی تھا کہ اچانک دو حسین نورانی چہروں والے جوان، جن کی پیشانیاں ستاروں کی طرح روشن تھیں اور لباس پاکیزہ اور بے داغ تھا میرے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے ان کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ میں ابھی اسی تذبذب میں تھا کہ ان میں سے ایک نورانی شخص نے کہا۔

"تم نے ہمیں پہچانا نہیں۔ ہم چاہ بابل کے جہنم میں ایک ساتھ رہے ہیں۔"

اب میرے لئے ان کی شناخت کوئی مشکل نہیں تھی۔ وہ ہاروت اور ماروت تھے خدا کے برگزیدہ بندے جن سے ایک کوتاہی سرزد ہوئی اور خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئے۔ میں نے ان کی تعظیم کی اور پوچھا کہ وہ چاہ بابل سے کب فرار ہوئے؟ کیوں کہ اس واقعے کو میرے اندازے کے مطابق دو سو برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ہاروت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"عزیز بھائی! خدا نے ہمارے گناہ معاف فرما دیئے اور ہماری سزا معاف کر دی۔ اس کی رحمت نے ہمیں بخش دیا ہم نے اپنی کوتاہیوں سے توبہ کی اور سیدھی راہ پر آ گئے۔ پھر ہمیں چاہ بابل سے فرار ہونے کی حاجت نہیں تھی۔ جس خداوند برتر نے ہمارے گناہ معاف فرما دیئے تھے وہ ہمیں چاہ بابل سے نکال بھی سکتا تھا۔"

میں نے ان سے سوال کیا کہ وہ دو سو برس سے زندہ ہیں؟ یہ سوال براہ راست تھا۔ ہاروت نے اپنی خوبصورت آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں جس پر ڈوبتے سورج کی سرخی جھلک رہی تھی اور کہا۔

"وقت کیا ہے؟ وقت خدا کی رحمت اور دلیل ہے اور جاری و ساری ہے اس کے نور کی طرح -- تم ابھی بہت کچھ نہیں جانتے۔ تاریخ اور انسانی تہذیبوں کے نشیب و فراز تمہیں بہت کچھ سکھا دیں گے۔ تم انسانوں میں سے خوش قسمت ہو کہ آنے والے نیک بندوں کے روشن چہرے دیکھو گے اور انہیں درس انسانیت دیتے سنو گے۔"

ہاروت نے آہستہ سے کہا۔

"بنی اسرائیل پر اللہ نے بڑی رحمتیں نازل فرمائیں مگر اس قوم نے قوانین خداوندی سے انحراف کیا اور نفاق اور بداعمالیوں میں مبتلا ہو گئی۔ اس قوم پر ایک عبرت انگیز ہلاکت نازل ہونے والی ہے۔ میں تمہیں یہ نہ کہوں گا کہ یہاں سے نکل جاؤ۔ کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ تم اس سبق آموز بربادی کے گواہ بنو گے۔ بخت نصر کی فوجیں اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجانے والی ہیں۔"

میں کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ خداوند کریم کے برگزیدہ بندے مسکرائے اور اس کے بعد جو دیکھا تو باغ میں کوئی بھی نہیں تھا۔ لوگ روتے آہ و زاری کرتے ہیکل کے دروازے کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔ یروشلم میں چاروں طرف ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔ سپاہ خاص کے دستے قلعے کے دروازے سے نکل کر شہر کی فصیل کی جانب دوڑ رہے تھے۔ فصیل کی درزوں اور برجوں میں تیر کمانوں سے مسلح دستے متعین کئے جا رہے تھے۔ کھولتے ہوئے گرم تیل کے مٹکے فصیل کی دیوار پر پہنچائے جا رہے تھے۔ یروشلم پر حملہ ہونے والا تھا بخت نصر کی فوجیں شہر کے قریب پہنچ چکی تھیں۔

بنی اسرائیل کی تاریخ ماضی کے دبیز پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ عہد نامہ عتیق میں بنی اسرائیل کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے اس کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں تین بیویوں سے تین بیٹے ہوئے۔ حضرت اسحاق' حضرت اسمٰعیل اور مدیان۔ ان میں سے حضرت اسمٰعیل سرزمین حجاز پر' مدیان بحر احمر کے ساحل کے قریب اور حضرت اسحٰق ارض فلسطین میں مقیم ہوئے۔ حضرت اسحاق کے ایک بیٹے کا نام یعقوب اور لقب اسرائیل (مرد خدا) تھا۔ آپ نے چار شادیاں کیں اور ان کے بطن سے بارہ بیٹے پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک حضرت یوسف تھے اور حضرت یوسف کی وجہ سے ان لوگوں کو بڑی عزت و تکریم ملی اور وہ مصر میں ہی سکونت پذیر ہو گئے لیکن حضرت یوسف کے بعد حکومت مصر نے انہیں ایک اجنبی قوم سمجھ کر ان کی سوشل حیثیت کم تر کر دی اور وہ مصر میں غلاموں کی سی زندگی بسر کرنے لگے۔ چار سو برس کی مدت میں یہ قبیلہ بارہ قبائل میں تقسیم ہو گیا۔ یہ بارہ قبائل اب ایک مستقل قوم بن گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی قوم کے ایک فرد تھے۔ ان کی طرز بود و باش اور مذہبی رسومات مصریوں سے بہت مختلف تھی۔ جس زمانے میں حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے وہ زمانہ بنی اسرائیل کے مصائب کا زمانہ تھا۔ حضرت موسیٰؑ منصب نبوت پر فائز ہونے کے بعد بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر وادی سینا میں لے آئے۔ یہاں بنی سرائیل کی ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ حضرت موسیٰؑ نے انہیں غلامانہ زندگی سے نجات دلا کر احکام خداوندی پر چلنے کی تلقین فرمائی لیکن بنی اسرائیل کچھ ہی وقت بعد نافرمانیوں پر اتر آئے اور انہوں نے احکام خداوندی سے انحراف کیا۔ جس کے نتیجے میں یہ قوم چالیس برس تک صحرا میں بھٹکتی رہی۔ پھر حضرت موسیٰؑ نے اس قوم کی ترتیب نو کی اور فلسطین کی سرسبز و زرخیز وادی پر اس قوم کی حکمرانی قائم ہوئی۔ بعد میں حضرت داؤدؑ بادشاہ ہوئے اور انہوں نے بیت المقدس کو دارالحکومت بنایا اور وہاں صیہون کے پہاڑ پر ایک ہیکل تعمیر کرنا چاہا مگر عمر نے وفا نہ کی - آپ کے بعد حضرت سلیمانؑ تخت نشین ہوئے۔ آپ نے اپنے برگزیدہ والد کی خواہش کے مطابق ایک عظیم الشان ہیکل تعمیر کرایا جو بعد میں ہیکل سلیمانی کے نام سے موسوم ہوا۔ بنی اسرائیل اس ہیکل میں اپنی مذہبی رسوم ادا کرنے لگے۔ حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد ان کا بیٹا رجعام تخت نشین ہوا لیکن اس کی حکومت شوکت سلیمانی کو برقرار نہ رکھ سکی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرزمین مصر کے بادشاہ سیق نے یروشلم پر حملہ کر کے اسے تاراج کیا۔ اس وقت بھی بنی اسرائیل باہمی نفاق کا شکار تھے اور ان کی عظیم الشان سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ یہ دونوں سلطنتیں ایک دوسرے کی دشمن اور حریف بن گئی تھیں۔ ایک سلطنت بنی اسرائیل کے دس قبائل (اسباط) کی تھی اور دوسری

سلطنت کا نام اسرائیل تھا۔ اسباط کے لوگ یہودی اور اسرائیل کے لوگ اسرائیلی کہلاتے تھے لیکن بعد میں دونوں کو یہودی کہا جانے لگا۔ روایت کے مطابق ملک صدق کنعان کا بادشاہ تھا اور اسی نے یروشلم کی بنیاد رکھی - اس قوم نے جو یبوسی کہلاتی تھی شہر کا نام یبوسالم رکھا جو پہلے یبوسلم اور پھر یروشلم بن گیا۔

اس عظیم تاریخی شہر کی پوری روایت اور اس قوم کی پوری بداعمالیاں میری آنکھوں کے سامنے تھیں اور میں ان کے نتائج کو نمودار ہوتے دیکھ رہا تھا۔ قومیں جب آپس کے نفاق کا شکار ہو کر ایک دوسرے سے قبائل اور صوبوں کی بنیاد پر برسرپیکار ہو جاتی ہیں تو وہ دوسروں کو اپنے ملک پر حملہ کرنے کی دعوت دیتی ہیں اور دشمن کے لئے راہ ہموار کرتی ہیں۔ ارض موعود کی قوم بھی یہی کچھ کر رہی تھی۔ ان کے آپس کے جھگڑوں' مناقشوں اور نفاق نے اشوری چنگیز خان بخت نصر کو اپنے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی خود دعوت دی تھی اور اس کا عظیم الشان خونخوار لشکر یروشلم کی سرحدوں کے قریب پہنچ چکا تھا اور پھر ایک روز بخت نصر کے لشکر کی منجنیقوں کے بھاری پتھر شہر کی فصیلوں سے ٹکرا کر ہیبت ناک آوازیں پیدا کرنے لگے۔ شہر کی فصیل ایک جگہ سے ٹوٹ کر گر پڑی۔ دشمن نے اس طرف یلغار کر دی۔ بنی اسرائیل کے سپاہی دشمن پر تیر برسانے لگے۔ شگاف میں گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی مگر عیش و عشرت کی دلدادہ اسرائیلی فوج بخت نصر کی فوج کا مقابلہ نہ کر سکی۔ یروشلم فتح ہو گیا۔ بخت نصر کی فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ ہر طرف قتل عام شروع ہو گیا۔ ہر طرف آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ ہیکل سلیمانی کو گرا کر زمین کے ساتھ ملا دیا گیا۔ یہودی گاجر مولی کی طرح قتل ہو رہے تھے۔ میں اپنی سرائے سے نکل کر عقبی گلی کے ایک مکان کی ڈیوڑھی میں آ گیا تھا۔ اگرچہ مجھے دشمن فوج کی تلواروں کا کوئی خوف نہیں تھا لیکن میں یہاں ایک خوبصورت یہودی لڑکی کی خاطر بیٹھا ہوا تھا جس کا نام نفتانی تھا اور جو ایک یہودی تاجر کی اکلوتی بیٹی تھی - پہلے ہی حملے میں اس گھر کے تمام افراد قتل کر دیئے گئے تھے اور اس نے بھاگ کر سرائے میں پناہ لی تھی۔ وہ میرے قدموں میں آ کر گر پڑی تھی اور اس نے اپنی جان بچانے کے لئے فریاد کی تھی۔ میری جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو وہ اس سے بھی یہی فریاد کرتی - میں اسے سرائے سے نکال کر پچھلی گلی کے ایک مکان کی ڈیوڑھی میں لے آیا تھا اور یہاں سے ایک کوٹھری میں چھپا دیا تھا۔ مجھے اس بھولی معصوم صورت یہودی لڑکی نفتانی پر رحم آ گیا تھا اور میں نے اس کی جان بچانے کا دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔

لیکن اس قتل و غارت گری میں ایک حسین صورت لڑکی کو بچا کر نکال لے جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ دو دنوں میں بخت نصر کے سپاہیوں نے ہزاروں یہودی مرد' عورتوں'

بچوں اور بوڑھوں کو قتل کر دیا تھا۔ اور مکان کو آگ لگا دی تھی۔ پھر یہ سپاہی اس گلی میں بھی آ گئے جہاں میں اس یہودی لڑکی کو ایک مکان میں چھپائے ہوئے تھا۔ اشوری سپاہی منہ زور وحشی جانوروں کی طرح للکارتے ہوئے گلی میں داخل ہوئے۔ ان کی تلواریں یہودیوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے ڈیوڑھی کے بند دروازے کے سوراخ میں سے انہیں مکان کی طرف بڑھتے دیکھا تو جلدی سے واپس کوٹھری میں آ گیا۔ یہودی لڑکی نفتانی نے بھی سپاہیوں کے دہشت خیز نعرے سن لئے تھے۔ وہ شاخ گل کی طرح لرز رہی تھی۔ موت کے خوف سے اس کے سرخ و سپید چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اور ہونٹ سوکھ کر سفید ہو گئے تھے۔ میں نے اسے بازو سے پکڑا اور کھینچتا ہوا مکان کے پچھلے کمرے میں لے گیا۔ اسے اندر ڈال کر میں نے دروازہ بند کر دیا اور خود ایک طرف چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے نفتانی کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ کوئی آواز نہ نکالے۔ ایک اشوری سپاہی تلوار لئے ڈیوڑھی کا دروازہ پاؤں کی ٹھوکر سے توڑ کر مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ میں ستون کے پیچھے چھپ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس سپاہی کی شکل سے درندگی ٹپک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ ڈیوڑھی کی کوٹھری کو خالی پا کر وہ لپک کر عقبی کمرے کے دروازے پر آیا اور پاؤں کی ضرب سے دروازہ کھول دیا۔ اندر سے یہودی لڑکی نفتانی کی چیخ بلند ہوئی۔ اشوری سپاہی ایک قہقہہ لگایا اور جوں ہی اندر گھسنے لگا میں اس کے سامنے آ گیا۔

اشوری سپاہی نے ایک لمحے کے لئے میری طرف سرخ خونیں آنکھوں سے دیکھا۔ میں تنہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی بھاری بھرکم تیز دھار والی تلوار اوپر کو اٹھی اور پھر بجلی کی طرح لہراتی ہوئی میری گردن سے پوری طاقت کے ساتھ ٹکرائی۔ اس کا کیا نتیجہ نکلنے والا تھا؟ میں جانتا تھا مگر وہ اشوری سپاہی نہیں جانتا تھا۔ اس نے ایک ایسا ہوش اڑا دینے والا منظر دیکھا جو اس سے پہلے اس کی سپاہیانہ زندگی میں کبھی ظاہر نہیں ہوا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ اس کی تلوار جونہی پوری طاقت کے ساتھ میری گردن سے ٹکرائی تو ایک تیز اور کرخت آواز پیدا ہوئی جیسے تلوار کسی چٹان سے ٹکرا گئی ہو اور بجائے اس کے کہ میری گردن کٹ جاتی اور میرا سر دھڑ سے جدا ہو کر فرش پر گر پڑتا۔ اشوری سپاہی کی مضبوط فولادی تلوار کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک ٹکڑا فرش پر جھنجھناتا ہوا گر پڑا اور دوسرے ٹکڑے کا دستہ سپاہی کے ہاتھ میں رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی مجھے اور کبھی اپنی تلوار کے ٹوٹے ہوئے دستے کو تکنے لگا۔ اس نے سوچا کہ شاید میں نے اپنی گردن کے گرد آہنی گلوبند لپیٹ رکھا ہے۔ اس نے ایک وحشیانہ چیخ کے ساتھ تلوار کا دستہ پھینکا اور پیش قبض کھینچ کر میرے سینے پر وار کر دیا۔ یہ ایک تنومند وحشی سپاہی کا بھرپور وار تھا مگر خنجر کا یہ وار بھی میرے سینے پر ایک خراش تک نہ ڈال سکا۔ میں نے سپاہی کا بازو پکڑ کر اسے زور سے کھینچا۔ یہ میری طاقت کا ایک معمولی سا مظاہرہ تھا۔ قوی ہیکل زرہ پوش سپاہی درخت کی نازک شاخ کی طرح میرے ایک ہی جھٹکے سے فرش پر گر پڑا۔ میرے جھٹکے سے وہ اتنی زور سے پکے فرش سے ٹکرایا کہ اس کا بھیجہ اس کے سر سے نکل کر دور جا پڑا۔ میں نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا۔ یہ پاؤں گویا ہاتھی کا پاؤں تھا۔ کیوں کہ میں نے اس پر اپنا پورا دباؤ ڈال دیا تھا۔ اشوری سپاہی کی چیخ بھی نہ نکل سکی اور اس کی گردن کے منکے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر فرش کے ساتھ چپک گئے۔ اس کا کام تمام ہو چکا تھا۔

میں لپک کر کمرے میں آ گیا۔ نیم تاریکی میں یہودی لڑکی کونے میں دیوار سے لگی کپکپا رہی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور کہا کہ سپاہی کو میں نے ہلاک کر دیا ہے اور اب میں اسے وہاں سے نکال رہا ہوں۔ میں یہودی لڑکی نفتانی کو لے کر مکان کا زینہ چڑھ کر چھت پر آ گیا۔۔ مکانوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں سے دن کے وقت ہی شہر پر اندھیرا مسلط کر دیا تھا۔ چاروں طرف سے ہاہاکار اور چیخ و پکار کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ آگ اس مکان کی طرف بھی بڑھنے لگی تھی۔ وہاں اس لڑکی کو رکھنا محفوظ نہیں تھا۔ آگ اور خون کا دریا بہت جلد اس مکان کو بھی اپنی لپیٹ میں لینے والا تھا۔ میں یہودی لڑکی کو لے کر ساتھ والے مکان کی چھت پر کود گیا اور پھر نیچے گلی میں آ کر ایک طرف بھاگنے لگا۔ نفتانی بھی میرے ساتھ بھاگ رہی تھی اور میں نے اسے بچانے کا عہد کر رکھا تھا۔ میں بازار میں آ گیا۔ میرا ارادہ شہر کی فصیل کے کسی شگاف سے فرار ہو جانے کا تھا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بازار میں ایک قیامت کا منظر بپا تھا۔ اشوری سپاہی پیدل اور گھوڑوں پر سوار مردوں کی گردنیں قلم کر رہے تھے اور جوان عورتوں کو گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ کھلے بازار میں نکل کر میں نے غلطی کی ہے۔ میں نے یہودی لڑکی نفتانی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور اسے کھینچتے ہوئے بازار کی دوسری جانب لئے جا رہا تھا کہ اچانک اشوری سپاہی گھوڑا دوڑاتا تلوار لہراتا میری طرف لپکا۔ اس نے مجھ پر تلوار کا بھرپور وار کیا اور یہودی لڑکی کو پلک جھپکتے میں اٹھا کر گھوڑے پر ڈالا اور اس سے پہلے کہ میں اس پر چھلانگ لگا سکوں وہ دیکھتے ہی دیکھتے گھوڑے کو دوڑاتا بازار کا موڑ گھوم گیا۔۔۔۔ اور یہودی لڑکی نفتانی کی صرف چیخوں کی آواز ہی سن سکا جو ایک لمحے کے بعد دوسری عورتوں کی چیخوں میں گم ہو گئی۔ جس طرف اشوری گھڑ سوار گیا تھا میں اس کی طرف بھاگا۔ اچانک میری نظر زمین پر پڑی۔ یہودی لڑکی نفتانی کے کان کا ایک بندہ جس پر سبز نگ چڑھا ہوا تھا زمین پر پڑا تھا۔ وہ اس افراتفری میں اس کے کان میں سے نکل کر گر پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر جیب میں رکھا اور بازار

میں دیوانوں کی طرح دوڑنے لگا۔ سڑک پر ٹوٹا پھوٹا سامان اور کٹی ہوئی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ سپاہی گھروں میں سے مردوں کو نکال نکال کر قتل کر رہے تھے۔

میں بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ دور مجھے وہی سپاہی یہودی لڑکی کو گھوڑے پر ڈالے شہر کی فصیل کے شگاف سے باہر جاتا نظر آیا۔ میرے پیچھے سے ایک خالی گھوڑا دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ میں نے اس کی لگام تھام لی اور چند قدم اس کے ساتھ دوڑنے کے بعد اس پر سوار ہو گیا اور فصیل کے شگاف کی طرف لپکا مگر میرے راستے میں جان بچا کر بھاگتی عورتیں اور بچے آ رہے تھے۔ میری رفتار مدھم ہو گئی اور اشوری سپاہی یہودی لڑکی نفتانی کو لئے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب مجھ پر اشوری سپاہیوں نے وار کرنے شروع کر دیئے تھے کیوں کہ میرا لباس یہودیوں جیسا تھا۔ میں نے گھوڑے کو دوسری طرف ڈال دیا - میں گھوڑا دوڑاتا اوپر سے ہو کر فصیل کے شگاف میں سے باہر کھلے میدان میں آ گیا۔ یہاں حد نگاہ تک بخت نصر کی فوجوں کے خیمے لگے تھے اور سپاہی لوٹا ہوا مال اور اغواء کی ہوئی عورتوں کو لئے اپنے اپنے خیموں کی طرف جا رہے تھے۔ اچانک ایک سپاہی کا وار میرے گھوڑے کی گردن پر ہوا اور وہ زخمی ہو کر گر پڑا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی نیچے گر پڑا۔ سپاہی تلواریں سونتے مجھ پر حملہ کرنے ہی والے تھے کہ خیموں کی جانب سے قرنا پھونکنے کی تیز آواز بلند ہوئی اور سپاہیوں کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ یہ بخت نصر کی جانب سے قتل عام بند کرنے کا حکم تھا۔ سپاہی بھی انسانوں کو قتل کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ انہوں نے تلواریں نیام میں ڈال لیں اور باقی بچے کھچے یہودیوں کو قیدی بنانے کا کام شروع کر دیا۔ مجھے بھی پکڑ لیا گیا۔ میں بڑی آسانی سی فرار ہو سکتا تھا۔ لیکن یہودی لڑکی نفتانی کو وہیں چھوڑ کر میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ شاید مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ مجھے بھی دوسرے یہودیوں کے ساتھ پابہ زنجیر کر کے ایک کھلے میدان میں ڈال دیا گیا۔ دن ڈوب گیا پھر رات ہو گئی۔ قیدیوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا خیموں میں جگہ جگہ آگ روشن کر دی گئی - ان ہی خیموں میں کہیں میری محبوبہ نفتانی بھی تھی مگر میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں لڑتا بھڑتا اور اشوری سپاہیوں کو تہ تیغ کرتا اپنی محبوبہ کا خیمہ تلاش کر کے پہنچ بھی جاتا تو سوائے اس کے اور کچھ حاصل نہ ہوتا کہ مجھے قتل کرنے میں ناکام ہو کر اشوری سپاہی میری محبوبہ کو قتل کر دیتے۔ چنانچہ میں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

ساری رات بنی اسرائیل کے قیدی میدان میں پڑے کراہتے' سسکیاں بھرتے اور آہ و بکا کرتے رہے۔ ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کا کوئی قتل نہ ہوا ہو اور بہن یا بیوی اغواء نہ ہوئی ہو۔ یروشلم شہر کے مکان ساری رات جلتے رہے۔ شعلے آسمان سے باتیں کرتے

رہے۔ اور ان کی روشنی یہودی اسیروں کے زرد چہروں پر جلتی بجھتی رہی۔ دوسرے دن سورج نکلا تو میں نے میدان پر ایک نگاہ ڈالی۔ یہودی اسیروں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ سپاہیوں کے خیموں کی طرف سے عورتوں کی چیخوں کی آوازوں نے دم توڑ دیا تھا۔ دوپہر کے وقت فوجوں نے خیمے اکھاڑے اور کوچ کا حکم ملتے ہی بابل کی طرف واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ ہم بیس پچیس ہزار قیدیوں کا بھی الم ناک سفر شروع ہو گیا۔

بنی اسرائیل کی یہ اس تاریخی اسیری کا آغاز تھا جس کا ذکر تورات میں بڑی تفصیل سے آیا ہے اور اہل یہود کی تاریخ ہر صفحے پر اس سانحے پر اشکبار ہے۔ اشوری بادشاہ شاہ بابل نے بیت المقدس (یروشلم) میں قتل و غارت گری کا وہ بازار گرم کیا جو چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھا۔ بخت نصر کے اس حملے نے نہ صرف بنی اسرائیل کی سلطنت تباہ و برباد کر کے رکھ دی بلکہ اسرائیل کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ ان کی مرکزیت ختم ہو گئی۔ تورات میں اس قومی المیے کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

"ہیکل مقدس کو زمین کے ساتھ ملا دیا گیا۔ بنی اسرائیل قتل ہو گئے۔ جو بچ گئے انہیں اسیر بنا کر بابل لے جایا گیا۔ اسرائیل پراگندہ بھیڑوں کی مانند ہے۔ شیروں نے اسے رگیدا ہے۔ شاہ اشور نے اسے کھا لیا اور پھر یہ شاہ بابل بنوکدوخر (بخت نصر) اس کی ہڈیاں تک چبا گیا۔" (یرمیاہ (50/17)

بخت نصر شاہ بابل کی فوج چھ حصوں میں بٹ کر یروشلم سے بابل کی طرف روانہ ہوئی تھی - ہراول فوج میں ہاتھیوں کے دستے تھے۔ اس کے بعد گھڑ سوار فوج تھی جس کے وسط میں شاہ بابل کا تخت رواں تھا۔ شاہی شامیانہ لگا تھا اور سراپردہ کھنچا ہوا تھا۔ شاہ بابل بخت نصر زرہ پہنے تخت پر متمکن تھا اور غلام سر.سہ کھڑے چنور ہلا رہے تھے۔ اس کے پیچھے گھڑ سوار فوج تھی جو ایک خاص فاصلے پر تھی تاکہ شہنشاہ تک گھوڑوں کی اٹھائی ہوئی گرد نہ پہنچ سکے۔ فوج کے سقوں کا خصوصی دستہ تخت رواں کے آگے آگے چھڑکاؤ کرتا جاتا تھا۔ گھڑ سوار فوج کے پیچھے پیدل فوج تھی اور بڑی بڑی منجنیقیں اور قلعہ شکن لکڑی اور لوہے کی توپیں تھیں جن کے آگے فولاد کے دیوہیکل برمے لگے ہوئے تھے۔ پھر آتش بار توپیں تھیں جن سے نیزوں اور تیروں کو آگ لگا کر قلعے پر پھینکا جاتا تھا اور یہ سفر دریا کے ساتھ ساتھ جاری تھا۔ راستے میں جو شہر اور دیہات پڑتے فوج انہیں تاخت و تاراج کر دیتی۔ لوگوں کو قتل کر دیا جاتا اور عورتوں کو اغواء کر لیا جاتا اور اناج اور دوسرا سامان لوٹ لیا جاتا۔ بیت المقدس کو ملیا میٹ کرنے کے بعد بخت نصر نے ایک سرخ چونے کا کتبہ تیار کروا کر لگوایا جس پر لکھا تھا۔

"میں نے یروشلم کو فتح کرنے کے بعد عمارتوں کو آگ لگوا دی۔ ہیکل سلیمانی کو زمین بوس کر دیا اور جلی ہوئی عمارتوں کو زمین کے ساتھ ملا کر ان پر ہل چلوا دیئے۔"

گھڑ سوار فوج کے بعد پیدل دستوں کے درمیان ہم اسیران بابلی کا قافلہ افتاں و خیزاں رواں تھا۔ ہزاروں اہل یہود پابہ زنجیر گریہ و زاری کرتے زبوں حالی کے عالم میں بابل کے قیدخانوں کی طرف رواں تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ہمارے پیچھے سینکڑوں رتھوں پر رتھ بردار فوجی دستوں کا قافلہ تھا جس کے ساتھ بنی اسرائیل کی اغواء کی ہوئی حسین و جمیل عورتیں تھیں جو بال کھولے آہ و زاری کرتی ان کے ہمراہ چل رہی تھیں۔ ان میں میری یہودی دوست نفتانی بھی تھی جس کے کان کا ایک سبز نگینے والا بندہ میری جیب میں رکھا ہوا تھا۔ ہم میں سے کوئی پیچھے جا کر ان عورتوں سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ اسیران بابل میں سینکڑوں ایسے یہودی بھی تھے جن کی بہنیں اور بیٹیاں اشوری سپاہیوں کی کنیزیں بن کر ان کے ساتھ قیدی بنی آ رہی تھیں مگر کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ان کی خیریت دریافت کر سکتیں۔ ہم قیدیوں کے پاؤں میں ایک لمبی اور مسلسل زنجیر تھی جس میں ہم سب بندھے ہوئے تھے اور آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ یہ ایک طویل اور مصائب سے پر سفر تھا۔ بیت المقدس سے بابل تک پہنچنے میں چھتیس دن لگے۔ اس عرصے میں سینکڑوں قیدی مرد اور عورتیں راستے میں ہی بھوک پیاس اور تھکن سے چور ہو کر مر گئیں۔ جو قیدی مرد یا عورت مر جاتا وہیں زنجیر کھول کر اس کی لاش کو صحرا کی دھوپ میں پھینک دیا جاتا تاکہ وہ گدھوں کی خوراک بن جائے۔

مجھے ایک غم یہ بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں ..... معصوم صورت نفتانی بھی راستے میں دم نہ توڑ گئی ہو۔ میں اس کی شکل دیکھنے کو بے تاب تھا تاکہ میرے دل کو تسلی ہو جائے اور پھر اسے وہاں سے نکال کر کسی دوسرے ملک کی طرف لے چلوں۔ مگر ہمیں بابل شہر کے باہر ایک کھلے میدان میں چاروں طرف لوہے کی باڑھ لگا کر قید میں ڈال دیا گیا۔ میں حالات کے پرسکون ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ بابل وہ شہر نہیں تھا جو حمورابی کے عہد میں تھا۔ حمورابی کے دور میں شہر کی صنعت ترقی پر تھی اور لوگ خوشحال تھے۔ مجرموں پر اگرچہ قانون کی گرفت سخت تھی لیکن بخت نصر کے عہد میں بابل کے غریب لوگ بہت غریب اور اشراف طبقہ انتہائی امیر ہو گیا تھا۔ بادشاہ ظالم' عیاش اور جاہ و حشم کا شیدائی تھا۔ اس نے حمورابی کے قدیم محل کو مسمار کر کے اس کی جگہ ایک نیا عالیشان محل تعمیر کروایا تھا جس میں چونے کے پتھر کے ایک ہزار ستون تھے جن پر سونے کا پترا چڑھا ہوا تھا اور چھتوں میں ہیرے جڑے تھے۔ اس ظالم اور بربریت پسند بادشاہ نے چاہ بابل کو بدقسمت مجرموں سے بھر دیا تھا اور پھر سے مینار

بابل تعمیر کروایا جس کی بنیاد دو میل کے گھیراؤ میں تھی۔ یہ دو سو چالیس فٹ چوڑا اور تین سو فٹ اونچا تھا۔ دس دس گز لمبے زینوں کا ایک خاص راستہ چوٹی تک جاتا تھا۔ مینار کی چوٹی پر دیوتا بعل مردوخ کا اڑتالیس فٹ بلند عظیم الشان مندر تھا۔ جس میں بعل مردوخ کا سونے کا بت رکھا تھا۔ بت کے اردگرد سونے کا فرنیچر تھا۔ اس میں استعمال کئے گئے سونے کا وزن آج کے حساب سے چھبیس ٹن تھا۔ بخت نصر نے ایک مرکزی شاہراہ بھی تعمیر کروائی جو تہتر فٹ چوڑی تھی اور اس کے دونوں جانب بائیس فٹ اونچی دیوار تھی۔ اس سڑک کی تعمیر میں اینٹیں اور سفید دودھیا پتھر استعمال کیا گیا۔ سڑک کے دو طرفہ چونے کی سلیں لگی تھیں۔ جن پر لکھا تھا۔

"میں بخت نصر ابن نبوپولاسر شاہ بابل نے یہ سڑک اینٹوں اور سفید پتھروں سے بنوائی تاکہ بعل مردوخ کو جانے والے جلوس اس سڑک پر سے گذرا کریں۔ اے بعل مردوخ! مجھے ابدی زندگی عطا کر۔"

جشن نوروز کے موقع پر اس سڑک پر سے شاہی جلوس گذرتا۔ جلوس کے آگے بابل کا سب سے بڑا پروہت ہوتا۔ اس کے پیچھے قربانی کے جانوروں کی قطاریں ہوتیں۔ ان کے پیچھے ڈھول بجانے والے اور آخر میں مردوخ کے لاکھوں عقیدت مندوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہوتا۔ بخت نصر شاہ بابل کا وہ کارنامہ جو تاریخ کے عجائبات میں شمار ہوا۔ بابل کے معلق باغات تھے۔ بخت نصر نے یہ باغات اپنی ایک چہیتی بیوی کے دل بہلانے کے لئے بنوائے تھے جو میڈیا کے سرسبز و شاداب پہاڑی علاقے کی رہنے والی تھی اور بابل کے ریگزاروں اور خشک صحرائی سرزمین پر اداس رہتی تھی اور اپنے وطن کے مرغزاروں کو یاد کرتی رہتی تھی۔ بخت نصر نے اس کی خوشنودی کی خاطر معلق باغات بنوائے۔ یہ باغات ہوا میں معلق نہیں تھے بلکہ بابل کی جنوبی فصیل پر واقع شاہی محل کی چھت پر لگائے گئے تھے جو اردگرد کی تمام چھتوں سے بلند تھی۔ چنانچہ دور سے دیکھنے پر یہی معلوم ہوتا کہ باغ ہوا میں معلق ہیں۔ پتھر کی جس عمارت پر یہ باغ لگے ہوئے تھے اس کے جنوبی سرے پر ایک کنواں تھا۔ اس کنویں کے اندر سے ایک تہرے شافٹ میں لگی ہوئی بالٹیوں کے ذریعے ان باغوں تک پانی پہنچایا جاتا تھا۔ کنویں میں اگر پانی کم ہو جاتا تو اس میں دریائے فرات کا پانی پہنچایا جاتا۔ اس باغ کے دروازے پر بھی بخت نصر نے ایک کتبہ نصب کروایا جس پر لکھا تھا۔

"یہ باغ بابل کے بادشاہ بخت نصر نے اپنی سب سے پیاری اور چہیتی ملکہ کے لئے لگوائے تھے۔ یہ ملکہ سیاکیسر شاہ میڈیا کی بیٹی تھی اور پھولوں کی بے حد شوقین تھی۔ جب بخت نصر اسے بیاہ کر بابل جیسے گرم اور خشک شہر میں لایا تو میڈیا کے لہلہاتے باغوں کی یاد میں

وہ اداس رہنے لگی۔ بخت نصر شاہ بابل نے اس کی دل جوئی کے لئے پتھروں کا ایک عظیم الشان محل بنوایا۔ اس کی چھت کو درجہ بدرجہ اونچا کیا کہ وہ تین سو پچاس فٹ بلند ہو گئی۔ یہاں چھت پر لاکھوں من مٹی ڈلوا کر باغات لگوائے گئے۔ ان کو سیراب کرنے کے لئے ایک طرف کنواں کھدوایا۔ دوسری طرف دریائے فرات سے پانی لانے کا بندوبست کیا گیا۔ اس طرح ملکہ کی چہل قدمی کے لئے سیرگاہ تیار ہوئی اور میڈیا کی یاد بھلائی جا سکی۔"

بخت نصر اگرچہ سنگدل' ظالم اور خونخوار بادشاہ تھا مگر اس کے عہد میں بابل اپنے عروج پر تھا۔ ایک اعتبار سے وہ بابل کی عظمت و شان و شوکت کا آخری محافظ ثابت ہوا۔ اس کے بعد اس کے جانشین عیاش اور نالائق نکلے۔ بخت نصر کے بعد سات برس کی قلیل مدت میں چار حکمران آئے اور چلے گئے۔ آخر میں بنونیدس نے عنان اقتدار سنبھالی اور اٹھارہ برس تک حکومت کی مگر یہ بادشاہ عیاشی اور بدمستیوں میں اپنے پیشرووں سے بہت آگے نکل گیا۔ بخت نصر نے جس قوم کو دنیا کی بہترین لڑاکا اور شجاع قوم بنا دیا تھا۔ اس کے جانشینوں نے اسے شرابیوں بدکرداروں اور اخلاقی لحاظ سے پست ترین قوم میں بدل ڈالا۔ اہل بابل کا اخلاقی انحطاط آخر یہاں تک پہنچا کہ انہوں نے اپنی جڑیں اپنے ہاتھوں سے کھودیں اور ایران کے بادشاہ کو اپنے ملک پر چڑھا لائے۔

مگر میں بابل کی تاریخ کی گہرائیوں میں زیادہ دور تک نہیں جانا چاہتا کیوں کہ میں کوئی مورخ نہیں ہوں بلکہ ایک سیاح ہوں - تاریخ قدیم کا سیاح اور آپ کو اپنے عجیب و غریب انوکھے اور حیرت انگیز سفر کے سچے واقعات بیان کرنے بیٹھا ہوں۔ میں تاریخ نہیں لکھ رہا۔ تاریخ کا سفر نامہ لکھ رہا ہوں جس کے ایک ایک ورق پر آپ کو تاریخ کے سچے اور ناقابل تردید چشم دید واقعات بکھرے ہوئے ملیں گے۔ اس لئے کہ میں ان واقعات کا چشم دید گواہ ہی نہیں بلکہ انسانی تاریخ کے اس حیرت افزا ڈرامے کا ایک زندہ جاوید کردار بھی ہوں۔ میں اپنے تاریخی سفر نامے کو پھر وہاں سے شروع کرتا ہوں جہاں میں نے واقعات کے تسلسل کو روک دیا تھا۔ میں بابل شہر کی فصیل سے باہر ایک وسیع و عریض میدان میں دوسرے بنی اسرائیل کے قیدیوں کے ساتھ پابہ زنجیر پڑا تھا اور دل میں اپنی دوست سیاہ گھنگریالے بالوں والی سرخ و سپید نفتانی کو یاد کر رہا تھا جو ہم سے تھوڑے فاصلے پر عورتوں کے قیدی کیمپ میں مقید تھی۔ کم از کم میں اس خوش فہمی میں تھا کیوں کہ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ وہ راستے میں ہی مر گئی ہو اور اب تک گدھوں نے اس لاش پر گوشت کا ایک ذرہ بھی نہ چھوڑا ہو اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسے وہی سپاہی اپنے ساتھ لے گیا ہو جو اسے یروشلم سے اغواء کر کے لے گیا تھا لیکن اہل بابل میں اور خاص طور پر بابل کی فوج میں ایک بات عجیب تھی۔ یہ

لوگ کسی بھی عورت کو اور خاص طور پر اغواء کر کے لائی گئی عورت کو زیادہ دیر تک اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے.... شوہر ایک خاص مدت گذر جانے کے بعد جب بچے جوان ہو جاتے تو اپنی بیویوں سے الگ ہو جاتے اور ان کی بیویاں بعل مردوخ کے مندر میں لوگوں کی خدمت پر مامور ہو جاتیں یا خود کشی کر لیتی تھیں۔ وہ بیویاں خوش قسمت ہوتی تھیں جن کے شوہر بڑھاپے میں مر جاتے تھے - اس طرح سے خاوند انہیں گھر سے نہیں نکالتا تھا اور ان کی اولاد ان کی نگہداشت کرتی تھی۔ جوان اور خوبصورت عورتوں کی اکثر اپنے خاوندوں سے نہیں بنتی تھی۔ اور وہ کسی نہ کسی دیوی کے مندر کے باہر آ کر بیٹھ جاتی تھیں اس لئے میرا دل کہہ رہا تھا۔ نفتانی یا تو دوسری قیدی عورتوں کے ساتھ ہی ہے اور اگر اپنے حسن و جمال کی وجہ سے وہ وہاں نہیں ہے تو ضرور اسے کسی امیر بابلی تاجر یا جاگیردار کے ہاتھ فروخت کر دیا ہو گا۔ بہرحال یہ ساری باتیں مجھے صرف اس قیدی کیمپ سے فرار ہونے کے بعد ہی معلوم ہو سکتی تھیں۔ قید میں اسرائیلی قیدیوں کی بری حالت تھی۔ انہیں دن میں ایک بار کھانے کو روکھی سوکھی روٹی دی جاتی۔ وہ سارا دن تپتی دھوپ میں پڑے اپنے وطن کی یاد میں آہیں بھرا کرتے۔ انہیں غلام بنا کر فروخت کرنے کی ممانعت تھی۔ بخت نصر شاید یہ چاہتا تھا کہ یہ سارے اسرائیلی قیدی بھوک اور بابل کی تیز دھوپ میں سسک سسک کر مر جائیں اور اس المیے کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی قیدی مر جاتا اور اس کی لاش کو وہیں تپتی ریت پر پڑا رہنے دیا جاتا۔ جب گدھ اسے نوچ کھانے کے لئے منڈلانے لگتے تو اس کے ساتھ پرے پرے ہٹ جاتے اور سہمی ہوئی ویران آنکھوں سے اپنے عزیز کی لاش کو گدھوں کی خوراک بنتے دیکھتے رہتے اور ان کا اپنا انجام بھی ان کی نگاہوں کے سامنے آ جاتا۔

میں نے وہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ تیار کر لیا۔ قیدی کیمپ کے گرد جو آہنی خار دار باڑھ لگی تھی۔ اس کی جگہ اب ایک بیس فٹ اونچی اینٹوں کی دیوار چن دی گئی تھی یہ دیوار ہزاروں مزدوروں نے مل کر تین دن کے اندر اندر بنا ڈالی تھی۔ اس دیوار کے اوپر تھوڑے فاصلے پر برج بنے تھے جہاں سپاہی پہرہ دیتے اور رات کو مشعلیں روشن رکھی جاتیں اور گھڑ سوار دستے مشعلیں ہاتھوں میں لئے دیوار کے گرد چکر لگایا کرتے۔ مگر میرے لئے فرار اس لئے آسان تھا کہ مجھے اپنی زندگی کی کوئی فکر نہیں تھی اور دل میں اپنی محبوبہ کی محبت کا شعلہ فروزاں تھا۔ جس نے میرے اندر اس قید خانے سے بھاگ نکلنے کے لئے ایک نئی طاقت بھر دی تھی۔ مجھے صرف ایک بات کا خیال رکھنا تھا کہ میری خفیہ طاقت خواہ مخواہ کسی پر ظاہر نہ ہو۔ اس اصول کو میں نے ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا۔ یہ آپ میرے سفر نامے میں آگے چل کر پڑھ لیں گے۔ اس عرصے میں میں اس قدر سراغ لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ زنانہ کیمپ

کی بیشتر خوبصورت خواتین کو بابل کے صاحب ثروت اور عیاش امراء کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا ہے۔ میں نے فرار کی تمام جزئیات اور امکانات پر اچھی طرح سے غور کر لیا تھا۔ اگر قیدیوں کی مردہ لاشوں کو کیمپ سے باہر کسی گڑھے یا صحرا میں پھینک دینے کا رواج ہوتا تو میں بڑی آسانی سے اپنے آپ کو مردہ ظاہر کر کے اس قید سے نجات حاصل کر سکتا تھا لیکن وہاں تو مردہ قیدی کی لاش کو زندہ قیدیوں کو مزید دہشت زدہ کرنے کے لئے وہیں چھوڑ دیا جاتا تھا۔ دوسری پریشانی یہ بھی تھی کہ فرار ہونے کے بعد بھی مجھے زنانہ قیدی کیمپ میں .... نفتانی کو تلاش کرنا تھا۔ جو ایک خطرناک کام تھا۔ اگرچہ بنی اسرائیل کے قیدیوں کی کوئی باقاعدہ فہرست تیار نہیں کی گئی تھی تاہم محافظ دستوں کے سپاہی ان قیدیوں کے چہروں سے شناسا ہو گئے تھے اور میں پہچانا جا سکتا تھا۔

...نفتانی کے کان کا سبز نگینے والا بندہ ابھی تک میرے پاس تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ کسی کو زنانہ کیمپ میں بندہ دے کر بھیجوں کہ وہ معلوم کرے کہ وہاں کوئی ایسی قیدی عورت ہے جس کے کان میں اس وضع کا دوسرا بندہ ہو لیکن اس کام میں بھی میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مجبوراً میں نے خود ہی قید سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا پروگرام رات کے اندھیرے میں دیوار پھاند کر فرار ہونے کا تھا ...نگہداشت کے دو برجوں کے درمیان بمشکل ساٹھ قدم کا فاصلہ تھا اور رات کو دونوں جانب مشعلیں روشن رہتی تھیں اور دیوار کی دوسری طرف مسلح بابلی سپاہی گھوڑے دوڑاتے پہرہ دے رہے تھے۔ اس رات میں نے پوری تیاری کر لی تھی۔ جب رات گہری ہو گئی اور اسرائیلی قیدیوں کی آہ و فغاں کی درد انگیز آوازیں خاموش ہو گئیں تو میں اپنے ریت کے اندر کھودے ہوئے گھروندے سے نکلا اور برجوں کے درمیان والی جگہ کی طرف رینگنے لگا۔ برجوں میں مشعلیں جل رہی تھیں اور ان کی روشنی دیوار پر پڑ رہی تھی مگر دیوار کے درمیان میں یہ روشنی بہت مدھم ہو گئی تھی اور وہاں ہلکا ہلکا اندھیرا بھی اس روشنی میں شامل ہو گیا تھا۔ میں ابھی اپنے گھروندے سے تین چار قدم تک ہی آگے بڑھا ہوں گا کہ اچانک ایک اسرائیلی قیدی کے نوحہ کرنے کی الم انگیز آواز رات کی خاموشی میں بلند ہوئی۔ میں زمین کی ریت سے چمٹ گیا۔ یہ اسرائیلی قیدی اپنے ٹوٹے ہوئے بربط کے تار کو چھیڑتے ہوئے آنسوؤں بھری آواز میں نوحہ گا رہا تھا۔

یہ نوحہ اس قدر درد بھرا تھا کہ اگر میں کسی دوسرے موقع پر سنتا تو میرا دل بھی بھر آتا مگر اس وقت مجھے یہ زہر لگ رہا تھا۔ کیوں کہ اس قیدی کی نوحہ گری نے برج کے سپاہیوں کو ہوشیار کر دیا تھا۔ ایک سپاہی نے وہیں سے آواز دے کر اس قیدی کو ڈانٹ دیا اور خاموش رہنے کا حکم دیا۔ اسرائیلی قیدی کا بربط خاموش ہو گیا۔ اس کی آواز ایک لمبی آہ بھر کر

خاموش ہو گئی اور صحرا میں ایک بار پھر موت جیسی گہری خاموشی چھا گئی۔ آج کے ماڈرن زمانے کی طرح اس دور میں قیدی کیمپوں میں سرچ لائٹوں کا تصور نہیں تھا مگر میں ریت پر لیٹا بڑی آسانی سے پہچانا جا سکتا تھا۔ میں کچھ دیر ریت پر اسی طرح لیٹا رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ برج کے پہرے دار دوبارہ اونگھنے لگے ہوں گے تو میں نے پھر دیوار کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ میں زخمی سانپ کی چال سے رینگ رہا تھا۔ مجھے اپنے ریت کے گھروندے سے دیوار کی بنیاد تک پہنچنے میں آدھا گھنٹہ لگا۔ یہاں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیوار کو ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھا۔ یہ پختہ اینٹوں کی دیوار تھی۔ اینٹوں کو چونے اور گچ کے ساتھ جوڑا گیا تھا جو بہت پختہ ہو چکی تھیں مگر میرے ہاتھوں کی طاقت ان اینٹوں سے کہیں زیادہ تھی۔ میں نے اپنے ناخنوں سے چونے کی تہہ کو کھرچنا شروع کیا۔ میرے ناخن لوہے کی ریتی کی طرح چل رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک اینٹ کا سارا چونا اتر گیا۔ اب میں اس اینٹ کو باہر کی طرف دھکیلنے لگا۔ میرے ہاتھوں میں اتنی طاقت تھی کہ میں وزنی سے وزنی پتھر کو اکھاڑ کر پھینک سکتا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑ رہا تھا کہ کسی قسم کی آواز پیدا نہ ہو۔ کچھ دیر تک کوشش کرنے کے بعد اینٹ اکھڑ کر دیوار کی دوسری جانب جا گری - اب دوسری اور تیسری اینٹ کو اکھاڑنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ چند لمحوں میں ہی وہاں دیوار میں اتنا سوراخ پیدا ہو گیا کہ میں اس میں سے رینگ کر باہر نکل سکتا تھا۔

میں نے دیوار کے سوراخ میں سے اپنا سر باہر نکالا۔ پھر دونوں بازو باہر نکالے اور اس کے بعد ٹانگیں بھی باہر کی طرف کھینچ لیں۔ میں دیوار کی دوسری جانب آ چکا تھا۔ یہاں مجھے گھڑ سوار گشتی دستے کا خطرہ تھا جو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گھوڑے دوڑاتے وہاں سے گذرتے تھے۔ ابھی تک میرے فرار کا کسی کو علم نہیں ہوا تھا۔ میں نے سارا کام اتنی خاموشی سے انجام دیا تھا کہ برج کے سپاہیوں کو آہٹ تک بھی سنائی نہیں دی تھی اور اگرچہ کوئی آواز پیدا بھی ہوتی تو مجھے معلوم تھا کہ برج کے پہرے دار آدھی رات کے بعد عام طور پر اونگھتے رہا کرتے ہیں۔ بابل کے گہرے نیلے آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ جھلملا رہے تھے۔ میرے سامنے ریت کی ایک چھوٹی سی کھائی تھی اور اس کے آگے ریت کے اونچے نیچے چھوٹے چھوٹے ٹیلے حد نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے - میری بائیں جانب دور بابل شہر کی فصیل پر کہیں کہیں مشعلوں کی روشنی ہو رہی تھی۔ میرے لئے وہاں وقت ضائع کرنا بہت خطرناک ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ کچھ لمحوں بعد گھڑ سواروں کا گشتی دستہ وہاں سے گذرنے والا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو کھائی میں لڑھکا دیا۔ ریت کی ڈھال پر سے لڑھکتا ہوا میں کھائی میں

جا گرا۔

اب گھڑ سوار دستے کی آواز سنائی دی۔ ریت پر گھوڑوں کے قدموں کی آوازیں قریب سے قریب تر آ رہی تھیں۔ میں کھائی کی دیوار کے ساتھ چمٹ کر چھپ گیا۔ میں اگرچہ اپنی طرف سے اندھیرے میں تھا مگر گھڑ سوار دستہ قریب آیا تو ایک سپاہی کی الو جیسی نظر مجھ پر پڑ گئی اور ساتھ ہی ایک تیر سن کر کے آیا اور میری گردن کے قریب ریت میں دھنس گیا۔ میں کھائی کے دوسرے کنارے کی طرف بھاگا۔ اب مجھ پر تیروں کی بارش ہونے لگی۔ ساتھ ہی سپاہیوں کی آوازیں آنے لگیں اور ایک سپاہی نے کھائی میں گھوڑا ڈال دیا۔ اتنی دیر میں میں کھائی میں سے نکل کر دوسری طرف ریت کے ٹیلوں کی طرف بے تحاشہ بھاگا جا رہا تھا۔ گھوڑا میرے پیچھے لگا ہوا تھا لیکن میری ناقابل یقین طاقتوں میں ایک طاقت برق رفتاری بھی تھی میں گھوڑے سے تیز بھاگا جا رہا تھا۔ میرا مقصد گھڑ سوار کو قیدی کیمپ اور اس کے ساتھیوں سے دور لے جانا تھا۔ جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم ریت کے ٹیلوں میں کافی دور نکل آئے ہیں تو میں نے اپنی رفتار ہلکی کر دی۔ مجھ پر پیچھے سے برابر تیر آ رہے تھے۔ میں ٹیلوں کے درمیان رات کے ہلکے ہلکے نیلے اندھیرے میں کھڑا ہو گیا۔ گھڑ سوار نیزہ تانے گھوڑا دوڑاتا میری طرف آیا۔ وہ مجھے نیزے میں پرو دینا چاہتا تھا مگر میں نے اس کے نیزے کو پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور وہ گھوڑے پر نیچے گر پڑا۔ گرتے ہی وہ اٹھا اور تلوار نکال کر میری طرف بڑھا مگر میں نے اچھل کر اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ مجھ پر تلوار کے وار کر رہا تھا اور میں اس کا گلا دبا رہا تھا۔ اس کی تلوار میرے جسم سے ٹکرا کر چھن چھن کی آواز پیدا کر رہی تھی جیسے کسی چٹان سے ٹکرا رہی ہو۔ سوائے اس کے کہ میرا لمبا کرتہ جگہ جگہ سے کٹ گیا تھا۔ مجھ پر تلوار کا ایک زخم بھی نہ لگا تھا۔ گھڑ سوار بابلی سپاہی پہلے تو میری برق رفتاری پر حیران تھا اب میرے ہاتھ کی گرفت پر ششدر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں باہر کو ابل آئیں اور چند سیکنڈ کے اندر اندر وہ میرے ہاتھوں میں مردہ لاش کی طرح لٹکنے لگا۔ میں نے اسے وہیں ریت پر پھینکا۔ اس کا گھوڑا قریب ہی ایک ٹیلے کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے اس کی باگ پکڑی۔ اس پر سوار ہوا اور نیم روشن ستاروں بھری رات میں ایک طرف روانہ ہو گیا۔

میں گھوڑے کو سرپٹ دوڑائے جا رہا تھا کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ بابلی سپاہی اپنے ساتھی کی تلاش میں وہاں آ سکتے ہیں لیکن دیکھتے ہی دیکھتے میرا گھوڑا کیمپ سے کوسوں دور نکل گیا اور میں مشرقی صحرا سے ہو کر دریائے فرات کے کنارے پہنچ کر رک گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دور تک صحرا میں سناٹا اور گہری خاموشی تھی۔ ایک سایہ بھی کہیں حرکت کرتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے گھوڑا دریا میں ڈال دیا اور دریا پار کر کے ایک بار پھر

گھوڑے کو صحرا میں پوری رفتار سے چھوڑ دیا۔ میں دریائے فرات کے دوسرے کنارے بابل کے صحراؤں میں کافی دور نکل گیا تھا کہ ایک جگہ گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور میں اچھل کر زمین کے بل گر پڑا۔ گھوڑے کی گردن ٹوٹ گئی تھی اور وہ ریت پر پڑا آخری سانس لے رہا تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپایا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ گھوڑا مر گیا۔ میں ٹھنڈی ریت پر پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ فاصلے پر مجھے ایک گاؤں کے سفید مکانوں کی جھلکیاں سی اندھیرے میں نظر آ رہی تھیں۔ میں اس بستی کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس میں فاصلے فاصلے پر چند ایک کچے مکان بنے ہوئے ہیں اور ان میں اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ میرے لئے اس بستی میں ٹھہرنا بے کار تھا۔ میں ایک کچے مکان کے قریب سے ہو کر آگے بڑھا ہی تھا کہ مجھے پھنکار سے ملتی جلتی آواز سنائی دی۔ میں رک گیا۔ آواز میرے پیچھے سے آئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے ایک سیاہ رنگ کا سات فٹ لمبا سانپ نظر آیا جس کے سر پر سفید کلغی تھی جس میں سے ستاروں کی طرح شعاعیں نکل رہی تھیں۔ یہ سانپ اس قدر خوبصورت اور پر جلال تھا کہ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس سے ڈرنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ مجھ پر خطرناک سے خطرناک سانپ کے زہر کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ سانپ بھی مجھے دیکھ کر رک گیا تھا اور اپنی سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی دوشاخہ زبان بار بار اس کے منہ سے باہر نکل رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر زور سے پھنکار ماری اور مکان کے بند کواڑوں کے دو سوراخوں میں سے اندر گھس گیا۔ مجھے ایک دم شدید خطرے کا احساس ہوا۔ ضرور یہ سانپ اس مکان میں سونے والی کسی عورت یا آدمی کو ڈس لے گا۔ میں نے زور زور سے کواڑ کو دھڑدھڑایا۔ کسی نے اندر سے کنڈی کھولی اور کواڑ کا ایک پٹ کھول کر مجھے دیکھا۔ یہ ایک سانولے رنگ کا حسین تیکھے نین نقش اور پرکشش آنکھوں والا نوجوان تھا۔ جس کے سر کے سیاہ بال گھنگھریالے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی مقناطیسی کشش تھی۔ اس نے بڑی پرسکون آواز میں پوچھا کہ میں کون ہوں اور کس لئے اس کا دروازہ پیٹ رہا ہوں؟ میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں اسے بتایا کہ ابھی ابھی اس کوٹھری میں ایک بڑا ہی خطرناک قسم کا سانپ گھسا ہے۔ اسے اس سے خبردار رہنا چاہئے۔ اس سانولے نوجوان نے زیتون کے تیل کا دیا روشن کر دیا اور کوٹھری میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس میں ایک تخت پر پھٹا پرانا نمدہ بچھا تھا اور کونے میں پانی کا مٹکا رکھا تھا جس پر مٹی کا آبخورہ اوندھا پڑا تھا۔ وہ بولا۔ ”یہاں تو کوئی سانپ نہیں ہے۔“ میں نے اسے بتایا کہ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے ابھی ابھی ایک سات فٹ لمبے کالے سانپ کو اندر داخل

ہوتے دیکھا ہے جس کے سر پر سفید چمکدار کلغی تھی۔ وہ نوجوان مسکرایا۔
"تم کو وہم ہوا ہو گا۔ اگر سانپ اندر آیا ہوتا تو یہیں کہیں ہوتا۔ مگر تم خود دیکھ رہے ہو کہ کوٹھری خالی پڑی ہے۔"

پھر اس نوجوان نے میرے سامنے کوٹھری میں ایک ایک شے اٹھا کر دیکھی۔ تخت پر پڑے نمدے کو بھی جھاڑا۔ پانی کے مٹکے اور خالی آبخورے کو دیکھا۔ واقعی سانپ کہیں نہیں تھا۔ نہ جانے اسے زمین کھا گئی یا وہ خفیہ بل میں گھس گیا تھا میں سوچنے لگا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ میرا وہم ہو اور میری قوت متخیلہ نے میرے سامنے سانپ پیدا کر دیا ہو۔ اس نوجوان نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور رات کے وقت کہاں جا رہا ہوں؟ میں نے اسے جھوٹ موٹ کہانی جوڑ کر سنا دی کہ میں ملک مصر کا رہنے والا ہوں۔ میرے ماں باپ مر چکے ہیں۔ روزگار کی تلاش میں بابل آیا تھا لیکن یہاں پھیلی ہوئی افراتفری سے گھبرا کر اب واپس جا رہا ہوں۔

نوجوان میری طرف گہری نظروں سے تک رہا تھا۔ وہ ذرا سا مسکرایا اور بولا۔ "اگر تم پسند کرو تو میری کوٹھری میں رات بسر کر سکتے ہو۔ کل شام کو یہاں سے قافلہ گذرے گا جو ملک شام کی طرف جا رہا ہوگا۔ تم اس قافلے میں شامل ہو کر اپنے وطن مصر پہنچ سکتے ہو۔"

میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ اس نوجوان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے؟ اور وہ کیا کام کرتا ہے؟ نوجوان نے پراسرار انداز میں مسکرا کر کہا۔

"میرا نام قنطور ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور ایک نخلستان میں انگور کا باغ ہے۔ میں وہاں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ مزدوری کرو گے؟ میں باغ کے مالک سے بات کر سکتا ہوں؟"

مجھے وہاں نوکری کرنے کی کیا ضرورت تھی میں تو چاہتا تھا کہ کسی طرح سے دوسرے کپڑے حاصل کر لوں اور تھوڑا سا بھیس بدل کر واپس بابل شہر میں جا کر..... نفتانی کو تلاش کروں اور پھر اسے اس شہر سے نکال کر کسی دوسرے ملک چلا جاؤں۔ میں نے کہا۔ "ابھی تو میرا دل واپس جانے کو چاہتا ہے۔ وطن کی یاد بہت ستا رہی ہے۔" قنطور نامی سانولے نوجوان نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے مجھے تخت پر سلایا اور خود ایک کپڑا بچھا کر زمین پر لیٹ گیا۔ مجھے نیند کی نہ تو ضرورت تھی اور نہ ہی مجھے نیند آتی تھی۔ نہ مجھے تھکن کا احساس تھا۔ میں بچھونے پر آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ میرا میزبان قنطور بھی زمین پر لیٹا رہا۔ کوٹھری کا دیا بجھا دیا گیا تھا۔ اندھیرے میں مجھے احساس ہوا کہ میرا میزبان بھی جاگ رہا ہے مگر میں نے اسے بلانے اور اس سے باتیں کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں اس طرح لیٹا رہا۔ رات

بہت تھوڑی باقی رہ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد بند کواڑوں کے سوراخ میں سے صبح کی نیلی روشنی اندر آنے لگی میرا میزبان اٹھ بیٹھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ میرا میزبان آبخورے میں پانی لئے دانت صاف کر رہا تھا۔ میں نے بھی ہاتھ منہ دھویا۔ اس نے کہا۔ "میرے پاس مٹکے میں دودھ ہے۔ میں تمہارے لئے لاتا ہوں۔" یہ مٹکا اس نے مکان کے پیچھے ریت میں دبایا ہوا تھا۔ وہ مٹکا نکال کر لایا۔ دودھ آبخورے میں ڈال کر مجھے دیا۔ دودھ ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ میں نے دودھ پی کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے بھی تھوڑا سا دودھ پیا اور کرتے پر تلواروں کے وار نے جو جگہ جگہ شگاف بنا رکھے تھے ان کی طرف دیکھ کر بولا۔
"یہ تمہارے کرتے کو کس نے پھاڑا ہے؟" میں نے جواب میں کہا کہ غریب آدمی ہوں۔ پھٹا پرانا لباس ہی پہن سکتا ہوں۔ کئی روز سے ایک ہی کرتہ پہنے ہوئے ہوں۔ پھٹ گیا ہے۔

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایکدم چھ سات بابلی سپاہی گھوڑوں پر سوار سامنے آن نمودار ہوئے۔ میرا میزبان انہیں حیرانی سے تکنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔ آناً فاناً انہوں نے مجھے دبوچا۔ میری گردن میں رسہ ڈالا اور گھسیٹتے ہوئے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے لے گئے اور رسہ درخت کی ٹہنی پر ڈال کر کھینچا۔ میں درخت کے ساتھ اس طرح لٹک گیا کہ جیسے پھانسی پر چڑھا ہوں۔ میری گردن میں رسہ پڑا تھا اور میں ہوا میں معلق جھول رہا تھا۔ سپاہیوں نے ایک میخ زمین میں گاڑ کر رسہ اس کے گرد لپیٹ دیا اور میرے اردگرد چیختے چلاتے گھوڑے دوڑانے اور مجھ پر تیر برسانے لگے۔ میرا میزبان قنطور بت بنا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ یہ اتنی جلدی ہو گیا کہ اسے بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں پھانسی چڑھا دیا گیا ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر اداکاری شروع کر دی اور اپنے جسم کو دو ایک بار زور سے پھڑپھڑا کر یوں ساکت کر دیا اور گردن لٹکا دی جیسے میری جان نکل گئی ہو۔ کم بخت سپاہی میرے اردگرد گھوڑے دوڑائے ابھی تک مجھ پر تیر برسائے جا رہے تھے اور تیر میرے جسم سے لگ لگ کر نیچے گر رہے تھے۔ میری طاقت کا راز فاش ہو سکتا تھا مگر اس غضب ناکی اور جوش انتقام میں کسی سپاہی کو یہ خیال نہ آیا کہ آخر تیر میرے جسم میں کھب کیوں نہیں رہے۔ وہ شاید یہی سمجھ رہے تھے کہ نشانہ چوک رہا ہے۔ جب میں نے اپنے جسم کو دو ایک بار جھٹکا دے کر آخری ہچکی لیتے ہوئے اپنے جسم کو ایک لاش کی طرح ساکت کر دیا تو وہ وحشیانہ نعرے لگاتے ہوئے وہاں سے واپس چلے گئے۔

میں دن کی روشنی میں درخت کے ساتھ اس طرح لٹکا ہوا جھول رہا تھا کہ رسہ میری گردن میں پڑا تھا اور سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ اور میں نے سانس روک کر اپنے جسم کو ایک مردہ لاش میں تبدیل کر لیا تھا۔ میرا میزبان قنطور بھاگ کر میری طرف آیا۔ وہ کچھ

گھبرایا ہوا تھا۔ جلدی سے پلٹ کر اپنی کوٹھری میں گیا۔ میں نے پلکیں اٹھا کر دیکھا۔ وہ کوٹھری سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ اس نے رسہ کاٹ دیا۔ میں دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ گاؤں کے دوسرے لوگ بھی آ کر میری لاش کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ میرے میزبان نے انہیں بتایا کہ یہ مردہ شخص (یعنی میں) مسافر تھا۔ رات کو اس کے پاس آیا تھا۔ بادشاہ کے سپاہی اس کے پیچھے لگے تھے۔ ایک آدمی بولا ضرور یہ کوئی مجرم ہو گا اور قید سے فرار ہوا ہو گا۔ ہمیں اس کی لاش کو بستی سے باہر صحرا میں پھینک دینا چاہئے۔ کہیں ہم پر بھی شاہی عتاب نازل نہ ہو۔ باقی سارے لوگوں نے اس کی تائید کی۔ میں یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ قنطور یعنی میرے میزبان نوجوان نے جھک کر میرے دل کے ساتھ کان لگائے۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکن کو اتنا خفیف کر لیا تھا کہ کسی کو اندازہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں زندہ ہوں۔ اس نے کہا۔ "یہ مرچکا ہے۔ اگر سب کی رائے یہی ہے تو ہم اسے بستی سے دور پھینک آتے ہیں۔" میں بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ لوگ مجھے بستی سی دور پھینک آئیں اور موقع پاتے ہی میں اٹھ کر کسی دوسری طرف چلا جاؤں۔

انہوں نے میری لاش کو ڈولی ڈنڈا کر کے اٹھایا۔ بستی سے دور ریت کے ٹیلوں کے درمیان لے آئے اور ایک جگہ ریت کے چھوٹے سے گڑھے میں پھینک دیا۔ کم بختوں نے میری گردن سے رسی کا پھندا اتارنے کی بھی ضرورت محسوس ہی نہیں کی تھی۔ خیر مجھے اس سے کیا غرض کہ پھندا گردن میں پڑا ہے کہ نہیں۔ تھوڑی دیر بعد تو میری لاش زندہ ہو کر وہاں سے بھاگنے والی تھی۔ میں نے تھوڑی تھوڑی آنکھیں کھول کر دیکھا کہ دھوپ ماند پڑ رہی تھی اور آسمان پر ابر چھانا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ بستی کے دوسرے لوگ تو لاش چھوڑ کر واپس جا رہے ہیں مگر میرا میزبان قنطور میری لاش کے قریب رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے بستی والوں کو بتایا کہ یہ لاش میرے مہمان کی ہے اور مجھ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ میں اسے گدھوں کے حوالے کرنے کی بجائے زمین میں گڑھا کھود کر ..... دفن کر دوں۔ بستی کے لوگوں نے جواب میں کہا کہ یہ بادشاہ کا قیدی تھا۔ ہم نے اس کی لاش کے ساتھ بہتر سلوک کیا تو ہماری بستی پر بھی بادشاہ کا قہر نازل ہو سکتا ہے اس لئے لاش کو کھلے میدان میں ہی پڑا رہنے دو۔ میزبان قنطور کہنے لگا۔ میں اس کی پوری ذمہ داری لیتا ہوں۔ اگر شاہی دستہ یہاں آ گیا تو میں اعتراف کر لوں گا کہ لاش کو میں نے دفن کیا تھا۔ مگر میں اپنے مہمان کی لاش کی بے حرمتی ہوتے نہیں دیکھ سکتا بستی والے میرے میزبان کے خلاف بڑبڑا کر واپس چلے گئے۔ میں دل میں اپنے میزبان کے اس اعلیٰ اخلاق سے بڑا خوش ہوا۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں یہ بات نہیں تھی کہ میرا میزبان اصل میں کون ہے اور

میری لاش سے وہ کیا کام لینا چاہتا ہے۔

جب بستی کے لوگ چلے گئے تو میرے میزبان قنطور نے ایک جگہ سے ریت ہٹانی شروع کر دی جیسے وہ میری قبر کھود رہا ہو۔ میں ذرا سی پلکیں اٹھائے دیکھ رہا تھا کہ قبر کا گڑھا کھودتے ہوئے میرا میزبان بار بار بستی والوں کی طرف نگاہ ڈال لیتا ہے جو گاؤں کی طرف واپس چلے جا رہے تھے۔ اس کی حرکتیں مجھے کچھ پراسرار سی لگ رہی تھیں لیکن میں نے کوئی زیادہ خیال نہ کیا۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ میرا میزبان قبر کھود کر مجھے اس میں لٹانے کے بعد چلا جائے اور میں کچھ دیر بعد اپنی قبر سے نکل کر فرار ہو جاؤں۔ مجھے کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس وقت جب کہ میں لاش کی صورت میں آنکھیں بند کئے ریت کے ڈھیر میں پڑا تھا تو میری بند پلکوں کے اندر سوائے میری یہودی محبوبہ نفتانی کی حسین و دلنواز شکل کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں جتنی جلدی ہو سکے کوئی نہ کوئی بھیس بدل کر دوبارہ شہر بابل میں اپنی محبوبہ کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق میرے میزبان قنطور کو اب تک قبر کا گڑھا کھود لینا چاہئے تھا۔ میں نے نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ بہت آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور وہ بار بار گاؤں کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ میں حیران ہوا کہ یہ شخص قبر کھودنے میں تاخیر اور تساہل سے کیوں کام لے رہا ہے۔ بادلوں سے اب ہلکی ہلکی گرج کی آوازیں آ رہی تھیں مگر ابھی بوندا باندی شروع نہیں ہوئی تھی۔ قنطور نے جب دیکھا کہ میدان صاف ہے اور بستی کے لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں تو اس نے جلدی جلدی میری تھوڑی سی کھدی ہوئی قبر کے اوپر اس طرح کی ڈھیری بنا دی جیسے وہ سچ مچ کی کوئی قبر ہو اور پھر میری لاش کو اپنے کاندھے پر اٹھا لیا اور ریت کے ٹیلوں کی طرف چلنے لگا۔ میری حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا کہ آخر یہ میری لاش کو نذر آتش کرنا چاہتا ہے یا اپنے قبیلے کی رسومات کے مطابق مجھے کسی خاص جگہ پر دفن کرنا چاہتا ہے؟ وہ میری لاش کاندھے پر اٹھائے ریت کے ٹیلوں میں کافی دور نکل گیا۔ میں نے محسوس کیا نہ تھ وہ تھکا تھا نہ اس کا سانس پھولا تھا۔ میں نے سوچا نوجوان ہے اس میں نوجوانی کا خون ابھی موجود ہے اس لئے اسے تھکان کا احساس نہیں ہو رہا۔ وہ ایک بلند ٹیلے کی اوٹ میں آ گیا۔ یہاں اس نے ایک جگہ بہت سی اگی ہوئی جھاڑیوں کو پاؤں سے ایک طرف ہٹایا اور پھر ٹیلے کے اندر ایک تنگ و تاریک چھوٹی سی سرنگ میں داخل ہو گیا۔ سرنگ میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ آگے جا کر سرنگ ایک طرف گھوم گئی۔ میرا سر قنطور کے پیچھے لٹکا ہوا تھا اور میں آنکھیں کھولے دیکھ رہا تھا۔ سرنگ کی چھت میرے میزبان قنطور کے سر سے کوئی چار پانچ انچ ہی اونچی تھی۔ سرنگ کا موڑ گھومتے ہی ایک کھوہ آ گئی جو سرنگ کی ریتلی دیوار میں کھود

کر بنائی گئی تھی - یہاں اس نے مجھے زمین پر لٹا دیا۔ میں اب بھی یہی سوچ رہا تھا کہ قنطور میزبانی کا حق ادا کرتے ہوئے اپنے مہمان کی لاش کو کسی بہت ہی محفوظ جگہ پر سپرد خاک کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے وہ مجھے اس سرنگ کے اندر لایا ہے لیکن اب ایک عجیب و غریب بات ہوئی۔

مجھے کھوہ کے اندر لٹانے کے بعد میرا میزبان قنطور زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لئے اور اپنی نظریں سامنے دیوار پر گاڑھ دیں۔ میں آدھی کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے پہلے بھی مقناطیسی کشش کا احساس ہوا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بہت کم ہی پلکیں جھپکتا ہے اور پلکیں مسلسل کھلی رکھ کر بات کرتا ہے۔ مگر میرے دال میں اس بات کا شائبہ تک نہیں آیا تھا جو اب سامنے آنے والی تھی۔ قنطور کے چہرے پر ایک سیاہی سی چھاتی چلی گئی اور اس کی آنکھیں سرخ ہونا شروع ہو گئیں۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا کہ یہ اس کے چہرے میں کس قسم کی تبدیلی ہو رہی ہے۔ معاً مجھے خیال آیا کہ وہ میری لاش پر جادو ٹونہ کر کے اپنا کوئی خاص مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن میں اپنی زندگی کا ایک محیر العقول اور سنسنی خیز تجربہ کرنے والا تھا۔ میرے میزبان کا چہرہ بالکل سیاہ رنگت اختیار کر گیا۔ پھر اس نے ایک گہرا سانس اندر کھینچا اور جب سانس باہر کو چھوڑا تو اس کی جگہ وہی سات فٹ کا لمبا کالا سیاہ سانپ کنڈلا مارے بیٹھا تھا جس کو میں نے گذشتہ رات اس کی کوٹھری میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے سر پر سفید کلغی ستاروں کی طرح چمک رہی تھی اور سرخ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اگرچہ مجھے موت کا خوف نہیں تھا اور کسی شے سے نہیں ڈرتا تھا لیکن اپنے سامنے ایک جیتے جاگتے انسان کو کالے سیاہ سانپ میں تبدیل ہوتے دیکھ کر میرے جسم پر وحشت اور خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے خواب میں بھی کبھی خیال نہیں آ سکتا تھا کہ اپنے جس میزبان قنطور کو میں ایک سانولا سلونا عام قسم کا نوجوان سمجھ رہا تھا وہ اصل میں سانپ ہے۔ علم الحیوانات اور خاص طور پر حشرات الارض کے خفیہ علوم کے مطالعے سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اگر ایک خاص قسم کا اعلیٰ نسل کا سانپ اپنی زندگی کے سو سال پورے کر لے اور اس دوران وہ نہ تو زخمی ہو اور نہ کبھی بیماری میں مبتلا ہو تو اس میں اتنی طاقت اور شکتی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ انسانوں کا روپ بدل کر، انسان کی شکل اختیار کر کے ایک عام آدمی کی طرح جب تک چاہے زندگی بسر کر سکتا ہے، یہ باتیں یہ رموز میں نے قدیم مصری علوم کی دقیق کتابوں میں پڑھے تھے لیکن اس کی زندہ مثال میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میرا میزبان حقیقت میں ایک سانپ تھا جو زمین پر اپنی عمر

کے سو برس پورے کرنے کے بعد اب انسان کے روپ میں چل پھر رہا تھا۔ اب جو سوال مجھے پریشان کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ انسانی سانپ مجھے وہاں یعنی میرا مطلب ہے کہ میری لاش کو وہاں کیوں لایا ہے؟

بہت جلد یہ نکتہ بھی حل ہو گیا۔ انسانی سانپ قنطور اپنا چوڑا پھن اٹھائے سر پر چمکتی کلغی سجائے آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا۔ اس کی دوشاخہ زبان بار بار اس کے منہ سے نکل کر لہرا رہی تھی۔ پہلے میری "لاش" بھی گرم تھی مگر قنطور کو سانپ کی شکل بدلتے دیکھ کر اب میرا سارا جسم خوف کے مارے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ قنطور سانپ نے اپنے پھن جھلاتے ہوئے سامنے والی دیوار پر اپنی مقناطیسی نگاہیں مرتکز کر دیں۔ اس نے ایک پھنکار ماری اور پھر سامنے والی دیوار پر روشنی کا ایک ہالہ نمودار ہو گیا۔ میں اس روشنی کے ہالے کو دیکھنے لگا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس ہالے میں ایک بہت بڑے سفید سانپ کی شکل نمودار ہوئی یہ کوئی برگزیدہ سانپ تھا۔ اس کی تھوڑی پر سفید بال جھالر کی طرح لٹک رہے تھے۔ گول گول سرخ آنکھیں قندھاری انار کی طرح دہک رہی تھیں جوں ہی اس بزرگ سانپ کی شبیہہ نمودار ہوئی قنطور سانپ کا پھن اس کی تعظیم کے لئے اپنے آپ جھک گیا پھر اس نے اپنا پھن اوپر اٹھایا اور مجھے اپنے میزبان قنطور کی آواز سنائی دی - وہ رک رک کر کہہ رہا تھا۔

"اے ناگوں کے دیوتا رشی ناگ! میں آپ کی آمد پر تہہ دل سے آپ کی تعظیم بجا لاتا ہوں۔ میں نے آپ کو اس لئے زحمت دی ہے کہ آپ کو بخوبی علم ہے کہ سو برس تک ایک اعلیٰ خاندانی سانپ کی شکل میں روئے زمین پر زندگی بسر کرنے کے بعد آپ نے میرے اندر اتنی طاقت، اتنی شکتی پیدا کر دی کہ میں سانپ سے دیمہ پلٹ کر انسان کے روپ میں آ گیا ہوں اور چند ایک شرائط پوری کرتے ہوئے زندہ رہ سکتا ہوں لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ابھی میں اپنی اس نئی انسانی زندگی کی ایک بہت بڑی کرامت سے محروم ہوں یعنی میں انسان سے سانپ اور سانپ سے دوبارہ انسان کی شکل تو اختیار کر سکتا ہوں مگر اس کے علاوہ کوئی تیسری شکل تبدیل کرنے پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے لیکن کتابوں میں لکھا ہے اور ہم نے اپنے بوڑھے دادا سانپوں سے سن رکھا ہے کہ اگر کوئی سانپ سو برس گزارنے کے بعد انسان بن جائے اور وہ اپنے اندر تیسری کرامت کی شکتی بھی پیدا کرنی چاہے تو اسے ایک ایسی رات کو جب کہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں اور بارش نہ ہو رہی ہو وہ کسی ایسے انسان کی لاش پیدا کرے جس کو گردن میں پھندہ ڈال کر پھانسی دی گئی ہو اور لاش ابھی گرم ہو اور وہ یہ لاش کسی پہاڑی سرنگ کی تاریکی میں لے جا کر منتر پڑھ کر رشی ناگ کے سامنے پیش کرے تو پھر اسے تیسری کرامت بھی مل سکتی ہے اور وہ انسان اور سانپ کے علاوہ جو شکل

چاہے اختیار کر سکتا ہے مگر صرف ایک شرط پر کسی جانور، حیوان یا انسان کا ہم شکل یا شئی نہیں بن سکتا۔۔۔ اے عظیم رشی ناگ! یہ میری خوش قسمتی تھی اور آسمانوں کے سارے دیوتا مجھ پر مہربان تھے کہ میرے ہاں آدھی رات کو ایک انسان مہمان بن کر اترا۔ پھر صبح صبح شاہی فوج کے سپاہیوں نے اسے میری آنکھوں کے سامنے درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی۔ دیوتاؤں کی مہربانی تھی کہ آسمان پر بادل بھی چھائے ہوئے تھے مگر بارش نہیں ہو رہی تھی۔ ہر بات میرے حق میں جا رہی تھی۔ میں ایک عرصے سے کسی ایسی لاش کی تلاش میں تھا۔ اگر لاش کا سراغ ملتا تھا تو آسمان پر بادل نہیں ہوتے تھے۔ اگر بادل چھائے ہوتے تھے تو بارش بھی ساتھ ہی ہو رہی ہوتی تھی لیکن ایسا حسین اتفاق آج ہوا کہ ایک انسان کو میری آنکھوں کے سامنے پھانسی دی گئی اور آسمان پر بادل بھی گرج رہے تھے اور بارش کی ایک بوند بھی نہیں گر رہی تھی۔ اب میں اس تازہ پھانسی پائی ہوئی لاش کو تمہارے حضور میں لے آیا ہوں۔ اب تم مجھے تیسری کرامت کی طاقت عطا کرو۔"

میں دم بخود سرد لاش بن کر زمین پر لیٹا قنطور سانپ کی تقریر سن رہا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ بزرگ سانپ رشی ناگ کے ہونٹ آہستہ سے کھلے اور ایک تیز سنسناتی ہوئی آواز سنائی دی جو کہہ رہی تھی۔

" قنطور ناگ! تم جس لاش کو مردہ سمجھ رہے ہو، اسے غور سے دیکھو، وہ مردہ نہیں زندہ ہے۔"

میں تو سر سے پاؤں تک لرز اٹھا اور میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں اور پھر نیم وا نظروں سے قنطور سانپ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا پھن میری طرف گھمائے مجھے گہری مقناطیسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا میرے اندر خود اتنی طاقت تھی کہ مجھ پر اس کی مقناطیسی نظروں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ رشی ناگ کا چہرہ غائب ہو گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے قنطور نے ایک بار پھر پھنکار کی آواز نکالی اور وہ سانپ سے دوبارہ انسانی شکل میں واپس آ گیا اور اسی طرح آلتی پالتی مارے سینے پر ہاتھ باندھے بیٹھا تھا۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر وہ لپک کر میری طرف آیا۔ میرے چہرے پر جھکا۔ میں نے اب اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور دل کی دھڑکن کو اپنے ارادے سے پھر سے آہستہ جاری کر دیا تھا تا کہ وہ مجھے زندہ سمجھے۔ کیوں کہ اب مجھے لاش بنے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں دل ہی دل میں رشی ناگ کی کشفی طاقت پر حیران تھا کہ اس نے میری لاش پر نگاہ ڈالتے ہی اپنے کشف کے ذریعے معلوم کر لیا تھا کہ میں مردہ نہیں بلکہ زندہ ہوں۔

قنطور نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا۔ میرا دل بہت آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ اب میرا

جسم گرم ہو گیا تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں لیکن مجھے یقین ہے کہ قنطور نے مجھے زندہ حالت میں پا کر اپنا سر پیٹ لیا ہو گا۔ اس کی شدید ناامیدی کی کیفیت کا صحیح اندازہ لگا سکتا تھا۔ اس کی زندگی میں اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ جب پھانسی پا جانے والی لاش بھی موجود تھی - آسمان بھی ابر آلود تھا لیکن افسوس کہ لاش زندہ ہو گئی۔ میں نے اپنے منہ سے کچھ اس قسم کی کراہ کی آواز نکالی جیسے طویل بے ہوشی کے بعد ہوش میں آ رہا ہوں۔ میں نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں اور کہا۔

"میں کہاں ہوں؟ قنطور۔ میرے بھائی۔ کیا میں زندہ ہوں؟ اف میرے خدا! میں سچ مچ زندہ ہوں؟ تم نے مجھے بچا لیا۔ میرے دوست قنطور۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ شاہی سپاہی تو مجھے پھانسی چڑھا کر چلے گئے تھے لیکن تم نے مجھے بچا لیا۔"

میں اس قسم کی اداکاری کر کے قنطور پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں اصل میں زندہ تھا۔ مردہ نہیں تھا۔ گلے میں پھندہ پڑنے سے بے ہوش ہو گیا تھا اور میں دیکھ رہا تھا۔ قنطور کو میری اس وضاحت پر یقین آ گیا تھا۔ کیوں کہ اس کے چہرے پر ناامیدی تھی۔ تجسس اور حیرت نہیں تھی۔ یعنی وہ اس حقیقت پر حیران نہیں ہو رہا تھا کہ میں مرنے کے بعد بھی زندہ رہا بلکہ اسے صرف اس بات پر شدید افسوس ہو رہا تھا کہ میں مرنے کے بعد بھی زندہ رہا بلکہ اسے صرف اس بات پر شدید افسوس ہو رہا تھا کہ میں اصل میں مرا نہیں تھا بلکہ زندہ تھا۔ صرف دم گھٹنے کی وجہ سے مجھ پر ایک طویل بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ اب میرے میزبان قنطور نے بھی اداکاری شروع کر دی اور بولا۔

"دیوتاؤں کا شکر ہے کہ تمہیں ہوش آیا۔ بستی والے تمہیں مردہ سمجھ کر تمہاری لاش چیل کوؤں کے آگے ڈالنا چاہتے تھے مگر میں تمہیں میدان سے اٹھا کر اس سرنگ میں لے آیا کیوں کہ میرا دل کہہ رہا تھا کہ تم مرے نہیں ہو بلکہ بے ہوش ہو اور تمہیں ضرور ہوش آ جائے گا۔ اب تمہیں ہوش میں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔" میں دل ہی دل میں اپنے میزبان سانپ۔ قنطور کی اس اداکاری پر مسکرا رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے اور اس کا راز مجھ پر فاش ہو گیا ہے لیکن میں اس پر اپنے دل کی کیفیت ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی محبوبہ نفتانی کو حاصل کرنے میں میں قنطور سے مدد لوں گا کیوں کہ وہ حقیقت میں ایک سانپ تھا اور سانپ اگر کسی انسان کے جسم کا کپڑا یا اس کی کوئی شے سونگھ لیں تو انہیں وہ کپڑا یا چیز جہاں کہیں بھی ہو اس کی بو آ جاتی ہے۔ میرے پاس نفتانی کے کان کا ایک بندہ تھا اور اس بندے میں اس کے جسم کی بو رچی ہوئی تھی۔ قنطور اسے سونگھ کر مجھے بتا سکتا تھا کہ نفتانی بابل شہر میں

کس مقام پر ہے۔ سوال صرف اتنا رہ جاتا تھا کہ میں یہ سبز نگینے والا بندہ قنطور کو کیا کہہ کر سونگھنے کے لئے دوں کیوں کہ وہ تو یہی سمجھتا ہے کہ مجھے اس کے سانپ ہونے کا علم نہیں ہے اور میں اس پر یہ بات ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مجھے اس کے سانپ ہونے کا علم ہے کیوں کہ اس طرح وہ میرے ہاتھوں سے نکل جاتا۔ کیوں کہ پرانی کتابوں میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر کسی انسانی سانپ کو یہ پتہ چل جائے کہ اس کا بھید کھل چکا ہے تو وہاں سے ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتا ہے۔ بہرحال اس پر سوچ و بچار کرنے کے لئے ابھی میرے پاس کافی وقت تھا۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس انسانی سانپ قنطور کے پاس ہی رہنے کی کوشش کروں گا اور اس کی مدد سے نفتانی کا سراغ لگاؤں گا۔

میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے میزبان قنطور کر ہاتھ پکڑ کر اس کا بار بار شکریہ ادا کیا کہ اس نے میری جان بچائی اور اس سرنگ کے اندھیرے سے باہر کھلی ہوا اور روشنی میں جانے کی خواہش کا اظہار کیا اور اس سے وقت پوچھا۔ قنطور نے مجھے بتایا کہ شام ہو رہی ہو گی۔ میں اس کے ساتھ اپنے پاؤں پر چل کر سرنگ سے باہر آ گیا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ دن غروب ہو رہا تھاا ور ریت کے ٹیلوں کے آس پاس شام کا سرمئی اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ہم بستی کی طرف چل پڑے۔ قنطور مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اسے حیرانی تھی کہ میں اتنی دیر درخت پر لٹکے رہنے کے بعد بھی زندہ کیسے رہا؟ میں نے پھر اپنی بات کو دہرایا کہ یہ محض اتفاق ہے ورنہ میرے مرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اب میرا کیا ارادہ ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ انسانی سانپ قنطور کو اب میری ضرورت نہیں تھی اور وہ مجھے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ مگر مجھے اس کے پاس کچھ دیر رہنے کی ضرورت تھی تاکہ میں اس کی مدد سے نفتانی کا سراغ لگا سکوں۔ میں نے قنطور کی میزبانی اور اس کے اخلاق کی بے حد تعریف کرتے ہوئے اسے پھسلانے کی کوشش کی اور کہا کہ ابھی میں کچھ دیر اس کے پاس چھپا رہنا چاہتا ہوں کیوں کہ شاہی فوج کے سپاہی میری جان کے دشمن بنے بیٹھے ہیں۔ اگر میں ان کے ہاتھ آ گیا تو اس بار وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ قنطور نے کہا کہ اس صورت میں مجھے گاؤں سے باہر نہیں جانا ہو گا۔ میں نے جھٹ کہا کہ وہ جس طرح کہے گا میں اسی طرح کروں گا۔

میں انسانی سانپ قنطور کے ساتھ اس کی کوٹھری میں رہنے لگا۔ قنطور دن بھر غائب رہتا اور شام کو واپس آتا۔ بابل شہر میں بنی اسرائیل کے اسیروں پر گھناؤنے ظلم و ستم ہو رہے تھے۔ وہ خود بھی بھوک اور قیامت خیز تپش کے باعث مر رہے تھے اور بعض سپاہی محض تماشا دیکھنے کی خاطر کسی قیدی کو کیمپ سے نکال کر شہر میں لے جاتے اور لوگوں کے

سامنے اسے اذیتیں دے دے کر ہلاک کر ڈالتے۔ قنطور شاید اس تلاش میں تھا کہ کسی یہودی قیدی کو پھانسی پر لٹکایا جائے اور وہ اس کی لاش کسی طریقے سے نکال کر صحرائی ٹیلے کی سرنگ میں لے آئے کیونکہ پہلی ہی شام شہر سے واپس آنے پر اس نے مجھے بتایا کہ شہر میں تمہارے بھائی بندوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ قنطور کو اس بات کا افسوس تھا کہ قیدیوں کو تیروں اور تلواروں سے قتل کیا جا رہا تھا مگر کسی کو پھانسی پر لٹکایا نہیں جا رہا تھا۔ اسے تو پھانسی یافتہ لاش کی تلاش تھی۔ مجھے قنطور کی کوٹھری میں رہتے ہوئے تیسرا دن جا رہا تھا۔ میں بستی سے باہر کبھی نہیں گیا تھا۔ قنطور نے بستی والوں کو میرے بارے میں بتا دیا تھا کہ میں زندہ بچ گیا ہوں اور اب اس کا مہمان ہوں۔ بستی کے لوگ مہمانوں کا بڑا خیال رکھتے تھے اور قنطور کی بھی بڑی عزت کرتے تھے چنانچہ کسی طرف سے میری مخبری کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے قنطور کے ساتھ نفتانی .... کی باتیں کرنی شروع کر دی تھیں اور اسے بتایا تھا کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا اور ہم ایک دوسرے سے بڑی محبت کرتے تھے۔ یروشلم پر بخت نصر کی فوجوں نے حملہ کر دیا اور ہمیں غلام بنا کر بابل لے آیا گیا۔ اب میں اس کی یاد میں تڑپ رہا ہوں۔ میں نے جیب سے نفتانی کے کان کا سبز نگینے والا بندہ نکال کر دکھایا اور کہا۔ "یہ بندہ نفتانی کا ہے۔ کاش کوئی مجھے یہ بتا دے کہ جس عورت کے پاس اس قسم کا دوسرا بندہ ہے وہ کہاں ہے؟" انسانی سانپ قنطور نے سبز نگینے والے بندے کو ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ایک بار اسے سونگھ لے۔ جلد ہی میری یہ حسرت بھی پوری ہو گئی اور قنطور نے چونکہ وہ سانپ تھا اس لئے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر بندے کو ناک کے پاس لے جا کر سونگھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس کی اس حرکت سی میں کسی شک میں نہ پڑ جاؤں جلدی سے بندہ ناک سی ہٹا کر مسکراتے ہوئے بولا کہ اس بندے سے یروشلم کے مہندی کے پھولوں کی خوشبو آ رہی ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

میں نے قنطور سے کہا۔ "میں تو شہر نہیں جا سکتا۔ تم روزانہ شہر جاتے ہو۔ میری منگیتر کا سراغ لگانے کی کوشش کرو۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہ بھلا سکوں گا۔"

قنطور بولا۔ "یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ شہر میں ہزاروں عورتیں ہیں اور پھر یروشلم سے لائی گئی عورتوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اتنے ہجوم میں تمہاری منگیتر کو کہاں سے ڈھونڈتا پھروں گا؟"

میں نے کہا۔ "پھر بھی تم کوشش کرنا میرے دوست! مجھے معلوم ہے کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کہہ رہا ہے۔ اس کے لئے اب میری منگیتر کا پتہ چلانا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ بندہ

سونگھنے کے بعد وہ بہ آسانی نفتانی کو تلاش کر سکتا تھا۔

اگلے دن دوپہر کے بعد وہ شہر سے واپس آیا تو بڑی ہی پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ مجھے بتایا کہ نفتانی کا سراغ مل گیا ہے۔ میں بہت خوش ہوا اور از حد اشتیاق کے ساتھ پوچھا کہ وہ کس جگہ پر رہتی ہے؟ انسانی سانپ قنطور نے بتایا کہ اس نے میری منگیتر کو دیکھا تو نہیں مگر اسے کسی عورت نے بندہ دیکھ کر خبر دی ہے کہ ایک حسین و جمیل عورت شہر کی ایک شاندار حویلی میں رہتی ہے جس کے پاس اس قسم کا دوسرا بندہ موجود ہے۔ میں سمجھ گیا کہ قنطور نے عورت کی مخبری کا بہانہ بنایا ہے اصل میں اس نے شہر کی ایک حویلی سے آتی میری منگیتر نفتانی کی بو سونگھی ہے۔ بہرحال یہ میرے لئے بڑی مسرت کی بات تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے ابھی شہر لے جا کر وہ حویلی دکھائے شاید انسانی سانپ قنطور بھی یہی چاہتا تھا کہ میں اس سے الگ ہو جاؤں۔ بولا "چلو ابھی چلو۔"

دن ڈھل رہا تھا ہم دونوں گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور شہر کی طرف چل پڑے۔ ہم نے شام ہونے سے پہلے پہلے تیز رفتار گھوڑوں کی مدد سے صحرا پار کر لیا اور بابل شہر کے جنوبی دروازے کی طرف بڑھے۔ دھوپ کا رنگ بابل شہر کی عمارتوں، شاہی محل اور مینار بابل کی سرخ و سپید اینٹوں پر قرمزی ہو رہا تھا۔ بخت نصر کی چہیتی بیوی کے شاہی محل کے معلق باغات کے درختوں کے جھنڈ شام کے بڑھتے ہوئے اندھیروں میں ڈوب رہے تھے۔ میں نے اپنا حلیہ بدلنے کے لئے سر پر نیلے رنگ کا رومال باندھ لیا تھا اور کاندھوں پر سیاہ چادر ڈال رکھی تھی۔

ہم جنوبی دروازے سے نکل کر شہر میں داخل ہو گئے۔ مکانوں، دکانوں اور سراؤں کے باہر کہیں کہیں دیئے روشن ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں لوگ دکانوں کے باہر لکڑی کی کرسیوں پر بیٹھے مشروبات سے دل بہلا رہے تھے۔ یہ آج سے تین پونے تین ہزار سال پہلے کا بابل شہر تھا۔ زندہ انسانوں، حسین عورتوں کی خوشبوؤں اور خونخوار سپاہیوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونجتا ہوا شہر بابل۔۔ انسانی سانپ قنطور میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں بھی گھوڑے پر سوار تھا اور گھوڑے کو قدم قدم چلاتا قنطور کی رہنمائی میں شہر کی اس حویلی کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں میری محبوبہ رہتی تھی۔ اس حویلی میں وہ یقیناً ایک کنیز کی حیثیت سے رہ رہی ہو گی۔ بابل کا کوئی امیر تاجر اسے خرید کر لے گیا ہو گیا۔ شہر کی پختہ شاہراہ پر سے گذرتے ہوئے ہم مینار بابل کے قریب پہنچے تو اچانک پہلو میں دو بابلی سپاہی تلواریں کھینچ کر چلائے۔ "اسرائیلی قیدی جانے نہ پائیں۔" اور ہم پر حملہ کر دیا۔ ہم نے گھبرا کر گھوڑے ساتھ والی تنگ شاہراہ پر موڑ دیئے۔ سپاہی ہم پر چڑھے آ رہے تھے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے۔ سڑک آگے

جا کر ایک گلی میں تبدیل ہو گئی۔ قنطور نے چلا کر کہا۔ "اس حویلی میں گھس جاؤ۔" ہم نے گھوڑوں پر سے چھلانگیں لگا دیں اور گلی میں ایک کھلی حویلی کے اندر گھس گئے۔ سپاہی بھی مار مار کرتے تلواریں لہراتے ہمارے پیچھے پیچھے آئے۔ انہوں نے ڈیوڑھی میں ہمیں جا لیا۔ یہاں نیم اندھیرا تھا۔ میں نے قنطور کو ڈیوڑھی کے کونے میں اندھیرے کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کے بعد وہ مجھے نظر نہ آیا۔ یقیناً وہ انسانی شکل کو تبدیل کر کے سانپ بن گیا تھا اور اپنی جان بچانے کے لئے کونے میں چھپ گیا تھا۔ دونوں سپاہی اب میرے سر پر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے پے درپے مجھ پر تلواروں کے وار کرنے شروع کر دیئے۔ میں اپنا سر گھٹنوں میں چھپائے اکڑوں بیٹھا تھا اور سپاہی میرے جسم پر دھڑا دھڑ تلواریں مار رہے تھے۔ وہ تلواریں چلاتے چلاتے تھک گئے۔ ان کی تلواریں ٹوٹ گئیں مگر مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ نیم اندھیرے میں انہیں زیادہ پتہ نہ چل سکا۔ میں یوں زمین پر گر پڑا جیسے مر گیا ہوں۔ مجھے مردہ سمجھ کر وہ یہ کہتے ہوئے ڈیوڑھی سے باہر نکل گئے کہ اس کے ساتھی کو تلاش کرو۔ وہ یہیں کہیں ہو گا۔

میں ابھی ڈیوڑھی کے فرش پر پڑا تھا کہ مجھے اپنے کندھے پر کسی انسانی ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرا سانولا میزبان انسانی سانپ قنطور مجھ پر جھکا مجھے گہری پرکشش آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری کمر اور گردن پر ہاتھ پھیر کر اچھی طرح سے دیکھا پھر بولا۔

"کیا تم چل سکتے ہو؟"

وہ مجھے اپنے ساتھ ڈیوڑھی کا زینہ چڑھ کر شہ نشین میں لے گیا۔ یہ شہ نشین ویران تھی اور فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ قنطور میری طرف برابر تکے جا رہا تھا۔ وہ پلکیں نہیں جھپک رہا تھا۔ میں نے اداکاری کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ ہماری جان بچ گئی۔"

انسانی سانپ قنطور نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور میرے چہرے پر نظریں گاڑ کر بولا۔ "تم کون ہو؟" اس مختصر سے سوال نے مجھے سر سے پاؤں تک چونکا دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں۔ میں قنطور کے طرف دیکھا وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اب کچھ چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ میری خفیہ طاقت سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اب میں مسکرایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی سانپ جیسی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"میرے دوست! اس سے پہلے کہ میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ بتاؤں۔ کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ جس وقت سپاہیوں نے ہم پر حملہ کیا اور ہم اس مکان کی ڈیوڑھی میں داخل

ہوئے تو تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

قنطور پر میرے اس سوال کا کوئی زیادہ اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کے تو خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ میں اس کے سانپ ہونے کی اصلیت سے باخبر ہو چکا ہوں۔ اس نے بے نیازی سے کہا۔

"میں کونے میں چھپ گیا تھا۔ دیوتا مجھ پر مہربان تھے کہ مجھ پر سپاہیوں کی نظر نہیں پڑی لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دونوں سپاہی تلواروں سے تمہارا قیمہ کر رہے تھے۔ ان کی تلواریں بھی ٹوٹ گئیں مگر تمہارے جسم پر ایک خراش تک نہیں آئی۔ کیا تم مجھے نہیں بتاؤ گے کہ اصل میں تم کون ہو اور یہ طاقت تمہارے اندر کہاں سے آئی؟"

میں نے قنطور کا دوسرا ہاتھ بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور کہا۔

"میرے دوست! میں جانتا ہوں کہ ڈیوڑھی کے کونے میں تم نہیں تھے یا اگر تھے تو.... کسی دوسری شکل میں تھے۔"

یہ جملہ قنطور پر گویا بجلی بن کر گرا۔ اس نے اپنے ہاتھ چھڑا لئے اور پرے ہٹ کر مجھے وحشت خیز نگاہوں سے تکنے لگا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور کہا۔

"قنطور! مجھ سے اپنا آپ چھپانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا اس لئے کہ تم جو کچھ ہو اس کا مجھے علم ہو چکا ہے۔ میں نے پہلے دن جب سفید کلغی والے کالے ناگ کو تمہاری کوٹھری میں داخل ہوتے دیکھا تھا اور پھر تم نے دروازہ کھول کر مجھے بتایا کہ کوٹھری میں سانپ نہیں آیا تو مجھے اسی وقت شک ہو گیا تھا لیکن جب تم میری زندہ لاش کو ٹیلے کی سرنگ میں لے گئے اور ایک مہاناگ کی شکل اختیار کر کے تم نے رشی ناگ کے ہیولے سے باتیں شروع کیں تو میں دیکھ رہا تھا اور تمہاری باتیں بھی سن رہا تھا۔ تم رشی ناگ سے کہہ رہے تھے کہ تم ایک تازہ پھانسی یافتہ لاش لے آئے ہو۔ اب تمہیں تیسری کرامت عطا کی جائے تاکہ تم سانپ کے علاوہ بھی جو چاہو شکل اختیار کر سکو۔ مگر رشی ناگ نے تمہیں بتایا کہ لاش زندہ ہے۔ میں نے اپنی منگیتر کے کان کا بندہ بھی تمہیں اس لئے دیا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ تم اصل میں سانپ ہو اور بندے میں سے انسانی بو سونگھ کر میری محبوبہ کا سراغ لگا سکو گے۔۔۔ بولو۔ تمہیں اور کیا بتاؤں؟"

انسانی سانپ قنطور کا چہرہ سیاہ پڑنے لگا اور اس کی آنکھیں سرخ سے سرخ تر ہوتی چلی گئیں۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"قنطور! شاید تمہارا ارادہ سانپ کا روپ دھار کر مجھے ہلاک کرنے کا ہے مگر میرے

دوست تمہاری یہ کوشش لاحاصل ہو گی۔ اب میں تمہیں اپنے بارے میں بتاتا ہوں۔ میرا نام عاطون ہے۔ میں مصر کے شاہی خاندان کا ایک فرد ہوں اور ہزاروں سالوں سے زندہ چلا آ رہا ہوں۔ میں تاریخ کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہوں۔ کسی وجہ سے مجھ میں ایک زبردست طاقت آ گئی ہے جس نے مجھے موت سے نہ جانے کتنی مدت کے لئے آزاد کر دیا ہے اور میں مر نہیں سکتا۔ میں نے فرعونوں' سمیریوں اور موہنجوداڑو کی قوموں کے عروج و زوال دیکھے ہیں اور تمہارے سامنے بابل کی تہذیب وہ معاشرت کا نظارہ کر رہا ہوں۔ تمہارا راز مجھ پر فاش ہو چکا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اصول و روایت کے مطابق اب تم مجھ سے الگ ہو جاؤ گے۔ مگر میں تم سے درخواست کروں گا کہ مجھ سے جدا ہونے کا خیال دل سے نکال دو۔ کیوں نہ آج سے ہم دونوں پکے دوست بن جائیں اور ایک دوسرے کے رازوں کی حفاظت کریں۔ ہم دونوں اپنے اپنے مقام پر حیرت انگیز طاقت کے مالک ہیں۔ ہم دونوں ناقابل یقین مدت تک زندہ رہ چکے ہیں۔ فی الحال تم مرسکتے ہو نہ میں مر سکتا ہوں۔ ہماری دوستی خوب رہے گی۔ ہم مل کر تاریخ کے عظیم دھارے پر سفر کریں گے اور انسانی تہذیب کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے تاریخ کے عروج و زوال کے مناظر دیکھیں گے۔ تم اگر مجھ سے جدا ہو گئے تو تمہیں مجھ جیسا دوست اور راز دار کبھی نہیں ملے گا۔ اب بتاؤ تم کیا فیصلہ کرتے ہو اور میری بات کا کیا جواب دیتے ہو؟"

میں قنطور کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی سیاہی ماند پڑ چکی تھی اور آنکھوں کی سرخی غائب ہو گئی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور گہری آواز اور پختہ لہجے میں بولا۔

"عاطون! میرا نام قنطور ہے۔ میں مہاناگ ہوں اور مجھے زندگی بسر کرتے ہوئے پچھتر برس ہو گئے ہیں۔ پہلے ایک سو سال تک سانپ کے روپ میں زندہ تھا اور پچھتر برس سے انسانی شکل میں زندہ ہوں۔ تم پہلے شخص ہو جس پر میری زندگی کا سب سے اہم راز آشکار ہوا ہے لیکن مجھے خوشی ہوئی ہے کہ میرا یہ راز ایک ایسے شخص پر فاش ہوا ہے جو خود ایک محیرالعقول طاقت کا مالک ہے اور صدیوں سے زندہ چلا آ رہا ہے۔ آج سے تم میرے دوست ہو اور تاریخ کی شاہراہ پر ہم دونوں ایک ساتھ مل کر سفر کریں گے۔"

قنطور مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ ہماری کبھی نہ مٹنے والی دوستی کی بنیاد پڑ گئی ہم نے ہمیشہ ایک دوسرے کے وفادار رہنے اور زندگی کے آخری سانس تک ساتھ نبھانے کے عہد و پیمان کئے۔ قنطور کہنے لگا۔ "اب ہمیں یہاں سے نکل کر واپس چلنا چاہیے۔"

میں نے اس خطرے کا اظہار کیا۔ "بابل کی شاہی فوج کے سپاہی مجھے پہچان گئے ہیں۔

وہ ہمارا پیچھا کریں گے۔ مجھے اپنا غم نہیں لیکن تمہاری فکر ہے۔ تم اگرچہ انسان سے سانپ بن سکتے ہو مگر وہ لوگ تمہیں موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں۔"

قنطور نے کہا۔ "اچھا ہوا کہ تم نے مجھے ایک بڑی اہم بات یاد دلا دی۔ اب جب کہ تم میرے دوست اور زندگی بھر کے ساتھی بن چکے ہو تو میں تمہیں اپنی زندگی کا ایک اور راز بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر کبھی زندگی کے کسی مرحلے پر سانپ یا انسان کے روپ میں مجھ پر کبھی دشمن کا وار چل گیا اور میرا جسم تلوار سے دو ٹکڑے کر دیا تو یہ بات کبھی نہ بھولنا کہ میں اپنے کٹے ہوئے جسم کے ساتھ صرف چھ ماہ تک زندہ رہ سکوں گا۔ اس عرصے میں تم پر یہ فرض عائد ہو گا کہ میری کٹی ہوئی لاش کو لے کر ہمالیہ کے پہاڑ کیلاش پربت جاؤ۔ وہاں پہاڑ کے دامن میں شیش ناگ کا ایک قدیم دراوڑی مندر ہے۔ اس مندر کے عقب میں ایک گہرے سبز پانی کی ایک جھیل ہے۔ میری لاش کو کسی صندوقچی میں بند کر کے اس جھیل میں ڈال دینا۔ جب چالیس روز گزر جائیں تو صندوقچی باہر نکال لینا اور میری لاش جو سانپ کی شکل میں ہو گی۔ جڑ گئی ہو گی اور میں زندہ ہو گیا ہوں گا۔ اگر تم چھ ماہ کے اندر اندر کیلاش پربت کے شیش ناگ مندر میں پہنچنے میں ناکام رہے تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ تم میری بات کو اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے؟"

میں نے جواب میں کہا۔ "تمہارا ایک ایک لفظ میرے دل پر نقش ہو گیا ہے۔ تم فکر مت کرو ۔ اگر خدانخواستہ ایسا وقت آن پڑا تو میں پہلی فرصت میں تمہاری لاش لے کر کیلاش پربت کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔"

قنطور بولا - "اب میری تسلی ہو گئی ہے۔ چلو اس حویلی سے باہر نکلتے ہیں۔ اب رات ہو گئی ہو گی۔ بابلی کے گلی کوچے اندھیرے میں گم ہو گئے ہوں گے۔ تمہیں کوئی نہیں پہچان سکے گا اور اگر کسی نے تم پر حملہ کر دیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میرے لئے سانپ بن کر اسے ڈسنا معمولی بات ہے ۔ آؤ۔"

میں نے کہا۔ میں اپنی منگیتر نفتانی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا اور اس لئے وہاں سے اس کے ساتھ آیا تھا۔ قنطور نے اپنی پیشانی پر آیا ہوا پسینہ پونچھ کر کہا۔ "اب تمہیں اپنی منگیتر کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کا نہ صرف سراغ لگانا بلکہ اس کو تمہارے پاس لانا اب میری ذمے داری ہے۔ یہ کام میں خود کروں گا۔ اب یہاں سے نکل چلتے ہیں"

گلی میں گھپ اندھیرا تھا۔ موڑ گھوم کر ہم بازار میں آئے تو دکانوں میں کہیں کہیں زیتون کے چراغ روشن تھے۔ ہمارے گھوڑے خدا جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ شہر کا جنوبی

دروازہ بھی کھلا تھا۔ ان دنوں ہنگامی حالات کی وجہ سے بابل شہر کے دروازے سر شام بند کر کے وہاں پہرہ بٹھا دیا جاتا تھا۔ ہم جنوبی دروازے سے گذر کر اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔

میرے دوست قنطور نے گاؤں میں آ کر مجھے بتایا کہ جب وہ میری یہودی منگیتر نفتانی کے کان کا بندہ سونگھ کر شہر گیا تو اسے ایک حویلی میں سے اس کی بو آئی تھی اور یہ بو اس نے واضح طور پر اس لئے محسوس کر لی تھی کہ وہ ایک سانپ کی قوت شامہ رکھتا ہے۔ اس نے دوسرے دن میری محبوبہ نفتانی کی حویلی میں جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ ہم رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ کمال کی بات یہ تھی کہ میری طرح قنطور بھی بھوک پیاس اور نیند سے بے نیاز تھا۔ وہ سانپ کی طرح ہنگامی حالات میں تھوڑا سا کھا کر کئی ماہ تک کھائے پیئے بغیر زندہ رہ سکتا تھا۔ اگلے روز اس نے میری منگیتر کا بندہ لے کر دوبارہ سونگھا اور اس کی تلاش میں شہر کی طرف نکل گیا...... نفتانی کے جسم کی بو اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ وہ بابل شہر کے مشرقی باغات کے پاس اس حویلی کے سامنے کر کر رک گیا جہاں سے اسے نفتانی کی تیز خوشبو آ رہی تھی۔ اس حویلی کے بڑے دروازے پر ایک حبشی دربان پہرہ دے رہا تھا۔

قنطور باغ میں درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ یہ سارے احوال اس نے مجھے بعد میں بتائے۔ وہ حویلی میں داخل ہونے کے بارے میں غور کرنے لگا۔ ابھی اس میں سانپ کے علاوہ کوئی تیسری شکل اختیار کرنے کی کراماتی طاقت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ صرف سانپ کے روپ میں ہی حویلی میں داخل ہو سکتا تھا لیکن دن کے وقت سانپ بن کر حویلی میں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ نظر پڑ جانے پر اس پر حملہ ہو سکتا تھا پھر وہ کیا کرے؟ کیا اندھیرا ہو جانے کا انتظار کرے؟ قنطور نے مجھے بعد میں بتایا کہ اسے اس بات پر حیرت تھی کہ حویلی کا دروازہ بند تھا اور دیر سے نہ کوئی اندر داخل ہوا تھا اور نہ ہی باہر نکلا تھا۔ خدا جانے یہ کیسی پراسرار حویلی تھی۔ حبشی دربان دروازے کے پاس پتھر کے چبوترے پر کمر میں تلوار لٹکائے پالتی مارے بت بنا بیٹھا تھا۔ میری محبوبہ نفتانی کی خوشبو حویلی کے اندر سے برابر آ رہی تھی۔ حویلی پر جیسے ایک سوگ کی حالت طاری تھی۔

قنطور کو جب باغ میں بیٹھے کافی دیر ہو گئی اور حویلی کا دروازہ کھول کر کوئی بھی باہر نہ نکلا تو اس نے خود حویلی میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ حویلی کے اندر سانپ کی شکل میں ہی داخل ہو سکتا تھا۔ سانپ کا روپ اختیار کرنے میں اس کے لئے ضروری نہیں تھا کہ وہ صرف سفید کلغی والے مہا ناگ کی شکل میں ہی ظاہر ہو۔ وہ ہر قسم کا سانپ بن سکتا تھا۔ قنطور باغ سے اٹھ کر ٹہلتا ہوا حویلی کی مغربی دیوار کی طرف آ گیا۔ اس دیوار پر جنگلی بیل

چڑھی ہوئی تھی اور نیچے ایک کھائی تھی جو جھاڑ جھنکار سے بھری ہوئی تھی۔ قنطور کی بائیں جانب کچی سڑک تھی جو آگے جا کر شہر کے خاص دروازے کو جاتی سڑک سے مل جاتی تھی۔ ایک سوڈانی غلام رتھ دوڑاتا تیزی سے اس سڑک پر سے گذر گیا۔ رتھ کے آگے دو سیاہ گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ یہ رتھ حویلی کے سامنے جا کر رک گیا اور غلام رتھ پر سے اتر کر حویلی کے دروازے کی طرف بڑھا۔ قنطور سمجھ گیا کہ یہ غلام ہے اور حویلی کے مالک کے پاس کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔ قنطور نے اپنے اردگرد دیکھا۔ وہ تسلی کرنا چاہتا تھا کہ اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ کیوں کہ وہ اپنی جون بدلنے والا تھا۔ باغ کا یہ ویران علاقہ تھا۔ قنطور پھر بھی کھائی کے قریب انجیر کے ایک پھیلے ہوئے درخت کے عقب میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے چاروں جانب نگاہ ڈالی وہاں اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ قنطور نے دل ہی دل میں کوئی خاص منتر پڑھا اور آنکھیں بند کر کے اپنے سانس کو اوپر کی طرف کھینچا۔ جب سانس چھوڑا تو وہ مٹیالے رنگ کا ایک بالشت بھر کا داغ دار سانپ بن چکا تھا۔ اور انجیر کے درخت کے نیچے جہاں کھڑا تھا وہیں گھاس میں رینگ رہا تھا۔ اس طرح رینگتے ہوئے قنطور حویلی کی دیوار پر چڑھا اور ایک گول روشن دان سے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ سامنے ایک چھوٹا سا باغیچہ ہے جس کے وسط میں بابل کے امیر گھرانوں کی طرح سنگ مرمر کا حوض بنا ہوا ہے۔ اردگرد اونچے ستونوں والا برآمدہ ہے اور برآمدے میں محرابی دروازوں والے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ایک کمرے کا دروازہ تھوڑا کھلا تھا۔ نفتانی کی خوشبو اس کمرے سے آ رہی تھی۔ قنطور دیوار پر چھت سے تھوڑے فاصلے پر رینگتا ہوا اس کمرے کی چوکھٹ کے اوپر والے حصے پر آ کر رک گیا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی گردن اوپر اٹھائی اور زبان دو ایک بار لہرا کر حالات کا جائزہ لیا۔ نفتانی کی تیز انسانی خوشبو آ رہی تھی۔ کمرے کا ایک پٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اب اندر سے ایک مرد اور ایک عورت کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ قنطور رینگ کر دروازے کے ادھ کھلے پٹ میں سے گذرتا ہوا دوسری طرف کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ داخل ہوتے ہی تیزی سے دیوار کے ساتھ نیچے کی جانب کھسک گیا اور کمرے پر ایک نگاہ ڈالی۔ یہ کمرہ بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر کمخواب اور اطلس کے بھاری پردے گرے ہوئے تھے۔ قالینوں کا فرش بچھا تھا۔ کونے میں مسہری لگی تھی جس پر ایک سیاہ گھنگریالے بالوں اور نیلی آنکھوں والی حسین و جمیل عورت تکئے سے ٹیک لگائے سوگوار بیٹھی تھی۔ اس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی۔ کانسی کی گول تپائی پر چاندی کی صراحی پڑی تھی اور چھت سے چاندی کا فانوس لٹک رہا تھا جس میں جواہرات جڑے تھے جو کمرے کی نیم روشنی میں چمک

رہے تھے۔ وحشی حبشی غلام جس کو قنطور نے رتھ پر گذرتے دیکھا تھا۔ اس عورت کی مسہری کے پاس قالین پر دوزانو بیٹھا تھا۔ فضا میں بوجھل اور الم انگیز سی خاموشی طاری تھی۔ قنطور سمجھ گیا کہ کوئی دردناک بات ہو گئی ہے۔ مسہری پر بیٹھی ہوئی حسین عورت کے کانوں میں بندہ نہیں تھا مگر بندے کی خوشبو اسی عورت کے جسم سے آ رہی تھی۔

قنطور سمجھ گیا۔ نفتانی یہی عورت ہے۔ اب وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہاں کیا حادثہ ہو گیا ہے۔ جس کے باعث ماحول اس قدر سوگوار ہے۔ اتنے میں حسین عورت نے ایک آہ بھر کر حبشی غلام سے پوچھا۔

"کیا کشان کے وہاں سے فرار کی کوئی سبیل نہیں ہو سکتی؟"

حبشی غلام نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا اور پھر بوجھل آواز میں کہا۔

"اپنے مالک پر اور آپ پر میری جان قربان۔ مگر میں اپنی جان دے کر بھی اپنے مالک کی زندگی نہیں بچا سکتا۔"

حسین عورت ایک لمحے خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی۔

"کیا میری ساری دولت' میرے سارے زیورات اور ہیرے جواہرات بھی میرے خاوند کو بادشاہ کی قید سے نہیں نکال سکتے؟"

حبشی غلام نے ادب سے کہا۔ "میرا مالک کشان بادشاہ بخت نصر کی قید میں ہے۔ وہ بادشاہ کا خاص قیدی ہے۔ بادشاہ میرے مالک کو اسی تانبے کے بیل کے اندر ڈال کر آگ میں پکانے والا ہے جو میرے مالک نے بادشاہ کی تفریح طبع کے لئے تیار کیا تھا۔ اس لئے میرا مالک بادشاہ کی خاص قید میں ہے مالکن! اس تک رسائی ناممکن ہے۔"

ان کی باتوں سے قنطور کو علم ہوا کہ اس حسین عورت نفتانی نے حویلی کے مالک کشان سے شادی کر لی تھی اور اس کا خاوند کشان شاہی دربار میں شاہ بابل بخت نصر کا خاص مشیر تھا جو بادشاہ کو جنگ میں طرح طرح کے مہلک ہتھیار ایجاد کرنے میں صلاح مشورہ دیتا تھا۔ بخت نصر ایذا پسند تھا اور اپنے دشمنوں کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر ہلاک کرنے میں اسے خاص لطف آتا تھا۔ اس نے اپنے مشیر خاص کشان سے کہا کہ وہ اس کے دشمنوں کو ہلاک کرنے کے لئے کوئی نادر الوجود قسم کی شے ایجاد کرے۔ چنانچہ کشان نے تانبے کا ایک بیل بنایا جس کے اندر خاص قسم کی کیلیں لگائیں اور بادشاہ کو پیش کرتے ہوئے بتایا کہ اگر آپ اس تانبے کے بیل کے اندر اپنے دشمن کو ڈال کر نیچے آگ جلائیں تو تانبے کے گرم ہو جانے پر بدقسمت قیدی کی چیخیں بیل کے اندر خاص قسم کے کیلوں سے ٹکرا کر جب بیل کے گلے میں سے باہر نکلیں گی تو ایسی آوازیں پیدا ہوں گی جیسے بیل ڈکرا رہا ہے۔ شاہ بابل بخت نصر

اس ایجاد پر بہت خوش ہوا۔ اس نے اسی وقت حکم دیا کہ اس خونی بیل کو آزمایا جائے۔ دربار میں موت کی خاموشی چھا گئی۔ یہ کوئی سہمی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگا کیوں کہ وہاں اس وقت بادشاہ کا کوئی دشمن موجود نہیں تھا کہ جس کو تانبے کے خونی بیل کے اندر ڈال کر ہلاک کیا جائے۔

بخت نصر نے خطرناک وزدیدہ نگاہوں سے اپنے مشیر خاص کشان کی طرف دیکھا اور اعلان کیا کہ بیل کو شاہی محل کی چھت پر پہنچا دیا جائے اور پورے چاند کی رات کو اس میں ہمارے مشیر خاص کشان کو ڈال کر اس پر پہلا تجربہ کیا جائے۔ درباریوں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن کشان کا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ نیم بے ہوش ہو کر لڑکھڑانے ہی والا تھا کہ دو سپاہی فوراً آگے بڑھے اور کشان کی مشکیں کس کر شاہی قید خانے کی طرف لے گئے۔ کشان کی بیوی نفتانی پر جو میری محبوبہ بھی تھی اور جس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا' اپنے خاوند کے بارے میں یہ دلدوز خبر سن کر گویا بجلی گر پڑی۔ شاہ بابل کا حکم حرف آخر تھا اور اب اسے دنیا کی کوئی طاقت ٹال نہیں سکتی تھی۔ قنطور دیوار کے ریشمی پردے کے پیچھے سے اپنی چھوٹی سی سانپ والی گردن نکالے یہ رقت آمیز منظر دیکھتا رہا اور نفتانی اور اس کے حبشی وفادار غلام کے مابین ہونے والی باتیں سنتا رہا۔ جب حبشی غلام نفتانی کو اشکبار چھوڑ کر چلا گیا تو قنطور بھی واپس مڑا۔ وہ اسی طرح دیوار پر سے رینگتا ہوا برآمدے کی چھت کے اندرونی حصے سے گزر کر روشندان میں سے باہر نکل آیا اور حویلی کی دیوار کی جنگلی بیلوں میں رینگتا ہوا نیچے اتر آیا۔ اس نے اپنی گردن اٹھا کر ایک بار پھر باغ کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ قنطور نے ایک ہلکی سی پھنکار کی آواز اپنے منہ سے نکالی اور دوسرے ہی لمحے وہ دوبارہ انسانی شکل میں واپس آ گیا تھا۔

جب وہ میرے پاس گاؤں میں واپس آیا تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں کوٹھری میں شمع روشن کئے بے تابی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جب اس نے مجھے شروع سے آخر تک یہ ساری داستان الم سنائی تو پہلا صدمہ تو مجھے یہ ہوا کہ میری منگیتر نے مجھ سے بے وفائی کی تھی اور اب میرے رقیب سے شادی کر لی تھی۔ دوسری صدمے کی بات یہ تھی کہ اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کا گھر اجڑ رہا تھا اور اس کا خاوند شاہی قید خانے میں بند اذیت ناک موت کا انتظار کر رہا تھا۔ میں اپنا صدمہ بھول گیا اور اپنی منگیتر پر ٹوٹی ہوئی ناگہانی آفت کا غم کرنے لگا۔ قنطور نے مجھے بتایا کہ نفتانی کی حالت قابل رحم ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے خاوند کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکے۔ یہ سن کر میرا دل ہل گیا۔ میں نے قنطور سے کہا۔

”میرے دوست! اگرچہ نفتانی اب میری نہیں رہی۔ کسی اور کی ہو چکی ہے لیکن میرے دل میں اس کی محبت کی شمع اسی طرح روشن ہے۔ میں اسے مصیبت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔ میں اس کے خاوند کی جان بچانا چاہتا ہوں۔ ابھی چاند رات میں چھ روز باقی ہیں۔ کیا ہم کسی طریقے سے کشان کو شاہی قید خانے سے فرار نہیں کروا سکتے؟“

قنطور سوچنے لگا۔ پھر بولا۔

”عاطون! یہ کام بظاہر ہم ایسے دو محیر العقول طاقتوں کے مالک انسانوں کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے لیکن اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ شاہ بابل بخت نصر کا قید خانہ خاص اس کے شاہی محل کے نیچے تہہ خانے میں ہے جہاں ہم پہنچ سکتے ہیں مگر نفتانی کے خاوند کشان کو نکال نہیں سکتے۔“

میں نے قنطور کا ہاتھ تھام لیا اور بڑی عاجزی سے کہا کہ میں ہر حالت میں نفتانی کے خاوند کی جان بچانا چاہتا ہوں۔ میں اس کا گھر برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا اور پھر کشان بے گناہ ہے۔ اس کا صرف اتنا قصور ہے کہ اس نے انسانوں کو ایک اذیت ناک موت سے ہمکنار کرنے والا بیل ایجاد کیا اور محض شاہ بابل کی خوشنودی کے لئے۔ ہو سکتا ہے شاہ بابل کشان کو تانبے کے بیل میں ڈال کر ہلاک کروانے کے بعد کئی دوسرے انسانوں کو اس کی بھینٹ چڑھائے۔ اس اعتبار سے ہمیں چاہئے کہ نہ صرف کشان کو اس الم ناک موت سے بچائیں بلکہ اس منحوس اور انسان کش بیل کو بھی توڑ پھوڑ ڈالیں۔ قنطور کسی گہری سوچ میں گم تھا لگتا تھا کہ وہ کسی ترکیب' کسی منصوبے پر غور کر رہا ہے۔ پھر وہ سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تمہاری باتوں نے مجھے قائل کیا ہے عاطون۔ میں اب اس امر پر غور کر رہا ہوں کہ ایسا کونسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ ایک تیر سے دو نشانے ہوں۔ کشان کی جان بھی بچ جائے اور تانبے کے خونی بیل کو بھی تباہ کر دیا جائے۔ اس میں تو کسی شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں کہ کسی نہ کسی طرح تہہ خانے تک تو میں پہنچ سکتا ہوں لیکن نفتانی کے خاوند کشان کو تہہ خانے سے کیوں کر فرار کرایا جائے؟ یہ غور طلب بات ہے۔“

ہم کوٹھری میں شمع روشن کئے دیر تک بیٹھے اس مسئلے پر سوچ و بچار کرتے رہے۔ آخر قنطور کے دماغ میں ایک ترکیب آ گئی۔ ترکیب واقعی بڑی معقول اور کارگر لگتی تھی۔ ہم نے فوری طور پر اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسرا روز اس پراسرار ترکیب کی مزید تفصیلات طے کرتے گزر گیا۔ جب سورج مغربی ریت کے ٹیلوں میں غروب ہو گیا تو اسکیم کے مطابق قنطور شہر بابل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے سامنے ویران صحرا پھیلا ہوا تھا۔ وہ

سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا آدھی رات کے قریب بابل کی فصیل کے قرب و جوار میں پہنچ گیا۔ وسیع و عریض قدیم شہر بابل کی چوڑی فصیل کے اوپر جگہ جگہ بروج میں مشعلیں روشن تھیں۔ یہاں شہر پناہ کے دفاعی مورچے بنے ہوئے تھے اور تیر اندازوں کے دستے تعینات تھے۔ قنطور فصیل شہر کے جنوب کی طرف آ گیا جہاں شاہ بابل بخت نصر کی سب سے چہیتی بیوی نوبیہ کا عظیم الشان محل تھا جس کی چھت پر معلق باغات میں جگہ جگہ فانوس جگمگا رہے تھے۔ اس نے ایک جگہ درختوں میں گھوڑے کو باندھا اور معلق باغات والے محل کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس جانب محل کی عقبی دیوار تھی جو کافی بلندی پر لہراتے درختوں کے جھنڈوں تک اٹھتی چلی گئی تھی۔ دیوار کے سائے میں دو جگہوں پر فوجی سپاہیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے اور چند ایک سپاہی گھوڑوں پر سوار دیوار کے ساتھ ساتھ شمالاً جنوباً گشت بھی لگا رہے تھے۔ قنطور کو ان ہی گھڑسواروں کے درمیان سے گذر کر شاہی محل کی دیوار تک جانا تھا جو عام حالات میں ایک ناممکن بات تھی کیوں کہ وہاں کوئی انسان ماسوائے شاہی سپاہیوں کے پر نہیں مار سکتا تھا۔

قنطور نے ایک اونچے ٹیلے کی اوٹ میں ہو کر دل ہی دل میں خفیہ منتر پڑھا۔ گہرا سانس بھرا اور پھر اسے چھوڑتے ہی ایک نیلے رنگ کے چکتوں والے چھوٹے سے خطرناک سانپ کی شکل اختیار کر لی اور شاہی محل کی عقبی دیوار کی طرف رینگنے لگا۔ سپاہیوں کے پڑاؤ تک وہ بڑی تیزی سے گذرتا گیا۔ پھر جھاڑیوں میں ایک جگہ رک گیا اور گھڑسواروں کے دستے کے گذرنے کا انتظار کرنے لگا جو بائیں جانب سے چلا آ رہا تھا۔ جب دستہ شمال کی جانب دیوار کے ساتھ ساتھ آگے نکل گیا تو قنطور نے حرکت کی اور برق رفتاری سے بنجر زمین پر جنگلی جھاڑیوں کے درمیان لہراتا بل کھاتا سیدھا دیوار تک پہنچ گیا اور پھر اس پر چڑھنے لگا۔ دیوار جہاں ختم ہوتی تھی وہاں سے معلق باغات کا پہلا تختہ شروع ہوتا تھا۔ دوسرے تختے کے اختتام پر شاہ بابل کی محبوب بیوی نوبیہ کا محل تھا جسے بادشاہ بخت نصر نے خاص طور پر اپنی بیوی کے لئے تعمیر کروایا تھا۔ معلق باغات کے دوسرے تختے کے اختتام پر شاہ بابل کی محبوب بیوی نوبیہ کا محل تھا جسے بادشاہ بخت نصر نے خاص طور پر اپنی بیوی کے لئے تعمیر کروایا تھا۔ معلق باغات کے دوسرے تختے میں بھی قسم قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے اور جا بجا ٹھنڈے پانی کے حوض تھے جن کے اوپر فانوس روشن تھے۔ قنطور ان کی روشنی سے بچ کر رینگتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی منزل شاہ بابل کی بیوی نوبیہ کی خواب گاہ تھی۔ یہ خواب گاہ اسے تلاش کرنی تھی۔ باغ کی فضا آدھی رات کی پرسکون خاموشی میں ہر نوع کے پھولوں کی خوشبو سے معطر ہو رہی تھی۔ سامنے شاہی محل کی کھڑکیوں میں سے کہیں شمع

دانوں کی سکون بخش روشنیاں باہر بکھر رہی تھیں۔ قنطور باغ کے تختے میں سے نکل کر ایک مرمریں روش کو پار کر کے ملکہ نوبیہ کے محل کے مغربی حصے میں آ کر ایک درخت کی سب سے اوپر والی شاخ پر چڑھ گیا اور سامنے محل کی کھلی کھڑکیوں کا جائزہ لینے لگا۔ اسے کنیزیں اور غلام پہرہ دیتے نظر آئے۔ ایک طرف کھڑکی کی طرز بارہ دری جیسی تھی جس کے پتلے ستونوں کے درمیان اسے خواجہ سرا او کنیزیں ایک اونچے دروازے والے کمرے کے اندر سے سونے چاندی کے طشت لئے نکلتے دکھائی دیئے۔ ان طشتوں میں اعلیٰ ترین عطریات کی رنگ برنگیاں شیشیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہی ملکہ نوبیہ کی خواب گاہ ہو سکتی تھی۔

قنطور درخت پر سے اتر آیا اور پہرہ داروں اور حبشی خواجہ سراؤں کی نظروں سے اپنے آپ کو بچاتا، اندھیرے میں رینگتا، اوپر دیوار پر لٹکتی پھولوں، بیلوں اور گیلریوں کے نیچے سے گذرتا پتلے مرمریں ستونوں والی بارہ دری کے پہلو میں آ گیا۔ پھر اس نے ایک مرمریں جالی میں سے اپنی گردن نکال کر جھانک کر دیکھا۔ اونچے آبنوسی دروازے پر سونے کی تاروں کا نفیس ترین کام ہوا ہوا تھا۔ آگے غلام گردش کے فرش پر بے حد قیمتی ریشمی قالین بچھے تھے۔ دیوار گیروں میں عنبر و لوبان میں ڈوبی ہوئی کافوری شمعیں روشن تھیں۔ دروازے پر رنگ برنگی چمکیلی شیشے کی جھلملیاں پڑی تھیں جن میں جواہرات پروئے ہوئے تھے۔ فضا میں عنبر و لوبان کی مہک رچی ہوئی تھی۔ دو خواجہ سرا تلواریں ہاتھوں میں لئے چل پھر کر اس دروازے کے آگے پہرہ دے رہے تھے۔ یہی ملکہ نوبیہ کی خواب گاہ تھی۔ وہ ملکہ نوبیہ جو شاہ بابل اور تاریخ کے عظیم ترین بابلی بادشاہ بخت نصر کی چہیتی بیوی تھی اور جس کی خوشنودی کی خاطر اس نے محل کی چوٹی پر آج کی دنیا کا ساتواں عجوبہ یعنی معلق باغات بنائے تھے۔ اب سب سے بڑا مسئلہ ملکہ نوبیہ کی خواب گاہ میں داخل ہونے کا تھا۔ تلوار بردار خواجہ سرا ایک وقفہ ڈال کر شاہی خواب گاہ کے دروازے کے سامنے سے گذرتے تھے۔ قنطور نے اس وقفے کو خاص طور پر درمیان میں رکھا اور جوں ہی دونوں دربان خواجہ سرا ایک دوسرے سے مل کر جدا ہوئے تو وہ بجلی کی طرح ابرہ دری کے درزوں میں سے نکلا اور قالین پر برق رفتاری سے رینگتا شاہی خواب گاہ کے دروازے کے کونے میں جھلملیوں کے پیچھے چھپ گیا۔ وہ اندر جانے کے لئے کوئی راستہ تلاش کرنے لگا۔ جہاں فرش ختم ہوتا تھا وہاں قالین کا فرش تھا اور اندر داخل ہونے کے لئے کوئی درز جتنی جگہ بھی نہ تھی۔ سارے دروازے پر سونے چاندی کے لٹو لگے تھے۔ قنطور رینگ کر دروازے کے اوپر محراب میں آ گیا۔ یہاں سے ایک جگہ چوکھٹ کی محراب میں سے ہلکی ہلکی روشنی باہر آتی نظر آئی۔ یہاں دروازے کا ایک پٹ چوکھٹ کی محراب سے تھوڑا سا آگے ہٹا ہوا تھا۔ قنطور کے لئے اتنی جگہ بہت تھی۔ وہ اس

درز میں سے گذر کر دوسری طرف آگیا۔

اندر آتے ہی اسے خوشبوؤں کی لپٹیں آتی محسوس ہوئیں۔ ایسی سحر انگیز اور جنت پرور خوشبو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سونگھی تھیں۔ بخور سلگ رہے تھے۔ کافوری شمعوں کے گل عنبریں شیشوں کے اندر سرخ حنا کے عطر میں ڈوب کر جل رہے تھے۔ زمین پر ریشمی قالینوں کا نرم فرش بچھا تھا۔ ایک بہت بڑے طاؤس کی شکل کا شاندار ہیرے موتیوں جڑا پلنگ خواب گاہ کے بیچ میں رکھا تھا۔ جس پر اندلسی ریشم کی باریک جالی کا سنہری پردہ گرا ہوا تھا۔ سرہانے کی جانب سونے کے شمع دان دھیمی دھیمی خواب آلود روشنی دے رہے تھے جن کی کرنیں طاؤس کی منقار آنکھوں اور کلغی میں لگے ہوئے نیلم، عقیق اور ہیروں پر پڑ رہی تھیں، اور ان میں سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس طاؤسی پلنگ پر ریشمی پردے کے اندر ایک کھلے بالوں والی.... نازنین بیٹھی اپنی مخروطی انگلیوں کی پوروں پر قرطاضیہ کے عطر گلاب کی مالش کر رہی تھی۔ یہی ملکہ نوبیہ تھی۔

وہ بے حد حسین تھی۔ اس کا سرخ و سپید رنگ شمعوں کی مدھم روشنی میں نورانی ہیولا بن کر چمک رہا تھا۔ کنیزیں اسے عطر و عنبر میں بسا کر شب بخیر کہہ کر جا چکی تھیں اور اب خوشبوؤں کی یہ ملکہ خود ایک مہکتا ہوا خواب بن کر خوابوں کی جنت میں اترنے والی تھی۔ یہی عورت قنطور کا شکار تھی اور اس نے اسی کی خاطر اتنا فاصلہ طے کیا تھا اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالی تھی۔

قنطور کے سامنے میدان بالکل صاف تھا۔ وہ دیوار سے اتر کر طاؤسی تخت کے سر کی جانب آیا۔ خواب گاہ میں روشنی بڑی مدھم تھی۔ وہ بڑی آسانی سے پلنگ کی ریشمی جھالروں سے لپٹ کر پلنگ کی پٹی پر سے ہوتا ہوا ریشمی پردے کی سلوٹوں کے نیچے سے گذر کر پلنگ کے اندر خواب انگیز معطر فضاؤں میں آگیا...ملکہ نوبیہ کی پشت اس کی طرف تھی۔ وہ اس خطرناک حقیقت سے بالکل بے خبر تھی اور ایک انتہائی زہریلا سانپ پلنگ پر اس کی پشت کے بالکل قریب ریشم و کمخواب کے تکیوں کے درمیان بیٹھا اسے اپنی سرخ آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ وہ عالم بے خبری میں بڑی معصومیت کے ساتھ اپنی انگلیوں پر عطر مل رہی تھی اسے قنطور کی موجودگی کا علم نہ تھا۔ قنطور اسے خبردار کر کے ڈسنا چاہتا تھا تاکہ وہ دیکھ لے کہ اسے ایک سانپ نے ڈسا ہے۔ قنطور نے ایک ہوش اڑا دینے والی پھنکار کی آواز نکالی۔ ملکہ نوبیہ تڑپ کر پیچھے گھومی۔ اپنے سامنے ایک نیلے رنگ کے سانپ کو پھن اٹھائے آہستہ آہستہ جھولتے اور بار بار سرخ دو شاخہ زبان باہر نکالتے دیکھا تو اس کے ہاتھ سے عطر کی مرمریں شیشی لڑھک گئی۔ اس کا رنگ دہشت کے مارے سفید پڑ گیا۔ منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور اس کے حلق سے چیخ بھی نہ نکل سکی۔ اب قنطور نے حملہ کر دیا۔ وہ اچھلا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لپک کر اس نے ملکہ کے پہلو میں آخری پسلی کے نیچے ڈس لیا۔ اب ملکہ نے ایک دلدوز چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔ اس کی چیخ پر دربان خواجہ سرا دروازہ دھڑاک سے کھول کر اندر کی طرف بھاگے۔ قنطور اس دوران میں دیوار پر پہنچ چکا تھا۔ ملکہ کو بے ہوش دیکھ کر خواجہ سراؤں کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ منہ اٹھائے دیوانہ وار شور مچاتے باہر کو دوڑے۔ محل میں کہرام مچ گیا۔ ملکہ عالیہ بے ہوش ہو گئیں۔ کسی کو بھی علم نہ ہو سکا کہ اسے سانپ نے ڈسا ہے۔ ملکہ کے پہلو پر قنطور کے ڈسنے سے دانتوں کا جو نشان بنا تھا اس پر ابھی تک کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ اسی وقت شاہ بابل بخت نصر کو اطلاع دی گئی۔ وہ شاہی حکیم کو لے کر ملکہ کی خواب گاہ میں پریشانی کے عالم میں پہنچا۔ شاہی حکیم نے تیز دوائیں سنگھا کر ملکہ کو ہوش دلایا تو اس نے بتایا کہ اسے سانپ نے کاٹا ہے اور دہشت کے مارے پھر بے ہوش ہو گئی۔ ملکہ کی پسلی کے نیچے سانپ کے کاٹے کا نشان موجود تھا۔ بخت نصر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ملکہ نوبیہ اس کی چہیتی بیوی تھی۔ شاہی حکیم کو حکم دیا گیا کہ وہ ملکہ کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ سارے محل میں سانپ کی تلاش کی گئی۔ مگر سانپ وہاں ہوتا تو انہیں ملتا۔

قنطور سانپ کی شکل میں ملکہ کی خواب گاہ سے نکل کر معلق باغات کے تختے پر سے ہوتا شاہی محل کی دیوار سے نیچے اتر چکا تھا۔ اب وہ رات کے اندھیرے میں شہر کی فصیل کے اوپر سے ہو کر دوسری طرف کھلے میدان میں آگیا جہاں ایک جانب نگراں دستوں کی چوکی تھی۔ وہ اس چوکی کے قریب اگی ہوئی جنگلی جھاڑیوں میں سے ہوتا دور نکل گیا اور پھر ایک چکر لگا کر اس باغ میں آیا۔ جہاں اس کا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ صبح ہو رہی تھی کہ قنطور میرے پاس پہنچا اور اس نے مجھے سارا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ سنایا جو میں آپ کو بیان کر چکا ہوں۔ یہاں میرے انسانی سانپ دوست قنطور کا پہلا مرحلہ ختم ہونا تھا اور اب میرا کام شروع ہونے والا تھا۔ قنطور نے مجھے بتایا۔ "میں نے منصوبے کے مطابق ملکہ نوبیہ کے جسم میں صرف اسی قدر زہر داخل کیا ہے جس سے وہ ہلاک نہیں ہو گی۔ صرف اس کا نچلا دھڑ بے حس ہو جائے گا اور جب تک میرا مہرہ اس کے ڈسے ہوئے زخم کے نشان پر نہیں رکھا جائے گا اس کے جسم میں زہر حرکت کرتا رہے گا اور وہ صحت مند نہیں ہو گی۔ میرے دوست عاطون! اب تمہارا کام شروع ہوتا ہے۔ اب تم شاہ بابل بخت نصر کے ساتھ نفتانی کے خاوند کشان کی زندگی کے بارے میں سودا بازی کر سکتے ہو۔ مگر شاہی حکیم اور شہر کے سارے طبیبوں کو ملکہ کے علاج سے مایوس ہو لینے دو۔" ہم نے ایسا ہی کیا اور وقت کا انتظار

کرنے لگے۔ اس دوران میں نے اپنی محبوبہ نفتانی سے ملنے کا فیصلہ کیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر ایک رات اس کی حویلی میں پہنچ گیا۔ دربان نے مجھے اندر جانے سے روک دیا لیکن جب میں نے اپنی منگیتر کو اپنا نام اور پیغام بھجوایا تو وہ خود حویلی کی ڈیوڑھی میں آ گئی اور مجھے دیکھ کر آنسو بہانے لگی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور کہا۔

"مجھے سب معلوم ہو گیا ہے۔ پہلے مجھے تمہاری شادی کا سن کر دکھ ہوا تھا کہ تم نے مجھ سے بے وفائی کی لیکن اب میرے دل میں تمہارے لئے کوئی گلہ شکوہ نہیں ہے۔ کوئی شکایت نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہارے خاوند کو بادشاہ محض اپنی تفریح طبع کے لئے ہلاک کر رہا ہے مگر وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔"

نفتانی نے پرامید نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ "تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟ بادشاہ نے اسے اپنی خاص قید میں رکھا ہوا ہے اور پورے چاند کی رات کا انتظار کر رہا ہے۔"

میں نفتانی کو منصوبے کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ "تمہارے خاوند کو شاہ بابل بہت جلد رہا کر دے گا۔ وہ اپنی جان بخشی کے بعد تمہارے پاس آ جائے گا لیکن تمہیں میری طرف سے تاکید ہے کہ اپنے خاوند کو لے کر تم اس شہر سے نکل جانا اور کسی دوسرے ملک میں جا کر اپنی زندگی شروع کرنا۔ کیوں کہ اگر تمہارا خاوند بابل میں رہے گا تو اس کی جان کو کسی وقت بھی شدید خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ کیا تم وعدہ کر سکتی ہو کہ اپنے خاوند کو لے کر بابل سے چلی جاؤ گی۔"

نفتانی کو میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے حامی بھری کہ اگر میرا خاوند رہا کر دیا گیا تو میں اسے لے کر بابل سے نکل جاؤں گی۔

"مگر عاطون! یہ کیسے ہو سکے گا؟ یہ ناممکن ہے۔ میرے خاوند کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ اب وہ کبھی میرے پاس نہیں آئے گا۔"

میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ حوصلہ رکھے خدا کی مرضی نہیں ہے کہ اس کا گھر برباد ہو اور اس کا خاوند ابھی ہلاک ہو۔ یہ کہہ کر میں واپس اپنے گاؤں آ گیا۔ چاند رات میں صرف دو دن باقی رہ گئے تھے اور دوسری جانب ملکہ نوبیہ کی حالت بدستور ویسی ہی مخدوش تھی۔ اس کا نچلا دھڑ سن ہو چکا تھا۔ شاہی دربار اور شہر کے سارے حکیم علاج سے مایوس ہو گئے تھے۔ شاہ بابل اپنی چہیتی بیوی کے بارے میں سخت پریشان تھا - اس نے اعلان کر دیا کہ جو کوئی اس کی ملکہ کو ٹھیک کر دے گا وہ اسے ملک قرطاضیہ انعام میں دے دے گا۔ حکماء اور طبیب ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے مگر ملکہ کے جسم سے زہر خارج نہ کر سکے تھے اور اس کا نچلا دھڑ بدستور بے حس تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ میں میدان میں کود پڑوں۔ چنانچہ

قنطور نے مجھے سبز رنگ کا چھوٹا سا سانپ کا ایک مہرہ نکال کر دیا اور کہا۔

"یہ میرا اپنا مہرہ ہے۔ اس کو جب تم ملکہ کے جسم پر زخم کے نشان کے قریب لے جاؤ گے تو یہ اڑ کر خود بخود زخم کے ساتھ جا کر چپک جائے گا اور اس کے جسم کا سارا زہر چوس لے گا لیکن اس مہرے کو جیب سے نکالنے سے پہلے تمہیں بادشاہ سے جو شرط منوانی ہو گی اس کو تم پوری طرح جانتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "اس شرط کے لئے تو ہم نے یہ سارا بکھیڑا شروع کیا تھا۔ میرے دوست! میں جانتا ہوں اور خدا نے چاہا تو کامیاب لوٹوں گا۔"

میں اپنا سفرنامہ قلمبند کرتے ہوئے ہر بار خدا کا ذکر کرتا ہوں۔ آپ ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ آج سے ساڑھے چار ہزار برس پہلے میرے ذہن میں خدا کا تصور کیسے آ گیا۔ جب کہ وہ بت پرستی کا اور مظاہر قدرت کی پوجا کا عہد تھا تو میں وضاحت کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مجھ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے افکار و عقائد کا گہرا اثر ہوا تھا۔ میں بھی پہلے مظاہر قدرت کی پرستش کرتا تھا اور خود ہمارے محل میں میرے چچا فرعون مصر اور شاہی خاندان کے تمام افراد سورج، بلی، سانپ اور دوسرے دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ لیکن ارشہر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام مظاہر قدرت کی پرستش چھوڑ کر ایک خدا کی تبلیغ فرمائی اور بیت المقدس کی بنیاد رکھی تو مجھ پر ان کی تبلیغ اور دین کا گہرا اثر ہوا اور میں نے تمام بتوں اور مظاہر کی پرستش چھوڑ دی اور توحید پرست ہو گیا۔ پھر خلفائے عباسیہ کے دور میں جب مجھ پر قرآن کی الہامی حکمت کا انکشاف ہوا تو میں نے بغداد کی ایک مسجد میں اسلام قبول کر لیا۔ اپنی زندگی کے اس خوش آئند انقلاب کے واقعے کو میں آگے چل کر بیان کروں گا جب میں عباسی خلفائے عہد میں داخل ہوں گا۔

ابھی میں یہ لکھ رہا ہوں کہ میں نے قنطور کے ساتھ مل کر اپنا حلیہ ایک حکیم جیسا بنا لیا۔ لمبی عبا پہنی، بغل میں جڑی بوٹیوں کا تھیلا لٹکایا اور گھوڑے پر سوار ہو کر شاہ بابل کے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جڑی بوٹیوں کا علم مجھے اپنے والد صاحب کی طرف سے ورثے میں ملا تھا اور میں ان کے خواص اور تاثیر سے خوب واقف تھا مگر یہاں قنطور کے سانپ والے مہرے کو اپنی کرامت دکھانی تھی جو میری جیب میں پڑا تھا۔ میں صبح کے وقت قنطور سے الگ ہو کر اپنے گاؤں سے نکلا تھا اور دوپہر کے وقت بابل پہنچا۔ میں سیدھا شاہی محل کی طرف آ گیا جہاں معلق باغات پر ایک اداسی چھائی ہوئی تھی۔ محل کے دروازے پر پہرہ لگا تھا۔ میں گھوڑی سے اتر آیا۔ تین حبشی دربان تلواریں سونتے میری طرف بڑھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور کس غرض سے وہاں آیا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ

میں ملک مصر کا ایک طبیب ہوں۔ ملکہ عالیہ کی بیماری کا سن کر اس کا علاج کرنے کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ بادشاہ سلامت کو اطلاع پہنچا دی جائے۔ اسی وقت بادشاہ کو خبر دی گئی کہ فرعونوں کے مصر سے ایک طبیب آیا ہے اور ملکہ کا علاج کر کے انہیں صحت یاب کرنے کا دعویٰ دار ہے۔ بادشاہ بخت نصر نے فوراً مجھے بلوا لیا۔ مجھے ملکہ نوبیہ کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ بادشاہ ایک منقش کرسی پر سر جھکائے اداس بیٹھا ہے۔ آس پاس کچھ وزیر اور امیر ادب سے کھڑے ہیں۔ سامنے طاؤسی پلنگ پر ملکہ نوبیہ بے ہوش پڑی ہے۔ اس کا رنگ زرد ہے اور چہرہ اترا ہوا ہے۔ آنکھوں میں سبز حلقے پڑ چکے ہیں۔ شاہی حکیم ملکہ کے پلنگ کی پٹی کے پاس بیٹھا طب کی ایک قدیم کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے۔ ذرا فاصلے پر ایک غلام کھرل میں آہستہ آہستہ کوئی بوٹی پیس رہا ہے۔ پلنگ کے سرہانے بخور سلگ رہے ہیں۔ بادشاہ نے ایک نگاہ بے نیازی سے مجھے دیکھا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا انداز صاف طور پر اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ میری نوجوان شکل و صورت دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی ہے اور اسے یقین نہیں آیا کہ جہاں اتنے لائق اور تجربہ کار حکیم اور طبیب علاج کر کے ناامید ہو چکے ہیں وہاں میں کیا کر سکوں گا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ شاہی حکیم کی نگاہیں ابھی تک طب کی کتاب پر لگی تھیں۔ اس نے مجھے اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ سب لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ میں ایک ناتجربہ کار نوجوان حکیم ہوں اور محض دولت کے لالچ کی غرض سے وہاں آ گیا ہوں۔ بادشاہ نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "تم کون ہو۔؟"

میں نے بڑے ادب سے کہا۔ "میں ملک مصر کا رہنے والا ہوں اور ملکہ عالیہ کی علالت کی خبر سن کر ان کا علاج کرنے آیا ہوں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "ہماری ملکہ کو پراسرار سانپ نے ڈس لیا ہے جس کے زہر نے اسے زندہ درگور کر دیا ہے۔ وہ بے ہوش ہے اور اس کا نچلا دھڑ سن ہو چکا ہے۔ ملک کے بڑے بڑے طبیب مریض مایوس ہو چکے ہیں تم کیسے علاج کرو گے؟ تم ابھی نوجوان ہو۔"

میں نے کہا۔ "بادشاہ سلامت! میں ملکہ عالیہ کی بیماری سے پوری طرح باخبر ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ان کا نہ صرف علاج کر سکوں گا بلکہ انہیں ابھی ایک پل میں صحت مند کر دوں گا مگر میری ایک شرط ہے۔"

اس پر سب میری طرف تکنے لگے۔ شاہی حکیم نے بھی کتاب پر سے نظریں ہٹا کر میری طرف گھور کر دیکھا۔ بادشاہ نے اپنی نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں اور پوچھا کہ میری شرط کیا ہے؟ میں نے بادشاہ کو بتایا کہ میری شرط یہ ہے کہ شاہی مشیر خاص کشان کی جان بخشی کی جائے اور اسے شاہی قید خانے سے نکال کر اس کے گھر پہنچا دیا جائے اور اس نے تانبے

کا جو بیل ایجاد کیا ہے اسے تباہ کر دیا جائے۔ اگر میری یہ شرط حضور تسلیم کرتے ہیں تو میں ابھی ملکہ عالیہ کو صحت مند کئے دیتا ہوں۔" خواب گاہ میں ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔ شاہی حکیم نے کتاب بند کر دی اور مجھ سے پوچھا کہ میں کس دوائی سے ملکہ عالیہ کا علاج کروں گا؟ میں نے کہا کہ میں یہ کسی کو نہیں بتا سکتا۔ بہرحال اگر میں ملکہ کو صحت مند نہ کر سکا تو بے شک میری گردن مار دی جائے۔ یہ اس قدر جرأت مندانہ پیش کش تھی کہ بادشاہ بخت نصر پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر جلدی سے کہا۔

"میں تمہاری دونوں شرطیں تسلیم کرتا ہوں۔ میں ابھی مشیر خاص کی رہائی اور تانبے کے بیل کو تباہ کرنے کا حکم صادر کرتا ہوں۔ یہ ہماری ملکہ کا علاج شروع کرو۔ اگر تم چاہو تو ہم تمہیں اس فرمان کو تحریری طور پر بھی لکھ کر دے سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے بادشاہ سلامت! مجھے آپ کے قول پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ میں جانتا ہوں آپ ایک عظیم بادشاہ ہیں اور اپنے قول سے کبھی نہیں پھریں گے۔"

بادشاہ نے فرمائش کی کہ ملکہ کا علاج شروع کیا جائے۔ سب کی نگاہیں مجھ پر لگی تھیں۔ شاہی حکیم تو ٹکٹکی باندھے میری ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے گزارش کی کہ ملکہ عالیہ کے جسم کو وہ حصہ سامنے کر دیا جائے جہاں سانپ کے کاٹنے کا زخم ہے۔ دو کنیزوں نے آگے بڑھ کر اسی وقت بے ہوش ملکہ عالیہ کے جسم کے اس حصے پر سے لباس کھسکا دیا۔ جہاں میرے دوست قنطور نے سانپ بن کر کاٹا تھا۔ یہاں قرمزی رنگ کے دو نشان پڑے ہوئے تھے جن پر آبلے بن گئے تھے۔ میں نے جیب سے سانپ کا سبز مہرہ نکالا تو شاہی حکیم کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بولا۔

"بادشاہ سلامت! یہ نوجوان ہم سے مذاق کرنے کا گستاخانہ ارادہ لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ یہ سانپ کا مہرہ ہے اور اس سے پہلے ہم ایک سو ایک سانپ کے مہرے آزما چکے ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے اور کارگر سے کارگر مہرے نے بھی ملکہ عالیہ کے جسم میں پھیلے ہوئے زہر کو نہیں چوسا۔"

بادشاہ نے استفسار طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ قنطور کا مہرہ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں ادب سے تعظیم کی اور بادشاہ سے کہا۔

"شاہ عالی مقام! اگر میرے علاج کے راستے میں رکاوٹ ڈالی گئی تو میں اپنے علاج میں کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ اس لئے شاہی حکیم کو ہدایت فرمائی جائے کہ وہ میرے طریقہ علاج میں دخل اندازی سے گریز کریں۔"

بادشاہ نے ہاتھ کے اشارے سے شاہی حکیم کو خاموش رہنے کا حکم دیا اور میری طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ مہرہ ہماری ملکہ کے جسم سے خطرناک سانپ کا زہر چوس لے گا؟"

میں نے ادب سے جواب دیا۔ "شاہ عالی مقام! اس کا جواب میرا یہ مہرہ دے گا۔"

ایک گہری خاموشی چھا گئی۔ میں نے سانپ کا مہرہ اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا اور ہتھیلی کا رخ ملکہ نوبیہ کے جسم کے عریاں حصے کی طرف کر دیا۔ میرا اپنا دل بھی اس وقت بری طرح دھڑک رہا تھا اور میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ میری لاج رکھ لینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کم بخت قنطور کا مہرہ دھوکہ دے جائے۔

لیکن قنطور صحیح معنوں میں ایک دیومالائی سانپ تھا جو ایک سو برس گزر جانے کے بعد انسانی شکل اختیار کرنے پر قادر ہو چکا تھا اور یہ مہرہ اس کا اپنا تھا اور انتہائی کارگر مہرہ تھا۔ میں نے بھی فرعون کے شاہی محلات میں سانپوں کے مہروں کی افسانوی کہانیاں سن رکھی تھیں مگر آج تک اپنی آنکھوں سے کسی مہرے کو کسی مارگزیدہ کے جسم سے زہر چوستے نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت میں نے بھی زندگی میں پہلی بار ایک مہرے کو یہ حیرت انگیز کارنامہ انجام دیتے دیکھا۔ جوں ہی میری ہتھیلی کا رخ ملکہ نوبیہ کے جسم کی طرف ہوا۔ قنطور کا مہرہ میری ہتھیلی سے اڑا اور سیدھا ملکہ کے جسم پر زخم کے نشان پر دونوں چھوٹے چھوٹے آبلوں کے درمیان جا کر چپک گیا۔ اس کرامت کو دیکھ کر سبھی دنگ رہ گئے۔ حیرت سے بادشاہ اور شاہی حکیم کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب سب کی نظریں سانپ کے مہرے پر لگی تھیں جو ملکہ کے جسم سے زہر کو چوس رہا تھا اور پھولتا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مہرے نے ملکہ نوبیہ کے جسم سے سارے کا سارا زہر چوس لیا اور وہ پھول کر انجیر جتنا ہو گیا تھا۔ پھر وہ خود بخود زخم سے الگ ہو کر نیچے گر پڑا۔ میں نے جلدی سے مہرا اٹھا لیا اور ایک خالی ڈبیہ میں اس کا سارا زہر نچوڑ ڈالیا۔ یہ کالا سیاہ زہر تھا۔

جسم سے زہر خارج ہوتے ہی ملکہ نوبیہ نے آنکھیں کھول دیں۔ ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بادشاہ نے اٹھ کر ملکہ نوبیہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

"ملکہ دیوتاؤں نے تمہاری زندگی واپس کر دی - کیا تم اپنے جسم کو ہلا سکتی ہو؟" ملکہ نے اپنے پاؤں کو حرکت دی۔ اس کے جسم میں زندگی کا ترو تازہ خون پھر سے گردش کرنے لگا تھا۔ وہ خوش ہو کر اٹھی اور بیٹھ گئی۔ بادشاہ نے بے اختیار ہو کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ شاہی حکیم نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھے اس حیرت افروز اور عظیم الشان کامیابی پر مبارک باد دی۔ دیگر معالجین بادشاہ اور ملکہ نوبیہ کو مبارک باد دینے لگے۔ بادشاہ نے حکم

دیا کہ مشیر خاص کشان کو رہا کر دیا جائے۔ تانبے کے منحوس بیل کو توڑ پھوڑ کر دریائے فرات میں پھینک دیا جائے اور خزانے کے منہ کھول دیئے جائیں اور غریبوں کے لئے لنگر جاری کر دیا جائے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

بادشاہ نے مجھے احسان مند نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "عاطون! دیوتا گواہ ہیں کہ میں نے تمہیں ایک ناتجربہ کار نوجوان سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی مجھے معاف کر دینا۔ تم نے ہماری ملکہ کو نئی زندگی دے کر ہمیں خرید لیا ہے۔ ہم نہ صرف تمہیں ملک قرطاضیہ کی حاکمیت عطا کرتے ہیں بلکہ تمہیں اپنے دربار میں شاہی حکیم کا منصب بھی عطا کرتے ہیں۔"

اس اعلان پر بزرگ شاہی حکیم کا چہرہ لٹک گیا۔ میں نے بادشاہ بخت نصر کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

"شاہ عالی مقام! مجھے نہ تو قرطاضیہ کی حاکمیت چاہئے اور نہ میرے دل میں کسی شاہی منصب کی خواہش ہے۔ میں ایک معمولی طبیب ہوں اور ملک ملک چل پھر کر خلق خدا کی خدمت کرنا چاہتا ہوں کہ یہی میرے استاد نے مجھے ہدایت کی تھی۔ اس لئے مجھے معاف کیا جائے۔ میری دونوں شرطیں آپ نے پوری کر دیں اور ایک انسان کی غلطی بخش کر اس کی جان بخشی کر دی اور دوسرے کئی انسانوں کی جان لینے والے منحوس تانبے کے بیل کو تباہ کر دیا۔ بس مجھے یہی چاہئے تھا۔ یہی میرا انعام ہے - میں ایک بار پھر تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب مجھے اجازت دی جائے۔"

میرے شدید اصرار پر شاہ بابل بخت نصر نے میری عرضداشت قبول کر لی اور میں شاہی محل سے کامیاب و کامران نکل کر سیدھا اپنی یہودی منگیتر نفتانی کی حویلی میں پہنچا۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے چہرے سے میرا خیرمقدم کیا ----- اس کا خاوند کشان تھوڑی دیر ہوئی شاہی قید خانے سے رہا ہو کر اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔ ان دونوں تک یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ میں نے شاہ بابل کی چہیتی ملکہ کو صحت یاب کیا ہے اور اس کے عوض کشان کی جان بخشی کروائی ہے۔ کشان کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا وہ ایک خوبصورت اور دل آویز شخصیت والا بابلی نوجوان تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ میری منگیتر کا خاوند بننے کے لائق تھا۔ وہ بار بار میرا شکریہ ادا کر رہے تھے اور میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا کہ میں نے اپنا انسانی فرض ادا کیا ہے۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے کے بعد میں واپس ہوا۔ میرے لئے اب وہاں کیا رکھا تھا۔ میری منگیتر کا گھر اجڑنے سے بچ گیا تھا اور اس کی زندگی کی خوشیاں اسے واپس مل گئی تھیں۔ میں نے انہیں تاکید کی کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے بابل شہر چھوڑ کر کسی دوسرے ملک چلے جائیں۔ نفتانی کے خاوند کشان نے کہا کہ وہ اگلے قافلے کے ساتھ

ملک یونان کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ میں قنطور کے پاس آگیا اور اسے اس کا مہرہ واپس دیتے ہوئے اپنی کامیابی کی خبر سنائی۔ وہ بھی بڑا خوش ہوا کہ کشان کی زندگی بچ گئی تھی۔ اس رات میں اور میرا انسان سانپ دوست قنطور کتنی ہی دیر تک بیٹھے آپس میں باتیں کرتے رہے۔ میں نے قنطور کو بتایا کہ میرا ارادہ ہے کہ بابل سے ملک یونان یا شام کی طرف چلا جاؤں۔ قنطور نے کہا کہ وہ جب کسی پھانسی یافتہ تازہ لاش کو رشی ناگ کے حضور پیش کرکے اپنی تیسری کرامت کی طاقت حاصل نہیں کرلیتا بابل ہی میں رہے گا۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ بخت نصر ایک ظالم بادشاہ ہے اور ہر دوسرے تیسرے روز کسی نہ کسی کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی روز اسے ایک ایسی لاش بھی مل جائے جس کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا ہو۔ میں نے مذاق کے طور پر قنطور سے کہا کہ وہ ایسا کیوں نہیں کرلیتا کہ جس روز آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں وہ کسی زندہ انسان کو پکڑ کر اسے خود پھانسی دے دے۔ اس پر قنطور نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

ہم سانپوں کا بھی ایک ضابطہ اخلاق اور قانون ہے۔ ہم کسی انسان پر صرف اس صورت حملہ کرتے ہیں جب ہماری جان کو خطرہ درپیش ہو۔ محض اپنے کسی دنیاوی مقصد کے لئے ہم کسی کو ہلاک نہیں کرسکتے۔ اس لئے مجھے لامحالہ کسی پھانسی دی ہوئی لاش کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اگر تم جانا چاہتے ہو تو بے شک چلے جاؤ۔ ہماری زندگیاں بڑی طویل ہیں۔ تاریخ کے دھارے پر سفر کرتے ہوئے کسی نہ کسی موڑ پر ہم پھر ایک دوسرے سے آملیں گے۔"

قنطور نے بڑے پتے کی بات کہی تھی کیوں کہ تجربے نے ثابت کردیا کہ بعد میں ایسا ہی ہوا۔ ہم کئی بار عجیب و غریب حالات میں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے لیکن کچھ عرصے بعد ان سے بھی زیادہ عجیب و غریب اور پراسرار حالات میں دوبارہ ایک دوسرے سے آن ملے۔ مگر ابھی فوری طور پر بابل سے جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ قنطور سے مجھے گہرا جذباتی لگاؤ ہو گیا تھا اور میں اس کے پاس زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میرے ساتھ کبھی ایسا ہوتا کہ میں وقت کے ساتھ ساتھ سفر کئے جاتا۔ بادشاہ اور دوسرے لوگ میرے سامنے قتل ہوتے یا بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر طبعی موت مر جاتے۔ ان کی جگہ دوسرا بادشاہ تخت شاہی پر متمکن ہو جاتا اور وقت میرے چہرے پر عمر رسیدگی کی ایک جھری ڈالے بغیر گذر جاتا اور کبھی ایسا ہوتا کہ اچانک کوئی معمولی سا حادثہ وقوع پذیر ہوتا اور میں اچانک ایک عہد، ایک دور سے نکل کر دو سو یا چار سو سال آگے کے زمانے میں جا نکلتا۔

اس رات جب میں اور قنطور بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو قنطور نے اپنا مہرہ مجھے دے کر کہا کہ اسے سونگھو۔ میں نے مہرے کو سونگھا۔ اس میں سے عجیب سی ہلکی ہلکی خوشبو نکل رہی

تھی۔ ایسی خوشبو میں نے پہلے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ قنطور نے کہا۔ "یہ میری خوشبو ہے۔ زندگی اور تاریخ کے اس طویل ترین سفر میں اگر کبھی ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور کسی اتفاق کے ساتھ ایک ہی عہد اور ایک ہی شہر میں نمودار ہوئے تو تمہیں میرے جسم کی یہی خوشبو آجائے گی اور تمہیں اس شہر اس صحرا یا اس جنگل میں میری موجودگی کا احساس دلا دے گی۔" میں نے قنطور کے مہرے کو دو تین بار سونگھا اور اس کی خوشبو ذہن میں بٹھا لی۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ صبح کا سورج مجھے بابل شہر کے قرب و جوار میں نہیں دیکھے گا۔

رات ڈھلنا شروع ہو گئی تھی۔ قنطور نے کہا کہ میں کچھ دیر کے لئے آرام کرنا چاہتا ہوں اور وہ تخت کے بچھونے پر لیٹ گیا۔ مجھے نیند آتی ہی نہیں تھی۔ میں نے قنطور کو آرام کرنے دیا اور خود باہر نکل آیا۔ آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ چاندی کے زیور کی طرح چمک رہے تھے۔ ریت کے ٹیلے ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں دیوپیکر ہاتھیوں کی طرح ساکت و جامد بیٹھے ہوئے لگ رہے تھے۔ بستی کے مکانوں پر گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں چہل قدمی کرتے ہوئے بستی کے عقب کی جانب نکل گیا جہاں کھجور کے درختوں کے سائے میں ایک چھوٹا سا چشمہ تھا۔ میں چشمے کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ بڑی پرسکون اور خاموش رات تھی۔ کسی پتے کے ہلنے کی بھی صدا پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے ایک ملکوتی طمانیت کا احساس ہوا اور میری آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں۔ شاید مجھے تھوڑی دیر کے لئے اونگھ سی آگئی تھی۔ مجھے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ مگر اب میری آنکھوں کے سامنے ایک اور ہی منظر تھا۔ نہ وہاں وہ گاؤں تھا نہ ریت کے ٹیلے تھے اور نہ وہ صحرا اور نہ کھجور کے درخت اور چشمہ تھا۔ میرے قریب ایک گھوڑا کھڑا گردن ہلا رہا تھا۔ وقت رات ہی کا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک قبرستان میں بیٹھا ہوا ہوں جہاں قبریں پتھروں کے چبوتروں کی طرح کی بنی ہوئی ہیں اور ہر قبر پر یونانی اصنام کی پچی کاری کی ہوئی ہے۔ یا خدا! یہ میں کہاں آگیا ہوں۔ قبرستان سے پرے پہاڑیوں کی ڈھلانیں تھیں۔ میں نے اپنے لباس کو دیکھا۔ میرا لباس یونانی نوجوان کا لباس تھا۔ پاؤں میں چپل تھی۔ جسم پر سفید اور نیلے رنگ کا یونانی لباس تھا اور سر پر زیتون کے پتوں کی گول ٹوپی تھی۔ کمر کے گرد چمڑے کے غلاف میں بند یونانی خنجر لٹک رہا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک پختہ عمر کی اونچی لمبی، سیاہ بالوں اور روشن آنکھوں والی عورت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں اسے حیرت سے تک رہا تھا۔ اس عورت کے چہرے پر شاہانہ

جلال تھا۔ میرے قریب آ کر اس نے تعجب سے کہا۔

"بطلیموس! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں تو سکندر سے مل کر سیدھا میرے پاس آنا چاہئے تھا۔ مجھے بتاؤ میرے بیٹے سکندر کا کیا حال ہے اور اپنی سوتیلی ماں قلوبطریس کے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہے؟؟"

میرا سر چکرا کر رہ گیا لیکن تھوڑی دیر بعد ہی مجھ پر تحیر افزا انکشاف ہوا کہ تاریخ نے ایک بار پھر مجھے پانچ برس آگے دھکیل دیا تھا۔ اور میں یونان کے سنہری عہد میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ عورت بعد میں بننے والے سکندر اعظم کی ماں اولمپیاس تھی۔

مگر یہ ایک بڑی زبردست سیاست کار اور جابر ارادوں کی مالک عورت تھی اور اس نے اپنے بیٹے سکندر کو دنیا کا فاتح بنانے کا عہد مصمم کر رکھا تھا۔ میری شناخت یہاں بطلیموس کی شکل میں متعین ہوئی تھی جو تاریخ کے اوراق پارینہ کے مطابق سکندر کا گہرا دوست اور عظیم یونانی فلاسفر اور سکندر کے اتالیق ارسطو کا شاگرد خاص تھا۔ آہستہ آہستہ میری نئی حیثیت اور نئی شناخت کی تمام جزئیات اور یادیں میرے ذہن میں ابھر رہی تھیں۔ اب مجھے بخوبی یاد آ رہا تھا کہ سکندر کی والدہ اولمپیاس نے مجھے سکندر کا حال احوال معلوم کرنے کے لئے شاہی محل کی طرف روانہ کیا تھا اور میں ابھی ابھی مقدونیہ کے یونانی بادشاہ اور سکندر کے والد فیلقوس کے شاہی محل سے نکل کر آ رہا تھا۔ اولمپیاس مجھے قبرستان میں بنی ہوئی ایک جھونپڑی میں لے گئی۔ یہاں ایک دیا روشن تھا۔ سکندر کی باجبروت اور پختہ کار پراسرار اور گہری صورت ماں میرے سامنے بیٹھی مجھ سے سکندر کی خیریت معلوم کر رہی تھی۔ اس کا حسن پراسرار اور طلسمی تھا اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں یونانی دیویوں کی مقناطیسی اور طلسمی کشش تھی۔ قبرستان میں ایک گہرا سناٹا تھا۔ اس وقت یہ عورت مجھے ایک جادوگرنی لگ رہی تھی۔ اس نے شروع ہی سے اپنے بیٹے سکندر کو دنیا کا فاتح بنانے کا عہد کر رکھا تھا اور اسے اس سانچے میں ڈھال رہی تھی۔ اس نے سکندر کے استاد عظیم فلسفی ارسطو کو خاص طور پر یہ ہدایت کی تھی کہ وہ اسے ایسی تعلیم دے کہ جس سے اس کے بیٹے سکندر کے دل میں دنیا کو فتح کرنے کا ولولہ اور عزم پیدا ہو اور ارسطو سکندر کو انہی اصولوں پر تعلیم دے رہا تھا۔

جھونپڑی میں خاموشی چھائی تھی۔ کونے میں دیا روشن تھا۔ اس پراسرار دھیمی روشنی میں مجھے سکندر کی والدہ کے چہرے پر خونی سازشوں اور بربریت خیز فتنوں کی پرچھائیاں چلتی پھرتی نظر آ رہی تھیں اور آگے چل کر یہ پرچھائیاں صحیح پیش گوئیاں ثابت ہوئیں۔ اس نے گہری اور پرعزم آواز میں کہا۔

"بطلیموس! تم سکندر کے گہرے دوست ہو۔ تم بھی یاد رکھو۔ میرے بیٹے کو مقدونیہ کے تخت پر بیٹھ کر ساری دنیا کو فتح کرنا ہے۔" اس کی آواز مجھے جھونپڑی میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔

سکندر کی والدہ کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ سکندر ایک کھلنڈرا لڑکا ہے اور اسے سوائے گھوڑوں کے اور کسی شے سے دلچسپی نہیں لیکن اس نے سکندر کے استاد عظیم فلسفی ارسطو کو ہدایات دے رکھی تھیں کہ وہ سکندر کے دل میں حکمرانی کا جذبہ بیدار کرے اور اسی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی تربیت کرے اور اس کے کان میں ہر وقت یہ بات ڈالتا رہے کہ وہ بادشاہوں کا بادشاہ بننے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ دوسری جانب سکندر کے باپ کو احساس ہو گیا تھا کہ اس کی ماں سکندر کو اپنے جیسا ایک پراسرار فتنہ بنانا چاہتی ہے چنانچہ اس نے بھی ایسے جتن شروع کر رکھے تھے کہ سکندر زیادہ سے زیادہ ماں سے دور رہے۔ قلوبطرس سے بیاہ رچانے اور اولمپیاس سے علیحدگی کے بعد فیلقوس کے لئے میدان صاف ہو گیا تھا لیکن یہ راز اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ اس نے اپنے بیٹے سکندر کو جس عظیم فلسفی کی درس گاہ میں طب اور حکمت کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیج رکھا ہے۔ وہ فلسفی اس کی سابقہ بیوی اولمپیاس کے اشاروں پر چل رہا ہے اور سکندر کے ذہن میں مقدونیہ کے تخت پر قبضہ کرنے کے بیج بو رہا ہے۔ ارسطو کی یہ تاریخی عبادت گاہ یا درس گاہ مقدونیہ شہر سے بارہ کوس دور ایک پرفضا پہاڑی مقام پر واقع تھی۔ اس درس گاہ کے باغ میں زیتون اور انجیر کے درختوں کے درمیان سرسبز گھاس پر چل پھر کر ارسطو طلبا کو علم و دانش کے رموز بتایا کرتا تھا۔

میں نے سکندر کی والدہ اولمپیاس کو یونانی انداز میں سلام کیا اور جھونپڑی سے نکل کر چاندنی رات میں ڈوبے ہوئے پراسرا خاموش قبرستان سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہو کر شاہی محل کی طرف چل دیا۔ سکندر کے باپ فیلقوس کی نئی نوجوان اور حسین بیوی قلوبطرس اپنے چچا اطالوس کے ہمراہ شاہی محل میں رہتی تھی۔ یہ دونوں سکندر کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھتے تھے اور جب قلوبطرس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو انہوں نے سکندر کو کھلنڈرا اور کند ذہن اور تخت کے لئے نااہل ثابت کرنے کی باقاعدہ مہم شروع کر دی۔ سکندر کا باپ فیلقوس اپنی

نوجوان بیوی کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا۔ اس پر قلوبطرس کے حسن کا جادو سوار تھا۔ اسے یقین ہونے لگا تھا کہ سکندر ولی عہد بننے کے لائق نہیں ہے اور مقدونیہ کے تخت کا وارث اس کی دوسری بیوی قلوبطرس کا بیٹا ہی ہو گا۔ ایک دن آدھی رات تک شاہی محل میں جشن ہوتا رہا اور ساغر گردش میں رہا مگر سکندر شراب نہیں پیتا تھا اور یہ بہت بڑی خوبی تھی۔ سکندر کی سوتیلی ماں اور اس کا چچا چاہتا تھا کہ سکندر کو شراب لگا دی جائے تا کہ وہ لہو و لعب میں ڈوب کر ناکارہ ہو کر رہ جائے۔ قلوبطرس نے سکندر کو جام مے پیش کیا۔ سکندر نے انکار کر دیا۔ اطالوس نے سکندر کو یہ کہہ کر ڈانٹا کہ وہ گنوار ہے اور مقدونیہ کے تخت کا وارث بننے کا اہل نہیں ہے کیونکہ دیوتا زیورس کسی ایسے شاہی نوجوان کو تخت شاہی پر متمکن نہیں دیکھ سکتا جو اس کے حضور شراب کا نذرانہ پیش نہ کرے۔ سکندر کو طیش آ گیا۔ اس نے جام شراب اٹھایا اور قلوبطرس کے چچا کے سر پر دے مارا۔ سکندر کی سوتیلی ماں لپک کر سکندر کی طرف آئی تو اس نے اس کے منہ پر بھی ایک زور دار طمانچہ مار دیا۔ محفل پر سناٹا طاری ہو گیا۔ سکندر کا باپ نشے اور غصے کی حالت میں اٹھا۔ اس نے تلوار کھینچ لی اور سکندر پر وار کرنے ہی والا تھا کہ نشے کی وجہ سے قدم ڈگمگا گئے اور گر پڑا۔ سکندر نے حاضرین محفل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو جو شخص تلوار تھام کر دو قدم نہیں چل سکتا اور جو میرا باپ ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ مقدونیہ کی حکمرانی کرنے کے قابل ہے؟"

پھر اس نے اپنی سوتیلی ماں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس زہریلی ناگن نے مقدونیہ کے عظیم شہنشاہ کو ایک معمولی شرابی بنا کر رکھ دیا ہے۔ لیکن میں اپنے باپ کے تخت پر بیٹھ کر نہ شراب پیوں گا نہ حسین عورتوں کے جادو میں پھنسوں گا۔ سن لو اے مقدونیہ کے لوگو! میں ایک دن مقدونیہ بلکہ پورے یونان کا نام سورج کی طرح روشن کروں گا۔"

اسی رات سکندر کی والدہ اولمپیاس نے خفیہ طور پر اپنے بیٹے کو قبرستان والی جھونپڑی میں بلا کر اس کا ماتھا چوم لیا اور کہا۔ "میرے لخت جگر! میں تمہیں صرف یونان ہی کا نہیں بلکہ پوری دنیا کا شہنشاہ دیکھنا چاہتی ہوں۔" سکندر رات گئے تک اپنی ماں سے باتیں کرتا رہا اگلی دن مجھے معلوم ہے کہ سکندر کے باپ کی دوسری بیوی نے اسے اور زیادہ بھڑکا دیا ہے اور وہ سکندر سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ قبرستان میں ایک رات سکندر کی والدہ کو میں نے بتا دیا کہ سکندر کی جان خطرے میں ہے۔ اس حسین ناگن اور پختہ کار جادوگرنی نے مجھ پر جیسے جادو کر دیا اور جب میں ملکہ اولمپیاس کی جھونپڑی سے نکل کر گھوڑا دوڑاتا شاہی محل کی

طرف جا رہا تھا تو مقدونیہ کے بادشاہ اور سکندر کے باپ فیلقوس کو قتل کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

وہ بڑی طوفانی رات تھی۔ مقدونیہ کے پہاڑی جنگلوں اور شہر پر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ شہر گھپ اندھیرے کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ شاہی محل میں بھی کہیں کہیں مشعلوں اور شمعوں کی دھندلی دھندلی روشنی ہو رہی تھی۔ یہی وہ رات تھی۔ جب مجھے سکندر کے باپ کو ہلاک کرنا تھا۔ خدا جانے اس حسین ناگن اولمپیاس نے مجھ پر کیا جادو کر رکھا تھا کہ میں فیلقوس کو قتل کرنے کے لئے بے تابی سے اپنے محل کی خواب گاہ میں ٹہل رہا تھا۔ زہر میں بجھا ہوا خنجر کپڑوں میں چھپایا اور شمع گل کر کے خواب گاہ سے نکل کر دبے پاؤں شاہ فیلقوس کی شاہی خواب گاہ کی طرف چلا۔ میں شاہی خواب گاہ میں جانے والے خفیہ راستے سے بخوبی واقف تھا۔ یہ ایک بارہ دری کی سیڑھیوں میں سے ہو کر بادشاہ کی خواب گاہ کی مرمریں دیوار کے ستونوں کے درمیان جا نکلتا تھا۔ اس خفیہ راستے کا علم بادشاہ اس کی پہلی بیوی اولمپیاس اور وزیر خاص کے سوا اور کسی شخص کو نہیں تھا۔ اس خفیہ راستے کا پتہ مجھے حسین ناگن اولمپیاس نے بتایا تھا۔ میں تاریک راہ داریوں اور نیم روشن غلام گردشوں میں سے گزرتا بارہ دری میں آ گیا اور سیڑھیاں اترتا خفیہ سرنگ میں داخل ہو گیا۔ اس سرنگ کا منہ ایک بہت بڑے قالین سے بند کر دیا گیا تھا۔ یہ قالین سیڑھیوں کی دیوار پر لٹکا ہوا تھا۔ سرنگ کے اندر تاریکی تھی لیکن زمین پر قالین بچھا ہوا تھا۔ میں دبے پاؤں چلتا، سانس روکے، بادشاہ کی خواب گاہ میں ستونوں کے پیچھے نکل آیا۔ خواب گاہ کی فضا خواب انگیز تھی اور خوشبوئیات سلگ رہی تھیں۔ سونے کے شمع دان میں لو ساکت تھی اور اس کی خواب آلود روشنی نے خواب گاہ کو پراسرار بنا دیا تھا۔ میں نے ستونوں کے آگے پڑا ہوا ویلوٹ کا بھاری پردہ سرکا دیا اور دیکھا کہ بادشاہ شاہی پلنگ پر محو خواب تھا۔ اس کے پہلو میں قلوبطرس گہری نیند میں تھی مگر دونوں کے درمیان فاصلہ تھا۔ خنجر میرے ہاتھ میں تھا۔ میں بادشاہ فیلقوس کا اس طرح سے کام تمام کرنا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی بیدار نہ ہو۔

میں دبے پاؤں چل کر بادشاہ کے سرہانے کی طرف آ گیا۔ اب پلک جھپکنے میں سب کچھ کرنا تھا۔ میں نے بیک وقت ایک ہاتھ بادشاہ کے منہ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے خنجر کے ایک ہی وار سے اس کی گردن آدھی سے زیادہ کاٹ کر رکھ دی۔ مگر بادشاہ کے کٹے ہوئے گلے سے ایسی بھیانک آواز نکلی کہ قلوبطرس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بادشاہ کو خون میں لت پت تڑپتے دیکھا تو پلنگ پر سے اچھل کر میری طرف لپکی۔ اس کی موت کا وقت آن پہنچا تھا جو اس نے ایسی حرکت کی۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرے چہرے کا نقاب نوچ لیا اور

میری شکل دیکھ کر اس کے منہ سے صرف اتنا نکل سکا۔ "بطلیموس تم؟" اگر وہ میرا نقاب نہ نوچتی اور میری شکل نہ دیکھتی تو میرا ارادہ اسے کوئی گزند پہنچانے کا نہیں تھا لیکن اب وہ ایک خطرناک گواہ بن گئی تھی اور میں اسے کسی طور بھی زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میرے خنجر کا دوسرا وار قلوبطرس کے سینے پر پڑا۔ وہ دہری ہو کر پلنگ پر سکڑ گئی۔ میں نے اسے بھی وہیں ختم کر دیا اور خنجر لبادے میں چھپا کر سرنگ کے خفیہ راستے سے ہوتا ہوا واپس اپنی خواب گاہ میں آ گیا۔

صبح محل میں شور مچ گیا کہ کسی نے بادشاہ فیلقوس اور اس کی بیوی قلوبطرس کو قتل کر دیا ہے۔ سکندر اپنے باپ کی لاش پر سوگوار کھڑا تھا اور میں اسے حوصلہ دے رہا تھا اور اس کی دل جوئی کر رہا تھا۔ سلطنتوں کی سیاست اور شاہی محلات کی سازشی فضاؤں نے مجھے یہی کچھ سکھایا تھا اور اس وقت تو مجھ پر سکندر کی والدہ کے سحر کا اثر بھی تھا۔ جب میں اس سحر سے نکلا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس روز اولمپیاس ایک ملکہ کی طرح شاہ محل میں واپس آ گئی اور اس نے اپنے بیٹے سکندر کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ دربار کے سبھی امراء اس حسین ساحرہ کے ساتھ ملے ہوئے تھے اور اس نے شاہی محل کے چپے چپے میں اپنی ساحرانہ سازشوں کا جال پھیلا رکھا تھا۔ سکندر اب سکندر اعظم تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس نے پورے یونان کو فتح کر لیا اور پھر مصر پر چڑھائی کر دی اور اسے بھی زیر نگین کر لیا۔ اب وہ ایران اور اس کے بعد ہندوستان پر پر چڑھائی کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ میں اس کے گہرے اور قریبی دوست اور مشیر خاص کی حیثیت سے اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ سکندر ہی کے ساتھ میں نے پہلی بار یونان کے عظیم الشان اور گمنام فلسفی دیوجانس کلبی کو دیکھا۔ اس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں درس گاہ اور مقدونیہ میں مشہور تھیں کہ وہ جنگلوں میں روپوش ہو کر رہتا ہے اور کسی سے نہیں ملتا۔ استاد زماں ارسطو بھی اس کا بڑا احترام کرتا تھا مگر وہ ارسطو کے ہمراہ شاہی محل کی طرف جاتے ہوئے زیتون کے باغ کے قریب سے گزرا تو ایک مضبوط تن و توش کا آدمی بوسیدہ لبادہ اوڑھے باغ کے باہر زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا انگلی سے اقلیدس کی اشکال بنا رہا تھا۔ سکندر علما اور فلسفیوں کا بے حد احترام کرتا تھا۔ وہ اس فلسفی کو پہچان گیا اور چلتے چلتے گھوڑے کی باگ کھینچ کر بولا۔

"بطلیموس! جانتے ہو یہ کون بیٹھا ہے یہ دیوجانس کلبی ہے۔"

میں پہلی بار اس نابغہ روزگار اور تاریخ فلاسفہ کی منفرد شخصیت کو دیکھ رہا تھا۔ دیوجانس کے بال کافی حد تک سفید ہو چکے تھے۔ وہ انگلی سے زمین پر اقلیدس کی شکلیں بنانے میں

اس قدر محو تھا کہ اسے احساس ہی نہ ہوا کہ سکندر اعظم گھوڑے سے اتر کر اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ موسم سرد تھا اور دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر سکندر کا سایہ دیوجانس پر پڑنے لگا تھا۔ سکندر اس وقت تقریباً آدھی دنیا فتح کر چکا تھا اور بقیہ نصف دنیا کو فتح کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس کے دل میں اپنی برتری کا ایک شدید احساس بیدار ہو چکا تھا۔ اصحاب علم و دانش کی تکریم و تعظیم کے باوجود وہ چاہتا تھا کہ اس کی بھی تعظیم و تکریم کی جائے مگر دیوجانس کلبی نے آنکھ اٹھا کر بھی سکندر اعظم کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ میں سکندر کے پہلو میں خاموش کھڑا تھا۔ سکندر نے کہا۔

"دیوجانس! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں سکندر اعظم ہوں۔"

دیوجانس کلبی نے سر اوپر اٹھائے بغیر کہا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں دیوجانس کلبی ہوں؟"

سکندر دیوجانس کی اس شان بے نیازی اور احساس خودی سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے کہا۔ "دیوجانس! تم اس وقت جو مانگو گے میں تمہیں دے دوں گا۔"

دیوجانس نے اب بھی آنکھ اٹھا کر سکندر کو نہ دیکھا۔ سکندر کا سایہ اس پر پڑ رہا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ "دھوپ چھوڑ دو۔" سکندر ایک لمحے کے لئے گویا سناٹے میں آ گیا۔ اس نے ابھی تک ارسطو ایسے فلسفی دیکھے تھے جن پر شاہی نوازشات کی ہر وقت بارش ہوتی تھی اور جو اپنی درسگاہ کے باغ میں رہتے ہوئے بھی ایک شاہی امیر کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا اور اب اس کے سامنے زمین پر ایک ایسا نابغہ روزگار فلسفی بیٹھا تھا جو علم و حکمت میں ارسطو سے دو قدم آگے تھا مگر شان بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ اس نے سکندر اعظم ایسے بلند مرتبت شہنشاہ کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔ سکندر نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"دیوتا زیوس کی قسم! اگر میں سکندر نہ ہوتا تو دیوجانس کلبی ہوتا اور اگر دیوجانس کلبی فلسفی نہ ہوتا تو سکندر اعظم ہوتا۔"

سکندر اعظم نے بڑی بلیغ بات کہہ دی تھی۔ ہم شاہی محل کی طرف چل پڑے۔ یونانی علم و حکمت نے ارسطو کی وساطت سے سکندر کے کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ اگرچہ اسے اپنے ایک عظیم و برتر بادشاہ ہونے کا احساس تھا مگر اس نے خود کو کوئی خطاب نہیں دے رکھا تھا۔ سکندر اعظم کا خطاب بھی دوسرے مفتوحہ ممالک کے امراء وزراء نے اسے دیا تھا۔ سکندر اعظم کے ہر معرکے اور فتوحات میں میں اس کے ہم رکاب رہا۔ اس نے جتنے بھی ملک فتح کئے وہاں کے لوگوں کے ساتھ اس نے حسن سلوک کا مظاہرہ کیا نہ لوٹ مار ہونے دی نہ عورتوں کو ذلیل و رسوا ہونے دیا اور نہ بستیوں کو آگ لگائی بلکہ اس

نے نئی بستیاں تعمیر کروائیں اور جنگلوں میں رہنے والے لوگوں کو وہاں آباد کیا۔ ہاں جب اس نے ایران فتح کیا تو اس پر ایرانی دربار کی سطوت اور جاہ و جلال کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ مفتوح ایرانی شہنشاہ دارا کے دربار میں آکر اس نے پہلی بار دیکھا کہ بادشاہ کی ایک دیوتا کی طرح پرستش ہوتی ہے اور اسے خدا کا اوتار سمجھا جاتا ہے ہندوستان پر حملے اور پنجابی راجاؤں کے ملک فتح کرنے کے بعد سکندر کے دل میں یہ احساس اور زیادہ شدت اختیار کر گیا اور اس نے اپنے دیوتا ہونے کا اعلان کر دیا۔

یونانی دور میں داخل ہونے سے پہلے میں نے فراعنہ مصر کی ملوکیت پرست تہذیب و سیاست کو دیکھا تھا اور اس کے بعد بابل و نینوا کی وادی میں مطلق العنان شہنشاہوں کے جبر و استبداد کا مشاہدہ بھی کیا اور خود ان کا شکار بھی ہوا لیکن یونان میں مجھے پہلی بار انسانی ذہن و فکر کی پختگی اور آزادی کا احساس ہوا۔ اگرچہ یہاں بھی حکومت کی باگ ڈور ایک فرد واحد کے ہاتھ میں تھی لیکن اس کے پیچھے پارلیمان کی ابتدائی شکل کی ایک مجلس تھی جو بادشاہ کے کردار پر کڑی نظر رکھتی تھی۔ حصول علم پر یہاں کسی کی اجارہ داری نہیں تھی۔ ہر کوئی علم حاصل کر سکتا تھا۔ سقراط نے جمہوریت کے اصول وضع کرتے ہوئے ہر صاحب فکر اور عام شہری کے لئے آزادی رائے کے دروازے کھول دیئے تھے۔ مذہبی معاملات کو شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک پروہت کلاس تھی۔ پروہتوں کو عام لوگ ایک طے شدہ عرصے کے لئے منتخب کرتے تھے۔ دوسری کلاس شاعروں کی تھی جو فطرت کے حسن اور مظاہرات کے گن گاتی تھی۔ تیسری کلاس یا تیسرا طبقہ فلسفیوں کا تھا جن کے ذمے نوجوان نسل کی اخلاقی نشو و نما اور تعلیم و تربیت کا کام تھا۔ اگر کوئی شخص دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا تو وہ پروہت کے پاس جاتا تھا۔ اگر وہ فطرت کے مظاہرات سے آگاہی کا خواہش مند ہوتا تو ہومر ایسے شعرا کا کلام پڑھتا یا سنتا تھا اور اگر وہ کسی نفسیاتی مرض میں مبتلا ہوتا تھا تو کسی فلاسفر کی طرف رجوع کرتا تھا۔ یونانی عہد سے پہلے سنگ مرمر اتنا مکمل کبھی نہیں تھا۔ یونانی مجسمہ سازوں نے سنگ مرمر کے اندر چھپے ہوئے حسن اور شاعری کو بے نقاب کیا۔ یونان میں فن سے فطرت کی اور فطرت سے فن کی نشو و نما ہوتی تھی۔ یونان میں خوب صورتی اور حسن کو خیر اور بدصورتی کو گناہ اور شر تصور کیا جاتا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ یونانی عورتوں نے اپنی خواب گاہوں میں اپالو کے حسین مجسمے رکھ چھوڑے تھے تاکہ ان کی اولاد بھی اپالو کی طرح حسین اور خوبصورت پیدا ہو۔ ایران کی فتح سے یونانی فکر و دانش کو ایک زبردست مہمیز ملی۔ ایران کی فتح سے پہلے یونان میں فن مجسمہ سازی ابھی اتنا پختہ اور مکمل نہیں ہوا تھا - ایران کی فتح کے بعد صحیح معنوں میں یونان سنگ مرمر کے حسن کا دور

شروع ہوا اور یونانی مجسمہ سازوں نے ہومر کے تصورات کو سنگ مرمر کی شکل میں ڈھالا۔ علم و ادب کی دنیا میں یونانی آپس میں متحد تھے اور ایک دوسرے کے انسپائریشن حاصل کرتے تھے لیکن سیاست میں وہ ایک دوسرے کے حریف اور دشمن تھے۔ سیاست نے انہیں پارہ پارہ اور کمزور کر دیا تھا لیکن جب سکندر ایک زبردست ناقابل شکست طاقت بن کر اٹھا تو اس نے یونان کے سارے شہروں کو فتح کر کے اسے ایک اکائی بنا دیا۔ سکندر کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ یونانیوں کی نااتفاقی اور خاص طور پر ایتھنز اور سپارٹا کی تاریخی دشمنی نے ماضی میں ایرانی بادشاہوں کو بڑھاوا دیا تھا کہ وہ ان شہروں پر حملہ کر کے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔ اب سکندر اعظم ایران سے اپنی ماضی کی ذلتوں کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

چنانچہ اس نے ایک لشکر عظیم تیار کیا اور ایران کی سرحدوں کی طرف کوچ بول دیا۔ یہ ایک عظیم سپاہ کا لشکر تھا - جہاں فوج پڑاؤ ڈالتی ایک بہت بڑا شہر آباد ہو جاتا۔ بازار لگ جاتے۔ کھیل تماشوں کے ساتھ گھڑ دوڑیں ہوتیں۔ رات کو خیموں کے باہر جگہ جگہ الاؤ روشن ہو جاتے۔ معلوم ہوتا کہ آسمان کے سارے ستارے زمین پر اتر آئے ہیں۔ کسی خیمے سے چنگ و رباب کی آوازیں ابھرتیں تو کسی خیمے سے قہقہوں اور کہیں سے ایلیڈ اور ہومر کے اشعار پڑھنے کی صدائیں بلند ہوتیں۔ پیشہ ور داستان گو ستاروں کی چھاؤں میں ٹھنڈی ریت پر بابل کی بنی ہوئی دریاں اور شطرنجیاں بچھا کر بیٹھ جاتے اور رباب کے تاروں پر انگلیاں چلاتے ہوئے قدیم داستانیں چھیڑ دیتے۔ وہ سپارٹا اور ایتھنز کی قدیم جنگوں کا حال اس زور دار اور پر اثر انداز میں بیان کرتے کہ سامعین پر ایک سحر طاری ہو جاتا۔ پھر اپنی کہانی کو عروج پر پہنچا کر ایک دم خاموش ہو جاتے اور ان کے خاص آدمی تانبے کا کاسہ لے کر سپاہیوں میں گھوم پھر کر چاندی اور تانبے کے سکے جمع کرنا شروع کر دیتے - سکندر کا خیمہ فوج کے وسط میں ہوتا۔ میرا خیمہ اس کے ساتھ نصب کیا جاتا۔ وہ مجھے بطلیموس ہی سمجھ رہا تھا اور میری اصل حقیقت سے بے خبر تھا۔ مجھے اپنے بارے میں اصل حقیقت اسے بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ بہت کم نیند لیتا - رات گئے تک خیمہ میں بیٹھا اپنے جنگی وزراء اور جرنیلوں کے ساتھ جنگی نقشے تیار کرتا اور تبادلہ خیال کرتا رہتا۔

سکندر کی عمر بیس بائیس سال کی تھی - وہ ایک وجیہہ اور دراز قد نوجوان تھا۔ اس وقت تک اس کی جوانی بے داغ تھی اور اس کے دل میں دنیا کا فاتح بننے کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں تھا۔ وہ سارا دن اور رات گئے تک فوجی وردی میں رہتا۔ سپاہیوں کے ساتھ اس کا سلوک مثالی تھا۔ لشکر کے خیموں کے درمیان گھوم پھر کر وہ ایک ایک سپاہی سے اس کی خیر خیریت دریافت کرتا اور فتح کی خوش خبری سے ان کے حوصلے بلند کرتا۔ وہ انہیں تلقین کرتا

کہ فتح کے بعد مکانوں کو نذر آتش نہ کریں۔ کسی بھی عورت بچے یا بوڑھے پر ہاتھ نہ اٹھائیں اور فصلوں کو نہ اجاڑیں اور درختوں کی بڑی حفاظت کریں۔

یہ لشکر مہینوں کا سفر دنوں میں طے کرتے ہوئے ایشیائے کوچک سے گزر کر جب گرناقس کے علاقے میں پہنچا تو اس کا ایرانی فوج سے پہلا مقابلہ ہوا۔ ایران کے شہنشاہ دارا کو یونانی لشکر کی آمد کی خبریں پہنچ چکی تھیں۔ اس نے ایک لشکر جرار راستے میں ہی سکندر کی فوج کو روکنے کے لئے روانہ کر دیا تھا۔ گرناقس پر یونانی اور ایرانی فوجوں کی پہلی جنگ ہوئی جس میں ایرانی لشکر شکست کھا کر فرار ہو گیا۔ سکندر اعظم ایسے جری اور باجروت اور باکردار جرنیل کی قیادت میں یونانی فوج کے حوصلے اور مورال بہت بلند تھا اور اس کی فوج نے بابل، مصر اور شام کے علاقے پر زبردست فتوحات حاصل کی ہوئی تھیں ۔ پہلی جھڑپ میں ایرانی فوج کی پسپائی سے ان کے حوصلے اور بلند ہو گئے۔ سکندر اب جلد سے جلد ایران کے دارالحکومت پر حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن یہاں دارا نے ایک بہت بڑی جنگی غلطی کی۔ جو ہو سکتا ہے اس کے ملکی حالات کے تناظر میں مناسب اقدام ہو مگر اس کا نتیجہ یونانی فوج کے حق میں نکلا۔

طوراس کے مقام پر پہنچ کر سکندر کو مخبروں نے خبر دی کہ دارا خود ایک لشکر عظیم لے کر یونانی فوج کے عقب میں آ پہنچا ہے۔ سکندر نے وہیں سے فوج کا منہ پیچھے کی طرف کر دیا اور برق رفتاری سے پہاڑی وادیوں کو عبور کرتے ہوئے دارا کی فوج پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ اس کی ایرانی فوج کو ہرگز توقع نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یونانی لشکر طویل سفر کی صعوبتوں کی وجہ سے تھکا ہارا ہو گا لیکن ایسا نہیں تھا۔ یونانی بے جگری سے لڑے اور ایک بار پھر ایرانی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ دارا اپنے دستہ خاص کی معیت مین بڑی مشکل سے جان بچا کر دارالحکومت کی طرف بھاگا۔ اب اس نے شہر پناہ کے دروازے بند کر کے پیچھے ہاتھی بٹھا دیئے اور قلعہ بند ہو کر سکندر کی فوج کا انتظار کرنے لگا۔

یونانی لشکر دو روز تک شہر کی فصیل سے کچھ فاصلے پر میدان میں خیمہ زن رہا اور حملے کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ سکندر بے چین تھا۔ وہ اپنے خیمے میں ہاتھ پیچھے باندھے بے قراری سے ٹہلتا رہتا۔ جنگی نقشوں کا بار بار مطالعہ کرتا۔ جنگی پلان پر جرنیلوں سے بحث مباحثے کرتا اور منجنیقوں کا معائنہ کرتا اور سپاہیوں کے حوصلے بڑھاتا۔ دوسری طرف ایرانی سپاہی بھی فصیل کے برجوں میں کھولتے ہوئے تیل کے کڑاؤ لئے تیار کھڑے تھے۔ تیر اندازوں کے دستے فصیل پر جگہ جگہ متعین تھے۔ ایرانی شہنشاہ دارا خود دن میں کئی بار شاہی برج میں آ کر دفاعی انتظامات کا معائنہ کرتا تھا۔ ایرانی دربار کے امرا نے دارا کو یقین دلا رکھا تھا کہ یونانی سپاہ

کا محاصرہ طول پکڑے گا اور شہر کی فصیل اتنی مضبوط ہے کہ یونانی سنگ انداز منجنیقیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی لیکن انہوں نے یونان کے جفاکش سپاہیوں کے حوصلوں اور سکندر کے سپاہیانہ عزائم کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ جیسا کہ میں نے بعد میں دیکھا کہ ایرانی دربار عیش و عشرت اور محلاتی سازشوں میں اس قدر ڈوب چکا تھا کہ وہ سکندر کے عزائم اور سپارٹا کے جفا کش سپاہیوں کے مورال کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ جب یونانی لشکر کی منجنیقوں نے سنگ اندازی شروع کی تو یہ گویا آسمان سے پتھروں کی خوف ناک بارش تھی جس کے آگے شہر پناہ کی فصیل جگہ جگہ سے ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئی۔ یونانی سپاہ قلعے کے دروازے پر ٹوٹ پڑی۔ گھمسان کا رن پڑا۔ فصیل شہر کی خندق یونانی سپاہیوں کی لاشوں سے پٹ گئی۔ ایک شاہی دستے کے سپاہیوں کی قیادت سکندر خود اپنے تاریخی گھوڑے پر سوار ہو کر رہا تھا۔ میں ایک بلند ٹیلے پر کھڑا اسے بے جگری سے لڑتے دیکھ رہا تھا۔ آپ لوگوں نے سکندر اعظم کے کارنامے تاریخ کی کتابوں میں پڑھے ہیں مگر میں نے اسے خود میدان جنگ میں لڑتے دیکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک بلند ہمت دلیر اور بہادر جرنیل تھا اور موت سے بے خوف ہو کر لڑتا تھا۔

سکندر اپنی فوجوں کے ساتھ ایران کے دارالحکومت میں داخل ہو گیا۔ ایرانی دربار کے لئے یہ شکست ناقابل یقین تھی۔ شاہی محلات میں ایک کہرام مچ گیا۔ یونانی جرنیلوں نے محل میں داخل ہو کر شہنشاہ دارا کی بیوی اور لڑکیوں کو حراست میں لے لیا مگر دارا فرار ہو چکا تھا۔ اس کا شاہی رتھ بان اسے لے کر خفیہ راستے سے قلعے سے نکل گیا تھا۔ سکندر اپنے دستہ خاص کے ساتھ اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ شہنشاہ دارا نے بیش قیمت ہار پہن رکھے تھے اور اس کے لباس اور تاج میں انمول ترین نادر جواہرات جڑے تھے۔ شاہی رتھ بان کی جنگل میں پہنچ کر نیت خراب ہو گئی۔ ایک جگہ ایران کا شکست خوردہ بادشاہ چشمے سے پانی پینے کے لئے رکا تو غدار رتھ بان نے پیچھے سے تلوار کا وار کر کے دارا کو شدید زخمی کر دیا اور اس کا تاج اور جواہرات نوچ کھسوٹ کر فرار ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد سکندر بھی تعاقب کرتا وہاں پہنچ گیا۔ میرا گھوڑا سکندر کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ پیچھے ایک جرنیل اور ایک سو بیس لشکریوں کا دستہ تھا۔ ایران کا جلال آور شہنشاہ زمین پر شدید زخمی حالت میں پڑا آخری سانس لے رہا تھا۔ سکندر گھوڑے سے اترا اس نے شہنشاہ کا باوقار سر اپنے زانو پر رکھ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا ۔ سکندر کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ دارا نے اپنی آنکھیں کھولیں سکندر کو دیکھا اور کہا۔

"اس عالم فانی کے ان گنت دروازے ہیں جن میں سے اس دار فانی کے مکین داخل

ہوتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔"

سکندر نے کہا۔

"اے عظیم شہنشاہ! میں زیوس دیوتا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے زندگی میں کبھی ایسے منحوس دن کی خواہش نہیں کی تھی کہ تمہارا گرد آلود بے تاج سر میرے زانو پر ہو گا اور خون تمہارے رخساروں پر بہہ رہا ہو گا۔"

سکندر کے اس مکالمے کا میں عینی گواہ ہوں۔ پھر بھی اگر لوگ یہ کہیں کہ یہ ایک افسانوی روایت ہے جس میں سچائی کا شائبہ تک نہیں کہ سکندر ایسا عظیم اور باجبروت جرنیل ایک شکست خوردہ شہنشاہ کے ساتھ ایسی مہر و محبت کی بات کر سکتا ہے تو میں ان سے صرف ایک سوال کروں گا کہ اگر ایک لمحے کے لئے مان بھی لیا جائے کہ یہ ایک افسانوی روایت ہے تو پھر ایسی مہر و محبت اور حسن اخلاق کی افسانوی روایتیں چنگیز خان اور تیمور لنگ کے بارے میں کیوں مشہور نہیں ہیں اور جن لوگوں کو ان دو سپہ سالاروں نے مفتوح بنایا۔ انہوں نے ان کے بارے میں ایسے افسانوی قصے مشہور کیوں نہیں کئے؟ افسانوی روایتیں اور قصے کہانیاں یونہی مشہور نہیں ہوا کرتیں ان کی تہہ میں تھوڑی بہت سچائی ضرور ہوتی ہے۔ دارا نے سکندر کے پہلو میں دم توڑ دیا۔ دارا کی آخری رسوم اس کے مذہب کے مطابق پورے شاہانہ طریقے سے ادا کی گئیں۔ سکندر نے دارا کے قاتل رتھ بان کو پکڑوا کر عبرت ناک سزا دی۔ اب سکندر یونان کا بادشاہ نہیں تھا بلکہ وہ دارا کا جانشین اور پورے مشرق کا شہنشاہ تھا۔ سکندر کی فوج کا خیال تھا کہ انہیں لوٹ مار کی اجازت دے دی جائے گی لیکن یہ دیکھ کر انہیں سخت مایوسی ہوئی کہ سکندر نے نہ صرف انہیں ایسا کرنے سے سختی سے منع کر دیا بلکہ وہ دارا کے درباریوں کو ان کے منصب دوبارہ واپس کرنے لگا۔ معزول وزراء کو پھر سے بحال کر دیا گیا۔ اس نے دارا کی بیٹی سے شادی کر لی۔ مشرقی شاہی دربار کے جاہ و جلال نے اس پر جادو کر دیا تھا۔ وہ بے دریغ بادہ و مینا سے کھیلنے لگا۔ وہ ایرانی بادشاہوں ایسا شاہی لباس زیب تن کرتا اور اسی طرح تخت پر بیٹھ کر دربار لگاتا۔ اس نے اپنے جرنیلوں اور سپاہیوں میں بھی بے پناہ دولت تقسیم کی جس کے باعث وہ اس کے گن گانے لگے۔ تین ماہ تک جشن فتح منانے کے بعد سکندر نے ہندوستان کا رخ کیا۔ کوچ سے ایک رات پہلے وہ شہنشاہ دارا کی جنت نظیر خواب گاہ میں سنجاب و سمور میں دھنسا سونے کا جام ہاتھ میں لئے مجھ سے کہنے لگا۔

"بطلیموس! تم ہندوستان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ کیا تم کبھی اس پراسرار ملک میں گئے ہو جس کے بارے میں میرے مخبر کہتے ہیں کہ وہاں زمین سونا اور جواہرات اگلتی ہے۔"

میں ہندوستان کے شمال مغربی علاقے موہنجوداڑو میں ایک پوری صدی گزار چکا تھا لیکن

میں نے اس کے بارے میں سکندر کو کچھ نہ بتایا۔ صرف اتنا کہا۔

"نکاثور! ایسی ہی پراسرار باتیں میں نے بھی ہندوستان کے بارے میں سنی ہیں لیکن کبھی اس ملک میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

سکندر نے سونے کا پیالہ سنگ سبز کے منقش ستون کے ساتھ مارتے ہوئے کہا۔

"بطلیموس قسم ہے زیوس دیوتا کی۔ میں ہندوستان کی سرزمین کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالوں گا۔"

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ سکندر کی فوج اس کی وفادار تھی اور وہ بھی ہر فتح کے بعد ان پر بے شمار دولت لٹا دیتا تھا۔ اگرچہ انہیں لوٹ مار اور عورتیں اغوا کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن وہ مفتوحہ لونڈیوں کو ان میں بانٹ دیتا تھا اور انہیں مال غنیمت میں شریک کرتا تھا۔ اس طرز سلوک نے لشکریوں کو سکندر کا گرویدہ بنا رکھا تھا اور وہ اس کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ سکندر کا عظیم الشان لشکر پہاڑوں، وادیوں، دریاؤں اور سنگلاخ میدانوں پر قبضہ کر کے وہاں اپنے گورنر تعینات کرتا چلا گیا۔ اب وہ پنجاب کے سرسبز و شاداب میدانی علاقے میں داخل ہو گیا تھا اور پھر دریائے جہلم کے کنارے راجہ پورس کے ساتھ یونانی فوجوں کا وہ تاریخی معرکہ کارزار گرم ہوا کہ جس میں اگرچہ سکندر کو فتح حاصل ہوئی مگر اس کے لشکریوں کی ہمت جواب دے گئی۔ وادی جہلم کے لوگ اس جاں بازی اور سرفروشی سے لڑے کہ اس سے پہلے یونانی فوج کا کسی نے اتنی شدت سے مقابلہ نہیں کیا تھا۔ یونانی لشکری سوچنے لگے کہ اگر ہندوستان کے دروازے کے محافظ اتنی بے جگری سے لڑے ہیں تو آگے ان کے ساتھ کیا نہیں ہو گا۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ آگے کچھ بھی نہیں ہے۔ مقابلہ کرنے والے پنجاب کے میدانوں میں ہی تھے آگے سارا میدان خالی پڑا تھا اور بعد میں تاریخ نے میرے اس نظریئے کو درست ثابت کر دیا۔ جو کوئی بھی بیرونی حملہ آور ہندوستان میں آیا اسے پنجاب میں بڑی سخت جنگ لڑنی پڑی - اس کے بعد دلی تک اسے میدان خالی ملا۔

سکندر نے یہاں بھی اپنے روایتی حسن اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہادر راجہ پورس کو اس کے دلیرانہ جواب پر اس کی سلطنت واپس کر دی اور اپنی فوج کو آگے بڑھنے پر اکسایا مگر یونانی دل لرز چکے تھے۔ ویسے بھی انہیں اپنے وطن کو چھوڑے ایک مدت ہو چکی تھی۔ سکندر اپنی فوج کے آگے بے بس ہو گیا اس نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور واپس یونان کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں سکندر کے ساتھ یونان واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ راجہ پورس کے شاہی محل کی ایک راجپوت کنیز روپا تھی جس کی سیاہ آنکھیں اور کنول کے

پھول جیسے چہرے نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ وہ راجہ پورس کی چہیتی کنیز تھی جب پورس کو اس کی سلطنت واپس ملی تو کنیز روپا بھی واپس اس کے پاس آ گئی۔ روپا شاہی محل کی مرمریں جالیوں سے چھپ چھپ کر مجھے دیکھا کرتی تھی۔ راجہ پورس بھی مجھے پسند کرتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ میں اس کا شاہی طبیب بن کر اس کے پاس رہ جاؤں مگر سکندر مجھے اپنے سے ایک منٹ بھی الگ نہیں کرنا چاہتا تھا مصیبت یہ تھی کہ میں اس کے گہرے دوست بطلیموس کی حیثیت سے اس کے محل میں ظاہر ہوا تھا۔ لیکن جاتے ہوئے میں اپنی راجپوت محبوبہ روپا سے محل کی چھت پر ملا اور اس سے وعدہ کیا کہ میں بہت جلد یونان سے واپس آ جاؤں گا۔

سکندر اعظم پورے ہندوستان کو فتح نہ کر سکنے کے خیال سے دل شکستہ تھا۔ اس نے بہت زیادہ پینی شروع کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کی صحت گرنے لگی - مقدونیہ پہنچ کر وہ بیمار پڑ گیا۔ میں نے اپنے خاندانی پیشے کو بروئے کار لاتے ہوئے کئی جڑی بوٹیوں سے اس کا علاج شروع کر دیا۔ دربار کے شاہی طبیب بھی اس کا علاج کر رہے تھے۔ مگر سکندر کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔

وہ بڑی تاریک اور اداس رات تھی - مقدونیہ اور بابل و نینوا میں کسی نے چراغ روشن نہیں کیا تھا۔ سکندر بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اس کی زبان بند ہو گئی تھی۔ شاہی اطبا کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ لوگ اندھیرے مکانوں کی چھتوں پر ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ان کی اشک آلود آنکھیں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ کسی محیرالعقول واقعے کے رونما ہونے کے منتظر تھے۔ مقدونیہ اور بابل کی بیٹیاں بال کھولے دیوتاؤں کے آگے سر بسجود تھیں مگر ہونی آخر ہو کر رہی۔ آدھی دنیا فتح کرنے والے نے موت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ سکندر کی موت کے بعد میں نے ہندوستان واپس جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ میں روپا سے ملنا چاہتا تھا - چالیس روز تک سرکاری طور پر سکندر اعظم کی موت کا سوگ منایا گیا۔ اسی دوران میں ایک روز عظیم فلسفی ارسطو کی درس گاہ کے باغ میں بیٹھا تھا کہ ایک مصری طالب علم نے مجھے بتایا کہ دیوجانس کلبی کا انتقال ہو گیا ہے۔ دیوجانس کلبی جنگلوں اور قبرستانوں میں گھومتا رہتا تھا۔ جہاں رات ہوتی وہیں کسی جگہ پڑ کر سو رہتا۔ کسی نے جنگل میں اس کی لاش دیکھی جو نیلی پڑ چکی تھی۔ پتہ چلا کہ اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اس روز مجھے اس قلندر فلسفی کی بہت یاد آئی۔ مجھے وہ دن بھی یاد آیا جب ایک آدمی نے اس کے سامنے کہا تھا کہ میں صاحب علم ہوں کیونکہ میں عام لوگوں کی صحبت میں رہتا ہوں۔ دیوجانس نے اسے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں امیر لوگوں کی صحبت میں رہا کرتا تھا مگر امیر نہیں ہو سکا۔"

شروع شروع میں جب دیوجانس کلبی لوگوں میں گھل مل کر رہتا تھا تو اس کی عادت تھی کہ اس کی مجلس مین کوئی نووارد آتا تو اس سے اس کا نام پتہ اور حسب نسب پوچھنے کی بجائے صرف اتنا کہا کرتا۔ "بات کرو تا کہ مجھے معلوم ہو سکے کہ تم کون ہو۔"

مجھے دیوجانس کی موت کا کوئی افسوس نہ ہوا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ شخص ساری زندگی موت کو گلے لگائے پھرتا رہا تھا بلکہ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ساری زندگی موت اس کے آگے بھاگتی رہی اور وہ اس کی گھات مین رہا۔ اپنی فلسفیانہ زندگی کے ابتدائی ایام میں دیوجانس کبھی کچھ فلسفے اور حکمت کی باتیں کیا کرتا تھا مگر اس کے بعد وہ کسی سے فلسفے کی کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ ایک تحقیر آمیز طنزیہ مسکراہٹ ہر وقت اس کے چہرے پر رہتی تھی۔ وہ بہت کم بات کرتا۔ جب بھی بات کرتا طنزیہ انداز میں کرتا۔ اس کی لاش رات بھر جنگل میں پڑی رہی۔ صبح درس گاہ کے کچھ طلبا لاش لینے جنگل میں گئے تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

اس روز مجھے اپنا سانپ دوست قنطور بہت یاد آیا۔ اگر وہ میرے ساتھ مقدونیہ میں ہوتا تو اپنے سانپ کے مہرے کی مدد سے دیوجانس کی لاش کا زہر چوس سکتا تھا لیکن تاریخ میں ہو چکے حادثوں کو تو وہ بھی نہیں روک سکتا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ میں اس کا مہرہ اپنے ساتھ نہ لا سکا تھا حالانکہ قنطور نے اصرار بھی کیا تھا کہ میں اس کا مہرہ اپنے ساتھ رکھ لوں۔ میں نے دیوجانس کی مارگزیدہ لاش کے پاس کھڑے ہو کر قنطور کے مہرے کی خوشبو لینے کی کوشش میں کئی بار لمبے سانس بھی لئے تھے مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ خدا جانے وہ کس ملک میں اور کن حالات میں تھا۔ بہرحال اب میرے لئے مقدونیہ میں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ چنانچہ ایک روز میں گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کا رخ ایتھنز کی طرف کر دیا۔ ایتھنز سے میں ایک بادبانی سمندری جہاز میں سوار ہوا جو ملک ہندوستان کی طرف تجارتی سامان لے کر جا رہا تھا۔

ہندوستان کا ملک اس زمانے میں بھی سونے کی چڑیا کہلاتا تھا۔ یہ ملک سیاحت و تجارت کا مرکز تھا لیکن اس ملک کے نام کے بارے میں ایک زبردست تاریخی غلط فہمی پیدا ہو چکی ہے جس کو میں ابتدا ہی میں واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ اس ضمن میں مجھے کسی مورخ محقق یا کسی مستند کتاب کے حوالے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ میں نے خود تاریخ کے ہر دور میں سفر کیا ہے اور کئی غلط باتوں کو رواج پاتے دیکھا ہے - حقیقت یہ ہے کہ جب ہم قدیم ہندوستان کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد وہ ہندوستان نہیں ہوتا جو آج کا بھارت ہے بلکہ اس سے مراد آج کا پاکستان ہوتا ہے۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اور جس زمانے میں آج

سے قریباً تین ہزار برس پہلے میں سفر کر رہا تھا اس وقت موجودہ بھارت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس زمانے کا بھارت یعنی آج کا جنوبی اور شمالی بھارت ایک ایسا گمنام علاقہ تھا کہ جہاں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے شہروں کے راجہ بند قلعے بنا کر رہتے تھے اور ان کا شمار ترقی اور تہذیب یافتہ قوموں میں نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے کا ترقی یافتہ علاقہ دریائے سندھ کی وادی تھی۔ جس میں موہنجوڈرو اور ہڑپہ کی تہذیبیں بھی شامل تھیں۔ ہند اصل میں سندھ کی بگڑی ہوئی شکل ہے موہنجوڈرو اور ہڑپہ اس ترقی یافتہ ملک ہند یعنی آج کے پاکستان کی قدیم ترین تہذیب کے مرکز تھے۔ چینیوں سے پاکستان کے قدیم زمانے ہی سے تعلقات چلے آ رہے ہیں۔ چینی اس علاقے کو دریائے سندھ کی مناسبت سے یو این تو کہا کرتے تھے۔ جو بعد میں پن تو اور شن تو بن گیا۔ سنسکرت زبان مین اس علاقے کو سندھو یا سپت سندھو کہا جاتا تھا۔ سپت سندھو سے مراد دریائے سندھ اور اس کے چھ معاونین تھے۔ سنسکرت کا لفظ سندھو جب فارس پہنچا تو وہاں سندھ کی "س" کو "ح" میں بدل دیا گیا اور سندھو سے ہندو بن گیا اور یوں اسے سپت سندھو سے ہفت ہندو کہا جانے لگا۔ ایران سے یہ نام یونان پہنچا تو انڈو اور انڈیا کی شکل میں ڈھل گیا۔ ہندو سنسکرت لفظ نہیں ہے اور نہ سنسکرت کی کتابوں میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔ کئی صدیوں تک "انڈیا" کا نام وادی سندھ یعنی آج کے پاکستان کے لئے بھی استعمال ہوتا رہا۔ ایران کے بادشاہ سائرس اعظم کے عہد میں جب ایرانی سلطنت کی حدود بحر روم سے نکل کر وادی سندھ تک پھیل گئیں تو شمالی ہند یعنی پنجاب کے شمال مشرقی علاقے کو "سرہند" کے نام سے پکارا جانے لگا۔ میں اس حقیقت کا عینی شاہد ہوں کہ آج سے ڈھائی تین ہزار سال پہلے بھی یہی علاقہ سرسبز و شاداب اور ترقی یافتہ اور خوش حال تھا جو آج کا پاکستان ہے۔

میری منزل بھی یہی ملک سرہند تھا اس وقت یعنی آج سے تین ہزار سال پہلے سکندر اعظم کی قلمرو میں شامل تھا۔ اور جس کا یونانی گورنر ٹیکسلا میں رہائش پذیر تھا۔ آج کے زمانے میں تو آپ کراچی ائرپورٹ سے جیٹ طیارے میں سوار ہو کر ہوا میں پرواز کرتے ہوئے مہینوں کا سفر، گھنٹوں میں طے کر لیتے ہیں لیکن تین ہزار سال پہلے بادبانی جہاز سمندروں میں ہوا کے رحم و کرم پر چلا کرتے تھے۔ اگر ہوا بند ہو جاتی تو جہاز بیچ سمندر میں کھڑے ہو جاتے اور کئی کئی دن کھڑے رہتے۔ کئی مہینوں کے بعد میں ہند کے ساحل پر اترا اور وہاں سے ایک قافلے میں شریک ہو گیا جو ٹیکسلا کی طرف جا رہا تھا۔ میرا دل اپنی محبوبہ روپا کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ قافلہ اونٹوں اور گھوڑوں پر سفر کرتے ہوئے ایک مہینے میں ٹیکسلا پہنچا۔ راجہ پورس مجھے اپنے شاہی محل میں پا کر بہت خوش ہوا۔ وہ میرے

جڑی بوٹیوں کے علم اور تجربے کا زبردست مداح تھا۔ اس نے اسی وقت مجھے اپنا شاہی طبیب نامزد کر دیا۔ میری آنکھیں اپنی سیاہ چشم محبوبہ روپا کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے موقع پا کر اس کے بارے میں ایک درباری رتن سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ روپا کی شادی راجہ پورس نے اپنے ایک ضعیف العمر بھائی سے کر دی تھی جو اس سے محبت کرتا تھا اور جس کی بات راجہ پورس نہیں ٹال سکتا تھا۔

"لیکن روپا کا بوڑھا خاوند بستر مرگ پر ہے۔ اسے کوئی ایسا مرض لاحق ہو گیا ہے جو لاعلاج ہے۔ وہ آج کل میں مرجائے گا اور یہاں کی رسم کے مطابق اس کی پتنی روپا اس کی لاش گود میں رکھ کر چتا کی آگ میں جل کر ساتھ ہی مرجائے گی۔"

میرے قدموں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں روپا کے خاوند کا علاج کرنے کے بہانے اس کے محل میں پہنچا۔ میں اس کا علاج کر کے اسے پھر صحت مند کرنا چاہتا تھا تاکہ روپا کی زندگی بچائی جا سکے۔ روپا مجھے دیکھ کر منہ چھپا کر آنسو بہانے لگی۔ وہ پہلے سے بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس کے ضعیف العمر خاوند کی حالت بہت خراب تھی۔ کثرت شراب نوشی نے اس کے جگر کو چھلنی کر دیا تھا۔ دنیا کی کوئی دوا اس کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی لیکن میں روپا کو اس بڈھے شرابی کی لاش کے ساتھ ستی ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ کسی طرح روپا کو اپنے ساتھ مشرقی ہندوستان کی طرف بھاگ چلنے پر آمادہ کروں مگر وہ بڑی سخت مذہبی عورت تھی کہنے لگی۔

"میں اپنے بیمار پتی کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتی۔ میں اس کے ساتھ چتا کی آگ میں جل کر مرجاؤں گی مگر اس سے بے وفائی نہیں کروں گی۔"

اس کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے اس کے خاوند کا علاج کرنا شروع کر دیا۔ لیکن اس بڈھے رقیب روسیاہ کی حالت بہت خراب تھی۔ میں نے اس پر ہر قسم کی جڑی بوٹی آزمائی۔ اس کی بیماری میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ حالت روز بہ روز خراب تر ہوتی چلی گئی۔ مجھے ایک دم سے ایک نادر بوٹی کا خیال آگیا جو جگر کے مرض کے لئے بڑی اکسیر ہوتی ہے اور وہ عام طور پر سنگلاخ میدانوں میں تھوہر کی خار دار جھاڑیوں کے پاس اگی ہوئی ملتی ہے۔ ٹیکسلا کے باہر سنگلاخ میدانوں کی کمی نہ تھی۔ آج کا ٹیکسلا تو ایک جدید شہر ہے مگر اس زمانے میں جب سکندر اعظم کا یونانی گورنر سلیوکس وہاں ایک عالی شان محل میں رہتا تھا اور راجہ پورس کی برائے نام حکمرانی تھی، ٹیکسلا سنگلاخ میدانوں کے درمیان ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ ابھی بدھ مت کا نام و نشان تک نہیں تھا اور وہاں کوئی یونی ورسٹی قائم نہیں ہوئی تھی۔ خود گوتم بدھ ابھی ایک شہزادہ تھا جو کپل وستو کے چھوٹے سے محل کی چار دیواری میں غور و فکر میں

غلطاں رہتا تھا۔ اس روز تھوڑی دیر پہلے دوپہر کے وقت بڑے زور کی آندھی چڑھی تھی اور آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی اور کسی وقت بھی بارش شروع ہو سکتی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جس میں کیکر کے پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ میں شہر کے باہر ایک پہاڑی کے دامن میں آ گیا۔ یہاں میں نے تھوہر کی خار دار جھاڑیوں میں جگہ جگہ اس کی نادر زمانہ بوٹی کو بہت تلاش کیا جو بابل اور مصر کے ویرانوں میں عام پائی جاتی تھی مگر میں کامیاب نہ ہو سکا۔ سخت ناامیدی اور پریشانی کے عالم میں ایک درخت کے قریب سے گزرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سپیرا ٹھنڈی چھاؤں میں پڑا سو رہا ہے۔ بین اس کی گود میں ہے اور پٹاری جس میں سانپ بند ہوتے ہیں اس کے پاس ہی تھی۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ سوچا بے چارہ تھکا ہارا ہو گا۔ ٹھنڈی چھاؤں دیکھ کر سو گیا ہے۔ جونہی میں اس کے قریب سے گزرا تو دیکھا کہ پٹاری میں اپنے آپ حرکت پیدا ہوئی اور اس کا ڈھکن اچھل کر پرے گر پڑا اور ایک تین فٹ لمبا کالا ناگ باہر نکل کر اپنا پھن لہراتا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

میں اس سے ڈرا بالکل نہیں۔ کیونکہ وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ مگر حیران ضرور ہوا کہ یہ اپنے آپ پٹاری سے نکل کر میرے سامنے کس لئے آ گیا ہے۔ اچانک مجھے اپنے سانپ دوست قنطور کی خوشبو آنے لگی۔ میں نے سانپ کی سرخ آنکھوں کو گھور کر دیکھا۔ سانپ نے اپنا پھن سکیڑا۔ نیچے ہوا اور میرے آگے آگے رینگنے لگا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ میرا راستہ بھی وہی تھا۔ ٹیلے کا موڑ گھومتے ہی سانپ نے پھنکار کی ایک دہشت ناک آواز نکالی اور دوسرے لمحے وہ اپنا سانپ کا روپ بدل چکا تھا اور اب میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے لپک کر مجھے گلے لگا لیا۔ میں بھی اس سے بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوا اور پوچھا کہ وہ ایک سپیرے کی پٹاری میں کیوں کر قید ہو گیا۔ قنطور نے کہا۔

"عاطون! میرے دوست! دنیا کا کوئی سپیرا مجھے اپنا قیدی نہیں بنا سکتا۔ یہ تو میں اپنی مرضی سے اس کی پٹاری مین بند ہوں۔ بے چارہ غریب آدمی ہے۔ میرا تماشا دکھا کر اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا ہے۔ میرا کیا بگڑتا ہے تم بتاؤ تم یہاں ہند میں کیسے آ گئے اور بابل میں تم اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے۔"

میں نے اپنی ساری رام کہانی بیان کر دی اور بتایا کہ چونکہ میں صدیوں کا مسافر ہوں اور تقدیر مجھے کسی بھی دور سے اچھال کر دو چار سو سال آگے کی طرف لے جا سکتی ہے۔ چنانچہ بابل کے نواح میں اس رات ایسا ہی ہوا کہ میں ایک تاریخی جھٹکے کے ساتھ پانچ سو سال آگے سکندر اعظم کے زمانے میں پہنچ گیا اور اب یہاں راجہ پورس کے محل میں سکندر

کے گہرے دوست بطلیموس کی حیثیت سے رہ رہا ہوں۔

"مگر میرے دوست قنطور اس وقت مجھ پر ایک عجیب مصیبت آن پڑی ہے' یہ عشق کی مصیبت ہے۔"

قنطور کہنے لگا۔

"تم ہر بار عشق کے چکر میں کیوں پھنس جاتے ہو دوست؟"

میں نے کہا۔

"میرے اندر ایک انسان کی تمام خوبیاں اور کمزوریاں موجود ہیں۔ میں روپا کے حسن و جمال کے آگے بے بس ہو چکا ہوں مگر وہ اپنے خاوند کو نہیں چھوڑ رہی - کہتی ہے اس بڈھے کے ساتھ چتا کی آگ میں جل کر مر جاؤں گی اور وہ بڈھا مرنے ہی والا ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ اب تک موت کا لقمہ بن چکا ہو۔"

پھر میں نے روپا سے اپنے عشق اور پیش افتاد مسائل کی ساری تفصیلات قنطور کے گوش گزار کر دی - اس نے کہا۔

"تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ ان پانچ سو سالوں میں میں نے طویل ریاضتوں اور چلہ کشی کی مدد سے وہ مقام حاصل کر لیا ہے جہاں پہنچ کر میں جس انسان یا جانور کی چاہے شکل اختیار کر سکتا ہوں۔ اس سے پہلے میں سانپ سے انسان اور انسان سے سانپ کی شکل بدل سکتا تھا لیکن اب میں جس چرند پرند یا انسان کی شکل چاہوں اس کا تصور ذہن میں لا کر تبدیل کر سکتا ہوں۔ اب مجھے ناگ دیوتا کا مقام حاصل ہو گیا ہے۔"

میں نے قنطور کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لئے روپا کے سلسلے میں میری مدد کرو۔ وہ بت پرست عورت ہے - اس بڈھے خاوند کی لاش کے ساتھ ستی ہو جائے گی۔"

قنطور نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو عاطون۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا لیکن سب سے پہلے مجھے اس سپیرے کی مدد کرنی ہو گی جس کی روزی کا دارومدار میرے کھیل تماشے پر تھا۔ میرے ساتھ آؤ۔"

ہم دونوں اس درخت کے پاس آ گئے جہاں وہ سپیرا ابھی تک خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ قنطور نے اپنے منہ میں انگلی ڈال کر ایک جگمگاتا ہوا سرخ یاقوت نکالا اور چپکے سے سپیرے کی پٹاری میں رکھ کر اوپر ڈھکنا دے دیا۔ کچھ فاصلے پر جا کر بولا۔

"یہ یاقوت اس کی پشتوں کے لئے کافی ہو گا۔ اب یہ سوچتے ہیں کہ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں تم ایسا کرو کہ مجھے اپنا نوکر یا کوئی طبیب بنا کر قریب المرگ بڈھے کے پاس

لے چلو میں تمہاری محبوبہ روپا کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ میں نے وہیں سے چند ایک جڑی بوٹیاں اکھاڑ کر قنطور کو دے دیں اور کہا۔

"یہ بوٹیاں تم اپنے پاس رکھو۔ میں روپا اور اس کے رشتے داروں سے تمہارا تعارف مصری طبیب کی حیثیت سے کراؤں گا۔ تم کہنا کہ یہ بوٹیاں پانی میں گھول کر مریض کو پلا دی جائیں۔ یہ بے ضرر بوٹیاں ہیں۔"

میں قنطور کو اپنے ساتھ روپا کے شاہی محل میں لے گیا۔ اس وقت وہاں راجہ پورس خود موجود تھا۔ اس کے دوسرے رشتہ دار اور روپا بھی۔ روپا کا بڈھا خاوند زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ اس کے سانس اکھڑ چکے تھے۔ راجہ پورس نے میری طرف دیکھ کر کہا کہ میرے بھائی کو کسی طرح سے بچا لو۔ میں نے قنطور کا ایک مصری طبیب کی حیثیت سے تعارف کروایا اور کہا کہ یہ طبیب ایک دوائی آزمانا چاہتا ہے۔ راجہ پورس کی اجازت سے قنطور نے بوٹیاں پیالے میں گھول کر موت کی آغوش میں آخری ہچکیاں لیتے ہوئے روپا کے خاوند کو پلا دیں۔ روپا کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو رہی تھیں۔ ظاہر ہے اس بوٹی کا کیا اثر ہونا تھا۔ روپا کا بڈھا خاوند آخری ہچکی لے کر مر گیا۔ روپا پچھاڑ کھا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

اب اس کے خاوند کے ساتھ ستی ہونے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ لاش کو رات کے پچھلے پہر پورے شاہی آداب اور مذہبی رسوم کے ساتھ جلایا جانا تھا۔ لاش محل کی بارہ دری میں رکھی ہوئی تھی۔ پروہت اور پجاری اس کے گرد بیٹھے بھجن کیرتن کر رہے تھے۔ ایک طرف ہون ہو رہا تھا۔ آگ میں گھی، کستوری اور دوسرے قیمتی بخور جلائے جا رہے تھے۔ روپا اب میرے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ وہ خود بھی ستی ہونے کو تیار تھی۔ کیونکہ وہ سخت مذہبی عورت تھی اور دیوتاؤں کے غضب سے تھر تھر کانپتی تھی کہ اگر وہ رسم کے مطابق اپنے خاوند کے ساتھ ستی نہ ہوئی اور میرے ساتھ فرار ہو گئی تو اس پر دیوتاؤں کا قہر نازل ہو گا۔ اسے شاہی محل کے مندر میں عورتیں اور پروہت ستی ہونے کے لئے تیار کر رہے تھے۔ اسے شادی کا سرخ جوڑا پہن کر دلہنوں کی طرح سنوارا جا رہا تھا۔ میں پریشان تھا۔ چاہتا تو اسے چلتی تلواروں میں وہاں سے نکال کر لے جا سکتا تھا مگر اس میں روپا کی زندگی کا خطرہ تھا اور اگر میں اسے کسی طرح بچا کر لے جانے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو وہ میرے ساتھ کبھی نہ رہتی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خودکشی کر لیتی۔ کیونکہ اب اس کے نزدیک اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ جل مرنے میں ہی اس کی مکتی اور نجات تھی۔

میرا سانپ دوست قنطور میرے محل کی چھت پر میرے سامنے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ روپا کے ستی ہونے کا وقت قریب تر آ رہا تھا۔ میں نے قنطور کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم کب تک سوچتے رہو گے قنطور؟" اس نے کچھ سوچ لیا تھا۔ وہ کسی فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔ جلدی سے اٹھا اور بولا۔

"کیا تم جانتے ہو وہ شاہی شمشان بھومی کہاں پر ہے جہاں روپا کے خاوند کی لاش کو نذر آتش کیا جائے گا؟"

میں نے اسے بتایا کہ روپا کے خاوند کی لاش کو شاہی مندر کے عقب میں ندی کے کنارے جلایا جائے گا۔ وہ بولا۔

"تم اس جگہ سے تھوڑی دور ندی پار میرا انتظار کرنا۔ اپنے گھوڑے کے علاوہ دو اور گھوڑے ساتھ لیتے آنا۔"

میں نے اس سے پوچھنا چاہا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے جس کے جواب میں اس نے کہا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو عاطون! اور جتنی جلدی ہو سکتا ہے گھوڑوں کا بندوبست کر کے رات کے اندھیرے میں ندی پار کے درختوں میں جا کر چھپ جاؤ اور میرا انتظار کرو اور فکر نہ کرو روپا زندہ حالت میں میرے ساتھ ہو گی۔ وقت ضائع نہ کرو۔"

مجھے اپنے ناگ دوست قنطور کی خفیہ طاقتوں پر بھروسہ بھی تھا اور دل میں یہ وسوسہ بھی تھا کہ ہو سکتا ہے۔ اس کی حکمت عملی ناکام ہو جائے۔ کیونکہ یہ شاہی رسم ستی تھی اور اس کے لئے بڑا اہتمام کیا جا رہا تھا لیکن قنطور کے لہجے میں اس قدر بھرپور اعتماد تھا کہ میں آگے کوئی سوال نہ کر سکا اور جلدی سے محل کی چھت کے نیچے چلا گیا۔ اس وقت رات کا دوسرا پہر گزر رہا تھا۔ میں راجہ کا شاہی طبیب تھا اور میرے لئے دو گھوڑوں کا بندوبست کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ میں نے شاہی اصطبل سے دو تنومند برق رفتار گھوڑے لئے اور انہیں ساتھ لے کر شاہی مندر کے عقب میں ندی کے دوسرے کنارے پر صنوبر کے گھنے درختوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

میرے دوست قنطور کے الفاظ کے مطابق میرے جانے کے بعد وہ محل سے نکل کر سیدھا شاہی مندر کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ مندر محل سے تھوڑے فاصلے پر تالاب کے کنارے ایک بہت بڑی سرخ چٹان کے چبوترے پر بنا ہوا تھا۔ اس مندر میں وہاں کے ہندوؤں کے سب سے بڑے دیوتا لکھ راج کا بت تھا جس کے چار بازو تھے اور گردن میں کالا ناگ لٹک رہا تھا۔ قنطور کے پاس جو ایک گھوڑا تھا اس نے اس پر چاندی کے تاروں والی چادر ڈال دی تھی اور اسے مندر کے پچھواڑے ایک عمودی چٹان کے پہلو میں چھپا دیا تھا۔

مندر میں شاہی خاندان کی عورتیں اور مرد پوجا پاٹ کر رہی تھیں۔ ناگ قنطور یہاں صرف دیوتا لکھ راج کی شکل دیکھنے آیا تھا۔ ایک جگہ ستون کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے شعلوں کی روشنی میں دیوتا لکھ راج کی شکل کو غور سے دیکھا اور اس کے خدو خال اپنے ذہن میں بٹھا لئے۔ پھر وہ مندر کے پچھواڑے عمودی چٹان کی اوٹ میں آ گیا جہاں اس کا گھوڑا کھڑا تھا۔ سامنے وہ ندی تھی جس کے کنارے چتا تیار کی جا چکی تھی اور پجاری پروہت اس پر صندل لوبان اور کیسر چھڑک رہے تھے اور گھی کے مٹکے انڈیل رہے تھے۔ چاروں طرف پتھر کے کھمبوں کے ساتھ مشعلیں جل رہی تھیں جس کی روشنی میں وہاں کی ایک ایک چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ رات آدھی گزر چکی تھی۔ جوں جوں رات کا پچھلا پہر قریب آ رہا تھا پجاریوں کے بھجن کیرتن کرنے کی صدائیں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر شاہی سواری آ گئی۔ راجہ پورس اپنے بڑے بھائی کی لاش کا انتم سنسکار ہوتے اور اپنی بھابی کو ستی ہوتی دیکھنے کے لئے وہاں آن پہنچا تھا۔ اس کے ساتھ شاہی پروہت اور دوسرے درباری امراء بھی تھے۔ چتا سے کچھ فاصلے پر تخت اور کرسیاں بچھا دی گئیں اور شاہی افراد وہاں براجمان ہو گئے۔ روپا کے بڈھے خاوند کی ارتھی بھی آ گئی اور اس کی لاش کو چتا پر لٹا دیا گیا۔ اس کے بعد روپا کی سواری آئی۔ وہ دلھن بنی تخت رواں پر بیٹھی تھی جسے جنوبی ہند کے سیاہ فام دراوڑ غلاموں نے اٹھا رکھا تھا۔ روپا کی سہیلیاں بال کھولے، سر جھکائے ماتم کرتی، تخت رواں کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

قنطور چٹان کی اوٹ سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف ندی کے پار میں بھی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس درد انگیز بلکہ وحشت انگیز منظر کو تک رہا تھا۔ میں اس وہم میں غرق تھا کہ قنطور کی اسکیم کیا ہے؟ اور وہ اپنی سکیم پر کس وقت عمل کرے گا؟ شعلوں کی تیز روشنی میں مجھے روپا کا اداس چہرہ نظر آیا۔ چتا اور میرے درمیان صرف ندی حائل تھی جس کا پاٹ پچیس تیس قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ روپا نے دلھنوں جیسا سنگار کر رکھا تھا اور وہ موت سے بیاہ رچانے کے لئے آئی تھی۔ میرا دل غم سے پاش پاش ہو رہا تھا۔ میں قنطور کی طرف سے کسی انقلابی اقدام کے انتظار میں تھا۔ یہ بڑی ہی نازک گھڑی تھی اور زبردست تجسس کے لمحات تھے۔

میری آنکھوں کے سامنے روپا کو چتا پر بٹھا دیا گیا۔ اس نے کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ وہ خوشی خوشی چتا پر چڑھ گئی اور اس نے اپنے مرے ہوئے خاوند کا سر اپنے زانو پر رکھ کر گردن جھکا دی۔ گویا یہ اشارہ تھا کہ چتا کو آگ لگا دی جائے۔ اچانک چتا کی ایک جانب سے جدھر عمودی چٹان تھی، جسے کسی بہت بڑے اژدھا کی پھنکار کی آواز فضا میں دھماکے کی طرح

گونج کر رہ گئی۔ سب کی نظریں چٹان کی طرف اٹھ گئیں۔ راجہ پورس اور اس کے امراء بھی حیرت سے ادھر تکنے لگے میں بھی چٹان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شعلوں کی روشنی اس قدر تیز تھی کہ مجھے ندی پار سے ہر شے صاف نظر آ رہی تھی۔

اچانک چٹان کے اوٹ سے ایک گھڑ سوار نمودار ہوا۔ اس کے گھوڑے کے جسم پر پڑا ہوا جھول تاروں کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ جب وہ روشنی میں آیا تو راجہ اور امراء سمیت وہاں بیٹھے ہوئے سب لوگ ایک دم دہشت زدہ ہو کر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پروہت اور پجاری دم بہ خود پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھوڑ سوار کو تک رہے تھے۔ کیونکہ ان کے سامنے ان کا سب سے بڑا دیوتا لکھ راج جھلمل جھلمل کرتے گھوڑے پر سوار چلا آ رہا تھا۔ وہی بڑی بڑی گول سرخ آنکھوں والا چہرہ اور چار بازو اور ہر بازو کے ہاتھ میں ایک ایک تلوار تھی جو آہستہ آہستہ گردش کر رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اصلی لکھ راج دیوتا نہیں ہے بلکہ میرا سانپ دوست قنطور ہے جس نے اپنی ایک خفیہ طاقت سے کام لیتے ہوئے لکھ راج دیوتا کا روپ دھار لیا ہے اور اس کی ہو بہو شکل بنا کر وہاں پہنچ گیا ہے۔ میں بہت خوش ہوا۔ قنطور نے بڑی زبردست چال چلی تھی۔ اس طریقے سے نہ صرف یہ کہ وہ روپا کو موت کے منہ سے نکال سکتا تھا بلکہ اس کے ذہن کو بھی میری مرضی کے مطابق ڈھال سکتا تھا۔ کسی دیوتا یا اوتار کا انسانی شکل میں سامنے آ جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی، راجہ پورس، پروہتوں اور پجاریوں سمیت ہر کوئی سجدے میں گر پڑا۔ لکھ راج دیوتا کے چاروں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تلواریں آہستہ آہستہ گردش کر رہی تھیں۔ اس کے گلے میں لٹکا ہوا کالا ناگ اپنا پھن اٹھائے پھنکاریں مار رہا تھا اور اپنی دوشاخہ سرخ زبان بار بار باہر نکال رہا تھا۔

روپا ستی ہونے کے لئے چتا پر تیار بیٹھی تھی۔ اس کے خاوند کی لاش کا سر اس کے زانو پر تھا اور وہ بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیوتا لکھ راج کو انسانی روپ میں گھوڑے پر سوار اپنے بالمقابل دیکھ رہی تھی۔ شعلوں کی تیز روشنی میں دیوتا کی سرخ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اچانک دیوتا کی آواز بلند ہوئی۔

"میں دیوتا لکھ راج ہوں۔ جس نے اس نازک اندام کنیا روپا کی قربانی قبول کر لی ہے۔ آکاش کی اپسرائیں اس ستی ساوتری کے بلیدان سے بہت خوش ہیں۔ اگنی دیوی کی اجازت سے میں اس ستی ساوتری روپا کو خود لینے آیا ہوں۔ آؤ روپا دیوی! میرے ساتھ چلو۔ آکاش کی اپسرائیں تمہارے دوسرے جنم میں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔"

سب نے اپنے چہرے اوپر اٹھا کر دیوتا کی عقیدت میں نعرے لگائے۔ راجہ پورس نے ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر کہا۔

"عظیم دیوتا! یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے ہماری ایک کنیا کی قربانی قبول فرمائی اور اسے یہ عزت بخشی کہ اسے لینے کے لئے آکاش سے خود چل کر یہاں تشریف لائے۔ ہمیں آشیر باد دیجئے مہاراجوں کے مہاراج!"

لکھ راج دیوتا نے کہا۔

"تمہاری بھومی پر دھن برسے گا راجہ۔ اب ہم اپنی امانت کو لے کر واپس جا رہے ہیں۔"

ایک دم سے سب لوگ پرے پرے ہٹ گئے۔ پجاری دھیمے سروں میں کپکپاتے ہونٹوں سے بھجن گانے لگے، لکھ راج دیوتا گھوڑے کو آگے بڑھا کر چتا کے پاس آگیا۔ روپا کا چہرہ اپنے عظیم دیوتا کو اتنا قریب دیکھ کر خوشی سے چمک رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھی کہ پر لوگ میں دیوتاؤں اور اپسراؤں نے اس کی قربانی قبول کر لی ہے اور اب وہ اپنے نئے جنم میں ایک اپسرا کی حیثیت سے زندگی بسر کرے گی۔ دیوتا کو چتا کے قریب آتا دیکھ کر اس نے اپنے خاوند کا سر نیچے چتا کی لکڑیوں پر رکھ دیا اور خود اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لکھ راج دیوتا نے اپنا ایک بازو آگے بڑھایا۔ اس کے ہاتھ کی تلوار چتا پر گر پڑی۔ روپا اسے اٹھانے لگی تو لکھ راج دیوتا نے بلند آواز میں کہا۔

"اس تلوار کو اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ ہی جل کر فنا ہو جانے دو۔"

اس نے روپا کو گھوڑے پر اپنے آگے بٹھا لیا۔ چتا کا ایک چکر کاٹا۔ پروہت اور پجاری اب زور زور سے بھجن کیرتن کرنے لگے تھے اور خوشی سے لہک لہک کر جھوم رہے تھے۔ ان کے لئے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا کہ ان کا دیوتا خود ستی ہونے والی عورت کو لینے ان کے درمیان موجود ہے۔ میں یہ سارا منظر ندی کے دوسرے کنارے سے دیکھ رہا تھا۔ لکھ راج دیوتا نے چتا کے سات چکر پورے کئے اور پھر گھوڑے کو ندی میں ڈال دیا۔ میں جلدی سے گھوڑوں کے پاس درختوں کے پیچھے چلا گیا۔ جس وقت روپا گھوڑے پر آگے ہو کر بیٹھی تو لکھ راج دیوتا کے روپ میں قنطور نے اپنے گلے میں لٹکے ہوئے سانپ کو اس کی زبان میں حکم دیا کہ وہ روپا کو ڈس لے اور اس کے جسم میں صرف اتنا ہی زہر داخل کرے کہ جس سے وہ کچھ مدت کے لئے بے ہوش ہو جائے۔ قنطور اب ناگ دیوتا تھا۔ کوئی معمولی سانپ نہیں تھا۔ دنیا کے سارے سانپ اس کا حکم مانتے تھے اور اس کے آگے سر جھکاتے تھے۔ سانپ نے ایسا ہی کیا۔ جونہی روپا گھوڑے پر بیٹھی اور قنطور نے گھوڑا ندی میں ڈالا سانپ نے اس کی گردن پر پیار سے اپنا منہ رکھ کر اسے نامعلوم انداز میں ڈس لیا اور صرف اتنا زہر اس کے جسم میں داخل کیا کہ وہ فوراً بے ہوش ہو گئی۔

قنطور لکھ راج دیوتا کی شکل میں بے ہوش روپا کو گھوڑے پر ڈالے ندی پار کر کے ان درختوں کی طرف بڑھا جہاں میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دوسری جانب چتا کے پاس شعلوں کی روشنی میں پروہت اور پجاری ابھی تک اونچی آوازوں میں بھجن گا رہے تھے اور رقص کر رہے تھے۔ انہوں نے چتا کو آگ لگا دی تھی اور اس میں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔

قنطور نے میرے قریب آ کر کہا۔ "عاطون! اب اسے گھوڑے پر ڈالو اور یہاں سے نکل چلو۔" میں نے اس کے چار بازوؤں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "خدا کے لئے ان کا تو کوئی انتظام کرو۔" قنطور نے کہا۔

"ابھی نہیں۔ ابھی اس شکل کی ضرورت ہے۔"

میں نے روپا کو بازوؤں میں اٹھا کر دوسرے گھوڑے پر ڈالا اور ہم رات کے اندھیرے میں وہاں سے نکل گئے جس وقت پو پھٹی اور آسمان پر صبح کاذب کی نیلی جھلکیاں نمودار ہونے لگیں تو ہم دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ ایک پہاڑی علاقے سے گزر رہے تھے۔ قنطور کے گلے میں جو کالا پھن دار سانپ لٹکا ہوا تھا اس نے روپا کے جسم میں جتنی مقدار میں زہر ڈالا تھا وہ اسے ایک ہی دن تک بے ہوش کرنے کے لئے کافی تھا۔ قنطور یہی چاہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ روپا ایک کٹر قسم کی ہندو مت پر اعتقاد رکھنے والی عورت ہے اور واقعات اور حالات کو اس کے مطابق ڈھالنا بہت ضروری ہے۔ روپا کو قنطور نے لکھ راج دیوتا کی شکل میں ظاہر ہو کر یہ یقین دلایا تھا کہ اس کی قربانی ستی ہونے سے پہلے قبول کر لی گئی ہے اور وہ آکاش میں سورگ یعنی جنت میں جا رہی ہے اور جہاں وہ اپسراؤں کے ساتھ ہمیشہ کی زندگی بسر کرے گی۔ چنانچہ قنطور دیوتا ہی کے روپ میں اسے کسی ایسی وادی میں لے جا کر ہوش میں لانا چاہتا تھا۔ جو جنت نظیر ہو۔ یہ ساری بات مجھے بھی بتا دی گئی تھی۔ اب ہمیں کسی ایسی وادی کی تلاش تھی جو سرسبز و شاداب ہو اور جس کے نظارے جنت کی یاد تازہ کرتے ہوں۔

دن بھر ہم پہاڑیوں میں سفر کرتے رہے۔ یہ ایک سنسان اور غیر آباد علاقہ تھا اور راستے میں ہمیں کوئی بستی نہ ملی۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ہم ایک ایسی وادی میں آ گئے جہاں دریا سرسبز میدان میں بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ گھنے ہرے بھرے درختوں پر پھول کھلے تھے اور جگہ جگہ چشمے پھوٹ رہے تھے اور جنگلی گلاب کی بیلیں چٹانوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ قنطور نے کہا۔

"یہ جگہ مناسب رہے گی۔ ہم اسی مقام پر قیام کریں گے۔"

روپا کو ہوش آ رہا تھا۔ قنطور ابھی تک لکھ راج دیوتا کی شکل میں تھا۔ ہم نے ایک

پر فضا جگہ کا انتخاب کیا اور روپا کو ایک چشمہ کے کنارے، جنگلی گلابوں کی جھاڑیوں کے پاس لٹا دیا۔ قنطور نے مجھے قریب ہی ایک غار میں چھپا دیا اور مجھے ہدایت کی کہ جب وہ آواز دے تو میں باہر نکل آؤں، وہ خود روپا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سورج پہاڑیوں میں غروب ہو رہا تھا اور وادی پر شام کے ٹھنڈے سائے پھیل رہے تھے۔ روپا کو ہوش آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اپنے سامنے لکھ راج دیوتا اور ارد گرد پر فضا مقام کو دیکھا تو اٹھ بیٹھی اور قنطور کے آگے سجدہ کر دیا۔ قنطور نے اپنے چاروں بازو بلند کئے اور کہا۔

"روپا! تم سورگ میں پہنچ چکی ہو۔ تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ دنیا سے یہاں آنے کے بعد تمہارے محبوب بطلیموس نے خود کشی کر لی تھی۔ وہ تمہاری جدائی برداشت نہ کر سکا۔ اس کی محبت اسے یہاں سورگ میں تمہارے پاس کھینچ لائی ہے میں نے اس کی روح کو دوبارہ انسانی شکل عطا کر دی ہے۔ اب تم اپنے محبوب کے ساتھ اس سورگ میں ہمیشہ کی زندگی بسر کرو گی۔"

روپا حیرانی سے منہ اٹھائے قنطور کی باتیں سن رہی تھی۔ میں غار کی دیوار کے ساتھ لگا اس کے چہرے کے ایک ایک تاثر کو دیکھ رہا تھا۔ قنطور نے مجھے آواز دی اور میں غار سے نکل کر روپا کے سامنے آ گیا۔ روپا خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ قنطور نے بلند آواز میں کہا۔

"روپا! یہ تمہارا محبوب ہے۔ اس نے تم پر جان دے دی ہے اس کی محبت تمہیں سورگ میں ابد تک زندہ رکھے گی۔ کیا تم اس کی محبت سے انکار کرتی ہو؟؟"

روپا ایک ضعیف الاعتقاد عورت تھی اور پھر لکھ راج دیوتا کو اپنے بالمقابل دیکھ رہی تھی۔ وہ میری محبت اور دیوتا لکھ راج کے فیصلے کو کیونکر جھٹلا سکتی تھی اور پھر اس کے دل میں میری محبت بھی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی لیکن اچانک سنجیدہ ہو کر دیوتا لکھ راج کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"عظیم دیوتا! دنیا میں میرا جسم اور میری روح میرے خاوند کی امانت تھی۔ کیا آکاش میں میرے پتی کی روح مجھے نہیں ملے گی؟؟"

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ قنطور نے فوراً جواب دیا۔

"روپا! اس تمہارے محبوب کے جسم میں تمہارے خاوند کی روح بھی حلول کر گئی ہے۔ یہ تمہارا محبوب بھی ہے اور خاوند بھی۔ اب تم اس کی امانت ہو۔ تم دونوں اس سورگ میں خوش و خرم رہو۔"

اور لکھ راج دیوتا یعنی میرا دوست قنطور اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا پہاڑیوں کے پیچھے

غائب ہو گیا۔ میں نے روپا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور کہا۔

"روپا! میں دنیا میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکا جب مجھے پتہ چلا کہ تم لکھ راج دیوتا کے ساتھ آکاش کو سدھار گئی ہو تو میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ میں شمشان میں آ گیا۔ دیکھا کہ چتا پر تمہارے خاوند کی لاش جل رہی تھی۔ میں نے دل میں تمہیں آواز دی اور چتا پر کود گیا۔ پھر میرا جسم جل کر راکھ بن گیا اور تمہارے خاوند کی روح بھی میری روح میں حلول کر گئی اور جب لکھ راج دیوتا نے مجھے آواز دی تو میں آکاش کے دور دراز ستاروں سے اتر کر یہاں سورگ میں تمہارے پاس پہنچ گیا۔"

روپا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے سرخ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس کو یقین آ چکا تھا کہ میں خود کشی کر کے اس کے پاس سورگ میں پہنچ چکا ہوں اور میری روح میں اس کے خاوند کی روح بھی شامل ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں میرے چہرے پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"میرے محبوب! میرے خاوند! دیوتا مجھ پر مہربان تھے میری محبت نے آخر تم دونوں کو جیت لیا۔ میں کس قدر خوش قسمت ہوں، میں سورگ میں ہوں۔ اپنے محبوب کے ساتھ، اپنے خاوند کے ساتھ۔"

میں بہت خوش تھا لیکن یہ مسرت عارضی اور نقلی تھی۔ ہم نے زمین کے ایک سرسبز و شاداب ٹکڑے کو جنت ارضی کے لئے چن تو لیا تھا مگر اسے زیادہ دیر تک جنت ثابت نہیں کر سکتے تھے۔ میرا سانپ دوست قنطور لکھ راج دیوتا کا روپ بدل کر اپنی اصلی شکل میں اسی وادی میں کسی جگہ چھپا ہوا تھا۔ ہم اس انتظار میں تھے کہ روپا پر اس جنت ارضی کا نقشہ پختہ ہو جائے تو اسے ساتھ لے کر آگے شمالی ہند کی کسی ریاست کی طرف روانہ ہوں لیکن روپا پر بہت جلد جنت کا نقش باطل ثابت ہونے لگا۔ اس کے مذہبی ذہن میں بچپن ہی سے جس سورگ کا تصور بٹھایا گیا تھا وہاں دنیاوی آلائش نہیں تھیں اور چاروں طرف دیوتا اپسرائیں رقص کرتی تھیں۔ لیکن اس وادی میں یہ سب کچھ ہم پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ روپا کے دل میں شک کی لہریں اٹھنے لگیں اور وہ کسی وقت گھاس، مٹی اور پھولوں اور چشمے کے پتھروں کو غور سے دیکھنے لگتی اور کہتی۔ سورگ میں تو مٹی پتھر نہیں ہوتے۔ میری ماتا کہا کرتی تھیں کہ سورگ میں پتھروں کی جگہ ہیرے جواہرات ہوتے ہیں اور بھوک نہیں لگتی۔ ان سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ رہی سہی کسر ایک رات میرے اور قنطور کے درمیان ہونے والے مکالمے نے پوری کر دی۔

قنطور رات کو میرے پاس آیا ہوا تھا۔ ہم ایک جگہ گھنی جھاڑیوں کے پاس بیٹھے باتیں

کر رہے تھے کہ روپا کے ذہن میں اس جنت نقلی کو ہم کب تک اصلی کر کے پیش کر سکیں گے کہ روپا نے ہماری باتیں سن لیں۔ وہ جھاڑیوں میں سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئی۔ ستاروں کی نیلی روشنی میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے صاف نظر آ رہے تھے۔ اس نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کئے اور کہا۔

"بھگوان! یہ مجھے میرے کس جنم کے گناہ کی سزا ملی ہے۔ میرے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ دیوتاؤں نے میرے ساتھ فریب کیا ہے۔ میں زندہ ہوں۔ گناہوں سے بھری دنیا میں زندہ ہوں۔ ہے بھگوان میرے خاوند کی روح کو کہو کہ میں آ رہی ہوں۔ میں آ رہی ہوں۔ میں اس کے ساتھ ستی نہیں ہو سکی مگر میں آ رہی ہوں مجھے معاف کر دینا۔"

اور اس سے پہلے کہ میں اور قنطور لپک کر اسے بچاتے اس نے اپنے ساڑھی کے اندر چھپایا ہوا خنجر نکالا اور چشم زدن میں اسے اپنے دل میں گھونپ لیا۔ خون کا ایک فوارہ اس کے سینے سے بلند ہوا اور وہ چیخ مار کر زمین پر گر پڑی۔ میں نے جلدی سے اس کے سینے سے خنجر باہر کھینچ لیا۔ قنطور بھی گھبرا گیا۔ ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ روپا وہیں چھپی ہماری باتیں سن رہی ہو گی اور وہ اتنی جلدی خنجر سے اپنے آپ کو ہلاک کر لے گی۔ ہم نے اسے بچانے کی ہزاروں تدبیریں کیں مگر روپا نے دم توڑ دیا۔ میں نے اس کی خون آلود نعش کو اپنے سینے سے لگا لیا اور سسکیاں بھرتے ہوئے رونے لگا۔ قنطور اس الم انگیز المیے کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"عاطون! تم ایک غیر معمولی اور ماورا انسان ہو مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں انسانی ذہن اور جذبات کی ساری کمزوریاں موجود ہیں، اب حوصلہ کرو۔ یہ عورت اپنے خاوند کی امانت تھی دنیا میں بھی اور آسمانوں میں بھی۔"

میں نے قنطور کو کوئی جواب نہ دیا۔ ہم نے اس جگہ لکڑیاں جمع کر کے ایک چتا بنائی اور روپا کو اس پر لٹا کر اس کے ہندو مذہب کے مطابق نذر آتش کر دیا۔ صبح میں نے اپنی آتش زدہ محبت کی راکھ کے پھول ایک ندی میں بہا دیئے۔ میرا سانپ دوست قنطور میرے ساتھ تھا مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اس پر اس المیے کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا اور ہوتا بھی کیوں۔ وہ ایک سانپ تھا۔ بنیادی طور پر انسان نہیں تھا۔ پھر بھی اسے میرے دکھ درد سے ہمدردی تھی اور میرے ہم راز، ہم سفر اور ہم دور ہونے کے ناطے اس نے ہر طرح سے میری دل جوئی بھی کی تھی اور مجھے اس قسم کی انسانی کمزوریوں سے بلند تر ہونے کی تلقین بھی کی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ میں ایک غیر معمولی انسان ہوں اور میرے جذبے اور ان کے ساتھ میرا رویہ بھی غیر معمولی ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ایک عام انسان نہیں

تھا۔ میرے اندر طاقت کا ایک ایسا کوہ ہمالیہ پوشیدہ تھا کہ جس کو موت کا ہاتھ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا تھا لیکن اس کے باوجود میں محبت میں عام انسانوں کی طرح کمزور تھا پھر بھی مجھے اپنے سانپ دوست قنطور کے خیالات سے اتفاق تھا اور میں اس نہج پر سوچنے لگا تھا کہ مجھے کمزور انسانوں کی بشری کمزوریوں سے اپنے دامن کو چھڑا لینے کی کوشش کرنی چاہئے کیونکہ میرا تاریخ اور زندگی کا سفر ناقابل ختم تھا اور کوئی بھی غم میرے ساتھ ابدی روگ کی حیثیت اختیار کر سکتا تھا اور یہ بات ناقابل برداشت تھی۔ اب ہمارے لئے اس سرسبز و شاداب جنت نظیر وادی میں کیا رکھا تھا۔ خاص طور پر مجھے تو وہاں کے ایک ایک شجر سے اپنی گم شدہ محبت کی خوشبو آتی تھی۔ روپا سے میں نے محبت کی تھی۔ ایک عام انسان کے بھرپور جذبے اور تمام بشری کمزوریوں کے ساتھ محبت کی تھی۔ ابھی میں جذباتی اعتبار سے اتنا طاقت ور نہیں تھا۔ چنانچہ ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ہم نے اس وادی محبت کو خیر باد کہہ دیا۔

ہم جس شمالی ہند کے جنگلوں وادیوں اور میدانوں میں سرگرم سفر تھے۔ وہ آج سے تین پونے تین ہزار برس پہلے کا ہند اور آج کے پاکستان کا شمالی علاقہ تھا۔ ہم کشمیر کے خوبصورت پہاڑی سلسلے میں سے گزرتے ہوئے آج کے کاغان کی حسین وادی میں داخل ہو گئے۔ اس زمانے میں یونانی مقبوضات کی حدیں کاغان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ آبادیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ کئی کئی روز سفر کرنے کے بعد کوئی چھوٹی سی بستی دکھائی دیتی تھی۔ اگرچہ یونانی رسم و رواج بھی یہاں کی ثقافت میں اثر پذیر ہو رہے تھے لیکن قدیم آریائی مذہب کی بنیادیں بڑی گہری تھیں اور لوگ درختوں، خود ساختہ بتوں اور پہاڑوں دریاؤں اور آگ کی پوجا کرتے تھے۔ کاغان سے نکل کر جب ہم آج کے اتری بھارت کے میدانوں میں داخل ہوئے تو کوہ ہمالیہ کی تلہٹی میں دیکھا کہ لوگ سانپوں اور بندروں کے بت بنا کر ان کی پرستش کرتے تھے۔ پہلے اس سارے شمالی علاقے میں کول اور دراوڑ قبیلے کے لوگ آباد تھے لیکن آریاؤں نے حملہ کر کے انہیں جنوب کی طرف بھگا دیا اور دریاؤں کے کنارے اپنی بستیاں اور چھوٹے چھوٹے شہر بنا کر اپنی الگ الگ قبائلی حکومتیں قائم کر لیں۔ ہر شہر کا ایک راجہ تھا اور یہ آپس میں اکثر لڑتے رہتے تھے۔ یہ قلعہ بند شہری حکومتیں ایک دوسرے سے سینکڑوں کوس کے فاصلے پر واقع تھیں اور گھڑ سوار ہرکارے دنوں کے سفر کے بعد ایک شہر سے دوسرے شہر میں پہنچتے تھے۔ ہم اسی طرح کے ایک شہر کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ شہر پناہ کے سات دروازے ہیں جن پر چوکی پہرہ لگا ہے اور ہر داخل ہونے والے کی پڑتال کی جاتی ہے۔ فصیل شہر پر جھکی ہوئی گول چھتوں والے برج بنے تھے۔ جن میں تیر انداز دستے متعین تھے۔ شہر پناہ کے ساتھ گہری کھائی کھدی ہوئی تھی جو پانی سے لبالب بھری تھی۔ ہم سیاحوں کی حیثیت

سے شہر میں داخل ہوئے اور ایک سرائے میں جا کر اتر گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا اور بیچ میں راجہ کا محل تھا جس کے کلس سونے کے تھے۔ یہاں جگہ جگہ ایسے معبد دیکھے کہ جہاں مظاہر فطرت کے بت بنا کر ان کی پوجا کی جاتی تھی۔ دراصل ہندی آریا اپنے ساتھ دیوتاؤں کی ایک فوج لائے تھے۔ وہ ان کی خوشنودی کے لئے یگ اور ہون بھی کرتے تھے۔ اس شہر کے لوگ ان ہی ہندی آریاؤں کی اولاد تھے اور ان کی زبان سنسکرت تھی جو ایرانی مقدس کتاب اوستا کی زبان سے ملتی جلتی تھی۔ یہاں بھی میں نے اندر دیوتا اور اگنی دیوی کے مندر دیکھے اس زمانے میں ہر شہر پر' ہر راجہ کا اپنا سکہ ہوتا مگر جواہرات اور سونا ہر جگہ قبول کیا جاتا تھا۔ ہمارے پاس نہ سونا تھا اور نہ جواہرات تھے کہ انہیں فروخت کر کے سرائے میں ٹھہرنے کی اجرت ادا کر سکتے۔ کھانے پینے سے ہم دونوں آزاد تھے۔ قنطور چونکہ بنیادی طور پر ایک سانپ تھا اس لئے وہ معمولی سی ہوا اور تھوڑے سے دودھ یا گوشت پر کئی دن تک گزر اوقات کر سکتا تھا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا مجھے نہ بھوک ستاتی تھی نہ پیاس۔ ہاں اپنی مرضی سے میں کھا پی سکتا تھا اور سو بھی لیتا تھا لیکن سرائے کا کرایہ ادا کرنے کے لئے ہمیں اس شہر کے سکے یا سونے یا جواہر کی ضرورت تھی جو ہمارے پاس نہیں تھا اور ابھی ہمیں اپنی آئندہ منزل کا تعین کرنے کے لئے چند ایک روز اس شہر میں رہنا تھا۔ میں نے قنطور سے کہا کہ میں یہاں کچھ محنت مزدوری کر کے کچھ سکے کماتا ہوں۔ قنطور ہنسا اور بولا۔

"اگر ہم دونوں عام انسانوں سے بلند تر ہیں تو پھر عام انسانوں کی طرح محنت مزدوری کیوں کریں؟"

میں نے کہا۔

"لیکن میں چوری نہین کر سکتا اور سرائے والے کے پیسے بھی نہیں مار سکتا۔ ہمیں ہر حالت میں یہاں ٹھہرنے کی قیمت ادا کرنی ہو گی۔"

قنطور بولا۔

"بس اتنی سی بات ہے؟ میرے ساتھ آؤ۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے پہلی بار اپنے سانپ دوست قنطور کی ایک ایسی کرامت دیکھی جس کے بعد مجھے یہ باور کرنے میں ذرا سی بھی کسر باقی نہ رہی کہ قنطور واقعی سانپوں کا دیوتا ناگ ہے۔ میں قنطور کے ساتھ سرائے سے باہر نکلا تو سرائے والے نے چبوترے پر کانسی کے دیگچوں کے درمیان بیٹھے ہمیں ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا۔ قنطور اس کی آنکھوں کا مطلب سمجھ گیا اس نے سرائے کے مالک کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اسے بہت جلد کرایہ ادا کر دیا جائے گا۔ اصل بات یہ تھی کہ جب ہم سرائے میں اترے تو ہمارے پاس پھوٹی کوڑی

بھی نہیں تھی اور ہم نے سرائے والے کے پاس ہی اپنے دونوں گھوڑے گروی رکھ دیئے تھے کہ پیسے کما کر گھوڑے چھڑا لیں گے۔ قنطور اور میں پیدل ہی شہر کی کشادہ سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ آج سے تین ہزار برس پہلے کے شہروں کی سڑکوں اور دکانوں کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔ آج سے تین ہزار سال پہلے کے شہروں میں ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کی جدید سہولتیں نہیں تھیں۔ وہ لوگ ان سہولتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مکان اک منزلہ ہوتے تھے۔ کہیں کہیں سہ منزلہ حویلیاں نظر آ جاتی تھیں - سڑکیں کچی اور کشادہ ہوتی تھیں بعض شاہراہوں اور مندروں یا شاہی محل کی طرف جانے والی سڑکوں پر پختہ اینٹیں یا پتھر جوڑ کر انہیں پکا کر دیا جاتا تھا۔ ان پر سارا دن گھوڑے اور رتھ دوڑتے پھرتے تھے۔ دکانوں کا تقریباً سارا قابل فروخت سامان باہر لا کر رکھ دیا جاتا تھا۔ اگرچہ چوری کی سزا بڑی سخت تھی پھر بھی ہر جگہ چوریاں ہوتے دیکھتا رہا ہوں۔

میرا سانپ دوست قنطور کسی پرانے کھنڈر کی تلاش میں تھا جو شہر کے اندر کسی جگہ نہیں تھا۔ ہم شہر کے باہر آ گئے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کھنڈر کس لئے تلاش کر رہا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا کہ قدیم خزانے عام طور پر کھنڈروں کے نیچے دفن ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا وہ کوئی دبا ہوا خزانہ کھودنا چاہتا ہے' اس نے جواب دیا کہ خزانہ ہم نہیں کھودیں گے۔ میں نے خیال کیا کہ ہو سکتا ہے اس شخص کو سانپ ہونے کی وجہ سے خفیہ خزانوں کا پتہ چل جاتا ہو لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا کہ قنطور کو زمین دوز خزانوں کا علم ہے کیونکہ اب وہ ایک سانپ کی نہیں بلکہ ایک عام انسان کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایک جگہ خشک خار دار درختوں کے قریب ایک پرانا کھنڈر نظر آیا۔ جس کی دیواریں گر چکی تھیں۔ سنگ سرخ کے صرف دو ستون سلامت تھے۔ قنطور ان ستونوں کے پاس جا کر رک گیا اور اس نے منہ اٹھا کر فضا میں کسی خاص قسم کی بو کو سونگھا اور مجھے ہدایت کی کہ میں اس کی ایک جانب زمین پر دوزانو ہو کر بیٹھ جاؤں اور نہ کوئی حرکت کروں اور نہ کسی چیز سے خوف کھاؤں۔ میں ایک بڑے سے پتھر پر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور قنطور کو دیکھنے لگا۔ اس نے ہوا میں اپنا سانس زور سے چھوڑا اور خود بھی ایک پتھر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ بعد مجھے پھنکار کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی آواز سنائی دی اور پھر کھنڈر کے پتھروں اور ملبے کے درمیان سے ایک کافی موٹا اور لمبا سانپ جو اژدھا لگتا تھا بل کھاتا' پھنکارتا نمودار ہوا اس کے جسم کا رنگ ہلکا سبز تھا اور گردن کے قریب سرخ دانے دانے سے نکلے ہوئے تھے۔ اژدھا نے اپنا بھاری سر تین بار اوپر اٹھا کر نیچے جھکایا جیسے قنطور یعنی ناگ دیوتا کی تعظیم کر رہا ہو اور پھر اس سے تین چار گز کے فاصلے پر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ اژدھا نے ایک بار میری طرف

اپنی لال لال آنکھوں سے گھور کر دیکھا اور دوشاخہ زبان باہر نکال کر لہرائی۔ قنطور نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھا دیا اور اس کے منہ سے سیٹی کی سی آوازیں نکلنے لگیں۔ اژدہا اپنا بھاری سر اوپر اٹھائے ہوئے تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ قنطور سانپوں کی زبان میں اس سے کوئی مطالبہ کر رہا ہے جسے وہ پوری توجہ سے سن رہا ہے۔ قنطور کے منہ سے سیٹی کی آوازیں نکلنا بند ہو گئیں۔ اژدہا نے سر جھکایا اور زمین پر بل کھاتا لہراتا جدھر سے آیا تھا ادھر کو ہی چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے قنطور سے پوچھا کہ کیا وہ اژدھا سے باتیں کر رہا تھا۔ قنطور نے کوئی جواب نہ دیا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔

چند لمحوں کے بعد کھنڈر کے پتھروں میں سے وہی اژدھا ایک بار پھر نمودار ہوا۔ اس دفعہ اس نے اپنے منہ میں ایک چھوٹا سا ہار تھام رکھا تھا۔ جس کے سفید ہیرے دن کی روشنی میں ستاروں کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ اژدہا نے ہیروں کا وہ ہار قنطور کے قدموں میں آگے لا کر رکھ دیا اور ادب سے سر جھکا کر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ قنطور نے اپنے ہونٹوں سے سیٹی کی آواز نکال کر شاید اژدہا کا شکریہ ادا کیا۔ اژدہا نے تین بار اپنے سر کو جھکا کر تعظیم کی اور واپس کھنڈر کے پتھروں میں غائب ہو گیا۔ قنطور نے ہار اٹھا لیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "اس کھنڈر کے نیچے کسی راجہ کا ایک بہت بڑا خزانہ مدفون ہے۔ یہ اژدہا اس خزانے کی حفاظت پر مامور ہے اور میرے حکم پر اس خزانہ میں سے یہ قیمتی ہیروں کا ہار لایا ہے۔"

میں نے دیکھا کہ قنطور کی آنکھیں اژدہا کی آنکھوں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ ہو بہو اژدہا کی آنکھیں لگ رہی تھیں۔ ہم کھنڈر سے نکل کر واپس شہر میں آ گئے۔ یہاں ایک بازار تھا جہاں سونے چاندی اور جواہرات کا کاروبار ہوتا تھا۔ ہم نے ایک جوہری کو ہار میں سے ایک ہیرا نکال کر دکھایا اور اس کی قیمت ڈلوائی۔ جوہری ہار اور اس کے ہیرے کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ایسا نادر ہیرا اس نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں پہلے کہاں دیکھا ہو گا۔ اس نے قنطور سے پوچھا کہ یہ ہار اسے کہاں سے ملا ہے؟ قنطور نے کہا کہ یہ اس کا خاندانی ہار ہے اور بعض مجبوریوں کی بنا پر وہ اس کا ایک ہیرا فروخت کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ ہیرے کی قیمت بہت زیادہ تھی لیکن ہوشیار جوہری نے ہمیں سونے کے سکوں کی صرف ایک چھوٹی سی تھیلی دی اور کہا کہ وہ اس سے زیادہ ادا نہیں کر سکتا۔ ہمیں تو چند یوم گزارنے کے لئے سرائے کے کرائے کی ضرورت تھی۔ زیادہ دولت کا ہمیں کوئی لالچ تھا اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ ہم نے سونے کے سکوں کی تھیلی اٹھائی اور سرائے میں آ کر سرائے والے کو پچھلا کرایہ ادا کر کے پندرہ روز کا پیشگی کرایہ بھی دے دیا۔ وہ بہت خوش ہوا اور اس نے

رات کو ہماری کوٹھری میں بھنی ہوئی بطخ بھیج دی۔ قنطور نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اس سے تو بہت تھا کہ وہ زندہ بطخ بھجوا دیتا تا کہ ہم اس سے دل بہلاتے ہم نے اسے شوق سے کھایا۔

ہمیں کوئی خبر نہیں تھی کہ جس وقت ہم جوہری کو اپنا ہار دکھا رہے تھے اور ہیرے کا سودا کر رہے تھے تو بازار میں سے گزرتے ایک ٹھگ نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ ہار کو دیکھ کر وہ وہیں رک گیا تھا۔ جب ہم بازار سے نکلے تو وہ بھی ہمارے تعاقب میں تھا۔ اس نے ہماری سرائے اور ہماری کوٹھری کو دیکھ لیا اور چلا گیا۔ وہ اپنے ساتھی ٹھگ کے ہمراہ اسی رات ہماری کوٹھری میں ڈاکے کی نیت سے داخل ہونے والا تھا جس کا ہمیں کچھ علم نہیں تھا۔ رات کو ہم کچھ دیر ایک داستان گو کی مجلس میں بیٹھے داستان سنتے رہے۔ پھر اپنی کوٹھری میں آ گئے۔ دونوں ٹھگ بھی وہیں داستان گو کی مجلس میں بیٹھے ہم پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ہم کوٹھری میں شمع روشن کئے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ قنطور کا ارادہ جنوبی ہند کی طرف جانے کا تھا۔ میں روپا کی موت کے بعد اس سرزمین سے دل برداشتہ ہو چکا تھا اور واپس ملک یونان کی طرف کوچ کر جانا چاہتا تھا۔ قنطور نے کہا کہ اگر تم یونان جانا چاہتے ہو تو میں بھی تمہارے ساتھ اسی سرزمین کو چھوڑ دوں گا۔ نیند ہمیں آ نہیں رہی تھی۔ ہاں قنطور کی آنکھیں کچھ کچھ خواب آلود ہو رہی تھیں۔ میں نے اسے کہا کہ وہ کچھ دیر آرام کر لے میں اتنی دیر میں چاندنی رات میں سنسان شہر کا نظارہ کرتا ہوں۔ قنطور لکڑی کے تخت پر بچھے ہوئے بچھونے پر لیٹ گیا۔ اس نے جواہرات کا ہار وہیں اپنے سرہانے کے نیچے کر دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اگرچہ اس کی آنکھیں سانپ کی آنکھوں سے مشابہ تھیں لیکن انسانی شکل میں آ جانے کے بعد وہ انہیں بند کر سکتا تھا۔ میں سرائے سے باہر نکل آیا۔ چاندنی چاروں طرف کھلی ہوئی تھی۔ شہر کی سڑک خالی اور سنسان تھی۔ سرائے کی ساری کوٹھریوں کے دروازے بند تھے اور مسافر خنک رات میں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ میں ٹہلتے ٹہلتے سڑک پر کافی دور نکل گیا۔ آگے ایک باغ آ گیا جہاں عطر بیز پھولوں کی مہک پھیلی تھی۔ اور تالاب میں ایک فوارے کا پانی سیال چاندی کی مانند اچھل رہا تھا۔ یہ منظر مجھے اس قدر اچھا لگا کہ میں تالاب کے کنارے سنگ سرخ کے ایک چبوترے پر بیٹھ گیا۔ خدا جانے کیوں مجھے اپنے بیوی بچے یاد آ گئے اور میں ان کی یادوں میں اس قدر محو ہوا کہ وقت کا کوئی احساس نہ رہا۔

عین اس وقت ہماری کوٹھری میں ڈاکا پڑا اور میرے سانپ دوست قنطور پر ان جانے اور کچھ نا سمجھی میں قیامت گزر گئی۔ اس المیے کا جو احوال اس نے مجھے بعد میں بیان کیا وہ میں آپ کو سنائے دیتا ہوں۔ جب میں کوٹھری سے نکل کر ٹہلتا ٹہلتا سنسان چاندنی رات میں

باغ میں تالاب کے کنارے آ کر بیٹھ گیا تو وہ دونوں ٹھگ جو جوہری کی دکان سے ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے منہ سر لپیٹے تلواریں عباؤں کے اندر چھپائے سرائے کی دیوار پھاند کر عقبی حصے سے کوٹھری کے پاس آ کر رک گئے۔ یہاں اندھیرا تھا۔ بدقسمتی سے دروازہ اندر سے کھلا تھا کیونکہ میں ٹہلنے کے لئے باہر نکل گیا تھا اور قنطور نے دروازہ اندر سے بند کرنے کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ٹھگ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ کوٹھری میں شمع روشن تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ قنطور کی بھی آنکھ لگ گئی تھی مگر پہلی ہی آہٹ پر اس نے آنکھیں کھول دیں لیکن اس وقت دیر ہو چکی تھی۔ قنطور ایک ثانئے میں سب کچھ سمجھ گیا کہ یہ چور ڈاکو ہیں اور اس کے قیمتی ہار کے پیچھے آئے ہیں' اس نے ٹھگوں کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی وہ تلواریں نہیں دیکھی تھیں جو وہ پیچھے چھپائے ہوئے تھے۔ قنطور نے ایک سیکنڈ کے اندر اندر سانس اندر کو کھینچ کر پھنکار ماری اور ایک بالشت بھر کے کالے زہریلے سانپ کا روپ بدل لیا اور اس سے پہلے کہ دہشت زدہ ٹھگ سنبھلتے اس نے ایک ٹھگ کی گردن پر اچھل کر ڈس دیا لیکن دوسرے ٹھگ نے قنطور کو اتنی مہلت نہ دی۔ ایک تو وہ انسان کی سانپ کی شکل اختیار کرتے دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا تھا اور دوسرے اسے اپنی جان بھی بچانی تھی۔ اس نے بجلی کی تیزی سے تلوار کا وار کر دیا۔ قنطور نے تلوار کا پھل چمکتا دیکھا تو ہوا میں اچھلا مگر اس سے پہلے ہی تلوار نے اس کے جسم کو دو ٹکڑوں میں کاٹ ڈالا تھا۔ اس کا ایک ٹکڑا تخت کی دوسری طرف اور سر والا ٹکڑا تخت پر گر پڑا۔ قنطور کی آنکھوں کے سامنے سرخ اندھیرا چھا گیا۔ مگر اس کے سر نے اچھل کر دوسرے ٹھگ کی گردن پر بھی ڈس لیا اور پھر بے جان ہو کر تخت پر گر گیا۔

یہاں یہ قیامت گزر گئی تھی اور میں چاندنی رات میں باغ میں فوارے کے پاس بیٹھا اپنی پیاری بیوی کو یاد کر رہا تھا جو دو ہزار سال گزرے مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ چکی تھی' چاند کھلے آسمان میں سفر کرتا ہوا آگے نکل گیا تھا۔ درخت پر کوئی الو بول اٹھا۔ میں استغراق خیال گم کشتگان سے چونکا اور واپس سرائے کا قصد کیا۔ کوٹھری کا دروازہ تھوڑا سا کھلا دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اندر داخل ہوا تو دو سیاہ پوش آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ قنطور غائب تھا۔ دل اچھل کر حلق کے قریب آ گیا۔ شمع کی لو دھیمی پڑ چکی تھی جس کے باعث کوٹھری میں روشنی دھندلی ہو رہی تھی۔ جلدی سے لو اونچی کی تو دیکھا کہ بالشت بھر کا سیاہ سانپ دو ٹکڑے ہو کر پڑا تھا۔ ایک ٹکڑا زمین پر او دوسرا تخت پر پڑا آہستہ آہستہ حرکت کر رہا تھا۔ ایک پل میں سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔ سرہانے کو اٹھا کر پرے پھینکا۔ جواہرات والا ہار سرہانے کے نیچے اسی طرح پڑا تھا۔ لاشوں کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں

جس نے سارا معمہ حل کر دیا - دہشت کے مارے میرے پاؤں کی زمین نکل گئی۔ یہ قنطور۔ میرا دوست تھا جس کے سانپ کی شکل میں دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا سر والا ٹکڑا اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ سانپ کی سرخ آنکھوں میں ایک حسرت ناک تاثر تھا۔ جیسے اس کی آنکھیں مجھے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یہ میرا دوست قنطور ہی تھا جس نے سانپ کی شکل دھار کر ڈاکوؤں کو ہلاک کرنا چاہا مگر ان میں سے کسی ایک کی تلوار کا شکار ہو گیا۔ پھر بھی اس نے دونوں ڈاکوؤں کو ڈس کر ہلاک کر دیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ میرے دوست کے ساتھ اب کیا ہو گا؟"

اچانک مجھے یاد آ گیا کہ قنطور نے ایک بار مجھے کہا تھا۔

"عاطون! اگر کبھی میں سانپ کی شکل میں کسی دشمن کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا تو تم میرے کٹے ہوئے یا کچلے ہوئے جسم کو لکڑی کے ڈبے میں بند کر کے کیلاش پربت لے جانا۔ یہ کوہ ہمالیہ کے سلسلے کا ایک بلند ترین پہاڑ ہے۔ اس کے دامن میں انتہائی دشوار گزار مقام پر شیش ناگ کا ایک مندر ہے۔ اس مندر کے صحن میں ایک تالاب ہے۔ میری لاش والی ڈبیا کا ڈھکن کھول کر اس تالاب کی تہہ میں لے جا کر رکھ دینا اور چھ ماہ تک وہیں رہ کر میری نگرانی کرنا۔ اگر میری لاش چھ ماہ تک شیش ناگ کے مندر والے تالاب میں سکون سے پڑی رہی تو میں ساتویں مہینے کے پہلے ہی روز پھر سے زندہ ہو کر تالاب سے باہر نکل آؤں گا لیکن اگر کسی نے مجھے وہاں سے نکال کر باہر پھینک دیا تو وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری موت واقع ہو جائے گی۔"

میں نے اسی وقت اپنے دوست قنطور کی لاش کے ٹکڑوں کو ایک لکڑی کی ڈبی میں رکھا اس کے ارد گرد سرہانے میں سے روئی نکال کر لگا دی۔ ڈبی بند کر کے جیب میں رکھی۔ ہیروں کا ہار اپنی عبا کی اندرونی جیب میں سنبھالا اور سرائے کے اصطبل کی طرف دوڑا۔ میں اپنے دوست قنطور کی جان بچانے کے لئے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رات ڈھل رہی تھی کہ میں گھوڑا دوڑائے شہر سے دور نکل چکا تھا۔ ایک ماہ تک میں منزلوں پر منزلیں طے کرتا سفر کرتا رہا۔ آخر کوہ ہمالیہ کی تلہٹی میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے کیلاش پربت کے شیش ناگ مندر کی چڑھائی شروع ہوتی تھی۔ یہاں میں نے اپنے گھوڑے کو آزاد کر دیا اور خود کیلاش پربت کی پہاڑیوں میں جاتی چڑھائی چڑھنے لگا۔ گرمیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا مگر یہاں کافی خنکی تھی۔ جوں جوں میں اوپر جا رہا تھا خنکی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا مگر میرا تاحال غیر فانی جسم موسم کی شدتوں اور سختیوں سے بے نیاز تھا۔ پھر بھی میں نے لوگوں کی توجہ کا مرکز بننے سے بچنے کے لئے جسم پر گرم کمبل ڈال کر کمر کے ساتھ رسی باندھ

لی تھی اور پاؤں میں ریچھ کی کھال کے جوتے پہن رکھے تھے۔ جواہرات کا ہار اور وہ لکڑی کی ڈبیا جس میں قنطور کی لاش کے دونوں ٹکڑے تھے میری جیب میں محفوظ تھی' سونے کے سکوں کی تھیلی نے سفر میں مجھے کام دیا تھا اور اب میرے پاس صرف چند ایک سکے باقی رہ گئے تھے۔

چڑھائی بڑی دشوار گزار تھی۔ اگرچہ میرا سانس نہیں پھول رہا تھا اور مجھے تھکان بھی نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں بڑی احتیاط سے چڑھ رہا تھا کہ اگر پاؤں پھسل گیا تو گہری کھڈ میں گر پڑوں گا۔ میں مروں گا تو نہیں لیکن مجھے ساری چڑھائی پھر سے طے کرنی پڑے گی اور قنطور کی لاش کی ڈبیا کو شیش ناگ کے تالاب میں ڈالنے میں تاخیر ہو جائے گی۔ مجھے قنطور کے قتل ہونے کے بعد تین مہینوں کے اندر اندر لاش کو تالاب کے پانی میں ڈالنا تھا اور ڈھائی مہینے مجھے سفر میں ہی گزر چکے تھے۔ راستے میں مجھے کوئی پجاری یا زائر اوپر مندر کی طرف جاتا نہ ملا۔ شاید اس لئے کہ میلے کا موسم حال ہی میں ختم ہوا تھا اور اب سردی بڑھ گئی تھی۔ میں برابر رکے بغیر چڑھائی چڑھتا چلا جا رہا تا۔ اب درخت اور سبزہ ختم ہو گیا تھا اور پہاڑی راستے کی دونوں جانب برفانی تودوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ جوں جوں میں اوپر جا رہا تھا سردی اور ہواؤں کی تیزی میں شدت آ رہی تھی راستے میں ہی رات ہو گئی مگر میں نے اپنا دشوار گزار پہاڑی سفر جاری رکھا۔ ساری رات گزر گئی۔ دوسرے دن سورج نکلا تو میں نے دیکھا کہ میرے چاروں طرف برف ہی برف ہے جو سخت ہو کر پتھر بن چکی ہے اور اوپر ایک پہاڑی پر شیش ناگ کے مندر کے سنہری کلس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ میرے دل میں خوشی کی لہر پھیل گئی۔ میری منزل سامنے نظر آ رہی تھی۔ سارا دن کیلاش پربت کی چڑھائی چڑھتے گزر گیا۔ سورج نے مغرب کی طرف کوہ ہمالیہ کے پہاڑی کے پیچھے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا کہ میں شیش ناگ کے مندر کے بہت بڑے احاطے کی دیوار کے پاس پہنچ گیا۔

یہ مندر کئی سو سال پرانا تھا اور آریاؤں کے ایک ایسے قبیلے نے یہاں بنایا تھا جو سانپوں کی پوجا کرتا تھا۔ یہ برف پوش کیلاش پربت کے دامن میں ایک ہموار جگہ پر بنایا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف پتھر کی دیوار تھی اور ایک بہت بڑا لکڑی کا دروازہ تھا جو اس کے احاطے میں کھلتا تھا۔ یہاں سے گزریں تو آگے مندر کی سیڑھیاں آ جاتی تھیں۔ یہاں پر ایک کانسی کا دروازہ تھا جو مندر کے صحن میں کھلتا تھا۔ یہی وہ صحن تھا جس میں مندر کا وہ تالاب واقع تھا جہاں مجھے اپنے سانپ دوست قنطور کی لاش کو رکھنا تھا۔ یہاں مجھے کچھ مقامی لوگ نظر آئے جو ایک مکان کے چھجے کے نیچے آگ جلائے بیٹھے کوئی مشروب پی رہے تھے۔ ہوا سخت برفیلی تھی اور مندر کی دیوار پر برف جمی ہوئی تھی۔ لکڑی کا بڑا ہاتھی نما دروازہ بند تھا مگر اس کے

ایک کواڑ میں نیچے بنایا گیا طاق کھلتا تھا اور دوسری طرف ایک کمبل پوش لمبے سیاہ بالوں والا آدمی لکڑی کے تخت پر بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ وہ پہرے دار تھا۔ جیسا کہ میرے بارے میں آپ پڑھ چکے ہوں گے اور میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ایک نامعلوم مدت کے لئے موت پر فتح حاصل کر لینے کے بعد مجھ میں ایک صفت یہ بھی پیدا ہو گئی تھی کہ میں دنیا کے کسی بھی قبیلے یا ملک کے لوگوں کی زبان بڑی روانی سی بول اور سمجھ لیتا تھا۔ جو سسکاروں اور سرگوشیوں میں بولی جاتی تھی۔ جیسے سانپ باتیں کر رہے ہوں۔ کیلاش پربت کے اس علاقے میں اس زمانے میں جو زبان بولی جاتی تھی۔ وہ آریاؤں کی سنسکرت زبان سے ملتی جلتی زبان تھی۔ کسی بھی نئی زبان کو سمجھنے سے پہلے ضروری تھا کہ کوئی دوسرا آدمی اس زبان کا کوئی لفظ یا کوئی جملہ بولے۔ اس کے ساتھ ہی اس زبان کے سارے ابجد اور ان کا مفہوم میرے ذہن کی لوح پر ابھرنا شروع ہو جاتا تھا۔

چنانچہ جب میں مندر کے پہرے دار کے قریب گیا تو مجھے اس کی زبان بالکل نہیں آتی تھی اور نہ مجھے معلوم تھا کہ یہ کون سی زبان بولے گا۔ یہ سب کچھ سمجھنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی زبان میں کوئی بات کرتا۔ چنانچہ میں دروازے کے طاق کے پاس پہنچ کر جان بوجھ کر پھسل کر زمین پر گر پڑا۔ پہرے دار نے جلدی سے اٹھ کر مجھے برف پر سے اٹھا لیا اور کہا۔ "برف جب سخت ہو جائے تو وہ قاتل بن جاتی ہے۔ اس پر بغیر چھڑی کے مت چلو۔ تم کوئی مسافر لگتے ہو۔ کیا تم میری زبان سمجھ رہے ہو؟" اب میں اسے کہہ سکتا تھا کہ میں اس کی زبان سمجھ رہا ہوں کیونکہ اس کے ایک جملہ ادا کرنے کے بعد میں اس کی زبان کے تمام مخارج گرائمر اور رموز و مفاہیم سے آگاہ ہو چکا تھا۔ یہ سنسکرت کی کوئی چھوٹی بہن لگتی تھی اور اس پر اوستا کی زبان سے زیادہ شمالی ہند کی قبل از آریائی مقامی زبانوں کا اثر تھا۔ میں نے اسے اس کی زبان میں کہا کہ میں نیچے کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں اور شیش ناگ کے مندر میں منت ماننے آیا ہوں۔ اس نے مجھے انگیٹھی کے پاس تخت پر بٹھایا اور قہوے کی طرح کا کوئی تلخ مشروب پینے کو دیا۔ پھر بولا۔

"منت ماننے کے لئے تمہیں مندر کے پروہت کو نذرانہ دینا ہو گا اور اجازت بھی لینی ہو گی۔ پروہت کو تم جانتے ہو؟"

میں نے کہا کہ میں کافی عرصہ اپنے گاؤں سے باہر رہا ہوں اور دیر بعد مندر میں آیا ہوں۔ وہ مسکرایا۔ بولا "فکر نہ کرو' پروہت بھی نیا نیا آیا ہے۔ ذرا سخت مزاج آدمی ہے لیکن اگر تم اسے چاندی کے بجائے سونے کا سکہ نذرانے کے طور پر پیش کرو گے تو وہ تمہیں منت ماننے کی اجازت دے دے گا۔" میرے پاس سونے کے چند ایک سکے ہی باقی رہ گئے

تھے۔ میں دو سکے اس پہرے دار کو دیتے ہوئے کہا کہ میں یہاں سے دور ایک راجہ کے ملک میں دس برس محنت مزدوری کرتا رہا ہوں۔ چند ایک سکے کمائے تھے ان میں سے یہ تم لے لو۔ باقی دو سکے میں پروہت کو پیش کر دوں گا۔" مندر کا پہرے دار سونے کے سکے لے کر بے حد خوش ہوا ۔ اس نے مجھے گرم قہوے کی ایک پیالی پلائی اور کہا۔ "تم فکر نہ کرو میں بڑے پروہت سے خود تمہاری سفارش کر دوں گا۔ اس کا نام کپالا ہے۔ تمہارے مندر میں رہنے کو ایک کوٹھری میں صاف کرا دوں گا۔ تم چند روز تو یہاں ضرور رہو گے۔" میں نے کہا کہ میں شیش ناگ کے آگے جو منت مان رہا ہوں اس کے لئے ضروری ہے کہ میں کم از کم چھ ماہ تک یہاں رہ کر اس کی عبادت کروں۔ پہرے دار نے خوش ہو کر کہا۔ "پھر تو تمہارے پاس سونے کے اور بھی سکے ہوں گے۔ تم مجھے ہر ماہ تین چار سکے دے دیا کرنا۔ پھر تمہیں کسی قسم کی کھانے پینے کی تکلیف نہیں ہو گی۔ میں تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔ میرا نام چکرا ہے۔ اب تم جا کر بڑے پروہت کپالا سے مل لو۔ وہ پوجا کے بعد ابھی ابھی اپنی کوٹھری میں گیا ہے۔ شیش ناگ تمہاری منت ضرور پوری کرے گا۔" میں نے پہرے دار چکرا کا شکریہ ادا کیا اور احاطہ میں سے گزر کر مندر کے کانسی کے بڑے دروازے کے طاق میں سے ہوتا ہوا مندر کے صحن میں آ گیا۔

میرے سامنے ایک بڑا خوب صورت مندر تھا جس کے دالانوں میں ہرن اور شیر کی کھال کے فرش جگہ جگہ بچھے تھے۔ صحن میں کونے کی طرف تالاب تھا۔ تالاب کے اوپر لکڑی کی چھت تھی۔ تالاب کا پانی ساکن تھا اور اس میں ایک بھی مچھلی نہیں تھی۔ مندر کے دالان میں سے گزرتا ہوا میں مندر کے سب سے بڑے ہال کمرے میں آ گیا جہاں لوبان سلگ رہے تھے اور سامنے دیوار کے آگے سیاہ پتھر کے چبوترے پر سنگ سرخ سے ایک اژدہا کا بہت بڑا بت رکھا تھا جس نے کنڈلی ماری ہوئی تھی۔ پھن اٹھا ہوا تھا اور آنکھوں میں دو سرخ یاقوت چمک رہے تھے۔ یہ شیش ناگ کا بت تھا۔ یہ بت اتنا بڑا تھا کہ اس کے چبوترے میں ایک دروازہ بنا ہوا تھا جو شاید سانپ کے بت کے اندر ہی اندر اس کے پھن تک جاتا تھا۔ دو خوب صورت دیوداسیاں شیش ناگ کے آگے سر جھکاتے ہوئے گزر گئیں۔ ان کے بالوں کے جوڑے سانپ کے پھن کی طرح بنے ہوئے تھے۔ پیشانیوں پر بھی سانپ کے پھن کی شکل کا سرخ ٹیکا لگا تھا۔ ایک پجاری زرد و موٹے لباس میں میرے قریب سے گزرا تو میں نے اس سے بڑے پروہت کے بارے میں پوچھا۔ اس نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا اور خاموشی سے گزر گیا۔ کونے میں دو ستونوں کے درمیان ایک دروازہ تھا جس کے کواڑ بند تھے۔ یہ دروازہ سیاہ لکڑی کا تھا اور اس پر سانپ کی شکلیں کھدی ہوئی تھیں۔ میں

نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ ایک گول مٹکے جیسی توند، موٹی گردن اور منڈے ہوئے سر والے اونچے لمبے آدمی نے دروازہ کھول کر اپنی مقناطیسی چمک والی نیم سرخ آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا اور پوچھا کہ میں کون ہوں اور اس کے آرام میں مخل ہونے کے لئے وہاں کیوں آیا ہوں؟ میں نے موقعے کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے فوراً جیب سے سونے کے چار سکے نکال کر اسے پیش کئے اور کہا۔

"عظیم مندر کے پروہت اعظم کی خدمت میں، میں یہ حقیر نذرانہ پیش کرتا ہوں۔"

سونے کے سکوں نے اس کی نیم سرخ آنکھوں کی چمک دوبالا کر دی۔ اس نے سکے لے کر رکھ لئے اور مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور کیا مقصد لے کر یہاں آیا ہوں میں نے اسے منت کے بارے میں من گھڑت کہانی بیان کی تو اس نے مجھے اندر بلا لیا۔ یہ ایک شان دار کوٹھری تھی جس میں آرام و آسائش کی ہر شے موجود تھی۔ آگ کی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ فضا نیم گرم تھی۔ کونے میں لکڑی کے شان دار پلنگ پر ریشمی لحاف والا بستر لگا تھا۔ دیواروں پر صندل کی لکڑی کو کھود کر بنائی گئیں شیش ناگ کی تصویریں لگی تھیں، بخور سلگ رہے تھے۔ اس نے مجھے لکڑی کی ایک چوکی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود پلنگ پر ریشمی لحاف میں دھنس کر بیٹھ گیا اور بولا کہ میں ہی پروہت کپالا ہوں۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس قسم کی منت ماننا چاہتا ہوں۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اپنی منت کے سلسلے میں چھ ماہ تک مندر میں قیام کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں تو اس کی سیاہ کالی بچھو ایسی بھویں اوپر کو چڑھ گئیں اور بولا کہ یہ ایک لمبی مدت ہے۔ اس کے لئے تمہیں سونے کے پچاس سکے پیشگی دینے پڑیں گے۔ میں نے کہا کہ میرے پاس سونے کا ایک بھی سکہ نہیں ہے لیکن یہاں سے تھوڑی دور نیچے ایک گاؤں میں میرا چچا رہتا ہے۔ میں آپ کو اس سے اپنے خاندانی ہار میں سے ایک ہیرا لا کر دے سکتا ہوں۔ ہیرے کا نام سن کر پروہت کپالا کی باچھیں کھل گئیں، اس نے اپنا ایک ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

"شیش ناگ تمہاری منت پوری کرے گا لیکن یہ ہیرا تمہیں یہاں منت کی عبادت شروع کرنے سے پہلے لا کر مجھے دینا ہو گا تاکہ میں اسے شیش ناگ دیوتا کے حضور پیش کر کے اس کی اجازت طلب کر سکوں۔"

میں سمجھ گیا کہ کمینہ بڑا لالچی ہے اور یونہی میری جان نہیں چھوڑے گا اور مجھے ہر حالت میں وہاں چھ ماہ بسر کرنے تھے۔ میں نے وعدہ کیا کہ رات کے پچھلے پہر میں گاؤں جاؤں گا اور صبح ہونے تک ہیرا لا کر اس کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ اس نے مجھے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر میں صبح ہونے تک ہیرا نہ لایا تو مجھے مندر میں رہ کر عبادت کرنے

کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ میں نے وعدہ کر لیا اور مندر سے واپس ہوا پہرے دار چکرا کو میں نے اس بارے میں کچھ نہ بتایا۔ مجھے بھلا کہاں جانا تھا۔ ہیرے، کا ہار تو میری جیب میں رکھا تھا۔ میں مندر سے نکل کر کچھ دور نیچے چلا گیا اور پھر ایک پہاڑی کھو میں راہ گزارنے کے لئے چھپ گیا۔ میری جگہ کوئی عام انسان ہوتا تو اتنی شدید برفانی سردی میں ٹھٹھر کر مر جاتا لیکن میں بڑے آرام سے غار کے پتھروں پر بیٹھا رہا۔ میں نے لکڑی کی ڈبی نکال کر ایک بار پھر اپنے دوست قنطور کی لاش کے ٹکڑوں کو دیکھا۔ وہ بالشت بھر کے سانپ کے دو ٹکڑے تھے۔ اوپر کے دھڑ والا ٹکڑا اب بالکل حرکت نہیں کرتا تھا مگر قنطور کی سرخ آنکھیں کھلی تھیں اور ان کی رنگت زرد پڑنے لگی تھی۔ مجھے اندیشہ لاحق ہوا اور میں اسے جتنی جلد ہو سکے شیش ناگ مندر کے تالاب میں رکھ دینا چاہتا تھا۔ چونکہ ڈبی لکڑی کی تھی اس لئے اس کا پانی کی سطح سے نیچے جانا ناممکن تھا۔ میں اس کے ساتھ پتھر کا ایک ٹکڑا باندھ کر اسے تالاب کی تہہ میں خود رکھنا چاہتا تھا۔ میں اس کام سے اگلی رات فارغ ہو جانا چاہتا تھا۔ خدا خدا کر کے رات ختم ہوئی۔ دن کی روشنی کیلاش پربت کی برفانی چوٹیوں پر پھیلی تو میں نے ہار میں سے ایک ہیرا توڑ کر الگ کر لیا اور واپس مندر کی طرف چل پڑا۔ مکار لالچی پروہت کپالا جیسے میرا انتظار ہی کر رہا تھا۔ میں نے اسے ہیرا دیا تو وہ اسے دیر تک الٹ پلٹ کر تکتا رہا۔ چہرہ خوشی سے کھل گیا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اسے ہیروں کی پہچان ہے اور وہ اس ہیرے کی قیمت سے خوب واقف ہے۔ اس نے ایک پجاری کو بلا کر مندر کے برآمدے میں ایک کوٹھری کھلوا دی اور مجھے شیش ناگ کے سامنے منت ماننے اور چھ ماہ تک وہاں رہ کر عبادت کرنے کی اجازت مل گئی۔

وہاں کی رسم کے مطابق میں غسل کر کے شیش ناگ کے آگے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا منت ماننے والا اپنی منت کسی کو نہیں بتاتا تھا اور صرف دل میں اسے تین بار دہراتا تھا۔ میں نے دل میں کچھ بھی نہیں دہرایا۔ بس قنطور کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ دو دیوداسیوں نے میرے گلے میں پھولوں کی مالائیں ڈالیں اور پجاریوں نے میرے ماتھے پر کیسر کا نشان لگایا۔ میں نے مندر کے ایک کونے میں بیٹھ کر عبادت شروع کر دی۔ مجھے سرخ پتھروں کے منکوں کی ایک مالا دے دی گئی جس کا مجھے آدھی رات تک وہاں بیٹھ کر جاپ کرنا تھا۔ مجھے شیش ناگ کی عبادت اور مالا کے جاپ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بس آدھی رات تک بیٹھا دل میں یونہی ادھر ادھر کی باتیں سوچتا رہا۔ کبھی نیم وا آنکھوں سے دیوداسیوں اور پجاریوں کو ادھر ادھر چلتے پھرتے دیکھ لیتا اور پھر آنکھیں بند کر لیتا۔ اسی طرح جب آدھی رات گزر گئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اٹھ کر شیش ناگ کے بت کی بادل نخواستہ تعظیم بجا لاتا ہوا

واپس اپنی کوٹھری میں آ گیا۔ میری کوٹھری جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں مندر کے ہال کمرے سے باہر برآمدے میں تھی جس کے آگے صحن کے کونے میں وہی تالاب تھا جس کی تہہ میں مجھے قنطور کی لاش والی لکڑی کی ڈبیا کو رکھنا تھا۔ یہ کام میں اسی رات کر دینا چاہتا تھا۔

میں نے اپنی کوٹھری میں آ کر چراغ گل کر دیا اور ادھر ادھر گزرنے والے پجاریوں کو یہ تاثر دیا کہ میں سو گیا ہوں۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ مندر میں ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی طرف سے ہوا کی ہلکی سی سرگوشی بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مندر کے پجاری اور دیوداسیاں گہری نیند سو رہی تھیں میں اپنے مشن کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے پہلے ہی سے پتھر کے دو ٹکڑے لکڑی کی ڈبی کے ساتھ رسی سے باندھ رکھے تھے۔ تھوڑا سا کواڑ کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔ مندر کا صحن خالی اور ویران تھا۔ برآمدے کی کسی کوٹھری کے روشن دان میں روشنی نہیں تھی۔ میں کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ ایک بار پھر چاروں طرف دیکھ کر تسلی کی۔ چونکہ میں اندھیرے میں بھی چیزوں کو دیکھ سکتا تھا اس لئے برآمدے کے اندھیرے کونوں پر بھی نگاہ ڈالی۔ کسی جگہ کوئی متنفس نہیں تھا۔ میں دبے پاؤں برآمدے میں سے ہوتا ہوا تالاب کی طرف چل پڑا۔ لکڑی کی ڈبیا جس میں سانپ قنطور کی لاش کے دونوں ٹکڑے رکھے تھے میرے ہاتھ میں تھی۔ سخت سردی میں تالاب کے اوپر کہر چھایا ہوا تھا۔ میں تالاب کے مشرقی کونے کی طرف آ کر کنارے کے پتھروں پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ میں نے جلدی سے ڈبیا کو تالاب کی سطح پر رکھ کر اس کا ڈھکن کھول کر اسے چھوڑ دیا۔ ڈبیا کے ساتھ بندھے ہوئے پتھر اسے پلک جھپکنے میں پانی کے اندر لے گئے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ لکڑی کی ڈبی تالاب کی تہہ میں جا کر بیٹھ گئی ہو گی تو میں خاموشی سے اٹھا اور اسی طرح دبے پاؤں چلتا اپنی کوٹھری کی طرف آ گیا۔ برآمدے میں پہنچا تو اچانک ایک سایہ ستون کے پیچھے سے نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ یہ مکار پروہت کپالا تھا۔

"تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے گہری پراسرار آواز میں پوچھا۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے کہا کہ مجھے باہر کچھ کھٹکا سا ہوا تھا۔ سوچا کہیں چور نہ آ گئے ہوں یہ دیکھنے کے لئے باہر نکلا تھا۔ پروہت نے میری طرف گھور کر اپنی نیم سرخ آنکھوں سے دیکھا اور کہا۔

"شیش ناگ کے مندر میں چور نہیں آ سکتے جاؤ جا کر سو جاؤ اور یوں راتوں کو اٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کر پروہت کو نمسکار کیا اور اپنی کوٹھری میں آ کر تخت پر بیٹھ گیا۔ اب مجھے فکر لگی تھی کہ کہیں اس کم بخت پروہت نے مجھے تالاب میں ڈبی ڈالتے نہ دیکھ لیا

ہوئے اور وہ اسے کوئی نادر شے سمجھ کر وہاں سے نکلوانے کی کوشش نہ کرے۔ میں نیم کواڑ سے لگ کر باہر دیکھنے لگا۔ میں نے اندھیرے میں پروہت کپالا کو مندر کے بڑے دروازے میں داخل ہوتے دیکھا تو کچھ دل کو اطمینان ہوا کہ اسے مجھ پر شک نہیں ہوا ورنہ وہ ضرور تالاب کی طرف جاتا۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میری کوٹھری کی تلاشی لی گئی تھی۔ جب میں نے شمع روشن کی تو دیکھا کہ میرا بچھونا اتھل پتھل تھا اور صاف لگ رہا تھا کہ کسی نے کوٹھری کی ایک ایک شے کو الٹ پلٹ کر دیکھا ہے۔ میرے لئے یہ سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں تھی کہ خود مندر کا پروہت کپالا میری کوٹھری کی تلاشی لینے آیا تھا اور وہ یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ اگر میں اسے ایک انتہائی قیمتی ہیرا لا کر دے سکتا ہوں تو میرے پاس مزید ہیرے بھی ہوں گے لیکن محض ایک اتفاق سے ہیروں کا ہار تالاب کی طرف جاتے ہوئے میری قمیض کی جیب ہی میں پڑا رہ گیا تھا۔ مجھے اس قیمتی ہار سے کوئی دل چسپی نہیں تھی لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہوا بلکہ پروہت پر غصہ آیا کہ اس نے میری عدم موجودگی میں چوروں کی طرح میری کوٹھری کی تلاشی لی تھی۔ اچانک مجھے اپنے سانپ دوست قنطور کے مہرے کا خیال آگیا۔ جس وقت میں نے قنطور کے جسم کے ٹکڑے تخت پر سے اٹھا کر لکڑی کی ڈبیا میں ڈالے تھے تو سرائے کی کوٹھری میں مجھے قنطور کا مہرہ بھی مل گیا جو میں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ یہاں جب میں شیش ناگ مندر کی اس کوٹھری میں اترا تو میں نے سب سے پہلے یہ کام کیا تھا کہ سانپ کے اس قیمتی ہیرے کو لکڑی کی ایک چوکی کے نیچے اس کی درز میں چھپا دیا تھا۔ میرے لئے اس مہرے کی اہمیت ہیروں کے ہار سے بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ میں نے لپک کر کونے میں پڑی چوکی اٹھائی اور اسے پلٹ کر دیکھا۔ خدا کا شکر ہے کہ قنطور کا مہرہ درز میں موجود تھا۔ میں نے اسے بھی وہاں سے نکال کر اپنی جیب میں سنبھال کر رکھ لیا۔

اس واقعے کے ایک ہفتے بعد میں رات کے وقت اپنی کوٹھری میں بچھونے پر لیٹا تھا کہ باہر برآمدے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس وقت رات کافی گزر چکی تھی۔ میں نے یہ معمول بنا رکھا تھا کہ رات کو کئی بار اٹھ کر تالاب پر نگاہ ڈال لیتا تھا۔ میں تھوڑی دیر ہوئی دروازے سے ہٹ کر تخت پر آ کر لیٹا تھا۔ میں نے دروازے کو اندر سے معمول کے مطابق بند کر لیا تھا۔ قدموں کی چاپ میری کوٹھری کے پاس آ کر رک گئی۔ قدرتی طور پر سوائے پروہت کے بھیجے ہوئے چور کے اور کون ہو سکتا تھا جو میرے قیمتی ہار کے پیچھے تھا اور ایک بار پھر میری کوٹھری کی تلاشی لینے آیا تھا۔ میں اس جگہ کسی قسم کی کوئی بھی انتقامی کاروائی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اپنے دوست قنطور کی زندگی بچانے کے لئے یہاں چ

بڑے امن سے گزارنے تھے۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اگر چور دروازے کو کسی طریقے سے کھول کر اندر آ گیا تو میں مزاحمت نہیں کروں گا اور بے ہوش بن کر پڑا رہوں گا اور اگر چور نے میری جیب سے ہیروں کا ہار نکال بھی لیا تو میں اسے کچھ نہیں کہوں گا۔ اس ہار سے میرے دوست قنطور کی زندگی زیادہ قیمتی ہے۔ چنانچہ میں بچھونے پر آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔

میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ چور دروازے پر دستک دیتا ہے یہ کسی خفیہ طریقے سے دروازہ کھول کر اندر آتا ہے۔ ظاہر ہے چور دروازے نہیں کھٹکھٹایا کرتے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ دروازہ توڑ کر مجھے قتل کرنے کی نیت سے آیا ہو۔ بہرحال اگر اس نے مجھ پر خنجر یا تلوار کا وار کیا تو پھر اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا تاکہ وہ کسی دوسرے کو یہ بتانے کے لئے زندہ نہ رہے کہ اس نے مجھ پر تلوار کا بھرپور وار کیا تھا مگر مجھ پر ذرا سا بھی اثر نہ ہوا۔ میں اپنی غیر انسانی طاقت کا راز یہاں کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اتنے میں دروازے پر کسی نے بڑی آہستگی سے دستک دی۔ میں خاموش رہا۔ ایک لمحے بعد پھر وہی آہستہ سے ٹھک ٹھک ہوئی۔ میں نے سوچا کہ یہ چور نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اول تو چور دستک نہیں دیا کرتے۔ دوسرے یہ کہ چور اتنی رازداری سے کیوں دستک دے رہا ہے کہ جیسے صرف مجھے بیدار کرنا چاہتا ہے۔ میں بچھونے سے اٹھ کر دروازے کے قریب آ گیا۔ لیکن میں نے آواز نہ نکالی اور خاموشی سے کھڑا رہا۔ اس بار دستک کے ساتھ ہی باہر سے کسی عورت کی مدھم سی آواز آئی۔

"دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو۔"

میں نے جلدی سے کنڈی ہٹا کر دروازہ کھول دیا۔ ایک لڑکی تیزی سے لہرا کر اندر آ گئی اور دروازہ بند کر کے اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ شمع کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ شیش ناگ مندر کی ایک دیوداسی تھی۔ اس دیوداسی کو میں نے پہلے روز شیش ناگ کے بت کے آگے سر جھکا کر گزرتے دیکھا تھا۔ اس نے سیاہ گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اور سیاہ بالوں کا جوڑا سا بنا کر پیچھے ڈال رکھا تھا اس کے ساتھ ہی میری کوٹھری میں کستوری اور عنبر کی خوشبو داخل ہوئی تھی جو اس کے جسم اور بالوں سے اٹھ رہی تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی اور اس کے خواب آلود ہونٹ نیم وا تھے۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھے وہ پھولے ہوئے سانس کو معمول پر لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں تعجب سے اس کی حسین سیاہ آنکھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا وہ سرگوشی میں بولی۔

"یہاں سے بھاگ جاؤ مسافر۔ وہ تمہیں قتل کر دیں گے۔"

اس کا سانس ابھی تک پھولا ہوا تھا مجھے وہ بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ قیمتی ہار کی وجہ سے مکار پروہت کپالا مجھے قتل یا اغوا کروانے کی کوشش کرے گا تاکہ مجھ

سے ہیروں کا ہار برآمد کروا سکے۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی لیکن مجھے اس بات کی خوشی ہوئی تھی کہ اس گل غدار حسینہ کو میرا خیال آیا تھا اور وہ میری جان بچانے کے لئے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر میری کوٹھری میں آ گئی تھی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں مندر میں اپنی منت کے سلسلے میں چھ ماہ تک عبادت کرنے آیا ہوں اور یہاں سے نہیں جا سکتا۔ اس نے کہا۔ "دیوتا ناگ تمہاری حفاظت کرے۔" وہ باہر جانے کے لئے مڑی ہی تھی کہ دروازے کو کسی نے باہر سے دھکا دے کر کھول دیا اور وہ لڑکی دھکا کھا کر میرے سینے سے آ لگی۔

چھ پجاری مشعلیں روشن کئے اندر آ گئے ان کے درمیان پروہت کپالا قہر آلود نگاہوں سے مجھے اور حسین ناگ داسی کو تک رہا تھا۔ اس نے کڑک کر کہا۔

"تم نے اپنی بدمعاشیوں سے مندر کی فضا کو ناپاک کیا ہے۔ تم دونوں کو شیش ناگ پر قربان کر دیا جائے گا۔"

ناگ داسی بے چاری غم سے بے ہوش ہو گئی۔ دو پجاری اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ پروہت کپالا نے میری تلاشی کا حکم دیا۔ میری جیب سے ہیروں کا ہار اور قنطور کا سبز رنگ کا مہرہ برآمد ہوا۔ کپالا کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ چلا کر بولا۔

"یہ چور بھی ہے اس نے شیش ناگ کے خزانے کا یہ قیمتی ہار بھی چرایا ہے اور یہ سبز پتھر کا ٹکڑا کیا ہے۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"یہ میری ماں کی نشانی ہے - یہ اس کی مالا کا پتھر ہے جو اس نے مرتے سمے مجھے یادگار کے طور پر دیا تھا۔"

قنطور کا سانپ والا مہرہ بڑا بدوضع سا سبز پتھر تھا جس پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ سانپ کا انمول مہرہ ہے۔ کپالا پروہت کے حکم سے یہ مہرہ میرے پاس ہی رہنے دیا گیا۔ مگر ہار اس نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ پجاریوں نے میرے ہاتھ باندھ دیئے اور مندر کے ایک تہہ خانے میں لے جا کر ڈال دیا۔ میں مزاحمت نہ کرنے پر مجبور تھا کیونکہ مجھے ہر حالت میں وہاں رہنا تھا اور تالاب کی نگرانی کرنی تھی۔ اگرچہ اب میں قید میں ڈال دیا گیا تھا اور مکار پروہت میرے ہار پر قبضہ جمانے کے بعد بھی مجھے شیش ناگ پر قربان کر دینے پر آمادہ تھا تاہم میں وہاں فساد برپا کر کے حالات کو اپنے لئے ناسازگار نہیں بنانا چاہتا تھا۔ افسوس تو مجھے اس معصوم ناگ داسی کا تھا جو میری زندگی بچاتے ہوئے خود موت کے منہ میں پہنچ رہی تھی۔ میں ہر قیمت پر اسے بچانا چاہتا تھا اور یہی کچھ میں تنگ و تاریک تہہ خانے میں بیٹھا سوچ رہا

تھا۔

پروہت کپالا مجھ سے جو حاصل کرنا چاہتا تھا اس کو مل گیا ہے۔ یعنی انمول ہیروں کا ہار۔ لیکن اب وہ مجھے اس لئے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے کہ میں باہر جا کر کسی کو یہ نہ بتا سکوں کہ مجھ سے میرا ہار چھین لیا گیا ہے اور پروہت کی بدنامی نہ ہو اور راجہ کہیں سے پروہت کی گدی سے اتار نہ دے۔ مجھے تو فکر نہیں تھی مگر ناگ داسی کا خیال دل کو لگا ہوا تھا۔ بے چاری نے خواہ مخواہ میری خاطر اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی۔ اس کا یہ جذبہ بے حد قابل قدر تھا اور اس بات کا تقاضا کرتا تا کہ میں اس کی جان بچاؤں لیکن مجھے یہ تک نہیں معلوم تھا کہ اسے کس جگہ قید میں ڈالا گیا ہے اور کیا اسے میرے ساتھ شیش ناگ پر قربان کیا جائے گا یا الگ موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ ہمیں شیش ناگ پر کس انداز میں قربان کیا جائے گا۔ تہہ خانے میں مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا گیا تھا لیکن میں بندھی ہوئی پٹی کے اندھیرے میں بھی یہ دیکھ لیا تھا کہ شیش ناگ کے بہت بڑے بت کے چبوترے میں جو دروازہ بنا تھا مجھے اس کی سیڑھیاں اتار کر اس کے اندر بنے ہوئے تہہ خانے میں لے جایا گیا ہے۔ باہر سخت پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ میرے لئے وہاں سے باہر نکلنا کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن میں اپنی خفیہ طاقت کا راز کسی پر فاش کئے بغیر اپنی محسنہ ناگ داسی کی زندگی بچانا چاہتا تھا۔ رات بھر میں انہی خیالوں میں کھویا رہا۔ تہہ خانے میں مجھے کچھ احساس نہیں تھا کہ صبح ہوئی ہے کہ نہیں لیکن جب مجھے باہر نکالا گیا تو میں نے دیکھا کہ دن کا وقت تھا لیکن چونکہ مندر کے تمام دروازے پروہت کپالا کے حکم سے بند کر دیئے گئے تھے اس لئے وہاں مشعلیں روشن تھیں مگر چھت کے قریب والے روشن دان سے صبح کی روشنی جھلک رہی تھی۔ شیش ناگ کے بت کے آگے لکڑی کا ایک چوڑا تختہ ڈال دیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ناگ داسی کو بھی رسیوں میں جکڑے ہوئے وہاں لایا گیا۔ بے چاری کا موت کے خوف سے برا حال ہو رہا تھا۔ سانپ کی ایک پٹاری لا کر وہاں رکھ دی گئی - میں سمجھ گیا کہ ہمیں سانپ سے ڈسوا کر ناگ دیوتا پر قربان کیا جائے گا۔

ناگ داسی کو تختے پر لٹا کر اس کے ہاتھ پیر کس کر جکڑ دیئے گئے۔ پروہت کپالا اپنے حواریوں کے ساتھ موقعے پر موجود تھا۔ جب مجھے بھی تختے پر باندھا جانے لگا تو میں نے پروہت کپالا سے کہا کہ ناگ داسی کی جان بخشی کر دی جائے۔ کیونکہ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ پروہت کپالا کے چہرے پر ایک مکروہ طنز کی لہر پھیل گئی۔ دانت پیس کر بولا۔

"شیش ناگ تمہاری قربانی کا انتظار کر رہا ہے نارائینی نے مندر کے مقدس اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے شیش ناگ کا حکم ہے کہ تم دونوں کو قربان کیا جائے۔"

مجھے رسیوں سے جکڑا جانے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے کیا میں اپنی طاقت کا راز فاش کر دوں؟ یا سانپ کے ڈسنے کے بعد کسی طریقے سے سانپ کے مہرے کی مدد سے ناگ داسی نارائینی کے جسم سے زہر نکال کر اسے پھر سے زندہ کر دوں؟ قنطور کا سانپ والا مہرہ اس وقت بھی میری جیب میں تھا جسے ایک بیکار پتھر کا ٹکڑا سمجھ کر میرے پاس ہی رہنے دیا گیا تھا۔ لیکن اس کی خوشبو پٹاری میں بند سانپ تک پہنچ رہی تھی اور وہ پٹاری کے اندر پھنکار رہا تھا اور باہر نکلنے کو بے تاب تھا۔ پروہت کپالا نے سانپ کی پٹاری میں سے پھنکار کی آواز نکلتی سنی تو کہا۔

"اے مہا ناگ! بے تاب نہ ہو۔ تمہارا شکار تمہارے سامنے ہے۔ بہت جلد تم ان کے خون کا ذائقہ چکھو گے۔"

ناگ داسی نارائینی میرے قریب ہی موت کے تختے پر لیٹی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کا رنگ سفید پڑ چکا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ اچانک پٹاری کا ڈھکنا اچھل کر دور جا پڑا اور اس کے اندر سے تین فٹ لمبا سبز کوڑیوں والا سیاہ کالا سانپ پھن اٹھا کر پھنکارتا ہوا باہر نکل آیا اور میرے قریب آ کر زمین سے دو فٹ بلند ہو کر اپنا پھن لہرانے لگا۔ ڈر کے مارے سب پجاری اور پروہت کپالا پرے ہٹ گئے۔ ناگ داسی کے منہ سے چیخ نکل گئی اور اس پر ایک بار پھر غشی طاری ہو گئی۔ کالا سانپ میرے سر کی طرف آ گیا۔ میں تختے پر لیٹا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ اور پاؤں رسی میں جکڑے تھے۔ سانپ نے لکڑی کے تختے کے گرد چکر لگانے شروع کر دیئے۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی جو پہلے وہاں کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ پروہت کپالا نے اپنے خاص پجاری کو حکم دیا کہ سانپ کو ڈسنے پر مجبور کیا جائے۔ جونہی پجاری آگے بڑھا کہ سانپ کو تانبے کے خاص چمٹے سے پکڑ کر پہلے ناگ داسی اور پھر میرے جسم پر ڈال دیا جائے کہ سانپ پھنکار کر پجاری کی طرف لپکا۔ پجاری ڈر کر پیچھے کی طرف ہو گیا۔ میں سانپ کی اس رمز خاص کو پہچان گیا تھا۔ وہ قنطور کے مہرے پر آ رہا تھا۔ اس کو قنطور کے مہرے کی بو میرے کپڑوں سے آ رہی تھی جو ان کا ناگ دیوتا تھا۔ سانپ نے اسی طرح پھن اٹھا رکھا تھا اور لکڑی کے تختے کے ارد گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ پھر وہ تختے پر چڑھ گیا۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ اب سانپ مجھے ڈس دے گا لیکن اس نے میرے آگے اپنا سر جھکا دیا۔ وہاں ہر کوئی ششدر ہو کر رہ گیا پروہت کپالا نے چیخ مار کر کہا۔ "اس نے سانپ کا منتر پڑھا ہو گا۔ سانپ کو پٹاری میں بند کر دیا جائے۔"

دو پجاری بڑے بڑے چمٹے لے کر آگے بڑھے اور انہوں نے سانپ کو قابو میں کر کے پٹاری میں بند کر کے اوپر پتھر رکھ دیا۔ پروہت کپالا نے جانوروں کو قربان کرنے والے خاص

پجاری کو حکم دیا کہ شیش ناگ کے حکم پر ان دونوں کو ذبح کر دو۔ میرا خیال تھا کہ وہ پہلے مجھ پر خنجر چلانے کی کوشش کرے گا لیکن کم بخت ہٹے کٹے جلاد ایسے پجاری نے خنجر لہرایا اور پہلے ناگ داسی نارائینی کے سینے پر وار کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ نارائینی ابھی تک بے ہوش تھی۔ اب میں اسے اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے کیسے دیکھ سکتا تھا۔ اب تو ہر حالت میں مجھے اپنی خفیہ طاقت کے راز کو فاش کرنا ہی تھا۔ میں نے ایک ہی جھٹکے سے اپنی ایک ٹانگ کی رسی توڑ ڈالی اور جلاد پجاری کو ایک زبردست لات ماری۔ وہ چھ سات لڑھکنیاں کھا کر دور جا گرا۔ پروہت کپالا نے غصے میں کانپتے ہوئے کہا۔

"پہلے اس کو ذبح کرو۔"

میں بھی یہی چاہتا تھا۔ جلاد خنجر لے کر میری طرف بڑھا تو میں نے مسکرا کر پروہت کپالا کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کپالا! جو کچھ تم کر رہے ہو میں اسے دیکھ رہا ہوں لیکن جو کچھ میں اب کروں گا اسے دیکھ کر تمہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔"

کپالا میری بات کہاں سمجھ سکتا تھا۔ قہقہہ لگا کر ہنسا اور جلاد کو گرج کر کہا۔

شیش ناگ کے حکم سے اس کا گلا کاٹ ڈالو۔ اس نے ہمارے دیوتا کی توہین کی ہے۔"

میں نے جلاد پجاری کو اپنے قریب آنے دیا۔ جب وہ میری گردن پر خنجر چلانے لگا تو میں نے کہا۔

"اس کے بعد تم کسی بے گناہ انسان کے ساتھ یہ سلوک نہ کر سکو گے۔"

جلاد پجاری نے میری بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور پوری طاقت سے میری گردن پر حلق کے قریب خنجر کا وار کیا۔ ایسی آواز آئی جیسے لوہا پتھر سے ٹکرایا ہو اور خنجر ٹوٹ گیا۔ جلاد پجاری حیرت سے اپنے ٹوٹے ہوئے خنجر کو تکنے لگا - پروہت کپالا نے اپنا چاندی کے دستے والا خنجر نکال کر پجاری کی طرف اچھالا اور کہا۔

"تمہارا خنجر کمزور تھا۔ میرے خنجر سے اس بدبخت کو ہلاک کرو۔ شیش ناگ تمہیں دیکھ رہا ہے۔"

جلاد پجاری نے پروہت کپالا کا خنجر تھام لیا اور مجھ پر دوسری بار وار کیا۔ اس دفعہ اس کا پہلے کی نسبت زیادہ طاقت ور اور جارحانہ تھا۔ اتنی ہی جلدی اس کا دوسرا خنجر بھی دو ٹکڑے ہو گیا۔ اب میں نے اپنی طاقت کے مظاہرے کا فیصلہ کیا اور تھوڑے تھوڑے جھٹکے دے کر اپنے دونوں بازوؤں اور پاؤں کی رسی توڑ دی اور اپنے قریب کھڑے جلاد پجاری کو گردن سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور کہا۔ "میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ اس کے بعد تم کسی کے ساتھ

ایسا ظلم نہ کر سکو گے اب میں اپنا وعدہ پورا کرتا ہوں۔" دوسرے پجاریوں نے کپالا کا حکم سن کر مجھ پر تلواروں اور خنجروں سے حملے کر دیئے۔ اس عرصے میں میں جلاد پجاری کا کام تمام کر چکا تھا۔ وہ واصل جہنم کئے جانے کا ہی سزاوار تھا کیونکہ اس سے پہلے وہ نہ جانے کتنے بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ دوسرے پجاریوں کی تلواریں اور خنجر میرے جسم پر پڑ رہے تھے مگر ہر وار کے بعد ان کے تحیر میں اضافہ ہو رہا تھا کہ میرے جسم پر نہ تو کوئی زخم لگ رہا تھا اور نہ خون نکل رہا تھا بلکہ الٹا ان کی تلواریں اور خنجر ٹوٹتے چلے جا رہے تھے۔ اب میں اپنی طاقت کے پورے عروج پر تھا۔ میں نے دو پجاریوں کو گردنوں سے پکڑ کر آپس میں ٹکرا دیا۔ ان کی کھوپڑیاں کھل گئیں۔

پروہت کپالا کے چہرے کے تاثرات بدل چکے تھے۔ وہ مجھے کوئی جادوگر سمجھ کر مجھ سے خوف زدہ ہو چکا تھا۔ میں تختے پر سے اتر کر اس کے قریب آ گیا اور اسے گردن سے دبوچ کر فرش سے تین فٹ اوپر اٹھا دیا۔ وہ ایک مردہ چوہے کی طرح میرے ہاتھ میں لٹکنے لگا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں نے اسے زمین پر پھینک دیا اور اس کے سینے پر اپنا پاؤں رکھ کر کہا۔

"تم مجھے جادوگر سمجھ رہے ہو لیکن میں جادوگر نہیں ہوں یہ طاقت میرے خدا نے مجھے اس لئے عطا کی ہے کہ میں اس دنیا کو تم جیسے ظالموں کے وجود سے نجات دلا سکوں۔"

میں نے اپنا پاؤں تھوڑا سا دبایا تو پروہت کپالا کی پسلیاں کڑکڑا گئیں۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "تم شیش ناگ کا انسانی روپ ہو۔ مجھے معاف کر دو مجھ سے غلطی ہو گئی اے شیش ناگ! مجھ سے خطا ہو گئی مجھے شما کر دو۔"

میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے سینے سے اپنا پاؤں اٹھا لیا۔ مندر کے سب سے بڑے پروہت نے مجھے شیش ناگ کا انسانی روپ کہا تھا۔ یہ سنتے ہی باقی سارے پجاری میرے آگے سجدے میں گر گئے۔ میں نے حکم دیا کہ ناگ داسی نارائینی کو آزاد کر کے اسے اس کی کوٹھری میں پہنچا کر ہوش میں لایا جائے۔ اس وقت پروہت کپالا کے اشارے پر پجاریوں نے بے ہوش ناگ داسی نارائینی کی رسیاں کھول دیں اور اسے اس کی کوٹھری میں لے گئے جہاں اسے صندل چھڑک کر ہوش میں لانے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ پروہت کپالا میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ میں نے اسے معاف کر دیا اور کہا۔

"میں اب بھی تمہیں یہی کہوں گا کہ میں تمہارے شیش ناگ دیوتا کا انسانی روپ نہیں ہوں اور نہ ہی کوئی جادوگر ہوں۔ قدرت نے مجھے امانت کے طور پر ایک خفیہ طاقت دے رکھی ہے جس کا تم سب نے ابھی ابھی مشاہدہ کیا ہے۔ ویسے میں اب بھی ایک عام انسان ہوں اور میں نے شیش ناگ کے آگے جو منت مانی ہے اس کے ضمن میں مندر میں اپنی چھ ماہ کی

عبادت ضرور پوری کروں گا۔ چنانچہ مجھے یہاں پریشان نہ کیا جائے۔ میری عبادت میں دخل نہ دیا جائے۔ کوئی پجاری میرے قریب آ کر میری پوجا کرنے کی کوشش نہ کرے۔ مجھے یقین ہے تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔"

پروہت کپالا نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

"اے عظیم دیوتا! تم جو چاہتے ہو ویسے ہی ہو گا۔ ہم سب تمہارے خادم پجاری ہیں۔"

میں نے پروہت کپالا کو خاص طور پر ہدایت کی کہ اب مندر میں کسی کو شیش ناگ کے سامنے قربان نہیں کیا جائے گا اور ناگ داسی نارائینی کو خاص طور پر بڑی عزت و احترام کے ساتھ رکھا جائے۔ کپالا نے سر تسلیم خم کر دیا۔ اب میں نے پروہت کپالا کی لالچی رگ کو چھیڑا۔

"اور تمہارے پاس ہیروں کے ہار کی شکل میں میری ایک امانت ہے۔ اسے فوراً میری کوٹھری میں پہنچا دیا جائے۔"

پروہت کپالا میری طاقت کے مشاہدے کے بعد مجھ سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ اس سے ٹھیک طرح سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ کہنے لگا۔

"عظیم دیوتا! آپ کی امانت میں ابھی ابھی آپ کی کوٹھری کے استھان پر واپس لاتا ہوں۔"

وہ تین بار میرے آگے سر جھکا کر دوسرے پجاریوں کے ساتھ مندر کے چبوترے کی طرف بڑھا اور میں وہاں سے ہٹ کر مندر کے صحن والے تالاب کے کنارے آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ قنطور کی لاش والی ڈبیا تالاب کی تہہ میں ہی ہے اور پراسرار طاقتوں نے اسے پھر سے زندہ کرنے کا عمل جاری کر دیا ہو گا۔ برفانی ہواؤں کے جھونکے چل رہے تھے مگر مجھے ایک لمحے کے لئے بھی سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں دیر تک تالاب کے کنارے پتھروں پر بیٹھا اپنے دوست قنطور کے بارے میں غور کرتا رہا جو سانپ کی شکل میں دو ٹکڑے ہو کر تالاب کی تہہ میں پڑا تھا۔ اب میں نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ تالاب کے کنارے بیٹھ کر ہی شیش ناگ کی جھوٹ موٹ عبادت کیا کرتا۔ اس سے میرا مقصد تالاب کی نگرانی کرنا تھی۔ ناگ داسی کو جب یہ علم ہوا کہ میری وجہ سے اس کی جان بچ گئی ہے اور یہ کہ میں نے بڑی زبردست کرامت دکھائی تھی اور میں موت کو شکست دینے والی خفیہ دیوتائی طاقتوں کا مالک ہوں تو وہ میری پہلے سے زیادہ معتقد ہو گئی لیکن میں نے اپنے عاشق مزاج دل کو اس کی سیاہ عنبریں زلفوں کے جال میں اٹکانے سے بچا لیا تھا۔ وہ رات کو مجھ سے ملنے میری کوٹھری میں ضرور آتی تھی۔ اسے میرے پاس آنے سے اب کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس

سے میری دل چسپی صرف اس حد تک تھی کہ وہ مجھے مندر کے اندر ہونے والی ساری باتیں بتا دیتی تھی۔ چارہ ماہ گزر چکے تھے۔ ابھی مجھے دو ماہ وہاں رہنا تھا اور میں وہاں رہتے ہوئے مکار پروہت کپالا کی سازشوں سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگرچہ وہ مجھ سے خائف ہے مگر جو کچھ مجھے ناگ داسی نارائینی کی زبانی معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ پروہت کپالا مجھے زبردست جادوگر سمجھتا ہے۔ میں نے اس کے غرور اور جھوٹی شان کا سر توڑ دیا تھا۔ اسے اس کے پجاریوں کے سامنے شکست دی تھی۔ چنانچہ وہ مجھے اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے اندر ہی اندر سازش میں مصروف تھا۔ اگرچہ بظاہر وہ میرا غلام تھا اور میرے ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا۔ میں اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ صرف اس کی ہر سازش سے باخبر رہنا چاہتا تھا اور یہ کام ناگ داسی نارائینی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھی۔ میرے صرف دو مہینے وہاں باقی رہ گئے تھے اور میں یہ عرصہ خاموشی سے گزارنا چاہتا تھا۔ میں دن بھر تالاب کے کنارے یونہی آنکھیں بند کئے بیٹھا رہتا۔ جیسے عبادت کر رہا ہوں اور شام کو ٹہلنے کے لئے باہر نکل جاتا۔ پہرے دار مجھے دور سے آتا دیکھ کر ادب سے سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا۔ میں اسے دیوتاؤں کے انداز میں دعا دیتا اور آگے نکل جاتا۔ یونہی وقت گزرتا چلا گیا۔

قنطور نے مجھے بتایا کہ جب اس کی سانپ کی شکل میں کٹی ہوئی لاش کیلاش پربت کے شیش ناگ مندر والے تالاب میں چھ ماہ تک ڈوبی رہے گی تو چھ ماہ گزرنے پر رات کے بارہ بجے وہ زندہ ہو کر سانپ کی شکل میں تالاب کی سطح پر ابھر آئے گا۔ آخر وہ گھڑی بھی آن پہنچی' تالاب میں قنطور کی لاش کا آخری دن تھا۔ میں شام تک تالاب کے کنارے بیٹھا عبادت کے بہانے نگرانی کرتا رہا۔ کسی وقت میرے دل میں شک پیدا ہوتا کہ کہیں کسی نے قنطور کی لاش کو تالاب میں سے نکال نہ لیا ہو۔ پھر یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتا کہ کسی کو کیا معلوم کہ اس ٹھنڈے یخ گدلے پانی کے اندر ایک لکڑی کی ڈبیا پڑی ہے جس میں ایک سانپ کی کٹی ہوئی لاش رکھی ہے۔ رات کے پہلے پہر میں میں واپس مندر میں آکر تالاب کے قریب سے گزرا۔ تالاب کا پانی پہلے سے زیادہ گدلا ہو گیا ہوا تھا۔ اس کی سطح پر ہلکی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ قنطور کی لاش کو تالاب کے پانی میں پڑے چھ مہینے کی مدت پوری ہو چکی تھی اور اب اسے تین گھنٹے کے بعد آدھی رات کو تالاب میں سے زندہ سانپ کی حالت میں باہر نکل آنا تھا۔ میں اپنی کوٹھری میں آکر تخت پر بیٹھ گیا۔ عین آدھی رات کے وقت جبکہ میں تالاب پر جانے کے لئے کوٹھری سے نکلنے ہی والا تھا کہ زمین نے ہلنا شروع کر دیا۔ کیلاش پربت کی پہاڑی وادیوں میں جیسے کسی بہت بڑی چکی کے چلنے کی بھیانک گونجارا

ایسی چیخ ابھر کر پھیل گئی۔ میری کوٹھری جھولنے کی طرح جھول رہی تھی۔ یہ زلزلہ تھا۔ کوٹھری کا دروازہ تڑاخ کی آواز کے ساتھ ٹوٹ کر گر پڑا۔ میں باہر کی طرف بھاگا لیکن زلزلے نے چاروں طرف خوف ناک تباہی پھیلانی شروع کر دی تھی۔ مندر کے ستون جگر خراش تڑاخوں کے ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر صحن میں گرنے لگے۔ ایک چٹان کا سینہ خوفناک آدھماکے سے شق ہو گیا اور اس کا بہت بڑا ٹکڑا تالاب کے اوپر آن گرا جس سے تالاب کے کنارے پاش پاش ہو گئے۔ مندر میں کہرام بپا تھا۔ پجاریوں اور ناگ داسیوں کی چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ میں اگرچہ مر نہیں سکتا تھا لیکن میرا جسم پہاڑوں سے لڑھک لڑھک کر آتے ہوئے پتھروں سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتا تھا۔ میں برآمدے میں زمین بوس ستونوں کے درمیان پھنس گیا تھا۔ یہ قیامت خیز زلزلہ تیس سیکنڈ سے بھی زیادہ عرصے تک جاری رہا۔ جب زمین نے ہلنا بند کیا تو میں ستونوں کو پرے ہٹا کر باہر نکلا۔ شیش ناگ کے مندر کے لمبوترے مینار ڈھے چکے تھے۔ صحن میں جگہ جگہ پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے اور چٹانیں بکھری ہوئی تھیں۔

میں تالاب کی طرف بھاگا۔ قنطور کے تالاب سے باہر نکلنے کا وقت ہو چکا تھا۔ جب زلزلہ آیا۔ وہ کہاں ہو گا؟ میں یہ دیکھ کر دم بخود ہو کر رہ گیا کہ تالاب پر ایک بہت بڑی چٹان نے گر کر اسے تباہ کر دیا تھا۔ اس کا ایک طرف سے کنارہ پورے کا پورا نیچے تک مسمار ہو گیا تھا اور سارا پانی نیچے وادی میں بہہ گیا تھا۔ میں چٹان کے بیچ میں سے ہو کر خالی تالاب میں کود گیا تالاب کا پانی غائب تھا۔ اس کی تہہ میں جگہ جگہ کائی اگی ہوئی تھی اور چٹان کے پتھروں کے سنگ ریزے بکھرے پڑے تھے۔ میں دیوانوں کی طرح قنطور کی لاش والی ڈبیا تلاش کرنے لگا لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں آہستہ آہستہ رینگتا ہوا تالاب کے مسمار شدہ کنارے کی طرف آگیا۔ چٹان نے اوپر گر کر اس کنارے کو اوپر سے لے کر نیچے تک پوری کی پوری دیوار کے پشتے کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا اور تالاب کا سارا پانی آن کی آن میں نیچے کھڈ میں گر کر ایک پہاڑی ندی میں شامل ہو کر گم ہو گیا تھا۔ میں مایوسی کے عالم میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا قنطور کی لاش خدا جانے پانی کے ریلے کے ساتھ ہی تالاب سے بہہ کر ندی میں گرنے کے بعد کہاں کی کہاں جا چکی تھی۔ میں نے تالاب سے نکل کر مندر کے گرے ہوئے دروازے کی طرف آگیا۔ جگہ جگہ پجاریوں کی کچلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ مندر کے بڑے ہال کمرے میں شیش ناگ کا بت اپنے چبوترے سے گر کر پاش پاش ہو چکا تھا۔ اس کے ملبے کے نیچے پروہت کپالا اور ناگ داسیوں کی لاشیں کچلی پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک ناگ داسی نارائینی کی لاش تھی۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے' میں تباہ شدہ

مندر سے باہر نکل آیا۔

میں تالاب کی ٹوٹی ہوئی ڈھال سے اتر کر نیچے کھڈ میں بہتی پہاڑی ندی کی طرف چلنے لگا۔ اترائی بڑی دشوار گزار تھی۔ میں جھاڑیوں کو پکڑ کر، پتھروں پر پاؤں ٹکا ٹکا کر نیچے اتر رہا تھا اور جہاں جہاں سے تالاب کا پانی گر کر نیچے بہا تھا وہاں ایک ایک جھاڑی ایک ایک پتھر کو بڑے غور سے دیکھتا جا رہا تھا۔ زلزلے نے یہاں بھی وادی کا نقشہ بدل دیا تھا۔ بھاری پتھروں اور چٹانوں کے ٹکڑوں نے نیچے ندی میں گر کر اس کا رخ بدل ڈالا تھا۔ مجھے گھاٹی میں ندی تک آتے کافی وقت لگا۔ پہاڑی ندی کا منہ زور شفاف پانی زلزلے سے گرتے ہوئے بھاری پتھروں کا چکر کاٹ کر نیا راستہ بناتا بڑی تیزی سے آگے نکل رہا تھا۔ میرے دوست قنطور کا کچھ پتہ نہ مل سکا۔ مجھے یقین تھا کہ چھ ماہ کی مدت گزرنے کے بعد وہ پھر سے زندہ ہو کر سانپ بن چکا ہو گا اور اب دوبارہ انسانی شکل میں واپس آنے کی طاقت اس میں پیدا ہو گئی ہو گی لیکن سوال یہ تھا کہ پھر وہ کہاں ہے! یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ پانی کے تیز بہاؤ کے ساتھ بہہ کر وادیوں میں دور نکل گیا ہو۔ میں پہاڑی ندی کے ساتھ ساتھ چلتا کافی دور نکل گیا۔ چلتے چلتے کئی بار مجھے ایسا لگا جیسے مجھ پر اپنے آپ غنودگی سی طاری ہو گئی ہے۔ ایسا عام طور پر اس وقت ہوتا جب وقت نے مجھے تاریخ کے دھارے میں آگے کو دھکیلنا ہوتا تھا۔ تو کیا میں تاریخ کے صفحات پر کچھ سال مزید آگے نکل گیا تھا؟ دن کی روشنی اس طرح پھیلی ہوئی تھی۔ بظاہر دیکھنے میں وقت معمول کے مطابق گزر رہا تھا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ مجھے اپنے قیمتی ہار کا خیال آ گیا۔ میں نے اپنی عبا کی جیبوں کو ٹٹولا مجھے اپنے سانپ دوست قنطور کا مہرہ تو مل گیا مگر ہیروں کا ہار موجود نہیں تھا۔ وہ میری کوٹھری میں سرہانے کے نیچے ہی رہ گیا تھا۔ مجھے اس کا کوئی افسوس نہ ہوا۔ مہرے کے مل جانے کی بہت خوشی ہوئی۔ کیونکہ اس کی خوشبو میرے دوست قنطور کو میرے پاس لا سکتی تھی۔

میں کھلے میدانوں میں پہنچا تو دن کافی نکل چکا تھا اور سنہری دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اپنے پیچھے کیلاش پربت کی سر بفلک پہاڑیوں کو دیکھا۔ برف پوش چوٹیاں ساکت کھڑی تھیں۔ شیش ناگ کا مندر اب مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ آج کل کے اتری بھارت کا شمال مشرقی علاقہ تھا۔ چیت وساکھ کا مہینہ تھا۔ کہیں کہیں کیکر اور پیپل کے درخت اگے ہوئے تھے۔ پھر ایک جنگل شروع ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک جانب سے دو تین پگ ڈنڈیاں جنگل کے اندر جاتی ہیں جہاں لوگ چلے جا رہے ہیں۔ میں نے ان کے قریب پہنچ کر دیکھا کہ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں مٹی کا ایک بجھا ہوا چراغ اور گیندے کے پھولوں کا ہار ہے۔ یہ دیہاتی لوگ تھے۔ میں نے قدیم سنسکرت زبان میں ایک دیہاتی

سے پوچھا کہ وہ لوگ جنگل میں بجھے ہوئے چراغ اور گیندے کے ہار لے کر کہاں جا رہے ہیں۔ اس نے حیرت سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پالی زبان میں کہا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس جنگل میں ہمارے بھگوان بدھ براجمان ہیں۔ وہ آج نروان حاصل کرنے کے بعد پہلی بار اپدیش دے رہے ہیں۔"

ایک ثانئے میں میں سمجھ گیا کہ کیلاش پربت سے میرے یہاں آتے آتے پندرہ بیس برس کا زمانہ گزر چکا ہے۔ کیونکہ جب میں ٹیکسلا سے کیلاش پربت کی طرف چلا تھا کہ اس وقت اطلاعات کے مطابق کپل وستو کے راجہ سندھو دھن کا بیٹا سدھارتو گوتم ابھی اپنے محل میں ہی تھا اور اس نے نروان کی تلاش میں ابھی اپنے محل اور بیوی بچوں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد نہیں کہا تھا۔ اب مجھے اس غنودگی کا خیال آنے لگا جو راستے میں مجھ پر کبھی کبھی اچانک طاری ہو جاتی تھی۔ یہ وقت کے تیزی سے چھلانگ لگانے کی غنودگی تھی۔ میرے دل میں اس شہزادے جوگی کو دیکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ جس نے انسانوں کے دکھوں کا حل تلاش کرنے کے لئے اپنا شاہی محل اور بال بچوں کو تیاگ دیا تھا۔ بارہ پندرہ برس تک جنگلوں میں ریاضتیں کی تھیں۔ اس وقت تک میں اس جوگی شہزادے سے واقف نہیں تھا۔ جس نے بعد میں گوتم بدھ کے نام سے تاریخ میں اپنا ایک منفرد مقام پیدا کرنا تھا۔ مجھے تو اس سے اس لئے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ یہ کیسا شہزادہ ہے کہ جس نے انسانوں کے دکھوں کی خاطر اپنا شاہی محل اور تخت و تاج چھوڑ دیا۔ جبکہ میں تاریخ میں دیکھتا آیا تھا کہ لوگوں نے تخت و تاج کے لئے اپنے سگے بھائیوں اور ماں باپ تک کو قتل کر ڈالا تھا۔ علاوہ بریں مجھے یہ معلوم کرنے کی بھی خواہش تھی کہ اس جوگی شہزادے نے انسانی دکھوں کا کیا حل تلاش کیا ہے۔

جنگل کے اندر ایک کھلی جگہ تھی جس کے درمیان میں ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس چبوترے پر ایک مقدس اور پرسکون چہرے والا انسان زرد رنگ کی عبا جسم کے گرد لپیٹے آسن جمائے خاموش بیٹھا ہے۔ اس کے چہرے کے گرد نور کا ہالہ ہو نہ ہو لیکن ایک گہرا سکون اور نورانی امن ضرور تھا۔ ایک جانب دن کے وقت بھی مشعل جل رہی تھی۔ لوگ اس مشعل کی لو سے اپنے دیئے روشن کر کے اس جوگی شہزادے یعنی گوتم بدھ کے چبوترے کے آگے رکھتے جا رہے تھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دن کے وقت اس جنگل میں ستارے اتر آئے ہیں اور جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ لوگ امن اور خاموشی سے ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھے تھے۔ میں بھی ایک جانب ہو کر بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں کپل وستو کے اس تیاگی شہزادے پر لگی تھیں۔ اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھول کر اپنے سامنے جمع لوگوں کو دیکھا۔ ہر طرف ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔ درختوں کا پتا تک نہیں ہل رہا تھا۔

ہر کوئی ہمہ تن گوش تھا۔ اور آنکھیں اس شہزادے پر لگی تھیں جو لوگوں کے دکھوں کا حل تلاش کرنے کی خاطر فقیر ہو گیا تھا۔ گوتم نے اپنی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور بڑی میٹھی اور پرسکون آواز میں یوں گویا ہوا۔

”ہر شخص اپنے ہی تعمیر کردہ قید خانے میں مقید ہے۔ تمہیں اپنے اندر سے نجات تلاش کرنی ہو گی۔ بتوں کی پرستش مت کرو۔ ان کے آگے خون کے نذرانے نہ پیش کرو۔ تمام اشیاء کی روح میٹھی ہے۔ سب انسان بھائی بھائی ہیں۔ برہمن اور چنڈال ایک ہی دروازے سے آتے ہیں۔ میں بدھ جو آنسو بہاتا اور روتا تھا جس کا دل تمام دنیا کے غموں سے ٹوٹ گیا تھا' آج ہنستا ہوں اور خوش ہوں۔ تم جو تکلیف میں ہو سن لو۔ تم اپنی ہی پیدا کردہ تکلیف میں ہو۔ ازل سے بھی پہلے' ابد کے بھی بعد۔ کائنات کی طرح دائمی یقین سے بھی زیادہ یقینی ایک ربی طاقت موجود ہے جو نیکی کے لئے حرکت کرتی ہے۔ صرف اسی کا قانون مستقل ہے۔ یہی وہ خدائی طاقت ہے جس کا لمس شگفتہ گلاب پر ہے جس کی ہنرمندی کنول کی پتیوں سے ہویدا ہے۔ تاریک زمین میں اور بیج کی خاموشی میں یہی بہار کا لباس بنتی ہے۔ ان شان دار بالوں میں اسی کی رنگت ہے اور مور کے پروں پر اسی کے موتی ہیں۔ اس کے مقامات ستاروں میں ہیں اور اس کے غلام بجلی ہوا اور بارش ہیں۔ مور کی گردن پر اسی نے نقش و نگار بنائے ہیں۔ سنہری پرندے کے خاکی انڈوں میں اسی کے خزانے پنہاں ہیں۔ مکھیوں کے چھتے کے اندر اسی کا شہد ہے۔ چیونٹی کو اس کے ارادوں کا پتہ ہے۔ سفید فاختہ کو ان سب کا علم ہے۔ عقاب کے پروں کو یہی پھیلاتی ہے اور ہر ایک کا رزق یہی طاقت مہیا کرتی ہے۔ ماں کی چھاتیوں میں یہی سفید اور میٹھا دودھ لاتی ہے اور وہ سفید قطرے بھی جن سے سانپ ڈستا ہے یہی بناتی ہے۔ متحرک سیاروں کے آہنگ کو آسمان کے خیمہ میں یہی ترتیب دیتی ہے۔ یہ ہمیشہ نت نئے راز افشاء کرتی ہے۔ موت اور زندگی اس کے کرگھے کے تانے بانے ہیں یہ بناتی ہے توڑتی ہے۔ جو بناتی ہے وہ پہلے سے بہتر ہوتا ہے یہ خدائی طاقت سب کچھ دیکھتی اور سمجھتی ہے۔ نیکی کرو' یہ قدر کرتی ہے۔ بدی کرو' یہ برابر کا ہرجانہ وصول کرتی ہے۔ اس کا ناپ تول سچا ہے۔ وقت اس کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ کل انصاف کرے گی یا کئی دنوں کے بعد۔ قاتل کا خنجر اسی کی بدولت اپنے ہی پیٹ میں لگتا ہے' یہی وہ قانون ہے جو نیکی کو متحرک کرتا ہے۔ اس کا مرکز محبت ہی اور اس کا کمال امن و سلامتی ہے۔ انسان اپنی ہی بوئے ہوئے کو کاٹتا ہے۔ اسی خدائی طاقت کے قانون کو سامنے رکھو۔ کسی کو رنج نہ پہنچاؤ' اپنے حواس پر قابو رکھو۔ دل کے پیالے کو نیک خواہشات سے بھر لو۔ اس ربی طاقت کا خزانہ جواہرات سے بڑھ کر قیمتی ہے۔ اس کی مٹھاس' شہد سے میٹھی

ہے۔ اس کی مسرتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں' اپنے دل کو دوسروں کی بھلائی کے خیال سے لبریز کر لو۔“

یہ گوتم بدھ کے نظریات اور خیالات تھے اور ان ہی میں انسان کے دکھوں کا حل پوشیدہ تھا۔ مجھے یہ خیالات بڑے اچھے لگے۔ بدھ کی وفات کے بعد ہی خیالات اس کے ماننے والوں کے بنیادی عقائد کہلائے۔ گوتم بدھ کا اپدیش ختم ہو گیا۔ لوگ اٹھ کر واپس جانے لگے۔ میری نگاہیں اس ہجوم میں بھی اپنی سانپ دوست قنطور کو تلاش کر رہی تھیں مگر مجھے نہ تو اس کی خوشبو آ رہی تھی اور نہ شکل دکھائی دیتی تھی۔ گوتم بدھ اپنی زرد پوش حواریوں کے ساتھ اپنی کٹیا میں واپس جا چکا تھا۔ چبوترے کے آس پاس جلتے ہوئے چراغ اسی طرح جل رہے تھے جو بجھ گئے تھے۔ عقیدت مند انہیں دوبارہ روشن کر رہے تھے۔ میں نے رات اسی جنگل میں دوسرے زائرین کے ساتھ بسر کی۔ صبح دم سورج نکلنے سے پہلے میں جنگل میں ٹہلنے کے لئے نکل گیا۔ میں اپنے دوست قنطور کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ ایک جگہ آم کے درختوں کے نیچے سے میں نے گوتم بدھ کو آتے دیکھا۔ وہ بڑی نرمی سے زمین پر پاؤں رکھ کر چل رہا تھا۔ اس کے چار حواری اس کے پیچھے تھوڑے فاصلے پر چل رہے تھے۔ میں ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ گوتم بدھ جب نظریں زمین پر گاڑے انتہائی سکون کے ساتھ میرے قریب سے گزرا تو میں نے کہا۔ ”عظیم شہزادے! تم نے لوگوں کے دکھوں کا حل تلاش کر لیا ہے۔ کچھ میرے دل کے دکھ کا بھی علاج کرو۔“ گوتم بدھ وہیں رک گیا اس نے نہ تو میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور نہ زبان سے کوئی لفظ ادا کیا۔ صرف ہاتھ فضا میں بلند کر کے اشارہ کیا کہ میں اسے اپنا دکھ بیان کروں۔ میں نے کہا کہ میرا ایک دوست گم ہو گیا ہے۔ میں اسے کہاں تلاش کروں کہ وہ مجھے مل جائے۔ گوتم بدھ ایک پل کے لئے ساکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے سکون بخش آواز میں کہا۔

”تم اپنے دوست کی طرف ہی جا رہے ہو۔“

او بے داغ قدم اٹھاتا آگے روانہ ہو گیا۔ اس وقت میں سمجھ نہ سکا کہ تیاگی شہزادے کا اس جملے سے مقصد کیا تھا۔ کیونکہ میں تو اپنے دوست قنطور کی تلاش میں ہی نکلا تھا۔ اس میں کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ میں باغ کی سیر کرنے کے بعد واپس اس چھوٹے سے میدان میں آ گیا۔ جہاں گوتم بدھ نے ایک رات پہلے اپدیش دیا تھا۔ یہاں چراغ ابھی تک روشن تھے اور لوگ ان میں تیل ڈال رہے تھے۔ سارا دن میں نے ان لوگوں میں اپنے سانپ دوست قنطور کی تلاش میں گزار دیا۔ رات ہوئی تو ایک جگہ درختوں کے نیچے بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک گھوڑ سوار میرے پاس آیا۔ گھوڑے سے اتر کر بولا۔

"اس گھوڑے کی سواری کرو گے؟ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ گھوڑا کسی اجنبی سوار کو قبول کرتا ہے کہ نہیں۔"

میرا دل تو نہیں چاہتا تھا مگر اس نووارد نے کچھ ایسی محبت سے یہ سوال کیا تھا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ میں گھوڑے پر سوار ہو گیا اور ایڑ لگائی۔ گھوڑا کیا تھا ایک بجلی تھی۔ باگیں ڈھیلی چھوڑتے ہی ہوا ہو گیا۔ آن واحد میں جنگل ختم ہو گیا اور میں اندھیرے میدان میں اڑا جا رہا تھا۔ میں نے گھوڑے پر سے چھلانگ لگانے کی کوشش کی مگر میرا جسم جیسے گھوڑے پر جم گیا تھا۔ تیز اندھیری ہوا نے میری آنکھیں بند کر دی تھیں اور مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ گھوڑا برق رفتار سے دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اچانک میری آنکھوں میں ایک چمک سی کوند گئی۔ میری آنکھیں اپنے آپ کھل گئیں۔

کیا دیکھتا ہوں کہ نہ میں گھوڑے پر سوار ہوں نہ وہ میدان اور جنگل ہے اور نہ وہ رات ہے۔ میں نے رومن غلاموں کا لباس پہن رکھا ہے۔ کمر کے ساتھ خنجر لگا ہے اور ہاتھ باندھے دریا کے کنارے ایک شاہی کشتی میں کھڑا ہوں۔ سامنے باغ میں شمعیں فروزاں ہیں اور کشتی کے سرے پر تانبے کی رومن مشعل جل رہی ہے۔ میرے ذہن پر سے ایک دم سے گویا ایک پردہ ہٹ گیا اور میرے دماغ کے کمپیوٹر میں یادداشت کا جو تازہ مواد فیڈ کیا گیا تھا وہ کھل کر میرے سامنے آ گیا۔ میں گوتم بدھ کے زمانے سے نکل کر آن واحد میں چھ سو سال کی مسافت طے کر کے رومان عہد میں آ گیا تھا جبکہ روم کی وسیع و عریض اور طاقت ور ترین سلطنت کی باگ ڈور ایک ظالم اور عاقبت نااندیش شہنشاہ نیرو کے ہاتھ میں تھی۔ میں اس درندہ صفت رومن شہنشاہ کا غلام خاص تھا اور یہاں میرا نام کیولیس تھا۔ نیرو مجھے مصری غلام کے لقب سے پکارتا تھا۔ آدھی سے زیادہ دنیا پر اس وحشی اور بدصورت بادشاہ کی حکومت تھی۔ یہ 50ء عیسوی کے عہد کی رومن سلطنت کا دارالحکومت روما تھا اور یہ بادشاہ کے شاہی محل کا باغ تھا جس کے جلو سے دریائے تائبر گزرتا تھا۔ اس وقت نیرو نے اپنی ماں ایگریپنا کو قتل کروانے کی سازش کر رکھی تھی۔ اس لئے کہ اس کی ماں امور سلطنت میں دخل دیتی تھی جسے اس کا ظالم اور شقی القلب بیٹا نیرو پسند نہیں کرتا تھا۔ عظیم ترین سلطنت روم کا پاگل وارث نیرو اس وقت میرے سامنے کھڑا تھا اور اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر بڑی محبت اور تعظیم کے ساتھ اسے کشتی میں سوار کروا رہا تھا۔

"مادر محترم! میرا غلام آپ کو آپ کے شاہی محل تک بہ حفاظت پہنچا دے گا۔"

اگرچہ نیرو کی مادر ملکہ نے دریائی سفر پر اصرار نہیں کیا تھا لیکن نیرو نے یہ کہہ کر اسے کشتی میں سفر کرنے پر آمادہ کر لیا کہ رات کے وقت دریائی سفر محفوظ ہوتا ہے اور ویسے بھی

مادر ملکہ کا محل وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن میں جانتا تھا کہ نیرو کے دل میں کیا ہے۔ اس نے ایک آدمی کو خفیہ طور پر پہلے ہی سے دریا میں چھوڑ رکھا تھا کہ جب کشتی شاہی محل سے تھوڑے فاصلے پر ہو تو وہ دریا میں سے نکل کر چشم زدن میں مادر ملکہ کا کام تمام کر دے۔ دوسری جانب مجھے یہ ہدایت تھی کہ جونہی ملکہ قتل ہو جائے میں خنجر سے اس کے قاتل کو ہلاک کر ڈالوں۔ نیرو کی ماں بھی بڑی ظالم عورت تھی اور اس سے پہلے وہ تخت پر اپنے بیٹے کو کٹھ پتلی کے طور پر بٹھانے کی کوشش میں کئی انسانوں کے خون سے ہاتھ رنگ چکی تھی۔ وہ کشتی میں بیٹھ گئی۔ اسے بھی یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ اس کا اپنا بیٹا اسے قتل کرانے کا منصوبہ بنا چکا ہے اور یہ کہ وہ موت کے سفر پر روانہ ہو رہی ہے۔ میں چپو چلانے لگا۔ نیرو نے ماں پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کرتے اور ہاتھ ہلاتے ہوئے ..... رخصت کیا جو اس کے راستے کی سب سے بڑی اور سب سے آخری رکاوٹ تھی۔ میں خاموشی سے کشتی کھے رہا تھا۔ ضیافت میں موجود مہمانوں کے قہقہوں کی آوازیں بہت پیچھے رہ گئیں کشتی دریا کے دوسرے کنارے پر ملکہ کے محل کی پتھریلی دیوار کی طرف جا رہی تھی۔ یہاں اندھیرا تھا۔ مگر ستاروں کی روشنی میں ایک دوسرے کو بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ سازش کے مطابق میں جان بوجھ کر کشتی کو محل کی دیوار کے اس طرف لے آیا جہاں نیرو نے اپنے ایک خنجر بکف آدمی کو سیڑھیوں کے پاس دریا میں متعین کر رکھا تھا۔ جونہی میری کشتی ملکہ کے شاہی محل کی پہلی سیڑھی کے قریب پہنچی پانی میں سے ایک سیاہ فام انسان مگرمچھ کی طرح باہر نکل کر کشتی میں لپکا اور اس نے ملکہ کو دبوچ کر اس کا گلا کاٹ کر رکھ دیا۔ اب سازش کے تحت مجھے وہ کام سرانجام دینا تھا جو شہنشاہ نیرو ہی نے مجھے تفویض کر رکھا تھا۔ میں نے چپو پھینکے اور کمر سے خنجر نکال کر ملکہ کے قاتل کی پیٹھ پر دو کاری وار کئے۔ وہ حیران سا ہو کر میری طرف پلٹا لیکن وہ میری غیر انسانی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی لاش بھی ملکہ کی لاش کے اوپر پڑی تھی۔ منصوبے کے مطابق میں نے شور مچا دیا کہ ایک بدبخت نے ملکہ پر قاتلانہ حملہ کر دیا تھا اور میں نے اسے بھی قتل کر دیا ہے۔ نیرو یہی چاہتا تھا اس نے مجھے انعام دیا اور دو دن تک اپنی ماں کا سوگ منایا۔

نیرو اس سے پہلے کئی لوگوں کو قتل کروا چکا تھا جس میں اس کا ایک بھائی بھی شامل تھا۔ پہلے نیرو کے اس بڑے بھائی کو روم کے تخت کا وارث بنایا گیا تھا۔ نیرو نے وہی زہر اپنے بھائی کی شراب میں ملوا دیا جو اس کی ماں نے نیرو کے سوتیلے باپ کو ہلاک کرنے کے لئے دیا تھا۔ اس وقت ضیافت میں سینکڑوں لوگ بیٹھے تھے۔ نیرو کے بھائی کی شراب میں یہ زہر میری ہی وساطت سے ملایا گیا تھا۔ شراب پیتے ہی نیرو کے بڑے بھائی پر تشنج کا دورہ پڑ گیا۔

اس کے ہاتھ پیر مڑ گئے۔ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے مر گیا۔ نیرو نے کہا۔ اسے مرگی کا دورہ پڑا تھا اور وہ بڑے مزے سے شراب پیتا اور تیتر کے کبابوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اگرچہ میں اس درندہ نما انسان اور سلطنت روم کے مطلق العنان بادشاہ کا غلام خاص تھا مگر وہ میری خفیہ طاقت سے ابھی تک واقف نہیں تھا۔ اپنی طاقت کے اظہار کا مجھے کبھی کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ کیونکہ ابھی تک مجھ پر نیرو کی نوازشیں تھیں اور اس نے مجھے قتل کروانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میں اس کے خونی منصوبوں کا عینی شاہد اور گواہ ہوں اور ایک نہ ایک دن وہ مجھے بھی حرف غلط کی طرح مٹانے کی ضرور کوشش کرے گا اور وہی دن میری خفیہ طاقت کے اظہار کا دن ہو گا۔ نیرو ایک بار روما کے گنجان آباد شہر کو آگ لگا کر راکھ کر چکا تھا اور اس کی راکھ پر اس نے نیا شہر بنوایا تھا۔ اس نے اپنے اردگرد درباری مسخروں اور خوشامدیوں کا ایک گروہ اکٹھا کر لیا تھا جو اسے دنیا کا عظیم شہنشاہ، عظیم موسیقار اور عظیم شاعر کہہ کر پکارتے تھے اور اس کی ظالمانہ حرکتوں کی تعریف کرتی اور انہیں دیوتاؤں کی منشا قرار دیتے تھے۔

نیرو نے سب سے پہلے اپنی بہیمانہ جبلتوں کی تسکین کے لئے ایک ایسا سرکس بنایا تھا جس میں دنیا بھر کے خوں خوار درندے اور جنگلی بھینسے اور مگرمچھ جمع تھے۔ ان درندوں سے ان قیدیوں کو لڑایا جاتا جنہیں موت کی سزا سنا دی گئی ہوتی یا پھر عیسائی مذہب کے ماننے والوں کو ان کے آگے ڈال دیا جاتا۔ نیرو عیسائیوں کا جانی دشمن تھا۔ اس وحشی اور مکار بادشاہ نے روم کو آگ لگانے کا ذمے دار بھی عیسائیوں ہی کو ٹھہرایا تھا۔ تاکہ لوگوں میں عیسائیوں کے خلاف نفرت پیدا کی جائے۔ اس ناکردہ جرم کی سزا میں میں نیرو نے سینکڑوں عیسائی مبلغین کو ان کے بیوی بچوں سمیت بھوکے شیروں کے آگے ڈال دیا تھا۔ بعض عیسائیوں کو زندہ جلا دیا جاتا۔ بعضوں کی کھال اتار کر انہیں مختلف جانوروں کی کھالیں پہنا دی جاتیں اور ان پر کتے چھوڑ دیئے جاتے۔ وہ ایک ظالم اور بدکار ماں کا بیٹا تھا۔ اس کی ماں بھی اذیت پرست تھی۔ وہ جس مرد سے محبت کرتی اسے بعد میں اپنے سامنے کسی خود ساختہ جرم کی پاداش میں قتل کروا دیتی قتل کروانے سے پیشتر وہ اسے طرح طرح کی اذیتیں دیتی اور خوش ہوتی۔

بادشاہ نیرو سرکس کے ظالمانہ تماشے دیکھنے بڑے شوق سے جایا کرتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی تماشا گاہ تھی جو بیضوی شکل کی تھی۔ اس کے کھنڈر آج بھی جدید شہر روم کے نواح میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ پاکستان آتے ہوئے جب میرا جمبو جیٹ ہوائی جہاز روم کے اوپر سے گزرا تھا تو مجھے اس منحوس تماشاگاہ کے کھنڈر نیچے نظر آئے تھے۔ جیٹ مسافر طیارے میں بیٹھے ہوئے کسی انسان کو یقین نہیں آ سکتا تھا کہ میں آج سے ساڑھے انیس سو برس پہلے اس

تماشاگاہ میں موجود تھا۔ اس خونی تماشاگاہ کی سیڑھیوں پر ہزاروں، لاکھوں لوگ بیٹھے ہوتے جنہیں اس قسم کے غیرانسانی اور ظالمانہ تماشے دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ نیرو اپنی درندہ صفت ذہنیت کی تسکین کے لئے نت نئے کھیل تماشے ایجاد کیا کرتا تھا۔

اس محسن کش، ننگ انسانیت بادشاہ نے اپنے اتالیق او تاریخ فلسفہ کی مشہور شخصیت فلسفی سنیکا کو محض اس لئے خود موت کے گھاٹ اتار دیا تھا کہ یہ درد مند فلسفی نے اسے ظلم کی بجائے انسانوں سے پیار محبت کی تلقین کرتا تھا۔ نیرو نے اپنے ہاتھ سے اس کی کلائی کی رگ کاٹ ڈالی اور اسے حکم دیا کہ مجھے نیک کاموں کی تلقین کرو۔ میں نیرو کے پہلو میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ فلسفی سنیکا کی کلائی سے گرم گرم خون ابل رہا تھا۔ جب خون جمنے لگتا تو نیرو آگے بڑھ کر قہقہے لگاتے ہوئے اپنے ہاتھ سے اس کی کلائی پر گرم پانی انڈیلنے لگتا مگر آفرین ہے اس عظیم اور نیک دل فلسفی پر کہ وہ آخری دم تک نیرو کو نیکی کی تلقین کرتا رہا۔ اگرچہ اس کا یہ فعل کسی حبشی کو اس خیال سے بار بار غسل دینے کی کوشش تھی کہ اس کا رنگ سفید ہو جائے گا لیکن اس ثابت قدم دانشور نے اپنا فرض ادا کیا اور جسم سے سارا خون بہہ جانے کے باعث مر گیا۔ اس بدنام زمانہ بادشاہ نے اپنے لئے جو شان دار محل بنوایا اس کی کھڑکیوں اور دروازوں پر سونے کی چادریں چڑھی ہوئی تھیں اور اس کی چھتوں سے بوقت ضرورت عطر کی پھواریں گرا کرتی تھیں۔

آخر ایک روز میری باری بھی آ گئی۔ اس روز نیرو کے خونی سرکس میں درندگی کے مظاہرے جاری تھے۔ موت کے قیدیوں کو بھوکے درندوں کے آگے محض ایک چاقو دے کر پھینکا جا رہا تھا اور درندے انہیں چیر پھاڑ رہے تھے۔ ہزاروں کا مجمع نعرے بلند کر رہا تھا۔ نیرو ہاتھ میں جام مے لئے قہقہے لگا رہا تھا۔ میں اس کے پہلو میں سرکس کی منڈیر کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ معمول کی طرح میرے پہلو میں زہر میں بجھا ہوا خنجر لگا تھا۔ جب موت کے سارے قیدی چیرے پھاڑے جا چکے تو غلام ان کی بچی کھچی لاشوں کے ٹکڑے تماشاگاہ سے رتھوں میں بھر کر لے گئے۔ میرا خیال تھا کہ یہ خونی تماشا اب ختم ہو چکا ہو گا۔ لیکن ایک اور تماشا ہونے والا تھا۔ نیرو نے بگل بردار کو اشارہ کیا۔ اس نے بگل بجا دیا۔ اس کے ساتھ ہی تماشا گاہ کی کوٹھری کا لوہے کا دروازہ اوپر اٹھ گیا اور ایک انتہائی خوبصورت اور جوان عیسائی لڑکی کو میدان میں اتارا گیا اس نے اپنے ہاتھ میں صلیب تھام رکھی تھی۔ اس کے سنہری بال کھلے ہوئے تھے۔ اگرچہ موت کے خوف سے اس کے قدموں میں لرزش تھی مگر حسین چہرے پر عقیدے کا جلال تھا۔ نیرو کے حکم سے ہی تماشاگاہ کی بالکل سامنے والی کوٹھری کا دروازہ اوپر اٹھا دیا گیا۔ اس کوٹھری کے اندر سے ایک چھ سات روز کا بھوکا شیر غراتا گرجتا

لڑکی کی طرف بڑھا۔ شدت بھوک سے شیر کی سرخی مائل زرد آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ اس سے پیشتر میں نے کئی انسانوں کو بھوکے درندوں کا شکار ہوتے دیکھا تھا اور میرے دل پر اتنا زیادہ کبھی اثر نہیں ہوا تھا لیکن اس سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں اور پرجلال چہرے والی عیسائی لڑکی کو بھوکے شیر کے آگے بے بس کھڑے دیکھ کر میرے اندر ایک دھماکا سا ہوا۔ میں نے کمر سے خنجر کھینچ کر نکالا اور منڈیر پر سے تماشا گاہ میں چھلانگ لگا دی۔ یہ دیوار ڈیڑھ منزل اونچی تھی۔ میں نے زمین پر لگتے ہی ایک قلابازی کھائی اور خوف سے لرزتی ہوئی لڑکی کے آگے جا کھڑا ہوا شیر نے اچھل کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ لوگ مارے حیرت و جوش کے اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شہنشاہ نیرو یہ معاملہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا غلام اس کے شکار کی جان بچانے کی جرات بھی کر سکتا ہے مگر اب مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میں نے عیسائی لڑکی کی جان بچانے کا عزم کر رکھا تھا۔

جونہی شیر نے مجھ پر چھلانگ لگائی میں نے ایک ہاتھ سے اس کا جٹا دھاری سر پکڑ کر خنجر سے اس کا پیٹ چاک کر دیا۔ شیر کی انتڑیاں باہر نکل آئیں ۔ خنجر کے ساتھ لگے زہر نے اس کے جسم کو مفلوج کر دیا۔ ورنہ وہ دوسری بار مجھ پر حملہ آور ہوتا۔ شیر تماشا گاہ کی ریت پر بے حس و حرکت پڑا تھا اور اس کے جسم سے خون ابل ابل کر ریت میں جذب ہو رہا تھا۔ میں نے عیسائی لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں ان درندوں سے نکال کر لے جاؤں گا۔“ وہ اب بھی خوف زدہ تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اب ہم دونوں کو روم کے سیاہ فام گلیڈی ایٹر آ کر بھالوں اور تلواروں سے قیمہ قیمہ کر دیں گے۔ میں نے شہنشاہ نیرو کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی شاہی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور میری طرف قہر بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سارے امرا اور درباری دم بخود تھے۔ نیرو نے ایک چیخ مار کر کہا۔ ”ان دونوں کی کھال اتار کر ان پر کتے چھوڑ دو۔“ اس حکم کے ساتھ ہی دو سیاہ گھوڑوں والا رتھ برق رفتاری سے دیوار کے دروازے میں سے نکل کر ہماری طرف بڑھا۔ اس رتھ پر دو ہٹے کٹے زرہ پوش گلیڈی ایٹر سوار تھے۔ وہ برچھے لہرا رہے تھے میں نے عیسائی لڑکی سے کہا۔

”بھاگنا مت۔ اپنی جگہ پر کھڑی رہنا۔“

جونہی رتھ میری طرف آیا میں ایک طرف ہٹ گیا اور زمین سے اچھل کر میں نے ایک زرہ پوش گلیڈی ایٹر کو نیچے گرا لیا لیکن اس دوران عیسائی لڑکی خوف کے مارے ایک طرف کو بھاگی۔ دوسرے گلیڈی ایٹر نے رتھ اس کے اوپر چڑھا دیا۔ میرے کانوں میں اس کی چیخ کی آواز آئی۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ وہ زمین پر دہری ہو کر پڑی تھی اور گلیڈی ایٹر نے اس کے سینے میں برچھا گھونپ دیا تھا۔ میں یہ الم انگیز منظر برداشت نہ کر سکا اور

بپھرے ہوئے شیر کی طرح دوسرے گلیڈی ایٹر پر جھپٹا میرے ہاتھ میں اب خنجر بھی نہیں تھا۔ اس نے برچھا دونوں ہاتھوں میں تھام کر میرے سر پر مارا تو برچھا ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد میں نے پہلے گلیڈی ایٹر کی طرح اسے بھی اس کی فولاد کی زرہ کے اندر ہی یوں کچل کر رکھ دیا جیسے اس پر کوئی بھاری چٹان آن گری ہو' لوگوں پر ایک دہشت چھا گئی تھی۔ کسی انسان میں اتنی طاقت نہیں ہو سکتی تھی جس کا میں نے مظاہرہ کیا تھا۔ نیرو گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے کوئی مافوق الفطرت ہستی سمجھ کر وہاں سے باہر نکلنے لگا تو لوگوں نے اس کے خلاف نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ عوام پہلے ہی اس کے مظالم سے تنگ آ چکے تھے۔ اب انہوں نے میری طاقت کے مظاہرے کو آسمانی معجزہ سمجھا اور نیرو کے خلاف بغاوت کر دی۔ تماشا گاہ میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ نیرو کے محافظ اسے تلواروں کی چھاؤں میں نکال کر محل کی طرف بھاگ گئے۔

میری سامنے سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی پرجلال عیسائی لڑکی کی کچلی ہوئی لاش پڑی تھی۔ میں نے اس کی لاش کو اٹھایا اور رتھ میں رکھ کر تماشا گاہ سے باہر نکل آیا۔ لوگ مجھے کوئی دیوتا سمجھ کر نعرے لگا رہے تھے مگر میں ان کے درمیان سے نکل کر شہر کی بڑی سڑک پر سے ہوتا ہوا روما کے قدیمی قبرستان میں آ گیا۔ میں عیسائی لڑکی کو عزت و احترام کے ساتھ دفن کرنا چاہتا تھا۔ میرا دل غم سے بوجھل تھا میرے ساتھ گویا آسمان پر جھکے ہوئے بادل بھی غم زدہ تھے اور ہلکی بوندا باندی کے ساتھ اپنے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر رہے تھے۔ میں نے صنوبر کے ایک گھنے درخت کے نیچے عیسائی لڑکی کے لئے قبر کھودی اور اسے دفن کرنے کے بعد وہی صلیب اس کی قبر کے سرہانے لگا دی تھی جو اس نے تماشا گاہ میں داخل ہوتے وقت ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔

شہر میں واپس آیا تو وہاں بغاوت ہو چکی تھی۔ لوگوں نے شاہی محل پر دھاوا بول کر جگہ جگہ آگ لگا دی تھی۔ اسی روز شام کے وقت تاریخ کے بدنام ترین اور درندہ صفت بادشاہ نیرو کو قتل کر دیا گیا۔ بعد میں مجھے جن واقعات کا علم ہوا وہ یوں کہ جب شاہی محل پر حملہ ہوا تو نیرو منہ سر ڈھانپ کر خفیہ راستے سے محل سے نکل بھاگا۔ لوگ اسے تلاش کر رہے تھے ۔ وہ شہر سے دور اپنے ایک وفادار غلام کے گھر میں جا چھپا لیکن بپھرے ہوئے لوگ یہاں بھی پہنچ گئے۔ نیرو نے اپنے غلام سے کہا کہ یہاں میرے لئے ایک قبر کھودو۔ پھر نیرو نے خنجر نکال کر خودکشی کرنی چاہی مگر حوصلہ نہ ہوا اور ڈر گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ خنجر کی نوک اپنے پیٹ پر رکھی اور غلام سے کہا کہ وہ اس خنجر کو اس کے پیٹ میں گھونپ دے۔ غلام نے ایسا ہی کیا۔ نیرو پیٹ پر ہاتھ رکھے لڑکھڑاتا ہوا گر پڑا۔ اتنے میں لوگ تلواریں اور

برچھے لہراتے اندر آ گئے۔ انہوں نے نیم جاں نیرو پر وار کرنے شروع کر دیئے نیرو کے ہونٹوں سے جو آخری جملہ نکلا وہ یہ تھا کہ "آج ایک فن کار دنیا سے اٹھ رہا ہے۔" کاش ایسے "فن کار" دنیا میں کبھی پیدا نہ ہوں۔"

روم شہر ایک بار پھر جل رہا تھا میرے لئے اب اس برباد شہر میں کچھ نہیں تھا۔ شام تک میں شہر کی نواحی پہاڑیوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ دل کے کسی گوشے میں یہ خیال بھی چھپا ہوا تھا کہ شاید اپنے سانپ دوست قنطور سے کسی جگہ پھر ملاقات ہو جائے مگر یہ امید بر نہیں آ رہی تھی۔ قنطور سانپ کا مہرہ اس وقت بھی میری جیب میں تھا۔ اس ظالم شہر سے میں دل برداشتہ ہو چکا تھا اور ب کسی دوسرے ملک کو نکل جانا چاہتا تھا لیکن جانے سے پہلے عیسائی لڑکی کی تربت پر جا کر خراج عقیدت ضرور پیش کرنا چاہتا تھا۔ رات ہو چکی تھی کہ میں نے روما کے قدیم قبرستان کی طرف رخ کیا۔ بوندا باندی اب نہیں ہو رہی تھی لیکن آسمان بادلوں س تیرہ و تار تھا اور کہر آلود ہوا چل رہی تھی۔ قبرستان میں موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نہ کہیں کوئی شمع روشن تھی اور نہ کسی قبر پر کوئی چراغ جل رہا تھا۔ ایک گہری سیاہ چادر تھی اندھیرے کی جس نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ مجھے اس اندھیرے میں دیکھتے ہوئے کوئی دقت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں صنوبر کے درخت تلے آ گیا۔ عیسائی لڑکی کی قبر کی ڈھیری ویسے ہی پڑی تھی۔ قبر کے سرہانے صلیب تھوڑی سی ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ صلیب کو سیدھا کر دینا چاہئے۔ میں قبر کے سرہانے کی جانب بڑھا ہی تھا کہ صلیب میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اپنے آپ سیدھی ہو گئی۔ میں ششدر رہ گیا۔ صلیب کو اٹھا کر کس نے سیدھا کیا؟ میرے ذہن میں خود بہ خود سوال پیدا ہوا۔

اچانک مجھے کپڑوں کی سرسراہٹ کی آواز سنائی دی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے کوئی ذی روح دکھائی نہ دیا۔ کپڑوں کی سرسراہٹ میرے قریب آ کر رک گئی۔ پھر ایک گہرا سانس بھرنے کی آواز آئی۔ میرے منہ سے اپنے آپ نکل گیا۔ "کون ہو تم؟" اب مجھے ایک پرسکون گہری آواز سنائی دی۔ یہ آواز کسی نوجوان لڑکی کی تھی۔

"عاطون! میرے بھائی۔ میں ماریانہ کی روح ہوں۔ جس کی جان بچانے کے لئے تم نے تماشاگاہ میں چھلانگ لگا دی تھی لیکن جسے رومن گلیڈی ایٹر نے قتل کر دیا اور پھر جس کی لاش کو تم نے یہاں صنوبر کے درخت کے سائے میں لا کر اس کی ابدی آرام گاہ میں لٹا دیا۔"

میں ساکت و جامد کھڑا اس عیسائی لڑکی کی آواز سن رہا تھا جس کی قبر پر میں آخری سلام

کرنے آیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔

"عاطون! میں صرف تم سے ملنے یہاں آئی ہوں۔ ایک شہید بہن کی روح کی دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔"

اب مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ میں نے کہا۔ "ماریانہ! کیا تم میرے سامنے نہیں آ سکتیں؟"

ایک لمحے کے لئے گہری خاموشی چھا گئی۔ پھر ماریانہ کی روح کی آواز آئی۔

"ہو سکتا ہے تم مجھے کبھی میرے جسمانی روپ میں دیکھ سکو مگر ابھی مجھے اس کی اجازت نہیں ہے۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"ماریانہ! کہتے ہیں روحیں آگے پیچھے ہر جگہ گھومتی رہتی ہیں۔ کیا تم مجھے میرے سانپ دوست قنطور کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو۔"

ماریانہ کی روح نے جواب میں کہا۔

"ابھی مجھے اس کی اجازت نہیں ہے لیکن تمہیں صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ تھوڑی دیر بعد تم ایک نئی دنیا میں ' تاریخ کے ایک نئے عہد میں ہو گے اور وہاں تمہاری ملاقات تمہارے دوست قنطور سے بھی ہو جائے گی۔"

"یہ۔ یہ کون سا عہد ہو گا؟"

مگر ماریانہ کی روح نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جا چکی تھی۔ میں دیر تک اس کی قبر پر بیٹھا اس کے لئے دعائے خیر کرتا رہا۔ پھر اٹھا اور بوجھل قدموں کے ساتھ قبرستان میں بکھری ہوئی ویران قبروں میں سے گزرنے لگا۔ میں اپنے خیالوں میں محو چلا جا رہا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ میرے آگے ایک گڑھا ہے۔ یہ ایک پرانی قبر کا گڑھا تھا جو بارشوں کی وجہ سے بیٹھ گئی تھی۔ میرا پاؤں اس میں پڑا تو میں قبر کے اندر گر گیا۔ میرا سر کسی شے سے بڑے زور سے ٹکرایا مجھے کوئی تکلیف تو نہ ہوئی اور نہ ہی سر پھٹ سکا مگر تھوڑی دیر کے لئے میری میری آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا۔ میں نے قبر کے کناروں کو تھام کر باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن مجھے چکر سا آ گیا اور میں اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر قبر کی دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ میں آنکھیں مل رہا تھا کہ مجھے کسی مرد کی آواز آئی۔

"جرجان بن سعی تمہاری آنکھوں میں کیا پڑ گیا ہے۔"

یہ جملہ بڑی فصیح عربی زبان میں ادا کیا گیا تھا۔ میں نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹائے تو نگاہیں خیرہ اور آنکھیں چکا چوند ہو کر رہ گئیں۔ وہاں نہ عیسائی لڑکی ماریانہ کی قبر تھی اور نہ روما کا قدیم قبرستان تھا۔ اس کی بجائے خلفائے عباسیہ میں سب سے زیادہ نامور اور جلیل

القدر خلیفہ ہارون الرشید کی جلالت گاہ قصر خلد کے بالمقابل اس کے ہر دل عزیز وزیر اعظم اور جگری دوست جعفر برمکی کے شاہی محل کی نشست گاہ تھی۔ ریشمی قالینوں کے فرش پر طبرستان و خراسان کے منقش تخت بچھے ہیں۔ عالی شان اطلسی مسندیں لگی ہیں' مرمریں ستونوں کے ساتھ ملک شام کے ریشمی پردے لٹکے ہیں۔ حلب کے فانوسوں میں کافوری شمعیں روشن ہیں۔ جعفر برمکی مسند شاہی پر کرو فر کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ دمشق و فارس و ہند کی کنیزیں محو رقص ہیں۔ بغداد کے مشہور و معروف نابینا گویئے ابو زکار نے رباب پر ایک دل نشیں نغمہ چھیڑ رکھا ہے۔ ندیم اور خواص حاضر ہیں۔ میں بھی خلفائے عباسیہ کے عہد کے لباس خاص میں ملبوس جعفر برمکی کے پہلو میں قدرے فاصلے پر بیٹھا اپنی آنکھوں کو مل رہا ہوں۔ میں نے جلدی سے کہا۔

کبھی کبھی آل برمک کے شان و شکوہ کو دیکھ کر آنکھیں ملنے لگتا ہوں کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔"

جعفر برمکی مسکرا دیا اور کنیز کی جانب پیالہ بڑھایا جس نے اسے مشروب سے بھر دیا۔ حسب معمول میرے ذہن کے کمپیوٹر نے کام شروع کر دیا تھا۔ مجھ پر میری نئی حیثیت کی شناخت واضح ہو چکی تھی۔ یہ آل عباسی کے مقتدر خلیفہ ہارون الرشید کا دور تھا۔ میں اس کے جلیل القدر' علیت اور عقل و دانش میں یگانہ روزگار' منہم و فراست کے نابغہ وزیر اعظم سلطنت عباسیہ جعفر برمکی کے شاہی محل میں اس کے ندیم خاص کی حیثیت سے وہاں نمودار ہوا تھا۔ یحییٰ برمکی کے اس فرزند اقبال مند جعفر برمکی کی فصاحت و بلاغت اور دانش وری و حکمت کا کہیں جواب نہیں تھا۔ خلیفہ ہارون الرشید اس کو اپنا وزیر اعظم ہی نہیں بلکہ اپنا بھائی کہہ کر پکارتا تھا۔ وہ اس سے اپنے دونوں بیٹوں مامون اور امین سے بڑھ کر محبت کرتا تھا۔ خلیفہ کے ذاتی مسائل ہوں یا ملکی معاملات ہوں' جعفر برمکی بے تکلفی سے بات کر سکتا تھا۔ دربار میں جعفر برمکی کی نشست' مسند خلافت کے ساتھ تھی۔ سکوں پر ہارون الرشید کے نام کے ساتھ جعفر کا نام بھی کندہ تھا۔ جعفر برمکی کا سن چھبیس سال تھا۔ وہ اپنی تمام جملہ خوبیوں پر مستزاد ایک وجیہہ و جمیل جوان بھی تھا۔ تدبر اور دوراندیشی میں بے مثل اور خیرات و بخشش میں یکتا۔ وہ اگرچہ عجمی تھا مگر فصاحت و بلاغت میں عربوں کا ہم پلہ تھا۔ دولت و ثروت میں آل برمک کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کے شاہی محلات خلیفہ کے شاہی محل سے زیادہ پرشکوہ اور فلک بوس تھے اور ان محلوں کے باہر ہمہ وقت حاجت مندوں کی بھیڑ رہتی تھی جن پر بیت المال کے منہ ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ شاعر آل برمک کی مدح سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے۔ جس وقت میں جرجان بن سعی کے نام سے جعفر

برمکی کے ندیم خاص کی حیثیت سے اس کے شاہی محل میں نمودار ہوا تو آل عباس کی سلطنت پر آل برمک کے پنجوں کی گرفت مضبوط تر ہو چکی تھی اور خلیفہ ہارون الرشید سلطنت عباسیہ کو اس خیرہ کن عجمی فتنے سے ہمیشہ کے لئے پاک کر دینے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگا تھا۔

یہ محفل چنگ و رباب اپنے عروج پر تھی کہ اچانک جعفر برمکی کے حاجب نے داخل ہو کر تعظیم بجا لاتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں عرض کی کہ خلیفہ معظم کی حالت خراب ہے اور آپ کو یاد کیا گیا ہے۔ جعفر برمکی نے جام مشروب اپنے ہاتھ سے رکھ دیا۔ "نصیب دشمناں کیا خلیفہ پر کسی مرض کا حملہ ہوا ہے؟"

حاجب نے عرض کیا۔

"حضور! دربار میں ایک یہودی منجم نے کوئی ایسی اندوہناک پیش گوئی کر دی ہے کہ جس سے خلیفہ معظم کو غش پر غش آ رہا ہے۔"

جعفر برمکی مسند سے اتر آیا۔ اس نے شاہی لباس زیب تن کیا اور مجھے ساتھ لے کر دربار خلافت کی طرف روانہ ہوا۔ میں پہلی بار عباسی عہد کے سب سے نامور شہنشاہ خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے فرعونوں سے لے کر یونانیوں' اشوریوں' ایرانیوں اور رومیوں کے پرشکوہ درباروں کی سطوت و شان دیکھی تھی مگر خلیفہ ہارون الرشید کے دربار کا جاہ و جلال سب سے الگ تھا۔ ایک اسلامی مملکت کے سربراہ سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ یہی وہ عہد زریں تھا کہ جس نے میرے سینے کو اسلام کی روشنی سے منور کیا۔ یہ میں آپ کو آگے چل کر بتا دوں گا۔ دربار عالی میں ایک ذی وقار خاموشی چھائی تھی۔ محل سرا میں ایک کہرام کا عالم تھا۔ خلیفہ مسند خلافت پر نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اطبا محو تدبیر تھے۔ پردوں کے پیچھے ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ اور بہن عباسہ کا اضطراب لحہ بہ لحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ دربار میں علماء امراء' وزراء اور عمائدین خاص مہر بہ لب پریشان حال کھڑے تھے۔ ان کی بے چین نگاہیں خلیفہ کے چہرے پر لگی تھیں۔ جس پر زردی کھدی ہوئی تھی۔ جعفر برمکی دربار عالی میں داخل ہوا تو ہر کوئی تعظیم شاہی بجا لایا۔ میں جعفر کے پیچھے تھا۔ مسند خلافت کے قریب علماء کی قطار میں ایک دبلا پتلا بوڑھا یہودی منجم کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ جعفر برمکی نے خلیفہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو خلیفہ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

"جعفر تم کہاں تھے؟"

جعفر برمکی نے پوچھا کہ نصیب دشمناں خیر تو ہے؟ خلیفہ نے یہودی نجومی کی طرف

اشارہ کر کے بتایا کہ یہ ایک فاضل اجل نجومی ہے۔ اپنے فن میں کامل ہے۔ اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے دو پیش گوئیاں کیں جو درست ثابت ہوئیں۔ اب اس نے میری فرمائش پر میرا زائچہ بنا کر بتایا ہے کہ میری زندگی کا صرف ایک برس باقی رہ گیا ہے۔ سوچتا ہوں خدا کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ ساری زندگی اس کو کبھی دل سے یاد نہ کیا۔ یہ کہہ کر خلیفہ کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ جعفر برمکی نے خلیفہ کے دل سے یہودی نجومی کی پیش گوئی کے برے اثرات کو زائل کرنے کی ہزار کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ خلیفہ ہارون الرشید کے دل میں نجومی کی بات بیٹھ گئی تھی۔ چونکہ وہ نجومی کی دو پیش گوئیوں کو سچ ثابت ہوتے دیکھ چکا تھا اس لئے اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کی زندگی کے بارے میں بھی نجومی کی ہر پیشین گوئی درست ہو گی اور ایک برس بعد وہ اس جہان فانی سے کوچ کر جائے گا۔

میں خاموش تماشائی بنا یہ سب کچھ چشم حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ جعفر برمکی نے چہرہ گھما کر یہودی منجم کی طرف غضبناک نظروں سے دیکھا۔ عاقبت نااندیش نجومی خوف سی بید مجنوں کی شاخ کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ متاسف تھا کہ اس نے خلیفہ کے آگے ایسی پیش گوئی کیوں کر دی۔ لیکن زبان کی کمان سے تیر نکل چکا تھا اور اب وہ واپس نہیں آ سکتا تھا۔

آپ کو عباسی دور میں واپس لے جانے سے پہلے ایک دل چسپ واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں جو میرے ساتھ گذرا۔ یہ واقعہ میرے ساتھ اسی آپ کے شہر کراچی میں گذرا۔ میں آپ کی دنیا میں کسی سے بھی زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا۔ اس خیال سے کہ میری شخصیت کا اصل راز کہیں فاش نہ ہو جائے۔ میں یہاں اپنے حیرت انگیز راز کو سینے میں چھپائے اس انتظار میں بیٹھا ہوں کہ تاریخ کے سمندر کی اگلی موج مجھے اٹھا کر وقت کے کونسے عہد میں لے جاتی ہے۔ میں اپنے مستقبل سے قطعاً بے خبر ہوں۔ مجھے کچھ علم نہیں کہ آگے چل کر میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور کب اور کس وقت اچانک آپ کے شہر سے غائب ہو جاؤں گا۔ صرف ہفتے میں ایک بار شہر جاتا ہوں۔ جڑی بوٹیاں فروخت کر کے ضرورت کی کچھ چیزیں خرید کر واپس اپنے کاٹج میں آ جاتا ہوں۔ سوائے کاغذ، قلم، کپڑوں، گیس اور بجلی کے بل کے میرا کوئی خرچ نہیں ہے۔ سارا دن سفر نامہ لکھنے میں گزر جاتا ہے۔ میں اس لئے بھی ہر نشست میں آپ کو تاریخ عالم کے زیادہ سے زیادہ واقعات سنا ڈالنے کی کوشش کرتا ہوں کہ .... کچھ پتہ نہیں کہ وقت کی لہر مجھے کب اٹھا کر ماضی کے کسی دورافتادہ عہد میں پھینک دے۔

یہی وہ راز ہے جو میں آپ کی دنیا کے کسی انسان پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو روزمرہ زندگی کے ہنگاموں سے یہاں محفوظ کر لیا ہے کہ کہیں میرے ساتھ کوئی ایسا حادثہ نہ ہو جائے کہ لوگوں پر میرے غیر فانی ہونے کا راز فاش ہو جائے۔ چنانچہ اس رات بھی سفر نامہ لکھنا بند کر کے میں نے کافی بنائی۔ اس کی ایک پیالی پی اور سیر کرتے کرتے ساحل سمندر پر دور نکل گیا۔ سمندر مجھ سے بائیں ہاتھ پر کچھ فاصلے پر رہ گیا تھا اور میرے سامنے اور داہنی جانب سنگلاخ چھوٹی چھوٹی ٹیکریاں تھیں جن کے درمیان ایک کچی سڑک جا رہی تھی۔ رات کا پہلا پہر تھا اور سارے علاقے پر ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مشرق کی جانب سنگلاخ ٹیکریوں کے اوپر گیارہ یا شاید بارہ تاریخ کا زرد چاند نکل آیا۔ جوں جوں وہ

اوپر کھلے آسمان میں آ رہا تھا زیادہ چمکیلا ہو رہا تھا اور اس کی دھندلی روشنی بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔ ایک عرصے بعد مجھ پر اس دھندلی چاندنی رات نے سحر طاری کر دیا۔ میں ٹیکریوں اور کہیں کہیں اگی ہوئی خشک جھاڑیوں میں سے ہوتا آگے بڑھتا رہا۔ اس ویرانے میں ایک ہول سا چھایا ہوا تھا۔

ٹیکریوں کے درمیان جو کچی جاتی تھی مجھے اس سڑک پر ایک کار بڑی تیزی سے جاتی دکھائی دی۔ کار کی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ پھر وہ بڑی تیزی سے ٹیلوں میں ایک طرف گھوم گئی۔ اس کے ساتھ ہی تیز آواز کے ساتھ بریک لگنے کی صدا گونجی۔ میں سوچنے لگا کہ شاید کراچی کے کھلنڈرے نوجوان ہوں گے اور ٹریننگ کرتے پھر رہے ہیں کہ اتنے میں ایک عورت کی چیخ ..... بلند ہوئی۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ میں چیخ..... کی طرف لپکا۔ مجھے چاہئے تھا کہ ذرا چھپ کر جاتا اور صورت حال کا جائزہ لیتا۔ مگر چوں کہ موت کے خوف سے بے نیاز تھا۔ اس لئے بھاگ کر بے دھڑک ٹیکری کے عقب میں آ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مہکی مہکی چاندنی میں تین آدمیوں نے ایک گورے رنگ کی خوبصورت لڑکی کو گھیر رکھا ہے۔ لڑکی کے بال کھلے..... اوز لباس آستین سے غائب ہو گیا ہے۔ ان آدمیوں نے چہروں پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ ان کے ارادے اچھے نہیں تھے لیکن ایک اجنبی کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے۔ ایک آدمی نے چلا کر دوسرے سے کہا۔ "منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ اس عینی گواہ کو ختم کر دو۔"

دوسرے آدمی نے پلک جھپکتے ہی پستول نکالا اور مجھ پر فائر کر دیا۔ میں ان لوگوں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ایک طرح سے بالکل ان کی زد میں تھا۔ گولی پستول سے نکل کر سیدھی میرے سینے میں بائیں جانب لگی اور دل کے ایک کونے میں گھس کر پیچھے سے نکل گئی۔ مجھے نہ تو جھٹکا لگا اور نہ کسی طرح کا درد محسوس ہوا اور نہ خون کا ایک قطرہ بہا اور نہ میں زخمی ہو کر گرا۔ میں فوراً اچھل کر ایک طرف جھک گیا۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ مجھے گولی نہیں لگی۔ اب دوسرے آدمی نے بھی پستول نکال لیا اور مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اور کچھ گولیاں میرے کاندھے اور سر کے قریب سے ہو کر گزر گئیں اور دو تین گولیاں میری گردن اور سر پر بھی لگیں مگر وہی ہوا کہ گردن اور سر کے زخم اپنے آپ آپس میں مل کر بند ہو گئے۔

اب میرے مر نہ سکنے کے راز کے کھل جانے کا خطرہ تھا۔ کیوں کہ گولیاں مجھ پر سیدھی آ رہی تھیں اور وہ ڈاکو یا جرائم پیشہ آدمی بھی میرے سر پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ میں بعد میں کسی کو یقین نہیں دلا سکتا تھا کہ گولیاں مجھے نہیں لگی تھیں۔ چنانچہ میں نے

جوابی حملہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی جگہ سے اچھل کر دونوں آدمیوں کی گردنیں دبوچ لیں۔ انہیں میری مافوق الفطرت طاقت کا احساس ہو گیا تھا۔ کیوں کہ میرے ایک ایک ہاتھ کی گرفت ان کی گردنوں پر تھی اور ان کا دم گھٹ رہا تھا اور زبانیں باہر نکل آئی تھیں۔
دونوں آدمی بے ہوش ہو چکے تھے۔ میں نے انہیں چھوڑا اور تیسرے غنڈے کی طرف بڑھا۔ اس نے ایک لمبا چاقو نکال لیا اور مجھ پر حملہ آور ہوا۔ احمق آدمی تھا۔ مجھے تنہا دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

میں نے اسے کہا بھی کہ اپنے دونوں ساتھیوں کو لے کر یہاں سے بھاگ جاؤ۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا مگر اس پر تو جیسے کوئی بھوت سوا تھا اور پھر وہ اس گھناؤنے کیس میں مجھے عینی گواہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ غضب ناک انداز میں چاقو لہراتا مجھ پر آن گرا۔ میں نے ایک ہاتھ آگے کر دیا۔ اس کے چاقو کی نوک میری ہتھیلی کے اندر گھس گئی مگر اس بار بھی نہ خون کا کوئی قطرہ نکلا اور نہ مجھے ایک لمحے کے لئے درد محسوس ہوا۔ اس نے چاقو پیچھے نکال کر دوسرا حملہ کرنا چاہا تو میں نے اسے بھی گردن سے پکڑ کر ذرا سا آگے کو جھٹکا دیا۔ میں ان میں سے کسی کو ہلاک کر کے اپنے اوپر خوامخواہ کا کوئی کیس نہیں بنانا چاہتا تھا۔ لڑکی سہمی ہوئی نظروں سے یہ سارا سنسنی خیز ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ میرے ساتھ جھٹکا کھا کر وہ غنڈہ بھی منہ کے بل زمین پر ایسا گرا کہ اس کا سر پتھر سے ٹکرا گیا اور وہ بھی بے ہوش ہو گیا۔

لڑکی بے چاری تھر تھر کانپ رہی تھی۔ شکل و صورت اور لباس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ امیر گھرانے کی لڑکی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ بی بی اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ گاڑی سٹارٹ کرو اور چلی جاؤ اور اگر تم پولیس میں رپورٹ درج کراؤ تو میرا ذکر نہ کرنا۔ میں مقدمے بازیوں میں نہیں الجھنا چاہتا۔ لڑکی نے کانپتی آواز میں کہا۔
"خدا کے لئے میرے ساتھ شہر تک چلیں، مجھے خوف آ رہا ہے۔"
میں کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور بڑی تیزی سے گاڑی وہاں سے نکال کر کچی سڑک پر آ گئی اور شہر کی طرف رخ کر لیا۔ جب مجھے اپنا کاٹیج بائیں جانب کچھ فاصلے پر دکھائی دیا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے یہیں اتار دے۔ اب وہ محفوظ ہے اور اکیلی اپنے گھر چلی جائے۔ لڑکی کا تو دہشت کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔
"خدا کے لئے مجھے میرے بنگلے تک چھوڑ آئیں۔ میرا ڈرائیور آپ کو جہاں جانا چاہیں گے پہنچا دے گا۔ پلیز۔"

میں اس معاملے میں اپنے آپ کو اتنا ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن لڑکی کی التجا نے مجھے اس امر پر مجبور کر دیا کہ میں اسے گھر تک پہنچا دوں۔"

گاڑی کراچی شہر کی طرف تیزی سے جا رہی تھی۔ لڑکی نے مجھے اپنا نام شبانہ بتایا۔ وہ کراچی کے ایک صنعت کار کی بیٹی تھی اور اپنی سہیلی کو اس کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد واپس گھر جا رہی تھی کہ ان غنڈوں نے سڑک پر رکاوٹ کھڑی کر کے گاڑی رکوا لی۔ اس کے بعد کے حالات کا مجھے علم ہی تھا۔ وہ ابھی تک سہمی ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے التجا کی کہ میں اس واقعے کا ذکر کسی سے نہ کروں۔ پھر پوچھنے لگی۔ "غنڈے اگر مر گئے ہیں تو پولیس کو پتہ چل جائے گا۔ میرے خاندان کی بدنامی ہو گی۔" میں نے اسے تسلی دی کہ غنڈے بے ہوش ہوئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں مرا۔ وہ خدا کا شکر ادا کرنے لگی کہ غنڈوں نے مجھ پر فائرنگ کی مگر گولی مجھے نہ لگ سکی۔

وہ مجھ سے میرا نام اور حسب و نسب پوچھنے لگی۔ میں نے اسے اپنا نام جمشید بتایا اور کہا کہ میں کراچی میں چھوٹا موٹا بزنس کرتا ہوں۔ وہ میرے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے بارے میں استفسار کرنے لگی کہ کیا وہ بھی میرے ساتھ رہتے ہیں؟ ان باتوں سے میں بچنا چاہتا تھا۔ وہ ایسی باتیں معلوم کرنا چاہتی تھی جو میں اسے بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ "بی بی' ان باتوں کا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے مجھ سے ایسے سوال مت کرو جن کا میں جواب نہیں دینا چاہتا۔" وہ خاموش ہو گئی۔ پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ سمجھ گئی کہ میں نہیں چاہتا کہ وہ میری ذات کے بارے میں سوالات کرے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ شبانہ نے میرے سینے پر گولی لگتے نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ میری زندگی کے سب سے قیمتی اور پراسرار راز کے فاش ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔

گاڑی کراچی شہر کے ایک فیشن ایبل علاقے میں پہنچنے کے بعد ایک کوٹھی کے پورچ میں داخل ہو گئی۔

شبانہ مجھے گاڑی میں چھوڑ کر اندر کوٹھی میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک لڑکی اور بھی تھی جو اس کی سہیلی تھی۔ شبانہ نے اسے بتا دیا تھا کہ میں نے اس کی جان بچائی ہے اور وہ مجھے دیکھنے آئی تھی۔ برآمدے میں روشنی بڑی ہلکی تھی۔ مجھے اس کی سہیلی کے خد و خال کچھ مانوس دکھائی دیئے۔ مگر میں نے کوئی خیال نہ کیا لیکن جب شبانہ کی سہیلی گاڑی کے قریب آئی اور مجھے جھک کر سلام کیا تو مجھ پر ایک دم سے جیسے بجلی سی گر پڑی۔ شبانہ کی سہیلی کی شکل آج سے پانچ ہزار سال پہلے میری بیوی سارا سے ہو بہو ملتی تھی۔ میں بے اختیار گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا اور ٹکٹکی باندھے شبانہ کی سہیلی

کو تکنے لگا۔ وہی گورا رنگ' ہلکی بھوری آنکھیں' ستواں ناک' گھنگریالے سیاہ بال۔ وہ مسکراتی ہوئی شکریہ ادا کر رہی تھی کہ میں نے اس کی سہیلی کی عین وقت پر مدد کی اور اسے غنڈوں سے بچا لیا۔ ایک لمحے کے لئے تو میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ میں عاطون ہوں اور میری پیاری بیوی سارا میرے سامنے کھڑی ہے لیکن میں بہت جلد سنبھل گیا۔ میرے دل نے مجھ سے کہا کہ یہ تمہاری بیوی سارا نہیں ہے بلکہ اتفاق سے اس کی شکل تمہاری بیوی سے ملتی ہے اور ہزاروں سال کے سفر میں شکلیں ایک دوسرے سے مل جایا کرتی ہیں۔ ہمیں صرف زیادہ سے زیادہ سو برس کی شکلیں یاد ہوتی ہیں۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد کے چہرے ہمارے شعور میں نہیں ہوتے۔

چنانچہ میں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ اگرچہ شبانہ کی سہیلی میری قدیم زمانے کی بیوی سارا کی ہم شکل ہے پھر بھی وہ ایک اجنبی خاتون ہے۔ میں کسی طرح بھی اس سے بے تکلف ہو کر گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے رسمی طور پر دو چار باتیں کیں۔ شبانہ نے اپنی سہیلی کا نام روبی بتایا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔

شبانہ اپنی سہیلی روبی سے اجازت لے کر گاڑی میں بیٹھی اور ہم کوٹھی کے پورچ سے باہر نکل آئے۔ میں نے راستے میں باتوں ہی باتوں میں روبی کے بارے میں کہا کہ وہ بڑی شائستہ لڑکی ہے۔ شبانہ نے روبی کے بارے میں بتایا کہ وہ ایک مقامی کالج میں نفسیات میں ایم اے کر رہی ہے اور اس کا باپ ڈاکٹر ہے۔ میں نے روبی کی کوٹھی کے اردگرد کے علاقے کو ذہن میں بٹھا لیا تھا۔ یہ کام میرے شعور نے غیر شعوری طور پر کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ روبی میری بیوی سارا کی ہم شکل تھی اور میں اسی نسبت سے روبی کو دوبارہ دیکھنا چاہتا تھا۔

شبانہ کی کوٹھی بہت بڑی تھی۔ کشادہ باغ میں ٹیوب لائٹس تھیں۔ معلوم ہوا کہ ان کے گھر میں کافی آزادی ہے اور لڑکی اگر گیارہ بجے رات کو گھر واپس آ کر یہ کہہ دے کہ وہ اپنی سہیلی کے پاس بیٹھی تھی تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ واپسی پر شبانہ نے ڈرائیور ساتھ کر دیا۔ اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا اور گاڑی مجھے لے کر اس کشادہ سڑک پر آ گئی جو شہر سے باہر نکل کر ساحل سمندر کی طرف جاتی تھی۔

گاڑی سمندر کے کنارے ویرانے میں پہنچی تو میں نے اسے رکوا دیا۔ ڈرائیور حیرانی سے مجھے تکنے لگا کہ میں اس ویرانے میں کہاں اتر گیا ہوں۔ مگر میں خاموشی سے سمندر کی طرف چل پڑا۔ مجھے اپنے پیچھے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے اور واپس مڑنے کی آواز آئی۔ پھر یہ آواز کچھ دور جا کر غائب ہو گئی۔ میں نے شبانہ کی سہیلی روبی کو ذہن سے نکال دیا تھا مگر اب

میرے ذہن میں سارا چھائی ہوئی تھی۔ وہ مجھے اتنی یاد آ رہی تھی کہ اس سے پہلے کبھی اتنی یاد نہیں آئی تھی۔ ایک دن اور ایک رات کی جدوجہد کے بعد اب اس قابل ہوا ہوں اپنا سفر نامہ ضبط تحریر میں لاتے ہوئے آپ کو ایک بار پھر واپس مسلمانوں کے درخشاں عہد عباسیہ میں لے چلوں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے اپنا سفر نامہ اس مقام پر ختم کیا تھا جہاں میں سلطنت عباسیہ کے جلیل القدر اور عقل و دانش' فہم و فراست' سیاست و سخاوت میں یکتا و یگانہ وزیر اعظم جعفر برمکی کے ہمراہ خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں داخل ہوا تھا۔ کیوں کہ خلیفہ وقت کو ایک یہودی نجومی زائچہ بنا کر یہ بتا دینے کی حماقت کر بیٹھا تھا کہ خلیفہ کی زندگی کا صرف ایک برس باقی رہ گیا ہے۔ دربار عالی میں سناٹا چھا گیا تھا اور خلیفہ ہارون الرشید مسند خلافت پر اندوہگیں و پریشان حال بیٹھا تھا۔ آنکھوں سے اشک رواں تھے اور چہرے پر موت کے خیال سے زردی ہویدا تھی۔ تمام درباری امراء اور علماء کرام دست بستہ خاموش کھڑے تھے۔ ان کے درمیان ایک دبلا پتلا بوڑھا یہودی منجم خوف سے کانپ رہا تھا۔

میں عہد عباسی میں وزیر اعظم جعفر برمکی کا ندیم خاص تھا اور میرا نام جرجان بن سعی تھا۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ جعفر برمکی محفل نشاط برپا کئے بیٹھا تھا۔ عباسی دور کا سب سے بڑا گویا اسحق موصلی رباب پر دھیمے سروں میں ایک دلگداز نغمہ چھیڑے ہوئے تھے۔ زرق برق لباس پہنے' ہند و یونان کی شعلہ رو کنیزیں چاندی کی صراحیوں میں مشروب لئے ادب سے کھڑی تھیں کہ دربار کا شاہی حاجب گھبرایا ہوا داخل ہوا اور اس نے یہ الم انگیز خبر سنائی کہ ایک نابکار یہودی منجم کی پیش گوئی نے آل عباس کا سکھ چین چھین لیا ہے۔ اور شاہی محل میں کہرام بپا ہے اور خلیفہ نیم بے ہوش ہے۔ جعفر برمکی نے سونے کا منقش پیالہ وہیں رکھ دیا اور مجھے ساتھ لے کر اسی وقت شاہی دربار کی طرف روانہ ہو گیا۔

شاہی دربار میں موت کا سناٹا تھا۔ امراء' وزراء' علماء' اور عمائدین مہر بہ لب سر جھکائے کھڑے تھے - پردے کے پیچھے ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ اور بہن عباسہ کا چہرہ اترا ہوا تھا اور اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ جعفر برمکی کو دربار میں داخل ہوتے دیکھ کر سب کو حوصلہ ہوا کہ شاید اس نابغہ روزگار کی بصیرت اور فراست اس دود لا دوا کا کوئی مداوا کر سکے۔ میں ندیم خاص کی حیثیت سے جعفر برمکی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دربار میں آتے ہی میں اس سے الگ ہو کر آداب شاہی کے مطابق علماء کی صف میں دس بستہ جا کھڑا ہوا۔ جعفر برمکی نے سیاہ ریشمی لباس پہن رکھا تھا جس میں سے اس کا سرخ و سپید حسین چہرہ چاند کی طرح نکلا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی بادشاہ کی خیریت دریافت کی - خلیفہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"جعفر تم نے دیر کیوں لگا دی۔ دیکھو ہم پر کیا گذر رہی ہے۔ ہم ایک برس بعد اس

دار فانی سے کوچ کرنے والے ہیں۔"

یہ کہہ کر خلیفہ کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ جعفر برمکی نے خلیفہ ہارون الرشید کو یہ کہتے ہوئے تالیف قلب کی کوشش کی کہ زندگی اور موت اللہ جل شانہ کے ہاتھ میں ہے اور موت کے وقت کا سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کے اور کسی کو علم نہیں ہے اور منجم محض قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ سیارگان کسی انسان کی موت کا تعین نہیں کر سکتے لیکن یہودی نجومی کا وار اپنا کام کر چکا تھا۔ خلیفہ کو یقین ہو گیا تھا کہ چوں کہ نجومی کی پہلی پیش گوئی بھی درست ثابت ہوئی ہے - اس لئے اس پیش گوئی میں بھی کوئی کلام نہیں کہ خلیفہ کی عمر صرف باقی ایک سال رہ گئی ہے۔

جب جعفر برمکی کی ساری کوششیں ناکام ہو چکیں تو اس کے ذہن میں فطین نے ایک تجویز پیش کی اور جعفر نے یہودی نجومی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"او نابکار! تیرے قیاسی زائچے نے امیر المومنین کی زندگی کا سکھ چھین لیا ہے اور میں تم سے کہتا ہوں کہ اب تو اپنا زائچہ بنا کر بتا کہ تیری زندگی کے کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔"

یہودی نجومی کا برا حال تھا۔ اپنے بال نوچ رہا تھا کہ اس نے امیرالمومنین سے ایسی بات کیوں کہہ دی۔ جعفر برمکی کا سوال سن کر اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔

"حضور انور! میں نے دو سال پہلے اپنی زندگی کا زائچہ بنایا تھا۔ اس زائچے کے حساب سے ابھی میری زندگی کے تیس برس باقی ہیں۔"

جعفر برمکی نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا زائچہ یہ کہتا ہے کہ تم تیس برس سے پہلے نہیں مر سکتے۔"

نجومی نے سر جھکا کر کہا۔ "آپ نے بجا فرمایا عالی جاہ! اس کمترین کو تیس برس سے پہلے موت نہیں آ سکتی۔"

دربار میں ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔ ہر کوئی بے تابی کے عالم میں جعفر برمکی اور یہودی نجومی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں بھی خاموش کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اور میرے ذہن میں اس مسئلے کا کوئی حل نہیں آ رہا تھا۔ مجھ سے دو چار قدم کے فاصلے پر شاہی مسند کے قریب شاہی جلاد جنید ختنلی یوں کھڑا تھا کہ اس کا ایک ہاتھ اس کی کمر سے بندھی ہوئی تلوار کے دستے پر تھا اور دوسرا ہاتھ سینے پر ٹکا تھا۔ اس شاہی جلاد کی سنگ دلی کا دور دور تک شہرہ تھا۔ اپنے فن میں ایسا ماہر تھا کہ گردن کٹنے کے بعد بھی مجرم کے کٹے ہوئے سر کی آنکھیں کچھ دیر جھپکتی رہتی تھیں گویا مجرم کو ابھی تک یقین نہ آیا ہو کہ اس کی گردن کاٹ دی گئی ہے۔

جب یہودی نجومی نے جعفر برمکی کو بتایا کہ وہ ابھی نہیں مر سکتا اور زائچے کی رو سے

اور سبع سیارگان کے حساب سے ابھی اس کی زندگی کے تیس برس باقی ہیں تو جعفر برمکی نے شاہی جلاد ختلی کی طرف دیکھا۔ شاہی جلاد سمجھ گیا کہ وزیر اعظم کا اشارہ ابرو کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے لپک کر یہودی نجومی کو گردن سے دبوچا اور گھسیٹتا ہوا اس مقام پر لے گیا جہاں باغیوں، قاتلوں اور شرپسندوں کی گردنیں اتاری جاتی تھیں۔ اس وقت یہودی نجومی کو شاہی جلاد کے آدمیوں نے مشکیں کس کر پتھر کی سل پر بٹھایا اور جلاد ختلی کی تلوار فضا میں لہرائی۔ دوسرے لمحے یہودی نجومی کا سر تن سے جدا ہو کر سنگ مرمر کے فرش پر پڑا تھا۔ جلاد ختلی نے بدقسمت یہودی کا سر اٹھا کر طشت پر رکھا اور جعفر برمکی کے سامنے پیش کر دیا۔ جعفر برمکی نے بڈھے یہودی نجومی کا سر بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ دربار میں ہو کا عالم تھا۔ ہر کوئی یہودی کے کٹے ہوئے سر کو دیکھ رہا تھا۔

جعفر برمکی نے خلیفہ کی طرف چہرہ اٹھا کر کہا۔

"امیر المومنین! جس شخص کا زائچہ اس کی اپنی زندگی کے بارے میں جھوٹ بولتا ہے وہ آپ کی زندگی کے بارے میں سچی پیش گوئی کیسے کر سکتا ہے؟ ثابت ہوا کہ زائچے سیاروں کی چال دیکھ کر زندگی کے معمولی واقعات کی پیش گوئی اور قیاس آرائی کر سکتے ہیں مگر زندگی اور موت کا علم خدا کے سوا اور کسی کو نہیں ہے۔ چنانچہ آپ کی زندگی کے بارے میں اس نابکار نے جو پیش گوئی کی تھی سراسر غلط تھی۔ خدا ظل الٰہی کو ہزار سال زندہ رکھے۔"

دربار میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہر شخص کا چہرہ کھل اٹھا۔ خلیفہ ہارون الرشید کو جیسے نئی زندگی مل گئی تھی۔ چہرے پر سے موت کی پرچھائیاں ہٹ گئیں۔ اس نے جعفر برمکی کو اٹھ کر سینے سے لگا لیا اور اس کا ماتھا چوم کر کہا۔

"جعفر! تمہاری دانشمندی سے مجھے نئی زندگی ملی ہے۔"

لیکن خلیفہ ہارون الرشید کے دل میں ایک بات بری طرح کھٹک رہی تھی۔ جس کا ذکر اس نے بعد میں اپنے حاجب خاص سے کیا تھا اور اس نے یہ بات بتائی تھی۔ خلیفہ ہارون الرشید ایک جلیل القدر سلطنت کا مطلق العنان بادشاہ تھا اور اس کے وزیر جعفر برمکی نے اس سے اجازت طلب کئے بغیر شاہی دربار میں ایک آدمی کی گردن کٹوا دی تھی جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا نکل سکتا تھا کہ آل برمک کو اب اتنی جرات ہو گئی تھی کہ وہ خلیفہ سے پوچھے بغیر شاہی جلاد کو حکم دے کر جس کی چاہیں گردن مار دیں۔

امیر المومنین کی تالیف قلب ضرور ہو گئی تھی۔ اسے جعفر برمکی نے ایک بار پھر ایک نئی زندگی سے ضرور ہمکنار کر دیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی خلیفہ کے دل میں برامکہ خاندان کی ہوس اقتدار کے خلاف ایک اور گرہ ضرور پڑ گئی تھی۔ کچھ گرہیں پہلے ہی پڑ چکی تھیں۔

کیوں کہ اس حقیقت کو عباسی دربار میں وارد ہونے کے بعد ہی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ امور سلطنت میں آل برامکہ کا بڑا زبردست عمل دخل ہے۔ میں جعفر برمکی کے ساتھ ہی واپس اس کے عالی شان محل میں آ گیا۔ میں جعفر برمکی کے ندیم خاص کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہ رہا تھا۔ وہ مجھ پر بڑا بھروسہ کرتا تھا۔ میں نے اس کے سلوک سے اندازہ لگایا کہ وہ مجھے اپنا دست خاص سمجھتا ہے اور یہ توقع رکھتا ہے کہ میں اس کی جان بچانے میں اپنی زندگی کی بھی پروا نہیں کروں گا۔ مجھے اس حقیقت کا بھی علم ہوا کہ اس نے مجھے جرجان بن سعی کی حیثیت سے ایک غلام کی شکل میں خریدا تھا اور میری عقل و ذہانت کے باعث مجھے اپنے ندیم خاص کا درجہ عطا کیا۔ اس کے ذہن میں میرے بارے میں اس طاقت نے جو مجھے صدیوں سے تاریخ کے سفر پر چلا رہی تھی۔ ایسی ہی یادداشت محفوظ کر دی تھی کہ میں ایک غلام کی حیثیت سے خریدا گیا ہوں اور میرا نام جرجان بن سعی ہے اور میری عقل و فراست نے مجھے اس کے ندیم خاص کا درجہ عطا کروایا ہے۔ ہر عہد میں جب میں کسی نہ کسی نئے ماحول میں نمودار ہوتا تو میری حیثیت کا تعین یوں ہی کیا جاتا تھا۔

جعفر برمکی کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ وہ مجھے ایک ذہین و فطین دوست اور محافظ سمجھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وقت آنے پر میں اس کی زندگی کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے سکتا ہوں۔ مگر اسے یہ ہرگز معلوم نہیں تھا کہ میں پانچ ہزار سال سے زندہ چلا آ رہا ہوں اور نہ جانے کب تک زندہ رہوں گا۔

آخر ایک وقت ایسا آ گیا کہ وہ میری زندگی کے اس سب سے گہرے اور قیمتی راز سے واقف ہو گیا۔ آل برامکہ کے جہاں دوست اور غمخوار اور مداح خواں بہت تھے۔ وہاں کچھ ایسے دشمن بھی تھے جو عرب سلطنت پر عجم کے بڑھتے ہوئے اثرات اور پنجہ اقتدار کو آہستہ آہستہ آگے بڑھتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

لیکن سب سے پہلے میں آپ کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ برامکہ کون تھے اور آل برامکہ کہاں سے چلی۔ ملک ایران کی آتش پرستی کے عہد میں میں موہنجوڈرو میں تھا اور مجھے بلخ و بخارا جانے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن موصل کے ایک قدیم کے کتب خانے میں میں ایک بار آتش پرستوں کی تاریخ پڑھ رہا تھا تو میں نے ایک ذی شان اور باوقار آتش پرستوں کے خاندان کے بارے میں ایک باب دیکھا جس میں لکھا تھا کہ برامکہ نام کا ایک آتش پرست بخارا میں رہا کرتا تھا۔ اس شہر میں آتش پرستوں کا ایک بہت بڑا معبد تھا جہاں آگ کی پوجا ہوتی تھی۔ برامکہ اس معبد کا ایک پجاری تھا۔ وہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ بلخ سے آ کر بخارا میں آباد ہو گیا تھا جو سلطنت ایران کا ایک تاریخی شہر تھا اس شخص برامکہ کا

خاندان فراست، تدبر، سیاست کاری، سخاوت، چالاکی میں سارے بلخ و بخارا میں مشہور تھا۔ علم و دانش میں بھی اس شخص کا کوئی جواب نہیں تھا۔ پاژند و اوستا آتش پرستوں کی دونوں مقدس کتابیں اس کو ازبر تھیں اور وہ علم و حکمت کی باتیں کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔

یہ بنو امیہ کے زوال کا دور تھا اور ابو مسلم خراسانی خلافت عباسیہ کی داغ بیل ڈال رہا تھا۔ برامک فوت ہو چکا تھا۔ اس کا بیٹا خالد علم و حکمت اور تدبر و دوراندیشی میں اپنے باپ سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ اسی دور میں خالد نے اسلام قبول کر لیا اور پھر ابو مسلم خراسانی کی فوج میں داخل ہو گیا۔ ایسا گوہر یگانہ کیسے چھپا رہ سکتا تھا۔ ابو مسلم خراسانی نے اس گوہر یک دانہ کی چمک دمک دیکھ کر اسے فوج میں ایک اعلیٰ عہدہ دے دیا۔ بنو امیہ کی فوجوں سے میدان کارزار میں ایک آخری معرکہ گرم ہوا جس میں اموی فوجوں کو شکست ہوئی۔ افق بغداد پر آل عباس کا سورج طلوع ہوا اور ابوالعباس مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوا۔ خالد نے اپنی فصاحت و بلاغت سے خلیفہ پر اپنا اس قدر اثر ڈالا کہ وہ ایک عجمی کو اس قدر بلیغ عربی میں بات کرتے دیکھ کر اس کا مداح ہو گیا اور اسے اہم عہدے پر فائز کر دیا۔ اس کلیدی عہدے پر فائز ہوتے ہی خالد نے ایسے ضابطے وضع کئے جو عجمی تھے اور اس سے بیشتر عرب حکمران ناواقف تھے۔ خوش قسمتی سے ان ضابطوں کا نتیجہ حکمران کے حق میں بہت مفید نکلا۔ جس کی وجہ سے خالد برمکی خلیفہ کے اور قریب ہو گیا۔ اب وہ اپنے تدبر اور جوڑ توڑ سے خلیفہ کے دل و دماغ پر حکمرانی کرنے لگا۔ خلیفہ ابوالعباس سفاح اس سے مشورہ لئے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ جب منصور خلیفہ تھا تو اس نے خالد برمکی کو وزیر خزانہ کا اہم عہدہ سونپ دیا۔ خالد برمکی نے اپنا اثر و رسوخ بنانے کے لئے لوگوں میں خزانے کی دولت بے دریغ لٹانی شروع کر دی۔ خلیفہ منصور کے ایک وزیر نے یہ کہہ کر خالد برمکی کے خلاف خلیفہ کے کان بھرے کہ یہ شخص ایرانی اثرات کی تبلیغ و اشاعت کے لئے سرکاری خزانے کو بے محابا استعمال کر رہا ہے۔ خلیفہ نے خالد برمکی کو طبرستان اور رے کی عمل داری دے دی اور بغداد سے فارغ کر دیا لیکن یہ سب کچھ قدرت کی منشا کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ رے میں ہارون الرشید کے والد مہدی کا خاندان آباد تھا۔ اس شہر میں برمکی خاندان کے ہاروں الرشید کے والد مہدی کا خاندان آباد تھا۔ اس شہر میں برمکی خاندان کے ہارون الرشید کے خاندان سے تعلقات مربوط ہوئے۔ ہارون الرشید کی ولادت کے بعد آل برامکہ کی خواتین نے ہارون الرشید کو اپنا دودھ پلایا تو یہ تعلقات مزید گہرے ہو گئے۔

خلیفہ منصور کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا مہدی سربراہ سلطنت ہوا۔ خالد کا بیٹا یحییٰ برمکی جوڑ توڑ اور سیاست کاری میں اپنے باپ سے بھی دو قدم آگے تھا۔ وہ بہت جلد اپنے نوجوان

خلیفہ کا ہم دم و ہم جلیس بن گیا۔

فضل اور جعفر برمکی یحییٰ کے بیٹے تھے جو حکمت و تدبر میں اپنے باپ سے کسی طرح کم نہ تھے۔ ہارون الرشید خلیفہ ہوا تو امور سلطنت پر یحییٰ برمکی حاوی تھا۔ خلیفہ کوئی کام یحییٰ برمکی سے صلاح لئے بغیر نہ کرتا تھا۔ یحییٰ برمکی نے اپنی ہی مرضی کے مطابق اپنے بیٹے فضل کو خراسان کا گورنر بنوایا۔ فضل برمکی نے خراسان میں ہی عباسی خزانے کے خرچ سے پانچ لاکھ کا ایک لشکر تیار کیا جس میں ایک بھی سپاہی عرب نہیں تھا۔ سارے کے سارے سپاہی غیر عرب اور ایرانی تھے۔ ان کا سارا خرچ بیت المال سے ادا کیا جاتا تھا۔ ہارون الرشید کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے فضل برمکی کو وزارت عظمیٰ کا عہدہ سونپ دیا اور خراسان کی عمل داری سے سبکدوش کر دیا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد ہارون الرشید نے اسے مشرقی حصے کا امیر بنا دیا اور وزارت عظمیٰ کا عہدہ جعفر برمکی کے حوالے کر دیا۔ یحییٰ، فضل اور جعفر تینوں باپ بیٹوں نے امور سلطنت میں بے حد اثر و رسوخ بڑھا لیا تھا اور یہ اپنی مرضی سے لوگوں میں بڑے بڑے منصب تقسیم کرتے تھے۔ ان کے عظیم الشان محلات تھے جن میں سرسبز و شاداب کشادہ باغات تھے اور نہریں بہتی تھیں۔ ان کی سالانہ آمدنی کروڑوں دینار سے تجاوز کر گئی تھی۔ وہ شاعروں اور اپنے خوشامدیوں اور بہی خواہوں میں لاکھوں دینار لٹا دیتے تھے۔

برامکہ کے عروج کا زمانہ تھا جب میں یعنی عاطون جعفر برمکی کے ندیم خاص کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ اب میں آپ کو وہ واقعہ سناتا ہوں جب جعفر برمکی پر میری شخصیت کا سب سے گہرا راز افشا ہوا۔ جعفر برمکی بہت ذہین اور سخی اور حوصلہ مند تھا مگر اس میں اپنے باپ جیسی چالاکی، معاملہ فہمی اور موقع شناسی نہیں تھی بلکہ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں جعفر برمکی طبعاً" ایک بھولا بھالا انسان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے جگری دوست بھی اس کے کٹر دشمن بن گئے تھے۔ ان میں منصور ابن زیاد کے دل میں جعفر برمکی کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ موجزن تھا۔ بظاہر وہ جعفر برمکی سے بڑی خوشامد اور لجاجت سے پیش آتا لیکن دل میں اس قدر خار رکھے ہوئے تھا کہ اس نے جعفر برمکی کو قتل کرنے کی سازش تیار کر لی۔

اس خونریز سازش کے بارے میں جعفر برمکی کو کچھ علم نہیں تھا حالانکہ اس کے تنخواہ دار مخبر اسے درون خانہ کی ایک ایک منٹ کی خبر لا کر دیا کرتے تھے مگر منصور ابن زیاد بہت زیرک اور چالاک شخص تھا۔ اپنے دل کی بات کبھی زبان پر نہیں لاتا تھا پھر بھی جعفر برمکی جیسے جلیل القدر آدمی کو قتل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا کہ اس کے لئے منصور ابن زیادہ جیسے عیار اور چالباز شخص کی ضرورت تھی۔ اس نے

ایک ایسی چال چلی کہ ایک بار تو جعفر بھی اس میں پھنس گیا۔ منصور نے خراسان کے گورنر سے مل کر جعفر برمکی کو ایک ہندی کنیز بھجوائی جسے علوم ہندی پر بے پناہ عبور حاصل تھا اور قدیم ویدوں کے اسے کئی ابواب زبانی یاد تھے۔ جعفر برمکی جیسے علم پسند شخص کو اس کنیز نے بہت متاثر کیا۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مگر میرے گمان میں یہ بات ہرگز نہیں تھی کہ یہ ہندی کنیز ایک خاص سازش کے تحت جعفر کے پاس پہنچائی گئی ہے۔ اس کنیز کا نام ریپا ولی تھا۔ ریپا ولی قدیم ہندی موسیقی میں بھی ماہر تھی اور دنیا بجاتی تھی۔ وہ جب پراچین ہندی علوم پر جعفر سے باتیں کرتے تھک جاتی تو دنیا پر نغمہ و آہنگ کا جادو چھیڑ دیتی۔ جعفر برمکی پہروں اس کے پاس بیٹھا اس کی موسیقی سنتا رہتا۔

اب ہندی کنیز ریپا ولی نے اپنے منصوبے پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ وہ منصور ابن زیاد سے حاصل کیا ہوا بے ذائقہ ست روز ہر مشروب میں ڈال کر جعفر کو پلانے لگی۔ اس زہر کی تاثیر یہ تھی کہ جگر اور گردوں کے فعل کو آہستہ آہستہ مفلوج کر دیتا تھا اور انسان کی موت واقع ہو جاتی تھی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد جعفر برمکی کی آنکھوں میں حلقے نمودار ہونے لگے اور بھوک کم ہوتی گئی اور چہرے پر تھوڑی تھوڑی سوجن بھی دکھائی دینے لگی۔ شاہی طبیبوں نے تشخیص کی مگر سوائے اس کے ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ جعفر کے جگر میں حدت بڑھ رہی ہے۔

ٹھنڈی ادویات تجویز ہوئیں۔ علاج بھی جاری رہا اور ریپا ولی مشروب میں ملا کر زہر بھی دیتی رہی۔ جعفر کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ میں نے بھی کچھ جڑی بوٹیوں کو کھرل کروا کر ان کا سفوف جعفر کو پلایا۔ مگر زہر خورانی کا سلسلہ چونکہ جاری تھا اس لئے میری جڑی بوٹیوں کا اثر بھی بے کار ہو گیا۔ ایک رات اتفاق سے مجھے جعفر برمکی کے محل خاص کے مشروب خانے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ سنگ ابیض کے تخت پر ظروف مشروب سجے ہوئے تھے۔ اس مختصر سے کمرے میں زربفت کے سنہری جھالر دار پردے لٹک رہے تھے۔ تخت کے ساتھ طلائی چوب کاری سے مزین صندل کی لکڑی کی مستطیل عمارت تھی جس کے اوپر سونے کا ایک شاہین بیٹھا تھا۔ مجھے کمرے کے باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر سرگوشی کی آواز آئی۔ اگر یہ سرگوشی کی آواز نہ آتی تو میرے دل میں ذرا سا بھی شک پیدا نہ ہوتا اور میں وہیں کھڑا رہتا لیکن سرگوشی سے میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ہزاروں برس سے محلاتی سازشوں اور قتل و غارت کے ماحول سے گزر رہا تھا۔ پاؤں خود بخود دیوار پر پڑے ہوئے زربفت کے بھاری پردے کی طرف اٹھے اور پردے کے پیچھے جا کر چھپ گیا مگر اس طریقے سے کہ مشروب خانے کا تقریباً سارا منظر نظروں میں تھا۔

دروازے کا پردہ ہٹا اور ہندی کنیز ریپا ولی مشروب خانے میں داخل ہوئی۔ وہ مشروب لینے آئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ خواہ مخواہ پردے کے پیچھے چھپ کر گناہ گار ہوا۔ اگر کسی باعث ریپا ولی کو معلوم ہو گیا تو بڑی شرمندگی ہو گی۔ بہرحال اب میں اس انتظار میں تھا کہ یہ ہندی کنیز باہر جائے اور میں پردے کے عقب سے نکلوں۔

ریپا ولی صراحی میں سے سونے کے ایک پیالے کو بھر رہی تھی۔ جب وہ پیالہ بھر چکی تو اس نے اپنی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی کا ننھا سا ڈھکن کھولا اور ایک نگاہ اپنے اردگرد ڈالی۔ میں پردے کے پیچھے متجسس اور متحیر تھا کہ یہ کیا کرنے والی ہے۔ یہ تسلی کر کے اسے وہاں کوئی نہیں دیکھ رہا۔ اس نے انگوٹھی کے خول میں پوشیدہ سفید رنگ کا سفوف مشروب کے گلاس میں چھڑکا اور پھر انگوٹھی کا ڈھکن بند کیا اور گلاس طلائی طشتری میں رکھ کر باہر نکل گئی۔

میرے ذہن میں جعفر برمکی کی بیماری کا راز کھل چکا تھا۔ ریپا ولی کسی دشمن کی ایما پر جعفر کو ست رو زہر دے رہی ہے۔ میں پردے کے پیچھے سے نکل آیا۔ جعفر کے سامنے محفل جمی ہوئی تھی۔ اسحاق موصلی رباب پر جادو جگا رہا تھا۔ جعفر مسند پر تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا۔ اس کی آنکھیں آہنگ فسوں ساز کے اثر سے بند تھیں۔ منقش چھت سے قیمتی فانوس لٹک رہے تھے۔ فضا عود و عنبر کی خوشبوؤں سے معمور تھی۔ ریپا ولی نے مشروب کا پیالہ جعفر کے سامنے رکھا تو جعفر نے آنکھیں کھول دیں۔ ریپا ولی نے مسکراتے ہوئے مشروب پیش کیا۔ جعفر نے پیالہ تھام لیا۔ میں جعفر کی مسند کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ جعفر برمکی پیالہ ہونٹوں کے پاس لے گیا تو میں نے بڑے ادب سے کہا۔

"عالی جاہ! سبع سیارگان کی کتاب تقویم میں درج ہے کہ جب آسمان پر سعد و نحس سیاروں کا ظہور ہو تو اس وقت کسی بھی سیال شے سے چند لمحوں کے لئے اجتناب کرنا چاہئے۔"

"جرجان بن سعی کیا تم نجوم بھی جانتے ہو؟ اگر ایسا ہے تو تمہیں یہ کیوں نہیں معلوم کہ اس وقت آسمان پر سعد اور نحس سیاروں میں قرب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے بضد ہو کر کہا۔ "عالی جاہ! اگر آپ اسی وقت ایک لمحے کے لئے کھلے آسمان تلے تشریف لے چلیں تو یہ خاکسار آسمان پر سعد و نحس سیاروں کے قرب کی نشان دہی کر سکتا ہے۔"

جعفر برمکی نے پیالہ ہاتھ سے رکھ دیا۔ ریپا ولی نے وینا اور اسحاق موصلی نے رباب پر ہاتھ روک دیا۔ جعفر برمکی مسکراتا ہوا میرے ساتھ ایوان سے باہر نکلا اور بولا۔

"ہم تمہارے دعوے کو غلط ثابت کر دکھائیں گے۔ ہم نے نجوم اپنے دادا سے پڑھا ہے جو اس فن میں یکتا تھے۔"

باہر آتے ہی میں جعفر برمکی کو بارہ دری میں لے گیا اور اسے ساری بات بتا دی۔ اس کے چہرے پر تحیر کے آثار نمودار ہوئے۔

"جرجان! کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "حضور' میں نے یہ سب اپنی آنکھوں سی نہ دیکھا ہوتا تو مجھے بھی کبھی یقین نہ آتا۔"

جعفر ایک پل کے لئے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"لیکن ریپا ولی کس کے ایما پر ہمیں زہر دے رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اب یہی ہمیں معلوم کرنا ہے عالی جاہ!"

جعفر برمکی نے مجھے ساتھ لیا اور یہ کہہ کر عشرت گاہ میں داخل ہوا کہ ہم اس سازش کا پتہ چلائیں گے لیکن ریپا ولی پر کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیں گے۔ جعفر برمکی نے اس خیال سے کہ ریپا ولی کو شک نہ گزرے مسند پر بیٹھتے ہی پیالے میں سے ایک گھونٹ مشروب کا لیا اور میری طرف دیکھ کر ہنس کر بولا۔

"ہمارے ندیم خاص کا دعویٰ غلط نکلا۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ جعفر کا چہرہ فکر مند ہے۔ اس نے مشروب کا دوسرا گھونٹ لینے سے پہلے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ بنا کر محفل ختم کر دی اور مجھے اپنے ساتھ لے کر اپنی خلوت گاہ خاص میں آ گیا۔ وہ بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ اس سازش کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"

یوں تو ہمارے دشمن بہت ہیں مگر کسی بھی دشمن کو اتنی جرات نہیں ہو سکتی کہ ہمیں اس دیدہ دلیری سے زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کرے۔ ظاہر ہے ریپا ولی کو ہم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ کسی کے اشارے پر یہ کام کر رہی ہے اور میرا شک منصور ابن زیاد پر ہے کیوں کہ میری فہم کے مطابق وہ ایک منافق شخص ہے۔ اس کا دل اندر سے آپ کا دشمن ہے اور خراسان کے گورنر کے ساتھ اس کی دوستی ہے اور اس ریپا ولی نام کی کنیز کو خراسان کے گورنر نے ہی آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔"

جعفر نے کہا۔ "لیکن ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ہمارے پاس اس کا بھی ثبوت نہیں ہے کہ ریپا ولی نے مشروب میں زہر ڈالا تھا۔

میں نے مشروب کا پیالہ غلام کے ہاتھ منگوایا۔ اسے کئی طریقوں سے جانچا' چکھا مگر وہ قطعاً بے ذائقہ تھا اور مشروب میں ذرا سی بھی کڑواہٹ نہیں تھی۔ میں نے جعفر سے کہا کہ یہ زہر کسی ماہر دوا ساز نے تیار کیا ہے چونکہ یہ سست رو زہر ہے۔ اس لئے مشروب کے پیالے میں اتنی کم مقدار میں ڈالا جاتا ہے کہ اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ ہاں اگر کسی طریقے سے ریپا ولی کے پاس محفوظ زہر کو حاصل کر لیا جائے تو اس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

جعفر بولا۔ "ریپا ولی سے اگر ہم نے زہر والی انگوٹھی طلب کی تو بات کھل جائے گی اور اس سازش کا اصل سرغنہ فرار ہو جائے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو اور یہ بھی سراغ لگ جائے کہ ہمارا وہ دشمن کون ہے جو ہمیں ہلاک کر رہا ہے۔"

میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں ریپا ولی کی زہریلی انگوٹھی حاصل کر لوں گا۔"

اسی رات جب کہ شاہی محلات میں شمعوں کی روشنیاں مدھم پڑ رہی تھیں اور خواب گاہوں میں سونے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور میں نے اپنی ایک کنیز خاص کو طلب کیا۔ یہ مصری کنیز تھی اور میں اس کی زبان میں اس سے بات کیا کرتا تھا۔ میں نے اسے صرف اتنا بتایا کہ ریپا ولی کی انگلی میں ایک بڑی انگوٹھی پڑی ہے جس کا اوپر کا حصہ کسی ڈھکن کی طرح ہے وہ مجھے ہر حالت میں چاہیے۔

مصری کنیز کو میں نے بڑے قیمتی تحائف دیے۔ یہ کنیز ریپا ولی کی خواب گاہ تک نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن اس نے ریپا ولی کی غسالہ سے رابطہ کر کے مصری کنیز نے انگوٹھی لا کر مجھے دے دی۔ میں اسے لے کر سیدھا جعفر برمکی کی خواب گاہ میں آ گیا۔ جعفر کچھ پریشان تھا اور ابھی تک جاگ رہا تھا میں نے انگوٹھی ان کو پیش کر دی۔ انہوں نے ڈھکن کھولا اور بولے۔

"اس میں بو بھی نہیں ہے۔"

میں نے اندر سے زہر نکال کر ایک طشتری میں ڈالا۔ یہ سفید رنگ کا بے رنگ و بو سفوف تھا۔ جب گوشت کی بوٹی کے ساتھ اس کی کافی مقدار لگا کر ایک بلی کے آگے ڈالا گیا تو کھانے کے ساتھ ہی اس کا سارا جسم اینٹھ گیا۔ اس پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ آن واحد میں مر گئی۔ جعفر برمکی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"جس دشمن نے ہمارے لئے یہ زہر بھیجا ہے ہم اسی زہر سے اسے ہلاک کریں گے۔ اگر یہ منصور ابن زیاد ہے تو خدا کی قسم وہ میرے انتقام سے بچ نہ سکے گا۔"

میں نے جعفر کو سمجھایا کہ اس وقت تدبر اور احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ تاکہ دشمن کو

کانوں کان خبر بھی نہ ہو اور اس کی شکل ہمارے سامنے بھی آ جائے۔ میں نے زہر والی انگوٹھی کو ریپا ولی کی انگلی میں پہنچا دیا۔ غسالہ نے یہی کہا تھا کہ حمام میں پڑی تھی لیکن اسے شک پڑ چکا تھا کہ انگوٹھی اس کی انگلی سے اتاری گئی ہے۔ اس نے حماقت کی اور ازراہ ہمدردی یہ بات خراسان کے گورنر تک پہنچا دی کہ ایسا لگتا ہے کہ جعفر برمکی کو شبہ ہو گیا ہے کہ اسے زہر دیا جا رہا ہے اور یہ زہر میں دے رہی ہوں۔ خراسان کے گورنر نے منصور ابن زیاد سے بات کی۔ ریپا ولی ان کے عزت و ناموس اور جاہ و منصب کے لئے اب سب سے بڑا خطرہ تھی۔ ان کی سازش طشت از بام ہونے والی تھی اور ریپا ولی شاہی اذیت کی تاب نہیں لا سکتی تھی۔ اذیت کی پہلی ہی لہر اس سے سارا راز اگلوا سکتی تھی۔ خراسان کے گورنر نے ابن زیاد سے کہا کہ ریپا ولی کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کر دی جائے اور جعفر برمکی کے قتل کا کوئی دوسرا طریقہ تلاش کیا جائے۔

ان خفیہ باتوں اور ریشہ دوانیوں کا مجھے بعد میں علم ہوا۔ میں ریپا ولی کو اپنے اعتماد میں لے کر اس سے جعفر کے دشمنوں کی نشاندہی کی فکر میں لگا تھا کہ ایک دن ریپا ولی اپنی خواب گاہ میں مردہ پائی گئی اور اس کی انگلی سے انگوٹھی غائب تھی۔ میں سر پکڑ کر رہ گیا۔ دشمن نے سازش پر ایک بھاری پردہ گرا دیا تھا۔ صرف ریپا ولی ہی ہمیں جعفر کے دشمن کے بارے میں بتا سکتی تھی اور وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی تھی۔ جعفر برمکی نے اپنے مخبروں کو چوکس کر دیا اور اپنے محافظوں کی تعداد میں اضافہ بھی کر دیا۔ میں نے جعفر کا علاج جڑی بوٹیوں سے کرنا شروع کر دیا۔ چوں کہ زہر خورانی ختم ہو گئی تھی اس لئے ایک ماہ کے عرصے میں ہی جعفر برمکی پوری طرح صحت یاب ہو گیا۔ امور سلطنت کی مصروفیت کے باعث جعفر اپنے دشمنوں سے ایک بار پھر غافل ہو گیا۔ یہ بات جعفر برمکی کے والد اور اس کے بھائی فضل برمکی میں نہیں تھی۔ وہ اپنے دشمنوں سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ سیاست اور کاروبار سلطنت میں دشمن سے چشم پوشی قابل معافی ہے مگر دشمن سے غفلت باعث ہلاکت ہوتی ہے اور اگر جعفر میری مصاحبت اور معیت میں نہ ہوتا تو مر گیا ہوتا۔

اس روز موسم خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جعفر نے شکار پر چلنے کا اعلان کر دیا۔ اپنے محافظوں' مخبروں اور فوج خاص کے ایک دستے کے ساتھ وہ وادی فرات کے ڈیلٹا میں شکار کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ ظاہر ہے میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ آج کل اس وادی کی پہاڑیاں وقت کے طوفانوں اور زلزلوں کی زد میں آ کر کافی ٹوٹ پھوٹ چکی ہیں مگر آج سے ہزار برس پہلے یہ پہاڑیاں دریائے دجلہ و فرات کی وادی میں دونوں جانب سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ یہاں کے جنگل چھدرے چھدرے

تھے اور ہرن کا شکار بہت پایا جاتا تھا۔ شکار کھیلنے یا شکار کے بعد یا پہلے کسی وقت سر شام سیر کرتے وقت محافظ دستہ جعفر برمکی کے آس پاس رہتا تھا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ صبح کے وقت شکار پر روانہ ہونے سے پہلے میں اور جعفر برمکی شاہی خیموں سے کچھ دور ایک جھیل کے کنارے مہندی کی جھاڑیوں میں ٹہلنے لگے جعفر برمکی مجھ سے کبھی اپنے سیاسی منصوبوں کے بارے میں بات نہ کرتا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ جڑی بوٹیوں یا عرب شاعری پر باتیں کرتا تھا۔ جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ میں تھوڑا بہت نجوم بھی جانتا ہوں تو وہ مجھ سے علم نجوم پر بھی بات کر لیتا تھا۔ اس روز وہ نجوم پر ہی باتیں کر رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے ہم خشک ریت کے ٹیلوں کی طرف آ گئے۔ یقیناً محافظ ہمارے آس پاس ہی تھے لیکن دشمن بھی غافل نہیں تھا۔ وہ شاہی محل سے جعفر کے تعاقب میں تھا اور شکار پر جانے کی خبر سن کر اپنی قسمت آزمانا چاہتا تھا۔

شاید وہ اسی موقع کی تلاش میں تھا۔

میں جعفر برمکی کے ساتھ ساتھ تھا۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ مجھے احساس ہوا کہ ہم شکار گاہ سے قدرے دور نکل آئے ہیں۔ میں نے واپسی کا ارادہ کیا تو جعفر رک گیا اور مسکراتے ہوئے کچھ کہنے کے لئے میری طرف پلٹا ہی تھا کہ سامنے والے ٹیلے کی اوٹ سے سن کی آواز کے ساتھ ایک برق رفتار تیر آیا۔ میں جعفر کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ دشمن کا نشانہ ذرا سا چوک گیا تھا۔ تیر عین سامنے آ کر میری چھاتی میں لگا۔ مجھے تو کچھ محسوس نہ ہوا۔ بس ایک ہلکا سا دھچکا سا لگا لیکن جعفر گھبراہٹ میں چلا اٹھا۔

"دشمن پہاڑی میں ہے۔ جانے نہ پائے۔"

اس کے محافظ گھوڑے دوڑاتے پہاڑی کی طرف بڑھے۔ میں نے سوچا کہ مجھے گر پڑنا چاہئے اور میں گر پڑا۔ جعفر نے آدمیوں کو آواز دی۔ کچھ غلام دوڑتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ جعفر تو پریشان تھا ہی لیکن میں اس سے زیادہ پریشان تھا کیوں کہ میری زندگی کا سب سے اہم راز فاش ہونے والا تھا۔ تیر میری چھاتی میں آدھے سے زیادہ چبھا ہوا تھا مگر خون کا ایک قطرہ نہیں نکل رہا تھا۔ میں نے جلدی سے خود ہی تیر کھینچ کر سینے سے نکال کر پھینک دیا۔ جعفر حیرت کی تصویر بنا میرے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں لباس میں ایک سوراخ ضرور ہو گیا تھا مگر خون بالکل نہیں بہہ رہا تھا اور نہ کوئی زخم تھا۔ مجھے ذرا سا بھی درد نہیں ہو رہا تھا۔ میں یوں ہی نام رکھنے کو زمین پر پڑا تھا جو بڑی مضحکہ خیز بات تھی۔

غلام مجھے اٹھانے لگے تو میں خود ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ میں یوں شرمسار ہو رہا تھا جیسے مجھے افسوس ہے کہ تیر سینے میں لگا لیکن خون نہیں نکلا

اور مجھے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا۔ جعفر برمکی مجھے حیرت و تعجب کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میرے جسم کا گوشت اور کھال تیر کے باہر نکلتے ہی ربر کی طرح ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔

”جرجان بن سعی! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ کیا تم اس بات سے انکار کر سکتے ہو کہ تمہیں میری آنکھوں کے سامنے تیر لگا تھا۔“

میں نے کھسیانا سا ہو کر کہا۔ ”عالی جاہ! تیر لباس میں ہی الجھ کر رہ گیا تھا۔“

غلام بھی حیران و ششدر کھڑے تھے کیوں کہ انہوں نے بھی اپنی آنکھوں سے مجھے اپنے سینے سے تیر کھینچ کر پھینکتے دیکھا تھا۔ جعفر برمکی ایک زیرک اور دانا شخص تھا۔ اتنا ضرور سمجھ گیا کہ معاملہ پراسرار ہے اور میں اس سے کوئی رازداری کی بات چھپا رہا ہوں۔ اس نے غلاموں کو واپس بھیج دیا۔ اسی وقت محافظ دستے کے گھڑ سوار ایک آدمی کی لاش لے آئے جس کے سینے میں خنجر چبھا ہوا تھا اور وہ مر چکا تھا۔ جعفر نے غصے میں کہا اسے کس نے ہلاک کر دیا؟ محافظ دستے کے سردار نے دست بستہ عرض کی۔

”حضور انور! جب ہم اس شخص کو گھیرے میں لے کر اس کے قریب پہنچے تو اس نے خنجر سے خودکشی کر لی۔“

دشمن ایک بار پھر ہاتھ سے نکل گیا تھا اور میرا راز جعفر برمکی پر فاش ہو چکا تھا۔ میں اب کوئی عذر یا بہانہ پیش نہیں کر سکتا تھا۔ جعفر نے اس وقت اس بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ اس نے واپسی کا اعلان کر دیا۔ اسی لمحے خیموں کو سمیٹ کر گھوڑوں اور اونٹوں پر لاد دیا گیا اور قافلہ واپس شاہی محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ خلیفہ ہارون الرشید کو جب پتہ چلا کہ جعفر پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے تو وہ خود اس کے محل میں آیا اور دلجوئی کی اور دشمن کے وار سے بچ نکلنے پر مبارکباد دی۔ ساتھ ہی اعلان کیا کہ اس معاملے کی سرکاری تحقیقات ہو گی۔ خلیفہ نے جعفر سے برملا کہا کہ تم کو جس پر شک ہے ان کا نام لو۔ ہم ان کی کھالیں کھنچوا کر بھس بھروا دیں گے مگر جعفر برمکی نے کسی کا نام نہ لیا۔ اس نے خلیفہ کو یہ بھی نہ بتایا کہ دشمن کا تیر اس کی بجائے میرے سینے میں لگا تھا۔ اس نے یہی کہا کہ دشمن کا نشانہ چوک گیا تھا اور تیر ایک درخت میں جا کر لگا تھا۔

لیکن رات کو جعفر برمکی نے مجھے اپنی خلوت گاہ میں بلوایا اور سامنے بٹھا کر سوال کیا۔

”جرجان بن سعی! یہ کیا راز ہے؟“

میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ ”کونسا راز عالی جاہ؟“

جعفر برمکی زیر لب مسکرایا۔ ”تم بازی ہار چکے ہو جرجان۔ جس راز کو تم مجھ سے چھپانا

چاہتے ہو وہ طشت از بام ہو چکا ہے۔ تمہارے پاس وہ کونسا جادو یا عمل ہے جس کی وجہ سے تیر تمہارے سینے میں اتر گیا مگر تم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا؟“

جعفر برمکی نے مجھے خود ہی اپنے سوال کا جواب سمجھا دیا تھا۔ میں نے کہا۔

”عالی جاہ! بات زیادہ لمبی اور پراسرار نہیں ہے۔ جس زمانے میں میں افریقہ کے ایک شہر میں تھا تو وہاں میں نے ایک صاحب کشف و کرامات بزرگ کی بڑی خدمت کی۔ انہوں نے ایک روز میری خدمت گزاری سے خوش ہو کر میرے سینے پر ہاتھ پھیر کر پھونک ماری اور کہا کہ جاؤ تمہارے سینے پر کسی خنجر، تیر، بھالے کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ دشمن کے تیر نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا۔“

جعفر برمکی سمجھ گیا کہ میں اصل بات اس سے چھپا رہا ہوں۔ مگر اس نے مصلحت اس میں سمجھی کہ اس معاملے کو زیادہ نہ کریدا جائے۔ وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا اور اس نے مجھے ہدایت کی کہ میں زیادہ سے زیادہ اس کے ساتھ رہا کروں۔ معاملے کو یوں نمٹتے دیکھ کر میرے دل کا بوجھ اتر گیا۔ اگر جعفر برمکی کو میرے خفیہ راز کا علم ہو بھی چکا تھا تو مجھے اس بارے میں زیادہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ اس نے اس بارے میں پھر مجھ سے کوئی بات نہ کی۔

ایک روز میں خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں موجود تھا۔ اس وقت اس عہد کے جید عالم دین اور سیف الاسلام حضرت ابن سماک رحمتہ اللہ علیہ بھی دربار میں تشریف فرما تھے کہ خلیفہ کو پیاس لگی۔ اشارے سے پانی طلب کیا۔ حاجب نے طلائی پیالے میں آب شفاف پیش کیا۔ خلیفہ پانی پینے کو تھا کہ حضرت سماکؒ نے فرمایا۔

”امیرالمومنین! ذرا ٹھہر جائیے۔ پہلے یہ بتائیے کہ اگر آپ کو شدید پیاس لگی ہو مگر پانی نہ ملے تو آپ پانی کا ایک پیالہ کس قیمت تک خرید سکتے ہیں؟“

ہارون الرشید نے کہا۔ ”میں نصف سلطنت دے کر پانی کا ایک پیالہ خرید لوں گا۔“

ابن سماکؒ نے فرمایا۔ ”اب پانی پی لیجئے۔“ جب خلیفہ پانی پی چکا تو فرمایا۔

”اے امیرالمومنین! اگر یہ پانی آپ کے پیٹ میں رہ جائے اور نہ نکلے تو اسے نکلوانے کے عوض آپ کیا خرچ کریں گے؟“

خلیفہ نے کہا۔ ”باقی آدھی سلطنت بھی دے ڈالوں گا۔“

حضرت ابن سماکؒ نے فرمایا۔ ”بس یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کا تمام ملک ایک گھونٹ پانی اور چند ناپاک قطروں کی قیمت رکھتا ہے اس پر کبھی تکبر نہ کیجئے اور جہاں تک ہو سکے لوگوں سے یکساں سلوک کیجئے۔“

پھر انہوں نے ہارون سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اے حسین چہرے والے! تو اس امت کا ذمے دار ہے۔ تجھی سے باز پرس ہو گی۔"

یہ سن کر ہارون الرشید کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت ابن سماکؒ نے ہارون کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔ "خدا سے ڈرا کر جس کا کوئی شریک نہیں اور اس پر یقین رکھ کہ کل تجھے خدا تعالیٰ کے روبرو جانا ہے۔ وہاں تجھے دو مقاموں میں سے ایک مقام اختیار کرنا ہو گا اس کے علاوہ تیرا تیسرا مقام نہیں ہے۔ یہ دو مقام جنت اور دوزخ ہیں۔"

اس وقت دربار میں ایک امیر فضیل بن حاجب بھی بیٹھا ہوا تھا۔ ابن سماکؒ کی نصیحت سن کر ہارون الرشید اتنا رویا کہ اس کی داڑھی کے بال بھی بھیگ گئے۔ یہ عالم دیکھ کر فضیل بن حاجب نے کہا۔ "سبحان اللہ! امیر المومنین کے جنت میں جانے میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟ آپ خدا کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ اس کے بندوں کے ساتھ عدل کرتے ہیں۔ اس کے صلے میں انشاء اللہ ضرور جنت کے مستحق ہوں گے۔"

حضرت ابن سماکؒ نے ایک بار پھر ہارون الرشید کو مخاطب کر کے کہا۔

"امیر المومنین! اس روز فضیل بن حاجب تیرے ساتھ نہ ہو گا۔ اس لئے خدا سے ڈرتا رہ اور اپنے نفس کی دیکھ بھال رکھ۔"

خلیفہ ہارون کا دربار عباسی عہد کے جاہ و جلال کا نمونہ تھا۔ کوئی شخص بغیر اجازت خاص اور ہزار مرحلوں سے گزرے بغیر دربار میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ بادشاہ قصر خلد میں ایک عالی شان تخت پر بیٹھا امراء اور وزراء اپنے درجوں کے مطابق کرسیوں پر بیٹھے ہوتے۔ ایک جانب علماء کی جماعت موجود ہوتی۔ وزیر اعظم بادشاہ کے دائیں جانب ہوتا۔ ان کے ساتھ ہی فوج کے نامور جرنیلوں کی کرسیاں ہوتی تھیں۔ علماء کی قطار کے پیچھے اطباء، شعراء اور ماہرین فنون لطیفہ کی کرسیاں اپنے اپنے مراتب کے اعتبار سے مقرر ہوتی تھیں۔

وقت گزرتا چلا جا رہا تھا جعفر برمکی کی طبیعت میں چوں کہ اپنے باپ یحییٰ جیسی فراست اور معاملہ فہمی نہیں تھی۔ اس لئے اس سے کچھ ایسی فاش غلطیاں سرزد ہوئیں جو آل برامکہ کی تباہی اور زوال کا باعث بنیں۔ جعفر نے اپنی ہر عام و خاص مجلس میں خلیفہ کے بارے میں غیرذمہ دارانہ باتیں کہنی شروع کر دیں۔ اس کے خوشامدیوں اور قصیدہ گو شعراء نے اسے اسلامی سرحدوں کا محافظ کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ اس نے بیت المال کا روپیہ دھڑا دھڑ خرچ کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک خلیفہ ہارون الرشید کو بھی اپنی ضروریات کے لئے رقم کے واسطے جعفر برمکی سے بات کرنا پڑتی تھی۔ برامکہ عرب ثقافت کی جگہ عجمی ثقافت کو مسلط کرنا چاہتے تھے لیکن اس میں کم از کم مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ جعفر برمکی یحییٰ برمکی اور فضل

برمکی کی نگاہیں سلطنت عباسیہ پر لگی ہوئی تھیں۔ فضل برمکی خراسان سے آیا تو اپنی فوج میں بیس ہزار عجمی فوجیوں کا ایک لشکر بھی ساتھ لیتا آیا۔ اس عجمی لشکر کو جس میں ایک بھی عرب سپاہی نہیں تھا بغداد شہر کے قلب میں واقع رفہ چھاؤنی میں رکھا۔ تھوڑے دنوں بعد فضل برمکی نے خلیفہ سے پوچھے بغیر ہی اس عجمی لشکر کا کچھ حصہ قصر خلد یعنی خلیفہ کے محل خاص کے اردگرد متعین کر دیا اور یہ مشہور کر دیا کہ یہ لشکر خلیفہ کے اہل و عیال کی حفاظت کے لئے ہے۔ برامکہ کے جاسوس پل پل کی خبریں لا کر دیتے تھے۔

جعفر برمکی بھی کسی وقت تکبر و غرور کے نشے میں آ کر کہہ دیا کرتا کہ ہم آل برامکہ خلیفہ کے لئے وبال بن جائیں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اس قسم کی باتیں خلیفہ تک نہ پہنچتیں۔ خلیفہ کے جاسوس بھی اپنا کام برابر کر رہے تھے۔ مگر یہ عظیم اور جلیل القدر بادشاہ بڑی بردباری اور تحمل سے کام لے رہا تھا۔ وہ خاموش تھا۔ برامکہ کے عالی شان محلوں کو اور ان کے باہر خیرات وصول کرنے والوں کا ہجوم دیکھتا تو خاموش رہتا لیکن اس کے دل میں ایک خوفناک منصوبہ پرورش پا رہا تھا۔ اس خاموشی کے اندر ایک قیامت خیز طوفان .... پھٹ پڑنے کے لئے کروٹیں لے رہا تھا۔ آل برامک بلاشبہ سلطنت عباسیہ کے لئے ایک بھیانک خطرہ بن کر مسند خلافت پر منڈلانے لگے تھے۔

ہارون الرشید نے کمال تدبر، حکمت عملی اور استقلال کے ساتھ اپنے دل میں کئے ہوئے تاریخی فیصلے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ میں سلطنتوں کے تختے الٹتے، بادشاہوں کو قتل ہوتے محلات کو خاکستر ہوتے اور تخت نشینوں کے سر شہر کے صدر دروازوں میں لٹکتے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے آنے والے خونیں طوفان کی بو سونگھ لی تھی۔ ایک روز معمول کے مطابق محفل رقص و سرود میں موجود تھا۔ جعفر برمکی ایک مطلق العنان شہنشاہ کی شان و شکوہ کے ساتھ مسند پر بیٹھا موسیقی سے محظوظ ہو رہا تھا کہ کسی نے خلیفہ کے بارے میں کوئی بات کی، جس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ بادشاہ کو ہماری رتی رتی خبر پہنچا دی جاتی ہے۔ جعفر برمکی نے بڑے غرور اور گھمنڈ کے ساتھ کہا۔ "ہارون الرشید ہماری مرضی کے خلاف ایک نوالہ تک نہیں اٹھا سکتا۔ وہ ہماری کیا جاسوسی کرے گا۔ ہمارے جاسوس جلوت و خلوت میں اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔"

اس دن پہلی بار میں نے موقع پا کر جعفر برمکی سے کہا کہ اسے بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ میں ضرورت سے زیادہ دخل اندازی نہیں کرنی چاہئے اور ہوا کے رخ کو پہچاننا چاہئے۔ جعفر اقتدار کے نشے میں چور تھا۔ اس پر میری نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا لیکن خلیفہ ہارون الرشید بڑی خاموشی، مکمل آزادی اور کمال تدبر کے ساتھ میدان عمل میں اتر چکا تھا۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ وہ قمری مہینے کی آخری تاریخیں تھیں اور موسم سردی کا تھا۔ رات ڈھل رہی تھی۔ جعفر برمکی خیمے کے اندر زربفت کی مسند پر بیٹھا تھا۔ میں اس کے داہنی جانب نیچے ایک چوکی پر بیٹھا تھا۔ جعفر کا خاص گویا ابو اسحاق موصلی دھیمے اور دلگداز سروں میں دف ہاتھ میں لئے اپنے آقا کی شان میں لکھا گیا قصیدہ گا رہا تھا کہ اچانک خیمے کا پردہ ہٹا اور خلیفہ کے حاجب خاص نے آ کر کہا کہ امیرالمومنین نے ایک تحفہ بھیجا ہے۔ جعفر نے نیم وا آنکھوں سے حاجب کو دیکھا اور خوش ہو کر کہا۔

"ہم ہارون الرشید کے تحفے کو خوشی سے قبول کرتے ہیں۔ تحفہ پیش کیا جائے۔"

کچھ غلام سروں پر خوان اٹھائے خیمے میں داخل ہوئے اور خوان جعفر کے سامنے رکھ دیئے گئے۔ رومال اٹھائے گئے تو میں نے دیکھا کہ ایک خوان شیریں میووں سے بھرا ہوا تھا۔ دوسرے خوان میں مٹھائیاں اور پھل تھے اور تیسرے خوان میں عطریات اور خوشبوئیات تھیں۔ جعفر برمکی نے کہا کہ امیرالمومنین کا میری جانب سے شکریہ ادا کیا جائے۔ غلاموں کو انعام و اکرام دے کر رخصت کر دیا گیا۔

میں کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ اتنی رات گئے خلیفہ کی جانب سے تحفے کا آنا ایک عجیب سی بات تھی۔ مگر میں بہت جلد اس بات کو بھول گیا۔ جعفر برمکی کی تقدیر میں جو کچھ لکھا تھا اسے ہو کر رہنا تھا اور میں اس میں کوئی دخل نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ قدرت نے مجھے وہاں سے کچھ دیر پہلے ہی اٹھا دیا۔ غلاموں کو رخصت ہوئے تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ جعفر برمکی نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"جرجان! رات بہت ہو گئی ہے۔ تم جا کر آرام کیوں نہیں کرتے؟"

میرا ارادہ جعفر برمکی کو اکیلا چھوڑ کر جانے کا نہیں تھا لیکن پھر خیال آیا کہ شاید جعفر کو خلوت کی ضرورت ہو۔ میں نے سلام کیا اور رخصت لے کر کچھ فاصلے پر اپنے خیمے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے بعد وہاں جو کچھ ہوا اس کی ساری تفصیل مجھے گویئے اسحاق موصلی نے بعد میں بتائی جو آخری وقت تک جعفر برمکی کے ساتھ تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مجھے نیند لینے کی حاجت نہیں ہوتی لیکن محض اپنی خوشی کے لئے یا کبھی کبھی خواب دیکھنے کی خاطر میں کسی وقت اپنی مرضی سے سو جایا کرتا ہوں۔ چنانچہ اس رات بھی جعفر برمکی کے خیمے سے آ کر میں بستر پر دراز ہونے کے کچھ دیر بعد سو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے قدرت نے خود سلا دیا تھا کیوں کہ تاریخ میں رونما ہونے والے ایسے واقعات کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا کہ جن کا اثر آنے والے عہد پر مرتب ہونا تھا۔ میرا کام تاریخ کے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے واقعات کو وقوع پذیر ہوتے دیکھنا اور ان کے نقوش کو اپنے حافظے

کی لوح پر نقش کرتے چلے جانا تھا۔ ان واقعات میں دخل انداز ہونا میرا مسلک نہیں تھا۔ میں نے بڑی بڑی تاریخی شخصیات کو سچائی کی خاطر مقتل کی طرف شاداں و فرحاں جاتے دیکھا اور میں نے ان کی جان نہیں بچائی۔ کسی غیبی طاقت نے جیسے میرے قدموں کو عین اس وقت جکڑ لیا اور میں خواہش کے باوجود ان کی طرف ایک قدم بھی نہ اٹھا سکا۔ یہی آل برامکہ کی تباہی سے پہلے میرے ساتھ بغداد میں ہوا تھا کہ قدرت نے عین وقت پر خود جعفر برمکی کے اصرار پر مجھے اس کی مجلس سے اٹھا دیا۔ جہاں تھوڑی دیر بعد تاریخ کا ایک خونیں ورق الٹا جانے والا تھا نہ صرف یہ کہ میں اپنے خیمے میں آ گیا بلکہ غیبی طاقت نے مجھے گہری نیند سلا دیا۔

اسحاق موصلی نے مجھے بعد میں جو کچھ بتایا وہ اس طرح سے ہے۔ میرے جانے کے بعد پھر دف بجنے لگی۔ گانا شروع ہو گیا۔ جعفر برمکی نیم مدہوشی کے عالم میں مسند پر نیم دراز تھا کہ اچانک خیمے کا پردہ ایک بار پھر اٹھا۔ مگر اس بار کوئی غلام تحفہ لے کر نہیں آیا تھا بلکہ جو اندر داخل ہوا وہ خلیفہ ہارون الرشید کا خاص الخاص جلاد تھا۔ خلیفہ نے اپنے کسی خاص آدمی کی گردن اڑانی ہوتی تھی تو اسی جلاد کو بلایا جاتا تھا۔ اس کا نام کبیر مسرور تھا۔ یہ شاہی جلاد بھی تھا اور خلیفہ کا خاص الخاص غلام بھی تھا۔ خلیفہ کو اس شخص پر بے حد اعتماد تھا۔ صرف کبیر مسرور کو تنہا یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ ہارون الرشید کو سوتے میں بھی جگا سکتا تھا۔

کبیر مسرور کی شکل دیکھتے ہی اسحاق موصلی کہتا ہے کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ جعفر برمکی بھی اسے دیکھ کر سنبھل کر بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا مشروب کا پیالہ ذرا سا کپکپایا۔ کنیز نے آگے بڑھ کر پیالہ جعفر کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس نے کبیر مسرور کو مخاطب ہو کر کہا۔

"تمہارا آنا ہمارے لئے خوشی کا موجب ہے مگر اس طرح بغیر اجازت کے اندر گھس آنے سے ہمیں لگتا ہے کہ خدانخواستہ خلیفہ کی طبیعت ناساز ہے۔"

کبیر مسرور نے کہا۔ "میں بغیر اطلاع اندر آنے پر معذرت خواہ ہوں۔ مگر امیرالمومنین نے اس وقت ایک بڑے اہم کام کے لئے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

کنیزیں دم بخود تھیں۔ اسحاق موصلی کہتا ہے کہ میں بھی مہر بہ لب تھا۔ لیکن سمجھ گیا تھا کہ کوئی طوفان آ رہا ہے بلکہ طوفان برامکہ کے گھروں کے دروازوں تک پہنچ گیا ہے۔ جعفر برمکی نے اہم کام کے بارے میں پوچھا تو کبیر مسرور نے برملا کہہ دیا۔

"امیرالمومنین نے مجھے آپ کا سر کاٹ کر لانے کا حکم دیا ہے۔"

کنیزوں کے رنگ اڑ گئے۔ اسحاق موصلی نے رباب اپنے ہاتھ سے رکھ دیا۔ جعفر برمکی کا

رنگ بھی سفید ہو گیا۔ مگر آخر وہ ایک مقتدر خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ ایک ذی وقار اور ذی عظمت انسان تھا۔ اس نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا اور کبیر مسرور کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بولا۔

"کبیر!! تم شاید اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہو۔ شاید تم ان تعلقات سے بخوبی واقف نہیں ہو جو میرے اور امیرالمومنین کے درمیان ہیں۔ میں ان کا رضاعی بھائی ہوں۔"

غلام جلاد کبیر مسرور کا ایک ہاتھ تلوار کے دستے پر تھا جو اس کی کمر کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی اور خلیفہ کے اشارہ ابرو پر نہ جانے اب تک کتنے انسانوں کے خون سے اپنی پیاس بجھا چکی تھی۔ اب وہ جعفر برمکی کے خون کی پیاسی نظر آ رہی تھی۔ کبیر مسرور نے کہا۔

"حضور! میں بالکل اپنے ہوش و حواس میں ہوں اور امیرالمومنین کا حکم بجا لانے کے لئے ہی یہاں آیا ہوں۔ اس لئے آپ گردن کٹوانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ کیوں کہ جو لوگ خود اپنے آپ کو تیار کر لیتے ہیں ان کو گردن کٹنے کی تکلیف نہیں ہوتی۔"

جعفر برمکی نے ایک اور چال چلی کہ جس سے کچھ تاخیر حاصل کر لی جائے۔ اس نے کہا کہ وہ امیرالمومنین کا یہ حکم خود اپنے کان سے سننا چاہتا ہے۔ کبیر مسرور نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا۔ "اب اس کا وقت نہیں ہے حضور۔"

اس نے اشارہ کیا۔ دو ہٹے کٹے غلام خیمے میں گھس آئے۔ انہوں نے مسند پر چڑھ کر جعفر برمکی کی مشکیں کس دیں۔ کنیزیں چیخیں مارتی وہاں سے بھاگ گئیں۔ اسحاق موصلی کونے میں دبک گیا۔ کبیر مسرور جلاد آگے بڑھ کر تخت پر چڑھ گیا۔ تلوار نکالی اور ایک ہی بھرپور وار سے جعفر برمکی کا سر تن سے جدا کر دیا۔ سر کٹ کر نیچے قالین پر گر پڑا۔ غلاموں نے جعفر برمکی کے خون آلود دھڑ کو وہیں پھینکا اور اس کا سر اٹھا کر ایک تھیلے میں ڈالا اور کبیر مسرور کے ساتھ خیمے سے باہر نکل گئے۔

میری آنکھ کھلی تو برامکہ کی تباہی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ جعفر برمکی کا سر شارع عام پر لٹکا دیا گیا - ان کے محلات پر عباسی سپاہیوں نے ہلہ بول دیا۔ اور ایک ایک تنکا اٹھا کر شاہی بیت المال میں جمع کرا دیا۔ یحییٰ برمکی، فضل برمکی اور ان کے تمام اہل خانہ اور خاندان کے دوسرے افراد کو پکڑ کر قید میں ڈال دیا گیا۔ ان کے حواریوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں چوراہوں میں پھینک دیں۔ ان کے عجمی لشکریوں کو ہارون الرشید نے پہلے ہی غیر مسلح کر دیا تھا۔ انہیں ملک بدر کر دیا گیا۔ قید خانے میں ایک ایک کر کے برامکہ خاندان کے سارے افراد مر کھپ گئے۔ ہارون الرشید نے اپنی زندگی میں کسی کو جیل سے باہر آنے کی اجازت نہ دی۔ اس کی وفات کے بعد امین الرشید تخت پر بیٹھا تو اس کی والدہ نے بچے کھچے برامکہ کو قید

سے رہائی دلائی مگر وہ اب انتہا درجے کی نقاہت اور خستگی کا شکار تھے۔ جھونپڑیوں میں رہنا ان کا مقدر بن گیا اور آخر ایک ایک کر کے یہ باقی ماندہ لوگ بھی ختم ہو گئے اور آل برامک کا نام تک مٹ گیا۔

یہ ایک بہت بڑا اور عبرت انگیز انقلاب تھا جسے میں نے اپنی آنکھوں سے برپا ہوتے دیکھا۔ میری اس لئے "جان بخشی" کر دی گئی تھی کہ میں عجمی نہیں تھا اور میرا تعلق سرزمین مصر سے تھا۔ امین الرشید زیادہ دن حکومت نہ چلا سکا اور اس کی جگہ اس کے بھائی مامون الرشید نے مسند خلافت کو سنبھالا۔ یہ تیسری صدی ہجری کے آخری عشرے کا زمانہ تھا۔ اس وقت اندلس (سپین) میں خاندان بنو امیہ حکمران تھا مگر سلطنت عباسیہ کی وسعت و ہمہ گیری کے مقابلے میں اندلس کا مسلمان فرمانروا بلا شبہ اسے اپنا حریف کہہ سکتا تھا۔ اس وقت سلطنت عباسیہ میں سارا براعظم ایشیا اور افریقہ کا لاکھوں مربع میل علاقہ شامل تھا۔ فرانس کے شہنشاہ شارلیمن نے جرمنی، اٹلی اور ہنگری کو بھی اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا۔ انگلستان سات چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا اور یہ آپس میں برسرپیکار رہتی تھیں۔ قسطنطنیہ سلطنت عباسیہ کا باجگذار تھا۔

اگرچہ مجھے غیر عجمی ہونے کی بنا پر ہارون الرشید نے "قتل" نہیں کروایا تھا لیکن مجھے تمام سرکاری مراعات سے محروم کر دیا گیا تھا۔ مجھے سرکاری مراعات کی حاجت بھی نہیں تھی۔ میں تو تاریخ کا مسافر تھا اور ابن سماکؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہونے کے بعد ان سے میری عقیدت بڑھ گئی تھی۔ میں بغداد کے مضافات میں ان کے پاس چلا گیا اور دن رات ان کی خدمت میں رہنے لگا۔ وہ کافی ضعیف ہو چکے تھے اور میں اسی طرح جوان تھا۔ مجھ پر وقت کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ حضرت صاحب کو کشف کے ذریعے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا مگر وہ قصداً خاموش تھے۔ جب ان کے وصال کا وقت آیا تو انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میری طرف دیکھ کر تبسم فرمایا اور کہا۔

"عبداللہ عاطون! میں اپنے رب کے پاس جا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم ابھی سینکڑوں سال زندہ رہو گے۔ میری خواہش ہے تم کوفہ چلے جاؤ۔ وہاں جو علما موجود ہیں ان کی بابرکت صحبت میں تم بہت کچھ سیکھ سکو گے مگر خبردار کبھی ان پر احسان کرنے کی جسارت نہ کرنا۔ اب تم جاؤ۔"

میں ادب سے سلام کر کے وہاں سے اٹھ آیا۔ اسی روز میرے پیر و مرشد حضرت ابن سماکؒ کا انتقال ہو گیا - میں نے رخت سفر باندھا اور بغداد چھوڑ کر کوفہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

معاف کیجئے گا تاریخ کے حقائق کو یاد کر کے اس وقت میں چائے کی طلب محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے قلم کاغذ رکھ کر چائے بنانا شروع کر دی۔

جس وقت میں چائے کی دوسری پیالی بنا کر پی رہا تھا تو میرے کاٹج کے اوپر سے ایک ہیلی کاپٹر گذرا۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ یہ پاک بحریہ کا ہیلی کاپٹر تھا اور سمندر کے اوپر اڑتا ہوا میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ سوچتا ہوں اگر بغداد کے قصر خلد کی چھت پر خلیفہ ہارون الرشید بیٹھا ہوتا اور اس کے اوپر سے کوئی ہیلی کاپٹر گذر جاتا تو حیرت کے مارے اس کی کیا حالت ہوتی لیکن تاریخ میں کوئی ایجاد' کوئی واقعہ اپنے سیاق و سباق کے بغیر رونما نہیں ہوتا۔ تاریخ کی ساری کڑیاں ایک دوسرے سے ایک ضابطے اور وقت کے تسلسل کے ساتھ مربوط ہیں۔ ہارون الرشید ہیلی کاپٹر کبھی نہیں دیکھ سکتا تھا اور ہم ہارون الرشید اور شہنشاہ روم کے رتھ سڑکوں پر نہیں دوڑا سکتے۔ صرف چند اصول اور ضابطے ہیں جو ہماری کائنات کی ترکیب و ترویج میں جاری و ساری ہیں۔

میں نے ایک چھوٹا سا رنگین ٹیلی ویژن اپنے کمرے میں لا کر رکھ لیا ہے۔ میں آپ کے پروگرام بڑے شوق سے دیکھتا ہوں۔ سفرنامہ قلمبند کرتے ہوئے میں اسے بند رکھتا ہوں۔ اس وقت بھی ٹیلیویژن بند ہے۔ سورج نے غروب ہوتے ہوتے سمندر میں آگ سی لگا دی ہے۔ میں کھڑکی کے پاس میز پر بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ چائے کی پیالی میں ابھی دو گھونٹ چائے باقی ہے۔ کھڑکی میں سے سمندر کی ٹھنڈی اور مرطوب ہوا اندر آ رہی ہے۔ اب میں اپنا سفر نامہ آگے لکھنا شروع کرتا ہوں۔

میں چند قدم چل کر مکان کے صحن سے باہر نکل آیا۔ کچھ فاصلے پر دریائے دجلہ سکون سے بہہ رہا تھا۔ دور کھجوروں کے جھنڈ میں کسی قافلے نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ دریا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دھوپ میں ابھی تمازت اور شدت نہیں آئی تھی۔ میں کھجوروں کے اس جھنڈ کی طرف چل پڑا۔ جہاں قافلے کے مسافر ٹکڑیوں کی صورت میں بیٹھے ستا رہے تھے۔ انہیں دن بھر آرام کرنا تھا اور سورج ڈھلے پھر قافلہ لے کر آگے روانہ ہونا تھا۔ اچانک مشرق کی جانب سے ریت کا ایک بگولا سا اٹھا' بگولے کا یہ چکراتا ہوا ستون سیدھا میری طرف اٹھ رہا تھا۔ میں اس صحرائی بگولے کو دیکھ کر حیران تھا کہ یہ کہاں سے نمودار ہو گیا جب کہ طوفان یا صحرائی آندھی کے کہیں بھی آثار نہیں تھے۔ میں اس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک طرف دوڑا مگر اتنی دیر میں بگولا میرے سر پر پہنچ چکا تھا اور اس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا - میں اس میں ڈوب کر اس کے ساتھ ہی چکر کھانے لگا۔ پھر میں ریت پر گر پڑا۔ ریت سے بچنے کے لئے میں نے اپنی آنکھوں پر کپڑا

رکھ لیا تھا۔ زمین گرنے کے بعد جب میں نے اپنی آنکھوں پر سے کپڑا ہٹایا تو منظر بدل چکا تھا۔ وقت بھی کچھ برس آگے نکل چکا تھا۔ کھجوروں کا جھنڈ ویسے ہی تھا مگر وہاں کوئی قافلہ پڑاؤ ڈالے نہیں بیٹھا تھا۔ سورج نصف النہار پر تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میرے ساتھ وہی ہوا ہے جو ہوتا آیا ہے اور نہ جانے کب تک ہوتا رہے گا۔ وقت نے مجھے کچھ برس آگے تاریخ کے اوراق میں لا پھینکا تھا مگر میں جانتا تھا کہ اگر وقت بدلا ہے تو میری حیثیت میں بھی تبدیلی وقوع پذیر ہو چکی ہو گی۔ میں نے اپنا جائزہ لیا - میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو مجھے اس میں سے تھوڑی سی دھنکی ہوئی روئی ملی۔ دھنکی ہوئی روئی کے کچھ پھاہے میرے لمبے کرتے کے بٹنوں پر بھی لگے ہوئے تھے۔ میری شناخت بدل چکی تھی مگر میں یہ کس حیثیت سے نمودار ہوا تھا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی - میں شہر کی جانب چل پڑا تا کہ لوگ مجھے میری نئی حیثیت سے مجھے آگاہ کریں اور ایسا ہی ہوا۔

میں بغداد شہر کے ایک کوچے میں داخل ہوا تو ایک عورت میری طرف آئی۔ اس نے اپنے سر پر گٹھڑی اٹھا رکھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

”عبداللہ تم کہاں گھومتے پھر رہے ہو؟ میں تمہاری دکان سے ہو کر آ رہی ہوں۔ وہاں اور بھی گاہک تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ کیا آج ہمیں روئی دھن کر نہیں دو گے؟“

اس کا مطلب یہ تھا کہ میں بغداد کے ایک دھنیے کی حیثیت سے ظاہر ہوا تھا۔ جوں ہی مجھے اپنی نئی شخصیت کا شعور ہوا میرے ذہن کو اس نئی شخصیت کی تمام یادداشت بھی عطا کر دی گئی۔ اب مجھے یاد آنے لگا کہ میں واقعی ایک دھنیا ہوں۔ بغداد کے ایک کوچے میں میری دکان ہے اور میں روئی دھن کر روزی کماتا ہوں لیکن ہمیشہ کی طرح میں اپنی اصلی شخصیت سے بھی پوری طرح باخبر تھا۔ یعنی میں جانتا تھا کہ اصل میں میں عاطون ہوں اور تاریخ کے دھارے کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہوں۔ میں نے عورت سے کہا۔

”میں ذرا ایک کام سے گیا تھا - آؤ میرے ساتھ دکان پر میں ابھی تمہیں روئی دھن کر دیئے دیتا ہوں۔“

جب میں اپنی دکان پر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں گاہکوں کا ہجوم ہے موسم سرما کی آمد آمد تھی۔ لوگ لحاف تیار کروا رہے تھے۔ میں نے ان سب سے کہا کہ وہ اپنی اپنی روئی رکھ کر چلے جائیں اور شام کو آ کر دھنی ہوئی روئی لے جائیں۔ جب سب گاہک اپنی اپنی روئی کی گٹھڑیاں رکھ کر چلے گئے تو میں نے روئی دھنا شروع کر دی۔ میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ کہاں تو میں بغداد کے وزیر جعفر برمکی کا ندیم خاص تھا اور شاہی محلات میں رہتا تھا اور کہاں بغداد کی ایک گمنام دکان پر بیٹھا روئی دھن رہا ہوں۔ میں اپنے کام میں لگ اتھا کہ

ایک حسین و جمیل نوجوان رنگین کپڑوں میں ملبوس آیا اور بولا۔ "عبداللہ! چلو دریا کی سیر کو چلتے ہیں۔"

میں نے اس کے وجیہہ چہرے کو دیکھا اور فوراً میری یادداشت کی لہر نے مجھے بتا دیا کہ اس نوجوان کا نام حسین بن منصور حلاجؒ ہے اور میں اس کا دوست ہوں۔ یہ فارس کے شہر بیفا کے شمال مشرق میں واقع قریہ طور پر پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ دھنیا تھا۔ اس نے تستر میں سہیل بن عبداللہ تستری کی معیت میں دو سال صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی۔ شہر واسط میں اس کی فارسی زبان پر عربی زبان غالب آ گئی۔ اسی شہر کے ایک مشہور مدرسے میں اس نے بارہ سال گزارے۔ یہیں اس نے قرآن حفظ کیا۔ اس کے بعد وہ بغداد آ گیا اور عمرو بن عثمان مکی سے خرقہ تصوف پایا۔ وہ ایک شب بیدار، عالم و زاہد اور اسلامی شریعت کا پابند تھا۔ تصوف میں وہ بے باک اور کھلا ہوا تھا مگر جنید بغدادیؒ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے وہ ابھی تک صبر و تحمل سے کام لے رہا تھا۔ میں نے روئی کی گٹھڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"حسین! تم دیکھ رہے ہو کہ ابھی میرا کتنا کام باقی ہے۔ ان ساری گٹھڑیوں کی روئی کو دھنا باقی ہے۔ میں تمہارے ساتھ سیر کے لئے کیسے جا سکتا ہوں؟"

حسین بن منصور حلاجؒ نے روئی کی گٹھڑیوں کی طرف دیکھ کر انگلی سے اشارہ کیا۔ گٹھڑیاں اس اشارے کے ساتھ ہی کھل گئیں اور میری دکان میں دھنکی ہوئی روئی کا انبار لگ گیا۔ میں حیران و ششدر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حسین بن منصورؒ نے اپنی کرامت کھل کر دکھائی تھی وہ بولا۔

"اب تو میں نے تمہارا سارا کام کر دیا ہے۔ چلو دریا کی سیر کو چلتے ہیں۔"

جن لوگوں نے یہ کرامت دیکھی شور مچا دیا۔ حسین بن منصورؒ کو حلاج کے لقب سے پکارا جانے لگا۔ اب ہر کوئی اسے منصور حلاجؒ کہتا اور اپنی اپنی حاجت روائی کے لئے اس کے پیچھے لگ جاتا مگر منصور حلاج کسی اور دنیا میں گم تھا وہ لوگوں کو نصیحت کرتا کہ نیک عمل کرو۔ ریاکار صوفیوں سے بچو۔ خدا تمہارے نیک اعمال لکھتا ہے۔ حقیقت میں منصور حلاجؒ خدا کی تلاش میں تھا۔ جب اس کی کرامت کھل کر سامنے آ گئی تو اس نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ وہ مجھ سے بھی ملنے اب نہیں آتا تھا۔ میں اس سے ملنے اس کے گھر جاتا تو پتہ چلتا کہ وہ ابن خلیل کے مزار کے پہلو والے قبرستان میں عبادت کر رہا ہے۔ پھر منصور حلاجؒ مکہ چلا گیا۔ وہ ایک برس تک مجاور مکہ رہ کر واپس آیا تو ان کے ساتھ درویشوں کی ایک جماعت بھی تھی۔ اس کے بعد منصورؒ نے صوفیانہ لباس اتار پھینکا۔ اب اس سے کھلی

کرامتیں ہو رہی تھیں۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ مجھے اکثر کہا کرتا۔ عبداللہ عاطون! میں خدا کی تلاش میں ہوں تم بھی خدا کو تلاش کرو۔ وہ دوسری مرتبہ فریضہ حج ادا کرنے کی غرض سے مکے گیا تو اس کے پاس سوائے ایک گدڑی کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کوئی چار سو آدمی تھے۔ اس سفر میں میں منصور کے ہمراہ نہیں تھا۔ فریضہ حج ادا کرنے کے بعد منصور نے کشمیر اور چین تک کا سفر کیا اور لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کی۔ اس سفر سے واپسی پر منصور حلاجؒ پر لوگوں نے جادوگری اور شعبدہ بازی کی تہمتیں لگانی شروع کر دیں۔ حلاج نے ان کی باتوں پر کان نہ دھرا۔ وہ تیسری بار حج کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس مرتبہ وہ دو سال تک حرم پاک کا مجاور بنا رہا۔ منصور حلاجؒ نے زندگی کا آخری بار حج کیا تو دعا مانگی۔ "اے خدا! مجھے اس سے بڑھ کر بے نوا اور حاجت مند بنا۔ مجھے رسوائی دے۔ لوگ مجھے ملامت کریں تاکہ میری زبان سے ادا ہونے والا کلمہ شکر صرف تیرے لئے ہو اور میں تیرے سوا کسی کا احسان نہ اٹھاؤں۔"

اس بار حج سے واپسی پر منصور حلاجؒ نے ایک عجیب و غریب کام کیا۔ اس نے اپنے گھر کے اندر ایک چھوٹا سا کعبہ بنا کر رکھ لیا۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو صاحب ملامت بنانا چاہتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ اس نے گھر والے کعبے کے آگے کبھی سجدہ نہیں کیا تھا۔ اس کی راتیں قبرستان میں عبادت کرتے گزرتی تھیں۔ دن کے وقت وہ میری دکان پر آتا اور لوگوں سے کہتا۔ "خدا سے لو لگاؤ۔ خدا کو تلاش کرو۔ اے مسلمانو! خدا سے میرا انصاف طلب کرو۔" پھر منصور نے بغداد کے گلی کوچوں میں پھر کر اعلانیہ کہنا شروع کر دیا کہ مجھے قتل کر دیا جائے۔ اس قسم کی باتوں سے لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ ایک بڑا طبقہ پہلے ہی اس کے خلاف تھا۔ قاضی محمد بن داؤد نے فیصلہ کیا کہ منصور حلاجؒ کو محاسبے کے لئے بلایا جائے تاکہ اسے سزائے موت سنائی جا سکے لیکن ایک شافعی المذہب بزرگ فقیہہ ابن صریح نے انہیں اس محاسبے سے بچا لیا۔ لیکن جب دوسری مرتبہ المقتدر مسند خلافت پر بیٹھا تو اس نے منصور حلاجؒ اور اس کے ساتھیوں کو زندان میں ڈال دیا۔

منصور کے ساتھیوں میں میں بھی تھا۔ منصور حلاجؒ نے عادی زندانیوں میں تبلیغ اسلام اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ خلیفہ کی والدہ حلاج سے عقیدت رکھتی تھی جس کی وجہ سے حلاج کو تختہ دار پر نہ لٹکایا جا سکا تھا۔ منصور حلاجؒ یہاں تصوف اور دینی علوم پر کتابیں لکھتا رہا۔ اپنی مشہور و معروف کتاب "طس الازل" اس نے اسی زندان میں مکمل کی۔ اس وقت تک منصور حلاجؒ پر راز حقیقت فاش ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پردے ہٹ گئے تھے۔ وہ کیا دیکھ رہا تھا۔ اس کے بارے میں وہ اکثر مجھ سے باتیں کرتا مگر جو کچھ وہ

خود دیکھ رہا تھا اسے وہ کسی دوسرے کو نہیں دکھا سکتا تھا۔ منصور حلاجؒ کے کئی ساتھیوں کو رہا کر دیا گیا تھا۔ مگر میں نے رہا ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ میں منصور کی حیثیت سے بہت متاثر ہوا تھا اور اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ منصور حلاجؒ حالت جلال میں تھا۔ اس نے اپنا خرقہ اتار کر مجھے دیا اور کہا۔

"جب میرے جسد خاکی کے ٹکڑے دریائے دجلہ میں پھینکے جائیں گے تو دریا میں طوفان نوح جیسے آثار پیدا ہوں گے اس وقت میرا یہ خرقہ دریا میں پھینک دینا نہیں تو یہ طوفان نوح کی طرح سب کو بہا کر لے جائے گا۔"

میں نے خرقہ سنبھال لیا - اس وقت وہاں سو کے قریب قیدی تھے۔ ان سے حالت جذب میں کہا۔

"کیا تم سب قیدی رہا ہونا چاہتے ہو؟" تمام قیدی کھلکھلا کر ہنس پڑے وہ منصور حلاجؒ کی شخصیت سے واقف نہیں تھے۔ وہ سب کے سب عادی مجرم تھے۔ ایک قیدی بولا۔

"تم تو خود ایک قیدی ہو ہمیں کیوں کر آزاد کراؤ گے؟"

یہ تمام قیدی زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے۔ منصور نے اپنی انگلی سے ان کی زنجیروں کی طرف اشارہ کیا۔ سب قیدیوں کی زنجیریں کٹ کر گر پڑیں۔ قیدی ششدر رہ گئے۔ منصور نے جیل کے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو جیل کا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ قیدی منصور کے آگے سجدے میں گرنے لگے تو منصور نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا اور کہا۔ "سجدہ صرف خدا کو کیا جاتا ہے اور میں خدا نہیں ہوں۔"

قیدیوں نے کہا۔ "آپ بھی ہمارے ساتھ قید خانے سے فرار کیوں نہیں ہو جاتے؟"

منصور نے کہا۔ "یہ ایک راز ہے جو سولی پر چڑھ کر بھی نہیں بتایا جا سکتا۔"

سارے کے سارے قیدی فرار ہو گئے۔ منصور نے مجھے بھی ان کے ساتھ چلے جانے کو کہا مگر میں نے انکار کر دیا۔ وہ مسکرایا۔

"تمہیں فرار ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں اگر سولی پر چڑھا بھی دیا جائے تو تم نہیں مر سکو گے۔"

منصور حلاجؒ میری اصل شخصیت سے واقف ہو چکا تھا مگر اس نے مجھ سے کبھی اس کا ذکر نہ کیا تھا۔ منصور حلاجؒ پر حال اور مستقبل کے سارے اسرار منکشف ہو گئے تھے اور اس نے اناالحق کا نعرہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ اس بناء پر اسے ملحد و زندیق قرار دیا جا چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو خدا ہرگز نہیں سمجھتا تھا۔ میں اس کی زندگی کے آخری ایام کی خلوت و جلوت کا شاہد ہوں۔ اسے ادراک ذات ہو چکا تھا اور وہ اپنے اوپر فدا ہو کر ازخود رفتہ ہو گیا تھا۔ ہم

یہ کہہ سکتے ہیں کہ اتنے بڑے راز کو معلوم کر لینے کے بعد وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ مگر یہ سب بڑے لوگوں کی باتیں ہیں۔ کم از کم میں ان مسائل پر بحث و مناظرے کے لائق خود کو نہیں سمجھتا۔ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ منصور نے اپنے آپ کو خدا نہیں کہا تھا بلکہ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کہ میں تو اپنے آپ کو خدا پر فدا کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے خون سے وضو کر کے خدا کی نماز ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جب صبح ہوئی اور جیل کے نگران کو قیدیوں کے فرار کا علم ہوا تو اس نے منصور کی طرف حیرت سے دیکھ کر پوچھا۔ "سب قیدی کہاں چلے گئے؟"

منصور نے کہا۔ "میں نے ان کو آزاد کر دیا ہے۔"

جیل کے نگران نے تعجب سے پوچھا۔ "تم کیوں نہیں گئے؟"

منصور نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

"ہم خدا کے قیدی ہیں۔ تمہارے قیدی ہوتے تو کب کے آزاد ہو چکے ہوتے۔؟"

چند روز گذرے تھے کہ بغداد میں اس وقت شیخ المشائخ محمد بن حنیف جیل میں منصور سے ملاقات کے لئے آئے۔ منصور اس وقت اپنے پیروں میں پڑی ہوئی آہنی بیڑیوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں اس کے پاؤں کے ناخن تراش رہا تھا کہ شیخ المشائخ کے آنے کی خبر ہوئی۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا۔ "منصور کس حال میں ہو؟"

منصور نے جواب دیا۔ "اللہ تعالیٰ کی نعمتیں مجھ پر ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی نازل ہو رہی ہیں۔"

شیخ المشائخ نے کہا۔ "منصور! میں تم سے تصوف کے تین مسئلے پوچھنا چاہتا ہوں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ صبر کسے کہتے ہیں؟"

منصور نے کہا۔ "صبر یہ ہے کہ میں ان بیڑیوں کی طرف ایک نگاہ کروں اور یہ ٹوٹ جائیں۔"

میں نے بھی دیکھا کہ منصور نے بیڑیوں پر ایک نگاہ ڈالی اور وہ ٹوٹ گئیں مگر منصور نے اس تصرف کے باوجود بیڑیوں کو دوبارہ اپنے پیروں میں پہن لیا۔ پھر منصور نے دیوار کی طرف نگاہ ڈالی تو دیوار شق ہو گئی۔

منصور نے شیخ المشائخ سے کہا۔ "یہ ہے صبر۔"

انہوں نے منصور سے دوسرا مسئلہ پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ فقر کیا ہے؟"

منصور کے قریب ہی پتھر کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ منصور نے اس پتھر پر نگاہ ڈالی تو وہ سونا بن گیا۔ منصور نے کہا یہ فقر ہے کہ باوجود اس تصرف کے میرے پاس نصف درہم بھی نہیں

ہو تا کہ جس سے میں اپنے گھر میں جلانے کا تیل خرید سکوں۔"

شیخ المشائخ نے تیسرا سوال کیا۔ "ہمت مرداں کسے کہتے ہیں؟"

منصور نے کہا۔ "یہ تم کل دیکھو گے جب مجھے سولی پر چڑھایا جائے گا۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔ کیوں کہ اس کا مطلب تھا کہ منصور کو علم ہو چکا تھا کہ کل اسے سولی پر چڑھا دیا جائے گا۔ شیخ المشائخ پر بھی حیرت طاری تھی۔

شیخ المشائخ نے منصور کا ہاتھ چوما اور تشریف لے گئے۔

منصور حلاجؒ کے ٹخنوں سے گھٹنوں تک لوہے کی تیرہ بیڑیاں تھیں۔ اس کے باوجود وہ رات اور دن میں ایک ہزار رکعتیں نوافل پڑھتا تھا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ منصور حلاجؒ نماز سے فارغ ہوا تو بولا۔ "عبداللہ! تم میرا خرقہ لے کر چلے جاؤ۔ اب ہم دونوں کا وقت آن پہنچا ہے۔ تمہارا زنداں سے باہر جانے کا اور میرا سوئے دار جانے کا۔" اس نے دیوار زنداں کی طرف دیکھا۔ دیوار ایک جگہ سے شق ہو گئی۔ میں اپنے دوست منصور کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس نے اپنی پرجلال آواز میں حکم دیا کہ میں خلق خدا کی بھلائی کی خاطر اس کا خرقہ لے کر زنداں سے نکل جاؤں۔ چنانچہ میں دیوار کے شگاف سے باہر نکل گیا۔ بغداد کے آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔

یہ 309ھ کی ایک صبح تھی۔ منصور حلاجؒ کو پابہ جولاں باب خراسان میں دریائے دجلہ کے کنارے لایا گیا۔ پہلے اس کے ہاتھ پیر کاٹے گئے۔ پھر اسے سولی پر لٹکا دیا گیا۔ جب منصور کی روح پرواز کر گئی تو اس کا سر کاٹ دیا گیا۔ اور اس کے جسم کے ٹکڑوں کو تیل میں بھگو کر نذر آتش کر دیا گیا۔ پھر اس کی جسم کی راکھ کو ایک اونچے مینار پر سے دریائے دجلہ میں پھینک دیا گیا۔ جوں ہی منصور حلاج کی راکھ دجلہ میں گری۔ دریا میں ایک طوفان آ گیا۔ اس کی موجیں مہیب انداز میں اوپر کو اٹھنے لگیں۔ قیامت کا شور بپا ہو گیا۔ دریا سمندر بن گیا اور اس کا طوفان بپھرتا ہوا باہر کو دوڑا۔ مجھے منصور کی وصیت یاد آ گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا خرقہ دریا میں پھینک دیا۔ خرقہ ڈالتے ہی طوفان تھم گیا۔ موجوں کو سکون آ گیا۔ جو لہریں بپھر کر باہر کو دوڑی تھیں سمٹ کر واپس دریا میں آ گئیں لیکن مرکز کے عدم استحکام اور لسانی اور نسلی اختلافات کی جو لہریں خاص ایوان شاہی سے نکل کر پوری سلطنت میں پھیل چکی تھیں وہ واپس نہ آ سکیں۔ المتوکل کی سیاسی غلطیوں نے مرکز کی رہی سہی طاقت کو بھی ختم کر دیا اور حریف علاقے زیادہ طاقتور ہوتے گئے اور عباسیوں کا زوال شروع ہو گیا۔ اب لوگ قرآن و سنت پر عمل پیرا ہونے کی بجائے ان پر مناظرے کرنے اور تاویلات پیش کرنے میں مصروف تھے اور چنگیز خان کی زرد آندھی کے پہلے جھونکے بغداد کی فصیل شہر سے

ٹکرانے لگے تھے۔

چنگیز خان کی پیدائش کے بعد اس کی ماں ہولون نے ایک نظم کہی جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"جب وہ پیدا ہوا تو اس کے ہاتھ میں سیاہ خون کا لوتھڑا تھا
اور وہ میرے ہی بطن سے تولد ہوا
جیسے وحشی چیتا اپنے بعد پیدا ہونے والے پر جھپٹ پڑے
اس شیر کی طرح جو اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکے
اس نے اپنے بھائی کو ہلاک کر ڈالا
اس عقاب کی طرح جو اپنے ہی سائے پر جھپٹ پڑے"

چنگیز خان بڑی تیزی سے پروان چڑھا۔ اسے بچپن ہی سے احساس تھا کہ قدرت نے اسے تمام دنیا کے منگولوں کا حاکم اعلیٰ بنانے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس نے بہت جلد اپنے آپ کو تمام منگول قبائل کا سردار تسلیم کروا لیا اور شمالی چین پر حملہ کر دیا۔ وہ قصبوں آبادیوں کو روندتا، شہروں کو آگ لگاتا خلق خدا کو بے دریغ قتل کرتا آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ اس نے بہت جلد شمالی چین، ایران اور روس تک پھیلے ہوئے سارے علاقے فتح کر لئے۔

سلطان علاء الدین محمد اس قیامت خیز ابھرتے ہوئے منگول فتنے سے بے خبر نہیں تھا مگر اسے اپنی اس سلطنت پر بڑا گھمنڈ تھا جس کی بنیادوں کو عیاشی اور سازشوں کی دیمک چاٹ چکی تھی۔ جب چنگیز خان کے پیکنگ فتح کرنے کی خبر پہنچی تو بادشاہ کے چہرے پر فکر و تشویش کی پہلی لہر ابھری۔ خاقان چین اس وقت کے طاقتور ترین بادشاہوں میں سے تھا۔ چنگیز خان نے اسے شکست فاش دی تھی اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ سلطان نے فیصلہ کیا کہ چنگیز خان کے دربار میں ...... ایک سفارتی وفد بھیجا جائے تاکہ چنگیز خان کا عندیہ معلوم ہو۔

میں بھی اس سفارتی وفد کے ہمراہ تھا۔ میری حیثیت سرکاری دبیر شاہی کی تھی اور مجھے روزنامچہ مرتب کرنا تھا۔ کئی مہینوں کا سفر طے کر کے جب ہم ان علاقوں میں پہنچے جنہیں چنگیز خان کی فوجوں نے تاخت و تاراج کیا تھا تو ہمیں جگہ جگہ سروں کے مینار نظر آئے اور زمین پر ٹخنوں تک خون جما ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر وفد کے ارکان کے جسموں میں خوف کی لہر سرد دوڑ گئی۔ پیکنگ میں سفارتی وفد کا شایان شان خیر مقدم کیا گیا۔ ہمیں شاہی خیموں میں ٹھہرایا گیا اور تھالیوں میں پنیر کے ٹکڑے اور دودھ کا مشروب پیش کیا گیا۔

دو روز بعد ہمیں چنگیز خان کے دربار میں پیش کیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ مشرق کا یہ خونخوار وحشی درمیانے قد کا آدمی تھا جس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی وہ طلائی مسند پر تلوار لگائے بیٹھا تھا۔ زرد آنکھوں سے سنگدلی ہویدا تھی جسم گٹھا ہوا تھا۔ وہ سلطان اور

اسلام کے بارے میں سوال کرتا رہا۔ پھر اس نے پیغام دیا کہ سلطان سے کہو کہ ہم اسے مغرب کا فرمانروا سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دونوں طرف کے سوداگر آیا جایا کریں۔ میں ایک ایک جملہ لکھتا جا رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ چنگیز خان کے قبیلے کے لوگ جفاکش اور عیاشیوں سے ناواقف تھے۔ بچہ بچہ شہسوار تھا اور لڑتے وقت ہنستے تھے۔ مشکوں پر لیٹ کر دریا عبور کرتے تھے۔ جب ہمارا وفد واپس جانے لگا تو چنگیز خان نے سلطان کے لئے سونے کا ایک ڈلا تحفے کے طور پر ساتھ بھیجا۔ سونے کے اس ڈلے کو دیکھ کر سلطان اور اس کے تمام درباری انگشت بدنداں رہ گئے۔ ان دنوں سلطان خوارزم شاہ خلیفہ وقت ناصر سے عداوت رکھتا تھا اور اس نے شہاب الدین غوری کو پیغام بھی بھیجا تھا کہ وہ بغداد پر چڑھائی کر کے خلیفہ ناصر کی حکومت کا تختہ الٹ دے مگر غوری نے ایسا نہیں کیا تھا۔ سلطان علاء الدین محمد نے لوگوں کے دل فتح نہیں کئے تھے۔ معاشرہ اخلاقی زوال کا شکار تھا۔ ہر طرف منافقت کا دور دورہ تھا۔ امراء طاؤس و رباب کی رنگینیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔

یہ افواہیں بھی عام پھیل گئیں کہ چنگیز خان کے جاسوس جگہ جگہ پھر رہے ہیں۔ ان ہی دنوں چنگیز خان کے ملک سے سوداگروں کا ایک قافلہ آیا جس کو سلطان کے معتمد خاص نے جاسوس قرار دے کر گرفتار کر لیا اور بعد میں سلطان کے حکم سے انہیں قتل کر دیا گیا۔ چنگیز خان کو سوداگروں کے قتل عام کی اندوہناک خبر پہنچی تو اس نے اپنا ایک خاص ایلچی سفیر خوارزم شاہی دربار میں بھیجا تا کہ واقعے کی وضاحت معلوم کی جائے۔ سلطان علاء الدین طاقت کے نشے میں چور تھا۔ اس نے اس وضاحت طلبی کو بھی اپنی توہین سمجھا اور حکم دیا کہ چنگیز خان کے سفیر کی داڑھی مونڈھ دی جائے۔ دربار میں حجام بلا کر چنگیزی سفیر کی داڑھی مونڈھ دی گئی۔ سلطان نے بڑے تکبر سے کہا کہ جاؤ اپنے بادشاہ سے کہو کہ ہم اسے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

جب یہ سفیر ذلت و رسوائی اٹھانے کے بعد چنگیز خان کے پاس پہنچا تو چنگیز خان غصے سے کانپنے لگا۔ اس نے تلوار نیام سے نکال کر کہا۔

"میری تلوار خوارزم کی آنے والی نسلوں سے بھی اپنے آدمیوں کا انتقام لے گی۔"

اور چنگیز خان کا لشکر بغداد، نیشا پور کی طرف چل پڑا۔ موت اس خون آشام لشکر کے ساتھ رقص کرتی چل رہی تھی۔ چنگیز خان نے بغداد پر حملہ نہیں کیا تھا اس لئے کہ خلیفہ وقت درپردہ سازشیوں کی مدد سے چنگیز خان سے مل گیا تھا اور وہ خود چنگیز کے ہاتھوں خوارزم شاہ کو نیست و نابود کروانا چاہتا تھا۔ چنانچہ نیشا پور، رے، مرو اور خراسان تاتاریوں کی قتل و

غارت کی آماجگاہ بن گئے۔ چنگیزی لشکر نے خوارزم شاہی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ نیشاپور جل رہا تھا۔ شاہی محلات میں آگ لگی ہوئی تھی۔ چنگیز خان کے لشکری تین روز سے شہر میں قتل عام کر رہے تھے۔ گلی کوچے خون سے بھر گئے تھے۔ ہر طرف لاشوں کے ڈھیر لگے تھے۔ آگ اور خون کے جس کھیل کو چنگیز خان نے نامکمل چھوڑا تھا اسے اس کے بیٹے تولی خان، پھر اس کے بیٹے منگو خان اور اس کے بیٹے ہلاکو خان نے مکمل کر دیا۔

جس وقت ہلاکو خان کا لشکر مشرق .... اور مشرقی ایشیا میں انسانی خون سے ہولی کھیل رہا تھا اس وقت بغداد پر عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کی حکومت تھی جو ایک زوال پذیر روایت کی علامت تھی۔ وہ کمزور، عیش پرست اور رقص و سرود کا دلدادہ تھا۔ اس عہد میں ہی فرقہ باطنیہ نے چاروں طرف اپنی دہشت بٹھا رکھی تھی۔ میں ایک مصری تاجر کی حیثیت سے خراسان میں آرام و سکون کے دن گذار رہا تھا۔ حسن بن صباح فرقہ باطنیہ کا بانی اور سربراہ تھا۔ اس نے مملکت میں خوف و ہراس کی لہر دوڑا رکھی تھی۔ خراسان کے قرب و جوار میں ہی قلعہ الموت تھا جو ایک بلند پہاڑی چٹان کے اوپر واقع تھا اور جسے فتح کرنا کسی بڑی سے بڑی فوج کے لئے بھی ممکن نہ تھا۔ اس قلعے میں حسن بن صباح نے اپنی ایک جنت بنا رکھی تھی جہاں حسین عورتوں اور غلمان کے جھرمٹ لگے رہتے اور جہاں سادہ لوح لوگوں کو حالت نشہ میں پہنچا کر انہیں یقین دلا دیا جاتا کہ حسن بن صباح ہی ان کو جنت میں پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ لوگ حسن بن صباح کے فدائی تھے اور دوبارہ اپنی جنت میں ہمیشہ کے لئے جانے کی خاطر حسن بن صباح کے لئے اپنی جان تک قربان کر دیتے تھے۔ یہ فدائی بھیس بدل کر پھرتے تھے اور حسن بن صباح کے حکم پر لوگوں کو قتل کر دیتے۔

میں نظام الملک طوسی کے امراء کی صف میں شامل تھا اور طوسی حسن بن صباح کے قلعے کو تاخت و تاراج کرنے کی کئی بار کوشش کر چکا تھا۔ صباح مجھے بھی اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فدائی کو مجھے ہلاک کرنے کے لئے بھیجا۔ وہ میری طاقت سے ناواقف تھا۔ سبھی میری طاقت سے ناواقف تھے۔ میں نے کبھی اپنی ماورائی طاقت کے مظاہرے کی کوشش نہیں کی۔ میں خراسان شہر کی ایک شاندار حویلی میں رہائش پذیر تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ حسن بن صباح کے فدائی مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اس لئے ان سے بے نیاز تھا۔ آخر ایک رات ایک فدائی خنجر بکف میری خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ اس وقت میں محض اپنے شوق کی وجہ سے سو رہا تھا ورنہ مجھے سونے کی حاجت نہیں ہوتی۔

میں محض لوگوں کو دکھانے کے لئے کھاتا پیتا، تھکان کا اظہار کرتا، اور سو جاتا تھا۔ اس

روز بھی میرا غلام میرے پاؤں دبا رہا تھا تو میں نے اس سے کہا کہ مجھے نیند آ رہی ہے وہ چلا جائے۔ جب وہ چلا گیا تو میرا ذہن اپنے واحد دوست .... قنطور کے بارے میں سوچنے لگا۔ قنطور بھی میری طرح صدیوں کا مسافر تھا اور اس سے ملے بھی صدیاں ہو گئی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ خدا جانے کہاں ہو گا؟ اور کس حال میں ہو گا؟ اتنا میرے دل کو یقین تھا کہ وہ سانپ سے دوبارہ انسانی شکل اختیار کر چکا ہو گا۔

میں اپنے خیالوں میں گم تھا دل نے چاہا کہ ذرا سو جاؤں اور ہو سکتا ہے کہ خواب میں اپنے ناگ دوست قنطور سے ملاقات ہو جائے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو نیند کی لہروں کے حوالے کر دیا۔ مجھے نیند کی دنیا میں گئے تھوڑی دیر ہوئی ہو گی کہ اپنی چھاتی پر مجھے کسی کے ہاتھ کا زور دار دھکا سا لگا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سر پر ایک سیاہ پوش انسانی ہیولا کھڑا ہے جس نے اپنا منہ سر کالے کپڑے میں ڈھانپ رکھا ہے اور مجھ پر خنجر کا ایک وار کر چکا ہے اور دوسرا وار کرنے ہی والا ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ نہ روکا۔ دوسری بار بھی خنجر میرے سینے میں دھنس گیا۔ باہر آیا تو اس کے ساتھ خون کا ایک قطرہ بھی نہیں لگا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ فدائی ہے جو مجھے قتل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر میری گرفت چٹان سے زیادہ مضبوط تھی۔ وہ اس بات سے پہلے ہی ششدر تھا کہ دو بار پوری قوت سے ایک تیز دھار خنجر گھونپنے کے بعد بھی میرے سینے سے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں نکلا اور ابھی تک زندہ ہوں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور فدائی کو ایک جھٹکا دیا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور وہ ایک جھٹکے سے میرے پلنگ پر اوندھے منہ گرا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر سیدھا کیا اور اس کے منہ پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ یہ دیکھ کر مجھے کوئی حیرانی نہ ہوئی کہ وہ میرا ایک بڑا وفادار ملازم ہی تھا۔ کیوں کہ مجھے علم تھا کہ حسن بن صباح کے فدائی نوکروں، تاجروں اور دکانداروں کے بھیس میں اپنا کام کرتے تھے۔

وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ مجھے کوئی مافوق الفطرت ہستی سمجھنے لگا تھا۔ کیوں کہ اس کا خونی خنجر مجھے ہلکا سا زخم بھی نہیں دے سکا تھا جب کہ اس کے حساب سے میرا سینہ چاک ہو جانا چاہئے تھا۔ میں نے خنجر اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

”اپنے آقا کے پاس یہ خنجر لے جاؤ اور اسے کہو کہ شیخ المصری کہتا ہے کہ اگر تم اپنے فدائین کی ساری فوج بھی لے کر آ جاؤ تو مجھے ہلاک نہ کر سکو گے۔“

فدائی خنجر وہیں پھینک کر خوف زدہ ہو کر بھاگ گیا۔

یہ وہ وقت تھا جب قصر بغداد میں سازشیں سر اٹھا رہی تھیں۔ مسلمان دو فرقوں میں بٹ گئے تھے اور دونوں فرقے ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرا تھے۔ وزیر اعظم علقمی ایک خاص فرقے کا حامی تھا - چنانچہ اس نے اپنے بھائی کے ذریعے ہلاکو خان کو پیغام بھیج کر بغداد پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ علقمی اور نصیر الدین طوسی کو یہ رنج بھی تھا کہ خلیفہ نے دنیائے اسلام کے تمام مسلمانوں کو حسن بن صباح کے فتنے کو ختم کرنے کی تلقین کی تھی۔ ہلاکو خان کی نظریں ویسے بھی بغداد پر لگی ہوئی تھیں اور سلطنت عباسیہ کی اس آخری کمزور اور بے وقعت نشانی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر کے شاہی محل میں لوٹ مار کرنا چاہتا تھا۔ ہلاکو خان اس حقیقت سے بھی باخبر تھا کہ مسلم رعایا دھڑوں میں بٹ گئی ہے اور ان میں زبردست نفاق پڑ چکا ہے جس نے اس کی یلغار کے لئے بڑا سازگار ماحول پیدا کر دیا تھا۔

چنانچہ ہلاکو خان فوج لے کر برق رفتاری سے بغداد کی طرف بڑھا۔ ہلاکو خان نے بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ شہر سے باہر تمام بلند مقامات سے تاتاری فوج نے بغداد پر منجنیقوں سے آگ اور پتھر برسانے شروع کر دیئے۔ شہر میں جگہ جگہ آگ بھڑک اٹھی۔ غدار علقمی نے خلیفہ کو مشورہ دیا کہ ہتھیار ڈال دینے میں ہی مصلحت ہے۔ اس کے مشورے سے خلیفہ اپنے اہل و عیال، امراء، علماء، قاضی اور اکابرین کو ساتھ لے کر ہلاکو خان کے دربار میں جا حاضر ہوا۔ علقمی نے خلیفہ کو یقین دلایا تھا کہ ہلاکون خان اسے بدستور مسند خلافت پر برقرار رکھے گا۔

ہلاکو خان نے بظاہر خلیفہ اور اس کے ہمراہیوں کی عزت اور احترام کیا - خلیفہ کو علقمی کی باتوں پر اعتبار آ گیا۔ ہلاکو خان کے ایماء پر خلیفہ نے ایک اور غلطی کی کہ شہر میں مناد کرا دی کہ تمام فوجی ہتھیار رکھ کر شہر سے باہر میدان میں آ جائیں تا کہ ان کی گنتی کر کے ان کی عام معافی کا اعلان کر دیا جائے۔ تمام فوجی ہتھیار جمع کروا کر شہر سے باہر آ گئے۔ ان سب کو گرفتار کر لیا گیا اور ہلاکو خان نے شہر میں قتل عام اور لوٹ مار کا حکم صادر کر دیا۔ تاتاری بغداد شہر پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے خون کی ندیاں بہا دیں۔ انہوں نے بوڑھوں، بچوں، عورتوں، جوانوں سب کو تہ تیغ کر دیا۔ حسین عورتوں کو الگ کر کے اغواء کر لیا۔ بغداد تاتاری فوجوں کے گھوڑوں کے سموں تلے روندا گیا۔ ہلاکو خان کے حکم پر خلیفہ اور اس کے اہل و عیال کو بوروں میں بند کر کے ڈنڈوں سے پیٹا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مر گئے۔ شاہی محلات کو لوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ لاکھوں نایاب کتابوں کو جلا ڈالا گیا یا دریائے دجلہ میں پھینک دیا گیا۔ چھ ہفتوں تک یہ قتل و غارت گری جاری رہی۔ اس وقت بغداد کی آبادی بیس لاکھ کے قریب تھی۔ ان میں سے 16 لاکھ افراد قتل کر دیئے گئے۔ ایسی الم انگیز تباہی میں نے

اس سے پہلے تاریخ میں نہیں دیکھی تھی۔ تاتاری لشکر نے دریائے دجلہ پار کر کے خراسان
اور نیشا پور کا رخ کیا تو میں سمجھ گیا کہ اب سلطان کے خوشامدی درباریوں اور امراء کے
ساتھ اہل شہر پر بھی قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ میں اکیلا کس کس کو بچا سکتا تھا۔ میں نے اپنے
تمام خادموں اور کنیزوں اور غلاموں کو آزاد کر دیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ راتوں رات اپنی
جانیں بچا کر فرار ہو جائیں۔ میں خود شہر سے نکل جانا چاہتا تھا کہ مظلوم انسانوں کو تاتاریوں
کے ہاتھوں قتل ہوتا نہ دیکھ سکوں۔ میں نے دو چار ہیرے اور اپنے ناگ دوست قنطور کا مہرہ
اپنے ساتھ لیا اور اپنی حویلی کو خیرباد کہہ کر شہر سے باہر ایک بزرگ کے آستانے پر آ گیا۔
یہ بزرگ صاحب کشف و کرامات تھے اور اپنا بیشتر وقت عبادت و ریاضت میں بسر کرتے تھے۔
ہلاکو خان کے لشکر نے خراسان پہنچتے ہی ہر طرف قتل عام شروع کر دیا۔ کچھ تاتاری سپاہی
اس بزرگ کو شہید کرنے جب ٹیلے کی طرف چڑھنے لگے تو بزرگ نے آنکھیں کھول کر
اپنے ایک مرید سے پوچھا۔ "یہ سپاہی کیا کرنے آ رہے ہیں؟"

ایک مرید نے کہا۔ "یا حضرت یہ ہمیں قتل کرنے آ رہے ہیں۔" بزرگ نے سپاہیوں پر
ایک جلالی نظر ڈالی۔ تمام سپاہیوں کی گردنیں کٹ کر نیچے گر پڑیں۔ اس کے بعد سپاہیوں کی
ایک اور ٹولی آئی۔ اس کے ساتھ بھی یہی حشر ہوا۔ ایک سپاہی نے ہلاکو خان کو جا کر خبر دی تو
وہ فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں آ گیا۔ ہلاکو خان نے بزرگ کو دیکھ کر تلوار نیام سے باہر
کھینچ لی اور ٹیلے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

ہلاکو خان کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بزرگ اٹھ کھڑے ہوئے اور خود ہی سیڑھیاں اتر کر
ہلاکو خان کی طرف چلے۔ مریدوں نے پوچھا کہ یا حضرت آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں۔
بزرگ نے تبسم کیا اور فرمایا۔

"ہم ملک الموت کو ہلاکو خان کی معیت میں دیکھ رہے ہیں۔ اب ہم پر واجب ہے کہ
ہم خود بھی شہید ہو کر اللہ تعالیٰ کے اس قہر کی شہادت دیں۔"

اور میری آنکھوں کے سامنے ہلاکو خان نے ایک ہی وار سے بزرگ کو شہید کر دیا۔
ہلاکو خان کے سپاہی ٹیلے والی خانقاہ کے درویشوں پر ٹوٹ پڑے۔ کوئی درویش زندہ نہ بچ سکا۔
ٹیلے کی دوسری جانب ایک نہر بہتی تھی۔ میں نے اس نہر میں چھلانگ لگا دی۔ میں اپنی طاقت
کے مظاہرے سے بچنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سپاہی مجھے جانے دیں گے مگر ایک بدقسمت
تاتاری سپاہی کی اجل آ چکی تھی۔ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر اسے دوڑاتا ہوا ٹیلے کا چکر کاٹ کر نہر
میں آ گیا۔ وہ تلوار لہرا رہا تھا۔ میں نہر کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ وہ بھی میرے سر
آ گیا۔ اس نے تلوار کا بھرپور وار کیا۔ تلوار میرے کندھے سے ٹکرائی اور میرے جسم میں

سے ہوتی ہوئی دوسری طرف پسلیوں کے نیچے سے نکل گئی۔ تلوار کے نکلتے ہی میرے جسم کا
گوشت آپس میں مل گیا۔ تاتاری سپاہی حیران رہ گیا کہ جب تلوار میرے جسم میں سے گذر
گئی ہے تو میں کٹ کر گرا کیوں نہیں؟

لیکن میں نے اسے زیادہ دیر حیران رہنے کا موقع نہ دیا۔ جوں ہی وہ دوسرا وار کرنے
کے لئے میری طرف بڑھا۔ میں نے اس کی تلوار پکڑ لی اور زور سے کھینچا۔ وہ گھوڑے پر
سے نیچے گر پڑا۔ اب میرے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ اسی تلوار سے تاتاری
سپاہی کا کام تمام کر دوں۔ میں سپاہی کے گھوڑے پر اچھل کر سوار ہو گیا اور نہر کے ساتھ
ساتھ گھوڑا دوڑانے لگا۔ آگے جا کر میں نے نہر کو چھوڑ دیا اور گھوڑا بائیں جانب بنجر میدان
میں ڈال دیا۔ اس وقت دن کی روشنی ماند پڑنے لگی تھی۔ میں گھوڑا دوڑائے چلا جا رہا تھا۔
میری کوئی منزل نہیں تھی۔ بس اسی آفت زدہ شہر سے جتنی دور نکل سکوں نکل جانا چاہتا
تھا۔ چلتے چلتے میں شہر سے کئی کوس دور نکل آیا تھا۔ دور اونچی پہاڑیوں پر مجھے حسن بن صباح
کے قلعہ الموت کے کنگورے غروب ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں دھندلے ہوتے نظر
آ رہے تھے۔ میں ان پہاڑیوں کے دامن سے ہو کر بخارا کی طرف کوچ کر جانا چاہتا تھا۔ ان
پہاڑیوں کے قریب پہنچتے پہنچتے رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ
میرے گھوڑے کو پیاس لگی ہے۔ اس کی چال میں نقاہت آ گئی تھی اور وہ بار بار گردن نیچے
جھکا دیتا تھا۔

قلعہ الموت کی پہاڑیوں میں داخل ہو کر میں نے پانی کی تلاش شروع کی تو ایک جگہ
مجھے پہاڑ کی درز میں سے پانی بہتا مل گیا۔ نیچے پانی کا ایک چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ میں
گھوڑے سے اتر پڑا تھا۔ گھوڑا واقعی پیاسا تھا۔ اس نے جی بھر کر پانی پیا اور پتھروں میں اگی
ہوئی گھاس چرنے لگا۔ میں نے اسے تازہ دم ہونے کا موقع دیا اور خود ایک ٹیلے کی اوٹ میں
پتھر کی سل پر بیٹھ گیا۔ میرے پیچھے پہاڑ کی دیوار تھی اور سامنے میدان تھا جس میں سے کچا
راستہ اوپر قلعے کی طرف جاتا تھا۔ کچھ دیر وہاں توقف کرنے کے بعد جب میں نے دیکھا کہ
گھوڑا تازہ دم ہو چکا ہے تو میں نے اٹھ کر اس کی لگام تھامی۔ اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ
پھیرا اور اس پر سوار ہونے ہی والا تھا کہ مجھے ایک آواز سنائی دی۔ میں وہیں ٹھٹک گیا۔ میں
ہمہ تن گوش ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہی آواز پھر سنائی دی۔ اب یہ آواز قریب سے سنائی
دی تھی۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی اور وہ درد بھری آواز میں کسی کو پکار رہی تھی۔ میں
نے گھوڑے کو وہیں چھوڑا اور جس طرف سے آواز آئی تھی اس طرف بڑھا۔ اگرچہ رات
ہو چکی تھی مگر سامنے کھلا میدان ہونے کی وجہ سے پہاڑی کے اس حصے میں ستاروں کی پھیکی

روشنی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت بال بکھیرے غم و الم کی تصویر بنی پہاڑی کی اس درز کی طرف بڑھ رہی تھی جس میں سے پانی نکل رہا تھا۔ میری جگہ اگر دوسرا شخص رات کے وقت ویران پہاڑیوں میں اس عورت کو دیکھتا تو اسے چڑیل سمجھ کر چیخ مار کے بے ہوش ہو جاتا۔ مگر میں اس سے پہلے بہت سی چڑیلوں اور جن بھوتوں کو بھگتا چکا تھا۔

وہ عورت جھک کر پانی پینے لگی۔ پانی پی چکنے کے بعد اس عورت نے ایک آہ سرد بھری اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولی۔

"اے رب العالمین! اگر اب میں کبھی اپنی اکلوتی بیٹی سے نہیں مل سکتی تو مجھے اس جگہ موت دے دے۔"

وہ واپس گھومی اور اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ ڈر کر بھاگنے ہی والی تھی کہ میں نے دوڑ کر اسے روک لیا اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ مجھے بتاؤ تم کون ہو؟ اور ان ویران پہاڑیوں میں اپنی بچی کو کہاں تلاش کرتی پھرتی ہو؟"

اب میں نے غور سے دیکھا کہ وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ بچی کی جدائی نے اس کے چہرے پر ویرانی کے سائے ڈال رکھے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے تک رہی تھی اور خوف کے مارے اس کا جسم آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا۔ اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا کہ میں فدائی تو نہیں ہوں؟ میں نے اسے بتایا کہ میں فدائی نہیں ہوں بلکہ ایک مصری ہوں اور خراسان سے بخارا جا رہا تھا کہ یہاں دم لینے کو رک گیا۔ تمہاری آواز سنی تو تمہارے پاس آ گیا۔ کیا تمہاری بچی وفات پا چکی ہے؟

اس عورت کو میری باتوں سے کچھ حوصلہ ہوا۔ وہ بیٹھ گئی میں بھی اس کے سامنے پتھروں پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولی۔

"میرا نام مائدہ ہے۔ ایک ماہ ہوا شیخ الجبل کے فدائی میرے خاوند کو قتل کر کے میری اکلوتی نوجوان لڑکی فائقہ کو اغواء کر کے اپنی جنت میں حور بنانے کے لئے لے گئے۔ تب سے آج تک میں ان پہاڑیوں میں اپنی بیٹی کو تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔ میری بیٹی ہی میری زندگی کا سہارا تھی۔ وہ بھی مجھ سے چھین لی گئی ہے۔ شیخ الجبل کی جنت میں .... اسی طرح امیر گھرانوں کی لڑکیاں اغواء کر کے لائی جاتی ہیں۔ وہ اس جنت میں دوزخ کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ جب کوئی لڑکی بیس برس کی عمر سے اوپر پہنچتی ہے تو اسے ہلاک کر کے اس کی جگہ دوسری لڑکی اغوا کر کے لائی جاتی ہے۔ میری فائقہ کی عمر اٹھارہ برس ہے جانتی ہوں دو برس بعد اسے بھی قتل کر دیا جائے گا۔ کاش میں اپنی بیٹی کو جوان کی موت سے بچا سکتی۔ مگر میں

ایک کمزور عورت ہوں۔ اسی طرح ان پہاڑیوں میں اپنی اکلوتی بیٹی کو پکارتی ایک دن مر جاؤں گی۔"

اس عورت کی آہ و فریاد نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ میں نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر کے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں اس غم زدہ ماں کی بیٹی کو ضرور واپس لا کر رہوں گا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ فکر نہ کرے اور نالہ و فریاد بند کر دے۔ میں اس کی بیٹی کو اس کے پاس لانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ وہ حیرت اور تجسس سے مجھے تکنے لگی۔

"مگر بیٹا! تم قلعہ الموت میں کیسے جاؤ گے؟ وہاں تو آج تک کوئی نہیں جا سکا۔ فدائی جس کو اغواء کر کے لے جائیں وہی قلعے میں جاتا ہے اور وہ بھی پھر واپس نہیں آتا۔"

میں نے کہا۔ "بی بی! تم یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو کہ میں شیخ الجبل حسن بن صباح کے قلعے میں کیسے داخل ہوتا ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہاری بچی فائقہ کو اس شعبدہ باز شیخ الجبل کے چنگل سے چھڑا کر لانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ کامیابی اور ناکامی خدا کے اختیار میں ہے۔"

وہ عورت بولی۔ "مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔ بیٹا شیخ الجبل کے فدائین خونخوار ہیں۔ موت ان کے نزدیک ایک کھیل ہے۔ خدا تمہارا نگہبان ہو۔ میں تمہارے لئے سجدے میں گر کر دعا مانگتی رہوں گی۔"

اس عورت نے مجھے اپنی چھوٹی سی جھونپڑی دکھائی جو اس نے ان ہی پہاڑیوں میں ایک جگہ ڈال رکھی تھی۔ وہ اسی جگہ فقر و فاقہ میں رہ کر اپنی بیٹی کی یاد میں دن رات آنسو بہاتی تھی۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ اسی جھونپڑی میں رہ کر اپنی بیٹی کا انتظار کرے۔ یہ کہہ کر میں واپس اپنے گھوڑے کے پاس آ گیا۔ کہنے کو تو میں نے یہ سب کچھ کہہ دیا تھا مگر اب میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں کیا کروں؟ قلعہ الموت میں کس طریقے سے داخل ہوں اور کس بھیس میں جاؤں۔ کیوں کہ بفرض محال اگر میں کسی طرح قلعے میں داخل ہو بھی گیا تو حسن بن صباح مجھے پہچان لے گا۔ کیوں کہ وہ خراسان کے سلطان کے سبھی امراء کو اور خاص طور پر اپنے دشمن امراء کے چہروں سے خوب واقف تھا اور مجھ پر قاتلانہ حملہ بھی کروا چکا تھا اور میری دھمکی بھی اسی فدائی کے ذریعے حسن بن صباح تک پہنچ چکی تھی۔

ایک بات بالکل واضح تھی کہ میں اگر سیدھے سبھاؤ قلعے کی طرف چلنا شروع کر دوں تو میرے لئے رکاوٹ نہیں ہو گی۔ قلعے کی چوکیوں سے مجھ پر تیر برسیں گے جو مجھ پر اثر نہیں کریں گے۔ مگر اس سے فائدہ کچھ نہیں ہو گا۔ میں اس بدنصیب ماں کی بیٹی کو آزاد نہ کرا سکوں گا۔ اگر حسن بن صباح پر میری خفیہ طاقت کا راز بھی ظاہر ہو گیا تو بھی ممکن ہے کہ وہ

فائقہ کو ہلاک کروا ڈالے۔ یا اگر میں اسے سب کے سامنے لے کر نکلوں تو ممکن ہے کہ میں اسے فدائین کے تیروں اور خنجروں سے نہ بچا سکوں۔ اس کے لئے مجھے حکمت عملی سے کام لینا ہو گا۔ کوئی منصوبہ بنا کر قلعے میں داخل ہونا ہو گا اور پھر اس منصوبے پر عمل کرتے ہوئے خفیہ طور پر فائقہ کو لے کر وہاں سے نکلنا ہو گا۔ میں نے فائقہ کی ماں سے اس کا حلیہ معلوم کر لیا تھا۔ فائقہ کی عمر اٹھارہ برس تھی۔ قد نکلتا ہوا تھا۔ آنکھوں کا رنگ نیلا تھا۔ رنگ گورا تھا۔

میرے ذہن میں صرف ایک ہی منصوبہ آ رہا تھا کہ میں کسی فدائی کا بھیس بدل کر قلعے میں داخل ہوں۔ کیوں کہ قلعے میں فدائین کی ایک فوج رہتی تھی اور ایسا ممکن تھا کہ وہ ایک دوسرے سے اتنے صورت آشنا نہ ہوں اور پھر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ قلعے میں گاہے بگاہے ایسے غریب' جوان اور حاجت مند آدمیوں کو بھی خفیہ طریقے سے لایا جاتا ہے جنہیں نشہ پلا کر جنت ارضی کی جھلکیاں دکھا کر فدائین کی صف میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ دوسری بات جس سے میں آگاہ تھا' یہ تھی کہ حسن بن صباح فدائین کے سامنے بہت کم آتا ہے۔ اس طرح سے مجھے موقع مل سکتا تھا کہ میں فائقہ تک رسائی حاصل کر کے اس سے رابطہ قائم کر کے اسے وہاں سے فرار کروا سکوں۔ میں گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑی سے باہر نکل آیا۔

آسمان ستاروں سے جھلملا رہا تھا۔ وادی میں ایک دھیمی نورانی سی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے وہ کچا راستہ چھوڑ دیا۔ جو آگے جا کر پہاڑی کی چوٹی پر قلعہ الموت کی طرف جاتا تھا۔ میں ایک پتھریلے میدان میں سے گزر کر قلعہ الموت کے جنوبی دامن کی طرف چل دیا۔ میں گھوڑا دوڑائے جا رہا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر میں نے پہاڑی کا اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ میں نے دیکھا کہ حسن بن صباح کے قلعے کو صرف ایک ہی راستہ اوپر پہاڑی پر جاتا تھا جو آگے جا کر جھاڑیوں میں چھپ گیا تھا۔ میں نے کافی سوچ بچار کے بعد گھوڑے کو زور سے لات ماری اور اسے واپس بھگا دیا۔ میرا لباس عام عربوں جیسا تھا۔ سر پر عمامہ اور لمبا کرتا میری جیب میں اپنی حویلی سے لائے ہوئے چند ایک قیمتی ہیرے اور اپنے سانپ دوست قنطور کا دیا ہوا مہرہ تھا۔ ان چیزوں کو میں نے ایک رومال میں لپیٹ کر لباس کے اندر اپنی کمر کے گرد باندھ لیا اور راستے سے ہٹ کر ساتھ ساتھ اوپر کو چلتی خشک جھاڑیوں اور سنگلاخ ٹیکریوں کے پیچھے سے ہو کر چڑھائی چڑھنے لگا۔

کچھ دور تک چڑھائی چڑھنے کے بعد میرا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا۔ وہاں قلعے کو جانے والا راستہ معدوم ہو گیا تھا اور خار دار جھاڑیوں اور خشک ٹیکریوں اور نوکیلی چٹانوں کا سلسلہ

شروع ہو گیا تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی چٹانیں کچھ اس بے ترتیبی سے لگی ہوئی تھیں کہ انہوں نے قلعہ الموت کو اپنی اوٹ میں چھپا لیا تھا۔ مجھے بڑی مشکل سے قلعے کی درست سمت کو برقرار رکھنا پڑ رہا تھا۔ چڑھائی بے حد دشوار گزار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کسی بھی بادشاہ کی باقاعدہ فوج آج تک اس قلعے پر چڑھائی کر کے اسے فتح نہ کر سکی تھی۔ رات نے ڈھلنا شروع کر دیا تھا کہ میں تنگ و تاریک الجھی ہوئی پہاڑی چڑھتا آخر قلعے کے قریب پہنچ گیا۔ میں اس قلعے کے دروازے کے بالکل سامنے والے راستے سے ہٹ کر جا رہا تھا اور قلعے کے پہلو میں جا نکلا تھا۔ قلعہ مجھ سے بمشکل آدھے فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور رات کی تاریکی میں وہ ایک بڑا بہت بڑا عفریت لگ رہا تھا جو اپنے سیاہ پر پھیلائے پہاڑی چٹان کے اوپر چمٹا بیٹھا ہوا ہو۔ اس کی دیوار بھی قدرتی اور پہاڑی چٹانوں کی بنی ہوئی تھی۔ اب میں اس کے دروازے کی سیدھ میں آ کر کسی محفوظ جگہ پر چھپ کر اپنے منصوبے پر عمل کرنا چاہتا تھا۔

میں پتھروں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں کھسکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ فدائین یہاں چھپ کر ضرور پہرہ دے رہے ہوں گے۔ میں ان ہی میں سے کسی ایک کے کھوج میں تھا۔ ایک جگہ مجھے جھاڑی میں کچھ حرکت ہوتی دکھائی دی۔ میں جان بوجھ کر اٹھ کھڑا ہوا تا کہ اگر وہاں کوئی پہرے دار ہے تو وہ مجھ پر وار کرے اور ایسا ہی ہوا۔ جوں ہی میں اٹھا سن کی آواز کے ساتھ ایک تیر اندھیرے کے سینے کو چاک کرتا ہوا میری طرف آیا اور میری گردن میں گھس گیا۔ میں نے اپنے آپ کو گرا دیا اور اندھیرے میں اس جھاڑی کو غور سے دیکھنے لگا جدھر سے یہ تیر آیا تھا اس جھاڑی میں سے ایک سیاہ پوش فدائی شیر کی طرح نکل کر میری طرف جھپٹا۔ میں زمین پر چپ چاپ لیٹا رہا۔ جوں ہی وہ میرے پاس آ کر مجھ پر یہ دیکھنے کے لئے جھکا کہ میں زندہ ہوں یا مر چکا ہوں تو میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ کر اسے وہاں گرا لیا۔ فدائی پہرے دار بھونچکا رہ گیا۔ اس پر دہشت بھی طاری ہو گئی تھی۔ کیوں کہ وہ صاف دیکھ رہا تھا کہ اس کی کمان سے نکلا ہوا تیر ابھی تک میری گردن کے آر پار ہے اور میں نہ صرف ابھی زندہ ہوں بلکہ پوری طاقت سے اس کی گردن دبا رہا ہوں۔

میری گرفت بے حد مضبوط تھی اور فدائی کا دم اکھڑنے لگا تھا۔ میں اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ میں اس کی گردن کو اسی طرح دبائے ہوئے تھا تا کہ وہ آواز نکال کر اپنے کسی ساتھی کو نہ بلا سکے۔ میں نے اس سے جلدی سے کہا۔

"تم دیکھ رہے ہو کہ میں تیر کھا کر بھی زندہ ہوں۔ میری گردن سے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہا۔ تم یہ بھی محسوس کر رہے ہو گے کہ میرے اندر ہاتھی سے بھی زیادہ طاقت

ہے۔ میں تمہیں اسی جگہ ختم کر سکتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ تم جو نئے فدائین بھرتی کرتے ہو وہ قلعے میں کس جگہ پہنچائے جاتے ہیں؟"

اس غریب کا دم نکلا جا رہا تھا۔ یہ شخص اپنے آقا کے حکم پر تو قلعے کی سب سے اونچی چوٹی پر سے کود سکتا تھا مگر اس ناگہانی آفت سے وہ بھی گھبرا گیا تھا اور میری مافوق الفطرت طاقت نے اس پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ اس نے لرزتی خرخراتی آواز میں کہا۔ انہیں قلعے کے تہہ خانوں میں سے لے جایا جاتا ہے مگر اس وقت قلعے میں نئے اغواء شدہ فدائین نہیں ہیں۔ میں نے اس کی گردن کو کچھ اور زور سے دبایا اور پوچھا کہ وہ کب لائے جاتے ہیں؟ اس کی آنکھیں باہر کو ابل آئی تھیں اور جسم میں بالکل جان نہیں رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ کچھ نوجوانوں کو اغوا کر کے آج اندھیرے میں لایا جا رہا ہے۔ یہ میرے لئے ایک مژدہ جانفزا تھا۔ جو کام مجھے قلعے کے اندر جا کر کرنا تھا اس کا پہلا مرحلہ قلعے کے باہر ہی طے ہو گیا تھا۔

جب میں نے قلعہ الموت کے بارے میں اس سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہیں تو اس نے آنکھیں بند کر کے سانس روک لیا۔ میں اس کا گلا بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ کہیں چیخ مار کر اپنے ساتھیوں کو خبردار نہ کر دے جس سے میرا سارا منصوبہ خاک میں مل سکتا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ خود ارادی حبس دم سے مرا یا میرے گلا دبانے سے اس کی موت واقع ہوئی۔ بہرحال جب میں نے اس کی گردن سے ہاتھ اٹھایا تو وہ مر چکا تھا۔ اس کا دل بند ہو گیا تھا اور سانس کی آمد و رفت ختم ہو چکی تھی۔ میں اس کی لاش کو گھسیٹ کر جھاڑیوں کے پیچھے لے گیا اور خود کچھ اور پیچھے جا کر قلعے کو جانے والے پتھریلے راستے کے کنارے ایک ٹیکرے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ اب مجھے ان فدائین کا انتظار تھا جو کچھ نئے لوگوں کو اغوا کر کے لا رہے تھے۔ ابھی پو پھٹنے میں کچھ دیر تھی۔ میں جگہ پر خاموشی سے دبکا بیٹھا رہا۔ خشک سوکھی جھاڑیوں میں سے سر نکال کر میری نگاہیں اس راستے پر جمی ہوئی تھیں جو مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر سے گزرتا ہوا اوپر قلعے کے بڑے دروازے کو جاتا تھا۔

منہ اندھیرے کی دھندلی فضاؤں میں کچھ دیر بعد مجھے سائے آگے بڑھتے نظر آئے۔ دس بارہ فدائی گھوڑوں پر سوار انہیں قدم بہ قدم چلاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے پچاس کے قریب آدمی چلے آ رہے تھے۔ عقب میں تھوڑا سا فاصلہ رکھ کر فدائیوں کا ایک اور دستہ ان کی نگرانی کرتا چلا آ رہا تھا۔ یہ پچاس کے قریب آدمی وہ لوگ تھے جنہیں فدائین کی فوج میں بھرتی کرنے کے لئے لایا جا رہا تھا۔ حسن بن صباح کو قلعہ الموت میں حکومت کرتے ایک مدت گزر گئی تھی۔ اس دوران میں جو فدائی اس پر فدا ہو کر یا طبعی موت مر

جاتے ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو اغوا کر کے یا ان کو ورغلا کر قلعے میں بھرتی کر دیا جاتا تھا۔ قلعہ الموت تک اکثریت کی تعداد باول نخواستہ آتی مگر نقلی جنت کی جھلک دیکھنے کے بعد وہ وہیں کے ہو رہتے اور مرنے کی خواہش کرتے تاکہ موت کے بعد اس نقلی جنت میں ہمیشہ کی زندگی بسر کر سکیں۔

میں چوکس ہو گیا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ نئے بھرتی کئے جانے والے آدمیوں اور عقبی نگران دستے میں کچھ فاصلہ ہے۔ ابھی ہلکا ہلکا اندھیرا بھی تھا۔ میں کچی سڑک کے کنارے ایک جھاڑی کے پیچھے گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ نئے فدائین کی ٹولی میرے قریب سے گزر رہی تھی۔ جب آخری آدمی میرے نزدیک سے گزرنے لگا تو میں چیتے کی طرح اچھلا اور اسے گردن سے دبوچ کر نیچے جھاڑیوں میں گرا لیا۔ نگران دستہ فاصلے پر ادھر ادھر دیکھ بھال کرتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے اس دوران میں اس نوجوان کو نیم بے ہوش کر کے اس کی پگڑی اپنے سر پر رکھی اور بھاگ کر آگے جانے والے نو بھرتی شدہ آدمیوں میں شامل ہو گیا اور ان ہی کی طرح سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ کسی نے میری طرف مڑ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ معلوم ہوا کہ وہ سب ایک دوسرے کے ناواقف تھے اور اپنے اپنے خیالوں میں گم چلے جا رہے تھے۔

قلعے کے دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے دیکھا کہ دروازے کے آگے ایک گہری پہاڑی کھڈ تھی۔ فدائی دستے کے لئے کھڈ کے اوپر ایک تختہ گرا دیا گیا۔ جس پر سے گذر کر ہم سب لوگ قلعے میں داخل ہو گئے۔ آج اس قلعے کے کھنڈر بھی مشکل سے ملیں گے لیکن اس زمانے میں قلعے کی ہیبت ہر کسی کے دل پر چھائی ہوئی تھی۔ قلعے کے اندر کی فضا بڑی پراسرار تھی۔ سیاہ لباس میں ملبوس فدائی تلواریں لگائے جگہ جگہ پتھر کے مجسموں کی طرح پہرہ دے رہے تھے۔ نیم اندھیرے میں ان کی آنکھیں چیتے کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہمیں ایک تنگ و تاریک راستے سے گذار کر ایک زمین دوز تہہ خانے میں لے جا کر بند کر دیا گیا۔ کچھ وقت گذرا ہو گا کہ ہمیں کھانے کو شہد اور ساتھ پینے کو مشروب دیا گیا۔ جو شاید نشہ آور تھا۔ اسے پینے کے تھوڑی دیر بعد سب کے سب نشے کی ایک کیفیت خاص میں غرق ہو گئے۔ مجھ پر نشے نے کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ مگر میں بھی اپنے ساتھیوں کی حالت بے خودی میں شامل ہو کر ان ہی جیسی اداکاری کرنے لگا تھا۔ اب ایک ایک کر کے سب بے ہوش ہونے لگے۔ میں نے بھی اپنے آپ کو بے ہوش ظاہر کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ مگر میں گوشہ چشم سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جب سارے آدمی بے سدھ ہو چکے تو تہہ خانے میں ساٹھ کے قریب فدائین داخل ہوئے۔ انہوں نے مجھ سمیت سب بے ہوش

آدمیوں کو اٹھا کر کاندھوں پر ڈالا اور کئی تنگ و تاریک دشوار گذار راستوں میں سے گزر کر ایک عجیب و غریب کشادہ اور پرفضا جگہ پر آ کر تمام بے ہوش انسانوں کو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ڈال دیا اور چلے گئے۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ مگر میں نے اپنی آنکھیں پوری نہیں کھولی تھیں۔ پھر بھی میں نے دیکھا کہ میں ایک ایسی جگہ پر آگیا ہوں جو سرسبز و شاداب چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھری ہوئی تھی۔ یہی ارضی جنت تھی۔ آبشاریں چاندی کی طرح چمکتی ہوئی نہروں میں گر رہی تھیں کہ جن کے کنارے سنگ سبز کے تھے اور بیچ میں جگہ جگہ نقرئی اور طلائی فوارے اچھل رہے تھے۔ درختوں پر رنگ برنگے پھولوں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں جن میں طیور خوش الحانی کر رہے تھے۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرے ساتھی ابھی تک عالم سکر میں تھے اور آہستہ آہستہ انہیں ہوش آ رہا تھا۔ جا بہ جا سونے چاندی کے تخت بچھے تھے جن پر ریشمی چادروں کے فرش تھے۔ سبزے کے فرش پر جگہ جگہ نیلم، فیروزے اور زمرد کا چھڑکاؤ کیا ہوا تھا جو طلوع ہوتے سورج کی سنہری شعاعوں میں رنگین کہکشاں کی طرح دمک رہا تھا۔ یہ شیخ الجبل حسن بن صباح کی جنت تھی جس میں ایک رات بسر کرنے کے بعد انسان شیخ کا فدائی بن جاتا تھا اور اس پر فدا ہونے کے بعد ابد تک اس جنت ارضی میں زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھتا تھا۔

حسینوں کا ایک جھرمٹ ہماری طرف بڑھا۔ انہوں نے سونے کے طشت اٹھا رکھے تھے جن میں عطر و گلاب اور مشروبات سے بھری ہوئی زمردیں صراحیاں تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور یہ ظاہر کیا جیسے آہستہ آہستہ ہوش میں آ رہا ہوں۔ یہ اس جنت ارضی کی حوریں تھیں یعنی سولہ برس سے لے کر سترہ برس تک کی عمر کی وہ لڑکیاں جو عرب و عجم کے اعلیٰ خاندانوں کی چشم و چراغ تھیں اور جنہیں اغوا کر کے وہاں لایا گیا تھا اور اب وہ اسی جنت ارضی کی ہو کر رہ گئی تھیں۔

میری نظریں ان میں سے فائقہ کو تلاش کرنے لگیں۔

یہ لڑکیاں تازہ واردان بساط جنت کو ہوش میں لانے کے جتن کرنے لگیں۔ سب ہوش میں آ گئے تھے مگر نشے کی کیفیت میں غرق تھے اور اپنے آپ کو جنت میں حوروں کے درمیان پا کر حیرت زدہ بھی تھے اور مسرور بھی۔ حوریں ہم سب پر عطر و گلاب چھڑک رہی تھیں۔ مجھے ان مہ جبینوں میں فائقہ کہیں دکھائی نہ دی۔ ان سب لڑکیوں کے رنگ کھلتے ہوئے گورے تھے مگر نیلی آنکھیں کسی کی نہ تھیں اور نہ ہی کسی کی تھوڑی پر تل تھا۔ اگرچہ یہ عرب و عجم کی حسین ترین دوشیزائیں تھیں مگر ان میں فائقہ کوئی نہیں تھی البتہ مجھے ان

سے فائقہ کا سراغ ضرور مل سکتا تھا۔

میں جنت کے ایک گوشے کی طرف چلا گیا۔ جہاں ایک مہ جبین تخت پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھی زمرد و عقیق کی لڑیاں پرو رہی تھیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ "کاش تمہاری آنکھیں نیلی ہوتیں اور تھوڑی پر سیاہ تل ہوتا۔ میں نے تو سنا تھا کہ جنت میں حوروں کی آنکھیں نیلی ہوتی ہیں۔"

اس نے جواب دیا کہ اس جنت میں ایک ہی نیلی آنکھوں اور سیاہ تل والی حور تھی جو شیخ الجبل کی مقرب خاص ہے۔

میں نے اندھیرے میں جو تیر چلایا تھا وہ ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا اور اس سیاہ چشم دوشیزہ نے مجھے فائقہ کے بارے میں بتا دیا تھا کہ وہ شیخ الجبل کی کنیز خاص ہے۔ میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ میرا کام اور زیادہ مشکل اور خطرناک ہو گیا تھا۔ کیوں کہ شیخ الجبل حسن بن صباح میری صورت سے واقف تھا اور میری جان کا دشمن بھی تھا۔ مگر میں فائقہ کی والدہ سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ میں اس کی بیٹی کو قلعہ الموت کے زندان بے در سے نکال کر اس کے پاس پہنچا کر دم لوں گا۔ سوچ رہا تھا کہ ایسی کونسی تدبیر ہو سکتی ہے کہ میں فائقہ کو یہاں سے نکال کر فرار ہو سکوں۔

میں حسن بن صباح کی جنت میں رقص کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں اس جنت ارضی کی ایک مہ جبیں حسینہ کا ہاتھ تھا اور اسی حسینہ نے مجھے یہ قیمتی راز بتایا کہ ... فائقہ' جس کی تلاش میں میں قلعہ الموت میں آیا تھا۔ شیخ الجبل حسن بن صباح کی کنیز خاص ہے اور اسی کی خدمت میں رہتی ہے۔ اس مہ جبین حسینہ کا نام مجھے معلوم نہیں تھا۔

ہم مدہوش ہو کر رقص کناں تھے اور آہو چشم لڑکیاں زرق برق لباس میں ملبوس جنت کی حوروں کا روپ دھارے ہم پر گلاب پاشی کر رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ شیخ الجبل حسن بن صباح کی کنیز خاص کو یہاں سے کیسے نکال لے جاؤں گا جب کہ شیخ الجبال میرا جانی دشمن ہے اور ایک بار مجھ پر اپنے ایک فدائی کے ذریعے قاتلانہ حملہ بھی کروا چکا ہے۔

میں جنت ارضی کی حور کے ساتھ محو رقص بھی تھا اور سوچ بھی رہا تھا کہ مجھے کونسی ترکیب پر عمل کرنا چاہئے کہ میں فائقہ کو ساتھ لے کر قلعہ الموت سے فرار اختیار کر سکوں۔ یہ حقیقت بھی میرے پیش نظر تھی کہ شیخ الجبال یعنی حسن بن صباح مجھے شکل سے پہچانتا ہے اور وہ میرا جانی دشمن ہے۔ وہ رات جنت ارضی یا جنت فرضی میں رقص و سرود و مے و نغمہ کی رات تھی۔ تازہ واردان محو رقص تھے۔ رات گذر گئی تو کچھ لوگ آئے اور ہم سب کو اس جنت سے نکال کر ایک کشادہ جگہ پر لٹا دیا گیا۔ میں ہوش میں تھا مگر اپنے آپ کو نشے میں چور ظاہر کر رہا تھا۔

دن چڑھا تو سب ہوش میں آ گئے۔ اس وقت حسن بن صباح کا وزیر خاص اپنے محافظ دستے کے ساتھ نمودار ہوا اور اس نے بلند آواز میں ہمیں مخاطب کر کے کہا۔ "تم نے جس جنت میں حور و غلمان کے درمیان رات بسر کی ہے وہ تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ مگر اب تم وہاں صرف ایک ہی صورت میں واپس جا سکتے ہو کہ اپنے آپ کو شیخ الجبل کے حکم پر قربان کر دو۔ فدا کر دو۔ اس کے فدائی بن جاؤ۔ پھر تم مرنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی جنت میں پہنچ جاؤ گے جہاں تم نے رات بسر کی ہے۔"

سب پکار اٹھے۔ "ہم شیخ الجبل پر اپنی جان فدا کرنے کو تیار ہیں۔ ہمیں حکم دیا جائے کہ قلعے کے اوپر سے کود جائیں گے۔"

وزیر خاص نے کہا۔ "جب اس کا وقت آئے گا تو شیخ الجبل تمہیں خود حکم دیں گے۔ آج سے تم شیخ کے فدائین میں شامل ہوتے ہو۔"

اسی وقت ہم سب کو سیاہ کپڑے پہنا دیئے گئے۔ میں نے بھی دوسرے فدائین کی طرح سیاہ کپڑے پہن کر سر پر عمامہ باندھ کر سیاہ کپڑے سے سوائے آنکھوں کے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ فدائین کی وردی نے میری شکل چھپا دی تھی اور یہ بات میرے حق میں بڑی مفید تھی مگر اب مجھے حسن بن صباح کے قریب پہنچ کر فائقہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور پھر اسے قلعے سے نکالنے کے بارے میں غور و خوض کرنا تھا۔ ہمیں دوسرے فدائین میں شامل کر کے مختلف مقامات پر پہرے اور فرائض کی ادائیگی کے لئے تعینات کر دیا گیا۔ قلعے کے اندر ایک سرنگ میں سے ٹھنڈے میٹھے پانی کی ایک نہر گذرتی تھی۔ یہ نہر پہاڑوں میں پانی کے رس رس کر بہنے سے بنی تھی اور پہاڑوں کے اندر ہی اندر خدا جانے کہاں چلی جاتی تھی۔ میری ڈیوٹی اس نہر کے کنارے پانی کے بڑے بڑے مٹکے صبح و شام بھروا کر قلعے کے محل میں پہنچانے پر لگا دی گئی۔ یہ ایک بڑی بیکار قسم کی ڈیوٹی تھی اور میں شاہی محل سے کافی دور ہو گیا تھا لیکن مجبور تھا۔ میں اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

غلام بڑے بڑے مٹکے اور کنیزیں لمبی لمبی صراحیاں لے کر صبح و شام نہر پر آتیں اور میری نگرانی میں پانی بھر کر لے جاتیں۔ ظاہر ہے ان کنیزوں میں فائقہ کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی میں نے ملک حبشہ کی ایک سیاہ رنگ کنیز سے راہ و رسم بڑھانی شروع کر دی۔ اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے کہ اس کے ذریعے مجھے فائقہ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو سکیں۔ کیوں کہ اس کنیز کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ شیخ الجبل کی سقہ کنیز ہے اور چشمے کے شفاف پانی میں کیوڑہ ملا کر شیخ الجبل کے محل خاص کی طلائی اور نقرئی صراحیوں کو بھرتی ہے۔ اس حبشی کنیز کا نام بانیکا ہے۔

اس ادھیڑ بن میں ایک ہفتہ گذر گیا۔ اس دوران میں نہ میں نے فائقہ کو دیکھا اور نہ حسن بن صباح سے آمنا سامنا ہوا۔ ویسے بھی وہ عام فدائین کے سامنے نہیں آتا تھا اور کچھ اس کی عمر کافی ہو گئی تھی۔ ستر برس سے اوپر کا ہو گیا تھا۔ میں صبح سے شام تک سرنگ والی نہر کے کنارے پڑے چبوترے پر بیٹھا پانی بھرتے غلاموں اور کنیزوں کی نگرانی کرتا۔ شام کو قلعے کی چھت پر کچھ دیر ٹہلنے کو چلا جاتا۔ چھت کو راستہ وہیں تہہ خانے میں بنے ہوئے ایک خفیہ زینے سے جاتا تھا جہاں اوپر ایک برج بنا تھا اور وہاں پہرہ لگا رہتا تھا۔ قلعے کی چھت کیا

تھی چاروں طرف سے اونچی چٹانی دیواروں سے گھرا ہوا ایک سنگلاخ میدان تھا جس میں طرح طرح کی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ پہلے روز میں چھت پر آیا تو ابھی دن کی روشنی تھی۔ میں نے چٹانی دیوار پر سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ الامان والحفیظ! اتنی گہری کھڈ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پہاڑ کی دیوار بالکل سیدھی نیچے چلی گئی تھی اور نیچے نوکیلی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ دوسری یا شاید تیسرے روز میں چھت پر آیا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس اندھیرے میں مجھے دور قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں میں کہیں کہیں دھیمی دھیمی روشنی نظر آئی۔

میں سمجھ گیا۔ یہ ایک بوٹی تھی جس کا نام آج سے پانچ ہزار برس پہلے قدیم مصر میں ویلاش تھا۔ یہ بوٹی اعصاب کی توانائی کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی تھی۔ مجھے یاد ہے ایک بار فرعون مصر کے جسم کے آدھے حصے پر فالج کا حملہ ہوا تو میرے آنجہانی والد نے میرے سامنے اس بوٹی کو کوٹ کر اس کے عرق میں تھوم کی سات تریوں کا عرق شامل کر کے پلایا تھا اور ایک گھنٹے کے بعد فرعون مصر نے اپنے فالج زدہ بازو کو ہلانا شروع کر دیا تھا یہ بوٹی رات کے اندھیرے میں ہلکی ہلکی روشنی دیا کرتی ہے۔ میں اسے دیکھ کر رہ نہ سکا اور یوں ہی عادت سے مجبور ہو کر جھاڑیوں کی طرف گیا اور چند ایک بوٹیاں توڑ کر ساتھ لے آیا اور اپنی کوٹھری میں ایک پتھر کے کوزے میں بند کر کے رکھ دیں کہ ہو سکتا ہے کبھی اس کی بھی ضرورت پڑ جائے۔

دو ہفتے گذر گئے۔ اس دوران میں میں نے فائقہ کی ایک جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ میری دوست حبشی کنیز بانیکا حسب معمول نہر پر پانی لینے آتی اور مجھ سے دو چار باتیں کر کے چلی جاتی۔ میں قصداً اب اس سے فائقہ کے بارے میں بات نہیں کرتا تھا لیکن میں نے اسے اپنا دوست بنا لیا تھا۔ اب میں اس نہج پر سوچنے لگا تھا کہ مجھے فائقہ تک پہنچنے کے لئے کوئی جراتمندانہ قدم اٹھانا چاہئے۔ آخر میں کب تک وہاں دشمنوں کے چنگل میں بیٹھا رہوں گا۔

ایک روز حبشی کنیز بانیکا آئی تو وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔ میں نے اسے کریدا تو کہنے لگی۔ ”کسی سے ذکر نہ کرنا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شیخ سخت بیمار ہے اور مرنے والا ہے۔“

اگلے روز تمام فدائین آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ شیخ الجبال پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں لہرا گیا۔ شیخ پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور میرے پاس وہ بوٹی موجود تھی جو اسے فالج سے نجات دلا سکتی تھی۔ اس طرح سے میں شیخ کو زیر بار احسان کر کے اس کا قرب حاصل کر سکتا تھا۔

وہاں شیخ کی بیماری کے بارے میں بات کرنا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ میں

خاموش رہا۔ ایک روز وزیر خاص نہر کے معائنے کے لئے آیا تو میں نے تعظیم بجا لاتے ہوئے شیخ الجبال کے علاج کی پیش کش کی۔ وزیر خاص نے مجھے گھور کر دیکھا اور ایک طرف لے جا کر پوچھا کہ میرے پاس کونسی دوا ہے اور میں قلعہ میں آنے سے پہلے کیا کام کرتا تھا۔

میں نے وزیر خاص کو بتایا کہ میرے پاس ایک خاص بوٹی ہے جو فالج کا تیر بہدف علاج ہے اور یہ کہ میں قلعہ الموت میں آنے سے پہلے طبابت کرتا تھا۔ اگرچہ میری پرورش ہی محلاتی سازشوں کے دور میں ہوئی تھی اور میں نے باپ کو بیٹے کے ہاتھوں زہر کھا کر ہلاک ہوتے ہوئے دیکھا تھا لیکن خدا جانے کیا بات ہوئی کہ میں اس اہم نکتے کو بھول گیا کہ ایک ضعیف العمر مطلق العنان بادشاہ قریب المرگ ہے اور ایک صحت مند وزیر لامحالہ اس کی موت کی گھڑیاں گن رہا ہو گا۔ وزیر خاص نے کہا۔ ”اپنی دوا لے کر میرے ساتھ چلو۔“

میں نے کوزے میں سے بوٹی نکال کر جیب میں رکھی اور وزیر خاص کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے اپنے معتمد فدائین سے کہا کہ مجھے شاہی محل کی انتظار گاہ میں پہنچا دیا جائے۔

یہ انتظار گاہ اصل میں ایک زمین دوز قید خانہ تھا جہاں مجھے زنجیروں میں جکڑ کر پھینک دیا گیا۔ اب مجھے ہوش آیا کہ مجھ سے کتنی بھیانک غلطی ہو گئی تھی لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ انہوں نے مجھ سے بوٹی چھین کر اسے نذر آتش بھی کر دیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وزیر خاص شیخ الجبال کی موت کا انتظار کر رہا ہے۔

قید خانہ ایک تنگ و تاریک کوٹھری تھی جس میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یہاں مجھے وقت کا کوئی احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ کب دن طلوع ہوا اور کب رات ہوئی۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے کہ اندھیرے میں زینے میں مجھے روشنی اپنی طرف بڑھتی نظر آئی۔ میں سمجھا کہ پہرے دار فدائی روٹیاں لے کر اندر آ رہا ہو گا۔ روشنی جب قید خانے کی سلاخوں کے قریب آئی تو میں نے حبشی کنیز بانیکا کو پہچان لیا۔ وہ شمع ہاتھ میں لئے چلی آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے فدائی پہرے دار بھی تھا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ پہرے دار نے قید خانے کا تالا کھول کر کنیز سے کہا۔ ”نصف ساعت کے پانچویں حصے سے زیادہ تم اندر نہیں ٹھہرو گی۔ میں ابھی واپس آ رہا ہوں۔“

پہرے دار چلا گیا۔ حبشی کنیز میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ مجھے زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے شمع ایک طرف رکھ دی اور کرتے کے اندر سے رومال میں لپٹا ہوا بھنے ہوئے گوشت کا ایک ٹکڑا نکال کر مجھے دیا اور کہا۔ ”تم سے ملنے کے لئے میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔“

اس کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ شیخ الجبال حسن بن صباح کا انتقال ہو گیا ہے یا اسے ہلاک

کر دیا گیا ہے اور وزیر خاص نے قلعہ الموت پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے۔ میں نے فائقہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے تو کنیز بانیکا نے مجھے اداس نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ "کیا تم فائقہ سے پیار کرتے ہو؟"

اب میں نے اس سے ساری کہانی بیان کر دی اور بتایا کہ میں حقیقت میں فائقہ کو قلعے سے فرار کروانے اور اس کی ماں کے پاس پہنچانے آیا تھا اور میں فائقہ سے پیار نہیں کرتا۔ حبشی کنیز کے چہرے پر اداسی کے جو سائے تھے وہ غائب ہو گئے - میں نے بانیکا سے کہا کہ وہ فائقہ کو قلعے سے فرار کروانے میں میری کیا مدد کر سکتی ہے۔ کنیز بانیکا سوچ میں پڑ گئی - پھر کہنے لگی۔

"شیخ کی ساری کنیزیں اب وزیر خاص کے حرم میں ہیں اور انہیں محل سے باہر نکلنے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔"

میں نے بانیکا سے کہا۔ "اگر کسی طرح تم فائقہ کو لے کر سرنگ والی نہر پر آ جاؤ تو میں وہاں موجود ہوں گا اور نہر کے ذریعے اسے نکال لے جانے کی کوشش کروں گا۔"

حبشی کنیز نے تعجب سے پوچھا کہ میں تو زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں۔ میں کس طرح آزاد ہو کر نہر پر پہنچ سکتا ہوں۔ میں نے کہا کہ تم اس کی فکر نہ کرو۔ مجھے یہ بتاؤ کیا تم فائقہ کو میری خاطر نہر پر لا سکتی ہو۔"

اس نے کہا۔ "میں کوشش کروں گی۔"

میں نے اسے جب مجبور کیا تو وہ راضی ہو گئی اور کہنے لگی۔

"اس وقت باہر رات کا آخری پہر گزر رہا ہے۔ میں دو راتیں گذرنے کے بعد تیسری رات کو فائقہ کو ساتھ لے کر نہر پر آ جاؤں گی۔"

وہ مجھ سے کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی۔ شاید اپنے دل کی باتیں زبان پر لانا چاہتی تھی کہ پہرے دار آ گیا اور کنیز کو واپس جانے کا حکم دیا۔ بانیکا چلی گئی۔ میں اندھیری کوٹھری میں ایک بار پھر اکیلا رہ گیا۔ مگر میں بڑا خوش تھا کہ ایک طریقہ کار طے ہو گیا تھا۔ میں نے وقت کا اندازہ رکھنے کی کوشش شروع کر دی۔ میرے اندازے کے مطابق جب دو راتیں گذر گئیں اور تیسری رات کے پہلے پہر میں پہرے دار میرے لئے روٹیاں لے کر آیا تو میں پہلے ہی سے کوٹھری کی سلاخوں کے پاس کھڑا تھا۔ میں کونے میں تھا اور اندھیرے میں وہ مجھے نہ دیکھ سکا۔

روز کے مطابق اس نے سلاخوں میں سے ہاتھ بڑھا کر روٹیاں اندر پھینک دیں اور مجھے آواز دی۔ میں اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ جوں ہی اس نے روٹیاں پھینکنے کے لئے اندر

ہاتھ ڈالا' میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ پہرے دار ہکا بکا رہ گیا۔ کھینچنے سے اس کا سر بڑے زور سے سلاخوں سے ٹکرایا اور اس نے خنجر نکال کر میرے ہاتھ پر وار کیا لیکن اس کے وار سے میرا کیا بگڑ سکتا تھا۔ میں نے اس کی گردن دبوچ کر دو چار جھٹکے دیئے اور اس کا کام تمام کر دیا۔ مجھے اس کی جیب سے تالے کی چابی نکالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اپنی زنجیریں پہلے ہی توڑ چکا تھا۔ قید خانے کی سلاخوں کو میں نے بڑی آسانی سے اکھاڑ کر پرے پھینک دیا۔ پہرے دار فدائی کی لاش کو کوٹھری کے اندر ڈالا اور اوپر جانے والے راستے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

قلعہ الموت کے نشیب و فراز سے مجھے کسی حد تک واقفیت ہو چکی تھی۔ میں قلعے کی پہلی منزل کے تختے پر آ گیا۔ یہاں میں نے کئی جگہوں پر شمعیں روشن دیکھیں تو احساس ہوا کہ رات کا وقت ہے اور میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ میں نے اس طرح چلنا شروع کر دیا جیسے میں پہرہ دے رہا ہوں۔ کئی راہداریوں اور نیم روشن غلام گردشوں سے گذر کر میں نہر کے کنارے والے چبوترے کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں میری جگہ ایک دوسرا فدائی نہر کی نگرانی پر مامور تھا اور وہ چبوترے کے پاس نہر کے کنارے ٹہل کر پہرہ دے رہا تھا۔ اس کے عقب میں پتھریلی دیوار پر ایک مشعل روشن تھی جس کی روشنی میں اس کی کمر کے ساتھ لٹکتا خنجر صاف نظر آ رہا تھا۔ مجھے یہ پریشانی تھی کہ میری کنیز دوست بانیکا' فائقہ کو لے کر یہاں آئے گی تو یہ پہرے دار اسے پکڑ لے گا اور پھر ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ قلعے میں تو قدم قدم پر موت رقص کرتی پھرتی تھی اور شیخ الجبال کی کنیز خاص بلکہ حرم خاص کو شاہی محل سے نکال لے جانے کی سزا ایک المناک موت کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی۔

نہر کوئی چھ سات قدم تک بہنے کے بعد ایک پہاڑی سرنگ میں داخل ہو جاتی تھی۔ میرا منصوبہ اس سرنگ میں سے فائقہ کو نکال لے جانے کا تھا۔ مجھے داہنی غلام گردش کے اندھیرے میں دو انسانی سائے حرکت کرتے دکھائی دیئے۔ چونکہ میری نگاہ اندھیرے میں بھی اشیاء کے ہیولے دیکھ سکتی تھی اس لئے میں نے دیکھا کہ آگے آگے حبشی کنیز بانیکا تھی اور اس کے پیچھے گورے رنگ کی ایک لڑکی سیاہ چادر میں لپٹی پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ پہرے دار فدائی کو دیکھ کر کنیز بانیکا نے فائقہ کو وہیں روک لیا۔ دونوں اندھیرے میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئیں۔ اب مجھے اپنا کام کرنا تھا۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں بھی اندھیرا تھا میں نے زمین سے ایک پتھر اٹھا کر نہر میں پھینک دیا۔

پانی میں پتھر گرنے کی آواز پر پہرے دار فدائی چونکا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور پھر پیش قبض سے خنجر نکال کر لپکا۔ میں پتھروں کے پیچھے ہو گیا۔ پہرے دار نے آواز دی۔ "کون

ہے؟"

اس سے پہلے کہ وہ اپنا سوال دوسری مرتبہ دہراتا میرا وزنی مکہ پتھر کے ایک ستون کی طرح اس کی گردن پر پڑا اور وہ دہرا ہو کر زمین پر گر پڑا اور اس کی گردن کی ہڈیوں کے مہرے کئی جگہوں سے ٹوٹ چکے تھے۔ میں بھاگ کر اس طرف اندھیرے میں چلا گیا جہاں حبشی کنیز بانیکا اور فائقہ سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ بانیکا نے کہا۔

"یہ ہے تمہاری امانت۔ میں نے اس کو ساری بات بتا دی ہے۔ یہ اپنی ماں سے ملنے کو بے تاب ہے۔"

میں نے اپنی دوست حبشی کنیز کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

"میں تمہیں کبھی نہیں بھلاؤں گا بانیکا۔"

بانیکا نے اندھیرے میں مجھے چمکیلی آنکھوں سے دیکھا۔ ان آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے فائقہ سے کہا۔

"فائقہ! میرے ساتھ آؤ۔ کیا تم اپنی والدہ کے پاس جانے کو تیار ہو؟"

فائقہ کا چہرہ اندھیرے میں چاند کی طرح چمک رہا تھا اور آنکھوں سے نیلی نیلی کرنیں نکل رہی تھیں۔ فائقہ واقعی بہت خوبصورت تھی اور جنت ارضی کی کوئی حور لگ رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "خدا کے لئے مجھے میری امی کے پاس لے چلو۔"

بانیکا نے کہا۔ "اب تم لوگ دیر نہ کرو۔ لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ نہر تمہیں قلعے سے باہر نکال دے گی؟" میں نے جواب دیا۔ "مجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے۔ وہ ہمیں یہاں سے ضرور نکال دے گا۔"

میں نے آخری بار اپنی دوست حبشی کنیز کو دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شاید اب میں اس کی زندگی میں اسے کبھی دوبارہ نہ دیکھ سکوں گا۔ میرے دل میں بھی اس کی محبت اور ایثار کا گہرا اثر تھا۔ مگر میں سوائے شکریہ ادا کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے فائقہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً کھینچتا ہوا نہر کے کنارے اس مقام پر لے گیا جہاں نہر سرنگ میں داخل ہوتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ نہر کا پانی تین چار فٹ سے زیادہ گہرا نہیں ہے اور سرنگ کی چھت سے ایک فٹ نیچے رہتا ہے۔ میں نہر میں اتر گیا اور ہاتھ پکڑ کر فائقہ کو بھی نہر میں اتار لیا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ فائقہ کی گردن تک پانی میں ڈوب گئی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

مجھے اس امر کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ یہ نہر قلعہ الموت کی پہاڑیوں سے ہوتی ہوئی کہاں جا نکلتی ہے۔ لیکن اس قدر اطمینان ضرور تھا کہ آخر کہیں باہر کھلے مقام پر ہی جا کر

نکلے گی۔ ایک خدشہ بار بار میرے دل میں پیدا ہو رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ نہر کہیں آگے جا کر کسی زیر زمین دریا سے مل گئی ہو۔ کیونکہ اس صحرائی علاقے میں ایسے دریا بھی تھے جو زمین کے اندر بہتے تھے۔ اگر ایسا ہوا تو فائقہ کا زندہ رہنا ناممکن تھا۔ مجھے اس وقت بھی اس کا فکر لگا ہوا تھا کہ اگر نہر زیادہ پرپیچ اور لمبی ہوئی تو خدا جانے کہیں خوف و دہشت کے مارے اس نازک اندام حسین لڑکی کا دم ہی نہ نکل جائے۔ مگر وہ بڑی ثابت قدمی سے میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ہم گردن تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہمارے اوپر پہاڑ کی چھت تھی جو ہمارے سروں سے چند انچ ہی اونچی تھی۔ میں فائقہ کو حوصلہ دیئے جا رہا تھا۔ اسے خود بھی احساس تھا کہ وہ موت کے منہ سے نکل کر آ رہی ہے اور اسے اپنی امی کے پاس پہنچنا ہے۔ اس لئے وہ پورے عزم و ہمت کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔

پانی کے بہاؤ میں تیزی نہیں تھی۔ سرنگ میں اندھیرا تھا۔ فائقہ نے دونوں ہاتھوں سے میرے کاندھوں کو پکڑ رکھا تھا۔ فائقہ کی وجہ سے میں سرنگ کی دیوار کو پکڑنے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھ رہا تھا کہ انجانے میں میرا پاؤں کسی گڑھے میں نہ گر پڑے اور فائقہ غوطہ کھا بیٹھے۔ نہر کی سرنگ ایک طرف کو مڑ گئی۔ یہاں مجھے اپنے پاؤں کے نیچے پانی میں گول گول پتھروں کا احساس ہوا۔ میں فائقہ کا دل بہلانے کے لئے اس سے اس کی والدہ کی باتیں کرنے لگا۔ اس نے مجھے بتایا کہ فدائین نے اس کے باپ کو قتل کر دیا تھا اور اسے اغوا کر کے لے گئے تھے۔

"خداوند کریم نے آپ کو رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔"

پانی کا بہاؤ تیز ہونا شروع ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ فائقہ کے قدم اکھڑنے لگے ہیں۔ سرنگ ڈھلانی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے پانی کے بہاؤ میں تیزی آ گئی تھی۔ خود میرے پاؤں بھی تیز لہروں میں بار بار اکھڑ جاتے تھے مگر میں مضبوطی سے قدم جما کر چل رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ فائقہ کا جسم خوف کے مارے آہستہ آہستہ کانپ رہا ہے۔ میں نے اسے حوصلہ دیا کہ ڈھلان کی وجہ سے پانی کی روانی میں تیزی آ گئی ہے۔ لیکن خود میں بھی پریشان تھا کیونکہ ڈھلان اور زیادہ نیچائی کی طرف جا رہی تھی اور بہاؤ اتنا تیز ہو گیا کہ فائقہ کے قدم اکھڑ گئے۔ اس کے حلق سے دہشت بھری آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ یہ سوچ کر میری جان ہوا ہو گئی کہ کہیں یہ نہر زمین کے اندر گہرائیوں میں بہنے والے کسی دریا سے تو جا کر نہیں مل جاتی؟

یہ بڑی بھیانک بات تھی اور اس صورت میں فائقہ کا زندہ رہنا محال تھا۔ مجھے خود احساس ہونے لگا تھا کہ جیسے میں پانی کی قبر میں آ گیا ہوں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ڈھلان

ختم ہو گئی۔ پانی کے بہاؤ میں سستی آ گئی اور وہ ہموار زمین پر بہنے لگا۔ پانی کی سطح کم ہونے لگی تھی۔ یہ بڑی خوش آئند بات تھی۔ میں نے فائقہ کو ایک بار پھر تسلی دی۔ مگر وہ خاموش تھی اور میرے پیچھے پیچھے میرے کاندھے تھامے چلی آ رہی تھی۔ سرنگ میں گھپ اندھیرا تھا۔ مگر اس اندھیرے میں بھی میں سرنگ کی دیوار اور چھت کے پتھروں کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ پانی ہمارے کاندھوں سے بھی نیچے آ گیا تھا۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کیونکہ نہر کا پاٹ اتنا ہی تھا۔ دو تین موڑ گھومنے کے بعد یہ معمہ بھی حل ہو گیا۔

ایک جگہ پہنچ کر نہر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک طرف اس کا پانی ایک ایسی سرنگ میں داخل ہو رہا تھا جو پانی کی وجہ سے چھت تک بھری ہوئی تھی اور نسبتاً چھوٹی تھی۔ جس سرنگ میں ہم چلے جا رہے تھے وہ اس سے فراخ اور کشادہ تھی۔ یہاں سے آگے بڑھے تو پانی ہمارے گھٹنوں تک آ گیا۔ فائقہ اب کچھ سنبھل گئی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کی زندگی بچ گئی ہے۔ میں اسے برابر دلاسے دیئے جا رہا تھا۔

اگرچہ نہر میں ابھی تک گھپ اندھیرا تھا لیکن پانی کی سطح برابر کم ہو رہی تھی اور پانی ہماری پنڈلیوں تک آ پہنچا تھا۔

سب سے بڑی خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ سرنگ میں ہوا موجود تھی اور اب سامنے سے دو ایک بار مجھے تازہ ہوا کے جھونکوں کا احساس ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم سرنگ کے دہانے پر پہنچنے ہی والے تھے۔ نہر کی تہہ میں چھوٹے چھوٹے سنگریزوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد تازہ ہوا کے جھونکوں میں اضافہ ہو گیا۔ میں نے خوش ہو کر فائقہ سے کہا۔

"یہ تازہ ہوا اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم کھلی جگہ پر نکلنے ہی والے ہیں۔"

فائقہ نے آہستہ سے کہا۔ "خداوند تعالیٰ ایسا ہی کرے۔"

پھر سرنگ کے آخری کنارے پر مجھے ہلکی ہلکی نیلی روشنی کا احساس ہوا۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو وہاں سے سورج کی روشنی نظر آ رہی ہوتی۔ لیکن رات کا وقت تھا اور میں سمجھ گیا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں نہر کسی کھلی جگہ دریا یا کسی جھیل میں گر رہی ہے اور اس سوراخ میں سے تاروں بھری نیلی رات کی روشنی کی جھلکیاں نظر آ رہی ہیں۔ میں نے فائقہ کو مبارک باد دی کہ سرنگ ختم ہو رہی ہے۔

"وہ دیکھو۔ وہ سامنے روشنی۔ یہ رات کی روشنی ہے۔"

فائقہ نے گہرا سانس لے کر خدا کا شکر ادا کیا۔ روشنی قریب آ رہی تھی۔ تازہ ہوا کے جھونکے بار بار ہمارے جسم اور چہروں کو چھو رہے تھے۔ آخر ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں سرنگ ختم ہو جاتی تھی اور نہر کا پانی ہلکے شور کے ساتھ کوئی بیس فٹ کا آبشار بنا کر نیچے ایک

جھیل میں گر رہا تھا۔ ہم نے تاروں بھری رات کی کھلی فضا میں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا۔ یہاں پانی کا بہاؤ ایک بار پھر تیز ہو گیا تھا مگر پانی کی سطح پنڈلیوں تک ہونے کی وجہ سے ہم دیوار کو پکڑ کر اطمینان سے سرنگ کے دہانے پر کھڑے تھے۔

میں نے جھیل کو دیکھا۔ یہ کافی بڑی جھیل تھی اور اس کے تینوں جانب اونچی نیچی چٹانیں رات کی نیلی کالی تاریکی میں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ میں نے فائقہ سے پوچھا کہ کیا اسے تیرنا آتا ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں نیچے جھیل میں چھلانگ لگا رہا ہوں۔ تم میرے فوراً بعد چھلانگ لگا دینا۔ اس نے آہستہ سے سر ہلا کر ہاں کہی۔ وہ نڈھال سی ہو رہی تھی۔ ہمارے پاس سوچنے کے لئے وقت نہیں تھا۔ میں نے جھیل میں چھلانگ لگا دی اور وہیں ایک چھوٹے سے دائرے کی شکل میں تیرنے لگا۔ میرے پیچھے فائقہ بھی پانی میں کود گئی۔ میں نے لپک کر اسے نیچے سے اٹھا لیا اور اس کا سر باہر رکھے آہستہ آہستہ بائیں کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ جھیل کا پاٹ کشادہ تھا اور پہاڑ کی سیدھی دیوار کافی دور تک چلی گئی تھی۔ آخر میں فائقہ کو لے کر جھیل کے کنارے پر نکل آیا۔ فائقہ ریت اور پتھروں پر لیٹی رہی۔ میں نے اس کے ہاتھ پاؤں کی مالش کی تو اس کی نقاہت کسی حد تک دور ہوئی۔ میں نے اسے ساتھ لیا اور ایک بلند چٹان کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

فائقہ بار بار اپنی والدہ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ ویسے تو میں اسے تسلی دے رہا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ میں قلعہ الموت سے کتنی دور اور کس سمت میں نکل آیا ہوں۔ میں اونچی چٹان پر چڑھ گیا اور دیکھا کہ قلعہ الموت کی بلند پہاڑی میرے بائیں جانب کافی فاصلے پر تھی اور ہم سرنگ کے اندر سے ہوئے ہوئے شمال مغرب کی طرف کافی دور تک نکل آئے تھے۔ میں نے فائقہ سے کہا کہ اس کی والدہ یہاں سے تقریباً تین کوس کے فاصلے پر واقع ایک پہاڑی غار میں ہے۔ وہ واپس قلعے کی طرف جاتے ہوئے گھبرا رہی تھی لیکن ماں کی محبت سے مجبور ہو کر وہ میرے ساتھ چل پڑی۔

یہ تین کوس کا دشوار گذار سنگلاخ پتھروں سے اٹا ہوا راستہ، فائقہ نے بڑی مشکل سے طے کیا اور جس وقت ہم غار والی پہاڑی کے دامن میں پہنچے تو مشرقی آسمان پر صبح خاذب کی نیلی جھلکیاں نمودار ہونے لگی تھیں۔ پہاڑی کھوہ کے دہانے پر فائقہ کی والدہ کی جھونپڑی اسی طرح تھی مگر وہ خود وہاں پر موجود نہیں تھی۔ فائقہ نے اپنی ماں کے پرانے کپڑے زمین پر پڑے دیکھے تو انہیں پہچان لیا اور سینے سے لگا کر آنسو بہانے لگی۔ میں نے اسے دلاسہ دیا کہ ان کی امی یہیں کہیں ہوں گی۔ میں جھونپڑی سے نکل کر ایک طرف چلنے ہی لگا تھا کہ

سامنی سے مجھے فائقہ کی ماں آتی نظر آئی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور وہ دل شکستگی کے عالم میں چلی آ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے مبارک باد دی کہ اس کی بیٹی جھونپڑی میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔ دونوں ماں بیٹی کی ملاقات کے منظر کو میں آج بھی یاد کرتا ہوں تو میرا دل گداز ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں آپس میں لپٹ کر دیر تک روتی رہیں..... جب ان کے دل کا غبار ہلکا ہوا تو فائقہ کی ماں میرا بے حد شکریہ ادا کرنے لگی کہ میں نے اس کی ویران گود کو پھر سے آباد کر دیا۔ فائقہ کے چہرے پر بھی رونق دوبارہ لوٹ آئی تھی۔ اس کی ماں نے روٹی کے کچھ ٹکڑے پانی میں بھگو کر مجھے اور فائقہ کو کھلائے اور بار بار آنسو پونچھتی ہوئی ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگیں۔ میری مہم کامیابی سے ختم ہو چکی تھی - اب میں ان سے اجازت لے کر وہاں سے چلا جانا چاہتا تھا کہ فائقہ کی امی بولی۔

"بیٹا ہمیں کس کے حوالے چھوڑے جا رہے ہو؟"

میں نے پوچھا کہ کیا وہ شہر میں واپس اپنے گھر جانا چاہتی ہیں؟

فائقہ کی امی نے کہا۔ "اب وہاں ہمارا کون ہے اور کیا خبر فدائین اب ہمیں بھی قتل کر ڈالیں۔" پھر قدرے توقف کے بعد کہا۔ "بیٹا! سمرقند میں میرا ایک چھوٹا بھائی سوداگری کرتا ہے۔ میں اسی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ مگر جوان بیٹی کا ساتھ ہے۔ اکیلی نہیں جا سکتی۔ یہاں سے موصل تک چار راتوں کا سفر ہے۔ اگر تم ہمیں موصل پہنچا دو تو وہاں سے سمرقند جانے والے کسی قافلے کے ساتھ ہو جاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "اماں! میں آپ کو موصل پہنچانے کا ذمہ لیتا ہوں۔"

فائقہ ساری رات کی تھکی ہاری تھی وہ سو گئی۔ میں ان کے لئے کچھ کھانے پینے کو لینے نکل گیا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں تھا۔ میرے پاس وہی چند ہیرے رکھے تھے جو میں اپنی حویلی سے نکلتے وقت سانپ کے مہرے کے ساتھ جیب میں رکھ کر چلا تھا۔ گاؤں کے پنساری کو ایک ہیرا دے کر کچھ آٹا دال خریدا۔ واپس آ کر فائقہ کی والدہ کو دیا۔ اس نے روٹیاں پکائیں۔ دوپہر کا کھانا کھا کر دونوں ماں بیٹی سو گئیں۔ میں پہرہ دیتا رہا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اب تک قلعہ الموت میں فائقہ کے فرار کا علم وزیر خاص کو ہو چکا ہو گا اور اس کے فدائین اس کی تلاش میں نکل چکے ہوں گے لیکن دوپہر کے وقت میں نے پہاڑی کے دامن میں شمال کی طرف سے ایک لشکر جرار کو آتے دیکھا جس کا رخ قلعہ الموت کی طرف تھا۔ یہ ہلاکو خان کا لشکر تھا جو فدائین کے پچھلے چند ایک قلعوں کی اینٹ سے اینٹ بجاتا قلعہ الموت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے فراعنہ مصر اور اشوری بادشاہوں کے لشکر بھی دیکھے ہیں۔ مگر ہلاکو خان کا لشکر کیا تھا ایک طوفانی سمندر تھا جو ٹھاٹھیں مارتا قلعہ الموت کو ہڑپ

کرنے کے لئے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ وادی میں جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی انسانوں کا ہجوم ہی ہجوم تھا۔ ان میں پتھر برسانے والی منجنیقیں اور آگ کے گولے پھینکنے والی کل دار مشینیں بھی تھیں۔ قلعے کے سر بفلک مضبوط دروازوں کو آن واحد میں پاش پاش کر دینے والے آہن پوش ہاتھیوں کے غول کے غول ساتھ چل رہے تھے۔ میں نے اس تاتاری لشکر کو ان کے دور سے لہراتے جھنڈوں اور سپاہیوں کے لمبے بالوں، گھوڑوں کی زرہ بکتر سے پہچان لیا تھا۔

مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب کم از کم ہمارے پیچھے کوئی فدائی نہیں آئے گا۔ اب انہیں اپنی پڑی ہو گی۔ دور پہاڑی کی چوٹی پر قلعہ الموت کے برجوں میں بھی مجھے انسانوں کی نقل و حرکت دکھائی دے رہی تھی۔ شاید کھولتے ہوئے تیل کے بڑے بڑے کڑھائے فصیلوں پر چڑھائے جا رہے تھے۔ میں واپس جھونپڑی میں آ کر فائقہ اور اس کی ماں کو صورتحال سے باخبر کیا۔ وہ گھبرا گئیں کیونکہ یہ جگہ قلعہ الموت کی وادی میں ہی تھی۔ ہمارا خیال دن بھر آرام کرنے کا تھا لیکن ہلاکو خان کے متوقع حملے کے پیش نظر ہم سرشام ہی وہاں سے چل پڑے۔

یہاں بھی ایک چھوٹی سی نہر چٹانوں کے درمیان بہتی تھی۔ ہم نے ایک جگہ سے نہر پار کی اور موصل جانے والے راستے پر خدا کا نام لے کر روانہ ہو گئے۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ میں گاؤں سے تین گھوڑے خرید لوں گا - لیکن تاتاری فوج کی آمد نے مجھے ایسا نہ کرنے دیا۔ اس وقت قلعہ الموت کی جانب سے تاتاری فوج کی یلغار کا شور اور آگ کے شعلے بلند ہونے لگے تھے۔ تاتاری فوج نے قلعہ الموت کو جانے والی سڑک پر قبضہ کر کے قلعے پر برق اور سنگ و آہن کی بارش شروع کر دی تھی۔ ہم رات کے اندھیرے میں چلتے ہوئے آہستہ آہستہ جنگ زدہ وادی سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ دونوں خواتین متمول گھرانے کی چشم و چراغ تھیں۔ انہیں پیدل چلنے کی عادت نہ تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ تھک جاتیں اور ستانے کے لئے بیٹھ جاتیں۔ ہمارے پاس ایک مشکیزے میں پانی بھرا ہوا تھا اور کچھ روٹیاں اور زیتون کا مربہ ساتھ رکھ لیا تھا۔

وادی کی سنگلاخ پتھریلی زمین کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ اب زمین بھربھری ہو رہی تھی اور خستہ بھربھری ریت کے ٹیلے اندھیرے میں جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔ رات کی وجہ سے ہم صحرا کی تپش سے ضرور بچے ہوئے تھے۔ مگر فائقہ اور اس کی والدہ کو چلنے میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ خدا خدا کر کے دور ایک جگہ روشنی دکھائی دی۔ یقیناً یہ کوئی مکان یا جھونپڑی تھی - قلعہ الموت کا میدان جنگ ہم سے کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ اب صرف آسمان پر شمال مشرق

کی جانب سے آگ کی دھیمی دھیمی روشنی ہی کسی وقت نظر آ جاتی تھی۔ فائقہ نے کہا۔

"عبداللہ بھائی! اگر یہ کوئی گاؤں ہے تو ہم یہاں باقی رات آرام کریں گے۔ اماں سے اب چلا نہیں جاتا۔"

جس روشنی کو ہم گاؤں کی روشنی سمجھ رہے تھے وہ ریت کے ایک ٹیلے کے دامن میں کھجور کے سوکھے درخت کا الاؤ تھا۔ جو ایک جھونپڑی کے سامنے روشن تھا۔ ہم جھونپڑی کی طرف بڑھے کہ ضرور کوئی آدمی وہاں ہو گا اور اس سے ہم مدد طلب کریں گے۔ لیکن جھونپڑی بالکل خالی تھی۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ الاؤ کے آس پاس اونٹوں کے پاؤں کے نشانات تھے جو ریت پر جنوب کی طرف چلے گئے تھے۔ اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ مخیر سوداگر بڑے قافلوں کی شاہراہوں سے ہٹ کر صحرا میں ایک گاؤں یا قصبے سے دوسرے قصبے کی طرف جاتے تو ویران اور چھوٹے چھوٹے گمنام راستوں میں مناسب فاصلوں پر جھونپڑیاں ڈلوا دیتے تھے اور جھونپڑی کے اندر زمین کھود کر پانی کا مٹکا بھی دفن کرا دیتے تھے کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر صحرا کی جھلسا دینے والی تپش میں اس طرف آ نکلے تو وہ اپنی پیاس بجھا کر جھونپڑی میں کچھ دیر آرام کر سکے۔ باہر جو الاؤ جل رہا تھا یہ کوئی دیہاتی بدو لوگ روشن کر گئے تھے جو شاید تھوڑی دیر پہلے ادھر سے گذرے تھے۔ ہم نے جھونپڑی کا جائزہ لیا تو کونے میں زمین کے اوپر سے پانی کے مٹکے کی ڈھکی ہوئی گردن باہر نکلی ہوئی تھی۔

میں نے فائقہ اور اس کی والدہ سے کہا کہ وہ اس جھونپڑی میں آرام کریں۔ میں کچھ دور آگے جا کر دیکھتا ہوں اگر کوئی گاؤں نزدیک ہوا تو وہاں سے گھوڑے خریدنے کی کوشش کروں گا۔ میں انہیں جھونپڑی میں چھوڑ کر ٹیلے کے عقب سے ہو کر پچھم کی طرف چلا۔

میں صحرا میں کافی دور تک نکل گیا مجھے کہیں کسی گاؤں کی روشنی دکھائی نہ دی۔ میں واپس چل پڑا۔ سوچا دن کی روشنی میں کسی آبادی کو تلاش کروں گا۔ جھونپڑی کے قریب آیا تو وہاں الاؤ کے پاس دو گھوڑے دکھائی دیئے۔ حیران ہوا کہ یہ کون لوگ آئے ہیں۔ خیال آیا کہ کہیں ڈاکو یا تاتاری سپاہی نہ ہوں۔ میں ٹیلے کے پیچھے سے ہو کر آگے بڑھا۔ اچانک فائقہ کی چیخ کی آواز بلند ہوئی۔ دو آدمی اسے گھسیٹتے ہوئے جھونپڑی سے باہر نکل رہے تھے۔ یہ تاتاری سپاہی تھے۔ ان کے بال لمبے تھے اور کمر بند کے ساتھ چھرے لٹک رہے تھے۔ فائقہ کی والدہ کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ جھونپڑی کے اندر صدمے سے بے ہوش ہو چکی تھی۔ یہ بڑا نازک لمحہ تھا۔ تاتاریوں کے لئے کسی حسین عورت کو اغوا کرنا یا اسے قتل کر ڈالنا بڑی معمولی بات تھی۔

مجھے فائقہ کو ہر حالت میں بچانا تھا۔ وہ تاتاریوں کے چنگل میں پھنسی تڑپ رہی تھی۔

تاتاری سپاہی قہقہے لگاتے اسے گھوڑوں کی طرف گھسیٹے لئے جا رہے تھے۔ یہ وقت سوچنے اور مصلحت انگیزی کا نہیں تھا۔ میں ٹیلے سے نکل کر تاتاری سپاہیوں کے سامنے آ گیا۔ وہ خون آشام درندوں کی مانند غرا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر فائقہ نے مدد کے لئے پکارا۔ ایک تاتاری میری طرف چھرا لے کر لپکا۔ اس کے سامنے میں نہتا کھڑا تھا۔ اس لئے مجھے ہلاک کرنا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ کرتا میں نے اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے اپنے ساتھ ہی زمین پر گرا لیا۔ تاتاری سپاہی کا چھرا میرے پیٹ کے آر پار ہو گیا تھا اور میرے ہاتھوں کا دباؤ اس کی گردن پر بڑھتا جا رہا تھا۔

دوسرا تاتاری سپاہی فائقہ کو گھوڑے پر ڈال رہا تھا کہ میں اس کی طرف دوڑا۔ مجھے اتنا بھی ہوش نہ رہا کہ کم از کم اپنے پیٹ میں اترا ہوا چھرا ہی کھینچ کر باہر نکال لوں۔ چھرا اسی طرح میرے پیٹ کے آر پار تھا اور میں نے لپک کر دوسرے تاتاری کو پیچھے سے نیچے کھینچ لیا۔ اس نے میرے پیٹ میں چھرے کو دستے تک اندر گئے دیکھا تو ایک پل کے لئے ٹھٹکا مگر اس کے ساتھ ہی اپنے چھرے کا وار کر دیا۔ یہ وار میں نے اپنے ہاتھ پر لے لیا اور چھرا اس کے ہاتھ سے چھین کر پرے پھینک دیا۔ اس نے مجھے اٹھا کر زمین پر پٹخنا چاہا مگر میں اس کے لئے ایک چٹان بن گیا تھا۔ وہ مجھے اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا سکا اور میں نے اپنے پیٹ سے چھرا نکال کر اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ تاتاری سپاہی نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ لیا اور لڑکھڑاتا ہوا نیچے گرا۔

میں نے فائقہ کو اٹھایا۔ اس کی والدہ کے بارے میں پوچھا۔ فائقہ نے میرے پیٹ میں اترے ہوئے چھرے کو دیکھ لیا تھا۔ وہ حیران تھی کہ میں ابھی تک زندہ کس طرح ہوں اور میرے پیٹ سے خون کیوں نہ بہا۔ اس نے جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔ فائقہ کی والدہ بے ہوش پڑی تھی۔ بڑی مشکل سے اسے ہوش آیا تو اپنی بیٹی کو اپنے پاس دیکھ کر اس سے لپٹ گئی۔ میں نے جلدی سے باہر نکل کر تاتاریوں کے دونوں گھوڑوں پر قبضہ کیا کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔ فائقہ نے بتایا کہ وہ جھونپڑی میں جا کر بیٹھی ہی تھیں کہ یہ دونوں تاتاری سپاہی چھرے لہراتے ہوئے آ گئے اور مجھے گھسیٹ کر لے جانے لگے۔

میں نے کہا۔ "اب ہمیں یہاں نہیں رکنا چاہئے۔ ہمارے پاس اتفاق سے دو گھوڑے بھی آ گئے ہیں۔" میں نے ایک گھوڑے پر فائقہ اور اس کی والدہ کو بٹھایا۔ دوسرے گھوڑے پر خود سوار ہوا اور ہم موصل کی طرف روانہ ہو گئے۔

یہ سفر کافی دشوار گذار تھا۔ راستے میں فائقہ نے میری کرامت کے بارے میں دو ایک بار مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ایک بزرگ کی دعا سے

ایسا ہوا ہے۔ چار راتوں کے تکلیف دہ سفر کے بعد ہم موصل پہنچ گئے۔ ہم ایک کارواں سرائے میں اترے جہاں سے تین دن بعد سمرقند اور بخارا کی جانب ایک قافلہ روانہ ہونے والا تھا۔ یہاں میں نے ایک اور ہیرا فروخت کیا اور فائقہ اور اس کی والدہ کا سمرقند تک کا کرایہ ادا کیا اور انہیں راستے کے لئے کچھ ضروری چیزیں خرید کر دیں۔ فائقہ میری طرف احسان مند نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ان نگاہوں میں مجھے محبت کی برق ریزیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ لیکن یہ محبت ہماری منزلوں کی سمت تبدیل نہیں کر سکتی تھی۔ فائقہ اپنی ماں کے ہمراہ قافلے میں شامل ہو کر سمرقند کی طرف روانہ ہو گئی۔

بغداد کی تباہی اور عباسیوں کے زوال نے مجھے دل برداشتہ کر دیا تھا۔ چنانچہ میں بھی ایک قافلے میں شامل ہو کر ملک ہند کی طرف روانہ ہو گیا کہ ایک بار اس خطے کی سیر کر لوں جہاں سندھ کی وادی کے سب سے بڑے شہر موہنجوداڑو میں میں شاہی کاہن اعظم کی حیثیت سے کچھ عرصہ سیر کر چکا تھا۔ اس وقت موہنجوداڑو ایک کھنڈر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ منزلوں پر منزلیں طے کرتا میں غزنی پہنچا تو معلوم ہوا کہ امیر اسمٰعیل بن امیر ناصر الدین سبکتگین کا بیٹا سلطان محمود غزنوی بت پرستوں کے سب سے بڑے مندر سومنات پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ غزنی کے ایک قہوہ خانے میں میری ملاقات اس وقت کے سب سے بڑے شاعر اسدی طوسی سے ہوئی جو "شاہنامے" کے شاعر فردوسی کا استاد تھا اور جس کی عمر اس وقت ستر برس کی ہو چکی تھی۔ میں نے قدیم سنسکرت ادب اور ویدوں کے بارے میں بات چیت کی تو وہ مجھ سے بہت متاثر ہوا اور بولا۔

"تم سلطان کی خدمت میں حاضر کیوں نہیں ہوتے؟ تمہیں ہندی زبانوں پر عبور ہے اور ہندوستان جانے کا شوق بھی ہے۔ سلطان تمہیں بڑی خوشی سے کوئی عہدہ عطا کر دیں گے۔ میں تمہاری سفارش کر دوں گا۔"

میں نے حامی بھرلی۔ اسدی طوسی نے سلطان محمود سے بات کی تو اس نے مجھے خلوت خاص میں طلب کر لیا۔ میں اس عظیم مجاہد اور اسلامی سپہ سالار اعظم کے روبرو کھڑا تھا جو آج آپ سب کا ہیرو ہے اور جس کی فتوحات کا حال آپ تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ تاریخ کی کتابوں میں کیا لکھا ہے؟ اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں چشم دید اور اپنے آپ پر گذرے ہوئے واقعات قلمبند کر رہا ہوں۔

آپ نے تاریخ کی کتابوں میں سلطان محمود غزنوی کی تصویر دیکھی ہو گی میں نے بھی دیکھی ہے۔ یہ ایک نہایت وجیہہ اور حسین و جمیل جوان آدمی کی تصویر ہے۔ آپ یقین کریں کہ سلطان محمود غزنوی ایسا نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ قد

درمیانہ تھا۔ مگر اس کی شخصیت میں ایک مقناطیسی کشش تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک سچا عبادت گذار اور دین دار مسلمان تھا اور اس کے سینے میں ایمان کی شمع روشن تھی۔ اس نے اپنی زندگی کفر و الحاد شکنی کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ خاندان غزنویہ میں محمود غزنوی پہلا بادشاہ ہے جس نے اپنے لئے سلطان کا لقب پسند کیا۔

میں بڑے ادب سے سلطان کی بارگاہ میں کھڑا تھا۔ منقش چھت سے نقرئی قندیلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ سلطان محمود نے مجھ پر ایک گہری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "استاد مکرم اسدی طوسی نے تمہاری بہت تعریف کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ تم ہندوستان کی قدیم زبانیں اور ویدوں کا علم جانتے ہو۔ کیا یہ درست ہے؟"

"جی ہاں سلطان مکرم!" میں ادب سے بولا۔

سلطان محمود نے کہا۔ "کیا تم ہندی ہو؟"

میں نے سلطان کو بتایا کہ میں ہندو نہیں بلکہ مصری ہوں اور مسلمان ہوں۔ عبداللہ عاطون میرا نام ہے اور میں نے سنسکرت اور ویدوں کا علم اپنے قیام ہند کے دوران حاصل کیا تھا۔ سلطان محمود نے مجھ سے کہا کہ مجھے کچھ اہل ہند کے مذہبی عقائد کے بارے میں بتاؤ۔ میں نے جواب میں مختصراً کہا۔

"سلطان مکرم! اہل ہند کے مطابق اس جہان بے ثبات کی گردشوں کے چار دور ہیں۔ ست یگ' تیتا یگ' دواپر یگ اور کل یگ۔ کل یگ کے خاتمے پر دنیا کے دوسرے یگوں کی گردش ایک بار پھر شروع ہو جاتی ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق بھگوان نے سب سے پہلے پانچ عناصر پیدا کئے اور پھر برہما نام کے ایک شخص کو پیدا کیا جس کو دنیا کی تخلیق کا سبب قرار دیا۔ برہما بھگوان کے حکم سے انسان کو عالم وجود میں لایا اور اسے چار گروہوں' اٹین' برہمن' چھتری' ویش اور شودر میں تقسیم کیا۔ برہمان نے ایک کتاب لکھی جس کو وید کہتے ہیں۔"

سلطان محمود میری باتیں بڑے غور سے سنتا رہا۔ پھر وہ پلٹا اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "عبداللہ عاطون! تم ایک نوجوان مسلمان ہو۔ مگر تمہارا علم ہزاروں سال قدیم ہے۔"

میں اندر ہی اندر چونک پڑا۔ کہیں اس مجاہد حق کو میری درازی عمر اور موت سے رستگاری کا کشف تو نہیں ہو گیا؟ لیکن ایسا نہیں تھا۔ سلطان محمود نے میرے علم کی تعریف کی تھی۔ سلطان کہہ رہا تھا۔

"ہم بہت جلد ہندوستان پر ایک اور حملہ کرنے والے ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ جنوب

مغربی ہند میں ایک بہت بڑا مندر ہے جس کا نام سومنات ہے اور وہاں کے ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ سورج سومنات سے اجازت لے کر طلوع ہوتا ہے۔ ہم اس باطل نظریئے کا قلع قمع کرنے اور سومنات کے بت کو پاش پاش کرنے جا رہے ہیں۔ ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سورج صرف خدا کے حکم سے طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ عبداللہ کیا تو نے سومنات کا مندر دیکھا ہے؟"

میں نے دست بستہ عرض کی۔ "نہیں سلطان مکرم! مجھے اس مندر کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن میں نے سن رکھا ہے کہ یہ مندر ہندوستان کے سارے ہندوؤں کا سب سے بڑا استھان ہے۔"

سلطان محمود نے استفسار کیا۔

"ہمیں بتایا گیا ہے کہ جنوب مغربی ہند میں عورتوں کو اس مندر کے سب سے بڑے بت سے بیاہ دیا جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ نے درست سنا ہے سلطان عالی.... دراصل ہندوؤں کے ہاں عورت کا مقام وہ نہیں ہے جو اسلام نے اسے عطا کیا ہے۔ اہل ہند عورتوں کو دوستی دشمنی کے لئے اور جاسوسی کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ برہمن کرامتیں بھی دکھاتے ہیں مگر یہ سب شعبدہ بازی ہے۔"

سلطان محمود قالین پر آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ اس کے ہاتھ پشت پر تھے۔ میری طرف دیکھ کر اس نے تبسم کیا اور کہا۔

"عبداللہ عاطون! آج سے تم ہمارے ایاز کے بعد مقرب خاص ہو۔"

میں نے ادب سے جھک کر شکریہ ادا کیا۔ سلطان نے اسی وقت ایک فرمان جاری کر کے مجھے اپنے مقربین میں شامل کر لیا۔ ابھی تک سلطان پر میری خفیہ طاقتوں کا راز ظاہر نہیں ہوا تھا۔ رہائش کے لئے مجھے ایک محل خاص مل گیا تھا جہاں چھ حبشی غلام پہرہ دیتے تھے۔ ایک خلعت بھی عطا ہوئی اور چھ گھوڑوں کی سواری کا بھی اہتمام ہوا۔ میں صبح و شام سلطان کی خدمت میں حاضر رہتا۔ سومنات پر حملے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ سلطان اکثر مجھ کو اپنی خلوت خاص میں بلوا کر ہندوستان کے حالات دریافت کرتا۔ کبھی کبھی ملک ایاز بھی مجلس میں موجود ہوتا۔ میں نے اسے ویدوں اور پراچین ہند کی قدیم تہذیب و ثقافت اور ان کی بت پرستیوں اور دولت کی پوجا کے بارے میں ایسے ایسے اسرار بتائے کہ جنہیں مورخین نے کبھی قلمبند نہ کیا تھا۔ سلطان مجھ سے بہت متاثر ہوا۔ جب اس پر یہ راز کھلا کہ میں سنسکرت کے علاوہ پالی، گجراتی اور قدیم ہند کی کئی ایک زبانیں روانی سے بول لیتا

ہوں تو وہ میرا اور بھی گرویدہ ہو گیا اور تقریباً سارا وقت مجھے اپنے ساتھ رکھتا۔ میں نے اسے بتایا کہ سومنات پر حملے کی صورت میں ہندوستان کے سبھی راجہ متحد ہو کر اس کا مقابلہ کریں گے اور اپنے ساتھ جنوبی ہند کے بدمست ہاتھی بھی لائیں گے اور ان کا ایک ہی علاج ہے کہ ان پر جلتے ہوئے تیر پھینکے جائیں۔

سلطان بڑا عادل تھا اور اس کے عدل کی داستانیں دور دور تک مشہور تھیں۔ عدل کرتے ہوئے وہ بڑی سے بڑی شخصیت کا بھی لحاظ نہیں کرتا تھا۔

سلطان محمود غزنوی کی عدل گستری اور انصاف پسندی کی میں کئی مثالیں دے سکتا ہوں جن کا میں نے ہندوستان میں آنے کے بعد خود مشاہدہ کیا۔ سلطان کو علمائے کرام اور صوفیائے عظام سے بھی بے حد عقیدت تھی۔ ایک بار سلطان محمود سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ شیخ ابوالحسن خرقانی سے ملنے خراسان گیا۔ میرے علاوہ حسین لونڈیاں بھی سلطان کے ساتھ تھیں۔ خراسان پہنچ کر سلطان نے یہ انداز اختیار کیا کہ خود تو اپنے غلام ایاز کا لباس پہنا اور ایاز کو اپنا شاہی لباس پہنا دیا۔ اس سے پہلے شیخ سے وہ کبھی نہیں ملا تھا۔ درجن بھر کنیزوں کو ہمراہ لے کر وہ شیخ ابوالحسن خرقانی کی خدمت میں پہنچا۔ ایاز نے بہ لباس سلطان غلام شیخ کو سلام عرض کیا تو انہوں نے سلام کا جواب دیتے تو دے دیا مگر سلطان کی طرف ملتفت ہوئے جس نے غلام ایاز کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس پر ایاز یعنی اصل محمود نے شیخ صاحب سے کہا۔ "اس کی کیا وجہ ہے کہ نہ تو آپ بادشاہ کی تعظیم کے لئے اٹھے اور نہ ہی اس کی طرف توجہ دی۔ کیا فقیر کے جال کی یہی کائنات ہے کہ بادشاہ کو اس طرح نظر انداز کیا جائے۔"

شیخ خرقانی نے جواب دیا۔

"ہاں۔ جال تو یہی ہے مگر تیرا مشار الیہ اس جال کا گرفتار نہیں ہے۔ تو سامنے آ۔ کیونکہ تو خود اس جال کا سب سے بڑا شکار ہے۔"

ہم سب سمجھ گئے کہ شیخ اصل حقیقت تک پہنچ گئے ہیں۔ سلطان بڑے ادب سے شیخ کے سامنے بیٹھ گئے اور کہا کہ مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔

شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے فرمایا۔

"تجھے چاہیئے کہ چار چیزوں کو اختیار کرے۔ اول پرہیز گاری، دوئم نماز باجماعت، سوئم سخاوت، چہارم شفقت۔"

سلطان محمود نے روپوں کا ایک توڑا شیخ کی خدمت میں پیش کیا۔ شیخ نے جو کی روٹی سلطان کے سامنے رکھی اور اسے کھانے کے لئے کہا۔ سلطان نے دیکھا کہ روٹی بہت سخت

ہے وہ نہ کٹتی تھی نہ گلے سے نیچے اترتی تھی۔ شیخ صاحب نے مسکرا کر فرمایا۔

"جس طرح یہ سوکھی روٹی تمہارے گلے سے نیچے نہیں اترتی اسی طرح تمہارا یہ روپوں سے بھرا توڑا ہمارے گلے سے نیچے نہیں اترتا۔ اس کو ہمارے سامنے سے اٹھاؤ۔ کیونکہ ہم اس کو بہت پہلے طلاق دے چکے ہیں"

سلطان محمود نے شیخ صاحب سے کوئی چیز بطور نشانی مانگی۔ شیخ صاحب نے اپنا خرقہ دے کر رخصت کیا۔ جب محمود رخصت کے وقت اٹھا تو اس مرتبہ شیخ نے اس کی تعظیم کی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ محمود نے پوچھا۔

"آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جب میں آپ کے پاس آیا تھا تو آپ نے میری بالکل پرواہ نہیں کی تھی لیکن اب آپ میرے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔"

شیخ نے جواب دیا۔ "جب تم میرے پاس آئے تھے اس وقت تم بادشاہی غرور میں تھے اور میرا امتحان کرنے کی غرض سے آئے تھے لیکن اب تم عاجزی و انکساری کے ساتھ واپس جارہے ہو۔"

سلطان محمود نے ازراہ عقیدت شیخ کے ہاتھوں کو چوما اور ہم رخصت ہوئے۔

اس زمانے میں سومنات نام کا ایک بہت بڑا شہر شمالی بحیرہ عرب کے کنارے واقع تھا۔ یہ شہر سومنات کے مندر کی وجہ سے ہندوؤں کے نزدیک ایک مقدس ترین مقام کی حیثیت رکھتا تھا۔ برہمنوں کی کتابوں سے جو کئی ہزار سال پہلے لکھی گئی تھیں پتہ چلتا ہے کہ یہ مندر سری کرشن کے عہد سے برہمنوں کا معبد ہے۔ اور سری کرشن نے اس جگہ دنیا اور اہل دنیا سے روپوشی اختیار کی تھی۔ لفظ سومنات' سوم' اور نات سے مل کر بنا ہے۔ سوم اس مندر کا نام تھا اور نات کے معنی مالک کے ہیں۔ یہی لفظ ناتھ کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ "سوم" اس راجہ کا نام تھا جس نے یہ مندر بنوایا تھا۔ لیکن اتفاق سے اس زمانے میں میرا گزرا ادھر سے نہیں ہوا۔

سومنات ہندوستان کے تمام ہندوؤں کے نزدیک بے حد متبرک تھا اور جب کبھی سورج گرہن یا چاند گرہن ہوتا تو یہاں تقریباً دو لاکھ تیس ہزار ہندو جمع ہوتے۔ بھجن گاتے اور نذریں چڑھاتے۔ ہندوستان کے راجاؤں نے اس مندر کے لئے بڑے بڑے گاؤں قصبے وغیرہ وقف کر رکھے تھے جن کی آمدنی سے اس مندر کے اخراجات پورے کئے جاتے تھے۔ سومنات کے مندر میں ہر وقت دو ہزار پجاری پوجا پاٹ کے لئے موجود رہتے تھے۔ یہ پجاری روزانہ رات کے وقت سومنات کے بت کو گنگا کے تازہ پانی سے غسل دیا کرتے۔ حالانکہ سومنات اور دریائے گنگا کے درمیان فاصلہ چھ کوس کا ہے۔ پجاریوں نے مندر کے ایک

کونے سے دوسرے کونے تک سونے کی زنجیر باندھ رکھی تھی جس کا وزن دو سو من تھا۔ اس زنجیر میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ پوجا پاٹ کے وقت اس زنجیر کو ہلایا جاتا اور گھنٹیاں بجنے لگتیں اور پجاری پوجا پاٹ کے لئے وقت مقررہ پر پہنچ جاتے۔ مندر میں پانچ سو گانے بجانے والی دیوداسیاں اور تین سو مرد سازندے موجود تھے۔ پجاریوں کے سر اور داڑھیاں مونڈنے کے لئے چار سو مرد حجام ملازم تھے ہندوستان کے اکثر راجہ اپنی بیٹیوں کو سومنات کی خدمت کے لئے مندر میں بھیج دیتے۔ یہ لڑکیاں تمام عمر کنواری رہ کر مندر میں مختلف فرائض انجام دیتیں۔ مندر کی وہ خاص جگہ جہاں سومنات کا عظیم الشان بت نصب تھا وہاں کوئی شمع روشن نہیں کی جاتی تھی بلکہ ان ہیرے جواہرات کی چمک سے وہاں روشنی پھیلی رہتی جو بت کے چہرے اور بازوؤں پر جڑے ہوئے تھے۔

ہندوؤں کا یہ عقیدہ تھا کہ موت کے بعد ہندو کی روح بدن سے جدا ہو کر سومنات کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے اور سومنات ہر روح کو اس کے اعمال و کردار کے مطابق نیا جسم عطا کرتا ہے۔ سلطان محمود کو بتایا گیا تھا کہ بت جن کو سلطان نے اپنے پہلے حملوں میں پاش پاش کیا تھا وہ ایسے بت تھے جن سے سومنات ناراض تھا اس لئے اس نے ان بتوں کو بچانے کی کوشش نہیں کی۔ ورنہ اس میں اتنی طاقت ہے کہ وہ جسے چاہے برباد کر سکتا ہے۔ سلطان کو یہ بھی مخبروں نے بتایا تھا کہ برہمنوں کے اعتقاد کے مطابق سومنات بادشاہ ہے اور باقی تمام بت اس کے دربان اور مصاحب ہیں۔ اس قسم کے بے معنی اور لغو افسانوں کو سن کر ہی سلطان محمود نے سومنات کو فتح کرنے اور وہاں کے تمام بتوں کو پاش پاش کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

20 شعبان 415ھ کا دن تھا جب سلطان محمود اپنے لشکر جرار کو لے کر ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ رمضان المبارک کے وسط میں یہ لشکر ملتان پہنچا۔ آگے ایک بے آب و گیاہ جنگل پڑتا تھا۔ سلطان نے حکم دیا کہ ہر شخص اپنے پاس چھ دنوں کا غلہ رکھ لے۔ اس کے علاوہ بیس ہزار اونٹوں پر غلہ اور پانی لاد دیا گیا۔ اس خطرناک جنگل کو عبور کرنے کے بعد غزنوی لشکر اجمیر شریف پہنچا تو وہاں کا راجہ محمود غزنوی کی آمد کی خبر سن کر پہلے ہی روپوش ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس شہر کو سلطانی لشکریوں نے جی بھر کر لوٹا مگر قلعے کی تسخیر پر توجہ نہ دی گئی۔ راستے میں کچھ اور قلعے بھی آئے جس کے سپاہیوں نے بغیر لڑے ہتھیار ڈال دیئے۔ لشکر گجرات پہنچا تو وہاں کے باشندے خوفزدہ ہو کر شہر چھوڑ گئے تھے۔ محمود کے حکم سے اس شہر کا سارا غلہ اونٹوں پر لادا گیا اور لشکر روانہ ہوا۔ جب سلطانی لشکر سومنات کے قریب دریا کے کنارے پہنچا تو دیکھا کہ سومنات کا مندر بلند قلعے پر ہے اور دریا کا پانی قلعے کی فصیل سے

ٹکرا رہا ہے۔ اہل سومنات قلعے کی دیوار پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کے لشکر کو حیرت سے دیکھ رہے تھے مگر انہیں یقین تھا کہ ان کا معبود سومنات مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دے گا۔

سومنات کا تین اطراف سے محاصرہ کر لیا گیا اور مسلمانوں کے لشکر نے میدان میں پڑاؤ ڈال دیا - اگلے روز اسلامی لشکر نے سلطان محمود کی قیادت میں سومنات کے قلعے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ قلعے کی دیوار کے نیچے جنگ شروع ہو گئی۔ قلعے کی جانب سے تیروں کی بوچھاڑیں آنے لگیں۔ صبح و شام تک جنگ ہوتی رہی۔ بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔ رات کی تاریکی پھیلی تو اسلامی لشکر اپنی قیام گاہ کی طرف واپس آ گیا۔ دوسرے روز قلعے کے آس پاس کے راجاؤں نے اپنے لشکر بھیج کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ طرفین میں گھمسان کا رن پڑا اور ہندو لشکر بھاگ گیا۔

سومنات کا محاصرہ جاری رہا۔ سومنات کا قلعہ بے حد بلندی پر تھا اور اوپر سے تیروں اور نیزوں کی بوچھاڑیں آتیں اور کھولتا ہوا تیل پھینکا جاتا قلعے کا دروازہ پتھروں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا اور بیچ میں سوراخ رکھ کر ان میں ایک ایک من کے وزنی نوکدار نیزے جڑ دیئے گئے تھے جنہوں نے ہاتھیوں کو زخمی کر دیا۔ ایک رات سلطان محمود نے مجھے طلب کیا اور کہا۔

"تم ان لوگوں کی زبان اور رسم و رواج سے واقف ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم دریا کی طرف سے قلعے پر حملہ آور ہوں تو قلعے کو فتح کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں قلعے کی دیوار کے کسی کمزور پہلو کا علم ہو تم کسی طرح قلعے کے اندر داخل ہو کر ہمیں اس کمزور پہلو کی خبر دے سکتے ہو؟"

قلعے کی اندرونی نشیب و فراز سے میں بھی بے خبر تھا اور مجھے وہی کچھ معلوم تھا جو میں برہمنوں کی پرانی کتابوں میں پڑھ چکا تھا۔ لیکن میں نے حامی بھر لی اور سلطان سے اجازت لے کر رات کے اندھیرے میں قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے ہندو برہمنوں کا بھیس بدل رکھا تھا۔ ماتھے پر رام نام کا ٹیکا لگا رکھا تھا۔ گیروے کپڑے اور جینو پہن کر ہاتھ میں ترشول رکھ لیا تھا۔ میں دریا کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ میرے پاس سوائے اپنے دوست سانپ قنطور کے مہرے کے اور کچھ نہیں تھا۔ دریا قلعے کے عقب میں جا کر بائیں جانب چٹانوں کی طرف مڑ جاتا تھا۔ یہاں میں نے دریا میں چھلانگ لگا دی اور تیرتا ہوا چٹانوں میں جا کر چھپ کر بیٹھ گیا اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ مشرق میں جب سپیدہ سحر نمودار ہوا تو میں دریا میں اتر گیا اور قلعے کی دیوار کی طرف تیرنے لگا۔

اس وقت مجھے قلعے کی فصیل پر کھڑے سومنات کے مندر کے ہندو دکھائی دے رہے تھے جو پہرے پر تھے کہ اگر اسلامی لشکر دریا کی طرف سے حملہ آور ہو تو سب کو خبردار کر

دیں۔ انہوں نے مجھے دریا میں تیرتے اور قلعے کی فصیل کی جانب آتے دیکھا تو مجھ پر تیر برسانے لگے۔ میں نے ترشول والا ہاتھ فضا میں بلند کر کے والبشیلم ویدوں کے اشلوک بلند آواز میں پڑھنے شروع کر دیئے اور کہا کہ میں والبشیلم راجہ کے دربار کا برہمن منتری ہوں مجھے بچاؤ۔ میں ڈوب رہا ہوں۔ میرا ترشول' ماتھے کا ٹیکہ اور میرے اشلوک سن کر فصیل کے ہندو آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ انہیں یہی خدشہ تھا کہ میں مسلمانوں کا جاسوس تو نہیں ہوں۔ ان میں ایک پنڈت پجاری بھی تھا اس نے میرے سنسکرت کے قدیم ویدک اشلوک سنے تو اوپر سے رسے کی سیڑھی لٹکا دی۔

سیڑھی کے ذریعے میں اوپر قلعے کی فصیل پر پہنچا تو انہوں نے مجھے گرفتار کر لیا اور وہیں ایک پردے میں لے جا کر برہمن پنڈت نے میرا طبی معائنہ کیا - عباسی عہد میں' میں نے جب اسلام قبول کیا تو اس وقت مختون نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے سومنات کے ہندوؤں کا شک رفع ہو گیا اوپر سے میری سنسکرت دانی اور اشلوک پڑھنے کے باعث انہیں یقین ہو گیا کہ میں سلطان محمود کی فوج کا جاسوس نہیں ہوں۔ میں نے گھڑی گھڑائی کہانی بیان کر دی۔

"راجہ والبشیلم کی فوج نے عقب سے مسلمانوں کے لشکر پر حملہ کیا تو میں اس کے ساتھ تھا۔ مگر افسوس ہماری اپنی ناسمجھی کی وجہ سے فوج جم کر مقابلہ نہ کر سکی۔ مسلمانوں نے ہمارا پیچھا کیا۔ میں نے رات کے اندھیرے میں دریا میں چھلانگ لگا دی اور چٹانوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ دیوتا مجھ پر مہربان تھے کہ آپ لوگوں نے مجھے اوپر اٹھا لیا۔"

مجھے اس وقت سومنات کے سب سے بڑے پجاری واستو کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے اپنی تسلی کے لئے مجھ سے راجہ والبشیلم اور دربار کے بارے میں بہت کچھ پوچھا جو میں نے بتا دیا - کیونکہ یہ ساری معلومات میں پہلے سے جانتا تھا۔ پجاری واستو بھی میری سنسکرت دانی اور ویدوں کے اشلوک پڑھنے سے بہت متاثر ہوا۔ اب اس نے مجھ سے سلطان محمود کے لشکر کے بارے میں پوچھا کہ فوج میں ہاتھی کتنے ہیں اور رات والی لڑائی میں اس کا کتنا نقصان ہوا تھا۔ میں نے من گھڑت باتیں بیان کر دیں اور اسے یقین دلایا کہ مسلمانوں کے حوصلے پست ہو چکے ہیں اور وہ سومنات کے دیوتا سے خائف ہیں۔ یہ سن کر تمام پجاریوں نے جو وہاں جمع تھے جے سومنات کے نعرے بلند کیے۔ سومنات کے شہر پر پہلے ہی مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا اب صرف قلعہ سر کرنا باقی تھا جس کے اندر سومنات کا بہت بڑا مندر تھا۔ میری خوب آؤ بھگت کی گئی اور پجاری واستو نے مجھے سومنات کے بت کے قریب بیٹھ کر ویدوں کے قدیم اشلوک پڑھنے کا فرض سونپا۔ وہاں کوئی ایسا ہندو برہمن نہیں تھا جس کو اتنے قدیم اشلوک اس قدر روانی سے یاد ہوں۔ پجاری واستو کے نزدیک ان اشلوکوں کے اثر سے

اسلامی لشکر کو پسپا کیا جا سکتا تھا۔

پجاری واستو مجھے سومنات کے بت کے قریب لے گیا۔ میں پہلی بار اس بت کو دیکھ رہا تھا۔ بت دس گیارہ گز لمبا تھا۔ اس کے بازوؤں' ماتھے اور آنکھوں میں قیمتی ہیرے' الماس ور لعل و عقیق جڑے ہوئے تھے جن کی کرنوں سے اس کے ارد گرد روشنی کا ہالہ سا بن گیا تھا۔ اس بت خانے کی چھت کو ساٹھ سے زیادہ منقش ستونوں نے اٹھا رکھا تھا۔ میں دوپہر تک وہاں بیٹھا اشلوک پڑھتا رہا۔ دوپہر کے بعد مجھے کھانے کو مٹھائی اور دودھ دیا گیا۔ تیسرے پہر پجاری واستو نے مجھے بلایا اور پوچھنے لگا کہ میرے خیال میں اسلامی لشکر اب کیا سوچ رہا ہے اور محاصرہ کب تک جاری رکھ سکتا ہے۔ میں نے اسے بتایا۔

"میرے خیال میں تو مسلمانوں کے حوصلے جواب دے گئے ہیں۔ ان کا بہت سا نقصان ہو چکا ہے۔ کئی ہاتھی زخمی ہیں۔"

پجاری واستو بولا۔ "پنڈت جی۔"

پھر اچانک میری طرف دیکھنے لگا۔

"تم نے اپنا شبھ نام تو بتایا ہی نہیں۔"

اس وقت میرے دماغ میں ایک ہی نام آیا اور میں نے فوراً کہہ دیا۔

"میرا نام پنڈت پربھودیال شاستری ہے۔"

وہ اپنی گفتگو کا سلسلہ پھر سے جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"پنڈت پربھودیال شاستری - تمہیں شاید مسلمانوں کے مذہبی جوش کا اندازہ نہیں۔ یہ قوم ہمیں کافر سمجھتی ہی اور ہمارے خلاف جنگ کرنا اپنا دھرم خیال کرتی ہے۔ اس لئے مجھے پورا وشواس ہے کہ یہ لوگ کوئی بڑا حملہ کرنے والے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "لیکن واستو جی! مسلمانوں نے پہلے بھی حملہ کر کے دیکھ لیا ہے۔ ان کے ہاتھی نہ قلعے کا دروازہ توڑ سکے ہیں اور نہ ہی ان کے فوجی ہماری فصیلوں پر چڑھ سکے ہیں۔"

پجاری واستو نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اس بار وہ دریا کی طرف سے حملہ کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہمیں دریا کی طرف فصیل پر کھولتے ہوئے تیل کے کڑھاؤ اور تیر اندازوں کا ابھی سے انتظام کر دینا چاہیئے۔"

پجاری واستو بولا۔ "اس کا بندوبست میں نے کروا دیا ہے لیکن اس جگہ قلعے کی دیوار کے نیچے سے دریا کا پانی قلعے کے اندر نہر کی شکل میں داخل ہوتا ہے۔ اگرچہ ہم نے وہاں لوہے کا جنگلہ چڑھا رکھا ہے۔ پھر بھی مجھے اس جگہ سے مسلمانوں کے حملے کا خطرہ ہے۔"

جس چیز کی تلاش میں میں وہاں آیا تھا وہ اس پجاری نے خود ہی میرے آگے رکھ دی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ یہ نہر کس مقام سے قلعے کی فصیل کے اندر داخل ہوتی تھی۔ بڑے پجاری کو پورا یقین تھا کہ قلعہ چند کوٹ' قلعہ منج اور قلعہ چند پال کے راجہ عنقریب سومنات کی مدد کو آئیں گے اور مسلمانوں کے لشکر کو تہس نہس کر کے رکھ دیں گے۔

"سومنات جی نے مجھے خواب میں اشارہ دے دیا ہے۔ پرانی پستکوں میں لکھا ہے کہ سومنات کے مقدس استھان پر حملہ کرنے والوں کو ہمیشہ تباہ و برباد کر دیا گیا۔"

میں نے مندر کے تمام پجاریوں کا بھرپور اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ ایک روز میں نے وہ مقام بھی دیکھ لیا جہاں فصیل کے نیچے اندر ہی اندر سے ایک نہر قلعے میں داخل ہو رہی تھی۔ قلعے کی فصیل پر چڑھ کر میں نے اس مقام کو ذہن نشین کر لیا۔ اب میں وہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسی رات کا ذکر ہے کہ مجھے بڑے پجاری نے اپنی گپھا میں بلایا اور کہا۔

"شاستری جی! آج منہ اندھیرے سومنات جی کے آگے ہم ایک اور دیوداسی کی قربانی دے رہے ہیں جو قلعہ چند پال کے برہمن جاگیردار کی بیٹی ہے۔ اس برہمن جاگیردار نے اپنی اس بیٹی کو سومنات کی خدمت کے لئے دان کے طور پر دیا تھا لیکن ہمیں پتہ چلا ہے کہ یہ برہمن لڑکی جس کا نام چترالی ہے چند پال شہر کے ایک شودر ذات کے نیچ نوجوان سے پریم کرتی تھی۔ اب ہم اس کی آتما کی شانتی کے لئے اسے سومنات کے حضور قربان کر رہے ہیں لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ اس ملیچھ دیوداسی کو رگ وید کے اشلوک پڑھ کر اس قابل بنایا جائے کہ وہ سومنات جی کے حضور پیش ہو سکے۔ تمہیں یہ سارے اشلوک یاد ہیں۔ چنانچہ تمہیں آج رات صبح بلیدان کے وقت تک اس ملیچھ دیوداسی کے پاس بیٹھ کر اشلوک پڑھنا ہوں گے تا کہ سومنات جی اس کی قربانی سویکار کر لیں۔"

یہ سن کر میرا دل دہل گیا کہ یہ سنگ دل لوگ ایک لڑکی کو محض اس لئے قتل کرنے والے ہیں کہ وہ اپنی پسند کے ایک نوجوان سے پیار کرتی ہے۔ چاہے وہ شودر ہی تھا۔ ان ہندو برہمنوں نے اپنے مفاد کے لئے انسانی معاشرت کو ذات پات میں تقسیم کر رکھا تھا۔ جس کو میں تسلیم نہیں کرتا تھا۔ میں نے اسی وقت اس بدنصیب مگر عظیم لڑکی کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جس نے ذات پات اور گھناؤنی ریتوں کے خلاف بغاوت کی تھی اور برہمن زادی ہوتے ہوئے بھی نیچی ذات کے ایک نوجوان سے محبت کی تھی۔

میں نے کہا۔ "میں تیار ہوں شری واستو جی۔ یہ میرے دھن بھاگ ہوں گے کہ مجھے

دیوتا سومنات کی خدمت کرنے کا موقع ملے گا۔"

بڑا پجاری بہت خوش ہوا۔ اس نے ایک ہٹا کٹا پجاری میرے ساتھ کر دیا جو مجھے مندر کے نیچے ایک تنگ و تاریک راستے سے گذار کر ایک تہہ خانے میں لے گیا جہاں ایک نازک اندام آہو چشم حسین لڑکی زنجیروں میں جکڑی پڑی تھی۔ موت کے خوف سے اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ تہہ خانے کے دروازے پر دو پجاری تلواریں لئے پہرہ دے رہے تھے۔ اس بے گناہ معصوم لڑکی کو بچانے کے لئے وقت بہت کم تھا۔ صرف رات کے دو پہر باقی تھے میں کوئی خاص منصوبہ نہیں بنا سکتا تھا۔ میں نے زندان میں داخل ہوتے ہی پہرے داروں سے کڑک کر کہا۔

"بندی خانے کا دروازہ بند کر دو۔"

انہیں معلوم تھا کہ میں سربرآوردہ شاستری ہوں اور مجھے مندر کے سب سے بڑے پجاری نے خاص طور پر اشلوک پڑھنے کے لئے بھیجا ہے۔ انہوں نے فوراً دروازہ بند کر دیا اور باہر کھڑے ہو کر پہرہ دینے لگے۔ دروازہ بند ہوتے ہی میں نے لڑکی سے کہا۔

"چترالی! حوصلہ رکھو میں تمہاری جان بچانے آیا ہوں۔"

وہ بڑی اداس نظروں سے میرا منہ تکنے لگی۔ میں نے جو کچھ کہا تھا اسے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ مندر کا ایک شاستری یا پروہت خود اس کو سومنات دیوتا پر قربان ہونے سے بچانے کے لئے تیار ہو جائے۔ میں نے پہرے داروں تک آواز پہنچانے کے لئے کبھی بلند آواز اور کبھی نیچی آواز میں اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔

تھوڑی دیر بعد میں نے بدنصیب برہمن زادی سے کہا۔

"چترالی! میں نے بھی زندگی میں ایک شودر ذات کی لڑکی سے پیار کیا تھا - میرے باپ نے جو برہمن تھا اس لڑکی کو قتل کروا دیا۔ اب میں تمہیں بچا کر ان برہمنوں سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ میں تم سے جیسے کہوں ویسے ہی کرنا۔"

چترالی اب بھی مجھے ٹکر ٹکر تک رہی تھی۔ ایک ننھا سا دیا روشن تھا جس کی دھیمی روشنی میں مجھے اس کے زرد چہرے پر موت کی پرچھائیاں اترتی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ جو کچھ میری زبان سے سن رہی تھی اسے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں پھر بلند آواز میں اشلوک پڑھنے لگا۔ کچھ دیر اشلوک پڑھنے کے بعد میں نے پھر اپنے عزم کو دہرایا تو اسے کچھ کچھ اعتبار سا آنے لگا۔ وہ سنبھل کر بیٹھی تو اس کی زنجیریں جھنجھنائیں۔ میں نے اشلوک پڑھتے ہوئے آواز بلند کر دی۔

دروازہ کھلا اور ایک دیوداسی مٹی کے پیالے میں ایک مشروب لائی۔ بلیدان یا قربانی کی

رسم کے مطابق یہ مشروب چترالی کو پلانا تھا۔ اس لڑکی نے زرد رنگ کی ساڑھی سے اپنے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا اور مشروب کی پیتل کی صراحی بغل میں دبا رکھی تھی۔ یہ دیوداسی بھی مندر کی دوسری دیوداسیوں کی طرح اونچی ذات کی برہمن زادی تھی اور چترالی کو ہاتھ لگانا یا چھونا گناہ خیال کرتی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اشلوک پڑھ رہا تھا۔ دیوداسی نے چترالی سے دو فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہو کر کہا کہ وہ ہتھیلی کا پیالہ بنائے تاکہ اسے مشروب پلایا جائے۔

چترالی نے ہتھیلی کا پیالہ بنا کر آگے کیا اور لڑکی نے صراحی میں سے مشروب اس کی ہتھیلی پر ڈالنا شروع کر دیا۔ چترالی ہتھیلی کی اوک سے منہ لگا کر بادل نخواستہ ایک ایک گھونٹ مشروب پینے لگی۔ اشلوک پڑھتے پڑھتے ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں لہرایا۔ میں نے اپنے فرار کے منصوبے میں پچاس فیصد ترمیم کر دی۔ میں اشلوک پڑھتے پڑھتے بڑے آرام سے اپنی جگہ سے اٹھا اور پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر آگے کو جھکی ہوئی برہمن زادی دیوداسی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور وہیں اس کی گردن پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا کہ صراحی اس کے ہاتھ سے گر کر شور نہ مچائے۔

برہمن زادی کو جو حیرت ہوئی تھی وہ اپنی جگہ پر تھی لیکن سب سے زیادہ حیرت چترالی کو ہوئی کہ یہ میں کیا کر رہا ہوں۔ برہمن زادی دیوداسی میرے ہاتھوں کی گرفت سے گردن چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے پوری قوت لگا کر آواز نکالنے کی کوشش کی مگر یہ کام اس کے بس کا نہیں تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ کی تین انگلیوں سے دیوداسی کی گردن کی کان کی لو کے نیچے کی دو رگوں کو زور سے دبایا۔ دیوداسی نے تین جھٹکے کھائے اور بے ہوش ہو گئی۔ میں نے چترالی سے سرگوشی میں کہا۔ "آواز نہ نکالنا۔"

اور اسی کے ساتھ ہی میں نے بلند آواز میں اشلوکوں کا دور شروع کر دیا تاکہ باہر کھڑے پہرے داروں کو شک نہ ہو۔ میں نے دیوداسی کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور چترالی کے قریب منہ لے جا کر کہا۔

"جتنی جلدی اس دیوداسی کے کپڑے بدل سکتی ہو بدل ڈالو۔ دیر نہ کرو۔" میں نے دوسری طرف منہ کر لیا تھا۔ میں نے دروازے کی طرف منہ کر کے اشلوک پڑھنے کی آواز کو اور بلند کر دیا۔ چترالی کے اندر زندہ رہنے کی خواہش نے ایک جوش بھر دیا تھا۔ چترالی نے دیوداسی کے کپڑے پہن لئے تھے اور اپنے کپڑے اسے پہنا دیئے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ میں پیتل کی صراحی دے کر کہا۔

"ساڑھی کا پلو منہ کے آگے ڈال کر قید خانے سے باہر نکل کر قلعے کی فصیل کی دریا والی برجی میں چھپ کر میرا انتظار کرو۔"

جتنی دیر میں چترالی نے صراحی اٹھا کر ساڑھی کے پلو سے منہ سر ڈھکا میں نے بے ہوش دیوداسی کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر اسے دیوار کے ساتھ سہارا دے کر یوں بٹھا دیا کہ اس کا سر عالم نقاہت اور مایوسی میں دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ میں یہ کام بھی کر رہا تھا اور تیز تیز اشلوک بھی پڑھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ چترالی دیوداسی کی زرد ساڑھی میں ملبوس بغل میں صراحی دبائے، چہرے کے آگے ساڑھی کا پلو کئے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے اس کے پیچھے بلند آواز میں اشلوک پڑھنا شروع کر دیا۔

"خبردار جو اب کسی دیوداسی کو یہاں بھیجا۔ تم میری عبادت کو بھنگ کر گئی ہو۔ چلی جاؤ یہاں سے۔"

چترالی نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ خاموش رہو اور چلتی چلی جاؤ۔ اس نے دروازہ کھولا تو پہرے داروں نے حیرانی سے جھانک کر اندر دیکھا۔ میں نے اشلوک پڑھتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"اگر اب تم دونوں نے کسی دیوداسی کو اندر آنے دیا تو میں بڑے پجاری سے کہہ کر تمہیں سولی پر چڑھا دوں گا۔ خبردار اب کوئی نہ اندر آئے۔ مجھے دیوتاؤں کے اشلوک سکون سے پڑھنے دو۔"

پہرے داروں نے دیکھ لیا تھا کہ جس دیوداسی کو صبح سومنات کے بت کے آگے قربان کرنا ہے وہ زنجیر پہنے دیوار سے ٹیک لگائے پڑی تھی۔ وہ اندھیرے میں تھی اور اس کی شکل پوری طرح سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اوپر سے میں نے شور مچا رکھا تھا۔ اس افراتفری میں چترالی نے بڑی پھرتی اور ہوشیاری سے کام کیا اور پہرے داروں کے قریب سے ہو کر ساڑھی کا پلو منہ کے آگے کئے گذر گئی۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور جھوم جھوم کر اشلوک پڑھتے ہوئے غرایا۔

"بدبختو! دروازہ بند کر دو۔"

پہرے داروں نے فوراً گردنیں پیچھے کھینچ کر دروازہ بند کر دیا۔ میں کچھ دیر اسی طرح اشلوک پڑھتا رہا۔ کبھی دھیمی اور کبھی اونچی آواز میں۔ جب کچھ دیر ہو گئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ چترالی فصیل کی دریا والی برجی میں پہنچ گئی ہو گی تو میں اشلوک پڑھتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا۔ چترالی اس قلعے کے تمام خفیہ راستوں اور نشیب و فراز سے واقف تھی اور قلعے میں چند روز گزارنے کے بعد مجھے بھی معلوم ہو گیا تھا کہ فصیل کی دریا والی برجی چونکہ عقب کی طرف ہے اس لئے وہاں رات کو پہرہ چوکی نہیں لگائی جاتی۔

اب رات کا ایک پہر باقی رہ گیا تھا اور پجاریوں کے جلاد چترالی کو موت کے گھاٹ

اتارنے کے لئے کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتے تھے۔ میں دروازہ کھول کر باہر آگیا اور پہرے داروں سے کہا کہ مقدس عبادت پوری ہو چکی ہے۔ انہوں نے دروازے سے جھانک کر اندر دیکھا اور انہیں اطمینان ہو گیا کہ دیوداسی چترالی کے پاؤں میں زنجیر پڑی ہوئی تھی اور وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے خاموش بیٹھی تھی۔ اچانک ایک پہرے دار نے کہا۔

"اس کے بال اتنے لمبے نہیں تھے۔"

"کیا کہا۔ یہ کون ہے پھر؟"

دوسرے پہرے دار نے تعجب سے میری طرف دیکھا میں نے چلا کر کہا۔

"میرا منہ کیا تک رہے ہو اندر جا کر دیکھو کہ یہ کون ہے۔"

دونوں پہرے دار تیزی سے اندر کی طرف دوڑے۔ ان کے اندر جاتے ہی میں نے قید خانے کی کوٹھری کا دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی اور تاریک زینے کی طرف بھاگا۔ ان کے چلانے اور مدد مدد پکارنے کی آوازیں آدھی سیڑھیوں تک میرا تعاقب کرتی رہیں۔ اس کے بعد ان کی آوازیں بھاری پتھروں کی سلوں میں دب کر رہ گئیں۔ میں اوپر قلعے کی پہلی منزل پر آگیا اور نیم روشن راہداری میں سے گذر کر فصیل کے جنوب کی طرف چلا۔ پچھلی رات کی ساعت تھی۔ قربانی کا وقت ہو رہا تھا۔ جس طرف سومنات کا بت تھا مجھے پجاریوں کی نقل و حرکت نظر آئی۔ بھجن کیرتن کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ میں اس طرف سے کتراتا ہوا دوسری جانب نکل کر مندر کے پجاریوں کی کوٹھریوں سے ہوتا ہوا کونے والی تاریک سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اچانک سامنے سے مجھے بڑا پجاری واستو آتا دکھائی دیا۔ میں نے اپنی رفتار آہستہ کر لی اور دھیمی آواز میں اشلوک پڑھنے لگا۔

بڑے پجاری واستو نے قریب آکر مجھے حیرت سے دیکھا اور بولا۔ "اشلوک کا دور پورا کر لیا شاستری تم نے؟"

"ہاں واستو جی پورا کر لیا۔"

"تو پھر کدھر جا رہے ہو؟ میرے ساتھ سومنات جی کے چرنوں میں چلو۔ بلی کا سمے ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ذرا فصیل کے اوپر کھلی ہوا میں سیر کو جا رہا تھا۔"

پجاری واستو نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔

"شاستری جی! یہ وقت سیر کا نہیں بلی کا ہے۔ قربانی کے سمے اشلوک بھی پڑھے جائیں گے۔ آخر وہ برہمن کی پتری ملیچھ ہو گئی تھی۔ اسے قربانی سے پہلے پوتر کرنا ہو گا۔"

میں کیا کرتا۔ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا ہوا سومنات کے بت کے پاس آگیا۔

یہاں ایک لڑکی کو مذہبی رسوم کے مطابق پتھر کے ایک بے جان بت پر قربان کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بت کے آگے چبوترے کا ایک فرش بچھا دیا گیا تھا تاکہ جب چترالی کے سینے میں خنجر گھونپ کر جلاد اس کا دل باہر نکالے تو خون سے سنگ مرمر کا فرش خراب نہ ہو جائے۔

میری جان سخت مصیبت میں آ گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ فصیل کی برجی پر چترالی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہو گی اور ادھر ابھی تھوڑی دیر بعد جب نقلی چترالی کو قربانی کے لئے لایا جائے گا بلکہ اس سے پہلے ہی یہ بھانڈا پھوٹ جائے گا جب قید خانے کا دروازہ کھلتے ہی پہرے دار شور مچاتے ہوئے باہر کو دوڑیں گے اور یہاں آ کر بتائیں گے کہ میں نے انہیں کوٹھری میں بند کر کے چترالی کو بھگا دیا ہے۔ میرا ایک ایک لمحہ اضطراب کے عالم میں گذر رہا تھا۔ میں خوب جانتا تھا کہ اگر میں تھوڑی دیر اور وہاں اسی طرح بیٹھا رہا تو وہاں ایک طوفان برپا ہو جائے گا اور عین ممکن ہے کہ اس طوفان میں چترالی کو ڈھونڈھ کر ہلاک کر دیا جائے۔

اچانک میں اٹھ کھڑا ہوا۔ بڑے پجاری واستو نے کہا۔

”شاستری جی! کہاں چلے؟“

میں نے کہا۔ ”بلیدان سے پہلے میرا اشنان کرنا ضروری ہے۔“

اب وہ مجھے نہیں روک سکتا تھا۔ ادھر میں سومنات کے بت کے سامنے سے اٹھ کر چلا اور ادھر پجاری واستو نے حکم دیا کہ جاؤ اور ملیچھ دیوداسی کو قربانی کے لئے لے آؤ۔ میں نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔ وہاں سے اپنی کوٹھری کی سیدھ میں چلا مگر اندھیرے میں آ کر اس اندھیرے راستے کی طرف گھوم گیا جو اوپر فصیل کی طرف جاتا تھا۔ یہاں کوئی آدمی نہیں تھا۔ میں اندھیری سیڑھیاں پھلانگتا چھت پر آ گیا۔

آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا اور صبح کاذب کی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ میں چھتے اور بارہ دریوں سے نکلتا ہوا سیدھا جنوب کی طرف والی سیاہ پتھروں کی بنی ہوئی برجی میں پہنچ گیا۔ یہاں چترالی موجود نہیں تھی۔ میں دھک سے رہ گیا۔ کیا وہ پکڑی گئی ہے؟ میں اسے پکار بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر اچانک پتھروں کے ڈھیر کے عقب سے ایک انسانی سایہ نکل کر سامنے آ گیا۔

”چترالی۔“

”ہاں۔“ ایک دھیمی نسوانی آواز آئی۔

یہ چترالی ہی تھی۔ میں اندھیرے میں بھی اس کے چہرے کے نقوش دیکھ رہا تھا۔ فصیل

کی دوسری جانب نیچے اندھیرے میں دریا کی لہریں قلعے کی دیوار سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے چترالی سے کہا۔

”تمہیں تیرنا آتا ہو یا نہ آتا ہو۔ دریا میں کود جاؤ۔“

وہ گھبرائی۔ لیکن یہ وقت گھبرانے اور پس و پیش کرنے کا نہیں تھا۔ میں نے اسے دریا میں دھکا دے دیا۔ قدرتی طور پر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ نے فصیل کی دوسری جانب پہرے پر کھڑے تیر اندازوں کو ہوشیار کر دیا۔ انہوں نے جدھر سے چیخ کی آواز آئی تھی ادھر دیکھا تو اس وقت فصیل پر سے میں دریا میں چھلانگ لگا چکا تھا۔

ہم پر تیروں کی بارش ہونے لگی۔ میں نے دریا میں گرتے ہی اپنی تیز نظر سے کام لیتے ہوئے اندھیرے میں چترالی کو لہروں میں غوطے کھاتے دیکھ لیا اور اس کی طرف لپک کر اس کے سر کو پانی سے باہر نکال کر جتنی جلدی تیر سکتا تھا اسے لے کر دوسری جانب کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ ہندو پہرے داروں نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور برابر تیر برسا رہے تھے۔ ایک تیر میری ٹانگ میں کھب گیا۔ لیکن میں اسی طرح تیرتا رہا۔ میری برق رفتاری میرے کام آ گئی اور چند لمحوں کے بعد چترالی کو لے کر دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔

کنارے پر آتے ہی میں نے چترالی کو ٹھنڈی گیلی ریت پر اوندھے منہ لٹا دیا۔ وہ بری طرح کھانس رہی تھی اور اس کے پھیپھڑوں میں گھسا ہوا پانی باہر نکل رہا تھا۔ ہم خطرے سے نکل آئے تھے۔ چترالی کی طبیعت تھوڑی دیر بعد سنبھل گئی۔ اب ہمارے ارد گرد دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ چترالی نے دریا کے کنارے کچھ فاصلے پر غزنوی لشکر کے خیموں کا میدان کارزار دیکھا تو گھبرا کر بولی۔

”شاستری جی! ہم دشمنوں میں آ گئے ہیں۔ یہ مسلمان ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

میں نے اسے بالکل نہ بتایا کہ میں مسلمان ہوں۔ میں نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ مسلمانو کی فوج کا ایک سالار میرا جاننے والا ہے ہم اس کے پاس چلتے ہیں۔ میں سلطان محمود کے پاس ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اسے اپنی کارگزاری کے بارے میں اطلاع کروں۔ جونہی میں اسلامی لشکر میں پہنچا میرا ہندوانہ حلیہ اور میرے ساتھ ایک ہندو عورت دیکھ کر سپاہیوں نے مجھے گرفتار کر لیا۔ سلطان کے لشکر میں ہزاروں سپاہی تھے۔ ہر سپاہی میری شکل او میرے رتبے سے واقف نہیں تھا۔ انہوں نے ہم دونوں کو رسیوں سے باندھ کر خیمے میں ڈال دیا۔ میں نے ان سے بہت کہا کہ مجھے سلطان کے پاس لے چلو۔ میں سلطان کا مقرب خاص ہوں۔ مگر میری کسی نے نہ سنی۔ میں فرار ہونے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ آسمان پر کالی سیاہ گھٹا اٹھی ۔ بجلی کڑکنے لگی اور ایکدم سے موسلا دھار بارش

شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی فوج میں طبل جنگ بج گیا اور اسلامی لشکر نے قلعے پر دھاوا بول دیا۔

بعد میں جو حالات مجھے معلوم ہوئے ان کے مطابق سلطان محمود سومنات کے محاصرے سے تنگ آ گیا اور اس نے شیخ ابوالحسن خرقانی کا خرقہ ہاتھ میں لیا اور سجدے میں گر گیا اور خداوند تعالیٰ سے دعا کی کہ اے خدا! اس خرقے کے مالک کے طفیل مجھے ان ہندوؤں کے مقابلے میں فتح دے۔ میں نیت کرتا ہوں کہ جو مال غنیمت یہاں سے حاصل ہو گا وہ غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دوں گا۔ اس کے بعد سلطان نے حملے کا حکم دے دیا۔ طوفان باد و باراں نے دشمن کو پہلے ہی پریشان کر دیا تھا۔ اب جو مسلمانوں نے نعرہ تکبیر بلند کر کے حملہ کیا تو بہت جلد ہندوؤں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ہاتھیوں نے قلعے کے دروازے کو توڑ ڈالا اور اسلامی لشکر قلعے میں داخل ہو گیا۔

اس وقت میں ایک خیمے میں قید تھا۔ جب میں نے اسلامی لشکر کو قلعے میں داخل ہوتے دیکھا تو میں نے رسیاں توڑ ڈالیں اور چترالی کو لے کر قلعے کی طرف بڑھا۔ وہ گھبرا کر بولی۔

"یہ کیا کرتے ہو۔ تم موت کے منہ میں جا رہے ہو شاستری جی۔"

میں نے اس سے کہا کہ تم کوئی سوال نہ کرو اور میرے ساتھ خاموشی سے چلو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں تمہارے محبوب کے پاس ضرور پہنچاؤں گا۔ میں نے اسے گھوڑے پر اپنے آگے بٹھایا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا لشکریوں کے ساتھ قلعے میں داخل ہو گیا۔ جو سپاہی پہلے قلعے میں داخل ہوئے تھے انہوں نے مجھے پہچان لیا اور میں سلطان محمود کے پاس پہنچ گیا جو سومنات کے مندر کے وسط میں گرز ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔

اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "ہم نے تمہارا انتظار کیا لیکن میرے ہاتھوں ان بتوں کو غارت ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ یہ لڑکی کون ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ یہ چند پال قلعے کے برہمن جاگیردار کی بیٹی ہے اور ایک شودر سے محبت کرنے کے جرم میں اسے سومنات کے آگے ہلاک کیا جا رہا تھا کہ میں اسے بھی اپنے ساتھ بچا کر لے آیا۔ پھر میں نے سلطان محمود کو اس نہر کے بارے میں بتایا جو دریا سے نکل کر فصیل کے نیچے سے قلعے میں داخل ہوتی تھی۔ سلطان نے میری کارگزاری کی تعریف کی اور کہا کہ خدا کے حکم سے ہم نے کفار پر فتح پائی۔ چترالی یہ دیکھ کر سخت حیران ہوئی کہ میں سلطان کا مقرب خاص تھا اور جاسوسی کرنے قلعہ سومنات گیا تھا اور میں مسلمان ہوں۔ میں نے چترالی کو پیچھے سلطان کی کنیزوں کے خیمے میں پہنچا دیا۔ سلطان اس دوران میں مندر کے سینکڑوں بتوں کو اپنے گرز سے پاش پاش کر چکا تھا۔ اب وہ مندر کے سب سے بڑے بت

سومنات کے رو برو کھڑا تھا۔ اس بت کے بارے میں مشہور تھا کہ جو کوئی اسے گزند پہنچائے گا وہیں تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔ سلطان محمود نے بلند آواز سے کلمہ شہادت پڑھا اور گرز سے بت کو ایک کاری ضرب لگائی۔ بت کا ایک بازو ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد سلطان نے اس بت کو گرز مار مار کر پاش پاش کر دیا۔ اس کے اندر سے ہزاروں قیمتی ہیرے جواہرات برآمد ہوئے۔

سلطان نے حکم دیا کہ اس بت کے پتھروں کو غزنی کی مسجد کے راستے میں بچھا دیا جائے تاکہ لوگ آتے جاتے ان پتھروں کو روندیں اور تمام قیمتی ہیرے جواہرات غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ جس وقت سلطان سومنات کے سامنے کھڑا تھا تو برہمنوں نے ہاتھ جوڑ کر سلطان سے عرض کی کہ اس بت کو نہ توڑا جائے اور اس کے عوض ایک لاکھ اطل سونا اور دو لاکھ اطل جواہرات لے لئے جائیں۔ اس کے جواب میں سلطان محمود نے کہا میں نہیں چاہتا کہ تاریخ مجھے بت فروش کے نام سے یاد کرے۔ میں محمود بت شکن کہلوانا پسند کروں گا اور یہ کہہ کر سومنات پر گرز برسانے شروع کر دیئے۔ سومنات کے پیٹ سے جو ہیرے جواہرات نکلے وہ برہمنوں کی پیش کی گئی قیمت سے سو گنا زیادہ تھے۔

مندر سومنات کے ایک کونے میں عجیب و غریب بت نظر آیا جو ہوا میں معلق تھا۔ سلطان نے اس بت کو حیران ہو کر دیکھا اور پوچھا کہ یہ ہوا میں بغیر کسی سہارے کے کس طرح کھڑا ہے۔ درباری علماء اس وقت سلطان کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے بڑا غور و فکر کیا مگر کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سلطان محمود نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

"سلطان معظم اس بت خانے کی چھت اور دیواریں مقناطیسی پتھر کی بنی ہوئی ہیں اور یہ بت لوہے کا ہے۔ آس پاس کی مقناطیسی کشش اور اس بت میں خاص تعلق ہے۔ ہر جانب کی کشش مساوی ہونے کی وجہ سے بت کسی طرف جھکنے نہیں پاتا اور عین درمیان میں معلق ہو گیا ہے۔"

اس بات کو آزمانے کے لئے سلطان نے حکم دیا کہ بت خانے کی ایک دیوار گرا دی جائے۔ فوراً اس حکم کی تعمیل کی گئی جونہی ایک جانب کی دیوار گری وہ بت بھی زمین پر گر پڑا۔

سومنات کی فتح کے بعد سلطان محمود غزنوی قلعہ نہر والا کے راجہ پرم دیو کی سرزنش کے لئے روانہ ہوا۔ کیونکہ سومنات کے محاصرے کے دوران اس راجہ کی فوجوں نے پیچھے سے اسلامی لشکر پر حملہ کر کے کئی مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا۔ میں نے سلطان محمود سے عرض کی کہ برہمن زادی چترالی میرے پاس اپنے محبوب کی امانت ہے اور میں یہ امانت اس

تک پہنچانا چاہتا ہوں اس لئے مجھے اجازت دی جائے کہ میں اسے قلعہ چند پال شہر میں لے جا کر اس کے محبوب کے حوالے کروں۔ سلطان نے مجھے اس شرط پر اجازت دی کہ میں اس کام کی ادائیگی کے بعد اس کے لشکر میں آن ملوں گا۔

میں نے اپنا ہندووانہ لباس ترک کر دیا تھا مگر جب برہمن زادی چترالی کو لے کر قلعہ چند پال کی طرف روانہ ہوا تو بعض مصلحتوں کی وجہ سے پھر ہندووانہ لباس پہن کر ماتھے پر تشقہ کھینچ لیا۔ چترالی کو علم ہو چکا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ ہم الگ الگ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور دن کے اجالے میں چند پال ریاست کی طرف روانہ ہو گئے۔ چترالی کا باپ ریاست کا بہت بڑا جاگیر دار تھا۔ چترالی کو اس نے انتقامی طور پر سومنات کے پجاریوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اس لئے چترالی کو اپنے باپ سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ اپنے باپ کے پاس نہیں بلکہ اپنے محبوب کے پاس جانا چاہتی تھی جو نیچی ذات کا شودر تھا اور جس کا نام چترالی نے جلمیک بتایا تھا۔ چترالی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اگر اس کے باپ کو پتہ چل گیا کہ میں سومنات کے مندر سے فرار ہو کر ریاست میں آ گئی ہوں تو وہ مجھے قتل کروا دے گا۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ چترالی کو ریاست کے باہر کسی محفوظ جگہ پر رکھ کر میں خود اس کے شودر محبوب جلمیک کی تلاش میں ریاست میں جاؤں اور اسے ساتھ لے کر چترالی کے پاس پہنچا دوں اور اس کام سے فارغ ہو کر واپس اسلامی لشکر میں چلا جاؤں۔

چند پال کی طرف ہمارا سفر جاری رہا۔ ہم دن کو سفر کرتے اور رات کو کسی جگہ آرام کرتے ۔ چترالی نازک اندام لڑکی تھی۔ میں نے کھانے پینے کا سامان کافی مقدار میں ساتھ رکھ لیا تھا۔ مجھے ضرورت نہیں تھی لیکن چترالی کو دکھانے کے لئے اس کے ساتھ تھوڑا بہت کھا لیتا تھا۔ ہمارے سفر کی آخری رات تھی۔ صبح ہمیں ریاست کی حدود میں داخل ہو جانا تھا۔ ہم ایک جنگل میں پہاڑی کھو میں آرام کر رہے تھے۔ چترالی کو گرمی لگی تو کہنے لگی میں ندی پر اشنان کرنے جاتی ہوں۔ میں اسے منع نہ کر سکا۔ ندی قریب ہی جھاڑیوں کی اوٹ میں گھنے درختوں کے نیچے سے گذرتی تھی۔ اسے ندی پر گئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اچانک رات کی تاریکی میں اس کی چیخ کی آواز بلند ہوئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا اور تلوار کھینچ کر ندی کی طرف بھاگا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ چترالی ندی کے کنارے اپنی پنڈلی تھامے بیٹھی ہے۔ اس کی چیخوں نے مجھے پریشان کر دیا اور میں چھلانگ لگا کر اس کے پاس پہنچا۔ اس نے چیختے ہوئے کہا۔

"سانپ.... سانپ۔"

اس کا رنگ زرد ہو کر نیلا ہونے لگا تھا۔ اسے کسی انتہائی زہریلے سانپ نے پنڈلی پر

کاٹ لیا تھا۔ اسی لمحے مجھے اپنے دوست قنطور کے مہرے کا خیال آ گیا جو اس نے مجھے خاص طور پر اسی لئے دیا تھا اور میں اسے ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا۔ چترالی کی پنڈلی پر چھالا پڑ گیا تھا اور اس میں سبز رنگ کا پانی بہہ رہا تھا۔ چاند درختوں کے اوپر آ کر ہم پر اپنی چاندنی کی کرنیں نچھاور کر رہا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور جلدی سے اس کی پنڈلی اوپر سے باندھ دی تا کہ زہر اوپر نہ جائے۔ پھر جیب سے سانپ کا مہرہ نکال کر زخم کے اوپر رکھنے لگا تو مہرہ خود بخود میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زخم کے ساتھ چمٹ گیا اور اس نے زہر چوسنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مہرہ پھول گیا۔ چترالی کے جسم میں سانپ نے جتنا زہر داخل کیا تھا وہ سارے کا سارا مہرے نے چوس لیا۔ چترالی جو نیم بے ہوش ہو گئی تھی آہستہ آہستہ ہوش میں آ گئی۔ جب مہرہ زہر کی وجہ سے پھول گیا تو وہ اپنے آپ زخم سے جھڑ کر نیچے گر پڑا۔ میں نے مہرہ اٹھا کر اس کا زہر نچوڑ ڈالا۔

چترالی رونے لگی۔ اسے اپنی زندگی کی امید نہیں تھی لیکن جان بچ جانے سے اس کا دل میری محبت اور احسان سے بھر آیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میرے پاس سانپ کا مہرہ موجود تھا۔ میں نے چترالی کو سہارا دے کر اٹھایا اور واپس کھوہ میں لا کر لٹا دیا۔ اب میں جنگل سے ایک خاص قسم کی بوٹی تلاش کر کے اس کے زخم پر لگانا چاہتا تھا تا کہ اگر سانپ کا تھوڑا بہت اثر رہ بھی گیا ہو تو وہ بھی جاتا رہے۔ میں واپس ندی کے کنارے آیا اور جھاڑیوں میں بوٹی ڈھونڈنے لگا۔ ایک دم سے مجھے سانپ کی پھنکار سنائی دی۔

میں اچھل کر پیچھے ہٹا تو جھاڑیوں میں سے ایک پانچ فٹ لمبا سیاہ کالا ناگ نکلا اور میرے بالکل سامنے پھن اٹھا کر کھڑا ہو گیا اور بار بار میرے آگے اپنا پھن جھکانے لگا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے ڈسے گا مگر اس نے ایسا نہ کیا۔ غالباً یہ وہی سانپ تھا جس نے تھوڑی دیر پہلے چترالی کو ڈسا تھا۔ مجھے اگر وہ ڈس بھی لیتا تو اس کا زہر میرے جسم کے لئے بے اثر تھا مگر سانپ یوں بار بار میرے آگے پھن جھکا رہا تھا جیسے میری تعظیم بجا لا رہا ہو۔ چاندنی رات میں اس کی سیاہ جلد چمک رہی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ میرا سانپ دوست قنطور تو نہیں ہے۔ میں نے اسے غور سے دیکھا لیکن نہیں۔ میرا سانپ دوست تو سانپوں کا دیوتا ہے اور اس کے سر پر تو سفید کلغی کا تاج تھا۔ یہ قنطور نہیں ہے اور اگر قنطور ہوتا تو وہ انسانی روپ میں آ کر مجھ سے ملتا اور یوں بھی وہ کسی انسان کو بلاقصور نہ ڈستا۔ تو پھر یہ میرے آگے یوں تعظیم کیوں بجا لا رہا ہے؟"

مجھے قنطور کے مہرے کا خیال آ گیا کہ ہو سکتا ہے کہ اس کو سانپ دیوتا قنطور کے

مہرے کی بو آ گئی ہو اور یہ اس کی تعظیم کر رہا ہو- میں نے جیب سے مہرہ نکال کر زمین پر رکھ دیا- مہرے کو دیکھتے ہی سانپ نے جھومنا شروع کر دیا- وہ جھومتے ہوئے آیا اور مہرے کے گرد چکر لگانے لگا- کبھی وہ جھک کر مہرے کو چومتا اور کبھی اس کے آگے سر جھکا دیتا- ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سانپ دیوتا تنتور کے مہرے سے معافی مانگ رہا ہے اور اس نے ایک لڑکی کو بلا وجہ ڈس لیا- مہرے کے گرد بار بار چکر کاٹنے اور اسے چومنے کے بعد سانپ نے پھن اٹھا کر میری طرف دیکھا- آخری بار سر جھکایا اور واپس جھاڑیوں میں رینگتا ہوا غائب ہو گیا-

میں نے مہرہ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا- ایک خاص قسم کی بوٹی ندی کے کنارے تلاش کر کے اسے پتھروں پر گھسا اور چترالی کی پنڈلی کے زخم پر لگا کر کپڑا باندھ دیا- اس کی حالت سنبھل چکی تھی-

صبح ہوئی تو میں اسے لے کر ریاست چندپال کی طرف بڑھا- میں نے اسے سانپ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا- اس کی ضرورت بھی نہیں تھی- ایک پہر دن چڑھے تک ہم ریاست چند پال کے قریب پہنچ گئے- چترالی اب میری رہنمائی کر رہی تھی- قلعے کے کنگرے دن کی روشنی میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر صاف دکھائی دے رہے تھے- اس قلعے کو سلطان محمود نے فتح کرنے کے بعد خراج لے کر واپس وہاں کے راجہ کے حوالے کر دیا تھا اور یہاں وہی راجہ حکومت کرتا تھا- قلعے کے اردگرد چند پال کا شہر آباد تھا جس کو ایک اونچی فصیل نے گھیر رکھا تھا- چترالی نے کہا کہ وہ شہر کے اندر نہیں جائے گی- کیونکہ اس طرح سے اس کے باپ کو پتہ چل جائے گا اور وہ اسے قتل کروا دے گا-

منصوبے کے مطابق میں نے چترالی سے کہ کہ وہ کسی جگہ چھپ جائے اور میں شہر میں جا کر اس کے محبوب کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں- ہمارے قریب ہی گھنے درختوں کا جھنڈ تھا جس کے اندر کسی برہمن رشی کی سمادھی تھی ایک بوسیدہ سی سہ دری بنی ہوئی تھی- سہ دری کے اردگرد بھی گھاس اگ آئی تھی- میں نے چترالی کو اس سمادھی میں بٹھا کر تاکید کی کہ وہ یہاں سے کہیں نہ جائے- اس کے گھوڑے کو میں نے درختوں میں ایک طرف لے جا کر باندھ دیا اور خود شہر کی طرف روانہ ہو گیا- چترالی نے مجھے اپنے محبوب جلمیک کا پتہ دیا تھا- میں برہمن ہندو کے حلئے میں شہر میں داخل ہو گیا- شہر زیادہ بڑا نہیں تھا- گلیاں اور بازار ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزر رہے تھے- دکانیں کھلی تھیں اور ہر قسم کا سودا سلف بک رہا تھا- میں پتہ پوچھتا پوچھتا شودروں کے جھونپڑیوں کی طرف آ گیا- جو شہر کی آبادی سے باہر ایک مرگھٹ کے پار بنی ہوئی تھیں - ہندو حیران بھی ہوئے کہ میں ایک برہمن ہو کر نیچ جات کے شودروں کی بستی میں کیا کرنے جا رہا ہوں-

شودروں کی بستی میں بھی لوگ مجھے دیکھتے ہی جھک گئے اور پرے پرے ہٹ گئے- میں نے ایک بوڑھے شودر سے جلمیک کے بارے میں پوچھا تو وہ گھبرا گیا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر جھونپڑی میں گھس گیا- میں سوچنے لگا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے- اتنے میں اسی جھونپڑی میں سے ایک کالے رنگ کا دبلا پتلا نوجوان نکلا اور میرے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا- میں نے کہا- "مجھے بتاؤ کہ جلمیک کہاں ہے؟ مجھے اس سے ملنا ہے-"

وہ اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر کر رک رک کر بولا-

"مہاراج! جلمیک کو پٹیل جی کے آدمی پکڑ کر لے گئے تھے- ایک ساون بیت گیا ہے- تب سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی- اس کی بوڑھی ماں اس کی یاد میں روتے روتے مر گئی- ہمیں اور کچھ نہیں معلوم مہاراج-"

میں نے پوچھا کہ جلمیک کا کوئی رشتہ دار یا عزیز یہاں رہتا ہے؟ نوجوان نے بتایا کہ جلمیک کی صرف ایک ماں ہی تھی جو اپنے بیٹے کی جدائی میں رو رو کر مر گئی - میں سمجھ گیا کہ پٹیل سے مراد چترالی کا باپ تھا اور اسی نے بدنامی کا داغ دھونے کے لئے جلمیک کو اغوا کروا کر یا تو قتل کروا دیا ہو گا اور یا اسے اپنی حویلی کے کسی تہہ خانے میں مرنے کے لئے ڈال دیا ہو گا- کیونکہ یہ ایک برہمن جاگیردار کے لئے بڑی بے عزتی کی بات تھی کہ اس کی بیٹی سے ایک نیچی ذات کا شودر محبت کرے-

میں یہ معلومات حاصل کر کے سیدھا چترالی کے پاس سمادھی میں پہنچا اور اسے ساری بات بتائی- اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے- پٹیل اسی کے باپ کو کہتے تھے اور اس نے جلمیک کو رگھو کے ہاتھوں ضرور قتل کروا دیا ہو گا- چترالی نے بتایا کہ رگھو اس کے باپ کا جلاد قسم کا خادم ہے اور اس سے پہلے کئی آدمیوں کو قتل کر چکا ہے- اب میرا رگھو سے ملنا ضروری ہو گیا تا کہ مجھے چترالی کے محبوب جلمیک کے انجام کا پتہ چل سکتا-

جب شام کا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تو میں نے چترالی کو ساتھ لیا اور شہر میں آ کر ایک سرائے میں اتر گیا- چترالی کو میں نے سرائے کی کوٹھری میں ٹھہرنے کی ہدایت کی اور اس سے رگھو کے گھر کا پتہ معلوم کر کے اس کے گھر کی طرف روانہ ہوا-

چترالی نے بتایا کہ رگھو رات کو اپنے گھر چلا جاتا ہے- رگھو کا گھر شہر کے ایک پرانے مندر کے عقب میں تھا- وہ منزلہ تنگ و تاریک مکان تھا- رگھو مکان کے باہر چارپائی ڈالے سونٹا پاس رکھے بیٹھا روٹی کھا رہا تھا- چوکھٹ میں دیا جل رہا تھا- چترالی نے جو حلیہ بتایا تھا اس کے مطابق یہ رگھو ہی تھا- میں جانتا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے مجھے جلمیک کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا- کیونکہ یہ اس کے مالک کا راز تھا اور اس نے اپنے مالک کے اشارے

سے ایک آدمی کو قتل کیا تھا۔ میں اس وقت تک یہی سمجھ رہا تھا کہ جلمیک کو چترالی کے باپ نے رگھو کے ذریعے قتل کروا دیا ہے۔ میں نے اس جگہ کا نقشہ ذہن میں بٹھایا اور واپس سرائے میں آ گیا اور چترالی سے کہا کہ میں رگھو کو اور اس کے مکان کو دیکھ آیا ہوں۔ اب میں ایک ایسی ترکیب پر عمل کرنے والا ہوں جس کی وجہ سے رگھو مجھے بتا دے گا کہ اس نے جلمیک کو قتل کیا تھا یا نہیں۔ چترالی نے مجھ سے ترکیب کے بارے میں پوچھا لیکن میں نے اسے کچھ نہ بتایا اور سرائے میں اپنے آپ کو چھپائے رکھنے کی ہدایت کی۔

تجربے نے ثابت کر دیا تھا کہ میرے سانپ دوست قنطور کا جو مہرہ تھا اس کی سانپ بہت تعظیم کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے مہرہ لیا اور دوسرے روز دن کی روشنی میں شہر سے نکل کر جنگل میں آ گیا اور کسی سانپ کی تلاش شروع کر دی۔ سانپ کو تلاش کرنا ذرا مشکل کام ہے۔ مجھے جہاں زمین کے اندر کوئی بل نظر آتا وہیں چھڑی اندر ڈالتا مہرہ بل کے منہ پر رکھ دیتا کہ گر سانپ اندر ہو گا تو مہرے کی بو اسے باہر کھینچ لائے گی اور ایسا ہی ہوا۔

ایک بل کے منہ پر مہرہ رکھتے ہی اندر سے سبز رنگ کا چھوٹا سا سانپ پھنکارتا ہوا باہر نکل آیا اور مہرے کے اردگرد چکر لگانے لگا۔ میں نے اسے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے مجھے ڈسنے کی بجائے اپنا سر جھکا دیا۔ میں نے سانپ کو اٹھا لیا۔ وہ میری ہتھیلی پر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور کبھی اپنی گردن اوپر اٹھاتا اور کبھی نیچے گرا لیتا۔ شکل ہی سے سانپ بڑا زہریلا لگتا تھا۔ میں ایک کپڑے کی تھیلی ساتھ لایا تھا۔ میں نے سانپ کو تھیلی میں ڈال دیا اور مہرہ جیب میں ڈال کر واپس سرائے میں آ گیا۔

میں نے سارا منصوبہ چترالی کو سمجھا دیا تھا۔ رات کو جب مجھے یقین تھا کہ رگھو جاگیردار پٹیل کی حویلی سے واپس اپنے گھر آ گیا ہو گا میں نے ایک سپیرے کا بھیس بدلا جھولا سا گلے میں ڈالا اور سرائے سے نکل کر رگھو کے محلے میں آ گیا۔ رگھو مکان کے اندر تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کے نوکر نے دروازہ کھولا۔ میں نے کہا کہ رگھو سے کہو کہ اس کا ایک ملنے والا آیا ہے۔ رگھو نے مجھے اندر بلا لیا۔ وہ چوکی پر بیٹھا شربت پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

"تم کون ہو؟ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ کس لئے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "اپنے نوکر کو یہاں سے بھیج دو۔ تنہائی میں تمہیں تمہاری قسمت کا حال بتانا ہے۔"

وہ بڑا خوش ہوا۔ اس زمانے میں سپیرے عام طور پر فال وغیرہ بھی نکالا کرتے تھے۔

جب وہ اور میں کوٹھری میں اکیلے رہ گئے تو میں نے تھیلی سے سانپ نکالا اور اسے رگھو پر

پھینک دیا۔ رگھو اچھل کر پرے گرا مگر اس دوران میں سانپ اس کی ران پر ڈس چکا تھا۔ اس نے چیخ مار کر سونٹا مجھے مارنے کے لئے اٹھایا ہی تھا کہ میں نے کہا۔

"رگھو تم مر جاؤ گے۔ سانپ بڑا زہریلا ہے۔ اس کا علاج بھی میرے ہی پاس ہے۔"

میں نے جیب سے مہرہ نکال کر اسے دکھایا۔ اس کی چیخ کی آواز سن کر نوکر اندر آ گئے تھے۔ میں نے رگھو سے کہا کہ ان کو باہر بھیج دو۔ سب کے سامنے یہ مہرہ تمہارے جسم کا زہر نہیں چوسے گا۔"

رگھو نے فوراً انہیں کوٹھری سے نکل جانے کا حکم دیا۔ وہ سب نکل گئے تو میں نے مہرہ رگھو کی ران پر سانپ کے چھالے پر رکھ دیا۔ رگھو کی حالت خراب ہونے لگی تھی۔ اس کا جسم دہشت کے مارے لرز رہا تھا۔ مہرے نے پھولنا شروع کر دیا۔ جب آدھا زہر نکل گیا تو میں نے مہرہ اٹھا لیا اور کہا۔

"ابھی تمہارے جسم میں آدھا زہر باقی ہے۔ یہ میں اس وقت نکالوں گا جب مجھے تم یہ بتاؤ گے کہ ...... تم نے نیچی جات کے شودر جلمیک کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔"

وہ ہکا بکا ہو کر میرا منہ تکنے لگا۔

"بھگوان کے لئے مجھے موت کے منہ سے بچاؤ۔"

میں نے کہا۔ "جب تک تم مجھے جلمیک کے انجام کے بارے میں نہیں بتاؤ گے میں یہ مہرہ سانپ کے چھالے پر نہیں رکھوں گا۔ کیا تم نے جاگیردار کے حکم پر قتل کر دیا تھا؟"

"نہیں - میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ بھگوان جانتا ہے میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔ میں نے جاگیردار کے حکم سے اسے موت کے غار میں بھجوا دیا تھا۔"

"موت کا غار۔" میں نے تعجب سے پوچھا۔

رگھو چلایا۔ "بھگوان کے لئے میرے جسم سے باقی کا زہر بھی نکالو۔ نہیں تو میں مر جاؤں گا۔ میرا گلا خشک ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں باقی کا زہر تمہیں اتنی جلدی ہلاک نہیں کرے گا۔ تم دو دن کے بعد مر جاؤ گے لیکن اگر تم نے مجھے موت کے غار کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تو میں مہرہ رکھ کر تمہارے جسم کا باقی ماندہ زہر بھی باہر کھینچ لوں گا۔"

رگھو بولا۔ "موت کا غار ایک کان ہے۔ جہاں سے تانبا نکلتا ہے۔ یہاں سے دس کوس دور ایک پہاڑ میں ہے۔ جاگیردار اس کا مالک ہے۔ وہاں جو غلام پتھر توڑتے ہیں ان کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ان کے پاؤں میں زنجیر پڑی ہوتی ہے۔ جاگیردار جی نے...... جلمیک کو وہاں بھجوا دیا تھا تا کہ وہ ساری عمر وہاں مشقت کرے اور پھر مر جائے۔"

"کون ہو تم؟"

میں گونگا بن گیا اور ہاتھ باندھ کر غوں غاں کرنے لگا۔ انہوں نے مجھے اٹھا کر زور سے دو تین جھٹکے دیئے ۔ ایک وحشی نے کہا۔ "کوئی غریب مسکین آدمی ہے۔ لے چلو اسے بھی اندر۔ چٹیل سے اس کی قیمت وصول کریں گے۔"

میں یہی چاہتا تھا۔ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے غار میں لے گئے۔ غار میں پہلے تو گھپ اندھیرا آ گیا۔ پھر پتھر کاٹ کر بنائی گئی سیڑھیاں نیچے اترنے لگیں۔ کافی نیچے جا کر جہاں ہوا نم دار اور فضا گھٹی ہوئی تھی ایک سرنگ آ گئی۔ اس سرنگ میں کہیں کہیں چراغ روشن تھے۔ جن کی دھیمی روشنی میں مجھے جگہ جگہ کھدی ہوئی دیوار کے ساتھ بدحال پرانے کپڑوں والے کالے کلوٹے نحیف و نزار بیمار لوگ لیٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کے پاؤں لمبی لمبی زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ پہلو بدلتے تو زنجیریں جھنجھنا اٹھتیں۔

یقیناً ان ہی زبوں حال غلاموں میں چترالی کا محبوب جلمیک بھی تھا۔ میرے پاؤں میں بھی ایک لمبی زنجیر ڈال دی گئی اور مجھے دھکا دے کر دوسرے سوئے ہوئے غلاموں پر گرا دیا گیا۔ جس پر میں گرا اس نے ہڑبڑا کر غصے میں اٹھتے ہوئے میری گردن پر مکہ جڑ دیا۔ مگر یہ ہاتھ بڑا کمزور تھا۔ میں نے اس سے معافی مانگی۔ اس نے کمزور آواز میں پوچھا کہ میں نیا آدمی ہوں؟ "ہاں" میں نے آہستہ سے کہا۔

میں بھی اس کے پاس ہی زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا سرنگ کے اندر اندھیرے اور نیم روشنی کے پراسرار ماحول میں کتنے ہی غلام الٹے سیدھے پڑے سو رہے تھے۔ ان میں سے مجھے چترالی کے محبوب جلمیک کو تلاش کرنا تھا اور اسے یہاں سے فرار کروانا تھا۔ رات گذر گئی۔ صبح ہوئی تو پہرے داروں نے کوڑے مار مار کر ان زبوں حال غلاموں کو جگایا اور وہ اٹھتے ہی دیوار میں کدالیں چلانے لگے ..... میں بھی اسی کام پر لگ گیا۔ سرنگ میں آگے جا کر کئی جگہوں پر اوپر پہاڑ کی چھت میں بڑے بڑے سوراخ بنا دیئے گئے تھے۔ ان سوراخوں میں بڑے بڑے ٹوکرے لٹکا دیئے جاتے۔ انہیں پتھروں سے بھر کر رسوں کی مدد سے اوپر اٹھا لیا جاتا۔

دوپہر کو ہمیں دو خشک روٹیاں' پیاز اور پانی دیا گیا۔ ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے دیکھا کہ تقریباً سبھی غلاموں کی حالت پتلی تھی۔ خدا جانے وہ کب سے اس جگہ بیگار پر لگے تھے۔ پہرے دار ہنٹر لئے چل پھر کر ہماری نگرانی کرتے۔ اگر کوئی غلام سستی دکھاتا تو اس پر کوڑوں کی بارش کر دی جاتی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا۔ اس موت کے غار میں جانوروں سے بھی بدتر حالت میں کام کرتے مجھے دو روز گذر گئے اور

میں جلمیک کو تلاش نہ کر سکا۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ میرے پاؤں میں جو زنجیر پڑی تھی اس کا دائرہ پندرہ بیس گز سے زیادہ نہیں تھا۔ میں اس سے زیادہ آگے نہیں جا سکتا تھا۔

تیسرے روز جب پہرے دار باہر گئے ہوئے تھے میں نے اپنے ایک ساتھی سے جلمیک کے بارے میں پوچھا۔ پہلے تو وہ جواب دیتے ہوئے گھبرایا۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے بولا۔

"یہاں کسی کا کوئی نام نہیں ہے۔"

میں نے اسے بتایا کہ جلمیک ایک شودر نوجوان ہے اور اسے موت کے غار میں آئے ایک سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ میرے ساتھی غلام نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور ست ہاتھوں سے کدال چلانے لگا۔

ایک روز ہم تین چار غلاموں کی زنجیریں کھول کر ہمیں سرنگ کے عقب میں اندر لے جایا گیا جہاں ایک جگہ سے پہاڑ کی نئی دیوار کھودی جا رہی تھی۔ ہماری زنجیریں یہاں نئے کھونٹوں سے باندھ دی گئیں۔ یہاں پہلے سے ہی چھ غلام کام کر رہے تھے۔ میں نے جلتے دیئے کی دھیمی روشنی میں دیکھا کہ ایک نوجوان کونے میں کدال چلا رہا تھا۔ اس کے شانے چوڑے اور چہرے کے نقش تیکھے تھے۔ جسم پسینے اور کوئلے کی کالک میں بھرا ہوا تھا۔ میرے دل نے کہا کہ یہی نوجوان جلمیک ہو سکتا ہے۔

میں کھسکتا کھسکتا اس نوجوان کے پاس پہنچ گیا اور اسے جلمیک کا نام لے کر پکارا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ یہی چترالی کا محبوب تھا ۔ اگرچہ وہ ایک مضبوط اور گھٹے ہوئے جسم کا نوجوان تھا لیکن سال بھر سے وہاں مشقت کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ میں نے سرگوشی میں اسے بتایا کہ مجھے اس کی محبوبہ چترالی نے وہاں بھیجا ہے اور وہ باہر ان ہی پہاڑیوں میں ایک جگہ اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اتنا سن کر اس کی آنکھوں میں ایک دم چمک سی آ گئی ۔ وہ کچھ بولنے ہی والا تھا کہ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

اب ہمارا نگران واپس چلا گیا تو میں نے اسے ساری بات کھول کر بیان کر دی ۔ وہ بڑا خوش ہوا مگر پھر ایک دم اداس ہو کر بولا۔

"ہم یہاں سے فرار نہیں ہو سکیں گے۔"

میں نے کہا ۔ "آج رات تیار رہنا۔ یہ کام میں کروں گا۔"

جب ہمیں رات کو بھی دو خشک روٹیاں اور پانی دیا گیا تو ہم سمجھ گئے کہ رات ہو گئی ہے۔ جلمیک نے جب سے سنا تھا کہ چترالی زندہ ہے اور مندر سے فرار ہو کر پہاڑیوں میں

اس کا انتظار کر رہی ہے اس کے اندر زندہ رہنے کی ایک زبردست خواہش جنم لے چکی تھی۔ سارے غلام خشک روٹیاں زہر مار کر کے لیٹ گئے تھے۔ وہ بے حد تھکے ہارے تھے۔ چند لمحوں بعد ہی ان کے خراٹوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

میں اور جلمیک جاگ رہے تھے۔ میں نے اسے آہستہ سے کہا۔ "تیار ہو جاؤ۔"

اتنا کہہ کر میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے پاؤں کی زنجیر کو دونوں ہاتھوں میں لے کر تھوڑا سا زور لگا کر کھینچا تو اس کی کڑیاں ٹوٹ گئیں۔ جلمیک میری اس مافوق الفطرت طاقت پر حیران سا ہو کر رہ گیا۔ اس کے بعد اسی طرح میں نے اس کے پاؤں کی زنجیر توڑ کر الگ کر دی۔ سرنگ میں تھوڑے فاصلے پر ایک دیا روشن تھا۔ سارے غلام گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے جلمیک کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں سرنگ کی دیوار کے ساتھ لگا آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ جہاں دیا روشن تھا وہاں سے ہم نیچے بیٹھ کر گزر گئے۔ سامنے وہ سیڑھیاں تھیں جو اوپر جاتی تھیں۔ یہ سیڑھیاں پتھروں کو کاٹ کر بنائی گئی تھیں۔ یہاں ایک پہرے دار تلوار لٹکائے پتھر پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی اس کی گردن کو دبوچ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی آواز نکالتا اس کا کام تمام کر دیا۔ میں نے جلمیک کو اشارہ کیا۔ ہم پتھر کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر سرنگ کے پہلے تختے میں آ گئے۔ یہاں کچھ تازہ ہوا کا احساس ہوا۔ اس جگہ بھی غلام دیوار کے ساتھ پڑے سو رہے تھے۔ ہم ان کے درمیان سے پھونک پھونک کر قدم رکھتے سرنگ کے دروازے پر آ کر دیوار کے ساتھ لگ گئے۔ میں نے گردن بڑھا کر دیکھا کہ سرنگ کے باہر تین ہٹے کٹے نگران کمر میں تلواریں لٹکائے گھاس پر بیٹھے نشہ کر رہے ہیں۔ یہ رات کے پہرے دار تھے۔

جلمیک کے کاندھے پر میں نے ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے کھڑے رہنے کو کہا اور خود سرنگ سے باہر نکل کر ان پہرے داروں کے درمیان آ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر اچھل پڑے۔ میں یہی تماشا دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک چراغ ان کے قریب ہی لکڑی کے اسٹول پر جل رہا تھا۔ میں نے پاؤں مار کر اسٹول گرا دیا۔ چراغ بجھ گیا۔ مگر ستاروں بھری رات کی اتنی روشنی ضرور تھی کہ میں انہیں اور وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے تلواریں کھینچ لیں اور مجھ پر حملہ کر دیا۔ تینوں تلواریں ایک ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئیں۔ میرے لئے انہیں قابو میں کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ دوسرے ہی لمحے ایک تلوار میرے بھی ہاتھ میں تھی اور دو پہرے داروں کی کٹی ہوئی لاشیں گھاس پر پڑی تھیں اور تیسرا پہرے دار مجھ سے تلوار بازی کر رہا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا ورنہ میں اسے قدیم مصر کی تلوار بازی کے کچھ نادر نمونے دکھاتا۔ چنانچہ میں نے اس وحشی کو بھی تہ تیغ کیا اور جلمیک کو آواز دی۔ وہ پہلے ہی سرنگ سے باہر

آ چکا تھا اور زمین پر گری ہوئی ایک تلوار اٹھا کر میری مدد کو آنے ہی والا تھا۔ مگر اب مجھے اس کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم وہاں سے نکل کر غار کے پیچھے آ گئے۔ یہاں ایک اصطبل بنا ہوا تھا جہاں پہرے داروں کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ہم نے دو گھوڑے کھولے۔ ان پر سوار ہوئے اور دریا کی طرف روانہ ہو گئے۔

جلمیک کو جب سے یہ معلوم ہوا کہ اس کی والدہ وفات پا چکی ہے تو وہ بے حد غمزدہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "اب میں شہر کس سے ملنے جاؤں گا۔ وہاں میرا کوئی نہیں ہے۔" میں نے کہا "چترالی نے تمہارے لئے سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے تمہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہو گی۔"

جلمیک بولا۔ "چترالی میری زندگی ہے میں اس کے لئے اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

اس طرح کی باتیں کرتے گھوڑے دوڑاتے ہم رات کی تاریکی میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں میں نے جنگل میں ایک جگہ جھونپڑی بنائی تھی اور اس کے اندر چترالی کو بٹھا کر باہر سبز سانپ کو پہرے پر بٹھا دیا تھا۔ آخری تاریخوں کا زرد آدھا چاند جنگل میں اوپر آ گیا تھا اور اس کی پھیکی روشنی کا غبار پھیل گیا تھا۔ جھونپڑی کے قریب آ کر ہم گھوڑوں سے اترے۔ جونہی میری نگاہ جھونپڑی پر پڑی میرا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا۔ جھونپڑی خالی تھی باہر سبز سانپ کٹا ہوا پڑا تھا اور اس کے پاس ہی ایک اجنبی آدمی کی لاش پڑی تھی جو پھول چکی تھی۔ جلمیک نے پوچھا یہ کیا ماجرا ہے۔ چترالی کہاں ہے؟ ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ میرے بعد ڈاکو قسم کے لوگ وہاں آ گئے ہوں گے۔ انہوں نے چترالی کو اغوا کرنے کی کوشش کی۔ ایک ڈاکو کو سانپ نے ڈس کر ہلاک کر دیا۔ دوسرے نے تلوار کے وار سے سانپ کے دو ٹکڑے کر دیئے اور چترالی کو اغوا کر کے لے گئے۔ میرا سانپ کا مہرہ بھی چترالی کے ساتھ چلا گیا تھا۔

جلمیک اپنی محبوبہ کو نہ پا کر سخت آزردہ ہو گیا۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ یقیناً چترالی کو ڈاکو قسم کے لوگ اٹھا کر لے گئے ہیں۔ ہم ان کا پیچھا کریں گے اور چترالی کو ان کے پنجے سے آزاد کرائیں گے۔ چترالی کے پاس میری بہت ہی قیمتی شے میرے سانپ دوست قنطور کا دیا ہوا مہرہ بھی تھا جو مجھے ہر حالت میں حاصل کرنا تھا۔ رات کے وقت وہاں گھوڑوں کے سموں کے نشان نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ گھاس پر گھوڑوں کے سموں کے ہلکے ہلکے نشان تھے جو دریا کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے جلمیک سے کہا۔

"ڈاکو دریا کی طرف گئے ہیں۔ ہمیں ادھر ہی چلنا ہو گا۔"

ہم نے گھوڑے دریا کی طرف ڈال دیئے دریا کے کنارے ریت پر گھوڑوں کے نشان دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ چار ڈاکو تھے۔ یہ نشان دریا میں اتر گئے تھے۔ ہم نے بھی ان کے پیچھے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے۔

اس کے بعد عاطون کا دوسرا حصہ
"اندلس کی آخری شمع"
کا مطالعہ کریں

اندلس کی آخری شمع
اے حمید

اداس جنگل کی خوشبو

میں نے اس لڑکی کو دیکھا ہے۔ جس کی یہ ناکام داستان محبت ہے۔ وہ غروب ہوتے سورج کی غم زدہ روشنی میں چنار کے درختوں میں سے گذر رہی تھی۔ اس کا چہرہ اداس تھا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

رخساروں پر رات کو بہائے ہوئے آنسوؤں کے نشان تھے۔ آنسو خشک ہو گئے۔ محبت کرنے والے جدا ہو گئے۔

یادیں باقی رہ گئیں۔ یہ لڑکی کون تھی؟

"اداس جنگل کی خوشبو" اسی اداس چہرے والی لڑکی کی داستان محبت ہے۔

اے حمید کے رومان پرور قلم سے ایک اثر انگیز اور رومانٹک ناول۔

دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔

برسات کا موسم گزر چکا تھا جس کی وجہ سے دریا سیلاب کی حالت میں نہیں تھا۔ شودر نوجوان جلمیک میرے ساتھ تھا۔ ہمارے گھوڑے دریا میں تیرتے چلے جا رہے تھے۔ دوسرے کنارے پر نکل کر ہم نے اپنے گھوڑے ڈاکوؤں کی تلاش میں جنگل کی طرف ڈال دیئے۔ جنگل میں چلتے چلتے دن نکل آیا۔ چترالی کو ڈاکوؤں سے برآمد کرانے میں میرا ایک مفاد یہ بھی تھا کہ چترالی کے پاس وہ قیمتی سانپ کا مہرہ تھا جو مجھے میرے ناگ دوست قنطور نے دیا تھا۔ جنگل اب گھنا نہیں تھا۔ اونچا نیچا ویران میدان شروع ہو گیا تھا جہاں جنگلی جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی کثرت تھی۔ مٹی اور پتھروں کے بنے ہوئے چھوٹے بڑے ٹیلے بھی نظر آنے لگے تھے۔ مجھے میدان میں ایک جگہ گھوڑوں کے سموں کے نشان دکھائی دیئے - یہ ڈاکوؤں کے گھوڑوں کے نشان بھی ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ہم ان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ ایک ڈھلانی میدان سے اترے تو سامنے ایک قلعے کے کھنڈر دکھائی دیئے۔ قلعے کی بناوٹ سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ قدیم زمانے میں کسی ہندو راجے کا قلعہ ہو گا لیکن اب بالکل کھنڈر بن چکا تھا۔ ہم نے ایک جگہ درخت کے نیچے گھوڑے روک لئے۔ جلمیک نے قلعے کے کھنڈر کو دیکھ کر کہا کہ ڈاکو ضرور اسی قلعے میں چھپے ہوں گے۔ میری نگاہیں قلعے کی ٹوٹی پھوٹی دیوار پر جمی ہوئی تھیں جس کے بڑے بڑے پتھروں میں جگہ جگہ گھاس اگی ہوئی تھی۔ میں نے جلمیک سے کہا کہ وہ اس جگہ ٹھہرے۔ میں آگے جا کر کھنڈر میں دیکھتا ہوں۔ اس نے کہا۔

"تم اکیلے ہو۔ اگر ڈاکو وہاں ہوئے تو وہ تمہیں ہلاک کر دیں گے۔"

نادان اچھوت نوجوان میری طاقت سے بے خبر تھا۔ میں نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی کہ میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں جاتا ہوں۔ میں نے گھوڑا قلعے کے کھنڈر کی طرف بڑھا دیا۔ قلعے کا ایک کافی اونچا دروازہ بھی تھا۔

جو ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ میں اس بوسیدہ دروازے کی اوٹ میں جا کر گھوڑے سے اتر پڑا۔ جھک کر اندر کو جاتے کچے راستے کو دیکھا۔ یہاں مٹی پر گھوڑوں کے سموں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ میں نے گھوڑے کو ایک پتھر کے سایہ میں باندھا اور اینٹوں پتھروں کے ڈھیروں پر سے گزرتا قلعے کے کھنڈر میں داخل ہو گیا۔ آگے ایک ڈیوڑھی آ گئی جس کی چھت میں جگہ جگہ شگاف پڑے ہوئے تھے۔ دونوں جانب ٹوٹی ہوئی کوٹھریاں تھیں جو خالی تھیں۔ آگے ایک راستہ میدان کی طرف چلا گیا تھا جس میں ملبے کے ڈھیر پڑے تھے۔ نصف دائرے میں ایک نیم تاریک برآمدہ بنا ہوا تھا جس کے ستون کا چونا اور گچ اکھڑ چکا تھا۔

میں ستونوں کی اوٹ لیتا برآمدے میں آگے بڑھنے لگا۔ یہاں ایک شکستہ سا گرد آلود سنگی زینہ نیچے جاتا تھا۔ میں نے یہاں کھڑے ہو کر کان نیچے لگا دیئے کہ نیچے سے کسی انسان کی آواز تو نہیں آ رہی۔ زینہ نیچے جا کر تاریک ہو گیا تھا اور وہاں سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میرا ہاتھ تلوار کے قبضے پر تھا۔ میں زینہ اترنے لگا۔ چھ سات سیڑھیاں اترنے کے بعد مجھے ٹھنڈی نیم تاریک فضا نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ زینہ ختم ہو گیا۔ آگے اونچا نیچا تنگ سا پتھریلا راستہ ایک طرف کو گھوم گیا تھا۔ یہاں پہلی بار میں نے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنی۔ یہ آواز دو چار قدم کے فاصلے پر دیوار کے پیچھے سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ آگے بڑھ کر میں نے دیوار کو غور سے دیکھا۔ یہاں ایک پرانا لکڑی کا بھاری دروازہ تھا جس میں سے کیل باہر کو ابھرے ہوئے تھے۔

دو آدمیوں کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز اسی دروازے کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ وہ کیسی باتیں کر رہے تھے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے قدموں کی آواز دروازے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں تیزی سے دیوار کیساتھ بائیں جانب گھوم کر اندھیرے میں ہو گیا۔ ایک ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازے کا ایک پٹ کھلا اور اندر سے دو انسانی سائے جنہوں نے اپنے سروں پر اس زمانے کے ہندو مرہٹوں جیسی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں' باہر نکلے۔ ان کی کمر سے تلواریں لٹک رہی تھیں۔ وہ زینے کی طرف چلے گئے جاتے وقت انہوں نے دروازے کو تالا وغیرہ نہیں لگایا تھا۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ چترالی یہاں نہیں ہے۔ میں نے اپنا شک دور کرنے کے لئے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر اندھیرے سے کسی نے آواز دی اور کہا۔ "تم پھر آ گئے؟ کیا بات ہے؟" میں فوراً سمجھ گیا کہ اندر تیسرا ڈاکو موجود ہے۔ ابھی میں باہر نکلنے یا اندر جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے کوٹھری میں شمع دان روشن کر دیا۔ اس کی روشنی میں مجھے مرہٹوں کے لباس میں ایک ڈاکو شمع دان ہاتھ میں لئے میری طرف بڑھتا

دکھائی دیا۔

میری شکل دیکھتے ہی اس شخص نے چلا کر کہا۔ "تم کون ہو؟" اور میرے جواب دینے سے پہلے اس نے ایک خنجر پوری طاقت سے میری طرف اچھال دیا۔ خنجر میرے بائیں کندھے سے ٹکرا کر سنسناتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ اس دوران میں' میں نے آگے بڑھ کر اس شخص کو پکڑ لیا تھا۔ میری گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ شخص دوہرا ہو گیا۔ میں نے شمع دان اس کے ہاتھ سے لے کر نیچے رکھ دیا اور اپنی تلوار نکال کر اس کی گردن کے ساتھ لگا دی اور پوچھا کہ وہ لڑکی کہاں ہے جس کو تم لوگ اغوا کر کے لائے ہو۔ پہلے تو اس نے بے خبری اور لاعلمی کا اظہار کیا مگر جب میری تلوار کی نوک اس کی گردن میں چبھی تو وہ بول پڑا۔ اس نے مجھے بتایا کہ چترالی نام کی برہمن زادی اس کوٹھری کے پیچھے ایک دوسری کوٹھری میں بند ہے۔ میں نے اسے دوسری کوٹھری کو کھولنے کا اشارہ کیا۔ دوسری کوٹھری کا دروازہ بڑا چھوٹا سا تھا اور مجھے اس ڈاکو کے پیچھے پیچھے اس دروازے سے کافی جھک کر اندر جانا پڑا۔

یہ کوٹھری کیا تھی ایک تنگ و تاریک کھوہ تھی جہاں زمین پر چترالی نیم بے ہوش پڑی تھی۔ میں اسے اس اندھیری کھوہ سے نکال کر باہر والی کوٹھری میں لے آیا۔ میں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ بدقسمت ڈاکو نے موقع پا کر میرے قریب پڑی ہوئی ننگی تلوار اٹھا لی اور پوری طاقت سے میرے سر پر وار کر دیا۔ ظاہر ہے میری بجائے اگر کوئی دوسرا انسان ہوتا تو اس کی کھوپڑی کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوتے لیکن وہاں میں بیٹھا تھا۔ تلوار کی ضرب بھرپور تھی۔ چنانچہ وہ میری پتھر ایسی کھوپڑی سے ٹکرا کر جھنجھنائی اور ٹوٹ گئی۔ ڈاکو یہ سمجھا کہ شاید میں نے اپنے سر پر لوہے کا پترا چڑھا رکھا ہے۔ اس نے مجھے گردن سے پکڑ لیا اور مجھ سے الجھ گیا۔ وہ کافی ہٹا کٹا آدمی تھا اور مجھ سے دوگنے وزن کا تھا۔ مگر میری طاقت کے سامنے اس کی حیثیت بالکل ایسی تھی جس طرح کسی ہاتھی کے مقابلے میں کوئی چوہا سامنے آ گیا ہو۔

چترالی ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ یہ کم بخت تیسرا ڈاکو میرے لئے سخت پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا۔ میں اسے ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس خیال سے میں نے اس کی کنپٹی پر ایک ہلکا سا مکا جما دیا وہ ایک طرف کو گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

میں نے چترالی کو کاندھے پر رکھا اور زینہ چڑھتا ہوا تہہ خانے سے باہر برآمدے میں آ گیا۔ تازہ ہوا میں سانس لینے سے چترالی کو ہوش آ گیا۔ میں نے اسے زمین پر لٹا دیا اور بتایا کہ بلیک اس کا محبوب بھی میرے ساتھ ہے اور کھنڈر کے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ چترالی کا چہرہ ڈاکوؤں کے خوف سے اترا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اور اپنے محبوب کا سن کر

اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی آ گئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"بھگوان کے لئے مجھے یہاں سے نکال کر لے چلو۔"

خدا جانے وہ دونوں ڈاکو باہر نکل کر کس طرف چلے گئے تھے۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ میں نے چترالی کو گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھایا اور اسے ساتھ لے کر جلمیک کے پاس آ گیا جو میرے ہمراہ..... چترالی کو..... دیکھ کر وفور مسرت میں اوٹ سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے اپنی محبوبہ اور ہونے والی بیوی کو اپنے گھوڑے پر بٹھایا میں بھی گھوڑے پر سوار ہو گیا اور ہم گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے واپس دریا کی طرف چل دیئے۔ دریا کو ایک بار پھر پار کیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر جلمیک اور چترالی نے میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے چترالی سے اپنے سانپ دوست کا قیمتی..... مہرہ لے لیا۔ کیونکہ وہ دونوں جنوب کی طرف کسی دور دراز علاقے میں جانا چاہتے تھے' انہیں رخصت کرنے کے بعد میں علاقہ گجرات کے اسی مقام کی طرف چل دیا جہاں سلطان محمود نے اپنا عارضی ہیڈ کوارٹر بنایا ہوا تھا۔

اس وقت سلطان محمود غزنوی اس علاقے کے ہندو سرداروں اور چھوٹے رجواڑوں کے ہندو حکمرانوں کو مطیع بنانے کی مہم میں مصروف تھا۔ سومنات کا مندر مسلمانوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ اس کا بڑا بت اور باقی تمام چھوٹے چھوٹے بت پاش پاش کئے جا چکے تھے اور ان کے ٹکڑے راستوں پر بکھیر دیئے گئے تھے تاکہ وہ پامال ہوتے رہیں۔ سومنات کا مندر ویران تھا۔ مگر وہاں ایک پنڈت ابھی تک رہ رہا تھا۔ اس نے غزنوی فوج کے نائب سپہ سالار سے وہاں رہنے کی اجازت لے لی تھی۔ چونکہ اس میں بظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آتی تھی اس لئے پنڈت کو اجازت دے دی گئی تھی۔ مندر میں نہ ناقوس بجتے تھے اور نہ صبح شام بھجنوں کی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ تمام پجاری اور دیوداسیاں گرفتار ہو کر غزنوی لشکر کی قید میں پڑی تھیں۔

یہ پنڈت اگرچہ ایک بے ضرر پجاری کی طرح سومنات کے ویران اور اجڑے ہوئے مندر میں پڑا تھا لیکن اس کے اندر مسلمانوں سے انتقام لینے کی آگ ہر دم سلگتی رہتی تھی۔ اس پنڈت کو اچھی طرح معلوم تھا کہ قریبی ریاست گوالیار کا راجہ ارجن سلطان محمود سے بری طرح شکست کھا چکا ہے اور اس نے سلطان محمود کی اطاعت قبول کر لی ہے اور قلعے کے ایک گوشے میں پڑا رہتا ہے۔ پنڈت کا ایک خاص مخبر پجاری گنگو تھا۔ گنگو نے ایک روز پنڈت کو آ کر بتایا کہ گوالیار کا راجہ شکست کھانے کے بعد زخمی سانپ کی طرح پیچ و تاب کھا رہا ہے اور سومنات مندر کی شان و شکوہ کو دوبارہ بحال کرنا چاہتا ہے اور مسلمانوں سے زبردست بدلہ لینے کی کوشش میں ہے۔ پنڈت کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

اس نے اپنے مخبر گنگو سے کہا۔ "گنگو! سومنات دیوتا کا گھر اجڑ گیا ہے۔ مگر سومنات دیوتا اسی جگہ موجود ہے۔ وہ مجھے ہر رات خواب میں آ کر کہتا ہے کہ مسلمانوں سے میری بے عزتی اور میری تباہی کا بدلہ لو۔"

گنگو مخبر نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مہاراج! مسلمانوں کا لشکر بہت طاقتور ہے۔ سلطان محمود کی فوج کا ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

پنڈت مکاری سے مسکرایا اور بولا۔

"گنگو! مقابلہ ہم نہیں کریں گے۔ مقابلہ دیوتا سومنات کرے گا۔ مگر دیوتا سومنات کو طاقت دینے اور آکاش کے جنگجو دیوتاؤں کی امداد حاصل کرنے کے لئے گوالیار کے راجہ ارجن کو ایک شرط پوری کرنی ہو گی۔"

"مہاراج! وہ کونسی شرط ہے؟ آپ مجھے بتائیں میں راتوں رات گوالیار کے راجہ ارجن کے پاس پہنچ کر اسے آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔"

پنڈت نے کوٹھری کا دیا بجھا دیا اور گنگو مخبر کے کان میں وہ شرط بتائی جو اسے گوالیار کے راجہ تک پہنچانی تھی۔ گنگو نے سرگوشی میں کہا۔ "مہاراج! یہ بڑا خطرناک اور مشکل کام ہے۔ کیا گوالیار کا ہارا ہوا راجہ یہ شرط پوری کر سکے گا۔" پنڈت نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"گوالیار کے راجہ کو جا کر کہو کہ سومنات دیوتا کے سب سے بڑے اور مہا پجاری پنڈت برج داس کا حکم ہے کہ مسلمانوں کی فوج کو تباہ کرنے اور سومنات کی تباہی کا بدلہ لینے کے ساتھ ساتھ مندر کو پھر سے آباد کرنے کے لئے جو شرط لگائی گئی ہے اسے ہر حالت میں پورا کیا جائے۔ جاؤ اور جتنی جلدی ہو سکے مجھے واپس آ کر یہ خبر سناؤ کہ راجہ ارجن تیار ہے۔"

"جو حکم مہاراج!"

گنگو مخبر نے جوگیوں کا بھیس بدلا۔ گھوڑے پر بیٹھا اور راتوں رات گوالیار کی طرف نکل گیا۔

گوالیار کا راجہ ارجن اپنے رشیوں اور منتریوں کے ساتھ محل کے گوشے میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ رات کا دوسرا پہر تھا۔ ایک آدمی کی ڈیوٹی محل کے باہر لگا دی گئی تھی تاکہ وہ خیال رکھے کہ قلعے کی حفاظت کرنے والے مسلمان سپاہیوں کا ادھر سے گزر تو نہیں ہوتا۔ اگر کوئی مسلمان سپاہی ادھر سے گزرے تو فوراً راجہ ارجن کو آ کر اطلاع کر دی جائے۔

راجہ ارجن کو سومنات کے شکست خوردہ سازشی پنڈت کا پیغام پہنچ چکا تھا اور گنگو مخبر

بھی وہیں ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ راجہ ارجن نے اپنے سب سے عقل مند رشی سے پوچھا کہ پنڈت برج داس نے جو منصوبہ اور شرط پیش کی ہے کیا اس پر عمل کرنے سے مسلمانوں سے سومنات کی تباہی کا بدلہ لیا جا سکے گا؟"

مہارشی نے ایک پستک کھول کر سنسکرت کے کچھ اشلوک پڑھے اور کہا۔

"مہاراج! سومنات کا پنڈت برج داس بڑا گیانی دھیانی ہے اس نے جو کچھ کہا ہے۔ اس پر فوراً عمل شروع کر دینا چاہئے۔"

سومنات کے برج داس نے راجہ ارجن کو پیغام بھیجا تھا۔

"راجہ ارجن! مسلمانوں نے ہمارے سب سے مقدس مندر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے۔ ہمارے مقدس بتوں کو پاش پاش کر دیا ہے۔ دیوتا سومنات اس ذلت کا بدلہ لینے اور اپنے استھان کو پھر سے آباد کرنے کے لئے بے تاب ہے۔ اس نے مجھے خواب میں آ کر حکم دیا ہے کہ راجہ ارجن سے کہو کہ مسلمان فوجیوں کی بیویاں اور لڑکیاں جو گوالیار میں رہ رہی ہیں ان میں سے جو سب سے زیادہ خوبصورت مسلمان کنواری لڑکی ہے اس کو اغوا کرو اور میرے پاس سومنات پہنچانے کا بندوبست کرو۔ میں اس لڑکی سے شادی کروں گا۔ جب اس مسلمان لڑکی کو بچہ ہونے والا ہو گا تو ہم اسے استھان پر لے جا کر ذبح کر دیں گے جہاں دیوتا سومنات کا سب سے بڑا بت رکھا ہوتا تھا۔ اس مسلمان لڑکی کی قربانی دینے کے بعد سومنات کو آکاش کے دیوتاؤں کی امداد حاصل ہو جائے گی پھر آکاش کے تمام دیوتا اپنی گندھیروں کی فوج لے کر زمین پر اتر آئیں گے اور مسلمانوں کے سارے کے سارے لشکر کو نیست و نابود کر کے مندر میں سومنات کا ایک نیا بت آسمان سے لا کر رکھ دیں گے۔ اس لئے اے راجہ ارجن میں تمہیں دیوتا سومنات اور ہندوستان کے سارے ہندوؤں کی طرف سے حکم دیتا ہوں کہ اس کام کو جتنی جلدی ہو سکے سرانجام دے اور کسی مسلمان امیر کی لڑکی کو اغوا کر کے فوراً میرے پاس پہنچایا جائے۔"

گوالیار کے راجہ ارجن نے سومنات کے تباہ حال پنڈت کا فرمان ملتے ہی اپنے منتریوں اور رشیوں سے صلاح مشورہ کرنے بیٹھ گیا۔ اس کے محل پر مسلمان لشکر کا قبضہ تھا مگر چونکہ اس نے سلطان محمود کی اطاعت قبول کر لی تھی اس لئے اس کا محل اسے دے دیا گیا تھا جہاں وہ اپنے درباریوں کے ساتھ ایک محکوم راجہ کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ مگر جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں وہ اندر ہی اندر سلطان محمود کی طاقت کو تباہ کرنے اور سومنات کے مندر کا انتقام لینے کے لئے کھول رہا تھا۔

اب اسے سومنات کے پنڈت کی طرف سے اشارہ ملا تو وہ اس شرط کو پورا کرنے کے

لئے تیار ہو گیا۔

گوالیار میں محل کے اندر ایک چھوٹا سا مندر تھا جہاں راجہ اور اس کی رانی جا کر پوجا کیا کرتے تھے لیکن اب اس مندر میں بھی کوئی مورتی نہیں تھی۔ وہاں صرف ایک بوڑھا ہندو پجاری رہتا تھا جس کو گھنٹیاں بجانے اور سنکھ بجانے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک روز رات کو راجہ ارجن نے اس ویران مندر کے پجاری کو اپنے محل میں بلایا اور اس سے پوچھا کہ کیا وہ بھی چھپ کر مندر میں خفیہ مورتی سامنے رکھ کر پوجا کرتا ہے؟

بوڑھے پجاری نے کہا۔

"ہاں راجہ! اس لئے کہ ہم مجبور ہو گئے ہیں۔ مگر مندروں کے اجڑنے سے دیوتا کہیں فرار نہیں ہو سکتے۔ دیوتا اسی مندر میں ہیں۔ اور وہ بہت جلد مسلمانوں سے اپنی توہین اور تباہی کا بدلہ لیں گے۔"

راجہ ارجن نے پجاری سے کہا۔ "وہ وقت آ گیا ہے۔"

اور پھر راجہ نے پجاری کو سومنات کے مندر کا پیغام سنایا۔ اور پوچھا کہ کسی مسلمان امیر کی کوئی کسی حسین شہزادی کیسے حاصل کی جا سکتی ہے؟ بوڑھے پجاری کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے کہا۔

"مہاراج! ان دنوں سلطان محمود کچھ دنوں کے لئے غزنی واپس گیا ہوا ہے۔ غزنی کے لشکریوں اور امراء کی بیویاں اور شہزادیاں قلعے کے محلوں میں رہتی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ کبھی کبھی شام کو مسلمان امیروں اور فوجیوں کی لڑکیاں محافظوں کے ساتھ دریا پر نہانے آتی ہیں۔ آپ حکم کریں۔ میں اپنے آدمیوں کی مدد سے ان میں سے سب سے حسین شہزادی کو اغوا کر کے آپ کے پاس پہنچا دوں گا۔

راجہ ارجن نے کہا۔ "سومنات دیوتا کی مدد تمہارے ساتھ ہو گی لیکن مسلمان لڑکی کو اغوا کرنے کے بعد میرے پاس لانے کا خطرہ مت مول لینا۔ تمہیں اس لڑکی کو جنگل کے کسی خفیہ ٹھکانے میں چھپا کر مجھے خبر کرنی ہو گی۔ میں خود اپنے بھروسے کے آدمیوں کے ساتھ مسلمان شہزادی کو سومنات کے پنڈت کی خدمت میں روانہ کروں گا۔

پجاری بولا۔ "ایسا ہی ہو گا مہاراج! مہادیو اور ہری کرشن ہمارے ساتھ ہیں۔ مسلمانوں سے اپنے دیوتاؤں کی ذلت کا بدلہ لینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ میں بہت جلد آپ کو خوشخبری سناؤں گا۔"

سومنات کے پنڈت کا مخبر گنگو ابھی تک راجہ گوالیار کے محل میں ہی تھا۔ شاہی مندر کے مکار پجاری نے اپنے آدمیوں کی میٹنگ بلائی اور ان میں سے چار طاقت ور اور تجربہ کار

تلوار بازوں کو چنا اور انہیں حکم دیا کہ وہ معلوم کریں کہ مسلمانوں کے سرداروں کی جو لڑکیاں کبھی کبھی شام کو قلعے سے نکل کر دریا پر نہانے آتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ خوبصورت کنواری لڑکی کون ہے۔

یہ لوگ مچھیروں کا بھیس بدل کر دریا کے کنارے جا کر مچھلیاں پکڑنے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے وہاں ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا لی۔ انہیں تین دن گذر گئے تھے - وہاں مچھلیاں پکڑتے کہ ایک روز قلعے کی جانب سے چار مسلمان محافظ سپاہیوں کے ساتھ چھ سات عورتیں دریا پر نہانے کے لئے آتی دکھائی دیں۔ چار مچھیروں میں سے ایک نے دریا میں ڈبکی لگائی اور اس مقام پر پہنچ گیا جہاں مسلمان عورتیں نہا رہی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک لڑکی ان میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں سے باتیں بھی کر رہی تھی۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوتا کہ اس لڑکی کا نام شگفتہ ہے اور وہ غیر شادی شدہ ہے۔ مچھیرا دریا کے پانی میں دوبارہ ڈبکی لگا گیا اور دریائی سرکنڈوں کے بیچ سے نکل کر اپنے ساتھیوں کے پاس آ گیا۔

بوڑھے پجاری کو انہوں نے جا کر بتایا کہ قلعے دار کی چھوٹی لڑکی کا نام شگفتہ ہے اور اس کے حسن کا جواب نہیں ہے۔ پجاری نے انہیں حکم دیا کہ اب جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ دریا پر آئے تو اسے اغوا کر کے جنگل میں پہنچا دیا جائے۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ آخر وہ بدقسمت دن آ گیا جب شاہی قلعے دار کی بیٹی شہزادی شگفتہ اپنی سہیلیوں اور محافظوں کے ہمراہ دریا پر نہانے آئی۔ محافظ سپاہی پہاڑی چٹانوں کی اوٹ میں جا کر بیٹھ گئے۔

اس وقت بوڑھے پجاری کے چاروں آدمی تیر کمان لئے ان چٹانوں کی اوٹ میں پہلے ہی سے چھپے بیٹھے تھے۔ جب مسلمان خواتین دریا میں نہانے کے لئے اتر گئیں تو ان چاروں آدمیوں نے محافظ سپاہیوں کو اپنے اپنے نشانے کی زد میں لے لیا۔ یہ بڑے ماہر نشانچی تھے اور راجہ کی فوج کے تیر انداز دستے میں ہوا کرتے تھے۔ ایک ہی وقت میں ان چاروں کی کمانوں سے چار زہر میں بجھے ہوئے تیر نکلے اور بے دھیانی میں بیٹھے چاروں محافظوں کی چھاتیوں میں پیوست ہو گئے۔ چاروں تیر دل سے پار ہو گئے تھے۔ ان کے منہ سے آہ تک نہ نکل سکی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ محافظوں کو ہلاک کرنے کے بعد ان میں سے وہ آدمی جو سب سے تجربہ کار غوطہ خور تھا' دریا میں ڈبکی لگا کر اتر گیا۔ پانی کے اندر ہی اندر سے دریائی سرکنڈوں کے بیچ میں سے اس نے ایک جگہ سر نکالا اور دیکھا کہ شگفتہ دریا میں تیرتی ہوئی تھوڑی آگے نکل گئی تھی۔ اس شخص نے ایک بار پھر پانی میں ڈبکی لگائی اور پانی کے نیچے ہی نیچے اپنے خاص اندازے کے مطابق اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے شگفتہ کے پاؤں پانی کے نیچے

نظر آ رہے تھے۔ اس نے ایک مگرمچھ کی طرح ایک ہی جھٹکے سے شگفتہ کو ٹانگوں سے پکڑ کر پانی میں کھینچ لیا۔ شگفتہ کو اتنی تیزی سے پانی میں کھینچا گیا تھا کہ وہ اپنی مدد کیلئے آواز بھی نہ نکال سکی۔ دریا کے اندر دس بارہ قدموں کے فاصلے تک لے جانے کے بعد اس آدمی نے شگفتہ کو سرکنڈوں کے اندر پانی سے باہر نکالا اور اس کے منہ پر اپنا ہاتھ مضبوطی سے جما دیا کہ وہ آواز نہ نکال سکے مگر ناک سے سانس پوری طرح لے سکے۔

اسی حالت میں وہ شگفتہ کو کھینچتا ہوا دریا کے کنارے پر لے آیا جہاں اس کے ساتھی اس کا انتظار کر رہے تھے انہوں نے شگفتہ کے منہ پر کپڑا باندھ دیا اور ہاتھ پیچھے رسی سے کس کر باندھ ڈالے اور غروب ہوتے سورج کے جھٹ پٹے میں گھوڑے پر ڈال کر جنگل کی طرف فرار ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد شگفتہ کو نہ پا کر عورتوں نے شور مچا دیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ محافظوں کو بھی ہلاک کر دیا گیا ہے تو وہ روتی ہوئی قلعے کی طرف دوڑیں۔ قلعے دار اور دوسرے امراء کو شگفتہ کی گمشدگی کا پتہ چلا تو وہاں ایک طوفان مچ گیا۔ محافظوں کی ہلاکت سے صاف ظاہر تھا کہ شگفتہ دریا میں نہیں ڈوبی بلکہ اسے کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ مسلمان لشکری شگفتہ کی تلاش میں قلعے سے نکل پڑے۔

لیکن اس وقت تک بوڑھے پجاری نے شگفتہ کو گوالیار کے گھنے جنگل میں بلند سرخ چٹانوں کے سائے میں بینا دیوی کے ویران مندر کے تہہ خانے میں پہنچا دیا تھا۔ یہ مندر جنگل کے اندر ایک ایسی جگہ پر تھا کہ جہاں پہنچنا بہت جان جوکھوں کا کام تھا۔ اس جنگل میں رات کو شیر دھاڑتے تھے۔ ویسے بھی غزنی سے آئے ہوئے مسلمان سپاہی ان جنگلوں سے واقف نہیں تھے۔ سلطان محمود کے جن مسلمان سپاہیوں نے اس مندر کی مورتیوں کو پاش پاش کیا تھا وہ سلطان محمود کے ساتھ ہی کچھ دنوں کے لئے غزنی گئے ہوئے تھے۔

غزنی فوج کے نائب سپہ سالار نے گوالیار کے راجہ کے سارے محلات کی تلاشی لی۔ شہر کے مکانوں کی بھی تلاشی لی گئی مگر شگفتہ کا کہیں سراغ نہ ملا۔ پھر بھی ساری ریاست میں شہزادی شگفتہ کی تلاش جاری تھی۔ بوڑھے پجاری نے اپنے خاص آدمی کے ہاتھوں راجہ ارجن کو شگفتہ کے اغوا کی خبر پہنچا دی تھی۔ راجہ نے پجاری کو پیغام بھجوایا تھا کہ وہ شہزادی شگفتہ کو خفیہ جگہ پر چھپائے رکھے۔ راجہ ارجن نے سومنات کے پنڈت کے مخبر گنگو کو رات کے اندھیرے میں اپنی خواب گاہ میں بلا کر کہا کہ مسلمان لڑکی کو اغوا کر لیا گیا ہے اب تم بتاؤ کہ اسے کب اور کس وقت گوالیار کے جنگل سے نکال کر سومنات کی طرف لے جاؤ گے۔

گنگو ہاتھ باندھ کر بولا۔ ”مہاراج! اس وقت حالات تشویشناک ہیں۔ جگہ جگہ آدمیوں کو روک کر تلاشی لی جاتی ہے۔ کچھ روز ہمیں خاموش رہنا ہو گا۔“

جب دس روز گزر گئے تو گنگو نے راجہ ارجن سے کہا کہ وہ شہزادی شگفتہ کو جنگل سے نکال کر سومنات لے جانے کے لئے تیار ہے۔ راجہ نے کہا کہ آج رات پچھلے پہر کی تاریکی میں ہم جنگل کی طرف جائیں گے۔ آدھی رات کو اٹھ کر انہوں نے جوگیوں کا بھیس بدلا اور محل کے خفیہ دروازے سے نکل کر عقبی پہاڑیوں میں آ گئے۔ یہ راجہ کی ریاست تھی اور وہ اپنی ریاست کے چپے چپے سے واقف تھا۔ ساری زندگی اس کی اس جنگل میں شکار کھیلتے گزری تھی۔ وہ گنگو کو جنگل کے ایسے راستے سے لے کر مینا دیوی کے مندر تک گیا جہاں کسی جنگلی درندے کے ملنے کا امکان نہیں تھا۔ جنگلی درندے زیادہ تر جنگل کے دوسرے حصے کی طرف ہوتے تھے جہاں پانی کا ایک بہت بڑا تالاب تھا۔

رات کے اندھیرے میں مینا دیوی کا چھوٹا سا ویران مندر انتہائی پراسرار لگ رہا تھا۔ وہاں کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مگر راجہ ارجن کو معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر تین بار ایک خاص انداز سے چیتل کی آواز نکالی۔ تیسری آواز کے بعد مندر میں سے بوڑھا پجاری ہاتھ میں چراغ لئے باہر نکل آیا اور بولا۔ ”یہاں نہ دیوی ہے نہ دیوتا۔ تو یہاں کیا لینے آیا ہے۔ جا جنگل میں بسرام کر۔ میں تیرے لئے دیوتاؤں کے آگے پرارتھنا کروں گا۔“

راجہ ارجن درختوں سے نکل کر بوڑھے پجاری کے سامنے آ گیا۔ بوڑھے پجاری نے جھک کر راجہ کی تعظیم کی اور اشارے سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ مندر میں مورتیوں کے استھان سنسان اور خالی پڑے تھے۔ ان پر ایک بھی مورتی یا بت نہیں تھا۔ پجاری راجہ ارجن اور گنگو کو مندر کے نیچے تنگ و تاریک تہہ خانے میں لے گیا جہاں مسلمان شہزادی شگفتہ بے بسی کی حالت میں پڑی تھی۔ وہ راجہ ارجن کو پہچانتی تھی۔ راجہ کو دیکھتے ہی اس پر پھٹ پڑی اور کہا کہ اس کا باپ اس کی ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ راجہ ارجن نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”شہزادی! تم مسلمانوں نے میری ریاست کی جو اینٹ سے اینٹ بجانی تھی بجا دی۔ اب ہمارے دیوتاؤں کا تم سے بدلہ لینے کا وقت آ گیا ہے۔ ہم ایک ایک مسلمان سپاہی کو ہندوستان کی سرزمین پر ہی قتل کر دیں گے اور ہمارے مندروں میں ناقوس اور گھنٹیوں کا شور ایک بار پھر بلند ہو گا۔“

شہزادی شگفتہ نے بڑی جرات کے ساتھ جواب دیا۔ ”ہندوستان پر اسلام کا جو پرچم بلند ہوا ہے اسے اب کوئی سرنگوں نہیں کر سکتا۔ تمہیں بہت جلد اس گستاخی کی سزا ملے گی۔“

گوالیار کے مکار راجہ ارجن نے راتوں رات شہزادی شگفتہ کو ایک ٹوکرے میں بند کر

کے اونٹ پر رکھا اور گنگو کے ساتھ اپنے چار سپاہی بھی حفاظت کے لئے ساتھ کر دیئے اور انہیں سومنات کے مندر کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ جس رات راجہ ارجن نے قلعے دار مہندی کی بیٹی شہزادی شگفتہ کو سومنات کی طرف روانہ کیا اس سے اگلے روز فوج کے سپہ سالار نے شہزادی کی گمشدگی یا اغوا کے بارے میں مجھ سے مشاورت کی۔ یہ جتنے واقعات میں نے اوپر لکھے ہیں یہ سب کے سب بعد میں مجھے ایک ہندو سپاہی نے بتائے تھے جو شہزادی شگفتہ کو اغوا کرنے والوں میں شامل تھا۔

میں نے سپہ سالار سے وعدہ کیا کہ میں شہزادی کا سراغ لگانے کی پوری کوشش کروں گا۔ سپہ سالار نے کہا کہ یہ مسلمانوں کی عزت اور وقار کا مسئلہ ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ شہزادی شگفتہ کو کسی غیر مسلم نے اغوا کیا ہے اور اغوا کرنے والا ایک آدمی نہیں ہے۔ میں خود بھی ان ہی نقوش پر غور کر رہا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ ہندوؤں کو اپنے بتوں کے پامال کئے جانے اور مندروں کے اجاڑ دیئے جانے کا شدید صدمہ ہے۔ اگرچہ بظاہر انہوں نے غزنوی لشکر کی اطاعت قبول کر لی تھی لیکن ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف سوائے نفرت کے اور کچھ نہیں.... اور وہ انتقام کی آگ میں جل بھن رہے تھے۔ چنانچہ میں نے غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک بلند مرتبت شہزادی کا اغوا کوئی عام ہندو نہیں کر سکتا۔ اس کے پیچھے کسی بااثر شخصیت کا ہاتھ ہے اور ہندوؤں میں اس وقت سوائے گوالیار کے راجہ ارجن کے اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ راجہ اطاعت قبول کرنے کے بعد اپنے محلات میں ایک طرح سے نظر بند تھا اور وہ اتنا احمق نہیں تھا کہ اگر شہزادی کو اس نے اغوا کروایا تھا تو وہ اسے اپنے محل میں چھپا کر رکھتا۔ شاہی محلات کے چپے چپے کی تلاشی لی جا چکی تھی۔ قرین قیاس یہی بات تھی کہ شہزادی شگفتہ کو یا تو گوالیار کے قرب و جوار میں کسی خفیہ جگہ پر چھپا دیا گیا ہے یا اسے قتل کر دیا گیا ہے اور اسے شہر سے باہر کسی دوسری جگہ بھجوا دیا گیا ہے۔ ایک بات ثابت ہوتی تھی کہ اس منصوبے میں اگر راجہ ارجن شریک تھا تو اسے کچھ ہندو مذہبی لوگوں یعنی پجاریوں وغیرہ کی بھی حمایت حاصل تھی۔

میں نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے شہر اور شہر کے باہر کے مندروں کا دورہ کیا جائے۔ ایک مسلمان یا سلطان محمود کی حکومت کے امیر کی حیثیت سے مجھے اس دورے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک روز ابروؤں کا صفایا کیا ماتھے پر تلک لگایا ہاتھ میں کرمنڈل پکڑا اور ایک رشی منی جوگی کا روپ دھار کر شہر کے مندروں کی طرف چل پڑا۔ جیسا کہ آپ کو علم ہی ہے کہ عاطون اور تاریخ کے غیر فانی مسافر ہونے کے ناتے سے مجھ پر دنیا کی ہر قدیم زبان کے مطالب واضح ہو گئے تھے اور تاریخ کے کسی بھی دور کی کوئی ایسی

زبان نہیں تھی کہ جو میں بول اور سمجھ نہ سکتا تھا۔ اس اعتبار سے میں اس وقت کی ہندوؤں کی مقدس ترین زبان سنسکرت کا بھی ماہر تھا اور اپنشدوں کے اشلوک مجھے زبانی یاد تھے۔ اسی لئے میں نے ایک ہندو رشی کا بھیس بدلا تھا۔ میں جس مندر میں بھی گیا وہاں کے پجاری نے میرا بھرپور خیر مقدم کیا کیونکہ وہ میرے ویدوں کے علم اور اپنشدوں کے اشلوکوں سے بے حد متاثر ہوتا۔ مندر ویران ہو چکے تھے۔ بت پاش پاش ہو چکے تھے۔ پجاری آزردہ دل تھے۔ میں نے ان کے سامنے مسلمانوں کی مخالفت کی اور سلطانی فوج سے انتقام لینے کے عزم کا اظہار کیا۔ یہ بھی کہا کہ کسی ہمارے ہی ہندو بھائی نے شہزادی شگفتہ کو اغوا کر کے ہمارے جذبہ انتقام کو کسی حد تک ٹھنڈا کردیا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ پجاری مجھ کو شہزادی شگفتہ کے بارے میں کچھ بتائیں۔ مگر میں نے دیکھا کہ شہر کے مندروں میں رہنے والے پجاری شہزادی شگفتہ کے اغوا کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتے۔

میں نے باتوں ہی باتوں میں ایک پجاری سے کہا کہ میں دیوتاؤں کے حکم پر اس مقدس مندروں کے شہر کی یاترا کو آیا ہوں۔ مجھے بتایا جائے کہ کیا شہر کے باہر بھی کوئی ایسا مندر موجود ہے جو میرے علم میں نہیں ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ شہر سے دور جنگل میں سرخ چٹانوں کے پہلو میں مینا دیوی کا ایک مندر ہے جہاں کبھی کبھی راجہ گوالیار مہاراج ارجن پوجا پاٹھ کرنے جایا کرتے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجھے اس اطلاع کی ضرورت تھی۔ میں اس وقت مینا دیوی کے مندر کی طرف چل پڑا۔ یہ مندر جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں گوالیار کے گھنے جنگل میں واقع تھا۔ میں نے مندر کو تلاش کر لیا۔ میں ایک عالم پنڈت یعنی رشی کے بھیس میں تھا۔ میں نے مندر کے دروازے پر پہنچتے ہی بلند آواز سے بھگوت گیتا کے اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔ خالص سنسکرت میں اشلوک پڑھے جانے کی آواز سن کر بوڑھا پجاری مندر سے نکل آیا اور... اس نے اپنے سامنے ایک سر منڈا رشی دیکھا جس کے ہاتھ میں کرمنڈل اور دوسرے ہاتھ میں ترشول پکڑا تھا تو وہ ہاتھ باندھ کر میرے آگے جھک گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے آشیرباد دی اور کہا۔

"دیوتا شنکر نے مجھے اجڑے ہوئے مندروں کی یاترا کو بھیجا ہے۔ نراش نہ ہو۔ دیوتا اپنی اپنی مورتیاں لیکر سارے مندروں میں واپس آ رہے ہیں۔"

بوڑھا پجاری بہت خوش ہوا۔ اسے کبھی شبہ تک نہیں ہو سکتا تھا کہ میں سلطان محمود کے دربار کا ایک مسلمان امیر ہوں۔ جس روانی سے میں سنسکرت کے اشلوک پڑھ رہا تھا۔ اتنی روانی سے اس زمانے کے ہندو پجاری اور پروہت بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ وہ ہاتھ باندھ کر بولا۔ "مہاراج! مندر میں پدھاریئے۔" وہ مجھے مندر میں لے گیا۔ اس نے میرے آگے

بکری کا دودھ اور جنگل سے توڑے گئے پھل لا کر رکھے۔ میں نے فوراً اپنی حکمت عملی پر کام شروع کر دیا اور باتوں ہی باتوں میں شہزادی شگفتہ کے اغوا کے موضوع پر آ گیا اور اسے کہا۔

"اے پجاری! دیوتا شنکر مسلمان شہزادی کے اغوا پر بڑے خوش ہیں۔ انہوں نے خاص طور پر مجھے اس آدمی کو مبارکباد پہنچانے کی تاکید کی ہے جس نے مسلمان شہزادی کو اغوا کیا اور دیوتاؤں کو آکاش میں خوش کیا۔"

یہ سن کر پجاری خوشی سے پھول گیا۔ دیوتا شنکر کی آشیرباد اور مبارک باد کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس نے فوراً پوچھا۔

"کیا دیوتا شنکر واقعی مجھ پر خوش ہیں؟"

میں کچھ چونک سا پڑا۔ میں نے پجاری کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تو کیا تم ہی وہ دیوتاؤں کے پیارے منش ہو جس نے ہندو مذہب کی لاج رکھ لی ہے اور آکاش پر دیوتا شنکر کو خوش کیا ہے؟"

بوڑھے پجاری نے کہا۔ "ہاں مہاراج! میں نے ہی مسلمان قلعے دار کی بیٹی شہزادی شگفتہ کو اغوا کروایا ہے۔"

میری منزل اور میرے گوہر مراد کو جانے والا دروازہ میرے سامنے کھل گیا تھا۔ اب میرے لئے یہ معلوم کرنا کوئی مشکل مرحلہ نہیں تھا کہ شہزادی شگفتہ اغوا کئے جانے کے بعد کہاں ہے۔ پجاری نے.... ساری بات بیان کر دی اور بتایا کہ اس وقت گنگو اور اس کے چار سپاہی شہزادی شگفتہ کو لے کر سومنات کے بڑے مندر کے پنڈت کی طرف چلے جا رہے ہوں گے۔

"وہاں مسلمان شہزادی کی بڑے پجاری سے شادی کی جائے گی اور جب وہ امید سے ہو گی تو اسے دیوتا سومنات کے استھان کے سامنے ذبح کر دیا جائے گا تاکہ دیوتا سومنات کا مندر پھر سے آباد ہو اور فضا دیوی دیوتاؤں کے بھجنوں اور سنکھ و ناقوس کی آوازوں سے گونج اٹھیں۔"

میرے پاؤں تلے سے ایک بار تو زمین کھسک گئی۔ ان بدبختوں نے کس قدر بھیانک اور ذلت آمیز منصوبہ بنایا تھا۔ حالات کا تقاضہ تھا کہ میں ایک پل کی بھی تاخیر نہ کروں۔ کیونکہ گوالیار سے احمد آباد کے مندر سومنات کا فاصلہ چار دنوں میں طے ہو جاتا تھا۔ اور اس وقت پجاری کے آدمیوں کو شہزادی شگفتہ کو اپنے آدمیوں کے ساتھ روانہ کئے ایک روز گزر چکا تھا۔ میں نے پجاری سے اجازت لی پھر آنے کا وعدہ کیا اور وہاں سے نکل کر شہر میں آ گیا۔

اس وقت دن ڈھل رہا تھا اور اسلامی لشکر کے خیموں کے باہر آگ کے الاؤ روشن ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میرا غلام میری اس پراسرار مہم سے واقف تھا۔ میں نے اس کو شاہی اصطبل میں بھیج کر ایک برق رفتار عربی گھوڑا منگوایا اور اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ میں نے مینا دیوی کے مندر سے پجاری سے جنگل سے گزرنے والا وہ راستہ معلوم کر لیا تھا جو وہاں سے چار دنوں کی مسافت پر سومنات کے مندر کو جاتا تھا۔ میں گھوڑے کو شہر میں سرپٹ دوڑاتا نکل گیا اور جب شام کے اندھیرے چاروں طرف اتر آئے تو میں گھنے جنگل میں داخل ہو چکا تھا۔

میں اندھیری رات میں جنگل کے جس راستے پر گھوڑا دوڑائے چلا جا رہا تھا وہ اگرچہ اتنا کشادہ نہیں تھا مگر درختوں اور جھاڑیوں سے صاف تھا۔ مجھے بھوک' پیاس اور تھکاوٹ کی کوئی فکر نہیں تھی چنانچہ میں جنگل میں گھوڑا دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شہزادی شگفتہ کو ایک اونٹ پر لاد کر لے جایا جا رہا ہے۔ اس اعتبار سے ان لوگوں کی رفتار تیز نہیں ہو سکتی تھی اور میں انہیں سومنات پہنچنے سے پہلے پہلے راستے میں ہی پکڑ سکتا تھا۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے ایک مسلمان لڑکی کی عزت بچائی جائے۔ ساری رات میں جنگل میں سفر کرتا رہا۔ پو پھٹی تو میں گھوڑے سے اتر پڑا۔ گھوڑے کو کھلا چھوڑ دیا - کچھ دیر چرنے اور تالاب پر پانی وغیرہ پینے کے بعد عربی گھوڑا پھر سے سفر کے لئے تیار ہو گیا۔ میں اس پر بیٹھا اور اسے ایڑ لگا دی۔

اس طرح دو دن کے سفر کے بعد مجھے ایک جگہ اونٹ اور گھوڑے کے سم دکھائی دیئے۔ میں شروع ہی سے سفر سے پریشان تھا کہ اگر وہ لوگ شہزادی کو اغوا کر کے اسی راستے سے گئے ہیں اور کچے راستے پر گھوڑوں کے سموں اور اونٹ کے پاؤں کے نشانات کیوں نہیں ہیں۔ اب یہ بھید کھلا کہ وہ لوگ سیدھا راستہ چھوڑ کر جنگل کی بائیں جانب والے پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے اب جنگل کے کچے راستے پر نکل آئے تھے۔ میں نے گھوڑے سے اتر کر نشانوں کا جائزہ لیا۔ ان نشانوں میں ایک اونٹ کے نشان تھے اور باقی پانچ گھوڑوں کے سموں کے نشانات تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ چھ آدمی شہزادی کو اغوا کر کے لئے جا رہے ہیں۔ میں نے گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگائی اور آگے کو چل پڑا۔ وہ دن بھی گزر گیا۔

جب تیسرا دن طلوع ہوا اور مجھے ان لوگوں کا کوئی سراغ نہ مل سکا تو میں کچھ پریشان ہوا۔ کیونکہ سفر میں مجھے اگر تین دن گزر گئے تھے تو ان لوگوں کے چار دنوں کی مسافت پوری ہو چکی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ سومنات کے مندر میں شہزادی کو لے کر پہنچ چکے

ہوں گے۔ میں نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑانا شروع کر دیا۔

سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے جب میں جنگل سے باہر نکلا تو دیکھا کہ دور سومنات کا مندر ہے جس کی اونچی دیوار پر ایک مشعل روشن تھی۔ میں فکر مند ہوا کہ وہ لوگ سومنات کے مندر میں پہنچ گئے ہیں' اور کہیں ایسا نہ ہو کہ شہزادی شگفتہ کی شادی کر دی گئی ہو۔ سومنات مندر میرے لئے کوئی نئی جگہ نہیں تھی اس سے پہلے بھی میں سلطان محمود کے ساتھ اس مندر میں آ چکا تھا جب اس نے اپنے گرز کی ایک ہی ضرب سے مندر کے سب سے بڑے بت کو پاش پاش کر دیا تھا۔ مندر کی دیوار کے پاس پہنچ کر میں نے گھوڑے کو چھوڑ دیا۔

میں چونکہ ایک رشی منی کے بھیس میں تھا اس لئے بلا جھجک مندر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ مندر کا دروازہ بند تھا۔ یہ ڈیوڑھی کا دروازہ تھا۔ یہاں دروازے میں ایک بہت بڑا گھنٹہ لٹک رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی گھنٹے کو بجانا شروع کر دیا۔ اس کی آواز سے مندر کے در و دیوار لرز اٹھے۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک موٹی توند اور چھوٹی مکار آنکھوں والے پنڈت نے ترش لہجے میں کہا۔ "کون ہو تم گستاخ جو اتنی زور سے....." اپنے سامنے ایک رشی منی کو دیکھ کر فقرہ اس کے منہ میں ادھورا ہی رہ گیا۔ میں نے کرمنڈل والا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

"دیوتا شنکر کی آشیرباد تمہارے لئے ہے۔ میں کیلاش پربت کا رشی ہوں۔ سومنات کی یاترا کو مجھے دیوتا شنکر نے بھیجا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے بڑی روانی سے اور خالص رشی منوں کے انداز میں بھگوت گیتا کے تین اشلوک پڑھ دیئے۔ پنڈت بہت متاثر ہوا۔ اس نے ہاتھ باندھ کر بڑے ادب سے میرے آگے سر جھکا دیا اور دروازے سے الگ ہٹ کر ڈیوڑھی میں کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"مہاراج! پدھاریئے۔ ہمارے دھن بھاگ کہ آپ دیوتا شنکر کی آشیرباد لے کر سومنات میں آئے۔"

میں دروازے میں سے گزر کر ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ میں نے ڈیوڑھی میں ایک جانب ایک اونٹ' پانچ گھوڑے بندھے ہوئے دیکھے۔ اسی جگہ ایک کافی بڑا ٹوکرا بھی پڑا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ شہزادی شگفتہ سومنات کے مندر میں پہنچ چکی ہے اور اس پنڈت کی تحویل میں ہے اور چاروں محافظ ہندو سپاہی بھی وہیں موجود ہیں۔

میں اشلوک کا ورد کرتا مندر کے بڑے استھان کی طرف بڑھا۔ میں اس مندر کے سارے حدود اربعے سے واقف تھا۔ پنڈت ہاتھ باندھے میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ شکل سے ہی یہ بڑا مکار اور کائیاں پنڈت لگ رہا تھا۔ مگر اس پر میرے ایک عظیم رشی ہونے کا اثر

بیٹھ چکا تھا۔ سومنات کا استھان خالی اور ویران پڑا تھا۔ کبھی یہاں دیوتا سومنات کا بہت بڑا بت ہوا کرتا تھا۔ جسے میرے سامنے سلطان محمود نے اپنے گرز سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ میں نے خالی استھان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”دیوتا اپنے استھان پر پھر براجمان ہو گا دیوتا شنکر نے مجھے مندر کے پھر سے آباد ہونے کی خوشخبری دے کر یہاں بھیجا ہے۔“

میں نے استھان کے گرد مقدس اشلوک پڑھتے ہوئے چار چکر لگائے اور پنڈت سے کہا۔

”ہمیں بھوک لگی ہے۔ کیا ہمیں بھوجن نہیں کھلاؤ گے؟“

مجھے بھوک وغیرہ کچھ نہیں لگی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کسی جگہ آرام سے بیٹھ کر پنڈت کے دل کو ٹٹولوں اور اس سے یہ راز معلوم کروں کہ شہزادی کو اس نے کہاں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ پنڈت جھک کر بولا۔

”میری کوٹھری میں پدھاریئے مہاراج! بھوجن پانی سے آپ کی سیوا کروں گا۔“

وہ مجھے اپنی کوٹھری میں لے آیا جہاں ایک چراغ جل رہا تھا۔ اس نے مجھے بستر پر بٹھایا اور خود ایک چوکی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں اس کا ساتھی گنگو مخبر بھی آ گیا۔ اس نے بھی ایک رشی منی کو دیکھ کر بڑے ادب سے ہاتھ باندھ کر پرنام کیا اور ادب سے کونے میں کھڑا ہو گیا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ٹیڑھی آنکھوں سے میرا جائزہ بھی لے رہا ہے۔ اس وقت میرے آگے کیلے کے چوڑے پتے بچھا کر بھوجن لگا دیا گیا۔ وہی چاول اور کیلے اور پانی کی کٹوری۔ میں بھوجن کرنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ پنڈت سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ میں ہر فقرے کے بعد اپنا اثر ڈالنے کے لئے ویدوں' اپنشدوں اور بھگوت گیتا میں سے ایک آدھ سنسکرت کا اشلوک بھی پڑھ دیتا تھا۔ جس کا خاطر خواہ اثر ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود مکار پنڈت اپنے دل کا راز نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ابھی تک مجھے اس راز سے آگاہ نہیں کیا تھا کہ اسی نے ایک امیرزادی کو اغوا کرایا ہے اور سومنات کے خالی استھان کے آگے اس کو ذبح کرنے والا ہے۔ میں جلدی سے جلدی اس بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بھوجن کھانے کے بعد پنڈت کی طرف جھک کر دیکھا اور کہا۔

”دیوتا شنکر تم سے بہت خوش ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ تم دیوتا سومنات کی کھوئی ہوئی عزت بحال کرنے کے لئے ایک بہت بڑی قربانی پیش کرنے والے ہو۔“

پنڈت کچھ چونکا۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں اور بولا۔
”مہاراج! دیوتا شنکر سب کچھ جانتے ہیں۔ میں ان سے کچھ نہیں چھپا سکتا۔“ میں نے کہا تو پھر مجھ سے کیوں چھپا رہے ہو؟ میں بھی تو دیوتا شنکر کا گندھرو بن کر یہاں استھان کے درشن

کرنے آیا ہوں۔ اس کا جواب پنڈت نے کچھ نہ دیا۔ وہ خاموش ہی رہا اور ایک نگاہ اپنے ساتھی گنگو پر ڈالی - وہ بھی اپنی جگہ پر ساکت کھڑا رہا۔ میں سب کچھ جانتا تھا۔ میں نے کہا۔
”کیا تم مجھ پر اپنے دل کا راز نہیں کھولو گے؟ میں رشی منی ہی نہیں - آکاش کا گندھیرو بھی ہوں۔“

اب پنڈت نے زبان کھولی اور کہا۔ ”مہاراج! آپ مجھ سے زیادہ اس بات کو جانتے ہیں کہ اس وقت سومنات کا مندر ہندوستان کے ہندوؤں اور آکاش میں رہنے والے دیوتاؤں کا سب سے بڑا مندر ہے جو اجڑ چکا ہے۔ جس کے سارے بت پاش پاش ہو چکے ہیں۔ اس کو دیوتاؤں کے بتوں سے پھر سے آباد کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے اور یہ بہت بڑی اور بڑی رازدارانہ ذمے داری ہے۔ اور اس ذمے داری کے ساتھ ہی مجھ پر ایک فرض لاگو ہو گیا ہے کہ مندر کو دوبارہ آباد کرنے کے منصوبے کو کسی باہر کے آدمی پر ظاہر نہ کروں۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن میں گندھیرو ہوں۔ آدھا انسان اور آدھا دیوتا ہوں۔ تم مجھ سے کیوں چھپاتے ہو؟“

پنڈت بولا۔ ”مہاراج! پھر تو آپ کو اچھی طرح سے معلوم ہو گا کہ سومنات مندر کے اس عظیم راز کو کسی باہر کے آدمی پر ظاہر کرنے کے لئے خواہ وہ گندھیرو ہی کیوں نہ ہو ایک شرط کا پورا کرنا ضروری ہے۔“

میں نے پوچھا کہ وہ کونسی شرط ہے؟ پنڈت بولا۔

”آپ کو مقدس ناگ سے اپنے آپ کو ڈسوانا ہو گا۔ کیونکہ ویدوں میں لکھا ہے کہ گندھیروں پر سانپ کے زہر کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اگر آپ پر مقدس ناگ کے زہر کا اثر نہ ہوا تو یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ آپ سچے گندھیرو ہیں پھر میں آپ کو وہ سب کچھ بتا دوں گا جو میں ابھی تک آپ سے اپنے دھرم کے اصولوں کی وجہ سے چھپا رہا ہوں۔“ میں دل میں مسکرا دیا۔ احمق آدمی نے ایک ایسی شرط لگائی ہے جو میں جتنی بار کہے پوری کرنے کو تیار تھا۔ میں نے فوراً کہا۔

”تم نے میرے گندھیرو ہونے پر شک کر کے ایک پاپ کیا ہے۔ لیکن میں سومنات اور دیوتا شنکر کے لئے تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ ورنہ میرا یہ ترشول تمہیں ابھی آگ میں جلا کر بھسم کر کے رکھ دیتا۔ لاؤ مقدس سانپ کو۔ میں اس سے ڈسوانے کے لئے تیار ہوں۔“

پنڈت خاموشی سے مجھے تکتا رہا۔ پھر اس نے اپنے گنگو مخبر کی طرف دیکھا اور اسے اشارہ کیا۔ وہ فوراً کوٹھری سے نکل گیا۔ اب میں نے پلنگ پر ہی یونہی جھوٹ موٹ آسن جما لیا اور اتھر وید میں سے اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔ پانچ منٹ کے بعد گنگو اندر داخل

ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی گول ٹوکری تھی۔ اس نے ٹوکری پنڈت کے سامنے رکھ دی۔ میں نے کوئی استفسار نہ کیا اور بدستور اشلوک گنگناتا رہا۔ پنڈت نے ٹوکری اٹھائی اور اسے پلنگ پر میرے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! اس ٹوکری میں مقدس ناگ بند ہے۔ جس کے زہر میں اتنی تاثیر ہے کہ اگر پتھر پر دانت مارے تو اسے آگ لگ جائے۔ اگرچہ مجھے آپ کے گندھیرو اور مقدس رشی ہونے کا یقین ہے لیکن مجھے شما کیجئے اس مقدس رسم کا پورا کرنا ضروری ہے۔" میں نے اشلوک پڑھنے بند کردیئے اور ٹوکری پر ہاتھ رکھ کر پنڈت کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔

"میرے بھائی! میں نے تمہیں شما کیا اور میری پرارتھنا ہے کہ آکاش کے دیوتا بھی تمہیں معاف کر دیں۔ کیونکہ تم نے ایک گندھیرو کی طاقت اور شکتی پر شک کیا ہے۔ پھر بھی چونکہ تم ایک مقدس دھرم کی شرط پوری کر رہے ہو اس لئے ہر آزمائش کے لئے تیار ہوں۔"

میں نے ٹوکری کا ڈھکنا اٹھا دیا۔ یک بارگی میں بھی کسی حد تک دہشت زدہ سا ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ اس کے اندر سے ایک کالا سیاہ ناگ پھنکار کے ساتھ اوپر کو اٹھا اور اپنا چوڑا پھن پھیلائے مجھے سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے جھومنے لگا۔ پنڈت اور گنگو خوف کے مارے پرے ہٹ گئے تھے۔ سانپ تین فٹ اونچا اٹھا ہوا تھا اور بار بار اپنی سرخ دوشاخہ زبان باہر نکال رہا تھا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اسے گردن سے پکڑنا چاہا تو اس نے بجلی ایسی سرعت کے ساتھ میری کلائی پر ڈس لیا۔ پھر بھی میں نے اسے گردن سے پکڑ لیا اور اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

"اے پنڈت! مقدس ناگ مجھے ایک بار ڈس چکا ہے لیکن میں اسے ایک بار پھر ڈسواؤں گا تاکہ تمہارے دل میں ذرا سا بھی شک باقی نہ رہے۔"

اس بار میں نے سانپ کو اپنے ننگے بازو پر ڈسوایا۔ سانپ کے دانت میرے جسم میں داخل ہی نہیں ہو سکتے تھے اس کا زہر اندر کہاں سے جاتا ۔ اس کے زہر کے قطرے باہر ہی میرے بازو سے لگے رہ گئے۔ جن کو میں نے پونچھ ڈالا۔ پنڈت اور اس کا ساتھی گنگو میری طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے تک رہے تھے۔ انہیں شاید یقین تھا کہ میں سانپ کے ڈسنے سے فوراً جل کر راکھ ہو جاؤں گا۔ جب ایسا نہ ہوا اور میں نے مقدس سانپ کو اپنی گردن میں لپیٹ لیا تو وہ میرے آگے سجدے میں گر پڑے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔

میں نے انہیں اٹھنے کا حکم دیا اور مقدس سانپ کو گردن سے نکال کر ٹوکری میں دوبارہ بند کر دیا اور پنڈت سے کہا۔

"اب تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو کہ مقدس سانپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا کیونکہ میں آکاش کا مقدس گندھیرو ہوں۔ اب مجھے بتاؤ کہ تم جس مسلمان لڑکی کو دیوتا سومنات کے استھان پر قربان کرنے کو لائے ہو وہ کہاں ہے؟ کیونکہ دیوتا شنکر نے مجھے حکم دیا ہے کہ قربانی سے پہلے میرا اس سے بیاہ ہو گا۔"

پنڈت نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "مہاراج! آپ پر سارا بھید کھلا ہے آپ زمین کے اوپر اور پاتال کے اندر کی چیزوں سے واقف ہیں۔ جیسی آپ کی اچھیا ہے ویسے ہی ہو گا۔ سب سے پہلے اس مسلمان لڑکی کا بیاہ آپ ہی سے ہو گا۔"

میری جان میں جان آئی۔ کیونکہ اس جملے سے ظاہر تھا کہ ابھی تک مسلمان امیرزادی شگفتہ ابھی محفوظ تھی اور اس کا کسی ہندو سے ابھی تک بیاہ نہیں ہوا تھا۔ میں مسکرا دیا۔ پھر میں نے چار اشلوک بلند آواز میں پڑھے اور پنڈت سے کہا۔

"ہمیں ہماری ہونے والی استری کے درشن کرائے جائیں۔"

پنڈت ایک دم چوکی پر سے اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج! میرے ساتھ تشریف لائیں۔"

مکار پنڈت اور گنگو مجھے اپنے ساتھ لے کر مندر کے مختلف تنگ و تاریک زینے اترتے ایک تہہ خانے میں لے گئے جہاں میں نے پہلی بار مسلمان امیرزادی شہزادی شگفتہ کو دیکھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چراغ کی روشنی میں اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے چہرہ اٹھا کر ایک حقارت بھری نظر ہم پر ڈالی اور فارسی زبان میں ہمیں برا بھلا کہا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"لڑکی خبردار! ہم تمہاری زبان بھی جانتے ہیں - ہم گندھیرو ہیں - اگر دوبارہ زبان کھولی تو تمہیں اسی جگہ جلا کر بھسم کر دیں گے۔"

مگر وہ بھی ایک غیور مسلمان کی بیٹی تھی۔ اس نے ہندو دیوی دیوتاؤں کی دھجیاں بکھیرنی شروع کر دیں اور کہا کہ ہندوستان میں بہت جلد اسلام کا پرچم لہرائے گا۔ دل میں میں بڑا خوش ہوا۔ مگر اوپر سے اسے ڈانٹا اور غضبناک ہو کر حکم دیا کہ اس لڑکی کا منہ بند کیا جائے۔ فوراً پنڈت اور گنگو نے شہزادی شگفتہ کے منہ پر کپڑا باندھ دیا۔ اس کے بعد ان دونوں کو حکم دیا کہ وہ کوٹھری سے چلے جائیں اور مندر کے استھان کے پاس بیٹھ کر گیتا کا پاٹھ کریں۔ کیونکہ میں دیوتا سومنات کی اس امانت کے سامنے قربانی سے پہلے مقدس اشلوک پڑھنا چاہتا ہوں۔ میں اس وقت مسلمان امیرزادی کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔ میں نے نیم باز آنکھوں سے دیکھا کہ پنڈت اور اس کا

ساتھی گنگو خاموشی سے میرے آگے باری باری سر جھکا کر کوٹھری سے باہر نکل گئے۔ مجھے ا
کی کھڑاؤں کی آوازیں کچھ لمحوں تک سنائی دیتی رہیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ تہ خا
کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا چکے ہیں تو میں نے جلدی سے اٹھ کر شہزادی شگفتہ کے منہ
کپڑا ہٹا دیا اور کہا۔

"بیٹی! گھبراؤ نہیں۔ میں ہندو نہیں مسلمان ہوں اور سلطان محمود کے دربار سے تمہیں لینے آیا ہوں۔"

یہ سنتے ہی شہزادی شگفتہ کے زرد چہرے پر مسرت کی ایک بے پایاں لہر دوڑ گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے میری بات کا یقین نہیں آ رہا۔ میں نے نگاہ اٹھ کر کوٹھری کے باہر ڈالی۔ پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بیٹی! میرا نام عبداللہ ہے۔ میں سلطان محمود کا معتمد خاص ہوں اور جوگیوں کا بھیس بدل کر تمہیں یہاں سے چھڑا کر اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آیا ہوں۔"

شہزادی شگفتہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی کہنے لگی۔

"لیکن .... آپ.... آپ تو سنسکرت کے اشلوک پڑھ رہے تھے۔"

"میں سنسکرت کا عالم بھی ہوں۔ اگر مجھے سنسکرت نہ آتی ہوتی تو یہاں تک کبھی نہ پہنچ سکتا تھا۔ اب تم فکر نہ کرو۔ میں بہت جلد تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔"

شہزادی شگفتہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میرے بابا کس حال میں ہیں؟ میری امی کو کتنا دکھ ہوا ہو گا۔ یااللہ! میرے گناہ معاف کر دینا۔ میرے گناہ معاف کر دینا۔"

میں نے شہزادی شگفتہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دی اور کہا۔

"بیٹی! آنسو مت بہاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ اسی لئے تو اس نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "اس جہنم سے نکلنا آسان کام نہیں ہے۔ یہاں چار سپاہی بھی ہیں جن کے پاس نیزے، تیر کمان اور تلواریں بھی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے ساتھ آپ بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بیٹی! ہماری جان اور عزت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہی ہم دونوں کو یہاں سے اپنی حفاظت میں نکالے گا۔ تم خاموشی کے ساتھ جس طرح پہلے بیٹھی تھیں اسی طرح بیٹھی رہو۔ کل رات میں تمہارے پاس آؤں گا۔ پھر ہم یہاں سے فرار ہو جائیں گے۔ میں

تمہارے لئے کچھ پھل اور چاول بھجواؤں گا انہیں تم سیر ہو کر کھانا۔ اچھا۔ اب میں جاتا ہوں۔"

میں کوٹھری سے نکل کر باہر آ گیا۔ کوٹھری کو باہر سے بند کر کے تالا لگا دیا۔ چابی مٹھی میں تھامی اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر مندر کے ہال کمرے میں آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ پنڈت اور اس کا ساتھی دیوتا سومنات کے خالی استھان کے سامنے بیٹھے اشلوک پڑھنے کی بجائے آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ مجھے خیال گذرا کہ کہیں ان دونوں کو مجھ پر شک تو نہیں پڑ گیا! مگر اب مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ باندھ کر سر جھکا دیئے۔ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"اب وہ میری استری بننے والی ہے۔ اس کو عمدہ عمدہ میٹھے پھل اور بھوجن کھلاؤ۔"

"جو حکم مہاراج!"

یہ کہہ کر پنڈت نے اپنے ساتھی گنگو کو اشارہ کیا۔ وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ اب میں نے پنڈت سے کہا کہ میں کل کی رات اس مسلمان لڑکی کے آگے مقدس گیتا کا پاتھ کروں گا۔ پھر کہیں جا کر وہ اس لائق ہو گی کہ میری استری بن سکے۔ پنڈت کہنے لگا۔

"مہاراج! کہیں اس کی قربانی میں دیر نہ ہو جائے۔"

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "دیوتا شنکر کی اچھیا کو ہم تم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ربانی آج سے ٹھیک پندرہ روز بعد پورنماشی کی رات کو ہو گی۔

"جو حکم مہاراج۔" پنڈت نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

اس وقت رات کا تیسرا پہر گزر رہا تھا۔ مجھے پنڈت جی نے بسرام کے لئے ایک کوٹھری میں پہنچا کر وہاں چراغ جلا دیا اور ڈنڈوت بجا کر چلا گیا۔ میں نے ابھی تک وہ چار ہندو سپاہی نہیں دیکھے تھے جو شہزادی شگفتہ کو گوالیار سے اغوا کر کے یہاں تک لائے تھے۔ ان کی طرف سے مجھے اس بات کا خطرہ تھا کہ جب میں شہزادی شگفتہ کو وہاں سے لے کر فرار ہوں گا تو یہ سپاہی راز کھل جانے پر تیر چلا کر شہزادی کو ہلاک کر سکتے تھے۔ اس لئے ان کے ہتھیاروں پر قبضہ کرنا بہت ضروری تھا۔ مگر ابھی تک میں نے ان کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ میں ہرن کی کھال کے بستر پر لیٹ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ کل رات مجھے شہزادی شگفتہ کو کس طرف سے نکال کر فرار ہونا ہو گا کہ گنگو ہاتھ میں دودھ کا پیالہ لئے داخل ہوا۔

"مہاراج یہ آپ کے لئے ہے۔ دس بکریوں کا دودھ دوہ کر ایک بکری کو پلایا گیا اور پھر اس بکری کا دودھ دوہ کر پہلا پیالہ آپ کو پیش کیا جا رہا ہے۔"

میں نے شکریئے کے ساتھ دودھ کا پیالہ لے لیا اور جب گنگو جانے لگا تو اس نے ان

چار سپاہیوں کے بارے میں پوچھا جو شہزادی کو اپنی حفاظت میں گوالیار کے جنگل سے یہاں لائے تھے۔

گنگو نے ایک گہری مشکوک سی نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر ہاتھ باندھ کر کہا۔ "مہاراج! بڑے پنڈت جی ہی جانتے ہیں کہ ان سپاہیوں کو کہاں رکھا گیا ہے۔" یہ کہہ کر گنگو چلا گیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس معمولی سے پروہت نے میرے سوال پر اتنی گہری نگاہ کیوں ڈالی تھی؟ نیند تو ظاہر ہے مجھے نہ آنی تھی نہ آتی تھی اور نہ آئی۔ میں بستر پر لیٹا جاگتا رہا۔ میں نے دیا گل کر دیا تھا۔ کوٹھری میں اندھیرا تھا۔ بائیں طرف ایک روشن دان تھا جس میں سلاخیں لگی تھیں۔ اس روشن دان سے ستاروں بھری رات کی ہلکی فیروزی روشنی اندر آ رہی تھی۔ آدھی رات کے بعد مجھے باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی میری کوٹھری کے آگے سے دبے پاؤں گذر گیا تھا۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اس کے بعد کوئی آواز نہ آئی۔ میں سوچنے لگا آدھی رات کے بعد یہ کون ادھر سے گذرا ہو گا۔ اپنے شک کو رفع کرنے کے لئے میں بستر پر سے اٹھا اور دبے پاؤں کوٹھری سے باہر آیا۔ ہال کمرے میں اندھیرا تھا۔ مندر کے پنڈت کی کوٹھری بالکل سامنے استھان کے عقب میں تھی۔ اس کے بند دروازے کی دہلیز میں سے چراغ کی دھندلی روشنی باہر آ رہی تھی۔ میں برآمدے کی دیوار سے لگ کر چلتا ہوا پنڈت کی کوٹھری کے بند دروازے کے پاس آ کر رک گیا۔ اندر سے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے آوازیں پہچان لیں۔ گنگو اور پنڈت آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ گنگو کہہ رہا تھا۔ "مہاراج! یہ شخص مجھے گندھیرو کے روپ میں کوئی چالاک شعبدہ باز لگتا ہے۔ مجھے شک ہے کہ یہ مسلمان لڑکی کو اڑا کر لے جائے گا۔ جب میں دودھ لے کر گیا تو مجھ سے سپاہیوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

پنڈت کی آواز آئی۔ "اگر ایسی بات ہے تو کیوں نہ ابھی سے اسے قتل کرا دیا جائے۔"

گنگو نے کہا۔ "مہاراج! اس پر مقدس سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہوا ہے۔ یہ تو کوئی جادوگر ہے۔ ہو سکتا ہے سپاہیوں کی تلواریں بھی اس پر اثر نہ کریں اور وہ جادو کے زور سے غائب ہو جائے۔"

"پھر تم مجھے کیا مشورہ دیتے ہو؟" پنڈت نے پوچھا۔

گنگو نے جواب میں کہا۔ "مہاراج! میری رائے میں ہمیں مسلمان لڑکی کو ابھی اس وقت یہاں سے نکال کر کسی دوسری جگہ پہنچا دینا چاہئے۔ صبح ہم مشہور کر دیں گے کہ لڑکی فرار ہو گئی ہے۔"

"تمہاری رائے معقول ہے۔ تم ایسا کرو کہ ابھی تہہ خانے میں اپنے ساتھ دو سپاہی لے

کر جاؤ اور لڑکی کو وہاں سے نکال کر مندر کی چھت والے برج کی اندھیری کوٹھری میں بند کر دو۔"

"جو حکم مہاراج۔"

"اور سنو۔ لڑکی کا منہ ضرور کپڑے سے باندھ دینا۔"

میں نے یہ سنا تو تیزی سے وہاں سے ہٹ آیا اور اپنی کوٹھری میں دروازے کے پیچھے لگ کر تکنے لگا۔ گنگو پنڈت کی کوٹھری سے نکل کر تیز تیز قدموں سے ایک طرف اندھیرے میں غائب ہو گیا میں کچھ سوچ کر اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔

دن چڑھا تو پنڈت بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور بناوٹی پریشان کے عالم میں بولا کہ مسلمان لڑکی فرار ہو گئی ہے گنگو بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں مصنوعی طور پر گھبرائے ہوئے تھے۔ مجھے تو معلوم ہی تھا کہ انہوں نے شہزادی کو کس جگہ چھپا دیا ہے۔ چنانچہ میں نے بڑے سکون سے آنکھیں بند کر لیں اور کہا۔ "دیوتاؤں کو اگر یہی منظور تھا تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"

پنڈت بولا۔ "مہاراج! اب دیوتا سومنات کی قربانی کا کیا ہو گا؟"

میں نے کہا۔ "ہمیں ایک اور مسلمان لڑکی پکڑ کر لانی ہو گی۔ مگر کیا تمہارے سپاہی کوٹھری کے باہر پہرہ نہیں دے رہے تھے؟"

پنڈت نے کہا۔ "سپاہی اس وقت سو رہے تھے کہ لڑکی روشندان توڑ کر باہر نکل گئی اور سرنگ کے راستے فرار ہو گئی۔"

میں نے آنکھیں کھول دیں اور پنڈت سے کہا۔ "مجھے آج سارا دن مندر کی چھت پر دریا کی طرف منہ کر کے بیٹھ کر تپسیا کرنی ہو گی۔ پھر میں تمہیں بتا سکوں گا کہ مسلمان لڑکی فرار ہو کر کہاں گئی ہے؟"

اب پنڈت گھبرایا۔ کہنے لگا۔ "مہاراج! آپ کو زحمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کوئی دوسری مسلمان لڑکی پکڑ لائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "وہ تمہاری مرضی ہے لیکن میں ریاضت کرنے کو تیار ہوں۔"

"نہیں مہاراج! آپ تکلیف نہ اٹھائیں۔ ہم بہت جلد گوالیار کے قلعے سے کسی دوسری مسلمان لڑکی کو اغوا کر کے لے آئیں گے۔ ہمارے لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں۔"

میں جان بوجھ کر خاموش ہو گیا۔ میں سارا دن مندر کے بڑے کمرے میں استھان کے پتھر کے آگے بیٹھ کر جھوٹ موٹ عبادت کرتا رہا۔ میں رات کی تاریکی چھا جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا منصوبہ اسی رات شہزادی شگفتہ کو وہاں سے نکال کر لے جانے کا تھا۔ میں نے

پنڈت سے باتوں ہی باتوں میں معلوم کر لیا تھا کہ چاروں سپاہی رات کو مندر کی ڈیوڑھی میں پہرہ دیتے ہیں جہاں ان کے گھوڑے بندھے ہوئے ہیں۔ اسی دوران میں مجھے اس بات کا بھی شک پڑ گیا تھا کہ پنڈت آج رات شہزادی شگفتہ کو برج والی کوٹھری سے نکال کر اپنی کوٹھری میں لانے کا پروگرام بنا چکا ہے۔ اس لئے میں عمداً استھان کے پاس ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں سے مجھے اوپر چھت پر جاتی سیڑھیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ چھت پر جانے کا صرف یہی ایک زینہ ہے۔

شام کو میں نے اپنی ریاضت کی صف لپیٹ دی اور دریا کا نظارہ کرنے کے بہانے اوپر چھت پر چلا گیا۔ سورج دور مغربی پہاڑیوں کے پیچھے غائب ہو رہا تھا اور مندر کے نیچے.... بہتے ہوئے دریا میں اس کی سرخ کرنوں نے آگ سی لگا رکھی تھی۔ میری نظریں دور کونے والے برج کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ جس کی کوٹھری کے بند دروازے پر تالا پڑا تھا۔ شہزادی شگفتہ اسی کوٹھری میں قید تھی۔ مجھے اوپر جاتا دیکھ کر گنگو بھی اوپر آ گیا اور میرے پاس ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔ "مہاراج! کبھی اس چھت پر پوجا کے لئے آنے والی خوبصورت ہندو عورتوں کا جمگھٹا لگا کرتا تھا جو دریا کے دیوتا کے بھجن گایا کرتی تھیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"گنگو وہ وقت پھر آ جائے گا۔ فکر مت کرو۔ دیوتا شنکر ہماری مدد کو خود نیچے آ رہے ہیں۔"

پھر جب رات کا اندھیرا بڑھنے لگا تو میں چھت سے اتر آیا۔ گنگو بھی میرے ساتھ ہی نیچے آ گیا۔ میں نے گنگو سے کہا۔ "پنڈت سے کہو کہ ایک گھنٹے بعد ہم بھوجن اس کی کوٹھری میں کریں گے۔"

"جو حکم مہاراج!" یہ کہہ کر گنگو پنڈت کی کوٹھری کی طرف چلا گیا۔ ڈیوڑھی میں آ کر میں نے دیکھا کہ ایک سپاہی چل پھر کر پہرہ دے رہا تھا۔ باقی تینوں سپاہی ڈیوڑھی کی کوٹھری کے اندر بیٹھے تھے۔ چراغ جل رہا تھا۔ جو سپاہی پہرہ دے رہا تھا میں نے اسے ایک طرف بلا کر کہا کہ اسے پنڈت جی مہاراج نے بلایا ہے۔ اس نے نیزہ وہیں دیوار کے ساتھ لگا دیا اور خود زینہ چڑھ کر اوپر جانے لگا۔ میں نے پیچھے سے اس کی گردن پر پوری طاقت سے ایک ہاتھ مارا۔ اس کی گردن ٹوٹ کر لٹک گئی اور وہ زینے پر لڑھک گیا۔ میں نے اسے گھسیٹ کر دروازے کے پیچھے ڈالا اور ڈیوڑھی میں آ کر اس کے ساتھیوں کے پاس کوٹھری میں گیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ ان میں سے کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ان کے تیر کمان، نیزے اور تلواریں کونے میں پڑی تھیں۔ وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ ایک نے پوچھا مہاراج

آپ کیسے آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ ڈیوڑھی میں سانپ نکل آیا ہے۔ اسے ہلاک کرو تا کہ میں پوجا پاٹھ کے لئے اوپر جا سکوں۔ تینوں سپاہی بڑی سعادت مندی کے ساتھ کوٹھری سے باہر نکل کر ڈیوڑھی میں مشعل جلا کر سانپ کو ڈھونڈنے لگے۔ انہوں نے تلواریں پکڑ رکھی تھیں۔ اس دوران میں میں نے کونے میں رکھی چاروں کمانوں کی رسیاں کاٹ ڈالیں۔ مجھے ان کی کمانوں سے ہی خطرہ تھا۔ ان کمانوں سے نکلا ہوا تیر شہزادی شگفتہ کو دور سے بھی ہلاک کر سکتا تھا۔

جب انہیں سانپ کہیں نہ ملا تو میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ سانپ باہر بھاگ گیا ہو گا۔ میں جاتا ہوں۔ ایک نے پوچھا ہمارا ساتھی جو یہاں پہرہ دے رہا تھا وہ کہاں چلا گیا ہے؟ میں نے جلدی سے جواب دیا کہ اسے پنڈت جی نے بلایا تھا - وہ ابھی ابھی اوپر گیا ہے۔ تینوں کوٹھری میں چلے گئے۔ میرے لئے اب میدان صاف تھا۔ مجھے سپاہیوں کے تیروں کا جو خطرہ تھا اب وہ خطرہ دور ہو چکا تھا۔ ایک بات کی ناکامی ضرور ہوئی تھی کہ میں گھوڑے حاصل کرنے اور انہیں ڈیوڑھی سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پر چھپا دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن اب میں ان کاموں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وقت گزرتا چلا جا رہا تھا اور عین ممکن تھا کہ بدخصلت پنڈت برج والی کوٹھری پر حملہ کرنے ہی والا ہو۔

چنانچہ میں وہاں سے سیدھا مندر کی چھت پر آ گیا۔ ابھی رات کا پہلا پہر تھا اور پنڈت شاید میرے ساتھ کھانا کھانے اور مجھے میری کوٹھری میں سلانے کے بعد برج والی کوٹھری پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔ میں نے ایک مضبوط رسی اپنے ساتھ رکھ لی تھی۔ یہ رسی میری کمر کے ساتھ بندھی تھی۔ چھت پر آتے ہی میں سیدھا برج کی طرف گیا اور اس کے دروازے پر لگا ہوا تالا ہاتھ کی معمولی سی ضرب سے توڑ دیا۔ میں نے دیکھا کہ شہزادی شگفتہ کے منہ پر کپڑا بندھا تھا اور وہ رسیوں میں جکڑی فرش پر پڑی تھی۔ میں نے جاتے ہی اسے آزاد کیا۔ خوف کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکلنے لگی تھی کہ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"بیٹی! میں ہوں عبداللہ۔ چلو میرے ساتھ یہاں سے نکل چلو۔ فرار ہونے کا وقت آ گیا ہے۔"

میں اسے کوٹھری سے نکال کر چھت کی مغربی جانب آ گیا۔ یہاں دیوار کی اونچائی تین منزلوں سے زیادہ نہیں تھی اور نیچے نوکیلی چٹانوں کی بجائے جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ میں نے چھت کے کنگرے کے ساتھ رسی باندھ کر نیچے لٹکا دی۔ اور شگفتہ سے کہا کہ وہ رسی کی مدد سے نیچے اتر جائے۔ اندھیرے میں وہ نیچے اترتے ہوئے پہلے تو ڈری مگر میرے حوصلہ

دینے پر وہ رسی کو مضبوطی سے تھام کر دیوار کے ساتھ پاؤں ٹکا کر آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔ جب اس کے پاؤں زمین کے ساتھ جا لگے تو اس نے رسی کو زور سے ہلا دیا۔ اس کے بعد میں رسی کے ذریعے نیچے اتر گیا۔ مجھے نیچے آتے ہوئے بمشکل دس سیکنڈ لگے ہوں گے۔ میں نے شگفتہ کو ساتھ لیا اور دریا کی طرف چل پڑا۔ راتوں رات دریا پار کر کے میں احمد نگر کے دکھن کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ اسی طرف ہندو کاشتھیوں کا ایک گاؤں تھا۔ چونکہ میں ایک جوگی یا رشی کے بھیس میں تھا اس لئے مجھے یقین تھا کہ وہاں سے دو گھوڑے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ کاشتھیوں کے گاؤں میں پہنچتے پہنچتے ہمیں صبح ہو گئی۔ میں نے شگفتہ کو ایک جگہ کھیتوں میں چھپ جانے کو کہا اور خود گاؤں میں داخل ہو گیا۔ یہاں ایک زمیندار سے اپنی عقیدت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دو گھوڑے حاصل کئے اور شگفتہ کو لے کر گوالیار کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے جنگل کے مشرقی کنارے کا راستہ اختیار کیا جو اگرچہ طویل تھا مگر بہت محفوظ تھا۔ ہمیں گوالیار پہنچتے پہنچتے پانچ دن لگ گئے۔ سلطان محمود غزنی سے واپس آ چکا تھا۔ شہزادی شگفتہ کو قلعے دار کے حوالے کر دیا گیا۔ میں نے ساری روداد سلطان محمود کو سنا دی۔ مہاراجہ گوالیار ارجن کو بوڑھے پجاری اور اس کے درباریوں سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ سلطان محمود میری کارکردگی سے بہت خوش ہوا۔ وہ مجھے اپنا نائب وزیر مقرر کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے بڑے ادب سے معذرت چاہی اور کہا کہ میں ملک ہندوستان کے مشرق میں سیاحت کے لئے جانا چاہتا ہوں۔ سلطان محمود نے مجھ سے وعدہ کیا کہ واپسی پر میں غزنی ضرور آؤں گا۔ میں نے سلطان سے اجازت لی اور گھوڑے پر سوار ہو کر گوالیار سے شمال مشرق کی طرف چل پڑا۔

احمد آباد میں اپنے قیام کے دوران میں نے راجہ بکرماجیت کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا کہ وہ ایک فقیر راجہ ہے اور اجین میں وہ اپنے شاہی محل میں بنی ہوئی ایک کٹیا میں رہتا ہے اور اس کا سرمایہ ایک مٹی کا پیالہ اور بوریا ہے۔ منزلوں پر منزلیں طے کرتا میں اجین پہنچ گیا۔ مسلمان ابھی یہاں تک نہیں پہنچے تھے۔ سلطان محمود کا لشکر احمد آباد اور گوالیار کے آس پاس کے رجواڑوں کو فتح کر کے مطیع بنانے کے بعد غزنی واپس جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اجین میں ایک بہت بڑا مندر تھا جس کا نام مہاکال تھا۔ یہ مندر بکرماجیت نے بنوایا تھا۔ جہاں بتوں کی پوجا ہوتی تھی۔ جو برہمن اور پجاری اس مندر میں رہتے تھے انہیں راجہ کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا۔

اجین میں رعایا بڑی خوش حال تھی۔ راجہ کا اپنی رعایا سے سلوک برادرانہ تھا۔ اس

وقت راجہ بکرماجیت کی عمر پچاس سال کی ہو گئی تھی۔ وہ دن کے وقت دربار میں آ کر اہم فیصلے کرتا اور رات کو دیر تک اپنی کٹیا میں بیٹھا عبادت کرتا رہتا تھا۔ اس کی کٹیا کے گرد اگرچہ پہرا لگا ہوتا مگر اس سے ہر کوئی مل سکتا تھا۔ ایک مدت سے میری کسی حیثیت کا تعین ظاہر نہیں ہوا تھا۔ میں ہر جگہ ایک اجنبی سیاح کی شکل میں داخل ہوتا تھا۔ اجین پہنچ کر میرا خیال تھا کہ شاید یہاں میری کسی حیثیت کا پہلے سے ہی تعین ہو چکا ہو۔ یعنی ہو سکتا ہے لوگ مجھے یہاں کے کسی مندر کا پجاری سمجھ کر میرا استقبال کریں۔ میں گھوڑے پر سوار شہر کی کشادہ سڑکوں پر سے گزر رہا تھا۔ میرا ارادہ راجہ بکرماجیت کے محل یں اس سے ملاقات کرنے کا تھا۔ اس وقت دن کا دوسرا پہر گزر رہا تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ ان علاقوں میں ویسے بھی سردی زیادہ نہیں پڑتی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ راجہ بکرماجیت اس وقت دربار میں مقدموں کے فیصلے کر رہا ہے اور اس سے شام کے بعد کٹیا میں ملاقات کی جا سکتی ہے۔

میں وقت گذارنے کے لئے شہر سے باہر نکل گیا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر بھوج کے درختوں کی چھاؤں میں کتنی ہی گپھائیں بنی ہوئی ہیں۔ یہ گھاس پھونس سے بنائی گئی مخروطی جھونپڑیاں تھیں جن میں پرانے زمانے میں جوگی لوگ رہا کرتے تھے۔ ان کے وسط میں ایک چبوترے پر ایک قدرے بڑی جھونپڑی بنی تھی جس کے اوپر زعفرانی رنگ کا ایک جھنڈا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو ان جوگی لوگوں کے ساتھ بات چیت کر کے کچھ وقت گذارتے ہیں۔ میں نے گھوڑے کو ان جھونپڑیوں کی طرف ڈال دیا۔

جونہی میں جھونپڑیوں کے درمیان پہنچا۔ ایک نوجوان جوگی جھونپڑی سے نکل کر دونوں بازو پھیلائے خوشی سے چلاتا ہوا میری طرف بڑھا۔

"سوامی وشال آ گئے۔ سوامی وشال دیو آ گئے۔"

اس کی آواز پر تقریباً سب ہی جھونپڑیوں سے جوگی باہر نکل آئے اور انہوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ یہ سب کے سب نوجوان تھے اور گیروے لبادوں میں ملبوس تھے۔ ماتھے پر سرخ تلک لگے تھے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہاں میری حیثیت کا پہلے ہی سے تعین ہو چکا ہے اور میں یہاں کسی سوامی وشال دیو کے روپ میں داخل ہوا ہوں۔ میں گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ وہ لوگ پراکرتی ہندی زبان بول رہے تھے جس میں سنسکرت کے علاوہ اس علاقے کی زبان کے الفاظ بھی شامل تھے۔ میرے لئے اس زبان کو سمجھنا اور بولنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ میں اب یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جس وشال دیو نامی سوامی جی کی شکل میں وہاں ظاہر ہوا ہوں وہ کون تھا اور یہاں کیا کرتا تھا؟ کیا وہ ان لوگوں کا سب سے بڑا گرو دیو تھا یا خود ایک جوگی تھا۔ نوجوان جوگی مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ میں کہاں چلا گیا تھا۔ اتنا عرصہ کہاں رہا۔

ایک جوگی نے کہا۔

"گرو دیو! کمار گری! آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔ آؤ ان سے ملیں۔ وہ اپنی گپھا میں گیان دھیان کر رہے ہیں۔"

ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ جوگیوں کے اس اجتماع یا گروہ کا میں سربراہ نہیں تھا۔ اس گروہ کا سربراہ کوئی گرو دیو کمار گری تھا اور میں اس کا معتمد چیلا تھا اور میرا نام وشال دیو تھا۔ کیونکہ یہ جوگی مجھے سوامی کے القاب سے بلاتے تھے جو ادب کا لقب تھا۔

جوگی مجھے اپنے ساتھ لے کر درمیان والی سب سے نمایاں جھونپڑی کی طرف بڑھے۔ جھونپڑی کا بانس کا دروازہ بند تھا اور اس کے باہر چبوترے پر جوگیوں نے عقیدت کے طور پر کنول کے پھول ڈال رکھے تھے۔ جوگی جھونپڑی کے سامنے جا کر نیم دائرے کی شکل میں زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ تھوڑی دیر بعد جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور اس کے اندر سے ایک دہرے بدن کا جوگی باہر نکلا۔ اس کے چہرے کا رنگ گلابی تھا۔ سر کے بال' بھویں اور مونچھیں منڈی ہوئی تھیں۔ جسم پر صرف ایک ہی گیروے رنگ کا لبادہ لپٹا تھا۔ آنکھوں میں بے حد کشش تھی۔ چہرے پر ایک ملائمت اور محبت کا احساس تھا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔

"وشال دیو! میں جانتا تھا تم ایک روز میرے پاس واپس آؤ گے۔ میں تمہیں گاؤں گاؤں جا کر غریبوں بیماروں کی خدمت کرتے اور کیلاش پربت کی چوٹیوں پر ریاضتیں کرتا دیکھ لیا کرتا تھا۔"

میں نے بھی ادب سے سینے پر ہاتھ باندھ لئے تھے۔ میری زندگی کا مشن وقت اور تاریخ کے ساتھ ساتھ سفر کرنا تھا۔ اس لئے مجھے ہر قسم کے ماحول میں رہ کر زندگی کی بوقلمونیوں کو قریب سے دیکھنے میں لذت حاصل ہوتی تھی۔ میری شکل وشال دیو سے ملتی تھی یا قدرت نے اصلی وشال دیو کو کچھ عرصے کے لئے گم کر کے اس کی جگہ مجھے گرو دیو کمار گری کے پاس بھیج دیا تھا۔ کیونکہ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے اپنے دھیان میں یا مراقبے میں مجھے بیماروں کی خدمت کرتے اور کیلاش پربت پر عبادت. و ریاضت کرتے دیکھا ہے تو وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ کیونکہ اس زمانے کے رشی منی اور جوگی شدید ترین اور اذیت بخش ریاضتوں کے بعد گیان دھیان کا وہ مقام حاصل کر لیا کرتے تھے۔ گرو دیو کمار گری نے ضرور اپنے خاص چیلے وشال دیو کو .... عالم دھیان میں کیلاش پربت پر دیکھا ہو گا۔ مگر قدرت کی ستم ظریفی سے اصلی وشال دیو کچھ مدت کے لئے غائب ہو گیا تھا اور اس کی جگہ میں وہاں اس کی شکل میں نمودار ہو گیا تھا۔

گرو دیو کمار گری کے سینے پر زمرد و عقیق کی مالائیں چمک رہی تھیں۔ کانوں میں بھی قیمتی پتھروں کی بالیاں تھیں۔ وہ بہت صحتمند جوگی تھا۔ مگر اس کا چہرہ بہت نرم اور دنیا کی ہر شے سے محبت کرنے کے لطیف جذبے سے چمک رہا تھا۔ وہ مجھے بڑے پیار سے اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔ اس کی جھونپڑی میں عود سلگ رہا تھا۔ فرش پر ہرن کی کھالیں بچھی تھیں۔ وسط میں ایک استھان بنا تھا جس پر صندل کی چوکی پڑی تھی۔ گرودیو کمار گری چوکی پر پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اور قریب ہی پڑی کانسی کی ایک لٹیا کی طرف اشارہ کیا۔

"وشال بیٹا!! اس میں گنگا میا کا جل ہے اس کا ایک گھونٹ پی لو۔ تم نے بڑی تپسیا کی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے جسم میں ریاضت اور تپسیا کی آگ دہک رہی ہے۔"

خدا جانے اسے میرے جسم میں کونسی آگ نظر آ رہی تھی۔ بہرحال میں نے بڑے آرام سے لٹیا میں سے گنگا کے جل کا ایک گھونٹ پی لیا۔

کمار گری نے کہا۔ "بچہ وشال! اب تم یہ کپڑے بدل کر جوگیوں کا گیروا لباس پہن لو۔"

"جو آگیا مہاراج!"

میں گرودیو کمار گری کا خاص چیلا وشال دیو بن کر جوگیوں کی اس کٹیا میں رہنے لگا جہاں دور دور سے آئے ہوئے جوگی نوجوانوں کو یوگا کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ گرودیو کمار گری کو نچلے طبقے کے ساتھ ساتھ امراء اور شرفاء کے طبقے میں بھی بڑی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ راجہ بکرماجیت بھی کمارگری کا بڑا احترام کرتا تھا۔ یہ محض اس لئے تھا کہ کمارگری کا کردار بے داغ تھا۔ میں نے اس کے قریب رہ کر دیکھا کہ وہ انتہائی نیک دل اور پاکباز انسان تھا۔ دن میں کسی وقت وہ اجین شہر کے گلی کوچوں میں جاتا اور بیماروں کی خبرگیری کرتا۔ ان کی خدمت کرتا۔ ان کے حق میں دعا کرتا۔ عورتوں کے قریب سے گذرتے ہوئے آنکھیں نیچی کر لیتا۔ کبھی کسی کے ساتھ اونچی آواز میں ہم کلام نہ ہوتا۔ جو کوئی اس کے پاس آتا اسے نیکی اور پاکیزگی کردار کی تلقین کرتا۔ اس کی باتوں کا لوگوں پر فوری اثر ہوتا تھا کیونکہ گرودیو کمارگری خود ایک پاکباز اور سچا انسان تھا۔ مجھے اس کی معیت میں رہتے ہوئے ایک روحانی خوشی مل رہی تھی۔ صبح سورج نکلنے کے بعد وہ اپنے چیلوں کے ساتھ ندی پر جا کر اشنان کرتا۔ بکری کے دودھ کا ایک پیالہ پیتا اور چبوترے پر پالتی مار کر بیٹھ جاتا۔ اس کے سارے چیلے اس کے سامنے نیم دائرے کی صورت میں ادب سے بیٹھ جاتے۔ میں ان سب سے آگے ہوتا کیونکہ میں گرودیو کمارگری کا خاص چیلا تھا۔ پھر وہ اپنا اپدیش شروع کر دیتا۔ میں نے دیکھا کہ اس کو اپنشدوں اور ویدوں کا بڑا گہرا علم تھا۔ والمیکی کی سنسکرت کی برانائین اسے زبانی یاد تھی۔ ایک پہر دن چڑھے اس کا اپدیش ختم ہو

جاتا۔ چیلے صفائی ستھرائی میں لگ جاتے۔ کمارگری اپنی جھونپڑی میں بیٹھ کر گیان دھیان میں مشغول ہو جاتا اور میں کچھ چیلوں کو ساتھ لے کر کھیتوں اور باغ میں پھل پھول اور ترکاریاں چننے چل دیتا۔

ہمارے مٹھ سے کوئی نو کوس کے فاصلے پر ایک ندی بہتی تھی۔ اس ندی کے پار ایک شاہی رقاصہ کا شاندار محل تھا جس کی سنگ مرمر کی سیڑھیاں ایک جانب سے ندی کے پانی میں اتر گئی تھیں۔ اس محل کے ستونوں کو تر ناری کے نیلے پھولوں والی بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جس زمانے میں راجہ بکرماجیت نے جوگ دھارن نہیں کیا تھا اور وہ دوسرے راجاؤں کی طرح عیش و عشرت سے دن گذارتا تھا تو یہ رقاصہ اس کے دربار کی شاہی رقاصہ اور مغنیہ تھی۔ اس کا نام رامائینی تھا۔ راجہ کے لوگ دھارن کرنے کے بعد اس رقاصہ سے شاہی محل چھٹ گیا تھا۔ اب وہ ندی کنارے والے اپنے محل میں ہی رہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی شاندار کشتی میں سوار ہو کر اجین شہر کے امراء کے محلوں اور حویلیوں میں جا کر ان سے ملتی اور تجدید ملاقات کرتی اور رات بھر اپنے مذہبی رقص کا مظاہرہ کرتی۔ رقاصہ رامائینی کے حسن کی بڑی شہرت تھی۔ اگرچہ اس کی عمر چالیس برس کے قریب تھی مگر لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ اب بھی اتنی حسین ہے کہ جو کوئی اسے دیکھتا ہے بس دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔

ایک روز ایسا ہوا کہ صبح کے اپدیش میں ایک چیلا موجود نہیں تھا۔ گرودیو کمارگری نے مجمع پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا کہ جوگی مراری نظر نہیں آ رہا۔ وہ کہاں ہے؟ ایک چیلے نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ گرودیو! مراری شہر گیا ہوا ہے۔ گرودیو نے کوئی خیال نہ کیا۔ مگر جب سارا دن گذر گیا اور مراری مٹھ میں واپس نہ آیا تو گرودیو کمارگری کو تشویش ہوئی۔ اس نے مجھے مراری کی تلاش کا حکم دیا۔ میں جوگیوں کے مٹھ سے نکل کر شہر کی طرف چلنے لگا تو ایک نوجوان چیلے نے مجھے ایک طرف لے جا کر ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ ”سوامی وشال دیو! میرا نام نہ بتائیں تو میں ایک بات کہوں۔“

میں نے کہا۔ ”ضرور کہو۔ میں تمہارا نام کسی کے آگے نہیں لوں گا۔ بولو کیا بات ہے؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

اس چیلے نے مجھے بتایا کہ مراری کو رقاصہ رامائینی سے پریم ہو گیا ہے اور اس نے ہمارا مٹھ چھوڑ کر اس کے محل میں ڈیرہ جما لیا ہے۔ وہ کہہ گیا تھا کہ اب وہ یہاں کبھی واپس نہیں آئے گا۔ شاہی رقاصہ رامائینی کے محل میں اس کا نوکر بن کر رہے گا۔

میں نے یہ ساری بات خاموشی سے سنی اور پھر شہر کا ایک چکر لگا کر واپس آ گیا۔ میں نے گرودیو کمارگری کو بتایا کہ شہر کے لوگوں سے پتہ چلا ہے کہ چیلا مراری شاہی رقاصہ

رامائینی کے پریم میں گرفتار ہو کر اس کے محل میں جا کر نوکر بن گیا ہے اور وہیں رہنے لگا ہے۔ گرودیو کمارگری کے دل آویز چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے کہا۔ ”نادان ہے۔ سورگ کو چھوڑ کر نرک کی طرف چلا گیا ہے۔ ہم اسے وہاں سے واپس لائیں گے۔“ اسی روز شام ہونے سے کچھ پہلے گرودیو کمارگری نے مجھے ساتھ لیا۔ کھڑاویں پہنیں۔ ہاتھ میں صندل کی لکڑی کا گنگا جل سے بھرا ہوا کرمنڈل پکڑا اور شاہی رقاصہ رامائینی کے محل کی طرف چل پڑا۔ وہ اس سے اپنا چیلا واپس لینے جا رہا تھا جو اس کے خیال میں بہشت کو چھوڑ کر جہنم کی آگ کے شعلوں میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ دو کوس تک کھیتوں اور درختوں میں ہم پیدل چلتے چلے گئے۔ کمارگری خاموش رہا۔ راستے میں اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ ہم ندی پر پہنچ گئے۔ اس ندی کا پاٹ پچاس ساٹھ گز تھا۔ ندی کے دوسرے کنارے پر ھوج اور آم کے گھنے جھنڈوں میں رقاصہ رامائینی کا پرانا مگر نہایت شاندار اور پرشکوہ مرمریں محل نظر آ رہا تھا۔ یہ محل سیتا پھل، کیلے اور آم کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ ستونوں اور دیواروں پر جنگلی پھول مسکرا رہے تھے۔ ندی پار کرنے کے لئے وہاں کوئی کشتی نہیں تھی۔ میں نے گرودیو کمارگری سے کہا..... ”گرو جی! یہاں کوئی کشتی دکھائی نہیں دیتی۔ کیا ہم تیر کر ندی پار کریں گے؟“

گرودیو کمارگری کے ہونٹوں پر خفیف سا تبسم نمودار ہوا۔ اس نے کہا۔ ”ہم چل کر ندی پار کریں گے۔ تم میرا ہاتھ تھامے رکھنا اگر چھوڑ دیا تو ندی میں ڈوب جاؤ گے۔“

میں کچھ حیران سا ہوا کہ یہ شخص یا کہہ رہا ہے؟ بھلا کوئی انسان پانی پر چل سکتا ہے۔ پھر سوچا کہ شاید اس نے سالہا سال کی ریاضت سے یہ مقام حاصل کر لیا ہو جس سے پانی پاؤں کے نیچے شیشے کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا اور اپنا دایاں پاؤں بڑھا کر ندی کے پانی کی سطح پر رکھ دیا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ ہی اپنا دایاں پاؤں بھی پانی کی لہروں پر رکھ دیا۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میرے پاؤں کے نیچے ندی کا پانی پتھر کی طرح سخت تھا۔ آج بھی میں یہاں کراچی میں بیٹھا جب اس لمحے کا تصور کرتا ہوں تو مجھے اپنے پاؤں کے نیچے پانی کی سنگین سختی محسوس ہوتی ہے۔

میں نے کمارگری کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور ہم دونوں ندی کی لہروں پر یوں چل رہے تھے جیسے کسی مدان میں سے گزر رہے ہوں۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر گرودیو کمارگری محل کی سیڑھیاں چڑھ کر رامائینی کے محل کے بند دروازے کے آگے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنی گردن میں سے زمرد کی مالا اتار کر اپنے ہاتھ میں پکڑی اور بلند آواز سے کہا۔

"رامائینی! ہم تمہارے محل پر اپنے چیلے کو واپس لینے آئے ہیں۔ ہمیں ہمارا بچہ واپس کر دو۔ ہم چلے جائیں گے۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے گا۔"

میں نے اس سے پہلے گرودیو کمارگری کی آواز میں اتنی گونج کبھی نہیں سنی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بڑا کرنی والا جوگی تھا۔ اس کی ریاضت' تپسیا اور پاکبازی نے اس کی روح میں ایک زبردست طاقت بھر دی تھی - میں سینے پر ہاتھ باندھے اس کے پہلو میں خاموش کھڑا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک سیاہ چشم' سیاہ گیسوؤں والی دیوداسی نے گرودیو کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور کہا۔ "مہاراج! مالکن نے عرض کی ہے کہ اندر تشریف لے آیئے۔ آپ کی امانت آپ کو مل جائے گی۔"

میرا خیال تھا کہ شاید گرودیو محل کے اندر نہیں جائیں گے۔ کیونکہ رقاصہ رامائینی ان کا خیر مقدم کرنے خود نہیں آئی تھی۔ گرودیو کمارگری کمال خاکساری سے کام لیتے ہوئے مسکرائے اور کہا۔ "ہم رامائینی کی خواہش کا پالن کریں گے۔" انہوں نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے محل میں داخل ہو گئے۔ محل کیا تھا ایک خواب کی دنیا آباد تھی۔ جگہ جگہ عود و عنبر سلگ رہے تھے۔ سنگ مرمر کے دالان میں جگہ جگہ چاندی ایسے فوارے اچھل رہے تھے۔ دیوداسی ہمیں دالان میں سے گزار کر دوسرے بڑے ہال کمرے میں لے گئی۔ اسکی خوبصورتی بھی جنت نظیر تھی۔ قالینوں کا فرش بچھا تھا۔ نازک اندام دیوداسیاں بیٹھی گیندے اور گلاب کے پھولوں کے ہار پرو رہی تھیں۔ وسط میں ایک حوض تھا جس میں فوارہ چل رہا تھا۔ ایک طرف صندل کے تخت پر ایک سیاہ گھنگریالے بالوں والی حسین مغنیہ بیٹھی وچتر وینا بجا رہی تھی۔ وینا کے دھیمے دھیمے سروں سے مہکتی ہوئی فضا مزید خواب آلود ہو رہی تھی۔ قالین پر گلاب اور گیندے کے پھول بکھرے پڑے تھے۔ شمع دانوں میں صندل کے چراغ روشن تھے۔

دیوداسی ہمیں دو چوکیوں پر بٹھا کر اندر چلی گئی۔ فضا میں نجور کی خواب پرور خوشبوؤں میں وچتر وینا کے پرسوز سر مخلوط ہو رہے تھے۔ گرودیو کمارگری کمر بالکل سیدھے کئے' چہرہ سامنے اٹھائے گوتم بدھ کی طرح بیٹھے تھے۔ ان کا چہرہ سنجیدہ' آنکھیں خاموش اور پرسکون تھیں۔ اچانک دو ستونوں کے درمیان لٹکا ہوا سرخ کم خواب کا پردہ ایک طرف ہٹا اور رقاصہ رامائینی نمودار ہوئی۔ وہ حسن کا ایک مجسمہ تھی۔ لمبے سیاہ بالوں میں کنول کے پھول سجے ہوئے تھے _ آنکھوں میں گہرا کاجل لگا تھا۔ اس کی گود میں ہرنی کا ایک بچہ تھا جس کو وہ گلاب کے پھول کھلا رہی تھی۔ اس نے ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ ہم دونوں کو دیکھا۔ دیوداسی نے آگے بڑھ کر اس کی گود سے ہرنی کے بچے کو لے لیا۔ رامائینی نے دونوں ہاتھ

جوڑ کر گرودیو کمارگری کو پرنام کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ رقاصہ رامائینی کے انداز میں ایک طنز چھپا ہوا تھا۔ وہ ہمارے سامنے تخت پر نیم دراز ہو گئی اور بولی۔

"مہاراج! میرے دھن بھاگ کہ آپ کسی وجہ سے ہی سہی لیکن میری کٹیا میں پدھارے۔ فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟ آپ کا اس ماحول میں دم تو ضرور گھٹتا ہو گا مہاراج - مگر میں اس سے بہتر ماحول آپ کو پیش نہیں کر سکتی۔"

گرودیو کمارگری کے چہرے پر وہی پرسکون نرم مسکراہٹ تھی - اس نے مالا والا ہاتھ تھوڑا سا اوپر اٹھا کر کہا۔

"رامائینی تم نے ہماری عزت بڑھائی ہے۔ ہم تمہارا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہمارا ایک چیلا مٹھ سے فرار ہو کر تمہارے پاس آ گیا ہے۔ ہم اسے واپس لینے آئے ہیں۔"

رقاصہ رامائینی کے ہاتھ میں گیندے کا ایک پھول تھا۔ اس نے پھول کو ہوا میں اچھالتے ہوئے ایک ہلکا سا نقرئی قہقہہ لگایا۔ پھر گرودیو کی طرف دیکھ کر بولی۔

"مہاراج! آپ کے چیلے کو میں نے نہیں بلایا تھا۔ وہ خود میرے محل میں آیا ہے۔"

کمارگری بولے۔ "رامائینی! ویدوں میں لکھا ہے کہ جگت میں سب سے بڑا جنم رقص کی لیک ہے۔ مراری نا سمجھ ہے۔ ابھی اس کا ابھیاس ادھورا ہے۔ وہ تمہارے حسن کے فریب میں پھنس گیا۔ میں اسے اس جنم سے نکال کر واپس اپنے سورگ میں لے جانا چاہتا ہوں۔"

رقاصہ رامائینی نے زیرلب مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے وچتر وینا کے سروں کو خاموش ہو جانے کے لئے کہا۔ دیوداسی کی انگلیاں وینا کے چاندی کے تاروں پر وہیں رک گئیں۔

"مہاراج!" رامائینی کے انداز میں کٹیلا طنز تھا۔ "آپ اپنے جس سورگ کی بات کر رہے ہیں اس سورگ نے مراری کے نوجوان خون کو منجمد کر دیا تھا۔ بھگوان نے اسے یہ خون اس لئے نہیں دیا تھا کہ وہ اسے موت سے پہلے ہی رگوں میں جما کر سرد کر دے۔ آپ کے مٹھ میں اسے سوائے روح ریاضت اور بتوں کے آگے سنگین سجدوں کے سوا اور کیا مل سکتا تھا۔ میرے محل میں اس کی اپنی کھوئی ہوئی زندگی پھر سے مل گئی ہیں۔ جایئے میرے باغ میں جا کر دیکھئے۔ وہ اس وقت اپنی حسین ہم جولیوں کے ساتھ صندلیں چراغوں کی روشنی میں رقص کر رہا ہے۔"

گرودیو کمارگری ایک لمحے کے لئے چپ رہے - میں نے ان کے چہرے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہاں وہی سکون اور دل آویز مسکراہٹ تھی - انہوں نے کہا۔ "مراری نادان

ہے تمہاری طرح وہ بھی مایا کے لوبھ میں گرفتار ہو گیا ہے۔ جس کو تم زندگی کی جوت کا نام دیتی ہو ویدوں نے اسے انسان کی سب سے بڑی بھول بتایا ہے۔"

راماینی بولی۔ "مہاراج! کیا ویدوں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ آکاش کے دیوتا بھی دیویوں کے پریم میں گرفتار ہوتے ہیں اور اپنی برسوں کی ریاضت چھوڑ کر شوخ چشم دیویوں کے غلام بن جاتے ہیں۔ اگر اس مایا سے دیوتا اپنا دامن نہیں بچا سکے تو اس میں غریب مراری کو کیوں دوش دیتے ہیں۔"

کمارگری بولے۔ "راماینی! اس میں مراری کا کوئی دوش نہیں۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔ قصور تمہاری حد سے بڑھی ہوئی شعلہ بیانی کا ہے جس کی شہرت کے گھنے سیاہ بادل نوجوانوں کے دلوں کو اپنی تاریکیوں میں نگل لیتے ہیں۔"

راماینی تخت پر نیم دراز تھی - وہ ایک دم سے ایسے بھڑک کر اٹھ بیٹھی جیسے کسی ناگن کو چھیڑ دیا ہو۔ لیکن فوراً ہی سنبھل گئی اور ترچھی نظر سے ہماری طرف دیکھ کر بولی۔

"مہاراج! مجھے شعلہ بیانی اور حسن بھی آپ کے بھگوان نے ہی بخشا ہے۔ ان شعلہ بیانیوں کی روشنی میں چلتے ہوئے میں بھی بھگوان کی عبادت ہی کرتی ہوں۔"

پھر اس نے تالی بجائی۔ ایک دیوداسی سر جھکائے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ راماینی نے اسے حکم دیا۔ "مراری کو باغ سے بلا لاؤ۔ کہو۔ تمہارے گرودیو تمہیں سورگ سے واپس لے جانے کے لئے آئے ہیں۔"

دیوداسی چلی گئی۔ راماینی نے ایک خاص انداز سے گردن ٹیڑھی کر کے کمارگری کو دیکھا اور بولی۔ "مہاراج! کیا کبھی آپ نے بھی کسی عورت سے پریم کیا ہے؟"

گرودیو کمارگری نے اپنی مالا والے ہاتھ کی انگلی چھت کی طرف اٹھائی اور کہا۔

"راماینی! ہم نے صرف بھگوان سے محبت کی ہے بھگوان کی محبت نے ہی ہمیں دنیا کے گناہوں سے بچا لیا ہے۔ عورت کی محبت ہمارے لئے ایک چھلاوا ہے 'مایا' ہے۔"

راماینی کا ایک نقرئی قہقہہ اس پراسرار خواب آمیز فضا میں گونج گیا۔

"مہاراج! آپ اپنا مٹھ چھوڑ کر میرے محل میں آ جائیں۔ میں آپ کو بتاؤں گی کہ عورت کی محبت میں کیوں اتنا جادو ہوتا ہے۔ کہ جس کے آگے دیوتا بھی اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگتے ہیں۔"

گرودیو کمارگری نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں دیوداسی ہمارے مٹھ کے نوجوان چیلے مراری کو ساتھ لے کر آ گئی۔ مراری کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بانسری تھی گلے میں پھولوں کے ہار تھے۔ چہرہ لال ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔

گرودیو اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان پر نظر پڑتے ہی مراری گھبرا گیا۔ اس کے ہاتھ سے بانسری گر پڑی اور وہ ہاتھ باندھ کر سر جھکائے ندامت کے احساس کے ساتھ اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ راماینی نے ہنس کر کہا۔

"مراری! یہ تمہیں لینے آئے ہیں۔ میں جانتی ہوں تم جانا نہیں چاہتے۔ لیکن چلے جاؤ۔ گرودیو خود تمہیں لینے آئے ہیں۔"

گرودیو کمارگری مراری کے قریب آ گئے۔ اس کے کاندھے پر بڑی شفقت سے ہاتھ رکھا اور کہا۔ "مراری! ہمارے ساتھ چلو گے؟"

مراری پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ گرودیو نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور راماینی کو پرنام کر کے اس کے محل سے واپس چل پڑے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس وقت وچتر وینا پر ایک طربیہ نغمہ چھڑ گیا تھا اور اس کے سروں سے شمعوں کے اندر صندلیں شعلوں کے دل دھڑکنے لگے تھے۔ جب ہم محل سے نکل کر سیڑھیوں پر آئے تو راماینی کی خاص کشتی ندی میں کھڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے خاص طور پر ہمیں ندی پار کرانے کے لئے اپنی خاص کشتی وہاں پہلے ہی سے بھجوا رکھی تھی۔ ہم خاموشی سے کشتی میں بیٹھ گئے۔ کشتی کے ماتھے کی محراب پر ایک مشعل روشن تھی۔ کشتی کو چار ملاح کھے رہے تھے اور کشتی رات کے اولیں عنبریں اندھیروں سے نکل کر ندی کی لہروں پر آہستہ آہستہ دوسرے کنارے کی طرف چلی جا رہی تھی۔

گرودیو سوامی کمارگری نے اس رات اپنے سب چیلوں کو ایک بڑا روح افروز درس دیا۔ اس درس میں انہوں نے گناہ اور ثواب اور عبادت کی اصلیت کی بڑے روح پرور اور بلیغ انداز میں تشریح کی اور ہم سب کو تلقین کی کہ ہمیں گناہ کے خیال کو اپنے دلوں میں جگہ نہیں دینی چاہئے۔ برے خیالات کا روح کی پوری طاقت سے مقابلہ کر کے انہیں شکست دینی چاہئے۔

درس ختم ہوا تو گرودیو کمارگری مجھے اپنی جھونپڑی میں لے گئے۔ اس رات چاند جنگل میں چمک رہا تھا۔ ہر طرف ایک نور برس رہا تھا۔ وہ چوکی پر بیٹھ گئے۔ ان کی دائیں جانب چراغ جل رہا تھا۔ اسی قسم کا نور اس پاکباز انسان کے چہرے سے بھی پھوٹ رہا تھا۔ کچھ دیر انہوں نے توقف کیا۔ آنکھیں بند کئے خاموش بیٹھے رہے۔ پھر آنکھیں کھولیں مجھے گہری نظر سے دیکھا اور کہا۔

"وشال دیو!! میرا من کہتا ہے کہ اس رقاصہ راماینی کو ایشور کی بھگتی کا پیغام سناؤ۔ وہ گناہ کے راستے پر جا رہی ہے۔ اسے سیدھے راستے پر لاؤ۔ میں کل اس کے محل میں اسے

ایشور بھگتی اور جوگ کا درس دینے پھر جاؤں گا۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟"

میں کیسے انکار کر سکتا تھا۔ یہ ایک نیک کام تھا۔ میں نے کہا۔ "گرودیو! میں آپ کے ساتھ ضرور جاؤں گا۔ آپ کے اپدیش سن کر ہزاروں انسان جو اندھیروں میں بھٹک رہے تھے سیدھے راستے پر آ گئے۔ کیا خبر رقاصہ رامائینی بھی اپنی گناہ آلود زندگی کو چھوڑ کر نیکی کی راہ پر آ جائے۔" گرودیو مسکرائے۔

"مجھے یقین ہے میرے اپدیش سے وہ ضرور سیدھی راہ پر آ جائے گی۔ اس کا من صاف ہے مگر وہ بھٹک گئی ہے۔"

دوسرے روز گرودیو کمارگری نے مجھے ساتھ لیا اور ہم رقاصہ رامائینی کے محل میں پہنچ گئے۔ مجھے خوشی ہے کہ اسی بہانے اس حسین عورت کے درشن ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے رامائینی کے محل کا خواب پرور ماحول بہت پسند تھا۔ رامائینی' گرودیو کو دیکھ کر پہلے تو کچھ متعجب ہوئی۔ پھر اس نے انہیں اپنے کمرہ خاص میں بلوا لیا۔ اور ہمارے آگے پھل اور پھول رکھے۔ پھر وہ باتیں کرنے لگی کہ ہمارے آنے کی وجہ دریافت کی۔ اس نے دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مہاراج! کیا پھر کوئی چیلا آپ کا مٹھ چھوڑ کر میرے سورگ میں آ گیا ہے؟"

مہاراج نے مسکرا کر کہا۔ "نہیں رامائینی! اس بار ہم خود اپنی مرضی سے اپنا مٹھ چھوڑ کر تمہارے پاس آئے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم پر تمہاری طرف سے ایک فرض ہے۔ ہم وہ فرض پورا کرنے آئے ہیں۔"

اس کے بعد گرودیو کمارگری نے اپنا درس بڑی دل نشین اپدیش کے انداز میں شروع کر دیا۔ رامائینی ایک دل ربا بے نیازی کے ساتھ ان کا درس سنتی رہی۔ صاف لگتا تھا کہ شاہی رقاصہ پر مہاراج کی باتوں کا کچھ اثر نہیں ہو رہا۔ جب گرودیو نے اپنا درس ختم کیا تو اس نے ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ اٹھتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! کیا آپ میرا رقص دیکھیں گے۔ اس رقص میں ..... رادھا اپنے سوامی کی جدائی میں بھگوان سے پرارتھنا کرتی دکھائی دے گی۔"

گرودیو اٹھ کھڑے ہوئے۔ "رامائینی! تمہارا رقص ہم سنیاسیوں کے لئے کسی دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنے من میں ہر وقت بھگوان کی بھگتی میں مصروف رہتے ہیں۔"

گرودیو مجھے ساتھ لے کر واپس اپنے مٹھ میں آ گئے۔

دوسرے روز وہ پھر رقاصہ رامائینی کے محل میں اسے نیک ہدایت دینے کی غرض سے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس روز بھی محفل رقاصہ رامائینی کے کمرہ خاص میں جمی۔

گرودیو نے اپنا اپدیش شروع کیا اور رقاصہ رامائینی تخت پر نیم دراز بیٹھی اک شان بے نیازی سے گرودیو کے اپدیش سنتی رہی۔ جب درس ختم ہوا تو وہ بالکل پہلے کی طرح تھی۔ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے ایک بار پھر گرودیو سے اپنا رقص پیش کرنے کی اجازت طلب کی۔ گرودیو نے رقص دیکھنے سے انکار کر دیا اور ہم واپس آ گئے۔

گرودیو کمارگری بڑی ثابت قدمی سے اپنا فرض سمجھ کر رقاصہ رامائینی کو راہ راست پر لانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ وہ ہر روز مجھے اپنے ساتھ لے کر رامائینی کے محل میں جاتے۔ اسے نیکی کی تلقین کرتے۔ نیک زندگی بسر کرنے کو کہتے۔ وہ خاموشی سے ان کا درس سنتی۔ ان کی خدمت کرتی اور پھر اپنی خواب گاہ میں چلی جاتی۔ اسی طرح دو ہفتے گزر گئے۔ رقاصہ رامائینی پر گرودیو کے اپدیش کا اثر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اب وہ خود گرودیو کو چھوڑنے محل کی سیڑھیوں تک آنے لگی تھی۔ لیکن اس نے اپنی زندگی کے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ وہ مہاراج کی باتیں بڑے غور سے سنتی۔ اب وہ بڑے ادب سے ان کے سامنے قالین پر روزانہ آ کر بیٹھی رہتی تھی۔ اپدیش کے دوران اس کی وہ پہلے والی بے نیازی جاتی رہی تھی۔

رقاصہ رامائینی کے محل میں ایک ادھیڑ عمر مگر توانا کسرتی بدن والا ایک رئیس آیا کرتا تھا۔ اس ہندو رئیس کی شہر میں کتنی ہی حویلیاں تھیں اور اس کے چاولوں کے کھیت افق سے افق تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ رامائینی کا پریمی تھا اور اس کے محل کا سارا خرچ وہی اٹھاتا تھا۔ اگرچہ شہر کا ہر رئیس رقاصہ رامائینی پر اپنی دولت لٹانے پر تیار تھا مگر رامائینی نے اس خاص ہندو رئیس کو اپنے لئے پسند کر لیا تھا۔ اس ہندو رئیس جاگیردار کا نام باسودیوا تھا۔ باسودیوا' رامائینی سے بیاہ کرنے کا خواہشمند تھا مگر رامائینی نے اسے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ جاگیردار باسودیوا' اس پر ہی خوش تھا کہ رامائینی ایسی مشہور شاہی رقاصہ نے جو کسی سے بات نہیں کرتی اسے اپنے محل میں آنے اور اس کے اخراجات پورے کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ لیکن اسے گرودیو کمارگری کا آنا بالکل پسند نہیں تھا۔ کیونکہ اس طرح سے خدشہ تھا کہ کہیں رامائینی محل کی عیش پرور زندگی ختم کر کے بھکشنی نہ بن جائے۔ مگر وہ گرودیو کو وہاں آنے سے منع نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خود بھی گرودیو کمارگری کی مذہبی شخصیت سے مرعوب تھا۔ اور اسے معلوم تھا کہ خود راجہ بکرماجیت گرودیو کا دوست ہے اور ان کا بے حد احترام کرتا ہے۔ جاگیردار باسودیوا نے دبی زبان میں ایک بار رامائینی کو گرودیو کی باتیں سننے سے منع بھی کیا۔ شروع میں تو رامائینی نے چمک کر کہا۔

"باسودیوا! تم کیوں گھبراتے ہو۔ گرودیو ایک زاہد خشک ہے اورر ایک زاہد خشک مجھے

متاثر نہیں کر سکتا۔"

لیکن جب اس تبدیلی کو جاگیردار باسودیوا نے بھی محسوس کیا کہ رامائینی پر گرودیو کے اپدیشوں کا اثر ہونے لگا ہے اور وہ ان کا بے حد احترام کرنے لگی ہے اور انہیں چھوڑنے ندی تک جاتی ہے تو اس نے ایک بار پھر رامائینی کو سمجھانے کی کوشش کی - اس پر رامائینی نے کسی قدر برہم ہو کر باسودیوا کو ڈانٹ دیا کہ خبردار آئندہ میرے ذاتی معاملات میں دخل مت دینا۔ میں کسی سے ملنے یا نہ ملنے میں آزاد اور خود مختار ہوں۔ اگر تمہیں اپنی دولت پر گھمنڈ ہے تو اپنی سونے کی تھیلیاں لے کر میرے محل سے نکل جاؤ۔ باسودیوا خاموش ہو گیا مگر دل میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جس طرح بھی ہو سکے گا گرودیو کے کانٹے کو اپنے راستے سے صاف کر کے رہے گا۔ اس حقیقت سے وہ بھی باخبر تھا کہ کمارگری کو راستے سے ہٹانا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ لیکن شاہی رقاصہ رامائینی کے پریم نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ وہ ایک دولت مند اور بااثر شخص تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ کمارگری ایک زبردست روحانی طاقت کا مالک ہے اور اجین میں اسے ایک مذہبی پیشوا کی حیثیت حاصل ہے اور کوئی شخص اسے قتل کرنے پر آمادہ نہ ہو گا۔ اس نے ایک دوسری چال چلی۔ اپنے ایک خاص دراوڑی غلام کو جنوبی ہند کے ایک شہر میں بھیجا جہاں سانپوں کی پوجا ہوتی تھی۔ وہاں سے اس نے ایک انتہائی مہلک زہر والا کالا سانپ منگوایا جس کا ڈسا پانی نہیں مانگتا تھا۔

ایک رات میں گرودیو کمارگری کی خدمت سے اٹھ کر اپنی جھونپڑی میں آ کر ابھی لیٹا ہی تھا کہ شور سا مچ گیا۔ میں باہر نکلا۔ وہ چیلا جو رات کو گرودیو کو سونے سے پہلے گنگا جل دیا کرتا تھا گھبرایا ہوا پکار رہا تھا کہ مہاراج کو کالے ناگ نے کاٹ لیا ہے۔ میں نے تھیلے میں سے اپنے سانپ دوست کا دیا ہوا مہرہ نکالا اور گرودیو کی جھونپڑی کی طرف بھاگا۔ گرودیو کمارگری جلتے چراغ کے سامنے چوکی پر آسن جمائے بیٹھے تھے اور ان کے سامنے ایک کالا ناگ پھن اٹھائے جھوم رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سانپ کو کچلنا چاہا تو کمارگری نے مجھے روک دیا اور کہا۔

"وشال دیو! اسے کچھ نہ کہنا اس نے مجھے کاٹ لیا ہے - لیکن میری محبت نے اس پر ندامت طاری کر دی ہے۔ یہ اپنا زہر واپس لینے آیا ہے۔"

میں ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے کالا سانپ جھومتا ہوا کمارگری کے آسن کے قریب گیا۔ اس نے اپنا پھن جھکایا اور منہ پنڈلی پر اس جگہ رکھ دیا جہاں اس نے کاٹا تھا۔ پھر کمارگری کے جسم میں داخل کیا ہوا سارا زہر چوس لیا اور کمارگری کے اردگرد دو چکر لگائے اور جدھر سے آیا تھا ادھر واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد گرودیو کمارگری مسکرائے اور بولے۔ "محبت میں بڑی طاقت ہے۔ محبت ہی اصل عبادت ہے دیکھو۔ اس نے مجھے کاٹا تھا لیکن میری محبت نے اسے زہر واپس لینے پر مجبور کر دیا۔ بھگوان کی ساری مخلوق اسی طرح آپس میں محبت کے رشتوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ وشال دیو! تم بھی بھگوان کی مخلوق سے محبت کرو۔ کسی سے نفرت نہ کرنا۔ کسی سے حسد نہ کرنا۔ ورنہ تم بھگوان سے دور ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "گرودیو یہ سانپ کس نے یہاں پھنکوایا ہے۔ آج تک کبھی کوئی سانپ ادھر نہیں آیا۔"

کمارگری نے مسکرا کر جواب دیا۔ "جس نے مجھے سانپ سے ڈسوایا ہے مجھے اس سے بھی پریم ہے۔ میں اس کا بھی بھلا چاہتا ہوں۔"

میں اس انسان دوست بزرگ انسان کی وسعت قلب پر حیران تھا۔ مجھے عباسی خلفاء کے دور کے بزرگان دین یاد آ رہے تھے جو اسی طرح خدا کی مخلوق سے محبت کرتے تھے اور کبھی کسی کا برا نہیں چاہتے تھے۔ خود تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھاتے تھے مگر خلق خدا کے لئے ہمیشہ دعائیں مانگا کرتے تھے۔

گرودیو کمارگری کی زندگی پر حملے میں ناکامی کے بعد جاگیردار باسودیوا انتہائی مرعوب ہوا اور شہر چھوڑ کر جنوبی ہند کی طرف چلا گیا۔ گرودیو کمارگری کا رقاصہ رامائینی کو اپدیش جاری تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ رامائینی پر کمارگری کے لیکچروں اور نیکی کی تلقین کا خاطرخواہ اثر ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنے محل میں ان امراء کا داخلہ بند کروا دیا تھا جو کبھی کبھی وہاں آیا کرتے تھے۔ اب وہ سولہ سنگھار بھی نہیں کرتی تھی۔ ہمیشہ ہمیں سادہ سی موٹے کپڑے کی ساڑھی میں ملبوس ملتی۔ اس کے محل میں اب نغمات عیش کی جگہ بھجن کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ یہ ایک بہت بڑی اور خوش آئند تبدیلی تھی۔

لیکن اس سے بھی بڑی تبدیلی گرودیو کمارگری کے اندر پیدا ہو رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اپدیش دیتے ہوئے گرودیو کمارگری رقاصہ رامائینی کو اپنے بہت قریب بٹھاتے اور کبھی کبھی اس کے کاندھے پر ہاتھ بھی رکھ دیتے تھے۔ ایسا انہوں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے چیلوں کے آگے صبح کے درس میں بھی کچھ اکھڑے اکھڑے سے رہتے تھے۔ ان کا لہجہ بھی بے اثر سا ہونے لگا تھا۔ وہ رقاصہ رامائینی کے محل میں جانے کو بے تاب رہتے۔ اب وہ دن کا زیادہ وقت رقاصہ کے محل میں بسر کرتے۔ وہیں کھانا بھی کھاتے۔ رامائینی ان کے آگے بچھی جاتی تھی۔ اس نے رقص کرنا اور گانا بھی ترک کر دیا تھا۔ ایک دن میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ گرودیو کمارگری نے رقاصہ رامائینی سے کہا۔

"راماینی! رقص اور گانا تو رام لیلا کا حصہ ہے۔ بھگوان کرشن کی گوپیاں بھی رقص کیا کرتی تھیں اور کرشن سے پریم کرتی تھیں۔ تم بھی کبھی کبھی میرے سامنے رقص کر لیا کرو۔"

یہ ایک خطرناک انقلاب تھا۔ مجھے گرودیو کمارگری کے الفاظ پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ خود راماینی کو بھی کچھ حیرت سی ہوئی کہ مہاراج یہ کیا کہہ رہے ہیں لیکن اس نے زیادہ خیال نہ کیا اور کہا۔

"مہاراج! آپ کے اپدیش نے مجھے ایسے مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں مجھے رقص و سرود گھٹیا باتیں لگتی ہیں۔ میں اگر چاہوں بھی تو اب ایسا نہیں کر سکتی۔"

گرودیو خاموش ہو گئے۔ ان کے چہرے پر ایک بے سکونی، بے اطمینانی اور اندرونی اضطراب کا تاثر تھا۔ انہوں نے واپس آ کر اپنے آپ کو مٹھ کی جھونپڑی میں بند کر لیا اور دو روز تک اندر ریاضت اور کٹھن تپسیا کرتے رہے۔ اس دوران نہ وہ باہر نکلے اور نہ کسی کو اندر آنے کی اجازت دی۔

میں سمجھ گیا کہ گرودیو کے اندر فطری جذبوں نے جو سر اٹھایا تھا وہ اسے دبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رقاصہ راماینی کے تیر نظر نے ان کی برسوں کی تپسیا اور ریاضت کو تباہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

تیسرے روز وہ کٹیا سے باہر نکلے تو انہوں نے مجھے بلا کر کہا کہ اب وہ رقاصہ راماینی کے محل پر نہیں جائیں گے۔ وہ سارا دن بے چین سے پھرتے رہے۔ انہوں نے دوپہر کے بعد کا درس بھی نہ دیا۔ چیلے بھی ان کی اس تبدیلی پر حیران سے تھے مگر کسی کو زبان ہلانے اور کچھ پوچھنے کی جرات نہیں ہو رہی تھی۔ میں بھی خاموش تھا۔ شام کو گرودیو نے مجھے ساتھ لیا اور راماینی کے محل پر پہنچ گئے۔ راماینی اس وقت جوگنوں ایسے گیروے کپڑے پہنے اشلوک پڑھ رہی تھی۔ اس کی دیوداسیوں نے بھی گیروے کپڑے پہن رکھے تھے۔ محل کی فضا ایک مندر کی فضا میں بدل چکی تھی۔

گرودیو کو دیکھ کر وہ ہاتھ باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے جھک کر پرنام کیا۔ گرودیو کمارگری اس کو بغور دیکھتے رہے۔ پھر بولے۔ "راماینی! کہیں میں نے تمہیں تمہاری دنیا سے واپس لا کر غلطی تو نہیں کی؟"

رقاصہ راماینی نے چونک کر گرودیو کی طرف دیکھا اور کہا۔

"مہاراج! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں تو جہنم سے نکل کر جنت کی فضاؤں میں آ گئی ہوں۔"

گرودیو چپ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے سر کو ہلکا سا جھٹک دیا اور بولے۔

"ہاں راماینی! تم ٹھیک کہتی ہو۔ بھگوان نے تم پر رحم کیا ہے۔ تم آگ سے نکل کر پھولوں کی وادی میں آ گئی ہو۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔"

رقاصہ راماینی انہیں روکتی ہی رہ گئی مگر گرودیو تیز تیز قدموں سے محل سے نکل کر ندی پر آ گئے۔ یہاں کشتی تیار کھڑی تھی۔ انہوں نے اپنی لال لال آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور غصے میں بولے۔

"وشال دیو! مجھے یہاں سے لے چلو۔ لے چلو۔"

میں نے اس سے پہلے انہیں ایسی غصیلی حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں جلدی سے کشتی میں اتر گیا۔ گرودیو بھی کشتی میں آ کر بیٹھ گئے۔ رقاصہ راماینی ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی محل کی سیڑھیوں تک آ گئی۔ وہ ہاتھ باندھ کر کھڑی تھی۔ گرودیو کمارگری نے آنکھ اٹھا کر بھی اس طرف نہ دیکھا اور کشتی تیز چلانے کا حکم دیا۔

دو تین روز گزر گئے۔ گرودیو کمارگری رقاصہ راماینی کے محل میں نہ گئے۔ وہ سارا سارا دن کٹیا میں آسن جمائے بیٹھے گیان دھیان میں مصروف ہونے کی کوشش کرتے لیکن کئی بار پریشان سے ہو کر کٹیا سے باہر نکل آتے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے چیلوں پر برسنے لگتے۔

چوتھا دن جا رہا تھا۔ شام ہونے والی تھی۔ سورج سنبل اور سیتا پھل کے درختوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا کہ چیلوں کی جھونپڑیوں میں ہلکا ہلکا شور سا بلند ہوا۔ معلوم ہوا کہ رقاصہ راماینی کی سواری آئی ہے۔ اتنا سننا تھا کہ گرودیو کمارگری ہاتھ میں زمرد کی مالا پکڑے اپنی کٹیا سے باہر نکل آئے۔ سامنے رقاصہ راماینی گیروے کپڑوں میں ملبوس، گلے میں مالائیں پہنے، لمبے بال شانوں پر بکھرائے، ہاتھ باندھے، رام نام کا جاپ کرتی اپنی دیوداسیوں کے ساتھ گرودیو کمارگری کی جھونپڑی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گرودیو جیسے سکتے کے عالم میں اسے تک رہے تھے۔ راماینی گرودیو کے سامنے آ کر جھک گئی اور ہاتھ باندھ کر بولی۔

"سوامی جی! میں نے اپنے گناہ آلود محل کو چھوڑ دیا ہے وہاں کی فضا میں مجھے اپنی گناہ کی زندگی کی یاد آتی تھی۔ میں سکون دل سے تپسیا نہیں کر سکتی تھی اس لئے میں محل کو چھوڑ کر آپ کی جوگن بن کر آپ کے مٹھ میں آ گئی ہوں۔ میرے لئے یہ آنند مٹھ ہے۔ مجھے اپنی داسی بنا کر اپنے چرنوں میں رکھ لیجئے۔"

گرودیو کمارگری کے چہرے پر میں نے ایک ایسی چمک دیکھی جس میں عبادت گاہ کے چراغ کے تقدس کی بجائے گھنے جنگلوں میں کڑکنے والی بجلیوں کی لپک تھی۔ انہوں نے

آگے بڑھ کر رقاصہ رامائینی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

"رامائینی! آج سے تم ہماری بھکشنی بن کر ہمارے مٹھ میں رہو گی۔"

گرودیو کے حکم سے ان کی کٹیا کے ساتھ والی جھونپڑی خالی کروا کر وہاں رقاصہ رامائینی کو رہنے کی اجازت دے دی گئی۔

چیلوں کے مٹھ میں رقاصہ رامائینی کے آنے سے گرودیو کمارگری کے معمولات میں نمایاں فرق آ گیا۔ اب وہ زیادہ وقت رامائینی کی کٹیامیں گزارتے۔ اسے اپنے پاس بٹھا کر چیلوں کو درس دیتے لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ ان کے درس میں وہ پہلے والی تاثیر باقی نہیں رہی تھی۔ ان کا لہجہ اکھڑا اکھڑا ہوتا۔ وہ بات کرتے کرتے بھول جاتے اور گردن گھما کر رامائینی کو تکنے لگتے۔ اس انقلابی تبدیلی کو مٹھ کے سارے چیلے شدت سے محسوس کر رہے تھے مگر خاموش تھے۔ ایک روز میں نے بڑی جرات کر کے گرودیو سے کہا کہ کہیں رقاصہ رامائینی کے آنے سے ان کی ریاضت میں خلل تو نہیں پڑا؟ گرو دیو نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر بولے۔

"وشال دیو! آکاش کے دیوتا ہمارا امتحان لے رہے ہیں۔ ہم اس امتحان میں پورا اتریں گے۔ ہم میدان چھوڑ کر بھاگنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ہم اس جنگ کو فتح کریں گے۔"

میں سمجھا کہ گرودیو نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنا تزکیہ نفس کر رہے ہوں اور دنیاوی علائق کے درمیان سے گذرتے ہوئے اپنا دامن پاک رکھنے کی ریاضت میں مصروف ہوں۔

اس وقت صبح طلوع ہونے میں ایک پہر باقی تھا۔ میں نے ندی پار کی اور اجین شہر کی سب سے بڑی کارواں سرائے میں آ گیا۔ میرا ارادہ وہاں سے کسی قافلے میں شامل ہو کر گوالیار میں غزنوی لشکر میں واپس جانے کا تھا کہ مجھے وہاں کچھ مسافروں سے جو شمال سے آئے تھے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لشکر نے لاہور اور ملتان فتح کر لیا ہے۔ مگر لاہور کے اردگرد کے راجہ لاہور پر ایک زبردست حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس وقت میرا دل لاہور جانے کے لئے مچلنے لگا۔ میں چوتھی عیسوی صدی کے لاہور کو ایک بار پھر اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اور غزنوی سرداروں اور مسلمان مجاہدوں کے ساتھ مل کر جہاد میں حصہ لینا چاہتا تھا۔ میں وہیں کارواں سرائے میں رک گیا اور چار یوم کے بعد ایک قافلے میں شامل ہو کر شمال کی طرف روانہ ہو گیا۔

غزنویوں کی اس وقت یہ حالت تھی کہ سلطان محمود کی وفات کے بعد اس کے بیٹے امیر مسعود کو قتل کرنے کے بعد اس کا بیٹا امیر مودود تخت غزنی پر جلوہ افروز تھا۔ اور غزنی

سلطان کی حیثیت سے وہ ہندوستان میں آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے ملتان، بھیرہ اور لاہور کو فتح کیا اور پنجاب کی حکومت مسلمان امراء کے حوالے کر کے واپس غزنی جا چکا تھا۔ منزلوں پر منزلیں طے کرتا جب میں پنجاب کی سرزمین میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ پنجاب میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو چکی ہیں اور مسلمان جاگیردار اور امراء امیر مودود کی اطاعت سے منہ موڑ کر آپس میں لڑ رہے ہیں اور دوسری طرف قرب و جوار کے ہندو دوسری ہندو ریاستوں کی مدد سے لاہور پر ایک زبردست حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔

میں آج آپ کے شہر میں بیٹھا یہ سفرنامہ حیرت قلم بند کر رہا ہوں تو مجھے آج سے پندرہ سو برس پہلے کا لاہور شہر یاد آ رہا ہے میں نے آج کے دور کے ماڈرن لاہور شہر کو بھی دیکھا ہے۔ پندرہ سو برس پہلے کا لاہور اس جگہ آباد نہیں تھا۔ اس شہر کے اب کہیں آثار بھی نہیں ملتے۔ میں نے کئی دن لاہور کی سیاحت کرنے اور ہر طرف سے جائزہ لینے کے بعد اندازہ لگایا ہے کہ جس مقام پر آج کل لاہور کی نئی آبادی اچھرہ ہے اس زمانے کا لاہور اسی جگہ پر آباد تھا اور اس جگہ ایک بہت بڑا قلعہ تھا جس میں مسلمان امیر کا محل تھا۔ یہ امیر غزنی کے سلطان کا نمائندہ اور اس کا وفادار تھا۔ لیکن دوسرے امراء اس سے منہ پھیر کر آپس میں برسرپیکار تھے اور ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ جس روز میں دہلی سے آنے والے ایک قافلے کے ساتھ سفر کرتا ہوا لاہور شہر کی حدود میں داخل ہوا تو کارواں سرائے میں اترتے ہی لوگوں میں ایک بھگدڑ مچ گئی۔ معلوم ہوا کہ ہندوؤں کے لشکر کے ہراول دستے لاہور شہر کی حدود میں پہنچ گئے ہیں۔ لوگ قلعے کی طرف بھاگے۔ کیونکہ شہر کی چار دیواری نام کی اس وقت کوئی شے موجود نہیں تھی۔ صرف ایک قلعہ ہی تھا جس میں چھپ کر مسلمان اپنی جانیں بچا سکتے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی قلعے کی طرف دوڑا۔ میں قلعے کے اندر جا کر غزنی امیر سے ملاقات کر کے ہندوؤں سے جنگ کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا تھا۔

اس وقت میرا لباس اس زمانے کے ایک عام شہری کا تھا۔ سلطان محمود غزنوی کی وفات کو چھ برس گزر چکے تھے اور لاہور کے قلعے کا امیر میری شکل سے واقف نہیں تھا۔ قلعے میں داخل ہونے کے فوراً بعد قلعے کے دربانوں نے دروازے بند کر دیئے اور قلعے کی لبریز کھائی پر جو پل ڈالا گیا تھا اسے بھی اٹھا لیا گیا۔ قلعے میں امیر غزنوی کے عالی شان سنگ سرخ کے محلات تھے۔ ان کے علاوہ قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ اندر کی جانب سینکڑوں کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ درمیان میں سبزیوں کے کھیت تھے جن میں رہٹ چل رہے تھے اور مویشی چر رہے تھے۔

لوگوں نے ان کوٹھریوں پر قبضہ کر لیا اور اپنے بال بچوں کو وہاں چھوڑ کر کھیتوں میں

اناج کاٹنے اور پانی لینے نکل گئے۔ شمال کی جانب فوجی چھاؤنی تھی جہاں فوجی بارکوں میں سے مسلمان لشکری نکل نکل کر قلعے کے اوپر کی طرف جا رہے تھے۔ ان میں تیر انداز دستوں کی تعداد زیادہ تھی۔ میں پہلی فرصت میں قلعے کے امیر سے ملنا چاہتا تھا۔ میں شاہی محل کے دروازے پر آیا تو محافظ دستے کے سپاہی مجھے دیکھتے ہی تلواریں لہراتے میری طرف بڑھے۔ وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے کہ پیچھے سے ان کے سالار نے بلند آواز میں چلا کر کہا۔

"اس کو قتل نہ کرنا۔ اسے امیر کے آگے پیش کیا جائے گا وہ اسے خود قتل کرنا چاہتے ہیں۔"

اس وقت مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ضرور یہاں میں امیر کے کسی جانی دشمن کی شکل میں نمودار ہوا ہوں مجھے زنجیروں میں جکڑ کر قلعے کے ایک تنگ و تاریک تہہ خانے میں پھینک دیا گیا۔ میں نے بہت کہا کہ مجھے امیر سے ملوایا جائے مگر اس وقت ان لوگوں کو اپنی پڑی تھی۔ ہندو لشکر نے قلعے کا محاصرہ کر لیا تھا۔ وہ میرے تہہ خانے کے دروازے کو باہر سے بھاری تالا لگا کر چلے گئے اور میں تاریک نیم دار تہہ خانے میں زنجیروں میں جکڑا اکیلا رہ گیا۔

ہندوؤں کی فوج نے لاہور قلعے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔

میں قلعے کے تہہ خانے میں زنجیروں میں جکڑا پڑا تھا۔ قلعے میں مسلمانوں کی اتنی فوج نہیں تھی کہ وہ باہر نکل کر ہندو فوج کا مقابلہ کر سکتی۔ لاہور قلعے کے امیر اژگر خان نے اپنا ایک خاص آدمی ملتان کے صوبے دار کی طرف روانہ کر دیا تھا اور اس سے امداد طلب کی تھی۔ ہندو راجوں کا مشترکہ لشکر قلعے سے کچھ فاصلے پر میدان میں خیمہ زن تھا۔ اس دوران چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ ہندو قلعے کی کھائی پر پل بنانے کی کوشش میں آگے بڑھتے تو قلعے کے اوپر سے غزنوی فوج کے تیر انداز ان پر تیروں کی بوچھاڑیں مارتے۔ قلعے میں چھ ماہ کی رسد موجود تھی۔ پھر بھی خطرہ تھا کہ اگر ہندو قلعے کی کھائی پاٹنے میں کامیاب ہو گئے تو مسلمانوں کے لئے مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں - کیونکہ قلعے میں فوج کی نفری ہندو لشکر کے مقابلے میں کم تھی۔ قلعے کا امیر اژگر خان ملتان سے آنے والی مدد کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ ادھر میں تہہ خانے میں پڑا سزا یا باعزت بریت کے انتظار میں تھا۔ میں زنجیریں اور تہہ خانے کا دروازہ بڑی آسانی سے توڑ کر باہر نکل سکتا تھا لیکن میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں یہاں کے تناظر میں کون ہوں؟ میری حیثیت کا تعین کیا ہوا ہے؟ میرا قصور کیا ہے اور قلعے دار امیر اژگر خان مجھے کیوں اپنے ہاتھ سے قتل کرنا چاہتا ہے۔ آخر ایک روز دو سپاہی تہہ خانے میں آئے اور مجھے اپنے ساتھ اوپر لے گئے، محل کے دربار میں امراء اور منصب دار اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ قلعے دار اژگر خان ایک تخت پر براجمان تھا۔ گھنی مونچھیں، خونخوار چہرہ، بھاری تن و توش مجھے چنگیز خان کی فوجوں کے سالار یاد آ گئے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنی سرخ آنکھوں کو سکیڑا اور غصیلی آواز میں بولا۔ اپنے دشمن کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ اس سے بھی زیادہ خوشی مجھے اس بات کی ہو رہی ہے کہ میں تمہیں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا۔"

میں نے دل میں کہا کہ تم کیا ہو اگر تمہاری ساری فوج بھی آ جائے تو میرا کچھ نہیں

بگاڑ سکتی لیکن میں اس کی زبان سے یہ سننے کو بے تاب تھا کہ میں کون ہوں؟ کس اعتبار سے اس کا دشمن ہوں اور وہ مجھے کس جرم کی پاداش میں اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ درباری بھی میری طرف نفرت بھری فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ امیر اژگر خان تخت سے اتر کر میرے قریب آیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرایا۔ "تم ہر بار میری ریاست میں ڈاکہ ڈال کر لوگوں کو قتل کر کے فرار ہو جاتے تھے۔ آج تم پکڑ لئے گئے لیکن ایک بات بتاؤ۔ تم خود کس طرح میرے قلعے میں آ گئے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ تم پہچان لئے جاؤ گے۔ پھر تم نہتے بھی ہو۔"

میں صرف اتنا سمجھ سکا کہ میں کسی خطرناک قاتل ڈاکو کی حیثیت سے اس قلعے میں نمودار ہوا ہوں۔ اب میں نے بھی زبان کھولی اور کہا۔

"اے امیر! یہ تم بھی جانتے ہو کہ میں ایک مسلمان ہوں اور کفار کے لشکر قلعے پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ پس میں مسلمانوں کی طرف سے کافروں کے خلاف جنگ کرنے کے خیال سے قلعے میں آ گیا تھا۔"

امیر اژگر خان نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور دانت پیس کر بولا۔

"تم جھوٹ بکتے ہو۔ تم کافروں سے لڑنے نہیں بلکہ اس افراتفری میں موقع نکال کر مجھے قتل کرنے کی نیت سے یہاں آئے تھے۔ بولو۔ کیا میں غلط کہتا ہوں؟ اگر تم جابر خان ڈاکو ہو تو میں بھی اژگر خان ہوں۔ غزنوی فوج کا سب سے بہادر امیر...!"

فوج کا سپہ سالار تخت کے پہلو میں کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "عالی مرتبت امیر! حکم دیجئے کہ میں تلوار کے ایک ہی وار سے آپ کے اور رعایا کے اس دشمن کی گردن اڑا دوں۔"

امیر اژگر خان نے میری طرف گھورتے ہوئے دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا اور گرج کر کہا۔

"نہیں جابر خان ڈاکو میرا دشمن ہے۔ یہ میرا شکار ہے۔ میں اسے اپنے ہاتھوں زمین میں زندہ دفن کروں گا"

میرے سر سے ایک بوجھ تو اتر گیا کہ میں کون ہوں اور میرے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ میں نے کہا۔

"امیر اژگر خان! آپ اسے نہیں سمجھ سکیں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نہ تو آپ کا دشمن ہوں اور نہ آپ کی رعایا کا اور مجھے زندہ دفن کر کے آپ کو کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

امیر اژگر خان نے ایک اور طنزیہ قہقہہ لگایا اور اپنے سپہ سالار کی طرف متوجہ ہو کر

کہا۔

"پائندہ خان! محل کے پائین باغ میں ہمارے مہمان کے لئے قبر فوراً کھودی جائے۔"

سپہ سالار پائندہ خان ادب سے تعظیم بجا لانے کے بعد دربار سے باہر نکل گیا۔ سپاہیوں نے مجھے دربار کے پہلو میں واقع ایک تاریک حجرے میں بند کر دیا۔ میں اب اپنے زندہ دفن کئے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ کیوں کہ اس کے بعد ہی میں اپنے منصوبے پر عمل درآمد کر سکتا تھا۔ کچھ وقت کے بعد مجھے حجرے سے نکال کر محل کے پائیں باغ میں لے جایا گیا۔ جہاں نیم دائرے کی صورت میں درباری ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ان کے آگے خود امیر اژگر خان ایک تخت پر بیٹھا تھا اور سامنے چار سپاہی قبر میں سے مٹی باہر نکال رہے تھے۔ قبر کافی گہری کھودی گئی تھی۔ مجھے میری قبر کے اوپر ایک جانب کھڑا کر دیا گیا۔ امیر اژگر خان اپنی گھنی مونچھوں کو بار بار تاؤ دے رہا تھا۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ دو سپاہیوں نے مجھے زنجیروں سمیت قبر میں دھکا دے دیا۔ سات فٹ گہری خندق نما قبر میں میں دھڑام سے گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی اوپر سے مجھ پر بڑے بڑے پتھر اور مٹی گرنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے قبر بھر گئی۔ میں پتھروں اور منوں مٹی کے نیچے دفن پڑا تھا اور ایسے دھماکوں کی آواز سن رہا تھا کہ جیسے بھاری بھرکم لکڑی کے مگدروں سے قبر کی مٹی کو نیچے دبایا جا رہا ہے۔

اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ میرا سارا جسم مٹی میں دبا ہوا تھا۔ مٹی کا بوجھ بہت زیادہ تھا مجھے ایسا لگ رہا تا جیسے میں سکوت کے پاتال میں اتر گیا ہوں ۔مجھے سوائے اپنے سانس کے چلنے کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں چاہتا تو اسی وقت قبر سے باہر نکل سکتا تھا مگر میں کچھ وقت قبر میں گزارنا چاہتا تھا۔ جس وقت مجھے قبر میں زندہ دفن کیا گیا اس وقت دوپہر کے بعد کا وقت تھا میں نے سوچا کہ مجھے کم از کم دو روز تک اس قبر میں رہنا چاہیے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو ماضی کی دنیا کی یادوں میں سمو دیا اور منوں مٹی کے نیچے ساکت ہو کر پڑ گیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرا جسم تو قبر کے اندر پڑا ہے مگر روح قدیم مصر و یونان کے شہروں اور محلوں میں گشت لگا رہی ہے۔ مجھے صحیح اندازہ نہیں تھا کہ میں کب تک اس حالت میں قبر کے اندر پڑا رہا لیکن جب مجھے احساس ہوا کہ مجھے کافی دیر گزر گئی ہے تو میں نے اپنے اوپر اور اردگرد سے مٹی اور پتھروں کو ہٹانا شروع کر دیا۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل نہیں تھا۔ معمولی سی جدوجہد کے بعد میں قبر سے باہر نکل آیا۔ میں نے اپنی زنجیروں کو قبر کے اندر ہی توڑ ڈالا تھا۔ قبر سے باہر نکلتے ہی میں نے دیکھا کہ رات کا وقت ہے۔ شاہی محل میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ خاموشی اور سناٹا گہرا تھا۔ لگتا تھا رات کافی گزر چکی ہے۔ پائین باغ میں کوئی سپاہی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں محل

کے بڑے دروازے کی طرف چلنے لگا۔ میں امیر اژگر خان سے ملنا چاہتا تھا اور اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں اس کا دشمن نہیں ہوں اور کسی درویش کی دعا سے میرے اندر ایسی طاقت پیدا ہو چکی ہے کہ کوئی پچاس برس تک مجھے ہلاک نہیں کر سکتا۔

محل کے دروازے پر دو سپاہی پہرہ دے رہے تھے اور مشعلیں روشن تھیں۔ انہوں نے میرے مٹی میں اٹے ہوئے کپڑوں کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ پہلے تو وہ دہشت زدہ ہو کر چند قدم پیچھے ہٹے پھر انہوں نے تلواریں سونت لیں اور مجھے قتل کرنے کے لئے دوڑے۔ میں نے ان کی تلواروں کے وار اپنی ہاتھ پر لئے۔ میرے ہاتھ سے ٹکراتے ہی ان کی تلواریں ٹوٹ گئیں۔ وہ اب اور زیادہ خوف زدہ ہو گئے۔ میں نے کہا۔

"مجھے امیر کے پاس لے چلو۔ مجھے اس سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

وہاں چند لمحوں میں ہی شور مچ گیا کہ ڈاکو جابر خان دو روز قبر میں دفن رہنے کے بعد زندہ باہر نکل آیا ہے۔ تو گویا میں دو روز تک قبر میں بند رہا تھا۔ محل کے لوگ بھی شور سن کر بیدار ہو گئے۔ مجھے ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اتنے میں محل کی دوسری منزل کی بارہ دری میں امیر اژگر خان نمودار ہوا۔ اس نے جب مجھے دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ مجھے اوپر لایا جائے۔

میں امیر کے سامنے کھڑا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے تک رہا تھا۔ میں ادب سے اس کی تعظیم بجا لایا اور کہا۔

"عالی مرتبت امیر! میں تنہائی میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے سپاہیوں کو چلے جانے کا اشارہ کیا اور خود تلوار نیام سے کھینچ کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔ جب میں اور امیر اژگر خان وہاں اکیلے رہ گئے تو میں نے کہا۔

"اے امیر! میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ اگر تم مجھے ڈاکو جابر خان ہی سمجھتے ہو تو بے شک سمجھو لیکن یقین کرو میں نے کبھی تمہیں ہلاک کرنے کی نیت نہیں کی اور میں نے تمہاری رعایا میں سے بھی کسی شخص کو قتل نہیں کیا۔"

امیر اژگر خان اپنی گھنی داڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ "مگر پہلے یہ بتاؤ کہ تم قبر میں دو روز تک زندہ دفن رہنے کے بعد زندہ کیسے باہر نکل آئے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "وہی بات میں تمہیں بتانے والا تھا۔ سنو! مجھے ایک درویش کی دعا ہے کہ میں پچاس برس تک کسی تلوار، زہر، تیر یا زمین میں دفن کر دیئے جانے یا کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دینے سے ہلاک نہیں ہوں گا۔ اس کا ثبوت تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ میں دو روز قبر میں منوں مٹی کے نیچے دفن رہنے کے بعد زندہ حالت میں

تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔"

امیر اژگر خان مجھے سر سے پاؤں تک گھور رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میں کفار کے حملے کے خلاف جہاد میں شریک ہو کر تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور کو بچانا چاہتا ہوں۔"

امیر نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ یہ امیر اژگر خان کا کمرۂ خاص تھا وہ خود تلوار ایک طرف رکھ کر مسند پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ میں اس کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ اس نے کہا کہ ملتان سے مسلمانوں کے لشکر کی امداد ابھی تک نہیں پہنچی۔ ہو سکتا ہے اس کے ایلچی کو دشمنوں نے راستے میں ہی قتل کر دیا ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم خود برق رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر ملتان جاؤ اور وہاں سے مسلمانوں کی فوج لے کر یہاں آؤ چونکہ تم ہلاک نہیں کئے جا سکتے اس لئے مجھے یقین ہے کہ تم خیریت سے ملتان پہنچ جاؤ گے۔"

میں نے اب امیر اژگر خان کو اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"عالی مرتبت امیر! اگر ملتان کے لشکر کے آنے سے پہلے ہی کفار کا لشکر تتر بتر ہو جائے تو کیا یہ اچھا نہیں ہے؟"

"یہ کس طرح ممکن ہے؟" امیر نے سوال کیا۔

میں نے کہا۔ "میرے پاس ایک منصوبہ ہے اور اسی منصوبے کو ذہن میں لے کر میں آپ کے پاس آیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہندو لشکر میں کسی طریقے سے گھس کر ان کے سپہ سالار اور دوسرے سالاروں کو قتل کر ڈالوں اور ان کے خیموں میں آگ لگا دوں۔ اس طرح سے ہندو لشکر میں افراتفری مچ جائے گی۔ ایسی صورت حال میں ساری فوجیں قلعے سے نکل کر ان پر ٹوٹ پڑیں تو فتح تمہارے قدم چومے گی لیکن اس کے لئے مجھے بتانا ہو گا کہ تمہارے فوجی مخبروں کی اطلاعات کے مطابق اس ہندو لشکر کا سب سے بڑا سرغنہ اور سپہ سالار کون ہے اور دوسری فوجوں کے بڑے سپہ سالار کون کون ہیں تاکہ میں انہیں اپنا نشانہ بنا سکوں۔"

امیر اژگر خان میرے منصوبے پر غور کرنے لگا۔ وہ کمر پر ہاتھ باندھے ٹہلنے لگا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"اگر تم اس منصوبے میں کامیاب ہو جاؤ تو یہ ہماری بہت بڑی فتح ہو گی۔ میرے پاس مجاہدین کا اتنا لشکر ضرور ہے کہ کفار کی بھاگتی ہوئی فوج پر حملہ کر کے تہہ تیغ کر ڈالے۔"

پھر اس نے مجھے بتایا کہ ہندوؤں کے لشکر میں چار ریاستوں کی فوجیں شامل ہیں جن کے

الگ الگ سپہ سالار ہیں اس اجتماعی فوج کا سپہ سالار رگھوناتھ سہائے ایک مرہٹہ ہے۔ تین سپہ سالاروں میں سے ایک جاٹ ہے اور دو مرہٹے ہیں اور وہ رگھوناتھ کے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔"

"مگر سپہ سالار رگھوناتھ سہائے کے خیمے تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ اس کا خیمہ لشکری خیموں کے عین درمیان میں لگا ہے۔ اگر تم ہلاک نہیں بھی کئے جا سکے تب بھی اس کے خیمے تک پہنچتے ہی سپہ سالار کو خبر ہو جائے گی اور وہ اپنا بچاؤ کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں اس منصوبے کے اس پہلو سے بخوبی واقف ہوں اس لئے میں ایک خاص بھیس میں رگھوناتھ سہائے کے خیمے تک پہنچوں گا۔"

امیر اژگر خان کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔

"اگر تم اسے اور اس کے ساتھی سپہ سالاروں کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گئے تو مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ مجھے ہندو فوج پر حملہ کر دینا چاہئے۔"

میں نے کہا۔ "جب میں ان سپہ سالاروں کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو خیموں میں آگ لگا دوں گا۔ قلعے کے محافظوں کو جب دور دشمن کے لشکر میں دھواں اور آگ کے شعلے اٹھتے دکھائی دیں تو فوراً حملہ کر دیا جائے۔"

جب یہ منصوبہ طے ہو گیا تو میں نے دوسرے دن صبح اپنا سر منڈوا کر ماتھے پر تلک لگایا۔ کھڑاویں پہنیں۔ ہاتھ میں چمٹا اور کرمنڈل پکڑا۔ گلے میں مالائیں ڈالیں اور اکیلا ہی قلعے کے چور دروازے سے نکل کر دوسری طرف سے ہو کر کفار کے خیموں کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہندوؤں کا لشکر قلعے سے دور ایک سنگلاخ میدان کے پار کیکر اور پھلاہی کے ایک وسیع و عریض جنگل میں خیمہ زن تھا۔ دن کی روشنی چاروں طرف بکھری ہوئی تھی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں شمال کی طرف مٹی کے تودوں کے پیچھے سے ہو کر ان خیموں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اب مجھے ہندو لشکر کے خیموں کے اوپر لہراتے جھنڈے دکھائی دینے لگے تھے ان خیموں کی تحفظاتی حدود میں پہنچا تو میں نے چمٹا بجاتے ہوئے رامائن کا پاٹھ کرنا شروع کر دیا۔ میں رامائن کے اشلوک گا بھی رہا تھا اور آہستہ آہستہ رقص بھی کر رہا تھا۔ جس طرح کہ اس زمانے کے ہندو جوگی کیا کرتے تھے یہاں ہندو سپاہی جگہ جگہ جھاڑیوں کے پیچھے چل پھر کر پہرہ دے رہے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو میرے قریب آ گئے۔

"کون ہو تم؟" ایک سپاہی نے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے اور کہا۔

"ہم رام نام کے جوگی ہیں۔ بھگوان کرشن کے بھجن گاتے ہیں اور تمہارے لئے پرارتھنا

کرتے ہیں کہ تم مسلمانوں کو مار بھگاؤ۔"

ان کا مجھ پر شک ہونا بے جا نہ تھا کہ ہو سکتا ہے کہ میں مسلمانوں کا جاسوس ہوں اور جوگی کا بھیس بدل کر ان کے فوجی راز معلوم کرنے وہاں آ گیا ہوں۔ اس سپاہی نے سب سے پہلے میری تلاشی لی پھر کہا۔

"سوامی جی! ٹھیک ہے آپ رام نام کے جوگی ہیں مگر آپ دوسری طرف سے ہو کر آگے گزر جائیں میں آپ کو لشکریوں کے خیموں کی طرف جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

میں نے پرنام کرتے ہوئے کہا۔ "جو حکم مہاراج! ہمیں تمہارے خیموں کی طرف جانے کی کیا ضرورت ہے بابا۔" اور میں دوسری طرف روانہ ہو گیا۔ نصف کوس جانے کے بعد میں نے دوبارہ خیموں کی طرف رخ کیا۔ یہاں بھی ہندو سپاہی پہرہ دے رہے تھے ابھی میں ان سے کچھ فاصلے پر تھا کہ مجھے ایک جھاڑی میں کالا سانپ رینگتا نظر آیا۔ اس سانپ کو دیکھتے ہی مجھے ایک خیال سوجھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سانپ کو پکڑ لیا۔ کم بخت سانپ نے میری کلائی پر ڈس لیا۔ لیکن اس کے ڈسنے سے کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے سانپ کو اپنی کلائی کے ساتھ لپیٹ لیا۔ سانپ نے دو تین بار مجھے ڈسا لیکن جب اس کے دانت تینوں بار سخت پتھر جیسی کلائی سے ٹکرائے تو وہ خاموش ہو گیا اور میری کلائی سے لپٹا رہا۔ میں نے اس کی گردن انگلیوں میں پکڑ لی اور سپاہیوں کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتے میں نے جاتے ہی اپنا سانپ والا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور کہا۔

"پربھوتت ست! ہم شیو شنکر کے گندھرو ہیں ہمیں دیوتا شیو شنکر نے تمہارے سپہ سالار رگھوناتھ سہائے کے نام ایک خاص پیغام دے کر بھیجا ہے ہمیں اپنے سپہ سالار تک پہنچاؤ۔"

میری آواز میں ایسی کڑک تھی اور میں اس روانی سے سنسکرت کے اشلوک پڑھ رہا تھا کہ سپاہی مجھ سے متاثر ہو گئے۔ پھر انہوں نے میری کلائی سے لپٹا ہوا ایک زہریلا ناگ بھی دیکھ لیا تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھے آگے بڑھنے کی اجازت دیتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ اب میں نے چمٹا بجاتے ہوئے رقص کرنا شروع کر دیا اور جان بوجھ کر کالے ناگ کو زمین پر چھوڑ دیا۔ سانپ کو زمین پر رینگتے دیکھ کر سپاہی ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن سانپ پہلے ہی بہت ڈرا ہوا تھا۔ زمین پر گرتے ہی وہ تیزی سے رینگتا ہوا سپاہیوں کی طرف لپکا۔ ایک سپاہی نے اس پر تلوار کا وار کیا مگر سانپ نے اچھل کر اس کی گردن پر ڈس دیا۔ دوسرے سپاہیوں نے سانپ کے ٹکڑے کر دیئے اور اپنے ساتھی کو سنبھال کر زمین پر لٹا دیا۔ میں یہی چاہتا تھا اب

میں نے بلند آواز سے کہا۔

”سانپ دیوتاؤں کا دیوتا تھا تم نے اسے ہلاک کر کے پاپ کیا ہے مگر تمہارے ساتھی کی جان بچا لوں گا۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔“

سپاہی جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے اپنے جھولے میں سے اپنے دوست کا دیا ہوا سبز رنگ کا سانپ کا مہرہ نکالا اور سپاہی کی گردن پر اس جگہ رکھ دیا جہاں سانپ نے ڈسا تھا۔ مہرے نے فوراً سپاہی کے جسم سے زہر کھینچنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مہرہ زہر پینے سے پھول گیا اور سپاہی جو مر رہا تھا ہوش میں آ گیا۔

میں نے مہرے کا زہر نچوڑ کر اسے اپنے جھولے میں ڈالا اور بولا۔

”بچنو! یہ شیو شنکر مہاراج کا دیا ہوا مہرہ تھا جس کے چمتکار نے تمہارے ساتھی کی جان بچا لی۔ اب تم شیو شنکر دیوتا کی اچھیا پوری کرو اور مجھے اپنے سپہ سالار رگھوناتھ سہائے کے پاس لے چلو۔“

ہندو ویسے بھی ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں اور پھر میں نے انہیں اپنی کرامت بھی دکھا دی تھی۔ وہ مجھ سے بہت متاثر ہوئے جس سپاہی کی میں نے جان بچائی تھی وہ ان کا سردار تھا وہ تو ہاتھ باندھ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور بولا۔

”مہاراج! میرے ساتھ چلئے۔ میں آپ کو اپنے سیناپتی جی کے خیمے تک لئے چلتا ہوں۔ مگر وہاں ان کے خاص سپاہیوں کا دستہ پہرہ دیتا ہے ان کو راضی کرنا آپ کا کام ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بچہ تم فکر نہ کرو۔ بھگوان شنکر مجھے تمہارے سیناپتی تک ضرور پہنچا دیں گے۔ چلو تم مجھے اس کے خیمے تک لے چلو۔“

چار سپاہی مجھے اپنے حصار میں لے کر لشکریوں کے خیموں کے درمیان سے گزرنے لگے۔ میں ان سب خیموں کو گہری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ ہم آدھ گھنٹے تک خیموں کے شہر کے درمیان چلتے رہے۔ واقعی یہ تو ہندوؤں کا ایک بہت بڑا لشکر تھا اور قلعہ لاہور میں مقیم مسلمان فوجیوں کی نفری اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی میں نے دیکھا کہ ان ہندو فوجیوں میں مرہٹہ سپاہیوں کی تعداد زیادہ تھی ہر مرہٹہ خیمے کے اوپر دو کونوں والا بھگوا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ ہندو سپاہی اپنے خیموں کے باہر بیٹھے مجھے دلچسپ نظروں سے دیکھ رہے تھے چند ایک ضعیف الاعتقاد سپاہیوں نے اٹھ کر مجھے ہاتھ جوڑ کر پرنام بھی کیا۔

ہندو لشکر کے سیناپتی رگھوناتھ سہائے کا کشادہ گیروا خیمہ ان خیموں کے بیچ میں ایک کھلی جگہ پر لگا تھا اور اس کے اردگرد مرہٹہ سپاہیوں کا ایک پورا دستہ پہرہ دے رہا تھا۔ ہمیں خیمے سے پچاس قدم پیچھے ہی روک لیا گیا۔ سپہ سالار کے محافظ دستے کے مرہٹہ سپاہی بڑے اجڈ

اور خونخوار قسم کے تھے۔ انہوں نے مجھے سپہ سالار کے پاس لے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ نہ صرف انکار کیا بلکہ انہوں نے ان سپاہیوں کو بھی گرفتار کر لیا جو مجھے وہاں تک لائے تھے میں کچھ گھبرایا کہ کہیں سارا معاملہ کھٹائی میں نہ پڑ جائے میں نے فوراً چالاکی سے کام لیتے ہوئے اونچی آواز میں اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے کہ ہو سکتا ہے میری آواز سن کر سپہ سالار خود خیمے سے باہر آ جائے۔ اس پر محافظ دستے نے تلواریں کھینچ لیں اور مجھ پر حملہ کرنے ہی والے تھے کہ سپہ سالار رگھوناتھ سہائے کے خیمے کا پردہ ہٹا اور اس کے اندر سے ایک نازک اندام حسینہ گہرے رنگ کے لباس میں ہیرے جواہرات پہنے باہر نکلی۔ اس کے دائیں بائیں دو آدمی بھی تھے جنہوں نے بسنتی رنگ کے بڑے بڑے پگڑ باندھ رکھے تھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں وچتروینا اور دوسرے کی بغل میں مردنگم تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی رقاصہ ہے۔

اس نے وہیں سے ہاتھ بلند کیا اور کہا۔

”ٹھہرو! ایک جوگی کی جیوہتیا نہ کرو۔“

سپاہی وہیں رک گئے۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ عورت سپہ سالار کی منظور نظر ہے وہ بڑے ناز و ادا سے چلتی میرے پاس آئی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”سوامی جی! یہ جھگڑا کیا ہے؟“

جب میں نے اسے اصل بات بتائی تو وہ بولی۔

”مہاراج! سیناپتی رگھوناتھ جی ناستک ہیں۔ میں انہیں جانتی ہوں۔ وہ دیوی دیوتاؤں پر یقین نہیں رکھتے وہ ایک سپاہی ہیں اور ہندوستان سے مسلمانوں کے لشکریوں کو باہر نکالنا ہی ان کی زندگی کا آورش ہے آپ ان سے نہیں مل سکتے۔“

میرے ذہن نے مجھے ایک اور بات سجھائی۔ اس عورت کی مدد سے میں سپہ سالار کے دربار میں پہنچ سکتا تھا۔ میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔

”بچہ ہم تیرے ماتھے پر دیوی سرسوتی کا پرکاش دیکھ رہے ہیں۔ کیا تم ہمیں بھوجن نہیں کھلاؤ گی۔“

دیوی سرسوتی علم اور موسیقی کی دیوی ہے۔ میری زبان سے اپنے بارے میں یہ کلمات سن کر وہ عورت بہت ہی خوش ہوئی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

”مہاراج! میرے خیمے میں پدھاریئے۔ آپ کو بھوجن کھلاؤں گی تو دیوتا مجھ پر مہربان ہوں گے۔“

دستہ خاص کے محافظوں نے سکھ کا سانس لیا کہ بلا ٹل گئی۔ میں اس عورت کے ساتھ

اس کے خیمے میں آ گیا۔ اس نے میرے ہاتھوں کو صندل اور گنگا جل سے دھلایا۔ میرے آگے سونے کے برتنوں میں پھل اور چاول رکھے اور خود پنکھا لے کر میرے سامنے بیٹھ گئی میں چاول کھانے لگا۔ ساتھ ساتھ اس کو ویدوں کے اشلوک اور بالمیکی کی رامائن کا پاٹھ کر کے بھی سناتا جاتا تھا کہ اس پر میرا رعب اچھی طرح جم جائے۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کا نام مادھوی ہے اور وہ رقاصہ نہیں بلکہ گائیکہ ہے اور گاتے ہوئے کبھی کبھی ترنگ میں آ کر نرت کرنے لگتی ہے۔ اس کی باتوں میں مجھے ایک بات اپنے مطلب کی نظر آئی جس پر میں چونکا۔ گائیکہ مادھوی چونکہ مجھ سے بہت مرعوب ہو چکی تھی اس نے مجھے بتایا کہ وہ رگھوناتھ سہائے سے محبت کرتی ہے۔ رگھوناتھ سہائے بھی اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ دونوں آپس میں شادی کرنا چاہتے ہیں مگر رگھوناتھ سہائے کی ایک بیوی بھی ہے جس کا نام چالکا ہے۔ رگھوناتھ سہائے اگرچہ ناستک ہے۔ دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتا مگر اسے یقین ہو گیا ہے کہ اس کی بیوی چالکا ایک ناگن ہے اور اگر اس نے اسے چھوڑ کر مجھ سے شادی کر لی تو وہ ناگن بن کر آئے گی اور اسے ڈس کر ہلاک کر ڈالے گی۔

"اس کی بیوی چالکا نے ایک ناگن بھی پال رکھی ہے جس کو وہ روزانہ دودھ اور شہد پلاتی ہے رگھوناتھ سہائے کو وہم ہے کہ یہ ناگن اس کی بیوی کی اصل ماں ہے اس نے مجھ سے کئی بار کہا ہے کہ مادھوی میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ تم سے بیاہ رچانا چاہتا ہوں۔ لیکن اگر میں نے ایسا کیا تو چالکا اور اس کی ماں مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گی۔"

مجھے اپنا راستہ صاف ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے مادھوی سے کہا۔

"مادھوی تو نے میری بڑی خدمت کی ہے۔ مجھے بھوجن کھلایا ہے۔ اب مجھ پر فرض ہو گیا ہے کہ تیری مدد کروں۔ سن - دیوتا شنکر نے مجھے ہدایت دے کر بھیجا ہے کہ میں رگھوناتھ سہائے سے مل کر دیوی دیوتاؤں سے محبت کرنے اور ان کی پوجا کرنے کا پیغام پہنچاؤں اگر تو مجھ سے وعدہ کرے کہ مجھے رگھوناتھ سہائے کے پاس لے جائے گی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی آسمانی دیوتاؤں کی دی ہوئی طاقت سے تمہارے راستے سے چالکا اور اس کی ماں کو ہمیشہ کے لئے ہٹا دوں گا۔"

مادھوی کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں کہنے لگی۔ "مہاراج! میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کو رگھوناتھ کے پاس لے چلوں گی پھر آپ اسے دیوتاؤں کا پیغام پہنچائیں۔ میں آپ کے بارے میں اسے ایسی اچھی باتیں کہوں گی کہ وہ خود آپ کو بلائے گا لیکن اس کے بعد آپ کو اس کی بیوی اور ناگن ماں کو ختم کر دینا ہو گا۔" میں نے کہا کہ میں وعدہ کرتا ہوں۔ وہ بولی۔

"کیا چالکا اور اس کی ناگن ماں میرے محبوب کو مجھ سے شادی کرنے کے بعد ڈس کر مار تو نہیں ڈالے گی؟؟"

میں نے پرزور الفاظ میں اسے یقین دلایا کہ چالکا اور اس کی ناگن ماں کو اس طرح جلا کر بھسم کر دیا جائے گا کہ وہ دوبارہ اس دنیا میں کسی روپ میں بھی واپس نہیں آ سکیں گی۔

مادھوی کو میں نے اپنی ان دیکھی طاقت کا یقین دلا دیا تو وہ رات کو جب رگھوناتھ سہائے کے خیمے.... میں گئی تو اس نے اسے میرے بارے میں بڑھ چڑھ کر بتایا اور یہ بھی کہہ دیا کہ میرے پاس ایسی کرامت ہے جس کی مدد سے میں چالکا اور اس کی ناگن ماں سے اس کو ہمیشہ کے لئے نجات دلا سکتا ہوں۔ رگھوناتھ سہائے نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مادھوی مجھے دوسرے روز اس کے پاس لے گئی۔

میں ایک خاص جوگیوں جیسے انداز کے ساتھ اس کے شاہی خیمے میں داخل ہوا۔ میں پہلی بار رگھوناتھ سہائے کو دیکھ رہا تھا وہ ایک کالا کلوٹا' ادھیڑ عمر کا گول مٹول مرہٹہ تھا جس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں مگر آنکھیں سانپ کی آنکھوں کی طرح سرخ اور مقناطیسی تھیں۔ ان آنکھوں سے سفاکی اور بے دردی جھلک رہی تھی وہ بھگوئے کپڑوں میں تھا جس پر گوٹہ کناری لگا تھا۔ اس کے سر پہ چٹیا تھی جس کو مروڑ کر ٹانڈ کے بیچ میں جما دیا گیا تھا۔ اس کے ماتھے پر زعفران کا ٹیکا تھا۔ دو ہٹے کٹے سیاہ فاہم مرہٹہ محافظ تلواریں لئے اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ احتراماً اٹھ کھڑا ہوا مگر چونکہ وہ ناستک تھا اس لئے اس نے مجھے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ مادھوی میرے ساتھ تھی۔

میں نے ہندو لشکر کے اس سب سے بڑے سپہ سالار کو غور سے دیکھا اور پھر ایک چوکی پر بیٹھ گیا۔ مادھوی ایک طرف قالین پر جا کر بیٹھ گئی۔ رگھوناتھ سہائے اپنی مونچھوں کے کنارے کو مروڑ رہا تھا اور میری طرف گہری مشکوک نگاہوں سے تک رہا تھا۔ خیمے میں ایک عجیب قسم کی دہشت بھری خاموشی طاری تھی۔ میں نے محسوس کیا یہ اس مرہٹہ سردار کی سفاک شخصیت کی دہشت تھی۔ وہ واقعی ایک حیرت انگیز مقناطیسی شخصیت کا مالک تھا لیکن مجھ پر اس مقناطیسی طلسم کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا میں بڑے مقدس انداز میں بیٹھا اشلوک پڑھتا رہا اور میں نے یوں ظاہر کیا جیسے مجھ پر اس کی موجودگی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

رگھوناتھ سہائے نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اشارے کے ساتھ ہی اس کے دونوں محافظ جھکے اور خیمے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد پھر وہی سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے کو رگھوناتھ سہائے نے دل میں خراش ڈال دینے والی آواز سے توڑا۔

"جوگی! مجھے مادھوی نے کہا ہے کہ تم اپنے کسی دیوتا شنکر کا میرے لئے کوئی پیغام لے

کر آئے ہو کیا ہے وہ پیغام؟"

میں نے کہا۔ "مہاراج! دیوتا شیو شنکر آپ کو ہندو جاتی ہندو دھرم کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں لیکن انہوں نے کہا ہے کہ آپ دیوی دیوتاؤں پر یقین رکھیں ان کی پوجا پاٹھ کریں اور اپنے خیمے میں ان کے بھجن گایا کریں۔"

رگھوناتھ سہائے کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ آئی کہنے لگا۔

"جوگی اگر تمہارے ساتھ مادھوی نہ ہوتی تو اس خیمے میں داخل ہوتے ہی میں خود اپنے ہاتھ سے تمہارا سر قلم کر دیتا۔ اب تم آ گئے ہو اور مادھوی نے تمہاری سفارش کی ہے تو میں تمہاری جان بخشی کرتا ہوں لیکن آئندہ اگر تم نے میرے آگے کسی دیوی دیوتا کا نام لیا تو میں مادھوی کی بھی پروا نہیں کروں گا۔"

مادھوی کا چہرہ اتر سا گیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ آدمی بڑا ٹیڑھا ہے میری مشکل یہ تھی کہ میں صرف اسے ہی نہیں بلکہ اس کی فوج کے باقی تین سالاروں کو بھی قتل کرنا چاہتا تھا اور مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور کس کس خیمے میں رہتے ہیں۔ میں نے اسے سنسکرت کا ایک اشلوک پڑھ کر سنایا۔

"بھگوان تم سے خوش ہیں کیوں کہ تم ہندو دھرم کو مسلمان ملیچھوں کی تباہی سے بچا رہے ہو اس لئے میں شیو شنکر کے حکم سے تمہیں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔"

رگھوناتھ سہائے اپنی ننگی تلوار کے پھل پر انگلی چلاتے ہوئے بولا۔

"تم اپنے دیوتاؤں سے یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ میری جگہ پر آ کر مسلمانوں کے لشکر کو تباہ و برباد کر دیں۔"

میں نے کہا۔ "مہاراج انہوں نے یہ کام تمہیں سونپا ہے وہ تمہارے ساتھ ہیں اور میدان میں تمہاری مدد کریں گے۔"

رگھوناتھ سہائے نے ناراضگی سے ہاتھ ایک طرف کو جھٹکا اور غرایا۔

"میدان جنگ میں سوائے میری فوجوں کے کوئی میری مدد نہیں کرے گا۔"

پھر اس نے اٹھ کر دو گلاسوں میں شربت ڈالا۔ ایک گلاس مادھوی کو دیا اور دوسرا میری طرف بڑھایا۔ میں نے کہا۔ "مہاراج! جوگی مشروب نہیں پیا کرتے' وہ مسکرایا اور تخت کی مسند سے لگ کر خود ہی پینے لگا۔ اب میں اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے بغیر کسی تمہید کے کہنا شروع کیا۔

"عظیم سیناپتی! میں دیکھ رہا ہوں کہ مستقبل کے ایک عظیم الشان محل میں تم اپنی پسند کی محبوبہ کے ساتھ کنول کے پھولوں کے کنج میں بیٹھے مشروب سے دل بہلا رہے ہو۔"

رگھوناتھ سہائے اپنی نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"مگر تمہارے راستے میں موت سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔"

وہ ایک دم یوں چونک پڑا جیسے اس نے اپنے قریب ہی پھن دار سانپ کو دیکھ لیا ہو۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "مہاراج! ناراض نہ ہوں۔ موت سے میری مراد وہ ناگنیں ہیں جو آپ کے اور آپ کی محبوبہ مادھوی کے درمیان بیٹھی پھنکار رہی ہیں وہ اس جنم میں آپ کا ملاپ نہیں ہونے دیں گی۔"

اب مادھوی آگے بڑھی۔ اس نے کہا۔

"مہاراج! سوامی جی بڑی کرنی والے ہیں انہوں نے بھی یہی کہا ہے کہ آپ کی بیوی چالاکا اصل میں ایک ناگن ہے جس نے عورت کا روپ اختیار کر رکھا ہے اور اس کے پاس جو ناگن ہے وہ اصل میں اس کی ماں ہے جس نے ناگن کا بھیس بدل رکھا ہے۔"

رگھوناتھ سہائے ہمہ تن گوش ہو گیا تھا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔

"مادھوی کا کہنا بجا ہے سیناپتی! ان دونوں ناگنوں نے آپ کے جیون کو نرک بنا رکھا ہے۔ جب تک یہ آپ کے درمیان پھنکارتی رہیں گی آپ پھولوں بھرے کمل کنج کے شاہی محلات تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

رگھوناتھ سہائے ایک حقیقت پسند مرہٹہ سردار تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے وہم ہو گیا تھا کہ اس کی بیوی ناگن ہے اور اسے مادھوی سے پیار کرنے کے جرم میں ڈس لے گی۔ اس نے سرخ تکیہ اٹھا کر اپنے زانو پر رکھا اور اس پر کہنی ٹکا کر میری طرف گھورتے ہوئے بولا۔

"کیا تم ثابت کر سکتے ہو کہ تم ایک کرنی والے جوگی ہو؟"

میرے لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی میں مسکرایا۔

"عظیم سیناپتی! تم مجھ سے جیسا چاہو امتحان لے سکتے ہو۔ میں اپنی آسمانی طاقت ثابت کرنے کے لئے ہر آزمائش سے گزرنے کو تیار ہوں۔"

رگھوناتھ سہائے اپنی مونچھوں کو مروڑنے لگا۔ پھر اس نے مسند کے قریب ہی لٹکی ہوئی ریشمی ڈوری کو کھینچ دیا۔ خیمے کے باہر مجھے گھنٹی بجنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ گھنٹی کے بجتے ہی باہر سے ایک سپاہی تیزی کے ساتھ اندر آ گیا۔ سیناپتی نے اسے انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔ سپاہی اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔ خیمے میں ایک بار پھر وہی پراسرار خاموشی چھا گئی۔ سیناپتی بولا۔

"جوگی میں نے دھرم شاستروں میں پڑھا ہے کہ شیو شنکر کے پجاریوں پر سانپ کا زہر اثر نہیں کرتا۔ کیا تمہارے جسم پر بھی سانپ کا زہر اثر نہیں کرتا؟"

میں نے جواب دیا۔ "جب میں شیو شنکر کے دھیان میں ہوتا ہوں تو مجھ کو چاہے جس قدر زہریلا سانپ ڈس جائے مجھ پر اس کے زہر کا اثر نہیں ہو گا۔"

سیناپتی نے کہا "تو پھر اپنے شیو شنکر کا دھیان شروع کر دیجئے کیونکہ آپ کے امتحان کے لئے میں نے ہندوستان کا سب سے زہریلا سانپ منگوایا ہے۔"

"میں تیار ہوں عظیم سیناپتی۔"

اور میں نے یونہی الٹ پلٹ اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔ اتنے میں وہی سپاہی خیمے میں واپس آیا۔ اس نے ہاتھوں میں ایک پٹاری اٹھا رکھی تھی پٹاری رگھو ناتھ سہائے کے حکم سے میری چوکی کے آگے رکھ دی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ مادھوی کچھ پریشان سی ہے۔ میں نے اسے کچھ نہ کہا اور آنکھیں بند کئے اشلوک پڑھ کر یہ ظاہر کرتا رہا کہ میں شیو شنکر کے تصور میں گم ہو رہا ہوں۔ پھر میں نے آنکھیں کھول دیں اور رگھو ناتھ سہائے سے کہا۔

"مہاراج میں امتحان کے لئے تیار ہوں۔"

وہ بولا۔ "تو پھر کس کا انتظار ہے۔ پٹاری کھولو۔ کالے ناگ سے اپنا آپ ڈسواؤ تاکہ تمہاری اصلیت ظاہر ہو سکے۔"

میں نے پٹاری کا ڈھکن اٹھا دیا۔ اف میرے خدا! کیا سانپ تھا۔ اس کے پھن کے اوپر لمبے لمبے سرکنڈوں جیسے بال تھے اور اس کی گلابی دوشاخہ زبان بار بار لہرا رہی تھی۔ لیکن میرے لئے وہ ایک بے ضرر کیڑا تھا۔ میں بھی نمائش کے طور پر ہری اوم کا جاپ کرنے لگا اور پھر ہاتھ بڑھا کر اپنی کلائی سانپ کے پھن کے آگے کر دی۔ سانپ نے فوراً میری کلائی پر ڈس لیا۔ گائیکہ مادھوی اور رگھوناتھ سہائے مرہٹہ سیناپتی کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے سانپ کو اپنی گردن میں ڈال لیا۔ سانپ نے ایک بار مجھے گردن پر بھی ڈسا۔ جب سانپ مجھے تین بار ڈس چکا تو میں نے اسے گردن سے اتارا اور سیناپتی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"عظیم سیناپتی! کیا اب بھی تمہاری تسلی نہیں ہوئی؟ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ تمہارے سب سے زہریلے سانپ نے مجھے تین بار ڈسا مگر مجھ پر اس کے زہر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔"

مادھوی نے اٹھ کر میرے پاؤں چھوئے۔ ناستک رگھوناتھ سہائے نے ایسی کوئی حرکت نہ کی۔ وہ اپنی مسند پر اسی کروفر کے ساتھ بیٹھا اپنی مونچھوں کے کنارے مروڑتا رہا۔ مگر وہ مجھ سے متاثر ضرور ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم سچے تیاگی ہو۔ یہ گن اور یہ شکتی تم نے اپنی تپسیا سے پیدا کر لی ہے۔"

میں نے سانپ کو پٹاری میں بند کر دیا۔ جسے سپاہی اٹھا کر لے گیا۔ اب سیناپتی میری طرف خاص انداز سے متوجہ ہوا۔ وہ اٹھا اور مسند کے گرد دو چکر لگا کر اچانک میری طرف پلٹ کر بولا۔

"جوگی! تمہیں مادھوی نے سب کچھ بتا دیا ہو گا۔ پہلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ چاہے تم آکاش کے دیوتا ہی کیوں نہ ہو۔ اگر تم نے میرے اس راز کو کسی پر ظاہر کیا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ میرے اس راز کو اپنے تک ہی رکھو گے؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں سیناپتی۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر مجھے بتاؤ کہ میں اپنی ناگن بیوی اور اس کی ناگن ماں سے کیسے نجات حاصل کر سکتا ہوں یہ دونوں میرے بچوں کو کھا جائیں گی۔ میں ایک ناگن بیوی اور ساس کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ میں مادھوی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے ایسا کیا تو میری بیوی چالاکا جو اصل میں ناگن ہے ہم دونوں کو ڈس لے گی۔ کیونکہ ویدوں میں لکھا ہے کہ جو ناگن سو برس کی ہو کر عورت کا روپ اختیار کر لے وہ مرنے کے بعد پھر سے ناگن بن جاتی ہے۔"

ہندو لشکر کا سیناپتی اس طرف ہی آ رہا تھا جس طرف میں اس کو لانا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس کی ناگن بیوی اور ساس کو اپنے آتشی اشلوکوں سے اس طرح بھسم کر ڈالوں گا کہ وہ دوبارہ جنم نہیں لے سکیں گے۔ رگھوناتھ.... میرے قریب آ کر سامنے والی چوکی پر بیٹھ گیا اور مادھوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔

"اگر تم مجھے ان ناگنوں سے نجات دلانے میں کامیاب ہو گئے تو میں تمہیں سونے جواہرات سے مالا مال کر دوں گا۔ تم میرے مہامنتری ہو گے۔"

میں مسکرا دیا۔ "مہاراج۔ ہم جوگی تیاگی سنیاسی لوگ ہیں ہم آپ کے دو بچھڑے ہوئے دلوں کو ہمیشہ کے لئے ملا دیں گے اور چلے جائیں گے۔ ہمیں مال و دولت کی خواہش نہیں ہے۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کو کیا کرنا ہو گا۔ کل صبح آپ اپنے اس خیمے میں اپنے لشکر کے سارے سپہ سالاروں کو جمع کریں۔ یہاں ایک دعوت ہو گی اس دعوت میں آپ کی بیوی چالاکا اور ساس بھی شامل ہو گی۔ آپ اعلان کریں گے کہ مسلمانوں کے قلعے پر حملے سے پہلے آپ ایک یگیہ ہون کر رہے ہیں۔ میں اس ہون میں مقدس ویدوں کا پاٹھ کروں گا۔ اس دوران میں ایک خاص منتر پڑھ کر آپ کی بیوی چالاکا اور اس کی ناگن ماں پر

پھونک دوں گا۔ اس منتر کے اثر سے وہ دعوت کے ختم ہونے کے آدھے گھنٹے بعد جب اپنے خیمے میں جائیں گی تو شعلہ بن کر بھسم ہو جائیں گی۔"

رگھوناتھ سہائے نے کہا کہ اس دعوت میں لشکر کے دوسرے سالاروں کو بلانا کیا ضروری ہے؟ میں نے کہا کہ میرا خفیہ منتر پھر ہی کام کرے گا جب دعوت میں میرے سامنے اعلیٰ ذات کے لوگ جمع ہوں گے۔ رگھوناتھ مان گیا۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اپنی فوج کے باقی سپہ سالاروں سے وہ اکثر خیمے میں ملتا ہی رہتا تھا۔ کل کا دن طے ہو گیا۔ اور میں مادھوی کے ساتھ واپس اس کے خیمے میں آ گیا۔ اس وقت ابھی ایک پہر دن باقی تھا۔ میں اپنے خفیہ منتر کا ابھیاس کرنے کے بہانے جنگل میں نکل گیا۔

میرا مقصد اس ویرانے میں گھوم پھر کر ایک خاص قسم کی بوٹی حاصل کرنا تھا۔ یہ بوٹی میں ہندوستان کے جنگلوں میں دیکھ چکا تھا۔ اس کی تاثیر انتہائی مہلک تھی اگر اس بوٹی کے بیج پیس کر اس کا سفوف پانی یا مشروب میں ملا کر کسی کو پلا دیا جائے تو وہ پینے کے دو گھنٹے بعد مر جاتا تھا۔ جنگلی جھاڑیوں میں گھومتے پھرتے آخر ایک جگہ مجھے یہ زہریلی بوٹی نظر آ گئی۔ میں نے اس کے پوست کی طرح کے خشک پھل توڑ کر اس کے بیج اکٹھے کئے - وہیں ایک جگہ پتھر پر انہیں رگڑ کر سفوف بنایا۔ اسے پوٹلی میں باندھا اور واپس مادھوی کے خیمے میں چلا آیا۔

دوسرے دن سیناپتی رگھوناتھ سہائے نے یہ کہہ کر اپنے تینوں سپہ سالاروں کو خیمے میں طلب کر لیا کہ وہ قلعے پر حملے کی تیاری کے سلسلے میں ایک ہون کر رہا ہے۔ سپہ سالاروں نے تعجب کا اظہار کیا کہ وہ تو ان باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ سیناپتی نے کہا کہ وہ ایسا اپنی بیوی چاپلکا کے کہنے پر کر رہا ہے جس کا خیال ہے کہ اس ہون کے بعد لاہور کا قلعہ فتح ہو جائے گا۔

ایک پہر دن ڈھلے رگھوناتھ سہائے کے خیمے کے وسط میں آگ روشن کر دی گئی - میں نے اپنی نگرانی میں مقدس مشروب تیار کروایا تھا جس میں موقع پا کر بوٹی کا زہر ملا دیا تھا۔ اپنے خیمے سے چلنے سے پہلے میں نے ارنڈ کے تیل میں ایک خاص بوٹی کا ست ملا کر ایک پیالی خود بھی پیا اور مادھوی کو بھی یہ کہہ کر پلا دیا کہ یہ مقدس مشروب ہے اس سے دیوتا مہربان ہو کر دھرتی پہ اتر کر ہمارے پاس آ جائیں گے۔ اس دوائی میں یہ تاثیر تھی کہ اگر اسے بھی زہریلا مشروب پینا پڑ گیا تو اس پر بوٹی کا زہر اثر نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے خود اس لئے پیالہ پیا تھا کہ مادھوی کو کسی قسم کا کوئی شک نہ ہو۔

جب میں تلک لگائے اشلوک کا پاٹھ کرتا سیناپتی کے خیمے میں داخل ہوا تو وہاں تینوں سپہ سالار شاندار پوشاکوں میں سیناپتی رگھوناتھ سہائے کے قریب چاندی کی چوکیوں پر زرد اور

بھگوتی پگڑیاں باندھے بڑی شان سے براجمان تھے۔ سیناپتی کے قدموں میں قالین پر اس کی ناگن بیوی چاپلکا اور اس کی ماں خوبصورت زرق برق ساڑھیوں میں ملبوس سرخ ٹیکے ماتھوں پر لگائے زیورات سے بنی سنوری بیٹھی تھیں۔ خیمے کی دیوار کے ساتھ ساتھ فوج کے نائب سپہ سالار بھی اسلحہ سے لیس چاق و چوبند کھڑے تھے۔

اب میں نے اپنا پاکھنڈ شروع کر دیا۔ اور گیتا کے اشلوک بلند آواز میں پڑھنے شروع کر دیئے۔ مادھوی میرے عقب میں ایک چوکی پر بیٹھی تھی۔ کچھ دیر اشلوکوں کا پاٹھ کرنے کے بعد میں نے آنکھیں کھول کر ہاتھ بلند کیا اور کہا۔

"مقدس مشروب پلانا شروع کیا جائے۔"

رگھوناتھ سہائے کے اشارے سے چار خادم اس مٹکے کی طرف بڑھے جو مشروب سے بھرا ہوا تھا اور جس میں میں نے پہلے ہی سے زہریلی بوٹی کا سم قاتل ملا دیا تھا مشروب چاندی کے پیالوں میں بھر کر سب سے پہلے رگھوناتھ سہائے کو پیش کیا گیا۔ اس کے بعد سہائے کی بیوی چاپلکا اور اس کی ساس نے وہ مشروب پیا میں دیکھ رہا تھا کہ خیمے میں جتنے انسان موجود تھے وہ سب بڑے شوق سے مشروب پی رہے تھے۔ ایک پیالہ مجھے بھی پیش کیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ مادھوی بھی پیالہ منہ سے لگائے مشروب پی رہی تھی - یہ کوئی تشویش ناک بات نہیں تھی میں جانتا تھا کہ مشروب کا زہر اسے ہلاک نہیں کرے گا۔ وہ میری محسنہ تھی اور میں اسے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اپنا پاکھنڈ جاری رکھا اور اشلوک پڑھتا رہا۔ پھر رگھوناتھ سہائے کو یقین دلانے کے لئے اٹھا اور ہون کنڈ کے سات چکر پورے کرنے کے بعد میں نے دو بار اس کی بیوی چاپلکا اور ساس کی طرف منہ کر کے پھونک ماری اور کہا کہ یہ مقدس منتر ہے اس کے اثر سے ان دونوں کی تمام بلائیں دور ہو جائیں گی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا ان سب کے ہلاک ہونے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ میں نے اب بھجن گانے شروع کر دیئے تا کہ وہ لوگ وہیں خیمے میں میری آنکھوں کے سامنے مریں اور مجھے ان کی موت کا یقین ہو جائے۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ میں بھجن گاتے گاتے تھکا نہیں تھا مگر تنگ ضرور آ گیا تھا لیکن یہ کام بہت ضروری تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ خیمے کے اندر میرے اور مادھوی کے علاوہ جتنے لوگ بھی بیٹھے تھے سب کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ میں نے مادھوی سے کہا۔

"ان پر مشروب کا نشہ ہے جو تھوڑی دیر بعد اتر جائے گا۔"

وہ حیران ہو کر بولی۔ "مہاراج! مگر مجھ پر اس کا اثر نہیں ہوا۔"

میں نے کہا۔ ”جس کا اعتقاد پکا ہو اس پر ان چیزوں کا اثر نہیں ہوا کرتا۔“

سب سے پہلے خیمے میں کھڑے محافظ گرے۔ اس کے بعد مشروب پلانے والے خادم لڑکھڑائے۔ انہوں نے زیادہ مقدار میں مشروب پی لیا تھا۔ رگھوناتھ سہائے کی حالت بھی بگڑنے لگی تھی۔ اسے کچھ شک سا ہوا۔ اس نے تلوار کھینچ لی اور کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے چلایا۔

”یہ کیا... کیا... ہو رہا... ؟“

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا اور مسند سے نیچے گر پڑا۔ اس کے دوسرے سپہ سالار اس کی طرف بڑھے تو وہ بھی لڑکھڑا گئے۔ سیناپتی کی بیوی چالاکا اور ماں پہلے ہی ڈھیر ہو چکی تھیں۔ مادھوی پریشان ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور گھبرا کر بولی۔

”مہاراج! یہ کیا ہو گیا ہے؟“

میں سیناپتی کی طرف بڑھا اور اس کی آنکھوں کو کھول کر دیکھا اس کی آنکھوں کا رنگ سفید ہو گیا تھا میرا سم قاتل اپنا کام کر چکا تھا - یہی حال اس کے دوسرے سپہ سالاروں کا تھا۔ سب زہر کے اثرات سے ہلاک ہو چکے تھے۔ میں نے پلٹ کر مادھوی سے کہا۔

”مادھوی جلدی سے اپنے خیمے میں جاؤ اور تیل کی وہ بوتل لے آؤ جس میں سے تیل نکال کر میں نے تمہیں پلایا تھا۔“

مادھوی بے چاری کو کیا خبر تھی کہ میں کسی منصوبے پر عمل کر رہا تھا۔ وہ اٹھی اور تیزی سے اپنے خیمے کی طرف بھاگی۔ اب میں ہندو لشکر کے مردہ سپہ سالاروں کے درمیان فاتح کی حیثیت سے تنہا کھڑا تھا۔ میں اپنے منصوبے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے منصوبے کے آخری مرحلے پر کام شروع کر دیا۔ خیمے کے وسط میں آگ روشن تھی۔ میں نے پردے کھینچ کر پھاڑے اور انہیں آگ میں ڈال دیا۔ آگ ایک دم بھڑک اٹھی میں نے ان جلتے ہوئے پردوں کو خیمے کی دیواروں کی طرف اچھال دیا اور آگ آگ کا شور مچاتا باہر نکل آیا۔

خیمے سے دس قدم کے فاصلے پر کھڑے شاہی محافظوں نے خیمے کی دیواروں کو آگ کے شعلوں میں تبدیل ہوتے دیکھا تو وہ گھبرا کر آگ بجھانے کو بھاگے۔ وہ خیمہ جہاں پانی کے مٹکے ذخیرہ کر کے رکھے گئے تھے وہاں سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ جب تک سپاہی اس خیمے تک پہنچے دوسرے خیموں نے بھی آگ پکڑ لی۔ وہاں ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ میں موقع پا کر وہاں سے کھسک گیا۔ میں سپاہیوں کے خیموں کے درمیان سے گزرتے ہوئے واویلا کرتے ہوئے آگ لگ گئی سیناپتی اور دوسرے سالار جل کر بھسم ہو گئے کا شور مچاتا چلا جا رہا تھا تاکہ ہندو

لشکر میں بددلی اور افراتفری پھیل جائے اور میں اپنی اس اسکیم میں کامیاب ہوا۔ لشکر میں کہرام سا مچ گیا جس سپاہی کو دیکھو وہ اس طرف بھاگا جا رہا تھا جہاں خیموں کو آگ لگی ہوئی تھی اور شعلے بلند ہو رہے تھے۔ میں بھی اس بھاگ دوڑ میں شامل ہو گیا اور لشکریوں کے خیموں سے نکل کر مغربی جنگل سے گزرتا کھلے میدان میں آ گیا۔ یہاں سے مجھے قلعہ لاہور صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ قلعے کی دیوار کے اوپر غزنوی لشکر تیار کھڑے ہیں۔ میرے دیکھتے دیکھتے قلعے کا پل کھائی پر ڈال کر قلعے کا دروازہ کھول دیا گیا اور مسلمانوں کا لشکر نعرے لگاتا تلواریں لہراتا سرپٹ گھوڑے دوڑاتا ہندوؤں کے خیموں پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ ہندو فوج میں پہلے ہی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ اوپر سے مسلمانوں کی فوج کا حملہ ہوا تو انہوں نے پلٹ کر کچھ دیر مقابلہ کیا مگر پھر ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔

اسی رات میں قلعہ لاہور کے امیر اژگر خان کے کمرۂ خاص میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ شمع دان روشن تھے۔ امیر اژگر خان بہت خوش تھا۔ اس کی فوجوں نے ہندوؤں کے لشکر پر فتح پا لی تھی۔ امیر اژگر خان نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”جابر خان! اگرچہ تم میرے دشمن رہ چکے ہو۔ تم نے نہ جانے کتنے ڈاکے ڈالے اور لوگوں کو قتل کیا ہے مگر یہ ایک ایسا کام تم نے کیا ہے کہ تمہارے سارے گناہ دھل گئے ہیں۔ میں تمہیں اس شاندار کارکردگی پر انعام دینا چاہتا ہوں۔ بتاؤ کیا تم صوبہ ملتان کے صوبیدار بننا پسند کرو گے؟ میں نے اژگر خان کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

”اے عالی مرتبت امیر! مجھے کسی منصب کی خواہش نہیں - اب میرا دل اس دنیا کے جاہ و حشم سے بے زار ہو گیا ہے چاہتا ہوں باقی زندگی خلق خدا کی خدمت اور یاد الٰہی میں بسر کر دوں۔ اس لئے مجھے اجازت دو کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔“

اژگر خان نے تعجب کیا اور بولا۔

”خان جابر! کیا تم سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کر رہے ہو؟ کیا تم صوبیدار رہ کر خلق خدا کی خدمت اور خدا کی عبات نہیں کر سکتے؟“

میں نے کہا۔ ”دنیا کے جھمیلوں میں جکڑا ہوا آدمی پوری یکسوئی سے خدا کی عبادت نہیں کر سکتا۔ میری خواہش ہے کہ آپ مجھے قلعے سے چلے جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ میں آپ کے لئے جو کر سکتا تھا کر دیا ہے۔“

اژگر خان ایک گہرا سانس بھر کر خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔

”اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو میں تمہیں روک نہیں سکتا۔ رات آرام کر لو۔ صبح چلے جانا۔ مگر تم کس طرف جاؤ گے؟“

میں نے کہا۔ "فقیر کی کوئی خاص منزل نہیں ہوتی۔ ہاں ارادہ ہے کہ ملتان کی سیر کروں۔ وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور صوفیائے کرام کے مزارات بھی ہیں کچھ دیر اس مقدس شہر میں رہ کر یاد الٰہی میں محو رہنا چاہتا ہوں۔"

امیر اژگر خان مجھے اپنے مہمان خانے تک چھوڑنے آیا۔ اگلے روز میں نے ہندوانہ لباس اتار دیا۔ ماتھے کا تلک دھو ڈالا۔ مسلمانوں کا لباس پہنا اور گھوڑے پر سوار ہو کر لاہور سے ملتان کی طرف روانہ ہو گیا۔ آج کل کے ماڈرن ٹیکنالوجی کے زمانے میں آپ لاہور سے بوئنگ طیارے پر بیٹھ کر پندرہ منٹ میں ملتان ایئر پورٹ پر پہنچ جاتے ہیں لیکن آج سے پندرہ سو برس پہلے ایسا نہیں تھا۔ لاہور سے ملتان تک کا سارا علاقہ گھنا جنگل تھا اور لوگ قافلوں کی صورت میں سفر کرتے ہوئے ایک مہینے کے بعد ملتان پہنچتے تھے۔ راستے میں ڈاکوؤں کا ہر دم دھڑکا لگا رہتا تھا۔ یہ ڈاکو مسافروں کو لوٹ کر قتل کر دیتے تھے۔ اکیلا آدمی کبھی سفر نہیں کرتا تھا۔ مگر مجھے نہ لٹنے کی فکر تھی اور نہ قتل کئے جانے کا ڈر تھا اس لئے اکیلا ہی سفر پر روانہ ہو گیا۔ میں اسی راستے پر چلا جا رہا تھا جس راستے پر قافلے سفر کیا کرتے تھے یہ جنگل سے بل کھا کر گزرتی ایک کچی سڑک تھی جس میں کہیں کہیں پڑاؤ بنے تھے اور وہاں کارواں سرائے میں مسافروں کے لئے کھانے پینے کا سامان رکھا جاتا تھا۔ رات کو مسافر ان کاروان سراؤں میں آرام کرتے اور صبح کو تازہ دم ہو کر پھر اپنے سفر پر روانہ ہو جاتے۔ میں بھی ان چھوٹے چھوٹے پڑاؤ پر رکتا۔ گھوڑے کو تازہ دم کرتا اپنے سفر پر رواں دواں رہا اور آخر ملتان پہنچ گیا۔ ملتان شہر ایک بلند و بالا چار دیواری کے اندر تھا۔ یہاں مسلمانوں نے چند ایک بڑی خوبصورت مسجدیں بنائی تھیں جن کے گنبدوں پر نیلی ٹائیلوں کے ساتھ منقش کام کیا گیا تھا۔ شہر میں ہندو بھی مسلمان صوبیدار کے زیر سایہ امن و چین سے رہ رہے تھے۔

شہر کافی کھلا اور کشادہ تھا دور تک کھیت اور پھل دار باغ تھے آبادی کافی گنجان تھی میں کارواں سرائے میں آ گیا۔ میرے پاس کافی دینار تھے۔ میں نے گھوڑے کو کارواں سرائے کے سائیس کے حوالے کیا اور خود شہر کی سیر کو روانہ ہو گیا۔ چلتے چلتے میں ایک بازار سے گزرا تو میں نے ایک مجذوب کو دیکھا کہ لڑکے اس کے پیچھے لگے تھے اور وہ ہر ایک سے ایک ہی سوال کرتا تھا۔

"مجھے ایک دینار اپنی حلال کی کمائی میں سے دے دو اور یہ دینار مجھے بخش دو۔"

یہ ایک نوجوان مجذوب تھا اور کسی کے آگے سوائے ایک دینار کا سوال کرنے کے اور کچھ نہ کہتا تھا۔ جب کوئی اسے دینار دیتا تو وہ کہتا کہ۔ "یہ دینار قبرستان میں میرے دوست

کی قبر میں لے جا کر ڈال دو۔" پھر خود ہی دینار کو ہوا میں اچھال کر آگے چل دیتا۔ اور دوبارہ دینار کا سوال دہرانے لگتا۔ وہ میرے قریب سے گزرا تو اس نے مجھ سے بھی ایک دینار مانگا میں نے اسے ایک دینار نکال کر دیا تو میری طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔

"بھائی یہ دینار قبرستان میں میرے دوست کی قبر میں لے جا کر پھینک دو۔ میں جہنم کے عذاب سے بچ جاؤں گا۔"

پھر غور سے دینار کو ہتھیلی پر رکھ کر دیکھا اور ہوا میں اچھال کر آگے نکل گیا۔ نہ وہ کسی کو بتاتا تھا کہ قبرستان میں وہ کس قبر میں دینار پھنکوانا چاہتا ہے۔ یا ایسا کیوں کرنا چاہتا ہے؟ اور نہ کوئی اس کی طرف توجہ ہی دیتا تھا۔ یہ مجذوب ایک خوش شکل نوجوان تھا اور افغان لگتا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ جب وہ شہر سے باہر نکل گیا تو میں بھی واپس شہر کی طرف چل دیا۔ جب میں ملتان کے بازاروں سے گزرنے لگا تو جو شکلیں مجھے پہلے روز دکانوں پر بیٹھی نظر آئی تھیں اب ان کی جگہ دوسرے لوگ بیٹھے تھے میں اپنی کاروان سرائے میں گیا تو دیکھا کہ اس کی جگہ سات محرابی دروازوں والی ایک نئی کارواں سرائے تعمیر ہو چکی ہے اب اپنے پراسرار دوست کو تلاش کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ غیاث الدین بلبن کا عہد حکومت ہے اور ملتان میں اس کا صوبیدار حکمران ہے۔ گویا میرے شہر سے باہر جانے اور اندر آنے میں دو سو سال کا زمانہ گزر گیا تھا۔ زمانہ تو گزرنا ہی تھا اور ہوائے برشگال کی طرح وہ مجھے اپنے ساتھ سوکھے پتے کی طرح اڑائے لئے جا رہا تھا۔

میرا لباس وہی تھا جو دو سو برس پہلے میں نے پہن رکھا تھا۔ اس لباس میں صرف اتنا فرق آیا تھا کہ انگرکھے کے بل اور چنٹیں کم ہو گئی تھیں۔ بہرحال دو ایک نے میری طرف نظر اٹھا کر میرے لباس کو غور سے دیکھا باقی نے کوئی خاص پروا نہ کی۔ اب پھر مجھے ایک بات کی تصدیق کی ضرورت تھی کہ اس عہد میں میرا تشخص کیا ہے؟ کیا میں ایک اجنبی سیاح کی حیثیت سے اس عہد میں نمودار ہوا ہوں یا میری پہلے ہی سے کسی حیثیت کا تعین ہو چکا ہے۔

میری جیب میں دو سو برس پہلے سلطان مسعود کے عہد کے سونے کے سکے پڑے تھے جن کو میں نے بازار صرافہ میں نوادرات کے طور پر فروخت کر دیا۔ اپنے لئے اس زمانے کے مطابق نیا لباس خرید کر پہنا اور سیدھا کارواں سرائے میں آ گیا۔ میرا ارادہ ملتان سے دہلی کی طرف کوچ کرنے کا تھا جو اس زمانے میں غیاث الدین بلبن کا پایہ تخت تھا۔ ایک ہفتے تک انتظار کرنے کے بعد آخر میں ایک قافلے کے ساتھ ملتان سے عازم دہلی ہوا۔

التمش کی وفات کے بعد دہلی کی حکومت اس کے پالے ہوئے چالیس لے پالک بیٹوں نے آپس میں بانٹ رکھی تھی۔ یہ چالیس ترک ترکان چہل گانی کے نام سے مشہور تھے۔ ہندوستان کی حکومت کو آپس میں تقسیم کرنے کے بعد یہ گروہ "ترکان" "خواجہ تاش" کا نام اختیار کر بیٹھا۔ غیاث الدین بلبن بھی ان ہی ترکان چہل گانی میں شامل تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد یہ ترک حکمراں غرور و تکبر کے نشے میں چور ہو کر خود پرست اور بے قابو ہو گئے اور انہوں نے آپس میں جنگیں شروع کر دیں۔ غیاث الدین بلبن نے ایک ایک کر کے ان سب کو شکست دی اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ حریفوں او دشمنوں سے ملک کو پاک کرنے کے بعد بلبن نے حکومت کے انتظامی امور کی طرف توجہ دی اور کچھ ہی عرصے میں اس نے سارے ملک کو اپنے زیر نگیں کر لیا۔ اس کی عظمت و شوکت یہاں تک بڑھی کہ عراق' خراسان' اور ماوراء النہر کے حکمرانوں نے بھی اس کے ساتھ دوستی کا رشتہ استوار کر دیا۔

جس وقت میں دہلی پہنچا اس وقت تک عراق' ترکستان' ماوراء النہر' خراسان' فارس' روم اور شام کے ملکوں سے کتنے ہی علماء اور شہزادے چنگیز خان کی ہلاکت خیزیوں سے تنگ آ کر دہلی میں پناہ گزین ہو گئے تھے اور یہ سب شہزادے اور علماء غیاث الدین بلبن کے درباری امراء میں شامل تھے اور بڑی عزت و تکریم کے مالک تھے۔ ان غریب الدیار شہزادوں میں سے دو بنی عباس کی نسل سے تھے۔ یہ دونوں تخت شاہی کے قریب بیٹھے تھے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ جب کوئی شہزادہ یا مسلمان حکمران کسی مصیبت کی وجہ سے اپنے وطن سے نکل کر بلبن کے دامن میں پناہ لیتا تو بلبن خدا کی درگاہ میں سجدہ شکر بجا لاتا۔ بلبن کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ اپنے مہمانوں کے لئے علیحدہ علیحدہ محلے آباد کرتا۔ اس طرح سے دہلی میں اس زمانے میں پندرہ محلے ان عالی نسبت مہمانوں کے نام سے آباد ہو گئے تھے۔ ان محلوں کے نام آج بھی مجھے یاد ہیں۔ آپ کی دلچسپی کے لئے میں ان کے نام یہاں لکھے دیتا ہوں۔ محلّہ عباسی' محلّہ سنجری' محلّہ خوارزم شاہی' محلّہ دیلمی' محلّہ علوی' محلّہ اتابکی' محلّہ غوری' محلّہ چنگیزی' محلّہ رومی' محلّہ سنقری' محلّہ یمنی' محلّہ موصلی' محلّہ سمرقندی' محلّہ کاشغری اور محلّہ خطائی - غیاث الدین بلبن ایک باشعور' زیرک اور صاحب وقار حکمران تھا۔ اس کے ہر حکم میں عقل مندی اور سنجیدگی ملتی تھی وہ ہمیشہ سلطنت کے امور اور اہم اور قابل افراد کی سپرد کرتا تھا۔ نااہل افراد کا اس کے دربار میں گزر نہیں تھا۔ اسے جب تک لوگوں کی قابلیت' ایمانداری' معقولیت' پرہیزگاری اور پختہ کاری کا تجربہ نہ ہو جاتا تھا وہ اس وقت تک کوئی اہم کام ان کے سپرد نہیں کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے عمال کی اعلیٰ خاندانی اور

شرافت نسبی کا بھی بہت خیال رہتا تھا۔ اس کے مقرر کردہ عمال اور صوبے داروں میں پست طبیعت لوگوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ لہو و لعب سے پاک تھا اور اس قسم کے لوگوں کا اس کے دربار تک پہنچنا ناممکن تھا۔

اس زمانے کے دہلی شہر میں بادشاہ کا ایک واقعہ جب وہاں پہنچا بڑا تازہ تازہ تھا اور اکثر کارواں سراؤں اور داستان سراؤں میں لوگ اس کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ یہ واقعہ یوں ہے کہ دلی کا ایک رئیس تھا جس کی دولت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کا نام فخرو بائی تھا۔ اس نے ایک عرصے تک بلبن کی خدمت بھی کی تھی۔ بلبن نے اپنی عادت کے مطابق فخرو بائی سے کبھی بات چیت نہیں کی تھی۔ ایک بار فخرو نے درباریوں کے توسط سے بادشاہ کی خدمت میں یہ معروضہ پیش کیا کہ اگر بادشاہ اس سے گفتگو کرے تو فخرو اس کے معاوضے میں دولت اور جنس کی ایک بڑی مقدار نذرانے کے طور پر بادشاہ کی خدمت میں پیش کرے گا۔ جب درباریوں نے فخرو کا یہ معروضہ بلبن کی خدمت میں پیش کیا تو اس نے جواب دیا۔

"فخرو اگرچہ بڑا دولت مند اور بڑا رئیس ہے لیکن وہ ایک نامعتبر شخص ہے اور نامعتبروں ہی کا سردار ہے۔ ایسے شخص سے بادشاہ کا بات چیت کرنا اس کے رعب اور وقار کے منافی ہے اور رعایا کے دلوں میں بادشاہ کا سچا احترام باقی نہیں رہتا۔"

غیاث الدین بلبن کے بارے میں یہ ساری باتیں اور حقائق دہلی پہنچنے پر میں نے لوگوں کی زبانی سنے ابھی تک میرا بلبن کے دربار سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ میرے دل میں ایسا کوئی خیال ہی تھا کہ میرا رابطہ دربار سے قائم ہو - میں تو تاریخ' تہذیب عالم کے ایک آفاقی سیاح کی حیثیت سے دہلی میں وارد ہوا تھا اور اس تاریخی شہر کی سیر کے بعد کسی دوسرے ملک کو نکل جانا چاہتا تھا لیکن ایک واقعہ ہو گیا جس نے مجھے بلبن کے دربار سے وابستہ کر دیا۔

دہلی کی جس سرائے میں میں مقیم تھا اس کے مالک کا نام بابک کاشغری تھا یہ ایک بھاری تن و توش کا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اس کی زندگی کے تیس برس دلی شہر میں گزرے تھے...... اور اس نے سلطان التمش کا عہد حکومت بھی دیکھا تھا وہ میرا دوست بن گیا اور اکثر مجھے بادشاہوں کے قصے کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھے ساتھ لے کر دلی کے قرب و جوار میں شکار کو بھی نکل جاتا۔ اسے ہرن کے شکار کا بڑا شوق تھا۔ اس کا نشانہ بڑا اچھا تھا۔ دور سے اپنے شکار پر ایسا تیر چلاتا تھا کہ شکار وہیں ڈھیر ہو جاتا۔

ایک بار صبح صبح وہ ہرن کے شکار کو چلا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس زمانے میں دلی شہر کے باہر جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ یہ جنگل آگے جا کر جمنا پار بڑا گھنا ہو جاتا تھا۔ اس

جنگل میں ہرن کا شکار بہت تھا۔ مگر اس روز نہ جانے کیا بات ہوئی کہ ہم تیر کمان لئے دوپہر تک جنگل میں پھرتے رہے' ہمیں ایک بھی ہرن دکھائی نہ دیا۔ میرے بزرگ شکاری دوست بابک کاشغری نے کہا کہ اس کا مطلب ہے کہ جنگل میں کوئی درندہ آن گھسا ہے جس کی بو پا کر ہرن شمال کی طرف پہاڑیوں میں چلے گئے ہیں۔ ہم تناور درختوں کے نیچے جنگلی جھاڑیوں اور خشک نالوں میں سے گزرتے آگے بڑھ رہے تھے ایک جگہ بیٹھ کر ہم نے روٹی کھائی۔ بابک کاشغری کو میرے بارے میں سوائے اس کے کچھ علم نہیں تھا کہ میں ایک مصری سیاح ہوں اور ہندوستان کی سیاحت کرنے آیا ہوں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ میں بھوک پیاس اور موت سے بے نیاز ہوں۔ میں نے بھی اسے اپنی خفیہ طاقت کے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ چنانچہ میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھائی۔ ندی سے پانی لا کر پیا پھر ایک جگہ گھاس پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ بابک کاشغری نے کہا کہ وہ شکار ساتھ لئے بغیر ہرگز واپس نہیں جائے گا۔

اتنے میں جنگل ایک خوفناک دھاڑ سے گونج اٹھا۔ یہ دھاڑ شیر کی تھی بابک کاشغری ایک دم سے اچھل پڑا۔ اس نے ترکش کاندھے پر ڈالا اور بولا۔

"عبداللہ تلوار سنبھالو' شیر ادھر ہی آ رہا ہے۔"

کمان میں تیر جوڑ کر وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں ہوا۔ جدھر سے آواز آئی ادھر بڑھنے لگا۔ میں تلوار ہاتھ میں لئے اس کے پیچھے تھا۔ اب شیر کی دوسری دھاڑ گونجی تو اس کے ساتھ ہی ایک انسان کی آواز بھی تھی جو فارسی زبان میں مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ بابک اس جانب دوڑا۔ میں بھی پیچھے لپکا۔ سامنے قد آدم جنگلی جھاڑیوں کی دیوار سی بنی ہوئی تھی۔ اس میں سے گزرے تو دیکھا کہ آگے تھوڑی سی ڈھلان تھی جس کے درمیان سرکنڈے لگائے ہوئے تھے وہاں ایک خوش پوش نوجوان تلوار ہاتھ میں پکڑے پینترا جمائے چوکس کھڑا تھا۔ اس کے سامنے پندرہ بیس قدموں کے فاصلے پر ایک خونخوار شیر دانت نکالے اس کی طرف گھورتے ہوئے غرا رہا تھا اور حملہ کرنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ بابک کاشغری نے اس منظر کو دیکھتے ہی شیر پر تیر چلا دیا۔ خدا جانے یہ گھبراہٹ کا اثر تھا کہ میرے دوست کا نشانہ چوک گیا۔ تیر شیر کی گردن کے بال اڑاتا نکل گیا۔ شیر نے گردن ہماری طرف گھما کر ہماری طرف دیکھا اور بجائے اس کے کہ وہ ہم پر حملہ کرے اس نے اپنے مدمقابل خوش شکل نوجوان پر جست لگا دی۔ وہ نوجوان اچھل کر دوسری طرف ہٹ گیا اور شیر پر تلوار کا وار کیا۔ تلوار شیر کے داہنے پنجے پر لگی اور اس کا پنجہ شدید زخمی ہو گیا۔ بابک نے دوسرا تیر چلایا۔ یہ بھی خطا گیا۔ اب جو میں نے دیکھا تو شیر خوش پوش نوجوان کی طرف قیامت خیز دھاڑ کے ساتھ بڑھا اور

قریب تھا کہ اسے چیر پھاڑ کر رکھ دے کہ میں نے ڈھلان پر سے اچھل کر شیر کے اوپر چھلانگ لگا دی۔

شیر اس بلائے ناگہانی سے گھبرا گیا۔ اس کی اپنے شکار کی طرف سے توجہ ہٹ گئی اور اس نے میری گردن پر اپنا بایاں پنجہ اتنی زور سے مارا کہ اگر میری جگہ بابک کاشغری ہوتا تو اس کا سر گردن سے الگ ہو کر دور جا پڑتا۔ لیکن مجھ پر شیر کے پنجے کی ضرب کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ خوش پوش نوجوان زمین پر گرا ہوا تھا اور اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی تلوار سے شیر پر حملہ کرنے کی فکر میں تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری خفیہ طاقت ان دونوں پر ظاہر ہو۔ میں شیر کے ساتھ لپٹ گیا اور اسے اپنی طاقت کے بل پر لڑھکاتا ہوا درختوں کے پیچھے اونچی اونچی گھاس کے اندر لے گیا۔ شیر بے حد طاقتور اور غضبناک تھا مگر وہ میری طاقت کے آگے بے بس تھا۔ میں نے اپنی کمر کے ساتھ لگا خنجر نکالا اور شیر کے پیٹ کو پھاڑ ڈالا۔ شیر گھاس پر چت پڑا آخری سانس لے رہا تھا۔

اتنے میں وہ خوش پوش نوجوان اور میرا دوست بابک کاشغری بھی وہاں میری مدد کو پہنچ گئے۔ انہوں نے شیر کو آخری سانس لیتے دیکھا تو میری بہادری کی تعریف کرتے ہوئے آگے بڑھے اور مجھے شیر کی دم توڑتی لاش سے کھینچ کر پیچھے لے گئے۔

"عبداللہ! تم زخمی تو نہیں ہوئے؟" بابک نے پوچھا۔ میں نے خنجر نیام میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"خدا کا شکر ہے میں زخمی ہونے سے بچ گیا۔" اس خوش پوش نوجوان نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور کہا۔

"تم نے میری جان بچائی میں تمہارا احسان مند ہوں۔ تم کون ہو؟ کیا کرتے ہو؟"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا میرے دوست نے کمان زمین پر سے اٹھا کر کاندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"میاں! پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ذات شریف ہو اور اکیلے اس جنگل میں کیا لینے آ گئے تھے؟"

اس نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں اس شہر میں ایک مسافر ہوں جنگل سے گزر رہا تھا کہ شیر نے حملہ کر دیا۔ اگر یہ نوجوان جس کا نام تم نے عبداللہ لیا تھا میری مدد کو نہ آتا تو شیر نے مجھے پھاڑ دیا تھا۔"

بابک کاشغری اس نوجوان کے لباس پر ایک نظر ڈال کر کہنے لگا۔

"میاں! تم لباس سے تو کوئی امیرزادے لگتے ہو۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

اس سے پہلے کہ وہ نوجوان کوئی جواب دیتا جنگل میں ایک شور سا بلند ہوا۔ گھوڑوں کے ہنہنانے اور ان کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر درختوں سے نکل کر کئی سوار ہمارے سامنے آ گئے۔ ایک سوار جو تلوار اور تیر کمان لگائے تھا اور سر پر فولادی زنجیروں والا ٹوپ پہن رکھا تھا۔ گھوڑے سے اترا آگے بڑھ کر نوجوان کی تعظیم بجا لایا اور بولا۔ ''شہزادے صاحب آپ ٹھیک ہیں نا؟''

ہم چونکے۔ تو یہ نوجوان کوئی شہزادہ تھا۔ اس نے کہا۔

''تم شیر کو مردہ پڑا دیکھ رہے ہو - میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن اگر یہ نوجوان نہ ہوتا تو یہاں شیر کی بجائے تمہارے شہزادے کی لاش پڑی ہوتی۔''

شہزادے کے لئے خالی گھوڑا لایا گیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''اگر تم محل میں آج شام کھانا میرے ساتھ کھاؤ تو مجھے خوشی ہو گی۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی انگلی سے سرخ عقیق کی ایک انگوٹھی اتار کر مجھے دی اور کہا۔ ''یہ انگوٹھی تمہیں شاہی محل میں میرے پاس پہنچا دے گی۔''

میں نے انگوٹھی تھام لی - وہ مجھے اور میرے دوست بابک کاشغری کو سلام کر کے اپنے شاہی دستے کے ساتھ جنگل میں آگے بڑھ گیا۔ بابک کاشغری نے انگوٹھی کو غور سے دیکھا اور بولا۔

''میاں عبداللہ! تمہاری تو قسمت کھل گئی۔ یہ تو شاہی محل کا شہزادہ تھا۔ اب تم رات کو اس کی دعوت پر ضرور جانا۔ وہ تمہیں انعام و اکرام سے مالا مال کر دے گا۔''

میں نے کہا کہ مجھے انعام و اکرام کا لالچ نہیں ہے۔ لیکن میں شہزادے سے ملنے شاہی محل ضرور جاؤں گا۔ اس طرح سے مجھے دہلی کا شاہی محل دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ ہم واپس سرائے میں آ گئے۔ شام کو میں نے کپڑے ذرا درست کر کے پہنے، گھوڑے پر سوار ہوا اور شاہی محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ آج سے پندرہ سو سال پہلے دہلی کا شاہی محل اس جگہ نہیں تھا جہاں آج کل لال قلعے کے اندر موجود ہے۔ یہ محل اس دور میں بھی قلعے کے اندر ہی تھا مگر قلعہ جنوب میں واقع تھا اور قلعے کا محرابی دروازہ اتنا بلند تھا کہ اسے پگڑی پر ہاتھ رکھ کر دیکھنا پڑتا تھا۔ شہزادے کی انگوٹھی دکھا کر میں قلعے میں بلا روک ٹوک داخل ہو گیا۔ قلعے میں شاہی محل کے راستے میں دونوں جانب خاص دکانیں تھیں۔ جہاں سے خادمائیں شاہی محل کی شہزادیوں کے لئے ضروری اشیا خریدتی تھیں۔ میں سرو و سمن والے باغ سے گزرتا شاہی محل کے دروازے کی پہلی سنگ مرمر کی ڈیوڑھی میں پہنچا تو محافظ نے مجھے روک لیا۔ میں نے انگوٹھی دکھائی وہ بڑے ادب سے مجھے ڈیوڑھی کے سنگ سرخ

دالان میں لے گیا۔ جہاں دربان خاص مسند لگائے بیٹھا تھا۔ جب اس نے شہزادے کی انگوٹھی دیکھی تو اٹھ کھڑا ہوا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

''عزیزم! جانتے ہو تم آج رات کس کے مہمان ہو؟''

میں نے کہا۔ ''میں اپنے شاہی میزبان کا نام نہیں جانتا۔''

دربان خاص نے کہا۔ ''تو پھر سنو تم شہنشاہ ہند سلطان غیاث الدین بلبن کے محبوب فرزند سلطان خان رشید کے مہمان ہو۔''

دو خاص محافظ مجھے شہزادہ خان رشید کے محل تک چھوڑنے گئے۔ شہزادہ خان رشید میرے خیرمقدم کو خود باہر آیا اور مجھ سے بغلگیر ہوا اور مجھے اپنے حجلہ خاص میں لے گیا۔ آبنوسی چوکیوں پر انواع و اقسام کے کھانے پھل اور خشک میوہ جات اور قسم قسم کے مشروبات چنے ہوئے تھے۔ کئی مہمان بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ شہزادے نے مجھے ان سب سے باری باری ملوایا۔ غلام اور کنیزیں خدمت کو چوکس کھڑی تھیں - کھانا شروع ہو گیا۔ شہزادے نے مجھے اپنے پہلو میں بٹھایا تھا۔ رات گئے تک محفل جاری رہی۔ جب سب مہمان چلے گئے تو میں نے بھی شہزادے خان رشید سے اجازت چاہی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور بولا۔

''عبداللہ! تم میرے محسن ہی نہیں اب میرے دوست بھی ہو اور میں نہیں چاہتا کہ میرا دوست اور محسن شہر میں ایک عام سرائے میں پڑا رہے میں چاہوں گا کہ تم میرے حلقہ احباب میں شامل ہو جاؤ۔ میرا شاہی مہمان خانہ تمہارا منتظر ہے۔''

اب مجھے بھی دربار بلبن کے اندرونی حالات کے مطالعے کا شوق ہوا۔ چنانچہ میں سرائے سے اٹھ کر شہزادہ خان رشید کے محل میں اٹھ آیا۔ خان رشید کے حلقہ احباب میں اس زمانے کے بڑے نامی گرامی علما و فضلا اور شاعر شامل تھے ان میں حضرت امیر خسرو اور خواجہ حسن جیسے نابغہ ہائے روزگار بھی تھے۔ خان رشید ان سب سے بڑی عزت و تکریم سے پیش آتا تھا۔ یہ شہزادہ اس قدر مہذب اور سلیقہ مند تھا کہ اگر تمام شب کسی مجلس سخن میں بیٹھتا تب بھی اپنا زانو اونچا نہ کرتا تھا۔ خان رشید کی محفل میں ہمیشہ علمی چرچے رہتے تھے اور وہاں خاقانی، انوری، نظامی، سعدی اور امیر خسروؒ کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ خود خان رشید بھی فارسی میں شعر کہتا تھا اور بڑے بڑے اساتذہ اور سخن فہم اس کی سخن فہمی کے قائل تھے میری موجودگی میں ایک بار حضرت امیر خسروؒ نے فرمایا تھا۔ ''میں نے سخن فہمی، نکتہ رسی، پختگی ذوق صحیح اور تمام نئے پرانے شعرا کے اشعار یاد رکھنے میں خان رشید جیسا فاضل شخص اور کوئی نہیں دیکھا۔''

خان رشید نے ایک قلمی بیاض تیار کی تھی - جس میں تمام نامی گرامی شعراء کے منتخب اشعار درج تھے۔ ان اشعار کی تعداد بیس ہزار تھی۔ امیر خسروؒ اور خواجہ حسن دونوں ہی خان رشید کے انتخاب اشعار کی خوبی کے قائل تھے۔ جس زمانے میں خان رشید کا قیام ملتان میں تھا اس زمانے میں شیخ عثمان ترمزیؒ جو اس دور کے بہت بڑے عالم اور عارف کامل تھے۔ اتفاق سے ملتان تشریف لائے۔ خان رشید نے شیخ صاحبؒ کی بہت تعظیم کی اور خاطر تواضع کی۔ ان کی خدمت میں نذر اور ہدیہ پیش کیااور بڑی عاجزی سے ان سے ملتان میں قیام کرنے کی درخواست کی اور کہا کہ اگر آپ یہاں قیام کرنا پسند فرمائیں تو حکومت کے خرچ سے ایک خانقاہ تعمیر کرائی جائے گی لیکن انہوں نے بعض مجبوریوں کی بنا پر ملتان میں مستقل رہائش سے عاجزی کا اظہار کیا اور واپس چلے گئے۔ جن دنوں شیخ صاحب ملتان میں تھے اور حضرت بہاء الدین ذکریا ملتانی کے صاحبزادے اور جانشین حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے ساتھ خان رشید کی محفل میں تشریف رکھتے تھے۔ اس محفل میں عربی میں اشعار پڑھے جاتے تھے۔ ایک بار کوئی ایک شعر سن کر ان بزرگوں پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی اور ان کے ساتھ ساری محفل کھڑی ہو گئی۔ خان رشید نے بھی اہل محفل کا ساتھ دیا اور دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ جب تک ان بزرگوں کو سکون نہ ہوا۔ خان رشید کی حالت بھی اضطرار کی رہی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری رہے۔ خان رشید کو شیخ سعدیؒ سے بھی بے حد عقیدت تھی۔ اگر کبھی کوئی شخص خان رشید کی مجلس میں شیخ سعدیؒ کا کوئی نصیحت آموز شعر پڑھتا تو وہ دنیا کے خیال کو دل سے نکال کر بڑی توجہ سے شعر سنتا اور شعر کے مضمون سے متاثر ہو کر زار و قطار روتا۔ خان رشید کی بالغ نظری اور قدر شناسی کا سب سے واضح ثبوت یہ ہے کہ اس نے امارت ملتان کے زمانے میں دو مرتبہ اپنے قاصد بیش قیمت اور اعلیٰ تحائف کے ساتھ شیراز روانہ کئے اور حضرت شیخ مصلح الدین سعدیؒ سے درخواست کی کہ آپ یہاں تشریف لا کر ہمیں نوازیں۔ آپ کے لئے ملتان میں ایک خانقاہ تعمیر کروائی جائے گی اور اس کے مصارف کے لئے چند گاؤں وقف کر دیئے جائیں گے چونکہ حضرت شیخ سعدیؒ ضعیف العمری کی وجہ سے بہت کمزور ہو چکے تھے اس لئے انہوں نے دونوں مرتبہ ملتان میں آنے میں عذر کیا۔ لیکن ہر بار اپنی ہاتھ سے اپنے اشعار اور غزلیات لکھ کر خان رشید کی خدمت میں بطور تحفہ روانہ کیں اور امیر خسروؒ کی سفارش فرمائی۔ ملتان کی امارت کے زمانے میں خان رشید کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر سال بہت سے گراں بہا اور نادر تحائف لے کر اپنے باپ غیاث الدین بلبن کی خدمت میں حاضر ہوتا اور چند روز دہلی میں قیام کر کے واپس چلا جاتا۔

خان رشید نے مجھے ہندوستان کے حکمران غیاث الدین بلبن کی خدمت میں پیش کیا تو

اس نے کچھ عرصے کے لئے مجھے اپنے بیٹے سے عاریتاً لے کر اپنے امرا میں شریک کر لیا۔ اس دوران مجھے غیاث الدین بلبن کے قریب رہ کر اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر قریب سے نگاہ ڈالنے کا موقع ملا۔ غیاث الدین بلبن کے دربار مین بہت سے نادر الوجود اور لاثانی افراد یک جا تھے۔ ان میں یکتائے روزگار اہل سیف و قلم بھی تھے اور مشہور زمانہ مغنی و موسیقار بھی تھے اس دور کی شان و شوکت محمود غزنوی اور سنجر جیسے عالی شان اور ذر مرتبت حکمرانوں کے درباروں سے کہیں زیادہ تھی۔

غیاث الدین بلبن' آرائش لباس' عظمت حکومت اور رعب شاہی کا بہت قائل تھا۔ وہ بڑے جلال اور شکوہ کے ساتھ دربار عام منعقد کرتا۔ یہ شان و شکوہ دیکھ کر لوگوں کے دل دہل جاتے تھے اور اس جاہ و جلال کا حال سن کر باغیوں اور سرکشوں کے جسم تھرتھرا جاتے تھے۔ بلبن جب بھی کہیں جانے کے لئے نکلتا تو اس کی سواری کے ساتھ پانچ سو غوری' عربی' سیستانی' سمرقندی اور کرد سپاہی ہاؤ ہو کے نعرے بلند کرتے ہوئے پیادہ پا چلتے تھے بلبن جشن کی محفلیں بھی بڑی دھوم دھام سے منعقد کرتا تھا۔ عید اور نوروز کے موقعوں پر دربار کو ایرانی بادشاہوں کے درباروں کی طرح سجایا جاتا اور بلبن سارا دن دربار میں بیٹھ کر امیروں اور منصب داروں سے نذریں وصول کرتا - یہ دستور تھا کہ جب کوئی امیر بادشاہ کی خدمت میں نذر پیش کرتا تو شاہی مقرب اس امیر کی اچھی عادات اور قابل قدر خدمات کا بادشاہ سے تذکرہ کرتے۔ محفل میں نقش و نگار سے مزین فرش بچھایا جاتا - زربفت کے پردے لٹکائے جاتے اور چاندی اور سونے کے برتن استعمال کئے جاتے۔ اہل محفل کی خاطر تواضع شربت میوے اور پان وغیرہ سے کی جاتی۔ بلبن اپنے امراء سے اکثر کہا کرتا تھا۔

"میں نے سلطان شمس الدین التمش کے دربار میں ترکی امرا سے یہ بارہا سنا ہے کہ جو بادشاہ دربار کی ترتیب' سواری کے طریقوں اور حکمرانی کے آداب کا خیال نہیں رکھتا رعایا کے دلوں پر اس کا دبدبہ نہیں بیٹھتا اور نہ ہی دیکھنے والے اس کی شان و شوکت سے متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسے بادشاہوں کے دشمن بڑی قوت حاصل کر لیتے ہیں اور ان کے راستے میں رکاوٹ بن کر سلطنت کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔"

جس طرح غیاث الدین بلبن دربار کے آداب وقواعد کا خیال رکھتا تھا اسی طرح انصاف اور حق پرستی کو بھی پوری طرح مدنظر رکھتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ دہلی میں ایک شاہی جام دار کے بیٹے ملک رفیق نے جو شاہی امرا میں تھا اور چار ہزار سواروں کا مالک اور بدایوں کا صوبے دار تھا ایک فراش کو اس قدر مارا اور درے لگائے کہ وہ مرگیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد بلبن بدایوں گیا تو مرحوم فراش کی بیوہ فریاد لے کر بلبن کے پاس آئی۔ بلبن نے تمام

واقعہ سننے کے بعد حکم دیا کہ ملک رفیق کو بھی اتنے درے لگائے جائیں کہ جتنے اس فراش کو لگائے گئے تھے۔ بلبن کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ ملک رفیق مر گیا اور اس کی لاش شہر کے دروازے پر لٹکا دی گئی۔ بلبن اپنے بیٹوں سے اکثر کہا کرتا تھا۔

میں نے معز الدین بن بہاء الدین سام کی محفل میں دو بار سید مبارک غزنوی سے سنا ہے کہ بادشاہوں کے اکثر افعال شرک کی حدود کو چھو لیتے ہیں اور وہ بہت سے ایسے کام کرتے ہیں جو سنت نبوی صلعم کے خلاف ہوتے ہیں لیکن وہ اس وقت اور بھی گناہ گار ہو جاتے ہیں جب کہ وہ چار باتوں پر عمل نہیں کرتے اور وہ چار باتیں یہ ہیں۔ پہلی یہ کہ بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے شان و شکوہ کو مناسب موقع پر استعمال کرے اور خدا ترسی اور خلق خدا کی بھلائی ہمیشہ اس کے پیش نظر رہے دوسری یہ کہ بادشاہ کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے کہ اس کے ملک میں بدکاری کا خاتمہ ہو۔ تیسری بات یہ کہ امور سلطنت کو عقلمند، پاکباز اور راست باز لوگوں کے سپرد کرنا چاہئے اور چوتھی بات یہ کہ بادشاہ کو چاہئے کہ وہ انصاف سے کام لے۔ خوشامدی اور بدعقیدہ لوگوں کو قریب نہ آنے دے۔ خلق خدا پر جن کو حاکم مقرر کیا جائے وہ دیانتدار... اور خدا ترس لوگ ہونے چاہئیں۔ پس تم سب جو میرے جگر گوشہ ہو یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر تم میں سے کسی نے کسی عاجز اور لاچار کو ستایا تو میں ظالم کو اس کے ظلم کی پوری پوری سزا دوں گا۔"

ایک بار میں بادشاہ کے ساتھ شریک سفر تھا۔ شاہی سواری ایک نہر کے کنارے پہنچی تو بلبن خود نہر کے کنارے جا کر کھڑا ہو گیا اور اس نے عہدہ داروں کو حکم دیا کہ وہ خود ہاتھوں میں لکڑیاں اور شہتیر لے کر انتظام کریں کہ سب سے پہلے خواتین، بچے، بوڑھے، بیمار اور کمزور ناتواں افراد کو پار اتارا جائے صحت مند اور توانا لوگ معذوروں اور کمزوروں کی مدد کریں۔ اس کے بعد گھوڑے، ہاتھی اور باربرداری کے دوسرے جانور پانی کو عبور کریں۔

غیاث الدین بلبن کو میں نے ارکان دین اور نماز روزے کا پابند پایا۔ ان کے علاوہ اس نے کبھی تہجد، چاشت اور اشراق کی نماز بھی قضا نہیں کی تھی۔ وہ ہر وقت باوضو رہتا تھا۔ عالموں، صوفیوں اور بزرگان دین کی موجودگی میں دستر خوان پر کبھی پیش دستی نہیں کرتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ کھانے کے وقت علماء کرام سے مختلف مسائل کی تحقیق کرتا۔ وہ امیروں وزیروں کی قیام گاہوں پر ان سے ملاقات کو جاتا اور اس طرح ان کی عزت افزائی کرتا۔ اس کا معمول تھا کہ جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد مشائخ اور علمائے دین کے گھروں میں جاتا اور برہان الدین بلخی، مولانا سراج الدین سنجری اور مولانا نجم الدین دمشقی جیسے جید اور بزرگ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا۔ بلبن قبروں پر بھی فاتحہ خوانی کے لئے جایا کرتا۔ جب

حکومت کے کسی رکن یا بزرگ کا انتقال ہو جاتا تو وہ اس کے جنازے پر جاتا، تجہیز و تکفین میں شریک ہوتا۔ بعد میں مرنے والے کے گھر جا کر صبر کی تلقین اور راضی بہ رضائے خدا رہنے کی تاکید کرتا۔ مرحوم امراء کے وارثوں کو بلبن خلعت اور انعامات وغیرہ سے سرفراز کرتا اور یتیم بچوں کی پرورش کے لئے بھاری وظیفے مقرر کرتا۔ بلبن کی عادت تھی کہ اگر کہیں سوار ہو کر جاتا اور راستے میں لوگوں کا ہجوم نظر آتا اور یہ معلوم ہوتا کہ یہاں وعظ ہو رہا ہے تو وہ فوراً سواری سے اتر کر مجلس وعظ میں شریک ہو جاتا۔ وہ خدا اور اس کے رسول پاک صلعم کے احکامات کو بہت غور سے سنتا اور زار و قطار روتا۔ میں نے غیاث الدین بلبن کے پاس اپنے قیام کے دوران اسے کبھی ننگے سر نہیں دیکھا۔ وہ محفل میں کبھی باآواز بلند قہقہہ نہیں لگاتا تھا۔

بلبن ان تمام صفات اور اعلیٰ عادات کے باوجود بغاوت و سرکشی کو ناپسند کرتا تھا۔ باغی چاہے مسلم ہو چاہے غیر مسلم اس کی سرزنش میں کسی قسم کی رو رعایت نہ کرتا تھا اس کے عہد حکومت میں ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے مفسدوں کو ہر طرح کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ التمش کے خاندان کے افراد کو بلبن نے اپنا دشمن سمجھ کر اشارے، کنائے، بہانے اور صریحی حکم، غرض ہر طرح سے قتل کیا۔ میرے زمانے میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ بلبن نے محض ایک شخص کی بغاوت اور سرکشی کی وجہ سے ساری فوج یا سارے شہر کو تباہ کر ڈالا۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی بلبن کی اطاعت کا منکر نہ ہوتا تھا۔ شمس الدین التمش کے وہ قوانین اور ضابطے جو اس کے جانشینوں کی غفلت اور نا اہلی کی وجہ سے تقریباً منسوخ ہو گئے تھے بلبن نے ان سب کو بالکل اسی طرح مروج کیا جیسے کہ التمش کے عہد میں مروج تھے۔

بلبن کو شکار کا بھی بہت شوق تھا یہی وجہ تھی کہ اس کے عہد میں میر شکاری کا عہدہ بڑی عزت اور رفعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سردیوں کے زمانے میں وہ اس شوق کو پورا کرنے کے لئے دہلی کے چاروں طرف بیس بیس کوس کے راستے کی حفاظت کی جاتی تھی۔ بلبن کا معمول تھا کہ وہ شکار کے لئے اس وقت نکلتا جب کہ تھوڑی سی رات باقی ہوتی اور دوسری رات کا دو تہائی حصہ جب گزر جاتا تو وہ شکارگاہ سے اپنی قیام گاہ پر واپس آ جاتا۔ اس کے ساتھ ہمیشہ ایک ہزار سوار اور ایک ہزار پیادہ تیر انداز رہتے تھے جن کے تمام اخراجات خزانے سے ادا کئے جاتے تھے۔

ایک بار کسی امیر نے جو ماوراء النہر سے واپس آیا تھا بادشاہ بلبن سے کہا۔ "عالی جاہ! میں نے بدخشاں میں ایک منگول سوداگر کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہلاکو خان نے آپ کے شکار کے شوق کی تفصیل سن کر کہا تھا کہ بلبن ایک تجربہ کار اور عاقبت اندیش بادشاہ ہے بظاہر تو وہ

شکار کا شوق کرتا ہے لیکن دراصل اس صورت سے وہ سواری کی ورزش اور اپنے لشکر کی حفاظت کرتا ہے۔"

بلبن نے یہ سن کر خندہ کیا اور کہا۔

"فرماں روائی اور سیاست کے قواعد و ضوابط وہی شخص بہتر طور پر جان سکتا ہے جس نے اپنی تلوار کے بل پر جہاں بانی کی ہو۔"

جس زمانے میں میں بلبن کے دربار سے منسلک تھا اس زمانے میں حکومت کی بنیادیں اچھی طرح سے مضبوط ہو چکی تھیں ایک روز دربار لگا تھا۔ بلبن شاہی کروفر کے ساتھ تخت شاہی پر براجمان تھا کہ ایک قابل اعتبار امیر نے کہا۔

"عالم پناہ! گجرات اور مالوہ کے علاوہ چند دیگر مقامات جو قطب الدین ایبک اور سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں اسلامی حکومت میں شامل ہو گئے تھے اب خود سر ہو گئے ہیں۔ اب یہی مناسب ہے کہ ملک کے اندرونی انتظامات کو پوری طرح انجام دینے کے بعد ان خود سر علاقوں کی طرف توجہ دی جائے تاکہ ان علاقوں کو دوبارہ شاہ دہلی کا مطیع و خراج گزار بنایا جا سکے۔"

بلبن نے یہ سن کر امیر سے کہا۔

"ان دنوں مغلوں کی ہنگامہ خیزیاں بہت بڑھی ہوئی ہیں انہوں نے ہندوستان کے ایک حصے پر قبضہ بھی کر لیا ہے اور ان کی جماعت ہندوستان پر باقاعدہ چھاپے مارتی رہتی ہے اس صورت حال میں دہلی سے نکلنا اور دور دراز علاقوں کو فتح کرنے کے لئے دارالسلطنت کو محافظوں سے خالی کرنا، دانشمندی نہیں ہے اس وقت یہی مناسب ہے کہ اپنے ملک میں رہ کر سلطنت کو دشمنوں سے محفوظ رکھا جائے نہ کہ نئے علاقے فتح کرنے کا ارادہ کیا جائے۔"

میں نے بلبن کے اس جواب کو اس کی ملکی معاملات پر دور رسی اور سیاسی دانشمندی پر محمول کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غیاث الدین بلبن کو رموز ملکی پر مکمل عبور حاصل تھا۔

ان ہی دنوں شہر دہلی کے آس پاس میواتیوں نے بڑی شورش برپا کر رکھی تھی۔ یہ لوگ جنگلوں میں چھپ چھپا کر قتل و غارت گری کرتے تھے۔ یہ لٹیرے راتوں کو زبردستی لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے اور مال و اسباب اٹھا کر لے جاتے اور شہر کے آس پاس کی سراؤں کو تباہ و برباد کرتے رہتے تھے۔ سوداگر اور تجارت پیشہ لوگ بھی ان لٹیروں کی دستبرد سے محفوظ نہ تھے کئی بار ایسا بھی ہوا کہ ان میواتیوں نے دن دہاڑے سقوں اور گھروں میں پانی بھرنے والی لونڈیوں کو اغوا کر لیا۔ ان کے خوف کی وجہ سے شہر کے دروازے مغرب کے

وقت بند کر دیئے جاتے تھے نماز عصر کے بعد کسی شخص کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ قبرستان تک جائے۔ بلبن کو جب میواتیوں کی اس لوٹ مار اور رعایا کی مصیبتوں کا حال معلوم ہوا تو اس نے مفسد گروہ کے قلع قمع کو حکومت کے بقیہ تمام کاموں پر مقدم رکھا اور ان سفاکوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے دہلی سے روانہ ہوا۔ بلبن نے ان میواتی ڈاکوؤں کو گھیر لیا اور تقریباً ایک لاکھ ظالموں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اس کے بعد جنگل کو جس میں لٹیرے رہتے تھے بالکل صاف کروا دیا اور زمین کو زراعت پیشہ لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ اس نے اس مقام پر سپاہیوں کی چوکیاں بھی مقرر کر دیں۔

غیاث الدین بلبن پٹیالی، کپِل اور بھوج پور (موجودہ بدایوں اور فرخ آباد کے اضلاع) کی بغاوت فرو کرنے اور وہاں مسجدیں اور قلعے تعمیر کروانے کے بعد واپس دہلی پہنچا تو اسے امروہہ کے حاکم کی طرف سے کیتھر کی سرکشی کی خبر ملی۔ اس خبر کو سنتے ہی بلبن نے فوج کو تیاری کا حکم دے دیا۔ امراء، وزراء، اور خود میرا یہی خیال تھا کہ اس بار بادشاہ کوہ پایہ کا سفر کرے گا۔ لیکن قبل اس کے کہ سرخ رنگ کا شاہی سراپردہ کوچ کے لئے بادشاہی محل سے باہر نکالا جاتا۔ بلبن پانچ ہزار سواروں کا ایک چنا ہوا لشکر ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔

میں بھی اس مہم میں اس کے ساتھ تھا۔ دریائے گنگا کو عبور کرنے میں دو روز لگے۔ تیسرے روز مسلمانوں کا لشکر کیتھر کے علاقے میں پہنچ گیا۔ بلبن نے اس شہر میں داخل ہوتے ہی قتل عام کا حکم دے دیا۔ لشکریوں نے بادشاہی حکم کی تعمیل میں قتل عام کا بازار گرم کر دیا اور عورتوں اور بچوں کے سوا کسی کو نہ چھوڑا۔ بلبن نے باغیوں کو کچھ اس طرح سے موت کی نیند سلایا کہ پھر جلال الدین خلجی کے زمانے تک سنبل اور امروہہ کے علاقوں میں کسی سرکش اور باغی کا نام سنائی نہ دیا۔

بلبن کے عہد میں یہ دستور تھا کہ جب بادشاہ سفر سے واپس لوٹتا تو دہلی کے تمام امراء اور ارکان سلطنت دو تین منزل پیشوائی کے لئے جاتے اور بادشاہ کو اپنے ساتھ لے کر شہر میں داخل ہوتے۔ اس موقع پر شہر کو بڑے سلیقے سے سجایا جاتا اور بادشاہ کے صحیح و سلامت لوٹنے کی خوشی میں عیش و عشرت کی محفلیں منعقد کی جاتیں۔ جو رقوم بادشاہ پر سے صدقے کی جاتیں ان کو یک جا کر کے تمام اسلامی ممالک میں بھیج دیا جاتا کہ فقراء اور محتاجوں وغیرہ میں تقسیم کر دی جائیں۔

اسی زمانے میں مجھے غیاث الدین بلبن کے ساتھ شہر لاہور کے سفر کا بھی اتفاق ہوا۔ شمسی حکمرانوں کے عہد میں مغلوں کی .... شورش کی وجہ سے شہر لاہور کا حصار جگہ جگہ سے شکستہ ہو گیا تھا۔ بلبن نے حصار شہر کو دوبارہ تعمیر کروایا شہر کا نواح بھی مغلوں کی لوٹ مار کی

وجہ سے ویران ہو گیا تھا۔ بلبن نے اس نواح کو بھی آباد کروایا اور دہلی واپس آ گیا۔

لاہور سے واپسی کے بعد ایک روز بلبن کو دربار میں اس کے وزیر امور مملکت نے بتایا کہ فوج کے بہت سے سپاہی ضعیف العمری کی وجہ سے جنگ و جدل کے کام کے نہیں رہے اس وجہ سے یہ سپاہی اپنے سرداروں کو تھوڑی بہت رقم دے کر اپنے گھر بیٹھے رہتے ہیں اور جنگ میں شرکت نہیں کرتے۔ بلبن نے یہ سنتے ہی حکم دیا۔

فوج سے ان بوڑھے سپاہیوں کو فوراً علیحدہ کر دیا جائے۔ ان کی خدمت کے صلے میں انہیں تیس تنگر رقم دی جائے۔ زائد رقم ان سے وصول کر لی جائے۔

بلبن کے اس حکم کی وجہ سے لشکر میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ ان معزول لشکریوں میں سے چند معتبر اشخاص بہت سے گراں بہا تحفے لے کر ملک فخرالدین کوتوال کے پاس گئے اور اس سے رو رو کر اپنا حال زار بیان کیا اور کہا ہمیں کیا خبر تھی کہ اس ضعیف العمری میں ہم پر ایسی مصیبت نازل ہو گی۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا تو جوانی میں کوئی ایسا کام کرتے جو بڑھاپے میں ہمارے کام آتا۔ فخرالدین کوتوال نے ان کے تحائف قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا۔

"اگر تم سے یہ رشوت وصول کر لوں گا تو بادشاہ پر میری سفارش کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔"

اس کے بعد کوتوال نے ان لوگوں کو رخصت کر دیا اور خود حسب معمول شاہی دربار میں چلا گیا۔ میں نے اس روز کوتوال شہر کو پریشان اور متفکر دیکھا۔ اس بات کو شہنشاہ بلبن نے بھی محسوس کیا۔ اور فخرالدین کوتوال سے اس کی پریشانی کا سبب پوچھا۔ فخرالدین بڑا تجربہ کار امیر تھا اس نے کہا۔

"عالم پناہ! مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ دربار شاہی میں ضعیف العمر لوگوں کی گزارشات پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ یہ دیکھ کر مجھے تشویش ہے کہ اگر قیامت کے روز رحمت الٰہی نے بوڑھوں کو اپنے کرم سے محروم کر دیا تو میرا کیا حال ہو گا۔"

یہ سن کر بلبن کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ وہ فخرالدین کوتوال کی اصل بات کو جان گیا تھا۔ اس نے اسی وقت حکم دیا کہ تمام معزول شدہ لشکریوں کو ان کی پوری پوری تنخواہ دی جائے اور اس میں کوئی تبدیلی یا کمی واقع نہ ہو۔

اپنے دوست اور غیاث الدین بلبن کے فرزند ارجمند خان رشید کے محل کے حجلہ خاص کی ایک شام مجھے آج بھی یاد ہے۔ اس شام کا منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ دیواروں پر زربفت کے پردے لٹکے ہوئے تھے عود و عنبر کے بخور سلگ رہے تھے سونے چاندی کے

شمع دانوں میں شمعیں روشن تھیں فضا روشن اور معطر تھی شہزادہ خان رشید مجھ سے امیر خسروؒ کے ایک ترانے کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ جو انہوں نے حال ہی میں ایجاد کیا تھا کہ مصاحب خاص نے بادشاہ کے آنے کی اطلاع دی۔ ہم ایک دم اٹھے اور بادشاہ کے استقبال کو گئے۔

غیاث الدین بلبن اپنے زرق برق شب کے لباس میں ملبوس زرنگار تلوار لگائے بڑی شان سے چلا آ رہا تھا۔ محافظ محل اس کے جلو میں تھے وہ اپنے فرزند ارجمند کے حجلہ خاص میں آ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر تبسم کیا اور کہا۔

"امیر عبداللہ! اچھا ہوا کہ تم بھی اس جگہ موجود ہو میں جانتا ہوں کہ تم میرے بیٹے کے خیر خواہ ہو۔ آج میں اپنے شہزادے بیٹے کی خیر خواہی کے لئے ہی اس سے چند باتیں کرنے آیا ہوں۔"

بادشاہ مسند پر بیٹھ گیا۔ ہم اس کے حضور ترکستانی قالین کے فرش پر ادب سے بیٹھ گئے بلبن نے ایک شفقت بھری نگاہ اپنے بیٹے پر ڈالی اور کہا۔

"میرے بیٹے! میں تم سے کچھ باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ میری باتوں کو دل کے دروازے کھول کر سننا۔ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ مجھے ایک روز یہ سلطنت تمہیں سونپ کر خدا کے حضور جانا ہے۔ اس لئے تمہیں کچھ ایسی نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں جو تمہارے کام آئیں گی۔"

یاد رکھو رعایا سے خراج وصول کرتے ہوئے میانہ روی اختیار کرنا۔ نہ اس قدر کم رقم وصول کرنا کہ باغیوں اور سرکشوں کو کھل کھیلنے کا موقعہ ملے اور نہ اتنی زیادہ رقم وصول کرنا کہ رعایا تباہ حال اور پریشان ہو جائے۔ ملازموں کو تنخواہ اتنی ہی مقرر کرنا جتنی ان کی سال بھر کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ انہیں ضروریات سے کم تنخواہ نہ دینا کہ وہ غربت و تنگدستی کا شکار ہو جائیں۔

ملک کی مہمات کو اپنے خیر خواہ، راست باز، پاکیزہ کردار مشیروں کے مشورے کے بغیر سر نہ کرنا۔

سلطنت کے احکام جاری کرتے ہوئے اپنی نفسانی خواہشوں کو پیش نظر نہ رکھنا۔ حق کو اپنے نفس پر قربان نہ کرنا۔

اپنے خدمت گاروں اور غلاموں سے بے التفاتی مت برتنا ان کے حالات سے پوری طرح باخبر رہنا۔ ان کی ضروریات کا پورا پورا خیال رکھنا۔ جو کوئی تمہیں ان کے خلاف ترغیب دے اس کی بات پر اس وقت تک یقین نہ کرنا جب تک کہ تم خود خفیہ طور پر

معاملے کی چھان بین نہ کر لو۔

ہمیشہ اس شخص کی حمایت کرنا جس نے دنیا سے منہ موڑ کر خدا سے لو لگا رکھی ہے اور خدا کی ذات پر ہی بھروسہ کیا ہوا ہے۔

اس نصیحت کے بعد بادشاہ عازم دہلی ہوا۔ اس وقت میں خان رشید کے ساتھ ملتان میں مقیم تھا۔ اس کے بعد ہمیں خبر ملی کی لکھنوتی کے حاکم نے بغاوت کر دی ہے اور بادشاہ بغاوت کو فرو کرنے کے لئے لکھنوتی روانہ ہو گیا ہے۔ پھر خبر ملی کہ بادشاہ لکھنوتی بغاوت کو فرو کرنے کے بعد دہلی واپس آ گیا ہے۔ خان رشید نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے باپ سے ملنے اور لکھنوتی بغاوت رفع ہونے پر مبارک باد دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہم ملتان سے عازم دہلی ہو گئے۔ خان رشید اپنی والد کے لئے بہت سے گراں بہا تحفے بھی ساتھ لے گیا تھا دہلی کے شاہی محل میں پہنچ کر خان رشید نے یہ تحفے اپنے باپ کی خدمت میں پیش کئے۔ بادشاہ اپنے بیٹے کی آمد اور سعادت مندی پر بہت خوش ہوا اور اس سے پدرانہ شفقت سے پیش آیا۔ ہم نے دہلی شہر میں ایک بے چینی سی پائی۔ حقیقت حال یہ تھی کہ لکھنوتی کی بغاوت فرو کرنے کے بعد بلبن اپنے ساتھ وہاں سے باغیوں کی ایک بھاری تعداد بھی گرفتار کر کے لایا تھا بادشاہ کے حکم سے چوراہوں میں پھانسیاں گاڑ کر ان سب باغیوں کو موت کے گھاٹ اتارا جانے والا تھا۔ ان باغیوں میں بہت سے اہل شہر کے عزیز اور رشتے دار بھی تھے اور دہلی کے یہ شہری اپنے عزیزوں کے انجام پر آہ و زاری کر رہے تھے۔ شہر کے ہر چوتھے گھر میں سے نالہ و شیون کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

قاضی شہر ایک متقی اور پرہیز گار شخص تھا اس سے شہریوں کی یہ مصیبت اور پریشانی نہ دیکھی گئی۔ وہ اپنی جان کی بازی لگا کر بلبن کے دربار میں پیش ہو گیا اور بادشاہ کو پرسوز اور پراثر انداز میں شہریوں کے الم سے آگاہ کیا۔ متقی و پرہیزگار قاضی شہر کی گفتگو نے بلبن کے دل پر اثر کیا اور اس نے تمام باغیوں کی جان بخشی کر دی اسی زمانے میں مغلوں کی ہنگامہ آرائیاں تیز تر ہونے لگیں۔ بادشاہ نے خان رشید کو کچھ اور نصیحتیں کر کے ملتان جانے کی اجازت دی اور خود مغل حملہ آوروں کی سرکوبی کے لئے شمال کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں بھی خان رشید کے ساتھ ملتان واپس آ گیا۔ ملتان کے شمال مغربی علاقوں پر مغل ڈاکوؤں نے غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ خان رشید نے ان ڈاکوؤں کو تہہ تیغ کر کے ان کے قبضے سے سارے علاقے واپس لے لئے۔ ان دنوں ایران کے تخت پر ارغون خان بن اباق خان بن ہلاکو خان بیٹھا تھا اور نامی گرامی تاتاری امیر تیمور خان ، ہرات ، قندھار ، بلخ ، بذخشاں ، غزنی اور بامیان کا حاکم تھا۔ وہ خان رشید سے اپنے ہم قوم مغلوں کے قتل کا بدلہ

لینے کے لئے بیس ہزار تاتاریوں کا لشکر لے کر دیپال پور کے علاقے میں آن وارد ہوا۔ اور وہاں لوٹ مار مچانے کے بعد ملتان کی طرف بڑھا۔

خان رشید کو امیر تیمور خان کی آمد کی خبر ملی تو اس نے جنگ لڑنے کی تیاری شروع کر دی۔ میرا دل جانے کیوں شہزادے کی طرف سے بوجھل بوجھل سا تھا۔ میں اسے جنگ پر جانے سے روک بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک بہادر بادشاہ کا جری اور لائق بیٹا تھا اور اپنے ملک کی رعایا کے جان و مال کی حفاظت اس پر فرض تھی۔ لیکن میرا دل بار بار مجھے کہتا کہ شہزادے کو اس جنگ میں خود نہیں جانا چاہئے لیکن جانے کیا بات تھی کہ میں شہزادے کے اتنا قریب اور اس کے مزاج میں اس قدر دخل رکھنے کے باوجود جب بھی اسے کچھ کہنا چاہتا تو میری زبان ساتھ نہ دیتی الفاظ میرے منہ میں ہی تحلیل ہو جاتے۔ شاید یہ اشارہ ایزدی تھا کہ میں خاموش رہوں۔

شہزادہ خان رشید نے صبح سویرے ملتان سے کوچ کیا اور آب لاہور (راوی) کے کنارے جو ملتان کے ساتھ چلتا تھا ڈیرے ڈال دیئے اور دوپہر کے وقت تیمور خان سے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا میں شہزادہ خان رشید کے ساتھ تھا دوسری جانب تیمور خان نے دریا کو پار کرنے کے بعد اپنی فوج کے میمنہ ، میسرہ اور قلب کو ترتیب دی اور حملہ کر دیا۔ گھمسان کا رن پڑنے لگا۔ میں خان رشید کے دستہ خاص میں تھا اور اس کی حفاظت پر مامور تھا۔ خان رشید کی فوج نے بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ تیمور خان کی فوج کے چھکے چھوٹ گئے۔ نامی گرامی تاتاری سرداروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ تیمور خان کی فوج کو شکست ہوئی۔ جب تاتاری سپاہی میدان چھوڑ کر بھاگے تو خان رشید کی فوجوں نے دریا پار کر کے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ یہ ان کی بہت بڑی غلطی تھی۔

مشیت ایزدی کو شاید یہی منظور تھا اور عظیم المرتبت نیک نفس شہزادے کا آخری وقت قریب آ چکا تھا۔ شہزادے نے نماز ظہر کے لئے دریا کے کنائے جانماز بچھائی اور اپنے پانچ سو جانثاروں کے ساتھ نماز پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ میں بھی اس کے پہلو میں اگلی صف میں نماز پڑھ رہا تھا۔ عین اس وقت دو ہزار تیموری سپاہیوں نے جو کمین گاہ میں چھپے ہوئے تھے نکل کر اچانک حملہ کر دیا۔ میں نے فوراً اپنے دوست شہزادہ خان رشید کو اپنے حصار میں لے لیا۔ میں اس کے عین سامنے آن کھڑا ہوا۔ کیونکہ دشمن کا زور سامنے کی جانب زیادہ تھا پھر ایک ایسی بات ہوئی جس پر آج بھی میں حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہوں۔ سامنے سے کسی تیموری سپاہی کا ایک فولادی تیر سنسناتا ہوا آیا اور سیدھا خان رشید کی چھاتی میں آ کر پیوست ہو گیا۔ اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ مجھے یقین ہے کہ تیر سب سے پہلے

میرے سینے پر آ کر لگا تھا کیونکہ میں شہزادے خان رشید کے آگے کھڑا تھا۔ تو کیا یہ تیر میرے سینے سے پار ہونے کے بعد خان رشید کے دل میں پیوست ہو گیا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا۔ مگر گمان ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو گا۔ کیونکہ میرے دوست کا وقت آخر آن پہنچا تھا اور دنیا کی کوئی طاقت اس کی موت کو ٹال نہیں سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میرا آہنی حصار بھی شہزادے کے کچھ کام نہ آیا اور وہ میری بانہوں میں دم توڑ گیا اس دوران تاتاری ہمارے کچھ سپاہیوں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے ان گرفتار شدگان میں امیر خسروؒ بھی شامل تھے۔ انہوں نے اپنی ایک تصنیف .خضر فانی اور دیواری" میں اپنی اس قید اور بعد میں رہائی کی روداد بیان بھی کی ہے۔ غیاث الدین بلبن کو اپنے فرزند ارجمند کی موت کی خبر ملی تو اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس کی عمر 80 برس کی ہو چکی تھی۔ اس بڑھاپے میں اولاد کے غم نے اسے بستر سے لگا دیا۔ بیٹے کی دائمی مفارقت سے اس کی حالت نازک صورت اختیار کر گئی۔ اس نے مجھے اپنے پاس دہلی بلوا لیا تھا۔ مجھے وہ اپنے مرحوم بیٹے کی نشانی سمجھ کر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اگرچہ بظاہر بلبن راضی برضا تھا اور یہی کہہ کر اپنے آپ کو حوصلہ دیتا کہ خدا کو ایسا ہی منظور تھا لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ تنہائی میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے بیٹے کو یاد کرتا تھا اور زار و قطار روتا تھا۔ آہ و فریاد کرتا تھا۔ اپنی اس حالت کو دیکھتے ہوئے اس نے لکھنوتی سے اپنے دوسرے بیٹے بغرا خان کو بلا لیا۔ بغرا خان جلد از جلد سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا دہلی پہنچا۔ باپ کی حالت دیکھ کر ملال ہوا اور باپ کو تسلی دی۔ بلبن کی کمزوری نے شدید بیماری کی صورت اختیار کر لی تھی - بغرا خان باپ کی پائنتی کے پاس ادب سے فرش پر بیٹھا تھا۔ میں بھی ساتھ ادب سے کھڑا تھا - شاہی طبیب بھی موجود تھا۔ بلبن نے اشارے سے شاہی طبیب کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ شاہی طبیب کورنش بجا لا کر چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ بلبن چونکہ اپنے بیٹے سے امور سلطنت کے بارے میں کوئی اہم بات کرنے والا ہے اس لئے شاید مجھے بھی وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کرے لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ اپنے چہیتے بیٹے خان رشید کی وفات کے بعد اسے مجھ سے بڑا لگاؤ ہو گیا تھا۔ اس نے بغرا خان کی طرف اپنا کمزور شاہانہ چہرہ اٹھا کر کہا۔

"میرے بیٹے! تمہارے بھائی کے غم نے مجھے گور کنارے پہنچا دیا ہے۔ میں موت کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میرا آخری وقت آن پہنچا ہے خان رشید کے بعد سلطنت کا تمہارے سوا اور کوئی وارث نہیں۔ ایسی حالت میں تمہارا مجھ سے دور رہنا کسی طرح مناسب نہیں - تمہارا بیٹا کیسقباد اور خان رشید کا بیٹا کیخسرو دونوں ابھی نوعمر ہیں ان دونوں میں سے کسی کے ہاتھ حکومت آ گئی تو خدا جانے وہ اپنی ناتجربہ کاری اور جوش

جوانی کے باعث کیا کچھ کریں۔ تمہیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ لکھنوتی کے حاکم کو ہر حالت میں دہلی کی اطاعت گزاری کرنی چاہئے۔ اور اگر تم بھی سلطنت دہلی پر بیٹھو تو تمہیں چاہئے کہ لکھنوتی کے حاکم کو اپنا مطیع اور باجگزار بنائے رکھو۔ ان حالات کے پیش نظر میں تم سے ایک بار پھر کہتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے دور نہیں رہنا چاہئے۔"

پھر بلبن نے میری طرف نظر ڈال کر بغرا خان سے کہا۔

"امیر عبداللہ اگرچہ نوجوان ہے مگر سچا اور وفادار دوست اور سلطنت کا خیر خواہ ہے اس کی صورت میں مجھے خان رشید کی صورت نظر آتی ہے اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا۔"

بغرا خان اپنے باپ کی بات کو سمجھ گیا اور دہلی ہی میں مقیم ہو گیا۔ چند روز بعد بلبن کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ یہ دیکھ کر بغرا خان کو باپ کی طرف سے اطمینان سا ہو گیا۔ اور وہ شکار کے بہانے بلبن سے اجازت لئے بغیر ہی لکھنوتی کی طرف روانہ ہو گیا۔ بلبن کو بغرا خان کی اس جدائی کا اپنے بیٹے خان رشید کی موت ایسا ہی صدمہ پہنچا۔ بغرا خان ابھی لکھنوتی پہنچا ہی تھا کہ بلبن کے مرض نے پھر اس پر حملہ کر دیا۔ بلبن کو یقین ہو گیا کہ اب اس کا زندہ رہنا بہت مشکل ہے اور وہ چند گھڑیوں کا مہمان ہے اس نے فوراً خان رشید کے بیٹے کیخسرو کے پاس آدمی بھیجے اور اسے بلوا کر اپنا ولی عہد مقرر کر دیا۔ جب بلبن چند لمحوں کو مہمان رہ گیا تو اس نے وزیر الملک وکیل السلطنت اور فخرالدین کوتوال کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

"تم لوگ یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ میں شہزادہ بغرا خان سے ہمیشہ ناخوش اور آزردہ رہا ہوں۔ اس کے برعکس میں خان رشید سے ہمیشہ خوش اور راضی رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خان رشید میری ہر بات مانا کرتا تھا اور میرے ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا۔ وہ میرے کسی فرمان سے ذرا سی بھی تجاوز نہیں کرتا تھا۔ لیکن بغرا خان نے کبھی میری بات نہیں مانی۔ وہ ہمیشہ میرے احکام کی خلاف ورزی کرتا رہا ہے اور اگر اس نے میری کوئی بات مانی بھی ہے تو محض خان رشید کے خوف سے۔ مجھے باپ اور واجب الاطاعت سمجھ کر اس نے کبھی میرا کہا نہیں مانا۔ ان تمام باتوں کے باوجود میں نے اپنی علالت کے زمانے میں بغرا خان کو لکھنوتی سے بلوا کر یہاں دہلی میں رہنے کی تاکید کی اور اسے اپنا ولی عہد مقرر کیا لیکن افسوس کہ اس نے میرے اس آخری حکم کی تعمیل بھی نہ کی۔ اس صورت حال میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ بغرا خان کو ولی عہدی سے معزول کر دوں اور کیخسرو کو اپنا جانشین مقرر کر دوں۔ میرے بعد تم لوگ کیخسرو کو اپنا بادشاہ منتخب کر لینا اور کیسقباد کو اس کے باپ کے پاس لکھنوتی بھیج دینا۔"

کوتوال فخرالدین اور دوسرے امراء نے بادشاہ سے اس وصیت پر عمل کرنے کا عہد کیا۔

اس کے بعد غیاث الدین بلبن انتقال کر گیا۔ بلبن کی وفات کے بعد وہی ہوا جو سینکڑوں برسوں سے بادشاہوں کے شاہی محلات میں ہوتا دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ ملک فخرالدین کوتوال کسی وجہ سے خان رشید مرحوم سے ناخوش تھا اس لئے اس نے اس کے بیٹے کیخسرو کو بادشاہ بنانا پسند نہ کیا۔ اس نے اپنی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور دربار کے دوسرے امراء اور وزراء سے کیخسرو کو معزول کرنے اور اس کی جگہ بغرا خان کے بیٹے کیسقباد کو تخت نشین کرنے کا مشورہ کیا اس نے کہا۔

کیخسرو مزاج کا بہت درشت ہے اگر حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں آ گئی تو یہ بات اچھی نہ ہو گی اور ہم لوگوں کے لئے آرام اور چین سے زندگی بسر کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن اس کے برعکس کیسقباد بہت ہی نیک نفس اور سیدھی طبیعت کا مالک ہے۔ اس نے غیاث الدین بلبن کی آغوش محبت میں تربیت پائی ہے اس لئے یہی مناسب ہے کہ ہم کیسقباد ہی کو بادشاہ کا جانشین مقرر کر دیں۔"

ان امیروں کو اس حقیقت کا علم نہیں تھا کہ اگر کیسقباد کے ہاتھ میں حکومت آ گئی تو اس کا انجام اچھا نہ ہو گا۔ دربار کے تمام امراء نے فخر الدین کوتوال کی رائے سے اتفاق کیا۔ انہوں نے کیخسرو کو ملتان روانہ کر دیا اور کیسقباد کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس وقت کیسقباد کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ ملک فخرالدین کوتوال کا داماد اور بھتیجا نظام الدین کیسقباد کا دست راست تھا اور کیسقباد کی عیش کوشیوں میں اس کا شریک خاص تھا۔ کیسقباد نے بڑی فراخ دلی سے نفس پرستی اور عیاشی میں اپنا وقت ضائع کرنا شروع کر دیا۔ کیسقباد معزالدین کا لقب پا کر دہلی کے تخت پر حکمرانی کر رہا تھا۔ فخر الدین کا داماد ملک نظام الدین اس کا ہم پیالہ و ہم نوالہ تھا۔ وہ "وکیل در" بنا دیا گیا جس کے بعد وہ سلطنت کے امور کے سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا۔ گویوں، شرابیوں اور عیش پرستوں کا ستارہ بلند ہو گیا۔ تمام امراء اور ارکان سلطنت نے بھی شاہی محل کے اردگرد اپنے محل تعمیر کروائے اور دن رات داد عیش دینے لگے۔ کیسقباد کی عیش پرستی اور بے خبری کا یہ رنگ دیکھ کر ملک نظام الدین کے سر میں حکومت کا سودا سمایا۔

میری یہ حالت تھی کہ میں کیسقباد کے درباری امراء میں شریک تھا اور ہر لحظہ ملک ہند سے بطرف اندلس جانے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ جہاں مور مسلمانوں کی ایک عظیم الشان سلطنت عروج پر تھی ملک نظام الدین کیسقباد کے خلاف سازش میں لگ گیا۔ مگر کیسقباد کی ایک چہیتی کنیز نے کیسقباد کو ملک نظام کے عزائم سے آگاہ کر دیا۔ کیسقباد نے ملک نظام کو زہر دلوا کر ہلاک کروا دیا۔ اس کی جگہ کیسقباد نے میر جاندار ملک جلال الدین

فیروز کو "عارضی ملک" کے عہدے پر سرفراز کیا۔ اب شاہی امراء دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ایک گروہ خلجی امرا کا تھا جو جلال الدین کی وفاداری کا دم بھرتا تھا۔ دوسرا گروہ ترکی سرداروں کا تھا یہ گروہ کیومرث کا حامی تھا کیسقباد کی غفلت اور بے راہ رویاں رنگ لانے والی تھیں۔

ان بے اعتدالیوں کی وجہ سے بادشاہ کی صحت کو سخت نقصان پہنچا اور وہ کمزور و نحیف ہو کر بستر مرگ پر پڑ گیا۔ دہلی کے امراء کی ایک بڑی تعداد جلال الدین خلجی کے حلقہ بگوش میں شامل ہو گئی جلال الدین خلجی نے ان ترک نوجوانوں کو جن کے باپ کیسقباد کے ہاتھوں مارے گئے تھے کیسقباد سے بدلہ لینے کے لئے کیلوکھری کے شاہی محل کی طرف روانہ کر دیا۔ کیسقباد فالج کی وجہ سے پہلے ہی ادھ موا ہو چکا تھا۔ صرف سانس کا رشتہ باقی تھا ان ترک نوجوانوں نے بادشاہ ہند کو چمڑے کے ایک تھیلے میں لپیٹا اسے موگروں سے کوٹا اور پھر لاش کے تھیلے میں پتھر ڈال کر دریائے جمنا میں بہا دیا۔ ہند کی سلطنت غور کے ترکی نژاد غلاموں کے ہاتھ سے نکل کر خلجیوں کے قبضے میں چلی گئی اور جلال الدین خلجی نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر 70 برس تھی گذشتہ حکمرانوں کے برعکس جلال الدین خلجی نے چتر شاہی کا رنگ سرخ کی بجائے سفید قرار دیا اور ظلم و شقاوت سے کنارہ کشی اختیار کر کے لطف و کرم کو اپنا شعار بنایا۔ جلال الدین نے دریائے جمنا کے کنارے ایک بڑا خوبصورت باغ لگوایا۔ اس نے کیلوکھری میں مسجدوں اور بازاروں کا ایک خوبصورت سلسلہ شروع کروایا اور اسے "شہر نو" کا نام دیا۔ بادشاہ کا شاہی محل بھی کیلوکھری میں ہی تھا۔ لیکن جب جلال الدین کے لطف و کرم کی شہرت عام ہوئی اور اپنی اعلیٰ خصوصیات کی بنا پر وہ اہل دہلی میں مقبول ہو گیا تو بادشاہ واپس دہلی آ گیا۔ جب وہ دہلی کے بادشاہی محل کے قریب پہنچا تو اس نے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔ تخت شاہی پر بیٹھ کر جلال الدین خلجی نے دربار سے مخاطب ہو کر کہا۔

میں سوچتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ کا کس طرح شکر ادا کروں۔ ایک وہ دن تھا کہ جب میں اسی تخت کے سامنے زمین بوس ہو کر ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا اور آج خود اس تخت پر بیٹھا ہوں۔"

تخت پر کچھ دیر بیٹھنے کے بعد بادشاہ نے غیاث الدین بلبن کے خاص محل "کوشک لعل" کا رخ کیا۔ میں بھی امراء کی جماعت میں شامل اس کے ہمراہ تھا بارگاہ سلطانی کے قریب پہنچ کر وہ اپنی عادت کے مطابق گھوڑے سے اتر پڑا۔ جلال الدین خلجی کو گھوڑے سے اترتے دیکھ کر وزیر ملک حبیب احمد نے فوراً آگے بڑھ کر عرض کی۔

"عالم پناہ! اب یہ محل آپ کی ملکیت ہے۔ اپنے خاص محل میں شاہی آداب کو ملحوظ رکھنا آپ کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

جلال الدین خلجی نے جواب دیا۔

"اپنے آقائے ولی نعمت کی عزت و حرمت کرنا ہر انسان کا اولین فرض اور مستحسن فعل ہے۔"

ملک حبیب احمد نے کہا۔ "اب حضور کو اسی محل میں قیام کرنا چاہئے۔" جلال الدین نے جواب میں کہا۔

"سلطان مرحوم نے اس محل کو اس زمانے میں جب کہ وہ امراء کی صف میں شامل تھے اپنے ذاتی روپے سے بنوایا تھا۔ اس لئے اس محل کے وارث غیاث الدین کے وارث ہیں نہ کہ میں۔"

اس پر ملک حبیب نے کہا۔ "ملکی انتظامات کے پیش نظر ایسی احتیاط کو ملحوظ رکھنا مناسب نہیں عالم پناہ!"

جلال الدین نے فوراً جواب دیا۔ "میں اس زندگی مستعار کے لئے اسلامی شرع کے احکام کی خلاف ورزی کرنا ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

اس کے بعد جلال الدین خلجی پیادہ پا کوشک لعل محل میں داخل ہوا۔ اس محل کے ایسے مقامات پر جہاں غیاث الدین بلبن بیٹھا کرتا تھا۔ جلال الدین نے حفظ مراتب کے پیش نظر وہاں پاؤں نہ رکھا بلکہ اسی چبوترے پر بیٹھا جہاں بلبن کے زمانے میں امراء اور ارکین سلطنت بیٹھا کرتے تھے۔ یہاں اس نے امراء کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"میرے دشمنوں نے میرے قتل کا ارادہ کیا اور میں نے اپنی جان کو خطرے کے پیش نظر اس عظیم الشان سلطنت کے بوجھ کو اپنے کاندھوں پر لادا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میرا انجام کیا ہو گا۔ جب باوجود اس تزک و احتشام، رعب داب، کثرت امراء و ملازمین کے سلطنت نے غیاث الدین بلبن سے وفا نہ کی اور اس کی آنکھیں بند کرتے ہی اس کی اولاد تباہ و برباد ہو گئی تو میرے بعد میری اولاد کا کیا حشر ہو گا؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میرے بعد میرے وارث کیا کریں گے اور زمانہ ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔"

بادشاہ کی اس تقریر سے بیشتر امراء کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔ بعض ایسے درباری جو جوانی کے نشے میں سرشار اور قدرے بے باک تھے آپس میں چہ میگوئیاں کرتے ہوئے بادشاہ کو برا بھلا کہنے لگے۔ ایک جواں سال امیر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"جلال الدین نے آج ہی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی ہے اور آج ہی سے اپنے

زوال کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے ہیں۔ جب ابھی سے اس کا یہ عالم ہے تو اس سے قہر و سیاست کی توقع رکھنا بے کار ہے جو حکومت کی بنیاد ہوتے ہیں۔"

عصر کے بعد جلال الدین کوشک محل سے دہلی واپس آیا۔ اس کے بعد اس نے دہلی میں ایک بہت عظیم الشان جشن مسرت منایا اور اپنی ایک بیٹی کی علاؤ الدین خلجی کے ساتھ شادی کی اور دوسری بیٹی کو الماس بیگ الغ خان سے بیاہا۔

اس کے بعد ایک روز ایسا بھی طلوع ہوا کہ جب دریائے گنگا کا پانی جلال الدین خلجی کے خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ یہ تاریخ کا ایک عبرت ناک سبق ہے جو وقت کے صفحات پر بار بار دہرایا جاتا رہا ہے اور جس کا میں عینی گواہ ہوں۔

غیاث الدین بلبن کی بادشاہت کے زمانے میں جلال الدین خلجی میر جامداری کے عہدے پر فائز تھا اور سمانہ کی جاگیر اس کے انصرام و انتظام میں تھی۔ ان دنوں اپنے زمانے کے مشہور شاعر سراج الدین سائی' سمانہ ہی میں رہتے تھے۔ قانون اور دستور کے مطابق جلال الدین خلجی نے ایک بار اس شاعر طرح دار سے علاقے کی مال گزاری طلب کی۔ سراج الدین سائی اس پر ناراض ہو گئے اور انہوں نے ..... جلال الدین خلجی کی ہجو لکھی اور اس کا نام "خلجی نامہ" رکھا۔ (جب جلال الدین نے تخت شاہی سنبھالا تو ایک بار اس نے خود مجھے یہ ہجو دکھائی تھی۔) جلال الدین نے اس ہجو کو پڑھا اور سراج الدین سائی کو کچھ نہ کہا۔ جب وہ تخت شاہی پر براجمان ہوا تو سراج الدین سائی بہت پریشان ہوا کہ اب اس کی خیر نہیں ہے۔ شاعر خود ہی جلال الدین خلجی کے دربار میں حاضر ہو گیا۔ مجرموں کی طرح پگڑی گلے میں لٹکی ہوئی تھی۔ اس وقت دربار میں میں بھی موجود تھا۔ میرا خیال تھا کہ جلال الدین خلجی اس کی گردن اڑانے کا حکم دے گا لیکن وہ تخت سے اٹھا۔ شاعر سراج الدین سائی کو گلے لگایا اور حکم دیا کہ اس کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

ان ہی دنوں مشہور بزرگ سیدی مولہ کی خانقاہ پر عوام کا ہجوم رہتا تھا۔ غیاث الدین بلبن کے عہد کے وہ تمام امیر جو تباہ حال ہو گئے تھے اور ہزارہا بیکار سپاہی اور وہ بارہ ہزار حافظ قرآن جو روزانہ قرآن مجید ختم کرتے تھے' اسی خانقاہ میں پناہ گزین تھے۔ دہلی میں سیدی مولہ کی عظیم الشان خانقاہ میں ہزاروں بے یارو مددگار مسلمانوں کی روٹی کپڑے سے مدد کی جاتی تھی۔ سیدی مولہ کا دستور تھا کہ وہ جمعہ کی نماز مسجد کے بجائے اپنی خانقاہ میں ادا کرتے تھے۔ وہ اولیاء اللہ اور مشائخ عظام کی طرح جماعت کی پابندی نہ کرتے تھے لیکن ریاضت اور مجاہدہ میں اس وقت ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ایک سفید بے داغ چادر کے سوا ان کے جسم پر کوئی اور کپڑا نہ ہوتا تھا۔ ان کی خانقاہ میں طرح طرح کے پکوان پکتے تھے مگر سیدی مولہ کا یہ عالم تھا کہ روٹی سادہ پانی میں بھگو کر کھاتے تھے۔ خدمت کے لئے کوئی نوکر' لونڈی یا منکوحہ

عورت گھر پر نہ تھی۔ کبھی کوئی نذرانہ قبول نہ کرتے تھے' لیکن خیرات جی کھول کر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی خیرات کو دیکھ کر ایک بار بادشاہ نے دربار میں اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ سیدی مولہ سونا بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔

سیدی مولہ جرجان سے جب اجودھن حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے حضور آئے تو انہوں نے سیدی مولہ کو ایک نصیحت کی تھی کہ دہلی پہنچ کر امیر اور حاکموں سے راہ و رسم پیدا نہ کرنا لیکن غیاث الدین بلبن کے بعد جب کیقباد کا غفلت اور بے خبری کا دور آیا تو سیدی مولہ کے مخیرانہ مصروفیات میں اضافہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی نصیحت کو بھی فراموش کر دیا اور امراء سے تعلقات استوار کر لئے۔ ان کی جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک حاجت مند کو دو دو سو ہزار اشرفیاں دے دیتے تھے۔ دستر خوان کی وسعت کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دن میں ایک ہزار من میدہ' چالیس من شکر' پانچ سو من گوشت اور کئی من گھی.... باورچی خانے میں صرف ہوتا تھا۔ ان کا یہ دستور تھا کہ جب کسی کو کچھ دینا ہوتا تھا تو اس سے کہتے "میاں فلاں بوریئے کو اٹھاؤ۔ اس کے نیچے سونا چاندی جو کچھ بھی ہے لے لو۔" جب اس بوریئے کو اٹھایا جاتا تو اس کے نیچے سے وہی کچھ نکلتا جو سیدی مولہ کے منہ سے نکلا ہوتا تھا۔

جب جلال الدین خلجی تخت پر رونق افروز ہوا تو خانقاہ پر عقیدتمندوں کے ہجوم میں بے حد اضافہ ہو چکا تھا۔ بادشاہ کا بڑا بیٹا خان خاناں سیدی مولہ کا بڑا عقیدت مند تھا۔ یہاں تک کہ اس نے سیدی مولہ کو اپنا منہ بولا باپ کہہ رکھا تھا۔ خان خاناں کے علاوہ دربار شاہی کے دیگر امراء بھی سیدی مولہ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے تھے۔ ان ہی دنوں ایک شرپسند امیر قاضی جلال الدین کاشانی نے سیدی مولہ سے تعلقات بڑھائے اور اپنی عیاری اور خوش گفتاری سے ان پر کچھ ایسا اثر ڈالا کہ وہ قاضی کاشانی کو اپنا بہترین دوست سمجھنے لگے۔ قاضی کاشانی نے سیدی مولہ کو بادشاہ بننے کی ترغیب دینی شروع کر دی۔ اس نے کہا۔

"خداوند کریم نے آپ کو یہ قدرت اس لئے عطا کی ہے کہ آپ بندوں سے رحم اور مہربانی سے پیش آئیں اور لوگوں کو دین کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع دیں۔ اگر آپ نے اس فرض سے کنارہ کشی کی تو قیامت کے دن خدا کو کیا جواب دیں گے؟"

سیدی مولہ اس شاطر کی باتوں میں آ گئے اور سلطنت حاصل کرنے کے اسباب فراہم کرنے میں لگ گئے۔ سید صاحب نے خفیہ طور پر اپنے مریدوں کو خطابات اور منصب سے بھی نوازنا شروع کر دیا۔ یہ تقاضائے بشریت تھا۔ قاضی کاشانی کی سازش سے یہ طے پایا کہ سیدی مولہ کے دو مرید برنجن کوتوال اور ہتھائی پہلوان جمعہ کے روز بادشاہ کی سواری تک پہنچ

کر اس کا کام تمام کر دیں اور سید صاحب کے دس ہزار مرید اسی وقت ان سے بیعت کر کے ان کی بادشاہت کا اعلان کر دیں۔

لیکن سیدی مولہ کا آخری وقت آ چکا تھا۔ کسی نے بادشاہ کو اس سازش سے آگاہ کر دیا۔ بادشاہ نے سیدی مولہ اور قاضی کاشانی کو دربار میں طلب کیا اور سازش کی بابت پوچھا۔ جب بادشاہ کو جرم ثابت کرنے کے لئے کوئی معقول ثبوت نہ ملا تو بادشاہ نے حکم دیا۔

"بہادر پور کے جنگل میں بہت بڑی آگ روشن کی جائے اور سیدی مولہ' کاشانی' برنجن کوتوال اور نتھائی پہلوان اس آگ پر سے ننگے پاؤں گزریں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ سچے ہیں کہ جھوٹے۔"

شاہی حکم کی فوراً تعمیل کی گئی - بہادر پور کے جنگل میں آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ روشن کر دیا گیا۔ بادشاہ اپنے امراء اور لشکر کے سرداروں کے ہمراہ خیمے میں آ کر ٹھہر گیا۔ میں بھی اس کے ہمراہ تھا۔ میرے لئے یہ ایک عجیب سی آزمائش تھی۔ کیوں کہ حقیقت عیاں تھی کہ آگ کا کام جلانا ہے وہ انسانوں کو جلا ڈالے گی۔ جب تمام ملزمان کلمہ شہادت پڑھ کر آگ میں کودنے لگے تو جلال الدین خلجی کو رحم آ گیا۔ اس نے علماء سے مشورہ کیا۔ علماء نے جواب دیا کہ جلا ڈالنا آگ کی فطرت ہے۔ کوئی بھی شخص خواہ وہ سچا ہو یا جھوٹا' آگ میں گرے گا تو آگ اسے جلا ڈالے گی۔ اس قسم کا فیصلہ آگ کے ذریعے کرنے کی اسلام نے اجازت نہیں دی۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ بادشاہ نے آگ سرد کرنے کا حکم دے دیا۔

جلال الدین خلجی نے قاضی کاشانی کو بدایوں کا قاضی مقرر کر کے دہلی سے باہر بھیج دیا۔ دونوں کوتوالوں کے سر قلم کروا دیئے۔ بلبنی امراء کو دیس نکالا دے دیا۔ بادشاہ سیدی مولہ کو لے کر شاہی محل میں آ گیا اور ان سے کچھ سوالات کئے۔ جن کا جواب سیدی مولہ نے بڑی دلیری اور جرات مندی سے دیا۔ سید صاحب پر شرع اور قانون کے لحاظ سے کوئی جرم ثابت نہ ہو سکا لیکن بادشاہ نے جشن شب کے موقع پر مجھے کہا کہ سیدی مولہ کا وجود اس کے لئے خطرے کا باعث ہے۔ بادشاہ نے شیخ ابوبکر طوسی حیدری اور دوسرے درویشوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم دیکھ رہے ہو نا کہ اس درویش سیدی مولہ نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور میرے ملک میں بدامنی پھیلانے اور مجھے قتل کرنے کا منصوبہ تیار کیا ہے۔ میں انصاف کو تم لوگوں کے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ تم جو مناسب سمجھو فیصلہ کرو۔"

بادشاہ کا یہ کہنا تھا کہ سنجری نام کا ایک درویش اپنی جگہ سے اٹھا اور سید صاحب کے جسم پر کئی گھاؤ لگائے۔ اس پر سید صاحب نے بلند آواز سے کہا۔ "میں اپنی موت سے

ہراساں نہیں ہوں۔ مجھ کو جلد میری قیام گاہ پر پہنچا دیا جائے۔"

پھر انہوں نے بادشاہ کی طرف متوجہ ہو کر اعلان کیا۔ "مجھے اپنے مرنے کا کوئی غم نہیں لیکن تم یاد رکھو' میرا لہو رائیگاں نہیں جائے گا۔ اس کا وبال تم پر اور تمہاری اولاد پر ضرور پڑے گا۔"

جلال الدین سیدی مولہ کو قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بادشاہ کا چھوٹا بیٹا ارکلی آگے بڑھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی خان خاناں کی .... سیدی مولہ سے عقیدت اور ان کا منہ بولا بیٹا بننے کی وجہ سے ناراض تھا۔ اس نے فیل بان کو اشارہ کیا۔ یہ اشارہ پاتے ہی فیل بان نے اپنے ہاتھی کو سیدی مولہ پر چھوڑ دیا۔ ہاتھی نے آن کی آن میں سیدی مولہ کو کچل کر رکھ دیا۔

میں بادشاہ کے ساتھ واپس محل میں آ گیا۔ شام کے وقت میں اپنی بارہ دری میں بیٹھا دریا کا نظارہ کر رہا تھا کہ ایک دم سے ایسی سیاہ آندھی اٹھی کہ دہلی شہر سارے کا سارا تاریکی میں ڈوب گیا۔ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اسی موسم میں دہلی میں سخت قحط پڑ گیا۔ اس قحط کے مصائب کی تاب نہ لاتے ہوئے ہزاروں ہندوؤں نے اپنے آپ کو دریا میں غرق کر دیا۔

یہ ساتویں صدی ہجری کا زمانہ تھا کہ ہلاکو خان کے ایک رشتہ دار نے ایک لشکر جرار کے ساتھ دہلی پر حملہ کر دیا۔ منگولوں کو شکست ہوئی اور چنگیز خان کا نواسہ الغو خان مشرف بہ اسلام ہوا۔ الغو خان اور اس کے ساتھیوں نے نومسلموں کے خطاب حاصل کئے۔ ان نومسلم منگولوں نے موضع غیاث پور کو اپنا مستقر بنایا۔ جہاں حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ قیام فرما تھے۔ بعد میں ان نومسلم منگولوں کی نسبت سے یہ علاقہ مغل پورہ کے نام سے موسوم ہونے لگا۔ اسی سال ملک علاء الدین حاکم کڑہ نے بھوپال کے نواح میں قلعہ بھیسہ پر چڑھائی شروع کر دی۔ یہ حملہ جلال الدین خلجی کی اجازت سے کیا گیا۔ علاء الدین نے بے شمار مال و دولت لوٹ کر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ بادشاہ نے علاء الدین کو شاہانہ نوازشوں سے سرفراز کیا اور اودھ کا حاکم مقرر کیا۔ علاء الدین کا بادشاہ کے مزاج میں بہت عمل دخل ہو گیا تھا۔ انہوں نے چپکے چپکے ایک سازش کے تحت دہلی دربار سے دور دور رہ کر اپنے اثر و رسوخ اور مقبوضہ علاقوں میں اضافہ شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں علاء الدین کی بغاوت کی خبر بھی دہلی میں پہنچ چکی تھی۔ علاء الدین نے دیوگڑھ کو فتح کر لیا۔ بادشاہ کو جب پتہ چلا کہ علاء الدین بے شمار مال غنیمت لے کر دہلی کی طرف آ رہا ہے تو جلال الدین کو بہت خوشی ہوئی۔ علاء الدین کو جلال الدین خلجی نے خود پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ وہ اس کی اقبال مندی پر بہت مسرور تھا۔

جلال الدین خلجی نے دربار کے امراء خاص کو طلب کیا اور مشورہ کیا کہ علاء الدین

دیوگڑھ فتح کر کے بے شمار زر و جواہر میری خدمت میں پیش کرنے دہلی آ رہا ہے۔ مجھے آگے بڑھ کر استقبال کرنا چاہیے یا اپنی جگہ پر خاموش بیٹھے رہنا چاہیے؟ امراء نے کہا کہ بادشاہ کو آگے بڑھ کر علاء الدین کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

اصل میں جلال الدین خلجی خود بھی راستے میں علاء الدین سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے دولت کا لالچ تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر علاء الدین پہلے لکھنوتی چلا گیا تو اس کے پاس جو دولت اور زر و جواہر ہیں وہ پھر کسی طرح نہ مل سکیں گے۔ چنانچہ بادشاہ اپنے ساتھ صرف پانچ سو سواروں کو لے کر کشتی میں روانہ ہو گیا۔ علاء الدین کو جب بادشاہ کی آمد کی خبر پہنچی تو اس نے گنگا کے پار اتر کر مانک پور کے مقام پر اپنے لشکر کے ساتھ ڈیرے ڈال دیئے۔ رمضان المبارک کی سترھویں تاریخ تھی۔ دریا کے پانی پر بادشاہی چتر دور سے نظر آیا تو علاء الدین کے لشکر نے بظاہر شان و شوکت کے اظہار کے لئے اور بہ باطن کسی دوسرے مقصد کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو مسلح اور ہاتھی گھوڑوں کو تیار کرنا شروع کر دیا۔ میں بادشاہ کی کشتی میں اس کے پہلو میں پیچھے کی طرف بیٹھا تھا اور دور دریا کنارے علاء الدین کے لشکر کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا۔ ابھی ہم دریا کے راستے ہی میں تھے کہ علاء الدین کا خصوصی ایلچی ایک کشتی میں حاضر ہوا اور کورنش بجا کر بادشاہ کو اپنی باتوں سے راضی کر لیا کہ وہ اپنے لشکر سے الگ ہو کر علاء الدین سے ملے۔ میں نے بڑے ادب سے جلال الدین خلجی سے کہا۔

”بادشاہ سلامت! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں مگر میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنے لشکری سواروں کو اپنے ساتھ رکھیں۔“

جلال الدین مسکرایا۔ ”علاء الدین سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں وہ ہمارے بیٹوں جیسا ہے۔ ہم نے اسے بیٹوں کی .... طرح پالا ہے۔“

عصر کے وقت بادشاہ کی کشتی کنارے پر جا لگی۔ علاء الدین نے آگے بڑھ کر بادشاہ کا استقبال کیا اور اپنا سر بادشاہ کے قدموں پر رکھ دیا۔ ہم دو امراء دوسری کشتی میں بیٹھے تھے۔ جلال الدین خلجی نے علاء الدین کو دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور اس کے گال پر ہلکی سی چپت لگا کر کہا۔

”میں نے تجھے بڑے لاڈ پیار سے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے اور اپنے حقیقی بیٹوں کی طرح عزیز رکھا ہے۔ پھر بھلا تیرے دل میں یہ خیال کیسے آ گیا کہ میں تیرے خلاف ہو گیا ہوں۔“

یہ کہہ کر بادشاہ نے علاء الدین کا ہاتھ پکڑا اور اسے ساتھ لے کر کشتی کی طرف بڑھا۔ اس موقعہ پر علاء الدین نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ سامنہ کے ایک سپاہی نے جھپٹ کر

بادشاہ پر تلوار کا وار کیا۔ بادشاہ زخم کھا کر ہماری کشتی کی طرف دوڑا اور کہا۔ ”اے بدبخت علاء الدین تو نے کیا کیا؟“

ابھی بادشاہ کشتی تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ اختیار الدین نے بادشاہ کو پچھاڑ کر اس کا سر کاٹ کر الگ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی سپاہی ہماری کشتی کی طرف لپکے اور میرے ساتھی ملک خرم کا بھی سر کاٹ دیا۔ ایک سپاہی نے مجھ پر بھی تلوار کا وار کیا۔ تلوار میرے سر پر لگی اور میری پگڑی کٹ کر دریا میں گر گئی۔ اس دوران علاء الدین کے ایک سپاہی نے جلال الدین خلجی کا سر نیزے پر چڑھا لیا تھا۔ سپاہی نے مجھ پر دوسرا وار کیا۔ میں نے اپنا بازو آگے کر دیا۔ تلوار میرے بازو سے ٹکرا کر دو ٹکڑے ہو گئی۔ سپاہی سمجھا کہ میں نے فولاد کا بازو بند چڑھا رکھا ہے۔ اس نے پیش قبض نکال لیا۔ اب میں بھی اس سے گتھم گتھا ہو گیا اور ہم دریا میں گر پڑے۔ اس وقت شام کے سائے چاروں طرف پھیلنے لگے تھے۔ برسات کا موسم تھا۔ دریا چڑھاؤ پر تھا۔ دریا کی لہریں بہت تیز تھیں۔ میرے لئے علاء الدین کے سپاہی کو ہلاک کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا مگر میری اس سے کوئی ذاتی یا ملکی دشمنی نہیں تھی۔ میں نے اسے کچھ نہ کہا۔ محض دریا کی لہروں کے حوالے کر دیا۔

وہ میرے سامنے دریا کی لہروں پر تیرتا کنارے کی طرف چلا گیا۔ ہماری کشتی الٹ چکی تھی۔ جلال الدین کے قتل کے بعد اس کے لشکری راہ فرار اختیار کر چکے تھے۔ میں دریا میں تیرنے لگا کہ دوسرے کنارے پر پہنچ جاؤں مگر دریا کی لہریں بہت تیز تھیں اور دریا میں اچانک جیسے سیلاب آ گیا تھا۔ میری سرتوڑ کوشش کے باوجود دریا کی طوفانی لہروں نے مجھے دوسرے کنارے پر نہ جانے دیا اور میں دریا کے عین درمیان آ کر سامنے کی طرف بہنے لگا۔ میں ایک تیز رفتار لہر پر سوار تھا اور وہ مجھے طوفانی رفتار کے ساتھ آگے بہائے لئے جا رہی تھیں۔ میں نے کئی بار دوسرے کنارے تک پہنچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ دریا میں بہتے بہتے رات کا اندھیرا چھا گیا۔

مجھے دریا کی دھندلی لہروں کے سوا اور کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اگرچہ میرے لئے یہ اندھیرا کوئی انوکھی بات نہیں تھا۔ میں نے ہزاروں برس پہلے کے اندھیرے بھی دیکھے تھے لیکن میں غیر یقینی حالت میں آگے بڑھ رہا تھا۔ دریا کا پاٹ آگے جا کر چوڑا ہو گیا۔ آسمان پر ستارے چمکنے لگے۔ اب ان کی پھیکی پھیکی روشنی میں مجھے دریا کا مٹیالا پاٹ نظر آنے لگا تھا۔ دور کنارے پر گھنے جنگلوں کی سیاہ لکیر پھیلتی چلی گئی تھی۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا کہ میں دریا میں بہتا چلا جاؤں۔ کیوں کہ میں جب بھی کنارے کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا لہریں چٹان بن کر میرے راستے میں حائل ہو جاتیں۔ میں نے اپنے آپ کو دریا کی لہروں کے

حوالے کر دیا۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے مجھ پر غنودگی طاری ہو رہی ہے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے تو کبھی اپنے آپ اونگھ تک نہیں آئی تھی۔ مجھے نیند وغیرہ کی بھی حاجت نہیں تھی۔ میں تو قریباً پانچ ہزار سال سے جاگتا چلا آ رہا تھا لیکن اس غنودگی کا تجربہ مجھے پہلی بار ہو رہا تھا۔ میں نے ہوش میں رہنے کی کوشش کی مگر میری آنکھیں اپنے آپ بند ہوئی جا رہی تھیں۔ میں نے ہندوستان کے طلسم اور جادو کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ مجھ پر بھی کسی جادو یا طلسم کا اثر ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ پھر وہ مقام آ گیا کہ میرے اندر اتنی طاقت ہی نہ رہی کہ میں اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو کھول سکوں۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں اور مجھ پر جیسے بے ہوشی طاری ہو گئی۔

کچھ یاد نہیں کہ کتنا وقت گذر گیا تھا۔ شاید رات' شاید دو راتیں۔ میں نیند کے عالم میں دریا کے ساتھ ساتھ بہتا جا رہا تھا کہ اچانک نیند کا اثر غائب ہو گیا۔ میری آنکھیں کھل گئیں میں نے سب سے پہلی تبدیلی جو دیکھی وہ یہ تھی کہ دریا کا پاٹ بہت چھوٹا ہو گیا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ میرے دونوں جانب پہاڑی سلسلے حد نظر تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ سورج ان پہاڑیوں کے پیچھے مغرب کی جانب چھپ گیا تھا۔ پہاڑی ڈھلانوں پر گنجان جنگل ہی جنگل تھے جن پر سرمئی رنگ کی دھند اتر رہی تھی...... میں دریا کے کنارے کنارے بہہ رہا تھا۔ پھر میں کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ کنارے پر اونچی اونچی دریائی گھاس اگی ہوئی تھی۔ ان میں مینڈک اور جھینگر بول رہے تھے۔ میں دریا سے نکل آیا۔ میرے کپڑے بھیگ رہے تھے۔ قد آدم گھاس میں سے باہر آیا تو میرے سامنے سیاہی مائل چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں دور تک اونچے سر بفلک پہاڑوں کی جانب بڑھتی چلی گئی تھیں۔ میں ایک جنگل میں کھڑا تھا۔ جگہ جگہ بڑے بڑے ناتراشیدہ پتھر بکھرے پڑے تھے۔ جن پر بھورے رنگ کی کائی جمی ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ مجھے قدیم ہندوستان میں کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کے باوجود میں اس وسیع براعظم کے جنوبی اور وسطی علاقوں سے ناواقف تھا۔ اتنا مجھے احساس تھا کہ دریا مجھے دلی کے گرد و نواح سے نکال کر دور دراز کے کسی علاقے میں لے آیا ہے۔ جہاں کوئی آبادی نہیں ہے۔

رات کی آمد آمد تھی۔ میں نے اس خیال سے پہاڑیوں کی طرف چلنا شروع کر دیا کہ شاید کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں رات گذاری جا سکے اور پھر صبح واپس دلی جانے کے بارے میں سوچوں گا۔ میں جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا۔ درختوں پر پرندوں کا شور زیادہ ہو گیا تھا۔ میں جنگل سے نکل کر ایک پہاڑی کے دامن میں آ گیا۔ اس پہاڑی کی ڈھلان پر دائیں

بائیں سال املی اور بانس کی اونچے گھنے درخت کھڑے تھے۔ ان درختوں کے درمیان ایک مندر بنا ہوا تھا جس کی دیواریں ایک طرف کو جھکی ہوئی تھیں۔ گھاس میں چھپا ہوا بڑے بڑے پتھروں کا زینہ اوپر مندر تک چلا گیا تھا۔ میں نے درختوں کے بیچ سے نظر آتے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہاں سیاہ بادل اڑے چلے جا رہے تھے۔ ایک دو بار ان بادلوں میں بجلی کی چمک سی لہرا گئی اور ساتھ ہی بجلی کی ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے بارش آ جائے۔ اس لئے مندر کے کھنڈر میں ہی رات بسر کر لینی چاہئے۔ میں گھاس میں چھپے ہوئے پتھروں کے زینے پر سے ہوتا ہوا مندر کے دروازے پر آ گیا۔ مندر کا دروازہ بوسیدہ اور دیوار کے ساتھ ہی ایک طرف کو جھکا ہوا تھا۔ ہندوؤں کے پرانے مندروں کی طرح اس مندر کا دروازہ بھی چھوٹا تھا۔ اس کا ایک پٹ اس طرح اپنی جگہ سے اکھڑا ہوا تھا کہ اندر جانے کا راستہ بن گیا تھا۔ مندر کی حالت بہت خستہ تھی۔ لگتا تھا کہ شاید قدیم زمانے میں یہاں لوگ پوجا کرنے کو آیا کرتے تھے۔

بادلوں میں بجلی کی چمک پھر نمودار ہوئی۔ ہلکی سی گرج سنائی دی اور ایک دم سے موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ میں پہلے ہی بھیگا ہوا تھا۔ بھیگنے سے مجھے کوئی فرق تو نہیں پڑتا تھا۔ مگر پھر بھی میں نہیں چاہتا تھا کہ مزید بھیگ جاؤں۔ میں مندر کے پٹ میں سے اندر داخل ہو گیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ پھر پتھریلی دیواروں کا خاکہ سا ابھرنے لگا۔ یہ ایک نیچی چھت والا کمرہ تھا۔ دیوار پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ فرش پر پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے اس مندر کا مزید جائزہ لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو یہاں رات بسر کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں دروازے کے سوراخ کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ رات کا اندھیرا باہر جنگل میں پھیل گیا تھا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی۔ جنگل میں موسلا دھار بارش کی آوازیں ایسی ہوتی ہے کہ اس کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔ مجھے افریقہ اور ہندوستان کے .... جنگلوں کی موسلا دھار بارشوں کی آواز بڑی پسند ہے۔ شاید اس لئے بھی کہ میں قدیم مصر کا رہنے والا ہوں۔ جہاں برسوں بعد قسمت سے ہی بارش ہوتی ہے۔ میں نے اپنا سر دیوار کے ساتھ لگا لیا تھا۔ اب اس غنودگی کا بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں تھا جو دریا کے وسط میں پہنچ کر مجھ پر طاری ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے میں بے خبری کی حالت میں بہتا ہوا اس گمنام جنگلوں کے علاقے میں پہنچ گیا تھا۔

رات گذرتی چلی گئی۔ بارش ایک ہی رفتار سے جاری تھی۔ مندر کے ایک طرف کو جھکے ہوئے دروازے کے سوراخ میں سے سوائے تاریک اندھیرے جنگل کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے خیال میں آدھی رات گذر چکی تھی کہ بارش کا زور ٹوٹ گیا۔

بارش آہستہ آہستہ رک گئی - بارش کے رکتے ہی جنگل میں ایسا سناٹا چھا گیا کہ یہ موت ایسی خاموشی میں نے کم محسوس کی تھی۔ مندر کے نیچے پتھریلی سیڑھیوں کی ڈھلان ہونے کی وجہ سے وہاں بارش کا پانی کہیں جمع نہیں ہوا تھا ورنہ اس پر ٹپکتے درختوں کی بوندوں کی آواز ضرور آتی۔ دیر تک یہ قبرستان جیسا سناٹا چھایا رہا۔ میں آنکھیں بند کئے دیوار کے ساتھ سر لگائے خاموش بیٹھا تھا۔

شاید رات کا ایک یا ڈیڑھ بج رہا ہو گا کہ مجھے اس ویران کمرے میں جہاں میں دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ پیروں کی .... آہٹ سنائی دی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی ننگے پیروں سے چل پھر رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مجھے اندھیرے میں چیزوں کے خاکے ضرور نظر آجایا کرتے تھے۔ مگر مجھے کمرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ کمرہ خالی تھا۔ فرش پر چھوٹے چھوٹے پتھر اسی طرح بکھرے ہوئے تھے مگر پاؤں کی آہٹ کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی میرے قریب سے گزر کر سامنے والی دیوار کی طرف جا رہا ہے۔ مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے..... یہاں بدروحیں رہتی ہوں یا یہاں جادو طلسم کا اثر ہو۔ قدیم ہندوستان کے ویران مندروں میں بدروحوں کے ٹھکانے ہوا کرتے تھے۔ مجھے گھبراہٹ نہیں تھی کیوں کہ بدروحیں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔ میں اس سے پہلے قدیم مصر کے فرعونوں کی بدروحوں کو بھگت چکا تھا۔ لیکن میرے دل میں ایک کرید سی ضرور پیدا ہو رہی تھی کہ معلوم کرنا چاہئے یہ بدروح کس کی ہے اور یہاں کس لئے آئی ہے۔ میں نے پیروں کی آہٹ پر کان لگا لئے۔ اب کپڑوں کی سرسراہٹ کی آواز بھی سنائی دی۔ پھر یہ آواز غائب ہو گئی۔

ایک بار پھر وہی گہرا گھمبیر سناٹا چھا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ بدروح یا بدروحیں آئی تھیں۔ انہیں اپنے غیبی علم سے میری طاقت کا اندازہ ہو گیا اور وہ مجھے نقصان پہنچائے بغیر واپس چلی گئیں۔ میں نے دیوار کے ساتھ دوبارہ اپنا سر لگا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں اسی انتظار میں تھا کہ رات گزرے اور میں صبح ہوتے ہی دریا کے الٹے رخ پر دہلی کی طرف اپنا سفر دوبارہ شروع کروں۔ مجھے جلال الدین خلجی کے عبرت ناک انجام کا منظر یاد آ گیا۔ اس کا سر نیزے پر چڑھا ہوا تھا اور اس کے محافظ لشکری راہ فرار اختیار کر رہے تھے۔ بزرگ درویش سیدی مولہ کا لہو آخر رنگ لے آیا تھا۔ میں نے اب تک ان گنت بادشاہوں کے سر اسی طرح نیزوں پر چڑھے دیکھے تھے۔ مجھے قدیم ایران کے عظیم شہنشاہ دارا کا انجام یاد آنے لگا جس کو اس کے وفادار محافظوں نے ہی محل سے فرار ہونے کے بعد جنگل میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

ایکا ایکی مجھے ایک نئی آواز سنائی دی۔ میرے خیالات اور تصورات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ یہ آواز کچھ عجیب سی تھی، جیسے کسی نے کانسی کے کٹورے پر چمچ مارا ہو۔ میں آنکھیں کھول کر ہمہ تن گوش ہو گیا۔ یہ آواز کہاں سے آئی تھی؟ پھر مجھے سرگوشیوں میں باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ان میں عورتوں کی آوازیں بھی تھیں اور مردوں کی آوازیں بھی تھیں۔ وہ جنوبی ہند کی کسی زبان میں باتیں کر رہے تھے مگر ان کی آوازیں اتنی مدھم اور سرگوشیوں میں تھیں کہ اس حقیقت کے باوجود کہ میں دنیا کی ہر زبان سمجھ سکتا ہوں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پہلے میرا اندازہ تھا کہ بدروحیں میرے بالکل قریب غیبی حالت میں بیٹھی ہیں اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہی ہیں مگر پھر احساس ہوا کہ یہ آوازیں کچھ فاصلے پرے سے آ رہی ہیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اندھیرے کمرے میں اس طرف بڑھا جس طرف سے میرے خیال کے مطابق کچھ پراسرار عورتوں اور مردوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرے سامنے پتھریلی زمین آ گئی۔ میں نے دیوار کے ساتھ کان لگا دیا۔ آواز اس دیوار کے عقب سے آ رہی تھی۔ میں نے دیوار کے پتھروں کو ہاتھ سے ٹٹولنا شروع کیا کہ شاید وہاں کوئی خفیہ دروازہ ہو مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اب ایک عجیب بات ہوئی کہ میں نے جوں ہی دیوار سے کان ہٹایا آوازیں میرے عقب سے آنے لگیں۔

اس کے بعد سارا اندھیرا کمرہ ان آوازوں سے بھر گیا۔ میں نے سوچا کہ اس بک بک جھک جھک سے بچنا ہی چاہئے۔ خوامخواہ کسی مشکل یا الجھن میں نہ پھنس جاؤں۔ میں نے جھکے ہوئے دروازے کی طرف قدم بڑھایا تو جیسے میرے آگے ایک دیوار سی آ گئی جو مجھے نظر تو نہیں آتی تھی مگر فولاد سے بھی زیادہ مضبوط تھی۔ میں نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی جیسے وہ فولاد کی غیبی دیوار میرے آگے سے ہٹ گئی۔ میں دروازے کی طرف بڑھا - باہر نکلنے لگا تو وہاں بھی فولاد کی دیوار میرے سامنے حائل ہو گئی۔ میں کچھ گھبرا سا گیا۔ کیا یہ سب کچھ میرے ساتھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہا تھا؟ مگر ان بدروحوں کو مجھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ کمرے میں یکایک گھنگروؤں کی جھنکار اور رقص کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ جیسے کچھ غیبی دیوداسیاں رقص کر رہی ہوں.... نسوانی اور مردانہ قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں..... یہ رقص کرتی دیوداسیاں یا بدروحیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ یہ رقص دیر تک جاری رہا۔ اس رقص کے بیچ ایک نسوانی آواز نے کوئی عجیب و غریب گیت بھی تھوڑی دیر کے لئے گایا۔ اس کی لے لمبی اور آواز بے حد درد انگیز تھی۔ اس میں بین کرنے کا تاثر زیادہ تھا۔ اس گانے کے ساتھ رقص کی تال بھی مدھم ہو گئی تھی۔ میں خاموش دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھا یہ سارا نظر نہ آنے والا پراسرار کھیل سن

رہا تھا۔

یہ رقص و سرود اور نسوانی آوازوں کے نقرئی قہقہے پچھلے پہر تک جاری رہے۔ دروازے کے سوراخ میں سے دن کی روشنی اندر آنے لگی تو یہ آوازیں بھی غائب ہو گئیں۔ میرے لئے یہ ایک عجیب تجربہ تھا۔ نہ مجھے رات کو کوئی خوف محسوس ہوا اور نہ میں پریشان ہی ہوا تھا۔ میں نے ویسے ہی اس بک بک سے دور ہو جانے کی کوشش کی تھی مگر میرے راستے میں کوئی طلسمی دیوار حائل ہو گئی۔ ابھی تک میں یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ اس طلسمی دیوار نے مجھے کس لئے روکا تھا؟ ظاہر ہے یہ حرکت ان بدروحوں نے کی تھی مگر اس سے ان کا مقصد کیا تھا؟ بہرحال صبح ہو چکی تھی۔ اب مجھے ان معاملات میں زیادہ دلچسپی لینے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں اٹھ کر سوراخ میں سے نکل کر باہر جانے لگا تو اچانک میری نظر دروازے کی ایک جانب پتھر کے قریب پڑے کانسی کے ایک چھوٹے سے بت پر پڑی۔ یہ پھن اٹھائے ہوئے سانپ کا بت تھا۔ یہ بت چھوٹا سا تھا۔ میں اسے اٹھا کر باہر دن کی روشنی میں لے آیا۔ سانپ کی آنکھوں کی جگہ سیاہ پتھر کے دو ننھے سے نقطے لگے ہوئے تھے جو روشنی میں چمک رہے تھے۔ یہ چھوٹا سا کانسی کا سانپ پھن اٹھائے ایک گول ٹھلیا پر بیٹھا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ سانپ کے بت کا جسم بہت ہی خفیف طور پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد آہستہ سے دھڑکتا ہے۔ یہ وقفہ دو چار ثانئے کا تھا اور مجھے باقاعدہ اس کے کانسی کے جسم کی دھیمی سی دھمک اپنے ہاتھ پر محسوس ہو رہی تھی۔ اس بت پر ضرور کسی بدروح کا سایہ تھا یا اس پر کسی نے جادو ٹونہ کیا ہوا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے سانپ کے بت کو ایک درخت کے تنے کے پاس رکھ دیا۔ جس کی شاخوں میں سے ابھی تک بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ میں چلنے لگا تو ایک نظر سانپ کے بت پر ڈالی۔ میں وہیں ٹھٹک سا گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے سانپ نے اپنا پھن ذرا سا گھما کر میری طرف دیکھا تھا۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھا اور ویران مندر کی سیڑھیاں اترنے لگا۔

آسمان ابھی تک ابر آلود تھا۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ سیڑھیوں کے بڑے بڑے پتھروں کے کناروں پر اگی ہوئی گھاس رات کی موسلا دھار بارش کے بعد گیلی ہو رہی تھی۔ میرا پاؤں پتھر پر جمی ایک کائی پر سے پھسلا تو میں نے ایک جھاڑی کو پکڑ لیا۔ اس جھاڑی میں کانٹے تھے۔ ہاتھ ڈالنے سے دو لمبے کانٹے میری ہتھیلی پر لگے تو مجھے درد محسوس ہوا۔ میں وہیں پتھر کی طرح سن ہو کر رہ گیا۔ پانچ ہزار سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے کسی کانٹے کے چبھنے سے درد محسوس ہوا تھا۔ میں نے گھبرا کر اپنی ہتھیلی کو دیکھا۔ میری ہتھیلی میں جہاں دو کانٹے لگے تھے' وہاں سے سرخ سرخ خون رس رہا تھا۔ اب تو میری سٹی گم ہو گئی۔ میں پانچ ہزار

برسوں میں پہلی بار اپنے جسم سے رستا ہوا خون دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔ میری زندگی کی سب سے بڑی تبدیلی تھی تو کیا میں پھر سے فانی انسان بن گیا ہوں؟ کیا اب میں موت کی دسترس میں ہوں؟ میں شدید گھبراہٹ میں وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اپنی ہتھیلی میں سے رستے ہوئے خون کو غور سے دیکھنے لگا۔ کانٹے کا زخم ابھی تک درد کر رہا تھا۔ میں نے ہتھیلی کا خون اپنی قمیض کے پلو سے پونچھا اور سیڑھیوں کے اوپر ویران مندر پر نگاہ ڈالی۔

دن کی ابر آلود روشنی میں مندر ایک آسیبی کھنڈر کی طرح خاموش اور ساکت کھڑا تھا۔ خوف سے میرا دل دھڑکنے لگا تھا۔ اگر میں پھر سے وہی فانی انسان بن چکا ہوں جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے مصر کے دارالحکومت سے اپنے بیوی بچوں کے بوڑھا ہو جانے کے بعد لافانی ہو کر تاریخ کے دھارے پر بہہ نکلا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میرے جسم کو ایک دم سے بوڑھا ہو کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر سڑ گل جانا چاہئے تھا۔ میرے جسم پر تو ہزاروں سال کے بڑھاپے کا اثر تھا۔ مجھے تو ایک سیکنڈ کے اندر اندر مٹی بن جانا چاہئے تھا مگر ایسا نہیں ہوا تھا لیکن پھر ہتھیلی سے رستا ہوا خون اور درد کا احساس اس حقیقت کا واضح ثبوت تھا کہ میں اب وہ پہلے کا غیر فانی انسان نہیں رہا جس پر چاقو' بھالے' تیر' تلوار کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا' جو مر نہیں سکتا تھا اور جس میں بے پناہ غیبی طاقت تھی۔ اب اگر مجھے تیر لگے گا تو خون بہے گا۔ تلوار کا وار کیا جائے گا تو میرا جسم کٹ جائے گا اور میں مر جاؤں گا۔ یہ ایک پریشان کر دینے والی تبدیلی تھی جو گزشتہ پانچ ہزار برسوں میں پہلی بار میرے جسم سے نمودار ہوئی تھی۔ میں نے جھاڑی میں سے ایک کانٹا توڑ کر اپنی انگلی پر چبھویا۔ مجھے درد ہوا۔ میں ایک گہری حیرت انگیز سوچ میں ڈوب گیا۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا تھا؟ کیا یہ اس آسیب کا اثر تھا؟ کیا یہ سانپ کے بت کا اثر تھا جس نے مجھے اپنے حلقہ طلسم میں لے کر میرے جسم کو ایک بار پھر فانی بنا دیا تھا؟

اب اس پر غور کرنا اور مزید سوچنا بے کار تھا۔ میرے ساتھ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ میں ایک عام انسان بن چکا تھا جو مر سکتا تھا۔ اس اعتبار سے وقت کی گرفت بھی مجھ پر مضبوط ہو گئی تھی اور میں وقت گزرنے کے ساتھ بوڑھا ہو کر مر سکتا تھا۔ یہ سنسنی خیز انقلاب میری موت کا باعث بن گیا تھا اور میں اس طلسم سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر رکھا تھا کہ اگر مروں گا تو پانچ ہزار برس پہلے کی طرف دوسری بار سفر کرتے ہوئے اپنی بیوی سارا کی قبر پر جا کر مروں گا۔ مگر میرا یہ منصوبہ تہس نہس ہو گیا تھا۔ میں بڑی شدت سے چاہتا تھا کہ اس طلسم سے نکل جاؤں اور ایک مرتبہ پھر لافانی انسان بن کر تاریخ کے ایوانوں میں واپسی کا سفر کرتا ہوا قدیم فرعونوں کے مصر میں اپنی

بیوی کی قبر پر پہنچوں، جہاں سے میں پانچ ہزار سال پہلے اپنے صدیوں کے سفر پر روانہ ہوا تھا۔

میرے جسم میں اس ہلاکت خیز تبدیلی کا باعث سانپ کا وہ چھوٹا سا مجسمہ ہی ہو سکتا تھا جس کو میں نے تھوڑی دیر کے لئے ہاتھ میں تھاما تھا اور جس کے جسم کی دھیمی دھیمی گرمی اور دھمک میں نے صاف طور پر محسوس کی تھی۔ میں زینہ چڑھ کر اوپر کے پہلو والے درخت کے پاس آ گیا۔ جہاں میں نے تھوڑی دیر پہلے پھن دار سانپ کے بت کو رکھا تھا، یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ سانپ کا بت وہاں نہیں تھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ درخت کی شاخوں پر نگاہ ڈالی۔ سانپ کا مجسمہ کہیں بھی نہیں تھا۔ مجھے مزید تعجب ہوا کہ سانپ کا مجسمہ کہاں غائب ہو گیا؟

میں درخت کے پاس کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ مندر میں سے وہی گھنگروں کی آواز سنائی دی۔ اس بار گھنگروں کے ساتھ ڈھولک کی ہلکی ہلکی تھاپ کی آواز بھی آ رہی تھی۔ میں مندر میں داخل ہو گیا۔ جس اندھیرے ویران کمرے میں میں نے رات گزاری تھی، وہ اسی طرح ویران اور تاریک تھا مگر فضا میں پراسرار گھنگریوں اور ڈھولک کی تھاپ کی دھیمی دھیمی آواز گونج رہی تھی۔ میں مشرقی دیوار کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ گھنگریوں کی آواز اس دیوار کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ خوف سے میرا دل دھڑک اٹھا۔ مجھے کونے میں دیوار پر پڑا ہوا ایک لمبا بھاری پردہ نظر آیا جو رات کو وہاں نہیں تھا۔ گھنگرو کی آواز اس پردے کے پیچھے سے بلند ہو رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے پردے کو ایک طرف کھسکا دیا۔

کیا دیکھتا ہوں دیوار پر مشعل روشن ہے نیچی چھت والی تنگ کوٹھری کے فرش کے وسط میں کالے ناگ کا ایک مجسمہ بنا ہوا ہے اور اس کے گرد ایک عورت جس نے قدیم آریائی مندروں کی دیوداسیوں کا نیم لباس پہن رکھا ہے رقص کر رہی ہے۔ اس کے جسم کا رنگ گہرا جامنی تھا۔ گردن میں ایک سانپ پھن اٹھائے جھول رہا تھا۔ فانی انسان ہونے کے ساتھ ہی میرے اندر تمام انسانی کمزوریاں اور خوف دوبارہ پیدا ہو گئے تھے۔ میں اس منظر کو دیکھ کر ششدر سا ہو کر رہ گیا۔ یہ ضرور کوئی بدروح تھی۔ میں وہاں سے بھاگنے لگا تو مجھے محسوس ہوا میرے پاؤں من من کے ہو گئے ہیں اور میں اپنی جگہ سے کوشش کے باوجود ایک قدم بھی نہ چل سکتا۔ اس وقت پراسرار آبنوسی رقاصہ نے اپنا رقص روک کر میری طرف پلکیں اٹھا کر دیکھا۔ مشعل کی روشنی میں اس کی کیسری رنگ کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اس کی گردن میں جھولتا ہوا سانپ دھیمی دھیمی پھنکاریں مار رہا تھا۔ میں بت بنا ساکت کھڑا اس آبنوسی رقاصہ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی سانپ کی سسکار ایسی بلند ہوئی، اس

نے قدیم دراوڑی زبان میں کہا۔

"عاطون! تم میری مرضی کے خلاف نہیں جا سکتے۔"

میں نے محسوس کیا کہ اجنبی زبانوں کو سمجھنے کی صلاحیت ابھی تک میرے لاشعور میں پائی جاتی تھی۔ میں دہشت زدہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ گھنگروؤں کی جھنکار کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے قریب آئی۔ اس کے لباس سے لوبان کی بو آ رہی تھی۔ جو دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کے آگے پوجا کرتے سے جلایا جاتا ہے۔ اس کی گردن والا سانپ پھن اٹھائے میرے چہرے کی طرف بڑھا۔ رقاصہ نے اپنی آبنوسی انگلی اٹھا کر سانپ کو اشارہ کیا۔ سانپ دوبارہ اس کی گردن میں جھول گیا۔

پراسرار رقاصہ بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو اور میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہو۔ میرا نام وشکالی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میری دراوڑی مرہٹی زبان سمجھ رہے ہو۔ میں وشکالی ہوں۔ مجھے سانپ کا زہر پلا کر پالا گیا ہے۔"

میں نے اسی دراوڑی زبان میں پوچھا۔ "کیا میری غیبی طاقت تم نے اپنے طلسم سے سلب کی ہے؟"

رقاصہ وشکالی نے کہا۔ "ہاں، میں نے ہی تمہیں یہاں بلایا ہے۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

رقاصہ وشکالی نے اپنی کیسی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ اس کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش تھی جو مجھے اپنی جگہ پر ساکت کر رہی تھی۔ وہ بولی۔

"یہ تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ میرے ساتھ آؤ۔"

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ ایک کوٹھری کے اندھیرے کونے میں رک گئی۔ یہاں ایک اندھیرا زینہ زمین کے اندر جاتا تھا۔ زینے سے اترے تو ایک طرف سے روشنی آ رہی تھی۔ اس نے میری کلائی پکڑ رکھی تھی۔ وہ چھن چھن کی آواز کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ ہم ایک زمین دوز غار سے گزر رہے تھے جس میں ایک جگہ دیوار پر مشعل جل رہی تھی۔ آگے ایک کھلی جگہ آ گئی۔ یہاں دو مشعلیں روشن تھیں اور اس کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ ایک تخت بچھا ہے۔ اس پر ہرن کی کھال پڑی ہے اور ایک کالا بھجنگ ٹھگنے قد کا مکروہ صورت آدمی آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی سانپ کا کانسی کا بت تھا جس کی وجہ سے میں اس مصیبت میں گرفتار ہوا تھا۔ نہ میں اسے ہاتھ میں اٹھاتا اور نہ مجھ پر یہ آفت نازل ہوتی۔ رقاصہ وشکالی نے مجھے کھینچ کر آگے کر دیا اور بولی۔

"رگھودیو! مہاناگن سے کہو اپنا شراپ (بددعا) واپس لے۔ میں اس کا بلیدان لے آئی

ہوں۔"

مکروہ صورت رگھودیو نے اپنی کراہت آمیز زرد آنکھوں سے گھور کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ میں پکڑے کانسی کے بت کو ہوا میں اٹھا کر بولا۔

"مہاناگن! تیرا بلیدان پہنچ گیا۔ وشکالی کا شراپ واپس لے لو۔ بلیدان کی طاقت وشکالی کو عطا کر کے اسے امر کر دو۔"

رگھودیو نے اپنا سانپ کے بت والا ہاتھ فضا میں روک دیا۔ سانپ مورتی کی سیاہ آنکھوں میں سے روشنی کی کرنیں نکل کر جامنی رنگ کی رقاصہ وشکالی کے اوپر پڑیں اور اس کے ساتھ ہی وشکالی نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور دیوانہ وار رقص کرنے لگی۔ میں بت بنا رگھودیو کے سامنے خاموش کھڑا تھا۔ میری ٹانگوں میں اتنی طاقت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی کہ میں اپنی جگہ سے ہل سکتا۔ وشکالی رقص کرتے کرتے غار کی طرف بڑھنے لگی اور پھر غار کے نیم اندھیروں مین غائب ہو گئی۔ اس کے غائب ہوتے ہی مکروہ صورت رگھودیو نے میری طرف ایک بار پھر گھور کر دیکھا' اپنی جگہ سے اٹھا' تخت پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا چہرہ غار کی چھت کی طرف اٹھایا۔ اس کے حلق میں سے ایک لرزا دینے والی چیخ کی آواز نکلی۔ اس کے عقب میں ایک تنگ کھلا دروازہ تھا۔ چیخ کی آواز پر اس دروازے کی تاریکی میں سے کالے رنگ کی پتلی کیسری آنکھوں والی دو لڑکیاں برآمد ہوئیں۔ ان کی گردنوں میں وشکالی کی طرح سیاہ سانپ پڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی ایک ایک سانپ تھا۔ سانپوں والی لڑکیاں بگولے کی طرح رقص کرتی اندر داخل ہوئی تھیں۔ انہوں نے آتے ہی اپنے ہاتھوں والے سانپ میری طرف اچھال دیئے۔ میں ایک دم نیچے جھک گیا مگر دونوں سانپ ہوا میں ایک جھکولا کھا کر سیدھے میری گردن میں آ کر لپٹ گئے اور اپنے پھن اٹھا کر میری آنکھوں کے سامنے لہرانے لگے۔ دہشت سے میرا جسم سرد ہو گیا۔ اب مجھے اپنی جان کی بھی حفاظت کرنی تھی۔ کیوں کہ میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ میں ایک عام آدمی کی طرح سانپ کے کاٹے سے بھی مر سکتا ہوں۔

رگھودیو تخت سے نیچے اتر آیا۔ اس نے سانپ کی مورتی کو میرے سر کے گرد گھمایا اور تنگ دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میرے پاؤں میں اپنے آپ حرکت پیدا ہو گئی۔ جیسے کسی نے مجھے ہلکا سا دھکا دیا اور میں اس دروازے کی طرف بڑھا۔ جدھر سے ابھی ابھی سانپوں والی لڑکیاں نمودار ہوئی تھیں۔ یہ لڑکیاں میرے پیچھے پیچھے چلنے لگیں۔ سامنے والے تنگ دروازے میں پتھر کی تین سیڑھیاں اتر کر ایک عجیب و غریب غار آ گیا۔ اس کی پتھریلی چھت کافی اونچی تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دیوار کے ساتھ بنے ہوئے سیاہ ستونوں میں

شعلیں روشن تھیں۔ ان کی روشنی میں مجھے غار کی دیواروں پر دونوں طرف حیرت انگیز مورتیاں نظر آئیں۔ یہ مورتیاں اور بت دیوار کے پتھر کھود کر بنائی گئی تھیں۔ یہ مورتیاں مختلف مناظر کا حصہ تھیں۔ کہیں نیم پوشیدہ عورتیں سنگھار کر رہی تھیں۔ اب ایک لڑکی میرے آگے اور ایک میرے پیچھے ہو کر چل رہی تھی۔ میں ان کے درمیان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ فضا میں لوبان کی تیز بو رچی ہوئی تھی جس سے پانچ ہزار برسوں میں پہلی مرتبہ مجھے دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ مورتیوں اور بتوں سے آراستہ یہ غار ایک طرف گھوم گیا۔ آگے پھر سیڑھیاں آ گئیں۔ سیڑھیاں اتر کر اسی قسم کا ایک اور غار شروع ہو گیا۔ اس غار کی دیواروں پر بھی بت اور ان کے مختلف بھیانک منظر بنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہم تیسرے غار میں داخل ہو گئے۔ اس تیسرے غار کی چھت اونچی نہیں تھی۔

میں جیسے ایک ڈراؤنے خواب کے اندر سفر کر رہا تھا۔ سانپوں والی لڑکیاں مجھے اس تیسرے غار کے ایک خفیہ مقام پر لے گئیں۔ جہاں مجھے ایک گول دیواروں والی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ میری گردن سے سانپوں کو اتار لیا گیا تھا۔ میں جب اکیلا رہ گیا تو کوٹھری کا جائزہ لیا۔ ایک چراغ دیوار کے طاق میں جل رہا تھا۔ کوٹھری کی دیوار میں ایک جگہ چوکور سوراخ بنا تھا۔ اس کے اندر تنگ سی جگہ تھی جہاں مٹی کے برتن میں پانی رکھا تھا۔ یہ شاید منہ ہاتھ دھونے کے لئے تھا۔ میں نے غور سے جھک کر دیکھا۔ یہاں سے ایک نالی گندے پانی کے نکاس کے لئے باہر جاتی تھی۔ طلسم کی یہ ایک عجب دنیا تھی جس کے جال میں ایک بے بس مکھی کی طرح پھنس گیا تھا۔ مجھے مہاناگن کے بلیدان کے لئے یہاں رکھا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے مہاناگن نام کی دیوی کے بت کے آگے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ چونکہ میں اب مر سکتا تھا اس لئے یہ بات میرے لئے بے حد تشویش ناک تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ مجھے مہاناگن نام کی دیوی پر کب اور کس وقت قربان کیا جانا تھا۔

اس حقیقت کے باوجود کہ میں عارضی لافانیت کے مقام سے گر کر اس آسیبی مخلوق کے باعث فانی انسان بن چکا تھا اور موت میرے سر پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس بدروحوں کے جہنم سے فرار ہونے کے طریقوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ سیلابچے کی نالی اتنی چھوٹی تھی کہ میں اس میں سے گزر کر فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ باقی کوٹھریوں کی دیواریں بند تھیں۔ دروازہ کیسے کھلا اور کیسے بند ہو گیا۔ اس کی مجھے خبر نہیں تھی۔ خدا جانے اس تنگ گول کوٹھی میں کہاں سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ میں زمین کے اندر تیسری منزل پر تھا اور یہاں سے فرار ہونا کوئی سہل اور آسان کام نہیں تھا۔ پھر بھی میں ہر قیمت پر یہاں سے باہر نکلنے کا عہد کر چکا تھا۔ اب مجھے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ ہزاروں سال کے وقفے

کے بعد پہلا موقع تھا کہ مجھے باقاعدہ بھوک لگ رہی تھی۔ پیاس تو میں نے سیلابچے میں جا کر کٹورا پانی پی کر بجھالی مگر بھوک کا کوئی علاج دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ احساس نہیں تھا کہ کتنا وقت گذر گیا ہے اندازہ یہی تھا کہ دن کا پہلا پہر گذر چکا ہے۔ پانچ ہزار برس کے بعد مجھے بھوک لگی تھی۔ انتڑیوں میں اینٹھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں ایک بار پھر پانی پینے کی غرض سے دیوار کے سوراخ میں سے گزر کر سیلابچے میں گیا تو خیال آیا کہ نالی کا پتھر اکھیڑ کر میں اسے اگر چوڑا کر سکوں تو وہاں سے نکل کر کسی سمت فرار ہو سکتا ہوں۔ میں نے جھک کر نالی کے پتھر کو ہلانا چاہا مگر وہ پہاڑ کی طرح مضبوطی سے اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔ مجھے نالی کی دوسری طرف سے ہلکے ہلکے شور کی آواز سنائی دی - میں نے نالی کے ساتھ کان لگا دیئے۔ دوسری جانب سے ایسی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی جیسے نیچے کوئی تیز رفتار ندی پتھروں سے ٹکراتی بہہ رہی ہو۔ ضرور اس غار کی تہہ میں زمین کے اندر ہی اندر کوئی ندی بہہ رہی تھی۔ مگر میں اس ندی تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اگر میرے اندر کی طاقت زائل نہ ہو گئی ہوتی تو میں مضبوط سے مضبوط پتھر کو اکھاڑ کر ندی تک راستہ بنا سکتا تھا' لیکن اس وقت تو مجھ میں اور ایک انسان میں کوئی فرق نہیں تھا اور میرے لئے پتھر کو اپنی جگہ سے ہلانا محال تھا۔

میں واپس کوٹھری میں آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر گذری ہو گی کہ ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ دیوار میں ایک جگہ سے تنگ سا دروازہ نمودار ہوا اور ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھالی تھی۔ تھالی ایک جگہ زمین پر رکھتے ہوئے اس نے مجھے کہا کہ تھالی اٹھا کر لے جاؤں۔ وہ خود دروازے کے بیچ میں کھڑی تھی۔ میں اپنی جگہ سے آہستہ سے اٹھ کر تھالی کے قریب گیا اور اسے اٹھائے کن اکھیوں سے.... اس عورت کو دیکھا۔ گو کہ اس نے دیوداسیوں والا لباس پہنا ہوا تھا مگر اس کے گلے میں کوئی سانپ نہیں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے نقش دوسری سانپوں والی لڑکیوں کے خد و خال سے مختلف تھے۔ ان لڑکیوں کے ناک چپٹے اور نتھنے فراخ تھے مگر اس سیاہ فام عورت کی ناک تیکھی اور ذرا سی اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ اس کا تعلق کسی دوسرے قبیلے سے ہے۔ وہ مجھے سانپ جیسی ساکت نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے تھالی اٹھالی اور ان کی دراوڑی زبان میں شکریہ ادا کیا۔ میں جان بوجھ کر تھوڑا سا مسکرا دیا۔ اس عورت نے کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہ کیا اور دروازے میں سے الٹے پاؤں واپس چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی تنگ دروازے کی دیوار آپس میں ہلکی سی آواز کے ساتھ مل گئی۔

میں نے چراغ کی روشنی میں دیکھا۔ تھالی میں ابلے ہوئے نمکین چاول اور دو زرد رنگ

کے کیلے پڑے تھے۔ میں نے جلدی جلدی یہ سب کچھ چٹ کر لیا اور کونے میں بیٹھ کر اپنی رہائی کے بارے میں غور کرنے لگا۔ میرے ذہن میں اچانک ایک منصوبے کا خاکہ ابھر آیا تھا۔ اس منصوبے کی صرف ایک فیصد کامیابی کا امکان تھا مگر یہ منصوبہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ضرور تھا۔ میں نے خالی تھالی ایک طرف رکھ دی تھی اور سوچ رہا تھا کہ وہ سیاہ فام عورت پھر کب آئے گی؟ تنہا کوٹھری میں بیٹھے بیٹھے مجھے نیند آنے لگی - یہ اصلی اور فطری غنودگی تھی جس کا تجربہ مجھے ہزاروں برس کے بعد ہو رہا تھا۔ میں وہیں لیٹ کر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو خدا جانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ مجھے وقت یوں گزرتا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی زخمی سانپ زمین پر ہولے ہولے رینگ رہا ہو۔

کئی گھنٹے گزر گئے۔ مجھے پھر بھوک محسوس ہونے لگی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ باہر ضرور رات ہو گئی ہو گی۔ میں انتظار کرنے لگا کہ وہ عورت کب دوبارہ میرے لئے ابلے ہوئے چاول اور کیلے لے کر آتی ہے۔ چونکہ مجھے مہاناگن نام کی کسی دیوی پر قربان کیا جانے والا تھا۔ اس لئے یہ پراسرار مخلوق مجھے بھوکا نہیں رکھ سکتی تھی۔ دیوار میں ہلکی سی آواز کے ساتھ دروازہ ایک بار پھر کھلا اور وہی عورت تھالی میں کھانا لے کر آ گئی۔ اس نے تھالی دروازے کے پاس ہی زمین پر رکھ دی اور مجھے اسے اٹھا لے جانے کا کہا۔ میں نے دراوڑی زبان میں اس کا شکریہ ادا کیا..... اور پوچھا کہ مجھے مہاناگن پر کب قربان کیا جا رہا ہے؟ اس کے جواب میں اس کی کیسری رنگ کی آنکھیں تھوڑی سی پھیل گئیں مگر اس نے زبان سے کچھ نہ کہا اور پہلے والی خالی تھالی اٹھا کر واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ کھانے میں کیلے کی بجائے شکرقندی تھی اور چاول کی جگہ ابلی ہوئی مچھلی تھی۔ کھاتے کھاتے مجھے خیال آیا کہ اس سیاہ فام عورت کے چہرے پر ایک خاص قسم کی اداسی چھائی تھی۔ اس اداسی کی ایک گہری اور خاص لہر کو اس کی کیسری آنکھوں کے کناروں پر ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ میں نے چہرہ شناسی کے اپنے طویل ترین تجربے کی بناء پر یہ نتیجہ نکالا تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ اس عورت سے ہمدردی کا اظہار کیا جائے۔ مگر میں کس بنیاد پر اس سے ہمدردی کا اظہار کر سکتا تھا؟ یہ بات تو صاف تھی کہ یہ عورت اس قبیلے کی چپٹی ناکوں والی عورتوں میں سے نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے اس کو بھی اس خونی مخلوق نے قید کر رکھا ہو۔

چنانچہ دوسرے روز جب وہ سیاہ فام عورت میرے لئے کھانے کی تھالی لے کر آئی تو میں نے اسے جان بوجھ کر بہن کہہ کر مخاطب کیا۔ کیوں کہ میں جانتا تھا کہ قدیم دراوڑی زبان میں بہن کا لفظ بہت اہم سمجھا جاتا تھا اور اگر کوئی غیر آدمی کسی عورت کو بہن کہہ کر مخاطب کرتا تو اس کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ میں نے دراوڑی زبان میں اس سے پوچھا۔

"بہن! میں اس عذاب میں کب تک پڑا رہوں گا۔ مجھے مہاناگن دیوی پر کب قربان کیا جائے گا؟"

میری زبان سے بہن کا لفظ سن کر سیاہ فام عورت نے میری طرف قدرے چونک کر دیکھا اور خاموشی سے کھانا رکھ کر اور خالی تھالی اٹھا کر واپس چلی گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اس رات پہلی بار دروازے میں سے میری نظر باہر غار میں گئی تو میں نے دیکھا کہ دو قدموں کے فاصلے پر دو ٹھگنے قد کے مضبوط جسموں والے آبنسی انسان ہاتھوں میں سانپوں کی گردنوں کو پکڑے خاموش کھڑے تھے۔ وہ میری یا شاید اس عورت کی نگرانی کے لئے ساتھ آتے تھے۔

تیسرے دن پھر میں نے سیاہ فام عورت سے بات شروع کر دی۔ اس بار میں نے اسے پھر بہن کہہ کر مخاطب کیا اور اپنی آواز میں درد پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"میری بہن! مجھے تو اب تھوڑے دنوں میں مرجانا ہے مگر تم کیوں اداس اداس ہو؟"

اب اس نے پہلی بار اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کیسری آنکھوں سے اپنے پیچھے اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا۔ اس کے پیچھے غار میں جو دو دراوڑی راکھشش ہاتھوں میں زہریلے سانپ لئے کھڑے تھے، وہ ان سے محتاط رہنا چاہتی تھی۔ مجھے اس کی اس حرکت سے کافی حوصلہ ہوا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ان محافظوں کی موجودگی میں مجھ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ وہ ان لوگوں کے دباؤ میں تھی۔

رات کو وہ کھانا لے کر آئی تو اس نے اندر آتے ہی دیوار میں کسی جگہ کوئی خفیہ کل دبائی دروازہ بند ہو گیا۔ اس سے ظاہر تھا کہ آج سانپوں والے کالے بھتنے اس کے ساتھ نہیں آئے تھے۔ اس نے روز کی طرح تھالی زمین پر رکھ دی اور میری طرف شعلہ بار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے دراوڑی زبان میں مجھے کوسنا اور برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ وہ بار بار مجھے ظالم اور منحوس آدمی کہہ کر پکار رہی تھی۔ اس کی باتوں سے یہ انکشاف ہوا کہ میرے ساتھ اس کی چھوٹی بیٹی کو بھی جس کی عمر سات برس ہے مہاناگن دیوی پر قربان کیا جا رہا تھا۔ اس لئے وہ اداس اداس تھی۔ وہ شدید غصے میں پھنکارتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"تم اس طرف کیوں آ گئے۔ تمہاری وجہ سے میری بیٹی کی جان جا رہی ہے۔ میں اپنی بیٹی سے محروم ہو رہی ہوں۔ تم نے مجھے اپنی بہن کہا ہے مگر تم کیسے سنگدل بھائی ہو کہ اپنی بہن کی گود اجاڑنے آ گئے ہو۔"

میں نے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"بہن! اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں تو یہاں سے دور دریا کے کنارے اپنے لشکر کے ساتھ سفر کر رہا تھا کہ اچانک دشمن نے حملہ کر دیا اور میں دریا میں گر پڑا اور پھر خدا

جانے کہاں سے ایک طوفان سا اٹھا اور دریا کی لہریں مجھے بہا کر اس ویران مندر کے کنارے لے آیا۔"

میں نے اسے ساری کہانی بیان کر دی اور پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں اور یہ بدروحیں ہیں یا طلسم زدہ پراسرار ہستیاں - وہ کہنے لگی۔

"میں یہ کچھ نہیں بتا سکتی۔ میں تمہیں کوس کر تمہیں برا بھلا کہہ کر اپنے دل کا غبار نکالنا چاہتی تھی۔ میری بیٹی اور تمہاری زندگی میں صرف سات روز باقی رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد نہ تم زندہ رہو گے اور نہ میری بیٹی۔"

اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا یہ نادر موقع تھا۔ میں نے جھٹ اسے ایک بار پھر بہن کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بہن! اگر تم میرا ساتھ دو تو میں تمہاری اکلوتی بیٹی کو یہاں سے نکال لے جانے کے لئے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔"

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ "تم ایک کمزور انسان بن چکے ہو۔ ہمیں یہاں سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ تمہاری طاقت زائل ہو چکی ہے۔ تم کچھ نہیں کر سکتے۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "بہن! اگرچہ میں مر سکتا ہوں مگر میرا حوصلہ بلند ہے۔ مجھے یقین ہے اگر مجھے فرار ہونے کا کوئی موقع مل جائے تو میں تمہاری بیٹی کو بھی یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔"

اس نے ایک لمحے کے لئے میرے چہرے پر اپنی کیسری آنکھیں گاڑ دیں۔ میں نے یہ جملہ کچھ ایسے اعتماد اور عزم کے ساتھ کہا تھا کہ اس پر اس کا اثر ہو گیا تھا۔ میں نے مزید سوچنے کا موقع نہ دیتے ہوئے فوراً کہا۔

"میں پانچ ہزار سال سے زندہ چلا آ رہا ہوں۔ ٹھیک ہے، میں پھر سے ایک عام کمزور آدمی کے روپ میں آ گیا ہوں لیکن یاد رکھو مجھے مارنا اتنا آسان نہیں ہے۔ میں ایک نڈر اور بہادر آدمی ہوں۔ تم مجھے آزما کر تو دیکھو۔ آخر یہ میرا نہیں تمہاری اکلوتی بیٹی کی زندگی کا بھی سوال ہے اور پھر تمہارا اس فیصلے سے کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔"

"یہ تمہیں کس نے بتایا؟" وہ پلٹ کر بولی۔

"تمہاری صورت بتا رہی ہے۔ میں پانچ ہزار سال سے آریاؤں کو جانتا ہوں۔ میں تمہارے قدیم ترین آباؤ اجداد سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ زندگی گذار چکا ہوں۔ تمہارا تعلق دراوڑی نسل کے اس قبیلے سے ہے جن میں آریاؤں کا خون شامل ہے۔"

وہ خاموشی سے میری باتیں سن رہی تھی۔ جب میں نے ایک بار پھر اس سے مدد کے لئے کہا تو وہ بولی۔

"یہاں سے فرار ناممکن ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی دروازہ بند ہو گیا وہ مجھ سے کسی قسم کی مدد کا وعدہ کئے بغیر چلی گئی تھی مگر میرا دل مطمئن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے یہاں سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور بتا دے گی۔ میں اس سیاہ فام نیم دراوڑی نیم آریائی ماں کے دل میں یہ خیال جاگزین کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ اس کی اکلوتی بیٹی کی زندگی بچ سکتی ہے۔ میں اگلے دن کا انتظار کرنے لگا۔

اگلے روز وہ میرے لئے کھانا لے کر آئی تو اس کے ساتھ محافظ نہیں تھے۔ خدا جانے وہ کس طریقے پر عمل کرتے ہوئے ان محافظوں سے پیچھا چھڑا لیتی تھی۔ اس نے اندر آتے ہی پہلے روز کی طرح دروازہ بند کر دیا اور بولی۔

"تم نے مجھے اپنی بہن کہا ہے تو سنو! میرا اس قبیلے سے تعلق نہیں ہے۔ ہمارا قبیلہ یہاں سے دور ایک جھیل کے کنارے پہاڑیوں میں آباد ہے۔ ہمارے قبیلے کے لوگ موروں کی نسل سے ہیں اور یہ لوگ سانپوں کی نسل سے ہیں اور سانپوں کے زہر پر پلے بڑھے ہیں۔ اگر یہ کسی کو کاٹ لیں تو وہ اسی وقت مر جاتا ہے۔ ان لوگوں میں یہ بات نسل در نسل چلی آ رہی ہے کہ اگر کبھی یہ موروں کے قبیلے کی کسی سات برس کی لڑکی کو کسی ایسے آدمی کے ساتھ دیوی مہاناگن کے آگے قربان کر دیں جو ہزاروں برس سے زندہ چلا آ رہا ہو تو یہ لوگ بھی امر ہو جائیں گے اور ان میں کسی کو موت نہیں آئے گی۔ کوئی بوڑھا نہیں ہو گا۔ رگھو دیو اصل میں کوئی بدروح نہیں ہے۔ وہ سانپوں کے اس پراسرار قبیلے کا سردار ہے اور بہت بڑا جادوگر ہے۔ اسے جادو کے زور سے تمہارے بارے میں پتہ چل گیا تھا کہ تم جمنا دریا کی لہروں میں بہہ رہے ہو۔ اس نے سانپ کی مورتی کے ذریعے تم پر طلسم کر دیا۔ اور تم بے ہوشی کے عالم میں دریا میں بہتے رگھو دیو کے پرانے مندر کے کنارے پر آ گئے۔ پھر انہوں نے ہمارے قبیلے میں سے میری سات سال کی بچی کو جادو کے زور سے اغوا کر لیا مگر میں ماں تھی۔ میں رگھو دیو کے قدموں پر گر پڑی اور کہا کہ تم بے شک میری بیٹی کو دیوی مہاناگن پر قربان کر ڈالو مگر اسے میری آنکھوں سے اوجھل نہ کرو۔ وہ جب تک، جتنے دن بھی زندہ رہے گی۔ میں اس کے سامنے رہنا چاہتی ہوں۔ رگھودیو مجھے بھی ساتھ ہی اٹھا کر لے آیا۔ اس نے مجھے اپنی بیوی بنا لیا اور اب وہ تمہیں اور میری بیٹی کو مہاناگن کے آگے قربان کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔"

میں اس کی زبانی یہ کہانی سن کر حیران رہ گیا کہ ہندوستان میں اتنے زبردست جادوگر بھی موجود ہیں۔ میں نے اس سے وشکالی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وشکالی کو مہاناگن نے اس کی ایک غلطی کی وجہ سے شراپ دیا تھا کہ وہ اگلے جنم میں چوہیا کے روپ میں جنم لے گی۔ وشکالی نے کہا کہ اگر میں کسی ایسے انسان کو یہاں لانے میں کامیاب ہو جاؤں جو ہزاروں برس سے زندہ ہو تو کیا دیوی اپنا شراپ واپس لے لے گی؟"

وشکالی کی شرط منظور کر لی گئی۔ مجھ پر قبضہ کر کے ان..... منحوس غاروں میں لانے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ میرا انسانی ارادہ تھا.....ان غاروں تک پہنچانے کے لئے ضروری تھا کہ میں سانپ کی مورتی کو ایک بار اپنے ہاتھ میں پکڑوں اور اس کے لئے میرے ارادے کو قابو کرنا ضروری تھا۔ رگھودیو ایک جادوگر ہونے کے باوجود اس صلاحیت سے محروم تھا۔ چنانچہ وشکالی نے یہاں اپنی خدمات پیش کیں اور وہ..... سانپ کی مورتی کو اس بارش والی طوفانی رات میں مندر کی کوٹھری میں پھینک کر خود چھپ گئی اور اپنی قوت ارادی کی شعاعوں سے میرے ذہن میں اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میرے سامنے تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہاری بیٹی کو لے کر یہاں سے کیسے نکل سکتا ہوں؟ کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ جس سے میری کھوئی طاقت واپس مل جائے؟"

اس نے کہا۔ "تمہارے بارے میں یہ ساری باتیں اپنے خاوند رگھودیو سے معلوم ہوئی ہیں جس سے مجھے نفرت ہے مگر میں محض اپنی بچی..... کی وجہ سے اس کی ہر بات مان لیتی ہوں۔"

"کیا تم اس سے معلوم نہیں کر سکتیں کہ میری کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟"

میرے اس سوال پر وہ بولی۔ "رگھودیو ایک مکروہ اور عیار بھتنا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں ایک دشمن قبیلے کی عورت ہوں۔ اس لئے وہ مجھے کبھی راز کی کوئی بات نہیں بتاتا۔"

وہ کچھ سوچ کر بولی۔ "میں اس بوڑھی عورت سے باتوں ہی باتوں میں یہ راز معلوم کرنے کی کوشش کر سکتی ہوں لیکن تمہاری اور میری بیٹی کی موت میں صرف دو دن باقی رہ گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تم آج اس بوڑھی عورت سے بات کر کے دیکھو۔ ہو سکتا ہے اس سے تمہیں کوئی قیمتی معلومات حاصل ہو جائیں۔"

"اچھا اب میں جاتی ہوں۔ میں کل آؤں گی۔" یہ کہہ کر جانے لگی تو میں نے کہا۔
"کیا میں اس کھلے دروازے سے نکل کر فرار نہیں ہو سکتا؟"
وہ بولی۔ "اس دروازے کے باہر قدم قدم پر موت کا پہرہ لگا ہے۔ اس طرح یہاں سے فرار کی کوشش کا نتیجہ ایک المناک موت کے سوا کچھ نہ نکلے گا۔ میں کل آؤں گی۔"
وہ چلی گئی۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے ایک کٹھن ترین مرحلہ درپیش تھا۔ مسئلہ کوئی بھی ہو میرے لئے کبھی کٹھن نہیں رہا تھا۔ مگر میں اتنا کمزور پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اب مجھے قدم قدم پر اپنی جان کی فکر لگی تھی۔ پانچ ہزار برس تک موت کے خوف سے آزاد رہنے کے بعد اچانک اس کا خوف مجھ پر سوار ہو گیا تھا۔ یہ ایک قدرتی امر تھا۔ یہ خیال مجھے الگ پریشان کر رہا تھا کہ کہیں میں کسی کاری زخم کے لگتے ہی اچانک ہڈیوں اور مٹی کا ڈھیر نہ بن جاؤں۔ یعنی پانچ ہزار سال کی قدامت اور کہولت ایکاایکی مجھ پر طاری نہ ہو جائے۔ اور میرے خاکی جسم کے اجزائے ترکیبی آناً فاناً خاک میں نہ مل جائیں۔ اس کے باوجود اس جہنم سے خود بھی نکلنے اور سیاہ فام دراوڑی عورت کی اکلوتی بیٹی کو بھی وہاں سے نکال لے جانے کا عزم میرے دل میں بیدار ہو چکا تھا۔ مہاناگن کے بت کے آگے مجھے قربان کرنے میں.... دو دن باقی رہ گئے تھے۔ میرے پاس زیادہ غور و فکر کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں بے چینی سے سیاہ فام عورت کا انتظار کرنے لگا۔

دوسرے روز سیاہ فام عورت میرے لئے کھانا لے کر آئی تو اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے تھے۔ کہنے لگی کہ میں نے بوڑھی عورت سے بڑے طریقے سے معلوم کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ رگھودیو کے سانپ منتر کا جادو مجھ پر چل چکا ہے اور میری کھوئی ہوئی طاقت اب کبھی واپس نہیں آ سکتی۔ مجھے بہت مایوسی ہوئی لیکن آخر میں جوان تھا اور میں اپنے آپ کو بلیدان کی الم انگیز موت سے ہر قیمت پر بچانا چاہتا تھا۔ سیاہ فام عورت کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کہنے لگی۔
"میں اپنی اکلوتی بیٹی کو مہاناگن دیوی کے ظلم سے نہیں بچا سکتی۔ تم نے میرے دل میں ایک امید سی پیدا کر دی تھی۔ اب مجھے اپنی بچی کی موت کا زیادہ قلق ہو گا۔"
میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے ساتھ جو دو سانپوں والے محافظ آیا کرتے تھے' وہ کہاں ہیں؟ سیاہ فام عورت نے بتایا کہ اس نے ان دونوں کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ آئیں گے ضرور مگر کافی پیچھے رہیں گے...... اس وقت بھی وہ غار میں کچھ فاصلے پر کھڑے ہیں۔
میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا اس غار میں کوئی خفیہ دروازہ بھی ہے جو یہاں سے باہر

جاتا ہو؟"
سیاہ فام عورت کی زبانی معلوم ہوا کہ اس غار کے نیچے ایک چوتھی تہہ بھی ہے جہاں ان دیوداسیوں کو مرنے کے لئے بند کر دیا جاتا ہے جو بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسا تہہ خانہ ہے جو پہاڑی کے نیچے زمین کی گہرائیوں میں ایک سرنگ کی طرح دریا کے پار تک چلا گیا ہے مگر اس طرف آج تک کسی کو جانے کی ہمت نہیں ہوئی کیوں کہ یہ بات مشہور ہے کہ جہاں یہ سرنگ دریا کی تہہ کے نیچے تک جاتی ہے وہاں نیلے اور سرخ رنگ کے ایسے سانپ رہتے ہیں جو انسان کو ڈسنے کے بعد اس کا گوشت کھا جاتے ہیں۔ میں نے سیاہ فام عورت سے سوال کیا کہ کیا وہ مجھے اس زیر زمین سرنگ تک جانے کا راستہ بتا سکتی ہے۔ اس نے بتایا کہ زیر زمین ڈیوڑھی دیوداسیوں کی سرنگ تک جانے کا ایک ہی راستہ ہے جو دیوی مہاناگن کے بت کے عقب سے جاتا ہے .... ایک سوال بہت اہم تھا۔ میں نے سیاہ فام عورت سے یہ سوال پوچھا تو کہنے لگی۔
"ہمارے سیاہ جسموں سے جو تمہیں لوبان کی بو آتی ہے وہ اصل میں کالے سانپوں کی چربی کی بو ہے۔ ہمارے جسموں پر اس چربی کی روزانہ مالش کی جاتی ہے۔ اس بو کی وجہ سے یہاں کا کوئی بھی سانپ ہمیں کاٹ نہیں سکتا۔"
میں نے سیاہ فام عورت سے کہا کہ وہ پہلا کام یہ کرے کہ مجھے تھوڑی سی چربی لا کر دے۔ طے یہ ہوا کہ سیاہ فام عورت جس مقام پر مہاناگن کا بت ہے وہاں تک میری رہ نمائی کرے گی۔ اسی بت کی ایک عقبی کوٹھری میں اس کی بیٹی کو میرے ساتھ دیوی پر قربان کرنے کے لئے قید میں رکھا ہوا تھا۔ وہاں سے مجھے اس بچی کو بھی نکال کر اس کی ماں کے ساتھ ہی فرار ہونا تھا۔ یہ کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہیں تھا۔ کوئی باقاعدہ فرار کی کوئی اسکیم نہیں تھی۔ اس سکیم پر میں نے اس لئے عمل کرنے کا فیصلہ کیا تھا کہ کوئی دوسری سکیم ہی نہیں تھی اور میری موت میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا۔
ٹھیک آدھی رات کے بعد میری کوٹھری کا دروازہ کھلا اور سیاہ فام عورت اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں کیلے کے پتوں میں لپٹی ہوئی سانپ کی چربی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک تیز دھار خنجر بھی میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے جلدی جلدی اپنے جسم پر کالے سانپ کی چربی ملی اور سیاہ فام عورت سے خنجر لے کر اپنے لمبے کرتے میں چھپا لیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔
"مجھے اس فرار میں بھی ہم تینوں کی موت نظر آتی ہے۔"
میں نے جواب میں کہا کہ اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ میرے آگے آگے

چلو۔ میں نے خنجر اپنے ہاتھ میں اس طرح پکڑ لیا کہ وہ دکھائی نہ دے اور سیاہ فام عورت کے پیچھے پیچھے چلتا کوٹھری سے باہر آ گیا۔ غار میں کوئی مشعل نہیں جل رہی تھی سیاہ فام عورت نے میری کوٹھری کے آس پاس کی دونوں مشعلیں بجھا دی تھیں۔ ہم غار کی دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ مہاناگن کا بت غار کی اسی تیسری منزل کے آخری کونے میں پہاڑی کھود کر بنائی ہوئی ایک کشادہ کوٹھری میں ایستادہ تھا۔ غار کے کونے تک ہمیں کسی نے نہ دیکھا۔ ہم جب غار کا موڑ گھومنے لگے تو اچانک ایک دراوڑی پہرے دار آ گیا۔ اس نے میری شکل دیکھتے ہی مجھ پر اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا زہریلا سانپ پھینکا۔ اس اثناء میں میں نے اچھل کر اس کی گردن دبوچ لی تھی۔ میرے جسم سے آنے والی چربی کی بو کی وجہ سے سانپ نے مجھے بھی کچھ نہ کہا۔ دراوڑی بھتنا چلانے کی کوشش کرنے لگا تو سیاہ فام عورت نے قریب ہی پڑا ہوا پتھر مار کر اس کے سر کو دو ٹکڑے کر دیا۔ لاش کو ایک طرف دیوار کے ساتھ پھینک کر ہم تیزی سے غار کے موڑ پر گھوم گئے۔ سیاہ فام عورت آگے آگے تھی۔

دائیں جانب روشنی نظر آئی۔ سیاہ فام عورت نے میرے کان کے قریب منہ لا کر کہا۔

"یہ مہاناگن کا استھان ہے۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

دیوار کے پتھروں میں صرف اتنی جگہ تھی کہ ایک انسان اس میں سے گزر سکتا تھا۔ اس دراڑ میں سے مشعل کی روشنی غار میں آ رہی تھی۔ سیاہ فام عورت نے مجھے وہیں رکنے کو کہا اور خود اندر چلی گئی۔ میں دیوار کی اوٹ سے اسے تکنے لگا۔ یہ سیاہ فام عورت اگرچہ رگھودیو کے قبیلے سے تعلق نہیں رکھتی تھی مگر دیوی کے استھان کے پجاریوں کو اس نے کسی وجہ سے اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ مہاناگن کے بت کے پاس گئی۔ دیوی کے بت کے آگے جا کر ماتھا ٹیکا اور وہاں جو دراوڑی بھتنے پہرہ دے رہے تھے، ان سے باتیں کرنے لگی۔ پھر وہ دونوں پہرے دار ایک طرف چلے گئے۔ سیاہ فام عورت چند لمحے وہیں دیوی کے بت کے آگے جھکی کھڑی رہی۔ پھر ادھر ادھر دیکھا اور لپک کر میری طرف آ گئی۔

"آ جاؤ۔ کوئی بات مت کرنا۔"

میں اس کے پیچھے دیوی کے استھان میں داخل ہو گیا۔ یہاں عجیب قسم کی ناقابل برداشت بو پھیلی ہوئی تھی۔ میری رہنما سیاہ فام عورت تیز تیز چلتی دیوی کے بت کے پیچھے آ گئی۔ یہاں ایک تنگ و تاریک راستہ نیچے جاتا تھا۔ آگے ایک کوٹھری تھی۔ جس کے دروازے پر تالا پڑا تھا۔ میں نے پتھر کی ضرب سے تالا توڑ دیا۔ کوٹھری میں چراغ جل رہا تھا۔

اس کی دھیمی روشنی میں میں نے سات برس کی لڑکی کو دیکھا کہ اسے رسی سے باندھا ہوا تھا۔ سیاہ فام عورت جاتے ہی اس سے لپٹ گئی اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی زبان میں کہا کہ وہ آواز نہ نکالے۔"

ہم نے بچی کی رسی کھول دی اور اسے ساتھ لے کر کوٹھری سے نکل کر آگے کو دوڑ پڑے۔ یہ ایک تنگ راستہ تھا۔ لڑکی دوڑتے ہوئے کئی بار گر پڑی۔ سیاہ فام عورت ہمارے آگے آگے تھی۔ اس نے اپنی بچی کو اپنے کاندھے پر بٹھا لیا۔ اس میں ایک حیرت انگیز طاقت آ گئی تھی۔ یہ تنگ راستہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ آخر ہم ایک کھلی جگہ میں آ گئے۔ سیاہ فام عورت نے وہاں رک کر کہا۔

"یہاں سے بوڑھی دیوداسیوں کی سرنگ شروع ہوتی ہے مگر یہ عورتیں بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے نیم مردہ ہو چکی ہیں۔ وہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گی۔"

کھلی جگہ میں تھوڑی دور چلے ہوں گے کہ ہم ایک کشادہ سرنگ میں داخل ہو گئے۔ یہاں کہیں کہیں چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ جن کی دھندلی روشنی میں مجھے دیوار کے ساتھ ہڈیوں کے ڈھانچے نظر آئے۔ کہیں کہیں سے کراہنے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ سیاہ فام عورت نے بتایا کہ یہ بوڑھی دیوداسیاں ہیں جنہیں مرنے کے لئے یہاں چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہاں اس قدر ناگوار بو تھی کہ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ ہم جلدی جلدی اس سرنگ میں سے نکل گئے۔ آگے سرنگ بائیں طرف مڑ کر ڈھلان میں اتر گئی تھی۔ یہاں ایک جگہ درختوں کی سوکھی شاخوں کے ڈھیر نے سرنگ کے راستے کو بند کر رکھا تھا۔

"اس کے آگے وہ غار ہے جہاں نیلے زہریلے سانپ رہتے ہیں۔ ان سانپوں کو اس طرح سے پال کر یہاں چھوڑ دیا گیا ہے کہ یہ چربی کی بو کو نہیں پہچان سکتے۔ یہ ہمیں ڈس سکتے ہیں۔"

یہ ایک خطرناک مرحلہ تھا۔ میرے ذہن میں ان سانپوں سے بچنے کے لئے ایک ترکیب آ گئی۔ میں نے سوکھی شاخوں کو توڑ کر ایک مشعل بنائی۔ اسے آگ لگا کر اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور ہم راستہ بنا کر سانپوں کے غار میں داخل ہو گئے۔ شاخوں کا گٹھا جل رہا تھا۔ اس میں سے شعلے نکل رہے تھے۔ میں آگ کو چاروں طرف گھما رہا تھا۔ میں نے نیلے رنگ کے سانپوں کو بھاگ کر بلوں میں گھستے دیکھا۔ کئی سانپ آگ کی زد میں آ کر جل گئے۔ اسی طرح راستے بناتے اور سانپوں کو مارتے ہم نے وہ خطرناک ترین موت کی سرنگ عبور کر لی۔

مجھے پانی بہنے کی آواز سنائی دی۔ سیاہ فام عورت نے بتایا کہ آگے ایک ندی ہے جو پہاڑی کے بیچ گہرائی میں بہتی دریا کے دوسرے کنارے پر نکل جاتی ہے۔ یہی وہ ندی تھی

جس کی آواز پہلی بار میں نے اپنی کال کوٹھری کے سیلا بچے میں سنی تھی۔ عورت نے مجھے بتایا کہ ہم دریا کے نیچے سے گذر آئے ہیں۔ یہاں زمین پر کیچڑ ہی کیچڑ تھا اور دیواروں اور چھت میں سے پانی کے قطرے بارش کی موٹی موٹی بوندوں کی طرح ٹپک رہے تھے۔ بچی سہمی ہوئی ہونے کی وجہ سے کوئی آواز نہیں نکال رہی تھی۔ شاخوں کی مشعل کا شعلہ چھت سے ٹپکتے پانی کی وجہ سے بجھ چکا تھا۔

ہم اندھیرے میں ہی دلدلی سرنگ میں سے گزرتے ہوئے زمین کے نیچے ہی نیچے بہنے والی ایک ندی پر آ گئے۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے اس کا پانی ہمیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ پانی کی رفتار تیز تھی۔ میں خدا کا نام لے کر کنارے کو تھام کر ندی میں اتر گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں پانی زیادہ گہرا نہ ہو۔ ندی کا پانی میری کمر تک پہنچ رہا تھا مگر پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ سے وہاں کھڑا رہنا مشکل محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے سیاہ فام عورت کی سہمی ہوئی بچی کو اپنے کاندھے پر بٹھا لیا اور سہارا دے کر اس کی ماں کو بھی ندی میں اتار لیا۔ ندی کا بہاؤ ہمیں لے کر چل پڑا۔ ہمارے سر ندی کے اوپر بنی ہوئی پہاڑی کی چھت سے لگ رہے تھے۔ ہم نے اپنے سر جھکا لئے تھے۔ بچی میری گردن کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔

اچانک ہمیں اپنے پیچھے شور سنائی دیا۔ سیاہ فام عورت نے گھبرا کر کہا۔

"وہ لوگ آ گئے ہیں۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے خیال کے مطابق ندی کتنی لمبی ہو گی؟ سیاہ فام عورت اپنے پیچھے سے آنے والی آوازوں کی وجہ سے بہت پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔

"وہ.....وہ میری بچی کو مار ڈالیں گے۔"

میں نے اپنے بازوؤں کو چپوؤں کی طرح پانی میں چلانا شروع کر دیا۔ اس سے میری رفتار کچھ تیز ہو گئی۔ سیاہ فام عورت نے بھی ایسا ہی کیا۔ ندی گھوم گئی۔ پھر پانی کا شور زیادہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی غار میں تازہ ہوا کا احساس ہوا۔ عورت بری طرح پانی میں ہاتھ چلا رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ آگے کوئی آبشار ہے۔ وہ احتیاط سے کام لے۔ ہمارے پیچھے آنے والی انسانی آوازیں کچھ مدہم ہو رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمارا تعاقب کرنے والے پیچھے رہ گئے تھے۔ ندی کے پانی کا بہاؤ بے حد تیز ہو گیا تھا اور ہم اس میں طوفانی رفتار سے بہے جا رہے تھے۔

پھر غار کے آگے ایک گول سوراخ میں سے رات کی دھندلی نیلی روشنی کا مینار دکھائی دیا۔ میں نے سیاہ فام عورت کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے کہا کہ آگے کوئی دریا ہے۔ خبردار

رہنا۔ اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور اپنی بچی کو بھی ایک ہاتھ سے تھام لیا۔ اب میں ان دونوں کی گرفت میں تھا اور پانی کی تیز لہروں پر گیلی لکڑی کی طرح تیزی سے بہا جا رہا تھا۔

پوری رفتار سے ہم تینوں قلابازی کھاتے ہوئے آبشار سے نیچے گر پڑے۔ آبشار کوئی بیس فٹ کی بلندی سے ایک جھیل نما ندی میں گرتی تھی۔ جھیل نما ندی میں گرتے ہی ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔

میں نے سیاہ فام عورت کو سنبھالا۔ اس نے چلا کر کہا۔ میری بچی کو پکڑو۔ میں نے دیکھا کہ بچی دو چار گز آگے غوطے کھا رہی تھی۔ میں تیر کر اس کے پاس گیا اور اس کا منہ پانی سے باہر نکال لیا۔ بچی پر غشی کی حالت طاری تھی۔ ہم بڑی مشکل سے تیر کر اس جھیل نما ندی سے باہر نکل آئے۔ ہم نے بچی کو کنارے کی گھاس پر لٹا دیا۔ سیاہ فام عورت بھی بے دم سی ہو کر اوندھے منہ گر پڑی۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ پھر اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں اپنی بچی کے بارے میں پوچھا۔ اس کی بچی زندہ تھی۔

ستاروں کی پھیکی دھندلی روشنی میں اوپر پہاڑی کی ڈھلان پر ایک جگہ سے ندی کا پانی آبشار کی طرح جھیل میں گرتا نظر آ رہا تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں ہمارے دشمن آسیبی بھتنے ہمارا تعاقب کرتے یہاں بھی نہ آ جائیں۔ بچی کی حالت سنبھل گئی تھی۔ سیاہ فام عورت اسے اپنے ساتھ لپٹا کر چومنے لگی۔ میں نے کہا۔

"یہاں سے جتنی جلدی ممکن ہو سکے نکل چلو۔"

باقی ساری رات ہم دشوار گزار گھنے پہاڑی جنگلوں میں سے گزرتے رہے۔ جب دن کی روشنی ہوئی تو ہم ایک پہاڑی عبور کر کے ایک پرفضا وادی میں پہنچ چکے تھے۔ سامنے نشیب میں مجھے کیلے کے درختوں کے جھنڈوں میں کتنے ہی جھونپڑے دکھائی دیئے۔ سیاہ فام عورت نے خوش ہو کر اپنی بچی کا منہ چوم لیا اور ان جھونپڑوں کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"یہ .....یہ ہمارا قبیلہ ہے۔"

سیاہ فام عورت اور اس کی بچی کے واپس پہنچنے پر اس کے قبیلے کے لوگوں نے بڑی خوشی منائی۔ دو دن میں نے وہاں آرام کیا۔ ان لوگوں سے مجھے صرف اتنی معلومات ہی حاصل ہو سکی کہ یہ بدھیل کھنڈ کا جنوبی علاقہ ہے اور یہاں چند نام کا ایک راٹھور راجہ حکمرانی کرتا ہے اور ہمارے پیچھے نربدا کا دریا واقع ہے۔ کچھ روز اس قبیلے میں رہنے کے بعد میں تازہ دم ہو چکا تھا۔ میں نے اب ان سے اجازت طلب کی۔ سیاہ فام عورت اور اس کی بچی ہاتھ باندھ کر میرے آگے جھک گئیں۔ میں نے بھی ان کا.... شکریہ ادا کیا اور اجازت لے کر

دریائے نربدا کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں ان پہاڑیوں کے مخالف سمت شمال مغرب کی طرف چل رہا جہاں منحوس رگھو دیو کی حکمرانی تھی جو میرے خون کا پیاسا تھا۔ دریائے نربدا کے کنارے تک چھوڑنے، قبیلے کا ایک جنگلی آدمی میرے ساتھ آیا۔ یہاں ایک پرانی وضع کا گھاٹ تھا جہاں ایک کشتی جس میں بانس، ناریل اور کیلے لدے ہوئے تھے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر جانے کے لئے تیار تھی۔ میں نے اپنے محافظ کو رخصت کر دیا اور کشتی میں بیٹھ کر دریا پار کر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔

یہاں بانس اور ناریل کے ایک آڑھتی سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہاں سے گوالیار کا شہر پچاس کوس کے فاصلے پر ہے۔ وہ چھکڑے پر ناریل اور کچے کیلے لے کر گوالیار کی جانب جانے والا تھا۔ میرے پاس کوئی اشرفی تو کیا پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ میرا لباس بھی جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا۔ میں نے اس آڑھتی کو بتایا کہ مجھے ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا تھا۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔ اس نے ہمدردی کے طور پر مجھے اپنی گٹھڑی میں سے ایک دھوتی اور کرتہ نکال کر پہننے کو دیا اور اپنے چھکڑے پر بیٹھ کر گوالیار تک سفر کرنے کی اجازت بھی دے دی - پچاس کوس کا فاصلہ ہم نے دو دنوں میں طے کیا۔ تیسرے روز دن کی روشنی میں دور سے گوالیار شہر کی فصیل نظر آنے لگی تو میری جان میں جان آئی۔ فصیل کے چار بڑے بڑے دروازوں کے اندر بندھیا چل کی پہاڑیوں کے دامن میں یہ شہر آباد تھا۔ اس شہر پر چندل خاندان کے راجہ چندل دیر کی حکمرانی تھی۔ خلجی فوجوں نے ابھی اس شہر کا رخ نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ دہلی میں امراء اور شاہی خاندان کی باہمی سازشیں اور چپقلش تھی۔ جس کا حال میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

گوالیار شہر کے بازار کشادہ مگر گلیاں تنگ و تاریک اور اونچی نیچی تھیں۔ اس شہر کا راجہ چندل دیر ایک کٹر برہمن راجہ تھا جو بھگوان شو کا پجاری تھا۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق بھگوان شو تخریب کی علامت ہے۔ وہ بڑا متعصب تھا اور دوسرے مذہب کے لوگوں پر بڑی سختی کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے گوالیار شہر میں مسلمانوں کے جو چند ایک گھرانے تھے وہ نقل وطن کر کے دہلی کی طرف کوچ کر چکے تھے۔ میں جس آڑھتی کے ساتھ گوالیار میں آیا تھا۔ اس نے مجھے اپنی حویلی میں ہی ٹھہرا لیا - میں نے اس پر یہی ظاہر کیا تھا کہ میں ہندو برہمن ہوں۔ میرا مقصد وہاں سے کسی قافلے کے ساتھ شامل ہو کر دہلی کی طرف کوچ کرنا تھا۔ میرے پاس سفر خرچ بالکل نہیں تھا۔ میرا ارادہ شہر میں محنت مزدوری کر کے کچھ پیسے کمانا چاہتا تھا۔ اس وقت مجھے اپنا پرانا سانپ دوست قنطور بہت یاد آ رہا تھا۔ اس کا دیا ہوا سانپ کا قیمتی مہرہ بھی مجھ سے ضائع ہو چکا تھا۔ اگر میرا ناگ دوست قنطور میرے ساتھ ہوتا تو

مجھے اتنی مصیبتیں نہ اٹھانی پڑتیں اور وہ گوالیار کے کھنڈروں میں جا کر اپنے مطیع سانپ کی مدد سے زمین میں دفن شدہ خزانے کی کچھ دولت بھی بڑی آسانی سے حاصل کر سکتا تھا۔

اب تو میں اپنی طاقت ہی کھو چکا تھا۔ ایک اعتبار سے میں بے بسی اور لاچاری کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ جب میرے ہندو آڑھتی میزبان کو پتہ چلا کہ میں دہلی جانا چاہتا ہوں تو اس نے بڑی فراخ دلی سے مجھے سفر خرچ دینے کی پیش کش کی اور میں نے بھی بڑی فراخدلی سے اسے قبول کر لیا۔ مجھے دہلی سے کسی قافلے کی آمد کا انتظار تھا۔ ہندو آڑھتی کا نام شیواپاند تھا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کا کٹر برہمن ہندو تھا۔ جس کی ایک ہی بیٹی سوئیکارنی نام کی تھی۔ ان ہی دنوں اسے ایک ایسا مرض لاحق ہو گیا کہ وہ بستر کے ساتھ لگ گئی۔ میں جنگل میں جا کر اس کے لئے جڑی بوٹیاں اکٹھی کر کے لایا۔ اس کا علاج کیا اور وہ پھر سے صحت مند ہو گئی۔ لڑکی کا باپ شیواپاند مجھ سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے مجھے کہا کہ میں اس کی بیٹی سوئیکارنی سے شادی کر لوں۔ سوئیکارنی اگرچہ بہت خوبصورت برہمن زادی تھی مگر میں کوئی ایسی دوسری مخلوق تھا اور اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میرے دل کو پکا یقین تھا کہ ایک نہ ایک روز میری کھوئی ہوئی غیر فانی طاقت مجھے ضرور واپس مل جائے گی اور اس لحاظ سے میرا کسی فانی مخلوق کے ساتھ شادی کرنا مناسب نہیں تھا۔ ویسے بھی میں ایک خانہ بدوش تھا۔ تاریخ کے ناقابل عبور صحراؤں کا مسافر تھا۔ میں کسی لڑکی سے شادی رچا کر اس کی زندگی فراق کے لق و دق.... ریگزاروں کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے یہ کہہ کر شیواپاندیا کو ٹال دیا کہ میرے اپنے ہی خاندان کی ایک لڑکی سے منگنی ہو چکی ہے۔ اسے میری بات کا یقین آ گیا۔ اتفاق سے سوئیکارنی کے لئے گوالیار شہر کے ایک برہمن پنڈت کے بیٹے کا رشتہ آ گیا۔ میں ابھی پاندیا کی حویلی میں سے دہلی سے آنے والے قافلے کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ سوئیکارنی کی پنڈت کے بیٹے سے شادی ہو گئی۔ میں زیادہ وقت شہر اور شہر سے باہر جنگل اور کھیتوں میں گزارا کرتا۔ کیوں کہ گھر میں رہتے ہوئے مجھے خدشہ تھا کہ کہیں برہمن پاندیا پر میرا اصل مذہب ظاہر نہ ہو جائے۔ اس میں کوئی خطرناک بات نہیں تھی لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے میزبان کے جذبات کو ٹھیس پہنچے جب کہ وہ مجھے اپنی لڑکی کا رشتہ بھی پیش کر چکا تھا۔ سوئیکارنی کے بیاہ کو بمشکل چار پانچ روز ہی گذرے ہوں گے کہ ایک دن شام کو حویلی میں لوٹا تو وہاں کہرام مچا ہوا تھا۔

سوئیکارنی کا خاوند مر گیا تھا۔ وہ اپنی نئی بیاہتا دلہن کو لے کر اپنے سسرال کی جانب آ رہا تھا کہ کسی دشمن نے پیچھے سے خنجر گھونپ کر اس کا کام تمام کر دیا۔ چار پانچ روز کی بیاہی دلہن بیوہ ہو گئی لیکن اس وقت میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ جب میں نے سنا کہ

نوجوان بیوہ کو اپنے مردہ شوہر کے ساتھ ہی چتا پر جلانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس زما
میں ستی کی رسم عام تھی اور خاص طور پر برہمن عورتیں اپنے مردہ شوہروں کا سر گود میں ر
کر جل کر راکھ ہو جاتی تھیں۔ عام طور پر کٹر مذہبی ہندو بیوہ عورتیں خوشی خوشی آگ یں
جل جاتی تھیں۔ کیوں کہ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ اگلے جنم میں اپنے شوہر کی بیوی بن کر ظا
ہوں گی لیکن قدیم ہندوستان میں رہتے ہوئے ایسے واقعات بھی میری نظر سے گزرے ہ
کہ بعض ہندو بیوہ عورتیں چتا پر جلنا نہیں چاہتی تھیں مگر برہمن اور رشتے داروں نے انہی
زبردستی آگ کے شعلوں میں دھکیل دیا۔

شیوا پانڈیا کی لڑکی چونکہ برہمن زادی تھی۔ اس لئے مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے مر
والے شوہر کے ساتھ خوشی خوشی ستی ہو جائے گی لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ جب میں اس کے
پاس تعزیت کے لئے گیا تو میں نے دیکھا کہ ابھی اس کے سرخ و سپید نازک ہاتھوں پر مہند
کا رنگ بھی پھیکا نہیں پڑا تھا۔ وہ سفید چادر میں لپٹی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے سیاہ بال
کھلے تھے۔ مانگ کا سیندور بکھر چکا تھا۔ ماتھے کی بندیا مٹا دی گئی تھی اور کلائیوں کی چوڑیا
بھی توڑ دی گئی تھیں۔ اس کے قریب ہی کچھ ہندو رشتہ دار عورتیں بیٹھی اشلوک پڑھ رہ
تھیں۔ میں سوئیکارنی کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اس کے خاوند کی موت پر افسوس کا اظہا
کرنے لگا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنسوؤں سے بھری آنکھیں
اٹھا کر میری طرف دیکھا اور اس کی پلکوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس کے چہرے پ
غم سے زیادہ خوف و دہشت تھی۔ اس کے خاوند کی لاش دوسرے کمرے میں پڑی تھی۔ او
برہمن پنڈت، اور پجاری اس کو نہلانے کے بعد اس پر خوشبوئیں مل رہے تھے۔ اشلوک
پڑھنے والی عورتیں ایک مٹی کا گول برتن اٹھا کر لے آئیں جس میں لوبان اور عود سلگ رہے
تھے اور درمیان میں شوجی مہاراج کی مورتی رکھی تھی۔ عورتوں نے بیوہ سوئیکارنی کے سر
کے گرد اس برتن کو سات بار پھرایا اور اس کے خاوند کی لاش والے کمرے میں چلی گئیں۔

جونہی کمرہ خالی ہوا برہمن لڑکی سوئیکارنی نے میرا بازو زور سے پکڑ لیا اور دہشت سے
سہمی ہوئی خشک آواز میں کہا۔

"مجھے بچا لو۔ میں چتا پر جل کر مرنا نہیں چاہتی۔ بھگوان کے لئے ہری لعل مجھے بچا
لو۔"

میں نے اپنا نام وہاں ہری لعل بتایا تھا۔ یہ سن کر میں کانپ سا اٹھا۔ کیوں کہ میں جانتا
تھا کہ وہ عورت ستی ہونے سے نہ بچ سکے گی اور اسے ہر قیمت پر پنڈت اور اس کے رشتے
دار آگ میں جھونک دیں گے۔

میرے دل میں اس کے لئے شدید ہمدردی پیدا ہو گئی اور میں نے اسے ہر قیمت پر
اس مذموم رسم کی بھینٹ چڑھنے سے بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "فکر نہ
کرو میں تمہیں یہاں سے نکال لوں گا۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے تکنے لگی۔ جیسے اب اسے خیال آ رہا تھا کہ میں اسے اس
جہنم سے کیسے نکال سکوں گا۔ اشلوک پڑھتی عورتیں وہی مٹی کا برتن لئے پھر اندر آ گئیں اور
اسے زمین پر رکھ کر منتروں کا جاپ کرنے لگیں۔ میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا آیا اور
سوئیکارنی کے باپ کے پاس جا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ وہ رو رہا تھا۔ میں اسے صبر کی تلقین کرنے
لگا لیکن میرا دماغ بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا کہ سوئیکارنی کو اس حویلی سے کیسے نکالا جا سکتا
ہے۔ یہ حویلی شہر کے کونے پر ایک گلی کے شروع میں واقع تھی اور اس کی ڈیوڑھی میں
گھوڑے بندھے رہتے تھے۔

اگرچہ اصولی طور پر مرنے والے کا کریا کرم اس کے ماں باپ کے گھر میں ہونا چاہئے تھا
مگر یہ کسی خاص گوت کے برہمن تھے جن کے ہاں اگر بڑی اولاد کی شادی کے بعد لڑکا
شوراتری سے پہلے پہلے فوت ہو جائے تو کریا کرم لڑکی کے گھر والے کرتے ہیں تاکہ منحوس
لڑکی کا سایہ بھی اب اپنے سسرال کے گھر پر نہ پڑنے پائے۔ یہی وجہ تھی کہ کریا کرم کی
ساری رسومات سوئیکارنی کے باپ کے گھر میں ادا ہو رہی تھیں۔ مرنے والے کے رشتے دار
بھی جمع تھے اور ماتم ہو رہا تھا۔ ہندو عورتیں ٹولیاں بنا کر بیٹھی تھیں اور اونچی آواز میں بین
کر رہی تھیں۔ رات کا اندھیرا ہوتے ہی بیوہ سوئیکارنی کو کمرے میں لے جا کر چتا پر ستی
ہونے کے لئے تیار کیا جانے لگا۔ اس کو زعفرانی ساڑھی پہنائی گئی۔ بالوں میں کافور لگایا گیا۔
سات ناریل اس کے آگے توڑے گئے اور اس کے خاوند کی لاش کے گرد سات پھیرے
لگوائے گئے۔ اس سارے وقت میں سوئیکارنی کا نازک جسم موت کے خوف سے بید مجنوں کی
طرح لرزتا رہا۔

شہر کے باہر شمشان بھومی میں چتا تیار ہو چکی تھی۔ وقت گذر رہا تھا۔ ایک بے گناہ
لڑکی کو آگ میں جلانے کی ساری تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں۔ بدنصیب برہمن لڑکی
نے اپنی زندگی کی امید صرف اس وعدے سے باندھ رکھی تھی۔ میں نے اس کی زندگی بچانے
کا اس سے وعدہ کیا تھا اور اب مجھے اپنی جان پر کھیل کر بھی اس کی زندگی کو بچانا تھا۔

یہ میں پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ دہلی سے جو قافلہ چلا ہے وہ دس روز بعد گوالیار کی
سرائے میں اترے گا اور پھر وہیں سے ایک تازہ دم قافلہ چھکڑوں، گھوڑوں اور اونٹوں پر
سامان اور مسافر لاد کر چار روز بعد دہلی کی طرف روانہ ہو گا۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ میں

سوئیکارنی کو گوالیار سے کالنجر کی طرف نکل جاؤں گا۔ اور وہاں سے کسی قافلے میں شریک ہو کر دہلی کی طرف کوچ کروں۔ رات کے بارہ بجے تک بے چاری سوئیکارنی کو دو بار غش آیا۔ رشتے دار یہی کہتے کہ بے چاری کو اپنے پتی کی موت کا کتنا دکھ ہے۔ بار بار غش کھا رہی ہے۔ حالانکہ سوئیکارنی کو چتا میں جل کر راکھ ہونے کے خوف سے غش آ رہا تھا۔ سبھی رشتے دار سوئیکارنی کو منحوس ڈائن بھی کہہ رہے تھے کہ اس نے بیاہ کے پانچ روز بعد ہی اپنے خاوند کو کھا لیا۔ چنانچہ کوئی بھی عورت زیادہ دیر اس کے پاس نہیں بیٹھتی تھی۔ یہ بات میرے حق میں بہت زیادہ فائدہ مند ثابت ہوئی۔

میں نے دو تین بار اندر جا کر دیکھا اور اس بات کا پتہ چلا لیا کہ جس کمرے میں سوئیکارنی کو چتا میں ستی ہونے کے لئے تیار کر کے بٹھایا گیا تھا اس کے پیچھے ایک تنگ کوٹھری تھی جس کی ایک کھڑکی پیچھے عقبی گلی کی طرف کھلتی تھی۔ اس لڑکی کو موت کے منہ سے نکالنے کا یہی ایک راستہ تھا۔ میں نے رات کے دوسرے پہر میں ہی بہانے سے ڈیوڑھی میں سے دو تازہ دم گھوڑے نکال کر لے گیا تھا اور انہیں گلی سے دور ایک جگہ کھائی کے پاس درختوں میں باندھ دیا تھا۔ میں شوجی مہاراج کی مقدس مورتی میں ڈوبا ہوا تسلا بہانے سے لے کر اس کمرے میں آ گیا جہاں سوئیکارنی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بھگوان کے لئے...."

میں نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ پوری کانپ رہی تھی۔ پھر میں نے اسے ساری اسکیم بتا دی۔ اس نے بتایا کہ پچھلی کوٹھری کی کھڑکی پر تالا لگا ہے۔ میں نے تسلا اس کے سامنے رکھا اور لپک کر پچھلی کوٹھری میں آ گیا۔ کھڑکی پر واقع تالا پڑا تھا۔ میں نے ڈھونڈھ کر لوہے کی ایک سلاخ تلاش کر لی اور اسے کنڈے میں ڈال کر زور سے اپنی طرف کھینچا تو تالا کنڈی سمیت اکھڑ گیا۔ میں نے باہر آ کر سوئیکارنی سے کہا۔

"یہاں سے نکل چلو۔ جلدی کرو۔"

وہ بدنصیب تو چتا کے شعلوں سے بچنے کے لئے قلعے کی دیوار سے بھی کودنے کو تیار تھی۔ میرا یہ جملہ سن کر اس کے جسم میں ایک نئی طاقت آ گئی تھی۔ وہ تیزی سے میرے ساتھ کوٹھری میں آ گئی۔ نیچے گلی میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ پہلے میں کھڑکی میں سے نکلا۔ نیچے دیوار کی ابھری ہوئی کارنس پر پاؤں رکھا اور پھر نیچے لٹک کر گلی میں کود گیا۔ میرے بعد سوئیکارنی کھڑکی سے نکل آئی۔ میں نے اس کے کودتے ہی اسے نیچے سنبھال لیا اور اسے ساتھ لے کر گلی میں سے نکل کر ان درختوں کی طرف دوڑا' جہاں گھوڑے ہمارے انتظار میں

کھڑے تھے ہم اندھیرے میں ہی دوڑتے درختوں کے جھنڈ میں پہنچے۔ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور انہیں تیز دوڑاتے شہر کے مشرقی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ شہر کے باقی دروازے بند تھے مگر مشرقی دروازہ شمشان بھومی کی طرف جانے والی ارتھی کے لئے کھلا رکھا گیا تھا۔ سوئیکارنی نے اپنے آپ کو زعفرانی ساڑھی میں لپیٹ رکھا تھا جس کا رنگ رات کے اندھیرے میں سیاہ نظر آتا تھا۔

شہر کا یہ دروازہ اگرچہ کھلا تھا مگر وہاں راجہ کے سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ انہوں نے دروازے میں ہمیں روک لیا اور پوچھا کہ ہم کون ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ میں نے سوئیکارنی کو سب کچھ پہلے ہی سمجھا دیا تھا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

"بھیا جی مر گئے ہیں۔ شمشان بھومی جا رہی ہوں..... ننددئی کے ساتھ۔"

میں نے پہرے دار کو بتایا کہ جس کی ارتھی پچھلے پہر شمشان جائے گی یہ اس کی بہن ہے اور ضروری رسمیں پوری کرنے شمشان بھومی جا رہی ہے۔ پہرے دار نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔ شہر کے دروازے سے باہر نکلتے ہی میں نے سوئیکارنی سے کہا کہ وہ جم کر گھوڑے پر بیٹھے اور گھوڑے کی باگیں ڈھیلی کر کے چھوڑ دے۔ اس بے چاری کو نئی زندگی ملی تھی۔ اس کا حوصلہ بلند ہو گیا تھا۔ اس نے گھوڑے کی باگیں ڈھیلی چھوڑ کر ایڑ لگا دی۔ میں نے اپنا گھوڑا آگے کر لیا۔ ہمارے گھوڑے اندھیری رات میں کالنجر کی طرف جانے والی کچی سڑک پر ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔

کالنجر کی جانب سے پایہ تخت اگرچہ بہت دور تھا لیکن یہ راستہ محفوظ تھا۔ اس لئے کہ اس قسم کی تشویش ناک خبریں مجھے گوالیار میں ہی ملنے لگی تھیں کہ جلال الدین خلجی کے قتل کے بعد علاء الدین خلجی دہلی کے تخت پر قابض ہو گیا ہے اور نہ صرف یہ کہ اس نے اپنے بھائی الغ خان اور بھائی نصرت خان کی سرکردگی میں ایک لشکر گجرات فتح کرنے کے لئے بھیج دیا ہے بلکہ اس نے ان تمام امیروں کو قتل کروا دیا ہے جو جلال الدین کے ساتھ آئے تھے اور جو افراد فرار ہو چکے ہیں ان کی تلاش میں ہے۔ میں بھی جلال الدین خلجی کے امراء میں سے تھا اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں جب کہ میری طاقت معطل ہو گئی تھی۔ اگر گرفتار ہو گیا تو قتل ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں کالنجر کی طرف سے ہو کر بندھیاچل کے جنگلوں میں سے گزرتا ہوا دہلی پہنچ کر وہاں سے مشرقی مگدھ کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔

برہمن لڑکی زنجیر کی طرح سے میرے پاؤں میں بندھی ہوئی تھی اور مجھے اس زنجیر کے ساتھ ہی یہ دشوار گزار سفر کرنا تھا۔ رات بھر ہم سفر کرتے رہے۔ صبح ہوئی تو جنگل میں ایک ندی کے کنارے قیام کیا۔ تازہ دم ہوئے۔ جنگلی پھلوں سے پیٹ کی آگ بجھائی اور ایک بار

پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے بعد دریائے چمبل کے کنارے ایک قصبے میں پہنچے تو وہاں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ لوگ خچروں' گدھوں اور چھکڑوں پر سامان لاد کر قصبے سے بھاگ رہے تھے۔ معلوم کرنے پر معلوم ہوا کہ علاء الدین خلجی کی فوجیں گجرات کو فتح کرنے کے لئے آگے بڑھتی چلی آ رہی ہیں اور راستے میں جو کوئی گاؤں یا قصبہ آتا ہے اسے لوٹ کر تاخت و تاراج کر دیا جاتا ہے۔

ہم قصبے کی ایک سرائے نما حویلی میں اترے ہوئے تھے۔ یہ حویلی بالکل خالی تھی اور سامان ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی یہاں نہا کر اپنا لباس تبدیل کیا - مجھے یہاں مردانہ اور سوئیکارنی کو زنانہ کپڑے مل گئے۔ رسوئی میں کھانے پینے کی چیزیں بھی موجود تھیں۔ گھوڑوں کے آگے اصطبل سے چارہ لا کر ڈالا اور سوچنے لگے کہ اب ہمیں کس طرف کا رخ کرنا چاہئے۔ کیوں کہ ہمارے پیچھے میری جان کے دشمن علاء الدین کی فوجیں چڑھی چلی آ رہی تھیں۔ آگے ایک طرف سوئیکارنی کے دشمن رشتے داروں کا شہر گوالیار تھا تو دوسری جانب ایک نہ ختم ہونے والا پہاڑی سلسلہ تھا۔ جو خطرناک حشرات الارض اور آدم خور شیروں سے بھرا پڑا تھا۔ ہمارے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ ہم دریائے چمبل کے کنارے کنارے سفر کرتے ہوئے کسی طرح گجرات کے قریبی ساحل سمندر پر نکل جائیں۔ میرا ارادہ وہاں سے کسی بادبانی جہاز میں سوار ہو کر مسلمان ملک اندلس (اسپین) کی طرف جانے کا تھا۔ جہاں مور اسلامی حکمران ایک عظیم الشان اور تاریخ ساز اسلامی حکومت کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ بس یہی ایک سوال مجھے بار بار پریشان کر رہا تھا کہ سوئیکارنی کا کیا ہو گا؟ اس سوال کا میرے پاس ایک ہی جواب تھا کہ میں دہلی کی بجائے اب گجرات کے کسی ساحلی علاقے میں پہنچ کر اس کی شادی کسی ہندو برہمن سے کرا دوں گا اور خود اندلس کی طرف کوچ کر جاؤں گا۔

لوگوں کا ایک قافلہ قصبہ چھوڑ کر گجرات کی طرف جا رہا تھا۔ ہم بھی ان میں شامل ہو گئے۔ یہ ہندو لوگ تھے۔ وشنو بھگوان کے پجاری تھے اور راستے میں وشنو کے بھجن گاتے سفر کر رہے تھے۔ اس قافلہ کے ساتھ ہم اس لئے ہو گئے تھے کہ ہمیں خوراک اور پانی کی سہولت میسر تھی۔ کیوں کہ گجرات کی طرف جانے والا راستہ بنجر پہاڑیوں کے ایک بے آب و گیاہ علاقے میں سے گزرتا تھا جہاں ہمیں پانی کی ایک بوند بھی نہیں مل سکتی تھی۔

سات روز تک ہم نے اس قافلے کے ہمراہ سفر کیا اور پھر بندھیا چل کے دامن کا سرسبز و شاداب جنگل شروع ہو گیا۔ یہاں سے مجھے شمال مغرب کی طرف سے ہو کر ساحل سمندر کی طرف بڑھنا تھا۔ چنانچہ میں نے سوئیکارنی کو ساتھ لیا اور قافلے سے الگ ہو گیا۔ دریائے

چمبل ہم سے دائیں جانب کے پہاڑی سلسلے کی طرف چلا گیا تھا۔ ہم نے کھانے پینے کا کچھ سامان اپنے ساتھ رکھ لیا تھا اور ہمارے گھوڑے قدم قدم چلتے مسافت طے کر رہے تھے۔ اس دوران برہمن لڑکی سوئیکارنی مجھ سے خاصی گھل مل گئی تھی۔ اس حقیقت نے اسے میرا گرویدہ بنا دیا تھا کہ میں انتہائی دلیری سے کام لیتے ہوئے اسے موت کے منہ سے نکالا ہے۔ وہ سفر میں میرا بہت خیال رکھتی۔ کھانے کو پہلے مجھے دیتی اور پھر خود کھاتی۔

ہم نے قافلے والوں سے لے کر دو کمانیں اور تیروں کا ایک ترکش اور ایک بھالا اور تلوار اپنے پاس رکھ لی تھی۔ ہم خاموشی اور ثابت قدمی سے سفر کر رہے تھے۔ پانچ دن تک ہم جنگلوں میں چلتے رہے۔ چھٹے روز دریائے چمبل پہاڑیوں سے نکل کر ایک بار پھر ہمارے قریب آ گیا۔ ہم نے اس کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہم ایک گھاٹ پر پہنچے جہاں سے بڑی بڑی کشتیاں گجرات کی طرف جاتی تھیں۔ ہمارے گھوڑے بھی تھک چکے تھے۔ ہم خود جنگلوں کے سفر سے تنگ آ گئے تھے۔ ہم نے دونوں گھوڑے وہیں گھاٹ پر فروخت کر دیئے۔ جو رقم ملی وہ کشتی بان کے حوالے کی اور بادبانی کشتی میں سوار ہو گئے۔ مجھے یقین تھا کہ علاء الدین کی فوجیں ابھی گجرات نہیں پہنچی ہوں گی اور میں وہاں سے کسی بادبانی جہاز میں بیٹھ کر اندلس کی طرف فرار ہو سکوں گا۔

دریائے چمبل میں تین روز تک سفر کرنے کے بعد بادبانی کشتی گجرات' کاٹھیاواڑ یعنی کورومنڈل کے شمال کی جانب ساحل کی ایک بندرگاہ سے کچھ فاصلے پر کنارے کے ساتھ جا کر لگ گئی۔ یہاں سے گجرات کا شہر سات کوس کے فاصلے پر تھا جو ہم نے مسافروں کے ساتھ ایک چھکڑے میں طے کیا۔ گجرات کی فصیل شہر تک پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ خلجی فوجوں کی چڑھائی کی اطلاعات گجرات کے راجہ چندر بھاٹے کو مل چکی تھیں اور اس نے فصیل شہر پر برج کے تیر انداز دستے تعینات کر رکھے تھے۔ شہر کے دروازے سرشام ہی بند کر دیئے جاتے تھے۔

شہر پناہ کے دروازے پر راجہ چندر بھاٹے کے سپاہیوں نے ہمیں روک کر پوچھا کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے انہیں بتایا کہ ہم کالنجر کے جنوبی قصبے سے فرار ہو کر آ رہے ہیں کیوں کہ دہلی کے بادشاہ کی فوج چڑھائی کرتی چلی آ رہی ہے۔ ہمیں شہر میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔ گجرات کا تاریخی شہر سمندر کے کنارے اس طرح آباد کیا گیا تھا کہ ایک بہت بڑی بندرگاہ شہر کے اندر ہی آ گئی تھی.... جنوب کی طرف شہر کی فصیل سے باہر سومنات کے مندر کی وسیع و عریض عمارت تھی۔ اس مندر کی تباہی میں سلطان محمود غزنوی کی فوج کے ساتھ رہ کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا مگر ہندو راجاؤں نے اسے پھر

سے تعمیر کروا دیا تھا۔ مندر کے اردگرد ایک مضبوط اور اونچی فصیل بنی ہوئی تھی۔ ان بر
کے برجوں میں بھی تیر اندازوں کے دستے پہرہ دے رہے تھے۔ رات کے وقت ان بر
میں مشعلیں روشن تھیں۔ شہر گجرات سمندری تجارت کی وجہ سے بہت ترقی یافتہ تھا۔ لو
خوش حال تھے مگر خلجی بادشاہ کی فوج کی چڑھائی کی خبر نے شہر میں لوگوں کو پریشان کیا ہوا
راجہ کے فوجی تلواریں اٹھائے جگہ جگہ گشت کر رہے تھے۔ فصیل شہر کے ساتھ
بھاری فوج متعین تھی۔ کھولتے ہوئے تیل کے بڑے بڑے کڑھاؤ فصیل کے اوپر چڑھا
گئے تھے۔ شہر کے وسط میں راجہ کا قلعہ تھا۔ اس قلعے کے باہر اور اندر بھی فوج تع
تھی۔ گویا مسلمان لشکر سے مقابلے کی پوری تیاری ہو چکی تھی۔ ہم ایک سرائے میں آ
جہاں آس پاس کے دیہاتوں سے بھاگ کر آئے ہوئے لوگ پناہ گزین تھے۔ یہاں
لوگوں کو راجہ کی طرف سے مفت کھانا ملتا تھا۔ سوئیکارنی رات کو دال بھات کھانے کے
کہنے لگی۔

"مسلمانوں کی فوج جس ملک پر چڑھائی کرتی ہے۔ اس پر قبضہ کر لیتی ہے۔ اگر
بھی مسلمان آ گئے تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

میں خود اس خیال سے پریشان تھا لیکن میرے ذہن میں یہ اسکیم تھی کہ میں ش
بندرگاہ پر صبح جاؤں گا اور معلوم کروں گا کہ کوئی بادبانی جہاز دوسرے ملک کی طرف جا ر
یا نہیں۔ اگرچہ شہر کی ہنگامی صورت حال کو دیکھ کر مجھے شک ہو گیا تھا کہ ایسی حالت
شاید ہی کوئی جہاز بندرگاہ سے روانہ ہو۔ بہرحال میں نے سوئیکارنی کو یہ کہہ کر تسلی د
مسلمان فوجی عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"تمہاری جان تو خطرے میں ہو گی۔ پھر میں کیا کروں گی؟ کہاں جاؤں گی؟"

میں نے اس موقع پر اسے دل کی بات بتا دی۔

"سوئیکارنی! میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں کسی شریف ہندو برہمن سے بیاہ رچا لو۔
سلسلے میں میں تمہاری مدد کروں گا۔"

سوئیکارنی میرے چہرے کو تکنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تھی۔ اس نے
خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"میں کسی دوسرے سے بیاہ نہیں کروں گی۔"

میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے۔ اسی لئے میں خاموش ہو گیا۔

میں نے اس منصوبے پر غور کرنا شروع کر دیا کہ کیوں نہ سوئیکارنی کو بھی ساتھ
شہر سے نکل جاؤں؟ ابھی میں اس منصوبے پر غور کر ہی رہا تھا کہ ایک روز صبح صبح

شور مچ گیا کہ مسلمانوں کی فوج آ گئی ہے۔ لوگ گھروں میں گھس گئے۔ مکانوں کے دروازے
اندر سے بند کر لئے گئے۔ فوج شہر فصیل پر چڑھ گئی۔ مسلمان فوجوں نے شہر پر حملہ شروع
کر دیا۔ فصیل پر سنگ باری شروع ہو گئی۔ دو روز تک سنگ باری جاری رہی مگر فصیل اتنی
پکی تھی کہ سوائے معمولی سے نقصان کے اس پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا۔ علاء الدین خلجی کا
بھائی الغ خان خود فوج کی قیادت کر رہا تھا۔ اس نے ایک خاص فوجی دستے کو تیار کیا' جس
نے اپنی جان کی بازی لگا کر تین جگہوں پر سے فصیل کے نیچے زمین کھود کر بارود بھر دیا۔ پھر
اسے آگ لگا دی گئی۔ دھماکے ہوئے اور شہر کی فصیل تین جگہوں سے منہدم ہو گئی۔
مسلمان لشکری اللہ اکبر کے نعرے لگاتے شہر میں داخل ہو گئے۔ گلیوں' بازاروں میں جنگ
شروع ہو گئی۔ اسلامی لشکر کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ انہوں نے راجہ چندر بھاٹے کے قلعے کی
دیوار بھی بارود سے اڑا دی اور قلعے میں داخل ہو گئے۔ شہر فتح ہو گیا۔ راجہ چندر بھاٹے کو
گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی رانی کنولا دیوی کے ساتھ ایک غلام بھی گرفتار ہوا جو بعد میں ملک
کفور کے نام سے مشہور ہوا۔

ہم لوگ اس دوران سرائے کے زمین دوز تہہ خانے میں چھپے رہے لیکن بہت جلد
شاہی فوج کے سپاہی وہاں بھی پہنچ گئے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمیں بھی گرفتار کر لیا
گیا۔ ابھی تک میری شناخت نہ ہوئی تھی۔ میرے سر پر موت کا شدید خطرہ منڈلا رہا تھا۔
میں جانتا تھا کہ جب مجھے علاء الدین خلجی کے بھائی اور سپہ سالار الغ خان کے سامنے پیش کیا
جائے گا تو مجھے پہچان لے گا کہ میں جلال الدین خلجی کا مصاحب خاص تھا اور اسی وقت میری
گردن اڑا دی جائے گی۔

لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جب مجھے اور سوئیکارنی کو الغ خان کے حضور پیش
کیا گیا تو اس نے مجھے فوراً پہچان لیا' اور بولا۔

"ہمیں تمہاری ایک عرصے سے تلاش تھی۔"

میں سمجھ گیا کہ انجام آ پہنچا۔ کوئی دم تلوار کا وار میری گردن پر پڑے گا اور میرا سر
کٹ کر نیچے گر پڑے گا۔ مگر پانسہ الٹ گیا۔ الغ خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم جلال الدین کے امیر ضرور تھے مگر میں جانتا ہوں کہ تم طبیب خاص بھی تھے اور
تمہیں جڑی بوٹیوں پر بہت دسترس حاصل ہے۔ میں بھی تمہیں اپنا طبیب خاص بناتا ہوں۔"

مجھے نئی زندگی مل گئی تھی۔ اب مجھے سوئیکارنی کی فکر تھی کہ اس کے ساتھ کیا سلوک
کیا جاتا ہے۔ الغ خان نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ لڑکی کون ہے؟ شکل سے یہ ہندو لگتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "عالی جاہ! یہ ایک برہمن زادی تھی لیکن مجھ سے شادی کرنے کے بعد مسلمان ہو گئی ہے۔"

الغ خان ہنس دیا۔ اس نے اپنے گلے میں سے موتیوں کا ایک قیمتی ہار اتار کر میری طرف بڑھایا اور کہا۔

"یہ ہماری طرف سے تمہاری شادی کا تحفہ ہے۔"

ہمیں شاہی محل کے مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں آتے ہی سوئیکارنی نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اسے یہ کیوں نہیں بتایا کہ میں مسلمان ہوں اور بادشاہ کا شاہی طبیب رہ چکا ہوں۔ اس کے چہرے پر شدید حیرت اور شکایت کے اثرات تھے۔ اب میرے لئے سوائے اعتراف کر لینے کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ میں نے اپنے بارے میں صرف اتنا ہی صاف صاف بتایا کہ میں مسلمان ہوں اور جلال الدین خلجی کا طبیب خاص تھا۔ اور بادشاہ کے قتل کے بعد میں لشکر سے فرار ہو کر گوالیار کے قرب و جوار کے جنگلوں میں پہنچ گیا تھا۔

سوئیکارنی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کس طرح تسلی دوں۔ اس نے اچانک میرا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔

"تم نے مجھے اپنی پتنی کہا ہے۔ اب میں تمہاری پتنی ہوں۔ میں تمہارا مذہب قبول کرتی ہوں۔"

میں بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ عجیب صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔ میں سوئیکارنی سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر کے مجھ پر ایک بھاری دینی ذمہ داری عائد کر دی تھی۔ اب میرا فرض تھا کہ اسے حلقہ بگوش اسلام سے منع نہ کروں اور اس سے شادی کر لوں۔ میں نے سوئیکارنی سے کہا کہ مجھے ایک دن سوچنے کی مہلت دو۔ سوئیکارنی آنسو پونچھتی خواب گاہ میں چلی گئی۔ میں پریشانی کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ جتنا سوچتا اسی نتیجے پر پہنچتا کہ سوئیکارنی سے شادی کرنا میرا دینی فرض بن چکا ہے۔ دوسرے روز میں نے سوئیکارنی کو ساتھ لیا اور لشکر کے ایک مولوی صاحب کے خیمے میں جا کر ان سے کہا کہ یہ عورت زبانی طور پر حلقہ بگوش اسلام ہونے کا اقرار کر چکی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ باقاعدہ طور پر اسے کلمہ پڑھا کر مسلمان کریں۔ مولوی صاحب نے اسی وقت سوئیکارنی کو سامنے بٹھا کر کلمہ پڑھایا اور میرے اصرار پر ہمارا نکاح پڑھا دیا۔

سوئیکارنی میری منکوحہ بیوی بن گئی۔ میں نے اس کا اسلامی نام زبیدہ رکھا۔ میرا نام وہی عبداللہ ہی تھا۔ گجرات پر قبضہ کرنے کے بعد ہم بھی الغ خان کی فوج کے ساتھ پایہ تخت دہلی آ گئے۔ میں الغ خان کے محل میں ہی اس کے طبیب خاص کی حیثیت سے تعینات رہا۔

وقت گذرتا جا رہا تھا۔ سوئیکارنی نے میرے دو لڑکوں کو جنم دیا۔ جب ان لڑکوں کی عمر دس اور بارہ برس کی ہوئی تو علاء الدین خلجی بوڑھا ہو چکا تھا اور وہمی ہو گیا تھا۔ ملک کافور نے اپنا زور بڑھانے کے لئے بادشاہ کو لوگوں سے بدگمان کرنا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ تمام بڑے سرداروں کو دربار سے نکلوا دیا۔ شہزادہ خضر خان جو ولی عہد تھا' اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ نظر بند کر دیا گیا۔ آخر ملک کافور نے بادشاہ کو زہر دے کر ہلاک کر ڈالا۔ ملک کافور نے بادشاہ کے مرتے ہی منادی کرا دی کہ بادشاہ نے مرتے وقت اپنا جانشین سب سے چھوٹے بیٹے کو بتایا ہے۔ جس کی عمر اس وقت چھ برس تھی۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ سب ملک کافور کا فریب ہے مگر فوج' خزانہ اور تمام اختیارات کافور کے ہاتھ میں تھے۔ کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی اور شہر دہلی میں علاء الدین کا سب سے چھوٹا بیٹا شہاب الدین تخت نشین ہو گیا۔ اس کے دو بڑے بھائی گوالیار کے قلعے میں بند تھے مگر تیسرا موجود تھا۔ اب کافور نے اس کو قتل کرنے کی ٹھانی لیکن جو لوگ اس شہزادے کو مارنے کے لئے آئے' ان کو شہزادے نے سمجھایا کہ اگر تم نے مجھ کو بے گناہ قتل کیا تو دین و دنیا دونوں جگہ منہ کالا ہو گا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اس نمک حرام کو قتل کرو جس نے سلطنت پر بغیر کسی حق کے قبضہ کر رکھا ہے اور اپنے آقا کو ہلاک کرنے کے بعد اس کی بے گناہ اولاد کی جان لینا چاہتا ہے۔ اگر تمہیں دولت کا لالچ ہے تو بھی ملک کافور کو قتل کر دو۔ اختیار میرے ہاتھ میں آ گیا تو اس قدر دولت دوں گا کہ تم نے کبھی تصور بھی نہ کی ہو گی۔

قاتلوں پر شہزادے کی اس تقریر کا بہت اثر ہوا۔ وہ اسی وقت واپس آئے اور کافور کے مکان میں گھس کر اسے قتل کر دیا اور تھوڑے ہی دنوں بعد شہزادہ قطب الدین اپنے باپ کی سلطنت کا مالک ہو گیا۔ نئے بادشاہ کا پورا نام سید قطب الدین مبارک شاہ تھا۔ دو تین سال تک قطب الدین مبارک شاہ سلطنت کا اچھی طرح انتظام چلاتا رہا مگر پھر وہ رات دن ناچ رنگ میں مشغول رہنے لگا۔ میں اب اس کے دربار سے وابستہ رہ گیا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ وہ بھرے دربار میں طرح طرح کی واہیات حرکتیں کرتا۔ ڈوم ڈھاڑی' مسخرے ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور اس کی ان خلاف شرع حرکتوں سے دربار کے بوڑھوں اور معزز امیروں کو اپنی عزت سنبھالنی مشکل ہو گئی تھی۔ وہ خود بادشاہ سے جہاں تک ہو سکتا دور دور رہتے۔ یوں سلطنت کے معاملات میں ایک نوجوان غلام خسرو خان کو اتنا عمل دخل ہو گیا تھا کہ بادشاہ اس کے مشورے کے بغیر کام نہ کرتا تھا۔

اصل میں یہ خسرو خان چھوٹی ذات کا ہندو تھا اور گجرات سے گرفتار ہو کر دہلی آیا تھا' وہ مسلمان ہو گیا تھا اور سلطان قطب الدین کی عنایات کے باعث وہ فوج کا سپہ سالار بنا دیا گیا

تھا۔ پھر خسرو خان نے یہ عہدہ پا کر گجرات سے اپنے ہندو عزیزوں کو دہلی بلا کر بڑی بڑی تنخواہوں پر فوج میں ملازم رکھ لیا۔ اس کے بعد سلطان قطب الدین مبارک شاہ کی غفلت دیکھ کر اسے یہاں تک جرات ہوئی کہ ایک دن موقع پا کر اس نے سلطان کو قتل کرا دیا اور دھوکے سے شہر کے بڑے بڑے عہدیداروں کو شاہی محل میں بلا کر قید میں ڈال دیا۔ پھر تخت پر بیٹھ کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ مگر وہ زیادہ دیر تک حکومت نہ کر سکا اور چند مہینوں میں ہی اس کی بادشاہی کا خاتمہ ہو گیا لیکن اس دوران میں خسرو خان اور اس کے عزیزوں نے ایسے ایسے ظلم کئے کہ آج بھی میں اسے یاد کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شاہی خاندان کے کسی فرد کو ان ظالموں نے زندہ نہ چھوڑا اور بچے بچے کو قتل کرا دیا۔ پھر شاہی بیگمات پر طرح طرح کے ظلم توڑے اور کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

لیکن ان بے رحموں سے خدا نے جلد ہی بدلہ لے لیا۔ پنجاب کے صوبے دار غازی ملک تغلق نے خسرو خان پر چڑھائی کر دی۔ خسرو خان کی فوج کو دو مقامات پر شکست فاش ہوئی.... خسرو خان اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ چونکہ شاہی خاندان کا کوئی مرد باقی نہ بچا تھا اور یوں بھی غازی ملک سلطان معزز سردار سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے سب امیروں نے مل کر اسے بادشاہ بنا لیا اور یوں اس کی تخت نشینی سے ..... خاندان تغلق کا آغاز ہوا۔

ایک طرف تاریخ آہستہ آہستہ انقلابات زمانہ کے نقوش بناتی ہوئی اپنے اوراق الٹ رہی تھی اور دوسری طرف میرے دونوں لڑکے جوان ہو گئے تھے اور میری بیوی زبیدہ بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی۔ ایک حیرت انگیز اور خوش آئند بات یہ تھی کہ مجھ پر عمر کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اگرچہ میرے اندر ایک فانی انسان کی ساری کمزوریاں موجود تھیں مگر میں بوڑھا نہیں ہوا تھا۔ میری عمر اس جگہ رکی ہوئی تھی۔ یہ بات میرے لئے انتہائی خوشگوار اور میرے بچوں اور بیوی کے لئے انتہائی تعجب خیز تھی۔ میں نے انہیں اپنے بارے میں ابھی تک نہیں بتایا تھا کہ حقیقت میں میں کون ہوں۔ جب بھی میرے جوان لڑکے مجھ سے پوچھتے کہ میں ابھی تک جوان کس طرح ہوں تو میں یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ میں کھانے پینے کا بہت خیال رکھتا ہوں لیکن میری بیوی سوئیکارنی یعنی زبیدہ میرے اس جواز سے مطمئن نہیں تھی۔ جب میرے بچوں کی عمر مجھ سے زیادہ ہو گئی اور زبیدہ کے چہرے پر جھریاں نمودار ہونے لگیں تو ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا۔

"میرے سرتاج! کیا مجھے بھی نہیں بتاؤ گے کہ تم اصل میں کون ہو؟ کیا تم کوئی دیوتا ہو؟ کوئی اوتار ہو؟ مجھے اپنے دل کا راز بتا دو۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

جب میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا راز برہمن زادی پر ظاہر کر دیا تو پہلے تو اسے یقین نہ آیا لیکن میرا چہرہ میرے بیان کی تصدیق کر رہا تھا۔ میرا بڑا لڑکا مجھ سے بڑا ہو چکا تھا۔ وہ خود بوڑھی ہو گئی تھی اور میں ابھی تک جوان تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک حادثے کی وجہ سے میری زندہ رہنے کی اور موت کو شکست دینے کی طاقت معطل ہو چکی ہے مگر جوان رہنے کی صلاحیت بدستور موجود ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ میری کھوئی ہوئی طاقت وقتی طور پر معطل ہوئی ہے اور یہ واپس آ سکتی ہے۔ میری بیوی کی آنکھیں بھر آئیں۔ کہنے لگی۔

"کاش میں اور میرے بچے بھی آپ کے ساتھ اسی طرح جوان رہ سکتے تاکہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے۔"

لیکن ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنے بڑے لڑکے کو بھی یہ راز بتا دیا مگر اس کا خیال تھا کہ میں کسی طلسم یا جادو کی وجہ سے ابھی تک جوان ہوں۔ اس نے کہا کہ میں کسی روز اچانک بوڑھا ہو کر مر جاؤں گا۔

اب میرے لئے ایک دیرینہ مشکل پھر سے کھڑی ہو گئی تھی۔ تین بادشاہ یکے بعد دیگرے قتل ہو گئے تھے.... تین بادشاہتیں بدل گئی تھیں۔ لوگ میری آنکھوں کے سامنے بوڑھے ہو رہے تھے اور میں ان کی آنکھوں کے سامنے ابھی تک جوان تھا۔ میرے چہرے پر جوانی کی وہ شادابی تھی۔ لوگ میرے بارے میں چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے۔ مجھے اب وہاں سے حسب معمول کچھ عرصے کے لئے غائب ہونا تھا تاکہ یہ بوڑھے لوگ وقت کی سٹیج پر اپنا کردار ادا کر کے غائب ہو جائیں۔ سلطان خسرو خان نے مجھے ایک باغ عطا کر رکھا تھا جو اس کے بعد سے واپس نہیں لیا گیا تھا۔ اس لئے کہ میں طبیب تھا اور ہر بادشاہ کو کچھ خاص کشتہ جات کے لئے میرا مرہون منت ہونا پڑتا تھا۔ میں نے اپنی اس مجبوری کا ذکر اپنی بیوی سے کیا اور کہا کہ میں کچھ عرصے کے لئے وہاں سے غائب ہو جانا چاہتا ہوں۔ اس نے غمزدہ لہجے میں کہا کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ آپ میری نظروں سے اوجھل نہ ہوں، لیکن میں اس کی یہ خواہش پوری کرنے سے معذور تھا۔ چنانچہ میں نے ایک روز اپنے بڑے لڑکے کو بلا کر کہا کہ میں ایک ضروری کام سے ملک سے باہر دوسرے ملک میں جا رہا ہوں۔ اپنی والدہ کا خیال رکھنا۔

اسی رات میں نے زاد راہ باندھا اور گھوڑے پر سوار ہوا اور پایہ تخت دہلی سے مگدھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ لکھنوتی (آج کا لکھنؤ) اس وقت مگدھ کا پایہ تخت تھا۔ لکھنوتی پر تغلق بادشاہوں کی حکومت تھی مگر وہاں میرا جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ میں وہاں ایک اجنبی کی

حیثیت سے داخل ہوا اور کارواں سرائے میں جا کر اتر گیا۔ یہ سرائے ایک بھٹیارن کی تھی۔ میں نے اپنا تعارف ایک حکیم کی حیثیت سے کروایا اور کہا کہ میں شہر میں کسی جگہ طبابت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ بھٹیارن کے پاس ایک پراسرار آدمی سر پر رومال باندھے بیٹھا تھا۔ جب میں نے بھٹیارن کو بتایا کہ میں جڑی بوٹیوں کی مدد سے ہر بیماری کا علاج کر لیتا ہوں تو وہ پراسرار آدمی ذرا سا چونکا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا اور شہر کی طرف چلا گیا۔ میں شاہی دربار یا کسی امیر کے ہاں طبیب کی حیثیت سے ملازمت نہیں کرنا چاہتا تھا کیوں کہ اس میں اندیشہ تھا کہ دہلی سے آنے والے امیر یا دہلی دربار سے متعلق لوگ مجھے دیکھ لیں گے اور میرے بارے میں یوں ہی تفتیش کا سلسلہ شروع ہو جائے گا کہ میں اتنے برس گذر جانے پر بھی ابھی تک جوان کس طرح ہوں۔

شام کو میں کارواں سرائے میں واپس آ گیا۔ کونے میں بچھی کھاٹ پر بیٹھ کر روٹی کھائی۔ بھٹیارن دوسرے مسافروں کو کھانا دے رہی تھی۔ جب میں کھانا کھا چکا تو بھٹیارن میرے پاس آ کر پوچھنے لگی کہ میں نے شہر میں کوئی دکان دیکھی یا نہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی نہیں۔ وہ بولی۔

"میں تمہیں ایک دکان لے دوں گی۔ امیروں کے محلے میں ہے۔ تم بہت دولت کماؤ گے۔"

میں خاموش رہا۔ وہ بولی۔ "لیکن تمہیں میرا ایک کام کرنا ہو گا۔"

میں نے کام پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کا ایک چھوٹا بھائی کئی ماہ سے بیمار ہے۔ اسے کوئی ایسی بیماری ہو گئی ہے کہ ٹانگیں سن ہو گئی ہیں اور وہ چل پھر نہیں سکتا۔ میں نے کہا کہ مجھے اس کے پاس لے چلنا۔ دیکھ کر بتاؤں گا کہ اس کا علاج ہو سکتا ہے کہ نہیں۔ رات کو وہ مجھے شہر سے باہر ایک پرانے باغ کے کنارے بنی ہوئی کچی کوٹھری میں لے گئی... کوٹھری میں چراغ دان میں شمع جل رہی تھی۔ ایک بھری بھری مونچھوں والا لمبا تڑنگا آدمی سر پر رومال باندھے چارپائی پر لیٹا تھا۔ جس پراسرار آدمی کو میں نے پہلی بار سرائے میں دیکھا تھا۔ وہ بھی سر پر رومال باندھے چارپائی کے قریب ہی بیٹھا' مونچھوں والے آدمی کی ٹانگوں پر مالش کر رہا تھا۔ میں نے مریض کو دیکھا۔ ٹانگوں کی رگیں سکڑی نہیں تھیں۔ میں نے بھٹیارن کو الگ لے جا کر کہا کہ تمہارے بھائی کا علاج ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے مجھے جنگل میں جا کر جڑی بوٹیاں لانی ہوں گی۔ وہ میری منتیں کرنے لگی۔ میرے دل میں اس عورت کے لئے بڑی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ میں دوسرے دن ہی دریا کے کنارے جنگل میں نکل گیا۔ آج سے سات آٹھ سو برس پہلے جنگل قدرت کی پیدا کی ہوئی انمول جڑی بوٹیوں سے

بھرے ہوتے تھے۔ صرف دیکھنے والی آنکھ کی ضرورت ہوتی تھی۔

میں جنگل سے جڑی بوٹیاں اکٹھی کر کے لایا اور اس کی دوائی تیار کی اور بھٹیارن کے بھائی کا علاج شروع کر دیا۔ میں دن میں ایک بار اس کے پاس جا کر اس کی ٹانگوں پر مالش کرتا اور اسے اپنے ہاتھ سے پندرہ پندرہ منٹ کے بعد دوائی پلاتا۔ اس مونچھوں والے مریض کا نام میرن تھا اور شکل سے مجھے کوئی ڈاکو لگتا تھا۔ مگر مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ وہ کون ہے۔ میں تو اسے بھٹیارن کا بھائی سمجھ کر علاج کر رہا تھا۔ اب وہ ٹھیک ہو گیا تھا اور چارپائی سے اٹھ کر چلنے پھرنے لگا تھا۔

میں آخری دن اسے دیکھنے گیا تو شام کا وقت تھا۔ میں دالان میں ہی تھا کہ مجھے میرن کے کسی سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اگر وہ مالدار ہے تو تم اسے باتوں میں لگا کر کل دوپہر کے بعد جنگل میں لال برجی کی طرف لے آؤ۔ باقی کام میں خود سنبھال لوں گا۔"

دوسرے آدمی نے جواب میں کہا۔ "میرن! وہ بہت مالدار ہے۔ باپ بیٹا ہیں۔ بڑی حویلی میں اترے ہوئے ہیں۔ سوداگر ہیں۔ باپ اور بیٹا دونوں سونے کی ڈلیاں اپنی کمر کے ساتھ باندھ رکھتے ہیں۔ میں نے سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم کل دوپہر کے بعد پہلے باپ کو اور پھر اس کے بیٹے کو کسی بہانے حویلی سے نکال کر لال برجی کے پیچھے لے آنا۔ میرا رومال دونوں کا کام تمام کر دے گا۔"

میں دالان میں ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ رومال کا لفظ سن کر میں سب کچھ سمجھ گیا۔ یہ آدمی جس کو میں نے دوبارہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا کیا تھا۔ وہ ایک ٹھگ تھا۔ ہندوستان کے ٹھگوں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ انہیں عروج اور شہرت آگے چل کر ملی۔ مگر اس سے پہلے بھی ان کی ہلاکت خیزیاں جاری تھیں۔ یہ لوگ اکا دکا مسافروں کو موت کے گھاٹ اتار کر انہیں لوٹ لیتے تھے۔ ان کے ہلاک کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک ٹھگ بدنصیب شکار کو باتوں میں لگائے رکھتا تھا اور دوسرا ٹھگ پیچھے سے پلک جھپکنے میں اس کی گردن کے گرد رومال ڈال کر ایک ہی جھٹکے سے گردن کا منکا توڑ دیتا تھا۔ پھر یہ ٹھگ لاش کو زمین کھود کر دفن کر دیتے تھے۔ ان ٹھگوں کی اپنی زبان اور اپنے اشارے ہوتے تھے۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ یہ لوگ واردات کرنے سے پہلے کالی دیوی کے مندر میں جا کر مورتی کے آگے ناریل توڑتے اور نذرانہ چڑھاتے اور دعا مانگتے تھے کہ وہ اپنی واردات میں کامیاب و کامران ہوں۔

میں کوٹھری کی طرف بڑھا تو دیکھا کہ اندر میرا مریض یعنی بدمعاش ٹھگ میرن چارپائی پر

نیم دراز تھا اور اس کی پائنتی کی طرف وہی رومال والا پراسرار آدمی بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چپ ہو گیا۔ میرن نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔

"شاہ جی! آپ ویسے تو نوجوان ہیں مگر بڑے تجربہ کار طبیب ہیں۔ دیکھئے' آپ کے علاج سے میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔ یہی بات میں اپنے دوست کو بتا رہا تھا۔"

پھر اس نے اپنے دوست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بشیر سے کہو میرے لئے روٹی پکا کر رکھے۔"

اب اس کی تصدیق ہو گئی کہ یہ لوگ واقعی بڑے سفاک ٹھگ ہیں۔ کیوں کہ "بشیر اور روٹیاں پکانا" ان ٹھگوں کے کوڈ ورڈ تھے۔ میں نے میرن ٹھگ کو دوائی پلائی۔ اس کی ٹانگوں کو دبا کر دیکھا اور کہا کہ اب وہ بالکل درست ہے۔ اور اب اسے علاج کی ضرورت نہیں ہے۔ میرن ٹھگ نے میرا بہت شکریہ ادا کیا اور سرہانے کے نیچے سے پندرہ اشرفیاں نکال کر مجھے پیش کیں۔ میں اشرفیاں تھیلی میں رکھ کر خاموشی سے وہاں سے چلا آیا۔ دل میں یہ عہد کر چکا تھا کہ سوداگر اور اس کے بیٹے کو ان سفاک ٹھگوں کے ہتھے نہیں چڑھنے دوں گا۔

دوسرے روز دن کی روشنی میں میں نے شہر کی ساری حویلیوں کو دیکھ لیا مگر مجھے وہاں کوئی سوداگر باپ بیٹا نظر نہ آئے۔ دوپہر کے وقت میں لال برجی کا کھوج لگا کر وہاں درختوں کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔ مجھے اپنی جان کا بھی خطرہ تھا۔ اگرچہ میرن ٹھگ کی میں نے جان بچائی تھی مگر یہ لوگ اپنے پیشے کے بارے میں بڑے سخت تھے اور اپنے راستے میں حائل ہونے والے اپنے محسن کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔ میں ان سنگ دل ٹھگوں کی بہت کہانیاں سن چکا تھا۔

لال برجی ایک دو منزلہ چھوٹی سی گول عمارت تھی جس کے عقب میں ایک تالاب تھا۔ میں تالاب کے قریب ہی ایک درخت کے نیچے گھنی جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر ہی گذری ہو گی کہ میں نے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنی۔ لال برجی کی طرف جو درخت تھے ان میں سے دو آدمی باتیں کرتے نکلے۔ ان میں سے ایک تو وہی رومال والا پراسرار ٹھگ اور میرن کا ساتھی ٹھگ تھا اور دوسرا ایک بزرگ صورت درویش نما انسان تھا جس نے سر پر کلاہ پہن رکھا تھا۔ بدن پر لمبا چغہ تھا۔ لمبی شرعی داڑھی تھی اور ہاتھ میں تسبیح تھام رکھی تھی۔ یہ کوئی پرہیز گار اور عبادت گزار مسافر تھا جس کو یہ سفاک ٹھگ ہلاک کرنے والے تھے۔ پہلے اس کی باری تھی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتارا جانے والا تھا۔ عبادت گذار سوداگر درختوں کی طرف نگاہ ڈال کر بولا۔

"بھائی صاحب! مجھے تو یہاں کوئی مسجد دکھائی نہیں دیتی۔"

"حضرت' ان درختوں میں ہے۔ بڑی قدیم مسجد ہے۔ کہتے ہیں. وہاں رات کو اللہ اکبر اکبر کی آوازیں آتی ہیں۔"

"اللہ اللہ! اللہ اللہ!"

وہ بزرگ سوداگر بے اختیار پکار اٹھا اور ٹھگ کے ساتھ آگے بڑھا۔ یہاں دوپہر کے ت بڑی ویرانی تھی۔ دور دور تک کوئی انسان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میری آنکھیں میرن ں کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ مجھے باہر نکل کر بزرگ سوداگر کو خطرے سے ہ کر دینا چاہئے۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک جھاڑی کے پیچھے سے میرن سر پر رومال باندھے چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ نکل کر بزرگ سوداگر پر جھپٹا۔ میں نے ر کر کہا۔

"خبردار! خبردار!"

اور میں درختوں میں سے نکل کر ٹھگوں کی طرف بھاگا لیکن عین اس وقت کیا دیکھتا کہ اس بزرگ سوداگر نے جسم کو ایک جھٹکا دیا اور میرن ٹھگ ایک چیخ مار کر زمین پر ۔گرتے ہی ایک فٹ زمین سے اچھلا۔ پھر گرا اور دوبارہ نہ اٹھ سکا۔ یہی حال اس کی ل والے ساتھی کا ہوا۔ دونوں زمین پر بے حس و حرکت پڑے تھے۔ میں بھاگ کر ۔ سوداگر کے پاس گیا اور ان کی خیریت دریافت کی۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"بیٹا! میں تو اللہ کے فضل سے ٹھیک ہوں مگر ظالموں کو ان کی نیت کی سزا مل گئی "

یہ کہہ کر وہ تسبیح پھیرتے منہ میں کچھ پڑھتے واپس ہو گئے۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ ں ٹھگ اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے اور ان کے جسم نیلے ہو کر سرد لاشوں میں تبدیل ہو تھے۔ میں بزرگ سوداگر کے پیچھے پیچھے چلا۔ یہ کوئی کرامت والا خدا دوست بزرگ تھا۔ نے اپنی کسی غیبی طاقت سے اپنے قاتلوں کو جہنم رسید کر دیا تھا۔ میں بزرگ سوداگر کے پیچھے چلتا گیا۔ وہ ایک حویلی میں داخل ہو گئے جس کی ڈیوڑھی میں ایک ہاتھی بندھا ہوا ا رہا تھا۔ ڈیوڑھی کے اندر پائیں باغ کے وسط میں ایک حوض تھا۔ پہلو میں کچھ کوٹھریاں ہوئی تھیں۔ وہ ایک کوٹھری میں داخل ہونے لگے تو میری طرف مڑ کر دیکھا اور ہاتھ کے سے سے قریب بلایا۔

"بیٹا تم نے میری جان بچانے کی کوشش کی تھی۔ میں اس کے بدلے میں تمہاری مدد چاہتا ہوں۔"

وہ کوٹھری کے باہر بچھے ہوئے تخت پر بیٹھ گئے۔ میں ان کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ

بولے۔

"تم نے ابھی ابھی جو کچھ دیکھا اسے بھول جاؤ۔ جو مجھے بے گناہ قتل کرنے کی ک
کرے گا۔ اس کا یہی انجام ہو گا۔ جب انسان اپنا آپ اللہ کے سپرد کر دیتا ہے تو اللہ ا
حفاظت کے لئے خاص فرشتے مقرر کر دیتا ہے جو اس کو ہر آفت سے بچاتے ہیں۔"

میں نے بڑی عقیدت سے کہا۔

"میں دہلی سے آیا ہوں - میرا نام عبداللہ ہے۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا
ہوں۔"

"بیٹے! میں جانتا ہوں تم کہاں سے آئے ہو۔ تم بڑی دور سے آئے ہو اور تمہیں
دور جانا ہے اور تمہارا اصل نام عبداللہ نہیں ہے۔ تمہاری ایک بڑی انمول چیز کھو گئی
اسی سلسلے میں میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

مجھ پر یہ بات کھل گئی کہ یہ بزرگ سوداگر میرے سارے احوال سے واقف ہیں۔
نے دست بستہ ہو کر عرض کیا۔

"حضرت جی! اگر آپ پر میرا ظاہر و باطن عیاں ہے تو برائے خدا میری مدد کیجئے
میری کھوئی ہوئی شے مجھے واپس دلا دیجئے۔"

بزرگ سوداگر گردن جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر چہرہ اوپر اٹھایا۔ میری ط
ایک نگاہ ڈالی اور آہستہ سے کہا۔

"بیٹا! اگر یہ ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم تمہیں تمہاری کھوئی ہوئی قوت بحال کر
یہاں سے رخصت کرتے لیکن تم پر ایسے گندھیرو کے طلسم کا اثر ہو چکا ہے جو زمین کے
سفلی علوم کا سب سے بڑا گندھیرو ہے۔ جادو برحق ہے۔ آدمی کی قوت ارادی کمزور ہو تو
کا اثر ہو جاتا ہے۔"

میں نے عرض کیا۔ "حضرت صاحب! کیا میں ناامید ہو جاؤں۔"

انہوں نے کہا - "ناامیدی گناہ ہے۔ دنیا میں کوئی جادو ایسا نہیں جس کا کوئی توڑ نہ
تم پر جو جادو کیا گیا ہے۔ اس کا بھی توڑ موجود ہے مگر وہ ہمارے پاس نہیں ہے لیکن
تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ یہاں سے پندرہ یوم کی مسافت پر ملک خاندیس میں برہان پور
مقام پر ایک دریا بہتا ہے۔ دریا کے پرانے گھاٹ پر اوپر کی طرف چٹانوں میں ایک
ہے۔ ہر چاند کی پندرھویں کو ایک جٹا دھاری سادھو اس گپھاہ میں آدھی رات کو آتا
گپھاہ کے باہر چٹان کے چبوترے پر بیٹھ کر بھگوان کی عبادت کرتا ہے۔ اس کے پاس
جب وہ عبادت سے فارغ ہو جائے تو اسے کہو۔ مہاراج! پیر جی نے آپ کو سلام بھیجا

اس کے بعد خاموش ہو جانا۔ تم جتنی جلد ہو سکے برہان پور روانہ ہو جاؤ۔"

اسی دن میں نے رخت سفر باندھا۔ گھوڑے پر کھانے پینے کی چیزیں رکھیں اور لکھنوتی
خاندیس کی طرف چل دیا۔ برہان پور آج کل کے بھارت میں مدھیہ پردیش میں ہے
بھارت کا وسطی علاقہ ہے جہاں سے جنوب کی طرف آندھرا پردیش کا علاقہ شروع ہو جاتا
ہے۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں یہ علاقہ اس سلطنت میں شامل تھا۔ سلطان نے پور تک
رول کو جوڑ کر برہان پور تک ایک سڑک تعمیر کرائی تھی جس کے ہر دس کوس پر سرائے
نی تھی۔ میں اسی سڑک پر دن کو سفر کرتا اور رات کسی سرائے میں پڑ کر گزار دیتا۔ اسی
ح سفر کرتے کرتے آخر میں برہان پور پہنچ گیا۔ ایک پہاڑ کے دامن میں آباد یہ شہر بڑا
فضا تھا اور ایک دریا بھی بہتا تھا۔ میں ایک سرائے میں اتر گیا۔ رات آرام کرنے کے بعد
ا دریا کے کنارے کنارے پرانی گھاٹ پر پہنچا تو دور اوپر پہاڑی کی ایک چٹان پر مجھے گپھا
ائی دی۔ میں یہ گپھا دیکھ کر واپس کارواں سرائے میں آ گیا۔ چاند کی دسویں تاریخ کو میں
اں پہنچا تھا مجھے پانچ دن مزید انتظار کرنا تھا۔

چاند کی پندرھویں رات تھی۔

جب چاند کا دوسرا پہر ہوا تو میں گھوڑے پر سوار ہو کر کارواں سرائے سے نکلا اور جلتے
اغوں کی روشنی میں شہر سے گزرتا ہوا دریا کے کنارے آ گیا۔ چاندنی ہر طرف چٹکی ہوئی
تھی۔ چیت بیساکھ کے دن تھے۔ ہواؤں میں طرح طرح کے جنگلی پھولوں کی مہک رچی ہوئی
تھی۔ دریا کی سطح چاندنی میں دودھیا ہو رہی تھی۔ پرانے گھاٹ پر پہنچ کر میں نے گھوڑا ایک
درخت کے ساتھ باندھا اور پہاڑی کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ چاندنی میں راستہ صاف نظر آ رہا
تھا۔ چڑھائی دشوار گزار تھی۔ آخر میں اس چٹان کے پہلو میں پہنچ گیا.... جہاں سادھو کی گپھاہ
تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک انسانی سایہ گپھاہ کے سامنے چٹان کے باہر کو نکلے ہوئے چبوترے
پر سادھی لگائے بیٹھا ہے۔ میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور سادھو کے گیان سے فارغ ہونے
کا انتظار کرنے لگا۔ آدھی رات کے بعد جا کر سادھو کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے
دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف چہرہ اٹھا کر ایک اشلوک پڑھا اور گمبھیر آواز میں بولا۔

"کون ہو تم؟ یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر نمسکار کیا اور کہا۔

"گورو جی مہاراج! پیر جی نے آپ کو سلام بھیجا ہے۔"

سادھو کے جسم پر ایک لنگوٹ تھا۔ داڑھی اور سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ جسم پر
سیندور ملا تھا جو چاندنی میں شعلے کی طرح چمک رہا تھا۔ پیر جی کا سن کر اس کے چہرے پر

مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا اور کہا۔

"بیٹھ جاؤ! ہم ابھی معلوم کرتے ہیں کہ ہمارا دوست ہم سے کیا خدمت لینا چاہتا
میں چبوترے کے آگے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ سادھو نے آنکھیں بند کر لیں۔ ا
بائیں جانب ایک سیاہ رنگ کا کرمنڈل اور ترشول پڑا تھا۔ چند ثانیے کے لئے وہ آنکھ
کئے ساکت رہا۔ پھر آنکھیں کھول دیں اور بولا۔

"پیر جی ہمارے دوست ہیں۔ ان کی خدمت کر کے ہمیں دلی مسرت ہو گی۔"

سادھو نے ایک بار پھر چپ سادھ لی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ مہاراج
لئے کیا حکم ہے۔ سادھو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنی لال لال آنکھیں کھولے چاند
کے ساکت خلاؤں میں کسی موہوم شے کو تک رہا تھا۔ میں نے پھر کوئی سوال نہ ک
وقت گذر گیا۔ پھر سادھو نے اپنے کرمنڈل میں سے ایک کیل اور ایک مور پنکھ نکال
دیا اور کہا۔

"یہ کیل اور مور کا پنکھ اپنے پاس رکھو۔ یہاں سے اتر کی طرف سات کوس ک
پر ایک پہاڑی گاؤں ہے - اس گاؤں کے باہر ایک شمشان بھومی ہے۔ جہاں ہندو لوگ
مردوں کو جلاتے ہیں۔ تم وہاں چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ جب لوگ وہاں کسی مردے کو جلا
لئے لائیں تو تم آنکھ کے آگے یہ مور پنکھ لگا کر اس مردے کی شکل کو دیکھنا۔ اگر اس
کی شکل تمہیں کسی جانور کی طرح کی نظر آئے تو اس مردے کے جلنے کا انتظار کر
مردے کے رشتہ دار اس کی چتا کو آگ لگا کر چلے جائیں تو اس کے پاؤں کی طرف آ
میں یہ کیل ٹھونک دینا۔ اس وقت بہت سی بلائیں تمہیں ڈرانے کے لئے نمودار ہوا
ڈرنا ہر گز نہیں۔ وہ تمہارے قریب نہ آ سکیں گی۔ اگر تم ڈر گئے تو یاد رکھو زندہ ن
گے۔ جب کیل سارے کا سارا زمین میں دھنس جائے گا تو ساری بلائیں چیختی چلاتی
جائیں گی۔ پھر ایک چھوٹے قد کا سیاہ فام بونا تمہارے پاس آ کر کھڑا ہو جائے گا۔ و
اشارے سے بلائے گا۔ تم اس کے پیچھے پیچھے چلے جانا۔ وہ تمہیں اس کالے جادو کے
آزاد کرا دے گا جس نے تمہاری طاقت چھین رکھی ہے۔"

اس کے بعد سادھو نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور گیان دھیان میں مشغول
میں نے مور پنکھ اور کیل سنبھال کر رکھ لی۔ ہاتھ جوڑ کر سادھو کو نمسکار کیا اور واپسی
کی چڑھائی اتر کر دریا کے کنارے گھاٹ پر آ کر گھوڑے پر سوار ہوا اور شہر کی طرف
لیا۔ مجھے سادھو کی باتوں پر پورا یقین تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ جس طرح سادھو نے
اگر میں نے اسی طرح کیا تو میری کھوئی ہوئی ناقابل شکست طاقت مجھے واپس مل جا

میں نے دل میں ارادہ کر لیا کہ میں اس طلسمی عمل میں ثابت قدم رہوں گا۔

رات میں نے کاروان سرائے میں بسر کی۔ دن چڑھا تو گھوڑے پر بیٹھ کر سادھو کے
بتائے ہوئے پہاڑی گاؤں کی طرف چل پڑا۔ سات کوس کے بعد ایک گاؤں آ گیا۔ جہاں چند
ایک کچے پکے دیہاتی مکان بنے ہوئے تھے۔ گاؤں سے باہر ایک جگہ پتھر کی چار دیواری تھی۔
یہاں کچھ ہندو لوگ ایک جگہ چبوترے پر بکھری راکھ میں سے ہڈیوں کے پھول نکال نکال کر
پیتل کی گاگر میں ڈال رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ رات کو یہاں کوئی مردہ جلایا گیا تھا۔ اسے
میں آنکھ پر مور پنکھ لگا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اب میں کسی دوسرے مردے کی ارتھی کی راہ
دیکھنے لگا۔ دوپہر کے بعد کچھ لوگ ماتم کرتے ایک ارتھی کو لے کر شمشان بھومی میں داخل
ہوئے۔ چبوترے پر لکڑیاں لگا کر مردے کی ارتھی کو لاش سمیت اس پر رکھ دیا گیا۔ مور پنکھ
میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ایک طرف کھڑے ہو کر مور پنکھ آنکھ سے لگایا اور مردے کی
شکل کی طرف دیکھا۔ مردے کی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ انسانی شکل ہی تھی۔

اسی طرح میں نے اس شمشان بھومی میں چار روز گذار دیئے۔ پانچویں روز ایک ارتھی
آئی۔ چتا پہلے سے تیار تھی۔ یہ کسی امیر ہندو کی لاش تھی۔ رشتے دار ساتھ گھی اور چندن
بھی لائے تھے۔ میں نے موقع پا کر مور پنکھ اپنی آنکھ کے آگے رکھا او مردے کے چہرے کو
دیکھا۔ حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس مردے کی شکل انسان کی بجائے
لومڑ کی بنی ہوئی تھی۔ میں نے مور کا پر آنکھوں سے ہٹایا تو مردے کی شکل انسانی شکل اختیار
کر چکی تھی۔ دوبارہ مور کا پنکھ آنکھ سے لگا کر دیکھا تو ارتھی پر ایک لومڑ والا انسانی مردہ لیٹا
ہوا تھا۔

مجھے اس مردے کی تلاش تھی۔ میں نے مور کا پر جیب میں رکھ لیا اور ایک طرف
ہٹ کر درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ ارتھی چتا پر رکھ تھی۔ ساتھ آئے ہوئے لوگ اشلوک پڑھ
رہے تھے۔ ارتھی کو اس کے رشتے داروں نے آگ دکھا دی۔ خالص گھی نے آناً فاناً آگ
پکڑ لی اور چتا دھڑا دھڑ جلنے لگی۔ جب چتا انگاروں کا ڈھیر بن گئی تو شام کے سائے زمین پر
اترنا شروع ہو گئے تھے۔ میت کے عزیز و اقارب اور رشتے دار دوسرے روز ٹھنڈی چتا کے
پھول چننے کے بعد روتے دھوتے واپس چلے گئے۔

جب شمشان بھومی میں ایک مہیب سناٹا چھا گیا تو میں درختوں سے نکل کر چتا کی طرف
بڑھا۔ چبوترے پر چتا کے انگارے دہک رہے تھے اور ان میں سے سینک اٹھ رہا تھا۔ میرے
ہاتھ میں کیل اور دوسرے ہاتھ میں ایک پتھر تھا۔ میں چتا کے پاؤں کی طرف ہو کر زمین پر
بیٹھ گیا۔ کیل کی نوک زمین پر رکھی اور اس پر پہلی ضرب لگائی ہی تھی کہ زمین ایک بھیانک

چیخ سے لرز اٹھی۔ پتھر میرے ہاتھ سے چھٹ گیا اور میں مارے دہشت کے سمٹ گیا۔ مجھے سادھو کی ہدایت یاد آ گئی کہ اگر تم ڈر گئے تو جان سے ہاتھ دھونا پڑ جائے گا۔ کیل تھوڑی سے ٹھک چکی تھی۔ چیخ کی آواز مسلسل بلند ہو رہی تھی۔ میں نے دوسری ضرب لگائی تو اس چیخ کی آواز میں دوسری آوازیں بھی شامل ہو گئیں اور وہاں بھیانک چیخوں کا کہرام مچ گیا۔ میں نے تیسری ضرب لگائی تو چتا کے انگاروں میں سے ہیبت ناک ڈراؤنے پیکر نکل کر میرے اردگرد گردش کرنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے ترشول تھے اور وہ انہیں میری جانب بڑھا رہے تھے جیسے مجھے ترشول سے چھلنی کر دینا چاہتے ہوں۔ ان کے چہرے انگاروں کی طرح لال تھے اور زبانیں شعلوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔ خوف سے میری جان آدھی نکل چکی تھی مگر میں زور زور سے پتھر کی ضربیں لگائے جا رہا تھا۔ کم بخت زمین سخت تھی۔ کیل آہستہ آہستہ زمین میں دھنس رہی تھی۔ جب کیل زمین کے برابر ہو گئی تو اچانک وہ بھیانک پیکر دلدوز آوازیں بلند کرتے غائب ہو گئے۔ چاروں طرف پھر وہی موت جیسا سناٹا چھا گیا۔ میرے ماتھے سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

مجھے اپنے پیچھے سرسراہٹ کی سی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک چھوٹا سا سیاہ فام بونا جس کے سر پر لمبی بودی تھی جو بالکل ننگ دھڑنگ کھڑا میری طرف اپنی سرخ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ سادھو نے جو کچھ کہا تھا' حرف بہ حرف اسی طرح ہو رہا تھا۔ سیاہ فام بونا مجھے شمشان بھومی کی دیوار کے پاس ایک سادھی میں لے گیا۔ سادھی پر پتھر کی چھتری بنی ہوئی تھی۔ سادھی کے اندر ایک تنگ و تاریک زینہ نیچے جاتا تھا۔ سیاہ فام بونا زینہ اتر گیا۔ میں اگرچہ بے حد ڈر رہا تھا مگر اپنی کھوئی ہوئی طاقت بحال کرنے کے لئے میں ہر خطرہ مول لے سکتا تھا اور پھر مجھے سادھو کی باتوں پر اس تجربے کے بعد بالکل یقین آ گیا تھا کہ میری جان اس وقت تک محفوظ ہو گی جب تک کہ میں خوف نہیں کھا جاتا۔

میں اندھیرے میں زینہ اتر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آگے ایک چھوٹا سا پانی کا حوض بنا ہوا ہے۔ سامنے کنارے پر سانپ کا بت ہے جس کے پھن میں سے پانی کی دھار نکل کر حوض میں گر رہی ہے۔ سیاہ فام بونا حوض کے کنارے کھڑا تھا۔ اس نے میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور خرخراتی آواز میں کہا۔

"اس حوض میں تین بار غوطہ لگاؤ۔ تیسری بار جب تم ڈبکی لگا کر نکلو گے تو تمہارے جسم پر کیا گیا رگھوویر کا جادو ٹوٹ چکا ہو گا۔ پھر یہاں سے فوراً واپس نکل جانا۔ کسی دوسری جانب دھیان مت دینا۔"

میں حوض میں اتر گیا۔ حوض کا پانی نیم گرم تھا۔ میں نے پہلی ڈبکی لگائی' سیاہ بونا کنارے پر تھا۔ میں نے دوسری ڈبکی لگائی' سیاہ بونا وہاں نہیں تھا۔ تیسری بار حوض کے پانی میں ڈبکی لگا کر جب میں نے سرپانی سے باہر نکالا تو حوض کے کنارے پر ایک حسین و جمیل ہندو عورت ماتھے پر سیندور لگائے بالوں میں پھولوں کے گجرے سجائے کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ فضا مشک و عنبر کی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ میں حوض سے نکل کر بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ اس نے مسکرا کر اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور میں کسی غیبی طاقت کے اثر میں جکڑا اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ میں بھول گیا کہ سیاہ بونے نے مجھے وہاں سے فوراً واپس نکل جانے اور کسی دوسری جانب دھیان نہ دینے کی ہدایت کی تھی۔ میں اپنے ہوش و حواس میں نہ تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھ پر سحر سا کر دیا گیا ہو۔ اتنا ضرور یاد تھا کہ مجھے اپنی غیر فانی طاقت کی آزمائش کرنی ہے اور یہ معلوم کرنا ہے کہ میری کھوئی ہوئی صلاحیتیں اور قوت بحال ہوئی ہے کہ نہیں۔ لڑکی مجھے اپنے ساتھ حوض کی ایک طرف سرنگ میں لئے جا رہی تھی۔ ایک نکہت و نور کا ہالہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور اس کی کافوری روشنی میں سرنگ چند قدم آگے روشن ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ہم ایک چھوٹے سے اونچی پتھریلی چھت والے ہال میں داخل ہو گئے۔ جہاں ایک سیاہ ناگ کا بہت بڑا بت چبوترے پر پھن اٹھائے کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ ایکا ایکی میرے جسم میں ایک سنسناہٹ دوڑ گئی۔ سانپ کا یہ بت اسی سانپ کا ہم شکل تھا جس کی مورتی نے مجھے اس ساری مصیبت میں پھنسایا تھا۔ لڑکی نے ناگ کے بت کے آگے ہاتھ جوڑ کر سر جھکا دیا۔ وہ قدیم ویدوں کے کچھ منتر پڑھنے لگی یہی موقع تھا۔ میں تیزی سے پلٹا اور پوری طاقت سے بھاگ اٹھا۔ سرنگ میں سے نکل کر حوض کے پاس پہنچا تو سامنے پتھروں کی دیوار آ گئی - راستہ بند تھا۔

میرے سامنے پتھر کی دیوار تھی اور مجھے اندھیرے میں بھی چیزیں دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ ایک خوش آئند تبدیلی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ میں مکروہ صورت رگھودیو کے کالے جادو سے آزاد ہو چکا ہوں اور میری کھوئی ہوئی طاقت بحال ہو گئی ہے۔ میں نے پیچھے دیکھا' سرنگ دور دور تک خالی تھی۔ حسین نرتکی کے عطریات اور پھولوں کی خوشبو فضا میں بسی ہوئی تھی۔ مجھے اس ساحرہ کے سحر میں آ کر اس کے پیچھے نہیں جانا چاہئے تھا۔ سیاہ بونے نے مجھے تاکید کی تھی کہ حوض میں تیسری ڈبکی کے بعد میں وہاں سے چلا جاؤں مگر میں نے اس پر عمل نہیں کیا تھا اور اب سرنگ میں قید ہو گیا تھا۔ لیکن ایک بات کی مجھے تسلی تھی کہ میری طاقتیں بحال ہو چکی ہیں اور اب مجھے دنیا کی کوئی طاقت ہلاک نہیں کر سکتی - میں نے اپنی طاقت کو آزمانا چاہی اور حوض کے کنارے پڑے ایک بھاری پتھر کو دونوں ہاتھوں سے دھکیلا - وہ پتھر ایک چھوٹی سی چٹان جتنا تھا مگر میرے ذرا سے زور لگانے سے اپنی جگہ سے ہل گیا۔ میرا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ میری کھوئی ہوئی طاقت مجھے واپس مل گئی تھی۔ اب میں پھر وہی عاطون تھا۔ میں نے ایک نئے عزم کے ساتھ ماحول کا جائزہ لیا۔ حوض کا پانی اندھیرے میں مجھے کسی بہت بڑے عفریت کی دھندلی آنکھ کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کے کنارے' سانپ کے جس بت کے منہ سے پانی کی دھار بہہ رہی تھی' وہ اسی طرح ساکت تھا۔

اچانک مجھے گھنگروؤں کی آواز سنائی دی۔ میں چونک پڑا۔ یہ وہی منحوس آواز تھی جس نے ویران مندر میں مجھے مکروہ صورت رگھودیو کے طلسم میں جکڑ دیا تھا۔ گھنگروؤں کی آواز سرنگ کے اس ہال سے آ رہی تھی جہاں میں حسین نرتکی کو چھوڑ کر بھاگا تھا۔ اس نرتکی کی پائل میں اس قدر کشش تھی کہ ایک بار تو میرے پاؤں بے اختیار گھنگروؤں کی آواز کی طرف بڑھے مگر میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اس سرنگ سے نکلنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ گھنگروؤں کی آواز کے ساتھ اب مردنگ کی دھیمی دھیمی تھاپ بھی سنائی دینے لگی

تھی یوں لگ رہا تھا جیسے نرتکی سانپ کے بت کے آگے رقص کر رہی ہو۔ میں پتھر کی دیوار کو ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا۔ ایک جگہ چھوٹی سی درز تھی اور ایک پتھر تھوڑا سا باہر کو نکلا ہوا تھا۔ میں نے زور لگایا تو پتھر اپنی جگہ سے کھسک گیا۔

گھنگروؤں کی آواز میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اب اس آواز میں عورتوں کی چیخیں اور بین کرنے کی آوازیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ میں نے پتھر کو دیوار سے کھینچ کر نیچے پھینک دیا۔ پتھر کی جگہ دیوار میں ایک سوراخ بن گیا جو اتنا بڑا تھا کہ میں اس میں سے رینگ..... کر بہ آسانی باہر نکل سکتا تھا۔ میں سوراخ کے دوسری جانب نکل آیا.... حوض والی سرنگ میں سے عورتوں کی چیخیں اور واویلا کرنے کی آوازیں بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔

میں حیران تھا کہ دیوار کے اس پار پہلے شمشان بھومی تھی مگر اب وہاں اندھیرے میں مجھے غلام گردش نظر آ رہی تھی..... ایسی تنگ و تاریک غلام گردشیں' میں نے ہندوستان کے قدیم مندروں میں اکثر دیکھی تھیں' جہاں بھیانک جرائم پرورش پاتے تھے۔ میں اس خیال سے ایک طرف چلنے لگا کہ شاید آگے جا کر' وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ مل جائے۔

اب عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ تاریک غلام گردش کے اختتام پر ایک باؤلی بنی ہوئی تھی جس میں نیچے پانی تھا۔ باؤلی کی دیوار کے ساتھ اوپر پتھروں میں ایک زینہ موجود تھا۔ میں اس زینے سے چڑھ کر باؤلی سے باہر آ گیا۔ مجھے امید تھی کہ یہاں ضرور کوئی راہ فرار ہو گی لیکن یہاں بھی ایک غار سے واسطہ پڑا۔ اس غار کی دیواروں پر دیوی دیوتاؤں اور نرتکیوں کے بت کندہ تھے۔ میں اندھیرے میں ٹٹولتا آگے بڑھنے لگا۔ میں کسی نہ کسی طرح اس طلسم کدے سے نکل جانا چاہتا تھا.... مگر مجھے کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ ایک جگہ دیوار میں کسی راج نرتکی کا ایک بہت بڑا بت کندہ تھا۔ وہ رقص کے انداز میں ہاتھ اٹھائے کھڑی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ترشول تھا۔ ترشول کے نیچے تقریباً دو بالشت کے فاصلے پر مجھے ایک گول سوراخ نظر آیا۔ میں نے جھک کر اس سوراخ سے آنکھ لگا دی۔ دوسری طرف ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کشادہ لان کے وسط میں ایک مردہ کفن میں لپٹا پڑا ہے.... وہی نرتکی جس کے پیچھے پیچھے میں یہاں تک چلا آیا تھا' اس ارتھی کے سرہانے آنکھیں بند کئے اور ہاتھ جوڑے بیٹھی ہے.... پھر اس نے اس طرح چونک کر آنکھیں کھول دیں جیسے اسے میری موجودگی کا احساس ہو گیا ہو۔ اس نے چہرہ گھما کر دیوار میں اس سوراخ کی جانب دیکھا جس سے میں آنکھ لگائے کھڑا تھا۔

اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور اس نے تیزی سے اپنی کمر کے گرد بندھا ہوا خنجر نکال کر میری جانب پھینکا۔ میں ایک دم پیچھے ہٹ گیا اور تیز قدموں سے غار میں چلنے

لگا۔ سارا غار' اس نرتکی کی چیخوں سے گونج رہا تھا۔ دور مجھے روشنی کا ایک دائرہ دکھائی دیا۔ میں نے اس کی جانب دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ روشن دائرہ' اس غار کا دہانہ تھا۔ جہاں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے دہانے سے باہر چھلانگ لگا دی اور خار دار جھاڑیوں میں جا گرا۔ اٹھ کر پیچھے دیکھا تو وہاں نہ کوئی غار تھا' نہ اس کا دہانہ تھا۔

جنگل میں چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں حسب سابق کسی دوسرے ملک میں کسی اجنبی جگہ پہنچ چکا ہوں لیکن اردگرد کی پہاڑیاں مجھے کچھ مانوس لگ رہی تھیں.... میں ایک پہاڑی کے پہلو سے ہو کر دوسری جانب پہنچا تو وہاں دریا بہہ رہا تھا اور دریا کے کنارے برہان پور کی بستی آباد تھی۔ میں نے اس کے مندروں کے کلس اور مسجدوں کے مینار پہچان لئے تھے۔ میں ابھی تک اپنے عہد میں تھا اور برہان پور ہی میں موجود تھا۔

بستی میں آ کر میں اس کارواں سرائے میں ٹھہر گیا جہاں میں چھ سات روز سے قیام پذیر تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس سرائے پر' ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا۔ "یہاں ایک نوجوان آدمی بیٹھا کرتا تھا' وہ کہاں ہے؟"

بوڑھے نے میری طرف دیکھا اور اس لڑکے کا نام پوچھا.... میں نے نام بتایا تو وہ بولا۔
"یہ نام تو میرا ہی ہے مگر تم کون ہو اور اس لڑکے سے کب ملے تھے؟"

میں اس کی بات ٹال گیا اور دل میں کہا کہ اگرچہ مقام نہیں بدلا مگر تاریخ ضرور بدل گئی ہے اور یہ وہی لڑکا ہے جو اب بوڑھا ہو چکا ہے..... اس کا مطلب تھا کہ میرے شمشان بھومی میں داخل ہونے اور غار سے نکلنے میں ساٹھ سال کا عرصہ گزر گیا تھا..... میں نے سرائے سے ایک گھوڑا لیا اور اس پر سوار ہو کر سیدھا دریا کے پرانے گھاٹ پہنچا اور اوپر والی چٹان کی گپھاہ میں آ گیا۔ یہاں سادھو مہاراج کا کرمنڈل اور ترشول' ویسے ہی گپھاہ کی باہر چٹان کے چبوترے پر پڑا تھا لیکن سادھو غائب تھا۔ اتنے میں ایک آدمی تھالی میں پھل مٹھائیاں اور ہار لے کر آیا اور گپھاہ کے باہر چبوترے پر رکھ کر' ادب سے وہیں بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے سادھو مہاراج کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ گرودیو ابھی جنگل سے واپس آ جائیں گے۔ میں نے دیکھا' تھالی میں چاندی کے چند سکے بھی پڑے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک سکہ اٹھا لیا تو اس شخص نے لجاجت سے کہا۔
"یہ گرودیو مہاراج کے لئے ہیں۔"
"میں یہ لوں گا نہیں۔ فکر نہ کرو۔" میں نے کہا۔ سکے پر سکندر لودھی کا نام تھا۔ گویا فیروز تغلق کا دور گزر چکا تھا اور اب میں بہلول لودھی کے بعد سکندر لودھی کے دور میں

نمودار ہوا تھا۔ اب میرا وہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ میں پلٹا ہی تھا کہ ایک نوجوان سادھو' ہاتھ میں تلسی کے پتوں والی ایک شاخ لئے نمودار ہوا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا اور اس سے پہلے والے سادھو مہاراج کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بولا۔ "بچہ.....وہ تو کب کے پرلوک سدھار چکے ہیں۔"

میں خاموشی سے پہاڑی کے نیچے بہتے دریا کو تکنے لگا۔ زندگی کا دریا بہہ رہا تھا' لوگوں کی شکلیں ابھر ابھر کر غائب ہو رہی تھیں۔ میں واپس سرائے میں آ گیا۔ میرا دل اپنے بیوی بچوں سے ملنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ میں نے جنگل سے کچھ جڑی بوٹیاں توڑیں..... یہ بڑی قیمتی جڑی بوٹیاں تھیں اور ایسی جگہوں پر پتھروں کی اوٹ میں اگتی تھیں جن کا عام لوگوں کو علم نہیں ہوتا۔ برہان پور آ کر میں نے ان جڑی بوٹیوں کو فروخت کیا اور دہلی جانے والے ایک قافلے میں شامل ہو کر لودھی بادشاہوں کے پایہ تخت کی طرف روانہ ہو گیا۔

ساٹھ برس میں دہلی کی شاہی عمارتوں اور محلات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ البتہ لوگ بدل گئے تھے جن کو میں بچے چھوڑ کر گیا تھا' وہ بوڑھے ہو چکے تھے' جنہیں بڑھاپے کے عالم میں چھوڑ گیا تھا' وہ مرکھپ چکے تھے۔ میں سیدھا شاہی مہمان خانوں کے قریب اپنی سرخ حویلی میں پہنچ گیا۔ وہاں باہر تخت پر ایک بوڑھا شخص بیٹھا' پتھر سے آہستہ آہستہ زرد چنوں کو پیس رہا تھا۔ ایک عجیب سی پدرانہ شفقت نے میرے اندر جوش مارا۔ میں سلام کر کے اس کی طرف بڑھا تو بوڑھے نے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر سکتے کے عالم میں مجھے دیکھتا رہ گیا۔ "بابا جان! اس کے حلق سے کپکپاتی ہوئی آواز نکلی..... اور میں اشکبار آنکھوں کے ساتھ اس سے لپٹ گیا۔ یہ میرا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ جو میرے جدا ہونے کے وقت پندرہ بیس سال کا ہو گا۔ میں نے اس سے اس کے بھائی اور ماں کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کا جواب میری توقع کے عین مطابق تھا۔ وہ سب مرکھپ چکے تھے اور میرے بوڑھے بیٹے کی گزر اوقات' حویلی کے کرائے پر تھی۔ حویلی میں ایک سوداگر رہتا تھا اور میرا بوڑھا بیٹا' حویلی سے متصل ایک کوٹھری میں رہائش پذیر تھا۔

میں نے حویلی میں کسی کو نہیں بتایا کہ میں اس بوڑھے کا جوان باپ ہوں اور نہ ہی میرے بیٹے نے کسی سے کچھ کہا۔ میں اپنے بوڑھے بیٹے کے پاس رہ گیا اور اس کی خدمت کرنے لگا۔ کچھ دنوں بعد میرے بوڑھے بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ میں نے اسے اس کے بھائی اور ماں کے پہلو میں دفن کر دیا..... اور اپنی حویلی کی کوٹھری میں رہنے لگا۔ حویلی پر میرے بیٹے کے کرایہ دار سوداگر نے قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ کرایہ بھی ادا نہیں کرتا تھا۔ مجھے حویلی' مکان.... اور جائداد کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ میں نے بڑے محلوں کو کھنڈروں میں تبدیل ہوتے اور ان

میں حشرات الارض کو رینگتے دیکھا تھا۔ میں کچھ عرصہ دہلی میں گزار کر اندلس کی طرف روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔

..... پھر سکندر لودھی کا انتقال ہو گیا اور ابراہیم لودھی تخت شاہی پر متمکن ہوا۔ اس وقت تک لودھی کے افغانی امراء اقتدار حاصل کر چکے تھے اور ان کی قوت بڑھ گئی تھی - وہ ابراہیم لودھی سے حسد کرتے تھے۔ ان افغانوں کے انحراف اور غرور کی وجہ سے سلطنت کے کاموں میں بدانتظامی کا دور دورہ تھا۔

دوسری طرف ظہیر الدین بابر' درہ خیبر سے گزر کر ہندوستان کے شمالی علاقوں کو تاراج کرتا' دریائے سندھ کے کنارے پہنچ چکا تھا...... وہاں اس نے تہلاب نام کا ایک قلعہ فتح کیا پھر سندھ پار کر کے' پنجاب کے ایک پرگنے کو فتح کرنے کے بعد' شہنشاہ ہند ابراہیم لودھی کو پیغام بھیجا کہ چونکہ وہ تمام ممالک جن پر لودھی شہنشاہ نے قبضہ کر رکھا ہے' زیادہ تر آل تیمور کے علاقے رہ چکے ہیں اور صاحبقران گورگانی یا اس کی اولاد کا ان پر قبضہ رہا ہے' اس لئے مناسب ہو گا کہ پرگنہ پرہ مع گرد و نواح کے قصبوں کے' بابر شاہ کے حوالے کر دیا جائے..... چونکہ ابراہیم لودھی' بابر شاہ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف تھا اور خود اس کی اپنی صفوں میں استحکام نہیں تھا۔ اس لئے اس نے پرگنہ پرہ اور اس کے گرد و نواح کے علاقے بابر شاہ کے حوالے کر دیئے..... بابر شاہ نے سندھ اور پرہ کے درمیان کے علاقوں کی فرماں روائی محمد علی فنگ کے سپرد کی اور خود کابل واپس چلا گیا۔

پایہ تخت دہلی کی سیاسی اور اقتصادی حالت کسی طور بھی اچھی نہیں تھی۔ لیکن خدا جانے کیا بات تھی کہ میرا اس شہر سے جانے کو اب دل نہیں چاہتا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس شہر بے مثال کی خاک میں میری بیوی اور بچے دفن تھے۔ مجھے اپنی پہلی مصری بیوی سارا سے بھی بہت محبت تھی اور آج سے پانچ ہزار سال پہلے میں نے سرزمین مصر میں بھی اپنے بیوی بچوں کو دفن کیا تھا مگر اس عہد کا تعلق قدیم مصر کے ایک سفاک فرعون سے تھا جو میری جان کا دشمن تھا اور وہاں سے فرار ہونا میری قسمت میں لکھا جا چکا تھا۔ آج سے سات آٹھ سو برس پرانا دہلی مجھے اپنی تمام اندرونی شورشوں اور نفسا نفسی کے عالم کے ساتھ پسند تھا۔

میں اپنی حویلی ہی کی ایک کوٹھری میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ میں نے دنیا دکھاوے کے لئے جڑی بوٹیوں کا کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ میں تیسرے چوتھے روز جنگل میں چلا جاتا اور وہاں سے جڑی بوٹیاں اکٹھی کر کے شہر کے طبیبوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب ہندوستان میں مغل امیر' ظہیر الدین بابر کے ساتھ مل چکے تھے۔ لاہور پر بابر کا قبضہ تھا اور بابر خود کابل میں بیٹھا عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ

ہندوستان پر چار حملے کر چکا تھا۔

تسخیر ہند کا ارادہ لے کر وہ ایک بار پھر کابل سے سندھ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا بیٹا ہمایوں بھی ایک لشکر جرار لے کر بدخشاں پہنچ گیا۔ یکم ربیع الاول کو بابر نے دریائے سندھ عبور کیا۔ وہ سیالکوٹ پہنچا تو سلطان علاء الدین' بابر کی خدمت میں نذرانے لے کر حاضر ہوا۔ کچھ افغان امیر بھی چالیس ہزار کی جمعیت لے کر بابر کے ساتھ آن ملے' شاہ آباد کے قریب ابراہیم لودھی کے ایک لشکر نے مزاحمت کی..... ایک خون ریز جنگ کے بعد ابراہیم لودھی کی فوج کو شکست ہوئی۔ اب میدان جنگ پانی پت کا میدان تھا۔ ابراہیم لودھی کی فوج کی تعداد ایک لاکھ سپاہیوں تک پہنچ گئی تھی اور اس کے ساتھ ایک ہزار جنگی ہاتھی بھی تھے۔ اس کے برعکس بابر کی فوج کی تعداد زیادہ نہیں تھی مگر اس کے پاس سات سو چھوٹی توپیں تھیں۔

جنگ شروع ہوئی۔ لودھی کی فوج نے پہلے تو بہت تیزی اور سرعت دکھائی لیکن بابر کی توپوں نے ان کے منہ پھیرنے شروع کر دیئے۔ فوج میں بے قاعدگی پیدا ہو گئی۔ لودھی اپنی چھ ہزار محافظ فوج کے ساتھ اس جنگ میں ختم ہو گیا اور بابر کو فتح نصیب ہوئی۔ بابر کی فوج جب دہلی میں داخل ہوئی تو شہر میں موت اور دہشت کا سماں تھا۔ ہندوستانی باشندے بابر کی فوج سے ڈرے ہوئے تھے مگر بابر نے تخت پر بیٹھتے ہی خزانے کا منہ کھول دیا اور اس قدر خیرات کی کہ لوگوں کے دل جیت لئے اس کے ساتھ ہی بابر اپنے دشمنوں کے معاملے میں بڑا سنگ دل تھا..... دہلی میں اس نے ابراہیم لودھی کے حامی امیروں اور وزیروں کی کھالیں کھنچوا دی تھیں۔

میری حویلی کا ناجائز مالک سوداگر حشمت خان تھا۔ اس کی ایک خوبصورت کنیز فروشانہ نام کی تھی۔ یہ کنیز کبھی کبھی میرے لئے کوئی پکوان پکا لاتی تھی۔ یہ کنیز ایرانی النسل تھی۔ شہزادہ ہمایوں کی دو کنیزیں بھی ایران سے تعلق رکھتی تھیں..... اور شہزادے کا بہت خیال رکھتی تھیں..... رانا سانگا کی شکست اور اس کے قتل کا داغ سینے پر لئے ایک راجپوت سردار' بابر سے انتقام لینے کے لئے ایک جوگی کے روپ میں دہلی پہنچا۔ اس نے بابر کے بیٹے شہزادہ ہمایوں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور ہمایوں کے محل کے ایک کالستھ ہندو چوبدار کے ذریعے' ہمایوں کی ایرانی کنیزوں سے رابطہ پیدا کر لیا۔ اس نے دونوں کنیزوں کے زائچے بنا کر انہیں بتایا کہ وہ رانیاں بن کر ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔ دونوں کنیزیں اس چرب زبان اور عیار راجپوت کی باتوں میں آ گئیں۔ اسے معلوم تھا کہ ایک کنیز ہمایوں شہزادے کا کھانا اپنی نگرانی میں تیار کرواتی ہے۔ جوگی نے اسے الگ لے جا کر بتایا کہ اس وقت سارے بابرکت ستارے اس کے طالع میں جمع ہیں اور اگر وہ کسی طرح شہزادہ ہمایوں کو

ہلاک کر ڈالے تو بادشاہ اپنے بیٹے کی موت کے صدمے سے خود جاں بحق ہو جائے گا۔ شمال سے تاتاری باغیوں کا گروہ' ملک پر حملہ کرنے والا ہے جس کا سردار قتلغ خان' اس کا دوست ہے اور اس کا ستارہ اس وقت عروج پر ہے۔ وہ اس کی شادی قتلغ خان سے کروا دے گا۔ اس طرح وہ ملکہ بن کر ہند پر حکومت کرے گی۔ کنیز' اس عیار کی باتوں میں آگئی۔ راجپوت جوگی نے اسے ایک خاص قسم کا بے رنگ اور بے ذائقہ زہر دیا کہ وہ اسے شہزادے کے کھانے میں ملا دے۔

کنیز نے شام کو کھانا تیار کروایا اور زہر کا سفوف چپکے سے کھانے میں ملا دیا۔ اس کا ذکر اس نے اپنی بہن سے بھی نہیں کیا۔ شہزادہ ہمایوں کھانا کھانے بیٹھا۔ اس نے ابھی ایک ہی لقمہ کھایا تھا کہ اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور کھانا ایک بلی کے آگے ڈالا گیا۔ جسے کھاتے ہی بلی کا سارا جسم پھول گیا۔ اسی وقت شاہی طبیب کو بلایا گیا اور ایک لقمے کے ساتھ جو زہر شہزادے کے معدے میں گیا تھا' نکال دیا گیا۔

فوراً باورچی' چاشنی گیر اور طعام خاص کی نگران ایرانی کنیز اور اس کی بہن کو گرفتار کر لیا گیا۔ بابر بادشاہ کو اس واقعے کا علم ہوا..... تو اس نے دونوں کنیزوں کو بلا کر ان سے پوچھا۔

"بتاؤ زہر کس نے کھانے میں ملایا تھا؟"

ایرانی کنیز نے تھر تھر کانپتے ہوئے اعتراف کر لیا کہ اس نے ایک جوگی کے کہنے پر ایسا کیا تھا۔ راجپوت جوگی اپنا کام کر کے شہر سے فرار ہو چکا تھا..... مگر بابر نے ایرانیوں کی جانب سے اسے اپنے خلاف ایک سنگین سازش پر محمول کیا کیونکہ انہی دنوں بعض ایرانی سرداروں نے بلوچستان کی طرف سے ہند پر چڑھائی کرنے کی کوشش کی تھی اور دہلی میں یہ افواہ بھی گرم تھی کہ کچھ ایرانی جاسوس بادشاہ کو ہلاک کرنے کے لئے شہر میں داخل ہو گئے ہیں۔ بابر نے دونوں ایرانی کنیزوں کے سر قلم کروا دیئے اور حکم دیا کہ شہر میں جتنے ایرانی موجود ہیں' انہیں گرفتار کر لیا جائے۔

اسی سلسلے میں ایک روز شاہی سپاہی ہماری حویلی بھی پہنچ گئے اور حشمت خان کی ایرانی کنیز فروشانہ کو پکڑ کر لے گئے۔ مجھے فروشانہ کی گرفتاری کی خبر ملی تو بہت افسوس ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔

تین چار روز بعد' ایک رات جبکہ نصف شب کا گجر بج چکا تھا کسی نے میری کوٹھری کے دروازے پر دستک دی میں سمجھا..... کہ حشمت خان کا کوئی مہمان ہے۔ آدھی رات کو مجھ سے بھلا کون ملنے آ سکتا ہے میں نے بستر پر لیٹے ہی لیٹے آواز دی۔ "میاں! حویلی کا دروازہ آگے ہے۔" تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ اس کے بعد پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ میں

نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر اندھیرے میں مجھے ایک انسانی ہیولا نظر آیا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر آ گیا۔ میں نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟" اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے بڑھ کر شمعدان روشن کر دیا۔ وہ سیاہ چمکیلی آنکھوں والا' درمیانے قد اور چھریرے بدن کا مالک ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس نے افغانیوں کا سا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا رنگ گورا اور ناک ایرانیوں کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ وہ میرے سامنے مونڈھے پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"معاف کرنا بھائی! میں تم سے اجازت لئے بغیر اندر آ گیا..... معاملے کی نزاکت کے پیش نظر مجھے ایسا کرنا پڑا۔ میرا نام ہرمز ہے اور میں فروشانہ کا بڑا بھائی ہوں۔"

میں نے اس سے مصافحہ کرنے کے بعد پوچھا کہ آدھی رات کو اسے مجھ سے کیا کام پڑ گیا ہے اور فروشانہ کیسی ہے؟

"فروشانہ ہی نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ شاہی قید خانے کے ایک نگران کو راضی کر کے میں نے چند ثانیے کے لئے فروشانہ سے ملاقات کی تو اس نے بتایا کہ اسے شہزادے کو زہر دینے کی سازش کے الزام میں قتل کیا جانے والا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بے گناہ ہی اور اس کا اس شاہی کنیز سے کوئی تعلق نہیں ہے جس نے شہزادہ ہمایوں کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور اس نے تمہارے نام ایک پیغام بھیجا ہے۔"

میں نے پیغام کے بارے میں پوچھا..... تو فروشانہ کے بھائی نے کہا۔

"فروشانہ نے کہا ہے کہ عبداللہ سے کہنا کہ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ میں بے گناہ ہوں اور وہ مجھے بچائے۔"

"میں تو خود ایک بے سہارا اور گمنام آدمی ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں اسے شاہی قید سے کیسے نکال سکتا ہوں؟"

"فروشانہ ایک نیک' عبادت گزار مسلمان لڑکی ہے۔" ہرمز بولا۔ "میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔" میں اپنے پارسی مذہب پر قائم ہوں لیکن میری بہن فروشانہ ایک معصوم اور پارسا مسلمان لڑکی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ صرف عبداللہ ہی میری جان بچانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ یہ اس پر اس کے دین کی طرف سے بھی فرض ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میری بہن کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ شاید وہ تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔ جبھی اس نے ایسا پیغام بھیجا ہے۔ وہ بھولی لڑکی یہ نہیں جانتی کہ اسے شاہی قید خانے سے کوئی نہیں نکال سکتا۔" پھر وہ اٹھا اور بولا۔ "معاف کرنا عبداللہ بھائی! مجھے اس کا پیغام پہنچانا تھا' سو میں نے پہنچا دیا۔ میں جانتا ہوں کہ میری طرح تم بھی میری بہن کی کوئی مدد نہیں کر سکتے لیکن

مجھے اپنا فرض پورا کرنا تھا۔ اچھا' اب میں چلتا ہوں۔ میں نے تمہیں بے آرام کیا۔ مجھے معاف کر دینا۔"

ہرمز واپس جانے کے لئے مڑا تو میں نے اسے روک کر کہا۔ "ہرمز! ذرا بیٹھو۔" وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ اپنی چھوٹی بہن کے انجام پر بے حد غمگین تھا۔ فروشانہ کا انجام ہمارے سامنے تھا۔ ملک میں چن چن کر ایرانیوں کو قتل کیا جا رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا.... کہ فروشانہ کا زندہ بچنا ناممکن تھا میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کا جذبہ جاگ اٹھا۔ بے شک فروشانہ ایک معصوم اور پارسا کنیز تھی۔ میں نے ایک دو بار اسے نہایت خضوع و خشوع سے خداوند کریم کی عبادت کرتے دیکھا تھا۔ علاوہ ازیں اس نے تھوڑی بہت میری خدمت بھی کی تھی.... وہ بے گناہ تھی اور اسے بچانا میرا فرض تھا..... پھر اس نے مجھ سے مدد کی درخواست بھی کی تھی۔ خدا جانے اسے کیسے یقین آ گیا تھا کہ میں اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ میں نے ہرمز سے پوچھا کہ وہ کہاں رہتا ہے.... اور شاہی زندان کے جس نگران کو اس نے راضی کر کے فروشانہ سے ملاقات کی ہے کیا وہ میری بھی ملاقات کرانے پر آمادہ ہو سکتا ہے؟

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاہی قید خانے کا نگران ایک لالچی آدمی ہے۔ اگر اسے بھاری رشوت دے دی جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ راضی ہو جائے۔ میں شہر کے باہر جمنا کے کنارے ایک بستی میں رہتا ہوں۔ میری کچھ کشتیاں ہیں جن میں سوار ہو کر لوگ دریا پار کرتے ہیں۔ یہی میرا ذریعہ معاش ہے۔"

"میں جڑی بوٹیوں کا دھندا کرتا ہوں۔" میں نے ہرمز کو اپنے بارے میں بتایا۔ "یہ حویلی میرے آباؤ اجداد کی ملکیت تھی مگر اب اس پر ایک سوداگر نے قبضہ کر رکھا ہے۔ اس لئے میرے پاس' شاہی قید خانے کے نگران کو بھاری رشوت دینے کے لئے کوئی رقم نہیں ہے۔" اور یہ حقیقت بھی تھی۔ جب تک میرا سانپ دوست قنطور میرے ساتھ تھا وہ کسی مدفون خزانے پر پہرہ دینے والے سانپ کی مدد سے زمین میں چھپی ہوئی کسی دولت کا تھوڑا سا حصہ نکلوا لیا کرتا تھا مگر اب میرے پاس دولت حاصل کرنے کا ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

"میرے پاس دریا کے کنارے ایک باغ ہے۔" ہرمز بولا۔ "میں وہ باغ فروخت کر دوں گا۔ اور اس کی تمام رقم فروشانہ کی رہائی کے لئے خرچ کر دوں گا۔"

ایک بات صاف ظاہر تھی کہ ان لوگوں کو میری خفیہ طاقتوں کا علم نہیں تھا.... لیکن فروشانہ کو کیسے یقین آ گیا کہ میں اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ میں نے ہرمز کے دل کا حال معلوم کرنے کے لئے اسے کریدا۔ "ہرمز! تمہارے پاس تو اور بھی وسائل ہیں مگر میں تو ایک

عام سا بے یارو مددگار شخص ہوں... پھر میں تمہاری بہن کو شاہی قید خانے سے کیسے نکال سکتا ہوں۔" اس سوال کے ساتھ ہی میں ہرمز کے چہرے کا بغور جائزہ لینے لگا لیکن اس کا چہرہ بے تاثر رہا۔

"میں اس حقیقت سے باخبر ہوں۔" اس نے کہا۔ "مگر میری بہن نے تمہارا نام لیا ہے۔ خدا جانے اسے کیسے یقین آ گیا ہے کہ نہ صرف تم ہی اس کی مدد کر سکتے ہو۔ بہرحال' میں اس کا بھائی ہوں... میں اسے قتل ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اگر تم بھی میرے ساتھ مل جاؤ تو ہم ایک سے دو ہو جائیں گے۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔"

مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میری خفیہ طاقت سے بے خبر ہے.... میں نے ہرمز سے کہا۔ "بہتر ہے' میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھ سے جو ہو سکا تمہارے لئے کروں گا۔ مجھے بتاؤ مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

ہرمز کے چہرے پر میں نے مسرت کے تاثرات دیکھے۔ وہ جلدی سے بولا۔ "تم میرا انتظار کرنا۔ میں شاہی نگران سے رابطہ قائم کرنے کے بعد تمہیں آ کر اطلاع کر دوں گا۔"

میں نے کہا کہ وقت تھوڑا ہے' اگر ہمیں کچھ کرنا ہے تو پھر زیادہ انتظار فروشانہ کے حق میں مہلک ثابت ہو گا۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں ایک پل بھی ضائع نہیں کروں گا۔ عبداللہ بھائی۔" یہ کہہ کر وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ میں نے کوٹھری کا دروازہ بند کر لیا اور فروشانہ کو شاہی قید خانے سے نکالنے کے بارے میں غور کرنے لگا۔ اگلے روز میں کچھ جڑی بوٹیاں تھیلے میں رکھ کر بازار گیا تو ایک افواہ گرم تھی کہ جن ایرانی لوگوں کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے انہیں قلعے کے اندر ہاتھیوں سے کچلوا دیا گیا ہے۔ مجھے تشویش ہوئی۔ بادشاہوں کے فیصلے ایک ثانیے میں ہو جاتے تھے اور اسی وقت ان پر عمل بھی کر دیا جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ افواہ درست ہو۔ مجھے فروشانہ کی موت کا صدمہ ہوا۔ دوپہر کے بعد واپس اپنی حویلی میں آیا تو ڈیوڑھی کے باہر فروشانہ کا بھائی ہرمز نیم کے پیڑ تلے بے چینی سے ٹہلتا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں اسے اپنی کوٹھری میں لے آیا۔

"تم نے افواہ سنی جو شہر میں گشت کر رہی ہے۔"

ہرمز بولا۔ "ہاں۔ مگر اس میں کوئی سچائی نہیں۔ میں نے آج صبح شاہی قید خانے کے نگران سے ملاقات کی ہے۔ فروشانہ ابھی زندہ ہے۔ کچھ باغیوں کو ضرور ہاتھیوں کے آگے ڈالا گیا ہے مگر فروشانہ ابھی زندہ ہے۔ شاہی نگران کو میں نے بھاری رقم دے دی ہے۔"

میں نے پوچھا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہو گا؟ ہرمز نے جو منصوبہ بنایا تھا' مجھے سنا دیا۔ یہ

منصوبہ بقول اس کے، اس نے شاہی نگران کے ساتھ مل کر تیار کیا تھا۔ منصوبہ یہ تھا۔ شاہی قید خانہ قلعے کے شمال مغرب کی جانب ایک تہہ خانے میں تھا۔ شاہی نگران نے فروشانہ کو قید خانے کی پہلی کوٹھری میں منتقل کر دیا تھا۔ بارہ بجے رات کے بعد اس کا پہرہ بدلتا تھا۔ اس نے منصوبہ یہ بنایا تھا۔ کہ جب آدھی رات کا گجر بجے گا اور اس کی جگہ دوسرا سپاہی پہرہ دینے آئے گا تو وہ اسے ایک خواب آور مشروب کسی طریقے سے پلا دے گا۔ اس کے بعد سارا کام ہمیں کرنا ہو گا۔ کیونکہ ہمارا ہم راز شاہی پہرے دار اس کے بعد وہاں سے چلا جائے گا تا کہ بعد میں وہ نہ پکڑا جائے۔ اس منصوبے کے مطابق ہمیں اپنے طور پر قلعے کی چھت پر چڑھ کر نیچے شاہی قیدخانے تک جانا ہو گا اور خواب زدہ پہرے دار کو ہلاک کر کے فروشانہ کو وہاں سے نکال کر لے جانا ہو گا۔ شاہی نگران اس سے زیادہ ہماری مدد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر آنے والے پہرے دار کو بے ہوش کر دے گا اور یہ وہ کام ہے جو ہم کبھی نہیں کر سکتے تھے۔ بس یہی ہمارے لئے سنہرا موقع ہو گا۔

میں نے کہا۔ "لیکن چھت پر چڑھنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ وہاں قدم قدم پر پہرہ ہوتا ہے۔ ہم زندہ نہیں بچیں گے۔"

ہرمز نے سر جھکا لیا اور آنکھوں میں آنسو لا کر بولا۔ "میں اپنی پیاری بہن کے لئے اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔ میں یہ خطرہ مول لے کر قلعے کی دیوار پر چڑھوں گا۔ مر گیا تو میری روح کو کم از کم اتنی تسکین تو ضرور ہو گی کہ میں نے اپنی بے گناہ بہن کی جان بچاتے ہوئے، جان دی تھی۔"

مجھے ہرمز پر ترس آ گیا۔ لامحالہ مجھے یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ اس کی جگہ میں قلعے کی چھت پر چڑھوں گا۔ کیونکہ مجھے اپنی جان کا خطرہ نہیں تھا۔ میں نے ہرمز کو یہ تو نہیں بتایا کہ مجھے جان کا خطرہ نہیں ہے لیکن اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تم فکر نہ کرو، یہ کام میں سرانجام دوں گا۔ اگرچہ اس میں جان جانے کا قدم قدم پر امکان ہے، مگر میں تمہاری بے گناہ بہن کے لئے یہ خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔ میں نے محسوس کر لیا کہ ہرمز نے میری اس بظاہر خودکشی کی پیش کش پر زیادہ ہمدردانہ رویے کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ یہ کہہ کر میری پیش کش کی تصدیق کر دی کہ وہ میرا یہ احسان ساری عمر نہیں بھولے گا۔ مجھے کچھ حیرت ضرور ہوئی تاہم وہ کہنے لگا۔

"میرے بھائی عبداللہ! میں تمہارے ساتھ ہوں گا... تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا۔"

وہ میری زیادہ مدد نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے کوئی تعرض نہ کیا اور طے پایا کہ ہم

آج رات اندھیرے میں قلعے کی چھت پر چڑھیں گے۔ یہ کام آسان اور سہل نہیں تھا۔ میرے سوا کوئی بھی آدمی اس کام کا بیڑا اٹھاتا تو اس کی موت یقینی تھی۔ لیکن میں یہ مرحلہ طے کر سکتا تھا۔ رات ہونے تک میں نے سارا ضروری سامان جمع کر لیا تھا۔ جب رات گہری ہو گئی تو ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے کی طرف چل پڑے۔ دن کے وقت ہم نے خاص خاص جگہوں کو نگاہوں میں رکھ لیا تھا۔ قلعے کے عقب میں پانی سے بھری ہوئی کھائی تھی۔ ہم نے سیاہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ کمر کے گرد پیش قبض لگے ہوئے تھے۔ ایک خاص کمند بھی ہمارے پاس تھی جس کے آگے بڑا مضبوط آنکڑا لگا تھا۔

ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ ہم گھوڑوں کو قدم قدم چلاتے قلعے کے عقب میں کھائی سے کچھ فاصلے پر ایک ویران باغ میں آ کر رک گئے۔ گھوڑوں کو آم کے جھنڈ میں ایک جگہ باندھا اور کھائی کی طرف چلے۔ ہم خاموش تھے اور ضروری بات سرگوشی میں کرتے تھے۔ آدھی رات کا گجر بجنے میں ابھی آدھا پہر باقی تھا۔ منصوبے کے مطابق ہمیں آدھی رات کا گجر بجنے کے وقت قلعے کی چھت پر ہونا چاہئے تھا۔ صبح کے وقت ہم نے سرکنڈوں کو جوڑ کر ایک گٹھا بنا کر جھاڑیوں میں چھپا دیا تھا۔ اندھیرے میں ہم نے وہ گٹھا جھاڑیوں میں سے نکالا اور اسے کھائی کے پانی میں ڈال دیا۔ ہم اس پر اوندھے منہ لیٹ گئے اور بازوؤں کو چپوؤں کی طرح چلاتے ہوئے کھائی کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ اب ہم قلعے کی عظیم الشان عقبی دیوار کے نیچے اندھیرے میں کھڑے تھے۔ کچھ فاصلے پر قلعے کے اوپر بائیں جانب ایک برجی بنی تھی - جس میں ایک مشعل روشن تھی۔ اس کی روشنی میں ایک سپاہی نیزہ اٹھائے پہرہ دے رہا تھا۔ میں نے اندھیرے میں قلعے کی دیوار کا جائزہ لیا۔ پرانا قلعہ تھا جو آج ایک کھنڈر بن چکا ہے۔ اس زمانے میں اس کی دیواریں شکستہ حالت میں نہیں تھیں۔ میں نے اندھیرے میں قلعے کے اوپر کنگروں کو دیکھا۔ یہی میرا نشانہ تھا۔ میں نے سرگوشی میں ہرمز سے کہا۔ "میں اکیلا اوپر جاؤں گا۔ تم یہاں ٹھہرو گے۔" وہ کچھ کہنے لگا میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ ہم جلدی سے دیوار کے ساتھ چپک گئے۔ دو مغل سپاہی گشت کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ ان کی زرہ بکتر اندھیرے میں چمک رہی تھی۔ میں چوکس ہو گیا لیکن وہ ہمارے قریب سے گزر گئے۔ میں نے اپنی سانس روک لی تھی۔ جب وہ کافی دور جا کر قلعے کی دیوار کے ساتھ گھوم گئے تو میں نے کمند گھما کر دیوار پر پھینکی۔ اس کا آنکڑا قلعے کے کنگرے میں پھنس گیا۔ کمند مضبوط تھی۔ میں نے ہرمز کو ایک بار پھر تاکید کی وہ اسی جگہ اندھیرے میں چھپا رہے اور خود جتنی تیزی سے ہو سکتا تھا کمند کی مدد سے قلعے کی دیوار پر

چڑھ گیا۔ کنگرے کو پکڑ کر میں چھت پر آ گیا اور کمند کو اوپر کھینچ کر ایک طرف چھپا کر ر
دیا۔ کچھ فاصلے پر برج میں مشعل کی روشنی ہو رہی تھی اور ایک سپاہی وہاں کھڑا پہرہ دے ر
تھا مگر یہ روشنی مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں ہرمز کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق
جھک کر قلعے کی چھت پر چلتا ایک بارہ دری کے پہلو میں آ گیا۔ یہاں سے ایک زینہ نیچے جا
تھا۔ بارہ دری کے چبوترے کے دروازے پر ایک سپاہی پہرے پر موجود تھا مگر شاہی نگرا
اپنا وعدہ پورا کر چکا تھا۔ یہ سپاہی چبوترے کی دیوار سے ٹیک لگائے مدہوش بیٹھا تھا۔ م
دبے پاؤں چلتا اس کے قریب آیا۔ پیش قبض نکال کر میں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا
میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا اس کے قریب سے نکل کر زینے پر آ گیا۔ پتھر کے ٹکڑوں
جوڑ کر بنایا گیا زینہ نیچے تہہ خانے کے دروازے تک جاتا تھا۔ یہ دروازہ بند تھا۔ مگر میر
لئے اسے کھولنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ میں نے کندھے کا زور لگایا اور دروازے کا ایک پ
اکھڑ کر الگ ہو گیا۔

سامنے ایک تنگ و تاریک غار میں کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں میں نے پہلی کوٹھری ک
تالے کو توڑ ڈالا۔ اندر دیا جل رہا تھا اس کی روشنی میں میں نے فروشانہ کو دیکھا' اس ک
رنگت زرد تھی' آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور بال شانوں پر پریشان تھے۔ میر
صورت دیکھتے ہی اس کے حلق سے خوشی کی ایک چیخ سی نکل گئی۔ میں نے آگے بڑھ ک
اسے تسلی دی اور کہا کہ فوراً میرے ساتھ یہاں سے نکل چلے۔ وہ پہلے ہی تیار بیٹھی تھی
اٹھی اور میرے پیچھے پیچھے کوٹھری سے نکل کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ بارہ دری کے باہر مغ
سپاہی اسی طرح مدہوش بیٹھا تھا۔ میں نے فروشانہ کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ قلعے کی چھت پر بر
میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے فروشانہ سے آگے بڑھنے کو کہا۔ ہم ایک طرح سے رینگ
رینگ کر چلتے اس کے کنگرے کے پاس آ گئے جہاں میں نے کمند چھپائی تھی۔

میں نے قلعے کی دیوار سے نیچے دیکھا۔ کھائی کے کنارے پر کوئی سپاہی نہیں تھا۔ اندھیر
بہت زیادہ تھا مگر مجھے ہر شے دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے کمند کو نیچے لٹکا
دیا۔ پھر فروشانہ کو سنبھال کر دیوار کے ساتھ پاؤں ٹکا کر نیچے اترنے لگا میرے پاؤں زمین کے
ساتھ لگے تو میں نے اسے دیوار کے اندھیرے میں کر دیا۔ یہاں ہرمز پہلے ہی سے چھپا ہوا
انتظار کر رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں اس سے کہا کہ وہ فروشانہ کو لے کر فوراً کھائی پار کر
لے میں اس کے پیچھے پیچھے تیر کر آؤں گا۔

چند لمحوں بعد ہم فروشانہ کو لئے قلعے کے عقبی ویران جنگل سے گزر رہے تھے۔ ہرمز
اور فروشانہ ایک ہی گھوڑے پر سوار تھے۔ میں دوسرے گھوڑے پر ان کے ساتھ ساتھ تھا

جنگل سے نکل کر ہم نے گھوڑوں کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور وہ سرپٹ دوڑنے لگے۔
ہماری منزل' شہر کے مشرق میں پارسیوں کا لاشوں کا مینار تھا۔ یہ جگہ ہرمز نے فروشانہ کو
چھپانے کے لئے خاص طور پر چنی تھی۔ یہاں شہر کے پارسی' لاشوں کو مینار کے اوپر رکھ کر
گدھوں کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ اس مینار کے نیچے ایک گہرا کنواں تھا۔ جب گدھ لاش
کا گوشت چٹ کر جاتے تو مردوں کی ہڈیاں اس کنویں میں پھینک دی جاتی تھیں۔ یہاں
مردوں کو ٹھکانے لگانے والے کو بھی ہرمز نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اس لاشوں کے مینار کے
نیچے کنویں کے پہلو میں ایک زمین دوز کوٹھری تھی جہاں..... پارسیوں کی لاشوں پر مالش
کرنے والی دوائیں اور عجیب عجیب قسم کے تیل کی بوتلیں رکھی تھیں۔ ہم فروشانہ کو یہاں
لے آئے۔ ہرمز اور فروشانہ بڑے خوش تھے..... فروشانہ میرا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ ہرمز
گھوڑوں کو کسی خفیہ مقام پر باندھنے کے لئے کوٹھری سے نکل کر اوپر گیا تو فروشانہ کہنے لگی۔
"مجھے یقین نہیں تھا کہ تم میرے لئے اپنی جان کی بازی لگا دو گے۔ مگر ہرمز کا خیال درست
نکلا۔"

"کون سا خیال؟" میں نے پوچھا۔

"ہرمز نے مجھ سے کہا تھا کہ عبداللہ ہی مجھے یہاں سے نکال سکتا ہے۔ اس نے مجھے
یقین دلایا کہ عبداللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ میں نے تمہیں پیغام بھیجا کہ مجھے
یہاں سے نکالو۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔"

میں ایک لمحے کے لئے چونکا۔ ہرمز کو کیسے پتہ چلا کہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔
ہرمز مجھے ایک گہرا اور پراسرار آدمی لگنے لگا تھا۔ میں نے فروشانہ سے پوچھا۔ "کیا ہرمز تمہارا
بھائی ہے؟"

"میرا چچازاد ہے۔ کبھی کبھی مجھ سے ملنے حویلی میں آیا کرتا تھا۔"

گویا ہرمز' فروشانہ کا سگا بھائی نہیں تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ سوال یہ تھا کہ ہرمز کو کیا پڑی
تھی کہ اپنی چچا زاد کو شاہی قید خانے سے نکالنے کے لئے اتنی رقم خرچ کرے۔ جبکہ فروشانہ
کی زبانی یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ ہرمز اس سے کبھی کبھی ملنے آیا کرتا تھا۔ ہرمز کی بیوی
ایران میں موجود تھی۔ فروشانہ نے اس بات کی بھی تصدیق کر دی کہ ہرمز نے اسلام قبول
نہیں کیا تھا جبکہ اس کے خاندان کے باقی تمام افراد مسلمان ہو چکے تھے۔ ہرمز میرے لئے
ایک معمہ بن گیا تھا۔ بار بار میرے دل میں یہی خیال آتا کہ اسے کیسے پتہ چلا کہ مجھے کوئی
نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ کہیں وہ میری خفیہ طاقتوں سے باخبر تو نہیں ہو گیا لیکن یہ کیسے ممکن
تھا۔ ہرمز سے میری پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہاں میرا کوئی دوست اور ہم راز نہیں

تھا۔ بہرحال، میں نے فیصلہ کر لیا کہ ہرمز سے دور رہوں گا۔ ویسے بھی اب مجھے ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ فروشانہ شہر کی فصیل سے کسی طرح باہر نکل کر اپنے ملک ایران کی طرف کوچ کر جائے تاکہ اس کی زندگی محفوظ ہو جائے۔ میں نے ہرمز سے پوچھا کہ فروشانہ کو شہر سے نکال کر، ملک ایران کی طرف لے جانے کے لئے اس کا کیا منصوبہ ہے؟ اس نے بتایا کہ ابھی کچھ روز تک فروشانہ اسی مردوں کے مینار کے تہہ خانے میں چھپی رہے گی۔ جب ذرا حالات معمول پر آجائیں گے تو وہ اسے اپنے ایک پارسی دوست کی مدد سے شہر سے نکال کر ملک ایران کی طرف لے جائے گا۔ جب میں جانے لگا تو ایران کنیز فروشانہ مجھے ایک طرف لے گئی اور بولی۔

"عبداللہ! تم مجھ سے ملنے آتے رہنا مجھے یہاں ڈر لگتا ہے۔"

"تم اپنے چچازاد کی حفاظت میں ہو۔" میں نے کہا۔

"عبداللہ! مجھے سوائے تمہارے یہاں کوئی بھی اپنا ہمدرد دکھائی نہیں دیتا۔"

میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں ہر رات اس کی خیر و عافیت دریافت کرنے آتا رہوں گا۔ اس کا ذکر میں نے قصداً ہرمز سے نہیں کیا تھا۔ میں اس پر اسرار پارسی کے دل کا حال معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں ان لوگوں کو لاشوں کے مینار کے نیچے چھوڑ کر واپس روانہ ہوا۔ رات ڈھل چکی تھی اور مشرق میں صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ میں اپنی حویلی میں پہنچ گیا۔ گھوڑے کو اصطبل میں باندھا پھر اپنی کوٹھری میں آ کر چارپائی پر لیٹ گیا اور ہرمز کے بارے میں غور کرنے لگا۔ جس زمانے میں ایران میں زرتشت کا مذہب عروج پر تھا اور اسے عظیم ایران شہنشاہ سائرس کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ اس زمانے میں، میں نے کچھ وقت ایران کے پایہ تخت میں گزارا تھا۔ وہاں مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس عہد کے پارسی آتش پرستوں میں جادو ٹونے کا بہت رواج تھا اور وہ اپنی مقدس کتاب "اوستا" کے بعض خفیہ اشلوکوں کی مدد سے خفیہ طاقتوں کا علم حاصل کر لیتے تھے۔ میں نے سوچا کہ ہرمز بھی پارسی ہے ہو سکتا ہے اس نے مقدس کتاب "اوستا" کے کسی اشلوک کی مدد سے میری خفیہ طاقت کا حال معلوم کر لیا ہو مگر یہ معمہ ابھی تک حل طلب تھا۔

دن چڑھا تو شاہی رازداری کے باوجود شہر میں یہ افواہ گرم تھی کہ ایک باغی ایرانی کنیز، شاہی جیل توڑ کر فرار ہو گئی ہے۔ اور مغل سپاہی جگہ جگہ اس کی تلاش میں چھاپے مار رہے ہیں۔ سب سے پہلے تو میری حویلی میں مغل سپاہیوں کا ایک دستہ آ گیا۔ حویلی کے کونے کونے کی تلاشی لی گئی۔ سپاہی، حشمت خان سوداگر کو پکڑ کر لے جانے لگے تو اس نے کچھ قیمتی جواہرات دے کر اپنی اور اپنے اہل خانہ کی جان بچائی۔ مغل سپاہیوں نے میری طرف

رخ کیا اور پوچھا کہ فروشانہ تمہاری پاس تو نہیں آئی؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں یہاں کوٹھری میں پڑا ہوں۔ جڑی بوٹیوں کا دھندا کرتا ہوں۔ میرا کسی ایرانی کنیز سے کبھی واسطہ نہیں رہا۔ سالار دستہ کو میری بات کا یقین آ گیا۔ مغل سپاہی واپس چلے گئے۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں اپنے آپ کو اس نئی پریشانی میں نہیں الجھانا چاہتا تھا مجھے فروشانہ کی طرف سے تشویش تھی - جانے کیوں فروشانہ ہرمز کے بظاہر ہمدردانہ سلوک سے کچھ فکر مند تھی۔ میں نے وہ دن شہر میں گھومتے گزار دیا۔ جب سورج چھپ گیا، شہر کے مکانوں میں چراغ روشن ہو گئے اور پھر شام کے سائے، رات کے اندھیروں میں تحلیل ہو گئے تو میں گھوڑے پر سوار ہو کر حویلی سے نکلا اور پارسیوں کے مردہ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

مردہ گھر پر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اس کا چھوٹی اینٹ کا پرانا مینار تاریکی میں آسمان کی طرف انگلی اٹھائے کھڑا تھا۔ میں نے گھوڑے کو باہر درخت کے نیچے باندھا اور لاشوں کے کنویں کے ایک دروازے سے گزر کر اندر ڈیوڑھی میں آ گیا۔ یہاں بھی اندھیرا تھا۔ میں سیڑھیاں اتر کر اس کوٹھری میں گیا جہاں فروشانہ کو موجود ہونا چاہئے تھا مگر وہ وہاں نہ تھی - میں نے سوچا شاید اسے کسی دوسری کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا ہو۔ دوسری کوٹھری میں گیا تو دیکھا کہ چبوترے پر ایک پتھر کا بنا ہوا لمبا ٹب پڑا تھا۔ طاق میں ایک چراغ روشن تھا۔ جونہی میں نے ٹب میں جھانک کر دیکھا تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ٹب میں ایرانی کنیز فروشانہ کی لاش تیزاب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تیزاب سے ہلکے ہلکے بلبلے اٹھ رہے تھے۔ فروشانہ کا جسم گلنے لگا تھا۔ میں پریشانی اور تذبذب کی حالت میں کھڑا فروشانہ کی گلتی ہوئی لاش کو دیکھ رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے چبوترے سے اتر کر دیوار کے پاس پڑے بہت بڑے مٹکے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں کوٹھری کے دروازے پر لگی تھیں۔ اتنے میں دو آدمی نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک تو ہرمز تھا اور دوسرا کوئی پارسی پجاری تھا۔ اس نے سر پر سیاہ رومال باندھ رکھا تھا اور کمر کے گرد بڑی تسبیح لٹک رہی تھی۔ دونوں فروشانہ کی لاش کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ "سپتما! میں نے اپنا کام پورا کر دیا ہے۔ فروشانہ کی لاش تمہارے سامنے تیزاب میں ڈوبی پڑی ہے۔ اب تم اس پر "اوستا" کا آخری اور کارگر منتر پھونکو تاکہ میں بعد میں لاش کی گردن کاٹ کر اس کی کھوپڑی کا کاسہ تمہارے سامنے پیش کر سکوں۔"

میں یہ سن کر کانپ سا گیا۔ اس سنگ دل بھائی نے خدا جانے کس لالچ کے پیش نظر اپنی چچا زاد کو تیزاب کے ٹب میں ڈال کر ہلاک کر دیا تھا اور اب اس کی گردن کاٹ کر اس کی کھوپڑی اس پارسی جادوگر کے سامنے پیش کرنے والا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس

سارے بھیانک اقدام سے اس کا مقصد کیا ہے؟ پارسی جادوگر نے اپنے لمبے سیاہ چوغے کی جیب سے ایک چمڑے کی بوتل نکالی اور اس میں سے سیاہ رنگ کا سفوف اپنی بائیں ہتھیلی پر ڈال کر "اوستا" کے اشلوک پڑھنے لگا۔ پھر رک کر ہرمز سے بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ یہی وہ لڑکی ہے جس کی کھوپڑی کے اندر کی جانب ہڈی پر عظیم الشان ایرانی شہنشاہ سائرس کے مدفون خزانے کے خفیہ اشارے لکھے ہوئے ہیں۔ میں ایک بار پھر تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس خزانے کے آدھے حصے پر میرا بھی حق ہو گا۔"

ہرمز نے بے تابی سے کہا۔ "سیتما! مجھ پر بھروسہ رکھو" میں نے جو وعدہ کیا ہے..... اسے پورا کروں گا۔"

پارسی جادوگر بولا۔ "یہ مت بھولنا کہ اگر تم نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو میں اپنے منتر کے زور سے تمہیں ہمیشہ کے لئے پتھر کا بنا دوں گا۔"

ہرمز جلدی سے بولا۔ "سیتما! تم اپنا عمل شروع کرو اور میری طرف سے مطمئن رہو۔ میں کم از کم تمہیں دھوکا نہیں دے سکتا۔"

اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ ان سفاک لوگوں نے سائرس کے مدفون خزانے کو حاصل کرنے کے لئے بے گناہ ایرانی کنیز کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ پارسی جادوگر منتر پڑھنے لگا۔ یہ منتر کسی ایسی الٹی سیدھی زبان میں تھے کہ خود میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ ہرمز نے تلوار نکال لی اور فروشانہ کی گردن پر ایک وار کیا اور پھر اس کے سر کو تلوار کی نوک میں پرو کر ٹب سے باہر نکال لیا۔ پارسی جادوگر کے منتر پڑھنے کی آواز تیز ہو گئی۔ معصوم ایرانی کنیز کے اس ہولناک انجام پر میرا خون کھولنے لگا۔ میں شدید غصے کے عالم میں مٹکے کے پیچھے سے نکل کر پارسی جادوگر کی طرف جھپٹا تو ہرمز اور پارسی جادوگر مجھے دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ ہرمز کے ہاتھ سے تلوار چھٹ کر گر پڑی۔ اس نے چبوترے پر سے چھلانگ لگا دی۔ شاید اس لئے کہ وہ میری خفیہ طاقت سے باخبر تھا۔ میں نے لپک کر پارسی جادوگر کو اٹھایا اور تیزاب کے ٹب میں جھونک دیا۔ اس کی چیخ بلند ہوئی مگر اس عرصے میں وہ اپنی ہتھیلی پر رکھا ہوا جادوئی سفوف میرے چہرے پر پھینک چکا تھا۔ تیزاب میں گرتے ہی وہ ٹب میں سے تڑپ کر باہر نکل آیا۔ مگر تیزاب نے اس کے جسم کے گوشت کو ادھیڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ چبوترے پر گر کر تڑپنے لگا۔ میں ہرمز کی طرف لپکا۔ ہرمز باہر کی طرف دوڑا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے پاؤں بھاری ہو رہے ہیں۔ میرے ہاتھوں اور بازوؤں میں ایک بوجھل قسم کی ٹھنڈک سرایت کر رہی تھی اور مجھے اپنے بازوؤں اور جسم کا بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔ پارسی جادوگر نے آخری بار سسکتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہرمز! میرا

جادو اس پر اثر کر چکا ہے۔ اسے میرا جادو ہلاک نہیں کر سکتا مگر یہ پتھر ہو جائے گا اسے پتھر کی مورتی میں بدل دیا ہے" میں نے دیکھا کہ پارسی جادوگر کی آواز بند ہو گئی۔ منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ گوشت نیچے لٹک گیا اور کھوپڑی کے دانت نظر آنے لگے۔ اب میری حالت بھی غیر ہونے لگی تھی۔ پہلے میرے جو پاؤں مجھے من من وزنی لگے تھے اب پتھر کی طرح اپنی جگہ پر جم چکے تھے۔ میرے باقی بدن کی بھی یہی کیفیت تھی۔ میں نے حرکت کرنے کی کوشش کی۔ میں اپنی جگہ سے بالکل نہ ہل سکا۔ ہرمز واپس کوٹھری میں آ گیا۔ وہ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا پھر اس نے زمین پر گری ہوئی اپنی تلوار کو فروشانہ کی گردن سے کھینچ کر نکالا اور اس کی نوک میرے پیٹ میں چبھوئی۔ تلوار کی نوک میرے پیٹ پر اچٹ گئی۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس نے جلدی جلدی فروشانہ کے سر پر سے ادھڑے ہوئے گوشت کو تلوار کی مدد سے ہٹایا۔ نیچے سے بدنصیب کنیز کی کھوپڑی نکل آئی۔ اس نے کھوپڑی کو داہنے رخ سے کاٹ دیا۔ سفید مغز کو جھاڑا اور پھر کھوپڑی کی اندر کی جانب ہڈی کو چراغ کی روشنی میں جا کر دیکھا۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اسے فروشانہ کی کھوپڑی کے اندر ہڈی پر سائرس کے مدفون خزانے کے خفیہ اشارے مل گئے تھے۔ یہ اشارے فروشانہ کی کھوپڑی میں کس نے درج کئے تھے؟ یہ راز میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔

ہرمز نے کھوپڑی کو ایک طرف رکھ دیا اور میری طرف متوجہ ہوا۔ اس وقت تک میں مکمل طور پر پتھر کے بت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ لیکن میں دیکھ سکتا تھا' سن سکتا تھا اور فضا کو سونگھ سکتا تھا مگر اپنی جگہ سے نہ تو ہل سکتا تھا اور نہ ہی کوئی حرکت کر سکتا تھا۔ ہرمز نے مجھے ایک مجسمے کی طرح اپنے کاندھے پر اٹھایا اور دوسری کوٹھری کی اندھیری سیڑھیاں اتر کر ایک ایسے پوشیدہ تہہ خانے میں لے آیا جہاں مردوں کی بے شمار ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ پاس ہی گندے پانی کا ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ یہاں دیوار کے ساتھ لوہے کے بڑے بڑے ٹب پڑے تھے۔ اس نے مجھے ایک ٹب میں ڈال دیا۔ اس ٹب میں کیسری رنگ کا کوئی گاڑھا محلول بھرا ہوا تھا۔ اس محلول کی ایک موٹی تہہ مجھ پر چڑھ گئی۔ جب اس نے مجھے باہر نکالا تو میں کیسری رنگ کا ایک بت بن چکا تھا۔ ہرمز نے ایک چھری کی مدد سے میرے چہرے پر چڑھی ہوئی محلول کی موٹی تہہ کو جو اب خشک ہو چکی تھی چھیل کر میرے نقش بدلنے شروع کر دیئے۔ آدھے گھنٹے تک وہ میرے ناک نقشے کو بدلتا رہا۔ اتنی دیر میں میرا جسم خشک ہو گیا تھا اور محلول کی تہہ پتھر بن چکی تھی۔ میں اپنی شکل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لئے مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میری شکل کس دیوتا یا اوتار کی شکل میں تبدیل کر دی گئی ہے۔ جب ہرمز اپنے کام سے فارغ ہو گیا تو اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"میں تمہیں مار نہیں سکتا تھا۔ مگر تمہاری وہ حالت کر دی ہے کہ تم مردوں سے بھی بدتر ہو۔ میں نے تمہیں ایک ایسے راکھشش کی شکل دے دی ہے جس کو جنوبی ہند کے ہندو لوگ منحوس سمجھتے ہیں اور اس کا بت بنا کر اسے زمین میں گاڑ دیتے ہیں اور اس پر مردہ سانپ چڑھاتے ہیں۔ میں اپنے پارسی جادوگر کا شکرگزار ہوں کہ اس کے طلسم نے مجھے ہمیشہ کے لئے تم سے نجات دلا دی۔ اب جاؤ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نحوست کے تاریک سایوں میں اتر جاؤ۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے اٹھایا اور گندے پانی کے نالے میں پھینک دیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میرا سارا جسم پانی میں ڈوب گیا صرف میری گردن پانی سے باہر تھی۔ پانی کا بہاؤ مجھے لے کر آگے کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میں اپنی آنکھیں گھما نہیں سکتا تھا۔ میری آنکھیں بالکل سیدھ میں ہی رہتی تھیں۔ ایک طرح سے وہ پتھر ہو گئی تھیں مگر میں دیکھ سکتا تھا۔

نالہ ایک تاریک سرنگ میں سے گزر رہا تھا۔ پانی کی رفتار تیز نہیں تھی۔ کچھ دیر سرنگ میں سے گزرنے کے بعد پانی کی رفتار تیز ہو گئی۔ سرنگ میں روشنی ہونے لگی۔ روشنی ایسی تھی جیسے ستارے چمک رہے ہوں۔ پھر مجھے ٹھنڈی اور تازہ ہوا کا احساس ہوا۔ ایک لہر نے مجھے سیدھا کر دیا۔ میں نے دیکھا آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے۔ میں گندے پانی کے نالے سے نکل کر کسی دریا کے تنگ پاٹ میں سے گزر رہا تھا اردگرد اونچے اونچے بانس کے درختوں کے جھنڈ پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر ساکت کھڑے تھے۔ تاریکی میں وہ کوئی دیوزاد لگ رہے تھے ہوا میں مرطوب جھاڑیوں کی مہک تھی۔ ساری رات میں دریا میں بہتا رہا۔ صبح کا سورج نکلا تو دریا پہاڑیوں میں سے نکل کر ایک وادی میں سے گزر رہا تھا۔ لہریں مجھے کنارے کی طرف لئے آئی تھیں۔ کنارے پر سرکنڈے اگے ہوئے تھے۔ میرا پتھر کا جسم ان سرکنڈوں میں پھنس کر ایک جگہ ٹھہر گیا۔ میں ساکت پڑا رہا۔ ان سرکنڈوں میں پڑے پڑے مجھے کافی دیر گزر گئی تو مجھے پانی میں شپ شپ کی آواز سنائی دی۔ یہ کسی کشتی کے چپوؤں کی آواز تھی۔ یہ کشتی میرے سر کی جانب سے آ رہی تھی۔ اس کے بعد وہی کچھ ہوا جس کی پیش گوئی پارسی ہرمزنے کی تھی۔ یہ دو ماہی گیر تھے۔ میرے بت کو سرکنڈوں میں پھنسا ہوا دیکھ کر انہوں نے شور مچا دیا۔ وہ گاؤں کے لوگوں کو پکار رہے تھے۔ میرا بت نحس ہونے کے ساتھ ساتھ اس اعتبار سے خوش آئند بھی سمجھا جاتا تھا کہ لوگوں کی بستی کی نحوست ایک جگہ جمع کر کے انہیں منحوس اثرات سے نجات دلا دیتا تھا۔

یہ جنوبی ہند کے ایک مہادیر جینی قبیلے کا گاؤں تھا۔ یہ لوگ جین مت کے پیرو تھے۔ انہوں نے میرے بت کو گاؤں کے باہر ایک جگہ تالاب کے کنارے ویران جگہ پر گھٹنوں

تک گاڑ دیا اور مجھ پر مردہ سانپوں کے چڑھاوے چڑھانے شروع کر دیئے۔ گاؤں میں جہاں کہیں انہیں کوئی مردہ سانپ ملتا وہ اسے اٹھا کر دور سے مجھ پر پھینک دیتے۔ یہ لوگ خود سانپوں کو نہیں مارتے تھے بلکہ اپنی قضا سے مرے ہوئے سانپوں کو مجھ پر پھینک دیتے تھے۔ ایک مہینہ اسی طرح گزر گیا۔ تالاب کے دوسرے کنارے پر مہادیر کا مندر تھا۔ جہاں صبح و شام مہادیر کے بت کی پوجا ہوتی تھی۔ اس گاؤں میں جین مت کے ڈگمبر فرقے کے لوگ بھی رہتے تھے۔ اس فرقے میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی بزرگ چاہتا تو وہ سانس کو روک کر اپنے آپ کو عارضی موت کے حوالے کر دیتا تھا۔ اس عمل سے وہ اپنے عقیدے کے مطابق نجات حاصل کر جاتے تھے اور آواگون کے چکر سے محفوظ ہو جاتے تھے مجھے اس حقیقت کا علم اس وقت ہوا۔ جب میں نے ایک بوڑھے جینی کو تالاب کے مندر کے باہر ایک روز حبس دم کے بعد مرتے دیکھا۔ لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے ایک دوسرے کو بتایا کہ مرنے والے نے حبس دم کیا ہے اس کی لاش بڑے احترام و عقیدت سے پھولوں سے ڈھانپ دی گئی۔ منتر پڑھے گئے اور اسی جگہ اسے سپرد آتش کر دیا گیا۔ دوسرے دن گاؤں کے لوگ وہاں اکٹھے ہوئے اور مرنے والے کی ہڈیوں کو وہیں دفن کر کے اس کی سمادھی بنا دی گئی۔

ایک رات ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گاؤں کے لوگ اپنی اپنی کھپریل سے بنی ہوئی جھونپڑیوں میں سو رہے تھے۔ آسمان پر تارے خاموشی سے چمک رہے تھے' تالاب کا پانی پرسکون تھا۔ میں اس موت ایسے سناٹے میں پتھر کا بت بنا اپنی جگہ پر چپ چاپ کھڑا تھا کہ ایک طرف سے مجھے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ دو گھڑ سوار میرے قریب آ کر رک گئے۔ انہوں نے چہروں پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ ان کی آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ تلواریں ان کی کمر سے بندھی تھیں۔ وہ گھوڑوں پر سوار میری طرف غور سے تکنے لگے۔ ایک نے کہا۔ "سانگو یہ کس دیوتا کا بت ہے۔ ایسا بت تو ہم نے پہلے نہیں دیکھا۔"

دوسرا بولا۔ "یہ منحوس دیوتا کا بت ہے۔ اس سے دور رہو۔ نہیں تو آج کی رات خیر نہیں۔"

سانگو ہنسا - "ارے ہم ڈاکو ہیں۔ ہمیں کسی کا خوف نہیں۔ چلو' چل کر اپنا کام کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ گاؤں کی طرف چلے گئے۔

میں سمجھ گیا کہ یہ ڈاکو اس گاؤں میں ڈاکہ ڈالنے جا رہے ہیں۔ مجھے اس گاؤں والوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی مجھ سے ان لوگوں کا سلوک ایسا نہیں تھا کہ میں ان سے ہمدردی رکھتا۔ میری بلا سے گاؤں کو آگ لگ جائے یا ڈاکو لوٹ کر لے جائیں۔ میں اس غور و فکر میں ڈوبا رہا کہ دیکھیں اس پتھر کی قید سے کب نجات ملتی ہے۔ کچھ وقت گزرا ہو گا کہ اچانک

گاؤں کی طرف سے وہی ڈاکو نمودار ہوئے۔ وہ گھوڑے دوڑاتے چلے آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک ڈاکو نے اپنے آگے ایک کمسن لڑکے کو زبردستی بٹھا رکھا تھا اور ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبایا ہوا تھا۔ یقیناً یہ ڈاکو اس لڑکے کو کسی کے لئے بھینٹ چڑھانے کے لئے اٹھا کر لائے ہوں گے۔

لڑکا بڑی بری طرح سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ جب وہ میرے قریب سے گزرے تو لڑکا ڈاکو کی گرفت سے نکل گیا۔ اس نے گھوڑے پر سے چھلانگ لگا دی ڈاکو بھی اس کے پیچھے کود پڑا لڑکا بہت زیادہ خوف زدہ تھا۔ وہ بھاگ کر میرے پاس آ گیا اور اپنی بانہیں میری کمر کے گرد ڈال کر روتے ہوئے گڑگڑانے لگا۔ "امبا دیوتا! تو دوسروں کے لئے منحوس ہو گا پر میرے لئے نہیں۔ یہ ڈاکو مجھے دیوتا کی بھینٹ چڑھانے لئے جا رہے ہیں۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ تو میری مدد کر۔"

ایکا ایکی مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے مجھے اپنی جگہ سے ہلکا سا دھکا دے کر ہلا دیا ہو۔ ڈاکو اس لڑکے کو گھسیٹ رہے تھے لڑکا میری کمر نہیں چھوڑ رہا تھا۔ وہ رو رو کر مجھ سے مدد مانگ رہا تھا۔ مجھ پر اس کی آہ و زاری کا شدید اثر ہوا۔ مجھے ایک بار پھر ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اتنے میں ایک ڈاکو نے تلوار کھینچ لی۔ دوسرے نے کہا۔ "ارے سانگو۔ اس کو دو ٹکڑے کر دے۔ کم بخت شور مچا کر گاؤں والوں کو اکٹھا نہ کر لے۔"

سانگو ڈاکو نے لڑکے کو قتل کرنے کے لئے تلوار والا ہاتھ ہوا میں اٹھایا ہی تھا کہ ایک ہلکے سے کڑاکے کی آواز کے ساتھ میرے جسم کا پتھر ٹوٹ کر نیچے گرنے لگا۔ میں نے اپنا ہاتھ ایک دم سے اوپر کر کے ڈاکو سانگو کی تلوار کا وار اپنے بازو پر لے لیا۔ تلوار میرے بازو سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔ دونوں ڈاکوؤں کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک پتھر کے بت میں جان پڑ گئی تھی لڑکا سہم کر ایک طرف ہو گیا تھا۔ میں نے تھوڑا سا زور لگایا تو میری دونوں ٹانگیں زمین سے باہر نکل آئیں۔ ڈاکو گھوڑوں کی طرف لپکے کہ راہ فرار اختیار کر سکیں مگر میں انہیں کسی دوسرے معصوم لڑکے کی زندگی سے کھیلنے کے لئے زندہ رہنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے ان پر چھلانگ لگا دی۔ میرے جسم پر چڑھی ہوئی کیسری تہہ اکھڑ چکی تھی۔ میں نے دونوں ڈاکوؤں کو گردنوں سے دبوچ لیا۔ میرے جسم کی پوری طاقت واپس آ چکی تھی۔ یہ گرفت اتنی شدید تھی کہ ڈاکوؤں کی گردنیں میرے ہاتھوں کے پنجوں میں پچک گئیں اور وہ دوسرا سانس لئے بغیر ہی میرے ہاتھوں میں ٹھنڈے ہو گئے۔ میں نے واپس مڑ کر دیکھا تو لڑکا ڈر کے مارے گاؤں کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ میں نے اس کے پیچھے جانے کی ضرورت محسوس نہ کی اور اپنے جسم کو ہاتھ لگا لگا کر ٹٹولنے لگا۔ میرا جسم اپنی اصلی

حالت میں واپس آ چکا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ طلسم ٹوٹا کس طرح؟ کہیں یہ اس معصوم لڑکے کی فریاد کا اثر تو نہیں تھا کہ جس نے میرے جسم کے پتھر کو ریزہ ریزہ کر دیا؟ ضرور یہی بات تھی کیونکہ لڑکے نے جب چیخ کر فریاد کی تو اس وقت ایک کڑاکے کے ساتھ میرے جسم کا پتھر پاش پاش ہو گیا تھا۔ میرا دل اس لڑکے کا شکریہ ادا کرنے کو چاہ رہا تھا۔ میں گاؤں کی طرف چلا۔ ڈاکوؤں کی لاشیں وہیں گھاس پر پڑی تھیں۔ جونہی میں تالاب کے کنارے بنی ہوئی بوڑھے جینی سادھو کی سمادھی کے قریب سے گزرا تو مجھے کسی کے گہری سانس لینے کی آواز آئی۔ میں رک گیا۔ پلٹ کر دیکھا میرے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ راستہ رات کی تاریکی میں سنسان تھا۔ گاؤں پر بھی گہری خاموشی طاری تھی۔ میں نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ کسی نے پھر میرے بالکل قریب ہی گہری سانس لی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی بدروح ہے جو مجھے ڈرانے آئی ہے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "تو مجھے نہیں ڈرا سکے گی۔ جدھر سے آئی ہے ادھر کو چلی جا۔" اس کے جواب میں ایک نحیف سی عمر رسیدہ آواز آئی۔

میں نے چونک کر بائیں طرف دیکھا حبس دم سے مر جانے والے بوڑھے جینی کی سمادھی میں ایک انسانی ہیولا آہستہ آہستہ ہل رہا ہے۔ میں نے سمادھی کے قریب جا کر پوچھا۔ "تم کون ہو؟ جواب میں نحیف آواز آئی۔

"میرے لڑکے کی تم نے جان بچائی ہے۔ وہ میرا اکلوتا نواسہ تھا اور تم میری دعا سے دوبارہ زندہ ہوئے ہو؟ تو یہ حبس دم والے بوڑھے اچاری کی روح تھی۔ میں نے دبی زبان میں اس کا شکریہ ادا کیا تو اس کی روح بولی۔ "بھگوان نے تمہیں دوبارہ زندگی اس لئے عطا کی ہے کہ دکھی انسانوں کی خدمت کر سکو۔"

میں نے کہا۔ "محترم روح! میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ کسی بے گناہ کو میرے ہاتھ سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ان ڈاکوؤں کو میں نے اس لئے ہلاک کیا ہے کہ یہ ظالم تھے انہوں نے ایک بے بس غریب لڑکے کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہا تھا۔"

بوڑھے کی روح نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "میں جانتا ہوں۔ لیکن ابھی تمہیں ایک اور نیک کام کرنا ہے۔"

میں خاموش ہو گیا اور بزرگ روح کے ہیولے کی طرف تکنے لگا۔ ہیولے میں ایک لرزش پیدا ہوئی اور مجھے اپنے کان میں اس کی پراسرار آواز سنائی دی۔ "دریا پار ایک بستی ہے رنگاپتی ڈاکو وہاں لوٹ مار کرتا رہتا ہے۔ رنگاپتی اس گروہ کا سردار ہے جس کے دو آدمی میرے نواسے کو اٹھانے یہاں آئے تھے۔ اس گاؤں کو رنگاپتی ڈاکو کے ظلم و ستم سے بچاؤ۔ بھگوان نے تمہیں جو خفیہ طاقت دی ہے اس سے بادشاہوں ہی کی نہیں غریبوں کی بھی مدد

کرو۔“

میں نے رنگاپتی ڈاکو کی کمین گاہ کے بارے میں سوال کیا تو سادھی کے ہیولے نے بتایا کہ آگے جا کر دوسرے کوس پر دریا میں سے ایک ندی نکل کر پہاڑیوں کی طرف جاتی ہے۔ جہاں ندی دو سرخ چٹانوں کے درے میں سے گزرتی ہے اس کے اوپر پہاڑی میں ڈاکو رنگاپتی کا خفیہ ٹھکانہ ہے۔ سادھی کا ہیولا غائب ہو گیا تھا۔ چند لمحے میں وہاں کھڑا سوچتا رہا۔ پایہ تخت دہلی یا لکھنوتی میں اب میرے لئے کشش باقی نہیں رہی تھی۔ دوسری طرف سادھی کے پراسرار ہیولے نے دریا پار گاؤں کو خونی ڈاکو کے چنگل سے چھڑانے کی مجھ پر اخلاقی ذمے داری عائد کر دی تھی۔ میرا فرض بن گیا تھا کہ میں اس گاؤں کے بے بس اور کمزور لوگوں کی مدد کروں۔

رات دم توڑ رہی تھی۔ ستارے ماند پڑنے لگے تھے۔ میں دریا کی طرف چل دیا۔ دریا کنارے رات کے پچھلے پہر کا سناٹا چھایا تھا۔ اندازے سے میں دوسرے کوس پر پہنچ کر رک گیا۔ دریا پار کرنا میرے لئے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ میں دریا میں اتر گیا اور تیرتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ یہاں پر کچھ آگے جا کر ایک چھوٹی سی ندی جنگل کی طرف پہاڑیوں کے درمیان جاتی تھی۔ میں اس ندی کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ ندی کے کنارے اونچے اونچے املی اور سال کے درخت اگے ہوئے تھے۔ دونوں جانب پہاڑوں کے نشیب تھے جن پر گھنے جنگل پھیلتے چلے گئے تھے۔ ندی پہاڑی جنگلوں میں پیچ و خم کھاتی گزر رہی تھی اردگرد کے جنگل اتنے گھنے تھے کہ درختوں کے نیچے دن کی روشنی پوری طرح سے نہیں پہنچ رہی تھی۔ دن کا پہلا پہر مجھے ندی کنارے چلتے چلتے گزر گیا۔ جنگل میں کئی مقامات پر مجھے درندوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ دن کا دوسرا پہر گزر رہا تھا کہ آسمان ابر آلود ہو گیا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ یہاں بادل بڑے گھنے اور سیاہ تھے جن کے باعث جنگل میں دن کی روشنی کم ہو گئی تھی۔ آخر میری نظر ان دو سرخ چٹانوں پر پڑی جن کے درمیان ندی ایک سانپ کی طرح گزر رہی تھی۔ یہی وہ چٹانیں تھیں جن کے اوپر پہاڑی پر رنگاپتی ڈاکو کا مسکن تھا۔ کچھ دیر کھڑا میں اوپر پہاڑی کے درختوں کو دیکھتا رہا۔ پھوار گرنا بند ہو گئی۔ ایک گہرا سکوت چاروں طرف چھا گیا۔ ہوا بھی بہت دھیمے چلنے لگی تھی۔ میں نے تلاش بسیار کے بعد ایک پتھریلی پگڈنڈی ڈھونڈھ نکالی جو گنجان درختوں اور خار دار جھاڑیوں کے بیچ سے ہوتی اوپر چلی گئی تھی۔ میں اس پگڈنڈی پر درختوں کی اوٹ میں ہو کر اوپر چڑھنے لگا۔ مجھے اپنے پیچھے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ میں ایک درخت کے تنے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ تین گھڑ سوار میرے قرب سے گھوڑے

دوڑاتے گزر گئے۔ انہوں نے اپنے چہروں پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اور کمر کے ساتھ تلواریں لٹک رہی تھیں۔ مجھے اطمینان ہوا کہ ڈاکوؤں کا مسکن اوپر ہی ہے لیکن اب مجھے بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ اگرچہ ڈاکو مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے لیکن جس بدنصیب گاؤں کو رنگاپتی کے چنگل سے چھڑانے آیا تھا وہ ذرا سی بداحتیاطی کے سبب خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ چنانچہ مجھے پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت تھی۔

پہاڑی کی ڈھلان ایسی تھی کہ گھوڑے بڑی آسانی سے دوڑ سکتے تھے۔ پتھریلے راستے پر سنگریزے بکھرے ہوئے تھے اور یہاں گھنے درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں نے ایک طویل محراب بنا رکھی تھی۔ پہاڑی کے اوپر ایک ہموار جنگل آ گیا جہاں درخت اس قدر گنجان تھے کہ ان کی ٹہنیاں ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی تھیں۔ ان درختوں کے پہلو میں ایک تنگ سا راستہ درختوں اور جنگلی جھاڑیوں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ یہاں مجھے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ میں چھپ کر آگے بڑھنے لگا۔ ابر آلود آسمان کی وجہ سے یہاں روشنی زیادہ نہیں تھی۔ آگے کھلی جگہ آ گئی۔ یہ ایک کھلا آنگن سا تھا۔ جس کی ایک طرف پتھروں سے دیوار بنا دی گئی تھی۔ بیچ میں ایک کھوہ تھی جس کے باہر دو آدمی تلواریں لئے زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ دیوار کی دوسری جانب گھوڑے بندھے ہوئے تھے جن کی صرف گردنیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ یہ دونوں آدمی شکل صورت سے جرائم پیشہ لگ رہے تھے۔ میں ایک جگہ چھپ کر ان کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ ملیالم زبان میں آپس میں باتیں کر رہے تھے اور میرے اندازے کے مطابق وہ اپنے ان دو ساتھیوں کے بارے میں بات کر رہے تھے جن کو میں نے گاؤں کے تالاب کے کنارے ہلاک کر دیا تھا اتنے میں مجھے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ یہ آواز میرے عقب سے آ رہی تھی۔ میں پھرتی سے درخت پر چڑھ کر شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ تین گھڑ سوار چلے آ رہے تھے۔ وہ میرے نیچے سے گزر گئے ایک گھڑ سوار ان کے آگے آگے تھا وہ کالے سیاہ رنگ کا ڈراؤنی شکل والا ہٹا کٹا آدمی تھا۔ جس کے کانوں میں سبز پتھر چمک رہے تھے۔ اس آدمی کو دیکھ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے ڈاکو تعظیم سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ سیاہ رو جرائم پیشہ شخص گھوڑے سے اتر پڑا اور ملیالم زبان میں بولا۔ ”گاؤں میں ان کی لاشیں پڑی ہیں۔ بھیس بدل کر جاؤ لاشیں اٹھا لاؤ۔“ دونوں ڈاکو فوراً دیوار کی دوسری جانب چلے گئے۔ گھوڑے کھول کر ان کی باگیں تھامیں اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔

سیاہ رو آدمی کے ساتھ جو دو ڈاکو آئے تھے وہ گھوڑوں سے اتر پڑے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”رنگاپتی! ہمارے آدمیوں کو گاؤں والوں نے مارا ہے۔“

میں چوکنا ہو گیا۔ یہ ڈاکو رنگاپتی تھا جس کی خون ریزیوں کے بھیانک قصے مشہور تھے اور جس نے اردگرد کے علاقے میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ رنگاپتی ڈاکو گھوڑے سے اتر کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اپنی تلوار کو زانوؤں پر رکھ کر بولا۔ میں جانتا ہوں گاؤں والوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ مگر لگتا ہے یہ کسی اور ہی شخص کی کارستانی ہے۔ گاؤں والوں میں اتنی جرات نہیں ہے۔" اس کے ساتھی خاموش اس کے سامنے زمین پر بیٹھے تھے۔ اس کے بعد وہ آپس میں قدرے جھک کر سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ ان کی سرگوشیاں مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد رنگاپتی دیوار کے دوسری طرف سے گھوڑا کھول کر جنگل کی ڈھلان پر اتر گیا۔ نہ جانے اسے کیا کام آ پڑا تھا۔ میں درخت کی شاخوں میں چھپا یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ پھر میں درخت سے اتر کر چند قدم چلنے کے بعد ان ڈاکوؤں کے سامنے آ گیا۔ میری شکل دیکھتے ہی ان پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ تڑپ کر اٹھے اور تلواریں کھینچ کر مجھ پر جھپٹے۔ میرے پاس کوئی تلوار نہیں تھی۔ دونوں کی تلواروں کے وار میرے جسم پر پڑے اور میرا کرتہ دو جگہوں سے کٹ گیا۔ ظاہر ہے میرے بدن پر ایک خراش تک بھی نہ آئی۔ ڈاکوؤں کو ابھی میری خفیہ طاقت کا وہم و گمان تک نہ تھا۔ انہوں نے دوسری بار وار کیا تو میں نے دونوں وار اپنے بازوؤں پر لئے۔ دونوں تلواریں میرے بازو سے ٹکرا کر ٹوٹ گئیں۔ ڈاکو یہ سمجھے کہ میں نے لباس کے اندر لوہے کی جالی پہن رکھی ہے وہ دیوار کے ساتھ لگے نیزے کی طرف لپکے۔ لیکن اب میں نے انہیں اتنی اجازت نہ دی اور چھلانگ لگا کر ان کے سر پر پہنچ گیا۔ میں نے دونوں کو نیچے گرا دیا۔ وہ میری طاقت سے خوف زدہ ہو رہے تھے۔ میں نے نیزہ اٹھایا کہ انہیں باری باری جہنم رسید کر دوں کہ وہ ہاتھ جوڑ کر رحم کی بھیک مانگنے لگے۔ میں نے تیزی سے دونوں ڈاکوؤں کو اوندھے منہ لٹا کر ان کے صافے اتار کر ان کے منہ میں ٹھونسے رسی سے دونوں ڈاکوؤں کی مشکیں باندھ دیں اور پھر میں وہیں جھاڑیوں میں چھپ کر ڈاکو رنگاپتی کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک جنگل میں ہاتھی کی چنگھاڑ سنائی دی۔ جنگل کے سناٹے میں یہ چنگھاڑ کمزور دل کو دہلانے کے لئے کافی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس جنگل میں جنگلی ہاتھی بھی موجود ہیں جن کی موجودگی یقیناً ڈاکوؤں کی مددگار ثابت ہوتی ہو گی۔ کوئی بھی ادھر کا رخ نہ کرتا ہو گا۔

جنگل کی اندھیری راتیں جنہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہی ان راتوں کی تاریکی اور دہشت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جنگل پر ایک سکوت مرگ طاری ہو گیا۔ کبھی کبھی کسی جنگلی درندے کی آواز اس سکوت کو توڑ کر خاموشی کے سینے پر ایک خراش سی ڈالتی ہوئی غائب ہو جاتی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ ہاتھی کی آواز پھر سنائی نہیں دی تھی۔ شاید وہ تھک ہار کر

ندی پار کر کے دوسرے جنگل میں جا چکا تھا مجھے ڈاکو رنگاپتی کی طرف سے بھی خطرہ لگا تھا۔ اندھیرے میں مجھے جنگل کے درخت، ان درختوں کے درمیان سے گزر کر نیچے جاتی پتھریلی پگڈنڈی دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ جنگل کے گہرے سکوت نے مجھ پر خدا کے جلال کی ہیبت سی طاری کر دی - میں نے آنکھیں بند کر لیں اور خداوند کریم کی حمد و ثنا کرنے لگا۔ اچانک مجھے ایسی آہٹ سنائی دی جیسے کوئی جھاڑیوں پر قدم رکھتا آگے بڑھ رہا ہو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے درختوں کے نشیب میں دو انسانی سائے کھنڈر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں وہ ذرا قریب آئے تو میں نے اندھیرے میں بھی ڈاکو رنگاپتی کو پہچان لیا، اس کے ساتھ اس کا ایک اور ساتھی ڈاکو تھا۔ کھنڈر کے قریب آ کر وہ جھک کر آگے بڑھنے لگے۔

میں ان سے مقابلے کے لئے بالکل تیار تھا۔ اچانک رات کے سناٹے میں ہاتھی کی غصیلی چنگھاڑ بلند ہوئی اور وہی دیوپیکر ہاتھی دیوانہ وار جھاڑیوں سے نکل کر ان دونوں ڈاکوؤں کی طرف لپکا۔ اس اچانک حملے سے ڈاکو گھبرا گئے۔ وہ پیچھے بھاگنے لگے مگر ہاتھی ان کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ رنگاپتی نے پلٹ کر ہاتھی کی سونڈ پر تلوار کا وار کیا۔ ہاتھی نے سونڈ اوپر اٹھا رکھی تھی۔ دوسرا ڈاکو بائیں جانب کو بھاگا۔ ہاتھی نے سونڈ بڑھا کر اسے دبوچ لیا اور پھر اتنی زور سے زمین پر پٹخا کہ ڈاکو کی چیخ بھی نہ نکل سکی ہاتھی نے اس پر اپنا بھاری پاؤں رکھ کر اسے کچل دیا۔ رنگاپتی زمین پر گر پڑا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور پیچھے ہٹنے لگا وہ تلوار چلا رہا تھا تاکہ ہاتھی کو آگے بڑھنے سے روک سکے۔ لیکن ہاتھی اس کے سر پر آ گیا۔ رنگاپتی نے تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ ہاتھی کی سونڈ پر مارا۔ مجھے ایسا نظر آیا جیسے ہاتھ کی سونڈ آدھی کٹ کر ایک طرف کو لٹک گئی ہو۔ ہاتھی کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور اس کے ساتھ ہی ہاتھی نے اپنا آپ رنگاپتی ڈاکو کے اوپر گرا دیا۔ یہ گویا ایک پہاڑ تھا جو ایک چوہے پر اچانک گر پڑا تھا۔ سفاک ڈاکو رنگاپتی کا جو حشر ہوا وہ میں نے دن کی روشنی میں دیکھا۔ اس کی لاش چپٹی ہو کر زمین کے ساتھ چپک گئی تھی۔ اس وقت میں ڈاکو رنگاپتی کی لاش کو دیوپیکر، غصے اور انتقام کی آگ میں چنگھاڑتے ہوئے زخمی ہاتھی کے نیچے چپٹا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ہاتھی اپنے جسم کو زمین پر رگڑ رہا تھا۔ اس کے حلق سے دل دہلا دینے والی چنگھاڑیں نکل رہی تھیں۔ جب ہاتھی کے انتقام کی آگ قدرے ٹھنڈی ہوئی تو وہ اٹھا۔ اس نے اپنی سونڈ اوپر اٹھا کر ایک فاتحانہ چیخ بلند کی - میں نے دیکھا کہ اس کی آدھی سونڈ کٹ چکی تھی۔ پھر وہ زخمی سونڈ کو بار بار اپنے منہ میں ڈالتا جھولتا جھامتا نشیب کے درختوں میں گم ہو گیا۔

اب میرا وہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ جس کام سے آیا تھا وہ انجام کو پہنچا۔ میں ندی پر آ

گیا۔ سوئے اتفاق ندی کے کنارے ایک کشتی موجود تھی میں نے کشتی کو کھولا اس میں بیٹھ کر
کشتی کو لہروں میں چھوڑ دیا۔ سارا دن کشتی میں سفر کرتا رہا۔ شام کے قریب کشتی ندی سے
نکل کر دریا میں داخل ہو گئی۔ میں کشتی کو دریا کے بہاؤ کے رخ پر لا کر اس کی دوسری جانب
چلا گیا۔ اور کشتی کو آگے کھینے لگا۔ رات بھر کشتی دریا میں چلتی رہی اگلے دن صبح کے وقت
کشتی ایک گاؤں کے گھاٹ کے ساتھ لگا دی پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ برہان پور سے دو سو
کوس آگے کی جانب مالا بار کے ساحل کے قریب نکل آیا ہوں۔ یہاں سے مال بردار بادبانی
کشتیاں ہندوستان کے مغربی ساحل کی طرف جاتی تھیں۔ میرا ارادہ ہندوستان کی سرزمین سے
نکل کر اندلس کی طرف کوچ کرنے کا تھا۔ میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ گھاٹ پر
بیس روز تک مزدور بن کر مال ڈھوتا رہا۔ اس طرح سے کچھ کوڑیاں اکٹھی ہو گئیں تو کرایہ
ادا کر کے بادبانی کشتی میں بیٹھ کر ساحل سمندر کی طرف روانہ ہوا۔

چار روز کے سفر کے بعد کشتی گجرات کی بندرگاہ کالی گھاٹ پر پہنچی۔ گجرات پر ان دنوں
مندوب بیگ خان کی حکومت تھی جو شہنشاہ بابر کا باج گزار تھا۔ عملی طور پر وہاں مغلوں کی
عملداری تھی۔ یہاں سے ملک اندلس کو مہینے میں دو بار بادبانی جہاز جاتے تھے۔ سونے کی
سات اشرفیاں ایک آدمی کا کرایہ تھا میں نے اس ساحلی شہر میں جڑی بوٹیوں کا دھندا شروع
کر دیا تاکہ اندلس جانے کا کرایہ جمع کر سکوں۔ اس چھوٹے ساحلی شہر میں بڑے مندر تھے۔
ان میں بھور کالی' وشنو اور شیو کے مندر بھی تھے۔ شہر کے جنوب میں ایک قدیمی جھیل کے
پاس ناگ مندر تھا جس میں سانپ کے بت کی پوجا ہوتی تھی اس مندر میں زندہ سانپ بھی
قربان گاہ پر پھرتے رہتے تھے۔ چنانچہ یہاں سانپ کے کاٹے کی دوائی تیار کی اور مندر سے
کچھ فاصلے پر ایک جگہ کوٹھری لے کر دھندا شروع کر دیا۔ جس کو سانپ ڈستا لوگ اسے اٹھا
کر میرے پاس لے آتے۔ اگر زیادہ دیر نہ ہوئی ہوتی۔ میں اپنی دوائی پلا دیتا اور سانپ کا زہر
غیر موثر ہو جاتا اور اس فرد کی جان بچ جاتی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ ایک بوڑھا آدمی اپنے نوجوان بیٹے کو چارپائی پر ڈال کر میری پاس
لایا۔ نوجوان کا رنگ نیلا پڑ چکا تھا۔ وہ بے حد کمزور تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑے تھے۔
اس کا نام گوسوامی تھا۔ اس کا باپ ہاتھ باندھ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اشکبار
آنکھوں سے مجھے بتایا کہ اس کا ایک ہی بیٹا ہے جس کو ایک عجیب مرض ہو گیا ہے۔ آج
سے دو ماہ پہلے وہ کھیتوں میں کٹائی کر رہا تھا کہ ایک کالے ناگ نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس
نے درانتی مار کر کالے ناگ کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اس کے بعد رات کو وہ چارپائی پر سو رہا
تھا کہ ایک پھنکار کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے سینے پر ایک

سیاہ ناگن پھن اٹھائے بیٹھی ہے۔ نوجوان گوسوامی کی آواز خوف کے مارے خشک ہو گئی وہ
تھر تھر کانپنے لگا۔ اتنے میں کالی ناگن نے اس کی گردن پر ڈس لیا اور سینے سے اتر کر غائب ہو
گئی۔ نوجوان گوسوامی نے شور مچا دیا۔ گوسوامی کے باپ کو یقین تھا کہ اس کا بیٹا اب زندہ
نہیں بچ سکے گا۔ مگر وہ زندہ رہا۔ زہر نے اس کی گردن پر ایک سیاہ داغ ڈال دیا تھا۔ اب ایسا
ہوتا ہے کہ ہر ہفتے.... کی رات کو ناگن آتی ہے اور گوسوامی کی گردن پر ڈسی ہوئی جگہ پر
ڈس کر غائب ہو جاتی ہے۔

"تب سے میرے بچے کی زندگی موت سے بدتر ہو گئی ہے۔ مہاراج کچھ سمجھ میں نہیں
آتا کہ میں اپنے بچے کی جان کیسے بچاؤں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ناگ کی ناگن ہے جو اپنے
ناگ کا بدلہ لے رہی ہے اور میرے بچے کو ایک دم مارنے کی بجائے تڑپا تڑپا کر مار رہی
ہے۔ ہفتہ کی رات کو میرے بھائی اور رشتے دار تلواریں بھی لے کر بیٹھتے ہیں مگر سانپ بجلی
کی طرح ڈس کر غائب ہو جاتا ہے۔ وہ کہاں سے آتا ہے؟ کہاں چلا جاتا ہے؟ کچھ معلوم
نہیں ہوتا۔ ایک آدمی نے اس کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تو سانپ اچھل کر اس کے منہ پر
جھپٹا اور ایسا ڈسا کہ وہ بدقسمت اسی وقت مر گیا۔ اب تو ڈر کے مارے میرے بیٹے کے
نزدیک بھی کوئی نہیں پھٹکتا۔ وید جی! آپ گنوان ہیں رشی منی ہیں میرے بچے کی جان بچا
لیجئے۔"

میں نے نوجوان گوسوامی کا بغور معائنہ کیا۔ اس کی گردن پر سانپ کے بار بار کاٹنے سی
نیلے رنگ کا کھرنڈ جم گیا تھا۔ جس میں سے کالے رنگ کا زہریلا مواد رس رہا تھا۔ ناگن کے
زہر کے نشے سے وہ غنودگی کے عالم میں تھا۔ سانپ اس بدقسمت نوجوان کو اس طریقے سے
ڈس رہا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ موت کے منہ میں چلا جا رہا تھا۔ میں نے نوجوان کے باپ کو
تسلی دی اور ہفتہ کو اس کے مکان پر آنے کا وعدہ کیا۔ ہفتہ کی شام کو بوڑھا میرے پاس آیا
اور مجھے اپنے ساتھ اپنے مکان پر لے گیا۔ شہر کے کنارے ایک جوہڑ کے کنارے ایک کچا
کوٹھا تھا۔ جس کی چھت ناریل کی شاخوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ بوڑھے کی بیوی یعنی
نوجوان کی ماں غمگین چہرہ لئے اپنے بیٹے کی چارپائی کے پاس بیٹھی لوبان سلگائے مالا کا جاپ کر
رہی تھی۔ نوجوان گوسوامی غنودگی کے عالم میں چارپائی پر پڑا تھا۔ آج کی رات ناگن کے
آنے کی رات تھی۔ جب رات گہری ہو گئی تو میں نے نوجوان کے ماتا پتا کو کوٹھڑی میں سے
نکل دیا اور اکیلا گوسوامی کی چارپائی کے سرہانے کی طرف بیٹھ گیا۔ کوٹھری میں ایک ہی چراغ
جل رہا تھا۔ گوسوامی کی ماں نے سرہانے ایک چوکی پر کرشن کی مورتی کے پاس لوبان سلگا دیا
تھا۔ جس کی تیز بو کوٹھری میں پھیلی ہوئی تھی۔ جب آدھی رات کا وقت قریب آیا تو میں

نے نیم مدہوش نوجوان کے کان میں جھک کر کہا کہ وہ فکر نہ کرے آج اسے ہمیشہ کے لئے زہریلی ناگن سے نجات مل جائے گی۔ یہ کہہ کر میں نے ایک خالی چوکی لی اور نوجوان کے سرہانے ڈال کر اس پر بیٹھ گیا۔ باہر گہری خاموشی تھی۔ کوٹھری میں کوئی روشندان نہیں تھا بس ایک نالی تھی جسے اینٹ گارے سے بند کر دیا گیا تھا مگر میں نے اسے کھلوا دیا تاکہ ناگن کو اندر آنے کا موقع مل سکے۔

آدھی رات ہو چکی ہو گی کہ مجھے سانپ کی ہلکی سی پھنکار سنائی دی۔ میں آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ چراغ کی روشنی میں کوٹھری کی دیواریں اور دیوار کے ساتھ لگی ہوئی گٹھڑی مجھے صاف نظر آ رہی تھی مگر سانپ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے نالی پر نگاہ ڈالی سانپ وہاں بھی نہیں تھا۔ لیکن پھنکار ابھری..... یہ آواز میرے پیچھے سے آئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میرے پیچھے کرشن کی مورتی کے پاس دو قدموں کے فاصلے پر لمبے سیاہ بالوں والی ایک دراز قد نوجوان اور خوبصورت عورت کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔ وہ پلکیں نہیں جھپکا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش تھی۔ اس کے حسین چہرے سے میری نگاہیں نہیں ہٹ رہی تھیں میں بت بنا اسے تک رہا تھا۔ اس نے سانپ کی سی پھنکار نما آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ تو بہتر ہے۔"

میرے منہ سے جیسے اپنے آپ نکل گیا۔ "تم.... تم کون ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں ناگن ہوں۔ اس نے میرے نر کو مارا ہے۔ میں اسے تڑپا کر مارنا چاہتی ہوں۔"

میں حیرت سے اس حسین عورت کو تک رہا تھا جو اپنے آپ کو ناگن کہہ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "میں اس نوجوان کی جان بچانے یہاں آیا ہوں۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں۔ اس کو معاف کر دو۔"

حسین ناگن کے منہ سے ایک غضبناک پھنکار نکلی - وہ زمین سے اوپر کو اچھلی اور پھر غائب ہو گئی اور ایک سیاہ ناگ چھت کی جانب سے چارپائی پر لیٹ ہوئے نوجوان کی چھاتی پر ٹھپ سے گرا۔ مگر اس سے پہلے کہ سانپ اسے ڈسے میں نے لپک کر سانپ کو گردن سے دبوچ لیا۔ سانپ کی سرخ آنکھیں باہر کو ابل آئیں جیسے وہ میرے شکنجے سے نکلنے کے لئے سارا زور لگا رہا ہو..... مگر وہ میری گرفت سے نہیں نکل سکتا تھا۔ میں اسے چھوڑنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا اور میں اسے ہلاک بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایک حسین صورت ناگن ہے میں نے گوسوامی کے ماتا پتا کو آواز دی۔ وہ بھاگے بھاگے کوٹھری

میں آئے۔ میرے ہاتھ میں سانپ دیکھ کر خوشی سے ان کی چیخ نکل گئی۔ میں نے کہا کہ سانپ کو میں نے قابو میں کر لیا ہے۔ اب تمہارے بچے کو کوئی ناگن ڈسنے نہیں آئے گی۔ دونوں میاں بیوی میرے قدموں پر گر گئے۔ وہ سانپ کو مار ڈالنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ لیکن میں سانپ کو لے کر وہاں سے چلا آیا۔ اپنے مکان میں آ کر میں نے سانپ کو مٹی کے مٹکے میں ڈال کر اس کا منہ بند کر کے اوپر مٹی کا لیپ کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ سانپ اور خاص طور پر ایسا سانپ جس میں انسانی روپ دھارنے کی شکتی آ چکی ہو۔ ہوا کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ مجھے ایک ہی ڈر تھا کہ ناگن مٹکا توڑ کر باہر نہ نکل آئے مگر ایسا نہ ہوا۔ پندرہ دن گزر گئے۔ اس عرصے میں میں نے کافی اشرفیاں جمع کر لیں اور ایک روز اندلس کی طرف جانے والے بادبانی جہاز میں سوار ہو گیا۔ مٹکا جس میں سانپ یعنی ناگن بند تھی' میرے ساتھ تھا میرا ارادہ بیچ سمندر میں مٹکا پھینکنے کا تھا تاکہ یہ ناگن دوبارہ ہندوستان کے ساحل تک نہ پہنچ سکے۔

بادبانی جہاز ایک مہینہ سمندر میں سفر کرتا رہا۔ اندلس کا آدھا سمندری راستہ طے ہو گیا تھا۔ جہاز پر مسافروں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ اس پر مال زیادہ لدا ہوا تھا۔ سمندر ابھی تک پرسکون تھا اور کوئی طوفان نہیں آیا تھا۔ ایک رات چاندنی چٹکی ہوئی تھی سمندر کی لہریں چاندنی میں نہا رہی تھیں۔ بادبانی جہاز بڑے سکون سے ڈولتا ہوا سمندری موجوں کو چیرتا آگے چلا جا رہا تھا عرشے پر مسافر ادھر ادھر پڑے گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے رسوں کے پاس رکھا ہوا مٹکا اٹھایا اور اسے عرشے کے جنگلے کے پاس لے آیا تاکہ وہاں سے اسے سمندر میں پھینک دوں۔ جہاز کے عرشے پر اس وقت سوائے میرے دوسرا کوئی انسان ایسا نہیں تھا جو جاگ رہا ہو۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میں مٹکے کو اٹھائے جہاز کے عقبی حصے میں آ گیا یہاں سمندر کی لہریں بڑی تیزی سے جھاگ اڑاتی پیچھے کی طرف جا رہی تھیں۔ میں نے مٹکے کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور پھر ہاتھوں سے چھوڑ دیا۔ مٹکا ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ سمندری لہروں پر جا کر گرا۔ اس کے گرتے ہی مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ جیسے کسی نے پیچھے سے مجھے اوپر کو اچھال دیا ہو اور میں قلابازیاں کھاتا دھڑام سے سمندر میں آن گرا۔ میں اپنے ہی زور میں پانی میں نیچے تک چلا گیا۔ جب دوبارہ سمندر کی سطح پر ابھرا تو جہاز مجھ سے کافی دور جا چکا تھا اس کے عقبی حصے میں جلتی ہوئی مشعل میری آنکھوں سے دور ہو رہی تھی۔ مجھے سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ ناگن والا مٹکا میرے قریب ہی سمندری لہروں میں تیرتا چلا جا رہا تھا۔

ناگن مٹی کے مٹکے میں بند تھی۔

وہ کالے سانپ کی شکل میں تھی اور اسے عورت کے روپ میں دیکھنے کے بعد مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہو چکا تھا کہ وہ اصل میں مادہ سانپ ہے مگر پانچ سو برس تک زندہ رہنے کے بعد اس میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ عورت کی شکل میں ظاہر ہو سکتی تھی۔ میں اس حقیقت سے بھی باخبر تھا کہ خود اس پر میری اپنی خفیہ طاقت کا راز بھی کھل گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کالی گھاٹ کے نوجوان گوسوامی کو ڈسنے سے پہلے اس نے انسانی شکل میں آکر مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں اس کے راستے میں نہ آؤں اور گوسوامی کو ڈسنے دوں کیونکہ گوسوامی نے اس کے نر سانپ کو ہلاک کر دیا تھا' لیکن میں نے ایک نوجوان کی جان بچانا اپنا فرض سمجھا اور ناگن کو پکڑ کر مٹکے میں بند کر دیا۔

میں اسے ساتھ لئے اندلس کی طرف جا رہا تھا' خیال تھا کہ بیچ سمندر میں ناگن والا مٹکا گرادوں گا۔ جب میں نے مٹکا سمندر میں گرایا تو مجھے ایک دھکا سا لگا اور مٹکے کے ساتھ میں بھی سمندر میں گر پڑا۔

اب ناگن والا مٹکا مجھ سے تھوڑی دور سمندر کی موجوں پر بہا جا رہا ہے۔ یہ بات میرے لئے حیرت کا باعث تھی کہ اچانک مجھے دھکا کس نے دیا؟ کیا یہ ناگن کی خفیہ طاقت کا کرشمہ تھا' بہرحال میں سمندر میں بہا جا رہا تھا۔ جس بادبانی جہاز پر میں سوار تھا' اس کے عقبی حصے میں جلتی مشعل کی روشنی اب مجھے دور افق پر جھلملاتے ستارے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد یہ جھلملاتا ستارہ بھی غائب ہو گیا اور سمندر پر رات کی تاریکی نے اپنی چادر پھیلا دی۔ اس کے باوجود میں کچھ فاصلے پر ناگن والے مٹکے کو لہروں پر ڈوبتے ابھرتے دیکھ رہا تھا۔ میرے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ آسمان پر ستارے نکل آئے تھے' لگتا تھا وہ بھی میری بے بسی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدرت نے مجھے ایک نہ معلوم مدت کے لئے موت سے محفوظ کر دیا تھا مگر جس صورت حال سے میں اس وقت دوچار تھا اس میں زیادہ دیر تک نہیں رہنا چاہتا تھا۔ یعنی ایک

بیکراں سمندر ... رات کی تاریکی ہے اور بڑی بڑی سمندری موجیں مجھے بہائے لیے جا رہی ہیں۔ کچھ دور تک مجھے ناگن کا مٹکا دھندلا دھندلا سا نظر آتا رہا' پھر وہ بھی میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں کسی برق رفتار لہر کے انتظار میں تھا تاکہ وہ مجھے اپنے ساتھ بہاتی ہوئی کسی براعظم تک پہنچا دے۔

قطبی ستارہ نکل آیا تھا' اس سے مجھے راستے کی سمت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ میں شمال مغرب کی سمت جا رہا تھا' سمندر میں بہنے کا اندازہ کچھ ایسا تھا کہ ایک ٹیلے جتنی بلند لہر مجھے اٹھا کر اوپر لے جاتی اور پھر دوسری لہر کے حوالے کر کے نیچے نکل جاتی کسی وقت مجھے احساس ہوتا کہ میں ایک ہی جگہ پر گردش کر رہا ہوں اور کسی بہت بڑے سمندری بھنور کی گرفت میں ہوں۔ ناگن والا مٹکا خدا جانے کدھر کا کدھر نکل کر چلا گیا تھا۔ سمندری پانی کے بھاری ہونے کی وجہ سے میرا سر پانی سے باہر تھا۔ پانی کے اندر بھی ہوتا تو بھی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اسی طرح سمندر کی موجوں پر بہتے بہتے ساری رات گذر گئی۔

مشرق میں سورج کی سنہری روشنی کا سیلاب طلوع ہوا' ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو گئی' میرا رخ شمال مغرب کی طرف ہی تھا۔ سورج میرے عقب میں تھا۔ یہ بات خوش آئند تھی۔ اس طرح پانی میں بہتے بہتے میں اندلس کی کسی بندرگاہ تک پہنچ سکتا تھا۔ زمین کا دور دور تک کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔ اچانک میرے پاؤں پانی کے اندر کسی شے سے ٹکرائے۔ پہلے میں سمجھا کہ شاید سمندر کے نیچے کوئی چٹان ہے۔ میں نے پاؤں لٹکا دیئے۔ یہ جگہ سخت نہیں تھی۔ پھر کسی نے مجھے اوپر اٹھا دیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو میں ایک بہت بڑی وہیل مچھلی کی پہاڑ ایسی کمر پر سوار ہوں۔ میں بیٹھ گیا۔ وہیل مچھلی دیو پیکر تھی۔ شاید اسے بھی اپنے اوپر کسی انسان کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے سمندر میں ڈوبنا ابھرنا شروع کر دیا۔ میں اس کے جسم کے ساتھ چمٹ گیا۔ میں اسی طرح وہیل مچھلی پر سوار ہو کر سمندر کا سفر تیزی سے طے کرنا چاہتا تھا۔ دیو پیکر وہیل مچھلی کا رخ تھوڑا سا جنوب مغرب کی طرف ہو گیا تھا۔ وہیل مچھلی مجھے اپنی کمر سے گرانا چاہتی تھی۔ وہ بار بار سمندر میں غوطہ لگا جاتی اور جب سطح پر ابھرتی تو زور سے جسم کو جھٹکا دیتی۔ میں اس کی کمر سے چمٹا رہا۔ وہیل مچھلی بڑی تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ میرا یہ خطرناک سمندری سفر کوئی ایک پہر تک جاری رہا۔ پھر وہیل مچھلی میرے نیچے سے نکل کر سمندر میں ڈوبتی ابھرتی غائب ہو گئی۔ میں ایک بار پھر لہروں کے رحم وکرم پر تھا۔

دن گذر گیا۔ ایک بار پھر رات آگئی۔ سمندر کو اندھیروں نے اپنی آغوش میں لے

لیا۔ رات گذر گئی۔ تیسرا دن اور تیسری رات بھی اسی طرح سمندر میں بہتے بہتے گذر گئی۔ مجھے سمندر میں بہتے چوتھا دن تھا۔ دوسرے پہر کا وقت ہو گا کہ مجھے پہلی بار سمندر میں ایک ٹہنی تیرتی نظر آئی۔ یہ ناریل کی ٹہنی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھی کہ کوئی جزیرہ قریب ہے' کچھ ناریل بھی تیرتے ہوئے میری طرف آ گئے۔ میری نگاہیں دور افق پر جمی تھیں۔ تیسرے پہر دور ایک سیاہ دھبہ سا دکھائی دیا جو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ سمندری لہروں کا رخ اسی سیاہ دھبے کی طرف تھا جو یقیناً" کوئی جزیرہ تھا۔ سورج مغربی افق کی جانب جھک رہا تھا کہ سمندر کی لہروں نے مجھے ایک جزیرے کی ساحلی ریت پر لا پھینکا۔ ساحل پر ڈوبتے سورج کی سنہری دھوپ پھیل ہوئی تھی۔ یہ ایک ویران ' اجاڑ جزیرہ تھا۔ ساحل سے کوئی پچاس قدموں کے فاصلے پر ناریل اور عجیب عجیب قسم کے بلند وبالا گنجان درختوں کے جھنڈ ہی جھنڈ تھے۔ میں کچھ دیر وہیں ساحلی ریت پر چت لیٹا رہا۔ پھر اٹھا اور درختوں کی طرف آ گیا۔ جزیرے میں کہیں کوئی آبادی نہیں تھی۔ سارا جزیرہ ویران پڑا تھا۔ گھنے درختوں پر کچھ پرندے ضرور بول رہے تھے۔ جنوب کی طرف ساحل سمندر پر دو چھوٹی چھوٹی بھوری چٹانیں پانی سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ریت پر کسی جانور کے پاؤں کے نشان نہیں تھے۔ رات کو سردی ہو گئی۔ جزیرے پر موت کا سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر تو میں سمندری چٹان کے پہلو میں ریت پر بیٹھا رہا۔ پھر جنگل میں آ کر ایک گنجان درخت کے نیچے اس کے تنے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا اور سوچنے لگا کہ یہ کون سا جزیرہ ہو سکتا ہے۔ سمندر میں کسی مقام پر واقع ہے اور یہاں سے کون سا ملک قریب ہو گا اور یہاں سے میں کس طرح نکل سکوں گا۔ رات گہری ہوتی چلی گئی۔ سارے کا سارا جزیرہ سکوت کی گہرائیوں میں ڈوب گیا تھا۔ کوئی ہلکی سے ہلکی آواز بھی کسی طرف سے ابھرتی سنائی نہیں دیتی تھی۔

میرے اندازے کے مطابق رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی کہ مجھے اپنی بائیں جانب ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں کھول کر دیکھا تو ششد رہ گیا۔ ایک جھاڑی کی شاخ سانپ کی طرح رینگتی میری جانب بڑھ رہی تھی۔ پہلے تو میں نے اسے سانپ خیال کیا لیکن اس پر کانٹے اور چھوٹے چھوٹے پتے تھے۔ یہ آدم خور جھاڑی کی شاخ تھی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر اپنا ہاتھ شاخ کی طرف کیا تو شاخ کسی سانپ کی طرح میری کلائی پر لپٹ گئی۔ میں نے اسے توڑ کر پھینکا تو مجھے ایسے لگا جیسے آدم خور جھاڑی نے ایک تکلیف دہ آہ بھری ہو میں وہاں سے اٹھ کر ایک دوسرے درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گیا۔ اب جھاڑی کی دوسری شاخ نے اندھیرے میں میری طرف رینگنا شروع کر دیا۔ اس آدم خور جھاڑی کو میری بو آ رہی تھی۔ میں درختوں کے اس ذخیرے سے نکل کر

ساحل کی طرف بڑھنے لگا۔ درختوں کی شاخیں میرے چہرے کو چھو رہی تھیں۔ میں انہیں ہاتھوں سے پیچھے ہٹاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ابھی میں ساحل سے دور تھا لیکن درختوں کے تنوں کے بیچ میں سے مجھے نیلی رات کی پھیکی روشنی میں سمندر کی ایک دھندلی سی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ میں درختوں کے جنگل سے نکل کر کھلے ساحل پر آیا تو ایک دم سے وہیں رک گیا۔ ساحل سمندر پر ایک چھوٹی سی کشتی کھڑی تھی۔ میں حیران ہوا کہ اس ویران جزیرے پر آدھی رات کو کون آیا ہے؟ میں پیچھے کی طرف سے چل کر کشتی کے پاس آ گیا۔ کشتی میں چپو پڑے تھے۔ کشتی درخت کے تنے کو کھوکھلا کر کے بنائی گئی تھی۔ ساحل کی گیلی ریت پر انسانی قدموں کے نشان بھی تھے جو جنوب کی سمت بھوری چٹان کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے جھک کر دیکھا' ریت پر چار پانچ انسانی قدموں کے نشان تھا جو ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر دور بھوری چٹان کی طرف دیکھا۔ وہاں مجھے چٹان کے عقب میں روشنی کی ایک جھلک نظر آئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے جلتی ہوئی مشعل اٹھا رکھی ہے میں قدموں کے نشان سے تھوڑا پرے ہٹ کر چٹان کی طرف بڑھا' قریب پہنچا تو انسانی آوازیں سنائی دیں۔ میں چٹان کی اوٹ میں آ گیا اور ابھرے ہوئے پتھروں کو پکڑ کر آہستہ آہستہ چٹان پر چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچ کر میں چٹان پر اوندھے منہ لیٹ گیا اور تھوڑا سا کھسک کر نیچے دیکھا' کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پندرہ سالہ لڑکے کی مشکیں کس کر زمین پر لٹا رکھا ہے اور دو جنگلی آدمی اس پر سوکھی شاخیں اور گھاس ڈال رہے ہیں۔ ایک جنگلی ہاتھ میں مشعل لئے قریب کھڑا ہے۔ ایک جنگلی ہاتھ میں بھالا لئے لڑکے کے سر کی طرف آیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اور مشعل بردار جنگلی نے درختوں کی شاخوں اور گھاس کو آگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی لڑکے کی چیخ بلند ہوئی.... یہ لوگ اس لڑکے کو زندہ نذر آتش کر رہے تھے۔ میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر چٹان کے اوپر سے چھلانگ لگا دی۔ میں ایک جنگلی کے عین اوپر گرا۔ باقی جنگلی حیرت سے مجھے تکنے لگے کہ یہ آسمانی بلا کہاں سے نازل ہو گئی۔ میں پاؤں کی مدد سے جلدی جلدی جلتی ہوئی شاخیں اور گھاس ادھر ادھر کرنے لگا۔

جنگلیوں نے مجھ پر ہلہ بول دیا اور تیر سن کی آواز کے ساتھ سیدھے میرے پیٹ اور گردن پر آ کر لگے۔ میری بجائے کوئی دوسرا انسان ہوتا تو ان تیروں نے اس کا کام تمام کر دیا ہوتا لیکن تیر میرے جسم سے ٹکرانے کے بعد نیچے گر پڑے۔ تیروں کی دوسری بوچھاڑ آئی۔ جس جنگلی پر میں گرا تھا وہ بھالا لے کر میری طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ میری طرف حملہ کرتا' بائیں جانب سے ایک بھالا میری کمر کے ساتھ زور سے ٹکرا کر اچٹتا ہوا

پرے جا گرا۔ جنگلی ششدر تھے کہ مجھ پر تیروں اور بھالوں کا اثر کیوں نہیں ہو رہا۔ میں نے حلق سے ایک چیخ نما آواز نکالی زمین سے بھالا اٹھا کر مشعل بردار جنگلی کی طرف لپکا۔ وہ اچھلا اور بھاگ کھڑا ہوا اسے بھاگتا دیکھ کر دوسرے جنگلی بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ میں جلدی جلدی جلتی شاخوں کو پاؤں سے بجھانے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ مجھے سب سے پہلے ساحل پر کھڑی کشتی پر قبضہ کرنا چاہئے تھا۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ جنگلی بڑی تیزی سے بھاگتے ہوئے کشتی میں سوار ہو گئے تھے اور کشتی کو ساحل سے دور لے جا رہے تھے۔ میں نے بندھے ہوئے لڑکے کی رسیاں کھول دیں۔ یہ ایک نوجوان لڑکا تھا جس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹ تھا۔ لمبے بال بکھرے ہوئے تھے۔ جسم پر نیلے رنگ کا کوئی روغن ملا تھا جو ستاروں کی روشنی میں چمک دے رہا تھا۔

لڑکا پھٹی پھٹی مگر شکر گزار نگاہوں سے مجھے تک رہا تھا' میں بھی اسے تک رہا تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس کے ساتھ کس زبان میں بات کروں۔ اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ جزیرہ اندلس کے قریب ہو' میں نے اس سے قدیم اندلسی زبان میں پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہ لوگ اسے زندہ نذر آتش کرنے یہاں کیوں لائے تھے؟ لڑکے کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے اپنی زبان میں مجھے بتایا کہ وہ ملاکی قبیلے کے سردار کا بیٹا راجس ہے۔ یہ دشمن قبیلے کے لوگ تھے جو اس کے باپ سے بدلہ لینے کے لئے اسے زندہ جلانے کے لئے اغوا کر کے اسی جزیرے پر لے آئے تھے۔

"سانچو! اگر تم نہ آتے تو میں آگ میں زندہ جل گیا ہوتا۔ تم کوئی دیوتا ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟ تم پر تیروں کی بارش اور بھالوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ تم ضرور اس جزیرے کی روح ہو۔"

میں نے اسے بتایا کہ نہ میں دیوتا ہوں اور نہ اس جزیرے کی روح ہوں بلکہ ایک مسافر ہوں۔ اندلس جا رہا تھا کہ جہاز سے سمندر میں گر پڑا اور اس جزیرے پر پہنچ گیا لیکن اسے میری بات کا یقین نہیں آ رہا تھا' مجھے یقین دلانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ہم اس ویران جزیرے سے کس طرح نکل سکتے ہیں۔ وہ بولا۔

"میرے باپ کے آدمی میری تلاش میں ہوں گے۔ وہ دو ایک روز میں یہاں بھی مجھے تلاش کرتے پہنچ جائیں گے۔ اگر وہ نہ آئے تو میرا بیٹا لاچی آ جائے گا۔"

"تمہارا بیٹا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا اتنی چھوٹی سی عمر میں تمہارا بیٹا بھی ہے۔"

وہ ہنسا کہنے لگا۔ "میں لاچی کو اپنا بیٹا ہی کہتا ہوں۔ وہ سفید عقاب ہے۔ میں نے

اسے پالا ہے۔ وہ میری تلاش میں اس جزیرے پر ضرور آئے گا۔ اسے میری خوشبو آ جاتی ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن دل میں یہ امید ضرور بندھ گئی کہ اس نوجوان لڑکے کا باپ قبیلے کا سردار ہے اور وہ اپنے بیٹے کا کھوج لگانے اپنے آدمیوں کو ادھر ضرور بھیجے گا۔ راجس کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا جزیرہ وہاں سے کشتی میں ایک دن کے فاصلے پر ہے۔ رات ہم نے وہیں چٹان کے پاس گزاری۔ صبح ہوئی تو ہم جنگل میں چلے گئے۔ راجس درختوں' جھاڑیوں سے خوب واقف تھا۔ وہ ہرن کی طرح جنگل میں کلیلیں بھرتا پھرتا تھا۔ وہ کہیں سے ایک بڑے چوترے جتنا جنگلی پھل توڑ کر لے آیا۔ یہ بڑا میٹھا اور رس دار تھا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ پھل کھایا۔ ناریل توڑ کر اس کا میٹھا پانی پیا۔ میں اس پر اپنی زندگی کا راز ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ سچ مچ مجھے دیوتا سمجھنے لگا تھا اور پہلے پھل مجھے کھانے کو دیتا پھر خود کھاتا تھا۔

دوپہر کے وقت اچانک اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ ہم ساحلی درختوں میں گھوم رہے تھے۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا بولا۔ سانچو! میرا بیٹا آ گیا ہے' اور وہ درختوں میں سے بھاگتا ہوا سمندر کے ساحل پر چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ وہ چٹان کے قریب کھڑا تھا۔ چہرہ آسمان کی طرف اٹھا تھا اور منہ سے سیٹی کی آواز نکال رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آسمان کی وسعتوں کو چیرتا ہوا ایک سفید عقاب نمودار ہوا اور اس نوجوان کے کاندھے پر آ کر بیٹھ گیا۔ راجس دوڑتا دوڑتا میرے پاس آیا تھا' اس نے بڑے فخر سے سفید عقاب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "سانچو! میں نے کہا تھا کہ لاچی کو میری خوشبو آ جاتی ہے۔ میرا لاچی آ گیا ہے۔" سفید عقاب درمیانے سائز کا تھا مگر اس کی آنکھیں عقیق کی طرح سرخ تھیں۔ نوجوان راجس نے اسی وقت اپنے بالوں کی ایک لٹ پتھر مار کر کاٹی۔ اسے سفید عقاب کی گردن میں لپیٹ کر باندھی اور فضا میں اڑا دیا۔ سفید عقاب اڈاری مار کر بلند ہو گیا۔ سمندر کے اوپر جا کر اس نے ایک طرف اڑنا شروع کر دیا۔ راجس اسے اشتیاق بھری نظروں سے تک رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"سانچو! صبح تک میرا باپ یہاں پہنچ جائے گا۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن کا سورج ابھی طلوع ہی ہوا تھا کہ ساحل سمندر پر لوگوں کا شور بلند ہوا۔ راجس ایک درخت پر چڑھ کر سو رہا تھا۔ میں نے درختوں کے جھنڈ سے نکل کر دیکھا کہ ساحل پر چھ سات کشتیاں کھڑی تھیں اور کچھ جنگلی لوگ چلے آ رہے تھے۔ ان کے آگے آگے ایک تنومند اونچا لمبا بھاری بھرکم جنگلی تھا جس کے ہاتھ میں تلوار

تھی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ کہیں کسی جزیرے سے آدم خور نہ آ گئے ہوں۔ میں نے واپس جا کر راجس کو جگایا اور بتایا کہ کچھ لوگ کشتیوں میں آئے ہیں۔ اتنے میں ان جنگلی آدمیوں کی آوازیں آئیں۔ وہ خاص انداز میں نعرے لگا رہے تھے۔ راجس نے خوشی سے اچھل کر ویسا ہی ایک نعرہ لگایا اور ساحل کی طرف اٹھ دوڑا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

اپنے بیٹے کو زندہ سلامت دیکھ کر سردار نے اسے گلے لگایا پھر تلوار گھما کر غصیلی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ راجس نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور چلایا۔

"سانچو! یہ دیوتا ہے۔ اس نے دشمنوں سے میری جان بچائی ہے۔"

اتنا سننا تھا کہ سارے کے سارے جنگلی سردار کے ساتھ ہی میرے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔ انہوں نے مجھے کاندھے پر اٹھا کر کشتی میں سوار کرایا اور اپنے جزیرے کی طرف چل پڑے۔ یہ نیا جزیرہ وہاں سے کافی دور تھا۔ شام کے وقت ہم وہاں پہنچے جنگلی لوگوں کے جھونپڑے درختوں میں دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ ان کی عورتیں تالیاں بجا بجا کر خیر مقدمی گیت گا رہی تھیں میری بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ راجس کے سردار باپ نے تو باقاعدہ میری پوجا شروع کر دی۔ وہ روز صبح میرے آگے ناریل اور پھول رکھتا۔ اپنی زبان میں دیومالائی گیت گاتا۔ دوسرے جنگلی بھی اس کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ میں وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن سردار کی زبانی معلوم ہوا کہ اندلس کی بندرگاہ جبل الطارق وہاں سے تین دن کی سمندری مسافت پر ہے اور کوئی کشتی اتنا طویل سفر طے نہیں کر سکتی کیونکہ آگے سمندر میں تیز رفتار موجیں بہتی ہیں۔ وہاں تک صرف جہاز میں ہی پہنچا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ جزیرہ تجارتی اور مسافر جہازوں کے .... راستے سے کافی ہٹ کر واقع تھا۔ ادھر کبھی کوئی جہاز نہیں آتا تھا۔ سردار بولا۔

"کبھی سال میں ایسا ہو جاتا ہے کہ سمندری ڈاکوؤں کا کوئی جہاز پھل اور پانی کی تلاش میں ادھر آ نکلتا ہے۔ ہم جنگل کے اندر جا کر خفیہ ٹھکانوں میں چھپ جاتے ہیں کیونکہ سمندری ڈاکو کسی کو زندہ نہیں چھوڑتے۔ وہ عورتوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ لیکن سانچو، تم جزیرے کی روح ہو، تم اڑ کر کیوں نہیں چلے جاتے۔"

میں خاموش رہا۔ سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ کیا کسی بحری ڈاکوؤں کے جہاز کا انتظار کرنا ہو گا، خواہ وہ جہاز کوئی مسافر بردار ہو یا بحری قزاقوں کا ہو، راجس اور اس کا باپ صبح وشام میری خدمت میں لگے رہتے۔ میں ان کے لئے دیوتا تھا کسی وقت ان کے چہروں سے اس امر پر حیرت کا اظہار ضرور ہوتا کہ میں دیوتا ہو کر اتنا بے بس کیوں ہوں کہ کسی بحری جہاز کے انتظار میں وہاں پڑا ہوں۔ انہوں نے قبیلے کی ایک لڑکی سے میری شادی

بھی کر دی مگر میں نے اسے اپنی بیوی کے طور پر قبول نہ کیا اور اپنی الگ جھونپڑی میں ڈیرا لگائے رہا۔

اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ میری بے چینی بڑھنے لگی۔ آخر میں وہاں کب تک پڑا رہ سکتا تھا۔ مجھے وہاں سے نکلنے اور اندلس پہنچنے کی کوئی نہ کوئی ترکیب ضرور کرنی چاہئے۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ ایک روز دور سے کوئی بحری جہاز جزیرے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ جزیرے کے لوگ ٹیلے پر چڑھ کر جہاز کا جائزہ لینے لگے۔ راجس اور اس کا سردار باپ بھی ان لوگوں میں تھا۔ ایکدم سے ان میں افراتفری مچ گئی۔ وہ شور مچاتے ایک دوسرے کو پکارتے، خبردار کرتے اپنی جھونپڑیوں کی طرف بھاگے۔ راجس اور اس کا سردار باپ بھی سخت گھبراہٹ میں تھا۔ سب لوگ جھونپڑیوں میں سے اپنے بال بچوں اور عورتوں کو نکال کر جنگل کی طرف بھاگنے لگے۔ راجس کے باپ نے بھی اپنی بیویوں اور بچوں کو راجس کے ساتھ جنگل کی طرف دوڑا دیا، اور میرے پاس آ کر بولا

"سانچو! تم دیوتا ہو۔ ہماری مدد کیوں نہیں کرتے۔ یہ جہاز بحری قزاقوں کا جہاز ہے۔ وہ لوگ جزیرے میں پہنچ کر تباہی مچا دیں گے۔"

میں نے کہا : "تم لوگ ڈاکوؤں کا مقابلہ کیوں نہیں کرتے۔؟"

سردار بولا۔ "یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ بحری ڈاکوؤں کو تم نہیں جانتے سانچو! وہ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اگر تم دیوتا کی طاقت نہیں رکھتے تو ہمارے ساتھ بھاگ چلو۔ جنگل میں ہم نے ایک خفیہ تہہ خانہ بنا رکھا ہے۔ اپنی بیوی کو لے کر آ جاؤ ہمارے ساتھ۔"

سردار اتنا کہہ کر گھنے درختوں کی طرف دوڑنے لگا۔ میری بیوی پہلے ہی مجھے چھوڑ کر اپنے بھائی بندوں کے ساتھ جا چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں وہاں اکیلا رہ گیا۔ جھونپڑیاں جو ایک لمحے پہلے انسانی آوازوں اور بچوں کی قلقاریوں سے گونج رہی تھیں، اب ویران پڑی تھیں۔ لگتا تھا کہ وہاں کبھی کوئی آباد نہیں تھا۔ میں نے ٹیلے پر چڑھ کر دیکھا، جہاز ساحل کے قریب سمندر میں آ کر لنگر انداز ہو چکا تھا اور اس میں سے دو کشتیاں سمندر میں اتاری جا رہی تھیں۔ جہاز کے مستول پر بحری ڈاکوؤں کا مشہور کھوپڑی کی ہڈیوں والا جھنڈا تیز ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ بحری قزاق کسی جہاز پر حملہ کرتے وقت یا کسی جزیرے پر اترتے وقت یہ جھنڈا لہرا دیا کرتے تھے۔ خدا جانے جزیرے کے لوگ زمین کے اندر کن تہہ خانوں میں جا کر چھپ گئے تھے کہ سارے جزیرے پر موت جیسا سناٹا چھا گیا تھا۔ بحری قزاقوں کو جزیرے کی طرف بڑھتے دیکھ کر درختوں کے پرندے بھی چپ ہو گئے تھے۔ میں ٹیلے پر جنگلی

گل مہر کی جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑا دونوں کشتیوں کو ساحل کی طرف آتے دیکھ رہا تھا۔ موسم صاف تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ قزاقوں کے سروں پر نیلے اور سرخ رومال بندھے تھے اور ان کے کانوں کی بالیاں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں ان قزاقوں سے لڑائی جھگڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی یہ ایک حقیقت تھی کہ مجھے ان ڈاکوؤں کے ہی جہاز میں بیٹھ کر اس جزیرے سے نجات حاصل کرنا تھی۔ جہاز کے عرشے پر بھی کچھ ڈاکو کھڑے اپنے ساتھیوں کو جاتا دیکھ رہے تھے۔ بحری قزاقوں کی کشتیاں ساحل پر آ کر رک گئیں۔ قزاق تلواریں لہراتے وحشت انگیز نعرے لگاتے جھونپڑیوں کی طرف دوڑے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں جھونپڑیوں کے خالی ہونے پر کوئی حیرانی نہیں ہوئی تھی۔ شاید وہ اس کے عادی تھے۔ انہوں نے جھونپڑیوں میں سے اناج، پھل، اور پانی کے مٹکے نکال کر درختوں کے درمیان ایک جگہ جمع کر لیے۔ آگ کا الاؤ روشن کر دیا اور چار جنگلی جانور کو پکڑ کر ان کی گردنیں اڑائیں اور کھال سمیت انہیں آگ پر رکھ کر بھوننا شروع کر دیا۔

ان قزاقوں میں ان کا سردار بھی تھا جو الاؤ کے قریب آلتی پالتی مارے بیٹھا مشروب پی رہا تھا اور قہقہے لگا رہا تھا۔ میں ٹیلے پر جس مقام پر چھپا ہوا تھا وہاں سے مجھے نیچے کا سارا منظر نظر آ رہا تھا۔ درختوں میں سے الاؤ کا دھواں نکلتا دیکھ کر جہاز پر موجود باقی قزاقوں نے بھی کشتیاں سمندر میں اتار دیں اور ساحل کی طرف بڑھنے لگیں۔ یہ بھی اپنے دوسرے ساتھی قزاقوں کے ساتھ آ کر مل گئے اور ناؤ نوش اور ہاؤ ہو میں مشغول ہو گئے۔ میں خاموش تماشائی بنا، یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس وقت تک میرے ذہن نے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ میں جزیرے سے کیوں فرار ہو سکوں گا۔ میں ٹیلے کی دوسری طرف سے جا کر قزاقوں کی کسی ایک خالی کشتی کو لے کر سمندر میں نکل پڑا تھا جیسا کہ مجھے نوجوان راجس نے خبردار کیا تھا۔ بحیرہ روم اور بحر اوقیانوس کے اتصالی سمندروں کی تیز رفتار موجوں کا ایک چھوٹی کشتی مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اور وہ عظیم سمندری بھنوروں میں بھٹک بھی سکتی تھی۔ میں چپ چاپ جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھا رہا، مجھے اس حقیقت کا بھی احساس تھا کہ اس جزیرے سے فرار ہونے کا شاید یہ میرا آخری موقع ہے کیونکہ اس کے بعد ایک لمبے عرصے تک کسی بحری قزاقوں کے جہاز کے بھی وہاں پہنچنے کی توقع نہ تھی۔

دن ڈھل رہا تھا۔ سورج مغرب کی طرف سمندر پر جھکتا چلا جا رہا تھا۔ درختوں کے نیچے جہاں قزاق بیٹھے تھے، دن کی روشنی کم ہو رہی تھی۔ میرے ارد گرد قسم قسم کی جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک جھاڑی کے پتے مجھے کچھ شناسا دکھائی دیے۔ اس قسم

کی جھاڑیاں میں نے زیریں مصر کے علاقے میں سیلاب کے دنوں میں اگی ہوئی دیکھی تھیں۔ میں نے جھاڑی کے ایک پتے کو توڑ کر غور سے دیکھا۔ یہ وہی بوٹی تھی مجھے یاد آ گیا کہ میرا باپ درد سے تڑپتے ہوئے بعض مریضوں کو بے ہوش کرنے کے لئے اس بوٹی کے پتوں کا عرق نکال کر اسے پانی میں ملا کر دیا کرتا تھا۔ اس بوٹی کے عرق کے پینے سے مریض کچھ دیر کے لئے بے ہوش ہو جاتے تھے۔ میں نے اس بوٹی کو پہچان لیا تھا اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک ترکیب بھی آ گئی۔

اس بوٹی کی شاخوں میں چھوٹے چھوٹے گول پھول لگے تھے۔ جو نسواری رنگ کے بیجوں سے بھرے ہوئے تھے۔ مگر مجھے ان بیجوں کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے بوٹی کے سبز پتوں کو توڑ کر اپنے پاس جمع کیا، انہیں دونوں ہاتھوں سے مسل کر نرم کر دیا۔ ان میں سے ہرے رنگ کا عرق ٹپکنے لگا تھا۔ اب میں خاموشی سے چھپ کر رات کا اندھیرا پھیلنے کا انتظار کرنے لگا۔ بحری ڈاکوؤں کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ اسی جزیرے پر رات بسر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جزیرے پر سورج غروب ہوتے ہی اندھیرے نے بڑھنا پھیلنا شروع کر دیا۔ قبیلے والوں کے تقریباً" سارے جانور بھون کر بحری قزاق ہڑپ کر چکے تھے اور اب ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بے ہنگم رقص کر رہے تھے۔ الاؤ کے گرد روشنی تھی جہاں انہوں نے پانی اور مشروب سے بھرے ہوئے دو بڑے مٹکے رکھے تھے وہاں جھونپڑی کی دیوار کا سایہ پڑ رہا تھا۔ مجھے اسی جگہ پہنچنا تھا۔

جب اندھیرا زیادہ گہرا ہو گیا تو میں نے بوٹی کے کچلے ہوئے سبز پتے چادر میں لپیٹے اور گھنی جھاڑیوں کی اوٹ میں ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔ رات کی تاریکی میری مدد کر رہی تھی۔ ویسے بھی میں جزیرے کا ایک چکر کاٹ کر اندھیرے میں جھونپڑیوں کے عقب میں نکل آیا۔ میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا اسی خاص جھونپڑی کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں کھپریل کی دیوار کی اوٹ میں مشروب اور پانی کے دونوں بڑے مٹکے رکھے تھے۔ بحری قزاقوں کے قہقہوں اور اونچی آواز میں باتیں کرنے کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں یہ ڈاکو پرتگالی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔

جب مجھے درختوں کے بیچ میں سے الاؤ کی روشنی دکھائی دی تو میں نے گھاس پر اوندھے لیٹ کر آگے رینگنا شروع کر دیا۔ خوش قسمتی سے اس طرف کوئی آدمی نہیں تھا۔ میں رینگ رینگ کر مشروب کے مٹکے کے پاس پہنچ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر دو ڈاکو میری طرف پیٹھ کئے گھاس پر لیٹے لکڑی کے پیالے سامنے رکھے باتیں کر رہے تھے۔ دونوں مٹکوں کے ڈھکنے غائب تھے۔ بڑا سنہری موقع تھا۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے جھولی میں سے کچلی کی ہوئی

بوٹی کے سبز پتے نکالے اور باری باری دونوں مٹکوں میں ڈال دئے۔

اس کام سے فارغ ہوتے ہی تیزی سے گھوما اور کہنیوں کے بل پیچھے درختوں اور گھنی اونچی گھاس کی طرف رینگنے لگا۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر میں دوبارہ اسی ٹیلے پر آکر جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں نیچے بحری قزاقوں کو دیکھ رہی تھیں جو مدہوشی کے عالم میں رقص کر رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک قزاق اٹھا اور مٹکے کے پاس جاکر لکڑی کا جگ مشروب سے بھر کر لے آیا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ اس نے قزاقوں کے پیالے دوبارہ بھر دیئے۔ آدھی رات تک یہ لوگ مٹکے میں سے مشروب بھر بھر کر لاتے اور پیتے رہے۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ جنگلی بوٹی کبھی دھوکا نہیں دے گی اور وہ اپنا اثر ضرور دکھائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آدھ گھنٹے بعد بحری قزاقوں کا شور مدہم پڑ گیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ الاؤ کے گرد جو ڈاکو لیٹا ہے وہ دوبارہ نہیں اٹھ رہا اور جو بیٹھا ہے وہ لیٹ گیا ہے۔ رات کا آخری پہر گزر رہا تھا کہ جزیرے پر گہری خاموشی چھا گئی۔ سارے کے سارے بحری قزاق سردار سمیت زمین پر جگہ جگہ بے ہوش پڑے تھے۔

میں ٹیلے سے اتر کر ان کے قریب آیا۔ وہ سب بے ہوش ہو چکے تھے۔ میں ساحل پر آگیا۔ یہاں ان قزاقوں کی دونوں کشتیاں خالی پڑی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ صبح ہونے تک بے ہوش رہیں گے۔ میں ایک کشتی میں بیٹھا اور اسے لے کر جہاز کی سمت چل پڑا۔ بحری قزاقوں کا جہاز وہاں سے ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر سمندر میں خاموش کھڑا تھا۔ جہاز کے بادبان لپیٹے ہوئے تھے۔

اگرچہ سارے بحری قزاق جزیرے پر آ گئے تھے۔ پھر بھی اس بات کا اندیشہ تھا کہ جہاز پر دو تین قزاق ضرور پہرہ دے رہے ہوں گے۔ مجھے ان سے چوکس رہنے کی ضرورت تھی۔ میں سمندر میں اس طرح چپو چلا رہا تھا کہ ان کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی' جہاز کے اس حصے کی جانب جدھر اندھیرا تھا میں کشتی کو لے کر آگے بڑھا۔ اب میں نے چپو کشتی میں رکھ دئے تھے اور ہاتھ کی مدد سے کشتی کو جہاز کے پہلو میں لے آیا۔ یہ جہاز زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بحری ڈاکو زیادہ بڑے جہاز نہیں رکھا کرتے تھے۔ ان کے جہاز چھوٹے اور ہلکے پھلکے ہوتے اور وہ دشمن کے بھاری بھرکم جہاز کو بڑی پھرتی سے حرکت کر کے تباہ کر دیا کرتے تھے۔

جہاز کی دیوار کے عین وسط میں دو تین موٹے رسے لٹک رہے تھے۔ میں نے ایک رسے کو آہستہ سے تھام کر کھینچا۔ میری کشتی جہاز کی دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ میں رسے کی مدد سے جہاز کے عرشے کی جانب چڑھنے لگا۔ میں نے جنگلے میں سے سر نکال کر جہاز کے

عرشے پر ایک نگاہ ڈالی۔ جہاز کا عرشہ بالکل خالی تھا۔ کچھ لکڑی کے ڈرم اور موٹے رسوں کے گچھے وسط میں پڑے تھے اور چرخی سے بادبان کی رسیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ یہاں کوئی نہ کوئی پہرے دار ضرور تھا لیکن وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں خاموشی سے جہاز کے عرشے پر چڑھ آیا۔ چند سیکنڈ تک میں وہیں جنگلے پر عرشے کے تختے پر لیٹا حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ رات خاموش اور سنسان تھی۔ آسمان پر چاند نہیں تھا مگر ستارے خوب چمک رہے تھے جن کی دھندلی پھیکی روشنی کا غبار سا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ جہاز لنگر انداز تھا مگر سمندر کی دھیمی موجوں میں وہ آہستہ آہستہ ڈول رہا تھا۔ شروع رات میں ہوا بند تھی لیکن جوں جوں رات ڈھل رہی تھی۔ ہوا کا چلتے رہنا بہت ضروری تھا۔ دوسری صورت میں میری اسکیم دھری کی دھری رہ جاتی۔ چند لمحے عرشے کے تختے پر بے حس و حرکت پڑے رہنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ چوکیدار اگر کوئی ہے تو وہ عرشے پر نہیں ہے بلکہ جہاز کے اندر کسی جگہ ہو گا۔

میں آہستہ سے اٹھا اور جھک کر چلتا لکڑی کے اس محرابی دروازے تک آیا جو بند تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہاں سے ایک سیڑھی نیچے جاتی ہے۔ اس قسم کے سینکڑوں جہازوں میں سفر کر چکا تھا۔ اس زمانے میں سبھی جہاز ایک سے ہوا کرتے تھے۔ میں نے دروازے کے ایک پٹ کو آہستہ سے دھکیلا۔ وہ ایک ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ رات کے سناٹے میں دروازے کی چرچراہٹ کافی پریشان تھی۔ میں ایک پل کے لئے ایک بار پھر ساکت ہو گیا۔ میں نے سر اندر ڈال کر دیکھا۔ لکڑی کی چھوٹی سی سیڑھی نیچے چلی گئی تھی۔ نیچے کسی چراغ کی دھیمی روشنی پڑ رہی تھی۔ میں سانپ کی طرح رینگ کر دروازے کے ادھ کھلے پٹ میں سے دوسری طرف چلا گیا اور الٹے رخ سیڑھیاں اترنے لگا۔ چھ سات سیڑھیاں تھیں۔ آگے سر نکال کر دیکھا۔ چھوٹی سی تنگ راہداری تھی جس کی چھت پر ایک جگہ شمع دان میں چراغ روشن تھا۔ راہ داری بالکل خالی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔ مجھے آہٹ سی سنائی دی۔ پھر جیسے کوئی دروازہ کھلا اور دوبارہ بند کر دیا گیا۔ میں اندھیرے میں پیچھے ہٹ گیا اور سانس روک لیا۔ کوئی بھاری قدم ٹہلتا راہداری میں میری جانب چلا آ رہا تھا۔ میں اندھیرے میں تھا مگر قریب سے مجھے بڑی آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا تھا۔ میں چوکس ہو گیا۔ اچانک ایک بحری قزاق جس کے کانوں میں تانبے کی بالیں تھیں۔ سر پر رومال بندھا تھا۔ کمر میں خنجر لٹکائے ہاتھ میں بالٹی لئے میرے سامنے آگیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی ایک چیخ ماری اور خنجر نکال کر مجھ پر جھپٹا۔ میں غافل نہیں تھا' اس کے حملے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ اٹھا ہی تھا کہ میں

نے اس کی گردن دبوچ لی۔ اس کے خنجر کا بھرپور وار میری گردن پر پڑا اور خنجر میری گردن سے ٹکرا کر چٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ بحری قزاق دوسری آواز نکالتا اس کی آنکھیں باہر کو ابل آئیں میں نے اس کے سر پر ایک مکا مارا' وہ راہداری کے فرش پر گر پڑا اور مجھے ایسا لگا جیسے اس کی گردن اندر کو دھنس گئی ہے۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا یا مرچکا تھا۔ میں نے اس کے سر سے رومال اتار کر اس کے دونوں بازوؤں کو پیچھے کر کے باندھا اور راہداری سے گزر کر آگے گیا۔ وہاں ایک چھوٹا سا کیبن تھا جس کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا اور اندر سے روشنی کی ایک لکیر سی باہر آ رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ اگر کوئی ڈاکو اس کیبن میں ہوتا تو بحری قزاق کی چیخ کی آواز سن کر ضرور باہر آ جاتا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر مار کر دروازہ کھول دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کیبن کے ایک ستون کے ساتھ چراغ دان روشن ہے۔ لکڑی کے فرش پر ناریل کی چھال بچھی ہے اور اس پر ایک عورت اور ایک بوڑھا آدمی اس طرح بیٹھے ہیں کہ دونوں کے منہ رومال سے بند ہیں اور ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ میں ان کو اور وہ مجھے .... حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ عورت نوجوان تھی۔ بال سیاہ اور لمبے تھے جو اس کے شانوں پر بکھرے تھے۔ لباس مغربی طرز کا تھا اور آدمی کی عمر ساٹھ پینسٹھ کی ہو گی اور اس کے بال لمبے پٹے تھے جن میں سفید لٹیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ چہرے پر نقاہت اور کمزوری تھی۔ میں نے پرتگالی زبان میں ان سے پوچھا کہ وہ کون ہیں' پھر میں نے آگے بڑھ کر ان کے منہ کھول دیئے۔ عورت خوبصورت تھی اور چہرے سے خاندانی شرافت اور نجابت ٹپکتی تھی۔ ادھیڑ آدمی نے پرتگالی زبان میں ہی مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں؟ کیونکہ میرا لباس بحری قزاقوں ایسا نہیں تھا۔

میں نے کہا "میں کون ہو؟ اس سوال کا جواب کافی تفصیل طلب ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم لوگ مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو اور ڈاکوؤں نے تمہیں کس لئے باندھ رکھا ہے" تب بوڑھے نے مجھے بتایا۔ "میرا نام کاؤنٹ کارڈول ہے اور یہ میری بھانجی ازابیلا ہے" پرتگال کی بندرگاہ لزبن سے تھوڑی دور سمندر میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو میری ملکیت ہے۔ وہاں ہمارا ایک محل ہے۔ میری کوئی اولاد نہیں۔ میں اپنی بھانجی کے ساتھ اپنے محل میں رہتا تھا کہ چند روز پہلے ان بحری قزاقوں نے میرے جزیرے پر آ کر محل پر دھاوا بول دیا۔ میرے نوکروں اور نوکرانیوں کو قتل کر کے ہمارے قیمتی جواہرات لوٹ لیے اور ہمیں قید کر کے اپنے ساتھ لے آئے۔ بس یہ ہماری کہانی ہے مگر تم کون ہو۔ تم بحری قزاقوں کے ساتھی نہیں لگتے؟"

میں نے انہیں بتایا کہ میں ایک سیاح ہوں۔ جڑی بوٹیوں کی تجارت بھی کرتا ہوں۔ اپنی سیاحت کے دوران ایک جہاز پر سفر کر رہا تھا کہ جہاز سمندری طوفان میں گھر کر تباہ ہو گیا۔ میں کسی نہ کسی طرح جان بچا کر اس جزیرے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جب ان بحری قزاقوں کو جزیرے میں اترتے دیکھا تو ایک خاص جڑی بوٹی کی مدد سے تمام قزاقوں کو بے ہوش کر دیا اور خود کشتی لے کر اس جہاز پر آ گیا۔

عورت نے کہا۔ "اور ابھی جس ڈاکو کی چیخ بلند ہوئی تھی۔ وہ .... وہ کہاں ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ وہ راہ داری میں ایک طرف بے ہوش پڑا ہے۔ یا مجھ سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا ہے۔"

بوڑھے کاؤنٹ نے کہا۔ "ہمارے ہاتھ کھول دو۔ تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

میں نے دونوں کی رسیاں کھول ڈالیں۔ عورت اپنی کلائیوں کو دبانے لگی۔ میں نے کاؤنٹ سے کہا۔

"میرا منشا یہ ہے کہ اس جہاز کو یہاں سے اغوا کر کے اندلس یا پرتگال کی کسی قریبی بندرگاہ پہنچا جائے۔ میری منزل اندلس تھی۔ میں اندلس جانا چاہتا ہوں مگر کیا آپ جہاز کو ٹھیک ٹھیک سمندری راستے پر چلا سکتے ہیں؟"

کاؤنٹ کارڈول بولا۔ "میرا تعلق پرتگال کے شاہی خاندان سے ہے۔ ہمارے آباؤاجداد جنگی لڑائیاں لڑتے رہے ہیں۔ جہاز رانی ہماری گھٹی میں پڑی ہے۔ اگر باہر ہوا چل رہی ہے تو میں قطبی ستارے اور سورج کی مدد سے جہاز کو یہاں سے نکال کر پرتگال کے ساحل تک لے جانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔" میں نے اسے بتایا کہ باہر ہوا چل رہی ہے اور دن نکلنے میں ابھی ایک پہر باقی ہے۔ اور سورج نکلنے تک بحری قزاق بھی ہوش میں آ جائیں گے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے جہاز نکال کر لے جانا ہو گا۔ میرے ساتھ آؤ۔" ازابیلا کو ہم نے وہیں کیبن میں رہنے کی ہدایت کی اور خود باہر راہ داری میں آ گئے۔ بحری قزاق وہیں پڑا تھا کاؤنٹ نے جھک کر اس کے سینے پر ہاتھ رکھا اور بولا "یہ وحشی درندہ مرچکا ہے۔ نہ جانے اس نے کتنے بے گناہوں کو قتل کیا ہو گا۔ میرے ساتھ عرشے پر آؤ۔"

عرشے پر آئے تو مشرق کی طرف سے ہوا کے جھونکے چلے آ رہے تھے۔ رات ڈھلنے لگی تھی۔ ہم نے بادبانوں کی رسیاں کھولنی شروع کر دیں۔ جزیرے کی طرف وہی گہرا سناٹا طاری تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ بحری قزاق ابھی تک ہوش میں نہیں آئے تھے صبح ہونے

سے پہلے انہیں ہوش آ بھی نہیں سکتا تھا۔

ہم نے بادبان کھول دیے۔ بادبانوں کے کھلتے ہی ان میں ہوا بھر گئی' پھر ہم نے جہاز کا لنگر کھینچنا شروع کر دیا۔ لنگر کے اٹھتے ہی جہاز چرچرایا اور پھولے ہوئے بادبان اسے آگے کی طرف سمندر میں دھکیلنے لگے۔ بوڑھا کاؤنٹ ایک ماہر جہاز ران کی طرح لکڑی کی چرخی کو پکڑے کھڑا تھا وہ اسے پوری طاقت سے ایک طرف گھما رہا تھا اور آنکھیں مغرب کی طرف آسمان پر نکلے ہوئے قطبی ستارے پر جمی تھیں۔ اس نے جزیرے کی طرف دیکھا اور کہا۔

"برخوردار! اگر ایک پہر تک بحری قزاقوں کو ہوش نہ آیا اور ہوا اسی طرح چلتی رہی تو ہم ان کی پہنچ سے بہت دور نکل جائیں گے۔ تم نے ان موذیوں کو بے ہوش کرکے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم نے اکیلے یہ کام کیسے کر لیا۔ ضرور تم جادوگر ہو یا بہت بہادر نوجوان!"

میں خاموش کھڑا جزیرے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں درختوں کے جھنڈ پچھلے پہر کی دھند کی نیلی روشنی میں اب کسی قدر صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ ہمارا جہاز سمندر میں مغرب کی طرف چل نکلا تھا۔ یہ بڑی خوش آئند بات تھی۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہوا ساتھ دے رہی تھی۔ اگر ہوا نہ چل رہی ہوتی تو ہم جہاز کو ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھا سکتے تھے۔ جزیرے کا ساحل آہستہ آہستہ ہم سے دور ہونے لگا تھا۔ جس وقت سورج کی سنہری کرنوں نے مشرقی افق سے طلوع ہو کر سمندر پر اپنا سونا بکھیرنا شروع کیا تو ہمارا بادبانی جہاز جزیرے سے کافی دور دور نکل کر کھلے سمندر میں آ چکا تھا۔ کاؤنٹ نے جہاز کو صحیح سمت پر ڈال کر چرخی کو باندھ دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ کاؤنٹ کی بھانجی ازابیلا کھل کر بات نہیں کرتی تھی۔ وہ چپ سی رہتی اس کے چہرے پر اداسی کی ایک خاموش کیفیت تھی۔ کیا اسے بحری قزاقوں سے بچ نکلنے کی خوشی نہیں تھی؟

ہمیں سمندر میں سفر کرتے تیسرا دن جا رہا تھا۔ اس عرصے میں میں نے ازابیلا کے دل کو ٹٹولنے کی کوشش بھی کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

کاؤنٹ جہاز کو پرتگال کی جانب اپنے آبائی جزیرے کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ پرتگال کی سرحد اندلس سے ملی ہوئی تھی اور میں وہاں سے بڑی آسانی سے اندلس جا سکتا تھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ بوڑھے کاؤنٹ نے ازابیلا کو اپنے رعب میں رکھا ہوا تھا اور وہ اس سے دبی ہوئی تھی بلکہ کسی حد تک خوف زدہ تھی۔

سمندر میں ہمارا سفر جاری رہا۔ بوڑھا کاؤنٹ واقعی بڑا ماہر جہازراں تھا۔ وہ جہاز کو بالکل ٹھیک سمت پر چلا رہا تھا۔ چھٹے روز ہمیں دور درختوں کے جھنڈ نظر آئے۔ بوڑھے کاؤنٹ نے اپنا ہیٹ اتار کر ایک پر مسرت نعرہ لگا کر کہا۔

"سینور! وہ دیکھو ہمارا جزیرہ!"

میں نے درزدیدہ نظروں سے اس کی بھانجی ازابیلا کو دیکھا ازابیلا کے چہرے پر اداسی کچھ گہری ہو گئی تھی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اسے اپنے آبائی جزیرے پر پہنچنے کی کوئی خوشی نہیں ہے۔ بہرحال یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا۔ میں نے بوڑھے کاؤنٹ سے پوچھا کہ اس جزیرے سے پرتگال کی بندرگاہ لزبن کتنی دور ہوگی۔ کیونکہ مجھے اندلس جانا ہے۔

کاؤنٹ بولا۔ میرے جزیرہ سے لزبن سے کشتی پر ایک دن اور اس قسم کے جہاز پر نصف دن کی مسافت پر ہے۔ تم فکر نہ کرو میرے بچے۔ میں تمہیں اپنی خاص کشتی پر لزبن پہنچا آؤں گا۔ تم نے ہمیں درندوں کی قید سے بچایا ہے اور ہمارے جواہرات بھی ہمیں واپس مل گئے ہیں۔ تمہارا یہ احسان میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔"

یہ قیمتی جواہرات مخمل کی ایک تھیلی میں بند تھے جو سردار کے کیبن میں ایک پلنگ کے نیچے سے ہمیں مل گئی تھی۔ کاؤنٹ کارڈول نے اسی وقت تھیلی کو اپنے کمر کے گرد باندھ کر اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ ہمارا جہاز کاؤنٹ کے جزیرے پر پہنچ کر ساحل سے کچھ دور سمندر میں لنگر انداز ہو گیا۔ کاؤنٹ نے بتایا کہ وہ اس جہاز میں ضروری تبدیلیاں کرنے کے بعد اسے اپنے لئے محفوظ کر لے گا۔ میں نے جب اس خدشے کا اظہار کیا کہ بحری قزاق انتقام لینے اس کے جزیرے پر واپس بھی آ سکتے ہیں تو اس نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"میں لزبن سے کرائے کی فوج بھرتی کروں گا۔ اب میں اپنے محل میں اکیلا نہیں رہوں گا۔ میری فوج کے جوان بحری قزاقوں کے پرخچے اڑا دیں گے۔"

بوڑھے کاؤنٹ کا محل اس چھوٹے سے پرتگالی جزیرے کے وسط میں تھا۔ اس تین منزلہ دو سو سالہ پرانے محل کی دیواریں بارش اور دھوپ کی مار سہہ سہہ کر سیاہ پڑ چکی تھیں۔ محل کے گیٹ پر دو ہٹے کٹے پرتگالی دربان نیزوں سے مسلح کھڑے تھے۔ اپنے مالک اور ازابیلا کو دیکھ کر وہ تعظیم کے انداز میں جھک گئے۔

کاؤنٹ کارڈل نے مجھے بھی تازہ دم ہونے کو کہا' ایک حبشی خادمہ مجھے میرے کمرے میں لے گئی جو دوسری منزل پر تھا اور اس کی کھڑکی باغ کی طرف کھلتی تھی۔

میں وہاں سے جتنی جلدی ہو سکے اندلس روانہ ہو جانا چاہتا تھا لیکن کاؤنٹ کارڈول

نے کہا تھا کہ وہ مجھے اپنی خاص کشتی میں بٹھا کر اس جزیرے سے لے جائے گا' چنانچہ جب میں نے کھانے کی میز پر اس سے اپنی روانگی کے بارے میں پوچھا تو اس نے مسکرا کر کہا۔

"سینیور! دو ایک روز یہاں آرام کرو' پھر تمہیں لے چلوں گا۔ تم میرے محسن ہو میں تمہاری خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

کھانے کی میز پر بھی میں نے دیکھا کہ ازابیلا کا چہرہ اداس اداس تھا۔ وہ نئے لباس میں تھی۔ خادماؤں نے اس کے بالوں میں گلاب کے پھول سجائے ہوئے تھے۔ ادھیڑ عمر کاؤنٹ بار بار اپنی بھانجی کو کچھ نہ کچھ کھانے کو کہہ رہا تھا۔ جوں جوں رات گہری ہو رہی تھ' ازابیلا کی اداسی اور بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا اس کی تبدیلی کو میں بڑے واضح طور پر محسوس کر رہا تھا۔ رات کے دوسرے پہر کھانے کی محفل تمام ہوئی۔ ادھیڑ عمر کاؤنٹ نے مجھے میری دوسری منزل والے کمرے میں بھجوا دیا اور خود ازابیلا کا ہاتھ تھام کر اسے اس کے کمرے میں چھوڑنے چل دیا۔ ازابیلا کا رنگ زرد تھا اور وہ کاؤنٹ کا ہاتھ تھامے ایک برگ خشک کی طرح کپکپاتی ہوئی چل رہی تھی۔

میرے کمرے کی محرابی کھڑکی کے آگے خادمہ نے بھاری پردہ گرا دیا تھا اور بستر لگا ہوا تھا۔ کونے کے شمع دان میں چراغ روشن تھا' اس کی روشنی دھیمی اور نرم تھی۔ یہاں موسم سرد تھا۔ میں نے چراغ بجھایا اور بستر میں لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرے ذہن میں کئی قسم کے خیالات آ رہے تھے۔ پھر مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی' حالانکہ اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا کرتا تھا۔ میں اپنی مرضی سے ضرور کبھی کبھی نیند لے لیتا تھا مگر اپنے آپ مجھ پر غنودگی طاری نہیں ہوتی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں' میری پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں' کمرے میں اندھیرا تھا۔ میرے سرہانے کے پاس ہی کھڑکی والے بھاری پردے کی رسی لٹک رہی تھی۔ میں نے رسی کو تھوڑا سا کھینچ دیا۔ پردہ کھڑکی کے آگے سے تھوڑا سا ہٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی ستاروں بھری رات کی پھیکی پھیکی ہلکی کافوری روشنی کمرے میں ایک پراسرار آسیب کی طرح پھیل گئی۔

میری پلکیں دوبارہ بھاری ہونا شروع ہو گئیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا' میں عالم بے بسی میں نہیں سونا چاہتا تھا۔ کمرے کی فضا میں ضرور کوئی آسیب تھا۔ جس کا مجھ پر اثر ہو رہا تھا۔ لیکن بظاہر کمرے میں کسی آسیب کی ایک بھی نشانی نظر نہیں آ رہی تھی۔

ایک دم رات کی گہری خاموشی میں مجھے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں متعجب سا ہو کر ہمہ تن گوش ہو گیا کہ یہ آواز کہاں سے آئی۔ جب کہ اس سارے ویران محل میں مجھے بچہ کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

بچے کے رونے کی آواز ایک بار ابھر کر پھر معدوم ہو گئی۔ اس آواز نے اپنے پیچھے آہنی خاموشی کا ایک خلا سا پیدا کر دیا تھا۔ ایک پل کے لئے خیال آیا کہ شاید میرا وہم تھا۔ ایک ایسے محل سے کسی بچے کی رونے کی آواز کیسے آ سکتی ہے۔ جہاں کوئی بچہ ہی نہیں ہے۔

میری پلکیں ایک بار پھر بوجھل ہونا شروع ہو گئیں۔ میں اپنی بھرپور قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے اپنی آنکھیں کھلی رکھے ہوئے تھا۔ اب مجھے کمرے کی فضا میں ایک عجیب قسم کی بو محسوس ہوئی' جو میں نے ایک بار میسو پوٹیمیا کے علاقے میں ایک ایسے غار میں محسوس کی تھی جہاں چمگادڑوں کا بسیرا تھا۔ میں ابھی اس بو کے بارے میں غور ہی کر رہا تھا کہ وہی بچے کے رونے کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ آواز کھڑکی سے باہر نیچے باغ سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مسلسل آنے لگی۔ میں بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ آدھی رات کے موت ایسے سناٹے میں نیچے سنسان باغ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ رونے کی آواز اس بار بلند ہوئی تو محسوس ہوا کہ یہ کسی بلی کے رونے کی آواز ہے۔ میں مطمئن ہو کر کھڑکی سے ہٹنے والا تھا کہ مجھے ایک پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ یہ کسی بڑے پرندے کے لمبے پروں کی پھڑپھڑاہٹ تھی۔ اندھیرے میں مجھے اب ہر شے دھندلی دھندلی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ سیاہ رنگ کے کسی بہت بڑے پرندے کا سایہ محل کی پہلی منزل کی کھڑکی میں سے پھڑپھڑاتا ہوا نکلا اور انجیر کے درختوں کی طرف جا کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ یہ کیا معمہ تھا؟ اتنا بڑا پرندہ محل کے کمرے میں سے کہاں سے نکل آیا تھا؟

اجڑے ہوئے ویران محل میں پھر وہی موت کا سناٹا چھا گیا۔ خوشگوار بو اب کم ہو گئی تھی۔ میں دوبارہ کھڑکی سے پیچھے ہٹنے ہی والا تھا کہ جس کھڑکی پر سے پراسرار سیاہ پرندہ پھڑپھڑاتا ہوا اڑا تھا۔ وہاں دھیمی روشنی ہوئی۔ میں بڑے غور سے اس دھندلی روشنی کو تکنے لگا۔ یہ روشنی بڑھنے لگی۔ میرے دیکھتے دیکھتے ایک عورت کھڑکی میں سے باہر نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں موم بتی جل رہی تھی میں اس عورت کو پہچاننے میں ذرا بھی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کاؤنٹ کی بھانجی ازابیلا تھا۔ اس نے ایک باریک سا لمبا ریشمی گاؤن پہن رکھا تھا۔ سیاہ بال شانوں پر کھلے ہوئے تھے' ہاتھ میں موم بتی روشن تھی۔ وہ کھڑکی میں سے اتر کر نیچے زیتون کے درختوں کے درمیان آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ساکت کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں سامنے باغ کے گھنے درختوں کی تاریکی پر جمی ہوئی تھیں۔ میں حیران ہو رہا تھا۔ کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اتنے میں بلی کے رونے کی آواز ایک بار پھر بلند ہوئی۔ یہ واقعی بڑی

ڈراؤنی آواز تھی۔ لگتا تھا کوئی سنگدل شخص بلی کو ذبح کر رہا ہے۔ بلی کی چیخ فضا میں بلند ہو کر ختم ہو گئی۔

ازابیلا نے ایک دم سے پھونک مار کر موم بتی کو بجھا دیا۔ اندھیرے میں وہ مجھے ہیولے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ ازابیلا نے بجھی ہوئی موم بتی کو کھڑکی میں رکھا اور دونوں بازو نیچے گرائے کسی زندہ بت کی طرح تاریک درختوں کی طرف چل پڑی۔ یہ ایک ایسے راز کی بات تھی جس کی تہہ تک پہنچنے کے لئے میرے اندر ہلچل سی مچ گئی۔ آخر ازابیلا کہاں جا رہی ہے؟ بڑے سیاہ پروں والا پرندہ کیسا تھا اور بلی کے رونے کی آواز کہاں سے آئی تھی؟ میں محل کی ٹھنڈی سنسان سیڑھی سے اتر کر نیچے باغ میں آ گیا۔ سارا محل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک ڈراؤنی خاموشی اور سناٹے نے ہر شے کو اپنی دبیز چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ میں تیزی سے اس کی طرف چل پڑا جدھر ازابیلا گئی تھی۔ وہ اب مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ جب میں انجیر کے درختوں کے تاریک سایوں میں آیا تو ازابیلا مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں نے پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے ہوئے اسے محل کے باغ میں جگہ جگہ تلاش کیا مگر وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ آگے محل کی دو منزلہ اونچی پرانی زنگ آلود دیوار آ گئی۔ جس کی دوسری طرف سمندر کی لہریں ساحل کی ریت کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھیں۔

مجھے ازابیلا کے بارے میں تشویش ہوئی کہ آخر وہ کہاں غائب ہو گئی۔ وہ اتنی اندھیری رات میں اپنے کمرے سے موم بتی جلا کر کیوں نکلی تھی۔ ناخوشگوار بو کا معمہ کیا تھا اور بلی کی آخری چیخ پر اس نے موم بتی کیوں گل کر دی تھی؟ یہ سب کچھ کسی طلسمی کہانی کا تانا بانا لگ رہا تھا۔ دل میں بار بار یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ کہیں ازابیلا کی زندگی خطرے میں نہ ہو۔ میں نے ایک بار پھر درختوں کے نیچے اندھیرے میں ازابیلا کی تلاش شروع کر دی مگر پھر وہی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مایوس ہو کر واپس اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ اب نہ تو میری پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں اور نہ وہ ناخوشگوار بو فضا میں باقی رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ باغ دم توڑتی رات کے اندھیرے میں ساکت وجامد سا دکھائی دے رہا تھا۔ اسی طرح باقی رات بھی گزر گئی۔

دن کا اجالا ہوا تو خادمہ نے دروازے پر دستک دے کر کہا کہ نیچے ناشتے پر میرا انتظار ہو رہا ہے۔ میں جلدی سے ہاتھ منہ دھوئے لباس تبدیل کر کے نیچے ناشتے کے کمرے میں آ گیا۔ محل کے وسطی دالان میں سیاہ سنگی ستونوں کے درمیان سنگ یشب کی ایک لمبی میز لگی تھی۔ کاؤنٹ کارڈول اکیلا بیٹھا تھا۔ اس نے ایک پراسرار سی معنی خیز مسکراہٹ کے

ساتھ میرا خیر مقدم کیا اور کہا کہ رات کیسے گزری؟ امید ہے تم گہری نیند سوئے ہو گے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا اور اس کے سامنے اونچی کرسی پر بیٹھ گیا۔ خادمہ گرم مشروب لے کر آئی۔ ہم خاموشی سے ناشتہ کرنے لگے۔ میں نے ازابیلا کے بارے میں پوچھا کہ وہ ناشتہ نہیں کرے گی؟ اس پر کاؤنٹ کارڈول کے چہرے پر ایک ناخوشگوار سا تاثر ابھرا مگر فوراً" ہی مسکرایا اور بولا۔

"ازابیلا جزیرے کی خانقاہ میں چلی گئی ہے۔ وہ ان دنوں اعتکاف میں بیٹھی تھی کہ بحری قزاقوں نے حملہ کر دیا۔ اب وہ پھر خانقاہ میں چلی گئی ہے۔ بڑی عبادات گذار ہے میری بھانجی۔"

ایک گہری خاموشی چھا گئی۔ معاملہ اور زیادہ پراسرار ہو گیا تھا۔ میں نے جزیرے سے واپس جانے کی بات شروع کر دی۔ کاؤنٹ نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔

"پرسوں بندرگاہ سے میرا ایک خاص ملازم بڑی بادبانی کشتی لے کر یہاں پہنچ رہا ہے۔ تم اس کے ساتھ واپس چلے جانا۔"

وہ چپ ہو گیا۔ میں بھی خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بیچ بیچ میں کسی وقت میری طرف گھور کر دیکھ لیتا ہے۔ میں اسے یہی تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے کسی چیز کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ ناشتے کے بعد کاؤنٹ نے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں آرام کرنے جا رہا ہے۔ "اگر تم چاہو تو جزیرے میں گھوم پھر سکتے ہو مگر اس بات کا خیال رکھنا کہ جزیرے کے درختوں کے نیچے جہاں گلے سڑے پھل گرے ہیں وہاں سانپ رہتے ہیں۔" میں نے جواب میں بتایا کہ میں ساحل سمندر کی سیر کرنے کو ترجیح دوں گا۔

کاؤنٹ سیڑھیاں چڑھتا اوپر چلا گیا۔ میں کچھ دیر لمبی کرسی پر خاموش بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم رہا۔ پھر میں اٹھا اور محل کے دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر رات والے چوکیدار نہیں تھے۔ عقبی باغ کی راہداری کے پتھروں کے بیچ میں جنگلی گھاس باہر نکلی ہوئی تھی۔ یہاں مجھے وہی خادمہ نظر آئی جس نے ہمیں ناشتہ کرایا تھا۔ وہ ایک تسلہ اٹھائے گزر رہی تھی۔ قصداً" کچھ تیز چلتا اس کے پاس آ کر رک گیا اور جزیرے کے خوبصورت ماحول کے بارے میں دو ایک جملے کہے۔ خادمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ساکت چہرے سے میری طرف تکتی رہی۔ میں نے اچانک سوال کر دیا کہ ازابیلا جس خانقاہ میں گئی ہے وہ کس طرف ہے؟ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا تسلا ایک پل کے لیے لرزا۔ اس نے گھمبیر آواز میں کہا۔

"سینور! ادھر جانے کا خیال دل سے نکال دیں۔" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے کی

طرف گھوم گئی۔ اب میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ ازابیلا کا معمہ حل کر کے یہاں سے جاؤں گا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ازابیلا کسی سخت مصیبت میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس کی مدد کرنا میرا انسانی فرض تھا اور خاص طور پر ایسی حالت میں جبکہ میں اس کی مدد کر سکتا تھا اور مجھے اپنی جان کی فکر بھی نہیں تھی۔ میں جزیرے میں گھومنے پھرنے لگا۔ میں نے سارا جزیرہ دیکھ لیا مگر مجھے وہ خانقاہ کہیں نظر نہ آئی جہاں بقول کاؤنٹ کارڈول کے اس کی بھانجی ازابیلا اعتکاف میں بیٹھی تھی۔ میں ان گھنے درختوں میں بھی گیا جہاں رات کو میں نے ازابیلا کو غائب ہوتے دیکھا تھا۔ ان درختوں میں بھی سوائے گلے سڑے پھلوں کے اور کچھ نہیں تھا۔

آسمان صبح ہی سے ابر آلود تھا۔ دھوپ غائب تھی اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں نے جھک کر زمین پر ازابیلا کے پاؤں کے نشان دیکھنے کی کوشش کی لیکن گھاس پر پاؤں کے نشان غائب تھے۔ اچانک ایک سانپ پھنکارتا ہوا جھاڑی میں سے نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ میں سانپ کو کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ میں نے راستہ بدل لیا۔ جنگلی اناروں کے درختوں کی طرف بڑھا تو سانپ پھنکار مار کر ایک بار پھر میرے سامنے آگیا۔ اس نے میرا راستہ روک لیا تھا۔ وہ مجھ سے تین قدموں کے فاصلے پر زمین سے چار فٹ بلند ہو کر پھن اٹھائے مجھے اپنی کیسری رنگ کی مقناطیسی آنکھوں سے تک رہا تھا۔ اس سانپ کی موت آ گئی تھی ۔ اس کے باوجود میں نے اسے زندہ رہنے کا ایک اور موقع دیا اور دوسری طرف قدم اٹھا کر گھوم گیا لیکن سانپ کے سر پر موت منڈلا رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی حملہ کر دیا۔ اپنے منہ سے شوں کی آواز نکالتے ہوئے اپنے پھن کو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس نے آگے جھکایا اور میری کلائی پر ڈس لیا۔ اب مجھے اس پر سخت غصہ آیا۔ کم بخت یہ کسی دوسرے امن پسند انسان کو بھی اسی طرح ڈس کر ہلاک کر سکتا ہے میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے گردن سے پکڑ لیا۔ سانپ نے اپنا جسم میری کلائی کے گرد لپیٹ کر کسنا شروع کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ بڑا مہلک اور طاقت ور سانپ تھا مگر وہ میری طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے سانپ کی گردن کٹ چکی تھی اور اس کا باقی کا دھڑ زمین پر تڑپ رہا تھا۔

جزیرے کے جنوب کی جانب ساحل سے کچھ دور بحری قزاقوں کا جہاز اسی طرح کھڑا تھا۔ اس کے بادبان لپٹے ہوئے تھے' وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ دوپہر تک میں نے سارا جزیرہ چھان مارا مگر مجھے نہ کہیں کسی خانقاہ کا کوئی نشان ملا اور نہ ہی ازابیلا کا کچھ پتہ چلا۔ خدا جانے وہ کہاں گم ہو گئی تھی۔ دوپہر کو میں طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر اپنے

کمرے میں ہی لیٹ گیا۔ میں نے کھانا بھی نہ کھایا۔ خادمہ کھانے کے لئے بلانے آئی تو میں نے اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے ازابیلا کی بات چھیڑی تو وہ سہم سی گئی اور بغیر کوئی جواب دیئے تیزی سے واپس چلی گئی۔ میں شام تک اپنے کمرے میں لیٹا ازابیلا کی پراسرار گمشدگی کے راز پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتا رہا۔ پرسوں مجھے لامحالہ اس جزیرے سے واپس چلے جانا تھا۔ اور میں اس سے پہلے پہلے ازابیلا کی گمشدگی کا معمہ حل کر لینا چاہتا تھا۔ میرے دل سے بار بار یہی آواز آتی تھی کہ ازابیلا کسی مصیبت میں گرفتار ہے اور اسے میری مدد کی ضرورت ہے۔ جو کشتی مجھے جزیرے سے واپس لے جانے کے لئے پرسوں آ رہی تھی اس کے پہنچ جانے کے بعد میرے پاس اس جزیرے میں رہنے کا اور کوئی جواز نہیں تھا اور میں اس سے پہلے پہلے اس راز سے پردہ اٹھا دینا چاہتا تھا۔

رات کے کھانے پر پتہ چلا کہ کاؤنٹ بحری قزاقوں کے خالی جہاز پر کسی ضروری کام سے گیا ہوا ہے۔ مجھے کھانے کی حاجت نہیں تھی' پھر بھی خادمہ سے باتیں کرنے کے خیال سے کھانے کی میز پر بیٹھ گیا۔ میں نے خادمہ سے بات کرنے اور ازابیلا اور کاؤنٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر خادمہ نے اپنے لبوں پر مہر خاموشی ثبت کر رکھی تھی۔ وہ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد میں اوپر اپنے کمرے میں آگیا۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اگلے روز دن کی روشنی میں جزیرے کے چپے چپے کا بھرپور جائزہ لوں گا۔ آخر ازابیلا یہیں اسی جزیرے میں کسی جگہ ہو گی۔ اسے نہ تو زمین نگل سکتی ہے اور نہ آسمان اٹھا کر لے گیا ہے۔

شام کو بادل گھنے ہو گئے تھے اور ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ رات کے پہلے پہر جزیرے پر دھند سی اتر آئی' ویران آسیبی محل پر قبرستان ایسی خاموشی طاری تھی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ گرا دیا اور پلنگ پر آ کر لیٹ گیا۔ آدھی رات کو مجھے پھر وہی نامانوس بو فضا میں محسوس ہوئی اور میری پلکیں اپنے آپ بوجھل ہونے لگیں۔ میں چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ایکا ایکی آدھی رات کے سناٹے میں پھر وہی بلی کے ڈراؤنے انداز میں رونے کی آواز ابھر کر اپنے پیچھے ایک آسیبی خلا چھوڑ کر غائب ہو گئی۔

میں اچھل کر بستر پر سے اٹھا۔ پردہ ہٹا کر کھڑکی میں سے نیچے باغ میں دیکھا۔ مجھے ٹھنڈی ہوا میں نمی کا احساس ہوا۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ تاریک بادلوں میں بجلی کی چمک لہرائی اور پھر ایک گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ بادل دیر تک گرجتے رہے۔ ایک بار پھر گہرا سناٹا چھا گیا۔ کھڑکی کے محرابی چھجے پر پھیلی بیل کے پتوں پر بارش کی بوندیں گر کر آواز پیدا کر رہی تھیں۔ یہ بڑی پراسرار سرسراہٹ کی آوازیں تھیں۔ میری نظریں

اپنے آپ ازابیلا کے کمرے کی کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہاں گہری تاریکی تھی۔ بلی کے رونے کی آواز دوبارہ بلند ہوئی۔ اس دفعہ آواز جزیرے میں اس طرف سے آئی تھی جدھر جنگلی انار اور صنوبر کے گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔

وہی ناگوار بو جیسے ایک لہر کی شکل میں میرے قریب سے ہو کر نکل گئی۔ میں کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے لمبے لمبے سانس لیے ناگوار بو کمرے سے غائب ہو چکی تھی۔ میں نے کھڑکی کے پاس جا کر باہر جھانکا۔ تاریکی ہی تاریکی' سناٹا ہی سناٹا' میں تاریکی اور سناٹے کی اس دیوار کو گرا دینا چاہتا تھا۔ میرے قدم سیڑھیوں کی طرف بڑھے اور میں محل کے عقبی دروازے کو کھول کر باہر اندھیری ابر آلود رات کی کھلی فضا میں نکل آیا۔

میں نے ہلکی بوندا باندی اور اندھیرے میں صنوبر کے تاریک جھنڈوں کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ گھاس گیلی تھی' ہوا میں درختوں کی شاخیں اندھیرے میں لہرا رہی تھیں۔ آخر میں صنوبر کے درختوں کے گھنے جھنڈ میں پہنچ گیا۔ یہاں اس قدر تاریکی تھی کہ مجھے بھی درختوں کے تنوں سے چمٹی ہوئی جنگلی بیلیں دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ اچانک میرے پاؤں کسی شے سے ٹکرائے۔ اس کے ساتھ ہی بلی کی چیخ بلند ہوئی۔ میں اچھل کر پرے ہو گیا۔ میں نے جھک کر دیکھا' گھاس پر ایک کالی بلی پنجے اٹھائے چت لیٹی تھی اور اس کے سینے میں ایک خنجر اترا ہوا تھا۔ بلی کی زرد آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں اور وہ مر چکی تھی۔ میں نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ بجلی چمکی تو اس کی روشنی میں مجھے دور ایک درخت کے نیچے کوئی چمکتی ہوئی شے نظر آئی۔ بادلوں کی گرج کے ساتھ میں اس درخت کی طرف بڑھا۔ جس جگہ بجلی کی چمک میں مجھے کوئی شے چمکتی ہوئی دکھائی دی تھی وہاں ایک چھوٹے سے چبوترے کا ٹوٹا پھوٹا کھنڈر تھا جس کے تین چوتھائی حصے کو جنگلی گھاس اور جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے جھاڑیوں میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولا تو میرے ہاتھ کسی سخت شے سے ٹکرائے میں نے جھک کر دیکھا۔ یہ ایک تابوت تھا۔ پرانا کرم خوردہ سیاہ تابوت جس میں عیسائی لوگ اپنے مردوں کو بند کر کے دفن کرتے ہیں۔ جو چیز اندھیرے میں چمکتی تھی وہ اس تابوت کا ایک کنڈا تھا جو گھاس میں سے ذرا سا باہر نکلا ہوا تھا۔ تابوت کے قبضے ٹوٹ چکے تھے۔ میں نے تھوڑا سا زور لگا کر اس کے تختے کو ایک طرف کھسکا دیا۔ جھانک کر دیکھا' تابوت خالی تھا۔ اس میں نہ کوئی لاش تھی اور نہ کسی لاش کا ڈھانچہ تھا۔

تابوت کی تہہ میں ایک طرف لکڑی کا تختہ ہٹا ہوا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں تابوت میں اتر گیا۔ تابوت کا تختہ چرچرایا جس جگہ سے تختہ ہٹا ہوا تھا وہاں اندھیری سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ یہ ایک تہہ خانے کی سیڑھیاں تھیں جہاں اندھیرا تھا۔ میں سیڑھی کے ہر خستہ

حال رنگ خوردہ پتھر کو دیکھ رہا تھا ان پر قدیم ہسپانوی زبان میں کوئی تحریر کندہ تھی۔ جو اس قدر ٹوٹی پھوٹی اور بگڑی ہوئی تھی کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ویسے بھی اس وقت مجھے اس تحریر سے زیادہ ازابیلا کی فکر تھی۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ اس زمین دوز تہہ خانے میں کسی جگہ موجود ہے۔ دس بارہ سیڑھیاں اترنے کے بعد ایک آہنی دروازہ آ گیا جس میں ایک چھوٹی سی سلاخ دار کھڑکی تھی جو بند تھی۔ میں نے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ کھل گیا۔ اندر سے وہی ناگوار بو کا ایک بھبکا میرے نتھنوں کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ آگے ایک دالان تھا کسی طرف سے زرد' کمزور' بیمار سی روشنی آ رہی تھی۔ فرش پر کنکر اور خشک گھاس بکھری ہوئی تھی۔ دو بھدے ستون چھت تک چلے گئے تھے۔ میں ان ستونوں کی اوٹ میں' دبے دبے قدموں سے آگے بڑھا۔

زرد دھیمی روشنی ایک محراب میں سے آ رہی تھی۔ یہ محراب کسی کھڑکی کی تھی۔ میں نے وہاں سے اندر نگاہ ڈالی تو دہشت کی ایک خفیف سی لہر میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ یہ ایک گول' پراسرار' نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا کمرہ تھا۔ کونے میں ایک زرد فانوس روشن تھا جس پر سیاہ باریک پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ وسط میں فرش پر ایک دیوان بچھا تھا۔ دیوان پر ازابیلا سینے پر دونوں ہاتھ باندھے لیٹی ہوئی تھی اور ادھیڑ عمر کاؤنٹ میری طرف پیٹھ کیے کھڑا تھا۔ مجھے ازابیلا کا چہرہ دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں' اور معصوم چہرے پر کرب کے اثرات تھے۔ سامنے اندھیرے میں سے ایک عورت کا ہیولا نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک طشتری تھی جس میں عود کی قسم کی کوئی چیز سلگ رہی تھی۔ کاؤنٹ نے چہرہ اوپر اٹھا کر اس عورت کو دیکھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ کاؤنٹ کی وہی خادمہ تھی جس نے مجھے ازابیلا کی تلاش میں جنگل کی طرف جانے سے منع کیا تھا۔ خادمہ کے بال کھلے ہوئے اور چہرے پر وحشت برس رہی تھی' اس کی آنکھیں کسی بھیڑیے کی آنکھوں کی مانند چمک رہی تھیں۔ کاؤنٹ نے اسے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ خادمہ نے عود کی طشتری ازابیلا کے سرہانے کی طرف رکھ دی اور دونوں بازو پھیلا دیئے۔ کاؤنٹ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ خادمہ نے اس کے اشارے پر اپنا منہ ازابیلا کی گردن کے ساتھ لگا دیا۔ میری روح کانپ گئی۔ ازابیلا لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ جب خادمہ نے اپنا منہ ازابیلا کی گردن سے اٹھایا تو اس کے ہونٹوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ کاؤنٹ نے خادمہ کی گردن سے اپنی انگلی کو دبا کر مس کیا اور پھر اسے ساتھ لے کر جدھر سے خادمہ برآمد ہوئی تھی' ادھر اندھیرے میں جا کر گم ہو گیا۔

میں وحشت زدہ نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ازابیلا اسی انداز میں سینے پر

دونوں ہاتھ باندھے آنکھیں بند کئے دیوان پر پڑی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کاؤنٹ اور خادمہ وہیں کہیں ہوں گے اور تھوڑی دیر بعد واپس آئیں گے۔ لیکن جب کافی وقت گزر گیا اور دونوں میں سے کوئی بھی واپس نہ آیا تو میں کھڑکی میں سے اتر کر ازابیلا کے قریب آگیا۔ اس کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں۔ چہرہ زرد گلاب کی طرح اداس اور کمزور تھا۔ وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی اور گردن پر خون کے دو ننھے سے قطرے عقیق کی طرح چمک رہے تھے۔ میں نے آہستہ سے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ازابیلا نے ایک دم سے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے سامنے مجھے دیکھا تو اس کے ہونٹ آہستہ سے ہلے۔ "سینور! تم ... تم یہاں کیوں آئے؟"

میں نے کہا۔ "ازابیلا! میں تمہیں یہاں سے لے جانے کے لئے آیا ہوں۔" ازابیلا نے اپنا ہاتھ اٹھا کر میرے ہاتھ کو تھام لیا اور نقاہت بھری آواز میں کہا۔

"سینور! خدا کے لئے یہاں سے واپس چلے جاؤ۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم میری فکر مت کرو' اور میرے ساتھ یہاں سے نکل چلو۔ میں تمہیں ان خون آشام درندوں کے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔"

ازابیلا گھبرا گئی۔ بولی "وہ تمہارے ساتھ مجھے بھی ہلاک کر ڈالیں گے۔ وہ کسی کو راز دار نہیں بنا سکتے۔ خدا کے ئے اپنی اور میری جان سے مت کھیلو' سینور!"

میں نے کہا۔ "ازابیلا! میں اپنی جان کی بازی لگا کر تمہاری تلاش میں یہاں تک آیا ہوں۔ تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے' میں جانتا ہوں کہ تم زندہ رہنا چاہتی ہو' مگر یہ تمہارا کاؤنٹ ماموں....."

اس نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور آہستہ سے کہا "وہ میرا ماموں نہیں ہے۔ میں اس کی بھانجی نہیں ہوں۔"

یہ میرے لئے ایک عجیب مگر حالات کے عین مطابق انکشاف تھا۔ کیونکہ ازابیلا کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کاؤنٹ کر رہا تھا' کوئی ماموں اس کا ارتکاب نہیں کر سکتا تھا۔ ازابیلا نے اپنی کمزور آواز میں مجھے بتایا کہ وہ کاؤنٹ کی بھانجی کبھی نہیں رہی' وہ اس کے دور کے ایک رشتے دار کی اکلوتی بیٹی تھی' اس کی ماں مر چکی تھی۔ کاؤنٹ نے اس کے باپ کو سازش کر کے اپنے آدمیوں سے قتل کروا دیا اور پھر ازابیلا کو اپنے جزیرے والے پراسرار محل میں لے آیا۔

"میں ایک برس سے اس کے رحم و کرم پر ہوں۔ اس نے اور اس کی خادمہ نے

مجھے اپنے ستم کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ وہ ہفتے میں چار دن مجھے اس زمین دوز تہہ خانے میں لا کر رکھتے ہیں۔ ہر رات یہ دونوں میرے پاس آتے ہیں۔ خادمہ میرا خون چوستی ہے اور اس کے بعد کاؤنٹ اس کے منہ سے خون اگلوا لیتا ہے اور خود اس کو پی جاتا ہے۔ مجھے یہ کوئی ایسا مشروب پلا دیتے ہیں کہ مجھ پر چار دن تک مدہوشی طاری رہتی ہے۔ میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتی۔"

میں نے ازابیلا کے ساتھ کچھ ایسی باتیں کیں کہ اس کے اندر زندہ رہنے کا ولولہ ایک بار پھر بیدار ہو گیا اور وہ اٹھ بیٹھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ "تم ابھی یہاں سے اٹھ کر میرے ساتھ چلو۔"

ازابیلا نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ ہم جزیرے میں جہاں کہیں بھی چھپے ہوں گے۔ کاؤنٹ کے خفیہ ساتھی ہمیں تلاش کر لیں گے اور پھر ایک عبرت انگیز موت ہمارا مقدر ہو گی۔ کاؤنٹ نے جزیرے میں ایک جگہ تالاب میں مگرمچھ چھوڑ رکھے ہیں۔ وہ اپنے دشمنوں کو ان مگرمچھوں کے آگے ڈال دیتا ہے اور مگرمچھ ان کی تکا بوٹی کر ڈالتے ہیں۔ میں نے ازابیلا کو بتایا کہ ہم وہاں سے نکل کر جزیرے میں کسی ایسی جگہ چھپ جائیں گے۔ جہاں کاؤنٹ کے آدمی ہمیں کبھی تلاش نہ کر سکیں گے۔ "بہرحال تمہیں جتنی جلدی ہو سکے میرے ساتھ یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

ازابیلا پر نقاہت طاری تھی اور ایک رات پہلے اسے کاؤنٹ نے جو مشروب پلایا تھا اس کا اثر اس پر موجود تھا مگر میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا..... اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا سیڑھیوں میں سے ہوتا تابوت میں لے آیا۔ ازابیلا نے مجھے بتایا کہ یہ تابوت کاؤنٹ نے اس کے لئے وہاں ڈلوا رکھا ہے کہ جب میرے جسم میں مزید طاقت باقی نہ رہے اور میں مر جاؤں تو مجھے اس تابوت میں بند کر دیا جائے۔ تابوت سے ہم باہر نکلے تو بوندا باندی رک چکی تھی۔ آسمان ابھی تک ابر آلود تھا۔ رات کا تیسرا پہر ڈھل رہا تھا۔ میں نے ازابیلا سے مشورہ کیا کہ اس کے خیال میں جزیرے میں کون سی جگہ سب سے زیادہ محفوظ ہو سکتی ہے۔ اس نے جواب میں بتایا کہ سارا جزیرہ کاؤنٹ کی دسترس میں اور اس کی نگاہ میں ہے۔ ہم جہاں بھی جائیں گے اس کے آدمی ہمیں تلاش کر لیں گے' پھر بھی جزیرے کے جنوب مشرق کی جانب ایک پرانا قبرستان ہے۔ جہاں آج سے دو سو برس پہلے کی قدیم قبریں موجود ہیں' وہاں ہمیں چھپنے کو جگہ مل سکتی ہے مگر ازابیلا کا کہنا تھا کہ ہم وہاں زیادہ دیر تک اپنے آپ کو نہیں چھپا سکے گے۔ ہمیں اس جزیرے سے ہی نکلنے کی کوشش کرنی ہو گی۔

ازابیلا بولی۔ "یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ ہم نہتے ہیں اور کاؤنٹ کا جو خاص آدمی

تمہارے لیے کشتی لے کر آ رہا ہے اس کے ساتھ دو مسلح آدمی بھی ہوں گے جو کشتی پر پہرہ دیں گے۔"

میں نے ازابیلا کو کوئی جواب نہ دیا۔ میں اپنے ذہن میں اس کشتی پر قبضہ جمانے کی ترکیبوں پر غور کرنے لگا۔

ہم رات کی تاریکی میں بھیگے ہوئے جھاڑ جھنکاڑ اور جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے ہو کر گزر رہے تھے۔ میں نے ازابیلا سے بلی کے رونے کی آواز' ناگوار بو اور پھر بلی کے سینے میں پیوست خنجر کے بارے میں پوچھا جس کا اس نے ان الفاظ میں جواب دیا کہ ان باتوں کے متعلق اسے خود کچھ معلوم نہیں ہے۔ ہم صنوبر اور سرو کے اونچے' تناآور اور گنجان درختوں میں داخل ہو گئے۔ یہ قدیم پرتگالی قبرستان تھا جہاں اندھیرے میں مجھے قبروں کے گرے پڑے کتبے دکھائی دیے' چبوترے ٹوٹے ہوئے تھے اور قبروں پر لگی ہوئی پرانی صلیبیں ایک طرف کو جھک گئی تھیں۔ ازابیلا اس قبرستان کے نشیب و فراز سے واقف تھی۔ وہ مجھے قبرستان کے عقب میں لے گئی۔ یہاں صنوبر کا ایک سال خوردہ گھنا درخت تھا جس کے تنے کا گھیر کافی بڑا تھا۔ اس درخت کے تنے میں جڑوں کے درمیان ایک گہرا شگاف بنا ہوا تھا۔ جسے جنگلی جھاڑ جھنکاڑ نے چھپا رکھا تھا۔ ازابیلا نے جھاڑیوں کو پیچھے ہٹایا تو درخت کے تنے کا شگاف واضح ہو گیا۔ ازابیلا بولی۔

"میں اس شگاف میں زیادہ سے زیادہ ایک دن چھپ سکتی ہوں۔ اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ کاؤنٹ کے آدمی مجھے یہاں بھی تلاش کر لیں۔ تمہیں کل کے دن میں شام تک یہاں سے فرار ہونے کی کوئی آخری ترکیب سوچ کر اس پر عمل کرنا ہو گا۔ دوسری صورت میں ہمارا پکڑے جانا یقینی ہو گا اور پھر ہم اپنے آپ کو مگرمچھوں کا لقمہ بننے سے نہیں بچا سکیں گے۔ ہو سکتا ہے کاؤنٹ میری جان بخشی کر دے مگر وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ میں اب بھی تمہیں یہی مشورہ دوں گی کہ تم واپس محل میں چلے جاؤ اور مجھے زمین دوز تہہ خانے میں چلے جانے دو۔"

میں نے ازابیلا سے کہا کہ مجھے ایک دن کی مہلت دو۔ پھر میں نے اسے درخت کے تنے کے شگاف میں چھپا دیا۔ یہ تنا اندر سے اتنا کھوکھلا تھا کہ وہاں دو تین آدمی بڑی آسانی سے چھپ سکتے تھے۔ میں نے تنے کے منہ پر جنگلی جھاڑیاں اور درختوں کی گری پڑی شاخیں اٹھا کر ڈال دیں اور ازابیلا کو ایک بار پھر اسی جگہ چھپے رہنے کی تاکید کر کے واپس محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

محل بدستور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں عقبی دروازے سے ہوتا ہوا دوسری منزل پر

اپنے کمرے میں آ کر پلنگ پر لیٹ گیا اور غور کرنے لگا۔ دوسرے روز کاؤنٹ کے بیان کے مطابق اس کے خاص آدمی کو مجھے لے جانے کے لئے کشتی لے کر آنا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ہر حالت میں اس کشتی پر قبضہ کرنے کے بعد ازابیلا کو وہاں سے نکال کر لے جانا ہو گا۔ ازابیلا کی جان کی حفاظت بہت ضروری تھی۔ کاؤنٹ کے آدمی اور وہ خود اپنے آپ کو میرے آگے بے بس پا کر ازابیلا کو ہلاک کر سکتا تھا۔ اسی ادھیڑبن میں رات گذر گئی۔ صبح ہوئی تو میں نیچے آ گیا۔ محل میں سوائے دو نوکروں اور ایک خادمہ کے اور کوئی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں کاؤنٹ بھی آ گیا۔ وہ صاف ستھرے لباس میں تھا۔ اس نے مجھے صبح بخیر کہا اور پوچھا کہ رات کیسے گذری۔ اس کے بشرے سے ٹپک رہا تھا کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے۔ تنے میں خون چوسنے والی خادمہ بھی ناشتے کا طشت تھامے آ گئی۔ اس کی آنکھیں بھی شب بیداری سے گلابی ہو رہی تھیں۔

میں نے ناشتہ کرتے ہوئے کاؤنٹ سے پوچھا کہ بندرگاہ سے اس کا خاص آدمی کشتی لے کے جزیرے پر کس وقت پہنچنے والا ہے۔ کاؤنٹ نے صاف ستھرے رومال سے اپنے ونٹوں کو بڑی نفاست کے ساتھ پونچھا اور بولا۔

"شام تک اس کے پہنچنے کی امید ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ تم بندرگاہ پر پہنچ اؤ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم یہاں اداس ہو گئے۔"

مین جانتا تھا کہ کاؤنٹ مجھے جلدی سے جلدی وہاں سے کیوں نکالنا چاہتا ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں کاؤنٹ ایسی بات نہیں ہے۔ تمہاری مہمان نوازی اور اس پرسکون محل کے سکون ماحول نے میرے دل کو موہ لیا ہے۔ میں یہاں کئی مہینے رہ سکتا ہوں۔"

اس پر کاؤنٹ کے چہرے پر ناگواری کے احساسات ابھر آئے پھر بھی مسکراتے ہوئے ہا۔

"میرا غریب خانہ تمہارے لئے حاضر ہے۔ مگر..... مگر میں خود ازابیلا کے اعتکاف میں ٹھنے کے بعد دو ایک روز میں یہاں سے لزبن چلا جانا چاہتا ہوں۔ اپنی بھانجی کے بغیر میرا ل بہت غمگین ہے۔ میرے جانے کے بعد تم خود کو یہاں بہت اکیلا اکیلا محسوس کرو گے۔ لزبن پہنچ کر مجھے ضرور ملنا' میں تمہیں شہر کی سیر کراؤں گا۔"

میں سب کچھ سمجھ رہا تھا کہ وہ میرے وہاں رہنے پر کیوں پریشان ہو گیا ہے۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"کاؤنٹ ' تمہاری میزبانی کا شکریہ میں خود زیادہ دنوں تک نہیں رک سکتا مجھے

اندلس اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے جا کر ملنا ہے جو میرے اندلس نہ پہنچنے پر پریشان ہوں گے۔"

اس کے بعد میں نے باتوں ہی باتوں میں پتہ چلا لیا کہ اس کا خاص آدمی کشتی لے کر جزیرے کے شمال کی جانب ایک گھاٹ پر اترے گا۔ اس کے ہمراہ مسلح محافظ بھی ہوں گے۔ جو گھاٹ پر ہی ٹھہریں گے۔ کاؤنٹ کی زبانی معلوم ہوا کہ اگرچہ محل میں دو تین چوکیدار ہی تھے مگر محل کے پیچھے ایک خاص مقام پر اس کا ایک حفاظتی دستہ ہر وقت چوکس رہتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ جب بحری ڈاکوؤں نے قلعے پر حملہ کیا تھا تو اس وقت یہ حفاظتی دستہ کہاں تھا؟

کاؤنٹ نے کہا۔ "بحری ڈاکوؤں کی تعداد زیادہ تھی۔ پھر بھی میرے جانبازوں نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا اور کچھ مارے بھی گئے لیکن بحری ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنا کوئی آسان بات نہیں ہوتی یہ بڑے چھٹے ہوئے شمشیر زن ہوتے ہیں۔ اب میرا ارادہ ہے کہ بندرگاہ سے فوج کی ایک خاص نفری بھرتی کر کے یہاں اپنی حفاظت کے لئے رکھوں۔"

ناشتے کے بعد کاؤنٹ بحری جہاز کی تزئین و آرائش کا کہہ کر ساحل سمندر کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد میں نے دو روٹیاں اور پھل کاغذ میں لپیٹا اور قبرستان کی طرف آ گیا۔ ازابیلا تنے کے شگاف میں نہیں تھی، مجھے تشویش ہوئی، دیکھا تو وہ درختوں کے درمیان میں چلی آ رہی تھی۔ میں نے اسے دبے لہجے میں ڈانٹا کہ اس طرح کھلے بندوں جزیرے میں نہیں پھرنا چاہئے۔ وہ مسکرائی اور بولی۔

"کاؤنٹ کو میرے بارے میں آج آدھی رات کے بعد پریشانی شروع ہو گی جب وہ مجھے زمین دوز تہہ خانے میں نہیں پائے گا۔ ابھی تک تو وہ مطمئن ہے کہ میں تہہ خانے میں لیٹی ہوں۔"

میں نے ازابیلا کو روٹی اور پھل دیئے تو اس نے بتایا کہ جزیرے میں اس نے جنگلی پھل کھا کر اور چشمے کا پانی پی کر اپنی بھوک پیاس دور کر لی ہے۔ میں نے کہا اسے دوپہر کے لئے اپنے پاس رکھو، تمہیں پھر بھی تو بھوک لگے گی۔ ازابیلا گھاس پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

"مجھے بھوک اب نہیں لگتی مگر پیاس بہت لگتی ہے۔"

میں نے اسے بتایا کہ کاؤنٹ نے تصدیق کر دی ہے کہ اس کا آدمی دو مسلح جوانوں کے ساتھ کشتی لے کر شام کو جزیرے پر پہنچ کر جائے گا۔ وہ مجھے جلد سے جلد یہاں سے رخصت کرنا چاہتا ہے۔

ازابیلا نے مسکرا کر پوچھا۔ "تم اس کی راہ میں رکاوٹ ہو۔ تمہاری وجہ سے اسے

اپنے راز کے طشت ازبام ہونے کا خطرہ ہے۔"

ازابیلا کے چہرے پر گذشتہ روز والی نقاہت اور کمزوری نہیں تھی، وہ بڑی ہشاش بشاش تھی۔ ظاہر ہے وہ کاؤنٹ کی قید سے آزاد ہو گئی تھی اور آزادی ہمیشہ مسرت و شادمانی کا پیغام لاتی ہے۔ وہ مجھ سے دریافت کرتی رہی کہ میں نے کشتی پر قبضہ کرنے کی کیا ترکیب سوچی ہے، کیا منصوبہ بنایا ہے؟ میرے دماغ میں ابھی تک کوئی منصوبہ نہیں تھا، میں نے اسے تسلی دی کہ بہرحال آج رات ہم اس جزیرے سے نکل جائیں گے۔

"تم تیار رہنا۔ میں آدھی رات سے پہلے پہلے کسی بھی وقت تمہیں آ کر لے جاؤں گا۔"

ازابیلا کچھ متفکر ہو کر بولی۔ "اگر تم آدھی رات نہ آئے تو کاؤنٹ کو میری گمشدگی کا علم ہو جائے گا اور اس کے آدمی سارے جزیرے میں میری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ پھر ہمارا فرار ناممکن ہو سکتا ہے۔ کچھ دیر میں ازابیلا کے ساتھ رہا اور اسے تسلی دے کر میں واپس محل کی طرف چل پڑا۔ سارا دن اسی سوچ بچار میں گزار دیا کہ ایسی کون سی ترکیب ہو سکتی ہے۔ کہ کشتی پر قبضہ بھی کر لیا جائے اور اگر کاؤنٹ کے دو مسلح آدمی وہاں پہرہ دے رہے ہوں تو انہیں بھی معلوم نہ ہو تاکہ وہاں ہنگامہ کھڑا نہ ہو سکے۔

دن غروب ہو گیا تو کاؤنٹ نے مجھے محل میں سے باہر جاتے ہوئے بتایا کہ کشتی لے کر اس کے آدمی کے آنے کا وقت ہو گیا اور وہ گھاٹ پر جا رہا ہے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر گھاٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بھی جنگل میں سے ہو کر گھاٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں محل وقوع دیکھنا چاہتا تھا۔ اگرچہ سورج غروب ہو چکا تھا مگر دن کی روشنی باقی تھی۔ گھاٹ کاؤنٹ کے محل سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں ایک ٹیلے کی اوٹ میں سے نکلا تو سامنے ساحل سمندر پر لکڑیاں جوڑ کر بنائے گئے پشتے کے قریب کاؤنٹ تلوار لٹکائے ٹہل رہا تھا۔ وہ بار بار سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک کشتی نہیں آئی تھی۔ سمندر پر غروب ہوتے دن کی سرخی سیاہی میں بدلنے لگی تھی اور جزیرے کے گنجان درختوں میں اندھیرا چھانا شروع ہو گیا تھا۔ میری نگاہیں بھی کھلے سمندر پر جمی تھیں۔

پھر مجھے دن کی رخصت ہوتی ہوئی الوداعی سرمئی دھندلی روشنی میں ایک بادبانی کشتی ساحل کی طرف آتی دکھائی دی۔

کاؤنٹ کی آنکھیں بھی اس کشتی پر جمی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد کشتی ساحل پر گھاٹ کے پشتے پر آ کر لگ گئی۔ اس میں سے تین آدمی نکلے، تینوں مسلح تھے۔ تلوار اور

بھالے ان کے پاس تھے۔ ایک اونچے قد کے جوان مسلح آدمی نے آگے بڑھ کر جھک کر کاؤنٹ کو سلام کیا۔ اس کا بایاں ہاتھ چوما اور کشتی کی طرف اشارہ کیا۔ کاؤنٹ اور وہ چند لمحے تک باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ واپس محل کی طرف روانہ ہو گئے۔ چونکہ ان کے پاس ایک ہی گھوڑا تھا' اس لئے وہ پیدل چل رہے تھے۔ یہ میرے اطمینان کی بات تھی۔ میں بھی تیزی سے واپس محل کی طرف چلنے لگا۔ میں ان سے پہلے محل میں پہنچ گیا اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد خادمہ نے آکر اطلاع دی کہ کاؤنٹ نیچے مجھے یاد کر رہا ہے۔ نیچے دالان والے کمرے میں کاؤنٹ لمبی کرسی پر بیٹھا تھا اس کا خاص آدمی جو کشتی لے کر آیا تھا' اس کے قریب بڑے ادب سے کھڑا تھا۔ تلوار اس کی کمر سے لٹک رہی تھی اور سر پر کسی جانور کے لمبے پروں والی ٹوپی تھی۔ کاؤنٹ نے میرا اس سے تعارف کروایا اور کہا۔

"اگر کبھی لزبن آنا ہو تو میرے محل کی طرف ضرور آنا۔ مجھے خوشی ہو گی۔"

رات کا کھانا ہم تینوں نے مل کر کھایا۔ پھر میں اجازت لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اب میرا مشن شروع ہونے والا تھا' بلکہ شروع ہو چکا تھا۔ رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا اور جزیرے پر گہری خاموشی اور تاریکی چھا گئی تھی۔ میں نے اپنے کمرے کا چراغ نہیں جلایا تھا۔ اندھیرے میں ہی کمرے سے نکل کر سیڑھیوں اور راہداری میں سے ہوتا ہوا محل کے عقبی دروازے سے باہر باغ میں آگیا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا جزیرے کے قبرستان کی طرف چلا جا رہا تھا۔ قبرستان میں موت کا سناٹا تھا۔ صنوبر کے تناور درخت کے پاس مجھے ایک سایہ بے چینی سے ٹہلتا نظر آیا۔ غور سے دیکھا تو وہ ازابیلا تھی۔ وہ پھر خفیہ کمین گاہ سے باہر آ گئی تھی۔ قریب گیا تو مجھے دیکھتے ہی اس کے بے چین چہرے پر اطمینان سا آگیا۔ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "مجھے سخت پیاس لگی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم نے چشمے پر جا کر پانی پی لیا ہوتا۔

وہ ہاتھ جھٹک کر بولی۔ "پانی ...... یہ پانی ٹھیک نہیں ہے۔" پھر میری طرف چمکیلی آنکھوں سے دیکھا اور کہنے لگی۔ "مجھے ایک بار تہہ خانے میں لے چلو۔ وہاں سیکورے میں میرا ایک خاص مشروب رکھا ہے۔ اس کے پینے سے میری پیاس بجھ جائے گی۔ خدا کے لئے مجھے ایک بار ..... صرف ایک بار زمین دوز تہہ خانے میں لے چلو۔"

میں نے اسے بتایا کہ وقت بہت تنگ ہے اور کاؤنٹ کسی بھی وقت تہہ خانے میں پہنچ سکتا ہے۔ وہ سر جھٹک کر بولی۔

"وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم مجھے وہاں لے چلو' بس سیکورے کا مشروب پی کر

تمہارے ساتھ واپس چل دوں گی۔"

میں مجبور ہو گیا۔ اسے ساتھ لیا اور جزیرے کے اس حصے میں آ گیا۔ جہاں شکستہ چبوترے پر بوسیدہ تابوت پڑا تھا۔ میں آگے آگے تھا۔ جلدی سے تابوت کے اندر داخل ہو کر تاریک سیڑھیاں اترتا نیچے تہہ خانے میں آ گیا۔ دو ایک بار پیچھے سے ازابیلا کا ہاتھ مجھے اپنے کندھے پر محسوس ہوا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ ہم اس کمرے میں کھڑے تھے جہاں ایک جانب سے زرد روشنی اندر آ رہی تھی اور دیوان خالی پڑا تھا۔ میں نے پلٹ کر ازابیلا سے کہا۔ "جلدی سے اپنا مشروب پیو اور یہاں سے نکل چلو۔" اس وقت میں نے ازابیلا کی آنکھوں میں ایک ایسی خونخوارانہ چمک دیکھی کہ ایک پل کے لئے میرے جسم میں بھی دہشت کی لہر دوڑ گئی۔

میں ایک قدم پیچھے ہٹا تو ازابیلا ایک چیخ مار کر مجھ پر جھپٹ پڑی۔ اس نے میری گردن اپنے ہاتھوں میں دبوچ لی۔ اس کی گرفت کسی جانور کی گرفت کی طرح مضبوط تھی۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی مگر میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتی تھی۔ میں نے کوئی حرکت نہ کی اور اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔ میری بے حسی سے ازابیلا کا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ سمجھی کہ میں دہشت زدہ ہو گیا ہوں۔ اس نے اپنا منہ میری گردن پر رکھ کر اپنے دانت میری کھال میں چبھو دیئے۔ بہت جلد اسے احساس ہو گیا کہ معاملہ الٹ ہے۔ میں اس کے مذموم عندیے کو سمجھ گیا تھا۔ میں نے اسے پیچھے جھٹک دیا اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"ازابیلا! ازابیلا! کیا تم بھی خون آشام چڑیل بن چکی ہو۔ ہوش میں آؤ۔"

ازابیلا حقیقت میں خون آشام چڑیل کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ اس کا چہرہ ڈراؤنا ہو گیا تھا۔ آنکھیں اوپر کو چڑھ گئی تھیں ہاتھوں کی انگلیاں مڑ گئی تھیں۔ اس کے حلق سے ایک ڈراؤنی آواز بلند ہوئی اور دلان نما کمرے کے مغربی ستونوں کے اندھیرے میں سے اچانک کاؤنٹ اور خون آشام خادمہ نکل کر میری طرف لپکے۔ ازابیلا نے میری طرف اشارہ کر کے چیخ کر کہا۔

"کاؤنٹ! اس کے بدن میں خون نہیں ہے۔"

میں ازابیلا کے کردار کی اس کایا پلٹ پر ششدر ہو کر رہ گیا۔ ابھی میں سنبھل نہ سکا تھا کہ کاؤنٹ اور خادمہ نے بھی مجھ پر حملہ کر دیا۔ کاؤنٹ نے مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا اور خادمہ نے وحشیانہ انداز میں اچھل کر میری گردن میں اپنے دانت گاڑ دیئے پھر فوراً ہی اپنی گردن پیچھے جھٹک دی اور چیخ نما آواز میں بولی۔

"اس کے جسم میں خون نہیں ہے۔"

کاؤنٹ نے دھکا دے کر مجھے زمین پر گرانے کی کوشش کی۔ وہ اگر ساری زندگی اپنی اسی کوشش میں لگا رہتا تو بھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے کاؤنٹ کو ستون کی طرف جھٹک دیا۔ وہ لڑھکتا ہوا ستون سے جا ٹکرایا۔ خادمہ اور ازابیلا بھی اس کی طرف لپکیں۔ کاؤنٹ فرش پر سے اٹھا اور جدھر اندھیرا تھا اس طرف دوڑا۔ وہ دونوں بھی جدھر کاؤنٹ گیا تھا۔ ادھر کو لڑکھڑاتی ہوئی چل پڑیں۔ ازابیلا اپنے آپ کو خادمہ کی گرفت سے چھڑانے کے لئے کوئی کوشش نہیں کر رہی تھی۔

ازابیلا کو اس خونی ماحول سے نکالنے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ خون آشاموں کی اس ٹولی کا حصہ بن چکی تھی اور اسے وہاں سے نکال کر انسانوں کی بستی میں لے جانا غیر انسانی فعل تھا میں تہہ خانے کے دلان میں اکیلا رہ گیا۔ تینوں خون آشاموں کے جانے کے بعد کونے سے آتی زوردروشنی بجھنا شروع ہو گئی۔ اس جانب سے ایک بار پھر کسی زخمی بلی کے کراہنے کی ڈراؤنی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں تہہ خانے کی جالی دار ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے گزر کر سیڑھیوں میں آگیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر تابوت کے سوراخ میں سے باہر نکلا تو دیکھا کہ رات کی تاریکی کم ہو رہی تھی اور مشرقی آسمان پر صبح کاذب کی کافوری جھلکیاں پھیل رہی تھیں۔

میں جزیرے کے درختوں میں سے گزرتا گھاٹ کے قریب آگیا۔ دونوں مسلح سپاہی کشتی کے قریب ہی ریت پر سو رہے تھے میں ان کے پاس سے گزرا تو ان کی آنکھ کھل گئی انہوں نے تلواریں کھینچ کر مجھے للکارا۔ میں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اچھل کر کشتی میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ یہ ان کی حماقت تھی۔ میرا ارادہ ہرگز ہرگز ان کو قتل کرنے کا نہیں تھا اور میں نے انہیں واپس چلے جانے کو بھی کہا۔ مگر وہ مجھ پر تلواریں برسانے لگے۔ ان کی تلواروں کے وار میرا تو کچھ نہ بگاڑ سکے لیکن تھوڑی دیر بعد ریت پر ان کی اپنی لاشیں پڑی تڑپ رہی تھیں۔ میں نے چپو سنبھالے اور کشتی کا رخ کھلے سمندر کی طرف کر دیا۔ ابھی ہوا کی رفتار مناسب نہیں تھی۔ چنانچہ میں دور تک چپوؤں کی مدد سے کشتی کھینچتا چلا گیا۔ جب کاؤنٹ کا منحوس جزیرہ کافی پیچھے رہ گیا تو سمندر کے وسط میں آنے کے بعد ہوا کے جھونکے چل نکلے۔ میں نے کشتی کا بادبان کھول دیا اور اسے شمال مغرب کی طرف چلانے لگا۔

کاؤنٹ کے بیان کے مطابق میری کشتی کو تیسرے روز پرتگال کے ساحل پر پہنچ جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہ ہوا۔ مجھے سمندر میں سفر کرتے پانچ روز گزر گئے تھے اور ساحل ابھی

تک دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں سمجھا کہ میں راستے سے بھٹک گیا ہوں اور اب خدا جانے کہاں سے کہاں جا نکلوں۔ سمندر میں دس روز تک بھٹکنے کے بعد ایک روز جبکہ آسمان پر گھنی گھٹائیں چھا رہی تھیں اور سورج غروب ہو چکا تھا مجھے دور سے ساحل کی سیاہ لکیر دکھائی دی۔ میں کشتی کو ساحل کے رخ پر رکھے ہوئے تھا اور سمندر کی لہریں اب تیزی سے ساحل کی طرف بڑھتے ہوئے میری کشتی کو آگے ہی آگے کھینچے لیے جا رہی تھیں۔ رات ہو چکی تھی جب میری کشتی ساحل کے ساتھ جا کر لگ گئی۔ ساحل پر جگہ جگہ سرو اور ایلوا کے درختوں کے جھنڈ کھڑے تھے۔ میں اندھیرے میں بھی ان درختوں کو پہچان سکتا تھا۔ سرو کے درختوں کو دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ میں پرتگال کی سرزمین پر نہیں ہوں۔ کیونکہ پرتگال میں سرو کے درختوں کی اتنی بہتات نہیں ہے۔ میں نے کشتی کو وہیں ساحل پر چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی ٹیکریوں میں چلنے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد مجھے بائیں جانب کھجور کے درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیا۔ یہ درخت اس امر کی نشانی تھی کہ میں اندلس کی سرزمین پر پہنچ چکا ہوں۔ کیونکہ کھجور کے درخت اندلس میں ہی مسلمانوں نے پہلے پہل آ کر لگائے تھے اب مجھے اس کی تصدیق کرنی تھی۔ میں کھجور کے جھنڈ کی طرف بڑھا۔ آدھی رات کا سکوت طاری تھا۔ کھجور کے جھنڈ میں ایک چھوٹا سا صحرائی چشمہ جاری تھا جس کا پانی ستاروں کی روشنی میں دھندلا نظر آ رہا تھا۔

میں چشمے کے کنارے بیٹھ گیا اور منہ ہاتھ دھونے لگا۔ اچانک عقبی ٹیکریوں کی جانب سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ ٹاپوں کی آواز چشمے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں کچھ سوچ کر درختوں کے پیچھے اندھیرے میں جا کر چھپ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں تین گھڑ سوار نمودار ہوئے انہوں نے ہسپانوی انداز میں لمبے لبادے اوڑھ رکھے تھے' کمر کے ساتھ تلواریں لٹک رہی تھیں۔ میں نے درخت کی اوٹ سے غور سے دیکھا۔ یہ دو مرد تھے اور ان میں ایک حسین عیسائی لڑکی بھی موجود تھی۔ چونکہ میں اندھیرے میں بھی عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ بہتری سے دیکھ لیتا ہوں اس لئے مجھے اس لڑکی کے بشرے سے محسوس ہوا کہ وہ کسی اعلیٰ خاندان کی چشم دچراغ ہے۔ مگر اس کا لباس مسلمان لڑکیوں ایسا نہیں تھا۔ اس نے عیسائیوں کا لباس پہن رکھا تھا۔ دونوں سوار چشمے پر آ کر رک گئے انہوں نے لڑکی کو بھی نیچے اتار لیا۔ انہوں نے لڑکی کو ایک طرف زمین پر بٹھا دیا۔ اور ہسپانوی زبان میں منہ ہاتھ دھونے اور پانی پینے کے لئے کہا۔ وہ خود بھی منہ ہاتھ دھونے لگے۔ گھوڑے پانی پی رہے تھے لڑکی نے منہ ہاتھ دھو کر اپنے بالوں کو جھٹکا۔ پھر ان میں آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرتی

ہوئی بولی۔

"ڈان پیڈرو! تم مجھے ناحق واپس لے جا رہے ہو، میں وہاں نہیں رہوں گی۔"

اس ہسپانوی نے جس کا نام ڈان پیڈرو تھا، غصیلی آواز میں کہا۔

"عذرا! تم نے ایک مسلمان نوجوان کے ساتھ گھر سے نکل کر ہماری ناک کٹوا دی ہے۔ سارے خاندان کو بے عزت کیا ہے۔ تمہارا باپ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم تمہیں اس کے پاس لے جائیں۔"

دوسرا ہسپانوی بولا۔ "اگر اس نے تمہیں سزا نہ دی تو ہم تمہیں ہلاک کر ڈالیں گے۔ تم نے ہماری عزت اور وقار خاک میں ملا دیا ہے۔"

اس لڑکی کا نام عذرا تھا۔ عذرا نے شان بے نیازی سے گردن کو ایک طرف خم دیا اور بولی۔ "تم چاہے میرے ٹکڑے اڑا دو مگر میں عبداللہ بن علی کی ہوں اور ہمیشہ اسی کی محبت کا دم بھرتی رہوں گی۔" اس پر ہسپانوی ڈان پیڈرو نے غصے میں آ کر تلوار کھینچ لی۔ اس کے ساتھی نے فوراً اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"نہیں ڈان پیڈرو، یہ ہمارے چچا اور اپنے باپ کی امانت ہے ہمیں اسے زندہ حالت میں اس کے باپ تک پہنچانا ہے۔ ہم نے اس کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اپنے غصے پر قابو پاؤ۔"

ڈان پیڈرو نے تلوار دوبارہ نیام میں کر لی اور گھوڑے پر سے کمبل اتار کر نیچے ریت پر بچھانے لگا۔

"ہم یہاں باقی رات آرام کریں گے۔ اس کے ہاتھ باندھ دو۔"

عذرا کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے۔ اس کے لئے ذرا ہٹ کر زمین پر موٹا کمبل بچھا دیا گیا۔ ڈان پیڈرو نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "یہاں سو جاؤ۔ شاید یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہو۔" عذرا نے بالوں کو جھٹک کر کہا۔ "زندگی اور موت خداوند کے ہاتھ میں ہے۔"

چار قدم کے فاصلے پر دونوں ہسپانوی جو عذرا کے قریبی رشتے دار تھے لیٹ گئے انہوں نے عذرا کے پاؤں میں بھی ایک رسی ڈال کر اپنے پاؤں میں باندھ لی تھی تاکہ اگر وہ فرار ہونے کی کوشش کرے تو انہیں پتہ چل جائے۔ میں خاموش تماشائی بنا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر تک آپس میں باتیں کرنے کے بعد دونوں ہسپانوی سو گئے۔ ان کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ عذرا نے لیٹے لیٹے سر اٹھا کر ان کی طرف نگاہ ڈالی۔ شاید وہ فرار ہونے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مگر مجبور تھی اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنا سر دوبارہ نیچے ڈال لیا۔

ساری کہانی میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ کسی ہسپانوی جاگیردار کی بیٹی تھی جو کسی مسلمان نوجوان عبداللہ بن علی سے محبت کرتی تھی اور شاید اس کے ساتھ گھر سے فرار ہو گئی تھی اور یہ لوگ اسے دوبارہ پکڑ کر لائے تھے۔ خدا جانے عذرا کے محبوب عبداللہ بن علی کا کیا حشر ہوا تھا۔ زندہ تھا یا مر گیا تھا لیکن عذرا کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ مرا نہیں ہے۔ بہرحال میں نے عذرا کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ اس کی باتوں سے ثابت ہو چکا تھا کہ وہ عبداللہ بن علی سے محبت کرتی ہے اور اپنی مرضی سے اس کے پاس گئی تھی۔ جو لوگ نہ صرف یہ کہ محبت کرتے ہیں۔ بلکہ محبت میں اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ ان کی مدد کرنا میرا اولین فرض تھا۔ میں نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا۔ دونوں ہسپانوی سرداروں کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔ چاروں طرف رات کا اندھیرا تھا۔ انہوں نے وہاں کوئی الاؤ بھی روشن نہیں کیا تھا۔ ان کی باتوں سے یہ بات بھی تقریباً ثابت ہو چکی تھی کہ میں اندلس کی سرزمین پر ہوں۔

میں بڑی احتیاط کے ساتھ کھجور کے درختوں کی اوٹ سے نکلا میں آہستہ آہستہ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا ہسپانوی دوشیزہ عذرا کے سرہانے کی طرف آ گیا۔ وہ جاگ رہی تھی مگر اس نے اپنا سر نیچے کر رکھا تھا مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ مجھے اچانک دیکھ کر خوف سے اس کی چیخ بھی نکل سکتی تھی۔ میں ذرا سی آہٹ پیدا کیے بغیر گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اس کے قریب آ کر رک گیا۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ جلدی سے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے ہونٹوں پر مضبوطی سے جما دیا۔ پھر اس کے کان میں ہسپانوی زبان میں کہا۔ "عذرا، میں تمہاری مدد کرنے آیا ہوں۔ بالکل خاموش رہنا۔" اس کے ساتھ ہی میں نے سب سے پہلے نہایت احتیاط سے اس کے پاؤں کی رسی کھول ڈالی۔ میرے رسی کھولنے سے عذرا کی تسلی ہو گئی کہ میں کوئی غیبی امداد ہوں۔ اس کے بعد میں نے اس کے ہاتھوں کو بھی رسی کی بندش سے آزاد کر دیا۔ عذرا اٹھ کر بیٹھ گئی اور اندھیرے میں اپنی چمکیلی آنکھوں سے میری طرف تکنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں مسرت آمیز حیرت تھی۔ میں نے اسے اشارے سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ وہ میرے پیچھے چلنے لگی۔ ہم کھجوروں کے جھنڈ میں آ گئے۔ اب اس نے سرگوشی کی۔

"تم کون ہو؟ تمہارا لباس ہسپانوی نہیں ہے۔"

میں نے اسے سرگوشی میں جواب دیا۔ "میں کوئی بھی ہوں، اس کی تم فکر نہ کرو۔ اس وقت تمہیں یہاں سے نکالنا ہے میرے ساتھ آؤ۔"

عذرا نے ایک بار پھر سرگوشی میں کہا۔ "ہمیں گھوڑے نکال کر لے آنے چاہئیں۔"

یہ کام خطرناک تھا، گھوڑے اجنبی کو دیکھ کر بدک سکتے تھے اور ان کی ہنہناہٹ کی آواز پر دونوں ہسپانوی جاگ کر عذرا کے لئے موت کا فرشتہ بن سکتے تھے۔ میں ایک ہسپانوی سے عذرا کی جان بچا سکتا تھا لیکن دوسرا اس پر وار کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود عذرا کی تجویز قابل غور تھی۔ اگر میں اسے ساتھ لے کر نکل بھی جاتا تو دن نکلنے پر ہسپانوی ہمارے قدموں کے نشان لیتے ہم تک پہنچ جاتے، پھر ان ٹیکریوں میں گھنے جنگل بھی نہیں تھے بس کہیں کہیں سرو اور ایلوا کے درختوں کے جھنڈ کھڑے تھے۔ تیسری بات یہ تھی کہ میں اس علاقے سے ناواقف تھا۔ عذرا کی زبانی مجھے اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ ہم اندلس کے جنوبی ساحل پر ملاکا کی بندرگاہ سے کچھ ہی فاصلے پر تھے۔ عذرا سے میں اس سے زیادہ نہیں پوچھ سکا تھا۔ آخر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ مجھے گھوڑے کھولنے کی خطرناک غلطی نہیں کرنی چاہئے۔ میں نے عذرا کو ساتھ لیا اور ہم تیز تیز چلتے ہوئے درختوں کے جھنڈ سے نکل کر شمال کی طرف ایک ٹیکری کے دامن میں آ گئے۔ میں نے عذرا سے پوچھا کہ کیا وہ ان علاقوں سے واقف ہے؟ اس نے جواب میں بتایا کہ شمال مشرق کی جانب غرناطہ کا شہر ہے جو وہاں سے اونٹوں پر چار دن کی مسافت پر ہے۔ اس کے سوا اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔

میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ہسپانوی دوشیزہ عذرا زیادہ دور تک میرا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ وہ تھک جائے گی۔ اس لئے ضروری تھا کہ کوئی ایسا محفوظ ٹھکانہ تلاش کیا جائے جہاں عذرا کو چھپا دیا جائے، زمین پر گھاس بالکل نہیں تھی اور وہاں ہمارے قدموں کے نشان پڑ رہے تھے۔ جو عذرا کے رشتے دار ہسپانوی گھڑ سواروں کو اس کی خفیہ کمین گاہ تک پہنچا سکتے تھے۔ یہ ساری باتیں میرے پیش نظر تھیں۔ سامنے حد نظر تک چھوٹے چھوٹے اونچے اونچے ٹیلوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جہاں کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ سیاہ دھبوں کی طرح لگ رہے تھے۔ ہسپانوی گھڑ سوار کسی وقت بھی بیدار ہو کر عذرا کی تلاش میں نکل سکتے تھے اب رات بھی ڈھلنا شروع ہو گئی تھی۔ اندلس کا مشرقی آسمان ابھی زمرد کے رنگ کا ہو گیا تھا۔

آخر وہی ہوا۔ عذرا تھک کر بیٹھ گئی۔ اس نے کہا کہ اس سے آگے نہیں چلا جاتا۔ میں نے دائیں بائیں نظریں دوڑائیں۔ مجھے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں ایک ایسی چیز نظر آئی جس نے ایک پل کے لئے مجھے متعجب کر دیا اور میں نے از سر نو غور کیا کہ کہیں میں غلطی سے اندلس کی بجائے اپنے آباؤ اجداد کی قدیم سرزمین مصر میں تو نہیں آ گیا' یہ تعجب خیز چیز اہرام کی طرز کا ایک مخروطی ٹیلہ تھا۔ حیرانی کی یہ بات تھی کہ اگر یہ اندلس کی سرزمین ہے تو یہاں یہ اہرام کہاں سے آ گیا۔ میں نے ایک بار پھر ہسپانوی دوشیزہ سے سوال کیا کہ کیا

ہم اندلس میں ہی ہیں نا؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میرے پاس غور و فکر کا وقت نہیں تھا۔ میں نے عذرا کو ساتھ لیا اور اہرام کی طرف بڑھا۔

قریب جا کر دیکھا تو وہ واقعی ایک پرانا اہرام تھا۔ جس کی مخروطی دیوار کے بڑے بڑے پتھر جگہ جگہ سے ٹوٹ کر جھڑے ہوئے تھے۔ ہسپانوی دوشیزہ کو اس اہرام کے بارے میں صرف اتنا ہی علم تھا کہ یہ ایک قدیم کھنڈر ہے۔

میں نے عذرا کو ایک طرف بیٹھنے کے لئے کہا اور خود اس بوسیدہ اہرام کے کھنڈر کا تینوں جانب گھوم کر جائزہ لیا۔ میں دیوار میں اس جگہ کو تلاش کر رہا تھا۔ جہاں تین پتھروں کو ایک خاص شکل میں جوڑ کر ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا جاتا ہے۔ آخر وہ جگہ مجھے مل گئی۔ یہاں تین پتھروں کو اس طرح جوڑا گیا تھا کہ ان کے درمیان چھوٹی سی تکون بن گئی تھی۔ یہی اہرام میں داخل ہونے کا پوشیدہ دروازہ تھا۔ میں نے ایک پتھر کو اپنی گرفت میں لے کر ہلایا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل گیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے اس پتھر کو اور پھر دوسرے پتھر کو باہر نکال لیا۔ اندر سے بھاری نم آلود خاص پراسرار اہرامی خوشبوئیات میں ڈوبی ہوئی ہوا کا جھونکا بڑی تیزی سے باہر کو نکلا۔ میں نے جھانک کر اندر دیکھا۔ گھپ اندھیرا تھا۔ دو سیڑھیوں کے پتھر دیوار کی اندر کی جانب بنے ہوئے تھے۔ میں دیوار کی اوٹ سے نکل کر عذرا کے پاس گیا اور اسے اپنے ساتھ لے کر اہرام کے خفیہ دروازے پر آ گیا۔

وہ خستہ حال اہرام کی دیوار میں شگاف دیکھ کر حیران رہ گئی۔ میں نے اس کو مطمئن کرنے کے لیے کہا کہ یہاں پہلے ہی سے یہ پتھر اکھڑا ہوا تھا۔ وہ اندر جاتے ہوئے گھبرا رہی تھی لیکن اب صبح کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ ہمیں دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے عذرا سے کہا کہ اس کے ظالم رشتے دار اسے گرفتار کرنے چلے آ رہے ہیں۔ اس پر وہ گھبرا کر اہرام کی طرف بڑھی۔ میں نے اسے روک دیا اور خود شگاف میں سے اندر اہرام کے گھپ اندھیرے میں اتر گیا۔ سیڑھیوں کے دو پتھروں کے نیچے ریتلی زمین تھی میں نے عذرا کو بھی اندر کھینچ لیا۔ اسے اہرام کی اندرونی دیوار کے ساتھ بیٹھنے کو کہا۔ خود شگاف سے باہر آ کر پتھروں کو دیوار میں اس طریقے سے جمایا کہ عذرا کو تازہ ہوا اندر ملتی رہے۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اس کا تعاقب کرتے سرداروں کو غلط راستے پر ڈالنے کے لئے باہر جا رہا ہوں۔

میں اہرام کے سامنے مہندی کی جھاڑیوں کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک چالاکی یہ کی کہ شور زدہ زمین پر بنے ہوئے اپنے اور عذرا کے قدموں کے نشان دور

تک مٹا دئے۔ اتنے میں دونوں ہسپانوی اپنے ساتھ عذرا کا خالی گھوڑا لئے میرے قریب آ کر رک گئے۔ ان میں جوڈان پیڈرو تھا۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میں نے وہاں سے کسی نوجوان دوشیزہ کو جاتے دیکھا ہے؟ میں نے کچھ سوچ کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہاں تھوڑی دیر پہلے اس طرف ایک عورت کو میں نے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ دونوں سرداروں نے میرا شکریہ ادا کیا اور دوسری جانب گھوڑے ڈال دئے۔ جب وہ گھڑ سوار میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو میں اٹھا اور اہرام کی دیوار کے پتھر کو باہر کھینچ کر اندر داخل ہو گیا۔ میں نے پتھر کو کھینچ کر دوبارہ اس کی جگہ پر اس طرح جوڑ دیا کہ تازہ ہوا اندر آتی رہے۔ میں چاہتا تھا کہ جب گھڑ سوار اس علاقے سے دور نکل جائیں تو میں عذرا کو وہاں سے نکال کر جہاں وہ جانا چاہتی ہے وہاں پہنچا دوں۔

اندھیرے میں مجھے ہسپانوی دوشیزہ وہاں نظر نہ آئی۔ میں نے اسے آواز دی تو اس کی بڑی کمزور سی آواز اہرام کے ایک کونے سے آئی۔ میں اس کی طرف لپکا۔ میں اہرام کے گھپ سیاہ اندھیرے میں بھی پتھروں کے دھندلے خاکے دیکھ سکتا تھا۔

کونے میں ایک جگہ ممی کا تابوت اپنے چبوترے سے لڑھک کر ایک طرف اوندھا پڑا تھا۔ چبوترے میں گہرا شگاف تھا۔ عذرا اسی شگاف میں پڑی تھی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے باہر نکالا۔ اس نے بتایا کہ وہ شگاف کو جھک کر دیکھ رہی تھی کہ کسی نے اسے پیچھے سے دھکا دے کر اس میں گرا دیا۔ میں نے جھک کر غور سے دیکھا۔ گڑھے میں اس قسم کے لکڑی اور پتھر کے گول ڈبے ٹوٹے پڑے تھے جن میں فرعونوں کے گھروں میں بیگمات اپنے قیمتی جواہرات رکھا کرتی تھیں۔ اسی قسم کے کچھ ڈبے اوندھے پڑے تابوت کے پاس بھی بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ اس اہرام کو چور اور ڈاکو لوٹ چکے ہیں۔ کیونکہ وہاں سوائے نیزوں اور بھالوں کے کوئی سونے چاندی کا برتن' سونے کی بگھی اور جواہرات سے مزین عقاب اور بلی کا کوئی بت بھی نہ تھا۔ عذرا سخت گھبرائی ہوئی تھی جب اسے معلوم ہوا کہ میں نے اس کے رشتے دار سرداروں کو غلط راستے پر ڈال دیا ہے۔ تو وہ اہرام سے باہر نکلنے کے لئے بے تاب ہو گئی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اسے کچھ دیر مزید وہاں ٹھہرنا ہو گا تاکہ دشمن کافی دور نکل جائے۔ وہ سہم کر ایک طرف دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ وہ اوندھے پڑے تابوت کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔" وہ پریشان ہو کر اٹھی اور بولی۔ "خدا کے لئے یہاں سے نکل چلو۔ یہاں میرا دل گھبرا رہا ہے۔" میں نے عذرا کو ساتھ لیا اور اہرام سے باہر نکل آیا۔ میں نے باہر آتے ہی پتھروں کو اس طرح دیوار سے جوڑ دیا کہ کسی کو شک نہ ہو کہ

یہاں سے کوئی خفیہ راستہ اندر جاتا ہے۔

کھلی ہوا اور روشن دھوپ میں آ کر عذرا نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہم نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ گھڑ سوار وہاں کہیں نہیں تھے۔ اب میں نے عذرا سے پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہے ہم مہندی کی جھاڑیوں کے سائے میں بیٹھ گئے۔

عذرا نے اب مجھے اپنی محبت کی داستان سنائی۔ یہ ہسپانوی دوشیزہ غرناطہ کے ایک نواب ڈان کارلوس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ غرناطہ میں قرطبہ کے دربار کے امیر اور قاضی القضاۃ محمد بن علی کے اکلوتے لڑکے عبداللہ بن علی کی ایک چھوٹی سی جاگیر تھی۔ یہ جاگیر قرطبہ کے قاضی کے بیٹے کو خلیفہ مسترشد نے بخشی تھی۔ خلیفہ ' قاضی صاحب کی اعلیٰ دینی اور منصبی خدمات سے خوش ہو کر یہ جاگیر انہیں بخشنا چاہتا تھا لیکن قاضی صاحب نے یہ کہہ کر اسے لینے سے انکار کر دیا۔ "مجھے اللہ تعالیٰ نے ضروریات کے لئے کافی دیا ہے۔ میری کوئی ضرورت رکی ہوئی نہیں ہے۔ ضرورت سے زیادہ مال انسان کو تباہ کر دیتا ہے۔" اس وقت تو خلیفہ خاموش رہا لیکن کچھ ایام گزر جانے پر اس نے یہی جاگیر قاضی کے اکلوتے اور نوجوان بیٹے عبداللہ بن علی کو بخش دی جو قرطبہ سے اٹھ کر غرناطہ اپنی جاگیر پر آ گیا۔ اگرچہ قاضی صاحب نے سلطان سے منت کی کہ جاگیر اس کے بیٹے کو نہ دی جائے مگر سلطان نے ان کی ایک نہ سنی۔ روانگی کے بعد قاضی صاحب نے اپنے بیٹے کو خط لکھ کر نصیحت کی کہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا۔ صرف رضائے الٰہی کی خاطر اس کے بندوں کی خدمت کرنا۔ کسی پر زیادتی اور ظلم نہ کرنا۔ مگر عبداللہ بن علی حسین اور نوجوان تھا۔ پھر دولت کی کثرت ہو گئی۔ چنانچہ اس نے غرناطہ کے ایک ہسپانوی عیسائی جاگیردار ڈان کارلوس کی اکلوتی بیٹی سے عشق کرنا شروع کر دیا اور شادی کی کوشش میں ناکامی کے بعد اسے اپنے ساتھ لے کر ملاکا کی طرف نکل گیا۔

اس کے بعد کے حالات مجھے معلوم ہی تھے۔

عذرا نے خواہش ظاہر کی کہ میں اسے ملاکا میں واپس اس کے محبوب عبداللہ بن علی کے پاس پہنچا دوں۔ جہاں وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ یہ بڑی جائز اور خوش آئند بات تھی۔ میں نے ہامی بھر لی اور غور کرنے لگا کہ کہیں سے دو گھوڑوں کا انتظام ہو جائے تو عذرا کو ساتھ لے کر ملاکا کی طرف کوچ کر جاؤں۔

عذرا نے میرے بارے میں دریافت کیا تو میں نے اسے بتایا کہ میں ایک مصری سیاح ہوں۔ دنیا کی سیاحت پر نکلا ہوں۔ ساتھ ساتھ جڑی بوٹیوں کا بھی دھندہ کرتا ہوں اور میرا نام بھی عبداللہ ہے وہ بڑی خوش ہوئی کہ میں اس کے محبوب کا ہم نام ہوں۔ وہ وہاں سے

نکل جانے کو بے تاب تھی۔ میں نے گھوڑوں کے بارے میں بات کی تو اس نے اپنی سونے کی صلیب اتار کر کہا۔ "یہاں سے سات کوس پیچھے کی جانب ایک گاؤں ہے۔ یہ صلیب فروخت کر کے ہم وہاں سے تازہ دم گھوڑے حاصل کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔" میں نے صلیب اس کے گلے میں ہی پڑی رہنے دی اور اسے ساتھ لے کر واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ ایک امیر گھرانے کی چشم و چراغ نازک اندام دوشیزہ کے لئے پر خطر بیاباں میں سات کوس پیدل سفر کرنا بہت مشکل تھا۔ عذرا اپنے محبوب سے ملنے کے جذبے میں تیز تیز چل رہی تھی۔ کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے اس نے میرے ساتھ سات کوس کی مسافت طے کر لی۔ ہم ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ یہ عیسائی ہسپانویوں کا گاؤں تھا۔ یہاں ایک چھوٹا گرجا بھی بنا ہوا تھا۔ مکانوں کی چھتیں ڈھلانی تھیں اور ہر مکان کی دیوار پر سرخ جنگلی پھولوں کی بیل چڑھی ہوئی تھی ملاکا یہاں سے ایک دن اور ایک رات کے فاصلے پر تھا۔ مجبوراً" عذرا کو اپنی سونے کی صلیب بیچنی پڑی ہم نے دو گھوڑے حاصل کر لئے کچھ سوکھا پھل اور گوشت اور پانی کی چھاگل ساتھ لے لی اور آگے کو روانہ ہو گئے۔

عذرا کو ایک ہی ڈر لگا تھا کہ کہیں اس کا محبوب عبداللہ بھی وہاں سے چلا نہ گیا ہو لیکن جب ہم ملاکا شہر کے باہر انجیر کے باغ میں پہنچے تو ہمیں پتہ چلا کہ ہسپانوی دوشیزہ کا محبوب عبداللہ بن علی وہاں موجود ہے اور غرناطہ جا کر عذرا کے باپ سے ملنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ دونوں محبت کرنے والے ایک دوسرے کو ایک بار پھر اپنے سامنے پا کر خوشی سے نہال ہو گئے۔ عذرا نے اپنے محبوب سے میرا یوں تعارف کرایا کہ اگر میں اس کی مدد کو نہ آتا تو وہ واپس نہیں آسکتی تھی۔ عبداللہ بن علی ایک وجیہہ اور عالی نسب نوجوان تھا۔ اس نے مجھے گلے لگا لیا اور شکریہ ادا کیا۔ اسی روز عذرا اور عبداللہ بن علی کی شادی ہو گئی۔ عذرا نے اسلام قبول کر لیا۔ اب عبداللہ بن علی نے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر واپس غرناطہ جانے کا منصوبہ بنایا تاکہ وہ عذرا کے باپ کو صورت حال سے آگاہ کر کے اپنی جاگیر پر ہنسی خوشی زندگی بسر کر سکے۔ عذرا اس منصوبے کے خلاف تھی مگر عبداللہ نے اسے راضی کر لیا۔ میں خود غرناطہ جانے کا خواہشمند تھا۔ چنانچہ ایک روز ہم غرناطہ جانے والے قافلے میں شامل ہو گئے۔ چار دن کی مسافت کے بعد ہمارا قافلہ غرناطہ پہنچ گیا۔ سیرانواڑ کی برف پوش چوٹیوں کے دامن میں خلیفہ مسترشد اول کے عہد کا شہر غرناطہ ایک نگینے کی طرح دمک رہا تھا۔ ایک ٹیلے پر دور ہی سے ہمیں الحمرا کے باغات کے اشجار نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ قصر الحمراء کے سرخ رنگ کے مربع برجوں کی چوٹیاں نیلگوں آسمان کی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔

غرناطہ شہر کے باہر ایک حسین و جمیل وادی میں عبداللہ بن علی کی جاگیر تھی جہاں انگور و انجیر کے باغات میں ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے رواں تھے۔ میں نے اس محبت کرنے والے نوبیاہتا جوڑے کے ساتھ قیام کیا۔ شام کے وقت عبداللہ بن علی تلوار لٹکا کر گھوڑے پر سوار ہوا اور عذرا کے باپ کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ عذرا نے ایک بار پھر اسے آنسوؤں بھری آنکھوں کے ساتھ رخصت کیا اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ اسے اپنے باپ کی جاگیر پر جانے سے منع کرنا چاہتی تھی مگر عبداللہ بن علی جانے کا فیصلہ کر چکا تھا تاکہ حالات معمول کی شکل اختیار کر سکیں۔ وہ اکیلا ہی گیا اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ عذرا دل تھام کے رہ گئی میں اسے حوصلہ دینے لگا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد ایک گھڑ سوار گھبرایا ہوا آیا اس نے بتایا کہ عبداللہ بن علی کا ڈان کارلوس کی حویلی میں عذرا کے ماموں سے جھگڑا ہو گیا۔ عبداللہ بن علی نے اسے قتل کر دیا اور سپاہی اسے پابہ زنجیر کر کے غرناطہ کے گورنر کے محل میں لے گئے ہیں۔ عذرا پر تو گویا بجلی گر پڑی۔ گھڑ سوار نے یہ بھی بتایا کہ ڈان کارلوس خود اپنی بیٹی کو لینے وہاں آ رہا ہے۔ عذرا کا رنگ سفید پڑ گیا اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں مجھے بتایا اس کا باپ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ "خدا کے لئے مجھے یہاں سے کہیں لے چلو۔" میں نے اسی وقت گھوڑوں پر زین کسی۔ عذرا کو گھوڑے پر بٹھا کر ساتھ لیا اور ہم جاگیر کے باغات سے نکل کر دریائے ویگاس کو عبور کر کے غرناطہ کے شمال کی جانب روانہ ہو گئے۔ عذرا اس سارے علاقے سے واقف تھی۔ اس نے بتایا کہ دریائے ویگاس مرسلانہ کی پہاڑیوں سے جہاں نکلتا ہے وہاں ڈھلانی جنگل میں ایک پرانی خانقاہ ہے جس کا متولی ایک نیک دل بوڑھا عیسائی پادری ہے جو اسے بچپن میں اسے کھلایا کرتا تھا۔ ہم نے دریا کے منبع کی جانب گھوڑے ڈال دیئے۔

نصف شب کے بعد ہم ڈھلانی جنگل میں واقع پرانی خانقاہ میں پہنچ گئے بوڑھا عیسائی پادری شمع دان ہاتھ میں لئے خانقاہ سے باہر آ گیا اس نے عذرا کو پہچان لیا۔ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ عذرا نے اسے سارے حالات بتا دیئے بوڑھا پادری پدرانہ شفقت سے مسکرایا اور بولا۔ "خدا معاف کرنے والا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ جب تک تمہارے خاوند کا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا تم میری پناہ میں رہو گی۔" وہ مجھ سے بھی بڑے اخلاق سے پیش آیا۔

عذرا اپنے خاوند کی گرفتاری پر بہت پریشان تھی۔ عیسائی پادری نے فکر انگیز انداز میں کہا۔ "بیٹی! مسلمانوں کے عہد حکومت میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہے تمہارے خاوند کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے گا۔"

عذرا نے آنسو بھر کر کہا۔ "مقدس باپ میں مسلمانوں کے انصاف ہی سے خوفزدہ ہوں۔ یہ لوگ کسی سے رو رعایت نہیں کرتے صرف انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ ڈرتی ہوں کہیں میرے خاوند کو۔" وہ رونے لگی۔ پادری نے اسے تسلی دی اور پھر ایک کوٹھری میں بستر ڈال کر اسے سلا دیا۔ اس کے بعد وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ میں نے ان کو بھی اپنے بارے میں یہی بتایا کہ میں ایک مصری سیاح ہوں اور عذرا کی مدد کے خیال سے اس کے ساتھ آگیا ہوں۔ پادری مسکرایا۔ "مبارک ہیں وہ لوگ جو ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ اب تم بھی آرام کرو۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔" پادری اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔ میں وہیں گھاس کے بستر پر لیٹ گیا۔

غرناطہ کے گورنر کو جب پتہ چلا کہ قاتل عبداللہ بن علی قرطبہ کے قاضی القضاۃ محمد بن علی کا اکلوتا بیٹا ہے تو اس نے خلیفہ مسترشد کو سارا احوال لکھ بھیجا کہ اس مقدمے کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے۔ اصل میں غرناطہ کا مسلمان گورنر اتنی بڑی درباری شخصیت کے بیٹے کے خلاف خلیفہ کو مطلع کئے بغیر کوئی کاروائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خلیفہ مسترشد نے انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے قاتل کے باپ یعنی قاضی محمد بن علی کو غرناطہ روانہ کر دیا۔

غرناطہ کی عدالت خاص میں مقدمہ پیش ہوا۔ یہ ایک انوکھی عدالت تھی کہ انصاف کی کرسی پر باپ بیٹھا تھا اور ملزموں کے کٹہرے میں منصف کا اکلوتا بیٹا عبداللہ بن علی کھڑا تھا۔ عدالت میں لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ میں بھی عدالت کے ایک کونے میں فیصلہ سننے کے لئے بیٹھا تھا۔ قاضی نے مقدمے کے کاغذات کو دیکھا۔ گواہوں نے شہادت دی۔ اس کے بعد قاضی نے ملزم، یعنی اپنے اکلوتے بیٹے کی طرف دیکھا اور بارعب آواز میں پوچھا۔

"تم اس مقدمے کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہو؟"

عبداللہ بن علی نے کہا۔ "میرے محترم باپ میں...."

قاضی القضاۃ نے گرج کر کہا۔ "یہاں تم ملزم کی حیثیت سے لائے گئے ہو۔ میرے بیٹے کی حیثیت سے نہیں اس لئے کسی رشتے ناتے کو زبان پر مت لاؤ۔"

عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ میں بھی قاضی صاحب کی عدل گستری پر دنگ رہ گیا۔

عبداللہ بن علی نے عاجزی سے کہا۔ "میں عدالت سے رحم کی درخواست کرتا ہوں۔"

اس پر قاضی القضاۃ اور قاتل کے والد گرامی نے انصاف کی بلند مسند پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ "دنیا سے انصاف اٹھ چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک بندے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ دنیا میں حق وانصاف کا بول بالا ہوا۔ ظلم وستم کا

دور ختم ہوا۔ ہم سب اللہ جل شانہ، کے احسان مند ہیں کہ اس نے ہمیں ایک ایسی مکمل ہدایت سے مشرف فرمایا کہ جس میں نہ کسی کمی بیشی کی گنجائش ہے اور نہ اس کی حاجت ہے۔ میں بھی اللہ تعالیٰ کا ایک بندہ اور اس کے رسول مقبول صلعم کا ادنیٰ ترین غلام ہوں۔ اگرچہ میرا دل اپنے اکلوتے بیٹے کی محبت سے لبریز ہے۔ مگر انصاف کا خون ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں جس قانون کا امین بنایا گیا ہوں اس میں مرتے دم تک خیانت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم پر ایک عیسائی کا قتل ثابت ہو گیا ہے۔ اب میں تمہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سناتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں خون کا بدلہ خون قرار دیا ہے۔ اس کی رو سے میں تمہیں قتل کے جرم میں سزائے موت کا حکم سناتا ہوں۔ ماسوائے اس کے کہ مقتول کے وارث قتل کے بدلے خون بہا لینے پر تیار ہوں۔"

قاضی نے اپنے فیصلے پر عدالت کی مہر ثبت کر دی۔ عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ اس فیصلے پر مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور عیسائی بھی عش عش کر اٹھے، کئی لوگ فرط عقیدت سے زار وقطار رونے لگے۔ قاضی نے مقتول کے وارثوں سے پوچھا۔ ان کا جواب نفی میں تھا۔ وہ خون بہا لینے پر راضی نہ تھا۔ وہ عبداللہ کو قتل ہوتا دیکھنا چاہتے تھے۔ قاضی نے دوسرے روز صبح کے وقت عبداللہ کی گردن اڑا دینے کا حکم صادر فرما دیا۔

میں نے خانقاہ میں واپس آکر عذرا کو یہ جانکاہ خبر سنائی تو وہ غش کھا کر گر پڑی۔ عیسائی پادری بھی غم زدہ ہو گیا کہنے لگا۔ "مسلمانوں کا یہی عدل وانصاف ہے جس کی وجہ سے ملک اندلس میں امن وامان کی حکمرانی ہے۔ سوائے اس قسم کی مشتعل وارداتوں کے کبھی کسی کا قتل نہیں ہوا۔" میں نے ان سے پوچھا کہ اب کیا ہو گا؟ عذرا تو زندہ نہ بچ سکے گی۔ عبداللہ کی موت کے ساتھ ہی وہ بھی مر جائے گی۔ پادری بولا۔ "میں اس بارے میں کیا کر سکتا ہوں۔" پھر میری طرف روشن نظروں سے دیکھا اور کہا۔ "ہاں اگر تم اپنے طور پر کچھ کر سکتے ہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔" عذرا کو ہوش آیا تو وہ زار وقطار رونے لگی۔ مجھ سے اس کی حالت زار دیکھی نہیں جاتی تھی۔ پادری نے مجھے اشارہ دے دیا تھا۔ انصاف کے تقاضے پورے ہو گئے تھے۔ اب میں محبت کے تقاضے پورے کرنا چاہتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ عبداللہ بن علی کو موت کے منہ میں نہیں جانے دوں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے لئے مجھے ایک ایسا قدم اٹھانا پڑے گا۔ جس کے باعث کئی محافظ میرے ہاتھوں مارے جائیں گے میں اسی کشمکش میں تھا عذرا نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ رات ہو گئی تھی۔ میں عذرا کے پاس ہی بیٹھا تھا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی مجھ سے سرگوشیوں میں کہہ رہا ہے۔ "عاطون! تم نے غلط فیصلہ کیا ہے۔ انصاف کے تقاضے پورے نہ ہوئے تو عدل

کے ترازو کا پلڑا جھک جائے گا۔ معاشرے سے امن وامان اٹھ جائے گا۔ خلق خدا کی زندگیاں غیر محفوظ ہو جائیں گی اور اگر تم ان دو محبت کرنے والوں کی زندگیاں بچانا چاہتے ہو تو تمہیں اپنے آپ کو پیش کرنا ہو گا۔"

میں نے قدرے تعجب سے اپنے آپ کو پیش کرنے کے ضمن میں ان دیکھی ہستی سے وضاحت چاہی تو سرگوشی کرنے والی ہستی نے جو کچھ بتایا وہ یہ تھا کہ مجھے شب کی تاریکی میں غرناطہ کے شاہی قلعے کی غربی دیوار کے پاس جا کر تکونی چٹان کے نیچے آنکھیں بند کر کے لیٹ جانا ہو گا۔ خانقاہ میں عیسائی پادری کو اعتماد میں لیتے ہوئے بتا کر جانا ہو گا کہ میں عبداللہ بن علی کو قید سے نکالنے جا رہا ہوں۔ چنانچہ جب تھوڑی دیر بعد وہ خانقاہ میں پہنچے کو اسے عذرا کے ہمراہ خانقاہ میں ہی اس وقت تک چھپا کر رکھا جائے جب تک کہ میں واپس نہ آ جاؤں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ خانقاہ میں اندر آیا تو عذرا ایک بار پھر بے ہوش ہو چکی تھی اور پادری اس کو لخلخہ سنگھا رہا تھا۔ میں نے پادری کو ایک طرف لے جا کر کہا۔

"اس حقیقت کا مجھے کسی نہ کسی طریقے سے علم ہو چکا ہے کہ آپ میری زندگی کے راز اور خفیہ طاقت سے باخبر ہیں۔ زیادہ تفصیل میں جانے کا یہ وقت نہیں ہے۔ میں عبداللہ بن علی کو قید خانے سے چھڑانے جا رہا ہوں۔ میرے جانے کے بعد وہ خانقاہ کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ آپ اسے فوراً" عذرا کے ساتھ ہی خانقاہ کی کسی کوٹھری میں چھپا دیں۔ اگرچہ عبداللہ بن علی آپ کے پاس محفوظ ہو گا مگر کل صبح ایک اور عبداللہ بن علی کی گردن سب کے سامنے اڑا دی جائے گی۔ یہ میں ہوں۔ اس کا ذکر آپ کو عبداللہ اور اس کی بیوی عذرا سے ہرگز نہیں کرنا۔ آپ ایسا کریں گے کہ جب میری لاش کو سر اور دھڑ سمیت رواج کے مطابق دریا میں پھینک دیا جائے تو آپ آگے جا کر اسے پانی کی لہروں سے نکال لیں پھر میرے سر کو گردن کے ساتھ لگا کر آپ خاموشی سے بیٹھ جائیں آگے جو کچھ ہو گا آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ اب میں جا رہا ہوں۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ جیسا میں نے کہا ہے آپ ویسے ہی کریں۔"

پادری بڑی محویت کے ساتھ ہونٹوں پر ہلکی سی دلکش مسکراہٹ لئے میری باتیں سنتے رہے۔ جب میں جانے لگا تو میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میرے بیٹے! میں جانتا تھا تم ضرور ان کی مدد کرو گے جاؤ۔ تم نے جیسا کہا ہے میں ویسے ہی کروں گا۔"

میں گھوڑے پر سوار ہوا اور رات کی تاریکی میں غرناطہ کے قلعے کی طرف نکل گیا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ دور قصر الحمرا کی فصیل پر کہیں کہیں شمع دان روشن تھے۔ میں قلعے کی

غربی دیوار کی طرف آیا تو یہاں دیوار سے ہٹ کر ایک تکونی چٹان اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں مجھے لیٹ جانے کے لئے کہا گیا تھا۔ میں نے گھوڑے کو ایک طرف باندھا اور چٹان کے سائے میں زمین پر چت لیٹ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند ثانیوں بعد مجھے ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ میں نے آنکھیں بند رکھیں مگر میں نے محسوس کیا کہ میں کھلی ہوا میں نہیں ہوں اور میرے نیچے کی زمین کی بجائے سخت پتھریلا فرش ہے۔ میرے کان میں پھر سرگوشی ہوئی "عاطون! آنکھیں کھول کر دیکھو کہ تم کہاں ہو۔"

میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایک تنگ کوٹھڑی میں پڑا ہوں۔ دیوار گیر میں ایک چراغ جل رہا ہے۔ میرا رنگ گورا ہو گیا تھا۔ میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو چہرے کے نقوش بدلے ہوئے پائے یہ میرا چہرہ نہیں بلکہ عذرا کے خاوند عبداللہ بن علی کا چہرہ تھا۔

رات کا پچھلا پہر ہوا تو مجھے قید کی کوٹھری سے باہر آذان کی آواز سنائی دی۔ پھر دروازہ کھلا۔ دو ہٹے کٹے جلاد نما آدمی تلواریں اٹھائے ایک باریش بزرگ کے ساتھ اندر داخل ہوئے انہوں نے مجھے وضو کروایا' سفید چادر پہننے کو دی اور کہا کہ میں زندگی کی آخری نماز پڑھ کر خدا سے اپنی بخشش کی آخری دعا مانگ لوں۔ اب اس حقیقت میں ذرا سا بھی شبہ باقی نہیں رہا تھا کہ میری شکل ہو بہو عبداللہ بن علی ہی کی شکل میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میں نے نماز پڑھ کر خدا سے دعا مانگی کہ وہ مجھے پھر سے نئی زندگی عطا فرمائے اور میرے گناہ معاف فرما دے۔ میرے دل کو بہت تسلی اور اطمینان تھا کہ دو محبت کرنے والے دل ایک دوسرے سے مل چکے ہوں گے اور میں اب قانون اور انصاف کا بول بالا کر رہا ہوں' نماز سے فارغ ہوا تو مجھ سے پوچھا گیا کہ میری آخری خواہش کیا ہے۔ میں نے مزید اطمینان کرنے کے لئے کہا کہ میری لاش کو دریا کی لہروں کے حوالے کر دیا جائے۔ باریش بزرگ نے کہا۔ "رواج کے مطابق تمہاری لاش کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے گا۔ کیونکہ قاتل کی لاش زمین بھی قبول نہیں کرتی۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ لوگ مجھے بند کر کے چلے گئے۔ غرناطہ میں سورج طلوع ہو چکا تھا کہ ایک بار پھر دروازہ کھلا۔ اس بار چار مسلح سپاہی داخل ہوئے انہوں نے مجھے زنجیر پہنائی اور قید خانے سے نکال کر ایک چھکڑے میں سوار کرایا اور غرناطہ کے سب سے بڑے چوراہے پہ لا کر کھڑا کر دیا۔ میرے سینے پر ایک حکم نامہ لٹکا دیا جس میں میرا جرم اور جرم کی سزا درج تھی۔ چوک لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ اسلامی قانون اور انصاف کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ میرے پاؤں کی زنجیر اتار دی گئی۔ میرے دونوں ہاتھوں کو پشت پر رسی سے باندھ دیا گیا۔ ایک جلاد جس نے سیاہ لبادہ پہن رکھا تھا میرے پہلو میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں چوڑے پھل

والی تلوار تھی جس کا پھل سورج کی روشنی میں بار بار چمک رہا تھا۔ قانون کے دو محافظ عہدے دار ایک طرف کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھ میں دستاویزات تھیں۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے اپنی زندگی کا سب سے خطرناک تجربہ ہونے والا تھا۔

مجھے جلاد کی اپنے طرف آنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد میری گردن پر تلوار کا بھرپور وار پڑا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

اگلی صبح پادری خانقاہ پر تالا ڈال کر شہر کے چوک میں آگیا جہاں میرا سر قلم کیا جانے والا تھا۔ پادری کا بیان تھا کہ وہ مجھے چوک میں عبداللہ بن علی کی شکل میں دیکھ کر حیرت زدہ ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر اس کے سامنے میرا سر دھڑ سے الگ کر دیا گیا۔ لوگوں نے اموی خلیفہ مسترشد کے حق وانصاف کا نام بلند رکھنے کے حق میں نعرے بلند کیے۔ اس کے بعد میرے دھڑ اور سر کو ایک بوری میں بند کر کے چھکڑے پر ڈال دیا گیا اور چھکڑا مسلح گھڑ سوار سپاہیوں کی نگرانی میں دریا کی جانب روانہ ہو گیا۔ پادری نے بھی اپنے گھوڑے کا رخ دریا کی جانب کر دیا اور جس مقام پر میری لاش کو دریا کی لہروں کے سپرد کیا جانا تھا۔ وہاں سے دور دریا کے کنارے پر آ کر انتظار کرنے لگا۔ سپاہیوں نے بوری دریا میں پھینک دی بوری جس میں میری کٹی ہوئی لاش تھی دوہ ایک بار ڈوب ابھر کر لہروں کے بہاؤ پر بہنے لگی۔ سپاہی واپس چلے گئے۔ بوری تیرتی ہوئی جب اس مقام پر پہنچی جہاں پادری موجود تھا تو اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی اور بوری کو کھینچ کر کنارے پر لے آیا۔ بوری کو کنارے پر لانے کے بعد اس نے میری لاش کو باہر نکالا اور میرا کٹا ہوا سر میرے دھڑ کے ساتھ لگا کر خود ایک طرف جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔

جب جلاد کی تلوار کی کاری ضرب میری گردن پر پڑی تو مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ میں اس وقت سے لے کر کٹی ہوئی گردن کے دھڑ کے ساتھ لگانے تک عالم لاشعور میں رہا۔ جونہی میرا سر میرے دھڑ کے ساتھ دوبارہ لگا تو میرا شعور اور ہوش وحواس واپس آ گئے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دن کے اجالے میں مجھے اپنے اوپر نیلا آسمان دکھائی دیا۔ غیر شعوری طور پر میرا ہاتھ میری گردن کی طرف اٹھ گیا۔ میرا ہاتھ اٹھتا دیکھ کر پادری جلدی سے میرے پاس آگیا۔ میں نے گردن پر ڈرتے ڈرتے ہاتھ پھیرا۔ میری گردن جڑ چکی تھی۔ وہاں تلوار کا کوئی زخم نہیں تھا۔ میں خدا کا نام لے کر اٹھ بیٹھا۔ پادری کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "یہ خدا کا معجزہ ہے۔" میں نے اصلی عبداللہ بن علی کے بارے میں پوچھا۔ پادری نے کہا تم نے جیسے کہا تھا میں نے ویسے ہی کیا۔ تمہارے جانے کے تھوڑی دیر بعد وہ

آن پہنچا تھا اور اب اپنی بیوی عذرا کے ساتھ خانقاہ میں محفوظ ہے۔ میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ میرے اصلی نقوش واپس آ چکے تھے۔ پادری نے مسکرا کر کہا "تم اس وقت اپنی اصلی شکل میں ہو۔" میں نے ہاتھ باندھ کر خدا کے حضور سجدہ شکرانہ ادا کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم گھوڑے پر بیٹھ کر واپس پہاڑی کے ڈھلانی جنگل والی خانقاہ میں آ گئے۔ عذرا مجھے دیکھتے ہی فرط مسرت سے بولی۔

"عبداللہ بھائی۔ دیکھو یہ کون ہے؟"

میں نے اس کے خاوند عبداللہ بن علی کو گلے لگا لیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں رات کو کہاں چلا گیا تھا۔ پھر اس نے مجھے بھی اپنی رہائی کی "حیرت انگیز" داستان سنائی اور بار بار سر جھٹک کر کہنے لگا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔

"مگر عبداللہ سپاہی میرے فرار کے بعد میری تلاش میں ہوں گے۔ ہمیں یہاں سے نکل کر کسی دور دراز مقام پر چلے جانا چاہیے۔"

عذرا بولی۔ "اندلس میں ہمیں نہیں رہنا چاہیے۔ یہاں تمہیں کسی وقت بھی پکڑ لیا جائے گا۔"

عبداللہ بن علی نے کہا۔ "ہم پرتگال چلے جائیں گے۔ وہاں میرا ایک دوست جہاز سازی کا کاروبار کرتا ہے۔ اس کے پاس ہمیں پناہ مل جائے گی۔"

عیسائی پادری نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر عبداللہ بن علی سے کہا کہ وہ قرطبہ اپنے والد کے پاس کیوں نہیں چلا جاتا۔ اس پر عبداللہ بن علی نے چونک کر کہا۔

"نہیں نہیں۔ میں ان کے پاس گیا تو وہ مجھے دوبارہ قانون کے حوالے کر دیں گے۔ میں اندلس میں نہیں رہوں گا۔ ہم دوسرے ملک میں جا کر ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔"

اس وقت تک پرتگال کا مغربی علاقہ مسلمانوں کی عمل داری میں نہیں آیا تھا اور وہاں عیسائی حکومت تھی۔ ہم نے عبداللہ بن علی اور عذرا کو یہ بات بالکل نہ بتائی کہ قانون کے فیصلے کے مطابق اس کے ایک ہم شکل عبداللہ بن علی کو موت کی سزا دی جا چکی ہے۔ وہ خانقاہ کی کوٹھری میں بند تھے انہیں شہر کے چوک میں کسی قاتل کے سر قلم ہونے کی خبر بھی نہیں تھی۔ عبداللہ بن علی یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ قید خانے سے فرار ہو گیا ہے اور سپاہی اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

میں ان دونوں کو اندلس سے نکال کر ان کی منزل مراد کی طرف روانہ کرنے کے بعد

ان سے جدا ہونا چاہتا تھا۔ ہم نے اندلس سے فرار کی ترکیبیں سوچنا شروع کر دیں۔ ابھی ہم غور وفکر ہی کر رہے تھے کہ خبر آئی سلطان اندلس کی فوجوں نے پرتگال پر چڑھائی کر دی ہے۔ یہ خبر ہمارے لئے تشویش ناک تھی۔ اب ہم پرتگال کا رخ نہیں کر سکتے تھے۔ آخر یہ طے پایا کہ فرانس کی طرف فرار ہوا جائے۔ فرانس ' اندلس کے شمال کی سرحد تھی اور غرناطہ سے ہمیں .... باجا' مرسیہ ' ترکونہ اور بارسلانہ کی طرف سفر کرتے ہوئے فرانس کے سرحدی پہاڑی سلسلے پیرینس کی وادی میں پہنچنا تھا۔ یہ ایک طویل مسافت تھی لیکن اس کے بغیر چارۂ کار بھی کوئی نہیں تھا۔ ہم نے غرناطہ سے کوچ کی تیاریاں شروع کر دیں ہماری پہلی منزل باجا کا شہر تھی۔

عذرا کو عیسیٰ راہب عورتوں اور عبداللہ بن علی کو عیسائی پادریوں کا لباس پہنایا گیا۔ عیسائی پادری اپنی خانقاہ چھوڑ کر ہمارے ساتھ نہیں جا سکتا تھا چنانچہ ایک رات ہم غرناطہ سے باجا جانے والے قافلے میں عیسائی راہبوں کے بھیس میں شامل ہو کر باجا کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ بحیرہ روم کے ساتھ ساتھ اندلس کی طویل ترین سرحد کا سفر تھا۔ باجا سے قافلہ پکڑ کر ہم مرسیہ اور پھر وہاں سے بارسلانہ پہنچ گئے۔

ہمیں اس سفر میں چار ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ فرانس کی سرحد پر اندلس کا آخری شہر گیروند اب زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔ ایک ہفتہ ہم نے اندلس کے سرحدی شہر گیروند کی کارواں سرائے میں آرام کرتے ہوئے بسر کیا۔

گیروند کی کارواں سرائے سے کوئی قافلہ فرانس کی سرحد تک نہیں جاتا تھا۔ ان دنوں فرانس میں اندلس کی مسلمان حکومت کے خلاف ریشہ دوانیاں اور سازشیں اپنے عروج پر تھیں۔ اندلس میں یہ افواہ بھی عام تھی کہ فرانس کے عیسائیوں نے سرحدی پہاڑیوں میں ایک جگہ اندلسی خلیفہ کی حکومت کے خلاف خفیہ مستقر قائم کر رکھا ہے۔ جہاں دن رات تخریبی کاروائیوں پر غور وفکر ہوتا ہے اور اندلس میں خلیفہ کی حکومت سے برگشتہ جاگیردار مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے کی سازشیں تیار ہوتی ہیں۔

میرا مقصد صرف عذرا اور اس کے خاوند عبداللہ بن علی کو فرانس کی سرحد میں کسی محفوظ مقام پر پہنچانا تھا۔ اس کے بعد نہ تو مجھے عذرا اور اس کے خاوند سے اور نہ ہی اندلس کے اندرونی خلفشار سے کوئی واسطہ تھا۔ میں قرطبہ کی سیروسیاحت کے بعد کسی دوسرے ملک کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن حالات اور واقعات کس طرح مجھے اپنی گرفت میں جکڑنے کی ریشہ دوانیاں کر رہے تھے۔ اس کا مجھے علم ہی نہیں تھا۔ گیروند کی کارواں سرائے میں ایک ہفتے کے قیام کے بعد ہم نے زاد راہ ساتھ لیا اور تازہ دم ہو کر

گھوڑوں پر سوار فرانس کی سرحدی پہاڑیوں کی طرف چل پڑے۔

ہم نے پیری نیس کی پہاڑیوں میں ایک مقام پر اندلس کے ملک کو چھوڑ کر فرانس کی سرحد پار کر لی۔ سرحد پار کرنے کا ثبوت ہمیں اس وقت ملا جب ہم ایک فرانسیسی گاؤں میں داخل ہوئے۔ یہ عیسائی قصابوں کا گاؤں تھا۔ ہم نے عیسائی راہبوں کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ اندلس میں ہم پر ظلم وستم ہوتا تھا اس لئے وہاں سے فرار ہو کر فرانس میں پناہ لینے آئے ہیں۔ گاؤں والوں نے ہمیں راہبوں کے لباس میں دیکھ کر ہمارے بیان پر اعتبار کیا اور ہماری خوب آؤ بھگت کی۔ ایک ہفتہ ہم نے گاؤں میں آرام کیا۔ اس کے بعد عذرا اور عبداللہ بن علی ایک قافلے میں شامل ہو کر فرانس کے بڑے شہر تلوز کی طرف روانہ ہو گئے اور میں انہیں ہنسی خوشی رخصت کرنے کے بعد واپس اندلس کی سرحد کی جانب چل پڑا۔ میں آدھی رات کو راستے میں ان سے جدا ہوا تاکہ گاؤں والوں کو مجھ پر شک نہ پڑ سکے۔

اس رات کے پچھلے پہر طوفان بادوباراں نے آ لیا اور میں وادی کے پہاڑی جنگل میں راستہ بھول کر مغرب کی طرف ایک پرشور دریا کی طرف جا نکلا۔ جو چٹانوں کے درمیان جھاگ اڑاتا تیزی سے بہہ رہا تھا دن کی روشنی ہوئی تو میں نے گھوڑے کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ایک چٹان پر چڑھ کر جائزہ لینے لگا۔ میری دونوں جانب پہاڑی ٹیکریوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ آخر میں چٹان سے اتر آیا۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور اندازے سے جنوب کی طرف چل پڑا۔ اندلس کی سرحد جنوب کی جانب ہی تھی۔ رات کے طوفان بادوباراں کی وجہ سے کئی درخت ٹوٹ کر جگہ جگہ گرے پڑے تھے۔ ایک ویران راستہ جنگل کے درختوں میں سے ہو کر جنوب کی طرف جا رہا تھا۔ میں اسی راستے پر گھوڑے کو قدم قدم چلاتا رواں تھا کہ اچانک درختوں میں سے کچھ گھڑ سوار تلواریں لٹکائے ہاتھوں میں نیزے تھامے نکل آئے ان کے لباس عیسائی سپاہیوں ایسے تھے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ انہوں مجھ پر حملہ کرنے کی بجائے مجھے گھیر لیا اور حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک سپاہی جو ان کا سالار لگتا تھا۔ میرے قریب گھوڑا لا کر بولا۔

"لیوگو! کیا تم زندہ ہو؟ ہم تو تمہیں مردہ سمجھے ہوئے تھے۔ جلدی سے ہمارے ساتھ چلو۔ شارلیان تمہیں دیکھ کر بہت خوش وہ گا۔ مگر تم اندلسی مسلمانوں کے نرغے سے زندہ کیسے نکل آئے؟؟"

میں ایک لمحے کے اندر اندر سمجھ گیا کہ میں کسی دوسرے کا ہم شکل ہو کر یہاں نمودار ہوا ہوں۔ کوئی لیوگو نام کا عیسائی ہے جو یقیناً" مرچکا ہے اور میں اس کی شکل میں

یہاں ظاہر ہو گیا ہوں۔ اس قسم کے تجربے سے میں پہلے بھی گزر چکا تھا مگر شخصیت کے بدلنے کے ساتھ ہی میرے شعور میں اس آدمی کی یادیں اور حافظہ بھی محفوظ ہو جاتا تھا جس کے روپ میں میں ظاہر ہوتا تھا لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا تھا۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ لیوگو کون ہے؟ وہ کس مشن پر اندلس گیا تھا اور شارلیان کون ہے جس نے لیوگو کو یعنی مجھے اس مشن پر بھیجا تھا۔ ایک خیال میرے دل میں ضرور آیا کہ یہ فرانسیسی عیسائی تخریب کار ہیں جو اندلس اور فرانس کی سرحد پر اندلسی حکومت کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں اور جن کے بارے میں اندلس ہی میں سن چکا تھا۔ میں نے بھی اب کسی قسم کے تعجب کا اظہار کرنا مناسب نہ سمجھا اور خود کو لیوگی ہی ظاہر کرتے ہوئے ان عیسائیوں کے ہمراہ چل پڑا۔ وہ راستے میں مجھ سے یہی پوچھتے رہے کہ میں کیسے بچ کر آ گیا ہوں۔

"تمہارے ساتھ جو آدمی گیا تھا اس نے شارلیاں کو آ کر بتایا تھا کہ اس نے تمہیں خود مسلمان سپاہی کا تیر کھا کر چٹان سے دریا میں گرتے دیکھا ہے۔"

میں نے ان ہی کی زبان میں کہا کہ تیر مجھے نہیں لگا تھا اور میں نے خود دریا میں چھلانگ لگا دی اور پھر دریا میں تیرتا ہوا دور نکل گیا اور بڑی مشکل سے سرحد پار کر کے یہاں پہنچا ہوں۔ باتوں ہی باتوں میں میں بڑی ہوشیاری کے ساتھ میں نے ان سے اتنا ضرور معلوم کر لیا کہ لیوگو ایک سوڈانی غلام تھا جو ان پہاڑیوں میں فرانسیسی تخریب کاروں کے سالار شارلیاں کا دست راست تھا اور خلیفہ اندلس کے ایک غدار چچا سلیمان کے نام اس کا ایک خاص پیغام لے کر قرطبہ گیا تھا کہ واپسی پر اندلسی سپاہیوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ لیوگو کے ساتھ تین فرانسیسی بھی تھے۔ جنہوں نے بھیس بدل رکھا تھا۔ ان میں سے دو مارے گئے۔ ایک فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے لیوگو کو تیر کھا کر دریا میں گرتے دیکھا تھا۔ میں اب اپنے آپ کو شارلیاں کا وفادار سوڈانی غلام لیوگو ہی ظاہر کر رہا تھا۔ یہ سپاہی مجھے جنگل کے ایک خفیہ اڈے پر لے گئے جو ایک پہاڑ غار کے اندر تھا۔ یہاں میں نے پہلی بار فرانسیسی تخریب کاروں کے سالار شارلیاں کو دیکھا۔ وہ سرخ وسپید تنو مند جوان تھا جس نے چمڑے کی لمبی جیکٹ پر تلوار لگا رکھی تھی۔ سر پر ایک ترچھی ٹوپی تھی جس میں باز کا پر لگا تھا۔ اس کے اردگرد چھ سات فرانسیسی فدائی تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنی بانہیں پھیلا دیں اور مجھے گلے لگا لیا۔

"لیوگو..... لیوگو! خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ بچ گئے میرا دل کہتا تھا کہ تم زندہ ہو۔ ان کمبختوں نے مجھے تمہاری موت کی خبر سنا کر میرا دل توڑ دیا تھا۔ ہم ایسے وفادار عیسائی دوستوں سے ہم ہاتھ نہیں دھو سکتے۔"

اس نے میرے آگے پھل اور دودھ رکھا میں نے اسے بھی وہی کہانی سنا ڈالی جو اس سے پہلے فرانسیسی سپاہیوں کو سنا چکا تھا۔ ایک خوبصورت نوجوان عورت غار کی کوٹھری میں سے ہاتھ پھیلائے میرا نام بار بار پکارتی میری طرف بڑھی۔ شارلیاں نے مسکرا کر کہا۔

"تمہاری بیوی لوسی بھی تمہاری موت کا سن کر نڈھال ہو گئی" میں چونک پڑا۔ میری بیوی لوسی کے 'مارے خوشی کے آنسو نکل رہے تھے اور وہ بار بار کہہ رہی تھی۔

"میرے پیارے لیوگو.... تم زندہ ہو' تم زندہ ہو۔"

اور میں سوچنے لگا کہ یہ میں کس جھنجٹ میں پھنس گیا ہوں۔

رات بھر وادی میں طوفان بادو باراں برپا رہا۔

اگرچہ اسلام دشمن فرانسیسی تخریب کاروں کے پہاڑی غار کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔ پھر بھی سرد برفیلی ہوائیں اندر فراٹے بھرتی رہیں اور میری کوٹھری میں ٹمٹماتا دیا کئی بار بجھ گیا۔ میری زبردستی کی بیوی لوسی' کمبل میں دبکی خراٹے لے رہی تھی۔ میں جاگ رہا تھا۔ نہ مجھے سردی لگ رہی تھی اور نہ نیند کی حالت طاری تھی۔ تخریب کاروں کے سالار شارلیان کی زبانی مجھے جس قسم کے حالات سے آگاہی ہوئی وہ کچھ یوں تھے۔ اندلس کی مسلم مملکت کی شمالی اور مغربی سرحدوں پر فتنے نمودار ہو رہے تھے۔ ملک میں طبقاتی تقسیم اور دولت کے غلط بٹوارے اور شاہی خاندان کی غلط پالیسی نے ملکی حالات کو ابتر کر دیا تھا۔ جاگیردارانہ نظام کے آہنی پنجے نے معاشرے کو جکڑ لیا تھا۔ کاشت کاروں اور کسانوں کو جاگیر دار اپنا غلام سمجھنے لگے تھے۔ تن آسانی اور تعیش پسندی عام تھی۔ یورپ کے عیسائی حکمران ان حالات کا پوری طرح فائدہ اٹھا رہے تھے۔

عیسائی حکمرانوں کو یہ خطرہ بھی تھا کہ مسلمان فرانس پر حملہ آور ہو سکتے ہیں اور یوں یورپ کے دوسرے علاقوں کی جانب اپنی پیش قدمی جاری رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اندلس اور فرانس کی سرحدی پہاڑیوں میں عیسائی سالار شارلیان کی زیر قیادت ایک زبردست تخریب کار اڈہ قائم کر رکھا تھا' جہاں سے یہ لوگ اندلس کے غدار مسلمانوں کو دولت اور اقتدار کا لالچ دے کر اندلسی حکومت کے خلاف بغاوت اور فتنہ وفساد کا بازار گرم کرنے کی فکر میں تھے۔ ان سب کاروائیوں کا مقصد اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا تھا۔ تاکہ ان کی زد سے یورپ محفوظ ہو جائے۔ فرانس کے بادشاہ لوئی نے ہسپانیہ کے حکمران خلیفہ مسترشد کے ایک چچا سلیمان کو یہ لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ کہ اگر خلیفہ کو شکست دے دی گئی تو وہ سلیمان کو ہسپانیہ کا بادشاہ بنا دے گا۔ پہاڑی غار کے اڈے میں بیٹھا شارلیان شاہ فرانس کا خاص آلہ کار تھا اور یہ ساری بات چیت اور

غداری کی سازش اسی کی وساطت سے ہو رہی تھی۔ سوڈانی غلام لیوگی یعنی میں شارلیان کا دست راست تھا۔ میری وفاداری اور بہادری کی ان فرانسیسی تخریب کاروں میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور اس بار بھی تیر کھا کر دریا میں چھلانگ لگانے کے بعد بچ کر اپنے اڈے پر پہنچ جانے سے میری دھاک میں اضافہ ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اصلی سوڈانی غلام لیوگی (جس کا میں یہاں ہم شکل تھا) تیر کھانے کے بعد دریا میں گرنے سے مر چکا ہو گا۔ ورنہ وہ اب تک یہاں پہنچ چکا ہوتا۔ کیونکہ اس واقعے کو دو ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ سالار شارلیان کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اس تک خلیفہ اندلس کے چچا سلیمان کا بھیجا ہوا پیغام اس عیسائی کے ہاتھوں پہنچ گیا تھا۔ جو جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہوا۔ خلیفہ کے غدار چچا سلیمان کا پیغام یہ تھا کہ وہ شارلیان سے بہ نفس نفیس ملاقات کرنے پیری نیسن کی خفیہ کمین گاہ میں پہنچ رہا ہے۔ اور وہ قرطبہ سے ایک تاجر کے بھیس میں روانہ بھی ہو چکا تھا۔ جس وقت میں لیوگی کی شکل میں ان عیسائی فرانسیسیوں سے ملا تو غدار سلیمان کے آنے میں ایک ہفتے کی مدت باقی تھی۔ شارلیان نے اپنے خاص آدمی اندلس کی سرحد پر بھجوا دیئے تھے تاکہ غدار سلیمان کا خیر مقدم کیا جا سکے۔

تاریخ کا یہ ایک تاریک باب ہے کہ خاص طور پر مسلمانوں کی حکومتوں کے چراغ اغیا کی بجائے خود مسلمانوں ہی کی پھونکوں سے بجھے۔ میں نے بنو امیہ کے عہد میں دیکھا۔ عباسیوں کی سلطنتوں کے ٹکڑے ہوتے دیکھے۔ ہر دور میں مسلمانوں کی تاریخ کے اسی بے رحمانہ اصول کو سرگرم عمل پایا۔ اگر مسلمانوں کے پندار کو کسی نے زمین بوس کیا تو وہ کوئی مسلمان غدار ہی تھا جس کا خفیہ ہاتھ چنگیز وہلاکو کے ہاتھوں کو تقویت دے رہا تھا۔ اب یہی کھیل ہسپانیہ کی مسلم مملکت میں بھی کھیلا جا رہا تھا۔ شاہی محلات خونی سازشوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ علماء اور فقہاء کے گروہ نظریاتی بحث اور عقائد کے اختلافات میں الجھے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں تھے۔ بادشاہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے پوری جدوجہد کی جاتی تھی۔ علاقائی خود مختاری کا بیج بویا جا چکا تھا۔ یورپ کی عیسائی حکومتیں ان حالات سے نہ صرف پوری طرح باخبر تھیں بلکہ ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے جتن کر رہی تھیں۔ ایک نو مسلم ہونے کے ناتے ایسی اندوہناک صورت حال سے میں ناخوش تھا اور دل سے چاہتا تھا کہ اندلس میں مسلمانوں کی یک جہتی اور استحکام کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے مگر میں تاریخ کے دھارے کا رخ نہیں موڑ سکتا تھا۔ دشمن سامنے آ جائے تو اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بغل میں چھپی ہوئی چھری کسی کو نہیں دکھائی دیتی اور اس کا وار بڑا کاری ہوتا ہے۔

ہسپانیہ کا سلطان خلیفہ مسترشد ریاستوں کی بغاوتیں فرد کرنے میں لگا ہوا تھا اور اس کا ضمیر فروش اقتدار کا بھوکا ' اسلام دشمن چچا ' سلیمان اس کی حکومت کا تختہ الٹ کر خود بادشاہ بننے کی سازش میں مصروف تھا اور ہوس اقتدار کے اس ناپاک کھیل میں عیسائیوں کا آلۂ کار بن چکا تھا۔ جس رات وادی میں طوفان بادوباراں آیا اس کے دو روز بعد خلیفہ اندلس کا غدار چچا سلیمان ' عیسائی سوداگر کے بھیس میں ہماری کمین گاہ میں پہنچ گیا۔
شارلیان کا محافظ دستہ اسے بڑے احترام وعزت کے ساتھ اپنے ساتھ لایا۔ میں بھی اس وقت کمین گاہ میں موجود تھا اور شارلیان کا خاص الخاص غلام اور جانثار ہونے کی وجہ سے اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ میں نے تیز عقابی آنکھوں اور تیکھی سازشی ناک والے غدار سلیمان کو آگے بڑھ کر شارلیان سے بغل گیر ہوتے دیکھا تو مجھے ہسپانیہ کی عظیم الشان مسلم سلطنت کے انجام پر رونا آگیا۔ شارلیان نے غدار سلیمان کے اعزاز میں غار کے اندر ایک زبردست محفل رقص وسرور برپا کی اور اسے تحفے تحائف سے لاد دیا جو فرانس کے حکمران عیسائی بادشاہ لوئی نے خاص طور پر بھجوائے تھے۔
جب رات ڈھل گئی تو شارلیان اور غدار سلیمان کی خفیہ مجلس کا آغاز ہوا۔ شارلیان نے مجھے اپنے پاس ہی رکھا۔ ہمارے سوا وہاں کوئی چوتھا آدمی نہیں تھا۔ شارلیان نے سلیمان سے کہا کہ جنوبی صوبوں میں بغاوتوں کا سلسلہ ماند نہیں پڑنا چاہئے۔ "شاہ فرانس نے آپ کے لئے سونے اور جواہرات کا بہت بڑا خزانہ روانہ کر دیا ہے۔" غدار سلیمان کی ترچھی آنکھیں مزید ترچھی ہو گئیں' بھینچے ہوئے باریک ہونٹوں پر عیارانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور بولا۔
"شارلیان ! صوبوں میں بغاوتیں ہوتی ہیں اور سلطان کی فوجیں انہیں فرو کر دیتی ہیں۔ یہ سلسلہ جاری ہے مگر یہ سلسلہ جاری نہیں رہنا چاہئے۔ میں زیادہ دیر تک اندلس کے تخت وتاج سے دور نہیں رہ سکتا۔ اس وقت میرے ساتھی اپنی جانیں قربان کرنے پر تیار ہیں۔"
شارلیان نے غدار سلیمان کے پیالے میں مشروب انڈیلتے ہوئے استفسار کیا کہ اس سلسلے میں پھر اس کا مشورہ کیا ہے....؟ سلیمان ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر مشروب کا پیالہ ہونٹوں سے لگا کر آنکھیں سکیڑلیں اور بولا۔
"سلطان کا قتل اب لازمی ہو گیا ہے۔"
شارلیان نے قدرے تعجب سے سلیمان کی جانب دیکھا۔ غدار سلیمان نے پیالہ لکڑی کی میز پر رکھ دیا اور اٹھ کر اپنی لمبی فرغل کا پلو کاندھے پر ڈالتے ہوئے ٹہلنے لگا۔ پھر رکا اور

شارلیان کی طرف دیکھ کر بولا۔
"مگر سلطان کو قتل کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ وہ ہمہ وقت اپنے فدائین کے حصار میں رہتا ہے۔ رات کو یہی فدائین اس کی خواب گاہ میں پہرہ دیتے ہیں۔ یہ لوگ اس کے جان نثار اور عقیدت مند ہیں۔ انہیں دنیا کا کوئی لالچ اپنے فرض سے غافل نہیں کر سکتا۔ میں نے آزما کر دیکھ لیا ہے۔"
میں نے دل میں کہا۔ کاش جان نثاری اور عقیدت مندی کا یہ جذبہ سلیمان کے دل میں بھی موجزن ہوتا۔ شارلیان نے بھنے ہوئے ہرن کی ٹانگ پر سے گوشت کا ٹکڑا کاٹتے ہوئے کہا۔
"سلطان کو کھانے میں بھی زہر دیا جا سکتا ہے۔ یہ زہر ہم فراہم کریں گے جو بے ذائقہ ہو گا۔"
سلیمان کرسی پر بیٹھ گیا۔ "سلطان کو جو چیز بھی کھانے کو دی جاتی ہے اسے اس کے جانثار پہلے خود چکھ کر اطمینان کرتے ہیں کہ کہیں اس میں زہر کی آمیزش تو نہیں ہے۔"
شارلیان مسکرایا۔
"ہم تمہیں ایسا زہر مہیا کریں گے جس کا اثر فوری نہیں ہوتا۔ اس زہر کا اثر دو روز بعد ظاہر ہو گا۔ بادشاہ کے پیٹ میں ' زہر کی معمولی سی مقدار کھانے کے دو روز بعد ' درد اٹھے گا اور وہ مر جائے گا۔ اسے دنیا کا لائق ترین طبیب بھی موت کے منہ سے نہ بچا سکے گا۔ تم سلطان کے کھانے میں اس زہر کو کسی طرح ملا دو گے۔ سلطان کے جانثار پہلے کھانے کو چکھیں گے۔ ان پر فوری طور پر کچھ اثر نہیں ہو گا۔ سلطان اطمینان سے کھانا تناول کرے گا اور پھر دو دن کے بعد اس کی لاش محل میں پڑی ہو گی۔"
غدار سلیمان کا چہرہ ہوس اقتدار سے چمک اٹھا۔ بولا
"ہاں یہ تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھے گا۔ بادشاہ کے مرتے ہی میرے آدمی بغاوت کر دیں گے۔ محل کو آگ لگا دی جائے گی۔ شاہی خاندان کے تمام افراد کو یرغمال بنا لیا جائے گا۔ سپہ سالاروں کو میں پہلے ہی اپنے ساتھ ملا چکا ہوں۔ تم مجھے یہ زہر کب تک فراہم کر سکتے ہو؟"
شارلیان نے قدرے توقف سے کہا۔
"اس کے لئے مجھے خود شاہ فرانس کے دربار میں حاضر ہونا پڑے گا۔ میں یہ خاص الخاص زہر خود جا کر لاؤں گا اور پھر...."
شارلیان نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "اور پھر میرا یہ جانثار دوست لیوگی تمہیں یہ

زہر قرطبہ پہنچ کر تمہارے حوالے کر دے گا۔ اس میں ایک مہینہ لگ جائے گا۔"

غدار سلیمان نے شارلیان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گرمجوشی سے دبایا اور کہا

"میں لیوگی کا انتظار کروں گا۔"

اگلے روز سلطان اندلس کا غدار چچا سلیمان واپس قرطبہ کی طرف چل دیا۔ اس روز دوپہر کے بعد شارلیان فرانس کے بادشاہ سے ملنے فرانس کے دارالحکومت کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں اپنی زبردستی کی بیوی لوسی اور دوسرے عیسائی تخریب کاروں کے ساتھ وہیں کمین گاہ میں رہا۔ معلوم ہوا کہ شارلیان کی عدم موجودگی میں میں ہی ان لوگوں کی سربراہی کے فرائض ادا کیا کرتا تھا۔ لوسی کو دن بھر کھانے پینے اور جنگل میں گھومنے پھرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا۔ بھاری مالیت کا سونا چاندی اور جواہرات کمین گاہ کے خفیہ خانے میں موجود تھے۔ یہ زروجواہرات غدار مسلمانوں کو رشوت دینے کے لئے تھے۔ میں نے اندلسی حکمران کو سازشی موت کے منہ سے بچانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس ضمن میں اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بھی تیار کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے ایک خاص بوٹی کی تلاش تھی۔ میں نے فرانسیسی سرحد کے جنگل میں گھوم پھر کر اس بوٹی کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ یورپ کے سرد علاقے میں یہ بوٹی ناپید تھی۔ اندلس کی گرم خشک فضا میں اس کا حصول قرین قیاس تھا۔

میں شارلیان کی واپسی کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ تین ہفتوں کے بعد ایک شام وہ آگیا۔ وہ اپنے ساتھ مہلک زہر لے آیا تھا۔ اس نے غار میں آکر مجھے خفیہ طور پر یہ زہر دکھایا۔ زہر سفید رنگ کا سفوف تھا جو چمڑے کے چھوٹے سے بٹوے میں بند تھا۔

"لیوگی! تم میرے جانثار دوست ہو۔ تمہارے سوا میں یہاں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ تم کل ہی یہ زہریلا سفوف لے کر قرطبہ کی طرف کوچ کر جاؤ اور یہ امانت سلیمان شاہ کو جا کر دے دو۔ اس کے بعد تم وہیں اس کے پاس رہنا۔ وہ تمہیں زر خرید غلام ظاہر کرے گا وہاں جب تک سلیمان بادشاہ کو زہر نہیں کھلا دیتا اور بادشاہ کی موت واقع نہیں ہوتی تم قرطبہ ہی میں رہنا۔ یہ میری طرف سے تمہیں تاکید ہے۔ قرطبہ کے جنوب میں عیسائیوں کی ایک درگاہ ہے۔ وہاں کا متولی لیپارڈی ہمارا ساتھی ہے۔ تمہیں اگر کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو اس کے پاس چلے جانا اور یہ انگوٹھی اسے دکھا دینا۔ وہ تمہاری ہر طرح کی مدد کرے گا۔"

شارلیان نے اپنی انگلی میں سے زمرد کی ایک انگوٹھی اتار کر میری انگلی میں پہنا دی۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

"تم پیچھے کی فکر نہ کرنا۔ تمہاری بیوی کا ہم ہر طرح سے خیال رکھیں گے اور اگر تم دیکھو کہ سلیمان کی نیت بدل گئی ہے تو اسے وہیں ہلاک کر کے اس زہر کو ضائع کر کے واپس آ جانا۔"

میں نے اندلس کے مسلمان سیلانیوں ایسا لباس پہن رکھا تھا۔ شارلیان نے مجھے تاکید کی کہ میں رات کے اندھیرے میں قرطبہ میں داخل ہو کر سیدھا سلیمان شاہ کے محل کی طرف جاؤں۔ اس نے خلیفہ کے چچا غدار سلیمان شاہ کے محل کا حدود اربعہ نہیں بتایا تھا۔ اس لئے کہ وہ تو یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ میں اس سے کئی بار مل چکا ہوں۔ میں نے بھی اس سے پتہ دریافت نہ کیا اور گھوڑے پر بیٹھ کر اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا کہ میں اس زہر کو ضائع کر کے اپنی راہ لیتا۔ یا قرطبہ پہنچ کر خلیفہ مسترشد کو شارلیان اور اس کے چچا کے ناپاک عزائم سے آگاہ کر دیتا لیکن ایک بار زہر کو ضائع کر دینے یا خلیفہ کو سازشیوں کے عزائم سے آگاہ کر دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی دوسرا آدمی خلیفہ کو زہر دے سکتا تھا یا کسی دوسرے طریقے سے اسے ہلاک کیا جا سکتا تھا۔ میں جس منصوبے کو لے کر قرطبہ کی طرف سرگرم سفر تھا اس کا مقصد محض اتنا تھا کہ مسلمانوں کے اموی خلیفہ مسترشد کو نہ صرف یہ کہ اس کے چچا کی مذموم سازش سے آگاہ کیا جائے بلکہ اسے ایک ایسا مشروب پلا کر ہر روز نہار منہ پینے کی ہدایت کی جائے جو مہلک سے مہلک زہر کو بے اثر کر دے۔ یہ مشروب ایک خاص بوٹی کی مدد سے تیار کیا جاتا تھا۔ جو فرانس کے سرحدی جنگل میں نہیں تھی اور جس کو میں قرطبہ کے قرب وجوار میں تلاش کرنے کا خواہش مند تھا۔ میں اس زہر کو بھی بے اثر بنانا چاہتا تھا۔ جسے میں اپنے ساتھ چمڑے کی تھیلی میں بند کر کے لے جا رہا تھا۔

کارواں در کارواں قرطبہ کی طرف سفر کرتے ہوئے جب میں طلیطلہ کے خوبصورت شہر میں پہنچا تو میں نے اپنے منصوبے کے مطابق پہلا کام یہ کیا کہ شہر کے ایک پرانے طبیب کی دکان پر جا کر زہر کے سفید سفوف سے ملتا جلتا ایک بے ضرر سفید سفوف لے کر زہریلے سفوف کو چمڑے کی تھیلی سے نکال کر پھینک دیا اور اس کی جگہ بے ضرر سفوف ڈال کر رکھ لیا۔ اس طرح سے میں نے کم از کم وقتی طور پر اندلس کے مسلمان حکمران خلیفہ مسترشد کو ہلاکت کی سازش سے بچا لیا تھا۔ مجھے شارلیان کے آگے جواب دہی کی فکر اس لئے نہیں تھی کہ میرا اس کے پاس واپس جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ یہاں میں نے ایک حمام میں غسل کیا اور آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ میری شکل عاطون کی شکل ہی تھی۔ میرا اندازہ صحیح نکلا تھا۔ یعنی میری شکل میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ فرق اتنا

تھا کہ شارلیان کے جانثار مرحوم غلام لیوگی سے میری شکل حیرت انگیز حد تک مشابہہ تھی۔

میں نے طلیطلہ کے بوڑھے دکاندار طبیب سے اس خاص بوٹی کے بارے میں استفسار کیا جو زہر کے اثرات کو معدے میں پہنچتے ہی بے اثر کر دیتی تھی۔ طبیب نے بتایا کہ یہ بوٹی قرطبہ کے پہاڑی جنگل میں مل جائے گی۔ طلیطلہ میں وہ ناپید تھی۔ میں ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ یونہی سفر کرتے طلیطلہ سے مجریط اور مجریط سے قرطبہ پہنچ گیا۔ یہ شہر اندلس میں عربی طرز کا ایک دلکش شہر تھا۔ جگہ جگہ کشادہ سڑکوں میں فوارے اچھل رہے تھے۔ دور سے قصر زہرا اور قصر خلافت کے **عطلا** گنبد غروب ہوتے ہوئے سورج کی سنہری روشنی میں جھلملاتے دکھائی دیتے تھے۔ ایک جانب پہاڑیوں کے دامن میں ایک بلند ٹیلے پر مسجد قرطبہ کی چھت کے ان گنت گنبدوں کو ڈھلتے سورج کی شعاعیں چوم رہی تھیں۔ میں اس مسجد کی بھی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ جسے عبدالرحمان نے تعمیر کروایا تھا اور جس کی دھوم اس عہد کے مشرق و مغرب میں تھی۔ قرطبہ شہر کے لوگوں کے چہروں سے خوش حالی اور بے فکری ٹپکتی تھی۔ میں نے ایسے سرداروں کو بھی گھوڑوں پر سوار بازاروں میں گھومتے دیکھا۔ جن کی تلواروں کے دستوں پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔

کارواں سرائے میں اترنے کے ساتھ ہی میں نے ایک بزرگ سے خلیفۂ وقت کے چچا کے محل کا حدود اربعہ معلوم کر لیا اور رات گہری ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ یہاں میں نے اپنے آپ کو ایک سیاح ظاہر کیا تھا اور کارواں سرائے کے مالک کو اپنا نام عبداللہ ہی بتایا۔ جب رات کے اندھیرے اور خاموشی نے قرطبہ کے کشادہ بازاروں اور پراسرار اونچی اونچی پختہ گلیوں کو اپنے طلسم میں جکڑ لیا تو میں نے اپنے جسم کے گرد لبادے کو لپیٹا اور تاریکی میں کارواں سرائے سے نکل کر سلیمان شاہ کے محل کی طرف چل پڑا۔

میں گھوڑے کو آگے بڑھائے چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ مجھے دو پہرے داروں نے گھیر لیا اور پوچھا کہ میں آدھی رات کو کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے انہیں بڑی شستہ اور خالص نجد کی عربی میں بتایا کہ میں خلیفہ کے چچا سلیمان شاہ کا غلام خاص ہوں اور اشبیلیہ سے اس کی بڑی ہمشیرہ کا ایک خاص پیغام لے کر آ رہا ہوں۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور سلیمان شاہ کے محل کے دروازے پر لا کر چھوڑ دیا۔

سلیمان شاہ کا محل سہ منزلہ تھا اور اس کے دروازے پر سونے چاندی کے بڑے بڑے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ جو دونوں جانب روشن شمع دانوں کی روشنی میں جھلملا رہے تھے۔ چار مسلح حبشی پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں شاہ صاحب عالی لقب کی ہمشیرہ صاحبہ کا غلام ہوں اور ان کے لئے اشبیلیہ سے ایک خاص پیغام لے کر آیا

ہوں۔ پہرے داروں نے سلیمان شاہ کو خبر کر دی اور مجھے فوراً محل میں بلوا لیا گیا۔ خلیفہ کا غدار چچا سلیمان اپنے شب خوابی کے کمرے سے نکل کر مہمان سرا میں آیا اور مجھے فوراً پہچان کر بولا۔

"میری امانت اپنے ساتھ لائے ہو؟"

میں نے نقلی زہر کے بے ضرر سفوف والی چمڑے کی تھیلی اس کے حوالے کر دی۔ اس نے اسے کھول کر غور سے دیکھا۔ پھر اس کے تسمے کس کر باندھے۔ اسے اپنے بالائی پاجامے کی اندرونی جیب میں سنبھال کر رکھا اور بولا۔

"لیوگی! تم اب آرام کرو۔ کل باتیں ہوں گی۔" یہ کہہ کر سلیمان شاہ واپس اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

خلیفہ مسترشد کی زندگی محفوظ تھی۔ غدار چچا سلیمان شاہ اپنے بھتیجے کو اس زہر سے ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔ جو میں نے فرانس کے بادشاہ کی طرف سے لا کر اسے دیا تھا۔ اب میں ہسپانیہ کے مسلمان بادشاہ اور اس کے اہل خانہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کسی بھی مہلک زہر کے اثرات سے محفوظ کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے لئے خاص بوٹی کا حصول ضروری تھا۔ چنانچہ میں صبح صبح سلیمان شاہ کے محل سے سیر کے بہانے قریبی جنگل میں نکل گیا۔ میں ہر جڑی بوٹی کی شکل سے واقف تھا۔ ایک پہر دن تک میں اس خاص بوٹی کو ڈھونڈتا رہا جو قاتل سے قاتل زہر کا تریاق تھی مگر مجھے وہ کہیں نہ ملی۔ میں محل میں واپس آیا تو سلیمان شاہ میرا انتظار کر رہا تھا۔

"تم کہاں چلے گئے تھے لیوگی؟ اس نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔ میں نے قرطبہ کی حسین وادی اور دریائے دارالکبیر کی سیر کا بہانہ کر کے بات ٹال دی۔ وہ مجھے اپنے کمرۂ خاص میں لے گیا اور مخملیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا کہ بادشاہ کو زہر دینے سے پہلے زہر کی آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ زہر خالص ہے اور تیر بہدف قسم کا ہے اس کے آزمانے کی حاجت نہیں۔ وہ کہنے لگا۔

"لیوگی! اندلس کا تاج و تخت حاصل کرنے کا یہ میرا آخری موقع ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہم سے کوئی کوتاہی ہو۔" میں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ اس زہر کا دنیا میں کوئی توڑ نہیں ہے۔ اور وہ ضرور اثر کرے گا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بادشاہ کے مطبخ میں کھانے کی شاہی دیگ تک پہنچنا آسان کام نہیں ہے۔ اور اگر کوئی پہنچ بھی جائے تو کھانے میں زہر ملانا کارے وارد ہے۔ وہاں ہر لمحے چار مسلح ترک جوان پہرے پر رہتے ہیں اور سوائے داروغہ مطبخ کے دوسرا کوئی شخص دیگ کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ وہ اٹھ کر قالین پر

ٹہلنے لگا۔ پھر بولا۔

"میں نے تمہارا تعارف یہاں اس حیثیت سے کرایا ہے کہ میرا ایک جانثار خادم' ابو ظریف سوڈان سے آیا ہے۔ کاش میں تمہارا تعارف ایک بہترین باورچی کی حیثیت سے کرواتا۔ یوں میں تمہیں شاہی مطبخ میں بھجوا کر شاہی دیگ میں زہر ملانے کا کام تم سے لے سکتا تھا۔ مگر خیر کوئی بات نہیں کوئی دوسری ترکیب سوچتا ہوں یہ کام مجھے بہرحال کرنا ہے۔ اور بطریق احسن کرنا ہے۔"

میں مطمئن تھا کہ چاہے وہ کسی سے زہر ملا سفوف شاہی کھانے میں ڈلوا دے بادشاہ کو کچھ نہیں ہو گا۔ دوپہر کے وقت میں دریائے دارالکبیر کے دوسرے کنارے ویران علاقے میں نکل گیا۔ یہاں خوش قسمتی سے مجھے وہ خاص بوٹی مل گئی جس کی مجھے تلاش تھی۔ یہ لال بیر جتنی بوٹی تھی جس کی گول سطح پر چھوٹے چھوٹ کانٹے ابھرے ہوئے تھے۔ میں اس بوٹی کو توڑ کر محل میں لے آیا۔ میں نے بوٹی کو کچل کر اس میں نمک کی ایک خاص مقدار ملائی اور اسے دوبارہ کوٹ کر سفوف بنا لیا۔ پھر اس میں زیتون کے تیل کی آمیزش کر کے اس تریاق کو چمڑے کی ایک بوتل میں ڈال کر محفوظ کر لیا۔ تریاق تیار ہو چکا تھا۔ اس تریاقی تیل کی دو تین بوندیں پانی میں ڈال کر پی لی جائیں اور اس کے سات روز کے اندر اندر مہلک سے مہلک زہر بھی اگر پیا جائے تو وہ بے اثر ہو کر جسم سے خارج ہو جاتا تھا۔ میں نے اس تریاق کی بوتل کو اپنی شاہی خواب گاہ میں چھپا کر رکھ لیا۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ کسی طرح سے بادشاہ مسترشد کی بارگاہ تک رسائی حاصل کر کے یہ تریاق اسے سونپ دوں اور کہوں کہ ہفتے میں ایک بار وہ اور اس کے اہل خانہ اس تریاق کے دو قطرے پانی میں حل کر کے پی لیا کریں تاکہ ہمیشہ کے لئے دشمن کی زہریلی سازش سے محفوظ ہو جائیں۔ یہ تیل خلیفہ اور اس کے شاہی اہل خانہ کے لئے کم از کم ایک برس کے لئے کافی تھا۔ میرا ارادہ یہ بھی تھا کہ میں خلیفہ کو اس کے چچا کی سنگین سازش سے بھی آگاہ کر دوں اور اگر ضروری ہو تو اس پر اپنی اصلیت بھی ظاہر کر دوں۔

دوسری طرف خلیفہ کا غدار چچا سلیمان شاہ اپنی ناپاک ریشہ دوانیوں میں مصروف تھا۔ قرطبہ میں مجھے تیسرا روز تھا کہ سلیمان شاہ نے مجھے آ کر بتایا کہ اس نے ایک خفیہ طریق کار پر عمل کرتے ہوئے خلیفہ کو زہر کھلا دیا ہے۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے دیوار پر لگے سونے کے عقاب کے مجسمے پر نظریں گاڑ دیں اور بولا۔

"کل صبح خلیفہ اس دنیا میں نہیں ہو گا اس کے بعد اندلس کا تاج و تخت میرے قبضے میں ہو گا۔" میں مطمئن تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس نے جو زہر خلیفہ مسترشد کو جس

طریقے سے بھی کھلایا ہے وہ اصلی زہر نہیں ہے۔ لیکن جب اس نے یہ کہا کہ خلیفہ کل اس دنیا مین نہیں ہو گا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ کیونکہ حساب کے مطابق یہ بات اسے بھی معلوم تھی کہ زہر کا اثر دو دن کے بعد ہونا چاہئے۔ میں نے بڑے ادب سے سوال کیا کہ زہر کو تو دو روز کے بعد اثر دکھانا ہے۔ آپ نے آج ہی زہر دیا ہے پھر رات تک اس کا نتیجہ کیسے سامنے آئے گا؟

اس پر مکار سلیمان شاہ ۔نے اپنی بند مٹھی ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔

"میں نے زہر کے مہلک اثر کو سہ چند کر دیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے حیرت سے چونکتے ہوئے پوچھا۔ سلیمان شاہ بولا۔

"لیوگی! میں دو روز تک زہر کے اثر کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میرے پاس ایک دوسرا زہر محفوظ پڑا تھا۔ میں نے اسے تمہارے لائے ہوئے زہر میں ملا کر بادشاہ کو ایک ساقی کی ساز باز سے مشروب میں ملا کر پلا دیا ہے۔ مجھے میرے مخبر نے ابھی ابھی خبر دی ہے کہ بادشاہ بستر مرگ پر پڑا ہے۔ وہ نصف شب سے پہلے ہی مر جائے گا۔"

پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "لیوگی! تم نے بھی بہت بڑا کام کیا ہے۔ میں تمہیں فراموش نہیں کروں گا۔ تخت نشین ہونے کے بعد تم میرے مقرب خاص ہو گے۔" یہ کہہ کر وہ میرے کمرے سے نکل گیا۔ میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ تقدیر نے میرے خلاف پانسہ الٹ دیا تھا۔ میں کچھ اور سوچ کے بیٹھا تھا اور نتیجہ کچھ اور نکلنے والا تھا لیکن میں نے خلیفہ کی جان بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ سوال یہ تھا کہ میں کس طرح بادشاہ کی خلوت گاہ میں جاؤں؟ سلیمان شاہ کو علم ہو جانے کی صورت میں معاملہ گڑ بڑ ہونے کا اندیشہ تھا۔ مگر یہ وقت ان مصلحتوں کے سوچنے کا نہیں تھا۔ میں مہمان خانے سے نکل کر شاہی محل کی طرف بھاگا۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ بجائے خلیفہ اندلس سے ملنے کے مجھے شاہی طبیب سے رابطہ قائم کرنا چاہئے۔ یہ بڑا موزوں اور مناسب خیال تھا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو یہ علم ہو کہ میں نے شاہی طبیب سے ملاقات کی ہے۔ میں نے گھوڑے کی باگ شاہی علاج گاہ کی طرف موڑ دی۔ جو شاہی محل کے عقب میں تھی۔ یہاں میں نے ایک اہل کار سے رجوع کیا۔ اور اسے بتایا کہ میں شاہی طبیب کے لئے ایک ضروری پیغام لایا ہوں۔ اس نے مجھے بتایا کہ طبیب شاہی اس وقت بادشاہ کی خواب گاہ میں ہیں اور بادشاہ کا علاج کر رہے ہیں۔ میں نے کہا میں اسی سلسلے میں انہیں ایک اہم پیغام دینے آیا ہوں۔ اہل کار نے میری بیتابی دیکھ کر طبیب خاص کو پیغام بھجوا دیا۔ چند لمحوں کے بعد ایک سفید ریش بزرگ شاہی عبادہ پہنے میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں اسے خلوت میں لے گیا اور جیب سے تریاقی تیل کی

بوتل نکال کر اسے دی اور کہا۔

"اس تیل کے چند قطرے پانی میں ملا کر بادشاہ کو پلا دیں۔ انہیں شفا ہو جائے گی۔"

طبیب خاص نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور مشتبہ انداز میں پوچھا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟

میں نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "یہ ساری باتیں میں آپ کو بعد میں عرض کروں گا۔ اس وقت بادشاہ کی جان بچانے کی ضرورت ہے۔ مجھ پر اعتبار کریں۔ یہ تریاق ہے۔ بادشاہ کو مشروب میں زہر دیا گیا ہے۔ یہ تریاق زہر کے اثرات کو ختم کر دے گا۔"

طبیب خاص نے بوتل کھول کر تیل سونگھا اور بولا۔ "اس میں سنگ اصحاک کی بوٹی شامل ہے۔"

وہ میرے تریاق کے اجزائے ترکیبی کو بہت حد تک پہچان گیا تھا۔ میں نے جلدی سے عرض کی ہاں سنگ اضحاک کی آمیزش سے یہ تریاق بنایا گیا ہے اور میرا خاندانی نسخہ ہے۔ طبیب خاص کے دل پر میری سچائی کا اثر ہو گیا۔ کچھ اس لئے بھی کہ ایک اعلیٰ طبیب ہونے کی وجہ سے وہ جان گیا تھا کہ سنگ اضحاک کی بوٹی بے ضرر ہوتی ہے۔ اس نے مجھے وہیں بیٹھنے کو کہا اور خود تریاقی تیل کی بوتل لئے بادشاہ کی خواب گاہ کی طرف چل دیا۔ میں بے چینی کے عالم میں ایک دیوان پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد طبیب خاص دوبارہ آیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے میرے کاندھے کو تھپتھپایا اور بولا۔

"میرے بچے! تمہارے خاندانی نسخے نے بادشاہ وقت کی جان بچا لی ہے۔ زہر کا اثر ختم ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور تمہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ بادشاہ کو زہر دیا گیا ہے؟"

اس کے ساتھ ہی طبیب خاص نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی اور چار مسلح حبشی محافظ شاہی تلواریں کھینچے اندر گھس آئے اور انہوں نے آتے ہی مجھے دبوچ لیا۔ طبیب خاص بولا۔ "یہ شخص بادشاہ کے قاتلوں کا ساتھی ہے۔ اسے لے جا کر قید میں ڈال دو اور اس کی کڑی نگرانی کی جائے۔"

میں ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے بہت کہا کہ میرا کسی سازش یا شاہ کے قاتلوں سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر میں کہہ چکا تھا کہ بادشاہ کو زہر دیا گیا ہے۔ اور یہ بات اس امر کو ظاہر کرتی تھی کہ میں سازشیوں کا آدمی ہوں ورنہ مجھے ان کے ناپاک عزائم کا کس طرح علم ہوتا۔ تنومند مسلح حبشی مجھے کھینچتے ہوئے قید خانے میں لے گئے اور ایک کوٹھری میں دھکا دے کر بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ اس اعتبار سے میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ

میرے اس اقدام سے خلیفہ اندلس کی جان بچ گئی تھی۔ اب خطرہ اس بات کا تھا کہ اگر میں قید خانے میں ہی پڑا رہا تو غدار سلیمان شاہ بادشاہ کے بچ جانے کی صورت میں اسے دوبارہ زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کرے گا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اس بار زہر کی بجائے بادشاہ کو قتل کروا دے۔ چنانچہ میرا قید خانے سے باہر نکل کر خلیفہ اندلس کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کرنا بہت ضروری تھا۔ اب مجھے اس امر کی پروا نہیں تھی کہ سلیمان شاہ کو میری نیت سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ میں اس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اس .... گروہ سے وابستہ سمجھا گیا ہوں۔ جس نے بادشاہ کی جان لینے کی کوشش کی ہے۔ اور مجھ سے بہت جلد پوچھ گچھ کی جائے گی۔ اس کے باوجود میں نے طے کر لیا اگر کل تک مجھے قید خانے سے باہر نہیں نکالا گیا تو میں دروازہ توڑ کر خود بادشاہ کے روبرو پیش ہونے کی کوشش کروں گا۔

وہ رات میں نے قید خانے کی کال کوٹھری میں گزار دی۔ دوسرے روز مجھے قید خانے کا دروازہ توڑنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ شاہی محافظ دستہ آیا اور مجھے قید خانے سے نکال کر اپنے ساتھ لے گیا۔ مجھے لے جانے سے پہلے انہوں نے میرے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔ میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ میرا مقصد تو کسی شاہی اہل کار کے روبرو جا کر سنگین حقائق کی نقاب کشائی تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے کوتوال خاص کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ محافظ دستہ مجھے پوشیدہ طور پر طور پر شاہی محل کے عقبی دروازے سے نکال کر خلیفہ مسترشد کے قصر خلافت میں لے گیا۔ وہاں خلیفہ مسترشد بہ نفس نفیس اپنے طبیب خاص کے ساتھ موجود تھا۔ اگرچہ وہ ایک آرام وہ عالی مسہری پر نیم دراز تھا لیکن اس کی حالت بہتر تھی۔ اور وہ صحت مند محسوس ہو رہا تھا۔ طبیب خاص' جس کے حکم سے میں گرفتار ہوا تھا خلیفہ کے پلنگ کے قریب دیوان پر دو زانوں ہو کر بڑے ادب سے بیٹھا تھا۔ شاہی محافظوں کو طبیب خاص نے اشارہ کیا۔ وہ واپس چلے گئے۔ اب قصر خلافت کے اس ذی شان کمرے میں اکیلا بادشاہ اور اس کے شاہی طبیب کے رو برو کھڑا تھا۔ میں سلطان اندلس کی اموی خلیفہ مسترشد کو پہلی بار دیکھا رہا تھا۔ وہ ایک بار رعب اور وجیہہ' ادھیڑ عمر بادشاہ تھا۔

بادشاہ نے ایک بھرپور نگاہ مجھ پر ڈالی۔

شاہی طبیب نے میری طرف گھور کر دیکھا اور بولا۔

"تم سلطان ذی وقار کے حضور ایک مجرم کی حیثیت سے کھڑے ہو۔ اپنے آپ کو حد ادب میں رکھو۔"

میں نے کہا۔ "میں سلطان معظم کا مجرم نہیں بلکہ خیر خواہ ہوں۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو میں آپ کی وساطت سے سلطان کی جان بچانے کے لئے تریاقی روغن نہ بھیجتا۔"

شاہی طبیب بولا۔ "اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر تم ان سازشیوں کے ساتھی ہو جنہوں نے سلطان معظم کی جان لینے کی ناپاک جسارت کی ہے۔ تمہیں اس لئے یہاں بلایا گیا ہے کہ ہمیں ان کے نام بتاؤ۔"

میں نے کہا کہ سب سے پہلے میرے ہاتھ کھول دیئے جائیں۔ کیونکہ میں کسی قسم کے گھناؤنے جرم میں ملوث نہیں ہوں۔ بادشاہ کے اشارے پر شاہی طبیب نے خود اٹھ کر میرے ہاتھ کھول دیئے۔ اس کے بعد میں نے ساری کہانی سنا ڈالی۔ طبیب شاہی اور خلیفہ مسترشد نے میری زبان سے اپنے چچا سلیمان شاہ کے بارے میں سنگین انکشاف سنا تو سکتے میں آ گئے۔ خلیفہ مسترشد نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ اس کے چچا پر بہتان تراشی ہے۔ وہ غداری کا مرتکب کبھی نہیں ہو سکتا۔ شاہی طبیب کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ بادشاہ کو اس کے چچا سلیمان شاہ نے زہر دیا تھا۔ میں نے بڑے ادب سے کہا۔

"سلطان ذی شان! یہ زہر فرانس اور اندلس کی سرحدی کمین گاہ سے میں خود لے کر چلا تھا اور میں نے دل میں چلتے وقت ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ میں آپ کی جان بچا لوں گا۔ چنانچہ جیسا کہ میں عرض چکا ہوں۔ میں نے اصلی زہر کی جگہ ایک بے ضرر نقلی سفوف تھیلی میں ڈال کر آپ کے چچا سلیمان شاہ کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے تریاق بھی تیار کر لیا تھا اور اسے آپ کی خدمت میں پہنچانے کا متمنی تھا تاکہ آئندہ اگر کوئی غدار آپ کو زہر دینے کی ناپاک جسارت کرے تو آپ پر اس کے اثر نہ ہو لیکن بد قسمتی سے سلیمان شاہ نے آپ کی نصیب دشمناں موت کو فوری بنانے کے لئے میرے بے ضرر سفوف میں ایک مہلک زہر کی آمیزش کر دی۔ جب مجھے اس سانحے کی خبر ملی تو میں بھاگتا ہوا آپ کے محل میں آیا اور تریاق تیل طبیب شاہی کے حوالے کرتے ہوئے تاکید کی کہ اس تیل کے چند قطرے پانی میں ملا کر فوراً" آپ کو پلا دیئے جائیں۔ کیونکہ جڑی بوٹیوں کا ماہر ہونے کی وجہ سے میں جانتا تھا کہ میرا بنایا ہوا تیل آپ کے معدے میں پہنچتے ہی زہر کے مہلک اثرات کو فوراً" ختم کر دے گا اور خدا کا شکر ہے کہ ایسا ہی ہوا۔"

خلیفہ اندلس پر میری گفتگو کا خاطر خواہ اثر ہو رہا تھا۔ طبیب شاہی بھی متاثر ہو چکا تھا۔ بادشاہ نے سوال کیا۔

"مگر تم اندلس سے فرانس کی سرحد پر کس لئے گئے تھے اور پھر تم ہمارے دشمن فرانسیسیوں کے ساتھ کس لئے مل گئے؟"

میں نے عرض کی۔ "سلطان معظم! جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں' میں عیسائی غلام نہیں ہوں بلکہ مسلمان ہوں اور میرا نام عبداللہ ہے اور میں ایک سیاح ہوں اور جڑی بوٹیوں کا دھندا بھی کرتا ہوں۔ فرانس کی سرحدی کمین گاہ کے جنگل میں جڑی بوٹیوں کی تلاش میں ہی گیا تھا کہ ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔ کیونکہ میری شکل شارلیان کے خاص محافظ اور جانثار غلام لیوگی سے بہت زیادہ ملتی تھی جو سلیمان شاہ کو ایک خفیہ پیغام پہنچا کر واپس آتے ہوئے مارا گیا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ شارلیان مسلمانوں کا دشمن ہے اور آپ کے چچا سے مل کر آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے اور مجھے اس نے اپنا محافظ سمجھ لیا ہے تو میں اسی وقت ان کے ساتھ مل گیا تاکہ اندلس پہنچ کر آپ کو آپ کے دشمنوں سے خبردار کر سکوں۔ اس سلسلے میں پہلا اہم کام میں نے یہ کیا کہ آپ کو دیا جانے والا زہر بے اثر کر دیا۔"

خلیفہ مسترشد کے چہرے پر ابھی تک گہری سنجیدگی تھی۔ طبیب شاہی بھی خاموش تھا۔ خلیفہ ایک دو ثانئے کے سکوت کے بعد بولا۔

"ہم اپنے چچا کی غداری کا کوئی ٹھوس ثبوت چاہتے ہیں کیا تم ہمیں کوئی ایسا ثبوت مہیا کر سکتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "سلطان معظم! مجھے موقع دیا جائے۔ اس ضمن میں مکمل رازداری سے کام لینا نہایت ضروری ہے۔ میری گرفتاری اور حضور کے روبرو پیشی کو محل کے باہر اور محل کے اندر مکمل رازداری میں رکھا جائے۔ شاہی محافظ دستے کے جوانوں کو ہدایت کر دی جائے کہ وہ میری گرفتاری کا ہرگز کسی سے ذکر نہ کریں۔ میں عیسائی غلام لیوگی کی حیثیت سے ہی آپ کے چچا کے پاس واپس چلا جاؤں گا ظاہر ہے وہ اس بار ناکام ہونے کی وجہ سے کوئی دوسرا منصوبہ تیار کرے گا۔ میں نہ صرف آپ کو اس منصوبے سے آگاہ کروں گا بلکہ آپ اپنے چچا کو رنگے ہاتھوں پکڑ بھی سکیں گے۔"

خلیفہ اندلس کو میری یہ تجویز پسند آ گئی۔ اس نے فوراً" طبیب شاہی کو حکم دیا کہ جو محافظ مجھے پکڑ کر قصر خلافت میں لائے تھے انہیں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر حکم ثانی تک قید تنہائی میں ڈال دیا جائے۔ طبیب شاہی فوراً" اپنے دیوان سے اٹھا اور کورنش بجا لا کر تیزی سے دوسری طرف نکل گیا۔ خلیفہ مسترشد نے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے قریب گیا تو ارشاد ہوا۔

"عبداللہ! ہم تمہاری اسلام دوستی اور سلطان اندلس کی جان بچانے کے اقدام سے بہت خوش ہیں۔ ہم ہر طرح سے مکمل رازداری سے کام لیں گے۔ تمہیں محل کے خفیہ

راستے سے سلیمان شاہ کے محل کے پائیں باغ میں پہنچا دیا جائے گا۔"
پھر خلیفہ نے اپنی انگلی سے ایک خاص انگوٹھی اتار کر مجھے دی جس پر مرجان لگا ہوا تھا اور خلیفہ کا نام کندہ تھا۔
"یہ انگوٹھی دکھا کر تم جب اور جس وقت چاہو ہمارے پاس پہنچ سکتے ہو۔ اور ہاں' ہم تم سے بھی ایک وعدہ لینا چاہیں گے۔ کاروبار خلافت میں اس قسم کے حالات پیدا ہو جانا بعید از قیاس بات نہیں ہوتی۔ ہم چاہیں گے کہ تم بھی ان باتوں کا ذکر کسی سے مت کرنا۔"
میں نے سلطان اندلس کو یقین دلایا کہ میں اس بارے میں مہربہ لب رہوں گا۔
بادشاہ نے اپنی مسہری کے سرہانے کی طرف لٹکی ہوئی ایک ریشمی پٹی کو تھوڑا سا کھینچا۔ اس کے کھینچتے ہی بائیں جانب دیوار کا پردہ ہٹا اور ایک ہٹا کٹا حبشی غلام ہاتھ میں ننگی تلوار لئے خونخوار شیر کی طرح نکل کر مجھ پر جھپٹا۔ خلیفہ نے اشارہ کیا۔ وہ وہیں رک گیا۔ خلیفہ نے اسے حکم دیا کہ مجھے محل کے خفیہ راستے سے سلیمان شاہ کے پائیں باغ میں پہنچا دیا جائے۔ حبشی غلام نے خلیفہ کے آگے تین بار سر جھکایا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر ایک محراب کی طرف بڑھا۔ جس کے آگے سبز کمخواب کا بھاری پردہ گرا ہوا تھا۔ اس نے پردہ اٹھایا تو آگے سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ یہ سیڑھیاں ایک تاریک غار میں اتر گئیں۔ یہاں چند قدم چلنے پر شمع کی روشنی ہوگئی۔ چھ سات موڑ گھومنے کے بعد آگے پھر ایک زینہ آگیا جو اوپر جاتا تھا۔ حبشی غلام نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس نے اوپر کی جانب اشارہ کیا اور خود جدھر سے آیا تھا ادھر کو چلا گیا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر آخری زینے پر پہنچا تو پتھر پر میرے پاؤں کے دباؤ کی وجہ سے سامنے والا پتھر اپنی جگہ سے اندر کی طرف کھسک آیا اور دن کی تیز روشنی نے میرے آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ میں باہر نکل آیا۔ میرے نکلتے ہی پتھر دوبارہ اپنی جگہ پر چلا گیا اور اب وہاں میرے سامنے ایک ایسی دیوار تھی جس پر زند لگا تھا اور جنگلی بیلوں نے اسے آدھے سے زیادہ ڈھانپ رکھا تھا۔
میرے سامنے بھی جھاڑیاں تھیں۔ جھاڑیوں سے نکلا تو میں خلیفہ کے چچا سلیمان شاہ کے پائیں باغ میں تھا۔ میں نے خلیفہ اندلس کی دی ہوئی انگوٹھی کو چھپا کر رکھ لیا تھا۔ اپنے ذہن میں جو منصوبہ میں نے تیار کیا ہوا تھا اس پر عمل کرتے ہوئے پائیں باغ سے ہوتا ہوا سلیمان شاہ کے محل کے دروازے پر آگیا۔ محل کے محافظ میری صورت سے شناسا تھا اور جانتے تھے کہ میں ان کے آقا کا غلام خاص ہوں۔ انہوں نے محل کا دروازہ کھول دیا۔ میں سلیمان شاہ کی خلوت گاہ میں پہنچا تو دیکھا کہ محفل رقص و سرور گرم ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ہاتھ بلند کیا۔ رقص تھم گیا۔ سلیمان شاہ نے دوسرا ہتھ بلند کیا تو ایک لمحے کے اندر اندر مجلس خالی ہوگئی۔ جب سب چلے گئے تو سلیمان شاہ نے مجھے مسند پر بٹھاتے ہوئے کہا۔
"تم کہاں غائب ہو گئے تھے' کم بخت! ایک تو میرا منصوبہ ناکام ہو گیا دوسرے مجھے تمہاری فکر کھائے جا رہی تھی کہ کہیں شاہی جاسوسوں کے ہاتھ نہ لگ گئے ہو۔"
میں نے پہلے ہی سے جھوٹ موٹ کہانی گھڑ رکھی تھی۔ میں نے چہرے پر پریشانی کے تاثرات نمایاں کئے اور کہا۔ "حضور! میں نے جب سنا کہ بادشاہ کی حالت سنبھل گئی ہے تو سمجھ گیا کہ زہر نے خاطر خواہ کام نہیں کیا۔ حضور! ڈرپورک ہوں۔ جان بچا کر جنگل میں جا کر چھپ گیا۔ اب آپ کی محبت نے جوش مارا تو آپ کے پاس آگیا ہوں۔ حضو! کسی کو ہم پر شک تو نہیں ہوا؟"
سلیمان شاہ سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "کسی کو جرات ہے کہ مجھ پر شک کرے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ میرا وار خالی گیا ہے۔ مگر کیا تمہیں یقین ہے کہ جو زہر تم شاہ فرانس سے لائے تھے وہ اصلی تھا؟"
میں نے فورا" کہا۔ "سو فیصد اصلی تھا حضور! مجھے تو شک ہے کہ جو زہر آپ نے اس میں ملایا تھا وہ دھوکا دے گیا۔" سلیمان شاہ نے مسند پر زور سے ہاتھ مارا اور بولا۔
"وہ روم کے ایک ایسے طبیب کا تیار کیا ہوا زہر تھا جس کا خاندان بادشاہوں کی ہلاکت کے لئے ہمیشہ سے زہر فراہم کرتا رہا ہے۔"
میں نے جلدی سے کہا۔ "تو حضور! پھر ان دونوں زہروں کے امتزاج کے باعث وہ تریاق بن گیا ہو گا۔"
"کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟" سلیمان شاہ نے تعجب سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
میں نے اس کی لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔
"کبھی کبھی ایسا ہو جایا کرتا ہے حضور کہ بعض زہر کے اجزا دوسرے زہر کے اجزا سے مل کر اپنی تاثیر بدل دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ کی جان بچ گئی۔"
سلیمان شاہ نے میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔
"لیوگی! تم نے اگر آئندہ اتنی اونچی آواز میں بات کی تو میں تمہاری گردن اڑا دوں گا۔"
میں نے خاموش ہو کر سر جھکا لیا۔ سلیمان شاہ اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر ٹہلتے رہنے کے بعد وہ دوبارہ مسند پر آکر متفکر انداز میں بیٹھ گیا اور اپنے آپ بڑبڑایا۔
"فرانس کا بادشاہ مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اس میں ان کا بھی نقصان ہے۔ زہر میری آنکھوں کے سامنے جشن والی دعوت میں خلیفہ کے مشروب میں ڈالا گیا تھا۔ تمہارا

اندازہ درست لگتا ہے۔ دو زہروں کے اجزا نے مل کر تریاق کی شکل اختیار کر لی ہو گی۔"

پھر وہ گاؤ تکیے میں کہنی دھنسا کر نیم دراز ہو گیا۔ میں نے جان بوجھ کر اس شارع معاملے میں عدم دلچسپی کے اظہار کی خاطر کہا۔ "حضور! اگر برا نہ مانیں تو مجھے واپس جانے کی اجازت دیں۔"

سلیمان شاہ نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ ذرا سا مسکرایا اور بولا۔

"تم عقل مند نوجوان ہو۔ شارلیان نے شاید تمہاری اسی صفت کی وجہ سے تمہیں اپنا خاص رفیق بنایا ہے۔ تم میرے پاس رہو۔ کچھ وقت کے لئے ہی سہی۔ مجھے تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اب تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔"

میں نے جھک کر تین بار سلام کیا اور وہاں سے اٹھ آیا۔

خلیفہ مسترشد مکمل طور پر صحت مند ہو کر امور سلطنت کی انجام دہی میں مصروف ہو گیا۔ میری ہدایت کے مطابق اور طبیب شاہی کی نگرانی میں خود خلیفہ اندلس اور اس کے شہزادے شاہزادیاں اور ملکہ میرے تریاق تیل کے چند قطرے ہفتے میں ایک بار ضرور نوش کر لیتے تھے تاکہ اگر انہیں انجانے میں کوئی زہر کھلا دے تو وہ اس کے اثرات سے محفوظ رہیں۔ سلطان اندلس کی دی ہوئی مرجان کی خاص انگوٹھی میں نے اپنی خواب گاہ کے بستر کے نیچے چھپا کر رکھ دی تھی۔ شارلیان نے مجھے زمرد کی انگوٹھی بھی دی تھی تاکہ وقت پڑنے پر میں قرطبہ کے جنوب والی عیسائی درگاہ کے متوالی لیوپارڈی کو انگوٹھی دکھا کر مدد حاصل کر سکوں۔ یہ انگوٹھی میری انگلی میں تھی۔ متولی لیوپارڈی تخریب کاروں کے سرغنہ شارلیان کا ساتھی تھا۔

شارلیان کو جب معلوم ہوا کہ خلیفہ مسترشد پر زہر نے اثر نہیں کیا اور وہ زندہ ہے تو اس نے اپنا ایک خاص آدمی مسلمان سیاح کے بھیس میں سلیمان شاہ کے پاس بھیجا۔ سلیمان شاہ نے اسے کہلوا بھیجا کہ زہر بے اثر ہو گیا تھا۔ ہر چند کہ میں اس میں شاہ فرانس اور اس کے دست راست شارلیان کو مورد الزام نہیں ٹھہراتا پھر بھی میں نے اپنے طور پر خلیفہ کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں اس وقت سلیمان شاہ کے پہلو میں موجود تھا۔ شارلیان کا آدمی پیغام لے کر واپس چلا گیا۔ اب میں اس ٹوہ میں تھا کہ سلیمان شاہ خلیفہ کو ہلاک کرنے کا کیا منصوبہ بناتا ہے۔ یہ شخص انتہائی مکار اور موقع شناس تھا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا؟ اس کی وہ مجھے بھی خبر تک نہیں ہونے دے رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اندر ہی اندر کوئی اسکیم تیار کر رہا ہے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میری بے خبری میں بادشاہ کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ وہ اب خلیفہ اندلس کے زیادہ قریب رہنے لگا تھا اور اپنے طرز

عمل سے اسے یقین دلانے کی کوشش میں تھا کہ وہ اس کا وفادار ہے۔ اگرچہ خلیفہ خوب جانتا تھا کہ اس کا چچا اس کے ساتھ مکاری کر رہا ہے۔ پھر بھی سلیمان شاہ کے خفیہ منصوبے سے میرا آگاہ ہونا ضروری تھا۔ بادشاہ کو بے خبری میں نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ ایک رات محفل سرور میں سلیمان شاہ بڑے موڈ میں تھا۔ جب وہ اکیلا ہوا تو میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔ سلیمان شاہ نے میری طرف جھک کر اپنی چھوٹی چھوٹی مکارانہ آنکھوں سے دیکھا اور کہا۔

"لیوگی! اندلس کا تخت بہت جلد اوندھا ہونے والا ہے۔ جب میں نے یہ سراغ لگانے کی کوشش کی کہ وہ اندلس کے تخت شاہی پر قبضہ کرنے کا کون سا خونیں منصوبہ بنا رہا ہے تو اس نے بات کو ٹال دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے اس بارے میں ہم راز نہیں بنانا چاہتا تھا۔ میں نے بھی اس خیال سے کہ اسے شک نہ ہو جائے مزید اشتیاق کا اظہار نہ کیا لیکن اندر ہی اندر چوکس ہو گیا اور اس کے معمولات پر کڑی نظر رکھنے لگا۔

ابھی تک میں قصر خلافت میں نہیں گیا تھا۔ نہ ہی میں نے طبیب شاہی یا خلیفہ مسترشد سے ملاقات کی تھی۔ اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ویسے بھی میں خواہ مخواہ غدار سلیمان شاہ کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ خاص طور پر ایسی صورت حال میں جب کہ سلیمان شاہ خلیفہ اندلس کو ہلاک کرنے کے لئے کسی منصوبے پر جلد عمل کرنے والا تھا۔

سلیمان شاہ کی ایک چہیتی کنیز تھی جو اس کی جلوت وخلوت کی راز دار تھی۔ اس کا نام طرسومہ تھا۔ اس حسین وجمیل اور نوجوان کنیز کا تعلق ملک شام سے تھا۔ اسے شام کے ایک امیر نے تحفے کے طور پر سلیمان شاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ سلیمان شاہ اس کا گرویدہ تھا۔ طرسومہ مجھے بھی اپنے آقا کا ایک غلام سمجھتی تھی اور مجھ پر کبھی اس نے نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی تھی۔ میں اپنی ادھیڑ بن میں تھا کہ ایک روز عجیب حادثہ ہو گیا۔ ایک چاندنی رات کو میں سلیمان شاہ کے محل کے عقبی باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ ایک سوڈانی کنیز پریشان حال دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ طرسومہ کو باغ میں سانپ نے ڈس لیا ہے۔ میں اس کے ساتھ باغ کے آخری تختے کی طرف بھاگا۔ یہاں تیونس کے سیاہ گلابوں کی جھاڑیاں کثرت سے تھیں اور ان جھاڑیوں میں اکثر زہریلے سانپ پائے جاتے تھے۔

کنیز طرسومہ گلاب کی جھاڑیوں کے پاس نیم بیہوشی کے عالم میں گھاس پر پڑی تھی۔ سانپ نے اسے پنڈلی پر ڈسا تھا۔ میں نے خنجر نکال کر جہاں سانپ نے ڈسا تھا وہاں ہلکا سا زخم لگایا اور اپنے ہونٹوں سے زہر چوس کر تھوکنے لگا۔ چار پانچ مرتبہ ایسا کرنے سے

طرسومہ کے خون سے سانپ کا زہر نکل گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں اسے اٹھا کر اس کی شاہی قیام گاہ میں لے آیا۔ میں نے اسے ضروری طبی امداد دی۔ اسے گرم اور تلخ مشروب پلایا تاکہ وہ سو نہ سکے۔ میں صبح تک اس کے پاس بیٹھا اس کی خبرگیری کرتا رہا۔ دن چڑھا تو وہ پوری طرح تندرست ہو چکی تھی۔ اس کی نگاہیں میری ممنونیت سے لبریز تھیں۔ اس کے خیال میں ' میں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس کی جان بچا لی تھی۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ سانپ کا زہر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ سلیمان شاہ کو اپنی چہیتی کنیز کو سانپ کے ڈسنے کی اطلاع ملی تو وہ شب خوابی کے لباس میں ہی طرسومہ کی شاہی قیام گاہ میں پہنچ گیا۔ جب اسے پتہ چلا کہ میں نے سانپ کا زہر چوس کا نکال دیا تھا تو اس نے مجھے گلے لگا لیا۔

"لیوگی! تم نے اپنی جانثاری کی ایک اعلیٰ مثال پیش کی ہے۔" اس حادثے کے بعد طرسومہ کا جھکاؤ میری طرف ہو گیا۔ وہ مجھ سے بڑی محبت سے پیش آنے لگی۔ ایک بار اس نے اپنی ایک حبشن نوکرانی کے ہاتھ خشک میوہ جات کا ایک طشت میرے ہاں بطور تحفہ بھجوایا۔ مگر میں اس کے زیادہ قریب ہونے سے کتراتا تھا۔ اس خیال سے کہ اگر سلیمان شاہ کا جذبہ رقابت بیدار ہو گیا تو وہ مجھے زبردستی اندلس سے واپس شارلیان کے پاس بھجوا دے گا اور میرا سارا کام دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ سلیمان شاہ کے قریب رہتے ہوئے مجھے بہت سے فوائد حاصل تھے اور میں انہیں ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتا تھا۔

ایک دن میں صبح کے وقت اپنی خواب گاہ سے نکل کر چمن زار میں آیا تو وہاں کی جنت افزا فضا نے مجھے مسحور کر دیا۔ ہر تختہ پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں کچھ دیر وہاں ٹہلتا رہا۔ جب واپس اپنی قیام گاہ میں گیا تو یہ دیکھ کر میں کچھ پریشان ہو گیا کہ میری مسہری کا بستر تبدیل کیا جا چکا تھا۔ میں جلدی سے سموری گدے کو الٹا کر پلنگ پر وہ انگوٹھی تلاش کرنے لگا جو مجھے خلیفہ اندلس نے خاص طور پر مرحمت فرمائی تھی۔ میرے ہوش اڑ گئے۔ انگوٹھی غائب ہو چکی تھی۔ میں نے کئی بار پلنگ کی تلاشی لی مگر انگوٹھی نہ ملی۔ دل میں خیال آیا کہ خادمہ نے بستر بدلتے وقت اسے دیکھا ہو گا اور ضرور اس کے پاس ہو گی۔ میں خادمہ کی تلاش میں دوڑا۔ وہ مطبخ میں بھی نہیں تھی۔ میں اس راہ داری میں آ گیا جو سلیمان شاہ کے محل کو جاتی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ خادمہ چلی آ رہی ہے۔ میں نے اس سے انگوٹھی کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔

"آقا! مجھے آپ کے پلنگ پر انگوٹھی ملی تو اس پر سلطان عالی کا نام کندہ تھا۔ میں ڈر گئی۔"

"وہ انگوٹھی کہاں ہے؟"

اس نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ وہ انگوٹھی اس نے اپنے آقا سلیمان شاہ کے حوالے کر دی ہے۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے اسے کچھ نہ کہا اور لپک کر اپنی خواب گاہ میں آ گیا۔ میرے پلنگ میں سے سلطان اندلس کی انگوٹھی کا برآمد ہونا اس بات کا بین ثبوت تھا کہ میرا رابطہ براہ راست بادشاہ سلامت سے ہے۔ اور میں ان کا آدمی ہوں۔ یہ بات سلیمان شاہ کے لئے ایک دھماکے سے کم نہیں ہو سکتی تھی۔ ظاہر ہے وہ ایک زیرک اور عیار شخص تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگے گی کہ میں اندر سے بادشاہ کے ساتھ ملا ہوا ہوں اور تخت شاہی کے مفادات کی حفاظت کر رہا ہوں۔

مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا۔ گھوڑے پر بیٹھا۔ اور سیدھا قرطبہ شہر کے جنوب میں تلاش کرتا عیسائی متولی لیوپارڈی کی درگاہ پر پہنچ گیا۔ یہ شخص شارلیان کا خاص آدمی تھا اور وہاں شاہ فرانس کی اسلام دشمن سازشوں کی نگرانی کرتا تھا۔ شارلیان نے مجھے زمرد کی انگوٹھی اسی شخص سے تعارف کے لئے دی تھی۔ لیوپارڈی ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا جس نے راہبوں کا لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا کہ کیا میں درگاہ میں چڑھاوا چڑھانے آیا ہوں؟ جب میں نے اسے شارلیان کی دی ہوئی زمرد کی انگوٹھی دکھائی تو وہ مجھے کوٹھری میں لے گیا اور میری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم کس لئے میرے پاس آئے ہو؟"

میں نے اسے بتایا کہ خلیفہ مسترشد کا چچا سلیمان شاہ اپنے وعدے سے پھر رہا ہے اور لگتا ہے کہ اس نے بادشاہ کو ہلاک کرنے کا منصوبہ ترک کر دیا ہے۔ لیوپارڈی نے کہا کہ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟ کیا اسے اندلس کا تخت و تاج حاصل کرنے کی خواہش نہیں ہے؟ میں نے جواب میں یہ کہا کہ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیفہ مسترشد نے اسے کوئی بہت بڑا لالچ دیا ہے جس کے بعد اب وہ ہمارے منصوبے کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے۔

"مجھے شارلیان نے خاص طور پر فرانسیسی مفادات کی تکمیل کے لئے اس کے پاس بھیجا ہوا ہے۔ اب حالات کے نیا رخ اختیار کرنے سے سلیمان شاہ میری جان لینے کے درپے ہے۔"

لیوپارڈی کے ماتھے پر شکن نمودار ہوئی۔ وہ اپنی داڑھی کو انگلیوں سے کریدنے لگا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا

"وہاں رہ کر حالات کا جائزہ لو۔ اگر سلیمان شاہ واقعی بادشاہ کے ساتھ مل گیا ہے تو ہم اسے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ تم ایک ایک پل کی مجھے خبر دو۔ اگر تمہاری جان کو

زیادہ خطرہ ہو تو چھپ کر میرے پاس چلے آنا۔"

میں نے لیوپارڈی سے ہاتھ ملایا اور واپس روانہ ہو گیا۔ اپنی قیام گاہ پر آیا تو خادمہ نے مجھے اطلاع دی کہ آقا سلیمان شاہ نے مجھے اپنے محل میں بلایا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ سارا شاخسانہ اسی شاہی انگوٹھی کا ہے جو اس کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ بہرحال میں نے گھبرانے کی بجائے اپنے حواس قابو میں کئے اور سلیمان شاہ کے محل میں پہنچ گیا۔ وہ اپنے حجلہ خاص میں مسند پر اکیلا بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور مجھے اپنے قریب دیوان پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس سے پہلے کہ میں استفسار کرتا کہ مجھے کس لئے طلب کیا گیا ہے اس نے خود ہی بات شروع کر دی اور کہا۔

"لیوگی! کبھی تمہیں سلطان معظم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے؟"

میں تھوڑا ٹھٹکا۔ عیار شخص نے براہ راست حملہ کر دیا تھا۔

مگر میں اس جیسے کئی عیاروں کو اپنی ہزاروں سالہ زندگی میں بھگت چکا تھا۔ میں نے بڑے تعجب سے کہا۔

"آقا! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ کہاں میں ایک ادنیٰ غلام اور کہاں خلیفہ اندلس کی بارگاہ!"

اس دوران سلیمان شاہ کی تیز نگاہیں مجھ پر جمی رہیں۔ میں نے اپنے چہرے پر ذرا سی بھی گھبراہٹ نہیں آنے دی تھی۔ اس لئے کہ میں اپنی جان کی طرف سے بالکل بے فکر تھا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور موضوع کو بدلتے ہوئے بولا۔

"میں تو تم سے مذاق کر رہا تھا۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ شارلیان نے تمہیں جو زہریلا سفوف دے کر بھیجا تھا کہیں وہ راستے میں تم سے کھو تو نہیں گیا تھا؟"

سلیمان شاہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا میں اسے سمجھ گیا تھا۔ میں نے فوراً جواب دیا کہ حضور! بھلا ایسا کبھی ہو سکتا تھا۔ میں نے زہریلے سفوف کی تھیلی خاص طور پر سنبھال کر رکھی ہوئی تھی اور ویسی کی ویسی آپ کو لا کر دے دی تھی۔ سلیمان شاہ اٹھ کر قالین پر ٹہلنے لگا۔

"یونہی مجھے خیال آ گیا تھا کہ کہیں تم سے اصل سفوف کھو نہ گیا ہو اور تم نے.... تم نے اس کی جگہ کوئی دوسرا سفوف لا کر مجھے دے دیا ہو۔"

"حضور یہ ناممکن ہے۔ شارلیان کی خدمت کرتے ہوئے میری عمر گزر گئی ہے۔ ان کی دی ہوئی کوئی معمولی سے معمولی شے بھی کبھی ادھر سے ادھر نہیں ہوئی ہے۔"

وہ میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں دیوان پر بیٹھا تھا۔ اسے قریب کھڑا دیکھ کر میں

بھی تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑی دھیمی آواز میں بولا۔

"لیوگی! میں نے تمہاری ذہانت اور احساس ذمہ داری پر شک کیا۔ تم.....اس کا خیال نہ کرنا۔ میں تمہاری جانثاری کا معترف ہوں۔ کیا تم آج رات میرے ہاں آؤ گے؟ میں نے خاص طور پر شتر مرغ پکوائے ہیں۔"

میں نے ادب سے سر جھکا کر کہا۔ "یہ میرے لئے باعث عزت ہے حضور! میں ضرور حاضر ہوں گا۔" اس نے مجھے واپس بھیج دیا۔ قیام گاہ پر آ کر میں سوچنے لگا کہ یہ عیار شخص میری نیت سے واقف ہو چکا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ میں بھی اس کے ناپاک عزائم سے واقف ہوں اور اب اس کی راہ میں حائل ہوں۔ ظاہر ہے وہ مجھے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ اور آج رات دعوت میں وہ مجھے زہر دے گا۔ میں زیر لب مسکرایا۔ میں زہر کھانے کے لئے تیار تھا۔ اس لئے کہ اس کا قاتل سے قاتل زہر بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں کر سکتا تھا۔

رات کو میں سلیمان شاہ کے محل میں پہنچ گیا۔ بزم احباب گرم تھی۔ طرسومہ شعلہ جوالہ بنی چنگ و مرونگ کی دھن پر رقص کر رہی تھی۔ خلاف معمول سلیمان شاہ نے مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ اس کے حاشیہ بردار برابر میں براجمان تھے۔ ایک شاعر عربی زبان میں قصیدے کے اشعار پڑھ رہا تھا۔ سلیمان شاہ نے اسے انعام میں اپنے گلے سے موتیوں کا قیمتی ہار اتار کر دیا۔ کھانے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ سلیمان شاہ نے اپنے خاص غلام مشروط کو آنکھوں کا ہلکا سا اشارہ کیا ہے۔ وہ فوراً پلٹ کر پیچھے گیا اور آبنوسی میز پر سے ایک صراحی اٹھا کر لے آیا۔ سلیمان شاہ نے میرے خالی پیالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غلام مشروط سے کہا۔

"ہمارے جانثار لیوگی کا پیالہ بھر دو مشروط، ہم اس کا جام صحت نوش کریں گے۔"

صراحی میں صرف اتنا ہی مشروب تھا جو میرے پیالے میں آ گیا۔ میں جان گیا کہ اس مشروب میں زہر ملا دیا گیا ہے۔ میں خاموش رہا۔ سلیمان شاہ نے اپنا پیالہ اٹھا لیا۔ میں نے بھی پیالہ اٹھا لیا۔ سب نے ہمارا ساتھ دیا۔ سلیمان شاہ نے میری تعریف میں کچھ کلمات کہے اور پھر جام صحت نوش کرنے کا اعلان کرتے ہوئے اپنا مشروب پی لیا۔ باقی احباب نے بھی ایسا ہی ظاہر کیا۔ ظاہر ہے مجھے بھی ایسا ہی کرنا تھا۔ میں نے بھی پیالہ ہونٹوں سے لگایا اور اسے خالی کر دیا..... سلیمان شاہ کے چہرے پر اس وقت اطمینان کی ایسی لہر نمودار ہوئی جیسے اس نے اپنے جانی دشمن کو پچھاڑ ڈالا ہو۔

طرسومہ رقاصہ کا رقص جاری تھا۔ محفل میں سوائے میرے، سلیمان شاہ اور مشروط

غلام کے اور کسی کو علم نہیں تھا کہ مجھے زہر دیا گیا ہے۔ میں نے اداکاری کرتے ہوئے تھوڑی دیر بعد سر درد کا بہانہ کیا تو سلیمان شاہ مسکرا کر بولا۔

"جی تو نہیں چاہتا لیکن بہتر ہے کہ تم جا کر آرام کرو۔"

میں اجازت لے کر اٹھا اور اپنی ..... خوابگاہ میں آ گیا۔ میں نے لباس تبدیل کیا۔ شمع دان .... کو بجھا دیا اور خاموشی سے پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ کل جب سلیمان شاہ کو معلوم ہو گا کہ میں اس کے دیئے گئے زہر سے ہلاک نہیں ہوا تو وہ کس قدر حیران ہو گا۔ پھر وہ میرے قتل کا کوئی دوسرا منصوبہ تیار کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ وہ خلیفہ اندلس کو ہلاک کرنے کا جو خفیہ منصوبہ تیار کر رہا ہے اس کے بارے میں بھی کچھ سراغ ملنا چاہیے۔ اسی ادھیڑ بن میں رات گزر گئی۔

دن کے پہلے پہر سلیمان شاہ خود میرے ہاں آ گیا۔ وہ میری لاش دیکھنے آیا تھا مگر میں اسے زندہ حالت میں ملا۔ پھر بھی میں جان بوجھ کر بیمار بن کر پلنگ پر لیٹ گیا تھا۔ سلیمان شاہ کی آنکھوں میں زبردست تحیر تھا جو میں صاف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے دل کی کیفیت کو چھپاتے ہوئے کچھ تردد کے ساتھ بولا۔

"کیوں رات تمہارے سر میں درد تھا۔ تم محفل سے اٹھ کر چلے آئے۔ میں نے سوچا صبح صبح تمہاری خبر لے آؤں۔ اب کیسی طبیعت ہے؟"

میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "درد ابھی تک ہے۔ رات بھر شدید بے چینی رہی۔ آدھی رات کے بعد پیٹ بھی درد کرنے لگا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے اب حالت بہتر ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں طبیب کو بھجوا دوں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں حضور! آپ کی عنایت سے اب بالکل تندرست ہوں۔ طبیب کی حاجت نہیں ہے۔"

سلیمان شاہ بظاہر میری حالت پر خوش اور دل میں میرے زندہ رہ جانے پر سخت حیران ہوتا وہاں سے چلا گیا۔ وہ سارا دن میں نے جان بوجھ کر اپنے بستر پر ہی گزارا۔ کسی کو شک نہ پڑنے کے خیال سے میں نے خادمہ سے دو تین بار تیتروں کی یخنی اور معدہ صاف کرنے والا جوشاندہ بھی بنوا کر پیا۔ شام ہو گئی۔ سلیمان شاہ کی جانب سے دوبارہ کوئی میری خیریت دریافت کرنے نہ آیا۔ ابھی رات کا پہلا پہر ہی گزرا ہو گا۔ خادمہ مجھے کھانا دے کر جا چکی تھی۔ میں خواب گاہ میں نیم دراز تھا۔ شمع روشن تھی۔ نجور سلگ رہے تھے کہ دروازے کا ریشمی پردہ ہٹا۔ سلیمان شاہ کی چہیتی کنیز رقاصہ طرسومہ کھڑی تھی۔ اس نے

اپنے جسم کو سیاہ لبادے میں لپیٹ رکھا تھا۔ جس میں اس کا سرخ و سپید گول چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میری خیریت پوچھنے آئی ہے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"اب بالکل ٹھیک ہوں۔ فکر کی کوئی بات نہیں طرسومہ۔ یونہی رات پیٹ میں درد ہوا تھا۔"

طرسومہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی میری طرف آئی اور پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر تفکرات کے سائے تھے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"تم نے میری بچائی تھی اب میں تمہاری جان بچا کر اپنا قرض چکانا چاہتی ہوں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو طرسومہ؟ میری جان کو کیا ہو گیا ہے؟ میں تو بالکل اچھا بھلا ہوں۔" اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور خبردار کرنے والے لہجے میں بولی۔

"آج رات تم یہاں سے کہیں چلے جاؤ۔ وہ لوگ تمہیں ہلاک کرنے آئیں گے۔"

میں نے انجان بنتے ہوئے سوال کیا۔ "وہ کون لوگ؟"

طرسومہ جلدی جلدی کہنے لگی۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں نے اپنے آقا کو تمہارے قتل کے بارے میں ہدایت دیتے خود سنا ہے۔ غلام مشروط زہر میں بجھا ہوا خنجر لے کر آج رات تمہیں قتل کرنے آ رہا ہے۔ تم میرے محسن ہو۔ اسی لئے میں بڑی مشکل سے وقت نکال کر تمہیں خبردار کرنے آ گئی ہوں۔ خدا کے لئے آج کی رات یہاں مت رہنا.... میں جاتی ہوں۔"

طرسومہ تیزی سے قدم اٹھاتی دروازے کی طرف بڑھی اور پردہ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

تو گویا سلیمان شاہ اب میرے قتل کا منصوبہ تیار کر رہا تھا۔ اگر میں وہیں رہتا ہوں اور مشروط غلام مجھ پر خنجر کا بھرپور وار کرتا ہے تو ظاہر ہے میں مروں گا نہیں۔ غلام مشروط پر میری ناقابل شکست طاقت کا راز فاش ہو جائے گا۔ یہ بات وہ سلیمان شاہ کو بھی جا کر بتا دے گا اور اس بات کا امکان تھا کہ وہ میری فوق الفطرت قوت سے مرعوب ہو کر خلیفہ اندلس کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بھی ترک کر دے۔ یہ بات میرے حق میں نہیں جاتی تھی کیونکہ میں اس اسلام دشمن غدار وطن کو رنگے ہاتھوں پکڑوانا چاہتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ میں اپنی قیام گاہ سے رات بھر کے لئے غائب ہو جاؤں اور صبح اگر سلیمان شاہ پوچھے تو کوئی بہانہ گھڑ دوں۔

چنانچہ یہ ..... فیصلہ کر کے میں بستر سے اٹھا۔ سر پر سیاہ عمامہ رکھ کر فرغل اوڑھا۔ اصطبل میں آ کر گھوڑا نکالا اور اسے رات کے اندھیرے میں دوڑاتا سیدھا لیوپارڈی کی درگاہ میں پہنچ گیا۔ اسے میں نے جاتے ہی بتا دیا کہ سلیمان شاہ آج رات مجھ پر قاتلانہ حملہ کروانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس لئے میں اپنی قیام گاہ سے فرار ہو کر اس کے پاس آ گیا

ہوں۔ اس نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

"یہ شخص ہم سے دشمنی مول لے کر قرطبہ میں زندہ نہیں رہ سکے گا۔ بہرحال تم اندر جا کر آرام کرو۔ میں شارلیان کو یہاں کے حالات سے باخبر کرنے کے لئے صبح آدمی دوڑا دوں گا۔"

وہ رات میں نے لیوپارڈی کی درگاہ میں بسر کی۔

دوسرے روز سلیمان شاہ سے ملاقات ہوئی تو اس نے متفکرانہ انداز میں کہا۔ "لیوگی! رات تم کہاں چلے گئے تھے؟ مجھے تم سے ایک ضروری مشورہ لینے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ میں نے آدمی بھیجا تو پتہ چلا کہ تم مہمان خانے سے غائب ہو۔" میں نے ایک فرضی کہانی سناتے ہوئے کہا۔

"حضور رات میرے ساتھ عجیب واقعہ ہو گیا۔ لیٹے لیٹے طبیعت کچھ بے چین سی ہو گئی۔ سوچا چاندنی رات میں دریا کی سیر کرنی چاہئے۔ میں گھوڑے پر بیٹھ کر دریا کے ساتھ ساتھ سیر کرتا پہاڑیوں کی جانب نکل گیا۔ جب واپس ہونے لگا تو معلوم ہوا کہ راستہ بھول گیا ہوں۔ حضور والا۔ یہاں اجنبی ہوں۔ جنگل پہاڑیوں کے راستوں سے بے خبر ہوں۔ بس ساری رات بھٹکتا پھرتا رہا۔ سورج نکلا تو اس کی روشنی میں راستہ ٹٹولتا بڑی مشکل سے دریا کا سراغ ملا اور پھر اپنے محل تک واپس آیا۔ میری توبہ حضور! اب میں کبھی ان پہاڑیوں کا رخ نہیں کروں گا۔"

میں نے اس فرضی قصے کو کچھ اس طریقے سے سنایا کہ سلیمان شاہ کو یقین آ گیا۔ مگر دوسری رات اس نے پھر قاتل مشروط کو میری خواب گاہ کی طرف بھیج دیا۔ اب میں ہوشیار ہو چکا تھا۔ میں نے خوابگاہ کی ساری شمعیں روشن کر رکھی تھیں اور پلنگ پر لیٹنے کی بجائے دیوان پر بیٹھا پرانی کتابیں نکال کر ان کا مطالعہ کرتا رہا۔ مجھے دو تین بار باہر راہ داری میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ایک بار دروازے کے قریب بھی آہٹ ہوئی مگر میں جاگ رہا تھا۔ خبردار تھا۔ اور میں نے اپنے قریب ہی ایک تلوار بھی رکھی ہوئی تھی۔ قاتل کو خواب گاہ میں کسی خفیہ دروازے سے بھی اندر آنے کی جرات نہ ہوئی۔ وہ مجھے نیند میں قتل کرنا چاہتا تھا یا غافل پا کر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ظاہر تھا کہ جاگتے میں اگر وہ مجھ پر حملہ آور ہوتا تو لڑائی شروع ہو جاتی اور میں قاتل کا چہرہ دیکھ لیتا۔ میں اس پر غالب بھی آ سکتا تھا۔ اس اعتبار سے سلیمان شاہ کی سازش نہ صرف ناکام ہو سکتی تھی۔ بلکہ الٹا اسے یہ وضاحت بھی کرنی پڑتی کہ اس کا خاص غلام مجھے کس لئے قتل کرنے آیا تھا۔

اسی طرح کچھ دن گزر گئے۔ اس دوران میں سلیمان شاہ مجھے ایک یا دو بار ہی

سر راہے ملا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اب اس کی ساری توجہ خلیفہ مسترشد کے قتل کی سازش کی طرف ہے۔ اب وہ اپنے رازوں میں بھلا مجھے کیوں شامل کرنے لگا تھا۔ لیکن میں ہر قیمت پر اس کے دل کا حال معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میری نگاہ انتخاب رقاصہ طرسومہ پر پڑی جو سلیمان شاہ کی جلوت وخلوت میں شریک تھی۔ ہرچند کہ سلیمان شاہ اسے سلطان کے خلاف سازش میں کسی حالت میں شریک نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن طرسومہ کی زبانی مجھے اس عیار شخص کی نقل وحرکت سے آگاہی مل سکتی تھی۔ رقاصہ طرسومہ کا جھکاؤ پہلے ہی کچھ میری طرف کو تھا۔ میں نے دو چار ملاقاتوں میں اسے اپنا مزید گرویدہ کر لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ سوڈان میں میری زمینیں ہیں اور یہاں سے واپس اپنے وطن میں جا کر سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ طرسومہ نے پوچھا کہ اس کا آقا سلیمان شاہ میری جان کا کیوں دشمن بن گیا ہے؟ میں نے ایک فرضی کہانی گھڑ کر اسے سنا دی کہ میں قرطبہ میں ایک خفیہ شاہی خزانے کی تلاش میں آیا تھا۔ آقا کو اس خفیہ خزانے کا علم ہو گیا ہے اور اب وہ مجھے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ مگر میں اسے یہ خزانہ اکیلے ہضم نہیں کرنے دوں گا۔ طرسومہ نے تعجب سے کہا کہ اس کا آقا تو سلطان معظم کا چچا ہے اسے خزانے کی کیا حاجت ہے۔ میں نے کہا کہ بادشاہوں کو خزانے کا لالچ ہم سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی باتوں سے میں نے طرسومہ سے اظہار محبت بھی کر دیا اور کہا کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے تو وہ شرما گئی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسری بار کی ملاقات میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بولی "میں خود اس زندگی سے تنگ آ چکی ہوں اور کسی کے ساتھ شادی کر کے باقی زندگی شرافت کے ساتھ بسر کرنا چاہتی ہوں۔۔" میں نے اسے حوصلہ دیا اور کہا کہ خزانہ ملتے ہی میں اس سے شادی کر کے اسے اپنے ساتھ سوڈان لے جاؤں گا۔ جہاں ہم عیش وآرام کی زندگی بسر کریں گے۔ اب اس کی ساری ہمدردیاں میرے ساتھ ہو گئیں۔ میں نے اسے یہ تو نہ بتایا کہ سلیمان شاہ سلطان معظم کو ہلاک کرنے کا منصوبہ تیار کرنے میں لگا ہے۔ صرف اتنا ہی کہا کہ وہ میرے خزانے پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہے اور مجھے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ اس لئے مجھے اس کی نقل وحرکت سے آگاہ کر دیا۔ طرسومہ نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں تمہیں ایک ایک بات کی خبر کر دیا کروں گی، تم مطمئن رہو۔"

رقاصہ طرسومہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ ایک رات وہ گھبرائی ہوئی میرے پاس آئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

"خدا کے لئے مجھے لے کر یہاں سے بھاگ چلو۔ نہ میں یہاں رہوں گی۔ نہ تمہیں

ان ظالموں کے پاس چھوڑ کر جاؤں گی۔"

"میں نے پوچھا۔ آخر بات کیا ہے؟"

طرسومہ رقاصہ نے بڑی مشکل سے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"وہ لوگ تمہارے کمرے کو بارود سے اڑانے والے ہیں۔"

میرے استفسار پر رقاصہ طرسومہ نے جو واقعہ مجھے بتایا وہ یہ تھا کہ رات کے عشائیے کے بعد وہ اپنے آقا کے پاس بیٹھی اپنی باتوں سے اس کا دل بہلا رہی تھی کہ ایک پراسرار شخص خلوت گاہ میں اجازت طلب کرنے کے بعد آیا۔ اس کو دیکھتے ہی سلیمان شاہ نے رقاصہ طرسومہ کو وہاں سے جانے کے لئے کہا۔ وہ اٹھ کر پہلو والے کمرے میں آ گئی لیکن چونکہ اسے میں نے ہر بات کی ٹوہ لگانے کے لئے کہا تھا اس لئے وہ دروازے کے پیچھے پردے کی اوٹ میں چھپ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے آقا سلیمان شاہ کو اس پراسرار آدمی سے کہتے ہوئے سنا کہ بارود کی تھیلیاں رکھنے کا کام کل تک مکمل ہو جانا چاہئے۔ میں چاہتا ہوں کہ قصر کے ساتھ ہی میرے دشمن کے بھی پرخچے اڑ جائیں۔ پراسرار آدمی اثبات میں جواب دینے کے بعد چلا گیا اور طرسومہ رقاصہ وہاں سے موقع پا کر دوڑتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ میں نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ میں دو ایک روز کے لئے کہیں غائب ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد یہاں سے خزانہ لے کر ایک ساتھ سوڈان کی طرف فرار ہو جائیں گے۔

جب وہ چلی گئی تو میں اٹھا اور مہمان خانہ خاص کی شاہی عمارات کے عقب سے ہوتا ہوا بادشاہ کے محلات کی طرف آ گیا۔ میرا اس نتیجے پر پہنچنا قدرتی امر تھا کہ سلطان شاہ میری قیام گاہ کو نہیں بلکہ خلیفہ مسترشد کی خواب گاہ کو بارود سے اڑانے کا منصوبہ بنا چکا ہے۔ خلیفہ کے ارد گرد اب حفاظتی اقدامات اس قدر سخت کر دیئے گئے تھے کہ اس پر قاتلانہ حملہ تقریباً" ناممکن بات تھی۔ سلیمان شاہ کے عیار دماغ نے آخر یہی ترکیب سوچی کہ بادشاہ کی خواب گاہ کو بارود سے اڑا دیا جائے۔ خلیفہ مسترشد کی خواب گاہ محل کے مشرقی جانب دوسری منزل پر اس طرح بنی ہوئی تھی کہ اس کے نیچے دوسری یا پہلی منزل کے کمروں کی بجائے ایک سیاہ ڈھلانی چٹان بنی ہوئی تھی۔ اس چٹان کے پتھروں کو نوکیلا بنا دیا گیا تھا اور وہاں ہر وقت مسلح پہرہ رہتا تھا۔ میرا قیاس یہ کہتا تھا کہ سلیمان شاہ نے ان پہرے داروں کو بھی عہدوں اور دولت کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور اسی جگہ چٹان کے اندر کوئی سرنگ کھود کر اسے بارود کی تھیلیوں سے بھرا جا رہا ہے تاکہ جب اسے آگ دکھائی جائے تو بادشاہ کی خلوت گاہ کے پرخچے اڑ جائیں اور بادشاہ کا بھی خاتمہ ہو جائے۔ اس کے لئے انہوں نے کل رات کا وقت مقرر کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ بارود کی تھیلیاں کئی روز سے سرنگ میں رکھی جا رہی ہوں گی۔

میں رات کی تاریکی میں سلطان کی خواب گاہ والی چٹان سے کچھ فاصلے پر آیا تو دیکھا کہ وہاں چٹان کی بنیادوں کے پاس پراسرار سائے حرکت کر رہے تھے۔ میں خاموشی سے رینگتا کچھ اور آگے چلا گیا۔ اب مجھے دو آدمی تھیلے اپنے کاندھوں پر لادے چٹان کے نیچے ایک شگاف میں جاتے دکھائی دیئے۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ وہاں مسلح شاہی پہرے داروں کا کچھ پتہ نہ تھا۔ میرا قیاس بالکل صحیح نکلا تھا۔ سلیمان شاہ، سلطان کی خواب گاہ والی چٹان کے نیچے بارود بچھوا رہا تھا۔ اب مزید انتظار کا وقت نہیں تھا۔ وقت آ گیا تھا کہ میں بادشاہ کے پاس پہنچ کر اسے اس گھناؤنی سازش سے فوراً" خبردار کر دوں۔ کیونکہ کل رات کی بجائے یہ لوگ آج رات کو ہی شاہی خواب گاہ کو قیامت خیز دھماکے سے اڑا سکتے تھے۔

جونہی میں جھاڑیوں میں واپس ہونے کے لئے پلٹا کسی نے میری گردن پر تلوار کا بھرپور وار کر دیا۔ وار اس قدر شدید تھا کہ جو تلوار میری گردن پر پڑی ایک چھناکے کی آواز کے ساتھ اس کے ٹکڑے ہو گئے۔ میں اندھیرے میں دیکھ رہا تھا کہ ایک پہریداروں کی وردی والا سپاہی ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی تلوار کا دستہ لئے حیران و پریشان کھڑا مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تک رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ منہ سے کوئی آواز نکالتا میں مگرمچھ کی طرح اچھل کر اس پر جھپٹا اور سب سے پہلے میں نے اس کے منہ کو دبوچ لیا۔

میری پوری طاقت بیدار ہو چکی تھی۔ وہ میرے بوجھ سے نیچے گر گیا اور اس کا سانس رکنے لگا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے خنجر کھینچ کر میری پشت پر وار کیا۔ میں نے اس کے منہ پر سے اپنا ہاتھ نہ اٹھایا تاکہ وہ آواز نہ نکال سکے اور اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر کہا۔

"اگر تم مجھے سچ سچ بتا دو کہ یہ لوگ بادشاہ کی خواب گاہ کو کب بارود سے اڑا رہے ہیں تو میں تمہاری جان بخشی کر دوں گا۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ تمہاری تلوار کا وار میری گردن کا مقابلہ نہیں کر سکا اور تمہارے خنجر کے وار بھی خالی جا رہے ہیں۔ تم نے یہ بھی محسوس کر لیا ہو گا کہ میں نے اپنے جسم پر زرہ بکتر نہیں پہن رکھا۔" اس شخص کی تو گھگی بندھ گئی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ میرے جسم کا بوجھ ہاتھی سے بھی زیادہ ہو چکا تھا اور ابھی میں نے اس پر صرف اپنے بازو کا بوجھ ڈالا ہوا تھا کہ اس کی ہڈی پسلی ایک ہو رہی تھی۔ وہ مجھے کوئی مافوق الفطرت ہستی سمجھنے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر رکھ دیئے۔ اس کا منہ کھلا اور اس نے لڑکھڑاتی، خرخراتی آواز میں کہا۔ "میں نہیں جانتا۔

ہو سکتا ہے آج پچھلے پہر دھماکہ ....دھماکہ ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کل....کل....مگر میں بے قصور ہوں۔"

میں نے اس کی گردن پر اپنی انگلیوں کی گرفت کچھ مزید مضبوط کی تو اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے پوچھا۔

"مسلح محافظوں کا دستہ سلطان کے چچا سے ملا ہوا ہے؟"

"ہاں ....ہاں.... میں بے قصور ہوں۔ میں لالچ میں آگیا تھا۔"

مگر میں اسے زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ چند ثانیوں کے بعد اس کی بے جان لاش پڑی تھی۔ میں نے لاش کو کاندھے پر اٹھایا اور ایک گہری خندق میں لا کر پھینک دیا۔ میرے سارے خدشے اور اندازے درست ثابت ہوئے تھے۔ اب مجھے جتنی جلدی ہو سکے سلطان معظم یا طبیب شاہی کے پاس پہنچنا تھا۔ شاہی طبیب کا قیام بھی بادشاہ کے محل کے اندر ہی تھا۔ میں جب شاہی محل کے صدر دروازے پر آیا تو ترک پہرے داروں نے مجھے روک کر پوچھا کہ میں کون ہوں اور کس لئے وہاں آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ میرا اس وقت بادشاہ سلامت یا طبیب شاہی سے ملنا بہت ضروری ہے۔ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ مگر انہوں نے الٹا مجھے پکڑ لیا اور شاہی محل کی ڈیوڑھی میں لے جا کر میرے پاؤں میں زنجیریں ڈالنے لگے۔ اسی وقت مجھے خیال آیا کہ اگر میں نے طرسومہ رقاصہ کی مدد سے کسی طرح شاہی انگوٹھی سلیمان شاہ کے کمرۂ خاص سے برآمد کروالی ہوتی تو اس فضول کی جھک جھک سے نجات مل جاتی اور وقت بھی ضائع نہ ہوتا۔ میں نے ترک پہرے داررووں سے کہا کہ مجھے بادشاہ کے پاس نہ سہی طبیب شاہی کے پاس ہی لے چلو۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ورنہ تم لوگ بعد میں پچھتاؤ گے۔ مگر ان کی سمجھ میں میری منطق بالکل نہیں آ رہی تھی۔ وہ مجھے کوئی فاتر العقل آدمی سمجھ بیٹھے تھے۔

آہن گر میرے پاؤں میں لوہے کی زنجیر ڈال کر اس کے کنڈے آپس میں بند کر رہا تھا۔ میں نے ایک چھناکے سے زنجیر کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ سپاہیوں اور پہرے داروں نے تلواریں کھینچ لیں۔ میں صدر دروازے کے بغلی طاق کی طرف دوڑا۔ مجھ پر پیچھے سے تیروں، نیزوں اور تلوار کے وار پڑ رہے تھے۔ میں نے دوڑتے ہوئے اپنا آپ بغلی طاق سے ٹکرا دیا۔ طاق دو ٹکڑے ہو کر کھل گیا۔ میں محل کے پائیں باغ میں دوڑ پڑا۔ یہاں اندھیرا بھی تھا اور روشوں پر کافوری فانوس بھی روشن تھے۔ میں سرو کے تاریک جھنڈوں کی طرف بھاگا۔ ان کے پیچھے شاہی طبیب کا محل تھا۔ سپاہی میرا پیچھا کر رہے تھے۔ وہاں ایک افراتفری سے مچ گئی تھی۔ تیروں کی بوچھاڑیں مجھ پر پڑ رہی تھیں۔ مگر میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ شاہی طبیب کی محل سرا کے دروازے پر بھی پہرہ لگا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو وہاں بھی مجھ پر پہرے داروں نے حملہ کر دیا۔ میں نے بھی ایک پہرے دار کی تلوار چھین کر مقابلہ شروع کر دیا۔ میں بڑی آسانی سے ان تمام سپاہیوں اور پہرے داروں کو تہ تیغ کر سکتا تھا کیونکہ ان کے کسی وار کا میرے جسم پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اب وہ بھی کچھ خائف ہو گئے تھے اور لڑتے لڑتے پیچھے ہٹنے لگے تھے۔ تلوار کی جھنکار اور سپاہیوں کا شور و غوغا سن کر شاہی طبیب نے بارہ دری میں سے جھانک کر نیچے دیکھا اور پوچھا کہ یہ کیسا شور مچا رکھا ہے؟ میں نے بلند آواز میں کہا۔

"عالی جاہ! میں عبداللہ ہوں اور حسب وعدہ سلطان معظم کے لئے ایک خاص پیغام لے کر آیا ہوں۔"

"اسے کچھ نہ کہو۔ اوپر آنے دو میرے پاس۔ جاؤ سب واپس جاؤ۔"

سپاہی اور پہرے دار حیرت زدہ چہروں کے ساتھ واپس چلے گئے۔ میں شاہی طبیب کی خواب گاہ میں پہنچا تو اس نے دروازے کے آگے پردہ گرا دیا اور مجھ سے پوچھا کہ میں کیا خاص پیغام لایا ہوں۔ میں نے ساری بات بیان کر دی۔ طبیب شاہی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

طبیب شاہی کی محل سرا کے اندر ہی اندر سے ایک راہ داری بادشاہ کے محل کو جاتی تھی۔ سلطان کے قصر خاص میں پہنچ کر شاہی طبیب نے اندر پیغام بھجوایا۔ سلطان نے ہمیں اسی وقت اندر بلوا لیا۔ وہ خواب گاہ سے نکل کر پہلو والی آرام گاہ میں بیٹھا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پوچھا کہ میں کیا خاص پیغام لایا ہوں۔ میں نے سارا قصہ سلطان کے گوش گزار کر دیا۔ سلطان نے اسی وقت اپنی خوابگاہ سے ملکہ کو نکلوا کر دوسرے قصر شاہی کی خواب گاہ میں بھجوا دیا۔ پھر سلطان اور شاہی طبیب مجھ سے مزید تفصیلات معلوم کرنے لگے۔ میں نے ایک ایک بات کھول کر من وعن بیان کر دی اور کہا۔

"سلیمان شاہ وہاں پر نہیں ہے مگر ایک ترکیب ایسی ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو وہ خود وہاں پہنچ سکتا ہے۔"

سلطان اور شاہی طبیب نے مجھ سے وہ ترکیب پوچھی تو میں نے انہیں بیان کر دی۔ سلطان نے فوراً" اپنے خاص محافظین کے سالار کو بلوایا۔ ان محافظین سلطان کی تعداد پندرہ ہزار تھی۔ سلطان نے اسے حکم دیا کہ ایک صد جانثاروں کو سیاہ لبادے اوڑھا کر خواب گاہ کی چٹان کی حفاظت گاہ کے ارد گرد خفیہ مقامات پر چھپا دیا جائے اس کے بعد خود بادشاہ او

طبیب شاہی نے اپنے جسم سیاہ فرغلوں میں چھپائے۔ پندرہ جانثاروں کو ساتھ لیا اور محل کے خفیہ دروازے سے نکل کر خواب گاہ والی چٹان کی حفاظت گاہ کے عقب میں آ کر جھاڑیوں میں پہنچ گئے۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ حفاظتی دستے کا سالار بادشاہ کی خدمت میں موجود تھا۔ رات کی تاریکی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے اندھیرے میں چٹان کے اندر بنائے ہوئے شگاف کا مشاہدہ کر لیا تھا اور وہ انگشت بدنداں تھے۔ اب وہ اپنے چچا کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتے تھے۔ سلطان نے سالار سے کہا کہ حفاظتی چوکی کے تمام سپاہیوں کو کوئی آواز نکالے بغیر خاموشی سے قتل کر دیا جائے۔ سالار نے تلوار کھینچ لی اور تعظیم کرنے کے بعد اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ سالار اس سارے علاقے اور حفاظتی چوکی کے حدود اربعہ اور سپاہیوں کی تعداد سے واقف تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کی ہلالی تلوار میں سے خون ٹپک رہا تھا۔ اس نے عرض کی کہ حسب الحکم چوکی کے تمام پہرے داروں کو جہنم واصل کر دیا گیا ہے۔ سلطان نے اب میری طرف دیکھا۔ میں نے سالار کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ اس کی رہنمائی میں میں نے ایک پہرے دار کی لاش پر سے اس کی وردی اتار کر خود پہن لی۔ اس کی سیاہ اور سرخ پٹی والی پگڑی اپنے سر پر جمائی۔ تلوار کمر سے لگائی اور سالار سے کہا۔

"آپ سلطان معظم کے پاس چلے جائیں۔ خفیہ مقامات پر چھپے ہوئے جانثاروں کو چوکس رکھیں۔ انہیں آپ کی ایک ہی آواز پر کمین گاہوں سے نکل کر مدد کو پہنچ جانا ہو گا۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" سالار نے جواب میں کہا اور خود اندھیرے میں انجیر کے اس درخت کی طرف چل پڑا جو چٹان کے بالکل سامنے ایک اونچی جگہ پر اگا ہوا تھا۔ اور جس کی اوٹ میں سلطان اندلس اور طبیب شاہی چھپے بیٹھے تھے۔ میں نے اندھیرے میں دیکھا کہ حفاظتی چوکی کے ارد گرد اور چوکی کے اندر مسلح سپاہیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ میں چٹان کے شگاف کے قریب آ گیا۔ یہاں دو آدمی شگاف کے اندر سے باہر نکلے۔ انہوں نے دائیں بائیں دیکھا اور حفاظتی چوکی کی طرف بڑھے۔ انہوں نے چٹان کے شگاف کے منہ پر جھاڑیاں اور جھاڑ جھنکاڑ ڈال دی تھیں۔

میں راستے میں ہی کھڑا تھا۔ انہوں نے اپنے سامنے حفاظتی دستے کے ایک مسلح پہرے دار کو دیکھا تو کسی قسم کی گھبراہٹ کا اظہار نہ کیا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ حفاظتی دستے کے سارے سپاہی ان کی سازش میں برابر کے شریک ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک آدمی کو اپنے قریب بلا کر کہا۔ "اس بارود میں قلمی شورے کی مقدار کم ہے اور ویسے بھی یہ

چٹان کی نمی سے گیلا ہو گیا ہے۔ مجھے شک ہے کہ اسے آسانی سے اڑایا نہیں جا سکے گا۔" میں اندھیرے میں کھڑا تھا۔ میں نے ویسے بھی حفاظتی عملے کے ایک سپاہی کی وردی پہن رکھی تھی۔ وہ آدمی مجھے اپنا ہی ہم سازش سمجھا۔ میری بات پر پریشان ہو کر بولا۔

"یہ بات ہمیں ذی جاہ، عالی وقار امیر کو فوراً" بتانی ہو گی۔ کیونکہ وہ کل رات یا ہو سکتا ہے آج پچھلے پہر اسے اڑانے کا حکم صادر کرنے والے ہیں۔"

یہی میں چاہتا تھا میں نے اس آدمی سے کہا کہ فوراً" سلیمان شاہ کو جا کر حالات سے آگاہ کرو۔ پھر وہ جیسا کہیں گے ویسا ہی کریں گے۔ وہ آدمی اسی وقت گھوڑے پر سوار ہو کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ دوسرا آدمی چٹان کے شگاف کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں ادھر ادھر کچھ دیر ٹہلتا رہا۔ پھر ایک تودے کے عقب سے ہو کر سلطان اندلس اور طبیب شاہی کے پاس آ گیا اور انہیں بتایا کہ میں نے یہ چال چلی ہے اور غدار سلیمان شاہ کوئی دم میں آنے والا ہے۔ سلطان نے اسی وقت حفاظتی دستہ خاص کے سالار کو بلوا کر حکم دیا کہ میرے تالی بجانے پر فوراً" اپنے آدمیوں کو لے کر یہاں پہنچ جانا۔

تھوڑا وقت ہی گزرا تھا کہ ہمیں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ میں وہیں سلطان کے پاس ہی کھڑا تھا۔ کیونکہ سلیمان شاہ مجھے اس وردی میں بھی پہچان سکتا تھا۔ اندھیرے میں سے دو گھڑ سوار نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک وہی آدمی تھا اور دوسرا سلطان اندلس کا چچا سلیمان شاہ تھا۔ سلطان نے اپنے چچا کو دیکھا تو ایک گہرا سانس لے کر خاموش رہے۔ سلیمان شاہ گھوڑے سے اتر کر سب سے پہلے چٹان کے شگاف کے پاس گیا جہاں بارود کی تھیلیاں بھری جا چکی تھیں۔ وہاں بیٹھے ہوئے آدمی سے کوئی بات کی۔ پھر ہمارے اور چٹانی شگاگ کے وسط میں آ کر دوسرے آدمی سے بولا۔

"عملے کا سالار کہاں ہے، اسے بلاؤ۔"

آدمی چلا گیا۔ سلیمان شاہ بے چینی سے نیم تاریکی میں وہیں ٹہلتا رہا۔ ہم انجیر کے درخت تلے خاموش سانس روکے بیٹھے تھے۔ ذرا سی دیر میں وہ آدمی واپس آ گیا۔ اس نے کہا کہ سالار کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ سلیمان شاہ نے مضطرب ہو کر کہا۔

"دیکھو میں جا رہا ہوں۔ سالار سے کہنا کہ بارود گیلا ہے یا نہیں۔ میں ہر حال میں چاہتا ہوں کہ آج پچھے پہر اسے آگ لگا دی جائے۔ بس۔ اگر اس نے میری حکم عدولی کی تو تم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے گھوڑے کی طرف مڑا ہی تھا کہ خلیفہ اندلس نے زور سے تالی بجا دی۔ تالی کا بجنا تھا کہ آس پاس تاریکی میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور سلطان کے مخالفین ننگی

تلواریں لہراتے درختوں اور جھاڑیوں میں سے نکل آئے اور انہوں نے سلیمان شاہ کو گھیرے میں لے لیا۔ سلیمان شاہ ہکا بکا ہو کر محافظین سلطان کا منہ تکنے لگا۔ اب خلیفہ اندلس اور شاہی طبیب بھی اندھیرے سے نکل کر سلیمان شاہ کے سامنے آ گئے تھے۔

"چچا! تم سے مجھے یہ امید نہ تھی۔"

سلطان نے غضب ناک آواز میں کہا۔ سلیمان شاہ نے اندھیرے میں مجھے پہچان لیا اور اپنا سر جھکا دیا۔ اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا تھا۔ سلطان نے اسی وقت اپنے چچا کی گرفتاری کا حکم صادر کرتے ہوئے یہ حکم بھی دیا کہ بارود کی تھیلیاں شگاف میں رکھنے والے آدمیوں کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر قلعے کی فصیل سے نیچے گرا دیا جائے۔

سلیمان شاہ کو اسی وقت گرفتار کر لیا گیا۔ سلطان اندلس میری اور شاہی طبیب کی معیت میں خفیہ دروازے سے ہوتا ہوا واپس اپنے محل میں آ گیا۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے سلیمان شاہ کے محل خاص اور خواب گاہ کی ایک ایک چیز کی تلاشی لی گئی اس کی الماری کے ایک خفیہ خانے سے وہ انگوٹھی بھی برآمد ہو گئی جس کے مرجان پر سلطان اندلس کا نام کندہ تھا اور جو بادشاہ نے خاص طور پر مجھے مرحمت فرمائی تھی۔

سلطان اندلس نے مجھے انعام وکرام سے نوازا۔ رقاصہ کنیز طرسومہ کو جب پتہ چلا کہ سلیمان شاہ اصل میں خلیفہ اندلس کو ہلاک کرنے کے لئے بارود بچھا رہا تھا تو وہ حیران ہو کر رہ گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ سلطان کا چچا تخت اندلس پر قبضہ کرنے کے لئے سلطان کو قتل کرنے والا تھا اور میں اس سازش کو بے نقاب کرنے میں لگا ہوا تھا۔

سلطان نے مجھے دربار میں اپنے مقربین کی جگہ عطا کی اور رفیق الملک کے خطاب سے بھی نوازا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ میں نے سلطان کی جان بچائی تھی۔ جنوبی قرطبہ کی درگاہ کے متولی لیوپارڈی کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ بظاہر تمام سازشی کیفر کردار کو پہنچ چکے تھے۔ لیکن ابھی ایک چھپا ہوا عنصر باقی تھا۔ جس کی مجھے خبر بھی نہیں تھی۔ اس پوشیدہ عنصر کا انکشاف رقاصہ طرسومہ کی وجہ سے ہوا۔ رقاصہ کنیز طرسومہ اپنے آقا کی موت کے بعد اپنی مرضی سے میرے محل میں آ گئی تھی۔ میرے حالات نہ صرف یہ کہ بدل گئے تھے۔ بلکہ بہت بہتر ہو گئے تھے۔ اس لئے طرسومہ کی خواہش تھی کہ میں اس سے شادی کر لوں لیکن میں اس سے شادی کر کے اسے زندگی کی مسرتوں سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ میرا کچھ پتہ نہیں تھا کہ آج اندلس میں ہوں تو تقدیر یا حادثات واقعات مجھے کل کہاں کھینچ کر لے جائیں گے لیکن میں نے طرسومہ کو اپنے محل میں مالکہ کا درجہ دے رکھا تھا۔

دوسری کنیزیں اس کی خدمت پر مامور تھیں۔ میں اس کی ہر آسائش کا خیال رکھتا تھا۔

ان ہی دنوں.....ملک کے جنوبی حصے میں بغاوت ہو گئی۔ خلیفہ لشکر لے کر بغاوت فرو کرنے کے لئے گیا ہوا تھا۔ امور سلطنت وزیر اعظم کے سپرد تھے۔ ایک روز میں دربار سے فارغ ہو کر اپنے محل میں واپس آیا تو پتہ چلا کہ رقاصہ طرسومہ وہاں نہیں ہے۔ خادماؤں نے بتایا کہ وہ ندی پر غسل کرنے گئی ہوئی ہیں۔ جب اسے خاصی دیر ہو گئی تو مجھے فکر لگی۔ میں نے دو غلاموں کو ساتھ لیا اور ندی پر پہنچ کر طرسومہ کو تلاش کیا۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ اچانک ایک جگہ جھاڑیوں میں مجھے ان دو حبشی کنیزوں کی لاشیں پڑی ملیں جو اس کی حفاظت کے لئے ساتھ گئی تھیں۔ بات بالکل واضح تھی کہ کسی نے محافظ حبشی کنیزوں کو قتل کر کے طرسومہ کو اغوا کر لیا ہے۔ میں نے ارد گرد ساری جگہ دیکھی۔ گھاس ہونے کی وجہ سے وہاں کسی کے قدموں کے نشان نہیں تھے۔ کہیں کہیں سے گھاس گھوڑوں کے سموں نے کچل دی تھی۔ کوئی گھڑ سوار طرسومہ کو اغوا کر کے لے گیا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ خلیفہ کے خلاف قتل کی سازش کے طشت ازبام ہو جانے کا ہی شاخسانہ ہے۔ ورنہ کسی کو طرسومہ سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ مجھے طرسومہ کے بارے میں سخت تشویش ہوئی۔ خطرہ تھا کہ اگر اس کو سازش کے ناکام ہونے کی وجہ سے پکڑا گیا ہے تو کہیں اسے ہلاک نہ کر دیا جائے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو کر سامنے آ گئی تھی کہ غدار سلیمان شاہ کے کچھ ساتھی ابھی تک باقی ہیں۔ بہرحال ابھی تک میرا ذہن اس بارے میں پوری طرح صاف نہیں تھا۔ اس وقت صرف طرسومہ کی جان بچانے اور اسے بازیاب کرنے کی ضرورت تھی۔ شہر کے چاروں جانب سپاہی دوڑا دیے گئے۔ گھر گھر کی تلاشی لی جانے لگی۔ مگر طرسومہ برآمد نہ ہو سکی۔

ایک روز میں نے بھیس بدلا اور طرسومہ کی تلاش میں شہر کے گلی کوچوں میں نکل کھڑا ہوا۔ میں نے عام مصری مسلمان طبیبوں ایسا لباس پہن رکھا تھا اور آدھا چہرہ سیاہ چادر سے ڈھکا ہوا تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے پہچانے اور کسی کو یہ خبر ہو کہ میں شاہی رقاصہ طرسومہ کی تلاش میں ہوں۔ مسلمان عرب بادشاہوں کے عہد کا قرطبہ کوئی معمولی شہر نہیں تھا۔ عربوں نے قرطبہ کو خوشحالی..... علمی عظمت اور اقلیتوں سے رواداری کے جذبے کو اس عروج تک پہنچایا کہ یہ عروج مسلمانوں کے بعد ہسپانیہ کی سرزمین دوبارہ کبھی حاصل نہ کر سکی۔

میں سارا دن شہر قرطبہ کی آوارہ گردی کرتا رہا۔ کئی چھپتی ہوئی نیم روشن گلیوں میں بھی گیا۔ پرانی حویلیوں میں بھی جھانک کر دیکھا بازاروں اور کاروں سراؤں میں بھی طرسومہ کا

سراغ لگانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ میں اب شہر سے نکل کر قرب وجوار کی پہاڑیوں کی طرف نکل آیا۔ سورج آہستہ آہستہ پہاڑوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ میں ایک ویران میدان میں چلا جا رہا تھا جہاں مجھے ایک پرانی دیوار کے احاطے کے اندر درختوں کے جھنڈ دکھائی دیئے۔ احاطے میں کچھ قبریں بنی ہوئی تھیں۔ یہ قبریں عیسائیوں کی تھیں اور ان کے پتھر اور کتبے شکستہ ہو رہے تھے۔ قبرستان کے کونے میں ایک چبوترے پر بوسیدہ کوٹھری ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ یہ کوٹھری رومن زمانے کی لگتی تھی۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ سیاہ بادل امڈے چلے آ رہے ہیں اور بجلی رہ رہ کر چمکنے لگی ہے۔ میں واپس جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دم سے بارش ... شروع ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ یہاں تھوڑی دیر کسی جگہ ٹھہر کر بارش رکنے کا انتظار کرنا چاہیئے۔ میں اسی بوسیدہ رومن طرز کی کوٹھری میں آ گیا۔ کوٹھری کے دروازے غائب تھے۔ فرش خاک آلود تھا۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ فرش کی مٹی پر کسی انسان کے قدموں کے نشان تھے۔ یہ نشان کوٹھری کی دیوار کے پاس جا کر غائب ہو گئے تھے۔ یہ کس کے قدموں کے نشان ہو سکتے تھے۔ میں سوچنے لگا۔ میں ابھی غور ہی کر رہا تھا کہ مجھے کسی کے سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ یوں لگا جیسے کوئی گہرا سانس لے کر میرے قریب سے گزر گیا ہے۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ باہر قبرستان میں شام کے پھیلتے اندھیرے میں بارش ہو رہی تھی۔ بجلی چمک رہی تھی۔ ماحول کو اس بارش اور شام کے لحہ بہ لحہ بڑھتے ہوئے اندھیرے نے مزید پراسرار اور آسیبی بنا دیا تھا۔ خیال آیا کہ یہ کسی انسانی سانس کی نہیں بلکہ ہوا کے جھونکے کی آواز تھی۔ لیکن وہی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ یہ آواز آہ بھرنے سے ملتی جلتی تھی۔ میں نے اس مقام پر نظریں جما دیں جہاں پہنچ کر قدموں کے نشان ختم ہو گئے تھے۔ یہاں اینٹوں اور پتھروں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ میں نے پتھروں کو پیچھے ہٹایا تو وہاں ایک شگاف نمودار ہو گیا۔ اسی شگاف میں سے نم دار ٹھنڈی ہوا باہر نکل رہی تھی۔ میں نے شگاف میں جھانک کر دیکھا۔ یہ ایک تنگ و تاریک سرنگ تھی۔ مجھے شبہ ہوا کہ ہو سکتا ہے یہاں اندر کسی جگہ باقی ماندہ سازشی گروہ کا کوئی خفیہ ٹھکانہ ہو اور طرسومہ کو انہوں نے اسی جگہ اغوا کر کے چھپا رکھا ہو۔

میں سرنگ میں اتر گیا۔ زمین گیلی گیلی تھی۔ کہیں سے سرنگ کے اندر پانی رس رس کر ٹپک رہا تھا۔ میں جھک کر دیوار کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ میں جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا سرنگ کشادہ ہوتی جا رہی تھی۔ چھت بھی بلند ہو رہی تھی۔ آگے ایک رومن طرز کا دروازہ آ گیا۔ جس کے دونوں جانب اونچے گول ستون کھڑے تھے۔ دروازے کے پٹ غائب تھے ان کی جگہ چھت میں سے جھاڑیاں نکل کر نیچے لٹک رہی تھیں۔ میں نے جھاڑیوں کو ہٹایا۔ اندر ایک دالان سا نظر آیا۔ جہاں دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ دالان میں پہنچا تو ایسے مصالحہ جات کی خوشبو آئی جو عام طور پر مردوں کے سرہانے جلائے جاتے تھے۔ کچھ اور آگے بڑھا تو دیکھا کہ طاق میں ایک پرانی گرد آلود شمع جل رہی ہے۔ فرش پر قالین بچھا ہوا ہے جو گرد آلود ہے۔ کونے میں ایک مسہری لگی ہے۔ جس کے سرہانے، دونوں طرف قدیم یونانی دور کے عریاں مجسمے نصب ہیں۔ مسہری پر تکیئے لگے تھے۔ مگر مکڑیوں نے جالے بن رکھے تھے۔ میں نے سرہانے کے قریب نصب عورت کے مجسمے کو جھک کر دیکھا۔ اس کے نیچے یونانی زبان میں یہ الفاظ کندہ تھے۔

"امیلیا۔ یونانی شاعرہ سیفو کی چھوٹی بہن۔"

یہ معمہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مشہور یونانی شاعرہ سیفو کی چھوٹی بہن امیلیا کا یہ مجسمہ یہاں کیسے آ گیا؟ اور یہ پراسرار قدیم خواب گاہ کس نے تعمیر کی تھی۔ مجھے اب بھی یہی شبہ ہو رہا تھا کہ اندلس کا تختہ الٹنے کی سازش کرنے والے گروہ کے باقی ماندہ لوگ اس کمین گاہ میں چھپے ہوئے ہیں۔

میرے اس نظریئے کو اس حقیقت سے تقویت ملی کہ گرد آلود قالین پر بھی کسی انسانی پاؤں کے نشان موجود تھے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ نشان ان قدموں کے نشانوں کے مشابہ ہیں جو میں نے سرنگ کے باہر دیکھے تھے۔ میں .... مسہری کی دوسری جانب آ گیا۔ یہاں پلنگ پر بچھی چادر پر ایک سیاہ رنگ کا باسی پھول پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا تو میرے ہاتھ کے ساتھ مکڑی کے جالے کے تار لپٹ گئے۔ پھول گلاب کا تھا جو کبھی تر و تازہ اور شگفتہ ہوا کرتا ہوا ہو گا مگر اب سوکھ کر سیاہ پڑ چکا تھا۔ مسہری کے عقب کی دیوار پر ریشمی پردہ پڑا تھا۔ اس پردے میں سرسراہٹ سی پیدا ہوئی۔ ضرور سازشی گروہ کا کوئی آدمی یہاں چھپا ہوا ہے۔ یہ سوچ کر میں تیزی سے ایک ستون کی اوٹ میں چھپ گیا۔ گرد آلود شمع دان میں موم بتی جل رہی تھی اس کی کمزور پھیکی زرد روشنی شمع دان کے فانوس میں سے جیسے سسک سسک کر باہر نکل رہی تھی۔ ایک بار پھر مجھے انسانی سانس کی آواز سنائی دی۔ یہ ایک گہری اداس ملال آمیز سرگوشی سی تھی۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر مسہری کے عقبی پردے کی طرف تکنے لگا۔ پردہ ذرا سا لرزا۔ پھر ایک طرف کو ہٹ گیا اور اس کے پیچھے سے ایک سفید پوش انسانی ہیولا نکل کر عورت کے مجسمے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک عورت تھی۔ جس کے سنہری گھنگریالے بال اس کی پیٹھ پر لٹک رہے تھے۔ اس کے

سر پر گلاب کی ٹہنی کا تاج تھا۔ جس پر گلاب کے سیاہ باسی پھول صاف نظر آ رہے تھے۔ میں نے تھوڑی دیر کے لئے اپنا سانس روک لیا۔ یا خدا! یہ عورت کون ہے؟ کیا یہ کسی مردے کی روح ہے؟ عورت نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور اپنے ہاتھ مجسمے کے پاؤں پر رکھ دیئے۔ پھر اپنا سر بھی مجسمے کے پاؤں کے ساتھ لگا دیا۔ اب اس کی سسکیوں کی آواز آنے لگی۔ ماحول پر ایک کرب انگیز سناٹا چھا گیا تھا۔ میں کسی طلسمی یا آسیب زدہ ماحول میں آ گیا تھا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ یہ کہیں طرسومہ تو نہیں ہے۔

اس خیال کا میرے دل میں آنا تھا کہ کانوں میں کسی عورت کی غمگین سرگوشی سنائی دی۔

"میں طرسومہ نہیں ہوں عاطون!"

حیرت کے مارے ایک بار تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میری پھٹی ہوئی آنکھیں اس عورت کے ہیولے پر لگی ہوئی تھیں جس کی پشت میری جانب تھی۔ یقیناً" یہ آواز اسی عورت کی تھی۔ میں اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔ میں نے کوئی آواز بھی نہ نکالی۔ بس ستون کے پیچھے ساکت کھڑا اس پراسرار عورت کو ٹکٹکی باندھتے تکتا رہا۔ اچانک وہ عورت مڑی۔ اب شمع کی دھندلی روشنی میں مجھے اس کا چہرہ نظر آیا۔ وہ ایک خوصورت عورت تھی۔ چہرہ کہر آلود تھا۔ آنکھوں میں ایک دھندلی سی چمک باقی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میرے کانوں میں ایک بار پھر اس کی آواز ٹکرائی۔

"ستون کے پیچھے سے نکل کر مسہری کی پائنتی کی جانب آ جاؤ عاطون۔" جیسے کسی طلسمی قوت نے مجھے مسہری کی پائنتی کے پاس لا کر کھڑا کر دیا۔ وہ پراسرار حسین عورت جس مجسمے کے پاس کھڑی تھی اب میں نے دیکھا کہ وہ اس کا ہم شکل تھا۔ یقیناً" یہ اس کا اپنا مجسمہ تھا۔ تو کیا یہ سیفو کی بہن امیلیا کی روح تھی؟ ضرور یہ اس کی روح ہی تھی۔ ورنہ اسے میرا نام کیسے معلوم ہو جاتا۔ اس کو تو یہ بھی علم تھا کہ میں طرسومہ کی تلاش میں وہاں آیا ہوں۔ اب میرا خوف بھی دور ہو چکا تھا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر سوال کیا۔

"تم .... تم کون ہو؟ تم میرا نام کیسے جانتی ہو؟"

عورت کے ہونٹ نہیں ہل رہے تھے۔ اس کے چہرے پر سنگین خاموشی تھی۔ لیکن اس کی سرگوشی نما آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔

"مجھ سے کوئی راز چھپا ہوا نہیں عاطون۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ اگر یہ بات ہے تو کیا وہ مجھے طرسومہ کے بارے میں بتا

سکتی ہے کہ وہ مجھے کہاں ملے گی؟ اس پر امیلیا کی روح نے ایک لمحے کے لئے توقف کیا پھر اس کی شکستہ آواز آئی۔

"عاطون! میں سینکڑوں برسوں سے ایک ناقابل برداشت عذاب میں مبتلا ہوں۔ تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دیوتاؤں نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ اور میرے طویل عذاب کی مدت ختم ہو گئی ہے۔"

میں اپنی جگہ پر ساکت کھڑا تھا۔ شمع دان کی دھندلی روشنی اس حسین عورت کے کہر آلود چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ روح کس قسم کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اس کی آواز آئی۔

"ابھی تک تم میرے عذاب کی اذیت سے واقف نہیں ہوئے ہو۔ چونکہ تمہیں دیوتاؤں نے میرا نجات دہندہ بنا کر یہاں بھیجا ہے۔ اس لئے میں تمہیں اپنے عذاب کی جھلک ضرور دکھاؤں گی۔"

امیلیا نے اس کے ساتھ ہی چادر ہٹا دی۔ میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ اس کے سینے میں ایک خنجر کھبا ہوا تھا۔ جس میں سے خون کے قطرے نیچے ٹپک رہے تھے۔ اس کی کرب آلود آواز ایک بار پھر بلند ہوئی۔

"یہ خنجر میرے سینے میں سینکڑوں برسوں سے گڑا ہے۔ میں اسے باہر نہیں کھینچ سکتی۔ میرے ہاتھ اس خنجر تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے قریب پہنچتے ہی میرے ہاتھ مفلوج ہو جاتے ہیں اور انگلیوں کی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ میں اس گہرے زخم کا درد برس ہا برس سے برداشت کرتی چلی آ رہی ہوں۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ دیوتاؤں نے اسے یہ سزا کیوں دی ہے۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔

"مجھ سے ایک گھناؤنا جرم' ایک مکروہ گناہ سرزد ہو گیا تھا۔ آج سے سینکڑوں برس پہلے جب میں اپنی بہن سیفو کے پاس اس کے محل میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہی تھی تو مجھے ایک سنگتراش سے محبت ہو گئی۔ یہ سنگ تراش شادی شدہ تھا۔ اس کا ایک ہی اکلوتا بچہ تھا۔ وہ اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا تھا۔ میں نے اس سنگ تراش سے جب شادی کی خواہش کا اظہار کیا تو اس نے کہا کہ وہ اپنے اکلوتے بچے سے بہت پیار کرتا ہے اور اس بچے کی وجہ سے اپنی بیوی سے بھی محبت کرتا ہے اور اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ میری آنکھوں پر خود غرضی نے پردہ ڈال رکھا تھا۔ میں نے ایک روز اس کے اکلوتے بچے کو اکیلا پا کر خنجر سے ہلاک کر ڈالا۔ میرے سنگ تراش محبوب پر اپنے بچے کی موت کا اس قدر گہرا اثر ہوا

کہ وہ ایتھنز چھوڑ کر نہ جانے کہاں نکل گیا۔ ایک رات میں اپنی خواب گاہ میں اپنے ریشمی بستر پر لیٹی تھی۔ میرے ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ میں اسے اپنے ہونٹوں سے لگائے غنودگی کے عالم میں تھی کہ اچانک ایک انسانی ہیولا تیزی سے میری طرف بڑھا۔ میں دہشت سے سن ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں خنجر چمک رہا تھا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے خنجر میرے سینے میں پیوست کر دیا۔ میرے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو میں ایک تاریک قبر میں ' سفید چادر میں لپٹی پڑی تھی۔ خنجر میرے سینے میں پیوست تھا اور درد سے میرا وجود لرز رہا تھا۔ میں نے خنجر کو اپنے سینے سے نکالنے کے لئے ہاتھ اٹھائے تو میرے ہاتھ سینے تک پہنچتے ہی مفلوج ہو گئے۔ میں نے کئی بار یہ کوشش کی مگر ہر بار میرے بازو خنجر کے قریب پہنچتے ہی جیسے پتھر کے بن جاتے۔ درد سے میرا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ مجھے اپنے سرہانے کی جانب قبر میں روشنی نظر آئی۔ یہ ایک شگاف تھا۔ میں اٹھ کر اس شگاف میں سے دوسری طرف آ گئی۔ اب میں اس کمرے میں تھی جہاں تم مجھے اس وقت دیکھ رہے ہو۔ تب سے لے کر آج تک سینکڑوں برس گزر گئے ہیں۔ نہ میرے عذاب میں کمی ہوئی نہ درد کی شدت کم ہوئی اور نہ میں خنجر اپنے سینے سے باہر نکال سکی۔ یہ ہے میری داستان عذاب۔"

میں بت بنا سیفو کی قاتل بہن کی روح کا المیہ سن رہا تھا۔ اس نے ایک گہری آہ بھر کر مجھ سے التجا کی کہ میں اس کے سینے سے خنجر نکال کر اسے اس عذاب سے نجات دلاؤں۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ میں نے اپنا ہاتھ امیلیا کے سینے میں پیوست قدیم یونانی خنجر کے دستے پر رکھا تو مجھے ایک شدید جھٹکا لگا۔ مگر میں نے خنجر باہر کھینچ کر فرش پر پھینک دیا۔ خنجر قالین کے فرش پر گرتے ہی غائب ہو گیا۔ امیلیا نے ایک گہرا پرسکون سانس لیا۔ اس کی روشن آنکھوں میں درد کرب کی جگہ ممنونیت کی جھلک تھی۔ اس کی آواز سنائی دی۔

"عاطون! میرے پاس وقت بہت تھوڑا ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تم سے محبت کرنے والی طرسومہ کہاں ہے۔ سنو' قلعہ شاہی کے جلاد کا نام تم جانتے ہو۔ جلاد اس گروہ کا آدمی ہے۔ جس نے خلیفہ اندلس کو قتل کرنے کی سازش کی تھی۔ اس سازشی ٹولے کا یہ آخری آدمی بچا ہے۔ یہ جلاد تم سے سازش کے پکڑے جانے اور اپنے سرغنہ سلیمان شاہ اور دوسرے ساتھیوں کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ لیکن اس نے کچھ سپاہیوں کی زبانی یہ بات سن رکھی ہے کہ تم کوئی جادوگر ہو۔ تمہارے پاس کوئی ایسی طلسمی طاقت ہے جس کے باعث تم پر تلوار یا بھالے کا وار کارگر نہیں ہوتا۔ اس نے تمہاری چہیتی کنیز طرسومہ کو اس لئے اغوا کر کے تہ خانے میں ڈال رکھا ہے کہ وہ اس سے تمہارے علم اور تمہاری غیبی طاقت کا راز معلوم کر سکے۔ وہ اسے سخت اذیت پہنچا رہا ہے۔ تم اس کی مدد کو پہنچو۔"

امیلیا کی روح کی زبانی طرسومہ کی حالت زار کا سن کر میں بے تاب ہو گیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

"طرسومہ اس وقت قرطبہ کی سرخ چٹانوں کے قدیم قلعے کے تہ خانے میں بند ہے۔ تمہیں بڑی رازداری سے قلعے میں داخل ہونا ہو گا۔ کیونکہ اگر تم اپنی طاقت کے بل بوتے پر وہاں گھسے تو جلاد کے آدمی فوراً طرسومہ کو ہلاک کر دیں گے۔ تمہاری طاقت کے آگے وہ بے بس ہو جائیں گے۔ مگر وہ تمہاری محبوبہ کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اب تم جاؤ۔ طرسومہ اذیت میں بار بار تمہیں پکار رہی ہے۔"

اتنا کہہ کر امیلیا کی روح کا ہیولا ریشمی پردے کے پیچھے چلا گیا۔ دالان کے طاق میں جو شمع دان روشن تھا ایک دم سے بجھ گیا اور کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ میں اب وہاں ایک پل بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ فوراً واپس پلٹا۔ سرنگ میں سے ہوتا ہوا قبرستان میں نکل آیا۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ بادل ابھی تک آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ بارش رک گئی تھی۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا سرخ چٹانوں والے پرانے قلعے کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس قلعے کو جانے والے راستے کا مجھے پتہ تھا۔ کسی زمانے میں یہ قلعہ عبدالرحمان اول نے بنایا تھا۔ مگر بعد کے بادشاہوں نے اسے کسی وجہ سے ترک کر دیا اور اب یہ سنگین جرائم کرنے والوں کی عقوبت گاہ کا کام دیتا تھا۔ مجھے کبھی اس قلعے کے اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن میں نے باہر سے اسے کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ میری بائیں جانب قرطبہ شہر کے بازاروں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ شہر خاموش تھا۔ پہاڑیوں میں تاریکی چھائی تھی اور گہرا سناٹا تھا۔ میں نے ایک پہاڑی نالہ عبور کیا اور اپنا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ میرے پاس اس وقت سوائے کمر کے ساتھ بندھے ہوئے خنجر کے اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ مجھے جذبات کی بجائے عقل مندی اور ہوشیاری سے کام لینے کی اشد ضرورت تھی۔

مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ پرانے قلعے کے اندر جانے کا کوئی خفیہ راستہ بھی ہے یا نہیں لیکن ایسے پراسرار قلعوں کے خفیہ راستے ضرور رکھے جاتے ہیں۔ میں نے بھی کسی ایسے ہی خفیہ راستے کو تلاش کر کے اندر گھسنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ چلتے چلتے آخر مجھے سرخ چٹانوں کے درمیان پرانے قلعے کے برج دکھائی دیئے۔ میں اس کے صدر دروازے کی بجائے اس کے پیچھے کی جانب چل پڑا۔ یہاں پہنچا تو دیکھا کہ پرانے قلعے کی پتھریلی دیوار اوپر اٹھتی چلی گئی تھی۔ اس دیوار پر کمند کی مدد کے بغیر نہیں چڑھا جا سکتا تھا۔ میں نے گھوم پھر کر قلعے کی دیوار کا جائزہ لیا۔ ایک جگہ سے قلعے میں پہاڑی چشمے کا پانی چھوٹی سی ندی کی

شکل میں اندر داخل ہو رہا تھا۔ میں ندی میں اتر گیا۔ پانی میرے گھٹنوں تک تھا۔ جہاں ندی قلعے کے اندر داخل ہوتی تھی۔ وہاں پتھروں کے درمیان فولاد کا مضبوط جنگلہ لگا تھا۔ اس کی فولادی سلاخیں اتنی موٹی اور گتھی ہوئی تھیں کہ دس آدمی مل کر بھی اسے توڑ یا اکھاڑ نہیں سکتے تھے۔ مگر میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ میں نے سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر انہیں مضبوطی سے پکڑا اور پھر زور لگا کر انہیں پہلو کی جانب موڑنے کے لئے دباؤ ڈالنے لگا۔ سلاخیں مڑ گئیں اور وہاں اتنا راستہ بن گیا کہ میں بڑی آسانی سے اس میں سے گزر گیا۔

اب میں قلعے کے نیچے ہی نیچے بہنے والے نالے میں سے گزر رہا تھا۔ یہاں پانی میری گردن تک آ گیا تھا۔ پانی کا بہاؤ پیچھے کی طرف سے تیز تھا مگر اس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میں دونوں ہاتھ نالے کی چھت سے لگائے آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس پانی کی سرنگ میں گھپ اندھیرا تھا۔ پانی کی یہ سرنگ قلعے میں ایک جگہ درختوں میں نکل آئی۔ میں ندی سے نکل کر کنارے پر آ گیا اور جلدی سے درختوں کے پیچھے چھپ کر اس جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ درختوں کے عقب میں چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ اس تاریکی میں مجھے شمال کی جانب ایک جگہ شمع کی دھیمی روشنی نظر آئی۔ خدا جانے یہاں کیا تھا۔ بہرحال مجھے وہاں پہنچ کر ہی کچھ معلوم کرنا تھا۔ میں نے اپنے لبادے کو نچوڑا اور اندھیرے میں اس سمت چل پڑا جدھر سے روشنی آ رہی تھی۔ میں درختوں کی اوٹ لیتا' پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ مجھے یہ بھی اطمینان تھا کہ میرا لبادہ سیاہ تھا۔ مجھے رات کے اندھیرے میں دور سے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس وقت رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ روشنی ایک کوٹھری کے طاق میں سے نکل رہی تھی۔ اب مجھے اندر سے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ کوٹھری کے اردگرد کوئی درخت نہیں تھا۔ دیوار کے ساتھ جھاڑیاں ضرور اگی ہوئی تھیں۔ طاق کوٹھری کے بند دروازے کے پہلو والی دیوار میں تھا۔

میں جھک کر بڑی احتیاط سے چلتا ہوا طاق کے نیچے جھاڑیوں میں پہنچ گیا۔ میرا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا تو پتھر اپنی جگہ سے لڑھک کر ایک دوسرے پتھر سے جا ٹکرایا۔ اس سے آواز پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی نے کہا۔ "دیکھو وہی خنزیر کہیں پھر نہ آ گیا ہو' اسے مار ڈالو۔"

میں نے تیزی سے اپنے آپ کو جھاڑیوں میں چھپا لیا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں بھاگ کر سامنے والے درختوں میں چلا جاتا۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا اور ایک نیزہ بردار سپاہی

جس نے پرانے قلعے کے محافظوں کا لباس پہن رکھا تھا باہر نکلا اور سیدھا اس طرف آ گیا جہاں میں جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ یہ اس شخص کی خوش قسمتی تھی کہ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ہی رہا۔ ورنہ میرے ہاتھوں اس کی موت یقینی تھی۔ اس نے جھاڑیوں میں نیزہ چلانا اور فرضی خنزیر کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ وہیں دو چار جھاڑیوں میں نیزہ مارنے کے بعد جب وہاں سے کچھ بھی برآمد نہ ہوا تو واپس کوٹھری میں چلا گیا۔

"پھر بھاگ گیا۔ اب کے آیا تو اس کا کام تمام کر ڈالوں گا۔" اس نے اندر جاتے ہی اپنے ساتھی سے کہا۔ میں نے آہستہ سے اپنا سر اونچا کیا۔ میرے سر کے بالکل اوپر وہ طاق تھا جس کی سلاخوں میں سے شمع کی دھیمی دھیمی سی روشنی باہر آ رہی تھی۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی آنکھیں طاق کی سلاخوں کے ساتھ لگا دیں۔ کوٹھری میں ایک گول میز کے سامنے ایک سیاہ فام حبشی تلوار میز پر رکھے مشروب سے دل بہلا رہا تھا۔ اس کے سامنے طشت میں پکائے ہوئے پرندے کے گوشت کی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ کونے میں شمع روشن تھی۔ حبشی کا ساتھی' نیزہ میز سے لگا کر ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا اور مشروب پینے لگا۔ حبشی نے ترنگ میں آ کر اپنی گردن کو لہرایا اور بولا۔ "اس شاہی رقاصہ کا تو رقص ہونا چاہئے تھا مگر آقائے شرطوم اسے اذیت دے رہا ہے۔ وہ اس سے کیا معلوم کرنا چاہتا ہے؟"

اس کا ساتھی بولا۔ "کوئی خفیہ راز معلوم کرنا چاہتا ہو گا۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔ لگتا ہے وہ اسے مار کر ہی دم لے گا۔ وہ اسے ہمارے حوالے کیوں نہیں کر دیتا۔"

حبشی میز پر مکا مار کر غرایا۔ "تم کون ہو اس حسین رقاصہ کو اپنے پاس رکھنے والے؟" پھر سر پیچھے ڈال کر بولا۔ "لیکن وہ ہماری قسمت میں نہیں ہے۔ ایک مدت کے بعد ایک حسین عورت اس منحوس قلعے میں آئی تھی وہ بھی ظالم شرطوم کے ہتھے چڑھ گئی۔"

شرطوم' اسی جلاد کا نام تھا۔ جس کے قبضے میں طرسومہ تھی۔ یہ دونوں محافظ طرسومہ کی ہی بات کر رہے تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ جلاد شرطوم طرسومہ پر کس لئے ظلم ڈھا رہا ہے لیکن میں جانتا تھا۔ اب مجھے یہ اطلاع چاہئے تھی کہ اس تہ خانے کو کونسا راستہ جاتا ہے جہاں شرطوم طرسومہ کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہا ہے۔ ان دونوں کی گفتگو سے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قلعے کے جلاد شرطوم نے طرسومہ کو زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور سوائے ان دونوں محافظوں کے اس منحوس قلعے میں اور کسی کو خبر نہیں ہے کہ طرسومہ اس جگہ قید ہے گویا یہ دونوں محافظ بھی شرطوم کے رازدار تھے لیکن طرسومہ کے اغوا کی حد تک۔ اس راز کو یہ محافظ بھی نہیں جانتے تھے کہ جلاد شرطوم' طرسومہ کو اذیت دے کر اس سے میری خفیہ یا غیبی طاقت کا اسرار معلوم کرنا چاہتا ہے۔

مجھے وہاں طاق کی سلاخوں کے پیچھے جھاڑیوں کے اندھیرے میں کھڑے کھڑے خاصا وقت گزر گیا مگر ان کی باتوں سے یہ پتہ نہ چل سکا کہ طرسومہ کس تہ خانے میں بند ہے اور اس تہ خانے کو کون سا راستہ جاتا ہے؟ میری بائیں جانب چٹانوں کے دامن میں پرانے قلعے کی ڈراؤنی عمارت کھڑی تھی مگر میں کوئی غیر ذمہ دارانہ قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ مبادا طرسومہ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ میں زیادہ دیر وہاں کھڑا ہی نہیں رہ سکتا تھا۔ میں واپس جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ حبشی نے دونوں ٹانگیں میز پر پھیلاتے ہوئے طشت کو نیچے پھینک دیا اور اپنے ساتھی سے بولا۔

"رقاصہ کے تہ خانے میں جا کر دیکھو۔ اگر جلاد شرطوم اپنے کمرے میں بدمست ہو کر سو چکا ہو تو مجھے خبر دو۔ ہم رقاصہ کا رقص دیکھیں گے۔"

ساتھی محافظ سپاہی بولا۔ "مگر رقاصہ کے پاؤں میں زنجیر پڑی ہے۔"

"ہم زنجیر تھوڑی دیر کے لئے اتار دیں گے۔ تم جاؤ اور اعتراض مت کرو۔ جاؤ۔"

محافظ سپاہی نے باہر کا رخ کیا تو میں جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گیا۔ میرا مسئلہ بہت حد تک حل ہو گیا تھا۔ محافظ سپاہی کو طرسومہ کے تہ خانے میں جانے کا حکم صد تھا۔ جونہی محافظ سپاہی کوٹھری سے نکل کر قلعے کی عمارت کی طرف بڑھا میں نے اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ اس شخص کا پیچھا کرنے سے مجھے کم از کم یہ ضرور معلوم ہو سکتا تھا کہ طرسومہ کس جگہ پر قید و بند کی صعوبتیں سہہ رہی ہے۔ محافظ سپاہی بلوط کے درختوں کے بیچ میں سے ہوتے ہوئے ایک ویران راستے پر آگے جا رہا تھا۔ میں کچھ فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ پرانے بوسیدہ قلعے کا ایک بے ڈھنگا سا بڑا دروازہ تھا جو بند تھا اور باہر کوئی پہرے دار بھی نہیں تھا۔ یہاں دیوار کے طاق میں کوئی مشعل بھی نہیں جل رہی تھی۔ محافظ سپاہی قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ ایک جگہ رک گیا۔ میں بھی ایک مٹی کے تودے کی اوٹ میں چھپ کر اس کی حرکات کا جائزہ لینے لگا۔ اندھیرے میں مجھے عام انسانوں سے زیادہ نظر آ رہا تھا۔ یہاں پتھروں کے درمیان ایک چھوٹا سا طاق بنا ہوا تھا۔ محافظ سپاہی اس طاق میں داخل ہو گیا۔ میں نے تھوڑا سا توقف کیا اور پھر تودے کے پیچھے سے نکل کر طاق کے پاس آ گیا۔ یہ تنگ راستہ پتھر کی دو بڑی سلوں کو کھسکا کر بنایا گیا تھا۔ اس کی دوسری جانب اندھیرا تھا۔ میں بھی طاق میں اتر گیا۔ میرے پاؤں زینے کے پتھر پر پڑے۔ زینہ نیچے جانے کی بجائے دیوار کے پہلو کی طرف ڈھلائی شکل میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ نصف دائرے کا چکر کاٹ کر زینہ ایک دروازے کے آگے جا کر ختم ہو گیا۔ یہ دروازہ لوہے کی سلاخوں کا تھا اور اندر کی جانب کھٹکا لگا تھا۔ محافظ سپاہی اس کھٹکے کو جاتے ہوئے

بند کر گیا تھا۔

میں نے سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر کھٹکا کھول دیا۔ عام طور پر یہاں تالا لگایا جاتا ہو گا۔ آگے پھر ایک اندھیری راہ داری آ گئی۔ میں بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ راہ داری میں ایک جگہ سے روشنی آتی دکھائی دی۔ میں قریب گیا تو دیکھا کہ ایک تہ خانے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہے۔ اندر موم بتی روشن ہے اور محافظ سپاہی فرش پر جھکا ایک عورت کو ہوش میں لانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ وہ بول بھی رہا تھا۔ "ہوش میں آؤ' ہم تمہارا رقص دیکھیں گے۔" یہ طرسومہ تھی۔ میں نے موم بتی کی روشنی میں اسے پہچان لیا تھا۔ سپاہی کا نیزہ اس کے قریب ہی فرش پر پڑا تھا۔ یہ بڑا نادر موقع تھا۔ میں نے باہر کھڑے کھڑے دیوار کے ساتھ لگ کر پاؤں سے کھٹ کھٹ کی تو محافظ سپاہی نے چونک کر آواز دی۔

"کون ہے؟"

میں خاموش کھڑا سپاہی کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ دوسری بار پاؤں کے کھٹ کھٹ کرنے سے سپاہی نیزہ ہاتھ میں لئے تہ خانے کی کوٹھری سے باہر نکلا ہی تھا کہ میں نے اسے وہیں دبوچ لیا۔ وہ پوری طرح میری گرفت میں تھا اور میں نے اس کا منہ بند کر رکھا تھا تاکہ وہ آواز دے کر کسی کو اپنی مدد کے لئے نہ بلا سکے۔ میرا شکنجہ اس قدر مضبوط اور ناقابل شکست تھا کہ محافظ سپاہی کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ جب وہ بے ہوش ہو گیا تو میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کی مشکیں کسیں اور کوٹھری میں کھینچ کر کونے میں ڈال دیا۔ اب میں طرسومہ کی طرف بڑھا۔ وہ نیم بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے جلدی جلدی اس کے پاؤں کی زنجیر جو آدھی کھل چکی تھی اس کے پاؤں سے اتار دی اور اسے ہوش میں لانے کی ترکیبیں کرنے لگا۔ طرسومہ کا جسم ٹھنڈا تھا اور آنکھوں کے قریب رخسار پر زخم کا نشان تھا جس میں سے خون رس رس کر جم گیا تھا۔

میں نے اسے آہستہ آہستہ آوازیں دیں تو وہ ہوش میں آ گئی۔ موم بتی کی روشنی میں میری صورت دیکھ کر وہ رونے لگی۔ میں نے اسے تسلی دی اور ساری صورت حال سے باخبر کیا۔ طرسومہ کے جسم میں ایک نئی طاقت آ گئی۔ وہ اٹھ بیٹھی مگر کمزوری کے باعث وہ لڑکھڑا سی گئی۔ میں نے اسے سہارا دے کر تہ خانے کی کوٹھری سے باہر نکالا۔ ہم تاریک راہ داری سے گزرنے لگے۔ ابھی میں دیوار سے ملحق زینے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ اوپر سے ایک بھاری بھرکم آدمی کو اترتے دیکھا۔ جس کی کمر کے ساتھ تلوار لٹک رہی تھی۔ میں نے

اسے پہچان لیا۔ یہ شرطوم جلاد تھا۔ طرسومہ کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی کہ خاموش رہے۔ شرطوم جلاد ایک جنگلی بھینسے کی طرح زینے پر پاؤں جماتا نیچے اتر رہا تھا۔ وہ آخری زینے پر تھا کہ طرسومہ کے حلق سے ایک ہلکی سی ہچکی نکل گئی۔ اس آواز کے ساتھ ہی شرطوم جلاد کے قدم وہیں رک گئے۔ اس نے تلوار کھینچ لی اور گرجا۔

"کون ہے؟"

تہ خانے کا دروازہ چونکہ ہم کھلا چھوڑ آئے تھے اس کی وجہ سے اندر جلتی موم بتی کی روشنی راہ داری میں آ رہی تھی۔ شرطوم جلاد تلوار سونتے جونہی آگے بڑھا اس کی نظر ہم پر پڑی۔ رقاصہ طرسومہ کو میرے پہلو میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے بے دریغ تلوار لہرا کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ تلوار کا وار میں نے اپنی تلوار پر لیا۔ شرطوم جلاد نے ایک دہشت ناک چیخ مار کر کسی کا نام لیا۔ شاید وہ کسی کو اپنی مدد کے لئے بلانا چاہتا تھا۔ ہماری تلوار زنی شروع ہو گئی۔ شرطوم اک ماہر تلوار باز تھا۔ مجھے اس کی زیادہ مشق نہیں تھی۔ میں اس کا ہر وار ناکام بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شرطوم نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں ہے۔ ورنہ وہ میری غیبی طاقت سے دب کر وار کرتا۔ میں اس سے زیادہ دیر تک الجھے رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے اس کے وار کی پروا کئے بغیر اپنی تلوار کا وار اس کی گردن پر بائیں جانب مارا۔ اس کی تلوار کا وار میرے کاندھے پر پڑا اور تلوار اچٹ گئی لیکن میرے وار نے اس کی آدھی گردن کو کاٹ ڈالا۔ خون فوارے کی طرح اس کی گردن سے چھوٹ پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر ایک طرف جھک گیا۔ اس جلاد نے نہ جانے کتنے لوگوں کے سر قلم کئے تھے میرے دوسرے وار نے اس کی گردن اڑا کر رکھ دی۔

طرسومہ خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ میں نے اس کا بازو پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا زینہ چڑھنے لگا۔ دیوار کے شگاف میں سے باہر آ کر طرسومہ نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"وہ.....وہ لوگ یہاں بھی ہوں گے۔"

میں نے اسے چپ رہنے کی ہدایت کی اور بلوط کے درختوں کی تاریکی میں قلعے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ کیونکہ طرسومہ کو میں نہر کے پانی میں سے گزار کر باہر نہیں نکالنا چاہتا تھا۔ قلعے کی دیوار کا یہ دروازہ اس کوٹھری کے عقب میں پندرہ بیس قدموں کے فاصلے پر تھا۔ جس کے اندر حبشی محافظ بیٹھا اپنے ساتھی کے واپس آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں اس کوٹھری سے ہٹ کر قلعے کی دیوار کی جانب چلنے لگا۔ کوٹھری کے طاق میں سے شمع کی

روشنی اسی طرح باہر آ رہی تھی۔

رات گہری تاریک تھی۔ ہم مہندی کی جھاڑیوں میں سے گزر رہے تھے۔ سامنے قلعے کی دیوار کا دروازہ آ گیا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے طرسومہ کو جھاڑیوں میں چھپے رہنے کی ہدایت کی اور خود دروازے کے قریب آ گیا۔ یہاں ایک چھوٹی سی ڈیوڑھی بنی تھی جہاں دو سپاہی گہری نیند سو رہے تھے۔ دروازے کے چھوٹے طاق پر تالا پڑا تھا۔

مجھے اب رازداری سے کام لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ تلوار لے کر میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے دونوں پہریداروں کو جگا دیا اور کہا۔

"میں عبداللہ! امیر دربار ہوں۔ دروازہ کھولو۔ میں شاہی رقاصہ کو نکال کر ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

لیکن سپاہیوں نے تلواریں کھینچ لیں اور حملہ کر دیا۔ تھوڑے سے مقابلے کے بعد ایک سپاہی تو فرار ہو گیا اور دوسرا زخمی ہو کر زمین پر گر پڑا۔ میں نے طرسومہ کو آواز دی۔ وہ جھاڑیوں میں سے نکل کر میرے پاس آ گئی۔ میں نے تلوار کے ایک ہی وار سے طاق کا تالا توڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس منحوس قلعے سے نکل کر سرو اور کھجوروں کے درختوں سے ہوتے ہوئے اپنے محل کی طرف جا رہے تھے۔

خلیفہ مسترشد بغاوت فرو کرنے کے بعد واپس آیا تو اسے میری زبانی یہ سن کر اطمینان ہوا کہ آخری سازشی شرطوم جلاد کو بھی میں نے اس کے راستے سے ہمیشہ کے لئے ہٹا دیا ہے۔ مگر خود سلطان اندلس اور اس کے شاہی خاندان والوں نے اپنے راستے میں جو کانٹے بکھیرنے شروع کر دیئے تھے ان کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ یہ مسلمانوں کی ایک زریں تاریخ کے زوال کا عبرت ناک باب تھا۔ جس کے تاریک الفاظ میری آنکھوں کے سامنے رقم ہو رہے تھے۔

طرسومہ کو شاہی محل میں چھوڑ کر میں ایک بادبانی جہاز میں سوار ہوا اور شمالی افریقہ کے ملکوں میں جا پہنچا۔ پھر میں وسطی افریقہ کے ایک شہر میں آ کر طبابت کا دھندا کرنے لگا۔ یوں تین چار شہروں میں گھوم پھر کر دھندا کرتے مجھے کئی برس گزر گئے۔ اس دوران میں مجھے خبر ملی کہ اندلس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا ہے اور مسلمانوں کو اس سرزمین سے نکال دیا گیا ہے جہاں انہوں نے سات سو برس تک علم و حکمت کی شمع روشن کر رکھی تھی۔ بنو سراج کے شہزادوں کو قتل کیا گیا اور آخری مسلمان تاجدار باب عادل اپنی والدہ کے ساتھ بڑی مشکل سے جان بچا کر ہسپانیہ سے فرار ہو سکا۔ اس کی والدہ کے منہ سے نکلا ہوا سبق آموز اور عبرت انگیز جملہ بھی افریقہ کی فضاؤں میں مجھ تک پہنچ گیا جو مسلم ہسپانیہ کی تاریخ

کا سب سے الم انگیز جملہ ہے۔ کہتے ہیں کہ جب باب العادل نے افریقہ کی طرف فرار ہوتے ہوئے جبل الطارق کی پہاڑیوں سے آخری بار اندلس کے میدانوں' کھجور کے جھنڈوں اور بلوط کے درختوں پر نگاہ ڈالی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ماں نے کہا۔

"جس ملک کو تم مردانہ وار لڑ کر بچا نہیں سکے اس کی بربادی پر عورتوں کی طرح آنسو مت بہاؤ۔"

اس کے بعد وہ دونوں گھوڑوں پر سوار پہاڑی سے اتر کر سمندر کی طرف چلے گئے جہاں ایک جہاز انہیں شمالی افریقہ کی طرف لے جانے کو تیار کھڑا تھا۔ یوں مسجد قرطبہ کے مینار اور گنبد اور غرناطہ کے الحمرا کے سرو وصنوبر اس آخری مسلمان بادشاہ کی نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئے۔ ہسپانیہ کے مسلمان بادشاہوں کا بھی وہی انجام ہوا جو عباسی خلفاؤں کا ہوا تھا۔ آخری اندلسی سلطان کا خاندان تیونس کے قرب وجوار میں آباد ہو گیا۔ انہوں نے پرانے قرطاضبہ کے کھنڈروں میں ایک ایسا شہر آباد کیا جو اپنے قوانین کی سختی' رواداری اور مسلمانوں کی روائتی سخاوت ' خوش اخلاقی کے لئے موری افریقہ میں امتیازی شان رکھتا تھا۔

قرطاضبہ میں پہنچ کر مجھے ایک طبیب کی زبانی معلوم ہوا کہ آخری مسلمان اندلسی سلطان کا بیٹا بنو حمید عرق گلاب کشید کرنے میں ماہر ہے۔ مگر یہ اس کا شوق تھا کاروبار نہیں تھا۔ اس کا اپنا گلاب کے پھولوں کا بہت بڑا باغ تھا۔ جہاں کئی غلام کام کرتے تھے۔ میرا دل اس اندلسی شہزادے سے ملنے کو چاہا اور میں اس کا پتہ تلاش کرتا اس کے گلاب کے پھولوں کے باغ میں پہنچ گیا۔

بنو حمید اپنے باغ میں ایک عالی شان آرام دہ کرسی پر بیٹھا بلوریں ظروف میں پڑے عرق کو جانچ رہا تھا۔ وہ حبشی غلام اور ایک بوڑھا شخص اس کے قریب ادب سے کھڑے تھے۔ میں نے جھک کر سلام کیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ بنو حمید کی پیشانی سے جرات ' دلیری اور کشادہ دلی ہویدا تھی۔ اس کے شانے چوڑے اور آنکھیں قدیم مسلمان مور شہزادوں کی طرح ہلکی نیلی تھیں۔ اس نے خالص ہسپانوی لہجے میں عربی بولتے ہوئے بوڑھے بزرگ کو کچھ ہدایات دیں اور وہ عرق کی صراحی لے کر تعظیم بجا لانے کے بعد چلا گیا۔ اب بنو حمید نے اپنی ہلکی نیلی شاہانہ آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پوچھا کہ میں اس سے کیوں ملنا چاہتا تھا اور کہاں سے آیا ہوں؟ میں نے آداب شاہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا کہ میرا نام عبداللہ ہے۔ میں مصر کا رہنے والا نوجوان ہوں۔ جڑی بوٹیوں کی پہچان رکھتا ہوں

اور اس کی خدمت میں رہ کر اپنی روزی کمانا چاہتا ہوں۔ بنو حمید مجھ سے کمال خوش اخلاقی سے پیش آیا اور مجھے اپنی معمل گاہ میں اسی وقت ملازم رکھ لیا۔ معمل گاہ جہاں جڑی بوٹیوں کی جانچ پڑتال ہوتی اور انہیں صاف کرنے کے بعد تھیلوں میں بند کیا جاتا تھا بنو حمید کی عالی شان حویلی میں ہی تھی۔ میں نے وہاں کام شروع کر دیا۔ بنو حمید سے میری ملاقات بہت کم ہوتی تھی' لیکن اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جڑی بوٹیوں کے بارے میں میرا علم بہت وسیع اور قدیم ہے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ شاہی خاندان کی ایک خاتون پر فالج کا حملہ ہوا اور اس کی ایک ٹانگ اور بازو مفلوج ہو کر رہ گیا۔ بنو حمید کے خاندانی معالج نے کئی ایک بوٹیوں سے دوائیاں تیار کر کے آزمائیں مگر خاتون کو کوئی افاقہ نہ ہوا۔ جب یہ بات مجھ تک پہنچی تو میں نے بنو حمید کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ جنتال نام کی ایک بوٹی اگر مل جائے تو مریضہ کا علاج ہو سکتا ہے۔ بنو حمید نے پوچھا کہ یہ بوٹی کہاں مل سکے گی۔ میں نے کہا کہ سب سے پہلے مجھے جڑی بوٹیوں کے گودام کی پڑتال کرنی ہو گی۔ اگر ہمارے پاس یہاں موجود نہ ہوئی تو پھر اسے جنگل میں جا کر تلاش کروں گا۔ بنو حمید نے مجھے ساتھ لیا اور ہم حویلی کے گودام میں آ گئے جہاں جڑی بوٹیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اتفاق سے میری نظر پہلے ہی ڈھیر پر پڑی تو مجھے وہاں جنتال بوٹی نظر آ گئی۔ میں نے اسے اٹھا کر بنو حمید سے کہا۔

"شہزادے صاحب! یہی وہ گوہر مقصود ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔"

بنو حمید نے تعجب سے بوٹی کو دیکھا۔ "مگر یہ تو ہم نے بے کار سمجھ کر یہاں پھینک رکھی ہے اور ہمارے شاہی معالج نے بھی اسے کوئی اہمیت نہ دی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"حضور مریضہ کو انشاء اللہ اسی بوٹی سے شفا ملے گی۔"

میں نے بوٹی کو پیس کا اس کا عرق کشید کیا اور مریضہ کو اس کے چار چار قطرے دو دو گھنٹے بعد پلانے شروع کر دیئے چوبیس گھنٹوں کے بعد مریضہ پر فالج کا اثر بالکل ختم ہو چکا تھا۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں کام کرنے لگے تھے۔ اس واقعے کے بعد بنو حمید کی مجھ سے دوستی ہو گئی۔ وہ زیادہ وقت مجھے اپنے ساتھ رکھنے لگا۔ میں بھی نوجوان تھا۔ اس کا بھی عالم شباب تھا۔ وہ میری زیرکی اور ذہانت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ جڑی بوٹیوں اور علم کیمیا کے علاوہ بعض نجی معاملات میں بھی مجھ سے مشورہ لینے لگا۔ میں نے ابھی اپنی فرض شناسی' خلوص اور احساس ذمہ داری سے اس کے دل میں اپنے لئے مزید جگہ بنا لی۔ ابھی تک اس پر میری خفیہ طاقتوں کا راز نہیں کھلا تھا۔ اس کا موقع بھی نہیں آیا تھا اور میری ایسی کوئی خواہش بھی نہیں تھی کہ میں اس پر اپنی خفیہ طاقتوں کا خواہ مخواہ انکشاف کروں۔

بنو حمید کی ذات میں حسن و احسان، شجاعت وبردباری، فیاضی اور دریا دلی کی وہ اعلیٰ صفات موجود تھیں جنہوں نے اس کے آباؤ اجداد کا نام روشن کیا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اکثر وہ ایک دم جیسے اداس ہو جاتا تھا۔ پھر وہ دیر تک ٹکٹکی باندھے ایک سمت تکتا رہتا۔ میں اس کے کافی قریب ہو چکا تھا اور اس کے مزاج میں بھی مجھے ایک حد تک دخل حاصل تھا۔ ایک روز میں نے بنو حمید سے اس کے اچانک اداس ہو جانے کی وجہ دریافت کی تو وہ آہ بھر کر بولا۔

"عبداللہ! میں تمہیں اپنا دوست ہی نہیں ہم راز بھی سمجھتا ہوں۔ میرا باپ اندلس کا آخری بادشاہ تھا۔ میں نے قرطبہ کے شاہی محلات میں پرورش پائی ہے۔ مجھے وہ محلات مسجد قرطبہ اور الحمرا کے شاہ نشین آج تک نہیں بھولے۔ جی چاہتا ہے کہ ایک بار اپنے آباؤ اجداد کے وطن جاؤں اور ان مقدس مقامات کی ایک بار پھر زیارت کروں۔"

میں نے عرض کی۔ "محترم شہزادے! ہسپانیہ پر عیسائیوں کی حکومت ہے۔ انہوں نے کسی ایک مسلمان کو اس سرزمین پر باقی نہیں چھوڑا۔ وہ مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ آپ وہاں کیسے جا سکتے ہیں۔" بنو حمید نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش رہا۔ پھر اٹھ کر ہاتھ پشت پر رکھے حویلی کے اندر چلا گیا۔

کچھ دنوں بعد ایک روز میں معمل گاہ میں جڑی بوٹیوں کا تجزیہ کر رہا تھا کہ غلام نے آکر کہا کہ شہزادہ بنو حمید نے مجھے یاد کیا ہے۔

شہزادہ بنو حمید سیاہ گلاب کے باغ کے ایک کنج راحت میں مسند نشیں تھا۔ دو سوڈانی کنیزیں اسے پنکھا جھل رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس نے کنیزوں کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔ جب ہم تنہا رہ گئے تو بنو حمید نے مجھے اپنے پاس مسند پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پاس ادب کی خاطر میں ذرا ہچکچایا تو بنو حمید نے اصرار کر کے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس کے خوب صورت چہرے پر اداسی کے ساتھ ساتھ گہری سوچ کا تاثر تھا۔ اس کے ہاتھ میں اندلس کا سیاہ گلاب تھا جس کی پنکھڑی پر وہ اپنی انگلی پھیر رہا تھا۔ گہری پر سکون آواز میں میری طرف دیکھے بغیر بولا۔

"عبداللہ! کل رات میں نے خواب میں اپنے دادا بنو سراج کی قبر دیکھی۔ الحمرا کے شاہی قبرستان میں اس کی قبر ویران تھی۔ اس کا چراغ غائب تھا اور مرمریں پتھر اکھاڑ لیا گیا تھا۔"

میں سمجھ گیا کہ شہزادے پر اس کے آباؤ اجداد کے وطن کی یاد نے پھر حملہ کر دیا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا اس نے اپنی ہلکی نیلی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑیں اور کہا۔

"عبداللہ! میں اپنے اجداد کی قبریں اور محلات کی زیارت کو اندلس جا رہا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟"

میں شہزادے کا منہ تکنے لگا۔ اس نے کہا۔ "میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ ہم قرطاجنہ کے عیسائی سیاح بن کر جائیں گے۔ کسی کو ہم پر شک نہیں ہو گا۔ میرا دل اپنے بچھڑے ہوئے وطن کی زیارت کو تڑپ رہا ہے۔ میں اپنے دادا کی قبر پر چراغ روشن کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں میرے ماموں اور پھوپھا خاندان کی بڑی خوش اسلوبی سے نگہداشت کر سکتے ہیں۔ بولو کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟ میں چاہتا ہوں کہ ماضی کے اس دلگداز سفر میں تم میرا ساتھ دو۔"

میں خود اس دیار غربت کی زیارت کرنے کا خواہش مند تھا لیکن مجھے شہزادے کی طرف سے خطرہ لاحق تھا کہ اگر وہاں کسی نے اسے پہچان لیا تو اس کا زندہ بچنا مشکل ہو گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کی میری معیت میں کوئی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ ہر وقت میرے ساتھ نہیں رہے گا۔ اگر وہ اکیلا کسی طرف نکل گیا اور کسی نے اسے پہچان لیا تو اسے فوراً" قتل کر دیا جائے گا۔ اگرچہ جب وہ اندلس کے شاہی محل میں تھا تو سات آٹھ برس کا تھا۔ پھر بھی دشمنوں کی سرزمین میں اس کی جان کو قدم قدم پر خطرہ تھا۔ میں نے شہزادے کو اس خطرناک سفر سے روکنے کی کوشش کی تو اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا کہ اگر میں اس کے ساتھ نہ بھی گیا تو بھی وہ اپنے ماضی کے کھنڈروں کی زیارت کو ضرور جائے گا۔ میں نے اس کے ساتھ جانے کی ہامی بھر لی۔ بنو حمید نے مسکرا کر میرا ہتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولا۔

"عبداللہ! تم میرے دوست ہو۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔"

بنو حمید نے مشہور کر دیا کہ وہ کچھ مال لے کر ملک ایران کی طرف جا رہا ہے تاکہ وہاں خود جا کر اپنے مال کی کھپت کا جائزہ لے۔ چنانچہ ایک روز ہم نے تھوڑا سا مال باندھ کر اونٹوں پر لادا اور ایک قافلے کے ساتھ تیونس کی طرف روانہ ہو گئے۔ تیونس پہنچ کر ہم نے سارا مال وہیں اونے پونے بیچ ڈالا۔ تیونس میں عیسائی بھی رہتے تھے۔ ہم نے وہاں اپنا حلیہ ور لباس عیسائی سیاحوں جیسا اختیار کیا اور ایک روز تیونس کی بندرگاہ سے ایک فونیقی بادبانی جہاز میں سوار ہو کر ہسپانیہ کی بندرگاہ طریفہ کی طرف چل پڑے۔ اس زمانے میں فونیقی جہاز روم کے سمندر میں مسافر برداری کے لئے خاصی شہرت رکھتے تھے۔ یہ تیز رفتار ہوتے تھے۔ جس فونیقی جہاز پر ہم سفر کر رہے تھے اس کے بادبانوں کا رنگ عنابی تھا۔ یہ

آج سے تین چار ہزار سال پہلے بھی فونیقیوں کا قومی رنگ ہوا کرتا تھا۔ یہ بادبان نیلے آسمان کے پس منظر میں کسی عظیم الجثہ عقاب کے پروں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ ہماری منزل غرناطہ اور پھر قرطبہ تھی۔ غرناطہ اور قرطبہ سبک رو دریاؤں، مسجد قرطبہ کے سرخ ستونوں اور الحمرا کے سرخ چوکور میناروں اور سیاہ گلابوں کی سرزمین ہے جہاں بنو حمید کے آباؤ اجداد کی قبریں تھیں اور جنہوں نے آٹھ سو برس تک ہسپانیہ میں حکومت کی تھی۔ اس بادبانی جہاز پر سوار ہوتے ہوئے ہم نے اپنے آپ کو عیسائی طبیب سیاح ظاہر کیا تھا جو سیاحت کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کے ہسپانیہ میں جڑی بوٹیوں کی کھوج میں جا رہے تھے۔ کیونکہ ہسپانیہ میں کسی مسلمان کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بنو حمید شاہی خاندان کا چشم وچراغ تھا۔ اور اس نے قرطبہ کے قصر خلافت میں عربی کے ساتھ ساتھ قدیم لاطینی زبان کی بھی تعلیم حاصل کی تھی اور اسے انجیل مقدس کی آیات زبانی یاد تھیں۔ ہم پر کسی نے شک نہ کیا اور ہم جہاز پر سوار ہو گئے۔

میں عرشے پر زیتون کے تیل کے بڑے بڑے رسوں سے بندھے ہوئے کپوں سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ بنو حمید دونوں ہاتھ جنگلے پر رکھے سمندر کی لہروں کا نظارہ کر رہا تھا۔

سات دن کے سمندری سفر کے بعد ہمارا جہاز ہسپانیہ کی پہلی بندرگاہ طریفہ کے ساحل کے ساتھ جا کر لگ گیا۔ کبھی حاکم افریقہ موسیٰ بن نصیر کی ہدایت پر طرفہ بن مالک پانچ سو مسلمان مجاہدین کا بیڑا لے کر اس ساحل پر اترا تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک ہسپانیہ کی اس جنوبی بندرگاہ کو طریفہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ میں بھی آج سے دو سو برس پہلے سمندر میں تیرتا ہوا اس بندرگاہ کے کنارے آن لگا تھا۔ طریفہ بندرگاہ پر ہر طرف غیر مسلم تھے۔ آس پاس آج سے دو سو برس پہلے مسلمانوں نے جو مسجدیں بنوائی تھیں وہ غائب تھیں۔ ان کی جگہ گرجا گھروں کی عمارتیں کھڑی تھیں۔ ہم بھی عیسائی تاجروں کے لباس میں تھے۔ ہم پر کسی نے شک نہ کیا ہماری اگلی منزل غرناطہ تھی۔

طریفہ سے ہم نے ایک قافلہ پکڑا اور مالقہ آ گئے۔ یہاں دو روز کارواں سرائے میں آرام کیا۔ یہاں سے پھر ایک قافلے میں شریک ہو گئے یہ قافلہ غرناطہ جا رہا تھا۔ مالقہ سے غرناطہ بذریعہ کارواں تین روز کی مسافت پر تھا۔ دو روز ویران صحرائی علاقوں سے گزرتے رہے۔ تیسرے روز غرناطہ کے قرب وجوار کی سرسبزوشاداب وادیاں اور پہاڑیاں شروع ہو گئیں۔ ہم اس علاقے میں سے گزر رہے تھے جو کبھی بنو سراج کے جنگجو بہادر مجاہدین کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونجا کرتا تھا۔ قافلے کے آگے آگے ایک ہسپانوی عیسائی راہ نما تھا۔ جس کی اونٹنی کے گلے میں گھنٹیاں بندھی تھیں۔ رات کی خاموشی میں ان گھنٹیوں کی مترنم آواز ماضی کے تاریک ایوانوں سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ بنو حمید اونٹنی پر سوار میرے پہلو میں سفر کر رہا تھا۔ اس نے کھجور اور سرو کے درختوں کے جھنڈ کو دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"عبداللہ! یہ پیڑ میرے آباؤ اجداد نے لگائے تھے۔" اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

غرناطہ کی وادی میں پہنچتے ہی ہمیں دور سے الحمرا کے سرخ رنگ کے مربع برجوں کی چوٹیاں نیلگوں آسمان کے پس منظر میں نظر آئیں۔ یہ قلعہ جسے عرب قلعۃ الاالحمرا بھی کہا کرتے تھے، برف پوش چوٹیوں کے نیچے غرناطہ شہر کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر واقع تھا۔ بنو حمید کے دل پر گویا ایک چوٹ سی لگی۔ اس نے رقت آمیز آواز میں آہستہ سے کہا۔

"عبداللہ! اس الحمرا کی شاہی بارہ دری میں میرے دادا مجھے پاس بٹھا کر اولین مجاہدوں کے بہادری کے کارنامے سنایا کرتے تھے۔"

ہمارے قافلے کو پہاڑوں کا ایک پورا چکر لگا کر شہر فصیل کے دروازے میں سے داخل ہونا تھا۔ دن ڈھل رہا تھا اور ہمارا قافلہ آہستہ آہستہ پہاڑوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اب ہم پہاڑوں کی اوٹ میں آ گئے اور قصر الحمرا ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا اور ہم غرناطہ کے کھیتوں میں سے گزر رہے تھے۔ غرناطہ کا شہر سیرا نوار کے دامن میں دو پہاڑیوں کے اوپر واقع ہے۔ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان ایک گہری وادی ہے۔ پہاڑیوں کے نشیب میں اور وادی کی گہرائیوں میں مکانات بنے ہوئے ہیں۔ یوں شہر کی شکل وصورت ایک کٹی ہوئی ناشپاتی کی طرح ہو گئی ہے۔ پہاڑیوں کے دامن میں دو دریا بہتے ہیں۔ ایک کا نام جنیل اور دوسرے کا نام ڈورو ہے۔ جنیل سنہری ریت پر مچلتا ہوا بہتا ہے اور ڈورو کا راستہ سفید براق ریت میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ آگے جا کر دونوں دریا ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور دغا کے میدان میں ایک ہی دریا بن جاتے ہیں۔ یہ میدان غرناطہ سے صاف نظر آتا ہے۔ اور انجیر، انگور، ناشپاتی سنگروں اور شہتوت کے باغات سے اٹا پڑا ہے۔ اس میدان کو خوبصورت پہاڑوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ جب سیاح اس جگہ قدم رکھتا ہے تو اس پر وجد کا سا عالم طاری ہو جاتا ہے اور اسے ایک پل کے لئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ جنت ارضی کے دامن میں آ گیا ہے۔

قافلہ غرناطہ کے شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ رات ہم نے کارواں سرائے میں گزاری۔ وہاں کسی کو خبر نہیں تھی کہ اس وقت اندلس کے آخری مسلمان تاجدار باب العادل کا بیٹا بنو حمید ان کے قریب ہی کارواں سرائے کے فرش پر بوریا بچھائے ایک عیسائی سیاح کے

بھیس میں گمنامی کے عالم میں پڑا ہے۔

★

اس کے بعد عاطون کا تیسرا حصہ
"ہڑپہ کی ناگن"
کا مطالعہ کریں

ہڑپہ کی ناگن
اے حمید

"پہلی محبت کے آنسو"

کیا سچی محبت کرنے والے مرنے کے بعد ہی ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں؟
اس نے کہا تھا کہ میں موت کے بعد ہی تمہارا انتظار کروں گا۔ تم موت کے دروازے سے گذر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے پاس آ جاؤ گی۔ دونوں ایک دوسرے کو جنون کی حد تک محبت کرتے تھے دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان زندگی کا سمندر حائل تھا۔

وہ ایک دوسرے کی سرگوشیاں سن لیتے تھے مگر ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتے تھے انہیں موت کا انتظار تھا۔

سچی اور پاکیزہ محبت کی ایک انوکھی داستان جسے اے حمید کے رومان پرور قلم نے لکھا۔

اندلس گم گشتہ کی آخری نشانی ابن حمید ' کارواں سرائے کے فرش پر گہری نیند سو رہا تھا۔ اسی سرزمین میں اس کے آباؤ اجداد بھی اپنی قبروں میں گہری نیند سو رہے تھے۔ مجھے رات گئے تک نیند نہ آئی کارواں سرائے کے وسیع صحن میں جھانکڑوں کا الاؤ روشن تھا۔ کچھ قرطاجنی مسافر گوسفندی کھالوں پر نیم دراز مشروبات اور تلخ قہوے سے دل بہلا رہے تھے۔ اونٹ ' گھوڑے اور خچر کجالوں میں سوکھی گھاس چر رہے تھے الاؤ کے پاس بیٹھے خوشیتی اور ہسپانوی بوڑھوں کے چہروں کی جھریاں چمک رہی تھیں۔ کارواں سرائے کی چھت کے نیچے خراسانی ایرانی' شامی اور ہسپانوی اور یہودی اپنی توشکوں پر لیٹے ہیں ہانک رہے تھے۔ وہ راستے کی سردی اور تھکان جھیلنے کے بعد آرام حاصل کرنے پر بے حد خوش تھے۔

اچانک کسی مطرب خوشنوا نے بربط پر ایک عربی گیت چھیڑ دیا۔ مطرب کی سوزوگداز والی آواز نے آدھی رات کی خاموش فضا میں مزید سوزوالم بھر دیا۔ اس گیت میں ایک عرب شہسوار اپنی محبوبہ کی یاد میں نوحہ کناں تھا۔

رات گئے مجھے بھی نیند آ گئی۔ صبح صبح بیدار ہو کر ہم خچروں پر سوار ہوئے اور اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر ٹیلوں اور میدانوں میں سفر کرنے کے بعد سورج طلوع ہو گیا اور ہم نے دور غرناطہ کے ... مکانوں کی چوٹیاں دیکھیں۔ جن کی سفید دیواریں اور سرخ ڈھلانی چھتیں اولین سنہری دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا میں سرو کے درخت دھیرے دھیرے جھول رہے تھے۔ موسم سرد تھا اور ہم نے چمڑے کے نیچے کوٹ پہن رکھے تھے۔

غرناطہ شہر کے مکانوں کو دیکھ کر ابن حمید کے ہونٹوں سے بے اختیار آہ نکل گئی۔ وہ بے تاب ہو کر خچر سے اتر آیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ لئے اور غرناطہ کے مقدس شہر پر نظریں جمائے خاموش کھڑا رہا۔ ابن حمید اپنے آباؤ اجداد کے وطن کی درد انگیز

یادوں میں کھو گیا تھا۔ ایک ہسپانوی بوڑھا گدھے پر سوار قریب سے گزرا تو ابن حمید نے اسے روک کر پوچھا۔

"اے بزرگ! خدا تمہارا بھلا کرے کیونکہ جس روز تم پیدا ہوئے تھے سمندر میں سکون تھا اور آسمان پر ہلال چمک رہا تھا۔ مجھے یہ بتا کہ سامنے جو مینار ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں کیسے ہیں؟"

ہسپانوی بوڑھے نے جواب دیا کہ "یہ الحمرا کے مینار ہیں۔" ابن حمید کے چہرے پر ایک الم انگیز سکوت چھا گیا۔ اس نے پہاڑی پر بنے ہوئے قلعے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ "یہ قلعہ کون سا ہے؟" بوڑھے ہسپانوی نے کہا۔ "یہ غناریف کا قلعہ کہلاتا ہے۔ اسی قلعہ میں حنا کا ایک شاہی باغ ہے جہاں کہتے ہیں ابن سراج اور سلطانہ فہمیدہ کی داستان محبت رسوا ہوئی۔ اس کے پرے العبقین ہے اور اس کے نزدیک ہی مقبرہ احمر ہے۔"

میں خوب محسوس کر رہا تھا کہ ہسپانوی بوڑھے کا ہر لفظ نشتر بن کر ابن حمید کے دل میں پیوست ہو رہا ہے۔ یہ قسمت کا کس قدر ظالمانہ عمل تھا کہ اسے اپنے آباؤ اجداد کی یادگاروں کے نام ایک اجنبی سے دریافت کرنا پڑ رہے تھے۔ ابن حمید نے پوچھا۔ "کیا سلطانہ کو ابن سراج سے محبت تھی؟"

ہسپانوی بوڑھا بولا۔ "ان کی محبت کو چاند اور سمندر کی محبت سے ملانا ایک ہلکی بات ہے۔ کہتے ہیں سلطانہ ہر روز علی الصباح نیند سے بیدار ہو کر آنکھیں بند کر لیتی اور صرف اس وقت کھولتی جب اسے یقین ہو جاتا کہ ابن سراج اس کے سامنے موجود ہے۔"

سلطانہ نے عظیم الشان بے مثال محبت کا ثبوت دیا۔ لیکن افسوس کہ لوگوں نے ان دونوں کو اس قدر بدنام کر دیا کہ آخر سلطانہ کو خودکشی کرنا پڑی کہتے ہیں کہ سلطانہ محل کی دیوار سے کود گئی تھی اور اس کی لاش حنا کے باغ میں ملی مگر شاہی تاریخوں میں سلطانہ کی موت کو طبعی موت سے تعبیر کیا گیا ہے آپ کا کیا خیال ہے جناب؟"

ہسپانوی بوڑھے نے ابن حمید سے پوچھا۔ ابن حمید غرناطہ کی جانب چہرہ اٹھائے الحمرا کے سرخ میناروں کو دیکھنے میں محو تھا۔ وہ محض اس غرض سے ہسپانوی بوڑھے کو باتوں میں لگائے ہوئے تھا کہ وہ ایک جگہ کھڑے ہو کر اپنے مقدس اور بچھڑے ہوئے وطن کی زیارت کر سکے۔ جی بھر کر آنسو بہا سکے۔ ہسپانوی بوڑھے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"خدا کی مرضی پوری ہوئی اور مسلمانوں کو اندلس چھوڑ کر اس طرح جانا پڑا کہ اب یہاں ان مسلمانوں کی یادگاروں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔"

ہسپانوی بوڑھے نے صلیب کا نشان بنایا اور گدھے کو ہانکتا ہوا آگے نکل گیا۔ ابن

حمید کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "میرے دوست! خدا کی یہی مرضی تھی کہ میں اپنے دادا بنو سراج کی قبر پر چراغ جلانے یہاں ماضی کے کھنڈروں میں آؤں۔"

میں نے ابن حمید کو کچھ نہ کہا کیونکہ تاریخ کے اوراق میرے سامنے رقم ہوئے تھے۔ میں نے ان گنت سلطنتوں اور شاہی محلات کو وقت کی آندھیوں میں زمین بوس ہوتے دیکھا تھا۔

ہم آگے چل پڑے ہم صنوبر کے ایک درخت کے پاس سے گزرے جس کے بارے میں وہاں ایک تختی پر لکھا تھا کہ یہ درخت ابو موسیٰ اور غرناطہ کے آخری تاجدار کی جنگ دیکھ چکا ہے۔ ہم نے سرسبز ٹیلے کا چکر کاٹا الویرا کے دروازے سے غرناطہ کے شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ شہر کے بازار آرائش اور رونق میں اپنی مثال آپ تھے۔ اگرچہ شہنشاہوں کے زوال کے بعد کا اثر نمایاں تھا۔ مسجدوں کے مینار اور گنبدوں کے وہ کلس جو کبھی سورج کی روشنی میں دمک رہے ہوتے تھے۔ اب بجھے بجھے سے دکھائی دے رہے تھے۔ کئی مسجدوں اور شاہی عمارتوں کے دروازوں پر سے سونے کے زیورات اور بیش قیمت دھاتوں کو اکھیڑ لیا گیا تھا۔ دیدہ زیب تالابوں میں بنے ہوئے سنگ مرمر اور سنگ سیاہ کے تخت ویران ہو گئے تھے۔ ان کی محرابوں پر جڑے ہوئے انمول ہیرے موتیوں کی جگہ سیاہ سوراخ اندھی آنکھوں کی طرح سیاحوں کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

شہر کے شاہی باغ کے صدر دروازے پر دو ہسپانوی پہرے دار نیزے لئے کھڑے تھے اور ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے ہماری طرف بھی تیز نگاہیں ڈالیں اور پھر اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ ہمارا حلیہ عیسائی سیاحوں جیسا تھا۔ یہ شہر ابن حمید کے مسلمان آباؤاجداد نے آباد کیا تھا۔ اس کی فصیل دیواروں، دروازوں، محرابوں، بارہ دریوں، جالی دار جھروکوں اور قلعے کی مہیب دیواروں کی ایک ایک اینٹ، ایک ایک پتھر پر سے مسلمانوں کے فن تعمیر اور ان کی محنت اور جانکاہی کا جلال ٹپک رہا تھا۔ بازاروں میں دورویہ دکانیں مال سے بھری ہوئی تھیں اور وہاں خرید و فروخت کرنے والوں کا ہجوم تھا۔

منڈی میں ایک طرف تربوزوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ ایک ہسپانوی لڑکا خنجر سے انہیں چیر چیر کر گاہکوں کو دکھا رہا تھا۔

اب ہم خچروں سے اتر پڑے اور بازار میں پیدل چلنے لگے۔ اگرچہ ابن حمید کے کپڑے ایک عام سیاح جیسے تھے لیکن اس کے چہرے سے شاہانہ جلال ٹپک رہا تھا اور لوگ اس کی پروقار چال اور چہرے کے جلال سے متاثر ہو کر راستہ چھوڑ کر پرے ہٹ جاتے

تھے۔ کئی ایک نے اسے عیسائی انداز میں سلام بھی کیا۔

میں جانتا تھا کہ ابن حمید ایک ذی وقار اور اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ وہ گھر سے میرے ساتھ ایک انتہائی خطرناک مہم پر نکلا تھا۔ وہ کفار کے ملک میں تھا۔ جو اس کے آباؤاجداد کے خون سے ہاتھ رنگ چکے تھے اور اب ہر مسلمان کے خون کے پیاسے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ابن حمید کی رگوں میں شرافت اور عالی نسبی کا پاکیزہ خون گردش کر رہا تھا۔

ہم اپنے خچر کی لگامیں تھامے پرہجوم بازار میں سے گزرتے چلے گئے۔ اور پھر اس پہاڑی دامن میں پہنچ گئے جہاں غرناطہ کے شاہی محلات اور الحمرا کو راستہ جاتا تھا۔ یہاں قلعے کے صدر دروازے پر فرانسیسی عیسائی پہریداروں کا ایک دستہ موجود تھا۔ ہر سیاح کی تلاشی لی جا رہی تھی۔

میں نے ابن حمید کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ اس نے کہا۔ ”ہم یہودی سیاح بن کر قلعہ میں داخل ہوں گے۔“

”میں نے کہا۔“ میرے آقا! ہم یہودی دین سے واقف نہیں ہیں۔ ہم پر جرح کی گئی تو راز کھل جانے کا اندیشہ ہے۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ ہم مسلمان ہیں اور آپ اندلس کے آخری تاجدار کے بیٹے ہیں تو آپ کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔“

ابن حمید سوچ میں پڑ گیا۔ میرا ذہن بھی اس مشکل کو حل کرنے کے لئے تیزی سے سوچ رہا تھا۔ ایک منصوبہ میرے ذہن میں آگیا میں نے ابن حمید کو ساتھ لیا اور ہم واپس کارواں سرائے میں آ گئے۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ غرناطہ شہر کے کسی بااثر سوداگر کی وساطت سے غرناطہ کے شاہی قلعے اور محلات میں داخل ہوا جائے۔ ابن حمید نے میرے اس منصوبے سے اتفاق کیا۔ میں نے اس مقصد کے لئے غرناطہ کے بڑے بازار کی منڈی میں گھوم پھر کر ایک بوڑھے اور وجیہہ سوداگر کا انتخاب کیا۔ جس کی دکان بازار میں سب سے بڑی تھی۔ اور دکان میں مصری ایرانی قالینوں اور حلب کے نوادرات کا انبار لگا تھا۔ اس کی دکان کی پیشانی پر عربی اور ہسپانوی زبان میں اس کا نام لکھا تھا۔ اس کا نام البطری تھا اور دکان کی محراب پر چاندی کی صلیب نصب تھی۔ اس عیسائی سوداگر کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ میں اس پر اپنی محیرالعقول طاقت کا اثر جماؤں۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

سوچی سمجھی ترکیب کے مطابق میں دوسرے روز صبح صبح ہی کارواں سرائے سے نکل کر غرناطہ کے قرب وجوار کے ایک جنگل میں آ گیا۔ یہاں تھوڑی سی تلاس کے بعد مجھے

ناگ پھنی کی بوٹی مل گئی۔ اس بوٹی میں اگر جوارش کی سیندوری بوٹی کاست شامل کر دیا جائے۔ تو یہ سانپ کاٹے کے لئے زبردست تریاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ جوارش کی سیندوری بوٹی میرے پاس تھیلے میں موجود تھی۔

اب مجھے کسی زہریلے سانپ کی تلاش تھی۔ سردی کی وجہ سے سانپ اکثر اپنے بلوں میں گھسے رہتے ہیں۔ ایک بل میں میں نے درخت کی ٹہنی ڈال کر زور زور سے ہلائی تو اندر سے سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ میں نے سانپ کو اس قدر تنگ کیا کہ وہ تڑپ کر پھنکارتا ہوا اپنے بل سے باہر آ گیا۔ وہ سخت غصے کی حالت میں تھا اور اپنا پھن اٹھائے میری طرف قہر آلود نگاہوں سے تک رہا تھا۔ یہ بالشت بھر کا سبز سانپ تھا مگر شکل سے ہی بڑا زہریلا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے گردن سے پکڑا تو اس نے مجھے کلائی پر ڈس لیا۔ مگر اس کا زہر مجھ پر کوئی اثر نہیں کر سکتا تھا۔ سانپ کو گردن سے پکڑ کر میں نے تھیلی میں ڈال کر اس کا منہ بند کر دیا اور وہاں سے سیدھا غرناطہ کے بڑے بازار میں آ گیا۔ عیسائی سوداگر البطری کی دکان کے قریب جا کر میں نے دیکھا کہ وہ باہر تخت پر قالین بچھائے تکئے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اور وحشی غلام اس کی خدمت میں لگے تھے۔ ایک سولہ سترہ سال کا لڑکا جو شکل وصورت سے البطری کا بیٹا لگتا تھا۔ گاہکوں کو قالین دکھا رہا تھا۔

میں واپس کارواں سرائے میں آ گیا اور ابن حمید کو بتایا کہ میں نے سانپ پکڑ لیا ہے۔ اور عیسائی سوداگر کو بھی دیکھ آیا ہوں۔ وہ اپنی دکان پر موجود ہے۔ اس کا لڑکا بھی وہی ہے۔ ابن حمید نے پہلی بار میرے منصوبے کو غیر انسانی قرار دیتے ہوئے اس پر نکتہ چینی کی۔

”میرے دوست !! اگر تمہاری بوٹی بے اثر ہوئی تو ناحق ایک نوجوان کی جان ضائع ہو جائے گی۔ یہ مجھے گوارا نہیں۔“

میں نے اسے یقین دلایا کہ جڑی بوٹیوں کے بارے میں میرا تجربہ لامحدود ہے اور ہماری اسکیم ناکام نہیں ہو گی۔ میں نے ناگ پھنی اور جوارش کی سیندوری بوٹیوں کے ست کو ملا کر ایک عرق تیار کر کے اس کو چھوٹی چمڑے کی شیشی میں بھرا اور اپنی مہم پر نکل کھڑا ہوا۔ عیسائی سوداگر اسی طرح تخت پر بیٹھا دو گاہکوں سے لین دین کر رہا تھا۔ سولہ سترہ برس کا نوجوان جو اس کا بیٹا لگتا تھا دکان کے اندر گاہکوں کو تازہ مال دکھا رہا تھا۔

میں نے جاتے ہی عیسائی انداز میں سلام کیا اور کچھ مصری نوادرات خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ عیسائی سوداگر بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا اور اپنے غلام کو اشارہ کیا کہ مجھے دکان کے اندر لے جا کر مصری نودرات دکھائے۔ دکان کافی بڑی تھی۔ پیچھے مال

کے انبار لگے تھے۔ نوجوان لڑکا ایک جانب پرچھتی کے نیچے لکڑی کی کرسی پر بیٹھا اپنے گاہکوں کو ریشمی کپڑے کے تھان کھول کھول کر دکھا رہا تھا۔

میں نے حبشی سے پوچھا کہ یہ لڑکا غلام ہے؟ حبشی نے کہا کہ یہ ہمارے آقا کا اکلوتا بیٹا ذکاریا ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی میں یہی چاہتا تھا۔ حبشی مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔ جو مصری نوادرات سے بھرا ہوا تھا۔ بظاہر میں ان نوادرات کو دیکھ رہا تھا لیکن میری توجہ عیسائی سوداگر کے اکلوتے بیٹے ذکاریا کی طرف تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں روشنی زیادہ نہیں تھی۔ میں نے حبشی غلام کو ایک ایسا فانوس لانے کو کہا کہ جو وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک طرف لٹک رہا تھا۔ جونہی حبشی غلام ادھر گیا میں نے جھٹ جیب سے تھیلی نکال کر کھولی اور زہریلے سانپ کو گردن سے پکڑ کر اپنی مٹھی میں بند کر لیا۔ حبشی غلام فانوس لے کر آیا تو میں نے یونہی اس میں نقص نکال کر کہا کہ اسے واپس لے جا کر رکھ دیا جائے۔ غلام فانوس واپس لے گیا تو میں کمرے میں سے نکل کر دکان کے دروازے کی طرف بڑھا۔ یہاں بھی نیم تاریکی تھی عیسائی سوداگر کا بیٹا لکڑی کی کرسی پر بیٹھا تھا اور اس کی پشت میری طرف تھی۔

بڑی ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے بڑی چابکدستی اور صفائی سے سانپ کو اس کی کرسی کی پشت پر ڈال دیا۔ میں چند قدم ہی بڑھا ہوں گا کہ پیچھے چیخ کی آواز سنائی دی اور گاہک گھبراہٹ میں باہر کو بھاگے۔ میں بھی دکھاوے کے لئے دوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ "سانپ نے ڈس لیا' سانپ نے ڈس لیا۔" کی آواز سن کر عیسائی سوداگر اندر کو دوڑا۔ اس کا اکلوتا بیٹا فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔ سانپ نے اس کے بازو پر ڈسا تھا۔ لوگوں نے سانپ کو وہیں کچل ڈالا تھا۔

عیسائی سوداگر نے سر پیٹ لیا۔ حبشی غلام طبیب کو بلانے دوڑے میں دیکھ رہا تھا کہ لڑکے کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ میں تیزی سے اس کے پاس گیا ----- اور جیب سے شیشی نکال کر اس کے باپ سے کہا۔

"محترم! آپ پرے ہٹ جائیں۔ میں طبیب تو نہیں ہوں لیکن میرے پاس اتفاق سے سانپ کے کاٹے کی دوا موجود ہے۔ مجھے کوشش کر لینے دیں۔"

عیسائی سوداگر نے میری طرف آبدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔

"یسوع مسیح تجھے جنت میں لے جائے۔ میرے بچے کی ..... جان بچا لے۔"

میں نے شیشی سے تریاق کے قطرے سانپ گزیدہ لڑکے کے بازو پر اس جگہ ٹپکائے جہاں سانپ کے دانتوں کا سرخ نشان تھا۔ دل میں ' میں بھی رب کریم سے دعائیں مانگ رہا

تھا کہ مولا کریم میری لاج رکھ لینا۔ جڑی بوٹی تو محض ایک بہانہ ہے۔ شفا تو تیرے ہاتھ میں ہے۔"

تریاق کے قطرے سانپ کے کاٹے کے نشان پر گرتے ہی جم گئے۔ تریاق اپنا کام کر رہا تھا۔ قطرے سفید تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نسواری اور پھر سیاہ ہو کر پھولنا شروع ہو گئے۔ تریاق سانپ کا سارا زہر جسم سے باہر کھینچ رہا تھا۔ جب دونوں قطرے سیاہ بڑے آلوچے جتنے ہو گئے تو آپ ہی نیچے گر پڑے۔ لڑکے نے آنکھیں کھول دیں۔ تریاق نے سارا زہر چوس لیا تھا۔

عیسائی سوداگر نے میرے دونوں ہاتھ چوم لئے۔

"نیک دل نوجوان! تم مسیحا بن کر میری دکان میں آئے ہو۔ اگر تم نہ ہوتے تو میرا بچہ دوبارہ زندگی حاصل نہ کرتا۔"

"میں نے کہا۔" محترم! زندگی خداوند کریم نے اسے عطا کی ہے۔ ہمیں خدا اور یسوع مسیح کی رحمتوں کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔"

لڑکے کو تخت پر لٹا دیا گیا اور میری ہدایت پر اسے پیاز اور لیموں کا عرق پلایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد لڑکا بھلا چنگا ہو گیا۔ اس کا باپ یعنی عیسائی سوداگر البطری میرا گرویدہ ہو چکا تھا..... اللہ تعالیٰ نے میری عزت رکھ لی تھی۔ اس نے میرے لئے انگور اور انجیریں منگوا کر مجھے پیش کیں اور پوچھا کہ میں کون ہوں اور غرناطہ میں کہاں مقیم ہوں۔

میں نے اسے بتایا کہ میں قرطاجنہ کا رہنے والا ہوں اور **مصری النسل**.... ہوں اور اپنے ایک دوست پطرس کے ساتھ شہر غرناطہ کی سیاحت کو آیا ہوں' مجھے جڑی بوٹیوں کی پہچان ہے اور سفر میں زہریلے کیڑوں سے بچنے کے لئے میں تریاق ضرور اپنے پاس رکھتا ہوں۔

"تمہارا نام کیا ہے میرے بچے؟" سوداگر نے سوال کیا۔

میں ابن حمید کا نام پطرس بتا چکا تھا۔ اپنا نام پال بتا دیا۔ عیسائی سوداگر البطری نے کہا کہ وہ ہمیں کسی حالت میں کارواں سرائے میں نہیں رہنے دے گا۔ اس نے اپنے دو غلام میرے ساتھ کر دئیے اور تاکید کی کہ ہمارا سامان اٹھا کر اس کی حویلی کے خاص مہمان خانے میں پہنچا دیا جائے۔

ابن حمید میری اس کارگزاری پر حیران بھی ہوا اور اس نے خدا کا شکر بھی ادا کیا کہ ایک بے گناہ نوجوان کی جان بچ گئی۔ ہم اسی روز کارواں سرائے سے اٹھ کر عیسائی سوداگر البطری کی عظیم الشان حویلی میں آ گئے۔ ہمیں ایک عالی شان مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔

سوداگر البطری ابن حمید سے مل کر بڑا خوش ہوا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔

"پطرس! تم مجھے یسوع مسیح کے حواریوں میں سے لگتے ہو...... خداوند تم پر مہربان رہے اس حویلی کو اپنا گھر سمجھ کر جب تک دل چاہے یہاں قیام کرو۔ ہماری کنیزیں اور غلام تمہاری خدمت کو ہر وقت حاضر رہیں گے۔"

ہمارے لئے قہوہ منگوایا گیا۔ مشروب کے دو جام پینے کے بعد عیسائی سوداگر نے کہا۔

"آپ قرطاجنہ سے آئے ہیں۔ سنا ہے وہاں اندلس کے شاہی خاندان کے لوگ آباد ہیں اندلس اب ان کے لئے جنہم بن چکا ہے اگر بنو سراج کا کوئی فرد یہاں آجائے تو وہ مجھے اپنے خون کا پیاسا پائے گا۔"

میں نے ابن حمید کی طرف دیکھا جو بنو سراج کے شاہی خانوادے کا آخری چشم وچراغ تھا۔ ابن حمید نے گہری سانس لے کر کہا۔

"محترم! تقدیر میں جو لکھا ہو وہ ہو کر رہتا ہے۔ قرطاجنہ میں اندلس کے مسلمان بادشاہوں کی اولاد عسرت میں زندگی بسر کر رہی ہے۔"

عیسائی سوداگر نے ایک قہقہہ لگایا۔ "خداوند میرا نگہبان ہو۔ اگر بنو سراج کی اولاد عیسائی مذہب بھی اختیار کر لے تو بخدا ہم اس کو زندہ نہیں چھوڑ سکتے۔"

میں نے موضوع بدلنے کی کوشش میں کہا۔ "محترم! آپ کا کبھی قرطاجنہ آنا ہو تو ہمارے ہاں ضرور تشریف لائیے گا۔ پطرس کا وہاں انجیر کا باغ ہے اور میں جڑی بوٹیوں کا دھندا کرتا ہوں۔ ہم غریب لوگ ہیں لیکن آپ کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔"

سوداگر البطری نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور میری طرف احسان مند نظروں سے دیکھنے لگا۔

"میرے بیٹے پال! تمہارا نام بڑا مقدس ہے۔ تم نے میرے اکلوتے بچے زکاریا کی جان بچا کر مجھے ہمیشہ کے لئے خرید لیا ہے۔ میں تمہارے سامنے اپنے آپ کو بہت غریب محسوس کرتا ہوں۔"

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں حرف مطلب زبان پر لایا۔ "ہماری بڑی خواہش ہے کے غرناطہ کے قلعے اور الحمرا کے باغات کی سیر کریں لیکن ہم نے سنا ہے کہ قلعے میں داخل ہونے پر بڑی پابندی ہے۔"

میں نے جان بوجھ کر ایسا کہا تھا۔ عیسائی سوداگر نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میرے لئے کہیں کوئی پابندی نہیں ہے۔ قلعے پر جو پہرے دار دستہ متعین ہے اس کا

سپہ سالار میرا داماد ہے تم جب چاہو میرے ساتھ قلعے کی سیر کر سکتے ہو۔ تمہیں دیکھ کر دروازہ کھول دیا جائے گا۔"

"ابن حمید نے کہا۔" محترم! آپ کا بہت بہت شکریہ لیکن آپ ہمارے ساتھ کہاں تکلیف کریں گے۔ اپنے داماد کے نام پرچہ لکھ دیجئے۔ ہم خود ہی قلعے کی سیر کر آئیں گے۔"

سوداگر البطری داڑھی کھجانے لگا۔ "تم جیسے کہو گے میں ویسے ہی کروں گا۔"

ہمارے لئے مہمان خانے میں الگ الگ خواب گاہوں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ بلکہ وہاں الگ الگ خواب گاہیں تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد ایک کنیز ابن حمید کو اس کی خواب گاہ تک لے گئی اور دوسری کنیز مجھے لے کر میری خواب گاہ کی طرف چلی۔ اس کنیز کا رنگ گہرا سانولا تھا اور چہرہ مہرہ ہندوستانی تھا۔ نقش تیکھے۔ بھویں کھینچی ہوئیں اور سیاہ بالوں کے جوڑے میں سفید گلاب کا پھول لگا تھا۔ ریشمی لباس میں ملبوس وہ شمع دان تھامے خواب ایسے عالم میں میرے آگے آگے غلام گردش میں چل رہی تھی۔

خواب گاہ میں داخل ہو کر اس نے شمع دان کارنس پر رکھ دیا اور میرا بستر ٹھیک کر کے بولی۔ "شمع بجھا دوں؟"

میں نے کہا۔ "نہیں شکریہ میں شمع کی روشنی میں سونے کا عادی ہوں۔"

وہ مسکرائی اور واپس جانے لگی تو میں نے پوچھا کہ وہ ہند کی رہنے والی ہے؟ کنیز رک گئی۔ پلٹ کر میری طرف دیکھا اور اپنی پلکیں جھکا کر بولی۔

"تم چہرہ دیکھ کر پہچان لیتے ہو۔ ہاں میں ہند کے ملک اجین کی رہنے والی ہوں۔ جہاں سوتنے کا سفید پھول گلاب جتنا ہوتا ہے اور جس کے مندروں میں مشک و عنبر میں بسی ہوئی دیوداسیاں آدھی رات کو دیوتاؤں کی مورتیوں کے آگے رقص کرتی ہیں۔"

"تمہارا شبھ نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

کنیز نے کہا۔ روشنی! یہی میرا نام ہے۔ میں کالا کنڈ کے مندر میں رقص کیا کرتی تھی کہ ایک رات ڈاکو مجھے اغوا کر کے لئے گئے اور پھر انہوں نے مجھے ساحل کو رومنڈل پر ایک بردہ فروش کے ہاتھ بیچ دیا اور میں سمندروں میں سفر کرتی یہاں پہنچ گئی۔

معلوم ہوتا تھا کہ وہ وہاں بہت خوش تھی اور نیم وا ہونٹوں سے مسکرا رہی تھی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک مقناطیسی کشش تھی جو مجھے سحر زدہ کرتے ہوئے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ یہ کسی ناگن کی آنکھیں تھیں۔ جو اپنے شکار کے خون کی پیاسی تھی میری مافوق الفطرت میری حفاظت کر رہی تھی۔ میں نے شمع کو جلتی رہنے کا اشارہ کیا اور نیند آنے کا بہانہ کیا۔ اور وہ ایک گہرا سانس لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے سانس کی آواز

کسی غصیلی ناگن کی پھنکار سے ملتی جلتی تھی۔ روشنی کے جانے کے بعد میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور شمع بجھا کر سو گیا۔

دن کافی نکل آیا تھا۔ جب میں اٹھ کر ابن حمید کی خواب گاہ میں گیا وہ آبنوسی کاؤچ پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کا چہرہ ہتھیلی پر ٹکا تھا اور گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ رات بھر نہیں سویا۔

"میرے آقا! کیا آپ کو نیند نہیں آئی؟" ابن حمید نے میری طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ اس کی شفاف آنکھوں میں جیسے صدیوں کی بے خوابی جھلک رہی تھی۔ آہستہ سے بولا۔

"رات میں اپنی خواب گاہ میں نہیں تھا۔"

میں حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔ اس کے بعد ابن حمید نے مجھے وہ تمام واقعات سنا دیئے جو اس کے ساتھ پیش آئے تھے۔ اس نے کہا۔

"جب کنیز مجھے میری خواب گاہ میں چھوڑ کر چلی گئی تو میں بستر پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن نیند میری آنکھوں سے جیسے کوسوں دور تھی مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ میں اپنے آباؤاجداد کے بسائے ہوئے شہر میں غریب الوطن مسافر کی طرح پڑا ہوں۔ کمرے کی اونچی لمبی مخروطی کھڑکی کھلی ہوئی تھی جس میں سے غرناطہ کا گہرا نیلا آسمان اور چاندی کے زیروں کی طرح چمکتے ستارے دکھائی دے رہے تھے۔ میں بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ گیا۔ خنک ہوا اندر آ رہی تھی۔ سارا شہر خاموش تھا۔ دور پہاڑی پر درختوں کی اوٹ میں سے الحمرا کے مینار خاموش آسمان کی طرف منہ اٹھائے کھڑے تھے۔ میرا دل غرناطہ کی نیلی رات میں باہر نکلنے کو بے چین ہو گیا۔ میں نے فرغل پہنا اور حویلی سے نکل کر کھلی فضا میں آ گیا۔

"رات کا دوسرا پہر گزر رہا تھا۔ ابھی چوکیداروں نے اپنے شبانہ فرائض کی ابتدا نہیں کی تھی۔ شہر کے گلی کوچوں میں گہرا سناٹا طاری تھا کہیں کہیں چوراہے یا کسی گلی کی نکڑ پر شمع دان دھیمی دھیمی روشنی بکھیر رہے تھے۔

"چلتے چلتے میں سرو سمن کی ایک سایہ دار سڑک سے گزرتا ہوا ایک قدیم عمارت کے قریب نکل آیا۔ اس عمارت سے شکوہ وجلال ٹپک رہا تھا۔ اگرچہ اس کی دیواروں کے پتھروں میں کہیں کہیں گھاس اگ آئی تھی۔ شاید یہ کسی زمانے میں بنو سراج کے بادشاہوں کا کوئی محل تھا۔ جو قلعے کی فصیل کے باہر بنایا گیا تھا۔ ممکن ہے، یہاں بعض ایسی شاہانہ رسوم ادا کی جاتی ہوں کہ جن میں عوام کو بھی شرکت کا موقع دیا جاتا۔

"مجھے دور درختوں کے درمیان ایک چھوٹا سا گنبد جو رات کی ہلکی نیلی روشنی میں طلوع ہوتے سرسبز چاند کی طرح لگ رہا تھا۔ ایک کھڑکی میں سے چراغ کی دھندلی روشنی نکل رہی تھی۔ میرے قدم جیسے اپنے آپ اس گنبد کی طرف اٹھنے لگے۔ قریب جا کر دیکھا کہ پتھر کے پتلے ستونوں کی ایک بارہ دری ہے۔ جس کی ایک جانب سیاہ انگور کی بیلوں نے دیوار سی کھڑی کر رکھی ہے اور دوسری طرف ایک حجرہ ہے جس کی کھڑکی میں سے مدہم سی روشنی باہر آ رہی تھی۔

"میں انگور کی بیلوں کے پاس آ گیا۔ سیاہ انگور کے گچھے شبنم میں بھیگ رہے تھے۔ میں بارہ دری کی سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے میں آ گیا۔ یہاں میری نظر ایک قبر پر پڑی۔ جس کے سرہانے ایک بجھا ہوا چراغ پڑا تھا۔ تعویذ پر گلاب کے مرجھائے ہوئے سرخ پھول بکھرے ہوئے تھے۔ کتبہ آدھے سے زیادہ ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ وہاں صرف کلمہ شریف لکھا ہوا تھا۔ میرے دل میں ایک چوٹ سی لگی۔ یہ کسی مسلمان بزرگ ہستی کی قبر تھی۔ میرے ہاتھ اپنے آپ فاتحہ خوانی کے لئے اٹھ گئے۔ میں نے فاتحہ پڑھ کر منہ پر ہاتھ پھیرا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے آہستہ سے گہری آواز میں کہا۔

"اجنبی مسافر تم مسلمان ہو۔"

آواز کا لہجہ شامی عربوں جیسا تھا اور یہ الفاظ عربی زبان میں ادا کئے گئے تھے۔ ایک لمحے کے لئے جیسے میں اپنی جگہ پر ساکت ہو کر رہ گیا۔ میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سفید ریش نورانی چہرے والا بوڑھا میرے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کے سر پر عمامہ تھا۔ اور گرم چغہ اس کے ٹخنوں کو چھو رہا تھا۔ یہ مسلمان علماء کا لباس تھا۔ میں متعجب ہوا کہ اندلس کی سرزمین پر یہ مسلمان بزرگ کہاں سے آ گیا؟ میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ اگرچہ میرا مسلمان ہونا اس پر آشکار ہو چکا تھا۔ پھر بھی میں خاموش رہا۔

اس بزرگ نے آگے بڑھ کر میرے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے بچے! تم شاید کوئی عرب ہو جو عیسائی سیاح کے بھیس میں اپنے مسلمان بادشاہوں کی آخری یادگاروں پر آنسو بہانے کے لئے یہاں آیا ہے۔ فکر نہ کرو۔ تمہارا راز میرے سینے میں ہی رہے گا۔ اگر میں نے تمہیں فاتحہ پڑھتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں بھی تمہیں کوئی عیسائی ہی سمجھتا۔"

میں نے اس بزرگ کے ہاتھوں کو چوم لیا۔

"میرے بزرگ محترم! آپ پر میرا راز ظاہر ہو چکا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں ایک شامی عرب ہوں اور عیسائی سیاح کا بھیس بدل کر اندلس کے مسلمان

بادشاہوں کی قبروں کی زیارت کرنے آیا ہوں لیکن مجھے حیرانی اس بات کی ہے کہ آپ مسلمان عالم کے حلیئے میں یہاں کس طرح زندہ ہیں۔"

بزرگ نے کچھ توقف کیا پھر آہستہ سے ہاتھ اٹھا کر آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ اور بولے ۔ "میرے بچے! شاید سرزمین اندلس پر میں اس وقت آخری مسلمان ہوں۔ جس کو فرانسیسی اور پرتگالی عیسائیوں نے معاف کر دیا ہے اور میرے بڑھاپے کا خیال کرتے ہوئے مجھے اتنی اجازت دے دی ہے کہ میں اپنی زندگی کے آخری چند سال ان کھنڈروں میں گذار دوں۔ وہ مجھے قتل کرنے آئے تھے۔ لیکن میری بزرگی اور کبیرسنی نے ان کے ہاتھ روک دیئے۔ پھر انہوں نے میری جان بخشی کر دی۔ اور میری خواہش پر مجھے اس قبر کے پاس چھوڑ دیا۔"

وہ مجھے اپنے حجرے میں لے گئے۔ حجرے کے طاق میں ایک دیا روشن تھا۔ تخت پر بستر لگا تھا۔ تپائی پر صراحی اور فنجان پڑے تھے یہاں کی فضا باہر کی نسبت گرم تھی۔ بزرگ نے مجھ سے پوچھا کہ میرا وطن شام ہی ہے؟ شاید وہ میرے عربی لہجے سے پہچان گیا تھا کہ میں شامی عرب نہیں ہوں۔ میں نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ بزرگ نے کہا۔

"تمہارا عربی لہجہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ تم اندلس کے رہنے والے ہو۔"

میرے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی۔ مگر میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور بزرگ کو کہا کہ انہوں نے ٹھیک پہچانا ہے۔ "میرے دادا تیونس کے رہنے والے تھے اور یہاں سوداگری کیا کرتے تھے۔ میں تیونس میں پیدا ہو لیکن ہوش سنبھالا ہی تھا کہ اندلس پر زوال آگیا اور ہم لوگ ہجرت کر کے واپس شام چلے گئے۔ کیونکہ شام ہمارے اجداد کا وطن ہے۔ اب میں جوان ہوا تو میرا دل چاہا کہ اپنے وطن کو دیکھوں کہ جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ ایک مسلمان عرب کی حیثیت سے میں اندلس کی سرزمین میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ناچار اپنے ایک دوست کو ساتھ لیا۔ عیسائی سیاحوں کا بھیس بدلا اور غرناطہ پہنچ گئے۔ آج رات میرا دل بے حد بے چین تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی کہ میں اپنے عیسائی سوداگر میزبان کی حویلی سے نکل کر ادھر آگیا اور یہاں ایک قبر دیکھ کر فاتحہ خوانی کرنے لگا اس کے بعد آپ سے ملاقات ہو گئی۔"

میں نے جھوٹ بولا تھا اور ایک روشن ضمیر نورانی چہرے والے مسلمان بزرگ کی موجودگی میں ضمیر میں خلش محسوس کر رہا تھا اور مجھے شبہ تھا کہ یہ بزرگ عالم دین میرے دل کا حال پا گیا ہو گا اور مجھے ضرور شرمندہ کرے گا کہ میں نے جھوٹ کیوں بولا لیکن بزرگ نے میری بات پر یقین کر لیا؛ شاید یہ اس کی بہت بڑی رواداری اور وسعت قلب کا

ایک اور ثبوت تھا۔ اب میں یہ معلوم کرنے کو بے تاب تھا کہ باہر بارہ دری میں مزار کس کا ہے میں نے پوچھ ہی لیا۔

"شفیق محترم! یہ باہر مزار کیسا ہے؟ کیا یہاں سلاطین اندلس کے شاہی خانوادے میں سے کوئی دفن ہے؟" اس بزرگ کے چہرے کی متانت میں ایک عجیب درد کی کیفیت جھلکنے لگی۔

اس نے کہا ۔ "میرے بچے! تم نے ابھی ابھی جس قبر پر فاتحہ کی ہے وہ ہسپانیہ کے آخری تاجدار باب العادل کی دادی صاحبہ کا مزار ہے۔"

میں اپنا کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ میرے اللہ! تو کیا یہ میری پڑدادی صاحبہ کی قبر تھی؟ میں نے اپنے بچپن میں اس مزار کا کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ آہ! اندلس کے آخری حکمران نشہ اقتدار میں اپنے اسلاف کی قبروں کو بھی فراموش کر بیٹھے تھے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میرے قدم اس بارہ دری کی طرف کیوں اپنے آپ اٹھتے چلے گئے تھے بزرگ کہہ رہا تھا۔

یہاں میرے حجرے کے پاس ایک شاندار عبادت گاہ تھی جو اس بزرگ خاتون نے خاص طور پر بنوائی تھی۔ لیکن مسیحی سرداروں نے اس عبادت گاہ کو ڈھیر کر دیا۔ اس کی روشوں اور فواروں کو روند ڈالا۔ اگر ایک نیک دل مسیحی پادری انہیں منع نہ کرتا تو وہ اس مزار کو بھی تہس نہس کر دیتے' میرے آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ حجرے میں بڑی دلخراش قسم کی خاموشی چھا گئی۔ طاق میں جلتے دیئے کی لو پھڑپھڑائی اور پھر ساکت ہو گئی۔ بزرگ نے ایک آہ سرد کھینچ کر کہا۔

"رات زیادہ ہو گئی ہے۔ تم یہیں سو جاؤ۔ صبح منہ اندھیرے چلے جانا۔"

میں نے بزرگ کا ہاتھ تھام کر ایک بار پھر چوم لیا اور کہا

"میرا ساتھی مجھے حویلی میں نہ پا کر پریشان ہو گا۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔"

"بزرگ نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"اللہ تعالیٰ تمہاری نگہبانی کرے گا۔ لیکن میرے بچے تم زیادہ دیر اس ملک میں مت رہنا۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا کہ تم مسلمان ہو تو تم پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔"

میں نے کہا۔ "آپ میرے راز کی حفاظت کیجئے گا۔ میں انشاء اللہ اپنے بزرگوں کی قبروں کی زیارت کے بعد واپس چلا جاؤں گا۔"

بزرگ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور کلمہ پڑھ کر کہا۔

"تمہارا راز میرے ساتھ قبر میں جائے گا۔"

میں سلام کر کے حجرے سے باہر آ گیا میں نے اپنی پڑدادی کی قبر پر ایک بار پھر فاتحہ پڑھی اور سیاہ انگور کی بیلوں میں سے گذر کر شہر غرناطہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ آدھی رات کا وقت ہو گا کہ شہر کے مغربی کنارے سے رات کو پہرہ دینے والوں کی آوازیں کبھی کبھی صدائے بازگشت کی طرح سنائی دے جاتی تھی' میں غرناطہ کے مشرقی حصے میں نکل آیا' یہاں گلیاں تنگ و تاریک اور گنجان تھیں گلیوں کے فرش پتھریلے تھے اور کسی کسی گلی کی نکڑ پر چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ مکانوں کے منقش چھجے آگے کو جھکے ہوئے تھے۔

غرناطہ کی گلیاں سرد ویران رات میں سنسان پڑی تھیں مکانوں میں چراغ بجھ چکے تھے۔ ایک بار ایک گلی میں مکان کی دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔

جس مکان کی دیواروں پر جنگلی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ یہ کوئی حویلی تھی۔ میں تھک گیا۔ آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں اونگھ ہی رہا تھا کہ اچانک مرغ نے بانگ دے دی پھر دور دور سے مرغوں کی بانگوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں ہوشیار ہو گیا۔ صبح ہو رہی تھی۔ میں اندر گلی میں چلنے ہی کو تھا کہ اچانک اس حویلی کا دروازہ کھلا اور اندر سے ایک خادمہ نکلی' جس نے ہاتھ میں قندیل تھام رکھی تھی' اس کے پیچھے ایک سروقد دوشیزہ برآمد ہوئی' جس نے گاتھک شہزادیوں جیسا بیش قیمت براق ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ چہرے پر سیاہ نقاب اس طرح پڑا تھا کہ باریک جالی میں سے چہرہ چاند کی طرح کرنیں بکھیرتا نظر آ رہا تھا اس کے پیچھے ایک خادمہ تھی جس نے اپنے ہاتھ میں صلیب تھام رکھی تھی' شاید وہ کسی عیسائی سردار کی بیٹی تھی جو صبح صبح گرجا میں مناجات کے لئے جا رہی تھی' میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایسا اتفاق ہوا کہ وہ گلی میں میرے قریب سے ہو کر گزری اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اس وقت تک صبح کا اولین اندھیرا گلی میں پھیل چکا تھا۔

دوشیزہ نے مجھے غور سے دیکھا۔ شاید وہ حیران تھی کہ میں کون ہوں جو اس کی گلی میں صبح صبح دھونی جمائے بیٹھا ہوں وہ چند قدم چل کے رک گئی۔ اس نے اپنی خادمہ سے کچھ کہا۔

ادھیڑ عمر خادمہ میرے قریب آئی اور اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا کر ہسپانوی زبان میں بولی۔ "کیا تم راستہ بھول گئے ہو اجنبی؟"

"میں ہسپانوی زبان جانتا تھا۔ یہ تو میری مادری زبان تھی میں نے عیسائی دوشیزہ کی طرف نظریں اٹھا کر کہا۔

"محترمہ! آپ کا اندازہ صحیح ہے۔ میں قرطاجنہ کا سیاح ہوں اور غرناطہ شہر کی سیر کو نکلا تھا کہ راستہ بھول گیا کیا تم مجھے ان عشق پیچاں کی طرح بل کھاتی گلیوں سے باہر نکلنے کا

راستہ بتا سکتی ہو؟"

یہ کہتا ہوا میں نے خادمہ کو نظرانداز کر دیا اور خود عیسائی دوشیزہ کے قریب چلا گیا' وہ نقاب کے پیچھے مجھے خاموش گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے گلاب کی پنکھڑیوں ایسے ہونٹوں پر ایک دل آویز تبسم نمودار ہوا اور بولی۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

اور میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا میں اس سے بات کرنے کا بہانہ تلاش کر رہا تھا کہ اس نے خود ہی یوں کلام کیا۔

"تمہارے چہرے پر اعلیٰ نسبی کا جلال دکھائی دیتا ہے۔ کیا تمہارا تعلق کیتلمہ کے مور خاندان سے ہے؟"

میں اس حسین و جمیل دوشیزہ کی ذہانت اور قیافہ شناسی پر دنگ رہ گیا۔ یہ بات اس سے پہلے کسی نے مجھے نہیں کہی تھی لیکن میں اپنا راز کسی عیسائی لڑکی کو بھلا کیسے بتا سکتا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خداوند یسوع مسیح تمہاری عمر دراز کرے میں تو قرطاجنہ کا سیاح ہوں اور پطرس میرا نام ہے ہو سکتا ہے کسی زمانے میں میرے آباؤ اجداد میں سے کوئی کیتلمہ آیا ہو۔"

پھر میں نے غرناطہ کی صبح کی تعریف کی اور کہا کہ کیا میں اتنی حسین رہبر کا نام پوچھ سکتا ہوں؟ اپنے حسن کی مدح پر وہ کوئی زیادہ خوش نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے مترنم آواز میں کہا۔

"میرا نام رونا بلانکا ہے۔ مگر مجھے اب بھی یقین ہے کہ تمہارا تعلق کیتلمہ کے اندلسی خانوادے سے ہے۔ میں نے اتنی کشیدہ اور شفاف پیشانی کسی قرطاجنی سیاح کی نہیں دیکھی۔"

یہ عیسائی دوشیزہ غضب کی ذہین تھی۔ میں نے ایک بار پھر اپنے موقف پر مصر ہوتے ہوئے کہا کہ میں قرطاجنہ کا ایک سیاح ہوں اور وہاں تجارت کرتا ہوں۔ گلی ایک طرف گھومی تو سامنے ایک محرابی دروازہ نظر آ گیا۔ رونا بلانکا نے اس دروازے کی جانب اشارہ کر کے کہے۔ "یہ راستہ تمہیں باہر لے جائے گا۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ ذرا سے مسکرا کر واپس مڑ گئی۔ خادمہ صلیب لئے اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

میں کتنی دیر وہاں بت بنا کھڑا اسے صبح کی پاکیزہ روشنی میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے بڑے وقار کے ساتھ واپس جاتے دیکھتا رہا اچانک گرجا گھر کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

میں نے چونک کر اردگرد دیکھا۔ جب میں اس حویلی کی طرف آ رہا تھا کہ میرے دل میں رونا بلانکا کا خیال بارہا اس کی شبیہہ بن کر ابھر رہا تھا۔

ابن حمید خاموش ہو گیا۔ میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ ابن حمید کو اس عیسائی دوشیزہ سے محبت ہو گئی ہے۔ میں نے اس امر کا اظہار کیا کہا ابن حمید نے اپنا تعارف ایک عیسائی سیاح کے طور پر کرایا ہے اور بلانکا کسی عیسائی سردار یعنی ڈان کی بیٹی ہو سکتی ہے۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا عشق پروان چڑھ سکے گا میرے آقا؟"

ابن حمید کے ہونٹوں پر پھیکا سا تبسم نمودار ہوا۔

"تم میرے دوست ہو' میں تمہارا آقا نہیں ہوں سمجھے؟ اور عشق میں عیسائی اور مسلمان میں کوئی فرق نہیں .... بہرحال میں یہاں کسی عیسائی دوشیزہ سے عشق کرنے بھی نہیں آیا۔"

عیسائی دوشیزہ کے حسن دل آرام نے ابن حمید کے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ اب اسے اندلس میں اپنے آباؤ اجداد کے محلات کے کھنڈر بھی خوب صورت نظر آنے لگے تھے۔ شاید اب اس کے دل میں اپنے دادا بنو سراج کی قبر پر دیا جلانے کی خواہش بھی کمزور پڑ گئی تھی اور اس جذبے میں پہلی جیسی شدت نہیں رہی تھی۔

مجھے اس سے زیادہ غرض نہیں تھی کہ ابن حمید اپنے اجداد کی قبروں پر چراغ جلاتا ہے یا نہیں۔ میں تو تاریخ کے صحراؤں میں اپنے نامعلوم سفر پر رواں دواں تھا اور ابن حمید کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ایک عبرت انگیز زوال کی نشانیوں کو دیکھ رہا تھا۔

ہمارے عیسائی میزبان البطری نے ہمارے لئے خاص طور پر الحمرا کی سیاحت کا انتظام کروا دیا۔ میں نے محسوس کیا' کہ ابن حمید ابھی تک عیسائی دوشیزہ کی یاد میں گم تھا' اس دوران وہ بلانکا کی گلی کا ایک چکر بھی لگا چکا تھا۔ مگر اسے اپنی محبوبہ و غم خوار کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دی تھی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے اور الحمرا کی طرف چل پڑے۔ قلعہ غرناطہ کے دروازے پر ہمارے عیسائی میزبان کا خاص آدمی ہمارے خیر مقدم کے لئے پہلے سے موجود تھا ہمارے گھوڑے وہیں ڈیوڑھی میں باندھ دیئے گئے اور ہمارا رہبر ہمیں الحمرا محل کے بائیں باغ کے صدر دروازے پر چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

الحمرا اندلس کے مسلمان شہنشاہوں کا شاہی محل تھا۔ یہاں جا بجا حسین پھولوں بھرے کنج تھے۔ سایہ دار راستے تھے سنگ سرخ کی ایسی روشیں تھیں۔ جن کے دونوں

جانب سرو کے درختوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ ابن حمید ان راستوں کو پہچانتا تھا اس نے کہا۔ "میرے دادا کی قبر اس محل کے عقب والے باغ سمن پوش میں ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

ابن حمید ہی بولا۔ "اس کنج میں میرے دادا بنو سراج کا وہ مزار ہے جس کے بارے میں میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ مزار کا سنگ سرخ اکھڑا ہوا ہے اور قبر کا دیا سیاہ پوش ہے۔"

بنو سراج کی قبر لمبی تھی۔ جس کے سرہانے کی جانب سے سنگ سرخ کی دو سلیں اکھڑ کر نیچے گری پڑی تھیں اور طاق بھی دیا بجھا ہوا تھا۔ ابن حمید کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ابن حمید نے آنکھیں پونچھیں اور طاق کا دیا روشن کر دیا' پھر ہم نے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی اور بوجھل قدموں سے واپس چل پڑے۔ ابن حمید کا دل اکھڑا اکھڑا سا تھا' وہ اپنے اجداد کے ویران محل میں جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا' اس نے مجھے بتایا کہ ان سنسان محلات میں سے اپنے آباؤ اجداد کی روحوں کے بین کرنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

"میرے دوست یہاں سے نکل چلو۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔" ابن حمید کے دل میں جو زبردست انقلاب برپا تھا اس کی وجہ سے اس کے آباؤاجداد کی روحوں کے بین کی آوازیں نہیں تھیں بلکہ وہ عیسائی دوشیزہ تھی جس کی نگاہوں کے تیر اس کے دل میں اتر چکے تھے۔ اس نے بنو سراج کے مقبروں کی تلاش چھوڑ کر عیسائی حسینہ رونا بلانکا کی تلاش شروع کر دی۔ اس تلاش عشق میں میں اس کے ساتھ تھا۔

ابن حمید مجھے لے کر کئی بار عیسائی دوشیزہ کی گلی میں گیا مگر اسے دیدار یار نصیب نہ ہوا۔ میں نے ابن حمید کو سنبھالنے کی کوشش کی کہ وہ آگ سے کھیل رہا ہے۔ اگر عیسائی دوشیزہ کو معلوم ہو گیا کہ وہ اصل میں مسلمان شہزادہ ہے اور اس کا تعلق بنو سراج کے شاہی خاندان سے ہے تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ لیکن ابن حمید پر میری باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا وہ بلانکا کی تلاش میں سرگرداں رہا' کئی بار اس کی حویلی کے آگے سے گذرا مگر ہر بار حویلی کا دروازہ بند ملتا۔

ہم نے کلیساؤں اور مسیحی خانقاہوں کو بھی چھان مارا مگر عیسائی دوشیزہ بلانکا کی دوبارہ جھلک دکھائی نہ دی۔ ابن حمید کی بے تابیوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔

ابن حمید کے لئے اب تنہائی میں کوئی لطف باقی نہ رہا تھا اکیلا رہ کر اسے ایک شدید افسردگی کا احساس ہو تا۔ چنانچہ اب وہ اکثر مجھے ساتھ رکھتا تھا۔ ہم ان روح پرور مقامات سے خاموشی سے گذر رہے تھے کہ سنگترے کے ایک باغ میں سے نکل کر سامنے ایک خوب

صورت مکان نظر آیا۔ جس کی محرابی کھڑکیوں پر گلاب کی بیلیں جھکی ہوئی تھیں۔

ہمیں چھتارے پر ہسپانوی گیت کی آواز سنائی دی۔ کوئی حسینہ اپنی درد بھری مگر دلکش آواز میں ایک قدیم محبت بھرا گیت گا رہی تھی۔ ابن حمید نے کہا۔ "خدا کی قسم اس آواز کو میں نے پہلے بھی سنا ہے۔ میرے ساتھ آؤ یہ بلانکا کی آواز ہے۔" ہم لیموں کے ایک کنج سے ہوتے ہوئے پر فضا مکان کے عقب میں آئے تو دیکھا کہ دو لڑکیاں غروب ہوتے سورج کی سنہری دھوپ میں مخملی گھاس پر نیم دراز ہیں اور ان کے درمیان سنہری تخت پر بیٹھی ایک حسین وجمیل سرخ وسپید چہرے والی لڑکی چھتارا ہاتھ میں لئے اس کے تاروں پر انگلیوں کا مضراب بجاتی گیت گا رہی ہے۔ ابن حمید نے میرے ہاتھ کو زور سے دبایا۔ وہ اپنی پرجوش آواز پر بڑی مشکل سے قابو پاتے ہوئے بولا۔

"یہ وہی حسینہ ہے میرے دوست! رونا بلانکا" اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا تھا۔

عیسائی دوشیزہ ایک قدیم ہسپانوی گیت گا رہی تھی۔ جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

"میرے محبوب! تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔

کیا ہماری سرحدوں پر دشمن نے حملہ کر دیا؟

آہ! تم شاہی محل کی حفاظت کرتے ہوئے مارے جاؤ گے۔ بادشاہ کا محل بھی محفوظ نہ رہے گا۔

میرا گھر بھی اجڑ جائے گا جس کے باغ میں بنفشہ کے پھول ہر موسم بہار میں کھل کر مجھے تمہاری یاد دلائیں گے۔"

بلانکا کی آواز میں بلا کا سوز تھا' جس تخت پر وہ بیٹھی تھی اس کے قریب ہی کچھ خالی کرسیاں پڑی تھیں اور ایک سنگ مرمر کی تپائی پر رکھے گلدان میں سرخ گلاب مسکرا رہے تھے۔ عیسائی دوشیزہ رونا بلانکا نے ایک نیا گیت شروع کر دیا۔ یہ نیا گیت اندلسی مسلمان مور بادشاہوں کے زوال کے بارے میں تھا اس گیت میں ابن حمید کے باپ ابن سراج کا نام کئی بار آیا۔ ابن حمید نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ جذبات کی شدت سے کپکپا رہا تھا اس گیت میں ابن سراج اور زجیریوں کی داستان بیان کی گئی تھی۔ ابن حمید اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ وہ مہندی کی جھاڑیوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے آگے بڑھا۔ لڑکیاں اس کو دیکھ کر خوفزدہ سی ہو گئیں۔ عیسائی دوشیزہ نے ابن حمید کو دیکھ کر چھتارا تخت پر رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات تھے۔ میں ابن حمید کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ ابن حمید نے جھک کر اس دوشیزہ کو سلام کیا اور انتہائی معذرت چاہتے ہوئے بولا۔

"خداوند تمہارے حسن کی آب وتاب کو دوبالا کرے میں وہی سیاح نوجوان پطرس ہوں جس کی تم نے غرناطہ کی گلیوں میں رہنمائی کی تھی۔ تمہاری آواز کا جادو مجھے بے بس کر کے یہاں کھینچ لایا ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔"

رونا بلانکا کے خوب صورت ہونٹوں پر تبسم ابھرا۔ اس نے ابن حمید کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنی سہیلیوں کو وہاں سے جانے کا حکم دیا۔ ابن حمید کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ کہ یہ میرا ساتھی عیسائی سیاح پال ہے۔ بلانکا نے ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی اور کہا۔

"میں تمہیں ایک نیا گیت سناتی ہوں۔"

وہ چھتارے پر اپنی نازک انگلیاں چلاتے ہوئے اپنی دلکش اور دل سوز آواز میں گیت گانے لگی۔

عیسائی دوشیزہ بلانکا کے گیت کی آواز سن کر مکان کے برآمدے میں ایک طویل قامت وجیہہ سردار نمودار ہوا' جس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہو رہے تھے۔ بلانکا نے اس کی طرف دیکھ کر گیت گانا بند کر دیا اور ابن حمید کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"پیارے ابا جان! یہ قرطاجنہ کا سیاح پطرس ہے۔ اسے میری آواز کا جادو یہاں کھینچ لایا ہے اس کے ساتھ اس کا دوست پال بھی ہے۔"

بلانکا کے باپ نے قریب آ کر ہم دونوں پر تیز نگاہیں ڈالیں پھر خندہ پیشانی سے ہمارا خیر مقدم کیا اور ہمارے لئے مشروب منگوایا۔ میں ابن حمید کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا' وہ رونا بلانکا کے حسن پر فدا ہوئے جا رہا تھا لیکن ایک بہادر اور عالی نسب شہزادے کے وقار کے ساتھ۔

اسی وقت سبزے پر اندلسی قالین بچھا دیئے گئے اور گرم قہوے کا دور شروع ہو گیا' ساتھ ہی خادماؤں کی ایک قطار نمودار ہوئی ان کے ہاتھوں میں طشت تھے۔ جن میں سرخ سنگترے اور ملاکہ کی سفید خستہ مٹھائی تھی۔

بلانکا کے والد نواب سانتانی نے کمال خوش اخلاقی سے ہمیں کہا کہ ہم پھر بھی اس کے ہاں آیا کریں' ابن حمید یہی چاہتا تھا' میں دیکھ رہا تھا کہ وہ بے حد خوش ہوا ہے۔

بلانکا ہمیں چھوڑنے پائیں باغ کے دروازے تک آئی۔

ہم زیتون کے گنجان درختوں میں کھڑے تھے۔ ابن حمید اس دوشیزہ کے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔ ابن حمید کی خاموش مگر گہری محبت نے بلانکا کے دل پر بھی اثر کیا تھا' وہ بھی اسے محبت آمیز نظروں سے تک رہی تھی۔

آسمان کے مشرقی افق پر چاند کی نقرئی جالی نمودار ہو گئی۔ مضافاتی مکان کی محرابی کھڑکیوں میں سے شمع کی روشنی باہر درختوں اور گھاس پر پڑنے لگی تھی۔ بلانکا خواب آلود جزیروں کی کوئی شہزادی لگ رہی تھی' میں آگے بڑھ کر زیتون کی جھاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ میں ان دو محبت کرنے والوں کو تنہائی کا موقع دینا چاہتا تھا' میرے جاتے ہی ابن حمید نے بلانکا کا نازک گورا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔

"بلانکا! تمہارے حسن نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ کاش میں ساری زندگی تمہارے مکان کی پراسرار گلیوں میں سیر کروں۔"

کیوپڈ کا تیر بلانکا کے دل سے بھی پار ہو چکا تھا اس نے آہستہ سے مسکرا کر کہا۔

"پطرس! محبت عقل مند لوگوں کا ورثہ نہیں ہے۔ کیا تم نے کبھی اپنے جذبے کے انجام پر غور کیا ہے۔"

میں بلانکا کی فراست کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ ابن حمید جذبات کی تیز رو میں بہا چلا جا رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"اگر محبت کرنے والوں کے دلوں میں سچائی کی شمع روشن ہو تو انجام ایک بے معنی لفظ معلوم ہوتا ہے۔"

ابن حمید نے جنگلی گلاب کی بیل پر سے ایک پھول توڑ کر بلانکا کو پیش کیا اور کہا۔

"یہ پھول ہماری محبت کی پہلی نشانی ہے۔"

"خداوند یسوع! اسے مرجھانے سے بچائیے۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے واپس مڑی اور مکان کی طرف شام کے بڑھتے پھیلتے اندھیروں میں گم ہو گئی۔ میں زیتون کی جھاڑی سے باہر نکل آیا اور ابن حمید سے کہا کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔ ابن حمید ابھی تک ان درختوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جدھر بلانکا گئی تھی۔

ابن حمید پوری طرح بلانکا کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا وہ بھول چکا تھا کہ وہ کیا مقصد لے کر ہسپانیہ میں آیا تھا۔ میں نے اسے واپس قرطاجنہ چلنے کے لئے کہا تو اس نے ترش روئی سے جواب دیا کہ اگر مجھے قرطاجنہ کی یاد ستا رہی ہے تو میں واپس جا سکتا ہوں' میں نے برا نہ مانا' میں ابن حمید کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میں اصل میں کون ہوں اور میرے اندر کون کون سی مافوق الفطرت طاقتیں موجود ہیں۔ لیکن ابن حمید جس خطرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اس سے بخوبی واقف تھا اور اس خطرے میں اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا تاکہ وقت پڑنے پر اس کی مدد کر سکوں۔

بلانکا سے ابن حمید کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم ابھی تک عیسائی سوداگر

البطری کی حویلی میں ہی قیام پذیر تھے لیکن زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں تھا' چنانچہ ایک روز ہم نے اپنے میزبان البطری سے اجازت طلب کی اور اس کی حویلی سے اٹھ کر واپس کارواں سرائے میں آ گئے' ابن حمید کے پاس سونے کی کچھ اشرفیاں تھیں جو ختم ہو گئیں۔ اب میں نے جڑی بوٹیوں کی تلاش اور ان کی فروخت کا کام شروع کر دیا۔ ایک روز میں نے ابن حمید سے کہا۔

"تم آگ سے کھیل رہے ہو میرے آقا! بہتر یہی ہے کہ ہمیں اس وقت اندلس کو خیرباد کہہ کر واپس قرطاجنہ چلے چلنا چاہئے۔"

ابن حمید پر بلانکا کی محبت ایک آسیب بن کر سوار تھی۔ اس نے آخری بار مجھے صاف صاف سخت الفاظ میں کہہ دیا کہ میں اسے چھوڑ کر جا سکتا ہوں اور وہ بلانکا کے بغیر قرطاجنہ میں زندہ نہیں رہ سکے گا۔ میں نے اسے کہا۔ "کیا تم عیسائی مذہب اختیار کر لو گے؟" اس پر وہ تڑپ کر بولا۔

"خدا کی قسم ایسا ہرگز نہیں ہو گا' میں عیسائی مذہب اختیار نہیں کروں گا۔ بلکہ بلانکا اسلام قبول کرے گی۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ یہ بات مجھے انہونی لگی۔ بلانکا جس خاندان سے تعلق رکھتی تھی وہاں اس کا اسلام قبول کرنا۔ ایک ناقابل یقین بات تھی' ابن حمید اس حقیقت سے بھی بے خبر تھا کہ جب بلانکا کو معلوم ہو گا کہ ابن حمید نہ صرف یہ کہ مسلمان ہے۔ بلکہ بنو سراج کا آخری شہزادہ اور الحمرا کی آخری شمع ہے۔ تو اس کا رد عمل کیا ہو گا۔

بہرحال میں نے ابن حمید کی حفاظت کا فیصلہ کر لیا۔

میں سائے کی طرح اس کے ساتھ رہنے لگا۔ جہاں وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا وہاں میں اس کے ساتھ ہوتا لیکن جہاں وہ اکیلا جانا چاہتا وہاں بھی میں اس کے پیچھے پیچھے ہوتا۔

ایک روز دن ڈھلے ابن حمید کارواں سرائے سے نکل کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ مگر میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ بلانکا کے والد کے مضافاتی مکان کی طرف جا رہا تھا' میں کچھ فاصلہ رکھ کر اس کے تعاقب میں تھا' اس سے پہلے ایک ہسپانوی گھڑسوار نے کارواں سرائے میں آ کر ابن حمید کو ایک خط دیا تھا' یقیناً" یہ بلانکا کا ..... خط تھا اس نے اسے اپنے ہاں بلایا تھا۔ میں اپنے دوست کو تنہا کیسے چھوڑ سکتا تھا۔

ابن حمید بلانکا کے باپ کے مضافاتی مکان میں پہنچ گیا باغ کے پیچھے جو مہندی اور

انجیر کی جھاڑیاں تھیں' میں وہاں چھپ کر بیٹھ گیا مکان کے برآمدے کے سامنے تخت اور
آبنوسی کرسیاں بچھی تھیں' بیچ میں آگ کا الاؤ روشن تھا' جس پر ایک غلام سالم ہرن بھون
رہا تھا۔ بلانکا نے آگے بڑھ کر ابن حمید کا خیر مقدم کیا اور اسے اپنے پاس تخت پر بٹھایا' وہ
دونوں راز و نیاز کی باتیں کرنے لگے برآمدے میں کھانسنے کی آواز آئی۔ اور بلانکا کا باپ
نواب سانتانی نمودار ہوا۔

ابن حمید جھک کر آداب بجا لایا۔ بلانکا کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا نواب سانتانی نے
ابن حمید کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا تھپتھپایا اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا' اتنے میں
بلانکا کا بھائی ڈان کارلو بھی آ گیا اس نے جڑاؤ پیش قبض لگا رکھا تھا اور سر پر شکاریوں والی
خوب صورت ہسپانوی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی سرد مہری سے ابن حمید سے ہاتھ
ملایا اور ٹانگیں پھیلا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا' وہ اپنے باپ سے جاگیر کی زمینوں کے بارے
میں باتیں کرنے لگا۔ بلانکا اور ابن حمید اس دوران ایک دوسرے کو دزدیدہ نگاہوں سے
دیکھتے رہے۔

اس عیسائی دوشیزہ بلانکا کے دل میں کیا تھا؟ یہ میں نہیں جانتا لیکن بہت جلد مجھے اس
کا علم ہو گیا۔ رونا بلانکا نے اپنے والد اور بھائی کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا۔

"میرے باپ اور بھائی! خداوند تم پر اپنی مہربانیاں نازل کرے۔ میں نے اپنے جیون
ساتھی کے طور پر اس نوجوان پطرس کا انتخاب کر لیا ہے کیا آپ لوگوں کو اس پر کوئی
اعتراض ہے؟"

محفل میں سناٹا چھا گیا' رونا کا باپ اور بھائی اس کا منہ تکنے لگے۔ ابن حمید خاموش
بیٹھا اپنی زندگی کے اہم ترین فیصلے کا منتظر تھا۔ میں بھی اپنی جگہ ہمہ تن گوش ہو گیا' لگتا تھا
یہ فیصلہ رونا بلانکا اور ابن حمید نے مل کر کیا ہے۔ بلانکا نے اپنے باپ اور بھائی کو خاموش
دیکھا تو بولی۔

"آپ کی خاموشی مجھے اپنے فیصلے پر نظرثانی پر مجبور نہیں کر سکتی۔ لیکن میں آپ کی
رضا مندی کے بغیر بھی کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔"

اب بلانکا کے بھائی ڈان کارلو نے تیز نظروں سے ابن حمید کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"بلانکا! تم ایک شاہی خاندان کی خاتون ہو تم نے جس نوجوان کے ساتھ زندگی
گزارنے کا فیصلہ کیا ہے ہم اس کے حسب و نسب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

بلانکا کے باپ نے ابن حمید کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا۔

"نوجوان پطرس! ہمیں تمہارے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہوا ہے کہ تم

قرطاجنہ کے عیسائی ہو' کیا تم ہمیں اپنے خاندان کے بارے میں کچھ بتاؤ گے؟"

میری نگاہ ابن حمید کے سنجیدہ ذی وقار چہرے پر آ کر رک گئی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ
وہ اپنے خاندان کے بارے میں کہاں تک سچائی سے کام لیتا ہے۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی اور اچانک برآمدے میں ایک بزرگ نمودار ہوا۔ جس
کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے اور لمبے فرغل میں وہ ذرا سا جھک کر چل رہا تھا' بلانکا کے
والد اور بھائی نے اس بزرگ کی طرف عقیدت کے انداز میں دیکھا بلانکا کے باپ نے
بزرگ کو سہارا دے کر کرسی پر بٹھایا بزرگ نے آتے ہی ابن حمید کی طرف اشارہ کر کے
کہا۔

"اس کے خاندان کے بارے میں میں بتاتا ہوں۔"

ابن حمید کے ساتھ میں بھی سکتے میں آ گیا' بلانکا' اس کا باپ اور بھائی اس نووارد
بزرگ کی طرف دیکھنے لگے۔ نواب سانتانی نے کہا۔

"محترم بزرگ! آپ ہمارے خاندان کے قدیم فرد ہیں اور ہمارے لائق صد احترام
۔ کیا آپ اس نوجوان کو جانتے ہیں؟"

بزرگ نے کہا۔ "میں اس نوجوان کو اس وقت سے جانتا ہوں۔ جب یہ الحمراء کے
شاہی محل میں اپنے باپ ابن سراج کے سامنے سونے کی گیند سے کھیلا کرتا تھا۔"

یہ جملے گویا بجلی بن کر محفل میں گرے' ہر کوئی سناٹے میں آ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے تو
کسی میں بولنے کی تاب نہ رہی۔ راز فاش ہو گیا۔ ابن حمید اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک طرف
کھڑا ہو گیا۔ جیسے وہ ہر مقابلے کے لئے تیار ہو' نواب سانتانی تو جیسے اپنی کرسی سے اچھل
پڑا تھا۔ اس نے کہا۔

"محترم بزرگ! تو کیا۔ کیا یہ نوجوان مسلمان ہے اور الحمراء کے آخری حکمران ابن
سراج کا بیٹا ہے۔"

بزرگ نے کہا۔ "ہاں۔ میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔ یہ نوجوان عیسائی نہیں
ہے اس کا نام پطرس بھی نہیں ہے۔ یہ اندلس کے آخری مسلمان بادشاہ ابن سراج کا
اکلوتا بیٹا ابن حمید ہے۔"

ڈان کارلو نے پیش قبض نکال لیا۔ اور دھاڑا۔

"خداوند کی قسم۔ اگر یہ سچ ہے تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

بلانکا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اب تک ابن حمید کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے جو
کچھ سنا تھا' اسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا۔ جب ڈان کارلو ابن حمید پر حملہ آور ہونے لگا تو

وہ تڑپ کر ابن حمید کے سامنے آگئی اور بازو پھیلا کر بولی۔

"محترم بزرگ نے جو کچھ کہا اگر یہ سچ ہے تو بھی نوجوان ہمارا مہمان ہے۔ اس کی جان کی حفاظت ہمارا اخلاقی فرض ہے۔" بلانکا کے والد نے آگے بڑھ کر بلانکا کو پیچھے کر دیا اور ابن حمید کی طرف گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ تم ابن سراج کے بیٹے ابن حمید ہو؟"

ابن حمید نے اثبات میں سرہلایا اور کہا۔

"جب میں نے بلانکا سے یہ کہا تھا کہ میں عیسائی ہوں اور میرا نام پطرس ہے تو شاید میں نے محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر زندگی کا سب سے پہلا جھوٹ بولا تھا۔ لیکن اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ ان بزرگ نے جو کچھ کہا وہ درست ہے میری رگوں میں آل بنو سراج کا پاکیزہ خون گردش کر رہا ہے اور میں اندلس کے آخری تاجدار ابن سراج کا فرزند ہوں۔"

بلانکا اپنا سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے باپ نے ڈان کارلو کو بازو سے پکڑ کر پیچھے کرسی پر بٹھا دیا اور کہا۔

"بیٹے! ہم اعلیٰ خاندان کے افراد ہیں اور ہم اپنے مہمان کو قتل نہیں کیا کرتے۔"

ڈان کارلو نے چلا کر کہا۔

"لیکن ابا حضور یہ شخص نہ صرف یہ کہ مسلمان ہے۔ بلکہ اندلس کے شاہی خاندان کا چشم وچراغ ہے جس کا قتل ہم پر فرض ہے۔"

اب اس بزرگ نے ایک بار پھر لب کشائی کی اور کہا۔

"میرے بچو! یہ ہمارے عالی نسبی اور خاندانی روایات کے منافی ہے کہ ہم اپنے مہمان پر ہاتھ اٹھائیں۔ ہم ہسپانیہ کے آخری حکمران کی اولاد کو ہدایت کریں گے کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے ہماری سرزمین سے نکل جائے۔"

ابن حمید خاموش نگاہوں سے یہ سب کچھ سن رہا تھا لیکن اس کی گردن ایک شان خود نمائی سے اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت اندلس کا آخری شہزادہ لگ رہا تھا۔ بلانکا نے ابن حمید کی طرف حسرت انگیز نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"ہسپانوی مسلم حکمرانوں کی آخری نشانی! تو نے مجھے میری زندگی کا سب سے بڑا صدمہ پہنچایا ہے۔ لیکن --- لیکن میری نظروں میں تمہاری وقعت اور بڑھ گئی ہے، میرے باپ کو اس بات پر فخر کرنا چاہئے کہ میری نگاہ انتخاب غلط نہیں تھی ابن حمید! اگر تم عیسائی مذہب اختیار کر لو تو میں اب بھی تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔"

ہسپانیہ کے مرحوم تاجدار کے زوال پذیر شہزادے نے گردن اٹھا کر کہا۔

"اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر میرے سامنے دنیا کی ساری دولت کے ڈھیر بھی لگا دیئے جائیں، تب بھی میں اپنے دین اسلام سے منہ نہیں پھیروں گا۔ بلانکا! میں تمہیں دعوت اسلام دیتا ہوں۔ اگر تم ......؟"

"خاموش!"

ڈان کارلو نے چلا کر کہا۔ "اگر آگے تم نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں اپنے مہمان کو بھی ہلاک کرنے سے گریز نہیں کروں گا۔"

بزرگ ہسپانوی نے بازو بلند کیا۔

"ہم اپنی خاندانی روایات پر دھبہ نہیں لگنے دیں گے۔ ابن حمید تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

ابن حمید نے بلانکا کی طرف دیکھا، بلانکا نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ابن حمید سر جھکا کر آہستہ آہستہ پائیں باغ کے دروازے کی طرف بڑھا۔ بلانکا کے باپ نواب سانتانی نے ابن حمید کو ہدایت کی۔

"اس مکان کی چار دیواری سے باہر جانے کے بعد ہم پر تمہاری زندگی کی ذمہ داری عائد نہیں ہو گی۔ تمہیں آج ہی ہسپانیہ کی سرحد عبور کر کے شمالی افریقہ کی طرف نکل جانا ہو گا۔"

بلانکا اپنے چہرے کو ہتھیلیوں میں چھپائے مکان کے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ ڈان کارلو نے پیچ وتاب کھاتے ہوئے کہا۔

"ابا حضور! کیا مسلمانوں کو قتل کرنا ہمارا مذہبی فرض نہیں۔"

اس کے باپ نے کہا۔ "ڈان کارلو میں تمہیں کوئی مشورہ نہیں دوں گا۔ تم اپنے ہر فعل کے لئے آزاد ہو لیکن میرے گھر میں کسی مہمان کا خون نہیں بہہ سکتا۔"

یہ کہہ کر نواب سانتانی بزرگ ہسپانوی کو سہارا دیتے ہوئے مکان کی طرف بڑھا۔ میں ڈان کارلو کی نیت کو بھانپ گیا تھا، وہ اپنے دل میں ابن حمید کو قتل کرنے کا منصوبہ تیار کر چکا تھا۔ ابن حمید جا چکا تھا، میں ڈان کارلو کا جائزہ لے رہا تھا۔ آگ کا الاؤ مدھم پڑ گیا تھا اور غلام بھنے ہوئے ہرن کے پاس خاموش بیٹھا تھا۔

ڈان کارلو کچھ دیر بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے پائیں باغ کے صدر دروازے کی طرف دیکھا۔ جہاں اب شام کے پھیکے پھیکے سائے اتر رہے تھے اور پھر تیز تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے ذرا سا بھی وقت ضائع نہ کیا اور مہندی کی جھاڑیوں

سے نکل کر سرو وصنوبر کے جھنڈ میں سے گزرتا باغ کے صدر دروازے کی جانب بلوط کے ایک پیڑ کے عقب میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

ڈان کارلو باغ کے صدر دروازے پر رک گیا۔

ابن حمید نشیب کی ایک سایہ دار سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ میں بھی اسے دیکھتے جا رہا تھا۔ ڈان کارلو نے اپنے پیش قبض پر ہاتھ رکھا اور پھر کچھ سوچ کر مکان کی طرف واپس مڑ گیا' اس نے ابن حمید کو قتل کرنے کا ارادہ ترک نہیں کیا تھا۔ لیکن شاید یہ کام کسی دوسرے وقت پر اٹھا لیا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا نشیب کی سایہ دار روش پر سے ہوتا ہوا ابن حمید کے پاس جا پہنچا۔

قدموں کی آہٹ سن کر وہ رک گیا' مجھے دیکھا تو بولا۔

”تم کہاں سے آ گئے؟“

میں نے اسے بتایا کہ میں مہندی کی جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا اور میں نے سب کچھ دیکھ اور سن لیا ہے۔ ابن حمید نے ایک سرد آہ بھری اور بولا۔

”میرے دوست! پانسہ میرے خلاف پلٹ گیا۔ بلانکا شاید مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں دین اسلام چھوڑ کر عیسائی مذہب اختیار کر لوں۔ پھر وہ مجھ سے شادی کرے گی۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا کبھی نہیں کر سکتا۔ میں اپنے دین اسلام کے لئے ہزاروں لاکھوں بلانکائیں قربان کر سکتا ہوں۔“

ہم درختوں میں چلنے لگے۔ میں نے ابن حمید سے کہا کہ اب اس کا ہسپانیہ میں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے اور اسے راتوں رات وہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ابن حمید ایک آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔ ہم اپنی کارواں سرائے کی کوٹھڑی میں آ گئے رات ہو چکی تھی۔ سرائے میں شمعیں روشن کر دی گئی تھیں۔ میں یہی چاہتا تھا کہ ابن حمید کو لے کر واپس قرطاجنہ چلا جاؤں۔ مجھے ڈان کارلو کی نیت ہرگز ہرگز اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ ابن حمید کو قتل کرنے کا عہد کر چکا تھا۔ جب میں نے ابن حمید کو ڈان کارلو کے ناپاک عزائم کے بارے میں بتایا تو وہ بولا۔

”میں موت سے نہیں ڈرتا میرے دوست! اور میں اتنا کمزور بھی نہیں ہوں کہ ڈان کارلو مجھ پر قابو حاصل کر لے۔ میری رگوں میں اندلس کے شاہی خاندان کا بہادر خون گردش کر رہا ہے۔“

میں نے کہا ڈان کالو سامنے آ کر وار نہیں کرے گا۔ وہ ان جانے میں کسی دوسرے سے یا خود اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کرے گا۔ اور ایسی صورت میں اپنی

جان بچانا دینی فریضہ بھی ہے۔“

ابن حمید ابھی تک بلانکا کی یاد میں سوگوار تھا۔ اسے بلانکا سے بچھڑ جانے کا بہت صدمہ تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ اگر وہ بلانکا سے اتنی ہی محبت کرتا ہے تو پھر اسے اغوا کر کے اپنے ساتھ لئے چلتے ہیں۔ ابن حمید نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”میرے دوست یہ ہماری خاندانی شرافت کے منافی ہے۔ ہم کسی عورت سے اس کی مرضی کے خلاف بیاہ نہیں کر سکتے۔ ہم اسے اغوا نہیں کر سکتے۔ ہم بلانکا کی جدائی کو صابر وشاکر رہ کر برداشت کریں گے۔ ہمارے دل پر پہلے ہی بہت زخم ہیں۔ یہ ایک زخم اور سہی۔“

”اس دشمن ملک سے واپس جانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

ابن حمید کچھ دیر طاق میں جلتی ہوئی شمع کی طرف گھورتا رہا پھر سانس بھر کر بولا۔

”یہاں میرے اجداد کی ہڈیاں دفن ہیں اس کی ہواؤں میں مجھے خاموش اذانوں کی صدائیں سنائی دیتی ہیں اور اس کی ویران مسجدوں میں سجدوں کے نشان دیکھتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن اب یہ ساری باتیں قصہ پارینہ بن چکی ہیں۔ مسلمانوں نے خود ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کر کے دنیا کی عظیم مسلم سلطنت ہاتھ سے گنوادی۔ اور ہزاروں فرزندان توحید شہید کر دئے گئے۔ ان باتوں کا ذکر بے سود ہے۔ اب مجھے آپ کی زندگی کی فکر ہے۔ ساناتی خاندان کے فرد آپ کی جان کے دشمن بن چکے ہیں۔“

ابن حمید میرے ساتھ رات گئے تک باتیں کرتا رہا۔ آخر ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ دوسرے روز رات ہونے سے پہلے پہلے غرناطہ سے قرطاجنہ کی طرف کوچ کر دیا جائے گا۔

”دوسرے روز میں نہیں چاہتا تھا کہ ابن حمید کارواں سرائے سے باہر جائے لیکن وہ غرناطہ سے جانے سے پہلے اپنے اجداد کی قبروں پر فاتحہ خوانی کرنے کا خواہشمند تھا۔ اور میری مخالفت کے باوجود وہ مجھے دوپہر کے وقت لے کر الحمراء کے محل کی طرف روانہ ہوا اور وہ آخری بار سب سے پہلے اپنے باپ ابن سراج کی قبر پر فاتحہ پڑھنا چاہتا تھا۔ عیسائی سوداگر البطری کی وساطت سے ہمیں الحمرا کے شاہی محل میں داخل ہونے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ابن حمید کے مسلمان ہونے کی خبر اڑتے اڑتے یہاں تک نہ پہنچ گئی ہو۔ لیکن پہرے دار دستے نے ہمارے داخلے پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

ابن سراج کی قبر پر پہنچتے ہی ابن حمید کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے وہ کپکپاتے ہونٹوں سے فاتحہ پڑھتا رہا۔ جب ہم اندلس کے آخری حکمران کے مزار کے محرابی دروازے

میں داخل ہوئے ہے تو میں نے محسوس کیا تھا کہ کوئی انسانی سایہ کچھ فاصلے پر ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ میں چوکس ہو گیا تھا۔ میں نے ابن حمید کو کچھ نہ بتایا۔ میں اس کے بارے میں زیادہ محتاط ہو گیا۔ ابن سراج کے مزار پر دیا جلا کر ہم واپس ہوئے تو ابن حمید نے اصرار کیا کہ وہ شاہی محل کا وہ باغ دیکھنا چاہتا ہے۔ جہاں بیضوی فوارے پر سات شیروں کے مجسمے ہیں کیونکہ بچپن میں وہ اس جگہ آ کر کھیلا کرتا تھا۔

میری چوکس نظریں چاروں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ یہ تیسرا پہر تھا۔ سورج ابھی غرناطہ کی پہاڑیوں کے اوپر ہی تھا۔ سرو کے اونچے درخت خاموش کھڑے تھے۔ ہم باب الرحمت سے گذر کر شاہی محل کے اس باغ کی طرف مڑے جہاں سات شیروں والا فوارہ تھا۔ ابن حمید پرنم آنکھوں کے ساتھ فوارے کے پاس کھڑا اپنے بچپن کی یادوں میں کھو گیا۔ میں اس کے پہلو میں موجود تھا۔ اتنے میں ایک ہسپانوی ہمارے پاس آ کر بولا۔

"سینور! اگر آپ اندلس کے مسلمان بادشاہوں کا کمال دیکھنا چاہتے ہیں تو میرے ساتھ چلئے۔ یہاں باغ کے ایک تہہ خانے میں ایک سونے کا چراغ ہے جو سات سو برس سے جل رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ پہلے اموی بادشاہ نے بنوا کر روشن کیا تھا۔"

ابن حمید نے پرشوق نگاہوں سے ہسپانوی کی طرف دیکھا جو مجھے شکل وصورت سے ایک ایسا آدمی دکھائی دیا۔ جو تاریخی عمارتوں میں سیاحوں کی رہنمائی کیا کرتے ہیں۔ میں نے ابن حمید کو واپس چلنے کے لئے کہا مگر وہ اپنے جد امجد کے بنائے عجوبہ روزگار چراغ کو دیکھنے پر مصر تھا۔ چنانچہ مجبوراً" مجھے بھی اس کے ساتھ چلنا پڑا۔

باغ کے کونے میں نجد سے لا کر اگائے گئے کھجور کے پرانے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ ہسپانوی راہ نما ہمیں یہاں ایک پوشیدہ زمین دوز دروازے سے گذار کر ایک اندھیری سرنگ میں لے گیا۔ میں محتاط ہو گیا کہ یہ کوئی سازش ہی نہ ہو' میں نے محافظ سے کہا کہ چراغ جلاؤ۔ یہاں بہت اندھیرا ہے۔

ابن حمید میرے آگے آگے تھا' ہسپانوی راہ نما بولا۔

"سینور! ابھی چراغ لا کر جلاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اندھیرے میں واپس مڑا۔ مجھے شدید خطرے کا احساس ہوا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا اندھیرے میں مجھے اس کا دھندلا خاکہ نظر آ رہا تھا۔ وہ غار کے دروازے میں سے گذرا تو دروازہ باہر سے بند ہو گیا۔ میں نے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا۔ دروازہ چرچرایا۔ اس سے پہلے کہ میں دوسری ضرب سے دروازے کو توڑ دیتا۔ پیچھے جہاں ابن حمید کھڑا تھا اور مجھے اپنے پاس بلا رہا تھا۔ ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا اور پھر غار میں سفید دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔

مجھے ابن حمید کے کھانسنے کی آواز آئی۔ میں اس کی طرف لپکا لیکن سفید دھوئیں نے اب مجھ پر بھی اثر کر دیا تھا۔ میرا سانس رکنے لگا۔ میں نے ابن حمید کو آواز دینی چاہی۔ مگر الفاظ میرے حلق میں ہی اٹک کر رہ گئے۔ اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا پھر مجھے کچھ خبر نہ ہوئی کہ میں کہاں ہوں۔ میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

خدا جانے کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔

غار کی فضا دھوئیں سے صاف ہو چکی تھی۔ میں نے بے تابی سے ابن حمید کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ میں اٹھا' میرا سر چکرا رہا تھا۔ دیکھا کہ سرنگ خالی پڑی ہے۔ ابن حمید کہیں بھی نہیں ہے۔ اب تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ہم سازش کا شکار ہو گئے تھے۔ یقیناً" یہ ڈان کارلو کی سازش تھی۔ اور وہ ابن حمید کو قتل کروانے کے لئے اغوا کر کے لے گیا ہے۔

سرنگ کا دروازہ کھلا تھا اور تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ میں باہر کی طرف لپکا رات ہو چکی تھی۔ آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے۔ میں پریشان ہو گیا۔ کیونکہ ابن حمید کو ضرور موت کے گھاٹ اتار دیا ہو گا۔

مجھ پر دنیا کا کوئی ہتھیار اثر نہیں کر سکتا تھا' لیکن بے ہوش کر دینے والے دھوئیں سے میں بھی محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ یہی میری سب سے بڑی کمزوری تھی۔ میں نے ابن حمید کو الحمراء کے ویران محلوں اور باغوں میں چاروں طرف ڈھونڈا۔ مگر وہ مجھے کہیں نہ ملا۔

ناامیدی کے عالم میں میں نے گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور سیدھا عیسائی دوشیزہ اور ابن حمید کی محبوبہ بلانکا کے مکان پر جا پہنچا۔ میں نے اندر پیغام بھجوایا تو وہ خود پائیں باغ میں آ گئی۔ جب اسے پتہ چلا کہ ابن حمید کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ اور مجھے اس کے بھائی ڈان کارلو پر شک ہے تو وہ ایک لمحہ کے لئے سکتے میں آ گئی۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ صدر دروازے پر شمع دان میں شمع جل رہی تھی۔ جس کی روشنی میں اس کا خوب صورت چہرہ بے حد دل آویز لگ رہا تھا۔

اس کے چہرے سے پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کی نظریں جیسے سرو کے درختوں پر جا کر ٹھہر گئی تھی۔ دل گیر آواز میں بولی۔ "اگر میرے بھائی نے ابن حمید کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

پھر میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

"ڈان کارلو تو صبح سے قرطبہ گیا ہوا ہے ہو سکتا ہے یہ کام کسی ایسے شخص کا ہو جس کو ابن حمید کے مسلمان ہونے کا علم ہو گیا ہو۔

میں نے کہا۔ "....یہ راز آپ کے خاندان کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہے اور پھر ڈان کارلو نے کہا تھا کہ ابن حمید کو قتل کرنا دینی فریضہ ہے۔"

بلانکا پریشانی کے عالم میں ٹہلنے لگی میری طرف دیکھا اور کہا۔

"ابن حمید کی زندگی اب خدا کے ہاتھ میں ہے میں سوائے خداوند کے آگے دعا کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ لیکن تم جو اس کے دوست ہو اگر تم بھی مسلمان ہو تو میں تمہیں یہی مشورہ دوں گی کہ کسی طرح اپنی جان بچا کر یہاں سے نکل جاؤ۔"

بلانکا اس کے سوا واقعی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ میں بلانکا کا شکریہ ادا کر کے واپس ہونے لگا تو اس نے مجھے روک لیا اور بولی

"میرے خاندان کے سب سے معمر بزرگ جنہوں نے ابن حمید کے شاہی خاندان کے فرد ہونے کا انکشاف کیا تھا۔ شاید اس سلسلے میں کوئی راہ دکھا سکیں میرے ساتھ آؤ۔"

بلانکا مجھے لے کر مکان کے ایک کمرے میں آ گئی جہاں وہی معمر بزرگ ایک تخت پر مسند سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ طاق میں شمع روشن تھی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور ہاتھ تسبیح پر چل رہے تھے سامنے شمع دان کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقلوب مجسمہ رکھا تھا۔

بلانکا کی آمد پر انہوں نے آنکھیں کھول کر ہمیں دیکھا اور میری طرف ہاتھ سے اشارہ کیا' جیسے بلانکا سے پوچھ رہے ہوں کہ میں کون ہوں' بلانکا نے میرا مختصر سا تعارف کروایا اور جب بتایا کہ ابن حمید کو اغوا کر لیا گیا ہے اور شبہ ڈان کارلو پر ہے معمر ہسپانوی بزرگ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور بلانکا کی طرف دیکھ کر بولے۔

"بیٹی فکر مت کرو۔ اگر یہ کام ڈان کارلو نے کیا ہے تو وہ اسے موت کے گھاٹ نہیں اتارے گا۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں دادا جان! ڈان کارلو نے تو اس روز باغ میں ہی ابن حمید کو قتل کرنے کے لئے خنجر نکال لیا تھا۔"

بزرگ کہنے لگے۔

"یہ درست ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ ڈان کارلو نے ابن حمید کو شاہی خزانے کا راز حاصل کرنے کے لئے اغوا کیا ہے اسے قتل کرنے کے لئے نہیں۔"

میں اور بلانکا حیرانی سے بزرگ ہسپانوی کے نورانی چہرے کو تک رہے تھے۔ یہ میرے لئے بھی ایک نیا انکشاف تھا کہ ابن حمید شاہی خزانے کے راز کو جانتا ہے۔ بلانکا نے پوچھا۔

"کیا ابن حمید اپنے آباؤ اجداد کے کسی خزانے کو حاصل کرنے یہاں آیا تھا؟"

ہسپانوی بزرگ کہنے لگے۔ "یہ بات نہیں ہے ابن حمید کو کسی شاہی خزانے کا علم نہیں ہے۔ نہ ہی وہ کسی خزانے کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جب میں نے اپنی قیافہ شناسی اور یادداشت کی قوت سے ابن حمید کو پہچان لیا اور ابن حمید نے بھی حقیقت کا اعتراف کر لیا تو ڈان کارلو اس کی جان کا دشمن ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ ڈان کارلو اگرچہ میرے کہنے پر رک گیا ہے لیکن وہ ابن حمید کا پیچھا کرے گا اور اس کے ہسپانیہ نکلنے سے پہلے پہلے اسے ہلاک کر ڈالے گا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ ہسپانوی مسلمان شہنشاہ ابن سراج کی آخری نشانی کو اس بہیمانہ قتل سے بچانے کے لئے میں نے ایک چال چلی اور ڈان کارلو کو اعتماد میں لے کر بتایا کہ ابن حمید دراصل اپنے اجداد کے ایک پوشیدہ خزانے کی تلاش میں وہاں آیا ہے جس کا راز صرف اسی کو معلوم ہے۔ ڈان کارلو خزانے کا سن کر بے چین ہو گیا۔ میں نے اس کی آتش حرص کو مزید بھڑکاتے ہوئے کہا کہ ابن حمید اگر مار دیا گیا تو اندلسی بادشاہوں کے بے پناہ قیمتی اور انمول خزانے کا راز بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔ ڈان کارلو چلا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اسی نے ابن حمید کو الحمراء کے شاہی محل سے اغوا کیا ہے اور فکر مت کرو وہ اسے موت کے گھاٹ نہیں اتارے گا۔ وہ ابن حمید سے شاہی خزانے کا راز معلوم کرنے کے لئے اسے زندہ رکھے گا۔ اور ابن حمید اسے اس لئے خزانے کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے گا کہ حقیقت میں اسے بھی کسی خزانے کی بابت کچھ علم نہیں ہے یوں اس کی جان بچی رہے گی۔ اسے ہسپانیہ سے فرار ہونے کے سلسلہ میں کوئی منصوبہ بنانے کے لئے وقت مل جائے گا۔

ہم ہسپانوی بزرگ کی اس صحت مند عیاری پر دنگ رہ گئے اس شخص نے ابن حمید کی جان بچانے کے لئے واقعی بڑی حیرت انگیز چال چلی تھی۔ یہ بزرگ میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

میں جانتا ہوں تم ابن حمید کے ساتھی ہو اور تم بھی یقیناً" مسلمان ہو گے۔ شکل سے تم شمالی مصر کے لگتے ہو' بہرحال میں نے تمہارے دوست ابن حمید کو فوری قتل سے بچا لیا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کی موت میں تاخیر پیدا کر دی ہے اب یہ تمہارا کام ہے کہ اسے تلاش کرو اور پھر تم دونوں ہسپانیہ کی سرزمین سے اپنی جانیں بچا کر نکل جاؤ۔"

بلانکا مکان کے برآمدے تک میرے ساتھ آئی۔ وہ اداس تھی۔ کہنے لگی۔

"کاش میں ابن حمید کی تلاش کی مہم میں تمہاری مدد کر سکتی لیکن اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑی تو مجھے ہر لحظہ تیار پاؤ گے۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے خیال میں اس کا بھائی ڈان کارلو ابن حمید کو اغوا کر کے کہاں لے گیا ہو گا۔ بلانکا نے کچھ سوچ کر بتایا کہ اس کے بھائی نے یہ کام خود نہیں کیا ہو گا۔ اس کا تعلق پرتگال کے شاہی خاندان سے ہے اور اس کے تعلقات ایسے لوگوں سے بھی ہیں جو کرائے کے قاتل اور اسمگلر قسم کے لوگ ہیں۔ یہ کام اس نے اسی قسم کے لوگوں سے کروایا ہو گا۔"

"میں ان لوگوں سے واقف نہیں ہوں' لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ ڈان کارلو سے ملنے کبھی کبھی ایک جرائم پیشہ آدمی سیاہ بارہ دری والی پہاڑی سے آیا کرتا ہے اس کا نام لاترے ہے لمبا تڑنگا آدمی ہے۔ گال پر بائیں طرف تلوار کے زخم کا لمبا نشان ہے۔ ہو سکتا ہے اس اغوا میں اس کا ہاتھ ہو۔ اور ڈان کارلو نے ابن حمید کو اغوا کر کے سیاہ بارہ دری والی پہاڑی میں کسی جگہ چھپا رکھا ہو اور اس سے شاہی خزانے کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا ہو۔"

ان حالات میں میرے لئے اتنا سراغ ہی بہت تھا بلانکا نے مجھ سے وعدہ لیا کہ ابن حمید کی خیریت کی خبر اسے ضرور دوں گا۔

رات میں نے سوچ بچار میں گذار دی۔ دوسرے روز میں کالی بارہ دری والی پہاڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس پہاڑی کا راستہ مجھے کارواں سرائے کے ایک پرتگالی ملازم نے بتایا۔ وہ خوفزدہ تھا۔ کیونکہ کالی بارہ دری کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں بدروحیں رہتی ہیں اور کوئی اجنبی اگر ادھر چلا جائے تو اسے اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ لیکن مجھ سے بڑا جن بھوت کون ہو سکتا تھا کہ جو پانچ ہزار سال سے زندہ چلا آ رہا تھا۔ مجھے اگر بدروحیں اٹھا کر بھی لے جائیں گی تو میرا کیا کر لیں گی۔ سیاہ بارہ دری والی پہاڑی غرناطہ کے جنوب میں دریا کے پار ایک غیر آباد علاقہ میں واقع تھی۔ ایک ویران پتھریلا پہاڑی سایہ دار راستہ اوپر پہاڑی کی چوٹی کو جاتا تھا۔ میں گھوڑے پر سوار اوپر چلا جا رہا تھا۔ چڑھائی زیادہ نہیں تھی۔ اوپر ایک سنسان کشادہ جگہ تھی۔ جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر عجیب قسم کے پیچ دار تنوں اور شاخوں والے آسیبی درختوں کے جھنڈ کھڑے تھے۔ ان کے درمیان ایک بارہ دری تھی جس کے ستون سیاہ پتھروں کے تھے۔

بارہ دری کے عقب میں ایک آبنوسی رنگ کی چٹان اوپر کو اٹھتی چلی گئی تھی۔ اس چٹان کی دیوار پر سیاہ پتھروں کی چوکور اور تکونی سلیں ایک دوسرے کے اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ بارہ دری کے پاس ہی ایک درخت کے نیچے کسی عیسائی کی قبر تھی۔ جس کے سرہانے پتھر کی صلیب نصب تھی۔ جو بارشوں اور دھوپ کی وجہ سے سیاہ پڑ چکی تھی۔ عجیب پراسرار

اور آسیبی ماحول تھا لیکن جس چیز کی تلاش میں میں وہاں آیا تھا۔ وہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یعنی وہاں کسی انسانی آبادی کے کوئی آثار نہیں تھے' خیال تھا کہ ضرور کوئی جھونپڑی یا مکان ہو گا۔ جہاں سے مجھے جرائم پیشہ لاترے کے بارے میں کوئی سراغ مل سکے گا۔ مگر وہاں کسی بھی انسانی آبادی کے آثار نہیں تھے۔ ہر طرف ایک طلسمی ویرانی چھائی تھی۔

گھوڑا ایک طرف باندھ کر میں وہاں کچھ دیر پھرتا رہا وہاں کسی بد روح یا جن بھوت سے بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک درخت کی ٹہنی سے مجھے ایک انسانی کھوپڑی لٹکتی دکھائی دی۔ شاید کسی نے جادو ٹونا کیا ہوا تھا۔ درخت کے نیچے سندور اور تانبے کے کچھ سکے اور چاول بکھرے ہوئے تھے۔ یہ جادو ٹونا ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے گھوڑا وہاں [illegible] فاصلے پر ایک درخت کے نیچے باندھا تھا۔

مجھے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ میں چوکنا ہو گیا۔ آواز پہاڑی کے نیچے سے اوپر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں لپک کر اپنے گھوڑے کے پاس جا کر چھپ گیا۔ اتنے میں دو گھڑ سوار وہاں نمودار ہوئے ان کے سیاہ لبادے پیچھے لہرا رہے تھے۔ سیاہ بارہ دری.... کے پاس جا کر وہ گھوڑوں سے اتر پڑے۔ ان میں سے ایک اونچا لمبا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گال پر زخم کا لمبا نشان بھی تھا۔ ہو سکتا ہے یہی جرائم پیشہ لاترے ہو۔

وہ بارہ دری کے عقب میں جا کر ڈھلان میں اتر گئے۔ اس کے بعد نہ وہ خود نظر آئے اور نہ ان کی کوئی آواز سنائی دی۔ میں بڑا حیران ہوا کہ یہ لوگ کہاں غائب ہو گئے۔ جب خاصی دیر گذر گئی اور میں خود نکل کر بارہ دری کی طرف جانے کا سوچ رہا تھا۔ کہ دونوں میں سے وہ آدمی نمودار ہوا۔ جو اونچا لمبا تھا۔ اور میرے خیال کے مطابق وہ لاترے تھا۔ اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر اس نے دوسرے گھوڑے کی باگ تھامی اور انہیں قدم قدم چلاتا پہاڑی سے نیچے اتر گیا۔

اس کا مطلب تھا کہ بارہ دری کے عقب میں ضرور کوئی خفیہ ٹھکانہ ہے۔ جہاں اس کا ساتھی رہ گیا ہے۔ جب گھڑ سوار کافی دور نکل گیا اور اس کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آنا بند ہو گئی تو میں درخت کی اوٹ سے نکل آیا۔ بارہ دری کے پاس جا کر میں خفیہ جگہ کا سراغ لگانے میں لگ گیا۔ میں پھونک پھونک کر اور دبے دبے قدم رکھ رہا تھا۔ ڈھلان پر کسی خفیہ غار یا سرنگ کا دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

پھر وہ آدمی کہاں غائب ہو گیا؟

پہاڑی ڈھلان آبنوسی چٹان کی دیوار کے پاس جا کر ختم ہو جاتی تھی سامنے پتھروں کی

سیاہ دیوار تھی۔ اچانک ایک پرانی قبر پر نگاہ پڑی جو نشیب میں جنگلی انجیر کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے دو درختوں کے درمیان بنی تھی اس قبر کے سرہانے جو صلیب لگی تھی وہ ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ یہ پتھر کی صلیب تھی اور ایک ستون کی شکل میں بنی ہوئی تھی۔ میں نے اسے ہلایا تو احساس ہوا کہ وہ اپنی جگہ سے ہلی ہوئی ہے۔ دو تین بار ہلانے سے وہ اپنی جگہ سے اکھڑ گئی میں نے صلیب کو ایک طرف زمین پر رکھ دیا۔ نیچے چھوٹا سا گڑھا تھا۔ جس میں گھاس بھرا ہوا تھا۔ میں گھاس کو ایک طرف ہٹانے لگا۔ جوں جوں گھاس پھونس نکل رہا تھا۔ گڑھا کشادہ ہوتا جا رہا تھا۔ جب گھاس ختم ہوا تو سامنے زمین میں دھنسا ہوا لکڑی کا ایک تختہ نظر ایا۔ تھوڑا سا زور لگانے سے تختہ ایک طرف ہٹ گیا۔ آگے ایک تنگ و تاریک سرنگ کا راستہ تھا۔

یہی راستہ خفیہ تہہ خانے کو جاتا تھا۔ سرنگ میں داخل ہونے کے بعد میں نے تختہ پیچھے لگا دیا۔ سرنگ میں گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے سرنگ کی دیواروں اور چھت کا دھندلا دھندلا خاکہ نظر آنے لگا۔ سرنگ کی چھت بلند تھی اور اس میں سے آبنوسی چٹان کی جڑوں کے نوکیلے پتھر باہر نکلے ہوئے تھے۔ میں آگے بڑھتا گیا سرنگ موڑ گھومی تو روشنی سی ہو گئی یہ روشنی ایک کوٹھڑی کے اندر سے آ رہی تھی۔ مجھے سکوں کی جھنکار سنائی دی۔ میں رک گیا اندر کوئی تھا جس نے میرے قدموں کی آواز سن لی تھی۔ اس نے ہسپانوی میں پکارا۔

"لاترے تم آ گئے؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک بات واضح ہو گئی کہ جو گھڑ سوار اس شخص کو سرنگ میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ جرائم پیشہ لاترے ہی تھا۔ سانس روکے کھڑا تھا کہ کوٹھڑی میں سے لاترے کا ساتھی باہر نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں برہنہ تلوار تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو ایک پل کے لئے ششدر رہ گیا۔ پھر ایک نعرہ لگا کر مجھ پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ تلوار میرے کاندھے سے ایک چھناکے سے ٹکرا کر اچٹ گئی۔

وہ شخص یہ سمجھا کہ میں نے لباس کے اندر زرہ پہن رکھی ہے۔ اس نے دوسرا وار میری گردن اور تیسرا میرے سر پر کیا۔ دونوں بار تلوار ٹکرا کر اچٹ گئی۔ وہ ہکا بکا ہو کر میری صورت تکنے لگا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے تلوار چھین لی اور اسے گھسیٹ کر کوٹھڑی میں لے گیا' کوٹھڑی میں شمع دان روشن تھی اور ایک تخت پر سونے کے سکوں کا ڈھیر لگا تھا۔ خدا جانے یہ سکے کہاں سے آئے تھے۔

وہ آدمی مجھے کوئی آسیب یا جن بھوت سمجھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے دہشت

جھلک رہی تھی۔ میں نے ہسپانوی میں اس سے کہا کہ اگر وہ اپنی جان کی سلامتی چاہتا ہے تو یہ بتا دے کہ انہوں نے ابن حمید کو اغوا کرنے کے بعد کہاں چھپا رکھا ہے اس شخص کے ہونٹوں پر جیسے مہر سکوت ثبت ہو گئی تھی۔ وہ پتھر کی طرح زمین پر پڑا تھا۔ میں نے دو تین بار جھنجھوڑ کر اپنا سوال دہرایا تو اس کی آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں ڈیلے باہر کو نکل آئے۔ ہونٹ لرزنے لگے۔ جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ میں نے اسے لٹا دیا۔ اور ابن حمید کے بارے میں ایک بار پھر پوچھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ہاتھ بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ ہاتھ کا رخ شمال کی طرف تھا۔ میں نے تلوار کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔ اور اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی دھمکی دی۔ جس پر اس کے ہونٹوں سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکلے۔

"قلعے کا شیروں والا فوارہ۔ چوتھے شیر کی سیدھ میں سامنے بارھواں ستون۔ اس کے تہ خانے میں۔"

اس کے ہونٹ ساکت ہو گئے۔ آنکھیں پتھرا گئیں اور وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا۔ وہ مر چکا تھا۔ خدا جانے اس پر اتنی دہشت کس وجہ سے سوار ہو گئی تھی کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ لیکن مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ مرتے مرتے مجھے ابن حمید کے بارے میں ایک اہم سراغ بتا گیا۔

میں نے اس کی لاش کو وہیں چھوڑا اور سرنگ سے نکل کر باہر آ گیا لکڑی کا تختہ سرنگ کے دہانے پر لگا کر اسی طرح گھاس پھونس سے اسے چھپا دیا۔ اور پتھر کی صلیب لگائی۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مرنے والے نے جس قلعہ کا ذکر کیا تھا۔ وہ الحمراء کا قلعہ ہی تھا۔ جہاں سات شیروں والا فوارہ تھا۔ یہ جگہ میں ابن حمید کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔

کارواں سرائے میں آ کر میں دن ڈوبنے اور اندھیرا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ میں اپنی اگلی مہم پر اندھیرا ہو جانے کے بعد روانہ ہونا چاہتا تھا۔ جب شام کا اندھیرا رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں گھل مل گیا اور غرناطہ شہر کے گلی کوچوں اور مکانوں کے جھروکوں اور دروازوں پر چراغ روشن ہو گئے۔ تو میں الحمراء کے قدیم قلعے کی طرف نکل پڑا۔ قلعہ کے دروازے پر جو پہرے دار متعین تھے۔ وہ میری صورت سے شناسا تھے۔ انہوں نے مجھے کچھ نہ کہا اور مجھے قلعے میں داخل ہونے دیا۔ میں نے گھوڑا وہیں قلعہ کی ڈیوڑھی میں ایک جانب چھوڑ دیا۔

بلند اونچے ستونوں والی راہ داریوں میں سے گذرتے ہوئے میں الحمراء کے شاہی محل

والے اس فوارے کے پاس آیا۔ جس پر سرخ پتھر کے سات شیروں کے مجسمے بنے ہوئے
تھے۔ میں چوتھے شیر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ شیر کا منہ سامنے کی جانب تھا وہاں سرخ اور
سیاہ ستونوں کی قطاریں تھیں۔ جنوب کی جانب سے میں نے ستونوں کو گننا شروع کر دیا اور
انہیں شمار کرتا ہوا بارہویں ستون کے پاس آ کر رک گیا۔

اس مقام پر کوئی انوکھی چیز نہیں تھی۔ جو میری توجہ اپنی طرف کھینچتی بارہویں ستون
کی دونوں جانب ستونوں کی قطاریں۔ ایوان اسد مین دور تک چلی گئی تھیں۔ میں سوچ رہا
تھا کہ مرتے وقت اس آدمی نے بارہویں ستون کا کس غرض سے نام لیا تھا کہیں وہ مجھے غلط
راستے پر تو نہیں ڈالنا چاہتا تھا؟ لیکن وہ تو مر رہا تھا۔ کیا اس نے مرتے وقت بھی جھوٹ بولا
تھا؟ میں انہی خیالوں میں گم تھا اور بارہویں ستون کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ یہاں نیم تاریکی
تھی۔ کھلے آسمان پر ستارے نکل آئے تھے۔ اور ان کی پھیکی روشنی ستون تک پہنچ رہی
تھی۔ اندھیرے میں بھی بہت کچھ دیکھ لینے کی میری خاصی حس میری مدد کر رہی تھی۔

مجھے، ستون کے نچلے نصف حصے پر ایک لکیر سی ابھری ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے
جھک کر ُ سے دیکھا اور اس پر ہاتھ پھیرا یہ تیر کا نشان تھا۔ جس کا رخ سامنے چند قدم کے
فاصلے پر محرابی دروازے کی جانب تھا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا محرابی دروازے پر آیا یہ
دروازہ لکڑی کا تھا اور اس پر تانبے کے ہلال بنے ہوئے تھے۔ میں نے اسے آہستہ سے اندر
کی طرف دھکیلا تو وہ کھل گیا میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔

مجھے گھپ اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

یہ کیا معمہ تھا۔ کہیں مجھے کسی جال میں تو نہیں پھنسایا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں
طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن ابن حمید کی جان بچانے کا خیال ان سب پر
حاوی تھا۔ میں نے ایک قدم آگے اندھیرے میں رکھا۔ آگے زمین ڈھلوان تھی۔ دیوار کا
سہارا لے کر نشیب میں اتر گیا۔ یہاں تاریکی' اتھاہ تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ڈھلوان
پر چند قدم چلنے کے بعد زمین کی سطح ہموار ہو گئی اس قبر جیسی تاریکی میں میری تیز آنکھیں
بھی کچھ نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ میں دیواروں کو ہاتھوں سے ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا تو اچانک میرا
پاؤں خلا میں پڑا اور اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکوں۔ میرا جسم قلابازیاں کھاتا ہوا ایک
گہرے کنوئیں میں گرا جا رہا تھا' پھر نیچے اس خلا کی تہہ میں گڑھے ہوئے نیزوں کی تیزانیاں
میرے جسم سے ٹکرا کر ٹوٹ ٹوٹ گئیں میں دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

ایک پل کے لئے کچھ بے حواس سا ہو کر وہیں پڑا رہا اور سوچنے لگا کہ میں کسی
اندھے کنوئیں میں گر گیا ہوں۔ یہ واقعی ایک اندھا کنواں تھا۔ جس کی تہہ میں لمبے لمبے

نیزے اور تلواریں اس طرح گاڑ دی گئی تھی۔ کہ ان کی نوکیں اوپر کی طرف تھیں۔ اب
مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اس جرائم پیشہ آدمی نے مرتے وقت میرے ساتھ دھوکہ
کیا تھا اور مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر میری جگہ کوئی عام انسان ہوتا تو اس کا
جسم نیزوں اور تلواروں میں پرو چکا ہوتا اور کئی نیزے اس کے جسم سے پار ہو گئے ہوتے۔
لیکن یہ نیزے اور اوپر کو اٹھی ہوئی تلواریں میرے چٹانی جسم سے ٹکرا ٹکرا کر ٹوٹ گئی
تھیں۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ یہاں بھی گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے ہاتھوں سے ٹٹولا۔ واقعی
میں ایک تنگ گھیرے والے کسی اندھے کنوئیں میں گرا ہوا تھا۔ اوپر جانے کا کوئی راستہ
نہیں تھا۔ کنوئیں کی مضبوط دیوار سپاٹ پھسلواں پتھروں کی بنی تھی۔ کچھ دیر بعد میں اس
قابل ہو گیا کہ اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے اپنے قریب ہی ایک ڈھانچہ پڑا دکھائی دیا۔
اس کی پسلیوں میں سے تلواریں باہر نکلی ہوئی تھیں ایک نیزہ اس کی گردن کی ہڈی کو توڑتا
ہوا باہر آ گیا ہوا تھا۔

میں نے دو تین بار آوازیں بھی دیں۔ مگر میری آواز تنگ و تاریک کنوئیں ہی میں
ٹکرا کر رہ گئی۔ اس وقت باہر ایوان اسد میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میری آواز باہر چلی بھی
جاتی تو میری مدد کو کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ ساری رات وہاں پڑے رہنے کی بجائے میں نے
کنوئیں میں سے کوئی راہ نجات تلاش کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ کنوئیں کی تہہ میں گول
دیوار پتھروں کے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ میں نے انہیں ہلانے کی کوشش کی لیکن وہ
زمین میں مضبوطی سے گڑی تھیں۔

ایک پتھر کو دو تین بار اپنی طرف کھینچا تو وہ اپنی جگہ سے تھوڑا سا ہل گیا۔ میرے
لئے اتنا ہی بہت تھا۔ میرے اندر جو بے پناہ طاقت تھی میں نے اس سے کام لینے کا فیصلہ کیا
اور پتھر کے تھوڑے سے باہر نکلے ہوئے کناروں کو اپنے ہاتھوں کے مضبوط شکنجے میں لے کر
ایک ایسا جھٹکا دیا کہ پتھرا کھڑ کر آدھے سے زیادہ باہر کو نکل آیا۔ دوسری بار اسے جھنجھوڑا تو
دیوار سے الگ ہو چکا تھا۔

میں جھک کر دیکھا اندر کافی گہرا سوراخ تھا۔ میں نے دوسرے پتھروں کو بھی اکھاڑ
ڈالا۔ اب وہاں ایک تنگ راستہ بن گیا۔ میں رینگتا ہوا آگے کی طرف کھسکنے لگا۔ میرے سر
اوپر سے مٹی گر رہی تھی۔ میں کسی سانپ کی طرح اس تنگ و تاریک سوراخ سے رینگتا
آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہاں سے کوئی نہ کوئی راستہ باہر کو جاتا ہو گا۔ ورنہ ان
پتھروں کے پیچھے شگاف رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

جوں جوں میں آگے رینگ رہا تھا۔ سوراخ کشادہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ پھر ایک دم سے

نشیب آگیا۔ اور میں منہ کے بل لڑھکتا دھپ سے ایک جگہ فرش پر جا گرا۔ سر اٹھا کر دیکھا کہ میں ایک تہہ خانے میں ہوں۔ سامنے دیوار کے ساتھ پتھر کاٹ کر سیڑھیاں بنی ہیں۔ جو اوپر ایک محرابی دروازے پر جا کر ختم ہو گئی تھیں۔ میں سیڑھیاں چڑھتا دروازے تک آیا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا دوسری طرف بھی گھپ اندھیرا تھا۔ میں ابھی اس نئی صورت حال کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ مجھے بھنبھناہٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں رفتہ رفتہ انسانوں کی بڑبڑاہٹ میں تبدیل ہو گئیں۔ جیسے اس اندھیرے میں لوگوں کا ہجوم آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہو چند لمحوں کے بعد یہ آوازیں غائب ہو گئیں اور فضا میں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ اندھیرے میں میری نظر کام نہیں کر رہی تھی۔ ایک دم سے ایک طرف روشنی ابھری اس روشنی نے مجھے بتایا کہ میں ایک طویل وعریض ہال کمرے میں ہوں' جس کی حالت بے حد بوسیدہ اور خستہ ہے۔ روشنی سامنے والے کونے کے ستونوں سے آگے بڑھ رہی تھی۔ میں جلدی سے ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ ایک آدمی ہاتھ میں شمع دان لئے قدیم مسیحی درباری پیشکاروں کے لباس میں آگر بڑھ رہا تھا۔ وہ ہال کمرے یعنی اس ایوان کے وسط میں آ کر ٹھہر گیا۔ شمع دان کو ایک ستون کے ساتھ لٹکایا اور جن قدموں سے آیا تھا انہی قدموں واپس اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

شمع دان میں دھیمی لو والی قندیل جل رہی تھی۔ اس کی مدھم روشنی میں اس پراسرار ایوان کے ستون بدروحوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ میں حیران تھا کہ یہ مسیحی پیش کار کہاں سے نمودار ہوا ہے اور اس نے یہ قندیل ستون کے ساتھ کیوں آویزاں کی ہے۔ اور وہ انسانی بھنبھناہٹ کی آوازیں کہاں سے آ رہی تھیں۔

اتنے میں مجھے زنجیروں کی دھیمی دھیمی جھنکار کی آواز آئی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر میری حیرت زدہ آنکھوں نے دیکھا کہ دو عیسائی سپاہی ایک عربی عبا والے بھاری بھرکم آدمی کو لئے چلے آ رہے تھے یہ شخص زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور بڑی مشکل سے قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ اس کے چہرے سے شاہانہ جلال ٹپک رہا تھا۔ لیکن اس جلال پر قید وبند کی صعوبتوں کی پژ مردگی طاری تھی اس کے پیچھے ایک جلاد ننگی تلوار دونوں ہاتھوں میں اٹھائے چلا آ رہا تھا۔

ایوان کے وسط میں آ کر سپاہی پیچھے ہٹ گئے۔ جلاد آگے آ کر کھڑا ہو گیا۔ قیدی کوئی شاہی خاندان کا فرد لگ رہا تھا۔ اور اس کا لباس اندلس کے مسلمان بادشاہوں کا سا تھا۔ لیکن جگہ جگہ سے تار تار ہو رہا تھا۔ یہ شاہی قیدی ایوان کے وسط میں آ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ سپاہی اور جلاد بھی اپنی جگہوں پر ساکت تھے۔

پھر زرہ بکتر کی آواز آئی۔ میں نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا جدھر سے قندیل والا مسیحی نمودار ہوا تھا۔ ادھر سے ایک لمبا تڑنگا آدمی نمودار ہوا اس کا سارا جسم زرہ بکتر میں چھپا ہوا تھا اس کے بائیں ہاتھ میں عریاں شمشیر تھی جس سے خون ٹپک رہا تھا۔ سپاہی ایک طرف سے ہٹ گئے۔ جلاد نے اپنا بایاں ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔ نووارد کوئی عیسائی سپہ سالار لگ رہا تھا۔ اس نے مسلمان شاہی قیدی کی طرف گھور کر دیکھا اور اپنی تلوار فضا میں لہرائی۔ تلوار کے لہراتے ہی جلاد کی برہنہ تلوار بجلی کی طرح فضا میں کوندی اور شاہی قیدی کی گردن پر پڑی قیدی کا سر کٹ کر فرش پر گر پڑا اور ساتھ ہی اس کا بے جان جسم بھی فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ فرش اس کے خون سے لالہ زار ہو گیا۔

عیسائی سپہ سالار نے اپنی تلوار نیام میں ڈالی اور گردن اٹھائے واپس چلا گیا۔ جلاد اور سپاہی بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ جب وہ اس خونی ایوان کے کون میں جا کر غائب ہو گئے تو میں ستون کی اوٹ سے نکل کر شاہی قیدی کی طرف آیا تھا۔ اس کا سر ایک طرف پڑا تھا اور داڑھی خون مین تر بتر تھی۔ ابھی میں نے اس کے جسم کو ہاتھ ہی لگایا تھا کہ وہ دیکھتے دیکھتے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں پلٹ کر لاش کے کٹے ہوئے سر کی طرف دیکھا سر بھی دھڑ کے ساتھ غائب ہو چکا تھا۔ ستون کے ساتھ لگی شمع دان میں قندیل کی لو نے تھرتھرانا شروع کر دیا۔ اور پھر وہ بھی ایک دم سے بجھ گئی۔

ایوان میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں سکتے کے عالم میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ میری آنکھوں نے ابھی ابھی جو خونیں واقعہ دیکھا وہ حقیقت تھی یا میرا وہم کہ اچانک میرے کانوں سے کسی مرد کی لڑکھڑاتی ہوئی دلگداز آواز ٹکرائی۔

"عاطون! یہاں سے چلے جاؤ۔ میں آج کی رات یہاں قتل کیا گیا تھا۔ میں ہر ماہ اسی رات کو بار بار قتل کیا جاتا ہوں۔ یہاں سے نکل جاؤ...... نکل جاؤ......"

یہ اندلس کے آخری حکمران ابن سراج کی روح کی آواز تھی۔

یہ آواز اس خونی قلعے کے تہہ خانے کی سنسناتی خاموشی میں بڑے کرب آلود لہجے میں تھرتھرا رہی تھی۔ یہ انجام تھا اس عظیم اسلامی مملکت کے آخری شہنشاہ کا جس کی سلطنت میں مسلمان صوبائی گروہوں میں منقسم ہو کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے، تاریخ ان کے خون کی پیاسی ہو گئی اور کاتب تقدیر نے انہیں حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔

میں نے بلند آواز میں کہا۔ "اے اندلس کے عظیم شہنشاہ کی روح! میں ابن حمید کی تلاش میں ہوں۔ مجھے بتاؤ تمہارا بیٹا مجھے کہاں ملے گا؟ وہ اپنے اجداد کی قبروں کی زیارت کے لئے یہاں آیا تھا۔" ابن سراج کی روح کی آواز دھیمے لہجے میں بولی۔

"اسے ڈان کارلو نے اغوا کر کے چوبرجی باغ والے ویران قلعے میں بند کر رکھا ہے۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میرے بیٹے سے کہنا اپنے آباؤ اجداد کی روحوں کے لئے دعا کرے اور پھر کبھی اندلس نہ آئے۔ جاؤ۔ نکل جاؤ۔"

تاریکی میں ایک دل دوز چیخ بلند ہوئی۔ بجلی کی کڑک کے ساتھ ایک مرگ آلود سکوت چھا گیا۔ مجھے ابن حمید کا سراغ مل گیا تھا۔ چوبرجی باغ غرناطہ کی سب سے آخری پہاڑی کے اوپر واقع تھا۔ اس باغ میں ایک ویران قلعہ تھا جو اسپین فتح کرنے والے پہلے بادشاہ کے زمانے میں تعمیر ہوا تھا۔ اس قلعے کی طرف کوئی نہیں جاتا تھا، کیوں کہ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں بد روحیں رہتی ہیں جو کوئی قلعے میں جائے اسے ہلاک کر ڈالتی ہیں۔

میں تہہ خانے کی کھڑکی سے نکل کر کنویں میں آ گیا۔ یہاں سے اوپر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ نیزے کنویں کی تہہ میں گڑھے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اوپر ایوان اسد میں چوکیدار موجود ہے۔ چنانچہ میں نے زور زور سے آوازیں دینا شروع کر دیں۔

تھوڑی دیر بعد کنویں کے اوپر سے کسی نے مشعل کی روشنی نیچے ڈالی اور پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

یہ چوکیدار کی آواز تھی۔ میں نے کہا کہ میں ایک عیسائی سیاح ہوں۔ راستہ بھٹک کر ادھر آ نکلا تھا کہ کنویں میں گر پڑا۔ مجھے باہر نکالو۔ چوکیدار نے اوپر سے رسا لٹکایا۔ میں رسے کی مدد سے کنویں سے باہر نکلا تو چوکیدار نے میری شکل غور سے دیکھ کر کہا۔

"تم مجھے ملک عراق کے باشندے لگتے ہو۔"

"ہاں میں کچھ روز عراق میں رہا ہوں لیکن میری پیدائش اسکندریہ میں ہوئی۔ میں عیسائیوں کے راہب خاندان سے ہوں۔"

اس نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔

"یسوع مسیح نے تیری جان بچا لی ہے۔ اس کنویں میں آج تک کوئی زندہ نہیں بچا۔"

میں نے چوکیدار کا شکریہ ادا کیا اور سات شیروں والے فوارے کے قریب سے گزر کر ویران محل کے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ وہاں میرا گھوڑا بلوط کے پیڑ تلے بندھا ہوا تھا۔ میں اس پر سوا ہوا اور غرناطہ کے محل سے نکل کر سیدھا چوبرجی باغ والے آسیبی قلعے کی جانب روانہ ہو گیا۔

ابھی رات کا تیسرا پہر تھا اور میں گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا ساتویں پہاڑی کا چکر کاٹ کر، میں نے پہاڑی کی چڑھائی پر گھوڑا ڈال دیا۔

میری جذباتی حالت اس وقت بڑی ہیجان خیز تھی۔ ابن سراج کی روح کے بیان کے مطابق ابن حمید اسی آسیبی قلعے کے کسی تہہ خانے میں قید تھا۔ میں ابن حمید کو چھڑا لینا چاہتا تھا۔

میں گھوڑے کو قلعے کے صدر دروازے کی طرف لے جانے کی بجائے اس کی عقبی دیوار کی طرف لے آیا۔ میں گھوڑے کو قدم قدم چلاتا قلعے کی خشک خندق میں سے نکال کر قلعے کی ٹوٹی پھوٹی پرانی دیوار کے پاس لے آیا۔ اس وقت میرے پاس تلوار بھی نہیں تھی۔ رسی کہاں سے لاتا۔

گھوڑے کو ایک طرف کھڑا کر کے دیوار کا قریب سے جائزہ لیا۔ اس کے بڑے پتھر جگہ جگہ سے اکھڑے ہوئے تھے۔ میں نے خدا کا نام لے کر دیوار کے شگافوں میں پاؤں لٹکا کر اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ بڑی مشکل اور سخت کوشش کے بعد میں دیوار کے اوپر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ قلعے کی غلام گردش تھی۔ ایک برجی میں سے پتھر کا زینہ نیچے جاتا تھا۔ مجھے اس مقام کی تلاش تھی جہاں سے قلعے کے تہہ خانے کو راستہ جاتا تھا۔

غلام گردش کوٹھڑیاں اندھے کنوؤں کی طرح ویران پڑی تھیں۔ ایک سانپ پھنکارتا ہوا میرے قریب سے نکل کر ایک کوٹھڑی میں غائب ہو گیا۔ غلام گردش میں کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر ایک ستون کے پاس مجھے روشنی سی نظر آئی۔ یہ گویا کسی چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی تھی جو ایک پل کے لئے ابھر کر بجھ گئی۔ میں ستونوں کی آڑ لیتا اس طرف بڑھا۔ وہاں پہنچا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اچانک میری نظر قریبی کوٹھڑی پر پڑی۔ وہاں کوئی شے انگارے کی طرح زمین پر پتھروں کے درمیان پڑی دھک رہی تھی۔ قریب جا کر دیکھا تو یہ ایک لعل تھا جو اندھیرے میں پڑا چمک رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا تو وہ بجھ گیا اور فضا میں ایک دبی ہوئی چیخ بلند ہوئی۔ میں نے لعل زمین پر پھینک دیا اور پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

لعل زمین پر بجھے ہوئے کوئلے کی طرح پڑا تھا۔ میرے سوال کا کسی نے جواب نہ دیا۔ خدا جانے یہ کس کی آواز تھی۔ میں اٹھ کر غلام گردش میں آ گیا۔ قلعے کا صدر دروازہ مجھے غلام گردش کے خم کے ساتھ مغرب کی سمت نظر آنے لگا تھا۔ رات کی تاریکی میں ایک گھڑ سوار گھوڑا دوڑاتا قلعے میں داخل ہوا۔ اس کا سیاہ لبادہ اس کے پیچھے لہرا رہا تھا۔ وہ غلام گردش کے اولین ستونوں کے درمیان اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں اس طرف چلا کہ شاید قلعے کا تہہ خانہ ادھر ہو اور ہو سکتا تھا کہ یہ ڈان کارلو اور بد معاش لاترے کے آدمی ہوں۔ قلعے کے صدر دروازے کے پہلو میں جہاں سے غلام گردش شروع ہوتی تھی۔ ایک ڈھلانی راستہ نیچے زمین کے اندر جاتا تھا۔ گھڑ سوار اسی راستے پر اترنے لگا ہی تھا کہ اندھیرے میں ایک قد آور سپاہی جس نے تلوار لٹکا رکھی تھی لپک کر میری طرف بڑھا اور اس نے تلوار کھینچ لی اور ہسپانوی میں بولا۔ "کون ہو تم؟"

میں نے تھوڑا سا جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں عیسائی سیاح ہوں۔ قلعے میں بھٹک گیا ہوں۔ مجھے باہر جانے کا راستہ نہیں مل رہا۔"

سپاہی نے تلوار کی نوک میرے چہرے کے سامنے نچاتے ہوئے کہا۔

"کیا تم قلعے کے صدر دروازے کو نہیں دیکھ رہے؟"

"کہاں ہے صدر دروازہ؟ مجھے تو کہیں نظر نہیں آ رہا۔"

میں نے انجان بنتے ہوئے جواب دیا۔ سپاہی مجھے گردن سے دبوچ کر جدھر سے وہ

آیا تھا۔ اس طرف لے گیا۔ یہاں پر درختوں کے اندھیرے مین ایک چھوٹی سی چوکی بنی تھی جس کی چھت ڈھلانی اور دیواریں پتھر کی تھیں۔ یہاں پہلے ہی سے ایک سپاہی بنچ پر بیٹھا تھا۔ مجھے اس سپاہی کی طرف دھکیل دیا گیا۔

میں نے اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ دیا تھا تاکہ مجھے پتہ چل سکے کہ یہ لوگ کون ہیں اور انہوں نے ابن حمید کو کہاں چھپا رکھا ہے۔ دوسرے سپاہی نے میری کمر پر زور سے لات ماری اور بولا۔

"اس کو زندہ کس لئے چھوڑ آ ہے تم نے۔ یہ دشمن کا آدمی ہے۔ اسے اسی جگہ قتل کر کے دبا دو۔"

دوسرا سپاہی تلوار لہرا کر بولا۔

"اس کو دبائیں گے نہیں۔ اس کی بوٹیاں ہمارے کتے اور گدھ کھائیں گے۔"

"ٹھہرو۔ میں اس کی گردن اڑاتا ہوں۔ میں اپنی نئی تلوار کی آزمائش کرنا چاہتا ہوں۔"

بنچ پر بیٹھے ہوئے سپاہی نے اتنا کہا اور قریب رکھی تلوار پکڑ کر میری طرف بڑھا۔ میں زمین سے اٹھ کر سنبھل کر کھڑا ہو گیا---- یہ کم بخت مجھے ہلاک کرنے میں پورے سنجیدہ تھے۔ یعنی بڑی سنجیدگی سے اپنی موت کو گلے لگانے کا عہد کر چکے تھے۔

دوسرا سپاہی ایک پاؤں بنچ پر ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ ستاروں بھری رات میں یہاں ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ پہلا سپاہی بولا۔

"سامنے سے وار کرنا۔"

پھر اس نے مجھے حکم دیا کہ میں گردن جھکا لوں۔ میں نے خاموشی سے اس کے حکم کو تسلیم کرتے ہوئے گردن جھکا دی۔ تلوار کا ایک وار بڑی زور سے میری گردن پر پڑا۔ ایک جھنکار کی آواز بلند ہوئی اور تلوار کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ میں نے گردن سیدھی کر لی۔ میرے جلاد نے چیخ کر کہا۔

"اس نے گردن پر فولاد کی جالی پہنی ہوئی ہے۔"

پہلا سپاہی تلوار سونت کر میری طرف لپکا۔ اس نے اپنی تلوار میرے سینے میں گھونپنی چاہی۔ اس کی تلوار کی نوک میرے فولادی سینے سے ٹکرا کر چٹ گئی اور وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ میں اپنی جگہ پر اسی طرح کھڑا رہا۔ جس کی تلوار ٹوٹی تھی' اس نے خنجر نکال لیا۔ اب مجھ پر ایک طرف سے تلوار اور دوسری طرف سے خنجر سے حملے شروع ہو گئے۔

تب میں نے اپنی طاقت کے مظاہرے کا فیصلہ کیا اور ایک سپاہی کے ہاتھ سے تلوار جھپٹ کر اپنے ہاتھ میں پکڑی۔ خنجر والے نے میرے پیٹ پر پوری طاقت سے خنجر مارا۔ خنجر ٹوٹ گیا اس کے ہاتھ سے خون بہنے لگا۔ میں نے تلوار کے ایک ہی وار سے اس بدبخت کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ دوسرا سپاہی سہم کر ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ نہتا تھا۔ اس کی تلوار میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے تلوار اس کی طرف اچھالی۔ اس نے تلوار دوبارہ تھام لی مگر اب وہ مجھ پر حملہ کرتے ہوئے کچھ ڈر رہا تھا۔

میں اس کے قریب آ گیا۔

"اب یہ بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو اور تم یہاں کس کے حکم پر پہرہ دے رہے ہو؟"

سپاہی ساکت کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"تم نے دیکھ لیا کہ تم مجھے ہلاک نہیں کر سکتے۔ اب اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہ دیا تو تمہارا حشر بھی یہی ہو گا۔ جو تمہارے ساتھی کا ہوا۔ اب بتاؤ کہ ڈان کارلو نے جس نوجوان کو قید کر رکھا ہے وہ کہاں ہے؟"

سپاہی نے کوٹھری کی سمت اشارہ کر کے کہا۔

"اس کوٹھری میں----- وہ اس کوٹھری میں ہے۔"

پتھر کی دیواروں والی کوٹھری پاس ہی تھی۔ میں جلدی سے کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ ادھر میں داخل ہوا ادھر اس سپاہی نے لکڑی کا دروازہ بند کر کے باہر کی کنڈی لگا دی۔ میں نے ایک ہی دھکے سے دروازہ توڑ دیا اور چھلانگ لگا کر چیتے کی طرح بھاگتے ہوئے سپاہی پر گرا اور اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"بدبخت کیوں اپنی موت کو پکار پکار کر بلا رہا ہے۔ مجھے ڈان کارلو کے قیدی کا پتہ بتا دو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

اس نے ڈھلائی راستے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اس طرف۔ وہ اس طرف ہے۔"

یہ اس سپاہی نے اپنی جان بچانے کے لئے کہا تھا یا اس میں کوئی سازش تھی؟ میں نے اس پر غور کرنا ضروری نہ سمجھا اور اسے وہیں چھوڑ کر جانے لگا تو خیال آیا کہ یہ شخص کسی کو جا کر اطلاع دے سکتا ہے۔ میں نے کوٹھری میں اسے ایک ستون کے ساتھ کس کر باندھ دیا اور خود ڈھلائی راستے پر سے اترنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں یہ گھوڑوں کا اصطبل ہو گا۔

ڈھلان ختم ہو گئی تھی۔ مجھے آگے اندھیرے میں گھوڑے کے زمین پر کھر مارنے کی

آواز آئی۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ سامنے اندھیرے میں مجھے ایک محرابی دروازہ دکھائی دیا۔ اس کے باہر ایک گھوڑا بندھا تھا۔ غالباً" یہ وہی گھوڑا تھا جس پر میں نے ایک سوار کو قلعے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ محرابی دروازہ کھلا تھا۔ اس کے اندر اندھیرا تھا۔ میں ایک طرف خاموش کھڑا ہو کر ماحول کا جائزہ لینے لگا۔

اندھیرے میں روشنی سی جھلکنے لگی۔ کوئی دروازے کے اندر سے مشعل ہاتھ میں لئے باہر آ رہا تھا۔ اب مجھے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ میں نے اپنے آپ کو ایک کھمبے کے پیچھے چھپا لیا۔ دروازے میں دو آدمی نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک گھڑ سوار تھا جس کی سیاہ عبا پیچھے لٹک رہی تھی اور دوسرے آدمی کو بھی میں نے مشعل کی روشنی میں پہچان لیا۔ یہ ڈان کارلو کا جرائم پیشہ ساتھی لاترے تھا جس کے گال پر زخم کا لمبا نشان مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔

گھڑ سوار نے مشعل لاترے کے ہاتھ دی اور گھوڑے پر سوار ہو کر واپس مڑا۔ لاترے اسے باہر جاتے دیکھتا رہا۔ مشعل اس کے ہاتھ میں تھی۔ تلوار اس کی کمر سے لٹک رہی تھی۔ جب گھڑ سوار اصطبل سے باہر نکل گیا تو لاترے دروازے کے اندھیرے میں واپس چلا گیا۔ مشعل کی روشنی کچھ دیر تک نظر آتی رہی پھر غائب ہو گئی۔

تب میں آگے بڑھا۔ محرابی دروازے میں داخل ہوا۔ سپاہی نے ٹھیک مخبری کی تھی۔ اگر لاترے یہاں پر ہے تو ابن حمید بھی اسی جگہ قید ہو گا۔ میں اندھیرے میں غور سے دیکھتا قدم قدم بڑھ رہا تھا۔ یہ ایک چھتی ہوئی طویل ڈیوڑھی تھی۔ اچانک کسی عورت کے ہنسنے کی نقرئی آواز آئی۔ میں وہیں رک گیا پھر کوئی ساز بجا اور عورت نے اونچے اونچے سروں میں گانا شروع کر دیا۔ یہ ہسپانوی گیت تھا جس میں محبت اور ہجر و فراق کے جذبات موجزن تھے۔ ایک جگہ دیوار سے روشنی کی کرنیں باہر نکل رہی تھیں۔ عورت کے گانے کی آواز بھی اسی کمرے یا کوٹھری سے آ رہی تھی۔

پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے درزوں سے جھانک کر اندر دیکھا۔ اندر مشعل روشن تھی۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔ قالین پر لاترے کے دو ہسپانوی غنڈے قسم کے کڑیل جوان بیٹھے کھانے پینے میں مشغول تھے اور ان کے درمیان ایک عورت ساز بجاتی ہوئی گا رہی تھی اس کے سنہرے بالوں میں گلاب کے سرخ پھول سجے ہوئے تھے۔ ڈان کارلو اور ابن حمید وہاں کہیں نہیں تھے۔ میں نے ڈیوڑھی میں آگے جا کر ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے کوئی کوٹھری دکھائی نہ دی۔ کیا ابن حمید اس کے بھی نیچے کسی تہہ خانے میں قید ہے؟

میں واپس لاترے والی کوٹھری کے پاس آ گیا۔

ہسپانوی دوشیزہ بڑے پرسوز انداز میں گا رہی تھی۔ میں نے درز میں دیکھا۔ عورت اب رقص کر رہی تھی۔ اس نے ساز ہاتھ سے رکھ دیا۔ اس کے ساتھ لاترے بھی رقص کرنے لگا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس کوٹھری کی دیوار میں ایک چھوٹا سا طاق کھلا۔ اس میں سے ایک حبشی برآمد ہوا۔ اس نے کچھ کہا۔ رقص بند ہو گیا۔ لاترے اپنے دونوں ساتھیوں کو لے کر طاق کے اندر چلا گیا۔ کوٹھری میں ہسپانوی رقاصہ قالین پر بیٹھ گئی جیسے تھکان اتار رہی ہو۔

عین اس وقت میرے پاؤں تلے ایک پتھر چرچرایا۔ رقاصہ نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور تیزی سے خنجر نکال کر دروازے کی طرف بڑھی۔ میں فورا" پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ ایک دم سے دروازہ کھلا اور ہسپانوی دوشیزہ نے پوچھا۔ "کون ہو تم؟" میں نے لپک کر اس کا منہ ہاتھ سے بند کر دیا۔ اس کی گردن پر میرا ہاتھ تھا اور میں نے اس کے ہاتھ سے خنجر چھین لیا تھا۔ میں نے اس کے کان میں آہستہ سے کہا۔

"کیا دوسری کوٹھری میں کوئی خوبصورت نوجوان قید ہے؟"

"ہاں ہاں۔"

ہسپانوی رقاصہ کے حلق سے اٹک اٹک کر یہ الفاظ نکلے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکی کا کیا کروں۔ یہاں ایک جنگ ہر حالت میں برپا ہونے والی تھی۔ اور میں اس جنگ کے لئے پوری طرح تیار ہو کر آیا تھا۔ خطرہ صرف اس بات کا تھا کہ اس جنگ میں ابن حمید نہ مارا جائے۔ بدمعاش لاترے میری شکل پہچانتا تھا۔ ورنہ میں باقیوں کو جل دے سکتا تھا۔

میں ہسپانوی رقاصہ کو واپس کوٹھری میں لے آیا۔ اس نے اندر آتے ہی یک لخت چیخ ماری۔ اس کے ساتھ ہی طاق کھل گیا۔ اور اس کے اندر سے لاترے، اس کے دونوں غنڈے اور حبشی غلام باہر نکل آئے۔ مجھے دیکھتے ہی لاترے نے تلوار سونت لی اور دوسرے غنڈوں نے بھی خنجر نکال لئے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس طاق کے اندر جو کوٹھری ہے وہاں ابن حمید قید ہے اور میرے اندازے کے مطابق اس وقت اس کے پاس کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جو اس پر حملہ کر سکتا۔ میں لپک کر طاق کے منہ پر آ گیا۔

لاترے نے تلوار کا وار کیا۔ میں نے بازو اٹھا کر اس کی تلوار کو پکڑ لیا اس نے زور سے تلوار کھینچی اس کا خیال تھا کہ میرا ہاتھ درمیان سے کٹ جائے گا لیکن میرے ہاتھ سے خون کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔ لاترے اور اس کے ساتھ ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ میں نے لاترے کو پر امن طریقے سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ابن حمید کو

میرے ساتھ روانہ کر دے اسے شاہی خزانے کا علم نہیں ہے۔

لاترے نے الٹا مجھے انتہائی غلیظ گالی دی اور تلوار کا ایک بھرپور وار میری گردن پر کیا۔

گالی نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ میں سب کچھ تو برداشت کر سکتا تھا مگر گالی کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں بڑے سکون سے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے دوسرا وار کیا اس کی تلوار میرے شانے سے ٹکرا کر دو ٹکڑے ہو گئی۔ میں نے ایک ہاتھ اس کی گردن اور دوسرا اس کی ٹانگوں میں ڈال کر اسے اوپر اٹھا لیا۔ اس کے پالتو غنڈے میرے جسم پر پے در پے خنجروں کے وار کر رہے تھے۔ میں نے پوری طاقت سے لاترے کو اپنے بازوں پر بلند کر کے نیچے زمین پر دے مارا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے جسم کی کوئی ہڈی سلامت نہیں رہی ہو گی۔ وہ چرمرسا ہو گیا اس کی ریڑھ کی ہڈی کئی جگھوں سے پرزے پرزے ہو گئی۔ وہ چکا تھا۔ اس کا جسم ابھی تک آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔

اب تو اس کے غنڈے اور حبشی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے دونوں غنڈوں کو بھی باری باری زمین پر دے مارا۔ گرتے ہی ان کی ہڈیاں بھی چکنا چور ہو گئیں ہسپانوی رقاصہ دہشت زندہ ہو کر دیوار کے ساتھ سمٹی بیٹھی تھی۔ حبشی غلام میری طاقت سے مرعوب ہو کر میرے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ اپنی افریقی زبان میں مجھے دیوتا کہہ کر بار بار سجدے کرنے لگا۔

میں طاق سے نکل کر دوسری طرف گیا تو دیکھا کہ ابن حمید ایک تختے کے ساتھ رسیوں میں جکڑا نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہے۔ میں نے جلدی جلدی رسیاں کھولیں۔ اسے کاندھے پر ڈالا اور دوسرے کمرے میں لے آیا۔ قالین پر لٹا کر اس کے حلق میں پانی ٹپکایا۔ ہسپانوی رقاصہ اور حبشی غلام بھی میری مدد کر رہے تھے۔

میں نے لاترے اور اس کے غنڈوں کی لاشوں کو گھسیٹ کر دوسری تاریک کوٹھری میں ڈال دیا۔ ابن حمید نے تھوڑی ہی دیر بعد آنکھیں کھول دیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور کمزور آواز میں بولا۔ "وہ لوگ کہاں ہیں؟"

"وہ کیفر کردار تک پہنچ چکے ہیں میرے آقا!" میں نے جواب دیا۔

ابن حمید نے بتایا کہ دو روز سے اس نے کچھ نہیں کھایا۔ وہ لوگ اسے بھوکا رکھ کر اس سے کسی خزانے کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ ہسپانوی دوشیزہ نے ایک طاق سے کچھ پھل اور گوشت کے سوکھے قتلے نکال کر ابن حمید کو دیئے۔ میں نے اسے مشروب

پلایا۔ چند لمحوں میں ابن حمید کی کھوئی ہوئی طاقت واپس آ گئی۔ حبشی غلام ابن حمید کے پاؤں داب رہا تھا۔ ہسپانوی دوشیزہ مجھ سے بار بار پوچھ رہی تھی کہ میرے پاس کون سا جادو ہے کہ مجھ پر تلوار کا اثر نہیں ہوا۔ ابن حمید نے تعجب سے پہلے ہسپانوی دوشیزہ کی جانب اور پھر میری طرف دیکھا۔ "یہ خاتون کیا کہہ رہی ہے عبد اللہ؟"

میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی کیونکہ ابن حمید ابھی تک میری خفیہ طاقتوں سے واقف نہیں تھا۔ لیکن حبشی غلام نے بھی ہسپانوی دوشیزہ کی تائید کی اور کہا کہ میں دیوتا ہوں اور میں نے اپنی دیوتائی طاقت سے لاترے اور اس کے دو ساتھیوں کو بغیر ہتھیار کے ہلاک کیا ہے۔ میں نے ابن حمید سے کہا۔ "یہ باتیں پھر ہوں گی پہلے ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے۔"

ہسپانوی دوشیزہ نے کہا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ جائے گی کیونکہ لاترے کے قتل کے بعد اس کے رشتے دار اس جرم کی پاداش میں اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ حبشی غلام نے کہا کہ وہ قرطبہ اپنے مالک کے پاس چلا جائے گا۔ ابن حمید بغیر کسی سہارے کے اٹھا اور ہم اس تاریک اصطبل سے نکل کر چوبرجی باغ کے آہنی قلعے کے صدر دروازے میں آ گئے۔ یہاں پر پہریداروں کی کوٹھری کے پیچھے دو گھوڑے مل گئے۔ میرا گھوڑا قلعے کے باہر موجود تھا۔ حبشی یہاں ہم سے الگ ہو گیا۔ ہسپانوی دوشیزہ کا نام ڈونا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ حبشی مجھے مشکوک لگتا ہے ہو سکتا ہے یہ ڈان کارلو کو جا کر قیدی ابن حمید کے فرار اور لاترے کی موت کے بارے میں خبر دے۔" ابن حمید بولا۔

"وہ غلام ہے۔ ہم نے اسے آزاد کر دیا ہے۔ اب ہم اسے دوبارہ نہیں پکڑیں گے۔ چلو عبداللہ خدا ہماری حفاظت کرے گا۔"

میں ابن حمید اور ہسپانوی دوشیزہ ڈونا گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے قلعے کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ساتویں پہاڑی کی وادی میں سے گزرنے لگے۔ اب رات کا پچھلا پہر ہو گیا تھا۔ ہم ڈھلتی رات کے کافوری اندھیرے میں بلوط کے جنگل میں سے گزر کر اپنی سرائے کی طرف جا رہے تھے۔

سرائے میں پہنچ کر ہسپانوی دوشیزہ ڈونا نے مشورہ دیا کہ ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ اسے اب خطرہ تھا کہ حبشی غلام نے ضرور مخبری کر دی ہو گی اور ڈان کارلو غرناطہ کا با اثر جرنیل ہے وہ پوری فوج لے کر اپنے دوست کا بدلہ لینے ضرور پہنچ جائے گا۔

ڈونا کی اس تجویز کو ابن حمید نے پسند نہ کیا۔ اس نے کہا کہ وہ سب کا مقابلہ کرے گا۔ پہلے انہوں نے مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ اب میں ایک بہادر شہزادے کی شان سے ان

سے نبرد آزما ہوں گا۔

لیکن مجھے ڈونا کی تجویز نے متاثر کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ڈان کارلو سپاہیوں کا دستہ لے کر یہاں حملہ آور ہوا تو مجھے کچھ نہیں ہو گا لیکن ابن حمید کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ بہرحال ہم نے باقی رات سرائے میں بسر کی۔ دوسرے روز ابھی سورج نکلے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ سرائے کے باہر گھوڑوں کی ٹاپوں اور ہنہنانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ میں جاگ رہا تھا۔ میں نے سرائے کے دروازے میں آ کر دیکھا۔ کہ ہسپانوی سپاہیوں کا ایک مسلح دستہ وہاں پہنچ گیا تھا۔ ڈان کارلو سیاہ گھوڑے پر سوار نیزہ ہاتھ میں لئے آگے آگے تھا۔ حبشی غلام نے مخبری کر دی تھی۔

میں بھاگ کر واپس کوٹھری میں آیا۔ ابن حمید اور ہسپانوی دوشیزہ ڈونا کو جگایا۔ ابن حمید کو صورت حال کا علم ہوا تو اس نے تلوار کھینچ لی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مقابلے کے لئے باہر نکلے لیکن ابن حمید کی رگوں میں بہادر مور شہنشاہ کا خون گردش کر رہا تھا وہ ڈان کارلو سے دو دو ہاتھ کرنے پر مصر تھا۔

اتنے میں ڈان کارلو کے سپاہیوں نے دھاوا بول دیا۔ وہ سرائے کے صدر دروازے میں گھوڑے دوڑاتے گھس آئے اور سرائے کی تمام کوٹھریوں کا محاصرہ کر لیا۔ ڈان کارلو ان کی قیادت کر رہا تھا۔ انہوں نے کوٹھری کے دروازے توڑ کر مسافروں کو باہر نکال کر زمین پر لیٹنے کا حکم دیا۔ سپاہی ہر کوٹھری کا دروازہ توڑنے لگے۔ میں نے ابن حمید سے کہا۔

"میرے آقا! پہلے میں دشمن کا مقابلہ کروں گا۔ آپ یہاں سے باہر نہیں نکلیں گے۔"

ابن حمید پر میری بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ ٹوٹ گیا۔ سپاہی نے ہمیں باہر نکلنے کا حکم دیا۔ ابن حمید نے تلوار لہرا کر کہا۔ "خدا کی قسم مجھے تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم ڈان کارلو کو کہو کہ میرے سامنے آئے۔ میں اندلس کا آخری شہزادہ ہوں۔ میں ڈان کارلو سے اپنے آباؤ اجداد پر توڑے گئے مظالم کا بدلہ لوں گا۔"

ڈان کارلو نے ابن حمید کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے سپاہیوں کو پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیا اور گھوڑے سے اتر کر تلوار ہاتھ میں لئے ابن حمید کے سامنے آ گیا۔

"ابن حمید! تم اندلس کے شاہی خاندان کی آخری شمع ہو اور میں اس شمع کو بجھانے آیا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی ڈان کارلو نے تلوار کا وار کیا جسے ابن حمید نے بڑی مہارت سے اپنی تلوار پر روک لیا۔ اب دونوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ ابن حمید بڑی بہادری اور شاہی

مہارت کے ساتھ تلوار چلا رہا تھا۔ ڈان کارلو کے لئے اس کے وار کو روکنا مشکل ہو گیا۔ و پیچھے ہٹتے ہٹتے سرائے کی دیوار کے ساتھ جا لگا تھا۔ ابن حمید نے ایک بھرپور وار سے ڈان کارلو کی تلوار اس کے ہاتھ سے گرا دی۔ تلوار کے گرتے ہی ابن حمید نے اپنی تلوار بھی [illegible] ن اور کہا۔

"خدا کی قسم میرے ہاتھ تلوار بن کر تم پر حملہ آور ہوں گے۔"

اب سپاہی تلوار اور نیزے تانے ابن حمید کی طرف جھپٹے یہ عالم دیکھ کر میں کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ میں اپنی جگہ سے چھلانگ لگا کر اچھلا اور ابن حمید اور سپاہیوں کے درمیان آ گیا۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ ابن حمید کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر اسے سرائے کی کوٹھری میں کھینچتا ہوا لے گیا۔

مجھ پر تیروں کی بوچھاڑ پڑی۔ سارے کے سارے تیر میرے جسم سے ٹکرا کر ٹیڑھے ہو کر زمین پر گر پڑے۔ میں نے ابن حمید کو اپنی طاقت کے بل پر کوٹھری میں جا کر بند کر دیا۔ ڈونا پہلے ہی یہاں سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔

میں سپاہیوں کی طرف لپکا۔ زمین پر گری ہوئی تلوار اٹھانے کے لئے جھکا تو ایک سپاہی نے نیزہ میری کمر پر پوری طاقت سے پھینکا۔ نیزہ میرے آر پار ہو سکتا تھا اگر میں عاطون نہ ہوتا۔ میں نے دائیں ہاتھ میں تلوار اٹھا کر بائیں ہاتھ سے نیزہ پوری طاقت کے ساتھ سپاہی کی طرف پھینکا۔ نیزہ قیامت خیز تیزی کے ساتھ سپاہی کے سینے کو چیرتا دوسرے، تیسرے اور پھر چوتھے سپاہی کے سینے سے آر پار ہو گیا۔ کچھ سپاہی میری اس طلسمی طاقت سے دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔

یہ محیر العقول منظر ڈان کارلو نے بھی دیکھا تھا لیکن وہ ایک بہادر جرنیل تھا۔ اس نے اپنے ایک سپاہی سے تلوار لی اور میرے مقابلے پر اتر آیا۔ وہ اس کوٹھری کی طرف جانا چاہتا تھا۔ جہاں میں نے ابن حمید کو بند کر رکھا تھا۔ میں کوٹھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اور ڈان کارلو کو آخری بار تنبیہہ کی کہ وہ میرے مقابلے پر نہ آئے۔ ڈان کارلو نے جواب یوں دیا کہ مجھ پر تلوار کا بھرپور وار کر دیا۔ تلوار سیدھی میرے سر پر آ کر پڑی اور اچٹ گئی۔ ڈان کارلو دیکھ رہا تھا کہ میرا سر ننگا ہے میں نے کوئی آہنی خود نہیں پہن رکھا۔ اس منظر سے ایک بار تو وہ بھی چکرا گیا۔ میں نے اسے پھر اپنے مقابلے سے باز رہنے کو کہا۔ مگر جانے وہ کیوں مجھے ہلاک کرنے یا خود ہلاک ہونے پر تلا ہوا تھا۔

دوسرا وار اس نے سیدھا میرے شانے پر کیا اس وار کو میں نے روکنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ تلوار کا وار کرتے ہوئے وہ آگے جھکا تو میں نے تلوار کا ہاتھ اس کے

بازو پر مارا۔ میرے دیکھتے ہی اس کا بازو کٹ کر نیچے گر پڑا۔ وہ ایک ہی ہاتھ سے لڑنے لگا۔ دوسرے وار سے میں نے اس کا دوسرا بازو کاٹ دیا۔ یہ معاملہ دیکھ کر باقی سپاہیوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ دو سپاہیوں کو میں نے گھوڑے پر سے کھینچا اور انہیں ہوا میں اچھالا اور وہ سرائے کی چھت پر جا گرے۔

دوسرے سپاہی دہشت زدہ ہو کر بھاگ گئے۔

ڈان کارلو خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے کوٹھری کا دروازہ کھول دیا۔ ابن حمید اور ڈونا نے میدان کارزار میں ڈان کارلو اور دوسرے سپاہیوں کی لاشوں کو دیکھا تو دنگ رہ گئے۔

تھوڑی دیر بعد ہم تینوں سرائے کے باہر لوگوں کو حیران چھوڑ کر ہسپانیہ کے سرحدی علاقے کی طرف سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے جا رہے تھے۔ غرناطہ سے فرانس کی سرحد تک خشکی کا راستہ کئی مہینوں کے سفر پر تھا۔ ہم ایلویرا بندرگاہ کی طرف بڑھ رہے تھے جو ہسپانیہ کے بحیرہ روم والے ساحل کی بندرگاہ تھی اور غرناطہ سے چار روز کی مسافت پر تھی۔

یہ چار روز کا سفر ہم نے اس انداز سے طے کیا کہ دن بھر سفر کرتے اور رات کو کسی گاؤں کے باہر آرام کرنے کے لئے ٹھہر جاتے۔

جس روز ہم ہسپانیہ کی بحیرہ روم والی بندرگاہ ایلویرا پہنچے اس روز وہاں کوئی جشن منایا جا رہا تھا۔ قدیم بندرگاہی شہر کی سڑکوں پر جلوس نکلے ہوئے تھے۔ عورتیں اور مرد رنگ برنگ لباس پہنے باجے بجاتے، سازوں کی دھن پر رقص کرتے گزر رہے تھے۔

ہم نے احتیاط سے کام لیا اور بندرگاہ سے دور ایک ساحلی سرائے میں آ کر ٹھہر گئے۔ ایلویرا بندرگاہ سے شمالی افریقہ کے ملک فونیقہ کا ساحل چھ روز کے سمندری سفر پر تھا۔ معلوم ہوا کہ ایک باربردار بادبانی جہاز جس میں مسافر بھی سوار ہوں گے تین روز بعد ایلویرا سے شمالی افریقہ کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔ ہم نے سفر کے لئے کھانے پینے کا ضروری سامان خرید کر ساری تیاری مکمل کر لی۔ یہاں ساحلی سرائے میں ابن حمید نے مجھ سے میری مافوق الفطرت طاقت کا راز معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ سب اللہ کی دین ہے۔ مجھے خد معلوم نہیں کہ اچانک یہ طاقت کہاں سے آ جاتی ہے۔ ڈونا کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مجھے کسی دوسری دنیا کی مخلوق سمجھے بیٹھی ہے۔

تیسرے روز ہم بادبانی جہاز پر سوار ہو گئے۔

جہاز شمالی افریقہ کی طرف روانہ ہوا تو ابن حمید نے آخری بار ہسپانیہ کے ساحل کو پیچھے ہٹتے دور سے دور تر ہوتے دیکھا اور آہ بھر کے بولا۔

"اندلس کی سرزمین! شاید میں تمہیں آخری بار دیکھ رہا ہوں۔"

موسم خوشگوار تھا۔ ہوا موافق سمت میں چل رہی تھی۔ جہاز بہت جلد اندلس کے ساحل کو پیچھے چھوڑ کر کھلے سمندر میں داخل ہو گیا۔ تین دن کے سمندری سفر کے بعد ہمارا جہاز فونیقہ ملک کی بندرگاہ آرمیز پر آ لگا۔

یہاں سے ہم ایک کارواں کے ساتھ ہو لئے اور صحرا میں سفر کرتے قرطاجنہ جا پہنچے۔

قرطاجنہ میں ابن حمید کو دیکھ کر اندلس کے باقی ماندہ شاہی خاندان کے افراد بہت خوش ہوئے۔ اس کی آمد پر شاہی حویلی میں دو روز تک جشن منایا گیا۔ محتاجوں میں خیرات تقسیم کی گئی۔ اب میرا ارادہ یہاں ٹھہرنے کا نہیں تھا۔ میں کسی دوسرے ملک کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ ایک عرصہ گزر گیا تھا اور میرے ساتھ ابھی تک تاریخ کے اگلے دور میں اچانک نکل جانے کا حادثہ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے ابن حمید سے اپنے ارادہ کا اظہار کیا تو وہ اداس ہو گیا۔ وہ مجھے اپنے سے الگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر میرے اصرار پر وہ خاموش ہو گیا۔

دوسری جانب، ہسپانوی دوشیزہ ڈونا بھی اسکندریہ کی طرف کوچ کرنے کے لئے پر تول رہی تھی۔ طے پایا کہ ڈونا میری حفاظت میں سفر کرے گی میں اسے اسکندریہ پہنچا کر آگے کسی دوسرے ملک کی طرف نکل جاؤں گا۔ ابن حمید سے میں نے یہی کہا کہ مصر اپنے آبائی وطن جانا چاہتا ہوں۔

چنانچہ ایک روز میں اور ڈونا قرطاجنہ سے مصر جانے والے قافلے میں شامل ہو کر ملک مصر کی طرف روانہ ہو گئے۔

یہ کارواں زیادہ بڑا نہیں تھا۔ دس بارہ اونٹ تھے۔ جن پر کچھ مسافر اور زیتون کا تیل اور گرم مصالحوں کے بورے لدے تھے۔ ہسپانوی دوشیزہ ڈونا ایک الگ اونٹ کے کجاوے میں سوار تھی۔ اس کے لئے قافلہ سالار کو میں نے زیادہ رقم ادا کی تھی۔ میں دوسرے اونٹ پر سوار ڈونا کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ قافلہ رات کو سفر کرتا۔ دن کو جب صحرا میں تیز دھوپ نکل آتی اور تپ سے صحرا دہکنے لگتا تو کسی جگہ پڑاؤ ڈال لیا جاتا۔ صحرا میں ہمارا سفر جاری تھا۔ ایک روز قافلے نے تیز دھوپ نکلنے کے بعد کھجور کے درختوں کے جھنڈ میں قیام کیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں قالین پر درختوں کے سائے میں لیٹ گیا۔ ہسپانوی دوشیزہ ڈونا کسی کام سے چٹان کی طرف نکل گئی۔ وہ مجھے بتا گئی کہ میں ابھی واپس آتی ہوں۔ میں نے کوئی خیال نہیں کیا۔ اور آنکھیں بند کر کے اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ دوسرے

مسافر بھی کھانا کھانے کے بعد آرام کر رہے تھے۔ صحرا میں تپش تھی مگر درختوں کے نیچے ہوا ٹھنڈی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈونا کو گئے دیر ہو گئی ہے۔ سوچا ابھی واپس آ جائے گی لیکن جب اسے گئے ایک ساعت گزر گئی تو میں پریشان ہو کر اس کی تلاش میں بھوری چٹان کی طرف بڑھ گیا۔

چٹان صحرائی دھوپ میں تپ رہی تھی۔ یہاں ریت پر ڈونا کے قدموں کے نشان دیکھے جو چٹان کے عقب کی طرف جا رہے تھے میں ان نشانوں کے ساتھ ساتھ چٹان کے عقب میں گیا۔ یہاں ایک جگہ چٹان کی سنگین اور بالکل سیدھی دیوار کے پاس آ کر پاؤں کے نشان رک گئے۔ میں نے جھک کر دیکھا' ڈونا کی واپسی کے نشانات کہیں نہیں تھے۔ تو پھر وہ یہاں سے کہاں غائب ہو گئی؟

میں نے ڈونا کو دو چار آوازیں دیں۔ کسی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ یا خدا اس حسین ہسپانوی دوشیزہ کو زمین کھا گئی یا کسی چٹان نے اپنے اندر سما لیا؟ آخر وہ کہاں غائب ہو گئی؟ دو تین بار چٹان کے گرد چکر بھی لگائے۔ چٹان میں بھی کوئی کھوہ یا غار نہیں تھا۔ بڑی بڑی تین تکونی پتھریلی دیواریں ریت میں سے اٹھ کر اوپر جا کر آپس میں مل گئی تھیں۔

ڈونا کو تلاش کرتے کرتے جب شام ہو گئی تو قافلے کے کوچ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ڈونا ضرور کسی مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی آسیب کا شکار ہو گئی ہو۔ کیونکہ صحرائی چٹانوں کے آسیب کے بارے میں اکثر کہانیاں مشہور تھیں۔ میں اسے مشکل میں گرفتار چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے قافلہ سالار سے جا کر ڈونا کی گمشدگی کا ذکر کیا تو وہ بھی پریشان ہو گیا۔ رات کا اندھیرا ہونے تک ہم نے ڈونا کو جگہ جگہ تلاش کیا۔ قافلے کا ایک ماہر کھوجی اونٹ لے کر دور دور تک گیا۔ آ کر اس نے بتایا کہ صحرا میں کسی انسانی پاؤں کے نشان تک نہیں ہیں۔ آخر کار میں نے قافلہ سالار سے کہہ دیا کہ وہ قافلہ لے کر چلا جائے۔ میں ڈونا کے بغیر آگے نہیں جا سکتا۔ وہ میری ذمے داری تھی' میں اسے جب تک تلاش نہ کر لوں یہاں سے نہیں ہلوں گا۔

قافلہ چل دیا اور میں نخلستان میں اکیلا رہ گیا۔

شام کی روشنی ڈوب گئی۔ صحرا میں چاروں طرف اندھیرا ہو گیا۔ پھر ستاروں کی چمک پھیل گئی۔

اچانک مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی عورت لمبی درد بھری آواز میں کسی کو بلا رہی ہو۔ یہ بڑی ڈراؤنی آواز تھی۔ میری نگاہیں اپنے آپ چٹان کی طرف اٹھ گئیں جو

صحرائی رات کی پراسرار دھیمی روشنی میں کسی بہت بڑے دیو کی طرف آسمان کو تک رہی تھی۔ آواز اسی چٹان کی طرف سے آ رہی تھی۔ پھر ایک چراغ کی لو دکھائی دی جو چٹان کے پیچھے سے نکل کر آہستہ آہستہ اس کے گرد چکر لگا رہی تھی۔

میں اٹھ کر چٹان کی طرف بڑھا۔

میرے چٹان تک پہنچنے تک یہ چراغ کی لو اس کے عقب میں چلی گئی۔ ستاروں کی روشنی میں مجھے ریت پر کسی درندے کے پنجوں کے نشان نظر آئے۔ میں چٹان کی دوسری طرف آ گیا کیا دیکھتا ہوں کہ چٹان سے باہر نکلے ہوئے ایک چھوٹے سے پتھر پر ایک انسانی کھوپڑی پڑی تھی۔ جس کے اوپر چراغ جل رہا تھا۔ چراغ کی لو بالکل سیدھی تھی۔ اور ذرا سی بھی حرکت نہیں کر رہی تھی۔ عورت کی درد بھری آواز پھر سنائی نہیں دی تھی۔

میں قدم اٹھاتا چراغ والی کھوپڑی کے قریب آ کر رک گیا۔ میں نے جھک کر کھوپڑی کی طرف دیکھا تو حیرت زدہ سا ہو گیا۔ کھوپڑی کی آنکھوں کے سوراخوں میں سے دو انسانی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے کھوپڑی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم جو کوئی بھی ہو مجھے بتاؤ کہ ڈونا کو تم نے کہاں غائب کیا ہے؟"

کھوپڑی کی آنکھوں کے ڈیلے دائیں بائیں گھومنے لگے۔ میں نے اپنا سوال ایک بار پھر دہرایا۔ کھوپڑی کے ڈیلے ساکت ہو گئے۔ اس کے بھیانک منہ کے سوراخ میں سے وہی دل کو ہلا دینے والی آواز نکلی۔ اس آواز میں اس قدر دہشت اور کرب تھا کہ ایک بار تو خوف سے میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ ضرور کوئی طلسم یا آسیب تھا۔ ایسے طلسم اور آسیب میں بہت دیکھ چکا تھا۔ میں ڈونا کا سراغ لگانے کو بے تاب تھا۔ اس خیال سے کہ شاید یہ آسیب ہی مجھے ڈونا کے بارے میں کچھ بتا دے۔ میں نے اس سے سوال کیا تھا لیکن اس کی درد بھری چیخ سے لگتا تھا کہ وہ خود کسی آسیب میں گرفتار ہے۔

میں نے کھوپڑی سے ایک بار پھر پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیا کسی نے اس پر طلسم کر رکھا ہے؟ کھوپڑی کے ڈیلے ایک بار پھر دائیں بائیں گردش کرنے لگے۔ مجھے سخت غصہ آ گیا۔ میں نے پھونک مار کر چراغ گل کر دیا۔ چراغ کے بجھتے ہی ایک دلدوز نسوانی چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا کیا دیکھتا ہوں کہ جہاں انسانی کھوپڑی پڑی تھی وہاں ایک طاق بنا ہوا تھا۔ طاق کے اندر جھانکا تو اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ڈونا کی تلاش کا خیال مجھے اندر لے گیا۔

طاق کے اندر تین بڑے بڑے پتھروں کی سیڑھیاں اترتی تھیں۔ نیچے ایک دالان سا تھا۔ بالکل خالی ویران اور اندھیرا اس قسم کے دالان احرام مصر میں بنائے جاتے تھے۔ میں

آگے بڑھا ایک تنگ راستے سے گزرنے کے بعد ایک چوکور کمرہ آ گیا۔ یہاں درمیان میں چھوٹے سے چبوترے پر چراغ جل رہا تھا۔ اس کی روشنی سنہری نہیں بلکہ کافوری تھی۔ سامنے دیوار کے ساتھ ایک تابوت سیدھا لگا ہوا تھا۔ اس تابوت پر کپڑا پڑا ہوا تھا۔ میں نے کپڑا ہٹایا تو دیکھا کہ تابوت کے اندر ایک عورت کا حنوط شدہ جسم اس طرح کھڑا تھا کہ اس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ رکھے تھے لیکن اس کی گردن کے اوپر سر کی جگہ کھوپڑی لگی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا کہ کھوپڑی کی آنکھوں کے سوراخوں میں دو انسانی آنکھ کے ڈیلے میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ معاً میں چونک اٹھا۔ یہ وہی کھوپڑی تھی جس کے اوپر چراغ جل رہا تھا اور جو چٹان کے باہر پتھر پر رکھی تھی۔ میں وہاں سے ہٹنے لگا تو میرے دل میں جیسے کچھ الفاظ کا مفہوم اترتا چلا گیا۔

"عاطون----- عاطون----- اسے بچاؤ-----"

میں تیزی سے تابوت کے پیچھے گیا۔ وہاں سیڑھیاں اندھیرے میں نیچے اتر رہی تھیں ہو سکتا ہے یہاں ڈونا کسی مصیبت میں مبتلا ہو۔ میں سیڑھیاں اتر کر نیچے گیا تو اندھیرے میں سے ایک سانپ پھنکارتا ہوا میرے سامنے آ گیا۔ یہ سانپ زمین سے پانچ فٹ اوپر اٹھا اپنا بہت بڑا پھن پھیلائے جھوم رہا تھا۔ اس کی دو شاخہ سرخ زبان بار بار پھنکار کے ساتھ باہر نکل رہی تھی۔ تابوت والی لاش مجھے جانتی تھی۔ یہ سانپ میری طاقت سے ناواقف تھا ورنہ وہ کبھی اس طرح پھن اٹھا کر میرا راستہ نہ روکتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں وہاں سے آگے بڑھوں۔ لیکن میرے لئے یہ کام ناممکن نہیں تھا۔ میں نے آگے قدم اٹھایا تو سانپ نے نہ صرف میرے ماتھے پر ڈس لیا بلکہ میری گردن کے گرد شکنجہ کس دیا۔

بہت جلد سانپ کو محسوس ہو گیا کہ اس نے یہ حرکت کر کے بہت بڑی حماقت کی ہے۔ اپنی گردن سے اتار کر میں نے اسے اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو وہ تڑپ کر مجھ سے بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر میں اسے زندہ کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ سانپ کے چار ٹکڑے میں نے اندھیرے میں پھینکے اور آگے قدم اٹھائے۔ ابھی میں چند قدم ہی آگے چلا ہوں گا کہ اوپر تاریک چھت سے ایک سفید سی پھوار مجھ پر گرنے لگی۔

میں نے اوپر دیکھا اوپر جیسے تاریک بادل کا ایک ٹکڑا سفید بارش برسا رہا تھا۔ اس ناگہانی بارش سے بچنے کے لئے میں نے چاہا کہ وہاں سے بھاگوں لیکن یہ دیکھ کر میرے جسم میں حیرت کی لہر دوڑ گئی کہ میں اپنی جگہ سے پاؤں نہیں ہلا سکتا تھا۔ میں نے اپنے بازو ہلانے کی کوشش کی مگر میرے بازوؤں نے بھی حرکت سے انکار کر دیا۔ چھت پر سے سفید بارش کی پھوار گرنا بند ہو گئی۔ اسی اثناء میں، میں اپنی جگہ سر سے پاؤں تک پتھر بن چکا تھا

لیکن میری سماعت قائم تھی اور بصارت بھی بحال تھی۔ میں دیکھ رہا تھا اور سن بھی سکتا تھا۔ لیکن نہ بول سکتا تھا نہ حرکت کر سکتا تھا۔ یہ ایک عجیب سا سانحہ مجھ پر گزر گیا۔

اب میں اندھیرے میں پتھر کا مجسمہ بنا سوچ رہا تھا کہ آگے میرے ساتھ کیا گزرتی ہے۔ یہ کوئی بہت بڑا آسیب تھا جس نے مجھے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ اس قابل رحم حالت میں مجھے ابھی چند ثانیے ہی گزرے تھے کہ اندھیرے میں سامنے ایک روشنی ہوئی۔ پھر اس روشنی میں دو انسان جن کے سیاہ جسم چمک رہے تھے۔ ہاتھوں میں مشعلیں لئے میری طرف آتے دکھائی دیئے۔ ان کے درمیان ایک منڈے ہوئے۔۔۔۔۔۔۔ سر والا کاہن نما انسان سیاہ چغہ پہنے ہاتھ میں ترشول تھامے چلا آ رہا تھا۔ اس پر اسرار انسان کا لمبوترا چہرہ کرخت تھا اور آنکھوں میں درندگی کی چمک تھی۔

میرے قریب آ کر اس نے ترشول سے میری طرف اشارہ کیا۔

دونوں غلاموں نے مشعلیں دیوار کے ساتھ لٹکا دیں۔ کمر سے بندھی ہوئی رسی کھول کر میری گردن میں ڈالی اور مجھے زمین پر گرا کر گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ میرا جسم ایک لاش کی طرح زمین پر گھسٹتا چلا جا رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ میرے ساتھ کیا بیت رہی ہے۔ کچھ بھی ہو مجھے اتنا احساس ضرور ہو گیا تھا کہ یہ کاہن کوئی بہت بڑا جادوگر ہے۔ اس عالم میں بھی مجھے ڈونا کا خیال آ رہا تھا کہ وہ کہاں گئی ہو گی؟ تابوت کی لاش کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔

میری پتھربنی لاش کو گھسیٹتے ہوئے یہ غلام اپنے کاہن آقا کی معیت میں اندھیرے غار سے نکال کر ایک ایسے دالان میں لے گئے جہاں چھت کے ساتھ ایک شمع دان لٹک رہا تھا۔ میں نے دیکھا دالان بالکل خالی پڑا ہے۔ سیاہ فام غلاموں نے مجھے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ کاہن نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آسیبی آواز میں کہا۔

”تم نے میرے مہا ناگ کا خون کیا ہے۔ اب تمہیں باقی ساری زندگی موت و حیات کے درمیان معلق رہ کر میری خدمت کرنی ہو گی۔ میرا ہر حکم بجا لانا ہو گا اور پھر تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس غار میں زمین کھود کر دبا دیا جائے گا۔“

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ کوئی جواب بھی نہیں دے سکتا تھا۔ کاہن اپنا ترشول والا عصاء اٹھائے سیاہ فام غلاموں کے ساتھ دالان کے غربی دروازے میں داخل ہو گیا۔ میں دالان میں اکیلا رہ گیا۔ میں آنکھیں بند نہیں کر سکتا تھا مگر ڈیلوں کو دائیں بائیں گھما سکتا تھا۔ جانے کتنی دیر میں پتھر بنا وہاں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا رہا۔ شاید ایک دن گزر گیا۔ شاید دو دن گزر گئے ہوں گے کہ اسی غربی دروازے میں روشنی ہوئی اور وہی دو سیاہ فام حبشی

غلام نمودار ہوئے اس بار میرے گلے میں رسی ڈالنے کی بجائے انہوں نے مجھے کاندھوں پر اٹھا لیا۔

غربی دروازے کے آگے ایک راہداری تھی جہاں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر شمعیں لٹک رہی تھیں۔ پھر مجھے عجیب و غریب قسم کی مست کر دینے والی خوشبوئیں آنے لگی تھیں۔ راہداری کے آخر میں ایک اونچا لمبا دروازہ تھا۔ پہرے داروں نے اسے کھولا تو وہاں ایک عجیب پر اسرار سی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ فضا خوشبوؤں سے بوجھل تھی۔ یہ جادو ٹونے میں کام آنے والی جڑی بوٹیوں کی گہری خوشبوئیں تھیں۔ میری آنکھیں چھت کی طرف تھیں۔ چھت کے ساتھ دو شمع دان میں شمعیں دھیمی دھیمی روشنی دے رہی تھیں۔ مجھے ایک چبوترے پر ٹکا دیا گیا۔

اب میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ میرے سامنے نیم دائرے کی شکل میں کچھ سیاہ فام غلام دو زانو ہو کر زمین پر بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان بخور سلگ رہے تھے۔ پیچھے ایک استھان پر وہی کرخت چہرے اور خونی آنکھوں والا کاہن ہاتھ میں ترشول تھامے بیٹھا تھا۔

اس کے ترشول کے اشارے پر ایک حبشی غلام نے اپنے ڈھول پر دوبار ہاتھ مارا۔ ڈھول کی آواز کے ساتھ ہی کمرے کے تین دروازوں میں سے تین سیاہ فام حبشی عورتیں ہاتھوں میں خنجر لئے رقص کرتی داخل ہوئیں۔ انہوں نے باری باری کاہن کے سامنے آ کر ڈنڈوت کیا اور ڈھول کی تھاپ پر وحشیانہ رقص شروع کر دیا۔ شمع دانوں کی نیلی روشنی میں ان کے سیاہ فام جسم نیلے خوابوں کے سیاہ ناگوں کی طرح لہرا رہے تھے۔

رقص کرتے کرتے یہ حبشی عورتیں میرے چبوترے کے سامنے آ کر نیم دائرے میں بیٹھ گئیں۔ کاہن نے ترشول کے عصاء کو تین بار زمین پر مارا۔ حبشی غلام نے ڈھول پر تین بار ہاتھ مارا۔ پھر بائیں جانب کی دیوار کا سیاہ پردہ ایک طرف ہٹا اور میں نے ہسپانوی دوشیزہ ڈونا کو صاف پہچان لیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی خنجر تھا اور وہ کسی از خود رفتہ مست رقاصہ کی طرح رقص کے دائرے بناتی چلی آ رہی تھی۔ اس نے بھی کاہن کے سامنے ڈنڈوت کی اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ کاہن کے اشارے پر ایک حبشی غلان نے اٹھ کر ڈونا کے چہرے پر بخورات کی دھونی دی۔

کاہن نے ترشول کو ایک بار پھر زمین پر مارا۔ ڈونا نے گھوم کر میری طرف دیکھا اور رقص شروع کر دیا۔ وہ میرے چبوترے پر چڑھ آئی۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں درندگی اور خون آسامی تھی۔ میں نے پتھر کی لاش میں ضرور بدل گیا تھا لیکن میری شکل نہیں بدلی تھی۔ اس کو مجھے بڑی آسانی سے پہچان لینا چاہیئے تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں اور

چہرے کا تاثر صاف بتا رہا تھا کہ وہ مجھے کوئی اجنبی بلکہ اپنا دشمن سمجھ رہی ہے۔ میں بول نہیں سکتا تھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں اس کا دوست ہوں۔ اس کا ساتھی ہوں۔ مگر اس پر میرے کسی اشارے کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کسی آسیب کے قبضے میں ہے اس پر کوئی طلسم کر دیا گیا ہے۔ میں خاموشی سے یہ دیکھنے لگا کہ وہ میرے قریب کس لئے آئی ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ اسے خنجر دے کر میرے پاس کیوں بھیجا گیا ہے۔

ڈونا میری آنکھوں کے آگے تیز نوکیلا خنجر بار بار لہرانے لگی۔

ڈھول پر تھاپ تیز ہو گئی۔ ڈونا کا رقص بھی تیز ہو گیا۔ وہ والہانہ انداز میں میرے اردگرد چکر لگانے لگی۔ پھر ایک دم سے ڈھول کی آواز رک گئی۔ ڈونا اس وقت عین میرے سامنے کھڑی تھی اس کا چہرہ پسینے میں تر تھا۔ آنکھوں میں بے گانگی اور وحشت تھی اس نے اپنا خنجر والا ہاتھ بلند کیا۔ خنجر کی نوک کا رخ میری ایک آنکھ کی طرف کیا اور میری طرف جیسے رینگنے لگی۔

میرے خدا! اسے تو میری آنکھیں نکالنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ مجھے یک لخت خیال آیا طلسم زدہ ہونے کے بعد کہیں میری آنکھوں کی غیر فانی قوت بھی ضائع تو نہیں ہو گئی! کہیں میری آنکھیں بھی عام انسانوں کی طرح نرم و نازک تو نہیں بن چکیں؟ اگر ایسا ہوا تو مجھے اندھا ہونے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ میں اپنی دوست اور ساتھی کے ہاتھوں اندھا ہو رہا تھا۔

اب تو اس بات کا فیصلہ خنجر کے میری آنکھوں میں لگنے کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔ ڈونا سحر کے اثرات کے تحت خنجر کی نوک میری داہنی آنکھ کے بالکل قریب لے آئی۔ میں آنکھ بند کرنے سے بھی قاصر تھا۔ محفل میں ایک سناٹا چھا گیا تھا۔ کوئی ہلکی سی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ ڈونا نے بڑی سنگدلی کے ساتھ خنجر کی نوک میری آنکھ میں چبھو دی۔ میں نے ذہنی اور نفسیاتی طور پر اپنی آنکھیں گویا بند کر لیں۔ لیکن میری آنکھیں کھلی تھیں۔ میری آنکھ صحیح و سالم تھی۔ اس کا ثبوت مجھے ڈونا کے خنجر سے ملا جس کی نوک آگے سے مڑ گئی تھی۔

ڈونا نے دوسری بار پوری طاقت سے میری آنکھ میں خنجر مارا' لیکن اب میں مطمئن تھا طلسم کا اثر میرے جسم پر تو ہو گیا تھا لیکن میری آنکھیں اس طلسم سے محفوظ ------ تھیں یا یہ کہ ان کی طاقت بحال تھی۔ ڈونا کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا۔ خنجر آگے سے ٹیڑھا ہو چکا تھا۔ اس نے گھوم کر کاہن کو اپنا خنجر لہرا کر دکھایا۔

کاہن اپنی جگہ سے اٹھا اور عصا ٹیکتا بڑے غیض و غضب کے عالم میں میری طرف بڑھا۔ اس نے خنجر کا معائنہ کیا پھر میری طرف دیکھا۔ ڈونا کو ہاتھ سے پرے ہٹاتے ہوئے کاہن نے ہاتھ پیچھے پھیلایا۔ ایک حبشی غلام نے جلدی سے اپنا خنجر نکال کر پیش کر دیا۔

خنجر اب کاہن کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خود میری آنکھیں نکالنے کے لئے میری طرف بڑھا لیکن اسے نا امیدی کا سامنا کرنا پڑا۔ نہ صرف یہ کہ اس کا خنجر ٹوٹ گیا۔ بلکہ اس کا ہاتھ بھی زخمی ہو گیا۔ کاہن نے ترشول والا ہاتھ اوپر بلند کر کے چیخ نما آواز میں کوئی ایسا منتر پڑھا جو میری سمجھ میں بھی نہ آ سکا۔

میرے کان میں اس منتر کی آواز کے پڑتے ہی مجھے اپنے جسم میں ایک لرزش سی محسوس ہوئی۔ کاہن کا چہرہ آگ بھبھوکا ہو رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے خنجر کو میری طرف لا رہا تھا۔ اب اس کے گرد ڈونا کے ساتھ تین حبشی لڑکیوں نے بھی رقص کرنا شروع کر دیا تھا۔

یہ کوئی بہت بڑا طلسم تھا جس کا ایک طرح سے ہون ہو رہا تھا۔

میرے جسم کی لرزش اسی طرح تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے بھونچال آ گیا ہے۔ کاہن نے ایک بار پھر اسی منتر کا نعرہ لگایا اور خنجر پوری طاقت سے میرے جسم پر دے مارا۔ خنجر کے لگتے ہی میرے جسم کے دو ٹکڑے ہو گئے اور میں فرش پر گر پڑا۔ فرش پر گرنے سے میری گردن میرے جسم سے الگ ہو گئی۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ میرے جسم کے تین ٹکڑے ہو چکے تھے۔ لیکن میرا شعور سلامت تھا۔ ایسی شکست میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ڈونا اور حبشی لڑکیاں میرے جسم کے ٹکڑوں کے گرد والہانہ بلکہ وحشیانہ رقص کر رہی تھیں۔

کاہن کی آواز پھر بلند ہوئی اس نے حکم دیا کہ میرے جسم کے ٹکڑوں کو مقدس چٹانوں کے سب سے گہرے تہہ خانے میں دفن کر دیا جائے۔

حبشی غلاموں نے میرے جسم کے تینوں ٹکڑے اٹھائے اور چکر کھاتی پیچ دار اندھیری سیڑھیاں اتر کر ایک تنگ و تاریک منبر نما کوٹھری میں آ گئے۔ یہاں انہوں نے ایک گڑھا کھودا اور میری پتھریلی لاش کے تینوں ٹکڑے اس میں دفن کر دیئے۔ میری آنکھیں ریت نے بند کر رکھی تھیں۔ میں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ صرف شعور باقی تھا۔ احساس زندہ تھا۔ اتنا شعور تھا کہ میں عاطون ہوں۔ میرا جسم تین حصوں میں تقسیم ہو کر اس قبر میں دفن ہے اور میرا جسم پتھر کا بن چکا ہے۔ میں نہ زندوں میں تھا اور نہ مردوں میں۔ اگر کوئی میری مدد کو نہ آیا' اگر کوئی معجزہ رونما نہ ہوا تو ہو سکتا ہے سینکڑوں برس گزرنے پر میرے جسم کا پتھر ریت کے ذرے بن کر قبر کی تاریک گہرائیوں میں جذب ہو جائے اور میں محض شور کا ہیولا

احساس کا نظر نہ آنے والا پتلا اور روح کی اکائی بن کر قیامت تک زندہ رہوں۔ ایسی حالت بھی مجھے قبول نہیں تھی۔

سوال یہ تھا کہ اس قبر سے میں اپنے جسم کے ٹکڑے سمیٹ کر کیسے باہر نکل سکتا ہوں ظاہر ہے جب تک کوئی دوسرا شخص میری مدد کو نہیں آتا۔ میں قبر سے از خود باہر نہیں آ سکتا تھا۔ مجھے یہ احساس بھی پریشان کئے ہوئے تھا کہ اگر میری لاش کے پتھریلے ٹکڑے آپس میں نہ جڑ سکے تو میرا انجام کیا ہو گا؟ کیا میں پھر کبھی زندہ حالت میں زمین پر نہ پھر سکوں گا؟ یہ احساس بڑا اذیت ناک تھا۔ اس وقت خدا جانے کیوں مجھے اپنی پیاری والدہ کا خیال آگیا۔ وہ مجھ سے کس قدر پیار کرتی تھی۔ مجھ پر اپنی جان نثار کرتی تھی۔ اگر اس وقت اسے پتہ چل جائے کہ اس کا بیٹا کس حالت میں ہے تو وہ ہزاروں سالوں کی سرحدی دیواریں توڑ کر اپنے بیٹے کی مدد کو آ پہنچے۔ پھر اچانک جیسے زلزلے کا ایک جھٹکا لگا۔ میری کٹی ہوئی گردن اپنی جگہ سے بائیں جانب مڑگئی۔ زمین ہلنے لگی تھی۔ میرے جسم کے تینوں ٹکڑے ادھر ادھر ہو رہے تھے۔ ڈول رہے تھے----- میں حیران تھا کہ جب یہ ٹکڑے ریت میں دبے ہونے کے باوجود دائیں بائیں کھسکنے کیسے لگ گئے۔ مجھے تھوڑی ہی دیر بعد احساس ہوا کہ میری آنکھوں کے سامنے سے ریت ہٹ رہی ہے۔ پھر ایسے لگا جیسے میری قبر فراخ ہونے لگی ہے۔ ریت پرے پرے جا رہی تھی میرے اردگرد ایک خلا سا بن گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے ڈیلے گھما کر دیکھا کہ میری قبر کشادہ ہو گئی ہے اور پھر قبر کی ایک دیوار میں ایک طاق سا کھل گیا۔ اس طاق میں سے روشنی کی ایک لکیر ابھر کر میرے جسم کے تینوں ٹکڑوں پر پڑی اور میرے جسم کے تینوں ٹکڑے آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ آ کر مل گئے۔

روشنی کی لکیر غائب ہو گئی۔ اب مجھے ایک شفقت بھری پر سکون آواز سنائی دی۔ میں اس آواز کو کیسے بھلا سکتا تھا۔ یہ میری پیاری ماں کی آواز تھی۔

"میرے بیٹے میں عالم بالا سے تیری مدد کو آئی ہوں۔ میرے جانے کے بعد تم پھر سے زندہ ہو جاؤ گے۔ تم اس طاق میں سے باہر نکل جانا اور سنو۔ میں تمہارے لئے ایک اسم خاص کا تحفہ بھی لائی ہوں۔ یہ اسم تمہارے طویل ترین تاریخی سفر میں تمہاری مدد کرے گا۔"

میں نے ماں سے پوچھا کہ وہ اسم خاص کیا ہے۔ میری ماں کی آواز آئی۔ اپنے شعور کو میرے خیال پر مرکوز کر دو اور سنو پھر میری والدہ نے میرے دل میں اسم خاص کو اتار دیا۔ یہ دو لفظ تھے جو اسی وقت میرے دل پر نقش ہو گئے۔ میری والدہ نے تاکید کی کہ میں

یہ اسم کبھی کسی کو نہ بتاؤں۔ اس نے کہا تم اس اسم خاص کو پڑھ کر اپنی انگلی کا اشارہ جس جاندار یا غیر جاندار کی طرف کرو گے وہ سکڑ کر اتنی چھوٹی ہو جائے گی کہ تم اسے اٹھا کر اپنی مٹھی میں بند کر سکو گے۔

میں نے اپنی والدہ سے سوال کیا کہ میں کب تک اپنی طویل ترین زندگی کے دکھ سکھ جھیلتا رہوں گا۔ اس سوال کا کوئی جواب نہ ملا۔ میری والدہ کی روح عالم بالا کو جا چکی تھی۔ والدہ کی روح کے جاتے ہی میرے جسم کا سخت پن ٹوٹ گیا----- اور میری رگوں میں پھر سے زندگی کا گرم خون گردش کرنے لگا۔ میں اپنے ہاتھ پاؤں ہلا سکتا تھا۔ قبر اتنی کشادہ ہو گئی تھی کہ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور جھکے جھکے رینگتا ہوا طاق سے باہر نکل آیا۔

طاق کی دوسری طرف وہی پیچ دار سیڑھیاں نظر آئیں جس پر سے اتر کر حبشی غلام میری لاش کے ٹکڑے یہاں لائے تھے۔ میں تاریک چکر کھاتے زینے پر سے ہوتا ہوا اوپر ایک اندھیری کوٹھری میں اتر آیا۔ یہاں سے ایک زینہ پھر اوپر جاتا تھا۔ اوپر دیوار میں ایک تختہ لگا تھا جس کی ایک جانب سے انسانی آوازیں سنائی دیں۔ تختے کے قریب ہو کر میں نے سنا۔

ایک آواز اسی بدطینت اور زبردست جادوگر کاہن کی تھی۔ وہ اپنے کسی غلام سے کہہ رہا تھا۔

"اب اس کی موت کا وقت بھی آ پہنچا۔ اس کی گردن اتار کر میرے سامنے پیش کرو۔"

غلام کی آواز آئی۔ "عظیم دیوتا! نرتکی کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔"

کاہن کی آواز آئی۔ "میں یہی چاہتا تھا۔ جاؤ میرا حکم بجا لاؤ۔"

ایک لمحے کے اندر اندر ساری حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی۔ یہ 'شقی القلب جادوگر' ڈونا کا سر طلب کر رہا تھا۔ ڈونا اس کے طلسم کے زیر اثر تھی جو اب ختم ہو چکا تھا۔ اور یہ حبشی غلام ڈونا کا سر اتارنے جا رہا تھا۔ ڈونا بے قصور تھی۔ اس نے جو کچھ کیا اس شیطان صفت کاہن کے طلسم کے زیر اثر کیا تھا۔

ڈونا کی جان بچانا میرا انسانی اور اخلاقی فرض تھا۔

وقت شاید بہت ہی کم تھا۔ میں نے تختے میں دوسری طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر تختے میں کہیں کوئی درز یا معمولی سا سوراخ بھی نہیں تھا۔ کوٹھری میں مجھے ایک بند کھڑکی دکھائی دی۔ اسے کھولا تو دوسری جانب وہی غلام گردش یا راہداری تھی۔ جہاں سے مجھے غلام کاندھوں پر اٹھا لائے تھے۔

راہ داری کی چھت سے شمع دان اسی طرح لٹک رہے تھے۔ میں راہداری میں اتر کر ایک طرف تیز تیز چلنے لگا۔ راہداری کے موڑ پر۔ میری نظر ایک سیاہ فام غلام پر پڑی جو تلوار ہاتھ میں لئے ایک کوٹھری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اس کی طرف لپکا میرے دروازے تک پہنچتے پہنچتے وہ کوٹھری میں داخل ہو چکا تھا۔ اچانک اندر سے ڈونا کی چیخ سنائی دی۔

میں نے دروازے پر زور سے لات مار کر اسے کھولا اور اندر گھس گیا۔ دیکھا کہ سیاہ فام غلام تلوار کا وار کرنے کے لئے ڈونا کی طرف بڑھ رہا تھا جو ایک ستون کے ساتھ بندھی تھی۔

"عبد اللہ! مجھے بچاؤ۔"

سیاہ فام غلام نے پلٹ کر خونخوار نگاہوں سے مجھے دیکھا اور مجھ پر حملہ کر دیا۔ احمق تھا موت اس کے سر پر کھیل رہی تھی۔ اگر وہ حملہ نہ کرتا تو بچ سکتا تھا لیکن وہ تو پے در پے میرے جسم پر تلوار کے وار کر رہا تھا۔ آخر اس کی تلوار ٹوٹ گئی۔ اب میری باری تھی۔ میں نے اسے گردن سے پکڑ کر فضا میں اٹھایا وہ ٹانگیں چلانے لگا لیکن اس کی گردن کے گرد میرے پنجے کی گرفت فولاد کی طرح سخت ہوتی چلی گئی اور وہ مردہ لاش بن کر میرے ہاتھوں میں لٹک گیا۔

میں نے ڈونا کی رسیاں کھول دیں۔

ہم دونوں کمرے سے نکل کر راہداری میں اس طاق کی طرف بڑھے جہاں سے میں اس پراسرار آسیبی چٹان کے اندر داخل ہوا تھا۔ ڈونا میرے ساتھ ساتھ تھی۔ طاق کو پتھر کی سل سے بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے پورا زور لگا کر سل کو باہر کی طرف کھسکایا تو گڑگڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور پھر ہمارے پیچھے جیسے ان گنت بلائیں چیخیں مارتی نمودار ہو گئیں۔

ڈونا کی بھی خوف کے مارے چیخ نکل گئی۔ میں نے اسے اٹھا کر طاق سے باہر پھینک دیا۔ خود باہر نکلنے لگا تو کسی نے پیچھے سے میری ٹانگیں پکڑ لیں۔ میں نے ٹانگوں کو زور سے جھٹکا دیا۔ اور طاق سے باہر کود گیا۔ باہر آتے ہی چٹان کا طاق جیسے غائب ہو گیا۔

میں ڈونا کو لے کر آسیبی چٹان کو پیچھے چھوڑتا ہوا نخلستان کی طرف چلا۔ ڈونا نے مجھے بتایا کہ وہ چٹان کے پاس پہنچی ہی تھی کہ اسے ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو شیطان صفت کاہن کے سامنے چبوترے پر پڑی تھی پھر اس نے مجھے اپنے طلسم کے اثر میں لے لیا۔

"خیر جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ اچھا ہوا کہ تم وہاں سے زندہ نکل آئیں ورنہ مجھے

بڑا پچھتاوا لگ جاتا۔ ہمارا قافلہ جا چکا ہے کوئی بات نہیں۔ دوسرے قافلے کا انتظار کر لیں گے۔"

اس جگہ ہمیں دو روز گزر گئے۔ قرطاجنہ سے کوئی قافلہ نہ آیا۔ ہمارے پاس خوراک کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ ڈونا کچھ پریشان ہونا شروع ہو گئی۔

پانچویں دن قافلے والوں کی دی ہوئی خوراک ختم ہو گئی۔ اب ہم نے درختوں کی کھجوروں پر گزارہ کرنا شروع کر دیا۔ پانی بھی ختم ہو رہا تھا۔ قافلہ تھا کہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ڈونا کو لے کر تپتے لق و دق صحرا میں کیسے نکل پڑتا۔ ہمارے پاس کوئی اونٹ بھی نہیں تھا ڈونا تو صحرا میں ایک رات کا پیدل سفر بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی اور پھر یہ سو فیصد یقینی بات تھی کہ آگے صحرا میں ہمیں پانی کی ایک بوند تک نہیں ملے گی۔ قرطاجنہ سے اگر ایک ہفتے بعد بھی قافلہ چلتا ہے تو اسے مزید دو روز بعد ہمارے پاس پہنچ جانا چاہئے تھا۔ ہم اسی راستے پر بیٹھے تھے جہاں قافلے آتے جاتے تھے۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ پندرہ روز گزر گئے اور نہ کوئی قافلہ مصر سے آیا اور نہ مصر کی طرف جاتا ہوا ہمیں ملا۔ زیر زمین پانی کا صرف ایک مٹکا آدھا رہ گیا تھا۔ درختوں کی تمام پکی پکی کھجوریں ختم ہو گئی تھیں۔ اب صرف کچی کھجوروں کے گچھے باقی رہ گئے تھے۔ ڈونا کی پریشانی قدرتی امر تھا۔ میں اسے کہاں تک حوصلہ دیتا۔ سترھویں روز آخری دس کھجوریں میں نے ڈونا کو کھلا دیں۔ خود کچھ نہ کھایا۔ اٹھارہویں روز ہمارا گزارا پانی پر تھا۔

ڈونا کی آنکھوں میں حلقے پڑنے لگے تھے۔ میں اس کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔ جہاں کھجوروں کے جھنڈ میں ہم بیٹھے تھے ہمارے اردگرد سینکڑوں میلوں تک ریت کا لق و دق صحرا ہی صحرا تھا جس پر دن کے وقت سورج آگ برساتا۔ ڈونا بھوک سے نڈھال ہو کر گر پڑی۔ میں اسے تنہا چھوڑ کر صحرا میں کسی شکار کی تلاش میں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ آسیبی چٹان اسی طرح موجود تھی۔ اسی کی طرف سے مجھے خطرہ تھا کہ کہیں ڈونا پر پھر کوئی آسیب حملہ نہ کر دے۔ شیطان صفت کاہن بھی تو چٹان کے اندر ہی تھا۔

ڈونا کی بگڑتی حالت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ اگر مزید دو روز اسے کھانے کو کچھ نہ ملا تو اس کی موت یقینی تھی۔ لاچار ہو کر ایک روز دن کے وقت میں نے ڈونا کو کھجوروں کے جھنڈ تلے چھوڑا اور خود کسی شکار کی تلاش میں صحرا میں نکل گیا۔ تیز دھوپ میں صحرا کی ریت انگاروں کی طرح دہک رہی تھی مگر وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔

میں صحرا میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ریت کا ایک اونچا ٹیلا آ گیا۔

قریب پہنچا تو اس کی دوسری طرف جہاں ٹیلے کا سایہ تھا ایک صحرائی ہرن بدک کر نکلا اور کلیلیں بھرتا ایک طرف کو بھاگا۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ مگر ریت میں میرے پاؤں دھنسنے لگیں۔ ہرن میری نگاہوں سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ڈونا کی زندگی کی آخری کرن بھی میری آنکھوں سے دور ہو رہی تھی۔ اگر میں اس ہرن کو پکڑنے میں کامیاب نہ ہوا تو ڈونا کا زندہ بچنا محال ہو گا۔

اچانک مجھے اپنی والدہ ماجدہ کا تفویض کیا ہوا اسم خاص یاد آگیا۔ اسم خاص کو آزمانے اور اس سے مدد حاصل کرنے کا یہ نادر موقع تھا۔ یہ ڈونا کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ ہرن مجھ سے کافی دور صحرا میں جا چکا تھا۔ میں نے دل میں والدہ صاحبہ کی روح کا بتایا ہوا اسم خاص پڑھا اور انگلی سے ہرن کی طرف اشارہ کیا اچانک ہرن میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

میں بڑا پریشان ہوا کہ ہرن تو غائب ہو گیا۔ اب کیا کروں پھر خیال آیا کہ ہرن غائب نہیں ہوا بلکہ چھوٹا ہو گیا ہو گا۔ میں جتنی تیز ریت پر بھاگ سکتا تھا بھاگتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں میں نے ہرن کو آخری بار دیکھا تھا۔ میں حیرت زدہ ہو کر رہ گیا اتنا بڑا ہرن چھوٹے سے چوہے کی شکل اختیار کر گیا تھا اور وہ بمشکل مجھ سے دو قدم ہی دور ہو سکا تھا تب اسم خاص سچا تھا۔

میں نے ہرن کو پکڑ کر اٹھا لیا اور واپس ہوا۔

اب ایک دوسرے خیال نے مجھے پریشان کر دیا۔ ہرن کو اسم خاص کی مدد سے میں نے چھوٹا تو کر دیا تھا لیکن یہ بات میں والدہ ماجدہ کی روح سے پوچھنا بھول گیا تھا اسے دوبارہ بڑا کیسے کروں گا۔ یہ چوہا سا ہرن تو ڈونا کے لئے ناکافی تھا میں واپس کھجوروں کے جھنڈ کی طرف جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہرن کو بڑا کیسے کروں؟

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کھجوروں کا جھنڈ قریب آ گیا تھا۔ ایک دم سے میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ اس ہرن پر ایک بار پھر اسم خاص پڑھ کر پھونکا جائے۔ ہو سکتا ہے مزید چھوٹا ہو جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پھر اپنی اصلی جسامت پر آ جائے۔ چنانچہ میں نے اس کو ریت پر چھوٹے سے چوہے کی طرح بٹھا دیا۔ میرا ہاتھ اس کی گردن پر تھا کہ کہیں یہ بڑا ہو کر یہ میرے ہاتھوں سے نکل نہ جائے۔ میں دل ہی دل میں اسم خاص کا ورد کیا اور داہنے ہاتھ کی انگلی سے ہرن کی طرف اشارہ کیا۔

میرے ہاتھ کو ایک جھٹکا لگا ہرن ایک دم بڑا ہو گیا تھا وہ میری گرفت سے نکل کر بھاگا لیکن اب میں اسے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں اچھل کر اس کے اوپر گر پڑا۔ ہرن کو میں نے ریت پر دبوچ لیا۔ پھر اسے اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا کھجوروں کے جھنڈ میں ڈونا آنکھیں بند کئے نقاہت کے عالم میں پڑی تھی۔ میں نے اسے ہرن کے شکار کی خوشخبری سنائی۔

فوراً" ہرن کو ذبح کیا۔ سوکھی شاخیں اور پتے اکٹھے کر کے آگ جلائی اور ہرن کو کھال سمیت بھوننا شروع کر دیا۔ ہرن کا گوشت کھا کر ڈونا کی آنکھوں میں پھر سے زندگی کی چمک عود کر آئی۔ دکھاوے کے طور پر میں نے بھی گوشت کے دو ایک ٹکڑے کھائے۔ اس کی کھوئی ہوئی طاقت بحال ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "یہاں صحرا میں ہرن کہاں سے آ گیا؟" میں نے اسے بتایا کہ بس قسمت اچھی تھی کہ ایک ٹیلے کے پیچھے بیٹھا مل گیا۔ ہم نے بھنے ہوئے باقی ماندہ گوشت کو کھجور کے پتوں میں لپیٹ کے ٹھنڈی ریت میں دبا دیا تھا تاکہ کم از کم دو تین روز تک تو کام آئے۔ مجھے اس امر کی بڑی خوشی ہوئی تھی کہ والدہ ماجدہ کے بتائے ہوئے اسم خاص کا تجربہ کامیاب ہوا تھا۔ ڈونا کی یہ فکر بالکل بجا تھی کہ جب یہ خوراک بھی ختم ہو گئی تو کیا کریں گے۔ میں نے اسے حوصلہ دیا کہ اللہ حافظ و ناصر ہے۔

اللہ نے میری دعا سن لی اور جس روز میں نے ہرن کا شکار کیا تھا۔ اس کے دوسرے ہی روز قرطاجنہ سے ایک قافلہ آتا نظر آیا۔ مغربی افق پر طلوع ہوتے سورج کی روشنی میں اونٹوں کی قطار دکھائی دی تو ڈونا خوشی سے رقص کرنے لگی۔ رقص کرتے کرتے وہ بے دم ہو کر ------ گر پڑی۔

"خداوند نے ہماری مدد کی عبد اللہ! قافلہ چلا آ رہا ہے۔"

قافلے نے اس نخلستان میں آ کر دن بھر کے لئے پڑاؤ کیا۔ سالار قافلہ کو ہم نے یہ کہانی سنائی کہ ہم اپنے قافلے سے بچھڑ گئے تھے۔ بہرحال اسی رات ہم اس قافلے میں شامل ہو کر مصر کی طرف روانہ ہو گئے۔

قاہرہ پہنچنے پر ایک کارواں سرائے میں ہم ٹھہر گئے۔ دو روز یہاں قیام کیا پھر ایک کارواں کے ساتھ اسکندریہ کی طرف چل پڑے۔ ڈونا کو اسکندریہ اس کی سہیلی کے گھر پہنچانا تھا۔ اسکندریہ کا شہر قاہرہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ فاطمی خاندان مصر پر حکمران تھا۔ رعایا خوشحال تھی۔ کارواں بے فکری سے چلتے تھے۔ ڈونا کی سہیلی کا نام سانچی تھا۔ جس نے اسکندریہ کے ایک تاجر سے شادی کر رکھی تھی۔

تاجر کی حویلی شاندار تھی۔ سانچی اپنی سہیلی ڈونا سے گلے لگ کر ملی۔ اس نے اور اس کے بوڑھے سوداگر خاوند نے ہماری خوب خاطر مدارت کی۔ ایک ہفتہ اسکندریہ میں قیام کرنے کے بعد میں نے واپس قاہرہ جانے کے لئے اجازت مانگی تو ڈونا کی سہیلی سانچی مجھے اپنے کمرہ خاص میں لے گئی۔ یہاں اس نے مجھ پر یہ حسین راز فاش کیا کہ ڈونا میری محبت میں گرفتار ہے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

”وہ شادی سے پہلے تمہارا مذہب اسلام قبول کر لے گی۔ اس کا دل مت توڑنا عبداللہ۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گی۔“

یہ ایک عجیب مسئلہ میرے سامنے پیش ہو گیا تھا۔ کئی حسین ترین لڑکیاں میری زندگی میں آئیں مگر آج تک کسی نے یوں مجھ سے شادی کا اظہار نہ کیا تھا۔ میں خود بھی اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ کسی خاتون سے بیاہ کروں کیونکہ میرا کوئی پتہ نہیں تھا کہ وقت کا ریلا مجھے کب تاریخ کے بحر بیکراں میں دو سو یا چار سو سال آگے بہا کر لے جائے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تب بھی میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میری بیوی اور میرے بچے میری آنکھوں کے سامنے بوڑھے ہو کر مر جائیں لیکن ڈونا کے معاملے میں صرف ایک بات میرا دامن کھینچ رہی تھی۔ ڈونا اسلام قبول کر رہی تھی۔ ہو سکتا ہے اسلام قبول کر کے میرے ساتھ شادی کرنے کے بعد اس کی نسل سے کوئی ایسا جید عالم پیدا ہو جائے جو دنیا کو ایک نئی فکر عطا کرے۔

میں الجھن میں پڑ گیا۔ اگر میں ڈونا سے شادی نہیں کرتا ہوں تو وہ محض میری وجہ سے حلقہ بگوش اسلام ہونے سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس کا ملال ہو سکتا ہے صدیوں تک میرے ضمیر کو کچوکے لگاتا رہے۔ میں نے ڈونا سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور سانچی سے کہا۔ کہ اگر ڈونا کی یہی خواہش ہے تو میں اس کو اپنی منکوحہ بیوی بنانے کو تیار ہوں۔ سانچی بہت خوش ہوئی۔

ڈونا نے شادی کے روز ہی ایک عالم دین کے ہاتھ پر کلمہ طیبہ پڑھ کر اسلام قبول کر لیا۔ اس کا نام سلطانہ رکھ دیا گیا ہماری شادی ہو گئی----- میں سلطانہ سے شادی کے بعد کچھ روز تو سانچی کی حویلی میں رہا پھر اسے ساتھ لے کر قاہرہ آ گیا۔ یہاں میں نے دریائے نیل کے قریب ایک بستی میں کرائے پر مکان لے لیا اور شہر میں جڑی بوٹیوں کا کاروبار شروع کر دیا۔

اندر ہی اندر مجھے ایک ہی دھڑکا لگا رہتا کہ اگر کسی روز اچانک میں تاریخ کے ادوار میں گم ہو گیا تو سلطانہ پر کیا گزرے گی۔ ظاہر ہے کہ میں واپس نہیں آ سکوں گا اور سلطانہ

میری جدائی میں بوڑھی ہو کر اللہ کو پیاری ہو جائے گی۔ یہ میری مجبوری تھی۔ یہاں میں بے بس تھا۔

سلطانہ نے شہر میں ایک شاندار کارواں سرائے تعمیر کروائی جس میں ایک پر شکوہ مسجد بھی تھی۔ سلطانہ نے قاہرہ شہر کی ایک یتیم لڑکی عامرہ کو اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ عامرہ کی عمر آٹھ دس برس کی تھی۔ سانولی سی بڑی پیاری سی بچی تھی۔ میں بھی اسے اپنی بیٹی کی طرح پیار کرنے لگا تھا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ اب وہی مرحلہ آ گیا جس کا مجھے خطرہ لگا تھا۔ یعنی سلطانہ بوڑھی ہونے لگی لیکن میں اسی طرح جوان تھا۔ وہ مجھ سے تعجب کرتے ہوئے کئی بار پوچھ چکی تھی کہ میری جوانی کا راز کیا ہے۔ میں ہر بار یہی جواز پیش کرتا کہ یہ قدرت کی طرف سے ہے اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں۔ میں نے اسے اپنی مافوق الفطرت شخصیت کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا تھا۔

اس جھک جھک سے بچنے کے لئے میں نے دوسرے ملکوں کے دورے کرنے شروع کر دیئے۔ میں اکثر باہر رہنے لگا۔ ایک بار واپس آیا تو حویلی پر ماتم کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ میری پیاری اور خدمت گزار بیوی سلطانہ کو فوت ہوئے تین دن گزر چکے ہیں۔ لے پالک بیٹی عامرہ جوان ہو چکی تھی۔ مجھے دیکھ کر آنسو بہانے لگی----- سلطانہ کی موت کا مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں اس کی قبر پر گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ میں نے فاتحہ پڑھی اور اس کی مغفرت کے لئے دو روز تک خیرات تقسیم کرتا رہا۔

میری بیٹی عامرہ نے مجھے ایک خط دیا اور بولی۔

”ابا! یہ امی نے مرنے سے کچھ دیر پہلے مجھے دیا تھا کہ اپنے والد کو دے دینا۔“

میں نے خط کھول کر پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔

”میرے سرتاج! تم جو کوئی بھی ہو، میں جانتی ہوں تم مسلمان ہو اور میرے شوہر ہو۔ میں مرنے کے بعد بھی تم سے پیار کرتی رہوں گی۔ تم نے اپنے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو اور کدھر جا رہے ہو؟ لیکن میرا ایمان ہے کہ مرنے کے بعد مجھے میرا خدا تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دے گا۔ پھر میں جنت میں بھی تمہارے لئے دعا کروں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ اس دنیا میں اب ہماری ملاقات نہیں ہو گی۔ میری بیٹی عامرہ کا خیال رکھنا۔ کسی اچھی جگہ اس کی شادی کر دینا۔“

خط پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے عامرہ بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور دیر تک اسے اپنے پاس بٹھائے سلطانہ کی یاد میں آنسو بہاتا رہا۔

ڈیڑھ ماہ بعد میں نے قاہرہ کے ایک سوداگر کے بیٹے راحیل سے عامرہ کی شادی کر دی۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ میں نے اپنی آدھی جائیداد اور دولت عامرہ کو دے دی اور باقی نصف جائیداد اور دولت کو اپنی حویلی کے ملازموں، خادماؤں اور کنیزوں میں تقسیم کر دیا۔ میں خود حویلی کے ایک کمرے میں بڑی سادگی سے رہنے لگا۔

عامرہ کے بیاہ کو ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ملک کے ایک طبقے نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ فوج حرکت میں آگئی اور بغاوت کو کچل دیا گیا۔ اب باغیوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ اس پکڑ دھکڑ میں بہت سے بے گناہ بھی پکڑ لئے گئے۔ ان میں میرا داماد اور عامرہ کا خاوند راحیل بھی تھا۔ راحیل کے گھر صف ماتم بچھ گئی۔ عامرہ کو غشی کے دورے پڑنے لگے۔ کیونکہ جو باغی بھی پکڑا جاتا اسے پھانسی دے دی جاتی تھی۔ راحیل کے باپ نے اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لاتے ہوئے اپنے فرزند کو چھڑوانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اس میں ناکام رہا۔

مجھ سے اپنی اور سلطانہ کی بیٹی عامرہ کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ آخر میں نے راحیل کی جان بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے عامرہ کو تسلی دی اور خود یہ معلوم کرنے نکل کھڑا ہوا کہ راحیل کو کس جگہ قید رکھا گیا ہے اور اس کی قسمت کا فیصلہ کب ہو رہا ہے۔ مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ راحیل قلعے کے تہہ خانے میں قید ہے اور اسے دو روز بعد قلعے کے اندر ہی پھانسی دے دی جائے گی۔ بے حساب لوگ پکڑے گئے تھے۔ کسی کو کسی کا نام نہیں معلوم تھا کہ کون کس کا بیٹا ہے اور کہاں رہتا ہے۔ بس لوگوں کو ادھر سے ادھر سے ذرا سا شک پڑنے پر پکڑ پکڑ کر قید خانے میں ڈال دیا گیا تھا اور انہیں موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔

قلعے کے بندی خانے تک پہنچنے کے لئے دو روز بہت تھے۔ قلعے میں پہنچنا کم از کم میرے لئے آسان تھا لیکن وہاں سے راحیل کو آزاد کرا کر لانا تقریباً ناممکن تھا۔ ان معنوں میں کہ میں سینکڑوں سپاہیوں کے تیروں کی بوچھاڑوں سے نہیں بچا سکتا تھا اور پھر اگر میں اسے کسی طریقے سے بچا کر لے بھی آتا ہوں تو اس کی شناخت ظاہر ہو جاتی ہے اور اس کے باپ پر شاہی عتاب نازل ہو سکتا ہے۔

اس وقت میں نے اپنی والدہ ماجدہ کی جنت مکانی روح کا شکریہ ادا کیا جس نے مجھے اسم خاص کی نعمت سے نوازا تھا۔ میں نے اسم خاص کو عمل میں لانے کا فیصلہ کیا اور رات کے وقت سیاہ لبادہ اوڑھا اور گھوڑے پر بیٹھ کر شاہی قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس وقت میری جیب میں ایک چھوٹی سی تھیلی بھی تھی جس میں دریائے نیل کا چھ

انچ لمبا ایک ایسا سانپ بند تھا جس کے ڈسنے سے آدمی مرتا نہیں بلکہ کچھ وقت کے لئے بے حس و حرکت اور بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اس سانپ کے زہریلے نہ ہونے کے بارے میں بہت کم لوگوں کو علم تھا۔ اس کے ڈسنے سے اکثر لوگ محض دہشت کی وجہ سے مر جاتے تھے۔

میں نے یہ سب معلومات پہلے ہی حاصل کر لی تھیں۔ کہ قلعے کے بندی خانے کا داروغہ آدھی رات کو گشت پر قلعے میں آتا ہے۔ میں قلعے کے دروازے سے کافی دور ایک جگہ راستے سے ہٹ کر ریت کے ٹیلے کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ قلعے کے داروغہ کی شکل میں نے دیکھ رکھی تھی۔ رات جب آدھی گزر گئی تو شہر کی طرف سے ایک گھڑ سوار کا سایہ نمودار ہوا۔ قلعے کا داروغہ آ رہا تھا۔

جب گھڑ سوار قریب آیا تو میں اپنا گھوڑا بڑھا کر اس کے سامنے آگیا۔ داروغہ نے گھوڑا روک کر پوچھا کہ میں کون ہوں اور کیا چاہتا ہوں؟ میں نے جیب سے سانپ والی تھیلی نکال کر کہا کہ وزیر اعظم نے تمہارے لئے ایک فرمان بھیجا ہے۔ اس سے پہلے کہ داروغہ مجھ سے پوچھے کہ میں فرمان لے کر راستے میں کیوں کھڑا ہوں، میں نے تھیلی ------ سے سانپ نکال کر اس کی طرف اچھال دیا۔ داروغہ تلوار نکال کر میری طرف لپکا لیکن اس دوران میں سانپ جو اس کی گردن سے چمٹ گیا تھا اپنا کام کر چکا تھا۔ داروغہ گھوڑے سے گر پڑا۔

وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں اسے گھسیٹ کر ٹیلے کے پیچھے لے گیا۔ اس کا گھوڑا واپس بھاگ گیا۔ داروغہ کی جیب میں شاہی مہر تھی۔ مجھے اسی شاہی مہر کی تلاش تھی۔ یہ مہر دکھا کر میں بے دھڑک قلعے میں داخل ہو سکتا تھا۔ جہاں چاہوں جا سکتا تھا۔ داروغہ کے منہ میں رومال ٹھونس کر میں نے اس پر مشکیں کس دیں اور گھوڑے پر بیٹھ کر تیزی سے قلعے کی طرف بڑھا۔ قلعے کے صدر دروازے پر مشعلیں روشن تھیں۔ بڑا سخت پہرہ لگا تھا۔ میں نے شاہی مہر دکھائی تو صدر دروازے کا طاق کھول دیا گیا۔

میں نے قلعے کے سپاہیوں کو بتایا کہ وزیراعظم نے مجھے بغاوت کے جرم میں گرفتار شدگان کے معائنے کے لئے بھیجا ہے کیونکہ ہمیں ایک خاص باغی سے پوچھ گچھ کرنا ہے باغیوں کو اگلے روز موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔ انہیں قلعے کی سنگین ترین کوٹھریوں میں بند رکھا گیا تھا۔ ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی تھی۔ سپاہی میرے ساتھ تھا۔ اس کے ہاتھ میں مشعل تھی۔ میں نے باری باری سب کوٹھریوں میں بدقسمت باغیوں کو دیکھا۔ آخر ایک کوٹھری میں مجھے اپنا داماد راحیل نظر آگیا۔ وہ زنجیروں میں جکڑا پتھریلے فرش پر سر

گھٹنوں میں دیئے بیٹھا تھا۔ میں نے سپاہی کو باہر کھڑا رہنے کا حکم دیا اور کوٹھری کھلوا کر اندر داخل ہو گیا۔ راحیل نے گردن اٹھا کر میری صورت دیکھی تو چونک کر کچھ بولنے ہی والا تھا کہ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کوٹھری کا دروازہ بند کر دیا۔

"ابا حضور! آپ نے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالی؟ یقین کریں' میں بے قصور ہوں۔"

میں نے کہا۔ "راحیل بیٹے میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔"

راحیل نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے خیال میں' میں نے ایک ناممکن بات کہہ دی تھی۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خاموش رہو۔ ایک ثانیے کے لئے آنکھیں بند کرو۔"

راحیل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے دل ہی دل میں اسم خاص پڑھا اور شہادت کی انگلی سے راحیل کی طرف اشارہ کیا میرے دیکھتے ہی دیکھتے راحیل سکڑ کر چڑیا کے بچے جتنا چھوٹا ہو گیا۔ وہ زنجیر کے حلقے سے اپنے آپ آزاد ہو گیا تھا۔ وہ دہشت اور گھبراہٹ میں زنجیروں کے درمیان ادھر ادھر دوڑنے لگا تھا۔ اس کی بہت ہی باریک آواز بلند ہو رہی تھی۔ میں نے وقت ضائع کئے بغیر اس کو اٹھا کر اپنے چغے کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔

کوٹھری کا دروازہ کھول کر اپنے پیچھے فوراً" ہی بند کر دیا اور سپاہی سے کہا کہ کوٹھری کو تالا لگا دے۔ سپاہی نے فوراً" میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے اسے بتایا کہ شاہی باغی سے پوچھ گچھ کر کے مطلوبہ معلومات حاصل کر لی گئی ہیں۔ قلعے میں سے کسی بھی باغی کو بادشاہ کے خود دستخطی پروانے کے بغیر باہر نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ اسی لئے مجھے اسم خاص سے کام لینا پڑا۔

ڈیوڑھی میں میرا گھوڑا بندھا تھا۔ میں نے نائب داروغہ کا شکریہ ادا کیا۔ اسے ایک بار پھر شاہی مہر دکھائی اور گھوڑا سرپٹ دوڑاتا قلعے سے باہر نکل گیا۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ مجھے اپنے چغے کے اندر سے راحیل کی باریک آواز مسلسل آ رہی تھی۔ ٹیلے کی اوٹ میں بندی خانے کا داروغہ اسی طرح بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اس کے منہ سے رومال نکال کر پھینک دیا اور اس کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں بھی کھول دیں اس کی نبض دیکھی۔ نبض باقاعدہ چل رہی تھی۔

میں نے چغے کی اندرونی جیب میں سے راحیل کو نکال کر اپنی ہتھیلی پر بٹھا دیا او

کہا۔ "راحیل بیٹے! گھبراؤ مت۔ میں تمہیں اسی طریقے سے موت کے منہ سے بچا سکتا تھا۔ لیکن مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرو کہ تم اس راز کو فاش نہیں کرو گے۔"

راحیل کی نقطوں جیسی آنکھیں خوفزدہ تھیں۔ وہ باریک آواز میں بولا۔ "ابا حضور! یہ---- یہ کیا ہو گیا۔ خدا کے لئے مجھے اس مصیبت سے نجات دلائیں۔"

میں نے کہا۔ "فکر نہ کرو بیٹے۔ خطرے سے نکلتے ہی تمہیں پھر سے بڑا کر دوں گا۔ یہ ایک جادو تھا۔ مگر تم اس جادو کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔"

"نہیں کروں گا ابا جان۔ مگر خدا کے واسطے مجھے بڑا کر دیں۔ مجھے آپ کی ہتھیلی میدان کی طرح نظر آ رہی ہے۔"

میں نے راحیل کو اپنی باہر والی جیب میں رکھا اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ حویلی میں راحیل کا باپ اور میری بیٹی عامرہ پریشان بیٹھے تھے کیونکہ اگلے روز راحیل کو دوسرے باغیوں کے ساتھ پھانسی دی جانے والی تھی۔ قاہرہ شہر سے ایک صحرائی راستہ ملک شام کی طرف جاتا تھا۔ اس شاہراہ کے آگے چھ سات کوس کے فاصلے پر ابو الہول کا قدیم مجسمہ تھا۔ میں گھوڑا دوڑاتا ہوا اس مجسمے کے پاس آ گیا۔ اندھیری رات میں ابو الہول کا عظیم الجثہ بت خاموش پتھریلی آنکھوں سے ماضی میں ڈوبے تاریک ادوار کو دیکھ رہا تھا۔

اس مجسمے کے قدموں میں ایک جگہ ابو الہول کے شیر ایسے پنجے کی انگلی کا ناخن اکھڑ گیا تھا۔ یہاں ایک کھوہ سی بن گئی تھی۔ میں نے جیب سے راحیل کو نکال کر ہتھیلی پر بٹھایا اور کہا۔ "راحیل! میں تمہیں اس کھوہ میں تھوڑی دیر کے لئے چھوڑے جا رہا ہوں۔ تمہیں یہاں سے کہیں باہر نہیں جانا ہو گا۔ میں عامرہ اور تمہارے والد صاحب کو لے کر تھوڑی ہی دیر میں واپس آ رہا ہوں۔"

راحیل چھوٹے چھوٹے بازو ہلا ہلا کر باریک آواز میں کہہ رہا تھا۔

"ابا حضور! میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں مجھے آپ ابو الہول سے بھی بڑے لگ رہے ہیں' خدا کے لئے مجھے بڑا کریں۔ میں اس طرح زندہ نہیں رہ سکوں گا۔"

راحیل کے لئے یہ ایک انوکھا اور بھیانک تجربہ تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور اپنی بات ذہن نشین کراتے ہوئے تاکید کی کہ وہ اس کھوہ میں سے ہرگز باہر نہ آئے۔ میں نے کھوہ کے اندر پتھر صاف کر کے راحیل کو ایک جگہ بٹھایا اور کھوہ کے منہ پر پتھر رکھ دیا۔ میں تیزی سے واپس شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

حویلی میں راحیل کا باپ اور عامرہ پریشانی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ راحیل کو میں موت کے منہ سے نکال لایا ہوں۔ "کہاں ہے میرا بیٹا؟" راحیل کے باپ

نے بے تابی سے میرا بازو تھام لیا تھا۔ عامرہ کی آنکھیں بھی مجھ پر جم گئیں۔

وہ شہر سے باہر ایک محفوظ مقام پر چھپا ہوا ہے۔ آپ لوگوں کو ابھی تھوڑا بہت زر و جواہر کے ساتھ ملک شام کی طرف کوچ کرنا ہو گا۔ راستے میں راحیل بھی ہمارے ساتھ ہو جائے گا۔ اسی وقت دو گھوڑے تیار کر لئے گئے۔ راحیل کے لئے ایک فالتو گھوڑا ساتھ رکھ لیا گیا اور ہم نے پچھلی رات کے دم توڑتے اندھیرے میں شہر سے نکل کر ملک شام کو جاتی صحرائی شاہراہ پر گھوڑے ڈال دیئے۔

ہم پوری تیز رفتاری سے گھوڑے دوڑاتے جا رہے تھے۔ اس شاہراہ پر ابو الہول کا مجسمہ بائیں ہاتھ کو پڑتا تھا۔ ہم اس مجسمے کے قریب سے گھوڑے دوڑاتے گزر گئے۔ راحیل کے باپ نے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا کہ وہ کس مقام پر چھپا ہوا ہے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور کچھ دور آگے جا کر گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ عامرہ اور راحیل کے باپ نے بھی گھوڑے روک لئے۔

"آپ لوگ یہاں ایک طرف ٹھہریں۔ میں راحیل کو لے کر ابھی آتا ہوں۔"

ان دونوں کو امید و بیم کے عالم میں چھوڑ کر میں صحرا کی طرف گھوڑا دوڑاتا راحیل کی جانب چلا۔ ابو الہول کے مجسمے کے پاس آ کر دیکھا کہ ایک صحرائی لگڑ بگڑ اس پتھر کو پنجوں سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں ے لگڑ گڑ کو بھگا دیا اندر سے راحیل کے شور مچانے کی باریک آوازیں آ رہی تھیں میں نے جلدی سے پتھر ہٹا دیا۔ دیکھا کہ راحیل چوہے کے بچے کی طرح ایک چھوٹے سے پتھر کے ساتھ لگا سہا بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چلایا۔

"ابا جان! خدا کے لئے مجھے اس کنوئیں سے باہر نکالئے۔ باہر کوئی شیر آ گیا ہے۔"

میں نے راحیل کو تسلی دی اور کھوہ میں سے باہر نکال کر ہتھیلی پر بٹھا کر کہا کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ عامرہ اور تمہارے والد صاحب یہاں سے تھوڑی دور تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ راحیل نے اپنا ننھا سا سر چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں تھام لیا اور گلوگیر آواز میں بولا۔ "مجھے میری اصلی حالت میں لائیے۔ میں اس عالم میں اپنی بیوی کے پاس نہیں جا سکتا۔

میں نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں بیٹا تم ابھی اپنی اصلی حالت میں آ جاؤ گے۔" یہ کہہ کر میں نے راحیل کو ریت پر بٹھا دیا اور دل میں اسم خاص پڑھا اور انگلی کا اشارہ راحیل کی طرف کا۔ راحیل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور وہ ویسے ہی چھوٹے کا چھوٹا رہا۔ میں سمجھا کہ شاید میں نے اسم خاص پورا نہیں پڑھا۔ دوسری بار میں اسم خاص پڑھ کر انگلی کا رخ ٹھیک راحیل کے سینے کی طرف کیا لیکن یہ دیکھ کر میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی کہ راحیل پر اس

بار اسم خاص کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ راحیل بھی اپنی نقطوں ایسی آنکھوں سے مجھے حیرانی سے تک رہا تھا۔

"کیا ہوا؟ ابا حضور! طلسم واپس لے لیں۔ آپ پریشان کیوں ہیں؟"

راحیل کی پتلی باریک منحنی آواز نے مجھے مزید پریشان کر دیا۔ میں نے تیسری، چوتھی اور پانچویں بار اسم خاص پڑھ کر انگلی کا اشارہ کیا لیکن اس بار بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ بہت بڑا سانحہ تھا۔ راحیل کی اس حالت سے موت ہزار درجے بہتر تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ میں اب کیا کروں۔ میں نے ذرا پرے جا کر اپنی اولدہ صاحبہ کی روح کو گڑگڑا کر پکارا۔ بار بار پکارا۔ مگر ان کی طرف سے بھی کوئی جواب نہ آیا۔ کچھ فاصلے پر وہی لگڑ بگڑ نمودار ہوا وہ میری بے بسی پر قہقہے لگا رہا تھا۔ راحیل دو پاؤں والی چوہیا کی طرح بھاگ کر میرے جوتوں کے پیچھے چھپ گیا۔

"شیر آ گیا۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔"

میں راحیل کو ہتھیلی پر اٹھا کر اپنے منہ کے قریب لایا اور کہا۔

"راحیل طلسم کام نہیں کر رہا۔ لیکن تم گھبراؤ نہیں ہو سکتا ہے دن کی روشنی میں اس کا اثر ہو جائے۔ اب میں تمہیں تمہارے والد اور تمہاری بیوی عامرہ کے پاس لے جا رہا ہوں۔ تم میری جیب میں ہی چھپے رہو گے۔ باہر نکلنے کی ہرگز ہرگز کوشش نہیں کرو گے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ لوگ تمہیں اس حالت میں دیکھیں۔"

"میں بھی ان کے سامنے نہیں جانا چاہتا ابا جان۔ لیکن بخدا اگر طلسم نے کام نہ کیا تو میں خودکشی کر لوں گا۔"

راحیل نے پتلی آواز میں کہا۔

میں نے اسے ایک بار پھر حوصلہ دیا اور اپنے چغے کی جیب میں چھپا لیا۔ جب میں گھوڑا دوڑاتا راحیل کے باپ اور عامرہ کے پاس پہنچا تو قدرتی طور پر انہوں نے راحیل کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ میں نے بتایا کہ جن محافظوں کے پاس میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ یہ پیغام چھوڑ کر راحیل کے ساتھ اگلے پڑاؤ کی طرف چلے گئے ہیں کہ یہاں خطرہ ہے۔ راحیل کے باپ نے سر جھکا لیا۔ عامرہ کا چہرہ بھی اداس ہو گیا۔

ہمارے گھوڑے ایک بار پھر شاہراہ پر سرپٹ دوڑے جا رہے تھے۔

پہلے پڑاؤ تک پہنچتے پہنچتے صبح کی روشنی صحرا تک پھیلنے لگی۔ عامرہ تھک گئی تھی۔ اسے گھڑسواری کی مہارت نہیں تھی۔ پڑاؤ میں ایک کچی کارواں سرائے تھی جس کے صحن میں اونٹ بیٹھے جگالی کر رہے تھے۔ قریب ہی سرکنڈوں کی آگ میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

عقب میں ایک چھوٹا سا تالاب اور انجیر کا مختصر باغ تھا۔ ہم اس باغ میں آ گئے۔ راحیل کے باپ نے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا۔ میں اسے کیا جواب دیتا انہیں باغ میں چھوڑ کر میں نے یوں ہی کارواں سرائے کا چکر لگایا اور واپس آ کر بتایا کہ وہ لوگ راحیل کو لے کر ابھی نہیں پہنچے۔ بس وہ آتے ہی ہوں گے۔ اصل میں انہیں چکر کاٹ کر آنا پڑا ہے۔"

اگر اس وقت راحیل کے باپ یا عامرہ کو معلوم ہو جاتا کہ راحیل میری جیب میں ہے تو فرط دہشت سے شاید دونوں ہی بے ہوش ہو جاتے۔ سورج نکل آیا تھا۔ میں کسی بہانے باغ میں درختوں کے پیچھے چلا گیا۔ یہاں آتے ہی میں نے راحیل کو جیب سے نکال کر زمین پر رکھا۔ انگلی کے برابر یہ انسان بدحال سا ہو رہا تھا۔ میں نے درخت کی شاخ پر سے ایک انجیر توڑی۔ اس کا ایک ننھا سا ٹکڑا پتھر پر رکھ کر راحیل کے آگے کر دیا۔ "بیٹا تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔ اسے کھاؤ۔ پھر میں طلسم دوبارہ پڑھتا ہوں۔"

راحیل نے تنکے جتنا بازو ہلا کر منمنی سی باریک آواز میں کہا۔

"ابا جان آپ طلسم پڑھیں۔ میں کچھ نہیں کھا سکتا۔

میں نے دل میں سب سے پہلے خدا سے دعا مانگی۔ پھر اسم خاص پڑھا اور ڈرتے ڈرتے اپنی شہادت کی انگلی راحیل کی طرف کی لیکن کوئی اثر نہیں ہوا۔ دوسری' تیسری اور چوتھی بار بھی اسم خاص پڑھ کر عمل دہرایا لیکن راحیل انچ کا ہزارواں حصہ بھی بڑا نہ ہوا۔ مجھے پسینہ آ گیا۔ یا خدا یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے اور میرے داماد کو اس مصیبت سے نجات عطا کر۔ میں نے اپنی والدہ صاحبہ کی روح سے بھی پکار پکار کر مدد کی درخواست کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ راحیل کا بھی برا حال ہونے لگا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ طلسم ناکام ہو گیا ہے اور اب شاید باقی زندگی حقیر کیڑا بن کر زندہ رہنا ہو گا۔ خدا جانے وہ اپنی پتلی آواز میں کیا کیا بولتا چلا گیا۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہا۔

"راحیل مجھے معاف کر دو۔ میں نے جو کچھ کیا تمہاری بھلائی کے لئے کیا تھا۔ میں اس طلسم کو ایک بار پہلے آزما چکا ہوں۔ یہ کامیاب ثابت ہوا تھا۔ اس بار خدا جانے کیا بات ہو گئی ہے۔ لیکن میں نا امید نہیں ہوں۔ میں سورج غروب ہوتے وقت ایک بار پھر کوشش کروں گا۔" راحیل سجدے میں گر گیا اور خدا سے دعائیں مانگنے لگا۔ سجدے میں گرنے سے وہ اور بھی چھوٹا ہو گیا اور بالکل کسی بچے کا انگوٹھا لگنے لگا۔ میں نے اسے انجیر کے دو ننھے ننھے سے ٹکڑے کھلائے اور اسی تاکید کے ساتھ اسے جیب میں ڈالا کہ وہ شام ہونے تک نہ آواز دے گا اور نہ جیب سے باہر نکلنے کی کوشش کرے گا۔

جیب میں سے راحیل کی آواز آئی۔ "مجھے پیاس لگی ہے۔"

میں نے اسے نکال کر زمین پر بٹھا دیا۔ انجیر کے پتے میں سے پانی کے چند قطرے ڈال کر لے آیا۔ راحیل نے سر پتے کے ساتھ اپنا چنے برابر سر لگا دیا اور پانی کے دو قطرے پینے کے بعد بولا۔

"بس ابا حضور پیٹ بھر گیا۔"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

واپس راحیل کے باپ کے پاس آیا تو عامرہ اداس' سر جھکائے بیٹھی تھی۔ راحیل کا باپ جھولے میں سے سوکھا گوشت نکال رہا تھا۔ عامرہ رندھی آواز میں بولی۔

"ابا جان۔ وہ ٹھیک ہوں گے نا؟"

"کیوں نہیں بیٹی! میں قسم کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا خاوند زندہ ہے میں نے خود اسے محافظوں کے حوالے کیا تھا۔"

میرے قسم کھانے پر عامرہ اور راحیل کے باپ کو واقعی بڑا حوصلہ ہوا۔ ان کے چہروں کی زردی اور اداسی کافی حد تک دور ہو گئی۔ اب وہ ایک خوشگوار بے تابی سے راحیل کا انتظار کرنے لگے۔ کیونکہ میرے بیان کے مطابق محافظ راحیل کو لے کر اسی پڑاؤ میں آنے والے تھے۔ ایک طرف یہ لوگ راحیل کا انتظار کر رہے تھے اور دوسری طرف میں راحیل کو اپنی جیب میں ڈالے سوچ رہا تھا کہ اگر غروب آفتاب کے وقت بھی اسم خاص نے اپنا اثر نہ دکھایا تو پھر کیا ہو گا؟

دوپہر کو تھوڑا بہت کھانا کھا کر راحیل کا باپ لیٹ گیا۔ عامرہ بھی انجیر کے ایک درخت کے نیچے ستانے لگی۔ میں بھی ایک طرف ہو کر پڑا رہا۔ میں نے چغہ اتار کر بڑی احتیاط سے اپنے سرہانے کے قریب ہی رکھ لیا تھا اور جیب کے ساتھ منہ لگا کر سرگوشی میں راحیل کو تاکید کر دی کہ وہ اندر خاموش بیٹھا رہے۔

میں قالین کے ٹکڑے پر لیٹا اوپر انجیر کی شاخوں کو تکتے ہوئے راحیل کی اور اپنی بیٹی عامرہ کی قسمت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اگر اسم خاص اس مرتبہ بھی بے اثر ہو گیا تو راحیل کا کیا بنے گا۔ میں کسی دوسری چیز پر بھی تجربہ کرتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ کیا خبر وہ دوبارہ اپنی اصلی جسامت پر نہ آ سکے۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ کارواں سرائے کی طرف سے کبھی کبھی کسی آدمی کی بلند آواز سنائی دے جاتی تھی۔ اس کے علاوہ چاروں جانب ایک گہرا سناٹا طاری تھا۔

میں جاگ رہا تھا۔ اچانک عامرہ کی چیخ سنائی دی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ غیر شعوری

طور پر میرا ہاتھ سرہانے رکھے چغے کی طرف گیا۔ اس کی جیب میں راحیل نہیں تھا۔ میں اور راحیل کا باپ لپک کر عامرہ کے پاس پہنچے۔

وہاں یہ منظر دیکھا کہ ----- انسانی چھنگلی کے برابر ----- عامرہ کا خاوند راحیل اس کے سامنے زمین پر دونوں ہاتھ اٹھائے منمنی باریک آواز میں اسے پکار رہا تھا اور عامرہ سمٹ کر ایک طرف سہمی بیٹھی تھی اور اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ راحیل کے باپ نے اپنے لخت جگر کو اس عالم میں دیکھا تو اپنا سر پیٹ پیٹ کر خدا سے فریاد کرنے لگا۔

"اے رب العالمین! یہ میرے بچے کو کیا ہو گیا ہے؟"

اب مجھے اس راز کو فاش کرنا پڑ گیا۔ چنانچہ میں نے عامرہ اور راحیل کے والد کو ساری کہانی بیان کر دی۔ راحیل کا باپ تو جیسے سکتے میں آ گیا۔ راحیل اپنے پتلے پتلے بازو ہلا ہلا کر عامرہ کو پکارے جا رہا تھا۔ میں راحیل کو اٹھا کر ایک طرف لے گیا۔

"تم نے یہ کیا حماقت کی راحیل؟ میں نے تمہیں بہت منع بھی کیا تھا کہ میری جیب سے باہر مت نکلنا۔"

راحیل کی مہین آواز آئی۔

"میں اپنی پیاری بیوی سے ملنا چاہتا تھا۔"

راحیل بھی سچا تھا۔ میں نے تالاب پر لے جا کر اسے پتے پر پانی ڈال کر پلایا۔ انجیر کا چوگا کھلایا اور واپس راحیل کے باپ اور عامرہ کے پاس آ گیا۔ انہیں تسلی دی کہ انشاء اللہ سورج غروب ہونے کے بعد اسم خاص کا اثر واپس آ جائے گا۔ میں قصداً" راحیل کو جیب میں ڈال کر تالاب کی طرف جا کر بیٹھ گیا اور سورج غروب ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ فضا میں بڑا حبس ہو گیا تھا۔ اگرچہ میں سردی گرمی کے احساس سے بے نیاز تھا۔ پھر بھی حبس کی وجہ سے میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے سوچا کہ تالاب میں غسل کرنا چاہیے۔ چنانچہ چغہ اتار کر ایک طرف رکھا اور راحیل کی جیب کا منہ کھول کر اسے اندر ہی رہنے کی تلقین کی اور کپڑوں سمیت تالاب میں اتر گیا۔

تالاب کا پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ خوب اچھی طرح سے نہایا۔ نہانے کے بعد میری طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی۔ گیلے کپڑوں کے ساتھ ہی قالین کے ٹکڑے پر آ کر بیٹھ گیا۔ سورج غروب ہی ہونے والا تھا۔ اسم خاص پڑھنے سے پہلے میں نے دو نفل ادا کر کے خدا سے دعا مانگی اور اس سے مدد کی درخواست کی۔

میری خوشی اور حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اپنے سامنے والدہ ماجدہ کی نیک

روح کو سفید لباس میں ملبوس دیکھا۔ ان کی آواز تو مجھے سنائی نہ دی لیکن جو کچھ وہ فرما رہی تھیں اسکا مفہوم میرے دل میں اترنے لگا۔

"بیٹا! اسم خاص میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اس نے اثر اس لئے نہیں کیا کہ تمہارا جسم پاک نہیں تھا۔ اب تمہارا جسم نہانے کے بعد پاک ہو گیا ہے۔ جاؤ اسم خاص کو آزماؤ۔ تم انشاء اللہ کامیاب رہو گے۔ سورج کے غروب ہونے کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔" میری والدہ ماجدہ کی روح غائب ہو گئی۔

میں خوشی سے دیوانہ وار عامرہ اور راحیل کے باپ کی طرف دوڑا۔ وہ اداس بیٹھے واپس قاہرہ جانے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ میرا چمکتا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ میرا منہ تکنے لگے۔ میں نے کہا۔

"اللہ نے آپ کی دعائیں سن لی ہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔"

میں نے عامرہ اور راحیل کے باپ کو ساتھ اور انجیر کے باغ کے پیچھے ایک ویران مقام پر آ گیا۔ راحیل کو چغے کی جیب سے نکال کر ریت کی ایک چھوٹی سی ڈھیری پر بٹھا دیا۔ راحیل سہمی ہوئی آنکھوں سے کبھی اپنی بیوی اور کبھی اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔

میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر خدا کو یاد کیا اور اسم خاص کو اپنے دل میں دہرا کر انگلی کا رخ راحیل کی طرف کر دیا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اور پھر ہم سب کی نظروں کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے راحیل بڑھتے بڑھتے اپنی پوری جسامت اختیار کر گیا۔ وہ ہمارے درمیان بھرپور جوان راحیل بیٹھا تھا۔ اس کے باپ نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔ عامرہ کی آنکھوں میں فرط مسرت سے آنسو آ گئے۔ اس چھوٹے سے کنبے میں پھر ایک بار خوشیوں کے ستارے جھلملاتے دیکھ کر میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر کیا۔

یہاں سے ہم ایک قافلے کے ساتھ ہو لئے جو ملک شام کی طرف جا رہا تھا۔ ایک رات ہمارا قافلہ صحرا میں سفر کر رہا تھا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ عامرہ اپنے کجاوے میں سو رہی تھی۔ راحیل اپنے والد کے اونٹ کے پیچھے گھوڑے پر سوار تھا۔ قافلے کے دوسرے اونٹ اور گھوڑے سست رفتار سے چلے جا رہے تھے۔ میں گھوڑے پر سوار عامرہ کے اونٹ کے پہلو میں چل رہا تھا۔ میرے گھوڑے نے چلتے چلتے رکنا شروع کر دیا۔ وہ رک جاتا۔ میں اسے ایڑ لگاتا۔ تو وہ دو قدم اٹھا کر پھر رک جاتا۔ یہ ایک عجیب سی تبدیلی گھوڑے میں پیدا ہوئی تھی۔ میں گھوڑے سے اتر آیا اور باگ پکڑ کر گھوڑے کو آگے لے کر چلا۔ گھوڑے نے مجھے پیچھے کی طرف کھینچا۔

میں نے باگ پکڑ کر اسے آگے لے جانے کی کوشش کی تو اچانک گھوڑا باگ چھڑا کر صحرا میں سرپٹ دوڑا۔ میں نے بائیں طرف گھوم کر دیکھا رات کے اندھیرے میں قافلہ' میری بیٹی عامرہ اور اس کے خاوند راحیل کے لئے آہستہ آہستہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ گھوڑا مشرق کی طرف دوڑا چلا جا رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک گھوڑے کے پیچھے گیا۔

پھر صحرا میں ایک بگولا اٹھا جس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بگولا مجھے صحرا سے اٹھا کر اپنے ساتھ اڑائے جا رہا ہو۔ میں بڑی تیزی سے بگولے کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ چکر کھا رہا تھا۔ اس بگولے نے مجھے فضا میں اچھال دیا اور پھر مجھے ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو تیز دھوپ چمک رہی تھی۔

میں صحرا کی بجائے ایک کھیت کے کنارے پڑا تھا۔ دو گھڑ سوار بڑی تیزی سے گھوڑے دوڑاتے میرے قریب سے نکل گئے۔ میں نے سر کو ہلکا سا جھٹک کر انہیں دیکھا۔ ان کے لباس مصری باشندوں جیسے نہیں تھے۔ اتنا مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ تاریخ کے اوراق تیزی سے پلٹے گئے ہیں۔ اور میں کسی اگلے زمانے میں نکل آیا ہوں۔ میں کھیت کے کنارے بیٹھ گیا۔ کھیت میں گیہوں کی فصل آدھی کٹی ہوئی تھی اور باقی آدھی اسی طرح پڑی تھی۔ اور ------ گرمی بے پناہ تھی۔ اردگرد کہیں کہیں گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ جن میں ملک مصر اور شام والے کھجور کا ایک درخت بھی نہیں تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ میں ملک مصر سے نکل کر ملک ہندوستان میں آ گیا ہوں۔ اس کی سب سے بڑی نشانی گھڑ سواروں کا لباس اور کھیت کی پرلی طرف اگا نیم کا درخت تھا۔

تین گھڑ سوار جنہوں نے فوجی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ گھوڑے سرپٹ دوڑاتے میرے قریب سے گزر گئے۔ ان سپاہیوں کے پاس تلواریں بھی تھیں اور رائفلیں بھی۔ میرا لباس مصریوں ایسا تھا۔ میں نے اپنے لمبے کرتے کی جیب کی تلاشی لی۔ جیب میں کچھ نہیں تھا۔

سامنے دو چار درختوں کے پاس کچے مکان تھے۔ سخت گرمی اور تیز دھوپ میں وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں مکانوں کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ سارے مکان خالی پڑے تھے۔ کسی مکان میں چارپائی تک نہیں تھی۔ بہت سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی میں نے دیکھا کہ گھڑ سوار گھوڑے سرپٹ دوڑائے چلے آ رہے ہیں' انہوں نے ایک جیسی وردیاں پہن رکھی تھیں کچھ کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں جن پر خون لگا تھا۔ جدھر گھڑ سوار گئے تھے' میں نے بھی ادھر کا رخ کیا۔ چند قدم چلا ہوں گا کہ پیچھے سے ایک کالا آدمی گھوڑے پر سوار آیا اور میرے پاس رک کر بولا۔ "کیوں بھائی یہاں پینے کو پانی مل جائے

گا؟"

یہ جملہ اس گھڑ سوار نے اردو زبان میں ادا کیا تھا۔ میں نے بھی اسے اردو میں ہی جواب دیا۔ کہ مجھے پانی کہیں نظر نہیں آیا۔ پھر اس گھڑ سوار سے میں نے سوال کیا یہاں کیا گڑبڑ ہے۔ اس نے مجھ پر ایک حیرت کی نگاہ ڈالی اور بولا۔

"کیوں میاں تم ملک روس سے آئے ہو کیا؟ تمہیں معلوم نہیں کہ فوج نے بغاوت کر دی ہے۔ پیچھے میرٹھ میں فرنگیوں کا قتل عام کر ڈالا اور اب فوج دلی بادشاہ سلامت کے پاس جا رہی ہے۔"

یہ 1857ء کی جنگ آزادی کا آغاز تھا۔ اس جنگ آزادی کو انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں انیسویں صدی کے ہندوستان میں پہنچ گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ پیچھے میرٹھ شہر میں چل کر کوئی گھوڑا لیتا ہوں بس پر بیٹھ کر ہندوستان کے دارالحکومت دلی کا رخ کروں گا۔ شہر قریب ہی تھا۔ وہاں دیکھا کہ جگہ جگہ آگ لگی ہے۔ ہندی فوج کے سپاہی گوروں کے بنگلوں کو آگ لگا رہے ہیں، شہر کے غنڈے بدمعاش اور چور اچکے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باغیوں کے ساتھ مل گئے ہیں اور مکانوں دکانوں کو توڑ کر لوٹ رہے ہیں۔ ایک گرجا گھر کے باہر انگریزوں کی کٹی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ آخر مجھے ایک گھوڑا مل گیا۔ میں اس پر سوار ہو کر شہر سے باہر جاتی سڑک پر چل پڑا۔

آگے جا کر سینکڑوں باغی ہندوستانی سپاہیوں کو دیکھا کہ پیدل ہی دلی کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ ان کی زبانی میرٹھ چھاؤنی میں غدر کا وہ سارا حال احوال معلوم ہوا جسے آپ کتابوں میں پڑھ چکے ہیں۔ چربی والے کارتوسوں کا تو ایک بہانہ تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ ہندوستان میں عیسائی پادریوں نے لوگوں کو زبردستی عیسائی بنانے کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ مسلمان ان کی سرگرمیوں سے سخت نالاں تھے۔ انگریز کا سیاسی دباؤ بڑھ رہا تھا۔ مسلمانوں کو ایک جنگ جو قوم سمجھتے ہوئے انگریزوں نے ان پر اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ اور ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا جاتا تھا۔ پنجاب میں سکھ مسلمانوں پر مظالم توڑ رہے تھے۔ زمینوں پر مقامی زمینداروں کا قبضہ تھا۔ کسانوں پر نت نئے ظلم ڈھائے جاتے۔ کوئی اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا تو اسے کوڑے مارے جاتے۔

یہ باتیں مجھے ان باغیوں نے بتائیں جو باغی سپاہیوں کے ساتھ دلی کی طرف مارچ کر رہے تھے۔ یہ قافلہ صبح صبح دلی پہنچ گیا۔ سامنے جمنا کا پل اور اس کے پیچھے شاہی قلعہ نظر آ رہا تھا۔ جہاں مغلیہ خاندان کا آخری بادشاہ اسی سالہ بہادر شاہ ظفر مقیم تھا۔ میرے دیکھتے

ہی دیکھتے اس ہجوم نے محصول چنگی کے انگریز ملازموں کو قتل کر ڈالا۔ ان کے بنگلوں کو آگ لگا دی۔ باغی پل پار کر کے دریا کے دوسرے کنارے بادشاہ کے محل کی کھڑکی کی جانب بڑھے۔ میں ان باغیوں میں شامل تھا۔

ایک شاہی اہل کار گھوڑا اڑاتا آیا اور حالات سے آگاہی حاصل کر کے واپس محل کی طرف ہوا ہو گیا۔ باغی سپاہیوں کا ہجوم کشتیوں کے پل کی دوسری طرف پہنچا تو شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ راج گھاٹ کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ بادشاہ شاہی جھروکے میں بیٹھا وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ لاغر جسم جھکی ہوئی کمر' سفید لانبی داڑھی' گلے میں موتیوں کے ہار' آنکھوں میں حلقے' یہ تھا سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ جس کی لو پہلے ہی مدھم ہو چکی تھی۔

باغی سپاہیوں نے بادشاہ کے حضور اپنی شکایات پیش کیں اور کہا کہ ان کی راہنمائی کی جائے تاکہ ہندوستان میں پھر سے مسلمانوں کی حکومت قائم ہو اور انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کیا جائے۔ بادشاہ نے کہا کہ میں کہاں کا بادشاہ ہوں میں تو حقیر فقیر ہوں۔ اپنی اولاد کے لئے اپنے اجداد کے محل میں پڑا ہوں۔ میرے پاس نہ مال ہے نہ خزانہ۔ میں تم لوگوں کو کہاں رکھ سکتا ہوں۔ ہاں میں بیچ میں پڑ کر انگریزوں سے تمہاری صلح صفائی کرا سکتا ہوں۔

باغی سپاہی اپنی کشتیاں جلا کر وہاں آئے تھے۔ بادشاہ کو بے بس و مجبور پایا تو انہیں اپنا اور اپنے بال بچوں کا مستقبل تاریک ہوتا دکھائی دینے لگا۔ کمشنر مسٹر فریزر باغیوں سے بات کرنے سامنے آیا تو ایک سپاہی نے اس پر گولی چلا دی۔ گولی غدار حکیم احسن اللہ خان کے برابر سے گزر کر تسبیح خانے کے ستون سے جا کر لگی۔

مسٹر فریزر اور مسٹر ڈگلس بگھی پر باہر نکلے تو سپاہیوں نے ان کو گھیر لیا۔ ڈگلس نے ایک سوار کو پستول سے قتل کیا اور بگھی کے گھوڑوں کی باگ قلعے کی ڈیوڑھی کی طرف موڑ دی چھتے سے ہوتے ہوئے یہ زینہ چڑھ رہے تھے کہ باغیوں نے وہیں دونوں کا کام تمام کر دیا۔ اب کچھ باغی قلعے میں گھس آئے باغیوں نے شہر کا رخ کیا۔ شہر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ بغاوت ہو گئی ہے اور بادشاہ نے اسلام کا پرچم بلند کر دیا ہے۔ لوگ باغی سپاہیوں کے ساتھ مل گئے اور شہر میں موجود انگریزوں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ باغی سپاہی انگریزوں کے بنگلوں میں جاتے۔ انگریزوں کو ہلاک کر کے آگے بڑھتے پیچھے شہر کے غنڈے بنگلوں کی لوٹ مار شروع کر دیتے۔

دلی چھاؤنی میں تین ہندوستانی پیادہ رجمنٹیں اور ایک توپ خانہ تھا۔ یہ رجمنٹیں بھی باغیوں سے مل گئیں۔ انگریزوں نے دلی کے بارود خانے کو آگ لگا دی۔ اس ہولناک دھماکے سے دلی کے کئی مکان گر گئے۔ انگریزوں نے دلی سے بھاگنا شروع کر دیا۔ بہت سے

راستے میں مارے گئے اور بہت کم انبالہ' کرنال پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

لال قلعے پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا۔ شہر میں کوئی انگریز باقی نہ رہا۔ بہادر شاہ ظفر کو اسلامی حکومت کی علامت کے طور پر بادشاہ بنا دیا گیا۔ مگر وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے خاندان کے افراد نے جب یہ دیکھا کہ تخت و تاج ان کے خاندان کے ہاتھ آ گیا ہے۔ تو محلاتی سازشوں کا بازار گرم ہو گیا۔ جنگ آزادی کے جیالے لڑ رہے تھے۔ مر رہے تھے۔ ہر شہر میں خون ریز معرکے ہو رہے تھے اور شاہی محل میں ولی عہدی کے لئے سازشیں شروع ہو رہی تھیں۔ غدار جنم لے چکے تھے۔ جو انگریزوں کو پل پل کی خبریں پہنچانے لگے۔ انگریز جوابی حملے اور دلی کے محاصرے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سکھوں کی تین بڑی ریاستیں' جنیدہ' نابھا اور پٹیالہ انگریزوں کے ساتھ مل گئی تھیں۔ نیپال کے گورکھے انگریزوں کی مدد کو آ رہے تھے۔

شاہی محل میں غداریاں اور سازشیں عروج پر تھیں۔

میں نے شاہی مسجد کے ایک حجرے میں اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ بادشاہ نے شہر کا نظم و نسق سنبھالا تو امن و امان کو بحال کیا۔ جنرل بخت خان کو گورنر جنرل نامزد کیا۔ بازار کھل گئے۔ لوگوں کا اعتماد بحال ہوا۔ کاروبار شروع ہو گیا۔ لیکن سرمائے کی کمی' غداروں کی سازشوں اور سرداروں' امیروں اور شہزادوں کی باہمی رقابت نے بہادر شاہ ظفر کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

دوسری طرف انگریز خاموشی سے دلی پر چڑھائی کی کوشش میں لگے تھے۔ مجاہدوں نے بھی مورچے بنا رکھے تھے۔ انگریز فوج کے ساتھ گورکھا اور سکھ فوج بھی تھی۔ دشمن نے دہلی پر حملہ کر دیا۔ محل کے غداروں نے انگریزوں سے در پردہ رابطہ قائم کر رکھا تھا دونوں طرف سے توپوں نے آگ اگلنی شروع کر دی۔ مجاہدین کا سب سے بڑا مورچہ کشمیری دروازے پر تھا۔ انگریزوں کے پاس اسلحہ کی کمی نہ تھی۔ ایک گولے نے کشمیری دروازے کو اڑا دیا اور گورا فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ گلی گلی کوچے کوچے میں جنگ ہونے لگی۔ شہر کے بڑے حصے پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ بادشاہ نے بخت خان کی مرضی کے الٹ لال قلعہ چھوڑ دیا اور ہمایوں کے مقبرے میں چلا گیا۔ دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا بادشاہ نے خود کو میجر ہڈسن کے حوالے کر دیا۔ شہزادوں کو قتل کر کے ان کی نعشیں خونی دروازے پر لٹکا دی گئیں۔

انگریزوں نے اپنی فوج کو اجازت دے دی کہ وہ تین دن تک شہر کو لوٹ سکتے ہیں۔

میں ابھی تک جامع مسجد کے حجرے ہی میں رہ رہا تھا۔ تاریخ کے طویل سفر کے دوران

شہروں پر اس قسم کی تباہی نازل ہوتے کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس لئے میں تاریخی عمل میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شہر میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا سلسلہ جاری تھا۔ لوگ اپنی جانیں بچا کر شہر سے بھاگ رہے تھے۔ کئی عالیشان عمارتیں مثلاً" ملاتی بیگم کا کوچہ' خان دوران کی حویلی' انگوری باغ اور جرنیل کی بی بی کی حویلی مسمار کر دی گئیں۔ جامع مسجد سے رام گھاٹ کی تمام عمارتوں کو زمین بوس کر دیا گیا۔ ہزاروں کو پھانسی ملی اور ہزاروں کو توپ نے دم کر دیا۔

ایک رات جامع مسجد میں بھی سکھ فوجی گھس آئے۔ یہاں کئی مسلمان پناہ لئے ہوئے تھے۔ ان سب کو پکڑ لیا گیا۔ میں بھی ان گرفتار شدگان میں تھا۔ سارا شہر وبال کی زد میں تھا۔ میں کس کس کی جان بچاتا قلعے کے میدان میں توپیں لگی تھیں۔ انگریز جرنیل کرسی پر تلوار ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ مجاہدین آزادی کو توپوں سے باندھ کر اڑایا جا رہا تھا۔ مجھے بھی ایک توپ کے منہ پر رسیوں سے جکڑ دیا گیا۔ انگریز نے تلوار کا اشارہ کیا۔ توپ کے بارود کو آگ لگا دی گئی ایک دھماکہ ہوا مجھے زبردست دھچکا لگا اور میرا جسم پرزے پرزے ہونے کی بجائے سب کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے فضا میں اڑتا ہوا میدان کی دوسری جانب دریا کنارے گھنے درختوں میں جا گرا۔ میں درخت کی شاخوں میں سے کھسکتا نیچے زمین کے ساتھ جا لگا۔ انگریز جرنیل اور وہاں کھڑے فوجی میرے جسم کو صحیح و سالم فضا میں اڑتے دیکھ کر بہت زیادہ پریشان ہوئے ہوں گے لیکن میں ان کی زد سے نکل چکا تھا۔ یہی میری خواہش بھی تھی کہ میں کسی سے لڑائی جھگڑا مول لئے بغیر چپکے سے وہاں سے نکل جاؤں۔

دریا چڑھا ہوا تھا۔ شام کا جھٹپٹا ہونے لگا تو میں نے سوچا دریا پار کر کے دوسری طرف نکل جانا چاہئے۔ میں نے کشتی میں سوار ہونے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ مجھے ایک عورت کی بھاری مگر خشک سی آواز سنائی دی۔

"میری بیٹی زمانی بیگم کو بچاؤ۔"

میں نے پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا وہاں کوئی عورت نہ تھی۔ کسی طرف بھی کوئی عورت نظر نہ آئی۔ پھر یہ آواز کہاں سے آ رہی تھی۔

"بیٹا میں اس کشتی میں بیٹھی ہوں۔ میں زمانی بیگم کی ماں ہوں۔ پچھلے برس میں دریا میں نہاتے ہوئے ڈوب گئی تھی تب سے دریا پر میری روح بھٹک رہی ہے۔ شہر میں غدر مچا ہے میری اکلوتی بیٹی زمانی کو سکھ فوجیوں نے گھر سے اغوا کر لیا ہے چاندنی چوک والی لال حویلی جاؤ۔ تم میری بچی کی جان اور عزت بچا سکتے ہو۔ میں اسی جگہ تمہاری راہ دیکھوں گی۔

ایک دکھی ماں کی روح کی فریاد سنو اور میری بچی کی مدد کرو۔"

میں کیسے اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ یہ حکم گویا مجھ پر من جانب اللہ آیا تھا۔ میں نے زمانی بیگم کی والدہ کی روح سے کہا کہ میں اس بچی کی جان بچانے کی کوشش کروں گا۔ وہ میرا انتظار کرے۔ یہ کہہ کر میں کشمیری دروازے والی دیوار کے شگاف میں سے شہر میں داخل ہو گیا۔ شہر ایک ویران قرینے کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ بھنگی منہ پر کپڑا لپیٹے لمبے لمبے بانسوں سے لاشیں اٹھا رہے تھے۔ گھروں پر تاریکی چھا رہی تھی۔ گورکھے' سکھ اور گورے فوجی بندوقیں اٹھائے دندناتے پھر رہے تھے۔

چاندنی چوک کا سارا علاقہ میرا دیکھا تھا۔ میں فتح پوری کے راستے سے نکل کر چاندنی چوک کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے رات کا اندھیرا شہر پر اتر آیا۔ لال حویلی' چاندنی چوک کے بازار کے مغربی کونے پر آم کے ایک وسیع باغ میں واقع تھی۔ یہاں قبرستان جیسی خاموشی اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

حویلی میں جیسے آسیب کا سایہ تھا۔ کسی دریچے' کسی کھڑکی سے روشنی کی ایک کرن بھی باہر نہیں آ رہی تھی۔ کہاں زمانی بیگم کی والدہ کی روح کو مغالطہ تو نہیں ہوا۔ لیکن روحوں کو بہت علم ہوتا ہے۔ میں حویلی کے عقب میں آ گیا۔ یہاں پر درختوں میں ایک چھوٹا سا ویران کٹیا نما مندر دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ مسلمان کی حویلی میں یہ مندر کہاں سے آ گیا۔ کسی عورت کی چیخ نما آواز بلند ہوئی۔ وہ مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ یہ زمانی بیگم کے سوا اور کسی کی آواز نہیں ہو سکتی تھی۔ میں حویلی کے صدر دروازے کی طرف دوڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس کا طاق کھلا ہے۔ یہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی کہ یہ طاق خود بخود کیسے کھل گیا تھا۔ میں حویلی میں گھس گیا۔

عورت کی آواز دوسری منزل سے آ رہی تھی۔ یہ اندھیری گھپ جگہ تھی۔ ستونوں والے دالان کے پیچھے بند کوٹھری تھی۔ عورت کی دبی دبی آواز اس کوٹھری سے آنے لگی۔ میں بے اختیار کوٹھری کے بند دروازے کو دھکیلتے ہوئے اندر گھس گیا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہوئی کہ میرے اندر جاتے ہی کوٹھری کا دروازہ دھڑاک کی آواز کے ساتھ اپنے آپ بند ہو گیا۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ پہلے جس عورت کی فریاد کی آواز آ رہی تھی اب اس آواز نے کپکپاتے ہوئے مگر ہڈیوں کو جما دینے والے ڈراؤنے لہجے میں بلند آواز کہا۔

"کالئے ---- او کالئے ---- ہریا کہاں ہے؟ اے لو اسے سنبھالو۔"

ایک دم سے میری چھٹی ساتویں بلکہ ساری حسیات بیدار ہو گئیں۔ خطرے کی گھنٹی

چیخ چیخ کر مجھے خبردار کرنے لگی۔ یہاں چکر ہی کچھ اور نکلا تھا۔ تاہم مجھے اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا۔ سوچا اگر میرے ساتھ فریب کیا گیا ہے تو مجھے فوراً" یہاں سے واپس چلے جانا چاہیئے۔ میں پیچھے مڑ کر بند دروازے کے پاس آیا۔ اسے کھولنے کے لئے ہاتھ لگایا ہی تھا کہ ایک شعلہ سا دروازے کے پٹ سے نکل کر میری طرف لپکا۔

میں ہاتھوں کو جھٹکتا ہوا پیچھے ہٹا۔ حیرت کی بات یہ نہیں تھی کہ دروازے کے پٹ میں شعلہ کہاں سے نکل آیا بلکہ یہ تھی کہ اس شعلے سے میرے ہاتھوں نے شدید تپش محسوس کی تھی۔ جو کہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے دوبارہ بند دروازے کو ہاتھ سے دھکیلا۔ پھر وہی شعلہ بلند ہوا اور میرا ہاتھ جلتے جلتے بچا اس کے ساتھ ہی کسی بوڑھے کی آواز آئی۔

"ابے او ہریا۔ اس مسلے کو باندھ رکھ رے دھشتنی آنے والی ہے۔"

کوٹھری میں گھپ اندھیرا تھا۔ خدا جانے یہ کس کی آواز تھی اور کہاں سے آ رہی تھی۔ اتنا مجھے پتہ چل گیا تھا کہ مجھے کسی نئی مصیبت میں پھنسا دیا گیا ہے۔ یہ لوگ کون؟ دھشتنی کون ہے؟ جس کا یہ بدروحیں بار بار نام لے رہی تھیں۔ زمانی بیگم کہاں غائب ہو گئی تھی؟ یقیناً" میں بدروحوں کے چکر میں گھر گیا تھا۔ جن کو ہندو لوگ بدروح نہیں بلکہ مسان کہتے ہیں۔ میں نے اپنے بازو میں اپنی انگلی کا ناخن چبھو دیا۔ مجھے درد محسوس ہوا۔ او خدا! یہ کیا ہوا؟ میری طاقت مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔ میں ایک عام کمزور انسان کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

اب کمرے میں مجھے گھٹن بھی محسوس ہونے لگی تھی جس کا احساس مجھے اس سے پہلے کوٹھری میں تو کیا قبر میں ہفتہ ہفتہ بھر بند رہ کر بھی نہیں ہوا تھا۔ کالیا کے مسان نے کسی مرہٹے مسان کو پکارا تھا۔ اس کا باریک سا جانوروں جیسا قہقہہ سنائی دیا۔

"رکھ دیا ہے باندھ کر اس مسلے کو۔ چل اب دھشتنی کو مندر سے بلاتے ہیں۔ اے لے۔ وہ تو چلی آ رہی ہے۔"

مجھے یہ آوازیں بالکل صاف سنائی دے رہی تھیں جو اگرچہ انسانی آوازیں تھیں لیکن ان میں ایک خاص قسم کا ڈراؤنا پن اور منمناہٹ تھی۔ انسانی کمزوریوں کے بیدار ہوتے ہی مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ میں چند قدم پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں پہلے مجھے کچھ نہ کچھ ضرور نظر آ جاتا تھا۔ لیکن اب سوائے اندھیرے کے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دل پر لرزہ طاری کر دینے والی خاموش چھا رہی تھی۔ اسی خاموشی کی دہشت نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے۔ اسی ہریے مسان کی مکروہ آواز ابھری۔

"ابے کالیے! کالی دھشتنی آ رہی ہے۔ بھاگ رے بھاگ۔"

چیزوں کے الٹے پلٹنے اور چھوٹے چھوٹے مکروہ قہقہوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور پھر گہرا سناٹا چھا گیا۔ یہ معمہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر میرے خلاف یہ جال کس لئے پھیلایا گیا تھا۔ یقیناً" کشتی والی روح کسی ہندو عورت کا مسان یا بد روح تھی جس نے زمانی بیگم کی مدد کا ڈھونگ رچا کر مجھے مکاری سے اس حویلی میں اپنے ساتھی مسان کے پاس پہنچا کر بند کر دیا۔ وہ مجھ سے کیا چاہتی تھی؟

میں اپنی پریشان سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ مجھے کوٹھری میں ایک ناگوار قسم کی بو کا احساس ہوا۔ میں نے سانس روک لی۔ مگر سانس رکنے سے میرا دم گھٹنے لگا۔ ناگوار بو جیسے میرے سارے جسم میں رچ گئی تھی۔ پھر کسی کے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی اور وہی کشتی والی عورت کی روح کی آواز آئی۔

"میں دھشتنی کا مسان ہوں۔"

میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔

"تو وہی کشتی والی عورت کی روح ہے۔ تو یہ بتا کہ تو نے میرے ساتھ یہ فریب کیوں کھیلا؟"

دھشتنی بولی۔ "تو یہ پوچھنے والا کون ہے۔ تو میرے قبضے میں ہے۔ ہریا اور کالیا میرے دو سیوک مسان تیرے پہرے پر لگے ہوئے ہیں۔ میں نے تیری شکتی چھین لی ہے۔ تو میرا غلام ہے۔ تیری زندگی میرے اختیار میں ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "آخر یہ سب کچھ کس لئے ہے؟ میں نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔"

دھشتنی مسان کا مکروہ قہقہہ بلند ہوا۔

"تو میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ میں تو تیرا کئی سالوں سے انتظار کر رہی تھی۔ مجھے راکشس دیوتا نے بتا دیا تھا کہ ایک مسلا پرانے زمانے سے سفر کرتا چلا آ رہا ہے۔ اس کو پکڑ لو وہی تمہارے کام آئے گا۔"

میں نے دوبارہ سوال کیا۔ "آخر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔ تم میرا انتظار کس لئے کر رہی تھی؟"

دھشتنی کی سرگوشی نما آواز آئی۔ "مجھے وہ منتر بتا دو جو تمہیں تمہاری ماتا نے بتایا ہے۔"

میں تو سر سے پیر تک جیسے کانپ گیا۔ یہ بدروح مسان کیا کہہ رہی تھی۔ میری والدہ

صاحبہ کا بتایا ہوا اسم خاص ان کی امانت تھی۔ اور میں اس امانت میں کبھی خیانت نہیں کر سکتا تھا۔ میں یہ اسم خاص کیونکر دوسرے کو بتا سکتا تھا۔ اور خاص طور پر ایک ہندو عورت کی بدروح یعنی مسان کو بتا دوں۔ یہ ایک ناممکن بات تھی۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"تم کس منتر کی بات کر رہی ہو؟"

دھشتی کی بدروح ہنسی۔ اس ہنسی میں طنز تھا۔

"انجان مت بنو۔ تم جانتے ہو میں کیا چاہتی ہوں۔ سنو۔ مجھے وہ اسم خاص بتاؤ جو تمہاری ماتا نے تمہیں بتایا تھا اور جس کے پڑھنے سے پہاڑ روڑا بن جاتے ہیں۔ درخت گھاس کی شاخ میں بدل جاتے ہیں اور انسان چھوٹا ہو کر ایک حقیر کیڑے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔"

میں نے دھشتی کی بدروح کو صاف صاف کہہ دیا کہ میں اپنی والدہ کی روح کو دوزخ میں نہیں جھونک سکتا۔ میں ان سے غداری نہیں کروں گا۔ یہ منتر میری والدہ کی روح کی امانت ہے۔ میں اسم خاص کبھی نہیں بتاؤں گا۔

ایک لمحے کے لئے کوٹھری میں خاموشی چھا گئی۔ یہ بڑی بوجھل اور تکلیف دہ خاموشی تھی۔ ڈراؤنی خاموشی تھی۔ کپڑوں کی سرسراہٹ کی آواز جیسے مجھ سے دور ہوتی چلی گئی۔ ناگوار بو بڑھتی چلی گئی۔ پھر کوٹھری کی فضا ایکدم چیخوں کی آوازوں سے بھر گئی۔ یہ انسانوں اور جانوروں کی چیخیں تھیں۔ میرے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ آوازیں ہاتھوں میں سے نکل کر میرے جسم میں گھس رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنی والدہ کا تصور کیا اور دل میں اسم خاص کا ورد کر کے انگلی اپنے جسم کی طرف کر لی اس خیال سے کہ شاید کسی سوراخ وغیرہ سے باہر نکل جاؤں گا لیکن یہ دیکھ کر میرے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے کہ اسم خاص کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ شاید اس ناگوار بو کا اثر تھا جو میرے اردگرد پھیلی ہوئی تھی۔ پھر جیسے کسی نے میرے سر پر کوئی بھاری شے ماری۔ میں فرش پر گر پڑا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

ہوش آیا تو میں اسی اندھیری کوٹھری میں تھا۔

مگر اب وہ ناگوار بدبو غائب تھی۔ میں نے اٹھ کر کوٹھری کے بند دروازے کو ہاتھ لگایا۔ وہی شعلہ ایک بار پھر میری طرف لپکا۔ میں ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے اپنی بے بسی کا شدت سے احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل خدا کی محبت اور اس کی بے پایاں بخشش کے احساس سے لبریز ہو گیا۔ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں بے اختیار سجدے میں گر پڑا اور اشکوں کی جھڑی کے ساتھ خداوند کریم سے دعا مانگنے لگا کہ وہ مجھے اس مصیبت سے نجات عطا فرمائے۔ میری آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ خدا کے حضور دعائیہ کلمات ادا کر رہے تھے۔

مجھے اپنے اردگرد خوشگوار خنکی کا احساس ہوا۔ جیسے کسی ندی کی طرف سے ہوا آ رہی ہو۔ عجیب سی ملکوتی خوشبو آنے لگی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکا۔ آنکھیں کھولنا چاہیں مگر آنکھیں بھی نہ کھلیں۔ اس کے باوجود دل و دماغ پر ایک حیرت انگیز سکون کی کیفیت طاری تھی۔ ہوا میرے جسم سے ایسے ٹکرا رہی تھی جیسے میں اڑا جا رہا ہوں۔ میں خاموشی سے سجدے میں پڑا خدا کے حضور اپنی رہائی کی دعائیں مانگتا رہا۔ پھر ہوا کی تیزی میں کمی آ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں زمین پر اتر رہا ہوں۔ میرے گھٹنے ابھی فرش سے لگے تھے۔

مجھے اپنے آس پاس کے لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں نعروں کی تھیں اور کچھ فاصلے سے آ رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے اپنا سر سجدے سے اٹھا لیا۔ سب سے پہلی چیز جسے میں نے دیکھا وہ کسی شہر کی فصیل اور ایک باغ تھا۔ میں اس باغ کی گھاس پر بیٹھا تھا۔ لوگوں کا ایک ہجوم جلوس کی شکل میں شہر کے دروازے میں سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ کچھ گورے اور سکھ گھڑسوار اس جلوس کے ساتھ ساتھ تو چل رہے تھے۔ مجھے ایک لمحے میں احساس ہو گیا کہ میں غدر کے

زمانے سے آگے نکل آیا ہوں۔ کیونکہ میں نے ایک توپ کو دیکھا' جسے ایک ایسی گا رکھا گیا تھا جو شور مچاتی پھٹ پھٹ کرتی چل رہی تھی۔ اس قسم کی گاڑی میں نے اپنی میں پہلی مرتبہ دیکھی تھیں۔

میں باغ سے اٹھ کر شہر کے دروازے کی طرف آ گیا۔ جلوس آگے نکل گیا تھا۔ سکھ دکاندار اپنی دکان کے بند کواڑ کھول رہا تھا۔ یہ کواڑ اس نے جلوس کو آتا دیکھ کر دیئے تھے۔ میں نے اس سے اردو میں پوچھا کہ یہ جلوس کدھر جا رہا ہے۔ اس نے میں جواب دیا۔ "جلیا انوالے باغ جا رہا ہے مہاراج۔ تم کو معلوم نہیں آج وہاں زبر جلسہ ہو گا۔"

اس دکان کی دیوار پر پرانی وضع کا گتے کے ٹکڑوں والا کیلنڈر لگا تھا۔ جس پر ۱۳ ۱۹۱۹ء عیسوی لکھا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں انیسویں صدی سے نکل کر بیسویں عیسوی میں داخل ہو چکا تھا۔ میرے قارئین سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ وہی دن تھا۔ جب امرتسر کے جلیا انوالے باغ میں انگریز جنرل ڈائیر کے حکم سے نہتے عوام پر گولیوں کا برسا دیا گیا تھا اور سینکڑوں لوگ شہید ہو گئے تھے۔ یہ لوگ اپنے لیڈروں کی گرفتاری خلاف احتجاج کرنے وہاں جمع ہوئے تھے۔ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پھ میں سیر تماشا دیکھنے کی خاطر لوگوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ یہ شہر امرتسر تھا اور میں اس دروازہ گھی منڈی سے گزر کر چوک ملکہ کے بت کی طرف جا رہا تھا۔

میں ایک' ایک چیز کو گہری دلچسپی سے تک رہا تھا۔ سڑک بڑی پختہ تھی اور اینٹوں بجائے کسی پختہ گارے کی مدد سے بنائی گئی تھی۔ سڑک کی دونوں جانب لوہے کے کھ کے اوپر چمکیلے بلب لگے ہوئے تھے۔ نئے زمانے میں آتے ہی مجھے اس عہد کی تمام ایجاد کا علم اپنے آپ حاصل ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ یہ بجلی کے بلب تھے۔ انسان نے بجلی ایجاد ک تھی۔ ریل بھی چلنا شروع ہو گئی تھی۔ جس کو بھانپ کا انجن کھینچ رہا تھا۔ انسان کی حیرت انگیز سائنسی ترقی پر میں دل ہی دل میں داد دے رہا تھا۔

اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ موسم بے حد خوشگوار ؛ ہجوم میں ہندو' مسلمان اور سکھ' عیسائی سبھی شامل تھے۔ مسلمانوں کی سرخ ٹوپیاں' کلاہ سکھوں کی مخصوص پگڑیاں اور ہندوؤں کی چھوٹی چھوٹی گول سیاہ ٹوپیاں صاف پہچانی جا تھیں۔ یہ لوگ "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔

ملکہ کے بت والے چوک سے یہ ہجوم بازار بھنگیاں کی طرف مڑ گیا۔ اسی بازار جلیانوالہ باغ کا پرانا دروازہ تھا۔ اندر جا کر دیکھا کہ باغ کا میدان خلق خدا سے بھرا

ہے۔ درمیان میں اسٹیج لگا تھا۔ اسٹیج پر میز کرسی بھی تھی۔ کرسی پر ڈاکٹر سیف الدین کچلو' کی فریم کی ہوئی تصویر رکھی تھی۔ ڈاکٹر کچلو کو بھی انگریزوں نے گرفتار کیا ہوا تھا۔ میں بھی لوگوں کی بھیڑ میں گھس گیا اور اسٹیج کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ ایک شاعر نے انقلابی نظم پڑھی۔۔۔۔۔ پھر ایک پنجابی کے شاعر نے اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد کوئی صاحب اٹھ کر تقریر کرنے لگے۔ عین اس وقت آسمان پر گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی اور ایک ہوائی جہاز گڑگڑ کا شور مچاتا ہوا نمودار ہوا' اور میدان کے اوپر چکر لگا کر چلا گیا۔ ہوائی جہاز کی ایجاد کو محو پرواز دیکھ کر میں واقعی دنگ رہ گیا۔ زمین کی کشش کے خلاف یہ انسان کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

ہوائی جہاز کے جانے کے کوئی پانچ منٹ بعد باغ کے دروازے پر میں نے گورکھا اور گورا فوج کی غیر معمولی نقل و حرکت دیکھی۔ یہ لوگ مشین گنیں لے آئے تھے اور ان کا رخ لوگوں کی طرف تھا۔ میں نے ایک انگریز فوجی افسر کو رومال اوپر اٹھا کر نیچے گراتے دیکھا۔

اس کے ساتھ ہی تڑتڑ کی آوازیں بلند ہوئیں تو مشین گن کی گولیوں نے لوگوں کو بھوننا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے وہ لیڈر گرا جو تقریر کر رہا تھا۔ اس کا سفید کرتا خون میں سرخ ہو گیا۔ کسی نے چلا کر کہا۔ "اوئے پھوکے فائر ہیں اوئے بیٹھے رہو۔"

مگر جب انسانوں کے سینے چھلنی ہونے لگے اور خون کے فوارے ابلنے لگے تو لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا' بھگدڑ مچ گئی۔ بچے بوڑھے جوان ایک دوسرے کو کچلتے ہوئے باغ کی نیم قوسی دیوار کی طرف بھاگے کہ اسی پر سے کود کو دوسرے محلوں میں نکل جائیں۔ یہ باغ شہر کے وسط میں تھا اور چاروں طرف گلی کوچوں کے مکانوں سے گھرا ہوا تھا۔

لوگ گولیاں کھا کر گر رہے تھے۔ ہر طرف خون ہی خون تھا۔ چیخ و پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ فائرنگ ابھی تک ہو رہی تھی۔ میرے جسم سے بھی کئی گولیاں ٹکرا کر نیچے گر چکی تھیں۔ میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ باغ کی دیوار کی طرف جا رہا تھا۔ میرے آگے آگے ایک چھ سات سال کا بچہ اپنے باپ کو پکڑے روتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے ہو گیا۔ کیونکہ گولیاں پیچھے سے آ رہی تھیں۔ تین گولیاں ایک ساتھ میری پشت سے ٹکرائیں۔ میں لڑکے اور اس کے باپ کے پیچھے ڈھال بنا دوڑ رہا تھا۔

باغ کی دیوار پر چڑھتے ہوئے لوگ گولیاں کھا کر نیچے گر رہے تھے۔ کچھ لوگ دیوار پھلانگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یہ دیوار کوئی پندرہ فٹ اونچی تھی۔ بچے کے باپ نے اچھل کر دیوار پار کرنی چاہی مگر وہ گر پڑا۔ اس نے بچے کو اپنے نیچے کر لیا۔ میں نے جلدی

سے بچے کو اپنی اوٹ میں لے لیا اور اس کے باپ کو پکڑ کر دیوار کی دوسری طرف گرا دیا۔ اس کے بعد بچے کو اپنے سینے سے چمٹائے میں نے بھی دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔

دوسری طرف لکڑیوں کا ٹال تھا۔ ہم لکڑیوں پر جا گرے۔ بچہ زور سے چیخ رہا تھا۔ خوف سے اس کا چہرہ زرد تھا۔ اس کے باپ کا ماتھا زخمی ہو گیا تھا اور زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہیں گولی تو نہیں لگی؟"

"جی نہیں بھائی صاحب۔ آ ـــــ کا ـــــ آپ کا ـــــ میرے خدا ـــــ یہ کیا قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں کہاں آ گیا ہوں۔ یہ کون سا محلہ ہے؟ چلو اشرف بیٹے گھر۔"

پھر یہ آدمی میری طرف دیکھ کر بوکھلایا ہوا بولا۔ "بھائی صاحب ـــــ ہمیں گھر پہنچا دو گے۔ ہمیں گھر پہنچا دو۔ گولی چل رہی ہے ـــــ گولی چل رہی ہے۔"

میں ان دونوں باپ بیٹے کو لے کر اونچے اونچے مکانوں والی تنگ گلیوں میں سے ہوتا ایک بازار میں آ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس آدمی نے ایک دکاندار سے پوچھا۔ "محلہ رامانند کہاں ہے؟" اس نے جواب دیا۔

"یہی محلہ ہے۔"

میرا ساتھی اس قدر حواس باختہ تھا کہ وہ اپنے محلہ کو بھی نہیں پہچان رہا تھا۔ میں نے اسے اس کے مکان پر پہنچایا اور خود شہر کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ میں پھر اسی باغ میں جا کر بیٹھ گیا۔ لوگ دیوانہ وار شہر سے نکل کر بھاگ رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو دیہات سے جلسہ سننے آئے تھے اور انگریزوں کی گولیوں سے بچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ گھڑ سوار پولیس کے سپاہی ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ چاروں طرف ایک افراتفری مچی تھی فصیل شہر کی جانب سے انقلاب زندہ باد کے نعروں کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ پھر شام کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ ابھی شہر کے گلی کوچوں میں بجلی نہیں آئی تھی۔ صرف بڑی سڑک پر کھمبے لگے تھے۔ جن کے دھیمے دھیمے بلب روشن ہوتے ہی بجھ گئے۔ اس کے بعد لوگ انگریزوں کے خلاف نعرے لگاتے گھروں سے نکل آئے۔ سڑک پر دو گھڑ سوار انگریز فوجی دوڑے جا رہے تھے۔ ایک ہجوم نے گھوڑوں کی ٹانگوں پر لاٹھیاں پھینکیں۔ گھوڑے گر پڑے۔ بپھرے ہوئے ہجوم نے دونوں انگریزوں کو لاٹھیاں مار مار کر ہلاک کر دیا۔ میں باغ سے نکل کر ہجوم میں شامل ہو گیا۔

ہر طرف لوٹ مار شروع ہو گئی۔ تھانوں کو آگ لگائی جانے لگی۔ میں ہال بازار میں آیا تو وہاں ہجوم ایک بینک میں آگ لگا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دو منزلہ عمارت کی چھت پر ایک انگریز خوف زدہ نگاہوں سے نیچے جھانک رہا تھا۔ اس کی موت یقینی تھی۔ ہجوم نے

بینک کو لوٹ کر اس کی پہلی منزل کو آگ لگا دی اور انگریز مینجر کی بے بسی کا تماشہ کرنے لگے۔ اس بینک کی ساتھ والی عمارتوں پر لوگ تلواریں، کلہاڑیاں لئے کھڑے تھے کہ اگر انگریز مینجر ادھر کودا تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ اچانک مجھے بینک کی چھت پر ایک پھول ایسی انگریز بچی کا دہشت زدہ چہرہ دکھائی دیا۔ وہ نیچے سے اٹھتے آگ کے شعلوں کو دیکھ کر روتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ بینک کا مینجر اوپر اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ مقیم تھا۔ مجھ سے اس پھول ایسی بچی کا جل کر مرجانا گوارا نہ ہوا۔ میں ہجوم سے نکل کر بینک کے شعلوں میں گھس گیا۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل میں آ گیا۔ آگ یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ پھر میں دوسری سیڑھی پر سے ہوتا اوپر چھت پر پہنچ گیا۔ انگریز مینجر کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے دہائیں سے مجھ پر فائر کر دیا۔ پرانی طرز کا پستول تھا۔ اس میں سے دھوئیں کے ساتھ کتنی ہی گولیاں نکل کر میرے جسم سے ٹکرا کر نیچے گر پڑیں۔

میں نے انگریزی میں چلا کر کہا۔ "احمق! میں تجھے اس آگ سے بچانے آیا ہوں۔"

اس کی پیاری سی پھول ایسی بچی سہمی ہوئی اس کے ساتھ لگی تھی۔ انگریز مینجر اس بات پر حیران ہوا کہ مجھ پر گولی کا اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے دوسرا فائر جھونک دیا۔ یہ فائر اس کی آنکھوں کے سامنے میرے سینے پر لگا۔ کیونکہ میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ جب پھر بھی میں زخمی ہو کر نہ گرا تو انگریز یہی سمجھا کہ میں نے لباس کے اندر لوہے کا توا باندھ رکھا ہے۔

میں نے پستول اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور کہا۔ "میں تمہیں اور تمہاری بچی کو موت کے منہ سے نکالنے آیا ہوں۔ تم مجھ پر فائر کر رہے ہو۔ یہ لو اپنا طمنچہ۔ اسے جیب میں رکھو۔" میرے پستول واپس کرنے پر اسے مجھ پر اعتبار آ گیا۔ کہنے لگا۔

"تم ہمیں کیسے یہاں سے نکالو گے۔ نیچے آگ لگی ہے۔ ارد گرد کے مکانوں پر بلوائی تلواریں، کلہاڑیاں لئے کھڑے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں تمہیں اس طرح لے جاؤں گا کہ تمہیں کوئی نہ دیکھ سکے گا۔"

پھر میں نے اپنے دل میں اپنی والدہ کی شکل کا تصور کیا۔ ان کا بتایا ہوا اسم خاص دل میں دہرایا اور انگریز مینجر کے کاندھے سے انگلی لگا دی۔ چشم زدن میں یہ انگریز نوجوان سمٹ کر چڑیا کے بچے جتنا ننھا ہو گیا۔ وہ خوف کے مارے میری ٹانگوں میں بھاگنے دوڑنے لگا۔ اس کی باریک آواز میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کیونکہ ہجوم کے نعروں کی گونج میں اب آگ کے شعلوں کی آواز بھی مل کر شور پیدا کر رہی تھی۔ انگریز کی بیٹی نے اپنے باپ کو ننھا

سا بنتے دیکھا تو رونے لگ پڑی۔ میں نے اسے بھی انگلی سے چھوا اور وہ تو بالکل ہی ننھی سی ہو گئی۔ میں نے ان دونوں کو اٹھایا اور اپنی قمیض کی اندر والی جیب میں چھپا کر زینے کی طرف لپکا۔

شعلوں کا مجھے خوف نہیں تھا۔ شعلے میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتے تھے۔ مگر یہ خطرہ تھا کہ میری اندرونی جیب میں چھپے باپ بیٹی گرمی سے نہ جھلس جائیں۔ میں چھلانگ لگاتا سیڑھی پر سے اتر کر پہلی منزل میں آ گیا۔ جو آگ سے سرخ ہو رہی تھی۔ ایک سیکنڈ کے اندر اندر میں نے شعلوں میں سے باہر چھلانگ لگا دی۔ میں سڑک پر گرا تو لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔

"تم اندر کیا لینے گئے تھے؟ تم کیسے بچ کر آ گئے؟ تمہیں آگ کیوں نہیں لگی؟"

ہر کوئی مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تک رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "بھائیو' اس بینک میں میری بیٹی کا زیور گروی پڑا تھا۔ وہ لینے گیا تھا۔ پر زیور نہیں ملا۔"

اور میں اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا ہجوم سے نکل کر ہال بازار کے دروازے کی طرف چلنے لگا۔ میں نے کرتے کے بٹن کھول کر اندرونی جیب میں دیکھا۔ انگریز نوجوان اور اس کی ننھی سی بچی ایک دوسرے سے لگے سہمے بیٹھے تھے۔ ان پر ایک ناقابل یقین دہشت چھائی ہوئی تھی۔

ہال گیٹ کے باہر لوگ لاری اڈے کو آگ لگا رہے تھے۔ میں نے ایک طرف ہٹ کر جیب میں منہ ڈال کر انگریزی میں پوچھا۔ "تم کہاں جانا چاہتے ہو؟" میری جیب سے بڑی ہی باریک آواز آئی۔

"امرتسر چھاؤنی۔ امرتسر چھاؤنی۔ آرٹیلری گراؤنڈ کا پہلا بنگلہ ----- پہلا بنگلہ ----- پہلا بنگلہ۔ مجھے بڑا کرو ----- بڑا کرو۔"

"ابھی تم خطرے سے باہر نہیں ہو۔ خاموشی سے دبکے رہو۔" میں ریلوے لائن عبور کر کے دوسری طرف آیا تو ایک کوچوان نظر آیا جو اپنے گھوڑے کو تانگے سے کھول رہا تھا۔ میں نے چھاؤنی کا پتہ پوچھا اور سیدھی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ اس سڑک پر آگے امرتسر کا ریلوے اسٹیشن تھا۔ جہاں گورکھا سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ انہوں نے مجھے گزرتا دیکھ کر کچھ نہ کہا۔ یہاں سے آگے گیا تو چھاؤنی کا علاقہ شروع ہو گیا۔

اس علاقے میں گورا فوج نے مورچے سنبھال رکھے تھے۔ میں ہندوستانی بلکہ غدر کے لباس میں تھا۔ اگرچہ غدر کے زمانے کے مسلمانوں کے لباس میں بہت تھوڑا فرق تھا۔ پھر بھی میں ہندوستانی تھا۔ گورا فوج کے ایک سارجنٹ نے مجھ پر بندوق سے فائر کر دیا۔ خدا کا

شکر ہے کہ گولیاں میرے پیٹ پر لگیں۔ اور میری جیب مین موجود نوجوان انگریز اور اس کی بچی محفوظ رہی۔

میں نے دونوں کو جیب سے باہر نکال لیا اور ایک طرف دوڑ کر درختوں کی اوٹ میں ہو گیا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ گورا سارجنٹ دو تین گورکھا سپاہیوں کو لے کر میری طرف دوڑا۔ اس عرصے میں' میں نے انگریز نوجوان اور اس کی بچی کو پھر سے بڑے سائز کا کر دیا تھا۔ انگریز سارجنٹ نے اپنے سامنے اپنے ہم وطن انگریز کو دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ انگریز مینیجر نے سارجنٹ کو انگریزی میں چلا کر کہا۔ "اسے مت مارو۔ یہ مجھے بلوائیوں سے بچا کر لایا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا خدا حافظ دوست۔"

انگریز مینیجر مجھ سے لپٹ گیا۔ "خدا کے لئے میرے ساتھ چلو۔ تمہیں ابھی میری مدد کرنی ہے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

مجھے بڑی عزت و احترام کے ساتھ یہ انگریز نوجوان مینیجر بنگلے پر لے گیا۔ اس کی بیٹی مجھے سہمی ہوئی نظروں سے تک رہی تھی۔ وہ ششدر تھی کہ وہ چھوٹی سی کیسے بن گئی؟ اس کے ڈیڈی نے اسے کمرے میں لے جا کر سلا دیا۔ پھر میرے لئے چائے بنا کر لے آیا اور بولا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ تم اس وقت دنیا کے سب سے بڑے جادوگر ہو۔ میں نے تمہارے جادو کا کرشمہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' اب تم اس جادو کے ذریعے مجھ پر ایک اور احسان کرو۔ میری بیوی الزبتھ سول لائنز کے بنگلہ نمبر تھری میں اپنی بڑی بہن کے ہاں گئی ہوئی ہے۔ بلوائیوں نے ضرور ادھر بھی حملہ کیا ہو گا۔ اس کی جان خطرے میں ہے۔ کیا تم اسے بچا کر لا سکو گے؟"

انگریز مینیجر نے مجھے اپنی بیوی کی تصویر دکھائی۔ میں اجازت لے کر اپنے بنگلے سے نکل پڑا۔ گورا سارجنٹ اور گورکھا سپاہیوں نے مجھے کچھ نہ کہا۔ سول لائنز کا سارا حدود اربعہ مجھے بتا دیا گیا تھا۔ اب رات ہو گئی تھی۔ سول لائنز کا علاقہ ٹھنڈی سڑک پر کمپنی باغ کے عقب میں تھا۔ یہاں سڑک کی بتیاں روشن تھیں۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ شہر کی جانب سے کسی وقت نعروں کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ ٹھنڈی سڑک پر پہنچا تو دیکھا کہ کئی بنگلوں میں آگ لگ چکی تھی اور ان میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ انگریزوں کا سامان سڑک پر بکھرا پڑا تھا۔

مجھے تشویش ہوئی کہ کہیں الزبتھ کی بہن کے بنگلے کو بھی لوگوں نے نذر آتش نہ کر دیا ہو۔ ایک جگہ گارڈینا کی جھاڑیوں کے پاس ایک انگریز کی کٹی پھٹی برہنہ لاش نظر آئی۔ میں آگے گزرتا گیا۔ سکھ بلوائیوں کی ایک ٹولی کرپانیں لہراتی نعرے لگاتی میرے قریب سے گزر

گئی۔ میں بنگلہ نمبر تھری کے پاس پہنچا تو وہی دیکھنے کو ملا جس کا مجھے ڈر تھا۔ بنگلہ نذر آتش کیا جا چکا تھا۔ سامان ٹوٹا پھوٹا بکھرا پڑا تھا۔ مگر وہاں کسی عورت کی لاش نہیں تھی۔

میں بنگلے سے باہر آ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سڑک پر بلوائیوں کی ٹولیاں بچے کھچے بنگلوں کو آگ لگا رہے تھے۔ میں بنگلے کے عقب میں آ گیا۔ یہاں نوکروں کے کوارٹر تھے۔ یہ کوارٹر بھی خالی تھے۔ ایک طرف دھوبی گھاٹ بنا تھا۔ یہاں دھوبی گھاٹ کی دیوار پر کیٹی کا ایک لیمپ جل رہا تھا۔ اس لیمپ کی روشنی میں اور کچھ اپنی مافوق الفطرت بصارت کی وجہ سے دھوبی گھاٹ کی دیوار کے پیچھے ایک راستہ اندھیرے درختوں میں جاتا دکھائی دیا۔ میں ان درختوں میں آ گیا۔

یہاں ایک طرف کچی کوٹھری تھی۔ جس پر تالا لگا تھا۔ باہر ایک آدمی چارپائی پر لیٹا حقہ پی رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا اور بولا۔ "کون ہو بھائی۔ ہم مسلمان ہیں عیسائی نہیں ہیں۔" میں سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ میں نے کہا۔ "بھائی میں بھی مسلمان ہوں۔ پردیسی ہوں۔ گاؤں سے جلسہ سننے آیا تھا۔ اللہ نے کرم کیا۔ جان بچ گئی۔ اب بڑی مشکل سے جان بچا کر واپس گاؤں جا رہا تھا کہ تمہارے حقے کی خوشبو ادھر کھینچ لائی۔ بڑی طلب ہے۔ دو ایک کش لگا کر چلا جاؤں گا۔"

"لو بھائی پی لو---- پر اب تو تمباکو جل چکا ہے۔"

"کوئی بات نہیں بھائی۔ تمہاری مہربانی ہے۔" یہ کہہ کر اس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ کر حقہ پینے لگا۔ مجھے اس کی عادت نہیں تھی۔ کھانسی آ گئی۔

"پانی لاؤں تمہارے لئے؟"

"ہاں بھئی۔ تھوڑا پانی پلا دو۔ اچھو آ گیا ہے۔" وہ آدمی پانی لینے ذرا فاصلے پر رکھے مٹی کے گھڑے کی طرف گیا تو میں نے کوٹھری کے تالے پر ایک نگاہ ڈالی۔ پھر منہ دروازے کی طرف کر کے آہستہ سے کہا۔ "الزبتھ۔ الزبتھ۔ مجھے تمہارے خاوند نے بھیجا ہے۔" اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ آدمی پانی لے کر آ گیا۔ میں نے کٹورا منہ سے لگا کر دو گھونٹ پانی پیا۔ پھر جلیانوالہ باغ میں انگریزوں کی فائرنگ کی باتیں کرنے لگا۔

"بھائی! ہم نے انگریزوں سے خوب خوب بدلہ لیا۔ شہر میں کوئی انگریز زندہ نہیں چھوڑا۔ یہاں سول لائنز میں تم نے کتنے انگریزوں کو جہنم میں پہنچایا؟" وہ حقے کا کش لگا کر بولا۔

"بھائی یہ بھی تو ظلم ہے۔ ہمیں انگریز کی حکومت سے بدلہ لینا چاہئے۔" میں سمجھ گیا کہ کوٹھری خالی نہیں ہے۔ کیونکہ اس دھوبی کے دل میں انسانیت کا درد موجود تھا۔ میں نے

براہ راست سوال کر دیا تھا۔ "اس کوٹھری میں کتنی فرنگی عورتیں قید ہیں؟"

وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر میرے گھٹنے پکڑ کر بولا۔ "بھائی۔ تم میرے مسلمان بھائی ہو۔ میں نے اپنے مالک کا نمک کھایا ہے۔ میں نے دو میموں کو چھپا لیا ہے۔ کہ بلوہ کم ہو گا تو انہیں چھاؤنی چھوڑ آؤں گا۔"

میں نے اسے ساری کہانی سنا ڈالی کہ مجھے الزبتھ کے خاوند نے اسے اور اس کی بہن کو لینے بھیجا ہے۔ وہ بولا۔ مگر جگہ جگہ بلوائی ہیں۔ تم انہیں کیسے لے جاؤ گے اور پھر تمہارے پاس کوئی ثبوت بھی تو نہیں ہے کہ تم کو میم صاحب کے صاحب نے بھیجا ہے۔

بڑا بھولا آدمی تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ الزبتھ اور اس کی بہن کی قسمت یاوری کر رہی تھی کہ بلوائیوں سے بچ گئی وگرنہ یہ بھولا بھالا آدمی میری جگہ کوئی دوسرا آتا تو اسے بھی سب کچھ اگل دیتا۔ میں نے کہا۔ "تم میم صاحب سے میری بات کرا دو۔"

ابھی ہم یہ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ تین آدمی ہاتھوں میں چھریاں لئے آ دھمکے۔ "میم نوں کڈو اوئے۔" (انگریز عورت کو باہر نکالو۔)

بے چارے دھوبی کے تو ہوش اڑ گئے۔ حقہ پرے کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہاں تو کوئی میم نہیں جی۔ میم صاحب تو چلا گیا۔"

ایک آدمی نے چھری دھوبی کی گردن پر رکھ دی اور اپنے ساتھی سے کہا۔ "تالا توڑ دے اوئے کوٹھری دا۔"

اب میری مداخلت ضروری تھی۔ میں کوٹھری کے بند دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جو آدمی تالا توڑنے آگے بڑھا تھا اسی نے دیکھا کہ میں بالکل نہتا ہوں لیکن سینہ تان کر کھڑا ہوں تو ہنس پڑا۔ اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔ "جیلے۔ اے انگریزاں داں ٹوڈی اے۔ لا دواں ایہنوں؟" "یہ انگریزوں کا پٹھو ہے۔ گردن اتار دوں اس کی؟)

اس کا ساتھی چھری ہوا میں لہرا کر بولا۔ "ایہنوں میں لاواں گا۔" (اس کو میں قتل کروں گا۔"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ بے گناہ معصوم عورتوں پر ہاتھ اٹھانا شریف انسانوں کو زیب نہیں دیتا۔ لیکن وہ تو غنڈے تھے جو اس تحریک آزادی کے بلوے سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ہو سکتا تھا وہ انگریز عورت کو اغوا کرنے آئے ہوں۔ اس نے چھری کی نوک میرے سینے سے لگا دی اور بولا۔ "اگوں ہٹ جا اوئے۔"

اب سے تھوڑا سا کرشمہ دکھانا ضروری تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا اندر انگریز عورت سہمی بیٹھی ہے۔ میں نے غنڈے کی چھری والی کلائی گرفت میں لے کر اپنی تھوڑی سی

طاقت ڈالی تھی کہ غنڈے کے ہاتھ سے چھری گر پڑی اور وہ درد سے دہرا ہو گیا۔

اس کی زبوں حالی دیکھ کر اس کے دونوں ساتھی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے اپنی طرف سے میرے پیٹ پر چھریوں سے حملہ کر دیا۔ چھریاں میرے جسم سے ٹکرا کر ان کے ہاتھوں کو زخمی کر گئیں۔ ایک چلایا۔ "اوئے اس نے لوہے کی واسکٹ پہن رکھی ہے۔ اس کی گردن اڑا دو۔"

دھوبی ایک طرف دبکا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں ان غنڈوں کو محض بھگا دینا چاہتا تھا کہ بدقسمتی ان کی، کہ ان میں سے ایک نے مجھے گالی دے دی۔ یہ بات میری برداشت سے باہر تھی میرا خون کھول اٹھا۔ جس غنڈے نے مجھے گالی دی تھی میں نے اسے گردن سے پکڑ کر جھنجوڑا اور پھر اٹھا کر درختوں کی طرف زور سے اچھالا۔ وہ زمین سے پچاس فٹ بلند ہو کر درختوں کی ٹہنیوں سے ٹکرایا اور پھر زمین پر اس طرح گرا کہ پھر نہ اٹھ سکا۔

یہ عالم دیکھ کر اس کے دونوں ساتھی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ اٹھے۔ یہ کرشمہ بوڑھے دھوبی نے دیکھ لیا تھا۔ وہ مجھے کوئی جن سمجھنے لگا۔ اور سہما ہوا ایک طرف کھڑا تھا۔ اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ اب اسے یقین آ گیا تھا کہ میں ان انگریز عورتوں کو بچانے کے لئے آیا ہوں۔ میں نے یہ کہہ کر اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کی کہ میرے پاس ایک اسم ہے جس کو پڑھنے سے مجھے طاقت آ جاتی ہے۔ ویسے میں ایک عام انسان ہوں۔ اس نے تالا کھول دیا۔

کوٹھری میں اندھیرا تھا۔ کونے میں دو انگریز عورتیں چارپائی کے پیچھے چھپی بیٹھی تھیں۔ میں نے الزبتھ سے کہا کہ مجھے اس کے خاوند نے بھیجا ہے۔ اس نے سب سے پہلے یہ پوچھا کہ اس کی بچی کہاں ہے؟ جب اس نے بتایا کہ میں انہیں بلوائیوں کے چنگل سے نکال کر چھاؤنی کے بنگلے پر پہنچانے میں کامیاب ہو گیا ہوں تو اس نے صلیب کا نشان بنا کر ہاتھ باندھ لئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر میرا شکریہ ادا کیا اور بولی۔ "کیا تم سچے ہو؟ مجھے اور میری بہن کو اغواء تو نہیں کر لو گے؟"

میں نے کہا۔ "ابھی ابھی میں نے ان غنڈوں کو بھگایا ہے جو تمہیں اغواء کرنے آئے تھے۔ تم اپنے ملازم دھوبی سے پوچھ سکتی ہو۔"

بوڑھے دھوبی نے سارا واقعہ الزبتھ اور اس کی بڑی بہن کو من و عن سنا دیا۔ الزبتھ میرے ساتھ جانے پر راضی ہو گئی لیکن اس خطرے کا اظہار کیا کہ راستے میں دوسرے غنڈے انہیں ہلاک کر دیں گے۔ میں نے دھوبی سے پوچھا کہ آس پاس کوئی بگھی یا گھوڑے نہیں ہیں؟ الزبتھ کی بہن بولی۔ "پیچھے اصطبل میں دو گھوڑے موجود ہیں۔"

ہم نے اصطبل میں سے گھوڑے نکالے۔ ان پر زین کسی۔ ایک گھوڑے پر الزبتھ اور اس کی بڑی بہن کو بٹھا کر ان پر کالی چادریں ڈال دیں۔ دوسرے گھوڑے پر میں خود سوار ہو گیا اور ان امانتوں کو لے کر چھاؤنی کی طرف گھوڑے ڈال دیئے۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ شہر کی طرف سے کہیں کہیں آگ کے شعلے بلند ہوتے نظر آ رہے تھے۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ ریلوے اسٹیشن تک ہمیں کسی نے نہ روکا۔ اسٹیشن کے قریب گورکھا سپاہی نے ہمیں گھیر لیا۔ یہاں الزبتھ نے چادر میں سے اپنا گورا چہرہ نکال کر انگریزی میں کہا کہ یہ آدمی ہمیں نکال کر لایا ہے۔ ہم چھاؤنی اپنے بنگلے پر جا رہے ہیں۔ اس نے اپنا تعارف کروایا تو گورکھا سپاہی پیچھے ہٹ گئے۔ چھاؤنی سڑک پر ہم گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے اسی مقام پر پہنچ گئے جہاں انگریزوں کے سپاہیوں نے باقاعدہ مورچے لگا رکھے تھے۔

الزبتھ نے چلا کر انگریزی میں اپنا تعارف کروایا تو مورچے میں سے وہی سارجنٹ باہر نکل کر ہماری طرف بڑھا۔ وہ بھی گھوڑے پر سوار تھا۔ اتنے میں الزبتھ کا خاوند بینک منیجر بھی آ گیا۔ اور ہم بنگلے کی طرف چل پڑے۔ بنگلے پر الزبتھ اپنی بچی کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "ایڈورڈ مجھے یقین نہیں آتا کہ ہم بچ گئے ہیں۔"

ایڈورڈ انگریز بینک منیجر کا نام تھا۔ اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ سب کچھ اس نوجوان نے کیا ہے۔ اس کے پاس ایک طلسم ہے۔"

میں نے ایڈورڈ کی طرف دیکھ کر آنکھ کا اشارہ کیا کہ وہ طلسم کی بات نہ کرے۔ "کون سا طلسم؟" الزبتھ کی بہن نے سوال کیا۔

ایڈورڈ بات گول کر گیا۔

رات میں نے ایڈورڈ کے بنگلے پر بسر کی۔ دوسرے دن بھی شہر میں لوٹ مار ہوتی رہی۔ سرکاری املاک کو ----- نذر آتش کیا جاتا رہا۔ شہر کے سارے بینک لوٹ لئے گئے۔ ہمیں منیجر ایک ایک پل کی خبر دیتے رہے۔ شام کو جالندھر اور لاہور سے رائل رٹلری کے فوجی دستے پہنچ گئے۔ شہر میں کرفیو لگا دیا گیا اور گورا فوج شہر میں گشت کرنے لگی۔ گھر گھر تلاشیاں ہونے لگیں۔ مال برآمد کیا جانے لگا۔ یہاں امرتسر میں ایک بار پھر غدر کے بعد کا منظر دیکھنے میں آیا۔ لوگوں کو بے دریغ پکڑ پکڑ کر جیلیں بھر دی گئیں۔ شہر میں جگہ جگہ ٹکٹکیاں لگ گئیں جہاں حریت پسندوں کو کوڑے مارے جانے لگے۔

مجھے بینک منیجر نے ایک چھوٹا سا سرٹیفکیٹ لکھ کر دے دیا تھا کہ میں نے ایک انگریز اور اس کی بیوی کی جان بچائی ہے۔ ایڈورڈ کے سارجنٹ دوست نے مجھے کرفیو پاس بھی بنا دیا تھا۔ میں امرتسر کے گلی کوچوں میں کرفیو کے دوران بھی گھومتا پھرتا تھا۔ اس خیال سے

کہ اگر کہیں کسی ہندوستانی بہن بھائی کو میری مدد کی ضرورت ہو تو میں ان کے کام آ سکوں۔ کوئی گورا سارجنٹ یا گورکھا میری راہ روکتا تو میں اپنا کرفیو پاس اور سرٹیفیکیٹ دکھا دیتا اور انہیں بتاتا کہ میں مخبر ہوں۔

ے کوئی کچھ نہ کہتا۔ اس طرح تیسرے روز دوپہر کے بعد شہر کے جنوب مغربی علاقے میں کوچہ کوڑیاں والا کے قریب سے گزر رہا تھا کہ وہاں گورا سپاہیوں اور گورکھا فوج کو دیکھا۔ انسپکٹر ہنٹر گلی کے دروازے پر کرسی ڈالے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ کرفیو کی وجہ سے لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند تھے۔ کوچہ کوڑیاں والا کے پرانی وضع کے چھجوں والے مکانوں کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور سہمے ہوئے چہرے نیچے گلی میں جھانک رہے تھے۔ میں بھی سکھ پولیس والوں کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ انسپکٹر ہنٹر نے میری طرف بید کا اشارہ کر کے پوچھا کہ میں کرفیو میں کیسے پھر رہا ہوں؟ میں نے جیب سے ایڈورڈ کا سرٹیفیکیٹ اور کرفیو پاس دکھایا تو گورا انسپکٹر دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ "شاباش جوان! تم ہمارے اپنے آدمی ہو۔ ادھر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔"

گورکھا سپاہی نے لوہے کی کرسی میری طرف کھسکا دی۔ میں انسپکٹر ہنٹر کے پیچھے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ابھی تک یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ یہ لوگ اس گلی کے باہر کس لئے منڈلی جمائے ہوئے ہیں۔ بہت جلد یہ معمہ حل ہو گیا۔ انسپکٹر ہنٹر نے سکھ تھانیدار کی طرف اشارہ کیا۔ سکھ تھانیدار گلی میں آ گیا۔ ساری گلی خالی اور سنسان تھی۔ لوگ کھڑکیاں ذرا ذرا کھولے نیچے تک رہے تھے۔ سکھ تھانیدار نے بلند آواز میں کہا۔ ہر گھر میں سے ایک ایک آدمی نکل کر گلی میں منہ کے بل رینگتا ہوا انسپکٹر صاحب کے حضور جا کر ان کے پاؤں پر اپنا سر رکھے گا۔ اگر کسی گھر سے کوئی آدمی برآمد نہ ہوا تو وہاں سے کسی عورت کو باہر آ کر یہ کام کرنا پڑے گا۔ جس نے اس حکم کو نہ مانا اس کے گھر کو آگ لگا دی جائے گی۔

معلوم ہوا کہ اس گلی میں جس کا نام کوچہ کوڑیاں والا ہے ایک انگریز اسکول ٹیچر مس شیرووڈ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ قاتلوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن انگریز پولیس انسپکٹر ہنٹر کی آتش انتقام سرد نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس گلی کے لوگوں کو ذلیل کر کے اپنی ہم قوم انگریز اسکول ٹیچر کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے حکم دیا تھا کہ ہر گھر کا ایک معمر اور باعزت آدمی گلی میں پیٹ کے بل ساری گلی میں سے رینگتا ہوا اس کے پاس آئے اور اس کے بوٹوں کو چوم کر اسی طرح واپس اپنے گھر چلا جائے۔ یہ بہت گھناؤنا اور انسانی وقار کے منافی سزا تھی۔ لیکن انگریز کی دہشت سے لوگ تھرتھرا رہے تھے۔

چنانچہ میری آنکھوں کے سامنے دو مکانوں میں سے دو آدمی نکل کر پیٹ کے بل رینگتے

ہوئے انسپکٹر ہنٹر کے پاس آئے اور اس کے بوٹوں سے منہ لگا کر واپس چلے گئے۔ یہ انسانیت کی توہین تھی۔ مجھے یہ بات بہت بری لگی۔ میں اس انسانیت سوز کھیل کو ختم کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کہ ایک مکان میں سے کوئی آدمی باہر نہ نکلا۔

سکھ تھانیدار نے وہاں جا کر آواز دی کہ مرد باہر آ کر صاحب کے حکم کی تعمیل کرے۔ پتہ چلا کہ اس گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ صرف ایک جوان لڑکی ہی ہے۔ انسپکٹر ہنٹر نے چلا کر کہا۔ اس لڑکی کو کہو کہ وہ خود گلی میں پیٹ کے بل رینگ کر اس کے پاس آئے۔ سکھ تھانیدار نے یہی حکم دہرا دیا۔ جب پھر بھی مکان میں سے کوئی نہ نکلا تو انسپکٹر ہنٹر نے سکھ تھانیدار کو بید لہرا کر اشارہ کیا۔

سکھ تھانیدار مکان میں گھس گیا اور اندر سے ایک چادر پوش مسلمان لڑکی کو گھسیٹتا ہوا باہر نکال لایا۔ لڑکی چیخ رہی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر بھیک مانگ رہی تھی۔ سکھ تھانیدار نے اسے گلی کے اینٹوں والے فرش پر گرا دیا اور بید مارتے ہوئے گرجا۔ "چل پیٹ کے بل رینگتی صاحب کے پاس۔"

لڑکی پیٹ کے بل رینگنے لگی۔ وہ رو رہی تھی اور آہ و فغاں کر رہی تھی۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ یہ عورت ہی کی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی ذلت اور توہین تھی۔ میں نے پیچھے سے انگریزی میں انسپکٹر ہنٹر سے کہا۔ "اگر مجھے اجازت دو تو میں اس لڑکی کو بڑے آرام سے رینگتے ہوئے یہاں تک لے آؤں گا۔ وہ مزاحمت نہیں کرے گی۔"

انسپکٹر ہنٹر نے گردن گھما کر مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "ویل ہم تمہیں اجازت دیتا ہے۔"

میں خاموشی سے اٹھا اور گلی میں لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے سکھ تھانیدار کو واپس بھیج دیا۔ اب میں زمین پر بیٹھ گیا اور زار و قطار روتی ہوئی لڑکی کے کان کے قریب منہ لے جا کر کہا۔ "میں بھی مسلمان ہوں۔ تمہارا بھائی ہوں۔ میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جا رہا ہوں۔ تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔"

پھر میں نے دل میں اپنی والدہ کا تصور کیا اور ان کا بتایا ہوا اسم خاص کا قدیم مصری منتر دہرایا۔ اس کے بعد رینگتی ہوئی اشکبار، مصیبت زدہ لڑکی کے سر کو انگلی سے چھو دیا۔ کچھ عورتیں مکانوں کے چھجوں کی درزوں اور ادھ کھلی کھڑکیوں میں سے جھانک رہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ لڑکی غائب ہو گئی ہے۔ یہ بات گورا فوج، سکھ تھانیدار اور انسپکٹر ہنٹر نے بھی محسوس کی۔ مگر مسلمان لڑکی غائب نہیں ہوئی تھی بلکہ میری چھنگلی کے برابر کے سائز کی ہو کر میرے پاؤں کے قریب پڑی اپنی نقطوں ایسی بھیگی آنکھوں سے مجھے ٹکر ٹکر تک

رہی تھی۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھا کر جیب میں ڈالا اور بھاگ کر اس کے مکان کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ پیچھے مجھے انسپکٹر ہنٹر کا شور سنائی دیا۔ دروازے کے آگے سیڑھیاں تھیں۔ میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی اور سیڑھیاں چڑھ کر مکان کے چوبارے میں آ گیا۔ یہاں سے ایک زینہ اوپر چھت پر جاتا تھا۔ میں چھت پر آ گیا۔ دوسرے مکانوں کی چھتیں ساتھ ملی ہوئی تھیں۔ میں ان کو پھلانگتا ہوا دوسری گلی کے ایک مکان کی چھت پر پہنچ گیا۔ نیچے جانے والا دروازہ کھلا تھا۔ اس مکان کی دوسری منزل میں آیا تو ایک عورت پانی کی بالٹی کے سامنے بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ایک چیخ ماری۔ میں بھاگ کر سیڑھیوں کی طرف لپکا اور تیز تیز سیڑھیاں اتر کر نیچے گلی میں آ گیا۔

کرفیو کی وجہ سے یہ گلی بھی سنسان تھی۔ گورا فوج اور پولیس کا ادھر آنا یقینی تھا۔ میں دوڑتا ہوا گلی کی دوسری طرف سے نکلتا ہوا بازار میں پہنچ گیا۔ یہ بازار بھی ویران پڑا تھا۔ ایک گائے بازار کے بیچ میں بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔ میں تیز دوڑ رہا تھا۔ یہ بازار آگے ایک دوسرے بازار سے جا ملا۔ میں اس علاقے سے ناواقف تھا۔ پھر بھی میں دوڑتا چلا گیا۔ چھوٹی اینٹوں والے مکانوں کی کھڑکیاں کھلیں اور پریشان چہروں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

یہ بازار بھی تنگ تھے۔ آخر شہر کا دروازہ آ گیا۔ یہاں پولیس کے دو سپاہی گھوڑے پر سوار آتے نظر آئے۔ میں نے اپنی رفتار معمول پر کر لی اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ یہ سپاہی بھی سکھ تھے۔ انہوں نے پرانی طرز کی رائفلیں مجھ پر تان لیں۔ "ہالٹ۔ کون ہو اوئے تم؟"

میں نے جیب سے کرفیو پاس نکال کر دکھایا تو ایک سکھ سپاہی نے کڑک کر کہا۔ "اوئے پہلے تو نے کیوں نہیں بتایا کہ تم مخبر ہو۔"

یہ اس نے سکھوں والی بات کی تھی۔

میں شہر کے دروازے سے نکل آیا۔ کہیں کوئی آدم یا آدم زاد نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس شہر میں شاید پہلی بار کرفیو لگا تھا۔ یہ میرے لئے بھی پہلا تجربہ تھا۔ لوگ گھروں میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ مسلمان لڑکی میری جیب میں تھی۔ اگرچہ بازار سنسان تھے۔ پھر بھی میں لڑکی کو باہر نکال کر بڑا کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ کیونکہ جب تک میں شہر کی حدود کے اندر تھا' کسی بھی وقت کسی فوجی یا گھوڑ سوار پولیس سے آمنا سامنا ہو سکتا تھا۔

مجھے لڑکی کی ہلکی ہلکی باریک آوازیں آ رہی تھیں۔ ۱۹۱۹ء کا زمانہ تھا۔ آبادی ابھی فصیل شہر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ شہر کے دروازے سے نکلتے ہی کھیت اور ویران میدان

شروع ہو جاتے تھے۔

میرے سامنے بھی کھیت تھے۔ میں کھیت میں سے گزرنے لگا۔ کھیتوں کے بعد امرود کا ایک گھنا باغ آ گیا۔

امرود کا باغ ختم ہو گیا۔ سامنے پرانی طرز کا ایک چوبی پل تھا۔ پل پر سے بھی گزر گیا۔ سامنے ایک میدان تھا۔ جس کے مشرقی کنارے پر شیشم کے درختوں کی قطار شمالاً" جنوباً" چلی گئی تھی۔ میدان کو عبور کر کے ٹاہلیوں میں پہنچا تو ایک کچا راستہ کسی گاؤں کو جا رہا تھا۔ میں شہر کی حدود سے نکل آیا تھا۔

چنانچہ ایک جگہ درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ جیب سے ننھی سی مسلمان لڑکی کو نکالا۔ وہ میری ہتھیلی پر بیٹھی پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

پھر اس نے ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر کمزور سی آواز میں کہا۔

"مجھے اس مصیبت سے نکالو۔ مجھ پر رحم کرو۔ اے جن! میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔"

وہ مجھے جن سمجھ رہی تھی۔ اسے سمجھنا بھی چاہئے تھا۔ بھلا ایک اونچی لمبی جوان لڑکی کو کون انگلی سے چھو کر اتنا چھوٹا کر سکتا ہے؟ میں نے اسم خاص کا منتر پڑھنے کے بعد دوسری بار لڑکی کو چھوا تو وہ پھر سے بڑی ہو گئی۔ اپنے اصلی قد کاٹھ میں آتے ہی لڑکی نے اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کو حیرت سے دیکھا اور میرے آگے ہاتھ باندھ دیئے۔

"جن! مجھے کچھ نہ کہنا۔ میں مسلمان ہوں۔ روز نماز پڑھتی ہوں۔ مجھے کچھ نہ کہنا۔"

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"میں جن نہیں ہوں بلکہ تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں۔ لیکن میرے قبضے میں ایک جن ضرور ہے جس کی مدد سے میں تمہیں چھوٹا کر کے اس ذلت سے نکال لایا ہوں۔ کیا تم خوش نہیں ہو؟"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ابھی تک مجھے جن سمجھ رہی تھی۔ میں نے اسے ایک بار پھر دلاسہ دیا۔ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں خود جن نہیں ہوں۔ اب اس سے پوچھا کہ اس کے بھائی بند کہاں ہیں کہ میں اسے ان کے پاس پہنچا دوں۔ لڑکی نے بتایا کہ اس کا نام ساراں ہے۔ اس کے ماں باپ وفات پا گئے ہیں۔ گھر میں وہ اپنی خالہ کے ساتھ رہتی تھی۔ جب کرفیو لگا تو اس کی خالہ گاؤں میں تھی۔ لڑکی کی شادی اگلے ماہ ہونے والی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے گاؤں جانا پسند کرے گی۔ کیونکہ وہ کچھ عرصے تک اسے اپنے گلی والے مکان میں واپس نہیں جانا چاہئے۔ وہ بولی۔

مجھے میری خالہ کے گاؤں پہنچا دو۔ تمہاری مہربانی ہو گی۔"

لڑکی ساراں کا گاؤں وہاں سے سات آٹھ کوس دور تھا۔ اور اس کا نام ویرکا تھا۔ وہ گاؤں کا راستہ جانتی تھی۔ میں اسے لے کر گاؤں کی طرف روانہ ہوا تو وہ بولی۔

"تم جن ہو۔ مجھے ہوا میں اڑا کر کیوں نہیں لے جاتے۔"

میں نے کہا۔ "اگر خود جن ہوتا تو تمہیں اڑا کر لے جاتا۔"

وہ بولی۔ "تو پھر جس جن کو تم نے اپنے قبضے میں کر رکھا ہے اسے کیوں نہیں کہتے کہ ہمیں اڑا کر گاؤں پہنچا دے۔"

میں نے گردن کھجاتے ہوئے کہا۔

"بھئی یہ جن ہمیں ہوا میں نہیں اڑا سکتا۔"

گاؤں کو جانے والا کچا راستہ خالی پڑا تھا۔ اگرچہ ..... گاؤں میں کرفیو نہیں تھا۔ پھر بھی لوگ ڈر کے مارے باہر نہیں نکل رہے تھے۔ راستے میں سرسوں کے کھیت آئے جو سنسان پڑے تھے۔ یہاں بھی کوئی کسان عورت یا مرد دکھائی نہ دیا۔ ساراں میرے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ لباس پرانی وضع کا یعنی شلوار اور لمبی قمیض پر مشتمل تھا۔ پاؤں میں کھال کی جوتی تھی۔ بالوں کی مینڈھیاں کی ہوئی تھیں اور کانوں میں چاندی کی بالیاں تھیں۔

وہ مجھ سے بار بار پوچھ رہی تھی کہ گورے میرے گاؤں تو نہیں پہنچ جائیں گے۔ اس کا خدشہ تھا۔ لیکن میں نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ ایسا نہیں ہو گا۔ آخر دور درختوں کے جھنڈ میں کچھ کچے کوٹھوں کی دیواریں دکھائی دیں۔ ساراں نے ادھر اشارہ کر کے کہا۔

"یہ ہمارا گاؤں ہے۔"

گاؤں کے قریب پہنچے تو یوں لگا جیسے یہاں بھی کرفیو لگا تھا۔ حالانکہ ایسی بات نہیں تھی۔ پھر بھی لوگ خوف کے مارے گھروں سے باہر نہیں نکل رہے تھے۔ ساراں کی خالہ کے گھر کا دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ ساراں نے دروازے پر ہاتھ مار کر اپنی خالہ کو آواز دی۔ کچھ قدم دوڑتے ہوئے دروازے کی طرف آئے۔ دروازہ کھلا تو ساراں کی خالہ نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔ ساتھ میں ایک نوجوان مرد بھی تھا۔ وہ میری طرف دیکھنے لگا۔

ساراں نے بتایا کہ یہ بھائی مجھے نکال کر لایا ہے۔ جب سارا واقعہ گھر والوں نے سنا تو میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔ ساراں نے اس جن کی بابت بھی بتا دیا تھا۔ جو بقول اس کے میرے قبضے میں تھا۔ اب تو میری زبردست آؤ بھگت شروع ہو گئی۔ گاؤں کی دوسری عورتیں بھی وہاں آ گئیں اور میری خاطر داریاں کرنے لگیں۔ طرح طرح کی فرمائشیں کی

جانے لگیں۔ میں نے سب کو یہی نصیحت کی وہ خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر دعا مانگیں۔ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ جن کچھ نہیں کر سکتے۔ مگر وہ تو اس قدر ضعیف الاعتقاد تھیں کہ میری بات کا اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔"

آخر میں ان سے تنگ آ گیا۔ میں نے وہاں غسل کیا۔ ان لوگوں کا منہ رکھنے کے لئے کھانا کھایا اور کوٹھری میں بچھے ہوئے پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ آگے کہاں جانا ہو گا۔ میں بڑی تیزی سے تاریخ کے اوراق عبور کر کے بیسویں صدی عیسوی میں پہنچ گیا تھا۔ بہرحال میں وقت کے رحم و کرم پر تھا۔ وقت کی لہریں مجھے بہائے لیے جا رہی تھیں اور میں بہے چلا جا رہا تھا۔

وہ رات میں نے ساراں کے گاؤں میں بسر کی۔

اگلے روز اٹھ کر نہایا۔ ساراں نے میرے کپڑے دھو کر سکھا دیئے تھے۔ میرا کرتا اور شلوار غدر کے زمانے کی لمبے گھیر والی تھی۔ ساراں کے منگیتر نے مجھے اپنا کھدر کا کرتا اور شلوار دے دی جس کا گھیرا اتنا کھلا نہیں تھا۔ انہوں نے ایک میل خورے رنگ کی چادر بھی مجھے پیش کی جو میں نے شکریے کے ساتھ واپس کر دی۔ کیونکہ موسم اب ٹھنڈا نہیں رہا تھا۔ صبح انہوں نے مجھے زبردستی گھر کے مکھن کے ساتھ روٹی کھلائی۔ ان کی خاطر داریاں اپنی جگہ پر لیکن گاؤں کی عورتوں نے فرمائشیں کر کے میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔

چنانچہ ناشتے کے بعد ایک پہر دن چڑھے میں گاؤں کی نہر پر سیر کرنے کے بہانے وہاں سے نکلا اور نہر کی پٹڑی پر ٹاہلی کے درختوں کی چھاؤں میں ایک طرف روانہ ہو گیا۔ میں سہ پہر تک چلتا گیا۔ راستے میں صرف دو تین گاؤں ہی آئے جہاں کھیتوں میں بھینسیں چر رہی تھیں۔ آدمی کہیں کہیں ہی دکھائی دیا۔ نہر بائیں طرف گھومی تو جلی ہوئی اینٹوں سے بنی ایک سڑک آ گئی۔ اس سڑک کی دونوں جانب اونچے اونچے شیشم کے درخت تھے۔ سڑک پر دھوپ ان درختوں کی گھنی شاخوں میں چھن چھن کر آ رہی تھی۔

میں سڑک پر اترا تو اچانک میری نظر ایک جانب درختوں کے نیچے گئی کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بگھی کا پہیہ سڑک کے کنارے کھائی میں دھنسا ہوا ہے۔ بگھی کے دونوں گھوڑے ایک طرف کھڑے ہیں۔ بگھی کا سائیس گھوم پھر کر کھائی میں دھنسی ہوئی بگھی کے پہیے کا جائزہ لے رہا ہے۔ اس کے پاس ہی ایک خوش پوش آدمی کھڑا ہے۔ سر پر کلا لگا ہے۔ جسم پر سیاہ رنگ کی اچکن اور شلوار ہے۔

میں قریب گیا تو اس خوش پوش جوان کو غور سے دیکھا۔ سرخ وسفید رنگ، ماتھے پر خاندانی وجاہت چمک رہی تھی۔ آنکھیں مغلیہ عہد کے شہزادوں کی یاد دلاتی تھیں۔ گال

بھرے بھرے سیاہ مونچھیں اوپر کو اٹھی تھیں۔ اگرچہ یہ چہرہ شاہی خاندان کے جاہ جلال کی علامت تھا اس کے باوجود مجھے اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں کسی گہرے کرب اور شدید تاسف کی جھلک نمایاں تھی۔

"برادر عزیز۔ ہماری بگھی گڑھے میں پھنس گئی ہے۔ میرے سائیس کی مدد کرو گے؟"

اگرچہ وہ مشکل میں گرفتار تھا مگر اس کے لہجے میں ایک خاص وقار اور تمکنت تھی۔ اس نے مصیبت میں بھی ' اپنی نہیں بلکہ اپنے سائیس کی مدد کے لئے پکارا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں خدمت کے لئے حاضر ہوں۔"

سائیس میرے ساتھ گڑھے میں اتر گیا۔ بگھی کا بڑا پہیہ آدھا مٹی میں دھنس چکا تھا۔ یہ دو آدمیوں کا کام نہیں تھا۔ لیکن یہ میرے دائیں ہاتھ کا کام تھا۔ مجھے دبلے پتلے سائیس کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم میں اپنا مافوق الفطرت طاقت کو راز میں ہی رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے سائیس سے کہا کہ وہ نیچے سے پہیے کو پکڑ لے اور اسی وقت زور لگائے جب میں آواز دوں۔ کلاہ پوش نوجوان سڑک کے کنارے کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے یقین نہیں ہے کہ میں سائیس کے ساتھ مل کر بھی اتنا بھاری بھرکم بگھی کے پہیے کو گڑھے سے نکال سکوں گا۔

میں یونہی پردہ پوشی کے لئے بگھی کے پیچھے چلا گیا اور پہیے کے دھرے کو اپنے کاندھے پر رکھ کر سائیس کو زور لگانے کے لئے کہا۔ سائیس کیا زور لگا سکتا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے پہیے کو زمین میں سے نکالا اور پھر اسے اوپر دھکیل دیا۔

بگھی سڑک پر کھڑی تھی۔ کلاہ پوش جوان میری طرف تجسس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں گڑھے سے باہر نکلا تو اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"برادر عزیز! تم دیکھنے میں اتنے طاقتور نہیں لگتے' مگر تم نے تو وہ کام کیا جو ایک بیل بھی نہیں کر سکتا۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "یہ طاقت کا نہیں ہنرمندی کا کام تھا۔"

سائیس بگھی کے آگے گھوڑے جوتنے لگا۔ کلاہ پوش جوان نے مجھ سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے برادر عزیز؟"

"عبداللہ۔"

اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

"میرا نام حیدر بیگ تیموری ہے۔ میرا تعلق مغلیہ خاندان سے ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ تو آپ کے بشرے سے ظاہر ہے۔"

اس نے بگھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم لاہور جا رہے ہو تو سواری حاضر ہے۔ میں بھی لاہور ہی جا رہا ہوں۔"

میں نے سوچا کہ چلو اس بگھی میں ہی لاہور چلے جاتے ہیں۔ میں اس کے ساتھ بگھی میں بیٹھ گیا۔ سائیس کاوچ بکس پر بیٹھ گیا اور سانٹے کو ہوا میں لہرایا۔ اور گھوڑے سڑک پر دلکی چال سے چلنے لگے۔ کلاہ پوش جوان یعنی حیدر بیگ لاہور پہنچنے تک بہت کم بولا۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا کہ لاہور شہر کے اندر اس کی ایک جاگیر ہے جہاں حویلی میں وہ اکیلا رہتا ہے۔ وہ میری جسمانی طاقت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ لاہور شہر کی فصیل پر دیا بتی روشن ہو چکے تھے۔ دلی سے لاہور آنے والی پکی سڑک سیدھی لاہور کے دہلی دروازے میں داخل ہوتی تھی۔ امیر زادے حیدر بیگ کی بگھی دہلی دروازے کی طرف بڑھی۔

حیدر بیگ تیموری کی حویلی دہلی دروازے کے اندر تھی۔ بگھی حویلی کے احاطے میں داخل ہو کر ایک جگہ نیم کے درخت تلے رک گئی۔ میں نے حیدر بیگ کا شکریہ ادا کر کے جانے کی اجازت چاہی تو وہ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"برادر عزیز عبداللہ! رات ہو رہی ہے۔ کھانا کھلائے بغیر تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گا۔" میں اپنے آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ آؤ میرے ساتھ خانساماں نے کھانا لگا دیا ہو گا۔"

میں نے سوچا کہ چلو کچھ وقت مزید گزار لیتے ہیں۔ اس مغلئی شہزادے کے ساتھ۔ حیدر بیگ مجھے ایک دیوان خانے میں لے گیا۔ جہاں قالینوں کا فرش بچھا تھا۔ چھت سے فانوس لٹک رہے تھے۔ دیواریں منقش تھیں۔ دیوار کے ساتھ ساتھ پرانے زمانے کے کاوچ لگے تھے۔ حیدر بیگ مجھے دالان میں لے گیا۔ جہاں ایک ملازم ہاتھ میں چاندی کا لوٹا اور سفید تولیہ لئے کھڑا تھا۔

"برادر عزیز تم منہ ہاتھ دھو لو۔ میں بھی تازہ دم ہو کر آتا ہوں۔"

نوکر نے میرا منہ دھلایا۔ ولایت کا صابن تھا جس کی خوشبو مشام جان کو تروتازہ کر رہی تھی۔ تولیے سے منہ پونچھ کر میں جانے لگا تو نوکر ایک قد آدم آئینے کے پاس لے گیا جہاں مختلف تیل اور سینٹ کی بوتلیں اور رنگ برنگی کنگھیاں رکھی تھیں۔ میں نے بالوں میں کنگھی کی اور خاموشی سے کاوچ پر آ کر بیٹھ گیا۔

اتنے میں حیدر بیگ بھی آ گیا۔ اس نے سفید قیمتی چکن کا انگرکھا نما کرتہ اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں صوف کی چپل تھی سرخ وسپید چہرہ فانوس کی روشنیوں میں دمک رہا

تھا۔ لباس سے خس کی مہک اٹھ رہی تھی۔ ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے تھے وہ کاؤچ پر
میرے قریب بیٹھ گیا۔ ایک نوکر بغلی کمرے سے نکل کر آیا اور آداب بجا لا کر بولا۔ "حضور
انور! کھانا چن دیا گیا ہے۔"

حیدر بیگ مجھے ساتھ لے کر ساتھ والے کمرے میں چلا آیا۔ یہاں قالین کے فرش پر
درمیان میں چاندنی بچھی تھی چاندنی پر دستر خوان لگا تھا اور قسم قسم کے قاب، ظروف اور
چینی کی منقش پلیٹیں پڑی تھیں۔ ہم دستر خوان پر بیٹھ گئے۔ نوکروں نے قابوں کے ڈھکن
اٹھائے۔ طرح طرح کے مزے دار پلاؤ کی خوشبو سے کمرہ مہک اٹھا۔ کہیں تیتر کا گوشت تھا
تو کہیں سالم بطخ روسٹ کر کے رکھی تھی۔ مجھے بھوک کبھی نہیں لگی تھی بس مہینوں میں
کبھی زبان کے چسکے کے لئے کھا لیا کرتا تھا۔ لیکن ان کھانوں کو دیکھ کر بھوک چمک اٹھی۔

کھانے کے بعد ہم دوبارہ واپس دیوان خانے میں آ کر بیٹھ گئے۔ نوکر الائچیاں اور
مصری کی ڈلیاں لے آیا۔

حیدر بیگ نے اب میرے بارے میں مجھ سے پوچھا کہ میں لاہور شہر میں کس جگہ رہتا
ہوں اور میرے ماں باپ کیا کام کرتے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔

"حیدر بیگ صاحب۔ میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ میں اس دنیا میں اکیلا ہوں۔ لاہور
کسی دھندے کی تلاش میں آ رہا تھا۔"

حیدر بیگ کچھ سوچ کر بولا۔

"عبداللہ! برادر عزیز! اگر تم برا نہ مانو تو میرے پاس کیوں نہیں ٹھہر جاتے۔ دریا پار
میری جاگیر ہے۔ اس کی دیکھ بھال کر لیا کرنا۔ جتنی رقم چاہو گے پیش کر دی جائے گی۔ مجھے
تم ایسے جرأت مند دلیر دوست کی ضرورت ہے تم میرے دوست بن کر میرے ساتھ ہو گے
تو مجھے خوشی بھی ہو گی۔"

میرے لئے حیدر بیگ کی حویلی میں رہنا یا لاہور کے کسی ویرانے میں رہنا ایک برابر
تھا۔ میں نے حامی بھر لی۔ حیدر بیگ بہت خوش ہوا۔ حویلی کی دوسری منزل پر مجھے ایک کمرہ
دے دیا گیا۔ گرمی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ اوپر چھت پر ایک جانب میرا چھپر کھٹ لگا دی
گئی۔

حویلی کی آخری چھت پر اس کی مسہری لگی تھی۔ لیکن وہ چھت پر سونے کی بجائے
نیچے اتر گیا۔ میں کبھی آنکھیں بند کر لیتا۔ کبھی کھول کر حیدر بیگ کی مسہری کی طرف دیکھ
لیتا۔ وہ ساری رات اوپر چھت پر نہ آیا۔

یہ شخص میرے لئے پراسرار بنتا جا رہا تھا۔

مجھے اس کی حویلی میں آئے پانچوں دن گزر رہا تھا۔ کہ ایک روز رات کے کھانے کے
بعد اس نے اچانک موضوع بدل کر کہا۔

"برادر عزیز عبداللہ! میں نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں غیر معمولی طاقت دی
ہے۔ ورنہ تم گڑھے میں پھنسی ہوئی میری فٹن کا پہیہ اکیلے نہیں نکال سکتے تھے۔

میں نے مسکرا کر کہا۔

"بس یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ میں اپنے جسم کی پوری طاقت کو ایک جگہ مجتمع کر
کے بھاری سے بھاری چیز کو اوپر اٹھا لیتا ہوں۔"

اس پر حیدر بیگ نے بظاہر بڑی بے نیازی سے کہا۔

"برادر عزیز" میری حویلی میں ایک کمرہ ہے۔ بھونچال کی وجہ سے دیوار کا ایک ....
بھاری پتھر کھسک کر اس کمرے کے دروازے کے آگے آ گیا ہے، اگر تم اسے دروازے کے
آگے سے ہٹا دو تو میں اس کمرے کو گودام کے طور پر استعمال کر سکوں گا۔"

میری چھٹی حس نے خبردار کر دیا کہ معاملہ کچھ اور ہے لیکن بظاہر میں نے پرسکون
سے کہا۔

"کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ آپ مجھے اس پتھر کے پاس لے چلیں۔"

"میرے ساتھ آؤ برادر عزیز۔ کمرہ حویلی کے پہلی منزل میں جنوب کی طرف ہے۔"

وہ مجھے چھت سے اٹھا کر اپنے ساتھ حویلی کی پہلی منزل میں لے گیا۔ چاندی کی طشتری
میں لگی ہوئی موم بتی اس کے ہاتھ میں تھی، حویلی بڑی خستہ ہو رہی تھی۔ راہ داری کی
چھت سے جالے لٹک رہے تھے اور فضا بے حد مرطوب تھی۔ حیدر بیگ تیموری راہ داری
کے آخر میں ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ میرے سامنے دیوار کے ساتھ ایک بہت بڑے پتھر کی
سل ترچھی لگی تھی۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اتنے بڑے پتھر کی سل یہاں کیسے آ
گئی۔ حیدر بیگ نے پتھر کی سل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ ہے وہ پتھر۔ مجھے یقین ہے کہ تم اسے بڑی آسانی سے ایک طرف گرا دو گے۔ ہم
تو اسے ہلا بھی نہیں سکتے۔"

میں نے پتھر کی بھاری سل میں ایک خالی جگہ میں ہاتھ ڈالا اور اسے معمولی سا زور
لگانے کے بعد اپنی جگہ سے کھسکا کر سامنے والی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ حیدر بیگ بہت
خوش ہوا۔ پتھر کی سل کے پیچھے ایک پرانی وضع کا لکڑی کا بڑا دروازہ نمودار ہوا۔ جس پر
لوہے کا زنگ خوردہ بھاری بھرکم تالا لگا تھا۔

"عبداللہ! تم نے میری بڑی پریشانی دور کر دی۔ یہ کمرہ ایک عرصے سے بے کار پڑا

تھا۔ اب میں اسے استعمال میں لا سکوں گا آؤ واپس چلتے ہیں۔"

وہ مجھے چھت پر چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

میں سوچنے لگا کہ اس کمرے میں ضرور کوئی راز ہے۔ اسے گودام بنانے کا محض ایک بہانہ ہے۔ گودام بنانے کے لئے حویلی میں کتنے ہی کمرے خالی پڑے تھے میں نے محض اپنی دلچسپی کے لئے اس کمرے کے راز کو معلوم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک روز حیدر بیگ گھوڑے پر بیٹھ کر دریا پار کی جاگیر کا دورہ کرنے گیا تو میں راہ داری کی طرف بڑھا۔ حویلی دن بھر ویران پڑی رہتی تھی۔ ملازم سارا وقت باورچی خانے کے قریب گذارتے تھے۔ جہاں جاگیر کی زمینوں پر مقیم' نادار لوگوں کے لئے ہر وقت چاول پکا کرتے تھے۔ راہ داری نیم روشن تھی۔ آگے جا کر اندھیرا ہو گیا۔ لیکن چونکہ میری آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھ لیتی تھیں اسی لیے موم بتی کے بغیر ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ آخر اس کے سامنے پہنچ گیا۔ جس کی بھاری پتھریلی سل میں نے ہٹائی تھی۔ دروازے پر وہی بھاری بھر کم تالا پڑا تھا۔

میں نے تالے کو ایک ہاتھ سے جھٹکا دیا۔ تالا کھل گیا۔

دروازے کا پرانا پٹ ایک ڈراؤنی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ اندر سے مشک کافور اور لوبان کی بو کا ٹھنڈا مرطوب جھونکا آیا۔ میں آہستہ سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے کے اندر دروازے کے بالکل سامنے بھی ایک دیوار اٹھی ہوئی تھی جو ایک طرح سے پردے کا کام دے رہی تھی۔

میں دیوار کی اوٹ سے نکل کر کمرے کے وسط میں آیا تو دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی اینٹوں کا ایک چبوترہ بنا ہوا ہے۔ چبوترے پر کوئی شخص سفید چادر اوڑھے سیدھا لیٹا ہوا ہے۔ میں ایک لمحے کے لئے اپنی جگہ پر ٹھٹھکا رہا کہ یہ شخص کون ہو سکتا ہے اور اس کو اس بند کمرے میں لیٹنے کی کیا ضرورت تھی۔

معاملہ پراسرار ہوتا جا رہا تھا۔ لیٹے ہوئے آدمی کے سرہانے کی جانب ایک دیا روشن تھا۔ میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا چبوترے پر لیٹے آدمی کے پاس گیا۔ اس کا چہرہ بھی سفید چادر میں ڈھکا تھا۔ سرہانے کانسی کی منقش تھالی میں کچھ باسی پھول۔ جلا ہوا لوبان اور مشک کافور کے سفید ذرے بکھرے ہوئے تھے۔ سرہانے کی طرف دیوار پر ایک قد آدم روغنی رنگوں کی پرانی پینٹنگ لگی تھی جس پر باریک جالی دار چادر پڑی تھی۔ میں سب سے پہلے اس لیٹے ہوئے آدمی کے معمے کو حل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر چادر سرکا کر لیٹے ہوئے آدمی کا منہ ننگا کیا تو میں دھک سے رہ گیا۔

میرے سامنے میرا میزبان حیدر بیگ تیموری اس حالت میں پڑا تھا کہ اس کی گردن میں

حلقوم کے عین نیچے ایک بھاری دستے والا خنجر آدھے سے زیادہ حلق میں دھنسا ہوا تھا۔ گلے میں سے بہنے والا خون جم چکا تھا۔ میں نے پوری چادر ہٹا دی۔ حیدر بیگ تیموری نے مغل دور حکومت کے شہزادوں ایسی زرق برق پوشاک زیب تن کر رکھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر بندھے تھے۔ انگلیوں میں جواہرات کی انگوٹھیاں تھیں۔

یہ منظر میرے لئے انتہائی تحیر انگیز تھا۔ اگر میں ایک عام آدمی ہوتا تو شاید وہیں غش کھا کر گر پڑتا۔ لیکن میں خود غیر معمولی قوتوں کا مالک تھا۔ اس قسم کے حالات سے پہلے بھی گزر چکا تھا۔ میں نے حیدر بیگ کے جسم کو ہاتھ لگایا۔ اس کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ وہ مردہ تھا۔ معمہ یہ تھا کہ اگر حیدر بیگ تیموری کی لاش اس چبوترے پر پڑی ہے تو' پھر جو شخص اسی کی شکل کا زندہ حالت میں حویلی میں رہ رہا ہے وہ کون ہے؟ یہ ایک ایسا پر پیچ اور ناقابل حل راز تھا کہ میں بھی چکرا کر رہ گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے' کہ ایک آدمی کی لاش کمرے میں پڑی ہو اور کمرے سے باہر وہ زندہ حالت میں چل پھر رہا ہو۔ میں نے چادر لاش پر اسی طرح ڈال دی۔ اور سرہانے کی جانب دیوار پر لگی قد آدم آئل پینٹنگ کی طرف آ گیا۔ میں نے اس پر جالی دار چادر ہٹائی۔ یہ کسی مغلیہ شہزادی کی تصویر تھی جو بھرپور شاہانہ لباس میں مسند پر پڑے شاہانہ وقار سے بیٹھی تھی اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اس شکل کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ میری نگاہیں مغلیہ شہزادی کی تصویر پر لگی تھیں اور ذہن اس کی ہم شکل کو شعور کے اوراق پر الٹ رہا تھا۔

میں چونک پڑا۔ مغلیہ شہزادی کی شکل ہو بہو اس لڑکی سے ملتی تھی جس کو میں امرتسر کی گلی میں سے نکال کر کچھ روز پہلے اس کے آبائی گاؤں دیرکا میں اس کی خالہ اور منگیتر کے گھر چھوڑ آیا تھا اور جس لڑکی کا نام ساراں تھا۔ میں نے چبوترے پر چڑھ کر مغلیہ شہزادی کی تصویر کو ایک بار پھر غور سے دیکھا میرا یقین مزید پختہ ہو گیا۔ اس کی شکل اور ساراں کی شکل میں کوئی فرق نہیں تھا وہی آنکھیں' وہی رخسار' وہی ستواں ناک اور فراخ ماتھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ تصویر میں ساراں شہزادیوں کے لباس میں تھی اور اپنے گاؤں والے گھر میں وہ عام دیہاتی لباس میں رہ رہی تھی۔ معمہ اور پیچیدہ ہو گیا تھا۔

میں نے تصویر کو جالی دار چادر سے دوبارہ ڈھانپ دیا۔ اور چپکے سے واپس' کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے کوٹھری کے دروازے پر پھر سے تالا لگا دیا۔ اور راہ داری میں سے تیز تیز گزرتا اپنے مہمان خانے میں آ کر کاؤچ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ شخص حیدر بیگ تیموری اصل میں کون ہے اور دیہاتی مسلمان لڑکی ساراں کی تصویر والی مغلیہ شہزادی سے اتنی مشابہت کیوں ہے؟ یہ کیا راز ہے؟ یہ کیا معمہ ہے؟

میں دیر تک بیٹھا اس گتھی کو سلجھانے میں لگا رہا۔

دن کا ایک پہر گزرا تو مجھے حویلی میں گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ پراسرار حیدر بیگ اپنی جاگیر کا چکر لگا کر واپس آگیا تھا۔ میں اپنے کمرے سے اٹھ کر دیوان خانے میں آگیا۔ کچھ دیر بعد حیدر بیگ سفید براق تولئے سے منہ پونچھتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"عبداللہ! گرمیوں کا موسم آیا ہی سمجھو۔ باہر کھیتوں میں گرمی ہو رہی ہے۔"

میں اب دوسری ہی نظروں سے اس پراسرار شخص کو دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے سامنے والے کاؤچ پر آکر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ملازم چاندی کے گلاسوں میں شربت لے آیا۔ ایک گلاس اس نے مجھے پیش کیا۔ میں ٹھنڈے شربت کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ پینے لگا۔ مجھے اس شخص کی حرکت پراسرار اور انوکھی لگ رہی تھی۔

حیدر بیگ اچانک میری طرف دیکھ کر بولا۔

"برادر عزیز! تم یہاں سے اکتا تو نہیں گئے؟"

"اگر ایسی بات ہو تو بے شک تم' میری زمینوں پر چلے جاؤ۔ وہاں میری حویلی خالی پڑی ہے۔"

اس نے مجھ سے جو کام لینا تھا لے لیا تھا۔ اب اسے میری ضرورت نہیں رہی تھی۔ لیکن اب میں اس پرپیچ گتھی کو سلجھائے بغیر وہاں سے نہیں جانا چاہتا تھا میں نے گلاس آبنوسی گول تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں یہاں بڑا خوش ہوں۔ اب تو میرا یہاں جی لگ گیا ہے۔"

میرے اس جواب سے حیدر بیگ کو خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا تاہم وہ مسکرانے لگا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے تمہارا اپنا گھر ہے' جب تک جی چاہے رہو برادر عزیز۔"

وہ اٹھا اور بولا۔

"میں بہت تھک گیا ہوں۔ میں نے کھانا وہیں جاگیر پر ہی کھا لیا تھا۔ تم کھانا کھا لینا میں ذرا آرام کرنے جا رہا ہوں۔"

اور وہ عقبی دروازے میں سے دوسری طرف چلا گیا۔

مجھے اس کی چال میں بھی ایک پراسرار سا ہلکا پن محسوس ہوا تھا۔ جیسے وہ پورا وزن ڈال کر نہیں چلتا تھا۔ یہ شخص کون ہے؟ میں حویلی سے گھوڑے پر بیٹھ کر نکلا اور سیر کرتا دریا کی سمت نکل گیا۔ شام تک میں دریا کنارے کے کھیتوں اور جنگلی درختوں کے ذخیرے

میں پھرتا رہا۔ کبھی خیال آتا کہ امرتسر کے گاؤں دیر کا جا کر دیہاتی مسلمان لڑکی ساراں سے ملوں اور اس سے کچھ کریدنے کی کوشش کروں۔ لیکن شاید وہ مجھے کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔ اس حیرت انگیز راز پر سے صرف حیدر بیگ ہی پردہ ہٹا سکتا تھا۔ مگر اس سے براہ راست کچھ پوچھتے ہوئے میں جھجک محسوس کر رہا تھا۔ شاید یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا اور سب سے خطرناک راز تھا خدا جانے اس پر میرے انکشاف کا کیا اثر پڑے۔

اس معمے کو حل کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ حیدر بیگ کا حویلی میں پیچھا کیا جائے وہ ضرور کسی نہ کسی وقت اس کمرے میں جاتا ہو گا۔ اسی لئے تو اس نے مجھ سے اس کمرے کے آگے پڑا ہوا پتھر ہٹوایا تھا۔ اب سوال تھا کہ میں حیدر بیگ کا پیچھا کیسے کروں؟ اچانک مجھے اپنی نئی طاقت کا خیال آگیا جو مجھے میری والدہ کی روح نے ودیعت کی تھی۔ اگر میں قدیم مصری منتر پڑھ کر دوسری چیزوں اور دوسرے انسانوں کو چھوٹا کر سکتا ہوں تو خود بھی چھوٹا ہو سکتا ہوں۔ چھوٹا ہو کر میں بڑی آسانی سے چھپ کر حیدر بیگ کا پیچھا کر سکوں گا۔

میں اپنی اس اسکیم پر بڑا خوش ہوا۔

شام ہو چکی تھی جب میں گھوڑے پر سوار حویلی میں واپس آیا۔ رات کا کھانا میں نے اور حیدر بیگ نے مل کر کھایا۔ میں نے ایک بار پھر محسوس کیا کہ اس نے زیادہ کھانا نہیں کھایا تھا۔ میں ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ حیدر بیگ کا رنگ اس رات زرد تھا۔ اگرچہ وہ مجھ سے بڑی خندہ پیشانی سے محو کلام تھا۔ لیکن صاف لگ رہا تھا کہ اس کا ذہن کچھ اور سوچ رہا ہے۔ کھانا ختم ہوا تو وہ جلدی ہی اپنی خواب گاہ میں چلا گیا اس رات میں نے حیدر بیگ کی خواب گاہ میں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جب حویلی کے اندر اور باہر گہری خاموشی چھا گئی تو میں آہستہ سے اپنے چھپر کھٹ سے اتر کر زینہ طے کرتا دیوان خانے کے ادھ کھلے دروازے کے پاس آکر رک گیا۔ چھت کے فانوس بجھا دیئے گئے تھے۔ یہاں اندھیرا تھا۔ صرف دالان کے ایک ستون کے ساتھ دھیمی شمع روشن تھی۔ میں ایک ایسا تجربہ کرنے والا تھا جس کی کامیابی کا مجھے سو فیصد یقین نہیں تھا۔ لیکن یہ تجربہ مجھے ہر حالت میں کرنا تھا۔ میں نے اپنی والدہ کی شکل کا تصور ذہن مین بٹھا کر قدیم مصری منتر دہرایا اور پھر کسی حد تک ڈرتے ڈرتے اپنی انگلی اپنے جسم کے ساتھ لگا دی۔ ایک روشنی سی میری آنکھوں کے آگے چمک گئی۔ اب جو میں نے اپنے آپ کو دیکھا تو میں اپنی چھنگلی کے برابر سائز کا ہو چکا تھا۔ یہ میرے لئے بھی ایک بالکل ہی انوکھا تجربہ تھا۔ میں اپنے ماچس کی تیلیوں جتنے بازوؤں پر اپنی ننھی ننھی انگلیاں پھیر رہا تھا۔ میری بصارت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ مجھے ہر شے صاف نظر آ رہی تھی مگر بہت بڑی بڑی لگ

رہی تھی۔ میں دروازے کے ادھ کھلے پٹ میں سے گزر کر دلان میں آ گیا۔

دالان میں مرمریں خانے دار فرش پر شمع کی روشنی پڑ رہی تھی۔ میں آگے بڑھنے ہی لگا تھا کہ اچانک سامنے والی خواب گاہ کا دروازہ کھلا اور میں نے حیدر بیگ کو باہر نکلتے دیکھا۔ میں جلدی سے ایک ستون کے پیچھے ہو گیا۔ مجھے چھپانے کے لئے ماچس کی ڈبیا ہی کافی تھی یہ تو ستون تھا جو مجھے کسی بڑے درخت کے تنے جتنا چوڑا لگ رہا تھا۔ حیدر بیگ نے قدیم مغلیہ شہزادوں کا لباس پہن رکھا تھا کمر کے ساتھ تلوار لگی تھی۔ سر پر مغلئی پگڑی تھی۔ جس کے ساتھ جواہرات کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ وہ کوئی مغل شہزادہ لگ رہا تھا۔ وہ پروقار قدم اٹھاتا راہ داری کی طرف چلا۔

میں بھی ستون کے پیچھے سے نکل کر اس کے تعاقب میں آگے بڑھا۔ راہ داری میں اندھیرا تھا۔ مگر میں مغل شہزادے حیدر بیگ کو آہستہ آہستہ چلتے بخوبی دیکھ رہا تھا۔ راہ داری ختم ہوئی۔ تو وہ پراسرار کمرہ آ گیا۔ جس کے اندر اس مغل شہزادے کی لاش پڑی تھی۔ دروازے کے سامنے حیدر بیگ رک گیا۔ اس نے چابی نکال کر تالا کھولا۔ پھر واپس مڑ کر پیچھے ایک نگاہ ڈالی۔ میں اس سے پہلے ہی دیوار کے ساتھ ہو گیا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ بھی اندھیرے میں دیکھ لیتا ہے۔

وہ لاش والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ ننھے ننھے قدم اٹھاتا کمرے کے پاس آ گیا۔ دروازہ بند تھا۔ مگر اس کی ذرا سی درز ہی میرے لئے کافی تھی۔ چنانچہ میں اندر کھسک گیا۔ سامنے وہی دیوار تھی جو پردہ کرنے کے لئے کھڑی کر دی گئی تھی۔ دیوار کی دوسری جانب موم بتی کی دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے دیوار کی پہلی اینٹ کی اوٹ میں سے جھانک کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ شہزادہ حیدر بیگ سر جھکائے ہاتھ سینے پر باندھے اس چبوترے کے گرد آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا چکر لگا رہا تھا جس پر اس کی لاش پڑی تھی۔

پھر اپنی لاش کے سرہانے کھڑا ہو کر چہرے پر سے چادر سرکائی اور گہری آواز میں بولا۔

"حیدر بیگ میں کب تک تم سے، اپنے آپ سے جدا رہوں گا۔ میرے گناہ کا کفارہ کب ادا ہو گا؟ دو سو برس بیت گئے ہیں۔ میں ممتاز بخت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ مجھے اس کی کہیں جھلک دکھائی نہیں دی۔ میرا یہ دربدری کا اذیت ناک سفر کب ختم ہو گا؟"

یہ کہہ کر حیدر بیگ نے اپنا سر جھکا دیا۔ پھر سر اٹھا کر سرہانے کی جانب دیوار پر لگی

مغل شہزادی کی تصویر کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ممتاز بخت! میرا پاپ کب کٹے گا تو مجھے کہاں ملے گی؟ کہاں ملے گی؟ میرا گناہ معاف کر دے۔ میں اپنی لاش میں واپس جا کر تمہارے پاس جنت میں پہنچنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے گناہ ہو گیا ہے۔ تو مجھ سے پیار کرتی تھی تو ہی خدا سے میری بخشش کی دعا کر۔ میں نے بھیانک غلط فہمی کا شکار ہو کر تجھے ہلاک کر ڈالا۔ تو وفادار تھی مگر میں نے تجھے بے وفا سمجھا۔ مجھے معاف کر دے اور جلد مجھے اپنا روپ دکھا۔ مجھے کسی عورت کی شکل میں مل، تاکہ میں تیری وفاداری کا عینی شاہد بنوں اور پھر اپنی لاش میں داخل ہو کر تیرے پاس جنت میں پہنچ جاؤں۔"

حیدر بیگ منہ پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگا۔ وہ دیر تک اسی حالت میں کھڑا رہا۔ معمہ مزید پیچیدہ ہو گیا تھا۔ حیدر بیگ نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹایا۔ رومال سے آنسو پونچھے۔ اپنی لاش کا ماتھا چوما۔ اس پر چادر ڈالی اور واپس مڑا۔ میں جلدی سے دروازے میں سے نکل کر راہ داری میں آ گیا اور دیوار کے ساتھ دوڑتا ہوا دالان سے گزر کر دیوان خانے میں آ گیا۔ دیوان خانے میں اندھیرا تھا۔ میں دیوان خانے سے بھی کاؤچ کے پیچھے سے ہو کر نکل گیا۔ اور زینہ چڑھنے لگا۔ زینہ چڑھتے ہوئے مجھے بے حد دقت ہو رہی تھی۔ کیونکہ میں بہت ہی ننھا منا تھا اور زینے کے پتھر اونچے تھے۔ بڑی مشکل سے ایک ایک زینہ طے کر کے میں چھت پر آیا۔ میرا چھپر کھٹ سامنے تھا جو مجھے بہت بڑا اور کسی دیو کا پلنگ نظر آ رہا تھا۔

یہاں میں اپنے اصلی قد کاٹھ میں واپس آنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے آنکھیں بند کر دیں۔ والدہ صاحبہ کا تصور دل میں جمایا۔ پھر قدیم مصری منتر پڑھا اور انگلی اپنے سینے سے لگا دی۔ ایک بار پھر میری آنکھوں میں چکا چوند سی ہوئی۔ آنکھیں کھولیں تو میں اپنے اصلی قد میں واپس آ چکا تھا جلدی سے چھپر کھٹ میں گھس کر بچھونے پر لیٹ گیا۔ میرا سانس پھولا ہوا تھا۔ میں جو واقعہ دیکھ چکا تھا اس پہ غور کرنے لگا۔

اس واقعے سے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ صرف اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ حیدر بیگ واقعی کوئی مغل شہزادہ ہے جو دو سو برس پہلے کسی بادشاہ کا فرزند تھا۔ ممتاز بخت اس کی بیوی تھی جس کو اس نے کسی غلط فہمی کی بنا پر قتل کر دیا اور اب اس کی وفاداری کے ثبوت کے لئے دو سو برس سے ایک مجسم روح یا بدروح یا ہمزاد کی شکل میں وقت کے دھندلکوں میں مارا مارا پھر رہا تھا۔

اسے یہ علم ہی نہیں تھا کہ جس ممتاز بخت کے دوسرے جنم کے لئے وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے وہ امرتسر کے قریبی گاؤں میں جنم لے چکی ہے۔ اور اس کا

صدیوں پرانا سنگین مسئلہ حل ہونے والا ہے۔ اب مجھ پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ میں کسی طرح یہ انکشاف کر دوں کہ اس کی مقتول بیوی دوسرا جنم لے چکی ہے۔ اس کا پاپ کٹ چکا ہے اور پچھتا کے دن ختم ہو چکے ہیں۔

غلط ہر انسان سے ہو جاتی ہے۔ یہ ایک شہزادہ تھا۔ اس سے غلطی بھی شہزادوں ...ن ہوئی۔ اس نے اپنی بیوی پر شک کیا اور اسے ہلاک کر ڈالا۔ اب وہ پچھتاوے کی آگ میں جل رہا تھا۔

میں نے طے کر لیا کہ ساراں کی شکل میں اس کی بیوی ممتاز بخت کے دوسرے جنم کی خوش خبری سنا ڈالوں گا۔

دوسرے روز میں دیوان خانے میں ناشتے پر حیدر بیگ کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ سفید بے داغ لباس میں مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ سلام علیک کے بعد صبح بخیر کہا اور دستر خوان پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی تھی لیکن وہ مسکرا کر اپنی روحانی اذیت کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ناشتے پر میں نے اس موضوع پر کوئی بات نہ کی۔ ناشتے کے بعد وہ زمینوں پر جانے لگا تو بولا۔ "برادر عزیز! تم بھی میرے ساتھ چلو گے؟

میں نے حیدر بیگ کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میرا لہجہ اور انداز کچھ ایسا تھا کہ حیدر بیگ ایک پل کے لئے مجھے دیکھتا رہ گیا۔ پھر مسکرا کر بولا۔ "کیوں نہیں، کیوں نہیں برادر عزیز ضرور بات کرو۔"

وہ میرے قریب ہی کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"کیا رقم کی ضرورت پڑ گئی ہے برادر عزیز؟" میری نگاہیں حیدر بیگ تیموری کے چہرے پر جمی تھیں۔ میں نے اس کا ہاتھ ایک بار پھر تھام کر ذرا سا دبایا اور صاف ہی پوچھ لیا۔

"کیا آپ زندہ ہیں؟"

یہ سوال گویا ایک چنگاری تھی جو گویا اس کے سفید لباس میں اچانک بھڑک اٹھی۔ اسے جیسے ایک جھٹکا لگا اور وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں پوری کھلی تھیں اور مجھے گھور کر تک رہا تھا۔

"تم ... تم کون ہو؟"

میں نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

"میں کون ہوں؟ یہ پھر کبھی بتاؤں گا لیکن اس وقت میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے

معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کون ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں آپ کی لاش دیکھ آیا ہوں۔"

حیدر بیگ کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ اس کا سانس پھول گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اچھلا، بجلی کی طرح مجھ پر جھپٹا اور میری گردن دونوں ہاتھوں میں جکڑ لی۔ میں نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ وہ پوری طاقت سے میری گردن کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہ محسوس کر کے ششدر ہو رہا تھا کہ اس کی انگلیوں کی آہنی گرفت میری گردن پر معمولی سا دباؤ ڈالنے میں بھی کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ جیسے وہ کسی آہنی ستون کو دبانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ قد کاٹھ اور جثے میں یہ مغل شہزادہ مجھ سے دگنا تھا لیکن میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے چھوٹی سی بکری کی طرح زمین سے چار فٹ اوپر اٹھا لیا اور کہا۔

"مغل شہزادے حیدر بیگ تیموری کے ہم زاد! مجھے معلوم ہے کہ میں تجھے ہلاک نہیں کر سکتا کیونکہ تو زندہ نہیں ہے، پہلے ہی سے ہلاک ہو چکا ہے۔ لیکن میں نے تمہارے دو سو سال پرانے راز کو تم پر اس لئے فاش کیا ہے کہ اس وقت دنیا میں صرف میں ہی وہ واحد شخص ہوں جو تجھے اس سینکڑوں برس کی اذیت سے نکال سکتا ہے۔ دوسری بات ہے کہ تو مجھے بھی نہیں مار سکتا۔ اس کا ثبوت تمہیں مل چکا ہے کہ تو میری گردن پر ذرا سا بھی دباؤ نہیں ڈال سکا۔"

حیدر بیگ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے اسے فرش پر اتار دیا۔

"اب مجھ سے ساری کہانی بیان کرو۔ اس کے بعد میں تمہیں یہ بتاؤں گا کہ تمہاری اذیت اور عذاب سے نجات کا میرے پاس کیا حل ہے؟"

حیدر بیگ بے حد ندامت کے ساتھ کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور بولا۔

"عبداللہ مجھے معاف کر دینا۔ میں نے اپنے مہمان پر ہاتھ اٹھایا مگر ... مگر میں اپنے راز کو کسی دوسرے پر ظاہر ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔"

میں نے اسے تسلی دی اور اس کے بعد اس تیموری شہزادے نے مجھے جو داستان سنائی وہ یہ تھی۔ حیدر بیگ تیموری، اورنگ زیب عالمگیر کے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ وہ ایک کھلنڈر اور غیر سنجیدہ شہزادہ تھا۔ اسے اپنے ہی خاندان کی ایک شہزادی ممتاز بخت سے محبت ہو گئی۔ دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ اس کے بعد ممتاز بخت پر اسے شک پڑ گیا کہ وہ اپنے پھوپھیرے بھائی سے پیار کرتی ہے جب کہ اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ چنانچہ غیرت میں آ کر حیدر بیگ نے ایک روز اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا۔ اسی رات وہ

اپنی خواب گاہ میں سویا ہوا تھا کہ اچانک ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے گلے میں ایک خنجر پیوست تھا اور اس کا سارا جسم تڑپنے کی بجائے برف کی طرح سن ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ پھر جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے اس کی لاش کو اسی شاہی حویلی کے کمرے میں لا کر چبوترے پر رکھ دیا۔ پیچھے اس کی بیوی کی تصویر لگی تھی۔ نصف شب گزرنے کے بعد کسی روح کے ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ حیدر بیگ اگرچہ مردہ تھا اور اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا تھا مگر اس کی سماعت اور محسوس کرنے کی حس اور ذہن بیدار تھا۔ یہی اس کی سب سے بڑی اذیت تھی۔

اس روح نے حیدر بیگ کی لاش سے کہا کہ ممتاز بخت معصوم تھی۔ تو نے ایک بے گناہ اور معصوم خاتون کو ہلاک کیا ہے جو جنت میں بیٹھی تیرا انتظار کر رہی ہے لیکن حیدر بیگ جب تک اپنے گناہ کا کفارہ ادا نہیں کر لیتا تو جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ حیدر بیگ اشک آلود آواز میں کہہ رہا تھا۔

”مجھے روح نے بتایا کہ میں نے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لئے اس وقت تک ا۔ پے ہم زاد کی شکل میں دربدر اور پریشان پھروں گا جب تک کہ ممتاز بخت دوسرا جنم لے کر دنیا میں نہیں آئی۔ ممتاز بخت کو اگر میں اپنے دوسرے جنم میں تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا تو مجھے اس کی وفا کی عظمت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنا ہو گا۔ جب مجھے اس کی وفا شعاری کا بین ثبوت مل جائے گا تو میں اپنی لاش میں واپس چلا جاؤں گا۔ اور یوں جنت میں داخل ہو کر اپنی مرحومہ بیوی سے جا ملوں گا اور اپنے کیے پر نادم ہو کر اس کے قدموں میں گر پڑوں گا۔“ یہ ہے میری دکھ بھری کہانی۔ اب مجھے خدا کے لئے بتاؤ کہ تمہارے پاس میری دو سو سال کی اذیتوں کا کیا حل ہے اور میں اپنے گناہ کا کفارہ کیسے ادا کر سکتا ہوں؟

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں یہ خوش خبری سنانا چاہتا ہوں کہ ممتاز بخت دوسرا جنم لے چکی ہے۔“

وہ تڑپ کر تیز لہجے میں بولا۔ ”کہاں؟ کہاں ہے ممتاز بخت؟“

اب میں نے اسے امرتسر کی لڑکی ساراں کے بارے میں ساری کہانی سنا ڈالی۔

حیدر بیگ نے قدرے پریشان ہو کر پوچھا۔

”لیکن عبداللہ تمہیں کیسے علم ہوا کہ یہی ممتاز بخت ہے؟“

میں نے کہا

”میں نے تمہاری لاش والے کمرے میں جب دیوار پر ممتاز بخت کی روغنی رنگوں

والی تصویر دیکھی تو فوراً“ پہچان گیا کہ یہ تو ساراں کی پہلے جنم کی تصویر ہے۔۔“

حیدر بیگ نے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔ ”خدا کے لئے مجھے ممتاز بخت کے گاؤں لے چلو۔ میں اس کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”مگر وہ تو تمہیں نہیں پہچانے گی۔ آدمی دوسرے جنم میں آ کر اپنے پہلے جنم کی یادیں بھول چکا ہوتا ہے۔“

”میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے نہیں پہچان سکے گی لیکن میں اپنی تسکین کے لئے اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”وہ تو میں تمہیں دکھاؤں گا ہی۔ ہم کل صبح امرتسر کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔“

”نہیں نہیں عبداللہ! ہم ابھی اسی وقت روانہ ہوں گے۔“

اتنا کہہ کر اس نے ملازموں کو دیوانہ وار آوازیں دینا شروع کر دیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو گھوڑوں والی بگھی تیار کھڑی تھی۔ کاوچ بکس پر سائیس بیٹھا حکم کا منتظر تھا۔ ہم نے کھانے پینے کی اشیاء اپنے ساتھ رکھیں اور فٹن یعنی بگھی میں سوار ہو کر امرتسر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم لاہور سے دن کے پہلے پہر کو چلے تھے۔ گھوڑے منہ زور اور ہٹے کٹے تھے۔ تیس بتیس کوس کا فاصلہ انہوں نے راستے میں دوبارہ تازہ دم ہونے کے بعد تیسرے پہر تک طے کر لیا۔ ہم امرتسر شہر میں داخل ہوئے تو دن ڈھلنے میں ابھی ایک پہر باقی تھا۔ شہر کا امن وامان بحال ہو چکا تھا۔ اندھا دھند گرفتاریوں کے بعد اب بازار بھی کھل گئے تھے۔ گورا فوج نے جگہ جگہ مورچے بنائے ہوئے تھے۔

میرا خیال تھا کہ شاید ساراں بھی اپنے گاؤں سے واپس آ چکی ہو گی۔ میرا خیال درست نکلا۔ حیدر بیگ تیموری کو امرتسر کا انگریز ڈی سی اچھی طرح جانتا تھا۔ ہم نے فٹن کوتوالی کے باہر کھڑی کر دی۔ ڈی سی سے ملاقات کی۔ اس نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی اور پوچھا کہ کیسے امرتسر آنا ہوا۔ میں صرف ایک ہی آدمی یعنی انسپکٹر ہنٹر کے سامنے جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ کیونکہ وہ مجھے ساراں کو نکال کر لے جاتا دیکھ چکا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ پولیس انسپکٹر جالندھر چھاؤنی گیا ہوا تھا۔

حیدر بیگ نے ڈی سی کو بتایا کہ وہ گولڈن ٹمپل کی سیر کرنے آیا ہے۔ ہم نے اپنی فٹن کوتوالی کے باہر ہی کھڑی رہنے دی اور شہر کے اندرونی علاقے کا رخ کیا۔ درشنی ڈیوڑھی اور کٹڑہ کرم سنگھ سے ہوتے ہوئے جب ہم کوچہ کوڑیاں والے کے باہر پہنچے تو میں نے کہا۔

"ممتاز بخت اور اس جنم کی ساراں اس گلی میں رہتی ہے۔"

حیدر بیگ وہیں رک گیا۔ پھر میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہنے لگا۔

"اگرچہ میں اپنے اصلی جسم کا ہم زاد ہوں لیکن میرے اندر حیدر بیگ کی تمام جذباتی کیفیات موجود ہیں۔ دیکھو! میرا دل ابھی سے دھڑکنے لگا ہے۔"

واقعی اس ہم زاد کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس شخص کے اندر اس کے اصلی جسم یعنی حیدر بیگ تیموری کا دل ہے۔ میں نے اسے گلی کے باہر کھڑا کیا اور خود ساراں کے مکان کی طرف چلا۔ ساراں کا مکان میں نے فوراً پہچان لیا۔ دروازہ بند تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک بوڑھی عورت نے پوچھا۔ کس سے ملنا ہے بیٹا؟ میں نے کہا۔ اماں ، ساراں بہن کہاں ہے۔ میں اس کی خیریت دریافت کرنے گاؤں سے آیا ہوں۔ اس نے تعجب سے کہا۔

"وہ تو گاؤں میں ہی ہے۔ تمہیں معلوم نہیں۔ اس کا بیاہ ہو گیا ہے۔"

میں سلام کر کے واپس حیدر بیگ کے پاس آ گیا اور اسے بتایا کہ ساراں کی شادی ہو گئی ہے اور وہ گاؤں میں رہتی ہے۔ حیدر بیگ نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے کھڑا زمین کو تکتا رہا۔ پھر بولا۔

"عبداللہ! اس کے گاؤں چلنا ہو گا مگر میں نہیں ، تم جاؤ گے اور جو کچھ میں کہوں گا ویسے ہی کرو گے۔"

ہماری فٹن نے شہر سے نکل کر دیرکا گاؤں کا رخ پکڑ لیا۔ صحت مند، طاقت ور گھوڑوں نے بہت جلد سات کوس کا فاصلہ طے کر لیا۔ دیرکا گاؤں کے باہر ہی ایک جگہ درختوں کی چھاؤں میں فٹن کھڑی کر دی گئی۔ حیدر بیگ نے مجھے جواہرات کی ایک چھوٹی سی ریشمی تھیلی جیب سے نکال کر دی اور کہا۔

"یہ جواہرات اسے بعد میں دینا لیکن مجھے ایک نظر اس کی جھلک دکھا دو تاکہ مجھے یقین ہو جائے کہ وہ ممتاز بخت ہی ہے۔" ساراں وہیں اپنی خالہ کے گھر پر ہی تھی۔ اس نے شادی کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ سرخ وسپید رنگ نکھرا ہوا تھا۔ ہوبہو حویلی والی مغل شہزادی کی تصویر کا نقشہ تھا۔ سوائے لباس کے دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس کا خاوند کھیتوں میں گیا ہوا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اس کی خیریت دریافت کرنے آیا تھا۔ ساراں بڑی خوش ہوئی۔

اس کی خالہ نے بھی میری بڑی عزت کی۔ چارپائی پر چادر بچھا دی گئی۔ ساراں مٹکے سے لسی نکال کر لے آئی۔ خالہ نے کہا۔

"تمہارا بڑا بھائی کہاں ہے؟ اسے کیوں نہیں ساتھ لائے؟" اچھا موقع تھا۔ میں نے کہا۔

"وہ باہر درختوں میں کھڑا ہے۔ ابھی لاتا ہوں۔"

میں بھاگا بھاگا حیدر بیگ کے پاس پہنچا۔ اسے ساتھ لیا اور ساراں کے گھر میں آ گیا۔ ساراں کو دیکھتے ہی اس کی حالت غیر ہو گئی۔ سر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ان لوگوں کو تو فکر پڑ گئی۔ میں نے کہا۔

"یوں ہی اسے چکر آ گیا ہے۔ شہر سے گرمی میں آ رہا ہے ناں۔"

وہ ساراں کو ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ جب وہ کوٹھڑی میں ہمارے لئے اصلی گھی کا گڑ لینے گئی تو حیدر بیگ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ شدت جذبات سے کپکپا رہا تھا۔

"عبداللہ! یہ تو ممتاز بخت ہے۔ میری بیوی۔ مغلیہ شہزادی ممتاز بخت۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ خدا کرے میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکوں۔"

شام ہوئی تو میں نے حیدر بیگ کو واپس بھیج دیا اور خود یہ کہہ کر ساراں کے گھر پر ہی رہا کہ مجھے صبح آگے دوسرے گاؤں زمینوں کا مالیہ وصول کرنے جانا ہے۔ شام کے وقت ساراں کا خاوند بھی آ گیا۔ اس کو بھی میں پہلے مل چکا تھا۔ میرے لئے کوٹھے کی چھت پر بچھونا لگا دیا گیا۔ ساراں نے قیمے والی کھچڑی پکائی۔ جواہرات کی پوٹلی میرے پاس ہی تھی۔ رات گزر گئی۔ دوسرے دن جب ساراں کا خاوند کھیتوں میں چلا گیا اور اس کی خالہ گائے کا دودھ دوہنے عقبی صحن میں چلی گئی تو میں نے ساراں سے آہستہ آہستہ باتیں شروع کر دیں۔ پہلے اسے یہ کہا کہ وہ اس گاؤں کی حسین لڑکی ہے۔ پھر کہا کہ اس کا بیاہ تو کسی شہزادے سے ہونا چاہئے تھا۔ اس کے بعد حیدر بیگ کا ذکر چھیڑ کر جواہرات کی پوٹلی کھول کر اس کے سامنے رکھ دی۔ چھوٹے بڑے کتنے ہی ہیرے ، پنے، مونگے، نیلم ، عقیق دمکنے لگے۔

ساراں کی آنکھیں انہیں دیکھ کر خیرہ سی ہو کر رہ گئیں۔ میں نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور ضرب لگائی۔

"یہ سارے جواہرات تیرے لئے ہیں ساراں۔"

"میرے لئے؟ کیا یہ تم لائے ہو بھائی؟" اس نے میری طرف نظریں اٹھا کر پوچھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"یہ میرا بھائی تمہارے لئے لایا تھا۔ کہتا تھا ساراں کو دے دینا۔"

وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ساراں! میرے بھائی کو تم سے محبت ہو گئی ہے۔ اصل میں اس نے تمہیں یہاں ایک روز کھیتوں میں گزرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ بہت امیر ہے۔ جاگیردار ہے۔ لاہور میں اس کی حویلی ہے۔ کروڑوں روپے اس کے پاس ہیں۔ دو گھوڑوں کی بگھی بھی ہے۔"

ساراں نے جواہرات کو ہاتھ سے نیچے رکھ دیا اور بولی۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو بھائی؟"

میں نے صاف صاف کہہ دیا۔

"ساراں! اگر تم میرے بھائی حیدر بیگ سے شادی کر لو تو تم شہزادی بن کر رہو گی۔ وہ تمہیں جواہرات میں لادے گا۔ تم ہزاروں مربعوں کی مالک ہو گی۔ رانی بن کر راج کرو گی۔"

ساراں کے چہرے پر ناگوار تاثر ابھر آیا۔

"بھائی! یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی؟"

میں نے کہا۔

"میں تمہارے ہی بھلے کی بات کر رہا ہوں ساراں! تمہارا کسان خاوند تمہیں دو وقت کی روکھی سوکھی کے سوا کیا دے سکے گا۔ ساری زندگی اس کے بچے پالتی، پالتی بوڑھی ہو جاؤ گی۔

میں تمہارے بھلے کی بات کر رہا ہوں۔ اسے چھوڑ کر میرے بھائی سے بیاہ کر لو۔"

ساراں نے جواہرات کی خالی تھیلی میرے منہ پر دے ماری۔ اور کہا۔ "اگر تم نے میری عزت نہ بچائی ہوتی تو میں تمہارے ساتھ کوئی دوسرا سلوک کرتی۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنے جواہرات لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔" اتنا کہہ کر ساراں کوٹھری میں چلی گئی۔

مجھے ساراں سے یہی توقع تھی۔ وہ ایک وفاشعار ستی ساوتری عورت تھی۔ اسے ایسا ہی ہونا چاہئے تھے۔ اس کے کردار کے اس عظیم ترین پہلو میں حیدر بیگ تیموری کی نجات اور اس کے گناہ کا کفارہ پوشیدہ تھا۔ میں خاموشی کے ساتھ وہاں سے اٹھ آیا۔ حیدر بیگ امرتسر میں ڈپٹی کمشنر کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ یکے میں بیٹھ کر اس کے پاس پہنچا۔ سارا ماجرا بیان کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خوش ہو گا۔ کیونکہ ساراں کی وفا شعاری ہی اس کی نجات کا باعث بن سکتی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بے چین ہو گیا ہے۔ اس بے چینی کو اگرچہ حیدر بیگ نے ظاہر نہیں کیا لیکن وہ مجھ سے چھپی نہ رہ سکی۔ کہنے لگا "عبداللہ! اس موضوع پر شام کو بات کریں گے۔"

شام کو حیدر بیگ مجھے کوٹھی سے باہر کمپنی باغ میں لے گیا۔ ہم ٹھنڈی سڑک پر ایک طرف چلنے لگے۔ میں نے کہا۔

"حیدر بیگ! مجھے تم کچھ پریشان پریشان لگتے ہو۔ حالانکہ ساراں کے تمہارے ساتھ شادی کرنے سے انکار پر تمہیں خوش ہونا چاہئے تھے۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ وفادار ثابت ہو گی تو تم دو سو برس کے عذاب سے نجات پا سکو گے۔"

وہ اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔ بولا۔

"عبداللہ! میں حیدر بیگ کا ہم زاد ہوں۔ میں خود حیدر بیگ نہیں ہوں۔ اگرچہ اس کے ساتھ میں بھی روحانی اذیت برداشت کرتا چلا آ رہا ہوں۔ لیکن ساراں کو دیکھ کر اپنی حسین محبوبہ بیوی ممتاز بخت کو دیکھ لینے کے بعد میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ میں ہر قیمت پر ساراں کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے۔"

میں نے اسے ہلکی سی ڈانٹ کے ساتھ متنبہ ہو کرتے ہوئے کہا۔

"یہ خیال دل سے نکال دو حیدر بیگ۔ اگر تم نے ساراں کی زندگی برباد کرنے کی کوشش کی تو میں اس کی طرف سے تمہارا مقابلہ کروں گا۔"

یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا جس کا حیدر بیگ کے ہم زاد کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔ شاید اسی لیے اس نے اپنا لہجہ ایک دم بدل لیا اور مسکرا کر بولا۔

"برادر عزیز تم تو سنجیدہ ہو گئے ہو۔ ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو تم سے مذاق میں کہہ رہا تھا۔ بھلا میں یہ حرکت کر کے ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو جہنم کے حوالے کیسے کر سکتا ہوں؟"

لیکن مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنے کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ میں اس کی طرف سے محتاط ہو گیا۔ اگلے روز ہم لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔

لاہور پہنچ کر حیدر بیگ تیموری کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ اس کے معمولات میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔ موسم گرم ہو گیا تھا۔ مئی کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ ایک روز میں صبح سو کر اٹھا اور چھت سے نیچے آیا۔ غسل کیا، لباس تبدیل کیا۔ ناشتے پر بیٹھا تو حیدر بیگ نظر نہ آیا۔ نوکر سے پوچھا تو اس نے کہا۔

"حضور انور شہزادہ صاحب کو اچانک سندھ کی زمینوں پر جانا پڑ گیا تھا۔ جاتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ آپ کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔"

میرا ماتھا ٹھنکا۔ دال میں ضرور کچھ کالا تھا۔ میں نے نوکر سے کچھ نہ کہا اور اکیلا ہی بیٹھا ناشتہ کرتا رہا۔ جب نوکر دستر خوان سمیٹ کر لے گئے۔ تو میں اٹھا دروازے میں سے گزر کر دالان میں اور پھر راہ داری میں آ گیا۔ میں لاش والے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ اس کمرے کے دروازے پر ویسے ہی تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے تالا کھول دیا۔ کمرے میں داخل ہوا تو میرے ہوش اڑ گئے۔ چبوترے پر نہ حیدر بیگ تیموری کی لاش تھی اور نہ دیوار پر ممتاز بخت کی تصویر ہی لگی تھی۔

میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ حیدر بیگ کا ہم زاد وہ حماقت کرنے والا تھا۔ جو اسے کبھی بھول کر بھی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ اب مجھے ساراں کی فکر پڑ گئی۔ میں نے حویلی کے اصطبل میں آ کر گھوڑے پر زین کسی اور اس پر سوار ہو کر امرتسر کی طرف چل دیا۔ شہر سے نکلتے ہی میں نے امرتسر کو جاتی سڑک پر گھوڑے کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ راستے کی چوکیوں پر دو بار گھوڑے کو پانی وغیرہ پلا کر تازہ دم کیا اور تیسری چوکی کو پیچھے چھوڑتا امرتسر کی حدود میں داخل ہو گیا۔

دلی کو جو سڑک جاتی تھی اس کے ناکے پر سے میں نے گھوڑے کی باگ ساراں کے گاؤں کی طرف موڑ دی۔ گاؤں پہنچ کر دور سے دیکھا کہ اس کے مکان کے باہر پولیس کے سپاہی چارپائیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ ایک سکھ تھانیدار رجسٹر پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے پاس ہی زمین پر ساراں کا خاوند سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ہر بات میرے قیاس کے مطابق ہو رہی تھی۔

میں نے گاؤں کے ایک آدمی سے پوچھا کہ یہاں پولیس کیوں آئی ہے۔ اس نے کہا۔

"گامی کے گھر رات ڈاکہ پڑا۔ ڈاکو اس کی بیوی کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔"

اس سے زیادہ مجھے مزید کچھ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بات صاف ہو گئی تھی۔ یہ کام حیدر بیگ کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے وہیں سے گھوڑے کی باگ واپس موڑ دی۔ کیونکہ اگر میں ساراں کے خاوند کے پاس جاتا تو پولیس مجھے بھی شک میں وہیں بٹھا لیتی اور خواہ مخواہ میرا وقت ضائع ہوتا۔

رات میں نے امرتسر کی ایک سرائے میں گزاری اور منہ اندھیرے واپس لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ دوپہر کو لاہور پہنچ گیا۔ گھوڑے کو نوکر کے حوالے کیا۔ غسل کر کے نام رکھنے کو دوپہر کا کھانا کھایا اور حیدر بیگ کے نوکر سے باتیں کرنے لگا۔ میں اس سے کرید کرید کر پوچھ رہا تھا کہ اس کے مالک کے کہاں کہاں ٹھکانے ہیں۔ اس کی زبانی بس اتنا ہی

پتہ چل سکا کہ حیدر بیگ یا اپنی جاگیر پر جاتا ہے یا سال میں ایک بار سندھ اپنی زمینوں کا پھیرا لگایا کرتا ہے۔

حیدر بیگ خود نوکروں سے کہہ گیا تھا کہ وہ سندھ اپنی زمینوں پر جا رہا ہے۔ اس لئے یقین تھا کہ وہ ادھر نہیں گیا ہو گا۔ میں نے گھوڑا پکڑا اور دریا پار اس کی جاگیر کی طرف آ گیا۔ یہاں میں نے اس کے چاروں گاؤں میں گھوم پھر کر دیکھا۔ طریقے طریقے سے حیدر بیگ کے بارے میں لوگوں سے بھی پوچھا۔ سب نے یہی کہا کہ انہوں نے دو تین روز سے شہزادہ صاحب کو نہیں دیکھا۔ میں حیدر بیگ کے چوتھے گاؤں میں پہنچا تو وہاں گھوڑے کو پانی پلانے کے لئے ایک کنوئیں کے پاس لے آیا۔ یہاں کچھ لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں۔ دو عورتیں ایک دوسرے کو کوسے دے رہی تھیں۔ ایک عورت نے دوسری عورت کو طعنہ دیا کہ تیرا خاوند تو ڈاکے مارتا ہے تو کیا بات کرتی ہے ۔ دوسری عورت نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اری ڈاکے مرد مارا کرتے ہیں۔ وہ مرد ہے۔ تیرے خاوند کی طرح گھر میں نہیں بیٹھا رہتا۔"

ڈاکے کا سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے اس عورت کو نگاہ میں رکھا جس نے دوسری عورت کو اس کے خاوند کے ڈاکو ہونے کا طعنہ دیا تھا۔ جب وہ پانی کا گھڑا سر پر اٹھا کر چلنے لگی تو میں گھوڑے کو وہیں پانی پیتا چھوڑ کر اس عورت کی طرف گیا اور سلام کر کے کہا۔

"بہن جی! میں بڑی دور سے اپنے ایک دوست کا پتہ کرنے یہاں آیا ہوں۔ اس کی بیوی جس سے آپ ابھی باتیں کر رہی تھیں اپنے خاوند کے بارے میں نہیں بتا رہی کیونکہ اس کا خاوند ڈاکے بھی مارتا ہے۔"

عورت نے تنک کر کہا۔

"ڈاکے کیا مارتا ہے پورا ڈاکو ہے ڈاکو۔ دو روز سے غائب ہے۔ کہیں ڈاکہ مارنے ہی گیا ہو گا۔"

میں نے جیب سے ملکہ وکٹوریہ کا چاندی کا ایک روپیہ نکال کر اس عورت کو دیتے ہوئے کہا۔

"اپنے بچوں کو مٹھائی کھلا دینا۔ بہن جی۔ آپ کو کیا معلوم ہے کہ اس عورت کا جو ڈاکو خاوند ہے یہ کس طرف جاتا ہے؟"

عورت ایک روپیہ لے کر نہال ہو گئی۔

"پکا ڈاکو ہے۔ کوئی ایک ٹھکانہ ہو تو بتاؤں۔ ہاں سنا ہے جاگیردار کا چیلا چانٹا ہے اور کبھی کبھی جہلم کی پہاڑیوں میں ڈھوک وتہ میں جایا کرتا ہے۔ وہاں کوئی ڈیرہ ہو گا اس کا۔"

اتنا کہہ کر عورت آگے بڑھ گئی۔ مجھے اس سے کافی مفید معلومات مہیا ہو چکی تھیں۔ میں نے گھوڑے کو جہلم کی طرف ڈال دیا۔ مئی کے مہینے کی بھرپور تپش ہو رہی تھی لیکن میں اس گرمی سے بے نیاز چلا جا رہا تھا۔ گھوڑے کا خیال ضرور تھا چنانچہ اسے دوڑا نہیں رہا تھا۔ درختوں کی چھاؤں میں ہو کر چل رہا تھا۔ راستے میں جہاں کوئی کنواں وغیرہ آتا گھوڑے کو کھلا پلا کر تازہ دم کرلیتا۔

رات میں نے لالہ موسیٰ کے قصبے کی ایک سرائے میں بسر کی۔

دوسرے روز گھوڑا تازہ دم تھا۔ جہلم کی بنجر پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ جگہ شدید گرمی اور سورج کی تپش میں ویران اور اجاڑ پڑی تھی۔ زمین کچی اور پتھریلی تھی۔ کہیں کوئی ٹکڑا کچے کا آ جاتا اور کہیں سے پتھریلا راستہ شروع ہو جاتا۔ کہیں کوئی کھیتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ سنگلاخ علاقہ تھا۔ آگے ریتلا علاقہ شروع ہوا۔ یہاں ایک برساتی نالے کا چوڑا پاٹ خشک پڑا تھا۔

اس جگہ مجھے گھوڑوں کے سموں کے نشان نظر آئے۔ میں نے رک کر ان کا جائزہ لیا۔ یہ دو سے زیادہ گھوڑوں کے سموں کے نشان تھے جو برساتی نالے کے دوسرے کنارے کی طرف جا رہے تھے۔ میں ان نشانوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ نالے کا دوسرا کنارہ اونچا تھا۔ یہاں سموں کے نشان بائیں جانب کنارے کے ساتھ ساتھ گھوم گئے تھے۔ آگے ایک جگہ سے نالے کے کنارے کو کاٹ کر ڈھلان سی بنا دی گئی تھی۔ سموں کے نشان یہاں سے اوپر چلے گئے تھے۔ کنارے پر آیا تو سامنے ایک اونچا ٹیلا تھا۔ گھوڑوں کے سموں کے نشان اس ٹیلے کی طرف جا رہے تھے۔

ٹیلے کی چوٹی پر پہنچا تو دیکھا کہ دوسری طرف پیالہ نما ایک تنگ سی گھاٹی ہے جس کی ایک جانب پہاڑی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹا سا مندر دکھائی دیا۔ میں ٹیلے سے اتر کر قد آدم جنگلی جھاڑیوں کی اوٹ میں چلنے لگا۔ مندر قریب آیا تو میں نے گھوڑے کو ایک جگہ باندھا اور پیدل مندر کی طرف چلا۔ گھوڑوں کے سموں کے نشان اسی مندر کی طرف جا رہے تھے۔ میں جھاڑیوں کے پیچھے سے ہوتا مندر کے عقب میں آیا تو یہاں چار گھوڑے کیکر کے درختوں تلے بندھے تھے۔

میں ایک پل کے لئے رک گیا۔ یہاں انسان موجود تھے۔ کیا ساراں کو اغوا کر کے اس مندر میں رکھا گیا ہے؟ میں نے سوچا لیکن حیدر بیگ کا اعلیٰ نسل کا گھوڑا یہاں موجود

نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ساراں کو یہاں اپنے آدمیوں کے حوالے کر کے واپس چلا گیا ہو۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ' جھاڑیوں کی آڑ لیتا مندر کے پچھلے صحن کی طرف بڑھا۔ مندر کے مینار پر سے پتھر اکھڑ گئے تھے۔ سیاہ دیواروں کو جنگلی بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ چھوٹے سے کچے عقبی آنگن میں دھریک کی ٹھنڈی چھاؤں میں ایک ٹوٹا ہوا تخت بچھا تھا۔ پاس ہی مٹی کے تین گھڑے پڑے تھے۔ اس صحن میں سے گزرنے کی بجائے میں مندر کی عقبی دیوار کے پاس آ گیا۔ یہاں سے صحن میں چڑھ کر دھریک کے درختوں تلے لپکتا ہوا سامنے والے برآمدے کے کونے والے ستون کے پیچھے چھپ گیا۔ یہاں مجھے آدمیوں کی باتیں کرنے اور ایک آدمی کے قہقہہ لگانے کی آواز سنائی دی۔ یہ لوگ پنجابی میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی پنجابی چھاچھیوں کی پنجابی نہیں تھی بلکہ لاہور کے قرب وجوار میں بولی جانے والی پنجابی تھی۔ میں نے ان کی باتوں پر کان لگا دیئے۔ وہ علاقے کے کسی ہندو مہاجن کی لڑکی کو اٹھانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ گویا یہ لوگ ڈاکو تھے۔

ایسا لگ رہا تھا کہ یہ لوگ حیدر بیگ کے آدمی نہیں ہیں اور یہاں ساراں کو اغوا کر کے نہیں رکھا گیا لیکن ان ڈاکوؤں کا حیدر بیگ سے کوئی رابطہ ہو سکتا تھا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے ڈھوک رتہ کی طرف آگے جانا چاہئے۔

یہ سوچ کر میں پیچھے ہٹنے ہی والا تھا کہ ایک ڈاکو نے میرے مطلب کی بات کر دی۔ وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"اوئے لاہوری بادشاہ زادے کی یار کو ابھی وہیں رکھنا ہے یا لاہور پہنچانا ہے۔؟"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ لاہوری بادشاہ زادہ حیدر بیگ تھا اور اس کی یار ممتاز بخت عرف ساراں کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں ذرا سنبھلنے لگا تھا کہ ایک پتھر میرے ہاتھ کے نیچے سے کھسک کر نیچے گر پڑا۔ سنسان چلچلاتی دھوپ میں اس کا شور بلند ہوا تو ڈاکو ایک دم چپ ہو گئے۔ میں دیوار سے اتر کر جھاڑیوں کی طرف بڑھا ہی تھا کہ تین ڈاکو دیوار پر سے کود کر میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے دو ڈاکوؤں کے پاس توڑے دار بندوقیں اور ایک کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ انہوں نے منڈا سے باندھ رکھے تھے۔ چہرے تانبے کی طرح تھے اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اتنے میں پیچھے سے ان کا چوتھا ساتھی بھی ہاتھ میں چھرا تھامے وہاں آ گیا۔

"اوئے ایہہ کون اے اوئے؟"

ان ڈاکوؤں کا سرغنہ بندوق کی نالی میرے پیٹ سے لگا کر بولا۔ "کون ہو بے تم؟"

مجھے اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ ساراں کو ان لوگوں نے ہی حیدر بیگ کے ایما پر اغوا کر

کے کہیں چھپایا ہوا ہے۔ چنانچہ میں انہیں ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بڑی عاجزی سے کہا کہ میں ایک مسافر ہوں۔ اگلے گاؤں جا رہا تھا کہ پیاس لگی اور پانی کی تلاش میں اس مندر کو دیکھ یہاں آ گیا۔ جس ڈاکو کے ہاتھ میں چھرا تھا وہ مجھ پر چیتے کی طرح جھپٹا اور میری گردن پر چھرا رکھ کر اپنے سرغنہ سے بولا۔

"رنگو! اس کو ختم کر رہا ہوں۔"

وہ میری گردن پر چھرا گھونپنے ہی لگا تھا کہ رنگو ڈاکو نے ہاتھ بلند کر کے کہا۔

"نہیں اوئے۔ یہ مجھے پولیس کا آدمی لگتا ہے۔ اس سے بہت سی باتیں معلوم کریں گے۔ دوسرڈاکو نے کہا۔

"تو پھر رنگو چاچا' اس کو نیچے بند کر دیتے ہیں۔ واپس آ کر پوچھ گچھ کر لینا۔"

"ہاں۔" رنگو ڈاکو بولا۔ "لے جا کر اسے بند کر دو۔" انہوں نے میرے ہاتھ پشت پر رسی سے باندھے اور مجھے دھکیلتے ہوئے مندر کے نیچے بنے ہوئے ایک تہ خانے میں لے جا کر بند کر دیا۔ وہ ہندو مہاجن کے ہاں ڈاکہ ڈالنے جا رہے تھے۔ میں وہاں سے آزاد نہیں ہونا چاہتا تھا۔ جب تک ان لوگوں سے مجھے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ ساراں کو ان لوگوں نے کہاں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ میں ان سے کیسے الگ ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ساراں کو اسی مندر کے کسی دوسرے تہ خانے میں چھپا دیا گیا ہو۔ مجھے تہ خانے میں ایک ستون کے ساتھ جکڑ دیا گیا تھا۔ میں آسانی سے ان رسیوں کو توڑ سکتا تھا لیکن یہ سوچ کر اس خیال سے باز رہا کہ میں مندر کی تلاشی لے کر واپس تہ خانے میں آیا تو نہ تو میں تہہ خانے کو باہر سے تالا لگا سکوں گا اور نہ اپنے آپ کو ستون کے ساتھ رسیوں سے جکڑ سکوں گا۔ یہ ڈاکوؤں کو خواہ مخواہ شک میں ڈالنے والی بات ہو گی۔

لہٰذا میں نے یہی فیصلہ کیا کہ ڈاکوؤں کے واپس آنے تک میں ستون کے ساتھ ہی جکڑا رہوں گا اور جب ڈاکو واپس آئیں گے تو ان سے کسی دوسری حکمت عملی پر عمل کرتے ہوئے ساراں کے بارے میں پوچھوں۔ مجھے کچھ دیر بعد گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز دور ہوتے ہوئے غائب ہو گئی۔

ستون کے ساتھ رسیوں سے جکڑے ہوئے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ میں خاموشی سے ستون کے ساتھ سر لگا کر کھڑا رہا۔

ڈاکو ہندو مہاجن کو لوٹ کر اس کی بیٹی کو اغواء کر کے واپس آ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد تہ خانے کا دروازہ کھلا۔ دو ڈاکو اندر آئے اور رسیاں کھول کر مجھے اپنے سرغنہ رنگو کے سامنے لے گئے۔ وہ مندر کے چھتے ہوئے دالان میں لالٹین کی روشنی میں فرش پر آلتی پالتی

مارے بیٹھا تھا۔ بندوق اس کی گود میں تھی۔ کانسی کی کٹوری ہاتھ میں تھی۔ وہ جھوم رہا تھا۔ کانسی کی کٹوری میں دارو تھا۔ ایک ڈاکو اس کے پاس ہی زمین پر بیٹھا سامنے چادر بچھائے اس میں سے پرانی وضع کے سونے چاندی کے زیورات اٹھا اٹھا کر لالٹین کی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔ رنگو نے اسے فحش گالی دے کر ڈانٹا۔ "رکھ اوئے ایس پیو نوں پرے۔"

دوسرا ڈاکو زیورات چادر میں لپیٹ کر مندر کے پیچھے لے گیا۔ اب رنگو میری طرف متوجہ ہوا۔ میرے ہاتھ ابھی تک پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ رنگو نے مجھے فرش پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کٹوری میں سے ایک گھونٹ پیا اور مونچھیں صاف کرنے لگا۔ وہ میری طرف لال لال آنکھوں سے تک رہا تھا۔ "تمارا ناؤں کیا ہے اوئے؟"

میں نے کہا۔ "عبداللہ!"

وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ پھر بندوق اٹھا کر میرا نشانہ لے کر بولا۔ "بڑے خون کئے ہیں----- تیرا بھی خون کروں گا اگر تو یہ بتا دے گا کہ پولیس ہماری تلاش میں کہاں کہاں لگی ہے' تیرے دوسرے ساتھی کہاں ہیں تو میں تیرا خون نہیں کروں گا۔"

میں نے بڑے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ "رنگو بھائی! میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں' میں تو خود پولیس کا ستایا ہوا ہوں۔ میرے بڑے بھائی اور باپ کو پولیس نے مار مار کر ہلاک کر ڈالا ہے۔ میں تو پولیس کا جانی دشمن ہوں۔"

رنگو خاموش نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "اوئے تم مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہو؟ میں رنگو ہوں۔ چار تھانیداروں کو مار چکا ہوں۔ اب بیٹا جو میں پوچھتا ہوں سچ سچ بتا دے۔"

میں نے ایک چال چلی اور رنگو ڈاکو سے کہا۔ "تم تو مجھ پر خواہ مخواہ شک کر رہے ہو۔ پولیس والوں نے بھی مجھ پر شک کر کے پکڑ لیا تھا۔"

"وہ کیوں پکڑا تھا تمہیں اوئے؟" رنگو نے مونچھیں پھڑکا کر دریافت کیا۔

"ہمارے گاؤں دیرکا کی ایک نوبیاہتا عورت ساراں اغوا ہو گئی تھی۔ پولیس نے مجھے شبے میں پکڑ لیا۔ بڑا مارا----- بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا تھا کہ تم نے پکڑ لیا۔"

رنگو ڈاکو نے معنی خیز نگاہوں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "لو بھئی! ساراں کو یہ دبلا پتلا لڑکا اغوا کرے گا؟"

ڈاکو قہقہے لگانے لگے۔ رنگو نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"ابے اس عورت کو تو ہم نے بادشاہ زادے کے کہنے پر اٹھایا تھا۔"

"اچھا؟" میں نے حیرانی [illegible] "تو وہ زندہ ہے کیا؟"

ڈاکو گرج کر بولا۔ "اوئے تو کون ہوتا ہے یہ پوچھنے والا! ہم نے تو اسے ایسی جگہ چھپا رکھا ہے کہ جہاں سوائے بادشاہ زادے کے دوسرا کوئی نہیں جا سکتا۔ خبردار، پھر اس عورت کا ناؤں زبان پر لایا؟"

تیسری کٹوری پینے کے بعد اس کا سر ادھر ادھر گردش کرنے لگا۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اوئے پیر بخشا! اس کو تہ خانے میں بند کر دے، صبح اس کا کام تمام کر دیں گے۔"

ڈاکو پیر بخش مجھے لے کر واپس تہ خانے کی طرف چلا۔ ساراں کے بارے میں مجھے اتنا علم ہو گیا تھا کہ وہ زندہ ہے اور ایسی جگہ چھپا کر رکھی گئی ہے۔ جہاں سوائے حیدر بیگ تیموری شہزادے کے دوسرا کوئی نہیں جاتا۔ یہ بھی غنیمت تھا۔ حیدر بیگ کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ بلند کردار والا انسان ہے اور ساراں سے کسی قسم کی زیادتی نہیں کرے گا۔ اسے قائل کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ پہلے خاوند سے طلاق لے کر اس سے شادی کر لے۔

اب مجھے یہ کھوج لگانا تھا کہ ساراں کس مقام پر حبس بے جا میں رکھی گئی ہے۔ رنگو جھومتا ہوا مندر کی ایک کوٹھری میں گھس گیا۔ مجھے دوبارہ تہ خانے میں بند کر دیا گیا۔ میں نے غور کرنا شروع کر دیا کہ اب مجھے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہئے کہ جس سے مجھے ساراں کے خفیہ ٹھکانے کا علم ہو سکے۔ میں ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ کیا اس مرحلے پر میری طرف سے طاقت کا استعمال مناسب رہے گا یا نہیں؟

میں انہی خیالات میں غلطاں تھا کہ مجھے کسی لڑکی کی چیخ سنائی دی۔ جب لڑکی کی دوسری چیخ بلند ہوئی تو میرے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ میں نے ایک ہلکے سے جھٹکے سے اپنی رسیاں توڑ ڈالیں۔ میں رسیوں کے جکڑ بندھن سے آزاد ہو گیا۔

دروازہ باہر سے بند تھا۔ لیکن اسے کھولنے کے لئے بھی میرے ایک ہلکے سے جھٹکے کی ضرورت تھی۔ دروازے کا کنڈا تالے سمیت اکھڑ چکا تھا۔ میں نے باہر آ کر اندھیرے میں دیکھا کہ میرے پہلو میں تین چار قدم کے فاصلے پر ایک دوسری کوٹھری تھی جس کی درزوں میں شاید کڑوے تیل کے چراغ کی دھیمی روشنی باہر آ رہی تھی۔ لڑکی کی آوازیں اسی کوٹھری سے بلند ہوئی تھیں۔ میں کوٹھری کی طرف بڑھا۔ کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اندر سے لڑکی کی دبی دبی چیخیں آ رہی تھیں۔

میں نے بلند آواز میں کہا۔ "اوئے تم کون ہو اندر؟"

اندر سے کسی مرد کی غصیلی آواز آئی۔ "تم کون ہو اوئے؟"

میں نے پیر بخش ڈاکو کا نام سنا تھا، جھٹ کہا.... "میں پیر بخش ہوں۔"

میں نے بند دروازے سے کاندھا لگا کر تھوڑا سا دباؤ ڈالا اندر سے کنڈی تڑاخ کی آواز سے ٹوٹ کر لٹکنے لگی۔ دروازہ کھل گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ زمین پر ایک طرف مٹی کا دیا جل رہا ہے ایک کانسی کا کٹورا پڑا ہے۔ کٹورے کے پاس چھرا رکھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی فرش پر دری بچھی ہے جہاں ایک گورے رنگ کی نازک اندام لڑکی خوف کی حالت میں سمٹی بیٹھی ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں، چہرے پر گرمی کی وجہ سے پسینہ ہے اور وہ منہ گھٹنوں میں چھپائے سسکیاں بھر رہی ہے۔ اس کے قریب ہی ڈاکو گوپال بیٹھا ہے۔ جونہی اس کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو وہ اچھل کر اپنے چھرے کی طرف لپکا۔ میں نے کوئی حرکت نہ کی۔ اسے چھرا اٹھانے دیا۔ چھرا اٹھا کر گوپال نے تان لیا اور دانت پیس کر غرایا۔ "تم کہاں سے آ گئے اوئے؟"

میں نے جھپٹ کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لے لی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ چیخ مار کر اپنے ساتھی ڈاکو کو وہاں بلا لے۔ اس طرح سے اس ہندو لڑکی کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ گوپال کا چھرے والا ہاتھ آزاد تھا۔ اس کے لئے یہ بہت بڑا چانس تھا۔ اس نے دیوانہ وار پے درپے میرے پیٹ پر چھرے کے وار کرنے شروع کر دیئے۔

اس بے چارے کو کیا خبر تھی کہ حملے کے وقت میرے جسم کے اوپر پتھر کی ایک ایسی بلٹ پروف تہ چڑھ جاتی ہے کہ جس کے اندر سے توپ کا گولہ بھی نہیں گزر سکتا۔ لڑکی نے مجھ پر وار ہوتے دیکھے تو اس کی چیخ نکل گئی۔ میں نے خالی ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا اور گوپال کی گردن کو اپنے بازو کے شکنجے میں ذرا سا دبایا۔ گوپال کا چھرا میرے پیٹ پر وار کیے جا رہا تھا۔ میرا پیٹ تو ویسا ہی تھا صرف کرتا آگے سے پھٹ گیا تھا۔ لیکن گوپال کا ہاتھ خنجر لگنے سے زخمی ہو گیا تھا۔

چند ثانیوں میں وہ لٹک گیا۔

میں نے اسے فرش پر پھینک دیا... پھر لڑکی سے کہا۔ "اپنا لباس درست کرو۔"

ہندو لڑکی حیران پریشان، بوکھلائی ہوئی نظروں سے مجھے تک رہی تھی کہ میں اس کا مدد گار بن کر کہاں سے آ گیا۔ اس نے جلدی جلدی اپنی ساری کے پلو کو اپنے اوپر والے جسم کے گرد لپیٹا اور بال پیچھے کر کے بولی۔ "بھائی مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ بھگوان کے لئے مجھ پر دیا کرو۔"

میں نے دروازہ بند کر دیا اور فرش پر پڑے ڈاکو کی نبض دیکھی، وہ مر چکا تھا۔ میں

نے لڑکی سے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے؟

”م..... رادھا.... رادھا ہے۔“

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا ”رادھا بہن! میں تمہارا بھائی ہوں‘ جس طرح میں کہتا ہوں ویسے ہی کرو۔ تم یہاں تھوڑی دیر کے لئے چپ چاپ بیٹھی رہو۔ میں ابھی آکر تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔“

وہ رونے لگی۔ ”بھگوان کے لئے مجھے اکیلی نہ چھوڑو۔“

میں نے اسے تھوڑی سی تسلی دی۔ تھوڑا سا ڈانٹا اور دروازہ بند کر کے مندر کے چھتے ہوئے دالان میں آگیا۔ یہاں گھپ اندھیرا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان ڈاکوؤں کا سرغنہ جھومتا جھامتا کس طرف گیا تھا۔ میں بھی اسی طرف چلتا گیا۔ آگے ایک کوٹھری تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا دروازہ مندر کے تیسرے عقبی صحن کی طرف کھلتا تھا۔ یہ صحن چھوٹا تھا۔ یہاں میں نے لالٹین کی روشنی میں ڈاکوؤں کے سرغنہ رنگو کو دیکھا کہ چارپائی پر تکیہ رکھے نیم دراز ہے بندوق اس کے پاس ہی چارپائی سے لگی ہے۔

میں نے اب ڈرامہ کیا۔ چھلانگ لگا کر رنگو کی چارپائی کے پاس پہنچا اور اس کی بندوق اٹھا کر اس کے سینے میں رکھ دی اور کہا ”رنگو! ایک بات بتا دے گا تو تجھے جان سے نہیں ماروں گا۔“

رنگو کی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ یہ میں کہاں سے آدھمکا ہوں۔ بندوق کی نالی اس کے سینے سے لگی تھی پھر بھی میں دیکھ رہا تھا کہ اس پر موت کا خوف نہیں‘ بلکہ اس بات کی حیرت ہے کہ مجھے آزاد کس نے کر دیا۔ چلا کر بولا ”گوپالے نے دھوکا دیا ہے‘ وہ پہلے ہی میرے خلاف تھا۔“

اس کی آواز سن کر ساتھ والی کوٹھری سے باقی بچے ہوئے دونوں ڈاکو بندوقیں تانے نکل آئے۔ رنگو نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”تیری موت تجھے یہاں لے آئی ہے اوئے خبیثا! اب میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

اس دوران دونوں ڈاکوؤں نے میری کھوپڑی کی دونوں جانب بندوق کی نالیاں میری کنپٹیوں سے لگا دی تھیں۔

”بندوق سٹ دے اوئے!“ دونوں ڈاکوؤں میں سے ایک نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

میں بندوق رکھ بھی دیتا تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن میں نے انہی کے ضابطے پر عمل کرتے ہوئے بندوق پھینک دی۔ رنگو چارپائی سے اچھل کر بندوق تان کر میرے

سامنے آگیا۔ اب تین بندوقوں کا رخ میری طرف تھا۔

”اوئے تو کس بارے میں پوچھ رہا تھا مجھ سے....؟“ رنگو نے چلا کر پوچھا۔

میں نے بڑی شرافت سے کام لیتے ہوئے بغیر کسی خوف کے کہا۔ ”رنگو! مجھے اس عورت کی تلاش ہے‘ جس کا نام ساراں ہے اور جس کو تم لوگوں نے حیدر بیگ تیموری کے کہنے پر اغوا کیا تھا۔“

رنگو تعجب سے بولا۔ ”اوئے تو اس عورت کا پھوپھڑ لگتا ہے؟ اوئے تو کون ہے اصل میں ... بتا....بتا۔“

اس نے نالی میرے سینے میں دھنسانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اوئے تو بڑا رستم سہراب بنا پھرتا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی اس کمبخت نے بندوق کا فائر کر دیا۔ ایک دھماکا ہوا۔ بندوق کی نالی میرے سینے میں بمشکل دس انچ دور ہو گی۔ گولی میرے سینے سے ٹکرا کر اچٹتی ہوئی دائیں بائیں نکل گئی۔

رنگو نے چیخ کر کہا۔ ”اوئے اس نے لوہے کی صدری پہن رکھی ہے۔ اس کی گردن پر فائر کرو۔“

پیر بخش ڈاکو نے میری گردن پر فائر جھونک دیا۔ سکے کی گولیاں میری گردن سے ٹکرا کر ادھر ادھر اچٹ گئیں۔ اب تو تینوں ڈاکو گم سم سے ہو کر مجھے تکنے لگے۔

میں اس دوران پیر بخش ڈاکو کو نہ دیکھ سکا۔ وہ کھسک کر تیزی سے کوٹھری میں گیا اور وہاں سے لوہے کی شام والا لٹھ لے آیا اس نے پیچھے سے پورے زور کے ساتھ میرے سر پر دے مارا۔ تڑاخ کی آواز کے ساتھ لٹھ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اب مجھے غصہ آگیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر پیر بخش کو گردن سے پکڑ کر زمین سے پانچ فٹ اوپر اٹھایا اور پھر زور سے زمین پر دے مارا۔ اس کی شاید کوئی ہڈی ثابت نہیں بچی تھی۔ وہ چر مر ہو کر وہیں پڑا کراہنے لگا۔

رنگو ڈاکو نے ہاتھ باندھ لئے۔ وہ مجھے کوئی مافوق الفطرت قسم کی شے سمجھنے لگا تھا اور بولا۔ ”عبداللہ پیر! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا کہ تم جن ہو....جن پیر ہو۔ مجھے معاف کر دو۔“

میں نے اسے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن وہ جلدی سے میرے پاؤں میں فرش پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”پیر جی! تم چارپائی پر بیٹھو میں تو تمہارا خادم ہوں۔“

میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس سے ساراں کے بارے میں پوچھنے ہی والا تھا کہ مجھے

اچانک تہ خانے کی گرمی اور حبس میں بیٹھی ہندو لڑکی رادھا کا خیال آ گیا۔ میں نے اٹھتے ہوئے رنگو سے کہا۔ ”اسی جگہ بیٹھے رہو‘ میں کوٹھری سے لڑکی کو لے کر آتا ہوں۔“

رنگو ڈاکو نے ہاتھ باندھے اور کہا۔ ”پیر جی! میں تو غلام ہوں‘ جہاں بٹھا جائیں گے وہیں بیٹھا رہوں گا۔ بھلا آپ سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہوں؟“

میں تیزی سے دوسری کوٹھری کا زینہ اتر کر رادھا کے پاس گیا۔ وہ بے چاری گرمی میں نیم بے ہوش ہو رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے پیچھے آنے کو کہا اور زینہ اتر کر کوٹھری سے نکل کر عقبی صحن میں آیا تو رنگو غائب تھا۔ اس وقت مجھے اپنی حماقت کا شدید احساس ہوا مجھے اسے اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ عین اس وقت گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز رات کے سناٹے میں گونجی اور پھر دور ہوتی چلی گئی۔

میں سر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سہمی ہوئی ہندو لڑکی رادھا نے وہاں بھی ایک ڈاکو کی لاش دیکھی تو بے چاری خوفزدہ ہو کر وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ڈاکوؤں کے سردار کے بھاگ جانے پر بجائے خوش ہونے کے میں سر پکڑ کر کیوں بیٹھ گیا ہوں۔ ایک ایسا مخبر جو مجھے ساراں کے بارے میں بتا سکتا تھا کہ وہ کس مقام پر چھپا کر رکھی گئی ہے میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے تھا کہ مجھے جل دے کر نکل گیا تھا۔

اپنی اس پریشانی میں ہندو لڑکی رادھا کو شریک کرنا بیکار تھا۔ اسے تو مجھ سے صرف اتنی غرض تھی کہ میں اسے اس کے گھر پہنچا دوں۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے باپ کو ڈاکوؤں نے قتل نہیں کیا بلکہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر رسیوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس کی ماں خوف سے بے ہوش ہو گئی تھی اور نوکر ڈاکوؤں کو دیکھ کر بھاگ گئے تھے۔

میں نے رادھا کو گھڑے میں سے پانی نکال کر پلایا۔ ایک بار پھر اسے حوصلہ دیا کہ میں اسے اس کے گھر پہنچا دوں گا۔

اسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔ وہ مجھے بھی ڈاکوؤں کا ساتھی سمجھ رہی تھی۔ بہرحال میں نے اسے چارپائی پر لٹا دیا اور خود بندوق اٹھا کر کچھ فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ خطرہ صرف اتنا تھا کہ رنگو ڈاکو ہاتھ سے نکل گیا ہے کہیں اپنے ساتھیوں کو لے کر نہ آ جائے اگرچہ اس پر میری غیر معمولی طاقت کی دہشت بیٹھ چکی تھی۔ لیکن ڈاکوؤں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ ویسے بھی مجھے چوکس رہنے کی ضرورت تھی کیونکہ رنگو ڈاکو رات کے کسی بھی وقت واپس آ کر رادھا کو ہلاک کرنے کی کوشش کر سکتا تھا‘ اس لیے کہ وہ اس کے ڈاکے اور اغوا کی واردات کی شاہد تھی

ہندو لڑکی رات کے کسی وقت سو گئی تھی۔ صبح کی روشنی ٹیلوں اور ٹیکریوں پر پھیلی تو میں نے اٹھ کر دیکھا‘ رادھا معصوم بچی کی طرف گہری نیند سو رہی ہے۔ اس کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگ کر پپوٹوں سے جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے سوتے رہنے دیا اور مندر میں گھوم پھر کر دیکھا۔ یہ ڈاکوؤں کا مسکن تھا۔ انہوں نے ایک جگہ دیوار کے پاس چولہا بنا رکھا تھا مگر یہاں کھانے پینے کی کوئی شے نہیں تھی۔ ایک چنگیر میں باسی روٹی پڑی تھی۔ میں روٹی رومال میں لپیٹ کر واپس چھوٹے صحن میں آیا تو رادھا جاگ پڑی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ اپنی ساڑی کو درست کرنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”بی بی! اس طرف غسل خانہ ہے‘ وہاں پانی کی بالٹی رکھی ہے جا کر غسل وغیرہ کر لو پھر میں تمہیں تمہارے گھر لے چلوں گا۔“

رادھا خاموشی سے سر جھکائے جس طرف میں نے اشارہ کیا تھا ادھر کو چلی گئی۔ میں وہیں بیٹھا غور کرنے لگا کہ رادھا کو اس کے گھر چھوڑ کر مجھے رنگو کی تلاش میں کس طرف جانا چاہیے۔ واپس لاہور والی حویلی میں جانا بیکار تھا۔ کیونکہ مغل شہزادے کا ہمزاد حیدر بیگ وہاں نہیں آیا ہو گا۔ وہ تو اسی جگہ ہو گا۔ جہاں اس کی پچھلے جنم کی بیوی اور آج کے جنم کی ساراں قید ہو گی۔

ہندو لڑکی منہ ہاتھ دھو کر ساڑی کے پلو سے منہ پونچھتی ہوئی آ کر چارپائی کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا اور رومال میں سے روٹی نکال کر دی۔ ”یہ ڈاکو مسلمان تھے مگر رنگو ڈاکو ہندو تھے ہو سکتا ہے‘ یہ روٹی ہندو ڈاکو نے پکائی ہو۔ بھوک لگی ہے۔ تو اسے کھا لو۔“

ہندو لڑکی نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا کہ اسے بھوک نہیں ہے۔ میں نے اسے گھڑے میں سے پانی دیا۔ وہ اس نے پی لیا پھر ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”ویر جی! مجھے میرے ماتا پتا کے پاس لے چلو۔“

”چلو! میرے ساتھ ....؟ میں نے کہا۔

وہ اٹھی۔ ہم مندر سے نکل کر عقب میں آ گئے۔ یہاں تین گھوڑیاں بندھی تھیں۔ میں نے ایک بھری ہوئی بندوق اپنے ساتھ رکھ لی تھی۔ ایک گھوڑے پر ہندو لڑکی کو بٹھایا۔ دوسرے گھوڑے پر خود بیٹھا اور مندر کی گھاٹی سے نکل کر ٹیلے کے پہلو سے ہوتا ہوا چھوٹے سے ویران میدان میں آ گیا۔ ہندو لڑکی میرے آگے آگے تھی۔ وہ جب اس ویران میدان سے نکل کر کچی سڑک پر آئی تو اس نے مجھے اپنے قصبے کی سمت بتائی۔ اس کا گاؤں وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور جہلم جانے والی سڑک سے ایک کوس مشرق کی طرف واقع

تھا۔ اس کے گاؤں کے درختوں کا جھنڈ دور سے دکھائی دیا تو وہ خوش ہو کر بولی۔ "وہ ہمارا گاؤں ہے' ویر جی!"

رادھا کا باپ ایک امیر مہاجن اور ساہوکار تھا۔ اس کے گھر ڈاکہ پڑا تھا۔ اور اس کی بیٹی اغوا ہو گئی تھی۔ چنانچہ قدرتی بات تھی کہ پولیس وہاں ضرور آئی ہو گی۔ میں گاؤں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر رک گیا۔

"رک کیوں گئے ویر جی؟" ہندو لڑکی نے پوچھا۔

میں نے اسے کہا کہ میں آگے نہیں جاؤں گا۔ پھر اس سے وعدہ لیا کہ وہ پولیس یا اپنے گھر والوں کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتائے گی۔ بس یہی کہے گی کہ وہ موقع پا کر ڈاکوؤں کے چنگل سے بھاگ آئی ہے۔ ہندو لڑکی رادھا مجھے احسان مند نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "ویر جی! میں بھگوان کی قسم کھاتی ہوں' آپ کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں کہوں گی۔" اپنا گھوڑا میرے قریب لائی۔ میرے گھٹنوں پر ہاتھ لگا کر اپنے ماتھے پر لگایا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اس کے گھوڑے کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مار دیا۔ گھوڑا ہندو لڑکی کو لے کر گاؤں کی طرف چل دیا۔

میں نے اپنے گھوڑے کو بھی ایڑھ لگائی اور اسے دلکی چال چلاتا ہوا ایک بار پھر جہلم جانے والی سڑک پر لے آیا۔

اس وقت تک سورج آسمان پر کافی اوپر آ گیا تھا اور سخت گرمی پڑنے لگی تھی۔ دور دور تک کوئی چرند پرند دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ٹیکریوں اور ٹیلوں پر سناٹا چھایا تھا۔ میرے گھوڑے کی گردن اور شانوں سے پسینہ بہنے لگا۔ جب میں مندر کی گھاٹی کے کچھ دور آگے نکل کر ایک وادی میں آیا تو دیکھا کہ وہاں ایک پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔ اس ندی کے کنارے کھیت بھی تھے۔ میں نے گھوڑے کو یہاں چھوڑ دیا اور خود ایک جگہ کیکر کے درخت تلے بیٹھ گیا۔

گھوڑے نے جی بھر کر ندی سے پانی پیا اور پھر کھیت میں ادھر ادھر چرنے لگا۔ جب گھوڑا تازہ دم ہو گیا تو میں اسے لے کر پھر آگے بڑھا۔ ڈھوک رتہ آیا تو سہ پہر ڈھلنے لگی تھی۔ مجھے گاؤں میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک بوڑھے دیہاتی نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کس سے ملنا ہے؟ میں گھوڑے سے اتر آیا۔ میں نے قصبے کے مکانوں پر ایک نگاہ ڈالی اور گہرا سانس لے کر بولا۔ "پردیسی مسافر ہوں۔ تھک گیا تھا سوچا اس جگہ تھوڑی دیر آرام کر لوں۔"

"آؤ بیٹا' میرے گھر چلو.... لسی پیئو.... بے شک رات بھی ٹھہر جانا۔"

یہ بوڑھا مسلمان تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا جہاں اس کی بہو رات کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ اس کا جوان بیٹا درانتی سے چارہ کاٹ رہا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔ "کرمو بیٹا یہ مسلمان پردیسی مسافر ہے' اسے لسی پلاؤ۔"

جوان کرمو میرے لئے اسی وقت مٹکے میں سے کٹورہ بھر کر لسی لے آیا۔ ایک نوکر میرے گھوڑے سے زین اتار کر اس کی مالش کرنے لگا۔ گھوڑے کے آگے چارہ ڈال دیا گیا۔ میرے لئے آنگن میں چارپائی ڈال کر بچھونا لگا دیا۔ بہو نے مجھے کن انکھیوں سے دیکھا اور پھر کھانا پکانے میں لگ گئی۔

بوڑھا حقہ لے کر میرے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اسے یہی بتایا کہ میں لاہور سے آ رہا ہوں۔ سوان جانا ہے۔

میں خود اس گاؤں میں رہ کر ڈاکو رنگو اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں راضی ہو گیا۔ جوان کرمو نے مجھے چادر لا کر دی۔ میں کنوئیں پر نہانے چلا گیا۔ واپس آ کر کپڑے بدلنے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے کپڑوں کی تلاشی لی گئی ہے۔ میرا کرتہ اس جگہ نہیں تھا جہاں میں اسے رکھ کر گیا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔ رات کو بوڑھے اور اس کے بیٹے کرمو نے مجھے سرسوں کا ساگ اور جوار کی روٹی کھلائی۔ پینے کو دودھ دیا۔ میری چارپائی کوٹھے کی چھت پر ڈال دی گئی۔ میرا گھوڑا انہوں نے مکان کے باہر درخت سے باندھ دیا۔ بوڑھا حقہ لے کر میرے پاس آ گیا۔ آنگن میں دیا جل رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور اندھیرا تھا۔ آسمان پر کھلے ہوئے گرمیوں کے موسم کے چمکیلے ستاروں کی جتنی مدھم روشنی ہو سکتی تھی بس اتنی ہی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ڈاکوؤں کا موضوع چھیڑ دیا کہ سنا ہے ادھر ڈاکے بڑے پڑتے ہیں۔ بوڑھا بولا۔ "توبہ کرو جی! ادھر تو آج تک کسی ڈاکو نے رخ نہیں کیا۔ ہمارے ڈھوک کے نوجوان بڑے بہادر ہیں۔ ڈاکو تو ڈھوک رتے کا نام سن کر ہی کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔"

میں چپ ہو گیا۔ بوڑھا سلام کر کے حقہ اٹھائے چھت سے نیچے اتر گیا۔ میں ٹھنڈے بچھونے پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ یہ لوگ کہیں ڈاکوؤں کے بھائی بند تو نہیں ہیں۔ ایک ہلکا سا شک میرے دل میں ابھر آیا تھا۔

رات بھیگتی چلی گئی' گزرتی چلی گئی۔ میرا خیال ہے آدھی رات ہو گئی تھی کہ مجھے آنگن والے لکڑی کے دروازے کے کھلنے کی آواز آئی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے پھر قدموں کی چاپ اور دو آدمیوں کے کھسر پھسر کرنے کی آواز سنا دی۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

بوڑھے کی آواز میں نے پہچان لی تھی' وہ کسی آنے والے سے بات کر رہا تھا- وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا- اب اس کے جوان بیٹے کرمو کی آواز بھی آئی- انہوں نے دو تین بار مسافر کا نام لیا- ظاہر ہے' وہ میرے بارے میں بات کر رہے تھے- میں سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے- مجھے ایک شرارت سوجھی- میں بستر سے اٹھ کر چارپائی کے پاس بیٹھ گیا- میں نے اپنی والدہ کا تصور باندھا اور قدیم مصری منتر پڑھ کر انگلی اپنے سینے سے لگا دی-

ایک ثانیے سے بھی کم مدت میں' میں چڑیا کے ننھے سے بچے سے بھی زیادہ چھوٹا ہو گیا- میں اپنی عدم موجودگی میں ان لوگوں کی باتیں سننا چاہتا تھا کہ وہ کیا مقصد لے کر آ رہے ہیں اور کہیں ان میں رنگو ڈاکو بھی ہے؟ مجھے اسی کی تلاش تھی مجھے بستر پر لیٹا دیکھ کر ان کا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جانا یقینی تھا- کچھ آدمی سیڑھیاں چڑھتے کوٹھے پر آ رہے تھے- میں جلدی سے چارپائی کے پائے کے ساتھ اندر کی جانب لگ گیا- میری نظریں چھت کی سیڑھی پر لگی تھیں- ستاروں کی روشنی میں' میں نے دیکھا کہ بوڑھے میزبان اور اس کے جوان بیٹے کرمو کے ہمراہ ایک اونچا لمبا سیاہ رو ڈاکو نما آدمی بھی ہے جس کے ہاتھ میں چھرا ہے- چارپائی خالی دیکھ کر بوڑھے نے آہستہ سے کہا- "کہیں کھیتوں میں گیا ہوگا- تم ادھر چھپ جاؤ' ابھی آتا ہو گا-"

سیاہ رو آدمی بولا- "اس کے بچھونے کی تلاشی لو- روپے اس نے سرہانے کے نیچے چھپا رکھے ہوں گے-"

انھوں نے میرا سارا بچھونا کھنگال ڈالا مگر وہاں کچھ ہوتا تو ان کے ہاتھ آتا- "بوڑھا بولا بڑا کائیاں ہے- اس کے کپڑوں سے بھی مجھے کچھ نہیں ملا تھا- اس نے کمر کے ساتھ وسلی باندھی ہو گی- روپے اسی میں ہوں گے تم نے گھوڑا قابو میں کر لیا ہے' نا؟؟"

"ہاں!" سیاہ رو آدمی بولا- "اچھا اب ادھر تخت کے پیچھے اندھیرے میں چھپ جاتے ہیں-"

کرمو نے کہا- "شور مچانے کی مہلت نہ دینا شامو! بس اوپر آتے ہی تلوار کا ایسا وار کرنا کہ گردن اتر جائے- اس کے بعد اس کی وسلی کی تلاشی لیں گے-"

میں چارپائی کے ایک پائے کے ساتھ لگا یہ ساری باتیں سن رہا تھا- کمبخت یہ تو گھٹیا قسم کے چور نکلے- چند روپوں کے لیے مسافر کا خون بہانے پر تیار ہو گئے تھے- افسوس مجھے اس بات کا ہوا کہ یہ رنگو ڈاکو نہیں تھا لیکن مجھے اس سے رنگو کے گروپ کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی تھیں- میں نے سوچا کہ اب مجھے پورے قد میں ان کے سامنے آجانا چاہئے تاکہ میں چور شامو کو قابو میں کر کے اس سے اپنے مطلب کی پوچھ گچھ کر

سکوں- میں چارپائی کے نیچے سے نکل کر پائینتی کی طرف آیا اور دل میں والدہ صاحبہ کا تصور جما کر قدیم مصری منتر پڑھ کر انگلی اپنے سینے سے لگائی تو کچھ نہ ہوا دوسری بار انگلی لگائی تب بھی میں بڑے سائز کا نہ ہوا- میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر کے والدہ صاحبہ کا تصور دل میں جمایا- قدیم مصری منتر کو صاف صاف دل میں دہرایا- بڑی احتیاط کے ساتھ انگلی اپنے سینے سے لگائی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات- میں چھوٹے کا چھوٹا ہی رہا- ایک بار تو مجھے پسینہ آگیا-

اس دوران خدا جانے کسی طرح بوڑھے کے بیٹے کرمو کی نظر مجھ پر پڑ گئی- اس نے آہستہ سے اپنے باپ سے کہا- "بابا! یہ چارپائی کے پاس کیا شے ہل رہی ہے؟"

بوڑھا اور شامو چور آہستہ آہستہ میری طرف آئے تو میں سیڑھیوں کی طرف اٹھ دوڑا- انھوں نے جو ایک پورے انسانی اعضا والی ننھی سی شے کو دوڑتے دیکھا تو دہشت کے مارے وہیں جم کر رہ گئے- بوڑھے نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا- "یہ کوئی بھوت پریت ہے' شامو اسے کچھ نہ کہنا-"

اس کا بیٹا کرمو بولا- "بابا! اس نے تو وہی ہمارے مہمان والے کپڑے پہن رکھے ہیں-"

میں نے دیکھا کہ وہ تلوار لے کر میری طرف بڑھ رہا ہے- وہ مجھے تلوار سے ہلاک تو نہیں کر سکتا تھا لیکن یہ لوگ میرے لئے مصیبت کا باعث بن سکتے تھے- مثلاً" یہ مجھے گاؤں کے کنوئیں میں پھینک سکتے تھے' دریا میں پھینک سکتے تھے- میرے گلے میں رسی ڈال کر درخت کی اونچی شاخ پر لٹکا سکتے تھے جیسا کہ پرانے زمانے میں آسیبی چھلیڈوں کے ساتھ پنجاب کے گاؤں میں سلوک کیا جاتا تھا- چنانچہ میں اپنے آپ کو سیڑھیوں پر گرا دیا- میں ایک چھوٹے سے پتھر کے ٹکڑے کی طرح سیڑھیوں پر سے اچھلتا' گرتا پڑتا نیچے آنگن میں آن گرا-

گرتے ہی ہی اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگا- میری رفتار بھی کم ہو گئی تھی پھر بھی میں جتنی تیز بھاگ سکتا تھا' بھاگ کر آنگن کے ادھ کھلے دروازے میں سے باہر نکل گیا- میرے پیچھے بھاری انسانی قدموں کے دوڑنے کی آوازیں آرہی تھیں- میں دیوار کے ساتھ ہو کر دوڑ رہا تھا مگر میری اور ایک پورے قد کے انسان کی رفتار میں بہت زیادہ فرق تھا- میں نے سوچا کہ مجھے کسی جگہ چھپ جانا چاہئے- مکان کی دیوار ختم ہوئی تو پیپل کا درخت سامنے آگیا- اس کے تنے کی دوسری طرف کھیتوں میں ایک ننھی سی پانی کی کھال بہہ رہی تھی جو مجھے اس وقت ایک بڑی نہر لگی- میں نے اس میں چھلانگ لگا دی- میں ایک تنکے کی

طرح لہروں پر بہتا آگے ہی آگے نکلتا چلا گیا۔ اب آدمیوں کی آوازیں دور رہ گئی تھیں۔ شاید شامو چور میری تلاش میں دوسری طرف نکل گیا تھا۔ بہتے بہتے میرا جسم کسی بہت بڑے لجلجے پتھر سے ٹکرایا۔ میں نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ ایک بڑے غبارے جتنی بڑی آنکھوں والا مینڈک مجھے تک رہا تھا۔ میں نے جلدی سے پانی میں ڈبکی لگادی اور پانی کے اندر ہی کھال میں تیرتا چلا گیا۔

میں پانی کے اندر تیرتا چلا جا رہا تھا۔

میرا قد ابھی تک ایک ننھے مینڈک سے بھی چھوٹا تھا۔ میں نے جس وقت اس دیہاتی کھال میں چھلانگ لگائی تھی۔ تو رات کا وقت تھا۔ کھال کے پانی میں اندھیرا تھا۔ اپنی غیر معمولی قوت کی وجہ سے مجھے اس اندھیرے گدلے پانی میں اگی ہوئی جھاڑیاں اور سرکنڈے نظر آ رہے تھے۔ شامو چور اور اس کے بیٹوں کا خوف میرے ساتھ تھا۔ میں اپنی طرف سے بڑی تیز رفتاری سے پانی کے اندر تیر رہا تھا۔ مگر چونکہ میرا قد انسانی انگلی کے برابر تھا اس لئے فاصلہ کم طے ہو رہا تھا۔ شامو چور اور اس کے بیٹوں کی جانب سے مجھے ایک ہی خطرہ تھا کہ اگر ان کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ مجھے ہلاک تو نہیں کر سکیں گے لیکن مجھے کسی اندھے کنوئیں میں پھینک سکتے ہیں۔ میری گردن میں رسی ڈال کر مجھے کسی درخت کی اونچی شاخ سے باندھ سکتے ہیں۔ یوں وہ میرے لئے ایک عذاب کا باعث بن سکتے ہیں۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ قدیم مصری منتر پڑھنے کے باوجود میرا قد بڑا کیوں نہیں ہوا۔ میں نے دو تین بار منتر پڑھ کر اپنے جسم کو انگلی سے چھوا تھا مگر میں چھوٹے کا چھوٹا ہی رہا۔ میرا قد بڑا نہیں ہوا تھا۔ یہ بات بھی بے حد تشویش انگیز تھی۔ اگر میں یوں ہی ننھا سا بونا ہی بنا رہا تو آگے کیا ہو گا؟

میرا ننھا سا دماغ انہی پریشان کن خیالات میں غلطاں تھا اور میں پانی کے اندر ہی اندر تیرتا چلا جا رہا تھا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ پانی ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ پانی میں پہلے تو اندھیرا چھایا ہوا تھا اب دھیمی دھیمی روشنی سی ہونے لگی تھی۔ پنجاب کے کھال گدلے پانی کے ہوتے ہیں اور رات کے اندھیرے میں تو ان کے اندر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن اس کھال کے اندر ایسی روشنی پھیلنے لگی تھی جیسے باہر دن چڑھا ہوا ہو۔ حالانکہ میں نے جب کھال میں چھلانگ لگائی تھی تو رات آدھی گزر چکی تھی۔

پانچ ہزار سال سے تاریخ کی پر پیچ راہوں پر سفر کر رہا تھا۔ اس نوع کی تبدیلیوں کا

تجربہ کئی بار ہو چکا تھا' اب بھی یہی خیال آیا کہ یا تو میں ایک عہد سے نکل کر کسی دوسرے عہد میں داخل ہو گیا ہوں اور یا جس کھال کے اندر میں تیر رہا ہوں وہ کسی دریا میں گرنے والی ہے۔ کیونکہ پانی میں ٹھنڈک آ رہی تھی۔ مگر اتنی جلدی صبح نہیں ہو سکتی تھی۔ ابھی تو آدھی رات تھی۔ پھر دس پندرہ منٹ میں صبح کیسے ہو گئی؟

اصل حقیقت کا علم پانی سے نکلنے کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں پانی کی تہہ سے اوپر کی طرف اٹھنے لگا۔ قد بے حد چھوٹا تھا اس لئے پانی کی سطح پر آتے آتے مجھے کچھ وقت لگا۔ میں نے پانی کی سطح سے سر باہر نکالا تو پلکیں جھپکتا رہ گیا۔ وقت اور عہد بدل چکا تھا۔ اب دیکھنا صرف یہ تھا کہ یہ کون سا دور ہے اور کون سا ملک ہے۔ سب سے بڑی پریشانی مجھے اس بات کی تھی کہ نئے عہد میں آنے کے بعد بھی میرے قد میں تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ میں ایسے ہی چھوٹے کا چھوٹا تھا۔

پہلی تبدیلی میں نے یہ دیکھی کہ میں اب کسی گندے دیہاتی کھال میں نہیں بلکہ ایک ٹھنڈے پانی والی نہر میں تھا۔ جس کے دونوں کناروں پر گھنے شیشم کے درختوں کی خنک چھاؤں تھی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ میں پنجاب میں ہی ہوں۔ شیشم اور پیپل کا درخت پنجاب کی نشانی ہے۔ میں نے ایک عجیب بات دیکھی کہ نہر کے دونوں کنارے ویران اور سنسان تھے۔ موسم گرمی ہی کا تھا۔ سورج فضاء میں جمی ہوئی گرد کے غبار میں گم تھا۔ اور ایک چمکیلا غبار سا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ بڑی اداس اور دل گرفتہ سی دوپہر تھی۔ میں تیر کر نہر کے کنارے آ گیا اور گھاس کے لمبے لمبے خوشوں کے درمیان کھڑے ہو کر آس پاس کے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔

نہر کے پار کھیت خالی پڑے تھے۔ کسی کھیت میں کوئی کسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ دور دھندلے غبار میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا جس کے اندر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ یہ دھواں ویران دوپہر کی افسردگی میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ شاید ادھر کوئی گاؤں تھا۔ ادھر ہی سے نعروں کی آوازیں دو ایک بار گونجیں اور پھر وہی حسرت ناک مرگ آلود سناٹا چھا گیا۔

مجھے نہر میں کوئی شے تیرتی دکھائی دی۔ میں گھاس کے خوشوں سے نکل کر گیلی مٹی کی ایک چھوٹی سی ڈھیری پر چڑھ گیا۔ یہ کسی کم سن بچے کی پھولی ہوئی لاش تھی۔ اس کے سر کے ایک جانب گہرا شگاف پڑا تھا۔ یہ کیا معمہ ہے؟ میں کہاں آ گیا ہوں؟ بچے کی لاش پانی کی لہروں پر بہتی آگے نکل گئی۔ میں اپنے قد کے بونے پن سے پریشان تھا۔ سوچا کیوں نہ ایک بار پھر کوشش کروں۔

چنانچہ آنکھیں بند کر کے والدہ صاحبہ کی شکل دل میں جمائی اور پھر ڈرتے ڈرتے

امید و بیم کے اضطراب میں اپنی انگلی سینے سے لگا دی۔ مجھے جیسے کسی نے پیچھے سے ذرا سا آگے کو دھکیل دیا۔ مگر میں گرا نہیں کیونکہ میں بڑا ہو چکا تھا۔ اپنے آپ کو دوبارہ پورے قد میں دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اور خدا کا شکر بجا لایا۔ فوراً" پرے ہٹ کر درختوں میں آ گیا اور شمال کی جانب چلنے لگا۔

سوچ رہا تھا کہ کوئی راہ گیر ملے تو اس سے احوال پوچھوں کہ یہ کون سا شہر ہے کون سا زمانہ ہے میری چھٹی حس نے اتنا ضرور بتا دیا تھا کہ میں ۱۹۱۹ء کے زمانے سے بہت آگے نکل آیا ہوں۔ اس کی تصدیق بہت جلد راستے پر درخت کے نیچے پڑی ہوئی سگریٹ کی ایک خالی ڈبی نے کر دی۔ میں نے ڈبی کو اٹھا کر دیکھا۔ یہ پاسنگ شو سگریٹ کا خالی پیکٹ تھا۔ یہ سگریٹ میں نے ۱۹۱۹ء کے عہد میں نہیں دیکھے تھے۔ جس میں سے میں گزر کر آ رہا تھا۔

تھوڑی دور چلا ہوں گا کہ کے راستے کی ڈھال پر جھاڑیوں میں ایک اور لاش پڑی دیکھی۔ قریب گیا۔ لاش برہنہ تھی اور کسی مسلمان نوجوان کی تھی۔ اس کی گردن آدھی کٹی ہوئی تھی۔ قریب ہی ایک درانتی اور چھوٹی سی پوٹلی پڑی تھی۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ چند قدم چلنے کے بعد ایک چھوٹے سے جوہڑ کے پاس ایک عورت کی لاش اس طرح اوندھی پڑی دیکھی کہ گھٹنوں تک اس کی ٹانگیں جوہڑ کے گندے پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ عورت بوڑھی تھی اس کا پیٹ ادھڑا ہوا تھا۔ اور انتڑیاں نیچے سے باہر نکل آئی تھیں۔ میں نے سوچا کیا یہ ظلم انگریز حکمران کر رہے ہیں؟ لیکن جو تینوں لاشیں میں نے دیکھی تھیں انہیں تلوار یا چھرے کے وار سے قتل کیا گیا تھا اور انگریز کے پاس تو بندوقیں تھیں' مشین گنیں تھیں' جلیانوالہ باغ میں اس نے لوگوں کو مشین گن کے فائر سے بھونا تھا۔ تلوار یا چھرے سے ابھی تک میں نے کسی انگریز کو حملہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔

آگے بائیں جانب ایک چھوٹا سا گاؤں آ گیا۔ چند ایک کچے مکان تھے۔ گاؤں کے باہر کچھ لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ جن کے پاس گدھ بیٹھے اکتاہٹ سے مجھے تک رہے تھے۔ ان کے پیٹ بھرے ہوئے تھے۔ سارے مکان خالی تھے۔ ٹوٹا پھوٹا سامان بکھرا پڑا تھا۔ ان مکانوں میں بھی کئی عورتوں اور بچوں کی لاشیں دیکھیں' ایک مکان کے دروازے کے اوپر "اللہ' رسول" کھریا مٹی سے لکھا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ بھی مسلمانوں کی لاشیں تھیں۔ ایک کتا مجھے دیکھ کر گاؤں کی گلی میں بھاگ گیا۔ ان لاشوں میں کسی جوان لڑکی کی لاش نہیں تھی۔

لگتا تھا کہ کسی چنگیز خان نے حملہ کر دیا تھا۔ اور اس کی خون آشام فوج لوگوں کا قتل عام کرتے گزر گئی ہے۔ میں واپس نہر کنارے والی کچی سڑک پر آ گیا۔ دور کسی طرف

سے پھر پہلے ایسے نعروں کی آوازیں فضا میں گونج کر گم ہو گئیں۔
بہرحال میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایک جگہ نہر کنارے سے چھوٹی سی پگڈنڈی درختوں میں گھرے کچے مکانوں کی طرف جاتی دکھائی دی۔ ان مکانوں میں مسجد کے مینار دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ یہ بھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ مگر اس کا نہر والا حصہ ویران اور سنسان نظر آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ مسجد میں چلنا چاہیے۔ شاید وہاں کسی مسلمان سے ملاقات ہو جائے اور اس سے پوچھوں کہ یہاں مسلمانوں پر یہ ظلم کس نے کیا ہے۔

گاؤں میں داخل ہوا تو یہاں بھی جگہ جگہ لاشیں دیکھیں کئی مکان اور دکانوں کے چھپر جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔ میں سیدھا مسجد میں آ گیا۔ مسجد کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔ چھوٹی سی مسجد کا کچا صحن تھا۔ اس صحن میں لاش تو کوئی نہیں تھی مگر جگہ جگہ خون کے لوتھڑے بکھرے ہوئے تھے جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

میں اس سلسلے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا کہ اس علاقے پر کیا قیامت بیت گئی ہے۔ صاف عیاں تھا کہ یہ قیامت یہاں کے مسلمانوں پر ہی ٹوٹی تھی' کیونکہ مجھے کسی جگہ ابھی تک کسی غیر مسلم کی لاش نظر نہیں آئی تھی۔ مسجد کی چھت کو ایک راستہ جاتا تھا۔ میں چھت پر آیا تو دیکھا کہ مسجد کی دوسری طرف بھی کچھ کچے مکان تھے جہاں ایک آدمی درخت کی چھاؤں میں بیٹھا ٹوکے سے چارا کاٹ رہا تھا۔ یہ آدمی سکھ تھا۔ اس نے نیلی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ اور اس کی لمبی ڈاڑھی کھلی تھی میں نے سوچا کہ اس سے چل کر پوچھا جائے کہ یہاں کیا انقلاب آیا ہے۔

میں مسجد کی چھت سے اتر کر صحن میں سے گزرتا ہوا عقب میں اس درخت کی طرف چلنے لگا جس کی چھاؤں میں سکھ چارا کاٹ رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ میں قریب پہنچا تو اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹوکہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ غدر اور پھر ۱۹۱۹ء کی تحریک آزادی کے عہد میں سے گزرنے کے بعد میں سکھوں سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ اس سکھ کی نیلی پگڑی بتا رہی تھی کہ یہ اکالی نہنگ سکھ ہے۔ اکالیوں میں نہنگ سکھ وہ ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی سکھ پنتھ کے لئے وقف کر رکھی ہو۔ عام طور پر یہ نہنگ سکھ کوئی کام نہیں کرتے۔ گردواروں کی یاترا کرتے ہیں۔ بھنگ گھوٹ کر پیتے ہیں اور جب سکھ پنتھ پر کوئی آفت آتی ہے تو اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔

میں نے جاتے ہی ست سری اکال کیا۔ جواب میں اس نے بھی ست سری اکال کیا ـــــ اور پھر بولا۔ "مہاراج ہندو ہو؟"

میں نے کہا۔ "نہیں مسلمان ہوں۔ عبد اللہ میرا نام ہے۔ یہاں اتنا قتل عام کیسے

ہوا؟ کس نے کیا؟"

نہنگ سکھ نے اپنے پیچھے گردن موڑ کر دیکھا۔ نعروں کی جو آوازیں مجھے دور والے گاؤں کے جھنڈوں سے آتی سنائی دی تھیں وہ اب اس چھوٹے سے گاؤں کے عقب میں' درختوں سے بلند ہوئیں۔ نہنگ سکھ نے مجھے پرالی کے ایک بہت بڑے ڈھیر میں چھپ جانے کو کہا۔ میں نے قدرے پس و پیش کیا تو وہ مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا پرالی کے ڈھیر کے پاس لے گیا۔

"کوکے وڈ چھڈن گے پتر۔ پرالی چ لک جا۔"

اس کے لہجے میں ہمدردی اور ایثار تھا۔ پھر اس نے مجھے پتر یعنی بیٹا کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ چھپنے میں کیا حرج ہے۔ اس طرف سے حالات کا سراغ بھی مل جائے گا کہ آخر یہاں کیا ہو رہا ہے۔ میں پرالی کے خشک ڈھیر میں چھپ گیا۔ پرالی خشک تھی۔ میں نے باہر کا منظر دیکھنے کے لئے تھوڑی جگہ بنا لی تھی۔

نہنگ سکھ نے مجھے تاکید کی کہ میں آواز نہ نکالوں۔ وہ اپنے اڈے پر جا کر بیٹھ گیا اور چارا کاٹنے لگا۔ نعروں کی آواز اب قریب آ گئی تھی۔ بہت سے لوگوں کی بھاگ دوڑ کی آواز آئی۔ ان میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز بھی شامل تھی۔ پھر بہت سے لوگوں نے مل کر نعرہ لگایا۔ "جو بولے سو نہال۔ ست سری اکال۔"

نہنگ سکھ بڑے اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھا چارہ کاٹتا رہا۔ لمبے تڑنگے سکھوں کی ایک ٹولی نمودار ہوئی۔ کچھ سکھ گھوڑوں پر سوار تھے۔ سب کے ہاتھوں میں کرپانیں اور ننگی تلواریں تھیں۔ انہوں نے ڈاٹھے باندھ رکھے تھے اور آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ تقریباً سب ہی نے لمبے لمبے نیلے کرتے پہن رکھے تھے۔ پگڑیاں بھی نیلی تھیں ایک نیزہ بردار گھڑ سوار سکھ نے میرے میزبان سکھ سے کرخت آواز میں پوچھا۔ "اوئے لہنا سیاں ایتھے کوئی مسلا تے نہیں اوئے؟" (لہنا سنگھ! یہاں کوئی مسلمان تو نہیں ہے؟)

میرے میزبان نہنگ سکھ نے ہاتھ روک لیا اور ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھ کر کہا۔ "یہاں کوئی مسلمان ہوتا تو اسے میں زندہ نہ چھوڑتا جتنے مسلمان تھے سب مار ڈالے ہیں۔"

ایک دوسرے سکھ نے پرالی کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔ "اوئے ایس پرالی وچ تے کوئی نہیں چھپا ہوا؟" نہنگ سکھ نے بے نیازی سے کہا۔ "یہ ڈھیری تو میں نے ابھی لگوائی ہے۔ ایتھے کوئی مسلمان نہیں سنگیو۔"

گھوڑ سوار نیزہ بردار سکھ نے گھوڑے کی باگ موڑتے ہوئے کہا۔ لہنا سیاں۔ ایدھر دے سارے مسلمان ختم کر دیئے ہن۔ ہن نہریار والے مسلیاں نوں مکان جا رے ایں۔

جو بولے سو نہال"

باقی سب سکھوں نے چلا کر نعرے کا جواب دیا۔ "ست سری اکال۔" اور خونخوار لوگوں کی یہ ٹولی آگے بڑھ گئی۔ میں یہ سارا منظر پرالی کے اندر سے دیکھ رہا تھا۔ نہنگ سکھ ابھی تک اپنے دھیان میں چارا کاٹنے میں مصروف تھا۔ جب سکھوں کی ٹولی نہر کنارے کافی دور نکل گئی تو نہنگ سکھ ٹوکا ایک طرف رکھ کر تیزی سے اٹھ کر پرالی کے ڈھیر کے پاس آیا اور پرالی ادھر ادھر ہٹاتے ہوئے کہا۔ "کاکا۔ باہر نکل آ۔"

میں پرالی کے ڈھیر سے باہر نکل آیا۔ "یہ سب کیا ہے لہنا سنگھ جی؟ یہ آپ کے بھائی مسلمانوں کے خون کے پیاسے کیوں ہو رہے ہیں؟"

نہنگ سکھ مجھے بازو سے پکڑ کر کوٹھڑی میں لے گیا۔ یہاں خالی چارپائی بچھی تھی۔ مجھے اس پر بیٹھنے کو کہا اور دروازہ بند کر کے بولا۔

"تم کس گاؤں کے رہنے والے ہو عبد اللہ؟" مجھے کیا معلوم تھا کہ ادھر کون کون سے گاؤں ہیں۔ میں نے یوں ہی ایک فرضی گاؤں کا نام لے لیا۔ نہنگ سکھ میرے بارے میں ابھی تک پریشان تھا۔ بند دروازے کے پاس گیا۔ باہر دیکھا۔ واپس آیا اور بولا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہندوستان کا بٹوارہ ہو گیا ہے پاکستان بن گیا ہے۔ یہاں ہندو، سکھ، مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔ ادھر پاکستان سے ہندو سکھوں کے لٹے پٹے قافلے آ رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "سردار جی آپ بھی تو سکھ ہیں۔ آپ نے مجھے کیوں بچایا؟"

نہنگ سکھ نے ہاتھ باندھ کر چھت کی طرف دیکھا اور بولا۔ "واہگورو کے آگے سب ایک سمان ہیں۔ کیا برہمن کیا مسلمان کیا نہنگ۔ یہ لوگ واہگورو کو بھول گئے ہیں۔ مسلمانوں کا خون کر رہے ہیں کل یہ پچھتائیں گے۔"

ایک بار پھر دروازے کے پاس جا کر باہر دیکھا اور بولا۔ "پتر عبد اللہ! تیرے گھر والے کہاں ہیں۔ کیا وہ سب قتل ہو گئے؟"

"جی۔ جی میرے سارے گھر والے ہی یہاں سے چلے گئے تھے۔"

"لاہور چلے گئے تھے۔"

"جی ہاں۔"

"پھر تم بھی لاہور جاؤ گے؟"

"جی ہاں۔" میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

نہنگ سکھ میرے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی عمر پچاس سے اوپر تھی۔ داڑھی کے بالوں میں سفیدی آ رہی تھی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "پتر عبد اللہ! یہاں گاؤں میں میرا

ایک جگری یار خیر دین ماشکی رہتا تھا۔ دو روز پہلے رات کو نہنگ سکھوں نے اس کے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ میں اپنے یار خیر دین اور اس کی بیوی کو نہ بچا سکا۔ غنڈوں نے انہیں قتل کر دیا۔ لیکن اس کی جوان لڑکی صغراں کسی طرح اندھیرے میں بھاگ کر میرے گھر آ گئی۔ میں نے اسے ایک محفوظ جگہ چھپا رکھا ہے۔

میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر نہنگ سکھ کہنے لگا۔ "صغراں میرے دوست خیر دین کی نشانی ہے۔ واہگورو کی کرپا سے اس کی جان بچ گئی ہے۔ اب میرا ایک کام کرو۔ صغراں کو اپنے ساتھ لاہور لے جا کر مسلم لیگ والوں کے حوالے کر دو۔ مجھے معلوم ہے میں زیادہ دیر اس کی حفاظت نہیں کر سکوں گا۔ سکھوں کی ٹولیاں دن میں کئی بار آتی ہیں۔ میں نے اپنی جان کی بازی لگا کر صغراں کو ابھی تک چھپایا ہوا ہے؟"

میں نے پھر کہا کہ صغراں کہاں ہے؟ اس نے بتایا کہ کھیتوں میں جو ٹیوب ویل لگا ہے اس کے اندر نیچے موٹر کے پاس چھپی ہوئی ہے۔ اب وہ مجھے ایسے طریقے بتانے لگا جن پر عمل پیرا ہو کر میں صغراں کے ساتھ پاکستان میں داخل ہو سکتا ہوں۔ "مسلمانوں کے قافلے آگے امرتسر شہر سے جا رہے ہیں۔ مگر ان پر بھی حملے ہوتے ہیں۔ امرتسر تک تم پر بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ تم ہندووانہ بھیس بنا کر یا جوگی بن کر صغراں کو جوگنی بنا کر ساتھ لے جاؤ۔"

میرے لئے یہ باتیں دو راز کار تھیں۔ کیونکہ میں بڑی آسانی سے قدیم مصری منتر پڑھ کر صغراں کو چھوٹا بنا کر اپنی جیب میں ڈال کر لے جا سکتا تھا۔ یہ بات میں اس نیک دل سکھ نہنگ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ "سردار جی تم مجھے صغراں کے پاس لے چلو۔"

وہ بڑا خوش ہوا۔ بولا۔ "پتر تم دونوں رات کے اندھیرے میں یہاں سے نکل جانا۔ میں راستہ تمہیں بتا دوں گا اور تمہارے لئے ہندووانہ لباس بھی لے آؤں گا۔ اس شلوار میں تو تم صاف مسلمان لگتے ہو۔"

وہ مجھے کوٹھڑی سے نکال کر کھیتوں کی طرف لے کر چلا۔ کھیت دور دور تک ویران پڑے تھے۔ کھیتوں میں ایک جگہ پیپل کے درخت کے پاس پکا کوٹھا بنا تھا۔ یہ ٹیوب ویل تھا۔ جو بند تھا۔ چوبچے میں تھوڑا سا پانی جمع تھا۔ جس میں مچھر بھنبھنا رہے تھے۔ نہنگ سکھ نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ ہمیں کوئی نہیں دیکھ رہا تو لوہے کی سیڑھی پر سے نیچے اترنے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

نیچے زمین کے اندر کوئی ایک منزل کی گہرائی میں ایک عجیب قسم کی مشین زمین میں

لگی تھی۔ وہ ٹیوب ویل کی موٹر تھی۔ جس کا ذکر نہنگ سکھ نے کیا تھا اس قسم کی مشین میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہ ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا جس کا علم مجھے نہنگ سکھ سے ہو گیا تھا۔ راستے میں ٹیوب ویل کی طرف جاتے ہوئے اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ مسلمانوں نے اپنا الگ وطن پاکستان بنایا ہے جس میں سرحد' سندھ' بلوچستان اور آدھا پنجاب شامل ہے۔ واہگہ کے پاس پاکستان کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔

صغراں ٹیوب ویل کی موٹر کے پیچھے سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ سانولے رنگت کی اٹھارہ انیس سالہ دیہاتی لڑکی تھی۔ چہرے پر بے پناہ اداسی اور وحشت تھی۔ نہنگ سکھ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "دھی رانی! یہ بھی تمہارا مسلمان بھائی ہے' اس کا نام عبد اللہ ہے' یہ تمہیں اپنے ساتھ پاکستان لے جائے گا۔"

صغراں روتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔ نہنگ سکھ نے اسے پیار کیا اور کہا۔

"دھی رانی! یہ بڑا نیک لڑکا ہے یہ تمہیں اپنے ساتھ پاکستان لے جائے گا تم مسلم لیگ والوں کے پاس چلی جانا۔ وہ تمہیں تمہارے رشتہ داروں کے ہاں چھوڑ آئیں گے۔ بیٹی یہاں میں بوڑھا کب تک تمہاری حفاظت کر سکوں گا۔ غنڈے تو بڑی آسانی سے مجھے ہلاک کر کے تمہیں اٹھا لے جائیں گے مرنے کے بعد پھر میں تمہارے باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"

یہ سکھ موت کے بعد کی زندگی کی باتیں سوچ رہا تھا۔ ایسے لوگ میں نے شاذ و نادر ہی دیکھے تھے جنہیں یہ احساس ہو کہ انہیں اگلی دنیا میں جا کر اپنے اعمال کا حساب دینا پڑے گا۔ ویسے بھی یہ سکھ بڑا انسان دوست اور خدا خوفی کرنے والا سکھ تھا۔ میں نے بھی صغراں کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔ "صغراں! تم میری چھوٹی بہن ہو۔ تم فکر مت کرو میں تمہاری حفاظت کروں گا جو تمہیں اغوا کرنے آئے گا اسے پہلے مجھے موت کے گھاٹ اتارنا ہو گا اور یقین کرو میں موت کے گھاٹ نہیں اتر سکتا۔"

صغراں دوپٹہ منہ پر رکھے آنسو بہاتی رہی۔ نہنگ سکھ کہنے لگا۔ "بیٹا عبد اللہ! تم میری بچی کو لے کر آج رات یہاں سے نکل جاؤ۔ میں تمہارے لئے ہندووانہ کپڑے شام کو لے آؤں گا۔ اور امرتسر تک راستہ بھی بتا دوں گا۔ اچھا اب میں تمہارے لئے کھانا پانی لاتا ہوں۔ بیٹا تم سکھ کے ہاتھ کا بنا ہوا بھوجن کھا لو گے؟ میری بیوی سرگباش ہو چکی ہے۔ ایک ہی بیٹی تھی جو دلی بیاہی ہوئی ہے۔ بیٹا فوج میں ہے۔ میں اکیلا رہتا ہوں خود ہی پکاتا ہوں۔ کیا تم میرے ہاتھ کا پکا ہوا بھوجن------؟"

میں نے نہنگ سکھ کی بات کاٹ کر کہا۔

"سردار جی! آپ سکھ نہیں ہیں۔ آپ تو فرشتہ سیرت انسان ہیں۔ میں آپ سے کیسے چھوت چھات کر سکتا ہوں۔"

سکھ نہنگ جلدی واپس آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ بار بار تاکید کر رہا تھا کہ ہم ٹیوب ویل سے باہر نہ نکلیں اور اونچی آواز میں بات نہ کریں اور ٹیوب ویل کا دروازہ بند کر کے اس نے تالا لگا دیا۔

صغراں ابھی تک سسکیاں بھرتے ہوئے اپنے قتل ہو چکے ماں باپ اور بھائیوں کو یاد کر رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر مسلمانوں نے اپنا الگ وطن پاکستان بنا لیا ہے تو پھر یہاں کے مسلمانوں کو ہندو سکھ کیوں قتل کر رہے ہیں۔ نہنگ سکھ نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ پاکستان میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کو اسی طرح موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ یہ بات میرے لئے افسوس ناک تھی کیونکہ کوئی بھی مذہب تشدد نہیں سکھاتا میں اس نتیجے پر پہنچا کہ دونوں طرف غنڈہ عناصر اس منافرت اور معصوم لوگوں کے قتل عام کا باعث ہیں۔

مجھ سے جس قدر ہو سکا صغراں کو حوصلہ دیا اور اس کا غم دور کرنے اور اسے اجتماعی شکل دینے کی کوشش کی۔ میں نے صغراں کو بتایا کہ میں نے جگہ جگہ مسلمان عورتوں' آدمیوں اور بچوں کی لاشیں بے گور و کفن پڑی دیکھی ہیں۔ وہ خوش قسمت ہے کہ اسے سردار نہنگ سنگھ جیسا انسان دوست سکھ مل گیا اور اس کی جان بچ گئی۔ مگر صغراں کو صبر نہیں آ رہا تھا۔ وہ روئے جا رہی تھی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ میں اس غمزدہ لڑکی کو چھوٹا بنا کر اپنی جیب میں چھپا لوں۔ پھر یہ سوچ کر اس ارادے سے باز رہا کہ دہشت کے مارے کہیں اس کا دم ہی نہ نکل جائے۔

آدھے گھنٹے بعد ٹیوب ویل کا تالا کھلنے کی آواز سنائی دی نہنگ سکھ ہمارے لئے ساگ' چار روٹیاں اور لسی کا گڑوا لے کر آ گیا۔ اس نے بغل میں ایک گٹھڑی بھی داب رکھی تھی۔ اس میں ہمارے لئے ہندووانہ لباس یعنی میرے لئے تنگ موری والا پاجامہ' کھدر کا کرتا اور صغراں کے لئے نسواری رنگ کی ساڑھی وغیرہ تھی۔ بڑی مشکل سے ہم نے صغراں کو زبردستی تھوڑی بہت روٹی کھلائی۔ لسی کے دو گھونٹ پلائے۔ محض دکھاوے کے لئے میں نے بھی دو روٹیاں کھا لیں۔ پھر ایک طرف ہو کر میں نے نہنگ سکھ کی خاطر اور ویسے بھی موقع محل کو مد نظر رکھتے ہوئے ہندووانہ لباس پہن لیا۔ صغراں سے کہا کہ وہ بھی ساڑھی پہن لے۔

ہم دونوں ٹیوب ویل سے باہر آ کر ٹیوب ویل کے چوبچے کے پاس بیٹھ گئے۔ نہنگ سکھ بولا۔ یہ نور پورہ گاؤں ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور آگے جا کر جی ٹی روڈ آ جاتی ہے۔

یہ سڑک سیدھی واہگہ سرحد پر جاتی ہے۔ ابھی سرحدوں پر فوجیں نہیں بیٹھیں۔ ہر طرف افراتفری مچی ہے۔"

"آگے کون سا شہر ہے؟" میں نے پوچھا۔

نہنگ سکھ بولا۔ "آگے کرتار پورہ اور مجیٹھہ قصبے ہیں یہ سکھوں کے گڑھ ہیں۔ اس کے بعد امرتسر شہر آ جائے گا۔ وہاں مسلمانوں کا بہت زیادہ قتل عام ہو رہا ہے' سنا ہے کسی جگہ کیمپ بھی بن گیا ہوا ہے۔ جی ٹی روڈ پر تمہیں کوئی فوجی ٹرک امرتسر جاتا مل جائے تو اس میں بیٹھنے کی کوشش کرنا۔"

نہنگ سکھ نے مجھے چاندی کے بیس روپے دیئے۔ "یہ رقم تم دونوں کے لئے کافی تو نہ ہو گی لیکن میرے پاس اس وقت یہی کچھ ہے۔ اسے قبول کر لو۔ واہگورو تمہاری رکشا کرے گا۔ صغراں میرے دوست خیر دین کی امانت ہے۔ اسے پاکستان والوں کے پاس پہنچا دینا۔ اگر اس کے رشتے دار وہاں مل جائیں تو ان کے پاس لے جانا۔ یہ نیک کام ہے پتر۔ واہگورو تمہیں ثواب دے گا۔"

ہم ٹیوب ویل میں آواز دے کر نیچے آئے تو صغراں نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ کونے میں گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ نہنگ سنگھ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار کیا اور کہا دھی رانی! میں تیرے ماما پتا کی جان نہ بچا سکا۔ واہگورو کے لئے مجھے معاف کر دینا۔ دنیا کی ہوا بدل گئی ہے ہر طرف بھائی بھائی کا خون بہا رہا ہے۔ واہگورو کی کرپا سے تمہاری جان بچ گئی ہے تمہاری عزت بچ گئی ہے۔ میں واہگورو سے ارداس کروں گا کہ وہ تمہیں خیر خیریت سے پاکستان پہنچا دے۔ بیٹی جب حالات ٹھیک ہو جائیں تو مجھے خط لکھ کر اپنی خیریت کی خبر ضرور دینا۔"

اس کے بعد نہنگ سنگھ نے مجھے کہا۔ "پتر عبد اللہ! میں اب آدھی رات کو آؤں گا اور تمہیں خود جرنیلی سڑک تک چھوڑنے تمہارے ساتھ جاؤں گا۔"

نہنگ سکھ نے ہم دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور واپس چل اگیا۔ جاتے ہوئے وہ اوپر ٹیوب ویل کے دروازے کو باہر سے تالا لگا گیا۔ اس نے ہمیں ایک بار پھر تاکید کی کہ اگرچہ ہم ہندووانہ کپڑوں میں ہیں لیکن ٹیوب ویل سے باہر کھیتوں میں نکلنے کا خطرہ مول نہ لیں اور ٹیوب ویل ہی میں چھپے رہیں۔ ٹیوب ویل کے اس تہہ خانے میں حبس تھا۔ اگرچہ زمین ٹھنڈی تھی۔ صغراں دیوار سے لگی خاموش سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے اس کے غم کو بانٹنے کے لئے کہا کہ میرے بھی کئی رشتے دار فسادات میں مارے گئے ہیں۔ اس نے دھیمی خشک آواز میں پوچھا کہ میری کوئی بہن تو اغواء نہیں ہوئی۔ میں نے اسے بتایا کہ

ہمارے کنبے کی دو لڑکیاں اغواء ہوئی ہیں۔ میرے اس جھوٹ نے خاصا کام کیا۔ صغراں مجھ سے میرے کنبے کی اغوا شدہ فرضی لڑکیوں کے بارے میں پوچھنے لگی۔

وہ تھوڑی تھوڑی بات کرنے لگی۔ میں نے اسے بہت حوصلہ دیا اور کہا کہ خدا نے چاہا تو میں اسے بچا کر پاکستان پہنچا دوں گا۔ اس نے بتایا کہ حسن ابدال میں اس کا ایک دور کا رشتہ دار رہتا ہے۔

"اس کا نام مہتاب دین ہے۔ باپو اس سے ملنے کبھی کبھی حسن ابدال جایا کرتے تھے۔ میں حسن ابدال کبھی نہیں گئی؟"

میں نے صغراں سے کہا فکر نہ کرو۔ انشاء اللہ میں تمہیں حسن ابدال پہنچا دوں گا۔"

وقت گزرتا گیا۔ دوپہر سے سہ پہر ہو گئی اور ٹیوب ویل کے بند دروازے سے آنے والی دن کی روشنی مدھم پڑنے لگی تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے اپنے ماضی۔ پانچ ہزار سال قدیم ماضی کے ایوانوں میں نکل گیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کہاں سے میں نے اپنا سفر شروع کیا اور کیسے کیسے انقلاب سے گزرتا' تاریخ کی خندقوں اور وقت کے صحراؤں کو عبور کرتا یہاں تک پہنچا ہوں کہ اچانک اوپر کچھ لوگوں کی سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔ صغراں سہم کر بولی۔ "وہ آ گئے ہیں مجھے بچاؤ۔"

میں اوپر دیکھ رہا تھا۔ کسی نے باہر سے دروازے کے تالے پر کوئی بھاری شے ماری۔ کھٹاک سے تالا ٹوٹ گیا پھر دروازہ دھڑاک سے کھلا اور کسی نے اوپر سے بندوق کا فائر کر دیا۔

صغراں روتی ہوئی میرے پیچھے آ گئی۔ میں نے ایک ثانئے میں حالات کا جائزہ لیا اور تیزی سے آہنی زینہ اوپر چڑھنے لگا۔ اوپر دروازے میں ایک سکھ بندوق میری طرف تانے کھڑا تھا۔

میں نے اوپر چڑھتے ہوئے بڑی عاجزی سے کہا۔ "سردار جی میں سیتا رام ہوں۔ ٹیوب ویل چلاتا ہوں۔"

سکھ غرایا۔ "کیہڑا سیتا رام اوئے؟ اس ٹیوب ویل کا مستری تو گاماں مسلا تھا اس کو میں نے خود قتل کر ڈالا تھا۔"

میں اس عرصے میں ٹیوب ویل سے باہر آ گیا تھا۔ باہر تین سکھ منہ پر ڈاٹھے چڑھائے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں۔ ایک سکھ تلوار لے کر آگے بڑھا۔

"اوئے کیسر سیاں تھلے کڑی ای۔ اونہوں کڈ باہر۔"

میں دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ میں نے ایک بار پھر منت کرتے ہوئے کہا۔ "نیچے میری

بہن گوبندی ہے ہم ہندو ہیں ہمیں کیوں مارتے ہو سردار جی؟"

تلوار والا سکھ بولا۔ "اوئے ایدا پاجامہ اتروا کر دیکھو' یہ ہندو ہے کہ مسلا۔"

اب معاملہ کلائی میکس پر پہنچ چکا تھا۔ میرا مسلمان ظاہر ہو جانا یقینی تھا مجھے صغراں کی فکر تھی۔ اس کی عزت اور جان خطرے میں تھی۔ دور دور کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہنگ سنگھ شاید اپنی کوٹھری میں آرام کر رہا تھا۔ اسے کوئی خبر نہیں تھی کہ یہاں حملہ ہو گیا ہے۔ دو سکھ میرا پاجامہ اتروانے کے لئے آگے بڑھے تو میں نے دل میں اپنی والدہ کا تصور جما کر قدیم مصری منتر پڑھا اور ایک سکھ کے بازو پر انگلی لگائی لیکن یہ دیکھ کر میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ وہ سکھ چھوٹا نہیں ہوا تھا منتر کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ منتر کا اثر شاید غائب ہو چکا تھا۔ منتر بے اثر ہو چکا تھا۔

اب مجھے اپنی غیر معمولی اور اصلی طاقت سے کام لینا تھا جو دو سکھ میرے کپڑے اتروانے آگے آئے تھے میں نے ان میں سے ایک سکھ کے منہ پر الٹے ہاتھ کا زناٹے دار تھپڑ جڑ دیا۔ وہ اس تھپڑ کی تاب بھلا کہاں لا سکتا تھا۔ اس کا جبڑا ٹوٹ کر ایک طرف کو لٹک گیا اور وہ پیچھے کو پچھاڑ کھا کر گرا۔ اس کی پگڑی کھل گئی۔ دوسرے سکھ نے مجھ پر تلوار ماری۔ پہلے والے سکھ نے بندوق تان کر مجھ پر فائر کر دیا۔ میں نے لپک کر اس کی بندوق زور سے کھینچی وہ مجھ سے ٹکرا گیا۔ میں نے بندوق ایک طرف پھینک کر اسے اٹھایا اور زمین سے بیس پچیس فٹ اوپر اچھال دیا۔ وہ بازو اور ٹانگیں چلاتا گرا اور وہیں پڑے پڑے مجھے ششدر ہو کر دیکھنے لگا۔ باقی دو سکھ بھی کچھ خائف ہو گئے۔ لیکن ایک سکھ نے نعرہ مار کر کہا۔ "سنتوکھ سیاں۔ اوئے لا دے۔ ایس نوں ایہہ مسلا اے۔"

انہوں نے مجھ پر تلواریں چلانی شروع کر دیں۔ لیکن جب میرے جسم پر کوئی زخم نہ لگا۔ خون کا ایک قطرہ بھی نہ بہا۔ بلکہ الٹا میں نے ان کی تلواریں چھین کر توڑ ڈالیں تو وہ بھونچکے ہو کر رہ گئے۔

میں نے دونوں سکھوں کو گردن سے دبوچ کر آپس میں ٹکرایا تو ان کے ہوش گم ہو گئے۔ چکرا کر زمین پر گر پڑے۔ جس سکھ کا جبڑا ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بے ہوش پڑا تھا۔ بندوق والے سکھ کی ٹانگ کی ہی ٹوٹ چکی تھی۔ وہ بھی زمین پر پڑا تھا۔ باقی دو سکھ ہاتھ باندھ کر میرے سامنے بیٹھ گئے۔ "مہاراج شما کر دیں۔ آپ بھگوان کے اوتار ہیں۔"

میں نے بندوق ان کی طرف پھینکی اور کہا۔ "اپنے دونوں ساتھیوں کو اٹھاؤ۔ تلواریں اور یہ بندوق کھیتوں میں پھینک کر یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اگر تم نے اب کسی مسلمان

کی گردنیں اتار دں گا۔ بھاگو یہاں سے۔ میں تمہاری جان بخشی کرتا ہوں۔"

بیسویں صدی میں میری غیر معمولی طاقت کا مظاہرہ انہیں ششدر کرنے کے لئے بہت تھا۔ طلسم' کرشمہ سازیوں اور کرامتوں کا دور شاید گزر چکا تھا۔ وہ اس قدر خائف تھے کہ انہوں نے ساتھیوں کو اٹھا کر کاندھوں پر ڈالا۔ بندوق اور تلواریں دور کھیتوں میں پھینکیں اور سر جھکا کر مجھے نمسکار کرتے وہاں سے چلے گئے۔

اب مجھے صغراں کا خیال آیا۔ میں نے ٹیوب ویل کے دروازے میں سے نیچے جھانک کر کہا۔ "صغراں گھبراؤ مت۔ سب ٹھیک ہے میں نے غنڈوں کو بھگا دیا ہے۔"

اتنے میں مجھے دور گاؤں کے کچے مکانوں کی طرف سے نہنگ سنگھ نظر آیا۔ وہ کچھ پریشان تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ "میں نے تھوڑی دیر ہوئی فائر کی آواز سنی تھی۔ کیا یہاں کسی نے گولی چلائی تھی؟"

میں نے جواب دیا "کچھ سکھ غنڈے آئے تھے۔ انہوں نے تالا توڑ کر فائر کیا۔ میں نے باہر نکل کر جب انہیں بتایا کہ میں ہندو ہوں اور ٹیوب ویل کا مستری ہوں تو وہ چلے گئے۔"

نہنگ سکھ نے ہاتھ آسمان کی طرف جوڑ کر کہا۔ "واہگورو نے بڑی کرپا کی ہے۔ اگر تم ہندووانہ کپڑوں میں نہ ہوتے تو انہوں نے تمہیں نہیں چھوڑنا تھا۔ اب تم نیچے جا کر چھپ جاؤ۔ میں باہر نیا تالا لگائے دیتا ہوں۔ بیٹی صغراں تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں سردار جی! بالکل ٹھیک ہے۔"

میں ٹیوب ویل میں اتر گیا۔ اور نہنگ سنگھ تالا لینے واپس چلا گیا۔ اپنے مکان سے وہ نیا تالا لایا۔ اوپر سے آواز دے کر کہا کہ نیا تالا لگا دیا ہے اور پھر تالا لگا کر چلا گیا اور جاتے ہوئے بتا گیا کہ وہ آدھی رات کو آئے گا۔ میرے پاس اس کے دیئے ہوئے چاندی کے بیس روپے موجود تھے۔ صغراں گھبرائی ہوئی تھی کہ سکھ پھر حملہ کرنے آئیں گے۔ اسے یہ فکر بھی تھی کہ پاکستان کی سرحد تک پہنچتے پہنچتے کہیں اسے اغوا نہ کر لیا جائے۔ "مجھے سکھ قتل نہ کر ڈالیں۔" میں نے کہا۔ "اری بی بی بہن! میں ہندوؤں کے لباس میں ہوں تم نے ہندواستریوں ایسی ساڑھی پہن رکھی ہے' ہم پر کوئی شک نہیں کرے گا۔ تم کیوں فکر کر رہی ہو۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

رات ہو گئی ہم نے باقی بچی ہوئی تھوڑی سی روٹی کھا لی۔ آدھی رات ہو چکی تھی کہ نہنگ سنگھ آ گیا۔ وہ ہمارے لئے ایک پوٹلی لایا تھا۔ جس میں گڑ اور چار روٹیاں تھیں۔ گڑوی میں پانی بھی تھا۔

میں نے صغراں کو پانی پلایا۔ ننگ سکھ کہنے لگا۔ پتر عبد اللہ! یہ دھی رانی میرے دوست کی امانت ہے۔ دیکھنا اسے اس کے رشتے داروں کے پاس پہنچا دینا کہیں مجھے مرنے کے بعد' واہگرو کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ میں خیردین کو منہ نہ دکھا سکوں گا۔"

میں نے ننگ سنگھ کو پوری پوری تسلی دی اور کہا کہ صغراں کو ہر حالت میں اپنی جان پر کھیل کر بھی پاکستان اس کے رشتے داروں کے پاس پہنچا دوں گا۔ ننگ سکھ نے صغراں کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا ننگ سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے وہ بولا۔ "اب تم لوگ اپنے سفر پر روانہ ہو جاؤ۔ یاد رکھو۔ یہاں چھ سات کھیت چھوڑ کر جرنیلی سڑک آ جائے گی یہ سڑک سیدھی امرتسراور آگے پاکستان کی سرحد واہگہ تک جاتی ہے۔"

وہ ہمیں چھوڑنے کھیت کے دوسرے کنارے تک آیا۔ یہاں سے میں نے اسے واپس بھیج دیا۔ جاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر صغراں کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس سے معافی مانگی کہ وہ اس کے ماں باپ کی حفاظت نہیں کر سکا۔" صغراں رونے لگی۔

ننگ سکھ سے رخصت ہو کر میں نے صغراں کو ساتھ لیا اور کھیتوں میں سے گزرتا جرنیلی سڑک کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ بات میرے لئے ضرور پریشان کن تھی کہ میری والدہ کی روح کا بتایا ہوا قدیم مصری منتر بے اثر ہو گیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟ مجھے معلوم نہیں تھا۔ میری جیب میں چاندی کے بیس روپے پڑے تھے۔ میں نے ایک بار پھر مصری منتر کو آزمانے کی کوشش کی۔

جیب کے اندر ہاتھ ڈال کر چاندی کا روپیہ اپنی مٹھی میں دبایا۔ دل میں والدہ کا تصور جمایا اور دل ہی دل میں مصری منتر پڑھ کر چاندی کے روپے پر انگلی رکھ دی۔ امید یہ تھی کہ روپیہ چھوٹا ہو جائے گا لیکن اس بار بھی منتر نے اثر نہ دکھایا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کسی وجہ سے منتر کا اثر زائل ہو چکا ہے۔ اب اسے آزمانے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور مجھے اپنی مافوق الفطرت طاقت اور خدا کے بھروسے پر ہی صغراں کو آگ اور خون کے سمندر سے نکال کر پاکستان پہنچانا ہو گا۔

رات خنک تھی۔ فضا میں جلی ہوئی چیزوں کی بو رچی ہوئی تھی۔ آدھی رات کو ہمارا اس طرح کھیتوں میں سے گزرنا ویسے ہی مشکوک سمجھا جا سکتا تھا۔ ننگ سکھ نے اتنا مجھے یقین دلا دیا تھا کہ راستے میں کوئی مسلمان گاؤں ایسا نہیں ہے کہ جہاں کے مسلمان مجھے ہندو سمجھ کر مجھ پر حملہ کر دیں' بے چارے مسلمانوں پر تو پنجاب میں قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ انہیں اپنی جانیں بچانی مشکل ہو رہی ہیں۔"

صغراں میرے ساتھ لگی سہمی سہمی چل رہی تھی۔ وہ کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر کی باتوں سے اس کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔ مگر وہ خاموش تھی کسی ردعمل کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔ اصل میں وہ بے حد خوف زدہ تھی۔ اس نے اپنے سارے کنبے کو سکھوں کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا تھا۔ اس پر موت کی دہشت طاری تھی۔ یہ ایک بے بسی کی موت تھی۔ کہ آدمی دشمن کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

زرد سا نامکمل چاند مشرق کی طرف اندھیرے کھیتوں کے اوپر آ کر فضا میں اپنی افسردہ سی پھیکی پھیکی زردشنی بکھیرنے لگا۔ دور بتیاں دکھائی دیں۔ یہ بتیاں درختوں کے بیچ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر روشن تھیں۔ میں نے صغراں سے ان بتیوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ جرنیلی سڑک کی روشنی ہے۔

جرنیلی سڑک پر موت ایسا سناٹا چھایا تھا۔ ہم سڑک سے ہٹ کر درختوں کے درمیان جو کچا راستہ تھا۔ اس پر چلنے لگے۔ ہمارے پیچھے سڑک پر روشنی آنے لگی۔ پھر گھر گھر کی زبردست آواز سنائی دی۔ ایسی آواز میں نے جلیانوالہ باغ میں اس وقت سنی تھی۔ جب چار پہیوں والی گاڑی پر چار مشین گنیں باغ کے دروازے میں لائی گئی تھیں۔

صغراں جلدی سے میرے پیچھے ہو گئی۔

خاکی رنگ کی ایک اونچی لمبی گاڑی شور مچاتی دھڑ دھڑاتی سڑک پر سے گزر گئی۔ میں صغراں سے پوچھ بیٹھا کہ یہ کیا تھا؟ اس نے پہلے تو عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر بولی۔ "کیا تم نے اسے پہلے نہیں دیکھا؟ یہ فوجی ٹرک تھا۔"

مجھے فوراً" ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے کہا۔ "اصل میں مجھے اندھیرے میں پتہ نہیں چل سکا کہ یہ فوجی ٹرک تھا۔"

اب مجھے یاد آیا کہ میرے میزبان نیک دل سکھ نے کہا تھا کہ اگر راستے میں کوئی پاکستانی فوجی ٹرک ملا تو اس میں بیٹھ جانا۔ میں نے صغراں سے پوچھا کہ یہ پاکستانی ٹرک تھا۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ میں خاموشی سے بہت کچھ سوچتا اس کے ساتھ چلتا رہا۔

کچھ دور چلنے کے بعد ہماری بائیں جانب ایک قصبہ آ گیا۔ اندھیرے میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ سڑک پر کچھ کھوکھے الٹے پڑے تھے۔ صغراں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا کہ یہ کرتار پورے کا قصبہ ہے۔ یہاں سے جلدی نکل چلو یہاں کے سارے مسلمان مار دیئے گئے ہیں۔ جرنیلی سڑک پر کچھ دکانیں ٹوٹی پڑی تھیں۔ ہم تیز تیز وہاں سے گزر گئے۔ ایک جلی ہوئی دکان کے آگے دو انسانی لاشیں پڑی دیکھیں۔ ظاہر ہے یہ مسلمانوں کی لاشیں تھیں۔ فضا میں مجھے جلے ہوئے چیتھڑوں اور انسانی خون کی بو محسوس ہوئی۔ آگے مجھے

گاؤں تھا۔ صغراں تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد وہ پھر میرے ساتھ روانہ ہوئی۔

پو پھٹ رہی تھی کہ ہم مجیٹھہ گاؤں کے باہر پہنچ گئے۔ اس گاؤں کی نشان دہی صغراں نے کی۔ کھیتوں میں ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ ہم نے یہاں منہ ہاتھ دھویا۔ اسی جگہ درختوں کی آڑ میں بیٹھ کر دن نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔ جرنیلی سڑک پر کبھی کبھی کوئی ٹرک گزر جاتا تھا۔ میں کسی ٹرک کو رکوانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا کیونکہ یہ ٹرک اگر ہندو فوجیوں کا ہوا تو انہیں ہم پر شک ہو سکتا تھا کہ ہم پچھلی رات کے اندھیرے میں یہاں کیا کر رہے ہیں۔

دن کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔ مجیٹھہ گاؤں زیادہ بڑا نہیں تھا کچے پکے کوٹھے تھے۔ باہر ایک کھال تھی۔ کھیتوں پر ویرانی برس رہی تھی۔ امرتسر یہاں سے چند کوس کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں کی طرف سے دو تین سکھ نکل کر کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ جرنیلی سڑک پر گاؤں کے بالمقابل ذرا پیچھے ہٹ کر ایک چھوٹا سا مندر نظر آیا تو میں صغراں کو لے کر ادھر چلا گیا۔

مندر ہنومان جی کا تھا۔ مندر کیا تھا بس ایک کوٹھڑی تھی جس پر گرواجھنڈا لگا تھا۔ ایک پروہت باہر چبوترے پر بیٹھا منہ دھو رہا تھا۔ میں نے جا کر پرنام کیا تو وہ کلی کر کے بولا۔ "مہاراج اس گاؤں کے نہیں لگتے ہو۔"

میں نے بالکل ہندوؤں ایسے لہجے میں اسے بتایا کہ میں اپنی پتنی کو لے کر امرتسر جا رہا ہوں۔ ساتھ والے گاؤں سے آیا ہوں سواری نہیں مل رہی۔"

وہ حیران ہو کر بولا۔ "مہاراج چاروں پاسے آگ لگی ہے۔ تم کو امرتسر جانے کی یہ کیا سوجھی؟"

میں نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ میرا سسر امرتسر میں مر گیا ہے۔ ہمارا اس کے انتم سنسکار میں پہنچنا بہت ضروری تھا۔ وہ رام رام کرتا اٹھا اور ہمیں مندر میں لے گیا۔ میں نے ہنومان جی کی مورتی کے آگے چاندی کے پانچ روپے رکھ دیئے پروہت بڑا خوش ہوا۔ اس نے ہمیں مٹی کے کٹورے میں سے دہی نکال کر کھانے کو دیا۔ کہنے لگا۔ "پیچھے جالندھر کپور تھلہ سے مسلمانوں کے قافلے آ رہے ہیں۔ ان سے دور رہنا۔ کیونکہ امرتسر کے قریب ان پر حملہ ضرور ہوتا ہے۔ پہلے ایک قافلہ گیا تھا۔ سنا ہے وہ سارے کا سارا سکھوں نے کاٹ ڈالا۔ کوئی یکہ بھی نہیں جاتا آج کل۔ تمہیں پیدل ہی جانا پڑے گا مہاراج۔"

پھر اس نے بتایا کہ مجیٹھہ میں جتنے مسلمان گھر تھے سب کو آگ لگا دی گئی اور ایک بھی مسلمان زندہ نہیں بچا۔

"مہاراج! انہوں نے پاکستان کیوں بنایا ہے بھارت ماتا کے دو ٹکڑے کیوں کیئے ہیں۔ اب اس کا مزہ چکھیں بھارت ماتا ان سے بدلہ لے رہی ہے مہاراج! رام رام رام۔"

امرتسر کی طرف سے چھ سات نیزہ بردار سکھ اکالی گھڑ سوار نمودار ہوئے۔ ان کا سردار آگے آگے کالی گھوڑی پر سوار تھا۔ سڑک پر مندر کے قریب آ کر اس نے پروہت سے بلند آواز میں پوچھا۔ "اوئے پجاریا۔ ایدھر مسلیاں دا قافلہ تے نہیں آیا؟"

پروہت ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ "مہاراج ابھی نہیں گزرا ادھر سے سنا ہے کپور تھلہ سے چل پڑا ہے؟"

اکالی سردار نے بھڑک ماری۔ پھر سب نے ست سری اکال کا نعرہ لگایا اور گھوڑے دوڑاتے آگے کی طرف چل پڑے۔ پروہت کہنے لگا۔ "مسلمانوں کا یہ قافلہ بھی کٹ جائے گا۔ بھارت ماتا اپنا ٹکڑا الگ کرنے کا پورا پورا بدلہ لے گی۔ پہلے بھی اکالی سکھوں کا ایک جتھہ ادھر کو گیا ہے۔"

صغراں بے چاری میرے پاس سہمی بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ میں نے ہندو پروہت کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور صغراں کو لے کر آگے روانہ ہوا۔ صغراں قدم قدم پر ڈر رہی تھی۔ مگر وہ سکھوں کا ظلم و ستم دیکھ چکی تھی۔ اگرچہ وہ ساڑھی میں لپٹی تھی لیکن اسے اندیشہ تھا کہ کسی بھی وقت بھید کھل سکتا ہے۔

سڑک کنارے ایک چھوٹا سا چند ایک کچے مکانوں پر مشتمل گاؤں آیا۔ وہاں ایک کچی مسجد تھی۔ گاؤں کے مکانوں کے اندر اور باہر مسلمانوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ان میں بچے اور بوڑھے بھی تھے۔ عورتوں کی لاشیں بھی تھیں۔ صغراں تو رونے لگی۔ میں اسے گاؤں سے باہر نکال کر لے جا رہا تھا کہ ٹرک کی آواز آئی۔ ہم جلدی سے مسجد کی دیوار کے پیچھے ہو گئے۔ ٹرک گاؤں کے مکانوں کے پیچھے رک گیا۔ مجھے یہ ٹرک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

پھر کسی نے بلند آواز میں پنجابی زبان میں آواز دی کوئی مسلمان بچا ہو تو باہر آ جائے۔

میں نے صغراں سے کہا کہ یہ مسلمان فوجی لگتے ہیں صغراں مجھے سامنے جانے سے منع کرتی رہی۔ لیکن میں مسجد کی دیوار سے نکل کر اس طرف آ گیا۔ جہاں ایک فوجی ٹرک کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے ایک مشین گن لگی تھی۔ کچھ مسلمان عورتیں اور بوڑھے پہلے ہی

وہاں سمٹ سمٹا کر بیٹھے تھے۔ دو فوجی جوان ٹرک کے پاس کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک فوجی کی تیوری چڑھ گئی' تم ہندو ہو؟"

میں نے فوراً" کلمہ پڑھا اور کہا میں مسلمان ہوں ہندوؤں کا بھیس بدلا ہوا ہے۔ فوجی جوانوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پر ایک فوجی مجھے ایک درخت کے پیچھے لے گیا۔ اس نے میرا ڈاکٹری معائنہ کیا اور حیران ہو کر بولا۔ "تم اس آگ اور خون کے سمندر میں یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

میں نے اسے صغراں کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اس نے فوراً" صغراں کو مسجد کے پیچھے سے نکالا اور اس کو تسلی دی پھر پوچھا کہ گاؤں میں کوئی مسلمان بچا بھی ہے کہ نہیں۔ میں نے کہا۔

"ہر طرف لاشیں ہی لاشیں بچھی ہیں یہاں تو۔"

مسلمان فوجی جوان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے مجھے اور صغراں کو ٹرک میں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ بٹھا لیا اور ٹرک امرتسر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹرک میں بیٹھے ہوئے مسلمان مرد اور عورتیں ہمیں عجیب نظروں سے تکنے لگے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہم بہن بھائی ہیں۔ سارا خاندان شہید ہو گیا ہے ہم کافروں کا بھیس بدل کر نکل کھڑے ہوئے تھے خدا کا شکر ہے کہ اپنے بھائیوں کا ٹرک مل گیا۔

یہ بلوچ رجمنٹ کا فوجی ٹرک تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ۱۹۴۷ء کے مسلم کش ہولناک فسادات میں بلوچ رجمنٹ نے مسلمانوں کو بچانے میں ناقابل فراموش خدمات سر انجام دی تھیں۔ یہ ٹرک امرتسر شہر سے باہر جرنیلی سڑک کے پار والے مشہور محلے شریف پورے میں داخل ہو گیا۔ اس علاقے کو مسلمان مہاجرین کا کیمپ قرار دے دیا گیا تھا اور یہاں بلوچ رجمنٹ کے جوان مورچے سنبھالے ہوئے تھے۔ یہاں فوری طور پر ہمیں کیمپ انچارج کے حوالے کر دیا گیا۔ یہاں ہم نے ہندووانہ لباس اتار کر شلوار قمیض پہنی مسلمان کیمپ میں پہنچ کر صغراں کا خوف کافی حد تک دور ہو گیا تھا۔

یہاں سے مسلمان مہاجرین ریل اور ٹرکوں کے ذریعے پاکستان کی طرف روانہ ہونا شروع ہو گئے۔ ٹرک لاہور سے مسلم لیگ والے بھیج رہے تھے۔ ریل گاڑی کے خالی ڈبے ریلوے لائن پر آ کر کھڑے ہو جاتے۔ لوگ ہجوم کی شکل میں ان پر ٹوٹ پڑتے۔ بلوچ رجمنٹ کے جوان ان کے ساتھ ہو لیتے اور انہیں پاکستان پہنچا کر پھر واپس آ جاتے۔

آخری ہماری باری بھی آ گئی۔ ہمیں مسلم لیگ کے بھیجے ہوئے چودہ ٹرکوں میں سے ایک ٹرک میں جگہ مل گئی۔ رات کو یہ ٹرک آئے تھے۔ صبح سورج نکلتے ہی پاکستان کی طرف

چل پڑے۔ اگلے اور پچھلے ٹرک کے اوپر بلوچ رجمنٹ کے چار جوان مشین گنیں لئے چاق و چوبند بیٹھے تھے۔

ٹرک پہلے تو آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ جب ریلوے سٹیشن سے آگے نکل آئے تو ان کی رفتار تیز ہو گئی۔ یہاں سکھوں کا ایک بہت بڑا گردوارہ آیا۔ جھاڑیوں میں جگہ جگہ پٹھانوں کی لاشیں دیکھیں۔ مسلمان مہاجرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ایک آدمی نے رندھی ہوئی آواز میں کلمہ شریف پڑھ کر بتایا کہ یہ پٹھان پیدل اپنا اسباب لے کر پاکستان جا رہے تھے۔ ہم نے انہیں بہت روکا کہ آگے خطرہ ہے اکیلے مت جاؤ۔ قافلے کے ساتھ چلے جانا۔ لیکن اجل انہیں ہم سے جدا کر کے لے گئی۔

ہمارے ٹرک کے تمام مسلمانوں نے دبی دبی آواز میں فاتحہ پڑھی۔ ٹرک آگے بڑھتے چلے گئے۔ راستے میں ایک اور گاؤں آیا۔ یہاں بھی سڑک کے کنارے کٹی ہوئی لاشیں پڑی ملیں۔ ہمارے ٹرک میں بیٹھے سہمے ہوئے لوگوں نے کہا کہ یہ بھی مسلمانوں کی لاشیں ہیں۔ یہ ظلم' یہ قتل عام کیوں ہو رہا ہے؟ مجھے صرف اتنا ہی علم ہو سکا کہ مسلمانوں نے اکثریتی علاقے میں اپنا الگ وطن پاکستان بنا لیا تھا جہاں وہ اپنے دین اسلام پر کاربند رہتے ہوئے آزادی اور خودمختاری سے زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ یہ ان کا حق تھا۔ لیکن ہندوؤں اور سکھوں نے ہندوستان میں ان کا قتل عام شروع کر دیا اور وہ نقل آبادی کر کے ہندوستان خاص طور پر مشرقی پنجاب سے پاکستان روانہ ہو گئے۔ راستے میں ان لٹے پٹے قافلوں پر جگہ جگہ حملے ہوئے۔ لاکھوں مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا آ رہا تھا۔

ٹرک پاکستان کی سرزمین میں داخل ہوئے تو پوری فضا اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ یہاں سرحد پر ایک طرف درخت پر پاکستان کا ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔ مسلم لیگ کے رضاکاروں نے مہاجرین کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہمیں ایک جگہ عارضی کیمپ میں پہنچایا گیا۔ صغراں کے چہرے پر ایک عجیب نورانی چمک سی آ گئی تھی۔ یہاں ہمیں کھانا کھلایا گیا۔ ڈاکٹر ٹیکے لگا رہے تھے۔ کیونکہ ہیضے کی وبا پھیلی ہوئی تھی صغراں کو بھی ٹیکہ لگایا گیا۔

میں پہلی بار کسی ڈاکٹر کو انجکشن لگاتے دیکھ رہا تھا۔ اگر میں سویا ہوتا یعنی بے خبر ہوتا تو ڈاکٹر میرے بازو میں کبھی سوئی نہیں چبھو سکتا تھا۔ کیونکہ اس وقت میرا جسم پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتا۔ لیکن مرگ انبوہ میں میں بھی شامل ہو گیا۔ میں نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر نے میرے بازو میں انجکشن لگا دیا۔ وہ اس بات پر تھوڑا سا متعجب ضرور ہوا

کہ جہاں سوئی لگی تھی وہاں سے خون کا ننھا سا قطرہ بھی نہیں نکلا تھا۔

شام کو ہمیں لاہور شہر پہنچا دیا گیا۔ یہ اگست ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ کٹی ہوئی ریل گاڑیاں اور لٹے پٹے خون آلود قافلے چلے آ رہے تھے۔ ایک انتشار اور افراتفری کا عالم تھا۔ اس کے باوجود مجھے لوگوں کے چہروں پر ایک سکون اور مسرت کا تاثر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پاکستان کے قیام پر بے حد خوش تھے۔ گھروں' عمارتوں اور مسجدوں پر پاکستان کے جھنڈے لہرا رہے تھے وہ رات ہم نے ریلوے سٹیشن پر بسر کی۔ میں ریلوے سٹیشن اور شنٹ کرتے انجنوں اور چلتے پنکھوں کو دلچسپ حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ سائنس نے بہت ترقی کر لی تھی۔ بجلی تو لوگوں کے گھر گھر پہنچ گئی تھی۔ میں نے پہلی بار چائے کی کینٹین پر لگا ریڈیو سنا تو اسے دیکھتا اور سنتا ہی رہ گیا۔ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے جدید عہد میں داخل ہو چکا تھا۔

صبح صبح ہمیں حسن ابدال جانے والی گاڑی مل گئی۔ سب مہاجر ٹرینیں تھیں۔ کوئی ٹکٹ نہیں خریدتا تھا۔ مہاجرین کو لے کر ریل گاڑیاں پشاور اور پنڈی کی طرف چل رہی تھیں۔ میں نے ۱۹۴۷ء کا حسن ابدال مجھے اس طرح یاد رہ گیا کہ وہاں گلاب کے سرخ پھول اور ہری ہری جھاڑیوں میں بہتے شفاف پانی کے چشمے بہت دیکھے۔ صغراں کو کافی تلاش کے بعد اس کے رشتے دار مہتاب دین کے گھر پہنچایا۔ صغراں کو دیکھ کر وہ لوگ بے حد خوش ہوئے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ باقی سب گھر والے شہید ہو گئے ہیں تو وہاں کہرام مچ گیا۔

بہرحال میں نے نیک دل سکھ ننگ سنگھ کی امانت کو اس کے رشتے داروں کے حوالے کیا اور ایک دن وہاں بسر کرنے کے بعد شام کی ٹرین پر سوار ہو کر راولپنڈی چلا گیا۔ یہاں سے ہندو اور سکھوں کے آخری قافلے مشرقی پنجاب کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یہاں سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک قابل تعریف تھا۔ غیر مسلم نقل وطن کرتے ہوئے گدھوں اور ریڑھوں پر اپنا سارا سامان لاد کر لے جا رہے تھے۔

ایک دن راولپنڈی میں آوارہ گردی کرتا رہا پھر ریلوے اسٹیشن پر آ گیا۔ خیال تھا کہ لاہور واپس چلا جاؤں۔ اس شہر میں مجھے تاریخی فضا ملتی تھی۔ ریل گاڑی بھری ہوئی چل رہی تھی۔ بڑی مشکل سے ایک ریل گاڑی کی چھت پر مجھے بھی تھوڑی سی جگہ مل گئی۔ ہزاروں لوگ گاڑی کی چھت پر بیٹھے تھے۔ انجن نے سیٹی بجائی اور چھک چھک کرتا چل پڑا۔

جہلم پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ یہ وہی شہر تھا جہاں کے راجہ پورس نے سکندر اعظم کا مقابلہ کیا تھا۔ میں اس عہد میں بھی اس علاقے سے گزرا تھا۔ اڑھائی ہزار برس میں زمین

آسمان کا فرق پڑ چکا تھا۔ دریا بھی اپنی اصلی جگہ سے بہت پیچھے ہٹ گیا تھا۔ میں ابھی تک ریل گاڑی کی چھت پر ہی بیٹھا تھا۔ گاڑی جہلم سے چلی تو آگے کئی اسٹیشن آئے۔ میں ان کے نام پہلی بار پڑھ رہا تھا۔ پھر ایک گندا سا ریلوے اسٹیشن آیا۔ معلوم ہوا کہ یہ گوجرانوالہ شہر کا ریلوے اسٹیشن ہے۔ یہاں سے گاڑی آگے بڑھی تو رات کافی گزر چکی تھی۔ ایک دو چھوٹے چھوٹے اسٹیشن گزرے تو ٹرین کی رفتار دھیمی ہو گئی۔ ٹرین ایک مضافاتی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم میں آہستہ آہستہ داخل ہوئی۔ پلیٹ فارم پر سے پولیس والوں کی آوازیں آنے لگیں۔ "اوئے کھڑکیاں بند کرو۔ کھڑکیاں بند کرو۔"

میں دوسرے مسافروں کے ساتھ چھت پر بیٹھا تھا۔ نیچے ڈبے کی کھڑکیاں گرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ٹرین رک گئی۔ اب جو میں نے پلیٹ فارم پر نگاہ ڈالی تو جگہ جگہ لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں شدید زخمی بھی تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک آدمی نے اٹھ کر تھوڑی دور چلنے کی کوشش کی۔ لیکن فوراً ہی اوندھے منہ گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔ معلوم ہوا کہ یہ ہندو سکھ معاجرین کی ریل گاڑی تھی جو پنڈی سے آ رہی تھی اور یہاں اس پر حملہ ہو گیا۔ دونوں طرف یہ کام غنڈہ عناصر ہی کر رہے تھے۔

پلیٹ فارم کے دوسری طرف ایک مال گاڑی کھڑی تھی۔ یہ بھی مہاجر ٹرین تھی۔ ٹرین کے قریب ریلوے لائن پر بھی لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ جہاں ہمارا ڈبہ رکا تھا وہاں سے کٹی ہوئی مال گاڑی کا انجن صاف نظر آ رہا تھا۔ انجن ڈرائیور اور فائر مین باہر جھانک رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہماری گاڑی کو یہاں کس لئے روکا گیا تھا۔ دو آدمی ایک ہندو عورت کو مال گاڑی کے ڈبے میں سے نکال کر انجن کی طرف کھینچے لئے جا رہے تھے۔ عورت دائیں بائیں سر مار رہی تھی۔ اس کے منہ سے کسی قسم کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

یہ منظر مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے ریل کی چھت سے پلیٹ فارم پر چھلانگ لگا دی۔ ایک پولیس والا میری طرف دوڑا۔ "اوئے کدھر جا رہے ہو تم؟"

میں اس بد نصیب عورت کو ظالموں کے چنگل سے چھڑانا چاہتا تھا۔ پولیس کا سپاہی میرے پیچھے بھاگا۔ عورت کو اغوا کرنے والے غنڈوں نے میری طرف دیکھا۔ میرے پیچھے سپاہی نے ہوا میں فائر کر دیا۔ کیونکہ اس کی گولی مجھے نہیں لگی تھی۔ میں نے غنڈوں کو للکارا کہ وہ عورت کو چھوڑ دیں۔ ان بدبختوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اس عورت کے سینے میں خنجر اتار دیا اور خود مال گاڑی کے نیچے سے ہو کر دوسری طرف فرار ہو گئے۔ پولیس کا سپاہی مجھے پکڑنے کے لئے دوڑا۔ میں مال گاڑی کے ڈبے کے نیچے گھس گیا۔ اور پھر دوسری

طرف نکل گیا۔ غنڈے دور کھیتوں میں بھاگے جا رہے تھے میں ان کے پیچھے دوڑا۔ پولیس والا وہیں سے واپس ہو گیا۔ یہ جوار کے کھیت تھے۔ غنڈے اس علاقے ہی کے رہنے والے تھے۔ راستوں کے تمام نشیب و فراز سے واقف تھے خدا جانے وہ مجھے کوئی فوج یا پولیس کا افسر سمجھ بیٹھے تھے کہ ایسے غائب ہوئے کہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیئے۔

میں کٹی ہوئی ریل گاڑی سے کافی دور کھیتوں میں نکل آیا۔ ادھر گولیاں چلنے لگیں۔ پھر وہ گاڑی بھی چل پڑی جس پر بیٹھ کر میں اس ریلوے اسٹیشن تک آیا تھا۔ فائرنگ ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ مال گاڑی کے نیچے چھپے لوگوں کو گولیاں مار کر ہلاک کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح مشرقی پنجاب میں بھی مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا۔ میرا دل اداس ہو گیا۔ انسان انسان پر یہ ظلم کیوں کر رہا تھا؟

تاریخ کے تاریک ایوانوں میں سے گزرتے ہوئے میں نے ہر دور میں انسان کو انسان پر ظلم کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ ظلم جاری تھا۔ اس ظلم کا انجام کیا ہو گا؟ کہاں جا کر یہ ظلم و ستم کا قافلہ ٹھہرے گا؟ کب انسان ایک دوسرے سے محبت اور پیار کرنا سیکھے گا؟ اس کا علم کسی کو نہیں تھا۔ اس خون آشام بربریت کا جواب میرے پاس بھی نہیں تھا۔

میں کھیتوں سے نکل کر ایک چھوٹی سی کچی سڑک پر آ گیا۔ دور اونچی جگہ پر رات کے اندھیرے میں مکانوں کے ہیولے ابھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ یہ کوئی بڑا قصبہ تھا۔ میں قصداً یہاں اس مشہور قصبے کا نام نہیں لکھ رہا۔ آدھی رات کے بعد کا کرب انگیز سناٹا چاروں طرف کھیتوں میں چھایا ہوا تھا۔ میرا دل واپس ریلوے سٹین پر جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ جہاں میں نے بہیمانہ انسانیت سوز مناظر دیکھے تھے۔ سوچا یہ قصبہ جو کوئی بھی ہے۔ یہیں چلنا چاہئے پھر دیکھیں گے کہ آگے کیا انقلاب آتا ہے۔ کس عہد میں ابھرتا ہوں پانچ ہزار سال سے تاریخ کی منازل طے کر رہا تھا۔ قیاس یہی تھا کہ اگر میں بیسویں صدی عیسوی میں پہنچا ہوں تو اس کے آگے کا بھی کوئی زمانہ ہو گا یعنی ۲۱ ویں صدی ۲۲۰ ویں صدی۔

جس کچے راستے پر میں چل رہا تھا۔ یہ تھوڑا سا خم کھا کر قصبے کی سیدھ میں ہو گیا۔ دونوں جانب کھیت تھے جہاں اندھیرا تھا۔ یہ قصبہ پرانا تھا۔ اندھیرے میں مجھے اس کی فصیل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر اس کا ایک محرابی دروازہ بھی نظر آیا۔

میں نہر کی ایک چھوٹی سی پلیا پر سے گزر رہا تھا۔ کہ بائیں جانب سے کسی عورت کی دبی دبی چیخ کی آواز آئی۔ میں وہیں رک گیا بائیں طرف امرودوں کا باغ تھا۔ اس کے کنارے پرانی وضع کی ایک کوٹھی بنی ہوئی تھی۔ کوٹھی میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ آواز اسی کوٹھی میں سے آئی تھی۔

میرے قدم اپنے آپ اس کوٹھی کی طرف اٹھ گئے۔

آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے امرود کے درختوں تلے سوکھے پتے گرے ہوئے تھے۔ میں ان سوکھے پتوں پر احتیاط سے چل رہا تھا کہ آواز پیدا نہ ہو۔ پرانی وضع کی باہر کو نکلی ہوئی گیلریوں اور برآمدے والی اس کوٹھی کے گرد ایک چکر لگایا۔ عورت کی دبی ہوئی چیخ کی آواز کے بعد موت ایسی خاموشی چھا گئی تھی۔ میں بھی برآمدے کے قریب سے ہو کر گزر رہا تھا کہ مجھے کھسر پسر کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ دو تین آدمیوں کی آوازیں تھیں۔

میرے قدم وہیں رک گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ پھر اسی عورت کے رونے کی آواز آئی۔ یہ بڑی درد انگیز' دہشت زدہ اور کمزور آواز تھی۔ میں برآمدے میں آ گیا۔ آواز پہلو والے گول کمرے سے آ رہی تھی۔ پھر جیسے عورت کو کسی نے طمانچہ مارا۔ عورت کی آواز وہیں بند ہو گئی۔ میں گول کمرے کے دروازے کے پاس آ کر رک گیا۔ کسی مرد نے دوسرے کو جھنجھلا کر کہا۔ "اوئے منہ کیا دیکھ رہے ہو اس کا۔" میں نے دروازے کو آہستہ سے اندر کی جانب دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میرے دھکیلنے سے پرانا دروازہ تھوڑا سا چرچرایا۔ اندر خاموشی چھا گئی۔ کسی کے قدموں کی چاپ دروازے کے قریب آتی سنائی دی۔ میں ایک طرف اندھیرے میں ہٹ گیا۔

کسی مرد نے اندر سے آواز دی۔ "کون اے اوئے؟"

آواز کا لہجہ بتا رہا تھا کہ یہ غنڈہ لوگ ہیں اور انہوں نے کسی بد نصیب عورت کو اغوا کر رکھا ہے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک لمحے کے لئے پھر سناٹا چھا گیا اب میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

اندر گھبرائی ہوئی کھسر پھسر کی آواز آئی اور ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ اندھیرے میں مجھے ایک ہٹا کٹا دھوتی پوش جوان دکھائی دیا۔ جس نے ہاتھ میں چھرا پکڑا ہوا تھا۔ میں اس کے سامنے آ گیا۔

"کون ہو بھئی تم؟ یہاں کیا کرنے آئے ہو؟ اس ہٹے کٹے غنڈے نے بڑے دہشت زدہ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ "بھائی! تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اتنے میں دو غنڈے پیچھے سے نکل آئے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی چھرے تھے۔ ایک غنڈے نے میری گردن دبوچ لی۔ دوسرے غنڈے نے چھرا میرے سینے سے لگا دیا۔ "اوئے تو مسلمان ہے کہ ہندو؟"

اس کے ساتھ غنڈے نے کہا۔ "اوئے ہندو تو یہاں کوئی نہیں بچا۔ یہ مسلمان ہو

گا۔" پھر وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "یہاں سے بھاگ جاؤ جان بچا کر' جاؤ۔"

میں نے اسے نرم اور انکسار بھرے لہجے میں کہا۔ "اندر کون ہے؟"

ہٹے کٹے غنڈے نے ہنس کر کہا۔ "اوئے! یہ تمہاری کیا لگتی ہے ہندنی اوئے؟"

میں نے ان کو کہا۔ "اس لڑکی کو چھوڑ دو۔ یہ انسانیت سے گری ہوئی حرکت ہے۔ کسی مسلمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی۔"

ہٹے کٹے غنڈے کو طیش آ گیا۔ اس نے پوری طاقت سے میرے سینے پر چھرے کا وار کر دیا۔ لیکن جب چھرا میرے پتھر ایسے سینے سے ٹکرا کر اس کے ہاتھ سے اچٹ کر گر پڑا تو وہ چیخا۔ "اوئے اس نے لوہے کی وردی پہن رکھی ہے اس کی گردن کاٹ ڈالو۔"

تینوں غنڈے مجھ پر پل پڑے۔ میں اپنی جگہ پر چٹان کی طرح کھڑا رہا۔ وہ میری گردن پر چھروں سے وار کر رہے تھے۔ چھرے میری گردن پر اچٹ رہے تھے۔ میں انہیں زیادہ موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے فرار ہو جائیں۔ میں انہیں دھکیل کر کمرے میں لے گیا۔ اندر جاتے ہی میں نے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ کمرے میں اندھیرا تھا لیکن میں نے ایک لڑکی کو دیکھا جو کونے میں سہمی بیٹھی تھی۔

غنڈے مجھ سے لپٹ گئے۔ وہ مجھے نیچے گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں ان کی مرمت کرنے کے لئے آزاد تھا۔ مجھے بمشکل چھ سات سیکنڈ لگے ہوں گے۔ تینوں غنڈے کمرے کے فرش پر اس حالت میں بے ہوش پڑے تھے۔ کہ ان سب کی ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں۔ ان کی ٹانگیں میں نے جان بوجھ کر توڑی تھیں۔ تاکہ وہ وہاں سے بھاگ نہ سکیں۔

میں لڑکی کی طرف بڑھا تو وہ رونے لگی۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اس کے کان کے قریب جا کر پنجابی میں کہا۔ "رو نہیں بہن۔ میں تمہیں ان غنڈوں سے بچانے آیا ہوں۔"

لڑکی ایک دم چپ ہو گئی۔ میرے اس جملے نے جادو کا اثر کیا تھا۔ پھر بھی اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑے اور کپکپاتی آواز میں کہا۔ "مجھے کچھ نہ کہنا۔ بھگوان کے لئے کچھ نہ کہنا۔"

میں نے اس کے ننگے سر پر ساڑھی کا پلو ڈالا تو لڑکی سسکیاں بھرتے ہوئے رونے لگی۔ اس کا سارا جسم ہل رہا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں ہندو نہیں ہوں۔ مسلمان ہوں۔ اس کی چیخ کی آواز سن کر ادھر آ گیا تھا۔ چونکہ میں مسلمان ہوں اسی لئے تمہاری عزت کی حفاظت کرنا مجھ پر فرض ہو گیا ہے۔ ایک سچا مسلمان کسی مظلوم عورت کی پکار سنتا ہے تو پھر اس کی مدد اس پر فرض ہو جاتی ہے مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں تمہارا بھائی بن کر تمہاری

عزت اور تمہاری جان کی حفاظت کروں گا۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارا گھر کہاں ہے؟ تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟"

دہشت زدہ ہندو لڑکی نے رندھی ہوئی آواز میں رک رک کر بتایا کہ اس کا نام کوشلیا ہے۔ اس کے پتا کا نام لالہ ٹیک چند ہے جو لاہور کے ایک کالج میں پڑھاتے ہیں وہ بھی لاہور میں ایم۔ اے کی سٹوڈنٹ تھی۔ ان کا گھر لاہور کی لوئرمال پر تھا۔ وہ یہاں قصبے میں اپنی خالہ کے ہاں چھٹیاں گزارنے آئی تھی کہ ان کے گھر پر حملہ ہو گیا۔ غنڈوں نے سب گھر والوں کو تہہ تیغ کر دیا اور اسے اغواء کر کے یہاں لے آئے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا مجھے معلوم تھا۔ میں نے کوشلیا کو ایک بار پھر یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں اسے اس کے ماتا پتا کے پاس لاہور پہنچا دوں گا۔ اس کی ساڑھی ایک مسئلہ تھا۔ یہ لباس اسے ہندو لڑکی ثابت کر کے اس کی زندگی خطرے میں ڈال سکتا تھا۔ میرے پاس کوئی چادر بھی نہیں تھی کہ اسے اوڑھا دیتا۔ ابھی رات کا پچھلا پہر تھا۔

"میرے ساتھ چلو۔" میں نے بڑی شفقت سے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ ہم اندھیرے میں برآمدے سے اتر کر پرانی کوٹھی سے نکل کر ریلوے اسٹیشن والی چھوٹی سی کچی سڑک پر آ گئے۔ میرا دماغ بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا کہ کوشلیا کے لئے کوئی چادر یا قمیض شلوار کہاں سے حاصل کی جائے۔

صبح کی روشنی ہونے سے پہلے پہلے میں کوشلیا کی ساڑھی بدلوا دینا چاہتا تھا۔ یا کم از کم اس کو چادر اوڑھا دینا چاہتا تھا۔ قصبے کے مکانوں پر تاریکی چھائی تھی مجھے کھیت میں رہٹ نظر آیا۔ اس کے پاس ہی ایک کچی کوٹھری تھی۔ سوچا شاید یہاں سے کوئی چادر مل جائے۔ میں کوشلیا کو لے کر رہٹ کے قریب آیا۔ رہٹ چل نہیں رہا تھا۔ کچی کوٹھری کے دروازے پر تالا لگا تھا۔

میں نے تالا توڑ ڈالا۔ آدھی کوٹھری توڑی سے بھری ہوئی تھی۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک بڑا گٹھڑ کترے ہوئے چارے کا رکھا تھا۔ میں نے گٹھڑ کو کھول کر چادر کو جھاڑا۔ یہ کافی بڑی چادر تھی۔

کوشلیا کوٹھڑی کے باہر دیوار کے ساتھ لگی تھی۔ "اسے اوڑھ لو تمہاری ساڑھی چھپ جائے گی۔"

کوشلیا نے چادر کو اپنے جسم کے ساتھ اس طرح لپیٹ لیا کہ اس کی ساڑھی کافی حد تک غائب ہو گئی۔ اب میں اسے لے کر قدرے اطمینان سے آگے بڑھا۔ ریلوے اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے سورج نکل آیا۔ فضا میں ایک عجیب مرگ آلود دھول اڑ رہی تھی۔ کھیت

کھلیان ویسے ہی ویران پڑے تھے۔ بائیں جانب چھوٹا سا دیہاتی ریلوے اسٹیشن ویران پڑا تھا۔ رات جو گاڑی یہاں کٹی تھی وہ غائب تھی۔ لاشیں بھی پلیٹ فارم سے اٹھا لی گئی تھیں۔ ریلوے لائن پر چیتھڑے، ٹین کے ٹوٹے پھوٹے ٹرنک اور جوتے بکھرے پڑے تھے۔

سامنے سڑک تھی جو لاہور کو جاتی تھی۔ دھریک کے پیڑ تلے ایک ہینڈ پمپ لگا تھا۔ یہاں میں نے کوشلیا کا منہ ہاتھ دھلایا اس نے پانی پیا۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ میرے ساتھ بڑے اعتماد کے ساتھ لاہور تک سفر کرے اور اپنے آپ کو ایک مسلمان لڑکی تصور کرے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش تھی۔ سہمی ہوئی تھی۔ سڑک پر کبھی کبھی لاہور کی جانب کوئی ٹرک گزر جاتا۔ اس میں آدمی اور عورتیں بھری ہوئی تھیں۔ ہمارے قریب ہی کچھ دیہاتی مزدور قسم کے لوگ آکر کھڑے ہو گئے۔ یہ بھی لاہور جا رہے تھے۔ انہوں نے ایک ٹرک کو ہاتھ دے کر روک لیا۔ ان کے ساتھ ہم بھی ٹرک میں سوار ہو گئے۔ ٹرک والا افغانی پٹھان تھا۔ اس نے ہم سے ایک سواری کے دو آنے وصول کئے۔ ٹرک میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ ہم نے کھڑے ہو کر لاہور تک کا فاصلہ طے کیا۔

ٹرک نے ہمیں بادامی باغ کے پاس بوڑھے دریا کے پار سڑک پر اتار دیا۔ کوشلیا نے نسواری چادر اس طرح اپنے جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی کہ اس کی ساڑھی بالکل نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے بتایا کہ لوئر مال وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ "مگر ہمارے گھر تو آگ لگا دی گئی ہو گی۔ پتہ نہیں پتا جی اور ماتا جی زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ میں نے کہا کہ چل کر دیکھتے ہیں۔ وہ لاہور شہر کی تمام سڑکوں سے واقف تھی۔ وہی میری رہنمائی کر رہی تھی۔ کافی آگے جا کر ایک سکول کی قلعہ نما عمارت آگئی تو کوشلیا نے مجھے آہستہ سے بتایا کہ لوئر مال اب بالکل قریب ہے۔ میں نے اسے ایک درخت کے نیچے کھڑا ہونے کو کہا اور خود سامنے والے مسلم مہاجر کیمپ کے باہر زمین پر بیٹھے ایک آدمی سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے اس سے پوچھا کہ آگے جو لوئر مال پر ہندوؤں کے مکان تھے۔ انہیں آگ لگائی ہے کہ نہیں؟

وہ آدمی نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ "باؤ جی مسلمان بڑا نرم دل ہوتا ہے۔ دو تین مکانوں کو ہی آگ لگائی تھی۔"

میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔ "اور کافر کہاں گئے؟ کیا بھاگ گئے یا ختم کر دیئے گئے؟"

"ابی گورا فوج نے ڈی' اے' وی کالج کو ہندوؤں کا کیمپ بنا دیا۔ بس سارے کے سارے کافر بھاگ کر وہاں جا چھپے۔ اب وہاں گورا فوج اور گورکھوں کا پہرہ لگا ہے۔"

میں نے واپس آکر کوشلیا کو ساری بات بتائی اور کہا کہ ہو سکتا ہے اس کے ماتا پتا بھی ڈی۔ اے۔ وی ہندو مہاجر کیمپ میں چلے گئے ہوں۔ وہ بولی۔ "یہ کالج تو ہمارے گھر کے پاس ہی ہے۔"

ہم بھاٹی دروازے کے قریب سے نکل کر لوئر مال پر آگئے۔ یہاں سے کوشلیا مجھے ایک نسبتاً کشادہ گلی میں لے گئی۔ اس نے دور سے مجھے اپنا مکان دکھایا۔ اسے آگ نہیں لگی تھی۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج کا بڑا گیٹ سامنے نظر آ رہا تھا۔ باہر ایک گورا فوجی اور چار گورکھے رائفلیں لئے پہرہ دے رہے تھے۔

میں کوشلیا کے ساتھ گیٹ کے قریب پہنچا تو گورے فوجی نے رائفل میری طرف تان دی۔ "ہالٹ! کون ہو تم؟"

میں نے کوشلیا کو آگے کر دیا۔ اس نے بڑی صاف انگریزی میں گورے کو ساری کہانی مختصر الفاظ میں سنائی اور کہا کہ اس کے ڈیڈی کا نام لالہ ٹیک چند ہے۔ اگر وہ کالج کے کیمپ میں ہوں تو انہیں اطلاع کی جائے کہ ان کی بیٹی کوشلیا ان سے ملنے آئی ہے۔ گورے فوجی نے ہمیں وہیں کھڑے رہنے کی ہدایت کی اور گورکھے سپاہی کی مدد سے اندر پیغام بھجوا دیا۔ دس پندرہ منٹ بڑی قیامت کے گزرے۔ کوشلیا بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی۔ اس کی آنکھیں کیمپ کے گیٹ پر لگی تھیں۔

پھر اچانک وہ چیخ پڑی۔ "پتا جی۔ ماتا جی۔"

ایک ادھیڑ عمر کا ہندو اسی عمر کی ایک عورت کے ساتھ گیٹ کے پاس آکر رک گیا۔ دونوں کوشلیا کو دیکھ کر خوشی اور حیرت سے پاگل ہو گئے۔ ماتا پتا کے بیٹی سے ملنے کا منظر بڑا دل گداز تھا۔ کوشلیا نے روتے ہوئے اپنے پتا کو میرے بارے میں بتایا تو اس نے مجھے گلے لگا لیا۔ میں نے کہا۔ یہ میرا انسانی فرض تھا جو میں نے پورا کیا۔

میں اجازت لے کر واپس جانے لگا تو کوشلیا میرے قدموں پر گر پڑی۔ میں نے اسے اٹھا کر اس کے سر پر پیار کیا اور کہا "میری بہن! تم بہت جلد ہندوستان چلی جاؤ گی۔ اگر وہاں کسی مسلمان لڑکی کو مصیبت میں مبتلا دیکھو تو اس کی ضرور مدد کرنا۔"

کوشلیا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس وقت مجھے اس حقیقت کا شدت سے احساس ہوا کہ بہن بھائی کی محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ میں کالج کیمپ کے گیٹ سے واپس ہوا تو مجھے گلی کے کونے پر دو آدمی کھڑے نظر آئے۔ شاید یہ مسلمان تھے اور ایک ہندو لڑکی کو کیمپ میں اس کے ماں باپ کے حوالے کرتے دیکھ کر مشتعل ہو رہے تھے۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔

اور دوسری گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ سارا علاقہ ہندوؤں کا تھا۔ سارے کے سارے مکان خالی پڑے تھے۔ کچھ ادھ جلے تھے۔ کچھ مکانوں کے باہر ٹوٹا پھوٹا سامان بکھرا پڑا تھا۔ میں ان گلیوں سے ناواقف تھا۔

آگے گیا تو دیکھا کہ گلی آگے بند ہے۔ واپس مڑا تو وہ دونوں پراسرار آدمی جنہوں نے دھوتیاں پہن رکھی تھیں۔ میری طرف بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی نے اپنا ہاتھ کرتے کے اندر ڈال رکھا تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں شاید پستول قسم کا کوئی ہتھیار تھا۔ ان کی طرف جانے کی بجائے میں ایک مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ یہ مجھ سے غیر ارادی طور پر ہوا تھا۔

گلی میں دوڑنے کی آواز آئی۔ میں سیڑھی چڑھ کر مکان کی دوسری منزل میں آ گیا۔ اس مکان کا سارا سامان لوٹا جا چکا تھا۔ خالی ٹرنک الٹے پڑے تھے۔ دیوار میں لگی الماریوں کے پٹ کھلے تھے۔ انسانی قدم بڑی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ میں کسی قسم کی گھبراہٹ کے بغیر اپنی جگہ خاموش سے کھڑا رہا۔ مجھے گھبرانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

دونوں غنڈے زینے کے دروازے میں سے نکل کر میرے سامنے آ گئے۔ ان کی آنکھوں میں نفرت اور شدید غیظ و غضب تھا۔ ایک غنڈے نے پستول کا رخ میری طرف کر دیا اور بولا۔ کافر کی اولاد۔ اپنی بہن کو تو کیمپ میں چھوڑ آیا۔ پر تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

اس نے فائر کر دیا۔ گولی میرے پیٹ پر لگی۔ میرے کرتے میں سوراخ ہو گیا اور گولی میرے فولادی پیٹ سے ٹکرا میرے پاؤں میں گر پڑی وہ دونوں اس سوراخ کو ہاتھ سے ٹٹولتے دیکھ کر کچھ حیرانگی سے بولے۔

دوسرا غنڈہ بولا۔ "دوسرا فائر کر اوئے۔" دوسرے فائر کی گولی میرے شانے پر لگی۔ یہ گولی بھی نیچے گر پڑی۔ میں نے دونوں گولیاں فرش پر سے اٹھا کر ان کی طرف بڑھائیں اور کہا۔ "یہ یادگار گولیاں ہیں انہیں سنبھال کر رکھنا۔"

دوسرے غنڈے نے مجھ پر پوری طاقت سے خنجر کا وار کر دیا اس نے میرے پیٹ میں خنجر گھونپنا چاہا۔ ظاہر ہے وہ ناکام رہا۔ بلکہ الٹا اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا۔ میں نے بڑے اطمینان سے اس کے ہاتھ سے خنجر اور دوسرے کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ "میں ہندو نہیں ہوں۔ مسلمان ہوں۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آیندہ کسی بے قصور انسان کی جان لینے کی کوشش نہیں کرنا۔"

میں نے پہلے خنجر کو دو ٹکڑے کیا۔ پھر بھاری بھرکم پرانی طرز کے دیسی پستول کو بڑے

اطمینان سے دہرا کر کے فرش پر پھینک دیا۔ دونوں غنڈوں کے ہوش و حواس جیسے گم ہو گئے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے مجھے تک رہے تھے۔ ان کی قوت گویائی جیسے ختم ہو چکی تھی۔ وہ مجھے کوئی بھوت پریت سمجھ رہے تھے۔ میں نے گرج دار آواز میں کہا۔ "بھاگ جاؤ نہیں تو کچا کھا جاؤں گا۔"

وہ الٹے پاؤں زینے پر چھلانگ لگا کر ایسے بھاگے کہ تین سیکنڈ میں وہ گلی بھی پار کر چکے تھے۔ میرا دل انسانوں سے انسانوں کی نفرت کو دیکھ کر کچھ بجھ سا گیا تھا۔ قتل و غارت گری میں بہت دیکھ چکا تھا لیکن وہ سب اس عہد کی باتیں تھیں جب انسان جہالت کی تاریکیوں یا یہ کہہ لیجئے کہ تہذیب ابتدائی دور میں سے گزر رہا تھا۔ جبکہ آج سائنسی اور تہذیبی شعور کے عروج کا زمانہ تھا۔ پھر بھی انسان وحشی بن کر ایک دوسرے کا خون بہا رہا تھا۔

میں نے واپس اسی گلی میں جانا مناسب نہ سمجھا اور مکان کی چھت پر آ گیا کہ مکانوں کی چھتوں' سے ہوتا ہوا کسی اگلی گلی میں اتر جاؤں گا۔ یہ سارے مکان خالی اور ویران پڑے تھے۔ دو تین مکانوں کی چھتوں میں سے گزر کر میں ایک مکان کی سیڑھیاں اتر کر گلی میں آ گیا۔ یہاں مجھے گلی کی نالی پر ایک انسانی لاش پڑی نظر آئی۔ اس کے پہلو میں گہرا شگاف تھا۔ جہاں خون جم کر نیلا ہو چکا تھا۔

میں لوئر مال پر آ گیا۔ سامنے ایک چھوٹی سی گراؤنڈ تھی۔ یہاں ایک درخت کی چھاؤں میں پولیس کے دو چار سپاہی بیٹھے مجھے دیکھ رہے تھے۔ لوئر مال سنسان تھی۔ میں تیزی سے بھاٹی چوک کی طرف چلنے لگا۔ یہ مسلمانوں کا علاقہ تھا۔ سڑک کے بیچ میں بھاٹی دروازے کے سامنے کچھ لڑکے ٹرک کے بڑے بڑے ٹائروں کو آگ لگا رہے تھے۔ آدمیوں کی ٹولی پاکستانی جھنڈا اٹھائے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتی گزر گئی۔ میں نے لاہور آتے وقت پیچھے ایک خوبصورت دریا دیکھا تھا۔ جس کے کنارے کسی تاریخی عمارت کے مینار درختوں میں نظر آئے تھے۔ میرے دل میں دریا پر جانے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔

میں دریا کے پل کی طرف چلنے لگا۔ اس سڑک کے کنارے جو ٹاہلیوں کے درخت تھے۔ انہیں مہاجرین کلہاڑیوں سے کاٹ رہے تھے۔ یہاں کوئی فٹ پاتھ نہیں تھا۔ سڑک کنارے کچا راستہ تھا جہاں دھول اڑ رہی تھی۔ جھاڑیاں مٹی اور گرد سے اٹی ہوئی تھیں۔ چلتے چلتے میں بادامی باغ کے قریب سے بھی گزر گیا۔ میرے جوتے گرد میں اٹ گئے تھے۔ دریا کے پاس پہنچا تو سڑک سے اتر کر درختوں کا ایک ذخیرہ ملا جن کے درمیان سے دریا کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ میں اس ذخیرے میں داخل ہو کر دریا کی طرف چل پڑا۔

اس ذخیرے میں حبس تھا۔ اگرچہ یہ حبس مجھے کوئی تکلیف نہیں دے رہا تھا۔ یہاں کافی اونچی اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ ایک آدمی درختوں کے نیچے درانتی سے گھاس کاٹ رہا تھا۔ ذخیرے سے نکلا تو سامنے دریا کا پاٹ نظر آیا۔ دریا چڑھا ہوا تھا۔ میرے الٹے ہاتھ کو دریا کے گھاٹ پر چبوترے پر بنا ہوا ایک چھوٹا سا مندر نظر آیا۔ جس کے مینارے کا کلس ایک طرف کو مڑا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے توڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔

دریا کے دوسرے کنارے پر بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ پل کی جانب کچھ آدمی چل رہے تھے۔ دور کسی تاریخی عمارت کے پیچھے کالے کالے بادل آہستہ چلے آ رہے تھے۔ ایک ٹرین چھک چھک کرتی پل پر سے گزرنے لگی۔ اس کے انجن کی آواز مجھے بڑی اچھی لگی۔ میں دور پل پر سے ٹرین کو گزرتے دیکھنے لگا۔

گاڑی پل پر سے گزر گئی تو میں دریا کنارے ایک جگہ بیٹھ گیا دریا چونکہ چڑھاؤ پر تھا۔ اس لئے اس کی لہروں کی رفتار تیز تھی۔ پانی کا رنگ گدلا تھا۔ اس میں کبھی کوئی بڑا شہتیر، کبھی کوئی چھپر اور کبھی کوئی مٹی کا مٹکہ تیرتا نظر آ جاتا۔ میں دریا کی بہتی لہروں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے اور کہاں جانا چاہئے۔ اس شہر سے میرا جی اچاٹ ہو گیا تھا۔

جی چاہ رہا تھا کہ دور کسی ویرانے میں جا کر جھونپڑا بنا کر رہنا شروع کر دوں اور انتظار کروں کہ یہاں سے تقدیر مجھے کس دور، کس عہد میں لے جاتی ہے۔ ایک خیال آتا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد کا کوئی زمانہ نہیں ہے۔ یہ کرہ ارض کا آخری عہد ہے۔ پھر خیال آتا کہ نہیں شاید اس سے آگے بھی کوئی زمانہ ہو۔ کوئی تہذیب ہو اتنے طویل ترین تاریخی سفر کے دوران پہلی بار میں وقت کے بارے میں کشمکش میں پڑا تھا۔ میں نے خدا سے دعا کی کہ وہ اس ضمن میں میری راہ نمائی فرمائے۔

دریا کنارے بیٹھے بیٹھے کافی وقت گزر گیا۔ دوپہر سے شام ہو گئی۔ اس دوران میں بادل آسمان پر گھرے ہو گئے تھے ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ شہر کی طرف واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ شام کے سرمئی اندھیرے نے دریا، درختوں اور دریا پار کی بارہ دری پر اپنی چادر پھیلا دی۔ تھوڑی دیر بعد بوندا باندی ہونے لگی۔ بارش کی بوندیں کافی موٹی موٹی تھیں۔ اس خیال سے کہ کپڑے بھیگ جائیں گے میں نے ارد گرد نگاہ ڈالی کہ بارش سے بچنے کے لئے کوئی پناہ گاہ مل جائے۔ بائیں جانب گھاٹ والا مندر ہی نظر آیا جہاں بارش سے پناہ لی جا سکتی تھی میں اٹھ کر گھاٹ کی طرف چلا۔ مندر کا دروازہ آگ سے جل چکا تھا صرف اس کی چوکھٹ باقی بچ گئی تھی۔ اندر کوٹھری تھی دیوار میں کسی دیوی کی مورتی ابھری

ہوئی تھی۔ جس کے دونوں بازو اور ناک توڑ ڈالی گئی تھی۔ مورتی کے آگے اس کے بازو کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔

مجھے نہ اس مورتی سے کوئی سروکار تھا نہ اس مندر سے کوئی دلچسپی تھی۔ میں تو بارش سے بچنے کے لئے وہاں تھوڑی دیر کو آ گیا تھا۔ میں مندر کی چھوٹی سی کوٹھری کے دروازے میں دریا کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ بارش تیز ہو گئی۔ رات کا اندھیرا اب چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ دریا کے پاٹ نے رات کی سرمئی چادر اوڑھ لی تھی۔ ہوا تیز نہیں چل رہی تھی۔ بارش کا شور مجھے بھلا لگ رہا تھا۔ میں نے اپنا سر مندر کی چوکھٹ سے لگا رکھا تھا۔

درختوں کے ذخیرے کی طرف سے جو ہوا آ رہی تھی اس میں گیلے پتوں اور گھاس کی مہک تھی۔ رات کی تاریکی، دریا کا کنارہ اجڑا ہوا ویران مندر اور بارش، بڑا پراسرار منظر تھا۔

اس قسم کے پراسرار مناظر مجھے پسند تھے۔ جانے اسی طرح بیٹھے بیٹھے کتنا وقت گزر گیا۔ بارش کافی مدہم ہو گئی تھی بوندوں کی مہکی مہکی گنگناہٹ سی سنائی دے رہی تھی۔ ہوا بھی رک گئی تھی۔ فضا تاریک اور حبس آلود ہو گئی۔ دور پل پر تین بتیاں روشن تھیں جن کا لہراتا ہوا عکس دریا میں پڑ رہا تھا۔ ایک عجیب اثر انگیز خاموشی طاری تھی۔

میں آنکھیں بند کئے مندر کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھا اپنے ماضی حال اور مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے فضا میں ایک اجنبی سی آواز کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ رات سنسان تھی۔ میں نے سوچا شاید یہ بارش کی بوندوں کے کسی پانی کے گڑھے میں گرنے کی آواز تھی۔

میں نے آنکھیں دوبارہ بند کر لیں۔ وہی انوکھی مترنم سی آواز پھر سنائی دی۔ میں آنکھیں کھول کر ہمہ تن گوش ہو گیا آواز ایسی تھی جیسے کوئی کسی زمین دوز تہہ خانے میں بیٹھا کوئی ساز بجا رہا ہو۔ میرے آس پاس کوئی بھی نہیں تھا، ساز کی مترنم آواز برابر آ رہی تھی۔ میں نے مندر کی کوٹھری میں دیکھا۔ کوٹھری اندھیرے میں خالی پڑی تھی۔ پھر یہ آواز کہاں سے آ رہی تھی؟

میں اٹھ کر مندر کے پیچھے گیا۔ دیواروں سے کان لگا کر سنا۔ آواز یہاں سے نہیں بلکہ ایسا لگ رہا تھا کہ زمین کے اندر سے یا آسمان پر چھائے بادلوں میں سے آ رہی ہے۔ یہ مترنم آواز میرے علم کے مطابق کسی ستار یا وچترَوینا کی تھی۔ کوئی اس ساز کے تاروں کو آہستہ آہستہ چھیڑ کر سروں کو جھولا سا جھلا رہا تھا۔ پھر ساز ایک دم رک گیا۔ پھر وہی سناٹا

چھا گیا۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے یہ کوئی آسیب ہو۔ اس قسم کے بھوت پریتوں کی خوش فعلیوں کا مجھے پہلے بھی کئی بار تجربہ ہو چکا تھا۔ اور میں نے انہیں کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔

بارش تقریباً رک گئی تھی۔ سوچا دریا کے پل پر چل کر اندھیری رات میں ' دریا میں روشنیوں کے عکس کا نظارہ کیا جائے۔ میں اٹھا ہی تھا کہ وچتروینا ساز کی آواز ایک جھنکار کی طرح آئی اس بار آواز بڑے قریب سے آئی تھی۔

میں نے گردن گھما کر پیچھے کوٹھری میں دیکھا۔ مندر کی دیوار میں جہاں دیوی کی ٹوٹی پھوٹی مورتی لگی تھی اس جگہ ہلکی نیلی روشنی کا غبار سا گردش کر رہا تھا۔ میں ٹکٹکی باندھے اس روشن غبار کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس روشنی میں سے ایک نہایت حسین ' چمکیلے چہرے اور بڑی بڑی کنول ایسی آنکھوں والا بھرپور جوان عورت کا ہیولا نمودار ہوا۔ اس عورت کے سیاہ بالوں کا سر کے اوپر جوڑا بنا تھا۔ جس میں کنول کے سفید پھولوں کا گجرا سج رہا تھا۔ وہ کسی تخت پر بیٹھی تھی۔ ایک وچتروینا اس کے زانوؤں پر تھی۔ جس کے تاروں کو وہ آہستہ آہستہ چھیڑ رہی تھی۔

فضا ادھر سنگیت کی آواز سے معمور ہو رہی تھی۔ یہ کوئی ملکوتی سنگیت تھا جس کے سروں کی مٹھاس سے میری روح ابھی تک نا آشنا تھی۔ میں بت بنا اس ملکوتی حسن کی دیوی کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

دیوی نے وچتروینا پر چلتا ہوا ہاتھ روک دیا۔ پھر اپنی کنول ایسی پاکیزہ بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کے حسین چہرے پر سحر انگیز آسمانی مسکراہٹ تھی۔ یہ مسکراہٹ طلوع ہوتے سورج کے سنہری حاشیے ایسی تھی۔ پھر سنگیت سے بھی میٹھی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

عاطون ! میں سرسوتی دیوی ہوں۔ سنگیت اور علم ادب کی دیوی۔ تو نے ایک کنواری ہندو کنیا کی عزت بچا کر میری جیو آتما کو پرسن کیا ہے۔ میں سورگ سے تجھے آشیر باد دینے آئی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "سرسوتی دیوی ! تیرے درشن پا کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ آشیر باد کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو میرا فرض تھا جو میں نے ادا کیا۔"

سرسوتی دیوی کی آواز آئی۔ "ہاں۔ میں جانتی ہوں تو نے ہر سنکلپ میں اپنے کرتوے کا پالن کیا ہے۔ پرنتو میں پرسن ہوئی ہوں۔ خوش ہوئی ہوں.....سن میں تجھے ایک خاص شکتی ارپن کرتی ہوں۔"

میں خاموش کھڑا سرسوتی دیوی کو دیکھتا رہا۔ اس نے بڑی دل آویز مسکراہٹ کے

ساتھ کہا۔ "تیرا تہاس بڑا پراچین ہے آج تک تیرا سنکلپ تیرے بس میں نہیں تھا۔ آج میں یہ شکتی تیرے بس میں کرتی ہوں سن ! میں تجھے ایک گندھرو اشلوک بتاتی ہوں۔ اسے یاد کر رکھ۔ جب کبھی تجھے کسی منش کی بھلائی کے لئے ' کسی برائی سے سنگرش کرنے ' اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے اپنی شکل بدلنے کی ضرورت پڑے تو' تو میرے بتائے ہوئے اشلوک کا جاپ کرنا تو جس روپ میں چاہے گا۔ اسی روپ میں آ جائے گا۔ پرنتو انسان کے سوا تو کوئی دوسرا روپ اختیا نہیں کر سکے گا۔ اب دھیان لگا کر گندھرو اشلوک سن۔"

اس کے بعد سرسوتی دیوی نے سنسکرت کا ایک اشلوک پڑھا۔ یہ اشلوک ایک بار سنتے ہی مجھے یاد ہو گیا۔ سرسوتی بولی۔ "کبھی تو نے ناپاک حالت میں اس اشلوک کا جاپ کیا تو اس کا اثر نہیں ہو گا۔ یہ بھی یاد رکھنا۔ اندریوں کے لوبھ لالچ کے لئے بھی یہ اشلوک مت پڑھنا۔ ہری اوم۔ ہری اوم"

فضا وچتروینا کے مدھر سنگیت سے گونج اٹھی۔ سرسوتی دیوی کا ہیولا ستار کے تاروں پر اپنی کنول کی پنکھڑیوں ایسی انگلیاں چلاتا آہستہ آہستہ دیوار میں غائب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی روشنی بھی بجھ گئی اور پھر وہی اندھیرا چھا گیا۔ سرسوتی دیوی کے جاتے ہی میں نے گندھرو اشلوک کو دل میں دہرایا۔ مجھے وہ سارے کا سارا یاد ہو چکا تھا۔

اگرچہ اس سے پہلے میں اس تجربے سے گزر چکا تھا۔ لیکن میری شکل کبھی تبدیل نہیں ہوئی تھی بلکہ میری شکل ہی کو کسی دوسرے کی شکل پر محمول کر کے مجھے کبھی کاہن اعظم اور کبھی جرائم پیشہ گردانا گیا تھا اور ایک عرصے سے اب یہ سلسلہ بھی بند ہو چکا تھا۔

میں نے دل میں عہد کر لیا کہ اس مقدس گندھرو اشلوک کو کبھی ذاتی غرض یا لوبھ لالچ کے لئے استعمال نہیں کروں گا وہ رات میں نے اسی مندر میں گذار دی۔

صبح ہوئی تو میں دریا کے پل کی طرف چل پڑا۔ چونکہ یہ سارے واقعات جن کا میں آگے چل کر ذکر کروں گا اسی صدی کے وسط میں گذرے ہیں اور ان واقعات کے شاہد اور کردار اس ملک میں بقید حیات ہیں اس لئے میں اب ان کرداروں اور شہروں کے اصل نام نہیں لکھوں گا۔

سرسوتی دیوی کی جانب سے ایک ولولہ انگیز اور سنسنی خیز شکتی مل جانے کے بعد میرے دل میں بنی نوع انسان کی خدمت کا ایک نیا جذبہ بیدار ہو گیا تھا۔ اب میرا دل بجھا بجھا نہیں تھا۔ سرسوتی دیوی نے میرے دل میں امید اور جذب نو کی ایک نئی شمع روشن کر دی تھی۔ اس وقت کے لاہور شہر میں ایک انتشار پھیلا ہوا تھا جس سے میرا جی گھبرانے لگا اب میں کسی جگہ کچھ دیر جم کر زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر

لاہور سے دور ایک دوسرے شہر میں آگیا جو لاہور جتنا بڑا شہر نہیں تھا لیکن اس سے کم بھی نہیں تھا۔

میں اس شہر کا نام نہیں لکھوں گا۔ یہاں بھی مہاجرین آ کر آباد ہو رہے تھے لیکن لاہور والی افراتفری اور شوروغل نہیں تھا۔ میرے پاس صرف چھ سات روپے ہی بچے تھے میں اس شہر میں نئی زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے تاریخی اور آبائی پیشے پر اکتفا کرنا زیادہ پسند کیا۔ یہ پیشہ جڑی بوٹیوں کی فروخت تھا۔

مجھے جڑی بوٹیوں کا پانچ ہزار سالہ پرانا تجربہ تھا۔ اس میدان میں میرا کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ایسی ایسی جڑی بوٹیاں لا کر دکانداروں کو دیں کہ جو تیر بہدف تھیں اور جن کے بارے میں ان کی معلومات صفر کے برابر تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند مہینوں کے اندر اندر میں خوشحال ہو گیا۔ میں شہر کے ایک محلے میں ایک دو منزلہ مکان کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ نچلی منزل کو میں نے جڑی بوٹیوں کا گودام بنا لیا تھا۔ دوسری منزل کو میں نے اس زمانے کے مطابق خوشنما فرنیچر' قالین اور سامان آرائش سے خوب سجا لیا۔ ایک نوکر رکھ لیا جو گھر کا سارا کام بھی کرتا تھا اور کھانا وغیرہ بھی پکاتا تھا۔ مجھے کھانے پینے کی حاجت تو نہیں تھی لیکن پردہ رکھنا بہت ضروری تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھ پر کسی کو شک ہو اور میرا راز کھل جائے۔

ایک سال گذر گیا۔ محلے کے لوگ میری شرافت اور خوش اخلاقی کا دم بھرنے لگے۔ میں نوجوان تھا۔ پانچ ہزار سال سے بیس بائیس سال کا نوجوان چلا آ رہا تھا۔ کچھ قریبی دوستوں نے شادی کے لئے اصرار کیا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں شادی پانچ برس سے پہلے نہیں کروں گا۔ پانچ برس کے بعد قدرتی طور پر مجھے اس شہر کو چھوڑ دینا تھا کیونکہ پانچ برس میں میرے دوستوں پر عمر کے اثرات ظاہر ہو جاتے جبکہ میں ویسے کا ویسے جوان ہی رہتا۔ لہٰذا ہر پانچ یا زیادہ سے زیادہ سات برس کے بعد مجھے نقل وطن یا نقل مکانی کرنی پڑتی تھی۔

جس گلی میں میرا مکان تھا وہاں غریب محنت کش لوگ بھی رہتے تھے اور سرمایہ داروں کے چار منزلہ پکے مکان بھی تھے۔ جنہوں نے ہندو سکھوں کے چلے جانے کے بعد ان کے عالی شان مکانوں اور سامان پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور خوب دولت لوٹی تھی۔ جو شرفا اور پرانی وضع کے سرمایہ دار تھے وہ پرانی حویلیوں میں خاموش زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہماری گلی کے نودو لتیئے سرمایہ داروں میں نادر نام ک ایک غنڈہ ٹائپ آدمی بھی تھا۔ جس نے ہندوؤں ' سکھوں کی دولت کو خوب لوٹا تھا اور ایک بڑے مکان پر قبضہ کر رکھا تھا۔ یہاں

چھپ کر وہ شراب اور چرس وغیرہ کا ناجائز کاروبار بھی کرتا تھا۔

میں نے اور محلے کے دوسرے بزرگوں نے اسے کئی بار اس ناجائز اور سماج دشمن مذموم کاروبار سے غائب ہونے کے لئے کہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کے آدمی محلے کے شریف لوگوں کو پریشان بھی کرتے تھے۔ میں اس سماج دشمن غنڈے نادر کے قلع قمع کے لئے ابھی منصوبہ بنا رہا تھا کہ ایک روز گلی میں شور اٹھا۔

میں اپنے مکان میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ شور سن کر کھڑکی میں سے نیچے جھانکا۔ دیکھا کہ گلی میں نادر اور اس کے دو ساتھیوں کی لاشیں خون میں لت پت پڑی ہیں۔ دکاندار دکانیں بند کر کے بھاگ رہے ہیں اور اکبر خان پٹھان کا اکلوتا بڑا لڑکا امجد خان نلکے پر جھکا خون آلود خنجر دھو رہا ہے۔ اکبر خان کے محلے میں لکڑیوں کا ٹال تھا اور اس کا اکلوتا نوجوان بیٹا امجد خان اس ٹال پر اس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ میرے گلی میں پہنچنے تک وہاں پولیس کے دو سپاہی آ گئے جنہوں نے امجد خان کو پکڑ لیا تھا اور تھانے لے گئے۔

سارے محلے میں شور مچ گیا کہ امجد خان نے غنڈے نادر اور اس کے دو ساتھیوں کو قتل کر دیا ہے۔ معلوم ہوا کہ نادر خان نے امجد کی بڑی بہن کو گلی میں سے گذرتے ہوئے چھیڑا تھا۔ بہن نے امجد سے شکایت کی۔ اس کی غیرت جوش میں آ گئی۔ وہ خنجر لے کر گلی میں آ گیا نادر غنڈے کے مکان کے سامنے موچی کی دوکان پر بیٹھا رہا جب نادر اپنے دو جواری غنڈوں کے ساتھ مکان سے اتر کر گلی میں آیا تو نوجوان غیرت مند پٹھان نے اس بے جگری سے طوفانی حملہ کیا کہ نادر اور اس کے ایک غنڈے ساتھی کو وہیں دو وار کر کے ڈھیر کر دیا۔ تیسرا غنڈہ ابھی چاقو نکال ہی رہا تھا کہ امجد خان نے اسے بھی ڈھیر کر دیا۔

امجد خان اپنے ادھیڑ عمر باپ اکبر خان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اکبر خان کو اس بات کا فخر تھا کہ اس کے بیٹے نے اپنی بہن کی لاج رکھ لی مگر وہ غریب تھا۔ اس کے پاس دولت بھی نہیں تھی کہ اپنے غیرمند بہادر بیٹے کی زندگی بچانے کے لئے کوئی اعلیٰ وکیل کر سکے۔ اسے اپنے بیٹے کی زندگی موت کے اندھیروں کی طرف جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس اعتبار سے وہ پریشان اور فکر مند تھا۔ پیچھے قبائلی علاقے میں اس کی ایک ایکڑ زمین بھی نہیں تھی۔ ٹال پر لکڑیاں فروخت کر کے وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کا پیٹ پال رہا تھا۔ نادر غنڈے کے قلع قمع سے محلے کا گند دھل گیا تھا۔ محلے والے بڑے خوش تھے۔ شروع شروع میں تو جوش تازہ تھا۔ محلے کے چودھریوں نے اکبر خان کو یقین دلایا کہ وہ اس کے بیٹے کی جان بچانے کے لئے سردھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ بڑی سے بڑی رقم خرچ کر کے اعلیٰ ترین وکیل کریں گے۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اور اب وہ اکبر خان کے ٹال کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی کترانے لگے۔ اکبر خان بھی غیرت مند تھا اس نے اپنے بچوں کو ہمیشہ رزق حلال کھلایا تھا۔ اس نے بھی کسی چودھری کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ کوئی حرف شکایت لب پر نہ لایا۔ اللہ پر بھروسہ رکھا اور غریبی دعوے کا ایک وکیل کر لیا میں نے دبی زبان میں اکبر خان کی مدد کرنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن اکبر خان نے کسی قسم کی مدد لینے سے انکار کر دیا۔

دوسری طرف نادر غنڈے کے بھائیوں نے شہر کا سب سے بڑا وکیل کر لیا۔ ناجائز کمائی پانی کی طرح بہائی شروع کر دی۔ انہیں واردات کے عینی گواہ بھی مل گئے۔ جنہوں نے عدالت میں بیان دیا کہ انہوں نے امجد خان کو اپنی آنکھوں سے نادر اور اس کے دو ساتھیوں پر خنجروں سے وار کرتے دیکھا ہے۔ مقدمہ شروع ہو گیا۔

اکبر خان کا ٹال بک گیا۔ وہ صوبہ سرحد میں اپنے آبائی گاؤں جاتا۔ وہاں سے تھوڑی بہت رقم لاتا اور مقدمے کی نذر کر دیتا۔ پولیس نے اکبر خان کے بیٹے نادر خان کے خلاف بڑا زوردار کیس تیار کیا تھا۔ اگرچہ کیس اشتعال کا تھا مگر امجد خان سوچ سمجھ کر نادر کو قتل کرنے آیا تھا اور کچھ دیر بڑے سکون کے ساتھ مقتول کے انتظار میں موچی غلام رسول کی دکان پر بیٹھا رہا تھا۔

ڈیڑھ برس تک مقدمہ چلتا رہا۔ اور پھر اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ فیصلہ سننے اکبر خان کے ساتھ میں بھی عدالت میں موجود تھا۔ اکبر خان کے نوجوان بیٹے امجد خان کو پھانسی کی سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ اکبر خان کا رنگ زرد ہو گیا۔ میں نے اسے سنبھالا دیا اور اپنے ساتھ لگا لیا۔ آخر اکبر خان باپ تھا۔ جوان بیٹے کی پھانسی کا فیصلہ سن کر کیسے نارمل رہ سکتا تھا۔

دوسری طرف امجد خان نے بڑے حوصلے کا ثبوت دیا۔ اپنے باپ کی طرف دیکھ کر کٹہرے سے بولا۔ "بابا جان۔ میں بہن کی عزت کی خاطر پھانسی لگ رہا ہوں۔ آنسو نہ بہائیں۔" محلے کے کچھ غریب لوگ بھی فیصلہ سننے آئے ہوئے تھے وہ سب آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے اکبر خان سے کہا کہ ہم ہائی کورٹ میں اپیل کریں گے۔

اکبر خان نے پہلے ہائی کورٹ میں اپیل کی، پھر سپریم کورٹ میں اپیل کی لیکن پولیس نے کیس کچھ ایسی ہوشیاری سے تیار کیا تھا کہ امجد خان کی پھانسی کی سزا بحال رہی۔ امجد خان کی والدہ نے رحم کی اپیل کر دی۔ اور ایک روز اس کی رحم کی اپیل بھی مسترد ہو گئی۔ لکڑی کے ٹال کے مالک اکبر خان کے مکان پر غم واندوہ کے بادل چھا گئے۔ میں اس سے ملنے گیا تو وہ مکان کی بیٹھک میں دری پر سر جھکائے رنج والم کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ اکلوتے

جوان بیٹے کی پھانسی کے تصور نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ محلے کے دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ اکبر خان نے آہ بھر کر کہا۔ "میرے مولا کو یہی منظور تھا۔"

اوپر والے چوبارے سے جوان امجد خان کی غم نصیب ماں اور بہن کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ میرے دل پر اس غیرت مند بے قصور کنبے کے غم کا شدید اثر ہوا۔ امجد خان نے اپنی ہمشیرہ کے ناموس کے تقدس کی حفاظت کرتے ہوئے جرائم پیشہ غنڈوں سے محلے کو نجات دلائی تھی۔ اور اب پھانسی کا پھندا اس کا مقدر بن چکا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک عجیب وغریب منصوبے کا کوندا سا لپکا۔ یہ منصوبہ اتنا سنسنی خیز تھا کہ میں خاموشی سے اٹھ کر اپنے مکان پر آ گیا۔

یہ منصوبہ غم زدہ بہن کو اس کا بھائی، بد نصیب ماں کو اس کا لخت جگر اور سوگوار باپ کو اس کا نورالعین واپس کرنے کا تھا۔ میں اپنے مکان کے کمرے میں ٹہلتے ہوئے اس منصوبے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔ وقت کم تھا۔ منصوبہ کافی وقت طلب اور الجھا ہوا تھا۔ اس پر عمل کرنے کے لئے بڑی سوچ بچار کی ضرورت تھی۔ مجھے باقاعدہ ایک اسکیم تیار کرنی تھی۔ پھانسی کی کوٹھری میں بند امجد خان کے باپ کو اعتماد میں لینا تھا۔ سب سے نازک اور مشکل مرحلہ امجد خان کو پھانسی کی کوٹھری سے نکالنے کا تھا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ رحم کی اپیل مسترد ہو جانے کے بعد پھانسی پانے والے کے حفاظتی انتظام سخت کر دیئے جاتے ہیں۔ اسے جیل کے اندر جیل میں بنی ہوئی پھانسی کی کوٹھری میں بند کر دیا جاتا ہے۔

لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ غیرت مند امجد خان کو پھانسی نہیں چڑھنے دوں گا اور قانون کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں گے اور امجد خان بھی پھانسی کے پھندے سے بچ کر اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ جائے گا۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر میرے ذہن میں منصوبے کی تمام تفصیلات تیار ہو گئیں اس سلسلے میں سرسوتی دیوی کے گندھر واشلوک نے سب سے اہم کردار ادا کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے اس اشلوک کی سچائی کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔

میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے چٹخنی لگائی غسل خانے میں جا کر غسل کیا۔ پاک صاف کپڑے پہنے اور پھر تخت پر آئینہ سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔

میرے ذہن میں محلے کے جس آدمی کی شکل پوری طرف صاف اور واضح تھی وہ حکیم شریف تھا۔ ساٹھ برس کے حکیم شریف کی سفید [illegible] تھی اور ناک کے اوپر آنکھ کے قریب ایک کالا مسہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ [illegible] عجیب [illegible]

سنسنی خیز تجربہ کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ اس کا نتیجہ الٹا بھی نکل سکتا تھا۔ سب سے کمزور پہلو اس منصوبے کا یہ تھا کہ میں ایک غیبی ہندو دیوی کے بتائے ہوئے اشلوک پر اعتبار کرتے ہوئے یہ تجربہ کرنے والا تھا۔ لیکن اگر یہ تجربہ کامیاب ہو جاتا تو اس کا سب سے طاقتور پہلو یہ تھا کہ اس سے قانون کی خلاف ورزی یا قانون شکنی نہیں ہوتی بلکہ قانون کے تقاضے قانون کے مطابق پورے ہو جاتے ہیں۔ خطرہ صرف اس بات کا تھا کہ کہیں میں کسی ایسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں کہ جس سے رہائی بعد میں میرے لئے بھی ناممکن ہو جائے۔

لیکن جب امجد خان کی جوانی، اس کے ماں باپ اور بہن کے غم والم کا خیال کرتا تھا تو دل کہتا کہ چاہے کچھ ہو جائے مجھے یہ تجربہ کر گذرنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ یہ میری اپنی شکل تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب میرے دل نے قدرے بے چینی سے دھڑکنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے میں نے اللہ میاں کے حضور دعا مانگی۔ سات بار استغفار پڑھی۔ اللہ سے مدد کی درخواست کی۔ پھر اپنے محلے کے حکیم شریف کا تصور بند آنکھوں میں جمایا اور سرسوتی دیوی کو یاد کرتے ہوئے اس کا بتایا ہوا گندھر واشلوک کا جاپ شروع کر دیا۔ میں نے سات بار یہ اشلوک پڑھا۔ اس کے بعد خاموش ہو گیا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ میں ڈر کے مارے آنکھیں نہیں کھول رہا تھا۔ مجھے اپنے چہرے پر کچھ بوجھ سا محسوس ہوا جسم میں کمزوری کا احساس ہوا۔ میں نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنے منہ پر پھیرا۔

میرے بدن میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔ میرے ہاتھ میرے چہرے پر اگے ہوئے بالوں سے ٹکرائے تھے۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ میری آنکھیں آئینے پر لگی تھیں اور میں سکتے کے عالم میں اپنا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ جو اب میرا چہرہ نہیں تھا بلکہ محلے کے بوڑھے حکیم شریف کا چہرہ تھا۔ سفید ترشی ہوئی ڈاڑھی، ناک اور آنکھ کے درمیان کالا مسہ، رخسار کی ہڈیوں پر جھریاں سر کے خشخشی بال سفید ہو رہے تھے۔ میرا دل فرط جذبات سے اچھل پڑا۔ میرا تجربہ کامیاب ثابت ہوا تھا۔

اب دوسرا مرحلہ پہلے مرحلے سے زیادہ نازک اور خطرناک تھا۔ مجھے اپنی اصلی شکل میں واپس آنا تھا۔ یہ تجربہ بے حد اہم تھا میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے خدا کے حضور سات بار استغفار پڑھی۔ پھر سرسوتی دیوی کا تصور کیا۔ اپنی شکل کو ذہن میں جمایا۔ یہاں ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا حکیم شریف کی صورت کا تصور بڑی جلدی میرے ذہن میں [illegible] تھا۔ لیکن [illegible] اپنی شکل پوری تفصیل کے ساتھ تصور میں نہیں آ رہی

تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی شکل کا تصور جمایا اور سرسوتی کے بتائے ہوئے گندھر واشلوک کو سات بار دہرایا۔

ایک عجیب تذبذب کے عالم میں آنکھیں بند کئے اپنا ہاتھ اٹھا کر چہرے پر پھیرا۔ میری ڈاڑھی غائب تھی۔ جلدی سے آنکھیں کھول کر آئینے میں دیکھا۔ خوشی سے میرا چہرہ چمک اٹھا۔ میں اپنی اصلی شکل میں واپس آ چکا تھا۔ میں وہیں تخت پر خدا کے حضور سجدے میں گر گیا اور دعا مانگی کہ اے قادر مطلق تو میری نیت کو جانتا ہے۔ میں یہ سب کچھ جس کی خاطر کر رہا ہوں تو اس سے بھی واقف ہے۔ اے قادر مطلق مجھے اپنی حفاظت میں رکھنا اور توفیق عطا کرنا کہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو جائے۔

تخت سے اٹھ کر آئینہ طاق میں رکھا اور کمرے میں ٹہلتے ہوئے اپنے سنسنی خیز منصوبے کے ابتدائی اقدام پر غور کرنے لگا۔ میں نے اسے نازک ترین مشن کی تمام جزئیات ذہن میں طے کر لیں اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ مشن کو تیزی سے شروع کرنے کی ضرورت تھی۔ کیونکہ امجد خان کا بلیک وارنٹ ہو سکتا ہے۔ جیل کے حکام کے پاس پہنچ گیا ہو اور انہوں نے پھانسی کی تاریخ اور وقت بھی طے کر لیا ہو۔ میرے حساب سے ایک روز بعد امجد خان کی آخری ملاقات ہونے والی تھی۔

شام کے بعد جب رات کا اندھیرا چھا گیا تو میں اکبر خان کے مکان پر پہنچا۔ وہ اوپر اپنی بیوی اور بیٹی کے پاس تھا۔ میرا سن کر بیٹھک میں آ گیا۔ میں وہاں اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے ایک ضروری بات کرنے کا کہہ کر اپنے مکان میں لے آیا۔ دوسری منزل میں اسے پلنگ پر بٹھایا۔ کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور کہا۔ "اکبر خان! میں نے تمہارے بیٹے کو پھانسی کی کوٹھری سے نکالنے کا منصوبہ تیار کیا ہے۔"

اکبر خان میرا منہ تکنے لگا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ وقت مجھ سے مذاق کا نہیں اظہار ہمدردی کا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ اکبر خان کو اعتماد میں لینا بہت ضروری تھا۔ اس کو اعتماد میں لئے اور اس پر اپنا راز فاش کئے بغیر میرا منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے ادھیڑ عمر غم زدہ باپ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "اکبر خان! میں نے جو کچھ آپ کو کہا اس میں ذرا سا بھی جھوٹ نہیں ہے۔ میری بات غور سے سنیں میرے پاس ایک بزرگ کا دیا ہوا ایسا عمل ہے جس کو پڑھ کر میں کسی دوسرے انسان کی شکل اختیار کر سکتا ہوں۔ اس بزرگ نے تاکید کی تھی کہ میں یہ عمل صرف اس وقت اپنے کام میں لاؤں جب کسی بے گناہ کی جان بچانے کا مرحلہ درپیش ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا وقت آ گیا ہے۔"

اکبر خان ٹکٹکی باندھے مجھے تک رہا تھا۔ وہ اب بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ میں اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے ذرا بھی توقف کئے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ ”میں نے پروگرام یہ بنایا ہے کہ میں عمل پڑھ کر تمہارے بیٹے امجد خان کی شکل اختیار کر کے اسے تمہارے پاس پہنچا دوں گا۔ اور اس کی جگہ خود پھانسی چڑھ جاؤں گا۔“

وہ اب بھی خاموش تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ قانون کی رو سے میں پھانسی پا جاؤں گا۔ میں لاش کی طرح سخت ہو جاؤں گا مگر اصل میں میں مروں گا نہیں۔ اور رات کے اندھیرے میں قبر سے باہر نکل کر اپنی اصلی شکل میں واپس آ جاؤں گا۔ کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہو گا۔ قانون کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں گے۔ میں بھی واپس آ جاؤں گا۔ اور تمہارا بیٹا بھی تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ لیکن تمہیں ایک بات کا یقین دلانا ہو گا کہ تم اپنے بیٹے کو قبائلی علاقے میں کسی ایسی جگہ پہنچا دو گے جہاں سے وہ کبھی اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔ کیا تم میرے منصوبے کو کامیاب بنانے کے لئے میرا ساتھ بلکہ اپنے بیٹے امجد خان کے ساتھ تعاون کرو گے۔“

اکبر خان سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔ ”عبداللہ! تم جو کچھ کہہ رہے ہو مجھے یقین نہیں آتا۔“

اکبر خان سچا تھا۔ کسی کو میری بات پر یقین نہیں آ سکتا تھا۔ اس کو یقین دلانے کے لئے ضروری تھا کہ اس کے سامنے تجربہ کیا جائے۔ میں نے کہا ”ٹھیک ہے اکبر خان! میں تمہارے سامنے اپنی شکل بدل کر تمہارے بیٹے کی شکل اختیار کرتا ہوں۔ پھر تمہیں یقین آ جانا چاہئے۔

اکبر خان بے چارہ سیدھا سادا مسلمان تھا۔ لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ وہ توہمات پر یقین رکھتا تھا۔ یہ نقطہ میرے حق میں جاتا تھا۔ میں کرسی گھسیٹ کر ذرا پیچھے ہو گیا۔ اپنا عمل شروع کرنے سے پہلے میں نے اکبر خان سے کہا۔ ”اکبر خان! تھوڑی دیر بعد اس کرسی پر تمہارا بیٹا امجد بیٹھا ہو گا۔ لیکن وہ اصل میں تمہارا بیٹا نہیں ہو گا۔ میں عبداللہ ہوں گا۔ میں نے تمہارے بیٹے کی شکل اختیار کر رکھی ہو گی۔ اس لئے گھبرانا مت۔ اپنے ہوش وحواس میں رہنا۔ یہ میں صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ اس کے بغیر تمہیں کبھی یقین نہیں آئے گا کہ میں تمہارے بیٹے کو پھانسی کے تختے سے واپس تمہارے پاس لا سکتا ہوں۔ اب میں اپنا عمل شروع کرنے والا ہوں تم اپنی جگہ پر حوصلے اور صبر سے بیٹھے رہنا۔ یہ صرف بزرگ کے بتائے ہوئے عمل کا اثر ہو گا۔“

اکبر خان بس میری طرف تکے جا رہا تھا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بول رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ خدا کے حضور توبہ استغفار پڑھی۔ پھر سرسوتی دیوی کا خیال کیا اور اکبر خان کے بیٹے امجد کی شکل کا پورا پورا تصور اپنے ذہن میں جما کر سرسوتی دیوی کا بتایا ہوا گندھر واشلوک منہ ہی منہ میں پڑھنا شروع کر دیا۔ اشلوک کو ساتویں بار پڑھنے کے بعد میں ایک سیکنڈ کے لئے خاموش ہو گیا۔

اچانک اکبر خان کی چیخ سے ملتی جلتی آواز بلند ہوئی۔ ”میرے بیٹے امجد خان۔“

میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ میں اکبر خان کے بیٹے امجد خان کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اکبر خان نے بے اختیار مجھے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ میں نے درشت لہجے میں اکبر خان کو ڈانٹ دیا۔ ”اکبر خان۔ اپنی جگہ پر بیٹھے رہو۔ میرے عمل کو خراب نہ کرو۔“

اکبر خان کلمہ شریف پڑھتا ہوا پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ بار بار کلمہ پڑھ رہا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے تک رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اکبر خان! میں تمہارا بیٹا امجد خان نہیں ہوں۔ میں عبداللہ ہوں تمہارا ہمسایہ عبداللہ۔ میں نے عمل پڑھ کر تمہارے بیٹے امجد خان کی شکل اختیار کی ہے۔ تاکہ تمہیں یقین آ جائے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ تمہارا بیٹا امجد خان اس وقت بھی پھانسی کی کوٹھری میں بیٹھا موت کا انتظار کر رہا ہے۔“

اکبر خان میرے قدموں پر گر پڑا۔ ”میرے بچے کو بچا لو۔ میرے بچے کو بچا لو۔“

میں نے آنکھیں بند کر کے گندھر واشلوک کو سات بار دہرایا اور میں ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اپنی اصلی شکل میں واپس آ گیا۔ اکبر خان نے اپنے سامنے مجھے بیٹھے دیکھا تو میرے گھٹنے پکڑ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ وہ رو رہا تھا۔ ”تم میرے سچے پیر ہو۔ میرے بیٹے کی جان بچا لو۔ وہ بے گناہ ہے۔ تم میرے سچے پیر ہو۔ سچے پیر ہو۔“

میں نے اب اکبر خان کو آہستہ آہستہ سمجھایا کہ ”یہ کوئی معجزہ نہیں تھا بلکہ محض ایک بزرگ کے بتائے عمل کا نتیجہ تھا۔ اب میں جو کچھ کہوں اسے غور سے سنو۔“

ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے میں نے اکبر خان کو پوری تفصیل کے ساتھ ساری اسکیم سمجھا دی۔ اسکیم یہ تھی کہ صبح اٹھتے ہی وہ پہلا کام یہ کرے گا کہ اپنی بیوی اور بیٹی کو اپنے کسی رشتے دار کے ساتھ واپس اپنے قبائلی گاؤں کی طرف روانہ کر دے گا۔ وہ لوگوں کو یہ بتائے گا کہ اس کی بیوی اپنے بچے اور بھائی سے آخری ملاقات کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتیں۔ اس کے بعد کل ہی رات کے پچھلے پہر پورے تین بجے رات جیل کی عقبی دیوار کے پاس جو خشک کھائی ہے۔ وہاں چھپ کر بیٹھا رہے گا۔ ”صبح کی اذان سے پہلے پہلے

میں تمہارے بیٹے امجد خان کو دیوار کی دوسری طرف پہنچا دوں گا۔ تم اس کے لئے قبائلی لباس ساتھ لاؤ گے۔ کھائی میں ہی تم اسے قبائلی لباس پہنا دو گے۔ اس کے بعد تم کسی تیز رفتار سواری پر بیٹھ کر صوبہ سرحد کی طرف روانہ ہو جاؤ گے۔ ہو سکتا ہے پرسوں تمہارے بیٹے سے آخری ملاقات کا دن ہو۔ تمہیں دوسرے روز صبح صبح واپس اپنے مکان پر پہنچ جانا ہو گا۔ تم مجھ سے باقاعدہ آخری ملاقات کرنے آؤ گے اور مجھ سے مل کر آنسو بہاؤ گے۔ جیسے میں تمہارا اصلی بیٹا امجد خان ہی ہوں۔ پھر پھانسی کے بعد تم میری لاش وصول کرو گے اور قبرستان میں دفن کرو گے۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔ اور تم شہر سے اپنا ٹال بیچ کر اپنے قبائلی گاؤں ہمیشہ کے لئے چلے جاؤ گے۔ تم سمجھ گئے ہو؟"

اکبر خان کو میں نے ایک بار' دو بار تین بار ایک ایک تفصیل اچھی طرح ذہن نشین کرا دی۔ زیادہ زور اس بات پر دیا کہ وہ اس کا ذکر ہرگز ہرگز کسی سے نہ کرے اور مکمل رازداری سے کام لے۔ اکبر خان کو اب یقین ہو گیا تھا کہ میں اس کے بیٹے کو پھانسی کے تختے سے بچا سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ میری ہدایات پر عمل کرنے کے لئے پورے جذبے کے ساتھ تیار ہو گیا۔

دوسرے دن اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی بیوی اور بیٹی کو کسی دور کے رشتے دار کے ساتھ اپنے گاؤں کی طرف روانہ کر دیا۔ دوپہر کو وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں نے بیوی اور بیٹی کو گاؤں بھیج دیا ہے۔ میں نے رات کا پروگرام ایک بار پھر دہرایا۔ ایک ایک تفصیل اس کے ذہن میں بٹھا دی۔ جیل کی عقبی کھائی کے مقام کی نشان دہی کرائی۔ رکشے میں بیٹھ کر اسے یہ جگہ دکھا بھی دی۔

چار بجے وہ میرے پاس بھاگا بھاگا آیا۔ اس کی آواز آنسوؤں سے رندھی ہوئی تھی۔ آخر باپ تھا۔ کسی وقت اسے یہ سب کچھ ایک ڈرامہ سا لگتا اور محسوس ہوتا کہ اس کا بیٹا پھانسی پا جائے گا اس نے بتایا کہ اسے پرسوں شام آخری ملاقات کے لئے جیل بلایا گیا ہے۔ میرا قیاس درست نکلا۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ اگر اس نے اسی طرح کیا جس طرح میں اسے کہہ رہا ہوں تو انشاء اللہ اس کا بیٹا موت کے منہ سے نکل کر اس کے پاس آ جائے گا۔

اکبر خان سر جھکائے آنسو پونچھتا چلا گیا تو میں نے خاص قسم کی جڑی بوٹیوں کو پیس کر اس کا سفوف تیار کیا۔ مختلف قسم کی جڑی بوٹیوں کا یہ سفوف اس قدر سریع الاثر اور خطرناک تھا کہ اسے ایک بار ہلکا سا سونگھتے ہی سے انسان بے ہوش ہو جاتا تھا۔ یہ بڑا قدیم آمیزہ تھا اور مجھے یاد ہے کہ آج سے ہزاروں برس پہلے میرے والد محترم آپریشن

کرنے سے پہلے مریضوں کو یہی سفوف سنگھایا کرتے تھے۔ اس کا اثر ایک گھنٹے تک رہتا تھا۔ زرد رنگ کے اس سفوف کو میں نے پوٹلی میں ڈال کر جیب میں رکھ لیا اس کام سے فارغ ہو کر میں نے نیلے رنگ کی پتلون اور جیکٹ بازار سے خریدی۔ نسواری رنگ کے فلیٹ شوز اور نائیلان کی باریک مگر بڑی مضبوط رسی بھی خریدی۔

مکان پر آ کر میں نے اپنے آپ کو بند کر لیا اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ دن کے وقت جب میں اکبر خان کے ساتھ جیل کی عقبی دیوار کی نشان دہی کے لئے گیا تھا تو ایک خاص جگہ کو کمند ڈالنے کے لئے چن لیا تھا۔ یہاں دیوار کے اوپر ایک چھوٹا سا منارہ بنا ہوا تھا۔ یہی منارہ مجھے آدھی رات کے بعد جیل کی دیوار کی دوسری جانب پہنچانے والا تھا۔ اس کے باوجود میں اچھی طرح جانتا تھا کہ مجھے بے ہوشی کے سفوف کے علاوہ اپنی غیر معمولی مافوق الفطرات طاقت سے ہی کام لینا ہو گا ورنہ خالی بے ہوشی کے سفوف کی مدد سے کوئی عام انسان خواہ کتنا ہی دلیر اور تجربہ کار ڈاکو کیوں نہ ہو جیل کی دیوار پھاند کر کسی قاتل کو نہیں بھگا سکتا تھا۔

رات کے دس بجے جب گلی میں لوگوں کی آمدورفت کم ہو گئی تو میں اکبر خان کے مکان پر گیا۔ وہ کسی قدر گھبرایا سا ہوا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دلایا اور خدا پر بھروسہ رکھنے کی ہدایت کی اور کہا کہ میں دو بجے رات اپنے مشن پر روانہ ہو جاؤں گا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا ایک قبائلی جگری یار تیز رفتار جیپ لے کر جیل کی دیوار سے کچھ دور سڑک کے کنارے اندھیرے میں موجود ہو گا۔ اور وہ اسی جیپ کے ذریعے اپنے لخت جگر کو لے کر فرار ہو جائے گا۔

جب میری گھڑی نے رات کے ٹھیک دو بجائے تو میں نے غسل کیا۔ تخت پر آئینہ سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر کے توبہ استغفار پڑھی۔ پھر سرستی دیوی کا خیال دل میں لا کر اکبر خان کے بیٹے امجد خان کی شکل کا پورا تصور آنکھوں کے سامنے کیا اور سرستی دیوی کا بتایا ہوا گندھرو اشلوک سات بار دہرایا۔

آخری بار اشلوک پڑھنے کے ساتھ ہی مجھے اپنے جسم اور چہرے پر تبدیلی کا احساس ہو گیا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر آئینے میں دیکھا۔ میں عاطون نہیں بلکہ امجد خان تھا میری شکل، جسم، چہرہ، ناک، آنکھیں سر کے بال ہر شے اکبر خان کے بیٹے امجد خان کی بن چکی تھی۔

مجھے اس کامیاب تجربے پر بے حد خوشی ہوئی۔ میں تیزی سے اٹھا۔ نیلی چست پتلون، نیلی جیکٹ، نسواری فلیٹ شوز پہنے منہ پر نقاب کی جگہ رومال اس طرح باندھ کر آدھا

چہرہ اسی میں چھپ گیا۔ سفوف کی پوٹلی اور نائیلون کی رسی جیب میں ڈالی۔ مکان کو تالا لگایا اور گلی سے باہر نکل آیا۔

سارا بازار سنسان پڑا تھا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں کوئی گشت کرتا ہوا سپاہی یا چوکیدار نہ مل جائے۔ میں ان سے بچنا چاہتا تھا۔ اس میں میرے وقت ضائع ہونے کا اندیشہ تھا۔ جیل ہمارے محلے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ چوک میں مجھے ایک خالی رکشا جاتا مل گیا۔ اسے رکوا کر میں سوار ہوا اور جیل کی عقبی دیوار سے کچھ فاصلے پر اتر کر رکشا چھوڑ دیا۔

یہاں درختوں میں اندھیرا تھا۔ سڑک سے ہٹ کر کھائی شروع ہو جاتی تھی۔ کھائی میں بھی درخت اور جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ اس کے آگے جیل کی دیوار کھڑی تھی۔ میں نے کھائی میں چھلانگ لگا دی اور جھاڑیوں میں سے گذرتا ہوا دوسری طرف جیل کی دیوار کے پاس باہر نکل آیا۔ جیل کی گول دیوار پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر خار دار باڑھ کے اوپر بجلی کے کمزور سے بلب روشن تھے۔

میں دیوار کے نیچے اس جگہ آگیا جہاں دیوار کا منارہ تھا۔ میں نے جیب سے نائیلون کی رسی نکال کر کھولی۔ اسے گھمایا اور اوپر اچھال دیا۔ یہ میری غیر معمولی طاقت تھی جس کی وجہ سے رسی بڑی تیزی سے اچھل کر اوپر منارے میں جا کر پھنس گئی۔ میں رسی کو تھام کر دیوار پر چڑھنے لگا۔ جتنی تیزی سے ہو سکتا تھا میں دیوار کے اوپر خار دار تار پر پہنچا اور سر اوپر اٹھا کر دیوار کی دوسری طرف دیکھا۔ میں نے دیوار پر چڑھنے سے پہلے چہرے پر سیاہ نقاب پہن لیا تھا۔ یہاں نقاب پہننا بہت ضروری تھا کیونکہ میں ایک ایسے قاتل کی شکل میں تھا جو پھانسی کی کوٹھری میں بیٹھا موت کا انتظار کر رہا تھا۔

جیل میں پھانسی کی کوٹھری کے بارے میں میں نے پوری معلومات حاصل کر رکھی تھیں۔ یہ جگہ جیل کے پچھواڑے سے ایک چھوٹے سے کھلے میدان میں ایک کوارٹر کی طرح تھی۔ کوارٹر کے برآمدے میں دو سپاہی صبح شام پہرہ دیتے تھے۔ اس برآمدے میں چار کال کوٹھریاں تھیں جن میں سے ایک کوٹھڑی میں امجد خان بند تھا۔

میں نے دیکھا کہ جیل کے اندر کہیں کہیں گھنے درخت اگے تھے۔ اور کافی اندھیرا تھا۔ کسی کسی جگہ پر کمزور سی روشنی والے بلب روشن تھے۔ میں حیران ہوا کہ یہاں کسی قسم کی فلڈ لائٹ یا سرچ لائٹ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔

دور جیل کے شمال مغرب کی جانب مجھے ایک پہرے دار پھرتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی صرف ایک لاٹھی ہی تھی معلوم ہوا کہ سارا زور جیل کے صدر گیٹ پر صرف کیا گیا تھا۔ گیٹ پر ہی اوپر گول مورچہ بنا تھا جہاں سپاہی ہر وقت مشین گنیں لئے پہرے پر

رہتے تھے۔ ادھر ہی سرچ لائٹیں بھی تھیں۔ رائفل بردار سپاہی بھی زیادہ تر ادھر ہی گشت لگاتے تھے۔

میں نے رسی کو جیل کے اندر کی طرف لٹکا دیا اور خود تیزی سے نیچے اتر آیا۔ رسی کو میں نے اسی جگہ لٹکے رہنے دیا یہ رسی امجد خان کے کام آنے والی تھی۔ میں اندھیرے میں ہو کر جھکا جھکا درختوں میں گھرے ہوئے اس کوارٹر کی طرف جا رہا تھا جس کے اندر پھانسی کی کوٹھریاں تھیں۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں کے گارڈز اور سپرنڈنٹ صاحب کے کبھی وہم میں بھی نہیں تھا کہ کوئی قیدی جیل پھاند کر بھاگ سکتا ہے یا باہر سے کوئی آدمی دیوار پھاند کر اندر آئے گا۔ ان کا خیال درست بھی تھا۔ بھلا کون چور ایسا ہے جو جیل کی دیوار پھاند کر اندر جائے گا۔

کال کوٹھری کے کوارٹر کے قریب پہنچ کر میں زمین پر لیٹ گیا۔ ایک پہرے دار ہاتھ میں ڈنڈا لئے جیسے نیند میں میری طرف چلا آ رہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ محض وقت پورا کر رہا ہے اور بادل نخواستہ چکر لگا رہا ہے۔ پھر بھی یہ آدمی میرے لئے خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ راؤنڈ پر تھا تو ہو سکتا ہے پانچ منٹ بعد ادھر ہی سے پھر گذرے اور اس وقت میں امجد کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں گا۔ میں نے سب سے پہلے اس سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ میں رینگتا ہوا اینٹوں کے ایک چھوٹے سے ڈھیر کی اوٹ میں ہو گیا۔ یہ ایک دبلا پتلا وردی پوش پہرے دار تھا۔ جب وہ میرے قریب سے ہو کر گذرا تو میں نے پیچھے سے اچھل کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میرا ہاتھ ایک چٹان کی سی مضبوطی کے ساتھ اس کے ہونٹوں پر جم گیا تھا بے ہوشی کے سفوف کی پوٹلی میرے دوسرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے پوٹلی اس کی ناک پر چڑھا دی۔ اپنی طاقت کے بل بوتے پر اسے زبردستی سانس کھینچنے پر مجبور کر دیا۔ اس نحیف و نزار شخص کے لئے آدھا سانس ہی کافی تھا۔ اور وہ بے ہوش ہو کر میرے بازو میں لٹک گیا۔

میں نے اسے اینٹوں کی ڈھیری کے پیچھے کھینچ لیا اور احتیاطاً" اس کے منہ میں اس کی خاکی قمیض کا ٹکڑا کاٹ کر ٹھونس دیا۔ ویسے میرا سفوف سچا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے پہلے اس کو ہوش نہیں آئے گا۔

میں نے اپنے مشن کا سارا انحصار اپنی مافوق الفطرت طاقت پر کر رکھا تھا۔ میں اس کے لئے بھی تیار تھا کہ اگر مجھے چھ سات آدمیوں کی گردنیں بھی توڑنی پڑیں تو میں دریغ نہیں کروں گا۔ بے پناہ طاقت کے نشے میں چور میں پھانسی کی کوٹھری والی کوارٹر نما چھوٹی جیل کے دروازے کی طرف بڑھا۔ تاہم میں بڑی احتیاط کے ساتھ اندھیرے میں چل رہا

تھا۔ کوارٹر کے برآمدے کے منہ پر لوہے کا جنگلا لگا ہوا تھا۔ یہاں ایک پہرے دار جنگلے کے باہر اسٹول پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس نے ٹیک جنگلے کے ساتھ لگا رکھی تھی اور ایک رائفل بردار سپاہی مجھے جنگلے کے اندر ٹہلتا نظر آ رہا تھا۔ یہ میری مافوق الفطرات بصارت کا کرشمہ تھا ورنہ وہ مجھے اتنے صاف نظر نہیں آ سکتے تھے۔

مجھے ان دونوں پر قابو پانا تھا۔ وقت گذرتا جا رہا تھا۔ اگر بیک وقت دونوں پر ہلہ بولتا ہوں تو شور مچنا یقینی تھا۔ اور شور میرے سارے مشن کو ملیا میٹ کر سکتا تھا۔ میں نے زمین پر سے ایک روڑا اٹھا کر پہرے دار کے اسٹول کے قریب پھینک دیا۔ کھڑاک ہوا پہرے دار نے چونک کر زمین کو دیکھا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد دوسرا روڑا تھوڑا آگے کر کے پھینکا۔

پہرے دار نے بلند آواز میں کہا۔ "کون ہے اوئے؟"

اس کی آواز سن کر دوسرا سپاہی بھی جنگلے کے پاس آ گیا۔ میں اندھیرے میں زمین کے بالکل ساتھ لیٹ گیا۔ پہرے دار نے اندر والے سپاہی سے کہا۔ "کوئی پتھر آیا ہے یہاں"

اندر والا سپاہی بولا۔ "باہر سے کسی نے پھینکا ہو گا۔ میں پتہ کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر پہرے دار جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی اندھیرے میں میری طرف آیا۔ میں یہی چاہتا تھا اور اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھ رہا تھا اور زمین پر لاٹھی مار رہا تھا۔ وہ میرے بالکل قریب سے گذرنے لگا تو میں نے اچھل کر اس کی گردن دبوچ کر نیچے گرا لیا۔ اس کا حلق میری گرفت میں تھا۔ سوال ہی پیدا نہیں تھا کہ اس کی آواز نکل سکتی دوسرے لمحے میں نے بے ہوشی کے سفوف کی تھیلی اس کی ناک پر چڑھا دی۔ وہ بمشکل دو سانس کھینچ سکا اور بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اسے پیچھے کھینچ لیا۔ جیب سے رومال نکال کر اس کے بازو پیچھے باندھ ڈالے اور اب تیسرے سپاہی کا انتظار کرنے لگا مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے ساتھی کی تلاش میں ضرور آئے گا۔

اسی دوران میں رینگتا ہوا کوارٹر کی دیوار کی اوٹ میں آ گیا۔ یہاں سے مجھے جنگلے کے اندر پہرہ دینے والا سپاہی نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف لوہے کا جنگلا ترچھے زاویئے پر نظر آ رہا تھا۔ سپاہی نے جب دیکھا کہ اس کا ساتھی پہرے دار واپس نہیں آیا تو اس نے اسے آواز دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ سپاہی نے لوہے کا جنگلا کھولا اور رائفل سیدھی کر کے باہر نکلا ہی تھا کہ میرا بایاں ہاتھ اس کی گردن پر پڑا۔ وہ بدحواس ہو کر منہ کے بل گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس کی گردن میرے ہاتھ کی غیر معمولی ضرب کی تاب نہیں

لا سکتی تھی۔ وہ سفوف سونگھانے سے پہلے ہی بے ہوش ہو چکا تھا۔ پھر بھی میں نے اسے پیچھے اندھیرے میں کھینچا اور سفوف کی پوٹلی اس کی ناک کے ساتھ لگا دی۔

دس سیکنڈ تک پوٹلی اس کی ناک پر چڑھائے رکھی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ پوری طرح بے ہوش ہو چکا ہو گا۔ تو تیزی سے جنگلا کھول کر برآمدے میں داخل ہو گیا۔ یہاں پھانسی کی چار کوٹھریوں میں سے تین کوٹھریاں خالی پڑی تھیں۔ چوتھی کوٹھری میں اکبر خان کا بیٹا امجد خان اندھیرے میں دیوار سے ٹیک لگائے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ شاید وہ خدا کو یاد کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ جاگ رہا تھا۔

میرا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ اگرچہ میری آواز امجد خان کی آواز تھی تاہم میں نے اپنی اواز بدل کر اسے کہا۔ "امجد خان باہر آ جاؤ۔ میں قبائلی علاقے سے تمہیں نکال لے جانے آیا ہوں راستہ صاف ہے۔"

امجد خان ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ یہاں بھی کوٹھری کے سلاخ دار آہنی دروازے پر تالا پڑا تھا۔ امجد خان اپنے قبائلی علاقے کے لوگوں کی دلیری سے واقف تھا۔ اسے بہت جلد یقین آ گیا کہ میں اس کے باپ کا کوئی قبائلی دوست ہوں اور اسے لے جانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا کر وہاں آیا ہوں۔ اس نے پشتو میں کہا تالا لگا ہے۔

میں نے تالے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ تالہ ٹوٹ گیا۔ میں نے امجد کو پشتو ہی میں کہا۔ "تیزی سے میرے ساتھ آؤ۔ جیل کی دیوار کے باہر تمہارا باپ اور ہمارا ایک قبائلی سردار تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ جلدی کرو۔ میں نے راستہ صاف کر دیا ہے۔"

میں نے اپنی آواز کو بدل کر کافی بھاری بنا لیا تھا تاکہ امجد کو میری آواز پر اپنی آواز کا شبہ نہ ہو۔ ویسے بھی اس کی زندگی اور موت کا سوال تھا اس کا دھیان ان باتوں کی طرف نہیں جا سکتا تھا۔ وہ جیل کے کپڑوں میں تھا۔ میں اسے اندھیرے میں سے گذار کر دیوار کے نیچے لے آیا۔ یہاں میں نے اسے پشتو میں کہا "جلدی سے اپنے کپڑے اتار کر مجھے دے دو اور میرے کپڑے تم پہن لو۔"

وہ تعجب سے اندھیرے میں مجھے تکنے لگا۔ میں نے غصے سے کہا۔ "کیا دیکھ رہے ہو۔ جلدی کرو۔ کپڑے اتارو ورنہ پھانسی لگ جاؤ گے۔"

امجد خان نے جلدی سے جیل کے کپڑے اتار دئے۔ میں نے اپنے کپڑے اتار کر امجد کے کپڑے پہن لئے اور اسے اپنی پتلون جیکٹ اور نسواری بوٹ پہنا دئے۔ بے ہوشی

کے سفوف کی پوٹلی وہیں جھاڑیوں میں ایک جگہ مٹی کھود کر دبائی اور اس کا ہاتھ نائیلون کی رسی پر رکھ کر کہا۔ "اس رسی کے ذریعے دیوار پھاند جاؤ۔ تمہارا باپ دوسری طرف کھائی میں تمہارے لئے قبائلی لباس لئے چھپا بیٹھا ہے۔ دیر نہ کرو۔ کوئی آ گیا تو سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔"

امجد خان رسی پکڑ کر دیوار پر چڑھنے لگا۔ نوجوان تھا۔ زندگی کا حسین دروازہ اس کے لئے موت کی تاریکیوں میں کھل گیا تھا۔ اس کے اندر زبردست جوش اور طاقت آ گئی تھی۔ دیکھتے دیکھتے وہ دیوار کے اوپر پہنچ کر دوسری طرف اتر گیا۔ جونہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا میں اندھیرے میں تیز تیز چلتا پھانسی کی کوٹھری والے کوارٹر کی طرف بڑھا۔ اپنے منہ سے نقاب اتار کر دیا۔ اب میں نے ان سپاہیوں کی بالکل پرواہ نہ کی جو ادھر ادھر بے ہوش پڑے تھے۔ جو سپاہی جنگلے کے آگے بے ہوش پڑا تھا۔ اسے میں کھینچ کر اندھیرے میں درختوں کے نیچے لے گیا۔ جنگلے کو کھول کر پھانسی کی کوٹھریوں کے سامنے والے تنگ برآمدے میں آیا۔ اس برآمدے میں چھت نہیں تھی۔ آسمان پر تارے ماند پڑنے لگے تھے۔ میری پھانسی کی کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا۔ تالا کنڈے میں لٹک رہا تھا۔

میں اپنی پھانسی کی کوٹھری میں داخل ہو کر میلے کچیلے کمبل پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد مجھے کھلے تالے کا خیال آ گیا۔ اٹھ کر دیکھا= تالا کنڈے میں لٹک رہا تھا۔ وہ ٹوٹا نہیں تھا اس کا کنڈا نکل گیا تھا۔ میں نے سلاخوں میں سے ہاتھ باہر نکال کر اس کے کنڈے کو دوبارہ تالے میں ڈال کر زور سے دبایا تالا کٹک کی آواز کے ساتھ دوبارہ جڑ گیا۔ یہ بھی میری گرفت کی غیر معمولی طاقت کی کرامت تھی۔ ورنہ اتنا مضبوط تالا دوبارہ نہیں جڑ سکتا تھا۔

اب میں امجد خان قاتل قیدی کے روپ میں اندھیری کوٹھری میں خاموش بیٹھا تھا۔ وہی شکل صورت وہی آواز، وہی جسم، وہی انگلیاں، کچھ بھی فرق نہیں تھا۔ کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہو سکتا تھا کہ میں امجد خان نہیں ہوں۔ باقی جن سپاہیوں اور پہرے داروں کو میں نے بے ہوش کیا تھا ان کی مجھے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ کیونکہ مجھ پر شبہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کون پھانسی والا ایسا ہو گا کہ کوٹھری کا دروازہ کھول کر بے ہوش کر کے دیوار پر کمند ڈالے اور پھر فرار ہونے کی بجائے اپنی موت کی کوٹھری میں واپس آ کر بیٹھ جائے اگر بے ہوش سپاہیوں اور پہرے داروں اور جنگلے کی سلاخوں اور تالے پر میری انگلیوں کے نشان پولیس کو مل بھی جاتے ہیں تو کسی کا میری طرف دھیان ہی نہیں جا سکتا تھا۔ پولیس ان نشانوں کو غنڈوں کی انگلیوں کے نشانوں سے ملاتی جن کا ریکارڈ ان کے پاس

موجود ہوتا ہے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ یہ میری انگلیوں کے نشان ہیں اور میں نے ہی تالا توڑا اور پہرے داروں کو بے ہوش کیا تھا اور دیوار پر کمند پھینکی تھی۔ کیونکہ اگر یہ سب کچھ میرا کارنامہ تھا تو آخر میں فرار کیوں نہیں ہوا؟ پھانسی کی کوٹھری میں واپس کیوں آ گیا؟

ابھی تک جیل میں کسی کو بے ہوش سپاہی اور دو پہرے داروں کے بارے میں علم نہیں ہوا تھا۔ رات آہستہ آہستہ ڈھلنے لگی تھی۔ ستاروں کی چمک ماند پڑ رہی تھی۔ میں بڑا خوش تھا کہ میرا مشن کامیاب رہا اور امجد خان اس وقت اپنے باپ اور اس کے قبائلی جانثار دوست کے ساتھ تیز رفتار جیپ میں بیٹھا کہیں کا کہیں نکل گیا ہو گا۔

اتنے میں جیل کی مسجد سے صبح کی اذان کی صدا بلند ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد باہر شور مچ گیا۔ آدمیوں کے دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کھٹاک کھٹاک سے پولیس کی پوری گارڈ برآمدے میں سے گذر کر میری کوٹھری کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ کوٹھری کے باہر لوہے کے جنگلے پر لگے تالے کو چیک کیا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ تالا کھلا نہیں۔ ورنہ تفتیش کی لکیر میری کوٹھری کے اندر تک آ جاتی اور ہو سکتا ہے کہ معاملہ کچھ ٹیڑھی صورت اختیار کر لیتا کہ آخر کون شخص تالا کھول کر میری کوٹھری میں آیا اور پھر مجھے وہیں چھوڑ کر واپس بھی چلا گیا۔

بہرحال میں غمگین شکل بنائے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ میں نے آنکھ اٹھا کر بھی کسی سپاہی کی طرف دیکھا۔ مجھے پتہ بھی نہیں چل سکتا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے اور پولیس کن لائینوں پر جیل کے اندر کسی اجنبی آدمی کے آنے کے بارے میں تفتیش کر رہی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل، وارڈن، اسسٹنٹ وارڈن سبھی میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ سے تھوڑی بہت پوچھ گچھ بھی کی کہ میں نے رات کو کسی کو برآمدے میں آتے دیکھا ہے کہ نہیں؟

میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "میں تو موت کی گھڑیاں گن رہا ہوں۔ صبح شام خدا کی عبادت میں مصروف رہتا ہوں۔ میری بلا سے کوئی آئے یا نہ آئے۔"

جیل کے حکام کو اس بات کی بے حد تسلی اور اطمینان تھا کہ میں یعنی پرسوں پھانسی پانے والا قاتل اپنی کوٹھری میں موجود تھا۔ ویسے بھی جیل سے کوئی قیدی فرار نہیں ہوا تھا۔ ظاہر ہے پولیس اس نتیجے پر پہنچی ہو گی کہ کوئی شخص جیل کی دیوار پھاند کر اپنے کسی ساتھی قیدی کو نکال لے جانے آیا مگر کسی وجہ سے وہ اپنے منصوبے پر عمل نہ کر سکا اور پہرے داروں اور ایک سپاہی کو بے ہوش کرنے کے بعد خود ہی بھاگ گیا۔ میری کوٹھری کے باہر

انتظام سخت کر دیئے گئے۔ چار مسلح سپاہی ہر وقت پہرے پر لگا دیئے گئے۔ مجھے تسبیح اور سپارہ لا کر دے دیا گیا۔ میں سر جھکائے بیٹھا بڑے سکون سے یاد الٰہی میں مشغول رہتا۔ دن گذر گیا۔ دوسرا دن آ گیا۔ مجھے ابھی تک پھانسی کی تاریخ اور وقت نہیں بتایا گیا۔ لیکن مجھے امجد خان کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ آج میری ماں باپ سے ملاقات ہے اور آج ہی رات کے پچھلے پہر مجھے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔"

دن چڑھا تو سپرنٹنڈنٹ نے آ کر مجھے بتایا کہ آج سہ پہر میری آخری ملاقات ہو گی۔

میں سر جھکا کر خاموش ہو رہا۔

تیسرے پہر مجھے مسلح سپاہیوں کے نرغے میں پھانسی کی کوٹھری سے نکال کر ملاقاتی برآمدے میں لوہے کے جنگلے کے پاس بٹھا دیا گیا۔ میں نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ امجد خان کا باپ اکبر خان اہل محلہ اور اپنے دو تین بزرگ رشتہ دار پٹھانوں کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا میری طرف آ رہا تھا آتے ہی اس نے سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر میرے سر کو تھام لیا اور رونے لگا۔ بڑی صحیح اداکاری کر رہا تھا۔ پھر اس نے سہمی سہمی نظریں میرے چہرے پر جمائیں اور آہستہ سے پوچھا۔ "تم میرے بیٹے نہیں ہو ناں؟"

اس وقت محلے کے لوگ ذرا پرے کھڑے تھے۔

بوڑھے اکبر خان کی آواز کپکپا رہی تھی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ وہ جیل میں اپنے بیٹے سے آخری ملاقات کرنے آیا تھا اور اسی سے پوچھ رہا تھا کہ تم میرے بیٹے تو نہیں ہو؟ اسے یہی پوچھنا چاہئے تھا۔ یہی یقین دہانی اس وقت اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "میں عبداللہ ہوں۔ امجد خان کو تم ساتھ لے گئے تھے۔"

پھر بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یقین کیسے آتا۔ جو نوجوان جیل کے کپڑوں میں اس کے سامنے لوہے کے جنگلے کے پیچھے بیٹھا تھا' ہو بہو اس کا بیٹا امجد تھا۔ وہی قد کاٹھ ' وہی جسم ' وہی آنکھیں ' ناک ' کان آواز۔ کوئی شے بھی اس کے اپنے بیٹے سے مختلف نہیں تھی۔ میں نے جب ذرا بلند مگر رنجیدہ آواز میں پوچھا کہ میری ماں اور بہن مجھ سے آخری ملاقات کرنے کیوں نہیں آئیں تو وہ سچ مچ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اس وقت وہ اداکاری نہیں کر رہا تھا۔ روتے ہوئے کہنے لگا۔ "تیری ماں تجھ کو آخری بار نہیں دیکھ سکتی بیٹا۔" اور وہ آہنی جنگلے کے ساتھ سر لگا کر رونے لگا۔ میں نے ایک محبت کرنے والے بیٹے کی طرح اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور کان میں سرگوشی کی۔ "اکبر خان! میں عبداللہ ہوں۔ تمہارا بیٹا نہیں ہوں۔"

محلے کے لوگ بھی سہمے سہمے سے مجھے تکتے آگے بڑھے اور باری باری مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اکبر خان کے رشتے داروں نے میرے ماتھے کو چوما۔ وہ واقعی مجھے امجد خان ہی سمجھ رہے تھے۔ انہیں سمجھنا ہی چاہئے تھے۔ دو مسلح سپاہی میرے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ میں نے سب لوگوں سے کہا کہ مجھے اپنے باپ سے علیحدگی میں ایک بات کرنی ہے۔ وہ پرے پرے ہٹ گئے۔ میں نے اکبر خان سے آہستہ سے کہا۔ "امجد خان کو تم لے گئے تھے نا؟"

اکبر خان نے چادر سے آنسو پونچھے اور بولا۔ "ہاں .... اگر وہی میرا بیٹا ہے تو وہ اس وقت غیر علاقے میں ہے۔"

میں نے سرگوشی کی۔ "اکبر خان یقین کرو کہ وہی اصلی امجد خان ہے۔ میں اس کی نقل ہوں۔ کل صبح میری لاش لینے ضرور آنا۔ مجھے قبرستان میں دفن کرنے کے بعد یہاں سے ہمیشہ کے لئے گاؤں چلے جانا اور پھر کبھی پنجاب نہ آنا۔"

اکبر خان جیسے گم صم تھا۔ میں نے اس سے اس کے گاؤں کا پوچھا۔ اس نے مجھے اپنے گاؤں کا مختصر سا پتہ بتایا جو میں نے یاد کر لیا۔ اتنے میں سپاہی نے کہا۔ "ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔"

اکبر خان نے میرا ماتھا چوما اور روتے روتے چہرہ چادر میں چھپا لیا۔ محلے کے لوگوں نے مجھ سے اپنی دانست میں آخری بار ہاتھ ملایا اور اکبر خان کو سہارا دے کر کھڑے ہو گئے۔ سپاہی مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے پھانسی کی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ منہ اندھیرے چار بجے مجھے پھانسی دی جانے والی تھی۔ مجھ سے وصیت لکھوانے کے بارے میں پوچھا گیا۔ میں نے کہا کہ مجھے جو وصیت کرنی تھی اپنے باپ کو بتا دی ہے۔

رات کو وارڈن نے آ کر کہا کہ یہ میرا آخری کھانا ہے' جو پسند ہے بتا دوں۔ میں نے کھانے سے انکار کر دیا اور سر جھکائے تسبیح پھیرتا رہا۔ میری کوٹھری کے باہر غیر معمولی نقل و حرکت جاری رہی۔ قریباً" ساڑھے تین بجے پچھلے پہر ایک ڈاکٹر صاحب' مولوی صاحب' سپرنٹنڈنٹ جیل اور وارڈن میری کوٹھری میں آئے۔ مجھے گرم پانی سے غسل کروا کر پھانسی والے کپڑے پہنا دئے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا طبی معائنہ کیا۔ مولوی صاحب مجھے قرآنی آیات کا ورد کرا رہے تھے۔ جیل کے دو ملازموں نے مجھے سہارا دیا اور بازوؤں سے تھام کر کوٹھری سے باہر لے آئے۔

میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ بڑے ہی چمکیلے اور خوبصورت ستارے جھلملا رہے تھے۔ مشرق کی سمت نور کا ایک غبار پھیل رہا تھا' اگر یہ میری زندگی کی آخری صبح ہوتی تو واقعی مجھے اتنی خوبصورت دنیا چھوڑنے کا بہت دکھ ہوتا' لیکن ایسا نہیں تھا' مجھے اس جگہ لایا گیا' جہاں ایک اونچے چبوترے پر پھانسی گھر تھا۔ دو آدمی چبوترے پر چاق وچوبند کھڑے تھے۔ ان میں ایک جلاد تھا اور دوسرا جیل کا کوئی افسر۔ میں جان بوجھ کر ذرا سا لڑکھڑایا۔ مجھے جلدی سے سہارا دیا گیا۔ مولوی صاحب نے خدا کو یاد کرنے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کی تلقین کی۔ میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر پھانسی کے چبوترے پر آ گیا۔ فوراً" جیل کے افسر نے مجھے تختے پر کھڑا کر دیا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے عدالت کا حکم پڑھ کر سنایا۔

جو افسر میرے پاس کھڑا تھا' اس نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر میرے منہ پر کالا نقاب ڈال دیا اور رسی میرے گلے میں کس دی۔ اس کے دو سیکنڈ بعد میرے پاؤں کے نیچے سے تختہ کھسک گیا اور میں لٹک گیا۔ میرا جسم رسی کے ساتھ لٹکا جھول رہا تھا۔ کچھ دیر میں اس طرح جھولتا رہا' پھر مجھے فرش پر لٹا دیا گیا۔ کسی نے میرے سینے پر سٹیتھو اسکوپ رکھ دی۔ یہ ڈاکٹر صاحب تھے' جو یہ چیک کر رہے تھے کہ میری جان نکلی ہے کہ نہیں۔ میں نے اپنے جسم کو اکڑا کر پتھر بنا لیا۔ مجھے ڈاکٹر کی آواز سنائی دی۔ اس نے میری موت کا اعلان کر دیا تھا۔ میرے کالے کپڑے اتار کر دوسرے کپڑے پہنائے گئے۔ چہرے سے نقاب بھی اتار دیا گیا۔ میں نے اپنی آنکھیں تھوڑی سی کھلی رکھی تھیں' تاکہ باہر کا نظارہ کر سکوں۔ دیکھنے پر میری آنکھیں پتھر کی طرح مردہ اور ساکت لگتی تھیں' لیکن حقیقت میں' میں زندہ تھا اور ان آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میری لاش کو چارپائی پر ڈال کر جیل کے بڑے گیٹ پر رکھ دیا۔ میں نے ایک بوڑھے قیدی کو دیکھا' جو ذرا دور برآمدے میں میری طرف منہ کیے فاتحہ پڑھ رہا تھا۔

سورج نکلنے کے ساتھ ہی میری ہدایت کے مطابق اکبر خان اپنے بیٹے کی لاش لینے آ گیا۔ دو چار رشتے دار اس کے ساتھ تھے۔ میری لاش دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ رشتے داروں نے اسے سہارا دے کر پیچھے کر لیا۔ میری لاش ایک ویگن میں ڈال کر گھر لائی گئی۔ پھر مجھے غسل دے کر کفنایا گیا اور ... تابوت میں رکھ کر پھولوں سے لاد دیا گیا۔ مجھے اکبر خان کے رونے کی آواز آ رہی تھی' پھر میرا جنازہ قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔

شہر کے باہر قبرستان میں میری قبر پہلے سے تیار تھی۔ اکبر خان اور اس کے رشتے داروں نے مل کر میری لاش کو لحد میں اتارا' پھر مجھ پر مٹی گرنے لگی۔ میرے سر کی جانب کفن کی گرہ کھول دی گئی تھی۔ لیکن کفن کا پلو میرے چہرے پر ہی تھا۔ لحد کو کچی مٹی کی اینٹوں سے بند کر دیا۔ لحد میں اندھیرا ہوتے ہی میں نے ہاتھ نکال کر چہرے پر سے کفن کا پلو ہٹایا۔ ناک میں ٹھونسی ہوئی روئی کے پھاہے باہر نکالے۔ مجھے سارا دن اسی طرح پڑے رہنا تھا۔ کیونکہ میں رات کے اندھیرے میں قبر سے نکلنا چاہتا تھا۔ جب قبرستان تاریکی میں ڈوبا ہوا ہو' اور مجھے کوئی نہ دیکھ سکے۔ مجھے قبر میں مٹی کے گرنے اور بیلچہ چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں' پھر قبر کو کسی شے سے تھپتھپانے کی آواز آنے لگی۔ شاید قبر کی ڈھیری بنائی جا رہی تھی۔ مجھے قبر کے آس پاس لوگوں کے قدموں اور باتیں کرنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں بڑی مدھم تھیں۔ آہستہ آہستہ یہ آوازیں آنا بند ہو گئیں' پھر ایک گہرا اور ناقابل برداشت سناٹا چھا گیا۔

اچانک ایک خیال سے میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ قبر میں کہیں میرا حساب

کتاب نہ شروع ہو جائے' لیکن میں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ میں مرا نہیں ہوں' بلکہ زندہ ہوں اور حساب کتاب تو مردے کا ہوتا ہے۔ مجھے اپنی ٹانگوں کے ساتھ کوئی شے رینگتی محسوس ہوئی۔ میں نے کفن کے اندر ہاتھ ڈالا تو پھنکار کی آواز آئی۔ یہ کوئی سانپ تھا۔ کم بخت ابھی مردے کو دفن ہوئے دو منٹ ہی گزرے تھے کہ یہ آن وار ہوا۔ میں نے اس کو پکڑا اور اس نے میرے ہاتھ پر ڈس دیا۔ میں نے اسے گردن سے دبوچ لیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا سر اوپر لحد کی چھت سے ٹکرا رہا تھا۔ سانپ میری کلائی سے لپٹا زور لگا رہا تھا۔ سانپ کو کچل کر میں نے لحد کے کونے میں پھینک دیا۔ ابھی مجھے آٹھ دس گھنٹے اسی لحد میں گزارنے تھے۔ میں نے کفن کو اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا۔ لحد کے گھپ اندھیرے میں مجھے پہلو کی کچی دیوار میں پھنسی ہوئی مردوں کی ہڈیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ طرح طرح کے کیڑے مکوڑوں نے میری ٹانگوں اور بازوؤں اور گردن پر رینگنا شروع کر دیا۔ لحد کی بند فضا میں .... آکسیجن آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ مجھے باقاعدہ اس کا یوں احساس ہو رہا تھا کہ سانس لینے میں تو تکلیف تو نہیں ہو رہی تھی' لیکن حلق بتدریج کڑوا ہونے لگا تھا۔ یہ آکسیجن کی کمی اور دوسری مہلک گیسوں کی زیادتی کا اثر تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں اپنی اصلی شکل میں واپس آ جاؤں۔ اب مجھے امجد خان کے حلیئے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں پاک صاف ہی تھا۔ فوراً" آنکھیں بند کر کے خدا کے حضور توبہ استغفار پڑھی۔ سرسوتی دیوی کا خیال کر کے اپنی شکل کا تصور جمایا اور گندھرو اشلوک کو سات بار پڑھا۔ آنکھیں کھول کر اندھیرے میں اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ یہ میرے اپنے ہاتھ تھے۔ چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ میرا ناک' آنکھیں' ہونٹ' ماتھا' بال اور کان مجھے واپس مل گئے تھے۔ میں اپنی شکل اختیار کر چکا تھا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور لحد میں اکڑوں بیٹھ کر رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر تک تو مجھے وقت کا احساس رہا' پھر یہ احساس ختم ہو گیا۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ وقت گزر رہا ہے۔ یا ایک مقام پر آ کر ٹھہر گیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق جب مجھے تاریک اور ڈراؤنی لحد میں بیٹھے اور کیڑے مکوڑوں کو مارتے مارتے چھ سات گھنٹے گزر گئے تو میں نے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا۔

لحد کی کچی اینٹ کو اکھاڑا تو اندر مٹی آ گئی۔ جب ساری اینٹیں ہٹ گئیں تو لحد میں مٹی ہی مٹی بھر گئی۔ میں لحد سے نکل کر قبر کے گڑھے میں اس طرح بیٹھا تھا کہ میرا جسم سینے سے اوپر مٹی سے باہر تھا۔ باقی سارا دھڑ نرم اور نم دار مٹی میں دفن تھا۔ میں خاموشی

سے قبر کے اندر ہی مٹی میں دبا رہا۔ جب روشنی اندھیرے میں بدل گئی تو میں قبر سے رینگ کر باہر نکل آیا۔ میرا سارا کفن اور جسم مٹی سے لتھڑا ہوا تھا۔

قبرستان میں رات کا اولین اندھیرا پھیلا تھا اور گہری خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں دور سڑک پر کسی ٹرک کے گزرنے کی آواز کبھی کبھی آ جاتی تھی۔ میں اس قبرستان کے تمام راستوں سے واقف تھا۔ کیونکہ میں اکثر جڑی بوٹیاں جمع کرنے آیا کرتا تھا۔

قبرستان کے شمال میں ایک کنواں تھا۔ جس کے پاس ہی ہینڈ پمپ لگا تھا۔ میں قبروں کے درمیان سے ہوتا جھاڑیوں کی آڑ لیتا اس ہینڈ پمپ کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔

میں نے یہاں غسل کر کے کفن دھویا۔ اسے نچوڑا اور دھوتی کی طرح باندھ لیا۔ اب میرے جسم پر سوائے ایک دھوتی کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں اپنی اصلی شکل میں تھا۔ یعنی میں اپنے لئے عاطون تھا اور اپنے اہل محلہ کے لئے عبداللہ جڑی بوٹیوں والا تھا۔ ابھی رات کا پہلا پہر تھا۔ میں کچھ رات گزرنے کے بعد اپنے مکان پر جانا چاہتا تھا۔

قبرستان نے کافی جگہ گھیر رکھی تھی۔ قبرستان کی دیوار کوئی نہیں تھی۔ مغرب کی طرف شہر کے مکانوں اور سڑکوں کی بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں قبرستان کے کنارے ایک کچی قبر کے چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا۔ میرے چاروں جانب تاریکی اور گہرا سناٹا پھیلا تھا۔ رات خنک تھی۔ مجھے سردی بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ اپنی قبر سے نکلنے کے بعد میں نے قبر کی پھر سے ڈھیری بنا دی تھی تاکہ کسی کو شک نہ پڑے کہ اس قبر سے کوئی باہر نکلا ہے یا کوئی قبر میں سے مردہ نکال کر لے گیا ہے۔

جہاں میں بیٹھا تھا' وہاں اگرچہ قبرستان ختم ہو جاتا تھا لیکن آگے کوئی آبادی نہیں تھی۔ دور ایک کچی سڑک سے کبھی کبھی کوئی ٹرک گزر جاتا تھا۔ یہ سڑک ریلوے اسٹیشن کے پہلو سے ہو کر گزرتی تھی۔ جب رات کافی گہری ہو گئی تو میں قبر کے چبوترے سے اٹھ کر سڑک کی طرف چلا۔ جو کفن میں نے دھوتی کی طرح باندھ رکھا تھا' لحد کی مٹی لگنے سے میلا ہو گیا تھا۔ اگرچہ میں نے اسے پمپ کے پانی سے دھویا بھی تھا' لیکن اس کی سفیدی اور اجلا پن واپس نہیں آیا تھا' جو میرے لئے اچھی بات تھی۔ اچانک کوئی ٹھوس چیز میرے پاؤں سے ٹکرائی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ یہ پیتل کے سانپ کا چھوٹا سا بت تھا جو کنڈلی مارے پھن اٹھائے بیٹھا تھا۔ میں اسے ہتھیلی پر رکھ کر غور سے دیکھنے لگا۔ چھوٹے سائز کا بت تھا۔ پیتل کے سانپ کی آنکھوں میں سرخ شیشے کے دو ذرے جڑے تھے' جو اندھیرے میں چمک رہے تھے۔ اس شہر میں ہندوؤں کی کافی آبادی تھی' جو نقل وطن کر کے ہندوستان

چلے گئے تھے۔ ہندو لوگ سانپ کو متبرک سمجھتے ہیں۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے یہ کسی ہندو کے گھر سے نکلا ہو' اور کسی نے اسے منحوس سمجھ کر کوڑے میں یہاں پھینک دیا ہو۔

مجھے یہ سانپ کا بت اچھا لگا۔ میں نے اسے اپنی مٹھی میں تھام لیا اور اونچا نیچا عبور کر کے سڑک پر آ گیا۔ یہاں دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سڑک پار کی اور دوسری طرف کے کھیتوں ...... سے نکل کر ایک ذیلی سڑک پر آ گیا۔ یہ سڑک آگے جا کر اس سڑک سے مل جاتی تھی۔ جو ہمارے محلے کے سامنے سے گزرتی تھی۔ یہاں ایک خالی تانگہ چلا آ رہا تھا۔ میں ایک درخت کے پیچھے ہو گیا۔ جب تانگہ گزر گیا تو سڑک کے کنارے کنارے چل دیا۔

آخر اپنے محلے کے سامنے پہنچ گیا۔ گلی میں جو دو چار دکانیں تھیں وہ بند ہو چکی تھیں۔ دور گلی کے کونے میں ایک بلب جل رہا تھا۔ باقی ساری گلی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میرے لئے یہ بڑا اچھا موقع تھا' دوڑ کر گلی میں داخل ہو گیا اور مکانوں کے ساتھ ساتھ چلتا اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں گھس گیا۔

میں نے پیتل کے سانپ کی مورتی کو دوسری الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔

بتی جلا کر سب سے پہلے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ خدا کا شکر تھا کہ میں اپنی اصل شکل واپس آ چکا تھا۔ میں نے کفن اتار کر دوسرے کپڑے پہنے اور بتی بجھا کر بستر پر لیٹ گیا۔

صبح ہوئی تو گلی میں لوگوں کی چہل پہل شروع ہو گئی۔ کوئی نو بجے کے قریب میں لباس تبدیل کرنے کے بعد مکان سے نکلا اور اکبر خان کے ٹال پر آ گیا۔ دروازہ بند تھا۔ دستک دی۔ اکبر خان نے خود دروازہ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ پھر دروازے کو کنڈی لگائی اور مجھے دوسری منزل میں لے جا کر بولا۔ "عبداللہ خان! تم آ گئے۔ تم .... تم قبر سے نکل کر آئے ہو' نا۔ میرا مطلب ہے میرا بچہ گاؤں میں زندہ ہے نا؟"

میں نے مسکرا کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "اکبر خان۔ خداوند کریم کا شکر ادا کرو۔ تمہارے بیٹے کی ابھی زندگی لکھی ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بچا لیا۔ وہ وہیں ہو گا۔ جہاں تم اسے چھوڑ آئے ہو۔ اب تم ایسا کرو کہ دو ایک دن میں اپنا ٹال وغیرہ بیچ کر اس شہر سے ہمیشہ کے لئے واپس اپنے قبائلی گاؤں .... جا کر آباد ہو جاؤ اور مجھے بھی بھول جاؤ۔"

اکبر خان نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور آبدیدہ ہو کر بولا۔ "عبداللہ خان۔ میرے بچے۔ میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ تم نے مجھ پر وہ احسان کیا ہے کہ جب تک زندہ ہوں

تمہارا شکر گزار رہوں گا اور تمہارے لئے دعائیں کرتا رہوں گا۔"

میں اسے تسلی دے کر چلا آیا۔ اب میرا یہاں رہنا کچھ مناسب نہیں تھا۔ میں ویسے بھی سیلانی تھا۔ خیال تھا اس شہر میں دو ایک سال گزاروں گا۔ یا کم از کم اس وقت تک رہوں گا جب تک کہ کوئی حادثہ مجھے اچانک کسی اگلے زمانے میں نہیں پہنچا دیتا۔ لیکن حالات کچھ ایسی شکل اختیار کر گئے تھے کہ اب میرا وہاں رہنے کو دل نہیں مانتا تھا۔ چنانچہ میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ کس شہر کا رخ کیا جائے؟

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس اثنا میں اکبر خان اپنے ٹال کو اونے پونے بیچ کر اپنے قبائلی علاقے کی طرف کوچ کر گیا۔ میں ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا کہ کس شہر کو اپنا مسکن بناؤں۔

محلے میں مقتول غنڈے کے بڑے بھائی شابو نے اپنی مجرمانہ سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔ اس اڈے پر جرائم پیشہ لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ چرس' شراب اور افیون کا ناجائز کاروبار پھر سے شروع ہو گیا تھا۔ چونکہ اسے پولیس کی چند کالی بھیڑوں کی حمایت حاصل تھی۔ اس لئے محلے کا کوئی آدمی ان پر ہاتھ نہیں ڈالتا تھا۔

شابو غنڈہ اور اس کے چیلے چانٹے محلے میں دندناتے پھرتے تھے۔ مجھے ان لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ کام پولیس اور محلے داروں کا تھا' اگر وہ کچھ نہیں کرتے تھے تو مجھے خوامخواہ ان کا لیڈر بننے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

لیکن ایک ایسا افسوسناک واقعہ ہو گیا کہ مجھے میدان میں کودنا پڑ گیا۔ محلے کے ایک شریف آدمی کی نوجوان بیٹی کالج سے واپس آ رہی تھی۔ جب وہ گلی میں پہنچی تو شابو کے چار غنڈے اپنے مکان کے آگے چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ لڑکی سیاہ برقعے میں تھی۔ اس نے کتابیں اٹھا رکھی تھیں۔ میں اتفاق سے اپنے مکان کی دوسری منزل کی کھڑکی میں بیٹھا گلی میں جھانک رہا تھا۔ جب لڑکی ان غنڈوں کے قریب سے گزری تو انہوں نے لڑکی کو چھیڑا۔ لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ شریف بچی غنڈوں کو کیا جواب دیتی۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ایک غنڈہ چارپائی سے اٹھا اور اس نے لڑکی کا راستہ روک لیا۔ جس طرف لڑکی جاتی غنڈہ اس کے آگے آ جاتا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ہنس رہا تھا۔ دوسرے غنڈے بھی لڑکی سے مذاق کرنے اور اس پر واہیات قسم کی آوازیں کسنے لگے۔ اتنے میں غنڈے نے لڑکی کا نقاب زبردستی الٹ دیا۔ پردہ پوش نیک بچی وہیں روتے ہوئے بیٹھ گئی۔

غنڈے قہقہے لگانے لگے۔ اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں سیڑھیاں اتر کر گلی میں .... غنڈوں کے پاس آ گیا۔ لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "چلو بہن۔ تمہیں گھر چھوڑ

آؤں۔"

"اوئے یہ اس کی بہن ہے۔" ایک غنڈہ بولا۔

دوسرا چلایا۔ "اوئے اس کی بہن کو اٹھا لے جاؤ۔"

مگر کسی غنڈے نے میرا راستہ نہ روکا میں لڑکی کو اس کے گھر چھوڑ کر واپس آیا اور غنڈوں سے کہا کہ وہ محلے میں چاہے جو کچھ کریں مگر محلے والوں کی عزت سے نہ کھیلیں۔ غنڈے مجھ سے بھی مذاق کرنے لگے۔ میں ان کی تھوڑی بہت سرزنش کر کے اپنے مکان میں آگیا۔ دوپہر کے بعد میں کچھ قیمتی جڑی بوٹیاں اپنے بریف کیس میں ڈالے بازار جانے والا تھا کہ ملازم لڑکے نے آ کر بتایا' باہر کوئی مجھے بلا رہا ہے۔ میں نے بریف کیس وہیں تخت پر رکھا اور دروازے پر آگیا۔ یہاں ان چار غنڈوں میں سے ایک غنڈہ کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔ استاد شابو نے تمہیں بلایا ہے۔ اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

میں آخر بیس بائیس برس کا نوجوان لڑکا ہی تھا۔ ان کے سامنے میری کیا حیثیت تھی۔ چنانچہ غنڈے کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو کوئی بات نہیں۔ ان کے سرغنہ شابو کو ہی جا کے سمجھاتا ہوں کہ کم از کم اپنے محلے میں انہیں شریف بن کر رہنا چاہئے اور شریف، لوگوں کی بہو' بیٹیوں کو تنگ نہیں کرنا چاہئے۔ میں غنڈے کے ساتھ چل پڑا۔

شابو اپنے مکان کی بیٹھک میں اس شان سے تخت پر بیٹھا تھا کہ دو آدمی اس کے کاندھے دبا رہے تھے۔ ایک اس کے قدموں میں بیٹھا پاؤں دبا رہا تھا۔ شابو شکل ہی سے خونی لگتا تھا۔ گہرا سانولا رنگ ' بھینسے ایسا جسم ' چہرے پر زخم کا گہرا نشان ۔ پستول کی پیٹی اس کے پاس ہی تخت پر پڑی تھی۔

میں نے جاتے ہی بڑے ادب سے سلام کیا اور کہا "آپ نے مجھے یاد کیا تھا شابو صاحب۔"

شابو نے مجھے ترچھی آنکھ سے دیکھا اور مجھے مونڈھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ شابو بولا۔

"سنا ہے تم نے میرے آدمیوں کو دھمکیاں دی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں نے کسی کو دھمکی نہیں دی شابو صاحب۔ آپ کے ان چار آدمیوں نے محلے کی ایک شریف لڑکی کے ساتھ نازیبا سلوک کیا تھا' جس پر میں نے انہیں منع کیا کہ انہیں ایسی حرکتوں سے باز رہنا چاہئے۔"

شابو نے طیش میں آکر کہا۔ "اوئے تم ماے لگتے ہو محلے کی لڑکیوں کے؟"

میں نے کہا۔ "ماموں تو میں کسی کا بھی نہیں لگتا' لیکن میں ہر لڑکی کا احترام کرتا

ہوں اور احترام کروانے کے حق میں ہوں۔"

اب تو شابو غصے سے بھڑک اٹھا۔ "اچھا۔ تو تم ہم پر اب حکم چلاؤ گے۔ ہم سے احترام کرواؤ گے۔"

جو غنڈے اس کے کاندھے دبا رہے تھے اس نے انہیں شانے جھٹک کر پیچھے کر دیا۔ جو اس کا پاؤں دبا رہا تھا اس نے پستول کی پیٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔ جو غنڈہ مجھے وہاں لایا تھا اس نے خنجر نکال لیا۔ یہ چاروں وہی غنڈے تھے' جنہوں نے تھوڑی دیر پہلے گلی میں ایک شریف لڑکی کی بے عزتی کی تھی۔ شابو نے تہمد باندھ رکھا تھا۔ تہمد کی ڈھب میں ' اس کا اپنا پستول تھا۔ اس نے ڈھب سے پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں لہرایا اور بولا۔ "اس کو پہچانتے ہو؟ یہ کیا ہے؟"

"یہ پستول ہے۔" میں نے بڑے سکون سے کہا۔

شابو آگے بڑھ کر تخت کے کنارے آگیا۔ اس کے پاؤں اب فرش پر ٹکے تھے۔ خونخوار چہرے پر خون آشامی کے اثرات ہویدا تھے۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "لڑکے مجھے تمہاری جوانی پر ترس آتا ہے۔ میں تمہاری جان بخشی کرتا ہوں۔ خبردار' آئندہ ہمارے معاملے میں دخل مت دینا۔ جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "شابو صاحب۔ آپ اپنے آدمیوں کو بھی سمجھا دیں کہ وہ آئندہ محلے میں کسی شریف لڑکی کو تنگ کرنے کی جرات نہ کریں۔"

شابو غصے سے کانپنے لگا۔ "اوئے تمہاری......"

شابو نے مجھے گالی دی۔ اس کے بعد ہر بات میرے اختیار سے باہر تھی۔ ایک طوفان ' ایک آگ ' لاوے کا طوفان میرے دل میں جوالا مکھی سے گرجتا غراتا دھماکے کے ساتھ امڈ پڑا اور میں نے پوری طاقت سے شابو کو مارنے کے لئے اپنا الٹا ہاتھ اٹھایا۔ شابو نے جلدی سے اپنا سر نیچے کر لیا۔ اگر میرا تھپڑ اس کے منہ پر پڑ جاتا تو اس کا آدھا چہرہ یقیناً" اڑ گیا تھا۔

ایک غنڈے نے مجھ پر فائر کر دیا۔ گولی میرے پیٹ پر لگی۔ پیچھے سے اس کے ایک غنڈے نے میری گردن پر خنجر کا وار کیا۔ جس غنڈے نے مجھ پر پستول کا وار کیا تھا۔ وہ شابو کے پاؤں میں بیٹھا تھا۔ دوسرا فائر شابو نے جھونک دیا۔ میں نے شابو اور غنڈے کے ہاتھوں سے پستول جھٹک دیئے۔ شابو کو تخت پر سے گھسیٹ کر فرش پر ڈال دیا۔ وہ پہلے ہی اس بات پر دہشت زدہ ہو رہے تھے کہ مجھ پر ان کی دونوں گولیوں اور گردن پر خنجر کا وار کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ ”شہابو تم نے مجھے ایسی گالی دی ہے جس کی سزا میری غیرت کے ضابطہ قانون میں موت ہے۔“

پیچھے کھڑے دونوں غنڈے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ وہ خنجر پر خنجر مار رہے تھے۔ میں نے دونوں کو پکڑ کر سامنے الٹ دیا۔ اب وہ بھی میرے سامنے پر فرش پر پڑے تھے۔ وہ مجھے کوئی بھوت پریت سمجھنے لگے تھے۔ ایک غنڈہ باہر کو دوڑا۔ میں نے اٹھ کر پیچھے سے اس کی کمر پر لات ماری۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی دو ٹکڑے ہو گئی۔ وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح فرش پر گر کر بے حس ہو گیا۔ شہابو نے لپک کر زمین پر گرا پستول' اچک لیا اور مجھ پر دو فائر کئے۔ اب میرا نشانہ شہابو تھا۔ میں نے نیچے جھک کر ایک بار بھرپوری طاقت سے اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔ اس بار وہ میری زد سے نہ بچ سکا۔ اس کا آدھا چہرہ اڑ گیا اور سرخ سرخ گوشت ...... سے گال کی ابھری ہوئی سفید ہڈی باہر نکل آئی۔ وہ پیچھے کو گر پڑا۔

میں نے دوسرا پستول اٹھایا' اور دو گولیاں دونوں غنڈوں اور ایک گولی شہابو کے سر کا نشانہ لے کر اس کی کھوپڑی میں اتار دی۔ جس وقت میں شہابو کی بیٹھک میں داخل ہوا تھا تو گلی میں کوئی آدمی نہیں تھا۔ کسی نے مجھے اندر جاتے نہیں دیکھا تھا' اور جو میرے خلاف گواہی دے سکتے تھے ان سب کو میں نے ختم کر دیا۔ گولیوں کی آواز سے باہر گلی میں لوگوں کا شور بلند ہونے لگا تھا۔ شہابو کی بیٹھک کا پچھلا دروازہ ایک تنگ گلی میں کھلتا تھا۔ میں اس دروازے سے نکل کر تنگ گلی میں آگیا اور پھر دوسرے بازار میں نکل گیا۔ وہاں سے چوک کا چکر لگا کر واپس اپنی گلی میں آیا تو شہابو کے مکان کے آگے لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ میں بھی ہجوم میں شامل ہو گیا۔ اتنے میں پولیس آگئی۔ بیٹھک میں چاروں غنڈوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ بدبخت آپس میں لڑ بھڑ کر مر گئے ہیں۔ ”چلو جی خس کم جہاں پاک۔ کم بختوں نے شریفوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔“

پولیس نے لاشوں پر قبضہ کر کے لوگوں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ ہر کسی نے یہی کہا کہ انہوں نے کسی کو شہابو کی بیٹھک میں جاتے نہیں دیکھا۔ میں اپنے مکان پر آگیا۔ قیمتی جڑی بوٹیوں والا بریف کیس اٹھایا اور بازار چلا گیا۔ شام کو واپس آیا تو ہر کوئی غنڈوں کی موت پر خوش تھا اور دکانداروں نے تو مٹھائی بھی تقسیم کی۔

میں نے مکان پر آ کر غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور اٹیچی کیس کھول کر روپوں کا حساب کیا۔ میرے پاس اس وقت کل ایک ہزار چار سو روپے تھے۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑی رقم تھی۔ میں نے اب وہاں سے نکل جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ کسی بھی دوسری جگہ جا کر نئی زندگی شروع کرنے کے لئے یہ رقم کافی تھی۔ میری جیکٹ کو گولیوں اور خنجروں نے

کئی جگہ سے پھاڑ دیا تھا۔ میں نئی جیکٹ اور پتلون خریدنا چاہتا تھا۔ میں نے تین سو روپے جیب میں ڈالے اور مکان کو تالا لگا کر مارکیٹ کی طرف چل دیا۔

۱۹۴۸ء میں بیس پچیس روپے میں بڑی عمدہ پتلون آ جاتی تھی۔ سردی گرمی کا مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ پھر بھی دنیا کو دکھانے کے لئے میں نے گرم پتلون اور گرم جیکٹ خرید لی۔ کیونکہ موسم سرما کی آمد تھی۔ واپسی پر میں قبرستان کی طرف اپنی قبر دیکھنے نکل گیا۔ میری قبر یعنی امجد خان کی قبر کی ڈھیری ویسی ہی تھی' جیسی میں اسے چھوڑ آیا تھا۔ صرف قبر کے پھول مرجھا کر سوکھ گئے تھے۔ قبرستان سے نکل کر تانگہ لیا اور ریلوے اسٹیشن جا کر معلوم کیا کہ ملتان جانے والی گاڑی کس وقت روانہ ہوتی ہے۔ میرا ارادہ ملتان شہر کی سیر کا تھا۔ کیونکہ یہ پنجاب کا قدیم ترین شہر تھا اور آج سے ہزار برس پہلے بھی میں اس شہر کی سیاحت کر چکا تھا۔ معلوم ہوا کہ ایک پسنجر ٹرین رات کے دو بجے ملتان جائے گی۔

مکان پر آ کر میں نے پتلون اور جیکٹ پہن لی۔ روپے بٹوے میں ڈال کر جیب میں رکھ لئے۔ مجھے اپنے ساتھ کوئی شے لے جانے کی ضرورت نہیں تھی' اور میں کبھی کچھ ساتھ لے کر چلا بھی نہیں تھا۔ پانچ ہزار برس سے اکیلی جان کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔

یونہی وقت کاٹنے کے خیال سے میں ایک مقامی سینما گھر میں آخری شو دیکھنے چلا گیا۔ اب میں جدید سائنسی دور کی تمام ایجادات سے بخوبی واقف ہو گیا تھا۔ فلم ریڈیو..... جہاز اور ٹیلی فون مجھے ورطہ حیرت میں نہیں ڈالتے تھے۔ بارہ بجے رات فلم کا آخری شو دیکھ کر واپس گھر آیا۔ دروازے کی کنڈی لگا کر پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔

ذہن میں بار بار ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا کہ اگر تاریخ کا اگلا زمانہ کوئی نہیں ہے۔ اور میں تاریخ کے آخری عہد سے گزر رہا ہوں تو پھر اب کہاں جاؤں گا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہاں سے میرا واپسی کا سفر شروع ہونے والا ہے؟ کوئی بات واضح ہو کر سامنے نہیں آ رہی تھی۔ آگے سوائے گہری اور دبیز دھند کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک خیال آیا کہ میں نے قبرستان سے اٹھائی ہوئی پیتل کے سانپ کی چھوٹی مورتی الماری میں رکھ دی تھی' یہ بھی مجھے اپنے ساتھ لے جانی چاہئے۔

میں اٹھ کر الماری کی طرف گیا۔ اس الماری میں پیتل کے سانپ کی مورتی بند تھی۔ میں نے اسے اٹھایا تو وہ تھوڑی سی گرم تھی۔ میں نے سوچا شاید مورتی کا پیتل الماری میں بند رہنے سے ذرا گرم ہو گیا ہے۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا اور اسے اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ مجھے سفر کے لئے کسی تیاری کی جتنی ضرورت تھی' اتنی تیاری میں

نے کر لی تھی۔ بس ذہنی طور پر ہی تیار رہتا تھا۔

رات کے ڈیڑھ بجے میں اپنے مکان سے نکل کر گلی میں آ گیا۔ مکان کے دروازے کو میں نے تالا لگا کر چابی نالی میں پھینک دی اور ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بازار آدھی رات کے بعد سنسان اور خاموش تھے۔ کوئی تانگہ وغیرہ نہیں تھا۔ میں پیدل ہی چلنے لگا۔

ریلوے اسٹیشن پر بھی خلاف معمول خاموشی اور سناٹا چھایا تھا۔ ٹکٹ دینے والا بابو کھڑکی کے پیچھے اونگھ رہا تھا۔ میں نے ملتان کا ٹکٹ خریدا اور پلیٹ فارم پر آ کر' بینچ پر بیٹھ گیا۔ پلیٹ فارم پر بھی مجھے اپنے سوا کوئی مسافر دکھائی نہ دیا۔ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی۔ میں اسی اسٹیشن پر کئی بار رات کو چہل قدمی کرنے آیا تھا... یہاں ہر وقت مسافروں کی ریل پیل رہتی تھی' لیکن آج رات پلیٹ فارم پر ہو کا عالم تھا۔ ٹی اسٹال بھی بند تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے آج کسی مسافر کو سفر نہ کرنا ہو۔ میں خاموشی سے بیٹھا پسنجر ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ وہاں لگے کلاک نے رات کے دو بجا دئے۔ ٹرین کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔

جب آدھ گھنٹہ اوپر ہو گیا تو میں نے سوچا کہ چل کر ٹکٹ بابو سے پوچھا جائے کہیں گاڑی لیٹ تو نہیں ہے گیٹ پر بھی کوئی ٹکٹ چیکر نہیں تھا۔ ٹکٹ والی کھڑکی پر نگاہ ڈالی تو وہ بھی بند ہو گئی تھی۔ کہیں کوئی قلی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بڑی حیرانی ہوئی کہ آخر سارے لوگ کہاں غائب ہو گئے... اور کچھ نہیں تو کم از کم قلیوں کو تو ہونا چاہیے تھے۔

پلیٹ فارم پر واپس آیا تو ایک خاکی وردی والے ٹکٹ چیکر پر نگاہ پڑی۔ وہ ایک بند ٹی اسٹال کے کاؤنٹر پر کہنی رکھے کھڑا دور ریلوے سگنل کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر پوچھا کہ ملتان جانے والی پسنجر ٹرین کتنی لیٹ ہے۔ اس نے دور سبز سگنل کی بتی کی طرف اشارہ کیا اور خاموشی سے گیٹ کی طرف چل پڑا۔

سگنل کی بتی سبز ہو رہی تھی۔ یہ سگنل پیچھے سے آتی ریلوے لائن کے موڑ پر اس جگہ لگا تھا' جہاں ریل کی پڑی خم کھا کر اسٹیشن کی طرف آتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دور انجن کی روشنی نمودار ہوئی۔ یہ روشنی قریب آتی گئی۔ اب انجن کی چھک چھک کی آواز بھی آنے لگی۔ اس زمانے میں ریل کے انجن کوئلے سے چلتے تھے۔ ریل پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ تمام ڈبوں کی کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ اکثر مسافر سو رہے تھے۔ گاڑی رکی۔ مگر کوئی مسافر نہ اترا۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے' یہاں اترنے والا کوئی مسافر نہ ہو' لیکن یہ بات بڑی عجیب لگی کہ اتنا بڑا شہر ہو اور کوئی مسافر نہ اترے۔

میں ایک ڈبے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ فضا میں حبس تھا۔ تقریباً" سبھی مسافر سو رہے تھے۔ میں ایک خالی جگہ پر بیٹھتے ہوئے یونہی تازہ ہوا کی خاطر کھڑکی کا شیشہ اٹھانے لگا تو ایک مسافر نے لیٹے لیٹے کہا۔ "کھڑکی مت کھولنا۔" میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سبھی مسافر سو رہے تھے۔ بہرحال میں نے شیشہ نہ اٹھایا۔ پلیٹ فارم پر گارڈ کی سیٹی کی آواز بلند ہوئی۔ انجن نے وسل دیا اور چھک چھک کرتا ٹرین کو ساتھ لئے آگے رینگنے لگا۔ میں نے شیشے .... سے جھانک کر پلیٹ فارم پر دیکھا پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ ٹرین نے آہستہ آہستہ رفتار پکڑ لی اور شہر کے مضافات سے گزر کر تاریک میدانوں اور کھیتوں کے درمیان گزرنے لگی۔ عجیب مسافر تھے۔ سبھی سو رہے تھے۔ ورنہ ٹرین میں چاہے رات کا وقت ہو' کوئی نہ کوئی مسافر ضرور جاگ رہا ہوتا ہے۔ یہاں سب ہی لمبی تان کر سو رہے تھے۔ ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی تو اکثر مسافر خراٹے لے رہے تھے۔ اب کسی کے خراٹے لینے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ایک مسافر میرے برابر میں کھڑکی سے سر لگائے سو رہا تھا۔ پہلے یہ بھی خراٹے لے رہا تھا۔ اب خاموش ہو گیا تھا۔ غیر ارادی طور پر میری نگاہ اس پر پڑی۔ ڈبے میں بڑی مدہم روشنی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ مسافر سانس نہیں لے رہا۔ میں ٹھٹھک سا گیا۔ جھک کر سوتے مسافر کے سینے پر نگاہ ڈالی...... اس کا سینہ اوپر نیچے نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ دل کی حرکت بند تھی۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ شاید سوتے میں اس مسافر کی حرکت قلب بند ہو گئی تھی۔

میں نے ٹرین کی زنجیر کھینچ دی۔ مگر ٹرین نہ رکی۔ اب دوسرے مسافروں کو جھک کر دیکھا۔ کسی کا سینہ اوپر نیچے نہیں ہو رہا تھا۔ کسی کا سانس نہیں چل رہا تھا۔ میں عالم حیرت میں گم ہو گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ بیک وقت ڈبے کے مسافروں کی حرکت قلب بند ہو جائے' لیکن یہ حقیقت تھی کہ ان سب میں سے کوئی ایک مسافر بھی سانس نہیں لے رہا تھا۔ اگرچہ ان کے سانس کی آمدورفت رکی ہوئی تھی۔ دل کی حرکت بھی بند تھی۔ منہ ذرا ذرا کھلے تھے۔ آنکھیں بند تھیں' مگر چہروں پر موت کی زردی اور بے حسی نہیں تھی۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا کہ دیکھوں کوئی اسٹیشن آ رہا ہے کہ نہیں۔ خدا جانے کدھر سے گرم ہوا کا تھپیڑا ڈبے میں گھسا اور ڈبے...... میں لوگوں کی چیخ وپکار مچ گئی۔ میں نے جلدی سے شیشہ نیچے گرایا اور پلٹ کر دیکھا۔ سبھی مسافر اسی طرح مردہ حالت میں پڑے تھے۔ میں چپ چاپ متحیر سا ہو کر بیٹھ گیا۔

ٹرین کی رفتار ہلکی ہونے لگی' پھر وہ رک گئی۔ میں نے شیشے پر دونوں ہتھیلیوں کی اوٹ بنا کر باہر دیکھا۔ باہر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹرین ویرانے میں کسی جگہ کھڑی ہو گئی

تھی۔ ڈبے کا دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ کوئی اندر داخل نہ ہوا۔ میں اٹھ کر دروازے میں آیا اور باہر جھانک کر دیکھا اندھیرے۔ میں مجھے اونچے اونچے ٹیبے سے اُبھرے نظر آئے۔

اچانک مجھے اپنے کندھے پر کسی کا ٹھنڈا ہاتھ محسوس ہوا' میں نے پلٹ کر دیکھا..... ایک مسافر میرے پیچھے کھڑا تھا۔ ابھی میں اس سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ اس نے مجھے دھکا دے دیا۔ میں ڈبے کے دروازے..... سے نیچے جھاڑیوں میں گر پڑا۔ فوراً" اٹھا۔ دیکھا کہ دروازہ بند ہو گیا تھا اور ٹرین ایک دم تیز رفتاری سے آگے کو دوڑنے لگی تھی۔ دیکھتے دیکھتے ٹرین اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

میں کپڑے جھاڑتا ہوا ریل کی پٹڑی پر آیا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہاں ریل کی کوئی پٹڑی نہیں تھی۔ یہ معمہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ جہاں سے ریل گزری تھی۔ وہاں ایک کچی پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ میں اس پگ ڈنڈی پر چلنے لگا۔ چاروں طرف موت ایسی گہری خاموشی چھائی تھی۔ اندھیرا اس قدر گھنا تھا کہ مجھے بمشکل کچھ دکھائی دے رہا تھا۔

تاریک فضا میں ایسی بو رچی ہوئی تھی جو اکثر قدیم تاریخی کھنڈرات سے آیا کرتی ہے۔ اس پراسرار اور لطیف بو کو شاید صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ پگ ڈنڈی ایک ٹیلے پر چڑھنے لگی۔ یہ ٹیلا بالکل سپاٹ تھا اور کسی درخت یا جھاڑی کا دھندلا خاکہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ٹیلا زیادہ اونچا نہیں تھا۔ اس کے اوپر پہنچا تو دوسری جانب ایک پیالہ نما چھوٹا سا میدان اندھیرے میں نظر آیا۔ یہاں کہیں کہیں دیواریں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔

میں ٹیلے سے اتر کر اس میدان میں آ گیا۔ یہ پرانے کھنڈر تھے۔ اندھیرے میں اب مجھے چیزوں کے دھندلے ہیولے دکھائی دینے لگے تھے۔ کھنڈر ایسے تھے کہ چھوٹی گلیوں کے فرش اینٹوں سے بنے تھے۔ بعض مقامات پر اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ چار دیواریاں تھیں' جن کی چھتیں غائب تھیں۔ کہیں کوئی اکیلی دیوار کھڑی تھی۔ کوئی پرندہ پھڑپھڑاتا ہوا میرے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ ایک مقام پر ایسی گول دیوار تھی' جیسے کنواں زمین سے نکل کر باہر آ گیا ہو۔ مجھے اپنی جیکٹ کی جیب میں کوئی شے کلبلاتی محسوس ہوئی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پیتل کا سانپ میری کلائی سے لپٹ گیا۔ اس میں جان پڑ چکی تھی۔ میں نے ہاتھ باہر نکالا۔ سانپ کی سرخ کانچ ایسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"تم .... تم کون ہو؟" میں نے سانپ کو غور سے تکتے ہوئے پوچھا۔ سانپ میری کلائی سے اچھل کر نیچے گرا اور کھنڈر کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اس نوع کے اسرار وماورائیت سے میرا کئی بار واسطہ پڑ چکا تھا اس لئے میں نے اسے زیادہ اہمیت نہ دی اور

واپس پلٹا کہ کھنڈرات سے نکل اس شہر کا رخ کروں' جہاں سے ٹرین میں بیٹھ کر چلا تھا۔

قدیم کھنڈر کی اکھڑی ہوئی گلی میں تھوڑی دور ہی گیا ہوں گا کہ گھنگروؤں کے چھناکوں کی دھیمی دھیمی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ میں رک گیا۔ آواز ایک اونچی دیوار کے عقب سے آ رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی رقاصہ بند کوٹھری میں رک رک کر رقص کر رہی ہو۔ یہ اس اسرار و تحیر کا بڑا حسین پہلو تھا۔ میرے قدم جیسے اپنے آپ اس طرف بڑھے جدھر سے گھنگروؤں کی دبی دبی آواز آ رہی تھی۔

اونچی دیوار کی دوسری جانب آیا تو اندھیرے میں ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی محراب سی دکھائی دی۔ گھنگروؤں کی آواز اسی محراب سے آ رہی تھی۔ یہاں بھی اینٹوں کا اونچا نیچا فرش تھا اور خشک گھاس اگی تھی۔ محراب کے اندر جھانک کر دیکھا کہ ایک زینہ نیچے جا رہا ہے اور فرش پر دھندلی روشنی پڑ رہی ہے۔

گھنگروؤں کی آواز رک گئی۔ اب ایسی آواز آئی جیسے کسی نے کوڑا فرش پر مارا ہو۔ ساتھ ہی کسی مرد کی کرخت آواز بلند ہوئی۔ اس نے پانچ ہزار سال قبل قدیم زبان میں کہا۔

"میں کل رات پھر آؤں گا۔ جا دیوار میں اپنی جگہ واپس چلی جا۔"

کسی عورت کے سسکیاں بھرنے کی آواز کے ساتھ ہی گھنگروؤں کی ایسی آواز آئی جیسے وہ چل کر کسی طرف کو جا رہی ہو۔ اس کے بعد گہرا سناٹا چھا گیا۔ اس اسرار کا کھوج لگانے کے لئے میں زینے سے اتر کر نیچے آیا تو دیکھا کہ ایک تنگ سی کوٹھری ہے جس کے وسط میں ایک مٹکا اوندھا پڑا ہے۔ اس اوندھے مٹکے کے اوپر دیا روشن تھا۔ پیچھے دیوار پر ایک رقاصہ کی قد آدم سائز کی مورتی کندہ ہے۔ رقاصہ کی مورتی باہر کو ابھری ہوئی تھی۔

میں اس کے قریب گیا۔ بڑی ہی حسین رقاصہ تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں' نازک پیروں میں گھنگرو' بالوں کا جوڑا قدیم عہد کی دیوداسیوں کی طرح سر کے اوپر بنا تھا۔ جس میں پتھر کے پھولوں کا گجرا تھا۔ کلائیوں میں بھی پھولوں کے گجرے تھے۔ گلے میں سرخ گلابوں کی مالا تھی۔ یہ پھول بھی پتھر کے تھے۔ ایسی حسین رقاصہ میں نے شاید پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ آنکھیں اگرچہ پتھر کی تھیں' مگر ان میں زندگی کا نور جھلک رہا تھا۔ یہ آنکھیں گویا ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان میں مجھے ایک التجا' ایک فریاد سی نظر آ رہی تھی۔

دیوار میں پتھر کی چھوٹی سی چوکی بنی تھی جس پر یہ حسین رقاصہ کھڑی تھی۔ غیر شعوری طور پر میرا ہاتھ رقاصہ کے رقص کے انداز میں اٹھے ہوئے ہاتھ سے جا لگا۔ میرے ہاتھ کا لگنا تھا کہ حسین رقاصہ کے جسم میں جان پڑ گئی۔ وہ اپنی چوکی سے اتر آئی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں تھام لیا اور فریاد کے انداز میں کہا۔ "مجھے اس

راکھشس سے بچا لو عاطون۔"

میں نے چونک کر رقاصہ کی طرف دیکھا۔ وہ پانچ ہزار سال پرانی وہ زبان بول رہی تھی، جو میں نے موئنجودڑو میں سنی تھی۔ میں نے اسی زبان میں اس سے پوچھا۔ "تم میرے نام سے کیسے واقف ہو؟"

رقاصہ نے اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکائیں اور مترنم آواز میں بولی۔ "میں آکاش کی اپسرا ہوں عاطون۔ یہاں مجھے ایک راکھشس نے اپنی دیوداسی بنا رکھا ہے۔ مجھ پر تمہاری طویل ترین زندگی کے تمام اسرار رموز کھلے ہیں۔ میں جانتی ہوں تمہارا سفر آج سے پانچ ہزار برس پہلے قدیم مصر کے شاہی قبرستان سے شروع ہوا تھا، اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس کرہ ارض پر صرف تم ہی ایک ایسے انسان ہو جو مجھے ظلم کرنے والے راکھشس کے چنگل سے رہائی دلا سکتے ہو۔"

میرا ہاتھ ابھی تک حسین رقاصہ کے ہاتھوں میں تھا اور مجھے اپنے جسم میں ایک پرسکون قسم کی حرارت منتقل ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ راکھشس کون ہے اور اس سے کس چیز کا طلب گار ہے؟ حسین رقاصہ نے ایک گہرا سانس لیا اور مجھے روشن چراغ کے پاس فرش پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی میرے سامنے اپنے ریشمی لباس کو سنبھالتی ہوئی بیٹھ گئی۔ "میرا نام مالیکا ہے۔ میں آسمانوں میں دیوی دیوتاؤں کے ساتھ خوش و خرم رہ رہی تھی۔ میں دیوتاؤں کے آگے رقص کرتی، وہ خوش ہو کر مجھ پر آکاش کے نورانی گلاب نچھاور کرتے۔ لیکن میری بدقسمتی میرا پیچھا کر رہی تھی۔ ایک روز مجھ سے بڑی بھیانک غلطی ہو گئی۔ یہ غلطی میں نے جان بوجھ کر نہیں کی تھی بلکہ میری بدقسمتی نے مجھ سے کرائی تھی۔ دیوتاؤں نے مجھے آکاش سے اٹھا کر زمین پر پھینک دیا اور بددعا دی کہ ایک راکھشس ہر رات آ کر مجھے کوڑے مارا کرے گا۔ تب سے لے کر اب تک میں اس کھنڈر میں پڑی ہوں، راکھشس کوڑا لے کر ہر رات آتا ہے۔ مجھے دیوار سے اتار کر اپنے سامنے رقص کرواتا ہے۔ مجھے کوڑے مارتا ہے اور دیوار میں پتھر کا بت بنا کر اگلی رات آنے کا کہہ کر چلا جاتا ہے۔"

میں بڑی توجہ سے اس حسین رقاصہ کی داستان غم سن رہا تھا۔ میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کا شدید جذبہ بیدار ہو گیا تھا۔ مجھے اس حقیقت کا بھی احساس تھا کہ ہمدردی کے اس جذبے میں حسین رقاصہ مالیکا کے حسن اور سحرانگیز آنکھوں کی کشش کو زیادہ دخل تھا۔

میں نے مالیکا کا ہاتھ تھام لیا اور سوال کیا۔ "میں تمہیں اس راکھشس سے کیسے

نجات دلا سکتا ہوں، مالیکا؟"

مالیکا نے اپنے دوسرے ہاتھ کی نازک انگلیاں اپنے بالوں میں پھیر کر کہا۔ "عاطون! تم مجھے اس راکھشس سے اسی طرح نجات دلا سکتے ہو کہ مجھے اپنے ساتھ رکھو۔ جب تک تم میرے ساتھ ہو گے یہ راکھشس میرے قریب نہیں آسکے گا۔ وہ ظاہر نہیں ہو گا۔ اس کی ظاہر ہونے کی شکتی بھی ختم ہو جائے گی۔ بولو عاطون! کیا تم مجھے اپنے ساتھ رکھو گے؟"

اس حسین رقاصہ مالیکا کے انداز میں کچھ ایسا سحر، ایسا طلسم تھا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا مالیکا، لیکن .... کیا تم اس قدیم کھنڈر سے نکل کر میرے ساتھ جدید دنیا میں جا سکو گی؟"

"کیوں نہیں؟" مالیکا نے خوش ہو کر جواب دیا۔ "تمہارے غیرفانی قرب کی وجہ سے مجھ میں بے پناہ طاقت اور حوصلہ پیدا ہو گا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ "لیکن عاطون! تمہیں مجھ سے شادی کرنا ہو گی۔"

میں ایک دم چونک پڑا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

مالیکا کی کنول ایسی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔ "عاطون! کیا تم میری مدد نہیں کرو گے؟ کیا تم بھی آکاش کے دیوتاؤں کی طرح یہی چاہتے ہو کہ میں ساری زندگی راکھشس کے کوڑوں کا عذاب سہتی رہوں؟ تم نے تو مجھے ظلم سے نجات دلانے کا وعدہ کیا تھا عاطون!"

میں نے کہا۔ "لیکن مالیکا۔ میں اپنے بچوں کو اپنے سامنے سو سو برس کے بڈھے بنتے نہیں دیکھ سکتا، جبکہ میں ان کے سامنے بیس بائیس برس کا نوجوان ہی رہوں۔"

مالیکا کے گلاب کی پنکھڑیوں ایسے ہونٹوں پر...... مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "عاطون! تم غیرفانی انسان ہو۔ میں آکاش کی اپسرا ہوں۔ ہمارے ہاں اولاد نہیں ہو گی۔ اپسرائیں جب زمین پر آ کر کسی سے بیاہ رچاتی ہیں تو ان کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ اب تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے عاطون!"

میں چپ ہو گیا۔ مالیکا نے رحم طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "کیا تم چاہتے ہو کہ میں ساری زندگی عذاب سہتی رہوں عاطون! کیا تم ایک بے گناہ بدنصیب اپسرا کی مدد نہیں کرو گے۔ تم تو ہمیشہ دکھی اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتے آئے ہو!"

میں مجبور ہو گیا۔ میں نے مالیکا سے شادی کرنے کی ہامی بھر لی۔ مالیکا خوشی سے نہال ہو کر اٹھی اور اس نے رقص کرنا شروع کر دیا۔ یہ کسی ناگن کے رقص سے ملتا جلتا رقص تھا۔ پھر وہ میرے سامنے آ کر جھک گئی۔ جیسے جھک کر مجھے سلام پیش کر رہی ہو۔ اس نے

میرا ہاتھ تھاما اور دیوار پر اس جگہ لے گئی' جہاں وہ تھوڑی دیر پہلے پتھر کی مورتی بنی کھڑی تھی۔ اس نے دیوار پر بنی ہوئی چوکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "عاطون ! اب میں کبھی پتھر بن کر یہاں نہیں کھڑی ہوں گی۔ تم نے مجھے اس سنگین عذاب سے بچا لیا ہے۔"

ہم چراغ کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ مالیکا نے مجھے بتایا کہ یہ ہڑپہ کے کھنڈر ہیں جو موہنجو دڑو کا ہم عصر شہر تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ "مالیکا ! میں آج سے پانچ ہزار سال پہلے موہنجودڑو کے ایک مندر کا کاہن اعظم تھا۔"

مالیکا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے موتیوں ایسے دانت چراغ کی روشنی میں جھلملا رہے تھے۔ "عاطون ! میں آکاش پر بیٹھی تمہیں ہر وقت دیکھتی تھی۔ تم اس وقت بھی مجھے پیارے لگتے تھے' لیکن یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی کہ ایک دن تم میری نجات کا ذریعہ بنو گے۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

میں نے باتوں ہی باتوں میں مالیکا سے پیتل کے سانپ کی مورتی کا ذکر کیا اور کہا۔ "اپنی ہزاروں سالہ قدیم ترین زندگی میں کئی ایک طلسمی کرشمے دیکھے ہیں' لیکن میرا خیال تھا کہ اب میں سائنس کے ماڈرن زمانے میں آگیا ہوں۔ اب اس قسم کی کراماتی اور طلسمی باتیں دیکھنے میں نہیں آئیں گی لیکن قبرستان سے ملنے والا پیتل کا سانپ جب زندہ ہو کر میری کلائی سے اچھلا تو حیران ہوا کہ اس سائنسی زمانے میں بھی طلسم میرے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہے۔"

پیتل کے سانپ کا ذکر سن کر مالیکا کے چہرے پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور بولی۔ "وہ کوئی آکاش کا دیوتا ہو گا جو سانپ کا روپ دھار کر تم سے ملنے یہاں اس دنیا میں آگیا۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔" میں نے آہستہ سے کہا..... پھر میں نے مالیکا کو بتایا کہ شادی کے بعد ہمیں کسی شہر میں رہ کر نئی زندگی شروع کرنی ہو گی۔ "میں جڑی بوٹیوں کا کاروبار کر کے تمہارے اور اپنے اخراجات پورے کر سکوں گا۔ لیکن شاید تمہیں ویسے عیش وآرام سے نہ رکھ سکوں' جس طرح کہ تم آکاش پر رہا کرتی تھیں۔

مالیکا بولی۔ "جب میں تمہاری بیوی بن گئی ہوں' اور تمہیں جڑی بوٹیوں کی تجارت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں آکاش کی اپسرا ہوں۔ میں تمہارے آگے دولت کے انبار لگا دوں گی۔"

اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا۔ مالیکا آکاش کی اپسرا تھی اور آکاش کی اپسراؤں کو دنیا کے تمام خزانوں کا علم ہوتا ہے اور ان میں اتنی شکتی ہوتی ہے کہ وہ انمول خزانے زمین کی گہرائیوں سے نکال کر سامنے لے آئیں' پھر بھی میں ایک عورت کی کمائی پر عیش وآرام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ خواہ وہ آکاش کی اپسرا ہی کیوں نہ ہو۔ جب میں نے اپنے اس خیال کا اظہار مالیکا سے کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "عاطون ! کیا میں تم سے الگ ہوں؟ کیا میں کوئی غیر ہوں۔ میں تمہاری بیوی ہوں۔ تمہاری پتنی ہوں۔ تم کہو گے تو میں تمہارے لئے مسلمان بھی ہو جاؤں گی اور باقاعدہ تمہارے کسی مولوی کے سامنے گواہوں کی موجودگی میں نکاح کر لوں گی۔"

ایک عرصے کے بعد ایک حسین عورت مجھ سے اس والہانہ محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ میں تو پہلی ہی نظر میں مالیکا کے حسن ہوشربا کا اسیر ہو چکا تھا۔ اب جو اس نے یوں مجھ سے اپنی عقیدت اور ایثار کا اظہار کیا تو میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی مجبوری کا یوں ذکر کیا۔ "مالیکا ! تمہیں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا ہے کہ میں تاریخ کا آوارہ گرد راجکمار ہوں۔ میرا کوئی پتہ نہیں کہ کب اور کس وقت کسی دوسرے دور میں پہنچ جاؤں۔ تمہاری محبت بھی مجھے وقت کے اس گرداب سے نکل کر کسی دوسرے بھنور میں غائب ہو جانے سے نہیں روک سکے گی۔"

مالیکا نے کہا۔ "تم پھر بھول رہے ہو کہ میں آکاش کی اپسرا ہوں۔ موت کا مہلک ہاتھ مجھے بھی نہیں چھو سکتا اور تم جہاں 'جس دور میں جاؤ گے میں تمہارا کھوج لگا کر وہاں آ جاؤں گی۔"

میں خوش ہوا۔ مسکرا کر مالیکا کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مالیکا ! اگر تم ہر دور میں میرے ساتھ رہو تو میں اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت انسان تصور کروں گا۔ کیونکہ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

مالیکا کی حسین اور فسوں ساز آنکھیں چمک اٹھیں۔ اور سرد آہ بھر کر بولی۔ "خوش نصیب تو میں ہوں عاطون جسے تم مل گئے ہو۔" میرا دل بھی تمہارے نام کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ مجھے بھی تم سے پریم ہے۔ ستی ساوتری کا پریم۔ تم نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے دوزخ کے عذاب سے بچا لیا ہے۔ اب میں آزاد ہوں' مسرور ہوں' خوش ہوں۔ یہ ایک لافانی اور انمٹ خوشی ہے۔ چلو اب یہاں سے باہر نکل کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔"

مالیکا نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے ساتھ لے کر اس کوٹھری کے زینے کی طرف بڑھی۔ اس کے پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگرو چھنک رہے تھے۔ میں نے مالیکا کے لباس اور پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگروؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "باہر کی دنیا میں تمہارا یہ لباس مناسب نہیں رہے گا۔ پہلے تمہارے لئے اس دنیا کے فیشن کے مطابق کسی لباس کا

انتظام کرنا ہو گا۔"

مالیکا رک گئی۔ "تمہیں انتظام کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس ملک پاکستان کی مسلمان لڑکی کے لباس کا بندوبست ابھی کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اس دیوار کے پاس گئی، جہاں وہ پہلے بت بن کر کھڑی تھی۔ یہاں اس نے پتھر کی چوکی کو تین بار ہاتھ سے چھوا اور پھر سیدھی کھڑی ہو کر گہرا سانس لیا۔ میرے پلک جھپکتے ہی اس کا لباس تبدیل ہو گیا۔ اب اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ سر پر دوپٹہ تھا۔ پاؤں میں ۱۹۴۸ء کے فیشن کی سینڈل تھی۔ ہاتھ میں پرس تھا۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور بولی۔ "یہی لباس ہے نا پاکستانی عورتوں کا؟"

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔

مالیکا آکاش کی اپسرا تھی۔ وہ اس قسم کی کرامت کر سکتی تھی۔ ہم زمین دوز کوٹھری سے نکل کر باہر دیوار کے پاس آ گئے۔ رات ڈھلنے لگی تھی۔ آسمان پر ستارے ماند پڑ رہے تھے۔ میں نے مالیکا کو بتایا کہ میں ملتان جا رہا تھا کہ پراسرار ریل گاڑی نے مجھے یہاں پھینک دیا۔ مالیکا کی آنکھوں میں چمک لہرا گئی۔ "عاطون! یہ سب کچھ دیوتاؤں کی مرضی سے ہوا۔ آکاش پر لکھا جا چکا تھا کہ تم مجھے یہاں ملو گے اور مجھے راکھشس کے عذاب سے نجات دلاؤ گے۔ چلو ہم کسی بڑے شہر میں چلتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بڑا شہر تو پیچھے لاہور ہی ہے۔"

مالیکا خوش ہوئی۔ "ہاں لاہور ایک تاریخی شہر ہے اسے رام چندر جی کے بیٹے نے بسایا تھا۔ ہم اسی شہر میں جا کر رہیں گے۔ چلو ہم لاہور چلیں۔"

میں مالیکا ایسی حسین اپسرا کو حاصل کر کے بہت خوش تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میری ادھوری زندگی کو مالیکا نے مکمل کر دیا ہے۔ لاہور شہر مجھے بھی پسند تھا۔ میں نے مشرق کی طرف اشارہ کیا۔ "لاہور اس جانب آباد ہے مالیکا۔ ہمیں کسی ریلوے اسٹیشن تک پیدل چلنا ہو گا۔"

"کوئی بات نہیں عاطون! تمہاری طرح میں بھی موت اور تھکاوٹ سے بے نیاز ہوں۔ نہ کھانے کی حاجت ہے نہ پیاس پریشان کرتی ہے۔ ہاں تمہاری اور اپنی خوشی کے لئے یہ سب کچھ کر سکتی ہوں۔"

ہڑپہ کے کھنڈر پیچھے رہ گئے۔ ہم ڈھلتی رات کے سرمئی اندھیرے میں جنوب کی طرف چلے جا رہے تھے کہ مجھے دور ایک جگہ سگنل کی سرخ بتی دکھائی دی۔ میں نے کہا۔ "وہ دیکھو مالیکا یہ کسی دیہاتی ریلوے اسٹیشن کی بتی ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہاں ریل

گاڑیاں چلتی ہیں۔"

مالیکا نے ایک نقرئی قہقہہ لگایا۔ مجھ سے کوئی ایجاد کوئی ماڈرن شے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ میں اس عہد کی ہر شے سے واقف ہوں۔ چلو ریلوے اسٹیشن سے گاڑی پکڑتے ہیں۔"

سنسان کھیتوں میں ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلے جا رہے تھے۔ مالیکا کے لباس سے سحر طاری کر دینے والی مہک اٹھ رہی تھی۔ پاکستانی عورت کے لباس میں بھی وہ بے حد پرکشش دکھائی دے رہی تھی۔ ہم ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ یہ وہی ریلوے اسٹیشن تھا جس پر رکے بغیر میری گاڑی آگے نکل گئی تھی۔ اسٹیشن پر دیہات کے مہاجرین اپنے سامان کے پاس سو رہے تھے۔ میں نے مالیکا کو بتانا چاہا کہ کس طرح یہاں کے مسلمانوں نے قائد اعظم کی قیادت میں پاکستان کے نام سے ایک ملک الگ تشکیل دیا ہے تو وہ بولی۔ "میں سب جانتی ہوں عاطون۔ مجھے سب معلوم ہے۔"

ہم پلیٹ فارم کے ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ پو پھٹ رہی تھی۔ اسٹیشن سے دور کھیتوں میں مہاجرین نے عارضی جھونپڑے سے ڈال رکھے تھے۔ جہاں ایک جگہ آگ روشن تھی۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا کہ ملتان کی طرف سے ریل گاڑی آ کر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئی۔ میں نے پہلے ہی لاہور کے دو ٹکٹ خرید لئے تھے۔ مالیکا اور میں ایک ڈبے میں سوار ہو گئے۔ دن کے اجالے میں، میں نے پہلی بار مالیکا کو دیکھا۔ اس کا رنگ صاف اور زردی مائل تھا۔ آنکھیں سرگیں اور کنول کے پھولوں ایسی بڑی بڑی تھیں۔ ہونٹ قدیم ہندی دیوداسیوں کی مورتیوں کی طرح تھے۔ وہ واقعی خوبصورت تھی۔ خاص طور پر اس کی آنکھوں میں ایک زبردست کشش تھی۔

ڈبے میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی سوار تھیں۔ کچھ مسافر سو رہے تھے۔ ٹرین لاہور کی طرف روانہ ہو گئی۔ دن کافی نکل آیا تھا، پھر ہماری ٹرین لاہور ریلوے اسٹیشن میں شور مچاتی داخل ہو گئی۔ پلیٹ فارم پر اب بھی کہیں کہیں بھارت سے آنے والے مہاجرین نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ریلوے اسٹیشن کے باہر کافی رش تھا۔

ہم نے بھی ایک تانگہ لیا اور اسے مال روڈ پر نیڈو ہوٹل کی طرف چلنے کو کہا۔ نیڈو ہوٹل میں نے اس لئے منتخب کیا تھا کہ مالیکا کی خواہش تھی کہ ہم کسی اعلیٰ ہوٹل میں جا کر فی الحال قیام کریں۔ اس کے بعد کوئی خوبصورت کوٹھی کرائے پر لے کر وہاں اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں۔ میرے پاس ایک ہزار سے کچھ اوپر رقم تھی۔ اس ہوٹل میں ہم نے ڈبل بیڈ کا ایک سویٹ لے لیا اور کاؤنٹر پر ہم نے رجسٹر میں مسٹر اینڈ مسز عبداللہ بیگ لکھوایا۔ دوپہر

کے بعد ہم اپنی رہائش کے لئے کسی کوٹھی کی تلاش میں ماڈل ٹاؤن کی طرف نکل گئے۔ مالیکا کسی ایسی جگہ کوٹھی کرائے پر لینا چاہتی تھی جہاں ارد گرد کافی سبزہ اور درخت ہوں۔ ماڈل ٹاؤن کا علاقہ اسے بہت پسند آیا۔ یہاں کی تقریباً آدھی سے زیادہ کوٹھیاں ہندو، [illegible] تھیں، جو لوگوں کو الاٹ ہو چکی تھیں۔ ہمارا کوئی کلیم نہیں تھا۔ اس لئے ہمیں کسی کوٹھی کے الاٹ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مالیکا کو آم اور نیم کے درختوں میں گھری ہوئی ایک قدیم طرز کی ایک کوٹھی پسند آ گئی۔ ویران ٹھنڈے برآمدے کوٹھی کے چاروں جانب تھے۔ ایک چھتا ہوا پورچ تھا جس کی محراب پر پھول دار بیل چڑھی تھی۔ باغ ویران ویران تھا۔ اور گھاس کافی بڑھ آئی تھی۔ اس کوٹھی کو نیم اور آم کے گھنے درختوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ برآمدے اور پورچ میں ٹھنڈا ٹھنڈا اندھیرا سا چھایا تھا۔

یہ آسیبی کوٹھی سنسان پڑی تھی۔ اندر کا سامان لوگ لوٹ کر لے جا چکے تھے۔ جانے کیوں مالیکا کو یہ کوٹھی بہت پسند آ گئی۔ حالانکہ مجھے یہ اتنی پسند نہیں تھی، لیکن مالیکا کی خوشی اور اس کی مرضی مجھے سب سے زیادہ عزیز تھی۔ میں نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ یہ کوٹھی کسی ہندو دیوان کی ابھی اور بھی کسی کو الاٹ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے الاٹمنٹ آفس کے دو چکر لگائے مگر بات نہ بنی۔ ایک تجربہ کار چپڑاسی نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں ایک ہزار روپیہ بطور رشوت دے دوں تو وہ میرا جعلی کلیم داخل کروا کر یہ کوٹھی میرے نام الاٹ کروا سکتا ہے۔ میرے پاس صرف چھ سو روپے باقی رہ گئے تھے۔ میں نے مالیکا سے اس کا ذکر کیا تو وہ مسکرائی۔ "یہ کون سا مشکل کام ہے۔ تم جتنے پیسے کہو میں تمہیں یہاں لائے دیتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے کمرے کا دروازہ بند کر کے گول میز پر میرے بریف کو خالی کر کے رکھ دیا۔ پھر اس کے اوپر رومال ڈالا اور آنکھیں بند کر کے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی۔ ایک منٹ تک وہ کسی خفیہ منتر کا جاپ کرتی رہی۔ آنکھیں کھول کر بریف کیس پر سے رومال اٹھایا اور بولی۔ "اپنا بریف کیس کھول کر دیکھو۔"

میں نے بریف کیس کھول کر دیکھا تو وہ پانچ پانچ سو کے کرنسی نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس زمانے میں پانچ سو کے نوٹ چلا کرتے تھے۔ مجھے کوئی تعجب نہ ہوا، لیکن اپنے شک دور کرنے کے لئے میں نے مالیکا سے پوچھا کہ یہ روپے اس نے کس جگہ سے منگوائے ہیں؟

وہ بولی۔ "تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہے عاطون۔ ویسے تم پوچھ بیٹھے ہو تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گی۔ یہ کرنسی نوٹ میں نے پاکستان کے ایک بینک کے سیف سے نکلوائے

ہیں۔"

میں نے بریف کیس بند کر دیا اور بڑی محبت سے مالیکا کو سمجھایا کہ میں نے اپنی پانچ ہزار سالہ زندگی میں ایسا کام کبھی نہیں کیا۔ یہ کرنسی نوٹ کسی دوسرے شخص کے ہیں۔ اس لیے میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔ مالیکا بڑی حیران ہوئی، لیکن میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ مالیکا کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ میں نے اسے کہا۔ "اگر تم کسی پرانے بادشاہ کا مدفون خزانہ حاصل کر سکتی ہو تو اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ اس میں سے ہم اپنی ضرورت کے مطابق دولت لے سکتے ہیں۔"

مالیکا کو میری یہ تجویز پسند نہیں آئی تھی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ لیکن اس نے کوئی اعتراض نہ کیا بولی۔ "ٹھیک ہے۔ میں یہ کرنسی نوٹ واپس بینک کے سیف میں رکھوائے دیتی ہوں۔ اس کے بعد کسی مدفون خزانے کے بارے میں غور کر لیں گے۔"

مالیکا نے بریف کیس پر رومال ڈال کر وہی عمل ایک بار پھر دہرایا۔ اب جو بریف کیس کھول کر دیکھا تو کرنسی نوٹ غائب تھے۔ میں نے مالیکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"مالیکا! ہمیں اس قسم کی دولت سے گریز کرنا چاہئے۔ دیکھو، ہم بہت جلد میاں بیوی بننے والے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ ہمارے درمیان اس قسم کی دولت کا رابطہ قائم ہو۔ ہاں اگر تم چاہو اور ہمیں ضرورت ہو تو تم گئے زمانے کے ایسے مدفون خزانوں میں سے کچھ حصہ لے سکتی ہو، جن کا کوئی مالک نہیں ہے۔"

مالیکا نے اپنے پرجوش جذبات کو کسی قدر دباتے ہوئے گہرا سانس کھینچ کر کہا۔

"عاطون! میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں آکاش کی اپسرا ہوں اور وہاں عالی شان محل میں رہا کرتی تھی۔ میں یہاں غریبانہ زندگی بسر نہیں کر سکتی، میں یہاں بھی ٹھاٹھ باٹھ سے رہنا پسند کروں گی۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں تمہارے اس خیال سے متفق ہوں، لیکن اس کے لئے میں دوسروں کی دولت پر قبضہ نہیں جمانا چاہتا مالیکا۔"

مالیکا نے کسی قدر جھنجلا کر کہا۔ "کوئی بات نہیں عاطون۔ .....میں زمین سے خزانے نکال لاؤں گی۔ دھرتی میرے سامنے اپنے سارے خزانے لیے کھلی ہے۔"

میں نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ مالیکا بڑے پیار سے میرے قریب آئی۔ میرے کاندھے پر اپنا محبت بھرا ہاتھ رکھا اور بولی۔ "ناراض ہو گئے عاطون؟ تم جیسا کہو گے میں ویسے ہی کروں گی۔ زمین کے خزانوں میں سے بھی تم جتنی دولت کہو گے نکالوں گی۔ باقی

وہیں رہنے دوں گی' اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟"

میں نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ مالیکا مسکرا دی۔ اس کے موتیوں ایسے دانت چمک اٹھے۔ مالیکا میری کمزوری بن چکی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اگر وہ اصرار کرتی تو میں زیادہ دیر تک اپنے موقف پر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اسی رات مالیکا نے اپنے بیڈ روم میں یگ کیا۔ یہ ہون یگ نہیں تھا بلکہ ایک قسم کا مراقبہ تھا۔ سمادھی تھی۔ مجھے اس نے اپنے بیڈ روم میں داخل ہونے سے منع کر دیا تھا۔

صبح وہ بیڈ روم سے نکلی تو اس کے ہاتھ میں سبز مخمل کا ایک رومال تھا۔ اس میں بیش قیمت طلائی ہار تھا جس میں ہیرے موتی جڑے تھے۔ یہ انمول ہار میرے حوالے کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "یہ قیمتی ہار راجہ کنشک کے زمانے کا ہے۔ میرے گندھرو اسے زمین کے اندر سے نکال کر لائے ہیں۔ تم بازار میں لے جا کر اسے فروخت کر دو۔ میرا خیال ہے اس کے عوض کافی رقم مل جائے گی۔"

ہار قدیم زمانے کا تھا اور یقیناً" بیش قیمت نوادرات میں سے تھا۔ بازار میں بیچنے سے کچھ مسائل کھڑے ہو سکتے تھے۔ بہرحال ذہن میں کچھ سوچ کر میں صرافہ بازار آ گیا۔ اس زمانے میں لوگوں کو ہندو سکھوں کے پرانے گھروں سے اکثر زیورات ملتے تھے' جن کو اونے پونے دام بازار میں فروخت کر دیا جاتا تھا۔ میں نے بھی صراف کو یہی کہا کہ جو کوٹھی ہمیں الاٹ ہوئی ہے وہاں سے یہ ہار برآمد ہوا ہے۔ صراف کی شکل بتا رہی کہ اس ہار کو دیکھ کر مارے حیرت اور خوشی کے گنگ ہو کر رہ گیا ہے لیکن مجھے اناڑی سمجھتے ہوئے اس نے اس کی قیمت پانچ ہزار روپے لگائی۔ میں نے بہت اصرار کیا کہ ہار بڑا قیمتی ہے۔ نایاب ہیرے موتی جڑے ہیں مگر صراف یہی کہتا رہا کہ صاحب یہ سب نقلی نگینے ہیں' میں تو پہلے ہی آپ کو بہت رقم دے رہا ہوں۔ میں اسے کیا کہہ سکتا تھا۔ پانچ ہزار میں وہ قیمتی ہار بیچ کر رقم جیب میں ڈالی اور تانگے میں بیٹھ کر واپس ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

مالیکا اتنی کم قیمت پر ہار فروخت کر دینے پر کچھ ناراض ہوئی۔ وہ لاکھوں میں کھیلنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔ "اس سے زیادہ قیمت کوئی صراف بھی نہ لگاتا۔ آج کل تو سونے کے زیورات اونے پونے بک رہے ہیں۔"

مالیکا کی بھویں اوپر کو اٹھ گئیں۔ بولی۔ "ٹھیک ہے تم کوٹھی تو الاٹ کراؤ۔ اس کے بعد کوئی دوسرا طریقہ سوچنا پڑے گا دولت حاصل کرنے کا۔"

ہم نے ماڈل ٹاؤن والی آم اور نیم کے درختوں سے گھری ہوئی کوٹھی الاٹ کروالی۔ یہ کوٹھی مالیکا نے اپنے نام الاٹ کروائی۔ میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ اب سوال کوٹھی کو

آراستہ کرنے کا تھا۔ مالیکا نے مجھے اپنی عشوہ طرازیوں سے اس بات پر راضی کر لیا کہ اب وہ خود زیورات کی دوسری کھیپ لے کر بازار فروخت کرنے جائے گی۔ رات کو اس نے پھر سمادھی لگائی اور اپنے گندھرو کی مدد سے پہلے سے زیادہ تعداد میں قدیم خزانے..... سے زیورات منگوائے اور اگلے روز اکیلی تانگے میں بیٹھ کر صرافہ بازار کی طرف روانہ ہو گئی۔ جب واپس آئی تو اس کے پاس نوٹوں سے بھرا ہوا ایک تھیلا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔

"دیکھو عاطون! میں نے کتنا اچھا سودا کیا ہے۔ پورے سوا لاکھ روپے میں بیچے ہیں زیور۔"

تھیلے میں پورے سوا لاکھ روپے کے کرنسی نوٹ تھے۔ میں نے زیادہ سوال نہ کیے۔ کیونکہ اس وقت مجھ پر مالیکا کا سحر طاری تھا اور میں دل سے چاہتا تھا کہ وہ عالی شان کوٹھی کو آراستہ پیراستہ کر کے وہاں مہارانیوں کی طرح رہے۔ دوسرے روز اخباروں میں خبر چھپی کہ صرافہ بازار میں دن دہاڑے ڈاکہ پڑا اور چور ایک صراف کی تجوری سے سوا لاکھ روپے کے کرنسی نوٹ نکال کر لے گئے۔

میں نے اخبار وہیں پھینکا اور مالیکا سے پوچھا کہ اس نے سوالاکھ روپے چوری کیوں کیے۔ مالیکا کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ "تم مجھے چور کہہ رہے ہو' مگر اس صراف کو کیا کہو گے جس نے تم سے پانچ لاکھ کے زیورات لے کر صرف پانچ ہزار دیئے' اور پھر میں نے اگر اپنے گندھرو کی مدد سے تجوری میں سے سوا لاکھ کے نوٹ نکلوائے ہیں تو اس صراف کو چار لاکھ کے زیور بھی تو دے آئی ہوں۔"

میں خاموشی سے سر جھکائے کوٹھی کے برآمدے میں آ کر بیٹھ گیا۔ مالیکا منطقی طور پر غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ محبت نے مجھے بھی اندھا کر دیا اور میں اپنے ضمیر کی آواز کو مختلف دلائل سے دبانے کی کوشش کرنے لگا۔

دس پندرہ دنوں کے اندر' اندر مالیکا نے کوٹھی کو ضرورت کی ہر شے سے آراستہ کر دیا۔ سوالاکھ کی رقم اس زمانے میں بہت تھی۔ بیڈ روم میں قالین اور مہاگنی کے پلنگ بچھ گئے۔ فرنیچر اور دوسرا قیمتی سازوسامان آ گیا۔ کوٹھی کو اندر سے پوری طرح سے سجا دیا گیا تھا مگر میرے اصرار پر بھی مالیکا نے کوٹھی کے باہر نہ تو سفیدی کروانے کی اجازت دی اور نہ برآمدے کی دیواروں کے اکھڑے ہوئے پلاسٹر کی جگہ نیا پلاسٹر لگوانے پر رضا مندی ظاہر کی۔ کہنے لگی۔ "مجھے اس کوٹھی کا آسیبی ماحول اور پراسراریت ہی پسند ہے۔"

مالیکا نے محرابی ڈیوڑھی کی بیل کی بڑھی ہوئی شاخیں اور گراؤنڈ کی گھاس کو بھی نہ کاٹنے دیا۔ میں نے سوچا کہ چونکہ یہ خود ایک آسیبی عورت ہے اس لئے اسے یہی پراسرار ماحول پسند ہے۔ اس پراسرار کوٹھی میں قیام کیے ہمیں تیسرا ہفتہ جا رہا تھا کہ ہم نے شادی

کر لی۔ مالیکا نے میری خواہش پر اسلام قبول کر لیا تھا اور میں نے اس کا اسلامی نام زبیدہ رکھا تھا' لیکن اندر سے وہ ہندو دیوداسی ہی تھی۔ وہ ہر دوسری تیسری رات کو سادھی لگاتی اور دیوتاؤں کے اشلوک بھی پڑھتی۔ مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیتی کہ چونکہ اس کا تعلق آکاش کے دیوی دیوتاؤں سے ہے اس لئے اسے اپنے قدیم مسلک کو بھی نبھانا پڑ رہا ہے۔

میں نے اپنا جڑی بوٹیوں کا کاروبار بھی شروع کر دیا تھا۔ اگرچہ مجھے مالیکا نے منع بھی کیا' لیکن میں نے یہ کہہ کر اپنے کاروباری کو جاری رکھا کہ اس طرح سے میں اپنے آپ مصروف رکھ سکوں گا۔ مالیکا نے کاٹھ بازار سے کسی تارک الوطن ہندو رئیس کی فٹن خرید کر اسے پھر سے ٹھیک ٹھاک کروایا۔ ایک گھوڑا بھی خریدا۔ ایک بوڑھا کوچوان مجھے مل گیا۔ جسے مالیکا نے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ اب وہ ہر روز صبح شام اس فٹن میں بیٹھ کر نہر کے کنارے کنارے ہوا خوری کو جاتی۔ کوٹھی میں کام دھندے کے لئے مالیکا نے صرف ایک ہی لڑکی کو رکھا تھا۔ مالیکا اسے ایک مہاجر کیمپ سے اٹھوا کر اپنے پاس لے آئی تھی۔ اس لڑکی کا نام ریشماں تھا۔ وہ کوٹھی کے ایک کوارٹر ٹائپ کی کوٹھری میں رہتی تھی۔ کھانا وغیرہ بھی ریشماں ہی پکاتی۔

وقت گزرتا گیا۔ مالیکا کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ میں خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ میرے ہاں کوئی اولاد وغیرہ ہو۔ اس کوٹھی میں ہمیں رہتے جب ایک برس گزر گیا تو مجھے پیٹ میں ناف کے نیچے درد رہنے لگا۔ میری پانچ ہزار سالہ زندگی میں ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ مجھے اپنے جسم میں درد محسوس ہوا۔ میں نے پہلے تو کوئی خیال نہ کیا' پھر اس کا ذکر مالیکا سے کیا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "عاطون! اب تم انسانوں کی جون میں واپس آ رہے ہو۔ لگتا ہے کہ یہ تمہارے سفر کا اختتام ہے اور آگے کوئی زمانہ نہیں ہے جہاں تم جا سکو چلو اچھا ہے۔ اب میں تمہیں اپنے ساتھ آکاش میں لے جاؤں گی۔"

لیکن میں نے خفیہ طور پر شہر کے ایک ڈاکٹر سے بات کی۔ میری ناف کے نیچے پیٹ کا حصہ نیلی رنگت اختیار کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کیا۔ پیٹ کے نیلے حصے کا معائنہ کیا۔ دوائی لکھ کر دے دی۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ خون میں فولاد کی کمی ہے۔ میں نے دوائی لکھ دی ہے۔ اسے استعمال کریں ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے دوائی شروع کر دی' لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اس دوران ہماری کوٹھی کے ارد گرد لوگوں نے پراسرار حالات میں مرنا شروع کر دیا۔ مہینے کے اندر اندر آٹھ انسان مر گئے جن میں تین عورتیں اور پانچ مرد تھے۔ کارپوریشن کے محکمہ صحت نے وہاں کیمپ قائم کر دیا۔ خیال تھا کہ اس علاقے میں کوئی وبا پھیل گئی ہے۔ کیونکہ سب کی موت ایک ہی انداز

میں ہوئی تھی۔ مرنے والا پہلے پیٹ درد کی شکایت کرتا۔ پھر دیکھتے دیکھتے تڑپ کر جان دے دیتا۔ سب لاشوں کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔

میں نے مالیکا سے کہا کہ علاقے میں وبا پھیل گئی ہے کیوں نہ کچھ دنوں کے لئے کسی پہاڑ پر چلے جائیں۔ مالیکا نے قہقہہ لگایا۔ "عاطون! تم بھی ڈر گئے موت سے۔ تمہیں تو موت نہیں آ سکتی۔ نہ ہی میں مر سکتی ہوں۔"

میں نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "مالیکا۔ مجھے کچھ وہم سا ہو گیا ہے۔ زندگی میں پہلی بار پیٹ میں درد محسوس ہونے لگا ہے۔ سوچتا ہوں کہیں یہ میری زندگی کی آخیر تو نہیں ہے اور پھر مجھے تم سے محبت ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میرے لئے زندگی بسر کرنا ناممکن ہو جائے گا۔"

مالیکا نے پیار سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "گھبراؤ نہیں عاطون پیارے۔ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ کچھ نہیں ہو گا۔"

وبا اب ماڈل ٹاؤن کے دوسرے بلاکوں میں بھی پھیل گئی۔ ہر روز ایک انسان مر جاتا۔ سارے علاقے میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا اور لوگوں کو دھڑا دھڑ ٹیکے لگائے جانے لگے۔ کوٹھیوں کی صفائی شروع ہو گئی۔ کمروں میں جراثیم کش ادویات چھڑکی جانے لگی۔ گھاس پتوں میں اسپرے ہونے لگا۔

وبا کی شدت کم ہو گئی۔ اب کہیں کہیں کوئی موت واقع ہوتی' لیکن علاقے میں محکمہ صحت والوں کا کیمپ بدستور کام کرتا رہا۔ ایک روز اس وبا نے ہماری کوٹھی پر بھی حملہ کر دیا۔ ہماری نوکرانی ریشماں صبح سو کر اٹھی تو اس نے پیٹ درد کی شکایت کی' پھر زمین پر گر کر تڑپنے لگی اور دیکھتے دیکھتے دم توڑ گئی۔ اس کا سارا جسم بھی سیاہ پڑ گیا۔

مالیکا اس کی لاش کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔ اسے ریشماں سے بہت پیار ہو گیا تھا۔ ریشماں اس کا سارا کام کرتی تھی۔ اس کی بے پناہ خدمت کرتی تھی۔ مالیکا بھی اسے بہت کچھ دیتی تھی۔ مالیکا کے آنسو نہیں تھم رہے تھے۔ میں نے مالیکا کو تسلی دی۔ رومال سے اس کی کنول ایسی آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھے اور کہا۔ "مالیکا! تم اپنے آکاش کے گندھروؤں سے کہہ کر اس وبا کو ختم کیوں نہیں کرواتیں۔ دیکھو آج تمہاری چہیتی نوکرانی کو یہ وبا کھا گئی ہے۔"

مالیکا نے اشکبار آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "عاطون! آکاش کے گندھرو وبا کے معاملے میں بے بس ہوتے ہیں۔ جب ایک بیماری وبا بن جاتی ہے تو پھر اس میں دیوی دیوتا اور گندھرو بھی دخل نہیں دے سکتے۔"

میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ آکاش کے دیوتاؤں سے کم از کم اس وبا کا کوئی توڑ ہی معلوم کر لے۔ مالیکا نے آنسو پونچھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ایسا نہیں کر سکتی عاطون ! اگر ایسا کرتی تو آج اپنی پیاری ریشماں سے کیوں ہاتھ دھوتی۔ کاش ! میں **ریشماں** کی جان بچا سکتی۔"

مالیکا کی حالت تو واقعی **ریشماں** کے غم میں بہت خراب ہو رہی تھی۔ میں اسے اٹھا کر بیڈ روم میں لے گیا۔ زبانی تسلی دینے کے علاوہ میں نے بڑی مشکل سے اسے سلا بھی دیا۔ **ریشماں** کو اسی روز ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

مالیکا نے سات روز تک **ریشماں** کا باقاعدہ سوگ منایا۔ اس نے کالے کپڑے پہن لیے اور سات روز تک بالوں میں کنگھی تک نہ کی۔ آٹھویں روز میرے بے حد اصرار پر اس نے اپنا سوگ برت توڑا' لیکن بستر پھر بھی نہ چھوڑا۔ بس یہی کہتی کہ **ریشماں** کے بغیر مجھے کوٹھی کی ہر شے ویران لگتی ہے۔ میں نے کہا ہم دوسری کوٹھی خرید لیتے ہیں۔ مالیکا نے میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "نہیں عاطون۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اس کوٹھی سے میری پیاری ریشماں کی یادیں وابستہ ہیں۔ میں یہ کوٹھی نہیں چھوڑوں گی۔"

ناگہانی اموات کو ختم ہوئے ایک ماہ مشکل سے گزرا ہو گا کہ اچانک وبا نے پھر زور پکڑ لیا۔ اب اس وبا کا نشانہ قریبی گاؤں میں تھا' جہاں دن میں چار چار موتیں ہونے لگیں۔ وبا کی علامتیں وہی تھیں۔ مرنے والے کے پیٹ میں درد ہوتا اور دیکھتے دیکھتے تڑپ کر مر جاتا۔ مرنے کے بعد لاش کا سارا جسم سیاہ پڑ جاتا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ صرف اتنا ظاہر کرتی کہ مریض کے خون میں زہر سرایت کر گیا تھا۔

اب پولیس بھی حرکت میں آ گئی۔ سارے علاقے کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا۔ یہ مرض رات کو حملہ کرتا۔ صبح اٹھتے ہی مریض پیٹ کے درد سے بے حال ہو کر مر جاتا۔ میرے پیٹ کے درد میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ اب تو مالیکا بھی پریشان ہو گئی اور مجھے فٹن میں بٹھا کر ایک ماہر ڈاکٹر کے پاس معائنہ کرانے لے گئی۔ یہ ماہر ڈاکٹر بھی کوئی تشخیص نہ کر سکا۔ اس نے بھی اس محض اعصاب کا درد قرار دیا اور مجھے انجکشن لکھ کر دے دیئے کہ دن میں تین بار لگوا لیا کرو۔ ان انجکشنوں سے بھی کوئی افاقہ نہ ہوا۔

ایک روز میں کوٹھی میں اکیلا بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ مالیکا فٹن میں بیٹھ کر مارکیٹ کچھ خریدنے گئی ہوئی تھی۔ اچانک میرے پیٹ میں ناف کے نیچے درد اٹھا۔ اس کا تجربہ مجھے پانچ ہزار برس کے بعد پہلی بار ہو رہا تھا۔ ایک ٹیس سی بار بار پیدا ہو رہی تھی۔

میں بے اختیار ہو کر اٹھا کہ ڈاکٹر کو جا کر دکھاؤں۔ کوٹھی سے نکل کر ماڈل ٹاؤن کی

سنسان سڑک پر آ گیا۔ ابھی ماڈل ٹاؤن میں اتنی آبادی نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی اضافی بستیاں تعمیر ہوئی تھیں۔ سردیوں کا موسم ختم ہو رہا تھا۔ مارچ شروع ہونے والا تھا۔ ایک بس یہاں سے شہر کی طرف ضرور مل جاتی تھی۔ میں بس اسٹاپ پر آ کر رک گیا۔ بس کا دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ ایک برقعہ پوش عورت بھی میرے قریب ہی کھڑی تھی۔

میں درد کو برداشت کر رہا تھا۔ پیٹ میں درد ایک ٹیس بن کر تیز کانٹے کی طرح بار بار چبھ کر رہ جاتا' لیکن میں اسے ضبط کیے ہوئے تھا۔ میں ذرا پرے ہٹ کر درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ میں پیٹ پر ہاتھ رکھے گھٹنا پیٹ سے لگائے خاموش بیٹھا درد کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ادھر سے ایک بوڑھے فقیر کا گزر ہوا۔ سرخ وسپید چہرہ' بھاری بھرکم جسم' لمبا چولا' تہمد' پاؤں سے ننگا' ہاتھ میں لمبا سونٹا۔ میری طرف دیکھ کر رک گیا۔ اور بولا۔ "بیٹا ! ہمیں بھوک لگی ہے چوک میں چل کر نان کباب کھلاؤ گے؟"

میں اپنے درد کو سمیٹتا ہوا اٹھا اور کہا۔ "میں حاضر ہوں بابا۔"

اس لئے کہ میں نے آج تک کبھی کسی سوالی کو نہیں ٹالا تھا اور بھوکے کو کھانا کھلانا تو میری زندگی کا سب سے اہم فریضہ رہا تھا۔ میں نے فقیر کو چوک والی دکان پر جا کر نان کباب کھلائے۔ فقیر نے جیب سے بگلے کا سگریٹ نکال کر ماچس میری طرف بڑھا کر کہا۔ "بیٹا ! ہمارا سگریٹ سلگا دو۔"

میں نے ماچس جلائی۔ فقیر سگریٹ سلگانے کے لئے چہرہ میرے ہاتھوں کے قریب لایا۔ اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں میرے چہرے پر جمی تھیں' پھر اس نے سگریٹ سلگا کر ایک لمبا کش لگایا اور بولا۔ "یہ پیٹ کا درد تمہیں کب سے شروع ہوا ہے؟"

میں تو جیسے سکتے میں آ گیا۔ اس فقیر کو کیسے پتہ چل گیا کہ میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے چہرے پر درد کے ہلکے سے تاثر کو نہ آنے دیا۔ فقیر نے سگریٹ کے کش پر کش لگاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "چند ماہ ہوئے ہیں اس درد کو شروع ہوئے بابا۔"

فقیر مسکرا رہا تھا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ بول پڑا۔ "اپنا کان میری طرف لاؤ۔"

میں کان فقیر کے منہ کے قریب لے گیا۔ اس نے مجھے ایک ایسی بات کہی کہ جس سے میرے ذہن میں ایک دھماکہ سا ہوا جیسے کسی نے قریب ہی سے مجھ پر دستی بم پھینک دیا ہو۔ فقیر طنز بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ سگریٹ کا کش لگا رہا تھا۔ "جاؤ آج رات ایسا کرنا کہ ...."

وہ کچھ کہتے کہتے پھر رک گیا۔ مجھے کان قریب لانے کا اشارہ کیا۔ میں کان اس کے ہونٹوں کے پاس لے گیا۔ اس نے مجھے رات سونے سے پہلے دو باتوں پر عمل کرنے کی ہدایت کی' اور بلند آواز میں بولا۔ "پھر خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھنا۔ جس کا تمہیں یقین نہیں' اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھو گے۔ میں کل اسی وقت تمہیں یہیں ملوں گا۔" یہ کہہ کر فقیر چلا گیا۔

فقیر نے جو کچھ مجھے بتایا تھا وہ ایک دھماکہ خیز انکشاف تھا۔ ذہن اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ دل بار بار اس سنسنی خیز انکشاف کو جھٹلاتا تھا' لیکن فقیر غیب دان تھا۔ کرنی والا تھا۔ اس نے میرے بتائے بغیر میرے مرض کو پہچان لیا تھا۔ چنانچہ میں اس کی ہدایات پر عمل کرنے پر تیار ہو گیا۔ اگرچہ میں اور مالیکا دونوں ہی کھانے پینے اور نیند لینے کی حاجت میں بے نیاز تھے' پھر جب سے ہماری شادی ہوئی تھی' ہم نے اپنے آپ کو کھانے پینے اور رات کو بھرپور نیند لینے کا عادی بنا لیا تھا۔ مالیکا کی عادت تھی کہ وہ آدھی رات کو اٹھ کر دودھ ضرور پیتی تھی۔ شیشے کے گلاس میں چینی ملا دودھ ڈال کر اس کے سرہانے کی جانب تپائی پر ڈھانپ کر رکھ دیا جاتا تھا۔ کبھی کبھار تو ایسا ہوتا کہ میں جاگ رہا ہوتا اور وہ میرے سامنے دودھ پی لیتی' لیکن کبھی کبھی میں گہری نیند سویا ہوتا۔ صبح اٹھتا تو گلاس خالی ہوتا۔ یعنی مالیکا میرے سوتے میں دودھ پی لیا کرتی تھی۔

فقیر سے مل کر کوٹھی پہنچا تو مالیکا ابھی مارکیٹ سے واپس نہیں آئی تھی۔ میرے پیٹ کے درد میں کسی حد تک افاقہ ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مالیکا کی فٹن کوٹھی کے پورچ میں داخل ہوئی۔ مالیکا اپنے لیے ریشمی سوٹ کا کپڑا' کاسمیٹک کا سامان اور قسم قسم کی چیزیں خرید کر لائی تھی۔ وہ مجھے دکھانے لگی۔ کپڑا بڑا ہی خوبصورت اور قیمتی تھا۔ میں نے اس کی تعریف کی۔ اسی طرح باتیں کرتے' ہنستے کھیلتے دن گزر گیا۔ شام ہو گئی۔ ریشماں کی موت کے بعد مالیکا نے ابھی تک کسی کو بطور ملازمہ نوکر نہیں رکھا تھا۔ وہ خود ہی کھانا وغیرہ پکا لیتی تھی۔

رات کو ہم نے مل کر کھایا۔ اب میں مالیکا کو کسی دوسری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ مالیکا میری نگاہوں کے تجسس کو نہ پہچان سکی۔ میں نے دودھ کا گلاس مالیکا کے سرہانے ڈھانپ کر رکھ دیا۔ ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر مالیکا نے ایک جماہی لی اور بولی۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔ تم بھی سو جاؤ عاطون۔"

وہ ریشمی چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ میں بھی بستر پر لیٹ گیا۔ مگر آج رات مجھے سونا نہیں تھا۔ آج رات جاگنا تھا۔ میں جاگ رہا تھا۔ مالیکا سو گئی' میں پھر بھی انتظار کرتا رہا۔

اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ میں پھر بھی اپنے بستر پر لیٹا رہا۔ بیڈ روم کی ٹیبل لیمپ کی ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے دیوار پر لگا کلاک رات کے گیارہ بجا رہا تھا۔ میں خاموش بستر پر لیٹا رہا۔ میں کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ جب رات کے ساڑھے گیارہ بجے تو آہستہ سے چادر ہٹا کر بستر سے اٹھا۔ دبے پاؤں مالیکا کے سرہانے کی طرف آیا۔ گلاس اٹھایا اور اس کا سارا دودھ پی کر خالی گلاس وہیں رکھ کر اسے کپڑے سے ڈھانپا اور دبے پاؤں واپس اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ میں نیم وا آنکھوں سے سوئی ہوئی مالیکا کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے بیڈ روم کا آٹومیٹک تالا لگا کر اس کی چابی اپنے سرہانے کے نیچے رکھ لی تھی۔ جبکہ عام طور پر چابی تالے کے ساتھ ہی لگی رہنے دی جاتی تھی۔

دیوار کے کلاک نے رات کے بارہ کا گجر بجایا تو مالیکا کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں نیم وا آنکھوں سے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ مالیکا نے ریشمی چادر پرے ہٹا دی اور تپائی پر رکھے دودھ کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ گلاس کو خالی پا کر وہ کچھ حیران سی ہوئی۔ شاید سوچ رہی تھی کہ اس نے دودھ کس وقت پیا؟ کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ پھر بستر پر پہلو بدل کر میری طرف آئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور یوں ظاہر کیا جیسے میں گہری نیند سو رہا ہوں۔

وہ مجھے جھک کر دیکھ رہی تھی کہ میں سو رہا ہوں کہ نہیں؟ جب اسے یقین ہو گیا کہ میں سو رہا ہوں تو وہ بستر سے پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے تھوڑی تھوڑی آنکھیں کھول دیں۔ مالیکا بستر سے اٹھ کر دروازے کی طرف گئی۔ دروازے میں چابی نہیں تھی۔ اس نے پلٹ کر میز کی طرف دیکھا۔ اس کا دراز کھولا۔ پھر آہستہ سے بند کیا۔ تپائی کا چھوٹا سا دراز کھول کر دیکھا۔ چابی وہاں بھی نہیں تھی۔ وہ کھڑے ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ بیڈ روم کے اوپر ایک چھوٹا سا روشن دان بنا ہوا تھا جہاں سے تازہ ہوا اندر آتی تھی۔ یہ پرانی طرز کا روشن دان تھا جس کی جالی دو تین جگہوں سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ مالیکا پلٹ کر ایک بار پھر میرے قریب آئی۔

اس نے آہستہ سے مجھے آواز دی۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پھر نہ بولی۔ اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ میں گہری نیند میں ہوں۔ وہ روشن دان کے نیچے دیوار کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ میں نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں پھیلی ہوئی دھندلی نیلی روشنی میں وہ ایک خواب کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اس نے چھت کی طرف منہ کر کے اپنے بازو اوپر ..... اٹھا کر ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیے اور پھر اچانک میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ مجھے ایک لمبا سیاہ کالا سانپ بل کھاتا ہوا دیوار پر

چڑھتا دکھائی دیا۔

میرے خدا.... فقیر نے بالکل درست کہا تھا کہ یہ عورت اصل میں مالیکا ناگن ہے جو زمین پر ایک ہزار برس تک ناگن کی شکل میں زندہ رہنے کے بعد ایک حسین اپسرا کی شکل میں آکاش پر دیوتاؤں کے دربار میں پہنچا دی گئی' لیکن وہاں ایک بھیانک جرم کی پاداش میں دیوتاؤں نے اسے آکاش کے سورگ سے نیچے زمین پر گرا دیا اور شراپ دیا کہ وہ ہڑپہ کے قدیم غار میں پتھر کی مورتی بن کر رہے گی۔ مگر آدھی رات کو ایک راکشس آکر اسے زندہ کرے گا اور کوڑے برسانے کے بعد اسے دوبارہ پتھر کی مورتی بنا کر دوسری رات کو آنے کے لئے چلا جایا کرے گا۔ اس کی مکتی تقدیر کے اتفاقات پر رکھ دی گئی تھی کہ اگر کبھی مالیکا ناگن کے پاس ایک ایسا آدمی آگیا' جس کو زندہ رہتے ہوئے' پانچ ہزار سال گزر گئے ہوں تو وہ پتھر کی مورتی سے پھر انسان بن جائے گی اور اس کی کھوئی ہوئی شکتی کا آدھا حصہ اسے واپس مل جائے گا' لیکن جب تک وہ اس لافانی شخص سے بیاہ کرنے کے بعد ایک ہزار انسانوں کو ڈس کر ہلاک نہیں کرے گی اور آخر میں اپنے لافانی خاوند کو موت کے گھاٹ نہیں اتارے گی۔ وہ واپس آکاش کے سورگ میں داخل نہیں ہو سکے گی۔

یہ مالیکا کی روداد تھی' جو اس غیب دان فقیر نے میرے آگے بیان کی تھی اور جو حرف بہ حرف سچ ثابت ہو رہی تھی۔ مالیکا ایک سانپ کی شکل میں دیوار پر چڑھ رہی تھی۔ وہ روشن دان کی ٹوٹی ہوئی جالی میں سے باہر نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی میں گہری سوچ میں ڈوب گیا' پھر بستر میں خاموشی سے لیٹ گیا۔ میں جاگتا رہا۔ تاآنکہ کوئی آدھ گھنٹے بعد مجھے روشن دان میں سے کالا ناگ نیچے دیوار پر رینگتا نظر آیا۔ یہ مالیکا ناگن تھی۔ فرش پر آتے ہی وہ دوبارہ انسانی شکل میں واپس آگئی۔ انسانی شکل میں آتے ہی وہ دبے پاؤں میری طرف آئی۔ اس نے مجھ پر جھک کر آہستہ سے آواز دی۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ دوسری طرف سے بیڈ پر چڑھی اور ریشمی چادر اوپر کر کے ایک گہرا سانس بھر کر لیٹ گئی۔ میں باقی ساری رات جاگتا رہا۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی علاقے میں یہ شور سا مچ گیا کہ ساتھ والے بلاک میں ایک عورت اور اس کا بیٹا وبا کا شکار ہو کر مر گئے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ مالیکا کا کام ہے۔ اب مجھے وہ ایک شیطانی چڑیل کے روپ میں نظر آنے لگی تھی' لیکن فقیر نے مجھے سختی سے اپنی ہدایات پر عمل کرنے کے لئے کہا تھا۔

میں نے مالیکا کو کچھ نہ کہا۔ وہ عورت اور اس کے بیٹے کی موت پر جھوٹے آنسو

بہانے لگی۔ یہ حسین عورت اس قدر سنگ دل' بے رحم اور قاتل بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ غیب دان فقیر نے مجھے ملاقات کا جو وقت دیا تھا عین اس سے دس منٹ پہلے میں مارکیٹ کا بہانہ بنا کر کوٹھی سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔ فقیر ٹھیک وقت پر آگیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ "بیٹا! نان کباب نہیں کھلاؤ گے۔ بڑی بھوک لگی ہے اس فقیر کو۔"

"ہاں بابا۔ کیوں نہیں' میں حاضر ہوں۔"

میں نے کل کی طرح اسے چوک والی دکان پر لے جا کر نان کباب کھلائے۔ اس نے ابھی تک مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے بھی ذکر نہیں چھیڑا تھا۔ نان کباب کھانے کے بعد فقیر نے بگلے کا سگریٹ سلگایا اور مجھے ایک طرف ویران کھیت میں لے گیا اور بولا۔ "دیکھ لیا اپنی آنکھوں سے؟"

میں فقیر کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ "بابا آپ دلوں کا بھید جانتے ہیں۔ اب مجھے بتائیے کہ میں اور اس علاقے کی خلقت' اس قاتل ناگن سے کیسے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں' اگر آپ حکم دیں تو میں ابھی جا کر اس کی گردن اڑا دوں۔ اسے زمین میں زندہ دفن کر دوں۔"

فقیر روشن ضمیر نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور سگریٹ کا دھواں چھوڑ کر بولا۔ "نہ تم اسے زمین میں زندہ دفن کر کے مار سکتے ہو' نہ اس کی گردن اڑانے سے وہ ہلاک ہو گی۔ اس پر تمہارے پستول سے نکلی ہوئی گولی بھی اثر نہیں کرے گی۔"

میں نے پوچھا۔ "تو کیا وہ اسی طرح لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتی رہے گی بابا؟"

"نہیں۔" پیر روشن ضمیر بولا۔ "اس بلائے ناگہانی کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے اور خلق خدا کو اس کی ایذا سے بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے سنو......"

اس بزرگ نے مجھے بے ذائقہ سفوف کی ایک چھوٹی سی پڑیا دے کر کہا کہ آج رات میں یہ سفوف مالیکا ناگن کے دودھ میں ڈال دو۔ اس سفوف کا تھوڑا سا حصہ شیشے کی ایک خالی بوتل میں ڈال کر بیڈ روم میں ایک طرف رکھ دو۔ دودھ پینے کے بعد مالیکا کے جسم میں آگ سی لگ جائے گی۔ وہ اسی سفوف کو دوبارہ نگلنے کے لئے بے تاب ہو جائے گی اور کمرے میں اس کی بو پا کر اسے تلاش کرے گی اور پھر ناگن کی شکل میں آ کر بوتل کے اندر داخل ہو جائے گی۔ "جونہی مالیکا ناگن کے روپ میں بوتل داخل ہو تم بوتل کا منہ کارک سے بند کر دینا' پھر اگلے روز اسی بوتل کو لے کر اس جگہ میرے پاس آ جانا۔"

بزرگ سگریٹ کا کش لگاتا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں سفوف کی پڑیا لے کر کوٹھی واپس آ گیا۔ مالیکا غسل خانے میں تھی۔ میں نے شربت کی ایک خالی بوتل تلاش کر کے اسے صاف کیا اور بیڈ روم میں اپنے بستر کے نیچے چھپا کر رکھ دی۔ رات کو مالیکا نے خود گلاس میں دودھ ڈال کر اپنے بیڈ کے سرہانے والی تپائی پر ڈھک کر رکھ دیا۔ میں نے موقع پا کر بزرگ کا دیا ہوا سفوف آدھا گلاس میں ڈال دیا اور باقی کا سفوف شربت کی خالی بوتل میں ڈال کر اسے کمرے کے کونے میں سنگھار میز کی اوٹ میں رکھ دیا۔

دس گیارہ بجے تک ہم باتیں کرتے اور تاش وغیرہ کھیلتے رہے۔ اس کے بعد مالیکا حسب عادت سو گئی۔ وہ ہمیشہ آدھی رات کے بعد اٹھ کر دودھ پیا کرتی تھی۔ اس رات بھی میں جاگتا رہا۔ میری آنکھیں دودھ کے گلاس پر جمی رہیں۔ کمرے کے کلاک نے رات کے بارہ بجائے تو مالیکا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بستر سے اٹھی اور تپائی پر رکھا دودھ کا گلاس اٹھا کر آہستہ آہستہ دودھ پینے لگی۔ سفوف بے ذائقہ تھا۔ اسے محسوس نہ ہوا۔ دودھ پی کر اس نے گلاس تپائی پر رکھا ہی تھا کہ وہ بے چین سی ہو گئی۔ پہلے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتی رہی پھر اپنے کپڑوں کو نوچتی ہوئی بستر سے نیچے اتر گئی۔

میں نیم وا آنکھوں سے اسے برابر دیکھ رہا تھا۔ مالیکا کے بال کھل گئے تھے۔ اور وہ سر کو بڑی بے چینی کے عالم میں دائیں بائیں مار رہی تھی۔ پھر وہ قالین پر بلی کی طرح بیٹھ گئی اور قالین کو نوچتی ہوئی فضا میں سفوف کی بو سونگھتی سنگھاتی میز کی طرف بڑھی۔ سنگھار میز کے قریب جاتے ہی وہ ایک دم غائب ہو گئی۔ بیڈ روم کی نیلی روشنی میں مجھے ایک سانپ سنگھار میز کے قریب فرش پر رکھی خالی بوتل کی طرف لہراتا نظر آیا۔

یہ مالیکا ناگن تھی۔ بوتل کے اندر سفوف پڑا تھا۔ سانپ نے ایک پھنکار ماری اور بوتل میں اپنا منہ داخل کر دیا' پھر وہ بوتل کے اندر چلا گیا۔ ٹھیک اسی وقت میں چھلانگ لگا کر اپنے بستر سے اٹھا اور بوتل کا پیچ دار ڈھکنا پوری طرح سے بند کر دیا۔ سانپ غصے میں پھنکارا۔ طیش میں آ کر بوتل کی دیوار سے اپنا سر مارنے اور تیزی سے گردش کرنے لگا۔ لیکن وہ بوتل سے باہر نہیں آ سکتا تھا۔

میں نے مالیکا ناگن کو بوتل میں بند کر دیا تھا۔ سانپ والی بوتل کو کپڑے میں لپیٹ کر الماری میں رکھا۔ تالا لگایا اور بستر پر لیٹ کر صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ میں باقی ساری رات جاگتا رہا صبح ہوئی تو میں نے تالا کھول کر الماری .... سے مالیکا ناگن کی بوتل نکالی اور اسے میز پر رکھ دیا۔ ناگن مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سرخ آنکھوں سے شعلے سے نکلتے نظر آ رہے تھے۔

بوتل کو میں نے کپڑے میں لپیٹ کر جیکٹ کے اندر چھپایا اور ماڈل ٹاؤن کے بس اسٹاپ پر آ کر بزرگ کا انتظار کرنے لگا۔ آخر وہ بزرگ تشریف لے آئے۔ آتے ہی بولے۔ "نان کباب نہیں کھلاؤ گے بیٹا؟"

حسب عادت انہوں نے چوک والی دکان پر جا کر نان کباب کھائے۔ پھر مجھے اپنے ساتھ بس میں بٹھایا۔ اور ریلوے اسٹیشن آ گئے۔ راستے میں انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ صرف بس میں سوار ہونے سے پہلے ایک بار پوچھا کہ میں بوتل ساتھ لایا ہوں؟"

ریلوے اسٹیشن پر ہم نے ایک ایک پلیٹ فارم ٹکٹ خریدا اور اسٹیشن کے اندر چلے آئے۔ ایک ٹی اسٹال کی طرف اشارہ کر کے بزرگ نے کہا۔ "آؤ یہاں چائے پیتے ہیں۔"

وہ خاموشی سے چائے پینے لگے۔ چائے پینے کے بعد انہوں نے بگلے کا سگریٹ سلگا کر میرا ہاتھ تھاما اور پلیٹ فارم سے اتر کر ریل کی پٹڑیوں پر سے گزرتے انجن شیڈ کی طرف چل پڑے۔ یہاں دور ایک انجن شنٹنگ کر رہا تھا۔ اس کے ڈرائیور نے بزرگ کو سلام کیا۔ بزرگ نے کہا۔ "تھوڑی دیر کے لئے انجن کو روکو رحمت علی۔ ہم تمہارے انجن کی سیر کریں گے۔"

انجن پہلے ہی بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ ڈرائیور نے بزرگ کے کہنے پر انجن کو بریک لگا دی۔ انجن رک گیا۔ بزرگ نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ہم انجن میں سوار ہو گئے۔ انجن کی بھٹی میں کوئلے دہک رہے تھے۔ بھٹی کے منہ پر گول ڈھکنا چڑھا ہوا تھا۔ پھر بھی بڑی سخت گرمی اور تپش باہر آ رہی تھی۔ بزرگ نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ "بیٹے وہ بوتل مجھے دے دو۔"

میں نے جیکٹ کے اندر سے مالیکا ناگن والی بوتل نکال کر ان کے حوالے کر دی۔ ڈرائیور اور فائر مین بوتل میں بند سانپ کو دیکھ کر قدرے حیران ہوئے۔ بزرگ نے ڈرائیور سے کہا۔ "رحمت علی! یہ بڑا موذی سانپ ہے۔ اس نے بہت خلق خدا کی جان لی ہے۔ اسے دہکتی ہوئی بھٹی میں ڈال کر خلق خدا کو اس کے ظلم سے نجات دلاؤ۔"

رحمت علی نے بوتل اپنے ہاتھ میں لے لی اور کہا۔ "جو حکم شاہ جی!"

فائر مین نے اپنے ڈرائیور کے حکم پر بھٹی کا گول ڈھکنا آہنی سلاخ سے پرے ہٹایا۔ بھٹی کے اندر دوزخ کی آگ دہک رہی تھی۔ سفید اور نارنجی رنگ کے شعلے چکرا رہے تھے۔ بزرگ نے بلند آواز میں کہا۔ "رحمت علی! اس موذی کو بھٹی کی آگ میں جھونک دو۔ جلدی کرو۔"

ڈرائیور نے مالیکا ناگن وا' بوتل انجن کی دہکتی ہوئی بھٹی میں پھینک دی۔ سانپ والی

بوتل کے بھٹی کے جہنم میں گرتے ہی ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا۔ انجن میں جیسے زلزلہ آ گیا۔ اس کے بعد بھٹی کے شعلے نیچے ہو گئے۔ بھٹی میں سے پھنکاروں کی بھیانک آوازیں آنے لگیں۔ بزرگ کی ہدایت پر بھٹی کا منہ بند کر دیا گیا۔

میں نے قمیص ہٹا کر دیکھا واقعی پیٹ پر نیلا نشان موجود نہیں تھا۔ بزرگ نے کہا۔

"اب کبھی یہ نشان نظر نہیں آئے گا۔ نہ تمہیں درد ہو گا۔ جاؤ۔ انجن سے چھلانگ لگا کر واپس چلے جاؤ۔ تمہارا کام ختم ہو گیا ہے۔"

میں نے بزرگ کا شکریہ ادا کرنا چاہا مگر انہوں نے انگلی سے مجھے جانے کا اشارہ کیا۔ میں انجن سے نیچے اتر کر ریل کی پٹڑیوں کے جال پر سے گزرتا ریلوے پلیٹ فارم پر چڑھ گیا۔ میرے دل میں مالیکا کے المناک انجام کا ہلکا ہلکا درد بھی تھا۔ لیکن جب یہ خیال آتا کہ وہ ایک ڈائن تھی جو نہ جانے کتنے معصوم لوگوں کو کھا گئی تو میرے دل میں تسکین اور اطمینان کی ایک بے پایاں لہر ابھر آتی کہ لوگ ایک قاتل ناگن کے شر سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن کی عمارت سے باہر آ کر میں نے ماڈل ٹاؤن جانے والی بس پکڑی اور کوٹھی پہنچ گیا۔

اگرچہ مالیکا ناگن کی ہلاکت خیزیاں ثابت ہو چکی تھیں، پھر بھی کوٹھی میں داخل ہونے کے بعد مجھے ایک اداسی اور خالی پن کا احساس ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے مالیکا سے بے پناہ پیار کیا تھا۔ کوٹھی کے برآمدے میں سائیس بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "صاحب۔ بی بی آج ہوا خوری کو نہیں جائیں گی؟"

میں نے اسے واپس بھیج دیا اور خود بیڈ روم میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مالیکا کی حسین شبیہہ مسکراتی ہوئی آنکھوں میں ابھر آئی، پھر اچانک اس شبیہہ کے لمبے لمبے دانت نکل آئے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ واقعی مالیکا ایک چڑیل تھی۔ اگر وہ بزرگ مجھے نہ ملتے اور میری رہنمائی نہ کرتے تو نہ جانے اس بستی کے ابھی کتنے لوگ موت کا شکار ہوتے، اور نہ جانے خود میرا کیا انجام ہوتا۔ میں نے فٹن چلانے والے سائیس کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ میری بیوی زبیدہ (مالیکا) دو ماہ کے لئے سسرال چلی گئی ہے۔ سائیس کو میں نے پانچ سو روپے دیئے، وہ چلا گیا۔ مالیکا کی موت کے بعد سارے علاقے میں امن و امان چھا گیا۔ وبا ختم ہو گئی۔ مالیکا ناگن کے ڈسنے سے لوگوں کے مرنے کا سلسلہ رک گیا۔ محکمہ صحت اور پولیس کے کیمپ اٹھا دیئے گئے۔ لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ میرے پیٹ کا درد بھی قصہ پارینہ بن چکا تھا۔ اب مجھے خیال آتا کہ قبرستان سے مجھے جو پیتل کے سانپ کی مورتی ملی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ مالیکا ناگن کی مورتی ہی ہو اور اسی نے مجھے اپنے طلسم کے اثر سے ہڑپہ کے کھنڈر میں پہنچایا ہو۔ مجھے یک گونہ تسکین تھی کہ اس مصیبت سے نجات ملی جس کے سامنے میں بھی بے بس ہو گیا تھا۔

میں نے جڑی بوٹیوں کا کاروبار دوبارہ شروع کر دیا۔ میں نے اپنے ہاں کوئی ملازم نہیں رکھا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی اور ویسے بھی میں اپنی ماورائیت اور پراسراریت میں کسی کو گواہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ دن کو کوٹھی پر تالا لگا کر میں شہر چلا جاتا۔ دوپہر تک اکبری منڈی میں جڑی بوٹیوں کی فروخت کے سلسلے میں مصروف رہتا اور پھر واپس کوٹھی میں آ کر بند ہو جاتا۔ میں نے اپنے ہمسایوں سے بھی کسی قسم کے تعلقات استوار نہیں کیے تھے۔ بس آتے جاتے کسی ایک سے سلام علیک ہو جاتی تھی۔

مالیکا کی موت کو ایک ماہ گزرا ہو گا۔ گرمیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ دن کو بڑی تپش تھی۔ رات کو کوٹھی کے درختوں میں ٹھنڈک اتر آتی۔ چونکہ میں گرمی کے احساس سے بے نیاز تھا۔ اس لیے رات کو صحن کی بجائے کمرے میں سوتا تھا۔ ایک شام بڑے زور کی آندھی آئی۔ ہلدی کی طرح زرد آندھی تھی۔ درخت دہرے ہو رہے تھے۔ ہر طرف گرد و غبار چھا گیا تھا۔ آندھی کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ کئی درخت جڑوں سے اکھڑ کر سڑک پر گر پڑے۔ میں ڈرائنگ روم میں سب دروازے بند کیے بیٹھا تھا۔

آندھی کی وجہ سے رات ہونے سے پہلے ہی فضا تاریک ہو گئی۔ آندھی کے ساتھ سیاہ کالے بادل بھی آ گئے اور ان میں بار بار بجلی کے کوندے لپکنے لگے۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ بارش اس قدر طوفانی تھی کہ اس کی بوچھاڑ برآمدے سے گزر کر ڈرائنگ روم کے دروازے سے ٹکرا رہی تھی..... پھر ایک دم بجلی فیل ہو گئی۔

میں نے موم بتی ڈھونڈ کر روشن کی۔ تیز ہوا کے جھونکے دروازے اور کھڑکیوں کی درزوں .... سے ڈرائنگ روم میں بھی آ رہے تھے۔ موم بتی کی لو ادھر ادھر لہرا رہی تھی۔ میں بیڈ روم میں آ گیا۔ بیڈ روم کے اکیلے روشن دان کی ٹوٹی ہوئی جالی..... سے تیز بارش اور طوفانی ہوا کا شور غراتا ہوا سنائی دے رہا تھا۔ میں نے موم بتی سنگھار میز پر رکھ دی اور خود بستر پر تکیے سے ٹیک لگا کر لیٹ گیا۔

ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ کیا مالیکا واقعی مر چکی ہے؟ میں اب آگے کہاں جاؤں گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہاں سے میری واپسی کا سفر شروع ہو جائے گا۔"

رات گہری ہوتی گئی۔ بتی نہ آئی۔ موم بتی آدھی سے زیادہ پگھل چکی تھی۔ میں نے اٹھ کر سنگھار میز کی دراز سے نئی بتی ...... نکال کر روشن کر دی ۔ میں واپس تکیے سے ٹیک

لگا کر بستر میں نیم داز ہو گیا۔ موم بتی کا عکس سنگھار میز کے آئینے میں پڑ رہا تھا۔ روشن دان پر بجلی کی چمک ابھری' پھر زور کا کڑاکا سنائی دیا۔ روشن دان کی ٹوٹی ہوئی جالی میں سے چیخ [illegible]ی آواز بلند ہوئی۔ میری آنکھیں بے اختیار روشن دان کی طرف اٹھ گئیں' مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔

میں بستر میں تھوڑا سا نیچے کھسک گیا۔ اچانک موم بتی کی لو تھرتھرانے لگی۔ میں نے موم بتی کو دیکھا۔ میں جیسے بت سا بنا سنگھار میز کے آئینے میں تکنے لگا۔ سنگھار میز سے چپکی موم بتی کی لو دائیں بائیں لہرا رہی تھی لیکن سنگھار میز کے آئینے میں اس موم بتی کا جو عکس پڑ رہا تھا۔ وہ بالکل ساکن تھا۔ یہ ایک انہونی اور ذہن میں نہ آنے والی بات تھی۔

میں سنگھار میز کے آئینے کو ٹکٹکی باندھے تک رہا تھا۔ آئینے کے باہر کی موم بتی کی لو بری طرح لہرا رہی تھی لیکن آئینے کے اندر موم بتی کے عکس پر ہوا کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کسی حسین ہندو عورت کے ماتھے پر لگے ہوئے شعلہ نما تلک کی طرح بالکل ساکت تھا۔ میں اس مافوق الفطرت بات پر ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ آئینے میں موم بتی کی ساکن لو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ روشن لو پیچھے ہٹتے ہٹتے غائب ہو گئی اور آئینے کی گہرائیوں میں دہکتے ہوئے سانپ کا بالکل سیدھا جسم نمودار ہوا۔ اس دہکتے ہوئے جسم میں سے نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے سے شعلے نکل رہے تھے۔ آگ میں دہکتے سانپ کی آنکھیں سرخ تھیں اور میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے منہ سے اپنے آپ نکل گیا۔ "کون ہو تم؟"

سانپ کا دہکتا ہوا منہ تھوڑا سا کھلا۔ اس میں سے پھنکار کے ساتھ چھوٹا سا شعلہ باہر کو لپکا اور میرے کانوں میں مالیکا کی خشک' خراش زدہ آواز آئی۔ "یہ میں ہوں جسے تم نے ہمیشہ کے لئے جہنم کی آگ میں دھکیل دیا ہے۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔ "مالیکا تم اسی لائق تھی۔ کیا تم یہ چاہتی تھی کہ زندہ رہ کر ہزاروں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دو۔"

دہکتے انگاہ بنے سانپ کے منہ سے ایک پھنکار نکلی۔ مالیکا کی کھرکھراتی آواز آئی۔

"تم اور تمہارے بھائی مجھ سے بچ گئے ہیں۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں جلنے کے لیے ڈال دی گئی ہوں۔ عاطون! میں اگرچہ تمہیں ہلاک نہیں کر سکتی لیکن تم سے ایسا بدلہ لوں گی کہ جسے تم کبھی فراموش نہ کر سکو گے۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "اب تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

مالیکا نے ایک دلدوز چیخ مار کر کہا۔ "میں انتقام لوں گی۔ میں تم سے انتقام لوں گی۔"

اور انگارہ سانپ کا عکس آئینے میں پیچھے ہٹتے ہٹتے غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ موم بتی آگے آ گئی۔ اب آئینے کے اندر جو موم بتی تھی اس کا ننھا سا شعلہ ہوا میں تھرتھرانے لگا تھا۔ روشندان کی ٹوٹی ہوئی جالی میں بھی اب طوفانی ہواؤں کا شور رک گیا تھا۔ مالیکا ناگن مجھے انتقام کا چیلنج دے کر غائب ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر کے لئے مجھے تشویش ہوئی' پھر سوچا کہ مالیکا اب اس مادی دنیا میں نہیں ہے۔ نہ وہ مجھے ڈس سکتی ہے اور نہ میری بیوی ہے کہ مجھے اس سے اپنی جان کا خطرہ ہو۔ میں اٹھ کر تیزی سے سنگھار میز کے پاس آیا۔ موم بتی کی روشنی میں قمیص ہٹا کر اپنے پیٹ کو دیکھا۔ پیٹ پر کسی قسم کا کوئی نیلا نشان نہیں تھا۔

اتنے میں بجلی آ گئی۔ بیڈ روم بقعۂ نور بن گیا۔ میں نے تشویش کے احساس کو جھٹک کر اپنے ذہن سے نکال دیا اور بستر پر لیٹ کر ایک انگریزی رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ آدھی رات کے بعد میں نے بتی بجھا دی اور آنکھیں بند کر لیں۔

دوسرے روز شہر گیا۔ دس بجے تک وہاں رہا' پھر واپس اپنی کوٹھی میں آ کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔ رات بھر کی بارش اور آندھی کے بعد صبح کو .... موسم خوشگوار تھا۔ میں برآمدے میں اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی دبلی پتلی عورت ہاتھ میں خالی ٹوکری لئے کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوئی اور کچھ فاصلے پر رک کر مجھے سلام کیا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتی ہے؟

عورت شکل اور لباس سے بہت غریب معلوم ہوتی تھی۔ بڑی عاجزی سے بولی۔ "بابو جی! غریب عورت ہوں۔ آپ کی کوٹھی میں کچے آم گرے ہیں۔ آپ کا حکم ہو تو یہ اٹھالوں۔ بیچ کر چار پیسے کما لوں گی۔"

میں نے کہا۔ "ہاں اٹھا لو۔"

غریب عورت نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "آپ کا بھلا ہو بابو جی۔"

وہ باغ میں آم کے درختوں کے نیچے گرے پڑے آم اٹھا کر ٹوکری میں ڈالنے لگی۔ آم جمع کرتے ہوئے وہ برآمدے کے قریب آ گئی اور بولی۔ "بابو جی! آپ بڑے دیالو ہیں۔ یہاں تو کوٹھیوں والے سارے آم خود اکٹھے کر لیتے ہیں۔ مجھے کچھ نہیں ملتا۔"

میں نے پوچھا۔ "تم نے ہندی کا لفظ دیالو بولا ہے۔ کیا تم ہندو عورت ہو؟"

غریب ادھیڑ عمر عورت نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "بابو جی! میں پاکستان بننے سے پہلے ہندو تھی مگر اب مسلمان ہو گئی ہوں۔ بیوہ ہوں جی۔ پہلے درگاوتی نام تھا اب شریفاں بی بی نام ہے۔ جی مولوی جی نے مسلمان کیا ہے۔ میری ایک بیٹی بھی ہے بابو جی۔ بسنتی نام تھا اس

کا۔ اب بھی اس کا نام یہی ہے۔ بابو جی بسنتی ہندو نام نہیں ہے نا؟"

میں نے کہا۔ "نہیں شریفاں بی بی۔ بسنتی تو کسی لڑکی کا نام بھی ہو سکتا ہے۔"

غریب عورت مجھے دعائیں دیتے ہوئے آم اکٹھے کرنے لگی۔ وہ ساتھ ساتھ بولتی بھی جا رہی تھی۔ "یہاں ایک گاؤں میں رہتی ہوں جی اپنی بسنتی کے ساتھ۔ خاوند کو مرے دو سال ہو گئے ہیں۔ ہندوستان میں کون تھا جس کے پاس جاتی۔ یہیں مسلمان ہو کر رہ گئی ہوں۔ دل کو بڑی تسلی ہے بابو جی۔ گاؤں والے میرا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ بس آم بیچ کر لوگوں کے گھروں میں کام کر کے پیٹ پال لیتی ہیں دونوں ماں بیٹی۔"

میں نے شریفاں بی بی سے کہا کہ جب تک آموں کا موسم ہے۔ وہ بے شک کوٹھی پر آ کر آم اکٹھے کر کے لے جایا کرے۔ وہ بڑی خوش ہوئی۔ کچے آموں سے ٹوکری بھر کر مجھے دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔

ایک دن چھوڑ کر یہ عورت پھر آئی اور گرے پڑے آم اٹھا لے گئی.... پھر کئی روز نہ آئی۔ درختوں پر آم پک گئے تھے۔ میں نے دو مزدوروں کو بلوا کر آم تڑوا کر ٹوکرے میں بھر کر شریفاں بی بی کے لئے رکھوا لیے۔ اس خیال سے بھی مجھے اس سے بڑی ہمدردی تھی کہ وہ نومسلم خاتون ہے۔ ایک دن دوپہر کے بعد اچانک آ گئی۔ کہنے لگی میری بیٹی بسنتی بیمار تھی بابو جی اس لیے نہیں آئی۔ آموں کا ٹوکرا دیکھ کر بڑی خوش ہوئی۔ دو پھیرے ڈال کر وہ سارے آم لے گئی اور مجھے دعائیں دیں۔ اس بات کو تین دن گزر گئے۔ چوتھے روز شام کا وقت تھا۔ میں تھوڑی دیر پہلے شہر سے واپس آ کر اپنے لیے کافی بنا رہا تھا کہ مجھے باہر کسی عورت کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں کچن سے نکل کر جلدی سے برآمدے میں آیا۔ دیکھا کہ وہی نومسلم غریب عورت سینہ پیٹتی بین کرتی برآمدے کے ستون کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہے۔ آنکھوں سے زاروقطار آنسو جاری ہیں۔

میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا ہوا شریفاں بی بی۔ خیریت تو ہے۔"

نومسلم عورت نے روتے ہوئے کہا۔ "بابو جی! غنڈے میری بسنتی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

"کہاں لے گئے ہیں؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

شریفاں بی بی روتے ہوئے بولی۔ "مندر میں لے گئے ہیں بابو جی۔ میری بچی کی عزت بچا لو۔ پولیس والوں نے مجھے تھانے سے نکال دیا ہے۔ یہ لوگ ابھی تک مجھے ہندو عورت سمجھتے ہیں۔ بابو جی میں مسلمان ہوں۔ میری بیٹی مسلمان ہے۔ خدا کے لئے میری بچی کو بچا لو بابو جی۔"

میں نے اسی وقت پتلون پہنی، جوتا بدلا اور مصیبت زدہ عورت سے کہا۔ "چلو مجھے بتاؤ وہ مندر کہاں ہے؟"

غریب عورت مجھے دعائیں دیتی آنسو پونچھتی اٹھی اور میرے ساتھ چلنے لگی۔ وہ آنسو بہاتے بولے جا رہی تھی۔

"بابو جی! ہم ماں بیٹی ہندو نہیں ہیں۔ غنڈے کہہ رہے تھے تم ہندو ہو۔ ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ بابو جی ہم غریبوں کے پاس عزت ہی تو ہوتی ہے اور کیا ہوتا ہے۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔ بابو جی! وہ بڑے مسٹنڈے ہیں۔ آپ پولیس کو ساتھ لے چلیں۔ ان کے پاس چھری چاقو بھی ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم فکر مت کرو۔ بس مجھے یہ بتا دو کہ وہ مندر کہاں ہے؟"

غریب عورت بولی۔ "یہاں سے تھوڑی دور ہے بابو جی۔ اب یہ مندر اجڑ گیا ہے۔ غنڈے میرے سامنے میری بیٹی کو لے کر مندر میں گھس گئے تھے۔ ہائے میری بچی کا کیا حال ہو رہا ہو گا۔"

میں نے اس نومسلم خاتون کو تسلی دی اور کہا کہ وہ خدا پر بھروسہ رکھے۔ عزت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ بڑی مشکل سے اسے تھوڑا سا حوصلہ ہوا، پھر بھی اس کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔

سورج غروب ہو گیا تھا۔ ماڈل ٹاؤن کے عقبی کھیتوں میں گرم شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ کلر زدہ میدان تھا، جہاں زرد سوکھی گھاس ہی کہیں کہیں نظر آ رہی تھی۔ نومسلم عورت نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "وہ مندر ہے بابو جی۔"

اس طرف دو چار درختوں کے درمیان مندر کا کلس نظر آ رہا تھا۔ میں تیز تیز چل رہا تھا۔ عورت بے چاری پیچھے رہ رہ جاتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اب آنسو جاری تھے۔ مندر کا دروازہ غائب تھا۔ چبوترے کے زینے کی اینٹیں کئی جگہوں سے اکھڑی ہوئی تھیں۔ مندر کے اندر اندھیرا تھا۔ میں جوش کے عالم میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ استھان پر مورتی کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ میں نے پیچھے پلٹ کر عورت سے پوچھا۔ "یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

میں نے دیکھا کہ عورت وہاں نہیں تھی۔ میں نے اسے آواز دی اور مندر کی کوٹھری سے باہر دروازے کی طرف لپکا ہی تھا کہ ایک گڑگڑاہٹ کی آواز بلند ہوئی اور مندر کی چھت ایک زبردست دھماکے کے ساتھ میرے اوپر آن گری۔ ایک پل کے لئے میں اس چھت کے ملبے تلے دب گیا، لیکن میں ذرا سا بھی زخمی نہیں ہوا تھا۔ اس لیے کہ مجھے یاد

ہے مندر کی چھت کی لکڑی کی بھاری کڑی عین میرے سر کے اوپر گری تھی' لیکن مجھے چوٹ کا احساس نہیں ہوا تھا۔ میں اب ملبے کے نیچے دبا ہوا تھا۔ مگر مجھے اپنے جسم پر کہیں بھی درد محسوس نہیں ہو رہا تھا اور میں سانس بھی بڑی آسانی سے لے رہا تھا۔ مجھے اپنے اوپر گرے ہوئے ملبے کا بوجھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا' لیکن ایک عجیب بات یہ تھی کہ میں اپنی پلکیں نہیں جھپکا سکتا تھا۔ نہ ہی اپنے ہاتھ اور پیر ہلا سکتا تھا۔

ایک ناگوار سی بو میرے ذہن میں گھس رہی تھی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا بھی چھایا تھا۔ شاید یہ اس مٹی کی وجہ سے تھا۔ جس کی تہ میری آنکھوں کے آگے چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے زور لگا کر مٹی سے باہر نکلنا چاہا' مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ پھر میں نے ہاتھوں سے ملبے کو پرے ہٹانے کی کوشش کی تو میرے جسم پر جیسے بجلی سی گری۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے بازو اور ٹانگیں غائب ہیں۔

میں صرف اپنے جسم کو آگے پیچھے حرکت دے سکتا تھا۔ میں نے اپنے جسم کو حرکت دی تو وہ بل کھاتا ہوا لہرا کر ملبے کے اندر سے باہر نکل آیا۔ ملبے سے باہر آتے ہی میں خوف اور دہشت کے مارے برف کی طرح سرد ہو کر رہ گیا۔ میں اپنے جسم کو دیکھ رہا تھا جو دو فٹ لمبے سیاہ فام سانپ میں تبدیل ہو چکا تھا مجھے یقین نہ آیا کہ میں اپنا جسم دیکھ رہا ہوں۔ سوچا شاید میں غائب ہوں اور سانپ کے قریب ہی بیٹھا ہوں' مگر جب میں نے اپنی گردن کو حرکت دی تو سانپ کی گردن بھی حرکت میں آ گئی۔ اپنے جسم کو آگے پیچھے ہلایا تو سانپ کا جسم بھی بل کھانے لگا۔

میری روح چیخ اٹھی۔ میرے خدا! یہ کیا ہو گیا تھا۔ اپنی ہزاروں سالہ زندگی میں ایسا بھیانک حادثہ میرے ساتھ کبھی نہیں گزرا تھا۔ رات کا اندھیرا میرے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ میں ملبے کے ڈھیر پر بے حس و حرکت' حیران و ششدر پڑا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے میرے جسم کو رسیوں میں جکڑ دیا ہے۔ دور ماڈل ٹاؤن کی جانب درختوں میں کہیں کہیں کوٹھیوں کی بتیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان میں میری کوٹھی کی روشنی بھی ہو گی۔ میں اس حقیقت کو آج بھی تسلیم کرتا ہوں کہ اس وقت مجھ پر سراسیمگی طاری تھی۔ میں اپنا سر..... وہیں مٹی کے ڈھیر پر رکھے خاموشی سے دور نظر آتی ماڈل ٹاؤن کی روشنیوں کو تک رہا تھا۔ میں اس سنسنی خیز تجربے کی وجہ سے ابھی تک دہشت زدہ تھا۔

جب یہ دہشت ذرا کم ہوئی تو میں نے اپنے حواس پر غور کیا۔ میری نظر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ہر شے اسی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے میں انسان کے روپ میں دیکھا کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے سانپ بھی اسی طرح دیکھتا ہو۔ ایک پرندہ بولتا ہوا

میرے اوپر سے گزرا تو مجھے محسوس ہوا جیسے میرا سارا جسم اس کی آواز کو سن رہا تھا۔ میری قوت سامعہ کا تعلق براہ راست میری زبان سے مربوط ہو چکا تھا جو تھوڑی دیر بعد اپنے آپ میرے منہ سے باہر نکل کر واپس آ جاتی۔ سب سے اہم بات میرے ذہن کی تھی۔ میرا ذہن ایک انسان کی طرح کام کر رہا تھا۔ مجھے ہر شے یاد تھی۔ میرا شعور مجھے میرے ماضی اور حال سے برابر آگاہ کر رہا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ میں عاطون ہوں اور ایک عورت مجھے اس مندر میں اپنی بیٹی کو غنڈوں سے بچانے کے لئے لائی تھی۔

لیکن میرے ساتھ ایسا ہولناک حادثہ کیوں پیش آیا؟ کیا یہ محض ایک حادثہ ہے؟ وہ عورت کون تھی جو مجھے اپنے ساتھ اس مندر میں لائی۔ کیا اس کے پیچھے کوئی سازش کارفرما تھی؟ اس سوال کا جواب مجھے فوراً" ہی مل گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے مالیکا اپسرا کی شبیہ ابھری۔ اس کا سر عورت کا مگر باقی کا دھڑ سانپ کا تھا۔ انتقام کی آگ میں اس کا چہرہ جھلس رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ بند تھے۔ لیکن اس کی پھنکار ایسی آواز کی لہریں میرے جسم سے ٹکرانے لگیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "عاطون! میں ہمیشہ کے لئے آگ میں گر چکی ہوں' مگر میں نے تم سے بھی بدلہ لے لیا ہے۔ اب تو کبھی انسانی جون میں واپس نہیں آ سکے گا۔ جب تک زندہ ہے سانپ بن کر زندہ رہے گا۔ تو موت کو ترسے گا لیکن تجھے موت نہیں آئے گی۔" مالیکا ناگن کی شبیہہ غائب ہو گئی۔

بات صاف ہو گئی تھی۔ میں مالیکا ناگن کے انتقام کی زد میں تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنی والدہ کی روح کی طرف توجہ دی مگر میں والدہ کی شکل کو صاف طور پر اپنے ذہن کے پردے پر نہ لا سکا۔ مجھے قدیم مصری منتر بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ پھر میں نے سرسوتی دیوی کا تصور قائم کرنے اور اس کے بتائے سنسکرت اشلوک یاد کرنے کی کوشش کی۔ میں اس میں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ سرسوتی دیوی کی اگر شکل سامنے آتی تھی تو سنسکرت کے اشلوک ذہن سے محو ہو جاتے تھے۔ اشلوک یاد آتے تو سرسوتی دیوی کا تصور غائب ہو جاتا۔

میں نے اپنا سر خدا کے حضور جھکا دیا اور اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا۔ اب مجھے خدا کی رضا ہی اس اندوہناک صورت حال سے نجات دلا سکتی تھی۔ میں ملبے کے ڈھیر سے اتر کر ماڈل ٹاؤن کی طرف رینگنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ سانپ کی شکل میں میرے لئے کوئی تحفظ نہیں ہے۔ سانپ انسان کا دشمن ہے۔ مجھے دیکھتے ہی لوگ اینٹ پتھر اور لاٹھیوں سے مجھ پر حملہ کر دیں گے' اگر میں مر نہیں سکتا تو کم از کم یہ لوگ میرے جسم کو کچل کر میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے اور پھر خدا جانے یہ ٹکڑے کب آپس میں ملیں گے اور کب میں پھر سے انسانی شکل اختیار کر سکوں۔ ایسا ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ بہرحال اس وقت

سب سے اہم ضرورت یہ تھی کہ میں کسی جگہ جا کر چھپ جاؤں' اور یہ جگہ میری اپنی کوٹھی سے بہتر دوسری کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اپنی کوٹھی کی کسی اندھیری کوٹھری میں کسی بل میں گھس کر اس وقت تک پڑا رہوں گا' جب تک مجھ پر خدا کا فضل نہیں ہوتا اور مجھ پر کیا گیا یہ طلسم نہیں ٹوٹتا۔

رات کی تاریکی چاروں طرف گہری ہو رہی تھی۔ میں ویران میدان اور کٹے ہوئے کھیتوں' جھاڑیوں اور ناہموار جگہوں پر سے رینگتا ہوا اپنی کوٹھی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ درختوں میں گھری ہوئی ماڈل ٹاؤن کی چھوٹی سڑک پار کرنے لگا تو سامنے سے روشنی پڑی۔ میں تیزی سے جھاڑیوں کے پیچھے ہو گیا۔ ایک موٹر کار شور مچاتی گزر گئی۔ میں نے جھاڑی ..... سے نکل کر جلدی سے سڑک پار کی اور اپنی کوٹھی کے سامنے والی گراؤنڈ کی گھاس میں گھس گیا۔ گھاس خودرو اور خشک تھی۔ ایک جھینگر مجھے قریب سے گزرتے دیکھ کر چپ ہو گیا۔

سامنے میری کوٹھی کا گیٹ تھا۔ کوٹھی کے آگے سے جو چھوٹی سی کچی سڑک گزرتی تھی وہاں سناٹا چھایا تھا۔ میں کوٹھی کے پورچ میں آ گیا۔ برآمدے کے کونے والی بتی جل رہی تھی... برآمدہ سنسان تھا۔ میں اس کے ٹھنڈے فرش پر رینگتا ادھ کھلے دروازے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ ہرشے اسی طرح پڑی تھی جس طرح میں چھوڑ گیا تھا۔ بتی جل رہی تھی۔ میں نے ڈرائنگ روم کے قالین کا ایک چکر لگایا۔ کچن میں گیا' پھر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اسٹور روم کوٹھی کے عقب میں تھا۔ سوچا صبح ہو گی تو وہاں جا کر اپنے لیے کوئی خفیہ ٹھکانہ بنا لوں گا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے بھوک پیاس یا تھکان کا کوئی احساس نہیں تھا۔ کیا میری غیر معمولی طاقت بھی میرے پاس ہے یا نہیں؟ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے اپنی طاقت کو آزمانے کی کوشش کی اور ڈرائنگ روم میں آ کر بھاری بھرکم صوفے کے ساتھ سر لگا کر اسے زور سے آگے کو دھکیلا' مگر صوفہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ میرا دل مزید بیٹھ گیا۔ میری غیر معمولی طاقت بھی میرے انسانی روپ کے ساتھ ہی مجھ سے جدا ہو چکی تھی۔ اب میں ایک عام سانپ تھا۔ مجھے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ اگر کسی نے میرے دو ٹکڑے کر دیے تو میں زندہ بھی رہ سکوں گا یا نہیں۔ مجھے ایک خطرناک آزمائش میں ڈال دیا گیا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ دل کو ایک بار پھر اپنی جگہ پر قائم کر لیا تھا اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک بار پھر تیار تھا۔

ساری کوٹھی کھلی پڑی تھی۔ میں کچھ دیر ڈرائنگ روم میں گول میز کے نیچے بیٹھا سوچتا رہا۔ ڈرائنگ روم کے ادھ کھلے دروازے کو میں نے اپنے سر کے ٹھوکے سے بند کر

دیا۔ بتی جل رہی تھی۔ پہلے سوچا کہ دیوار پر رینگ کر پرانے ٹائپ کے سوئچ کے پاس جاؤں اور اسے بھی سر کے دباؤ سے آف کر دوں' پھر خیال کیا کہ روشنی دیکھ کر ہو سکتا ہے کہ کوئی چور ادھر کا رخ نہ کرے۔ چنانچہ بتی کو جلتے رہنے دیا اور خود رینگتا ہوا اسٹور روم میں آ گیا۔ اسٹور روم میں طرح طرح کا کاٹھ کباڑ بھرا تھا۔ کونے میں ٹوٹے پھوٹے سامان کے نیچے بیٹھنے کو ایک جگہ بنا لی اور کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔

رات گزرتی چلی جا رہی تھی۔ نیند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں سر اپنے جسم کے کنڈل پر رکھے چپ اپنے پریشان خیالات میں غرق تھا۔ نہ جانے کتنی دیر اس طرح گزر گئی کہ مجھے آہٹ سنائی دی۔ میں نے اپنا سر اٹھا لیا اور زبان باہر نکال کر کچھ سونگھنے' کچھ سننے کی کوشش کی۔

اب انسانی آواز بھی سنائی دی۔ یہ آواز ڈرائنگ روم کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں رینگ کر اسٹور روم سے باہر نکل کر تاریک راہ داری میں آ گیا۔ یہاں سے ایک دروازہ ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا۔ یہ دروازہ نیم وا تھا۔ دو انسان آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کے الفاظ سمجھ رہا تھا۔ "یہاں تو کوئی نہیں گامو۔ کوٹھی خالی پڑی ہے۔"

"روپیہ پیسہ' زیور کہاں ہے یہ تو پتہ کریں۔ دوسرے کمرے میں آؤ۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ چور ہیں اور بیڈ روم کی طرف جا رہے ہیں۔ جہاں تجوری میں کچھ ہزار روپے اور مالیکا کا روز مرہ کا زیور پڑا تھا۔ میں دروازے کے نیچے سے ہو کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ منہ پر ڈاٹھے باندھے دو دیہاتی وضع قطع کے چور ہاتھوں میں خنجر تھامے ڈرائنگ روم سے بیڈ روم والے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ ڈرائنگ روم میں روشنی تھی مگر بیڈ روم میں اندھیرا چھایا تھا۔

بیڈ روم کا دروازہ کھول کر چور اندر چلے گئے۔ میں تیزی سے رینگتا دیوار پر سے گزر کر بیڈ روم کی چھت کے کونے میں آ گیا۔ میں چھت کے کونے میں دیوار سے چمٹا ہوا تھا۔ اندھیرے میں مجھے دونوں چور صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ تجوری میں چابی لگا کر اسے کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"جلدی کر گامو۔ کوئی آ گیا تو؟"

"آ گیا تو یہ چھری کس واسطے رکھی ہے؟"

"چپ کر"

اس چور کے پاس چابیوں کا ایک پورا چھلا تھا۔ وہ مختلف چابیوں کو سیف کے تالے

پر آزما رہا تھا۔ آخر ایک چابی لگ گئی اور سیف کھل گیا۔ وہ تجوری کے خانوں میں سے
روپے اور زیور نکال کر کپڑے میں ڈالنے لگے۔ پہلے تو قدرتی طور پر خیال آیا کہ ان دونوں
کو اسی جگہ ڈس کر ہلاک کر ڈالوں۔ پھر سوچا کہ ان کو ہلاک کرنے سے مجھے کیا حاصل ہو
گا۔ یہ روپیہ پیسہ اور زیور اب میرے کس کام کے ہیں؟ چور لے جاتے ہیں تو لے جائیں۔
میرے لئے تو یہ سب کچھ بیکار ہے۔ چنانچہ میں نے انہیں کچھ نہ کہا دیوار کے ساتھ لگا
انہیں تجوری ...... سے مال سمیٹتے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ محض روپے پیسے کے لئے میں کسی
انسان کی جان نہیں لے سکتا تھا اور خاص طور پر جب کہ وہ روپیہ پیسہ میرے کسی کام کا نہ
ہو۔

چور بڑے خوش تھے۔ جلدی جلدی سب کچھ سمیٹ کر وہ بیڈ روم سے فرار ہو گئے۔
میں اسٹور روم میں آکر اپنی خفیہ جگہ پر چھپ گیا۔ ساری رات اسٹور روم میں پڑا رہا۔
دن کی روشنی کا احساس ہوا تو اسٹور روم سے نکل کر ڈرائنگ روم اور پھر برآمدے میں
آیا۔ ڈرائنگ روم کی بتی بدستور جل رہی تھی۔ برآمدے میں دن کی دھوپ پھیلی ہوئی
تھی۔ میرا دل اپنی تبدیلی ہیئت پر بوجھل تھا۔ فضا میں دھوپ کی تپش تھی۔ میں برآمدے کی
سیڑھیوں سے رینگ کر آم کے درختوں کے ٹھنڈے سائے میں آگیا۔ کوٹھی کا گیٹ کھلا پڑا
تھا۔ مجھے اس کوٹھی کی ویرانی پر ترس آنے لگا۔ کس چاؤ اور خوشی کے ساتھ میں مالیکا کو بیاہ
کر لایا تھا اور کیسا ہولناک انجام ہوا۔ میں آم کے ایک درخت کے نیچے ہری ہری گھاس میں
سمٹ کر بیٹھ گیا۔ کوٹھی کے لان کی باڑھ میرے قریب ہی تھی،' جس پر جنگلی بیل چڑھی
ہوئی تھی۔ کوٹھیوں کے آگے سے گزرنے والی کچی سڑک خاموش اور ویران تھی۔ اچانک
میرے کانوں میں بین کی آواز پڑی۔ اس آواز میں نہ جانے کیا جادو' کیا طلسم تھا کہ میرا
جسم اپنے آپ تھرکنے لگا۔ میرا سر اوپر کو اٹھا اور دائیں بائیں جھومنے لگا۔ بین کی آواز
کہیں قریب ہی سے آ رہی تھی۔ میرا جسم میری زبان اس بین کی آواز کی لہروں کو شدت
سے محسوس کر رہی تھی۔ میرے جسم کو اپنے آپ بین کی لہروں کی سمت کا اندازہ ہو گیا اور
میں نے اس طرف رینگنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنے آپ کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر
میں ناکام رہا۔ میرے جسم کسی ناقابل شکست طاقت کے زیر اثر خود بخود بین کی آواز پر آگے
بڑھ رہا تھا۔

میں کوٹھی کی باڑھ سے نکل کر کوٹھی کے عقبی حصے میں آ گیا۔ یہاں کچھ فاصلے پر
ایک سپیرا زمین پر بیٹھا سانپ کی پٹاری کھولے بین بجا رہا تھا۔ دو چار لڑکے اس کے سامنے
کھڑے دلچسپی سے سانپ کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے۔ سپیرے کو ابھی تک کوئی احسا نہیں ہوا

تھا کہ میں اس کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اپنے آپ کو شدید خطرے میں
ڈال رہا ہوں۔ میں نے اپنے جسم کو روک کر کئی بار واپس مڑنے کی کوشش کی مگر میں
کامیاب نہ ہو سکا۔ بین کی آواز نے مجھے مست کر دیا تھا۔ اب میرے منہ سے پھنکاریں بھی
نکلنے لگی تھیں۔

اچانک سپیرے نے بین بجاتے ہوئے اپنی پیٹھ پیچھے موڑی۔ بین ابھی تک اس کے
منہ کے ساتھ لگی تھی۔ ایک کالے ناگ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ ایک دم سے اٹھ
کھڑا ہوا اور پہلے سے زیادہ گرم جوشی کے ساتھ بین بجانے لگا۔ شاید اس کی تجربہ کار.....
نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ میں ایک انمول اور کبھی کبھی ہاتھ لگنے والا سیاہ ناگ ہوں۔ اس
نے ایک ہاتھ کے اشارے سے بچوں کو پرے پرے کر دیا اور خود بین کا رخ میری طرف کر
کے بین کو لہرا لہرا کر بجانے لگا۔ میں اس کے قریب آ کر رک گیا۔ اور بین کی آواز پر بے
اختیار ہو کر جھومنے لگا۔

سپیرا بڑی مہارت سے بین کو لہراتے ہوئے مجھے اپنی پٹاری کی طرف لا رہا تھا۔
میرے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ میں بین کی آواز کے طلسم میں جکڑا ہوا تھا' بین کے سروں
نے مجھے مست کر دیا تھا۔ سپیرا پٹاری کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے پٹاری
تھوڑی سی آگے کر دی۔ اب میری قوت ارادی پر سپیرے کی بین کی آواز غالب آ چکی
تھی۔ میں والہانہ انداز میں جھوم رہا تھا۔ جس طرف بین کا رخ ہوتا میں بھی اپنا منہ ادھر کو
کر لیتا۔ میرے جسم کا ذرہ ذرہ مست ہو کر جیسے رقص کر رہا تھا۔

سپیرا بار بار بین کا نچلا کنارہ پٹاری سے ٹکراتا۔ وہ ایک خاص سر اور تال کے ساتھ
بین بجا رہا تھا۔ میرے جسم پر رک رک کر بین کے سر اور تال کی مدھر ضرب سی پڑ رہی
تھی۔ یہ ضرب مجھے مدہوش کیے دے رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سپیرے کا چہرہ پسینے میں
شرابور ہو گیا تھا۔ اس کے ماتھے سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں
سرخ ہو رہی تھیں۔ گال بار بار پھول رہے تھے۔ دونوں ہاتھ بین کے ساتھ ساتھ لہرا رہے
تھے۔ اس نے بین کا کنارہ کالی پٹاری میں ڈال دیا۔ میں بے اختیار ہو کر رقص کرتا پٹاری
میں داخل ہو گیا۔ جونہی میں پٹاری میں داخل ہوا سپیرے نے جلدی سے اس کا ڈھکن بند
کر دیا۔ وہ پٹاری کے ڈھکن پر کپڑا ڈال کر اس کے گرد رسی لپیٹ رہا تھا۔ بین کی آواز
رکتے ہی مجھے ہوش آ گیا۔ مگر اب میں پٹاری میں بند تھا اور مجھ میں اتنی طاقت بھی نہیں
تھی کہ زور لگا کر پٹاری کو توڑ سکوں۔ مجھے سپیرے کی آواز سنائی دی۔ وہ لڑکوں سے کہہ رہا
تھا۔

"شیش ناگ پکڑا ہے۔ چلو لڑکو۔ بھاگ جاؤ' بھاگ جاؤ۔

پھر جیسے سپیرے نے پٹاری کو جھولے میں ڈالا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔

میں سپیرے کی پٹاری میں بند تھا۔

پٹاری سپیرے کے جھولے میں پڑی تھی اور جھولے کے آگے پیچھے ہلنے سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ تیز تیز چلا جا رہا ہے اگرچہ میں انسان سے سیاہ کالے سانپ کی شکل اختیار کر چکا تھا مگر میرا انسانی شعور سلامت تھا۔ تاہم جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا تھا۔ میری غیر معمولی طاقت مجھ سے چھین لی گئی تھی اور سرسوتی دیوی کا گندھرو' منتر یوں بیکار ہو گیا تھا کہ سرسوتی دیوی کی شکل ذہن میں آتی تھی تو منتر یاد نہیں آتا تھا' منتر یاد آتا تھا تو سرسوتی دیوی کی شکل غائب ہو جاتی تھی۔ جب کہ منتر کے کارگر ہونے کے لیے دونوں کا بیک وقت موجود ہونا لازمی تھا۔۔۔۔ اگر یہ دونوں باتیں ایک ہی وقت وقوع پذیر ہو جاتیں تو میں اپنی شکل کسی بھی دوسری شکل میں تبدیل کر سکتا تھا۔ میری والدہ کے منتر کے ساتھ بھی یہی کچھ بیت رہی تھی۔ چنانچہ اس قدیم مصری منتر کی وجہ سے' جو میں چیزوں کو اس کے اصلی سائز سے بہت ہی چھوٹا کر لیا تھا' مجھ سے گویا چھین لی گئی تھی۔ اس اعتبار سے میں بے بسی کی حالت میں سانپ کی شکل اختیار کیے سپیرے کی پٹاری میں بند پڑا تھا۔ میں اس گھڑی کو کوس رہا تھا جب میں اس مکار عورت کے پیچھے لگ کر ماڈل ٹاؤن والے مندر میں گیا' جہاں مالیکا اپسرا نے مجھے انتقام کا نشانہ بنایا اور مجھے سانپ میں تبدیل کر دیا۔ میں نے بھی مالیکا کو جو اصل میں ناگن تھی۔ ماڈل ٹاؤن کے بس اسٹاپ کے بزرگ کی ہدایت پر شنٹ کرتے ریلوے انجن کی بھٹی میں ڈال کر اسے آگ کے شعلوں کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ میرے اندازے کے مطابق اب دوبارہ انسانی شکل میں تو نہیں آ سکتی تھی اور ناگن بھی نہیں بن سکتی تھی' لیکن اس کی شکتی زندہ تھی اور اسی شکتی کے بل پر اس نے مجھ سے یہ بھیانک انتقام لیا تھا۔

مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ سپیرا مجھے پکڑ کر کہاں لیے جا رہا ہے۔ اسے بچوں سے اتنا کہتے میں نے ضرور سنا تھا کہ بڑا قیمتی اور زہریلا سانپ ہاتھ لگا ہے۔ کیا اس سپیرے کو

اپنے علم کی وجہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ میں اصل میں انسان ہوں؟ ہمارے ہاں کے سپیرے بڑے پراسرار علوم کے ماہر ہوتے ہیں۔ سانپوں کے بارے میں وہ بہت سی ایسی باتوں کو جان جاتے ہیں جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بہرحال میں نے اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا تھا کیونکہ میرے اپنے اختیار میں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ میری اپنی غیر معمولی طاقت ختم ہو چکی تھی جو فوق الفطرت قوتیں مجھے سرسوتی دیوی اور اپنی والدہ صاحبہ کی روح کی طرف سے ملی تھیں وہ بھی ایک اعتبار سے معطل ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس وقت میں محض ایک کالا سانپ تھا۔

کافی دیر گزرنے کے بعد سپیرا کچھ موڑ گھومنے اور ایک دو کھائیاں اترنے چڑھنے کے بعد ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں مجھے پٹاری کے اندر کچھ لوگوں کے بولنے اور بچوں کے شور مچانے کی آوازیں سنائی دیں۔ ایک بکری ممیائی--- پھر یہ آوازیں کچھ فاصلے پر رہ گئیں۔ سپیرا رک گیا۔ جھولا جیسے اس نے کاندھے سے اتار کر زمین پر رکھ دیا' پھر میری پٹاری باہر نکال کر اس کا ڈھکنا اٹھا دیا۔

میں پٹاری سے باہر نکل آیا۔ میں نے دیکھا کہ یہ ایک کچی کوٹھری تھی جس کے کھلے دروازے میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ سپیرا ایک ہاتھ میں کپڑے کا ٹکڑا اور دوسرے ہاتھ میں بین لیے مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر زمین پر بیٹھا تھا۔ میرے پٹاری سے نکلتے ہی اس نے بین بجانی شروع کر دی۔ بین کے سروں نے ایک بار پھر مجھے اپنے سحر میں گرفتار کر لیا اور میں پھن کھول کر جھومنے لگا۔

بین بجاتے بجاتے سپیرے نے ایک دو بار میرے آگے کپڑے کا ٹکڑا پھینکا میں نے اس پر پھن مارا۔ تیسری چوتھی بار ایسا کرنے کے بعد سپیرے نے بڑی چابکدستی سے مجھے پکڑ لیا۔ میں اگر چاہتا تو سپیرے کو ڈس سکتا تھا لیکن مجھے اس سے کوئی فائدہ نہیں تھا اور میں یونہی کسی کو موت کے گھاٹ اتارنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سپیرا میرا منہ کھول کر میرے دانتوں کو دیکھنے لگا' پھر اس نے مجھے زمین پر چھوڑ دیا۔ اب وہ بین نہیں بجا رہا تھا۔ میں ادھر ادھر رینگنے لگا۔ میں وہاں سے باہر بھاگ سکتا تھا' لیکن سوچا کہ باہر جا کر لوگوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے سے بہتر ہے کہ اس سپیرے کے پاس ہی رہوں۔ کم از کم یہاں میں محفوظ تو رہوں گا۔ یہ سپیرا میری حفاظت تو کرے گا۔

میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ سپیرے نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے اسے کچھ نہ کہا۔ اس نے مجھے بڑے آرام سے پکڑ لیا۔ وہ مجھ سے کھیلنے لگا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور مجھ سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے مٹی کی ایک پیالی میں شہد اور دودھ ڈال کر پلایا اور

پٹاری میں بند کر کے کونے میں دوسری پٹاریوں کے پاس رکھ دیا۔

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اسے میرے انسان ہونے کی خبر نہیں تھی۔ وہ صرف مجھے ایک انتہائی زہریلا سانپ ہی سمجھ رہا تھا۔ سپیرا کوٹھری بند کر کے چلا گیا۔ دوسرے روز وہ مجھے اپنے ساتھ جھولے میں ڈال کر لے گیا اور شہر کے مضافات میں گھوم پھر کر تماشہ دکھانے لگا۔ شام کو واپس آ کر مجھے پھر کوٹھری میں بند کر دیا۔ اسی طرح چار پانچ دن گزر گئے۔ میں وہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سوچنے لگا۔ آخر میں اس سپیرے کے پاس کب تک پڑا رہ سکتا تھا۔ اس دوران مجھے مالیکا ناگن کی کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ شاید وہ مجھے سانپ کا روپ دے کر اور مجھ سے اپنی بھیانک موت کا بدلہ لے کر خاموش ہو گئی تھی۔

ایک روز شام کے وقت میں کوٹھری میں اپنی پٹاری میں بند پڑا تھا کہ مجھے انسانی قدموں کی آواز سنائی دی' پھر دو آدمی کوٹھری میں آ کر باتیں کرنے لگے۔ ان میں ایک سپیرا تھا اور دوسرا کوئی اجنبی تھا۔

اجنبی کہہ رہا تھا۔ "میں تمہیں منہ مانگے دام دوں گا' مگر سانپ بے حد زہریلا ہونا چاہیے۔ اتنا زہریلا کہ جس کو ڈسے وہ پانی نہ مانگے۔"

سپیرا کہنے لگا۔ "چوہدری جی! ایسا کیڑا دوں گا کہ جسے ڈسے گا وہ پانی بن جائے گا۔"

اس کے ساتھ ہی میری پٹاری کا ڈھکنا اٹھ گیا۔ سپیرے نے مجھے باہر نکال کر زمین پر چھوڑ دیا۔ میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ سپیرے نے بین بجائی۔ میں نے اپنا پھن اٹھا لیا۔ سپیرے کے پاس جو پکی عمر کا دھوتی کرتے والا اجنبی بیٹھا تھا وہ ایک دم پرے ہٹ گیا۔ سپیرے نے بین منہ سے ہٹائی اور بولا۔ "چوہدری جی! یہ ہے وہ کیڑا۔ شیش ناگ ہے۔ ہمالیہ کی پہاڑیوں میں رہتا تھا۔ بڑی مشکل سے پکڑ کر لایا ہوں۔"

وہ آدمی بولا۔ "بس بس یہی ٹھیک رہے گا۔ اسے پٹاری میں بند کر دو۔ بتاؤ کتنے پیسے دوں اس کے؟"

سپیرے نے کہا۔ "حضور مالک ہیں۔ مال بڑا کھرا ہے۔"

اجنبی نے جیب سے بٹوہ نکالتے ہوئے کہا۔ "دو سو روپے ٹھیک رہیں گے۔"

سپیرا گردن جھٹک کر بولا "دو سو روپے کا تو میں اسے شہد ہی کھلا چکا ہوں جناب۔"

آخر پانچ سو روپے پر میرا سودا ہو گیا۔

سپیرے نے میری پٹاری کے گرد رسی باندھی۔ پٹاری کو ایک تھیلے میں ڈالا اور کہا۔ "اسے لے جائیں۔ یہ آپ کا کام چٹکی میں کر دے گا۔"

میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ یہ پکی عمر کا دیہاتی چوہدری----
مجھے پانچ سو روپے میں کس لیے خرید کر لے جا رہا ہے۔ سوچا شاید اپنے کسی دشمن سے
انتقام لینا چاہتا ہے۔ بہرحال میں خاموش رہا اور وہ مجھے لے کر وہاں سے چل دیا۔

یہ آدمی کوٹھری سے کچھ دور کچی سڑک پر جا کر کسی موٹر گاڑی، جیپ یا ویگن میں بیٹھ
گیا کیونکہ انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی تھی۔ یہ موٹر گاڑی دیر تک چلتی
رہی۔ میرے قیاس کے مطابق دو اڑھائی گھنٹے گزر گئے تھے کہ موٹر گاڑی یا جیپ ہموار
سڑک سے نیچے اتر گئی۔ اب وہ کچی سڑک پر جا رہی تھی کیونکہ اسے جھٹکے لگ رہے تھے۔
اس غیر ہموار سڑک پر موٹر گاڑی نے دو تین موڑ کاٹے اور پھر ایک جگہ رک گئی۔ دروازہ
کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ کسی نے میری پٹاری والے تھیلے کو اٹھا لیا اور مجھے لے کر
چلا، پھر مجھے ایک جگہ رکھ دیا گیا۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ اس کے بعد دو آدمی باتیں کرتے میرے قریب آ گئے۔
ان میں سے ایک آواز اسی چوہدری کی تھی، جو مجھے سپیرے سے خرید کر لایا تھا اور دوسری
آواز کسی دوسرے آدمی کی تھی۔ یہ آواز کرخت اور تیز تھی۔

"پورے پانچ میں خرید کر لایا ہوں۔"

"زہریلا کتنا ہے؟"

"سپیرے کا کہنا ہے کہ جس کو ڈسے گا اس کا جسم ایک سیکنڈ میں پانی بن کر بہہ جائے
گا۔"

"تو پھر اسے آج ہی رات شیخو کی چارپائی پر پھینک دیتے ہیں۔ اس کی چارپائی برآمدے
کے شروع میں ہی ہوتی ہے۔"

"یہ کام تمہیں کرنا ہو گا۔ اگر اس سانپ نے شیخو کو ڈس لیا، جس کا مجھے یقین ہے تو
سارا ٹنٹا ہی ختم ہو جائے گا اور ہم پر کسی کو شک بھی نہیں ہو گا۔"

"شک ہوا بھی تو پولیس ثابت نہیں کر سکے گی۔ سانپ تو کھیتوں میں آج کل رات کو
نکلتے ہی رہتے ہیں۔"

"اس کم بخت شیخو کا قصہ ختم ہونے کے بعد ہی ساری جائیداد ہمیں مل سکتی ہے۔"

"تو وہ کیا کرے گا بچہ ہے۔ سانپ تو اسے نظر بھی نہیں آئے گا، اسی اثنا میں سانپ
اسے ڈس چکا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے میں سانپ کی پٹاری لے جاتا ہوں۔"

مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ قصہ جائیداد کا ہے اور دونوں اپنے کسی قریبی اور جائیداد
کے مالک شیخو نام کے بچے کو میرے ذریعے ہلاک کروانا چاہتے ہیں۔ مجھے ان دونوں کے
جسموں کی برابر بو آ رہی تھی۔ ان کی بو سے میں پوری طرح شناسا ہو گیا تھا۔ میں نے دل
میں سوچ لیا تھا کہ شیخو کو تو میں کچھ نہ کہوں گا لیکن ان دونوں قاتلوں کو زندہ نہیں چھوڑوں
گا۔

ایک آدمی میری پٹاری اٹھا کر چل پڑا۔ وہ دروازہ کھول کر کسی کوٹھری میں داخل ہوا۔
مجھے ایک جگہ رکھا اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ باہر صحن میں کچھ عورتوں، بچوں کی
آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایک بھینس کہیں قریب ہی ڈکرا رہی تھی۔ یہ گاؤں کا کوئی گھر
تھا۔ آہستہ آہستہ یہ آوازیں ڈوبتی چلی گئیں اور پھر سناٹا چھا گیا۔ اب جھینگروں کی آوازیں
آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ رات ہو گئی ہے۔

رات آدھی سے کچھ زیادہ ہی گزری ہو گی کہ جس کوٹھری میں، میں بند پڑا تھا، اس کا
دروازہ کسی نے آہستہ سے کھولا اور قدموں کی آواز میرے نزدیک آ کر رک گئی، پھر میری
پٹاری کو اٹھا لیا گیا۔ یہ بو اس آدمی کے ساتھی کی تھی جو مجھے خرید کر لایا تھا۔ ظاہر ہے کہ
قاتل مجھے کسی دیہاتی حویلی کے برآمدے میں معصوم بچے شیخو کی چارپائی پر پھینکنے کے لیے
لے جا رہا تھا تاکہ میں اسے ڈس کر ہلاک کر ڈالوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ یہ آدمی چوروں
کی طرح چھپ چھپ کر چل رہا ہے۔ چلتے چلتے وہ کسی وقت رک بھی جاتا تھا، پھر مجھے لگا کہ
اس نے ایک جگہ دیوار پھاندی ہے۔ کیونکہ میں پٹاری میں اچھل سا پڑا تھا۔ وہ ایک جگہ
رک گیا۔ مجھے اس قاتل کے سانس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

اس نے میری پٹاری کا ڈھکن کھول کر ایک زور دار جھٹکا دیا اور میں سیدھا ایک
چارپائی پر بچھے ہوئے بچھونے پر گر پڑا۔ میں نے جلدی سے سر اٹھا کر دیکھا اس کے پاس
والی چارپائی پر شاید اس کی ماں گردن تک سفید چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ برآمدے کچھ
فاصلے پر بجلی کا پیڈسٹل فین چل رہا تھا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا اندھیرے میں مجھے قاتل
دیوار پھاند کر بھاگتا نظر آیا۔

میں نے معصوم بچے کو کچھ نہ کہا اور رینگتا ہوا چارپائی سے نیچے اتر آیا۔ میں تیزی
سے رینگتا دیوار کی طرف بڑھا۔ دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف اتر گیا۔ قاتل کی بو اسی
طرف سے آ رہی تھی۔ سامنے کیکر کے پیڑوں کا جھنڈ تھا۔ اس کے سائے میں اندھیرا تھا مگر
مجھے اندھیرے میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ یہاں سے ایک پگڈنڈی سامنے کچھ فاصلے پر---
ایک کچی دیوار کی طرف جاتی تھی۔ میں اس طرف تیزی سے رینگنے لگا۔ دیوار پر چڑھ کر
دوسری جانب دیکھا یہاں ایک صحن تھا۔ صحن کی ایک جانب کوٹھری میں لالٹین کی روشنی ہو

رہی تھی۔ کوٹھری کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اب مجھے چوہدری کے جسم کی بو بھی آ رہی تھی۔ میں دیوار سے اتر کر رینگتا ہوا کوٹھری کی چوکھٹ پر سے ہو کر دروازے کے نیچے سے گزر کر دیوار [illegible] ساتھ لگ گیا۔

کوٹھری میں لالٹین کی روشنی میں مجھے دو آدمی نظر آئے۔ ان میں ایک تو مجھے خرید کر لانے والا چوہدری تھا اور دوسرا وہ آدمی تھا جو مجھے معصوم بچے کی چارپائی پر پھینک کر آیا تھا۔ وہ چوہدری کو بتا رہا تھا۔ سانپ نے شیخو کا کام تمام کر دیا ہو گا۔ اب تو اس کی ماں کی آنکھ کھلے گی تو پتہ چلے گا۔

"سانپ کو اچھی طرح بچے پر پھینکا تھا نا؟ کہیں چارپائی کے نیچے تو نہیں گرا؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے چاچا۔ میں نے خود دیکھا کہ سانپ شیخو کی گردن کے پاس رینگ رہا تھا۔ اس نے تو بچے کو اب تک ڈس لیا ہو گا۔"

میں انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر خود فرش اور دیوار کے ساتھ ساتھ اندھیرے میں رینگتا اس چارپائی کے پیچھے آگیا جس پر یہ دونوں ظالم انسان بیٹھے حقہ پیتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ یہ قاتل تھے' اگر میں نے انہیں زندہ چھوڑ دیا۔۔۔۔ تو یہ جائیداد کی خاطر معصوم بچے کی جان لینے سے ہرگز گریز نہیں کریں گے۔ ان کا مار دیا جانا بہت ضروری تھا کیونکہ یہ اپنی طرف سے ایک معصوم بے گناہ بچے کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔ میں چارپائی کے پائے کے پیچھے تھا۔ دونوں قاتلوں کی ٹانگیں میرے آگے لٹک رہی تھیں۔ انہوں نے دھوتیاں گرمی ہونے کی وجہ سے تھوڑی تھوڑی اوپر اٹھا رکھی تھیں اور بڑا اعلیٰ ٹارگٹ تھا۔ میں آہستہ سے رینگ کر آگے ہوا اور ایک قاتل کی پنڈلی پر ڈس دیا۔

وہ تڑپ کر ٹانگ جھاڑتا اٹھا۔ دوسرا بھی ہڑبڑا کر پرے ہٹ گیا۔ "کیا ہوا ہے اوئے؟"

جس کو میں نے ڈسا تھا وہ ٹانگ کو دیکھ رہا تھا۔ سپیرے نے میرے زہر کے بارے میں کچھ زیادہ ہی مغالطے سے کام لیا تھا' اگرچہ میں نے اس قاتل کے جسم میں اپنا آدھا زہر ہی داخل کیا تھا اور آدھا زہر دوسرے قاتل کے لئے بچا کر رکھ لیا تھا' تاہم سپیرے کے قول کے مطابق اس شخص کو اتنے ہی زہر سے فوراً" مر جانا چاہیے تھا۔" یہ۔۔۔ کوئی کیڑا تھا۔ لالٹین ادھر لاؤ۔"

دوسرا گھبرا کر بولا۔ "کہیں۔۔۔ کہیں وہ سانپ تمہارے پیچھے پیچھے یہاں تو نہیں آ گیا؟"

پہلے نے سہم کر کہا۔ "نہیں نہیں۔" اس کے ساتھ ہی وہ کھڑے قدم سے فرش پر گر پڑا۔ دوسرا باہر کو بھاگا' لیکن میں اسے کیسے جانے دیتا؟ میں پھنکار مار کر پھن اٹھا کر اس کے

سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہ آدمی جی دار تھا۔ ڈرنے کی بجائے اس نے مجھ پر حملہ کر دیا' لیکن گھبراہٹ میں حملہ اس طرح کیا کہ مجھے گردن سے پکڑنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی کلائی پر ڈس کر باقی کا زہر اس کے حوالے کر دیا اور پھر فوراً" دیوار پر کافی بلندی پر چڑھ کر نیچے دیکھنے لگا۔

یہ وہی چوہدری تھا جو مجھے پانچ سو روپے میں خرید کر لایا تھا۔ وہ باہر کو بھاگا۔ اس نے شور مچا دیا۔ سانپ' سانپ۔" لیکن اس کے حلق نے جواب دے دیا وہ بھی ریت کی دیوار کی طرح وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں دیوار سے رینگ کر اترا اور کوٹھری سے باہر نکل گیا۔

اس کی آواز کسی نے نہ سنی تھی۔ باہر دور ایک جانب ہینڈ پمپ لگا تھا' جہاں کوئی نوکر چارپائی پر گہری نیند سو رہا تھا۔ میں صحن سے نکل کر ایک طرف گھاس میں رینگنے لگا۔ سوچا کدھر جاؤں؟ کس طرف کا رخ کروں کہ دن نکلنے کے بعد لوگوں کی لاٹھیوں اور پتھروں سے محفوظ رہ سکوں۔ میں نے پھن اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ واقعی سانپ کو اندھیرے میں ہر شے نظر آ جاتی ہے۔ میں اللہ کا نام لے کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔

مجھے خوشی تھی کہ میں نے قاتلوں کو جہنم رسید کر کے ایک بے گناہ بچے کی جان بچا لی ہے۔ میں چھوٹی سی کچی سڑک پر رینگتا چلا جا رہا تھا۔ چاہتا تھا کہ دن نکلنے سے پہلے پہلے کسی محفوظ جگہ چھپ کر بیٹھ جاؤں۔ دن گزر جائے تو رات کے اندھیرے میں پھر اپنا خطروں سے بھرا ہوا سفر شروع کروں گا۔ گاؤں سے کچھ دور جانے کے بعد محسوس ہوا کہ میں اونچی نیچی ڈھیروں کے درمیان سے گزر رہا ہوں۔ میں نے گردن اٹھا کر چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ یہ گاؤں کا قبرستان تھا۔ کچی قبریں اندھیرے میں ابھری ہوئی تھیں۔ موت ایسا سناٹا چھایا تھا۔ کسی قبر پر دیا نہیں جل رہا تھا۔ میں قبروں کے بیچ میں سے ہو کر بل کھاتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی بڑے درد بھرے لہجے میں آہستہ آہستہ کراہ رہا ہو۔ یہ آواز کسی مرد کی تھی۔ میں رک گیا۔ گردن اٹھا کر اردگرد دیکھا مجھے کہیں کوئی انسان نظر نہ آیا۔

آگے بڑھا ہی تھا کہ آواز پھر سنائی دی۔ اب میں نے آواز کی سمت کا تعین کیا اور اس طرف چلا۔ دل میں یہی سوچا کہ شاید کسی انسان کو میری مدد کی ضرورت ہو۔ چھ سات سات قبروں کے پاس سے گزر کر میں رک گیا۔ کراہنے کی آواز اب مجھے بہت قریب سے سنائی دے رہی تھی۔ مگر۔۔۔۔ آس پاس کوئی زخمی انسان نہیں تھا۔

پھر یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ یہ آواز زمین کے اندر سے آ رہی

ہے۔ میں نے اپنا سر زمین کے ساتھ لگا دیا۔ آواز قریبی قبر کے اندر سے آ رہی تھی۔ میں رینگ کر اس قبر پر آیا۔ یہ کوئی تازہ قبر تھی۔ اس کی مٹی ابھی گیلی تھی اور اس پر تازہ پھولوں کے ہار بھی پڑے تھے۔ یاخدا! یہ کیا ماجرا ہے؟ میں سوچنے لگا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ کسی نے دشمنی کی وجہ سے کسی انسان کو زندہ زمین میں دفن کر دیا ہو' یا پھر ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ قبر میں دفن ہونے کے بعد مردہ زندہ ہو گیا ہو یعنی اسے سکتہ ہو گیا ہو اور لوگ اسے مردہ سمجھ کر دفن کر کے چلے گئے ہوں۔ میں نے اپنا سر قبر کی مٹی پر رکھ دیا اور زبان بار بار نکال کر سننے کی کوشش کرنے لگا۔

کسی مرد کے کراہنے کی آواز بالکل صاف آ رہی تھی۔ اگرچہ دبی ہوئی سی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ قبر کے اندر کوئی انسان انتہائی کسمپرسی کے عالم میں مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ میں نے ایک جانب سے قبر میں سوراخ کرنا شروع کر دیا۔ قبر کی مٹی ابھی نرم تھی مجھے سوراخ کھودنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ میں چند ہی لمحوں کے بعد قبر کے اندر تھا۔ کراہنے کی آواز اب بالکل قریب سے آ رہی تھی۔ اس آواز میں انتہائی اذیت' بے بسی اور وحشت تھی کہ میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ میں نے سوراخ میں سے سر نکال کر لحد میں نگاہ ڈالی۔

وہاں میں نے جو کچھ دیکھا اسے میں ساری زندگی فراموش نہ کر سکوں گا۔ آج بھی اس منظر کا خیال آتا ہے تو میرے جسم میں خوف کے مارے ٹھنڈی سنسنی سی دوڑ جاتی ہے۔ یہ ایک کافی کھلی لحد تھی۔ مردہ لحد میں اٹھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی بالشت بھر زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ زبان کا رنگ سیاہ تھا۔ مردے کے گھٹنوں پر ایک پانچ فٹ کا سانپ کنڈل مارے اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کا پھن مردے کی زبان سے بمشکل چار انچ کے فاصلے پر تھا۔ سانپ کی زبان سرخ چھریوں کی طرح بار بار باہر نکل رہی تھی اور وہ ہر بار پھنکار کر مردے کی زبان پر ڈس دیتا تھا۔ مردے کا جسم بالکل بے حس و حرکت تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ذرا سی بھی حرکت نہیں کر سکتا' مگر اس کے حلق سے بڑی ہی المناک کراہیں نکل رہی تھیں۔ یہ عبرتناک منظر دیکھ کر میرے ہوش و حواس جیسے گم ہو گئے ہیں۔ بت بنا سانپ کو مردے کی باہر نکلی زبان پر بار بار ڈسنے کا خوفناک منظر تکنے لگا۔ اتنے میں لحد کے سانپ نے گردن گھما کر میری طرف اپنی خونی سرخ آنکھوں سے دیکھا اور اتنی زور سے پھنکار ماری کہ اس کی پھنکار کی گرمی نے میرے چہرے کو جھلسا دیا۔ میں نے تیزی سے گردن پیچھے کھینچ لی اور بجلی کی تیزی کے ساتھ قبر کے سوراخ میں سے نکل کر باہر آ گیا۔

"یا خدا! اس مردے کے گناہ معاف کر دے۔ یا رحیم و کریم! اس کی بخشش فرما دے'

میرے دل خدائے جبار و قہار کے آگے سر بسجود ہو گیا۔ میں نے اپنی ہزاروں سال کی زندگی میں شاید پہلی بار قبر کے عذاب کا منظر دیکھا۔ میں وہیں قبر پر سر رکھے پڑا اللہ سے مردے کی بخشش کی دعائیں مانگ رہا تھا کہ قبر کے سوراخ میں سے آگ کا شعلہ باہر کو لپکا۔

میں لپک کر دوسری قبر کے پیچھے ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس تازہ بنی ہوئی قبر کے بنائے ہوئے سوراخ میں سے آگ کی سرخ اور زرد زبانیں باہر نکل نکل کر لہرا رہی تھیں۔ مجھے مردے کی چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہاں ٹھہرنے کی اب مجھ میں تاب نہیں تھی۔ میں تیزی سے رینگتا ہوا دوسری قبروں کی طرف نکل گیا۔ اچانک جھاڑیوں---- سے اچھل کر ایک نیولے نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے نیولے اور سانپ کی لڑائی کئی بار دیکھی تھی۔ آخر میں یہی دیکھا تھا کہ نیولے نے سانپ کو ادھ موا کر کے اس کی گردن کو لہولہان کر کے مار دیا۔

میں نیولے کے حملے سے گھبرا کر ایک طرف بھاگا نیولے نے لپک کر میری دم پر دانت گاڑنے کی کوشش کی۔ میں نے پھن اٹھا کر اسے پھنکار ماری۔ وہ بھی جسم کو پھلائے چوکس تھا۔ اس کے بال کانٹوں کی طرح کھڑے تھے۔ وہ میری گردن کو دانتوں میں لینے کے لیے اچکا۔ میں ایک طرف ہٹ گیا اور پھر قبروں میں راہ فرار اختیار کی۔ نیولا میرے پیچھے تھا۔

سامنے ایک قبر کھنڈر بنی نظر آئی۔ ایک طرف اس میں گڑھا پڑا تھا۔ میں اس گڑھے میں گھس گیا۔ شاید نیولا مجھے اس قبر میں اترتے دیکھ نہیں سکا تھا یا اس نے میرے تعاقب کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ بہرحال نیولے سے میری جان چھوٹ گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ کچھ دیر اس قبر کے گڑھے میں چھپا رہنا ہی مناسب ہے۔ میں قبر میں کچھ اور آگے رینگ گیا۔ مجھے روشنی نظر آئی۔ یہ بڑی نرم اور نورانی سی روشنی تھی۔ میں حیران ہوا کہ اس کھنڈر بنی قبر میں یہ روشنی کہاں سے آ گئی۔

میں تھوڑا مزید آگے بڑھا۔ نیچے قبر کی لحد پر نظر پڑی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لحد میں ایک پاکباز نوجوان کفن میں لیٹا ہے۔ چہرے پر نورانی مسکراہٹ ہے۔ عین سر کے اوپر مٹی کے تودے میں سے ایک شاخ نکل کر اس کے ہونٹوں کے قریب آ کر رک گئی ہے۔ شاخ کے آگے سفید پھول کھلا ہے۔ اس سفید پھول میں سے ایسی سرمدی خوشبو نکل رہی ہے کہ ساری قبر مہک اٹھی ہے۔ میں نے آہستہ سے جھک کر پاکباز نوجوان کو سلام کیا اور قبر کے سوراخ سے باہر نکل گیا۔

باہر نکل کر دیکھا کہ قبرستان میں دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔ اجالا میرے لیے بڑا خطرناک تھا' اگر میں کسی انسان کو نظر آ گیا تو وہ پتھر مار کر مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کرے

گا۔ کسی سپیرے نے دیکھ لیا تو وہ بین بجا کر مجھے پٹاری میں بند کر لے گا۔ عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں' کیا نہ کروں؟

قبرستان کے کنارے پر شیشم کا ایک گھنا درخت تھا۔ میں نے اس درخت پر چڑھ کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی دور دور تک کھیت اور میدان نظر آ رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں لاہور شہر سے دور آ چکا تھا۔ کچھ فاصلے پر سڑک تھی' جہاں ایک لاری گزر رہی تھی۔ سڑک کے کنارے کنارے بجلی کے کھمبے دور تک چلے گئے تھے۔

دل میں خیال آیا کہ جس طرح سے بھی ہو سکے مجھے واپس اپنی ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں جا کر اس وقت تک چھپے رہنا چاہیے جب تک کہ میری ہیئت تبدیل نہیں ہوتی اور میں انسانی روپ اختیار نہیں کر لیتا۔ میں درخت سے زمین پر اتر آیا۔ سانپ ہونے کی وجہ سے میں وہاں سے ماڈل ٹاؤن تک کا راستہ معلوم نہیں کر سکتا تھا لیکن سانپ ہونے کی حیثیت سے میرے سونگھنے کی حس بے حد تیز ہو گئی تھی۔ میں نے چاروں طرف زبان نکال کر فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کی۔ مشرق کی طرف سے مجھے اپنے کپڑوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ یہ وہ کپڑے تھے جنہیں میں اپنی ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں چھوڑ آیا تھا۔ حیرانی کی بات تھی کہ اتنی دور سے مجھے اپنے کپڑوں کی خوشبو بالکل صاف محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے مشرق کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ اگرچہ دن کی روشنی تھی لیکن میرے سامنے کھیت اور میدان پھیلے تھے۔ کوئی انسان موجود نہیں تھا۔ میں نے کھیت اور میدان پار کر لیے۔ اب میرے سامنے ایک سڑک تھی اور اس پر ایک لاری گرد اڑاتی چلی آ رہی تھی۔ میں خشک جھاڑیوں میں رک گیا۔ لاری گزر گئی تو میں نے سڑک عبور کی اور دوسری طرف والے کھیتوں میں آ گیا۔ یہ گندم کے کھیت تھے۔ ان کھیتوں سے نکلا تو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے تھے۔ ان سے بچ کر آگے دیکھا تو ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ میرے کپڑوں کی خوشبو اس گاؤں کے عقب سے آ رہی تھی۔

میں گاؤں کے پہلو سے ہو کر ایک چکر کاٹ کر گزر گیا۔

میری رفتار اب بھی کافی تیز تھی۔ کچی پگڈنڈیوں' کلر زدہ میدانی زمین' کٹے ہوئے کھیتوں اور کوڑے کے ڈھیروں میں سے میں بجلی کی سی تیزی سے نکل رہا تھا۔ اس خیال سے کہ یہاں کوئی آدمی نہیں ہے جتنی جلدی ہو سکے یہ فاصلہ طے کر لوں' پھر مجھے دور سے ماڈل ٹاؤن کے اونچے اونچے گھنے درختوں کے جھنڈ نظر آئے۔ کپڑوں کی خوشبو ان ہی درختوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ ماڈل ٹاؤن آبادی کے عقب میں پہنچا تو وہاں لوگوں کو آتے جاتے دیکھا۔

کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ میں رک گیا۔ ماڈل ٹاؤن میں دن کے وقت داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہ فیصلہ کر کے کہ کسی محفوظ جگہ چھپ کر دن گزاروں' میں برگد کے ایک درخت کی طرف بڑھا۔ یہ بہت بڑا درخت تھا۔ اس کی چھاؤں کافی گھنی تھی اور قریب ہی ایک ٹوٹے پھوٹے نانک شاہی اینٹوں والا سوکھا تالاب تھا۔

یہ ویران جگہ ایک سانپ کے چھپنے کے لیے بہت موزوں تھی۔ برگد کے درخت کی ویسے بھی جڑیں گہری ہوتی ہیں۔ تقریباً" آدھی جڑیں موٹے تنوں کی شکل میں اس درخت کی بھی باہر نکلی ہوئی تھیں۔ یہاں میں بڑی آسانی سے چھپ کر دن گزار سکتا تھا۔ چنانچہ میں ایک طرف سے تھوڑی سی جگہ دیکھ کر درخت کی جڑوں میں نیچے چلا گیا۔ یہاں ٹھنڈک اور نمی تھی۔ بے شمار کیڑے مکوڑے رینگ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر یا شاید میرے جسم کی بو پا کر یہ کیڑے مکوڑے مجھ سے دور ہو گئے۔ میں اپنے آپ کو کنڈلی کی شکل میں سمیٹ کر سر ایک طرف ڈال کر وہاں پڑ گیا۔

درخت کی پتلی پتلی بے شمار جڑیں زمین میں دھنسی ہوئی تھیں۔ میری آنکھوں نے درخت کے تنے کے اندھیرے میں پتلی جڑوں کی جھالر کے پیچھے ایک چمکتی ہوئی چیز کو دیکھا۔ یہ کیا ہو سکتا تھا؟ میں اس کی طرف بڑھا۔ قریب جا کر دیکھا کہ یہ ایک پیتل کی گاگر تھی جس کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ اس قسم کی گردنوں والی پیتل کی گاگریں ہندوؤں کے گھروں میں ہوا کرتی تھیں' جن میں ہندو لوگ پانی وغیرہ رکھتے تھے۔ میں حیران ہوا کہ یہاں یہ گاگر کس نے لا کر رکھ دی ہے۔ میں نے اپنا منہ گاگر کے ساتھ لگا کر اسے ہلانے جلانے کی کوشش کی۔ گاگر وزنی تھی۔

میں نے اپنا منہ اوپر اٹھایا اور گاگر پر بندھا ہوا کپڑا ایک طرف سے پھاڑ دیا۔ منہ اندر ڈال کر دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ گاگر سونے کے زیورات اور چمکتے جواہرات سے آدھی بھری ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کسی امیر ہندو یا سکھ نے اپنے گھر کے قیمتی زیورات اور جواہرات گاگر میں ڈال کر یہاں چھپا دیے ہوں کہ جب حالات ٹھیک ہوں گے--- تو واپس آ کر یہاں سے اپنا قیمتی اثاثہ نکال کر لے جاؤں گا۔ سونے کے زیور میں ایک جڑاؤ مکٹ بھی تھا اس قسم کے مکٹ ہندو عورتیں اپنے سر پر لگایا کرتی تھیں۔

لیکن یہ خزانہ میرے لیے بے کار تھا۔ میں واپس تنے کی جڑوں میں آ کر بیٹھ گیا۔ باہر بھینسوں کے گزرنے اور گوالے کے ہانکنے کی آوازیں آئیں' پھر یہ آوازیں بھی دور ہوتے ہوتے غائب ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد دور کچی سڑک پر سے کوئی تانگہ گزرا۔ اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ سانپ ہونے کی وجہ سے آنکھیں تو بند کر نہیں سکتا تھا۔ بس وہیں

آنکھیں کھولے پڑا رہا۔ کافی دیر بعد برگد کے درخت پر سے چڑیوں کی گنجار بلند ہوئی۔ بڑا شور مچا رکھا تھا ان چڑیوں نے شاید شام ہو گئی تھی۔

میں نے درخت کے تنے کے سوراخ میں سے سر نکال کر دیکھا سورج غروب ہو چکا تھا۔ شام کا سرمئی دھندلکا گرم دن کی روشنی سے بچھڑ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ میں نے سوچا کہ ابھی کچھ دیر مزید چھپے رہنا چاہیے اور جب رات کا اندھیرا پھیل جائے تب اپنی کوٹھی کی طرف چلنا چاہیے چنانچہ میں تنے کے اندر چلا گیا۔ کافی دیر دبکا بیٹھا رہا۔ دوبارہ درخت کے تنے سے سر نکال کر باہر دیکھا تو ہر طرف اندھیرا چھا رہا تھا۔ دور ماڈل ٹاؤن کے کھمبوں پر بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ میں نے اس طرف رینگنا شروع کر دیا۔

اندھیرے میں بے خوفی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے اپنے کپڑوں کی خوشبو برابر آ رہی تھی اور اب تو میں نے راستہ بھی پہچان لیا تھا۔ یہ پاکستان بننے کے دو اڑھائی سال بعد کا زمانہ تھا اور ابھی یہاں اتنی آبادی نہیں ہوئی تھی۔ گارڈن میں کھیت تھے اور ان کھیتوں میں کوارٹروں کی صرف ایک قطار ہی دکھائی دیتی تھی۔ ماڈل ٹاؤن کی بھی اکثر کوٹھیاں خالی اور ویران پڑی تھیں۔ اس طرف کہیں کہیں ہندوستان سے آئے ہوئے لوگوں کو الاٹ منٹیں ہوئی تھیں اور وہ بھی کسمپرسی کے عالم میں پڑے تھے۔ دن میں شاید ہی ایک آدھ بار کوئی پرانی وضع کی موٹر کار دکھائی دے جاتی تھی۔ اکثر وسیع و عریض گراؤنڈوں والی کوٹھیاں اندھیرے میں ڈوبی تھیں۔

میں ایک ذیلی سڑک سے ہو کر اس کچے راستے پر آ گیا جو میری کوٹھی کی طرف جاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میری کوٹھی کے برآمدے کی بتی جل رہی تھی۔ برآمدے کے کونے میں جدھر نوکروں کا کچن تھا ایک مرد اور عورت فرش پر کپڑا بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کا لباس دیہاتی وضع کا تھا۔ ستون کے پاس ایک خالی چارپائی' ایک لوٹا اور ایلومونیم کی دیگچی اور گلاس پڑا تھا۔ اگرچہ ہندوستان سے مسلمان مہاجرین کے قافلوں کا سلسلہ بند ہو گیا تھا لیکن ان کی آباد کاری کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ میاں بیوی بھی مہاجر ہیں اور میری کوٹھی کے برآمدے میں آ کر پڑ گئے ہیں۔ میں انہیں نماز میں مصروف دیکھ کر اپنی کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ ساری کوٹھی خالی تھی۔ لوگ میرا سارا سامان لوٹ کر لے جا چکے تھے۔ کپڑوں کی الماری چوپٹ کھلی تھی اور میرے پرانے کپڑوں کا ڈھیر ایک طرف پڑا تھا۔ نہ پلنگ تھا نہ بڑی الماری' نہ سیف' نہ کرسیاں' نہ صوفے اور نہ قالین' کچن بھی ویران پڑا تھا۔ لوگ باتھ روم کا آئینہ تک اکھاڑ کر لے گئے تھے۔ ان تمام کمروں میں اندھیرا تھا۔ صرف میں یعنی سانپ ہی اس اندھیرے میں اپنی عالیشان کوٹھی کی ویرانی کا نظارہ

کر سکتا تھا۔

میں عقبی کھڑکی سے نکل کر آم کے درختوں میں سے ہوتا برآمدے کے شمال کی طرف آ گیا۔ یہاں سے مجھے دیہاتی میاں بیوی نماز پڑھتے بجلی کی روشنی میں بالکل صاف نظر آ رہے تھے۔ ان کی عمریں جوانی کی سرحد پار کر چکی تھیں۔ عورت کا جسم بھاری تھا اور اس نے پرانی سی چادر سے اپنا جسم لپیٹ رکھا تھا۔ میاں کے سر پر سفید پگڑی تھی۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگے۔

عورت سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ میاں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور عورت کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "بھاگوان صبر کرو۔ اللہ کو یہی منظور تھا اور پھر ہم اکیلے ہی یہ غم نہیں بھگت رہے۔ ہزاروں لوگوں کی جوان بچیاں ہندوستان میں رہ گئی ہیں۔" یہ کہتے کہتے اس آدمی کا پیمانہ صبر بھی لبریز ہو گیا اور وہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگا۔ یہ مشرقی پنجاب کے مہاجر میاں بیوی تھے اور ظاہر ہے ہزاروں مہاجروں کی بچیوں کی طرح ان کی بچی بھی وہاں اغوا کر لی گئی تھی۔ عورت نے روتے ہوئے کہا۔ "ظالموں نے میرا جوان بیٹا میری آنکھوں کے سامنے مار ڈالا۔ میری بچی کو بھی مار ڈالتے۔ کم از کم صبر تو آ جاتا وہ میری صغراں کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہوں گے۔ میرے اللہ! مجھے اٹھا لے۔"

عورت ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ اس کا میاں بھی رو رہا تھا اور ساتھ ساتھ اسے تسلی بھی دیتا جاتا تھا۔ یہ درد انگیز منظر مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ اگرچہ قیامت کے ان ایام میں اس قسم کے منظر ہر کیمپ میں دیکھنے میں آتے تھے۔ دیر تک روتے رہنے کے بعد جب ان کے دل کا غبار ذرا ہلکا ہوا تو عورت نے چادر سے اپنے آنسو پونچھ کر کہا۔ "رحمت ابھی تک کیمپ سے نہیں آیا۔"

مرد جانماز سے اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کھجوری پنکھے کو جھلتے ہوئے بولا۔ "پتہ کر رہا ہو گا' ٹرک ہندوستان کب جا رہا ہے۔"

عورت ابھی تک جانماز پر بیٹھی تھی۔ کہنے لگی۔ "میرا ایک ہی بھائی بچا ہے اسے نہ بھیجتے کیمپ۔ خدا جانے کہاں مارا مارا پھر رہا ہو گا۔"

مرد کچھ دیر خاموش رہا' پھر بولا۔ "آ جائے گا۔ جوان جہان ہے۔ ٹرک کا بھی تو پتہ کرنا ضروری ہے۔"

"خدا کرے ہماری بچی مل جائے۔" اس کی آواز بھر آئی۔ عورت پھر دبی دبی سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

اس بدنصیب مہاجر عورت کی بیٹی صغراں مشرقی پنجاب میں سکھوں نے اٹھا لی تھی اور اس کا بھائی رحمت مہاجر کیمپ میں یہ پتہ کرنے گیا ہوا تھا کہ باز یافتہ خواتین کا ٹرک ہندوستان کب جا رہا ہے۔ مرد نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "بھاگوان اللہ پاک کے حکم کے آگے ہمارے سر جھکتے ہیں۔ صبر کرو۔ اٹھو ڈول میں تھوڑی سی دال اور چاول پڑے ہیں کھچڑی ہی بنا لو۔"

عورت خاموشی سے اٹھی اور سامنے نوکروں کے کچن کے باہر اینٹوں کے چولہے میں آگ جلانے لگی۔ میں احتیاط کے طور پر قریبی آم کے درخت پر چڑھ کر ایک ٹہنی سے لپٹ کر بیٹھ گیا۔ دیہاتی عورت نے ایلومونیم کی دیگچی میں کھچڑی تیار کر کے ایک تھالی میں ڈال کر اپنے خاوند کو دی۔

"تم بھی تھوڑی سی کھالو بھاگوان پیٹ کا دوزخ تو بھرنا ہی ہے۔" مرد نے آہ بھر کر کہا۔ عورت نے مٹی کے پیالے میں تھوڑی سی کھچڑی ڈالی اور وہیں بیٹھی آہستہ آہستہ نوالے اٹھانے لگی۔ وہ رو رہی تھی میں دیکھ رہا تھا کہ ہر دوسرے تیسرے نوالے کے ساتھ وہ الٹے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھ لیتی تھی۔ اتنے میں ایک تانگہ باہر آ کر رکا۔ دونوں اٹھ کر ادھر گئے۔ ایک دراز قد دھوتی کرتے میں ملبوس جوان اپنے سر پر ایک بڑا سا گٹھرا اٹھائے کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوا۔

"رحمت بیٹے کچھ پتہ چلا۔" مرد نے پوچھا۔

یہ اس عورت کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے گٹھر برآمدے میں لا کر رکھ دیا۔ اس کے اندر دوچار کھیس اور ایک گٹھری میں آٹا چاول بندھا تھا۔ "یہ راشن کپڑا کیمپ سے ملا ہے۔"

عورت نے بے تابی سے پوچھا۔ "ٹرک میری صغراں کو لینے کب جائے گا۔"

"رحمت دھوتی کے پلو سے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر بولا۔" کہتے ہیں ابھی دس پندرہ دن بعد لیگ والوں کا ایک بڑا ٹرک جائے گا۔ میں نے اپنا نام ساتھ جانے کے لیے درج کرا دیا ہے۔"

صغراں کا باپ ٹھنڈی آہ بھر کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ عورت بے چاری برآمدے کے فرش پر ایک طرف کھیس بچھانے لگی۔ اس نے رحمت کو کھانے کے لیے کھچڑی دی۔

مرد بولا۔ "اپنا تو کچھ نہ رہا۔"

اور وہ چارپائی پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ رحمت کہنے لگا۔ "بھائی کیمپ میں لوگ بتا رہے تھے کہ کرتار پورے سے جو لڑکیاں اٹھائی گئی تھیں لیگ والے انہیں نکال کر لے آئے

ہیں۔ انشاء اللہ ہماری صغراں بھی ہمیں مل جائے گی۔"

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ صغراں کی ماں دوبارہ جانماز پر بیٹھ گئی تھی اور اللہ کے حضور دعا مانگنے لگی تھی۔ اس کا خاوند چارپائی پر چپ چاپ بت بنا بیٹھا تھا۔ ایک اذیت ناک خاموشی طاری تھی، پھرانہوں نے برآمدے کی بتی بجھا دی اور جہاں کوئی تھا وہیں پڑ کر سو گیا۔

میں نے درخت سے اتر کر اپنی خالی کوٹھی کا ایک چکر لگایا اور واپس آم کے درخت پر چڑھ کر شاخ سے چمٹ کر پڑ گیا۔ ساری رات اسی طرح گزر گئی۔ صبح کی اذان کے ساتھ صغراں کی ماں اور اس کا باپ بیدار ہو گئے۔ انہوں نے وضو کیااور جانماز پر جا بیٹھے۔ رحمت ابھی تک سو رہا تھا۔ دن کا اجالا ہوا تو ان لوگوں نے اسی دیگچی میں سے رات کی باسی کھچڑی نکال کر کھائی اور برآمدے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ کرتار پور ہندوستان میں ان کی کافی زمینیں تھیں۔ اپنی ایک حویلی تھی، جہاں وہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان پڑھ اور سیدھے سادے لوگ تھے۔ اوپر سے جوان بیٹے کی شہادت اور جوان بچی کے اٹھائے جانے کا غم پہاڑ بن کر ٹوٹ پڑا تھا۔ بس دوچار روز ہوئے کیمپ کی زندگی سے گھبرا کر میری کوٹھی برآمدے میں آ کر پڑ گئے تھے۔

اچانک کوٹھی کے باہر ایک جیپ آ کر رکی۔ اس میں سے تین چار خوش پوش آدمی نکلے۔ ایک سپاہی بھی ان کے ساتھ تھا۔ کرخت چہرے والا ایک فربہ آدمی ان کے آگے آگے تھا۔ اس کی موٹی توند خاکی پتلون میں باہر نکلی ہوئی تھی۔ ان میں ایک الاٹمنٹ افسر تھا جس نے آتے ہی ان بے گھر مہاجر دیہاتیوں کے سامان کو دیکھ کر کہا، تم کہاں سے آ گئے ہو یہاں؟ یہ کوٹھی تو ملک صاحب کو الاٹ ہوئی ہے۔"

موٹی توند والے ملک صاحب تھے۔ انہوں نے صغراں کے ماں باپ کے ٹوٹے پھوٹے سامان اور اینٹوں کے دھواں کھائے چولہے کو حقارت سے دیکھا اور دیگچی کو لات مار کر بولا۔ "ان گندے دیہاتی مہاجرین سے خدا بچائے۔ کس قدر گند ڈال رکھا ہے انہوں نے کوٹھی میں۔"

سپاہی نے کوٹھی کے چوپٹ کھلے دروازوں میں جھانک کر کہا۔ "شاہ جی! انہوں نے تو کوٹھی کا سارا سامان لوٹ لیا ہے۔"

صغراں کے باپ نے بڑی عاجزی اور حلیمی سے کہا۔ "بھائی جی! ہم جب یہاں آئے تھے تو یہ کوٹھی بالکل خالی پڑی تھی۔"

موٹے ملک صاحب نے جھڑک دیا۔ "اوئے تم گاؤں والے بڑے بھلے ہوتے ہو۔

کسی کے ہاتھوں میں سارا مال بیچ دیا ہو گا۔ اچھا چلو اٹھاؤ۔ یہاں سے اپنا بوریا بستر اور بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

رحمت نے کہا۔ "جناب ہم کہاں جائیں گے ہمارا تو کوئی گھر نہیں۔"

الاٹمنٹ افسر نے جھنجلا کر کہا۔ "اوئے ہم نے تمہارا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ جاؤ واپس کیمپ میں جاؤ۔ یہ کوٹھی ملک صاحب کو الاٹ ہو گئی ہے۔"

پھر وہ ملک صاحب کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "ملک صاحب آپ اپنا سارا سامان اندر رکھوائیں اور کوٹھی کو تالا لگائیں۔ میں شاہ جی کو اگلے بلاک کی کوٹھی الاٹ کر کے ابھی آتا ہوں۔"

الاٹمنٹ آفیسر دو خوش پوش آدمیوں کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ ملک صاحب اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ کوٹھی کے کمروں کا جائزہ لینے لگے۔ مجھے تعجب اس بات پر ہو رہا تھا کہ یہ کوٹھی میری ملکیت تھی۔ کسی ہندو سکھ کی متروکہ جائداد نہیں تھی۔ پھر بھی الاٹمنٹ والوں نے اسے ملک صاحب کو مفت الاٹ کر دیا تھا۔ خیر اگر یہاں یہ بدقسمت غم نصیب دیہاتی گھرانہ پہلے سے آ کر نہ بیٹھا ہوتا تو میں شاید پروا بھی نہ کرتا۔ مجھے کوٹھی سے کیا لینا تھا‘ مگر یہ دیہاتی کنبہ بڑا الم نصیب تھا اور ان کے پاس تو سر چھپانے کی کوئی جگہ بھی نہیں تھی‘ پھر یہ میری کوٹھی تھی اور میں یہی چاہتا تھا کہ یہاں صغراں کی والدہ‘ والد اور رحمت ہی رہیں۔

سپاہی نے جیپ سے نکالا ہوا ایک بھاری ہولڈال اندر لا کر رکھ دیا‘ اور صغراں کے باپ کی طرف نفرت سے دیکھ کر بولا۔ "چلو میاں جی۔ یہاں سے بوریا بستر گول کرو۔"

صغراں کی ماں خاموش تھی۔ رحمت بھی چپ تھا۔ صغراں کے باپ نے آہستہ سے کہا۔ "اگر ہمیں آج کا دن یہیں کوارٹر میں پڑے رہنے دیں تو ہم کل تک کوئی دوسرا ٹھکانہ ڈھونڈ لیں گے۔"

توندیل ملک صاحب کا تو پارا چڑھ گیا۔ "اگر تم اس طرح نہیں جاتے تو میں ابھی تمہارا سامان ..... باہر پھینکوائے دیتا ہوں۔"

میں درخت کی شاخوں میں چھپا یہ سارا ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے توندیل ملک صاحب پر سخت غصہ آیا۔ یہ کون ہوتا ہے۔ میری کوٹھی سے ان شریف لوگوں کو نکالنے والا۔ میں اسی وقت اسے مزا چکھانا اور وہاں سے بھگانا چاہا۔ لیکن یہ سوچ کر رک گیا کہ اس طرح صغراں کی والدہ اور باپ بھی گھبرا کر کوٹھی سے بھاگ جائیں گے۔ جس کوٹھی میں کالا سانپ رہتا ہو‘ وہاں کون ٹھہرتا ہے بھلا۔ چنانچہ میں خاموش رہا۔ ملک صاحب کے ساتھی نے کہا۔

"چلو۔ ادھر کوارٹر میں آج کے دن پڑے رہو‘ لیکن شام تک کوئی دوسری جگہ تلاش کر کے یہاں سے چلے جانا۔ تم رات یہاں نہیں رہ سکتے۔

"اچھا جی۔ جو اللہ کو منظور ہے۔" صغراں کے باپ نے آہ بھر کر کہا۔

یہ بے چارے بد نصیب دیہاتی اپنی خالی چارپائی دیگچی لوٹا‘ کھیس اور مٹی کا پیالہ اٹھا کر سامنے ہی بنے ہوئے میرے نوکر بلکہ سائیس کے کوارٹر کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ ملک صاحب نے سپاہی اور اپنے ساتھی سے کہا۔ "تم لوگ جا کر سامان لے آؤ۔ میں یہیں رہتا ہوں۔"

وہ لوگ چلے گئے۔ توندیل ملک صاحب نے اپنی توند کو پتلون کی پیٹی سے اوپر کیا۔ جیب سے ریشمی رومال نکالا۔ منہ پر آیا ہوا پسینہ پونچھا اور کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔

اس متکبر اور نخوت زدہ آدمی کو یہاں سے ہمیشہ کے لئے بھگانے کا یہی موقع تھا۔ چنانچہ میں درخت سے اتر آیا اور پیچھے سے خشک گھاس میں رینگتا اپنے بیڈ روم کی عقبی کھڑکی میں سے باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ توندیل ملک صاحب کوٹھی کے کمروں کا جائزہ لیتے ڈرائنگ روم سے چلتے چلتے میرے خالی بیڈ روم میں داخل ہو چکے تھے۔ میں باتھ روم کے دروازے کے پیچھے دہلیز سے سر اٹھائے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ بیڈ روم کے وسط میں آ کر چھت کو تک رہے تھے‘ جہاں میں نے اپنی ناگن بیوی مالیکا کی خواہش پر رنگین روغنی بیل بوٹے بنوائے تھے۔

میں باتھ روم کے دروازے سے نکل کر ایک دم سے پھن کھول کر فرش سے چار فٹ بلند ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ملک صاحب کی میری طرف پشت تھی۔ میں نے ایک زور دار پھنکار ماری۔ ملک صاحب نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ اب جو انہیں چند قدموں کے فاصلے پر ایک پانچ فٹ لمبا سانپ پھن اٹھائے‘ زبان لہراتا اور پھنکاریں مارتا نظر آیا تو دہشت کے مارے ان کی زبان گنگ ہو گئی۔ تھر تھر کانپنے لگے۔ میں پھنکار مار کر ان کی طرف بڑھا اور اپنا پھن اس طرح مارا جیسے حملہ کرنے لگا ہوں۔

ملک صاحب چیخ مار کر باہر کو دوڑے۔ میں نے پھن سمیٹا اور باتھ روم کی کھڑکی سے ہو کر دوسری طرف باغ میں آ گیا اور پھر گھاس کے اندر تیزی سے رینگتا آم کے درخت پر چڑھ گیا۔ ملک صاحب توند سنبھالتے گیٹ کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ وہ سانپ سانپ کا شور مچا رہے تھے۔ صغراں کا باپ اور رحمت کوارٹر کی طرف سے دوڑتے ہوئے آئے۔

"کہاں ہے جی سانپ۔"

ملک صاحب کو پسینے چھوٹ رہے تھے۔ کوٹھی کے برآمدے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اندر ... اندر ..... کالا پھنیئر تھا۔ اف خدا نے بچا لیا۔ بچا لیا خدا نے....."

رحمت درخت کی ایک شاخ توڑ کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا تو اس کی بہن نے اسے اندر جانے سے منع کیا مگر جوان خون تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے واپس آ کر کہا۔ "اندر سانپ کہیں نہیں ہے ملک جی۔"

"وہیں کہیں چھپا ہو گا۔" ملک صاحب نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "اتنا لمبا سانپ میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ اف ..... نہ بھائی۔ میں تو اس کوٹھی میں نہیں رہوں گا۔ میری توبہ!"

جیپ پر الاٹمنٹ افسر بھی واپس آ گیا۔ ملک صاحب کو پریشان دیکھ کر پوچھا کہ کیا بات ہے۔ ملک صاحب نے کہا۔ "بھائی صاحب مجھے کسی دوسرے بلاک کی کوٹھی الاٹ کر دیں۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ یہاں اتنا بڑا سانپ رہتا ہے۔"

الاٹمنٹ افسر نے بہت اصرار کیا مگر توندیل ملک صاحب تو کوٹھی کے گیٹ کے باہر جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ "سپاہی سے کہیں۔ ہمارا ہولڈال نکال کر لے آئے۔ ہم یہاں نہیں رہیں گے۔"

.....پھر انہوں نے اپنے ایک ساتھی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "بھاگ کر شہر جاؤ اور قمردین کو منع کر دو کہ سامان ابھی نہ لاء۔ ہم کوئی دوسری کوٹھی دیکھیں گے۔"

انہوں نے جیب سے بٹوہ نکالا۔ اس میں سے کچھ نوٹ نکال کر الاٹمنٹ افسر کو دیے۔ الاٹمنٹ افسر نے مسکرا کر سر ہلایا۔ نوٹ جیب میں رکھے اور سپاہی سے کہا۔ "میاں داد ..... جاؤ ملک صاحب کا ہولڈال اندر سے لے آؤ۔"

سپاہی اندر جاتے ڈر رہا تھا۔ ملک صاحب نے اسے بھی کچھ روپے دیے۔ سپاہی لاٹھی زمین پر مارتا ڈرتے ڈرتے ڈرائنگ روم میں گیا اور ہولڈال اٹھا کر لے آیا۔ ہولڈال جیپ میں رکھ کر ملک صاحب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔ میں بڑا خوش ہوا، لیکن اب یہ خدشہ تھا کہ سانپ نکل آنے کی وجہ سے یہ دیہاتی کنبہ بھی وہاں نہیں رہے گا۔ جب کہ میں چاہتا تھا کہ یہی غم نصیب شریف لوگ میری کوٹھی میں رہیں۔ لیکن یہ دیہاتی لوگ تھے اور سانپ ان کے لئے کوئی ایسی دہشت ناک چیز نہیں تھی۔ دیہاتوں میں سانپوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ چنانچہ جب میں تھوڑی دیر بعد نوکر کے کوارٹر کے پاس گیا تو یہ لوگ وہاں بیٹھے یہی باتیں کر رہے تھے کہ اچھا ہوا سانپ نکل آیا۔ جس کی وجہ سے انہیں وہاں سے اٹھوایا نہیں جائے گا۔ رحمت بولا۔ "اس سانپ کو میں آج ہی ڈھونڈ کر مار ڈالوں گا۔"

صغراں کی ماں بولی۔ "ہم اسی کوٹھری میں پڑے رہیں گے۔ سانپ تو کوٹھی کے اندر ہے۔ ہم وہاں نہیں جائیں گے۔ کیوں کسی کی جان لیں۔ وہ ہمیں تو کچھ نہیں کہتا۔"

رحمت بولا۔ "اور اگر وہ یہاں آ گیا تو؟"

صغراں کا باپ کہنے لگا۔ "سانپ کو کچھ نہ کہو تو وہ بھی کچھ نہیں کہتا۔ میں نے کھیتوں میں کئی بار سانپوں کو دیکھا کہ میں نے کچھ نہیں کہا تو وہ خاموشی سے نکل گئے۔"

ان لوگوں کے دلوں میں کیڑے مکوڑے کے لیے بھی رحم اور محبت تھی۔ جوان لڑکے رحمت کا رویہ قدرتی تھا۔ میں نے بہر حال فیصلہ کر لیا کہ ان لوگوں کے کوارٹر کی طرف بالکل نہیں آؤں گا اور اگر یہ کوٹھی میں گئے بھی تو میں سامنے نہیں آؤں گا۔ جب آہستہ آہستہ مجھے بھول جائیں گے تو خود بخود کوٹھی میں آباد ہو جائیں گے۔

مگر دو دن بعد وہی سنگدل الاٹمنٹ آفیسر ایک نئے آدمی کو کوٹھی میں لے آیا۔ حالانکہ اس الاٹمنٹ آفیسر کو علم ہو گا کہ یہ کوٹھی کسی ہندو یا سکھ کی متروکہ کوٹھی نہیں ہے لیکن وہ پھر بھی آدمیوں کو لیے چلا آ رہا تھا۔ یہ جو نیا آدمی آیا اس نے شکاریوں والی برجس پہن رکھی تھی۔ تانگے سے اترتے ہی اس نے صغراں کے ماں باپ کو تحقیر آمیز نظروں سے دیکھا اور الاٹمنٹ نے آفیسر سے کہا۔ "کیوں بھئی۔ یہ دھوبی لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟؟"

اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے آفیسر کو پیسے کھلا رکھے ہیں۔

الاٹمنٹ آفیسر خوشامدانہ لہجے میں کہنے لگا۔ "خان صاحب یہ تو کوٹھی کی چوکیداری کر رہے تھے۔ بس آپ کے آتے ہی یہ .... رفو چکر ہو جائیں گے۔" .... پھر وہ صغراں کے باپ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کل یہاں سے بوریا بستر اٹھا لینا بابا جی۔"

صغراں کا باپ حیران سا ہو کر اس کا منہ تک رہا تھا۔ مجھے برجس والے اکڑفوں جتاتے خان صاحب پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ یہ خان صاحب الاٹمنٹ آفیسر کے ساتھ کوٹھی دیکھنے کے لئے برآمدے میں داخل ہوئے تو میں ایک بار پھر پیچھے سے ہو کر بیڈ روم کے باتھ روم میں آ گیا۔ اس وقت خان صاحب آفیسر کے ساتھ ڈرائنگ روم کو دیکھ رہے تھے۔ جونہی وہ بیڈ روم میں آئے، میں ایک دل ہلا دینے والی پھنکار مار کر باتھ روم کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میرا پھن جھوم رہا تھا۔ منہ سے پھنکاریں نکل رہی تھیں۔

خان صاحب دہشت زدہ ہو کر پیچھے کو دوڑے، اور ایسے گئے کہ پھر پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ سانپ اور چور کی دہشت واقعی بہت ہوتی ہے۔ اس کے بعد کوٹھی دیکھنے کوئی نہ آیا۔ مزید دو روز گزر گئے۔ تیسرے روز دوپہر کے بعد صغراں کی ماں، صغراں کا باپ اور رحمت ٹھنڈے برآمدے میں لیٹے تھے۔ میں باہر والے آم کے درخت میں چھپا بیٹھا تھا کہ

اچانک باہر سے کسی فقیر نے صدا لگائی۔ اس آواز نے مجھے چونکا سا دیا۔ جانی پہچانی آواز تھی۔

"کیوں بھئی۔ کوئی اللہ کا بندہ نان کباب کھلائے گا۔"

میں نے شاخوں میں سے گیٹ کی طرف دیکھا۔ میں سنبھل گیا۔ وہی بزرگ آدمی چلا آ رہا تھا۔ جو مجھے ماڈل ٹاؤن کے بس اسٹاپ پر ملا کرتا تھا اور جس نے مجھے مالیکا ناگن کے عذاب سے نجات دلائی تھی۔ میں تیزی سے نیچے اترنے لگا۔

بزرگ فقیر برآمدے میں آ کر کھڑا ہو گیا اور صغراں کے باپ سے کہنے لگا۔

"کیوں بابا! ناں کباب نہیں کھلاؤ گے؟"

صغراں کے باپ نے بڑی حلیمی سے کہا۔ "بزرگو' نان کباب تو اس وقت نہیں ہے۔ یہ .... یہ تھوڑی سی کھچڑی رات کے لئے رکھی ہے۔ اسے قبول کر لیں تو مہربانی ہو گی۔"

اس اثنا میں' میں تیزی سے درخت سے اتر کر اس کے سامنے پھن اٹھا کر لہرانے لگا۔ صغراں کی ماں' اس کا خاوند تو ڈر کر ایک دم .... پرے ہٹ گئے۔ رحمت نے لٹھ اٹھا لیا۔

بزرگ فقیر نے ہاتھ کے اشارے سے رحمت کو وہیں بیٹھے رہنے کو کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور کہا۔ "کیوں میاں؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟؟"

میں نے اپنے دل میں کہا۔ "یہ اسی مالیکا ناگن کا انتقام ہے۔ حضور!"

جیسے میرے دل کی آواز فقیر نے سن لی تھی۔ سر ہلا کر بولے۔ "میں سمجھ گیا۔ سب سمجھ گیا۔"

پھر صغراں کے والد کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔ "میاں جی! آپ نان کباب نہیں کھلاتے تو نہ سہی۔ یہ سانپ ہمارا دوست ہے۔ یہ ہمیں نان کباب کھلا دے گا۔ کوئی بات نہیں۔ آؤ میاں"

یہ کہہ کر بزرگ فقیر نے مجھے بڑے آرام سے پکڑ کر اپنے لمبے کرتے کی جیب میں ڈال لیا اور وہاں سے چل پڑا۔

گیٹ سے نکلتے ہی بزرگ فقیر نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور میرے سر کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "میاں تم تو مالیکا ناگن کی پکڑ میں آ گئے۔ چلو کوئی بات نہیں۔ اللہ مالک ہے وہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ وہ غفورا لرحیم ہے۔"

فقیر اپنے آپ باتیں کیے جا رہا تھا۔ کچھ دور تک چلنے کے بعد وہ رک گیا۔ اس نے مجھے جیب میں سے نکالا تو میں نے دیکھا کہ میں اسی مندر کے کھنڈر کے سامنے ہوں' جس

کی چھت گرنے سے میں سانپ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

"میاں! یہاں مالیکا ناگن نے تم پر حملہ کیا تھا۔ گھبراؤ نہیں میں ابھی اس کا نان کباب بناتا ہوں۔"

بزرگ فقیر نے مجھے مندر کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر بنے دروازے کی دہلیز پر رکھا اور خود بھی وہیں بیٹھ گئے۔ ان کا رخ مندر کی طرف تھا جس کی چھت ڈھے گئی تھی مگر ایک دیوار اب بھی دکھائی دے رہی تھی۔ بس یہی ایک دیوار باقی رہ گئی تھی جس پر بنی ہوئی مورتی کو لوگوں نے پتھر مار مار کر توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ فقیر نے کہا۔ "میاں! یہاں لیٹ جاؤ۔ دیکھو میں اس مورتی سے نان کباب منگانے لگا ہوں۔"

میں دہلیز کے پاس ہی سیدھا لیٹ گیا۔ بزرگ فقیر نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر پھونک ماری اور دیوار کی ٹوٹی پھوٹی مورتی کی طرف جلالی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ "کیوں ری چڑیل۔ تو نے اب بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا؟ بتا تیرا نان بناؤں کہ کباب؟"

میں دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو دیوار میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ فقیر نے دوسری بار پھونک مار کر جلالی آواز میں اپنا جملہ دہرایا تو جیسے دیوار ہلنے لگی۔ رہی سہی ٹوٹی پھوٹی مورتی کا باقی حصہ بھی جیسے زلزلے کے ایک جھٹکے کے ساتھ نیچے گر پڑا۔ مجھے کسی عورت کی چیخ کی آواز سنائی دی' جو میرے جسم کے بالکل قریب سے ہو کر جیسے اوپر فضاؤں میں لرزتی ہوئی غائب ہو گئی۔ فقیر نے آسمان کی طرف منہ کر کے کہا۔ "تیرا مقام آگ ہے۔ آگ - آگ - اب تو واپس نہیں آئے گی۔ نہیں آئے گی۔"

مجھے ایک دم ایک جھٹکا لگا اور جیسے کسی نے میری آنکھوں کے آگے اپنا ہاتھ کر دیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میرا سارا جسم آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے کوئی میرے جسم سے چپکا تنگ لباس کھینچ رہا ہے۔ مجھے اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے پاؤں ہلائے' پھر ہاتھ ہلائے۔

میری آنکھوں کے آگے سے ہاتھ اٹھ گیا۔ بزرگ فقیر میرے سامنے بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ "میاں خدا کا شکر بجا لاؤ۔ اٹھو۔ اب سب سے پہلے چوک میں چل کر مجھے نان کباب کھلاؤ۔"

میں پھر سے اپنی انسانی شکل میں واپس آ چکا تھا۔ میرا لباس وہی تھا۔ جو سانپ کا روپ اختیار کرتے وقت میں نے پہن رکھا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں میں مسرت اور عقیدت کے آنسو امڈ آئے۔ میں نے بزرگ فقیر کا ہاتھ چوم لیا۔ وہ ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے بولے۔ "میاں خدا کے حضور سجدہ ادا کرو۔ ادھر قبلہ شریف ہے۔"

میں خدا کے حضور بطرف قبلہ سجدے میں گر پڑا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے اور میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ جب میں نے سجدے سے سر اٹھایا تو دیکھا کہ بزرگ فقیر غائب ہو چکے تھے۔ انہیں غائب ہونا ہی تھا۔ وہ تو اللہ کے حکم سے میری مدد کو آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے میرے گناہ بخش دیئے تھے اور مجھے معاف کر دیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ میرا لباس کرتہ اور پاجامہ ہی تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جیب میں ستر اسی کے قریب کرنسی نوٹ موجود تھے۔ ۱۹۵۲ء میں یہ رقم بہت ہوا کرتی تھی۔ میں نے مندر کی منہدم دیوار کو دیکھا۔ وہاں سوائے ملبے کے اور کچھ نہیں تھا۔

میں خوشی خوشی اپنی کوٹھی کی طرف چلا۔ مالیکا ناگن کا آسیب ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا تھا۔ سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ فضا میں گرمی تھی، لیکن یہ گرمی مجھے محسوس نہیں ہو رہی تھی اور مجھے پسینہ بھی نہیں آ رہا تھا جو اس امر کا ثبوت تھا کہ میری غیر معمولی طاقت مجھے واپس مل گئی تھی۔ کوٹھی کے برآمدے میں دیہاتی کنبہ اپنا مختصر سا سامان باندھ رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا تو صغراں کے باپ نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "آپ کو یہ کوٹھی الاٹ ہو گئی۔ فکر نہ کریں۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ آپ بے شک قبضہ کر لیں۔"

میں مسکرایا۔ برآمدے کے فرش پر ان کے قریب بیٹھ گیا۔ "میں اس کوٹھی کا اصلی مالک ہوں۔ میرا نام عبداللہ ہے۔ میں باہر گیا ہوا تھا۔ اب آیا ہوں۔"

صغراں کا باپ اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ کی کوٹھی آپ کو مبارک ہو بیٹا۔ ہم مہاجر ہیں، کیمپ میں چلے جائیں گے۔"

صغراں کی ماں اور رحمت خاموش بیٹھے مجھے تک رہے تھے۔ میں نے کہا "میاں جی! میں آپ کو یہاں سے نہیں .... جانے دوں گا، آپ اسی کوٹھی میں ہی رہیں گے۔"

انہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرے پاس اس کوٹھی کی رجسٹری موجود ہے جو میں نے ایک بینک میں رکھوائی ہوئی ہے۔ میں اس کے مالک کی حیثیت سے آپ کو اس میں رہنے کی دعوت دے رہا ہوں۔ میرے لیے کونے والا کمرہ ہی بہت ہے۔"

میری باتوں سے انہیں خلوص اور پیار و محبت کی خوشبو کا احساس ہوا اور وہ جلد مجھ سے گھل مل گئے۔ رحمت نے بتایا کہ اس کوٹھی میں ایک سانپ رہتا تھا جسے ایک فقیر پکڑ کر لے گیا ہے۔ میں نے کہا۔ "چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ سانپ چلا گیا۔"

صغراں کا باپ کہنے لگا۔ "جب ہم یہاں آئے تو کوٹھی کا سارا سامان لوگ لوٹ کر لے جا چکے تھے۔ یہاں کئی لوگ قبضہ کرنے آئے مگر سانپ کے ڈر کے مارے بھاگ گئے۔"

میں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ ہم نیا سامان لے آئیں گے۔"

میں نے صغراں کی والدہ اور والد سے درخواست کی وہ ڈرائنگ روم میں آ جائیں، انہیں نوکر کے کوارٹر میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شام کو میں بازار سے کچھ کھانے پینے کو لے آیا۔ ہم نے مل کر کھانا کھایا۔ صغراں کے باپ نے مجھے اپنی بیٹی صغراں کے بارے میں بتایا کہ وہ مشرقی پنجاب میں ہی رہ گئی ہے۔ مجھے سب کچھ پہلے سے ہی علم تھا، پھر بھی میں نے انہیں حوصلہ دیا کہ مسلم لیگ کے ٹرک مشرقی پنجاب سے ان کی بیٹی کو ضرور واپس لے آئیں گے۔ میرا صغراں کی والدہ اور والد سے انسانی ہمدردی کا رشتہ استوار ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں ان کی ہر حالت میں مدد کرنا چاہتا تھا۔ اب میرے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ سانپ سے واپس انسانی روپ میں آنے کے بعد اپنی خفیہ قوتوں کو آزماؤں۔ سرسوتی دیوی کے گندھرو منتر کی مدد سے اپنی شکل بدلنے کے تجربے سے میں گھبرا رہا تھا۔ خدا جانے میں دوبارہ کس مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں۔ باقی میری والدہ صاحبہ کی روح کی طرف سے عطا کیا گیا قدیم مصری اشلوک کا جادو تھا جس کو پڑھنے کے بعد میں کسی شے کو چھو کر اسے بہت ہی چھوٹے سائز کا بنا سکتا تھا۔

میں نے قدیم مصری اشلوک کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ باتھ روم میں گھس کر میں نے اندر سے چٹخنی لگا لی۔ باتھ روم میں پلاسٹک کا ایک لوٹا پڑا تھا۔ سب سے پہلے میں نے غسل کیا۔ اپنے جسم اور کپڑوں کو پاک صاف کیا۔ پھر والدہ کا تصور کر کے قدیم مصری اشلوک پڑھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پلاسٹک کے لوٹے کو انگلی لگا دی۔ لوٹے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کا سائز چھوٹا نہ ہوا۔ میں نے پریشان ہو کر دوسری بار اشلوک کو پڑھ کر انگلی لگائی تو لوٹا ایک دم سے اتنا چھوٹا ہو گیا کہ جیسے فرش پر ایک گھونگا پڑا ہو۔ میں بہت خوش ہوا اور دوسری بار اشلوک پڑھ کر چھوا تو وہ پھر اپنے اصلی سائز پر آ گیا۔ یہ طاقت مجھے واپس مل چکی تھی، لیکن سرسوتی دیوی کے گندھرو منتر کو آزماتے ہوئے میں ڈر رہا تھا کہ جانے میری شکل کیا سے کیا ہو جائے۔ میں باتھ روم سے نکل آیا۔

ایک روز بعد رحمت نے کیمپ سے واپس آ کر خبر سنائی کہ پرسوں مسلم لیگ والوں کا ایک ٹرک بازیافتہ عورتوں کو برآمد کرنے مشرقی پنجاب جا رہا ہے۔ صغراں کی والدہ اور والد خدا کے حضور دعائیں مانگنے لگے کہ .... جیسے بھی ہو ان کی بچی واپس مل جائے۔ میں نے

اصرار کیا میں بھی رحمت کے ساتھ صغراں بہن کو لینے مشرقی پنجاب جاؤں گا۔ صغراں کے والد کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں رحمت کے ساتھ کیمپ میں گیا اور ٹرک میں مشرقی پنجاب جانے کے لئے اپنا نام بھی بطور صغراں کے بھائی کے لکھوا دیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر وہاں کوئی الجھن پیدا ہو گئی تو اکیلا رحمت اسے حل نہ کر سکے گا۔

چنانچہ ایک روز میں اور رحمت ' لیگ کے ایک ٹرک میں بیٹھے واہگہ بارڈر کی طرف جا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ بازیافتہ خواتین کی انجمن کی سیکرٹری صاحبہ کے علاوہ انجمن کے صدر صاحب اور پولیس کا ایک دستہ بھی تھا۔ ہمارے خصوصی پرمٹ بنائے گئے تھے۔ ابھی پاسپورٹ ویزے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ سرحد کا تعین ہو چکا تھا۔ مگر باقاعدہ سرحدی فورس قائم نہیں ہوئی تھی۔ دونوں طرف فوج کے جوان پہرہ دیتے تھے اور وہ بھی واہگہ بارڈر پر جہاں ایک عارضی گیٹ بنا دیا گیا تھا۔

بھارت کے بارڈر پر ہمارے ٹرک کی معمولی سی چیکنگ ہوئی اور ہمیں آگے جانے کی اجازت مل گئی بازیافتہ خواتین کا سلسلہ دونوں حکومتوں کی باہمی رضا مندی سے شروع کیا گیا تھا۔ پاکستان میں بھی بھارت کے ٹرک ان ہندو عورتوں کی تلاش میں آتے جو ادھر دیہات میں رہ گئی تھیں۔ ہمارا ٹرک جی ٹی روڈ پر امرتسر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ہماری منزل جالندھر شہر کے قریب کا شہر کرتار پور تھا۔ صغراں اسی گاؤں کی ایک حویلی میں اپنے ماں 'باپ کے ساتھ رہتی تھی اور جب بلوائی تلواریں 'کرپانیں لے کر حویلی میں گھسے تو اسی جگہ اس کے جوان بھائی کو شہید کر دیا گیا تھا۔ صغراں کا باپ اور اس کی ماں ' بچی کو ساتھ لے کر دوسرے مکان میں کود گئے' لیکن بلوائیوں میں سے ایک سکھ نے صغراں کو پکڑ کر گھسیٹ لیا..... اور پھر خدا جانے وہاں کیا کہرام مچا کہ جب صغراں کا باپ اور ماں ' رحمت کے ساتھ جالندھر کے مہاجر کیمپ میں پہنچے تو صغراں ان کے ساتھ نہیں تھی۔ جالندھر سے کچھ میل ادھر ہی ایک نہر کے پل کے پاس بنے ہوئے ڈاک بنگلے پر پہنچ کر ہمارا ٹرک رک گیا۔ ہمیں یہاں سے آگے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ڈاک بنگلے پر بھارتی فوج کی عارضی چیک پوسٹ قائم تھی۔ ہمارے کاغذات کی پڑتال کی گئی۔ بھارتی سپاہیوں کا رویہ سرد مہری کا تھا۔ دونوں جانب فسادات میں قتل عام کے زخم ابھی تازہ تھے۔ یہاں بھارت کی بازیافتہ خواتین کی انجمن کی سیکرٹری مس لیلا نائیڈو ..... اور انجمن کے صدر وشرام بھگت موجود تھے۔ انہوں نے بظاہر مسکرا کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ یہاں سے ایک چھوٹی سڑک کرتار پور شہر اور اس کے قرب وجوار کے دیہات کو جاتی تھی۔ ہمارے ساتھ جو دوسرے تین دیہاتی آدمی بیٹھے تھے۔ ان کی عورتیں بھی اسی علاقے کے دیہات سے اغوا ہوئی تھیں۔ رحمت نے نہر

کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہاں سے ہمارا گاؤں دو کوس پر ہے۔"

ہم ٹرک سے اتر کر ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ رحمت نے دھوتی کے پلو سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر کہا۔ "شاہ جی! کیا ہماری بہن ہمیں مل جائے گی؟ مجھے تو امید نہیں۔ لگتا ہے ہم اپنے زخموں کو ہرا کرنے آ گئے ہیں۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور سامنے ڈاک بنگلے کے برآمدے میں اپنی پاکستانی سیکرٹری صاحبہ اور صدر صاحب کو میز پر بیٹھے ہوئے بھارتی فوجی کے پاس کاغذات پر دستخط وغیرہ کرتے دیکھ رہا تھا۔ کسی وقت مجھے لگتا کہ یہ محض خانہ پری ہی ہو رہی ہے۔ اور رحمت کا اندازہ صحیح ہے کہ کوئی لڑکی واپس نہیں ملے گی۔ خدا جانے وہ کہاں پہنچا دی گئی ہوں گی' پھر خیال آتا کہ اسی طرح ہندو سکھوں کی مغویہ لڑکیاں بھی پاکستان میں ہیں اور انہوں نے انہیں بھی برآمد کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ [illegible] لوگ صغراں اور دوسری لڑکیوں کو بازیافت کروانے میں ہماری مدد کریں اور ہم صغراں [illegible] واپس لے جانے میں کامیاب ہو جائیں۔

موسم کافی گرم تھا۔ دھوپ میں کافی تپش تھی۔ ہوا بالکل نہیں چل رہی تھی۔ انجمن بازیافتہ خواتین کے صدر صاحب ہمارے پا[illegible] آئے اور انہوں نے کہا کہ ہم ڈاک بنگلے کے کمروں میں جا کر آرام کریں' کیونکہ وہ پہلے [illegible] دوسرے لوگوں کی بچیوں کو برآمد کرنے جا رہے ہیں۔ ہم ڈاک بنگلے میں آ گئے۔ دوپہر [illegible] بج گیا۔ یہ لوگ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ رحمت نے کہا بھوک لگ رہی ہے۔ [illegible] ڈاک بنگلے سے باہر آ گئے۔

چیک پوسٹ کے سکھ سنتری ہمیں [illegible] نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہاں قریب ہی ٹاہلی درختوں تلے ایک عورت تنور [illegible] لگا رہی تھی۔ ہم نے اس کے پاس بیٹھ کر دال روٹی کھائی۔ یہ .... پاکستان کی شہر[illegible] [illegible] تھی۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ ہم جس عورت کو نکالنے آئے ہیں وہ ہماری کیا [illegible] ہے؟ رحمت نے کہا کہ وہ میری بہن ہے۔ سکھ شرنارتھی عورت کے پاس اس وقت سوائے ہمارے اور کوئی گاہک نہیں تھا۔ اس نے تنور میں سے روٹی نکال کر ایک طرف چھابے میں رکھی اور بولی.... "کرتار پورے سے سنا ہے کچھ مسلمان لڑکیاں اغوا ہوئی تھیں مگر وہ کرتار پور میں نہیں ہیں۔ تمہیں وہاں اپنی بہن نہیں ملے گی۔"

رحمت اس سکھ عورت سے کچھ پوچھنے والا تھا کہ میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے چپ رہنے کو کہا اور خود سوال کیا۔ "بہن جی! ہماری بہن کا نام صغراں بی بی ہے۔ آپ کو کچھ پتہ ہے کہ اسے کہاں لے گئے ہوں گے؟"

سکھ عورت خاموشی سے روٹیاں لگاتی گئی۔ "میں خود شرنارتھی ہوں۔ مجھے کیا پتہ وہ

کہاں ہو گی۔"

ہم اٹھ کر ڈاک بنگلے کی طرف چلنے لگے تو جانے اس عورت کے دل میں کیا خیال آیا۔ دوپٹے سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھ کر بولی۔ "کہتے ہیں گنڈا سنگھ نے چار مسلمان عورتیں گھر میں ڈال رکھی ہیں۔ پر وہ تو ڈکیت ہے۔ کئی خون کر چکا ہے۔ دریا پار کہیں رہتا ہے جنگل میں۔"

ڈاک بنگلے کا ایک سکھ فوجی جوان ڈونگا لئے وہاں آ گیا۔ "مائی کوڑی! ڈونگا بھر دے دال نال سنگتاں لئی۔"

میں نے رحمت کو اشارہ کیا اور ہم وہاں سے کھسک کر ڈاک بنگلے کی طرف چلے گئے۔ رحمت کہنے لگا۔ "شاہ جی! یہ تو بڑی مصیبت پڑ گئی ہے۔ گنڈا سنگھ تو ڈاکو ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس سکھ عورت کی بات پر اعتبار نہ کرو۔ ہمارے ساتھ انجمن کے افسران ہیں' وہ صغراں کو ضرور برآمد کر لیں گے۔"

تین بجے پاکستان انجمن کے صدر اور سیکرٹری صاحبہ اور سپاہی ٹرک میں واپس آ گئے۔ ان کے ساتھ دو پاکستانی بازیافتہ عورتیں تھیں جو سر جھکائے رنج والم کی تصویر بنی ٹرک میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ صغراں ان میں نہیں تھی۔ رحمت مایوس ہو گیا۔ سیکرٹری صاحبہ نے بتایا کہ انہوں نے سارا علاقہ چھان مارا ہے۔ کرتار پور کے آس پاس کسی دیہات میں کوئی مزید مغویہ خاتون نہیں ہے۔

رحمت نے کہا۔ "بہن جی! میری بہن کو گنڈا سنگھ ڈکیت نے اغوا کیا ہے۔ مجھے تنور والی عورت نے بتایا ہے۔"

سیکرٹری صاحبہ نے رحمت کو ڈانٹ دیا۔ "ہم ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے یہاں نہیں آئے۔ ہمیں ان عورتوں کو لے کر ہی واپس پاکستان جانا ہو گا۔ ہم یہاں کسی قسم کا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

چیک پوسٹ پر بازیافتہ خواتین کے بارے میں ضروری اندراج کے بعد واپس پاکستان جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ بھارتی سپاہیوں نے ٹرک کی ایک بار پھر تلاشی لی۔

میں نے رحمت کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ "تم ٹرک میں بیٹھ کر پاکستان چلے جاؤ۔ میں صغراں کو لے کر ہی واپس آؤں گا۔"

وہ ہکا بکا ہو کر میرا منہ تکنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔ "حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ صغراں کی ماں سے کہنا فکر نہ کرے' صغراں جہاں بھی ہے میں اسے نکال کر لے آؤں گا۔ .... اور ہاں ... کسی سے کوئی ذکر مت کرنا۔ یہ لوگ بھی میرے بارے میں

پوچھیں تو یہی کہنا کہ مجھے نہیں پتہ وہ کہاں فرار ہو گیا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔"

میں ایک طرف درختوں کے پاس چلا گیا' پھر آہستہ آہستہ کھسکتا ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو کر کھیتوں کے پیچھے ہو گیا اور پھر میں نے تیز تیز ایک جانب چلنا شروع کر دیا۔ میری جیب میں کچھ ہندوستانی نوٹ موجود تھے۔ میں جتنی تیز رفتاری سے چل سکتا تھا چلتا رہا۔

ایک بات طے تھی کہ جب ٹرک والوں کو پتہ چلے گا کہ ایک پاکستانی غائب ہے تو وہ میری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ ہمارے وفد کے ارکان میری گمشدگی کا معاملہ گول کر جائیں کیونکہ اس طرح سے بہت سے مسائل کھڑے ہو سکتے تھے۔

میں نے سوچا کہ اگر میں اسی طرح چلتا گیا تو سامنے سوائے میدانوں اور کھیتوں کے چھپنے کو کوئی آڑ وغیرہ نہیں ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ میں کسی جگہ کچھ دیر کے لئے چھپ جاؤں۔ چنانچہ میں ایک درخت پر چڑھ کر اس کی گھنی شاخوں میں اچھی طرح چھپ کر بیٹھ گیا۔ خیال تھا کہ وہ لوگ میری تلاش میں آئیں گے مگر ایسا نہ ہوا۔ تھوڑی دیر بعد پاکستانی ٹرک کے اسٹارٹ ہونے اور چلنے کی آواز سنائی دی۔ غالباً" انہوں نے میرے معاملے کو گول کر دیا تھا۔ اور میری گمشدگی کی چیک پوسٹ والوں کو اطلاع نہیں کی تھی۔ ٹرک کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی۔ درخت کی گھنی شاخوں کی وجہ سے مجھے ٹرک نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب ٹرک کی آواز آنا بند ہو گئی تو میں درخت سے اتر آیا اور ایک طرف چلنے لگا۔ درختوں کے ذخیرے سے نکلا تو سامنے کٹے ہوئے کھیت آ گئے۔ ان کے پار ایک کچا راستہ دور ایک گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ اس گاؤں کے درختوں کے جھنڈ دھبوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ رحمت نے کہا تھا کہ ان کا شہر کرتار پور وہاں سے دو کوس کے فاصلے پر ہے۔ یقیناً" یہی کرتار پور کا شہر تھا۔ جلدی میں' میں رحمت سے صغراں کا حلیہ نہ پوچھ سکا تھا۔ اب مجھے اپنے طور پر ہی صغراں کو تلاش کرنا تھا۔

میرا لباس کرتہ اور پاجامہ تھا اور ہندو بھی اسی قسم کا لباس پہنتے تھے۔ اگر میں نے شلوار پہنی ہوتی تو مجھ پر مسلمان ہونے کا شک ہو سکتا تھا۔ میرے پاؤں میں چپل تھی۔ راستے میں گاؤں کی طرف سے ایک بوڑھا سکھ آتا ہوا ملا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ سردار جی کرتار پور.... یہاں سے کتنی دور ہے؟ اس نے پیچھے گاؤں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "پتر۔ وہ ہے کرتار پور گاؤں۔"

گاؤں کے باہر ایک مسجد نظر آئی جو ویران ہو چکی تھی۔ ذرا آگے گیا تو ایک گردوارہ

آ گیا۔ کرتار پور اچھا خاصہ شہر تھا۔ ایک طرف درختوں میں شرنارتھیوں نے کیمپ لگا رکھا تھا۔ کئی ایک نے کچے گھر بھی بنا لیے تھے۔ مال مویشی درختوں کی چھاؤں میں بیٹھے تھے۔ ایک رہٹ چل رہا تھا۔ رہٹ کی گدی پر ایک نوجوان سکھ کا لڑکا بیٹھا تھا۔

میں نے چوبچے پر منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پیا اور سکھ لڑکے سے باتیں کرنے لگا۔ کھیتوں میں دو سکھ کسان ہل چلا رہے تھے۔ سکھ لڑکے کی زبانی معلوم ہوا کہ اس گاؤں میں مندر نہیں ہے اور آبادی سکھوں کی ہے جن میں آدھے سے زیادہ پاکستان سے آ کر آباد ہوئے ہیں۔ میں گاؤں میں داخل ہو گیا۔ جس طرح پنجاب کے گاؤں ہوتے ہیں' ویسا ہی یہ ایک نسبتاً" زیادہ آباد گاؤں تھا۔ ایک ہی کچا بازار تھا جو گاؤں کے بیچ میں سے گزرتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی گلیاں تھیں' جہاں ٹیڑھے میڑھے کچے مکان بنے ہوئے تھے۔ دکانیں سکھوں کی تھیں۔

ایک بھاری بھرکم سکھ صرف دھوتی باندھے اپنی آٹے دال کی دکان کے آگے سائبان تلے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کانسی کا ڈول تھا۔ گلے میں کرپان لٹک رہی تھی۔ میں نے پاس جا کر ست سری اکال کہا تو اس نے ایک ڈکار مار کر ست سری اکال کا جواب دیا۔ میں نے کہا۔ "سردار جی! پاکستان کا شرنارتھی ہوں۔ مول چند میرا نام ہے۔ گھر والے امرتسر کیمپ میں پڑے ہیں۔ یہاں روزگار کی تلاش میں آیا ہوں۔"

سکھ نے ڈول منہ کے ساتھ لگا لیا تھا۔ ڈول میں لسی تھی۔ اپنی گھنی مونچھیں پونچھ کر اس نے ڈول مونڈھے کے پاس زمین پر رکھ دیا اور بولا۔ "لالہ جی! ادھر کیا روزگار ملے گا۔ جالندھر جاؤ۔ تم مجھے شہری لگتے ہو۔ پیچھے کہاں رہتے تھے؟"

میں نے اسے بتایا کہ پاکستان میں ہم فیصل آباد کے پاس ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ میری دو بہنیں مسلمان اٹھا کر لے گئے۔ بڑا بھائی مارا گیا۔ سکھ پر کچھ اثر ہو گیا۔ اس نے مجھے خالی مونڈھے پر بیٹھنے کو کہا اور مجھ سے ہمدردی کرنے لگا۔ اس نے مجھے پیالے میں لسی ڈال کر پلائی۔ "پتر تم گاؤں میں کیا کرو گے؟ اچھا میں تمہارے لیے کوشش کروں گا کہ کوئی دکان الاٹ ہو جائے۔"

میں نے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد مغویہ خواتین کی بات چھیڑ دی۔ "سردار جی! ہماری بہت سی عورتیں ادھر رہ گئی ہیں۔ کیا یہاں ہم نے مسلمانوں سے اپنا بدلہ لیا ہے کہ نہیں؟"

سکھ پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "ایسا بدلہ لیا ہے کہ ساری عمر یاد کریں گے۔ میں کرتار پور کا ہی ہوں۔ شرنارتھی نہیں ہوں۔ یہاں کی چار مسلمان عورتیں سکھ اٹھا کر لے

گئے۔ ان مسلمون کی ایسی تیسی .... ڈھولن وال میں سے تو کسی جوان لڑکی کو سکھوں نے نکلنے ہی نہیں دیا۔ ان مسلوں کی ...."

میں نے کہا۔ "سنا ہے کرتار پورے کی چاروں مسلمان عورتیں گنڈا سنگھ ڈکیت اٹھا کر لے گیا تھا۔"

سکھ جھنجلا کر بولا۔ "اوئے تو پھر کیا ہوا۔ ادھر ہماری عورتیں بھی تو رہ گئی ہیں۔ گنڈا سنگھ ڈکیت اپنا بیلی ہے۔ دھرمی سکھ ہے۔"

میں نے فوراً" ہاں میں ہاں ملائی۔ کیوں نہیں سردار جی۔ کیوں نہیں۔ ساری سنگت اپنی ہے۔"

دن ڈھل گیا تو سکھ دکاندار نے مجھ سے پوچھا۔ "مول چند پتر رات رہو گے کے چلے جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "شام ہو رہی ہے سردار جی۔ آپ کی مہربانی ہو تو رات یہیں گزار دوں۔ کل صبح چلا جاؤں گا بھگوان کا نام لے کر۔"

سکھ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ جہاں اس کی ادھیڑ عمر سکھ بیوی' دو جوان لڑکیاں اور ایک جوان بیٹا بھی تھا۔ انہوں نے میری خاطر تواضع کی۔ رات ہوئی تو صحن میں چارپائی ڈال کر .... دری بچھا دی گئی۔ میرا سکھ میزبان میری چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا اور مجھ سے پاکستان کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔ کہنے لگا۔ گاندھی نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے نہیں تو ہم نے لاہور کو بھی ہندوستان میں ہی شامل کر لینا تھا۔"

میں بس اس کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا گیا' لیکن باتوں کے دوران میں نے اس سے اس بات کی تصدیق کر لی کہ .... گنڈا سنگھ ڈکیت دریا پار رکھ میں ہی رہتا تھا۔ "رکھ" پنجاب میں اس جنگل کو کہتے ہیں جہاں درختوں اور کھائیوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ اور ایسی بھول بھلیاں بنی ہوتی ہیں کہ ناواقف آدمی اندر چلا جائے تو اسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ گنڈا سنگھ ڈکیت کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ کئی جرائم میں پولیس کو مطلوب ہے مگر اس کا اثر رسوخ اور دبدبہ اور دہشت اتنی ہے کہ کوئی تھانے دار ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں وہ علاقے کے تھانے دار کو باقاعدہ ماہانہ بھی ادا کرتا ہے۔ چنانچہ کوئی اس پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ اور قتل وغارت گری کرتا پھرتا ہے۔

رات سکھ کے مکان میں گزار کر میں دوسرے روز ان سے اجازت لے کر وہاں سے واپس جالندھر کی طرف روانہ ہو گیا' لیکن آگے جا کر میں نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا۔ اب میرا رخ دریا کی جانب تھا۔

پل وہاں سے کافی دور تھا۔ ایک جگہ چھوٹا سا گھاٹ بنا تھا' جہاں سے ایک بیڑا مسافروں کو دریا کے دوسرے کنارے پہنچاتا تھا۔ اس بیڑے کے ذریعے میں نے دریا کا چوڑا پاٹ عبور کیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر میں بھی دیہاتی آدمیوں کے ساتھ کھیتوں کھیت جاتی پگڈنڈی پر چلنے لگا' پھر بظاہر سستانے کے لئے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے مشرق کی جانب .... "رکھ" کے جنگل کے درختوں کو دیکھ لیا تھا۔ یہ جنگل میری منزل تھی۔ اسی جنگل یعنی "رکھ" میں گنڈا سنگھ ڈکیت کی خفیہ کمین گاہ تھی۔

میں سوچنے لگا کہ مجھے کس حیثیت سے اس جنگل میں داخل ہونا چاہئے۔ ظاہر تھا کہ اگر میں ایک عام مسافر یا ہندو شرنارتھی بن کر سامنے جاتا ہوں تو وہ مجھے پولیس کا مخبر سمجھ کر پکڑ لے گا اور میرا منصوبہ ادھورہ رہ جائے گا۔ وہ مجھے ہلاک تو نہیں کر سکے گا لیکن ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ اس لڑکی یعنی صغراں کو قتل کر ڈالے' جس کی تلاش میں' میں یہاں آیا تھا۔ میرے پاس ایسا لباس یا سامان بھی نہیں تھا کہ میں اپنا حلیہ سادھوؤں ایسا بنا سکتا۔ ویسے بھی سکھ ڈاکو ہندو سادھوؤں سے زیادہ متاثر نہیں ہوتے۔

سورج کافی اوپر آگیا تھا۔ میں کسی نتیجے پر پہنچ نہ سکا اور یونہی خدا کا نام لے کر دور دریا کنارے والی "رکھ" کی طرف چل پڑا۔ "رکھ" کے قریب جا کر کھیتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ بنجر زمین آگئی جو تھوہر زدہ تھی۔ یہاں سے گزرتا ہوا "رکھ" کے درختوں میں داخل ہو گیا۔ یہاں درخت ایک دوسرے کے اتنے قریب قریب اگے ہوئے تھے کہ ان کی شاخیں اوپر جا کر ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ اور چھاؤں کافی گھنی تھی۔ جنگل میں کافی آگے جانے کے بعد درخت مزید گھنے ہو گئے۔

آگے مجھے درختوں کے بیچ میں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی نظر آئی۔ میں اس پر چلنے لگا۔ چند قدم ہی گیا ہوں گا کہ کسی نے درخت کے اوپر سے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ ہم دونوں زمین پر گرے اور لڑھکتے چلے گئے۔ میں اٹھنے ہی لگا تھا کہ کسی نے مجھے وہیں دبوچ لیا اور دو نالی بندوق میری گردن سے لگا دی۔ "کون ہو تم؟ کدھر جا رہے ہو؟"

ایک سکھ مجھ پر سوار تھا جس نے کالا پگڑ اور کالا ڈاٹھا باندھ رکھا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھیں۔ میں نے ہاتھ باندھ کر گھگھیاتے ہوئے کہا۔

"مہاراج شرنارتھی ہوں۔"

سکھ گرجا۔ ادھر کس ماں کے پاس جا رہے ہو؟ اٹھو میرے ساتھ چلو۔"

وہ مجھے دھکیلتا ہوا آگے لے چلا۔ میں یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے اپنے سردار ڈکیت کے

پاس لے چلے۔ میں نے بظاہر اس کی بہت منت سماجت کی مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے مجھے ایک موٹی گالی بھی دی اور کہا کہ میں پولیس کا مخبر ہوں۔ مجھے پولیس نے بھیجا ہے۔ میں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "مہاراج میں تو پردیسی ہوں۔ راستہ بھول کر ادھر آ نکلا ہوں۔"

"چل اوئے پولس ویا یارا۔"

گھنے درختوں اور خوردو جھاڑیوں سے نکل کر ہم تھوڑی کھلی جگہ پر آ گئے۔ یہاں ایک چھوٹی سی نہر بہہ رہی تھی' جس کے کنارے درختوں کی چھاؤں میں ایک چارپائی بچھی تھی۔ ایک ناٹے قد مگر گٹھے ہوئے بدن والا بھینسا نما سکھ بندوق پاس رکھے صرف جانگیہ پہنے بیٹھا آم چوس رہا تھا۔ تین چار سکھ اس کے پاس زمین پر اپنی اپنی بندوقیں رکھے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی چارپائی پر بیٹھے ہوئے سکھ نے آم کی گٹھلی پرے پھینک دی اور چادر سے اپنی گھنی مونچھیں پونچھ کر بولا۔ "اوئے گرمیت ایس مانے نوں کتھوں پھڑ لیایاں ایں؟"

اس سکھ نے مجھے زور سے چارپائی کی طرف دھکیل کر کہا۔ "سردار۔ ایہہ پولس دا بندہ اے۔"

وہ گرجا۔ اوئے پولس نوں تاں اسیں مال کھوانے آں۔ اوہ فیر ساڈے پچھے بندے لا دیندی اے۔"

میں سمجھ گیا کہ یہی گنڈا سنگھ ڈکیت ہے۔ میں اس کی چارپائی کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا اور ہندوں کی طرح ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "سردار جی میرا نام مول چند ہے۔ میں تو پردیسی ہوں۔ راستہ بھٹک کر ادھر آ نکلا ہوں۔ میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں۔"

گنڈا سنگھ کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ اس نے گردن سے پکڑ کر مجھے جھنجوڑا۔ میں اس کے جھنجوڑنے سے ہرگز نہیں گر سکتا تھا' لیکن میں جان بوجھ کر پیچھے کو گر پڑا۔

"مہاراج! مجھے معاف کر دیں۔ میں پردیسی ہوں۔ شرنارتھی ہوں۔"

گنڈا سنگھ ڈکیت چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پوری طاقت سے مرے پیٹ میں لات ماری۔ میں نے بازو آگے کر لیے کیونکہ میرا پیٹ تو پتھر کی طرح سخت تھا۔ خطرہ تھا کہ اس پر میری طاقت کا قبل از وقت راز کھل جائے گا۔ میں نے بازوؤں کو بھی نرم کر لیا تھا۔ پھر بھی میں جان بوجھ کر اداکاری کرتے ہوئے دہرا ہو گیا اور ہائے ہائے کرنے لگا۔

گنڈا سنگھ نے کڑک کر کہا۔ "جھٹکا کر دو اس کا۔"

فوراً" ہی ایک سکھ نے تلوار کھینچ لی اور میری گردن پر وار کرنے ہی لگا تھا کہ گنڈا سنگھ ڈکیت نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی بے رحمانہ مسکراہٹ تھی۔ "تلوار گندی نہ کرنا' اس کیراڑ کے خون سے۔ ٹھہر جا۔ کرپالے کو بلاؤ۔ اس نے کل

جو پھنئیر سانپ پکڑا تھا' وہ اس پر چھوڑ دو۔ بلاؤ کرپالے کو۔"

کرپالا سنگھ بھی ان کا ساتھی ڈاکو تھا۔ وہ ایک پٹاری لے کر حاضر ہو گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے۔ سب لوگ چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ گنڈا سنگھ ڈکیت نے دو نالی اپنے ہاتھ میں سنبھال لی اور کرپال سنگھ کو حکم دیا۔ "چھوڑ دو سانپ اس کیراڑ کی اولاد پر۔ اس کو ہماری مخبری کرنے کا مزہ چکھا دو۔"

کرپال سنگھ ڈاکو نے پٹاری میرے اوپر پھینک دی۔

دل ہلا دینے والی پھنکار کی آواز کے ساتھ پٹاری سے ایک سیاہ ناگ تڑپ کر مجھ پر گرا اور اس نے پھن اٹھا لیا۔ وہ میرے زانو پر بیٹھا اپنی زبان نکال کر مجھے سرخ آنکھوں سے تک رہا تھا۔ ایک دم سے اس نے مجھے ڈس کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ کیوں کہ اس کے دانت میرے چٹان ایسے سینے کے پتھر سے ٹکرا کر رہ گئے۔ سب نے دیکھا کہ سانپ نے مجھے ڈسا ہے۔ گنڈا سنگھ ڈکیت کی دو نالی کا رخ سانپ کی طرف تھا کہ اگر وہ مجھے ڈس کر اس کی طرف جاتا ہے تو وہ اسے شوٹ کر سکے۔ سانپ نے دوسری بار اپنا پھن میرے بازو پر مارا۔ اس بار مجھے کھٹک کی آواز آئی۔ غالباً" زہر والے دانت ٹوٹ گئے تھے۔ سانپ نے پھن فوراً" سمیٹ لیا اور میرے زانو سے اتر کر زمین پر بل کھانے لگا۔

ڈاکو میری موت کے منتظر تھے۔ کیونکہ ان کی آنکھوں کے سامنے سانپ نے مجھے دوبارہ ڈسا تھا۔ گنڈا سنگھ ڈکیت چلایا۔ "اوئے کرپالے۔ ایہہ کیراڑ ابھی زندہ کیوں ہے؟"

کرپالا بولا۔ "سردار! ایہہ کوئی بھوت اے۔ اس پر پھنئیر کے زہر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔"

سانپ چارپائی کی طرف رینگنے لگا۔ گنڈا سنگھ نے اس پر فائر جھونک دیا۔ دھماکے کی آواز سے جنگل گونج گیا۔ دوسرے لمحے سانپ کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھر گئے۔ اب گنڈا سنگھ ڈکیت اٹھ کر میرے قریب آیا۔ اس کی دو نالی کا رخ میری طرف تھا۔ اس نے کرپال سنگھ اپنے ساتھی ڈاکو کو پکار کر کہا۔ "اوئے یہ زندہ کیوں ہے؟ اسے دیکھو۔ اس نے کرتے کے اندر لوہے کی جیکٹ تو نہیں پہن رکھی؟"

کرپالے ڈاکو نے میرے کرتے کے اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولا اور بولا۔ "سردارا۔ اس کے اندر کچھ نہیں ہے۔ بنیان بھی نہیں۔"

"پھر زہر کا اثر کیوں نہیں ہوا؟"

باقی ڈاکو بھی مجھے تعجب سے دیکھنے لگے۔ میں نے گنڈا سنگھ ڈکیت کی طرف دیکھ کر

کسی قدر اعتماد کا لہجہ بنا کر کہا۔ "مہاراج! پاکستان میں میرے ایک گورو دیو تھے انہوں نے مجھے ایک ایسا منتر بتایا ہے' جس کو پڑھنے سے سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہوتا۔"

گنڈا سنگھ ڈکیت میرا منہ تکنے لگا۔ دو نالی بندوق اس نے نیچی کر لی اور بولا۔ "اوئے! وہ منتر مجھے بتاؤ۔ بتاؤ کون سا منتر ہے وہ؟"

میں نے کہا۔ "مہاراج پہلے میرے ہاتھ پاؤں تو کھولیں۔"

اسی وقت میرے ہاتھ پاؤں کھول دیے گئے۔ میں نے گنڈا سنگھ ڈکیت سے کہا۔

"سردار جی! وہ منتر میں سب کے سامنے نہیں بتا سکتا۔"

گنڈا سنگھ نے گرج دار آواز میں حکم دیا۔ "اس کیراڑ کو میری کوٹھری میں لے چلو۔"

کچی کوٹھری ٹھنڈی تھی۔ چھت کپاس کی چھڑیوں کی تھی۔ آمنے سامنے کے دروازے کھلے تھے جس کے اندر ہوا آ جا رہی تھی یہاں ایک بڑی چارپائی پر چھاپے دار کھیس بچھا تھا۔ پانی کا مٹکا رکھا تھا۔ کونے میں بندوقیں دیوار سے لگی تھیں۔ ایک چبوترے پر' دیسی شراب کی چھ سات بوتلیں بھی نظر آئیں۔

گنڈا سنگھ ڈکیت نے ڈاکوؤں سے کہا کہ کوٹھری میں کوئی نہ آئے۔ بندوق اس نے ایک طرف پھینک دی اور ہاتھ میں کرپان نکال کر پکڑ لی اور بولا۔ "اوئے کیراڑ۔ منتر غلط بتایا تو تیرا اسی جگہ جھٹکا کر دوں گا۔ بول کون سا منتر ہے؟"

منتر کوئی بھی نہیں تھا۔ اگر میں اسے کوئی سچا منتر بتا بھی دیتا ہوں تو ظاہر ہے وہ اپنے کسی ساتھی پر میرے منتر کو ضرور آزماتا۔ اسے منتر پڑھوا کر سانپ سے ڈسواتا اور یقینی طور پر وہ مر جاتا۔ اور میرا پول کھل جاتا۔ میں نے اس ڈاکو سے سیدھی اور صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا' اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "گنڈا سنگھ! تو کیا منتر کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ میں تجھے ایک ایسا راز بتاؤں گا کہ تجھ پر گولی' تیر' خنجر' چاقو' کوئی ہتھیار اثر نہ کر سکے گا۔"

میرے بدلے ہوئے لہجے سے وہ ٹھٹک سا گیا۔ کیونکہ میرے انداز میں انتہائی خود اعتمادی اور وقار تھا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھا اور کہا۔ "کیا تو کوئی جادوگر جوگی ہے؟"

میں نے کہا۔ "تم یہی سمجھ لو۔ میرے گورو نے مجھ سے ایک ایسی تپسیا کرائی تھی کہ اس کے بعد میرا جسم موت سے آزاد ہو گیا۔ اب مجھ پر نہ بندوق کی گولی اثر کر سکتی ہے' نہ تلوار میرے جسم کو زخمی کر سکتی ہے' اگر یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھ لو۔"

میں نے اپنا بازو گنڈا سنگھ ڈکیت کے آگے کر دیا۔ "میرے بازو پر اپنی کرپان سے

بھرپور حملہ کرو۔ ڈرو نہیں۔ مارو کرپان میرے بازو پر۔"

گنڈا سنگھ ایک بہادر اور خونی ڈاکو تھا۔ مگر میرے بازو پر حملہ کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اصل میں اس پر کچھ کچھ میری غیر معمولی شخصیت کا اثر ہو گیا تھا۔ میرے تیسری بار کہنے پر گنڈا سنگھ نے زور سے کرپان میرے بازو پر ماری۔ میرے پتھر ایسے بازو سے ٹکرانے کے بعد کرپان جھنجھنا اٹھی اور اس کی نوک آگے سے ٹوٹ گئی۔

گنڈا سنگھ ہکا بکا ہو کر کبھی میرے بازو کو دیکھتا اور کبھی اپنی ٹوٹی ہوئی کرپان کو۔ اس نے کرپان پھینک کر میرے بازو کو پکڑ کر اس پر ہاتھ پھیرا اور غور سے دیکھا۔ میرے بازو پر کرپان کے وار کا معمولی سا نشان بھی نہیں تھا۔ اس نے میرا بازو چھوڑ دیا اور بولا۔ "یہ کیا جادو ہے؟ اٹھو۔ میرے پاس آؤ' اس چارپائی پر بیٹھو۔"

وہ کوٹھری کے دروازے پر گیا اور بلند آواز میں بولا۔ "اندر کوئی نہ آئے اوئے۔"

میں چارپائی پر پائینتی کے پاس بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس بے قابو ریچھ کو کس طرح سے سان پر لگایا جا سکتا ہے۔ گنڈا سنگھ چارپائی پر بیٹھ گیا اور میری طرف جھک کر بولا۔ مجھے یہ منتر بتاؤ۔ میں تمہیں اپنا گدی دار بنا دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "اس کے لئے تمہیں پندرہ دن آدھی رات کو اٹھ کر تپسیا کرنی ہو گی۔"

میں اس دوران صغراں کا پتہ چلا کر اسے ساتھ لے رفو چکر ہو جانا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں پندرہ دن اس کام کے لئے کافی تھے۔ گنڈا سنگھ ریچھ کی طرح گردن ہلا کر بولا۔

"پندرہ دن؟ اوئے یہ تپسیا تم میرے لیے کر لو۔ میں تمہاری شادی ایک مسلمان لڑکی سے کر دوں گا۔ بولو' منظور ہے تمہیں؟"

وہ خود ہی اس طرف آگیا تھا جس طرف میں اسے لانا چاہتا تھا۔ میں نے یونہی اسے دکھانے کے لئے کچھ سوچا اور قدرے توقف سے کہا۔ "اگر تمہارے پاس کوئی مسلمان لڑکی موجود ہے تو میری تپسیا کا کام جلدی مکمل ہو سکتا ہے۔"

گنڈا سنگھ خوشی سے اچھل پڑا۔ "میرے پاس چار مسلمان لڑکیاں ہیں۔ تم چاروں سے شادی کر لو اور مجھے اس منتر سے اپنی طرح بنا دو کہ مجھ پر پولیس کی گولی اثر نہ کر سکے۔"

میرا راستہ وہ خود صاف کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "مجھے چار لڑکیوں کی نہیں صرف ایک مسلمان لڑکی سے چند روز کے لئے شادی کرنی ہو گی۔ لیکن میں چاروں لڑکیوں میں سے کسی ایسی لڑکی کو چنوں گا جو میری تپسیا کو آسان کر سکے۔"

گنڈا سنگھ چارپائی سے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں ابھی انہیں تمہارے پاس لاتا ہوں۔"

کوٹھری کے دروازے میں جا کر اس نے آواز لگائی۔ "کرپالے! اوئے کرپالے۔ ان مسلمان عورتوں کو لاؤ۔ جلدی لاؤ۔"

چند لمحوں کے اندر اندر چار غم زدہ مفلوک الحال مسلمان عورتیں کوٹھری میں میرے سامنے کھڑی تھیں۔ میں نے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی اور گنڈا سنگھ سے کہا۔ "سردار! تم ان سب لڑکیوں کو باہر لے جاؤ۔ ایک لڑکی کو اندر بھیجتے رہو۔ میں ان سے کچھ سوال کروں گا جس نے میری تسلی کر دی اسے میں اپنی پتنی بنا لوں گا اور آج ہی رات تپسیا شروع کر دوں گا۔"

گنڈا سنگھ چاروں لڑکیوں کو مویشیوں کی طرح ہانکتا کوٹھری سے باہر لے گیا۔ پھر اس نے پہلے نمبر پر ایک لڑکی کو اندر بھیجا۔ اب میرے لیے مشکل یہ تھا کہ مجھ پر ان چاروں بدنصیب مسلمان لڑکیوں کو وہاں سے نکالنے کی ذمہ داری عائد ہو گئی تھی۔

مغویہ لڑکی کا لباس میلا کچیلا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑے تھے۔ رنگ زرد ہو رہا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس کا نام پوچھا۔ وہ کرتار پورے ہی کی تھی مگر اس کا نام صغراں نہیں تھا۔ میں نے اس کو قطعی طور پر نہ بتایا کہ میں کون ہوں اور وہاں کس لیے آیا ہوں یا یہ کہ میں اسے وہاں سے فرار کرانے کا منصوبہ بنا رہا ہوں۔ یہ بات صغراں کے لیے خطرناک ہو سکتی تھی۔ چند ایک سوال پوچھ کر میں نے اسے باہر بھیج دیا۔ پھر دوسری لڑکی کو اندر بھیج دیا گیا۔ وہ بھی صغراں نہیں تھی۔ تیسری لڑکی بھی صغراں نہیں تھی۔ میں پریشان ہو گیا۔ یا خدا! اگر چوتھی لڑکی بھی صغراں نہ ہوئی تو میں اسے کہاں تلاش کرتا پھروں گا۔ میں اس کے ماں' باپ کو پاکستان جا کر کیا منہ دکھاؤں گا۔

چوتھی لڑکی اندر بھیج دی گئی۔ یہ دبلی پتلی زرد رو لڑکی لاش کی طرح سفید ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے اس کا نام پوچھا تو وہ خاموش رہی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے ذرا جھک کر آہستہ سے کہا۔ "کیا تم صغراں بی بی ہو؟ رحمت کی بھانجی؟"

وہ چونک پڑی۔ اس نے آنسوؤں بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس سے آگے کوئی بات نہ کی اور گنڈا سنگھ کو آواز دی۔ "سردار! اندر آ جاؤ۔ میں نے اپنی پتنی چن لی ہے۔" گنڈا سنگھ لپک کر اندر آ گیا۔ وہ بڑا خوش تھا۔ "لالہ! بس اب یہ تیری پتنی ہے۔ اب تو تمہاری تپسیا پانچ راتوں میں ختم ہو جائے گی؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ پورا ایک ہفتہ لگے گا۔ مگر میری کچھ اور بھی شرطیں ہیں؟"

"وہ بھی بتاؤ۔ جلدی بتاؤ تمہاری....." گنڈا سنگھ غصے میں مجھے گالی دیتے دیتے رہ گیا۔
مجھے یہ بھی خیال تھا کہ کہیں اسے یہ شبہ نہ ہو جائے کہ میں وہاں سے لڑکی کے ساتھ فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہا ہوں۔ میں نے کہا۔ "مجھے رات کو ندی کے کنارے بیٹھ کر تپسیا کرنی ہو گی۔ میری پتنی میرے پاس رہے گی۔ میں اسے کچھ خفیہ منتر بتاؤں گا جس کو پڑھتے ہوئے یہ ہر آدھے گھنٹے کے بعد میرے سامنے بیٹھ کر ندی کے پانی سے غسل کرے گی۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ہمارے آس پاس کوئی نہیں آئے گا' اگر کسی نے چھپ کر بھی ہمیں دیکھ لیا تو وہ اندھا ہو جائے گا۔ بعد میں مجھ پر کوئی الزام نہ لگائے۔ کیا تم کو میری شرطیں منظور ہیں۔"

"اوئے منظور ہیں۔ تیری ساری شرطیں' منظور ہیں لالہ! تم تپسیا شروع کرو۔"

میں نے محض دکھاوے کے لئے تپسیا سے پہلے دودھ کی کھیر بنوا کر اس پر جھوٹ موٹ کچھ منتر پڑھ کر پھونکے اور سب لوگوں میں کھیر تقسیم کی۔ جب رات ہوئی تو میں نے غسل کیا۔ کپڑے دھو کر دوبارہ پہنے۔ صغراں کو بھی کہا کہ وہ بھی غسل کر کے اپنے پاس کپڑے پاک صاف کر لے۔

دن کے وقت ہی میں نے ندی پر جا کر ایک مناسب جگہ کا انتخاب کر لیا تھا۔ یہ ندی کے اس طرف والا کنارہ تھا..... جہاں درخت اتنے گھنے تھے کہ دن کے وقت بھی ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ سرشام ہی میں نے یہاں اپنے بیٹھنے کے لئے استھان بنا لیا تھا۔ جگہ صاف کروا کر وہاں بوریا بستر بچھا دیا۔ رات کو میں نے کہہ دیا کہ میں اب کھانا نہیں کھاؤں گا۔ مجھے تو ویسے ہی کھانے کی حاجت نہیں تھی۔ تپسیا کا ڈرامہ رچانے کے لئے اس قسم کی باتوں کی بہت ضرورت تھی۔

رات کے پورے دس بجے میں لوبان سلگا کر اپنے استھان پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ صغراں بے چاری اسی طرح غم کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ گنڈا سنگھ نے زبردستی اسے نئے کپڑے پہنوا دیے تھے۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ کانسی کا ایک ڈول میں نے پاس رکھ لیا تھا۔ میں نے صغراں سے کہا۔ "لڑکی! تجھے ہر گھنٹے بعد ندی کے پانی سے غسل کرنا ہو گا۔ خبردار! یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ ان درختوں کے پیچھے ڈاکو بندوقیں لیے تیری چوکیداری کر رہے ہیں۔"

صغراں نے کچھ نہ کہا۔ سر جھکائے غم واندوہ کی تصویر بنی بیٹھی رہی۔ اگرچہ میں نے گنڈا سنگھ ڈکیت کو بہت ڈرا دیا تھا۔ کہ ہماری طرف کوئی نہ دیکھے' پھر بھی مجھے اندیشہ تھا کہ ہو سکتا ہے اس نے کسی دوسرے ڈاکو کو ہماری نگرانی پر لگا رکھا ہو۔ میرے چاروں طرف

اندھیرا تھا۔ ندی کا پانی ایک خاکستری کہکشاں کی دھندلی لکیر لگ رہا تھا۔ صغراں دوپٹے سے سر ڈھانپے سر جھکائے ایک دھندلے ہیولے کی طرح میرے سامنے خاموش بیٹھی تھی۔ ہمارے درمیان لوبان سلگ رہا تھا۔

جنگل سنسان تھا۔ کسی جانب سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں آلتی پالتی مارے سادھوؤں کی طرح بیٹھا تھا۔ میں نے چاروں طرف اندھیرے میں گھور کر دیکھا۔ اندھیرے میں میری آنکھیں جتنی دور تک دیکھ سکتی تھیں اتنی دور تک میں نے دیکھا کہ کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ میں نے صغراں سے ذرا بلند آواز میں کہا۔ "اٹھو میری پتنی! شنان کرو۔"

صغراں ایک سدھائے ہوئے جانور کی طرح اٹھی۔ اور کپڑوں سمیت اپنے جسم پر پانی کے دو ڈول ڈالے اور میرے حکم پر واپس میرے سامنے دری پر آ کر بیٹھ گئی۔ اب میں نے اس کے سامنے راز کھولنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ایک بار پھر چاروں طرف اندھیرے میں گھور کر دیکھا۔ ہمہ تن گوش ہو کر اندھیرے میں کسی کے سانسوں کی آواز سننے کی کوشش کی۔ کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "صغراں! مجھے تمہاری ماں نے تمہیں لینے بھیجا ہے۔"

صغراں کا جسم اس طرح ہلا جس طرح کوئی درخت کی شاخ کو ہلا دیتا تھا۔ اس نے زرد چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں نیم روشن دیے لگ رہی تھیں۔ میں نے فوراً" ہی کہا۔ "بولنا مت۔ جو میں کہوں خاموشی سے سنتی رہنا۔ اپنی جگہ سے اٹھنا بھی نہیں۔ سنو۔ میں ہندو نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ پاکستان سے آیا ہوں۔ میں تمہاری ماں اور تمہارے باپ اور رحمت کے ساتھ رہتا ہوں...."

میں نے دھیمے لہجے میں آہستہ آہستہ رک رک کر صغراں کو ساری صورت حال بتا دی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے اپنے ماں باپ کے بارے میں پوچھنے کے لئے بے تاب ہو رہی ہے' مگر میں نے اسے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ بالکل آواز نہ نکالے۔ صرف میری باتیں سنتی جائے۔ "میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔ یہ سارا ڈھونگ میں نے تمہیں یہاں سے نکالنے کے لئے ہی رچایا ہے۔ اس کے سوا..... کوئی چارہ نہ تھا۔ تم جس ڈاکو کے قبضے میں ہو' وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی تمہیں اس سے چھین کر لے جائے۔ اب تم اسی طرح کرتی رہنا جس طرح میں تمہیں بتاتا جاؤں۔"

میں نے صغراں کو یہ بتا کر تسلی دی کہ اس کے ماں' باپ بالکل تندرست ہیں اور میری ہی کوٹھی میں رہ رہے ہیں' میں نے صغراں کو اپنا نام عبداللہ ہی بتایا اور اسے سختی سے ہدایت کی کہ وہ دوسری پاکستانی لڑکیوں سے کوئی بات نہ کرے۔

صغراں نے میری طرف یوں دیکھا جیسے دوسری پاکستانی لڑکیوں کے مستقبل کے بارے میں پریشان ہو۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "میں وعدہ نہیں کرتا' لیکن اگر ہو سکا تو انہیں بھی تمہارے ساتھ ہی اس جہنم سے نکال کر لے چلوں گا۔"

میں نے بلند آواز مین کہا۔ "اٹھو میری پتنی! ندی کے کنارے بیٹھ کر اشنان کرو۔" صغراں خاموشی سے اٹھ کر ندی کے کنارے بیٹھ گئی۔

میں نے اونچی آواز میں یونہی جھوٹ موٹ منتر پڑھنے شروع کر دیے۔

دن کے وقت میں زیادہ تر خاموش رہتا اور ندی کے کنارے اپنے استھان پر جا کر کسی وقت یوں پانی کا چھڑکاؤ کرتا جیسے کوئی جادو ٹونہ کر رہا ہوں۔ گنڈا سنگھ کو بھی زیادہ بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ کوئی بات کرنے لگتا تو میں ہوں ہاں میں جواب دے دیتا اور اشارے سے کہتے کہ میں تپسیا کر رہا ہوں۔ مجھے مت بلاؤ۔

تین دن گزر گئے۔ اس دوران میں نے ادھر ادھر گھوم پھر کر سارا اندازہ لگا لیا کہ مجھے صغراں کو کہاں سے نکالنا ہو گا اور کس طرف جانا ہو گا۔ ان ڈاکوؤں کی بندوقیں کوٹھری میں رہتی تھیں۔ ان تین دنوں میں وہ کسی جگہ ڈاکہ مارنے بھی نہیں گئے تھے۔ چوتھے روز میں گنڈا سنگھ ڈکیت کے پاس گیا اور اولک نرنجن بول کر اس سے کہا۔ "سردار! آج کی رات تمہارے لیے بڑی شبھ ہے۔ آج تو جہاں ڈاکہ ڈالے گا' وہاں سے تمہیں ڈھیروں سونا چاندی ملے گا اور کوئی تمہیں پکڑ بھی نہیں سکے گا۔"

گنڈا سنگھ گردن کھجاتے ہوئے بولا۔ "ہم نے تو کل رات کو ڈاکے کا پروگرام بنایا ہے۔ تو کہتا ہے تو آج ہی چلے جاتے ہیں۔ پر دیکھ لے۔ اگر پکڑا گیا تو یہاں میرے ساتھی تیری گردن اتار دیں گے۔ اب بول کیا کہتا ہے؟"

میں نے بڑا سنجیدہ چہرہ بنا رکھا تھا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "کل تو پکڑا جائے گا۔ آج کوئی تیری ہوا کی طرف بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ جا۔ آج ڈاکہ مار۔ میرے کہنے پر ڈاکہ مار۔ آج میدان خالی پائے گا۔

گنڈا سنگھ نے کرپالے اور اپنے ساتھی ڈاکو کو آواز دی۔ "اوئے کرپالے۔ تیاری پکڑ لے۔ لالہ کہتا ہے کہ آج کی گھڑی بڑی شبھ ہے۔"

ڈاکوؤں نے سر شام ہی تیاری کرنی شروع کر دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک آدھ ڈاکو پیچھے رکھے گا' لیکن اس نے پورے چار ڈاکو پیچھے چھوڑ دیے کہ پہرہ دیں اور ہماری رکھوالی کریں۔ جب رات کا اندھیرا گہرا ہو گیا تو ڈاکو گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ ان کے چہرے ڈھاٹھوں میں چھپے ہوئے تھے۔

گنڈا سنگھ نے بندوق اپنے آگے گھوڑے پر رکھی ہوئی تھی۔ میں ندی کنارے اپنے استھان پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ وہ گھوڑے کو قدم قدم چلاتا میرے پاس آیا اور غراہٹ نما آواز میں بولا۔ "لالہ! میں جا رہا ہوں ڈاکہ مارنے۔ تم اگر تپسیا چھوڑ کر بھاگے تو میرے آدمی تمہیں قتل کر دیں گے۔ سمجھ گئے ہو؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔ "سمجھ گیا! ہم تپسیا کو ادھورا نہیں چھوڑا کرتے۔ اس سے ہمارا بھی ناش ہو جاتا ہے۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔"

گنڈا سنگھ نے گھوڑے کی باگ موڑی۔ چند قدم پر جنگل میں اس کے ساتھی ڈاکو گھوڑے پر تیار بیٹھے اپنے سردار کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر وہ گھوڑے دوڑاتے' درختوں کے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے جو چار ڈاکو پیچھے چھوڑے ہیں۔ وہ آس پاس ہی کہیں بیٹھے ہوں گے۔ ان ڈاکوؤں کو صبح ہونے سے پہلے پہلے ڈاکہ مار کر اپنی کمین گاہ میں واپس آ جانا تھا۔ میرے پاس صرف نصف رات ہی تھی۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا' صبح ہونے سے پہلے پہلے کر لینا تھا۔

صغراں حسب معمول میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی تھی۔

لوبان سلگ رہا تھا۔ میں نے صغراں کو آہستہ سے کہا۔ "صغراں! جہاں بیٹھی ہو اسی جگہ خاموش بیٹھی رہو۔ میں پہرے داروں کی خبر لیتا ہوں۔"

اپنے استھان سے اٹھ کر میں رات کی تاریکی میں خاموش ڈاکوؤں کی کوٹھری کی طرف چلا۔ کوٹھری میں لالٹین روشن تھی اور دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ درخت کی اوٹ سے میں نے دیکھا کہ تین ڈاکو چارپائی پر بیٹھے دیسی دارو پی رہے تھے۔ یہ سکھ تھے اور ان کی بندوقیں چارپائی کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

یہ تو اپنے ہی جال میں پھنسے بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں نشے میں دھت ہو جانا تھا اور ان پر قابو پانا مشکل نہیں تھا مجھے چوتھے پہرے دار ڈاکو کی تلاش تھی کہ وہ کہاں ہے۔"

میں درختوں کے اندھیرے میں یوں چل رہا تھا۔ جیسے کوئی جادو ٹونہ کر رہا ہوں اور یہ عمل میری تپسیا کا حصہ ہے۔ حقیقت میں میری آنکھیں چوتھے ڈاکو کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

چوتھا ڈاکو وہاں کہیں نظر نہ آیا۔ ایک جگہ درختوں کے نیچے چار گھوڑے جن پر زینیں کسی ہوئی تھیں کھڑے تھے۔ یہ گھوڑے میرے کام آ سکتے تھے۔ اس کوٹھری کے عقب میں کچھ فاصلے پر دوسری کوٹھری تھی۔ اس کوٹھری میں بھی دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ اس کوٹھری میں باقی تین مسلمان مغویہ لڑکیاں قید تھیں۔ مجھے ان کو بھی یہاں سے

نکالنا تھا۔ یہ بڑا وقت طلب کام تھا۔ ان لڑکیوں کی جان خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

میں دبے پاؤں دوسری کوٹھری کے قریب گیا۔ کوٹھری کا دروازہ بند تھا۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ چوتھا ڈاکو اندر تھا' جو لڑکیوں کو اپنے تشدد کا نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ "کون ہے اوئے توں؟" اندر سے آواز آئی۔

یہ گنڈا سنگھ ڈاکو کا ایک ساتھی جیتو تھا۔ میں نے کہا۔ "جیتو! میں مول چند ہوں۔ مجھے ماچس چاہیے۔ لوبان سلگانا ہے تپیا کے لئے۔"

اس نے مجھے موٹی سی گالی دی اور دروازہ کھول دیا وہ نشے میں جھول رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا' میں نے پوری طاقت سے ایک مکا اس کے جبڑے پر مارا۔ وہ قلا بازی کھا کر پیچھے کو گرا۔ میری غیر معمولی طاقت کے آگے اس کے جبڑے کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس کا جبڑا ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میں نے اس کی گردن پہ پاؤں رکھ کر زور سے دبایا۔ ابھی اس میں تڑپ پھڑک .... تھی۔ اس نے مجھے پاؤں سے پکڑ کر گرا لیا۔ میں اس کے اوپر گرا۔

گرتے کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن دبوچ لی اور اس وقت چھوڑی جب اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ تینوں لڑکیاں سہمی ہوئی یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ میں نے انہیں کہا۔ "اسی جگہ بیٹھی رہنا۔ میں تمہیں یہاں سے نکال کر پاکستان لے جا رہا ہوں۔ میں ہندو نہیں ہوں۔ مسلمان ہوں اور پاکستان سے تمہیں لینے آیا ہوں۔ میں صغراں کو لے کر ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے سکھ کی پگڑی اتار کر اس کے منہ پر کس کر باندھ دی۔ یونہی مجھے خطرہ تھا۔ کم بخت کہیں..... زندہ نہ ہو..... باہر نکل کر میں نے کوٹھری کا دروازہ بند کیا اور دوسری کوٹھری کی طرف آ گیا۔ یہاں جو تین سکھ ڈاکو بیٹھے تھے اب انہیں چڑھ گئی تھی اور وہ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے بڑکیں مار رہے تھے۔ میں کوٹھری کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

اندر سے بھگتا سنگھ ڈاکو نشے میں ڈولتا ہوا باہر نکلا اور لڑکیوں والی کوٹھری کی طرف چلا۔ میں اس کے پیچھے دبے پاؤں چلنے لگا۔ جب وہ درختوں کے نیچے پہنچا تو میں نے پیچھے سے اچھل کر اسے گردن سے دبوچ کر نیچے گرا لیا۔ وہ ہڑبڑا گیا تھا۔ میں نے اس کے حلقوم کو دونوں انگوٹھوں سے دبا رکھا تھا' تاکہ اس کی معمولی سی آواز بھی نہ نکلنے پائے۔

اس ڈاکو کا کام تمام کرنے کے بعد میں نے اس کی لاش درختوں میں ایک طرف

اندھیرے میں ڈال دی اور اب کوٹھری میں بے دھڑک داخل ہو گیا۔ دونوں ڈاکو مجھے جانتے تھے۔ ایک بولا۔ "اوئے لالہ۔ اوئے توں اپنا استھان چھڈ کر کیوں آ گئے ہو؟ دارو پیؤ گے۔ لو۔ کیا یاد کرو گے۔" اس نے گلاس میں دارو بھر کر میری طرف کیا۔

میں نے کہا۔ "دھنواد سردار جی! بڑا جی چاہ رہا تھا۔" میں نے گلاس تھام لیا اور قدیم مصری منتر کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا اپنی والدہ کا تصور جما کر قدیم مصری منتر کو پڑھا اور چارپائی پر اپنے قریب بیٹھے ہوئے ڈاکو کے کاندھے کو انگلی سے چھو لیا۔

یہ ڈاکو ایک سیکنڈ میں سکڑ کر بالکل چھوٹا ہو گیا۔ دوسرے ڈاکو نے سمجھا کہ اس کا ساتھی کہیں غائب ہو گیا ہے۔ وہ پہلے ہی نشے میں تھا۔ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور لالٹین کی روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر تکنے لگا۔ "اوئے۔ یہ کتھے چلا گیا اے۔"

پھر جب اسے اپنا ساتھی چارپائی پر انگلی جتنے سائز میں اپنی منمنی آواز میں شور مچاتا' اچھلتا کودتا نظر آیا تو سکھ کا نشہ ہرن ہو گیا۔ مگر اس پر کچھ ایسی دہشت طاری ہوئی کہ اپنی جگہ پتھر بن گیا۔ میں نے دوسری بار منتر پڑھ کر اس کو بھی چھو لیا اور کہا۔ "سردار جی! تم بھی اس کے پاس چلے جاؤ۔"

یہ سکھ بھی چشم زدن میں چھنگلی کے سائز کا ہو گیا۔ میں نے دونوں کو اٹھایا اور کونے میں پڑے ہوئے صندوق کا ڈھکن اٹھا کر انہیں اندر پھینکا اور ڈھکن بند کر دیا۔ یہاں جو بندوقیں پڑی تھیں انہیں وہیں پڑا رہنے دیا' کیونکہ یہ بندوقیں میرے منصوبے کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی تھیں۔ مجھے ان کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں بھاگ کر صغراں کے پاس گیا۔ وہ بے چاری سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ میں نے اسے کہا۔ "صغراں! چلو۔ ہمیں ابھی یہاں سے نکل جانا ہے۔"

دوسری کوٹھری میں آ کر تین مسلمان لڑکیوں کو بھی ساتھ لیا۔ ان چاروں کو گھوڑوں پر بٹھایا۔ صغراں کو میں نے اپنے گھوڑے کے پیچھے بٹھا لیا اور خدا کا نام لے کر رات کی تاریکی میں "رکھ" میں سے نکل کر دریا کی طرف گھوڑے ڈال دیے۔

چار مسلمان مغویہ لڑکیوں کو ساتھ لے کر میں چل تو پڑا تھا۔ مگر یہ بات میرے ذہن میں واضح نہیں تھی کہ میں انہیں بارڈر کس طرح سے پار کرا سکوں گا۔ پاکستان کا بارڈر وہاں سے بہت دور تھا۔ راستے میں جالندھر شہر پڑتا تھا' آگے امرتسر شہر تھا اور پھر وہاں سے آگے واہگہ باڈر تھا۔ پاکستان بننے کے اڑھائی تین سال بعد بارڈ سیل ہو چکے تھے اور دونوں جانب بارڈر فورس نے چوکیاں قائم کر لی تھیں۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ میں بھارتی فوج کی ڈاک بنگلے والی چیک پوسٹ سے رابطہ قائم کروں اور جب لاہور سے بازیافتہ عورتوں کو برآمد

کروانے کے لئے دوسرا ٹرک آئے تو ان لڑکیوں کو لے کر نکل جاؤں' مگر یہ بڑا خطرناک اقدام تھا۔ میں پیچھے دو ڈاکوؤں کو قتل کر کے آ رہا تھا۔ میرا راز فاش ہو سکتا تھا' لڑکیاں معمولی تشدد سے میرا راز اگل سکتی تھیں' اور پھر بھارتی فوجیوں کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ وہ لڑکیاں اپنے قبضے میں کر کے مجھے جاسوسی کے الزام میں جیل میں ڈال سکتے تھے۔ میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے ان لڑکیوں کو لے کر کسی خفیہ جگہ سے بھارت کا بارڈر کراس کرنے کی کوشش کروں۔

دریا رات کے اندھیرے میں خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ یہاں دریا پار کرنے کا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ میں دریا پار کرنے دوسری جانب کرتار پور کی طرف جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے دریا کنارے گھوڑا روک لیا اور لڑکیوں کو سمجھایا کہ انہیں اب ہندو دیہاتی لڑکیاں بن کر میرے ساتھ سفر کرنا ہو گا۔ میں نے انہیں ان کے ہندوانہ نام بھی بتا دیے۔ صغراں سمیت ساری لڑکیاں سمجھدار تھیں۔ حالات کی سنگینی کا بھی انہیں احساس تھا۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ پورے اعتماد سے ہندو عورتیں بن کر میرے ساتھ سفر کریں گی۔ اس زمانے میں پنجاب کے دیہات میں ہندو عورتیں بھی شلوار قمیص پہنا کرتی تھیں۔ شہر میں بھی بہت کم ہندو اور سکھ عورتیں ساڑھی باندھتی تھیں۔ میرا اپنا لباس بھی کرتہ پاجامہ تھا جو ہندوانہ لباس ہی تھا۔

میرے پاس بھارتی کرنسی موجود تھی۔ میں نے دریا کے ساتھ ساتھ گھوڑا ڈال دیا۔ میرا پروگرام دریا کو بہت آگے جا کر بڑے پل سے پار کرنا تھا۔ لڑکیاں پنجاب کے دیہات کی رہنے والی تھیں۔ اس لیے سخت جان تھیں اور گھوڑیوں پر سفر کرنے کی عادی تھیں۔ ہمارے گھوڑے دریا کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے چلے گئے۔

رات ڈھلنے لگی۔ ستاروں کی چمک ماند پڑ رہی تھی' پھر آسمان پر صبح کاذب کی نیلی جھلکیاں نمودار ہوئیں۔ اس پھیکی روشنی میں مجھے دور دریا کا بڑا پل نظر آیا۔ یہ پل جالندھر شہر سے دو میل پیچھے کی جانب تھا۔ میں نے لڑکیوں سے کہا کہ دن نکلنے سے پہلے ہمیں اس پل پر پہنچنا ہو گا۔ ہم نے گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی۔

ابھی مشرق میں سورج کی پہلی کرن نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ہم پل کے قریب پہنچ گئے۔ میں گھوڑے سے اتر آیا۔ لڑکیاں بھی اتر آئیں۔ میں نے گھوڑوں کو ہاتھ مار کر پیچھے کھیتوں کی طرف بھگا دیا۔ گھوڑے واپس اپنے اڈے کی طرف دوڑ پڑے۔

کھیتوں میں ابھی کوئی کسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ چاروں لڑکیوں کے لباس میلے کچیلے تھے۔ انہوں نے میرے کہنے پر دوپٹے سروں پر اوڑھ رکھے تھے۔ صبح کا اجالا چاروں طرف

پھیل گیا۔ پل پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک ٹرک سامان لادے گزر رہا تھا۔ ہم پل پار کر کے دوسری طرف آ گئے۔

پل کے پار دو تین یکے کھڑے تھے جو جالندھر شہر تک جاتے تھے۔ میں نے ایک سکھ یکے والے سے کہا۔ "سردار جی! بھگوان آپ کا بھلا کرے۔ ہمیں اسٹیشن تک پہنچا دو۔ وہاں ہمارے رشتے دار کی مرتیو ہو گئی ہے۔ ہم کرتار پور سے آ رہے ہیں۔"

سکھ بولا۔ "آ جاؤ مہاراج بیٹھو۔"

میں نے ایک روپیہ نکال کر سکھ کوچوان کو پہلے ہی دے دیا۔ وہ بڑا خوش ہوا اور یکہ جالندھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

یکہ ریلوے اسٹیشن سے گزر کر ذرا آگے گیا تو میں نے اسے رکوا لیا۔ ہم وہاں اتر گئے۔ سامنے ریل بازار تھا۔ سکھ' ہندو مہاجرین جگہ جگہ کچے مکان بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکیوں کو ساتھ لیے میں بازار میں کچھ دور گیا' وہاں پر ایک دکان پر سے چار سرخ بندیاں خریدیں۔ یہ بندیاں ہندو عورتیں اپنے ماتھے پر لگایا کرتی تھیں۔

میں لڑکیوں کو لے کر ریلوے اسٹیشن پر آ گیا۔ یہاں میں نے صغراں اور باقی تین لڑکیوں کو بندیاں دیں اور کہا کہ اپنے ماتھے پر لگا لیں۔ ریلوے پلیٹ فارم پر بہت رش تھا۔ شرنارتھی آ جا رہے تھے۔ جگہ جگہ مسافر سامان رکھے بیٹھے تھے۔ میں نے صغراں اور باقی تین لڑکیوں کو ایک طرف دیوار کے ساتھ بٹھا دیا۔ ان کے لئے پلیٹ فارم سے پوریاں وغیرہ خرید کر لایا۔ لڑکیاں خاموشی سے کھانے لگیں۔ انہوں نے اپنے ماتھے پر لال بندیاں لگا لی تھیں۔ وہ بالکل ہندو لڑکیاں لگ رہی تھیں۔

میں نے امرتسر کے لئے پانچ ٹکٹ خرید لیے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد لدھیانہ کی طرف سے ایک ریل گاڑی آئی۔ یہ ریل گاڑی امرتسر جا رہی تھی۔ میں نے صغراں اور دوسری لڑکیوں کو اس تاکید کے ساتھ زنانہ ڈبے میں سوار کرا دیا کہ وہ عورتوں سے زیادہ بات نہ کریں۔ کوئی پوچھے تو صرف اتنا ہی بتائیں کہ وہ چاروں بہنیں ہیں اور اپنے بھائی مول چند کے ساتھ امرتسر اپنی ماسی کے ہاں جا رہی ہیں۔

میں خود مردوں کے ڈبے میں گھس گیا۔ ٹرین کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ خدا خدا کر کے انجن نے سیٹی دی اور ٹرین روانہ ہوئی۔ جالندھر سے امرتسر چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ کم بخت پسنجر ٹرین تھی۔ ہر اسٹیشن پر کھڑی ہو جاتی۔ چالیس میل کا فاصلہ ٹرین نے دو گھنٹوں میں طے کر لیا اور امرتسر کا اسٹیشن آ گیا۔

یہاں میں نے لڑکیوں کو تھرڈ کلاس زنانہ ویٹنگ روم میں بٹھا دیا اور خود پلیٹ فارم پر

آ کر بنچ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔

میں بارڈر کے سرحدی دیہات سے بالکل ناواقف تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کہاں سے بارڈر کراس کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے چاروں لڑکیوں کو ساتھ لے کر بارڈر کراس کرنے کی کوشش کی تو عین ممکن ہے کہ پکڑ لیا جاؤں' پھر ان لڑکیوں کے واپس پاکستان پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اچانک میں ایک خیال سے اچھل سا پڑا۔

پاکستان سے بازیافتہ خواتین کی انجمن کا نیم سرکاری ٹرک مہینے میں دو بار بھارت آتا تھا۔ کیوں نہ اس ٹرک کا انتظار کیا جائے؟ یہ خیال مجھے بے حد مناسب لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ امرتسر ریلوے اسٹیشن سے تھوڑی دور جی ٹی روڈ پر ایک جگہ ہمارا ٹرک چیکنگ کے لئے رکا تھا' اگر میں اس چیکنگ پوائنٹ کے آس پاس رہ کر نگرانی کروں تو میں پاکستان سے آنے والے ٹرک کو پکڑ سکتا ہوں۔

میں جلدی سے اٹھ کر زنانہ ویٹنگ روم میں گیا جو بالکل کھلا تھا۔ میں نے صغراں اور دوسری لڑکیوں کو اپنی سکیم بتائی۔ اس اسکیم کو انہوں نے بھی پسند کیا۔ اس میں خطرہ کم تھا' اور پاکستان سے ٹرک ' مغویہ خواتین کو برآمد کرنے کے لئے مہینے میں دو بار ضرور آتے تھے۔ میں نے کہا۔ "اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم لوگوں کو کہاں رکھا جائے۔ ظاہر ہے تمہیں چیکنگ پوسٹ کے آس پاس ہی رہنا ہو گا' تاکہ جب پاکستانی ٹرک آئے تو تمہیں فوری طور پر اس میں سوار کروایا جا سکے۔"

انہیں ہوٹل میں رکھنا مناسب نہیں تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر ہم زیادہ دن قیام نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ مجھے چیکنگ پوسٹ کے پاس جی ٹی روڈ پر جو شرنارتھیوں کے کیمپ لگے ہیں اور جنہیں میں نے ٹرک پر آتی دفعہ دیکھا تھا' وہاں جا کر معلوم کرنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کسی کیمپ میں ہی انہیں ٹھہرانے کے لئے جگہ مل جائے۔ میں نے صغراں سے کہا۔ "تم لوگ ابھی ویٹنگ روم میں ہی بیٹھو۔ میں کسی جگہ کا بندوبست کر کے ابھی واپس آتا ہوں۔"

میں ریلوے اسٹیشن سے نکلا اور پیچھے جی ٹی رود پر چیکنگ پوسٹ کی طرف چل پڑا۔

یہ بھارتی پولیس کی چیکنگ پوسٹ تھی اور ریلوے اسٹیشن سے واہگہ کی جانب کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر سڑک کے کنارے بنی ہوئی تھی۔ معمولی سی پوسٹ تھی۔ شاید یہاں پاکستان کے آتے جاتے ٹرکوں وغیرہ کا اندراج ہی ہوتا تھا... اس کے قریب ہی چھوٹے گراؤنڈ میں سکھ شرنارتھیوں کا جو کیمپ تھا اس میں لڑکیوں کو لانا اس لیے ٹھیک نہیں تھا۔

کہ چیکنگ پوسٹ بالکل سامنے تھی اور لڑکیاں بھارتی سپاہیوں کی نگاہ میں آ سکتی تھیں۔ کچھ فاصلے سے جائزہ لینے کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ بہتر یہی ہے کہ لڑکیوں کو شہر کے کسی مندر کی سرائے میں کچھ دنوں کے لیے رکھا جائے۔ اور میں خود یہاں پوسٹ پر پاکستانی ٹرک کی ٹوہ میں رہوں۔ یہ سوچ کر میں واپس ریلوے اسٹیشن کی طرف مڑا تو سامنے سے ایک کشمیری ہاتو' پیٹھ پر سامان لادے نظر آیا۔ میں رک گیا۔ کشمیریوں سے میں بخوبی واقف تھا۔ یہ کشمیری محنت کش مسلمان سردیوں میں امرتسر اور جموں وغیرہ کے شہروں میں آ کر محنت مزدوری کر کے رزق حلال کماتے ہیں۔ اور جب کشمیر میں برف پگھل جاتی ہے تو واپس چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے امرتسر میں یہ کشمیری ہاتو' اکیلا نہیں رہتا ہو گا۔ اس کے ساتھی بھی ہوں گے۔ اس کے بال بچے بھی ہوں گے۔

اتنے میں کشمیری میرے قریب پہنچ چکا تھا۔

میں نے اسے سلام کیا اور کشمیری زبان میں اس سے پوچھا کہ کیا حال ہے؟۔

کشمیری ہاتو' مجھے کشمیری میں بات کرتے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ وہ پیٹھ کے سامان سمیت وہیں سڑک کے کنارے بیٹھ گیا اور مسکرا کر بولا۔ "تم کشمیری ہو؟ تمہارا رنگ گورا کیوں نہیں؟"

میں نے بھی ہنس کر کشمیری میں جواب دیا۔ "ایک مدت سے کشمیر میں نہیں گیا۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ وہ شہر میں کہاں رہتا ہے؟ اس نے بتایا کہ امرتسر میں کوئی ساٹھ کے قریب کشمیری محنت مزدوری کرتے ہیں اور مسجد خیر دین کے پاس والی گلی کے ایک احاطے میں اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرا بہت بڑا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ میں نے اس وقت اسے کچھ نہ بتایا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس سے رخصت لے کر شہر کی طرف چل پڑا۔ ریلوے اسٹیشن سے تانگہ کرایا اور مسجد خیر دین پہنچ گیا۔

کشمیری مسلمانوں کی وجہ سے مسجد خیر دین کی حالت قدرے بہتر تھی۔ اس کے عقب میں ایک احاطہ تھا۔ جہاں گندی گندی کوٹھریاں آمنے سامنے بنی تھیں۔ ایک سرخ و سفید بوڑھا کشمیری ایک کوٹھری کے آگے پرانے سے تخت پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میں نے سلام کیا اور کشمیری میں باتیں شروع کر دیں۔ وہ بھی مجھے کشمیری بولتا دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ میں بڑی روانی سے کشمیری بول رہا تھا۔ جب مجھے پوری طرح تسلی ہو گئی کہ وہ پکا مسلمان ہے اور اسے پاکستان سے دلی ہمدردی ہے تو میں نے اسے ساری بات کھول کر بیان کر دی اور کہا کہ میں ضلع جالندھر سے چار مسلمان مغویہ لڑکیوں کو نکال کر لایا ہوں۔ جو اس وقت

ریلوے اسٹیشن پر ہیں اور جنہیں میں پاکستانی ٹرک کی مدد سے واپس پاکستان لے جانا چاہتا ہوں۔ بوڑھے کشمیری نے اردگرد ایک نگاہ ڈالی اور مجھے کوٹھری میں لے گیا۔ کوٹھری بے حد گندی تھی اور دھواں کھائے برتن ادھر ادھر پڑے تھے۔

اس کشمیری بوڑھے کا نام رسل بٹ تھا۔ وہ میری مدد کرنے پر تیار ہو گیا۔ اس نے مجھے زارداری سے کہا۔ "یہاں سی آئی ڈی والے بھی پھرا کرتے ہیں۔ تم کسی اور سے بات نہ کرنا۔ لڑکیوں کو رات کے وقت لانا جب اندھیرا ہو جائے۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔"

کشمیر میں پاکستان اور ہندوستان کی پہلی جنگ ہو چکی تھی۔ جس کے بعد امرتسر کے کشمیری مسلمانوں پر کڑی نظر رکھی جا رہی تھی۔ اس کے باوجود مجھے اس بوڑھے مسلمان کشمیری کے پاس لڑکیوں کو رکھنا زیادہ محفوظ محسوس ہو رہا تھا۔ ساتھ والی کوٹھریوں کے باہر کچھ کشمیری عورتیں نل پر برتن وغیرہ مانجھ رہی تھیں۔ کچھ ننگ دھڑنگ کشمیری بچے کھیل رہے تھے۔ میں نے رسل بٹ کو رات کو آنے کا کہا اور سلام لے کر احاطے سے باہر نکل گیا۔

ریلوے اسٹیشن پر جا کر میں نے چاروں لڑکیوں کو حالات سے آگاہ کیا اور کہا کہ رات کو انہیں میرے ساتھ رسل بٹ کے گھر چلنا ہو گا۔ چاروں لڑکیاں سہمی بیٹھی تھیں۔ جیسا انہیں کہتا تھا ویسے وہ کرتی چلی جاتی تھیں۔ ویٹنگ روم میں ہندو' سکھ شرنارتھی عورتوں کا ہجوم پڑا تھا اس لیے کسی نے ان کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی تھی جس سے ان کی بچت ہو گئی اور کسی عورت نے ان سے زیادہ بات چیت نہ کی تھی۔ دوپہر کو میں اسٹیشن کے سامنے والے ڈھابے سے ان کے لئے پھلکے اور آلو کی ترکاری لے آیا۔

اسی طرح شام ہو گئی۔ جب رات کے اندھیرے نے شہر کو اپنی سیاہ چادر میں سمیٹ لیا تو میں لڑکیوں کو ساتھ لے کر ریلوے اسٹیشن سے نکلا اور تانگے میں بٹھا کر مسجد خیر دین کی طرف چلا۔ مسجد سے کچھ دور میں نے تانگہ چھوڑ دیا۔

رسل بٹ احاطے کے باہر ہی کھڑا میرے انتظار میں تھا۔ مجھے لڑکیوں کے ساتھ آتا دیکھ کر وہ واپس کوٹھری کی طرف مڑ گیا۔ اس کی کوٹھری کے باہر لالٹین روشن تھی اور ایک بوڑھی کشمیری عورت چارپائی پر بیٹھی ہاتھ سے پنکھا جل رہی تھی۔ میں رسل بٹ کے اشارے پر لڑکیوں کو لے کر سیدھا کوٹھری میں چلا گیا۔ رسل بٹ اور اس کی بوڑھی بیوی بھی اندر آ گئی۔ رسل بٹ نے اپنی بیوی کو ساری بات پہلے ہی بتا رکھی تھی۔ اس نے لڑکیوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار کیا اور کشمیری زبان میں کہا۔ "اللہ والی ہے۔ اللہ والی

ہے۔"

رسل بٹ لڑکیوں کو اپنی بیوی کے حوالے کر کے مجھے ساتھ لے کر احاطے سے باہر گیا۔ کچھ دور دوسرے کشمیری اپنی اپنی کوٹھریوں کے باہر چارپائیاں بچھائے ہوئے آپس میں کشمیری زبان میں باتیں کر رہے تھے۔

رسل بٹ احاطے کے شکستہ دروازے کے باہر ایک طرف اندھیرے میں ہو کر بولا۔

"عبداللہ ! تمہاری امانت میرے پاس بیٹیوں کی طرح رہیں گی۔ ہو سکتا ہے ہم میں سے بھی کوئی پولیس کا مخبر ہو۔ اس لیے تمہارا یہاں آنا جانا ٹھیک نہیں رہے گا۔ دن کو تو بالکل ہی نہ آنا۔ پاکستان سے ٹرک آئے تو اپنی امانت کو لے جانا۔ تم میری مجبوری کو سمجھ گئے ہو۔"

اس بوڑھے کشمیری نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ پولیس اسے غداری اور جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر سکتی تھی اور اس کے سارے کنبے پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ سکتا تھا۔ مگر یہ ایک جیالا بوڑھا کشمیری تھا۔ وہ اپنی جان کی بازی لگا کر پاکستانی مغویہ خواتین کی مدد کر رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ چوم لیا اور کشمیری میں کہا۔ "کاکا جی! میں اشد ضرورت کے وقت آپ کے پاس آؤں گا اور وہ بھی رات کے وقت۔ اگر ٹرک کل ہی آ گیا تو میں اسی وقت آ جاؤں گا۔ خدا حافظ!"

مجھ اکیلے کو کوئی فکر نہیں۔ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں مسجد خیر دین کے سامنے سے گزرتا ہوا دوبارہ ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ رات میں اسٹیشن پر ہی گزارنا چاہتا تھا۔ نیند مجھے نہیں آتی تھی۔ بھوک پیاس مجھے نہیں لگتی تھی۔ اس اعتبار سے ریلوے اسٹیشن ایک آئیڈیل جگہ تھی۔ وہاں اتنے شرنارتھی لوگ پڑے ہوئے تھے کہ کوئی کسی کی طرف دھیان نہیں دیتا تھا۔ رات پلیٹ فارم کے بنچ پر پڑے پڑے گزار دی۔ صبح اٹھا' نل پر جا کر منہ ہاتھ دھویا اور جی ٹی روڈ پر آ گیا۔ چیکنگ پوسٹ سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور آتے جاتے ٹرکوں کا جائزہ لینے لگا۔

خیال آیا کہ اس طرح تو مجھ پر خواہ مخواہ شک پڑ جائے گا۔ چنانچہ میں اٹھا اور ریلوے اسٹیشن کے سامنے والی دکانوں کے پاس آ کر ٹھہر گیا۔ یہاں چنے فروخت کرنے والوں کی ایک بڑی دکان تھی۔ میں نے ایک تھیلا خریدا۔ چار سیر بھنے ہوئے چنے اس میں ڈلوائے اور واپس چیکنگ پوسٹ کے سامنے والے درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گیا اور آوازیں لگانے لگا۔ "چنے خستہ گرم۔ چنے خستہ گرم مہاراج۔"

اب مجھ پر کوئی شک نہیں کر سکتا تھا۔ ان دنوں شرنارتھی ہر قسم کا کام کر رہے تھے۔ لوگوں نے مجھے بھی پاکستان کا شرنارتھی ہی سمجھا۔ شام تک میرے چنے بک جاتے۔

رات میں ریلوے اسٹیشن پر گزار دیتا اور اگلے روز چنے خرید کر پھر پولیس پوسٹ کے قریب درخت تلے جا کر بیٹھ جاتا۔

تین دن گزر گئے۔ پاکستان کا ٹرک دکھائی نہ دیا۔ چوتھے دن رات کو میں رسل بٹ سے ملنے اس کے پاس گیا۔ لڑکیاں ٹھیک ٹھاک تھیں۔ انہوں نے بندیا اتار دیں تھیں۔ پانچ نماز پڑھنے لگی تھیں۔ بوڑھے کشمیری نے اپنے ساتھیوں کو یہی بتایا تھا کہ اس کے پرانے دوست کی بچیاں ہیں۔ اس سے ملنے آئی ہیں۔ میں اندھیرے میں گیا اور اندھیرے میں ہی ریلوے اسٹیشن کی طرف واپس روانہ ہو گیا۔

سیڑھیوں والے ریلوے پل پر سے گزر رہا تھا۔ کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔

"مہاشہ جی!"

میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ایک گول مٹول سا سانولے رنگ کا ہندو لالہ ماتھے پر تلک سجائے میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا۔ وہ بولا۔

"مہاشے کہاں کے رہنے والے ہو؟"

میں نے پنجابی زبان میں کہا۔ "فیصل آباد کا شرنارتھی ہوں مہاراج۔ جی ٹی روڈ پر چنے بیچ کر گزارا کرتا ہوں۔ آپ کون ہیں؟

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے ایک اور خطرناک سوال کر دیا۔

"یہاں مسجد خیر دین میں کیا لینے آئے تھے؟"

میں فورا" سمجھ گیا کہ یہ انٹیلی جنس کا آدمی ہے' پھر بھی میں بالکل نہ گھبرایا۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "کیا مسجد خیر دین میں آنا ایک ہندو شرنارتھی کے لئے منع ہے؟ وہاں میں کسی مسلمان کا مکان الاٹ کرانا چاہتا ہوں اس لئے گیا تھا۔"

"رات کے وقت؟" وہ مکاری سے مسکرا رہا تھا۔

میں نے اسے جھاڑ پلا دی۔ "مہاراج تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے؟ میں جانتا ہوں تم کون ہو' اگر زیادہ مجھے تنگ کرنے کی کوشش کی تو ایسا شراپ دوں گا کہ ساری زندگی روتے رہو گے۔ چلو اب اپنا راستہ لو۔"

اس پر میرا کچھ تھوڑا سا رعب پڑ گیا تھا مگر وہ مجھے گہری مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر میں نے دوسرے شرنارتھیوں میں اپنے آپ کو گم کر دیا۔

دوسرے روز میں دوپہر کے وقت درخت کے نیچے بیٹھا چنے بیچ رہا تھا کہ میرے دل

کی کلی کھل اٹھی۔ جالندھر کی طرف سے ایک جانا پہچانا ٹرک ایا اور چیکنگ پوسٹ پر آ کر رک گیا۔ یہ پاکستانی ٹرک تھا۔ اس میں سے وہی سیکرٹری عورت اور مرد باہر نکلے اور سکھ سپاہی کے پاس جا کر اندراج کرانے لگے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹرک کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ ٹرک میں چار پاکستانی پولیس والے بیٹھے تھے۔ پاکستان سیکرٹری عورت ٹرک کے قریب واپس آئی تو میں نے اسے آہستہ سے سلام کیا۔ اس نے مجھے فورا" پہچان لیا اور مجھ پر برس پڑی کہ میں کہاں غائب ہو گیا تھا۔ "ہمیں تم نے عجیب مصیبت میں ڈال دیا تھا' تم لوگوں کو اسی لیے ہم اپنے ساتھ لائے تھے۔"

میں نے اسے ایک طرف لے جا کر جب صورت حال سے باخبر کیا تو وہ چونک سی پڑی۔ "کہاں ہیں مغویہ لڑکیاں؟"

"مسجد خیر دین کے عقبی احاطے میں۔"

سیکرٹری صاحبہ نے فورا" بھارتی پولیس والوں سے کہا کہ مسجد خیر دین میں کچھ پاکستانی مغویہ لڑکیاں ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔ ہم انہیں برآمد کرنے جا رہے ہیں۔

بھارتی سنتریوں نے کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ اسی طرح ان کی سیوا سمتی والی ہندو عورتیں اور مرد بھی بھارتی ٹرک لے جا کر پاکستان میں غیر مسلم مغویہ خواتین کو برآمد کرتے تھے۔ صغراں اور اس کی ساتھی تینوں لڑکیوں کو رسل بٹ کی کوٹھری سے لے کر ٹرک میں بٹھا دیا گیا۔ رسل بٹ وہاں سے ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ میں نے ٹرک کو جلدی سے وہاں سے نکال لے جانے کے لئے کہا۔

یہ سارا کام ایک دو منٹ میں ہو گیا۔ ٹرک اس سے زیادہ وہاں کھڑا نہ رہا۔ میں بے حد خوش تھا۔ میں نے دوسری لڑکیوں سے کہا کہ پاکستان میں مسلم لیگ والے انہیں ان کے رشتے داروں کے ہاں پہنچا دیں گے۔ صغراں کو میں نے اپنی ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی کا نمبر پہلے ہی سے یاد کرا رکھا تھا۔ ویسے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ میں خود اس کے ساتھ جا رہا تھا۔ چیکنگ پوسٹ پر لڑکیوں کا اندراج کروایا گیا۔ ان کے نام لکھے گئے۔ جب میری باری آئی تو سکھ سپاہی بولا۔ "یہ آدمی تو ہندو ہے اور روز درخت کے نیچے بیٹھ کر چنے بیچتا ہے اسے کیوں پاکستان لے جا رہے ہیں؟"

سیکرٹری صاحب چپ ہو گئیں۔ کیا جواب دیتیں۔ میں نے کہا۔ "سردار جی! میں پاکستان اپنے گھر والوں کی تلاش میں جانا چاہتا ہوں۔"

سکھ سنتری نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔ "بیٹھ جا اوئے اینتھے۔ تو مجھے کوئی جاسوس لگتا ہے۔"

پھر اس نے سیکرٹری صاحبہ سے کہا۔ "بہن جی! آپ لڑکیوں کو لے کر نکل جائیں۔"

اگر میں اپنی مافوق الفطرت طاقت کا مظاہرہ کرتا ہوں تو چاروں پاکستانی مغویہ لڑکیوں کے لیے مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں ٹھہر بھی گیا تو کیا قیامت آجائے گی۔ یہ میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ میں نے سیکرٹری صاحبہ کو آنکھ ماری۔ وہ گڑ بڑا سی گئیں۔ میں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں بہن جی۔ آپ چلی جائیں۔ میں نہیں جاتا آپ کے ساتھ۔"

صغراں نے پریشان ہو کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے بھی خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پاکستانی ٹرک میری آنکھوں کے سامنے وہاں سے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی سکھ سنتری جو غالباً" پولیس کا حوالدار تھا' مجھے قہر بھری نظروں سے دیکھا اور بولا۔ "کیوں اوئے۔ کب سے پاکستان کی جاسوسی کر رہے ہو؟"

"میں آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ اس نے اپنے سپاہی سے کہا۔ اس کو اندر کر دو گوربچن سنگھ۔"

گوربچن سنگھ سنتری نے مجھے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "کٹ چڑھے گی تو سب کچھ بتا دو گے۔"

یہ سکھ سنتری کاغذات پر سکھ حوالدار کے دستخط کروانے لگ گیا۔ میں نے سوچا کہ ان کو ذرا تماشا دکھانا چاہئے۔ اس چھوٹے سے عارضی لکڑی کے کمرے کی دیوار پر دو تصویریں لگی تھیں۔ ایک گاندھی کی تصویر تھی اور ایک پنڈت نہرو کی۔ ایک جانب کیلنڈر پر ایک خوش شکل فوجی وردی والے آدمی کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے سبھاش چندر بوس لکھا تھا۔ مجھے یہ فوجی وردی والا خوبصورت آدمی بہت اچھا لگا۔ میں نے سرسوتی دیوی کے گندھرواشلوک کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اگرچہ خطرناک تھا۔ ان معنوں میں کہ مجھے سانپ سے دوبارہ انسانی شکل میں آنے کے بعد ان کایا پلٹ قسم کے منتروں پر زیادہ اعتبار نہیں رہا تھا لیکن چونکہ میرا دوسرا منتر ٹھیک کام کر رہا تھا اس لیے سوچا کہ کیوں نہ اسے بھی آزما کر دیکھا جائے۔ مجھے زمین پر دیوار کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا۔ میں نے کیلنڈر والی سبھاش چند ربوس کی شکل کو اچھی طرح سے اپنے ذہن میں بٹھا لیا۔ پھر سرسوتی دیوی کا تصور کر کے گندھرو کا پورا جاپ کیا اور آنکھیں بند کر لیں اور آنکھوں میں سبھاش چندر بوس کی شکل قائم کر لی۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگتا محسوس ہوا۔ میں نے تھوڑی سی آنکھ کھولی تو سب سے پہلی تبدیلی جو میں نے اپنے جسم پر محسوس کی یہ تھی کہ میرے جسم پر کرتے پاجامے کی جگہ سبھاش چندر بوس والی فوجی وردی تھی۔ میں نے چہرہ دیوار کی طرف کر کے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ میرے نقش تبدیل ہو گئے تھے اور آنکھوں پر عینک تھی اور سر پر

اطالوی فوجیوں ایسی کشتی نما ٹوپی تھی۔ میں ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اب جو سکھ حوالدار اور سکھ سنتری نے مجھے دیکھا تو ان کے ہوش گم ہو گئے۔ منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ان کے سامنے بنگال کا سر فروش لیڈر سبھاش چندر بوس کھڑا تھا۔ جس کے بارے میں ساری دنیا یہ یقین کر چکی تھی کہ وہ جاپان میں کسی جنگی طیارے کے حادثے میں پانچ سال ہوئے ہلاک ہو چکا ہے۔

★

اس کے بعد عاطون کا چوتھا اور آخری حصہ

عاطون موت کے دروازے پر

کا مطالعہ کریں۔

عاطون
موت کے دروازے پر
اے حمید
عاطون

"صحرا کا چاند" (اے حمید)

اس کا معصوم حسن صحرائی راتوں میں چمکنے والے چاند کو شرماتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم ایک پاکستانی نوجوان کو صحرا کے اس درخشاں چاندنی میں لے آئی تھی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک دوسرے کی روح میں محبت کی مہک بن کر سما گئے۔

لیکن زندگی صرف محبت کی خوشبو ہی نہیں۔

زہریلے کانٹوں کا جنگل بھی ہے۔

انسانی محبت اور نفرتوں کے صحرا میں طلوع ہونے والے چاند کی سچی داستان محبت

مجھے سبھاش چندر بوس کی شکل میں دیکھ کر سب سکتے میں آ گئے۔

میں اس قیمتی موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں چیکنگ پوسٹ سے باہر نکل آیا۔ باہر ایک جیپ کھڑی تھی۔ میں نے جیپ میں چھلانگ لگائی اور اسٹارٹ کر کے اس کا رخ پاکستانی سرحدی چوکی کی طرف موڑ دیا۔ میں نے جان بوجھ کر رفتار تیز نہیں کی تھی۔ بھارت کی آخری سرحدی پوسٹ کو فون پر پہلے ہی اطلاع دے دی گئی تھی کہ سبھاش چندر بوس زندہ ہیں اور وہ پوسٹ کی طرف آ رہے ہیں۔

میں وہاں پہنچا تو پوسٹ کا سارا عملہ مجھے دیکھنے کے لیے باہر نکل آیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ششدر رہ گئے۔ انہوں نے بے اختیار ہو کر "نیتا جی زندہ باد' کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ میں نے ہاتھ ہلا کر ان کے نعروں کا جواب دیا اور جیپ میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر انہیں پرنام کیا اور کہا کہ میں ایک خاص مشن پر پاکستان جا رہا ہوں۔ سڑک کی رکاوٹ فوراً" اٹھا دی گئی اور میں پاکستانی چیک پوسٹ پر پہنچ گیا۔ میں نے پاکستانی سرحد میں داخل ہوتے ہی اپنے اندر ایک شدید قسم کا جھٹکا محسوس کیا۔ میں جیپ میں سے اچھل کر باہر گر پڑا۔

جب اٹھا تو میں سبھاش چندر بوس نہیں تھا۔ سارا طلسم اور منتر کا جادو ختم ہو گیا تھا۔ میں اپنی اصلی شکل میں واپس آ گیا تھا۔ مجھے بغیر پاسپورٹ اور ویزے کے پاکستان میں داخل ہونے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ رات میں نے حوالات میں گزاری۔ دوسرے روز میں نے ہیڈکوارٹر میں مہاجر کی حیثیت سے اپنی شناخت کروائی پھر مجھے رہا کر دیا گیا۔

میں وہاں سے سیدھا اپنی ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پہنچا تو دیکھا کہ کوٹھی کی جگہ ایک نئی شاندار کوٹھی کھڑی ہے میں چونکا۔ میری خاص حس نے مجھے بتایا کہ وقت نے آگے کی جانب چھلانگ لگا دی ہے۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ بیس برس گزر چکے ہیں۔ حوالات سے ماڈل ٹاؤن پہنچتے پہنچتے بیس برس کا عرصہ گزر گیا تھا۔ سڑکیں کشادہ اور ٹریفک زیادہ ہو

گئی تھی۔ موٹر کاروں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ میرا لباس ابھی تک ہندوانہ تھا۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میرے بٹوے میں پاکستانی کرنسی کے چند سو نوٹ موجود تھے۔ میں نے بازار سے نئے کپڑے خرید کر پہنے اور ریل میں سوار ہو کر کراچی کی طرف روانہ ہو گیا۔ تب سے لے کر اب تک کراچی میں بیٹھا جڑی بوٹیوں کا کاروبار کرتا ہوں لیکن کل رات میرے ساتھ ایک انقلابی واقعہ گزرا ہے جس کے نتیجے میں میرا ہزاروں سال کا یہ سفر ختم ہو رہا ہے اور یہاں سے میری واپسی کا ہزاروں سالہ سفر شروع ہو رہا ہے۔ کل رات میں سفرنامہ لکھنے کے بعد بتی بجھا کر سونے کے لیے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ کمرے میں مدہم سی روشنی ہوئی۔ میں نے لیٹے لیٹے آنکھیں کھول کر دیکھا روشنی بند کھڑکی میں سے اندر داخل ہو رہی تھی اور پھر سارا کمرا اس روشنی میں ڈوب گیا پھر کھڑکی کے قریب ایک عورت کا دھندلا سا ہیولا دکھائی دیا۔ میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"عاطون!"

عورت کے ہیولے کی آواز آئی۔ میں نے غور سے ہیولے کی طرف دیکھا۔ نقش واضح نہیں تھے جسم پر ایک سفید چادر لپٹی ہوئی تھی۔ سر پر موتیوں کا ایک چھوٹا سا تاج تھا اور ان موتیوں میں سے نیلی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

عورت نے کہا۔ "عاطون! میں وہ ہستی ہوں جس نے تمہیں زہر کی ہلاکت سے بچایا اور آج سے پانچ ہزار سال پہلے تاریخی سفر پر روانہ کیا۔ تمہارے سفر کی مدت ختم ہو گئی ہے۔ اب تمہیں یہاں سے واپسی کا سفر شروع کرنا ہے۔"

میں ہمہ تن گوش تھا۔ میں نے کہا۔ "میں اپنے واپسی کے سفر پر تیار ہوں لیکن مجھے صرف اتنا بتا دو کہ کیا پانچ ہزار برس پیچھے جانے کے بعد' میں اپنی بیوی اور بچوں سے مل سکوں گا۔"

پراسرار ہستی نے جواب دیا۔ "یہ ایک راز ہے جو میں افشا نہیں کر سکتی تمہارے لئے یہی حکم ہے کہ تم واپسی کے سفر کے لئے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لو۔"

میں ایک اعتبار سے خوش بھی ہوا کہ اس طویل سفر کی صعوبتوں سے نجات مل رہی ہے اور میں ایک بار پھر پانچ ہزار برس پیچھے کے زمانے میں جا کر اپنی پیاری بیوی سارا اور اپنے بچوں سے مل سکوں گا۔ میں نے جذباتی ہو کر کہا۔ "میں پوری طرح سے تیار ہوں اگر میری واپسی کا سفر شروع ہو گا تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میں کل صبح اس ماڈرن شہر کراچی سے نکل کر وقت کے کس عہد میں پہنچوں گا۔"

پراسرار عورت کی سرگوشی نما آواز ائی۔ "یہ بھی ایک راز ہے جو تمہیں ابھی نہیں

بتایا جا سکتا۔ کل صبح جب تم اٹھو گے تو تمہیں اپنے آپ علم ہو جائے گا کہ تم کس عہد میں پہنچ گئے ہو۔"

میں کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ پراسرار عورت کی آواز ایک بار پھر بلند ہوئی۔ "ایک بات تمہیں خاص طور بتا دینا چاہتی ہوں کہ اب تمہارے پاس سوائے تمہارے زندہ رہنے اور مر نہ سکنے کی غیر معمولی طاقت کے سوا اور کوئی طاقت نہیں ہے تمہارے سارے طلسم اور منتر بے اثر ہو چکے ہیں۔"

یہ بڑی افسوسناک بات تھی۔ میں احتجاج کرنے ہی والا تھا کہ عورت کا ہیولا غائب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں پھیلی ہوئی نیلی روشنی بھی بجھ گئی۔ میں نے ٹیبل لیمپ روشن کیا۔ کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ تاریک رات میں ستارے آسمان پر کھلے ہوئے تھے۔ کراچی کا سمندر پرسکون تھا۔ دور کراچی کی بلند عمارتوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں اور ساحل سمندر کی نم آلود ٹھنڈی ہوا میری پیشانی کو چوم کر گزر رہی تھی۔

میں نے سرسوتی دیوی کا گندھر و منتر اور والدہ صاحبہ کے تصور کو ذہن میں لا کر قدیم مصری منتر کو باری باری آزمایا مگر دونوں منتر بے کار ہو چکے تھے۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ یہ دونوں منتر میری واپسی کے سفر میں بے حد کام آ سکتے تھے لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اب صرف عاطون تھا جس کے پاس نہ مرنے کی مافوق الفطرت طاقت تھی۔

کھڑکی بند کر کے میں نے کمرے کی چیزوں پر ایک نظر ڈالی میں کوئی ایسی ہلکی پھلکی چیز اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا جو جدید سائنسی عہد کی نمائندہ ہو اور میرے واپسی کے پانچ ہزار سالہ سفر میں نہ صرف یہ کہ میرے کام آ سکے بلکہ قدیم عہد کے لوگوں کے لئے ایک عجوبہ بھی ہو۔ ٹیبل پر جیبی سائز کا چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا۔ اس میں بیٹری کے دو سیل پڑتے تھے۔ یہ سیل ایک ماہ میں خراب ہو جائیں گے۔ ٹیپ ریکارڈر بھی بے کار ہو جائے گا۔ اس کے قریب ہی میرا جرمن پستول رکھا ہوا تھا۔ اس کا چیمبر گولیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر گولیوں کا ڈبہ نکالا۔ جیب میں پستول اور ڈبے کی ساری گولیاں رکھ لیں۔ گیس کے چھوٹے لائٹر میں گیس بھرا اور اسے بھی جیب میں ڈال لیا۔ جیبی سائز کے ٹیپ ریکارڈر میں گانوں کا ایک کیسٹ پہلے سے لگا ہوا تھا۔ میں نے یہ ٹیپ ریکارڈر بھی اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس میں آواز بھی ریکارڈ ہو جاتی تھی۔ میں آپ کے شہر میں اپنے ساحل سمندر والے مکان کے کمرے میں بیٹھا یہ آخری سطریں لکھ رہا ہوں۔ کل کہاں ہوں گا۔ کل صبح کا سورج مجھے کس عہد میں کس زمانے میں دیکھے گا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں اپنا سفرنامہ ضرور لکھتا رہوں گا۔ لیکن یہ اوراق آپ تک کیسے پہنچیں گے؟ اس کا بھی مجھے

کچھ علم نہیں ہے۔

مجھے نیند آ رہی ہے۔ بال پوائنٹ میرے ہاتھ سے گر رہا ہے۔ اس پر میری گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ یہ طلسمی نیند ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ماورائیت کی مافوق الفطرت لہروں کی زد میں ہوں۔ خدا حافظ۔ خدا حافظ ! خدا حافظ .... خدا حافظ۔

اب میں یعنی اس پراسرار کہانی کا مؤلف آپ سے ہم کلام ہوں۔

عاطون کراچی شہر سے۔ شاید ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ اس کا ساحل سمندر والا کاٹیج ویران ہو گیا۔ لوگ اس کا مختصر سامان اٹھا کر لے گئے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ جس کے ہاتھ جو لگا وہ لے گیا۔ لوگوں نے دروازے کھڑکیاں بھی اکھاڑ لیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے عاطون کا کاٹیج بھوت گھر بن گیا۔ وقت گزرتا گیا پھر زمین کا وہ ٹکڑا سرکاری اسکیم میں آ گیا اور وہاں فلیٹ بن گئے۔

پچھلے برس مجھے یورپ کا سفر درپیش ہوا تو میں سیروسیاحت کی غرض سے ترکیہ کی طرف نکل گیا۔ وہاں سے بحری جہاز میں بیٹھ کر جزیرہ **سائپرس** میں جا اترا۔ کچھ روز یہاں قیام کیا۔ یہاں سے ایک اطالوی جہاز میں سیٹ بک کروا کر سکندریہ کی بندرگاہ پر جا اترا۔ سوچا مصر کی سیر کرتا ہوا واپس پاکستان جاؤں گا۔ قاہرہ زیادہ دور نہیں تھا۔ اسی روز ٹرین پکڑی اور قاہرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

قاہرہ میرے لیے نیا شہر نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی میں دو بار اس قدیم ترین تہذیب کے نمائندہ شہر کی سیر کر چکا تھا۔ اہرام بھی میرے دیکھے بھالے تھے۔ یہاں پہنچ کر مجھے عاطون کا خیال آ گیا۔ یہ کبھی عاطون کا وطن ہوا کرتا تھا مگر پانچ ہزار برس پہلے کے مصر اور آج کے مصر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک ہفتہ قاہرہ کی سیر کی۔ اہرام مصر دیکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کیونکہ اب یہ سارے اہرام کھل چکے تھے۔ اب ان میں کوئی بھید باقی نہیں رہا تھا۔ میں نے ہوٹل سے ہی ایک فضائی کمپنی کے آفس میں فون کیا اور کراچی کے لئے اگلے روز کی سیٹ بک کروالی۔ قاہرہ میں یہ آخری رات تھی۔ دل میں خیال آیا کہ آج رات قدیم شہر کے چھتے ہوئے بازار کے کسی قہوہ خانے میں بیٹھ کر کھانا کھایا جائے۔

رات ہوئی تو قاہرہ شہر روشنیوں سے جگمگانے لگا۔ میں شہر کے تمام راستوں سے واقف تھا۔ ٹیکسی پکڑی اور الجواد اسٹریٹ میں سے گزرتا ہوا قدیم قاہرہ کے ایک بازار سوق الخبیر میں پہنچ کر ٹیکسی چھوڑ دی۔ میں ٹہلتا ہوا ایک چھتے ہوئے چھوٹے بازار میں آ گیا۔ یہاں المامون نام کا ایک بہت پرانا قہوہ خانہ تھا۔ جہاں میں پہلے بھی دو ایک بار آ کر چاول اور مچھلی کے کبابوں سے لطف اندوز ہو چکا تھا۔

المامون قہوہ خانے کو زینہ اتر کر راستہ جاتا تھا۔ تہہ خانے میں ایک کشادہ کمرے کی محرابی دیواروں کے ساتھ ستونوں کے درمیان جگہ جگہ آبنوسی کا مداز میزیں لگی تھیں موم بتیوں کی رومانی روشنی میں مشک وعنبر کی خوشبوئیں اڑ رہی تھیں۔ شیشے کی رنگ برنگ نلکیوں والے بلوریں پردے لٹک رہے تھے۔ بیش قیمت قالین کے فرش بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر مصری کیلی گرافی کے نادر نمونے آویزاں تھے۔ کچھ غیر ملکی جوڑے میزوں پر بیٹھے کھانے کے بعد قہوے سے جی بہلا رہے تھے۔ ایک مصری پرانی وضع کے لباس میں تخت پر بیٹھا دھیمے سروں میں بربط بجا رہا تھا۔ بڑا رومانٹک اور پراسرار ماحول تھا اور میں اسی ماحول سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہاں آیا تھا۔

میری میز ایک ستون کے عقب میں تھی۔ میں نے اپنی پسندیدہ ڈش **ونگلدار** چاول اور دریائے نیل کی مچھلی کے کباب منگوائے اور مزے لے لے کر کھانے لگا۔ کھانے کے بعد قہوہ آ گیا۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا اور قہوے کے گھونٹ چڑھاتے ہوئے فراعنہ مصر کے عہد کے زمانے میں پہنچ گیا۔ ماحول ہی ایسا تھا۔

میرے پہلو میں جو میز تھی اس پر ایک داڑھی والا مصری لمبی عبا پہنے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی شکل بحری ڈاکوؤں ایسی تھی۔ وہ دو تین بار اپنی کلائی کی گھڑی پر وقت دیکھ چکا تھا۔ اسے کسی کا انتظار تھا۔ ایک ناٹے قد کا گول مٹول آدمی لمبی عبا سنبھالتا ہوا قہوہ خانے میں داخل ہوا ۔ وہ میرے پہلو والی میز کی طرف بڑھا۔ پہلے مصری نے اس سے مصافحہ کیا پھر دونوں سر جوڑ کر باتیں کرنے لگے۔ وہ اس عربی زبان میں باتیں کر رہے تھے جو شمالی سوڈان میں بولی جاتی تھی۔ میں چونکہ انگریزی لباس میں ملبوس تھا اس لیے وہ یہی سمجھے کہ میں ان کی زبان سے ناواقف ہوں۔ تاہم وہ دبی زبان میں بول رہے تھے مگر میں ان کے الفاظ بخوبی سمجھ رہا تھا لیکن مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

میں مزے سے مصری سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ میرے کانوں میں ایسی آواز پڑی جیسے کسی نے میرا نام لیا ہو۔ میں نے پلٹ کر ان دونوں مصریوں کی طرف دیکھا۔ ان دونوں میں سے جو ناٹے قد کا سوڈانی نژاد معلوم ہوتا تھا میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان دونوں میں سے کسی نے میرا نام لیا ہو۔ یہ لوگ میرے لیے اور میں ان کے لئے سمندر پار کا اجنبی تھا۔ شاید یہ میرا وہم تھا۔ میں قہوہ فنجان میں انڈیلنے لگا۔

اتنے میں وہ دونوں اٹھے اور میرے قریب سے گزر کر زینے کی طرف چلے۔ زینہ اوپر کو جاتا تھا۔ ناٹے قد کے آدمی نے میری طرف گھوم کر دیکھا اور مجھ پر ایک گہری نظر ڈالتا ہوا اپنے ساتھی کے ہمراہ زینہ چڑھنے لگا۔ جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو

میں قدرتی طور پر یہ سوچنے لگا کہ یہ لوگ آخر کون تھے اور مجھے کیوں تک رہے تھے۔
چند سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے کہ قہوہ خانے کا مصری بیرا پلیٹ میں کاغذ کا تہہ کیا ہوا ٹکڑا رکھے میرے پاس آیا اور بولا۔
"سر' یہ خط آپ کے لئے ہے۔"
میں نے بیرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "میرا خط؟ کس نے دیا ہے؟"
بیرے نے بتایا کہ ابھی ابھی جو دو صاحب یہاں سے اٹھ کر گئے ہیں انہوں نے دیا ہے کہ مجھ تک پہنچا دیا جائے۔ میں نے کاغذ کا ٹکڑا اٹھالیا۔ جلدی سے اسے کھولا تو اس میں عربی زبان میں لکھا تھا۔
"تیسرے اہرام کا عقبی قدیم دروازہ۔ آج آدھی رات کو آجاؤ۔ عاطون تمہارے انتظار میں ہے۔" خط پڑھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میرے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میں پھر کبھی' عاطون کا نام سنوں گا۔ میں نے بیرے سے پوچھا کہ یہ لوگ کون تھے؟ بیرے نے کہا کہ وہ انہیں نہیں جانتا۔
"میں نے اپنے قہوہ خانے میں انہیں پہلی بار دیکھا ہے۔"
میں تجسس اور حیرت کے سمندر میں گم تھا۔ بیرا چلا گیا تھا۔ میں نے کئی بار خط کی تحریر کو پڑھا۔ عاطون میرا انتظار کر رہا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ عاطون تو ایک عرصہ ہوا ہمارے عہد سے کوچ کر کے واپسی کے پانچ ہزار سالہ سفر پر روانہ ہو چکا ہے۔ پھر.... پھر وہ تیسرے اہرام کے عقبی دروازے.... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔
میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے ساڑھے نو بجنے والے تھے۔ اب نصف رات میں کافی وقت تھا۔ میں اٹھ کر باہر آگیا۔ میرا ذہن تیزی سے ان پراسرا مصریوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ کون تھے؟ کیا وہ قدیم زمانے سے آئے تھے؟ اگر نہیں تو وہ عاطون سے کیسے واقف ہو گئے؟

بہرحال میں نے عاطون سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے ہوٹل میں آ کر پہلا کام یہ کیا کہ فضائی کمپنی کے آفس میں فون کر کے اپنی سیٹ منسوخ کرا دی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے آدھی رات کو تیسرے اہرام میں ضرور جانا چاہئے۔ عاطون میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ اب میں بے چینی سے وقت گزارنے لگا۔ گیارہ بجے رات میں نے ٹیکسی لی۔ اور۔ جگمگاتے قاہرہ کے بازاروں سے نکل کر اہرام مصر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مصری ڈرائیور بڑا حیران ہوا کہ میں آدھی رات کو اہرام کی طرف کس لئے جا رہا ہوں۔ میں نے اسے یہی بتایا کہ میرا تعلق برطانیہ کے آثار قدیمہ کی ایک ٹیم سے ہے اور میں ان کے ساتھ اہرام کے پاس خیمے

میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ تاہم ابوالہول کے پاس پہنچ کر میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔
ٹھنڈی مگر خوشگوار ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ فضا میں ٹھنڈی ریت کی خوشبو رچی تھی۔ کچھ فاصلے پر عظیم الشان دیو قامت اہرام مصر صحرائی رات کے دھندلکے میں پرہیبت انداز میں سینہ تانے کھڑے تھے۔ آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ میرے پاس کوئی چاقو یا پستول نہیں تھا۔ ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں نے مجھے لوٹنے کا پروگرام بنایا ہو۔ مگر خاص طور پر مجھے ہی کیوں لوٹنا چاہتے تھے۔؟ دل نہیں مانتا تھا۔ قدم اپنے آپ تیسرے اہرام کی طرف اٹھ رہے تھے۔ شبنم کے گرنے سے صحرا کی ریت گیلی تھی۔ کہیں کہیں زمین کی سطح سنگلاخ تھی۔ تیسرا اہرام ذرا پیچھے ہٹ کر استادہ تھا۔ میں اس کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ آدھی رات کے سناٹے میں پرجلال' دیو پیکر اہرم کو دیکھ کر ایک بار تو مجھ پر بھی ہیبت طاری ہو گئی۔
میں آہستہ آہستہ چلتا اہرام کے عقب میں آگیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اہرام کا عقبی دروازہ کس مقام پر ہو گا۔ میں اہرام کی عقبی دیوار کے پاس آ کر رک گیا۔ ستاروں کی دھندلی روشنی میں اہرام کے بڑے بڑے پتھروں کے بلاک کئی جگہوں سے جھڑے ہوئے تھے۔ میں عقبی دروازے کو تلاش کرنے لگا۔ اچانک مجھے بلی کی آواز سنائی دی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ فراعنہ مصر کے عہد میں دیگر حشرات الارض کے ساتھ بلی کی بھی پوجا کی جاتی تھی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔
میری آنکھیں اہرام کی عقبی دیوار پر لگی تھیں۔ ایکا ایکی مجھے دو زرد آنکھیں چمکتی نظر آئیں۔ یہ اسی بلی کی آنکھیں تھیں جس کی آواز تھوڑی دیر پہلے مجھے سنائی دی تھی۔ مجھ پر خوف کا غلبہ ہوا اور ڈر کر واپس بھاگنے والا تھا کہ مجھے ایک شفقت بھری نرم آواز سنائی دی۔
"کیا مجھ سے ملے بغیر چلے جاؤ گے؟"
میں نے آواز پہچان لی۔ یہ عاطون کی آواز تھی۔ میرے قدم وہیں رک گئے۔ پھر بھی میرے ہونٹ جیسے بوجھل ہو گئے تھے اور میں ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا تھا۔
"چلے آؤ۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں۔" عاطون کی آواز مجھ سے ایک بار پھر مخاطب تھی۔
اب کافی حد تک میرا خوف کم ہو گیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم عاطون ہو؟"
"ہاں۔ چلے آؤ۔ دیوار میں دروازہ کھلا ہے۔"
میرے قدم خود بخود اہرام کی دیوار کی طرف اٹھنے لگے۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ دیوار

کے پہلو میں کونے کے پاس ایک محرابی دروازہ کھلا ہے۔ جس میں نیلی نیلی دھندلی روشنی کا مدہم غبار پھیلا ہے۔ میں ذرا جھجکا۔

عاطون کی آواز آئی۔ ”ڈرو نہیں‘ میں تمہارا دوست ہوں۔“

میں دروازے کی محراب میں سے گزر گیا۔ اب جو پیچھے مڑ کر دیکھا تو دروازہ غائب تھا۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا یہ نیچی چھت اور پتلے پتلے ستونوں والا کمرہ کسی بڑے دالان سے مشابہہ تھا جس پر نیلی روشنی کا غبار دھند کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس دھندلی روشنی میں سامنے ایک ممی کا تابوت دیوار کے ساتھ بنا ہوا تھا۔ میں قدرے پریشان ہو کر عاطون کو آواز دی تو اس کا جواب آیا۔

”اس تابوت کو کھول دو۔“

تابوت کے بائیں جانب ڈھکنے کا کنڈا تھا۔ میں نے اسے کھولا تو اس کے اندر کسی ممی کی لاش کی جگہ ایک محرابی دروازہ بنا ہوا تھا۔ اس دروازے میں سے نیچے کو سیڑھیاں جاتی تھیں۔ میں شش و پنج میں تھا کہ عاطون نے ایک بار پھر شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

”زینہ اتر کر میرے پاس آ جاؤ۔“

صورت حال خطرناک حد تک پراسرار ہوتی جا رہی تھی۔ ایک بار تو خیال آیا کہ الٹے پاؤں بھاگ جاؤں لیکن عاطون کی آواز اور اس کا دوستانہ لہجہ میری ہمت بندھا رہا تھا۔ عاطون شاید میرے دل کی کیفیت کو پڑھ رہا تھا۔ اس نے دھیمی سرگوشی میں کہا۔

”ڈرو نہیں۔ آ جاؤ۔“

میں تابوت کی سیڑھیاں اتر گیا۔ اب میں ایک ایسے کشادہ حجرے میں آ گیا تھا جہاں چاروں کونوں میں شمع دان روشن تھے مگر ان کی روشنی انتہائی نرم اور نورانی تھی۔ درمیان میں ایک چبوترہ بنا تھا۔ اس چبوترے پر چار تابوت پڑے تھے۔ عاطون کی آواز سنائی دی۔

”میرے دوست جن تابوتوں کو تم دیکھ رہے ہو ان میں سے ایک میرا تابوت ہے۔ ساتھ والے تابوت میں میری پیاری بیوی سمارا محو خواب ہے اور پہلو میں دونوں تابوت میرے دونوں بچوں کے ہیں۔“

”عاطون! مگر..... مگر تم تو ہزاروں سال کے واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ پھر تم کیسے انتقال کر گئے؟“

عاطون نے جواب دیا۔ ”یہ زمان و مکان کا ایک ایسا راز ہے جو تم زندہ لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ کیونکہ زندہ انسان کی محدود عقل اس مسئلے کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ یہ پردہ مرنے کے بعد ہی اٹھتا ہے لیکن اس وقت میں نے تمہیں یہاں زمان و مکان کے فلسفے پر

بحث کے لئے نہیں بلکہ تمہیں اپنے واپسی کے سفر کے ہوش ربا واقعات بتانے کے لیے بلایا ہے۔“

میرے منہ سے اپنے آپ نکل گیا۔ ”عاطون کیا..... کیا تم مجھے پانچ ہزار برس کے واقعات سناؤ گے؟“

عاطون کی ہلکی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ ”سناؤں گا نہیں بلکہ تم ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ جو واپسی کے پانچ ہزار برسوں میں میرے ساتھ بیتے۔“

میں نے عاطون کو بتایا کہ اتنی طویل ترین مدت کو دیکھنے کے لئے بھی پانچ ہزار سال درکار ہیں تو اس نے جواب دیا۔

”اس کا تعلق وقت اور مکان کی اس باریک مگر مضبوط ترین دیوار سے ہے جو زندگی اور موت کے درمیان حائل ہے۔ جب یہ دیوار اٹھ جاتی ہے تو پانچ ہزار سال سمٹ کر انسان کی ایک نگاہ میں آ جاتے ہیں۔ میرے تابوت کے سامنے چبوترے پر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہاری آنکھوں کے سامنے سے وقت کی دیوار کو ایک لمحے کے لئے اٹھا رہا ہوں۔ تم پانچ ہزار سال کے واقعات کو ان کی تمام جزئیات اور ذرا ذرا سی تفصیل کے ساتھ ایک پل میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ آؤ میرے تابوت کے سامنے آ کر بیٹھ جاؤ۔“

میں نے ایسا ہی کیا۔ درمیان والے تابوت کے پاس جا کر میں چبوترے پر بیٹھ گیا۔ عاطون نے کہا۔ ”اپنی آنکھیں میرے تابوت کی دیوار پر لگا دو۔ تم اپنی زندگی کے سب سے حیرت انگیز تجربے سے گزرنے والے ہو۔ ڈرنا مت۔“

میں نے اپنی آنکھیں عاطون کے تابوت کی دیوار پر جما دیں تابوت کی دیوار میں ایک محراب دار کھڑکی روشن ہو گئی۔ اس کھڑکی میں سے مجھے ایک منظر دکھائی دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک نہایت حسین و جمیل نوجوان عورت جس نے ہزاروں برس قدیم آریاؤں کا لباس پہن رکھا تھا روشنی میں نمودار ہوئی۔ اس نے میری طرف حجاب آلود نگاہوں سے دیکھا اور قدیم آریائی سنسکرت ..... میں کہا۔

”میرا نام مایا ہے۔ میں اس وقت تمہیں اس لئے دکھائی دے رہی ہوں کیونکہ میں نے اپنے آپ کو تم پر ظاہر کر دیا ہے۔ میں غیبی حالت میں رہتی ہوں اور عاطون کی پہلے ایک جنم میں ساتھی ہوں۔ ہمارا ایک اور ساتھی بھی ہے۔ اس کا نام پدم ہے۔ پدم کو گیتا میں بھگوان کرشن نے سانپوں کے دیوتا کے نام سے یاد کیا ہے۔ وہ دیکھو‘ تم سے ملنے پدم بھی آ گیا ہے۔“

میں نے دیکھا کہ روشنی میں سے ایک جانب سیاہ رنگ کا ایک اژدہا نمودار ہوا جس

کے سات منہ تھے۔ ہر منہ میں سے سرخ رنگ کی لمبی پتلی زبان پھنکار رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑے یاقوتوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ مایا کے پاس آکر اس نے اپنی کایا کلپ کر دی اور ایک سانولے رنگ اور نسواری مقناطیسی آنکھوں والے نوجوان میں تبدیل ہوگیا۔ اس کی نگاہوں میں زبردست کشش تھی۔ میری طرف دیکھ کر وہ مسکرایا اور آریائی زبان میں گویا ہوا۔

"میرا نام پدم ہے۔ میں سانپوں کا دیوتا ہوں۔ مجھے مہاناگر بھی کہتے ہیں۔ میں اور مایا تمہارے دوست عاطون کے جنم جنم کے ساتھی ہیں۔ ایک خاص یگ میں پہنچنے کے بعد ہم نے کسی مصلحت کے تحت عاطون کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کے بعد اس نے فرعون مصر کے شاہی خاندان میں جنم لیا اور ایک معینہ مدت تک غیرفانی انسان بن کر یگ یگ کے سفر پر روانہ ہوا۔ اب وہ پھر ہمارے ساتھ آ ملا ہے۔ اس نے تمہارے زمانے کے حساب سے دس ہزار برس پیچھے اور اپنے فراعنہ مصر کے زمانے کے حساب سے پانچ ہزار برس پیچھے ایک بار پھر ایک آریائی راجہ کے محل میں جنم لیا ہے۔ اب تم اس کے جنم جنم کے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ یہ ہزاروں برس کی زندگی کا سفر ہوگا۔"

میں نے اپنی زبان میں پوچھا کہ میں ہزاروں برس کے واقعات کو اتنی قلیل مدت میں کیسے دیکھ سکوں گا۔ اس پر مایا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وقت ایک بیکراں سمندر سے بھی کروڑوں سنکھوں سے بھی زیادہ وسیع وعریض ہے۔ لیکن یہ اتنا مختصر بھی ہے کہ آسمانی بجلی کی ایک لحہ بھر کی چمک میں بھی سمٹ سکتا ہے۔ ہم نے تمہارے لئے ہزاروں برس کے واقعات کو بجلی کی ایک چمک میں مرکوز کر دیا ہے۔ ابھی ایک بجلی تمہاری آنکھوں کے سامنے لہرا جائے گی اور تمہارے ذہن میں اس روشنی میں سمٹے ہوئے تمام واقعات وحادثات اپنی تمام جزئیات کے ساتھ منتقل ہو جائیں گے۔"

پدم نے کہا۔ "آنکھیں کھلی رکھنا۔ ہم جا رہے ہیں۔"

میرے دیکھتے ہی دیکھتے پدم .... سانپ کا روپ اختیار کر کے روشنی کے دائروں میں گم ہوگیا۔ خوبصورت دوشیزہ مایا نے میری طرف ترچھی نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"میں بھی جا رہی ہوں۔ اب تم ہم دونوں کو عاطون کے ایک ہزار اکانویں جنم میں اس کے ساتھ سفر میں دیکھو گے۔"

یہ کہہ کر مایا ایک دم سے غائب ہوگئی۔ ان کے جاتے ہی محرابی کھڑکی کے اندر سے روشنی کی ایک تیز لہر بجلی کا کوندا بن کر لپکی۔ ایک گڑگڑاہٹ کی آواز بلند ہوئی۔ میں اپنی

جگہ سے ہل گیا۔ لیکن میری آنکھیں روشنی کے مرکز پر جمی رہیں اور پھر میری آنکھیں اس کی چمک کے ساتھ ہی بند ہوگئیں۔ بند آنکھوں کے پردے پر اب عاطون کی شکل نمودار ہوئی۔ وہ اس قدر بوڑھا ہو چکا تھا۔ کہ میں اسے بمشکل پہچان سکا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال چھاتی سے نیچے لٹک رہے تھے۔ چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں اسے اس کی آواز سے ہی پہچان سکا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"میرے دوست! میرے دس ہزار برس پہلے کے جنم جنم کے واقعات تمہارے ذہن کی لوح پر محفوظ ہو گئے ہیں۔ واپس کراچی جا کر جب تم انہیں لکھنے بیٹھو گے تو ایک ایک واقعہ پوری تفصیل سے تمہارے سامنے آ جائے گا۔ تم مجھے جنم جنم میں چلتے پھرتے، مصائب کا شکار ہوتے، عیش وعشرت میں غرق اور نیکی اور سچائی میں سرگرداں دیکھو گے۔ تم مجھے ہر جنم میں پہچان لو گے۔ کیونکہ میں تم پر ہر جنم میں اپنا آپ ظاہر کر دوں گا۔ تم دیکھو گے کہ انسان کے برے اعمال اسے کس طرح اذیت میں مبتلا کر دیتے ہیں اور نیک اعمال کا کتنا اچھا اجر ملتا ہے۔ بعض لوگ دوبارہ جنم لینے پر یقین نہیں رکھتے۔ انہیں یقین کرنا بھی نہیں چاہئے۔ ہر شخص کے لئے اپنا عقیدہ ہی نجات کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے۔ کسی انسان کو اپنے عقیدے سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے۔ وہ جو دین اور مذہب لے کر پیدا ہوا ہے اسے اس دین یا دھرم پر مرتے دم تک قائم رہنا چاہئے۔ میں ایک بت پرست خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ اور میرے پہلے جنم بھی ایسے ہی تھے چونکہ میں نے ہر جنم میں سچائی اور نیکی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس لئے قدرت نے میرے اندر ایسی روشن ضمیری اور شعور پیدا کر دیا ہے کہ میں ہر جنم میں نہ صرف یہ کہ میں اپنے آپ کو پہچان لیتا ہوں بلکہ اپنے پچھلے جنم کے واقعات بھی مجھے یاد رہتے ہیں۔

اب مجھے اجازت دو، کیونکہ میں نے تم سے ملاقات کے لئے جتنا وقت آسمانی طاقتوں سے لیا تھا وہ ختم ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی کسی جنم میں اب تم سے دوبارہ ملاقات ہو۔ میری کہانی اب تم خود اپنی زبانی بیان کرنا۔ دیکھو تم اپنے وطن پاکستان پہنچ کر جب میری واپسی کی داستان حیرت لکھنے بیٹھو گے تو میں تمہیں آج سے دس ہزار برس پہلے شمالی ہند کی ایک ریاست کے شاہی محل میں تخت شاہی پر بیٹھا نظر آؤں گا۔ میرا نام بھارتہ ہو گا اور میری دو سو بیویاں ہوں گی۔"

"خدا حافظ میرے دوست!"

عاطون کا چہرہ میری بند آنکھوں کی تاریکی میں غائب ہوگیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے دیکھا کہ میں تیسرے اہرام کے کھنڈر کے پاس کھڑا ہوں اور صبح ہو چکی ہے۔

صحرا میں طلوع ہوتے سورج کی کرنیں اجالا پھیلا رہی تھیں۔ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا تھا اس پر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا لیکن میں عاطون کو جانتا تھا اور عاطون ہی نے مجھ سے ملاقات کی تھی پھر یہ حقیقت تھی میرا وہم نہیں تھا۔

میں نے ابوالہول ریستوران میں بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ میرا ذہن تیزی سے گزرے ہوئے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ میں آنکھیں بند کرتا تو مجھے نہ تو عاطون کی شکل نظر آتی اور نہ ہی اس کے ایک ہزار اکانویں جنم کے واقعات ہی دکھائی دیتے۔ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے میں نے کوئی خواب دیکھا ہو۔ بہرحال میں وہاں سے ٹیکسی لے کر اپنے ہوٹل میں واپس آیا۔ میں نے کراچی تک اپنی فلائٹ کینسل کروا دی تھی۔ اس لئے ایک دوسری فضائی کمپنی کے دفتر فون کیا۔ وہاں آدھی رات کے بعد کی ایک پرواز میں جگہ مل گئی۔ دوسرے روز میں اپنے وطن پاکستان پہنچ چکا تھا۔

جس روز شام کو میں کراچی پہنچا۔ اسی روز آدھی رات کو میں اپنے اسٹڈی روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ٹیبل لیمپ روشن کیا۔ چائے کا کپ پاس رکھ لیا۔ کاغذ اور قلم سنبھالا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی تو میرے کانوں میں عاطون کی آواز آئی۔ یہ آواز گویا بہت دور سے آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"میرے دوست جس کاغذ پر تم میرے جنم جنم کی داستان قلمبند کرنے بیٹھے ہو اس پر نگاہ ڈالو تمہیں صفحہ قرطاس پر تمام واقعات اپنی معمول کی رفتار کے ساتھ وقوع پذیر ہوتے نظر آئیں گے۔ تم اسی ترتیب سے انہیں لکھتے چلے جانا۔ خدا حافظ۔"

اب جو میں نے سفید کاغذ پر نگاہ ڈالی تو ایک قدیم ترین دھارمک فلم وہاں چلتی نظر آئی۔ میرے سامنے کسی قدیم آریائی مہاراجہ کا محل تھا جس کے بے شمار بلند ستونوں پر ہزار قسم کے اصنام تراشے گئے تھے۔ دالانوں میں ریشمی قالین بچھے تھے۔ سنگ مرمر کی دیواروں کے پیچھے بھی میری نظریں سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

میں جیسے شاہی محل کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ مناظر پوری تفصیل کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے رونما ہونے شروع ہو گئے تھے۔ میں نے انہیں اسی ترتیب اور جزئیات کے ساتھ قلمبند کرنا شروع کر دیا۔

عاطون ایک مہاراجہ کے روپ میں شاہی تخت پر بیٹھا تھا۔ تخت پر ایک شاہی چھتر سایہ فگن تھا جس میں قیمتی ہیرے موتی جڑے تھے۔ عاطون کے سر پر بھی ہیرے جواہرات سے مرصع تاج تھا۔ دو نوجوان کنیزیں اس کے تخت کے پیچھے ادب سے کھڑی مور چھل ہلا

رہی تھیں۔ عاطون سونے کے پیالے میں موجود کسی مشروب کے ہلکے ہلکے گھونٹ لے رہا تھا۔ اس کے تخت پر پہلو میں ایک ایسی عورت بیٹھی تھی کہ جس کا حسن شعلہ جوالا بن کر دمک رہا تھا۔ یہ عاطون کی ۲۰۰ رانیوں میں سے سب سے چہیتی رانی کامنی تھی۔ عاطون کا نام راجہ بھارتہ تھا۔ بھارتہ کو اپنی اس رانی کامنی سے والہانہ پیار تھا۔ کامنی بھی راجہ بھارتہ پر اپنی جان چھڑکتی تھی۔ ایک آتش نما رقاصہ دنیا اور مردنگم کی تال پر رقص کر رہی تھی۔ یہ وہ رقص تھا جو آکاش کی اپسرائیں آسمانی دیوتاؤں کے حضور ناچتی ہیں۔ رقاصہ سام دید کے مدھر کامناؤں سے بھرے ہوئے عاشقانہ گیت گا رہی تھی۔ اس کے گھنگروؤں کی جھنکار پاؤں کی تھاپ کے ساتھ بلند ہو کر شاہی محل کے اس کمرہ عیش میں سحر انگیز سماں باندھ رہے تھے اور راجہ بھارتہ یعنی عاطون اپنی چہیتی بیوی کامنی کو لازوال محبت کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

رقص ختم ہو گیا۔ شاہی رقاصہ ہاتھ باندھ کر راجہ بھارتہ کے حضور جھک گئی۔ بھارتہ نے اپنے گلے سے قیمتی موتیوں کا ہار اتار کر اس کی طرف پھینکا اور اپنی محبوب بیوی کامنی کو ساتھ لئے حجلہ خاص میں داخل ہو گیا۔ کنیزیں بستر سنجاب وسمور پر چنبیلی وسوسن کی گلاب پاشی پہلے ہی سے کر چکی تھیں۔ انہوں نے مہاراجہ اور مہارانی کے آگے تعظیم کی اور کمراء شب خوابی سے نکل گئیں۔

راجہ بھارتہ مسند شاہی سے ٹیک لگا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ رانی کامنی نے مشروب پیش کیا تو راجہ بھارتہ نے مسکرا کر کہا۔

"رانی کامنی! تم ہمارے دل کی بھی مہارانی ہو۔ جتنا پریم ہمیں تم سے ہے۔ اتنا اپنی کسی رانی سے نہیں ہے۔ بتاؤ۔ کیا تم بھی ہم سے اتنی ہی محبت کرتی ہو؟"

رانی کامنی نے مہاراجہ کا ہاتھ تھام کر اپنی مدبھری آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولی۔

"مہاراج! آپ میرے جنم جنم کے ساتھی ہیں۔ آپ سے میرے پریم کا مقابلہ آکاش دھرتی اور پاتال کی کوئی قیمتی سے قیمتی چیز بھی نہیں کر سکتی۔"

راجہ بھارتہ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اس نے رانی کامنی کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ "کامنی ہمیں پورا یقین ہے کہ ہماری محبت لازوال ہے۔ ہمارا ساتھ اٹوٹ ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایک بات کھٹکنے لگتی ہے۔"

رانی کامنی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "ایسی کونسی بات ہے مہاراج؟"

راجہ بھارتہ نے رانی کامنی کی لمبی سیاہ ریشمی زلف سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "رانی کامنی! جہاں محبت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے وہاں شک وشبہ ضرور جنم لیتا ہے۔ مجھے کبھی کبھی

خیال آتا ہے کہیں تم مجھے بھول تو نہیں جاؤ گی؟"

رانی کامنی کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اس نے آنسوؤں بھری آواز میں کہا۔ "مہاراج! آپ میرے دل کے سوامی ہیں۔ میری آتما' میری روح کے مالک ہیں۔ میں آپ کو بھلا دینے کا کبھی خیال بھی دل میں نہیں لا سکتی۔ پھر آپ نے ایسا گمان کیوں کیا؟"

راجہ بھارتہ نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ "ہمیں شما کر دو مہارانی! ہم نے ایسا گمان محض اس لئے کیا کہ ہمیں تم سے بے پناہ محبت ہے۔ ورنہ سوریہ دیوتا' دیوتا آگنی اور دیوتا اندر گواہ ہیں کہ ہم تمہاری محبت کے سوا اپنے دل میں کسی خیال کو جگہ نہیں دے سکتے۔"

راجہ بھارتہ نے شمع گل کر دی۔ سنگ مرمر کے جالی دار دریچوں میں سے چاند کی دھیمی رومانوی روشنی نے خواب گاہ کی رومان پرور فضا کو اور زیادہ پراسرار شہد آگیں اور رومانوی بنا دیا۔ مہارانی کامنی نے تازہ مشروب بھر کر راجہ بھارتہ کو دیا۔ راجہ پہلے ہی نیم مدہوش تھا۔ وہ یہ پیالہ پی کر گہری نیند سو گیا۔ رانی کامنی نے اٹھ کر اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ راجہ بھارتہ بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔ رانی کامنی آہستہ سے بستر سے اتر گئی۔ ایک ہاتھی دانت کے منقش صندوق میں سے اس نے سیاہ دو شالہ نکال کر اوڑھا۔ راجہ کے سرہانے کے پاس آ کر مدہوش راجہ کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی اور سیاہ دوشالے میں سمٹی خواب گاہ کے عقبی خفیہ دروازے کی طرف بڑھی۔ یہ دروازہ سرخ کمخواب کے بھاری پردے کے پیچھے دیوار میں ہنگامی حالات کے لئے بنایا گیا تھا جس کی اندھیری سیڑھیاں اترنے سے ایک سرنگ آ جاتی تھی جو شاہی محل سے کچھ فاصلے پر فصیل شہر سے باہر ایک جنگل میں جا کر نکلتی تھی۔

رانی کامنی خفیہ دروازے کی سیڑھیاں اتر کر اونچی چھت والی فراخ سرنگ میں آئی تو وہاں ایک رازدار خادم گھوڑا لیے تیار کھڑا تھا۔ رانی کو دیکھتے ہی خادم ادب سے جھک گیا۔ رانی نے گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور سرنگ میں سے گزرنے لگی۔

سرنگ کے دروازے پر جا کر رانی نے گھوڑے کو وہیں چھوڑا اور سرنگ کے دروازے سے نکل کر گھنی جھاڑیوں کے بیچ میں سے ہوتی ہوئی فصیل شہر کے جنوبی جنگل میں داخل ہو گئی۔ چاروں طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ اونچے گھنے درخت اپنی شاخوں کو جھکائے چشم عبرت سے جگر پاش بے وفائی کا منظر دیکھ رہے تھے۔

رانی کامنی بے تاب نگاہوں سے جنگل کی تاریکی میں ادھر ادھر دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔ املی کے ایک درخت کے نیچے پہنچی تو اندھیرے میں درخت کے پیچھے سے ایک سایہ

نکل آیا۔

رانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ "سامرتھ! تمہیں انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟"

یہ قوی ہیکل سیاہ رو حبشی سامرتھ تھا۔ راجہ بھارتہ کے حبشی سواروں پر مشتمل دستہ خاص کا ایک جانباز حبشی سپاہی جس پر رانی کامنی دل وجان سے عاشق تھی اور جس سے ملنے وہ آدھی رات کے وقت چھپ چھپ کر آیا کرتی تھی۔ ہفتے میں ان کی ایک رات طے تھی۔ اس رات رانی کامنی اپنے عاشق راجہ بھارتہ کو مشروب میں بے ہوشی کی دوا پلا کر مدہوش کر کے سلا دیتی اور خود اپنے عاشق سے ملنے خفیہ سرنگ سے ہوتی جنگل میں آ جاتی۔ اپنے ایک خادم خاص کو رانی کامنی نے بھاری رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا رکھا تھا جو اس رات مقررہ وقت پر سرنگ میں تازہ دم گھوڑا لیے تیار کھڑا ہوتا تھا۔ رانی کامنی نے اسے خاص حکم دے رکھا تھا کہ اگر کوئی اس کے پیچھے تعاقب کی غرض سے خفیہ دروازے سے اترے تو اسے بے دریغ قتل کر دے خواہ وہ راجہ بھارتہ ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ رانی کے جاتے ہی وہ خادم ننگی تلوار لے کر اس جگہ اندھیرے میں چھپ جاتا تھا جہاں سے راجہ کی خواب گاہ کے خفیہ دروازے کی سیڑھیاں سرنگ میں اترتی تھیں۔

شبنم سے بھیگے گھاس کے سبز مخملیں قالین پر لیٹی رانی کامنی کے کان کے قریب ہونٹ لے جا کر سامرتھ نے سرگوشی میں کہا۔ "رانی! کیوں نہ ہم یہاں سے فرار ہو جائیں۔ ملک حبشہ میں میرے کھیت ہیں۔ ہم وہاں چل کر رہیں گے۔"

رانی کامنی نے سامرتھ حبشی کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور بوجھل آواز میں کہا۔ "میرے سوامی' میری جان! میں رانی ہوں' مہارانی ہوں' بھاگ نہیں سکتی۔ پھر تمہیں اس سے کیا؟ میں ہر ہفتے کی رات کو تم سے ملتی ہوں۔ تم میرے مالک ہوتے ہو اور میں تمہاری کنیز۔"

ابھی پچھلے پہر کے ستارے نے جھلملانا شروع ہی کیا تھا کہ بے وفا رانی کامنی نے سامرتھ سے نیند بھری آواز میں کہا۔ "میرے محبوب! صبح ہونے والی ہے۔ میں اب واپس محل میں جاتی ہوں آج ہی کی رات پھر تم سے ملنے آؤں گی۔"

رانی کامنی نے دوشالہ اوڑھا اور تیز تیز قدموں سے چلتی جنگل کی اندھیرے میں غائب ہو گئی اور ایک بار پھر خفیہ سرنگ کی فضا گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج اٹھی۔ شاہی خواب گاہ کو جانے والی سیڑھیوں کے پاس خادم خاص اندھیرے میں نکل آیا۔ اس نے گھوڑے کو سنبھالا۔ رانی کامنی نے گھوڑے سے اترتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔ "کسی کو قتل کرنے کی نوبت تو نہیں آئی بکرم؟"

خادم خاص نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "نہیں مہارانی جی!"

مہارانی یہ سن کر تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ شاہی خواب گاہ کے جالی دار دریچوں میں سے آتی ہوئی چاند کی روشنی پھیکی پڑ چکی تھی۔ نیلے آسمان پر صبح کا ستارہ طلوع ہونے والے سورج کی نیلی روشنی میں پھیکا پڑ رہا تھا۔ رانی کامنی سرخ کمخواب کے بھاری پردے کے عقب سے نکل کر شاہی پلنگ پر آئی۔ راجہ بھارتہ بستر سنجاب وسمور پر اسی طرح مدہوش پڑا تھا۔ رانی کامنی نے دوشالہ اتار کر منقش صندوق میں رکھا اور آہستہ سے پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک اپنے حبشی عاشق کی تصویر سمائی ہوئی تھی۔ رانی کامنی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹوں پر راز بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ نیند کی آغوش میں پھسلتی چلی گئی۔

اس روز شمالی ہند کے سرسبزوشاداب جنگلوں اور پہاڑوں پر سیاہ گھٹائیں امڈ امڈ کر آ رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ راجہ بھارتہ اپنے خاص منتری' دوست اور دربار کے شاہی جوتشی شاستری دیوا' کے ساتھ جنگل میں شکار کھیلنے آیا ہوا تھا۔ راجہ اور شاستری دیوا گھوڑوں پر سوار ایک ہرے بھرے میدان میں سرسبز ٹیکریوں کے قریب سے گزر رہے تھے کہ انہیں ایک عورت کے قہقہے کی آوز سنائی دی۔

راجہ بھارتہ نے چونک کر اپنے منتری اور جوتشی شاستری دیوا کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ "شاستری جی! اس ویران جنگل میں یہ عورت کے قہقہے کی آواز کہاں سے آئی ہے؟"

شاستری نے مسکرا کر کہا۔ "مہاراج! عورت کے قہقہے کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا یہ کبھی کبھی دھوکا بھی دے جاتی ہے۔"

راجہ نے کہا۔ "لیکن ہم نے یہ آواز بڑی صاف سنی ہے۔"

شاستری بولا۔ "آواز تو میں نے بھی سنی ہے مہاراج! ہو سکتا ہے کوئی عورت اپنے پتی سے اس حسین موسم میں پیار ومحبت کی باتیں کر رہی ہو۔"

راجہ خوش ہو کر کہنے لگا۔ "شاستری جی! آپ نے کتنی سچی بات کہی ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ اس سنسار میں پیار کرنے والی پتنی سے بڑھ کر کوئی شے نہیں ہے۔"

شاستری کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ "آپ نے ٹھیک فرمایا مہاراج! لیکن عورت کا پیار جھیل میں نظر آنے والے چاند کی طرح ہے۔ یہ چاند جھیل کی آغوش میں رہ کر بھی اس سے الگ ہوتا ہے۔ جھیل کا نہیں ہوتا۔"

راجہ بھارتہ نے کہا۔ "ہمیں تم سے اختلاف ہے شاستری جی! جو پتنی اپنے پتی سے

بے پناہ محبت کرتی ہو وہ اس کی ہوتی ہے۔ وہ کسی دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی۔"

شاستری دیوا خاموش رہا۔ گھوڑے ایک ٹیکری سے باہر نکلے تو کچھ فاصلے پر نشیب میں انہیں برگد کے ایک گنجان درخت تلے ایک سادھو دکھائی دیا جو مرگ چھالا پر بیٹھا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک حسین وجمیل عورت بیٹھی اس سے محبت بھری باتیں کر رہی تھی۔

راجہ بھارتہ یہ منظر دیکھ کر بے حد خوش ہوا اور بولا۔ "شاستری جی! اپنی آنکھوں سے دیکھو۔ یہ عورت شاید اس سادھو جی کی پتنی ہے۔ دیکھو دونوں کتنی محبت سے محو رازونیاز ہیں۔ ایسا پاکیزہ منظر سورگ میں بھی شاید کہیں دیکھنے کو نہیں ملے گا۔"

شاستری دیوا بولا۔ "آپ نے سچ کہا مہاراج! لیکن میرا مشورہ ہے کہ ہمیں چھپ کر ان کی باتیں سننی چاہئے۔"

"نہیں شاستری جی! یہ غیر اخلاقی حرکت ہو گی۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔"

شاستری نے مسکرا کر کہا۔ "مہاراج! شاید آپ پر عورت کی محبت کا بھرم کھل جائے۔ میرے ساتھ چلئے۔ میں علم جوتش کا ماہر ہوں۔ میں ایسی بہت سی باتیں دیکھ لیتا ہوں جسے آپ نہیں دیکھ سکتے۔"

راجہ بھارتہ کچھ لاجواب سا ہو کر شاستری دیوا کے ساتھ چل پڑا۔ انہوں نے اپنے گھوڑے ٹیکری کی اوٹ میں باندھے اور جھاڑیوں کے عقب سے ہوتے ہوئے برگد کے اس درخت کے قریب آ کر چھپ گئے جہاں سادھو اپنی محبوبہ سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ راجہ بھارتہ اور شاستری دیوا' ان کی باتیں سننے لگے۔

حسین وجمیل عورت کے بال کھلے تھے اور وہ جیسے عالم مدہوشی میں سادھو سے کہہ رہی تھی۔

"گورو دیو میں تمہاری داسی ہوں۔ پھر تم مجھ پر بھروسہ کیوں نہیں کرتے؟"

سادھو نے کہا۔ "استری! میں جانتا ہوں کہ تم پتی ورتا ہو۔ میری داسی اور پریم لتا ہو۔ مجھے تمہاری نیت پر شک نہیں۔ پرنتو مجھے دوسروں پر اعتبار نہیں ہے۔ اس لئے جب سفر کرنے لگتا ہوں تو تمہیں اپنی ڈبیا میں بند کر کے گدڑی میں رکھ لیتا ہوں۔"

عورت قہقہہ لگا کر ہنس پڑی اور بولی۔ "گورودیو! ایک روز تمہیں میری وفا کا ضرور یقین آ جائے گا۔ اچھا اب تم سو جاؤ کچھ دیر آرام کرو۔" سادھو مسکرایا اور پھر اس نے اپنا سر ایک گدڑی میں سر رکھ دیا۔ عورت سادھو کے لمبے بالوں کو انگلیوں سے سہلانے لگی۔ تھوڑی دیر میں سادھو گہری نیند میں کھو گیا۔ جب اس کے خراٹوں کی ہلکی ہلکی آواز بلند

ہونے لگی تو عورت نے جھک کر سادھو کے نیند میں ڈوبے چہرے کو ایک نظر دیکھا۔ پھر اوپر درخت کی شاخوں کی طرف نظر اٹھا کر دو بار چٹکی بجائی اچانک درخت کی شاخوں میں ایک جوان آدمی نمودار ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ درخت سے اتر کر عورت کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور وہ دونوں عشق کے رازونیاز میں مشغول ہو گئے اور سادھو اسی طرح پڑا محو خواب تھا۔

راجہ بھارتہ نے نگاہیں دوسری طرف کر لیں۔ شاستری دیوا نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ آہستہ سے سرگوشی کی۔ "مہاراج! ابھی دیکھتے جائیں۔"

تھوڑی دیر بعد مرد' دوبارہ درخت کے اوپر چڑھ کر شاخوں میں چھپ گیا۔ سادھو نے آنکھیں کھول دیں۔ عورت نے بڑی محبت سے کہا۔ "میرے پریمی! کیا نیند پوری ہو گئی؟ کاش میں اسی طرح ساری زندگی تمہاری خدمت کرتی رہوں۔"

سادھو اٹھ بیٹھا۔ اس نے دلنشیں مسکراہٹ کے ساتھ عورت کو دیکھا اور کہا۔ "پریم لتا! اب ہمیں سفر پر روانہ ہونا ہے۔ کیا تم تیار ہو؟"

عورت نے دونوں بازو کھول دیئے اور کہا۔ "میں آپ کی جنم جنم کی داسی ہوں گورودیو! آپ جہاں چاہیں مجھے لے چلیں۔ میں تیار ہوں۔"

راجہ بھارتہ اور شاستری دیوا کے دیکھتے دیکھتے سادھو نے کچھ منتر پڑھ کر عورت پر پھونک ماری اور عورت ایک انگلی بھر کی مورتی میں تبدیل ہو گئی' سادھو نے ننھی سی مورتی کو اٹھا کر اپنی گدڑی میں ڈالا اور مرگ چھالا اٹھائے اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ ان کے جاتے ہی درخت پر چھپا ہوا آدمی بھی نیچے اتر آیا اور کچھ فاصلہ رکھ کر سادھو کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

راجہ بھارتہ گہری سوچ میں ڈوب چکا تھا۔ شاستری دیوا نے کہا۔ "مہاراج! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

راجہ بھارتہ بولا ۔ "شاستری جی! ہم سوچ رہے ہیں۔ کیا عورت اتنا بڑا فریب بھی کر سکتی ہے؟"

شاستری دیوا نے کہا۔ "مہاراج! آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ عورت اگر چاہے تو ہزار پردوں میں رہ کر بھی مرد کو دھوکا دے سکتی ہے۔ یہ سادھو اس عورت کو مورتی بنا کر اپنی گدڑی میں چھپائے پھرتا ہے مگر وہ پھر بھی بڑی کامیابی سے سادھو کے اعتماد کو دھوکا دے رہی ہے۔"

راجہ بھارتہ نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا میں کسی بھی عورت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔"

شاستری اور راجہ جھاڑیوں میں سے نکل کر اپنے گھوڑوں کی طرف جا رہے تھے۔

شاستری دیوا نے کہا۔ "مہاراج! جس عورت کے اپنے دل میں کسی مرد کے ساتھ وفا داری کا جذبہ نہ ہو اور اسے پاتال کے نیچے بھی رکھیں گے تو وہ آپ کو دھوکا دے جائے گی۔"

محل میں واپس آ کر راجہ بھارتہ یعنی عاطون اداس ہو گیا۔ اس نے اسی شام شاستری دیوا کو اپنے حجلہ خاص میں طلب کیا اور کہا کہ وہ جنگل والے واقعے سے ابھی تک پریشان ہے اور اسی سوچ میں گم ہے۔

"شاستری جی! ہمیں اپنی چہیتی مہارانی کامنی کے بارے میں فکر ہے کہ کہیں وہ بھی ہمارے ساتھ بے وفائی تو نہیں کر رہی؟"

شاستری دیوا نے راجہ کو تسلی دی اور کہا۔ "مہاراج! مہارانی جی ستی ساوتری ہیں۔ آپ ان کے بارے میں ایسا مت سوچیں۔"

راجہ بھارتہ نے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے پتا چل گیا تھا کہ اس سادھو کی عورت بد چلن ہو گی؟"

شاستری دیوا' نے بڑے ادب سے کہا۔ "مہاراج! میں علم جوتش کا ماہر ہوں اور علم قیافے کا گیانی ہوں۔ انسان کی صورت دیکھ کر میں اس کا زائچہ سمجھ جاتا ہوں۔ بدچلنی اور بد قماشی اس عورت کے چہرے پر لکھی تھی۔"

"راجہ بھارتہ نے شاستری کی طرف منہ کر کے کہا۔ "شاستری جی! ہماری چہیتی بیوی رانی کامنی کے بارے میں تمہارا علم کیا کہتا ہے؟"

شاستری جی کانپ اٹھے۔ اس نے نہایت ادب سے کہا۔ "مہاراج! آپ ایسا کبھی بھی نہ سوچیں۔ مہارانی کامنی کا چہرہ آکاش کی دیوی کا چہرہ ہے۔ ان کے بارے میں آپ کو کبھی ایسا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیئے۔"

راجہ بھارتہ کا دل اپنی جگہ سے اکھڑ چکا تھا۔ اس نے کہا۔ "شاستری جی! آپ ہمارے بہترین دوست اور لائق ترین منتری اور نجومی ہیں۔ آپ ہماری مہارانی کا زائچہ بنا کر ہمیں بتائیں کہ وہ ہمارے ساتھ وفادار رہے گی یا نہیں؟"

شاستری دیوا الجھن میں پڑ گیا۔ کیونکہ زائچہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ شاستری دیوا ایک روشن ضمیر جوتشی اور دیدوں کا عالم تھا۔ اس نے راجہ کو زائچہ بنانے سے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن راجہ بھارتہ نہ مانا آخر اس نے کہہ دیا۔

"شاستری جی! یہ ہمارا حکم ہے کہ آپ ہماری مہارانی کامنی کا زائچہ بنا کر ہمیں بتائیں کہ وہ ہم سے وفادار ہے کہ نہیں؟"

شاستری دیوا اب مجبور ہو گیا۔ اس نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ "مہاراج! اگر یہ آپ کا حکم ہے تو سیوک آپ کا نمک کھاتا ہے۔ میں ابھی زائچہ بناتا ہوں۔" شاستری دیوا نے وہیں راجہ بھارتہ کے سامنے چوکی پر بیٹھ کر کچھ اشلوکوں کا ورد کیا۔ پھر تقویم کو دیکھ کر آسمان اور برج میں ستاروں کی چال کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد مہارانی کامنی کی تاریخ پیدائش معلوم کی اور اس کا زائچہ بنانا شروع کر دیا۔ پوتھی پر زائچہ بنا کر شاستری دیوا گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ زائچے نے اسے مہارانی کامنی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ شاستری دیوا دل ہی دل میں دنگ رہ گیا تھا۔ جو کچھ زائچہ اسے بتا رہا تھا اس پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ مگر زائچہ سچ بول رہا تھا۔

اس کے باوجود شاستری، راجہ کو کچھ بتانے سے ہچکچا رہا تھا۔ شاستری کی ہچکچاہٹ کو راجہ بھارتہ نے بھی محسوس کر لیا۔ اس نے کہا۔

"شاستری جی! معلوم ہوتا ہے آپ ہمیں کچھ بتاتے ہوئے گھبرا رہے ہیں۔ میں آپ کو دویدوں کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ ہماری مہارانی کے بارے میں زائچہ کیا بتا رہا ہے؟"

شاستری دیوا نے آج تک جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ اب جھوٹ نہیں بولنا چاہتا تھا۔ محض اپنی سچائی کی وجہ سے شاستری دیوا اپنے روحانی شعور کو دیوتاؤں کے مقام تک لے گیا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کا اگلا جنم دیوتاؤں میں ہو گا۔ اس لئے محض راجہ کی خوشنودی کی وجہ سے جھوٹ بول کر وہ اپنی زندگی بھر کی تپسیا اور ریاضت کو زائل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ راجہ کو سچی بات بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ لیکن جب راجہ نے اسے مقدس دویدوں کی قسم دلائی تو شاستری دیوا سچ بتانے پر مجبور ہو گیا۔

اس نے کہا۔ "مہاراج! اگر آپ اپنی مہارانی کے بارے میں وہ سب کچھ جاننا چاہتے ہیں جو اس کا زائچہ مجھے بتا رہا ہے تو آپ کو بڑی جوانمردی اور حوصلے سے کام لینا ہو گا۔"

راجہ بھارتہ کے پاؤں تلے گویا زمین سرک گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اپنی چہیتی اور وفادار ترین رانی کے بارے میں اسے ایسی بات بھی سننی پڑے گی۔ اس نے کہا۔ "شاستری دیوا! تم کہو۔ میں راجہ ہوں، کھتری ہوں میرے حوصلے کو تم نہیں جانتے۔"

شاستری دیوا، نے اپنی نظریں پوتھی پر بنے ہوئے زائچے پر جما دیں اور کہنا شروع کر دیا۔ "مہاراج! مہارانی کامنی آپ کے ساتھ وفادار نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ ہر

ہفتے میں روی وار کی رات کو جب شہر پر سناٹا چھا جاتا ہے تو وہ جنوب کی طرف ایک جنگل میں کسی غیر مرد سے ملنے جاتی ہے جہاں سے وہ سورج نکلنے سے پہلے واپس محل میں آ جاتی ہے۔"

"شاستری!" راجہ بھارتہ گرج کر اٹھ کھڑا ہوا۔ شاستری سہم کر چپ ہو گیا۔ راجہ بھارتہ بے چینی سے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس وقت اس پر ایک ایسے زخمی چیتے کا گمان ہو رہا تھا جس کو سلاخوں میں بند کر دیا گیا ہو۔

راجہ بھارتہ نے دو تین بار تلوار نیام سے آدھی نکالی اور پھر زور سے نیام میں ڈال دی۔ وہ اپنے دل میں اٹھتے ہوئے طوفان کو دباتے ہوئے تخت پر بیٹھ گیا اور ایک گہری سانس بھر کر بولا۔ "شاستری جی! آپ کا زائچہ جھوٹ تو نہیں بول رہا؟ ایک بار پھر غور سے دیکھیں۔ ہماری رانی ہم سے بے پناہ پیار کرتی ہے۔ وہ ہمیں کبھی دھوکا نہیں دے سکتی۔"

شاستری نے زائچے پر ایک بار پھر نگاہ ڈالی اور ہاتھ باندھ کر بولا۔ "مہاراج! میں سنیاسی جوتشی ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ جیون مرن میرے لئے کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ اس لئے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے جو کچھ آپ کو گوش گزار کیا زائچہ وہی کچھ بتا رہا ہے۔"

راجہ بھارتہ ایک لمحے کے لئے سناٹے میں آ گیا۔ پھر اس نے خشک آواز میں پوچھا۔ "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ آدمی کون ہے جس سے ملنے ہماری مہارانی آدھی رات کو جاتی ہے؟"

شاستری نے کچھ دیر زائچے پر غور کیا۔ کچھ مزید حساب لگایا اور پھر بولا۔ "مہاراج! میں دیکھ رہا ہوں کہ شہر کی فصیل کے باہر سمت جنوب کو برگد کا ایک پیڑ ہے۔ اس پیڑ کے نیچے مہارانی کامنی ایک سیاہ جسم والے کسی مرد کے پاس بیٹھی ہے۔"

"بس بس۔ خاموش ہو جائیں۔" راجہ بھارتہ دھاڑتے ہوئے بولا۔ تلوار اس کے نیام سے نکل کر ہاتھ میں آ گئی تھی۔ راجہ کا سارا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس سے بڑھ کر کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی اس کی توہین نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے شاستری کی طرف دیکھا۔

شاستری نے گردن جھکا دی اور کہا۔ "مہاراج! سچ بولنے کے عوض میری گردن حاضر ہے مجھے کوئی دکھ نہیں ہو گا۔ کیونکہ میرا اگلا جنم وشنودوت کا ہو گا۔"

راجہ بھارتہ نے تلوار نیام میں کر لی اور آہستہ سے بولا۔ "شاستری! اس روی وار کو ہم تمہارے ساتھ آدھی رات کو شہر کی فصیل کے باہر جنگل میں جائیں گے اگر ہماری

مہارانی تمہارے حساب کے مطابق وہاں نہ آئی تو تمہاری گردن اڑا دی جائے گی۔"

شاستری دیوا واقعی موت سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس نے کہا۔ "مجھے منظور ہے مہاراج۔ میرا زائچہ میرے آگے ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ لیکن میری ایک عرض ہے۔"

"وہ کیا؟" راجہ نے پوچھا۔

شاستری نے کہا۔ "روی وار کو ابھی چار دن باقی ہیں۔ آپ روی وار سے ایک دن پہلے یہ اعلان کر دیں کہ آپ ایک ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے دور ریاست پانڈیہ کے مہاراج کے ہاں جا رہے ہیں اور آپ سب کے سامنے محل سے رخصت ہوں۔"

راجہ بھارتہ نے کہا۔ "مجھے منظور ہے۔"

چنانچہ طے شدہ منصوبے کے مطابق روی وار سے ایک روز پہلے راجہ بھارتہ نے محل سے ایک ہفتہ غیر حاضر رہنے اور دوسری ریاست کے راجہ کے ہاں جانے کا اعلان کر دیا۔ راجہ نے محافظ دستے کو ساتھ لیا۔ شاہی رتھ میں سوار ہوا۔ ساری مہارانیاں راجہ کو رخصت کرنے صندل اور پھول لے کر آئیں۔ مہارانی کامنی کا تو رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ وہ راجہ کے چرن چھوتی اور کہتی۔ "مہاراج! مجھ سے آپ کے بغیر پہاڑ ایسے دن کیسے کٹیں گے؟ میں آپ کی جدائی برداشت نہ کر سکوں گی۔"

اس کی یہ حالت دیکھ کر راجہ بھارتہ کو یقین ہو گیا کہ شاستری کا زائچہ غلط تھا اور رانی کامنی اس کی وفادار اور نیک دل بیوی ہے۔ مگر اب وہ جس امتحان کا فیصلہ کر چکا تھا اس میں سے گزرنا ضروری تھا۔

راجہ بھارتہ شہر سے روانہ ہو گیا۔ رات کو اس نے شہر سے دور دریا پار ایک جنگل میں قیام کیا۔ منتری شاہی جوتشی شاستری دیوا اس کے ہمراہ تھا۔ راجہ نے اعلان کیا کہ چونکہ اس جنگل کی فضا بڑی خوشگوار ہے اسی لیے دو روز تک وہاں قیام رہے گا۔

دوسرے دن آدھی رات سے پہلے راجہ نے شاستری دیوا کو ساتھ لیا اور گھوڑوں پر سوار ہو کر دونوں دریا کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے دریا پار کیا۔ سامنے شہر کے جنوبی سمت جنگل کی آخری سرحد شروع ہوتی تھی۔

شاستری دیوا' نے ایک بار پھر زائچے کو دیکھ کر اس کے حساب سے جنگل کی سمت تعین کر لیا تھا وہ راجہ بھارتہ کو لے کر جنگل میں اس گنجان درخت کے پاس لے آیا۔ جہاں آدھی رات کو اس کے زائچے کے مطابق رانی کامنی کو ایک سیاہ حبشی سے ملنے آنا تھا۔

راجہ بھارتہ گھوڑے سے اتر کر درخت کے قریب آیا۔ اندھیرا اور سکوت قبرستان کی یاد دلا رہا تھا۔ شاستری نے کہا۔ "مہاراج! ابھی آدھی رات نہیں ہوئی۔ پھر بھی میری

گزارش ہے۔ کہ آپ یہاں سے ہٹ کر کسی دوسری جگہ چھپ جائیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ سیاہ رو حبشی آپ کو دیکھ کر یہاں سے فرار ہو جائے۔"

راجہ کو شاستری دیوا کی یہ بات بے حد ناگوار گزری مگر وہ مجبور تھا۔ ایک بات اس کے دل میں بھی تھی کہ کم از کم اس امتحان سے ضرور گزرنا چاہئے تاکہ رانی کامنی کی پاک دامنی ثابت ہو سکے۔ راجہ بھارتہ کو یقین کامل ہو گیا تھا کہ کامنی اس کی وفادار ہے۔ ستی ساوتری ہے اور وہ کسی غیر مرد سے ملنے وہاں نہیں آتی۔

چنانچہ بھارتہ وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ دونوں چند قدموں کے فاصلے پر اونچی گھاس میں جگہ بنا کر بیٹھ گئے۔ گھوڑے انہوں نے جنگل میں دور ایک جگہ جا کر باندھ دیئے تھے۔

راجہ بھارتہ نے جنگل کے تاریک سناٹے میں شاستری دیوا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"شاستری جی! مجھے افسوس ہے کہ آپ کا زائچہ غلط ہے اور مجھے وچن کے مطابق آپ کی گردن اڑانی ہو گی۔"

شاستری دیوا نے جواب دیا۔ "مہاراج کی زندگی پر میری ہزار جان قربان.... لیکن میرا زائچہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

رات گزرتی چلی گئی۔ شاستری دیوا کے حساب سے جب آدھی رات ہونے میں ایک ثانیہ رہ گیا تو انہیں جنگل میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے گھاس کی دیوار میں سے جھانک کر دیکھا کہ دور جنگل کے درختوں میں ایک گھڑ سوار چلا آ رہا ہے۔

گھڑ سوار اس گنجان درخت کے نیچے پہنچ کر گھوڑے سے اتر پڑا' جس کی نشاندہی شاستری دیوا' نے کی تھی۔ اندھیرے میں گھڑ سوار کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاستری دیوا' نے کہا۔

"مہاراج! یہی وہ سیاہ رو حبشی ہے۔"

راجہ بھارتہ کا دل بیٹھ سا گیا۔ وہ چپ رہا۔ وہ آنکھیں پھاڑے گنجان درخت کی طرف تک رہا تھا۔ سیاہ رو حبشی گھوڑے کو ایک طرف باندھ کر درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے کسی کا انتظار ہے۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری ہو گی کہ اچانک سیاہ رو حبشی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا پھر راجہ بھارتہ نے ایک سیاہ پوش عورت کو درختوں کے اندھیرے سے نکل کر اجنبی مرد کی طرف بڑھتے دیکھا۔ راجہ بھارتہ کو رانی کامنی کے خاص عطر کی خوشبو آ گئی تھی۔ پہلے تو وہ سکتے میں آ گیا پھر اس کا خون کھول اٹھا۔ اس نے تلوار نیام سے کھینچی اور ایک فلک شگاف نعرہ لگاتا ہوا درخت کی طرف دوڑا۔ شاستری دیوا جب لپک کر راجہ بھارتہ کے پاس پہنچا تو راجہ سیاہ رو حبشی کے ساتھ اپنی چہیتی

رانی کامنی کو بھی ہلاک کر چکا تھا۔

شاستری اپنی جگہ بت سا بنا کھڑا تھا۔ خون آلود تلوار راجہ بھارتہ کے ہاتھ میں تھی۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے مہارانی کامنی کا سر بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھا رکھا تھا۔ مہارانی گردن سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا۔ راجہ بھارتہ نے مہارانی کامنی کے سر کو نفرت سے پھینک دیا۔ پھر شاستری کی طرف غم آلود آنکھوں سے دیکھا۔

"شاستری جی! تمہارا علم سچا ہے۔ میرا علم ناقص تھا۔ میری آنکھوں پر جھوٹے پیار کی پٹی بندھی تھی۔ تمہارے سچے علم نے میری آنکھوں پر بندھی ہوئی جھوٹ کی پٹی کو اتار پھینکا ہے۔ میں تمہارا دھنوادی ہوں۔"

یہ کہہ کر راجہ بھارتہ نے اپنی تلوار وہیں دونوں گناہ گار انسانوں کی لاش کے درمیان پھینک دی اور شاستری دیوا سے کہا۔ "میں نے بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔ شاستری جی! اب اس سنسار میں کچھ دیکھنے کو باقی نہیں رہا۔ چلو ہم آخری بار اپنے شاہی محل کو چلتے ہیں۔"

شاہی محل میں آتے ہی راجہ بھارتہ نے اپنی باقی کی تمام رانیوں کو بھی طلاق دے کر آزاد کر دیا۔ تخت پر اپنے بیٹے کو بٹھایا' شاہی لباس اتار کر جوگیوں والے گیروے کپڑے زیب تن کیے' اپنے شاہی بال کاٹ کر پھینک ڈالے اور شاستری دیوا کے ساتھ رتھ میں بیٹھ کر شاہی محل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔

جنگل کے پار دریا کے کنارے پہنچ کر راجہ بھارتہ رتھ سے نیچے اتر آیا۔ اس نے اپنے گلے میں پہنا ہوا آخری ہار بھی اتار کر شاستری کے حوالے کیا اور کہا۔ "شاستری جی! شاہی محل سے میرا ناتا ہمیشہ کے لئے ٹوٹ رہا ہے۔ میں بن باس لے رہا ہوں۔ دنیا کی ناپائیداری اور انسانی تعلقات کی حقیقت مجھ پر کھل گئی ہے۔ آپ شاہی محل کو لوٹ جائیں اور میرے بچے کی حفاظت کریں اور اسے زندگی اور آتما کا سچا علم سکھائیں۔ میں باقی زندگی بن باس میں گزار دوں گا۔ جنگل کے گر پڑے پھل کھاؤں گا۔ ندی کا پانی پیوں گا' مسافروں کی خدمت کروں گا' بھولے بھٹکوں کو ان کی منزل تک پہنچا دوں گا اور پرم آتما کا گیان حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

یہ کہہ کر راجہ بھارتہ دریا کے ساتھ ساتھ روانہ ہو گیا۔

شاستری دیوا' نے آخری بار جھک کر راجہ بھارتہ کو پرنام کیا اور رتھ کو واپس موڑ کر شاہی محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

راجہ بھارتہ اب جوگی بھارتہ بن گیا تھا۔

شام تک وہ دریا کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا۔ شام کے قریب وہ ایک گھاٹ پر پہنچا

جہاں ایک کشتی مسافروں سے بھری دریا پار جانے کو تیار کھڑی تھی۔ جوگی بھارتہ بھی اس کشتی میں بیٹھ گیا۔ جب کشتی دریا کے وسط میں پہنچی تو ملاح نے لوگوں سے کرایہ وصول کرنا شروع کر دیا۔ ہر کوئی ملاح کو دریا پار کرنے کا ایک سکہ تانبے کا کرائے کے عوض دیتا۔ جب راجہ بھارتہ اور اب جوگی بھارتہ کی باری آئی تو بڑی مونچھوں والے تنومند ملاح نے راجہ بھارتہ سے کرایہ طلب کیا۔ بھارتہ نے ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے کہا۔

"مہاراج! ہمارے پاس کرایہ ادا کرنے کو کچھ نہیں ہے۔"

ملاح کی مونچھیں غصے سے پھڑکنے لگیں۔ اس نے ڈانٹ کر کہا۔ "ابے جوگی ہو گا اپنے گھر..... نکال کرایہ..... نہیں تو ابھی دریا میں دھکا دیتا ہوں۔"

راجہ بھارتہ نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ "مہاراج! میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے' تمہاری مہربانی ہو گی' مجھے دریا پار کرا دو۔"

ملاح کو تو سخت طیش آ گیا۔ اس نے راجہ بھارتہ کو پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ دوسرے مسافر خاموش رہے کیونکہ ملاح ہٹا کٹا تھا۔ اور اس کی شہرت بھی اچھی نہیں تھی۔ راجہ بھارتہ خاموشی سے مار کھاتا رہا اور دل میں اپنے بھگوان کو یاد کر کے یہی بار بار دہرانے لگا۔

"اے بھگوان تو مجھے معاف کر دے' تو اسے بھی معاف کر دے۔ یہ میرا دشمن نہیں ہے۔ میرا کوئی دشمن نہیں' کوئی دوست نہیں' تو اسے معاف کر دے۔"

ملاح' راجہ بھارتہ کو مارتے ہوئے گالیاں بھی دے رہا تھا اور بار بار اس سے کرایہ مانگ رہا تھا کہ اچانک دریا کی لہروں میں طوفان آ گیا۔ کشتی ڈگمگانے لگی پھر دریا میں سے ایک اژدہا باہر نکل آیا۔ اس کے سات منہ تھے۔ ہر منہ سے سرخ زبان پھنکار رہی تھی..... یہ ایک بہت بڑا اژدہا تھا۔ مسافروں کی چیخیں نکل گئیں۔ اژدہے نے ملاح کو اپنے منہ میں اچک لیا۔ ملاح کے تو ہوش گم ہو گئے۔ لگا ہاتھ جوڑ کر رحم کی بھیک مانگنے....!

اژدہا ملاح کو نگلنے ہی والا تھا کہ راجہ بھارتہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میں نے اسے معاف کیا۔ تم بھی اسے معاف کر دو' یہ تمہارا دشمن نہیں' میرا دشمن ہے۔"

اژدہے نے ملاح کو کشتی میں واپس رکھ دیا پھر راجہ بھارتہ کو بڑی نرمی سے منہ میں پکڑ کر اپنے سر کے اوپر بٹھایا اور دریا کے دوسرے کنارے کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔

دریا کا طوفان رک گیا۔ مسافر "جے گنگا میا" کے نعرے لگانے لگے۔ ملاح تو کشتی میں سجدے میں گر گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اژدہا کشتی والوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اژدہا شام کے پھیلتے ہوئے اندھیرے میں راجہ بھارتہ کو دریا کے دوسرے کنارے پر

لے آیا۔ یہاں ایک اونچے ٹیلے میں ایک کھوہ بنا ہوا تھا۔ اژدہے نے اسے کھوہ کی زمین پر رکھ دیا پھر راجہ بھارتہ کے کانوں کو عجز کے عوض میں ایک ایسی طاقت ملی کہ جس کی مدد سے وہ جانوروں سے لے کر انسانوں تک ہر مخلوق کی زبان سمجھ اور بول سکتا تھا' اس نے سنا ' اژدہا کہہ رہا تھا۔

"مہاراج ! میں آپ کو جانتا ہوں کہ آپ کون ہیں۔ میں سانپوں کا دیوتا پدم ناگ ہوں مجھے آکاش سے حکم ملا کہ آپ کی مدد کو پہنچوں۔ مجھے حکم دیجئے۔ میں اپ کی مزید کیا مدد کر سکتا ہوں اگر آپ چاہیں تو میں زمین کی تہوں میں چھپے ہوئے سارے خزانے نکال کر آپ کی خدمت میں ارپن کر دوں۔"

راجہ بھارتہ نے مسکرا کر کہا۔ "میرے دوست پدم ناگ ! یہ سب کچھ میرے پاس تھا۔ میں انہیں اپنے شاہی محل میں چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ مجھے سوائے تنہائی کے کچھ نہیں چاہیے۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے میری مدد کی۔ پرنتو میں اس مدد کا طلب گار نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی تمہارا دھنواد ہوں۔"

پدم ناگ بولا۔ "مہاراج ! آپ سچے تیاگی ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ کو نروان حاصل ہو لیکن میں آپ کا دوست ہوں اور جنم جنم کے سفر میں آپ کا دوست رہوں گا۔"

راجہ بھارتہ نے کہا۔ "پدم ناگ ! مجھے دوسرا جنم نہیں ہو گا۔ میں نے سنسار کی ترشنا اور آلائشوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے آپ سے نوچ کر پھینک دیا ہے۔ جب مجھے سنسار کی پیاس باقی نہیں رہی تو پھر مجھے سنسار میں پیدا ہونے کی ضرورت کیوں پڑے گی؟"

پدم ناگ نے جواب دیا۔ "مہاراج ! آپ نے سنسار کی ترشنا کو سنسار کی پیاس کو چھوڑا ہے مگر اس ترشنا نے آپ کو نہیں چھوڑا۔ جب تک آپ کو کوئی وفادار اور آپ پر جان نچھاور کر دینے والی پتنی نہیں ملتی' آپ کا بار بار جنم ہو گا۔ پرنتو میں آپ کے ساتھ رہوں گا اور وقت آنے پر آپ کی مدد کروں گا۔"

راجہ بھارتہ اپنے خیال میں گم ہو گیا۔ پدم ناگ نے ٹھیک .... کہا تھا۔ راجہ بھارتہ کے دل میں ابھی تک یہ حسرت یہ خلش باقی تھی کہ کاش اس کی زندگی میں کوئی ایسی عورت بھی آئے' جو ستی ساوتری ہو اور جس کی پاک دامنی اور اس کے ساتھ اس کی وفا کی ' دیوتا بھی قسم کھا سکیں۔

پدم ناگ' راجہ بھارتہ کی تعظیم بجا لا کر واپس چلا گیا۔

راجہ بھارتہ نے باہر سے سوکھی گھاس لا کر کھوہ کے اندر زمین پر بچھائی اور قدیم زمانے کے جوگیوں کی طرح آلتی پالتی مار کر مراقبے میں بیٹھ گیا۔

راجہ بھارتہ مراقبے میں گم تھا۔ اس نے اپنے لاشعور.... اور تحت الشعور میں سے غیر ضروری اشکال اور چلتی پھرتی تصاویر کو الگ کر دیا اور خود اپنی روحانی شخصیت پر غور کرنے لگا۔ یہی اس کے خیال میں بھی اور قدیم مقدس کتابوں کی رو سے بھی ایک انسان کا اس دنیا میں فرض منصبی تھا کہ وہ اپنے روحانی تشخص کی حقیقت معلوم کرے لیکن اس کا خیال بار بار اپنی بے وفا مگر چہیتی پتنی رانی کامنی کی طرف چلا جاتا تھا۔ یہ خیال اس کے مراقبے میں حائل ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے تحت الشعور میں یہ حسرت ' یہ ترشنا باقی ہے کہ کاش وہ کسی باوفا عورت سے مل کر ایک جنم گزارے۔ شاید اس کے بعد اس کی مکتی ہو جائے۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کھوہ سے باہر نکل کر آسمان کو دیکھا۔ رات ہو چکی تھی۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا اور چمکیلے ستاروں کی مدہم روشنی نے جنگل کے راستوں ' سر سبز ٹیکریوں اور درختوں پر مدہم دھند کی ایک غیر مرئی سی چادر پھیلا رکھی تھی۔

راجہ بھارتہ نے ستاروں کی طرف دیکھ کر خدائے واحد کے حضور دعا کی کہ وہ اپنی رحمت بے پایاں سے سکون قلب عطا فرمائے۔ راجہ بھارتہ کی آنکھوں میں شدت جذبات سے آنسو آ گئے۔ یہ آنسو خدائے واحد کی محبت میں نکلے تھے۔ راجہ بھارتہ نے دعا مانگ کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور کھوہ میں واپس آ کر گھاس پر آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گیا۔

ایک بات کا عاطون ہونے کی حیثیت سے اسے شدید احساس تھا کہ اب اس میں موت کے خلاف جنگ کرنے کی شکتی نہیں رہی تھی' اس سے پہلے اس پر ایک خاص مدت کے لئے موت حرام کر دی گئی تھی مگر اس جنم میں وہ وقت کے ساتھ ساتھ بوڑھا بھی ہو سکتا تھا اور اس کی موت بھی آ سکتی تھی' اسے زخم بھی لگ سکتا تھا اور یہ زخم اس کی ہلاکت کا باعث بھی ہو سکتا تھا۔

لیکن عاطون عرف راجہ بھارتہ کو اپنی اس کمزوری کا افسوس نہیں تھا کیونکہ وہ ایک نیک اور سچے راستے پر چل رہا تھا۔ موت اور زندگی کی حقیقت کی تلاش میں اس کے دل سے موت کا خوف دور ہو گیا تھا۔ وہ سوکھی گھاس پر لیٹا کھوہ کے اندھیرے میں اپنی بیوی کی بے وفائی پر غور کر رہا تھا کہ اسے باہر گھوڑوں کے ہنہنانے اور پھر ان کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ راجہ بھارتہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گھوڑے اسی کھوہ کی طرف آ رہے تھے۔

یہ چار خونخوار ڈاکو تھے' جو دور دراز علاقے سے شہر کی طرف اس لیے آ رہے تھے کہ وہاں سے کوئی صحت مند جوان اغوا کر کے اسے اگنی دیوی کے حضور قربانی کے لئے پیش

کریں کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق ایسا کرنے سے انہیں ڈاکے سے بے پناہ مال ودولت حاصل ہوتی اور ان کی زندگیاں بھی محفوظ رہ سکتی تھیں۔

یہ چاروں ڈاکو دوپہر سے سفر کر رہے تھے۔ رات ہوئی تو وہ ٹیکری کے پاس ایک چشمہ دیکھ کر گھوڑوں سے اتر پڑے۔ گھوڑوں کو انہوں نے چرنے کے لئے چھوڑ دیا اور خود کھوہ کی طرف بڑھے۔ اس وقت راجہ بھارتہ کھوہ میں بیدار بیٹھا تھا۔ ایک ڈاکو نے مشعل روشن کر کے ایک درخت سے لگا دی اور کھوہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

"کیوں نہ ہم رات اس کھوہ میں بسر کریں۔ صبح ہونے پر شہر میں سوداگر بن کر داخل ہوں گے اور اپنی مرضی کے صحت مند جوان کو اغوا کر کے واپس چل دیں گے۔"

دوسرے ڈاکو نے کہا۔ "خیال برا نہیں ہے۔"

تیسرا ڈاکو کھوہ میں داخل ہو گیا۔ مشعل کی روشنی میں اس نے گھاس پر راجہ بھارتہ کو آلتی پالتی مارے بیٹھا دیکھا تو چلا کر بولا۔ "اندر شکار موجود ہے۔"

سارے ڈاکو کھوہ میں آ گئے۔ مشعل کی روشنی میں انہوں نے راجہ بھارتہ کو دیکھا تو بڑے خوش ہوئے۔ ایک ڈاکو نے کہا۔ "تم کون ہے؟؟"

راجہ بھارتہ نے کہا۔ "میں ایک سنیاسی ہوں۔ جوگی ہوں۔ یہاں بیٹھا بھگوان کو یاد کر رہا ہوں۔"

ڈاکو قہقہے لگا کر ہنس پڑے۔ "کندو! یہ نوجوان کیسا رہے گا؟؟"

دوسرا ڈاکو بولا۔ "سرداز کندو! یہ گاؤ دی اگنی دیوی کے بلیدان کے لئے بڑا ٹھیک رہے گا۔ اگنی دیوی اس کے بلیدان سے بڑی خوش ہو گی۔"

راجہ بھارتہ سمجھ گیا کہ یہ ڈاکو اسے اگنی دیوی کے آگے قربان کرنے والے ہیں۔ لیکن چونکہ اس پر موت اور زندگی کی حقیقت واضح ہو چکی تھی۔ اسے یہ گیان حاصل ہو گیا تھا کہ جو زندہ ہے' وہ کبھی نہیں مر سکتا اور جو مرتا ہے وہ پھر جنم لیتا ہے' اس لیے راجہ بھارتہ نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ "بھائیو! دیوی' دیوتاؤں کے آگے بلیدان دینے سے کچھ نہیں ہوتا اگر تمہارے اعمال اچھے ہیں تو تم کو سورگ ملے گا اگر کرم برے ہیں تو تمہیں دیوی' دیوتا بھی نرگ میں جانے سے نہیں بچا سکتے۔"

ڈاکو زور سے ہنس پڑے۔ کندو بولا۔ "ارے یہ تو بڑا گیانی دھیانی ہے۔ اگنی دیوی تو اس کے بلیدان سے خوش ہو کر ہمیں اپنا رودھان دے گی۔ چلو اسے بھی لے چلو' ایسا اچھا شکار ہمیں شہر میں بھی نہیں مل سکتا تھا۔"

ڈاکوؤں نے راجہ بھارتہ کو باندھ کر گھوڑے پر ڈالا۔ دوسرے ڈاکو بھی گھوڑوں پر

سوار ہوئے اور جنگل کے اندھیرے میں واپس روانہ ہو گئے۔

ساری رات یہ ڈاکو راجہ بھارتہ کو لیے تاریک' ویران راستوں پر سفر کرتے رہے۔ پو پھٹی تو وہ اونچی اونچی چٹانوں والے ایک سنگلاخ علاقے میں جا نکلے۔ یہاں ایک چٹان کے اوپر اگنی دیوی کا مندر تھا۔ ڈاکوؤں نے راجہ بھارتہ کو مندر کے باہر لا کر بٹھا دیا۔ انہوں نے راجہ بھارتہ کو غسل دیا۔ اس کو جنگلی پھل کھلائے اور گلے میں پھولوں کی مالا ڈالی۔ راجہ بھارتہ خاموش تھا۔ اس نے ڈاکوؤں کی کسی حرکت پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ ذرا سی بھی مدافعت نہ کی۔ وہ مرنے کے لئے بالکل تیار تھا۔ ایک ڈاکو بولا۔ "کندو! یہ تو نرابیل ہے۔ دیکھو بلیدان کے لئے کس شوق سے تیار ہو رہا ہے۔"

کندو اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "ارے! یہ تو اگنی دیوی کا من پسند شکار ہے۔ اب ہم پر اگنی کی مہربانیاں ہوں گی۔ ہم کو بہت زیادہ مال ودولت ملے گا۔ چلو! اسے اندر لے جا کر قربان کر دیں۔"

چاروں ڈاکو راجہ بھارتہ کو لے کر مندر کی کوٹھری میں آ گئے۔ ایک ڈاکو مشعل لے کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ دو ڈاکوؤں نے راجہ بھارتہ کو اگنی دیوی کی مورتی کے سامنے بنے ہوئے استھان پر لٹا دیا۔ کندو ڈاکو نے تلوار نکال لی اور اگنی دیوی کے حضور بلیدان کے اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔

راجہ بھارتہ نے اپنے ذہن میں اگلے جنم کا دھیان کیا۔ اسے لگا کہ اس کے سامنے ایک حسین وجمیل باغ کا دروازہ کھلا ہے۔ اس باغ میں پھولوں بھرے تختے کی مخملیں گھاس پر ایک نازک بدن حسینہ وچتروینا پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہے اور راجہ بھارتہ کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

لیکن اگنی دیوی جانتی تھی کہ راجہ بھارتہ کے ساتھ ڈاکو ظلم کر رہے ہیں۔ راجہ بھارتہ ایشور بھگت ہے اور یہ بدکردار لوگ اسے دھوکے سے اغوا کر کے لے آئے ہیں۔ اگنی دیوی جلال میں آ گئی۔ کندو ڈاکو تلوار لیے راجہ بھارتہ کو ہلاک کرنے کے لئے بالکل تیار تھا کہ اگنی دیوی نے مایا کو حکم دیا کہ وہ ان قاتل ڈاکوؤں کو ٹھکانے لگائے اور راجہ بھارتہ کی جان بچائے۔

راجہ بھارتہ کی آنکھوں کے سامنے جس باغ کا دریچہ کھلا تھا' وہ ایک دم بند ہو گیا۔ بھارتہ نے اگنی دیوی کی مورتی کی طرف دیکھا۔ مورتی سے مایا نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔ یہ وہی حسین عورت تھی۔ جو پدم ناگ کے ساتھ عاطون کے اہرام کے محرابی دروازے پر نمودار ہوئی تھی اور جس نے مجھے کہا تھا کہ میں مایا ہوں۔ میں غیبی عورت ہوں۔ میں کسی

کو دکھائی نہیں دیتی۔ میں نے صرف تمہارے لیے اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے اور میں عاطون کی ساتھی ہوں اور تم سے کسی جنم میں ضرور ملاقات کروں گی۔

راجہ بھارتہ اس خوبصورت آنکھوں والی عورت کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے مایا کو پہچان لیا کہ یہ اس کی رہنما دیوی ہے اور اس کو ڈاکوؤں سے بچانے آئی ہے۔ مگر ڈاکوؤں میں سے کسی نے مایا کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے اپنے فانی آنکھوں سے دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ مایا کے ایک ہاتھ میں چکر اور دوسرے ہاتھ میں ترشول تھا۔

کندو ڈاکو نے راجہ بھارتہ کی گردن کاٹنے کے لئے جونہی تلوار اوپر اٹھائی' مایا نے اپنا نوکیلا ترشول اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ کندو ڈاکو ایک بھیانک چیخ مار کر نیچے گر پڑا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر باقی ڈاکو باہر کو دوڑے مگر مایا جیسے ہوا میں اڑتی ہوئی ان کے سروں پر پہنچ گئی اور ایک ایک کر کے باقی تین ڈاکوؤں کو بھی کیفر کردار تک پہنچا دیا۔

مایا' راجہ بھارتہ کے پاس آ کر بولی۔ "میں نے اگنی ماتا کے حکم سے تمہاری جان بچائی ہے۔ اگنی دیوی نے تمہیں حکم دیا ہے کہ جوگ سنیاس کو چھوڑ کر سنسار دھاری بن کر انسانوں کی خدمت کرو' یہی تمہارا پرائشچت ہے کیونکہ تم نے اپنی پتنی کا خون کیا ہے۔"

راجہ بھارتہ نے کہا۔ "مایا میری پتنی بدکار تھی۔ اس نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔"

مایا نے کہا۔ "وہ اپنا عذاب خود جھیلے گی۔ پرنتو تم اس وقت اندریوں کے چنگل میں پھنس چکے تھے۔ تم نے انتقام لیا' جو ایک جٹا دھاری جوگی کے لئے پاپ ہے۔ اگنی ماتا نے تمہیں' تمہارا پرائشچت بتا دیا' اسی میں تمہاری مکتی ہے۔ یہاں سے دور تین دریاؤں کے پار ایک ریاست جودھنا ہے' وہاں جاؤ۔ وہاں مظلوم لوگوں کو تمہاری خدمت کی ضرورت ہے۔ میں اور پدم ناگ تمہاری مدد کریں گے۔"

یہ کہہ کر مایا' راجہ بھارتہ کی آنکھوں کے سامنے سے بھی غائب ہو گئی۔ راجہ بھارتہ نے اگنی دیوی کی مورتی کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ مورتی دیوار میں لگی خاموش تھی۔ راجہ بھارتہ استھان سے نیچے اتر کر مندر سے باہر نکل آیا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا سنہری دھوپ نے جنگل' بیابانوں کے راستے روشن کر دیے تھے۔ اور شاخوں میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔

راجہ بھارتہ نے قدیم جوگیوں کی طرح سورج کو ہاتھ باندھ کر پرنام کیا اور دل میں خدائے واحد کے بھجن گاتا چٹان کی پتھریلی سیڑھیوں سے اتر کر جنگل میں جنوب کی طرف روانہ ہو گیا۔

دوپہر کو وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچا۔ جو ایک دریا کنارے آباد تھا۔ یہاں

لوگوں نے جل پانی سے راجہ بھارتہ کی خدمت کی۔ راجہ بھارتہ نے لوگوں سے وسطی ہند کی ریاست جودھنا کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ آگے دور دریا پار کرنے ہوں گے اس کے بعد ایک جنگل آئے گا۔ جنگل کے پار کھیت شروع ہو جائیں گے۔ اور پھر ریاست جودھنا کے شہر کی فصیل دکھائی دے گی۔ گاؤں کے ایک بزرگ نے راجہ بھارتہ سے کہا۔

"مہاراج ! آپ اس ریاست میں نہ جائیں وہاں کا راجہ بڑا ظالم ہے۔ وہ سادھو سنتوں کا بھی دشمن ہے اور صرف بلیوں کی پوجا کرتا ہے۔"

راجہ بھارتہ سمجھ گیا کہ مایا نے ٹھیک کہا تھا۔ وہاں کے مظلوم لوگوں کو میری ضرورت ہے۔ اس نے کہا۔ "مجھے جودھنا جانے کا حکم ملا ہے۔ تم لوگوں نے جل پان سے جو میری خدمت کی ہے' بھگوان آپ کو اس کا اجر دے گا۔"

راجہ بھارتہ نے دوپہر کے بعد دریا پار کیا اور جنگلی جھاڑیوں میں بنی ہوئی ویران پگڈنڈی پر چل پڑا۔ یونہی سفر کرتے ہوئے راجہ بھارتہ نے باقی کے دونوں دریا بھی پار کر لیے۔ اب اس کے سامنے ایک گھنا جنگل تھا۔ شام ہو رہی تھی کہ وہ جنگل میں داخل ہو گیا۔ آدھی رات تک وہ جنگل میں سفر کرتا رہا۔ جب تھک گیا تو ایک جگہ سوکھے پتوں پر آرام کرنے لیٹ گیا۔ سفر کا تھکا ماندہ تھا۔ اسے نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو درختوں میں صبح کی سنہری روشنی پھیلی ہوئی تھی اور پرندے میٹھی بولیاں بول رہے تھے۔

راجہ بھارتہ نے ایک جنگلی چشمے کے پانی سے غسل کیا۔ کچھ گرے پڑے پھل کھا کر اپنی بھوک مٹائی اور آگے چل پڑا۔ جنگل ختم ہو گیا۔ اب سامنے کھیت پھیلے تھے' جس کی دوسری جانب شہر جودھنا کی فصیل نظر آ رہی تھی۔ اسی شہر میں جانے کا راجہ بھارتہ کو حکم ملا تھا۔ دیوار شہر کے قریب پہنچ کر راجہ بھارتہ نے دیکھا کہ فصیل پر جگہ جگہ کالی بلیوں کی مورتیاں لگی تھیں۔ اسے گاؤں کے بوڑھے کی بات یاد آ گئی کہ اس شہر کا راجہ بلیوں کا پجاری ہے اور سادھو سنتوں کا جانی دشمن ہے۔

راجہ بھارتہ شہر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کا لباس جوگیوں اور سادھوؤں جیسا نہ تھا۔ دروازے کی ڈیوڑھی میں کھڑے راجہ کے سپاہیوں نے اسے روک کر پوچھا۔

"کیا تم جوگی ہو؟"

راجہ بھارتہ نے جواب دیا۔ "میں ایشور بھگت ہوں۔ ایک بھگوان کو ماننے والا ہوں۔"

سپاہی نے کڑک کر کہا۔ "اسے گرفتار کر لو۔ یہ ہماری موکش دیوی کا دشمن ہے۔"

موکش دیوی اس شہر کی سب سے بڑی بلی کی مورتی کا نام تھا' جس کا مندر شہر کے

وسط میں تھا اور جہاں جودھنا کا راجہ شترو خود پوجا کرنے آیا تھا۔ بھارتہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ بھارتہ نے کوئی تعرض نہ کیا۔ اسے راجہ کے قلعے کی ایک کال کوٹھری میں ڈال دیا گیا۔ دوسرے دن اسے شہر کے موکش مندر کے بڑے پروہت کے سامنے پیش کیا گیا۔ بھارتہ نے یہاں بھی سچ بولنے سے گریز نہ کیا اور کہا کہ وہ ایک بھگوان کا پجاری ہے اور بلی کی پوجا نہیں کرتا۔ پروہت غصے سے کانپنے لگا۔

اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "اس ناستک کو ناگوں کے کنویں میں پھینک دو تاکہ وہ اس کے گوشت کو نوچ نوچ کر کھائیں۔"

سپاہی راجہ بھارتہ کو پکڑ کر قلعے پچھواڑے ایک ویران کنویں میں لے آئے۔ اس کنویں میں قسم قسم کے زہریلے سانپ بھرے ہوئے تھے۔ کنویں کے اندر سے سانپوں کی پھنکاروں کی وحشت ناک آوازیں آ رہی تھیں۔ ان زہریلے ناگوں کو ظالم راجہ شترو نے انسانی گوشت پر پالا تھا ہفتے میں ایک بار اس کنویں میں کسی بد نصیب قیدی کو گرا دیا جاتا اور سانپ دیکھتے دیکھتے اس کے جسم سے چمٹ جاتے پہلے وہ اسے ڈستے، جس سے بدنصیب قیدی فوراً" ہلاک ہو جاتا۔ اس کے بعد آدم خور سانپ اس جسم کا سارا گوشت نوچ کر کھا جاتے اور ہڈیوں کا پنجر باقی رہ جاتا۔ راجہ بھارتہ نے کنویں کی منڈیر پر کھڑے کھڑے نیچے دیکھا۔ اسے ان گنت سانپ پھنکارتے رینگتے اپنے شکار کو بے تابی سے دیکھتے نظر آئے۔ بھارتہ نے من ہی من میں اپنے دوسرے جنم کا دھیان کیا اور پرم ایشور سے اپنی مکتی کی پراتھنا کرنے لگا اور سپاہیوں نے پیچھے سے اسے دھکا دے دیا۔

راجہ بھارتہ کنویں میں انسانی ہڈیوں کے پنجروں کے اوپر گرا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ وہ موت کو گلے لگانے کے لئے بالکل تیار تھا۔ اسے اپنے چاروں طرف سانپوں کی بھیانک پھنکاروں کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا.... پھر جیسے پھنکاروں کا شور مدھم ہو گیا۔ پدم ناگ کے چمتکار سے راجہ بھارتہ پر تمام حشرات الارض کی زبان آسان ہو گئی تھی۔ اس نے ایک سانپ کو کہتے سنا۔ "اس کے جسم سے پدم ناگ کی بو آ رہی ہے۔"

راجہ بھارتہ نے آنکھیں کھول دیں۔ کنویں میں نیم اندھیرا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سارے کے سارے سانپ ایک طرف کنڈلی مار کر بیٹھے اسے سرخ سرخ آنکھوں سے تک رہے ہیں۔ بھارتہ کو خیال آیا کہ پدم ناگ کے دو تین بار قریب آنے کی وجہ سے شاید اس کے جسم میں اس کی خاص مہک رچ گئی ہے چونکہ پدم ناگ، ناگوں کا دیوتا ہے، اس لئے سانپ اسے ڈسنے سے گریز کر رہے ہیں۔

بھارتہ نے سانپوں کی زبان میں کہا۔ "میرے بھائیو! میرا نام بھارتہ ہے۔ پدم ناگ

میرا دوست ہے۔"

ایک انسان کے منہ سے اپنی زبان کے سسکار نما الفاظ سن کر سارے کے سارے سانپ سکتے میں آ گئے۔ ان کی گردنیں تعظیم سے جھک گئیں۔ ان میں سے ایک سانپ، جس کے سر پر کلغی تھی، رینگتا ہوا بھارتہ کے نزدیک آیا اور بولا۔ "مہاراج! آپ کے جسم سے ہمیں، ہمارے ناگ دیوتا کی مہک آ گئی تھی۔ اب آپ نے بتایا ہے کہ پدم ناگ آپ کے دوست ہیں۔ ہم آپ کی ڈنڈوت بجا لاتے ہیں۔ آپ کا خون ہم پر حرام ہے۔"

بھارتہ نے کہا۔ "کیا یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہے۔ میں یہاں سے نکل کر خلق خدا کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

کلغی دھر سانپ نے کہا۔ "مہاراج! یہاں سے باہر نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم سارے سانپ کنویں کی دیوار سے چمٹ کر ایک کمند بنا دیں اور آپ ہماری کمند کو پکڑ کر کنویں سے باہر چلے جائیں۔"

بھارتہ نے کہا۔ "مگر باہر ابھی دن کی روشنی باقی ہے۔ وہاں پروہت کے سپاہی مجھے پھر پکڑ کر کنویں میں پھینک دیں گے، اس لیے مجھے اندھیرا ہونے تک اسی کنویں میں رہنا پڑے گا۔"

سانپوں نے بھارتہ کی خدمت شروع کر دی۔ وہ اپنے اپنے بلوں میں گھس کر باہر گئے اور جب واپس آئے تو کسی نے منہ میں پھول پکڑ رکھا تھا، کسی کے منہ میں قیمتی موتی اور کسی کے منہ میں یاقوت جگمگا رہا تھا۔ راجہ بھارتہ نے ان کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔ "میرے بھائیو! کسی جنم میں، میں بھی تمہاری طرح کا ایک سانپ تھا۔ تم بھی آواگون کے چکر کو پورا کر رہے ہو اور اپنے ارتقا کی طرف سفر کر رہے ہو۔ مجھے صرف پھول دے دو۔ ہیرے موتی میرے کسی کام کے نہیں ہیں۔"

سانپوں نے راجہ بھارتہ کے اردگرد جنگلی پھولوں کا ڈھیر لگا دیا۔ جب اندھیرا ہو گیا اور سورج شہر کی فصیل کے پیچھے چھپ گیا تو کلغی دھر سانپ نے کہا۔ "مہاراج! ہم ایک دوسرے کی دمیں پکڑ کر کنویں کی منڈیر تک ایک کمند کی صورت میں لٹکنے لگے ہیں۔ باہر اندھیرا ہو گیا ہے۔"

چنانچہ سانپ ایک دوسرے کی دموں کو پکڑ کر کنویں کی دیوار کے ساتھ ایک لمبی رسی کی طرح لٹک گئے۔ یہ ایک مضبوط کمند بن گئی۔ بھارتہ نے سانپوں کی کمند کو پکڑا اور آہستہ آہستہ کنویں کی دیوار سے پاؤں ٹکا ٹکا کنویں کی منڈیر کے باہر آ گیا۔

باہر اندھیرے میں کوئی سپاہی نہیں تھا۔ سارا میدان سنسان پڑا تھا۔ راجہ بھارتہ نے

سانپوں کا شکریہ ادا کیا اور قلعے کی پرانی ٹوٹی ہوئی دیوار سے گزر کر شہر کے تاریک گلی کوچوں میں آ گیا۔ کہیں کہیں گلی کی نکڑ پر مشعلوں کی روشنی ہو رہی تھی۔ وہ راجہ بھارتہ ان روشنیوں سے دور دور رہ کر چل رہا تھا۔ وہ کسی ویران مکان میں رات بسر کر کے دن کے وقت شہر کی آبادی میں گھل مل جانا چاہتا تھا۔

وہ ایک اندھیرے بازار میں سے گزر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ "ٹھہر جاؤ۔ کون ہو تم؟"

راجہ بھارتہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک سپاہی جو رات کی گشت پر تھا۔ اس کی طرف نیزہ تانے بڑھ رہا تھا۔ جانے راجہ بھارتہ کے دل میں کیا آئی کہ وہ دوڑ پڑا۔ اس نے آج تک ایسی حرکت نہیں کی تھی اور ہمیشہ اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے ہی کیا تھا مگر اسے محسوس ہوا کہ اس کی یہ حرکت غیر ارادی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شاید تقدیر کا ہاتھ ہی اسے آگے کی طرف دھکیل رہا تھا۔

سپاہی' راجہ بھارتہ کے پیچھے دوڑا۔ بھارتہ ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ یہاں ایک دیوار بائیں جانب تھی۔ راجہ بھارتہ دیوار کود کر دوسری طرف جا گرا۔ سپاہی کے بھاگنے کی آواز گلی میں آ رہی تھی۔ بھارتہ اٹھ کر دوڑا۔ سامنے پتھر کا زینہ دوسرے مکان کی چھت پر جاتا تھا۔ اندھیرے میں وہ زینہ چڑھ گیا۔ اس نے سپاہی کے قدموں کی آواز گلی میں دور جاتی سنی۔ سپاہی دھوکا کھا کر گلی میں آگے نکل گیا تھا۔ شاید وہ واپس بھی آئے۔ یہ سوچ کر راجہ بھارتہ زینہ چڑھ کر دوسرے مکان کی چھت پر آ گیا۔

اس چھت پر اندھیرا تھا۔ راجہ بھارتہ کو اب محسوس ہوا کہ اس نے ایک نامحرم کے مکان پر آ کر پاپ کیا ہے۔ وہ چھت پر سے اترنے کے لیے سیڑھی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اسے کسی عورت کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ اس آواز میں ایک فتنہ انگیز جادو سا تھا۔ راجہ بھارتہ کے قدم اپنے آپ رک گئے۔

اس نے چھت کے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ ایک جگہ دیوار میں ایک کھڑکی تھی جس میں سے شمع کی دھیمی دھیمی روشنی نکل رہی تھی۔ عورت کی ہنسی کی آواز اسی کھڑکی کے پیچھے سے آئی تھی۔ راجہ بھارتہ دبے پاؤں چھت پر چلتا کھڑکی کے پاس آ گیا۔ اسے ایک دم پسینہ آ گیا۔ یہ اس نے ایک غیر شائستہ حرکت کی تھی۔ اسے واپس پلٹ جانا چاہیے۔

وہ واپس مڑنے لگا تو اسی عورت کی ہنسی کی آواز پھر آئی۔ اب عورت کی آواز بھی بلند ہوئی تھی۔ آواز خواب آلود تھی۔ "تم راکشس ہو..... پورے راکشس....."

راجہ بھارتہ نے نہ جانے کس طاقت کے زیر اثر اپنی آنکھیں کھڑکی' کی درز کے

ساتھ لگا دیں۔ کمرے میں دھیمی شمع روشن تھی۔ جھاڑ فانوس لگے تھے۔ دیواروں پر ریشمی پردے کھنچے ہوئے تھے۔ فرش پر ریشمی قالین بچھے تھے جس پر ایک مرد اور عورت بیٹھے محبت کے راز و نیاز میں محو تھے۔ راجہ بھارتہ نے فوراً" اپنا چہرہ پیچھے ہٹا لیا۔ اس نے مقدس اشلوکوں کا ورد کرنا چاہا مگر اشلوک اسے یاد نہیں آ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں کسی طاقتور جذبے کے زیر اثر ایک بار پھر کھڑکی' کی درز سے لگ گئیں۔ راجہ بھارتہ اس وقت تک کھڑکی' کی درز میں دیکھتا رہا' جب تک مرد نے شمع دان کی شمع کو پھونک مار کر بجھا نہ دیا۔

راجہ بھارتہ ستاروں بھری رات میں کوٹھے کی چھت پر تنہا تھا۔ اس نے آسمان پر چمکتے ستاروں کی طرف دیکھ کر ہاتھ باندھ لیے اور توبہ کرنے لگا۔۔۔

وہ چھت سے اترا اور پتھر کی سیڑھیوں میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دل کسی ان جانے مگر انتہائی طاقت ور جذبے سے دھڑکنے لگا تھا۔ یہ عورت کون ہے؟ اس نے ایسی حسین اور قیامت خیز عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی مہارانیوں میں بھی ایسی دل آویز عورت نہیں تھی۔

آسمان پر سپیدہ صبح نمودار ہونے لگا۔ راجہ بھارتہ زینے سے اترا۔ اس نے دیوار پھاندی اور گلی میں آ کر ایک طرف چلنے لگا۔ غیر ارادی طور پر وہ اس مکان کی ڈیوڑھی کے پاس آ کر رک گیا' جس کی دوسری منزل والے خواب آلود فضا سے بھرپور کمرے میں پریم کی گھٹائیں برس رہی تھیں۔ ڈیوڑھی کا دروازہ بند تھا اور باہر شمع دان میں جلتی شمع صبح کی بڑھتی پھیلتی روشنی میں جھلملانے لگی تھی۔

راجہ بھارتہ نے مکان کو یاد کر لیا اور گلی سے نکل کر بازار میں آ گیا۔ اس نے اس گلی کے باہر اگے ہوئے تلسی کے پیڑ والے چبوترے کو بھی نشانی کے طور پر ذہن میں بٹھا لیا۔ اس عورت کے حسن کا جادو راجہ بھارتہ کی ریاضت اور تپسیا کو بھنگ کر چکا تھا۔

صبح کی اولین روشنی میں لوگ گھروں سے نکل کر کھیتوں اور ندی نالوں پر اشنان کرنے جا رہے تھے۔ شہر کے وسط میں جو موکش بلی کا مندر تھا' اس طرف سے مسلسل گھنٹیاں بجنے کی آواز آنے لگی تھی۔ راجہ بھارتہ کا ذہن تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے خیالات اور جذبات پر وہ عورت سوار ہو چکی تھی۔ سب سے پہلے وہ اپنے قابل گرفت جوگیانہ لباس سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے اپنا لمبا گیروا چولا اتار کر دھوتی کو لنگوٹ کی طرح باندھ لیا تھا کہ اس پر سادھو ہونے کا گمان نہ ہو۔ اپنے جسم سے جنیؤ بھی اس نے اتار کر ایک درخت پر پھینک دیا تھا۔ ایک ندی شہر کے درمیان سے گزرتی تھی۔ راجہ بھارتہ نے وہاں جا کر اشنان کیا اور

کنارے پر واقع ایک کمہار کے مکان میں جا کر اس سے کرتا اور دھوتی طلب کی۔ کمہار نے کہا۔ "تم کو کپڑوں کے بدلے میرے برتنوں کے لیے صبح سے شام تک مٹی گوندھنی ہو گی۔"

راجہ بھارتہ نے کہا مجھے منظور ہے۔ بھارتہ ایک تنو مند آدمی تھا۔ وہ مٹی گوندھنے لگا۔ دوپہر کو کمہار نے اسے باجرے کی روٹی اور مچھلی کھانے کو دی۔ شام تک راجہ بھارتہ اس کے لیے کام پر جٹا رہا۔ جب سورج غروب ہو گیا تو کمہار نے کہا۔ "تم نے اپنے کپڑوں کی قیمت ادا کر دی ہے۔"

کمہار نے کرتہ پگڑی اور سفید دھوتی پہننے کو دے دی۔ راجہ بھارتہ نے غسل کرنے کے بعد نئے کپڑے زیب تن کیے اور کمہار سے باتوں ہی باتوں میں تلسی کے چبوترے والی گلی کے بارے میں پوچھا کہ وہاں کون لوگ رہتے ہیں کیونکہ راجہ بھارتہ کو شک تھا کہ وہ عورت کوئی گھریلو قسم کی عورت نہیں تھی۔ کمہار نے کہا۔ "اس گلی میں رقاصائیں رہتی ہیں مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو تم غریب آدمی ہو' تلسی گلی کا رخ نہ کرنا۔ وہاں تو دولت مند لٹ جاتے ہیں۔"

راجہ بھارتہ کا اندازہ درست نکلا۔ اب وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اس عورت کے پاس جانے کے لئے وہ دولت کہاں سے لائے؟ اس نے آخر یہی فیصلہ کیا کہ پہلے اس عورت سے ملاقات کرنی چاہئے اگر وہ سچ مچ رقاصہ ہے تو اس سے ملا جا سکتا ہے۔

بھارتہ تلسی گلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ گلیوں' بازاروں میں چراغ جل اٹھے تھے۔ امیر لوگ پالکیوں میں سوار اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ عورتیں ندی سے پانی کے گھڑے بھر کر انہیں سروں پر اٹھائے چلی جا رہی تھیں۔ تلسی گلی کی نکڑ پر بھی شمع دان میں چراغ روشن ہو گیا تھا۔ راجہ بھارتہ گلی میں داخل ہو گیا۔ مکان کو وہ پہلے دیکھ چکا تھا۔ اس وقت ڈیوڑھی میں دربان پہرہ دے رہا تھا۔ دو پالکیاں ڈیوڑھی میں رکھی تھیں۔ امیر تماش بین ملاقات کرنے آئے ہوئے تھے۔ اوپر والے کمرے سے گھنگروؤں کی جھنکار کے ساتھ دھرپد گانے کی دھیمی دھیمی آواز بھی آ رہی تھی۔

راجہ بھارتہ نے دربان کو نمسکار کیا اور پوچھا کہ اس مکان میں کونسی رقاصہ رہتی ہے؟

دربان نے راجہ بھارتہ پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور کرخت آواز میں پوچھا۔ "تم پوچھنے والے کون ہو؟ چلو اپنا راستہ لو۔"

راجہ بھارتہ نے کہا۔ "میں بڑی دور سے آیا ہوں اور رقاصہ کے لئے ایک خاص

پیغام لایا ہوں۔"

دربان ایک لمحے کے لئے سوچنے لگا پھر بولا۔ "ابھی کملا دیوی کا ایک سوداگر دوست آیا ہوا ہے۔ تم تھوڑی دیر بعد آ جانا۔" راجہ بھارتہ وہاں سے واپس آ گیا۔ وہ دیر تک شہر کے بازاروں میں پھرتا رہا۔ جب رات کافی گزر گئی تو وہ ایک بار پھر رقاصہ کملا کے مکان پر آ گیا۔ دربان نے کہا۔ "تم جو پیغام لائے ہو' مجھے بتا دو۔ میں کسی داسی کے ہاتھ کملا جی تک پہنچائے دیتا ہوں۔"

راجہ بھارتہ بولا۔ "یہ پیغام ایسا ہے کہ کسی دوسرے کو نہیں بتا سکتا۔ مجھے خود ہی کملا جی کے پاس جانا ہو گا۔" اس وقت رقاصہ کملا کا امیر سوداگر کا دوست واپس جا چکا تھا۔ دربان نے اوپر پیغام بھجوا دیا کہ ایک ہرکارہ کوئی خاص پیغام لایا ہے۔ رقاصہ کملا اس وقت اپنے حجلہ عیش ونشاط میں بیٹھی سنگار کر رہی تھی۔ دو کنیزیں اس کے گیسوؤں کو پھر سے سجا رہی تھیں' جو رقص کے دوران بکھر گئے تھے۔ خادمہ نے آ کر پیغام دیا تو رقاصہ کملا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "دربان سے کہو پیغام لے لے۔"

خادمہ بولی۔ "دیوی جی! ہرکارہ کہتا ہے کہ پیغام خفیہ ہے۔ وہ صرف آپ ہی کو دیا جا سکتا ہے۔"

کملا نے بھویں سکیڑ کر خادمہ کو دیکھا پھر ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ "بلاؤ اسے۔"

تھوڑی دیر میں راجہ بھارتہ حجلہ عیش میں کھڑا تھا۔ فضا مشک وعنبر کی مہک سے بسی ہوئی تھی۔ یہ وہ کمرا نہیں تھا جہاں رات کو راجہ بھارتہ نے کملا رقاصہ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ شاید وہ ساتھ والا کمرا تھا۔ رقاصہ کملا نے راجہ بھارتہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا۔ "کہاں سے آئے ہو تم؟"

راجہ بھارتہ نے داسیوں کی طرف اشارہ کیا کہ انہیں رخصت کیا جائے۔ رقاصہ کملا نے داسیوں کو جانے کے لئے کہا۔ جب کمرے میں راجہ بھارتہ اور رقاصہ اکیلے رہ گئے تو رقاصہ بڑی ادا سے اٹھی اور ناز سے چلتی اپنی مسند پر آ کر بیٹھ گئی۔ پھولوں کے گجرے اس کی کلائیوں میں سج رہے تھے۔ "اب بتاؤ تم میرے لیے کس کا پیغام لائے ہو؟"

راجہ بھارتہ اس کے قریب جا کر قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ رقاصہ تعجب خیز نگاہوں سے اسے تکنے لگی۔ راجہ بھارتہ نے اسے پہچان لیا تھا۔ یہی وہ قتالہ روز گار تھی جس کی ترچھی نظروں اور خواب آلود آواز نے راجہ بھارتہ کی ریاضت بھنگ کر دی تھی۔ اگرچہ راجہ بھارتہ کی تپسیا ختم ہو چکی تھی لیکن اس کے چہرے پر شاہانہ وجاہت ویسی ہی تھی۔ رقاصہ کملا اس کے مردانہ حسن سے کچھ متاثر ضرور ہوئی تھی۔ اتنا وہ سمجھ گئی تھی کہ

یہ کوئی معمولی غریب آدمی نہیں ہے۔

"تم خاموش کیوں ہو؟" رقاصہ نے کہا۔ "جو پیغام لائے ہو' وہ بتاتے کیوں نہیں؟"

راجہ بھارتہ نے رقاصہ کے سراپا پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا۔ "اے آکاش کی اپسرا..... میں دور دراز شہر سے تمہارے حسن اور رقص کی تعریف سن کر یہاں آیا ہوں۔"

کملا رقاصہ کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ سمجھ گئی کہ یہ بھی کوئی اس کے حسن گرہ گیر کا شکار ہے مگر راجہ بھارتہ کے غریبانہ لباس نے اسے متاثر کیا تھا۔ اس نے بے نیازی سے کہا۔ "تو تم گویا میرے حسن کے خریدار بن کر آئے ہو۔"

راجہ بھارتہ نے کہا۔ "ایسا ہی سمجھ لو۔"

کملا اپنے گجرے میں سے ایک سفید پھول توڑ کر اسے مسلتی ہوئی بولی۔ "مگر میرے حسن کی قیمت ادا کرنے کے لئے تمہارے پاس کتنی دولت ہے؟"

راجہ بھارتہ نے کہا۔ "میرے پاس سوائے تمہاری محبت کے اور کچھ نہیں۔"

رقاصہ کملا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے تالی بجائی۔ دو حبشی غلام لپک کر کمرے میں آ گئے۔ ان کی کمر سے تلواریں لٹک رہی تھیں۔ کملا نے راجہ بھارتہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اس چور اچکے کو اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دو۔"

دونوں حبشی آگے بڑھے۔ انہوں نے راجہ بھارتہ کو اٹھایا اور مکان کی ڈیوڑھی کے آگے گلی میں پھینک دیا۔ راجہ بھارتہ گلی کے کچے فرش پر گر پڑا۔ وہ کچھ دیر ویسے ہی پڑا رہا اور راہ گیر اس کا مذاق اڑانے لگے۔ وہ اس پر آوازے کسے جا رہے تھے۔ ایک آدمی نے کسی پھل کا چھلکا بھی راجہ بھارتہ کو مارا۔

راجہ بھارتہ کو شدید ملامت کا احساس ہوا۔ لیکن اس ملامت..... نے اس کی آتش عشق کو مزید بھڑکا دیا۔ وہ کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور گلی میں سے نکل کر قلعے کی طرف چل پڑا۔ قلعے کے پچھواڑے گہرا سناٹا چھایا تھا۔ یہاں وہی منحوس کنواں تھا' جس میں سانپ پھنکارتے رہتے تھے اور ڈر کے مارے ادھر کوئی نہیں جاتا تھا۔ راجہ بھارتہ کنویں کی منڈیر پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے سانپ کی آواز میں کہا۔ "میں پدم ناگ کا دوست راجہ بھارتہ ہوں۔ میں ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔"

چند لمحوں کے بعد کلغی دھر سانپ رینگتا ہوا کنویں سے باہر آ گیا۔ اس نے راجہ بھارتہ کو پہچان لیا اور پوچھا کہ وہ کس کام سے آیا ہے۔

راجہ بھارتہ نے کہا۔ "مجھے دولت چاہئے۔ اتنی دولت کہ میں اس شہر میں ایک شاندار حویلی خرید کر عیش و آرام سے زندگی بسر کر سکوں۔"

کلغی دھر سانپ نے کہا۔ "پدم ناگ دیوتا کے دوست کے ہم داس ہیں۔ آپ کچھ دیر ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں۔"

راجہ بھارتہ کنویں کی منڈیر پر بیٹھا رہا۔ کلغی دھر سانپ چلا گیا۔ رات کافی گہری ہو گئی تھی۔ گہرا سکوت ماحول پر طاری تھا۔ تاریکی نے سارے ماحول کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ چند لمحوں کے بعد کلغی دھر سانپ دوبارہ نمودار ہوا۔ اس کے منہ میں ایک پوٹلی تھی۔ پوٹلی اس نے راجہ بھارتہ کے قدموں میں ڈال دی اور کہا۔ "مہاراج! اس میں اتنے قیمتی ہیرے موتی ہیں کہ آپ اس کی مدد سے ایک چھوڑ' کئی حویلیاں خرید سکتے ہیں.... اگر آپ کو مزید دولت کی ضرورت پڑے تو یہاں آ جائیے گا۔ ہم آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں گے۔"

راجہ بھارتہ نے پوٹلی کو کھول کر دیکھا۔ ہیرے موتیوں کی چمک سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ راجہ تھا' ہیرے جواہرات کی قدر پہچانتا تھا۔ اس نے اتنے انمول اور قیمتی ہیرے اور موتی پہلے نہیں دیکھے تھے۔ پوٹلی بند کر کے راجہ بھارتہ نے کرتے کے اندر چھپائی اور کلغی دھر سانپ کا شکریہ ادا کر کے شہر کی طرف چلا۔ رات اس نے قلعے کے ویران میدان کے ایک کھنڈر میں گزاری۔

جب دن کافی نکل آیا تو راجہ بھارتہ سیدھا شہر کے صرافہ بازار میں آ گیا۔ یہاں جوہریوں کی کتنی ہی دکانیں تھیں۔ راجہ بھارتہ نے چند موتی یہاں فروخت کیے۔ اسے کافی بڑی رقم مل گئی۔ اس نے سب سے پہلے اپنے لیے نیا لباس خرید کر پہنا پھر ایک پالکی پر سوار ہو کر شہر کی سب سے بڑی اور مہنگی سرائے میں آ کر قیام کیا۔ یہاں رہ کر راجہ بھارتہ نے باقی جواہرات بھی فروخت کر دیے۔ اسے اتنی زیادہ دولت ملی کہ اس نے شہر کے کنارے پر واقع ایک شاندار دو منزلہ حویلی خریدی' جس کے ارد گرد ایک کشادہ باغ تھا' جس میں فوارے لگے تھے۔ حویلی کو راجہ بھارتہ نے قیمتی قالینوں اور سازوسامان سے سجا دیا۔ دو جواہرات سے مرصع پالکیاں اور بارہ غلام اور کنیزیں نوکر رکھ لیں۔ حویلی کے دروازے پر باوردی دربان پہرہ دینے لگا۔

کلغی دھر سانپ کی مدد سے راجہ بھارتہ نے مزید جواہرات حاصل کیے اور اپنا خزانہ سونے کے سکوں سے بھر لیا۔ وہ پالکی میں سوار ہو کر جدھر جاتا لوگ تعظیم سے جھک کر نمسکار کرتے۔ منگل وار کو اس کی حویلی میں خیرات بانٹی جاتی۔ جلد ہی شہر میں اس کی شہرت ہو گئی اور امراء اپنی دعوتوں میں اسے بلانے لگے۔ شہر کے تمام امیر خاندانوں سے اس کے تعلقات استوار ہو گئے تھے۔

ایک روز رات کو راجہ بھارتہ نے قیمتی لباس پہنا۔ گلے میں انمول موتیوں کے ہار ڈالے۔ سر پر کلغی والی پگڑی رکھی ۔ زرتار لباس کو عطریات میں بسایا اور پالکی میں سوار ہو کر رقاصہ کملا کے مکان کی طرف چل پڑا۔ دربان نے ایک زرنگار پالکی کو ڈیوڑھی کے آگے اترتے دیکھا تو مودب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ڈیوڑھی کے اندر سے دو غلام لپک کر آگے بڑھے اور پالکی کا زریں پردہ اٹھا کر قالین کا ٹکڑا فرش پر خیر مقدم کے لیے بچھا دیا۔ راجہ بھارتہ بڑی شان بے نیازی سے گلاب کا پھول انگلیوں میں تھامے پالکی سے نکلا۔ ایک طائرانہ نگاہ حویلی کی شہ نشین پر ڈالی اور غلاموں سے کہا۔ "کملا بائی سے کہو کہ شہر کا سب سے بڑا رئیس اس کا گانا سننے آیا ہے۔"

رقاصہ کملا کو غلاموں نے جا کر بتایا کہ شہر کا رئیس اعظم آیا ہے جس کے گلے اور کلائیوں میں انمول موتیوں کے ہار ہیں۔ کملا نے اپنے بالوں میں پھولوں کا جوڑا سجایا اور راجہ بھارتہ کے استقبال کو کمراء خاص سے باہر آ گئی۔ راجہ بھارتہ کو غلام پہلے ہی وہاں تک لے آئے تھے۔ کملا نے راجہ بھارتہ کو پہلی نظر میں نہ پہچانا۔ وہ تو کسی ریاست کا راجہ لگ رہا تھا۔ چہرے پر شاہانہ وقار اور وجاہت تھی۔ قیمتی جواہرات پوشاک پر جگمگا رہے تھے۔

رقاصہ کملا نے رواج کے مطابق ادب سے نمسکار کیا۔ راجہ بھارتہ نے سونے کے سکوں سے بھری ہوئی تھیلیاں غلاموں کو انعام میں عطا کیں اور رقاصہ کے نازک حنا آلود نیم گرم ہاتھ کو تھام لیا۔ "کملا دیوی ! ہم نے آپ کے رقص و نغمے کی اتنی شہرت سن رکھی ہے کہ آج ہمارے قدم بے اختیار تمہارے مکان کی طرف اٹھ آئے۔"

کملا نے تیکھی نظروں کے تیر برساتے ہوئے پیشہ ورانہ انداز دل ربائی سے کہا۔
"مہاراج ! آپ کا میرے غریب خانے پر آنا میرے لیے مبارک ہے' تشریف لائیے۔"

راجہ بھارتہ کو زرنگار تخت پر بٹھایا گیا۔ مشروب کا دور چلنے لگا۔ مردنگم کی تھاپ گونجی اور کملا کا لوچ دار جسم رقص کے دائروں میں تبدیل ہو گیا۔ گھنگروؤں کی جھنکار اور کملا کی مترنم آواز نے ماحول میں جادو جگا دیا۔ راجہ بھارتہ بے تاب نگاہوں سے کملا کے سراپا کو تکے جا رہا تھا۔ رقص و سرور کے بعد کھانا لگا دیا گیا۔ راجہ بھارتہ رقص کے دوران بے شمار انمول موتی جواہرات اور سونے کے سکے کملا پر نچھاور کرتا رہا۔

کملا بائی نے ایسا مخیر اور دل پھینک عاشق آج تک نہیں دیکھا تھا کہ جس کا ہاتھ دولت لٹاتے ہوئے رکتا ہی نہیں تھا۔ اس نے بھی اپنے ترکش کے سارے تیر نکال کر آزمانے شروع کر دیے۔ راجہ بھارتہ یہی چاہتا تھا۔ دستر خوان پر انواع واقسام کے کھانے چن دیے گئے۔ رقاصہ کملا' راجہ بھارتہ کے پہلو میں بیٹھی بار بار چشم نیم باز سے اسے تک

رہی تھی۔

دعوت ختم ہوئی تو راجہ بھارتہ حجلۂ عیش وطرب میں آیا تو اس نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں ایک رات اس نے کملا رقاصہ کو دیکھا تھا۔ شمع دان میں شمع کی دھیمی لو روشن تھی۔ مسہری پر پھولوں کے ہار سج رہے تھے۔ کمرے کی فضا نیم خواب اور مشرقی عطریات کی مہک سے معطر تھی۔

رقاصہ کملا' راجہ بھارتہ کے پاس بیٹھی اسے مشروب دینے لگی تو کہا۔ "مہاراج آپ نے ابھی تک اپنا شبھ نام نہیں بتایا۔"

راجہ بھارتہ نے جواہرات کی پگڑی اتر کر تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "کملا بائی ! تم نے ابھی تک مجھے نہیں پہچانا شاید؟"

کملا کو یہ شکل کچھ مانوس سی لگی تھی۔ اب اس نے غور سے راجہ بھارتہ کو دیکھا اور اپنے رنگین ہونٹوں پر حنا آلود انگلی رکھ کر کہنے لگی۔ "مہاراج ! کچھ کچھ یاد آ رہا ہے کہ آپ کو کہیں پہلے بھی دیکھا ہے۔"

راجہ بھارتہ نے مسکرا کر کہا۔ "کملا بائی ! میرا نام بھارتہ ہے۔ میں وہی غریب عاشق ہوں' جس کو تم نے اپنی حویلی سے دھکے دے کر نکال دیا تھا۔"

اب کملا کی آنکھوں کے سامنے پوری تصویر آ گئی۔ فتنہ پرور عورت تھی۔ فوراً راجہ بھارتہ کے قدموں میں سر رکھ دیا اور بولی۔ "مہاراج ! مجھے معاف کر دیں۔ مجھ سے بھول ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ راجہ غریبوں کا بھیس بدل کر بھی پھرا کرتے ہیں۔"

راجہ بھارتہ نے مسکراتے ہوئے کملا کا سیاہ خوشبو دار بالوں والا حسین چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور اس کی گہری جھیل جیسی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "کملا ! میں تیرے حسن کا شیدائی تھا اور اب بھی ہوں۔ اس وقت میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ اب میں راجہ کے بعد اس شہر کا سب سے امیر آدمی ہوں۔ بول کیا تو مجھ سے شادی کرے گی؟"

کملا رقاصہ کچی گولیاں نہیں کھیلتی تھی۔ اس کی نائیکہ نے بچپن میں ہی سارے گر سکھا دیے تھے۔ جس کنویں کے باہر بیٹھ کر وہ اس کا سارا پانی پی سکتی تھی' اس میں چھلانگ لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ عشوہ طرازی کے تمام حربوں کو اپنی چشم سرگیں میں سمیٹتے ہوئے بولی۔ "مہاراج ! بیاہ تو وہ کرتے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا ہونے کا خطرہ ہو۔ میں تو آپ کی جنم جنم کی داسی ہوں۔ آپ کا بیاہ تو مجھ سے پچھلے جنم میں ہو چکا ہے۔ پھر دوبارہ بیاہ کی ضرورت کس لیے؟"

راجہ بھارتہ کی آتما میں سرور کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ جس ستی ساوتری عورت کی اسے تلاش تھی وہ یہی کملا ہے۔ اسے اگلے جنم میں اپنے نروان حاصل کرنے کا احساس ہونے لگا۔ دیوتاؤں کی لیلا نیازی تھی۔ اس نے سوچا بھگوان نے ایک نرتکی کی صورت میں اسے سنسار کی ایک ایسی وفا شعار عورت سے ملایا تھا جو پچھلے جنم میں اس کی بیوی تھی۔ راجہ بھارتہ کی عقل پر نرتکی کملا کے بلاخیز حسن کا پردہ پڑ چکا تھا۔ اس نے بے اختیار ہو کر کملا رقاصہ کے ہاتھوں کو چوم کر اپنی آنکھوں سے لگا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”کملا میرے جنم جنم کی ساتھی کملا! اب مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ تم میرا نروان ہو، تم میری مکتی ہو۔“

کملا کا چلایا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ راجہ بھارتہ کے شب و روز اب زیادہ تر کملا نرتکی کی حویلی میں ہی گزرنے لگے۔ کملا نے بھی دونوں ہاتھوں سے راجہ کی دولت سمیٹنی شروع کر دی۔ راجہ بھارتہ کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی، اس کا خزانہ خالی ہونے لگتا تو وہ آدھی رات کو محل کے عقبی کنویں پر جا کر کلغی دھر سانپ کو ملتا۔ سانپ اسے زمین کی تہوں میں چھپے ہوئے خزانے میں سے مزید جواہرات اور موتی لا کر دے دیتا۔ ایک رات کلغی دھر سانپ نے راجہ بھارتہ کو شہر کے پاس ہی ایک کھنڈر میں دبے ہوئے خفیہ خزانے کا پتا بتایا اور کہا۔ ”مہاراج! آپ اس خزانے کو نکال کر لے جائیں۔ اس خزانے میں اتنی دولت ہے کہ آپ سے ایک سال میں بھی ختم نہ ہو گی۔“

لیکن راجہ بھارتہ کو کیا پروا تھی۔ وہ کلغی دھر سانپ کی وساطت سے نیا خزانہ حاصل کر سکتا تھا۔ چنانچہ ایک رات وہ سانپوں والے کنویں کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر اندھیرے میں اسے کنویں کی جگہ مٹی کا ڈھیر دکھائی دیا۔ راجہ بھارتہ بڑا حیران ہوا کہ کنواں کہاں غائب ہو گیا۔ اس نے سانپوں کی زبان میں کلغی دھر سانپ کو بار بار پکارا مگر وہ نہ آیا۔ راجہ بھارتہ سخت ناامیدی کے عالم میں واپس آ گیا۔

دوسرے روز اس نے پتا کروایا تو اسے معلوم ہوا کہ راجہ کے حکم سے کنویں کو پر کر دیا گیا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ کسی طرح ایک زہریلا سانپ کنویں سے نکل کر رینگتا ہوا شاہی محل میں پہنچ گیا اور اس نے ایک کنیز کو ڈس کر ہلاک کر دیا۔ راجہ نے اسی وقت کھولتے تیل کے بڑے بڑے کڑاؤ کنویں میں انڈیل دیے گئے۔ سارے کے سارے سانپ ہلاک ہو گئے۔ سانپوں کو اتنا موقع بھی نہ مل سکا کہ وہ اپنے بلوں کی طرف جا سکتے۔ اس کے بعد راجہ نے کنویں کو ملبے سے بھروا کر اوپر ڈھیری لگوا دی۔

راجہ بھارتہ کے پاس دولت کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ زمینوں سے جو تھوڑی بہت آمدنی

ہوتی تھی، اس طرف راجہ بھارتہ نے کبھی توجہ نہیں دی تھی اور پھر یہ قلیل آمدنی کملا نرتکی کے بھاری اخراجات پورے کرنے کے لئے ناکافی بھی تھی۔ بھارتہ نے اپنی شان میں کمی نہ آنے دی اور زمینوں اور جائدادوں کو فروخت کر کے کملا پر نچھاور کرنا شروع کر دیا۔ ہوتے ہوئے راجہ بھارتہ کی اپنی ذاتی حویلی تک بھی بک گئی۔

کملا بھانپ گئی کہ دولت کا کنواں خشک ہو رہا ہے۔ اس نے راجہ بھارتہ سے اپنی توجہ ہٹانی شروع کر دی۔ اب اس کا منظور نظر شہر کا ایک دوسرا رئیس تھا۔ راجہ بھارتہ کے غلام اور نوکر چاکر بھی اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ حویلی سے اٹھ کر راجہ بھارتہ ایک سرائے میں آ گیا۔ اس کے تمام قیمتی ہار اور جواہرات ختم ہو گئے تھے۔

ایک روز کملا کی محبت نے جوش مارا اور راجہ بھارتہ اس کی محفل رقص و سرور میں گھس آیا۔ کملا ناچ رہی تھی۔ اس کا نیا شکار شہر کا دوسرا رئیس اعظم مسند پر بیٹھا رقص سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ راجہ بھارتہ کو معمولی کپڑوں میں دیکھ کر اس کی بھویں چڑھ گئیں۔ اس نے کملا کی طرف نگاہیں گھما کر پوچھا۔ ”یہ اجنبی کون ہے، اسے بلا اجازت یہاں آنے کی ہمت کیسے ہوئی؟“

کملا نے راجہ بھارتہ کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھا اور کہا ”مہاراج! شاید کوئی دیوانہ بھکاری ہے۔“

..... پھر کملا نے تالی بجا کر غلاموں کو طلب کیا اور حکم دیا کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے۔ راجہ بھارتہ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جس عورت پر اس نے بے پناہ دولت لٹا دی اور جس کی وفا شعاری کی وہ قسمیں کھا سکتا تھا آج وہ ایک بار پھر اسے اپنی حویلی سے باہر پھنکوا رہی ہے۔

اس نے ایک غلام کی کمر میں لگی تلوار کھینچ لی۔ دوسرے غلاموں نے بھی تلواریں نیام سے باہر کر لیں اور راجہ بھارتہ پر پل پڑے، لڑائی شروع ہو گئی۔ کملا چیخ مار کر دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔

کملا کا نیا شکار رئیس اعظم بھی وہاں سے فرار ہو گیا۔ راجہ بھارتہ آخر ایک راجہ رہ چکا تھا اور فنون حرب سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے چاروں غنڈوں کو کاٹ کر پھینک دیا پھر خون آلود تلوار ہاتھ میں لیے دوسرے کمرے میں گھس گیا۔

کملا جواہرات سے بھرے ہوئے صندوق کے پاس سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ راجہ بھارتہ کے ہاتھ میں تلوار اور آنکھوں میں خون اترا ہوا دیکھ کر اس کی جان نکل گئی۔ پھر گڑگڑا کر بولی۔ ”مہاراج! مجھے نہ ماریں، میں آپ کی داسی ہوں۔ مجھ سے بیاہ کر لیں۔ میں ساری

زندگی آپ کے پاس رہ کر خدمت کریں گے۔"

راجہ بھارتہ نے تلوار قالین پر پھینک دی اور کہا۔ "تم اپنی جان سے اپنی دولت سے پیار کرتی ہو۔ تم وہ عورت نہیں ہو' جس کی مجھے تلاش ہے۔ میں تمہیں معاف کرتا ہوں' کملا۔ تم نے میرے مردہ ضمیر کو بیدار کر دیا ہے۔" یہ کہہ کر راجہ بھارتہ کمرے سے نکل کر حویلی سے باہر آ گیا۔

اس کی آنکھوں میں ندامت و سرشاری کے آنسو تھے۔ اس نے ستاروں بھرے آسمان کی طرف آنسوؤں سے بھرا چہرہ اٹھا کر کہا۔ "ہے ایشور! مجھے شما کر دینا۔ میں نے سنسار کے دلدل میں پھنس کر تجھے بھلا دیا تھا۔ مجھے شما کر دینا۔"

راجہ بھارتہ اندھیری رات میں شہر کے گلی کوچوں سے گزرتا ہوا شہر سے باہر آ گیا۔ اس کے سامنے کھیتوں کا سلسلہ دور جنگل تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ بھارتہ کا دل ندامت کے آنسو بہا رہا تھا۔ گناہ اور پچھتاوے کا زہر اس کے جسم کی رگوں میں آنسو بن کر نکلنے لگا تھا۔ اس کے پاؤں کھیتوں میں پڑی شبنم میں شرابور ہو رہے تھے۔ کھیتوں میں چلتا وہ جنگل کے کنارے پر رک گیا۔ اس نے گھوم کر پیچھے شہر کی فصیل پر جلتی مشعلوں کو دیکھا۔

راجہ بھارتہ کو یوں محسوس ہوا جیسے شہر کی فصیل پر جگہ جگہ اس کی اپنی لاش جل رہی ہے۔ وہ گھنے اندھیرے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اس کا دل ابھی تک بوجھل تھا۔ وہ جیسے خود فراموشی کے عالم میں چلا جا رہا تھا۔ جنگلی جھاڑیاں اس کے لمبے کرتے کو کھینچ رہی تھیں۔ درختوں کی لٹکتی ہوئی شاخیں اس کے کاندھوں سے ٹکرا کر گزر رہی تھیں۔

درختوں میں سے نکل کر راجہ بھارتہ ایک تالاب کے پاس آیا تو اسے غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ رک گیا پھر ایک بھاری بھرکم شیر دہاڑتا ہوا تالاب کی جھاڑیوں سے نکل کر راجہ بھارتہ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سخت طیش کے عالم میں تھا۔ اس کی دم بے قراری سے دائیں بائیں ہل رہی تھی اور آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ راجہ بھارتہ کو دیکھ کر غرا رہا تھا۔ راجہ بھارتہ پر شیر کی دہشت نے کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنی دونوں بانہیں پھیلا دیں اور کہا۔ "میرے بھائی! اگر تم بھوکے ہو تو مجھے کھا کر اپنی بھوک مٹا ڈالو۔ میں پاپی ہوں۔ میں نے مہاپاپ کیا ہے' میں جوگ سادھنا کے مارگ سے بھٹک کر نرگ میں گر گیا تھا' مجھے کھا لو۔ میں تمہارے سامنے حاضر ہوں۔"

مگر یوں لگا جیسے شیر نے بھی راجہ بھارتہ کو قبول نہیں کیا تھا۔ وہ راجہ بھارتہ کی طرف دیکھ کر تھوڑی دیر غراتا اور دم ہلاتا رہا۔ پھر واپس پلٹا' چھلانگ لگائی اور تالاب کی جھاڑیوں کے قریب سے ہو کر جنگل کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

راجہ بھارتہ نے بازو چھوڑ کر سر جھکا لیا اور بانس کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کا دل اپنے ٹھکانے پر نہیں تھا۔ شیر کی خوراک بن کر وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ پرائشچت کرنا چاہتا تھا۔ مگر بھگوان نے اس کے کفارے کو بھی قبول نہیں کیا تھا۔ راجہ بھارتہ کو بھگوان نے بھی بھلا دیا تھا۔

اس نے اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا لیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ جب اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو اس نے اپنے ساتھی پدم ناگ کو آواز دی۔ پدم ناگ کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ راجہ بھارتہ نے مایا کو آواز دی' اسے بار بار پکارا۔ "مایا تو نے وعدہ کیا تھا کہ تو مصیبت کے وقت میرا ساتھ دے گی۔ تو کہاں ہے؟ مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت ہے۔"

لیکن مایا بھی نہ آئی۔ کسی جانب سے بھی اس پر ظاہر نہ ہوئی۔ راجہ بھارتہ کو اپنے آپ پر ایک ایسے ٹوٹے ہوئے خشک پتے کا گمان ہو رہا تھا جیسے درخت نے اپنی ٹہنی سے توڑ کر پھینک دیا ہو اور مرگ آلود ہوائیں اسے اڑائے اڑائے پھر رہی ہوں۔ وہ اٹھا اور اس نے جنگل میں جنوب کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

ساری رات وہ جنگل میں چلتا رہا۔ پچھلے پہر وہ ایک دریا پر پہنچ گیا۔ اس نے دریا کے ٹھنڈے پانی سے اپنی پیاس بجھائی۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑا ہے۔ جوالا مکھی کے دہانے سے گرم راکھ آلود دھوئیں کے بادل اڈ رہے ہیں۔ اس کا سانس بند ہو رہا ہے۔ اس کا جسم جل رہا ہے۔ وہ کھولتے لاوے میں چھلانگ لگانے ہی والا تھا کہ کسی نے پیچھے سے کھینچ لیا۔ وہ پیچھے کو گر پڑا پھر اس کے کانوں میں آواز آئی۔

"تیرا پرائشچت لوگوں کی بھلائی کرنے میں ہے۔ تو آکاش کی بلندیوں سے گر چکا ہے۔"

راجہ بھارتہ کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکل گئی۔ وہ جاگ پڑا اس نے دیکھا کہ سورج کی روشنی دریا کے پانی پر چمک رہی ہے۔ دن نکل آیا تھا۔ راجہ بھارتہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور خواب میں جو آواز اس نے سنی تھی اس پر غور کرنے لگا۔ اس کا پرائشچت خدمت خلق میں تھا۔ اب یہی کرم اس کے گناہوں کے داغ دھو سکتا تھا' اچانک جیسے اس کا دل بنی نوع انسان سے محبت کے جذبے سے معمور ہو گیا۔

اس نے مشرق کی طرف طلوع ہو چکے سورج کی طرف منہ کر کے کچھ اشلوک پڑھے اور دریا کا پانی ہتھیلیوں میں لے کر اپنے سر پر ڈالا اور ہری رام کا جاپ کرتا دریا کے

کنارے ایک طرف روانہ ہو گیا۔ چلتے چلتے وہ ایک پھل دار درخت کے پاس پہنچا۔ اسے بڑی بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے درخت پر سے پھل توڑ کر کھائے اور پھر اپنے انجانے سفر پر روانہ ہو گیا۔

دریا کے کنارے کچھ فاصلے پر اسے دھواں اٹھتا نظر آیا۔ یہ ایک مرگھٹ تھا' جہاں چتا پر ایک جوان عورت کی لاش جلائی جا رہی تھی۔ کنارے پر ایک کشتی کھڑی تھی۔ کچھ لوگ چتا سے ہٹ کر کھڑے چتا سے اٹھتے آگ کے شعلوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہاں کوئی ایسا پروہت نہیں تھا' جو مرنے والے کی آتما کی شانتی کے لئے اشلوک پڑھ رہا ہو۔

راجہ بھارتہ نے لوگوں کے پاس جا کر پوچھا کہ یہ کس کی چتا ہے۔ کہ یہاں کوئی پروہت پجاری بھی نہیں ہے۔

ایک آدمی نے کہا۔ "یہ ایک پاپی اور گناہ گار عورت کی چتا ہے۔ اس کا نام چند رانی تھا۔"

راجہ بھارتہ نے پوچھا۔ "اس نے ایسا کون سا پاپ کیا تھا کہ اس کی چتا پر کوئی اشلوک پڑھنے والا بھی نہیں۔"

وہ آدمی بولا۔ "یہ عورت چار سال پہلے بیوہ ہو چکی تھی لیکن اس نے گناہ کیا اور ایک ناجائز بچے کو جنم دے کر مر گئی۔ اس کو مکتی کا حق نہیں پہنچتا۔ اس کی آتما اگلے جنم میں لومڑی کی شکل مین ظاہر ہو گی۔"

راجہ بھارتہ نے پوچھا کہ اس عورت کا ناجائز بچہ کہاں ہے؟ اسے بتایا گیا کہ وہ مرا ہوا پیدا ہوا تھا۔ راجہ بھارتہ چتا کے سرہانے کی جانب آلتی پالتی مارے بیٹھ گیا اور گناہ گار عورت چند رانی کی روح کی شانتی کے لئے مقدس اشلوک بلند آواز میں پڑھنے لگا۔

اسے مقدس اشلوک پڑھتا دیکھ کر لوگ خوفزدہ ہو کر کشتی میں سوار ہو کر وہاں سے چلے گئے۔ چتا کے شعلے اپنی لمبی زبانوں سے لاش کے جسم کو چاٹ رہے تھے۔ راجہ بھارتہ لاش کے سرہانے بیٹھا اشلوکوں کا ورد کرتا رہا۔

راجہ بھارتہ شام تک اشلوک پڑھتا رہا۔ چتا کے شعلے ماند پڑ گئے تھے۔ چتا سرخ انگاروں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ راجہ بھارتہ نے اٹھ کر دریا میں اشنان کیا' جنگلی پھل کھائے اور ایک بار پھر چتا کے پاس بیٹھ کر اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔

سورج غروب ہو گیا۔ دریا اور جنگل میں اندھیرے اترنے لگا۔ راجہ بھارتہ اشلوک پڑھنے میں مگن رہا۔ وقت گزرنے کا اسے کچھ احساس نہیں تھا۔ رات گہری ہوتی چلی گئی پھر دریا کے مشرقی کنارے درختوں کے جھنڈوں کے عقب سے زرد رو چاند طلوع ہو گیا اور

اس کی پھیکی اداس آسیب زدہ چاندنی نے دریا اور جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ راجہ بھارتہ کے چاروں طرف موت جیسا سناٹا تھا۔ وہ بڑی دھیمی آواز میں اشلوک پڑھ رہا تھا۔ چتا کی آگ کے انگارے سفید پوش ہو گئے تھے۔ ان پر راکھ جم گئی تھی۔ آدھی رات کے بعد شبنم گرنے لگی۔ چتا کی راکھ میں جو انگاروں کی دھیمی دھیمی آنچ دکھائی دیتی تھی۔ وہ بھی بجھ گئی۔ راجہ بھارتہ نے اشلوک پاٹھ کا ایک ادھیائے ختم کرنے کے بعد اٹھ کر چتا کے گرد سات چکر لگائے۔ ساتویں چکر کے بعد وہ چتا کے سرہانے کی طرف آیا تو اس نے چتا کی راکھ کے ڈھیر میں سے انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے کو ابھرتے دیکھا۔

بھارتہ ٹکٹکی باندھے اس پورے انسانی ڈھانچے کو تکنے لگا۔ اس کی تمام ہڈیاں اپنے جوڑوں میں پیوست تھیں۔ کھوپڑی میں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور آنکھوں کی جگہ جو سوراخ تھے ان میں دو انگارے دہک رہے تھے۔

راجہ بھارتہ فوراً" اشلوک پڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے کے پھٹے ہوئے سیاہ دانتوں والے منہ سے بھیانک چیخ کی آواز نکلی اور ڈھانچہ چتا سے اچھل کر راجہ بھارتہ پر گرا اور اس سے چمٹ گیا۔ بھارتہ نے اپنے جسم کی پوری طاقت سے ڈھانچے کو اپنے جسم سے الگ کرنے کی کوشش کی مگر اسے محسوس ہوا کہ اس کے جسم کی طاقت ختم ہو گئی ہے۔ وہ اپنا ہاتھ تک نہ ہلا سکا۔

ہڈیوں کے ڈھانچے میں سے سینک نکل رہا تھا۔ راجہ بھارتہ کے جسم کے گرد مردے کے ڈھانچے کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہونے لگی اور پھر راجہ بھارتہ کو کچھ ہوش نہ رہا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

اس کے گرتے ہی مردے کی کھوپڑی بھارتہ کے چہرے پر جھک گئی اور کھوپڑی نے اپنا کھلا ہوا منہ راجہ بھارتہ کے منہ پر رکھ دیا۔ ایک بار پھر مردہ ڈھانچے کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی اور وہ اچھل کر دوبارہ چتا کی راکھ میں گر کر غائب ہو گیا۔ اس کے غائب ہونے کے چند ثانے بعد ایک لومڑی چتا کی راکھ میں سے اپنا سر جھاڑتی نکلی اور غراتی شور مچاتی چیختی چلاتی جنگل کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

راجہ بھارتہ باقی ساری رات بے ہوش پڑا رہا۔ پو پھٹ رہی تھی کہ اسے ہوش آ گیا۔ سب سے پہلے اس نے جسم پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ مردے کا ڈھانچہ اس سے جدا ہو چکا تھا۔ بھارتہ بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے دل ودماغ کی کیفیات پر غور کیا۔ غور کرنے کی شکتی اب اس کے پاس نہیں تھی۔ گیان کے آئینے پر حرص وہوس کا زنگ جم گیا تھا۔ راجہ بھارتہ کو خود بھی ایسے خیالات سے اب کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اسے اپنے جسم کے مسام سے چتا

کی آگ کا سینک اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ بچپن میں اس کے راجہ باپ نے جنگل کی کٹیا میں اسے جس رشی کے پاس روحانی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس رشی نے راجہ بھارتہ کو تختی پر گناہ کے راکھشش دیوتا مارا' کی تصویر بنا کر دکھائی تھی۔ مارا کا رنگ سیاہ تھا' آنکھیں سرخ تھیں اور اس کی گردن میں پھنکارتے سانپ لٹکے ہوئے تھے۔ راجہ بھارتہ کو اپنے آپ پر مارا راکھشش کا گمان ہونے لگا۔ اس کے ذہن نے پردۂ شعور پر رقص کرتی عورتوں کی تصویریں گزارنا شروع کر دیں۔

راجہ بھارتہ نے اپنے بھرے بھرے بازوؤں کو دیکھا۔ ابھی ان میں جوانی کا پرجوش خون گردش کر رہا تھا۔ اس نے چبوترے پر چڑھ کر چتا کی راکھ کو ٹھوکر مار کر ہوا میں اڑایا اور ایک طرف چل پڑا۔

راجہ بھارتہ کے جسم میں عیش پرست اور ہیجان خیز مردہ عورت چند رانی کی گناہ آلود روح حلول کر گئی تھی۔

راجہ بھارتہ ایک جنگلی پگڈنڈی کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہ کہار ایک سجی سجائی دلھن کی پالکی اٹھائے چلے جا رہے ہیں۔ بھارتہ کے خون میں انگارے دہک اٹھے۔ آنکھوں سے گناہ کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ وہ بھوکے چیتے کی طرح لپک کر ایک جھاڑی کے پیچھے گھات لگا کر بیٹھ گیا اور دلھن کی پالکی کو اپنے قریب آتے دیکھنے لگا۔

دلہن کی پالکی قریب آ رہی تھی۔ راجا بھارتہ نے درخت کی ایک موٹی شاخ توڑ کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لی تھی جونہی کہار پالکی لیے اس کے سامنے سے گزرے وہ اچھل کر ان کے اوپر جا کودا۔ ڈنڈے کے ایک ہی وار سے راجا بھارتہ نے ایک کہار کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دوسرا کہار ہاتھ جوڑ کر جان کی دہائی دیتا وہیں بیٹھ گیا مگر راجا بھارتہ نے اسے بھی ہلاک کر ڈالا۔ دلہن نے یہ خونی منظر دیکھا تو پالکی میں بے ہوش ہو گئی۔

راجا بھارتہ نے بے ہوش دلہن کو اپنے کاندھے پر ڈالا اور جنگل کے گھنے درختوں میں چھپ گیا۔ راجا بھارتہ کے وحشیانہ تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے بدنصیب دلہن دو روز تک بے سدھ جنگل میں موجود اس غار میں پڑی رہی جہاں راجا بھارتہ نے اسے چھپا رکھا تھا۔ وہ جنگلی پھلوں کا رس نکال کر دلہن کے حلق میں ٹپکا کر اسے ہوش میں لانے کی تدابیر کرتا رہا مگر دلہن بے ہوش ہی رہی آخر ...... چوتھے روز اس نے دم توڑ دیا۔ راجا بھارتہ نے سے ایک جگہ گڑھا کھود کر دفن کر دیا اور وہاں سے آگے چل دیا۔

کئی دن کئی راتیں جنگل میں بھٹکتے رہنے سے اس کے کپڑے تار تار ہو گئے تھے اڑھی کے بال وحشیوں کی طرح بڑھ آئے تھے۔ وہ جنگلی خرگوشوں کے کچے گوشت سے اپنی بھوک مٹاتا جانوروں کی طرح تالاب کے کنارے منہ لگا کر پیاس بجھاتا' اپنی کیفیات کا جائزہ ینا تو دور کی بات ہے' راجا بھارتہ کو اپنی کیفیات کا بھی شعور نہیں رہا تھا۔ ایک روز جب بجلی لی کڑک کے ساتھ جنگل میں زبردست بارش ہونے لگی تو راجا بھارتہ ایک گنجان درخت کی ناخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

رات کا وقت تھا ایک گھڑ سوار کسی طرف سے بھٹکتا ہوا وہاں آ گیا اس کے ساتھ یک عورت بھی تھی انہوں نے اسی گنجان درخت کے نیچے پناہ لی جس کی شاخوں میں وحشی راجا بھارتہ چھپا ہوا تھا راجا بھارتہ نے بجلی کی چمک میں جوان عورت کے جسم کی ایک جھلک

دیکھی تو بے چین سا ہو گیا۔

اس نے ایک وحشیانہ نعرہ لگاتے ہوئے درخت کی شاخوں پر سے نیچے آدمی پر چھلانگ لگا دی وہ اس قدر غیض و غضب میں تھا کہ عورت کا مالک سنبھل بھی نہ سکا اور راجا بھارتہ نے اس کی گردن توڑ کر اسے ٹھنڈا کر دیا۔

بے چاری عورت واویلا کرتی جنگل میں بھاگی لیکن راجا بھارتہ نے چند قدموں کے فاصلے پر ہی اسے اس طرح دبوچ لیا جس طرح ایک وحشی شیر' نازک اندام ہرنی کو ایک ہی جست لگا کر دبوچ لیتا ہے۔ عورت کو غش آ گیا۔ راجا بھارتہ نے اسے اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور اندھیری بارش' بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک میں جنگل کے اندھیروں میں غائب ہو گیا۔

عورت کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک غار میں لیٹی ہے۔ اس کے قریب لکڑیوں کی آگ جل رہی ہے اور ایک وحشی انسان اس کے پاس بیٹھا اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا ہے' یہ راجا بھارتہ تھا' عورت نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر اپنی عزت اور آبرو کی بھیک مانگی تو راجا بھارتہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"چند رانی! یہ تم کہہ رہی ہو تم نے تو بیوہ ہو کر ناجائز بچہ جنا تھا"۔

عورت کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ وحشی کیا کہہ رہا ہے' اس نے خوف کے مارے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا' راجا بھارتہ اس کی طرف کھسکنے لگا' عورت اٹھ کر دوڑنے لگی تو بھارتہ نے اسے بالوں سے پکڑ کر نیچے گرا لیا۔ دس روز بعد یہ بدنصیب عورت بھی راجا بھارتہ کے وحشیانہ تشدد کا شکار ہو کر مر گئی تو بھارتہ اسے وہیں غار کے اندر چھوڑ کر آگے چل دیا۔

یہ جنگل اس قدر وسیع و عریض تھا کہ راجا بھارتہ کئی دنوں کے بعد اس سے باہر نکل سکا۔ اب اس کے جسم پر سوائے گھاس کی ایک جھالر کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ بال اور ناخن جنگلیوں کی طرح بڑھ گئے تھے۔ جنگل سے باہر آنے کے بعد راجا بھارتہ کو سامنے ایک غیر ہموار میدان نظر آیا جسے جنگلی خشک گھاس نے ڈھانپ رکھا تھا۔

دن کی ڈوبتی روشنی میں اسے کچھ فاصلے پر ایک قلعہ نما عمارت کا کھنڈر سا نظر آیا راجا بھارتہ اس قلعہ نما کھنڈر کی طرف چلنے لگا۔ کوئی انجانی طاقت اسے کھنڈر کی طرف کھینچ رہی تھی کھنڈر تک پہنچتے پہنچتے شام کا سرمئی اندھیرا میدان میں اترنے لگا تھا کھنڈر بالکل ویران پڑا تھا۔ بارشوں کی وجہ سے سیاہ پڑ جانے والی کچھ دیواریں اب بھی کھڑی تھیں جہاں کبھی اس عمارت کا دروازہ ہوا کرتا تھا وہاں اب مٹی اور پتھروں کا ڈھیر سا پڑا تھا۔

راجا بھارتہ کھنڈر میں داخل ہو گیا۔ جنگلی آک کی زہریلی جھاڑیاں جگہ جگہ اگی

تھیں۔ انسان کو آتا دیکھ کر ایک لمبی چھپکلی تیزی سے رینگتی ہوئی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے نیچے جا چھپی۔ قلعے کے کچھ ستون کھڑے تھے جن کے بیچ سے ایک غلام گردش گزر رہی تھی۔ اس غلام گردش کی چھت کی بوسیدہ کڑیوں میں جا بجا مکڑیوں کے جالے لٹک رہے تھے۔ راجا بھارتہ متوحش آنکھوں سے در و دیوار اور بوسیدہ ستونوں کو تکتا آگے بڑھ رہا تھا' یہ غلام گردش ایک بڑے دیوان خانے میں جا کر ختم ہو گئی فرش اکھڑا پڑا تھا دیواروں کے طاقوں میں جالے لگے تھے ایک چبوترا تھا جس کی پتھر کی سلیں ٹیڑھی ہو رہی تھیں۔ راجا بھارتہ اس چبوترے پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اسے آج کی رات اسی کھنڈر میں بسر کرنی چاہیے اور کل کسی قریبی بستی میں جا کر وہ اپنے لیے تازہ شکار اغوا کر کے لائے گا۔

وہ چبوترے پر لیٹ گیا تھوڑی دیر پہلے اس نے گھنے جنگل میں ایک ہرنی کے بچے کو مار کر کچا گوشت کھایا تھا۔ جسم تھکاوٹ سے چور تھا اور پیٹ بھرا ہوا تھا' سوچنے والا ذہن پہلے ہی بند ہو چکا تھا' اس لیے راجا بھارتہ کو آنکھیں بند کرتے ہی نیند آ گئی۔

آدھی رات بیت گئی تو دیوان خانے کے کھنڈر کی دیوار میں سے ایک عورت کا سایہ نکل کر راجا بھارتہ کی طرف بڑھا' سایہ سوئے ہوئے بھارتہ کے پاس جا کر بیٹھ گیا بھارتہ کو اپنے جسم پر کسی نرم و نازک گرم ہاتھ کا لمس محسوس ہوا تو اس نے چونک کر اپنی آنکھیں کھول دیں اور کسی بھوکے وحشی کی طرح عورت کی کلائی پکڑ لی۔

عورت نے کھردری آواز میں کہا "اٹھو اور میرے ساتھ چلو" عورت نے ایک ہی جھٹکے میں اپنی کلائی چھڑا لی' راجا بھارتہ کو اس عورت کی طاقت کا اندازہ ہو گیا۔ اندھیرے میں عورت کا جسم راکھ ایسے رنگ کا نظر آ رہا تھا یہ راکھ گرم تھی' شاید چتا کی راکھ تھی۔ راجہ بھارتہ نے پلٹ کر پوچھا' "کیا تم چند رانی کا دوسرا جنم ہو؟"

عورت نے پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اندھیرے میں اس کے دانت شارک مچھلی کے دانتوں کی طرح نظر آ رہے تھے اور بال فرش کو چھو رہے تھے "بھارتہ تم نے مجھے ٹھیک پہچان لیا' میں چند رانی کا دوسرا جنم ہوں' میں نے ہی تمہیں یہاں بلایا ہے"۔

وہ راجا بھارتہ کو لے کر دیوار میں داخل ہو گئی۔ راجا بھارتہ نے کہا "مگر چند رانی میں نے تمہاری چتا کی راکھ میں سے ایک لومڑی کو نکل کر بھاگتے دیکھا تھا۔"

چند رانی نے کہا "میں وہ ہی لومڑی ہوں' تم خاموش رہو' ان باتوں کے بارے میں کچھ نہ پوچھو۔"

بھارتہ نے سوال کیا "تم مجھے کہاں لیے جا رہی ہو؟ ہم ایک تاریک سرنگ میں سے گزر رہے ہیں شاید۔"

"ہاں"۔ چند رانی نے کھردری سرگوشی میں کہا "یہ زندگی کی سرحد سے پار، موت کی سرحد سے بھی آگے کام دیو سنسار کی سرنگ ہے۔"

چند رانی نے راجا بھارتہ کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا' اس کا ھاتھ چتا کی راکھ کی طرح گرم تھا' جوں جوں وہ آگے بڑھ رہے تھے ہلکی ارغوانی رنگ کی روشنی کا غبار پھیلتا جا رہا تھا' فضا میں عود اور لوبان کی ہیجان خیز مہک رچنے لگی تھی۔ آگے جا کر سرنگ کافی فراخ اور اونچی چھت والے ہال کمرے میں داخل ہوئی تو راجا بھارتہ نے دیکھا کہ سیاہ پتھروں کے ستونوں کے ساتھ عورتوں کے مجسمے رقص کے انداز میں کھڑے تھے' ہلکی ارغوان روشنی میں ان مجسموں کے راکھ ایسے بدن لو دیتے دکھائی دے رہے تھے۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ ان میں سے ہر مجسمے کے پاؤں میں ہڈیوں کا ایک انسانی ڈھانچہ پڑا تھا۔

چند رانی' راجا بھارتہ کا ہاتھ تھام کر کمرے کے وسط میں لے گئی جہاں باسی پھولوں کا فرش بچھا تھا اور کچھ مٹکے اور پیالے پڑے تھے - چند رانی نے راجا بھارتہ سے کہا "ابھی آدھی رات کا گجر بجے گا پھر یہاں ایک کھیل ہو گا کام دیو کی رھس ہو گی مگر تم اس میں شامل نہیں ہو سکو گے۔"

"کیوں؟" راجا بھارتہ نے پوچھا۔

چند رانی نے راجا بھارتہ کا ہاتھ دبایا۔ "یہ تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔"

ارغوانی روشنی مدھم ہونے لگی پھر فضا میں عود اور لوبان کی بو تیز ہو گئی اور کسی جانب سے گجر کی آواز سنائی دی۔ چند رانی نے راجا بھارتہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور باسی پھولوں کے فرش پر رقص کرنے لگی' نہ جانے کدھر سے کھڑتالوں' مجرنگ اور مجیروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

راجا بھارتہ چشم حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا' اس کی نظروں کے سامنے ستونوں والی عورتوں کے مجسموں میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ رقص کرتی ایک ایک کر کے اپنے ستونوں سے الگ ہو گئیں۔ اور چند رانی کے ارد گرد دائرہ بنا کر رقص کرنے لگیں' کسی نے راجا بھارتہ پر نگاہ نہیں ڈالی تھی۔ رقص کی لے تیز ہوئی تو ایک بار پھر گجر کی آواز گونجی' دیواروں کے سنگین در کھل گئے اور ارغوانی دھند اور لوبان کی راکھ ایسی لہروں میں راجا بھارتہ نے سیاہ فام مردوں کو رقص کرتے نمودار ہوتے دیکھا...... پھر وہ جوڑوں کی صورت میں رقص کرنے لگے۔ چند رانی جس مرد کے ساتھ رقص کر رہی تھی وہ ایک بن مانس کی شکل کا دیونما راکھشس معلوم ہو رہا تھا۔ رقص ختم ہوا تو ہر طرف قہقہوں کی آوازیں گونجنے لگیں اور مٹکوں کے منہ کھل گئے۔

پھر وہ مدھرا کے مٹکوں پر آن گرے اور دیکھتے دیکھتے مشروب سے بھرے مٹکے خالی ہو گئے ایک ہنگامہ بپا ہو گیا جس میں وحشیانہ قہقہے اور چیخیں بلند ہونے لگیں۔ اس عالم سرمستی میں کسی نے راجا بھارتہ کا بازو پکڑ کر زور سے اپنی طرف کھینچا' راجا بھارتہ ایک عورت کے پاس گر پڑا۔ یہ چند رانی تھی' اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں' اس نے لومڑی کی طرح غراتی آواز میں کہا۔

"تم وناشی کے نہیں ہو۔ تم میرے ہو' میرے ساتھ ادھر چلو"۔

راجا بھارتہ کو پہلی بار چند رانی کا چہرہ ایک خونخوار لومڑی کا چہرہ نظر آیا اس کے بازوؤں میں غضب کی طاقت آ گئی تھی وہ راجا بھارتہ کو کھینچتی ہوئی ایک طرف لے گئی۔ مردہ پھولوں کے فرش پر ہر کوئی مدہوش پڑا تھا دیوار میں ایک تاریک بھٹ سا بنا ہوا تھا چند رانی' راجا بھارتہ کو گھسیٹتی ہوئی اس بھٹ میں لے گئی۔

راجہ بھارتہ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ چند رانی نے اس پر حملہ کر دیا۔ وہ عورت سے ایک دم آدم خور لومڑی بن چکی تھی۔ اس کی تیز غراہٹوں اور چیخوں سے راجا بھارتہ کی روح تک کانپ گئی۔ وہ راجا بھارتہ کے جسم پر تیز پنجے مار رہی تھی اور اس کی گردن کو اپنے نوکیلے دانتوں میں دبوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ راجا بھارتہ نے اس کی گردن قابو کر لی وہ نڈھال ہو گئی مگر اس نے لومڑی کی گردن نہ چھوڑی آخر اس نے اسے فرش پر ڈال کر اس کی گردن پر اپنے جسم کا سارا بوجھ ڈال دیا اور ایک بھیانک چیخ کے ساتھ لومڑی کی جان نکل گئی۔

راجا بھارتہ نے لومڑی کی گردن نہ چھوڑی پھر وہ بھی بے دم ہو کر لومڑی کے اوپر ہی گر گیا اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا جسم پر جگہ جگہ لومڑی کے تیز پنجوں نے گوشت ادھیڑ ڈالا تھا زخموں سے خون بہہ رہا تھا راجا بھارتہ اپنا سر لومڑی کے مردہ جسم پر رکھے ہانپ رہا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں۔ نہ جانے وہ کب تک اسی طرح پڑا رہا جب اس کی حالت قدرے درست ہوئی تو اس نے اپنا چہرہ اٹھا کر آنکھیں کھول کر دیکھا تو بھٹ کے باہر اسے روشنی کی جھلک نظر آئی۔

لومڑی مردہ پڑی تھی۔ راجہ بھارتہ لومڑی کی لاش کو بھٹ سے باہر کھینچ لایا۔ اس کے اپنے جسم پر جگہ جگہ پنجوں کے زخم تھے جن پر اب خون جم گیا تھا اس نے ہال کمرے میں آتے ہی پہلی تبدیلی یہ دیکھی کہ وہاں کسی ستون پر کسی عورت کا مجسمہ نہیں تھا اور ستون کے ساتھ لگے مردہ عورتوں کے ڈھانچے بھی غائب ہو چکے تھے۔ کھنڈر کی چھت میں کی سوراخ میں سے سورج کی چمکیلی کرنیں ایک لمبی شعاع کی صورت میں فرش پر پڑ رہی

تھیں۔ فرش پر مردہ پھول اور راکھشس بھی غائب ہو چکے تھے۔ مدھرا کے مٹکوں اور پیالوں
کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔

راجا بھارتہ اپنے ذہن میں ایک خاص تبدیلی محسوس کر رہا تھا اسے گناہ کا احساس
ہونے لگا تھا اس کا دل ندامت کے بوجھ سے بوجھل تھا۔ اس نے چندرا لومڑی کی لاش کو
وہیں چھوڑا اور سرنگ میں سے گزرتا ہوا کھنڈر سے باہر نکل آیا۔ باہر چمکیلے دن کی پاکیزہ سفید
دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بھارتہ نے اپنے جسم کو دیکھا اس کا لباس تار تار تھا
اور جسم پر جگہ جگہ لومڑی کے پنجوں کے لمبے لمبے زخم تھے جن پر خون جم رہا تھا یہ زخم درد
کر رہے تھے راجا بھارتہ کی آنکھوں کے سامنے سے غفلت کا پردہ جیسے ایک دم سے ہٹ
گیا۔ اسے وہ تمام ظلم اور پاپ یاد آنے لگے جو اس نے عورتوں اور بے گناہ مردوں کے
ساتھ کیے تھے۔ ان گناہوں کے احساس سے اس کی آتما بھاری اور بے چین ہو رہی تھی
راجہ بھارتہ نے اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر سورج کو نمسکار کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"سوریہ! ہے سوریہ دیوتا' مجھ پاپی کو معاف کر دو"۔ وہ گڑگڑا کر اپنے
گناہوں کی بخشش کی دعائیں مانگتا رہا لیکن راجا بھارتہ کے دل کا بوجھ اور روح کی ندامت کا
احساس ہلکا نہ ہو سکا۔ وہ سمجھ گیا کہ بھگوان نے اسے معاف نہیں کیا اور اسے اپنے گناہوں کا
کفارا ادا کرنا ہی ہوگا۔ وہ کھنڈر کے گرے پڑے ستونوں میں سے گزرتا ٹیکری سے نیچے اتر
آیا۔

چمکیلی دھوپ نے میدانوں' پہاڑوں اور دور جنگل کے گنجان درختوں کو روشن کر
رکھا تھا۔ نیلے پاکیزہ آسمان پر کچھ سفید بگلے دریا کی طرف اڑے جا رہے تھے راجا بھارتہ کی
آنکھوں مین آنسو آ گئے۔ اس کا سر ندامت سے جھک گیا اتنے پاکیزہ اور بے داغ ماحول میں
راجا بھارتہ کو اپنے گناہ زیادہ واضح ہو کر نظر آنے لگے تھے۔ وہ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ
جنگل کی طرف چل نکلا۔

راستے میں ایک چشمے پر اس نے پانی پیا اور پھر روانہ ہو گیا اسے کچھ معلوم نہیں تھا
کہ اس کی منزل کہاں ہے اسے اپنی ہمدرد مایا اور پدم ناگ بہت یاد آ رہے تھے۔ وہ جانتا تھا
کہ مایا اور پدم ناگ کا پوتر دنیا' یعنی آکاش اور زمین کے درمیان جو نیم آسمانی دنیا آباد ہے اور
جہاں دیوی' دیوتا رہتے ہیں' وہاں بسیرا ہے اس لیے وہ اس کے پاس نہیں آئیں گے' جب
سے وہ گناہ کی دلدل میں پھنسا تھا' یہ پوتر ہستیاں یعنی غیبی دیوی مایا اور پدم ناگ اس سے
کنارہ کش ہو گئے تھے۔

جنگل ہی میں چلتے چلتے راجا بھارتہ کو رات ہو گئی اس نے راہ میں گرے پڑے

کچے جنگلی پھل کھا کر بھوک مٹائی اور ایک درخت کے نیچے مراقبے میں بیٹھ گیا لیکن اس کی
توجہ بار بار متاثر ہو رہی تھی اس کے شعور کے پردے پر اس کے گناہ کی تصویریں پھرنے
لگیں۔ راجہ بھارتہ نے چیخ مار کر آنکھیں کھول دیں وہ اپنے گناہوں کو دوبارہ نہیں دیکھ سکتا
تھا وہ کیسے دیکھتا کہ بے گناہ عورتوں کو قتل کر رہا ہے۔ ان پر بھیانک تشدد کر کے انسانیت کا
خون بہا رہا ہے۔ انتہائی بے چینی کے عالم میں اس نے رات درخت کے نیچے پہلو بدلتے
کاٹ دی۔ صبح ہوئی تو اس کے جسم کے زخم اکڑ گئے تھے اور ان میں درد ہو رہا تھا بھارتہ نے
کچھ جڑی بوٹیوں کو پہچان کر انہیں توڑ کر اپنے زخموں پر باندھا اور آگے روانہ ہوا' جنگل ختم
ہوا۔ سامنے ایک ایسا میدان تھا جس میں جگہ جگہ کھائیاں' ٹیبے اور بڑے بڑے گڑھے تھے'
ان گڑھوں میں کہیں کہیں پانی جمع تھا کچھ فاصلے پر اسے ایک آبادی کے آثار بھی نظر آ رہے
تھے مگر وہ انسانوں کے درمیان نہیں جانا چاہتا تھا اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس لائق نہیں
رہا کہ کسی انسان کو اپنا گناہگار چہرہ دکھا سکے۔

راجا بھارتہ ایک گڑھے میں بیٹھ گیا وہ اپنی گزری ہوئی زندگی پر غور کرنے لگا۔ اب
اسے اپنے پرانے جنم بھی آہستہ آہستہ یاد آنے لگے تھے۔ اس نے دیکھا کہ وہ ہزاروں جنم
میں سے ہوتا ہوا انسان کے روپ کو حاصل کر سکا تھا لیکن اپنے برے اعمال کی وجہ سے اس
نے اپنے آپ کو انسانی مقام سے گرا دیا تھا۔

راجا بھارتہ کے زخموں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں جڑی بوٹیوں سے کوئی فرق نہ پڑا
وہ سمجھ گیا کہ یہ اس کے برے کاموں کی سزا ہے جو اسے بھگتنا ہو گی اور شاید یہی اس کا
کفارا ہو سارا دن بھارتہ گڑھے میں پڑا رہا۔ پیاس لگتی تو اٹھ کر تالاب سے پانی پی لیتا۔ رات
ہو گئی' راجا بھارتہ نے شہر کا رخ نہ کیا اور وہیں پڑا رہا۔

دوسرے دن زخموں کا درد ناقابل برداشت ہو گیا تھا راجا بھارتہ زخموں کو دھونے لگا
تو یہ دیکھ کر اس کی چیخ سی نکل گئی کہ اس کے سارے زخموں میں کیڑے پڑ چکے تھے۔
چھوٹے چھوٹے لمبوترے سیاہ اور نسواری رنگ کے ہزاروں کیڑے اس کے زخموں میں
رینگ کر اس کے جسم کے گوشت کو کھا رہے تھے۔ اس نے کچھ کیڑوں کو بڑی مشکل سے
زخموں میں سے نکالا لیکن اگلے روز زخموں میں اس سے بھی زیادہ کیڑے پیدا ہو چکے تھے۔
اب ان زخموں سے بدبو بھی آنے لگی تھی ..... راجا بھارتہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا
عذاب شروع ہو گیا تھا۔ دو روز وہ گڑھے میں پڑا رہا۔ جب بھوک نے نڈھال کر دیا تو اٹھا
اور آبادی کی طرف چلنے لگا۔

گاؤں کے لوگ اس کے زخموں کی بدبو سے اس کے پاس نہیں آئے تھے راجا

بھارتہ نے کھانے کو کچھ مانگا تو لوگوں نے دور ہی سے اس کی طرف کچھ روٹیاں پھینک دیں وہ ایک پیپل کے درخت تلے [illegible] کر روٹی کھانے لگا۔

اب وہ گاؤں سے باہر اسی درخت تلے بیٹھا رہتا گاؤں کے لوگ صبح، شام دور ہی سے اس کی طرف روٹیاں پھینک کر چلے جاتے، کسی نے پانی کا مٹکا پاس رکھ دیا۔ زخموں کی حالت خراب سے خراب تر ہو گئی تھی۔ یہ زخم اس کے سارے جسم پر پھیل گئے تھے اور اس کا سارا بدن کیڑوں سے بھرا رہتا وہ خود کشی کر کے اپنے اگلے جنم کو مزید بد تر نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اب وہ اپنی موت کا انتظار کر رہا تھا شدید درد اور تکلیف کی حالت میں وہ آنکھیں بند کیے درخت کے نیچے کراہتا رہتا۔ گاؤں کے آوارہ کتے بھی اس کے پاس نہیں پھٹکتے تھے۔ کیڑوں نے راجا بھارتہ کے سارے جسم کو ڈھانپ دیا تھا درد سے وہ تڑپ تڑپ اٹھتا مگر اسے ضبط کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ بھگوان سے بار بار پرارتھنا کرتا کہ وہ موت دے کر اس عذاب کا خاتمہ کر دے مگر موت بھی اس سے دور بھاگ گئی تھی۔

ایک روز جب کہ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ راجا بھارتہ پر نزع کا عالم طاری ہو گیا۔ اس کے ذہن میں اس کی گناہ بھری زندگی کے نقش ابھرنے لگے۔ راجہ بھارتہ کے لیے یہ عذاب بھی ناقابل برداشت تھا۔ اس کے حلق سے درد انگیز کراہیں نکلنے لگیں گاؤں کے لوگوں نے اسے مرتا ہوا دیکھا تو اس کے گرد جمع ہو گئے۔

آخر راجا بھارتہ مر گیا۔ لوگوں نے اس کی کیڑوں بھری لاش کو وہیں سوکھے پتے اور لکڑیاں ڈال کر جلا دیا۔ راجا بھارتہ کا جسم فنا ہو گیا تھا جل کر راکھ ہو گیا تھا مگر اس کی آتما اس کی روح زندہ تھی، اور اپنی چتا کے اوپر منڈلا رہی تھی، یہ ایک گناہ گار اور بوجھل روح تھی جو ایک کثیف دھوئیں کے بھاری مرغولے کی طرح تھی جو نظر نہیں آ رہا تھا، مگر جو اوپر کو اٹھ کر آسمان کی طرف نہیں جا سکتا تھا، راجا بھارتہ کی روح کی تمام حسیات زندہ تھیں، وہ دیکھ سکتا تھا سن سکتا تھا اور محسوس کر سکتا تھا، اس کی روح ملول اور ندامت سے پر ابھی تک اپنے برے اعمال کی سزا بھگت رہی تھی، وہ بے بسی اور بے کسی کے عالم میں اپنی لاش کی چتا کے اوپر بوجھل پن سے منڈلا رہی تھی چتا راکھ ہو گئی تو لوگ راجا بھارتہ کی ہڈیاں دبا کر چلے گئے۔

تین دن گزر گئے اور راجا بھارتہ کی ملول روح ابھی تک اسی مقام پر منڈلا رہی تھی جہاں اس کے جسم کو نذر آتش کیا گیا تھا چوتھے روز اس کی روح نے اپنے آپ فضا میں ایک طرف چلنا شروع کر دیا راجا بھارتہ کی روح نے کئی بار فضا میں مزید بلند ہونے کی کوشش کی مگر وہ ایک خاص حد سے بلند نہیں ہو رہی تھی۔ یہی روح کا سب سے بڑا عذاب تھا وہ

لطیف ہونے کے باوجود کثیف دنیا کے ماحول میں رہنے پر مجبور تھی جو اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ راجا بھارتہ کا شعور بیدار تھا، اسے قریب سے پرواز کرتے گزرتے پرندوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں اسے اپنی بدکردار زندگی اور برے اعمال کی ندامت کا احساس کچوکے لگا رہا تھا۔ شاید یہی وہ گرز تھے جو جہنم کے فرشتے اسے مار رہے تھے۔ راجا بھارتہ چونکہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتا تھا اس لیے اسے یقین تھا کہ اس کا یہ جنم بد روح کا جنم ہے اور وہ اب تک اگر کسی جانور کے جسم میں داخل نہیں ہوا تو نامعلوم مدت تک بد روح کی حیثیت سے زندگی بسر کرے گا جو ایک بہت بڑا عذاب تھا، ایسا عذاب جو وقت کے صحرا میں نامعلوم منزلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ زندہ انسان ایک نہ ایک روز مر جاتا ہے مگر روح کو موت نہیں تھی، روح کو اپنا بویا ہوا پورے کا پورا کاٹنا تھا، راجا بھارتہ نے کانٹے بوئے تھے اور اب اسے کانٹے ہی کاٹنے تھے۔

راجا بھارتہ کی بد روح فضا میں تیرتی چلی جا رہی تھی۔ آگے ایک پہاڑ آ گیا بد روح اس کی دیوار میں سے گزر گئی، دوسری طرف پہاڑی کے دامن میں بھارتہ کی روح کو ایک مرگھٹ دکھائی دیا جہاں ایک سادھو ٹھنڈی چتا کے استھان پر اپنے گرد ایک دائرہ کھینچے بیٹھا منتر پڑھ رہا تھا۔ بد روح کو اس کے منتروں کی آواز فضا میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ یہ کالے علم کے منتر تھے، اس منتر سے کالا علم جاننے والا سادھو، بد روحوں اور جن بھوتوں کو اپنے قبضے میں کرتے ہیں، اور پھر ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیتے ہیں۔

راجا بھارتہ کی روح اس مرگھٹ سے گذر کر آگے نکل جانا چاہتی تھی لیکن سادھو کے منتر نے اس پر اثر کرنا شروع کر دیا۔ بد روح اپنے آپ مرگھٹ کی طرف اترنے لگی۔ راجا بھارتہ کی روح نے اوپر اٹھنے کی لاکھ کوشش کی مگر وہ جتنا اوپر اٹھنے کی کوشش کرتا، کالے منتروں کی کشش اسے اتنا ہی نیچے کی طرف کھینچتی۔

مرگھٹ میں بیٹھے منتروں کا جاپ کرتے سادھو کو بھی اپنے ارد گرد بد روح کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ زیادہ مستعدی سے منتروں کا جاپ کرنے لگا۔ راجا بھارتہ کی روح نیچے ہی نیچے آتی گئی پھر وہ سادھو کے گرد چکر لگانے لگی۔

سادھو ہوشیار ہو گیا اس نے لکڑی کی ایک چھوٹی سی گول ڈبیا کھول کر اپنے سامنے رکھ دی اور بلند آواز میں کہا۔ "اے بد روح، تو میرے قبضے میں آ چکی ہے، اس ڈبیا میں داخل ہو جا"۔

راجا بھارتہ کی روح نے اپنے آپ کو پیچھے کی طرف دھکیلا لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ روح آہستہ آہستہ دائرے کے اندر سادھو کے سامنے رکھی ڈبیا کی طرف آ رہی تھی سادھو

کے منتروں کی آواز تیز ہوتی چلی گئی پھر اس کے حکم سے راجا بھارتہ کی بد روح بانس کی ڈبیا میں داخل ہو گئی۔ سادھو نے ڈبیا کا منہ بند کر کے اوپر ڈھکنا چڑھا دیا اور اس پر کچھ منتر پڑھ کر پھونکے پھر کہا۔ "اے بد روح! میری بات غور سے سن' میں نے تمہیں اپنے قبضے میں کر لیا ہے اب تجھے سنسار کی کوئی شکتی مجھ سے نہیں سکتی' تو اب میری داسی اور میری غلام ہے' جو میں کہوں گا تمہیں کرنا ہو گا۔"

شاید ان منتروں کا اثر تھا کہ راجا بھارتہ کو زبان مل گئی' اس نے کہا "تم مجھ پر یہ ظلم کیوں کر رہے ہو؟"

سادھو نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "اے بدنصیب انسان! ظلم میں نہیں کر رہا' ظلم تو تو نے خود اپنے اوپر کیا ہے تجھے بھگوان نے ایک پوتر جیون دیا تھا مگر تو نے برے کرم کیے' بھگوان کو بھلا کر سنسار کے لوگوں کو ہلاک کیا ان پر ظلم و ستم کیا' اب تو اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہے میں نے تمہیں اپنے قابو میں جو کیا ہے تو یہ بھی تجھے تیرے برے کرموں کی سزا مل رہی ہے۔ راجا بھارتہ کی روح مزید بوجھل ہو گئی' اس نے کہا۔ تو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟"

سادھو بولا۔ "یہ وقت آنے پر تمہیں بتا دوں گا۔" سادھو نے ڈبیا اپنے تھیلے میں ڈالی اور چمٹا اٹھا کر چتا کے استھان سے نیچے اتر آیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا پہاڑی کی ڈھلان اترنے لگا۔ پہاڑی کے دامن میں ایک دریا بہہ رہا تھا گھاٹ پر موجود کشتی میں مسافر بیٹھے ہوئے تھے سادھو بھی کشتی میں بیٹھ گیا۔ دریا کے دوسرے کنارے ایک شہر آباد تھا' دریا شہر کی فصیل کے ساتھ لگ کر گزرتا تھا سادھو شہر میں داخل ہو گیا۔ اس شہر پر نہایت نیک دل راجا حکومت کرتا تھا جس کی رانی کاروشی حسن صورت و سیرت میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ رانی کا ایک بیٹا راجکمار آنند تھا جس کی عمر ابھی آٹھ برس کی تھی۔ رانی کاروشی اتنی حسین تھی کہ جو کوئی ایک نظر دیکھ لیتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ وہ اپنے راجا پتی کی بے حد وفادار تھی اور سلطنت کے امور میں راجا کو بڑے مفید مشورے بھی دیتی۔ راجا' رانی کا آپس میں بے حد پیار تھا' دونوں اپنے ولی عہد راج کمار کی بڑے شاہانہ انداز میں پرورش کر رہے تھے' رعایا خوش حال تھی اور راجا' رانی کی بے حد وفا شعار۔

جس بدطینت سادھو نے بھارتہ کی بد روح کو اپنے قبضے میں کیا تھا راجا نے اسی کو اپنے راجکمار کی ویدانت تعلیم کے لیے بطور اتالیق مقرر کیا ہوا تھا۔ شاہی محل کے باغ میں سادھو نے اپنی ایک شاندار کٹیا بنا رکھی تھی۔ جہاں وہ صبح کے وقت راجکمار آنند کو وید پڑھاتا تھا لیکن سادھو ایک بدنگاہ انسان تھا اور وہ رانی کو اپنانا چاہتا تھا یہ کوئی آسان کام نہیں تھا چونکہ یہ بدکردار سادھو کالا علم بھی جانتا تھا اس لیے اس نے ایک خطرناک منصوبہ تیار کیا۔

ہر روز گیان دھیان کرنے کے بہانے شہر سے باہر مرگھٹ میں جا کر بیٹھ جاتا اور بد روح کو قابو میں کرنے کے منتروں کا جاپ شروع کر دیتا۔ اسے وہاں بیٹھ کر کالے علم کے منتر پڑھتے بیس روز گزر چکے تھے کہ بھارتہ کی بد روح اس کے قبضے میں آ گئی۔

بد طینت سادھو شہر کے دروازے میں داخل ہوا تو دربانوں نے جھک کر تعظیم دی' کیونکہ سب ہی جانتے تھے کہ سادھو ..... وشال داس' راجا کے پتر راجکمار آنند کا گورو ہے' دروازے کی ڈیوڑھی میں چار غلام سادھو وشال داس کی سنہری چھتر والی پالکی کے پاس تیار کھڑے تھے' سادھو بڑی شاہانہ اور مغرور چال چلتا پالکی میں بیٹھ گیا تو پالکی شہر کی طرف روانہ ہو گئی۔

کہنے کو تو سادھو وشال داس کی کٹیا ایک جوگیانہ کٹیا تھی مگر اس کے اندر آرام و آسائش کا ہر سامان موجود تھا۔ قالین کا فرش بچھا تھا۔ ایک پلنگ پر مرگ چھالا سنہری گوٹ والے تکیے لگے تھے۔ سادھو کے لیے صبح و شام شاہی باورچی خانے سے کھانا تیار ہو کر آتا تھا۔ سورج نکلنے کے بعد راجکمار اشنان کر کے شاہی لباس زیب تن کیے آ کر سادھو وشال داس کو ادب سے جھک کر پرنام کرتا اور پھر سونے کی چوکی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا۔ سادھو وشال بڑی شفقت سے اسے ویدوں کا درس دینے لگتا۔ ایک گھنٹے بعد راجا کے خاص محافظ آ کر راج کمار کو پالکی میں بٹھا کر واپس شاہی محل میں لے جاتے۔ کبھی کبھی راجا' سادھو وشال کو اپنے محل میں بٹھا کر اپنے ساتھ کھانا کھلاتا۔ سادھو وشال دزدیدہ نظروں سے رانی کاروشی کا حسن و جمال کا نظارہ کرتا اور دل مسوس کر رہ جاتا۔

لیکن وہ اب بڑا خوش خوش اپنی کٹیا میں داخل ہوا تھا۔ اس کے خطرناک منصوبے کا سب سے مشکل مرحلہ طے ہو گیا تھا ایک بد روح اس کے قابو میں آ گئی تھی جس سے وہ اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا تھا۔ سادھو وشال نے بانس کی وہ ڈبیا جس میں بھارتہ کی وہ بد روح بند تھی تھیلے سے نکال کر صندل کے ایک صندوق میں بند کر کے رکھ دی۔ اس نے لباس تبدیل کر کے قیمتی دوشالہ رشیوں کے انداز میں' اوڑھا' ماتھے پر سیندور کا نیا ترشول نما ٹیکہ لگایا اور جھونپڑی کے باہر تلسی کے چبوترے کے پاس بچھے چاندی کے پایوں والے تخت پر بیٹھ کر بانس کی شاخوں پر لکھے ہوئے وید کے اشلوکوں کا مطالعہ کرنے لگا۔

یہ اس سادھو کا سب کچھ دکھاوا ہی تھا جب سے وہ اس محل میں شاہی اتالیق مقرر ہوا تھا اور اس نے رانی کاروشی کو دیکھا تھا اس کا من بھگوان کے گیان دھیان سے اچٹ گیا تھا شیطانی خیالات نے اس کے دل میں گھر کر لیا تھا اور وہ چوبیس گھنٹے رانی کاروشی کو حاصل کرنے کی ادھیڑبن میں ہی رہتا تھا۔

موسم خوشگوار تھا' کیاریوں میں گیندے اور گلاب کے پھول کھلے تھے۔ دھوپ میں
ابھی حدت نہیں آئی تھی یہ چیت وساکھ کا موسم تھا شاہی باغ کے آموں پر بور آ چکا تھا او
اس پر بھونرے منڈلا رہے تھے سادھو وشال کی آنکھیں وید کے پتروں پر لگی ہوئی تھیں' مگر
من میں رانی کاروشی کا سراپا بسا ہوا تھا۔ وہ اسے کئی زاویوں سے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں پشپ
شاہی کنیز' تھال میں چندن اور ناریل لے کر حاضر ہوئی اور عرض کی کہ مہاراج نے یاد کی
ہے۔

ساد ھو وشال بڑا خوش ہوا کیونکہ اس بہانے اسے رانی کاروشی کے قریب ہونے
موقع مل رہا تھا اس نے پشپا کنیز کو آشیر واد دی اور شاہی محل کی طرف چل دیا۔ نیک دل
راجا محل کے پائیں باغ میں شاہی چھتر کے نیچے رانی کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ دو کنیزیں
پیچھے مور چھل ہلا رہی تھیں۔ ساد ھو وشال نے جاتے ہی ہاتھ بلند کرکے راجا کو آشیرواد دی
راجا نے اٹھ کر ساد ھو کا خیر مقدم کیا اور اپنے سامنے کرسی پیش کی۔ ساد ھو نے رانی پر ایک
دزدیدہ نگاہ ڈالی۔

رانی کاروشی نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ ساد ھو وشال اس کو کبھی کبھی عجیب سی
نظروں سے دیکھتا ہے مگر اس نے کوئی خیال نہ کیا تھا۔ اس لیے کہ رانی ایک تو بے حد وا
شعار اور پاکیزہ خیالات والی عورت تھی' دوسرا ساد ھو وشال ایک عالم اور گھنی رشی منی تھا او
راج کمار کو بڑی محنت سے وید پڑھا رہا تھا۔

راجا نے مسند سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "مہا راج! ہمارا راجکمار ویدوں کے کتنے
ادھیائے پڑھ چکا ہے؟"۔

ساد ھو وشال بولا۔ "مہار راج میں اسے رگ وید کے بارہ ادھیائے کی تفسیر پڑھا چکا
ہوں۔"

راجا خوش ہوا' رانی نے پوچھا۔ "مہا راج! آپ یہاں خوش ہیں نا؟"

ساد ھو وشال نے ایک گہری نگاہ رانی پر ڈالی اور کہا۔ رانی صاحبہ آپ کی کرپا سے
میں یہاں ہر طرح سے خوش ہوں۔ میرا تو کسی دوسری سلطنت میں جانے کو دل ہی نہیں
چاہتا۔"

راجا بولا " مہاراج ہم بھی آپ کو جدا نہیں کرنا چاہتے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے
کہ آپ جیسا گیانی دھیانی رشی ہمارے بیٹے کی ذہنی تربیت کر رہا ہے۔" کچھ دیر باتیں کرنے
کے بعد راجا نے ساد ھو وشال کو رخصت کر دیا۔

اپنی کٹیا میں آکر ساد ھو وشال کا من بے چین سا ہونے لگا۔ آج رانی کاروشی اسے

بے حد حسین لگی تھی۔ ساد ھو وشال نے اسی رات اپنے خطرناک منصوبے پر عمل کرنے کا
فیصلہ کر لیا۔

جب سورج محل کے پیچھے پہاڑیوں میں غروب ہو گیا اور شہر کے باغوں اور کھیتوں پر
شام کا سرمئی اندھیرا دھیرے دھیرے اترنے لگا تو ساد ھو وشال اپنی کٹیا میں آ کر بیٹھ گیا اور
دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر صندوق میں سے بھارتہ بد روح والی بانس کی ڈبیا نکال کر
اپنے سامنے رکھی آبنوس کی سیاہ چوکی پر رکھا اور کالے علم کے کچھ منتروں کا جاپ کرنے کے
بعد بولا "اے بد روح! اب میری بات غور سے سن - میں تمہیں وہ کام بتاتا ہوں جس کی
خاطر میں نے تمہیں اپنے قابو میں کر رکھا ہے۔"

راجا بھارتہ کی بدروح کو ساد ھو وشال کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اگرچہ وہ
چھوٹی سی ڈبیا میں بند تھی تاہم اسے تنگی کا احساس نہیں تھا کیونکہ ویدوں میں لکھا ہے کہ آتما
اپنے حجم میں ایک ننھے سے نقطے کا دس ہزارواں حصہ ہوتی ہے۔

ساد ھو وشال نے کہا۔ "بھارتہ کی روح! کیا تو میری آواز سن رہی ہے؟"

بد روح خاموش آواز میں گویا ہوئی مگر ساد ھو نے اس کی آواز سن لی' "میں سن رہا
ہوں مہاراج! "ابھی تک بھارتہ کی روح کو یہ علم نہیں تھا کہ یہ ساد ھو اس سے کیا کام لینا
چاہتا ہے' مگر اتنا اسے ضرور معلوم تھا کہ یہ بد طینت شخص اس سے کوئی برا کام ہی کروائے
گا۔

ساد ھو وشال بولا۔ "غور سے سن۔ تمہیں آج رات شاہی محل میں راجا کی خواب
گاہ میں جانا ہوگا۔ وہاں تمہیں راجا اپنے عالی شان پلنگ پر محو خواب نظر آئے گا وہ بے خبر
ہوگا تم اس کے سانس کے ساتھ اس کے جسم میں داخل ہو کر اس کے شعور اور روح پر
قبضہ کر لو گے۔"

بھارتہ کی بوجھل روح سناٹے میں آ گئی۔ یہ بدخصلت ساد ھو' راجا کو شاید موت کے
گھاٹ اتارنے کی سازش کر رہا تھا۔ بد روح نے کہا مہار راج آپ مجھے راجا کے جسم میں
کس لیے داخل کر رہے ہیں یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔ کیونکہ میری روح کا بوجل پن
راجا کی نیک روح کو آہستہ آہستہ بے حس کر دے گا۔"

ساد ھو کی آنکھیں طیش سے سرخ ہو گئیں۔ اس نے گرج کر کہا۔ "تم کون ہوتے
ہو آگے سے سوال کرنے والے؟ تم میرے معمول ہو میں تمہارا آقا ہوں۔ تم میرے قبضے
میں ہو میرے منتروں میں جکڑے ہوئے ہو میں اگر چاہوں تو تمہیں پاتال کی دہکتی آگ میں
جھونک دوں جہاں لاکھوں برس تک تم آگ میں جلتے رہو گے۔"

راجا بھارتہ کی بدروح لرز گئی۔ بھارتہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے طور پر ادھر ادھر حرکت تک نہیں کر سکتا اور اس کی روح سادھو وشال کے منتروں میں جکڑی ہوئی ہے اور وہ اسے کسی جوالا مکھی میں بھی دھکیل سکتا ہے بھارتہ کی روح کھولتے، پگھلتے، سسکارتے، لاوے میں جلنے کے خیال ہی سے کانپ اٹھی۔ اس نے کہا۔ "مہاراج! مجھے شما کر دیں، مجھ سے بھول ہو گئی۔"

سادھو وشال بولا۔ "خبردار آئندہ سے اگر تم نے میری بات کاٹی تو میں تمہیں پاتال کے نرگ میں جھونک کر کسی دوسری بد روح کو اپنے قابو میں لے آؤں گا۔"

بھارتہ کی بد روح تو پہلے ہی عذاب میں تھی اس میں مزید عذاب اٹھانے کی ہمت نہیں تھی، اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ مہاراج! میں ایسا نہیں کروں گا۔ آپ مجھے حکم دیجئے کہ مجھے آپ کی کیا سیوا کرنی ہوگی"؟

سادھو وشال کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ نمودار ہوئی بولا تم سوتے میں راجا کے سانس کے ذریعے اس کے جسم میں داخل ہو کر اس کے دل کے گرد لپٹ جاؤ گے میں تمہیں ایک منتر بتاؤں گا تم سات روز تک اس منتر کو پڑھ کر راجا کے دل کے گرد اپنے حلقے کو تنگ کرتے جاؤ گے آٹھویں روز راجا کی روح اس کے دل سے نکل جائے گی اور راجا مر جائے گا۔ اس کے بعد میں راجا کی لاش پر آؤں گا اور تمہیں واپس اپنے پاس لے آؤں گا۔ اب تم وہ ہلاک کر دینے والا منتر غور سے سنو جسے تم سات روز راجا کے دل کے گرد لپٹے ہوئے پڑھو گے۔"

راجا بھارتہ کی بد روح سناٹے میں آگئی تھی بھارتہ ایک گناہگار ترین جنم گزار چکا تھا اور اب وہ کوئی ایسا برا کام نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے اس کا اگلا جنم خراب ہو۔ سادھو وشال اسے راجا کو قتل کرنے کے لیے بھیج رہا تھا جو انتہائی گھناؤنا گناہ تھا بے وجہ کسی کی جان لینا ویدوں میں سب سے بڑا گناہ بتایا گیا ہے لیکن وہ مجبور تھا۔ وہ بدکردار سادھو وشال کے قبضے میں تھا اس کی بدروح سادھو کے تابع ہو چکی تھی یہاں تک کہ بھارتہ کی بدروح کے شعور میں نیکی اور سادھو سے بغاوت کا خیال بھی بڑی مشکل سے آتا تھا۔

سادھو وشال کی آواز بلند ہوئی۔ منتر کو غور سے سنو اور پھر اس نے پانچ حروف پر مشتمل سنسکرت کا ایک منتر پڑھا راجا بھارتہ نے یہ عجیب و غریب منتر پہلے کبھی نہیں سنا تھا لیکن یہ ہلاکت خیز شر آلود منتر اسے ایک سیکنڈ میں یاد ہوگیا۔ " اب اسے دہراؤ۔" سادھو نے حکم دیا۔

بھارتہ کی روح بے اختیار ہو چکی تھی اس کی قوت ارادی سلب ہو کر سادھو وشال

کے ارادے میں جذب ہو گئی تھی - بھارتہ کی بدروح نے خطرناک منتر دہرایا تو سادھو وشال خوش ہو کر بولا۔

"شاباش! اب اس منتر کو اچھی طرح سے یاد کر لو، تمہیں آج آدھی رات کے بعد راجا کی خواب گاہ کی طرف جانا ہوگا۔"

جب رات گہری ہو گئی اور شہر میں سناٹا چھا گیا تو سادھو وشال نے بھارتہ کی بد روح والی ڈبیا کا منہ کھول دیا ڈبیا کے اندر سے بھارتہ کی بوجھل روح آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھ آئی وہ سوائے سادھو وشال کے اور کسی کو دکھائی نہیں دے سکتی تھی۔ بدروح کا رنگ نسواری دھوئیں کی ایک بالشت بھر کی لہر کی طرح تھا جو بے معلوم انداز میں حرکت کر رہی تھی۔

اب جاؤ اور راجا کی خواب گاہ میں جا کر اس کے جسم میں داخل ہو جاؤ میرے منتر تمہاری راہنمائی کریں گے تم راجا کے جسم میں داخل ہوتے ہی اس کے دل سے لپٹ کر خاص آتشی منتر کا جاپ شروع کر دو گے اور اپنے حلقے کو تنگ کرتے جاؤ گے میں آٹھویں روز راجا کی لاش پر آکر تمہیں اس کے مردہ جسم سے نکال کر اپنے پاس لے آوں گا۔ تم میری حکم عدولی کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے۔ کیونکہ تم شعور کی ایک لہر ہو جو میرے اشارے پر حرکت کر رہی ہے۔ اب جاؤ۔"

راجا بھارتہ کی بدروح جیسے اپنے آپ ایک طرف کو روانہ ہو گئی اس کی رفتار بہت حد ست تھی۔ بدروح کے شعور میں چونکہ نیکی کے خیال کا ایک ہلکا سا شائبہ موجود تھا اس لیے وہ کالے علم کے منتروں میں جکڑے ہونے کے باوجود سادھو وشال کے برے عزائم کے خلاف بغاوت کے بارے میں ضرور سوچ رہی تھی برائی اگر طاقت ور ہوتی ہے تو نیکی میں بھی بہت طاقت ہوتی ہے۔ راجا بھارتہ کی بد روح تاریکی کے ایک سمندر میں سفر کر رہی تھی لیکن روشنی کا ایک ننھا سا روشن قطرہ بھی اس کے ساتھ ساتھ محو پرواز تھا۔

تاہم بدروح اپنے راستے سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتی تھی بدروح نے دیکھا کہ وہ کسی انجانی طاقت کے زیر اثر خود بخود راجا کے شاہی محل کی طرف چلی جا رہی ہے۔ شاہی محل کی خواب گاہوں اور دیوان خانوں پر اندھیرا چھا جاتا تھا۔ محل کے صرف برجوں اور بارہ دریوں میں شمعیں روشن تھیں۔

بھارتہ کی بد روح کے رہنمائی سادھو وشال کے منتر کر رہے تھے۔ بدروح اپنے آپ ایک سنگ مرمر کے جالی دار جھروکے کی طرف بڑھی۔ جھروکے کی دوسری جانب ریشمی قالینوں کے فرش والی غلام گردش تھی جہاں مسلح محافظ پہرہ دے رہے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی بھارتہ کی بدروح کو نہ دیکھ سکا..... بد روح بھاری بھرکم ریشمی پردوں کی ایک دیوار

میں سے گزری تو دیکھا کہ یہ راجا کی خواب گاہ ہے عالی شان کشادہ مسہریوں پر راجا اور رانی محو خواب تھے دونوں جانب دھیمی دھیمی کافوری شمعیں روشن تھیں۔ فضا میں عود و عنبر کی مہک رچی ہوئی تھی بدروح ایک لمحے کے لیے رک گئی۔ بھارتہ کو اس حقیقت کا شدت سے احساس تھا کہ ایک بار وہ نیک دل راجا کے جسم میں داخل ہو گیا تو پھر راجا کی موت یقینی ہو جائے گی۔ اگرچہ یہ احساس بے حد موہوم تھا لیکن چونکہ نیکی کا خیال تھا اس لیے اس میں اپنی طاقت اور جذبہ تھا۔

بھارتہ کی بدروح نے واپس جانے کا خیال کیا ہی تھا کہ جیسے اس کے شعور کی لہریں کسی شعلے کی لپٹ سے جھلس گئیں اور کسی نے اسے دھکیل کر راجا' رانی کی مسہری کے اندر داخل کر دیا۔ اب روح کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ وہ منتروں کی طاقت سے راجا کے چہرے کے قریب آ گئی راجا سوتے میں بڑا بھولا لگ رہا تھا۔ وہ بڑے سکون سے سو رہا تھا اور سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

بھارتہ کی بدروح کے شعور میں ایک طوفان بپا ہو گیا ایک لہر اسے راجا کے جسم سے پیچھے لے جاتی تو ہزاروں لاکھوں لہروں کا ایک ریلا اسے راجا کی طرف دھکیل دیتا اسی کش مکش میں اسے سادھو وشال کی کڑک دار آواز سنائی دی۔ "بھارتہ کی بد روح! میرے حکم سے راجا کے بدن میں داخل ہو کر اس کے دل سے لپٹ جا"۔ اور بھارتہ کی بدروح راجا کے اندر جاتے سانس کے ساتھ اس کے جسم میں داخل ہو گئی۔ انسانی جسم کی گھپ اندھیری رگوں کی سرنگوں میں سے اپنے آپ تیرتے ہوئے بدروح راجا کے دل کے پاس آ گئی اس نے دیکھا کہ گوشت کا ایک لوتھڑا دھڑک رہا ہے وہاں ایک شور سا مچا ہوا تھا بدروح کے شعور کی لہریں دو تین بار چکر کھا کر راجا کے دل کے اتنی قریب آ گئیں کہ اسے دل کے پردوں میں چھپی ہوئی راجا کی روح کی لہروں کا احساس ہونے لگا۔ راجا کی روح نے خطرے کے احساس کے پیش نظر مدافعت کی۔ بدروح پیچھے ہٹ گئی۔ بھارتہ خود بھی یہی چاہتا تھا وہ مزید پیچھے کھسکنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اسے ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ حالت بے اختیاری میں راجا کے دل سے لپٹ گیا۔

بد روح کے لپٹتے ہی راجا کا دل دو تین بار زور زور سے دھڑکا راجا نے ہڑ بڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ رانی اس کے پاس لیٹی نیند کے مزے لے رہی تھی۔ راجا کو دل میں کچھ بے چینی سی محسوس ہوئی اس نے چاندی کی تپائی پر رکھے سونے کے پیالے میں پانی کا ایک گھونٹ پیا مگر دل کی بے چینی کم نہ ہوئی۔ راجا نے آہستہ سے رانی کو جگایا۔ راجا کو بے چین اور اپنے دل پر ہاتھ رکھے دیکھ کر رانی بھی پریشان ہو گئی۔

کیا بات ہے مہاراج! آپ خیریت سے تو ہیں؟"

راجا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں کاروشی! شاید کوئی برا خواب دیکھا ہے میں نے"

مگر راجا کے دل کی گھبراہٹ کم نہ ہوئی۔ رانی نے فوراً کنیز خاص کو بلوا کر شاہی طبیب کو طلب کرنے کا حکم دیا شاہی طبیب فوراً خواب گاہ میں حاضر ہو گیا۔ رانی نے راجا کا سر تھام رکھا تھا۔ شاہی طبیب نے فوراً کنول کے پھولوں کا عرق منگوا کر راجا کو پلایا۔

"مہاراج کبھی کبھی معدے پر دباؤ پڑنے سے ایسا ہو جاتا ہے بھگوان کی کرپا سے آپ بالکل صحت مند ہیں۔"

کنول کا مشروب پینے سے راجا کی طبیعت ذرا سنبھل گئی' اس نے شاہی طبیب کو رخصت کر دیا اور رانی کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا "کاروشیا! پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ لگتا ہے رات' میں نے دعوت میں مچھلی کچھ زیادہ ہی کھا لی تھی۔

رانی کاروشی نے راجا کے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور کہا "بھگوان آپ کو سدا سلامت رکھے۔ آپ میرا سہاگ ہیں' جب تک میں آپ کی داسی' زندہ ہوں آپ کو کبھی کچھ نہیں ہو گا۔"

راجا کو نیند آنے لگی' وہ سو گیا اس کے دل کے گرد لپٹی بھارتہ کی بدروح نے ابھی شرانگیز مہلک منتر کا جاپ شروع نہیں کیا تھا بدروح منتر شروع کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ اسے شیطان سیرت سادھو وشال کی گرج دار آواز سنائی دی۔

"جو منتر میں نے تمہیں بتایا ہے اس کا جاپ شروع کر دو۔ میرے حکم سے اس کا جاپ شروع کر دو"۔ اور بد روح نے منتر پڑھنا شروع کر دیا راجا کی روح تڑپ کر دل کی سطح پر آ گئی' لیکن بد روح کی بوجھل لہریں ایک دیوار بن کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ بھارتہ کی بدروح نہیں چاہتی تھی کہ راجا کی روح دل سے باہر نکلے اور راجا مر جائے لیکن سادھو وشال کے منتروں کے زور سے بدروح ایک طرف کو کھسک گئی۔

راجا کی روح دل کی سطح پر دوبارہ آئی لیکن واپس چلی گئی۔ بد روح کے منتر تیز ہو گئے بھارتہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی جگہ کوئی زبردست طاقت اس منتر کا جاپ کر رہی تھی۔ نیکی کا شعور بدروح کی گناہ آلود تاریکی میں ابھی تک روشن اور زندہ تھا اور گناہ کے اندھیرے کو روشن کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھا' نیکی اور بدی کی طاقتوں میں گویا جنگ ہو رہی تھی۔

پچھلے پہر راجا کا دل پھر بے چین ہو گیا۔ وہ بستر پر اٹھ بیٹھا رانی کاروشی بھی پریشان

ہو کر جاگ پڑی شاہی طبیب فوراً" حاضر ہو گیا اس نے دوسرے طبیبوں کو بھی بلا لیا اور راجا کی تیمار داری شروع ہو گئی۔ سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی راجا علیل ہے۔ رعایا سوگ میں ڈوب گئی مندروں میں پرارتھنا ہونے لگی لنگر کھل گئے محل کے دروازے پر دان دیا جانے لگا۔ سادھو وشال ان حالات سے بے حد خوش تھا۔ بدروح اس کے منصوبے پر بخوبی عمل کر رہی تھی۔

سادھو وشال بھی بظاہر پریشانی کے عالم میں راجا کے پلنگ کے پاس چوکی پر بیٹھا راجا کی صحت کے لیے ویدوں کی خاص دعائیں پڑھ رہا تھا۔ رانی کا چہرہ اداس تھا مگر سادھو وشال کو اس اداسی میں بھی رانی کاروشی بے حد حسین دکھائی دے رہی تھی اس نے دل میں کہا۔ کاروشی! بہت جلد تو میری ہو جائے گی تیرے راجا کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد میں تیرے راجکمار کی روح پر قبضہ کر لوں گا۔ راجا نے اپنی آنکھیں کھول کر سادھو وشال کی طرف دیکھا اور کمزور آواز میں کہا "مہاراج! آپ علم جوتش کے بھی ماہر ہیں' ہمارا زائچہ بنا کر دیکھیں کہ یہ روگ ہمیں کیوں لگا اور اس کا انجام کیا ہوگا؟"

سادھو وشال کو سب معلوم تھا کہ راجا کو کون سا روگ لگا ہے اور اس کا انجام کیا ہونے والا ہے پھر بھی اس نے راجا کے حکم پر فوراً زائچہ بنایا اور زائچے کو غور سے دیکھا..... سادھو وشال نے غلط زائچہ بنایا تھا اس نے مسکرا کر دیکھا اور بولا۔ "مہاراج کو بدھائی ہو' زائچہ بڑا مبارک ہے۔"

رانی کا تو چہرہ کھل اٹھا۔ راجا نے پوچھا۔ "ہم اچھے ہو جائیں گے نا؟"

سادھو وشال مکاری سے بولا "کیوں نہیں مہاراج آپ کا زائچہ بتا رہا ہے کہ آپ کو بہت جلد صحت مل جائے گی۔ اس وقت آپ کے دل پر ایک نحس سیارے کا اثر ہے لیکن یہ اثر میرے منتروں کی جاپ سے دور ہو رہا ہے۔ سورج دیوتا کالے بادلوں کے پیچھے سے نکل رہا ہے آپ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔" رانی کاروشی نے اس وقت اپنا بیش قیمت موتیوں کا ہار اتار کر سادھو وشال کو انعام میں دیا اور ہاتھ باندھ کر بولی "مہاراج! آپ رشی منی ہیں۔ دیوتا آپ کے قریب ہیں۔ میرے پتی دیو اچھے ہو جائیں میں آپ کا منہ موتیوں سے بھردوں گی۔"

سادھو وشال نے رانی کاروشی کی طرف دیکھا اور کہا' "رانی دیوی! آپ چنتا نہ کریں مہاراج کو بھگوان جلد اچھا کر دیں گے اور میرے لیے یہی سب سے بڑا انعام ہوگا۔"

سادھو وشال اجازت لے کر واپس اپنی کٹیا میں آگیا۔

اس نے کالے منتر کا ورد کیا اور آنکھیں بند کر کے بھارتہ کی بدروح کی طرف

دھیان کیا۔ اس نے دیکھا کہ بدروح رک رک کر منتر پڑھ رہی ہے اور راجا کے دل کے گرد اس کا حلقہ تنگ نہیں ہے۔ سادھو وشال غصے سے سرخ ہو گیا وہ سمجھ گیا کہ بھارتہ کی بدروح کے شعور میں نیکی کا ارادہ ابھی تک زندہ ہے اور وہ پاپ کے کرم سے گریز کر رہی ہے اور سادھو وشال یہ نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے ایک تیز منتر پڑھ کر بدروح کو مخاطب کیا۔

بھارتہ کی بدروح کے کسی کونے میں سمایا ہوا نیکی کا خیال برے خیالوں کو شکست دینے کی جانکاہ جدوجہد میں لگا ہوا تھا کہ اسے سادھو وشال کی آواز سنائی دی۔ "بھارتہ کی بدروح! تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی تیرے شعور میں میرے خلاف بغاوت کرنے کا خیال ہے اسے نکال باہر پھینک نہیں تو تیرا ٹھکانہ پاتال کا کھولتا ہوا جنہم ہوگا' چل میرے حکم سے راجا کے دل کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرنا شروع کر۔"

بھارتہ کی بدروح نے ایسا ہی کیا اور راجا کے دل کے گرد حلقہ تنگ ہونے لگا۔ راجا کا دل تیز تیز دھڑکا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ محل میں کہرام مچ گیا۔ دربار کے سارے طبیب جمع ہو گئے ' رانی کاروشی کے آنسو نہیں تھمتے تھے راجکمار آنند کو وزیر اعظم کی بیگم نے سنبھال رکھا تھا ایک پہر کے بعد راجا کو ہوش آگیا یہ اس لیے کہ بھارتہ کی بدروح کا نیک خیال ایک لمحے کے لیے غالب آگیا تھا اور اس نے راجا کے دل کے حلقے کو ڈھیلا کر دیا تھا۔ جب راجا کو ہوش آیا تو سادھو وشال راجا کے پلنگ کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ راجا کو ہوش میں آتے دیکھ کر اسے تشویش ہوئی اوپر سے اس نے راجا کو بدھائی دی اور حوصلہ دلایا کہ منحوس سیارے کا اثر دور ہو رہا ہے لیکن دل میں وہ پریشان ہو گیا اس نے راجا کے پلنگ کے پاس بیٹھے بیٹھے گیان دھیان کے بہانے آنکھیں بند کر لیں اور بھارتہ کی بدروح کو حکم دیا۔

تم مجھے شکست نہیں دے سکو گی' اے بدروح! تم میرے حکم کی پابند ہو تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گا۔ راجا کے دل کو جکڑ لو' جکڑ لو اور منتر پڑھتی چلو۔"

بھارتہ کی بدروح سادھو کے جبر میں تھی اس کے شعور کا نیک خیال سمٹ کر بہت پیچھے چلا گیا بھارتہ کی بدروح نے ہلاکت خیز منتر پڑھتے ہوئے راجا کے دل پر دباؤ بڑھا دیا۔ راجا تڑپ کر اٹھا اور دوہرا ہو کر پھر بے ہوش ہو گیا یہ حالت تین روز تک جاری رہی۔ راجا تھوڑی دیر بعد بے ہوش ہو جاتا تھا اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا رانی کاروشی کی حالت اس سے بھی بدتر تھی سوریہ دیوتا کی مورتی کے آگے سجدہ ریز ہو کر وہ گڑگڑا کر دعائیں مانگتی۔ خیرات کے لیے شاہی خزانے کا منہ کھول دیا گیا تھا۔ مندروں کی گھنٹیاں دن بھر بجتی رہی تھیں۔ رعایا سوگوار تھی۔ ہر گھر میں راجا کی سلامتی کی دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔

ساتویں دن کی رات آگئی یہ قیامت کی رات تھی اسی روز آدھی رات کے بعد راجا

کی موت واقع ہونے والی تھی۔ بھارتہ کی بدروح کا نیک خیال گناہ کی تاریکیوں کو چاک کرنے کی سرتوڑ کوششوں میں لگا تھا۔ یہ اصل میں بھارتہ ہی تھا جو اپنے پچھلے جنم کا کفارا ادا کرنے کی کوشش میں تھا مگر سادھو وشال کے کالے علم کا منتر بھی برابر اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ راجا کی حالت نازک ہوگئی۔

رات کے پہلے پہر اس پر نزع کا عالم طاری ہوگیا۔ سارا محل سوگ میں ڈوب گیا۔ رانی کاروشی کے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔ وہ بھگوان کی مورتی کے آگے سر بسجود تھی۔ شاہی طبیب راجا کی جان بچانے میں لگے تھے سادھو وشال اپنی کٹیا میں بیٹھا بھارتہ کی بدروح کی کمان کر رہا تھا۔

بھارتہ کی بد روح کا ایک غالب حصہ راجا کو مارنے پر تلا ہوا تھا۔ اس کی روح کا نیک خیال راجا کی جان بچانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ بہت جلد بھارتہ کی روح کو احساس ہو گیا کہ سادھو وشال اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو جائے گا اور راجا کا آخری وقت آ پہنچا ہے بھارتہ کی بدروح میں چھپے ہوئے نیک خیال نے اپنا رخ آکاش کی طرف کیا اور بھارتہ کی بد روح نے بے اختیار بھگوان کو پکارا۔

اس کی پکار پر روشنی کی ایک سنہری لکیر راجا کے ڈوبتے ہوئے دل کی سطح پر ابھری اور بھارتہ کی بد روح نے دیکھا کہ اس کی دوست مایا کا چہرہ نمودار ہوا ہے۔

بھارتہ کی روح نے بے اختیار ہو کر مایا کو آواز دی۔ "مایا! تونے اور پدم ناگ نے مصیبت کے وقت میری مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا تم لوگ مجھے چھوڑ گئے' اس لیے میں پاپی ہو گیا تھا مگر اس نیک دل راجا نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ اس کو موت کے منہ میں کس لیے جھونکا جا رہا ہے؟"

مایا کا چہرہ سنجیدہ تھا اس نے سرگوشی میں کہا "بھارتہ عاطون تجھے تیرے برے کرموں کی سزا مل رہی ہے۔ یہ سزا تمہیں بھگتنی ہی ہوگی۔"

بھارتہ کی روح نے کہا۔ "میری بہن مایا مگر اس راجا کو اس کے کس برے کرم کی سزا مل رہی ہے؟ یہ تو نیک راجا ہے"

مایا نے کچھ دیر سکوت کیا راجا کی نبض زائل نہیں ہو سکتی شیطانی سادھو وشال کے منتروں کا اثر بھی زائل نہیں ہو سکتا لیکن تمہارے دل میں موجود نیک خیال ابھی تک زندہ ہے گگن منڈل کے دیوتا نے حمایت کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور میں انہی کے حکم سے یہاں آئی ہوں۔"

بھارتہ کی روح نے کہا۔ "لیکن مایا! میرا اختیار وشال سادھو کے منتروں نے سلب کر

لیا ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

مایا نے کہا۔ "بھائی عاطون! یہ تیرے برے کرموں کا بھوگ ہے۔ بدی کے منتروں کا اثر بھی ہو کر رہے گا۔ اب تو وہی کرے گا جو ہونی نے تیرے ہاتھوں سے ہونا لکھ دیا ہے لیکن اس کے بعد ہم راجا اور اس کی پاکباز رانی اور اس کے یوراج کو سنبھالیں گے پھر بدخصلت سادھو کو مقدس اشلوک کو انسانوں کی برائی کے لیے استعمال کرنے کا عذاب ملے گا۔ راجا تیرے ہی ہاتھوں میں مرے گا۔ میں تمہیں راجا کی چتا پر ملوں گی۔"

مایا کا سنہرا چہرہ راجا کے ڈوبتے ہوئے دل کی سطح پر سے غائب ہو گیا۔ بھارتہ کی بدروح نے دل کے گرد اپنے شکنجے کو مزید کسنا شروع کر دیا۔

راج محل میں کہیں کوئی چراغ روشن نہیں تھا۔ محل کے اہلکار سر جھکائے سوگ میں تھے راجا شاہی پلنگ پر آخری سانس لے رہا تھا اور پھر راجا نے دم توڑ دیا..... رانی کاروشی کی چیخ نے راجا کی موت کا اعلان کر دیا ہر کسی کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ کنیزوں نے اپنے بالوں میں راکھ ڈال لی۔ رانی کاروشی نے چوڑیاں توڑ ڈالیں' شاہی پروہت نے اس کی مانگ کا سیندور بکھیر دیا ماتھے کا سہاگ ٹیکہ مٹا دیا اور راجکمار مردہ باپ کی پائینتی پر سر جھکا کر سسکیاں بھرنے لگا۔

سادھو وشال کی مراد بر آئی تھی۔ وہ دکھاوے کے لیے رو رہا تھا مگر اس کا دل خوشی سے اچھل رہا تھا راجا کو اس نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا رانی کاروشی تک اس کا راستہ صاف ہو گیا تھا برہمن' راجا کی لاش کے گرد بیٹھے ویدوں کا پاٹھ کر رہے تھے۔ لاش کے سرہانے لوبان سلگ رہا تھا۔ رانی بال کھولے سر جھکائے اپنی خواب گاہ میں ساکت بیٹھی تھی کنیزیں اسے تسلی دینے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

سادھو وشال' راجا کی لاش پر اشلوک پڑھ کر تھوڑی تھوڑی دیر بعد پھونک مارتا اور آنکھیں بند کر لیتا۔ بھارتہ کی بد روح ابھی تک راجا کے مردہ دل سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ خود کو مردہ جسم سے باہر نکال سکتا۔

سادھو وشال اس موقعے کی تلاش میں تھا کہ لاش اکیلی رہ جائے تو وہ بدروح کو اس کے اندر سے نکال کر ڈبیا میں بند کرے مگر راجا کی لاش کو برہمنوں نے گھیر رکھا تھا اور باہر سپاہی پہرہ بھی دے رہے تھے۔ سادھو نے سوچا کہ اب ایک ہی صورت ہے کہ جب راجا کو چتا پر آگ دکھائی جانے لگے تو وہ پھیرے لگاتے ہوئے بد روح کو نکال لے رات گزر گئی۔ دوسرے روز لاش کو خواب گاہ سے نکال کر سرکاری اعزاز کے ساتھ غسل دیا گیا۔ غسل دیتے وقت بھی راجا کے تمام رشتے دار وہاں پر موجود تھے۔ سادھو وشال کو یہاں بھی موقع نہ

ل سکا شام ہوئی تو شاہی محل میں صرف لاش کے پاس دو چراغ روشن کیے گئے سارا ش
تاریکی میں ڈوبا ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔

اس وقت گگن منڈل کے دیوتاؤں نے اندر کے حضور پرارتھنا کی اور اندر دیوتا کے
حکم سے بادل گھر گھر کر آئے اور بارش شروع ہوگئی۔ راجا کی لاش چھتر والی ارتھی پر ڈال
شاہی مرگھٹ کی طرف روانہ ہوئی۔ پیچھے ایک ہجوم بارش میں اشکبار بین کرتا چلا جا رہا تھا
سادھو وشال ارتھی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

مرگھٹ کے اونچے مچان پر چتا تیار تھی چندن کی لکڑی کو کیسر میں بھگو دیا گیا تھا
راجا کی لاش چتا پر رکھ کر اس پر لکڑیاں چن دی گئیں۔ بارش کی وجہ سے انتم سنسکار م
دیر ہوگئی اس وقت سادھو وشال نے اپنی طرف سے انتہائی چالاکی اور موقع شناسی سے کا
لیتے ہوئے اعلان کیا کہ بارش کے رکنے کا انتظار کیا جائے گا۔ اس لیے لوگ مرگھٹ ک
کوٹھریوں میں جا کر بارش کے رکنے کا انتظار کریں۔ برہمن' پروہت اور دوسرے لوگ
مرگھٹ میں بنی ہوئی کوٹھریوں میں چلے گئے' کچھ دیر کے لیے سادھو وشال بھی ان کے ساتھ
ہی چلا گیا۔

راجا کی لاش اکیلی رہ گئی یہ سب کچھ دیوتاؤں کی مرضی کے مطابق ہو رہا تھا کیونکہ
مایا نے بھارتہ عاطون کے دل میں پرورش پانے والی نیکی احساس کا واسطہ دے کر اس کی مد
کرنے کی درخواست کی تھی۔ بارش اور تیز ہوگئی چتا کو چاندی کے چھتر سے ڈھانپ دیا گیا
تھا مرگھٹ کے بڑے برآمدے میں روغنی مشعلیں روشن کر دی گئیں۔ لوگ کوٹھریوں میں سر
جھکائے بیٹھ گئے اور بارش کے رکنے کا انتظار کرنے لگے۔

سادھو وشال' شاہی خاندان کے افراد کو جھوٹے دلاسے دے رہا تھا کہ بھگوان کو یہ
منظور تھا' بارش اتنی تیز اور طوفانی ہو رہی تھی کہ وہ اکیلا لاش کے پاس جانے سے گریز کر رہا
تھا کہ کہیں شاہی خاندان کے رشتہ داروں اور برہمنوں کو شک نہ ہو کہ یہ اکیلا لاش کے
پاس کیوں گیا ہے۔ لیکن وہ اندر سے مطمئن تھا۔ راجا مر چکا تھا۔ اس کا راستہ صاف ہو چکا تھا
اور بدروح کو وہ تھوڑی دیر بعد بھی نکال سکتا تھا۔

مگر راجا کی لاش کے پاس کیا ہو رہا تھا؟ اس کی سادھو وشال کے فرشتوں کو بھی خبر نہ
تھی اندھیری رات اور طوفانی بارش میں چتا کے شاہی چھتر کے نیچے راجا کی لاش کے پاس ما
اور پدم ناگ موجود تھے مایا غیبی حالت میں تھی وہ کسی کو دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ پد
ناگ ایک سیاہ سانپ کی شکل میں پھن اٹھائے لاش کے سرہانے کنڈلی مارے بیٹھا تھا بھارتہ ک
روح راجہ کی لاش کے اندر اس کے خاموش اور ساکت دل سے لپٹی ہوئی تھی وہ کالے علم

کے طلسمی منتروں میں جکڑی ہوئی تھی اور اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتی تھی۔

دیوی مایا نے گورو گورکھ ناتھ کو یاد کیا اور اس کے حکم سے اپنے ہاتھ میں پکڑے
ہوئے ترشول کا رخ راجا کی لاش کی طرف کر دیا ترشول کی نوک سے روشنی کی ایک لہر نکل
کر راجا کی لاش سے ٹکرائی اس روشنی کو سوائے مایا دیوی اور پدم ناگ کے اور کوئی دیکھ نہ
سکا۔ اچانک چتا میں سے لاش کا ہیولا اوپر اٹھنے لگا یہ ہیولا راجا کے جسم کے برابر ہو بہو اس کا
نقشہ تھا۔ جبکہ راجا کی لاش چتا پر پڑی تھی۔ مایا دیوی نے پدم ناگ سے کہا۔

"پدم! میرے پاس آؤ۔"

پدم ناگ اچھل کر مایا دیوی کے کاندھے پر جا بیٹھا کیونکہ وہ مایا دیوی کو دیکھ سکتا تھا
راجا کی لاش کا ہیولا سمٹ کر روئی کے چھوٹے سے گالے کی طرح ہوگیا۔ مایا دیوی نے اسے
اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور فضا میں بلند ہو کر بارش اور اندھیرے میں مرگھٹ کے درختوں کے
اوپر اڑتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی یہ نیکی کی شکتی تھی جو نیکی کے لیے حرکت کر رہی تھی
اسے سادھو وشال کی بدکار نظریں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر میں بارش تھم گئی۔ برہمن' پروہت اور پنڈت لاش کے قریب آ
گئے۔ چتا کے اوپر سے شاہی چھتر ہٹا دیا گیا۔ سادھو وشال نے دیکھا کہ راجا کی لاش چتا کی
لکڑیوں پر ساکت پڑی تھی اس نے آخری پھیرے لگانے شروع کر دیئے وہ بلند آواز میں
اشلوک بھی پڑھ رہا تھا لیکن اندھیرے میں اس نے اپنے ایک ہاتھ میں چھوٹی ڈبیا پکڑ رکھی
تھی۔

بھارتہ کی بدروح لاش کے اندر موجود تھی۔ سادھو وشال نے تیسرے پھیرے پر
لاش کے قریب ہو کر بھارتہ کی بد روح کو سرگوشی میں حکم دیا کہ وہ لاش سے باہر نکل کر
واپس ڈبیا میں آ جائے۔ بھارتہ کی بدروح سادھو وشال کے حکم کی پابند تھی۔ اس کا حکم سنتے
ہی وہ راجا کے دل سے جدا ہوگئی۔ اور لاش کے منہ میں سے نکل کر سادھو وشال کی ڈبیا
میں آ کر بند ہوگئی۔ سادھو نے ڈبیا اپنی جیب میں رکھ لی۔

بھارتہ کی بدروح نے لاش کے اندر رہ کر دیکھ لیا تھا کہ راجا کا ایک دوسرا جسم اس
کے مردہ جسم سے علیحدہ ہو کر اوپر کو اٹھ رہا ہے۔ اسے مایا دیوی پر پورا بھروسہ تھا کہ یہ سب
کچھ اسی کے توسط سے گگن منڈل کے دیوتاؤں کی مدد سے ہو رہا ہے اور راجہ مر کر بھی زندہ
ہے۔ سادھو وشال نے راجکمار آنند کے ہاتھ میں مشعل دے دی۔ راجکمار نے اپنے پتا کی
چتا میں آگ لگا دیا۔

چتا کی لکڑیوں نے آگ پکڑ لی اور شعلے بلند ہونے لگے۔ برہمنوں کے بھجن' کیرتن

کی آوازیں بھی شعلوں کے ساتھ ہی بلند ہونے لگیں سادھو وشال کے چہرے پر گہرا اطمینان تھا' راجا کی لاش جل کر راکھ ہو گئی لوگ ساری رات چتا کے پاس موجود رہے۔ صبح کے وقت چتا ٹھنڈی ہوئی تو راجا کے بھبھول نکالنے کے لیے برہمن آگے بڑھے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ راکھ میں راجا کے جسم کی ایک بھی ہڈی نہیں تھی۔ پروہت نے چیخ کر کہا۔

"راجا کو دیوتاؤں نے اٹھا لیا ہے۔ وہ پھر واپس آئے گا۔" سادھو وشال نے چونک کر پروہت کی طرف دیکھا اور لپک کر چتا کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو راجا کی مرتیو ہوئی ہے۔"

پروہت نے کہا "مگر راجا کے بھبھول نہیں ہیں' یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ راجا مرا نہیں۔ اسے دیوتاؤں نے الوپ کر کے آکاش پر بلا لیا ہے۔ راجا زندہ ہے اور آکاش سے ضرور واپس آئے گا۔

دوسرے برہمنوں نے بھی پروہت کی تائید کی ہر طرف شور مچ گیا کہ راجا کی چتا میں اس کی ہڈیاں نہیں ملیں۔ راجا الوپ ہو گیا ہے۔ سادھو وشال چکرا گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے تو خود راجا کی لاش کو آگ لگتے دیکھا تھا۔ رانی کاروشی اور راجکمار آنند خوشی اور حیرت کے امتزاج میں گم تھے۔

رانی اپنے رشتہ داروں میں خاموش سر جھکائے بیٹھی تھی' شاہی پروہت نے آکر اسے ڈنڈوت کیا اور بولا۔ "مہارانی! آپ ستی ساوتری ہیں۔ آپ کے پتی دیو مہان ہیں۔ وہ مرے نہیں زندہ ہیں۔ شاستروں میں لکھا ہے کہ جس کو آکاش کے دیوتا پسند کرتے ہیں اسے تھوڑی دیر کے لیے بلا لیتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ منش مر گیا ہے۔ پرنتو وہ زندہ ہوتا ہے کیونکہ اس کے بھبھول چتا میں نہیں ہوتے۔ آپ کے راجا پتی کے بھی بھبھول نہیں ملے۔ وہ زندہ ہیں۔ وہ آکاش کے دیوتاؤں کے پاس ہیں۔ وہ ضرور واپس آئیں گے۔

رانی کاروشی کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ کبھی اسے پروہت کی بات کا یقین ہوتا اور کبھی سوچتی کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کیا خبر اس کے پتی دیو کبھی واپس نہ آئیں۔ چونکہ وہ ایک ہندو خاتون تھی' اس لیے اسے شاستروں پر بھی یقین تھا۔ اس اعتبار سے اس کے دل میں امید کی ایک کرن روشن ہو گئی کہ شاید اس کے سوامی دیوتاؤں کے پاس ہوں اور کسی روز اچانک واپس آ جائیں۔

دوسری طرف دیوی مایا اور پدم ناگ' راجا کے جسم کے ہیولے کو لے کر ہوا میں پرواز کرتے سات دریا پار ایک برف پوش پہاڑی کے غار میں آ گئے۔ دیوی مایا نے راجا کے ہیولے کو پھر سے انسانی لاش میں تبدیل کر دیا۔ پدم ناگ' دیوی مایا کے کاندھے سے اتر کر لاش کے پاس کنڈلی مارے بیٹھ گیا راجا کی لاش اپنے پورے خدوخال کے ساتھ مردہ حالت میں زمین پر پڑی تھی پدم ناگ نے دیوی مایا سے پوچھا۔ "مایا! ابھی راجا کو زندہ ہونے میں کتنی دیر لگے گی؟"

دیوی مایا نے کہا۔ "راجا کی لاش کو اس غار میں ایک ماہ پندرہ دن اسی طرح پڑے رہنا ہو گا۔ اس دوران راجا کی روح آکاش میں اپنے عارضی قیام کی مدت پوری کرنے کے بعد اپنے جسم کی تلاش میں یہاں آئے گی اور راجا کے جسم میں داخل ہو جائے گی۔" پدم ناگ بولا۔ "لیکن مایا! کیا یہ راجا کا دوسرا جنم ہو گا؟ کیونکہ راجا کی ایک لاش چتا میں ہی پڑی تھی۔"

دیوی مایا نے کہا۔ "پدم! تو سانپوں کا دیوتا ہے انسانوں کا علم تمہیں بہت کم ہے' سنو' ہر انسان کے دو جسم ہوتے ہیں ایک جسم چتا کے ساتھ جل جاتا ہے' دوسرا روح کی شکل میں آکاش کو روانہ ہو جاتا ہے شاستروں میں یہی بتایا گیا ہے مگر یہ راجا کا دوسرا جنم اس لیے نہیں ہو گا کہ گورو گورکھ ناتھ کے حکم سے ہم راجا کی چتا پر سے اس کے اصلی جسم کو اٹھا لائے ہیں۔ وہاں جس لاش کو لوگوں نے آگ لگائی وہ راجا کے جسم کا عکس تھا۔ اس کی شکل کا سایہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں چتا میں راجا کی لاش کے بھبھول نہیں ملے ہوں گے۔"

پدم ناگ نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو بدکردار سادھو وشال کو راجا کی موت کا یقین کیسے آئے گا؟"

دیوی مایا بولی۔ "اس نے بھی لاش کو دیکھا تھا۔ اس کے سامنے راجکمار نے راجا کی لاش کو آگ لگائی تھی' وہ کیسے اعتبار نہیں کرے گا؟ ہاں' اگر بھبھول نہیں بھی ملے تو سادھو کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسے یقین ہے کہ راجا مر چکا ہے اور یہی وہ چاہتا تھا۔" پدم ناگ نے پوچھا کہ سادھو وشال اب کیا قدم اٹھائے گا تو دیوی مایا نے کہا۔ "تمہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا کیونکہ ہم راجا کی لاش کو اس غار میں چھوڑ کر واپس راجا کے محل کی طرف جائیں گے تاکہ بھارتہ عاطوں کی بدروح کی جتنی مدد کر سکتے ہیں کریں۔" دیوی مایا نے پدم ناگ کے ساتھ مل کر راجا کی لاش کو پتھروں سے اچھی طرح ڈھانپ کر برف کے تودوں سے غار کا منہ بند کر دیا اور راج محل کی طرف چل پڑے۔ دیوی مایا غائب تھی۔ اس نے

پدم ناگ کو چھوٹے کالے سانپ کے روپ میں اپنی کلائی کے گرد لپیٹ رکھا تھا غیبی دیوی مایا کی کلائی سے لپٹنے کے بعد پدم ناگ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

راجا کے محل کے شاہی باغ کی ایک بارہ دری میں دیوی مایا اور پدم ناگ اتر پڑے یہاں رہ کر وہ سادھو وشال کی کارگزاریوں کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ دیوی مایا نے پدم ناگ کو ساتھ لیا اور سادھو وشال کی کٹیا میں آ گئی۔

سادھو کٹیا کے اندر نہیں تھا آبنوسی صندوق میں بھارتہ کی بد روح ڈبیا میں بند پڑی تھی۔ دیوی مایا کو بد روح کی موجودگی کا علم تھا۔ بھارتہ کی بدروح نے بھی دیوی مایا کی خوشبو محسوس کر لی تھی۔ دیوی مایا کا تصور کر کے بھارتہ کی روح نے کہا۔ "مایا! راجا زندہ ہے نا؟"

دیوی مایا آبنوسی صندوق کے قریب آ کر بولی۔ "ہاں' لیکن اسے سوا ماہ کے بعد ہوش آئے گا۔ یہ وقت اس کی روح کو گگن منڈل میں پورا کرنا ہو گا۔"

بھارتہ کی روح نے کہا "میں تمہیں ایک خطرناک بات بتانا چاہتا ہوں' مکار سادھو وشال اب مجھے راجکمار آنند کے جسم میں داخل کرنے والا ہے۔ وہ راجکمار آنند کو بستر مرگ پر ڈال کر پاکباز رانی کاروشی سے سودا کرنا چاہتا ہے' مایا! میں یہ پاپ نہیں کرنا چاہتا۔"

دیوی مایا نے کہا۔ " بھارتہ عاطون! تمہارے برے کرموں نے تمہیں ایک بد روح میں بدل دیا اور سادھو وشال کے جنمی منتروں نے تمہیں اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ تمہارے اندر نیکی کا خیال اتنا کمزور اور بے طاقت ہے کہ تم سادھو وشال کے حکم سے ذرا ادھر ادھر نہیں ہٹ سکتے۔"

بھارتہ کی روح نے کہا۔ "کیا میں اپنا پرا پشچت نہیں کر سکوں گا؟" دیوی مایا بولی۔ " یہ نیکی اور بدی کی طاقتوں میں جنگ ہے تم برائی کرنے پر مجبور ہو ہم نیکی کرنے کے پابند ہیں۔ تم اپنا کام کیے جاؤ۔ ہم اپنا فرض نبھاتے ہوئے تمہاری مدد کریں گے۔ اگرچہ اس میں یم دیوتا کی شکست ہے اور وہ ہمیں سراپ دے سکتا ہے لیکن ہمیں سنسار میں نیکی کی روشنی پھیلانے کے لیے یہ خطرہ مول لینا ہی ہو گا۔"

بھارتہ کی روح نے کہا۔ "کیا آکاش کے دیوتا ہماری مدد نہیں کریں گے؟"

دیوی مایا نے جواب دیا۔ "یہ کرم کانڈ ہے' پراکرتی کا قانون ہے قدرت کے اصول ہیں۔ روح مادے میں آکر ایک خاص ضابطے کے ساتھ عمل کرتی ہے کائنات کی ہر شے اس ضابطے کی پابند ہے۔ تم روح نہیں ہو تم ایک حصہ روح اور تین حصے مادہ ہو اس لیے تمہیں بد روح کہا جاتا ہے۔ یہ مادہ تمہارے اعمال کی وجہ سے تمہاری روح پر چھایا ہوا ہے دیوتا ان ضابطوں میں دخل نہیں دیتے۔ میں اور پدم ناگ ایک طرح سے کائنات کے ضابطے کے

خلاف کام کر رہے ہیں لیکن نیکی کی کمزور لہروں کو تقویت پہنچانے کے لیے ہم ایسا ضرور کریں گے۔ تم خاموشی سے اپنی فطرت کے مطابق کام کرتے جاؤ۔ موقع آنے پر ہم' تمہیں جو مشورہ دیں اس پر عمل کرنا۔" یہ کہہ کر دیوی مایا کٹیا سے چلی گئی۔ اس نے بارہ دری میں جا کر پدم ناگ کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا کہ سادھو وشال کے کیا عزائم ہیں اور پھر وہ راجا کی لاش کی دیکھ بھال کرنے راج محل کی بارہ دری سے برف پوش پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

سات دن گزرنے کے بعد رانی کاروشی نے یوگی کا لباس پہن کر راج پاٹھ کا کام سنبھال لیا تھا اسے اپنے پتی دیو کی طرح رعایا کا بہت خیال تھا چنانچہ وہ دربار لگا کر مقدموں کے فیصلے کرتی اور حق' حقدار تک پہنچاتی۔ راجکمار آنند اس کے پہلو میں تخت پر بیٹھا ہوتا۔
ایک روز رات کے وقت سادھو وشال نے بھارتہ کی بد روح کی ڈبیا کو نکال کر اسے اپنا نیا حکم سنایا۔

"اے بد روح! اب تمہیں میرا دوسرا حکم بجا لانا ہے۔ آج رات جب نصف شب کا گجر بجے گا تو' راج محل میں رانی کاروشی کی خواب گاہ میں جائے گی۔ راجکمار آنند اس کے پاس ہی سو رہا ہو گا۔ تم سانس کے ساتھ راجکمار آنند کے بدن میں داخل ہو کر اس کے دل سے چمٹ جاؤ گی۔ اس کے بعد تمہیں وہی کام کرنا ہو گا جو تم اس سے پہلے راجا کے لیے کر چکی ہو۔"

بھارتہ کی بدروح نے خاموشی سے سادھو کا حکم سنا۔ سادھو بولا۔ "تمہیں سات روز تک راجکمار آنند کے دل سے چمٹے چمٹے وہی منتر پڑھتے رہنا ہو گا اور آٹھویں روز راجکمار کے دل کو اپنے شکنجے میں کس دینا ہو گا مگر تم راجکمار کو ہلاک نہیں کرو گی بلکہ اسے نزع کی حالت میں ہی رکھو گی تاکہ میں رانی کاروشی سے معاملہ طے کر سکوں' اب میں جاتا ہوں' آدھی رات کو تمہیں نکال کر راج محل کی طرف روانہ کروں گا کیا تم سن رہی ہو؟"

بھارتہ کی روح بے بس تھی' اس نے کہا۔ "ہاں مہاراج! میں آپ کے حکم کے تابع ہوں۔ جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی کروں گا۔"

سادھو کٹیا سے نکل کر مرگھٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں اس نے ایک خاص چلہ کاٹا اور آدھی رات کے وقت کٹیا میں واپس آ کر بھارتہ کی بد روح کو ڈبیا سے نکال کر راج محل کی طرف روانہ کر دیا۔

بھارتہ کی روح نظر نہ آنے والے نسواری رنگ کے مرغولے کی شکل میں رانی کی خوابگاہ میں داخل ہو گئی شمع کی دھیمی روشنی عالی شان خوابگاہ میں پھیلی تھی رانی کاروشی کے

پاس ہی اس کا اکلوتا بیٹا راجکمار آنند بے خبر سو رہا تھا۔ رانی کاروشی بھی گہری نیند میں تھی بھارتہ کی بدروح کے اندر نیکی کی طاقت نے اسے روکا مگر برائی کا عمل اس قدر تیز اور طاقتور تھا کہ بدروح بے اختیار اور بے بس ہو کر راجکمار کی سانس کے ساتھ اس کے جسم میں چلی گئی۔

راجکمار کے ساتھ بھی وہی ہوا جو اس سے پہلے اس کے باپ کے ساتھ ہو چکا تھا۔ راجکمار ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ رانی کاروشی بھی جاگ پڑی اپنے بیٹے کو تکلیف میں دیکھ کر اس کے ہوش گم ہو گئے شاہی طبیب اور راج وید کو فوراً بلا کر علاج شروع کیا گیا مگر راجکمار کی بیماری جوں کی توں رہی رانی کاروشی پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں اس کا اکلوتا بیٹا بھی موت کے منہ میں نہ چلا جائے۔

چھ روز گزر گئے۔ بھارتہ کی بد روح' راجکمار کے دل کے ساتھ چمٹی اسے وقفے وقفے سے بھینچ رہی تھی۔ راجکمار آنند کو غشی کے دورے پڑنے لگے۔

اب سادھو وشال نے اپنے ترکش کا سب سے کاری تیر' کمان پر چڑھایا اور رانی کاروشی سے جا کر عرض کی۔ "مہارانی' میں تنہائی میں راجکمار کے روگ کے بارے میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

رانی کاروشی ہر قیمت پر اپنے اکلوتے راجکمار کی صحت چاہتی تھی وہ سادھو وشال کو لے کر کمرہ خاص میں آگئی۔ کہو' گورو دیو' آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

سادھو وشال نے رانی کاروشی کے سراپا پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور بولا۔

"مہارانی صاحبہ! راجکمار کو بھی وہی روگ ہے جس نے راجا کی جان لی تھی۔"

رانی کاروشی کا دل بیٹھ گیا' اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "مہاراج ایسا نہ کہیں۔ میرے بچے کو کسی طرح ٹھیک کر دیں۔ وہ میری زندگی اور خاندان کا آخری سہارا ہے۔"

سادھو وشال خاموش ہوگیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ رانی کاروشی اس مقام کی طرف آ رہی تھی جہاں وہ اسے لانا چاہتا تھا سادھو وشال نے منہ ہی منہ میں چند اشلوک بڑبڑائے اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کی بے باک نظریں رانی کے چہرے پر جمی تھیں۔ "رانی کاروشی! میں ابھی تھوڑی دیر پہلے شاہی مرگھٹ میں گیان دھیان میں مصروف تھا' یہ سادھی میں نے راجکمار کے روگ کو دور کرنے کے لیے لگائی تھی۔"

رانی کاروشی نے بے تاب ہو کر پوچھا۔ "کیا میرے پتر کا روگ دور ہو جائے گا؟"

سادھو وشال نے گہری آواز میں کہا۔ "ضرور دور ہوگا رانی! لیکن ایک شرط تمہیں پوری کرنی ہوگی' کیونکہ یہی گگن منڈل کے دیوتاؤں کی مرضی ہے۔"

وہ کیا شرط ہے مہاراج! مجھے بتائیں' میں اسے ضرور پورا کروں گی۔

سادھو وشال نے اپنی گناہ آلودہ نگاہیں رانی کاروشی کے پاکیزہ چہرے پر جما دیں اور کہا۔ "سنو رانی! یہ دیوتاؤں کا حکم ہے۔ اگر تم نے یہ حکم نہ مانا تو تمہیں اپنے راجکمار کی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔"

رانی کاروشی کا دل ڈوب سا گیا۔ اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "مہا راج ایسا نہ کہیں۔ میں دیوتاؤں کے حکم کو سوئیکار کروں گی۔ میں ان کا حکم ضرور مانوں گی۔ آپ فرمائیں مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

سادھو وشال نے اپنا بازو ہوا میں بلند کیا اور بولا۔ "رانی کاروشی! تمہیں خفیہ طور پر مجھ سے بیاہ کر کے راج پاٹ کے سارے احکام میرے مشورے سے صادر کرنے ہوں گے۔"

رانی کاروشی سناٹے میں آگئی' اسے سادھو وشال کی بدنگاہی اور بدنیتی کا پہلے ہی سے شک تھا۔ اب جب اس نے اپنے ناپاک ارادے کا اظہار کر ہی دیا تو رانی کاروشی اپنی جگہ سے ہل گئی۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ "گورو دیو! اگر آپ میرے پتر کے گورو دیو نہ ہوتے تو میں آپ کو اسی جگہ زندہ زمین میں گڑوا دیتی۔ اب آپ یہاں سے نکل جائیں۔"

رانی کاروشی واپس مڑی تو سادھو وشال نے بلند آواز میں کہا - "رانی کاروشی تم آکاش کے دیوتاؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ یاد رکھو اگر تم نے میری بات نہ مانی تو دو روز کے بعد راج محل میں تمہارے راجکمار کی لاش پڑی ہوگی۔"

بیٹے کی موت کا سن کر رانی کاروشی کے قدم وہیں رک گئے وہ اپنا دل تھام کر رہ گئی سادھو وشال نے دوسرا تیر چلایا رانی کاروشی! ذرا سوچو' یہ تمہارے اکلوتے راجکمار کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس سے پہلے راجا اس مرض میں مر چکا ہے مجھے دیوتاؤں نے پرکاشک ہو کر تمہیں یہ چنوتی دینے کے لیے کہا ہے کہ چاہے تم لاکھ علاج کرواؤ۔ ملک ملک کے ویدوں کو بلاؤ جب تم ان کی شرط نہیں مانو گی تمہارا راجکمار زندہ نہیں رہ سکے گا۔"

رانی کاروشی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا مگر دل اپنے بچے کی موت کے خیال سے ڈوبا جا رہا تھا وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی اس نے اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا لیا اور سسکیاں لیتی ہوئی بولی۔ "کیا آکاش کے دیوتاؤں کو نہیں معلوم کہ میں ایک بیوہ ہوں اور میں اپنے مرنے والے پتی کی امانت ہوں؟ کیا آکاش کے دیوتاؤں کا یہی انصاف ہے؟"

سادھو وشال بولا۔ "رانی! یہ گگن منڈل کے بھید ہیں۔ ان بھیدوں کو تم نہیں جان سکتیں۔ اگر تم کو اپنے راجکمار کی جان عزیز ہے تو وہی کرو جس کا دیوتاؤں نے تمہیں حکم دیا ہے مجھ سے بیاہ کر کے راج پاٹ کے کام میرے مشوروں سے چلاؤ' دیوتاؤں کی خوشی اور

تمہارے پتر کی زندگی اسی میں ہے۔"

رانی کاروشی کو ایسے لگا جیسے وہ ایک تاریک گلی میں بند کر دی گئی ہے۔ وہ دیوی' دیوتاؤں کو ماننے والی ایک' قدامت پرست ہندو عورت تھی' دیوتاؤں کے حکم کو بھی نہیں ٹال سکتی تھی اور اسے اپنے راجکمار کی جان بھی عزیز تھی لیکن ایک بیوہ ہو کر وہ سادھو سے بیاہ بھی نہیں رچانا چاہتی تھی۔

سادھو وشال نے اپنی آواز میں دیوتاؤں کا رعب پیدا کرتے ہوئے کہا' رانی کاروشی! تم اس پر کل تک سوچ' بچار کر لو لیکن یاد رکھو۔ اگر تم نے اس کا ذکر کسی پروہت یا کسی شاہی منتری سے کیا تو راجکمار کی موت ہو جائے گی۔"

رانی کاروشی نے روتے ہوئے سادھو وشال داس کے پاؤں پکڑ لیے۔ "مہاراج! مجھ پر دیا کریں مجھے اتنے کڑے امتحان میں نہ ڈالیں۔ مجھ سے میری جان لے لیں پر نتو میرے بچے کو اچھا کر دیں۔

سادھو نے اپنے پاؤں پیچھے کر لیے۔ "کاروشی! تم دیوتاؤں کا اپمان کر رہی ہو' میں تمہیں آخری بار کہہ رہا ہوں اگر تم نے مجھ سے بیاہ نہ کیا تو راجکمار مرجائے گا۔ میں تمہیں کل شام تک کی مہلت دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر سادھو وشال' رانی کاروشی کو روتا ہوا چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔

دوسرے روز دوپہر کے بعد راجکمار کی حالت زیادہ خراب ہو گئی یہ سب کچھ بھارتہ کی بے بس روح کے ہاتھوں ہو رہا تھا جو سادھو وشال کے سیاہ پوش منتروں کے تابع تھی۔ رانی کاروشی دیوانہ وار غم سے نڈھال' سادھو وشال کی کٹیا میں آئی اور اس کے چرنوں میں گر کر بولی۔ "مہاراج! میرے بچے کو بچا لیجئے' میں آپ کی شرط مانتی ہوں۔ میرے راجکمار کو بچالیں۔"

رانی زارو قطار آنسو بہا رہی تھی۔ سادھو وشال مکروہ انداز میں مسکرایا۔ اس نے رانی کے شانے پر ہاتھ رکھا تو رانی کاروشی نے اپنا بدن سمیٹ لیا۔ شرم و حیا کی پتلی رانی کاروشی ایک پاکباز عورت تھی ایک غیر مرد کے ہاتھ کو وہ کیسے برداشت کرتی مگر وہ اپنے بچے کو مرتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ سادھو وشال بولا ..... "شاباش کاروشی! تم نے دیوتاؤں کے حکم کو مان کر نہ صرف دیوتاؤں کو خوش کر دیا ہے بلکہ اپنے راجکمار کی جان بھی بچا لی ہے۔ اٹھو ہم آج ہی رات تم سے خفیہ طور پر بیاہ کریں گے۔ جاؤ' جا کر دیکھو راجکمار کو ہوش آگیا ہے۔"

رانی کاروشی دل کو تھامے' ماتا کے بے پناہ جذبے کے ساتھ اٹھ کر اپنے محل واپس

آئی تو' راج محل کے شاہی خوابگاہ میں داخل ہوتے ہی شاہی وید نے اسے خوشخبری سنائی کہ راجکمار نے آنکھیں کھول دی ہیں اور وہ آپ کو یاد کر رہا ہے۔"

رانی کاروشی خوشی سے دیوانہ وار اپنے بچے کے پاس گئی راجکمار مسکرا رہا تھا "ماتا جی! میں اچھا ہو گیا ہوں۔"

رانی کاروشی نے راجکمار کو سینے سے لگا لیا۔ اب رانی کو مزید یقین ہو گیا کہ یہ دیوتاؤں کا ہی چمتکار ہے اور اسے دیوتاؤں کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہی ہوگا۔

سادھو وشال کے حکم سے بھارتہ کی بد روح نے راجکمار کے دل کے گرد اپنی گرفت کو چھوڑ دیا تھا مگر بدروح ابھی راجکمار کے جسم کے اندر ہی تھی محل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ غریبوں میں دان بٹنے لگا درو دیوار پر گھی کے چراغ روشن کر دیئے گئے۔ مگر رانی کاروشی کا دل اب بھی بوجھل تھا' صرف وہی جانتی تھی کہ اسے اپنے بچے کی زندگی کے لیے کتنی بڑی قربانی دینی پڑ رہی ہے لیکن وہ مجبور تھی۔

رات کے پہلے پہر سادھو وشال' رانی کاروشی کے پاس آیا اس نے راجکمار کے سر پر ہاتھ رکھ کر آشیرواد دی ..... رانی کاروشی نے اپنی نظریں جھکا رکھی تھیں۔ اس کے دل پر چھریاں چل رہی تھیں۔ سادھو وشال نے رانی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"مہارانی جی! دیوتاؤں نے آپ کو خوشی کا سندیسہ بھیجا ہے۔ ایک طرف تشریف لا کر وہ سندیسہ سن لیجئے۔"

سادھو وشال اسے کیا پیغام دینے آیا تھا؟ یہ رانی کاروشی جانتی تھی اسے سادھو وشال کی صورت سے نفرت تھی۔ مگر اپنے راجکمار کی زندگی کے لیے وہ اٹھی اور سادھو کے ساتھ زرنگار ستون کے پیچھے آگئی۔

سادھو وشال نے آہستہ آہستہ سے کہا۔ کاروشی! آج آدھی رات کو تم سیاہ دوشالہ اوڑھ کر میری کٹیا میں آؤ گی۔ وہاں ہمارا بیاہ ہوگا پھر تم واپس اپنے شاہی محل میں آ جاؤ گی۔ اس بیاہ کی خبر سوائے تمہارے اور ہمارے اور کسی کو نہیں ہوگی۔ اب ہم جاتے ہیں' آدھی رات کو تمہارا انتظار کریں گے۔"

رانی کاروشی غم سے نڈھال ہو کر رہ گئی۔ سادھو وشال نے راجکمار کے پاس آ کر اسے مسکرا کر ایک بار پھر آشیرواد دیا اور ہری اوم کا جاپ کرتا محل سے نکل کر اپنی کٹیا کی طرف چل پڑا۔

اپنی کٹیا میں آ کر سادھو وشال نے خوشی کا ایک نعرہ بلند کیا اور نئے کپڑے پہن کر اپنے بالوں میں کستوری کا عطر بسانے لگا پلنگ پر نیا بستر بچھایا اور رانی کاروشی کا انتظار کرنے

لگا۔

ابھی رانی کاروشی کے آنے میں ایک پہر رات باقی تھی مکار سادھو وشال نے بھارتہ عاطون کی بدروح کو ابھی راجکمار کے جسم میں ہی مقید رکھا ہوا تھا۔

یہاں شیطان سیرت سادھو' رانی کاروشی کے انتظار میں گھڑیاں گن رہا تھا اور اوپر گگن منڈل میں دیویا مایا' دیوتاؤں کے دربار میں رانی کاروشی کو اس ظلم سے بچانے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔

دیوتا کام دیو نے کہا مایا! تم گگن منڈل کے قوانین سے خوب واقف ہو پراکرتی جب مزہ لینے کے لیے اپنے اندریوں کی لذتوں کی راہ پر چل نکلتی ہے تو ہم اسے بالکل نہیں روکتے' یہ پراکرتی کی اپنی اچھیا' اپنے اختیار کو استعمال کرنے کا حق ہوتا ہے جس میں ہم دخل نہیں دیتے۔"

دیوی مایا نے عرض کیا۔ مقدس کام دیو! پرنتو یہ ظلم ہے۔ سادھو وشال دھوکے سے رانی کے ناموس کو تار تار کرنا چاہتا ہے۔" کام دیو نے کہا۔ "سنسار کی یہی ریت ہے دیوی مایا! سنسار میں یہ بھی ہوتا ہے' سادھو وشال آج کسی پر ظلم کر رہا ہے تو کل اسے اپنے ظلم کا بدلہ ضرور ملے گا۔"

دیوی مایا نے کہا۔ "مگر مہاراج! کاروشی رانی کی ناموس تو لٹ جائے گی۔

کام دیو کسی قدر جھلا کر کہا۔ "مایا! تم منش کی عزتوں کی رکھوالی کب سے بن گئی ہو؟ ہم کام دیو ہیں ہمیں عشق و محبت کے رازو نیاز پسند ہیں اور پھر ہمیں منش کے ارادوں میں دخل دینے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔"

دیوی مایا کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے کہا۔ مہاراج! یہ ناانصافی ہے سراسر انیائے ہے۔ میں اس بے انصافی کو نہیں ہونے دوں گی۔"

کام دیو اپنے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا اس کا چہرے غصے سے لال ہو گیا۔ "مایا! اگر تم نے ہمارے نیم کو توڑا تو تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گگن منڈل سے دھتکار دیا جائے گا۔ تم پراکرتی میں پھینک دی جاؤ گی۔"

دیوی مایا نے اپنے سر پر رکھا ہوا چکر دھاری تاج اتار کر کام دیو کے چرنوں میں رکھ دیا اور ایک عجیب و غریب عزم کے ساتھ بولی۔ مقدس کام دیو! جس گگن منڈل پر پاکباز عورتوں کے ناموس' ان کی عزتوں کا خیال نہیں رکھا جاتا میں اس گگن منڈل کو چھوڑ رہی ہوں۔ آپ کا دیا ہوا مکٹ آپ کو مبارک ہو۔"

کام دیو نے جلال میں آتے ہوئے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا وہاں بھونچال سا آگیا۔ بجلی

کڑکنے لگی۔ بادل گرجنے لگے' ہوا کا طوفان چل نکلا مگر دیوی مایا اپنی جگہ پر قائم رہی اس نے بلند آواز میں کہا۔ ہے ایشورا! ہے سب آتماؤں کی آتما! میری سہائتا کرنا میں ایک بے گناہ اور پاکباز ستی ساوتری عورت کی عزت بچانے کے لیے گگن منڈل کو چھوڑ رہی ہوں' اگر میں نیکی کی راہ پر ہوں تو مجھے اس طوفان میں راستہ دکھا۔"

اس کے ساتھ ہی مایا دیوی کے سامنے ایک سفید سڑک بن گئی جو بادلوں میں سے نیچے اتر رہی تھی۔ مایا دیوی نے اس پر چلنا شروع کر دیا اس کے کانوں میں کام دیو کی آواز گونجی۔ مایا! تم اور پدم ناگ آج سے گگن منڈل سے دھتکارے جا رہے ہو۔ تم یہاں اب کبھی واپس نہیں آسکو گے۔ تم سے اور پدم ناگ سے گگن منڈل کا ادھیکار چھین لیا گیا ہے۔"

دیوی مایا بادلوں کی سفید سڑک پر نیچے اترتی چلی گئی بادلوں سے نکلی تو اسے دور زمین پر رانی کاروشی کے محل میں اندھیری رات میں دیپ جلتے دکھائی دیئے۔ یہ دیئے اس نے راجکمار کے صحت یاب ہونے کی خوشی میں روشن کیے تھے لیکن خود اس کا دل کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد سیاہ لبادہ اوڑھ کر سادھو وشال کی کٹیا میں جانے والی تھی۔

دیوی مایا ہوا میں تیرتی تیزی کے ساتھ نیچے شاہی محل کی بارہ دری میں آگئی۔ پدم ناگ نے کام دیو کے حکم کو سن لیا تھا وہ سیاہ سانپ کی شکل میں بارہ دری کے فرش پر کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ دیوی مایا اگرچہ غیبی حالت میں تھی لیکن پدم ناگ اسے دیکھ سکتا تھا اس نے دیوی مایا سے کہا۔ "مایا! میں نے سب کچھ سن لیا ہے مجھے یہ فیصلہ منظور ہے۔ انسانوں کی بھلائی کی خاطر اگر گگن منڈل چھوڑ دیا ہے تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ ایشور بھگتی کا یہی نیم ہے کہ انسانوں کی بھلائی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی پیچھے نہ ہٹا جائے۔"

دیوی مایا نے کہا۔ "مجھے اس کا کوئی دکھ نہیں پدم ناگ بلکہ خوشی ہے کہ اب ہم آزاد ہو کر رانی کاروشی کو اس کمینے دھشٹ سے بچا سکیں گے۔ چلو رانی کو بچائیں۔ وہ اپنی اولاد کی محبت میں جکڑی اپنی عزت قربان کرنے سادھو وشال کی کٹیا کی طرف آ رہی ہے۔"

دیوی مایا نے پدم ناگ کو اٹھا کر اپنی کلائی کے گرد لپیٹا اور فضا میں اڑتی ہوئی' سادھو وشال کی کٹیا میں داخل ہو گئی وہ غائب تھی اس کے ساتھ پدم ناگ بھی غائب تھا سادھو وشال بچھونے پر بیٹھا اپنی آنکھوں میں سرمہ لگا رہا تھا کہ اچانک اسے اپنی شکتی کے بل پر کٹیا میں کسی غیر مرئی ہستی کے وجود کا احساس ہوا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی طلسمی ہستی ہے جو اس کو نقصان پہنچانے آئی ہے دیوی مایا کے غیر مرئی جسم سے نکلتی نیکی اور انسانی بھلائی کی

شعاعوں کو سادھو نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا۔

سادھو وشال نے سر سے دائی پرے پھینکی اور اپنی کھڑاویں فرش سے اٹھا کر اپنے سفلی علم کا سب سے خطرناک اشلوک پڑھ کر پھونکا اور اس کے اندازے کے مطابق جس طرف دیوی مایا کھڑی تھی ادھر کھڑاویں زور سے پھینک دیں، کھڑاویں دیوی مایا کے جسم کی شعاعوں سے ٹکرائیں تو اس کے جسم میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ وہ چیخ مار کر کٹیا سے باہر کو لپکی۔

سادھو وشال چیخ کی آواز سن کر بلند آواز میں سفلی اشلوک پڑھنے لگا دیوی مایا کٹیا سے دور بھاگ گئی پدم ناگ نے کہا، "مایا! یہ کیا ہوا؟ سادھو کا سفلی علم ہمیں شکست دے رہا ہے۔" دیوی مایا نے کہا۔ "یہ سادھو بڑی شکتی والا ہے۔ اگر ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو کیا ہوا۔ ہم رانی کاروشی کو ضرور بچائیں گے۔"

دیوی مایا، راج محل کو جاتے راستے کی طرف اڑنے لگی، اس نے اندھیرے میں ایک سائے کو کٹیا کی طرف آتے دیکھا۔ "پدم! یہ رانی کاروشی ہی ہے، میرے پاس اب وہ شکتی نہیں ہے کہ میں رانی کاروشی کے جسم کو بادل کی لہر میں بدل کر یہاں سے اٹھالوں۔ اس لیے تم رانی کاروشی کا راستہ روکو اور اسے واپس محل میں جانے پر مجبور کرو۔"

پدم ناگ دیوی مایا کی کلائی سے نکل کر زمین پر آگیا۔

رانی کاروشی سیاہ دوشالہ اوڑھے بے جان قدم اٹھاتی، آنسو بہاتی، آہستہ آہستہ سادھو کی کٹیا کی طرف چل رہی تھی کہ اچانک اسے پھنکار کی آواز سنائی دی۔ وہ ڈر کر رک گئی کیا دیکھتی ہے کہ ایک پانچ فٹ لمبا سانپ اپنا پھن زمین سے اونچا کیے اس کی طرف دیکھ کر زور زور سے پھنکار رہا ہے، رانی کاروشی خوف زدہ ہو کر محل کی طرف دوڑی۔

دیوی مایا زمین سے دس فٹ بلند فضا میں تیر رہی تھی۔ اس نے پدم ناگ کو اپنی خاموش زبان میں کہا۔ "پدم ناگ! جونہی رانی شاہی محل میں داخل ہونے لگے اسے ڈس کر اس کے جسم میں صرف اتنا زہر داخل کرو کہ جس سے وہ مرے نہیں بلکہ بے ہوش ہو جائے۔"

پدم ناگ نے دیوی مایا کا حکم سن لیا تھا رانی کاروشی بھاگتے بھاگتے جیسے ہی راج محل کی راہداری میں داخل ہوئی پدم ناگ نے لپک کر اس کے پاؤں پر ڈس لیا، مگر اس نے رانی کے جسم میں صرف اتنا ہی زہر داخل کیا کہ جس سے وہ کچھ روز تک کے لیے بے ہوش جائے۔

رانی کی چیخ نکل گئی۔ اس نے سانپ کو ڈستے دیکھ لیا تھا وہ بے ہوش ہو کر راہداری

کے فرش پر گر پڑی دربان مشعلیں لے کر ادھر دوڑے انہوں نے مہارانی کاروشی کو بے ہوش پڑے دیکھا تو شور مچا دیا۔ کنیزیں جاگ کر اٹھ دوڑیں اور پھر مہارانی کو اٹھا کر خوابگاہ میں لے جایا گیا۔

سادھو وشال کو جب احساس ہوگیا کہ غیر مرئی جسم وہاں موجود نہیں ہے تو اس نے کھڑاویں پہنیں اور کٹیا کے دروازے پر آ کر سفلی اشلوک کا دم کیا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے محل کی طرف سے آنے والے راستے پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ رانی کاروشی کے آنے کا وقت کب کا ہو چکا تھا۔ سادھو فکر مند ہوا کہیں رانی نے اپنا ارادہ تو نہیں بدل لیا؟ اگر اس نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے تو میں اس کے راج کمار کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ سوچ کر سادھو وشال غصے میں باغ کے اس راستے پر چل پڑا جو شاہی خوابگاہ والی غلام گردش کو جاتا تھا۔ اس نے محل کے اندر لوگوں کی گھبرائی ہوئی آوازیں سنیں تو سادھو رک گیا ایک درخت کی اوٹ میں کھڑے ہو کر ان آوازوں پر غور کرنے لگا یہ آوازیں رانی کاروشی کی خواب گاہ سے آ رہی تھیں وشال کچھ سوچ کر محل کی طرف آگیا۔ غلام گردش کے پاس اسے ایک دربان بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلتے ملا۔ یہ آوازیں کیسی آ رہی ہیں؟ وشال نے پوچھا۔

دربان نے تعظیم بجا لا کر کہا۔ "مہاراج! مہارانی جی بے ہوش ہو کر غلام گردش میں گر پڑی ہیں۔ شاہی طبیب کو بلایا ہے۔"

سادھو وشال خاموشی سے اپنی کٹیا میں آ کر سوچنے لگا کہ رانی اس کی کٹیا کی طرف ہی آ رہی تھی پھر وہ بے ہوش کیسے ہو گئی؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کہیں یہ اسی غیر مرئی ہستی کا کارنامہ تو نہیں ہے؟ کیونکہ سادھو وشال نے اس غیر مرئی ہستی کی لہروں میں نیکی کی شعاعوں کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ صبح ہونے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ احتیاط کے طور پر اس نے صندوق میں بھارتہ کی بدروح کو آواز دی۔ تم کو ایک اور کام سونپا جائے گا بھارتہ کی بدروح؟

بدروح نے جواب دیا۔ میں آپ کی داسی ہوں، حاضر ہوں۔" چونکہ کٹیا میں بھارتہ کی روح نے رانی کاروشی کی آواز ابھی تک نہیں سنی تھی اس لیے اسے یقین ہو گیا تھا کہ دیوی مایا اور پدم ناگ نے کوئی ایسی ترکیب کی ہے کہ رانی کاروشی کا ناموس محفوظ رہے۔

دن نکلا تو راجکمار کی خبر لینے کے بہانے سادھو وشال کٹیا سے نکل کر سیدھا رانی کاروشی کے محل میں جا پہنچا وہاں اس نے دیکھا کہ رانی پلنگ پر بے ہوش پڑی تھی۔ اور طبیب ارد گرد بیٹھے دوائیاں تجویز کر رہے تھے اور دو کنیزیں رانی کے ماتھے اور تلوؤں پر تیل

کی مالش کر رہی تھیں۔

مہارانی کو نصیب دشمناں کیا ہوگیا؟

شاہی طبیب نے سادھو وشال کو بتایا کہ رانی رات کے وقت کسی کام سے خواب گاہ سے نکلی اور غلام گردش میں گر کر بے ہوش ہوگئی۔ ہم ابھی تک تشخیص نہیں کر سکے کہ رانی جی کو کیا روگ لاحق ہے اور وہ بے ہوش کیوں ہوئی ہیں۔"

پدم ناگ کے زہر کا اثر صرف رانی کو بے ہوش کرنے تک ہی تھا۔ رانی کے جسم پر زہر کی کوئی علامت نہیں تھی۔ سادھو وشال نے کہا۔ "میں رانی صاحبہ کا زائچہ بنا کر دیکھتا ہوں کہ رانی کو کیا بیماری ہے؟"

کٹیا میں آکر سادھو وشال نے رانی کا زائچہ بنایا۔ زائچے نے صرف اتنا ہی بتایا کہ رانی کو کسی کیڑے نے ڈسا ہے۔ اس کے آگے زائچہ بھی خاموش تھا۔ کہیں رانی کو سانپ نے تو نہیں ڈس لیا؟ لیکن اگر سانپ ڈستا تو وہ مرچکی ہوتی۔ اس کے جسم پر زہر کے اثرات بھی نہیں تھے۔ جب سادھو وشال نے واپس آکر شاہی طبیب کو بتایا کہ اس کے زائچے کے حساب سے رانی کو کسی کیڑے نے کاٹا ہے تو شاہی طبیب نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ یہ لوگ پہلے ہی سادھو وشال کے علم جوتش کو اپنے طبی معاملات میں مداخلت سمجھتے تھے۔ ایک طبیب کہنے لگا۔

"مہاراج! اگر رانی کو کوئی ایسا کیڑا کاٹتا کہ جس کے اثر سے رانی بے ہوش جاتیں تو اس زہر کی علامت کا جسم پر ظاہر ہونا ضروری تھا جب کہ ہم نے دیکھا ہے کہ رانی کے جسم پر زہر کی کوئی علامت نہیں ہے۔" شاہی طبیب بولا "یہاں تک کہ رانی صاحبہ کے خون میں بھی زہر کا اثر نہیں ہے۔"

سادھو وشال چاہتا تھا کہ جتنی جلدی رانی کو ہوش نہیں آتا سادھو وشال اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے کئی ٹوٹکے کئے۔ کئی طرح کے اشلوک پڑھ کر رانی پر پھونکے مگر رانی بے ہوش رہی۔ سادھو وشال کا منصوبہ تکمیل کے بالکل کنارے پر آکر ناکام ہوتا نظر آ رہا تھا۔

جس وقت سادھو وشال راج محل میں تھا عین اس وقت دیوی مایا اور پدم ناگ سادھو کی کٹیا میں داخل ہو چکے تھے۔ دیوی مایا نے کہا "اے بھارتہ عاطون کی روح! ہم نے رانی کاروشی کی عزت کو بدکردار سادھو کے ناپاک عزائم سے وقتی طور پر محفوظ کر لیا ہے لیکن جب تک تم اس کے قبضے میں ہو خطرہ موجود ہے اور پھر رانی کو زیادہ دیر تک بے ہوش نہیں رکھا جا سکتا۔"

بھارتہ کی روح بولی "دیوی مایا مجھے اس عذاب سے کب نجات ملے گی؟ میں مجبور ہوں اپنی' مرضی' اپنے ارادے سے کچھ نہیں کر سکتا۔"

دیوی مایا نے کہا "راجا کی لاش کے زندہ ہونے میں ابھی کچھ دن باقی ہیں۔ سادھو وشال جب تک رانی بے ہوش ہے راجکمار کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کر سکتا۔"

بھارتہ کی روح نے کہا "بھگوان کے لئے مجھے یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاؤ"

دیوی مایا بولی "اس کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ تمہارا ارادہ سادھو وشال کے سفلی اشلوکوں کے تابع ہے۔ تم جہاں کہیں ہو گے اس کی حکم کی تعمیل کے لئے نکل چلو گے۔"

اس پر پدم ناگ نے کہا "مایا! کیوں نہ ہم بھارتہ کی روح کو ساتھ لے کر یہاں سے دور دراز علاقے میں چلے جائیں۔ بدروح کو اگر سادھو کے منتروں نے اپنی طرف بلایا بھی تو اسے وہاں سے آنے میں بہت دیر لگ جائے گی۔"

دیوی مایا کچھ سوچنے لگی پھر بولی "اس سے زیادہ مفید نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ بدروح سادھو وشال کے پاس پہنچ ہی جائے گی۔"

پدم ناگ نے چونک کر کہا "میں بدروح کی ڈبیا سمندر کی گہرائیوں میں شیش ناگ کے حوالے کئے دیتا ہوں۔ وہ سمندر کا ناگ ہے۔ میں اگر مقدس دیوتا نہیں رہا لیکن سری ناگ ضرور ہوں گے اور دھرتی اور سمندر کے سارے سانپ اب بھی میرا حکم مانتے ہیں۔"

"ہاں' یہ مناسب رہے گا۔ بھگوان کے لئے مجھے یہاں سے لے چلو" بھارتہ کی روح بولی۔

مایا نے آبنوسی صندوق میں سے وہ ڈبی نکالی جس میں بھارتہ کی بدروح بند تھی۔ پدم ناگ بولا "اگر سادھو وشال نے راجکمار کو زہر دے کر ہلاک کر دیا تو کیا ہوگا۔"

دیوی مایا نے کہا "وہ ایسا نہیں کر سکے گا کم از کم جب تک رانی بے ہوش ہے' سادھو وشال کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھائے گا"

دیوی مایا نے بھارتہ کی بدروح والی ڈبیا مٹھی میں تھامی۔ پدم ناگ کو اپنی کلائی کے گرد لپیٹا اور کٹیا سے نکل کر فضا میں بلند ہوئی اور پچھم کے سمندر کی طرف اڑنے لگی۔ وہ بے حد تیز رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے وہ ہزاروں میل دور ساحل سمندر پر آ گئی۔ اب پدم ناگ اس کی راہنمائی کرنے لگا۔ ساحل سے دور کھلے سمندر میں ایک جگہ مونگوں کی چھوٹی چھوٹی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ پدم ناگ نے کہا "یہاں اتر چلو مایا۔ ان چٹانوں کے نیچے شیش ناگ کا بسیرا ہے۔"

دیوی مایا چٹانوں کے پاس آ کر زمین پر رک گئی۔ اس نے ڈبیا پدم ناگ کے حوالے کی اور کہا اسے سمندر میں جس گہرائی تک لے جا سکتے ہو لے جاؤ اور شیش ناگ کو سمجھا دینا کہ اس ڈبیا کا ڈھکن ہرگز نہ کھولے۔

دیوی مایا نے کہا "فکر مت کرو۔ اگر ایسی بات ہوئی تو ہم تمہاری مدد کو راج محل کے آس پاس موجود ہوں گے۔"

پدم ناگ' بھارتہ کی بدروح والی ڈبیا لے کر سمندر میں لے گیا۔ کافی دیر بعد وہ اوپر آیا تو اس نے دیوی مایا کہ بھارتہ کی روح شیش ناگ کے حوالے کر دی گئی "لیکن دیوی مایا شاید شیش ناگ بھی ظالم سادھو کے منتروں کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکے بہرحال جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

دیوی مایا نے پدم ناگ کو اٹھایا اور ایک بار پھر فضا میں پرواز کرنے لگی۔ اب اس کا رخ ان برف پوش پہاڑوں کی طرف تھا جس کے دامن کے ایک غار میں راجا کی لاش چھپائی گئی تھی۔ اگرچہ فاصلہ ہزاروں میل تھا لیکن دیوی مایا کی رفتار بجلی کی رفتار سے بھی تیز تھی۔ وہ روشنی کی ایک نظر نہ آنے والی لکیر کی طرح آن واحد میں برف پوش پہاڑوں کے دامن میں پہنچ گئی۔ غار کا منہ برف پوش تھا۔ دیوی مایا نے پدم ناگ سے کہا۔

"میں برف کی بند دیوار میں سے گزر سکتی ہوں تم نہیں گزر سکتے تم اس جگہ ٹھہرو۔ میں اندر جا کر دیکھتی ہوں کہ لاش اپنی جگہ پر موجود ہے۔"

پدم ناگ اب سیاہ سانپ کی شکل میں ہی تھا۔ وہ غار کے باہر پتھروں میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ دیوی مایا غیبی حالت میں غار کی برفانی دیوار پار کر کے اندر چلی گئی۔ غار میں اندھیرا تھا۔ مگر دیوی مایا اپنے شکتی کے باعث اندھیرے میں بھی دیکھ سکتی تھی۔ دیوی مایا نے دیکھا کہ راجا کی لاش ویسے ہی زمین پر پڑی تھی جونہی دیوی مایا لاش پر جھکی۔ سرہانے کی جانب دیوار میں سے روشنی کا ایک دائرہ سا نکل کر لاش کی طرف بڑھا۔ دیوی مایا پیچھے ہٹ گئی۔ روشنی کا دائرہ ایک انسانی ہیولے میں تبدیل ہو گیا۔ دیوی مایا اس کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔ انسانی ہیولا بہت ہی دھیمی آواز میں بولا۔

دیوی مایا! میں راجا کی روح ہوں۔ مجھے ابھی اپنے جسم میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملی لیکن چونکہ راجا نے مجھے اپنے جسم میں پاک صاف اور تمام گناہوں سے محفوظ رکھا اس لئے مجھے آکاش سے یہاں آ کر اپنے جسم کو دیکھنے کی اجازت مل گئی ہے۔

دیوی مایا نے راجا کی روح کو راجکمار اور رانی کاروشی کی چتا کے بارے میں بتایا اور اس سے مدد کی درخواست کی کیونکہ دیوی مایا کو معلوم تھا کہ نیک روح میں بے پناہ طاقت

ہوتی ہے۔ راجا کی روح نے کہا "یہ سنسار کے کام ہیں۔ یہ ان انسانوں کے کرم کانڈ ہیں مگر میں تمہارے لئے صرف اتنا کر سکتی ہوں کہ سادھو وشال سے اس کی طاقت چھین لوں۔"

دیوی مایا نے کہا "ہم یہی تو چاہتے ہیں۔"

راجا کی روح بولی "میں تمہیں ایک خفیہ منتر بتاتی ہوں تم اس منتر کو پڑھ کر سادھو وشال کی کٹیا میں جا کر پھونک دینا اس کے بعد جو کچھ ہو گا تم خود دیکھ لو گی۔"

اس کے بعد راجا کی روح نے دیوی مایا کے کان میں خفیہ منتر پڑھا اور غائب ہو گئی۔ دیوی مایا تیزی سے غار سے نکلی اور سارا ماجرا پدم ناگ کو سنایا اور کہا "راجا کی روح کا منتر بڑا کارگر ہو گا۔ نیک روحیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔ میرے ساتھ آؤ۔"

دیوی مایا' پدم ناگ کو لے کر راج محل کی طرف پرواز کر گئی۔ جب وہ راجا کے محل کے باغ میں پہنچی تو دوپہر ہو چکی تھی۔ سادھو وشال کی کٹیا پر تالا پڑا ہوا تھا اور وہ دریا پر اشنان کرنے گیا ہوا تھا۔ دیوی مایا' سادھو وشال کی کٹیا میں داخل ہو گئی۔ اس نے بند کٹیا میں راجا کی بدروح کا منتر پڑھ کر چاروں طرف پھونک دیا۔

بظاہر وہاں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی لیکن دیوی مایا کو معلوم تھا کہ سادھو وشال کے اندر داخل ہونے پر کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔ پدم ناگ کو اپنی کلائی میں لپیٹ کر سادھو وشال کی کٹیا سے دور ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی۔

کچھ دیر بعد سادھو وشال مقدس دریا میں اشنان کر کے رام نام کا جاپ کرتا چلا آ رہا تھا اور کانسی کا لوٹا اس کے ہاتھ میں تھا۔ سادھو وشال نے کٹیا کا تالا کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی کٹیا میں آگ کا شعلہ بلند ہوا جس نے ساری کٹیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سادھو وشال چیخ مار کر آگ میں لپٹا باہر کو بھاگا اور گھاس پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ آگ اس کے جسم کو جلا رہی تھی۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ محل کی طرف سے لوگ پانی لے کر بھاگے۔ وشال کی آگ بجھا دی گئی مگر اس کے جسم کی چربی نکل آئی تھی۔ اسے بانس کی چارپائی پر ڈال دیا گیا۔ فوراً" شاہی وید اور برہمن پروہت وہاں پہنچ گئے۔ یہ برہمن پروہت سادھو وشال کا دوست تھا۔ اس نے دیکھا کہ وشال پر نزع کا عالم ہے۔ وہ مرنے والا تھا۔ اس کا سارا جسم آگ میں جل کر سیاہ ہو چکا تھا جس میں سے چربی کے سفید دھبے ابل کر باہر نکل آئے تھے۔

سادھو وشال نے پروہت کی طرف دیکھا اور آنکھوں سے قریب لایا۔ پروہت نے اپنا چہرہ سادھو وشال کے جلے ہوئے ہونٹوں سے لگا دیا۔ سادھو وشال نے نزعی آواز میں رک رک کر کہا "راجکمار کو زندہ نہ چھوڑنا۔ اس کی وجہ سے مجھے ۔ مجھے جلا دیا گیا ... میں تمہیں

قسم دیتا ہوں تم میرے ..... دوست ہو۔ راجکمار سے میرا بدلہ ..... بدلہ لینا" اس کے ساتھ ہی
سادھو وشال نے دم توڑ دیا۔

پروہت نے اردگرد دیکھا۔ قریب کوئی نہیں تھا۔ پروہت برہمن تھا۔ برہمنوں کو
اس بات کا بڑا قلق تھا کہ ایک کھشتری خاندان تخت پر حکومت کرتا ہے۔ برہمن چاہتا تھا کہ
راج پاٹ کسی برہمن خاندان کے پاس ہونا چاہئے۔ اب اس کے سادھو نے جب اسے قسم
دلائی کہ وہ راجکمار سے اس کی موت کا انتقام لے گا تو اسے موقع مل گیا۔ پروہت نے دل
میں فیصلہ کر لیا کہ وہ راجکمار اور رانی دونوں کو تہ تیغ کر دے گا۔

چونکہ دیوی مایا اور پدم ناگ اب گگن منڈل کے دیوتاؤں کی دنیا سے تعلق نہیں
رکھتے تھے۔ اس لئے اب وہ لوگوں کے دل کا حال نہیں پڑھ سکتے تھے۔ البتہ دیوی مایا میں
غائب ہو جانے اور پدم ناگ کے روپ بدلنے اور الوپ ہو جانے کی شکتی بدستور موجود تھی۔

سادھو وشال کی موت سے رانی کاروشی نے ایک طرح سے اطمینان کا سانس لیا
کیونکہ وہ ایک بہت بڑے شر سے بچ گئی تھی۔ تاہم اس نے سادھو وشال کی آخری رسوم
پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ کرائیں۔ سادھو وشال کی موت کے بعد دیوی مایا اور پدم
ناگ پوری رفتار کے ساتھ سمندر کی جانب روانہ ہو گئے۔ بد طینت سادھو کی موت کے ساتھ
ہی اس کے سفلی علوم کا اثر ختم ہو گیا اور بھارتہ کی بدروح اپنے آپ ڈبیا سے باہر نکل آئی
تھی۔ شیش ناگ نے بدروح کو بتا دیا کہ وہ پدم ناگ کی امانت ہے۔ اس لئے اس کے پاس
ہی رہے۔ بھارتہ کی بدروح نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ اتنے میں پدم ناگ پہنچ گیا اس نے
بھارتہ کی روح کو سادھو وشال کی موت کی خبر سنائی تو روح نے کہا "بھگوان نے میری سن لی
مجھے ایک عظیم ترین عذاب سے نجات مل گئی ہے۔"

بھارتہ کی بدروح کو اپنی مٹھی میں لے کر دیوی مایا اور پدم ناگ واپس راجدھانی میں
آ گئے کیونکہ وہ راجکمار کی صحت کے بارے میں پوری تسلی کرنا چاہتے تھے۔ راجکمار آنند
پوری طرح صحت یاب ہو چکا تھا اور اپنی ماتا رانی کے ساتھ تخت پر بیٹھا تھا۔ پدم ناگ،
دیوی مایا اور بھارتہ کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی مگر بھارتہ کی بدروح پر اس کے برے اعمال کا بوجھ
تھا چنانچہ اکثر اس کے دل میں برائی کا خیال آ جاتا تھا جس پر بدروح کی نیکی کا ننھا جذبہ بڑی
مشکل سے قابو پاتا۔

بھارتہ کی بدروح کی روحانی کشمکش اب دیوی مایا اور پدم ناگ کی طرح باخبر نہیں رہ
سکتے تھے۔ جب بھارتہ کی بدروح کو معلوم ہوا کہ محض ایک انسان کی خاطر دیوی مایا نے
آکاش کے استھان کو چھوڑ دیا تو اس کی روح کا نیک پہلو بہت متاثر ہوا لیکن برا پہلو دیوی مایا

کو کوسنے لگا۔ ایک عجیب تبدیلی بھارتہ کی بدروح نے اپنے اندر یہ محسوس کی کہ اس کے
شعور میں دیوی کے خلاف جذبات پرورش پانے لگے تھے۔ اگرچہ بھارتہ کی روح کا نیک پہلو،
ان جذبات کو پس پشت ڈال دیتا لیکن وہ شرانگیز خیال پھر عود کر آتے۔ بھارتہ کی بدروح نے
اپنی روحانی کشمکش سے دیوی مایا اور پدم ناگ کو آگاہ نہیں کیا تھا۔

راجکمار اور رانی کو خوش و خرم دیکھ کر دیوی مایا، پدم ناگ، بھارتہ کی روح کو لے کر
راجا کی لاش کی طرف روانہ ہو گئے۔

دوسری جانب سازشی برہمن نے اپنے ساتھ ایک کٹر برہمن کو ملا لیا اور اسے سادھو
وشال کی آخری وصیت بتائی دوسرے برہمن نے کہا "وشال داس، ویدوں، شاستروں کا گیانی
تھا۔ وہ سچا برہمن تھا۔ راجا کھشتری بھی نہیں ہے۔ اس تخت پر برہمنوں کا حق تھا۔ ہمیں
راجکمار اور رانی کو اپنے راستے سے جتنی جلدی ہو سکے ہٹا دینا ہو گا۔"

یہ ایک گھناؤنی خون آشام سازش تھی۔ سادھو وشال نے رانی سے بیاہ کرنے کی وجہ
سے اسے اور راجکمار کو قتل نہیں کیا تھا لیکن ان برہمنوں نے راجکمار اور رانی کو موت کے
گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کر لیا۔ دیوی مایا اور پدم ناگ کو اس سازش کے مطلق کوئی خبر نہیں
تھی۔ بھارتہ کی بدروح بھی بے خبر تھی اور راجا کی لاش کے پاس ہی دیوی مایا کے پہلو میں
زمین پر لیٹی ہوئی تھی اور پدم ناگ غار کے دروازے پر کنڈلی بیٹھا تھا۔

دوسری جانب سازشی برہمنوں نے راجکمار اور رانی کو تہ تیغ کرنے کا منصوبہ تیار کر
لیا۔ انہوں نے مشہور کر دیا کہ ان کے گورو نے کاشی ناتھ سے گنگا کا پوتر جل بھیجا ہے۔ اس
جل کو چاندی کے بڑے کٹورے میں ڈال کر دونوں برہمنوں نے درباریوں، امرا اور منتریوں
میں تھوڑا تھوڑا تبرک کے طور پر تقسیم کیا اور سونے کی ایک کٹوری میں گنگا کا یہ پوتر جل
راجکمار اور رانی کے لئے بھی بھیجا۔ اس جل میں انہوں نے ایسا زہر ملا دیا تھا جو انتہائی مہلک
اور بے ذائقہ تھا۔

شاہی کنیز اور رانی کی خاص خدمت گار عورت پروہنی، پوتر کٹوری طشت میں رکھ
کر رانی کاروشی کے حجلہ شاہی میں داخل ہوئی۔ اس وقت راجکمار اور رانی دونوں دربار جانے
کے لئے شاہانہ لباس زیب تن کر چکے تھے۔ رانی زریں کرسی پر تاج سر پر رکھے بیٹھی تھی۔
ایک آسامی بلی اس کی گود میں تھی۔ راجکمار کو دو کنیزیں مخمل کی جڑاؤ عبا پہنا رہی تھیں۔

خاص کنیز پروہنی کو قطعی علم نہیں تھا کہ پوتر گنگا جل میں زہر ملا ہے۔ اس نے رانی
کے سامنے جا کر ادب سے عرض کی کہ یہ گنگا جل بڑے پروہت نے آپ کی خدمت میں
بھیجا ہے۔ رانی کاروشی نے بڑی عقیدت سے ہاتھ بڑھا کر گنگا جل کی طلائی کٹوری کو چھوا اور

ماتھے۔ پر ہاتھ لگا کر بولی "پروہت جی کو ہمارا پرنام دینا۔ ہمارے بڑے بھاگ ہیں کہ گنگا میا کا
پوتر جل ہمیں پینے کو ملا۔"

رانی کاروشی نے سونے کے دو پیالوں میں پوتر گنگا جل تھوڑا تھوڑا ڈالا اور ایک پیالا
راجکمار کی طرف بڑھا کر کہا "راجکمار یہ گنگا جل تمہارے لئے ہے۔"

راجکمار نے خوشی خوشی سے اپنی ماتا سے پیالہ لے لیا۔ ایک پیالہ رانی کے ہاتھ میں
تھا۔ راجکمار اور رانی گنگا کو پینے ہی لگے تھے کہ اچانک کنیز پروہنی نے ہاتھ بڑھا کر انہیں
روک دیا اور بولی "مہارانی جی! صدیوں سے راجوں' مہاراجوں کا یہ اصول رہا ہے کہ باہر سے
کوئی آئی ہوئی چیز بغیر دیکھے بھالے نہیں کھاتے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس پوتر جل کا ایک
گھونٹ اس بلی کو پلا کر دیکھا جائے۔"

رانی کاروشی جانتی تھی کہ محل میں اس کے راجکمار کے خلاف پہلے بھی سازش ہو
چکی ہے۔ اس نے زہر آلود گنگا جل کی کٹوری بلی کے سامنے رکھ دی۔

بلی کے لئے ایک ہی زہر آلود گھونٹ کافی تھا۔

وہ چاندی کی کٹوری کے پاس ہی گری۔ اس کا جسم اینٹھنے لگا اور چند سیکنڈ میں ہی وہ
مر گئی۔ رانی کاروشی' کنیز پروہنی اور راجکمار کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ گنگا کے پوتر
جل میں انتہائی مہلک اور بے ذائقہ زہر ملا دیا گیا تھا۔

رانی کاروشی نے راجکمار کو اپنے کمرے میں جانے کا حکم دیا اور کنیز پروہنی سے کہا
"ہمیں اور ہمارے راجکمار کو ایک بار پھر ہلاک کرنے کی سازش ہوئی ہے لیکن ہمارا دشمن
وشال تو مر چکا ہے۔ اس سازش کے پیچھے کون ہو سکتا ہے۔"

پروہنی کہنے لگی "رانی ماں! تخت و تاج کا کوئی بھی دشمن ہو سکتا ہے' لیکن میرا
خیال ہے کہ یہ کام وشال کے کسی چیلے کا ہے۔"

"اس کا کیسے پتہ چلے گا؟" رانی کاروشی نے استفسار کیا۔

کنیز پروہنی نے کچھ سوچ کر کہا "رانی ماں! اس سازش کے کھوج لگانے کا ایک ہی
طریقہ ہے کہ آپ یہ ظاہر کریں کہ بھگوان نہ کرے آپ پوتر جل پینے سے ہلاک ہو گئی
ہیں۔ اس کے بعد' میں شور مچا دوں گی۔ ظاہر ہے وہ شخص جس نے اس گنگا جل میں زہر
ڈالا ہے وہ سب سے پہلے آئے گا پھر میں آسانی سے مجرم کا سراغ لگا لوں گی۔"

رانی کاروشی نے کہا "لیکن راجکمار بھی تو میرے پاس تھا؟"

پروہنی بولی۔ "یہ میں سنبھال لوں گی۔ آپ تخت پر یوں لیٹ جائیں جیسے آپ زندہ
نہیں ہیں۔ آپ سانس روک لیں۔ میں کسی کو آپ کے پاس نہیں آنے دوں گی' تاکہ آپ
کے سانس کے چلنے کا کسی کو علم نہ ہو جائے۔"

رانی کاروشی کو یہ منصوبہ پسند آیا۔ اس نے فوراً" مردہ بلی کو وہاں سے ہٹا کر چاندی
کی کٹوری وہاں پر الٹ دی اور خود تخت پر ترچھی ہو کر لیٹ گئی جیسے مردہ ہو۔ کنیز پروہنی

نے دوسرے کمرے میں جا کر راجکمار کو ساری بات سمجھائی اور کہا کہ وہ اس طرح کرے جس طرح اسے کہتی ہے۔

باہر آ کر کنیز پروہنی نے شور مچایا کہ رانی ماں کو کچھ ہو گیا ہے۔

دوسری کنیزیں بھاگ کر وہاں آ گئیں۔ کنیز پروہنی نے اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا کہ کوئی بھی کنیز رانی ماں کے قریب نہ آنے پائے۔ رانی ماں کو اس کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ ساتھ ہی کنیز نے اعلان کر دیا کہ رانی ماں مرگئی ہے گنگا جل پیتے ہی ان کا دیہانت ہو گیا۔

محل میں شور مچ گیا۔ پروہنی نے رانی کاروشی کی لاش کو پلنگ پر ڈال دیا اور اوپر چادر پھیلا دی صرف رانی کا چہرہ باہر تھا۔

دربار کے امراء اور دوسری خواتین دوسرے کمرے میں آ کر سوگ میں بیٹھ گئیں۔ پروہنی نے جان بوجھ کر رانی کاروشی کی نقلی لاش والا بیڈ روم خالی کروا لیا اور خود ایک پردے کے پیچھے چھپ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے معلوم تھا کہ جس نے رانی اور راجکمار کو ہلاک کرنے کی سازش کی ہے وہ تصدیق کرنے ضرور آئے گا۔

تھوڑی دیر بعد وشال داس کا چیلا اپنے شاگرد کے ساتھ بیڈ روم میں دبے پاؤں داخل ہوا۔ رانی کاروشی کی لاش کے قریب آ کر دونوں نے جھک کر رانی کے چہرے کو دیکھا۔ رانی کاروشی نے سانس روک لیا۔ چیلا بولا "رانی کا کام تو تمام ہو گیا مگر افسوس کہ راجکمار بچ گیا۔"

اس کے شاگرد نے کہا "گورو دیو! اسے بھی ختم کر دیں گے رانی کاروشی بھی ہمارے راستے کا کانٹا تھی۔"

پھر چیلا واپس مڑا "ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو ہم پر شک پڑ سکتا ہے۔"

دونوں خواب گاہ سے چلے گئے۔

پروہنی کو سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ اسے پہلے ہی وشال داس کے چیلے پر شک تھا۔ جب خواب گاہ خالی کر دی گئی تو پروہنی نے رانی کاروشی سے کہا "رانی ماں! آپ نے سب کچھ سن لیا ہو گا۔ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ یہ دونوں وشال کے چیلے تھے اور انہوں نے ہی آپ اور راجکمار کو ہلاک کرنے کا ناپاک منصوبہ بنایا تھا۔"

رانی کاروشی نے آنکھیں کھول رکھی تھیں۔ اس نے کہا "تم اعلان کر دو کہ رانی مر نہیں گئی' بے ہوش ہو گئی تھیں اور انہیں ہوش آ گیا ہے۔"

کنیز پروہنی نے اسی وقت سب کو یہ خوش خبری سنائی کہ رانی کاروشی زندہ ہیں۔ انہیں ہوش آ گیا ہے۔

رانی کاروشی نے پلنگ سے اٹھتے ہی سب سے پہلے یہ حکم دیا کہ وشال کے دونوں چیلوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ سپاہی وشال سادھو کی شاہی کٹیا کی طرف دوڑے۔ دونوں چیلوں کو بھی رانی کے زندہ بچ جانے کی خبر ہو گئی تھی اور وہ دونوں تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر شہر کی فصیل سے نکل کر جنگل کی طرف فرار ہو چکے تھے۔

دوسری طرف جنگل کے غار کے منہ پر پدم ناگ' سانپ کی شکل میں بیٹھا تھا۔ دیوی مایا غار کے اندر راجا کی لاش کے پاس بیٹھی تھی۔ عاطون کی بدروح بھی اسی جگہ تھی۔ اچانک لاش میں حرکت پیدا ہوئی۔ دیوی مایا نے پدم ناگ کو آواز دی۔ وہ انسانی شکل اختیار کر کے غار میں آ گیا۔ عاطون بھارتہ کی بدروح بھی لاش کو تکنے لگی۔

راجا کی لاش میں اس کی روح داخل ہو گئی تھی۔ راجا نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے اپنے سامنے ایک خوبصورت لڑکی اور سحر انگیز آنکھوں والا نوجوان نظر آیا۔ خوبصورت لڑکی دیوی مایا تھی اور نوجوان پدم ناگ تھا۔ دیوی مایا نے راجا کو ساری کہانی سنا کر اس کی حیرت کو دور کیا اور اپنے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا کہ وہ اس کی ہمدرد ہے۔

راجا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے محل میں جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ پدم ناگ اور دیوی مایا بھی یہی چاہتے تھے۔ پدم ناگ نے عاطون بھارتہ کی بدروح کو اٹھا کر اپنی جیب میں داخل کیا اور راجا کو لے کر غار سے باہر آ گئے۔ پدم ناگ اور دیوی مایا جب راجا کو لے کر شاہی محل کے دروازے پر پہنچے تو سارا محل خوشی کے جے کاروں سے گونج اٹھا۔ رانی کاروشی کی مسرت کا تو کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ پدم ناگ نے رانی ماں کو بتایا کہ راجا مرا نہیں تھا۔ اسے سکتہ ہو گیا تھا۔ ہم نے جنگل میں اس کا علاج کیا اور اب اسے آپ کے محل میں پہنچا دیا ہے۔

راجا نے دربار لگایا اور پدم ناگ اور دیوی مایا کو شاہی خلعت پیش کی۔

دیوی مایا نے کہا "مہاراج! ہم سنیاسی لوگ ہیں' جنگلوں میں رہتے ہیں۔ اس خلعت کے برابر دولت ہماری جانب سے غریبوں میں تقسیم کر دی جائے۔"

راجا نے ایسا ہی کیا۔

عاطون بھارتہ کی بدروح راجا کو زندہ ہونے کے بعد اپنے آپ میں ایک عجیب مگر خوشگوار تبدیلی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس پر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہے۔ پدم ناگ اور دیوی مایا واپس جنگل کی طرف جا رہے تھے کہ بھارتہ عاطون کی روح

جیب سے باہر آ گئی۔

دیوی مایا نے روح کو دیکھ کر کہا "عاطون! میں تمہاری شکل دیکھ سکتی ہوں۔ تم زندہ شکل اختیار کر رہے ہو۔"

پدم ناگ بھی عاطون کو زندہ انسانی شکل میں واپس آتے دیکھ رہا تھا۔ عاطون بھار کی روح کی دھواں دھواں لہریں انسانی قد کے برابر ہو گئیں پھر اس نے انسانی جسم کی شکل اختیار کر لی۔ دوسرے ہی لمحے عاطون زندہ سلامت حالت میں ان کے سامنے کھڑا تھا۔

پدم ناگ بولا "عاطون! آکاش کے دیوتاؤں نے تمہارے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ ورنہ تمہیں انسانی شکل کبھی نصیب نہ ہوتی۔"

عاطون اپنے جسم کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی بے حد مسرور تھا۔ اس نے کہا۔ "پدم ناگ اور دیوی مایا! میرے دل میں نیکی اور پاکیزگی کے جذبات بیدار ہو رہے ہیں۔ اب میرا ضمیر شیشے کی طرح پاک صاف اور شفاف ہے۔"

اس وقت یہ تینوں جنگل میں ایک پہاڑی کے دامن میں چشمے کے پاس کھڑے تھے۔ وہ وہاں بیٹھ گئے۔ عاطون نے چشمے کے پانی کے دو گھونٹ پئے اور بولا "لگتا ہے میرا یہ جنم اور اس جنم کے سارے کشٹ ختم ہو چکے ہیں اور نیا جنم شروع ہوا ہے۔ میں اب نیکی اور ایمانداری کی زندگی بسر کروں گا۔"

ابھی الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ انہیں 'نارائن نارائن' کی آواز سنائی دی۔ پدم ناگ بولا "یہ گگن منڈل کے نارومنی دیوتا کی آواز ہے۔ وہ ضرور کوئی اہم پیغام لے کر آیا ہے۔"

اتنے میں درختوں میں ہلکی سی روشنی ہوئی پھر اس نے انسانی ہیولے کی شکل اختیار کر لی۔ یہ دیوتاؤں کا مشیر خاص نارومنی تھا' جس کے بارے میں شاستروں نے لکھا ہے کہ اسے زمین اور گگن منڈل کے سب راز معلوم ہیں۔ اس کے ہاتھ میں اک تارا تھا جس کی دھن پر وہ نارائن نارائن کا جاپ کر رہا تھا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر بری معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

پدم ناگ اور دیوی مایا نے تعظیم میں سر جھکا دیئے۔

نارومنی نے ان کی طرف دیکھ کر کہا "پدم ناگ اور دیوی مایا! گگن منڈل کے دیوتا تم دونوں سے ناراض ہیں۔ اس لئے کہ تم نے ان کے حکم کے خلاف جاتے ہوئے عاطون کی مدد کی پرنتو! میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔"

پدم ناگ نے کہا "کیا گگن منڈل کے دیوتاؤں نے ہمارے پاپ کو معاف کر دیا

ہے؟"

"نہیں" نارومنی بولا "تمہیں ابھی اپنے گناہوں کا بڑا طویل کفارہ ادا کرنا ہو گا لیکن عاطون کا کشٹ کٹ گیا ہے۔ پرنتو اسے اب ایک نیا جنم ملے گا۔ یہ آج سے دو ہزار برس پیچھے کے زمانے میں پہنچ کر مصر کی کنواری ملکہ نفرتی کے ہاں جنم لے گا لیکن ملکہ چونکہ کنواری ہو گی اس لئے بدنامی سے بچنے کے لئے عاطون کو لکڑی کے ایک صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دے گی۔ یہ صندوق مصر ہی کا ایک معمار اٹھا لے گا اور عاطون اس کے گھر پرورش پائے گا۔ جب یہ جوان ہو گا تو اس کے ماں باپ مر جائیں گے اور یہ راز کھل جائے گا کہ مصر کی ملکہ نفرتی کا ناجائز بیٹا ہے۔ یوں شاہی خاندان اس کا دشمن ہو جائے گا اور اسے ہلاک کرنے کے لئے سپاہیوں کا دستہ روانہ کیا جائے گا لیکن عاطون گھر سے فرار ہو کر مصر کے اس قبرستان میں اپنی والدہ کی قبر پر آخری بار دعا مانگنے کے لئے جائے گا بس یہاں سے عاطون کا ایک انوکھا اور سنسنی خیز سفر شروع ہو گا۔ اسے درویش اناطول کی جانب سے اس کے غیر فانی ہونے کی بشارت ملے گی۔"

عاطون' پدم ناگ اور مایا دیوی غور سے یہ سب کچھ سن رہے تھے۔ دیوی مایا نے سوال کیا "مہاراج! کیا ہم بھی عاطون کے ساتھ سفر کریں گے۔"

نارومنی بولا "نارائن نارائن! تم ابھی عاطون کے ساتھ نہیں ہو گے۔ اس کے حیرت انگیز سفر کے دوران اپنے آپ واقعات کی زنجیر کے ساتھ تمہاری ملاقات عاطون سے ہو جائے گی اور پھر تم بھی اس کے صدیوں کے سفر میں شامل ہو جاؤ گے۔"

اب عاطون نے کہا "مہاراج! میں ایک بار صدیوں کی مسافت طے کر چکا ہوں کیا یہ سفر اس سے مختلف ہو گا۔"

نارومنی مسکرایا پھر بولا "عاطون! تم نے جو سفر کیا وہ سفر اب سے پانچ ہزار برس آگے کا سفر تھا۔ اب تم سات ہزار برس تاریخ میں پیچھے چلے جاؤ گے۔ یہ تمہارا ایک پچھلا جنم ہو گا اور یہی تمہارے گناہوں کا کفارہ بھی ہو گا" پھر نارومنی نے پدم ناگ اور دیوی مایا کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا اور بولا "تم دونوں وقت کے دھندلکوں میں غائب ہو جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

نارومنی نے سیدھے ہاتھ کی انگلی کو تین بار لہرایا۔ اس کے ساتھ ہی پدم ناگ اور دیوی مایا غائب ہو گئے۔ عاطون خاموش مگر ادب سے کھڑا تھا۔

نارومنی نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "عاطون اب تم بھی پیچھے کے زمانے میں جا رہے ہو۔ پدم ناگ اور دیوی مایا اپنے وقت پر تم سے آن ملیں گے اور تم تینوں کی

یادداشت محفوظ ہوگی۔ تم ایک دوسرے کو پہچان لو گے۔ میں تمہیں غائب کر رہا ہوں۔ جب ظاہر ہو گے تو اپنے آپ کو ایک قبرستان کے دروازے پر پاؤ گے تم اس وقت جان کر مصر سے فرار ہو رہے ہو گے۔ اپنی آنکھیں بند کر لو۔"

عاطون نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اسے نارومنی کی آواز سنائی دی۔ "بچہ آنکھیں کھول دو۔"

عاطون نے آنکھیں کھولیں تو وہ ایک پرانے قبرستان کے بوسیدہ محرابی دروازے کے سامنے گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ اس کا لباس مصر کے قدیم راہب درویشوں ایسا تھا۔ مصر کے صاف آسمان پر غروب ہوتے سورج کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ قبرستان میں موت کا سناٹا تھا اور پرانی قبروں کو جنگلی جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ عاطون کو سب کچھ یاد آنے لگا کہ کس طرح اس نے ایک حکیم اور معمار مصری کے ہاں پرورش پائی اور پھر اس کے ماں باپ کا انتقال ہو گیا۔ باپ دریا برد ہو گیا اور ماں کو اس نے اپنے ہاتھوں اسی قبرستان میں دفن کیا تھا جس کے دروازے پر وہ کھڑا تھا اور مصر سے فرار ہونے سے پہلے ماں کی قبر پر دعا پڑھنے آیا تھا۔

عاطون کے دائیں جانب اہرام کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ عاطون گھوڑے سے اترا اور قبرستان میں داخل ہو گیا۔ وہ اپنی والدہ کی قبر کو پہچانتا تھا۔ والدہ کی قبر پر زرد گھاس اگ رہی تھی۔ عاطون نے ہاتھ اٹھا کر اپنی والدہ کے حق میں دعا پڑھی اور اٹھ کر واپس جانے لگا تو اچانک ایک بھاری خشک آواز نے اسے روک لیا یہ آواز جنگلی انجیر کے ایک درخت کے پیچھے سے آ رہی تھی۔

"عاطون! میں درویش اناطول کی روح ہوں۔ میں تمہیں یہ بشارت دیتا ہوں کہ رب عظیم نے تمہیں ایک خاص وقت کے لئے امر کر دیا ہے۔ تم دوسرے جنم میں بھی اسی حالت میں پیدا ہو گے لیکن یہ تمہارا پہلا انسانی جنم ہے۔"

عاطون نے کہا "عظیم درویش اناطول میں کبھی ختم نہ ہونے والی زندگی سے عاجز آ چکا ہوں۔ کیا میری رہائی نہیں ہو سکتی؟"

درویش اناطول کی آواز آئی "تمہیں اپنے پچھلے جنم کے کچھ برے اعمال کا کفارہ ہر حالت میں ادا کرنا ہوگا۔ تم یہاں سے کہاں جاؤ گے اور تمہیں کیسے کیسے حالات پیش آئیں گے یہ بتانے کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ رب عظیم تمہاری حفاظت کرے۔"

عاطون نے درویش اناطول کو پکارا مگر درویش کی روح جا چکی تھی۔

عاطون پرانے قبرستان سے نکلا تو اسے زرد صحرا میں کچھ گھڑسوار آتے ہوئے نظر

آئے۔ یہ اس کے دشمن تھے جو اسے گرفتار کرنے آ رہے تھے۔ وہ عاطون کو قتل نہیں کر سکتے تھے لیکن عاطون اب ان بے فیض لوگوں میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ اچھل کر گھوڑے پر بیٹھا اسے ایڑ لگائی اور باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ رات ہونے سے پہلے عاطون نے مصر کی سرحد عبور کر لی اور ملک بابل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس وقت بابل اور نینوا پر مشہور جرنیل بخت نصر کی حکومت تھی۔ بخت نصر کی حکومت آج کے ملک شام سے لے کر ایران اور لیبیا کے ساتھ ساتھ بحیرہ روم کے جزیروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بابل و نینوا کی تہذیب کے عروج کا دور تھا۔ یہ قوم بت پرست تھی اور سب سے بڑے بت مردوخ کی پوجا کرتی تھی۔ بادشاہ بخت نصر خود کو دیوتا مردوخ کا بیٹا کہتا تھا۔ جب باشادہ بخت نصر کی سواری نکلتی تو فوج کے دستے اس کے آگے پیچھے ہوتے۔ مندروں کے پجاری آگے آگے بھجن گا رہے ہوتے اور دیوداسیاں محو رقص ہوتی تھیں۔ اس وقت کسی کو مکان کی کھڑکی میں سے جھانکنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ لوگ بازاروں میں سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ بخت نصر ایک ظالم بادشاہ بھی تھا۔ اس نے جب نینوا کو فتح کیا تو وہاں کے لوگوں کی کھوپڑیوں کا ایک اونچا مینار بنایا۔ بخت نصر نے اپنی بیوی سمیرا کی خاطر بابل میں معلق باغات بنوائے تھے۔

بابل کی سرحد پر عاطون کو بابلی سپاہیوں نے روک کر پوچھ گچھ کی۔ عاطون نے انہیں بتایا کہ وہ راہب حکیم ہے اور جڑی بوٹیوں کی تجارت کرتا ہے اور ملک ایلام سے آیا ہے۔ سپاہیوں نے عاطون کو بابل کی سرحد میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ عاطون نے گھوڑا بابل کی سرحد میں بڑھا دیا۔ ابھی بابل کا شہر دور تھا کہ اسے صحرا میں رات ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ بابل کا شہر ابھی کافی دور ہے کیوں نہ کسی جگہ رات بسر کی جائے ... عاطون ابھی گھوڑے پر سوار کوئی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا کہ صحرا کے ایک ٹیلے سے نکلتے ہی اسے دور صحرائی رات میں مشعل کی دھیمی روشنی نظر آئی۔ اس نے سوچا کہ ضرور یہ کسی خانہ بدوش کا خیمہ ہے۔ وہاں رات بسر کرنے کی جگہ مل جائے گی۔ وہ روشنی کی طرف چلنے لگا۔

قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ صحرا میں یہ ایک بوسیدہ سی حویلی تھی، جس کے دروازے پر ایک مشعل روشن تھی۔ ایک سپاہی نیزہ لیے ٹہلتا ہوا وہاں پہرہ دے رہا تھا۔ عاطون نے سوچا کہ خواہ مخواہ کسی مصیبت میں پھنسنے سے بہتر یہی ہے کہ وہ وہاں سے واپس چلا جائے۔

اس نے گھوڑے کو واپس کیا ہی تھا کہ اس کا گھوڑا ہنہنایا پہرے دار چوکس ہو گیا اور وہیں سے آواز دی۔ "جو کوئی بھی ہو، وہیں رک جاؤ۔ تم ہمارے آدمیوں کے نرغے میں

ہو۔"

عاطون نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور گھوڑے سے اتر آیا۔ پلک جھپکنے میں وہاں چھ سات مسلح سپاہی آ گئے اور انہوں نے اپنے نیزوں کا رخ عاطون کی طرف کر دیا۔

"کون ہو تم؟ یہاں کیوں آئے ہو؟"

عاطون نے انہیں بتایا کہ وہ شہر ایلام کا حکیم ہے اور بابل کی طرف جا رہا ہے۔ روشنی دیکھ کر ادھر آ گیا کہ شاید رات بسر کرنے کی جگہ مل جائے۔ سپاہی اسے نیزے کے کچوکے لگانے لگے "تم اسے سرائے سمجھ رہے تھے؟ چلو۔ اندر چلو"

عاطون نے مدافعت کرنی مناسب نہ سمجھی۔ حویلی کی ڈیوڑھی میں آ کر سپاہیوں نے عاطون کی تلاشی لی۔ اس کے سونے چاندی کے سکے اور گھوڑا وہیں ہتھیا لیا گیا۔ اس کے بعد وہ عاطون کو بوسیدہ حویلی کی دوسری منزل پر لے گئے اور وہاں اسے ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ عاطون نے کوئی تعرض نہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ رات بسر کرنے کو اسے کوئی جگہ مل جائے اور یہ جگہ اسے مل گئی تھی۔ ان سپاہیوں کی قید سے وہ جب چاہے آزاد ہو سکتا ہے۔ نیند کا وہ محتاج نہیں تھا۔ وہ تو صحرا کی تاریکی میں راستے سے بھٹک جانے کے اندیشے کے پیش نظر کسی مقام پر رات گزارنا چاہتا تھا۔ کوٹھری میں وہ فرش پر ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے کوٹھری کے آگے گزرتے دو آدمیوں کی باتیں سنیں۔ ایک نے کہا "یہ کوئی دشمن کا قیدی ہے؟ اگر دشمن ہے تو اسے قتل کیوں نہیں کر دیتے؟"

دوسرے نے جواب دیا "دشمن کا جاسوس لگتا ہے صبح اس کا کام تمام کر دیں گے۔"

عاطون زیر لب مسکرایا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس حویلی کے سارے سپاہی بھی مل جائیں تو اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ اس نے یونہی اپنے ذہن کو سکون پہنچانے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد اسے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی عورت آہستہ آہستہ بین کر رہی ہے۔ عاطون نے آنکھیں کھول کر اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ عورت کی آواز ایک جگہ دیوار کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ اس نے دیوار کو ٹٹولا۔ یہ چوڑی اینٹ کی دیوار تھی جس کا چونا جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ عاطون نے مزید چونا کھرچ ڈالا پھر شگاف میں انگلیاں ڈال کر اپنی غیر معمولی طاقت سے کام لیتے ہوئے چوڑی اینٹ کا زور لگا کر اندر کی طرف کھینچا۔ اینٹ دیوار سے اکھڑ کر اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ عاطون نے دوسری اور تیسری اینٹ میں اکھاڑ ڈالی۔ یہ تینوں اینٹیں اس نے دیوار کے ساتھ فرش پر رکھ دیں اور دوسری طرف گھس گیا۔

دوسری طرف بھی اندھیرا تھا مگر یہاں اندھیرے میں ہلکی خنک ہوا آ رہی تھی۔

ایک چھوٹی اور تنگ سی غلام گردش قسم کی راہداری تھی۔

عورت کی آواز اب صاف سنائی دے رہی تھی۔ عاطون اس آواز کی سمت دبے پاؤں چلنے لگا۔ اندھیرے میں چند قدم آگے جا کر راہ داری بند ہو گئی۔ یہاں ایک لکڑی کا دروازہ تھا جس پر لوہے کا تالا لگا تھا۔ آواز اس دروازے کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ عاطون نے کنڈے کو تالے سمیت اکھاڑ کر آہستہ سے نیچے لٹکا دیا کہ آواز پیدا نہ ہو پھر اس نے تھوڑا سا دھکیل کر دروازے کا پٹ کھول دیا۔

اندر کوٹھری میں دیئے کی دھیمی لو میں ایک عورت اپنے سیاہ بال کھولے، چہرہ گورے گورے ہاتھوں میں چھپائے آہستہ آہستہ سسکیاں بھر کر رو رہی ہے۔ اس کے پاؤں میں لوہے کی زنجیر پڑی ہے۔ اور وہ چٹائی پر بیٹھی ہے۔ اس عورت نے دروازے کھلنے کی بے معلوم آواز کو نہیں سنا تھا۔

عاطون آگے بڑھا تو اس کے قدموں کی آواز سے عورت نے اپنے چہرے پر سے ہاتھ اٹھا لیے اور عاطون کی طرف دیکھا۔

عورت جوان تھی اور اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور چہرہ بتا رہا تھا کہ کسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نے سسکی بھر کر کہا۔ "اگر تم میری گردن کاٹنے آئے ہو تو بے شک گردن کاٹ ڈالو مگر رب عظیم کے نام پر مجھے ایک بار اپنے شہزادے کی صورت دکھا دو۔"

عاطون نے کوٹھری کا دروازہ بند کر دیا اور جلدی سے اس عورت کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور سرگوشی میں اسے بتایا کہ وہ جلاد نہیں بلکہ اسے وہاں قیدی بنا لیا گیا ہے عورت سیاہ آنکھیں کھولے عاطون کو تکنے لگی۔

عاطون نے اسے بتایا کہ وہ ایلام شہر کا باشندہ ہے۔ بابل کی طرف جا رہا تھا کہ سپاہیوں نے پکڑ کر یہاں قید میں ڈال دیا تمہاری درد بھری آواز مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ اے خاتون تم کون ہو اور یہ لوگ تمہیں کیوں قتل کرنے والے ہیں۔

خوبصورت عورت نے آنسو بھری آواز میں آہستہ سے کہا "میں ملک نینوا کے مقتول بادشاہ کی بد نصیب ملکہ ہوں۔ بخت نصر نے میرے خاوند اور شاہی خاندان کے ایک ایک فرد کو بے دردی سے ہلاک کر دیا۔"

عاطون نے کہا "تو پھر آپ کا شہزادہ کیسے بچ گیا؟ جس کا ابھی آپ ذکر کر رہی تھیں۔"

ملکہ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی اور کسی قدر گھبراہٹ میں کہا "نہیں نہیں۔ میرا

شہزادہ ہلاک ہو گیا تھا وہ زندہ نہیں ہے۔ رب عظیم کی قسم وہ زندہ نہیں ہے۔"

عاطون نے ملکہ کا ہاتھ تھام کر اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "شاہی خاندان کی عظی
عورت! میں تمہیں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ میرا تعلق
بخت نصر کی فوج کے محکمہ جاسوسی سے نہیں ہے۔ میں ایک طبیب ہوں اور روزی کما
بابل جا رہا تھا اگر تم مجھے شہزادے کے بارے کچھ بتانا چاہو تو بے جھجک بتا دو۔ میں تمہار
دل و جان سے مدد کروں گا۔"

ملکہ نے عاطون کا ہاتھ تھام کر بے تابی سے کہا "کیا تم مجھے میرے شہزادے بیٹے
سے ملوا سکتے ہو؟ کیا تم مجھے ان ظالموں کی قید سے نکال کر میرے بیٹے کے پاس لے جا سک
ہو؟"

عاطون نے کہا "میں کوشش کروں گا لیکن پہلے مجھے بتاؤ کہ شہزادہ کہاں ہے؟"

ملکہ نینوا نے چراغ گل کر دیا۔ اندھیرے میں اس نے سرگوشی میں کہا "جب اشور
ادشاہ بخت نصر اپنے ہاتھ میں تلوار لئے محل میں داخل ہوا تو اس نے میری آنکھوں کے
سامنے میرے خاوند اور میرے خاندان کے لوگوں کو قتل کر ڈالا میں محل کے ایک ستون کے
پیچھے یہ سارا دردناک منظر دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے میرے شہزادے پر تلوار کا وار کیا تو
میں چیخ مار کر اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے دوڑی۔ شہزادہ زخم کھا کر بے ہوش ہو کر گرا۔ بخت
نصر نے میری گردن پر بھی تلوار رکھ دی۔ پھر اپنے جرنیل سے کہا کہ ملکہ کو قید میں ڈال
دو۔ وہ تلوار نیام میں ڈال کر چلا گیا اور سپاہیوں نے مجھے محل کے ایک اندھیرے تہ خانے
میں پھینک دیا۔ آدھی رات کو میرا وفادار غلام کسی طرح شاہی محل میں پڑی لاشوں تک پہنچ
گیا۔ اس نے دیکھا کہ میرا شہزادہ' میرا بیٹا ماروت شدید زخمی حالت میں پڑا تھا مگر ابھی اس کا
سانس چل رہا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر محل کے خفیہ راستے سے نکال کر شہر سے باہر ایک پہاڑی
غار میں لے گیا۔ اس نے شہزادے کی مرہم پٹی کی اور پھر مجھے آ کر بتایا کہ شہزادہ زندہ ہے مگر
زخمی ہے۔ اس بات کو ہفتہ عشرہ گزر گیا ہے' مجھے پھر میرے بچے کی خبر نہیں ملی۔ میں اس
خیال سے کسی کے آگے اس کا نام نہیں لیتی کہ لوگ اسے قتل کرنے نہ چل دیں پھر بھی
جب تمہیں دیکھ کر محسوس ہوا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے تو میں نے تمہارے سامنے
زندگی کی آخری خواہش کا اظہار کر دیا۔"

عاطون نے کہا "لیکن تمہیں محل سے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

ملکہ نے بتایا کہ شاہی محل کے تہ خانے میں مجھے اس ویرانے میں اس لیے قید کیا گیا
ہے کہ میں اپنی رعایا سے دور ہو جاؤں۔ "بخت نصر کا ارادہ مجھ کو اپنے حرم میں ڈالنے کا ہے

لیکن یہ ظالم انسان مجھے کچھ وقت تک قید کی اذیتیں دینا چاہتا ہے۔"

عاطون نے کہا "نینوا پر تو بخت نصر کا قبضہ ہے اور وہاں اس کا جرنیل حکومت کرتا
ہے وہ غار کہاں ہے جہاں تمہارا بیٹا چھپا دیا گیا ہے؟"

ملکہ کہنے لگی "میرے وفادار نے مجھے بتایا تھا کہ شہر کے مشرقی دروازے سے اگر باہر
نکلیں تو سات کوس کے فاصلے پر ایک خشک اور بنجر پہاڑی کے دامن میں ہے۔ دریائے
فرات وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

عاطون نے ملکہ کو تسلی دی اور کہا کہ وہ منہ اندھیرے کسی نہ کسی طرح اس حویلی
سے فرار ہو جائے گا اور اس کے بیٹے کے پاس جا کر اس کی خیریت معلوم کر کے اسے کسی
محفوظ مقام پر پہنچانے کے بعد واپس آ کر اسے بھی وہاں سے نکال لے جائے گا۔ اس کے
ساتھ ہی عاطون نے ملکہ سے اس خدشے کا اظہار بھی کر دیا کہ اس کا اس وقت اس کے
ساتھ جانا مزید مشکلات پیدا کر دے گا۔ ملکہ نے عاطون کا ہاتھ تھاما کر التجا کی کہ وہ طبیب ہے
تو فوراً" اکیلا ہی اس کے بیٹے کے پاس جا کر اس کی جان بچانے کی کوشش کرے۔ "میرے
ساتھ جو ہو گا وہ مجھے قبول ہے مگر میرے بیٹے کو ضرور زندہ رہنا چاہیے۔ وہی باپ کے تخت کا
وارث ہے اگر وہ زندہ رہا تو ایک نہ ایک دن اپنا شاہی مقام حاصل کرنے میں ضرور کامیاب
ہو جائے گا۔"

عاطون نے ملکہ سے وعدہ کیا کہ وہ اس کے شہزادے کی جان بچانے کی سر توڑ
کوشش کرے گا۔ ملکہ نے ایک انگوٹھی اتار کر عاطون کو دی تاکہ اس کے وفادار غلام کو اس
پر دشمن کے جاسوس ہونے کا شک نہ ہو۔

عاطون خاموشی سے اٹھ کر کوٹھری سے باہر اندھیری ..... راہ داری میں آ گیا۔ اس
نے دروازے کے تالے والے کنڈے کو دوبارہ دروازے کے پٹ میں لگا دیا اور دبے پاؤں
چلتا راہ داری کے دوسرے کنارے کی طرف آیا۔

یہاں ایک زینہ نیچے جاتا تھا۔ وہ زینہ اترتا گیا۔ زینے کی آخری سیڑھی کے پاس
ایک سپاہی تلوار اپنے گھٹنوں پر رکھے سو رہا تھا۔ عاطون دبے پاؤں اس کے قریب سے گزرا
تو سپاہی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے تلوار اٹھا کر عاطون پر حملہ کر دیا عاطون نے اس کے تلوار
کے وار کو اپنے بازو پر لیا اور لپک کر اس کی گردن کو دبوچ لیا۔ عاطون نہیں چاہتا تھا کہ
سپاہی شور مچا سکے۔ عاطون کی آہنی گرفت سے نکلنا سپاہی کے بس کی بات نہیں تھی۔ عاطون
کے ایک ہی جھٹکے نے اس کا کام تمام کر دیا۔

سامنے وہ دروازہ تھا جو حویلی کی ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔ عاطون دروازے کی طرف

بڑھا۔

ڈیوڑھی میں صرف دو سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ سامنے والے برآمدے میں عاطون کا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ عاطون نے پاؤں کو آہستہ سے زمین پر مارا اور جلدی سے دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ دونوں سپاہیوں نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا اور نیزے تانے اس طرف آئے۔

جونہی وہ دروازے میں سے گزرے، عاطون نے پیچھے سے ان کی کھوپڑی پر پوری طاقت سے ضرب لگائی۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ دونوں کی کھوپڑیاں پچک گئیں۔ اور وہ منہ کے بل آگے کو گر پڑے۔ عاطون ڈیوڑھی میں آگیا۔ حویلی کے دوازے میں جو مشعل جل رہی تھی اس کی روشنی اندر ڈیوڑھی میں آ رہی تھی۔ عاطون نے دیکھا کہ کچھ سپاہی ایک طرف لمبی تانے سو رہے تھے۔ صرف حویلی کے پھاٹک کے باہر سپاہی دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔

عاطون نے دبے پاؤں اس کے عقب میں آگیا اور اسے بھی جہنم رسید کر دیا پھر وہ برآمدے میں آیا۔ گھوڑے کو کھولا اور اسے قدم قدم چلاتا پھاٹک کی طرف بڑھا ہی تھا کہ گھوڑے کے قدموں کی چاپ سے سپاہیوں کی آنکھ کھل گئی۔ اپنے رات کے قیدی کو فرار ہوتے دیکھ کر وہ اس پر ٹوٹ پڑے مگر عاطون گھوڑے پر اچھل کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے گھوڑے کی اگلی ٹانگیں اوپر اٹھالیں اور اس طرح گھما کر ایک چکر دیا کہ گھوڑے کی ٹانگوں سے ڈر کر سپاہی پیچھے ہٹ گئے۔ عاطون کے گھوڑے کے لئے اتنی مہلت ہی کافی تھی۔ عاطون نے گھوڑے کی پسلیوں پر زور سے پاؤں مارے اور گھوڑا ایک دم سے حویلی سے باہر تھا۔ پیچھے سے اس پر نیزے مارے گئے پھر تیروں کی بارش کی گئی مگر عاطون ان کی زد سے نکل چکا تھا۔ سپاہیوں نے اس خیال سے بھی عاطون کا پیچھا کرنا ناپسند نہ کیا کہ وہ شاہی قیدی نہیں تھا۔

عاطون ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں صحرائی راستے پر گھوڑے کو بھگائے لئے جا رہا تھا۔ اس نے بہت جلد ملک بابل کی سرحد کو عبور کر لیا تھا اور اپنا رخ نینوا کی جانب موڑ دیا۔ نصف شب گزر چکی تھی کہ وہ دریائے فرات کے کنارے پہنچ گیا۔ دریا کا پانی ستاروں کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ یہاں عاطون نے اتر کر گھوڑے کو پانی پلایا۔ دم بھر اسے آرام کرنے دیا اور پھر اس پر سوار ہو کر نینوا کی جانب روانہ ہو گیا۔

صبح کا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا کہ عاطون کو دور سے نینوا شہر کی عمارتیں سورج کی اولین کرنوں میں چمکتی نظر آئیں۔ اس نے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی۔ شہر کو جانے کے لئے دریا

پر کشتیوں کا پل بنا تھا۔ یہاں لوگ آ جا رہے تھے۔ عاطون کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ دریا پار کر کے عاطون نے شہر نینوا کی فصیل کے ساتھ ساتھ شہر کے مشرقی دروازے کا رخ کیا۔ اسے شہر میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ شہر نینوا کے مشرقی دروازے کے قریب پہنچ کر عاطون نے مشرق کی سمت گھوڑے کو ڈال دیا۔ ملکہ کے کہنے یہاں سے وہ غار سات کوس کے فاصلے پر تھا۔ جہاں اس کے وفادار غلام نے زخمی شہزادے کو چھپا رکھا تھا۔

اندازے کے مطابق سات کوس طے کرنے کے بعد عاطون کو ایک چھوٹا سا سنگلاخ ٹیلا نظر پڑا۔ وہ گھوڑا دوڑاتا ٹیلے کے پاس آگیا۔ اس میں واقعی ایک غار بنا ہوا تھا مگر افسوس کہ غار بالکل خالی تھا۔ وہاں نہ تو کوئی وفادار غلام تھا اور نہ ہی نینوا کا کمسن شہزادہ۔

عاطون نے جھک کر دیکھا۔ غار میں سے کچھ انسانی قدموں کے نشان نکل کر ایک طرف جا رہے تھے۔ یہ تین انسانوں کے قدموں کے نشان تھے۔ عاطون ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ان نشانوں کا رخ کھلے صحرا کی جانب تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد زمین پتھر کی طرح سخت ہو گئی اور انسانی قدموں کے نشان غائب ہو گئے۔

عاطون شش و پنج کے عالم میں دوبارہ غار کی طرف آگیا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ شہزادے کو اگر سپاہی پکڑ کر لے گئے ہیں تو قدموں کے نشان شہر کی طرف جانے کے بجائے کھلے صحرا کی طرف کیوں جا رہے تھے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ غلام غار میں شہزادے کو غیر محفوظ سمجھ کر کسی دوسری جگہ لے گیا ہو؟ لیکن سوال یہ ہے کہ تیسرا آدمی کون تھا؟

یہ معمہ عاطون کو پریشان کر رہا تھا آخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ شہر کی طرف جانے کی بجائے اسے قدموں کے نشان کی سمت صحرا کی طرف جانا چاہئے۔ قدموں کے نشان جہاں آ کر غائب ہو جاتے تھے عاطون نے اس کے آگے گھوڑے کو دوڑا دیا۔ یہاں زمین سخت تھی۔ اب دن پوری طرح نکل آیا تھا۔ دھوپ میں تیزی آنے لگی تھی۔ آہستہ آہستہ زمین نرم ہونے لگی۔ عاطون نے ایک جگہ گھوڑے کو روک کر نیچے دیکھا۔ کسی جگہ بھی ریت پر انسانی پاؤں کے نشان نہیں تھے۔ عاطون کو یقین تھا کہ غلام کم سن شہزادے کو لے کر اسی طرف گیا ہے۔

ویران صحرا میں آدھے گھنٹے تک گھوڑے پر سفر کرنے کے بعد عاطون کو دور سرو اور کھجوروں کے جھنڈ دکھائی دیئے۔ ان کے پاس ہی ایک کچے مکان بھی تھے۔ عاطون نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور چند ساعتوں میں اس جھنڈ کے پاس پہنچ گیا۔ یہ سرخ انگوروں کا ایک باغ تھا جس کے عقب میں کھجور اور سرو کے درخت صحرا کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔

کچے مکانوں پر سناٹا چھایا تھا۔ وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ عاطون نے گھوڑے کو ایک جگہ باندھا اور انگور کے باغ کے قریب سے ہو کر گزرنے لگا۔ وہ کچے مکانوں کی طرف جا رہا تھا۔ انگور کے باغ میں پتھر کا ایک حوض بنا ہوا تھا۔ اس حوض میں سرخ انگور کے گچھوں کو ڈال کر مشروب تیار کیا جاتا تھا۔ انگور کی بیلیں لکڑی کے سائبانوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ ان پر ابھی پھل نہیں لگا تھا۔

اچانک عاطون کی نظر ایک حبشی پر پڑی جو انگور کے پتوں کو توڑ رہا تھا۔

وہ اس کے قریب آیا تو حبشی جو غلام معلوم ہوتا تھا چونک سا گیا لیکن اس نے بظاہر عاطون کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ عاطون نے اسے اس زمانے کی رسم کے مطابق سلام کیا اور کہا کہ کیا پینے کو پانی مل جائے گا۔ حبشی بڑی رکھائی سے بولا۔ "یہاں پانی نہیں ہے۔ یہاں کوئی نہیں رہتا" یہ کہہ کر حبشی انگور کے پتوں والی ٹہنیاں اٹھا کر ایک طرف چل پڑا۔

عاطون نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بھائی! کیا یہاں کوئی انسان نہیں جو ایک پیاسے کو پانی پلائے۔"

حبشی کے کاندھے پر ہاتھ رکھنے سے عاطون کا مقصد یہ تھا کہ اگر یہ حبشی ملکہ کا غلام ہے تو عاطون کی انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی دیکھ کر ضرور چونکے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حبشی غلام نے عاطون کی انگلی میں ملکہ کی خاص انگوٹھی دیکھی تو قدرے تعجب سے پوچھا "تم کو یہ انگوٹھی کہاں سے ملی ہے؟"

عاطون نے مسکرا کر کہا "یہ راز میں میں صرف ملکہ نینوا کے وفادار غلام کو ہی بتا سکتا ہوں۔"

حبشی ایک لمحے کے لئے چپ ہو گیا۔ وہ عاطون کی طرف ٹکٹکی باندھے تک رہا تھا۔

عاطون نے کہا "میں شہزادے کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔ مجھے ملکہ نے بھیجا ہے"

حبشی کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اس نے آہستہ سے پوچھا "یہ انگوٹھی تمہیں کس نے دی ہے؟"

"ملکہ نینوا نے یہ انگوٹھی خود مجھے عنایت کی تھی تاکہ تم مجھ پر بھروسہ کر سکو۔ کیا تم ملکہ کے وفادار غلام جانو ہو؟"

حبشی غلام عاطون کو کھجور اور سرو کے درختوں کے جھنڈ میں لے گیا۔ یہاں گہری چھاؤں تھی۔ ایک جگہ خشک ٹہنیوں اور پتوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ حبشی غلام وہاں پہنچ کر رک گیا اس نے پلٹ کر عاطون کی طرف دیکھا اور پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟ تمہیں ملکہ کہاں ملی

تھیں؟"

عاطون نے سارا قصہ اسے سنا دیا۔ سب سے بڑا ثبوت ملکہ کی خاص انگوٹھی تھی پھر بھی وفادار غلام اپنی بھرپور تسلی کرنا چاہتا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ آدمی ملکہ نینوا کی طرف سے آیا ہے تو اس نے عاطون کو اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

درختوں کے جھنڈ کے پیچھے ایک کچی چار دیواری تھی۔ اندر کچا صحن تھا۔ صحن کے دائیں جانب ایک کوٹھری کا دروازہ بند پڑا تھا۔ حبشی غلام دروازہ کھول کر عاطون کو اندر لے گیا۔ کوٹھری کی نیم روشن ٹھنڈی فضا میں عاطون نے دیکھا کہ کونے میں زمین پر ایک چٹائی بچھی ہوئی ہے جس پر آٹھ نو برس کا ایک لڑکا یوں لیٹا ہے کہ اس کے سینے پر پٹیاں بندھی ہیں اور وہ آہستہ آہستہ کراہ رہا ہے۔

حبشی نے بتایا کہ یہی شہزادہ ماروت ہے۔ عاطون نے چراغ جلا کر شہزادے کے سینے کا زخم دیکھا۔ زخم اتنا گہرا نہیں تھا لیکن لمبا تھا مناسب دوائی نہ ملنے کی وجہ سے خراب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ عاطون نے اس وقت زخم کو نیم گرم پانی سے صاف کیا اور اس پر انگور کے پتے رکھ کر پٹی باندھ دی پھر وہ صحرا میں ایک خاص بوٹی کی تلاش میں چل پڑا۔ یہ بوٹی ایک خاص قسم کا فالسے کے برابر سرخ پھل دیتی ہے جو گہرے سے گہرے زخم کو فوری طور پر بھرنے میں بے حد معاون ثابت ہوتی ہے۔

تھوڑی سی تگ و دو کے بعد اسے یہ بوٹی مل گئی۔ حبشی غلام کی مدد سے اس نے بوٹی کے پھل کو پتھر پر رکھ کر پیسا اور اس کا لیپ شہزادے کے زخم پر لگایا۔ کچھ دیر بعد شہزادے کو افاقہ ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ عاطون کو دیکھ کر اس نے حبشی غلام سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟

عاطون نے بتایا کہ وہ شاہی خاندان کا وفادار طبیب ہے اور اس کا علاج کر رہا ہے۔

شہزادہ ماروت نے آنکھیں بند کر لیں تین چار دن کے علاج کے بعد شہزادہ ماروت کو کافی صحت ہو گئی۔ جب شہزادہ اس قابل ہو گیا کہ وہ عاطون اور حبشی غلام کے ساتھ ملک نینوا سے فرار ہو سکے تو عاطون نے غلام سے دریافت کیا کہ انہیں شہزادے کو نکال کر کہاں لے جانا چاہئے کہ جہاں وہ بخت نصر کی تلوار سے محفوظ ہو جائے۔

حبشی غلام نے عاطون کو بتایا کہ ملک یمن میں اس کا ایک چچا رہتا ہے' اگر ہم شہزادے کو کسی طرح یمن لے جانے میں کامیاب ہو جائیں تو وہ دشمن کی پہنچ سے باہر ہو جائے گا۔

حبشی غلام کے پاس سونے کے سکوں کی ایک تھیلی اور کچھ قیمتی جواہرات بھی تھے

اس نے نینوا کے شہر میں جا کر جواہرات فروخت کر کے تین گھوڑے اور ریشمی کپڑے کے کچھ تھان خریدے۔ انہیں ایک گھوڑے پر لادا اور واپس غار میں آ گیا۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ کپڑے کے سوداگر کا بھیس بدل کر سفر کریں گے۔ ایک رات انہوں نے سوداگروں کا بھیس بنایا۔ شہزادے کو کپڑے کے تھانوں میں چھپا کر گھوڑے پر لٹا دیا اور منہ اندھیرے غار سے نکل کر نینوا کی سرحد کے طرف روانہ ہو گئے۔ آسمان پر ستاروں کی چمک ماند پڑنے لگی۔ دریائے فرات دائیں جانب ان سے کافی دور رہ گیا تو سورج نکل آیا۔ نینوا کی سرحد قریب آ رہی تھی۔ راستے میں انہوں نے شہزادے کے اوپر سے کپڑے کے تھان ہٹا لئے تھے۔ کھانے پینے کی اشیا انہوں نے ساتھ رکھ لی تھیں عاطون اور حبشی غلام جانو بھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ عاطون فکر مند تھا کہ سرحد پر اگر سپاہیوں سے مڈبھیڑ ہو گئی تو کہیں شہزادے پر کوئی آنچ نہ آ جائے۔ اس وقت وہ ایک ایسے علاقے میں سے گزر رہے تھے جہاں کبھی تو سنگلاخ میدان آ جاتا' کبھی صحرا اور کبھی جنگلی کھجور کا چھدرا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ حبشی غلام سرحد کی جانب رہنمائی کر رہا تھا۔

یونہی سفر کرتے وہ نینوا کی سرحد کو پار کر گئے۔ سرحد کے پار جاتے ہی انہوں نے شہزادے پر سے تھان ہٹا دیئے اور ایک جگہ پڑاؤ ڈال دیا۔

عاطون نے شہزادے کے زخم پر دوائی لگا کر پٹی تبدیل کی۔ ایک دن آرام کرنے کے بعد وہ دوبارہ ملک یمن کی طرف چل پڑے۔ اب صحرائی علاقہ شروع ہو گیا تھا چنانچہ وہ دن رات کا کچھ حصہ وہ کسی مناسب جگہ آرام کرتے۔ یونہی سفر کرتے کرتے وہ ایک شام نخلستان میں پہنچ کر گھوڑوں سے اتر آئے۔ یہاں سے ایک چھوٹا سا چشمہ بہہ رہا تھا۔ گھوڑے پانی پینے لگے عاطون نے شہزادے کے زخم کو دیکھا۔ زخم بھر گیا تھا۔ انہوں نے تھوڑا سا کھانا کھایا۔ پانی پی کر تازہ دم ہوئے اور ستانے کے لئے درختوں تلے بیٹھ گئے۔ عاطون کا خیال تھا کہ انہیں رات ہی جگہ آرام کرنا چاہئے اور منہ اندھیرے سفر شروع کرنا چاہئے۔

صحرا میں غروب ہوتے سورج کی سنہری روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ریت کے اونچے ٹیلوں کے سائے گہرے اور طویل ہو رہے تھے۔ شہزادہ قالین کے ایک ٹکڑے پر لیٹا ہوا تھا۔ عاطون ذرا دور ایک درخت کے نیچے آنکھیں بند کئے پڑا تھا اچانک اسے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ اس سے پہلے کہ وہ آنکھیں کھولتا' دس بارہ سپاہی اس کے سر پر پہنچ گئے تھے۔

یہ بخت نصر کی فوج کے سپاہی تھے۔ انہوں نے آتے ہی سب سے پہلے شہزادے کو قابو میں کیا۔ عاطون اور حبشی غلام ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

سپاہیوں نے دونوں کو دبوچ لیا اور ان کی مشکیں کس دیں عاطون نے دیکھا کہ شہزادہ دو سپاہیوں کی ننگی تلواروں کی چھاؤں میں سہا کھڑا تھا۔ عاطون اگر اپنی غیر معمولی طاقت کا مظاہرہ کر کے خود کو آزاد کرا بھی لیتا تو شہزادے کی جان کو شدید خطرہ تھا۔ چنانچہ وہ خاموش رہا۔ انہیں بخت نصر کے خاص گورنر کی جانب سے زبردست انعام و اکرام کی توقع تھی۔ شہزادہ سپاہیوں کے قبضے میں تھا۔ وہ مطمئن تھے۔ انہوں نے اس جگہ رات بسر کرنے کا فیصلہ کیا اور حبشی غلام اور عاطون کو ایک درخت کے ساتھ باندھ ڈالا اور شہزادے کو دو سپاہی اپنے نرغے میں لے کر بیٹھ گئے۔ سپاہیوں نے محفل گرم کر دی۔

کچھ دیر بعد سپاہی ایک ایک کر کے وہیں مدہوش ہو کر لیٹ گئے۔ صرف وہ سپاہی جاگ رہا تھا جس نے شہزادے کو باندھ کر اپنے پاس ڈال رکھا تھا۔ دوسرا سپاہی سو گیا تھا۔ عاطون کی نگاہیں اس جاگتے ہوئے سپاہی پر جمی تھیں وہ سوچ رہا تھا کہ کون سی ایسی ترکیب ہو کہ وہ اپنی غیر معمولی طاقت سے کام لے کر سپاہی پر جھپٹے اور اسے یوں دبوچے کہ شہزادے کو آنچ نہ آنے پائے۔

رات ہو گئی تھی لیکن آسمان پر ستاروں کے چمکنے کی وجہ سے صحرا میں ہلکی ہلکی روپہلی چمک سی پھیلی تھی۔

عاطون چونک پڑا۔ اس نے ایک دراز قد سپاہی کو آہستہ آہستہ درختوں کی اوٹ سے اس سپاہی کی طرف بڑھتے دیکھا' جو شہزادے کے پاس بیٹھا تلوار ہاتھ میں لئے پہرہ دے رہا تھا۔ اس دراز قد سپاہی کو حبشی غلام نے بھی دیکھ لیا تھا اور وہ بھی اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا پہلے تو عاطون کو خیال گزرا کہ یہ سپاہی بھی انہی میں سے ایک ہے۔ مگر وہ جھک کر یوں آگے بڑھ رہا تھا جیسے پہرے دار سپاہی پر انجانے میں حملہ کرنا چاہتا ہو۔ باقی سپاہی ریت پر ادھر ادھر مدہوش پڑے تھے۔

عاطون کے دیکھتے ہی دیکھتے دراز قد سپاہی شہزادے کے پیچھے کے پہرے دار کے پیچھے آ گیا۔ پیچھے آتے ہی اس نے پلک جھپکنے میں سپاہی کی گردن اپنے ہاتھوں میں دبوچ کر اسے زمین پر گرا دیا۔ پہرے دار کی گردن اس نے پوری طاقت سے دبا رکھی تھی وہ کوئی آواز نکالے بغیر ہی مر گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر دراز قد سپاہی اٹھا اور ریت پر پھونک پھونک کر قدم رکھتا' مدہوش پڑے سپاہیوں کے درمیان سے گزرتا عاطون اور حبشی غلام کے پاس آ گیا۔ اس نے دونوں کی رسیاں کھول ڈالیں پھر شہزادے کو ساتھ لیا اور عاطون اور حبشی کو اشارہ کرنے کے بعد نخلستان کے درختوں میں سے ایک طرف چلنے لگا۔

عاطون اور حبشی غلام بھی دبے پاؤں اس کے پیچھے ہو لئے۔ صحرائی رات کے نیم

روشن اندھیروں نے انہیں بہت جلد اپنی آغوش میں لے لیا۔ ایک ٹیلے کے پاس سپاہیوں کے گھوڑے بندھے تھے۔ انہوں نے بڑی احتیاط سے گھوڑوں کو کھولا اور انہیں ریت پر قدم قدم چلاتے نخلستان سے کافی دور لے گئے پھر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور بہت جلد صحرائی ریت کی دھندلی تاریکی میں گم ہو گئے۔

دراز قد سپاہی نے ابھی تک آپ کو ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ کون ہے۔ اور اس نے شہزادے کو کیوں آزاد کرایا؟ عاطون کو اتنا ضرور اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شخص معزول اور مظلوم شاہی خاندان کا ہمدرد ہے۔

دراز قد سپاہی خود صحرا میں راہ نمائی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کا رخ نینوا کی مخالف تھا۔ جب صحرا میں انہوں نے دو پڑاؤ کا سفر طے کر کیا تو ایک جگہ ریتلی نشیب میں وہ دم لینے کو رک گئے۔ یہاں پہلی بار دراز قد سپاہی نے ان الفاظ میں اپنا تعارف کرایا "میرا نام یورکا ہے میں مقتول شاہ نینوا کی وفادار فوج سے تعلق رکھتا ہوں اور سپہ سالار زرکیسر کی تلاش میں قرطاجنہ فرار ہو رہا تھا کہ مجھے میرے مخبروں نے اطلاع دی کہ شہزادے کی تلاش میں بخت نصر کے سپاہی صحرا کی طرف روانہ ہو گئے ہیں چنانچہ میں اس طرف کو نکل آیا۔ دیوتاؤں نے میری مدد کی اور میں شہزادے اور آپ دونوں کو دشمنوں کی قید آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔"

عاطون نے اپنا تعارف کرایا حبشی غلام کو یورکا جانتا تھا۔ یورکا نے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ شہزادے کو شاہی تخت پر بٹھانے میں ایک روز ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ پھر اس نے بتایا کہ بخت نصر کی سپاہ نے ان کی خفیہ کمیں گاہ پر چھاپہ مار کر سپہ سالار زرکیسر کو گرفتار کر لیا ہے اور اسے بہت جلد شاہ بابل بخت نصر کے دربار میں پیش کرنے کے بعد اس کا سر تن سے جدا کر کے شہر کے دروازے پر لٹکا دیا جائے گا۔ "مجھے اپنے سپہ سالار کو بچانا ہے ملکہ اگرچہ بخت نصر کی قید میں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ شاہ بابل اس کی جان نہیں لے گا بلکہ اس سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ زرکیسر اس وقت قرطاجنہ میں ہے میں قرطاجنہ جاؤں گا۔"

حبشی غلام نے کہا "ہم شہزادے کو لے کر ملک یمن جا رہے ہیں جہاں میرے ایک چچا کا انگور کا باغ ہے"

یورکا نے ہدایت کی ہمیں پوری طرح سے ہوشیار رہنا ہو گا کیونکہ شاہی فوج کے جاسوس شہزادے کی ٹوہ میں یمن بھی پہنچ جائیں گے۔

عاطون نے یورکا سے پوچھا کہ وہ قرطاجنہ میں کہاں قیام پذیر ہو گا' کیونکہ عاطون

شہزادے کو حبشی غلام کے چچا کے مکان پر پہنچا کر یورکا کے توسط سے بابل پہنچ کر ملکہ نینوا کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ یورکا بولا "میں سوداگر کے بھیس میں قرطاجنہ کی پرانی کارواں سرائے میں مقیم ہوں گا۔"

اس کے بعد وہ پھر صحرا میں اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

دوسرے روز یورکا نے اپنے گھوڑے کا رخ قرطاجنہ کی طرف پھیر دیا۔ عاطون اور حبشی غلام شہزادے کو لے کر ایک روز کی مسافت طے کرنے کے بعد ملک یمن کے دارالحکومت میں داخل ہو گئے۔ اس وسیع و عریض قدیم شہر کے جنوب میں انگور کا ایک پرانا باغ تھا۔ اس باغ میں سیاہ پتھروں سے بنا ہوا ایک مکان تھا' جس کے کونے پر سرخ پھولوں والی بیل جھکی ہوئی تھی۔ حبشی غلام' عاطون اور شہزادے کو لے کر مکان کے آنگن میں آیا تو اس کا ادھیڑ عمر حبشی چچا مکان سے نکلا۔

شہزادے کو اس نے پہچان لیا تھا۔ پہلے تو وہ کچھ گھبرایا جلدی سے شہزادے کو مکان کے اندر لے گیا جب اسے اصل صورت حال معلوم ہوئی تو اس نے خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ شہزادے کو اپنی حفاظت میں رکھے گا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد ان سب نے مل کر کھانا کھایا پھر حبشی چچا انہیں اپنے ساتھ مکان کے عقبی کمرے میں لے گیا جہاں اندھیرا تھا۔ اس نے شمع روشن کی اور فرش پر بچھا ہوا قالین ایک طرف ہٹایا۔ نیچے لکڑی کا تختہ لگا تھا۔ اس تختے کو ہٹایا تو نیچے زینہ نمودار ہوا۔ زینے کے ختم ہونے پر ایک چھوٹا سا تہ خانہ آ گیا جس کی دیوار میں چھت کے ساتھ چھوٹے سے روشن دان میں سے دن کی روشنی اور تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ چچا نے بتایا کہ یہ روشن دان مکان کی عقبی جھاڑیوں میں کھلتا ہے اور یہاں پر کسی کی نگاہ نہیں پڑ سکتی۔

عاطون نے شہزادے کی دوائی چچا کو دی اور تاکید کی کہ وہ ہر دوسرے دن شہزادے کے زخم پر لگا دیا کرے۔

ایک رات حبشی چچا کے انگور کے باغ میں قیام کرنے کے بعد یورکا نے اجازت لی اور گھوڑے پر سوار ہو کر قرطاجنہ کی طرف چل پڑا۔ وہ زرکیسر کے ساتھ مل کر وفادار فوج کے سپہ سالار زرکیسر کی مدد کرنا اور ملکہ نینوا کے تخت کو پھر سے بحال کرنا چاہتا تھا۔

اس کے بعد عاطون نے بھی قرطاجنہ کا رخ کیا۔ عاطون کا یہ سفر کافی طویل اور کٹھن تھا۔ تین راتوں تک وہ مسلسل سفر کرتا رہا تھا۔ چوتھے روز اسے دور قرطاجنہ کی فصیل سے سوار دکھائی دیے۔ عاطون کا گھوڑا پیاس سے نڈھال ہو رہا تھا اس نے ایک جگہ چھوٹی سی

کوٹھری دیکھی، جس کے باہر پانی کا چھوٹا سا حوض بنا ہوا تھا۔ عاطون، گھوڑے کو پانی پلانے کے لئے وہاں آیا تو ایک عورت کوٹھری سے نکلی۔ عاطون نے گھوڑے سے اتر کر اس کی تعظیم کی اور بتایا کہ اس کا گھوڑا پیاسا ہے کیا وہ حوض میں سے پانی پلا سکتا ہے؟

بوڑھی عورت نے اجازت دی اور عاطون سے بھی صراحی میں سے پانی پینے کے لئے کہا۔ عاطون نے شکریہ ادا کیا اور گھوڑے کو حوض پر لا کر پانی پلانے لگا۔ عاطون ایک سوداگر کے بھیس میں تھا سورج نکل آیا تھا۔ قرطاجنہ کی فصیل کے برج دھوپ میں چمکنے لگے تھے۔ عاطون مٹی کے پیالے میں پانی پی رہا تھا کہ ایک سپاہی کو دیکھا کہ گھوڑا دوڑاتا وہاں آ کر رک گیا۔ عاطون ہوشیار ہو گیا کیونکہ قرطاجنہ پر بھی بخت نصر کا قبضہ تھا اور وہاں کا ایک گورنر تعینات تھا مگر نووارد سپاہی نے عاطون کی طرف توجہ نہ دی۔ وہ گھوڑے سے اتر کر سیدھا بوڑھی عورت کے پاس آیا اور بولا "اماں! اپنے بیٹے سے کہنا کہ گورنر قرطاجنہ کے شاہی محل میں آج دوپہر تک جنگلی بوٹی کا بڑا تھیلا پہنچا دے۔ شاہی طبیب کو گورنر قرطاجنہ کی دوائی بنانے کے لئے اس کی اشد ضرورت ہے۔"

بوڑھی عورت کے پوچھنے پر سپاہی نے بتایا کہ حاکم اعلیٰ قرطاجنہ تین روز سے بخار میں پھنک رہا ہے اور ابھی تک افاقہ نہیں ہوا۔

عاطون چونکہ جڑی بوٹیوں کا ماہر تھا اس لئے محض انسانی ہمدردی کے خیال سے اس نے سپاہی سے کہا کہ اسے حاکم اعلیٰ کا علاج کرنے کی اجازت مل سکتی ہے؟

سپاہی نے پلٹ کر عاطون کو سر سے پاؤں تک دیکھا

عاطون نے کہا "میں اگرچہ ملک مصر کا ایک سوداگر ہوں لیکن جڑی بوٹیوں سے علاج کرنا میرا آبائی پیشہ ہے۔ ہو سکتا ہے حاکم قرطاجنہ میرے علاج سے اچھا ہو جائے۔"

سپاہی طنزیہ انداز میں بولا۔ "اجنبی سوداگر تم نہیں جانتے کہ اگر تمہارے علاج سے حاکم اعلیٰ کو صحت نہ ہوئی تو تمہیں بھی دوسرے طبیبوں کی طرح اندھے کنویں میں پھینک دیا جائے گا۔ اگر تمہیں یہ شرط قبول ہے تو میں تمہیں شاہی محل میں لے جا سکتا ہوں۔"

عاطون نے کہا کہ اسے یہ شرط قبول ہے۔ چنانچہ سپاہی نے اسے اپنے ساتھ لیا اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گورنر قرطاجنہ کا محل شہر کے وسط میں ایک قلعے کے اندر واقع تھا۔ حاکم قرطاجنہ بے ہوشی کے عالم میں اپنی خواب گاہ میں ریشمی بستر پر پڑا تھا۔ بخور سلگ رہے تھے۔ شاہی طبیب نے حاکم اعلیٰ کی نبض تھام رکھی تھی۔ اس کے ملازم ہاتھ باندھے پاس کھڑے تھے۔ شاہی طبیب نے ناپسندیدہ نظروں سے عاطون کی طرف دیکھا۔ سپاہی نے بتایا کہ یہ سوداگر حاکم اعلیٰ کا علاج کرنا چاہتا ہے۔ شاہی طبیب نے عاطون کو خواب گاہ سے

نکل جانے کا اشارہ کیا لیکن حاکم اعلیٰ کی بیوی نے عاطون کو علاج شروع کرنے کی اجازت دے دی۔

عاطون نے اسی وقت شاہی دوا خانے سے خاص قسم کی تین بوٹیاں منگوائیں۔ ان کو کوٹ ایک مشروب تیار کروایا اور حاکم اعلیٰ کے حلق میں ایک خوراک ڈالی۔

اس دوائی نے اکسیر کا اثر کیا اور حاکم اعلیٰ نے آنکھیں کھول دیں۔ حاکم کی بیوی کا چہرہ مسرت سے چمک اٹھا شام تک حاکم اعلیٰ کا بخار بھی ٹوٹ گیا اور وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے عاطون کو نہ صرف انعام و اکرام سے نوازا بلکہ اسے اپنے طبیب خاص ہونے کی بھی پیش کش کی۔ عاطون کے لئے شاہی مہمان خانہ کھول دیا گیا۔ عاطون کو شاہی محل میں تحفظ مل گیا تھا چنانچہ شام کو وہ شہر کی سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ اس کا اصل مقصد پرانی کارواں سرائے میں زرکیسر کے وفادار سردار یورکا کو تلاش کرنا تھا۔ عاطون بہت جلد پرانی کارواں سرائے میں پہنچ گیا۔

کارواں سرائے کی چار دیواری کے اندر صحن میں اونٹ اور گھوڑے بندھے تھے۔ برآمدے میں کوٹھریاں تھیں۔ عاطون کو ایک کوٹھری میں یورکا مل گیا جو سوداگر کے بھیس میں کھاٹ پر نیم دراز تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ عاطون نے یورکا سے پوچھا کہ کیا وہ سپہ سالار زرکیسر کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوا ہے؟

یورکا نے کہا "صرف اتنا ہی سراغ لگا سکا ہوں کہ سپہ سالار زرکیسر قرطاجنہ کے شاہی محل کے ایک اندھیرے تہ خانے میں قید ہے اور چونکہ وہ بخت نصر کا خاص قیدی ہے اس لئے اس پر سخت پہرہ لگا ہے کسی کو اس سے بات کرنے کی اجازت نہیں۔"

عاطون نے یورکا کو بتایا کہ اسے شاہی محل تک تو رسائی ہو گئی ہے پھر اس نے یورکا کو حاکم قرطاجنہ کی بیماری اور اس کے علاج کا سارا واقعہ سنایا۔ یورکا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے ایک منصوبے پر کام کرنے لگا۔ اس نے عاطون سے کہا۔

"تم مجھے اپنا شاگرد اور غلام ظاہر کر کے اپنے شاہی مطب میں لے چلو گے۔ میں اپنا حلیہ غلاموں ایسا بنا لوں گا۔ اس کے بعد میں محل کے خفیہ تہ خانے سے زرکیسر کو نکال لے جانے کی کوشش کروں گا۔ تم نے میری آدھی مشکل حل کر دی ہے دوست!"

دوسرے روز پروگرام کے مطابق یورکا نے اپنا حلیہ غلاموں ایسا بنایا۔ اور جڑی بوٹیوں کا ٹوکرا سر پر اٹھائے شاہی محل مہمان والے مطب میں پہنچ گیا۔ عاطون نے یورکا سے یہ کہہ کر سرداروں اور دوسرے اہل کاروں سے ملوایا کہ یہ اس کا شاگرد غلام ہے اور ملک افریقہ سے اس کے لئے خاص جڑی بوٹیاں لے کر آیا ہے۔

یورکا پر کسی نے شک نہ کیا کیونکہ اسے کوئی جانتا نہیں تھا۔ عاطون نے حاکم قرطاجنہ کا باقاعدہ علاج شروع کر رکھا تھا۔ اس کے علاج سے حاکم قرطاجنہ صحت مند ہو چکا تھا لیکن اپنے مطلب کے لئے عاطون نے حاکم کو یہ تاثر دیا تھا کہ ابھی ایک ماہ تک وہ اسے اپنی نگرانی میں رکھے گا۔

دوسری طرف عاطون نے شاہی محل کے خفیہ تہ خانے کی ٹوہ لگانا شروع کر دی تھی۔ دس پندرہ روز گزر گئے مگر وہ تہ خانے کا سراغ لگانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس دوران میں عاطون نے شاہی محل کے سپاہیوں کو مقوی صحت دوائیاں دے دے کر اپنے اعتماد میں لے لیا تھا اور وہ بلا روک ٹوک شاہی محل میں جہاں چاہتا چلا جاتا تھا۔

حاکم اعلیٰ کی بیوی بھی عاطون کی بڑی مداح تھی۔ آخر اس نے اس کے خاوند کی جان بچائی تھی۔

ایک روز تہ خانے میں شاہی قیدی زرکیسر بیمار پڑ گیا۔ حاکم اعلیٰ قرطاجنہ نے قیدی زرکیسر کو تہ خانے میں اس لئے رکھا ہوا تھا کہ زرکیسر کو اپنی حفاظت میں لے جانے کے لئے بابل سے بخت نصر کا خاص فوجی دستہ 'قرطاجنہ' آ رہا تھا۔

شاہی قیدی کی بیماری شدت اختیار کر گئی تو قرطاجنہ کے حاکم اعلیٰ کو دامن گیر ہوئی کیونکہ زرکیسر' بخت نصر کا خاص قیدی تھا اور اسے زندہ حالت میں بابل کے شاہی دستے کے حوالے کرنا حاکم اعلیٰ کے فرائض منصبی میں داخل تھا۔

حاکم اعلیٰ کا خیال قدرتی طور پر طبیب عاطون کی طرف گیا۔ ایک تو اس کا علاج بڑا کارگر ہوتا تھا' دوسرا وہ ایک اجنبی طبیب تھا اور اسے شاہی قیدی سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ حاکم اعلیٰ نے یہی سوچ کر عاطون کو طلب کیا اور اسے کہا کہ ہماری تحویل میں شاہ بابل کا خاص قیدی ہے۔ وہ بیمار پڑ گیا ہے۔ اس کا صحت مند ہونا بہت ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کا علاج کرو' لیکن اس کی خبر کسی دوسرے آدمی کو نہیں ہونی چاہئے۔

عاطون کی امید بر آئی تھی۔ اس نے اپنے مسرت کے جذبات کو ظاہر نہ کرتے ہوئے گہری متانت سے حاکم اعلیٰ کو یقین دلایا کہ وہ شاہی قیدی کے علاج کے بارے میں کسی سے ذکر نہیں کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے معذرت چاہتے ہوئے کہا "حضور! میرے شاگرد کو میرے ساتھ رہنے کی اجازت مرحمت فرمایئے کیونکہ وہی میرے ساتھ دوائیوں وغیرہ کو لے کر بیمار کے پاس لے جائے گا۔ ضرورت کے وقت میں اسی سے کوئی خاص دوائی شاہی مطب سے منگوا سکوں گا۔"

حاکم اعلیٰ نے کچھ دیر کے لئے سوچا پھر اجازت دے دی یورکا کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ خوشی سے اچھلا مگر عاطون نے اسے خاموش اور پرسکون رہنے کی ہدایت کی اور کہا سب سے پہلے وہ اکیلا ہی قیدی سپہ سالار زرکیسر سے ملاقات کرے گا اور یورکا کے بارے میں اسے بتائے گا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ہے۔ عاطون نے کچھ دوائیاں اپنے ساتھ لیں اور اسے حاکم اعلیٰ کے خصوصی حکم سے راز دار پہرے داروں کی معیت میں تہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔

خفیہ تہ خانے کی اندھیری فضا میں نینوا کی فوج کا شکست خوردہ قیدی سپہ سالار زرکیسر اس حالت میں فرش پر پڑا تھا کہ اس کا لباس میلا کچیلا تھا۔ پاؤں میں زنجیر بندھی تھی اور بخار سے بے حال ہو رہا تھا۔

عاطون نے اس کی نبض دیکھی تو زرکیسر نے اپنی بڑی بڑی عقابی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور دوبارہ بند کر لیں۔ عاطون نے اسے پانی کے ساتھ ایک اکسیر جڑی بوٹی کا سفوف پلایا۔

سپاہی تہ خانے کے دروازے کے باہر کھڑے تھے تہ خانے میں تنہائی تھی۔ دوائی پینے کے بعد سپہ سالار زرکیسر نے دوبارہ آنکھیں کھول کر عاطون کی طرف دیکھا اور نفرت سے منہ دوسری طرف کر لیا۔ شاید وہ اپنا علاج نہیں کروانا چاہتا تھا۔ عاطون نے اس کی نبض پر انگلی رکھی ہوئی تھی پھر اس نے زرکیسر سے آہستہ سے کہا "زرکیہ! میں تمہارا ساتھی ہوں۔ یورکا ایک خاص پیغام لے کر آیا ہوں۔"

زرکیسر نے چونک کر عاطون کی طرف دیکھا۔

عاطون نے پھر سرگوشی کی "زیادہ حیرانی کا اظہار مت کرو۔ میری بات غور سے سنو' تمہارا وفادار ساتھی سردار یورکا بھی میرے ساتھ ہے۔ شہزادہ زندہ ہے ملکہ بھی زندہ ہے ہم تمہیں نکالنے آئے ہیں۔"

زرکیسر کے ناتواں جسم میں جیسے پھر سے طاقت آ گئی مگر وہ ایک تجربے کار سپہ سالار تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری رکھی۔

عاطون نے قدرے بلند آواز میں کہا "تم لیٹ جاؤ تمہارا بخار اترنا شروع ہو جائے گا۔"

سپہ سالار زرکیسر وہیں فرش پر لیٹ گیا۔ عاطون نے اسے دوائی کی ایک اور خوراک پلائی اور آہستہ سے جھک کر سرگوشی کی۔ "میں کل پھر آؤں گا۔ یورکا اور میں مل کر تمہارے فرار کا کوئی منصوبہ تیار کریں گے۔ تم بے فکر رہو۔"

عاطون تہ خانے سے چلا آیا۔ اس نے حاکم اعلیٰ کی خدمت میں جا کر عرض کی کہ

مریض کی صحت دو ایک روز میں بحال ہو جائے گی پھر اجازت لے کر اپنے مہمان خانے میں
آگیا جہاں یورکا ایک شاگرد غلام کے بھیس میں کھرل آگے رکھے دوائیاں پیس رہا تھا۔ عاطون
نے اسے رزکیسر سے اپنی ملاقات اور گفتگو کے بارے میں آگاہ کیا۔ اب وہ دونوں سوچنے لگے
کہ زرکیسر کو تہ خانے سے نکال لے جانے کے لئے کس طریق کار پر عمل کیا جائے۔

عاطون نے کہا کہ قید میں جگہ جگہ پہرہ لگا ہے اگر حاکم اعلیٰ کو ذرا بھی شک پڑ گیا تو
وہ اسی وقت ہماری گردنیں قلم کروا دے گا۔

یورکا نے یہ رائے دی کہ وہ اپنے ساتھ سپہ سالار کے پاس لے چلے۔

دوسرے دن عاطون نے ایک کھرل یورکا کے کاندھے پر رکھوایا اور یہ کہہ کر اسے
بھی اپنے ساتھ لے کر تہ خانے کی طرف چلا کہ ایک خاص دوائی وہیں وقت کے وقت پیس
کر بیمار کو پلانی ہوگی۔ حاکم اعلیٰ کے حکم پر یورکا کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔

شاید حاکم اعلیٰ کو عاطون کے غلام پر بھروسہ نہیں تھا یا وہ نہیں چاہتا تھا کہ طبیب
عاطون کے شاگرد کو بھی تہ خانے کے خفیہ راستے کا علم ہو۔ یورکا کی آنکھوں پر پٹی بندھی
ہوئی تھی اور وہ عاطون کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے خفیہ راستوں سے ہوتا ہوا تہ خانے میں آ
گیا۔ سپہ سالار زرکیسر نے یورکا کو دیکھا تو اس کا حوصلہ دگنا ہوگیا۔ یورکا نہ صرف یہ کہ ایک
بہادر سردار تھا بلکہ اس کا دست راست بھی تھا۔

تہ خانے میں لانے کے بعد پہرے دار باہر چلے گئے۔ یورکا کی آنکھوں کی پٹی کھول
دی گئی۔ یورکا نے سرگوشی میں سپہ سالار کو سلام کیا اور کہا "سالار اعظم! ہماری فوج کے
سپاہی یمن کے ایک سرحدی گاؤں میں جمع ہو رہے ہیں۔ وہ شاہ بخت نصر کے خلاف علم
بغاوت بلند کرنے پر تیار ہیں۔"

زرکیسر نے سرگوشی میں کہا "یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے۔ پہلے بتاؤ کہ شہزادہ
کہاں ہے؟"

یورکا نے یہ کہہ کر تسلی دلا دی شہزادہ بحفاظت یمن کے ایک خفیہ مقام پر محفوظ
ہے۔ ملکہ بابل کے نواح کی ایک حویلی میں قید تنہائی میں ہے۔ بیچ بیچ میں عاطون اونچی آواز
میں یورکا کو دوائی اچھی طرح گھوٹنے کی ہدایت بھی دیتا جاتا تھا۔ زرکیسر فرش پر لیٹا تھا۔ وہ
بہت ہی مدھم سرگوشی میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ زرکیسر نے اس مشکل کا
اظہار کیا کہ محل میں جگہ جگہ پہرہ لگا ہے اور وہ لوگ نہتے ہیں۔ ان کا یہاں سے نکلنا آسان
نہیں ہے۔

عاطون نے کہا "تم اگرچہ صحت مند ہو گئے ہو مگر بیماری کا بہانہ بنا کر پڑے رہو۔

اس دوران ہم کوئی نہ کوئی ترکیب سوچ لیں گے۔"

عاطون اور یورکا تہ خانے سے واپس آ گئے۔ کافی دیر سوچ بچار کرنے کے بعد آخر
ایک ترکیب عاطون کے ذہن میں آ گئی۔ اس نے یورکا کو اس ترکیب سے باخبر کیا اور اپنے
مطب کے عقب میں سرشام ہی تین برق رفتار عربی النسل گھوڑوں کو درختوں کے نیچے لے
جا کر باندھ دیا۔ یورکا کو ان گھوڑوں کے پاس ہی جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپے رہنے کی ہدایت
کی اور خود خاص دوائی تھیلے میں ڈال کر حاکم اعلیٰ کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ شاہی قیدی کا
بخار پوری طرح سے ٹوٹ نہیں رہا۔ حاکم اعلیٰ نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا "عاطون!
ہمیں پورا یقین تھا کہ تمہاری دوا سے شاہی قیدی بہت جلد اچھا ہو جائے گا۔"

عاطون بولا "حضور انور! میں خود اسی فکر میں لگا ہوں یہی وجہ ہے کہ میں نے سارا
دن لگا کر کئی جڑی بوٹیوں کے مرکب سے ایک خاص سفوف تیار کیا ہے جو میں آج رات ہی
شاہی قیدی کو پلانا چاہتا ہوں تاکہ صبح تک اس کی بیماری اس دوا کے اثر سے ہمیشہ کے لئے
ختم ہو جائے۔"

حاکم اعلیٰ نے کہا "تمہیں تہ خانے میں جانے کی اجازت ہے۔"

حاکم اعلیٰ نے اپنا ایک خاص رازدار سپاہی عاطون کے ساتھ کر دیا۔ شاہی محل میں
رات کے وقت خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سپاہی محل کے خفیہ راستوں سے ہوتا ہوا عاطون کو
تہ خانے کے دروازے پر لے گیا۔ دروازے پر ایک پہرے دار پہلے ہی سے موجود تھا۔ یہ
سپاہی بھی باہر پہرے دار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

عاطون دوائیوں کا چھوٹا بکس لے کر زرکیسر کے پاس آ گیا زرکیسر پوری طرح صحت
مند ہو چکا تھا مگر جان بوجھ کر بیمار پڑا تھا۔ کونے میں شمع جل رہی تھی۔ عاطون نے سرگوشی
میں زرکیسر کو بتایا کہ یہ فرار کی رات ہے۔ سارا انتظام ہو چکا ہے۔ زرکیسر چوکس ہو گیا۔
عاطون نے بکس میں سے ایک خاص محلول والی نیلے رنگ کی شیشی نکالی اور اس میں کپڑے کا
ایک ٹکڑا بھگو کر اسے اپنی بائیں ہتھیلی میں چھپا کر رکھ لیا پھر باہر سپاہی کو آواز دی۔ وہ اندر
آیا عاطون نے کہا "بھائی میری مدد کرو۔ ذرا شیشی کو اپنے ہاتھ میں تھامے رکھنا۔ میں مریض
کو دوائی پلاتا ہوں شیشی کو ہلانا مت۔"

سپاہی جونہی شیشی پکڑنے کے لئے جھکا' عاطون نے دوائی میں بھیگا ہوا رومال اس کی
ناک پر چپکا کر اس کی گردن کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ عاطون کی غیر معمولی طاقت کا علم
زرکیسر کو نہیں تھا لیکن قیامت خیز طاقت کا احساس سپاہی کو فوراً ہی ہو گیا کیونکہ وہ اپنی
گردن عاطون کے شکنجے سے ہلا بھی نہ سکا۔ زرکیسر پیچھے ہٹ گیا۔ عاطون نے بے ہوش سپاہی

کو ایک طرف لٹایا اور تیزی سے اٹھ کر باہر کی طرف گیا۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازے کو آہستہ سے کھولا۔ پہرے دار نے اس کی طرف جھک کر دیکھا "کیا بات ہے؟"

عاطون نے اچانک اچھل کر اس کی گردن کو دبوچ لیا۔ پہریدار کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی مگر اس آواز کو سننے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ عاطون کی جناتی گرفت میں آنے کے چند سیکنڈ بعد ہی پہرے دار کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ عاطون نے اسے بھی تہ خانے میں کھینچ لیا اور دروازہ بند کر کے بولا "زرکیسر! جلدی سے اس سپاہی کی وردی تم خود پہن لو۔"

زرکیسر نے کسی قدر پریشانی سے کہا کہ پاؤں میں لوہے کا زنجیر ہے۔

عاطون لپک کر اس کے پاؤں کے پاس آ کر بیٹھا۔ ایک ہاتھ سے زنجیر کو پکڑا دوسرے ہاتھ کو اوپر اٹھا کر پوری قوت سے زنجیر پر ضرب لگائی تو زنجیر دو ٹکڑے ہو گئی۔ زرکیسر ہکا بکا ہو کر عاطون کا منہ تکنے لگا۔ اس نے کسی انسان میں اتنی زبردست طاقت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عاطون نے جھنجلا کر کہا "زرکیسر یہ فضول باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے جلدی سے سپاہی کے کپڑے پہن لو۔"

زرکیسر نے فوراً محل کے سپاہی کی وردی پہن کر پھول دار ٹوپی پہن لی اور ہاتھ میں نیزہ تھام لیا۔ دونوں دبے پاؤں تہ خانے کی اندھیری سیڑھی چڑھ کر اوپر چلے آئے۔ راہ داری میں آئے تو ایک طرف سے سپاہی نے آواز دے کر پوچھا کون جا رہا ہے؟ عاطون نے کہا "شاہی طبیب عاطون ہوں۔ تمہارے بھائی کی نگرانی میں شاہی قیدی کو دوائی پلا کر واپس آ رہا ہوں۔"

سپاہی ستون کی اوٹ میں تھا۔ وہ ستون کی اوٹ سے نکل کر اچانک سامنے آ گیا۔ اس نے زرکیسر کی طرف گھور کر غور سے دیکھا اور پوچھا "تم کو میں نے محل میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ تم کون ہو۔"

عاطون نے زرکیسر کی طرف دیکھ کر کہا "یہ شاید نیا نیا آیا ہے"

لیکن سپاہی کو شک ہوا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ اس نے زرکیسر کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ زرکیسر کا نیزہ پلک جھپکنے میں سیدھا ہوا اور پھر سپاہی کے سینے کے آر پار ہو گیا۔

عاطون نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور محل کے عقبی دروازے کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔ وہ محل کے خفیہ راستوں سے باخبر تھا۔ زرکیسر اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ عاطون اسے لے کر محل کے عقبی چور دروازے پر آیا تو یہاں بھی ایک سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے حیران ہو کر عاطون کو دیکھا کہ یہ شاہی طبیب اس طرف کدھر آ رہا ہے۔ اس

نے تلوار نکال لی۔ وقت نازک تھا۔ عاطون اس سے سوال و جواب کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ وہ سپاہی پر جھپٹا تو اس نے تلوار کا بھرپور وار کر دیا۔ تلوار عاطون کی گردن پر لگی۔ عاطون نے اپنا جسم پتھر کر لیا۔ تلوار اس کی گردن سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔

دوسرے لمحے وہی تلوار سپاہی کے سینے میں گھسی تھی۔ زرکیسر یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس شخص کے پاس ضرور کوئی طلسم ہے جس کی بدولت اس میں غیر انسانی طاقت عود کر آئی ہے۔ عاطون نے اسے بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچا۔ وہ دوڑتے ہوئے ایک اندھیری سرنگ میں سے گزرے اور پھر سرنگ کے خفیہ دروازے سے عقبی باغ میں آ گئے۔ یورکا برق رفتار گھوڑوں کے پاس اندھیرے میں کھڑا ان کی راہ دیکھ رہا تھا۔ زرکیسر کو عاطون کے ساتھ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ وہ فوراً گھوڑوں پر سوار ہوئے اور محل کے باغ کی جھاڑیوں کو پھلانگتے ہوئے اندھیری رات کے سناٹے میں شہر کے بڑے دروازے کی طرف لپکے۔ اس وقت شہر کا دروازہ بند تھا اور پہرہ بھی تھا۔ اس وقت عاطون کی شکل سے سارے پہرے دار شناسا تھے اور جانتے تھے کہ وہ شاہی طبیب ہے اور حاکم اعلیٰ کا خاص دوست ہے۔ عاطون نے زرکیسر اور یورکا کو پیچھے اندھیرے میں چھپا رہنے کو کہا اور خود دروازے کی ڈیوڑھی میں آ کر پہرے دار سے باتیں کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں ہی وہ انہیں کوٹھری میں لے گیا۔ یہاں شمع روشن تھی اور پانی کے دو مٹکے پڑے تھے۔ عاطون نے انہیں بتایا کہ حاکم اعلیٰ کے خاص حکم سے وہ شہر میں گھوم پھر کر انتظامات کا جائزہ لینے نکلا ہے۔ پہرے دار اس کی خوشامد کرنے لگے۔ عاطون نے انہیں کوٹھری میں ہی ٹھہرنے کو کہا اور خود باہر نکل گیا۔ باہر آتے ہی اس نے کوٹھری کا دروازہ یک دم سے بند کر کے زنجیر لگا دی۔

پہرے داروں نے شور مچانا شروع کر دیا مگر وہاں ان کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ زرکیسر اور یورکا گھوڑے دوڑاتے ڈیوڑھی میں آ گئے۔ عاطون نے دروازہ کھول دیا اور وہ تینوں شہر سے باہر تھے۔

شہر سے باہر ویران اندھیرے، سناٹے میں ایک کچا راستہ صحرا کی طرف جاتا تھا۔ ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں انہوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ برق رفتار گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ صبح ہونے تک وہ صحرا میں سفر کرتے رہے۔ دن میں جب دھوپ تیز ہو گئی تو بھی انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ یونہی سفر کرتے یہ لوگ آخر ایک روز حبشی غلام کے چچا کے انگور کے باغ میں پہنچ گئے جہاں شہزادہ پوری طرح صحت یاب ہو چکا تھا۔

زرکیسر نے شہزادے کی تعظیم کی اور اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ ایک روز
آرام کرنے اور تازہ دم ہونے کے بعد یہ لوگ شہزادے اور حبشی غلام کو بھی ساتھ لے
ملک بابل کی طرف چل پڑے کیونکہ بابل کی پہاڑیوں میں سپہ سالار زرکیسر اور ملکہ نینوا کے
وفادار سپاہی چھپے ہوئے تھے۔

دور دراز کے طوفانی سفر کے بعد یورکا' زرکیسر' عاطون' حبشی غلام اور شہزادہ
گھوڑے بابل کے نواح کی ان سنگلاخ پہاڑیوں میں آ گئے جس کے ایک خفیہ غار میں
بچے کھچے سپاہی پناہ لئے ہوئے تھے۔ یورکا کو اس خفیہ غار کا راستہ معلوم تھا۔

غار کے آس پاس وفادار سپاہی چھپ کر پہرہ دے رہے تھے وہ یورکا کو دیکھ کر
گاہوں سے باہر نکل آئے۔ زرکیسر کو دیکھ کر ان کے حوصلے بلند ہو گئے۔ وہ نعرے
اپنے سپہ سالار کو غار میں لے آئے۔ سارے سپاہیوں نے انہیں گھیر لیا اور شہزادہ ز
کے نعرے بلند کئے۔ یہاں زرکیسر کو معلوم ہوا کہ ملک کے کونے کونے سے مزید وفادار
انہی پہاڑیوں کی طرف آ رہے ہیں۔ زرکیسر نے فیصلہ کیا کہ اس جگہ جمع ہو کر وہ ملک
حملہ کرنے کے لئے اپنی فوج تیار کر سکتا ہے مگر سب سے پہلے ملکہ نینوا کو دشمن کی ق
چھڑانا ضروری تھا کیونکہ ملکہ نینوا کو زندہ سلامت دیکھ کر نینوا کی رعایا بھی بخت نصر کی فو
خلاف اٹھ کھڑی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ عاطون کے اصرار پر یہی طے پایا کہ عاطون او
بھیس بدل کر ملکہ کو دشمن کی قید سے چھڑانے کے لئے جائیں گے۔ چنانچہ عاطون او
گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ملکہ نینوا کو دشمن سپاہیوں کی قید سے آزاد کرانے کے لئے
پڑے۔ عاطون اسی حویلی سے واقف تھا جو بابل کے جنوبی نواح میں واقع تھی۔ وہاں پہنچ
بعد یہ خبر ملی ملکہ کو بابلی سپاہ اپنی نگرانی میں سوریا لے گئی ہے جو بابل کا صحت افزا مقا
اور جہاں بادشاہ بخت نصر نے اسے اپنے پاس بلایا ہے۔ عاطون اور یورکا نے سوریا کی
رخ بدل دیا۔

سوریا کا صحت افزا مقام بابل سے ایک دن کی مسافت پر ایک پہاڑی وادی میں
صبح کو بابل کے نواح سے روانہ ہونے کے بعد شام کو دونوں ساتھی سوریا کی وادی میں
ہو گئے۔ اس وادی کی سب سے دلفریب پہاڑی پر بادشاہ بخت نصر کا عالی شان سفید
اس محل کو جانے والے راستے پر پہرہ لگا تھا۔ کسی کو ادھر جانے کی اجازت نہیں تھی۔
میں ایک ندی کے کنارے چھوٹا سا گاؤں آباد تھا۔ یورکا اور عاطون اس گاؤں میں آ
قسمت بخت نصر کا ساتھ دے رہی تھی اور زوال زرکیسر' یورکا اور جلا وطن ملکہ کے
میں لکھ دیا گیا تھا۔ اس کا ثبوت عاطون کو یوں ملا کہ جس روز وہ وادی کے گاؤں میں

ں دن بخت نصر کے مخبروں نے اسے یورکا کی آمد کی خبر دی۔
عاطون اور یورکا ایک مکان میں سو رہے تھے شاہی دستے کے خصوصی سپاہیوں نے
انک حملہ کر دیا۔ یورکا اور عاطون نے گھبرا کر تلواریں تھامے باہر نکلے تو ان پر تیروں کی
چھار پڑی۔ عاطون کے پتھر جسم پر تیروں کا کوئی اثر نہ ہوا مگر یورکا ان گنت تیر کھا کر گر
۔ عاطون نے سپاہیوں سے مقابلہ شروع کر دیا۔

بخت نصر کے سپاہیوں کی تلواروں کے وار عاطون پر بے کار جا رہے تھے جبکہ عاطون
تلوار انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ رہی تھی۔ اسی وقت عاطون کو خیال آیا کہ وہ خواہ
اہ ان لوگوں کی جان کس لئے لے رہا ہے۔ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ یورکا موت کے گھاٹ
ر چکا ہے۔ وہ کب تک ان سپاہیوں کو ہلاک کرتا چلا جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ تلوار چلاتا
پنے گھوڑے کی طرف بڑھا اور اچھل کر اس پر سوار ہو گیا پھر اس نے گھوڑے کو وادی کے
نوب کی طرف گھمایا۔ گھوڑا کچے راستے پر سرپٹ دوڑنے لگا۔ سپاہی عاطون کی غیر معمولی
اقت بہادری سے پہلے ہی خائف تھے۔ جب انہوں نے اسے فرار ہوتے دیکھا تو اس کا
اقب کرنا مناسب نہ سمجھا۔

عاطون صبح ہونے تک سوریا کے پہاڑی علاقے سے کافی دور صحرا میں نکل آیا تھا۔
ں نے سورج کی سمت کو ذہن میں رکھ کر ملک شام کی طرف گھوڑے کو ڈال دیا۔ وہ
ہزادوں کے اغواء بادشاہوں کے قتل اور محلاتی سازشوں سے بہت دور نکل کر اس وقت تک
سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا جب تک کہ درویش اناطول کی پیش گوئی کے مطابق کسی
دوسرے عہد میں داخل نہیں ہو جاتا اور اس کی ملاقات پچھلے جنم کے ساتھیوں یعنی مایا دیوی
اور پدم ناگ سے نہیں ہوئی۔

عاطون کو صحرا میں سفر کرتے دو دن گزر گئے مگر اسے آبادی کے آثار کہیں بھی
دکھائی نہ دیئے۔ اسے خیال آیا کہ کہیں وہ راستے سے بھٹک تو نہیں گیا۔ اب تک اسے سفر
میں کہیں نہ کہیں کوئی چھوٹا سا نخلستان مل جاتا تھا جہاں وہ گھوڑے کی پیاس بجھا لیتا تھا لیکن
اب اس کے سامنے صبح سے ہی ایک لق و دق صحرا پھیلا ہوا تھا گرمی شدت کی پڑنے لگی۔
گھوڑے کا بھوک اور پیاس کے مارے برا حال ہونے لگا۔ آخر گھوڑا نڈھال ہو کر رک گیا۔
عاطون ایک خاص پودے کو تلاش کرنے لگا جو صحرا میں اگتا ہے اور جس کی جڑیں کھودنے پر
نیچے سے پانی نکل آتا ہے۔ یہ پودا اسے ایک ٹیلے کے سائے میں مل گیا۔ گھوڑے کی پیاس
بجھانے کے لئے یہ ناکافی تھا تاہم تھوڑا بہت پانی پینے سے ہی گھوڑا چلنے کے قابل ہوا اور
عاطون اس پر سوار ہو کر آگے چل دیا۔

یونہی صحرا میں قدم قدم چلتے شام ہو گئی پھر آسمان ستاروں سے جگمگانے لگا۔
ستاروں کو دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ شام کی سرحد سے جنوب مشرق کی طرف ہٹ
ہے۔ عاطون آدھی رات تک چلتا رہا پھر گھوڑے نے جواب دے دیا۔ وہ بہت نڈھال ہ
تھا۔ وہ گھوڑے سے اترا اور ٹھنڈی ریت پر لیٹ گیا۔ گھوڑا ادھر ادھر چل پھر کر صحرا
گھاس تلاش کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

عاطون پر خلاف توقع غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں
نیند اور خواب کے درمیانی عالم میں تھا۔ نہ جانے کب تک وہ اسی عالم میں رہا جب اس
آنکھیں کھولیں تو دیکھا گھوڑا وہاں نہیں تھا۔ عاطون نے گھوڑے کو ستاروں کی روشنی
ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن خدا جانے گھوڑا کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے ارد گرد دور
تک ریت کے بڑے چھوٹے ٹیلے پھیلے ہوئے تھے۔ عاطون اپنے گمشدہ گھوڑے کے با
میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کچھ اس طرح کی آوازیں سنائی دیں جیسے کہیں قریب ہ
بہہ رہا ہو۔ عاطون اس آواز کے تعاقب میں چل پڑا۔

وہ ٹیلے کے پیچھے آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔
کی بات یہ تھی کہ اس چشمے کی آواز اسے پہلے سنائی نہیں دی تھی۔ گھوڑا وہاں بھی نہیں
حالانکہ جانور پانی کی خوشبو سب سے پہلے پا لیتے ہیں۔ عاطون نے چشمے پر منہ ہاتھ دھویا
سا ٹھنڈا پانی پیا اور سوچنے لگا کہ یہ چشمہ یہاں کہاں سے آ گیا؟ چشمہ ریت کے اندر بہ
تھا اور تھوڑی دور جا کر ریت ہی کے اندر غائب ہو جاتا تھا۔ عاطون نے چشمے کے دہانے
اوپر کی جانب چلنا شروع کیا شاید ادھر کوئی آبادی نظر آ جائے۔

یونہی رات ڈھلنے لگی۔ دن کا پہلا کافوری اجالا مشرقی افق پر نمودار ہوا۔ صحر
ریت اب سخت اور پتھریلی ہو گئی تھی۔ صبح کی پھیکی روشنی میں آس پاس دور دور
سنگلاخ ٹیلے ہی ٹیلے تھے۔ ان ٹیلوں پر کوئی جھاڑی نہیں اگی تھی۔ ایک بلند سنگلاخ ٹیلے
پاس پہنچ کر عاطون نے دیکھا کہ اسی چشمے کا پانی ریت میں سے ایک نالے کی شکل میں نکل
ٹیلے کی آغوش کی طرف جا رہا ہے۔

یہاں ایک سرنگ کا دہانہ تھا۔ پانی کا چھوٹا سا نالہ اس سرنگ کے اندر داخل ہ
تھا۔ عاطون تعجب سے غار کی ناہموار نیم روشن دیواروں اور اونچی پتھریلی دیواروں کو د
سرنگ کے اندر چلتا چلا گیا۔ کچھ دور جا کر غار اندر سے کشادہ ہو گیا۔ چشمے کا پانی نال
شکل میں غار کی دیوار کے ساتھ بہہ رہا تھا' پھر غار بائیں جانب مڑ گیا۔ یہاں پہلی بار عاطو
ایسی روشنی نظر آئی جیسے دوسری جانب سورج طلوع ہو رہا ہو۔ نالہ چوڑا ہو گیا تھا اور ا

بہاؤ بھی تیز ہو رہا تھا۔ مزید کچھ دور چلنے کے بعد غار بہت کشادہ ہو گیا اور اس کے اوپر سے
سرنگ کی چھت مزید بلند ہو گئی پھر سرنگ ختم ہو گئی۔ یہاں نالے کا پانی ایک چھوٹی سی آبشار
کی صورت میں نیچے ایک تالاب میں گر رہا تھا۔ عاطون کے سامنے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے
گھرا ہوا ایک میدان تھا۔ ان پہاڑیوں کے اوپر ڈھلوانوں پر جھاڑیاں اور چھوٹے قد کے
درختوں کے جھنڈ تھے۔

عاطون نالے کی آبشار کے کنارے ہو کر نیچے اتر آیا۔ یہاں عاطون نے ایک جگہ
بجھی ہوئی آگ دیکھی جس کی راکھ میں انسانی کھوپڑی اور کچھ ہڈیاں پڑی تھیں۔ عاطون ذرا
آگے بڑھا تو ایک پہاڑی کی کھوہ میں اسے انسانی ہڈیوں کا چھوٹا سا ڈھیر دکھائی دیا۔ وہ سوچنے لگا
کہ یہ انسانی ہڈیاں کہاں سے آ گئیں؟ اس نے سوچا ہو سکتا ہے یہ ہڈیاں زمانہ قدیم سے تعلق
رکھتی ہوں اتنے میں اسے کچھ انسانی آوازیں دکھائیں دیں وہ جلدی سے ایک طرف ہو کر
پہاڑی کے دوسرے کھوہ میں چھپ گیا۔ انسانی آوازیں ایک ٹیکری کے عقب سے آ رہی
تھیں۔

یہاں چاروں طرف دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ عاطون نے دیکھا کہ دس پندرہ
جنگلی آدمیوں کا گروہ ایک نیم جان انسان کو رسیوں میں جکڑے کھینچے چلا آ رہا ہے۔ قیدی کا
مارے خوف کے رنگ فق تھا اور چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ لگتا تھا کہ اسے اپنے انجام کی خبر
ہے۔ انسانی ہڈیوں والے کھوہ کے سامنے لا کر قیدی کو زمین پر لٹا کر اسے لکڑی کی میخیں گاڑ
باندھ دیا گیا پھر انہوں نے بدنصیب قیدی پر خشک لکڑیوں کے ٹکڑے اور سوکھے پتوں کا چھوٹا
سا ڈھیر لگا دیا۔ یہ سارے کے سارے خوفناک شکلوں والے سیاہ فام حبشی تھے۔ ان کا
ایک سردار تھا سب کے ہاتھوں میں نیزے تھے۔ سردار قیدی کے سر کے پاس آ کر کھڑا ہو
گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ حلق سے ایک عجیب سی غراہٹ
نما آواز نکالی اور کہا "دیوتا کے نام پر قربانی شروع کی جائے۔"

عاطون نے اس بدنصیب انسان کی مدد کرنے کا فیصلہ ضرور کیا ہوا تھا لیکن اس قیدی
کی موت کا وقت آ چکا تھا۔ عاطون سے ذرا کوتاہی ہو گئی اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے پندرہ
بیس جنگلیوں کے نیزے بدنصیب قیدی کے پیٹ کا ترازو بن چکے تھے۔ اس کی چیخوں کی
آوازیں وحشی جنگلیوں کی بہیمانہ چیخوں میں گم ہو گئیں۔

عاطون کھوہ میں چھپا ہوا یہ سارا دہشت ناک منظر دیکھ رہا تھا اس کے سامنے جنگلیوں
نے بدنصیب انسان کی لاش کا گوشت ہڑپ کر لیا اور وہاں صرف ہڈیوں کا پنجر ہی باقی رہ گیا۔
سردار نے دونوں بازو فضا میں بلند کر کے ایک بار پھر نعرہ بلند کیا۔ سارے آدم خور ایک

طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے سردار نے پیچھے کی جانب منہ گھما کر دوسری بار چیخ ماری۔
کے ساتھ ہی چار جنگلی نمودار ہوئے جنھوں نے ایک حسین و جمیل عورت کو رسی سے با
رکھا تھا۔ عورت کے سیاہ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ رنگ زرد تھا۔ بڑی بڑی آنکھ
مارے دہشت کے پوری کھلی تھیں۔ آدم خوروں کے سردار کے حکم پر اس عورت کو
زمین پر لٹا کر لکڑی کی میخوں کے ساتھ جکڑ دیا۔ عاطون اس عورت کو آدم خوروں کا ش
ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اچانک کھوہ سے باہر نکل آیا۔

آدم خور دم بخود ہو کر عاطون کو دیکھنے لگے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ پہاڑی
کھوہ میں بالکل ان کے قریب ایک اجنبی انسان چھپا ہوا تھا۔ سردار نے حلق سے ایک فل
شگاف چیخ نما آواز بلند کی اور اپنا نیزہ عاطون کے پیٹ کی طرف پوری طاقت سے پھینکا۔ ن
عاطون کے پیٹ سے ٹکرا کر نیچے گر پڑا۔ عاطون کا پیٹ کسی چٹان کی طرح سخت تھا مگر آ
خور سردار کو علم نہیں ہو سکا تھا سردار یہ سمجھا کہ اس کا وار خالی گیا ہے۔

اس نے دوسرا نیزہ لیا اور عاطون کے پاس آ کر اس کے سینے پر دے مارا۔ اس
نیزہ دہرا ہو گیا۔

سردار ہکا بکا ہو کر عاطون کا منہ تکنے لگا۔ وہ کچھ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ سردار نے چلا
اپنے ساتھیوں کو حملے کا حکم دیا۔ آدم خود' عاطون پر ٹوٹ پڑے اور نیزوں سے حملہ کر
لیکن عاطون ایک چٹان کی طرح اپنی جگہ کھڑا رہا اور آدم خوروں کے نیزے اس کے ج
سے ٹکرا کر ٹوٹتے چلے گئے۔ عاطون نے اب ایک آدم خور وحشی کو گردن سے پکڑ کر او
اچھال دیا۔ آدم خور وحشی زمین سے کئی فٹ فضا میں اچھلا اور پھر قلابازیاں کھاتا پتھروں
ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھ سکا۔ اب سردار پر دہشت طاری ہو گئی۔ اس نے ایک دم عاطون کے
سامنے سجدہ کر دیا۔ وہ اسے کوئی دیوتا سمجھ رہا تھا سردار کو سجدے میں گرتا دیکھ کر باقی آد
خور بھی سجدہ ریز ہو گئے۔

یہ سارا ناقابل یقین منظر وہ عورت بھی پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ عاطو
نے سردار کے سر کو بالوں سے پکڑ کر اوپر کھینچا اور بارعب آواز میں ان ہی کی زبان میں بو
"اس عورت کو آزاد کر دو"

فوراً" قیدی عورت کی رسیاں کھول دی گئیں۔ عاطون حسین و جمیل عورت کے
قریب آ گیا اور عبرانی زبان میں اس سے اس کا نام پوچھا۔ اس زمانے میں دجلہ و فرات کی
وادی میں عام طور پر عبرانی زبان ہی بولی جاتی تھی۔ عورت نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر
ہوئے اپنا نام تھائیس بتایا۔ یہ عورت بھی عاطون کو کوئی آسمانی مخلوق سمجھ رہی تھی۔ عاطو

نے سردار سے اس کی زبان میں پوچھا کہ یہ جگہ کون سی ہے اور یہاں سے ملک شام کو
راستہ کدھر سے جاتا ہے۔

سردار سینے پر ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے بتایا کہ ملک شام ان پہاڑوں
کے پچھم میں چھ دن کی مسافت پر ہے۔ عاطون کے حکم پر آدم خور سردار انہیں پہاڑیوں
کے دوسری جانب لے آیا۔ یہاں عاطون اور تھائیس کو دو گھوڑے اور کچھ کھانے پینے کی
چیزیں پیش کی گئیں۔ عاطون ان آدم خور وحشیوں کی سنگت سے بہت جلد نکل جانا چاہتا تھا
چنانچہ سردار کی راہ نمائی میں وہ تھائیس کو ساتھ لے کر ان پہاڑیوں سے نکل کر پچھم کی
طرف چل پڑا۔ تھائیس نے عاطون کو بتایا کہ وہ ایلام کے ایک تاجر کی بیوی ہے وہ ایک
قافلے میں سفر کر رہی تھی کہ ان آدم خوروں نے حملہ کر دیا۔ اس کے خاوند اور دوسرے
مسافروں کو ہلاک کر کے ان کی لاشوں کو ایک غار میں رکھ دیا اور اسے اغوا کر کے لے
آئے۔ عاطون نے اپنے بارے میں تھائیس کو یہی بتایا کہ وہ ایک طبیب ہے جڑی بوٹیوں کی
تلاش میں صحرا میں آیا تھا کہ راستہ بھول گیا اور آدم خوروں کی بستی میں نکل آیا۔

تھائیس کو یقین تھا کہ عاطون کوئی آسمانی مخلوق ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے یہ
منظر دیکھا تھا کہ عاطون پر نیزوں کے حملے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ جب اس نے عاطون سے
اس بارے میں سوال کیا تو عاطون نے مسکرا کر کہا کہ میں آسمانی مخلوق نہیں ہوں۔ ہاں
میرے پاس ایک طلسمی اشلوک ہے جس کو پڑھنے سے میرے جسم میں چٹان کی سی سختی آ
جاتی ہے اور مجھ پر تیر' تلوار کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تھائیس خاموش ہو گئی۔ صحرا میں سفر
کرتے کرتے انہیں تین دن گزر گئے۔ ان کے پاس جو جنگلی پھل اور پانی کی چھاگلیں تھیں وہ
ختم ہونے لگی تھیں۔ پانچویں دن راشن بالکل ختم ہو گیا۔ عاطون سمجھ گیا کہ وہ راستے سے
بھٹک گئے ہیں اور ان کا رخ ملک شام کی طرف نہیں ہے۔ اس روز عاطون کو صبح ہی سے
ہوا میں سمندر کی خوشبو محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ سمندر کا ساحل قریب
ہے۔ تھائیس نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ وہ بحیرہ روم کی طرف جا رہے ہیں اور ملک شام
سے بہت دور ہو چکے ہیں۔ عاطون تھائیس کو اس کے گھر ملک شام پہنچانا چاہتا تھا۔ دل میں
سوچنے لگا کہ اب یہی ہو سکتا ہے کہ ساحل سمندر پر کسی شہر میں داخل ہو کر اسے شام جانے
والے کسی قافلے کے ساتھ کر دیا جائے۔ اب انھوں نے اس طرف چلنا شروع کر دیا جدھر
سے سمندر کی ہوا آ رہی تھی۔

جب شام ہو گئی تو پیاس اور بھوک کے مارے تھائیس نڈھال سی ہو گئی۔ عاطون
نے تھائیس کو ایک جگہ ریت پر بیٹھنے کی ہدایت کی اور خود پانی کی تلاش میں صحرائی بوٹی کی

تلاش میں ایک طرف چل دیا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ ساحل سمندر قریب ہے اسے ا
صحرا میں کہیں نہ کہیں پانی ضرور مل جائے گا۔ گھوڑے پر سوار عاطون پانی کی تلاش میں ص
میں کافی دور نکل آیا۔ تھائیس اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ غروب ہوتے سور
کی الوداعی سرمئی روشنی میں اسے ریت کے ایک ٹیلے کے پہلو میں کھجوروں کے کچھ درخ
نظر آئے۔ ضرور یہ کوئی نخلستان ہے اور یہاں پانی بھی ضرور مل جائے گا۔ یہ سوچ کر عاط
نے اس طرف گھوڑا ڈال دیا۔

ادھر تھائیس ریت پر خاموش بیٹھی تھی۔ جوں جوں شام ہو رہی تھی اس پر خو
طاری ہونے لگا تھا۔ عاطون ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اچانک اسے اپنے عقب م
گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں سنائی دیں۔ تھائیس نے پلٹ کر دیکھا کہ چند گھڑ سوار ا
کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں اور سروں پر رومال بند
تھے۔ یہ خونخوار بحری قزاق تھے جو میٹھے پانی کی تلاش میں ادھر نکل آئے تھے اور اکیلی عور
کو صحرا میں دیکھ کر اس کی طرف دیوانہ وار لپکے تھے۔ انھوں نے آتے ہی تھائیس کو دبو
لیا۔ تھائیس نے شور مچانے کی کوشش کی تو اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا گیا۔ ڈاکوؤں ن
اسے گھوڑے پر ڈالا اور واپس ساحل سمندر کی طرف روانہ ہوگئے جہاں ان کا بحری جہاز ل
انداز تھا۔

ڈاکوؤں نے تھائیس کو اپنے کپتان کے حضور پیش کر دیا۔ کپتان نے اپنی بڑی بڑ
مونچھوں کو پھڑپھڑاتے ہوئے تیکھی نظروں سے تھائیس کا جائزہ لیا اور قہقہہ لگا کر کہا۔
یروشلم کے بازار میں اس حسینہ کو سونے کے برابر تول کر فروخت کیا جا سکتا ہے۔"

تھائیس کو جہاز کی نچلی منزل کے ایک کیبن میں بند کر کے جہاز کا لنگر اٹھا دیا گیا۔

دوسری طرف عاطون جب نخلستان میں پہنچا تو وہاں پانی کا چھوٹا سا چشمہ بہہ رہا تھ
اس نے گھوڑے کو پانی پلایا۔ چھاگل پانی سے بھری اور گھوڑے پر سوار ہو کر واپس اس مق
پر آیا جہاں وہ تھائیس کو چھوڑ گیا تھا تو وہاں تھائیس موجود نہیں تھی۔ شام کی دھندلی رو
میں عاطون نے ریت پر انسانی قدموں اور گھوڑوں کے سموں کے گہرے نشان دیکھے۔ وہ ا
نشانوں کو دیکھتے ہوئے چل پڑا۔ رات کا اندھیرا صحرا میں پھیل چکا تھا جب عاطون سمندر
کنارے پہنچ گیا۔ اس کے سامنے وسیع و عریض سمندر پھیلا ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ تھائیس
کسی بردہ فروش گروہ نے اغوا کر لیا ہے۔ عاطون کو بے حد افسوس ہوا مگر وہ تھائیس کو واپ
نہیں لا سکتا تھا۔ انتہائی ناامیدی کے عالم میں اس نے سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ شم
کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

ساری رات عاطون سمندر کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا۔ طلوع آفتاب کے وقت
عاطون کو دائیں جانب ایک سیاہ پہاڑ کے دامن میں کھجور کے جھنڈوں کے درمیان کچھ مکان
نظر آئے۔ یہ کوئی گاؤں لگتا تھا۔ عاطون نے ادھر کا رخ کیا۔ قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران
ہوا کہ گاؤں کی کچی گلیاں سنسان تھیں۔ مکانوں کے کواڑ کھلے تھے مگر وہاں کسی انسان کا نام و
نشان نہ تھا۔ گاؤں کا چھوٹا سا ایک ہی بازار تھا۔ بازار کی چند دکانیں کھلی تھیں مگر وہاں
دکاندار تھا اور نہ کوئی گاہک نظر آرہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی ناگہانی آفت کے بعد سارے کا
سارا گاؤں ایک دم سے خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ عاطون نے گھوڑے کو ایک جگہ چھوڑ دیا اور
خود پیدل ہی گاؤں کی آسیب زدہ ویران جگہوں میں نکل آیا۔ اس نے ایک مکان کے اندر
جھانک کر دیکھا۔ آنگن میں کھاٹ بچھی تھی۔ کچھ سامان بھی موجود تھا مگر انسان کہیں دکھائی
نہیں دیتا تھا۔ کیا یہ کوئی آسیبی گاؤں ہے؟

عاطون سوچتا ہوا آگے چلا۔ گلی کی نکڑ پر اسے ایک مکان کے چبوترے پر ایک بوڑھا
آدمی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا نظر آیا۔ عاطون جلدی سے اس کے قریب آیا اور پوچھا کہ
گاؤں کے لوگ کہاں چلے گئے ہیں؟

بوڑھے کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ عاطون نے اسے ذرا سا ہلایا
ہی تھا کہ وہ دھڑام سے نیچے فرش پر جھک گیا۔ وہ مر چکا تھا۔ عاطون کچھ گھبراہٹ کے ساتھ
پیچھے ہٹ گیا۔ اب اسے گھنگروؤں کے دھیمے دھیمے چھناکوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ
کر دیکھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ایک انتہائی خوب صورت بنی سنوری عورت
بیش قیمت لباس پہنے پاؤں میں گھنگرو باندھے گلی میں اس کے آگے آگے چلی جا رہی تھی اور
عاطون کو بار بار پلٹ کر مسکراتے ہوئے دیکھتی جا رہی تھی۔ یہ عورت گلی کے آخری مکان
کے پاس جا کر رک گئی۔ اس نے عاطون کی طرف مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور ہاتھ سے
اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور گلی میں گھوم گئی۔ عاطون جیسے مسحور سا ہو کر اس کے پیچھے
پیچھے چلنے لگا۔

گلی کا موڑ گھوم کر عاطون نے دیکھا کہ عورت ایک پتھر کے مکان کے سامنے کھڑی
پیچھے دیکھ رہی ہے۔ مکان کے باہر ایک چبوترے پر رکھے پیالے میں آگ جل رہی تھی۔
عورت نے عاطون کو اشارہ کیا اور مکان میں داخل ہو گئی۔ عاطون اس پراسرار عورت کے
معمے کو حل کرنے کے خیال سے مکان کے دروازے پر آکر رک گیا۔ اس نے جھانک کر اندر
دیکھا۔ مکان کی ڈیوڑھی میں تاریکی چھائی تھی۔ اندر گہرا سناٹا تھا پھر گھنگروؤں کی وہی چھن
چھن سنائی دی لیکن اب یہ آواز دبی دبی سی تھی۔ عاطون مکان میں داخل ہو گیا۔ یہ مکان

کوئی پرانا مندر معلوم ہو رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں دونوں جانب بیل کے پتھریلے سروں کے
بنے ہوئے تھے۔ ڈیوڑھی سے گزر کر عاطون کو ایک والان دکھائی دیا جس کے وسط میں
چبوترے پر پتھر کے پیالے میں آگ روشن تھی۔ چبوترے کی ایک جانب بیل کے
مورتی بنی ہوئی تھی۔ عاطون ایک سنگین ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ گھنگروؤں کی
دور سے آ رہی تھی پھر یہ آواز قریب آتی گئی اور اچانک وہی حسین عورت نمودار ہوئی۔
اس کے جسم پر کپڑے ناکافی تھے اور وہ جیسے خواب کے عالم میں رقص کے دائرے
آہستہ آہستہ چبوترے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چبوتری کے پاس آکر وہ پتھر کی مورتی
آگے ہاتھ جوڑ کر تعظیم کے انداز میں جھکی اور پھر رقص کرنے لگی۔ وہ مورتی اور آگ
پوجا کر رہی تھی۔ یہ رقص پوجا کا رقص تھا۔ فضا میں ایک سحر انگیز طلسمی خوشبو اڑ
تھی۔ وہ بار بار آگ کی طرف جھک کر آتی۔ ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتی اور پھر آہستہ آہستہ
ہٹ جاتی۔

عاطون بت بنا یہ خواب انگیز رقص دیکھ رہا تھا۔ رقص ختم ہو گیا۔ حسین ر
کے ماتھے پر پسینے کے موتی جھلملا رہے تھے۔ وہ ناز سے قدم قدم چلتی عاطون کے پاس آ
اس کی آنکھوں میں عاطون کو لافانی شعاعوں کی کشش محسوس ہوئی۔ اس کے گلے میں چا
کی ایک چھوٹی سی تختی لٹک رہی تھی جس پر ستاروں کا کوئی طلسم نقش تھا۔

عاطون کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ رقاصہ نے اپنے ہاتھ کی انگلی اس کے ہونٹوں پر
دی۔ عاطون کو عجیب سی گہری خوشبو آئی۔

رقاصہ نے کہا۔ "تم عاطون ہو۔ تم ہزاروں برس سے سفر کر رہے ہو۔ یہ تمہار
سب سے پہلے جنم کا سفر ہے اس سفر کے ختم ہوتے ہی تم ملک مصر میں دوسری بار
ہوگے۔ آسمانی دیوتاؤں نے تمھیں غیر معمولی طاقت عطا کر رکھی ہے۔ تم ابھی مر نہ
سکتے۔"

عاطون اس پراسرار رقاصہ کی زبان سے اپنے بارے میں یہ باتیں سن کر دم بخو
ہو کر رہ گیا۔

رقاصہ نے کہا۔ "مجھ پر زمین کے سارے راز کھلے ہیں۔ میں دیوتا آمون
دیوداسی ہوں۔ میں تمھارے لیے یہاں آئی ہوں۔ تم جو کچھ مجھ سے پوچھنا چاہتے
پوچھو۔"

عاطون نے کہا۔ "آمون کی دیوداسی! تم نے میرے بارے میں جو کچھ کہا ہے
حرف بہ حرف درست ہے لیکن میں اس وقت ایک مظلوم بیوہ خاتون تھائیس کے لیے پریشا

ہوں۔ وہ صحرا میں میرے ساتھ سفر کر رہی تھی کہ گم ہو گئی۔"

رقاصہ نے عاطون کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیار سے دبایا۔ عاطون گھبرا گیا۔

رقاصہ کی آنکھوں میں ایک معنی خیز پرکشش مسکراہٹ تھی۔ اس نے جذبات سے
مغلوب آواز میں کہا۔ "عاطون! میں دیوداسی ہوں لیکن مجھے تم ایسے نوجوان کی تلاش تھی۔
کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے؟ اگر تم مجھ سے شادی کر لو تو میں دیوتا آمون کو راضی کر
لوں گی اور پھر ہم دونوں ایک ایسے محل میں ابد تک پر مسرت زندگی بسر کریں گے۔ جس کی
آسائشوں کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

عاطون نے اپنا ہاتھ آہستہ سے کھینچتے ہوئے کہا۔ "میری قسمت میں کسی سے بیاہ کرنا
نہیں لکھا گیا اور پھر اس وقت میں بیوہ خاتون تھائیس کے لیے پریشان ہوں۔ اگر تم مجھے اس
کے بارے میں کچھ بتا دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ واپسی پر تمھیں ضرور ملوں گا اور پھر ہو سکتا
ہے کہ میں تم سے شادی بھی کر لوں۔"

رقاصہ کی آنکھوں میں ایک گہری چمک اور سکون تھا۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹ
ذرا سے کھلے اور اس نے کہا۔ "تھائیس اس وقت روم کے سمندر میں سفر کر رہی ہے۔ وہ
بحری ڈاکوؤں کی قیدی ہے جو اسے یروشلم لے جا کر فروخت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

عاطون کو تھائیس کے بارے میں تشویش ہوئی۔ اس نے رقاصہ کا شکریہ ادا کیا اور
اس آسیبی گاؤں کے لوگوں کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔

رقاصہ نے بتایا کہ اس گاؤں کے لوگ گناہ کی دلدل میں گہرائی تک ڈوب چکے تھے۔
انھیں کئی بار آسمانی دیوتاؤں کی طرف سے نیکی پر چلنے کی ہدایت دی گئی مگر انھوں نے پروا نہ
کی۔ آخر ان پر دیوتاؤں کا عذاب نازل ہوا۔ ایک آواز بلند ہوئی اور سب کے سب گناہ گار
لوگ زمین میں دھنس گئے۔

رقاصہ عاطون کو ساتھ لے کر آہستہ آہستہ چلتی مندر سے باہر عذاب زدہ گاؤں کی
سنسان گلی میں آ گئی۔ گاؤں کے کنارے آکر رقاصہ نے عاطون کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میں
تمھارا انتظار کروں گی۔"

عاطون کچھ دیر کے لیے چپ سا ہو گیا پھر اس نے یروشلم جانے والے راستوں کے
بارے میں سوال کیا تو رقاصہ بولی۔

"سمندر کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف چلتے جانا۔ شام کو ایک شہر میں داخل ہو جاؤ
گے۔ یہاں سے تمھیں یروشلم جانے والا قافلہ مل جائے گا۔"

رقاصہ نے عاطون کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آنکھوں سے لگایا اور کچھ کہے بغیر

پلٹ کر سنسان گلی میں غائب ہو گئی۔ عاطون گھوڑے پر سوار ہوا۔ اسے ایڑ لگائی اور بحر کے ساحل پر آکر شمال کی جانب چل دیا۔ رقاصہ کے کہنے کے مطابق شام کو وہ ایک بندرگاہ شہر میں آگیا۔ یہاں وہ ایک کاررواں سرائے میں اترا۔ ایک ہفتے بعد یہاں سے وہ ا قافلے میں شامل ہو گیا جو یروشلم کی طرف جا رہا تھا۔ اس قافلے کو ایک مہینے کے بعد ی پہنچنا تھا۔ عاطون گھوڑے پر سوار قافلے والوں کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ اس قافلے میں اونٹ اور سترہ گھوڑے شامل تھے۔ میر کاررواں ایک اونٹنی پر آگے آگے سفر کر رہا تھا۔

تھائیس جس بحری جہاز میں سوار تھی اسے ایک سمندری طوفان نے آلیا اور ا شمالی افریقہ کی ایک قدیم بندرگاہ عاتکہ شہر کے ایک بردہ فروش تاجان کے ہاتھ اونے پونے دیا۔ تاجان کے پاس دوسرے ملکوں کی کئی ایک عورتیں تھیں جو وہ ادھر ادھر علاقوں سے کر کے لایا تھا۔ یہ تمام بد نصیب اور غم زدہ خواتین تھیں لیکن انہیں معلوم تھا کہ وہ فرار کر کہیں نہیں جا سکتی تھیں۔ علاوہ ازیں ایک کنیز نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی تو ا سب کنیزوں کے سامنے لا کر اس کا سر تن سے جدا کر دیا گیا تھا۔ اس لیے یہ سب عور راضی بہ رضا ہو کر وہاں پڑی تھیں اور انھوں نے اپنی قسمت کے لکھے کو قبول کر لیا تھا۔

وہ ایک نئی کنیز تھائیس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں کیونکہ تھائیس ان سب زیادہ خوب صورت تھی۔ ایک ہفتے کے بعد تاجان کی حویلی میں بعلبک کا ایک بردہ فر آیا اور تھائیس کو بھاری قیمت پر خرید کر اپنے ساتھ بعلبک کی طرف لے گیا۔ اس زما میں جیسا کہ آپ نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہوگا مصر، شام اور بعلبک میں کنیزیں ا غلاموں کے بازار لگا کرتے تھے جہاں کنیزیں کھلے عام فروخت ہوتی تھیں۔ ایک روز بعلبک میں بھی ایسا ہی بازار لگا۔ تھائیس کو بھی سولہ سنگھار سے آراستہ کر کے وہاں دوسری کنیزو کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ بردہ فروش نے تھائیس کو چبوترے پر لا کر اس کے حسن کی تعریفیں شروع کر دیں۔ وہ خریداروں سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔

"یہ عورت ابھی نوجوان لڑکی ہے۔ اس کا کوئی بچہ نہیں جس کی خاطر یہ چوری کرے۔ یہ بھوکی رہ کر بھی مالک کی خدمت کر سکتی ہے۔ اس کے جسم سے قدرتی خوشبو آتی ہے۔ اس کے دانت موتیوں کی طرح سفید اور سمتی ہیں۔"

خریداروں میں سے ایک سیاہ فام کانا آدمی آگے بڑھا۔ اس کے گلے میں قیمتی ہیرے جگمگا رہے تھے۔ وہ کسی ملک کا امیر و کبیر آدمی لگ رہا تھا۔ اس نے تھائیس کی بولی لگائی بولی بڑھتی چلی گئی۔ دس ہزار سونے کی اشرفیوں سے چل کر بولی ایک لاکھ اشرفیوں تک جا پہنچی سیاہ فام کانا سوداگر پیچھے ہٹنے والی چیز نہیں تھی۔ اس نے ایک لاکھ پچاس ہزار اشرفیوں کی بولی

دی تو سب کو سانپ سونگھ گیا۔

کانے سوداگر نے تھائیس کو خرید لیا اور اپنے غلاموں کے ساتھ کاررواں سرائے کی طرف آگیا۔ یہاں اس کی چار خادمائیں بھی موجود تھیں۔ انھوں نے تھائیس کو نئے کپڑے پہنائے اور خاص اونٹنی کے کجاوے میں کانے سوداگر کی ساتھ والی نشست پر بٹھا دیا۔ یہ اونٹنی غلاموں اور کنیزوں کی دوسری اونٹنیوں کے ساتھ کانے سوداگر کے ساتھ انطاکیہ کی جانب روانہ ہو گئی۔

انطاکیہ جس کو یونانی انطوح کے نام سے پکارتے تھے، اس زمانے میں یہ ترقی یافتہ ملک تھا اور ایک مصروف بندرگاہ تھی۔ یہ بندرگاہ دریائے فیرو کے کنارے پر تھی۔ جہاں سے چند کوس دور جا کر یہ سمندر میں جا گرتا تھا۔ انطاکیہ میں کانے سوداگر کا ایک شاندار محل تھا جہاں کئی خادم اور کنیزیں موجود تھیں۔ کانے سوداگر کی بارہ عدد بیویاں تھیں جن کا تعلق مختلف ممالک سے تھا۔ سوداگر نے تھائیس کو اپنی خاص کنیز کا درجہ دے کر محل کے ایک خوبصورت پائیں باغ والے چھوٹے سے محل میں رکھا۔ اسی روز بھالو نما کانے سوداگر نے اعلان کیا کہ وہ پورے چاند کی رات کو تھائیس سے بیاہ رچا لے گا۔ دوسری کنیزیں تھائیس پر رشک کرنے لگیں لیکن تھائیس غم سے نڈھال ہو گئی۔ وہ ایک سیاہ فام بھالو کی بیوی بننے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کانے سوداگر نے اپنی سب سے ادھیڑ چہیتی کنیز کو تھائیس کا دل سوداگر کی طرف راغب کرنے اور اس کی دیکھ بھال کرنے پر مقرر کیا۔

کسی زمانے میں سوداگر، شغالہ پر فریفتہ تھا مگر اب چونکہ وہ بوڑھی ہو گئی تھی اس لئے سوداگر کا دل اس کی طرف سے اچاٹ ہو گیا تھا شغالہ ایک جہاندیدہ کنیز تھی اور سوداگر کی تمام کمزوریوں سے واقف تھی اس لئے سوداگر نے اسے اس کام پر مامور کیا کہ وہ تھائیس کے دل میں اس کی جگہ پیدا کرے۔

تھائیس کو جب یہ معلوم ہوا کہ شغالہ کبھی سوداگر کی چہیتی کنیز تھی اور اب اسے دھتکار دیا گیا ہے تو تھائیس نے اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی۔ شغالہ تو تھائیس کو سوداگر کی طرف راغب کرنے کے مشن میں لگی رہتی اور تھائیس نے اس کے دل میں سوداگر کے خلاف نفرت کو ابھارنا شروع کر دیا۔ اب لوہا گرم تھا بس تھائیس نے اس پر چوٹ کرتے ہوئے کہا "شغالہ! تم بھی میری طرح ایک عورت ہو اور عورت ہی دوسری عورت کے دکھ درد کو سمجھ سکتی ہے۔ اس کے دل کو ٹٹول کر دیکھ سکتی ہے۔ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ ملک شام میں میرا خاوند اور بچے موجود ہیں۔ میں کیسے دوسرے خاوند سے بیاہ ہو سکتی ہوں۔ اگر تمہارا خاوند ہوتا تو کیا تم اس کانے سوداگر سے شادی کر لیتی۔"

"ہرگز نہیں! شغالہ نے پھنکار کر کہا اور سوداگر کو لعن طعن کرنے لگی۔"

تھائیس بولی "شغالہ! اگر تم کسی طرح سے یہاں سے فرار ہونے میں میری مدد کرو میں تمہارا یہ احسان عمر بھر فراموش نہیں کروں گی۔ میرے بچے تمہیں ساری عمر دعائیں دیں گے اور یوں تم اس ہرجائی اور ظالم شخص سے اپنی بے اعتنائی اور بے وفائی کا بدلہ بھی لے سکو گی۔"

شغالہ کے چہرے پر ہرجائی اور مطلب پرست سوداگر کے خلاف نفرت کے جذبات ابھر آئے۔ اس نے تھائیس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا کہ وہ محل سے فرار ہونے میں اس کی مدد کرے گی۔

"مگر تم اکیلی کہاں جاؤ گی؟ ملک شام تو یہاں سے ایک مہینے کی مسافت پر ہے۔"

تھائیس بولی "تم مجھے کسی طرح یہاں سے نکال کر کسی قافلے کے ساتھ کر دو۔ میں اپنے آپ منزل پر پہنچ جاؤں گی۔"

شغالہ نے ایک بار پھر تھائیس کو یقین دلایا کہ وہ بہت جلد اس کا بندوبست کر دے گی۔ شغالہ ایک تجربہ کار اور بااثر عورت تھی۔ شہر میں کئی لوگ اس کے ہمدرد اور دوست تھے۔ اس نے فوراً پتا کروایا کہ ایک قافلہ چھ روز بعد شام کے شہر دمشق کی جانب روانہ ہونے والا ہے۔

پورے چاند کو ابھی دس روز باقی تھے۔ شغالہ نے تھائیس کو یہ خوش خبری سنائی کہ ایک قافلہ ساتویں دن انطاکیہ سے دمشق کی طرف جا رہا ہے' وہ تیاری کرے۔ تھائیس نے خوش ہو کر شغالہ کو گلے سے لگا لیا۔

شغالہ نے اپنے ایک خاص رازدار کی مدد سے امیر کارواں کو تھائیس کے کرائے کی رقم بھی ادا کر دی۔ تھائیس بڑی خوش تھی۔ آخر وہ دن آ گیا جس کی شام کو انطاکیہ کی کارواں سرائے سے قافلے روانہ ہونے والا تھا۔ شغالہ نے تھائیس کو بتا دیا کہ اسے مردانہ لباس پہن کر ایک عرب سوداگر کی حیثیت سے سفر کرنا ہوگا۔ تھائیس تو چوہا بن کر بھی وہاں سے فرار ہونے کو تیار تھی۔ دوپہر کے بعد شغالہ نے دریا کی سیر کے بہانے ساتھ لیا اور محل کے دور ایک مقام پر آ گئی۔ یہاں اس کا رازدار پہلے سے موجود تھا۔ تھائیس کو عرب سوداگروں کا مردانہ لباس پہنایا گیا۔ کچھ سوداگری کا سامان ساتھ کر دیا۔ جاتے ہوئے تھائیس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ شغالہ کے گلے لگ کر رو پڑی۔ شغالہ نے اسے پیار کیا اور کہا "تھائیس ہم عورتوں پر ہمیشہ ظلم ہوتے آئے ہیں۔ ہم مظلوم ہیں۔ اگر ہم ایک دوسرے کی مدد نہیں کریں گی تو پھر ہماری مدد کون کرے گا؟ جاؤ دیوتا تمہاری نگہبانی کریں۔"

شغالہ نے تھائیس کو اپنے رازدار دوست کے حوالے کر دیا۔ تھائیس مردانہ لباس میں تھی۔ وہ گھوڑے پر سوار تھی۔ اس کے ساتھ شغالہ کا رازدار بھی گھوڑے پر تھا۔ تیسرے گھوڑے پر سوداگری کا کچھ سامان لدا ہوا تھا۔ کارواں سرائے میں قافلے کے چلنے کی تیاری زور و شور پر تھی۔

تھائیس کا نام میر کارواں کو العارف بتایا گیا۔ میر کارواں نے تھائیس کا تپاک سے خیر مقدم کیا۔ کارواں کو ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ یہ عربی سوداگر اتنا نرم و نازک کیوں ہے؟

شغالہ کا رازدار کارواں سرائے سے واپس چلا گیا۔ اسی شام جب سورج انطاکیہ کے دریا کے عقب میں غروب ہو گیا تو قافلے کے اونٹ' گھوڑے اور خچر کارواں سرائے سے باہر نکلنا شروع ہو گئے۔ اس قافلے میں عورتیں مرد اور بچے بھی شامل تھے۔ ان کا سامان خچروں اور دوسرے بار بردار اونٹوں پر لدا تھا۔ کچھ مرد پیدل ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ باقی اونٹوں پر سوار تھے۔ میر کارواں آگے آگے تھا۔ رات کے پہلے پہر یہ قافلہ انطاکیہ کے قدیم شہر کو پیچھے چھوڑ کر لق و دق صحرا میں داخل ہو گیا۔ میر کارواں کی اونٹنی کے ساتھ محافظوں کا ایک مسلح دستہ تھا۔ قافلے میں کہیں کہیں مشعل بردار خادم بھی ہاتھوں میں مشعلیں لئے گھوڑں پر سوار ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

ادھر تھائیس عربی سوداگر کے بھیس میں دمشق کی طرف سفر کر رہی تھی اور دوسری جانب عاطون ایک طویل سفر کے بعد یروشلم پہنچ چکا تھا۔ یہ یروشلم یہودیوں بلکہ فراعنہ مصر سے بھی پہلے کا یروشلم تھا اور اس شہر پر ایک سامی بادشاہ ارژنگ حکومت کرتا تھا۔ عاطون کارواں سرائے میں اترا ہوا تھا۔ اس نے شہر میں تھائیس کی تلاش شروع کر دی کیونکہ رقاصہ دیوی نے اسے یہی بتایا تھا کہ تھائیس کو بحری قزاق لے کر یروشلم جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

عاطون نے شہر کا کونا کونا چھان مارا مگر اسے تھائیس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ ایک روز وہ تھائیس کی تلاش میں ایک شمشان دیوی بھومی کی طرف سے گزرا تو وہاں لوگوں کا ہجوم دیکھ کر رک گیا۔ ان لوگوں کے درمیان سے کسی عورت کے رونے اور چیخنے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ عاطون نے ایک بوڑھے سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اس نے اپنی کمزور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر عاطون کو بتایا کہ یہ عورت سنتھالہ جس کا خاوند شہر کے سب سے بڑے سوداگر کو قتل کر کے فرار ہو گیا تھا اس کے رشتے داروں نے آ کر خبر دی کہ سنتھالہ کے خاوند کو ایک شیر نے چیر پھاڑ کر کھا لیا ہے۔ انہوں نے ہڈیاں بھی پیش کی ہیں۔ چنانچہ

اب یہاں کی رسم کے مطابق اس عورت سنتھالہ کو اس خاوند کی موت کے بعد خاوند کی بچی کچھی ہڈیوں کے ساتھ چتا کی آگ میں ستی کیا جا رہا ہے۔

عاطون کو بڑا افسوس ہوا۔ وہ ہجوم میں آگے بڑھا کہ اس بدنصیب عورت کو دیکھے جس کو ناحق چتا کے شعلوں کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ایک جوان خوبصورت عورت کو سیاہ لباس پہنا کر چتا کی لکڑیوں کے ساتھ رسیوں سے باندھ دیا گیا ہے اور پروہت مقدس اشلوک پڑھ رہے ہیں۔ غریب عورت رو رہی ہے اور مدد کے لئے دیوتاؤں کو پکار رہی ہے اور بار بار کہہ رہی ہے کہ میں مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے بچاؤ۔

عاطون لوگوں کو پیچھے ہٹاتا ہوا اس عورت کی مدد کا خیال دل میں لے کر ذرا آگے بڑھا تو اچانک ایک آدمی نے چلا کر کہا "ارے یہ تو پرتھال ہے۔ یہ زندہ ہے۔"

ایک دم سے سب لوگ عاطون کی طرف متوجہ ہو گئے۔ عورت کے رونے کی آواز بھی بند ہو گئی۔ پروہت اشلوک گاتے گاتے رک گئے پھر لوگ عاطون پر ٹوٹ پڑے "پرتھال زندہ ہے۔ پرتھال زندہ - اسے پکڑ کر راجا کے سامنے پیش کرو۔"

اس کے ساتھ ہی چتا پر جکڑی ہوئی عورت سنتھالہ کی آواز بھی بلند ہوئی۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ "میرا خاوند زندہ ہے۔ میں اب ستی نہیں ہو سکتی - مجھے یہاں سے اتارو۔"

عاطون اگر چاہتا تو ایک لمحے میں دس بارہ آدمیوں کی گردنیں توڑ کر وہاں سے بڑی آسانی سے فرار ہو سکتا تھا لیکن احساس ہوا کہ اس کے گرفتار ہو جانے سے ایک بے گناہ عورت چتا کی آگ پر زندہ جل جانے سے بچ جائے گی تو اس کے دل میں انسانی ہمدردی کا شدید احساس جاگ اٹھا۔ اس نے اپنے آپ کو لوگوں کے حوالے کر دیا۔ اتنا وہ سمجھ گیا کہ اس کی شکل عورت کے خاوند پرتھال سے بے حد مماثلت رکھتی ہو گی یا شاید میں پرتھال کی شکل میں وہاں ظاہر ہو گیا ہوں۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ عورت کا خاوند پرتھال ہو بہو اس کی شکل و صورت کا ہو۔ اتنے میں پروہت اور ستی ہونے والی عورت کے رشتے دار چتا کی مچان سے اٹھ کر عاطون کے پاس آ گئے۔ لوگوں نے عاطون کو پکڑ رکھا تھا۔ رشتے دار نے عاطون کو گھور گھور کر دیکھا۔ پروہت نے بھی پرتھال کو پہچان لیا تھا۔ اس نے پرتھال کے رشتے داروں سے تصدیق کرنے کی غرض سے پوچھا کہ وہ تصدیق کرتے ہیں کہ پرتھال زندہ ہے اور وہ کسی دوسرے انسان کی ہڈیاں اٹھا لائے تھے۔ رشتے داروں میں سے ایک بولا "مہاراج! کسی دشمن نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا اور پرتھال کو مردہ ظاہر کر کے کسی دوسرے مردے کی ہڈیاں ہمارے حوالے کر دیں۔ ہم نے سنتھالہ کے خاوند کو پہچان لیا ہے۔ یہی سنتھالہ کا خاوند ہے۔ سنتھالہ اب ستی نہیں ہو گی۔"

پروہت نے عاطون کی طرف دیکھ کر کہا "لیکن پرتھال کو قانون کے حوالے ضرور کیا جائے گا کیونکہ اس نے ایک انسان کا خون کیا ہے۔ اس کی تقدیر کا فیصلہ راجا ارژنگ کے دربار میں ہو گا۔"

لوگ عاطون کو پکڑ کر شاہی محل کی طرف لے چلے۔ سنتھالہ کو چتا سے اتار دیا گیا۔ وہ بین کرتی اپنے خاوند کے پیچھے دوڑی "میرے پتی کو چھوڑ دو۔ اس نے قتل نہیں کیا وہ بے گناہ ہے۔"

عاطون کو جب معلوم ہوا کہ بے گناہ عورت کی جان بچ گئی ہے اور وہ ایک بہیمانہ رسم کی بھینٹ نہیں چڑھی تو وہ بہت خوش ہوا لیکن وہ ابھی فرار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ویسے بھی اسے بخوبی علم تھا کہ دنیا کا کوئی راجا اسے ہلاک کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سنتھالہ کے خاوند پرتھال پر شہر کے ایک امیر سوداگر کے قتل کا الزام ہے۔ جس کی پاداش میں راجا اسے موت کی سزا دے گا اور جب اسے بظاہر ہلاک کر دیا گیا تو اس بے گناہ عورت سنتھالہ کو دوبارہ چتا کے شعلوں کے حوالے کر دیا جائے گا جس کی وہ جان بچانا چاہتا تھا۔

لوگ عاطون کو کشاں کشاں راجا کے دربار میں لے گئے راجا نے فوراً اسے موت کی سزا کا حکم سنا دیا۔ وہاں کی رسم کے مطابق پرتھال یعنی عاطون کو چمڑے کی بوری میں ڈال کر دریا میں پھینکا جانا تھا۔ پرتھال کو موت کی سزا کا حکم ملنے کے فوراً بعد اس کے بھائیوں نے سنتھالہ کو جا کر قابو میں کر لیا۔

یہ لوگ چاہتے تھے کہ پرتھال کی بیوی کو ستی کر دینے کے بعد اپنے بھائی کی جائیداد کو آپس میں بانٹ لیں۔ سنتھالہ پر پھر مصیبت نازل ہو گئی۔

مذہبی رسوم کے مطابق اس کو خاوند کی موت کے بعد زندہ جلا دینا ضروری تھا۔ چنانچہ اسے مکان کی ایک کوٹھری میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ سب رشتے دار اور خاص طور پر پرتھال کے بھائی اس لمحے کا انتظار کرنے لگے جب پرتھال کو چمڑے کی بوری میں بند کر کے دریا میں پھینکا جانا تھا۔

عاطون بھی اس حقیقت سے باخبر تھا۔ اب اس نے بھی غصہ سے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بے گناہ عورت سنتھالہ کو کسی صورت میں بھی ان آدم خوروں کے حوالے نہیں کرے گا جو اس کی جان کے ناحق دشمن بنے بیٹھے تھے۔ وقت مقررہ پر عاطون کو قید خانے سے نکال کر دریا کے کنارے قلعے کی دیوار کے اوپر لایا گیا۔ کوتوال اور دوسرے متعلقہ درباری موجود تھے۔ ان کے سامنے عاطون کو چمڑے کی ایک بوری میں بند کر کے اس کا منہ سی دیا گیا۔

عاطون نے کوئی مزاحمت نہ کی پھر کوتوال کے اشارے پر چمڑے کی بوری دریا میں پھینک دی گئی۔ دریا کی تہ میں اترتے ہی عاطون نے بازوؤں کا زور لگا کر چمڑے کی بوری کو پھاڑ دیا اور دریا کی گہرائی میں اندر ہی اندر تیرتا دور نکل گیا۔ کافی دور جا کر اس نے دریا کی سطح پر آ کر سر باہر نکال کر دیکھا قلعہ پیچھے کافی دور رہ گیا تھا مگر اس نے شاہی سپاہیوں کو گھوڑوں پر سوار دریا کے کنارے کنارے اپنی طرف آتے دیکھا۔ عاطون ڈبکی لگا گیا۔

عاطون نے پانی کے اندر دریا کے بہاؤ کی جانب تیرنے لگا پانی کی تیز لہریں اسے آگے ہی آگے لیے جا رہی تھیں۔ جب اپنے اندازے کے مطابق وہ کافی دور نکل آیا تو اس نے ایک بار پھر پانی میں سے سر نکال کر دیکھا گھڑ سوار سپاہی اب اسے نظر نہ آئے۔ وہ دریا میں کافی دور نکل آیا تھا۔ یہاں دریا کے کنارے سرکنڈوں کی گھنی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ عاطون ان جھاریوں میں آ گیا پھر دریا سے نکل کر کنارے پر بیٹھ کر غور کرنے لگا کہ اسے کس بھیس میں واپس جا کر سنتھالہ کے گھر اس کی جان بچانے کے لئے جانا چاہیئے۔ ظاہر ہے اگر وہ پرتھال کے روپ میں جاتا ہے تو وہاں کے لوگ اسے ایک بار پھر پکڑ کر راجا کے حوالے کر دیں گے اور اس کی موت کا منظر ایک بار پھر دہرایا جائے گا۔ بھیس بدلنے کے لئے اس کے پاس کوئی دوسرے کپڑے وغیرہ بھی نہیں تھے۔ وہ شام کا اندھیرا ہونے کا انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس دوران میں ہو سکتا تھا سنتھالہ کو چتا کے شعلوں پر زندہ جلا دیا جائے۔ عاطون نے دور قلعے کی فصیل کو دیکھا جہاں سے اسے دریا میں پھینکا گیا تھا۔ اسے سنتھالہ کے گھر کا ہی پتا نہیں تھا۔ اس کے پاس غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ ویران علاقے میں کھڑا تھا۔ ایک کچا راستہ جنگلی جھاڑیوں میں سے شہر کی جانب جاتا تھا۔ عاطون نے اس پر چلنا شروع کر دیا۔ اب اس پر سنتھالہ کو بچانا فرض ہو گیا تھا اس لئے کہ اب یہ عورت اس کی وجہ سے موت کے منہ میں لے جائی جا رہی ہے جبکہ وہ خود زندہ تھا۔

اس وقت نہ جانے کہاں سے بادلوں کی سیاہ لہریں آسمان پر ابھر آئیں اور ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ ایک جگہ جھاڑیوں کے عقب میں خانہ بدوشوں کے کچھ جھونپڑے بنے تھے یہاں گدھے بھی بندھے ہوئے تھے۔ عورتیں جھونپڑیوں میں بیٹھی سوت وغیرہ کات رہی تھیں۔ خانہ بدوش ایک جھونپڑی کے سائے میں آگ روشن کر رہے تھے۔ عاطون ان کے قریب آ گیا۔ اس نے سلام کیا اور بارش سے بچنے کے بہانے سائبان کے نیچے خانہ بدوشوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے پرتھال کی باتیں شروع کر دیں جسے تھوڑی دیر پہلے قلعے کی فصیل سے دریا میں گرایا گیا تھا بوڑھے خانہ بدوش نے کہا کہ اسے معلوم نہیں۔ اس بوڑھے خانہ بدوش کی زبان عاطون کو معلوم ہوا پرتھال کی بیوی کے لواحقین دوپہر کے بعد پرتھال کی لاش

کو دریا میں تلاش کرنے نکلیں گے۔ اگر ایک ہفتے تک نہ ملی تو اس کی بیوی سنتھالہ کو اکیلے ہی چتا پر جلا دیا جائے گا کیونکہ سینکڑوں لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ پرتھال کو دریا میں گرا دیا گیا تھا اور کوئی نہتا آدمی چمڑے کی بند بوری سے باہر نہیں نکل سکتا۔ عاطون کو قدرے اطمینان ہوا کیونکہ ابھی سنتھالہ کی زندگی کے سات دن باقی تھے۔ عاطون کچھ دیر ان خانہ بدوشوں کے پاس بیٹھا رہا۔

جب بارش تھم گئی تو وہ اٹھ کر دور درختوں کے درمیان آ کر بیٹھ گیا۔ وہ رات کا اندھیرا چھا جانے کے انتظار میں تھا۔ بارش پھر ہونے لگی۔ اس بار بارش تیز تھی۔ چند قدموں کے فاصلے پر ایک ٹوٹا پھوٹا چبوترا سا تھا جس کے اوپر درختوں کی گھنی شاخوں نے چھت سی ڈال رکھی تھی۔ عاطون اٹھ کر وہاں چلا گیا۔ دوپہر کے وقت بارش رک گئی چونکہ زمین ریتلی تھی اس لئے بارش کا پانی جلد ہی خشک ہو گیا تھا۔ سورج غروب ہوا تو بادل صاف ہو گئے اور آسمان پر دو ایک ستارے چمکنے لگے۔ جب شام کے بعد رات کا اندھیرا زمین پر اتر آیا تو عاطون درختوں سے نکلا اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ اندازے سے دریا کے ساتھ شمشان کی طرف جا رہا تھا۔ شمشان کے بوسیدہ دروازے تک پہنچتے پہنچتے گہرا اندھیرا چھا گیا تھا۔ عاطون نے دیکھا کہ شمشان کے اندر ایک طرف کٹیا بنی تھی جس میں دیا جل رہا تھا۔ عاطون دروازے کی اوٹ میں تھا۔ اتنے میں کٹیا میں سے ایک آدمی نکلا اس کے ہاتھ میں مٹی کا پیالہ تھا۔ کٹیا کے سامنے پڑے گھڑے سے اس نے پانی لے کر پیا اور واپس کٹیا میں چلا گیا۔ عاطون نے کٹیا کے پاس جا کر اس آدمی سے پینے کے لئے پانی مانگا۔ کٹیا میں آدمی کی آنکھیں انگاروں کی مانند چمک رہی تھیں۔ اس نے اٹھ کر گھڑے میں سے پانی لیا اور پیالہ اپنے ہاتھ میں رکھے عاطون کو اوک بنا کر پانی پینے کے لئے کہا۔ پانی پینے کے بعد عاطون نے بتایا کہ وہ دوسرے گاؤں میں پرتھال کی موت کی خبر سن کر آیا ہے مگر اسے پرتھال کے گھر پتہ نہیں ہے۔ عاطون نے تسلی کر لی تھی کہ شمشان کے باوے نے اسے پہچانا نہیں تھا۔ باوے نے عاطون کو بتایا کہ پرتھال کی بیوی کا گھر چماروں کی بستی میں شہر کی فصیل سے باہر ٹبے کے پاس ہی ہے۔

عاطون شکریہ ادا کر کے شمشان سے چماروں کی بستی کی طرف چل دیا۔ دور شہر کی فصیل کے برجوں پر مشعلوں کی روشنیاں ہو رہی تھیں۔ اندھیرے میں وہ بتائے ہوئے راستے پر چلتا گیا کوئی ایک فرلانگ طے کرنے کے بعد اسے گہرے کھڈوں اور ٹبوں کے قریب ایک بستی میں جلتے چراغوں کی دھندلی روشنیاں نظر آئیں۔ اسی بستی میں کہیں سنتھالہ کا گھر بھی تھا۔ وہ بستی کے قریب آ کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ ایک جانب سے کتے کے بھونکنے کی آواز

آئی۔ اتنا عاطون کو معلوم تھا کہ چونکہ اس کی شکل سنتھالہ کے مرحوم خاوند پرتھال سے خطرناک حد تک ملتی ہے۔ اس لئے بستی کے لوگ اسے فوراً پہچان لیں گے اور ممکن ہے اسے پکڑ کر دوبارہ سپاہیوں کے حوالے کر دیں۔ شمشان والے باوے نے اسے بتایا تھا کہ پرتھال کی بیوی سنتھالہ کا گھر چماروں کی بستی کے جنوب کی طرف کونے والا مکان ہے۔

عاطون خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ جب رات گہری ہو گئی اور بستی کے اکثر چراغ گل ہو گئے تو وہ اٹھا اور دبے پاؤں چلتا بستی کے جنوب کی سمت آ گیا۔ اسے بستی کے کونے والا کچا اک منزلہ مکان اندھیرے میں ابھرا ہوا نظر آنے لگا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا قدرے جھکا جھکا اس مکان کی طرف بڑھا۔ وہ مکان کے صحن کی دیوار کی اوٹ میں آ کر اندھیرے میں بیٹھ گیا۔ مکان کا دروازہ بند تھا۔ آنگن کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ یہ کچی دیوار تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اندر جھانک کر دیکھا کہ سامنے ایک چھوٹی سی کوٹھری کے آگے دو آدمی زمین پر چٹائیاں بچھائے سو رہے ہیں۔ اس مکان میں دوسری کوئی کوٹھری نہیں تھی۔ عاطون وہاں سے دبے پاؤں چلتا کوٹھری کے پیچھے آ گیا۔ یہ ایک تنگ سی کچی گلی تھی جس کے درمیان سے گندے پانی کی نالی گزرتی تھی۔ عاطون نے دیکھا کہ کوٹھری کے عقب میں ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے جس پر سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کو یقین تھا کہ سنتھالہ اسی کوٹھری میں بند ہے۔ وہ کھڑکی کے پاس آ گیا۔ گلی میں گہرا اندھیرا تھا۔ اس نے کھڑکی پر آہستہ سے انگلی بجائی۔ گہرے سناٹے میں یہ آواز عاطون کو بہت بلند محسوس ہوئی۔ چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد عاطون نے پھر آہستہ سے دستک دی۔ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ تیسری بار دستک دینے پر اندر سے کسی نے کھڑکی کی کنڈی اتاری اور کھڑکی کا ایک پٹ آہستہ سے کھل گیا۔ عاطون کو کچھ نظر نہ آیا۔ عاطون نے آہستہ سے کہا۔ "سنتھالہ!"

دوسری طرف سے سنتھالہ کی جذبات سے کپکپاتی ہوئی خشک آواز آئی۔ "پرتھال تم زندہ ہو؟"

شی .... عاطون نے سنتھالہ کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر ایک طرف موڑ کر اکھاڑ ڈالا تین سلاخیں اکھیڑیں تو وہاں اتنی جگہ پیدا ہو گئی کہ ایک انسان گزر سکتا تھا۔ عاطون نے سنتھالہ کو انتہائی احتیاط سے کھڑکی میں سے باہر نکال لیا۔ سنتھالہ کا جسم خوشی اور خوف سے لرز رہا تھا۔ عاطون نے اسے ساتھ لیا اور سنسان اندھیری گلی میں سے گزرتا ہوا بستی کے کنارے کچے مکانوں کی اوٹ لیتا ویران میدان کی طرف بڑھا۔ آگے انجیر کے گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ سنتھالہ اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی جونہی وہ جھنڈ میں سے نکلے، اچانک سامنے سے ایک گھڑسوار آ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں نیزہ تھا۔ سنتھالہ نے کہا "پہرے دار"

پہرے دار نے بلند آواز میں پوچھا "کون ہو تم لوگ؟" اس کے ساتھ ہی وہ گھوڑے سے اتر کر عاطون کی طرف بڑھا نیزے کا رخ سامنے کی طرف تھا۔ عاطون نے ہکلاتے ہوئے کہا "ہم پردیسی ہیں۔"

پہرے دار قریب آیا تو اس نے عاطون یعنی پرتھال کو پہچان لیا۔

"پرتھال"

ساتھ ہی وہ چیخ پڑا "پرتھال آ گیا۔ پرتھال زندہ ہے۔" اس کی بلند آواز پر بستی کے کتے بھونکنے لگے۔ عاطون نے اچھل کر پہرے دار کو گردن سے دبوچ کر نیچے گرایا اور دو تین زبردست جھٹکوں سے اس کی گردن کا منکا توڑ دیا۔ بستی کی طرف سے آدمیوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ عاطون نے سنتھالہ کو گھوڑے پر بٹھایا پھر اچھل کر اس کے ساتھ ہی گھوڑے پر بیٹھا اور گھوڑے کو زور سے ایڑ لگانے لگا کمبخت گھوڑا جیسے اپنی جگہ جم سا گیا ہو۔ عاطون نے اس کی پسلیوں میں زور سے لات ماری۔ گھوڑے نے ہنہناتے ہوئے اگلے پاؤں اٹھا لیے پھر ایک طرف سرپٹ بھاگ لیا۔ بستی کی طرف سے اب شور بلند ہونے لگا تھا۔ سنتھالہ کے رشتے داروں کو اس کے فرار کا علم ہو گیا تھا۔ وہ اسکے پیچھے دوڑے مگر کسی کے پاس گھوڑا نہیں تھا۔ دوسری جانب عاطون گھوڑے کو اندھیری رات میں اندھا دھند بھگائے جا رہا تھا۔

عاطون کو سب سے زیادہ خطرہ اس بات کا تھا کہ اس کے دریا سے زندہ نکل جانے کی خبر بہت جلد راجا ارژنگ کے سپاہیوں کو ہو جائے گی اور ان کا چاق و چوبند دستہ برق رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر اس کے تعاقب میں نکل کھڑا ہو گا۔ سنتھالہ عاطون سے چمٹی ہوئی تھی۔ گھوڑے کی باگیں عاطون نے ڈھیلی چھوڑ رکھی تھیں۔ اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا تاریک رات میں ویران میدان میں دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اس کا رخ مشرق کی طرف تھا راتوں رات عاطون راہ میں تھوڑا سا دم لینے کے لئے شہر سے بہت دور نکل آیا۔ پو پھٹنے کے قریب ایک دریا راستے میں آ گیا۔ انہوں نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے دریا پار کیا۔ دریا کی دوسری جانب چھوٹی بڑی سنگلاخ پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ یہاں نشیب میں جنگلی جھاڑیوں میں کہیں کہیں پانی کے چھوٹے موٹے چشمے بہہ رہے تھے۔ گھوڑا تھک گیا تھا عاطون نے اسے چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا اور سنتھالہ سے پوچھا کہ وہ کہاں جانا پسند کرے گی؟ وہ حیرت سے عاطون کا منہ تکنے لگی "پرتھال! یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ تم میرے خاوند ہو میں تو تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔"

عاطون عجیب الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ عورت بجا طور پر اسے اپنا خاوند سمجھ رہی تھی کیونکہ عاطون کی شکل و شباہت ہی نہیں بلکہ سنتھالہ کے بقول اس کی آواز ' چال ڈھال' جسم اور چلنے اور بات کرنے کا انداز سب کچھ پرتھال کی طرح تھا۔ عاطون اسے موت کے منہ سے نکال لایا تھا اور اب اسے بے یارو مددگار بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں سنتھالہ سے معلوم کر لیا کہ ملک سندھ میں اس کی ایک خالہ رہتی ہے۔ عاطون نے ملک سندھ کی جانب چلنے کا فیصلہ کر لیا۔

آج سے سات ہزار سال قبل براعظم پاک و ہند کو سندھ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ آریاؤں کی آمد سے پہلے کا زمانہ تھا جبکہ شمالی ہند میں دراوڑوں سے بھی پہلے کی ایک قوم آباد تھی۔ دن نکلنے پر تازہ دم ہو کر عاطون اور سنتھالہ دوبارہ گھوڑے پر بیٹھے اور مشرق ہی کے رخ پر اپنا سفر شروع کر دیا۔ ایک پہر دن ڈھلے یہ دونوں ایک سیاہ پہاڑ کے دامن میں پہنچے تو اچانک زمین ہلنے لگی پہلے تو عاطون کو گھوڑے پر سوار ہونے کی وجہ سے زمین کی حرکت محسوس نہ ہوئی لیکن جب گھوڑے کے پاؤں لڑکھڑانے لگے اور وہ خوف کے مارے رک گیا تو سنتھالہ نے خوف زدہ آواز میں کہا "پرتھال! بھونچال آ رہا ہے۔"

گھوڑے نے ایک جھولا کھایا اور وہ زمین پر گر پڑا۔

زمین بری طرح ہلنے لگی۔ گھوڑا ڈر کر ایک طرف بھاگا مگر تھوڑی دور جا کر وہ بھی زمین پر لڑھک گیا۔ سنتھالہ سہم کر عاطون سے چمٹ گئی۔ زلزلہ شدید قسم کا تھا۔ اب زمین کے اندر سے گڑگڑاہٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں پھر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بھیانک دھماکا ہوا اور سیاہ پہاڑ کی چوٹی کے پتھر روئی کے گالوں کی طرح آسمان کی طرف اڑ گئے۔ پہاڑ کی چوٹی پھٹ گئی اور اس میں سے پہلے تو نسواری رنگ کا گردوغبار اور پھر دھوئیں کا بادل اوپر اٹھا اور ساتھ ہی سرخ شعلوں کی بجلیاں چمکیں اور زرد رنگ اور لال رنگ کا پگھلا ہوا لاوا جھاگ اڑاتا ہوا پہاڑ کے دہانے سے ابل کر وادی کی طرف بہنے لگا۔ زمین ابھی تک بھونچال کی زد میں تھی۔ سنتھالہ کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ ایک طرف اٹھ کر بھاگ گئی۔ عاطون نے اسے رک جانے کو کہا مگر وہ نہ رکی۔ ایک اور دھماکا ہوا اور سنتھالہ کے آگے زمین پھٹی اور گہرے شگاف کی ایک دراڑ نمودار ہوئی جس نے سنتھالہ کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ عاطون نے اسے زمین پر شگاف میں بھیانک چیخ کے ساتھ گرتے دیکھا۔ سنتھالہ کی آخری چیخ زمین کی گڑگڑاہٹ اور آتش فشاں پہاڑ کے ہلکے ہلکے دھماکوں کی گونج میں گم ہو گئی۔

زلزلے میں ہی عاطون دوڑ کر اس طرف گیا تھا۔ زمین کا شگاف لمبا اور گہرا تھا۔ شگاف کی گہرائیاں تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں' اور اس گہرائی میں سنتھالہ کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ عاطون نے چلا کر اسے آواز دی۔ جواب میں پہاڑ کی چوٹی پر مزید ایک ہولناک دھماکا ہوا' اور زمین اتنی شدت سے ہلی کہ شگاف کے کنارے تڑاک کی آواز کے ساتھ آپس میں مل گئے۔ عاطون پیچھے کی طرف گر پڑا اور پھر اسی حالت میں اس نے دیکھا کہ زرد رنگ کا سسکارتا' کھولتا ہوا لاوا پہاڑ کی ڈھلان کو تیزی سے پیچھے کی طرف دھکیلتا ہوا اس کی جانب بڑھ رہا ہے تو عاطون اٹھا اور الٹے رخ دوڑ پڑا۔ لاوے کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ اسی آخر ہولناک دھماکے نے کھولتے لاوے کا ایک اور سیلاب نیچے کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ عاطون چھوٹی چھوٹی سنگلاخ پہاڑیوں کے درمیان دوڑتا چلا جا رہا تھا اور لاوا بھی ٹیکریوں کو اپنی بانہوں میں لیتا بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا عاطون نے پیچھے گھوم کر ایک نظر دیکھا تو لاوے کی سرخ انگارہ نما پگھلتی چادر اس کے بہت قریب پہنچ گئی تھی' اگرچہ عاطون کو معلوم تھا کہ وہ مر نہیں سکتا' لیکن لاوے کے کھولتے سیلاب کو دیکھ کر ایک بار تو اسے بھی موت سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ عاطون تیزی سے دوڑ کر ایک ٹیکری پر چڑھ گیا' وہ ابھی ٹیکری کی چوٹی پر بھی نہیں پہنچا تھا کہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی پھنکاریں مارتے اس کھولتے ہوئے لاوے نے اس ٹیکری کو بھی اپنے آتشیں بازوؤں میں لے لیا اور پھر آگے نکل گیا۔

عاطون ٹیکری کی چوٹی پر کھڑے ہو کر سرخ لاوے کو آگے کی طرف جاتے دیکھنے لگا۔ لاوے کے پگھلے ہوئے سیلاب میں گرداب پڑ رہے تھے' اور راستے کے بڑے بڑے پتھر لڑھکتے چلے جا رہے تھے۔ آسمان پر آتش فشاں پہاڑ کا سیاہ اور نسواری دھواں بادل بن کر چھا گیا تھا اور سورج اس میں ایک بے نور سفید آنکھ کی طرح نظر آنے لگا تھا۔ ٹیکری کی چوٹی پر پتھر کی بڑی بڑی سلیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ عاطون ایک سل پر بیٹھ کر سنتھالہ کے

المناک انجام پر افسوس کرنے لگا۔ اچانک اس پر خاکی اور سفید رنگ کی بارش سی ہونے لگی۔ یہ آتش فشاں پہاڑ کی راکھ تھی، جو آسمان کی بلندیوں میں پہنچ کر بادلوں سے نیچے گرنا شروع ہوگئی تھی۔ یہ گرم راکھ تھی۔ یہ کھولتے ہوئے لاوے سے کم ہلاکت خیز نہیں تھی۔ ٹیکری کے دامن کی جانب سے کھولتے لاوے کی بے پناہ تپش بھی اٹھ رہی تھی، مگر عاطون پر ان دونوں چیزوں کا اثر نہیں ہو رہا تھا تاہم عاطون یہ بالکل نہیں چاہتا تھا کہ وہ آتش فشاں پہاڑ کی گرم راکھ میں دب جائے، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ آتش فشاں پھٹنے کے بعد اس کی راکھ دیر تک گرتی رہتی ہے اور زمین کی ہر شے اس میں دب جاتی ہے۔ عاطون گرتی راکھ میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے ٹیکری کی چوٹی پر بکھری ہوئی پتھر کی چوڑی سلوں کو جوڑ کر اس کا ایک ڈربہ سا بنا لیا اور اس میں گھس کر اس کا سامنے والا حصہ بھی ایک سل سے بند کر دیا۔ آکسیجن کی اسے ایسے موقعوں پر ضرورت نہیں رہتی تھی، وہ کم سے کم آکسیجن میں کئی کئی روز تک ہوش میں رہ سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ بے ہوشی کی حالت میں مہینوں پڑا رہ سکتا تھا۔ پتھر کی سلوں کے ڈربے میں ابھی اندھیرا نہیں تھا، کیونکہ عاطون نے سل کے اوپر ذرا سی جھری خالی رکھی ہوئی تھی۔

اس جھری میں وہ باہر گرتی گرم راکھ کو دیکھ رہا تھا۔ راکھ بارش کی طرح گر رہی تھی۔ بہت جلد ٹیکری پر راکھ کی تہ چڑھنے لگی۔ سورج کی دھندلی گندھکی رنگ کی آنکھ، آتش فشاں کے بادلوں میں مغرب کی طرف جھک گئی تھی، کچھ دیر بعد چاروں طرف رات کا اندھیرا چھا گیا۔ ساری رات عاطون ڈربے میں بند پڑا رہا۔ صبح ہوئی تو جھری سے دن کی پھیکی روشنی اندر آنے لگی۔ عاطون نے جھری میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ راکھ گرنا بند ہوگئی تھی، مگر ٹیکری پر راکھ کی کئی فٹ اونچی تہ چڑھ چکی تھی۔ عاطون نے دروازے والی سل کو ہاتھ سے پیچھے گرا دیا۔ پتھر کی سل راکھ میں دب گئی۔ گرم راکھ کا اوپر والا حصہ ابھی تک نرم تھا، مگر نیچے تقریباً" فٹ کی تہ جم چکی تھی۔

عاطون ڈربے سے نکل آیا، وہ گھٹنوں تک نیم گرم راکھ کی تہ میں دھنس گیا۔ اس نے اردگرد نگاہ ڈالی۔ آتش فشاں کا دھانہ قیامت خیز طوفان کے بعد خاموش تھا۔ نشیب میں لاوا جم گیا تھا، مگر اس میں سے ابھی تک بھاپ اٹھ رہی تھی۔ آگے جتنی ٹیکریاں تھیں۔ ان سب کے گرد لاوے کی تہ گھیرا ڈالے ہوئے تھی۔ عاطون کو ٹیکری پر ہی رک کر لاوے کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کرنا تھا، کیونکہ وہ لاوے میں اتر کر پتھر نہیں بننا چاہتا تھا۔

بھوک اور پیاس سے وہ بے نیاز تھا، چنانچہ بڑی آسانی سے وہاں مزید انتظار کر سکتا تھا، وہ واپس اپنے ڈربے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اسے بدنصیب سنتھالہ کا خیال آنے لگا۔ قسمت

نے اس کا ساتھ نہ دیا اور وہ ایک بھیانک موت کا شکار ہوگئی۔ عاطون کو اب پدم ناگ اور دیوی مایا کا خیال آیا، جن کے بارے میں گگن منڈل کے دیوتاؤں کے مشیر نارومنی نے کہا تھا کہ وہ اسے اس جنم میں ناگ اور مایا کے روپ میں ملیں گے، ابھی تک عاطون کی ملاقات اپنے ان پرانے دوستوں اور ہمدرد ساتھیوں سے نہیں ہوئی تھی۔ عاطون کو اپنے پچھلے جنم کے کچھ کچھ واقعات خواب کی طرح یاد آنے لگے تھے، لیکن یہ واقعات دھند کی دبیز چادر میں ستاروں کی طرح گردش کر رہے تھے۔ کسی وقت کوئی بات اچانک یاد آتی اور پھر اس کے ذہن سے نکل جاتی۔

تھائیس کو بوڑھی کنیز نے عرب سوداگر کا بھیس بدلوا کر دمشق جانے والے ایک قافلے کے ساتھ کر دیا تھا۔ قافلے کے امیر کو یہی بتایا گیا تھا کہ یہ نوجوان عرب سوداگر اپنا مال فروخت کر کے واپس دمشق جا رہا ہے اور اس کا نام العارف ہے۔ امیر کارواں نے العارف یعنی تھائیس سے معانقہ بھی کیا تھا، جس پر اسے کچھ عجیب سا لگا تھا کہ اس نوجوان کا جسم اتنا نرم نرم کیوں ہے۔ اسی قافلے میں ایک اور شامی نوجوان بھی سفر کر رہا تھا، وہ ابھی اپنا مال فروخت کرنے کے بعد دمشق جا رہا تھا۔ قافلہ کافی بڑا تھا اور اس میں کئی اونٹ، گھوڑے اور خچر شامل تھے۔ دوسری جانب سیاہ فام کانے سوداگر کو جب اپنی چہیتی کنیز (جس کو وہ اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا) کے فرار کا علم ہوا تو اس نے اپنے آدمی بھیج کر انطاکیہ کا چپہ چپہ چھان مارا مگر تھائیس کا کوئی سراغ نہ ملا، دو روز بعد اسے معلوم ہوا کہ جس روز تھائس فرار ہوئی تھی۔ اسی رات ایک قافلہ دمشق کی طرف روانہ ہوا تھا۔ سیاہ فام کانے سوداگر نے اپنے خاص غلام کو جو اپنے مالک کی خاطر ان گنت لوگوں کا خون بہا چکا تھا اور انتہائی سنگدل شخص تھا۔ خفیہ ہدایت دے کر قافلے کے پیچھے روانہ کر دیا۔ اس غلام کے ساتھ سیاہ فام سوداگر کے چھ باڈی گارڈ بھی تھے۔ آگے آگے تھائیس کا قافلہ جا رہا تھا اور اس کے پیچھے حبشی غلام اور چھ باڈی گارڈ سپاہیوں کے لباس میں گھوڑوں پر سوار چلے آ رہے تھے۔ ان کے درمیان دو دن کی مسافت حائل تھی۔

سفر کے دوران قافلے میں شریک شامی نوجوان تاجر کی تھائیس سے دوستی ہوگئی۔ اس دوستی میں شامی کا زیادہ عمل دخل تھا۔ تھائیس کسی سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی، لیکن اس کی الگ تھلگ رہنے کی عادت سے بھی قافلے والوں کو شک پڑ سکتا تھا۔ چنانچہ اسے لامحالہ شامی کی دوستی کا جواب اثبات میں دینا پڑا۔ تاہم تھائیس اس کے زیادہ قریب جانے سے گریز کرتی تھی۔ ایک روز قافلے نے پڑاؤ ڈالا تو شامی اپنے دوست العارف یعنی تھائیس کے لیے گوشت کا بھنا ہوا ٹکڑا لے آیا۔ تھائیس آخر عورت تھی۔ اسے بڑی نزاکت اور

شائستگی سے کھاتے دیکھ کر شامی نے زور سے اس کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا' "العارف! تو عورتوں کی طرح کھا رہے ہو۔"

اسی دن شام کے قریب جب قافلہ کوچ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ایک عجیب حادثہ ہوگیا۔ شامی اور تھائیس کھجور کے درخت کے نیچے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ شامی' تھائیس کا پنجہ اپنے پنجے میں لے کر بولا "عارف آؤ پنجہ آزمائی کرتے ہیں۔"

تھائیس نے اسے بہت روکا' پس و پیش کیا' مگر شامی نے زور آزمائی شروع کر دی۔ اس کش مکش میں تھائیس ایک طرف کو جھکی تو اس کی پگڑی کھل گئی اور لمبے بال باہر لہرانے لگے۔ شامی ہکا بکا ہو کر جیسے سکتے میں آگیا۔ تھائیس جلدی جلدی سر پر دوبارہ پگڑی باندھنے لگی۔ شامی نے حیرت سے کہا' "تم عورت ہو العارف؟"

تھائیس کا راز کھل چکا تھا۔ اس نے بہتر یہی سمجھا کہ شامی کو اعتماد میں لے لینا چاہیے۔ تھائیس نے ادھر ادھر دیکھا۔ مسافر اپنا اپنا سامان درست کرنے میں لگے تھے۔ اس نے شامی کو شروع سے لے کر آخر تک اپنی ساری درد بھری کہانی بیان کر دی اور یہ بھی بتایا کہ ہو سکتا ہے کہ سیاہ فام سوداگر کے آدمی میری تلاش میں قافلے کا پیچھا کر رہے ہوں۔ شامی نے تھائیس کا ہاتھ تھام کر اسے تسلی دلائی کہ اس کا راز اس کے سینے میں دفن ہو جائے گا اور وہ ہر مشکل وقت میں اس کی مدد کرے گا۔ تھائیس مطمئن ہوگئی' تھائیس کا قافلہ دن کو آرام کرتا اور رات کے وقت سفر کرتا تھا۔ جب کہ اس کے تعاقب میں آنے والا حبشی غلام اور اس کے ساتھ دن کے وقت بھی گھوڑے دوڑاتے چلے آ رہے تھے۔

چنانچہ ایک روز جب کہ قافلہ ایک نخلستان میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ دور صحرا میں کچھ گھڑ سوار آتے دکھائی دیے۔ تھائیس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے شامی کو ایک طرف لے کر کہا کہ شاید سیاہ فام سوداگر کے سپاہی اسے گرفتار کرنے آن پہنچے ہیں۔ شامی نے دور گھڑ سواروں کو آتے دیکھ لیا تھا۔ تھائیس مردانہ لباس میں تھی۔ شامی اسے نخلستان کی ایک جانب درختوں کے پیچھے لے گیا۔ یہاں ایک جگہ مٹی اور ریت کے بڑے بڑے تودے میں ایک کھوہ تھی۔ شامی نے تھائیس کو اس کھوہ میں چھپا کر آگے خشک جھاڑیاں وغیرہ ڈال کر کھوہ کے منہ کو چھپا دیا اور خود قافلے والوں کے پیچھے ہی آ گیا تھا۔

اتنی دیر میں گھڑ سوار نخلستان میں پہنچ گئے۔ میر کارواں نے اپنے سیاہ فام سوداگر دوست کے حبشی غلام اور اس کے خاص گارڈز کو پہچان کر ان سے باری باری مصافحہ کیا۔ جب اسے پتا چلا کہ یہ لوگ سوداگر کی چہتی کنیز کی تلاش میں وہاں آئے ہیں' تو وہ کہنے لگا' "میرے دوست کی کنیز اگر میرے قافلے میں موجود ہے تو تم اسے لے جا سکتے ہو۔"

تلاشی کا کام شروع ہوگیا۔ حبشی غلام اور اس کے ساتھیوں نے ایک ایک مسافر مرد اور عورت کو گھور گھور کر دیکھا' سامان کے بڑے بڑے بوروں اور گٹھروں کو کھلوا کر ان کی تلاشی لی' مگر کنیز تھائیس وہاں نہیں تھی۔ میر کارواں نے انہیں کہا کہ کنیز بعلبک میں ہی کسی جگہ چھپی بیٹھی ہو' کیونکہ اگر میرے قافلے میں ہوتی تو وہ کہیں نہیں جا سکتی تھی۔

حبشی غلام اور گارڈ نا امید ہو کر واپس چلے گئے۔ شامی نے اطمینان کا سانس لیا' اور فوراً" کھوہ کے پاس جا کر تھائیس کو یہ خوشخبری سنائی' مگر اسے ابھی وہیں چھپے رہنے کی ہدایت کی۔ شام کو جب قافلہ ایک بار پھر کوچ کرنے لگا تو شامی نے تھائیس کو کھوہ میں سے نکال لیا۔ سرشام قافلہ دمشق کی طرف کوچ کر گیا۔

تھائیس ابھی تک مردانہ لباس میں سفر کر رہی تھی' اور شامی نے اسے بھرپور تحفظ دے رکھا تھا۔ رات کے وقت تھائیس نہ دیکھ سکی تھی' لیکن ایک پراسرار اور نیا آدمی قافلے میں شامل ہوگیا تھا۔ یہ سیاہ فام سوداگر کا خاص جاسوس تھا' جسے گارڈ کے سپاہیوں نے قافلے میں کنیز تھائیس کی ٹوہ لگانے کے لیے ساتھ کر دیا تھا۔ دن نکلا تو تھائیس نے اس آدمی کو پہچان لیا تھا۔ تھائیس نے اسے سیاہ فام سوداگر کے محل میں صرف ایک بار مالک کے کمرہ خاص کی طرف جاتے دیکھا تھا' وہ گھبرا کر شامی کے پاس آگئی اور اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ شامی نے بھی چلتے پھرتے اس پراسرار جاسوس کو دیکھا' اور کہا' یہ بالکل نیا مسافر ہے۔ پہلے یہ ہمارے قافلے میں شامل نہیں تھا۔ یہ سب کچھ ضرور میر کارواں کی ملی بھگت سے ہوا ہے' جو سیاہ فام سوداگر کا دوست ہے' لیکن تم فکر نہ کرو' ہم اس سے ہوشیار رہیں گے۔

ابھی دمشق بہت دور تھا' جو تھائیس کا وطن تھا' اور جہاں پہنچنے کے بعد اسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ قافلہ سفر کرتا رہا' آدھا سفر طے ہوا تو قافلہ سوسہ نام کے ایک بارونق شہر کی کارواں سرائے میں اتر گیا۔ شامی اور تھائیس شہر کی سیر کو نکل گئے۔ شہر میں مصری' بابلی' شوری اور دراوڑی قوم کے لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ شامی اور تھائیس ایک تنور کے پاس بچھے ہوئے قالین پر بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے کہ ایک دم سے تھائیس کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے دبی زبان میں شامی کو بتایا کہ پراسرار جاسوس ان کی طرف آ رہا ہے۔ شامی نے گردن کھجانے کے بہانے پیچھے کی جانب دیکھا پراسرار آدمی کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا اور خادم سے کھانا لانے کو کہا۔

تھائیس نے جلدی جلدی دو چار نوالے لیے اور شامی کو لے کر وہاں سے چل دی۔ "شامی! اس شخص سے کیسے پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے۔ اس نے ضرور مجھے پہچان لیا ہے' اور اب یہ مجھے اغوا کرنے کی کوشش کرے گا یا میر کارواں سے کہہ کر مجھے گرفتار کر لے گا۔"

شامی بولا' "اگر یہ ایسا کر سکتا تو اب تک کر چکا ہوتا۔ میر کارواں دوسرے مسافروں کے ہوتے ہوئے یہ دھاندلی نہیں کر سکتا۔" اسی طرح سے قافلے کی بدنامی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں اغوا کرنے کی ضرور کوشش کرے گا' لیکن ہم محتاط رہیں گے' تم بالکل نہ گھبراؤ۔ جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں تمہیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ تھائیس کو حوصلہ ضرور ہوا' مگر اندر سے وہ بے حد گھبرا رہی تھی' اسے عاطون کا خیال آ رہا تھا جس کی غیر معمولی طاقت کے سامنے بڑی بڑی طاقت والا دشمن بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ کارواں سرائے کی طرف جانے کی بجائے شامی' تھائیس کو لے کر شہر کے پرانے قبرستان میں آگیا۔ یہاں قدیم بادشاہوں اور شاہی خاندانوں کے افراد کی قبریں بنی تھیں' جن کے کتبوں اور چبوتروں پر بڑی اعلیٰ نقش گری کی گئی تھی۔ تھائیس نے کئی بار مڑ کر دیکھا۔ پراسرار جاسوس برابر اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ تھائیس کو ایک نئی پریشانی لگ گئی تھی۔ اس نے شامی کو واپس کارواں سرائے کی طرف چلنے کو کہا۔

کارواں سرائے میں آکر تھائیس نے اپنے آپ کو کوٹھری میں بند کر لیا۔ شامی نے باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا' وہ پراسرار جاسوس وہاں نہیں تھا' وہ ادھر ادھر ہوگیا تھا۔ رات کو تھائیس قالین پر لیٹ گئی' شامی اس کے سامنے والی دیوار کے ساتھ بچھے قالین پر لیٹا تھا' اچانک تھائیس ڈر کر بولی۔ شامی بھائی! میں نے باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنی ہے۔" شامی نے اٹھ کر جلدی سے کوٹھری کی کھڑکی کھول دی۔ باہر دیکھا' ہزاروں برس پہلے کے آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ شامی نے کھڑکی بند کر دی اور تھائیس کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ باہر کوئی نہیں۔ یہ محض اس کا وہم تھا' مگر تھائیس حوصلہ ہار بیٹھی تھی' اس کے دل کو یقین ہوگیا تھا کہ ابھی اس کا وطن دمشق کافی دور ہے اور اگر وہ اس قافلے کے ساتھ سفر کرتی رہی تو پراسرار جاسوس اسے ضرور ہلاک کر دے گا۔ اس نے شامی کے قریب ہو کر التجا کی "میرے دوست" اگر تمہیں مجھ سے ذرا بھی ہمدردی ہے تو مجھے آج رات ہی یہاں سے نکال کر لے چلو۔ شامی نے تعجب سے تھائیس کو دیکھا اور بولا' "ہم اکیلے اس لق و دق صحرا میں کیسے سفر کریں گے؟ کہاں جائیں گے؟" تھائیس نے کہا۔

"مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس شہر میں سوسہ سے مشرق کی جانب صحرا میں ایک آسان راستہ سنگلاخ پہاڑیوں میں دمشق کی طرف جاتا ہے۔ ہم اس راستے پر سفر کرتے ہوئے ایک رات اور ایک دن میں دمشق پہنچ جائیں گے۔"

شامی ان خطرناک صحراؤں میں اکیلا سفر کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا' مگر تھائیس نے اسے مجبور کر دیا' وہ کوٹھری سے باہر نکل کر کارواں سرائے کے صحن میں آگیا۔

یہاں اس کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے گھوڑوں پر پانی کی چھاگلیں اور تھوڑا بہت کھانے کا سامان لادا اور پھر چپکے چپکے تھائیس کے ساتھ اندھیرے میں کارواں سرائے سے نکل کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور سنسان رات میں سوسہ شہر سے روانہ ہوگئے۔ ستاروں سے راہنمائی حاصل کرتے ہوئے یہ دونوں مسافر رات بھر سنگلاخ وادیوں میں سفر کرتے رہے۔ صبح کو وہ ایک ایسے صحرا میں پہنچے' جہاں قدم قدم پر گہرے کھڈ تھے۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ اپنا خطرناک سفر شروع کر دیا' شامی کو ہر دم یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں وہ راستے سے بھٹک نہ جائیں' مگر تھائیس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ شام ہو رہی تھی کہ انہیں دور سے دمشق شہر کی فصیل کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ تھائیس کی خوشی کا تو ٹھکانہ نہ تھا۔ اس نے اپنے وطن کی روشنیوں کو پہچان لیا تھا۔

آخر وہ دمشق پہنچ گئے۔ تھائیس' شامی کو اپنے ماں باپ کی حویلی میں لے گئی۔ اس کی والدہ فوت ہو چکی تھی۔ بوڑھا باپ اپنی بیٹی کو زندہ دیکھ کر خوشی سے نہال ہوگیا۔ شامی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے تھائیس کو بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیا' کچھ روز تھائیس کے ہاں قیام کرنے کے بعد شامی وہاں سے اپنے کاروبار کے سلسلے میں بغداد کی طرف روانہ ہوگیا۔

تھائیس نے ماں باپ کے گھر واپس پہنچ کر اپنی پرسکون اور مسرور زندگی شروع کر دی تھی۔ معمول کے مطابق وہ صبح چشمے پر جا کر پانی بھر کر لاتی۔ بکریوں کا دودھ دوہتی اور انہیں چرانے کے لیے دوپہر کو چراگاہ کی طرف نکل جاتی۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ محفوظ ہے اور پراسرار جاسوس سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر چکی ہے' مگر ایسا نہیں تھا۔ سیاہ فام سوداگر کا پراسرار جاسوس اس کا پیچھا کرتا دمشق میں پہنچ چکا تھا اور اس نے تھائیس کے گھر کو بھی دیکھ لیا تھا۔ دمشق میں اس نے ایک طبیب سے ملاقات کی اور اسے سونے کے سکے دے کر بے ہوش کرنے والا محلول خرید کر بوتل میں بھر لیا۔ اس نے ایک برق رفتار سانڈنی بھی خرید لی تھی۔ منصوبے کے مطابق وہ ایک روز دوپہر کے بعد چراگاہ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

معمول کے مطابق تھائیس بکریوں کا ریوڑ لے کر چراگاہ میں آگئی۔ بکریوں کو چرنے کے لیے کھلا چھوڑ کر تھائیس خود ایک چشمے کے پاس بیٹھ کر عاطون کے بارے میں سوچنے لگی کہ اس کا دوست عاطون اس وقت کہاں ہوگا۔ اتنے میں اسے اپنے عقب میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ہی تھا کہ پراسرار جاسوس نے اسے وہیں دبوچ کر زمین پر گرا لیا اور محلول میں بھیگا ہوا رومال اس کی ناک کے ساتھ چپکا دیا۔ تھائیس نے

پوری طاقت سے ہاتھ پاؤں چلائے' لیکن دوسرے لمحے وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ پراسرار جاسوس نے تھائیس کو اٹھا کر سانڈنی کے کجاوے میں ڈالا' خود بھی سانڈنی پر سوار ہوا اور اس کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی۔ سانڈنی تیز رفتاری کے ساتھ دمشق شہر کے جنوب کی طرف روانہ ہو گئی۔

پراسرار جاسوس میں برق رفتار سانڈنی پر مہینوں کا سفر دنوں میں طے کرتا نیم جان تھائیس کو لیے .علبک اپنے سیاہ فام سوداگر کی حویلی میں پہنچ گیا۔

سیاہ فام سوداگر نے تھائیس کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر حویلی کے تہ خانے میں بند کر دیا۔ ایک کنیز اسے روزانہ صبح شام آکر کھانا دے جاتی تھی۔ اس کی زبانی تھائیس کو معلوم ہوا کہ ظالم سیاہ فام سوداگر نے شفالہ کو ہلاک کروا دیا تھا۔ تھائیس کو اس نیک دل خاتون کی موت کا بہت صدمہ ہوا' وہ خود اپنے صدمے سے نڈھال تھی۔ چند روز کی قید تنہائی کے بعد سیاہ فام سوداگر نے تھائیس کو تہ خانے سے نکال کر اسے شاندار پوشاک لا کر دی اور کنیزیں' تھائیس کو دلہن بنانے لگیں۔ تھائیس کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ اس ظالم شخص کے چنگل سے اب نہیں بچ سکتی' چنانچہ اس نے اپنے آپ کو قسمت کے حوالے کر دیا۔ اسی روز سیاہ فام سوداگر سے اس کی شادی ہوگئی۔

جب لاوے کی موٹی تہیں جم کر سخت اور ٹھنڈی ہوگئیں تو عاطون ٹیکری سے اترا اور لاوے کی سخت سطح پر چلتا اس موت کی وادی سے نکل کر شمال کی جانب چل پڑا۔ ایک دن اور ایک رات کے سفر کے بعد وہ ایسی سرزمین میں پہنچ گیا' جہاں ہری بھری چراگاہوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ان چراگاہوں میں کہیں کہیں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ چر رہے تھے۔ ان چراگاہوں کے بعد دور پہاڑیوں کے دامن میں عاطون کو ایک شہر کی فصیل نظر آئی۔ عاطون نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک طویل اور تکلیف دہ سفر کے بعد وہ ایک شہر میں داخل ہو رہا ہے۔

اس شہر کے لوگ صحت مند اور زرد رنگ کے تھے اور ان کی آنکھیں چھوٹی تھیں' وہ لمبے اونی لباس میں ملبوس تھے' کیونکہ یہاں سردی تھی۔ عاطون کا لباس پھٹ چکا تھا اور اس کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی' وہ شہر کے بارونق بازاروں میں گھوم رہا تھا کہ ایک شخص لنگڑاتا ہوا اس کے پاس عجیب سی زبان میں بولا۔ "سرائے میں چلنا ہے تو میرے ساتھ چلو۔"

عاطون میں چونکہ اتنی غیر معمولی صلاحیت موجود تھی کہ وہ کسی بھی ملک اور کسی بھی قبیلے کی زبان سمجھ سکتا تھا' اس لیے اسے دقت نہ ہوئی۔ شرط صرف اتنی تھی کہ پہلے

اس کے کان میں اجنبی زبان کے الفاظ پڑنے ضروری تھے۔ عاطون نے کہا' "میں اس شہر میں مسافر ہوں۔ میرے پاس سرائے کا کرایہ ادا کرنے کی رقم نہیں ہے۔"

لنگڑے آدمی نے کہا' "اس کی ضرورت نہیں پڑے گی' تم ہمارے مہمان ہو' میرے ساتھ آؤ۔"

یہ آدمی عاطون کو لے کر شہر کے گنجان علاقے میں آگیا' جہاں تنگ و تاریک گلیاں تھیں اور مکان ڈبوں کی طرح ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ ایک گلی کا موڑ گھومنے کے بعد لنگڑا آدمی عاطون کو ایک بوسیدہ مکان کی اندھیری ڈیوڑھی میں لے آیا۔ آگے مکان کا صحن تھا' جس کی ایک دیوار پر سیاہ انگور کی بیل چڑھی تھی۔ عاطون نے اس شخص سے پوچھا کہ یہ کیسی سرائے ہے کہ یہاں کوئی دوسرا مسافر نظر نہیں آتا۔ لنگڑے آدمی نے عاطون کا ہاتھ دبا کر کہا' "تمہیں یہاں ہر قسم کا آرام ملے گا۔"

یہ شخص عاطون کو ایک بیٹھک میں لے آیا۔ جہاں قالین کا فرش بچھا تھا اور ایک طرف پلنگ لگا تھا۔ "تم یہاں آرام کرو میں تمہارے لیے کھانا اور کپڑے لے کر آتا ہوں۔" وہ آدمی چلا گیا' تو عاطون نے سجی سجائی بیٹھک کا جائزہ لیا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ کوئی سرائے نہیں ہے' بلکہ کسی متمول سوداگر کا مکان ہے۔ عاطون کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ پراسرار لنگڑا اسے اس جگہ کس غرض سے لایا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک طشت تھا اور کاندھے پر شاندار پوشاک تھی۔ عاطون نے غسل کیا' نئی پوشاک پہن کر کھانا کھایا اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ اب اسے یہاں سے کس طرف کوچ کرنا چاہیے۔ اسے بڑی شدت سے اپنے پرانے دوستوں یعنی دیوی مایا اور پدم ناگ کا انتظار تھا' جو ابھی تک اسے نہیں ملے تھے۔

اتنے میں دروازے کا پردہ ہٹا اور ایک سیاہ داڑھی والا اونچا لمبا آدمی داخل ہوا۔ اس نے سیاہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی' اس نے آگے بڑھ کر عاطون سے مصافحہ کیا اور بتایا کہ میرا نام سیاہ پوش ہے۔ میری عادت ہے کہ شہر میں کوئی بھی مسافر داخل ہو' میرا نوکر اسے میرے پاس لے آتا ہے تاکہ میں کچھ روز اس کی خدمت کر سکوں۔ عاطون نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ جڑی بوٹیوں کا تاجر ہے' وہ جس قافلے کے ساتھ سفر کر رہا تھا' اسے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر اس شہر میں پہنچا ہے۔ سیاہ پوش بولا۔ "آپ کو یہاں کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہیں ہوگی۔" یہ کہہ کر سیاہ پوش چلا گیا۔

رات کو سیاہ پوش نے عاطون کے ساتھ ایک ہی دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا'

کھانے کے بعد لنگڑا ملازم قہوہ لے آیا۔ قہوے کے پہلا گھونٹ پیتے ہی عاطون نے صاف محسوس کیا کہ اس میں ایک ایسی بوٹی کا ست ملایا گیا ہے جو آدمی پر بے ہوشی طاری کر دیتی ہے۔ عاطون سمجھ گیا کہ سیاہ پوش میزبان اسے بے ہوش کرنا چاہتا ہے' لیکن عاطون اب یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ اسے کس مقصد کے تحت بے ہوش کر رہا ہے۔ عاطون بے ہوش نہیں ہو سکتا تھا' مگر اس نے جان بوجھ کر اپنے آپ غنودگی سی طاری کر لی اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ بے ہوش ہو رہا ہے' پھر وہ اپنے آپ کو بے ہوش ظاہر کرتے ہوئے پلنگ پر گر گیا۔

عاطون کی آنکھیں بند تھیں' مگر کان کھلے تھے اور وہ پوری طرح ہوش میں تھا۔ اس نے سیاہ پوش کی آواز سنی' وہ لنگڑے ملازم سے کہہ رہا تھا۔ "مسافر بے ہوش ہو چکا ہے' اسے اٹھا کر سانپوں کی کوٹھری میں ڈال آؤ۔ میرے آدم خور سانپوں کو سخت بھوک لگ رہی ہوگی۔ اس دفعہ انہیں پندرہ روز انسانی گوشت کا انتظار کرنا پڑا ہے۔"

لنگڑے ملازم نے عاطون کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا اور بیٹھک سے نکل کر ڈیوڑھی کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ عاطون خاموش پڑا رہا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا' سیڑھیاں تاریک تھیں۔ نیچے روشنی نظر آئی۔ یہ آدم خور سانپوں کی کوٹھری کے باہر جلتی مشعل کی روشنی تھی۔ لنگڑے ملازم نے بند کوٹھری کی اوپر والی کھڑکی کھولی اور عاطون کو کوٹھری کے اندر پھینک دیا۔ عاطون سخت فرش پر گرا اسے گرتے ہی سانپوں کی پھنکاریں سنائی دیں۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اوپر کھڑکی بند ہو گئی تھی۔ اندھیرے میں عاطون کو سانپوں کی سرخ نگینوں جیسی چمکتی' دہکتی آنکھیں نظر آئیں۔ دو سانپوں نے اس پر حملہ کر دیا اور اپنے پھن اس کی ران پر مارے کہ اس کا گوشت توڑ کر کھائیں' مگر عاطون نے اپنے جسم کو گرنے کے ساتھ ہی پتھر کر لیا تھا۔ سانپوں کے منہ عاطون کی پتھر کی طرح سخت ران سے ٹکرائے تو ان کے دانت ٹوٹ گئے۔ سانپ بوکھلا کر پیچھے ہٹ گئے۔ اب دوسرے سانپوں نے عاطون پر حملہ کر دیا۔ عاطون نے ایک کالے سانپ کو گردن سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔ باقی سانپوں نے عاطون کے سخت جسم پر منہ مارے تو اپنے دانت تڑوا کر پیچھے ہٹ گئے عاطون کے ہاتھ میں جو سانپ تھا' اس نے اس کی کلائی کے گرد اپنی گرفت مضبوط تر کر دی تھی' مگر عاطون پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ سانپ نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ یہ کلائی کسی عام انسان کی کلائی نہیں ہے۔ کالے سانپ نے اپنی گردن پر عاطون کی گرفت کو سخت ہوتے دیکھا تو ایک زبردست پھنکار ماری۔

عاطون ایک دم سے چونک پڑا۔ اس کالے سانپ نے سانپوں کی زبان میں اپنے ساتھی سانپوں سے چلا کر کہا تھا کہ وہ انسان کو ڈس کر ہلاک کیوں نہیں کرتے؟ عاطون چونکہ

اپنی غیر معمولی صلاحیت کی وجہ چرند پرند اور انسانوں کی تمام بولیاں سمجھ لیتا تھا' اس لیے سانپ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر سمجھ گیا کہ یہ سانپ ان سانپوں کا سردار ہے۔ اس نے بھی سانپ کی طرح منہ سے سسکاری کی آواز نکالی اور سانپوں کی ہی زبان میں کہا۔

"میرے دوست! تمہارے سانپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ان سب کے دانت ٹوٹ چکے ہیں۔"

اب اس کالے سانپ کے حیران ہونے کی باری تھی۔ عاطون کی زبان سے اپنی بولی سن کر سب کے سب ششدر ہو کر رہ گئے' وہ پرے پرے ہٹ گئے۔ عاطون نے سیاہ سانپ کو فرش پر رکھ دیا۔ سیاہ سانپ نے حیرت سے پوچھا' "تم کون ہو اور ہماری زبان کیسے بول لیتے ہو؟ دنیا کا کوئی انسان ہماری زبان نہیں بول سکتا۔"

عاطون نے کہا' "یہ ایک ایسا راز ہے' جو میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ ہاں چونکہ اب تم مجھ سے ہم کلام ہو تو مجھے یہ بتاؤ' کہ کیا تم نے کبھی پدم ناگ کا نام سنا ہے۔

پدم ناگ کا نام سنتے ہی سیاہ سانپ کا پھن تعظیم سے جھک گیا۔ اس نے کہا' "پدم ناگ ہمارے ناگ دیوتا کا نام ہے' وہ ہمارا دیوتا ہے۔ دنیا کے تمام سانپ اس کے تابع ہیں۔ تم ہمارے دیوتا سانپ کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

عاطون نے کہا' "اس لیے کہ پدم ناگ میرا دوست ہے' اور میں اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے اس کے پاس پہنچا سکتے ہو؟"

سیاہ سانپ اب بڑے ادب سے بات کر رہا تھا' وہ بولا' "عظیم انسان! کیا میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں۔ تمہیں اب اپنے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم پدم ناگ دیوتا کے دوست ہو' تو ظاہر ہے تم غیر معمولی اور دیوتا انسان ہو۔ مجھے صرف اپنا نام بتا دو تاکہ میں تمہیں اس نام سے پکار سکوں۔"

عاطون نے سیاہ سانپ کو اپنا نام بتایا تو سانپ بولا' "پدم ناگ یہاں سے شمال میں ہمالیہ کی چھت پر برفوں کی وادی تبت کی ایک گپھا میں گگن کے دیوتاؤں کی یاد میں محو ہے' مگر اس وادی تک جانے کا راستہ موت کا راستہ ہے' کہتے ہیں کہ وہاں آج تک کوئی انسان قدم نہیں رکھ سکا۔"

عاطون کو اس بات کی خوشی ہوئی کہ اسے اپنے دیرینہ دوست پدم ناگ کا سراغ مل گیا تھا۔ اس نے سیاہ سانپ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ پدم ناگ سے ملنے جائے گا' لیکن یہ بتاؤ کہ یہ سیاہ پوش کیا بلا ہے اور اس نے تم سانپوں کو آدم خور کیوں بنا دیا ہے۔

سیاہ سانپ بولا' یہ ایک خبیث شیطان ہے' اس نے کئی برسوں سے ہمیں یہاں پال

رکھا ہے۔ پہلے یہ ہمیں انسانی خون پلایا کرتا تھا۔ اس کے بعد اس نے ہمیں مردہ انسانوں
گوشت ڈالنا شروع کر دیا۔ جب ہمیں انسانی گوشت کھاتے ایک سال گزر گیا تو پھر یہ ہر
ہم میں سے ایک سانپ کو پکڑ کر اس کا زہر نکال لیتا ہے۔ ہمارے ایک بزرگ سانپ نے
ہمیں ایک دفعہ بتایا تھا کہ یہ سیاہ پوش خبیث اس زہر کا کشتہ تیار کر کے بادشاہوں کے ہاتھ
سونے کی ڈلیوں کے عوض فروخت کرتا ہے۔

عاطون نے کہا' "اچھا! اب تم ایسا کرو کہ یہاں سے چلے جانے کا منصوبہ بناؤ۔ تمہیں
آخری بار کھانے کو دو لاشیں ملیں گی۔ ان کو ہڑپ کرنے کے بعد پدم ناگ دیوتا کی قسم کھا
کر وعدہ کرو کہ تم پھر کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے اور یہاں سے جنگلوں' صحراؤں
کی طرف چلے جاؤ گے۔

سیاہ سانپ نے کہا' "میں اپنی ساتھی سانپوں کی طرف سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم
یہاں سے جانے کے بعد کبھی کسی انسان کو گزند نہیں پہنچائیں گے۔"

عاطون اپنا اطمینان کرنے کے بعد اٹھا۔ بند کھڑکی کو ذرا سا دھکا دیا تو وہ کھل گئی
عاطون اچھل کر کھڑکی میں سے باہر آگیا۔ پھر تاریک زینے میں سے ہوتا ہوا سیاہ پوش خبیث
کے مکان کے برآمدے میں آگیا۔ عاطون کی اپنی بیٹھک جہاں اس کا پلنگ بچھا تھا' خالی تھی
وہ دبے پاؤں چلتا برآمدے کی دوسری کوٹھری کے پاس گیا۔ کوٹھری میں دیا جل رہا تھا۔ عاطون
نے دستک دی۔ دروازہ کھلا تو سامنے سیاہ پوش خبیث موجود تھا' وہ تو عاطون کو زندہ دیکھ کر
ششدر رہ گیا۔ عاطون نے طنز بھری مسکراہٹ سے کہا' "سانپوں نے ایک پیغام بھیجا ہے
تمہارے نام' وہ تمہیں بلا رہے ہیں۔"

سیاہ پوش نے کمر میں سے چمکتا ہوا خنجر نکال کر عاطون پر حملہ کر دیا۔ عاطون کے
لیے اس حملے کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس نے سیاہ پوش کے پیٹ میں ایک لات ماری'
دہرا ہو کر فرش پر لڑھک گیا۔ عاطون نے پلنگ پر سے چادر اٹھا کر اس کی مشکیں کس دیں
اور اس سے لنگڑے خبیث کے بارے میں پوچھا' مگر سیاہ پوش کا درد سے برا حال ہو رہا تھا
اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ عاطون' سیاہ پوش کو گھسیٹتا ہوا برآمدے میں لے آیا
اچانک ایک طرف سے اس کے کاندھے پر تلوار کا بھرپور وار ہوا۔ تلوار اس کے سخت
کاندھے سے ٹکرا کر اچٹ گئی۔

عاطون نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے پیچھے لنگڑا ملازم ہاتھ میں تلوار لیے اسے
غضبناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ عاطون تھوڑا سا ہنسا۔ "لنگڑے شیطان! مجھے تمہارا ہی انتظار
تھا۔ چلو میرے پیارے! تمہارے لاڈلے سانپ تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ آؤ وہ تمہارا

ضیافت اڑانے کے لیے بے تاب ہو رہے ہیں۔"

لنگڑے ملازم نے ایک وحشیانہ چیخ کے ساتھ دوسرا وار کیا۔ تلوار اس بار عاطون کے
سر پر پڑی' مگر پڑتے ہی ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہوگئی۔ عاطون نے لنگڑے کے منہ پر اتنے زور
سے الٹا ہاتھ مارا کہ اس کا جبڑا ٹوٹ کر لٹکنے لگا۔ عاطون ان دونوں کو گھسیٹتا ہوا زینے کی طرف
لے گیا۔ پھر سیڑھیوں پر سے ان دنوں کو پاؤں کی ٹھوکر سے نیچے لڑھکا دیا۔ سانپوں والی
کوٹھری کے پاس آکر عاطون نے کھڑکی کھول دی اور منہ اندر ڈال کر تین بار سسکار نما
پھنکار کی آواز نکالی۔ اس نے سیاہ سانپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں وعدے سے
مطابق تمہاری آخری ضیافت لے آیا ہوں۔

یہ کہہ کر عاطون نے لنگڑے اور سیاہ پوش خبیث کو سانپوں کی کوٹھری میں پھینک
دیا۔ واپس سیاہ پوش کی کوٹھری میں آکر عاطون اس کے سامان کی تلاشی لینے لگا۔ ایک تھیلی
سونے کے سکوں سے بھری ہوئی تھی۔ عاطون کو سفر میں ان سکوں کی ضرورت تھی۔ اس
نے کچھ سکے کپڑے میں لپیٹ کر اپنی کمر سے باندھ لیے۔ مکان کے آنگن میں ایک طرف
اصطبل تھا' جس میں کچھ گھوڑے بندھے تھے۔ عاطون نے وہیں پڑی ہوئی زین اٹھا کر گھوڑے
پر ڈالی' اور گھوڑے کو قدم قدم چلاتا مکان کی ڈیوڑھی میں سے گزرتا گلی میں آیا' گلی میں ہر
طرف رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ عاطون گھوڑے پر بیٹھا اور شہر کی فصیل کی طرف روانہ
ہوگیا۔

اب عاطون کی منزل کوہ ہمالیہ کی قدیم برفوں بھری وادی تبت تھی' جس کی برف
پوش گھپا میں اس کا پرانا دوست اور ہمدرد پدم ناگ رہائش پذیر تھا۔ پدم ناگ اور دیوی مایا'
یہ وہ دو مخلص دوست تھے' جنہوں نے محض عاطون کی مدد کرنے کی خاطر گگن منڈل کے
دیوتاؤں کی ناراضگی قبول کر لی تھی' اور یوں وہ ایک غیر معینہ اور نامعلوم مدت تک کے لیے
گگن منڈل کے پوترا استھان سے دنیا کے مایا جال میں گر پڑے تھے' وہ ایک طرح سے اپنی
نافرمانی کا کفارہ ادا کر رہے تھے۔ نارو منی نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ وہ تینوں ایک نامعلوم
عرصے تک ایک دوسرے سے جدا رہیں گے اور پھر واقعات کے چکر میں گھومتے ہوئے ایک
بار پھر ایک دوسرے سے آن ملیں گے۔ اب وہ وقت آگیا تھا۔ عاطون کو خوشی تھی کہ دیوی
مایا نہ سہی' مگر پدم ناگ کا سراغ اسے ضرور مل گیا تھا' اور اب وہ اسے ملنے جا رہا تھا۔

کئی سنگلاخ پہاڑ' جنگل اور ویرانے عبور کرتا عاطون آخر ایک دن کوہ ہمالیہ کی برف
پوش وادی میں پہنچ گیا۔ تبت وہاں سے ایک دن کی مسافت پر تھا' یہاں سے اسے راہبوں کا
ایک قافلہ مل گیا' جو تبت کے معمر لاما کی موت کی آخری رسوم میں شرکت کے لیے جا رہا

تھا۔ یہاں عاطون کو معلوم ہوا کہ تبت کا بوڑھا لاما فوت ہو گیا ہے۔ اسے یہ بھی علم ہوا کہ لاما کو اس وقت تک سپرد خاک نہیں کیا جائے گا، جب تک کہ مقدس خانقاہ کے پجاریوں کو لاما کا ہم شکل نہیں مل جاتا، جو مرنے والے لاما کا دوسرا جنم ہوگا۔ عاطون نے کوئی دلچسپی نہ لی اور قافلے والے راہبوں کے ساتھ تبت کی طرف محو سفر ہو گیا۔

ابھی تبت آدھے دن کی مسافت پر تھا کہ برفانی پہاڑیوں کے اوپر ایک وادی میں تبت کی مقدس خانقاہ کے زرد سرنگوں جھنڈے ہوا میں لہراتے نظر آنے لگے۔ راہب مقدس اشلوک پڑھنے لگے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی ڈفلیاں تھیں جنہیں وہ آہستہ آہستہ بجا رہے تھے۔ یہ چھوٹا سا قافلہ تبت کی قدیم ترین اور پراسرار بستی کی طرف ایک برف پوش سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ اچانک سامنے سے گھڑ سواروں کا ایک دستہ نمودار ہوا۔ قافلے کے راہب ایک دم سڑک کے کنارے ہٹ کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔ عاطون بھی ان کے ساتھ ہی ایک طرف کھڑے ہو کر گھڑ سواروں کو دیکھنے لگا، جنہوں نے سرخ لباس پہن رکھے تھے، ان کے پیچھے پیچھے زرد لمبے چوغے میں ملبوس چھ ساتھ سرمنڈے لاما جا رہے تھے۔ ان کے عقب میں بھی گھڑ سوار تھے، جنہوں نے زرد رنگ کے جھنڈے اٹھا رکھے تھے۔ عاطون کے پوچھنے پر ایک راہب کہنے لگا۔ "یہ مقدس لاما کی خانقاہ کا بڑا راہب گنڈھپ ہے، وہ لاما کی موت کے بعد دوسرے جنم میں لاما کی تلاش میں نکلا ہے۔ یہ تبت کے سارے علاقوں میں گھوم کر مرنے والے لاما کا کھوج لگائے گا، انہیں معلوم ہے، لاما کی روح مرنے کے بعد کسی اپنے ہم شکل جسم میں داخل ہو گئی ہے۔

عاطون اس جنم جنم کے چکر سے پہلے ہی بیزار تھا، وہ ایک جگہ پتھر پر سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ راہب اعظم گنڈھپ کا ٹولہ جب عاطون کے قریب سے گزرا تو ایک دم سے جیسے ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ سب کے سب راہب وہیں پتھر بن کر رہ گئے، پھر ایک ساتھ عاطون کے سامنے آ کر مقدس اشلوکوں کا ورد کرتے ہوئے تعظیم میں جھک گئے۔ قافلے کے لوگ گھبرا کر ادھر ادھر ہو گئے۔ عاطون کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ راہب اعظم گنڈھپ نے ڈمرو بجا کر اعلان کیا۔

"مقدس لاما کی روح جاوداں ہے، ہمیں اپنا راہنما عظیم ترین مقدس لاما مل گیا ہے۔"

گھڑ سوار اپنے گھوڑوں سے اتر کر سجدے میں گر پڑے۔ سارے راہب بھی سربسجود ہو گئے۔ عاطون سمجھ گیا کہ وہ ایک بار پھر کسی کے ہم شکل ہونے کی مصیبت میں پھنس گیا ہے، لیکن اس بار چونکہ وہ خود تبت آیا تھا اور اسے اسی ملک کی برفانی وادیوں میں اپنے

دوست پدم ناگ کو تلاش کرنا تھا، اس لیے اس نے کوئی تعرض نہ کیا۔ اور اپنے آپ کو لاما ظاہر کرتے ہوئے ایک ہاتھ فضا میں بلند کیا اور تبت کی مقدس زبان ہی میں بولا۔

"میں اپنی رعایا کو بے یارومددگار نہیں چھوڑ سکتا۔ دیوتاؤں نے مجھے ایک بار پھر تمہاری خدمت اور اپنی عبادت کے لیے بھیجا ہے۔"

راہب اعظم گنڈھپ نے آگے بڑھ کر عاطون کے پاؤں کو بوسہ دیا اور ہاتھ باندھ کر کہا، "مقدس و عظیم لاما! ہم دیوتاؤں کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہم پر رحم فرماتے ہوئے بہت جلد ہمیں آپ کو بخش دیا۔ چلیے! اپنی عظیم خانقاہ میں تشریف لے چلیے اور اپنے ہاتھوں اپنے پہلے جنم کے جسد خاکی کو زمین کے سپرد کیجیے۔"

عاطون یہ سن کر کچھ پریشان سا ہو گیا کہ اس کی ایک لاش اوپر تبت کی خانقاہ میں تجہیز و تکفین کے لیے اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اس نے آہستہ سے سر ہلا کر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ فوراً ایک سفید گھوڑا عاطون کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ دو راہبوں نے عاطون لاما کو سہارا دے کر گھوڑے پر بٹھایا اور تبت کی مقدس خانقاہ کی طرف چل پڑے۔

تبت اس سے پہلے سوگ میں ڈوبا ہوا تھا، لیکن راہب اعظم گنڈھپ کے شہر میں داخل ہوتے ہی سنکھ پھونک کر عظیم لاما کی دوسرے جنم میں بازیافت کا اعلان ہو گیا اور شہر میں لوگ خوشی سے رقص کرنے لگے۔ مکانوں کے باہر ڈھول اور ڈفلیاں بجنے لگیں۔ مقدس خانقاہ کا جھنڈا دوبارہ اونچا کر دیا گیا۔ دس پجاریوں نے خانقاہ کے دالان میں کھڑے ہو کر ایک ساتھ دس سنکھ بجا کے لاما کی بازیافت کا سرکاری طور پر اعلان کر دیا، کیونکہ لاما تبت کا صرف مذہبی راہنما ہی نہیں تھا، بلکہ ان کا بادشاہ بھی تھا۔

لوگ نئے لاما یعنی عاطون کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھروں سے باہر نکل آئے۔ عاطون کو گھوڑا ان کے درمیان سے گزرا تو وہ تعظیم میں جھک گئے۔ راہب اعظم گنڈھپ نئے لاما کی سواری کو لیے مقدس خانقاہ کے عقب والے شاہی محل میں آ گیا۔ یہ لکڑی کا محل چوب کاری اور سادگی کا ایک عظیم الشان نمونہ تھا۔ جگہ جگہ قالینوں کے فرش بچھے تھے۔ اونچی محرابی کھڑکیوں پر مخملیں پردے گرنے تھے۔ ستونوں میں جواہرات اور قیمتی پتھر جڑے تھے۔ عاطون کو شاہی محل کے حجلہ خاص میں پہنچا دیا گیا۔ راہب اعظم اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ یہاں لاما کی دیو داسیوں کا ایک گروہ ہاتھوں میں مقدس لاما کی زرد پوشاک، عطر اور پھول لیے منتظر تھا۔ نئے لاما کو دیکھتے ہی دیو داسیوں نے اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔ سب نے دیکھا کہ نئے لاما کی شکل ہو بہو مرنے والے لاما سے ملتی تھی۔ دیو داسیوں نے اپنے مقدس لاما کو شاہی زرد لباس پہنایا، جس کے چغے اور لمبوتری زرد ٹوپی میں انتہائی بیش قیمت عقیق اور

یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ عاطون دیوداسیوں سے باتیں کرنے لگا‘ تو راہب اعظم نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی ادب سے سر جھکا دیا‘ پھر وہ حجلہ خاص سے باہر چلا گیا۔ عاطون نے ایک سیاہ چشم‘ سرخ و سپید دیوداسی سے پوچھا‘ کہ میرے پہلے جنم کی بیوی کہاں ہے؟ سیاہ چشم دیوداسی خوف سے پیچھے ہٹ گئی اور سینے پر ہاتھ رکھ کر گہرے سانس لینے لگی‘ جیسے اسے مقدس لاما سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ عاطون مسکرایا۔

”تمہارا نام کیا ہے دیوداسی؟“

دیوداسی کے سرخ ہونٹ خشک ہو رہے تھے‘ اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا‘ ”عمیکا!“

عاطون نے عمیکا کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا‘ ”ہم تمہیں اپنی خاص دیوداسی مقرر کرتے ہیں۔“

دوسری دیوداسیوں کے منہ سے مارے حیرت کے ہلکی ہلکی چیخیں سی نکل گئیں۔ عاطون نے بازو اٹھا کر کہا‘ ”خبردار! کسی کو ہمارے سامنے زبان کھولنے کی جرات نہ ہو‘ اب تم چلی جاؤ‘ عمیکا! تم بھی جاؤ۔“

ساری دیوداسیاں بار بار سر جھکاتی‘ کورنش بجا لاتیں پیچھے ہٹیں حجلہ خاص سے نکل گئیں۔ ان کے جاتے ہی راہب اعظم گنڈھپ ہاتھ میں سونے کا مقدس عصا تھامے اندر آیا۔ ادب سے کورنش بجا لایا اور بولا۔ ”مقدس لاما اعظم! اپنی آخری رسوم کے لیے تشریف لے چلئے۔ دربار اور خانقاہ کے امراؤ بچاری‘ حضور کے چشم براہ ہیں۔“

عاطون اپنے لمبے اونی فرغل کو سنبھالتا اور اپنی چال میں وقار پیدا کرتا راہب اعظم کے آگے آگے چلنے لگا۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ مقدس لاماتبت کے دیس کی سب سے بڑی اور برگزیدہ ہستی سمجھی جاتی ہے‘ وہ اس ملک کی رعایا کا بادشاہ بھی ہے اور دینی راہنما اور دیوتا بھی۔ شاہی محل تین منزلہ تھا اور اس کا عقبی حصہ ایک خانقاہ یا مندر تھا‘ جہاں عجیب شکل والے کسی دیوتا کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ راہب اعظم جب عاطون لاما کو لے کر اس مندر میں پہنچا تو وہاں دورویہ تعظیم میں کھڑے راہبوں‘ بچاروں‘ امراء اور دینی راہنماؤں نے عاطون کی راہ میں پھول برسائے اور شہنائیاں گونج اٹھیں ایک معمر راہب ڈفلی بجاتا‘ اشلوگ گنگناتا آگے چل رہا تھا۔ مورتی کے سامنے چبوترے پر ایک تابوت رکھا تھا۔ اس کے سرہانے دو زرد پوش کھلے بالوں والی سیم تن دیوداسیاں ہاتھوں میں طشت لیے ادب سے کھڑی تھیں۔ ان طشتوں میں اگر بتیاں اور عود و عنبر سلگ رہے تھے۔ تابوت میں کفن پوش لاما

کی لاش پر سفید پھولوں کا ڈھیر لگا تھا۔ صرف اس کا سر نظر آ رہا تھا۔

عاطون تمام مذہبی رسومات راہب اعظم گنڈھپ کی زیر ہدایت ادا کر رہا تھا۔ جب وہ مردہ لاما کے تابوت کے سرہانے کی طرف آیا تو عاطون نے ایک نظر لاما کے چہرے پر ڈالی اور وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ تابوت میں گویا عاطون مردہ حالت میں پڑا تھا‘ اس کی شکل لاما سے بے پناہ مشابہت رکھتی تھی‘ چونکہ اس سے پہلے عاطون کے ساتھ کئی بار ایسا ہو چکا تھا کہ اس کی شکل ہوبہو کسی دوسرے انسان کی نقل ہو‘ اس لیے اس کی حیرانی زیادہ دیر تک قائم نہ رہی‘ وہ خاش تھا کہ ایک ایسے دیس کا وہ سب سے اعلیٰ فرد بن گیا ہے‘ جس کی کسی برف پوش وادی میں اس کا دیرینہ رفیق پدم ناگ رہائش پذیر تھا۔ ابھی اس بات کا احساس نہ تھا کہ وہ یہاں کس قسم کے چکر میں پھنسنے والا ہے۔

عاطون نے دیکھا کہ مورتی کی آنکھوں میں دو انتہائی قیمت سرخ عقیق چمک رہے ہیں اور اس کے پیچھے سورج کی طرح کا سونے کا جو تھال لگا تھا‘ وہ قیمتی جواہرات اور یاقوتوں سے مزین تھا۔ مورتی بھی سونے کی تھی۔ جب تمام ضروری رسوم ادا کر دی گئیں تو مردہ لاما کی لاش کو مندر کے صحن میں لا کر رکھ دیا گیا۔ ساری فضا اشلوکوں اور دف کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ لاما کی لاش پر صندل‘ زعفران اور طرح طرح کے عطریات انڈھیلے گئے۔ پھر راہب اعظم نے طوفان کے ہاتھ میں چندن کی چھڑی روشن کر کے دی اور کورنش بجا لاتے ہوئے کہا‘ ”مقدس لاما اعظم! اپنے پہلے جنم کے جسم کے گرد سات پھیرے مکمل کیجئے!“

عاطون نے ایسا ہی کیا۔ چبوترے پر لاش کے پاس ہی ایک قبر کھدی ہوئی تھی۔ دیوداسیوں نے بھجن گاتے ہوئے قبر میں سینکڑوں بوتلیں عطریات کی انڈھیل دیں۔ اب باری باری تمام راہب بچاری اور امراء مرنے والے لاما کے آخر درشن کرنے لگے۔ سب سے آخر میں عاطون آگے بڑھا۔ رسم کے مطابق اسے جھک کر مردہ لاما کی پیشانی پر بوسہ دینا تھا۔ عاطون نے جھک کر لاما کی سرد پیشانی پر بادل نخواستہ بوسہ دیا‘ جب وہ اوپر کو اٹھا تو اس کے جسم میں دہشت کی سرد لہر دوڑ گئی۔

مردہ لاما نے اچانک آنکھیں کھول دی تھیں اور اسے سرگوشی میں کہا تھا۔ ”میں پھر آؤں گا۔“ پہلے تو عاطون نے سمجھا کہ یہ محض اس کا وہم تھا۔ بھلا مردہ کیسے زندہ ہو سکتا ہے‘ لیکن جب لاما کی لاش قبر میں رکھ دی گئی اور عاطون نے قبر میں جھک کر آخری بار پھولوں کی مالا لاش کے اوپر ڈالی تو مردہ لاما نے ایک بار پھر آنکھیں ذرا سی کھول کر ایک لمحے کے لیے عاطون کو دیکھا‘ اور فوراً ہی آنکھیں بند کر لیں۔ عاطون جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

ڈفلیوں‘ دفوں اور شہنائیوں کی گونج میں مردہ لاما کو سپرد خاک کر دیا گیا اور دیگر

مقدس رسومات کی ادائیگی میں شام ہوگئی۔

اب عاطون کو اس کی خواب گاہ میں لایا گیا۔ یہ کمرہ انتہائی سادگی اور نفاست سے سجایا گیا تھا۔ دروازے اور کھڑکیوں پر زرد مخملیں پردے پڑے تھے۔ آبنوسی پلنگ میں ہیرے جواہرات جڑے تھے۔ اطلسی بستر پر زرد کمخواب کے تکیے لگے تھے۔ خواب گاہ میں دو چاندی کے شمع دان روشن تھے اور فضا میں قسم قسم کی عنبریں خوشبوئیں گردش کر رہی تھیں۔ عاطون پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ راہب اعظم گنڈھپ نے تین بار تالی بجائی۔ دروازے کا پردہ ہٹا اور حسین دیو داسیوں کا ایک گروہ سر جھکائے خواب گاہ میں داخل ہوا' کسی کے ہاتھوں میں زرد گیندے کے پھول تھے۔ کوئی چاندی کی کٹوری میں چندن لیے ہوئے تھی۔ کس نے چاندی کی سلفچی تھام رکھی تھی۔ ایک چاندی کی صراحی تھامے ہوئے تھی۔ ان میں عمبکا دیوداسی نہیں تھی۔ ایک دیوداسی نے شب خوابی کا زرد ریشمی لباس ہاتھوں پر پھیلا رکھا تھا۔ عاطون کے پاؤں صندل ملے خوشبو دار نیم گرم پانی سے دھوئے گئے۔ دیوداسیوں نے پھول اس کے سرہانے کی تپائی پر رکھ کر بخور سلگادیئے۔ عاطون خاموشی سے معمول بنا بیٹھا تھا اور سب کچھ دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک شوخ چشم دیوداسی سے پوچھا' "عمبکا کہاں ہے؟ وہ نظر نہیں آ رہی؟"

شوخ چشم دیوداسی نے نچلا ہونٹ رازداری سے دانتوں تلے داب لیا اور سرگوشی میں تنبیہی انداز میں کہا' "مقدس اعظم! اسے راہب اعظم گنڈھپ نے روک لیا تھا۔

عاطون سمجھ گیا کہ عمبکا دیوداسی کا عاطون کے قریب جانا راہب اعظم گنڈھپ کو پسند نہیں ہو سکتا ہے' وہ خود اس پر فریفتہ ہو۔ اس نے کوئی خاص دلچسپی کا اظہار نہ کیا اور بڑے سکون سے بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے لیٹتے ہی دیوداسیاں سر جھکائے ایک ایک کر کے خواب گاہ سے الٹے پاؤں باہر نکل گئیں۔ عاطون کو محسوس ہوا کہ اسے دوپہر سے لے کر اب تک کھانے کو کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے کے پردے کے عقب سے آواز آئی۔

"مقدس لاما اعظم! پجاری درشن کو حاضر ہوا ہے۔"

یہ راہب اعظم گنڈھپ کی آواز تھی۔ عاطون نے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ راہب اعظم گنڈھپ پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا' جھک کر تعظیم کی اور آہستہ آہستہ چلتا عاطون کے پلنگ کی پائنتی کی جانب آ کر کھڑا ہوگیا۔ عاطون نے اس کی طرف نگاہیں اٹھائیں تو راہب اعظم بولا' "مقدس روح! آپ کو شام کی خوارک پیش کی جاتی ہے۔"

راہب اعظم نے آہستہ سے تالی بجائی۔ ایک دیوداسی ہاتھوں میں چاندی کا ڈھکا ہوا

کٹورہ لیے اندر آ گئی۔ کٹورہ عاطون کو پیش کیا گیا۔ اس میں ہلکے سبز رنگ کا کوئی مشروب تھا۔ راہب اعظم نے کہا' "مقدس روح! آپ اپنے پہلے جنم میں بھی یہ مشروب نوش جان کرتے رہے ہیں۔ آپ کو علم ہوگا کہ یہ مشروب دن میں تین بار آپ کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس مشروب میں اتنی طاقت ہے کہ آپ کو دنیا کے کسی بھی کھانے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ مقدس لاماؤں کی صدیوں سے یہی خوراک رہی ہے۔"

عاطون پہلے ہی کھانے پینے سے بے نیاز تھا۔ اس نے مشروب پی لیا۔ اس کا ذائقہ کسی حد تک تلخ تھا۔ دیوداسی الٹے پاؤں چلی گئی تو راہب اعظم بولا' "مقدس لاما اعظم! کل آپ کی خدمت میں آپ کی شریک حیات پیش کی جائے گی' جس کو راہبوں کی مقدس جماعت نے متفقہ طور پر آپ کے لیے چنا ہے۔ اس عورت کا بیاہ کسی پچھلے جنم میں آپ سے ہوا تھا۔ ہماری مقدس کتاب میں آپ کی جس بیوی کا ذکر کیا گیا ہے اس کی ساری نشانیاں اس عورت میں موجود ہیں حضور!"

عاطون نے یونہی دل لگی کے طور پر پوچھ لیا کہ یہ عورت کون ہے؟ راہب اعظم بولا' "ہمارے پیشوائے اعظم! اس عورت کا نام رتنالی ہے' اور وہ ہمالیہ کی بیٹی ہے۔ اسے راہبوں نے مقدس ہمالیہ کی برفانی گود میں پڑے پایا تھا' وہ گیندے کے پھول سے زیادہ حسین اور خوشبودار ہے۔"

راہب اعظم ادب سے گویا ہوا' "لاما اعظم! پچھلے جنم کی یادیں آپ کے اعلیٰ ترین ذہن میں کچھ دھندلی پڑ گئی ہیں۔ عظیم پیشوا! آپ شاید بھول گئے ہیں کہ مقدس لاما کی بیوی تو ہوتی ہے' مگر اسے اولاد پیدا کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ صدیوں سے دیوتاؤں کا یہی حکم چلا آ رہا ہے' کیونکہ موت کے بعد مقدس لاما کو دوسرے جنم میں خود ہی شاہی محل میں واپس آنا ہوتا ہے۔

عاطون کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ اس کے استفسار پر راہب گنڈھپ نے کہا' "مقدس کتاب میں لکھا ہے کہ لاما اعظم کو وقت کے ساتھ ساتھ اپنے پچھلے جنم کی ساری باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ آپ کو بھی خودبخود اس راز کا علم ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر راہب گنڈھپ کورنش بجا لا کر خواب گاہ سے رخصت ہوا۔ اس کے جانے کے بعد عاطون نے اس قسم کی تمام فضول باتوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور پدم ناگ کے بارے میں سوچنے لگا' مشکل یہ آن پڑی تھی کہ وہ تبت کی سب سے اعلیٰ ترین شخصیت بن بیٹھا تھا اور اسے وہاں کے سربراہ اعظم کی حیثیت حاصل تھی اور یوں وہ ہمالیہ کی طرف پوش وادیوں کی آوارہ گردی نہیں کر سکتا تھا کہ پدم ناگ کی گپھا کو تلاش کر سکے' اگر

وہ برفانی وادی کی سیرو سیاحت کو جاتا ہے' تو راہبوں کا ایک گروہ اس کے ساتھ ہوگا۔ اس کے لیے بس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ بھیس بدل کر رات کے وقت محل سے نکل کر برف پوش وادی میں پدم ناگ کی گپھاہ کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔

عاطون کی خواب گاہ میں ایک قدم ریت گھڑی تپائی پر شمع دان کے پاس ہی رکھی تھی۔ اس میں سے ریزہ ریزہ ریت کی ایک باریک دھار نیچے گر رہی تھی۔ جب آدھی رات ہوئی تو کھٹکا سا ہوا۔ خواب گاہ کے آتش دان میں آگ جل رہی تھی' جس کی وجہ سے فضا نیم گرم تھی' حالانکہ باہر چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ عاطون بستر پر ریشمی کمبل گردن تک کیے لیٹا تھا۔ کھٹکے کی آواز پر اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ شمع کی لو دھیمی تھی۔ خواب گاہ میں دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ عاطون خاموشی سے لیٹا رہا' وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ کھٹکا کس شے کا تھا' پھر اس نے دیکھا کہ پلنگ کے بالکل سامنے والی لکڑی کی دیوار کا ایک تختہ اپنی جگہ سے کھسک گیا اور دو زرد پوش انسان اندر داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں لکڑی کی گول صندوقچی تھی۔ خواب گاہ کے خفیہ دروازے میں وہ ایک لمحے کے لیے بالکل ساکت ہو کر کھڑے رہے۔ شاید وہ یہ تسلی کرنا چاہتے تھے کہ لاما سو رہا ہے۔ عاطون اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔ اس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ سو رہا ہے' مگر وہ نیم وا آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے خراٹوں کی آواز پر دونوں زرد پوش پراسرار آدمی دبے پاؤں چلتے اس کے پلنگ کی پائنتی کے پاس آکر بیٹھ گئے' پھر جس آدمی کے ہاتھ میں صندوقچی تھی' اس نے اس کا ڈھکن کھول دیا۔ صندوقچی کے اندر سے زرد رنگ کے ایک پتلے سانپ نے اپنا چھوٹا سا پھن باہر نکال لیا۔ اس زرد پوش راہب نے صندوقچی کو عاطون کی پائنتی پر الٹ دیا' اور فوراً" ہی دبے پاؤں چلتے خفیہ دروازے سے باہر نکل گئے' ان کے جاتے ہی دیوار کا تختہ بند ہوگیا۔

عاطون نے محسوس کیا کہ اس کی پنڈلی پر سانپ نے ڈس لیا ہے۔ اس نے کمبل پرے ہٹایا تو دیکھا کہ زرد سانپ رینگ کر بھاگنے کی کوشش میں تھا۔ عاطون نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا۔ زرد سانپ کے منہ سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ رہی تھی۔ عاطون نے سانپ کی سسکار نما زبان میں کہا' "دوست! ناحق مجھے ڈسا اور اپنے دانت تڑوا لیے۔"

زرد سانپ تو عاطون کے ہاتھ میں لرز اٹھا۔ اس کا چھوٹا سا پھن سمٹ گیا۔ عاطون نے سانپ سے کہا' "کیا تم نہیں جانتے تھے کہ میں مقدس لاما ہوں اور مجھ پر دیوتاؤں کا سایہ ہے اور تمہارا زہر کوئی اثر نہیں کرے گا۔"

زرد سانپ نے کپکپاتی آواز میں کہا' "عظیم لاما! میں نے سات لاماؤں کو ڈسا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے کسی لاما کو سانپ کی زبان میں بات کرتے نہیں دیکھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسی لاما کا جسم پتھر کا جسم نہیں تھا کہ ڈستے ہی میرے دانت ٹوٹ جاتے۔"

عاطون بولا' "میں ان سے مختلف لاما ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تم مجھے کس لیے ڈسنے آئے تھے اور تم اس سے پہلے والے لاماؤں کو کیوں ڈستے رہے ہو؟"

زرد سانپ نے اپنا سر جھکا دیا اور بولا' "مقدس لاما! آپ دلوں کے بھید ضرور جانتے ہیں۔" میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپا سکتا' مجھے راہب اعظم گنڈھپ کے حکم سے ہر لاما کے پاس پہلی رات کو بھیجا جاتا ہے تاکہ میں اسے ڈس دوں۔ میرے ڈسنے سے لاما مرتا نہیں۔ مجھے خاص جڑی بوٹیاں کھلا کر پالا گیا ہے۔ جس سے میرے زہر میں سے ہلاکت کا عنصر بے اثر ہوگیا ہے' لیکن میں جس مرد کو ڈس دوں' اس کا جوہر مردانگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔

اب ساری بات عاطون کی سمجھ میں آگئی۔ گنڈھپ نے اسی لیے اسے کہا تھا کہ لاما کی شادی ضرور ہوتی ہے' مگر اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوتی' اتنے میں زرد سانپ بولا' حضور! آپ اصل میں کون ہیں اور آپ نے سانپوں کی زبان کہاں سے سیکھی تھی۔ کیا میں یہ سوال پوچھنے کی جرات کر سکتا ہوں؟"

عاطون نے کہا' "مجھے اپنے دوست اور تمہارے دیوتا پدم ناگ سے جدا ہوئے ایک عرصہ ہوگیا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ پدم ناگ یہیں کہیں برف پوش وادیوں کی کسی گپھا میں رہتا ہے۔ کیا تم مجھے اس کا کچھ پتا بتا سکتے ہو؟"

زرد سانپ کہنے لگا' "عظیم لاما! عام حالات میں پدم ناگ دیوتا کی ہمیں خوشبو آجایا کرتی ہے' لیکن ہم نے سنا ہے کہ ناگ دیوتا' ان دنوں کسی برفانی چوٹی کی گپھاہ میں مراقبے میں ہے اور جب ناگ دیوتا مراقبے میں ہوتا ہے تو وہ اپنا سانس روک لیتا ہے اور جب ناگ دیوتا سانس روک لے تو اس کے جسم میں سے خوشبو باہر نکلنا بند ہو جاتی ہے' اس لیے میں آپ کو یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ پدم ناگ دیوتا کس پہاڑی کی گپھاہ میں ہے۔"

عاطون ایک پل کے لیے خاموش ہوگیا۔ زرد سانپ نے کم از کم اس بات کی ضرور تصدیق کر دی تھی کہ پدم ناگ یہیں کسی پہاڑی کی گپھاہ میں مراقبے کے عالم میں موجود ہے' اگرچہ وہ اس گپھاہ یا برف پوش پہاڑی کی نشاندہی نہیں کر سکا تھا۔ جب کہ تبت کی پہاڑیوں کا یہ عالم تھا کہ سینکڑوں چھوٹی چھوٹی برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں آس پاس پھیلی ہوئی تھیں۔ عاطون سوچ رہا تھا کہ پدم ناگ کی تلاش میں اسے خود ہی نکلنا ہوگا۔

عاطون نے کپڑے سے زرد سانپ کے منہ پر لگے خون کو صاف کیا تو زرد سانپ

نے اپنے سر جھکا دیا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا' "مجھے اگر معلوم ہوتا کہ آپ پدم ناگ کے دوست ہیں تو میں یہ جسارت کبھی نہ کرتا۔"

عاطون نے زرد سانپ کے سر پر آہستہ سے انگلی پھیرتے ہوئے کہا' "اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں' مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ تمہارے دانت ٹوٹ گئے۔"

زرد سانپ بولا۔ "مقدس لاما! دانت ایک ماہ بعد نئے نکل آئیں گے اگر آپ حکم کریں تو میں پدم ناگ دیوتا کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

عاطون کچھ سوچ کر کہنے لگا' "کیا تم شاہی محل سے باہر نکل سکو گے؟"

زرد سانپ نے کہا' "مجھے ان راہبوں نے سیدھا رکھا ہے اور میں ہر لاما کو ڈسنے کے بعد اپنے آپ مندر کی مورتی کے عقب میں بنے ہوئے سوراخ میں گھس کر آرام کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مخصوص راہب میرے بل کو جالی دار طشتری سے بند کر دیتے ہیں' لیکن میں آپ کے حکم پر اسی جگہ سے برفانی وادیوں کی طرف نکل جاؤں گا۔"

عاطون نے کہا' "تم سردی میں ٹھٹھر جاؤ گے۔ میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا' تم اب واپس اپنے بل کی طرف جاؤ۔ پدم ناگ کو میں خود تلاش کر لوں گا۔ ہاں ایک بات بتاؤ کہ راہب اعظم گنڈھپ کو کیسے پتا چلتا ہے کہ تم نے مجھے ڈس لیا ہے؟"

زرد سانپ بولا' "راہب اعظم کل صبح کسی بہانے آپ کی پنڈلی پر میرے ڈسنے کا نشان دیکھے گا۔"

عاطون نے پنڈلی پر سے کپڑا ہٹا کر کہا' "لیکن میری پنڈلی تو صاف ہے' تمہارے ڈسنے کا کوئی نشان نہیں پڑا۔"

زرد سانپ نے ادب سے سر جھکایا' اور بولا' "مقدس لاما! اس سلسلے میں میں کچھ بھی عرض نہیں کر سکتا۔"

عاطون نے مسکرا کر زرد سانپ کو خواب گاہ سے جانے کی اجازت دے دی۔

زرد سانپ نے جھک کر عاطون کو سلام کیا اور پلنگ سے اتر کر رینگتا ہوا خواب گاہ کے اندھیرے کونے میں غائب ہوگیا۔ عاطون کے لیے اپنی پنڈلی پر ننھے سے زخم کے دو نشان لگانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے زرد سانپ سے ویسے ہی اس کا عندیہ معلوم کرنے کے لیے پوچھا تھا' کیونکہ عاطون اپنی مرضی سے جسم کو جب چاہے نرم کر لیتا تھا۔ اس نے اسی وقت اپنے فرغل میں لگے چاندی کے بکسوئے سے اپنی پنڈلی پر زخم کے دو ننھے سے نشان بنا دیے' جیسے وہاں سانپ نے ڈسا ہو اور بستر پر لیٹ گیا۔ اس کی ساری توجہ پدم ناگ کے سراغ لگانے کے منصوبے پر مرکوز تھی' وہ دیر تک اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔

صبح ہوئی تو سب سے پہلے راہب گنڈھپ خواب گاہ میں اجازت لے کر داخل ہوا۔ عاطون کو خواب گاہ کے باہر خاص قسم کی مترنم گھنٹیاں بجا کر بیدار کیا گیا تھا' حالانکہ وہ پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔ راہب گنڈھپ کے ہاتھ میں صندل ملے نیم گرم پانی سے بھرا ہوا طشت تھا۔ اس نے ادب سے عاطون کو سلام کیا اور عرض کی کہ وہ پہلے روز عظیم لاما کے پاؤں خود دھلانے کا فخر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ عاطون خوب سمجھتا تھا کہ وہ یہ فخر کیوں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ عاطون پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ راہب گنڈھپ بڑے احترام سے عاطون کے پاؤں طشت میں رکھ کر نیم گرم پانی سے دھونے لگا' عاطون اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ گنڈھپ نے بڑی عیاری سے عاطون کی پنڈلیوں پر سے کپڑا ہٹا کر ریشمی رومال سے دھونا شروع کیا۔ اس نے گوشہ چشم سے عاطون کی پنڈلی پر بنے ہوئے زخم کے دو ننھے سے نقطے دیکھ لیے تھے۔ جنہیں وہ سانپ کے ڈسنے کے نشان سمجھ رہا تھا۔ عاطون دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

پاؤں دھونے کے بعد راہب گنڈھپ نے کہا' "مقدس لاما اعظم! آج رات آپ کی شادی ہے۔ یہ رسم پچھلے جنم میں ادا ہو چکی ہے۔ صرف آپ کی مقدس بیوی کو آپ کے پاس بھیج دیا جائے گا' جو آپ کے ہر آرام و آسائش کا خیال رکھے گی' اور آپ کی خدمت کرے گی۔"

عاطون نے تقدس آمیز لہجے میں کہا' "ہمیں اب پچھلے جنم کے تمام واقعات یاد آ رہے ہیں۔ ہماری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔"

راہب گنڈھپ سر جھکائے پانی کا طشت لے کر واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رات والی دیوداسیاں خوشبوؤں کے بادل اڑاتی آ گئیں' وہ اپنے جلو میں عاطون یعنی مقدس لاما کو شاہی حمام میں لے گئیں۔ سنگ مرمر کے اس عالیشان حمام میں نیم گرم پانی کے چاندی کے تسلوں میں مشک و نافہ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

اسے شاہی مندر کے استھان پر بٹھا دیا گیا۔ اب باری باری دربار اور مندر کی اہم شخصیتیں آ کر عاطون کو سجدہ کرتیں۔ اسے قیمتی تحائف پیش کیے جاتے۔ راہب گنڈھپ اپنی کھنچی ہوئی آنکھیں اور سنگین چہرہ لیے عاطون کے بائیں جانب کھڑا تحائف وصول کیے جا رہا تھا۔ صبح کی پوجا کی رسومات ختم ہوئیں' تو عاطون کو واپس خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ دوپہر کو راہب گنڈھپ نے اسے وہی سبز مشروب پینے کے لیے پیش کیا۔ عاطون نے بلا جھجک پی لیا' کیونکہ اسے یقین تھا کہ اگر یہ زہر بھی ہو تو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دربار کے امراء اور پجاری خواب گاہ میں ہی عاطون سے ملاقات کرنے آتے رہے۔ جب رات ہوگئی تو ایک بار

پھر عاطون کو مشروب دیا گیا۔ اس کے بعد دیو داسیاں مقدس لاما کو شب خوابی کا غسل دینے آ گئیں۔ غسل کے بعد انہوں نے عاطون کے جسم کو عطریات میں بسایا اور شب خوابی کی پوشاک دے کر چلی گئیں۔ دیوداسی عمیکا ان میں اس روز بھی نہیں تھی۔

عاطون کو اپنی ان دیکھی بیوی کا انتظار تھا۔ خواب گاہ میں عود و عنبر کی مہک بسی ہوئی تھی۔ شمع دانوں کی روشنی خواب آلود تھی۔ آتشدان میں چندن کی لکڑیاں جل رہی تھیں۔ عاطون پلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھا پدم ناگ کی گپھاہ کے سراغ لگانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ خواب گاہ کا طویل زرد و مخملیں پردہ ایک طرف ہٹا اور ایک دراز قد لمبے سیاہ بالوں والی عورت اندر داخل ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر عاطون کو قالین پر سجدہ کیا پھر آہستہ سے اٹھی اور نظریں جھکائے قدم قدم چلتی عاطون کے پلنگ کے پاس آ کر دوزانوں ہو کر فرش پر بیٹھ گئی۔ عاطون سمجھ گیا کہ یہی اس کی بیوی ہے۔ گلے میں یاقوت کی سرخ مالا تھی۔ کانوں میں زمرد کے بندے چمک رہے تھے اور ماتھے پر زعفران کا ٹیکا لگا تھا۔ سیاہ لمبے بال کمر سے پھسل کر قالین پر ڈھیر ہو رہے تھے۔ عاطون نے اس کے شانے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا اور اس کا نام پوچھا' عورت نے دھیمی سحر انگیز آواز میں اپنا نام سنچال بتایا اور کہا۔

"مقدس روح عظیم مجھے آپ کی بیوی ہونے کا فخر حاصل ہوا ہے' میں آج سے آپ کی باندی ہوں۔ دیوتاؤں نے مجھے آپ کی خدمت کے لیے چنا ہے۔"

عاطون نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور سنچال سے کہا' "ہمیں تمہاری وفاداری پر پورا پورا یقین ہے' لیکن اس وقت ہم تنہائی چاہتے ہیں' تم دوسرے کمرے میں جا کر سو سکتی ہو۔"

ان الفاظ کا عاطون کی زبان سے نکلنا تھا کہ اس عورت کا جسم برگ آوارہ کی طرح کپکپانے لگا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہوگئی' وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ عاطون پریشان سا ہوگیا کہ کہیں اس عورت کی موت واقع نہ ہو جائے۔ سنچال نے اپنا سر عاطون کے قدموں پر رکھ دیا اور گلوگیر آواز میں فریاد کی۔

"مقدس روح عظیم! مجھے یہ سزا نہ دیں۔ مجھے پہلی رات اپنے پلنگ سے نہ اتاریں۔ نہیں تو میرا اگلا جنم کتیا کا ہوگا' اور میں جنم جنم بھٹکتی پھروں گی۔ مجھ پر رحم کریں۔ مقدس روح عظیم مجھ پر رحم کریں۔ مجھے آج کی رات نہ دھتکاریں۔"

عاطون عجیب مصیبت میں پڑ گیا' وہ ایسا نہیں چاہتا تھا' مگر اس عورت کی آہ فریاد سے مجبور ہو کر اس نے اسے پلنگ پر ایک طرف ہو کر پڑے رہنے کی اجازت دے دی۔ سنچال نے وفور مسرت سے عاطون کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا اور اس کے بائیں جانب پلنگ

پر ایک طرف ہو کر لیٹ گئی۔

دوسرے دن سنچال کو دیوداسیوں نے جب غسل سے فارغ کیا تو وہ کچھ پریشان اور کچھ گھبرائی ہوئی موقع پاتے ہی راہب گنڈھپ کے کمرے کی طرف بھاگی۔ راہب اعظم گنڈھپ اس وقت بانس کی پتیوں پر لکھی ہوئی مقدس تحریروں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ لاما کی بیوی سنچال کو پریشان حالت میں آتے دیکھ کر پوتھی کی پنکھڑیوں کو ایک طرف رکھا اور بولا'
"کیا بات ہے؟ تم گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

سنچال نے جھک کر راہب گنڈھپ کے پاؤں چھوئے اور پھر اس کی طرف اپنا چہرہ اٹھا کر کہا' "مہاراج! مقدس روح عظیم پر سانپ کے زہر نے اثر نہیں کیا۔"

یہ جملہ گویا بجلی بن کر راہب گنڈھپ پر گرا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ بت بنا سنچال کے چہرے کو تکتا رہا' جس پر بہار کی صبح کی شگفتگی کھلی ہوئی تھی' پھر اس نے اسے اپنی کٹیا میں جانے کا حکم دیا' اور کہا کہ جب تک وہ نہ کہے کٹیا سے ہرگز باہر نہ نکلے۔ راہب گنڈھپ کو اپنے زرد سانپ کے زہر کے اثرات پر ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا۔ یہ زہر اس سے پہلے سات لاماؤں کو ناکارہ بنا چکا تھا' پھر اس پر سانپ کے زہر نے اثر کیوں نہیں کیا' جب کہ لاما کی پنڈلیوں پر سانپ کے کاٹے کا نشان بھی موجود تھا۔ راہب گنڈھپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا' اگر سنچال کے ہاں بچہ پیدا ہوگیا تو یہ لاماؤں کی ہزاروں سالہ پرانی روایات کے خلاف ہوگا' اور لوگ حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ملک میں بغاوت بپا ہو جائے گی' اور محل کو آگ لگا دی جائے گی' کیونکہ لوگوں کو ہزاروں سالوں سے یہی یقین دلایا گیا تھا کہ لاما کی بیوی ضرور ہوتی ہے' مگر دیوتا اسے اولاد نہیں دیتے' کیونکہ لاما کو اپنی موت کے بعد خود ہی دوسرے جنم میں واپس آنا ہوتا ہے۔ دوسری خطرناک بات یہ تھی کہ لاما کی اولاد کسی بھی وقت تخت کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ تیسری اور سب سے اہم ترین بات یہ تھی کہ راہب گنڈھپ جس خصوصی عمل کے لیے یہ سب کچھ کر رہا تھا اور آٹھویں لاما کے انتظار میں تھا اس کی سب سے پہلی شرط ہی یہ تھی کہ لاما کی کوئی اولاد نہ ہو۔

راہب گنڈھپ نے خاص قسم کا سرخ رنگ کا چولا پہنا اور صندل کے صندوق میں رکھی ہوئی سونے کی تین کونوں والی چھری نکال کر اسے تین بار چوما اور اپنی خواب گاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کی خواب گاہ محل کے عقبی مندر کے پہلو میں تھی۔ خواب گاہ میں آتے ہی اس نے اندر سے دروازہ بند کیا' اور مشرقی دیوار کے بھاری پردے کے پیچھے بنے ہوئے ایک خفیہ زینے سے اترنے لگا' وہ ایک اندھیری سرنگ میں آ گیا۔ جو پتھر کی دیواروں سے پہاڑی میں کھودی گئی وہ اسے ایک تاریک کوٹھری میں لے گئی۔

گنڈھپ نے پتھروں کو رگڑ کر آگ کی چنگاری سے کونے میں لگی شمع روشن کی۔ اس دھیمی شمع کی روشنی میں پتھریلی دیوار کے ابھرے ہوئے کونے نظر آنے لگے۔ یہ ایک بہت ہی اہم ترین جگہ تھی۔ اس خفیہ کوٹھری کے وسط میں پتھر کی چوکی پر ہرن کی کھال پر لکھی ہوتی بڑے سائز کی ایک کتاب بند پڑی تھی۔ کتاب کی جلد پر بھی ہرن کی کھال منڈی تھی' جس پر خون سے انسانی ہاتھ کا نشان لگا تھا۔ یہ کتاب لاما مذہب کی روایت کے مطابق دس ہزار سال پرانی تھی اور اسے ہمالیہ کی بلند ترین برف پوش چوٹیوں پر رہنے والے لافانی اور نروان پانے والے لاماؤں کی روحوں نے مل کر تحریر کیا تھا۔ اس کتاب کے بارے میں خاص بات یہ تھی کہ اس کی تحریر کسی کو بظاہر دکھائی نہیں دیتی تھی' لیکن جب کوئی بڑا راہب سونے کی تین کناروں والی مقدس چھڑی کو کتاب سے تین بار مس کرنے کے بعد خاص اشلوک کا ورد کر کے کوئی بھی بات دل میں لا کر کتاب کو کھولتا تھا تو اسے اپنے سوال یا خواہش کا جواب لکھا ہوا مل جاتا تھا۔

راہب گنڈھپ اس پراسرار طلسمی کتاب کے سامنے دوزانوں ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور مقدس اشلوک کا ورد کرنے لگا۔ سات بار اشلوک کا ورد کرنے کے بعد اس نے آنکھیں کھول کر طلسمی کتاب کے عقب میں دیوار پر بنے ہوئے اگنی دیو کی علامت کو دیکھا اور ہاتھ باندھ کر کہا' "مقدس دیوتا! میں نے سات برس تک تیرا چلہ کیا۔ تیرے نام پر ایک سو ایک عورتوں کی قربانی دے چکا ہوں۔ اب جبکہ تمہارے قدیم ترین عمل کے مطابق آٹھواں لاما تلاش کرنے میں بھی کامیاب ہوگیا ہوں اور میں آخری عورت کی قربانی بھی تمہارے حضور پیش کرنے والا تھا تو اچانک مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ اس لاما کے اندر کوئی غیر معمولی طاقت ہے۔ جس کے باعث اس پر ہمارے مقدس زرد سانپ کے زہر کا بھی اثر نہیں ہوا۔ اے اگنی دیو! میں تیرے نام کا ورد کرتے ہوئے تمہاری کتاب کے ورق الٹنے لگا ہوں۔ میری راہنمائی کرنا۔

یہ کہہ کر راہب گنڈھپ نے آنکھیں بند کر لیں اور مزید سات بار اشلوک کا ورد کیا اور پھر تین بار طلسمی کتاب کی جلد کو سونے کی چھڑی سے چھوا اور کتاب کو کھول کر دیکھا۔ اس کے سامنے جو صفحہ آیا اس پر قدیم ترین تبتی زبان میں درج تھا۔

"گنڈھپ! تم اپنے امر جیون کے عمل کے آخر میں آ کر دھوکا کھا گئے ہو۔ تم جس شخص کو لاما کا ہم شکل بنا کر لائے ہو۔ اس کی طاقت کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس کا ادنیٰ سا ثبوت تمہیں یوں ملے گا کہ جس زرد سانپ کو تمہارے آدمی لے کر اس پراسرار اور غیر معمولی طاقت کے آدمی کی خواب گاہ میں گئے تھے۔ اس کے دانت ٹوٹ چکے ہیں' کیونکہ اس

پراسرار شخص کا جسم اس وقت چٹان سے بھی زیادہ سخت تھا۔ اس شخص کا اصلی نام عاطون ہے۔ اس سے زیادہ مجھے زبان کھولنے کی اجازت نہیں۔ ہاں تمہیں مشورہ دے سکتا ہوں' جس زرد سانپ کو تم نے لاما کو ڈسنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس کو ہلاک کر کے اس کے مردہ ٹکڑوں کا عرق نکالو اور اس کے دو قطرے عاطون کی ناف میں گرا دو۔ اس سے اس کی غیر معمولی طاقت عارضی وقفے کے لیے معطل ہو جائے گی' تم اس دوران میں اسے ہلاک کر کے اس کا کٹا ہوا سر مقدس تالاب میں پھینکنے میں کامیاب ہوگئے' تو تم اپنے عمل میں کامیاب ہو جاؤ گے' اور تمہیں ہمیشہ کی زندگی مل جائے گی۔ اس کام کے لیے لاما عاطون کی بیوی سنبھال کو نہیں' بلکہ دیوداسی عمیکا کو استعمال کرو۔ صرف وہی یہ کام کر سکتی ہے' کیونکہ لاما عاطون اسے پسند کرتا ہے۔ اس کھیل کا انجام کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔"

اس کے آگے طلسمی کتاب کے اوراق خالی تھے۔

راہب گنڈھپ یہ تحریر پڑھ کر ششدر سا رہ گیا۔ اس کے وہم میں بھی کبھی یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ اپنی طلسمی طاقت سے اس نے جس اجنبی اور احمق سے مسافر کو لاما کی شکل دے کر اسے مقدس لاما بنایا تھا' وہ زبردست طاقت کا حامل ہوگا اور وہی اس کے منصوبے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جائے گا' لیکن اب وہ مجبور تھا کہ طلسمی کتاب کی ہدایات پر عمل کرے' کیونکہ وہ امر جیون یعنی ہمیشہ کے لیے غیر فانی ہو جانے کا خطرناک اور سب سے بڑا عمل کر رہا تھا اور اس عمل کی شرط کے مطابق آٹھویں لاما کے سر کو کاٹ کر مقدس تالاب میں رات کے وقت پھینکنا ضروری تھا۔ راہب گنڈھپ نے تمام مراحل طے کر لیے تھے۔ اس خطرناک عمل کے بس آخری مرحلہ باقی تھا کہ یہ مشکل اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے کتاب کو بند کر کے تین بار اس کو بوسہ دیا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔

راہب اعظم گنڈھپ نے اپنے کمرے میں آتے ہی راز دار اور چہیتی دوست دیوداسی عمیکا کو طلب کیا۔ عمیکا نے آتے ہی گنڈھپ کو جھک کر سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی' کیونکہ وہ راہب گنڈھپ کی روحانی یا طلسمی طاقت سے بے حد خوفزدہ تھی۔ گنڈھپ نے مسکرا کر عمیکا کو دیکھتے ہوئے اسے زریں چوکی پر بٹھایا اور خود سامنے مسند لگے تخت پر بیٹھ گیا۔ عمیکا کو معلوم تھا کہ گنڈھپ امر جیون یعنی غیر فانی زندگی کے لیے خطرناک عمل کر رہا ہے' اور عمیکا اس کی واحد رازدار تھی' کیونکہ گنڈھپ نے عمیکا سے شادی کر کے اسے بھی غیر فانی بنا دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ عمیکا کی بھی یہی

خواہش تھی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جوان اور حسین بن کر زندگی گزارے۔

گنڈھپ نے قدرے آگے کو جھک کر عمیکا کو دھیمی دھیمی آواز میں تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ عمیکا کے چہرے پر تردد اور حیرت کے اثرات تھے۔ اسے یہ تو احساس تھا کہ لاما عاطون اس کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے' لیکن یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ وہ اتنی زبردست طاقت کا مالک ہے کہ جس کی تصدیق پراسرار کتاب کے دیوتاؤں نے بھی کر دی ہے۔ اس نے گنڈھپ سے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اگر کسی طرح عاطون لاما کو ذرا سا بھی شک ہوگیا تو وہ گنڈھپ اور عمیکا میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ گنڈھپ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس نے عمیکا کی طرف پلٹ کر کہا۔ "کیا تم میری روحانی طاقت سے واقف نہیں ہو؟ کیا تم نہیں جانتیں کہ جب میں تمہیں زرد سانپ کا عرق دے کر عاطون کے پاس بھیجوں گا تو تم کبھی ناکام نہیں ہوگی۔"

عمیکا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا' "مہاراج! میں آپ کی داسی ہوں' آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی کروں گی۔ آپ کی روحانی طاقت میرے ساتھ ہوگی۔ آپ حکم کریں کہ مجھے کب عاطون لاما کے پاس جانا ہوگا۔"

گنڈھپ نے عمیکا کو بتایا کہ سنچال کا ہلاک کیا جانا ضروری ہوگیا ہے۔ "میں آج رات یہ کام خود کروں گا۔ اس کے بعد زرد سانپ کا عرق تیار کر کے تمہیں دوں گا' جس کے دو قطرے تمہیں موقع پا کر عاطون لاما کی ناف میں گرانے ہوں گے۔"

تم آج رات سنچال کی جگہ عاطون لاما کی خواب گاہ میں جاؤ گی' اگر وہ سنچال کا پوچھے تو کہہ دینا کہ وہ بیمار ہوگئی ہے اور اب تم اس کی بیوی ہو۔

"جو حکم عظیم گنڈھپ!" عمیکا نے سر جھکا کر کہا۔

راہب اعظم گنڈھپ نے عمیکا کو نئی پوشاک پہن کر بن سنور کر تیار ہونے کا حکم دیا اور خود سب سے پہلے خانقاہ کی مورتی والے استھان کے پاس آگیا۔ اس کے لباس کے اندر ایک تلوار چھپی ہوئی تھی۔ مورتی کے پیچھے وہ بل تھا۔ جس میں زرد سانپ آرام کر رہا تھا۔ گنڈھپ نے ایک خاص قسم کی آواز نکالی۔ زرد سانپ اس آواز پر لگا ہوتا تھا۔ آواز کے تحرک کو محسوس کرتے ہی وہ رینگتا ہوا بل سے باہر آگیا۔ جونہی وہ بل سے باہر نکلا تلوار کا ایک بھرپور وار اس پر پڑا اور اس کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ گنڈھپ نے وار کر کے زرد سانپ کے کئی ٹکڑے کر دیئے پھر ان ٹکڑوں کو رومال میں باندھ کر اپنے حجلہ خاص میں آگیا۔ یہاں آکر اس نے ایک ہانڈی میں پانی ڈال کر سانپ کے ٹکڑے اس میں رکھے اور ہانڈی ہلکی آنچ پر رکھ کر اس کا منہ بند کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ سنچال کو موت کے

گھاٹ اتارنے کے لیے چل دیا۔

سنچال اپنی کوٹھری میں بند تھی۔ اسے گنڈھپ کے خونی عزائم کی کچھ خبر نہیں تھی' وہ تخت پر مسند لگائے نیم دراز سوچ رہی تھی کہ گنڈھپ نے اسے یہاں کس لیے بند کر دیا ہے' وہ اس شش و پنج میں تھی اور دوسری طرف راہب گنڈھپ آستین میں تیز دھار خنجر چھپائے نیم روشن خفیہ راستے سے سنچال کی کوٹھری کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اچانک جیسے کوٹھری کے کونے میں سفید نورانی روشنی کا دائرہ سا ابھر آیا۔ سنچال ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں ٹکٹکی باندھے کونے میں ابھرتی روشنی کے دائرے کو دیکھ رہی تھیں۔ جہاں اب ایک گول چہرہ نمودار ہوگیا تھا' اگرچہ چہرے کے نقوش دھندلے تھے' لیکن سنچال نے اسے فوراً" پہچان لیا۔ یہ مرے ہوئے لاما کا چہرہ تھا۔ سنچال جلدی سے اٹھ کر سجدے میں گر پڑی۔ اسے مردہ لاما کی روح کی آواز آئی۔

"سنچال! گنڈھپ تجھے قتل کرنے آ رہا ہے۔ یہاں سے جان بچا کر بھاگ جا۔"

سنچال چونک اٹھی۔ لاما کی روح پھر مخاطب ہوئی۔" یہ سوچنے کا وقت نہیں۔ میرے جاتے ہی یہ دیوار کھل جائے گی۔ تو یہاں سے فرار ہو جانا۔ گنڈھپ تجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے پہنچنے ہی والا ہے۔" اس کے ساتھ ہی لاما کی روح کا چہرہ اور روشنی کا دائرہ غائب ہوگیا' پھر دیوار میں ایک دروازہ بن گیا۔ سنچال گھبرا گئی تھی۔ اس نے کونے میں رکھا ہوا پوستین کا لمبا چغہ اٹھایا اور کوٹھری کے طلسمی دروازے میں سے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر جاتے ہی دروازہ غائب ہوگیا' اور دیوار بن گئی۔ سنچال نے دیکھا کہ وہ شاہی محل اور شاہی خانقاہ کی حدود کے اندر نہیں ہے' بلکہ ایک ایسی وادی میں کھڑی ہے جہاں اس کے چاروں جانب بلند پہاڑیوں کی برف پوش ڈھلانیں اور گہری کھڈیں ہیں۔ سنچال نے پوستین کا چغہ پہن کر سر ڈھانپا اور ایک طرف تیز تیز چلنے لگی۔

ادھر گنڈھپ نے سنچال کی کوٹھری کے پاس آ کر دائیں بائیں دیکھا' جب اسے اطمینان ہوگیا کہ کوئی اسے نہیں دیکھ رہا تو کوٹھری کا تالا کھول کر جلدی سے اندر داخل ہوگیا۔ کوٹھری میں شمع روشن تھی' مگر یہ دیکھ کر اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کہ کوٹھری خالی پڑی تھی۔ سنچال وہاں پر نہیں تھی۔ باہر تالا لگا تھا پھر سنچال کہاں چلی گئی۔ اس نے تلاشی لی تو معلوم ہوا کہ سنچال کا اونی چغہ وہاں نہیں ہے' وہ چغہ پہن کر کس طرف سے فرار ہوئی ہے؟ کیا کسی نے اس کے لیے تالا کھول دیا تھا؟ مگر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ کہیں عمیکا نے تو اسے اطلاع نہیں کر دی تھی؟ لیکن عمیکا تو لاما کی بیوی بننے اور ہمیشہ کی جوانی اور ہمیشہ کی زندگی حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے' وہ اپنے پاؤں پر کلہاڑا

نہیں چلا سکتی' کیونکہ اس کے خواب کے پورا ہونے کے لیے سنچال کی موت لازمی شرط ہے۔

گنڈھپ پریشان ہو کر وہاں سے نکل کر عمیکا کے کمرے کی طرف دوڑا۔ عمیکا تانبے کے آئینے کے سامنے بیٹھی بناؤ سنگھار میں مصروف تھی۔ گنڈھپ نے اس کی طرف گھور کر دیکھا' وہ اس پر سنچال کی گمشدگی کا انکشاف کرتے کرتے کچھ سوچ کر رک گیا۔ عمیکا اس کی نگاہوں کی تشویش کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔

"مہاراج! کیا بات ہے؟ آپ کچھ پریشان سے دکھائی دے رہے ہیں؟"

گنڈھپ نے مسکراتے ہوئے عمیکا کے سیاہ لمبے خوشبودار بالوں کو دیکھتے ہوئے کہا' "بس تمہیں ایک نظر دیکھنے کو چلا آیا تھا۔ ٹھیک ہے تمہیں خوب بن سنور کر آدھی رات سے کچھ پہلے عاطون لاما کی خواب گاہ میں بھیج دیا جائے گا' عرق کی چھوٹی شیشی تمہیں کل ملے گی۔

گنڈھپ تیزی سے پلٹا اور کمرے سے نکل گیا۔ عمیکا کے دل میں ہلکا سا شبہ ابھرا' لیکن آئینے میں اپنی من موہنی صورت دیکھ کر وہ ہمیشہ کے لیے جوان رہنے کے تصور میں گم ہو گئی۔

اس وقت دن ڈھل رہا تھا' مگر فضا میں دھند چھائی تھی اور لگتا تھا کہ برف گرے گی۔ گنڈھپ اس وقت اپنے محافظ خاص کی کٹیا میں گیا اور اسے رازداری سے بتایا' "سنو! دیوداسی سنچال جو لاما کی بیوی بن چکی ہے' قیمتی اور مقدس جواہرات چرا کر شاہی محل سے فرار ہو چکی ہے۔ تم فوراً" خاص محافظ دستہ لے کر اس کی تلاش میں نکل جاؤ۔ خبردار یہ راز سوائے تم اور تمہارے دستے کے سات آدمیوں کے سوا کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ سنچال کو گرفتار کر کے یہاں لانے کی ضرورت نہیں' وہ آس پاس کی پہاڑیوں میں کہیں چھپی ہو گی' وہ جہاں ملے اسے وہیں موت کے گھاٹ اتار کر اس کا سر تھیلے میں ڈال کر میرے پاس لے آنا' اور اگر تم ناکام لوٹے تو اس کی جگہ میں تمہارا سر کاٹ ڈالوں گا۔

گنڈھپ کے محافظ خاص سارنگ نے گنڈھپ کے پاؤں چھو کر کہا' "عظیم گنڈھپ! سنچال کا سر بہت جلد آپ کی خدمت میں پہنچا دیا جائے گا۔

سارنگ نے اسی وقت اپنے ساتوں خفیہ سپاہیوں کو تیار کیا اور برفانی دھند میں گھوڑوں پر سوار ہو کر تبت کی برف پوش وادی میں نکل کھڑے ہوئے۔

عاطون ان تمام انقلابی اور خونین تبدیلیوں سے بالکل بے خبر اپنے محل کی خواب گاہ میں پلنگ پر نیم دراز تھا۔ عاطون کو دیوداسی عمیکا کا خیال آ رہا تھا۔ اس روز کے بعد

عاطون نے عمیکا کی جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک مدت دراز کے بعد کسی عورت کی زلف کا اسیر ہوگیا ہے' وہ اس تجربے سے بھی گزرنا چاہتا تھا۔ گنڈھپ کی طرف سے وہ ضرور چوکس ہوگیا تھا' وہ سمجھ گیا تھا کہ گنڈھپ ایک گہرا اور خطرناک شخص ہے اور اس کے خلاف کوئی سنگین سازش کر رہا ہے۔

یونہی رات ہوگئی اور راہب گنڈھپ' عاطون کے لیے خاص مشروب لے کر آگیا۔ دیوداسیاں کورنش بجا کر رخصت ہوگئیں۔ گنڈھپ کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ رقصاں تھی۔ عاطون بھی خاموشی سے گنڈھپ کے پراسرار چہرے کو تک رہا تھا۔ گنڈھپ کے دل میں اگرچہ عاطون لاما کی غیر فانی طاقت کا احساس تھا' لیکن چہرے پر اس طرح کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ گنڈھپ کو غار کی مقدس کتاب کے دیوتاؤں پر اعتقاد تھا اور اسے اپنی کامیابی کا بھرپور یقین تھا۔

عاطون کے ساتھ گنڈھپ نے سلطنت اور خانقاہ کے امور کے بارے میں کچھ باتیں کیں اور اسے مشروب پلا کر الٹے قدم چلتا ہوا واپس آگیا۔

رات کے پہلے پہر عاطون لاما کو دیوداسیاں شاہی حمام تک لے گئیں۔ اس نے معمول کے مطابق صندل اور عطریات ملے نیم گرم پانی سے غسل کیا اور اس نے عطریات میں بسی شب خوابی کی پوشاک پہن لی تو اسے مسہری تک پہنچا کر اس کے پاؤں چھو کر کورنش بجا لاتے ہوئے چلی گئیں۔

آدھی رات سے کچھ پہلے عاطون اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ پردہ ہٹا کر کھڑکی کھول کر باہر دیکھا' باہر اندھیری رات میں برف گر رہی تھی۔ عاطون کو ایک پل کے لیے بھی سردی محسوس نہ ہوئی' حالانکہ باہر قیامت کی سردی تھی۔ اس کو اپنے پیچھے کسی کے ریشمی لباس کی سرسراہٹ اور جواہرات کی لڑیوں کی کھنکھناہٹ سی سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ عاطون کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ خواب گاہ کی دھیمی شمع کی خواب آلود روشنی میں مسہری کے پاس دیوداسی عمیکا ہاتھ باندھے' سر جھکائے کھڑی تھی۔ عاطون کے دل کی امید بر آئی تھی۔ اس کی محبوبہ اس کے سامنے سولہ سنگھار کیے کھڑی تھی' وہ آہستہ آہستہ وقار کے ساتھ اس کے قریب آیا۔ عمیکا نے اپنی سرمگیں آنکھیں اٹھا کر عاطون کو دیکھا' وہ جانتی تھی کہ عاطون اصل لاماؤں کی نسل سے نہیں ہے' اور یہ مرے ہوئے لاما کا دوسرا جنم بھی نہیں ہے اور محض گنڈھپ کے طلسم کی وجہ سے اسے لاما کی شکل دے دی گئی ہے۔ عمیکا کو یہ بھی معلوم تھا کہ بہت جلد اس کا سر کاٹ کر خانقاہ کے مقدس تالاب میں گرا دیا جائے گا' اور پھر گنڈھپ کے ساتھ ساتھ عمیکا بھی ہمیشہ کی جوانی حاصل کر لے

گی۔ اس کے باوجود اسے اس وقت عاطون پر بڑا ترس آیا' وہ اس کی غیر فانی طاقت سے بھی آگاہ تھی' مگر عمبکا کو یقین تھا کہ دیوتاؤں کی مدد سے عاطون کی بے پناہ غیر فانی طاقت زائل کر دی جائے گی۔

"عمبکا! اتنی دیر کہاں تھیں؟ پہلے کیوں نہ ہمارے پاس آئیں۔ ہمیں تم پسند ہو۔"

عمبکا نے ادب سے کہا' "عظیم پیشوا! میں تو آپ کی باندی ہوں' جب سے آپ کو دیکھا ہے' تب سے آپ کی سیوا کرنے کو بے تاب تھی' لیکن سنچال مجھ پر بازی لے گئی۔ اب وہ بیمار ہوگئی ہے اور راہب اعظم نے مجھے آپ کی خدمت کے لیے بھیجا ہے۔ میں اب ہمیشہ کے لیے آپ کی باندی ہوں۔"

عاطون بہت خوش ہوا' وہ بھی یہی چاہتا تھا' اس نے عمبکا کو بڑے احترام کے ساتھ بٹھایا اور اس سے پیار محبت کی باتیں کرنے لگا۔ عاطون اس قسم کی گفتگو کو تقریباً بھول سا گیا تھا' لیکن اس کے دل کے کسی کونے میں وحشی بھارتہ کا دھیما سا پرتو اب بھی باقی تھا' مگر عمبکا سنسنی خیز بنی ہوئی تھی۔ عاطون کی طرف سے متوقع کسی بھی بات سے پہلے عمبکا نے بڑی مکاری سے اپنا سر عاطون کے قدموں پر رکھ دیا اور معذرت طلب لہجے میں کہا کہ ایک دن کے لیے اسے معاف کر دیا جائے۔ عاطون سمجھ گیا۔ اس نے عمبکا کو تسلی دی اور اس سے راز و نیاز کی باتیں کرنے لگا۔

تبت کی سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی وادی رات کے یخ اندھیرے میں گم تھی۔ برف مسلسل گر رہی تھی۔ ہوا سیٹیاں بجاتی برفانی تودوں اور ٹیلوں سے سر پٹختی گزر رہی تھی۔ عین اس وقت بدنصیب سنچال اپنی جان بچانے کے واسطے دور ایک برفانی تودے کے غار میں دبکی بیٹھی تھی۔ خانقاہ سے فرار ہونے کے بعد وہ برف پوش گھاٹیوں اور ٹیلوں میں گھومتی رہی شام کو جب دھند گہری ہوگئی اور برف گرنے لگی تو اسے ایک برفانی تودے میں ایک غار نما کھوہ دکھائی دیا' تو وہ پناہ لینے کے لیے اس میں گھس کر بیٹھ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ گنڈھپ کے خاص آدمی اس کی تلاش میں نکل چکے ہوں گے۔ ایک بات کی اسے تسلی تھی کہ برف گرنے سے اس کے قدموں کے نشانات غائب ہو چکے تھے اور سپاہی اس کے قدموں کا سراغ نہیں پا سکتے تھے۔ تاہم وہ شاہی محل اور خانقاہ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ برفانی رات میں سپاہیوں کے وہاں آنے کا امکان کم تھا پھر بھی وہ صبح ہونے سے پہلے پہلے وہاں سے نکل بھاگنا چاہتی تھی۔ سردی سے اس کا جسم ٹھٹھر رہا تھا۔ تبت کا برف پوش پہاڑی سلسلہ شمال میں منگولیا کے صحرا تک پھیلا تھا اور یہ راستہ پیدل چل کر عبور کرنا ناممکن تھا۔ سردی اور

بھوک پیاس سے وہ بہت جلد دم توڑ جائے گی۔ یہی سوچ سوچ کر اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے دل میں مرحوم لاما کا تصور کیا اور اس سے مدد کی دعا مانگی' لیکن لاما کا چہرہ پھر اسے دکھائی نہ دیا۔ اسے خیال آیا کہ روحیں' دنیاوی معاملات میں ایک خاص حد تک ہی دخل دے سکتی ہیں۔ اس سے آگے انہیں کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ سنچال دیوتاؤں کو یاد کرنے لگی۔

یونہی ٹھٹھرتے ہوئے خوف کے عالم میں اس نے رات برفانی غار میں ہی کاٹ دی۔ صبح کی روشنی پھیلی تو اس نے غار کے دہانے پر آ کر باہر دیکھا' تو چاروں طرف برف ہی برف پھیلی تھی' مگر اب برف گرنا بند ہوگئی تھی۔ سنچال کو گنڈھپ کے محافظ سپاہیوں کے آنے کا دھڑکا لگا تھا۔ چنانچہ اس نے نشیب میں شمال کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ سنچال کا بچپن ان وادیوں سے دور منگولیا کے سرحد کے قریب گزارا تھا اور وہ اس علاقے سے اتنی واقف نہیں تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں اس کا باپ اسے چند سکوں کے بدلے راہبوں کی خانقاہ میں چھوڑ گیا تھا۔ تب سے لے کر اب تک وہ مختلف راہبوں کی منظور نظر بنتی گنڈھپ تک پہنچی تھی اور اسے خانقاہ کی حدود سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان پہاڑیوں کو اس نے خانقاہ کے برآمدوں اور کھڑکیوں میں سے ہی دیکھا تھا۔

اب جب کہ اسے جان کے لالے پڑے تھے' تو وہ منہ اٹھائے شمال کی طرف نرم نرم برف میں پنڈلیوں تک دھنسی چلی جا رہی تھی۔ ہوا میں تلوار کی سی کاٹ تھی۔ سنچال نے پوستین کی فر سے اپنے آدھے چہرے اور سر کو ڈھانپ رکھا تھا' وہ کوہ ہمالیہ کی ہڈیوں کو جما دینے والی سردی کی عادی تھی۔ اس کے باوجود وہ یوں تن تنہا برف کی وادیوں میں پہلے کبھی نہیں نکلی تھی۔ چلتے چلتے وہ دو پہاڑی تودوں کے درمیان میں آ گئی' اور ایک تودے کے پہلو سے اس کے قدموں کی باقاعدہ ایک پگڈنڈی سی بنتی جا رہی تھی' جو اسے گرفتار کروانے کے لیے کافی تھی' وہ اس نشان کو مٹا بھی نہیں سکتی تھی۔ رات بھر کی گری ہوئی تازہ برف نرم تھی اور تیز ٹھنڈی ہوا میں اسے شام کے وقت جا کر کہیں سخت ہونا تھا۔ چڑھائی کے بعد پھر برفانی ڈھلان آ گئی۔ چلنے سے سنچال کے جسم میں کچھ حدت آ گئی تھی اور شدید سردی کا احساس ہو گیا تھا' لیکن اسے کسی ایسی جگہ پناہ لینے کی ضرورت تھی کہ جہاں گنڈھپ کے آدمی اس تک نہ پہنچ سکے۔

ایسی جگہ ان پہاڑوں کے پار منگولیا کے صحرا میں ہو سکتی تھی' لیکن وہاں تک سنچال کا سواری' پانی اور روٹی کے بغیر پہنچنا ناممکن تھا۔ خوف کے مارے اسے ابھی بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ پیاس محسوس ہوتی تو اس نے تھوڑی سی برف منہ میں ڈال کر اسے چوسنا شروع

کر دیا۔ یونہی برف میں ست رفتاری سے قدم قدم چلتے سنچال ایک ایسی جگہ پہنچی، جہاں برفانی ٹیلوں کے درمیان ایک طرف گہری گھاٹی تھی۔ گھاٹی میں نیچے تک برف ہی برف تھی، کہیں کہیں اسے چند ایک ٹنڈ منڈ چھوٹے درخت نظر آئے، وہ تھک گئی تھی۔ اس کا سانس پھول رہا تھا اور اب بھوک بھی تنگ کر رہی تھی، وہ رک گئی۔ اس نے گھاٹی میں ایک نگاہ ڈالی۔ اسے گھاٹی کی دیوار میں گھاس کی جھاڑیاں باہر کو نکلی نظر آئیں۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے، یہاں برفانی جنگلی پودا ایلوا لگا ہو، وہ اسے کھا کر اپنے پیٹ کی آگ کچھ کم کر سکتی تھی۔ گھاٹی میں ایک ڈھلانی راستہ جاتا تھا۔ یہ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ اس راستے کی طرف اس نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ اچانک اسے اپنے پیچھے برف کی دھند میں برفانی کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ سنچال کا دل دھک سے رہ گیا۔ گنڈھپ کے آدمی برفانی سراغ رساں کتوں کو لے کر اس کی تلاش میں چلے آ رہے تھے۔ کتوں کو سنچال کا لباس سنگھا دیا گیا تھا، اور وہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ برف میں بنی ہوئی پگڈنڈی بھی ان کی راہنمائی کر رہی تھی۔ سنچال کا دل خوف سے دھک دھک کرنے کرنے لگا۔ اسے اور تو کچھ نہ سوجھا، وہ بے اختیار گھاٹی کے ڈھلانی راستے پھسل پڑی۔ برف میں پھسلتی ہوئی وہ سوکھے ٹنڈ منڈ درختوں کے پاس جا کر رک گئی، یہاں برف ہموار تھی۔ اس نے دیکھا کہ درختوں کے پیچھے ایک برفانی غار کا منہ کھلا تھا۔

کتوں کی آواز قریب آ رہی تھی۔ اب سنچال کو آدمیوں کی للکاریں بھی سنائی دینے لگی تھیں، وہ غار میں گھس گئی اور وہیں پتھروں کے پیچھے چھپ کر باہر کی طرف تکنے لگی۔ اسے یقین ہوگیا کہ اب وہ بچ نہیں سکتی۔ موت اس کی آنکھوں کے آگے ناچ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اپنے ماں باپ کو یاد کر کے آنسو آ گئے۔

اتفاق سے یہی وہ گپھاہ تھی، جس کے اندر بڑے بڑے پتھروں کے پیچھے پدم ناگ سفید سانپ کی شکل میں کنڈل مارے بیٹھا کئی مہینوں سے مراقبے میں محو تھا۔ مہینوں سے اس نے کبھی کوئی آہٹ تک نہیں سنی تھی، جب اسے پہلی بار کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی تو اس نے ناگواری سے اپنا سر اٹھا کر اپنی گردن اونچی کی اور گڑھے میں سے باہر دیکھا، اس وقت سنچال گھبراہٹ کے عالم میں غار میں داخل ہو کر پتھروں کے پیچھے چھپ رہی تھی۔

پدم ناگ سمجھ گیا کہ یہ عورت کسی مصیبت میں گرفتار ہے اور برفانی کتے اس کی تلاش میں آ رہے ہیں، پھر پدم ناگ کو انسانوں کی للکاریں سنائی دیں۔ اس نے اپنی گردن نیچی کر لی، وہ سوچنے لگا کہ یہ عورت کون ہے جس کے پیچھے اسے کے دشمن لگے ہیں۔ کوئی بھی ہو؟ اسے اس وقت پدم ناگ کی مدد کی ضرورت تھی، یہ سوچ کر پدم ناگ نے فوراً انسانی

شکل اختیار کی اور گڑھے سے باہر آ گیا۔

جب گنڈھپ کے سپاہیوں اور کتوں کی آوازیں غار کی طرف آنے لگیں تو سنچال غار کے منہ کے قریب سے اٹھ کر غار میں پیچھے کی طرف دوڑی کہ شاید پیچھے کوئی راستہ غار سے باہر جاتا ہو، جونہی وہ غار کے عقب میں آئی وہ چیخ مار کر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے ایک اونچا لمبا مرد کھڑا تھا۔ جس کے سیاہ گھنگریالے بال اس کے کاندھے پر گرے تھے اور جس نے لمبا سیاہ چغہ پہن رکھا تھا، یہ پدم ناگ تھا۔ پدم ناگ نے بڑی شفقت سے سنچال کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا، بہن گھبراؤ نہیں، لیکن یہ لوگ کون ہیں، کیا تمہارے رشتے دار ہیں، کوئی تم گھر چھوڑ کر بھاگی ہو؟"

سنچال نے لڑکھڑاتی ہوئی خوفزدہ آواز میں کہا، وہ..... وہ مجھے مار ڈالیں گے، وہ میرے...... وہ میرے دشمن ہیں مہاراج!"

سنچال، پدم ناگ کو کوئی برہمن جوگی سمجھ رہی تھی، جو اکثر ہمالیہ کی گپھاؤں میں عبادت میں محو رہتے تھے۔ پدم ناگ نے اپنے گڑھے کی طرف اشارہ کر کے سنچال سے کہا، کہ وہ وہاں اتر کر چھپ جائے۔

پدم ناگ اب غار کے منہ کے پاس آگیا۔ برفانی کتے شور مچاتے وہاں پہنچ گئے تھے۔ گنڈھپ کے آدمی ابھی پیچھے گھوڑوں پر بیٹھے سنبھل سنبھل کر انہیں ڈھلان پر چلاتے آ رہے تھے۔ پدم ناگ نے ایک گہرا سانس اوپر کو کھینچ کر چھوڑا تو وہ انسان سے ایک دیو قامت قوی الجثہ اژدہا بن گیا، جس کے بہت بڑے بھیانک منہ میں سے دہشت ناک پھنکاروں کے ساتھ زرد اور سرخ آگ کے شعلے لپک رہے تھے۔ پدم ناگ نے ان شعلوں کا رخ کتوں کی طرف کر دیا۔ تین کتے آن کی آن میں شعلوں کی لپیٹ میں آ کر وہیں بھسم ہوگئے۔ باقی دم دبا کر پیچھے کو بھاگے پیچھے گنڈھپ کے سات سپاہی گھوڑوں پر سوار تلواریں ہاتھوں میں لیے آ رہے تھے۔

انہوں نے کتوں کو دم دبا کر بھاگتے دیکھا تو انہیں للکارا۔ اب جو ان کی نگاہ غار پر پڑی تو ایک بہت بڑا اژدہا منہ سے آگ کے کئی کئی فٹ شعلے برساتا، پھنکارتا ہوا ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گھوڑوں پر کپکپی طاری ہوگئی، وہ بدکے اور پھر الف ہوگئے۔ سوار نیچے گر پڑے۔ گھوڑے جدھر کو منہ اٹھا بھاگ گئے۔ سوار ابھی سنبھل ہی رہے تھے کہ اژدہا ان کے سر پر پہنچ گیا۔ چار سپاہی اژدہے کے شعلوں کی لپیٹ میں آ کر جلنے لگے۔ تین آدمیوں نے گھاٹی میں ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ اژدہا رینگتا ہوا گھاٹی کی تہ میں آ گیا، باقی ماندہ سپاہی جان بچا کر بھاگ رہے تھے کہ اژدہے کے شعلے بجلی کی طرح کڑک کر ان پر گرے اور تھوڑی ہی

دیر بعد ان تینوں جلی ہوئی لاشیں بھی برف کے پگھلتے ہوئے پانی میں ڈوب چکی تھیں۔

پدم ناگ تیزی سے رینگتا ہوا واپس چلا۔ غار کے منہ پر آتے ہی اس نے اپنا سانس اندر کو کھینچ کر چھوڑا تو دوبارہ انسانی شکل میں آ گیا' وہ میں آہستہ آہستہ چلتا گڑھے کے پاس آیا اور آواز دے کر سنچال سے کہا باہر آ جاؤ۔ دشمن بھاگ گئے ہیں۔ سنچال کو اس برہمن جوگی کی بات کا یقین نہ آیا۔ پدم ناگ نے سنچا کو ہاتھ سے پکڑ کر گڑھے سے باہر نکالا اور غار کے باہر لے جا کر کتوں اور باقی سپاہیوں کی جلی ہوئی سیاہ لاشیں دکھائیں۔ سنچال مزید حیرت و استعجاب میں ڈوب گئی۔ پدم ناگ نے اس کی حیرانگی کو رفع کرنے کے لیے کہا' "بہن! میں ایک تپسوی جوگی ہوں۔ برسوں کی ریاضت سے مجھ میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ اگر غصے میں آ کر ایک خاص منتر پڑھ کر پھونکوں تو آگ لگ جاتی ہے۔ میں نے اسی آگ میں تمہارے دشمنوں کو بھسم کیا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور یہ لاما کے سپاہی تیرے پیچھے تجھے مارنے کیوں آ رہے تھے؟"

سنچال نے پدم ناگ کے پاؤں' ہاتھوں سے چھو کر ہاتھ اپنے ماتھے پر لگائے اور پدم ناگ کو اپنی داستان غم سناتے ہوئے بتایا کہ روایات کے مطابق لاما لاولد ہوتا ہے اور مرنے کے بعد وہی لاما اپنے دوسرے جنم میں شاہی تخت پر براجمان ہوتا ہے' مگر اس دفعہ ایسا نہ ہو سکا۔ اس لیے گنڈھپ راہب اعظم اس کا دشمن ہو گیا اور اسے مروانا چاہتا ہے' پھر اس نے پدم ناگ سے نئے لاما کے خلاف اسے گھناؤنی سازش کا بھی ذکر کیا جس میں گنڈھپ کسی وجہ سے ناکام رہا تھا۔

پدم ناگ نے یہ سب کچھ اطمینان سے سنا اور سنچال سے پوچھا' کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہے۔ سنچال نے منگولیا میں اپنے عزیزوں رشتے داروں کے پاس جانے کی خواہش کا اظہار کیا' تو پدم ناگ سوچ میں پڑ گیا۔ منگولیا وہاں سے کافی دور تھا اور پدم ناگ اپنے مراقبے کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ اس نے سنچال سے کہا' "اگر تم پسند کرو تو میں خود لاما کے پاس جا کر تمہیں اس کے حوالے کیے دیتا ہوں۔ لاما تبت کا بادشاہ بھی ہے اور دھرمی دیوتا بھی' وہ تمہیں اپنی حفاظت میں لے لے گا۔"

سنچال پاؤں چھو کر بولی' "مہاراج! مجھے ایسا لگتا ہے کہ خود لاما کی زندگی خطرے میں ہے۔ گنڈھپ ایک گہرا سازشی انسان ہے۔اس کے دل میں کیا ہے' کسی کو معلوم نہیں' مجھے محسوس ہوا ہے کہ وہ لاما کی زندگی کے خلاف بھی کوئی گھناؤنی سازش کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں مقدس لاما مجھے گنڈھپ کے انتقام سے نہیں بچا سکے گا۔

پدم ناگ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا پھر بولا' "ایسی بات ہے تو پھر تم اس گپھاہ

میں چند روز قیام کرو' میں دوسری گپھاہ میں جا کر مراقبہ کر لوں گا۔"

سنچال نے سہمی ہوئی آواز میں اس خدشے کا اظہار کیا کہ گنڈھپ کے آدمی اس کی تلاش میں پھر آ گئے تو اسے تیروں سے چھلنی کر دیں گے۔

پدم ناگ نے کہا' اس کی تم فکر نہ کرو' اس گپھاہ کے منہ پر میں ویدک منتروں کا دم کر دوں گا' کوئی انسان سوائے میرے اس گپھاہ میں داخل نہ ہو سکے گا۔

سنچال' پدم ناگ کے ویدک منتروں کا کرشمہ دیکھ چکی تھی' وہ راضی ہو گئی۔ اس گپھاہ کے ساتھ ہی ایک دوسری گپھاہ تھی۔ پدم ناگ نے سنچال کو ہدایت کی کہ وہ کسی حالت میں بھی وہاں سے باہر قدم نہ رکھے۔ اس کے بعد اس نے ایک برف کھودی اور اس کے نیچے سے کچھ جڑیں نکال کر سنچال کو کھلائیں' جن سے اس کی بھوک اور پیاس بھی جاتی رہی اور اس کی کھوئی ہوئی طاقت بھی بحال ہو گی..... پدم ناگ ساتھ والی گپھاہ میں چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے سنچال والی گپھاہ کے باہر ایک ایسا ویدک منتر پڑھ کر پھونک دیا کہ اگر کوئی چڑیا بھی اندر داخل ہو تو اس کی لہروں کا تموج پدم ناگ کے جسم سے ٹکرا کر اسے خبردار کرے۔

پدم ناگ نے دوسری گپھاہ میں جاتے ہی سانپ کی جون بدلی اور مراقبے میں گم ہو گیا۔

دوسری جانب جب شام ہو گئی اور گنڈھپ کے آدمی واپس نہ آئے تو اسے فکر دامن گیر ہوئی' وہ یہ سوچ کر چپ رہا کہ ہو سکتا ہے' وہ لوگ سنچال کی تلاش میں دور گئے ہوں۔ گنڈھپ کے سامنے ایک اس سے بھی اہم مرحلہ تھا اور یہ مرحلہ عاطون لاما کی غیرفانی طاقت کو وقتی طور پر زائل کر کے اس کے سر کو قلم کرنے کا تھا۔ زرد سانپ کا عرق تیار ہو گیا تھا۔ اس نے اس کے چند قطرے تانبے کی ایک چھوٹی سی شیشی میں ڈال کر عمیکا کو دیے اور کہا' "آج کی رات تمہارے امتحان کی رات ہے' اگر تم اس میں کامیاب ہو گئیں' تو نہ صرف یہ کہ تم ہمیشہ کے لیے امر ہو جاؤ گی' بلکہ تبت کی ملکہ بھی بن جاؤ گی۔ یاد رکھو تم سے ذرا سی بھی چوک ہو گئی تو پانسہ پلٹ جائے گا' پھر اگر عاطون لاما کی زد سے نکل گئیں تو میں تمہیں کسی حالت میں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا' کیونکہ اس کھیل میں تم ہی میری ایک رازدار ہو' اور ناکامی کی صورت میں' میں سب سے پہلے تمہیں ہلاک کروں گا۔"

عمیکا خوفزدہ بھی تھی اور پر اشتیاق بھی.... ایک طرف موت تھی' تو دوسری طرف ہمیشہ کی دل آویز جوانی' بڑھاپے اور موت سے نجات کے علاوہ تبت کی بادشاہی بھی

نجی۔ اس نے گنڈھپ کے ہاتھوں کو چوم کر ماتھے سے لگایا اور قسم کھا کر کہا کہ اس سے ہرگز کسی قسم کی چوک نہیں ہوگی' اور وہ آج کی رات آزمائش پر پوری اترے گی۔ راہب گنڈھپ نے اسے آشیر وادی اور سولہ سنگھار کر کے عاطون لاما کی خواب گاہ میں جانے کی ہدایت دے کر کہا' "میں آدھی رات کے بعد خواب گاہ میں پہنچ جاؤں گا' تمہیں اس وقت تک لاما کی ناف میں ویدک عرق کے قطرے ٹپکا کر اس طاقت کو بے اثر کر دینا ہوگا؟؟"

عمیکا نے کہا' "اگر اس کی آنکھ کھل گئی تو کیا کروں گی؟؟"

گنڈھپ بولا۔ "جونہی اس عرق کے دو قطرے لاما کی ناف پر گریں گے۔ ان کا پہلا چمتکار یہ ہوگا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گا' اس لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' بس تمہیں کسی نہ کسی طرح ان قطروں کو لاما کی ناف پر گرا دینا ہوگا۔ چلو رات ہو رہی ہے۔ اب تم تیاری کرو۔"

گنڈھپ چلا گیا اور عمیکا سولہ سنگھار میں مصروف ہوگئی۔

عاطون لاما اس وقت خانقاہ کے استھان پر بیٹھا راہبوں' پجاریوں اور امراء سے پوجا کے تحائف وصول کر رہا تھا' مگر اس کا دل عمیکا کی طرف لگا تھا۔ عمیکا آج رات اس پر اپنی محبت نچھاور کرنے والی تھی' وہ جلدی سے جلدی اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر اس کا انتظار کرنا چاہتا تھا' لیکن خانقاہی رسومات کی ادائیگی بھی بہت ضروری تھی۔ آخر رات کا پہلا پہر ہوا تو وہ راہبوں کے جلوس کے ساتھ اپنی خواب گاہ کی طرف چل پڑا۔ دیوداسیاں اس کی راہ میں پھول نچھاور کر رہی تھیں۔ خانقاہ کے برآمدوں میں راہب ڈفلیاں بجا کر بھجن گا رہے تھے۔

معمول کے مطابق دیوداسیوں نے عاطون کو...... عطریات میں بسی ہوئی شب خوابی کی نئی پوشاک دی اور خوابگاہ میں چھوڑ کر رخصت ہوگئیں۔ عاطون نے شمعوں کی روشنی دھیمی کر دی اور اپنی محبوب دل نواز عمیکا کا بے تابی سے انتظار کرنے لگا۔ باہر بادلوں میں گرج کی آواز گونجی' عاطون نے اٹھ کر کھڑکی کے آگے سے بھاری مخملیں پردہ ہٹایا اور کھڑکی کھول کر دیکھا۔ اندھیری رات میں آس پاس سفید پہاڑیوں کے پھیکے خاکے ابھر ہوئے تھے۔ آسمان پر گھٹا ٹوپ بادل چھائے تھے اور ان میں کسی وقت بجلی چمک جاتی۔ عاطون نے کھڑکی بند کر کے پردہ چھوڑ دیا اور مسہری کی طرف مڑا۔

اچانک اسے پھنکار کی ہلکی سی آواز سنائی دی' وہ اس آواز کو خوب پہچانتا تھا' یہ کوئی سانپ تھا۔ عاطون نے قالین پر نگاہ دوڑائی۔ اس نے ایک زرد رنگ کے سانپ کو دیکھا' جو اپنا پھن اٹھائے قالین پر اس کی طرف رینگ رہا تھا۔ سانپ نے اپنا پھن جھکا کر تعظیم کیا اور

اپنی زبان میں بولا' "پدم ناگ دیوتا کے قابل احترام دوست! میں آپ کو ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہ کرنے آیا ہوں۔"

عاطون پلنگ پر بیٹھ گیا۔ "خطرہ! کون سا خطرہ؟" اس نے سانپ ہی کی زبان میں سوال کیا۔ زرد سانپ رینگتا ہوا عاطون کے پاؤں کے قریب آگیا۔ اس نے اپنا پھن پیچھے کو جھکاتے ہوئے کہا۔

"مقدس لاما! جس زرد سانپ نے آپ کو ڈسنے کی جسارت کی تھی' وہ میرا چھوٹا بھائی تھا۔ افسوس اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔"

عاطون نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا' "اسے کیا ہوگیا تھا؟"

زرد سانپ بولا۔ "مقدس ہستی! اسے گنڈھپ راہب نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کے مردہ جسم سے ایک خاص عرق کشید کیا ہے' جس کے دو قطرے اگر آپ کی ناف پر گرائے جائیں' تو آپ کی غیر فانی قوت کچھ وقت کے لیے زائل ہو جائے گی۔"

عاطون کے کان کھڑے ہوگئے۔ "گنڈھپ نے ایسا کیوں کیا؟"

زرد سانپ بولا' "اس لیے کہ وہ آپ کی طاقت زائل کرنے کے بعد آپ کا سر کاٹ کر مقدس تالاب میں پھینکنا چاہتا ہے۔ ایسا کرنے سے اسے اور آپ کی چہیتی دیوداسی عمیکا کو ہمیشہ کی زندگی حاصل ہو جائے گی۔ عمیکا اس خطرناک عرق کی شیشی لے کر آپ کے پاس آنے ہی والی ہے' چونکہ آپ ہمارے ناگ دیوتا کے دوست ہیں' اس لیے آپ کو خبردار کرنا میرا فرض تھا۔ اب میں جاتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر سانپ گھوما اور تیزی سے رینگتا ہوا واپس چلا گیا' اس کے جانے کے بعد عاطون اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اسے مکار گنڈھپ کی نیت پر پہلے ہی شبہ تھا۔ افسوس اسے اس بات کا تھا کہ جس عورت سے وہ محبت کرنے لگا تھا' وہ بھی اس سازش میں برابر کی شریک تھی اور اس کی جان کے درپے تھی۔ عاطون آتش دان کے پاس رک کر کچھ سوچنے لگا

اس کے کانوں میں کسی دیوداسی کے پاؤں میں پڑی پائل کی ہلکی ہلکی نقرئی جھنکار کی آواز آئی۔ اس نے پلٹ کر دروازے پر گرے بھاری ریشمی پردے کی طرف دیکھا۔ یہ پائل کی آواز عمیکا کی تھی۔ پردہ ایک طرف ہٹا اور اس کے سامنے حسین دیوداسی عمیکا اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ عمیکا ہاتھ باندھ کر جھکی اور پھر ادائے خاص سے چلتی عاطون کے پاس آ کر ادب سے سر جھکائے کھڑی ہوگئی۔

باہر بادل زور سے گرجے۔ سرد اندھیری رات میں چلنے والی تیز یخ بستہ ہواؤں کا

دھیما دھیما شور سنائی دے رہا تھا۔ عاطون نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ عمیکا کا خیر مقدم کیا اور اس کا حنائی خوشبودار نیم گرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ عمیکا آج ایک خونی منصوبہ دل میں لیے وہاں آئی تھی۔ قاتل عرق کی چھوٹی سی شیشی اس نے اپنے لباس میں چھپا رکھی تھی۔ عاطون سب کچھ سمجھ رہا تھا۔ قدرتی طور پر عمیکا آج عاطون پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو رہی تھی‘ کچھ دیر تک وہ محبت بھری باتیں کرتی رہی‘ پھر عاطون نے ظاہر کیا کہ اسے نیند آ رہی ہے اور وہ پلٹ کر سیدھا لیٹ گیا۔ عمیکا عاطون کا سر دباتے ہوئے عاطون کے گہری نیند میں کھو جانے کا انتظار کرنے لگی۔ عاطون بھی غافل نہیں تھا۔ اس نے بہت جلد خراٹے لینے شروع کر دیئے۔

عمیکا کو اسی لمحے کا انتظار تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنی کمر میں لباس کے نیچے چھپائی پیتل کی چھوٹی سی شیشی نکالی۔ بے حد احتیاط کے ساتھ عاطون کی ناف پر سے کپڑا ہٹا دیا‘ وہ شیشی میں سے عرق کے قطرے عاطون کی ناف میں گرانے ہی والی تھی کہ عاطون نے آنکھیں کھولیں اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”یہ کیا کر رہی ہو عمیکا□“

عمیکا کا رنگ زرد ہوگیا۔ عاطون اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عمیکا نے فوراً“ کہا‘ ” مقدس لاما! یہ ایک خاص دیوتاؤں کا تیل ہے‘ میں آپ کے مقدس بدن پر اس کی مالش کرنا چاہتی تھی۔“

عاطون نے شیشی اپنے ہاتھ میں لے لی اور عمیکا کی طرف پیار بھری مگر انتہائی ذومعنی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا“ عمیکا اگر یہ تیل مقدس دیوتاؤں کا تحفہ ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اسے تم پر استعمال کروں۔“

عمیکا کے منہ سے خوف کے مارے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ عاطون نے اسے بازو سے پکڑ کر ذرا سا آگے کو کھینچا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا‘ ”کیوں! تم گھبرا کیوں گئی ہو عمیکا! یہ تو مقدس تیل ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ میں نے اس کی مالش کا تمہیں حق دیا ہے۔“

عمیکا کا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس کا حلق خشک ہوگیا تھا‘ وہ جانتی تھی کہ راز فاش ہو چکا ہے اور وہ عاطون کے آگے بے بس ہے۔ عاطون نے عمیکا کو پلنگ پر گرا لیا۔ اس کی گردن پر گھٹنا رکھ کر دبایا اور شیشی کھول کر عرق کے دو قطرے عمیکا کی زبان پر گرا دیئے۔ عمیکا کی گردن دبی ہوئی تھی۔ اس کے حلق سے دبی ہوئی چیخ کی آواز نکلی جو عاطون کی خواب گاہ سے باہر نہ جا سکی۔ عرق کے زبان پر گرنے کے چند ہی

سیکنڈ بعد عمیکا بے ہوش ہوگئی۔ عاطون نے عرق کی شیشی کو بستر کے نیچے چھپا دیا اور عمیکا کو اس طرح پلنگ پر لٹا دیا جیسے وہ سو رہی ہو۔ اس کے بعد وہ خود بھی لیٹ گیا۔ عاطون نے جان بوجھ کر اپنے پیٹ پر سے ذرا سا کپڑا کھسکا رکھا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں نیم وا کر رکھیں تھیں اور یوں پڑا تھا‘ جیسے بے ہوش ہوگیا ہو۔ عاطون کو معلوم تھا کہ مکار راہب گنڈھپ اپنے خونی منصوبے کے دوسرے مرحلے پر عمل کرنے کے لیے وہاں ضرور آئے گا۔

خواب گاہ میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ شمع دان میں شمع کی دھیمی لو روشن تھی۔ آتش دان میں انگاروں کی آنچ مدھم ہوگئی تھی۔ رات کا دل بھی جیسے آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ باہر بادلوں کی گرج معدوم ہوگئی تھی۔ صرف تیز ہوا کا ہلکا ہلکا سرگوشیوں جیسا شور سنائی دے رہا تھا۔ عاطون کی نیم وا آنکھیں سامنے دروازے کے بھاری پردے پر لگی تھیں۔ وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا‘ پھر دروازے کے پردے میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی‘ اور پردے کے پیچھے سے راہب گنڈھپ کا منڈا ہوا گول سر نمودار ہوا۔ یہ سر ایک پل کے لیے وہیں ساکت رہا۔ گنڈھپ انتہائی ہوشیاری سے عاطون اور عمیکا کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ حالات سازگار ہیں تو وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ سیدھا عاطون کے سرہانے کی جانب آیا‘ عاطون نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور خود کو بے ہوش بنا لیا تھا۔ گنڈھپ نے سب سے پہلے عاطون کی ناف پر نگاہ ڈالی۔ اس کے چہرے پر تشویش تھی‘ کیونکہ عمیکا بھی ہوش میں نہیں تھی۔ گنڈھپ نے عاطون کے سینے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیا‘ پھر اس کے سر کو ہلایا‘ جب اسے یقین ہوگیا کہ عاطون بے ہوش ہوچکا ہے‘ تو اس نے اس کی گردن کے گوشت کو انگلی سے دبایا۔ گوشت سخت نہیں تھا۔ گنڈھپ کے منصوبے کا پہلا مرحلہ کامیاب ہو چکا تھا۔

اب اس نے عمیکا کو بیدار کرنے کی کوشش کی‘ مگر وہ بے سدھ پڑی تھی۔ گنڈھپ نے یہی خیال کیا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہوگئی ہوگی‘ لیکن چونکہ عاطون بے ہوش تھا‘ اور اس کی غیر فانی طاقت اس کے خیال کے مطابق کچھ وقت کے لیے زائل ہو چکی تھی‘ اس لیے اسے اطمینان تھا۔ عمیکا کی اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ گنڈھپ نے زمین پر دوبارہ پاؤں مارا‘ پردہ ہٹا اور گنڈھپ کے دو رازدار راہب ساتھی اندر آ گئے۔ گنڈھپ نے انہیں اشارہ کیا۔ دونوں راہبوں نے بے ہوش عاطون کو اٹھایا اور خواب گاہ سے باہر لے کر چلے۔ گنڈھپ نے عمیکا کو وہیں پڑے رہنے دیا۔ اس نے عرق کی شیشی عمیکا کے لباس میں تلاش کرنے کی کوشش کی‘ مگر وہ اسے نہ ملی۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ان

باتوں میں اپنا وقت ضائع کرتا' وہ تیز تیز قدم اٹھاتا خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔

عاطون کو خواب گاہ کے نیچے ایک تہ خانے میں لا کر پتھر کے چبوترے پر لٹا دیا گیا۔ گنڈھپ نے ایک بار پھر عاطون کے جسم کو ٹٹول کر دیکھا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ گنڈھپ نے اپنے ساتھی راہبوں کو اشارہ کیا۔ دونوں تہ خانے کے کونے کی طرف گئے۔ وہاں ایک تیز دھار تلوار نیام میں پڑی تھی۔ ایک راہب نے تلوار کو نیام میں سے نکال لیا اور قدم قدم چلتا عاطون کے سرہانے کی طرف آگیا۔ گنڈھپ اور دوسرا راہب عاطون کے پاؤں کے جانب کھڑے تھے۔ گنڈھپ نے آہستہ سے کہا' "اس کی گردن تن سے جدا کر دو۔"

اس حکم کو سنتے ہی راہب نے تلوار کے دستے کو دونوں ہاتھوں میں تھاما۔ تلوار کو اپنے سر کے اوپر تک لے گیا اور پوری طاقت سے عاطون کی گردن پر وار کر دیا۔ کھٹاک کی آواز کے ساتھ تلوار کا وار عاطون کی گردن پر پڑا اور تلوار کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ گنڈھپ دہشت زدہ ہو کر پیچھے کو ہٹا۔ راہب کے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی تلوار رہ گئی تھی' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے عاطون کی گردن کی طرف دیکھ رہا تھا' جہاں تلوار کے وار کا معمولی سا نشان بھی نہیں تھا۔

گنڈھپ گھبرا کر بولا' "دوسری تلوار لاؤ جلدی۔"

اتنے میں عاطون نے آنکھیں کھول دیں اور اچھل کر چبوترے سے اترا اور تہ خانے کے بند دروازے کے آگے کھڑا ہوگیا۔ گنڈھپ پر یہ بھیانک حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ عاطون کی طاقت زائل نہیں ہوئی۔ دونوں راہب گنڈھپ کے پیچھے کھڑے سہمی ہوئی خوفزدہ نظروں سے عاطون کو تک رہے تھے' وہ اس کی غیر معمولی طاقت سے دہشت زدہ تھے۔ گنڈھپ کی حالت بھی غیر تھی' وہ اپنی زندگی سے نا امید ہو چکا تھا' اسے یقین تھا کہ عاطون اب اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ عاطون نے گنڈھپ کی طرف تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا' "گنڈھپ تمہارا خونی منصوبہ مجھ پر فاش ہوگیا تھا' میں تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا' میں اگر چاہوں تو ایک لمحے کے اندر اندر تم تینوں کی ہڈیوں کا سرمہ بنا سکتا ہوں' لیکن میں تمہیں اور تمہارے دونوں ساتھیوں کو معاف کرتا ہوں' کیونکہ میں ناحق کسی کے خون سے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا' میں اس جنم میں کسی پچھلے جنم کا پرائشچت کر رہا ہوں۔ میں اس ہدایت کے ساتھ تم تینوں کو آزاد کرتا ہوں کہ آج سے اپنی ساری صلاحیتیں بدحال رعایا کی بہتری اور بھلائی کے لیے صرف کرنا۔ اس حقیقت سے تم تینوں بخوبی واقف ہو چکے ہو کہ تمہاری کوئی بھی سازش میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں تمہاری خونی سازشوں سے بہت بلند اور

طاقت ور ہوں۔ مجھے تمہارے دلوں کے بھید معلوم ہو جاتے ہیں اب اگر تم نے اپنے مضحکہ خیز امر جیون کے عمل کے لیے کوئی قدم اٹھایا تو میں خود اپنے ہاتھ سے تم تینوں کے سر تن سے جدا کر دوں گا۔ عمیکا میری خواب گاہ میں بے ہوش پڑی ہے' میں اسے اپنے حکم سے اسی وقت تبت سے جلاوطن کرتا ہوں۔ اسے اٹھا کر لے جاؤ اور صبح کا سورج اسے تبت کی حدود میں نہ دیکھے۔"

یہ کہہ کر عاطون نے تہ خانے کا دروازہ کھولا اور بڑے وقار سے قدم اٹھاتا ہوا باہر سرنگ میں نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد کچھ دیر تینوں راہب سکتے کے عالم میں اپنی جگہوں پر بت بنے کھڑے رہے' پھر گنڈھپ نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا' کہ وہ اپنی زبانیں ہمیشہ کے لیے بند رکھیں اور اس راز کو اپنے سینوں میں دفن کر دیں۔ گنڈھپ خاموشی سے تہ خانے سے چلا گیا۔ اپنی خواب گاہ میں پہنچتے ہی اس نے خفیہ دروازے کو کھولا اور زینہ اتر کر سرنگ نما راہداری سے ہوتا اس پتھریلی کوٹھری میں آگیا جہاں پراسرار مقدس کتاب چبوترے پر پڑی تھی۔ گنڈھپ نے چبوترے کے پاس جاتے ہی ڈنڈوت کیا۔ آنکھیں بند کر کے خاص منتر کو سات بار پڑھ کر چبوترے کو چوما۔ کتاب کو تین بار چھڑی سے چھوا اور کتاب کو ایک جگہ سے کھول دیا' وہ اپنے منصوبے کی ناکامی کے بعد مقدس کتاب کے دیوتاؤں سے مشورہ لینا چاہتا تھا۔

کتاب کھلی تو بائیں جانب والا چھال کا صفحہ خالی تھا۔ دائیں جانب والے صفحے پر یہ تحریر درج تھی۔

"تم خوش نصیب ہو کہ زندہ بچ گئے۔ عاطون احمق ہے کہ اس نے اپنے دشمن کو معاف کر دیا' لیکن عاطون ایک خاص وجہ سے ابھی تبت کے شاہی محل میں رہنا چاہتا ہے۔ یہ وجہ ہم تمہیں بتانے کے مجاز نہیں ہیں' کیونکہ عاطون پر ہم سے بھی اعلیٰ دیوتاؤں کی نظر ہے۔ ہم تمہیں صرف یہ مشورہ دے سکتے ہیں اب جب کہ تمہارا دشمن شاہی محل میں بدستور موجود ہے' تو کسی طرح اس کو شاہی خانقاہ کے پرانے کنوئیں تک لانے کی کوشش کرو۔ اگر تم عاطون کو اس کنوئیں میں گرانے میں کامیاب ہوگئے تو تم اپنے مقصد کو حاصل کر لو گے' کیونکہ کنواں ہی ایک ایسی جگہ ہے' جہاں سے غیر فانی طاقت رکھنے والے عاطون بھی باہر نہیں نکل سکتا' لیکن اس کے لیے تمہیں انتہائی احتیاط سے کام لینا ہو گا' اگر عاطون کو ذرا سا بھی شک پڑ گیا تو تمہاری خیر نہیں۔"

اس کے آگے کتاب کا صفحہ خالی تھا۔

گنڈھپ نے کتاب بند کر دی۔ تین بار کتاب کو بوسہ دیا اور ادب سے اٹھ کر واپس

چلا۔ اس کے دل میں مقدس دیوتاؤں نے امید کی ایک نئی شمع روشن کر دی تھی۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ چاہے اسے اپنی جان پر کھیلنا پڑے' وہ عاطون کو خانقاہ کے کنوئیں میں گرا کر ہی دم لے گا' یہ کنواں ایک عرصے سے ویران پڑا تھا اور اتنا گہرا تھا کہ اس میں ہوا پانی ستارے کی طرح نظر آتا تھا۔

گنڈھپ نے یہ بھی طے کر لیا کہ اب وہ اپنے آپ کو عاطون کا بے حد وفادار اور جانثار ساتھی ثابت کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد کوئی ایسا منصوبہ تیار کرے گا کہ عاطون کو پرانے کنوئیں میں گرایا جا سکے۔ گنڈھپ کو اس بات کا یقین تھا کہ چونکہ خود اس کا رابطہ مقدس کتاب کے دیوتاؤں سے ہے' اس لیے عاطون اس کے دل میں چھپے ہوئے خیالات کا مشورہ حاصل نہیں کر سکتا' اور یہ بات صحیح بھی تھی۔ عاطون نے یونہی گنڈھپ کو خوفزدہ کرنے کے لیے ایسا کہہ دیا تھا۔

اگلے روز عمیکا کو ہوش آیا تو اس نے ساری روداد گنڈھپ کو سنا ڈالی۔ گنڈھپ نے کہا' "میں مجبور ہوں۔ عاطون لاما کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں جلا وطن کرتا ہوں۔"

عمیکا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گنڈھپ نے کہا' "تم بھی میری طرح خوش قسمت ہو کہ عاطون نے تمہیں جان سے نہیں مارا۔ تم اسی وقت ملک اندرابرست کی جانب کوچ کر جاؤ' جہاں تمہارے عزیزوں اور رشتے داروں کے مکان ہیں۔ یہ تمہیں میرا بھی حکم ہے۔"

اس روز عمیکا کو جلا وطن کر دیا گیا' اور گنڈھپ نے عاطون کو فوراً" یہ خوش خبری سنا دی کہ اس کے حکم کی تعمیل کر دی گئی ہے۔ گنڈھپ کو فکر لاحق تھی کہ اس کے ساتھ جو سنچال کو ہلاک کرنے گئے تھے۔ ابھی تک واپس نہیں آئے' کتوں میں سے کوئی واپس نہیں پہنچا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ پہاڑوں میں کس طرف نکل گئے ہیں کہ وہیں کھو کر رہ گئے۔

دوسری طرف عاطون گنڈھپ کو زیر فرمان کرنے کے بعد بہت حد تک مطمئن تھا۔ اب اسے اپنے رفیق' دیرینہ پدم ناگ کی تلاش کا خیال آیا۔ چنانچہ ایک روز اس نے گنڈھپ کو طلب کر کے کہا' کہ میں ملک تبت کی برف پوش وادیوں کی سیر کرنا چاہتا ہوں لیکن میں یہ سیر اکیلا اور بغیر کسی محافظ کے کروں گا۔ میرے پیچھے کوئی نہ آئے۔ گنڈھپ نے عاطون کو خوشامد اور اس کی ہر بات پر سر تسلیم کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ پس اس نے سر جھکا لیا اور کہا'

"مقدس لاما اعظم! آپ ہمارے لیے دیوتا سمان ہیں' آپ کی مرضی کے خلاف ہم ذرا سی بھی حرکت نہیں کر سکتے۔ آپ وادی کی سیر کو شوق سے تشریف لے جائیے۔"

چنانچہ ایک روز عاطون نے لمبا فرغل پہن کر سر کو اونی ٹوپی میں چھپایا اور گھوڑے پر سوار ہو کر شاہی محل کے عقبی دروازے سے نکل کر ہمالیہ کی برف پوش وادی کی طرف نکل گیا' وہ اپنے دوست پدم ناگ کی تلاش میں تھا۔ گنڈھپ نے بھی انتہائی عیاری سے کام لیتے ہوئے اپنے ایک قابل اعتبار اور زیرک ساتھی کو کسان کا بھیس بدلوا کر عاطون کے تعاقب میں روانہ کر دیا۔

گنڈھپ کا جاسوس عاطون کے تعاقب میں تھا۔

عاطون گھوڑے پر سوار اس سے کچھ فاصلے پر برفانی وادی میں چلا جا رہا تھا۔ تبتی جاسوس نے اپنے اور عاطون کے درمیان اتنا فاصلہ رکھا تھا کہ عاطون اسے دیکھ نہ سکے۔

تبتی لامہ کی راجدھانی کی نواحی برف پوش وادی کی ایک پہاڑی کھوہ میں پدم ناگ مراقبے میں محو تھا جبکہ ساتھ والے کھوہ میں سنچال چھپی بیٹھی تھی۔ اسے ہر لحظہ موت کا خوف لگا تھا۔ اگرچہ پدم ناگ کی جانب سے اسے حوصلہ بھی تھا کہ وہ اس کی جان بچا سکتا ہے' لیکن پدم ناگ ہروقت تو اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔

دن کا وقت تھا۔ کھوہ کے باہر گھنے سیاہ بادلوں کی وجہ سے روشنی کم تھی۔ سنچال گرم لبادے میں لپٹی ایک پتھر سے لگ کر بیٹھی تھی کہ گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی' جو سخت برف پر گھوڑے کے پاؤں پڑنے سے پیدا ہو رہی تھی۔ سنچال کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اٹھ کر کھوہ کے منہ پر آئی۔ اس نے دیکھا کہ سفید فرغل والا آدمی سر پر اونی ٹوپی ڈالے گھوڑے پر سوار اسی طرف چلا آ رہا ہے۔ وہ بھاگ کر پدم ناگ کی کھوہ میں چلی آئی۔

پدم ناگ کو پہلے ہی عاطون کی ہلکی ہلکی خوشبو آنے لگی تھی' جب سنچال نے اسے آکر بتایا کہ ایک گھڑسوار ادھر آ رہا ہے تو پدم ناگ نے خاموشی سے اپنا ہاتھ اٹھا کر سنچال کو ایک طرف بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ سنچال چبوترے کے پیچھے جا کر بیٹھ گئی۔ پدم ناگ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کھوہ سے باہر آگیا۔ اپنے سامنے گھوڑے پر عاطون کو سوار دیکھ کر پدم ناگ نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ دونوں دوستوں کے چہرے خوشی سے مسکرا رہے تھے۔

سنچال نے دونوں کو گلے ملتے اور پھر کھوہ میں داخل ہوتے دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی کہ نو وارد کوئی دشمن نہیں تھا' بلکہ عاطون تھا۔ سنچال نے بھی لامہ اعظم کو پہچان لیا تھا۔ عاطون نے پدم ناگ کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ پدم ناگ نے عاطون سے کہا۔

''میرے دوست! ہمیں تبت کے تخت سے کیا سروکار؟ کیوں نہ ہم سنچال کو لے کر یہیں سے قازقستان کی طرف روانہ ہو جائیں۔ سنچال کو اس کے ماں باپ کے ہاں پہنچا دیں گے اور اس کے بعد ہمیں جہاں تقدیر لے جائے گی چل دیں گے۔

عاطون نے کہا'' مجھے تمہاری تلاش تھی' میرے دوست! تم مل گئے ہو اب میں لامہ بن کر کیا کروں گا بھلا۔''

سنچال پہلے ہی سے اپنے ماں باپ کے ہاں جانے کو تیار بیٹھی تھی۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ پدم ناگ نے عاطون کو ایک طرف لے جا کر کہا وہ تو عقاب کی شکل اختیار کر کے ان کے ساتھ اڑتے ہوئے بھی سفر کر سکتا ہے' لیکن سنچال پر وہ اپنی اس خفیہ طاقت کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ مزید دو گھوڑوں کا بندوبست کر لیا جائے۔ عاطون بولا۔

''میں شاہی محل میں جاتا ہوں اور وہاں سے مزید دو گھوڑے لے آتا ہوں۔'' چنانچہ پدم ناگ اور سنچال کو غار میں چھوڑ کر عاطون شاہی محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

گنڈھپ کا جاسوس برابر عاطون کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس نے عاطون کو پہاڑی کے غار نما کھوہ میں داخل ہوتے دیکھا تو وہیں ایک چٹان کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جب عاطون کو شاہی محل کی جانب رخصت کرنے کے لیے پدم ناگ اور سنچال کھوہ سے باہر آئے تو جاسوس نے سنچال کو پہچان لیا۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ اسے سنچال ہی کی تلاش تھی جو اسے نظر آ گئی تھی۔ پدم ناگ کو اس نے کوئی معمولی راہب خیال کیا جو غار میں بیٹھا گیان دھیان کر رہا تھا۔

جب عاطون چلا گیا تو جاسوس سنچال کو اغوا کرنے کے خیال سے پدم ناگ کے غار کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنے لمبے فرغل میں ایک تیز دھار خنجر چھپا رکھا تھا۔ پہلے اس کا ارادہ یہی تھا کہ وہ شاہی محل میں جا کر گنڈھپ کو سنچال کی بازیابی کی خبر کر کے وہاں سے کمک اپنے ساتھ لائے لیکن پھر یہ سوچ کر اس ارادے کو ترک کر دیا کہ کیوں نہ وہ خود اس معرکے کو سر کرے اور یہاں گنڈھپ کے انعام و اکرام کا حقدار بنے' کیونکہ پدم ناگ اسے دبلا پتلا سا راہب ہی لگا تھا اور اس پر وہ بڑی آسانی سے قابو پا سکتا تھا۔

جاسوس نے گھوڑا وہیں چٹان کے عقب میں ہی چھوڑا اور برفانی چڑھائی چڑھتا اوپر کے غار کے دہانے کے قریب آ گیا۔ عین اس وقت جاسوس کی بد بختی سے پدم ناگ غار سے باہر نکلا۔ جونہی دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں جاسوس خنجر لہراتا ہوا اس پر حملہ آور ہو گیا۔ اگرچہ یہ بڑی بہادری کا کام تھا مگر جاسوس کی حماقت بھی تھی۔ اس حملے سے پدم ناگ کو شدید نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اگرچہ وہ نیم دیوتا سمان تھا مگر اس وقت آکاش کا راندہ ہوا تھا۔

اس پر آگ تلوار اور پانی اثر کر سکتا تھا۔ جونہی اس نے ایک آدمی کو خنجر لہراتے ہوئے اپنے پر حملہ آور ہوتے دیکھا' وہ اچھل کر غار کے اندر گر پڑا۔

فرش پر گرتے ہی جاسوس کی نظروں سے وہ غائب ہو گیا تھا۔ سنچال نے ایک اجنبی تبتی کو خنجر لیے غار میں اپنی طرف آتے دیکھا تو چیخ مار کر پدم ناگ کو آواز دی۔ جاسوس نے ادھر ادھر دیکھا کہ ابھی جو دبلا پتلا سا راہب وہاں کھڑا تھا اور زمین سے اچھل کر غار میں گرا تھا' وہ کہاں چلا گیا؟

اس عرصے میں پدم ناگ ایک چھوٹے سانپ کی شکل اختیار کر کے جاسوس کے عقب میں آ گیا تھا۔ جاسوس اس سے بے خبر تھا مگر اسے اتنا احساس تھا کہ راہب وہیں نہیں غار کی تاریکی میں چھپا ہوا ہے۔ اس نے سوچا کہ سنچال کو اغوا کرنے کی بجائے بہتر ہے کہ اس کا اسی جگہ کام تمام کر دیا جائے۔ گنڈھپ کی طرف سے بھی اسے یہی حکم ملا تھا۔ وہ خنجر لہراتا ہوا سنچال پر جھپٹا۔

ابھی دو قدم ہی بڑھا ہو گا کہ اسے اپنے جسم میں ایک لرزش سی محسوس ہوئی پھر اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے خون میں آگ لگا دی ہے۔ خنجر ہاتھ سے پھینک کر وہ اپنے سینے کو پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا اور پھر ازخود ایک طرف کو لڑھک گیا۔ پدم ناگ نے سانپ کی شکل میں اپنا کام کر دیا تھا۔ اس کا زہر جاسوس کے رگ و پے میں آگ بن کر دوڑ رہا تھا۔ سنچال سینہ تھامے سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ پدم ناگ رینگتا ہوا غار سے باہر نکل گیا' وہ پھر دوبارہ انسانی روپ بدل کر واپس آیا اور بولا۔ "سنچال تم ٹھیک ہو نا؟"

"ہاں گورو دیو مگر اسے کیا ہوا؟"

"یہ ہمارا دشمن تھا۔"

پدم ناگ یہ کہہ کر جاسوس کی لاش گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا کہ ہو سکتا ہے اسے کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا ہو۔ اس نے جاسوس کی لاش کھڈ میں گرا دی۔ جب واپس آیا تو سنچال اسے تحیر انگیز آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اسے پدم ناگ کی خفیہ طاقتوں پر پہلے ہی سے شک تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پدم ناگ سے کوئی سوال کرتی۔ پدم ناگ نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

"جو باتیں تمہاری سمجھ میں نہ آئیں ان کے بارے میں کبھی سوال نہ کرنا۔" سنچال خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد عاطون بھی آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ دو تنومند گھوڑے بھی لایا تھا' جن پر زین کسی ہوئی تھی اور پانی کی بڑی چھاگل اور خشک مچھلی کا تھیلا لٹک رہا تھا۔ اس

گھوڑے پر انہوں نے سنچال کو بٹھایا۔ دوسرے گھوڑے پر پدم ناگ سوار ہو گیا۔ پدم ناگ نے اسے گنڈھپ کے جاسوس کی موت کا حال سنایا تو عاطون بولا۔

"اس کا یہی انجام ہونا تھا۔ یہ ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست لوگ ہیں اور عیار گنڈھپ کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں۔ ان کا کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ خدا خود انہیں ہدایت دے۔"

عاطون' پدم ناگ اور سنچال نے اپنا دشوار گزار سفر شروع کر دیا۔ اس سفر میں سنچال کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ پدم ناگ اور عاطون نے اس کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھا' پھر بھی جب وہ قازقستان کی راجدھانی میں پہنچے تو سنچال کا تھکن اور سردی سے برا حال ہو رہا تھا۔ اپنے ماں باپ سے مل کر سنچال کی جان میں جان آئی۔ انہیں تمام حالات سے آگاہ کر دیا گیا۔

پدم ناگ اور عاطون نے وہاں چند روز قیام کیا اور پھر سنچال اور اس کے والدین سے اجازت لے کر شمال مغرب میں اس جانب روانہ ہو گئے' جہاں آج کل آذربائی جان کا علاقہ ہے۔ دونوں دوست مختلف قافلوں کے ساتھ سفر کرتے ہوئے دریائے آمو کے کنارے آباد شہر کی سرائے میں اترے۔

رات دیر تک دونوں دوست اپنی تیسری دوست اور ساتھی دیوی مایا کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ایک عرصے سے ان کی دیوی مایا سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں عاطون اور پدم ناگ کو کچھ معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ کس ملک میں تاریخ کے کس عہد میں اور کن حالات میں ہو گی؟

خود ان کی کوئی منزل نہیں تھی۔ تاریخ اور وقت کے دھارے پر وہ کسی بے بادبان جہاز کی طرح بہے چلے جا رہے تھے۔ پدم ناگ کے دل میں تو پھر بھی امید کی ایک دھیمی سی شمع روشن تھی کہ اپنا کفارہ ادا کرنے کے بعد وہ واپس آکاش کے گگن منڈل میں اپنے دیوتاؤں کے پاس چلا جائے گا لیکن عاطون اپنی منزل سے بے خبر تھا۔

دونوں دوست تکان' نیند اور کھانے پینے کی حاجتوں سے بے نیاز تھے۔ کبھی کبھی وہ محض لوگوں کو دکھانے کے لیے کچھ کھا پی لیتے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں پدم ناگ نے عاطون کو اپنے بارے میں ایک ایسا قیمتی راز بتایا کہ اگر اس رات وہ یہ راز اسے نہ بتاتا تو پدم ناگ کے حسرت ناک انجام کے بارے میں عاطون کو ساری زندگی کچھ علم نہ ہوتا۔

پدم ناگ نے عاطون سے کہا۔ "میرے دوست! اس سے پیشتر بھی میں نے دو ایک بار اپنی زندگی کے اس خطرناک ترین راز کو تم پر افشا کرنا چاہا مگر ہر بار ہمیں کچھ ایسے حالات

سے دو چار ہونا پڑا کہ اس کا موقع نہ مل سکا۔ بہرحال اب میں چاہتا ہوں کو جو کچھ کہوں اسے تم اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ یہ راز میری زندگی اور موت کا راز ہے اور اس کا اطلاق میرے ناگ کے روپ میں آنے کے بعد ہوا ہے۔ میرا تعلق اگرچہ گگن منڈل کے دیوتاؤں کے قبیلے سے ہے لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو میں اور دیوی مایا ایک نامعلوم مدت کے واسطے گگن منڈل استھان سے نیچے اس مادی یعنی پراکرتی کی دنیا میں پھینک دیے گئے ہیں۔ اگرچہ ہمارے پاس گگن منڈل کی کچھ کرامتیں ہیں لیکن مجھ پر موت اپنا وار کر سکتی ہے۔ وہ یوں کہ جب میں سانپ کا روپ دھارتا ہوں تو میرا دشمن وار کر کے مجھے ہلاک کر سکتا ہے۔"

عاطون نے کسی قدر تشویش کے ساتھ پوچھا۔ "تو کیا تم سچ مچ ہلاک ہو جاؤ گے؟"

پدم ناگ بولا۔ "یہی وہ راز ہے، جو میں تمہیں بتانے والا ہوں۔ سنو! اگر کبھی ایسا حادثہ ہو گیا کہ کسی دشمن نے تلوار کے وار سے سانپ کی حالت میں میرے جسم کے ٹکڑے کر دیے اور تم اتفاق سے وہاں موجود بھی ہوئے تو میرے جسم کے ٹکڑوں کو جمع کر کے کسی تھیلے یا لکڑی کی صندوقچی میں بند کر لینا۔ یہاں سے دور صحرائے عشور میں جوڈیا شہر کے قریب عیسس کے قدیم مندر کے پیچھے زیتون کے درختوں کے درمیان ایک تالاب ہے، جس کی سیڑھیاں کناروں سے نیچے پانی کی سطح تک چلی گئی ہیں۔ میرے کٹے ہوئے جسم کے ٹکڑوں کو تمہیں اس تالاب میں کسی پتھر کے ساتھ باندھ کر چھ مہینوں تک رکھنا ہو گا۔ چھ مہینوں کے بعد اس مقدس تالاب کے پانی کے اندر ہی اندر میرے جسم کے ٹکڑے اپنے آپ جڑ جائیں گے، پھر تم مجھے صندوقچی سے نکالو گے تو میں زندہ ہو چکا ہوں گا۔"

عاطون، جو حیرت سے اس تفصیل کو سن رہا تھا کہنے لگا "میرے دوست پدم ناگ! تم نے مجھے پہلے یہ سب کچھ کیوں نہیں بتایا؟ اگر خدانخواستہ کوئی حادثہ ہو جاتا تو میں کیا کرتا؟"

پدم ناگ مسکرایا۔ "بہرحال، اب میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا۔ اول تو میں اس معاملے میں بے حد محتاط رہتا ہوں، لیکن چونکہ ہم واقعات و حوادث کی اس دنیا میں اپنا کفارہ بھگت رہے ہیں اس لیے یہاں ہمارے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح باتیں کرتے کرتے رات بیت گئی۔ شہر کے معبدوں میں صبح کے گجر بجنے لگے۔ عاطون نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی..... طلوع ہوتے ہی سورج کی سنہری روشنی لہروں کی صورت میں ابھر رہی تھی۔

یہاں سے ایک قافلہ دمشق کی طرف جا رہا تھا۔ پدم ناگ اور عاطون اس قافلے میں شامل ہو گئے اور کئی شب و روز کے سفر کے بعد دمشق پہنچ گئے۔ دیوی مایا ابھی تک انہیں نہیں ملی تھی۔ پدم ناگ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہو سکتا ہے وہ ہندوستان کے جنوبی

مندروں میں ہی رہ گئی ہو۔ دمشق ان دنوں ایک حکمران بادشاہ بھیروم کے زیر نگین تھا۔ یہ لوگ مظاہر فطرت کی پوجا کرتے تھے۔ انہوں نے سورج، چاند، ستاروں، باد سموم اور زلزلوں کے فرضی بت بنا رکھے تھے۔ اس ملک کی مغربی سرحدیں قدیم مصر کے صحرائے سینا سے جا ملتی تھیں۔ عاطون کو اس کی فضاؤں میں اپنے قدیم ترین وطن کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ دمشق کی کارواں سرائے ایک منزلہ اور اونچی چھت والی تھی، کیونکہ اس شہر میں شدید گرمی پڑتی تھی۔ اس کے چاروں طرف صحرا اور بیابان تھے، جہاں کہیں کہیں تباہ شدہ منہدم محلات کے کھنڈر بکھرے ہوئے تھے۔ دریائے دجلہ شہر کی عقبی فصیل کے قریب سے ہو کر گزرتا تھا۔ دریا کے کنارے دور تک جنگلی نرسلوں کے جھنڈ چلے گئے تھے۔ ان کی جانب سے ٹھنڈی مرطوب ہوا آ رہی تھی۔

دمشق کی کارواں سرائے میں اترے پدم ناگ اور عاطون کو تیسرا روز جا رہا تھا کہ شام کو سرائے کے باہر ٹھنڈی ریت پر دریاں بچھا کر ٹھنڈے مشرب کے گھڑے لگا دیے گئے۔ چوگرد شمعیں بھی روشن ہو گئیں۔ معلوم ہوا کہ مصر کا کوئی داستان گو آیا ہوا ہے اور آج رات داستان سنائے گا۔

سر شام ہی لوگ دریوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ رات کی پہلی ساعت میں نیلے آسمان پر چاند نکل آیا..... پھر لوگوں میں شور مچ گیا کہ داستان گو آ گیا۔ پدم ناگ اور عاطون بھی ان لوگوں میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اہل بابل کے قدیم خانہ بدوشوں ایسی ایک چوکور گاڑی آ کر رکی۔ اس کے آگے کالا گھوڑا جتا ہوا تھا۔ گاڑی میں سے ایک تومند اونچا لمبا خانہ بدوش داستان گو ہاتھ میں بربط لیے اترا اور اس نے دونوں بازو پھیلا کر لوگوں کو سلام کیا۔ لوگ تالیاں بجانے لگے۔ پدم ناگ نے عاطون سے کہا۔ "یہ تو مجھے کوئی جادوگر لگ رہا ہے۔"

عاطون بولا۔ "دجلہ اور فرات کی وادی میں قدیم زمانے میں اس قسم کے داستان گو ہوا کرتے تھے۔ ان کی نسل اب بھی یہاں آباد ہے۔ یہ لوگ بڑے چرب زبان ہوتے ہیں بے تکان جھوٹ بولتے ہیں۔ داستان اس طرح سناتے ہیں کہ لوگوں پر جادو کر دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ یہ جادوگر ہیں۔ یہ چھوٹا موٹا ٹونہ ٹوٹکا ضرور جانتے ہیں، مگر اصل میں یہ بڑے پکے چور ہوتے ہیں۔"

داستان گو نے اس دوران میں بربط پر ایک نغمہ چھیڑ دیا تھا۔ اس کی آواز میں کچھ ایسا سوز تھا کہ لوگ دم بخود ہو گئے تھے۔ نغمہ ختم ہوا تو وہ آبنوسی چوکی پر مشروب لے کر بیٹھ گیا اور داستان شروع کر دی۔ اس کا انداز بیان ایسا پر اثر تھا کہ عاطون بھی متاثر ہوئے بغیر نہ

رہ سکا۔ وہ ہندوستان کے کسی راجا کی داستان عشق بیان کر رہا تھا۔ لوگ تصویر حیرت بنے سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ برہمن راجا نے اپنے محل میں شودر لوگوں کی دعوت کی اور شہر کے سارے شودر محل میں آن جمع ہوئے۔ اس پر پدم ناگ نے کھڑے ہو کر کہا۔

"ہندوستان میں شودر کسی برہمن راجا کی دعوت میں شریک نہیں ہو سکتے۔ تم غلط کہہ رہے ہو۔"

سب لوگ گردنیں گھما کر پدم ناگ کی طرف دیکھنے لگے۔ عاطون نے پدم ناگ کا ہاتھ کھینچ کر کہا۔ "میرے دوست! کہانی سنو، تم کن باتوں میں پڑ گئے ہو؟ یہ تو کہانیاں ہیں محض فرضی کہانیاں۔" لیکن داستان گو کو پدم ناگ کی بات بری لگی تھی کیونکہ اسے بھری محفل میں ٹوکا گیا تھا۔ وہ چوکی پر سے اٹھ کر پدم ناگ کے قریب آ گیا اور اس کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے یہ بات؟"

پدم ناگ بولا۔ "اس لیے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا برہمن ہوں۔"

خانہ بدوش داستان گو کی عیار نظروں نے پدم ناگ کی آنکھوں میں ایک عجیب و غریب بات دیکھ لی تھی۔ وہ اس کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ پہلے تو وہ سخت غیظ و غضب کے عالم میں تھا، لیکن اب بڑی ملاطفت سے بولا۔ "میرے دوست! تمہارا نام کیا ہے؟ پدم ناگ نے کہا۔" "پدم" ناگ اس نے جان بوجھ کر نہیں کہا تھا۔ داستان گو بڑی حلیمی سے کہنے لگا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو دوست مجھ سے بھول ہو گئی۔ اچھا، اب میں یہ کہانی نہیں سناؤں گا، بلکہ اپنی بین پر ایک نغمہ سناؤں گا۔"

عاطون نے پدم ناگ کا بازو کھینچ کر نیچے بٹھا لیا۔ داستان گو لوگوں کو تسلی دیتا ہوا واپس اپنی گاڑی میں گیا۔ باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی بین تھی۔ یہ سپیروں کی بین جیسی تھی مگر اس کا سائز بالشت بھر کا تھا۔ وہ واپس اپنی چوکی پر آ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ "اب میں آپ لوگوں کو بادشاہ حرم کی داستان غم سناؤں گا، ساتھ ساتھ میں بین بھی بجاتا رہوں گا۔ میرے بھائیو سنو کس طرح اس بد نصیب بادشاہ پر غم و الم کے پہاڑ ٹوٹے اور وہ جلا وطن ہوا۔"

خانہ بدوش داستان گو نے تھوڑی سی داستان اپنے مخصوص پر اثر انداز میں بیان کی، پھر بین بجانی شروع کر دی۔ چاندنی رات میں اس کی بین کی لے نے ایک عجیب سماں پیدا کر دیا۔ عاطون نے محسوس کیا کہ پدم کچھ بے چینی محسوس کر رہا ہے۔ اس نے پدم ناگ سے پوچھا کہ خیریت تو ہے؟ پدم ناگ بولا۔ مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ عاطون اٹھ کر مشروب کے

گھڑوں کے پاس گیا۔ اس دوران خانہ بدوش نے بین کا رخ پدم ناگ کی طرف کر دیا اور بین کی لے تیز کر دی تھی۔ پدم ناگ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور چلایا۔ "بند کرو اس ساز کو۔"

ایک سناٹا چھا گیا۔ لوگ پدم ناگ کی طرف حیرت سے تکنے لگے۔

خانہ بدوش داستان گو کے چہرے پر ایک عجیب سی عیارانہ مسکراہٹ تھی۔ ان نے سر جھکائے ہوئے کہا۔ "میرے دوست! تمہارا کہا سر آنکھوں پر اگر میری بین تمہیں ناپسند ہے تو میں نہیں بجاؤں گا۔"

لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ "ہم بین سنیں گے، ہم بین سنیں گے" عاطون نے حالات خراب ہوتے دیکھے تو پدم ناگ کو لے کر وہاں سے نکل گیا اور سرائے کے صحن میں آ کر بولا۔ "تم پاگل تو نہیں ہو گئے پدم؟ تمہیں کیا ضرورت تھی اسے ٹوکنے کی؟"

پدم ناگ نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ "نہ جانے اس بین کی آواز سے مجھ پر وحشت کیوں سوار ہو رہی تھی۔ میں اندر جا کر لیٹنا چاہتا ہوں۔"

عاطون اسے اپنے ساتھ کوٹھری میں لے گیا۔ پدم ناگ قالین کے فرش پر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ عاطون نے اطمینان کا سانس لیا کہ یوں پدم ناگ کی طبیعت پر سکون ہو جائے گی۔ عاطون کے ذہن میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ آخر یہ خانہ بدوش داستان گو کون شخص ہے، جس کی بین کی آواز پر پدم ناگ کی طبیعت بے چین ہو گئی تھی۔ باہر لوگوں کا شور مدھم ہوتا جا رہا تھا اور اب خانہ بدوش داستان گو کی آواز نہیں آ رہی تھی۔

عاطون نے پدم ناگ کو وہیں محو خواب چھوڑا اور خود کوٹھری سے نکل کر کاروں سرائے کے صحن میں آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ لوگ اپنی اپنی کوٹھریوں کی طرف جا رہے تھے۔ وہ کچھ جھنجلائے ہوئے تھے۔ پتا چلا کہ خانہ بدوش داستان گو ان سے ناراض ہو کر اپنی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر واپس چلا گیا ہے۔ بہت وہاں سناٹا چھا گیا۔ دریا کی جانب گول زرد چاند نیچے جھکتا چلا جا رہا تھا۔ ایک عجیب سی اداسی دھندلی رات کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔ عاطون ٹہلتے ٹہلتے کارواں سرائے سے دور ٹھنڈے صحرائی ٹیلوں کی طرف نکل گیا۔ اسے اپنے پچھلے جنم کے تحیر افروز واقعات یاد آ رہے تھے۔ جب وہ کراچی کے ساحل سمندر پر ایک کاٹج میں پر سکون زندگی گزار رہا تھا اور پھر اسے اپنا وہ جنم بھی یاد آیا، جب وہ بھارتہ کی بد روح کی شکل میں اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے خلاؤں میں بھٹکتا پھرتا تھا۔ اس کے بعد اسے اپنا وہ جنم بھی یاد آیا۔ جب وہ ایک وحشی ڈاکو کے روپ میں صنف نازک کا دشمن گیا تھا۔ انہی گناہوں کی پاداش کا وہ خمیازہ بھگت رہا تھا۔

انہی خیالوں میں گم وہ صحرا میں کافی دور نکل گیا۔ صحرا میں گہری خاموشی چھائی تھی نیلے آسمان پر چمکیلے ستارے چاندی کے زیوروں کی طرح کھلے پڑے تھے۔ وہ ایک ٹیلے کے پاس ٹھنڈی ریت پر بیٹھ گیا۔

ادھر پدم ناگ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی کوٹھڑی میں قالین کے فرش پر گہری نیند سو رہا تھا کہ کھلی کھڑکی کے پاس ایک انسانی سایہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ یہ وہی خانہ بدوش داستان گو تھا۔ اس نے اپنے جسم کو سیاہ لبادے میں ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹی بین اور دوسرے ہاتھ میں چاندی کی چھوٹی سی ڈبی تھی۔ وہ دبے پاؤں کھڑکی کے پاس آیا۔ ایک بار ادھر ادھر دیکھا پھر آہستہ سے کھڑکی میں سے اندر کوٹھری میں کود گیا۔ کوٹھری میں شمع بجھی ہوئی تھی۔ قالین پر پدم ناگ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے خراٹوں کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ کھلی کھڑکی میں سے داخل ہوتی مدھم چاندنی نے فضا کو مزید پر اسرار بنا دیا تھا۔

خانہ بدوش داستان گو نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر چاندی کی ڈبی میں سے زرد رنگ کا ایک سفوف نکال کر پدم ناگ کے چاروں طرف بکھیر دیا' پھر اس کے سرہانے کی جانب بیٹھ کر دھیمے سروں میں بین بجانی شروع کر دی۔ بین کی آواز پدم ناگ کے کانوں میں پڑی تو اس نے ایک دم سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا کہ اس کے سرہانے ایک سیاہ پوش بیٹھا بین بجا رہا تھا۔ پدم ناگ نے داستان گو کو پہچان لیا۔ وہ تیزی سے اٹھا ہی تھا کہ اسے ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ گر پڑا۔ بین کی آواز اور لے تیز ہو گئی۔ پدم ناگ کے ہوش و حواس گم ہونے لگے۔ وہ دونوں بازوؤں اور گردن کو سانپ کی طرح لہرانے لگا۔ خانہ بدوش ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی بین کا رخ پدم ناگ کے چہرے کی طرف تھا۔ پدم ناگ بین کی دھن پر رقص کرنے لگا۔ وہ سانپ کی شکل اختیار کرنے لگا۔ پہلے اس کی ٹانگیں غائب ہوئیں' پھر بازو غائب ہو گئے اور پھر پدم ناگ کی جگہ قالین پر ایک فٹ کا سیاہ ناگ پھن اٹھائے بین کی دھن پر جھوم رہا تھا۔ خانہ بدوش داستان گو اسی لمحے کا منتظر تھا۔ اس نے بین بجاتے بجاتے اپنے لبادے کے اندر سے چمڑے کی ایک تھیلی نکالی۔ اسے کھول کر پدم ناگ کی طرف بڑھایا۔ بین کی لے تیز تر ہوتی گئی۔

پدم ناگ جھومتا ہوا تھیلی میں چلا گیا۔ خانہ بدوش نے تھیلی کو جلدی سے بند کر دیا اور اس کا منہ تسمے سے کس کر باندھ کر کھڑکی میں سے کود کر کارواں سرائے کے آنگن کی دیوار کے سائے میں سے گزرتا ہوا دریا کی طرف چل دیا۔ دور دریا کے کنارے اس کی گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ خانہ بدوش نے گاڑی کے آگے جتا ہوا گھوڑا کھولا۔ گاڑی کو دھکیل کر دریا میں ڈل دیا۔ گاڑی دیکھتے دیکھتے پانی میں ڈوب گئی۔ خانہ بدوش گھوڑے پر اچھل کر سوار ہوا اور اسے دوڑاتا ہوا دریا کے ساتھ ساتھ نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

عاطون اپنے تخیلات و تصورات میں کچھ ایسا محو ہوا کہ اسے وقت گزرنے کا کچھ احساس ہی نہ رہا۔ جب وہ اپنی محویت سے باہر آیا تو رات ڈھل چکی تھی اور مشرق میں ستارہ صبح ماند پڑ رہا تھا۔ عاطون کو جلدی بھی نہیں تھی کیونکہ پدم ناگ کے بارے میں اسے اطمینان تھا کہ وہ کارواں کے سرائے میں سو رہا ہے اور عاطون نیند سے بے نیاز تھا۔

ایک مدت کے بعد صحرا میں طلوع صبح کا خیال انگیز منظر دیکھ کر اسے بے انتہا مسرت محسوس ہو رہی تھی۔ طلوع ہوتے سورج کی کرنیں صحرا میں سونا بکھیر رہی تھیں۔ جب سورج آہستہ آہستہ اوپر آ گیا اور اس کا سنہری رنگ چاندی ایسا سفید ہونے لگا' تو عاطون وہاں سے واپس چل پڑا۔

کاروں سرائے میں لوگ بیدار ہو گئے تھے اور اپنے اپنے معمول کے کام دھندوں میں لگے تھے۔ عاطون کوٹھری میں آیا تو پدم ناگ وہاں نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ اٹھ کر باہر گیا ہو گا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ اس میں سے دن کی چمکیلی روشنی اندر آ رہی تھی۔ عاطون دیوار پر لٹکتے ہوئے چمڑے کے تھیلے کو اتارنے کے لیے آگے بڑھا تو اسے قالین پر زرد رنگ کا کوئی سفوف بیضوی دائرے کی شکل میں بکھرا ہوا نظر آیا۔ وہ جھک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے زرد رنگ کے سفوف کو انگلی سے اٹھا کر سونگھا۔ اس میں سے عجیب ناگوار سی بو آ رہی تھی۔ عاطون کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے غور سے دیکھا کہ زرد سفوف کا بیضوی دائرہ قالین پر اس طرح بنا ہوا تھا' جیسے کسی سوئے ہوئے آدمی کے ارد گرد بکھیرا گیا ہو۔

عاطون تیزی سے کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ اس نے کارواں سرائے کے آنگن میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اسے پدم ناگ کہیں دکھائی نہ دیا' پھر وہ کھڑکی کی طرف آ گیا اور جھک کر زمین پر دیکھا' وہاں انسانی قدموں کے نشان بنے ہوئے تھے' جو کھڑکی کے پاس آ کر رک گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہی نشان واپس مڑتے نظر آ رہے تھے۔ عاطون ان نشانوں کا کھرا لیتا آنگن میں آیا تو وہاں یہ نشان اونٹوں اور گھوڑوں اور انسانوں کے پاؤں کے نشانات میں گڈ مڈ ہو گئے تھے۔ عاطوں نے سرائے کے اندر اور باہر دور تک زمین کا چپہ چپہ چھان مارا مگر اسے پدم ناگ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ پدم ناگ کو کسی ایسے شخص نے اغوا کر لیا ہے' جو نہ صرف یہ کہ اس کے ناگ ہونے کے راز سے واقف ہے بلکہ اسے قابو کرنے کا بھی منتر جانتا ہے۔ اچانک اس کا خیال خانہ بدوش داستان گو کی طرف چلا گیا۔ اسے یاد آیا کہ خانہ بدوش کی بین کی آواز پر رات پدم ناگ کی طبیعت بے چین ہو گئی

تھی اور جب اس نے خانہ بدوش کی داستان کے ایک حصے پر شدید احتجاج کیا تھا تو داستان گو نے قریب آ کر پدم ناگ کو گھورا تھا اور پھر اسے کچھ نہیں کہا تھا بلکہ معنی خیز انداز میں مسکراتا واپس چلا گیا تھا۔

یقیناً" پدم ناگ کو اس خانہ بدوش داستان گو نے ہی اغوا کیا ہے۔ اس نتیجے پر پہنچتے ہی عاطون تیز تیز قدموں سے کاروں سرائے کے مالک کے پاس گیا۔ یہ ایک فلسطینی یہودی تھا۔ عاطون نے اس سے رات والے داستان گو کے بارے میں پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ یہودی بولا۔

"خانہ بدوشوں کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ یہ داستان گو کبھی کبھار ہی ادھر کا رخ کرتا ہے۔ ہمیں تو اس کے نام کا بھی پتا نہیں' سب اسے داستان گو ہی کہتے ہیں۔"

عاطون نے پوچھا۔ "کیا اس کے قبیلے کے لوگ یہاں نزدیک نہیں رہتے؟"

فلسطینی یہودی کندھوں کو اچکا کر بولا۔ "ہو سکتا ہے اس کا قبیلہ یہاں کہیں دریا پار آباد ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اکیلا ہی گھوم پھر رہا ہو' کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ داستان گو عام طور پر اکیلے ہی آوارہ گردی کرتے ہیں۔"

عاطون نے اب سرائے میں ٹھہرے ہوئے لوگوں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ وہ لوگ خود مسافر تھے۔ انہیں خانہ بدوش داستان گو کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ سرائے کے ملازموں نے بھی وہی کچھ کہا' جو اس سے پہلے سرائے کا مالک بیان کر چکا تھا۔ عاطون مایوسی کے عالم میں اپنی کوٹھری میں آ گیا۔ وہ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ پدم ناگ کی تلاش میں نکلنا چاہیے۔ خانہ بدوش داستان گو گھوڑا گاڑی پر آیا تھا۔ صحرا میں اس کی گاڑی کے نشان ضرور مل جائیں گے۔

یہ سوچ کر عاطون نے اپنا چمڑے کا تھیلہ اتارا' صحن میں بندھے ہوئے گھوڑے کو کھول کر اس پر سوار ہوا اور کاروان سرائے کے صدر دروازے کے سامنے سے گزرنے والی کچی سڑک پر آ گیا۔ یہاں اسے خانہ بدوش کی گھوڑا گاڑی کے نشان مل گئے۔ اس نے ان نشانوں کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ لکڑی کے پہیوں کے یہ نشان دریا پر جا کر ختم ہو گئے۔ عاطون گھوڑے سے اتر آیا۔

اس نے دیکھا کہ گاڑی کے پہیوں کے نشان دریا کے کنارے پر اپنی جگہ پر سے گھوم گئے تھے اور ان کا رخ دریا کی طرف ہو گیا تھا۔ وہ ذرا آگے گیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ گاڑی کو دریا میں گرا دیا گیا ہے۔ یہاں سے صرف گھوڑے کے کھروں کے نشان دریا کے کنارے کنارے شمال مغرب کی طرف جا رہے تھے۔ عاطون سمجھ گیا..... خانہ بدوش پدم ناگ

کو اغوا کر کے یہاں تک آیا' پھر پہنچ کر گاڑی کے آگے سے گھوڑا کھولا' گاڑی کو دریا میں دھکیلا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر رفو چکر ہو گیا۔ گاڑی کو اس لیے دریا میں غرق کیا کہ کوئی اس کا پیچھا نہ کر سکے۔ پدم ناگ کی شکل میں ضرور اس خانہ بدوش داستان گو کو کوئی گوہر نایاب ہاتھ لگا ہے کہ جس کے بعد اس نے اپنی گاڑی کی بھی پرواہ نہیں کی۔

انھی خیالات میں گم عاطون نے اپنا گھوڑا داستان گو کے گھوڑے کے کھروں کے پیچھے ڈال دیا۔ دن کافی نکل آیا تھا اور دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ دریا خاموشی سے بہہ رہا تھا کہیں اس کے کنارے پر سرکنڈے اگے ہوئے تھے اور کہیں ساحل بالکل ویران تھا۔ زمین ریتلی اور بھربھری تھی' اس پر گھوڑوں کے سموں کے نشان واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر بھورے رنگ کی بے ڈھنگی چٹانیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑی تھیں۔ عاطون اپنے گھوڑے کو قدم بہ قدم چلا رہا تھا۔ داستان گو کے گھوڑے کے سموں کے نشان آگے آگے جا رہے تھے۔

اچانک ایک مقام پر پہنچ کر یہ نشان دریا میں اتر گئے۔ عاطون نے گھوڑا روک لیا۔ وہ جھک کر دیکھنے لگا داستان گو نے یہاں اپنا گھوڑا دریا میں اتار دیا تھا۔ عاطون نے بھی اپنے گھوڑے کو دریا میں اتار دیا۔ دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا' لہروں کا بہاؤ بھی سست تھا۔ گھوڑا نتھنے پھلائے تیرنے لگا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر عاطون نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر گھوڑے کے سموں کے نشان دریا کے کنارے کو چھوڑ کر بھوری چٹانوں کی طرف چلے گئے تھے۔ عاطون بھی اس طرف چل پڑا۔

آگے جا کر مشکل یہ پیش آ گئی کہ یہاں زمین سخت تھی۔ زمین کے اندر دھنسے ہوئے بڑے بڑے پتھروں کی سلوں نے وہاں ایک ناہموار فرش سا بنا دیا تھا۔ گھوڑے کے سموں کا کھرا یہاں غائب تھا۔ عاطون سموں کے رخ پر آگے بڑھنے لگا۔ یہ سخت چٹیل میدان حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ کسی جگہ بھی گھوڑے کے سموں کے نشان نظر نہیں آ رہے تھے۔ عاطون کے ہاتھ سے کھرا نکل گیا تھا۔ وہ یونہی اندازے سے چلا جا رہا تھا۔ دھوپ کی حدت میں تیزی آ گئی تھی۔ اگرچہ عاطون کو گرمی نہیں لگ رہی تھی مگر اس کے گھوڑے کی گردن پسینے میں تربتر ہو گئی تھی۔ بھوری اور بد وضع چٹانوں کا سلسلہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ یہ چٹانیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر زمین سے نکلی کھڑی تھیں۔ صحرا کی تپش میں ان میں سے گرم لہریں خارج ہو رہی تھیں۔ عاطون نے فضا میں کئی بار لمبے لمبے سانس لیے مگر اسے پدم ناگ کی خوشبو کہیں بھی محسوس نہ ہوئی۔ آخر بھوری چٹانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

مگر زمین اسی طرح چٹیل اور سخت تھی' جس کی وجہ سے وہاں گھوڑے کے سموں کے نشان نہیں پڑ سکتے تھے۔ خدا جانے وہ خانہ بدوش کدھر نکل گیا تھا۔ عاطون نے گھوڑے کی رفتار کو قدم قدم کر لیا۔ چٹیل صحرا میں اسے دور ایک تکونی چٹان دکھائی دی۔ یہ چٹان کسی اہرام سے ملتی جلتی تھی۔ عاطون کو اچھی طرح سے علم تھا کہ کسی زمانے میں فرعونوں کی سلطنت عراق و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہو سکتا یہ اہرام بھی یہاں کسی فرعون نے بنوایا ہو جیسے کہ جب یونانیوں کے ہاتھوں شکست کھا کر فراعنہ مصر سوڈان کی طرف فرار ہو گئے تھے اور انہوں نے وہاں اپنی سلطنت قائم کر لی تھی تو سوڈان کے قرب و جوار میں بھی انہوں نے کئی ایک اہرام تعمیر کروائے تھے۔

عاطون یہی سوچتا تکونی چٹان کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ جب وہ ذرا قریب ہوا تو اس نے دیکھا کہ یہ واقعی ایک اہرام تھا مگر اس کی حالت بے حد خستہ تھی۔ تکونی دیواروں کے بڑے بڑے پتھر کئی جگہوں سے اکھڑ کر نیچے گرے پڑے تھے' جگہ جگہ دیواروں کی دراڑوں میں زرد گھاس کی جھاڑیاں اگ رہی تھیں۔ عاطون اہرام کے عقب میں گیا یہاں اہرام کی دیوار ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور پتھروں کی سلیں لڑھکی پڑی تھیں۔ اہراموں کے ساتھ یہ تاخت و تاراج صدیوں سے ہوتا چلا آیا تھا۔ زیادہ تر یہ کام ان ڈاکوؤں کا ہوتا تھا' جو اہراموں میں دفن سونے اور جواہرات کے خزانوں کے لالچ میں اسے توڑ پھوڑ دیتے تھے۔

عاطون کا گھوڑا شدید گرمی کی وجہ سے نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر آیا۔ اس نے گھوڑے کو ایک طرف کھلا چھوڑ دیا۔ گھوڑا زرد گھاس میں منہ مارنے لگا۔ عاطون نے جھک کر دیکھا' جہاں دیوار کے پتھر اکھڑے ہوئے تھے' وہاں ایک چھوٹا سا غار بن گیا تھا۔ اس غار میں ٹھنڈک تھی۔ عاطون سر نیچے کر کے غار میں داخل ہو گیا۔ آگے اندھیرا تھا۔ عاطون وہیں بیٹھ گیا۔ غار کے فرش پر ریت اور بجری کی چھوٹی سی تہ بچھی تھی۔ وہاں کسی انسانی پاؤں کا نشان نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا' خانہ بدوش اس اہرام کی طرف نہیں آیا تھا۔

عاطون غور کرنے لگ گیا کہ اب اسے کدھر کا رخ اختیار کرنا چاہیے کہ اپنے دوست پدم ناگ کا کچھ سراغ مل سکے۔ اس نے ایک بار پھر اہرام کے گرد و نواح کا جائزہ لینا چاہا اور غار سے نکل کر باہر آ گیا۔ باہر اسے اپنا گھوڑا کہیں نظر نہ آیا۔ گھوڑا کہاں چلا گیا تھا؟ عاطون نے اہرام کے چاروں طرف گھوم کر اردگرد دیکھا گھوڑا کہیں بھی نہیں تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ گھوڑا پانی کی تلاش میں واپس دریا کی طرف چلا گیا ہو گا۔ صحرائی گھوڑوں اور اونٹوں کو میلوں دور سے پانی کی خوشبو آ جاتی ہے۔

عاطون اپنا چمڑے کا تھیلا ساتھ ہی غار میں لے گیا تھا' جس کی وجہ سے وہ اس کے

پاس ہی رہا۔ اس تھیلے میں اس کا ایک فالتو لباس اور کچھ اس عہد کے طلائی سکے تھے۔ اب آگے عاطون کو پیدل ہی سفر کرنا تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ تپتے صحرا میں سینکڑوں میل پیدل چل سکتا تھا لیکن گھوڑا نہ ہونے کی وجہ سے اس کے سفر اور تلاش کی رفتار سست پڑنے والی تھی۔ دوپہر ڈھل رہی تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے مغرب سے سیاہ کالی گھٹا اٹھی اور تیز ہوا چلنے لگی۔ یہ ایک زبردست آندھی تھی۔ عاطون غار میں آ کر بیٹھ گیا۔ آندھی سیاہ کالے رنگ کی تھی۔ آن کی آن میں ایسا اندھیرا چھا گیا جیسے شام ہو گئی ہو۔

تیز ہواؤں کے تھپیڑے اہرام کے پتھروں سے ٹکرا کر چیخ رہے تھے۔ دور بیابان میں ریت کے بگولے چکر کھا رہے تھے۔ سیاہ آندھی نے کالی گھٹاؤں کا روپ دھار لیا اور رہ رہ کر بجلی چمکنے اور بادل گرجنے لگے۔ پھر اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ صحراؤں میں جہاں بارشوں کا منطقہ ہے' ایسے ہی ہوا کرتا تھا' ذرا گرمی پڑی اور فوراً" آندھی آ گئی اور پھر بارش ہونے لگی۔ صحراؤں میں جب موسلادھار بارش ہوتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ سارا صحرا سمندر بن گیا ہے' لیکن جونہی بارش رکتی ہے صحرا کی ریت سارا پانی جذب کر جاتی ہے اور صحرا پھر خشک اور بھورا نظر آنے لگتا ہے۔ اہرام کے اردگرد کا علاقہ چٹانی تھا۔ چنانچہ یہاں بارش کے باعث دھارے بہہ نکلے۔ بارش کا پانی دریا کی طرح بہنے لگا۔ یہ پانی غار میں بھی داخل ہو گیا۔

عاطون غار کے ایک چبوترے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس قسم کی طوفانی بارش اور آندھی اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کا ذہن اس وقت صرف پدم ناگ کی بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ اسے کیوں اغوا کیا گیا اور خانہ بدوش اصل میں کون تھا اور وہ پدم ناگ کو لے کر کدھر چلا گیا ہے؟ یقیناً" اس کے پاس کوئی بڑا ہی طاقت ور منتر ہو گا' جو اس نے پدم ناگ ایسے نیم دیوتاؤں کی طاقت رکھنے والے انسان کو اغوا کر لیا۔

بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ ہوائیں اہرام کی دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر چیخ رہی تھیں۔ سیاہ کالی گھٹاؤں نے باہر اندھیرا کر رکھا تھا۔ یہ عجیب مہیب طوفان تھا' جس نے آن کی آن میں صحرا اور بیابان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بارش اور بپھری ہوئی تیز ہواؤں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ آخر آندھی کا زور تھما بارش کا شور بھی کم ہوا موسلادھار بارش نے بوندا باندی کی شکل اختیار کر لی۔ عاطون نے غار سے نکل کر دیکھا۔ بارش کا پانی چھوٹے بڑے گڑھوں میں جھرجھراتا ہوا گر رہا تھا پھر بادلوں کے پیچھے سورج مغرب کی طرف اتر گیا اور شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ بوندا باندی ابھی تک جاری تھی۔ عاطون یہ سوچ کر غار کے چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا کہ بوندا باندی رکے تو آگے کو روانہ ہو۔

آندھی رک گئی تھی۔ اب صرف بارش کی دھیمی دھیمی آواز ہی سنائی دے رہی تھی۔ عاطون نے آنکھیں بند کر کے غار کی دیوار سے سر لگا دیا اور پدم ناگ کے بارے میں سوچنے لگا کہ اس کی تلاش میں کس طرف کا رخ اختیار کرنا چاہیے؟

ایکا ایکی عاطون نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کا نام لے کر اسے پکارا ہے۔ غار میں اندھیرا گھپ تھا۔ سوائے بونڈا باندی کی ہلکی ہلکی یکساں آواز کے دوسری کوئی آواز نہیں تھی۔ شاید یہ میرا وہم تھا۔ عاطون نے دوبارہ آنکھیں بند کر کے سر دیوار سے لگا دیا۔ ایک لمحے بعد اسے پھر وہی آواز سنائی دی۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی اور اس بار عاطون نے صاف صاف اپنا نام سنا تھا۔

وہ چوکنا ہو کر ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اس کے کان آواز پر لگے تھے۔ تیسری بار وہی آواز پھر آئی - "عاطون! مجھے یہاں سے نکالو۔"

عاطون جلدی سے چبوترے سے اتر آیا۔ عورت کی آواز بہت دھیمی تھی جیسے پتھروں کے اندر سے آ رہی ہو۔ عاطون نے بلند آواز میں کہا۔ "تم کون ہو اور کہاں ہو؟"

عورت کی آواز پھر سنائی دی۔ "عاطون! غار میں آگے آؤ تمہیں ایک زینہ ملے گا۔ اس کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے اس تہہ خانے میں میری قبر ہے' میں اپنی قبر میں ہوں۔"

عاطون بڑا حیران ہوا کہ یہ اگر مردہ عورت ہے تو قبر سے کیوں باہر آنا چاہتی ہے اور اگر زندہ ہے تو اسے قبر میں کس نے بند کر دیا ہے۔ عاطون نے سوال کیا۔ "تم زندہ ہو؟"

عورت کی دھیمی سی مگر کمزور آواز آئی۔ "نہیں میں مردہ ہوں مجھے یہاں سے نکالو' مجھے تم ہی اس عذاب سے نجات دلا سکتے ہو۔"

عاطون کا دل اس مردہ عورت کے لیے رحم کے جذبات سے بھر گیا۔ وہ یہی سمجھا کہ یہ کسی عورت کی روح ہے! جو قبر کے کسی بھیانک عذاب میں مبتلا ہے۔ عاطون نے کہا۔ "میں آ رہا ہوں" یہ کہہ کر وہ غار میں آگے بڑھا۔ آگے اندھیرے میں چند قدم چلنے پر پتھر کا ایک تنگ و تاریک زینہ آ گیا۔ عاطون زینہ اتر کر تہ خانے میں آیا تو وہاں واقعی ایک قبر بنی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں عاطون کو اچھی طرح قبر کے پتھروں پر لگی قدیم عبارت نظر آ رہی تھی۔ یہ قدیم منتر تھے' جو کاہن امیر عورتوں کی قبروں پر خود کندہ کرتے تھے۔ اس سے عاطون کو یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ یہ کسی امیر کبیر خاتون کی قبر ہے۔ وہ بات بھی قدیم مصری زبان میں کر رہی تھی اور روح ہونے کے ناطے عاطون کو جانتی تھی۔

عاطون نے آہستہ سے آواز دی۔ "کیا تم اسی قبر میں ہو؟"

عورت کی آواز اب جیسے قریب سے آئی۔ "میری قبر کے پہلو میں ایک پتھر اپنی جگہ

سے ہل گیا ہے' اسے باہر کھینچ لو۔ تم غیر معمولی طاقت رکھتے ہو' تم آسانی سے ایسا کر سکتے ہو۔"

عاطون قبر کے پہلو میں آ گیا۔ یہاں ایک چوکور پتھر اپنی جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ عاطون نے اسے اپنی طرف ایک ہلکا سا جھٹکا دیا تو وہ باہر نکل آیا۔ قبر کے اندر سے ٹھنڈی اور مرطوب ہوا کا جھونکا آیا۔ عاطون نے اندر جھانک کر دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ اندر کسی عورت کی لاش ہو گی..... مگر وہاں لاش کی بجائے ایک زینہ نیچے اتر رہا تھا۔ نیچے گہری تاریکی تھی۔

عاطون ابھی سوچ میں ہی تھا کہ اسے عورت کی آواز آئی۔ "عاطون! مجھے یہاں سے لے جاؤ' میرا جسم بھسم ہو رہا ہے۔"

عاطون نے اللہ کا نام لیا اور زینہ اترنے لگا۔ چند سیڑھیاں اترنے کے بعد وہ اندھیرے میں ڈوب گیا تاریکی اتنی گہری تھی کہ خود اسے اپنا آپ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر روشنی کی کرنیں ابھرنے لگیں اور اس دھیمی دھیمی روشنی میں اس نے دیکھا کہ قبر کی سیڑھیاں اتر کر وہاں ایک ستون دار صحن میں آ گیا ہے۔ یہاں پتھر کی چوڑی سل والی چھت کے ساتھ لگے کتنے ہی ستون کھڑے تھے۔ فرش پر ریت تھی۔ ریت پر کسی انسان کے پاؤں کے نشان پڑے تھے۔ ہوا دم ہونے کی وجہ سے نشان بالکل تازہ تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی یہاں سے گزرا ہے۔

اس نیم روشن تنگ جگہ کے وسط میں ایک تابوت پڑا تھا۔ تابوت کے سرہانے دو نیلے رنگ کے قدیم مصری مرتبان پڑے تھے۔ تابوت کے اوپر ایک شمع دان رکھا تھا۔ اس شمع دان میں شمع کی دھیمی لو جل رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ قبر کے عُقب میں مروے کی روز مرہ استعمال کی چیزیں پڑی تھیں۔ سونے کی چوکی' سنگھار دان' جوتے' زیورات' ریشمی کپڑے' مشروب پینے والے آلات..... یہ یقیناً" کسی فرعون کی ملکہ کا تابوت تھا۔

عاطون نے تابوت پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اسی عورت نے آواز دی "عاطون! میں یہاں نہیں ہوں۔"

عاطون نے چونک کر اس طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی۔ یہ آواز سامنے والی دیوار کی طرف سے آئی تھی۔ ریت پر انسانی قدموں کے نشان اس دیوار کی طرف جا رہے تھے۔ عاطون دیوار کے پاس گیا تو اسے نیم تاریکی میں ستون کے ساتھ زنجیر سے بندھا ہوا ایک انسانی ڈھانچہ نظر آیا۔ یہ انسانی ڈھانچہ قدرے آگے کو جھکا ہوا تھا۔ عاطون چشم حیرت سے اس

ڈھانچے کو دیکھ رہا تھا' جس کی کھوپڑے پر ابھی تک سنہری بالوں کی چند ایک لکیریں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ آواز پھر آئی۔

"عاطون! مجھے اس زنجیر سے آزاد کر دو۔ یہ لوہا آگ کی طرح دہک کر میری روح کو جلا رہا ہے۔"

عاطون نے لوہے کی زنجیر کو ایک جھٹکے سے توڑ ڈالا۔ ڈھانچہ نیچے گرنے لگا تو عاطون نے اسے سنبھال لیا اور احتیاط سے فرش پر لٹ دیا۔ عاطون کو ایک عورت کے گہرا سانس لینے کی آواز آئی۔ "عاطون تم نے مجھے ایک ایسے عذاب سے نجات دلائی جسے میں سینکڑوں برس سے بھگت رہی تھی۔"

عاطون نے عورت کے ڈھانچے کو غور سے دیکھا۔ اس کی کھوپڑی کے سوراخوں میں جیسے دو آنکھوں کا دھیما سا عکس جھلک رہا تھا۔ عاطون نے کہا۔ "تم کون ہو؟ ایسا کیوں ہے کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جانے کے بعد بھی تمہاری روح تمہارے جسم سے الگ نہیں ہوئی؟ اور یہ ساتھ والی قبر کس کی ہے؟"

ڈھانچے کی کھوپڑی کے سوراخوں میں آنکھوں کا عکس دھندلا ہو گیا۔ عاطون کو عورت کی آواز آئی۔ "یہ ایک ایسا راز ہے جس کو صرف میں تمہارے سامنے ہی افشا کر سکتی ہوں کیونکہ تم عام انسانوں سے مختلف ہو اور غیر مرئی طاقتیں رکھتے ہو مگر اس راز کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے جسم کا تھوڑا سا خون نکال کر میری کھوپڑی پر ٹپکاؤ۔"

عاطون بولا۔ "یہ کون سی مشکل بات ہے۔"

عاطون نے فرش پر سے ایک نوکیلا پتھر اٹھا کر اپنی انگلی پر ہلکا سا کٹ لگایا۔ اس وقت اس نے اپنے جسم کی رگوں کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ انگلی میں سے خون کے قطرے نکلنے لگے۔ عاطون نے یہ قطرے عورت کی کھوپڑی کے اوپر گرائے۔ خون کے قطروں کا گرنا تھا کہ عاطون کو اپنا جسم سوائے گردن کے اور آنکھوں کے اکڑتا محسوس ہوا۔ اس نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ وہ اپنی جگہ سے پیچھے کھسکتے ہوئے بولا۔ "میری رگیں سخت ہو رہی ہیں' اس کی کیا وجہ ہے؟"

عاطون کو عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی بجائے عاطون نے ایک حیرت انگیز بات دیکھی۔ عورت کے ہڈیوں کے ڈھانچے نے ہلنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی کھوپڑی کے سوراخوں میں آنکھوں کا رنگ بدل کر سیاہ ہو گیا تھا۔ پھر عاطون کے دیکھتے ہی دیکھتے کھوپڑی پر زندہ انسانی کھال کی تہہ ابھر آئی۔ آہستہ آہستہ اس کا ڈھانچہ گوشت پوست میں تبدیل ہو گیا۔ کھوپڑی پر سنہری گنجان بال نمودار ہو گئے۔

عاطون نے سوال کرنے کے لیے ہونٹ ہلانے چاہے مگر یہ محسوس کر کے وہ سکتے میں آ گیا کہ اس کے ہونٹ پتھر بن گئے تھے۔ وہ صرف اپنی گردن اور آنکھیں ہی ہلا سکتا تھا' باقی سارا جسم پتھر کی طرح سخت اور بے حس ہو گیا تھا۔ آواز اس کے پتھریلے حلق سے خالی ہوا بن کر باہر نکل گئی۔ اس کا ذہن ویسے ہی کام کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں عورت کے ڈھانچے پر لگی ہوئی تھیں' جو اب ایک انتہائی حسین اور صحت مند نوجوان عورت کے جسم میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور چمکیلی تھیں - وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور عاطون کی طرف دیکھ کر بولی۔

"میں ایک ایسی گناہ گار عورت تھی' جس نے اپنے عاشق کی خاطر اپنے خاوند اور اس کے بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں مصری دمشق کی سب سے امیر ترین عورت کی چہیتی کنیز تھی۔ میرا نام الطواشی ہے مگر میرے بے وفا عاشق نے بھی مجھ سے وفا نہ کی اور مجھے چھوڑ کر کسی دوسری عورت سے بیاہ کر لیا۔ میں نے ان دونوں کو بھی مار ڈالا۔ چونکہ میں ایک امیر زادی کی چہیتی کنیز تھی' اس لیے کوئی مجھ پر ہاتھ نہ ڈال سکا پھر بھی دشمن میرے پیچھے لگے تھے۔ شہر کے سب سے بڑے کاہن سے میری دوستی تھی' اس نے مجھے پانی میں ایک نقش گھول کر پلا دیا' جس کی تاثیر یہ تھی کہ میں مر نہیں سکوں گی۔ اس وقت میں بڑی خوش ہوئی کہ اب میں ہمیشہ زندہ رہوں گی۔ جب امیر زادی مر گئی اور اس کی وصیت کے مطابق مجھے اس کی میت کے ساتھ زندہ دفن کر دیا گیا۔ تب بھی مجھے یقین تھا کہ میں نہیں مروں گی۔ مجھے زندہ حالت میں اس کے ستون کے ساتھ جکڑ دیا گیا..... لیکن چند ہی روز گزرنے کے بعد میرا جسم گلنے سڑنے لگا۔ میرا جسم سڑ گیا.....میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی لیکن کاہن کے نقش کے اثر سے میں زندہ رہی۔ میری روح اپنے جسم کی ہڈیوں سے اسی طرح لپٹی رہی۔ اب مجھے میرے گناہوں کی سزا ملنے لگی۔ لوہے کی زنجیر آگ میں سرخ ہو گئی اور وہ میری روح کو اپنی بے پناہ تپش میں جلانے لگی۔ میری آہ و زاری نے خود میرا کلیجہ ہلا کر رکھ دیا۔ پھر ایک روز میرے کانوں میں کاہن کی آوز آئی۔ اس نے بتایا کہ عاطون نام کا ایک حیرت انگیز نوجوان ادھر سے گزرے گا' تم اس کی آمد پر اس کو محسوس کر لو گی اگر کسی طرح اس کے جسم کے خون کے چند قطرے تمہاری کھوپڑی پر گرا دیے جائیں تو عاطون پتھر کی زندہ لاش میں تبدیل ہو جائے گا مگر تم پھر سے زندہ حالت میں آ جاؤ گی تب سے لے کر اب تک کئی صدیاں تمہارے انتظار میں گزر گئیں۔ آخر میرے عذاب کی مدت ختم ہوئی اور تم اہرام کے غار میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تم بخوبی جانتے ہو۔"

عاطون اس عیار خاتون سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا یہی نیکی کا صلہ ہوتا ہے، جیسے کہ اطواشی اس کے دل کا حال سمجھ گئی تھی اس نے مسکرا کر کہا۔

"میں ایک زندگی کے گناہوں کا عذاب جھیل چکی ہوں، اب دوسری زندگی کے عذاب کے لیے گناہوں کی تاریک وادی میں داخل ہو رہی ہوں، اس لیے کہ میں گناہ کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ میرا پہلا گناہ ہے کہ میں نے تمہیں دھوکا دے کر یہاں بلایا اور پھر تمہاری زندگی کو ساکت کر کے خود زندگی کا چولا بدل لیا۔ اب میں تمہیں اپنی مالکن کے تابوت میں ڈال جاؤں گی تاکہ تمہیں کوئی تلاش کرنے بھی آئے تو تمہارا سراغ نہ مل سکے۔"

مکار اور گناہ گار کنیز اطواشی، عاطون کے بے حس جسم کو گھسیٹتی ہوئی تہہ خانے کے وسط میں بنے ہوئے تابوت کے پاس لے گئی۔ اس نے تابوت کو کھول کر ڈھکنا الگ کیا۔ تابوت کے اندر لاش کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ اطواشی نے عاطون کو اٹھا کر تابوت میں لاش کے ڈھانچے کے اوپر لٹایا اور تابوت کا ڈھکن بند کر دیا۔

اس کے بعد اطواشی نے کونے میں رکھے ہوئے کپڑے پہنے۔ بالوں میں سونے کی کنگھی پھیری اور تابوت پر جلتی شمع کو پھونک مار کر بجھایا اور زینہ چڑھ کر قبر کے پہلو سے نکل کر اوپر تہہ خانے میں آ گئی اس نے قبر کے اکھڑے ہوئے پتھر کو زور لگا کر واپس اپنی جگہ پر جوڑا اور دوسرے زینے پر سے ہوتی ہوئی اہرم کے غار میں آ گئی۔ غار کے باہر تازہ ہوا میں اطواشی نے نیلے آسمان پر پھولوں کی طرح کھلے ہوئے ستاروں کو دیکھا تو ایک گہرا سانس لیا۔ ان ستاروں اور صحرا کی بارش میں بھیگی ہوئی رات کو سینکڑوں برسوں کے بعد دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک عجیب مخلوق تھی، جو زندوں میں تھی اور نہ مردوں میں..... اس کی زندگی کا راز اس نقش میں تھا، جو اس کی ہڈیوں میں سرایت کر چکا تھا۔

اطواشی نے منہ ہی منہ میں سینکڑوں برس پہلے کا ایک قدیم منتر دہرایا اور غار کے باہر آ کر فضا میں اوپر کو اچھلی۔ فضا میں اچھلتے ہی وہ غائب ہو گئی۔ غائب وہ اس انداز میں ہوئی کہ وہ خود تو اپنے آپ کو دیکھ سکتی تھی مگر اسے کوئی دوسرا شخص نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ نیم روشن خاموش رات کی فضاؤں میں اس طرح لیٹی تھی جیسے کسی تخت پر سو رہی ہو اور اس کے جسم نے اپنے آپ اس طرف پرواز شروع کر دی تھی جدھر آسمان پر قطبی ستارہ چمک رہا تھا۔

عاطون اہرام کے نہاں خانے میں تابوت کے اندر لاش کی ہڈیوں پر سیدھا لیٹا تھا۔ اس کا جسم جامد تھا۔ وہ صرف اپنی گردن اور آنکھوں کو ادھر ادھر ہلا سکتا تھا۔ اس کا ذہن زندہ

تھا۔ وہ ان نیک روحوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جنہوں نے مصیبت کے وقت ہمیشہ اس کی مدد کی تھی۔ وہ دل ہی دل میں انہیں یاد کرنے لگا مگر کوئی بھی روح اس کی مدد کو نہ پہنچی۔ خدا جانے یہ اس کے کس گناہ کا کفارہ تھا۔ عاطون سوچنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور گہرے مراقبے میں محو ہو گیا۔ اس نے خود کو تقدیر کے عوامل کے حوالے کر دیا تھا۔

خانہ بدوش داستان گو پدم ناگ کو سانپ کے روپ میں تھیلی میں بند کیے گھوڑے پر سوار دریائے اردن کی جانب سفر کر رہا تھا۔ راستے میں تین مقامات پر پڑاؤ کرنے کے بعد خانہ بدوش وادی اردن میں داخل ہو گیا۔ وادی کے جنوب میں دریا سے دور مٹی کے بڑے اونچے اونچے تودے نصف دائرے کی صورت میں پھیلے ہوئے تھے ان تودوں کے وسط میں ایک جگہ زیتون کے درختوں کا جھنڈ تھا اس جھنڈ میں کوئی پرانا معبد تھا، جس کی دیواریں بوسیدہ ہو رہی تھیں اس کے صحن میں خاک اڑتی تھی اور محرابی دروازے پر جنگلی داخ کی بیل نے سایہ ڈال رکھا تھا۔ یہ معبد کسی ایسے فرقے کا تھا جو رومن قبضے کے بعد وہاں سے جانیں بچا کر بھاگ گئے تھے۔

معبد ایک اونچے کچے چبوترے پر بنا تھا، جس کے آگے پتھر جوڑ کر سیڑھیاں بنا دی گئی تھیں۔ خانہ بدوش یہاں آ کر گھوڑے سے اتر پڑا۔ پدم ناگ جس تھیلی میں سانپ کی شکل میں بند تھا۔ وہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ خانہ بدوش جنگلی داخ کے محرابی دروازے سے گزر کر معبد میں داخل ہو گیا۔ معبد کے اندر ایک تنگ و تاریک کوٹھری تھی۔ یہاں ایک چھوٹی سی قربان گاہ تھی، جہاں کبھی اس فرقے کے لوگ اپنی دیوی، دیوتاؤں کے بت رکھا کرتے تھے۔ اب یہاں کوئی بت نہیں تھا۔ قربان گاہ کے چبوترے کے نیچے ایک چوکور سوراخ تھا۔ جہاں ایک تاریک زینہ نیچے کسی تہہ خانے میں جاتا تھا۔

خانہ بدوش اس تہہ خانے میں اتر گیا۔ یہاں زمین پر رکھے پتھر کے ایک کلس پر موم بتی جل رہی تھی۔ اس کے بالکل سامنے آلتی پالتی مارے سیاہ لبادے میں لپٹا ایک بوڑھا آنکھیں بند کیے بیٹھا گیان دھیان میں محو تھا۔

خانہ بدوش داستان گو اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر بوڑھے نے اپنی لال لال آنکھیں کھول کر خانہ بدوش پر نگاہ ڈالی اور بولا۔ "میں جانتا ہوں تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہو۔ تمہارا ستارہ بہت طاقت ور ہے۔ اس نے تمہیں اس شخص سے ملا دیا، جو ہزار برس کی تگ و دو کے بعد بھی مشکل سے ملتا ہے۔"

خانہ بدوش نے چمڑے کی تھیلی بوڑھے کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "بزرگ عاطوش! تمہارے منتروں کا بھی میری کامیابی میں بڑا ہاتھ ہے۔"

عاطوش زیر لب مسکرایا پھر اس نے تھیلی کو کھول کر پدم ناگ کو فرش پر الٹ دیا۔
پدم ناگ جو اس وقت چھوٹے سانپ کی شکل میں تھا۔ ایسے بے حس ہو چکا تھا جیسے سردی کھایا ہوا ہو۔ وہ بمشکل حرکت کر سکتا تھا۔ اس کا ذہن جیسے گہری نیند میں تھا۔ عاطوش نے انگلی سے پدم ناگ کے سر کو ذرا سا دبایا۔ پدم ناگ کے جسم میں سردی کی مزید ایک یخ بستہ لہر دوڑ گئی۔ خانہ بدوش بولا۔ "یہ میری خوش بختی تھی کہ کارواں سرائے کے باہر جس مجمع میں میں داستان سنا رہا تھا' وہاں یہ پدم ناگ انسانی شکل میں موجود تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس پدم ناگ پر جلدی سے وہ عمل شروع کیا جائے' جس کا تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔"

عاطوش نے خانہ بدوش کو گھور کر دیکھا اور کہا "مجھے یقین ہے کہ تمہیں وہ شرط بھی یاد ہو گی' جو میں نے اس سلسلے میں تمہیں بتائی تھی۔"

"کیوں نہیں عاطوش!" خانہ بدوش بولا۔ "وہ تمہارے اور میرے درمیان معاہدہ ہے' اگر اس پدم ناگ نے سکندر اعظم کے خفیہ خزانے والے مقبرے کا سراغ لگا لیا تو وہاں جس قدر بھی سونا اور جواہرات برآمد ہوئے' اس کا آدھا حصہ تمہارا ہو گا۔"

عاطوش نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "اتنا یاد رہے کہ اگر تم اپنے وعدے سے پھر گئے تو تم میرے منتروں کے انتقام سے نہ بچ سکو گے۔"

خانہ بدوش بڑے انکسار سے کہنے لگا۔ "عاطوش! میرے لیے آدھا خزانہ ہی بہت ہو گا۔ تم مجھ پر اعتبار کرو اور اب جلدی سے پدم ناگ پر اپنا عمل شروع کرو۔"

عاطوش نے پدم ناگ کو مٹی کے ایک کوزے میں بند کر دیا۔ خانہ بدوش پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ عاطوش نے خفیہ منتروں کا جاپ شروع کر دیا۔ ہر پانچ منٹ کے بعد وہ سانپ والے مٹی کے کوزے پر پھونک مارتا۔ یونہی ایک گھنٹے تک وہ عمل پڑھتا رہا۔
جب جاپ کا عمل ختم ہو گیا تو عاطوش نے فرش پر سے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر کوزے پر پھینکی اور خانہ بدوش کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "میرا عمل پورا ہوا۔ اب یہ پدم ناگ ہمیں اسکندر اعظم کے خفیہ مقبرے تک لے جائے گا' لیکن اس کے لیے ہمیں رات کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

جب رات گہری ہو گئی اور بیابان میں اندھیرا چھا گیا تو عاطوش اور خانہ بدوش' پدم ناگ کے کوزے کو لے کر معبد سے نکل آئے۔ وہ ایک ہی گھوڑے پر سوار ہوئے اور شہر جوڈیا کی طرف رخ کیا' جو ارض فلسطین کے شمال میں واقع تھا اور جہاں ایک رومن گورنر ہیروڈ حکومت کرتا تھا۔ دونوں رات کے اندھیرے میں سفر کرتے اور دن کے وقت کسی غار یا درختوں کے جھنڈ میں آرام کرتے کیونکہ عمل کے مطابق پدم ناگ کے ساتھ رات کے سفر

کی شرط تھی۔
تین راتوں کے سفر کے بعد عاطوش اور خانہ بدوش شہر جوڈیا کے قرب و جوار میں واقع وادی گورستان شاہی میں پہنچ گئے۔ قدیم قصے کہانیوں کے حوالے سے اسکندراعظم کے خزانے والا خفیہ مقبرہ اسی وادی میں کہیں زیر زمین موجود تھا۔ ایک روایت کے مطابق اسکندراعظم کی ماں نے اس کی وفات کے بعد ایک تابوت اسکندریہ میں شاہی اعزاز کے ساتھ دفن کروایا تھا اور دوسرا تابوت' جس میں اسکندراعظم کا سونے کا بت رکھا تھا بے پناہ زر و جواہر پر مشتمل خزانے کے ساتھ وادی گورستان شاہی میں کسی جگہ مدفون کر دیا تھا۔
عاطوش اور خانہ بدوش اسی مدفون مقبرے کے خزانے کی تلاش میں پدم ناگ کو لے کر وہاں آئے تھے۔ وادی میں اس وقت رات کا اندھرا پھیلا تھا۔ اس اندھیرے کو ستاروں کی روشنی' تھوڑا تھوڑا روشن کر رہی تھی۔ یہ وادی ایک ویرانہ تھا' جہاں پرانی قبروں کے نشان جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔ عاطوش نے یہاں آتے ہی پدم ناگ کو مٹی کے کوزے سے نکال کر اپنے ہاتھ میں تھاما اور کہا۔ "میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ ہمیں اس مقام پر لے چل' جہاں سکندر اعظم کا زیر زمین خزانہ اور مقبرہ مدفون ہے۔"
پدم ناگ مکمل طور پر عاطوش کے قبضے میں تھا۔ عاطوش نے سانپ کو زمین پر چھوڑ دیا اور خود اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے..... عاطوش کے ہاتھوں سے مس ہونے کے بعد پدم ناگ میں جیسے ایک نئی توانائی سرایت کر گئی تھی اور وہ ناہموار زمین پر بل کھاتا' تیزی سے رینگتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک خاص بو کے تعاقب میں رواں تھا۔ یہ کافور کی بو تھی' جس میں لاخ کی بو کی آمیزش تھی۔ یہ مخصوص بو سکندر کے زیر زمین مدفون مقبرے سے آ رہی تھی۔ فضا میں بکھری ہوئی مختلف بوؤں میں پدم ناگ کی تمام حیات صرف اسی ایک خاص بو پر مرکوز کر دی گئی تھیں۔ اندھیری رات میں اجاڑ بیابان کی غیر ہموار زمین کے گڑھوں' کھڈوں اور خشک کاریزوں میں سے پدم ناگ تیزی سے اس خاص بو کی جانب رواں دواں تھا۔

عاطوش اور خانہ بدوش اس کے پیچھے تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے۔ پدم ناگ مٹی کے ایک بہت بڑے تودے کے پیچھے پہنچا تو مخصوص بو تیز ہو گئی۔ پدم ناگ مٹی کے تودے کی بہت بڑی دراڑ میں داخل ہو گیا۔ یہ دراڑ اتنی بڑی تھی کہ عاطوش اور خانہ بدوش بڑی آسانی سے اس میں داخل ہو گئے۔ عاطوش اپنے ساتھ مشعل اور پھاوڑا بھی لایا تھا۔ اس نے مشعل روشن کر کے ہاتھ میں لے لی..... پھاوڑا خانہ بدوش کے پاس تھا۔ پدم ناگ مشعل کی روشنی میں بو کا سراغ لگاتا آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔

دراڑ کے اندر ایک ایسی سرنگ تھی جو تھوڑے فاصلے پر جا کر بند ہو گئی۔ پدم ناگ ایک جگہ گول چکر کاٹنے لگا۔ بو اس زمین کے نیچے سے آ رہی تھی۔ عاطوش نے سانپ کو پکڑ کر کوزے میں بند کر دیا۔ کوزے میں آتے ہی پدم ناگ کا جسم ایک بار پھر بے حس ہو گیا۔ عاطوش نے خانہ بدوش سے کہا۔ "مدفون مقبرہ اسی جگہ پر ہے یہاں سے زمین کھودنی شروع کر دو۔"

تنو مند خانہ بدوش نے اشارہ پاتے ہی پھاوڑا چلانا شروع کر دیا۔ زمین کچی اور بھربھری تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک گڑھا بن گیا۔ گڑھے میں ایک زینہ ابھر آیا۔ زینے کے آگے ایک پتھر کی دیوار نمودار ہوئی تو عاطوش نے خوشی سے چلا کر کہا۔ "یہی مقبرے کی دیوار ہے' اسے گرا دو۔"

تھوڑی سی تگ و دو کے بعد دیوار گرا دی گئی۔ دیوار کی دوسری جانب ایک تنگ راہ داری تھی۔ عاطوش نے مشعل کی روشنی اندر ڈالی۔ راہ داری میں چھت سے لے کر فرش تک مکڑیوں کے جالے لٹک رہے تھے جو مشعل کے شعلے کے لگتے ہی شرارے بن کر اڑ گئے۔ اب وہ دونوں اس راہ داری میں آگے بڑھے۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ ایک شاہ نشین میں آ گئے جس کے وسط میں آبنوس کا ایک لمبا تابوت پڑا تھا۔ دیوار سیاہ پتھروں کی تھی جس کے ساتھ دو بھاری صندوق پڑے تھے۔ خانہ بدوش خوشی سے اچھل پڑا۔ "عاطوش ہم نے خزانہ پا لیا ہے۔"

خانہ بدوش آبنوسی تابوت کی درز میں پھاوڑا پھنسا کر اسے اکھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ عاطوش نے کوزے میں سے پدم ناگ کو نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ پھر عاطوش نے بجلی ایسی تیزی کے ساتھ پدم ناگ کو خانہ بدوش کی گردن پر چھوڑ دیا۔ پدم ناگ ایک بار پھر عاطوش کے ہاتھوں کے لمس سے تیز طرار ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے عاطوش کے ہاتھوں کے لمس میں ایک حکم تھا۔ پدم ناگ نے اس کے حکم کی تعمیل میں ایک سیکنڈ کے اندر خانہ بدوش کی گردن پر ڈس لیا۔ پدم ناگ سانپوں کا دیوتا تھا۔ اس کے زہر کو ایک پل کے لیے بھی انسان برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ڈستے ہی پدم ناگ اچھل کر پیچھے کو ہٹ گیا جب کہ خانہ بدوش دھڑام سے آگے کو تابوت پر گر پڑا۔

عاطوش نے سانپ کو ہاتھوں میں لے کر پھونک ماری اور کوزہ توڑ کر اسے اپنی جیب میں ڈال لیا پھر جھک کر خانہ بدوش کے چہرے کو دیکھا۔ خانہ بدوش کے منہ' ناک اور کانوں سے سیاہ رنگ کا سیال تیزی سے بہنے لگا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ عاطوش نے خانہ بدوش کی لاش کو تابوت پر سے پیچھے دھکیل دیا اور تابوت کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا۔ مشعل کی روشنی میں تابوت

کے اندر سکندر اعظم کا سونے کا بت جگمگا رہا تھا۔ عاطوش نے وفور مسرت سے ایک قہقہہ لگایا اور تیزی سے پلٹ کر دیوار کے ساتھ لگے دونوں صندوق بھی توڑ دیے۔ صندوق منہ در منہ انمول ہیرے جواہرات' مونگوں' موتیوں اور عقیق و گوہر سے بھرے پڑے تھے۔ یہ اتنا بڑا خزانہ تھا کہ عاطوش نے کبھی خواب میں بھی اس کا تصور نہیں کیا تھا۔ وہ دیوانہ وار ان جواہرات کو اپنے اوپر اچھالنے لگا۔ اتنی دولت دیکھ کر وہ اپنے آپ میں نہ رہا تھا۔ وہ ہیرے موتیوں سے اپنی جیبیں بھرنے لگا۔ کبھی رقص کرتا' کبھی جواہرات کی ڈھیریوں پر لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ اتنے میں اسے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دھم.....دھم.....دھم.....

کوئی اس طرف بڑھ رہا تھا۔ عاطوش وہیں رک گیا۔ مشعل تابوت کے ساتھ لگی جل رہی تھی۔ عاطوش پھٹی پھٹی آنکھوں سے گری ہوئی دیوار کی طرف دیکھنے لگا۔ آواز اسی طرف سے آ رہی تھی۔ اتنے میں ایک اونچی لمبی ممی جو سر سے پاؤں تک زرد اور میلی کچیلی پٹیوں میں لپٹی تھی بھاری قدم اٹھاتی نمودار ہوئی۔ عاطوش نے ایک منتر پڑھ کر پھونکا۔ ممی کے اردگرد ایک شعلہ سا بلند ہوا مگر ممی پر اس شعلے کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ گری ہوئی دیوار کے شگاف میں سے شاہ نشین میں آ گئی۔ اندر آتے ہی اس کے منہ سے ایک ایسی دہشت ناک آواز بلند ہوئی کہ عاطوش کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خوف اور دہشت کے مارے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ پہلو بچا کر ممی کے ایک طرف سے باہر بھاگنے لگا تو ممی نے اسے اپنا لمبا بازو بڑھا کر گردن سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔ عاطوش کی چیخ نکل گئی۔ ممی کے حلق سے ایسی غراہٹ نکلی جیسے کوئی زخمی چیتا درد سے جھلا کر غرا رہا ہو۔

ممی نے عاطوش کو ایک زور دار جھٹکا دیا۔ پدم ناگ اس کی جیب سے اچھل کر نیچے گر پڑا۔ ابھی تک پدم ناگ کا جسم بے حس تھا۔ جیسے پالا کھایا ہوا ہو۔ ممی نے عاطوش کو زور سے تابوت پر دے مارا۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ عاطوش کی کمر کی ہڈی کے دو ٹکڑے ہو گئے اور وہ وہیں ختم ہو گیا۔ ممی نے انتہائی خونخواری کے عالم میں عاطوش کی لاش کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

عاطوش کے مرتے ہی پدم ناگ کی طاقت واپس لوٹ آئی۔ وہ برق رفتاری سے دیوار کے شگاف سے نکل گیا اور راہ داری سے گزرتا زینہ چڑھ کر تنگ و تاریک سرنگ میں آ گیا۔ یہاں سے بھی رینگتا ہوا وہ مٹی کے تودے کی دراڑ سے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہی پدم ناگ نے سانس کھینچ کر چھوڑا تو وہ انسانی شکل اختیار کر گیا تھا۔ پدم ناگ نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور مٹی کے بہت بڑے تودے پر نگاہ ڈالی جو یوں لرز رہا تھا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ پدم ناگ کے دیکھتے دیکھتے تودے کی دراڑ ایک دلخراش آواز کے ساتھ بند ہو گئی۔ اس کے

بعد چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ مٹی کا تودہ بھی ساکت ہو گیا۔

پدم ناگ کو ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ اس نے اپنے سر کو ہلکا سا جھٹکا اور آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس ملک میں ہے اور اس وادی کا نام کیا ہے اور اس کے آگے کیا ہے۔ اسے خانہ بدوش اور عاطوش کی باتیں بھی یاد نہیں رہی تھیں۔ پدم ناگ کو اپنے دوست عاطون کا خیال آنے لگا۔ اسے یاد آیا کہ وہ کارواں سرائے میں گہری نیند سو رہا تھا اور اب یہاں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر پہلے عاطوش اور خانہ بدوش کی جو باتیں یاد تھیں اب وہ انہیں بھی بھول گیا تھا۔

پدم ناگ کے لیے یہی بات بہت غنیمت تھی کہ اسے اس کی کھوئی ہوئی طاقت واپس مل گئی تھی۔ اس نے قطبی ستارے کی سیدھ میں چلنا شروع کر دیا۔ مٹی کے تودوں کی وادی سے نکل کر پدم ناگ کو دور جوڈیا شہر کی فصیل پر جلتی مشعلوں کی جھلملاتی روشنیاں نظر آئیں۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سا شہر ہے۔ وہ محض اس امید پر اسی طرف چل پڑا تھا کہ شاید وہاں اس کی ملاقات عاطون سے ہو جائے۔ پدم ناگ نے اپنی جون بدلنے کا فیصلہ کیا اور اندر کو سانس کھینچ کر ایک چھوٹے سنہری عقاب کی شکل میں آ گیا۔ وہ غوطہ لگا کر اوپر کو اٹھا اور شہر کی طرف پرواز کرنے لگا۔

جوڈیا شہر اس وقت عظیم رومن سلطنت کے زیر نگیں تھا اور ہیروڈ نام کا ایک ہوس پرست، عیاش رومن سردار اس شہر پر حکومت کرتا تھا۔ اسے شاہ روم، شاہ آگٹس کی حمایت حاصل تھی، چنانچہ وہ من مانی کرتا تھا اور رعایا اس کی ستم رانیوں کا شکار بنی ہوئی تھی۔ پدم ناگ فضا میں پرواز کرتے ہوئے جوڈیا کے اوپر آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ یہ ایک قدیم شہر ہے جس کی فصیلوں پر حفاظتی برج بنے ہیں جہاں زرہ پوش رومن سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ شہر کے وسط میں گورنر کا عالیشان محل تھا جس کے بعض ایوانوں کی جھلمنیوں میں سے شمع دانوں کی دھیمی روشنی باہر آ رہی تھی۔ شہر کے اوپر دو تین چکر لگانے کے بعد پدم ناگ فصیل شہر سے باہر کھجور کے درختوں کے ایک جھنڈ میں اتر آیا۔ یہاں اندھیرا تھا اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ درختوں کے قریب ہی ایک چھوٹا سا چشمہ بہہ رہا تھا۔ اس چشمے کی مترنم آواز خاموشی کو جیسے گہری نیند سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پدم ناگ یہ سوچ کر ایک درخت کی سب سے اونچی شاخ پر بیٹھ گیا کہ جب دن چڑھے گا تو وہ اپنے دوست عاطون کی تلاش میں نکل کھڑا ہو گا۔

رات آہستہ آہستہ ڈھلتی جا رہی تھی۔ فصیل شہر پر جلتی مشعلیں بجھا دی گئیں۔ شہر کا صدر دروازہ کھول دیا گیا اور پھر مشرقی افق پر دریا پار سنہری سورج طلوع ہوا۔ شاہی محلات

پر پیش کاروں نے نفیریاں بجا کر صبح کی آمد کا اعلان کیا۔ اتنے میں پدم ناگ کو نوبتوں، نفریوں اور عورتوں کے گیت گانے کی سریلی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے اپنی گردن گھما کر دیکھا کہ مغرب کی طرف سے ایک جلوس چلا آ رہا ہے۔ جلوس میں سرخ رومن جھنڈے صبح کی ہوا میں لہرا رہے تھے اور اونٹوں کے ہودوں پر منڈا ہوا پترا چمک رہا تھا۔ یہ کوئی شاہی جلوس تھا۔ پدم ناگ جلوس دیکھنے کے لیے درخت کی بلند شاخ سے اڑ گیا۔

جلوس کئی اونٹوں پر مشتمل تھا اور ایک قافلے کی شکل میں آ رہا تھا۔ رومن فوج کا ایک گھڑ سوار دستہ ساتھ تھا۔ کچھ اونٹوں پر شاہی سازوسامان تھا۔ دس بارہ رومن لڑکیاں جلوس کے آگے آگے مجیرے بجاتی گاتی ہوئی رقص کرتی آگے بڑھ رہی تھیں۔ تقریباً" سبھی اونٹوں کے ہودوں پر زرنگار رنگ برنگی عماریاں جمی ہوئی تھیں سب سے آگے جو اونٹ تھا اس کی عماری کی چھت پر ہیرے جواہرات طلوع ہوتے سورج کی کرنوں میں جگمگا رہے تھے۔ پدم ناگ نے دیکھا کہ اس عماری میں سنہری بالوں اور سرخ و سفید چہرے والی ایک انتہائی حسین نوجوان شہزادی سر پر جواہرات کا تاج رکھے ریشمی لباس میں ملبوس بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ دو کنیزیں اس کے دائیں بائیں بیٹھی اسے مور چھل سے ہوا دے رہی تھیں۔

پدم ناگ اگرچہ ایک سنہری عقاب کی شکل میں تھا لیکن وہ بھی اس شہزادی کے حسن جہاں سوز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس اثناء میں شہزادی نے بھی ایک سنہری عقاب کو اپنی عماری کے اوپر اڑتے دیکھ لیا تھا۔ یہ خوش نصیبی کی علامت تھی کہ کسی شہزادی کی عماری شہر میں داخل ہو رہی ہو اور آسمان پر سنہری عقاب نے اس کے چکر کاٹے۔ شہزادی نے حکم دیا کہ عقاب کو پکڑا جائے۔ سپاہی عقاب کی طرف دیکھنے لگے۔ چونکہ پدم ناگ کو بھی یہ شہزادی پیاری لگی تھی اس لیے اس نے سوچا کہ خود ہی اس کے حضور پیش ہو جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے اس طرح عاطون کا بھی کوئی سراغ مل جائے۔

پس پدم ناگ نے ایک غوطہ لگایا اور اس سے پیشتر کہ شاہی محافظ دستے کے سپاہی اسے پکڑنے کے لیے کوئی جتن کرتے وہ خود ہی شہزادی کی عماری میں آ کر اس کی گود میں بیٹھ گیا۔ یہ بہت بڑی خوش نصیبی کی علامت تھی کہ سنہری عقاب شہر میں داخل ہوتی شہزادی کے پاس اپنے آپ اتر آئے۔ گیت گاتی کنیزوں اور رومن سپاہیوں نے شہزادی سلومی زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

شہزادی سلومی نے سنہری عقاب کے سر پر بڑے پیار سے اپنی نازک خوشبودار انگلیوں والا سرخ و سپید ہاتھ پھیرا۔ پدم ناگ نے اپنا سر نیچے کر لیا۔ شہزادی سلومی کے پاس بیٹھی کنیزوں نے شہزادی کی خوش بختی پر اسے مبارکباد دی۔ شہزادی نے انھیں زر و جواہر

لٹانے کا حکم دیا۔ اسی وقت اونٹوں کے کجاووں پر سے سونے کے سکوں اور موتیوں سے بھرے ہوئے طشت راستے پر الٹ دیئے گئے۔ فصیل سے باہر کے غریب لوگ دور کھڑے ڈری ہوئی نظروں سے شہزادی کی سواری کو گزرتے دیکھ رہے تھے۔ جونہی سکوں اور موتیوں کے طشت الٹائے گئے وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے اور ان سکوں پر ٹوٹ پڑے۔ رومن سپاہیوں نے شہزادی کے حکم پر انہیں کچھ نہ کہا۔

شہزادی سلومی کی سواری فصیل شہر کے قلعے والے دروازے میں سے اندر داخل ہو گئی۔ شاہی محل کے صدر دروازے پر گورنر ہیروڈ اور اس کی بیوی جوڈتھ' امراء' وزرا کے ساتھ شہزادی کے استقبال کو کھڑے تھے۔ سلومی' گورنر ہیروڈ کی بیوی' جوڈتھ کے پہلے خاوند میں سے تھی۔ بد کردار ہیروڈ' سلومی پر بری نظر رکھے ہوئے تھا۔ یہ ایک عیاش اور بد کردار حکمران ہی نہیں تھا بلکہ انتہائی سنگ دل اور ظالم بھی تھا۔ مگر سلومی کے معاملے میں اپنی بیوی اور سلومی کی ماں جوڈتھ سے دبتا تھا۔ اگرچہ اس نے اپنے دل کا حال ظاہر نہیں کیا تھا مگر اس کی بیوی اپنے بے غیرت خاوند کی بری نظروں کو بھانپ چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی بیٹی سلومی کو روم بھجوا رکھا تھا۔ سلومی آج دو برس کے بعد جوڈیا لوٹ رہی تھی۔

گورنر ہیروڈ نے آگے بڑھ کر سلومی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ہمارا محل سلومی کے بغیر دو برس سے اداس تھا۔"

سلومی بھی اپنے مکروہ باپ کے جذبات سے آگاہ تھی اور اس سے دور دور رہتی تھی مگر اوپر سے وہ تمام شاہی آداب کو ملحوظ خاطر رکھے ہوئے تھی۔ ملکہ جوڈتھ نے اپنی بیٹی کو گلے لگا کر اس کا ماتھا چوما اور سنہری عقاب کے بارے میں پوچھا۔ جب اسے علم ہوا کہ یہ عقاب اپنے آپ اس کی عماری میں آیا تھا تو وہ اس کی بلائیں لینے لگی۔ ہیروڈ نے اسی وقت حکم دیا کہ سنہری عقاب کو سونے کے پنجرے میں رکھا جائے۔ سلومی نے اپنی چمکیلی آنکھیں اٹھا کر کہا۔

"یہ مبارک عقاب پنجرے میں بند نہیں کیا جائے گا۔ یہ ہمارے پاس رہے گا۔" تو گورنر ہیروڈ کھسیانا ہو کر رہ گیا۔

عقاب کو شہزادی نے اپنے ہاتھ پر بٹھا رکھا تھا۔ اس رات شاہی محل میں شہزادی سلومی کے اعزاز میں زبردست ضیافت ہوئی۔ شہزادی سلومی کے زرتار شاہانہ لباس پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ عقاب اب بھی اس کے ساتھ تھا مگر اسے اب ایک کنیز خاص اٹھائے ہوئے تھی۔ پدم ناگ اس شاہی ضیافت سے خوب لطف اندوز ہوا۔ شاہانہ جشن رات گئے

تک جاری رہا۔ رقص و سرور کی محفل گرم رہی۔ پھر ملکہ جوڈتھ شہزادی سلومی کو اپنے ساتھ اس کی خواب گاہ میں لے گئی۔

پدم ناگ عقاب کو شہزادی کی خواب گاہ میں سونے کے اسٹینڈ پر بٹھا دیا گیا۔ اسے کھانے کو انواع و اقسام کے پھل اور ہر قسم کے پرندوں کا گوشت دیا گیا۔ پدم ناگ کو اس کی حاجت نہیں تھی پھر بھی اس نے اس دعوت کا خوب مزا اڑایا۔ جوں جوں رات گہری ہوتی گئی محل پر خاموشی چھاتی چلی گئی۔ کنیزوں نے شہزادی کو شب خوابی کا لباس پہنایا اور شب بخیر کہہ کر چلی گئیں۔ خواب گاہ کی شمع دھیمی کر دی گئی۔ فضا خوشبویات سے مہک رہی تھی۔ چوبی دریچوں کی زرکار جالیوں میں سے زرد چاند کی کرنیں اندر داخل ہو رہی تھیں۔ شہزادی سلومی زرنگار پلنگ کے بستر سنجاب پر لیٹی نیند کی لہروں پر ہلکے ہلکے جھکورے لے رہی تھی۔ پدم ناگ عقاب بھی سر نہواڑے خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ عاطون کو شہر میں ڈھونڈنے کی کوشش کرے گا۔ سارے شہر پر سناٹا چھا چکا تھا۔ گھروں کے چراغ گل کر دیے گئے تھے۔ زرد چاند شہر کی فصیل کے اوپر چمک رہا تھا۔

اتنے میں شہر کی فصیل کے باہر ایک پر شکوہ آواز بلند ہوئی۔ یہ کسی مرد کی صحت مند' بارعب اور پر وقار آواز تھی جو دور سے آ رہی تھی مگر الفاظ صاف سمجھ میں آ رہے تھے۔ شہزادی سلومی نے بند ہوتی نگاہیں کھول دیں اور آواز پر کان لگا دیے۔ فصیل کے باہر سے آتی آواز میں ایک آسمانی گونج تھی۔ کوئی شخص کہہ رہا تھا۔

"تیرے دل کو شیطان نے اپنی مٹھی میں جکڑ لیا ہے۔ اس روز سے ڈر جب تجھ پر قہر خداوندی نازل ہو گا۔ تو ایک ایسے گناہ کو دعوت دے رہا ہے جس کے تصور ہی سے زمین و آسمان کانپ اٹھتے ہیں۔ اے ہیروڈ! اپنے گناہوں سے توبہ کر نہیں تو میں تجھے تمہارے المناک انجام کی پیش گوئی سناتا ہوں۔"

شہزادی سلومی بستر پر سے اٹھ بیٹھی۔ اس پر شکوہ آواز نے اس پر بھی لرزہ سا طاری کر دیا تھا۔ اس نے سرہانے کی جانب لٹکتی سنہری پٹی کو زور سے کھینچا۔ دوسرے لمحے کنیز خاص خواب گاہ میں داخل ہو کر آداب بجا لائی۔ شہزادی سلومی نے پوچھا یہ کون شخص ہے جو آدھی رات کے بعد ہیروڈ کو اس کے عبرت انگیز انجام سے خبردار کر رہا ہے؟ کنیز خاص نے ادب سے عرض کی۔

"شہزادی سلامت! یہ راہب جیکونن ہے جو کہتے ہیں کہ بہت عبادت گزار نوجوان ہے۔ وہ پہاڑی غار میں رہتا ہے اور جنگلی شہد پر گزر بسر کرتا ہے۔ پچھلے دو ماہ سے وہ ہر رات محل کی جانب منہ کر کے یہی الفاظ دہراتا ہے۔"

شہزادی سلومی نے پوچھا۔ "ہیروڈ نے اسے ابھی تک قتل کیوں نہیں کیا؟"
کنیز خاص نے عرض کیا۔ "شہزادی سلامت! میں لاعلم ہوں۔"
سلومی نے کنیز خاص کو واپس جانے کا حکم دیا اور خود دریچہ کھول کر باہر دیکھا۔ زرد چاند دور خشک پہاڑیوں کے اوپر لٹک رہا تھا۔ خندق کے پار ایک کچی ٹیکری پر اسے انسانی سایہ نظر آیا۔ "ہیروڈ کی بیٹی! اپنے گناہوں سے توبہ کر۔ تیرے سنہری بال ایک دن شعلوں کی زبانیں بن کر تیرے جسم سے لپٹ جائیں گے۔ انسان چاہے چھپ کر گناہ کرے آسمان کے ستارے اسے دیکھ رہے ہیں۔ وقت دیکھ رہا ہے۔ ستارے اور وقت تیرے گناہوں کی گواہی دیں گے۔ آسمان پر آنے والے عذاب کی نشانی کو پہچان اے ہیروڈ کی بیٹی۔"
سلومی نے جلدی سے دریچہ بند کر دیا۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ راہب جیکونن اس کے خلاف کیوں ہے؟ پھر سلومی کو اپنے گناہ یاد آنے لگے۔ اس نے شمع کی روشنی اونچی کر دی اور بستر پر لیٹ کر پہلو بدلنے لگی۔ پدم ناگ عقاب کی شکل میں یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

دوسرے روز سلومی نے اپنی والدہ سے رات والی آواز پر استفسار کیا تو اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں چھا گئیں۔ اس نے سلومی کو اپنی بیٹی کو گلے سے لگا لیا اور پیار کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اب تیرا بھی دشمن بن گیا ہے۔ وہ تیرے باپ کے گناہوں سے برافروختہ ہے۔ مگر تو پریشان نہ ہو میری بیٹی! یہ راہب کچھ روز وعظ کرنے کے بعد چلا جائے گا۔ ایسے راہب شہروں میں آواز حق بلند کر کے چلے جایا کرتے ہیں۔"
سلومی نے کہا۔ "مگر امی جان! میرا باپ ہیروڈ کیسے برداشت کر رہا ہے۔ اس نے ابھی تک اسے موت کے گھاٹ کیوں نہیں اتارا؟"
ملکہ جوڈتھ بولی۔ "شہنشاہ روم آگسٹس کی اب یہی حکمت عملی ہے کہ ان راہبوں کو کچھ نہ کہا جائے۔ یہی وجہ ہے ہ ہیروڈ' راہب جیکونن کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ ورنہ اب تک وہ اس آواز کو ہمیشہ کے لیے دبا چکا ہوتا۔ تو اس کا ذکر ہیروڈ سے مت کرنا۔"
اسی وقت شہزادی سلومی کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا کہ وہ اس نیک دل' روشن ضمیر اور بے باک راہب جیکونن سے ملاقات کرے گی۔ وہ اپنے حجلہ شاہی میں آئی تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی کہ اس کا سنہری عقاب غائب تھا۔ پدم ناگ اپنے دوست عاطون کی تلاش میں شہر کی طرف اڑ گیا تھا۔ سلومی نے محل کے تمام نوکروں اور کنیزوں کو حکم دیا کہ سنہری عقاب کو ڈھونڈا جائے۔

پدم ناگ نے دوپہر کے بعد تک جوڈیا شہر کا کونہ کونہ چھان مارا مگر اسے عاطون کا کوئی سراغ نہ ملا۔ دن ڈھلے وہ محل میں واپس آیا تو شہزادی سلومی بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ جونہی اس کی نگاہ سنہری عقاب پر پڑی اس کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا۔ پدم ناگ سمجھ گیا کہ شہزادی اس کے جانے سے پریشان تھی۔ وہ بڑے پیار سے شہزادی کے کندھے پر آ کر بیٹھ گیا۔ شہزادی سلومی اسے پیار کرنے لگی۔ سنہری عقاب کے واپس آتے ہی شاہی محل کی زندگی بھی معمول پر آ گئی۔
دوسری رات شہزادی سلومی نے راہب جیکونن کی پر شکوہ آواز کا انتظار کیا مگر آواز نہ آئی۔ جب تیسری رات بھی راہب جیکونن کی آواز سنائی نہ دی تو شہزادی سلومی نے اپنے خفیہ جاسوس کو یہ پتا چلانے کے لیے بھیجا کہ راہب جیکونن کس پہاڑی کے غار میں رہتا ہے۔

شام کو خفیہ جاسوس نے آ کر خبر دی کہ راہب جیکونن بستی رملا کی عقبی پہاڑی کے غار میں رہتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک شیر غار کے باہر پہرہ دیتا ہے۔ کوئی اس پہاڑی کی طرف نہیں جاتا۔ شہزادی سلومی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ وہ ایک جذباتی عورت تھی۔ ایک بار جس ضد پر اڑ جائے اسے پورا کر کے ہی چھوڑتی تھی۔ وہ آدھی رات کو راہب جیکونن کے غار میں جانے کا منصوبہ تیار کر رہی تھی کہ سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے اس کے جاسوس نے آ کر اطلاع دی کہ راہب جیکونن بستی رملا میں لوگوں کو وعظ کر رہا ہے۔ شہزادی سلومی نے اسی وقت بھیس بدل کر اپنے جسم اور سر کو سیاہ چادر میں ڈھانپا اپنی کنیز خاص کو ساتھ لیا اور محل کے خفیہ دروازے سے نکل کر گھوڑے کا رخ رملا بستی کی طرف کر دیا۔

رملا بستی فصیل شہر سے ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر تھی۔ شہزادی سلومی سنہری عقاب کو اپنے ساتھ نہیں لے گئی تھی مگر پدم ناگ سمجھ گیا تھا کہ سلومی اپنے آپ کو خطرے میں ڈال رہی ہے۔ چنانچہ اس کے محل سے نکلتے ہی پدم ناگ بھی محل کی کھڑکی سے پرواز کر گیا اور کچھ فاصلے پر رہ کر شہزادی کا تعاقب کرنے لگا۔
شہزادی سلومی نے دور سے دیکھا کہ بستی کے باہر کچھ لوگ جمع ہیں اور ایک لمبے بالوں والا آدمی چبوترے پر کھڑا ایک بازو پھیلائے بول رہا ہے۔ وہ گھوڑے سے اتر پڑی۔ اس نے کنیز سے کہا۔ "تو گھوڑے کو لے کر یہاں ٹھہر۔ میں ابھی آتی ہوں۔"
راہب جیکونن چبوترے پر کھڑا لوگوں کو گناہوں سے توبہ کر کے نیک زندگی بسر کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔ شہزادی سلومی نے بھی عام عورتوں کی طرح سیاہ چادر سے اپنا جسم

ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کی صرف آنکھیں ہی کھلی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی لوگوں کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی نگاہ راہب جیکونن پر پڑی تو وہ اس کے پاکیزہ حسن کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ راہب نے اونٹ کی کھال کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے گھنگریالے سرخ بال لال انگوروں کے گچھوں کی طرح اس کے کاندھے پر پڑے تھے۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں جن میں سات سمندروں کی گہرائی اور بلا خیز چمک تھی۔ راہب جیکونن کا چہرہ سونے کی طرح دمک رہا تھا۔ سلومی اس کے ملکوتی حسن سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔
راہب جیکونن اپنی کیفیت میں گم وعظ کر رہا تھا۔ لوگ ہمہ تن گوش اس کی آواز پر بت بنے کھڑے تھے۔

پدم ناگ بھی عقاب کی شکل میں ایک قریبی مکان کی چھت کی منڈیر پر بیٹھا صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک راہب جیکونن نے پلٹ کر ہجوم میں کھڑی شہزادی سلومی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی مقناطیسی کشش نے جیسے سلومی کو سحر زدہ کر دیا۔ راہب نے اپنا بازو اٹھا کر سلومی کی طرف اشارہ کیا اور پر شکوہ مگر کسی قدر غضب ناک آواز میں بولا۔ "سن اے ہیروڈ کی بیٹی! تیرے عذاب کا دن بھی سر پر آ پہنچا ہے۔ تو میری نگاہوں سے نہیں چھپ سکتی۔"

ہجوم نے شہزادی سلومی پر اپنی نظریں گاڑ دیں پھر ہیروڈ کے خلاف دبی زبان میں بولتے ہوئے سلومی کی طرف بڑھے۔ راہب جیکونن نے بلند آواز میں کہا۔ "گناہ کرنے والے کو خدا کے قانون کے حوالے کر دو تم اس سے بدلہ نہیں لو گے۔"
کچھ لوگ پیچھے ہٹ گئے مگر کچھ مشتعل ہو کر سلومی کی طرف بڑھے۔ سلومی پیچھے کی طرف بھاگی۔ اسے بھاگتے دیکھ کر لوگ بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ کنیز خاص نے یہ عالم دیکھا تو گھوڑے پر سوار ہو کر خالی گھوڑے کی باگیں تھامے شہزادی کی طرف لپکی مگر اس دوران کچھ لوگ سلومی کے سر پر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے سلومی کی چادر کھینچ لی۔ راہب جیکونن کی اونچی آواز گونجی "خبردار! اسے کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ عذاب دینے والے فرشتے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی پدم ناگ چھت کی منڈیر سے اڑا اور مشتعل لوگوں سے چند قدم آگے جا کر زمین پر سیاہ کالا سانپ بن کر گرا اور پھن اٹھا کر اتنے زور سے پھنکار ماری کہ لوگ ڈر کر پیچھے کو دوڑے۔ اس اثناء میں شہزادی سلومی گھوڑے پر سوار ہو چکی تھی اور گھوڑا اسے لے کر شاہی محل کی طرف سرپٹ دوڑنے لگا تھا۔ پدم ناگ نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہیں سے ایک بار پھر سنہری عقاب کا روپ بدلا اور محل کی طرف اڑ گیا۔ لوگ اسے

بھی راہب جیکونن کی کرامت سمجھے اور پلٹ کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ کیونکہ راہب نے انہیں سلومی کو ہاتھ نہ لگانے کا حکم دیا تھا۔ راہب نے اپنے پرجلال چہرے کو آسمان کی طرف اٹھایا۔ سورج مغربی پہاڑیوں میں غروب ہو رہا تھا۔ وہ لوگوں کو اسی حالت میں چھوڑ کر اپنے غار کی طرف چل دیا۔
راہب جیکونن کی محبت نے جیسے سلومی کے دل میں ایک آگ لگا دی تھی۔ یہ آگ اسے جہنم کی آگ کی طرح بھسم کیے جا رہی تھی۔ کیونکہ اس محبت میں گناہ کے انگارے دہک رہے تھے۔ یہ روح کو پاکیزگی عطا کرنے والی محبت نہیں تھی۔ سلومی کو اب کسی کل چین نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ راہب جیکونن سے دوبارہ ملنے کو بے چین تھی۔ اسی رات کے پچھلے پہر جب اسے راہب کی پرجلال آواز فصیل پار سے آتی سنائی دی تو اس نے اپنے جسم کو سیاہ فرغل میں لپیٹا اور محل کے خفیہ دروازے سے نکل کر چاندنی رات میں جس طرف سے آواز سنائی دے رہی تھی اس طرف روانہ ہو گئی۔ خندق کے پل کو عبور کرنے کے بعد اس نے گھوڑے کا رخ ٹیکری کی طرف موڑ دیا۔
راہب جیکونن کی آواز جیسے صحراؤں میں گونج رہی تھی۔ سلومی کو چاندنی رات میں راہب جیکونن کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ ٹیکری کے اوپر کھڑا دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے ہیروڈ کو اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔ شہزادی سلومی ٹیکری کے نشیب میں ایک طرف گھوڑے سے اتری اور راہب کا انتظار کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ وعظ ختم کرنے کے بعد راہب جیکونن اسی راستے نیچے آئے گا۔
اسے ٹیکری کے اوپر سے راہب کی آواز بڑی صاف اور واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد آواز رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ڈھلان پر راہب کا سراپا دکھائی دیا۔ چاندنی میں وہ کوئی شیر لگ رہا تھا جو اپنے سرخ بالوں بھرا سر اوپر اٹھائے بڑے جلال سے نیچے اتر رہا ہو۔ شہزادی سلومی ایک طرف اندھیرے میں ہو گئی۔ جونہی راہب جیکونن اس کے قریب سے گزرا سلومی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ راہب جیکونن بازو چھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ "ہیروڈ کی گناہ گار بیٹی! میرا بازو پکڑنے کے بجائے خدائے واحد کے آگے سجدہ ریز ہو شاید کہ وہ تیرے گناہ بخش دے۔"
شہزادی سلومی نے دونوں بازو پھیلا دیے اور بولی۔ "جیکونن مجھے تمہاری اور صرف تمہاری ضرورت ہے۔ تم میرے محبوب ہو۔"
راہب جیکونن کی آواز شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ "ہیروڈ کی بیٹی! تیرے جسم سے

مجھے گناہ کی بو آ رہی ہے۔ جاؤ واپس اپنے محل میں چلی جا اور اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر۔"

شہزادی سلومی دیوانہ وار آگے بڑھی مگر راہب نے اسے یوں پرے جھٹک دیا جیسے وہ کوئی زہریلا سانپ ہو۔ شہزادی سلومی دھکے سے نیچے گر پڑی۔ راہب جیکونن نے ایک بار پھر سلومی کو ملامت کی اور اپنے پہاڑی غار کی طرف چل دیا۔

شہزادی سلومی اس ناگن کی طرح بل کھا کر رہ گئی' جس کو پاؤں تلے کچل کر راہ گیر آگے چل دیا ہو۔ اس نے جھلا کر کہا۔ "جیکونن! تم میرے انتقام سے نہ بچ سکو گے۔ میں تم سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لوں گی۔ تم نے جوڈیا کی شہزادی کو ٹھکرایا ہے۔"

دور پہاڑی غار کی جانب سے شیر کی آواز سنائی دی۔ شہزادی سلومی نے نفرت سے اپنا پاؤں زمین پر مارا اور گھوڑے پر بیٹھ کر اسے زور سے ایڑ لگاتی محل کے خفیہ دروازے کی طرف روانہ ہو گئی۔

پدم ناگ عقاب کی شکل میں برابر اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ وہ راہب جیکونن کو ایک روشن ضمیر' خدا پرست درویش سمجھتا تھا اور راہب جیکونن کے رویے نے یہ بات ثابت بھی کر دی تھی۔ اس نے شہزادی کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔ صرف اس لیے کہ سلومی کی محبت میں روح کی پاکیزگی نہ تھی۔ اب شہزادی نے اسے دھمکی دی تھی کہ وہ اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے گی۔

پدم ناگ سلومی سے پہلے ہی اس کی خواب گاہ میں اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے سلومی کی دھمکی کو کوئی زیادہ اہمیت نہ دی۔ آخر ایک درویش خدا مست سے یہ عورت کیا بدلہ لے سکتی ہے۔ مگر شہزادی سلومی کے عیار ذہن میں ایک ترکیب آ چکی تھی۔ وہ ہیروڈ سے سیدھے منہ کبھی بات نہیں کرتی تھی' لیکن اب اس نے اپنی ساری توجہ اس پر مرکوز کر دی اور ایک روز اس کی خواب گاہ میں کچھ ایسے انداز میں جا پہنچی کہ بد کردار ہیروڈ بھی حیران رہ گیا۔

شہزادی سلومی نے گہری آواز میں کہا' "مجھے راہب جیکونن کا سر چاہیے۔"

ہیروڈ ناعاقبت اندیش تھا۔ اس پر شیطان کا غلبہ تھا۔ اس نے اسی وقت جلاد کو بلا کر حکم دیا کہ جیکونن راہب کا سر کاٹ کر حاضر کرے۔ اس کے ساتھ ہی ہیروڈ نے شہنشاہ روم شاہ آگسٹس کو خفیہ خط لکھ دیا کہ راہب جیکونن کی سرگرمیاں بغاوت کی حد تک پہنچ گئی ہیں اور خطرہ ہے کہ اگر وہ زندہ رہا تو لوگ سلطنت روم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اس لیے اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا جائے۔ ہیروڈ کو یقین تھا کہ شہنشاہ روم کی طرف سے اسے اجازت مل جائے گی۔ شہزادی سلومی مسکراتی ہوئی خواب گاہ سے نکل گئی۔ پدم ناگ نے یہ

صورت حال دیکھی تو محل سے پرواز کر گیا' وہ سیدھا راہب جیکونن کی غار کے باہر آیا۔ عقاب سے اپنا روپ انسانی شکل میں بدلا اور غار کے اندر چلا گیا۔ دوسری طرف شاہی جلاد بھی گھوڑا دوڑائے غار کی طرف آ رہا تھا۔ راہب مراقبے میں تھا۔ پدم ناگ انسانی شکل میں اس کے سامنے جا کر ادب سے بولا۔ "مقدس راہب! آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

راہب جیکونن نے اپنی آنکھیں کھول کر پدم ناگ کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر آسمانی نور برس رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "جیکونن کے اگر ایک ہزار سر بھی ہوں تو انہیں ایک ایک کر کے خدا کی راہ میں قربان کر دے گا۔"

پدم ناگ بولا۔ "مگر یہ ظلم ہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

راہب جیکونن نے ایک گہری نگاہ پدم ناگ پر ڈالی۔ پدم ناگ کو وہ نگاہ اپنے جسم میں اترتی محسوس ہوئی۔ "پدم ناگ! کیا تو ایک بار پھر منشائے خداوندی میں دخل دینے کی جسارت کرے گا۔ نہیں اب تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ خدا کا حکم پورا ہو گا۔ تم جو کچھ دیکھ رہے ہو یہ ایک بار پہلے بھی ہو چکا ہے اور ایک بار پھر ہو گا۔"

باہر گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ راہب اپنے استھان سے اٹھا اور غار کے دروازے پر آ گیا۔ شاہی جلاد غار کے سامنے آ کر گھوڑے پر سے چھلانگ لگا کر اتر پڑا۔ اس نے اپنی تلوار کھینچ لی اور کہا' "میں ہیروڈ کے حکم سے تمہارا سر کاٹنے آیا ہوں۔"

پدم ناگ شاہی جلاد پر حملہ آور ہوا چاہتا تھا کہ راہب جیکونن نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ راہب کے انداز میں انتہائی سکون اور محبت کا احساس تھا۔ راہب نے شاہی جلاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا سر حاضر ہے۔ تم اپنا فرض ادا کرو اور مجھے اپنا فرض ادا کرنے کا موقع دو۔"

شاہی جلاد کی تلوار چمکی اور دوسرے ہی لمحے راہب جیکونن کا سر تن سے جدا ہو کر زمین پر پڑا تھا۔ شاہی جلاد نے سر اٹھا کر تھیلے میں ڈالا گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے سرپٹ دوڑاتا واپس شاہی محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا تھا کہ پدم ناگ اپنی جگہ پر ششدر کھڑا تھا۔ راہب جیکونن کا دھڑ زمین پر پڑا تھا۔ پدم ناگ کو راہب جیکونن کی موت کا بے حد صدمہ ہوا تھا۔ وہ اس خیال سے لاش کی طرف بڑھا کہ اسے غار کے اندر لے جا کر دفن کر دے لاش ایک دم سے روشن ہو گئی۔ یہ روشنی آسمان کی نامعلوم وسعتوں سے ایک کرن کی طرح اتر کر راہب جیکونن کے جسم پر پڑ رہی تھی..... پھر پدم ناگ کے دیکھتے ہی دیکھتے روشنی غائب ہو گئی۔ پدم ناگ بخوبی جانتا تھا کہ خدا کے برگزیدہ بندوں کے لیے موت کوئی نئی حقیقت نہیں ہوتی' وہ ہر نفس پر اللہ کی راہ میں اپنی جان کی

تک زخم کے کیڑے کھاتے رہے۔ اس کے بعد دوسرے بدقسمت قیدی کو ہلاک کر دیا گیا۔
جب چاروں قیدیوں کے مغز بدکردار ہیروڈ کے زخم میں بھر چکے تو اس نے اپنی توجہ اپنی رعایا کی طرف مبذول کی۔ پدم ناگ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ہیروڈ کے سپاہی خفیہ طور پر ایک نوجوان فلسطینی کو اغوا کر کے قلعے کے تہ خانے میں لے آئے۔ پدم ناگ یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ایک بدکردار شخص کے لیے کسی بے گناہ کا خون بہایا جائے۔

پدم ناگ نے فوراً چھوٹے سانپ کی شکل بدلی اور قلعے کی اندھیری سیڑھیوں میں رینگتا نیچے اس تہ خانے کے دروازے پر پہنچ گیا' جہاں نوجوان کی تھوڑی دیر بعد گردن اتاری جانے والی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ پدم ناگ دروازے کی طرف اندھیرے میں چھپا بیٹھا تھا کیونکہ کال کوٹھری کا دروازہ بند تھا۔ سیڑھیوں پر رومن سپاہی کے قدموں کی بھاری چاپ گونجی۔ وہ بدنصیب نوجوان کا سر اتارنے آ رہا تھا۔ پدم ناگ چوکس ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ رومن سپاہی کے ہاتھ میں تلوار تھی' وہ تیز تیز قدم اٹھاتا کوٹھری کی طرف بڑھا۔ چابی لگا کر تالا کھولا' وہ اندر گھسا ہی تھا کہ پدم ناگ نے اچھل کر اس کی گردن پر ڈس لیا' پدم ناگ اس رومن سپاہی کو ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس کے جسم میں صرف اسی قدر زہر داخل کیا تھا کہ جس سے وہ کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو جائے۔ رومن سپاہی ایک طرف بے ہوش ہو کر گرا۔ پدم ناگ فوراً باہر رینگ کر نکل آیا۔ یہاں اس نے سانس کھینچ کر انسانی شکل اختیار کی..... اور کال کوٹھری میں موجود خوفزدہ نوجوان کے پاس آ کر بولا۔ "فوراً اسی رومن سپاہی کی وردی پہن لو' جلدی کرو۔"

نوجوان ہکا بکا ہو کر پدم ناگ کو تکنے لگا۔ پدم ناگ نے اسے جھنجوڑ کر کہا۔ "کیا سوچ رہے ہو۔ کیا تم یہاں سے جان فرار نہیں ہونا چاہتے؟"

نوجوان نے فوراً اپنے کپڑے اتار کر رومن سپاہی کی وردی پہن لی۔ پدم ناگ بولا۔ "اب خاموشی سے باہر نکل کر قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھو' میں تمہارے پیچھے پیچھے آ رہا ہوں۔"

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق نوجوان رومن سپاہی کی وردی میں جان بچا کر سیڑھیاں چڑھتا باہر نکل گیا۔ آگے قلعے کا صحن تھا' وہ قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دور قلعے کا دروازہ تھا۔ وہاں سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ چونکہ یہ نوجوان بھی سپاہیوں کے بھیس میں تھا' اس لیے کسی نے اس طرف دھیان نہ دیا۔ پدم ناگ سانپ کی شکل میں اس کے پیچھے پیچھے رینگتا چلا جا رہا تھا۔ قلعے کے دروازے پر پہنچتے ہی ایک پہرے دار نے نوجوان کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

نوجوان بوکھلا گیا اور بولا۔ "مجھے جانے دو..... مجھے جانے دو۔"

پہرے داروں کو شک پڑ گیا' وہ تلواریں کھینچ کر اس کی طرف لپکے ہی تھی کہ پدم ناگ اچھل کر اس سپاہی کی گردن پر آ گیا جو سب سے آگے تھا' اسے ڈسا وہ بے ہوش ہو کر گرا۔ دوسرا پریشانی کے عالم میں اپنے ساتھی پر جھکا تو پدم ناگ نے اسے بھی ڈس لیا۔ نوجوان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ پدم ناگ قلعے کی ڈیوڑھی کی طرف بھاگا۔ وہاں دوبارہ انسانی شکل بدلی اور ایک گھوڑا کھول کر لے آیا اور کہا "فوراً" اس پر سوار ہو کر نکل جاؤ۔"

نوجوان نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اسے ایڑ لگائی اور قلعے سے باہر نکلتے ہی رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

اس کام سے فارغ ہوتے ہی پدم ناگ سنہری عقاب بن کر اڑا اور سیدھا ہیروڈ کی خواب گاہ میں آ گیا۔ ہیروڈ بستر پر پڑا درد سے کراہ رہا تھا کیونکہ اس کے پھوڑے میں بھرا ہوا مغز کیڑے چٹ کر گئے تھے اور اب اسے دوسرے انسانی مغز کا انتظار تھا۔ دو شاہی طبیب آلات جراحی اور دوائیاں لیے اس نوجوان کے سر کا انتظار کر رہے تھے جسے دن میں شہر سے اغوا کر کے لایا گیا تھا۔

پدم ناگ ہیروڈ کی خواب گاہ میں انسانی شکل میں داخل ہوا۔ شاہی طبیبوں اور ہیروڈ نے پدم ناگ کی طرف تعجب سے دیکھا۔ اس سے پہلے انہوں اس اجنبی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہیروڈ درد سے کراہتے ہوئے بولا۔ "تم کون ہو؟"

پدم ناگ نے کہا۔ "ہیروڈ! میں ایک ہندی طبیب ہوں میرے پاس تمہارے پھوڑے کا بے مثل علاج موجود ہے مگر مجھے پہلے یہ بتایا جائے کہ وہ کون سا طبیب ہے' جس نے تمہارے مرض کے لیے انسانی مغز کا علاج تجویز کیا ہے؟"

دونوں میں سے ایک یہودی طبیب نے کہا۔ "میں نے یہ علاج تجویز کیا تھا اور ہمارے بادشاہ سلامت کو اس علاج سے افاقہ ہوا ہے مگر تم محل میں کیسے گھس آئے؟"

پدم ناگ نے اس یہودی کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔ "میں جہاں چاہے آ سکتا ہوں۔ تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

..... پھر پدم ناگ نے ان کے سامنے کھڑے کھڑے اپنا سانس اندر کو کھینچا اور دس فٹ لمبے سیاہ کوبرا ناگ کی شکل اختیار کر لی' وہ پھن اٹھا کر فرش سے پانچ فٹ بلند ہو کر پھنکارتا ہوا اس طبیب کی طرف لپکا' جس نے انسانی مغز کا نسخہ تشخیص کیا تھا۔ دونوں طبیب ڈر کر بھاگے مگر پدم ناگ سے وہ بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ پدم ناگ نے خاص طبیب کو اپنے

قربانی دیتے ہیں۔ پھر بھی اسے راہب جیکونن کے چلے جانے کا افسوس تھا۔ ساتھ ہی شہزادی سلومی سے اس کا جی اچاٹ ہو گیا تھا لیکن اسے معلوم یقین تھا کہ وہ قانون قدرت کی گرفت سے نہیں بچ سکے گی۔ پدم ناگ اب اس کا بھی انجام اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ایک بار پھر سنہری عقاب کا روپ دھار کر محل کر طرف پرواز کر گیا۔

محل میں ایک سناٹا طاری تھا۔ راہب جیکونن کے قتل کی خبر ہر طرف پھیل چکی تھی۔ سلومی کی والدہ جوڈتھ انتہائی خوفزدہ تھی۔ انسے معلوم تھا کہ اس کے خاندان پر کوئی بھاری آفت نازل ہونے والی ہے۔ ہیروڈ نے شہزادی سلومی کے آگے راہب کا سر سونے کی طشت میں رکھ کر پیش کیا' تو بجائے خوش ہونے کے شہزادی سلومی کی دہشت کے مارے چیخ نکل گئی اور وہ اپنی خواب گاہ کی طرف بھاگی۔ اسی لمحے طشت میں رکھا ہوا راہب جیکونن کا سر چاند کی طرح روشن ہوا اور پھر غائب ہو گیا۔ ہیروڈ سہم کر پیچھے ہٹا اور' اپنا بازو آنکھوں کے آگے کر لیا پھر عالم وحشت میں اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔

شہر میں راہب کے قتل اور لاش کے غائب ہونے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگ مشتعل ہو کر گھروں سے باہر نکل آئے اور شاہی محل کی طرف دوڑے مگر رومن فوجی دستے تیر کمان لیے تیار کھڑے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کتنے ہی بے گناہ خاک و خون میں تڑپتے دکھائی دیے۔ ہیروڈ نے انتہائی تشدد سے کام لے کر اس بغاوت کو کچل دیا۔ ملکہ جوڈتھ بے حد دہشت زدہ تھی۔ اس نے اپنی بیٹی شہزادی سلومی کو ساتھ لیا اور سوڈان میں واقع اپنے صحت افزا محل کی طرف کوچ کر گئی۔ اس اثناء میں گورنر ہیروڈ کی گردن پر ایک پھوڑا نکل آیا مکافات عمل کا آغاز ہو چکا تھا۔

شاہی طبیبوں نے بہت علاج کیا مگر پھوڑا پھیلتا چلا گیا۔ زخم میں کیڑے رینگنے لگے تھے۔ ان کیڑوں کو نکال کی مرہم لگایا جاتا تو دوسرے روز پھر نئے کیڑے پیدا ہو جاتے۔ شدید درد کے مارے ہیروڈ مرغ بسمل کی طرح تڑپتا تھا۔ اسے ایک پل چین نہیں تھا۔ آخر ایک مصری طبیب نے یہ علاج تجویز کیا کہ اگر پھوڑے کے زخم میں کسی زندہ انسان کا مغز بھرا جائے تو درد غائب ہو سکتا ہے۔ جب تک زخم کے کیڑے انسانی مغز کھاتے رہیں گے درد نہیں ہو گا۔ جب انسانی مغز کا مواد ختم ہو جائے تو دوسرے انسان کی کھوپڑی توڑ کر تازہ مغز بھر دیا جائے گا۔

کال کوٹھری میں اس وقت چار بد نصیب موت کی سزا پر عمل در آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ فوراً" ان میں سے ایک کو تہ تیغ کر کے اس کی کھوپڑی توڑ کر تازہ مغز نکال کر گورنر ہیروڈ کے زخم میں بھر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہیروڈ کا درد غائب ہو گیا۔ یہ مغز چوبیس گھنٹے

پورے زہر کے ساتھ ڈس لیا' کیونکہ ایسا سنگدل طبیب نسل انسانی کا دشمن تھا' جو محض ایک بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہزاروں بے گناہ انسانوں کے خون سے ہولی کھیلنے والا تھا۔ دوسرا طبیب خواب گاہ سے فرار ہو گیا۔ پدم ناگ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ہیروڈ کا رنگ دہشت کے مارے زرد ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی انسان کو سانپ کی شکل اختیار کرتے دیکھا تھا۔ درد کے مارے پہلے ہی اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ پدم ناگ کو خوب معلوم تھا کہ اگر یہ بد کردار شخص زندہ رہا تو نہ جانے کتنی ماؤں کی گود اجاڑ دے گا۔ اس کی موت ہی اس کا بہترین علاج ہے۔

ہیروڈ بستر پر بڑی مشکل سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سیاہ سانپ کو دیکھنے لگا' جو فرش سے پانچ فٹ تک اپنا نصف دھڑ اوپر اٹھائے' پھن پھیلائے آہستہ آہستہ پھنکارتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب سانپ قریب آیا تو اس نے چیخ مار کر سپاہیوں کو آواز دی۔

اس سے پہلے کہ سپاہی اندر آتے' پدم ناگ نے اچھل کر ہیروڈ کے ماتھے پر ڈس لیا۔ پدم ناگ نے زہر کی پوری طاقت اس کے خون میں سرایت کر دی تھی۔ ڈسنے کے ساتھ ہی ہیروڈ کا سارا جسم سن ہو گیا اور اس کے اعصابی نظام کے پرزے اڑ گئے' وہ پلنگ پر ایک طرف لڑھک گیا۔ سپاہی دوڑتے ہوئے تلواریں بے نیام کیے خواب گاہ میں آ گئے' مگر پدم ناگ سنہری عقاب بن کر وہاں سے پرواز کرتا ہوا باہر نکل چکا تھا۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے ہیروڈ کو ہلاک کر کے شہر کے سینکڑوں جوانوں کو موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا ہے۔ پدم ناگ نے جوڈیا شہر کو خیر باد کہہ دیا' اور ملک روم کی طرف پرواز کر گیا' جو رومن سلطنت کا پائے تخت تھا اور جہاں شہنشاہ آگسٹس حکومت کرتا تھا..... پدم ناگ کے لیے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ اپنے ساتھی اور دوست عاطون کی تلاش میں تھا اور اب اس خیال سے ملک روم کی طرف روانہ ہوا کہ شاید وہاں حسن اتفاق سے اس کی ملاقات عاطون سے ہو جائے۔

دوسری طرف عاطون غار کے تہہ خانے میں مصری امیر زادی کے تابوت میں اس کے ہڈیوں کے ڈھانچے پر یوں بے حس پڑا تھا کہ صرف اپنی آنکھیں اور گردن ہی ہلا سکتا تھا۔ وہ پدم ناگ اور دیوی مایا کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ خدا جانے وہ کہاں ہوں گے۔ ان کو عاطون کی حالت زار کا کبھی علم نہیں ہو سکتا تھا۔ عاطون نے دل ہی دل میں کئی بار دیوی مایا کو مدد کے لے پکارا..... مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ عاطون نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ اسے تابوت کے اندر امیر زادی کی لاش کے ڈھانچے پر پڑے ایک ہفتہ

گزر گیا تھا کہ ایک دن اسے اپنے اوپر کوئی شے رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ عاطون نے آنکھیں
اوپر کو اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے کچھ نظر نہ آیا۔ یہ کوئی کیڑا تھا، جس کی چار یا
ٹانگیں تھیں اور وہ اس کے بالوں میں رینگتا اس کے ماتھے پر آ گیا، یہ ایک سیاہ بچھو تھ
عاطون نے آنکھیں بند کر لیں اور دل میں بچھو کو کوسنے لگا کہ کمبخت یہ باقی رہ گیا تھا۔ بچ
ماتھے سے رینگتا ہوا عاطون کی گردن پر آ گیا۔ عاطون نے گردن کو ذرا سی جنبش دی تو بچ
نے فوراً ڈس لیا۔

عاطون نے کوئی خیال نہ کیا۔ اس کے ڈسنے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اس نے اپن
آنکھیں بدستور بند رکھیں، لیکن اچانک عاطون کو اپنے بے حس جسم میں زندگی کی حرارت
دوڑتی محسوس ہوئی۔ چند لمحوں کے اندر اندر وہ اپنے ہاتھ پاؤں بڑی آسانی سے ہلا سکتا تھا۔
عاطون نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر تابوت کے ڈھکنے کو کھول دیا اور باہر نکل آیا۔ سیاہ بچھو کا
زہر اس کے حق میں تریاق ثابت ہوا تھا۔ عاطون پر طلسم کا اثر ختم ہو چکا تھا، وہ تاریک زینہ
چڑھ کر اوپر غار میں آ گیا۔ یہاں سے باہر نکلا تو دیکھا کہ اجاڑ ویرانے میں تیز دھوپ نکلی
ہوئی تھی۔ چٹیل پہاڑیاں اور ناہموار سخت پتھروں کی سلیں دھوپ میں گرم بھاپ چھوڑ رہی
تھی۔ عاطون نے تابوت سے زندہ بچ کر نکل آنے پر خدا کا شکر ادا کیا اور مغرب کی سمت
چلنے لگا۔ تیز دھوپ اور تھکان کے اثرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، وہ شام تک چلتا چلا
گیا۔ سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی اسے دور ایک قافلے کے اونٹوں کی قطار نظر آئی
عاطون قافلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ چھوٹا سا قافلہ تھا۔ اونٹوں پر تجارتی سامان لدا تھا۔
کچھ مسافر بھی ساتھ تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ قافلہ وادی اردن کے تاریخی شہر بیت اللحم کی
طرف جا رہا ہے۔ عاطون بھی اس قافلے کے ساتھ ہو لیا۔

تین راتوں کے سفر کے بعد قافلہ بیت اللحم سے ایک کوس کے فاصلے پر نخلستان کی
ایک سرائے میں پہنچ کر رک گیا۔ یہاں سے مسافر اپنی اپنی بستیوں کو چل دیئے۔ عاطون کو یہ
نخلستان بہت پسند آیا تھا۔ وہاں انجیر اور کھجور کے درختوں کے جھنڈ پھیلے تھے، اور ٹھنڈے
پانی کا ایک چشمہ بھی بہہ رہا تھا۔ عاطون یہاں نہا دھو کر تازہ دم ہوا۔ یہاں سے قافلے کے
واپس جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ بیت اللحم اور قریبی بستیوں سے مسافر وہاں پہنچنے
لگے۔ ان میں عاطون کو اپنا دوست پدم ناگ کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔

دو روز قیام کرنے کے بعد قافلہ واپس روانہ ہو گیا۔ عاطون نخلستان میں ہی پڑا رہا۔
اس نے سوچا کہ آج کی رات اسی جگہ قیام کرتا ہوں، پھر صبح کو بیت اللحم کی طرف جا کر پدم
ناگ سے دیوی مایا کی جستجو کروں گا، اگرچہ اسے ان دونوں میں سے کسی کے ملنے کی بہت کم

امید تھی، وہ ایک بڑی ہی خوبصورت چاندنی رات تھی۔ رات کے وقت صحرا میں چاندنی کا
سماں اس وقت دلفریب تھا کہ عاطون صحرا میں چہل قدمی کرتے کرتے نخلستان سے دور نکل
گیا۔

ایک جگہ ریت کے ٹیلے کے پاس اس نے ایک انسان کو دیکھا، کہ وہ ریت پر دوزانو
ہو کر بیٹھا ہے، اور اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر سر جھکا رکھا ہے۔ عاطون ابھی اس
باریش بزرگ کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک جانب سے شیر نکل کر بزرگ کے پاس آ گیا۔
عاطون اس بزرگ کو شیر کے حملے سے بچانے کے لیے لپکنے ہی والا تھا، کہ شیر بڑے آرام
سے بزرگ کے پہلو میں بیٹھ گیا، اور اپنا سر بزرگ کے جسم سے بڑی محبت سے رگڑنے لگا۔
عاطون یہ منظر دیکھ کر بڑا حیران ہوا پھر شیر کے حلق سے بھیانک غراہٹ کی آواز نکلی۔ شیر کو
عاطون کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ عاطون یہ سمجھا کہ شاید شیر اس عبادت گزار انسان پر
حملہ کرنے والا ہے، وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ شیر پر حملہ آور ہوتا،
عبادت گزار بزرگ نے اپنا ہاتھ اٹھا کر عاطون کو روک دیا۔

"اے نوجوان! میں جانتا ہوں تم میری جان بچانے کے ارادے سے آئے، لیکن
گھبراؤ نہیں، یہ شیر مجھے کچھ نہیں کہتا، یہ میرا دوست ہے۔"

شیر اپنی لال لال آنکھوں سے عاطون کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے حلق سے ہلکی
ہلکی غراہٹ کی آواز نکل رہی تھی۔ بزرگ نے شیر کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا، "جاؤ میرے
بچے! تم اپنی کچھار میں جا کر آرام کرو۔" شیر اپنے بھاری جسم کو مٹکاتا ٹیلے کی طرف چلا گیا۔

عاطون نے بزرگ سے پوچھا، "آپ کون ہیں محترم اور آدھی رات کو یہاں کس کی
عبادت کر رہے ہیں۔"

بزرگ نے کہا، "میرے بچے! میرا نام جوزف مجوسی ہے۔ میں اپنی بیٹی ماریانہ کے
ساتھ بیت اللحم کی ایک چھوٹی سی بستی میں رہتا ہوں۔"

عاطون نے اس کا نام دہرا کر کہا، "یہ نام تو آتش پرستوں جیسا نام ہے؟ کیا آپ
آتش پرست ہیں؟"

جوزف مجوسی نے اپنا پرسکون چہرہ عاطون کی طرف پھیر کر کہا، "مگر تم کون ہو بیٹا؟
مجھے تم اجنبی لگتے ہو؟"

عاطون نے کہا، "میں ملک مصر کا رہنے والا ہوں۔ میرا باپ جڑی بوٹیوں کا تاجر تھا۔
میں بھی یہی کام کرتا ہوں۔ وادی اردن کی سیاحت کو یہاں آیا ہوں۔ سرائے سے نکل کر سیر
کرتا یہاں آ گیا۔"

جوزف نے اٹھ کر عاطون کو پیار کیا اور بولا' "تم میری جان بچانے کے ارادے سے میرے پاس آئے تھے۔ اس کے لیے' میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ کیا تم میرے ہاں چلو گے؟ میری بیٹی ماریانہ تم سے مل کر خوش ہوگی۔"

عاطون کو بھی کسی ایسے ٹھکانے کی ضرورت تھی' جہاں رہ کر "اپنے دوستوں کا سراغ لگا سکے' وہ جوزف کے ساتھ چلنے پر تیار ہوگیا۔ بزرگ جوزف نے عاطون کو ساتھ لیا' اور دونوں باتیں کرتے بیت اللحم کی طرف چل پڑے۔ بیت اللحم وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا' یہ قدیم ترین شہر ایک اونچے ٹیلے پر آباد تھا۔ اس کے دامن میں چھوٹی چھوٹی تین بستیاں وادی میں پھیلی تھیں۔ ان میں سے ایک بستی کے باہر جوزف مجوسی کا کچا مکان تھا۔ پاس ہی اس کا انجیر کا ایک باغ تھا' جس کی آمدنی پر اس کی گزر بسر ہو رہی تھی۔ جوزف مجوسی سے عاطون نے سوال کیا' کہ اگر وہ آتش پرست ہے' تو رات کے وقت صحرا میں آ کر کس کی عبادت کر رہا تھا؟

جوزف نے کوئی جواب نہ دیا۔

جوزف کے کچے مکان کے آنگن میں چراغ روشن تھا۔ سامنے ایک برآمدہ تھا' جس کے پیچھے تین کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ جوزف نے ایک کوٹھری کھول کر عاطون سے کہا' "تم یہاں آرام کرو' صبح تم سے باتیں کریں گے' اور ہاں تم نے مجھے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں؟"

عاطون نے کہا' "محترم بزرگ! مجھے عاطون کے نام سے پکارا جاتا ہے۔"

"بہت خوب! یہ تو خاص مصری نام ہے۔" یہ کہہ کر جوزف اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔

ابھی تھوڑی دیر ہی گزری ہوگی کہ باہر گھوڑوں کے ہنہنانے اور ان کی ٹاپوں کی آواز بلند ہوئی۔ عاطون نے کوٹھری کا پٹ ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ چاندنی میں اسے جوزف نظر آیا۔ جو مکان کے سامنے چار' ہتھیار بند گھڑ سوار رومن سپاہوں کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ان سے باتیں کر رہا تھا۔ ایک رومن سپاہی نے رعونت سے کہا' "ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اس بستی میں عیسائی لوگ چھپے ہوئے ہیں؟"

جوزف نے ان سے کہا' "سردار! آپ تو مجھے جانتے ہیں کہ میں آتش پرست مجوسی ہوں' میرے گھر میں اگر کوئی عیسائی آتا تو میں اسے پکڑ کر آپ کے حوالے کر دیتا۔"

رومن سردار نے کہا' "ہمیں' تم سے یہی امید ہے' ٹھیک ہے! تم آرام کرو' ہم بستی کے دوسرے مکانوں کی تلاشی لیتے ہیں۔"

رومن گھڑ سوار وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ جوزف آنگن میں سے گزر کر اپنی کوٹھری کی طرف جانے لگا تو عاطون نے بڑے ادب سے کہا' "محترم بزرگ! یہ لوگ عیسائیوں کو

کیوں پکڑ رہے ہیں؟"

جوزف نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا' "خاموش رہو۔ غنیمت ہے کہ میری بیٹی ماریانہ کی آنکھ نہیں کھلی' وہ سو رہی ہے' تم بھی آرام کرو' صبح بات کریں گے۔"

عاطون بستر پر لیٹ گیا' وہ سمجھ گیا کہ یہ حضرت یسوع مسیح کے پیروکاروں پر رومن حکومت کی طرف سے بے پناہ ظلم و ستم کیا جا رہا تھا' اور عیسائی لوگ چھپ چھپ کر عبادت کرتے تھے۔

دن چڑھا تو عاطون نے باہر آ کر دیکھا' ایک سانولے رنگ کی دبلی پتلی' خوش شکل لڑکی قدیم یہودیوں کے لباس میں ملبوس آنگن میں بکری کا دودھ دھو رہی تھی۔ اس کا باپ جوزف پاس ہی بیٹھا خشک انجیروں کو ایک بوری میں بند کر رہا تھا۔ عاطون نے صبح بخیر کہا' تو لڑکی نے پلٹ کر عاطون کی طرف دیکھا' جوزف نے مسکرا کر کہا' "بیٹی! یہ ہمارا مہمان عاطون ہے اور عاطون بیٹے! یہ میری بیٹی عراشی ہے۔"

عاطون نے کہا' "مگر آپ نے تو رات اپنی بیٹی کا نام ماریانہ بتایا تھا۔"

اس پر لڑکی خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ جوزف' عاطون کے قریب آ گیا۔ اس نے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے چوکی پر اپنے پاس ہی بٹھا لیا اور بولا' "بیٹا عاطون! میں تم سے کچھ نہیں چھپانا چاہتا' حقیقت یہ ہے کہ ہم پہلے آتش پرست تھے' اب ہم نے عیسائی مذہب قبول کر لیا ہے' پہلے میرا نام کچھ اور تھا' مگر اب میں جوزف ہوں اور میری بیٹی کا نام ماریانہ ہے' لیکن رومن سپاہیوں کے خوف کے مارے ہم نے یہ راز بستی میں کسی کو نہیں بتایا۔ لوگ مجھے اوستی اور میری بیٹی کو عراشی کے نام ہی سے جانتے ہیں۔ جانے تمہارے چہرے پر مجھے کیا بات نظر آئی تھی کہ پہلی ملاقات میں ہی میں تمہارے آگے جھوٹ نہ بول سکا اور میں نے تمہیں اپنا صحیح نام بتا دیا۔ اب تم بھی یہاں مجھے اوستی اور میری بیٹی کو عراشی کے نام ہی سے پکارو گے۔"

....پھر وہ سرد آہ بھر کر بولا' "ہم عیسائیوں پر رومن حکومت بے انتہا ظلم کر رہی ہے' جہاں کہیں کسی عیسائی کا سراغ ملتا ہے اسے رومن سپاہی پکڑ کر لے جاتے ہیں یا تو اسے بھوکے شیروں کے آگے ڈال دیا جاتا ہے یا صلیب پر چڑھا دیا جاتا ہے۔"

عاطون نے کہا' "محترم بزرگ! ایک وقت آئے گا یہ عیسائی قوم اتنی ترقی کر جائے گی کہ اس کے دو افراد چاند پر پہنچ جائیں گے' اور خلا میں چہل قدمی کریں گے۔"

ماریانہ اور جوزف پہلے تو کچھ مسکرائے پھر حیرت سے عاطون کی طرف دیکھنے لگے۔

"بیٹا عاطون! بھلا کوئی چاند پر کیسے پہنچ سکتا ہے اور.... خلا کیا ہوتا ہے۔"

عاطون زیر لب مسکرایا، "محترم بزرگ! فی الحال یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ بہرحال میری طرف سے اطمینان رکھیں آپ کا راز میرے سینے میں میرا راز بن کر رہے گا۔"

ماریانہ نے دودھ کا کٹورہ آگے بڑھا کر کہا، "بابا! مہمان کو دودھ نہیں پلائیں گے، اسے بھوک لگی ہوگی۔"

عاطون بولا، "مجھے زیادہ بھوک نہیں لگی، ویسے میں چند گھونٹ ضرور پی لوں گا۔"

عاطون نے تازہ نیم گرم دودھ تھوڑا سا پی کر ماریانہ کا شکریہ ادا کیا۔ بھولی بھالی لڑکی شرما سی گئی۔ اس کے بعد جوزف اسے ساتھ لے کر اپنے انجیر کے باغ میں آگیا۔ یہ ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ ایک جگہ انجیر خشک ہونے کے لیے دھوپ میں ڈالے ہوئے تھے۔ باغ کے عقب میں ایک چھوٹی سی باولی تھی، جہاں بستی کی عورتیں پرانے زمانے کی صراحیوں میں پانی بھر رہی تھی اور آپس میں باتیں بھی کر رہی تھیں۔ ایک لڑکی کا نقرئی قہقہہ بلند ہوا تو عاطون نے سوچا اس معصوم لڑکی کو کچھ معلوم نہیں کہ اس کا قہقہہ وقت کی لوح پر ثبت ہو گیا ہے۔

عاطون کا اس چھوٹے سے سادہ اور پاکیزہ گھرانے میں دل لگ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ یہاں کچھ دیر ٹھہرے گا، وہ باغ کے کام میں جوزف کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ ایک روز وہ بزرگ جوزف ہی کے کسی کام سے بیت اللحم میں گیا ہوا تھا۔ دوپہر تک وہ بیت اللحم کے قدیم چھتے ہوئے بازاروں میں گھومتا پھرتا رہا۔ ہتھیار بند رومن سپاہی اسے جگہ جگہ پھرتے نظر آئے۔

دوپہر کے بعد عاطون واپس بستی کی طرف آیا تو اس نے دور ہی سے بزرگ جوزف کے کچے مکان سے دھواں اٹھتے دیکھا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا، وہ تیز تیز قدموں سے قریبا" دوڑتا ہوا قریب آیا، تو معلوم ہوا کہ مکان جل کر بھسم ہو چکا ہے۔ بستی کے لوگوں نے عاطون کو بتایا کہ رومن سپاہی جوزف اور اس کی بیٹی کو پکڑ کر لے گئے ہیں، کیونکہ دوہ دونوں عیسائی مذہب کے پیروکار تھے۔ بستی والے عاطون کو بھی مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ایک یہودی عورت نے عاطون کو خبردار کیا کہ رومن سپاہی اس کی بھی تلاش میں ہیں، کیونکہ انہیں شبہ ہے کہ وہ بھی عیسائی ہے۔ عاطون اس تصور ہی سے پریشان ہوگیا کہ رومن سپاہی بوڑھے جوزف اور اس کی بیٹی ماریانہ پر کیا کیا ستم نہ توڑ رہے ہوں گے، وہ رومن حکومت کے ہولناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی تشدد رسانیوں سے خوب واقف تھا، وہ باہر رہ کر جوزف اور اس کی بیٹی کی مدد نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ رومن سپاہی ان دونوں کو کہاں لے گئے ہیں، اگر عاطون بھی اپنے عیسائی ہونے کا اعلان کر دے تو واثق

امید تھی کہ اسے بھی گرفتار کر کے وہیں پہنچا دیا جائے گا، جہاں بزرگ جوزف اور ماریانہ قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے۔ چنانچہ اس نے سب کے سامنے بلند آواز میں کہا، "ہاں، ہاں! میں بھی عیسائی ہوں، مجھے کیوں نہیں گرفتار کرتے تم لوگ! مجھے بھی گرفتار کرو۔"

کسی نے بھاگ کر رومن سپاہی کو خبر کر دی۔ دوسرے ہی لمحے عاطون کو بھی پکڑ لیا گیا۔ بیت اللحم میں اس وقت جینٹین رومن حکومت کرتا تھا۔ یہ سارے صوبے گیسی کا بھی گورنر تھا، وہ یسوع مسیحؑ کے ماننے والوں کو طرح طرح سے اذیتیں دیتا اور خوش ہوتا تھا۔ عاطون کا خیال تھا کہ چونکہ وہ جوزف کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا، اس لیے یقینی طور پر اسے بھی ان کے پاس ہی لے جایا جائے گا، مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا۔ رومن کوتوال کے حکم سے عاطون کو اللحم کے قلعے کے ایک تنگ و تاریک بندی خانے میں پھینک دیا گیا۔ عاطون کو عجیب بے بسی کا احساس ہوا۔ باہر رہ کر تو پھر بھی جوزف اور ماریانہ کا کچھ سراغ لگا کر ان کی مدد کو پہنچ سکتا تھا، لیکن یہاں تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا، سوائے اس کے کہ اپنی غیر معمولی طاقت کا مظاہرہ کر کے وہاں سے نکل جائے، لیکن اس کے آزاد ہو جانے سے جوزف اور ماریانہ کی زندگی بچائی نہیں جا سکتی تھی۔ اس کے لیے کسی منصوبے، کسی حکمت عملی کی ضرور تھی، لیکن اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ باقاعدہ کوئی منصوبہ تیار کیا جائے، کیونکہ رومن حکمران کے حکم سے پکڑے جانے والے عیسائیوں کو فورا" سزا دے دی جاتی تھی۔

عاطون زیر زمین بندی خانے میں اس طرح پڑا تھا کہ اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر ایک لوہے کے کھم سے باندھ دی گئی تھی۔ عاطون کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ بندی خانے کی دیوار کے ساتھ ساتھ پتھر کی سیڑھی اوپر کو جاتی تھی۔ اوپر لوہے کا دروازہ تھا۔ دروازہ کھلا اور رومن گارڈ نیزہ ہاتھ میں لیے سیڑھیاں اتر کر عاطون کے پاس آیا اور کرخت لہجے میں بولا۔ "تمہارا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ اٹھو۔" اتنے میں اوپر سے مزید چار ہتھیار بند رومن سپاہی نیچے آ گئے۔ عاطون نے اسی جگہ طوفانی کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا، مگر اس سے پہلے اس نے پوچھا، کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ ایک رومن سپاہی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، "تمہیں تمہارے باپ اور بہن کے ساتھ شیروں کے آگے ڈالا جائے گا۔"

عاطون نے اطمینان کا سانس لیا۔ جوزف اور ماریانہ ابھی زندہ تھے اور اسے ان ہی کے ساتھ شیروں کے سامنے پھینکا جا رہا تھا۔ کوئی بات نہیں۔ عاطون نے دل میں سوچا، جو ہوگا وہیں دیکھا جائے گا۔ رومن سپاہیوں نے عاطون کی زنجیر کھولی۔ اس کے دونوں بازو رسی سے پیچھے کی طرف باندھے اور بندی خانوں سے نکال کر کئی تاریک راہداریوں کے اندر ہی

اندر سے گزارتے قلعے کے ایک ایسے بیضوی آنگن میں لے آئے جس کی قوس نما دیوار کے بیچ میں لوہے کا ایک سلاخ دار دروازہ لگا تھا۔ دیوار مشرق سے مغرب کی طرف کوئی بیس فٹ اونچی تھی۔ عقب میں اوپر ایک بڑی گیلری بنی تھی، جہاں رومن سپاہی نیزے لیے کھڑے تھے۔

عاطون کو صحن کے فرش کے درمیان میں لا کر بٹھا دیا گیا۔ فرش بڑے بڑے پتھروں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ عاطون کے بازو رسی سے آزاد کر دیئے گئے۔ عاطون کی نگاہیں جوزف اور ماریانہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ آخر وہ اسے نظر آ گئے۔ رومن سپاہی، جوزف اور ماریانہ کو قریباً گھسیٹتے ہوئے لا رہے تھے۔ جوزف اور ماریانہ ہاتھ باندھے رحم طلب نظروں سے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں بھی عاطون کے پاس لا کر پتھریلے فرش پر دھکیل دیا گیا۔ جوزف اور ماریانہ نے عاطون کو دیکھا، تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"عاطون بیٹا! تم کیسے آ گئے یہاں۔"

عاطون نے کہا، "اس لیے کہ میں بھی آپ کے مذہب کا ماننے والا ہوں۔"

ایک گڑگڑاہٹ کی آواز بلند ہوئی۔ ماریانہ کی چیخ نکل گئی۔ دیوار والا لوہے کا جنگلا نصف اوپر کو اٹھ چکا تھا، اور اس کے نیچے سے دو بھوکے شیر غراتے ہوئے جوزف اور عاطون اور ماریانہ کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ان شیروں کو انسانوں کے گوشت پر پالا گیا تھا، اور یہ تین روز سے بھوکے تھے۔ ماریانہ اپنے بوڑھے باپ سے لپٹ کر خوف سے رونے لگی۔ جوزف خدا کو یاد کرنے لگا، جب کہ عاطون کی نگاہیں شیروں پر جمی ہوئی تھیں۔

شیروں کی بھوکی آنکھوں سے چنگاریاں اڑ رہی تھیں اور وہ اپنے سامنے تین زندہ انسانوں کو دیکھ کر غراتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ماریانہ، جوزف سے لپٹی خوف سے لرز رہی تھی اور جوزف ہاتھ اٹھائے خدا سے دعا مانگ رہا تھا جونہی شیر قریب آئے عاطون نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور اچھل کر شیروں کے پیچھے جا گرا۔ گرتے ہی وہ اٹھا اور اس نے دونوں شیروں کی دموں کو ایک ایک ہاتھ میں مضبوط سے پکڑ کر پیچھے کو کھینچا تو شیر عاطون پر دہاڑتے ہوئے گھوم کر حملہ آور ہونے کی کوشش کرنے لگے مگر عاطون کی گرفت کوئی معمولی گرفت نہیں تھی۔ شیر پیچھے کو گھومنا چاہتے تو عاطون انہیں کھینچ کر سیدھا کر دیتا۔ اس نے شیروں کو نصف دائرے کی شکل میں گھمانا شروع کر دیا۔ جوزف اور ماریانہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے، گیلری میں کھڑے رومن سپاہیوں نے یہ منظر دیکھا تو اوپر سے تیر برسانے لگے شیروں کی دہاڑ سے کانوں کے پردے پھٹ رہے تھے عاطون نے چلا کر جوزف سے کہا۔

جوزف! ماریانہ کو لے کر شیروں کی کوٹھری میں گھس جاؤ۔" جوزف نے ماریانہ کی بغل میں ہاتھ ڈالا اور تیروں کی بوچھاڑ سے بچتا شیروں کی کوٹھری کے جنگلے کی طرف بڑھا جو نصف اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ عاطون شیروں کو گول چکر میں گھماتا آہستہ آہستہ کوٹھری کی طرف ہٹتا جا رہا تھا۔ کئی تیر اس کے جسم سے ٹکرا کر اچٹنے کے بعد دور جا گرے تھے کچھ تیر شیروں کے بھی لگے اور وہ زخمی ہونے کے باعث مزید غضبناک ہو کر دہاڑنے لگے۔

عاطون نے جب دیکھا کہ جوزف اور ماریانہ شیروں کی کوٹھری میں گھس گئے ہیں تو اس نے شیروں کی دمیں زور سے گھما کر چھوڑ دیں اور خود لوہے کے جنگلے کی طرف بھاگا شیر چکرا کر دور جا گرے۔ عاطون نے پوری قوت سے لوہے کے اوپر اٹھے ہوئے جنگلے کو زور سے نیچے گرا دیا۔ کم از کم اس نے وقتی طور پر جوزف اور اس کی بیٹی کو شیروں کی خوراک

بچنے سے بچا لیا تھا ماریانہ کا خوف کے مارے رنگ فق تھا وہ دیوار کے ساتھ لگی سہمی سمٹی بیٹھی ...... کپکپا رہی تھی۔ جوزف نے عاطون سے کہا۔

"یہاں تو ہم ایک بار پھر قید ہو گئے ہیں۔"

عاطون نے دیوار کے اوپر دیکھا۔ چھت کے قریب ایک چوکور روشندان تھا جس میں سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ باہر صحن میں شیر اسی طرح دیوانہ وار دھاڑ رہے تھے' اور رومن سپاہی انہیں لوہے کے جال میں قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں جوزف' ماریانہ اور عاطون' ان تینوں قیدیوں کی طرف سے اطمینان تھا کہ وہ شیروں کی کوٹھری سے بھاگ نہیں سکیں گے۔ عاطون زمین پر سے اچھلا اور دس فٹ اوپر بنے ہوئے روشندان کی سلاخوں کو پکڑ کر روشندان میں بیٹھ گیا۔ باہر نیچے قلعے کی خندق تھی جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ عاطون نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی غیر معمولی طاقت سے کام لیتے ہوئے روشندان کی لوہے کی موٹی سلاخوں کو اکھاڑ کر دوسری طرف پھینک دیا اور اپنی ٹانگ نیچے لٹکاتے ہوئے بولا۔

"جوزف' ماریانہ کو اوپر پہنچاؤ جلدی کرو۔"

ماریانہ موت کے خوف سے جلدی اٹھی اور عاطون کی ٹانگ سے لپٹ گئی عاطون نے اسے اوپر کھینچ لیا اور کہا "خندق میں کودو اور تیر کر دوسرے کنارے کی جھاڑیوں میں چھپ کر ہمارا انتظار کرو۔ اس کے ساتھ ہی عاطون نے ماریانہ کو روشندان کی دوسری جانب دھکا دے دیا۔ اس کے بعد جوزف کو اوپر کھینچ کر خندق میں گرا دیا اور پھر ان کے پیچھے خود بھی چھلانگ لگا دی یہ سب کچھ دو تین منٹ کے اندر اندر ہو گیا۔ اس اثناء میں رومن سپاہی شیروں کو لوہے کے جال میں پھنسا کر بے بس کر چکے تھے۔ جونہی انہوں نے شیروں کی کوٹھری کے جنگلے پر آ کر اندر دیکھا۔ کوٹھری خالی تھی۔

"قیدی فرار ہو گئے ہیں۔ باہر سپاہی دوڑاؤ۔"

وہاں ایک شور مچ گیا۔ سپاہی قلعے کے خندق والے عقبی دروازے کی طرف بھاگے مگر یہ راستہ ایک لمبی راہداری میں سے ہو کر جاتا تھا اس دوران میں عاطون اور جوزف تیر کر خندق پار کر چکے تھے۔ ماریانہ پہلے ہی خندق کے پار پہنچ گئی تھی انہوں نے بستی کے شمال کی طرف دوڑنا شروع کر دیا ابھی قلعے کی خندق سے تھوڑی دور ٹیکریوں کے پاس ہی گئے تھے کہ عاطون نے قلعے کے دروازے سے رومن سپاہیوں کو بھاگتے نکلتے دیکھا تو فوراً ہی جوزف اور ماریانہ سے کہا۔ تم لوگ جتنی تیز بھاگ سکتے ہو بھاگ کر ان ٹیکریوں کے پیچھے چھپ جاؤ میں ان سپاہیوں کو سنبھالتا ہوں تم میری فکر مت کرنا۔ اور عاطون وہیں سے پیچھے کی طرف گھوم

گیا۔ رومن سپاہیوں کی تعداد پانچ تھی اور وہ تلواریں لہراتے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ عاطون بھی ان کی طرف دوڑنے لگا اس نے ایک پل کے لیے عقب میں دیکھا۔ جوزف اور ماریانہ مٹی کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گم ہو چکے تھے۔ عاطون پر سپاہیوں نے برچھے پھینکے۔ دو برچھے عاطون کے سینے سے ٹکرا کر نیچے گر پڑے عاطون نے ایک برچھا اٹھا لیا اور سپاہیوں سے بھڑ گیا رومن سپاہی اسے ایک پل میں یہ تیغ کرنے کے لیے اس پر پے در پے وار کرنے لگے مگر وہ یہ دیکھ کر پریشان ہو گئے کہ عاطون پر برچھوں کے پھل کوئی اثر نہیں کر رہے تھے۔ اس کے برعکس عاطون نے دو سپاہیوں کو ڈھیر کر دیا تھا اتنے میں قلعے کی جانب سے تین رومن ہتھیار بند گھڑ سوار بھی گھوڑے سرپٹ دوڑاتے وہاں پہنچ گئے عاطون نے ایک گھڑ سوار کو ٹانگ سے پکڑ کر نیچے گرا لیا۔ دوسرے گھڑ سوار نے عاطون کی گردن پر تلوار کا بھرپور وار کیا تلوار عاطون کی گردن سے ٹکرا کر دو ٹکڑے ہو گئی۔ رومن سپاہی ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ عاطون نے کوئی خاص قسم کی زرہ پہن رکھی ہے۔

عاطون رومن سپاہی کو نیچے گرا کر گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا گھوڑے پر بیٹھتے ہی اس نے طوفانی انداز میں تلوار چلانی شروع کر دی۔ اس کو اپنی جان کی تو پرواہی نہیں تھی۔ لہٰذا دیکھتے دیکھتے وہاں رومن سپاہیوں کی لاشیں بچھ گئیں۔ عاطون نے گھوڑے کو مٹی کی پہاڑیوں کی طرف ڈال دیا۔ وہ سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ایک ٹیلے کے پیچھے آیا تو دیکھا کہ جوزف اور ماریانہ دور بھاگے جا رہے تھے۔ عاطون نے ان کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ قریب پہنچ کر وہ گھوڑے سے اترا اور بولا۔ "اس گھوڑے پر سوار ہو کر یہاں سے ملک شام کی طرف نکل جاؤ۔ تمہارے پاس وقت کم ہے۔"

جوزف اور ماریانہ ابھی تک بوکھلائے ہوئے تھے۔ جوزف جلدی سے گھوڑے پر بیٹھ گیا عاطون نے ماریانہ کو سہارا دے کر گھوڑے پر سوار کرایا اور پیچھے سے گھوڑے پر زور سے ہاتھ مارا گھوڑا بدکا اور پھر بگٹٹ دوڑنے لگا۔ عاطون ایک طرف کو چل پڑا اس کی کبھی بھی کوئی منزل نہیں رہی تھی کیونکہ منزل کا فیصلہ تو اس کے حالات کرتے تھے زندگی کے وسیع و عریض لامتناہی سمندر میں حادثات و واقعات کی تیز موجوں پر وہ بہا چلا جا رہا تھا ہاں اس وقت اسے اپنے ساتھی پدم ناگ کا خیال ضرور آنے لگا تھا کہ شاید آگے چل کر اس سے ملاقات ہو جائے۔

عاطون ویران علاقے سے نکل کر اس راہ گزر پر آ گیا جہاں سے کبھی جوڈیا کی شہزادی سلاہو کا قافلہ شہر میں داخل ہوا تھا۔ وہ پیدل سڑک کی ایک جانب چلا جا رہا تھا اسے پاکیزہ نفس درویش جیکونن کے سانحے کا سخت دکھ تھا۔

عاطون انہی خیالات میں ڈوبا ریگزار میں کافی دور نکل گیا اور اس کے عقب میں جوڈیا کا ستم ایجاد شہر ریت کے بلند ٹیلوں میں چھپ گیا تھا جیکونن کی وفات کے بعد عاطون جی رومنوں کے زیر تسلط فلسطین سے بھر گیا تھا وہ کسی دوسرے ملک کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ ایک وادی سے گزرتے ہوئے عاطون نے ایک قافلے کو دیکھا کہ جس نے ایک نخلستان میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا اونٹ نیم دائرے کی صورت میں کھجوروں کے جھنڈوں کے نیچے جگالی کر رہے تھے مسافر جگہ جگہ بیٹھے آرام کر رہے تھے معلوم ہوا کہ یہ قافلہ تجارتی سامان لے کر ملک ہند کی طرف جا رہا ہے عاطون کو ملک ہند میں گزارے ہوئے ایام یاد آگئے اور اس کا دل ہند کی طرف جانے کو مچل اٹھا۔ مگر اس کے پاس میر کارروان کو سفر کا معاوضہ ادا کرنے کے لیے کچھ نہ تھا عاطون میر کارروان سے ملا اور اسے بتا دیا کہ وہ ایک غریب معمار ہے جوڈیا میں کام کی تلاش میں آیا تھا۔ اسے کام نہیں ملا اور وہ واپس ہندوستان جانا چاہتا ہے جہاں کا وہ رہنے والا ہے میر کارروان نے اس صورت میں عاطون کو قافلے کے ساتھ چلنے کی اجازت دے دی کہ راستے میں جہاں کہیں پڑاؤ ہوگا اسے اونٹوں کو چارا ڈالنے کا کام کرنا ہوگا۔ عاطون راضی ہو گیا میر کارروان نے اسی وقت عاطون کو کام پر لگا دیا۔

کارواں نے سورج غروب ہوتے ہی کوچ بول دیا۔ سفر طویل تھا پندرہ روز کے بعد یہ قافلہ دمشق پہنچا یہاں دو روز قیام کے بعد روانہ ہوا تو بغداد پڑاؤ کیا۔ بغداد' پرسی پولس اور سمرقند و بخارا سے ہوتا ہوا ہندوستان میں داخل ہو گیا اس وقت ہندوستان کے شمال میں راجا کنشک کی حکومت تھی اور پنجاب تک کا علاقہ اس کے زیر نگیں تھا پشاولی (موجودہ پشاور) راجا کنشک کی راجدھانی تھی۔ راجا اور رعایا بدھ مت کی پیرو تھی۔ شمالی ہند میں سکندر اعظم کے جانشین یونانی حکمرانوں کا ختم ہو چکا تھا مگر یونانی مجسمہ سازوں کے بنائے ہوئے مہاتما بدھ کے مجسّمے جگہ جگہ نصب تھے جن کے نیچے بدھ کے اخلاقی اصول کندہ تھے۔

اس وقت ملک ہند میں دو بڑی درسگاہیں قائم تھیں' جہاں مذہب' فلسفہ' منطق' ہندسہ اور علم الاخلاقیات کا درس دیا جاتا تھا ایک تیکشلا کی گندھارا درسگاہ اور دوسری نالندہ درسگاہ جو پاٹلی پتر (موجودہ پٹنہ) میں تھی۔ یہاں سینکڑوں کی تعداد میں بیرون ملک سے آئے ہوئے طلبا مقیم تھے ان درسگاہوں کو سرکاری امداد ملتی تھی۔ پاٹلی پتر میں اس وقت راجہ باسودیو حکومت کرتا تھا جو بدھ مت کا پیرو تھا پشاولی سے عاطون تیکشلا آگیا یہاں بے شمار یونانی خاندان آباد تھے کچھ روز تیکشلا میں قیام کرنے کے بعد عاطون ایک قافلے میں شامل ہو کر پاٹلی پتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ گیا شہر میں اس مقدس درخت کو دیکھنا چاہتا تھا جہاں مہاتما بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔

موسم' سرما کا تھا پنجاب میں شدید سردی تھی مگر پاٹلی پتر میں موسم خوشگوار تھا۔ عاطون نے اس شہر میں جڑی بوٹیوں کا کاروبار شروع کر دیا دریائے گنگا کے کنارے اس نے ایک کچا مکان کرائے پر لے لیا۔ دن بھر وہ جنگل میں جا کر جڑی بوٹیاں تلاش کرتا اور شام کو انہیں شہر میں لا کر ویدوں کے پاس فروخت کر دیتا اس نے اپنے لیے نئے کپڑے بنوائے۔ دو گھوڑے بھی خریدے اور ایک نوکر بھی رکھ لیا۔ جو گھر کا سارا کام کاج کرتا تھا اس طرف سے فارغ ہو کر ایک روز وہ گیا کی طرف روانہ ہوگیا۔

گیا کا شہر پاٹلی پتر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ عاطون گھوڑے پر سفر کر رہا تھا صبح کو وہ پاٹلی پتر سے چلا اور شام ہونے سے پہلے پہلے گیا پہنچ گیا بدھ مت کے اس مقدس مقام پر پاٹلی پتر کے راجا باسودیو نے ایک عالی شان بدھ مندر بنوا دیا تھا جس میں گوتم بدھ کی بہت بڑی مورتی رکھی تھی جس کے آگے بھکشو صبح و شام بھجن اور اشلوک پڑھتے رہتے تھے۔ فضا عود و عنبر کی خوشبوؤں سے بوجھل رہتی بدھ مت کے طریق کے مطابق اس مندر میں مرد بھکشوؤں کے علاوہ بھکشنی عورتوں کے رہنے کو کوٹھریاں بھی تھیں یہ بھکشنیاں بھی مرد بھکشوؤں کی طرح ہاتھوں میں کشکول لیے بھکشا لینے شہر کے گلی کوچوں میں نکل جاتیں یہ ان کی ایک مقدس رسم تھی۔

جس درخت کے نیچے کہا جاتا ہے کہ مہاتما بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا وہ ایک گنجان درخت تھا جس کی شاخیں زمین سے لٹک کر جڑ پکڑ چکی تھیں۔ یہاں لوگ دور دور سے آ کر منتیں مانتے اور درخت کی شاخوں کے ساتھ سوت کے دھاگے اور اٹیاں باندھتے' ایک پروہت یہاں بھی بیٹھا ہوا تھا جو ان کی دکھشنا وصول کرتا تھا بدھ مندر کے پیچھے ایک گھنا باغ تھا جہاں آم کے جھنڈ کے جھنڈ کھڑے تھے۔ اس گھنے باغ کے کنارے ایک نہر بہتی تھی نہر کے دوسرے کنارے سے گنجان جنگل شروع ہو جاتا تھا جہاں سے رات کو جنگلی درندوں کی آوازیں آتی تھیں نہر پار جہاں سے یہ جنگل شروع ہوتا تھا وہاں گنپتی گنیش کا ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ وہاں گنپتی گنیش کے ماننے والے ویشنو ہندو صبح و شام اس کی پوجا کرنے آتے تھے۔ راجا کی طرف سے ان ہندو برہمنوں کو اپنے دھرم کے مطابق پوجا پاٹھ کرنے کی اجازت تھی۔ اگرچہ شہر میں ان ہندوؤں کی تعداد بہت کم تھی مگر وہ اپنے دھرم کے بڑے پابند تھے۔ اس مندر کے بارے میں لوگوں میں یہ بات عام تھی کہ جب برہمن مت کو زوال آیا تو ایک آریہ سردار نے جو موجودہ راجا باسودیو کے دادا کا وزیر تھا چوری چھپے شاہی خزانے کو مندر کے آس پاس کسی جگہ دفن کر دیا یہ بھی مشہور تھا کہ کئی لوگ اس خزانے کی تلاش میں گئے اور پھر واپس نہ آ سکے۔ راجا باسو نے بھی اپنے آباو اجداد کے خزانے کو تلاش کروانے کی بہت

کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ گنپتی مندر میں حسین لڑکیوں کی قربانی بھی دی جاتی ہے اور اماوس کی تاریک اندھیری راتوں میں جنگل کی طرف سے عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں بھی آتی ہیں۔

عاطون کے نزدیک یہ سب افسانوی باتیں تھیں کیونکہ اس نے اندھیری رات میں جنگل کی طرف سے آتی اس قسم کی کوئی آواز نہیں سنی تھی اسے پاٹلی پتر میں رہتے ہوئے دو ماہ گزر گئے تھے۔ عاطون نے محسوس کیا کہ پاٹلی پتر میں رہنے والے مٹھی بھر برہمن اگرچہ بظاہر بدھ مت کے پیروکاروں سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں مگر دل میں نہیں سخت ناپسند کرتے ہیں۔ بدھ لوگ نیچ ذات کے لوگوں سے ذرا سی بھی چھوت چھات روا نہیں رکھتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ ایک جگہ بیٹھ کر روٹی بھی کھاتے تھے جبکہ برہمن نیچ ذات کے لوگوں کے سائے سے بھی کترا کر نکل جاتے۔ اگر اتفاق سے کسی برہمن پر نیچ ذات کے اچھوت کا سایہ پڑ جاتا تو وہ فوراً اشنان کے لیے گنگا کی طرف چل پڑتا اور جب تک گنگا دریا کے پانی میں اچھی طرح اشنان نہ کر لیتا واپس نہیں آتا تھا۔ گنپتی برہمن مندر کے پروہت کا نام کالپی تھا' منڈا ہوا سر' آگے کو نکلی ہوئی توند' سرخ آنکھیں' چوڑے نتھنوں والا بیٹھا ہوا ناک اور بھینسے جیسی ہیبت و جسامت والا کالپی شکل سے کسی وحشی قبیلے کا سردار لگتا تھا مگر درحقیقت وہ بڑا کٹر برہمن تھا اور ایک بار پھر برہمنیت کا عروج دیکھنا چاہتا تھا مگر راج دھرم بدھ مت تھا۔

کالپی نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری تھی اس نے سام وید اور یجروید کا پھر سے مطالعہ کیا اس میں سے اس نے کچھ خفیہ سیاہ پوش اشلوک نکالے' کالپی سیاہ پوش اشلوکوں کے طلسم کو جانتا تھا۔ مٹی کے ایک پیالے میں سرسوں کا تیل بھر کر اس میں گنپتی کا ایک تانبے کا پترا کاٹ کر ڈالا۔ تھوڑا سیندور اور تلسی کے پتے جلائے اور خفیہ اشلوک ایک سو مرتبہ پڑھ کر اس پر پھونکے' سرسوں کے تیل میں ڈوبے ہوئے تانبے کے پترے پر قدیم ترین سنسکرت زبان کے حروف ابھر آئے۔ ان حروف کی شکل میں لکھا تھا۔

"تیرا جو مقصد ہے اس کو پورا کرنے کے لیے شوراتری کی رات شہر کی سب سے خوبصورت اچھوت کنواری لڑکی کو اس منش کے ساتھ نہر کنارے زمین میں زندہ دفن کر جو شام کے وقت سب سے پہلے تیرے گھر میں داخل ہو۔ تیرے من کی اچھیا پوری ہو گی۔"

کالپی نے تیل کا پیالہ گنپتی کی مورتی کے پیچھے پتھر کے نیچے رکھا اور اپنے چیلے کانشی کو ساری روداد سنائی اور کہا "برہمن مت کا پھر سے عروج آنے والا ہے' برہمنیت کا چکر شروع ہو گا۔ تم شہر کی سب سے خوبصورت اچھوت کنواری لڑکی ڈھونڈو' شوراتری میں ابھی تین روز باقی ہیں۔"

کانشی بھی کٹر برہمن تھا وہ برہمن مت کے عروج پر بے حد خوش ہوا مگر اچھوتوں کی بستی میں جانے پر ہچکچایا' اور بولا "گورو دیو نیچ ذات والوں کی بستی میں میرے اندر کا دھرم بھرشٹ نہ ہو جائے کہیں۔"

کالپی پروہت نے اسے کھا جانے والی سرخ آنکھوں سے دیکھا اور کہا۔ "کیا تم دھرم راج کے دشمن ہو؟ کیا تم دھرم کے لیے یہ بلیدان نہیں دے سکتے؟ میں تمہیں شراپ دوں گا اور تمہارا اگلا جنم بچھو کا ہو گا۔"

کانشی فوراً کالپی پروہت کے قدموں پر گر پڑا اور بولا۔ "مہا راج! مجھے ایسا شراپ نہ دیں میں دھرم کی اچھیا پوری کروں گا۔ میں آج ہی اچھوتوں کی بستی میں جاتا ہوں۔"

کانشی نے اسی وقت سادھو کا بھیس بدلا اور کرمنڈل ہاتھ میں لے کر آواز لگاتا اچھوتوں کی بسی کی طرف نکل گیا۔ پاٹلی پتر میں اگرچہ اچھوتوں سے چھوت چھات نہ کی جاتی تھی پھر بھی انہوں نے اپنی بستی شہر سے الگ بسا رکھی تھی کانشی سادھو آواز لگاتا ان کی بسی میں داخل ہو گیا وہ ایک خوبصورت آنکھوں والا برہمن تھا۔ اس کی شخصیت اور آواز میں ایسا اثر تھا کہ ہر کوئی اپنے گھر سے نکل کر اسے تکنے لگا۔ اچھوت عورتیں بھکشا لیے دروازے پر آن کھڑی ہوئیں ان کے نزدیک یہ بھی بڑی مبارک اور عزت افزائی کی بات تھی کہ ایک برہمن سادھو ان کی بستی میں بھکشا مانگنے آیا تھا۔

کانشی سادھو کے بھیس میں اچھوتوں کی بسی میں آواز لگاتا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا آگے بڑھتا گیا وہ جان بوجھ کر کسی گھر کے آگے کھڑا نہیں ہو رہا تھا کہ کہیں کوئی نیچ عورت یا مرد اس کو ہاتھ نہ لگا دے مگر اس کی عقابی آنکھیں ایک ایک عورت ایک ایک اچھوت لڑکی کا گہری نگاہوں سے جائزہ لے رہی تھیں۔ مگر وہاں ایک بھی عورت خوبصورت نہیں کہلائی جا سکتی تھی کسی کی آنکھیں خوبصورت تھیں تو ناک بیٹھی ہوئی تھی ناک اونچی تھی تو آنکھیں بھینگی تھیں کسی کا دہانہ چوڑا تھا تو کسی کے دانت باہر کو نکلے ہوئے تھے۔

کانشی ناامید ہو کر واپس پروہت کالپی کے پاس آ گیا کالپی بے حد سٹ پٹایا کیونکہ شوراتری کی رات میں صرف دو دن باقی رہ گئے تھے۔ اور ابھی تک کسی حسین اچھوت لڑکی کا سراغ نہیں ملا تھا کالپی پروہت نے خود بھیس بدلا اور لمبی داڑھی لگا کر شہر کے علاقے میں آ گیا جہاں کلال خانہ تھا اور جہاں شہر کے اچھوت بھی نشہ کرنے آتے تھے کالپی بانس کے اس جھونپڑے کے باہر تنور کے پاس آ کر بیٹھ گیا جہاں پہلے ہی سے کچھ اچھوت ناریل کے پیالوں میں تاڑی پی رہے تھے۔ کالپی نے بھی اپنا حلیہ ان جیسا ہی بنا رکھا تھا اس نے بھی تاڑی کی ایک ہنڈیا مع ناریل کے پیالے کے منگوائی اور تاڑی پینی شروع کر دی۔ اچھوت پہلے ہی نشے

میں تھے کالپی نے انہیں تاڑی پیش کی تو وہ بہت خوش ہوئے اور کالپی کے گرویدہ ہو گئے۔ کالپی نے تاڑی کے دو پیالے پینے کے بعد اپنی گردن گھٹنوں میں دے دی اور سسکیاں بھرنا شروع کر دیں۔

قدرتی طور پر اچھوت لوگ پریشان سے ہوئے ان میں جوان بھی تھے اور ادھیڑ عمر اچھوت بھی تھے۔ ایک نوجوان نے کالپی سے پوچھا وہ کیوں رو رہا ہے؟ کالپی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ”مترو! میں بھی بالمیکی ہوں۔ ایک جوتشی مہاراج نے میرے پتر کی جنم پتری دیکھ کر کہا کہ اگر اس کی شادی دیش کی سب سے حسین اچھوت لڑکی سے نہ کی گئی تو وہ شادی کی رات مرجائے گا۔ میں نے تب سے دیش کا کونہ کونہ چھان مارا ہے مجھے کوئی حسین اچھوت کنیا نہیں ملی۔ اگر میرے پتر کی شادی کسی عام کنیا سے ہو گئی تو وہ مرجائے گا اور میری گوت ختم ہو جائے گی۔ اس غم میں میرے آنسو نکل آئے تھے۔

ایک اچھوت نوجوان نشے کی ترنگ میں بولا۔

”والمیکی بابا! اگر تم سونے کے دو سکے مجھے دو تو میں تمہیں ایک اچھوت کنیا کا پتا بتا دوں گا جو سندرتا میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔“

عیار کالپی کی سرخ آنکھیں چمک اٹھیں اس نے فوراً کہا۔ بیٹا میں اپنے اکلوتے بچے کے لیے تمہیں سونے کے بیس سکے دینے کو تیار ہوں لیکن لڑکی سب سے حسین ہونی چاہیے۔“

تمام اچھوت ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے‘ جس نوجوان نے حسین لڑکی سے ملوانے کا وعدہ کیا تھا وہ تو خوشی سے اچھل پڑا اور بولا۔ خبردار اب کوئی دوسرا نہ بولے‘ سونے کے بیس سکوں پر میرا حق ہے۔ پہلے میں نے بات کی تھی روہنی کی۔“

معلوم ہوا کہ روہنی نام کی ایک اچھوت لڑکی دریا پر بانس کے پل کے پاس اپنی کٹیا میں اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ رہتی ہے۔ سب نے بیک آواز تائید کی کہ اس جیسی حسین لڑکی پاٹلی پتر میں دوسری کوئی نہیں ہے کالپی کا من خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس کے من کی مراد بر آئی تھی۔ اب اچھوت نوجوان سونے کے بیس سکوں کا مطالبہ کر رہا تھا۔ عیار کالپی نے کہا۔ ”میرے بچے! میں سونے کے سکے اپنے ساتھ کلال خانے میں نہیں لایا۔ تم میرے ساتھ میرے ڈیرے پر چلو وہاں میں تمہیں تمہاری رقم ادا کر دوں گا“

اچھوت نوجوان نشے میں تھا۔ خوشی خوشی کالپی کے ساتھ چل پڑا کالپی ہوش میں تھا اس نے تاڑی کا ایک ہی پیالہ پیا تھا جبکہ بدقسمت اچھوت نوجوان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے کالپی پروہت اس سارے علاقے سے واقف تھا وہ اسے شہر سے باہر شمشان بھومی کے اندھے

کنویں کے پاس لے آیا اور پھر موقع پا کر اسے کنویں میں دھکا دے کر گرا دیا۔ بدقسمت اچھوت نوجوان کی ایک ہی چیخ بلند ہوئی اس کے بعد شمشان بھومی میں موت کا سناٹا چھا گیا۔

مندر میں آتے ہی کالپی نے اپنا حلیہ تبدیل کیا اور کانشی کو حکم دیا کہ اندھیرا ہوتے ہی دریا پار بانس کے پل والی کٹیا کی طرف جاو اور روہنی نام کی اچھوت لڑکی کو اغوا کر کے لے آؤ۔ کانشی اس قسم کے کاموں میں بڑا ماہر تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی لڑکیوں کو اغوا کر کے اپنے بدکردار گورو کے چرنوں میں پیش کر چکا تھا وہ صرف اچھوت لڑکی کو چھوتے ہوئے گھبرا رہا تھا لیکن یہاں معاملہ دھرم راج کا تھا اور اس کے گورو دیو نے اسے آگیا بھی دے دی تھی اس لیے وہ تیار ہو گیا اس نے جوگی کا حلیہ بدلا۔ بے ہوشی کا سفوف ساتھ رکھا اور گھوڑے پر سوار ہو کر آم کے باغوں کے ...... درمیان سے ہو کر دریا کی طرف نکل گیا بانس کے پل کے قریب اس نے اپنے گھوڑے کو ایک جگہ جھاڑیوں میں باندھا اور رات کا اندھیرا پھیلنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب سورج غروب ہو گیا اور رات کی تاریکی نے ہر شئے کو اپنی سیاہ چادر میں لپیٹ لیا اور فصیل شہر کے برجوں کی مشعلیں روشن ہونے لگیں تو کانشی جھاڑیوں میں سے نکل کر بانس کے پل کی طرف روانہ ہوا۔ پل کے نیچے کنارے پر ایک جانب چھوٹی سی کٹیا بنی ہوئی تھی کانشی نے وہاں جاکر بھکشا کے لیے آواز لگائی۔

کٹیا میں سے روہنی کا بوڑھا باپ باہر نکلا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔ ”مہا راج! آپ برہمن ذات کے جوگی ہیں ہم شودر ذات کے ہیں‘ ہماری بھکشا آپ کیسے سویکار کریں گے۔“

کانشی نے اولکھ نرنجن کا نعرہ لگا کر کہا۔ بابا! ہم تیری بچی روہنی سے دکھشا سویکار لیں گے۔ اس کہو ہمارے لیے چاول لائے۔“

بوڑھا بہت خوش ہوا جلدی سے اپنی بیٹی کو آواز دی اور کہا کہ مہان جوگی کے لیے چاول لائے کٹیا کے باہر ایک چراغ روشن تھا۔ تھوڑی دیر بعد کٹیا میں سے ایک سانولی سلونی لڑکی باہر نکلی اس کے ہاتھ میں چاولوں سے بھری ہوئی تھالی تھی۔ چراغ کی دھیمی روشنی میں ہی کانشی نے دیکھ لیا کہ لڑکی بے حد حسین ہے جب وہ چاول کانشی کے کرمنڈل میں ڈالنے کے لیے جھکی تو کانشی نے اس کا بازو پکڑ لیا اور کہا۔ ”اولکھ نرنجن! بچی ہم تم سے پرسن ہوئے۔ ہم تمہیں برہم دیو جی کی گھٹی ارپن کرتے ہیں۔ تم دونوں اسے پی لو گے تو سیدھے سورگ میں جاؤ گے۔“

بوڑھا کانشی کے پاؤں کے قریب سر جھکا کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”مہاراج! ہمارے دھن بھاگ کہ ہمیں برہم دیو جی کی گھٹی پینے کو ملے۔ آؤ بیٹی روہنی تم بھی میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔“

کانشی نے اسی وقت پانی سے بھرا ہوا پیالہ منگوایا' اس میں بے ہوشی کی دوائی کا سفوف ملایا اور کہا "اس امرت رس کو دونوں پی جاؤ' تمہارا کلیان ہو جائے گا۔"

اچھوت لڑکی روہنی اور اس کے باپ نے خوشی خوشی وہ مشروب پی لیا۔ کانشی بولا۔ اچھا اب ہم جاتے ہیں۔ رام تمہارا بھلا کرے گا۔" تھوڑی دور جا کر کانشی ایک درخت کے پیچھے چھپ کر ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ بے ہوشی کی دوائی نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا بوڑھا اٹھ کر کٹیا کی طرف گیا اس کی بیٹی چراغ کی لو کو دھیمی کرنے کے لیے بڑھی مگر دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر بے ہوش ہو کر دھڑام سے گر پڑے۔ کانشی جو اسی وقت کے انتظار میں تھا فورا لپک کر کٹیا کی طرف گیا اور بے ہوش روہنی کو کپڑے میں لپیٹ کر کاندھے پر رکھا اور جھاڑیوں میں آگیا۔ جہاں اس کا گھوڑا بندھا ہوا تھا' روہنی کو گھوڑے پر ڈال کر وہ خود بھی اس پر سوار ہوا اور دریا کی طرف گھوڑے کو دوڑانے لگا۔

بے ہوش روہنی کو اس نے مندر کے پیچھے والی ایک اندھیری کوٹھری میں ڈال دیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ صبح سے پہلے ہوش میں نہ آ سکے گی۔ اس وقت مندر میں لوگ پوجا پاٹھ کے لیے آ رہے تھے پروہت کالپی تلک لگائے جینو گلے میں ڈالے مورتی کے سامنے بیٹھا بھجن گا رہا تھا اور پوجا کرنے والوں سے دکھشنا لے کر ان کے ماتھوں پر زعفران کا ٹیکا لگائے جاتا تھا اس نے ترچھی نگاہوں سے کانشی کو آتے دیکھ لیا تھا اور کانشی نے بھی اشارے سے اسے بتا دیا تھا کہ سب کام منصوبے کے مطابق ہو گیا ہے۔

رات کا پہلا پہر گزرنے کے بعد لوگوں کے آنے کا سلسلہ ختم ہو گیا تو کانشی اپنے گورو کالپی کو ساتھ لے کر پچھلی کوٹھری میں آ گیا۔ کالپی نے چراغ کی روشنی میں بے ہوش روہنی کو دیکھا تو اس کی سندرتا سے بے حد متاثر ہوا۔ بولا "کانشی! تو برہم دیو کے لیے آکاش کی اپسرا اٹھا لایا ہے۔ اب برہم جی کا راج ہو گا۔ چلو اس اچھوت کنیا کو نہر کے کنارے زمین میں دفن کرتے ہیں۔"

انہوں نے نہر کے کنارے ایک جگہ گھنے درخت کے نیچے زمین کھودنی شروع کر دی یہاں مٹی نرم تھی بہت جلد گہرا گڑھا کھد گیا۔ پوشیدہ اشلوکوں کے طلسم کے مطابق اسی گڑھے میں انہوں نے اس آدمی کو بھی دفن کرنا تھا' جو شوراتری کی شام کو سب سے پہلے اس مندر کے استھان میں داخل ہو گا۔ چنانچہ اس حساب سے انہوں نے گڑھے کو نیچے سے کشادہ کر دیا تاکہ دو انسانوں کو اس میں لٹایا جا سکے۔ جب گڑھا تیار ہو گیا تو کالپی نے کانشی کو اشارہ کیا کہ وہ روہنی کو اٹھا لائے۔

کانشی فورا کوٹھری میں گیا۔ بدقسمت اچھوت لڑکی روہنی اسی طرح بے ہوش پڑی

تھی کانشی نے اسے اٹھا کر کاندھے پر ڈالا اور قبر کے پاس لے آیا۔ دونوں نے مل کر روہنی کو گڑھے میں اتارا۔ اسے گڑھے کی تہ میں نرم مٹی پر لٹا دیا۔ اوپر درخت کا کٹا ہوا تنا رکھا اور قبر کو مٹی سے بند کرنے کی بجائے جھاڑیوں سے اچھی طرح سے ڈھانپ دیا۔

صبح سویرے کانشی نے آ کر روہنی کے حلق میں بے ہوشی کی تھوڑی سی دوائی مزید انڈیل دی اور واپس مندر میں چلا گیا۔ آج شوراتری کی رات تھی۔ اسی شام کو مندر میں داخل ہونے والے پہلے آدمی کو کالپی کا شکار بننا تھا۔ اس لیے کالپی پروہت نے پہلے ہی سے بندوبست کر رکھا تھا۔ کانشی کو اس نے خاص ہدایت دے کر مندر کے پیچھے ایک درخت کے پاس بٹھا دیا تھا۔ جہاں وہ فرضی گیان دھیان میں مصروف تھا۔ مگر اس کی نگاہیں مندر میں داخل ہونے والے دروازے پر لگی تھیں۔

دوسری طرف حسین اچھوت لڑکی روہنی کو جب زمین میں زندہ دفن کرنے کے بعد گڑھے کے اوپر گھاس پھوس ڈال کر کانشی اور پروہت کالپی مندر کی طرف چلے گئے تو دن کے تیسرے پہر روہنی کو ہوش آگیا۔ مگر وہ اسی قدر ہوش میں آ سکی تھی کہ صرف آنکھیں کھلی تھیں' مگر اس کا جسم بدستور بے حس تھا اور وہ بدن میں اتنی طاقت بھی نہیں پا رہی تھی کہ کوئی آواز نکال سکے۔ اس نے اپنے اردگرد چاروں طرف اندھیرا دیکھا تو بہت جلد اسے احساس ہو گیا کہ وہ زندہ زمین کے اندر کسی گڑھے میں دفن کر دی گئی ہے۔ اوپر گھاس پھوس کی چھت ہونے کی وجہ سے اسے تازہ ہوا باقاعدہ سے آ رہی تھی۔ اس نے سب سے پہلے تو اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کی کہ وہاں سے نکل سکے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے جسم نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر اس نے پوری قوت سے چیخ مارنے کی کوشش کی مگر اس کے حلق اور آواز نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اس بے چارگی پر روہنی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کی آنکھوں میں اس جوگی کی شکل گھوم گئی جس نے اسے اور اس کے پتا کو پانی میں بے ہوشی کی دوا پلائی تھی۔ اسے اپنے باپ کا خیال آنے لگا کہ نہ جانے وہ کس حال میں ہو گا مگر وہ اس بات پر حیران تھی کہ اگر اسے اغوا کیا گیا ہے تو اسے زندہ زمین میں کس لیے دفن کر دیا گیا ہے؟ اسی الجھن میں گم وہ گڑھے کے اندر چت پڑی رہی۔

دن ڈوبنے لگا۔ سورج مغرب کی جانب فصیل شہر کے پیچھے غروب ہو گیا پروہت کالپی مندر کے استھان پر آلتی پالتی مارے بیٹھا پہلے پجاری کے مندر کی ڈیوڑھی میں داخل ہونے کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس کی بے چین نگاہیں ڈیوڑھی پر لگی تھیں۔ دوسری طرف کانشی بھی اسی فکر میں بیٹھا تھا۔

اس شام ایسا ہوا کہ عاطون نہر کے کنارے والے آم کے گھنے باغ کا چکر لگاتا مندر کی طرف نکل آیا۔ اس کا مندر میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر کوئی نامعلوم طاقت اسے مندر کی طرف لے گئی اور اس کے قدم اپنے آپ ڈیوڑھی کی طرف بڑھنے لگے۔

جونہی پروہت نے ایک سانولے نوجوان کو مندر کی ڈیوڑھی میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے کانشی کو خبردار کرنے کے لیے اولکھ نرنجن کا نعرہ بلند کیا۔

کانشی نے بھی عاطون کو مندر کی ڈیوڑھی میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا یہ اس شام مندر میں داخل ہونے والا پہلا پجاری تھا۔ وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور عاطون کے پاس آ کر بولا۔ "اولکھ نرنجن! بابا لوگ آج شوراتری ہے ویدوں میں لکھا ہے جو منش اس روز شام کو سب سے پہلے مندر میں داخل ہوگا اسے شوجی مہاراج کی جٹا کے درشن کرائے جائیں گے۔ آؤ میرے ساتھ تم بڑے بھاگوان ہو کہ شوجی مہاراج کے جٹا کے درشن کرو گے۔"

عاطون مسکرایا! اس نے سوچا کہ چلو ذرا تفریح ہی رہے گی شوجی مہاراج کی جٹا کے درشن بھی کر لیتے ہیں۔ کیا حرج ہے وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "مہاراج! میرے دھن بھاگ۔"

کانشی عیاری سے مسکرایا۔

آؤ میرے ساتھ بالک۔

کانشی، عاطون کو پیچھے پیچھے لیے مندر کی عقبی کوٹھری میں داخل ہو گیا پھر اس نے دیوار میں بنے ایک طاق کی طرف اشارہ کرکے عاطون سے کہا۔ "بالک! اس طاق کو کھول کر شوجی مہاراج کی جٹا کے درشن کرو اور مکتی حاصل کرو۔"

عاطون نے آگے بڑھ کر طاق کھول دیا طاق خالی تھا عین اسی وقت کانشی نے پیچھے سے عاطون کی کھوپڑی پر پتھر کی شدید ضرب لگائی۔ اگرچہ عاطون پر اس ضرب کا کوئی اثر نہ ہوا لیکن فوراً ہی اس نے سوچا کہ دیکھنا چاہیے اس برہمن پجاری نے یہ جال کیوں بچھایا ہے؟ چنانچہ عاطون جان بوجھ کر نیچے گر پڑا اور یوں ظاہر کیا جیسے بے ہوش ہو گیا ہے اس دوران میں پروہت کالپی بھی وہاں توند سنبھالتا پہنچ گیا تھا اس نے آتے ہی عاطون کو فرش پر بے ہوش پڑے دیکھا تو بولا۔

"کانشی! تم نے دھرم کی آگیا کا پالن کیا۔ باہر اندھیرا ہو گیا ہے اسے اٹھا کر اس جگہ لے چلو جہاں اچھوت لڑکی دفن ہے۔ میں بھی آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر پروہت کالپی تیزی سے باہر نکل آیا عاطون نے یہ سب کچھ سنا تو سمجھ گیا کہ یہ جرائم پیشہ پروہت کوئی گھناؤنا منصوبہ بنا رہے ہیں یہ منصوبہ کیا تھا؟ عاطون اس کو جاننے کے لیے بے ہوش ہی پڑا رہا۔ اس نے اپنا جسم بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا تاکہ کانشی کو اسے اٹھانے میں آسانی ہو۔ کانشی نے عاطون کو

ایک چادر میں لپیٹا اور اسے اٹھا کر کاندھے پر ڈال کر نہر کی طرف چل دیا نہر کے کنارے جہاں اچھوت لڑکی روہنی دفن کی گئی تھی اس جگہ لا کر عاطون کو بھی ڈال دیا۔ اتنے میں پروہت کالپی بھی وہاں پہنچ گیا۔

"جلدی سے گھاس پھوس ہٹا کر اسے بھی گڑھے میں دفن کر دو۔ تاکہ ویدک طلسم کی شرط پوری ہو اور دیش میں ایک بار پھر برہم راج قائم ہو۔"

کانشی نے گھاس پھوس ہٹا دیا۔ اندھیرے میں عاطون نے دیکھا کہ کشادہ گڑھے کے اندر پہلے سے ایک لڑکی چت پڑی تھی۔ روہنی کی آنکھیں کھلی تھیں مگر وہ بول نہیں سکتی تھی۔ نہ حرکت کر سکتی تھی اندھیرے میں آنکھیں نظر نہ آئیں۔ عاطون یہ دیکھ کر خوش ہوا کہ لڑکی ابھی تک زندہ تھی۔

عاطون کو قبر میں ڈال کر اوپر درخت کا تنا دوبارہ رکھ کر گھاس پھوس ڈال دیا گیا پھر کالپی اور کانشی پھاوڑوں کی مدد سے مٹی ڈال کر گڑھے کو بند کرنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے گڑھا بند ہو گیا۔ دونوں پروہتوں نے زمین کو برابر کرکے اوپر خشک جھاڑیاں اور گھاس ڈال دی اور خوشی خوشی واپس مندر کو چل دیئے۔

عاطون نے اپنے آپ کو اچھوت لڑکی روہنی سے ایک طرف ہٹایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "تم کون ہو؟ تمہیں یہ لوگ کہاں سے اٹھا کر لائے تھے؟"

روہنی نے اپنے ساتھ زمین میں زندہ دفن ہونے والے جوان کی آواز سنی تو بولنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے ہونٹ ہلائے مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ عاطون سمجھ گیا کہ لڑکی دہشت کی وجہ سے بے حس ہو گئی ہے اس نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں، میں تمہیں یہاں سے باہر نکال لوں گا" اور عاطون نے اپنے اوپر کوئی ایک فٹ کی بلندی پر پڑے ہوئے تنے کو آہستہ سے اوپر کو اٹھایا۔ ٹھیک اسی وقت زمین ہلنے لگی۔ ایک کڑاکے کی آواز کے ساتھ گڑھے کی دیوار ایک طرف کو جھک گئی۔ دہشت کے مارے روہنی کی چیخ نکل گئی زمین جھولے کی طرح جھول رہی تھی۔ عاطون نے لڑکی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "یہ بھونچال ہے۔ ڈرو نہیں۔"

عاطون نے لڑکی کو بازو سے پکڑ کر دوسرے طرف دیوار کے ساتھ لگا دیا اور خود درخت کے تنے کے ساتھ اپنی کمر ٹکا دی۔ کہ اگر یہ نیچے گرے بھی تو لڑکی محفوظ رہے بھونچال کے جھٹکے جاری تھے۔ اچانک کھڈ کی دیوار میں ایک شگاف پڑ گیا اور اس میں سے نہر کا پانی ایک دھارے کی شکل میں کھڈ میں بھرنے لگا۔ روہنی کی قوت گویائی اور جسمانی توانائی واپس آگئی تھی اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ہم مرجائیں گے۔"

بھونچال کے جھٹکے مدھم ہو گئے تھے عاطون کے لیے اب وہاں سے باہر نکلنا ضروری ہو گیا تھا اس نے پوری طاقت صرف کرتے ہوئے درخت کے تنے کو اتنی زور سے اوپر کو اچھالا کہ وہ اپنے اوپر پڑی ہوئی مٹی سمیت گڑھے سے باہر جا پڑا۔ عاطون نے روہنی کو سہارا دے کر گڑھے سے باہر نکالا اور پھر خود بھی باہر آ گیا اب انہیں لوگوں کی چیخ و پکار سنائی دی جو شہر کی طرف سے آ رہی تھی۔ عاطون نے دیکھا کہ شہر کے اندر کئی جگہوں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔

روہنی نے غم سے نڈھال ہو کر کہا۔ "میرے پتا جی! مجھے پتا جی کے پاس لے چلو۔"

زلزلہ رک گیا تھا مگر اس نے شہر میں تباہی مچا دی تھی۔ کئی جگہوں سے زمین پھٹ گئی تھی۔ نہر کا کنارہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا تھا اور پانی کھیتوں اور نشیب میں تیزی سے بھر رہا تھا۔ عاطون نے لڑکی کو ساتھ لیا اور جب مندر کے قریب سے گزرا تو دیکھا کہ مندر کی عمارت ڈھے چکی تھی۔ عاطون قریب گیا تو اندھیرے میں اسے کانشی اور کالپی پروہت کی لاشیں اس حالت میں پڑی ملیں کہ ان کے آدھے دھڑ کٹ چکے تھے شہر کے دروازوں میں سے گھبرائے ہوئے لوگ نکل نکل کر کھیتوں اور آم کے گھنے باغ کی طرف بھاگ رہے تھے۔ بانس کا پل ٹوٹ کر نہر میں گر گیا تھا۔ روہنی چیختی' اپنے باپ کو آوازیں دیتی ادھر ادھر دوڑنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے اپنے باپ کی لاش مل گئی جو ایک درخت کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ روہنی اپنے باپ کی لاش سے لپٹ کر بلک بلک کر رونے لگی۔ عاطون نے محض انسانی ہمدردی کی خاطر روہنی کو تسلی دی۔ اسے اس لڑکی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر چونکہ حالات نے اسے اس کی تحویل میں دے دیا تھا' اس لیے عاطون پر روہنی کی جانب سے اخلاقی ذمے داری عائد ہو گئی تھی کہ وہ اسے کسی محفوظ جگہ پر پہنچائے جب روہنی کے صدمے کا غبار ذرا کم ہوا تو عاطون نے بوڑھے کی لاش کو نہر میں بہا دیا اور روہنی سے پوچھا کہ وہ اب کہاں جانا چاہتی ہے۔

نڈھال آواز میں کہا۔ "میرا اب اس شہر میں کوئی نہیں ہے۔ ہاں ویشالی میں میرے پتا جی کا ایک بڑا بھائی رہتا ہے۔"

عاطون نے کہا۔ "ابھی رات ہے تم اسی جگہ آرام کرو۔ صبح ہونے پر میں تمہیں ویشالی لے چلوں گا۔"

روہنی اپنے منہدم شدہ مکان کے ملبے کے پاس ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی عاطون بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اب اس نے روہنی کا نام پوچھا اور اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ روہنی ایک اچھوت لڑکی ہے اور کانشی اسے اغواء کر کے مندر کی طرف لے گیا تھا۔ عاطون

نے کہا۔ "بدکردار پروہت تو اپنے انجام کو پہنچا۔ اس نے ہم دونوں کو کس مقصد کے لیے اغواء کیا۔ یہ جاننے کی ہمیں اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔"

روہنی نے عاطون کی طرف پراسرار نگاہ سے دیکھا اور سوال کیا کہ اس کے پاس اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ اس نے ایک ہی جھٹکے سے قبر پر گرے ہوئے درخت کے بھاری تنے کو باہر اچھال دیا؟"

عاطون اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "اتنی طاقت تو ہر انسان میں ہوتی ہے۔ مصیبت کے وقت آدمی کی طاقت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مجھ میں کوئی خاص طاقت نہیں ہے۔"

روہنی ایک ذہین لڑکی بھی تھی وہ سمجھ گئی کہ عاطون اس سے اپنی غیر معمولی طاقت کے راز کو چھپا رہا ہے وہ خاموش بیٹھی رہی شہر کی جانب آگ مدھم پڑ گئی تھی۔ لوگوں کی چیخ و پکار بھی کم ہو گئی تھی زلزلے نے بہت زیادہ تباہی مچائی تھی روہنی وہیں گھاس پر پڑ کر سو گئی اور عاطون جاگ کر اس کی حفاظت کرتا رہا۔ پھر جب سورج کی روشنی چاروں طرف پھیلی تو عاطون نے روہنی کو جگایا۔ انہوں نے دور سے دیکھا کہ شہر کی دیوار میں کئی جگہ پر شگاف پڑ گئے تھے اور راجا کی فوج کے سپاہی تباہ حال لوگوں کو محفوظ ٹھکانوں پر لے جا رہے تھے۔

روہنی جنگل میں نکل گئی۔ ایک جگہ ندی کے پانی میں اتر کر روہنی نے غسل کیا۔ کپڑے پہنے اور عاطون کے پاس آ گئی۔ عاطون نے اس سے پوچھا کہ ویشالی وہاں سے کتنی دور ہے؟"

روہنی نے کہا! "اگر ہم گھوڑوں پر بیٹھ کر چلیں تو دوپہر تک ویشالی پہنچ جائیں گے۔ لیکن ہمارے پاس گھوڑے نہیں ہیں۔ پیدل چل کر ہم رات کے وقت منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔"

عاطون نے کہا کہ وہ گھوڑوں کا بندوبست کرے گا۔ چنانچہ روہنی کو وہیں چھوڑ کر عاطون شہر کی منڈی کی طرف آ گیا یہاں مکان زمین بوس ہو چکے تھے۔ منڈی میں بھی ویرانی کا منظر تھا۔ ایک اصطبل کے باہر کچھ گھوڑے بندھے ہوئے تھے عاطون جس گھر میں رہتا تھا وہ بھی تباہ ہو چکا تھا عاطون کے پاس سونے کے کچھ سکے موجود تھے۔ اس نے ان کے عوض ایک گھوڑا خریدا پھر روہنی کے پاس آیا اور اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھا کر ویشالی کی طرف روانہ ہو گیا۔

زلزلے نے کافی دور تک تباہی پھیلائی اور ویشالی کی طرف جاتی سڑک پر کئی جگہ

زمین پھٹ گئی تھی۔ عاطون گھوڑے کو قدم قدم چلاتا پاٹلی پتر سے تین کوس دور پہنچا تو یہاں
زلزلے کا کوئی اثر نہیں تھا اب اس نے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی راستے میں تین جگہوں پر
اس نے پڑاؤ کیا یوں سفر کرتے ہوئے وہ شام ہونے سے پہلے ویشالی شہر میں داخل ہو گیا۔
روہنی کا تایا اپنے بھائی کی موت کی خبر سن کر آبدیدہ ہو گیا' پاٹلی پتر کے اندوہناک زلزلے کی
خبر وہاں پہنچ چکی تھی۔ اس نے عاطون کے آگے دودھ اور روٹی رکھی اور ہاتھ باندھ کر کہا کہ
ہم اچھوت ہیں۔ آپ ہمیں معاف کر دیں۔"
عاطون نے اسے سینے سے لگا لیا اور کہا۔ "سب انسان برابر ہوتے ہیں میں ان باتوں
کو نہیں مانتا۔"

روہنی اور اس کا تایا' عاطون کے خیالات سے بہت متاثر ہوئے روہنی کے تائے کا
نام بھاشو تھا' بھاشو' ویشالی شہر کے ایک سوداگر بکرم کی حویلی میں صفائی وغیرہ کا کام کرتا تھا اس
کی بیوی' بچے بھی وہیں کام کرتے تھے اس نے روہنی کو بھی بکرم سوداگر کی حویلی میں کام پر
لگا دیا۔ عاطون کی ذمے داری اب ختم ہو گئی تھی۔ اس نے چند روز ویشالی شہر کی سیروسیاحت
کی اور پھر ایک روز وہاں سے ٹیکشلا کی طرف جانے کا منصوبہ بنایا اور روہنی کے تایا بھاشو
کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا تاکہ اس سے رخصت طلب کرے۔
بھاشو شام کو واپس آیا تو بہت پریشان تھا۔ اس کی بیوی بھی گھبرائی ہوئی تھی عاطون
کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ روہنی کو شیر اٹھا کر لے گیا ہے اس قسم کے افسوس ناک حادثے
اس زمانے میں ایسے شہروں میں اکثر ہوتے رہتے تھے جو جنگل کے کناروں پر آباد تھے۔ اس
زمانے میں بندوق وغیرہ تو تھی نہیں۔ شکاری لوگ تیر کمان یا نیزے بھالے سے ہی کبھی کبھی
شیر کا شکار کر لیتے تھے بیشتر حالات میں ایسا ہوتا تھا کہ کوئی شیر زخمی ہو کر بھاگ کر شکار کرنے
کے قابل نہ رہتا۔ یہ معذوری اسے آدم خور بنا دیتی وہ تیز رفتار ہرنوں کا پیچھا کرنے کی
بجائے جنگل میں کام کرتے یا بیل گاڑی میں گزرتے انسانوں پر گھات لگا کر حملہ کرتا اور دبوچ
کر لے جاتا لیکن جب بھاشو نے عاطون کو بتایا کہ روہنی کی لاش بھی نہیں ملی اور اس نے خود
بھی شیر کو روہنی پر حملہ کرتے نہیں دیکھا تو عاطون کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے تفصیل پوچھی تو
بھاشو نے کہا۔

"روہنی روز کی طرح حویلی کے ان دالانوں میں صفائی کا کام کر رہی تھی جو جنگل کی
طرف بنے ہوئے ہیں کافی دیر تک جب روہنی واپس نہ آئی تو میں اس کی تلاش میں دالانوں
میں گیا وہاں ٹھاکر بکرم کے نوکر نے مجھے بتایا کہ روہنی کو شیر اٹھا کر لے گیا ہے۔ ہم دوڑے
دوڑے جنگل میں گئے وہاں ایک جگہ جھاڑی میں روہنی کی پھٹی ہوئی چنری پڑی تھی۔ پھر ٹھاکر

بکرم بھی وہاں آ گئے اور روہنی کی موت کا افسوس کرنے لگے۔" بھاشو نے آہ بھر کر کہا۔
اب کیا ہو سکتا ہے جی۔ بھگوان کی یہی مرضی تھی۔ شیر کوئی آدم خور تھا۔ روہنی بے چاری
کی تو ہڈیاں بھی نہیں بچی ہوں گی۔"
عاطون کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر بولا۔ "میں تمہارا شہر چھوڑ کر آج جانے
والا تھا مگر اب رک گیا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ روہنی کو کوئی آدم خور شیر اٹھا کر نہیں
لے گیا۔"
بھاشو اور اس کی شودر بیوی عاطون کا منہ تکنے لگی۔ "لیکن میرے بچے! ٹھاکر بکرم
نے مجھے خود کہا ہے کہ روہنی کو آدم خور شیر اٹھا کر لے گیا ہے۔"
عاطون بولا۔ "میں اسی معمے کو حل کرنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے ٹھاکر بکرم کی حویلی کا
راستہ بتا دو۔ میں اس راز پر سے پردہ اٹھا کر رہوں گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ روہنی زندہ
ہے۔"
بھاشو اور اس کی بیوی ابھی تک ٹھاکر بکرم کی بات پر یقین کیے ہوئے تھے پھر بھی
بھاشو نے عاطون کو ٹھاکر بکرم کی حویلی کا پتا بتا دیا۔ عاطون نے کہا۔ "ایک بات کا خیال رہے۔
اگر تم مجھے ٹھاکر بکرم کی حویلی میں دیکھو اور تمہارا میرا آمنا سامنا ہو جائے تو اجنبی بن جانا اور
مجھے مت پہچاننا یہ بہت ضروری ہے۔"
بھاشو نے وعدہ کیا کہ وہ ٹھاکر بکرم کی حویلی میں عاطون کے سامنے اجنبی بن جائے گا
یوں عاطون شام ہوتے ہی بھاشو کے مکان سے نکل کر ویشالی شہر کے بازاروں میں آ گیا۔
دکانیں کھلی تھیں چراغ روشن ہو گئے تھے۔ عاطون جڑی بوٹیاں بیچنے والے ایک دکاندار کے
پاس گیا اور کھلی بوریوں میں رکھی جنگلوں کی مختلف جڑی بوٹیوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے
تین خاص قسم کی بوٹیاں خریدیں اور ٹھاکر بکرم کی حویلی کی طرف چل پڑا۔ حویلی کا پھاٹک بند
تھا۔ باہر دربان پہرے پر تھا۔ عاطون نے دربان کے پاس جا کر کہا۔ "ٹھاکر صاحب کو خبر کرو
کہ ملک مصر سے ایک کاہن آیا ہے اور اس سے ملنا چاہتا ہے۔"
پہلے تو دربان نے لیت و لعل سے کام لیا مگر جب عاطون نے کہا کہ وہ ٹھاکر بکرم سے
اس کی شکایت کرے گا تو وہ راضی ہو گیا اس نے ٹھاکر کو جا کر اطلاع دی۔ ٹھاکر بکرم اس
وقت دستر خوان پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اس نے عاطون کو بلوا لیا عاطون کی آنکھوں کی چمک
دیکھ کر ٹھاکر بکرم کسی حد تک متاثر ہوا۔ اس نے عاطون کو کھانے کی دعوت دی۔ عاطون
خاموشی سے دستر خوان پر بیٹھ گیا۔
کھانے پر عاطون نے کوئی بات نہ کی۔ ٹھاکر بکرم نے اس سے ویشالی شہر آنے کا

عندیہ پوچھا تو عاطون نے کہا۔ "قدیم درویشوں اور رشیوں نے کہا کہ کھانے پر باتیں نہیں کیا کرتے۔ اس قسم کی باتوں سے عاطون کا مطلب اپنے لیے راہ ہموار کرنا اور ٹھاکر بکرم پر اپنا پیشگی اثر ڈالنا تھا جب نوکر دستر خوان سمیٹ کر لے گئے اور ایک سیاہ چشم ہندی باندی نے الائچیاں اور پان پیش کیے تو ٹھاکر بکرم نے عاطون سے سوال کیا کہ وہ کس لیے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ عاطون نے اشارے سے کہا کہ لونڈی کو رخصت کیا جائے۔ ٹھاکر بکرم نے لونڈی کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔ لونڈی ادب سے سر جھکا کر چلی گئی۔

اب عاطون نے اپنی جیب سے بوٹیوں والی تھیلی نکالی اور اسے اپنے ہاتھ میں تھام کر کہا۔ "ٹھاکر بکرم! میں نے تمہاری سخاوت اور انسان دوستی کی بہت تعریف سنی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے در سے کوئی حاجت مند کبھی خالی ہاتھ واپس نہیں گیا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں ایک ایسا تحفہ عطا کروں کہ جس سے تمہارے خزانے کا صندوق زر و جواہر سے سدا بھرا رہے اور تم ہمیشہ کھلے دل سے غریبوں کی مدد کرتے رہو۔"

ٹھاکر بکرم اپنی تعریف سن کر بے حد خوش ہوا۔ اپنے بھرے بھرے گل مچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "میں تمہاری ذرہ نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوں نوجوان مگر تمہارا نام کیا ہے اور تم کہاں سے آئے ہو اور مجھے کیا تحفہ دینا چاہتے ہو؟"

عاطون بولا۔ "میرا نام عاطون ہے‘ میں ملک مصر سے آیا ہوں‘ خدمت خلق میرا پیشہ ہے۔ میرا تعلق مصر کے قدیم ترین طبیبوں اور کیمیا گروں کے خاندان سے ہے‘ میرے پاس سونا بنانے کا ایک صدری نسخہ ہے۔ اس نسخے کی مدد سے میں لوہے کو سونے میں بدل سکتا ہوں اور یہی تحفہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔"

اگرچہ ٹھاکر بکرم ایک اچھا خاصا زمیندار تھا مگر امیر آدمی کو دولت کی ہوس غریب آدمی کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے اور پھر عاطون نے ٹھاکر کے چہرے سے بھانپ لیا تھا کہ یہ ایک جرائم پیشہ ہوس کار‘ لالچی آدمی ہے۔ اس کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا۔ ٹھاکر بکرم نے جب یہ سنا کہ عاطون لوہے کو سونے میں بدل سکتا ہے تو اس کی خوب آؤ بھگت شروع کر دی۔ عاطون بولا۔ "میرے پاس کچھ دوسرے انمول اور پراسرار نسخے بھی ہیں مگر اس وقت تمہارے لیے صرف کیمیا گری کا نسخہ ہی لایا ہوں۔ مجھے اس جگہ لے چلو جہاں بھٹی میں آگ جل رہی ہو۔"

ٹھاکر بکرم فوراً عاطون کو لے کر حویلی کے پیچھے باورچی خانے میں آیا۔ یہاں نوکر ایک بھٹی میں آگ روشن کئے کڑاہی میں دنبے کا گوشت بھون رہا تھا عاطون کے ایما پر تمام نوکروں کو باورچی خانے سے نکال دیا گیا۔ جب عاطون اور ٹھاکر بکرم وہاں اکیلے رہ گئے تو

عاطون نے ایک کڑاہی میں دودھ ڈال کر آگ پر رکھ دیا جب دودھ پکنے لگا تو عاطون نے اس دوران تھیلی میں سے تینوں بوٹیاں نکال کر انہیں سل بٹے پر اچھی طرح سے کوٹا اور اسے چھان کر پکتے ہوئے دودھ میں پھینک دیا۔ دودھ کا رنگ ایک دم سیاہ پڑ کر دلدل کی طرح بھد بھدانے لگا۔ تب عاطون نے ٹھاکر بکرم سے کہا۔ "کوئی لوہے کی شے یہاں ہو تو لاؤ۔"

ٹھاکر نے کونے میں رکھا لوہے کا ہاون دستہ اٹھا کر دیا اور کہا۔ "اس وقت یہاں یہی ایک شے لوہے کی ہے۔"

عاطون سمجھ گیا کہ ٹھاکر بکرم لالچ کے مارے اسے بھاری شے دے رہا ہے اس نے کوئی خیال نہ کیا اور ہاون دستے کو کڑاہی میں ڈال دیا ہاون دستہ سیاہ محلول میں ڈوب گیا۔ عاطون منہ ہی منہ میں یونہی ایک فرضی اشلوک پڑھنے لگا اس لیے کہ وہ ویدوں اور شاستروں کے سبھی اشلوک جانتا تھا۔ اس نے اشلوک پڑھ کر کڑاہی پر تین بار پھونک ماری اور پھر کپڑے کی مدد سے کڑاہی آگ سے اٹھا کر پانی کی بالٹی میں الٹ دی۔ شوں شاں کی تیز آواز کے ساتھ بالٹی میں سے سیاہ رنگ کی بھاپ اوپر کو اڑی۔ جب پانی میں گرا ہوا محلول ٹھنڈا ہو گیا تو عاطون نے ٹھاکر سے کہا۔ "ٹھاکر مہاراج! بالٹی میں ہاتھ ڈال کر ہاون دستہ باہر نکالیے۔ وہ سونے کا بن چکا ہے۔"

ٹھاکر نے بے تابی سے ہاون دستہ کو باہر نکالا تو وہ سونے کی طرح چمک رہا تھا یہ سارا کمال ان جڑی بوٹیوں کا تھا جن کے امتزاج کی کسی کو بھی خبر نہیں تھی۔ عاطون نے ٹھاکر بکرم کو بھی ابھی تک ان جڑی بوٹیوں کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔

ٹھاکر بکرم تو سونے کے ہاون دستے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا بھاری لوہے کا ہاون دستہ دیکھتے دیکھتے سونا بن گیا تھا عاطون نے کہا۔ "ٹھاکر! تم اب ایسا کرو کہ بازار اگر کھلے ہوں تو کسی صراف کو بلا کر اس کی تصدیق کراؤ‘ یہ بہت ضروری ہے۔ تاکہ تمہیں پورا یقین ہو جائے۔"

ٹھاکر بکرم خود بھی یہی چاہتا تھا اس نے سونے کے ہاون دستے کو کپڑے میں لپیٹا اور عاطون کو لے کر اپنی خوابگاہ میں آ گیا پھر اس نے اپنے خاص ملازم کو بلا کر کہا کہ صراف جیوکیش کو جا کر لے آؤ۔ نوکر چلا گیا ٹھاکر بکرم نے عاطون کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگائے اور بولا۔ "مہاراج! آپ بڑے گنی اور گنی والے کیمیا گر ہیں۔ آپ یہ نسخہ مجھے تحفے میں دے کر میری نسلوں پر بڑا احسان کریں گے۔"

عاطون نے کہا "پہلے صراف اس سونے کے خالص ہونے کی تصدیق کر دے اس کے بعد تم سے بات کروں گا۔" صراف جیوکیش ٹھاکر بکرم کا نمک خوار تھا پیغام ملتے ہی بھاگم

بھاگ وہاں پہنچ گیا تعظیم بجا لایا اور ہاتھ باندھ کر ایک طرف بیٹھ گیا ٹھاکر بکرم نے کپڑا ہٹا کر ہاون دستہ اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ "یہ صاحب ملک ایران سے آئے ہیں اور میرے پاس یہ سونے کا ہاون دستہ فروخت کرنا چاہتے ہیں کہتے ہیں کہ یہ بادشاہ دارا کے شاہی محل کے مطبخ کا ہے' تم دیکھ کر یہ بتاؤ کہ کیا یہ خالص سونے کا ہے؟ اس میں کوئی کھوٹ تو نہیں ہے؟"

جو حکم مہاراج! "یہ کہہ کر صراف جیوکیش نے تھیلے میں سے سیاہ رنگ کی بڑی کسوٹی نکالی اسے سونے کے ہاون دستے پر کئی پہلوؤں سے رگڑ رگڑ کر غور سے دیکھا پھر ٹھاکر بکرم سے کہا۔ "مہاراج! یہ خالص ترین سونا ہے۔ اس میں ایک رتی کے ہزارویں حصے کے برابر بھی کھوٹ نہیں ہے۔"

ٹھاکر بکرم نے کہا۔ "کیا تم دعوے سے کہہ سکتے ہو؟" جیوکیش ہاتھ باندھ کر بولا۔ "مہاراج! باپ' دادوں کے وقت سے سونے کو پرکھتے چلے آ رہے ہیں۔ کھوٹ تو ہم سونے کو ایک نظر دیکھنے سے ہی بتا دیتے ہیں۔ یہ خالص سونا ہے مہاراج۔ آپ کسی دوسرے صراف کو بھی بے شک دکھا دیں۔ اگر پھر بھی آپ کو میرے بات کا اعتبار نہیں تو میں یہ سونے کا ہاون دستہ دس لاکھ سونے کے سکوں کے عوض خریدنے کو تیار ہوں۔"

ٹھاکر بکرم کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ صراف کے شانے کو آہستہ سے تھپتھپا کر بولا۔ "جیوکیش! ہمیں تو تم پر بھروسہ ہے۔ ہم تو مذاق سے تمہیں ایسا کہہ رہے تھے۔ اب تم جا سکتے ہو۔ اگر اس ہاون دستے کو بیچنے کی ضرورت پڑی تو یقین کرو تمہارے پاس ہی پہنچ جائے گا۔"

صراف جیوکیش پرنام کرتا ہوا چلا گیا اس کے جاتے ہی ٹھاکر بکرم نے عاطون کے ہاتھوں کو ایک بار پھر مکارانہ عقیدت سے چوم کر آنکھوں سے لگایا اور کہا۔ "گیانی کیمیا گر عاطون! تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم میرے لیے تحفہ لائے ہو اور وہ تحفہ یہی نسخہ ہے۔"

عاطون نے کہا۔ "ہمیں اپنا وعدہ یاد ہے ہم سونا بنانے کا یہ نسخہ ضرور تمہیں دیں گے لیکن ہماری ایک شرط بھی ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ اس نسخے کی مدد سے بنائے ہوئے سونے کا تیسرا حصہ اپنے پاس رکھ کر باقی کا سارا غریبوں' محتاجوں میں بانٹ دیا کرو گے اور ہر مہینے تم سیر بھر وزن کا سونا بنایا کرو گے۔"

ٹھاکر بکرم نے فوراً" حامی بھر لی کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ "اب مجھے نسخہ بتا دیجئے عاطون مہاراج!"

عاطون نے کہا جب تک میں تمہارے پاس تمہاری حویلی میں ٹھہرا ہوا ہوں تمہیں کیمیا کے نسخے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ میں خود تمہیں سونا بنا کر دوں گا۔ ہاں

جس روز یہاں سے جانے لگوں گا نسخہ یقیناً" تمہارے حوالے کر دوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ رہا۔"

ٹھاکر بکرم نے مزید اصرار مناسب نہ سمجھا کہ کہیں یہ کیمیا گر ناراض نہ ہو جائے۔ اس نے دوسرے ہی روز سونے کا ہاون دستہ صراف جیوکیش کے ہاتھ فروخت کر کے سونے کے دس لاکھ سکے حاصل کر لیے یہ بہت بڑی رقم تھی اس کا تیسرا حصہ ٹھاکر بکرم نے اپنے پاس رکھ لیا اور باقی غریبوں میں بانٹ دیا اس خیرات میں سے بھاشو شودر کو بھی سونے کے چار سکے ملے جو حویلی میں موجود تھا۔ مگر ہدایت کے مطابق اس نے یہ بالکل ظاہر نہ کیا کہ وہ عاطون کو پہلے سے جانتا ہے۔

ٹھاکر بکرم نے دو ایک بار دبی زبان میں عاطون سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ سونے کے مزید سکے غریبوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ مزید سونا بنایا جائے گا مگر عاطون نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کیمیا گری کا بھی ایک ضابطہ اخلاق ہوتا ہے اگر اس پر عمل نہ کیا جائے تو جڑی بوٹیوں کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ ٹھاکر بکرم مجبورا" چپ ہو رہا مگر اس کے دل میں لالچ کا سمندر موجزن تھا۔ بے پناہ خزانے کی چابی اس کے پہلو میں تھی مگر اسے ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ وہ زیادہ اصرار اس خیال سے بھی نہ کرتا تھا کہ کہیں عاطون ناراض نہ ہو کر چلا جائے' دوسری طرف عاطون اس ٹوہ میں تھا کہ کسی طریقے سے گمشدہ روہنی کا سراغ لگایا جائے لیکن بظاہر عاطون کو کوئی ایسے شواہد نہیں مل رہے تھے کہ جو روہنی کی گمشدگی کے راز سے پردہ اٹھا سکتے۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ایک رات اسے روہنی کا سراغ مل گیا۔

عاطون کو جو کمرا رہنے کے لیے دیا گیا تھا اس کے برابر میں ٹھاکر بکرم کی خواب گاہ تھی ایک رات عاطون کو ٹھاکر بکرم کی خواب گاہ سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں ان میں سے ایک آواز ٹھاکر کی تھی - عاطون نے باہر آ کر خواب گاہ کے بند دروازے پر کان لگا دیئے۔

خواب گاہ میں کوئی اجنبی کہہ رہا تھا۔ "ٹھاکر! اس بار تم نے ہمارے لیے کچھ نہیں کیا۔ میں چاہتا ہوں کہ اگلے پھیرے پر آؤں تو اس سے زیادہ مال پیدا کر کے دو۔"

ٹھاکر بولا۔ "مال تو پہلے سے بڑھیا اور زیادہ بھی پیدا کر دوں گا مگر دام اب زیادہ ہوں گے۔ اس لیے کہ ہمیں بھی بڑی تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔"

اجنبی مرد کی آواز آئی۔ "اگر مال اچھا ہوگا تو منہ مانگے دام دوں گا ٹھاکر' اس کی تم فکر نہ کرو مگر ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ تمہارے ہاں سے مجھے صرف ایک ہی نگ ملے۔"

ٹھاکر بکرم کے ہنسنے کی آواز بلند ہوئی ارے تھاروکس! یہ بھی تو دیکھو کہ تنگ کیسا تھا۔ بھگوان جھوٹ نہ بلوائے تو روہنی جیسی حسین اور سڈول لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔" عاطون ایک دم چونک پڑا' اس نے اپنا سانس روک لیا اجنبی تھاروکس کوئی یونانی تھا۔ وہ بولا۔ اس میں کوئی شک نہیں اس بار تم نے جو سانولی لڑکی ہمارے پاس فروخت کی ہے وہ بے حد دلکش اور حسین تھی' مگر اس کے دام بھی ہم نے تمہیں زیادہ دیئے ہیں۔"

ٹھاکر بکرم نے پوچھا۔ "تھاروکس! یہ بتاؤ کہ تم واپس کب جا رہے ہو؟"

تھاروکس کی آواز آئی' میں نے روہنی کے علاوہ ویشالی اور پاٹلی پتر سے چار غلام خریدے تھے ان کو پرسوں ہی ایک قافلے کے ساتھ روم روانہ کر چکا ہوں میں خود پرسوں واپس چلا جاؤں گا۔ دوسرا قافلہ جو بخارا سے ہوتا ہوا بغداد جا رہا ہے پرسوں روانہ ہو گا اچھا اب میں جاتا ہوں' پرسوں تم سے ملنے آؤں گا۔"

عاطون جلدی سے اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ بند دروازے کی درز میں سے باہر دالان میں دیکھنے لگا۔ دالان کے طاق میں چراغ روشن تھا۔ ٹھاکر بکرم' تھاروکس کے ساتھ خواب گاہ سے باہر نکلا۔ عاطون نے دیکھا کہ تھاروکس ایک ادھیڑ عمر کا گورا چٹا یونانی تھا جس کے سر کے پیچھے کالے اور سفید بالوں کی جھالر سی لٹک رہی تھی۔ اس نے یونانی لباس پہن رکھا تھا ٹھاکر بکرم اسے حویلی کے دروازے تک چھوڑنے ڈیوڑھی کی طرف چلا گیا۔

روہنی کا معمہ حل ہو گیا تھا مگر افسوس کہ وہ بردہ فروشوں کے ہتھے چڑھ چکی تھی۔ اور اس وقت قافلے کے ساتھ ملک روم کی طرف رواں دواں تھی۔ ظاہر ہے اسے تھاروکس کا کوئی ساتھی اپنی تحویل میں رکھے لیے جا رہا تھا عاطون نے دل میں ایک فیصلہ کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

دوسرے دن عاطون نے اپنے منصوبے کے مطابق ٹھاکر بکرم سے کہا۔ "ٹھاکر! سوچتا ہوں کہ اب یہاں سے کوچ کروں۔ اس بار ارادہ ملک روم کی سیر کا ہے مگر میرا وہاں جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ کیا تمہارا وہاں کوئی ایسا دوست ہے جس کے ہاں میں چند روز قیام کر سکوں۔"

ٹھاکر بکرم کو کیمیا گری کے نسخے کا لالچ تھا فوراً بولا۔ "مہاراج! آپ کو پریشانی کی کیا ضرورت ہے اتفاق سے میرا ایک یونانی دوست ویشالی آیا ہوا ہے وہ پرسوں قافلے کے ساتھ ملک روم کی طرف روانہ ہو رہا ہے میں آپ کا تعارف اس سے کرا دوں گا وہ میرا بہت گہرا دوست ہے آپ جتنی دیر چاہیں روم میں اس کے مکان پر ٹھہر سکتے ہیں' مگر مہاراج! بھگوان کے لیے اسے سونا بنانے کا نسخہ نہ بتایئے گا۔"

عاطون نے ہنس کر کہا۔ "ٹھاکر بکرم! یہ نسخہ صرف تمہاری قسمت میں لکھا تھا یہ کسی دوسرے شخص کو نہیں بتایا جا سکتا ہاں تو تم مجھے کب اس سے ملاؤ گے۔"

ٹھاکر بکرم بولا۔ "آج شام ہی اسے یہاں بلوا لیتا ہوں۔" شام کے وقت بکرم ٹھاکر نے تھاروکس کو دوبارہ حویلی میں بلوا لیا۔ اس نے پہلے ہی تھاروکس کو بتا دیا تھا کہ عاطون اس کا پرانا دوست ہے اور اس کے ہاں روم میں کچھ دن ٹھہرے گا۔"

تھاروکس نے عاطون سے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر یونانیوں کی طرح بولا - "عاطون! روم میں میرے گھر کے دروازے تم پر کھلے ہیں' تم میرے ساتھ ہی روم چلو گے' مجھے بڑی خوشی ہو گی۔"

اس کام سے فارغ ہو کر عاطون رات کے اندھیرے میں شودر لڑکی روہنی کے تایا کے ہاں پہنچا اور کہا۔ "روہنی کا سراغ مل گیا ہے' مگر وہ یہاں نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے دیش پہنچا دی گئی ہے بہرحال میں اس کی تلاش میں یہاں سے جا رہا ہوں میرے پیچھے تم اپنی زبان بند رکھنا اور میرے بارے میں بھول کر بھی کسی سے ذکر نہ کرنا کہ میں روہنی کے کھوج میں نکلا ہوا ہوں۔"

روہنی کے تایا نے کانوں کو ہاتھ لگا کر قسم کھائی کہ وہ کسی سے ذکر نہیں کرے گا عاطون نے جان بوجھ کر بھاشو کو یہ نہ بتایا کہ ٹھاکر بکرم نے روہنی کو لونڈی بنا کر فروخت کر دیا ہے۔ عاطون نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی اب جبکہ عاطون کے رخصت ہونے میں ایک دن باقی رہ گیا تھا تو ٹھاکر بکرم کے دل میں قدرتی طور پر کھد بد ہونے لگی۔ وہ سونا بنانے کا نسخہ حاصل کرنے کو بے تاب تھا۔ عاطون نے کہا۔ "ہمارا قافلہ کل شام ملک روم کو روانہ ہونے والا ہے میں کل جانے سے پہلے تمہیں نسخہ بتا کر جاؤں گا۔ تم بے فکر رہو۔ یہ قیمتی نسخہ میرے پاس تمہاری امانت ہے بکرم ٹھاکر!"

عاطون نے یہ الفاظ کچھ ایسے باوقار لہجے میں کہے کہ ٹھاکر بکرم چپ سا ہو کر رہ گیا اندر سے وہ سخت بے چین تھا وہ عاطون کے آگے پیچھے پھر رہا تھا اور اسے اپنی آنکھوں سے ذرا بھی اوجھل نہیں ہونے دے رہا تھا۔ رات گزری دوسرا دن طلوع ہوا دوپہر ہوئی تیسرا پہر آگیا' ٹھاکر بکرم کی بے تابی دیکھنے والی تھی۔

جب شام ہونے میں چند ساعتیں ہی رہ گئیں تو عاطون نے مسکرا کر ٹھاکر بکرم کو دیکھا اور بولا۔ چلو ٹھاکر! تمہیں نسخہ بتائے دیتا ہوں مگر آخری بار تمہارے سامنے ایک بار پھر سونا بنانا چاہتا ہوں' باورچی خانے میں آؤ۔"

ٹھاکر بکرم خوشی خوشی باورچی خانے میں آگیا' نوکروں کو اس نے وہاں سے رخصت

اور جنگل کے ہرے بھرے درختوں اور گھنی خود رو جھاڑیوں کی طرف سے مرطوب ہوا آ رہی تھی۔

ٹہلتے ٹہلتے عاطون ایک پگڈنڈی پر آگیا۔ جو جنگل کے اندر چلی گئی تھی یہاں جنگلی پھولوں کے جھاڑ تھے۔ زرد اور گلابی رنگ کے یہ پھول بڑے خوبصورت تھے اور ان میں سے بھینی بھینی مہک اٹھ رہی تھی۔ عاطون ایک پھول کو جھک کر سونگھ رہا تھا کہ اسے پھر وہی پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز سنائی دی جیسے کوئی غیبی پرندہ اس کے سر کے اوپر سے ہو کر جنگل کی طرف نکل گیا ہو آواز عاطون کو بڑی صاف سنائی دی تھی مگر دن کی روشنی میں بھی اسے کوئی پرندہ دکھائی نہ دیا۔ اسے الجھن سی ہونے لگی کہ آخر یہ کیا معمہ ہے۔ پگ ڈنڈی پر ٹہلتے ہوئے وہ جنگل میں کچھ دور نکل گیا۔ اچانک اسے اپنے عقب میں غراہٹ کی آواز سنائی دی۔

عاطون نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک زرد دھاری دار قوی الجثہ شیر اپنے اگلے پنجے زمین میں گاڑے جھاڑیوں میں سے اس کی طرف غضب ناک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ عاطون کو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ شیر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ وہ شیر کی طرف آہستہ آہستہ بڑھا شیر نے ایک ہلکی سی غراہٹ بھری اور عاطون پر حملہ کرنے ہی والا تھا کہ ایک انسانی ہیولا درخت کے پیچھے سے نکل کر شیر پر حملہ آور ہوا یہ ایک عورت تھی جس نے نیزہ شیر کی گردن میں پرو دیا تھا۔ شیر ایک کرب ناک انداز میں دھاڑا اور جنگل کی طرف بھاگ گیا۔

عورت نے عاطون کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تمہیں اکیلے جنگل میں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

عاطون نے کہا۔ "اگر تم اکیلی جنگل میں آ سکتی ہو تو میرے آنے میں کیا قباحت ہے۔؟"

عورت بولی - "میرے پاس نیزہ تھا۔ تم نہتے ہو۔"

عاطون کہنے لگا" میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے میری جان بچانے کی کوشش کی۔"

عورت' عاطون کے قریب آ گئی۔ عاطون کو لوبان کی تیز خوشبو محسوس ہوئی شاید یہ خوشبو اس عورت کے جسم سے آ رہی تھی عورت نے کہا "انسان کو انسان کے کام آنا چاہیے۔ تمہاری جان بچانا میرا فرض تھا تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

عاطون نے اسے بتایا کہ وہ جڑی بوٹیوں کا سوداگر ہے اور ویشالی سے ملک روم کی

طرف بغرض تجارت جا رہا ہے۔"

"تم اس قافلے کے ساتھ ہو جو آج یہاں اترا ہے۔" عورت نے اپنی لمبی پلکوں والی آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

عاطون نے کہا "ہاں مگر تم نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔"

عورت بولی۔ "میرا نام مرگنی ہے۔ اس جنگل کے پار ایک گاؤں ہے میں وہاں رہتی ہوں میرے ماتا' پتا مر گئے ہیں گاؤں میں اب صرف میرے حسن و شباب کے دشمن ہی رہ گئے تھے۔ وہ میری عزت کے در پے تھے میں وہاں سے بھاگ کر آ گئی ہوں اس خیال سے کہ کارواں سرائے میں کوئی قافلہ آ کر رکے گا تو میں اس میں شامل ہو کر کسی دوسرے ملک میں جا کر عزت و آبرو کی زندگی بسر کروں گی۔"

عاطون نے اپنے دل میں مرگنی کے لیے گہری ہمدردی محسوس کی تھی۔ ویسے بھی وہ اس کا احسان مند تھا۔ آخر اس نے عاطون کی جان بچانے کے لیے شیر پر حملہ کر دیا تھا جو بڑی جرات کا کام تھا اس میں مرگنی کی اپنی جان بھی جا سکتی تھی۔ عاطون نے کہا۔ "یہ یقیناً" بڑی اچھی بات ہے' میں ملک روم کو جا رہا ہوں۔ اگر تم پسند کرو تو میرے ساتھ سفر کر سکتی ہو اور اگر تم چاہو تو ملک روم میں ہی اپنی نئی زندگی شروع کر سکتی ہو۔"

مرگنی نے بڑی بے باکی سے عاطون کا ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں لے لیا اور بولی۔ "میں بڑی دکھی ہوں میرا اس دنیا میں کوئی نہیں میں صرف یہی التجا کروں گی' کہ مجھے حفاظت سے ملک روم پہنچا دو۔ وہ ایک دور دراز ملک ہے میں وہاں اپنے دشمنوں سے محفوظ رہ کر نئی زندگی شروع کر سکوں گی۔"

عاطون نے آہستہ سے اپنا ہاتھ مرگنی کے ہاتھوں سے کھینچ لیا اور کہا۔ "اس میں التجا کرنے کی کون سی بات ہے میں تو ملک روم جا ہی رہا ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ چلی چلو۔ اس کے علاوہ تمہاری مدد کرنا اب میرا اخلاقی فرض بھی ہے۔"

عاطون' مرگنی کو ساتھ لے کر کارواں سرائے میں آ گیا۔ اس نے اسے تھاروکس سے ملایا۔ بردہ فروش تھاروکس نے حسین و جمیل مرگنی کو دیکھا تو اس کی نیت میں فتور آ گیا سوچنے لگا کہ یہ حسین لڑکی روم میں بڑے اچھے داموں بک سکتی ہے اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ روم پہنچنے کے بعد وہ اسے اغواء کر کے کسی دوسرے بردہ فروش کے ہاتھ فروخت کر کے خوب دولت کمائے گا۔ عاطون نے قافلہ سالار کے پاس جا کر مرگنی کے سفر کے اخراجات ادا کیے اور مرگنی کو اس اونٹ پر سوار کر دیا گیا جو عاطون کے اونٹ کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اور جس میں ایک ادھیڑ عمر عورت بھی سوار تھی۔

قافلہ منزلوں پر منزلیں طے کرتا سرگرم سفر رہا۔ اس دوران میں مرگنی عاطون کے کافی قریب آ گئی اس کی باتیں اتنی میٹھی اور دل پر اثر کر دینے والی تھیں کہ عاطون متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بردہ فروش تھاروکس بھی پیچھے نہ رہا اس نے بھی مرگنی پر اپنی امارت کا رعب جمانے کی ہر طرح سے کوشش کی۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ مرگنی کا جھکاؤ عاطون کی طرف زیادہ تھا۔ وہ یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اسے مرگنی سے شادی تھوڑی کرنی ہے وہ تو اسے آگے فروخت کرنے والا ہے قافلہ سفر کرتے کرتے ملک شام میں داخل ہو چکا تھا ایک روز دن کے وقت جب کہ صحرا میں سخت گرمی پڑ رہی تھی قافلہ کھجوروں کے ایک باغ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا عاطون اور مرگنی درختوں کی چھاؤں میں ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے کہ عاطون کو اپنے قریب پھرپھڑاتے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔

مرگنی نے پوچھا۔ "کیا دیکھ رہے ہو عاطون؟"۔

عاطون کو دھوپ میں چمکتی صحرائی فضا میں کوئی پرندہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس نے اپنی حیرت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں' یونہی کھجور کے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ کتنی ٹھنڈی ہے ان درختوں کی چھاؤں۔"

لیکن عاطون کی تجربہ کار عقابی نظروں نے پروں کی پھرپھراہٹ کی آواز کے ساتھ ہی مرگنی کے چہرے پر ایک سائے کی لہر سی گزرتی دیکھ لی تھی وہ متجسس ہوا کہ مرگنی پر آواز کا اثر اس انداز میں کیوں ہوا کہ اس کا چہرہ متغیر ہونے کی بجائے پراسرار ہو گیا تھا عاطون پھڑ پھڑاہٹ کی آسیبی آواز اور مرگنی کی شخصیت کے درمیان کوئی رابطہ قائم نہ کر سکا۔ مرگنی کا بھولا بھالا معصوم چہرہ کسی آسیب کے متحمل ہونے سے انکار کر رہا تھا۔

وہ صحرا میں حد نظر تک پھیلے' دھوپ میں تپتے ہوئے ٹیلوں کی طرف دیکھ رہی تھی پھر بڑے اداس لہجے میں بولی۔ "عاطون کسی وقت میرا دل اپنے گاؤں کو یاد کر کے ایک دم اداس ہو جاتا ہے۔ پھر سوچتی ہوں وہاں میرا کون تھا۔ سبھی دشمن ہو گئے تھے۔ اور وہ ایک آہ بھر کر رہ گئی۔ عاطون کی آنکھیں دور صحرائی ٹیلوں پر جمی ہوئی تھیں جس طرف اس کے اندازے کے مطابق پروں کی پراسرار آواز گئی تھی۔

سرشام قافلہ کوچ کر گیا۔

روم پہنچ کر قافلہ جس کارواں سرائے میں اترا وہ دریا کے کنارے ایک چھوٹی پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ تھاروکس کا مکان وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا عاطون اور مرگنی کو لے کر تھاروکس اپنے مکان میں آگیا تھاروکس نے یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ شہر میں اجناس کی

سوداگری کرتا ہے چنانچہ وہ دن میں کچھ دیر کے لیے چلا جاتا ہے عاطون کو اس بات کا سراغ لگانا تھا کہ اچھوت لڑکی روہنی کو تھاروکس نے کس امیر کے ہاتھ فروخت کیا ہے مرگنی کے ذمے داری بھی عاطون پر پڑ گئی تھی' عاطون چاہتا تھا کہ اسے روم میں کسی امیر زادی کی حویلی میں ملازم رکھوا دے اس کے لیے عاطون نے تھاروکس سے بات کی تو وہ خوش ہو کر بولا۔

"یہ کون سی بات ہے۔ میں مرگنی کو ایک ایسی نواب زادی کے محل میں بھجوا دوں گا جہاں وہ نواب زادی کی کنیز خاص بن کر ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرے گی مگر یہ نوابزادی جزیرہ قبرص میں رہتی ہے۔"

مرگنی تو وہاں جانے کو تیار تھی مگر عاطون کو تھاروکس کی نیت پر شک تھا عاطون جانتا تھا کہ تھاروکس مرگنی کو کسی دوسرے شہر لے جا کر فروخت کر دے گا۔ چنانچہ اس کی یہی کوشش تھی کہ مرگنی روم میں ہی کسی امیر زادی کے ہاں رہے تاکہ وہ اس کی خبرگیری کر سکے لیکن تھاروکس بھی بڑا کائیاں تھا۔ اس نے حالات کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ جس کی رو سے مرگنی کو روم شہر کے کسی بھی امیر زادی کے ہاں کام نہیں مل سکتا تھا۔ مرگنی نے اصرار کیا کہ وہ تھاروکس کے ساتھ جزیرہ قبرص اس صورت میں جائے گی کہ عاطون بھی اس کے ساتھ چلے۔ عاطون راضی ہو گیا۔ تھاروکس نے اپنا کھیل بگڑتے دیکھا تو فوراً ایک منصوبہ اس کے عیار ذہن میں آگیا۔

اس نے اسی روز اپنے ایک رتھ بان دوست کلا نکس سے بات کی۔ کلا نکس کا بھی جرائم پیشہ گروہ سے تعلق تھا اور تھاروکس کے ساتھ مل کر مصر اور شام سے کئی لڑکیوں کو اغواء کر کے فروخت کر چکا تھا۔ طے یہ ہوا کہ کلا نکس آدھی رات کو تھاروکس کے مکان سے مرگنی کو اغوا کر کے اسے ایکرو پولیس کی تاریخی عمارت کے پاس ایک غار میں چھپا دے گا اور پھر موقع پا کر تھاروکس اور کلا نکس دونوں مرگنی کو کسی دوسرے شہر لے جا کر فروخت کر دیں گے۔

ادھر عاطون نے مرگنی کے ساتھ قبرص جانے کا ارادہ کر لیا اس نے یہی سوچا کہ مرگنی کو قبرص میں امیر زادی کے ہاں لے جا کر وہ اپنی تسلی کرے گا اور پھر واپس تھاروکس کے پاس آ کر روہنی کا کھوج لگانے کی کوشش کرے گا۔ ایک رات عاطون مکان کے صحن میں ایک طرف چبوترے پر قالین بچھائے دراز تھا موسم خوشگوار تھا آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا اور خنک ہوا چل رہی تھی تھاروکس کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا مرگنی برآمدے والے اپنے کمرے میں سو رہی تھی کہ عاطون نے صحن کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ وہ جاگ رہا تھا اس نے لیٹے لیٹے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ تھاروکس دبے پاؤں اندر داخل ہوا دروازے کے پاس

ہی رکا اور پیچھے پلٹ کر کسی کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ عاطون کا ماتھا ٹھنکا' دال میں کچھ کالا تھا۔

تھاروکس نے دبے پاؤں چلتا عاطون کے قریب آیا۔ عاطون نے جان بوجھ کر آنکھیں موند لیں اور ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگا یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ گہری نیند سو رہا ہے - تھاروکس نے جھک کر عاطون کو دیکھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ سو رہا ہے تو اسی طرح دبے پاؤں واپس دروازے کی طرف گیا۔ باہر کھڑے رتھ بان دوست کلا کس سے سرگوشی میں کوئی بات کی اور اپنے کمرے کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔

عاطون سمجھ گیا کہ وہ کسی خطرناک منصوبے پر عمل کرنے والا ہے صحن کا دروازہ کھلا اور کلا کس سیاہ لبادہ جسم کے گرد لپیٹے بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتا آنگن کے باغیچے میں داخل ہوا اور سیدھا مرگنی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ مکان کے درو دیوار گہرے سناٹے میں لپٹے ہوئے تھے کلا کس آہستہ سے دروازہ کھول کر مرگنی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

وہ مرگنی کو اغواء کرنے آیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی عاطون چبوترے پر سے اٹھا اور پھونک کر قدم رکھتا مرگنی کے کمرے کے قریب آگیا اسے اندر سے ایسی آوازیں آئیں جیسے کسی قریب المرگ آدمی کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا ہے مرگنی کے کمرے میں چراغ کی لو مدھم تھی۔

عاطون نے دروازے کی درز میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہ دھک سے رہ گیا اس نے دیکھا کہ کمرے میں مرگنی اپنے پلنگ پر آلتی پالتی مارے بیٹھی ہے اور ایک ایسا سیاہ فام دیو پیکر انسان کہ جس کی گردن سے نیچے کا دھڑ انسان کا ہے اور گردن سے اوپر ہاتھی کا سر لگا ہے اپنی لمبی سونڈ میں کلا کس کو جکڑے کھڑا ہے۔ اس عجیب الخلقت انسان کے ایک ہاتھ میں ترشول ہے اور دوسرے ہاتھ میں خمدار چمکیلا خنجر پکڑا ہے کلا کس کی آنکھیں باہر کو ابل پڑی ہیں اور اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا ہے۔ دیو پیکر انسان نے اپنی سونڈ میں جکڑے ہوئے کلا کس کو فرش سے دس پندرہ فٹ اوپر اٹھایا اور مرگنی سے کہا۔

"مرگنی! اس نے تیرا ایمان کیا ہے' یہ بری نیت سے تیرے بھون میں آیا تھا اس کے ساتھ کیا سلوک ہو؟"

مرگنی نے ایک ہاتھ فضا میں بلند کیا اور سرد مہری سے بولی۔ اس ملک میں ایک سب سے بڑا جوالا مکھی پہاڑ ہے اس ملیچھ کو لے جا کر اس جوالا مکھی کے اندر کھولتے ہوئے لاوے میں پھینک دو۔"

عجیب انسان غرایا۔ "ایسا ہی ہوگا مرگنی پرنتو! تم جانتی ہو تمہیں آگے کیا کرنا ہے۔ یم

راج کی بھی یہی اچھیا ہے۔"

مرگنی نے سرہلایا۔ اس کے ساتھ ہی ہاتھی کی سونڈ والا عجیب الخلقت انسان کلا کس سمیت غائب ہو گیا - عاطون نے چشم حیرت سے یہ سارا منظر دیکھا۔ مرگنی پلنگ پر دراز ہو گئی پھر اس نے وہیں پڑے پڑے پھونک ماری اور دس قدم کے فاصلے پر طاق میں چراغ بجھ گیا۔ عاطون جلدی سے دروازے سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا ذہن مافوق الفطرت تصورات میں الجھا ہوا تھا وہ تیز تیز مگر بے آواز قدموں سے چلتا چبوترے پر آکر لیٹ گیا۔ اس کے دماغ میں ایک ہی سوال بار بار گردش کر رہا تھا کہ یہ مرگنی اصل میں کون ہے اور کسی خاص مشن پر یہاں آئی ہے؟ کیا یہ کوئی جادو گرنی ہے؟ اس کا تعلق یم راج سے ہے جو موت کا دیوتا ہے۔ ہاتھی کی سونڈ والا انسان کون ہے؟ کیا یہ گنیش گنپتی کا کوئی منفی روپ ہے؟ عاطون کسی اطمینان بخش نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

اتنے میں اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی عاطون نے گوشہ چشم سے دھندلی چاندنی میں دیکھا کہ ...... تھاروکس برآمدے میں مرگنی کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا وہ ادھ کھلے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اس نے آہستہ سے ایک پٹ کھولا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ پھر اس نے جلدی سے گردن باہر نکال لی ظاہر ہے وہ مرگنی کو اپنے پلنگ پر سویا ہوا دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا اسے اپنا ساتھی کلا کس بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ پریشان کن ادھیڑ بن میں مبتلا دبے پاؤں آنگن کی دیوار والے دروازے کی طرف گیا باہر نکل کر دیکھا۔ پھر واپس اندر آ گیا۔ وہ شدید الجھن میں تھا۔ اس کی الجھن کو عاطون خوب جانتا تھا مگر وہ خاموش لیٹا یہ سارا کھیل دیکھتا رہا تھاروکس اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس کے بعد وہاں ہولناک سناٹا چھا گیا رات گزرتی چلی گئی عاطون جاگ رہا تھا اسے پھر وہی پروں کی پراسرار پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی یہ اواز ایک بار بالکل اس کے بالکل قریب سے ہو کر آگے نکل گئی۔ عاطون سانس روکے وہیں پڑا رہا۔ صورت حال مزید پراسرار اور پیچیدہ ہوتی جا رہی تھی چاند مغرب کی طرف اتر گیا۔ پھر مشرق کی جانب سے صبح کی نیلی روشنی کے دھارے آسمان پر بہہ نکلے اور ستارہ صبح ماند پڑتا چلا گیا دن چڑھا تو عاطون نے دیکھا کہ تھاروکس تیار ہو کر برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔

عاطون کو بیدار ہوتے دیکھ کر وہ اس کے پاس آیا اور اپنی بے چینی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"میرے دوست! میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گا۔ اصل میں ایک تاجر مصر سے آیا ہوا ہے۔ اس سے ملنا ضروری ہے۔" یہ کہہ کر

تھاروکس جواب کا انتظار کیے بغیر صحن کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

عاطون خوب جانتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے وہ اپنے اس جرائم پیشہ ساتھی کلا نکس کے پاس جا رہا تھا جو اس وقت آتش فشاں پہاڑ کی تہہ میں کھولتے ہوئے لاوے کے ساتھ خود بھی لاوا بنا کھول رہا تھا۔ عاطون پھر مرگنی کے بارے میں غور کرنے لگا کہ وہ کون ہے اور اس کے ساتھ یہاں کیوں آئی ہے؟ کیا اس نے شیر پر حملہ کرکے عاطون کی جان بچانے کا محض ڈھونگ رچایا تھا؟ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو پھر یہ ڈھونگ اس نے کس لیے رچایا تھا کہیں ایسا تو نہیں کہ مرگنی' عاطون پر اپنی ہمدردی اور وفاشعاری کا عکس ڈال کر اس سے کوئی ایسا کام نکلوانا چاہتی ہے کہ جو اسے یم راج کے دوت ہاتھی کے سر والے انسان نے تفویض کیا ہے؟ یہ ایک الجھا ہوا معمہ تھا۔ جس کا حل بظاہر عاطون کو نظر نہیں آ رہا تھا۔

مرگنی کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ اپنے لمبے سیاہ بالوں کا جوڑا بناتی باہر آئی۔ اس نے مسکرا کر عاطون کو دیکھا اور بولی۔ "عاطون! اس ملک کا موسم ہمارے دیش سے کس قدر ملتا ہے۔ مجھے یہ ملک بہت پسند آیا ہے۔"

عاطون اپنی کسی بھی حرکت سے مرگنی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ اسے اس کی ماورائیت کا علم ہو چکا ہے اس نے معمول کے مطابق صبح کی تعریف کی اور کہا۔ "ہاں مرگنی! یہاں کا موسم بہت خوشگوار ہے' مگر تم تو اب جزیرہ قبرص جا رہی ہو۔ سنا ہے وہاں کا موسم بڑا مرطوب ہے کیا وہاں تمہارا جی لگ جائے گا؟"۔

مرگنی چبوتری پر آکر عاطون کے قریب قالین پر بیٹھ گئی۔ "تم جو میرے ساتھ رہو گے۔ پھر بھلا میرا دل کیسے نہیں لگے گا؟"

عاطون نے کہا۔ "لیکن میں سدا کے لیے تو تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا میں خود جڑی بوٹیوں کا تاجر ہوں۔" سیاحت کرتا ایک روز یہاں سے بھی چلا جاؤں گا۔

مرگنی نے الفت بھری نگاہ عاطون پر ڈالی اور اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "تم مجھے اپنے ساتھ ہی کیوں نہیں رکھتے عاطون؟ میں تمہاری بڑی خدمت کروں گی تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گی۔"

عاطون نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ مرگنی! میں ایک آزاد منش انسان ہوں اور پھر میرے سفر پر خطر ہوتے ہیں۔ تم کہاں میرے ساتھ ماری ماری پھرو گی؟"

مرگنی ہنسنے لگی' اس کے دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ "کوئی بات نہیں۔ تم قبرص میں تو کچھ روز میرے ساتھ رہو گے نا؟ وعدہ کرو۔"

عاطون بولا "میں وعدہ کرتا ہوں' میں کچھ روز ضرور تمہارے ساتھ رہوں گا۔"

پھر وہ ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ "تمہارا دوست تھاروکس کہاں ہے؟ کیا ابھی تک سو رہا ہے؟"

عاطون نے کہا۔ "وہ ابھی ابھی کسی کام سے گیا ہے۔ بس تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔

"صبح صبح اسے کون سا کام پڑ گیا؟ مرگنی نے درختوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

عاطون اٹھ کر حوض کے پاس آگیا۔ "کوئی کام پڑ گیا ہو گا کیا تم منہ ہاتھ نہیں دھوؤ گی؟ تھاروکس کے نوکر ناشتا تیار کرچکے ہوں گے۔"

مرگنی اٹھ کر باغ کی طرف جاتے ہوئے بولی میں پچھواڑے والے حوض میں جا کر اشنان کروں گی۔"

جب وہ چلی گئی تو عاطون نے حوض پر منہ ہاتھ دھویا۔ پھر جانے کیوں اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ مرگنی کو حوض میں غسل کرتے دیکھے حالانکہ اس سے پہلے اس کے دل میں کبھی ایسی خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی۔ عاطون حوض سے اٹھ کر مکان کی مغربی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا اپالو کے سنگ مرمر کے بڑے مجسمے کے پیچھے آکر چھپ کر مکان کے عقبی باغ میں بنے ہوئے حوض کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک دم سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اس نے دیکھا کہ مرگنی کے کپڑے حوض کے کنارے پڑے تھے اور حوض میں ایک چھوٹے قد کا بچہ ہاتھی نہا رہا تھا' عاطون کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا پھر بھی وہ مجسمے کے پیچھے چھپا ٹکٹکی باندھے یہ محیر العقول منظر دیکھتا رہا نہانے کے بعد ہاتھی کا بچہ حوض سے نکل کر باہر آگیا۔ جونہی وہ حوض سے باہر آیا' اس نے مرگنی کی شکل اختیار کر لی۔

عاطون نے اپنی نظریں دوسری طرف کر لیں اور جھکا جھکا چلتا واپس صحن والے چبوترے پر آکر بیٹھ گیا اب اسے حتمی طور پر یقین ہو چکا تھا کہ یہ عورت مرگنی کوئی مافوق الفطرت ہستی ہے اور کسی انتہائی اہم مشن پر وہاں آئی اور یہ کوئی ایسا پراسرار مشن ہے جو کہ عاطون کے ساتھ رہ کر ہی وہ پورا کر سکتی ہے۔

آنگن کی دیوار والا دروازہ کھلا اور تھاروکس اندر آگیا۔ وہ شکل سے بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ عاطون نے سیدھا سوال کر دیا۔ تھاروکس! خیرت تو ہے؟ تم بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو۔ کیا بات ہے؟"

تھاروکس اپنی پریشانی کو نہیں چھپا سکا تھا بولا "عاطون بھائی! کیا بتاؤں میں نے کچھ اجناس مصر روانہ کی تھیں۔ ڈاکوؤں نے راستے میں قافلے کو لوٹ لیا میرا کافی نقصان ہوا ہے۔"

تھاروکس کا جو نقصان ہوا تھا اسے عاطون اچھی طرح سمجھتا تھا اس نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا نقصان میرا نقصان ہے دوست! مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

تھاروکس نے عاطون کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر احسان مندی کے احساس سے دبایا اور کہا۔ "شکریہ میرے دوست! میں تمہارے اس احساس ہمدردی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کوئی بات نہیں سوداگری میں نفع و نقصان تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہاں' مرگنی ابھی تک نہیں اٹھی۔"

عاطون نے اشارہ کرتے ہو کہا۔ "وہ پچھواڑے کے حوض میں نہانے گئی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد اپنے بالوں کو ساڑھی کے پلو سے جھاڑتی مرگنی بھی آ گئی۔ "تھاروکس بھائی! تم کہاں چلے گئے تھے صبح صبح؟ عاطون کی آنکھیں تھاروکس کے چہرے پر مرکوز تھیں اگرچہ تھاروکس ایک عیار شخص تھا اس کے باوجود ایک لمحے کے لیے مرگنی کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کا چہرہ ساکت ہو گیا پھر فورا" ہی گردن جھٹک کر ذرا سا ہنسا اور بولا۔ "بھئی تم بڑی خوش قسمت ہو مرگنی۔ اب تمہیں اتنی دور جزیرے پر نہیں جانا ہوگا۔ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ نواب زادی اب مقدونیہ میں آگئی ہے وہاں اس نے ایک شاندار محل خرید لیا ہے۔"

عاطون سمجھ گیا تھا کہ تھاروکس کے ذہن میں مرگنی کو اغواء کرنے کا ایک نیا منصوبہ تیار ہو چکا تھا تھاروکس کو یہ تو کبھی بھی علم نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کا ساتھی کلا نکس' مرگنی کے یم دوت کے ہاتھوں المناک موت کا شکار ہو چکا ہے' وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ کلا نکس نے اس سے دغا کیا اور مرگنی کو اغواء کرنے کی بجائے اسے بتائے بغیر کسی دوسرے شہر کی طرف نکل گیا ہے ہو سکتا ہے اس نے ہمت ہار دی ہو اور مرگنی کو اغواء کرنے کے خیال سے دستبردار ہو گیا ہو۔ تھاروکس یہی کچھ سوچ سکتا تھا۔

مرگنی نے عاطون کی طرف دیکھا اور خوش ہو کر بولی۔ "کیا مقدونیہ یہاں کہیں قریب ہی ہے تھاروکس؟"

عاطون نے کہا "زیادہ دور نہیں ہے"۔

یہی تو اچھی بات ہے تھاروکس یہ کہہ کر باغیچے میں بچھی ہوئی کرسیوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اس نے نوکروں کو آواز دی دو نوکر ناشتے کے طشت لے کر آگئے۔ عاطون مرگنی اور تھاروکس بیٹھ کر ناشتا کرنے لگے ناشتے پر تھاروکس نے مرگنی اور عاطون کو تفصیل سے بتایا کہ قبرصی نواب زادی کی صحت جزیرے کی آب و ہوا میں خراب رہنے لگی تھی چنانچہ اس نے جزیرے کا محل فروخت کرکے مقدونیہ میں ایک خوبصورت محل خرید لیا ہے

اب میں چاہتا ہوں کہ تم کل میرے ساتھ مقدونیہ کی جانب روانہ ہو جاؤ کیونکہ دس پندرہ روز کے بعد مجھے کاروبار کے سلسلے میں بغداد جانا پڑ رہا ہے کیا تم تیار ہو نا؟"

مرگنی نے عاطون کی طرف دیکھا۔ تھاروکس بولا۔ "ارے بھئی عاطون کو تم اپنے ساتھ کیوں لے جانا چاہتی ہو؟ عاطون نے ابھی یہاں اپنا کاروبار جمانا ہے اسے یہیں رہنے دو۔ مقدونیہ میں تمہیں اجنبیت محسوس نہیں ہو گی وہاں میری دو چھوٹی بہنیں بھی رہتی ہیں۔ میں تمہارا ان سے تعارف کروا دوں گا تمہارا جی وہاں بہلا رہے گا۔"

عاطون بھی یہی چاہتا تھا کہ مرگنی اس سے اب دور ہی رہے تو بہتر ہے چنانچہ اس نے بھی تھاروکس کے خیالات اور تجاویز کی تائید کی مرگنی نے ایک عجیب سی چمکیلی نگاہ عاطون کے چہرے پر ڈالی۔ اپنے اندر مافوق الفطرت طاقت رکھتے ہوئے بھی عاطون کو یہ نگاہ اپنے دل کی گہرائیوں میں اترتی محسوس ہوئی۔

مرگنی کی آنکھوں میں ایک ماورائی کشش آگئی تھی اس نے متبسم ہونٹوں کے ساتھ کہا۔ "اگر عاطون بھائی بھی یہ چاہتا ہے تو میں جانے کے لیے تیار ہوں۔"

تھاروکس خوشی سے جھوم اٹھا فورا ایک نارنگی چھیل کر مرگنی کو دی اور کہا۔ "عاطون بھائی بھی تمہارا ہمدرد ہے اور پھر ہم دونوں مہینے میں ایک آدھ بار تم سے ملنے آ جایا کریں گے۔ مقدونیہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ لو یہ نارنگی کھاؤ ایسی نارنگیاں تمہیں مقدونیہ میں بھی ملتی رہیں گی۔"

تھاروکس قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ عاطون چمچ سے دلیا کھا رہا تھا مرگنی کی گرم نظروں کا اثر اسے اپنے چہرے پر باقاعدہ محسوس ہو رہا تھا کیونکہ مرگنی گوشہ چشم سے عاطون کی طرف تک رہی تھی کچھ بھی ہو عاطون کو اس بات سے یک گونہ اطمینان ہوا تھا کہ مرگنی اس سے دور ہو جائے گی اور وہ روم میں روہنی کا کھوج لگا سکے گا۔ اگرچہ دل میں یہ دھڑکا ضرور لگا تھا کہ مرگنی غیر مرئی قوتوں کی مالک ہے اور اسے ہاتھی کے سر والے یم دوت کی امداد بھی حاصل ہے جو انسان کو کھڑے کھڑے چشم زدن میں غائب کر دیتا ہے اس کے باوجود عاطون مرگنی کے مقدونیہ جانے کے تصور سے خوش تھا۔ بلکہ اسی لمحے اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ مرگنی کو رخصت کرنے کے بعد وہ روم شہر کی آبادی کو چھوڑ کر پہاڑی وادیوں میں چلا جائے گا اور وہاں رہ کر وہ روہنی کو دوبارہ حاصل کرنے کے بعد اس ملک کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر مصر کی طرف روانہ ہو جائے گا۔

مرگنی کیا سوچ رہی تھی؟ اس کا سوائے مرگنی اور اس کے یم دوت ساتھی کے تیسرے کسی ذی روح کو علم نہیں تھا عاطون کو یہ بھی بخوبی علم تھا کہ تھاروکس مرگنی کو

مقدونیہ میں کسی نواب یا امیر زادی کے ہاں فروخت کر رہا ہے لیکن اس سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ عاطون نے مرگنی کے کمرے میں جو خونیں کھیل دیکھا تھا اس کے بعد تو وہ ہر حالت میں مرگنی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا اتنا ضرور تھا کہ عاطون نے اپنی طرف سے اس بات کا بے حد خیال رکھا تھا کہ مرگنی پر اس کے دل کے تاثرات کاشائبہ تک بھی نہ پڑے۔

چنانچہ ایک روز مرگنی، تھاروکس کے ساتھ ایک رتھ میں سوار ہو کر مقدونیہ شہر کی طرف روانہ ہو گئی چلتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بھیگی آواز میں اس نے عاطون سے کہا۔ "عاطون! مجھے بھلا تو نہیں دو گے نا؟ مجھے ملنے ضرور آنا۔ میرا خیال تمہاری طرف ہی لگا رہے گا۔"

عاطون نے بادل نخواستہ اسے تسلی دی تھی کہ وہ ہر ماہ اسے ملنے آتا رہے گا جب مرگنی کا رتھ روانہ ہوا تو عاطون نے فضا میں پھر وہی پروں کی پراسرار پھڑپھڑاہٹ کی آواز سنی۔ اس نے چونک کر فضا میں دیکھا۔ فضا میں کچھ بھی نہیں تھا۔ روم کے گہرے نیلے آسمان پر دن کی روشنی چمک رہی تھی مرگنی کا رتھ بلوط کے درختوں کا ایک موڑ گھوم کر عاطون کی نظروں سے اوجھل ہو گیا عاطون نے خدا کا شکر ادا کر کے ایک گہری سانس لی اور تھاروکس کے مکان میں آ کر برآمدے میں پڑے سنگ مرمر کے دیوان پر نیم دراز ہو گیا نوکر اس کے لیے گرم قہوہ بنا لایا۔

عاطون کی ساری توجہ اب روہنی کی بازیافت کی طرف لگی تھی اس نے تھاروکس کی بجائے اپنی تفتیش تھاروکس کے نوکروں سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھاروکس کے ہاں چار نوکر کام کرتے تھے ایک باورچی تھا جو ملک شام کا رہنے والا تھا اور یونانی اور شامی دونوں زبانیں بڑی روانی سے بول لیتا تھا تھاروکس کے گھر میں سوائے عاطون کے دوسرا کوئی نہیں تھا جو اس نوکر سے شامی زبان میں بات کر سکتا چنانچہ یہ نوکر جس کا نام کلدان تھا عاطون سے بہت خوش تھا کہ وہ اس کے وطن کی زبان میں اس سے بات کرتا تھا۔ اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عاطون نے کلدان کی طرف ایک چھوٹا سا جال پھینکا جس میں وہ سیدھا سادا شامی بہت جلدی پھنس گیا۔ عاطون نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کلدان کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔ "بھئی! تم ایک اعتبار سے میرے ہم وطن بھی ہو، کیونکہ میں نے شام میں زندگی کے دس سال بسر کیے ہیں یہی وجہ ہے کہ میں شامی زبان مادری زبان کی طرح بول سکتا ہوں۔"

کلدان بڑا ہی خوش ہوا باورچی خانے میں بیٹھا پیاز کاٹ رہا تھا بولا عاطون بھائی میں

تو تمہیں اپنا شامی بھائی ہی سمجھتا ہوں۔ آج تمہیں کھانے پر بحیرہ روم کی مچھلی پکا کر دوں گا۔ مالک بھی گھر پر نہیں ہے۔"

عاطون ایک آہ بھر کر خاموش ہو گیا کلدان نے فوراً محسوس کیا کہ عاطون اداس ہے، پیاز کاٹتے ہوئے ہاتھ روک کر بولا۔ "میرے بھائی کیا بات ہے! تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟"

عاطون نے تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھتے دیکھ کر کہا۔ "کلدان! تم میرے ہم وطن ہو تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا، بات دراصل یہ ہے کہ میں یہاں اپنی ایک بھانجی کی تلاش میں آیا ہوں جو کئی ماہ ہوئے گم ہو گئی تھی گھر سے کنویں پر پانی بھرنے گئی اور پھر اس کی کوئی خبر نہ ملی میں نے تمہارے مالک تھاروکس کو اپنی بھانجی کے بارے میں نہیں بتایا تم بھی اس سے ذکر مت کرنا، خواہ مخواہ وہ بھی پریشان ہو گا۔"

کلدان تو عاطون سے دو قدم بڑھ کر پریشان ہو گیا۔ گہری سوچ میں گم ہو گیا پھر سر اٹھا کر عاطون کی طرف دیکھا اور بڑی راز داری کے ساتھ ذرا آگے جھک کر بولا۔ "میرے بھائی! تمہاری بھانجی کا سن کر مجھے بڑا دکھ ہوا ہے خدا کرے کہ وہ تمہیں مل جائے لیکن ایک بات ہے۔"

"وہ کیا؟" عاطون نے فوراً پوچھا۔

کلدان نے آنکھیں سکیڑ لیں، کہنے لگا۔ "کسی کے آگے میرا نام مت لینا مگر میرے مالک کے پاس سال چھ ماہ بعد کچھ لڑکیاں آتی ہیں۔ شاید وہ انہیں دور دراز کے ملکوں سے خرید کر لاتا ہے۔ پھر آگے ایک آدمی کے ہاں فروخت کر دیتا ہے وہ یہ دھندا چھپ کر بڑی راز داری سے کرتا ہے لیکن مجھے سب معلوم ہے۔"

عاطون اس سے یہی راز اگلوانا چاہتا تھا اس نے جھٹ کہا۔ "کلدان! میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ پچھلے دنوں اس کے ہاں کوئی ایسی لڑکی آئی تھی، جس کا رنگ سانولا تھا اور جو بہت ہی خوبصورت تھی۔" کلدان کچھ سوچ کر بولا۔ "تھاروکس ہمیشہ خوبصورت لڑکیاں ہی لاتا ہے لیکن پچھلے دنوں ایک سانولی لڑکی میں نے بھی دیکھی تھی۔ وہ واقعی بہت حسین تھی مگر وہ تو ہندی بولتی تھی۔"

عاطون چونکا۔ "ہاں ہاں، وہی میری بھانجی ہے وہ ...... وہ ہندی بڑی روانی سے بول لیتی ہے۔ وہاں اپنے باپ کے ساتھ رہ چکی ہے وہ ..... وہ کہاں ہو گی میرے بھائی؟"

کلدان بڑا خوش ہوا کہ عاطون کو اس کی بھانجی کا سراغ مل گیا تھا کہنے لگا۔ "میرا ذکر بالکل نہیں کرو گے نا؟"

"کبھی نہیں" عاطون نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

کلدان نے عاطون کو بتایا کہ روہنی کو تھاروکس نے طولون نام کے ایک رومن رئیس کے ہاتھ فروخت کیا تھا' جو جہازوں کی تعمیر کے لیے جنگل سے درختوں کی کٹائی کا کاروبار کرتا ہے اور اسی شہر سے چند کوس دور بلوط کے گھنے جنگل میں اپنے شاندار مکان میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ "مجھے یقین ہے کہ تمہاری بھانجی کو تھاروکس اس کے پاس لے گیا تھا۔"

عاطون نے کلدان سے طولون نامی رومن ٹھیکیدار کے جنگل والے مکان کا پتا لیا اور اس طرف روانہ ہوگیا۔ اس زمانے کا روم ایک خوشحال شہر تھا اور بازار تجارت کے مال سے اٹے پڑے تھے۔ ملک ملک کے سوداگر تجارت کی غرض سے اپنا مال لے کر آتے تھے۔ ایکرو پولس کی پہاڑی کی ڈھلان پر سنگ مرمر کے بنے ہوئے سفید مکانوں کی قطار دور تک پھیلی تھی ان کی بائیں جانب شہنشاہ روم کے شاہی محلات تھے اور پھر امراء کی حویلیاں تھیں۔ مکانوں کی کھڑکیوں پر جنگلی گلاب کی بیلیں جھکی ہوئی تھیں۔ عاطون شہر کے بازاروں میں سے گزرتا انگور اور زیتون کے باغات میں آگیا۔ یہاں سوڈان اور مصر کے غلام کام میں لگے تھے کھیتوں میں بھی سیاہ فام غلام کام کر رہے تھے ان باغوں اور کھیتوں کے پار بلوط اور سیڈار کے درختوں کا گھنا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا یہی وہ جنگل تھا جہاں رئیس طولون کا مکان تھا۔

اس جنگل کے درخت آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے بیچ میں ایک چھوٹا سا راستہ بنا تھا جہاں بھاری رتھ کے پہیوں کے نشان پڑے تھے گھوڑوں کے سموں کے نشان بھی جنگل میں جا رہے تھے۔ عاطون ان نشانوں کے ساتھ ساتھ چلتا جنگل میں کافی آگے نکل گیا ایک جگہ یہ کچا راستہ بائیں جانب گھوما تو سامنے درختوں کے بیچ میں سے سنگ مرمر کا بنا ہوا ایک عالی شان دو منزلہ محل نما مکان نظر آیا۔ عاطون محتاط ہو کر چلنے لگا یہ مکان بہت سے درختوں کو کاٹ کر ایک کشادہ جگہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ کھلے پائیں باغ میں جگہ جگہ وینس اور دوسری حسین عورتوں کے مجسمے نصب تھے۔ درمیان میں ایک حوض تھا جس میں فوارہ اچھل رہا تھا عاطون ایک درخت کی اوٹ میں ہو کر غور سے مکان کا جائزہ لینے لگا۔

پائیں باغ میں ایک غلام پودوں کی کانٹ چھانٹ کر رہا تھا آگے مکان کے اونچے ستونوں والے برآمدے میں سنگ مرمر کا ایک دیوان پڑا تھا جس کے پاس ہی پتھر کی گول میز پر گلدان میں پھول سج رہے تھے ایک کنیز طشت میں پھل رکھے برآمدے میں سے گزر کر دوسری طرف چلی گئی۔ عاطون نے اسے غور سے دیکھا وہ روہنی نہیں تھی۔ عاطون جب تھاروکس کے گھر سے چلا تھا تو آسمان صاف تھا اور دھوپ نکلی ہوئی تھی لیکن اب بادل جمع

ہونے لگے تھے۔ اور دھوپ غائب ہو گئی تھی وہ سوچ رہا تھا کہ کس بھیس میں اس مکان میں جا کر رئیس طالون سے ملاقات کرے کہ اسے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ اس آواز میں درد کرب کے ساتھ رحم کی درخواست تھی' عاطون نے دیکھا کہ برآمدے میں ایک جانب سے دو حبشی غلام ایک ادھیڑ عمر دبلی پتلی عورت کی گردن میں رسی ڈال کر اسے کھینچتے ہو... برآمدے کے دوسرے کونے میں سے نکل کر جنگل کے درختوں کی جانب چل دیئے۔

عاطون اس رقت انگیز منظر سے بے حد متاثر ہوا وہ جلدی سے درخت کی اوٹ سے نکل کر جھاڑیوں کے عقب سے ہوتا ان غلاموں کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ طولون کے مکان سے کچھ دور ایک ڈھلان پر پہاڑی کا ایک چھوٹا سا غار تھا غار کے باہر ایک نیم دائرے کی شکل میں کھلی جگہ تھی جس پر سیڈار کے درختوں نے سایہ ڈال رکھا تھا عورت کی چیخ و پکار میں اضافہ ہوا تو غلاموں نے کپڑے سے اس کا منہ باندھ دیا۔ غار کے سامنے کھلی جگہ پر لا کر انہوں نے ادھیڑ عمر عورت کو زمین پر چت لٹا دیا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا اور بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی عاطون ایک طرف جھکا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

غلاموں نے زمین پر لکڑی کی چار میخیں گاڑ دیں پھر عورت کے دونوں ہاتھ اور پاؤں رسیوں کی مدد سے ان میخوں کے ساتھ اس طرح باندھ کر جکڑ دیئے کہ وہ اپنے جسم کو حرکت نہیں دے سکتی تھی بے چاری کا منہ بھی بندھا ہوا تھا جس میں سے اس کی گھٹی گھٹی ستم زدہ آواز بہت کمزور پڑ گئی تھی۔ عاطون چند قدموں کے فاصلے پر ہی جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا غلام اپنے کام سے فارغ ہو کر عورت کے پاؤں کی جانب کھڑے ہو گئے اور غار کی طرف دیکھنے لگے پھر ایک غلام نے تھیلے میں سے لوبان نما قسم کی کوئی چیز نکال کر سلگائی۔ اس میں سے دھویں کی لکیر سی نکلنے لگی۔

عورت اپنا سر بری طرح دائیں بائیں مار رہی تھی۔ حبشی غلام نے لوبان کو عورت کے سر کے پاس ہی زمین پر رکھ دیا دوسرے غلام نے رومن زبان میں کہا۔ "اس کی بو پر وہ غار سے ابھی نکل آئے گا ہمیں یہاں سے بھاگ جانا چاہیے نہیں تو وہ ہمیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

غار میں کوئی تھا جو اس عورت پر حملہ آور ہونے والا تھا یہ کون ہو سکتا تھا؟ عاطون نے سوچا کیا غار میں کوئی بھوکا شیر رہتا ہے؟ رومن قوم کے رئیس اپنے از کار رفتہ غلاموں کو شیروں کے آگے ڈالنے کے بہت شوقین تھے دونوں غلام وہاں سے بھاگ گئے ان کے جانے کے بعد عاطون جھاڑیوں میں سے نکل کر عورت کی طرف بڑھا۔ ابھی اس نے قدم اٹھائے ہی تھے کہ غار کے اندر سے ایک غضبناک پھنکار کی آواز سنائی دی۔ عاطون...

عورت بے چینی سے سر دائیں بائیں مارنے لگی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں اچانک غار میں سے دس بارہ فٹ لمبا سیاہ رنگ کا اژدھا نما سانپ چھلانگ لگا کر باہر نکلا زمین سے پانچ فٹ بلند ہو کر اس نے اپنا چھتر ایسا بڑا پھن اٹھایا اور جھومتا ہوا عورت کے سر کے اوپر پہنچ گیا۔

عاطون وہیں ٹھٹک کر رہ گیا سانپ عورت کو ڈسنے والا تھا۔ بے چاری عورت کا جسم ساکت ہو گیا تھا۔ خوف سے اس کی آنکھیں باہر کو ابل آئی تھیں۔ سانپ آہستہ آہستہ اپنا پھن اس کے چہرے کی طرف لا رہا تھا عاطون نے فوراً سانپ کی آواز میں اسے آواز دی۔ "رک جاؤ' پدم ناگ دیوتا کا بھائی تم سے مخاطب ہوں۔"

اژدھا نما سانپ کا پھن جہاں تک پہنچا تھا وہیں رک گیا اس نے اپنی گردن اٹھا کر ان درختوں کی طرف دیکھا جدھر سے عاطون نے اسے آواز دی تھی سانپ نے اپنی آواز میں کہا۔ "پدم ناگ دیوتا کے بھائی کے پاس کیا ثبوت ہے؟"

عاطون جھاڑیوں میں سے نکل کر سانپ کے پاس آ گیا۔ زمین پر چت پڑی ادھیڑ عمر عورت خوفزدہ نظروں سے کبھی سانپ اور کبھی عاطون کو تکنے لگی اسے نہ تو سانپ کی آواز سنائی دے رہی تھی اور نہ ہی اجنبی کی آواز آ رہی تھی جو سانپ کی طرف گھور کر دیکھ رہا تھا۔ عاطون نے سانپ کی سرگوشی نما سسکار میں کہا۔ "تم نے ناگ دیوتا کے بھائی پر شک کر کے ناگ دیوتا کی توہین کی ہے۔ اچھا تو پھر میں تمہیں ثبوت دیئے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر عاطون نے سانپ کو گردن سے پکڑ لیا۔ یہ سانپ بھی کوئی معمولی سانپ نہیں تھا اس انسانی گوشت اور خون کی چاٹ پڑ چکی تھی اور وہ خود سر' ضدی اور اکھڑ ہو گیا تھا اس نے فوراً عاطون کی کلائی پر ڈس لیا۔ عاطون نے اپنے جسم کو پتھر بنا لیا تھا کلائی پر ڈستے ہی سانپ کے دانت پتھر سے ٹکرائے اور وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا اس کے دانتوں میں سے خون جاری ہو گیا تھا۔ عاطون بولا۔ "کیا اب بھی تمہیں کسی ثبوت کی ضرورت ہے؟"

عاطون نے سانپ کی گردن کو ذرا سا دبایا تو سانپ کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں سانپ نے گڑگڑا کر معافی مانگتے ہوئے کہا۔ "ناگ دیوتا کے عظیم بھائی! مجھے معاف کر دے مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اب مجھے واقعی تمہارے جسم سے پدم ناگ دیوتا کی بو آ رہی ہے مجھ پر رحم کر۔"

عاطون نے کہا۔ "میں تمہیں ایک شرط پر چھوڑ سکتا ہوں۔ ناگ دیوتا کی قسم کھا کر مجھ سے وعدہ کر کہ آئندہ تو کسی انسان کو ہلاک نہیں کرے گا۔"

سانپ کی جان پر بنی ہوئی تھی اس نے فوراً ناگ دیوتا کی قسم کھا کر عاطون سے وعدہ

کیا کہ وہ کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ عاطون کو معلوم تھا کہ جب کوئی سانپ ناگ دیوتا کی قسم کھا کر کوئی عہد کرتا ہے تو اس سے کبھی نہیں پھر سکتا عاطون نے سانپ کو چھوڑ دیا اور کہا۔ "یہاں سے کہیں دور کسی ویرانے میں چلا جا اور خبردار آئندہ کسی انسان کے قریب مت پھٹکنا' نہیں تو ناگ دیوتا کے انتقام سے تم خوب واقف ہو۔"

سانپ نے سر جھکا کر کہا۔ "عظیم ناگ دیوتا کے بھائی! میں نے جو عہد کیا ہے اس پر قائم رہوں گا۔ اس سے پھر جانا اب میرے بس میں نہیں ہے"۔ یہ کہہ کر سانپ جنگل میں ایک طرف چلا گیا۔

اب عاطون نے ادھیڑ عمر عورت کے بازوؤں اور پاؤں کے ساتھ بندھی ہوئی رسیوں کو توڑ ڈالا۔ پھر اس کے منہ پر بندھا کپڑا بھی کھینچ کر پھینک دیا۔ بے چاری عورت ابھی تک خوف زدہ اور سہمی ہوئی تھی وہ تو عاطون کے قدموں پر گر پڑی۔ عاطون نے اسے اٹھا کر بٹھایا اور بڑی شفقت سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہ حبشی غلام اسے یہاں سانپ کے آگے کیوں ڈال گئے ہیں؟"

عورت نے کہا۔ "میرے بیٹے! مجھے یہاں سے لے چل۔ طولون کے غلاموں کو پتا چل گیا تو وہ میرے ساتھ تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

عاطون نے عورت کو ساتھ لیا اور جنگل میں جنوب کی طرف اندر کی جانب چلنے لگا۔ ادھیڑ عمر کی یہ دبلی پتلی عورت رومن لباس میں تھی مگر اس کا لباس بوسیدہ تھا اگرچہ وہ موت کے منہ سے نکل آئی تھی پھر بھی اس کے دبلے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں بدستور موجود تھیں۔ اس کے نقش ہندی تھے عاطون نے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کس ملک کی رہنے والی ہے؟

عورت نے ایک طرف ڈھلان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اس طرف نیچے ایک ندی بہہ رہی ہے اس کے پار بندرگاہ کو ایک کچا راستہ ہے۔ وہاں ہم محفوظ ہوں گے۔"

عاطون نے عورت کو گود میں اٹھا کر ندی پار کی ندی کے دوسرے کنارے نشیب میں ایک کچا راستہ بل کھاتا پہاڑی کے پہلو سے گزرتا تھا۔ عورت تھک گئی تھی۔ وہ دم لینے کو ایک پتھر کی چٹان کی اوٹ میں بیٹھ گئی عاطون نے پالی زبان میں اس سے کہا۔ "کیا تم جنوبی ہندوستان کے رہنے والی ہو؟"

عاطون کو معلوم تھا کہ جنوبی ہند میں پالی زبان بھی بولی جاتی ہے عورت نے چونک کر عاطون کو دیکھا اور پھر اس کے چہرے کو اپنے کمزور سوکھے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ "میرے بچے! کیا تم بھی ہندوستان کے رہنے والے ہو؟ تم ضرور بھگوان کے اوتار ہو جس کو دیکھ کر

موذی سانپ بھاگ گیا تم نے میری جان بچائی ہے۔ میں تمہاری پوجا کرنا اپنا دھرم سمجھتی ہوں۔"

وہ عاطون کے آگے سجدہ کرنے لگی تو عاطون نے بڑے احترام سے اس کا سر اٹھایا اور کہا۔ "ماتا! میں بھگوان کا اوتار نہیں ہوں بلکہ تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہوں۔ سانپ میرے مقابلے میں کمزور تھا اس لیے بھاگ گیا۔ اب مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو اور حبشی غلام تمہیں وہاں کس جرم میں ہلاک کرنے کے لیے لائے تھے؟"

عورت نے کہا۔ "میرا جرم یہ ہے کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں طولون کے محل میں جو کنیز میری عمر کی ہو جاتی ہے تو اسے سانپ کے غار کے آگے ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ آدم خور سانپ تھا۔ اس سے پہلے میری عمر کی تین کنیزیں اس سانپ کا لقمہ بن چکی ہیں۔

عاطون نے فوراً سوال کیا۔ "کیا طالون کے محل میں روہنی نام کی بھی کوئی جوان اور خوبصورت کنیز موجود ہے؟ اس کا تعلق بھی ہندوستان سے ہے۔"

عورت نے عاطون کو اپنا کمزور سر اٹھا کر دیکھا اور کہا۔ روہنی کو میں جانتی ہوں۔ وہ پاٹلی پتر سے اغواء کر کے لائی گئی ہے۔ وہ بے حد حسین ہے اور یہی حسن اس کے عذاب کی وجہ بن گیا۔"

اس ہندی عورت نے عاطون کو روہنی کے بارے میں بتایا کہ طولون نے اسے بھاری رقم لے کر روم کے ایک خفیہ شیطانی فرقے والوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ "اس شیطانی فرقے کا نام کسی کو معلوم نہیں لیکن ان کے بارے میں یہ افواہ عام ہے کہ اس فرقے کے لوگ حسین اور نوجوان عورت کے جسم کی پرستش کرتے ہیں۔ ان کے پرستش کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر مہینے ایک انتہائی سڈول صحت مند اور حیرت انگیز کشش رکھنے والی نوجوان عورت کو ملک کے کسی نہ کسی کونے سے تلاش کر کے اپنے خفیہ اڈے پر لے جاتے ہیں پندرہ یوم تک اس عورت کو گدھی کے دودھ سے نہلایا جاتا ہے اسے کھانے کو اعلیٰ ترین غذا دی جاتی ہے اس کے بعد جب چاند کو زوال آنا شروع ہوتا ہے تو اس حسین ترین عورت کی کچھ ایسے گھناؤنے اور بہیمانہ طریقے سے پرستش کی جاتی ہے کہ وہ ایک ہی رات میں ہلاک ہو جاتی ہے بھگوان روہنی کی رکھشا کرے۔ اس کا بھی یہی انجام ہونے والا ہے۔

یہ تفصیل سن کر ایک بار تو عاطون کے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ روہنی کی زندگی خطرے میں تھی مگر اسے شیطانی خفیہ فرقے کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ لوگ کون ہیں اور ان کے اراکین کہاں مقیم ہیں۔ ادھیڑ عمر عورت نے بتایا کہ حسین عورت کو یہ لوگ یا تو اغواء کر لیتے ہیں اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو اسے معاوضہ ادا کر کے خرید لیتے ہیں

اور خود خریدنے بھی نہیں جاتے بلکہ کسی ایسے معروف آدمی کی وساطت سے خریدتے ہیں کہ بیچنے والے کو بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ جس عورت کو بیچ رہا ہے وہ کہاں لے جائی جائے گی۔ چنانچہ یوں طولون کو بھی روہنی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ ادھیڑ عمر کنیز کی زبانی عاطون کو صرف ایک نشانی ہی مل سکی تھی کہ اس خفیہ شیطانی گروہ کی خوراک صرف مچھلی ہے جس کو وہ کچا ہی کھاتے ہیں اور جو مشروب وہ پیتے ہیں اسے خود کشید کرتے ہیں اس عورت کے حساب سے روہنی کو طولون کے محل سے شیطانی گروہ کے خفیہ مقام کی طرف روانہ ہوئے صرف چار پانچ دن ہی ہوئے تھے۔ اس اعتبار سے ابھی روہنی کی ناز برداریاں ہو رہی ہوں گی اور اس کی موت میں ابھی دس گیارہ دن باقی تھے۔ عاطون کو بڑی تیزی سے اپنے کسی منصوبے پر عمل کرتے ہوئے بے گناہ معصوم روہنی کو وحشیوں کے چنگل سے چھڑا کر لانا تھا۔

اس نے ادھیڑ عمر کنیز کی مرضی کے مطابق اسے بندرگاہ کی بستی میں اس کی ایک یونانی سہیلی کے ہاں پہنچایا اور خود واپس تھاروکس کے مکان کی طرف چل دیا مرگنی کی بجائے اب اچھوت لڑکی روہنی، عاطون کے ذہن پر سوار تھی، اسے ہر حالت میں روہنی کی زندگی بچانی تھی۔ مگر یہ سب کچھ کیسے اور کیوں کر ہو سکتا تھا؟ عاطون کو کچھ معلوم نہیں تھا تھاروکس کے مکان میں باورچی کلدان نے اسے دیکھتے ہی ایک طرف لے جا کر پوچھا کہ بھانجی کا کچھ پتا چلا؟ اس کے جواب کی بجائے عاطون نے کلدان سے شیطانی فرقے کے بارے میں سوال کر دیا کہ وہ اس گروہ کے بارے میں کچھ جانتا ہے؟

کلدان نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس شیطانی گروہ کا پھر ذکر مت کرنا۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ عورت کو کھا جاتے ہیں۔ کیا تمہاری بھانجی ان کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔"

ارے نہیں کلدان میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔ یہ کہہ کر عاطون اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔

دوسرے دن مرگنی اکیلی ہی واپس آ گئی۔ بظاہر وہ بے حد پریشان تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ تھاروکس پہاڑی کے کھڈ میں گر کر ہلاک ہو گیا ہے وہ ہلکی ہلکی سسکیاں بھرتے ہوئے کہہ رہی تھی ہم ایک پہاڑی ڈھلان پر سے گزر رہے تھے ایک طرف بڑی گہری کھڈ تھی میں نے تھاروکس سے کہا کہ وہ دیکھ کر چلے مگر اس کا وقت پورا ہو چکا تھا موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور میرے دیکھتے دیکھتے وہ ہزاروں فٹ گہری کھڈ میں لڑھک گیا۔"

مرگنی رونے لگی عاطون خوب جانتا تھا کہ وہ جھوٹے اور مگرمچھ کے آنسو بہا رہی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنے یم دوت کی مدد سے خود تھاروکس کا کام تمام کیا ہے۔ گھر میں صرف غلام اور دو کنیزیں ہی تھیں تھاروکس نے شادی ہی نہیں کی تھی۔ گھر کی فضا بوجھل بوجھل سی ہو رہی تھی پہلے تھاروکس کا ساتھی لقمہ اجل بنا اور اب تھاروکس اگلی دنیا کو سدھارا۔ مرگنی اپنی ساری کی ساری توجہ عاطون پر مرکوز کرنے کے لیے بالکل آزاد تھی۔ اس بات سے عاطون بھی بخوبی آگاہ تھا۔ دوسری جانب عاطون کو درندوں سے روہنی کی جان بچانے کا مشن بھی درپیش تھا عاطون کے سامنے بس ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ تھاروکس کے مکان سے اچانک غائب ہو جائے اور مرگنی کو تھاروکس کے مکان پر ہی رہنے دے۔ اگر پھر بھی وہ اپنی غیر مرئی اور ماورائی طاقت کے ذریعے اس کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گئی تو پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا اس وقت عاطون کو اس بات کی شدت سے ضرورت تھی کہ وہ تنہا اور بے فکر ہو کر یک سوئی سے روہنی کو تلاش کر سکے اور اس کی مدد کرے۔ کیونکہ حقیقت میں وہ ایک سادہ، معصوم اور بے گناہ لڑکی تھی اور اس کی مدد کو پہنچنا عاطون اپنی اولین انسانی ذمے داری محسوس کرتا تھا۔

اس رات عاطون دیر تک مرگنی کے پاس باہر باغیچے میں بیٹھا تھاروکس کی المناک حادثاتی موت پر افسوس کا اظہار کرتا رہا۔ وہ جان بوجھ کر اسے بار بار حادثاتی موت کہہ رہا تھا تاکہ مرگنی کو یقین ہو جائے کہ عاطون اس کے ماورائی ہتھکنڈوں سے قطعی بے خبر ہے۔ جب رات زیادہ گہری ہو گئی تو مرگنی اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی گئی۔ عاطون کچھ دیر چاندنی رات میں باغیچے میں بیٹھا سرو کے اونچے درختوں کی طرف ٹکٹکی باندھے سوچتا رہا کہ اسے یہاں سے نکل کر کدھر کا رخ کرنا چاہیے۔ ادھیڑ عمر عورت نے بتایا تھا کہ شیطانی گروہ کے عورت پرست لوگ صرف کچی مچھلی کھاتے ہیں اس اعتبار سے ضرور دریا کے قریب ہی انہوں نے کہیں اپنا ٹھکانہ بنایا ہوگا دریائے ٹائبر، روم شہر کے درمیان سے ہو کر گزرتا تھا اس دریا پر شہر میں پتھروں کے تین کشادہ پل بنے ہوئے تھے آگے جا کر یہ دریا سمندر میں جا گرتا تھا۔ وہاں ایک ڈیلٹا تھا جہاں دلدل اور گھنے درخت تھے ان دلدلوں کی طرف کوئی آدمی نہیں جاتا تھا کیونکہ یہاں خونخوار مگرمچھ دلدل میں لیٹے رہتے تھے اگر کوئی بھولا بھٹکا ماہی گیر ادھر جا نکلتا تو مگرمچھ ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والی پھنکار کے ساتھ اس پر جھپٹتے اور دیکھتے دیکھتے اسے کھینچ کر دلدلی پانی میں نیچے ہی نیچے لے جاتے عاطون کو یقین سا ہونے لگا کہ شیطانی گروہ کا ٹھکانہ اسی ویران اور بے آباد مقام پر کسی جگہ ہو سکتا ہے۔

چنانچہ اس روز جب رات تین پہر گزر چکی تو عاطون چپکے سے اپنے کمرے کا دروازہ

کھول کر برآمدے میں آیا مکان کے عقبی باغ کی دیوار پھاندی اور دریا کی طرف روانہ ہو گیا۔ قدیم روم کا شہر گہری نیند سو رہا تھا گول پتھر کے فرش والی گلیاں سنسان تھیں۔ دور شہر کے ایک کونے سے چوکیدار کے لٹھ کی آواز سنائی دی جاتی تھی، عاطون دریا کا پہلا پل عبور کر کے دوسرے کنارے پر آگیا وہ دریا کے ڈیلٹے کی طرف جا رہا تھا تینوں پل جب پیچھے رہ گئے تو اندھیرے میں دور سے ڈیلٹے کی دلدل کے ٹیڑھے میڑھے درخت دکھائی دینے لگے دریا کا پاٹ یہاں چوڑا ہو گیا تھا۔ عاطون دریا کے بائیں کنارے درختوں کے نیچے اونچی اونچی گھاس کے بیچ میں آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا زمین نرم اور لجلجی ہو گئی تھی۔ چاند ایکرو پولس کی پہاڑی کے پیچھے چھپ گیا تھا جس کی وجہ سے ڈیلٹے کا علاقہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ مگر عاطون اس اندھیرے میں بھی بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ سائپرس کے دلدلی درختوں کے پیچھے اسے ایک جگہ دلدل میں کوئی شے ابھری ہوئی نظر آئی عاطون گھاس پر پھونک پھونک کر قدم جماتا قریب گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک چھوٹی سی کشتی ہے جو درخت کا تنا کھوکھلا کر کے بنائی گئی ہے۔ کشتی آدھی دلدل کی سطح پر تھی اور آدھی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی تھی، کشتی میں دو چپو بھی پڑے تھے جن کے سروں پر کیچڑ جمی تھی۔

عاطون نے دلدل میں دور نگاہ ڈالی۔ کچھ فاصلے پر دلدل میں ایک چھوٹا سا درختوں کا ٹاپو بنا ہوا تھا اس ٹاپو پر گہرا اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا عاطون سوچنے لگا کہ کشتی کون یہاں چھوڑ گیا تھا چپوؤں پر لگی کیچڑ سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی شخص کچھ دیر پہلے دلدل کو عبور کر کے یہاں آیا ہے یہ ماہی گیر نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہاں مچھلیوں کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ابھی عاطون اس نقطے پر غور ہی کر رہا تھا کہ اسے آدمیوں کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دیں۔

عاطون جلدی سے لپک کر قریبی جھاڑی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا دلدل کا کنارہ بائیں جانب نیم دائرے کی شکل میں دور رات کے اندھیرے میں گم ہو گیا تھا۔ عاطون نے اس طرف سے دو انسانی سائے کشتی کی طرف بڑھتے دیکھے وہ دور سے باتیں کرتے آ رہے تھے۔ قریب آکر خاموش ہو گئے عاطون یہ دیکھ کر چونک سا گیا کہ یہ دونوں مرد تھے۔ ان کی داڑھیاں تھیں مگر انہوں نے ...... زنانہ لباس پہن رکھا تھا ان کی چال بھی مردانہ تھی صرف لباس زنانہ تھا۔ کشتی میں سوار ہوئے اور چپوؤں کی مدد سے کشتی کو پتلی کیچڑ ملی دلدل پر اس ٹاپو کی طرف کھینے لگے جہاں درختوں کے جھنڈ اندھیرے میں بھوتوں کی طرح لگ رہے تھے۔ عاطون کو ان کے زنانہ لباس سے خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ اسی شیطانی گروہ کے لوگ ہیں جو عورت کی پرستش کرتے ہیں۔ کشتی دلدلی سطح پر اندھیرے میں دور ہوتی جا رہی تھی۔ عاطون جھاڑیوں سے نکل کر دلدل کے کنارے کنارے اوپر کی سمت چلنے لگا۔

تاریک فضا میں جیسے بھنور لپک رہے تھے۔ ایسے گھپ اندھیرے میں صرف عاطون ہی تھوڑا بہت دیکھ سکتا تھا۔ دلدلی کناروں پر وہ درختوں سے نکل کر ایسی جگہ آ گیا جہاں جنگلی کلائی کی اونچی اونچی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں لیکن دلدل کے بیچ میں ابھرے ہوئے ٹاپو تک جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسی وجہ سے دونوں زنانہ لباس میں ملبوس پراسرار آدمی کشتی پر بیٹھ کر ٹاپو تک پہنچ گئے تھے۔ عاطون کے لئے اس ٹاپو تک پہنچنا بہت ضروری تھا۔ اسے یقین تھا کہ جنس پرست شیطانوں کا خفیہ معبد اسی ٹاپو میں کسی پوشیدہ جگہ پر ہے اور اچھوت حسینہ، روہنی وہیں قید ہو گی۔ وہ کلائی کی جھاڑیوں میں سے ٹاپو کی طرف دیکھنے لگا۔

تاروں کی پھیکی کافوری دھند میں ٹاپو کے درخت بے ہنگم انداز میں جھکے، بھوتوں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ نہ تو وہ دونوں پراسرار آدمی کہیں نظر آتے تھے اور نہ ہی ان کی کشتی کا کچھ پتا چل رہا تھا۔ عاطون کو اس وقت دیوی ملیا اور اپنے دوست پدم ناگ کا خیال آیا۔ اگر وہ موجود ہوتے تو عاطون کے لئے دلدلی ٹاپو تک پہنچنا کوئی مشکل مرحلہ نہیں تھا مگر وہ دونوں ساتھی عاطون سے ایک مدت سے جدا تھے اور ان سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ عاطون کی نگاہ کنارے کے پاس ہی ایک گول سی تھالی نما شے پر پڑی۔ اس نے جھک کر دیکھا اسی قسم کی مزید دو گول گول تھالیاں قریب ہی دلدل کی سطح پر پڑی تھیں۔ اسے قریب ہی دو کنول کھلے ہوئے نظر آئے جن کے ڈنٹھل، دلدل سے کوئی ایک فٹ اوپر کو نکلے ہوئے تھے۔ عاطون فوراً سمجھ گیا یہ کنول کے پتے ہیں۔

وہ کنول جو دلدل میں کھلتا ہے اس کے پتے چنگیر کی طرح گول ہوتے ہیں اور دلدل میں پڑے پڑے کچھ وقت گزر جانے کے بعد سخت ہو جاتے ہیں۔ عاطون نے ایک گول تھالی نما پتے کو ہاتھ سے نیچے دبایا پتہ سخت ہو چکا تھا۔ یہ تھالی نما پتہ دلدل میں نیچے تو نہ ہوا مگر آگے کو ذرا سرک گیا۔ عاطون کے دل میں امید کی کرن روشن ہوئی۔ وہ جھاڑیوں میں سے

نکل کر درختوں میں آ گیا۔ یہاں اس نے ایک درخت کی ٹہنی توڑی اور واپس کنول کی تھالی کے پاس آ گیا۔ اس نے اللہ کا نام لے کر گول پتے پر اپنا پاؤں رکھا پتہ اپنی جگہ پر قائم رہا عاطون اپنا دوسرا پاؤں رکھ کر اس پر بیٹھ گیا پھر اس نے درخت کی مضبوط ٹہنی کو چپو بنایا اور پتے کو دلدل میں آگے کھینے لگا۔ کنول کے تھالی نما پتے نے دلدل پر کھسکنا شروع کر دیا یہ ایک چھوٹی سی کشتی بن گئی جو آہستہ آہستہ اندھیری رات میں دلدل پر پراسرار ٹاپو کی طرف بڑھنے لگی۔ عاطون بڑی احتیاط کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ دلدل میں چپو چلا رہا تھا۔

ایک تھکا دینے والی جدوجہد کے بعد عاطون ٹاپو پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ کنارے پر لمبی گھاس اگی ہوئی تھی جس میں آدمی چھپ جاتا تھا۔ زمین نرم تھی۔ عاطون پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا دلدلی گھاس سے نکل آیا۔ کچھ فاصلہ پر دھیمی سی روشنی نظر آ کر غائب ہو گئی۔ عاطون وہیں بیٹھ گیا اور جہاں سے روشنی ہوئی تھی وہاں غور سے دیکھنے لگا۔ اندھیرے میں قدیم رومن وضع کی ایک بارہ دری ابھری ہوئی دکھائی دی۔ عاطون جھاڑیوں اور سائپرس کے پرانے بد وضع درختوں کی آڑ لیتا بارہ دری کی طرف بڑھا۔ سناٹا اس قدر گہرا تھا کہ فضا سنسنا رہی تھی۔ عاطون بارہ دری سے چند قدم کے فاصلے پر پہنچ کر رک گیا۔ وہ سائپرس کے درخت کی اوٹ میں تھا۔ بارہ دری کے چار ستون تھے جو اندھیرے میں سیاہ نظر آ رہے تھے۔ عاطون نے اپنی بصارت کو پوری طرح استعمال میں لاتے ہوئے ان ستونوں کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ چاروں ستون نیم عریاں عورتوں کے مجسموں کی شکل کے ہیں جنہوں نے بارہ دری کی چھت کو اپنے سروں پر اٹھا رکھا ہے۔ عاطون اس سوچ میں تھا کہ ابھی ابھی مدھم روشنی کس جگہ پر ہوئی تھی۔ آسیبی بارہ دری پر موت کی خاموشی تھی۔ بارہ دری کے پیچھے بھی ٹاپو کے درختوں کا ذخیرہ تھا۔ اچانک اس جانب ہلکی سی روشنی ہوئی۔ عاطون نے اس پر اپنی آنکھیں گاڑ دیں۔

یہ روشنی اتنی مدھم تھی کہ مشعل کی روشنی نہیں ہو سکتی تھی۔ بارہ دری کے پہلو میں نشیب تھا۔ روشنی نشیب کی جانب سے اوپر کو آ رہی تھی۔ اندھیرے میں ایک انسانی سایہ نشیب سے ابھرا۔ اس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی شمع تھی۔ عاطون کو اس آدمی کا لمبا لبادہ اور سر پر نوک دار لمبی ٹوپی دکھائی دی۔ اس کے پیچھے پیچھے اسی وضع کے لباس میں تین آدمی چلے آ رہے تھے جنہوں نے ایک عورت کو اس طرح اپنے ہاتھوں پر اٹھا رکھا تھا کہ وہ ان کی ہتھیلیوں پر سیدھی لیٹی تھی اور اس کے دونوں بازو نیچے لٹک رہے تھے۔ اس عورت کے لمبے بال نیچے جھول رہے تھے۔

پراسرار انسانوں کی یہ ٹولی خاموشی سے بارہ دری کی طرف بڑھی اور پھر جیسے غائب

ہو گئی۔ شمع کی روشنی بھی غائب ہو گئی۔ عاطون چند ثانیے اپنی جگہ پر بالکل ساکت سا ہو کر بیٹھا رہا۔ پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کے اردگرد کوئی انسان موجود نہیں ہے تو وہ جھک کر باری دری کے عقب میں آ گیا۔ بارہ دری ایک اونچے چبوترے پر بنی ہوئی تھی۔ اس چبوترے میں ایک جگہ سرنگ نما راستہ نیچے کو جاتا تھا۔ وہ شیطانی ٹولی اسی سرنگ میں غائب ہو گئی تھی۔ عاطون نے سرنگ میں جھانک کر دیکھا یہ ایک ڈھلانی راستہ تھا جو آگے جا کر گہری سرنگ کے ساتھ مل جاتا تھا۔

عاطون نے ایک پل کے لئے سوچا کہ کیا اسے سرنگ میں اترنا چاہیے؟ اس میں خطرہ بھی تھا لیکن خطرہ مول لئے بغیر وہ اس شیطانی راز کو حل نہیں کر سکتا تھا اور روہنی کو بھی ایک الم ناک موت سے نہیں بچا سکتا تھا۔ وہ ڈھلان میں اتر گیا۔ سرنگ میں آتے ہی وہ اندھیرے میں دیوار کے ساتھ لگ کر قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔ سرنگ میں عجیب قسم کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی سرنگ بالکل سیدھی زمین کے اندر جا رہی تھی بیس قدم چلنے کے بعد سرنگ بائیں جانب مڑ گئی تاریکی میں عاطون کو ایک طاق دکھائی دیا۔ وہ طاق کے قریب آیا تو اسے دھیمی اور آسیب زدہ سی انسانی آوازیں سنائی دیں۔ الفاظ ان آوازوں میں کہیں خلط ملط ہو گئے تھے۔ پھر یہ آوازیں رک گئیں۔

عاطون نے اپنا سانس روک لیا۔ ایک لمحے کے لئے گھپ اندھیرے میں قبر کا ایسا سکوت چھا گیا۔ عاطون کھسکتا ہوا طاق کے پاس پہنچا اور اس نے بڑی احتیاط سے اپنی گردن ذرا سی آگے بڑھا کر دوسری طرف دیکھا۔ ادھر نیچی چھت والا ایک تہ خانہ تھا۔ کونے میں ایک آدمی ہاتھ میں جلتی ہوئی شمع لئے کھڑا تھا چار لبادہ پوش مرد نصف دائرے کی شکل میں کھڑے تھے ان کے بیچ میں وہی عورت جس کو ابھی تین آدمی اٹھا کر لائے تھے ایک تخت پر اس حالت میں پڑی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں تخت کے کونوں میں ابھری ہوئی میخوں کے ساتھ رسی سے بندھے ہوئے تھے عورت نیم مدہوش تھی اور اس کے حلق سے کسی وقت ہلکی سی کراہ کی آواز نکل جاتی تھی۔

عاطون نے دیکھا یہ عورت روہنی نہیں ہے اس عورت کی رنگت اور جسامت ظاہر کر رہی ہے کہ وہ یونانی یا رومن قوم سے تعلق رکھتی ہے اس مدہوش بے بس عورت کی کمر کے پاس تخت کے ساتھ ایک چھٹا آدمی کھڑا تھا۔ اس آدمی کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا جس کی نوک شمع کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ وہ عورت کے سینے کے اوپر خنجر کی نوک رکھ کر کچھ بڑبڑانے لگا۔ عورت کی ہلکی سی چیخ کی آواز بلند ہوئی اور عورت کے سینے پر سے خون کی ایک لکیر سانپ کی طرح بہہ نکلی پھر وہ وحشی انسان اس عورت پر جھک گیا شاید وہ اس کے

خون سے اپنی بہیمانہ پیاس بجھا رہا تھا۔

چاروں لبادہ پوش، عورت کے اردگرد آہستہ آہستہ اپنی گردنوں کو دائیں بائیں گھماتے چکر لگانے لگے۔ دس بارہ چکر لگانے کے بعد وہ رک گئے اور پیچھے ہٹ کر دیوار سے جا لگے جو خبیث انسان مظلوم عورت پر جھکا اس کے خون کے قطروں سے اپنی کبھی نہ بجھنے والی پیاس بجھا رہا تھا وہ سیدھا کھڑا ہوا اپنے خنجر والے بازو کو اٹھا کر دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ اشارہ ملتے ہی شمع والا آدمی دیوار کی طرف لگ گیا۔ شمع کی روشنی میں دیوار میں ایک طاق دکھائی دینے لگا۔ ایک ایک کر کے پانچوں آدمی اس طاق سے گزر گئے۔ تہ خانے میں خنجر بردار شیطان ہی رہ گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ کراہتی، بے بس عورت کے تخت کے گرد ایک چکر لگایا پھر اس کے پاؤں کی طرف آ کر دونوں ہاتھ چھت کی طرف اٹھائے اور قدیم سریانی زبان میں بولا۔

"دیوتا عسیری! تیری خوابگاہ میں اس عورت کا نذرانہ بھیج رہا ہوں۔ اسے قبول کر اسے قبول کر۔"

ان سریانی الفاظ کو دہرانے کے بعد شیطان سیرت آدمی نے خنجر کے دستے کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھاما اسے اوپر اٹھا اور چاہتا تھا کہ ایک ہی وار میں خنجر عورت کے پیٹ میں گھونپ دے کہ عاطون نے طاق میں سے اس کی گردن پر چھلانگ لگائی اور اسے دائیں جانب فرش پر یوں گرایا کہ عاطون کے دونوں پنجے اس خبیث کی گردن کو شکنجے کی طرح دبوچے ہوئے تھے۔ اس خبیث کو یہ سوچنے کی مہلت نہ مل سکی کہ یہ کیا بلا ہے جو اچانک اس پر موت بن کر گری ہے۔

عاطون کی گرفت سے اس کا بچ نکلنا ناممکن تھا اس کی آواز تک نہ نکل سکی۔ گردن کی رگیں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئیں اور ہڈیوں کے منکے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئے۔ عاطون نے لبادہ پوش کی لاش کو گھسیٹ کر ایک طرف کر دیا۔ دوسری دیوار والے طاق میں جھانکا وہاں کوئی شیطان موجود نہیں تھا وہ تخت پر جکڑی ہوئی بے بس عورت کے پاس آ گیا۔ سب سے پہلے اس نے مرے ہوئے شیطان کا لبادہ اتار کر اس عورت پر ڈالا پھر اس کی رسیاں کھول کر اس کے بازوؤں اور پاؤں کو آزاد کیا۔ عورت کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ عاطون نے اسے اپنے کاندھے پر ڈالا اور طاق میں سے باہر سرنگ میں لے گیا۔

سرنگ میں جاتے ہی اسے مردہ شیطان کی لاش کا خیال آیا۔ وہ طاق میں اتر کر واپس کوٹھری میں آ گیا۔ لاش کو اٹھایا اور سرنگ میں لڑھکا دیا۔ وہ خود بھی سرنگ میں آ گیا۔ یونانی دوشیزہ ابھی تک مدہوش تھی۔ عاطون نے عورت کو تو کاندھے پر رکھا اور شیطان کی

لاش کو اس کے لمبے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا سرنگ میں سے نکال کر بارہ دری کے چبوترے کے عقب میں پہنچ گیا۔ وہ اس جگہ ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا یونانی عورت اس کے کاندھے پر پڑی آہستہ آہستہ کراہ رہی تھی۔ عاطون نے شیطان صفت آدمی کی لاش کو دلدل میں گرا دیا۔ دلدل لاش کے گرتے ہی اوپر نیچے ہونے لگی اور دیکھتے دیکھتے سسکاری کی آواز کے ساتھ لاش کو نگل کر یوں ساکن اور خاموش ہو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اب عاطون کو یونانی عورت کی فکر ہوئی کہ وہ اسے کہاں لے جائے؟

وہاں سے فرار کا ایک ہی ذریعہ یعنی کنول کے چنگیر نما سخت پتے کی کشتی تھی۔
عورت کو اٹھا کر اس نے بڑے پتے پر پاؤں رکھا تو وہ دلدل میں دھنسنے لگا۔ عاطون نے جلدی سے اپنا پاؤں ہٹا لیا۔ اسے کشتی کا خیال آیا جس پر سوار ہو کر دو زنانہ لباس والے شیطان اس دلدلی ٹاپو کے اندھیرے میں آئے تھے وہ کشتی کے کھوج میں وہاں سے ہٹا ہی تھا کہ چبوترے کے نیچے تاریک سرنگ کے سوراخ میں شمع کی دھیمی روشنی کی شعاعیں پڑنے لگیں۔ کوئی سرنگ میں سے چلا رہا تھا۔ عاطون نے عورت کو کاندھے پر ڈالا اور جتنی تیزی سے دوڑ سکتا تھا اندھیرے میں گھاس آلود زمین پر دوڑتا ہوا جنوب کی جانب سائپرس کے گنجان درختوں میں آ گیا۔

اسے کوئی ایسی جگہ نہیں مل رہی تھی جہاں وہ عورت کو لے کر کچھ دیر کے لئے چھپ جائے وہ ایک درخت پر چڑھنے کا ارادہ باندھ ہی رہا تھا کہ گھپ اندھیرے میں اس کی نگاہ درخت کی جڑوں پر پڑی وہاں ایک دوسرے کے اوپر چڑھی ہوئی جڑوں کے گچھے کے نیچے ایک گڑھا بن گیا تھا۔ عاطون نے جلدی سے عورت کو اس گڑھے میں لٹا کر اوپر گھاس پھوس ڈال دیا اور خود درخت کی ایک شاخ پر چڑھ کر چبوترے کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں چبوترے کی سرنگ میں سے دو زرہ پوش رومن سپاہی نیزے ہاتھوں میں لئے باہر نکلے اور ٹاپو کے کنارے کی طرف اندھیرے میں گم ہو گئے۔

عاطون درخت کی شاخوں میں بیٹھا اندھیرے میں غور سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں رومن سپاہی شیطانی گروہ کے افراد ہی ہیں اور ان کا کام یہاں کی نگرانی ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ ایک زرہ پوش سپاہی اس درخت کی طرف عقب سے بڑھ رہا تھا جس کے گڑھے میں گھاس پھوس میں نیم بے ہوش یونانی عورت پڑی تھی۔ وہ اس طرح چل رہا تھا کہ اس کے قدموں کی چاپ تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی وجہ سے دلدلی گھاس تھی جو گیلی تھی۔

زرہ پوش رومن سپاہی کو دیوتا پر قربان کی جانے والی یونانی عورت کے جسم پر لگائے

گئے تیل کی بو آ رہی تھی وہ اس بو کا سراغ لیتا گڑھے پر آ گیا اور اس سے پہلے کہ عاطون اس پر چھلانگ لگاتا زرہ پوش سپاہی نے پوری طاقت سے نیزہ گھاس میں چھپی یونانی عورت کے سینے میں اتار دیا۔ اس کے ساتھ ہی عاطون نے اس پر چھلانگ لگا دی زرہ پوش نیچے گرا اور اس کا خود سر سے الگ ہو کر دور جا گرا۔ رومن سپاہی اٹھ کر عاطون پر حملہ کرنے ہی والا تھا کہ عاطون نے اس کی گردن دبوچ لی۔ چند ثانیوں کے اندر رومن سپاہی کی لاش گھاس پر پڑی تھی۔ عاطون نے جلدی سے نیزہ باہر کھینچا اور جھاڑیاں ہٹا کر یونانی عورت کو دیکھا اس کے سینے میں گہرا سرخ سوراخ تھا۔ وہ مر چکی تھی۔

عاطون نے رومن سپاہی کا زرہ اتار کر خود پہن لیا اور اس کی لاش کو بھی گڑھے میں ڈال کر اسے گھاس پھوس سے ڈھانپ دیا پھر سر پر رومن خود رکھا نیزہ ہاتھ میں لیا اور بارہ دری والی سرنگ کی طرف بڑھا اسے بڑا افسوس تھا کہ وہ یونانی عورت کو بچا نہیں سکا۔ اب وہ روھنی کو ہر حالت میں جان بچانا چاہتا تھا۔ وہ سرنگ کے پاس جا کر رک گیا۔ اتنے میں دوسرا رومن سپاہی ٹاپو کے کنارے کی طرف آتا نظر آیا۔ اس نے قریب آ کر عاطون سے کہا۔

"ایلوس! کاہن اور لڑکی کا کچھ پتا نہیں چل سکا وہ اسے لے کر ٹاپو سے فرار ہو گیا تھا۔ چلو بڑے کاہن کو چل کر خبر کرتے ہیں۔"

عاطون نے زرا کھانس کر اسی زبان میں "ہاں" کا لفظ ادا کیا جس زبان میں رومی سپاہی نے اس سے بات کی تھی یہ زبان بھی سریانی زبان تھی۔ عاطون نیزہ ہاتھ میں لیے رومن سپاہی کے ساتھ ہی سرنگ میں داخل ہو گیا۔ اسے ہر لمحے یہی دھڑکا لگا تھا کہ کہیں اس کا پول نہ کھل جائے۔ اس کے ساتھی نے اس کا نام ایلوس بتایا تھا مگر عاطون کو اپنے ساتھی کا نام معلوم نہیں تھا سرنگ میں وہ اس طاق سے گزرے جہاں سے عاطون نے یونانی عورت کو اٹھایا تھا آگے زینہ آ گیا۔ زینہ مزید نیچے زمین کے اندر جاتا تھا۔ رومن سپاہی بولا۔

"کاہن بڑا بدمعاش ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔"

عاطون نے گلا صاف کیا اور بولا "تم ٹھیک کہتے ہو۔"

رومن سپاہی بولا "تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے؟؟"

عاطون نے مزید کھانس کر کہا "باہر کی ٹھنڈی ہوا کا اثر ہے۔"

رومن سپاہی اسے لے کر ایک دروازے میں سے گزر کر ایسے کمرے میں آ گیا جہاں درمیان میں ایک گول چبوترے پر ایک سرخ و سفید آدمی سرخ زنانہ لباس پہنے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اس کی چھوٹی چھوٹی مہندی رنگی داڑھی تھی۔ چار زرہ پوش دیوار کے ساتھ کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ تین زنانہ لباس والے رومن مرد چبوترے کے آگے

دوزانو بیٹھے تھے۔ یہ کاہن اعظم تھا اس نے متجسس انداز میں کاہن اور یونانی عورت کے بارے میں استفسار کیا جس کے جواب میں عاطون کے ساتھی نے بتایا کہ ٹاپو پر ان کا کہیں نام و نشان نہیں ملا۔ وہ دونوں فرار ہو گئے ہیں۔ کاہن اعظم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"اس نے ہمارے دیوتا کی توہین کی ہے۔ وہ روما میں ہم سے چھپ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ ہم بہت جلد پکڑ کر اسے آگ میں زندہ جلا دیں گے۔ اس دوران تم لوگ ہندی لڑکی کی قربانی کی تیاری کرو۔ ہم اس لڑکی کو آج رات صبح سے پہلے پہلے اپنے دیوتا کی خواب گاہ میں بھیجنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا عسیر دیوتا ہم پر اپنا عذاب نازل کرے گا۔"

زنانہ لباس والے آدمی جھک کر باہر چلے گئے۔ عاطون چپ چاپ اپنے ساتھی سپاہی کے ساتھ کھڑا تھا۔ کاہن اعظم نے ان کی طرف دیکھا "تم لوگ ابھی جا کر ہندی لڑکی کو اپنی حفاظت میں تہ خانے سے نکال کر قربان گاہ پر لاؤ۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں قربانی کی تیاریاں کرتا ہوں۔ جاؤ جلدی جاؤ۔"

عاطون نے بھی رومن سپاہی کو سر جھکاتے دیکھ کر اپنا سر جھکا دیا اور اس کے ساتھ کمرے سے نکل کر سرنگ میں آ گیا۔ رومن سپاہی بولا "کاہن نے دیوتاؤں کو ناراض کر دیا ہے۔ اب ضرور کوئی آفت آنے والی ہے۔"

وہ سرنگ کے کونے میں ایک کوٹھری کے سامنے رک گیا پھر اس نے اس کا تالا کھولتے ہوئے عاطون سے کہا "ایلوس! کیا بات ہے تم خلاف معمول چپ کیوں ہو؟"

عاطون نے ایک بار پھر کھانس کر کہا "میرا گلا درد کرنے لگا ہے۔"

رومن سپاہی تالا کھول چکا تھا۔ اس نے ایک پل کے لئے عاطون کی طرف دیکھا اور جیسے شک آمیز لہجے میں بولا "کیا تم ایلوس ہی ہو؟"

عاطون نے کوٹھری کا دروازہ کھول دیا اور بولا "کیوں نہیں میں کوئی اور بھی ہو سکتا ہوں۔"

مگر رومن سپاہی پر اس کا راز کھل چکا تھا اس نے ایک دم نیزہ تان کر عاطون پر حملہ کر دیا۔ عاطون بھی اس سے بے خبر نہیں تھا۔ اس نے اسے ایک زور سے لات ماری اور کوٹھری میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔ رومن سپاہی نے حلق سے ایسی آواز نکالی جیسے وہ آس پاس کے افراد کو باخبر کر رہا ہو کہ عاطون نے اسے وہیں دبوچ لیا۔ رومن سپاہی کا نیزہ عاطون کی گردن میں لگا مگر اس کی گردن میں گھسنے کی بجائے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ اسی نیزے کو اپنے ہاتھ میں لے کر عاطون نے رومن سپاہی کے سینے پر بھرپور وار کیا۔ نیزہ اس کے سینے پر لگی لوہے کی جھالر کو توڑتا ہوا اس کی پسلیوں میں آر پار ہو گیا۔ رومن سپاہی سینے میں کھبے

ہوئے نیزے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے ایک طرف گر گیا۔

عاطون نے اب کوٹھری میں دیکھا تو اسے کونے میں ایک سہمی ہوئی عورت گٹھری کی طرح بیٹھی نظر آئی۔ اس نے وہیں سے آواز دی۔ "روہنی میں عاطون ہوں"

اچھوت لڑکی روہنی کے جسم میں جیسے دوبارہ جان پڑ گئی۔ وہ اٹھ کر عاطون کی طرف آئی۔ عاطون نے اپنا خود اتار دیا۔ چراغ کی دھیمی روشنی میں روہنی نے عاطون کو صاف پہچان لیا۔ وہ اس کے ساتھ لگ کر سسکیاں بھرنے لگی "عاطون! مجھے یہاں سے نکال لے چلو' یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

عاطون نے کہا "اسی لیے تو میں یہ سارے جتن کر رہا ہوں تم خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ تم اپنا سر یوں مایوسی سے جھکائے رکھنا جیسے میں تمھیں گرفتار کر کے لئے جا رہا ہوں۔"

اچھوت حسینہ روہنی ایک عرصے سے عاطون کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ اسے عاطون پر اعتماد تھا۔ چنانچہ وہ اس کے پیچھے پیچھے سر جھکائے چل پڑی۔ عاطون زرہ پوش رومن سپاہی کے بھیس میں تھا۔ وہ اسے کوٹھری کی بجائے وہ سرنگ سے باہر جانے والے راستے پر چلنے لگا۔ سرنگ سے باہر آتے ہی اس نے اندھیرے میں روہنی سے کہا "جتنی تیز بھاگ سکتی ہو میرے ساتھ ان درختوں کی طرف بھاگ چلو۔"

عاطون اسے لے کر درختوں کی تاریکی میں سے گزرتا ہوا دلدلی ٹاپو کے اس کنارے پر آ گیا جہاں دلدل کے کنارے پر چھوٹی کشتی موجود تھی۔ اس نے اپنی زرہ وہیں اتار کر دلدل میں پھینکی۔ روہنی کو اپنے ساتھ کشتی میں بٹھایا اور کشتی کو دوسرے کنارے کی طرف کھینا شروع کر دیا۔ رات ڈھل رہی تھی۔ ستارے آسمان پر پھیکے پڑ رہے تھے۔ دلدل میں کشتی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی اور ٹاپو کی طرف سے ایک ڈراؤنا سکوت طاری تھا۔ کسی بھی لمحے شور مچ سکتا تھا مگر شاید ابھی تک کسی کو عاطون اور روہنی کے فرار کا علم نہیں ہوا تھا۔ آخر عاطون کنارے پر پہنچ گیا۔ اس نے روہنی کو ساتھ لیا اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔ روہنی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ یونہی چلتے چلتے وہ اسے تھاردس کے مکان پر لے آیا۔

اس وقت پو پھٹ چکی تھی اور کلدان مکان سے نکل کر انگور کے باغ کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے عاطون کے ساتھ ایک سانولی سلونی حسین دوشیزہ کو دیکھا تو وہیں رک گیا اور بولا "عاطون! تم ضرور اپنی بھانجی کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے ہو۔"

عاطون نے روہنی کی طرف اشارہ کر کے کہا "تمہارا اندازہ درست ہے کلدان۔

میری بھانجی روہنی ہے۔ بڑی مشکل سے اسے بردہ فروشوں کے چنگل سے نکال کر لایا ہوں۔"

کلدان نے اسی وقت واپس جا کر روہنی کے لئے بستر بچھایا۔ اس کے لئے غسل کا پانی گرم کیا۔ اسے نیم گرم دودھ پلایا پھر انگور کے باغ کی طرف چل دیا۔ دوپہر تک روہنی کی حالت کافی سنبھل گئی تھی۔ اب وہ عاطون سے اصرار کرنے لگی کہ اسے واپس اس کے گھر ہندوستان پہنچا دیا جائے۔ "عاطون! اس ملک سے مجھے ڈر لگنے لگا ہے میں یہاں نہیں رہ سکتی ہندوستان میں میرے اپنے لوگ ہوں گے تم اگر میرے ساتھ نہیں جانا چاہتے ہو تو مجھے ایسے قافلے کے ساتھ کر دو جو ہندوستان جا رہا ہو۔"

پراسرار عورت مرگنی باہر گئی ہوئی تھی۔ دوپہر کے بعد وہ واپس آئی تو روہنی کو گھور کر دیکھنے لگی۔ عاطون نے روہنی کے بارے میں بتایا تو مرگنی مسکرائی "یہ ہندی لڑکی تو کوئی دیوداسی لگتی ہے۔ اسے تو جنوبی ہند کے مندروں میں ہونا چاہئے تھا جہاں یہ دیوتاؤں کے دربار میں رقص کر کے ان کا دل لبھائے۔"

روہنی نے کوئی جواب نہ دیا وہ مرگنی کی مقناطیسی آنکھوں سے اپنی نظریں چراتی رہی۔

عاطون نے کہا "یہ اب واپس ہندوستان جا رہی ہے یہاں اس کا دل نہیں لگ رہا" اور عاطون، روہنی کو لے کر اس کے کمرے میں آ گیا۔

روہنی بولی "مجھے اس عورت کی آنکھوں سے ڈر لگتا ہے عاطون۔ یہ کسی راکھشنی کا روپ ہے۔"

عاطون نے کہا "تم اس کی فکر مت کرو۔ قافلہ تین روز بعد یہاں سے روانہ ہو گا۔ میں تمہیں اس کے ساتھ کر دوں گا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا لیکن مجھے اپنے دوست پدم کی تلاش ہے۔ اس لیے اسی جگہ رہنے پر مجبور ہوں۔"

روہنی نے کہا "قافلے کے ساتھ میں محفوظ رہوں گی۔ قافلے میں کئی عورتیں بھی سفر کرتی ہیں میں ان کے ساتھ ہی رہوں گی"

عاطون بولا "میں اس کا خاص بندوبست کردوں گا۔ اچھا میں ڈیلفی کے مندر والی خانقاہ تک جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے میرا دوست پدم وہاں پر مل جائے۔ رات ہونے سے پہلے میں آ جاؤں گا۔ تم مرگنی کے سامنے زیادہ مت جانا۔"

یہ کہہ کر عاطون، تھاروکس کے مکان سے ڈیلفی کے مندر کی طرف چل پڑا۔ روہنی نے اندر سے دروازے کو کنڈی لگا دی اور پلنگ پر لیٹ کر اپنے وطن کی سرزمین کے

خواب دیکھنے لگی۔ وہ دل ہی دل میں بھگوان کا شکریہ ادا کر رہی تھی کہ وہ آدم خور قسم کے لوگوں سے بچ کر نکلی۔ دوسری طرف عاطون ایکروپولس کی پہاڑی کے دامن سے گزر کر وادی میں داخل ہوا تو اسے دور سے زیتون کے درختوں کے پاس ڈیلفی کے مندر کے بلند ستون اور سنگ مرمر کا گنبد دکھائی دینے لگا۔ ڈیلفی کا مندر قدیم رومن لوگوں کا سب سے مقدس مندر تھا۔ اس مندر میں رومن عقیدے کے مطابق ایک رات ڈیلفی کی آواز آیا کرتی تھی جو اہل رومن کو آنے والی آفات سے خبردار کرتی تھی۔ یونانیوں نے مصر کو فتح کر کے وہاں کئی سالوں تک حکومت کی تھی۔ یونان کو جب رومیوں نے فتح کیا تو مصری عقائد یونانیوں کی وساطت سے رومیوں کے عقیدوں میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ ڈیلفی کے مندر کے پیچھے ایک چھوٹی سی خانقاہ تھی جہاں بلی اور سانپ کے چھوٹے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ رومیوں کا ایک پیگن گروہ ایسا تھا جو مصری روایات کا حامل تھا اور بلی اور سانپ کے ان بتوں کی بوجا کرتا تھا۔ قدیم روم میں ہر شخص کو اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت تھی حکومت صرف ایک ہی بات کا مطالبہ کرتی تھی کہ وہ رومیوں کے دیوتاؤں کو بھی تسلیم کریں اور ان کی مخالفت نہ کریں۔

عاطون اس خیال سے کبھی کبھی ڈیلفی کی مندر والی خانقاہ میں چلا آتا تھا کہ شاید اس سانپ کے مجسمے کے حوالے سے پدم ناگ کا کبھی سراغ مل جائے۔ اسی خیال سے وہ آج بھی اس خانقاہ کی طرف آ گیا تھا۔ خانقاہ اگرچہ پراسرار انداز میں تعمیر کی گئی تھی اور وہاں کبھی کبھار ہی کوئی باہر کا آدمی نظر آتا تھا۔ تاہم وہاں کسی کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ایک بوڑھا رومی پجاری جس کی لمبی سفید داڑھی تھی اور جو سر پر سیاہ رومال باندھے رکھتا تھا۔ شام کے بعد بلی اور سانپ کے بتوں کے پاس آ کر چاندی کا چراغ روشن کر کے پرانی مصری زبان میں اشلوک پڑھتا تھا۔ وہ عاطون کی شکل سے شناسا تھا۔ عاطون جب بھی شام کو آتا تو بتوں کے سامنے ایک طرف ہو کر ادب سے بیٹھ جاتا وہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ ان لوگوں کا ہم عقیدہ ہے حالانکہ اسے ان بتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس شام بھی عاطون خانقاہ کے اندر جا کر بلی اور سانپ کے بتوں کے سامنے ایک طرف ایک دیوار کے ساتھ لگ کر ادب سے بیٹھ گیا۔

بوڑھے رومن پجاری نے آ کر بتوں کے سامنے چاندی کا چراغ روشن کیا۔ پھر دوزانو ہو کر قدیم مصری اشلوک پڑھنے لگا۔ عاطون ان اشلوکوں کی زبان بخوبی سمجھ رہا تھا۔ ان میں دریائے نیل، بلی اور سانپ کی تعریف کی گئی تھی۔ یہ اشلوک اس نے دو ہزار برس پہلے بھی مصر کی خانقاہوں میں سن رکھے تھے۔ اشلوک پڑھ چکنے پر بوڑھا پجاری عاطون کے پاس آ

کر بیٹھ گیا اور بولا "بیٹا! میں کئی روز سے دیکھ رہا ہوں کہ تم خاموشی سے آتے ہو۔ یہاں بیٹھ کر ہمارے دیوتاؤں کی عبادت کرتے ہو اور پھر خاموشی سے واپس چلے جاتے ہو۔ تمہارا رنگ روپ ظاہر کرتا ہے کہ تم نہ تو یونانی ہو اور نہ رومن ہو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کس ملک سے تعلق رکھتے ہو اور روما میں کس جگہ رہتے ہو۔"

عاطون نے کہا "محترم پجاری! میں ملک مصر کا رہنے والا ہوں۔ جڑی بوٹیوں کی سوداگری کرتا ہوں۔ تجارت کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں چونکہ میں بھی ان دیوتاؤں کو مقدس سمجھتا ہوں اس لئے کبھی کبھی اپنے دیوتاؤں کی پوجا کرنے آتا ہوں۔"

رومن پجاری نے عاطون کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا "میرے بچے تمہارا نام کیا ہے۔"

"عاطون میرا نام ہے محترم"

رومی پجاری نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا "بیٹا عاطون، تم ہمارے دیوتاؤں کے دیس کے رہنے والے ہو۔ اس لئے ہم پر تمہاری تعظیم بھی واجب ہے۔ اگر تم کسی سرائے میں اترے ہوئے ہو اور وہاں تمہیں کوئی تکلیف محسوس ہوتی ہے تو اس خانقاہ کی ایک خالی کوٹھری تمہاری میزبانی کا شرف حاصل کرنے کے لئے حاضر ہے۔ خانقاہ سے تم دو وقت کا کھانا بھی کھا سکتے ہو۔"

عاطون نے رومی پجاری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت کا اظہار کیا اور استھان پر رکھے سانپ کے سیاہ بت کی طرف دیکھ کر بولا "محترم پجاری! ہمارے ملک مصر میں تو پورے چاند کی رات کو صحرا میں سے زندہ سانپ دیوتا کی پوجا کرنے خانقاہوں میں آیا کرتے ہیں۔ کیا کبھی اس خانقاہ میں بھی کوئی زندہ سانپ آیا ہے۔"

پجاری مسکرایا۔ عاطون کے کاندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور بولا "میرے بچے! یہاں کبھی باہر سے تو کوئی زندہ سانپ نہیں آیا لیکن اگر ایک خاص اشلوک ایک سو مرتبہ سانپ دیوتا کے حضور پڑھا جائے تو سانپ کا مجسمہ زندہ ہو کر اس سائل کی بات سنتا ہے اور اپنی زبان میں جواب بھی دیتا ہے۔"

عاطون چونکا کیوں نہ وہ چلا کر کے اس پتھر کے سانپ سے بدم ناگ کے بارے میں پوچھے۔ اس نے پجاری سے کہا "بابا مجھے ایک پرانی مرض ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی مجھ پر مرگی کے دورے پڑتے ہیں اور میں مرتے مرتے بچتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ یہ چلہ کر کے سانپ دیوتا سے اپنے مرض کا کوئی علاج پوچھوں۔ کیا تم مجھے وہ خاص اشلوک بتاؤ گے۔"
مشفق پجاری کو عاطون کی بیماری سے تشویش ہوئی۔ اس نے کہا "کیوں نہیں بیٹا۔

یہ تو نیکی ہے اس سے انسان کی خدمت مقصود ہے۔ میں تمہیں وہ اشلوک ضرور بتاؤں گا بلکہ یہ اشلوک ہی تم جیسے روگی لوگوں کے لئے ہے"

عاطون بڑا خوش ہوا وہ پجاری کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ پجاری نے اسے خاص اشلوک بتا دیا۔ عاطون نے اسے فوراً یاد کر لیا اور بولا "مجھے یہ چلہ کس وقت کرنا ہوگا۔"

پجاری نے کہا "یہ چلہ رات کے پچھلے پہر کیا جاتا ہے تم آج رات اسی خانقاہ میں ٹھہرو صبح چلا کرنے کے بعد چلے جانا۔"

عاطون یہی چاہتا تھا چنانچہ وہ وہیں ٹھہر گیا۔ شفیق رومی پجاری نے عاطون کو روٹی اور مچھلی کا گوشت کھلایا۔ پھر اسے خانقاہ کی کوٹھری میں چارپائی ڈال دی اور کہا "میں تمہیں پچھلے پہر آ کر جگا دوں گا۔ تم اطمینان سے سو جاؤ۔"

مگر عاطون کو سونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جاگتا رہا جب رات آدھی سے زیادہ گزر گئی اور رات کا پچھلا پہر آ گیا تو اس کو کوٹھری کے دروازے پر دستک ہوئی۔ عاطون نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے رومی پجاری کھڑا تھا۔ "بیٹا یہی وقت چلہ کرنے کا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

خانقاہ میں بلی اور سانپ کے مجسموں کے سامنے چراغ روشن تھا۔ سانگری سلگ رہی تھی۔ سانپ کے بت کے آگے سرخ پھول پڑے تھے۔ رومی پجاری، عاطون کو وہاں بٹھا کر چلا گیا۔ عاطون نے اشلوک پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ آہستہ آہستہ اشلوک منہ ہی منہ میں دہرا رہا تھا۔ ابھی اس نے پچاس مرتبہ ہی اشلوک پڑھا تھا کہ معاً پراسرار پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ عاطون نے اس طرف دھیان نہ دیا اور یہی سمجھا کہ یہ سانپ دیوتا کی روح آئی ہے مگر وہ سانپ دیوتا نہیں بلکہ یم دوت تھا جو عاطون کو وہاں چلہ کاٹتے دیکھ کر آ گیا تھا۔ مرگنی بھی اپسرا کے روپ میں اس کے ساتھ تھی۔ دونوں غیبی حالت میں تھے نہ انہیں کوئی دیکھ سکتا تھا اور نہ ان کی گفتگو سن سکتا تھا۔ یہاں تک کہ عاطون بھی ان کے وجود سے بالکل بے خبر تھا۔ یم دوت نے مرگنی سے کہا۔

"اس شخص کو اپنے قبضے میں کرنے کا تمہارے لئے اس سے سنہری موقع اور کوئی نہیں آئے گا۔ تم عاطون پر فتح حاصل کر سکتی ہو۔ جیسا کہ میں نے تمہیں کہا ہے تمہیں ویسا ہی کرنا پڑے گا۔"

مرگنی، یم دوت کے آگے ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ اس نے سر جھکا کر کہا "ایسا ہی ہوگا مہاراج"

یم دوت بولا "یہ شخص سانپ دیوتا سے بات کرنے کے لئے اشلوک پڑھ رہا ہے وہ

کبھی زندہ ہو کر اس سے بات نہیں کرے گا۔ بت میں اتنی شکتی ہی نہیں ہے یہ محض پتھر کا بت ہے ہم انسانی دیوتاؤں میں اتنی شکتی ضرور ہوتی ہے کہ ہم کسی اپنے ہمدرد کے کام آ سکیں۔"

مرگنی نے سوال کیا "مہاراج۔ آپ کس طریقے پر عمل کریں گے۔"

یم دوت بولا "میں سانپ کی آواز میں عاطون سے ہم کلام ہوں گا۔ تم ایک طرف کھڑی ہو کر چپ چاپ دیکھتی جاؤ۔"

عاطون نے سو بار اشلوک پڑھ لیا تو گہری نگاہوں سے سانپ کے بت کی طرف دیکھا اسے سانپ کے بت میں زندگی کے آثار بالکل نظر نہیں آ رہے تھے۔ اسے افسوس ہوا کہ یہ چلہ بھی ناکام ہو گیا لیکن دوسرے لمحے اسے سانپ کی ہلکی سی بھاری بھاری آواز سنائی دی "میرے دوست! تو کیا چاہتا ہے۔"

عاطون کو سخت تعجب ہوا کہ پتھر کا سانپ اپنی زبان میں اس سے ہم کلام تھا۔ اس نے جلدی سے کہا "میرا ایک ساتھی پدم ناگ مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ مجھے بتایا جائے کہ وہ مجھے کہاں ملے گا۔"

آواز تو یم دوت کی تھی اور یم دوت کو پدم ناگ کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ چنانچہ عاطون کو ایک بار پھر سانپ کی آواز سنائی دی "عاطون! پدم ناگ اس وقت یہاں سے بیس کوس دور اولمپس نامی گاؤں کے باہر پہاڑی کے دامن میں ملے گا۔ وہاں ایک مجسمہ ساز یورائی رہتا ہے۔ اس کے سامنے پدم ناگ آتا رہتا ہے مگر یہ راز تمہیں نہیں بتائے گا لیکن تم اس سے دوستی کرنے کی کوشش کرنا۔ اگر وہ تمہارا مجسمہ بنانا چاہے تو اسے ایسا کرنے دینا یوں وہ تم سے خوش ہو کر پدم ناگ کے آنے کا وقت بتائے گا۔ اگر تم نے اس کی بات نہ مانی تو وہ پدم ناگ کو وہاں آنے سے روک دے گا اور تمہیں کچھ نہیں بتائے گا۔ اب تم میری خانقاہ سے اپنے گھر چلے جاؤ۔"

سانپ کی آواز بند ہو گئی۔ عاطون نے دیکھا کہ سانپ کے مجسمے پر ایک پراسرار سکوت طاری تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ بوڑھے پجاری کا اشلوک سچا تھا اور یہ اسی سانپ دیوتا کی آواز تھی۔ وہ خانقاہ سے نکل کر پجاری کی کوٹھری میں گیا۔ اس نے بتایا کہ سانپ دیوتا نے اسے' بیماری کا علاج بتا دیا ہے۔ پجاری بہت خوش ہوا عاطون نے مصافحہ کرتے ہوئے بوڑھے رومی پجاری کا شکریہ ادا کیا اور واپس تھاروکس کے مکان پر آ گیا۔

دن چڑھا تو عاطون نے روہنی سے بھی پدم ناگ کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ اسے صرف اتنا ہی بتایا کہ وہ ایک ضروری کام کے لئے اولمپس گاؤں جا رہا ہے ہو سکتا ہے

وہاں سے آگے بھی جانا پڑے۔ روہنی نے بہت پوچھا کہ وہ کتنے دن کے لئے جا رہا ہے۔ عاطون نے کہا۔ "میں تین روز میں واپس آ جاؤں گا۔ اس دوران میں اگر تمہارا قافلہ تیار ہو گیا تم اس میں شامل ہو کر ہندوستان کی طرف روانہ ہو جانا۔ میں کندان کو تاکید کر جاؤں گا وہ تمہیں سرائے تک چھوڑ آئے گا۔"

روہنی نے انکار کر دیا کہ وہ عاطون کے سوا اور کسی کے ساتھ سرائے میں نہیں جائے گی۔ عاطون نے کہا "تو پھر میرا انتظار کرو۔ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔"

عاطون گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے سرپٹ دوڑاتا ہوا روما کے مضافات سے نکلتا ہوا گاؤں اولمپس کی طرف روانہ ہو گیا۔ اولمپس گاؤں وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک پہر گزرنے پر ہی وہاں پہنچ گیا۔ یہ ایک آتش فشاں پہاڑ کی ڈھلوان پر آباد تھا۔ سفید سفید دیواروں والے مکان دھوپ میں چمک رہے تھے۔ عاطون گاؤں میں سے گزرتا ہوا اس کے باہر والی پہاڑی کے پہلو میں آ گیا۔ یہاں سے نکلا تو اس کی نظر دامن میں سرو و صنوبر کے درختوں میں بنی ہوئی ایک چاردیواری پر پڑی۔ اس چاردیواری کے اندر ایک دو منزلہ مکان بنا ہوا تھا۔ عاطون قریب گیا تو دیکھا کہ مکان کی چار دیواری پر جگہ جگہ عورتوں اور مردوں کے مجسمے نصب تھے۔ عاطون گھوڑے سے اتر پڑا۔ پھر مکان کی چاردیواری میں داخل ہو گیا۔ سامنے ایک باغ تھا جس کے وسط میں ایک فوارہ بنا ہوا تھا۔ مگر اس کا پانی خشک تھا عاطون رک کر آواز دینے لگا تو ایک طرف سے ٹھگنے قد کا ادھیڑ عمر داڑھی والا آدمی' رومن وضع کا سرخ و سفید لبادہ اوڑھے سر پر سیاہ رومال کی پٹی باندھے اس کی طرف آیا اور گردن ایک طرف ٹیڑھی کر کے بولا۔

"تمہیں اندر آنے کی اجازت طلب کرنی چاہیے تھی۔"

عاطون نے بے حد معذرت کا اظہار کیا اور بولا "معاف کیجئے گا میں سمجھا کہ دروازہ چار دیواری کے اندر ہو گا۔ اس لئے میں یہاں رک کر آواز دینے ہی والا تھا۔"

ادھیڑ عمر آدمی ابھی تک گردن ٹیڑھی کئے عاطون کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کرخت لہجے میں پوچھا "تم کس سے ملنا چاہتے ہو؟"

عاطون نے کہا۔ "میں یورائی مجسمہ ساز کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ میں ملک مصر کا سیاح ہوں۔ میں نے اس کے مجسموں کی بہت تعریف سن رکھی ہے۔"

وہ پراسرار ٹھگنا بولا "میں ہی یورائی مجسمہ ساز ہوں۔"

عاطون نے بڑی عقیدت سے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور بولا "یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ملک روما کے اتنے عظیم مجسمہ ساز کے حضور کھڑا ہوں۔"

یورائی نے ایک نگاہ عاطون کے سراپا پر ڈالی اور پہلی بار مسکرایا "تمہارا جسم سانولا ہے۔ تم صحیح معنوں میں مصری ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم کسی جنم میں فرعون رہ چکے ہو۔ میں تمہارا مجسمہ بناؤں گا۔ کیا تم تیار ہو؟"

عاطون کو اور کیا چاہئے تھا۔ سانپ دیوتا نے بھی عاطون کو یہی ہدایت کی تھی کہ اس کی ہربات پر ہاں کے سوا کچھ نہ کہے۔

یورائی نے عاطون کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا "آؤ میں تمہیں اپنے بنائے ہوئے مجسمے دکھاتا ہوں۔ وہ اسے اپنے ساتھ مکان کے اندر لے گیا۔ مکان کے اندر بھی ویرانی چھائی تھی۔ کوئی شے کہیں بھی ترتیب سے نہیں پڑی تھی۔ چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ یورائی نے بڑے پراسرار طریقے سے مسکرا کر کہا "تم نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا؟"

عاطون نے اپنا نام بتایا تو وہ اپنی کرنجی آنکھیں جھپکا کر بولا "یہ تو کسی فرعون کا نام معلوم ہوتا ہے۔"

عاطون خاموش رہا۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ اس کا تعلق فراعنہ مصر کے خاندان ہی سے ہے۔ یورائی مکان کے زینہ اترتے ہوئے بولا "میں سنگ تراش مکان کے نیچے ایک تہ خانے میں تنہائی اور یکسوئی سے کرنے کا عادی ہوں"

مکان کے نیچے دو بڑے بڑے کشادہ کمرے تھے جہاں دیوار کے اوپر چھت کے ساتھ بنے روشندانوں میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ ایک کشادہ کمرے میں دیوار کے ساتھ پتھر کے چھوٹے چھوٹے چبوتروں پر انسانی مجسمے کھڑے تھے۔ ان کی دو خصوصیات نے عاطون کو بے حد متاثر کیا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ان تمام مردوں اور عورتوں کے مجسمے انسانی قد و قامت کے تھے۔دوسری خصوصیت یہ تھی کہ ان کے چہرے اور رنگ و روغن ایسے تروتازہ اور شگفتہ تھے کہ زندہ انسان لگ رہے تھے۔ یہ سب کے سب جوان مرد اور عورتوں کے مجسمے تھے۔ یورائی بڑے فخر سے ایک ایک انسانی مجسمے کی طرف انگلی اٹھا کر عاطون سے ان فن پاروں کی عظمت کے رموز و نکات بیان کر رہا تھا۔ "میں نے یہ سارے نامور مجسمے زندہ انسانوں کو سامنے کھڑے کر کے بنائیں ہیں۔ یونان کا ایک بہت نامور مجسمہ ساز ایک بار یہاں آیا تو اندر آتے ہی بولا۔ یورائی! تم نے اپنے گھر میں اتنے آدمیوں کو آنے کی اجازت کیوں دی۔" یورائی قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا "وہ یہ سمجھا کہ مجسمے نہیں بلکہ انسان کھڑے ہیں۔"

عاطون کو یورائی کا قہقہہ کسی جانور سے ملتا جلتا محسوس ہوا مگر اس کے بنائے ہوئے

مجسموں کی حقیقت نگاری دیکھ کر وہ بھی دنگ رہ گیا تھا۔ اس نے ایک عورت کے مجسمے کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو وہ پتھر کی طرح سخت تھا مگر قریب سے دیکھنے پر بھی ایسے لگتا تھا جیسے ایک زندہ عورت کھڑی ہے۔ یہاں تک کہ اس عورت کے بال بھی بالکل اصلی تھے۔ اس کے بارے میں عاطون نے استفسار کیا تو یورائی اپنے گنجان کھچڑی بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولا "یہ خالص اصلی انسانی بال ہیں جن کی میں نے وگیں تیار کی تھیں۔ یہ بال میں شہر کے ایک حجام سے حاصل کرتا ہوں۔"

عاطون نے مجسموں کی بہت تعریف کی۔ اب یورائی اسے دوسرے بڑے کمرے میں لے گیا جہاں کونے پر سفید سنگ مرمر کے سفید چونے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ پاس ہی بالٹیوں میں پانی رکھا تھا۔ بیچ میں ایک انسانی سائز کا حوض بنا ہوا تھا۔ حوض کے کنارے لکڑی کے انسانی سائز کے دو تختے پڑے تھے۔ ایک لکڑی کے بٹھل میں لوہے کی سلاخیں' چھینیاں اور کچھ دوسرے اوزار پڑے تھے۔ یورائی نے بتایا کہ وہ آج کل اس مجسمے پر کام کر رہا ہے پھر عاطون کے بازو پر ہاتھ پھیر کر بولا "تمہارا جسم مجسمے کے لئے بہت موزوں ہے۔ میں کل ہی تمہارا مجسمہ بنانا شروع کردوں گا۔"

عاطون تو اسے ہر حالت میں خوش کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ اسے پدم ناگ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہو سکیں۔ اس نے فوراً کہا "میں تو آج ہی تیار ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ یہاں ایک میرا بھی مجسمہ موجود ہو۔"

یورائی مسکرایا۔ عاطون کے جسم پر اوپر سے نیچے ایک نگاہ ڈالی اور سر کھجا کر بولا "ٹھیک ہے تم پہلے کچھ کھا پی لو۔ پھر میں تمہارا مجسمہ تیار کرنا شروع کر دوں گا۔"

عاطون نے اپنی معلومات کے لئے پوچھا کہ اس کا مجسمہ کتنے دنوں میں تیار ہو جائے گا؟ اس کے جواب میں میں یورائی نے اپنی آنکھیں تھوڑی سی میچ کر کہا "یہی کوئی دس دن لگ جائیں گے۔ ویسے تمہیں دن میں آدھا گھنٹہ میرے سامنے کھڑا ہونا پڑے گا۔"

عاطون کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ فوراً تیار ہو گیا۔ یورائی اسے تہ خانے سے اپنے ساتھ اوپر والے کمرے میں لے آیا۔ ایک بات عاطون نے محسوس کی تھی کہ وہاں اسکے علاوہ دوسرا کوئی آدمی نہیں تھا۔ کوئی نوکر بھی نہیں تھا۔ جب اس نے اس کی طرف اشارہ کیا تو یورائی بولا "میں فن کار ہوں اور ہم لوگ تنہائی میں زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ اسی لئے میں نے شادی نہیں کی۔ میں پھل' دودھ اور روٹی کھاتا ہوں۔ مجھے کھانا پکانے کے لئے کسی نوکر کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تم بیٹھو میں کچھ پھل اور دودھ لے کر آتا

ہوں۔"

عاطون کمرے میں بچھے ہوئے قالین پر بیٹھ گیا اور پدم ناگ کے متعلق سوچنے لگا کہ اگر وہ یورائی سے ملنے آتا ہے تو ضرور اس کمرے میں ٹھہرتا ہوگا اور انسانی شکل میں یہاں سوتا اور دودھ وغیرہ پیتا ہوگا اور اس سے باتیں کرتا ہو گا۔ اتنے میں یورائی ایک طشت اٹھائے آ گیا۔ طشت میں کچھ پھل اور دودھ کے دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ وہ بڑا خوش تھا۔ عاطون کو اس کی خوشی سے خوشی ہو رہی تھی کہ اب وہ اسے بڑی آسانی سے پدم ناگ کے آنے کا راز معلوم کر لے گا۔

یورائی نے طشت عاطون کے سامنے رکھا اور بولا "یہ پھل میں خاص طور پر دریا کے کنارے والے باغ سے منگوا کر رکھتا ہوں اور دودھ روما کی ایک عورت مجھے روز آ کر دے جاتی ہے۔ شہر میں دودھ کی صفائی وغیرہ کا خیال رکھا جاتا ہے لو پہلے یہ سیب کھاؤ"

عاطون نے سیب چکھا واقعی بے حد شیریں تھا۔ یورائی ایک سنگترہ اٹھا کر چھیلنے لگا۔ وہ زیادہ تر اپنے مجسموں کے بارے میں ہی باتیں کر رہا تھا۔ عاطونؔ بھی بار بار اس کے فن کی تعریف کرتا جا رہا تھا۔ یورائی دودھ کا گلاس پیتے ہوئے عاطون سے بولا "دودھ چکھو۔ تم نے ایسا خالص اور خوشبودار دودھ کسی ملک میں نہیں پیا ہوگا۔"

عاطون دودھ کا گلاس ہاتھ میں لے کر منہ تک لے گیا۔ ایک گھونٹ پیا تو اس کا حلق الائچی کی مہک سے لبریز ہو گیا۔ اس نے جھوم کر کہا "اس میں کوئی شک نہیں محترم یورائی! میں نے اتنا لذیذ دودھ اور خوشبودار دودھ پہلے کبھی نہیں چکھا۔ یہ تو اعلیٰ ترین دودھ ہے۔"

یورائی بڑا خوش ہو رہا تھا۔ اپنا گلاس حلق میں انڈیل کر بولا "اسے غٹاغٹ پی جاؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔ میں کھانے کے بعد تھوڑی دیر ضرور آرام کرتا ہوں۔"

عاطون نے سارا دودھ پی لیا۔ یورائی نے ایک تکیہ عاطون کی طرف پھینکا اور خود دروازے کی طرف جاتے ہوئے گویا ہوا "تم آرام کرو۔ میں گھنٹے آدھے گھنٹے بعد آؤں گا۔ پھر تم نہا دھو کر مجسمہ بنوانے کے لئے تیار ہو جانا۔ دیوتا تمہارا نگہبان ہو۔"

یہ کہہ کر یورائی کمرے سے نکل گیا۔ عاطون نے ایک مدت کے بعد کھانا کھایا تھا۔ پھل اور دودھ یہ تو دیوتا کی خوراک تھی۔ عاطون کی طبیعت بے حد ہشاش بشاش تھی۔ اس کے سانس سے ابھی تک دودھ کی خوشبو آ رہی تھی۔ وہ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر قالین پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ اس کے حساب سے اگر دس روز تک اس نے اپنے مجسمے کے سلسلے میں

یورائی سے تعاون کیا تو گیارھویں روز وہ پدم ناگ کے بارے پوچھنے کا حق دار ہوگا۔ دس، گیارہ دن تک یورائی اس سے کافی گھل مل جائے گا۔ عاطون کو اس کی ہمدردیاں بھی حاصل ہو جائیں گی۔ ہو سکتا ہے اگر اس عرصے میں پدم ناگ وہاں آ جائے تو وہ اسے اپنے مکان پر ہی لے آئے اور عاطون سے ملا دے۔ سانپ دیوتا نے کہا تھا کہ جب یورائی مجسمہ ساز کے ہاں کوئی دوسرا آدمی ہوتا ہے تو وہ پدم ناگ کو باہر ہی سے رخصت کر دیتا ہے یا اسے کسی جگہ وادی میں لے جاتا ہے مگر مکان میں نہیں آنے دیتا۔

عاطون ابھی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ اس کی آنکھوں میں نیند کے سائے گہرے ہونا شروع ہو گئے۔ وہ قالین پر ٹیڑھا میڑھا ہو کر لیٹا تھا۔ اس کے جسم میں کچھ اینٹھن سی شروع ہو گئی اور وہ بالکل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس سے اینٹھن غائب ہو گئی۔ عاطون کو کچھ تعجب ہوا کہ یہ اچانک نیند کہاں چلی گئی جب کہ وہ خود اپنے ارادے سے سونا چاہتا تھا۔ عاطون کے ماتھے پر ایک چیونٹی رینگی اس نے ہاتھ اٹھا کر انگلی سے اسے مسلنا چاہا جونہی اس نے ہاتھ اٹھانے کا ارادہ کیا تو یہ محسوس کر کے اس کے جسم میں ایک سنسنی دوڑ گئی کہ وہ اپنا ہاتھ نہیں ہلا سکتا تھا۔ اس نے بیٹھنا چاہا مگر وہ اٹھ بھی نہ سکا۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ ہلانے کی کوشش کی۔ وہ اس ہاتھ کو ہلا بھی نہ سکا۔ پاؤں ہلانے چاہے تو پاؤں نے بھی ہلنے سے انکار کر دیا۔ اب تو عاطون کو پسینہ آ گیا۔ کیا اس کے ساتھ ایک بھیانک دھوکہ ہوا ہے؟ عاطون کو اپنا جسم کسی پہلو سے بھی سن محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اسے اپنے جسم کی رگوں کی گرمی اور دل کی دھڑکن باقاعدہ محسوس ہو رہی تھی مگر وہ نہ تو اپنی پلکیں ہلا سکتا تھا نہ اپنی آنکھوں کے ڈیلوں کو ادھر ادھر اوپر نیچے کر سکتا تھا۔ وہ ایک زندہ لاش کی طرح قالین پر پڑا تھا۔ اس نے منہ کھول کر یورائی کو آواز دینا چاہی مگر نہ اس کا منہ ہی کھلا اور نہ اس کے حلق سے کوئی آواز ہی نکلی حالانکہ اسے اپنے سانس کے چلنے کی برابر آواز سنائی دے رہی تھی۔

عاطون کو ایک المناک سازش کا احساس ہوا۔ یورائی نے دودھ میں زہر ڈال دیا تھا۔ مگر اس نے ایسا کیوں کیا؟ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ اب یورائی کے ساتھ دو حبشی غلام بھی تھے جنہوں نے سروں پر سیاہ رومالوں کی پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ یورائی کا چہرہ کرخت اور بے جان تھا۔ اس کے اندر آتے ہی عاطون کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں حبشی غلام آگے بڑھے۔ انہوں نے عاطون کو اٹھایا اور کمرے سے باہر لا کر تہ خانے کا زینہ اترنے لگے۔

وہ اسے تہ خانے کے دوسرے حصے میں لے آئے جہاں مجسمہ سازی کے اوزار

رکھے تھے اور سنگ مرمر کے فرش والا خالی حوض بھی تھا۔ عاطون کا ذہن اسی طرح کام کر رہا تھا۔ اس کی بینائی نارمل تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اپنے ڈیلے نہیں گھما سکتا تھا۔ وہ چھت کی طرف دیکھنے پر مجبور تھا۔ یورائی نے لکڑی کا تختہ اٹھا کر حوض کے سرہانے کی جانب سیدھے رخ پر رکھ دیا۔ پھر غلاموں کو اشارہ کیا۔ غلاموں نے عاطون کی زندہ لاش کو تختے پر سیدھا لٹا دیا۔ یورائی نے اشارہ کیا تو دونوں غلام سر جھکانے کے بعد وہاں سے چلے گئے۔

اب یورائی نے اپنی زبان کو اذن گویائی دیا۔ عاطون جس تختے پر پڑا تھا یورائی اس کے پہلو میں آ کر کھڑا ہو گیا اور عاطون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "عاطون! تم جس پدم ناگ کی تلاش میں یہاں ائے میں تو اسے بالکل نہیں جانتا میں تو صرف ایک ہی حسینہ کو جانتا ہوں جس کا نام مرگنی ہے اور جو ہندی اکاش کی اپسرا ہے اور جس نے مجھے محبت کا فن سکھایا ہے۔ وہ ایک آسیبی عورت ہے اور میں آسیبی عورتوں کا عاشق ہوں۔ یہ سب کچھ میں نے اسی کے حکم پر کیا۔ میں تمہارے نام کے سوا تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں تو مرگنی کے وجود کا عاشق ہوں۔ میں پہلے ہی سے زندہ عورت' مردوں کے مجسمے بناتا تھا۔ میرا شوق یہی ہے۔ اب مرگنی یہاں آئی اس نے مجھے حکم دیا کہ میں ایک تمہارا بھی زندہ مجسمہ تیار کروں۔ وہ تم سے کیا کام لینا چاہتی ہے؟ اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ وہ جب آئے گی تو تمہیں اپنے آپ ہو معلوم جائے گا کیونکہ جب تم زندہ پتھر کے ایک مجسمے میں تبدیل ہو چکے ہو گے تب بھی تم سن سکو گے' دیکھ سکو گے اور محسوس کر سکو گے۔ اب مجھے اپنا کام شروع کرنے کی اجازت دو۔"

عاطون کے سامنے ہر شے کھل کر واضح ہو گئی تھی۔ وہ مرگنی کے ہاتھوں بری طرح سے شکست کھا چکا تھا۔ خانقاہ والے سانپ کی آواز اصل میں آسیبی مرگنی کی آواز تھی۔ اس میں خانقاہ کے بزرگ پجاری اور سانپ کے بت کا کوئی قصور نہیں تھا۔ عاطون کو اپنے دوست پدم ناگ کا خیال آیا کہ شاید وہ کسی طرف سے اس کی مدد کو پہنچ جائے مگر وہ کہاں آ سکتا تھا؟ پھر اسے روہنی کا خیال آیا کہ جب وہ واپس گھر نہ پہنچا تو وہ کس قدر پریشان ہو گی۔

یورائی مجسمہ ساز بڑی پھرتی سے اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنا فرغل اتار پھینکا تھا۔ باہر سے وہ انجیر کی ایک شاخ بھی توڑ کر لے آیا جو حوض کے پاس ہی چوکی پر پڑی تھی۔ اس نے کونے میں سے سنگ مرمر کے برادے کے چار طشت بھر کر خالی حوض کے فرش پر پھینکے۔ اس کے بعد اس میں کچھ تیل اور ادویات ملائیں اور بالٹیوں میں سے پانی نکال کر حوض میں ڈالنا شروع کر دیا۔ پھر خود حوض میں اتر گیا۔ اس کے ٹخنے سنگ مرمر کے برادہ ملے پانی میں ڈوب رہے تھے۔ وہ حوض میں چل پھر کر پاؤں سنگ مرمر کے محلول کو کچل

رہا تھا۔ بار بار محلول کو جو اب لئی کی طرح ہو گیا تھا ہاتھ میں رکھ کر مسلتا اور غور سے دیکھتا۔ جب وہ مطمئن ہو گیا تو حوض سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی اس نے جلدی سے اپنے پاؤں ٹخنوں تک اور ہاتھ کہنیوں تک دھو ڈالے۔ انہیں کپڑے سے پونچھ کر صاف کیا اور پھر عاطون کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے عاطون کے کپڑے اتار کر ایک طرف رکھ دیے۔ پھر اس کی کمر کے گرد انجیر کی شاخ لوہے کے تار سے کس کر باندھ دی اور تختے کے پیچھے آ کر اسے دونوں ہاتھوں سے اس طرح اٹھایا کہ اس کی ڈھلان بن گئی اس نے آہستہ سے جھٹکا دیا اور عاطون تختے پر سے پھسل کر غڑاپ سے حوض میں گر پڑا۔ وہ بالکل سیدھا گرا اور حوض کے محلول میں ڈوب گیا۔ عاطون نے منہ بند کر لیا مگر وہ آنکھیں بند نہ کر سکا تھا۔ اس کی پلکیں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلی تھیں۔ سنگ مرمر کے محلول میں بلبلے اٹھنے لگے۔

یورائی مجسمہ ساز حوض کے کنارے لکڑی کے ایک چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھ گیا اور حوض کے بلبلوں کو غور سے دیکھنے لگا بیس منٹ کے بعد بلبلے اٹھنا بند ہو گئے۔ یورائی نے لکڑی کے بٹھل میں سے لوہے کی دو سلاخیں نکالیں۔ ان کے آگے آنکڑے لگے تھے۔ یہ آنکڑے اس نے حوض کے محلول میں ڈال دیے حوض کا محلول گاڑھے دہی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس نے آنکڑوں کی مدد سے عاطون کی زندہ لاش کو اوپر کھینچ کر ایک بار پھر لکڑی کے تختے پر سیدھا ڈال دیا۔

عاطون کو اس حالت میں چھوڑ کر یورائی تہ خانے سے نکل کر اوپر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے پتھر کی صراحی میں سے کوئی مشروب گلاس میں انڈیل کر پیا اور قالین پر سیدھا لیٹ گیا۔ پھر جیسے وحشت میں آ کر اس نے تین بار کسی جانور کی طرح چلا کر کہا "مرگنی' مرگنی' مرگنی ....." اور آنکھیں بند کر لیں۔ کمرے کی کھڑکی کے باہر سورج غروب ہو رہا تھا اور ویران باغ میں شام کے اولین سائے اترنے لگے تھے۔ مکان کی چاردیواری کے باہر درختوں پر ایک دو پرندے کسی وقت بول لیتے تھے۔ ہر طرف ایک عجیب منحوس اور گناہ آلود سی خاموشی طاری تھی۔ کوئی دو گھنٹے تک اسی طرح قالین پر لیٹے رہنے کے بعد یورائی اٹھا۔ اس نے فرغل لپیٹا اور نیچے تہ خانے میں آ گیا۔

عاطون اسی طرح لکڑی کے تختے پر سیدھا پڑا تھا۔ یورائی نے قریب جا کر اس کو غور سے دیکھا۔ عاطون کے سارے جسم پر سفیدے کی ایک نصف انچ موٹی تہ چڑھی تھی جو اب سخت ہو گئی تھی۔ یورائی نے اسے ہاتھ سے دبایا۔ سنگ مرمر کا محلول پتھر کی طرح سخت ہو گیا تھا عاطون کے جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی آنکھیں' ناک' منہ' کان اس سفیدے اور جمے ہوئے محلول میں ڈوب چکی تھیں۔ یورائی بٹھل میں سے ایک ہتھوڑی

نکال لایا۔ اس ہتھوڑی کی ہلکی سی ضرب اس نے عاطون کے سر کے ایک طرف لگائی تو ترخ کی آواز کے ساتھ سخت محلول عاطون کے سر کے ایک طرف سے ٹوٹ کر نیچے گر پڑا۔
یورائی نے عاطون کے جسم پر آہستہ ہتھوڑی مارنی شروع کر دی جہاں جہاں ہتھوڑی کی ضرب لگتی سنگ مرمر کے جمے ہوئے محلول کی سطح ترخ کر کے ٹوتی اور ٹکڑے ہو کر نیچے گر پڑتی۔ تھوڑی دیر بعد عاطون کا سارا جسم اپنی اصلی حالت میں آ گیا مگر اب وہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ عاطون کو بھی اب اپنے جسم میں نہ تو خون کی گردش کا احساس ہو رہا تھا نہ اسے اپنے سانس کی آواز آ رہی تھی اور نہ اسے اپنے دل کی دھڑکن سنائی دیتی تھی۔ مگر اس کی سوچنے، دیکھنے اور سننے کی طاقت اسی طرح بحال تھی۔

عاطون کے پاؤں یورائی نے ویسے ہی سنگ مرمر میں ڈوبے رہنے دیئے۔ اس کے پاؤں کے نیچے جو سنگ مرمر کی تہ تھی اس کا ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا دیا تھا اور عاطون کو اٹھا کر ایک مجسمے کی طرح دیوار کے ساتھ لگا دیا اب عاطون سامنے دیکھ سکتا تھا اسے یورائی نظر آیا کہ وہ سامنے کھڑا اس کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے خبیث چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ تھی۔

اس نے عاطون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "اب مجھے اپنی حسینہ، اپنی ملکہ مرگنی کا انتظار ہے۔ اسے پتہ چل گیا ہو گا کہ اس کے حکم کی تعمیل ہو گئی ہے۔ وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچ جائے گی پھر وہ خود آ کر اپنی آنکھوں سے تیرا جائزہ لے گی تو اس پتھر کے اندر صرف دو دن زندہ رہے گا۔ پھر جس طرح دوسری عورتیں اور مرد مجسمہ بننے کے تیسرے روز مر گئے تھے تو بھی مر جائے گا۔"

عاطون کو پہلی بار علم ہوا کہ یورائی اس کی غیر معمولی اور ماورائی طاقت سے باخبر نہیں ہے۔ شاید آسیبی مرگنی نے اسے یہ بات نہیں بتائی تھی۔ مرگنی عاطون، کو صرف اسی صورت میں اپنے قبضے میں کر سکتی تھی اور اس نے خونی مجسمہ ساز یورائی کو اس گھناؤنے کام کے لئے چنا تھا۔ اس کام کے لئے مرگنی کو اس سے بہتر آدمی کہیں نہیں مل سکتا تھا۔ عاطون کی ماورائی طاقت اب اس کے کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔ وہ صرف اپنے ارادے سے کسی شے کو پاش پاش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لئے اسے ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت تھی اور وہ پتھر کے اندر جکڑ دیا گیا تھا۔

یورائی اس کے سامنے ٹہلنے لگا۔ پھر عاطون کی طرف دیکھ کر بولا "مرگنی خود اگر چاہتی تو تمہیں ایک سیکنڈ میں ہلاک کر سکتی تھی مگر نہ جانے اس نے خود یہ کام کیوں نہیں کیا۔ یقیناً" اس میں اس کی کوئی مصلحت ہو گی مگر مجھے خوشی ہے کہ اس کی نظر انتخاب مجھ پر

پڑی۔ اب میں اس کی بے جا عنایات کا بھی حقدار بن گیا ہوں۔ اب جب وہ رات میرے پاس آئے گی تو اس کے حسن کا شعلہ مجھے جلا کر انگارہ بنا دے گا۔" اور خونی مجسمہ ساز یورائی ریچھ کی طرح خرخراتا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پہلی بار اس خونیں کمرے میں عاطون کو وہی منحوس پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ یہ پھڑپھڑاہٹ اتنی تیز تھی کہ عاطون کو اپنے کانوں سے کسی بہت بڑے پرندے کے پر ٹکراتے محسوس ہوئے۔

خونی مجسمہ ساز یورائی، اپنے کمرے میں جاتے ہی فرش پر سیدھا لیٹ گیا۔ اسے اب اپنی حسینہ دلنواز مرگنی کا انتظار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مرگنی دن کی روشنی یا چاندنی رات میں اسکے پاس کبھی نہیں آئی۔ وہ ہمیشہ تاریک اندھیری راتوں میں ہی آیا کرتی ہے۔ ابھی رات ہونے میں کچھ دیر تھی۔ تاہم یورائی ابھی سے مرگنی کا انتظار کرنے لگا جب باہر وادی میں رات کا اندھیرا چھا گیا اور سنگتروں کے باغوں کی طرف سے پراسرار خوشبو آنے لگی تو یورائی نے اٹھ کر مشروب پیا۔ کمرے کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے صرف ایک کھڑکی کھلی رہنے دی جس کا رخ باغ کی طرف تھا۔

یہ اماوس کی رات تھی اور اتنی تاریک کہ آسمان پر ستارے بھی پھیکے پھیکے دکھائی دے رہے تھے۔ یورائی کو یقین تھا کہ آج رات مرگنی ضرور آئے گی۔ ایک تو گھپ اندھیری رات ہے دوسرے اس کے حکم کی تعمیل بھی کر دی گئی تھی۔ آدھی رات کے وقت یورائی نے سنگ مرمر کے ایک گلدان میں تیز خوشبویات سلگا دیں۔ کمرہ ان کی بوجھل مہک سے لبریز ہو گیا۔ اس بوجھل مہک میں ایک عجیب نشہ سا تھا۔ یورائی کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ اس نے موم بتی روشن نہیں کی تھی کیونکہ مرگنی تاریکی کی مخلوق تھی۔ اسے روشنی سے نفرت تھی۔ یورائی کو ایکا ایکی تیز نشہ آلود بخور کی خوشبوؤں میں ایک الگ بو کا احساس ہوا۔ یہ مرگنی کی خاص بو تھی۔ اس کی نگاہیں باغ والی کھڑکی پر لگی تھیں۔ وہاں ایک عورت کا خاک ابھرا جس کے لمبے بال اس کے جسم کو ڈھانپے ہوئے تھے۔

مرگنی کے ایک ہاتھ میں انجیر کے پتوں کی باریک شاخ تھی۔ وہ کھڑکی میں سے گزر کر سیدھی یورائی کے پاس آئی جو دونوں بازو پھیلائے سامنے موجود تھا، مرگنی نے اس کے جسم پر اپنے لمبے بال ڈال دیئے اور کہا "تم نے میرے لئے ایسا کام کیا جو تم ہی کر سکتے تھے میں یم دوت کے آگے سرخرو ہوں۔ اب میں تمہاری ہوں اور تم میرے ہو۔"

یورائی پر بے خودی سی چھانے لگی۔ مرگنی سرگوشی میں بولی "تمہارا پہلا جنم ایک ڈاکو کا تھا جو عورتوں کو ہتیا کرتا تھا۔ تمہارا دوسرا جنم ایک درندے کا ہو گا اور میں لومڑی کی شکل میں تمہیں ملوں گی۔"

جب گلدان کے بخارات جل کر راکھ ہو گئے تو یورائی' مرگنی کو ساتھ لے کر تہ خانے میں عاطون کے بت کے پاس آیا۔ عاطون نے پہلی مرتبہ مرگنی کو وحشی عورت کے روپ میں دیکھا جو تہذیب اور اخلاق کی تمام سرحدوں کو روندتی چلی آئی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح تھیں اس کی سانس کی آواز جلتی آگ سے ملتی جلتی تھی۔ اس کے بال کاندھے پر کھلے تھے۔ یورائی اس کے ساتھ ہی تھا اور عاطون کی طرف فاتحانہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔ مرگنی نے عاطون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور کہا "اس سے زیادہ تم مجھ سے بھاگ نہیں سکتے تھے...." پھر یورائی کی طرف دیکھ کر بولی "جس انسان کو تم پتھر میں بدلتے ہو وہ کتنی دیر زندہ رہتا ہے؟"

یورائی نے اسے بتایا کہ وہ سات روز تک مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے اور اس کی روح پرواز کر جاتی ہے۔

مرگنی کی انکھیں عاطون کے چہرے پر جمی تھیں۔ اس نے یورائی سے کہا "میرے غلیظ عاشق یورائی! میں چاہتی ہوں کہ عاطون سات دن تک اسی مجسمے کی شکل میں رہے۔"

یورائی سر جھکا کر بولا "مرگنی! تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔"

مرگنی نے کہا "مگر اس مجسمے کی کڑی نگرانی کرنی ہوگی۔ میں ایک چلہ کاٹنے یم دوت کے استھان پر کنچن چنگا پربت جا رہی ہوں۔ سات روز بعد واپس آؤں گی۔"

یورائی نے مرگنی کو یقین دلایا کہ عاطون کا مجسمہ اس کے پاس محفوظ اور بحفاظت رہے گا۔ مرگنی انتہائی اشتعال انگیز انداز میں مسکرائی اور یورائی کو گردن سے دبوچ کر تہ خانے سے باہر لے گئی۔ عاطون کو بے بسی کا احساس ہو رہا تھا مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پتھر بنا تہ خانے کی دیوار کے ساتھ لگا سیدھا دیکھ رہا تھا وہ صرف اسی جانب دیکھنے پر مجبور تھا۔ مرگنی دن نکلنے سے پہلے یورائی کے خوشبوؤں سے بوجھل کمرے کی کھڑکی میں سے گزر کر نکل گئی۔ وہ خیال کی رفتار کے ساتھ دوسرے ہی لمحے ہمالیہ کے سلسلے کی پہاڑی کنچن چنگا کی ایک گپھاہ میں تھی جہاں یم اس کی کامیابی پر اسے مبارکباد دینے کے لئے موجود تھا۔

جب عاطون کو گئے دو روز گزر گئے اور وہ واپس نہ آیا تو اچھوت ہندی دوشیزہ کو تشویش ہوئی۔ وہ اسے جاتے وقت بتا گیا تھا کہ وہ اولمپس نامی گاؤں کی طرف جا رہا ہے۔ روہنی کے دل میں عاطون کے لئے بے پناہ ایثار اور احترام تھا۔ وہ اسے کسی مصیبت میں پھنسا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ چنانچہ ایک روز وہ عاطون کی تلاش میں اولمپس گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔ وہ گھوڑے پر سوار تھی۔ وہ کافی عرصے سے ملک روما میں رہ رہی تھی اور رومن زبان سمجھ بول لیتی تھی۔ اسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ عاطون اس گاؤں میں کہاں اور

کس جگہ ہوگا۔ اس نے ایک دکان پر جا کر عاطون کے بارے میں پوچھا مگر اسے دکاندار خاطر خواہ جواب نہ دے سکا۔ روہنی نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ گاؤں سے باہر ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ روہنی گھوڑے پر سے اتر پڑی تو گھوڑا پانی پینے لگا اور روہنی ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ عاطون اگر اس گاؤں میں آیا تو وہ کہاں ہوگا۔

عین اس وقت سنگدل مجسمہ ساز' یورائی کا ادھر سے گزر ہوا۔ وہ کسی ضروری کام سے گاؤں آیا تھا اور اب وہ واپس اپنے گھر جا رہا تھا۔ اس نے ایک سانولی سلونی حسین دوشیزہ کو سائپرس کے درخت سے ٹیک لگائے بیٹھے دیکھا۔ یہ سلونا رنگ روم اور یونان میں نایاب تھا۔ وہ اس رنگ پر فریفتہ ہو گیا۔ فوراً روہنی کے پاس آیا۔ وہ بے حد مکار اور قیافہ شناس تھا۔ روہنی کے چہرے کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ اجنبی لڑکی ضرور کسی کی تلاش میں یہاں آئی ہوگی۔ پاس آکر بڑی خوش اخلاقی سے بولا "اے آکاش کی کی دیوی! تم اگر آسمان سے اتری ہو تو مجھے میزبانی کا شرف بخشو۔ ہو سکتا ہے وہ انسان تمہیں مل جائے جس کی تم تلاش میں ہو۔"

پہلے جملے تو روہنی کی سمجھ میں نہ آئے لیکن آخری جملے پر وہ چونک پڑی۔ نادان لڑکی تھی۔ فوراً ہی بول اٹھی "کیا تم جانتے ہو میرا بھائی عاطون کہاں ہے؟"

اب مجسمہ ساز یورائی کے چونکنے کی باری تھی مگر کائیاں آدمی تھا۔ اپنے محسوسات کو چھپانے میں اسے مکمل مہارت حاصل تھی۔ وہ مسکرانے لگا اور بولا "تمہارا بھائی عاطون تو میرا دوست ہے ابھی صبح منہ اندھیرے ہی کسی کام سے گیا ہے کہتا تھا ایک پہر دن گزرنے کے بعد آؤں گا۔"

روہنی خوشی سے اچھل پڑی "خدا تمہارا بھلا کرے۔ مجھے میرے بھائی سے ملا دو۔ میں تو جگہ جگہ اسے تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔"

یورائی نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور روہنی کا سانولا ہاتھ تھام لیا۔ بولا "محترم دوشیزہ! میرے گھر چلو اور مجھے اپنی خدمت کا موقع دو۔ جب تک عاطون نہیں آتا میرے گھر آرام کرو۔"

روہنی ایک پل کے لئے ہچکچائی لیکن عیار یورائی نے اسے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ دیا اور روہنی کو گھوڑے پر بٹھا کر باگ تھامی اور اس کی پوری دلجوئی کرتا اپنے وادی والے مکان کی طرف چل پڑا۔ روہنی کو یورائی کا چہرہ بڑا بھولا بھالا لگا۔ ویسے بھی وہ اس کے باپ کی عمر کا تھا۔ وہ یورائی سے پوچھنے لگی کہ عاطون دو روز سے گھر واپس نہیں آیا۔ آخر وہ کس مقصد کے لئے یہاں آیا ہے۔

یورائی کاندھے جھٹک کر بولا "عاطون اپنی مرضی کا مالک ہے اس نے مجھے کچھ نہیں

بتایا۔ ایک پہر گزرنے پر آ جائے گا تم اس سے پوچھ لینا۔" اور یورائی مسکرانے لگا مکان کی چاردیواری پر لگے عورتوں اور مردوں کے مجسمے دیکھ کر روہنی نے سوال کیا کہ وہ بت ساز ہے۔

یورائی نے سر جھکا دیا اور بولا "ویسے تو میں ایک کاشتکار ہوں۔ میری مقدونیہ میں زرعی زمین ہے۔ جہاں غلام کام کرتے ہیں لیکن مجھے بت تراشنے کا بے حد شوق ہے۔ یہ کام میں صرف اپنا شوق پورا کرنے کے لئے کرتا ہوں۔ تم ذرا آرام کر لو۔ پھر میں تمہیں اپنے بنائے ہوئے مجسمے دکھاؤں گا۔"

روہنی کے اس سوال پر یورائی نے مسکرا کر کہا "تم تو جانتی ہی ہو وہ سیلانی ادمی ہے کبھی ایک جگہ رات بسر نہیں کرتا ویسے کل رات اس نے اسی کمرے میں گزاری تھی۔ میں تمہارے لئے اپنے باغ کا پھل لاتا ہوں۔"

روہنی نے بہت کہا کہ وہ ناشتہ کر کے آئی ہے لیکن بھلا یورائی اس کی معذرت کیسے قبول کر سکتا تھا فوراً" طشت میں پھل اور پیالے میں دودھ لے کر آ گیا۔

یورائی نے دودھ کا پیالا ہاتھ میں زبردستی تھماتے ہوئے کہا "کم از کم دودھ ہی پی لو۔ عاطون تو مجھ پر سخت ناراض ہو جائے گا کہ میں نے تمہاری کوئی خدمت نہ کی۔ یہ لو' بڑا خوشبودار اور میٹھا دودھ ہے۔"

عاطون کا نام سن کر روہنی نے پیالہ تھام لیا اور سارے کا سارا دودھ پی گئی "یورائی بھائی!دودھ نے مجھے تازہ دم کر دیا ہے۔"

یورائی نے دل میں کہا "ابھی معلوم ہو جائے گا سب کچھ"" لیکن اوپر سے بولا " خالص دودھ تھا روہنی۔ یہ دودھ میں خاص طور پر شہر کے ایک گوالے سے منگواتا ہوں۔ اچھا' اب تم تھوڑی دیر آرام کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

یورائی چلا گیا مگر وہ ایک خفیہ جگہ سے روہنی کو تک رہا تھا۔ روہنی اٹھ کر کھڑکی کے پاس آئی اور باہر باغ میں دیکھنے لگی۔ باغ میں سنہری دھوپ درختوں پر چمک رہی تھی۔ وادی میں دور ایک سفید مکان میں سے دھوئیں کی پتلی سی لکیر اوپر اٹھ رہی تھی روہنی کو اپنی آنکھیں بوجھل ہوتی محسوس ہوئیں۔ اسے یوں لگا جیسے نیند آ رہی ہے۔ اس نے سوچا شاید یہ رات جاگنے کا اثر ہے اسے کچھ دیر کے لئے سو جانا چاہئے تب تک عاطون بھی آ جائے گا۔

روہنی قالین پر ایک طرف کروٹ بدل کر لیٹ گئی پھر اسے اپنے جسم میں ہلکی ہلکی اینٹھن سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے قالین پر اپنا جسم بالکل سیدھا کر لیا۔ ایسا کرنے سے

روہنی کو بے حد تسکین ملی۔ اب وہ قالین پر بالکل سیدھی چت لیٹی ہوئی تھی۔ بازو پہلوؤں کے ساتھ لگے تھے روہنی کی آنکھوں سے نیند جیسے غائب ہو گئی۔ روہنی تعجب کرنے لگی کہ اچانک اس کی آنکھوں سے نیند کے بادل کیسے چھٹ گئے۔ وہ اٹھ کر بیٹھنا چاہتی تھی کہ اسے محسوس ہوا کہ اس کا جسم حرکت نہیں کر سکتا۔ روہنی نے اپنا بازو اوپر اٹھانا چاہا تو اس کے بازو نے اوپر اٹھنے سے انکار کر دیا۔ روہنی کو پسینہ آ گیا۔ اس نے یورائی کو آواز دینے کے لئے منہ کھولنا چاہا مگر نہ تو اپنا منہ کھول سکی اور نہ اس کے حلق سے کسی قسم کی آواز نکل سکی۔ روہنی کا دل خوف اور دہشت کے مارے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کیا اسے دودھ میں کچھ پلا دیا گیا تھا۔ کاش وہ اس اجنبی کے ہاتھوں کوئی شے لے کر نہ پیتی۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔

روہنی اپنے جسم کو حرکت دینے کی جتنی بھی کوشش کرتی اسی قدر اس کا جسم سن ہوتا جاتا۔ دوسرے لمحے روہنی نے محسوس کیا کہ وہ اپنی آنکھوں کی پلکیں بھی نہیں ہلا سکتی مگر اس کا ذہن متحرک اور زندہ تھا۔ وہ سوچ سکتی تھی۔ سن سکتی تھی۔ محسوس کر سکتی تھی۔ اتنے میں عیار یورائی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پتھر کا چھوٹا سا پیالہ تھا جس میں بخور سلگ رہے تھے اور آنکھوں میں گھناؤنی چمک تھی۔ روہنی کے سامنے اس کا اصل روپ ظاہر ہو گیا تھا وہ اسے بہت کوسنا چاہتی تھی مگر ایک لفظ بھی حلق سے ادا نہیں کر سکتی تھی۔ روہنی کو اپنی آنکھوں کے پیچھے بے بسی کے آنسوؤں کی حرارت کا احساس ہوا مگر یہ آنسو اس کی آنکھوں میں نہیں آ سکتے تھے۔ اس کی آنکھیں ابھی تک بہت ست روی کے ساتھ دائیں بائیں حرکت کر سکتی تھی۔

یورائی نے بخور کا پیالہ روہنی کے پاس قالین پر رکھ دیا اور کھڑکی بند کر دی کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ روہنی کی رگوں میں خون کی گردش کا احساس موجود تھا۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ یورائی کے ہاتھوں کے لمس سے روہنی کے جسم میں ایک قابل نفرین تھرتھراہٹ دوڑ گئی۔ اس پر یورائی کی خباثت' دھوکے بازی اور فریب کا پول کھل چکا تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھتی تھی کہ آخر یہ خبیث اس سے کیا چاہتا ہے اور اس نے کس لئے اسے زندہ لاش میں تبدیل کر دیا ہے۔ پھر بہت جلد روہنی کو یہ بھی معلوم ہو گیا جب دو حبشی غلام روہنی کو لے کر تہ خانے والے کمرے کے حوض کے پاس لے کر گئے تو روہنی کی نگاہ عاطون پر پڑی جو مجسمے کی شکل میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ روہنی دنگ سی ہو کر رہ گئی۔ تو کیا اس شیطان نے عاطون کو بھی مجسمے میں تبدیل کر رکھا ہے؟ غلام چلے گئے یورائی مجسمہ ساز نے سارا عمل دہرایا۔ جب حوض میں سنگ مرمر کے برادے کا محلول تیار ہو گیا تو اس نے روہنی کو تختے پر سے دھکیل کر حوض میں بالکل سیدھا

گرا دیا۔

دن کے دوسرے پہر روہنی بھی انسانی مجسمے کی شکل میں عاطون کے پاس ہی کھڑی تھی۔ یورائی اس سالونی لڑکی روہنی کے سالونے سلونے مجسمے کو بڑی محبت اور عقیدت سے دیکھتے ہوئے بولا "تم ہندی آسمان کی اپسرا ہو۔ مرگنی بھی آکاش کی اپسرا ہے وہ جب تمہیں دیکھے گی تو بہت خوش ہوگی" پھر عاطون کی طرف دیکھ کر بولا "عاطون یہ کہتی ہے میں تمہاری بہن ہوں۔ میں تمہاری بہن کو بھی تمہارے پاس لے آیا ہوں تاکہ تم اداس نہ ہو۔" اور قہقہہ لگاتا ہوا تہ خانے سے چلا گیا۔

تہ خانے میں ایک اذیت ناک خاموشی چھا گئی۔ عاطون صرف آنکھوں کے کنارے سے ہی روہنی کے انسانی مجسمے کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ دل میں افسوس کر رہا تھا کہ روہنی نے اس کی طرف آنے کی غلطی کیوں کی روہنی بھی بائیں آنکھ کے گوشے ہی سے عاطون کے ایک پہلو کو دیکھ سکتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے بارے میں ہی سوچ رہے تھے مگر ایک دوسرے سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر پتھر کے بت بنے ساکت کھڑے تھے۔

پدم ناگ اس وقت ایک بادبانی جہاز میں انسانی شکل میں سفر کر رہا تھا کہ جہاز کو سمندری طوفان نے آ لیا اور جہاز تنکے کی طرح ڈولنے لگا۔ پدم ناگ نے سانپ کا روپ بدلا اور ہیجان آمیز موجوں میں چھلانگ لگا دی۔ ایک دن اور ایک رات سمندر میں تیرتے رہنے کے بعد پدم ناگ ملک روم کے مضافاتی ساحل پر نکل آیا۔ کنارے پر آتے ہی وہ انسانی شکل میں آ گیا اور سنہری دھوپ میں دور نظر آتی ایک سفید گنبد والی عمارت کی طرف چل پڑا۔ اس عمارت کے پیچھے دور پہاڑیوں پر اور پہاڑیوں کے درمیان وادی میں ایک بہت بڑے شہر کے مکانات پھیلے ہوئے تھے۔ پدم ناگ سمجھ گیا کہ وہ کسی بڑے شہر میں پہنچ گیا۔ چھوٹی عمارت کسی خانقاہ سے ملتی جلتی تھی پدم ناگ خانقاہ کے پاس آیا تو ایک بزرگ صورت رومی پجاری کو خانقاہ سے باہر نکلتے دیکھا یہ وہی خانقاہ تھی جہاں مصری روایات کے حامل گروہ لوگ سانپ اور بلی کے بت کی پوجا کرتے تھے اور یہی وہ سانپ کا بت تھا جس کے جسم میں داخل ہو کر مرگنی نے عاطون کو دھوکے سے یورائی مجسمہ ساز کے پاس پہنچا دیا تھا۔

بزرگ رومی پجاری نے پدم ناگ کو خوش آمدید کہا وہ یہی سمجھا کہ یہ نوجوان بھی اسی کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن جب پدم ناگ نے بزرگ رومی پجاری سے پوچھا کہ یہ کون سا شہر ہے تو معلوم ہوا کہ نوجوان شہر میں نووارد ہے۔ رومی پجاری نے شفیق لہجے میں کہا "بیٹا تم اس وقت عظیم الشان رومی سلطنت کے دارالحکومت روما کے مضافات میں کھڑے ہو۔"

"اور یہ خانقاہ کس کی ہے؟ پدم ناگ نے سوال کیا۔"

رومی پجاری بولا "ہم لوگ روم والوں کے دیوتاؤں کو بھی مانتے ہیں اور اپنے دیوی دیوتاؤں کو بھی پوجتے ہیں یہ ہماری خانقاہ ہے تمہارا نام کیا ہے بیٹا۔"

پدم ناگ نے کہا "میرا نام پدم ہے ــــ اور میرا تعلق ملک ہندوستان سے ہے۔"

بزرگ پجاری بولا "وہ تو تمہاری شکل و صورت اور رنگ ہی سے ظاہر ہو رہا ہے۔ تم تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔ اگر پسند کرو تو خانقاہ کی کوٹھری میں کچھ دیر آرام کر سکتے ہو۔ کیا تم دودھ روٹی کھانا پسند کرو گے۔"

پدم ناگ، روم کے بارے میں مزید کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے بزرگ پجاری کی میزبانی قبول کر لی۔ اس نے کہا "محترم! کیا میں آپ کے دیوی، دیوتا کے درشن کر سکتا ہوں۔"

"کیوں نہیں بیٹا۔ آؤ اندر آ جاؤ" بزرگ پجاری پدم ناگ کو خانقاہ کے اس چھوٹے سے کمرے میں لے آیا اور جہاں استھان پر بلی اور سیاہ ناگ کے بت ساتھ ساتھ رکھے تھے۔ اور ان کے سامنے تازہ پھول پڑے تھے۔ پدم ناگ نے سانپ کے بت کی طرف دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ سانپ کے بت میں ایک ہلکی سی تھرتھراہٹ پیدا ہوئی ہے۔ پدم ناگ زمین اور سمندر میں رہنے والے تمام سانپوں کا عظیم دیوتا تھا اور ہر سانپ خواہ وہ پتھر ہی کا کیوں نہ ہو اس کی تعظیم کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ پدم ناگ کے لئے سانپ اور بلی کے ان بتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بزرگ پجاری ساتھ ایک خالی کوٹھری میں آ گیا جہاں لکڑی کے تخت پر قالین کا ٹکڑا بچھا تھا پدم ناگ بیٹھ گیا۔

بزرگ پجاری اس کے لئے لکڑی کے پیالے میں دودھ لے آیا جس میں روٹی کے ٹکڑے بھگوئے ہوئے تھے۔ پدم ناگ کو بھوک نہیں لگی تھی لیکن وہ اپنے شریف النفس میزبان کا دل رکھنے کے لئے دودھ میں بگوئی ہوئی روٹی کھانے لگا۔ بزرگ نے پدم ناگ سے پوچھا کہ وہ ہندوستان سے کب چلا تھا؟

پدم ناگ نے یونہی ایک فرضی داستان سفر اسے سنا دی پھر سوال کیا "محترم پجاری ہمارے ملک ہندوستان میں بھی لوگ سانپوں کے بت بنا کر ان کی پوجا کرتے ہیں مگر ان کا عقیدہ یہ ہے کہ سانپ کا بت پورنماشی کی رات کو زندہ ہو کر ان کے بگڑے کام سنوار دیتا ہے۔ کیا آپ کا یہ بت بھی کوئی ایسا کرشمہ دکھاتا ہے؟"

بزرگ پجاری نے بڑے احترام سے کہا "بیٹا ہمارے سانپ دیوتا کا ایک چلہ ہے۔ اگر کوئی یہ چلہ کاٹے تو ہمارا دیوتا اس کے سوال کو پورا کر دیتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ملک مصر

کا ایک نوجوان یہاں آیا تھا۔ اسے اپنے کسی گمشدہ دوست کی تلاش تھی۔ میں نے اسے چلے کے اشلوک بتائے۔ اس نے چلہ کیا اور اس کا کہنا تھا سانپ دیوتا نے اس کو اس کے دوست کا پتا بتا دیا تھا۔"

پدم ناگ کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے خیال آیا کہ کہیں وہ مصری نوجوان عاطون تو نہیں تھا۔ اس نے بزرگ پجاری سے اس نوجوان کا حلیہ دریافت کیا تو وہ ہو بہو عاطون کا حلیہ تھا۔

بزرگ پجاری نے پوچھا کیا تم اسے جانتے ہو بیٹا؟

ہاں بابا۔ وہ میرا دوست بھی ہے میں بھی اسی کی تلاش میں ہوں۔

بزرگ پجاری سوچ میں پڑ گیا پھر بولا "تو میں تمہیں وہ اشلوک بتائے دیتا ہوں تم بھی ہمارے مقدس سانپ دیوتا کا چلہ کاٹو۔ ہمارا دیوتا تمہاری ضرور رہنمائی کرے گا اور تمہارے دوست کا علم ہو جائے گا۔"

پدم ناگ کو کسی سانپ سے بات کرنے کے لئے چلہ کاٹنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ سانپ پتھر تھا۔ پتھر کا بت تھا اور پھر پدم ناگ اس بزرگ پجاری پر یونہی اپنی غیر معمولی ماروائی طاقت کا راز ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے پجاری کی ہدایات پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ پجاری نے اسے بتایا کہ تین دن کے بعد ایسی رات آئے گی جب وہ چلہ کاٹ کر مقدس دیوتا سے ہم کلام ہو سکے گا۔ پدم ناگ کو عاطون کا ٹھکانہ معلوم کرنے کی اشد ضرورت تھی چنانچہ اس نے سوچا کہ اسی خانقاہ میں رہ کر مقدس سانپ سے بات کرنے والی رات کا انتظار کرنا چاہئے۔

دوسری طرف جب سات دن پورے ہو گئے تو مرگنی، کنچن چنگا کی پہاڑی گپھا سے نکل کر سیدھی یورائی کے مکان پر جا پہنچی۔ حسب معمول اس وقت آدھی رات کا سے تھا اور رات بے حد تاریک تھی۔ مجسمہ ساز یورائی کو مرگنی کی آمد کی فوراً خبر ہو گئی اس نے خاص قسم کی ناگوار بو کو محسوس کر لیا تھا۔ پھر مرگنی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور بولی "نرک میں رہنے والے عاشق! میں اپنی امانت لینے آئی ہوں۔ میرے ساتھ چلو"

یورائی کے ساتھ مرگنی تہ خانے والے کمرے میں پہنچی تو وہاں روہنی کے مجسمے کو دیکھ کر بولی "یہ یہاں کیسے آ گئی۔"

عیار مجسمہ ساز بولا "یہ تمہارے شکار عاطون کی تلاش میں آئی تھی کہ میں نے اسے شکار کر لیا" اور پھر وہ خباثت سے ہنسنے لگا یہ الفاظ عاطون اور روہنی نے بھی سنے۔ دونوں گوشہ چشم سے مرگنی کو تک رہے تھے۔

مرگنی عاطون کے سامنے آ گئی اور بولی "عاطون! میں چار جنموں سے تیری تلاش میں

تھی۔ تیری ماروائی طاقت مجھے درکار تھی مگر تو میرے قابو میں نہیں آیا۔ اس جنم میں میں تجھے اپنا مفتوح بنانے میں کامیاب ہو گئی ہوں اب تو نہ صرف یہ کہ میرا غلام ہو گا بلکہ تیری ساری ماروائی طاقت تجھ سے چھن جائے گی۔"

روہنی نے یہ سنا تو حیرت زدہ ہو کر رہ گئی۔ یہ عورت' عاطون کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنا چکی تھی۔ عاطون خاموش تھا وہ اس قسم کے تجربے سے پہلے کبھی نہیں گزرا تھا مگر اس نے اپنے آپ کو رضائے الٰہی پر چھوڑ دیا تھا وہ اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

مرگنی نے اپنی انگلی میں سیاہ عقیق کی ایک انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ یہ سیاہ عقیق گول اور ابھرا ہوا تھا۔ جیسے ننھا سا سیاہ اہرام ہو۔ یورائی مجسمہ ساز ایک طرف دبکا ہوا کھڑا تھا۔ وہ مرگنی کی آسیبی طاقت سے واقف تھا مرگنی نے سیاہ عقیق کی انگوٹھی انگلی سے اتار کر اسے عاطون کے مجسمے کے بازو سے تین بار رگڑا۔ تیسری بار رگڑنے سے عاطون کے مجسمے میں لرزش پیدا ہوئی اور پھر وہ استھان پر سے غائب ہو گیا۔ روہنی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی کیونکہ وہ اس کے پہلو میں کھڑی تھی مرگنی نے یورائی کی طرف متوجہ ہو کر کہا "سات دن پورے ہو جانے کے بعد اس بت کے اندر بند عاطون مر گیا ہے مگر اب اس کی لاش میری انگوٹھی کے نگینے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مدفون ہو گئی ہے۔"

مرگنی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر یورائی کو انگوٹھی دکھائی یورائی نے غور سے دیکھا تو اسے سیاہ عقیق کے اندر عاطون کا مجسمہ نظر آیا جو بے حد ننھا سا بن چکا تھا۔ مرگنی نے روہنی کی طرف اشارہ کیا اور بولی "اس کی موت میں کتنے روز باقی ہیں۔"

یورائی مجسمہ ساز نے کہا "میری آتشیں محبوبہ مرگنی! اس سانولی لڑکی کو بت بنے آج تیسرا روز ہے اس کی موت میں ابھی چار روز باقی ہیں۔"

مرگنی نے یورائی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے دروازے کی طرف لے جاتی ہوئی بولی "یہ عورت اپنی موت آپ مر جائے گی اور تمہارے مجسموں میں ایک سانولی عورت کے مجسمے کا اضافہ ہو جائے گا۔ اب تم کس قسم کی عورت کا شکار کرنا چاہتے ہو۔"

یورائی نے مرگنی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیا اور بولا "میں حبشہ کی کسی ایسی سیاہ فام عورت کا شکار کرنا چاہتا ہوں جو تاریک رات میں دکھائی نہ دے اور جس کے ہونٹ انجیر کی طرح سیاہ ہوں۔" مرگنی نے یورائی کی طرف دیکھ کر ایک مکروہ قہقہہ بلند کیا اور غائب ہو گئی۔

اندھیری رات میں پدم ناگ خانقاہ کی کوٹھری میں سانپ دیوتا کے سامنے بیٹھ گیا۔ بزرگ پجاری چاندی کا چراغ دان روشن کر گیا تھا۔ بخور سلگ رہے تھے۔ پدم ناگ نے ابھی

اشلوک پڑھا ہی تھا کہ سانپ کے بت میں حرکت ہوئی۔ وہ زرا سا جھک گیا جیسے پدم ناگ دیوتا کی تعظیم کر رہا ہو۔ پھر اس کی دھیمی آواز پدم ناگ کو سنائی دی "عظیم ناگ دیوتا! آپ کو اشلوک پڑھنے کی کیا ضرورت تھی میں آپ کا داس ہوں۔ مجھے حکم دیجئے کہ میں اپ کی کیا خدمت بجا لا سکتا ہوں۔"

پدم ناگ نے کہا "یہاں کچھ روز پہلے ایک نوجوان نے تمہارا چلہ کیا تھا میں یہ پتہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس نوجوان کو تم نے کس طرف روانہ کیا تھا؟"

سانپ کے بت کی انتہائی عاجزانہ آواز آئی "عظیم پدم ناگ! اس وقت میں نہیں بول رہا تھا۔ مجھ پر مرگنی نام کی ایک راکھشنی کا آسیب سوار تھا۔ اس نوجوان سے میں نہیں بلکہ مرگنی کا آسیب بول رہا تھا اور مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اس نوجوان نے مجھ سے آپ ہی کے بارے میں پوچھا تھا"

پدم ناگ نے جلدی سے کہا "پھر تم نے اسے کہاں روانہ کیا تھا؟"

سانپ دیوتا نے بڑے ادب سے کہا "عظیم دیوتا! میں نے نہیں بلکہ میرے وجود میں حلول کی ہوئی راکھشنی مرگنی نے اسے کہا تھا کہ پدم ناگ دیوتا اولمپس نامی گاؤں کے قریب رہنے والے ایک مجسمہ ساز کے ہاں ملاقات کرنے آتا ہے۔ تم وہاں جاؤ۔ وہاں تمہاری ملاقات پدم ناگ سے ہو جائے گی۔"

"اور پھر وہ نوجوان چلا گیا" پدم ناگ نے بے تابی سے پوچھا

سانپ دیوتا نے جواب دیا "بجا ارشاد فرمایا عظیم ناگ دیوتا!" پھر وہ نوجوان اس خانقاہ سے چلا گیا تھا اور دوبارہ میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔

پدم ناگ نے سر جھکا لیا۔ وہ گہری سوچ میں گم تھا کچھ دیر بعد گردن اٹھائی۔ پتھر کے سانپ کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا "میرے اور تمہارے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں وہ کسی کو نہ بتانا" یہ کہہ کر پدم ناگ اٹھ کر اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔ باقی ساری رات وہ عاطون کے بارے میں غور کرتا رہا کہ وہ مجسمہ ساز کے پاس اگر رہتا ہے تو یہاں تک اس کی دھیمی دھیمی خوشبو ضرور آنی چاہئے کیونکہ پتھر کے سانپ کے بقول اولمپس نامی گاؤں یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں باقی رات بھی گزر گئی۔

صبح ہوئی تو بزرگ رومی پجاری پدم ناگ کے لئے دودھ لے کر آیا اور اس سے رات کے چلے کے بارے میں دریافت کیا تو پدم ناگ مسکرا دیا۔ اس نے پجاری کو کچھ نہ بتایا اور بات ٹال دی۔ اس کے بعد شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔ وہ سانپ کے بتائے ہوئے اولمپس نامی گاؤں میں پہنچا۔ یہاں اسے اس مجسمہ ساز کی تلاش تھی جس کے پاس

مرگنی راکھشنی نے عاطون کو بھیجا تھا۔ پدم ناگ کو مجسمہ ساز کا نام نہیں معلوم تھا۔ تاہم ایک چھوٹے گاؤں میں مجسمہ ساز کا پتہ لگانا کوئی دشوار کام نہیں تھا۔ پدم ناگ نے ایک دکاندار سے پوچھا کہ یہاں کوئی بت تراش رہتا ہے؟

دکاندار نے بتایا کہ باہر وادی میں ایک مجسمہ ساز رہتا ہے جس کا نام یورائی ہے مگر وہ پراسرار آدمی ہے اور کسی سے ملتا جلتا نہیں۔ پدم ناگ کے لئے اتنی معلومات کافی تھیں۔

وہ خاموشی سے اس پگڈنڈی پر چل پڑا جو گاؤں کے مشرق میں واقع وادی کی طرف جاتی تھی۔ اس پگڈنڈی پر کہیں کہیں سرو کے درخت اگے ہوئے تھے۔ وادی میں پہنچتے ہی پدم ناگ کی نگاہ درختوں کے درمیان بنی ہوئی پتھر کی ایک چار دیواری پر پڑی جس کی دیواروں پر جگہ جگہ مجسمے نصب تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ مجسمہ ساز کا گھر یہی ہے۔ مرگنی ایک آسیبی عورت تھی اور اس کے دھوکے سے عاطون کو اس مجسمہ ساز کے پاس بھیجا تھا۔ ظاہر ہے عاطون کے ساتھ کوئی بہت بڑا فریب کھیلا گیا تھا۔ اس اعتبار سے عام حالات میں پدم ناگ کو مجسمہ ساز سے عاطون کی خیر خیریت معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔ پدم ناگ غیر معمولی حالت کے ساتھ وہاں جانا چاہئے تھا۔ اور اس کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ اپنی شکل بدل کر کسی دوسرے روپ میں وہاں جائے اور عاطون کا کھوج لگانے کی کوشش کرے۔ پدم ناگ کو خیال آیا کہ یہ بت تراش لوگ ایسی عورتوں کے مجسمے بنانے میں بڑے اشتیاق کا مظاہرہ کرتے ہیں جن کے جسم سڈول اور دیوداسیوں جیسے ہوں۔ یہ بات ہندی دیومالا سے بھی ثابت ہوتی تھی۔

اسی لمحے پدم ناگ نے فیصلہ کیا کہ وہ جنوبی ہند کے مندروں میں رہنے والی کسی پرکشش جسم والی دیوداسی کا روپ دھار کر بت تراش کے پاس جائے گا۔ چنانچہ پدم ناگ نے ایک خاص منتر پڑھ کر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ذہن میں جنوبی ہند کی قدیم غاروں میں تراشی ہوئی حسین دیوداسیوں میں سے ایک دیوداسی کا تصور کیا اور زمین سے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر اپنے جسم پر ڈالی۔ اسے ایک معمولی سا جھٹکا لگا اور دوسرے ہی لمحے وہاں پدم ناگ مرد کی جگہ ایک سیاہ فام مگر انتہائی پرکشش متناسب جسم والی عورت کھڑی تھی جس نے دیوداسیوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ مسکرایا اور مکان کی چاردیواری کی طرف بڑھا۔ چار دیواری کا دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازہ زرا سا کھول کر اندر دیکھا۔ زمین پر خشک گھاس اگی ہوئی تھی۔ درمیان میں ایک فوارہ تھا جو خشک پڑا تھا۔ ایک عجیب ویرانی برس رہی تھی۔ سامنے ایک دومنزلہ مکان تھا جس کی دیواریں بوسیدہ ہو چکی تھیں۔

پدم ناگ صحن میں آ گیا۔ خشک گھاس پر چلتا مکان کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ

اندر سے بند تھا۔ دروازے کے باہر بھی ایک عورت کا آدھا مجسمہ پڑا ہوا تھا۔ اس مجسمے پر گرد جم رہی تھی، پدم ناگ نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ آیا تین چار بار دستک دینے کے بعد کسی شخص کے غراتے ہوئے دروازے کی طرف آنے کی آواز آئی پھر کوئی چلایا "کون بدتمیز ہے باہر؟"

پدم ناگ نے ایک عورت کی مترنم آواز میں کہا "میں پردیسی ہوں۔ راستہ بھول گئی ہوں۔"

ایک دم سے دروازہ کھل گیا۔ پدم ناگ نے غور سے دیکھا اس کے سامنے کھچڑی بالوں والا ٹھگنے قد کا ایک بدہیئت آدمی کھڑا تھا جس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ عورتوں کا شکاری ہے۔ یہ مجسمہ ساز یورائی تھا۔

یورائی نے جو دروازے میں ایک سیاہ فام، صحت مند، متناسب بدن اور سیاہ خواب آلود آنکھوں والی جوان عورت کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا خواب اتنی جلدی پورا ہو سکتا ہے وہ اس سیاہ فام عورت کا مجسمہ بنائے گا۔ اس نے آواز کو انتہائی بااخلاق اور مہذب بناتے ہوئے کہا "اندر آ جاؤ، اندر آ جاؤ۔ تم کہاں سے آئی ہو؟ فکر مت کرو میں تمہیں خود تمہارے گھر پہنچا آؤں گا۔ تم پردیسی عورت لگتی ہو؟"

"جی ہاں" پدم ناگ نے کہا "میں ملک ہندوستان کی رہنے والی ہوں۔ میرا نام شتاولی ہے۔ میں رقاصہ ہوں۔ اپنے قبیلے کے ساتھ روم آئی تھی۔ صبح کی سیر کرنے اکیلی نکلی تو راستہ بھول گئی۔"

یورائی اسے پلک جھپکنے میں دوسری منزل والے خاص کمرے میں لے گیا۔ پدم ناگ بظاہر ہچکچانے کی اداکاری کر رہا تھا یورائی اسے بار بار تسلی دے رہا تھا کہ وہ خود اسے اس کے آدمیوں کے پاس چھوڑ آئے گا "تم تھوڑی دیر یہاں آرام کر لو پھر میں تمہیں ساتھ لے چلوں گا اور تمہارے آدمیوں کے پاس پہنچا دوں گا۔ ٹھہرو میں تمہارے لئے دودھ لاتا ہوں۔ تم تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔"

پدم ناگ بڑی ادا سے قالین پر تکیے کے سہارے لیٹ کر بولا "میں تھک گئی ہوں"

یورائی چشم زدن میں باہر گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دودھ کا پیالہ تھا مگر اس پیالے میں وہ دودھ نہیں تھا جو یورائی نے عاطون اور روہنی کو پلایا تھا۔ اس میں ایسا دودھ تھا جس میں روم کا سفید کیف آور مشروب ملا ہوا تھا۔ پدم ناگ جانتا تھا کہ اس پر کسی زہریا خواب آور شے کا اثر نہیں ہو سکتا چنانچہ وہ پی گیا۔ یورائی اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا اور اس کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے بولا "شتاولی! تم مجھے ہندی آسمان کی اپسرا لگتی ہو۔

تمہارا جسم سیاہ فام جسم دیوداسیوں کی یاد دلاتا ہے میں تمہارا مجسمہ بناؤں گا۔"

لیکن یورائی مجسمہ ساز نے یہ طے کر لیا تھا وہ اس سیاہ فام عورت کو پتھر کے مجسمے میں تبدیل نہیں کرے گا بلکہ اسے اپنے پاس ہی رکھے گا اور اسے سونے، چاندی کے گہنوں سے لاد دے گا۔ اس کا اظہار اس نے پدم ناگ سے بھی کیا اور کہا "شتاولی! میں تمہارے حسن پر فریفتہ ہو گیا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم میرے پاس ہی رہ جاؤ۔ میں تمہیں سونے، چاندی اور ہیرے جواہرات سے لادوں گا۔ تم مہارانی بن کر میرے ہاں عیش کرو گی۔"

پدم ناگ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا وہ تو اسی مقصد کے لئے وہاں آیا تھا۔ پہلے تو اس نے بڑے ناز نخرے کئے۔ اپنے قبیلے کے آدمیوں کے بارے میں کہا کہ وہ بڑے بدمعاش قسم کے لوگ ہیں۔ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

یورائی نے پدم ناگ کا ہاتھ تھام لیا اور بولا "شتاولی! تم میری طاقت سے واقف نہیں ہو۔ میرے قبضے میں ایک ایسی چڑیل ہے جو میرا ہر حکم مانتی ہے۔ وہ تمہارے دشمنوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گی۔ بولو شتاولی کیا میرے پاس رہو گی میں تمہارا عاشق ہوں میں تمہیں ملکہ بنا دوں گا۔"

پدم ناگ سمجھ گیا کہ بد طینت مجسمہ ساز جس چڑیل کا ذکر کر رہا ہے وہ مرگنی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ عاطون کی پراسرار گمشدگی میں مرگنی نے اہم کردار ادا کیا تھا اور وہ اس سازش میں کلیدی حیثیت رکھتی تھی۔ پدم ناگ نے مسکرا کر یورائی کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور کہا "مجھے ہیروں کا ہار لا کر دو گے نا۔"

یورائی تو پدم ناگ کے سامنے بچھ بچھ گیا "میں تمہیں اتنے ہیرے جواہرات لا کر دوں گا کہ تم دنگ رہ جاؤ گی۔ وعدہ کرو کہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گی۔"

پدم ناگ بولا "اگر میرے قبیلے کے لوگ مجھے تلاش کرنے آ گئے تو کیا ہو گا؟"

یورائی نے سینے پر ہاتھ مارا اور بولا "میں ان میں سے ایک ایک سے نپٹ لوں گا۔ یہ بات تم مجھ پر چھوڑو شتاولی۔ وہ تمہارے قریب بھی نہیں پھٹک سکیں گے۔"

پدم ناگ نے اپنے بازو یورائی کے گلے میں ڈال دیئے "تو پھر میں تمہاری ہوں۔"

یورائی خوشی سے جھوم اٹھا۔ پدم ناگ پر تو سفید نشہ اور مشروب والے دودھ کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا مگر یورائی بہک رہا تھا مگر پدم ناگ پوری طرح سے چوکس تھا۔ اس نے یورائی کا ہاتھ جھٹک دیا اور کہا "پہلے مجھے ہیروں کا ہار لا کر دو۔ پھر میرے پاس آنا"

یورائی نے اپنا سر تھام لیا۔ وہ ریچھ کی طرح لمبے لمبے سانس لینے لگا پھر اٹھا اور بولا

"میں ابھی تمہارے لئے ہار لے کر آتا ہوں مگر تم یہاں سے اکیلی باہر مت جانا۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گی" پدم ناگ نے گردن ایک طرف خاص انداز سے ڈھلکاتے ہوئے کہا یورائی مجسمہ ساز تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ وہ شہر میں موجود اپنے ایک دولت مند دوست سے ہیروں کا ہار لینے جا رہا تھا۔

پدم ناگ نے اسے کھڑکی میں سے گھوڑے پر سوار مکان کی چاردیواری سے نکلتے دیکھا تو تیزی سے دروازے کی طرف آیا۔ دروازے پر باہر سے تالا لگا تھا۔ پدم ناگ کے لئے تالا کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ سانپ کی شکل میں دروازے کے ایک سوراخ میں سے دوسری طرف نکل گیا۔ اس نے سارے مکان میں گھوم پھر کر دیکھا۔ وہاں کوئی انسان نہیں تھا۔ ایک کوٹھری میں کھانے پینے کا سامان بھرا تھا۔

پدم ناگ نچلی منزل میں آیا تو اس نے دیکھا کہ ایک زینہ نیچے کسی تہ خانے کی طرف جا رہا ہے۔ وہ سانپ کے روپ میں تھا۔ زینہ اتر کر تہ خانے میں آیا تو دیکھا کہ ایک کشادہ کمرہ ہے جہاں دیوار کے ساتھ مجسمے کھڑے ہیں۔ پدم ناگ نے پھنکار مار کر فوراً اپنی روانہ انسانی شکل اختیار کی اور مجسموں کے قریب آ کر انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ چھت والے روشندان میں سے دن کی روشنی ان مجسموں پر پڑ رہی تھی۔ پدم ناگ یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ سارے کے سارے مجسمے زندہ لگ رہے تھے۔ ان کے قد بھی عام انسانی عورتوں اور مردوں کے قد تھے اور جسم کا رنگ اور آنکھوں کی چمک بھی زندہ انسانوں جیسی تھی۔ پدم ناگ نے ایک ایک مجسمے کو ہاتھ لگا کر دیکھا مگر وہ پتھر کے مجسمے تھے۔ پدم ناگ نے محسوس کیا کہ تقریباً سب ہی مجسموں کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی صرف ایک عورت کا مجسمہ ایسا تھا جس کی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جیسے وہ سب کچھ دیکھ رہی ہو۔

پدم ناگ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا جھک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور کہا "کیا تم مجھے دیکھ رہی ہو؟ مجھے سن رہی ہو؟"

یہ روہنی کا مجسمہ تھا۔ روہنی اس نوجوان کی آواز بھی سن رہی تھی اور اسے دیکھ بھی رہی تھی۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ عاطون کا جگری یار پدم ناگ ہے۔ روہنی کوئی جواب نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے جسم کی طاقت اور گرمی آہستہ آہستہ زائل ہو رہی تھی۔ اس کی موت صرف دو ایک روز ہی رہ گئے تھے۔

پدم ناگ نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ یہ عورت پتھر کے اندر زندہ ہے۔ پدم ناگ نے فوراً اپنی جون بدلی اور سانپ کی شکل میں آ گیا۔ روہنی ایک نوجوان کو سانپ کی شکل میں بدلتے دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ پدم ناگ نے اپنا پھن فرش سے کوئی پانچ فٹ اوپر اٹھایا

اور مجسمے کے چہرے کے بالکل سامنے لا کر پھنکار ماری۔ اس پھنکار میں کچھ ایسی گرمی اور اثر انگیزی تھی کہ روہنی کے مجسمے کا سارا پتھر پگھل کر موم کی طرح بہہ گیا اور نیچے سے زندہ انسانی شکل میں روہنی نمودار ہو گئی۔ روہنی اپنے سامنے پھن اٹھائے سانپ کو دیکھ کر ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ پدم ناگ نے سانس کھینچا اور انسان کے روپ میں آ گیا۔ روہنی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پدم ناگ نے کہا "میری بہن! مجھ سے ڈرو نہیں۔ اب جب کہ تم نے مجھے انسان سے سانپ اور سانپ سے انسان بنتے دیکھ لیا ہے تو سنو میرا نام پدم ناگ ہے۔ میں ناگوں کا دیوتا ہوں۔ مگر تم یہ بتاؤ تمہیں یہاں کس نے پتھر میں بند کر کے کھڑا کر دیا تھا اور یہ باقی مجسمے بھی کیا تمہاری طرح انسان ہیں؟"

روہنی، پدم ناگ کے قدموں میں سجدہ ریز ہو گئی اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی "مہاراج! آپ نے مجھے دوبارہ زندگی دی ہے میں آپ کی داسی ہوں۔ میرا نام روہنی ہے۔ میں ملک ہندوستان کی رہنے والی اچھوت کنیا ہوں اور اپنے بھائی عاطون کے ساتھ یہاں آئی تھی کہ ۔۔"

"عاطون" پدم ناگ چونک پڑا "عاطون کہاں ہے؟ میں خود اس کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ وہ میرا گہرا دوست ہے۔"

اس کے بعد روہنی نے ساری کہانی پدم ناگ کو سنا ڈالی جب پدم ناگ کو علم ہوا کہ مرگنی، عاطون کو اپنی انگوٹھی کے نگینے میں بند کر کے کسی نامعلوم مقام کی جانب روانہ ہو گئی ہے تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ مرگنی کہاں گئی ہے؟ اس کے بارے میں اگر وہاں کوئی پدم ناگ کی مدد کر سکتا تھا تو وہ بدطینت شیطان صفت مجسمہ ساز یورائی ہی ہو سکتا تھا۔ پدم ناگ کو اسی سے مرگنی کی کمیں گاہ کا پتا چلانا تھا۔ اس نے روہنی سے کہا "تم نے کہا ہے کہ تم مرحوم تھاروکس کے مکان میں رہتی تھیں۔ کیا اب بھی تم وہاں جا کر قیام کر سکتی ہو؟ مگر اس طرح کہ تمہیں اس مکان سے باہر نہیں نکلنا ہو گا۔"

روہنی نے کہا "ہاں میں وہاں رہ سکتی ہوں۔ وہی ایک جگہ ہے جہاں میں پناہ لے سکتی ہوں مگر مجھے وہاں کب تک رہنا ہو گا۔"

پدم ناگ بولا "میں بہت جلد تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ اب تم جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ۔ وہ خونی مجسمہ ساز آ ہی رہا ہو گا۔"

روہنی جانے لگی تو پدم ناگ نے دوسرے انسانی مجسموں کے بارے میں دریافت کیا۔ روہنی نے بتایا کہ مجسمہ ساز کے بیان کے مطابق یہ سب لوگ مر چکے ہیں۔ اب انہیں دوبارہ زندہ نہیں کیا جا سکتا۔ پدم ناگ، روہنی کو لے کر مکان کی چار دیواری تک آیا۔ جب

روہنی دور ٹیلوں کے درختوں میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ دوسری منزل کے خاص کمرہ میں آگیا اور ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا کہ آسیبی مرگنی' عاطون کو لے کر کہاں گئی ہوگی؟ وہ اسے یونہی نہیں لے گئی۔ عاطون ایسے غیر معمولی اور ماورائی طاقتیں رکھنے والے انسان کو اپنے قبضے میں کرکے مرگنی کوئی بہت بڑا کام نکالنا چاہتی ہے اور اس سے عاطون کو شدید نقصان پہنچنے کا بھی احتمال ہو سکتا ہے۔ پدم ناگ کو باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ اس نے کھڑکی میں سے دیکھا مجسمہ ساز گھوڑے پر سوار مکان کی طرف چلا آ رہا ہے۔

پدم ناگ تیزی سے پیچھے ہٹا۔ پھنکار کی آواز منہ سے نکلی اور دوبارہ سیاہ فام دوشیزہ کے روپ میں آکر قالین پر نیم دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد کمرے کا تالا کھلنے کی آواز آئی اور پھر مجسمہ ساز یورائی اندر داخل ہوا۔ وہ مسکرا رہا تھا اس کے ہاتھ میں ہیروں کا ایک خوبصورت ہار چمک رہا تھا۔ "میری مہارانی! میری دیوداسی شتاولی! یہ دیکھو میں تمہارے لئے نایاب ہیروں کا ہار لایا ہوں ٹھہرو' میں خود تمہیں پہناؤں گا۔"

پدم ناگ نے اپنی گردن آگے کر دی۔ یورائی نے ہار پہناتے ہوئے پدم ناگ کو پیار کرنا چاہا تو وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ "شتاولی! کیا اب بھی تم مجھ سے پیار نہیں کرو گی۔ اچھا آؤ۔ میں تمہیں اپنے فن کے حیرت انگیز کارنامے دکھاؤں" اور مجسمہ ساز' پدم ناگ کو لے کر نیچے تہ خانے میں آگیا۔ یہ دیکھ کر ایک بار اس کے پاؤں تلے زمین نکل گئی کہ ان تمام مجسموں میں سے روہنی عورت کا مجسمہ غائب تھا۔ وہ پریشان نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر دوسرے کمرے میں آگیا۔ وہاں بھی روہنی کا مجسمہ نہیں تھا کہاں جا سکتا ہے یہ مجسمہ؟ اس نے سوچا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اسے مرگنی اٹھا کر لے گئی ہو۔ اسے اس پر حسد آیا ہو اور وہ اپنے ہوتے ہوئے ایک دوسری ہندی عورت کی موجودگی برداشت نہ کر سکی ہو۔ سوائے مرگنی کے یہ کارنامہ کوئی دوسرا شخص انجام ہی نہیں دے سکتا تھا۔ مجسمہ ساز زیر لب مسکرایا۔ اسے پکا یقین ہو گیا تھا کہ یہ کام مرگنی نے مارے حسد کے کیا ہے۔

وہ واپس ساتھ والے کمرے میں آگیا۔ یہاں پدم ناگ سیاہ فام ہندی دوشیزہ کے روپ میں مصنوعی حیرت سے انسانی مجسموں کو دیکھ رہا تھا۔ مجسمہ ساز یورائی بڑے فخر کے ساتھ پدم ناگ کو بتانے لگا کہ یہ مجسمے پتھر کے ہیں مگر میں نے انہیں ایسی مہارت اور چابکدستی سے بنایا ہے کہ زندہ انسان معلوم ہو رہے ہیں۔ پدم ناگ جانتا تھا کہ یہ اصل میں زندہ انسان ہی ہیں جنہیں وحشی مجسمہ ساز نے بربریت سے کام لیتے ہوئے انہیں زندہ پتھر بنا دیا ہے۔

پدم ناگ کو مجسمہ ساز کے ہاں رہتے ہوئے چار روز ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں

پدم ناگ نے مجسمہ ساز کو اپنی محبت سے گرویدہ کر لیا۔ وہ تو شتاولی کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ پدم ناگ نے باتوں ہی باتوں میں اس سے مرگنی کے بارے میں ساری تفصیلات معلوم کر لی تھیں۔ مجسمہ ساز کو مرگنی کے متعلق جتنا کچھ معلوم تھا وہ اس نے شتاولی یعنی پدم ناگ کو بتا دیا تھا۔ ان معلومات کی تفصیل یہ تھی کہ مرگنی کیچن چنگا کی وادی کی کسی گپھا میں رہتی ہے اور کبھی کبھار ہی اس سے ملنے آتی ہے۔ مجسمہ ساز نے شتاولی کو یہ قطعا" نہیں بتایا کہ مرگنی اپنے ساتھ عاطون کو انگوٹھی میں بند کر کے لے گئی ہے۔ مرگنی کا بھیانک روپ مجسمہ ساز نے پدم ناگ کی آنکھوں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کی تھی مگر پدم ناگ کو سب کچھ معلوم تھا۔ جب پدم ناگ کو مطلوبہ معلومات حاصل ہو گئیں تو اس نے جانے سے پہلے مجسمہ ساز کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا تاکہ آئندہ سے انسانیت کو اس وحشی درندے کی بربریت سے نجات مل جائے۔ پدم ناگ کے لئے مجسمہ ساز کو ہلاک کرنا ایسی ہی بات تھی جیسے ہاتھی کسی چیونٹی کو اپنے پاؤں تلے مسل دے مگر پدم ناگ اسے عبرت ناک سزا دینا چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ جو سلوک اس نے بے گناہ انسانوں کے ساتھ کیا ہے ویسا ہی سلوک اس کے ساتھ بھی کیا جائے۔

چنانچہ ایک روز شتاولی یعنی پدم ناگ نے تہ خانے میں رکھے ہوئے مجسمے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مجسمہ ساز تو شتاولی کا گرویدہ تھا۔ وہ بھلا اس کی بات کیسے ٹال سکتا تھا۔ فورا" اٹھا اور بولا "چلو' ابھی تہ خانے میں چلتے ہیں میری سیاہ فام ملکہ۔"

تہ خانے میں آکر پدم ناگ مجسمہ ساز کو خالی حوض کے پاس لے آیا۔ اسے روہنی نے سب کچھ بتا دیا تھا کہ مجسمہ ساز کس طرح زندہ انسانوں کو پتھر کے مجسموں میں تبدیل کرتا تھا۔ پدم ناگ کو مجسمہ ساز کو بے ہوش کرنے کے واسطے کسی خواب آور دوائی یا مشروب کی ضرورت نہیں تھی۔

مجسمہ ساز یورائی بولا "اس خاص حوض پر تم کیا کرنے آگئی ہو میری ملکہ' چلو اوپر چل کر مشروب سے دل بہلائیں۔ آؤ۔"

لیکن مجسمہ ساز یورائی کا آخری وقت آن پہنچا تھا۔ اب وہ اوپر والی منزل میں کیسے جا سکتا تھا کیونکہ وہی تہ خانہ تھوڑی دیر بعد اس کی موت کا استھان بننے والا تھا۔ پدم ناگ نے بڑی لگاوٹ سے کہا "میرے محبوب' میرے راجا! تھوڑی دیر یہیں رک جاؤ۔ اچھا یہ بتاؤ تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟"

یورائی نے اپنی بانہیں پدم ناگ کے گلے میں ڈال دیں اور کہا "میں تمہیں اپنے دل کی رانی سمجھتا ہوں شتاولی"

پدم ناگ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور کہا "اور میں یہ کہوں کہ میں سانپ ہوں تو کیا پھر بھی تم مجھ سے محبت کرو گے۔"

مجسمہ ساز یورائی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا "میری آکاش کی اپسرا' اگر تم چڑیل بھی نکل آؤ تو میری محبت میں کمی نہیں آئے گی۔"

پدم ناگ نے مجسمہ ساز کی ٹھگنی سی چپٹی ناک پر انگلی رکھ کر کہا "میں چڑیل بھی ہوں اور سانپ بھی ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی مجسمہ ساز یورائی کا خون خشک ہو گیا اور وہ سوکھے پتے کی طرح خوف کے مارے مارے تھر تھر کانپنے لگا کیونکہ ابھی جس سیاہ فام حسین جسم والی عورت نے اس کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کر رکھی تھیں وہ سیاہ کالا سانپ بن کر اس کے گلے میں لٹک رہی تھی اور اس کا پھن اس کے منہ کے آگے جھول رہا تھا۔ یورائی کا حلق دہشت کے مارے خشک ہو گیا تھا اور آنکھیں مارے دہشت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ پدم ناگ نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ مجسمہ ساز کی گردن پر بائیں جانب کی ایک خاص رگ پر ڈس لیا۔ مجسمہ ساز کے حلق سے چیخ کی ایک بھیانک آواز نکلی اور وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگ پڑا۔ پدم ناگ نے اس خبیث قاتل کے جسم میں جو زہر سرایت کیا تھا وہ صرف چند لمحوں کے لئے اس کی گردن سے نچلے دھڑ کو سن کرنے کے لئے تھا۔ اس سے اس کی موت کا یا اس کے سارے جسم کا پتھر بن جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

مجسمہ ساز یورائی روتے روتے' حلق سے دہشت زدہ ڈراؤنی آوازیں نکالتے فرش پر گر پڑا۔ اس کا گردن سے نیچے تک کا سارا جسم سن ہو گیا تھا۔ پدم ناگ اس کی گردن سے اتر آیا پھر اس نے ایک ہلکی سی پھنکار کے ساتھ اپنی اصلی مردانہ شکل اختیار کی اور مجسمہ ساز کی انکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "میں صرف تمہیں اتنا ہی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب میں تم سے وہی سلوک کرنے والا ہوں جو تم ان تمام بدقسمت نوجوانوں سے کر چکے ہو جنکی زندہ لاشیں پتھریلی دیوار کے ساتھ کھڑی ہیں۔"

پدم ناگ نے خالی حوض میں سنگ مرمر کا چورا ڈال کر اس میں بالٹیوں کا پانی انڈیلا۔ روہنی نے جیسے بتایا تھا ویسے ہی اس نے مختلف بوتلوں میں سے محلول اس میں ڈالے اور پھر لکڑی سے اس کا محلول بنایا اور شیطان مجسمہ ساز کو لکڑی کے تختے پر لٹا کر اس کی آنکھوں پر جھک کر کہا "اپنے کئے کی سزا بھگتو۔"

مجسمہ ساز یورائی کا جسم سن تھا مگر وہ دیکھ رہا تھا سن رہا تھا۔ پدم ناگ نے اسے حوض کے محلول میں دھکیل دیا سنگ مرمر کے گاڑھے محلول میں گرتے ہی مجسمہ ساز اس میں

ڈوب گیا۔ پدم ناگ اسی جگہ بیٹھا رہا۔ جب ایک معینہ وقت پورا ہو گیا تو پدم ناگ نے مجسمہ ساز کو آنکڑے سے کھینچ کر حوض کے کنارے پر ڈال دیا اور کہا "اب تم اسی طرح یہاں پڑے رہوگے تمہارا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔"

پدم ناگ تہ خانے کا زینہ چڑھ کر اوپر کی منزل میں آیا تو دو حبشی خنجر نکالے اس کے سامنے کھڑے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے اس کی طرف بڑھے۔ پدم ناگ مسکرایا "تم اپنی عاقبت کیوں خراب کرتے ہو؟ جاؤ میں تمہیں معاف کرتا ہوں اگرچہ تم بھی اپنے مالک کے گناہوں میں برابر کے شریک تھے۔"

حبشی غلام' پدم ناگ کو قتل کرنے کا ارادہ لے کر آئے تھے۔ انہیں شک تھا کہ پدم ناگ نے ان کے مالک کو کہیں غائب کر دیا ہے۔ ایک حبشی نے خنجر سے پدم ناگ پر حملہ کر دیا۔ پدم ناگ پہلے ہی چوکس تھا۔ حبشی غلام سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا کیونکہ پدم ناگ اس کے مقابل موجود نہیں تھا۔ وہ باریک سانپ بن کر فرش پر رینگتا دوسرے حبشی کی پنڈلی پر ڈس چکا تھا۔ پدم ناگ سانپوں کا دیوتا تھا۔ اس کے زہر کا کہیں توڑ نہیں تھا۔ اس زہر نے حبشی کے جسم میں داخل ہوتے ہی اس کے خون کے ذروں کو نہ صرف پھاڑ دیا بلکہ اس کے اعصاب کو بھی پتھر کر دیا۔ اپنے ساتھی کو گرتے دیکھ کر حملہ آور حبشی اس کی طرف بڑھا تو پدم ناگ نے اسے بھی ڈس لیا۔ پھر انسانی شکل میں آ گیا اور بولا "تم نے اپنی موت کو آواز دی تھی۔ تمہیں موت مل گئی۔"

پدم ناگ' مکان کی چار دیواری سے نکل کر روہنی کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس مکان کا پتہ روہنی نے اسے بتا دیا تھا۔ روہنی مرحوم تھاروکس کے مکان کے ایک کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی کلدان نے اسے بتایا تھا کہ ایک نوجوان جو اپنا نام پدم بتاتا ہے اس سے ملنے آیا ہے۔ روہنی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا "وہ میرا بھائی ہے ہندوستان سے آیا ہے۔"

وہ اٹھ کر باہر آ گئی اور پدم ناگ کو لے کر کمرے میں آ گئی۔ پدم ناگ نے اسے بتایا کہ ظالموں کو ظلم کی سزا مل چکی ہے "اب ہمیں یہاں سے واپس ہندوستان کا رخ کرنا چاہئے تاکہ کنچن چنگا کی وادی میں اپنے دوست اور ساتھی عاطون کو تلاش کر کے اسے مرگنی کے طلسم سے نجات دلا سکوں۔"

روہنی خود واپس ہندوستان جانا چاہتی تھی۔ چنانچہ ایک روز وہ روم کے کارواں سرائے سے روانہ ہونے والے قافلے میں شامل ہو کر ہندوستان کی جانب چل پڑے۔

مرگنی کنچن چنگا پہنچ چکی تھی اور عاطون اس کی سیاہ مخروطی نگینے والی انگوٹھی میں بند تھا۔ کنچن چنگا پہنچتے ہی مرگنی ترشول مندر میں آئی۔ یہ مندر کنچن چنگا پہاڑ کے دامن میں ہزاروں فٹ کی بلند پر چٹانی دیواروں کے پہلو میں واقع تھا۔ یہ ایک پراسرار مندر تھا کسی زمانے میں یہاں ایک سادھو نے کالے علم کا چلہ کاٹا جو الٹا پڑ گیا اور سادھو کی لاش کے ٹکڑے دیواروں سے ٹکرانے لگے پھر یہ ٹکڑے غائب ہو گئے۔ تب سے یہ مندر ویران پڑا تھا۔ پھر یہ یم دیوتا کے دوت یعنی یم دوت کے تصرف میں آ گیا۔ مندر کی نچان میں ایک چھوٹی سی تلیٹی تھی جہاں چرواہوں کا ایک گاؤں تھا۔ اس گاؤں کی چرواہنیں بہت خوبصورت تھیں مرگنی نے جب انگوٹھی میں بند عاطون کو لا کر یم دوت کے حوالے کیا تو وہ بولا "تم نے شرط پوری کر دی مرگنی۔ اب تم اس مندر کی دیوی بنو گی۔ ایک ایسی دیوی جو ہمیشہ جوان اور زندہ رہے گی۔ اب میں اپنا وعدہ پورا کرنا چاہتا ہوں۔"

تلیٹی والے گاؤں کی دو حسین چرواہنیں بکریاں چراتے چراتے پہاڑی میں اوپر آ گئیں تو پھر انہیں کسی نے نہ دیکھا گاؤں والے پریشان ہو کر ان کی تلاش میں نکلے مگر وہ انہیں کہیں نہ ملیں۔ وہ یہ خیال کر کے بیٹھ گئے کہ ہو سکتا ہے انہیں کوئی درندہ اٹھا کر لے گیا ہو۔ چند روز بعد دو مزید چرواہنیں غائب ہو گئیں۔ جب گاؤں کی چھ چرواہنیں غائب ہو گئیں تو گاؤں والوں میں افراتفری مچ گئی۔ نیچے میدانی علاقے میں ایک چھوٹا سا شہر تھا جس پر ایک راجا حکومت کرتا تھا گاؤں والوں نے راجا کے آگے جا کر فریاد کی۔ راجا کی فوج کے ایک دستے کو حکم دیا کہ وادی میں چرواہنوں کو تلاش کیا جائے۔

راجا کے سپاہی کھوج لگاتے لگاتے جب ویران مندر کے قریب آئے تو یم دوت ایک شیر کا روپ دھار کر ان پر حملہ آور ہوا۔ سپاہیوں نے شیر پر تیر اور نیزے برسائے مگر یم دوت جو موت کا سفیر تھا کیسے مر سکتا تھا وہ تیر کھا کر سپاہیوں پر جھپٹا اور پانچ سپاہیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ باقی سپاہی بڑی مشکل سے جان بچا کر راجا کے پاس آئے اور آدم خور آسیبی شیر کے بارے میں بتایا۔

راجا نے کہا "ضرور ان چرواہنوں کو بھی اسی شیر نے ہڑپ کیا ہے۔ اگر اسی شیر پر تیر اور نیزے کا اثر نہیں ہوتا تو وہ کوئی برگزیدہ سادھو ہے جو غضبناک ہو کر اس جنم میں شیر بن گیا ہے میں حکم دیتا ہوں کہ ویران مندر کی طرف کوئی نہ جائے۔"

ان چھ حسین اور خوبرو کنواری چرواہنوں کو یم دوت اٹھا کر مندر میں لے آیا تھا۔ ایک طلسم پھونک کر ان کی یادداشتیں گم کر دیں اور انہیں مندر کی دیوداسیاں بنا دیا۔ مرگنی' مندر کے استھان پر قائر دیوی بن کر بیٹھ گئی۔ اس نے چرواہنوں کو اپنے حضور طلب کر کے

کہا "میں تمہاری قائر ہوں۔ تم میری دیوداسیاں ہو۔ میں جو تمہیں حکم دوں گی وہی کرنا ہو گا۔ تم صبح و شام میری پوجا کرو گی۔"

ان حسین چرواہنوں نے ہاتھ جوڑ جکر سر جھکا دیئے اور یک زبان ہو کر کہا "قائر دیوی! ہم دیوداسیاں تیرے ہر حکم کی پابندی کرنے کو اپنا دھن بھاگ جانیں گی۔"

قائر دیوی' مرگنی نے انہیں حکم دیا کہ اپنے جسموں پر صرف ایک دوپٹہ لپیٹ لیں۔ چرواہنوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر مرگنی دیوی نے ایک ایک کے ماتھوں پر کیسر سے شولنگ کا تلک لگایا اور انہیں اپنی اپنی کوٹھریوں میں بھیج دیا۔ کنچن چنگا کی یہ وادی سرد یخ ہواؤں کی لپیٹ میں رہتی تھی مگر یم دوت نے مندر میں ایک ایسا طلسم پھونک دیا کہ اس کی فضا نیم گرم ہو گئی۔

یم دوت کے جانے سے پہلے مرگنی کو مندر کے چٹانی کمرے میں طلب کیا اور کہا "مرگنی تو نے میرے دشمن عاطون کو انگوٹھی میں ہمیشہ کے لئے بند کر کے میرا دل جیت لیا ہے۔ میں سنسار کے ہر انسان' چرند پرند کی جان قبض کرتا ہوں مگر یہ عاطون واحد شخص ہے جس کے آگے میری ساری شکتی بے اثر ہو جاتی تھی۔ میں اس کی جان قبض نہیں کر سکتا تھا لیکن اب مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہاری مدد سے اسے ہمیشہ کے لئے اس نگینے میں دفن کر دیا ہے۔"

میرے لئے اب یہ مر چکا ہے۔ یوں میں نے اس پر فتح پا لی ہے میں اس انگوٹھی کو اس چٹانی کوٹھری میں فرش کے اندر چھپا رہا ہوں۔ تم کبھی کبھی اسے نکال کر دیکھتی رہنا کہ میرا دشمن اس میں موجود ہے۔ اگر کبھی ایسا ہوا کہ یہ انگوٹھی غائب ہو گئی تو مجھے تین بار آواز دینا۔ میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔" اس کے بعد یم دوت نے اس چٹانی کوٹھری کا ایک پتھر اکھاڑا اس کے نیچے گڑھے میں انگوٹھی رکھی اور اس کے اوپر پتھر رکھ کر فرش برابر کر دیا۔ پھر اس نے مرگنی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا "مرگنی! اب میں تمہیں تمہارا انعام دیتا ہوں جاؤ آج سے تو جو بھی بری خواہش کرو گی پوری ہو جائے گی کسی نیک کام کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لانا اگر ایسا تم نے کیا تمہاری بری خواہش بھی کبھی پوری نہیں ہو گی اور تمہیں نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو گا۔ اب میں جاتا ہوں۔"

مرگنی کو پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی اور پھر چٹانی کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ مرگنی کے چہرے پر گناہ آلود مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کے زرد دانت نظر آنے لگے۔ مرگنی چٹانی کمرے سے باہر آ گئی اس کے جسم پر سوائے ایک دوپٹے کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس کے بال کاندھوں پر سانپوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ وہ مندر کی نیم گرم فضا میں چلتی ہوئی اپنی

خاص خواب گاہ میں آئی۔ یہاں پر پتھریلا فرش خالی پڑا تھا۔ مرگنی دیوی نے اشارہ کیا۔ فوراً وہاں ایک پلنگ آن لگا جس کے سیاہ بچھونے پر سیاہ رنگ کے پھول بکھرے ہوئے تھے مرگنی نے دوسرا اشارہ کیا تو پلنگ کے پاس تکیے کے لگے دو چوکیاں ظاہر ہو گئیں تیسری خالی چوکی پر مشروب کی ایک صراحی اور پیالے آ گئے۔ مرگنی نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا اور اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا وہ غائب ہو گئی۔

قائز دیوی کے ترشول مندر پر اندھیرا چھا رہا تھا دیوداسیاں اپنی اپنی کوٹھریوں میں آنکھیں بند کئے' بال کھولے بیٹھی مرگنی دیوی کے خبیثانہ اشلوک پڑھ رہی تھیں۔ عاطون سیاہ مخروطی نگینے والی انگوٹھی میں قید چٹانی کوٹھری کے فرش کے نیچے بے بسی کی حالت میں پڑا تھا۔ ترشول مندر کے نیچے' وادی کے کنارے دریا کے پاس راجا کا شہر آباد تھا۔ راجا کا محل پر بھی خاموشی کی حکمرانی تھی۔ مرگنی ایک دھند لہر کی شکل میں شہر کے سنسان اندھیرے بازاروں اور گلیوں میں چکر لگا رہی تھی۔ اس کی نظر ایک مکان کی چھت پر پڑی جہاں منڈیر پر دیئے جھلملا رہے تھے مرگنی قریب گئی تو مکان کے آنگن میں ڈھولک پر لڑکیوں کے گیت گانے کی صدائیں آنے لگیں۔

اس مکان میں ایک نوجوان کی شادی تھی۔ وہ دلھن لے کر آیا تھا اور گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ مرگنی دھندلی لہر کی صورت میں مکان میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ حجلہ عروسی پھولوں سے سجا ہوا ہے سفید اور سرخ کلیوں کی سیج بچھی ہے۔ فضا میں صندل اور کستوری کی مہک ہے۔ سیج پر ایک پاکیزہ چہرے والی سجی سجائی دلھن' لڑکیوں میں گھری شرمائی ہوئی بیٹھی تھی۔ لڑکیاں اسے ہنس ہنس کر چھیڑ رہی تھیں مرگنی کو دلھن کی شرم و حیا اور چہرے کی پاکیزگی سے نفرت محسوس ہوئی۔

ایک عورت نے دروازے میں آ کر مسکرا کر کہا "دلھا آ رہا ہے لڑکیو' چلو یہاں سے ہٹو"

لڑکیاں کھلا کھلا کر ہنستی حجلہ عروسی سے باہر نکل گئیں دلھن اکیلی رہ گئی تو مرگنی کے ناپاک عزائم بیدار ہو گئے۔ وہ دھندلی لہر کی صورت میں دلھن کے سر کے گرد گھوم گئی۔ پھر ہلکی پھنکار کی آواز پیدا ہوئی اور دلھن کی جگہ ایک کالی بلی سیج پر بیٹھی تھی۔ دلھن کالی بلی میں تبدیل ہو کر وحشت بھری آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پھر سیج کے پاس مرگنی نمودار ہوئی۔ وہ دلھن کی شکل میں و صورت اور اسی کے عروسی جوڑے میں ملبوس تھی۔ مرگنی نے اسے لات مار کر سیج سے بھگا دیا۔ کالی بلی پلنگ کے نیچے دبک گئی۔ مرگنی دلھن بنی سیج پر بیٹھی اور اس نے گھونگٹ نکال لیا اور دلھا کا انتظار کرنے لگی۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور دلھا پھولوں کا سہرا سجائے زرق برق لباس میں حجلہ عروسی مین داخل ہوا دلھن کے پاس بیٹھتے ہی اس نے اچکن کی جیب سے ہیرے کی انگوٹھی نکالی اور دلھن مرگنی کا نرم و نازک ہاتھ تھام کر کہا "کملانی! یہ میری محبت کی انمٹ نشانی ہے" پھر اس نے دلھن کا گھونگٹ اٹھایا اس کے سامنے مرگنی دلھن کے روپ میں مسکرا رہی تھی۔ اس کی اور کملانی کی شکل میں کسی قسم کا فرق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دلھا نے کملانی کو پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا اسے محسوس ہوا کہ دلھن کی آنکھوں میں شرم و حیا کی بجائے ایک عجیب قسم کی بے باکی جھانک رہی ہے مگر دلھا کو کبھی بھی یہ شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی اصلی دلھن کملانی اس کے پلنگ کے نیچے کالی بلی کی شکل میں دبکی بیٹھی تھی اور اسکی جگہ حیا باختہ مرگنی' کملانی کے روپ میں بیٹھی تھی۔

مرگنی نے دلھا کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "میں ہزاروں سال سے اسی رات کا انتظار کر رہی تھی میرے راج کنور" اور مرگنی نے پلنگ کے قریب ہی روشن دان شمع دان کو گل کر دیا۔ پلنگ کے نیچے سے بلی کی غراہٹ کی آواز آئی۔

دلھا تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا "یہ بلی کہاں سے آ گئی ہے۔"

مرگنی نے ہنستے ہوئے کہا "ہماری باتیں سننے آئی ہے۔"

دلھا نے چراغ روشن کیا اور بلی کو پلنگ کے نیچے سے باہر بھگا دیا۔ کالی بلی حسرت بھری نظروں سے دلھا کو دیکھتی اور رونے کی آواز نکالتی چلی گئی شمع ایک بار پھر گل کر دی گئی تاریکی ہی مرگنی کی اصل روشنی تھی۔ وہ گناہ کی تاریک دلدل سے پیدا ہوئی تھی اور جنم جنم میں اس نے گناہوں کو اپنے سینے سے لگایا تھا۔ کالی بلی مکان کی چھت پر ساری رات ہولے ہولے روتی رہی پچھلے پہر گھر والوں نے بلی کو مار مار کر نکال دیا مگر سورج نکلنے کے بعد بلی پھر آ کر مکان کی چھت پر منڈیر کے نیچے دبک کر بیٹھ گئی۔ مرگنی دلھن نے تین راتیں نئے نویلے دلھا کے ساتھ خوشبوؤں بھری سیج پر گزاریں اور پھر اس گھر مین اندر ہی اندر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اس گھر کی دلھن کملانی غائب ہو گئی تھی کوئی کچھ کہہ رہا تھا کوئی کچھ۔ دلھا منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ کوئی کہتا کملانی اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہو گئی۔ کوئی کہتا تھا دلھن پیٹ سے تھی۔ دلھا نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ مگر اصل بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اچانک دلھن کہاں چلی گئی۔ کالی بلی اسی طرح مکان چھت پر بیٹھی تھی۔ اب اس کا رونا بند ہو گیا تھا کیونکہ جب وہ روتی تھی تو گھر والے اسے مار مار کر بھگا دیتے تھے۔ کسی نے کہا یہ کالی بلی منحوس ہے اس کا ہون کرو۔ ہون کی رسم بھی ادا کی گئی سادھو پنڈتوں کو بلا کر بھوگ کرایا گیا۔ جوتشی بلوا کر پتری کھولی گئی مگر کوئی دلھن کے بارے میں نہ بتا سکا کہ وہ

کہاں ہے؟ گھر والوں نے کالی بلی کو مار کر نکال دیا بلی مکان کے قریب ہی ایک شمشان میں جا کر کیکر کے درخت تلے چھپ گئی۔

مرگنی اپنی اصلی شکل میں واپس آ کر ترشول مندر کے استھان پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی اور دیوداسیاں اس کے سیاہ جسم پر سرخ گلال پھینک رہی تھیں۔ سارا دن مرگنی گلال، کیسر اور جڑی بوٹیوں کے پانی سے غسل کرتی رہی۔ چھ کنواری دیوداسیاں الگ الگ کوٹھریوں میں رہ رہی تھی۔ ہر رات مرگنی، مرد راکھشش کے روپ میں ایک دیوداسی کی کوٹھری کا دروازہ کھٹکاتی پھر وہ مرگنی دیوی کی آواز میں بولتی "کیا میرے لئے دروازہ نہ کھولو گی؟" ساتویں رات کو مرگنی ایک بار پھر ترشول مندر کے استھان سے غائب ہو گئی اور دھندلی لہر کی شکل میں رات کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے سنسان گلی کوچوں میں چکر لگانے لگی۔ اس رات بھی ایک گھرمین حجلہ عروسی سجا تھا اور دلھن سہیلیوں میں شرمائی ہوئی بیٹھی اپنے دلھا کا انتظار کر رہی تھی۔ مرگنی نے اس مکان کا چکرلگایا اور شادی والے مکان میں داخل ہو گئی۔ اب اس کی نگاہ انتخاب دلھا پر پڑی۔ دلھا اپنے دوستوں سے جدا ہو کر حجلہ عروسی میں جانے سے پہلے غسل خانے میں گیا تو مرگنی بھی غسل خانے میں گھس گئی۔ اس نے دلھا پر اپنے آپ کو بجلی کی طرح گرایا۔ دلھا چشم زدن میں غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ایک کالا بلا غسل خانے سے گھبرایا ہوا غراتا ہوا پھر رہا تھا۔ دلھا کی جگہ مرگنی نے وہی شکل و صورت اختیار کی اور کالے بلے کی طرف ایسی بھیانک نظروں سے دیکھا کہ وہ کونے میں دبک کر کانپنے لگا۔ مرگنی دلھا نے غسل خانے سے فراغت حاصل کی اور دروازہ کھولا دروازے کھلتے ہی کالا بلا باہر کو دوڑا اور مہمانوں کے درمیان جا کر زور زور سے منہ اوپر اٹھا کر رونے لگا۔

خوشی کے گھر میں ایک کالے بلے کو روتا دیکھ کر گھر والے ڈنڈا لے کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ کالا بلا چھت پر بھاگ گیا۔ وہاں بھی لوگ پہنچ گئے تو کالا بلا چھلانگ لگا کر مکان کی چمنی پر جا کر بیٹھ گیا اور اندھیری رات میں اپنی زرد زرد آنکھوں سے حیرت، حسرت اور غصے کے ساتھ شادی والے مکان کی طرف دیکھنے لگا جہاں حجلہ عروسی میں دلھن اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دوسری طرف مرگنی کے روپ میں دانت نکالے، ہونٹوں سے رال ٹپکاتے حجلہ عروسی کی طرف بڑھی دلھن اسے دیکھ کر سمٹ گئی۔ دلھا نے جاتے ہی کچھ ایسی حرکتیں کرنی شروع کردیں کہ دلھن ششدر ہو کر رہ گئی مگر مرگنی سے یہی توقع کی جا سکتی تھی۔ وہ تو خباثت اور بے حیائی کی پوٹلی تھی اور یہی اس کی زندگی تھی۔ اس زندگی کو امر بنانے کے لئے اس نے یم دوت کی کڑی شرط کو پورا کیا تھا اور عاطون کو قبضے میں کر کے اس کے حوالے کر دیا تھا۔ مرگنی دلھا اس بدقسمت دلھن کے کمرے میں تین دن تک رہی۔ چوتھے روز مرگنی دھند کی لہر بن کر اس مکان سے کوچ کر گئی۔ اس کے جانے کے بعد گھر والوں نے دلھن کو اس صورت میں حجلہ عروسی سے باہر نکالا کہ وہ نیم بے ہوش تھی۔ دلہن کو طبی امداد دی گئی۔ شام ہو گئی اور دلھا واپس گھر نہ آیا۔ گھر میں شور مچ گیا۔ دوسرے اور تیسرے روز بھی دلھا غائب رہا۔ تو گھر میں کہرام مچ گیا۔ کالا بلا صبح شام مکان کے صحن کے سامنے آ کر غرانے لگتا۔ گھر والوں نے اسے اتنا مارا کہ وہ نیم زخمی حالت مین جان بچا کر شہر کے صدر دروازے کی طرف بھاگ نکلا۔

مرگنی، ترشول مندر میں واپس آ گئی۔ اس نے پھر وہی عمل کیا یعنی سارا دن کیسر، صندل اور جڑی بوٹیوں کے عرق ملے پانی سے غسل کیا۔

چھ روز کے بعد مرگنی ایک بار پھر غائب ہو کر رات کے وقت شہر پر منڈلانے لگی۔ اس روز بھی شہر میں ایک شادی تھی۔ مرگنی نے اس بار دلھن کو بلی بنا کر بھگا دیا اور خود اس کی جگہ دلھن بن کر بیٹھ گئی تین روز تک دلھا کو حیران و ششدر کیا اور پھر غائب ہو گئی۔ جب شہر میں سے کبھی دلھا اور کبھی دلھن غائب ہونے لگی تو شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ لوگوں نے اپنے لڑکے لڑکیوں کی شادیاں ملتوی کر دیں۔ کچھ لوگ شہر چھوڑ کر چلے گئے کہ کسی دوسرے شہر میں جا کر اپنے بچوں کا بیاہ رچائیں گے۔ یہ خبر راجا تک پہنچی تو اس نے تحقیقات کا حکم دے دیا۔ تحقیقاتی ٹیم نے راجا کو بتایا کہ جس گھر سے بھی دلھن یا دلھا غائب ہوا ہے وہاں سے ایک پراسرار بلی یا بلا ضرور نمودار ہوا ہے۔ راجا نے اسی وقت پنڈتوں اور مندروں کے پجاریوں کو طلب کیا مگر پنڈت اور پجاری اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے اور راجا کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ انہی دنوں میں راجا کی اپنی بیٹی کا بیاہ تیار تھا۔ اندر سے راجا کو بھی ہلکی ہلکی تشویش تھی مگر راجا کو یہ بات زیب نہیں دیتی تھی کہ وہ رعایا کو یہ تاثر دے کہ وہ خود ڈر گیا ہے۔ اس طرح سے رعایا پر شدید ردعمل ہوتا اور لوگ شہر سے باقاعدہ نقل مکانی کرنا شروع کر دیتے اور کوئی اپنے بچے کی شادی نہ رچاتا۔ چنانچہ راجا کی بیٹی کی شادی کا دن طے ہو گیا۔

ان ساری باتون کا مرگنی کو علم ہو تا رہتا تھا۔ وہ راجا کو بھی ایک سبق دینا چاہتی تھی۔ اس نے راجا کی بیٹی کو بھی اڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ راجہ کی بیٹی کی شادی مہامنتری کے بیٹے سے ہو رہی تھی جس کا محل راجا کے محل کے قریب ہی واقع تھا۔ جس روز مہامنتری کا بیٹا کنوربھان، راجا کی بیٹی کو لے کر اپنے محل میں لایا تو اس روز مرگنی بھی دھند کی شکل میں اس محل میں موجود تھی اور محل کے ایک کمرے کا چکرلگا کر حجلہ عروسی کو دیکھ آئی تھی۔ حجلہ عروسی کو تو جنت کا ایک گوشہ بنا دیا گیا تھا۔ عجیب قسم کے چراغ دان دھیمی روشنیاں دے

رہے تھے۔ سیج پر پھول ہی پھول تھے۔ چاندی کی چھت سے پھولوں اور جواہرات کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ مشروب سے بھری ہوئی سونے کی صراحی اور چاندی کے پیالے زمرد کی میز پر رکھے تھے۔ حجلہ عروسی کی صرف ایک ہی کھڑکی تھی جو دوسری جانب ایک گھنے جنگل کی طرف کھلتی تھی۔ آدھی رات کے بعد سہیلیاں اور گھر کی عورتیں راجا کی بیٹی جو سولہ سنگھار سے سجی اور سونے میں لدی ہوئی تھی حجلہ عروسی میں لے آئیں دلہن کو سیج پر بٹھا دیا گیا۔ عورتوں نے اس کی بلائیں لیں۔ اس کی نذریں اتاریں گئیں۔ طرح طرح کی رسومات ادا کی گئی۔ مرگنی اس حجلہ عروسی میں چھت کے ساتھ ہلکی دھند کی ایک لہر کی شکل میں موجود تھی اور ان عورتوں کے حجلہ عروسی سے چلے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔

آخر سب عورتیں چلی گئیں۔ حجلہ عروسی میں اب صرف دلہن یعنی راجا کی بیٹی ہی رہ گئی تھی۔ مرگنی کو اپنا ناپاک اور خبیث عمل شروع کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ آہستہ سے چھت سے الگ ہو کر دلہن کے قریب آئی اور اس کے گرد ایک چکر لگایا۔ پھر تیر کی طرح اس کے جسم سے ٹکرائی۔ ٹکراتے ہی راجا کی بیٹی ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ سیج پر کالی بلی سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ مرگنی نے راجا کی دلہن کا روپ اختیار کیا اور سب سے پہلے کالی بلی کو دبوچا اور اسے کھڑکی میں سے دوسری طرف تاریک ڈھلائی جنگل کے درختوں پر گرا دیا۔ بلی کے دردناک انداز میں چیخنے کی آواز ایک لکیر کی طرح دور تک گونجتی چلی گئی۔ مرگنی دلہن نے جلدی سے کھڑکی بند کی اور سیج پر آ کر بیٹھ گئی۔

چند ہی لمحوں بعد دلہا کنور بھان جھومتا جھامتا اندر داخل ہوا وہ ایک مست ہاتھی کی طرح قوی الجثہ تھا اور ریچھ کی طرح خرخرا رہا تھا مرگنی نے تین دن تک کنور بھان کو کہیں جانے نہ دیا چوتھے روز مرگنی غائب ہو گئی۔

اس بار مرگنی کا غائب ہو جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ کیونکہ وہ اس بار راجا کی بیٹی کے روپ میں غائب ہوئی تھی۔ جب راجا کی بیٹی کی گمشدگی طشت از بام ہوئی تو سارے کا سارا شہر جیسے ساکت ہو گیا۔ شاہی محل سوگ میں ڈوب گیا۔ راجا اور اس کی رانی کے ہوش گم ہو گئے۔ راجا کے حکم سے سارے شہر اور اردگرد کے علاقے کو فوج نے گھیرے میں لے لیا مگر یہ فوج کے بس کی بات نہیں تھی۔ راجا کی بیٹی کالی بلی کے روپ میں شاہی محل کے بڑے دروازے کے سامنے آ کر رونے لگی تو وہاں دربانوں نے اس پر تیر برسائے۔ کالی بلی جان بچا کر بھاگی اور جنگل کی طرف نکل گئی راجا کی بیٹی کی خواب گاہ میں بلی کے رونے کی آواز آیا کرتی تھی۔

مرگنی بہت خوش تھی اس نے راجا کو ایسا سبق سکھایا کہ وہ ساری زندگی یاد رکھے گا

مگر راجا آخر راجا تھا اس کی بیٹی گم ہوئی تھی یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس نے ویشالی اور اندرپرستھا کے سب سے بڑے جوتشی کو بلوا کر زائچہ تیار کروایا۔ جوتشی نے کافی محنت سے زائچہ تیار کیا تھا مگر یہ شاہی جوتشی تھا اور اپنے شوق کے لئے نہیں بلکہ انعام و اکرام کے لالچ میں زائچہ بنانے کا عادی تھا جس کی وجہ سے علم کی تیغ جگرّدار سے محروم تھا اور خالی نیام ہی اس کے ہاتھ میں باقی رہ گیا تھا۔ علم جوتش کے زائچے کے بارے میں حکماء کا قول ہے کہ جھوٹے آدمی کے سامنے زائچہ بھی جھوٹ بولتا ہے یہی حال راجا کی بیٹی کے زائچے کے ساتھ ہوا۔ لالچی جوتشی نے راجا کو بتایا کہ شہر میں ایک بدروح بلیوں کی شکل میں آتی ہے۔ اسی نے راج کماری اور شہر کی دوسری دلہنوں اور دلہوں کو غائب کیا ہے۔ اگر شہر کی تمام بلیوں کو مار دیا جائے تو گمشدہ لوگ واپس آ سکتے ہیں۔

اسی دم بلیوں کی شامت آ گئی۔ راجا کے حکم سے بلیوں کا قتل عام شروع ہو گیا جو بلیاں اور بلے جانور ہو کر بھی انسانی شعور رکھتے تھے وہ سمجھ گئے کہ یہ آفت ان پر کیوں ٹوٹی ہے۔ انہوں نے فوراً شہر کو چھوڑا اور فرار ہو کر پہاڑیوں میں دور ایک غار میں جا کر پناہ لے لی۔ یہ چار بلیاں اور دو بلے تھے یعنی چار دلہنیں اور دو دلہا۔ ان میں سے ایک بلی راجا کی بیٹی بھی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے انسانی زبان میں بات نہیں کر سکتے تھے مگر انسانی احساسات رکھنے کی بنا پر ایک دوسرے کے چہرے سے آپس کا مشترکہ غم سمجھ گئے تھے انہوں نے غار میں رہنا شروع کر دیا۔

مرگنی کو جب یہ پتا چلا کہ راجا کو کسی جوتشی نے یہ بتایا ہے کہ شہر پر کوئی بدروح نازل ہوئی ہے تو اسے سخت غصہ آیا وہ غائب ہو کر فوراً راجا کے محل کے مہمان خانے میں جا پہنچی۔ وہاں مہمان شاہی جوتشی پھولی ہوئی توند سامنے رکھے' چوکی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا بھوجن کر رہا تھا۔ مرگنی ایک خوبصورت کنیز کی شکل میں ہاتھ میں چاندی کا گلاس لئے حاضر ہوئی۔

جوتشی نے کنیز کو دیکھا تو توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "سندری تو دور کیوں کھڑی ہے میرے پاس کیوں نہیں آتی۔"

مرگنی نے بڑے انداز سے کہا "مہاراج! پہلے آپ یہ دودھ پی لیں۔"

"لاؤ لاؤ ہم ضرور پئیں گے" یہ کہہ کر موٹے جوتشی نے مرگنی کے ہاتھ سے گلاس لے کر غٹاغٹ چڑھا لیا اس دودھ میں جوتشی کی بدقسمتی بھی شامل تھی۔ جونہی دودھ اس کی پھولی ہوئی توند کے اندر گیا اسے اندر سے جیسے کسی نے بڑے زور سے گھونسا مارا جوتشی پچھاڑ کر پیچھے گر پڑا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ نوکر چاکر بھاگے بھاگے آئے مگر کنیز یعنی

مرگنی وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ اسے غائب ہوتے ہوئے جوتشی نے بھی دیکھ لیا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا اس کی توند کے اندر دھڑا دھڑ سے گھونسے لگ رہے تھے اور وہ کانپ بھی رہا تھا اور تڑپ بھی رہا تھا وہ سمجھ گیا کہ یہ وہی بدروح ہے جس کے خلاف اس نے زائچہ بنایا تھا دیکھتے ہی دیکھتے جوتشی کا پیٹ مزید پھولنے لگا اور پھر ایک گنبد جتنا بڑا ہو کر دھماکے سے پھٹ گیا۔

راجا کو پتا چلا تو اسے بے حد دکھ ہوا۔ بدروح اس کے محل میں بھی آگئی تھی۔ اس بات سے بھی راجا فکرمند تھا۔ اس نے محل میں ہون یگیہ کا حکم دے دیا۔ اسی وقت محل میں آگ جلا کر بھجن کرتن شروع ہو گیا۔ مرگنی کو راجا کی یہ بات بھی پسند نہ آئی کیونکہ مرگنی ایک بدروح تھی اور اسے گناہ اور برائی سے پیار تھا۔ اس نے راجا کے محل میں بدکرداری اور معصیت پرستی کے لئے اس کی چھوٹی رانی ہتنی کو چن لیا جو ہون یگیہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ مرگنی اس کے اردگرد منڈلانے لگی۔ رات کو جب پاکباز چھوٹی رانی ہتنی ہون کی رسومات سے فارغ ہو کر اپنی خواب گاہ میں گئی تو مرگنی دھند کی ہلکی سی لہر کی شکل میں اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ مرگنی نے اس پر حملہ کر دیا وہ تیر کی طرح اس پر گری اور دوسرے ہی لمحے چھوٹی رانی غائب تھی اور اس کی جگہ مرگنی اس کے ریشمی کپڑوں کی ڈھیری پر بیٹھی غرا رہی تھی اور اس کی جگہ مرگنی چھوٹی رانی ہتنی کے روپ میں وہاں کھڑی بلی کی طرف خونی نگاہوں سے تک رہی تھی۔

بلی خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگی تو مرگنی نے اسے دبوچ کر اٹھا لیا اور کھڑکی سے باہر محل کے پائیں باغ میں پھینک دیا۔ بلی چیختی چلاتی باغ کے درختوں کی طرف دوڑی تو اس کی آواز راجا کی خواب گاہ میں بھی پہنچی۔ بلی کے چلانے کی آواز سن کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا رانی بھی دہشت زدہ ہو کر اٹھ بیٹھی "ہے بھگوان! یہ منحوس بدروح ہمارے محل کے اندر آگئی ہے۔"

راجا نے سپاہیوں کو طلب کر کے حکم دیا کہ محل میں بلی کو تلاش کر کے ختم کر دیا جائے۔ مگر یہ کالی بلی راجا کی چھوٹی رانی تھی' وہ خوب جانتی تھی کہ اسے راجا کے سپاہی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ چنانچہ پائیں باغ میں آتے ہی وہ شاہی محل کی باغ والی دیوار کی طرف دوڑی۔ ایک درخت پر چڑھ کر دیوار کے اوپر سے دوسری جانب کود گئی وہ محل کے باغ اور بارہ دریوں میں چھلانگیں لگاتی رات کے اندھیرے میں شاہی محل سے نکلی اور شہر کے صدر دروازے کی طرف بھاگی اور تھوڑی دیر بعد وہ پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہی اس کے لئے ایک جائے پناہ ہو سکتی تھی۔ اور ایک عجیب سی بات تھی کہ اسے اپنی ہی طرح کی

دوسری بلیوں کی بو بھی ان پہاڑیوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد چھوٹی رانی بلی بھی دوسری انسانی بلیوں میں شریک ہونے والی تھی۔

چھوٹی رانی کے روپ میں آتے ہی مرگنی نے سرہانے کی جانب لٹکتی ریشمی ڈوری کو کھینچا۔ خواب گاہ کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک کنیز سر جھکائے اندر داخل ہوئی۔

"مہارانی ..... آپ نے یاد فرمایا"

مرگنی پلنگ سے اٹھ کر کنیز کے پاس آئی اور ایک ہی جھٹکے سے اس کے سر پر اوڑھا ہوا دوپٹا دور پھینک دیا۔ کنیز تو خوف سے کانپنے لگی کہ چھوٹی رانی کا اس پر عتاب نازل ہونے والا ہے۔ مرگنی نے اس کے بال کھول دیئے اور ٹھوڑی سے پکڑ کر چہرا اوپر اٹھایا اور کہا "تیرا کوئی عاشق نہیں ہے ری؟"

چھوٹی رانی کی زبان سے یہ کلمہ سن کر کنیز شرم اور تحیر سے پانی پانی ہو گئی۔ چھوٹی رانی اپنے تقدس اور حیاداری ودھرم کی پالنا کے باعث سارے محل میں مشہور تھی اور محل کے لوگ اسے دیوی کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ اس کی زبان سے ایسے کلمات کا ادا ہونا ایک حیران کن اور انتہائی بے شرمی کی بات تھی مرگنی نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کنیز سے پوچھا "کیوں ری یہاں باہر کوئی مرد پہرہ نہیں دیتا رات کو؟"

کنیز نے خشک زبان ہونٹوں پر پھیری اور کہا "جی مہارانی جی ارطبان اس وقت پہرے پر ہے۔"

مرگنی نے کنیز کو ہاتھ سے دروازے کی طرف دھکیلا اور کہا "جاؤ ارطبان کو میرے پاس بھیج دو۔ ابھی"

کنیز تو بوکھلا گئی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چھوٹی رانی کو کیا ہو گیا ہے اور وہ یہ کس قسم کے احکامات دے رہی ہے اور کس قسم کی حرکتیں کر رہی ہے مگر حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق وہ خواب گاہ سے نکل کر راہداری میں دوڑتی ہوئی پر دروازے پہرہ دیتے پارسی نوجوان محافظ ارطبان کے پاس گئی اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں جلدی جلدی کہا کہ تمہیں چھوٹی رانی نے اپنی خواب گاہ میں بلایا ہے اور یہ کہتے ہی واپس دوڑی۔ ارطبان سوچ میں پڑ گیا کہ چھوٹی مہارانی صاحبہ نے اسے خواب گاہ میں کس لئے طلب کیا ہے؟ بہرحال چھوٹی رانی کا حکم تھا۔ وہ فوراً لمبے لمبے ڈگ بھرتا خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اپنے ہاتھ میں اٹھایا ہوا نیزہ کمر کے گرد لٹکاتا ترکش اور کمان اتار کر دروازے کے باہر رکھے اور سر جھکا کر آہستہ سے کہا "چھوٹی رانی صاحبہ! غلام حاضر ہے۔"

"اندر آ جاؤ میرے غلام ارطبان۔ اندر کیوں نہیں آتے باہر کیوں کھڑے ہو؟"

پارسی محافظ ارطبان کے لئے مہارانی کے الفاظ انتہائی غیر مانوس تھے۔ ارطبان آتش پرست تھا اور انتہائی پاکباز اور روشن ضمیر اور عبادت گزار نوجوان تھا وہ سر جھکائے چھوٹی رانی صاحبہ کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ اس نے سر جھکائے ہوئے ایک بار پھر استفسار کیا کہ اسکے لئے کیا حکم ہے۔؟

چھوٹی رانی نے کہا "ہماری طرف دیکھو میرے غلام"

ارطبان کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اب جو اس نے سر اٹھا کر رانی کو دیکھا تو لرز کر اپنا سر جھکا لیا اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

چھوٹی رانی یعنی مرگنی انتہائی ہیجان خیز روپ میں کھڑی تھی۔ روشن ضمیر، پاک باز پارسی نوجوان ارطبان نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ چھوٹی رانی مرگنی نے ارطبان کو حکم دیا کہ وہ اس کے روپ کو چہرہ اٹھا کر دیکھے۔ ارطبان نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا اور کہا۔ " رانی صاحبہ! کنول کا پھول دلدل میں اُگتا ہے مگر اس کا چہرہ آسمان کی طرف اٹھا ہوتا ہے۔ وہ اپنی دلدل سے لاتعلق ہوتا ہے۔"

اس سے زیادہ مرگنی کی توہین نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بہت غضبناک ہو گئی۔ اس نے فوراً جلاد کو بلوا کر حکم دیا۔ "اس گستاخ کو لے جاؤ اور ہاتھی کے پیروں تلے کچلوا دو۔"

ارطبان کو اسی وقت گرفتار کر کے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ ارطبان کے چہرے پر گہرا اطمینان اور سکون آمیز خاموشی تھی۔ اسے جیل خانے کی عقبی کوٹھری میں ڈال دیا گیا۔ دوسرے روز اسے قلعے کے صحن میں پابہ زنجیر لایا گیا۔ چھوٹی رانی مرگنی شاہ نشین کے طاق میں ارطبان کی عبرت انگیز موت کا تماشا دیکھنے پہلے سے آ کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک کنیز مور چھل ہلا رہی تھی۔ ارطبان کے صرف پاؤں کی زنجیر رہنے دی گئی۔ اسے فرش پر لٹا کر اوپر لکڑی کا مضبوط تختہ ڈال دیا گیا۔ مہاوت کو اشارہ ملا۔ وہ جیل خانے میں گیا اور سب سے قوی الجثہ ہاتھی کو لے کر صحن میں آ گیا۔ مرگنی اور دوسرے چند ایک درباری اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ مرگنی انتقام کی آگ میں سلگ رہی تھی۔ ارطبان نے اس کے حسین سراپا کو ٹھکرا کر اس کی توہین کی تھی اور وہ اسے ہاتھی کے پاؤں تلے کچلتا دیکھنا چاہتی تھی۔

فیل بان نے ہاتھی کی سونڈ کو پکڑا اور اسے اس تختے کی طرف بڑھنے کا حکم دیا جس کے نیچے روشن ضمیر ارطبان لیٹا تھا۔ ہاتھی تختے کی طرف بڑھا مگر تختے کے پاس آ کر رک گیا۔ فیل بان نے بہت کوشش کی مگر ہاتھی اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھا۔ مرگنی کو تشویش ہوئی۔ اس نے شاہ نشین میں سے نیچے جھانک کر مہامنتری کو حکم دیا کہ فیل بان سے

کہو ہاتھی کو آنکس کی مدد سے آگے بڑھائے۔ فیل بان چھوٹی رانی کے حکم پر عمل کرتے ہوئے ہاتھی کی گردن پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور آنکس چلاتے ہوئے ہاتھی کو آگے بڑھانے کے لیے جتن کرنے لگا۔

نوکیلا آنکس ہاتھی کی گردن میں بار بار گھس رہا تھا۔ ہاتھی کو ضرور تکلیف ہوئی ہو گی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ اب وہاں موجود بعض درباریوں پر خوف سا طاری ہو گیا اور آپس میں ارطبان کی بے گناہی کے بارے میں چہ مگوئیاں کرنے لگے۔ چھوٹی رانی مرگنی غصے سے بپھر گئی۔ اس نے مہامنتری کو کہا۔ فیل بان سے کہو اگر میرے حکم پر عمل درآمد نہ کیا گیا تو خود فیل بان کو یہ سزا بھگتنی ہو گی۔"

جب فیل بان کو یہ اطلاع ملی تو اس نے اپنی زندگی کے بھرپور تجربے کو روبہ عمل لاتے ہوئے ہاتھی کو طرح طرح سے اذیت دے کر لکڑی کے تختے پر چڑھنے کی ترغیب دینے کی کوشش کی مگر ہاتھی اپنی جگہ پر پہلے کی طرح کھڑا رہا۔ فیل بان کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھی کے کان پر زور سے آنکس مارا۔ ہاتھی سونڈ اٹھا کر چنگھاڑا اور پھر سونڈ کو اوپر لہراتے ہوئے فیل بان کو جکڑ کر نیچے گرا لیا اور اس کے پیٹ پر اپنا بھاری بھرکم پاؤں رکھ کر ایسا دبایا کہ فیل بان کی لاش پچک کر فرش کے پتھر کے ساتھ کاغذ کی طرح چمٹ گئی۔

درباریوں میں دہشت چھا گئی۔ چھوٹی رانی مرگنی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا جسم غصے سے لرز رہا تھا۔

اس نے گرج دار آواز میں کہا۔ "ارطبان کو زنجیروں میں جکڑ کر دریا برد کر دو۔"

جلاد نے فوراً اپنے ساتھیوں کی مدد سے ارطبان کو لکڑی کے نیچے سے نکالا اور اس کے جسم کو ایک بار پھر زنجیروں سے جکڑ کر رکھ دیا۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے دریا پر لے گئے۔ دریا میں ایک چھوٹی کشتی کھڑی تھی۔ دس مسلح سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ارطبان کو کشتی کے وسط میں بٹھا کر اسے کشتی کے ساتھ رسیوں سے باندھ دیا گیا۔ پھر مرگنی کے حکم سے کشتی میں سپاہیوں نے پتھر بھرنے شروع کر دیے۔

کشتی آہستہ آہستہ پانی میں ڈوبنے لگی۔ پھر ان سب نے ایک ایسا منظر دیکھا جو انہوں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ کشتی پانی میں ڈوب گئی مگر ارطبان صحیح سلامت پانی کے اوپر آلتی پالتی مارے بیٹھا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور چہرے سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ مرگنی آگ بگولا ہو گئی۔ اس نے حکم دیا کہ ارطبان کو شیر کے غار میں پھینک دیا جائے۔ قلعے میں ایک غار تھا جس کے اندر ایک خونخوار شیر رہتا تھا۔ ارطبان کو غار میں دھکیل دیا گیا۔ غار سے شیر کی دہاڑ سنائی دی۔ اس کے بعد کوئی آواز نہ آئی۔ سب

نے یہی سمجھا کہ شیر نے ارطبان کو ہڑپ کر لیا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

چند لمحوں کے بعد ارطبان ایسی شان سے باہر نکلا کہ وہ شیر پر سوار تھا اور شیر بڑی شان سے اپنا سر اٹھائے قلعے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مرگنی طیش میں آ کر کوئی دوسرا حکم دینے ہی والی تھی کہ مہامنتری نے بڑے ادب سے درخواست کی کہ شیر اور ارطبان کو قلعے سے نکل جانے دیا جائے۔ مرگنی اس پر تیار نہیں تھی لیکن اب راجا کو بھی اس کی خبر ہو گئی تھی۔ اس نے جب سب حالات سنے تو حکم دے دیا کہ ارطبان کو قلعے سے نکل جانے دیا جائے۔

ارطبان شیر کی پیٹھ پر بیٹھا قلعے سے نکل کر جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ کسی کو اس کے قریب آنے کی جرات نہیں ہو رہی تھی۔ شیر انتہائی وقار سے چلتے ہوئے غرا رہا تھا۔ پہاڑی ترہٹ میں پہنچ کر ارطبان نے شیر کو پیار کر کے رخصت کر دیا اور خود..... پہاڑی کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ وہ پہاڑی کی چوٹی پر جا کر باقی عمر مالک حقیقی کے گیان دھیان میں بسر کرنا چاہتا تھا۔ اسی پہاڑی کی ڈھلان پر اوپر جا کر ترشول مندر پڑتا تھا جس کی ایک کوٹھری میں عاطون زمرد کی انگوٹھی میں قید تھا۔ ارطبان نے جب اس ویران مندر کو دیکھا تو اسے مالک حقیقی کی یکسوئی کے ساتھ عبادت کے لیے وہ جگہ پسند آئی۔ وہ مندر کے بوسیدہ پتھریلے صحن میں داخل ہوا تو سامنے سے ایک دیوداسی آتی دکھائی دی۔ ارطبان وہیں رک گیا۔ دیوداسی نے ایک سفید لباس والے پر نور شخص کو دیکھا تو قریب آ کر اسے نمسکار کیا ارطبان نے پوچھا کیا اس مندر میں پوجا پاٹھ ہوتی ہے اور کوئی پجاری بھی ہے؟ دیوداسی مسکرائی اس نے کوئی جواب نہ دیا اور دانتوں تلے انگلی دابے مسکراتی ہوئی پیچھے کو مڑ گئی۔

ارطبان کو یہ اسرار پسند نہ آیا۔ وہ مندر کے صحن سے باہر نکلا اور مندر کے عقب سے ہو کر اوپر والی ایک پہاڑی کھوہ میں داخل ہو گیا۔ اس کھوہ میں اندھیرا اور تنہائی تھی۔ یہاں وہ مالک حقیقی کے انوار کو زیادہ پر جلال انداز میں دیکھ سکتا تھا۔ ارطبان نے ایک جگہ صاف کی' آسن جمایا اور سادھی لگا کر مالک حقیقی کے تصور میں گم ہو گیا۔

مرگنی اپنی شکست کی بعد غضبناک ہو گئی تھی۔ وہ بدی کی پوری طاقت بن کر اب نیکی کی غیر فانی طاقت کو نیچا دکھانے کی ناکام کوشش میں لگ گئی۔ اس نے راجا کے محل کو چھوڑ دیا اور ترشول مندر میں آ کر اپنی اصلی مرگنی کی شکل میں آ گئی۔ اس نے مندر میں آتے ہی چھ دیوداسیوں کو ہلاک کر کے ان کے سر مندر کے دروازے میں لٹکانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے کبھی کبھی ان دیوداسیوں کے چہروں پہ نیکی کی چمک نظر آ جاتی تھی جو مرگنی کو اب ہرگز گوارا نہیں تھی۔ دیوداسیاں مرگنی کے ناپاک عزائم سے بے خبر اپنی اپنی کوٹھری میں

لیٹی تھیں کہ مرگنی نے دیوداسیوں کو بلا کر اپنے استھان کے سامنے ایک قطار میں کھڑا کر دیا۔ پھر وہ ترشول لے کر ان کی طرف بڑھی تو دور اوپر پہاڑی کی کھوہ میں سادھی لگائے بیٹھے ارطبان کے مراقبے میں خلل پڑا اور اس کی چشم روشن نے وہ منظر دیکھ لیا۔ مرگنی نے ترشول کو لہرا کر ایک دیوداسی کی گردن پر حملہ کرنا چاہا تو ترشول اس کے ہاتھ سے اڑ کر غائب ہو گیا۔

مرگنی کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ دیوداسیاں مرگنی کے طلسم میں بندھی بت بنی کھڑی تھیں۔ مرگنی نے یم دوت کو یاد کیا اور ایک ہاتھ بڑھایا۔ دوسرے لمحے اس کے ہاتھ میں ایک تلوار لہرا رہی تھی۔ مرگنی نے غصے میں غراتے ہوئے تلوار سے ایک دیوداسی کی گردن پر وار کیا۔ اس دفعہ تلوار کی بجائے دیوداسی غائب ہو گئی۔ مرگنی دوسری دیوداسی پر لپکی وہ بھی غائب ہو گئی۔ یوں چھ کی چھ دیوداسیاں غائب ہو گئیں۔ مرگنی کے ہاتھ میں تلوار پکڑی رہ گئی۔

وہ نیکی کی برتر قوتوں سے خائف ہو کر اپنی کوٹھری کی طرف دوڑی اور یم دوت کو یاد کر کے اسے آواز دی۔ یم دوت نے جواب دیا۔ "مرگنی تیرا مقابلہ ایک بہت بڑی چٹان سے ہے جس سے ٹکرا کر تیری ساری شکتی ناکام ہو جاتی ہے۔"

مرگنی نے کہا۔ "تو میری مدد کر یم راج' میں نے تیرے لیے بہت کچھ کیا ہے' میں تیری بالکی بھی ہوں۔"

یم دوت بولا۔ "یہاں تیری مدد کرنا میرے اختیار سے باہر ہے۔ میں تجھے ایک مشورہ ضرور دوں گا' تو ارطبان کی تپسیا کو بھنگ..... نہیں کر سکے گی اس لیے بہتر ہے کہ تو مہالنکا کی طرف چلی جا۔"

مرگنی کو ہزیمت کبھی گوارا نہیں تھی اس نے جھنجلا کر کہا۔ "میں یہیں رہ کر اس رشی کو شکست دوں گی۔ میں اسے اپنے ساتھ گناہوں کی دلدل میں گھسیٹ کر لے جاؤں گی۔"

یم دوت بولا۔ "اگر تجھ میں اتنی شکتی ہے تو یہ بھی کر کے دیکھ لے۔ ہو سکتا تو کامیاب ہو جائے۔" اصل میں یم دوت اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا' کیونکہ اسے معلوم تھا کہ مرگنی ایسے اعلیٰ مہارشی کو شکست نہیں دے سکے گی جو خالق حقیقی کی محبت میں روشنی کے ساتھ خود بھی روشنی بن چکا ہے۔ جانے سے پہلے یم دوت نے مرگنی کو ہدایت کی کہ وہ چٹان والی کوٹھری میں جا کر عاطون کی زمردیں انگوٹھی کو ایک نظر دیکھ لے۔ اگر وہ اس کے ہاتھ سے نکل گئی تو خود بھی باقی نہیں رہے گی۔"

یم دوت کے جانے کے بعد مرگنی مندر کے ویران والان میں زخمی شیرنی کی طرح

ٹہلنے لگی۔ پھر وہ چٹان والی کوٹھری میں گئی' پتھر ہٹا کر گڑھے میں دیکھا۔ زمرد کی وہ مخروطی انگوٹھی وہیں پڑی تھی جس میں عاطون قید تھا۔ مرگنی نے دوبارہ پتھر گڑھے پر رکھا اور مندر میں آ گئی۔ اس میں اتنی شکتی ضرور تھی کہ اپنی کسی خواہش کو پورا کر سکے۔ وہ مندر کے دروازے پر آ کر دور اوپر پہاڑی ڈھلانوں کو تکنے لگی۔ اس طرف سے اسے نیکی کی شعاعیں آتی محسوس ہوئیں۔ یہ شعاعیں اسے پریشان کر رہی تھیں۔ وہ تیزی سے مندر میں واپس چلی گئی۔ وہ مندر کے سب سے بڑے ستون کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور پاتال منتر کا جاپ کرنے لگی۔ جاپ ختم کرنے کے بعد اس نے ایک چیخ ماری اور دوسرے ہی لمحے ناگن کا روپ دھار لیا۔ یہ ایک بالشت بھر کی انتہائی زہریلی ناگن تھی جس کا چھوٹا سا نیلا پھن پھنکاریں مار رہا تھا اور سخت غضبناک عالم میں تھا۔

مرگنی ناگن مندر سے نکل کر پہاڑی ڈھلوان والے کھوہ کی طرف چل پڑی۔

کھوہ کے قریب وہ ایک جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گئی' اور رات کا اندھیرا پھیلنے کا انتظار کرنے لگی۔ پھر جب سورج..... پہاڑیوں کے پیچھے اتر کر غروب ہو گیا اور شام کی سیاہی رات کی تاریکی میں گھل مل گئی اور ہر طرف اندھیرا اور سناٹا چھا گیا تو مرگنی نے اس کھوہ کی طرف رینگنا شروع کیا جس کے اندر روشن ضمیر ارطبان عبادت الٰہی میں محو تھا۔

جو لوگ خالق حقیقی کی یاد میں ہمہ تن گم ہو جاتے ہیں انھیں آس پاس کی کوئی خبر نہیں رہتی۔ ارطبان بھی ذات الٰہی کے جلال و جمال کے نظارے میں گم تھا۔ مرگنی ناگن کی شکل میں کھوہ میں داخل ہو گئی۔ اس نے دور سے ارطبان کو دیکھا جو اندھیرے میں ایک جگہ سادھی لگائے بیٹھا تھا۔ آنکھیں بند کیے' چہرے کے گرد نورانی ہالہ سجائے۔ مرگنی کو بے چینی محسوس ہونے لگی۔ وہ کھوہ کی پتھریلی دیوار پر رینگتی ہوئی ارطبان کے پیچھے کی طرف نکل گئی۔ پھر چھت پر آ گئی اور عین ارطبان کے سر کے اوپر آ کر اسے نیچے دیکھا۔ ارطبان مراقبے میں گم تھا۔ مرگنی اسی وقت حملہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے انجام سے صرف بے خبر ہی نہیں تھی بلکہ بے پروا بھی تھی۔ اس نے اپنا چھوٹا سا زہریلا پھن پھیلایا اور پھر پھنکار مار کر ارطبان کی گردن پر چھلانگ لگا دی۔

ارطبان کی گردن پر گرتے ہی مرگنی ناگن نے اس کی گردن پر ڈس لیا۔ اگر کسی عام آدمی کو مرگنی ڈستی تو اس کا جسم ایک سیکنڈ میں پانی بن کر پگھل جاتا' مگر ارطبان پر مرگنی ناگن کے زہر کا کوئی اثر نہ ہوا' نہ ہی اس کا مراقبہ ٹوٹا۔ مرگنی ناگن نے ایک بار پھر گردن پر ڈس لیا۔ اس مرتبہ زہر نے خود مرگنی ناگن پر اثر کیا اور وہ تڑپ کر پیچھے کو گری۔ زمین پر گرتے ہی وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔ وہ کھوہ سے باہر کی جانب بھاگی۔ باہر بڑے پتھر پر

آتے ہی اس نے خواہش کی کہ وہ اپنے مندر میں اصلی روپ میں پہنچ جائے اور پھر ایسا ہی ہوا کیونکہ یم دوت کا اسے وردھان حاصل تھا کہ اس کی ہر خواہش پوری ہو جایا کرے گی۔

مرگنی دوسرے لمحے اپنے اصلی روپ میں مندر میں پہنچ گئی مگر اس کے جسم کا رنگ سبز پڑ گیا اور اس کے خون میں جیسے کسی نے آگ لگا دی تھی۔ وہ باہر مندر کے تالاب پر آئی اور اس میں چھلانگ لگا دی۔ تالاب کے یخ پانی نے اسے بے حد سکون دیا اور وہ دیر تک پانی میں بیٹھی رہی۔ اس کے سانس کے ساتھ پانی گرم ہو جاتا تھا۔ آدھی رات کو وہ پانی سے نکلی اور مندر میں آ کر کسی دوسرے وار کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگی۔ اس نے سوچا کہ وہ پہاڑ کا ایک بہت بڑا پتھر بن کر اس کھوہ کے اوپر گرے گی جس کے اندر ارطبان محو مراقبہ ہے اور کھوہ کو تہس نہس کر دے گی۔ ارطبان خود ہی کھوہ میں دب کر مر جائے گا۔

مرگنی نے یہ سوچ کر ایک قہقہہ لگایا اور اندھیرے میں بیٹھ کر ایک بار پھر پاتال منتر کا جاپ شروع کر دیا۔ عین اسی وقت مندر بھٹکتی سادھو کی روح وہاں پہنچ چکی تھی۔ سادھو کی روح نے مرگنی کو پاتال منتر کا جاپ کرتے دیکھا تو ہر شے اس کے آگے روشن ہو گئی وہ ایک بندر کا روپ دھار کر مرگنی کے سامنے آ گیا۔ مرگنی کا ہون بھنگ ہو گیا۔ اس نے غصیلی نظروں سے بندر کو دیکھا۔ بندر نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "دیوی مجھے شما کر دے۔ میں اپنے بچوں کی تلاش میں ادھر آ نکلا ہوں۔ میرے بچے صبح سے گم ہیں۔"

مرگنی کو اس قدر غصہ آیا کہ اس نے دل میں خواہش کی کہ بندر پتھر کا ہو جائے۔ اس نے بندر کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا مگر بندر اسی طرح زندہ حالت میں بیٹھا رہا۔ وہ پتھر کا نہ ہو سکا۔ مرگنی کچھ پریشان ہوئی کہ یہ بندر اصل میں کون ہے؟ اس نے بندر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "سچ بتا تو کون ہے؟"

بندر غائب ہو گیا۔ مرگنی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر تکنے لگی۔ جب اسے بندر کہیں دکھائی نہیں دیا تو اس نے دوبارہ پاتال منتر کا جاپ شروع کر دیا۔ ابھی اس نے منتر پڑھا ہی تھا کہ اسے عجیب قسم کی پھنکار سنائی دی..... مرگنی نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا مگرمچھ اس سے چند قدم کے فاصلے پر فرش پر لیٹا اپنا منہ کھولے اسے تک رہا تھا۔ مرگنی نے ہاتھ اٹھا کر اسے سراپ دیا۔ "تو اسی فرش کے نیچے دفن ہو جا۔"

مگر اس مگرمچھ پر بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح منہ پھاڑے، دانت نکالے مرگنی کو کھا جانے والی نظروں سے تکتا رہا..... مرگنی کو تشویش ہوئی کہ معاملہ الٹ ہو رہا ہے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بھاگ کر اپنی کوٹھڑی میں آئی اور یم دوت کو آواز دی، لیکن اس دفعہ یم دوت بھی اس کی آواز پر نہ آیا۔ مرگنی نے کئی بار یم دوت کو پکارا مگر ہر بار اسے ناکامی ہوئی۔

اب اسے اپنے اردگرد گرم لہروں کا احساس ہوا جو اس کے سبز جسم سے ٹکرا رہی تھیں۔ مرگنی بوکھلا کر باہر کو دوڑی۔ مندر کے دالان میں اسے ایک سادھو نظر آیا جو اتنا لمبا تھا کہ اس کا جٹا دھاری سر مندر کی اونچی چھت کو چھو رہا تھا۔ اس کے لمبے بازو ستونوں کی طرح نیچے فرش سے لگ رہے تھے۔ مرگنی خوف زدہ ہو کر بولی۔

"تم کیا چاہتے ہو؟ آخر تم کیا چاہتے ہو؟ تم کون ہو؟"

سادھو بولا۔ "میں تمہاری موت ہوں۔"

مرگنی لرز گئی۔ پھر ہمت کر کے بولی۔ "تم میری موت نہیں ہو سکتے۔ میری موت یم دوت کے اختیار میں ہے۔"

سادھو نے اپنا چھپر جیسا ہاتھ مرگنی کے سر کے اوپر رکھ دیا۔ مرگنی کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے سر پر چٹان رکھ دی ہو۔ پھر سادھو کی آواز آئی۔ "مرگنی! میں نے بھی زندگی میں بڑے پاپ کیے ہیں۔ میں بھی اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں، پر تو نے خلق خدا کو جس طرح ذلیل کیا اور اس کی بے عزتی کی ایسا گناہ میرے وہم میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ لگتا ہے تیری موت سے میرا کفارہ ادا ہو جائے گا۔"

سادھو نے اپنا ہاتھ اس کے سر سے اٹھا لیا۔ وہ باہر کی طرف تیزی سے لپکی۔ سادھو کے بازو اتنے لمبے تھے کہ اس نے مندر کے دروازے میں ہی مرگنی کو چوہے کی طرح دبوچ کر اٹھا لیا اور اپنے منہ کے قریب لا کر بولا۔ "مرگنی برائی کبھی پائیدار نہیں ہوتی۔ برے کام کا بدلہ ہر برے کو ضرور ملتا ہے۔ تو نے نہ جانے کتنے بے گناہوں کی جان لی ہے۔ تمہیں اس کی سزا دی جائے گی۔"

مرگنی نے فوراً ایک کالی بلی کا روپ بدلا اور چیختی چلاتی باہر کو دوڑی۔ مندر سے نکلتے ہی مرگنی کی رفتار چیتے کی مانند ہو گئی اور وہ ایک سیکنڈ میں بہت دور نکل گئی لیکن دیو قامت سادھو اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے جھک کر بھاگتی ہوئی مرگنی کو دم سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ پھر اسے زور سے نیچے پتھر پر پٹخا پتھر سے ٹکراتے ہی مرگنی ایک آدمی کی شکل میں آ گئی۔ سادھو نے اسے ٹانگ سے پکڑ کر دوبارہ پتھر پر دے مارا۔ اس بار وہ ایک عورت کی شکل اختیار کر گئی۔ مرگنی نے آج تک جتنے روپ بدلے تھے وہ ان روپ میں آتی گئی اور سادھو اسے پتھروں پر پٹکتا رہا۔ آخری روپ مرگنی کا اپنا روپ تھا۔ اس بار سادھو نے اسے پتھر پر مارا تو وہ مادہ خنزیر کی شکل میں بدل گئی۔ سادھو نے اسے اٹھا کر زور سے فضا میں اچھال دیا اور اس کی طرف ایک زور دار پھونک ماری۔ مادہ خنزیر یعنی مرگنی کو فضا میں ہی آگ لگ گئی اور آگ کا گولا بنی نیچے آنے لگی۔ وہ زمین تک آتے آتے جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ سادھو

نے ایک قہقہہ لگایا اور فضا میں اچھل کر غائب ہو گیا۔

مرگنی کے فنا ہوتے ہی عاطون اپنے آپ انگوٹھی سے نکل کر چٹان والی کوٹھری میں آ گیا۔ اس نے حیرت سے اردگرد دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ مرگنی کا طلسم کسی وجہ سے ٹوٹ گیا ہے۔ وہ کوٹھری سے نکل کر مندر میں آیا۔ مندر تاریکی میں ڈوبا سنسان پڑا تھا۔ باہر آسمان پر چاند نکل آیا تھا۔ جس کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے کو چوم رہی تھی۔ عاطون کو یہ سارا منظر بے حد پرسکون محسوس ہوا۔ وہ نیچے شہر کو جانے والی پہاڑی پگڈنڈی پر چل پڑا۔

شہر کا دروازہ ابھی دور تھا کہ اسے ایک نورانی شکل والا نوجوان ملا۔ اس نے عاطون کی طرف دیکھ کر کہا۔ "عاطون اب تیرا اس شہر میں کوئی کام نہیں۔"

عاطون رک گیا۔ وہ اس نورانی شکل والے نوجوان سے بہت متاثر ہوا۔ اس کی پرنور شکل پر خدا کا جمال تھا اور بے حد سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے ادب سے پوچھا۔ "اے بزرگ نوجوان' کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟"

نوجوان بولا۔ "میں تمہیں شروع سے آخر تک جانتا ہوں میرے بھائی۔ جس بدکار عورت نے تجھ پر طلسم کر رکھا تھا وہ جہنم رسید ہو چکی ہے اور اس کے طلسم میں گرفتار شہر کی تمام لڑکیاں اور لڑکے انسانی شکل میں واپس آ کر اپنے اپنے گھروں میں پہنچ گئے ہیں۔"

عاطون نے کہا۔ "کیا اس عورت نے شہر کی لڑکیوں اور لڑکوں پر بھی طلسم کیا تھا؟"

ہاں۔ نوجوان نے کہا۔ "وہ بلیوں کی شکل میں تھے..... بہرحال اب تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

عاطون نے سوال کیا۔ "حضور! میرا دوست پدم مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ میں اس شہر میں اس کو تلاش کرنے جا رہا ہوں۔"

نوجوان نے کہا۔ "وہ تمہیں اس شہر میں نہیں ملے گا۔"

عاطون نے پوچھا۔ "پھر میں اسے کہاں تلاش کروں؟"

نوجوان بولا۔ "تم اپنے قدیم وطن ملک مصر جاؤ۔ وہاں پر ایک خدا پرست' نیک دل اور انصاف پسند بادشاہ رعمیس حکمران ہے۔ وہ سورج کی پرستش نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اس خدا کی پرستش کرنے کا خواہش مند ہے جس نے سورج بنایا ہے مگر دربار کے کاہن اور وزیر اس کے خلاف خونیں سازشیں کر رہے ہیں۔ اسے تمہاری ضرورت ہے۔"

عاطون بولا۔ "اے بزرگ نوجوان! میں وہاں کس حیثیت سے داخل ہوں گا کیونکہ فرعون کے محل میں تو کوئی اجنبی داخل ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

نوجوان نے کہا۔ "جب تم وہاں جاؤ گے تو تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری حیثیت کیا ہے۔"

نوجوان جانے لگا تو عاطون نے کہا۔ "کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

نوجوان مسکرایا اور بولا۔ "میرا نام ارطبان ہے۔" اور پھر وہ غائب ہو گیا۔

عاطون ایک پل کے لیے وہاں خاموش کھڑا رہا۔ اس کے بعد وہ شہر کی سب سے بڑی کارواں سرائے میں آ گیا اور کسی ایسے قافلے کا انتظار کرنے لگا جو اسے ملک مصر پہنچا دے۔

دو دن کی مسافت کے بعد قافلہ جب روم کے ایک مضافاتی قصبے میں رکا تو پدم ناگ نے عاطون کو ملک ہندوستان میں تلاش کرنے کی بجائے ملک مصر جا کر تلاش کرنے کا سوچا کیونکہ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ عاطون سے اب ملاقات صرف ملک مصر میں ہی ہو سکے گی۔ یہ خیال آتے ہی پدم ناگ نے روہنی کو سالار قافلہ کی نگرانی میں بحفاظت اس کے گھر پہنچانے کا بندوبست کر دیا اور اس خدمت کے عوض سالار قافلہ کو زاد راہ بھی دے دیا۔ روہنی پدم ناگ اور عاطون کے الگ ہونے کے خیال سے رونے لگی تو پدم ناگ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ قانون قدرت کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور ہم پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ ہم ان کو پورا کریں..... پھر تقدیر میں تمہارا اور ہمارا ساتھ اتنا ہی لکھا تھا لیکن یہ میرا وعدہ رہا کہ میرا اور عاطون کا جب بھی ملک ہندوستان آنا ہوا تم سے ملاقات ضرور کریں گے۔ اسی رات پدم ناگ روہنی کو سالار قافلہ کے سپرد کر کے واپس روم کی طرف روانہ ہوا تاکہ وہاں مصر جانے والے کسی بھی قافلے کے ساتھ ملک مصر روانہ ہو سکے۔

صبح کو پدم ناگ روم کی کارواں سرائے جانے کی بجائے گھومتے گھومتے روم کے ایمفی تھیٹر کی طرف چلا گیا۔ اس وقت ایمفی تھیٹر میں گلیڈی ایٹرز کا خونی کھیل ہو رہا تھا۔ جہاں سزائے موت پانے والے ایک بدنصیب شخص کو چھرا ہاتھ میں دے کر میدان میں چھوڑ دیا گیا اور ایک زرہ پوش گلیڈی ایٹر بھی ہاتھ میں چھرا لے کر اس کے مقابلے پر آ گیا۔ موت کی سزا پانے والے کو کہا گیا کہ اگر وہ اپنے مدمقابل کو چھرے سے ہلاک کر دے گا تو اس کی سزائے موت معاف کر دی جائے گی۔ مقابلہ شروع ہو گیا۔ سزا یافتہ بے چارہ کمزور تھا اور پھر دشمن زرہ پوش تھا۔ پدم ناگ ایک دیوار پر بیٹھا اس ناانصافی کا نظارہ کر رہا تھا۔

پدم کو احساس ہوا کہ اگر اس نے مزید دیر کر دی تو کمزور قیدی مارا جائے گا۔ پدم نے ایک چھوٹے سے مٹیالے رنگ کے باریک سانپ کا روپ دھارا اور میدان میں اتر آیا۔

گنیڈی ایٹر دھڑا دھڑ چھرا چلا رہا تھا۔ پدم ناگ اس کی زرہ کے اندر اس کی پنڈلی کے اوپر چڑھ گیا اور فوراً اس کے گھٹنے پر ڈس لیا۔ زہر کے اثر سے زرہ پوش سپاہی دھڑام سے گر پڑا۔ سزا یافتہ کمزور سا قیدی ہکا بکا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ تھیٹر میں شور مچ گیا۔ پدم زرہ پوش سپاہی کے بدن سے اتر کر رینگتا ہوا قیدی کی طرف گیا۔ اور انسانی آواز میں کہا۔ "اسے میں نے تمہاری خاطر ہلاک کیا ہے۔ مجھے دیکھ کر گھبراؤ نہیں، مجھ سے ڈرو نہیں، میں انسان ہوں مگر یہاں سب کے سامنے انسانی شکل میں نہیں آ سکتا۔"

لوگ شور مچا رہے تھے کہ قیدی کو چھوڑ دیا جائے۔ شرط کے مطابق اب رہائی اس کا حق ہے۔ بادشاہ یہ نہیں چاہتا تھا مگر لوگوں کی رائے کے سامنے اسے مجبوراً قیدی کو چھوڑ دینا پڑا۔ اس نے حکم دیا کہ قیدی کو رہا کر دیا جائے۔ ساتھ ہی اس نے اپنے ایک خاص جلاد کو اس کے پیچھے لگا دیا کہ موقع ملتے ہی قیدی کو ہلاک کر دے۔ قیدی تھیٹر سے باہر نکل آیا۔ لوگ اسے مبارک باد دینے آگے بڑھے۔ ان میں بادشاہ کا جلاد بھی تھا۔ خنجر اس نے اپنی بغل میں چھپا رکھا تھا۔ پدم ناگ اس وقت انسان کی شکل میں تھا۔ اس نے قیدی سے کہا۔ "یہاں سے نکل چلو۔" قریب ہی ایک رتھ کھڑا تھا۔ پدم نے قیدی کو اس پر سوار کرایا۔ خود باگیں تھامیں اور گھوڑوں پر چابک رسید کی۔ گھوڑے رتھ کو لے کر شہر سے باہر جانے والی سڑک پر سرپٹ دوڑنے لگے۔ بادشاہ کے جلاد نے بھی اپنے گھوڑے کو رتھ کے پیچھے ڈال دیا۔ پدم ناگ نے قیدی سے اس کا نام پوچھا۔ اس نے کہا۔ "میرا نام فیدس ہے۔ میں ایک وطن پرست ہوں اور ملک میں آزادی رائے دہی کے لیے جدوجہد میں شریک تھا کہ گرفتار ہو گیا۔"

پدم نے پوچھا۔ "تمہارے پاس کوئی ایسی جگہ ہے جہاں تم چھپ کر کچھ دیر رہ سکو؟"

فیدس نے کہا۔ "میں یہاں اکیلا آیا تھا۔ میری گرفتاری کے بعد میرے ساتھی ملک سے فرار ہو گئے ہیں۔"

پدم نے اس سے سوال کیا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے جس پر فیدس بولا۔ "ملک مصر میں میری ایک رشتے دار عورت رہتی ہے۔ میں مصر کے دارالحکومت تھیبز جانا زیادہ پسند کروں گا۔ وہاں میں محفوظ رہوں گا۔"

پدم نے کہا۔ "میں تمہیں اپنی حفاظت میں مصر لے چلوں گا۔"

فیدس نے کہا۔ "تم میرے لیے کہاں اتنی تکلیف کرو گے۔"

پدم بولا۔ "یہ میرا فرض ہے اور پھر مجھے اپنے جس دوست کی تلاش ہے اس کا

وطن بھی کبھی مصر ہی تھا۔ سوچتا ہوں ہو سکتا ہے اسی بہانے میری ملاقات اپنے دوست سے ہو جائے۔"

فیدی نے کہا۔ "تو پھر رتھ کا رخ بندرگاہ کی طرف موڑ دو ہمیں مصر کے لیے وہاں سے بادبانی جہاز مل جائے گا جو ہمیں اسکندریہ تک لے جائے گا۔"

پدم ناگ نے ایسا ہی کیا۔ بادشاہ کا جلاد جاسوس برابر ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ فیدس اور پدم بندرگاہ کے قریب ایک پرانی کارواں سرائے میں اتر گئے۔

جہاز دوسرے روز شام کے وقت لنگر اٹھانے والا تھا۔ پدم ناگ نے فیدس سے بات کی تو وہ بولا۔ "ہو سکتا ہے مجھے ہلاک کروانے کے لیے بادشاہ نے میرے پیچھے آدمی لگا دیے ہوں، کیونکہ ہم جیسے آزادی پسند اور شاہ دشمن انقلابیوں کو بادشاہ کسی صورت میں زندہ دیکھنا نہیں چاہتا۔"

پدم ناگ نے کہا۔ "میں تمہاری حفاظت کروں گا مگر میری ایک ہی شرط ہے کہ تم کسی صورت میں بھی اس کوٹھری سے باہر نہیں نکلو گے۔"

فیدس نے حامی بھر لی اور کوٹھری میں بچھے ہوئے پلنگ پر لیٹ گیا اور پدم ناگ کوٹھری سے باہر عقاب کی شکل میں درخت کی شاخ پر بیٹھ کر فیدس کی نگرانی کرنے لگا۔ بادشاہ کا جلاد.... جاسوس کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ کوٹھری میں فیدس کے ساتھ اس کا ساتھی بھی ہو گا۔ جب دن ڈوب گیا اور کوٹھری سے کوئی بھی باہر نہ نکلا تو جلاد جاسوس کو بے چینی ہوئی۔ اندھیرا ہوتے ہی وہ کوٹھی کی عقبی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ یہ کھڑکی پدم ناگ نے بند کروا رکھی تھی۔ پدم ناگ اس کھڑکی سے غافل نہیں تھا۔ اندھیرے میں بھی اس نے جلاد جاسوس کو پچھلی بند کھڑکی کی طرف جاتے دیکھ لیا اور وہ غوطہ لگا کر فوراً وہاں پہنچ گیا۔

جلاد جاسوس کھڑکی کے پٹ میں سلاخ ڈال کر اسے آواز پیدا کیے بغیر اکھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پدم ناگ عقاب کی صورت میں کھڑکی کے پاس منڈیر پر آ کر بیٹھ گیا اور انسانی آواز میں جلاد جاسوس سے مخاطب ہوا۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو بادشاہ کے حکم پر؟"

جلاد جاسوس کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پہلے تو اسے کسی طرح یقین ہی نہ آیا کہ عقاب اس سے انسانی آواز میں مخاطب ہے مگر جب پدم ناگ نے کہا۔ "بد قسمت انسان، میں عقاب کی شکل میں تجھ سے ہم کلام ہوں اور شاید میری آواز تیری زندگی کی وہ آخری آواز ہے جس کے بعد تو کسی کی آواز نہیں سنے گا۔"

جلاد جاسوس خوفزدہ سا ہو کر پیچھے کو ہٹا۔ پدم ناگ خاموش بیٹھا رہا۔ جلاد جاسوس

ایک دم سے پیچھے کو دوڑا۔ پدم ناگ ہوا میں اوپر کو اٹھا اور پھر چند قدموں کے فاصلے پر بھاگتے ہوئے جلاد جاسوس کو جا لیا۔ اس طرح فضا میں سے جلاد پر گرا جیسے عقاب فضا میں بلندی پر سے غوطہ لگا کر کبوتر پر گرتا ہے۔ پدم نے کوئی دوسری شکل اختیار کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور عقاب ہی کے روپ میں جلاد جاسوس کی گردن میں اپنے نوکیلے پنجے گاڑ دیے اور نوکیلی تیز چونچ سے اس کی شہ رگ کو ادھیڑنا شروع کر دیا۔ پدم عقاب کی ضربیں اتنی شدید تھیں کہ جلاد جاسوس کی شہ رگ جگہ جگہ سے کٹ گئی اور جب وہ اپنی گردن چھڑا کر بھاگا تو اس کی شہ رگ سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔

پدم ناگ وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا اور سیدھا فیدس کے پاس پہنچا اور اسے بتایا کہ وہ سچا تھا۔ بادشاہ نے ایک جلاد جاسوس اس کے پیچھے لگا رکھا تھا جس کو تہ تیغ کر دیا گیا ہے۔ اب ہمیں یہاں سے نکل جانا ہو گا کیونکہ ہو سکتا ہے بادشاہ کے سپاہی یہاں دھاوا بول دیں اور تمہیں جلاد کے قتل کے الزام میں دوبارہ پکڑ لیا جائے۔"

فیدس جو پہلے ہی بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا تھا یہ صورت حال جان کر پریشان ہو گیا اور پدم سے کہنے لگا۔ "ہم کشتی لے کر دور سمندر میں نکل جاتے ہیں اور وہاں اپنے جہاز کا انتظار کریں گے۔ یہ بہترین ترکیب ہے۔"

راتوں رات انہوں نے بندرگاہ سے ایک کشتی لی اور اس میں سوار ہو کر سمندر کی طرف چل دیے۔ نصف شب کے بعد وہ کھلے سمندر میں پہنچ گئے اور ایک خاص مقام پر دائرے کی شکل میں سمندر میں چکر لگانے لگے کیونکہ وہ سمندر میں کشتی کو ایک جگہ کھڑا نہیں کر سکتے تھے۔ جب دن نکلا تو پدم ناگ عقاب کی شکل بدل کر ہوا میں اڑ گیا۔ اس نے دیکھا کہ اسکندریہ جانے والا بادبانی جہاز روم کی بندرگاہ سے روانہ ہو کر کھلے سمندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پدم نے واپس کشتی میں آ کر فیدس کو بتایا کہ جہاز ادھر ہی آ رہا ہے۔ دو گھنٹوں کے بعد جب جہاز سمندر میں دکھائی دیا تو فیدس نے کشتی کا رخ جہاز کی طرف موڑ دیا۔

جہاز والوں نے کشتی کو سمندر میں ڈولتے دیکھا تو اپنی حفاظتی کشتی اس کی سمت روانہ کی۔ پدم اور فیدس نے جہاز کے کپتان کو یہی بتایا کہ وہ اسکندریہ جانا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس کرایہ نہیں تھا اس لیے کشتی میں ہی نکل کھڑے ہوئے اور اب سمندر کے گرداب میں پھنس گئے تھے۔ جہاز کے کپتان نے ان پر ترس کھا کر ان کو اپنے جہاز پر سوار کروا لیا۔

پدم ناگ اور فیدس کی ترکیب کامیاب ہو گئی اور وہ اسکندریہ پہنچ گئے۔ اسکندریہ میں فیدس پدم کو ساتھ لے کر اپنی رشتے دار خاتون کے گھر جا پہنچا جو ایک بیوہ عورت تھی اور اپنے خاوند کے انگور کے باغ پر گزارہ کر رہی تھی۔ فیدس کو دیکھ کر وہ زیادہ خوش نہیں ہوئی پھر

اس کے ساتھ ایک دوست بھی تھا۔ اس نے فیدس سے کہا۔ "تمہیں میرے انگور کی باغ میں کام کرنا ہو گا۔ اگر تم اور تمہارا دوست تیار ہو تو میرے پاس رہ سکتے ہو نہیں تو اپنا راستہ پکڑو۔"

فیدس کو اپنی رشتے دار خاتون کے اس رویے سے افسوس تو بہت ہوا مگر اس وقت اس کے پاس اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ پدم ناگ کو بھی کوئی ایسا ٹھکانا چاہیے تھا جہاں رہ کر وہ عاطون کی تلاش جاری رکھ سکے۔ اس نے فیدس کو عورت کی شرط تسلیم کر لینے پر راضی کر لیا۔ فیدس اور پدم ناگ دونوں خاتون کے انگور کے باغ میں دن بھر کام کرتے۔ شام کو پدم ناگ فیدس کو اطلاع دے کر اپنے دوست کی تلاش میں نکل جاتا۔ اس کی تلاش کا دائرہ صرف اسکندریہ تک ہی محدود نہ تھا۔ عقاب بن کر وہ..... سینکڑوں میل کا سفر چند ساعتوں میں طے کر کے مصر کے دارالحکومت تھیبز تک ہو آتا تھا مگر ابھی تک اسے عاطون کا کوئی نشان نہیں ملا تھا۔

اس وقت تک عاطون ابھی قافلے کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ جملہ گونج رہا تھا کہ وہ اس بار مصر ایک خاص حیثیت سے داخل ہو گا۔ اس کی ایک شناخت ہو گی۔ یہ شناخت کیا تھی؟ عاطون کو اس بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ ایک عرصہ دراز کے بعد وہ اس تجربے سے گزرنے والا تھا۔ آخر ایک روز قافلہ تھیبز پہنچ گیا۔ اس وقت تھیبز کے شہر پر سورج طلوع ہو رہا تھا۔ دریائے نیل کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ اس ہوا میں دریا کے پانی میں ڈوبے ہوئے نرسلوں اور کنول کے پھولوں کی مہک تھی۔ عاطون نے شہر کے اندر دور فرعون رعمیس کے محل کی دیواریں اوپر کو اٹھی دیکھیں تو اسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ یہی وہ محل تھا جس میں کبھی اس نے اپنا بچپن گزارہ تھا۔ کارواں سرائے میں آتے ہی وہ قدیم اہراموں کی طرف نکل گیا۔ یہاں شاہی قبرستان کی ایک جانب کبھی اس کے ماں باپ اور بیوی بچوں کی قبریں ہوا کرتی تھیں۔ اب وہاں ان کے نشان بھی باقی نہیں رہے تھے۔ قبروں کی جگہ چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ عاطون نے وہیں ایک جگہ کھڑے ہو کر اپنے ماں باپ اور بیوی بچوں کی روحوں کے لیے دعا مانگی اور اس اہرام کی طرف چلا جو اس کے باپ نے اپنی نگرانی میں تعمیر کروایا تھا اور جہاں اس کی ماں کی قبر ہونی چاہیے تھی مگر اسے وہاں دفن کرنے کی اجازت نہ ملی کہ وہ شاہی خاندان کی فرد نہیں تھی جبکہ عاطون کے باپ کا براہ راست شاہی خاندان کے شہزادگان سے رشتہ تھا۔

دھوپ خوب نکل آئی تھی۔ عاطون اہراموں کے علاقے سے چلتا ہوا شاہی قلعے کی طرف آیا تو قلعے کے دروازے میں سے ایک رتھ باہر نکلا۔ وہ شاہی رتھ معلوم ہوتا تھا۔

رتھ بان شاہی وردی میں تھا اور پیچھے ایک کاہن جس کا سر منڈا ہوا تھا اور جس نے زرد لبادہ جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا' کھڑا تھا۔ رتھ کی محراب کے ساتھ کنول کے پھول لٹک رہے تھے۔ ان کے پیچھے دو اور رتھ تھے جن میں شاہی گارد کے سپاہی سوار تھے۔ عاطون ایک جانب کھڑا ہو گیا تاکہ رتھ قریب سے گزرے تو ان کا نظارہ کرے اور اپنی پرانی یادیں تازہ کرے۔

جونہی آگے والا رتھ اس کے قریب پہنچا تو کاہن کی عقابی نظریں عاطون پر پڑیں۔ اس نے ایک دم سے بازو ہوا میں بلند کیا اور چلا کر رتھ روکنے کا حکم دیا۔ رتھ بان نے گھوڑے کی لگاموں کو کھینچ کر پیچھے کی طرف دہرا ہو گیا۔ عقبی رتھ بھی وہیں رک گیا۔ اب عاطون کو خیال آیا کہ یہ اس کی شناخت کا خطرناک ترین لمحہ ہے۔ کچھ خبر نہیں یہاں اس کی شناخت کس حیثیت سے ہونے والی ہے۔ آیا فرعون کے دشمن کے حیثیت سے یا اس کے دوست کی حیثیت سے۔ عاطون وہیں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ کاہن نے عاطون کی طرف اشارہ کر کے حکم دیا۔ "اسے گرفتار کر لو' ہمیں اسی کی تلاش تھی۔"

عاطون سمجھ گیا کہ یہاں اس کی حیثیت فرعون رعمیس کے دشمن کی ہے۔ اگر فرعون رعمیس کا نہیں تو وہ کم از کم کاہن کا دشمن ضرور ہے جو اسے کسی سازش میں ملوث کر کے مروانا چاہتا ہو گا۔ عاطون اس قسم کی کئی خونیں سازشوں سے گزر چکا تھا۔ وہ فرار ہونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ بقول ارطبان وہ اپنے دوست پدم ناگ سے اسی صورت مل سکتا تھا۔ عقبی رتھ میں سے شاہی گارد کے زرہ پوش سپاہی نیچے اتر کر عاطون کی طرف لپکے اور اسے فوراً گرفتار کر کے اس کے بازوؤں کو پیچھے رسی سے باندھ کر رتھ میں ڈال دیا گیا۔ کاہن نے شاہی گارد کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ "اس شاہی دشمن کو قلعے کے تہہ خانے میں جا کر بند کر دو۔ ہم مندر اکیلے ہی جائیں گے۔"

کاہن کا رتھ آگے بڑھا اور شاہی گارد کا رتھ عاطون کو لے کر قلعے کی طرف سرپٹ دوڑنے لگا۔ کاہن اعظم نے اپنے رتھ کو فرعون کی فوج کے سپہ سالار گوپاز کے محل کی طرف موڑ دیا۔ سپہ سالار گوپاز اس وقت اپنی ٹھنڈی شہہ نشین میں آرام کر رہا تھا۔ کاہن اعظم کے آنے کی خبر سن کر اس نے خادموں کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ کاہن اعظم شہہ نشین میں آ کر باوقار انداز میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے شہہ نشین کے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ سپہ سالار گوپاز اٹھ کر کاہن اعظم کا خیر مقدم کیا اور اسے بتایا کو دونوں اس وقت تنہا ہیں۔ آپ کا اس وقت بغیر پیشگی اطلاع کے اچانک آنا مصلحت سے خالی نہیں لگتا۔ کاہن اعظم دیوان [illegible] پھر گوپاز کی طرف گھور کر اپنی چمکیلی زرد' زرد آنکھوں سے دیکھا اور

کہا۔ "گوپاز میں اس وقت تمہیں بہت بڑی خوش خبری سنانے آیا ہوں۔"

سپہ سالار گوپاز صراحی میں سے مشروب انڈیلتے ہوئے رک گیا۔ "کاہن اعظم' میں اس خوش خبری کے لیے ہمہ تن گوش ہوں۔"

کاہن اعظم کے ہونٹوں پر بڑی فاتحانہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور بولا۔ "گوپاز فرعون کا سب سے بڑا حمایتی اور ہمارا سب سے بڑا دشمن شمعار اس وقت میری حراست میں ہے۔"

سپہ سالار گوپاز نے چاندی کا پیالہ وہیں تپائی پر رکھ دیا اور کاہن اعظم کے قریب تخت پر جھک کر بیٹھ گیا۔ وہ بے حد مسرور تھا۔ "کاہن اعظم کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں یقین نہیں آتا کہ اتنا طاقتور شخص اتنی آسانی سے قابو میں آ گیا۔"

کاہن اعظم بولا۔ "کاہن اعظم جھوٹ کے نام سے ناواقف ہے۔ مجھے فرعون رعمیس سے اس لیے دشمنی ہے کہ اس نے ہمارے آباؤ اجداد کے مذہب سے بغاوت کی ہے۔ وہ سورج کو چھوڑ کر ایک خدا کی پوجا کرتا ہے اور سورج کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھائے رکھتا ہے۔ ہمیں اپنے مذہب کی بقاء کے لیے اس فرعون کو ہلاک کر دینا ہے۔ شمعار ہمارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا کیونکہ اسے سوڈان کی مصری حکومت کی حمایت حاصل تھی۔ اب وہ ہمارے قبضے میں ہے اور ہم فرعون کے خلاف اپنی سازش کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔"

سپہ سالار گوپاز کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے رک کر کھڑکی سے باہر نظر آنے والے کھجور کے درختوں کو دیکھا اور بولا۔ "کاہن اعظم ہمارے دشمن شمعار کی گرفتاری کی خبر فرعون تک نہیں پہنچنی چاہیے۔"

کاہن اعظم نے کہا۔ "میں نے اس کا بندوبست کر لیا ہے۔ تم بے فکر رہو' جن آدمیوں نے شمعار کو پکڑا ہے وہ میرے خاص جاسوس ہیں۔ میں نے انہیں اپنی زبانیں بند رکھنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ اب تم بتاؤ کہ ہمیں اگلا قدم کیا اٹھانا ہو گا؟ اس وقت آدھی سے زیادہ رعایا فرعون کے خلاف ہے کیونکہ اس نے ان کا آبائی مذہب ترک کر دیا ہے' ہمیں سب سے زیادہ خطرہ شمعار سے تھا اب وہ ہمارے قبضے میں آ چکا ہے۔ اب ہمیں اپنے کام کو تیز کر دینا چاہیے۔"

سپہ سالار ٹہلتے ٹہلتے تخت پر بیٹھ گیا۔ صراحی سے مشروب انڈیل کر پیالے میں ڈالا اور اسے حلق میں ڈالنے کے بعد بولا۔ "کاہن اعظم فرعون رعمیس کو آپ کا بھرپور اعتماد حاصل ہے۔ آپ پہل کریں میری طرف سے آپ مطمئن رہیں' فوج میرے ساتھ ہے۔ وہ

میرے اشارے کی منتظر ہے لیکن فرعون کا مارا جانا سب سے زیادہ ضروری ہے۔"

کاہن اعظم نے آہستہ سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک خصوصی فوجی دستے کو قلعے کے تہہ خانے کے باہر تعینات کر دیں تاکہ شمعار کے فرار کے تمام راستے مسدود ہو جائیں۔"

سپہ سالار نے کہا۔ "ہم اسے موت کے گھاٹ کیوں نہ اتار دیں؟"

کاہن اعظم بولا۔ "میرا خیال ہے ہمیں پہلے اس سے ضروری پوچھ گچھ کرنی ہو گی۔"

سپہ سالار ایک بار پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا پھر کاہن اعظم کی طرف ذرا سا جھک کر بولا۔ "نہیں کاہن اعظم! ہم شمعار کے زندہ رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ سوڈان کی حکومت کو اطلاع مل گئی تو اس کے جانباز راتوں رات اپنی جانیں دے کر بھی اسے یہاں سے نکال لے جائیں گے۔ اسے جتنی بھی جلدی ہو سکے ختم کر دینا چاہیے۔"

کاہن اعظم تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا۔ "ٹھیک ہے ہم شمعار کو آج رات موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔"

سپہ سالار نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اسے مار کر تہہ خانے کی زمین میں ہی دفن کر دیتے ہیں۔ یہ کام میرے چار جانباز سپاہی بڑی کامیابی سے انجام دے سکتے ہیں۔"

"تو پھر تم آدھی رات کو اپنے چار آدمی لے کر قلعہ کے تہہ خانے میں پہنچ جاؤ۔ میں وہاں پہلے سے موجود ہوں گا۔ اب میں جاتا ہوں۔" کاہن اعظم یہ کہہ کر اٹھا اور باہر نکل گیا۔ عاطون شام تک تہہ خانے..... میں پڑا سوچتا رہا کہ یہ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں اور پدم ناگ سے کہاں اور کیسے ملاقات ہو گی؟ عاطون نے خود کو حالات کے حوالے کر دیا تھا کیونکہ صرف اسی صورت میں پدم ناگ سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ رات کے پہلے پہر میں اس کی کوٹھری میں خشک مچھلی اور پانی کا آبخورہ لے کر ایک سپاہی آیا۔ دو سپاہی تلواریں لیے اس کی حفاظت کر رہے تھے حالانکہ عاطون کے بازو رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ عاطون نے ان سے کوئی بات نہ کی' کوئی احتجاج نہ کیا۔ خاموشی سے ان کو دکھانے کے لیے مچھلی کھائی' پانی پیا اور فرش پر لیٹ گیا۔ اس کا ایک ہاتھ کھول دیا گیا تھا۔

رات جب آدھی گزری تو کوٹھری کے باہر اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر چار سپاہی ہاتھوں میں تلواریں لیے اندر داخل ہوئے۔ کاہن اعظم اور سپہ سالار گوپاز ان کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ شمعار یعنی عاطون نے ان کے آتے ہی پوچھا "مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

کاہن اعظم نے کہا۔ "شمعار تم خوب جانتے ہو کہ ہم نے تمہیں یہاں کیوں قید کیا ہے۔ تم اور فرعون رعمیس ہمارے اور ہماری رعایا کے سب سے بڑے دشمن ہو' اس لیے کہ تم نے ہمارے آبائی مذہب سے روگردانی کی ہے۔"

عاطون خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ کاہن کو اس نے پہچان لیا تھا۔ اسی کے حکم سے اسے گرفتار کر کے قید میں ڈالا گیا تھا۔ اب وہ یہ سراغ چاہتا تھا کہ ان کا منصوبہ کیا ہے' اس سلسلے میں عاطون نے خاموش رہنے اور اپنے آپ کو ان کے احکامات کے حوالے کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ کاہن اعظم نے گوپاز کو اشارہ کیا۔ عاطون نے گوپاز کے چہرے مہرے سے یہ اندازہ لگا لیا کہ کوئی بہت بڑا فوجی افسر ہے۔ گوپاز نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔

سپاہیوں نے نیزے سیدھے کیے اور چاروں طرف سے عاطون پر حملہ کر دیا۔ عاطون نے اپنے جسم کو ربر کی طرح نرم کر دیا۔ نیزے اس کے جسم کے آر پار ہو گئے۔ عاطون ایک طرف گر پڑا۔ اس نے اپنے آنکھوں کو یوں پتھرا لیا جیسے مر گیا ہو۔ سپاہیوں نے عاطون کے جسم سے نیزے کھینچ لیے۔ سپہ سالار گوپا نے جھک کر عاطون کے جسم کے گہرے زخموں کو دیکھا اور تعجب سے بولا۔ "اس کے زخموں سے خون بالکل نہیں نکلا۔"

کاہن اعظم بولا۔ "جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کا خون جم جاتا ہے۔ اب دیر نہ کرو اسے فوراً اسی جگہ گڑھا کھود کر دفن کر دو۔"

سپاہیوں نے اسی وقت زمین کھود کر گڑھا بنایا اور عاطون کی لاش کو اس میں ڈال کر اوپر مٹی ڈالی اور فرش برابر کر دیا۔ اس کے بعد عاطون کو ان کے قدموں کی باہر کو جاتی چاپ سنائی دی۔ عاطون گڑھے کے اندر زندہ تھا اور اب اس کے جسم کے زخم اپنے آپ مل گئے تھے۔ وہ کچھ دیر گڑھے میں ہی لیٹا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ تہہ خانے میں اب کوئی نہیں ہو گا تو وہ مٹی کو ہٹا کر گڑھے میں سے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ گڑھے میں مٹی بھر کر فرش کو ہموار کر دیا تاکہ کسی کو شک نہ پڑے کہ وہ اس میں سے باہر نکل گیا ہے۔ تہہ خانہ خالی تھا اور اس کا دروازہ باہر سے بند نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سپہ سالار اور کاہن اعظم کے نزدیک عاطون مر چکا تھا اور مردہ قبر میں سے نکل کر فرار نہیں ہوا کرتا۔

عاطون نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ آگے تاریک راہداری تھی۔ عاطون دبے پاؤں راہداری میں آ گیا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا راہداری کے زینے کی طرف بڑھا۔ اسے اسی راستے سے تہہ خانے میں لایا گیا تھا۔ راہداری خالی تھی مگر عاطون نے زینہ

چڑھ کر دیکھا کہ باہر پہرے دار موجود تھا۔ دروازے کے باہر دیوار سے لگی ایک مشعل بھی جل رہی تھی جس کی روشنی میں عاطون اگر باہر نکلتا تو دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو اس کے فرار کا علم ہو۔ وہ زینے کے اندر ہی ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور پہرے دار کا جائزہ لینے لگا۔

یہ پہرے دار مصری نہیں تھا۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا تھا۔ اور لگتا تھا کہ اس کا تعلق آئیونا کے جزیرے سے ہے۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ عاطون زینے میں چھپا بڑے غور سے پہرے دار کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ پہرے دار پہلے تو چل پھر کر پہرہ دیتا رہا۔ پھر وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اس نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا دی۔ عاطون یہی چاہتا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ پہرے دار کو ضرور نیند آ جائے گی۔ پہرے دار تھکا ہوا تھا۔ ٹیک لگتے ہی اس پر غنودگی طاری ہونے لگی اور چند لمحوں کے بعد اس کا منہ کھل گیا اور ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ عاطون دبے پاؤں اٹھا اور آہستہ آہستہ اس کے قریب سے ہو کر آگے نکل گیا۔ اندھیرے میں سے گزرتے ہوئے اس نے بائیں جانب نگاہ ڈالی۔ یہ وہی راستہ تھا جہاں سے اسے کل دن کے وقت یہاں لایا گیا تھا۔ چند قدموں کے فاصلے پر قلعے کا دروازہ تھا۔

عاطون قلعے کے دروازے سے نہیں گزر سکتا تھا..... وہاں پوری گارد پہرے پر موجود تھی۔ اس نے دروازے سے ہٹ کر قلعے کی دیوار پھاندنے کا فیصلہ کیا اور دیوار کے سائے میں آ کر الٹے رخ چلنے لگا۔ یہ کوئی آج کے زمانے کا پرانا قلعہ نہیں تھا جس کی دیوار شکستہ ہو۔ دیوار پختہ اور ہموار تھی اور اوپر کو چلی گئی تھی۔ کسی جگہ سے ایک پتھر بھی نہیں اکھڑا ہوا تھا۔ عاطون کو لگا کہ وہ دیوار پار نہ کر سکے گا مگر اچانک امید کی شمع روشن ہو گئی۔ قلعے کی دیوار میں ایک مقام پر، اوپر..... افقی روزن تھا۔ اس روزن فصیل کی دوسری جانب روزن سے پھینکے جانے والے تیل کا ایک خالی کڑھاؤ رکھا ہوا تھا مگر نیچے سے روزن تک جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس روزن تک اوپر فصیل کی دیوار سے ایک سیڑھی آتی تھی مگر روزن چونکہ ذرا نیچے تھا اس لیے عاطون کے دل میں امید پیدا ہوئی کہ اگر وہ پوری طاقت سے اچھل کر کوشش کرے تو روزن تک پہنچ سکتا ہے۔ عاطون نے خدا کا نام لے کر سانس کو قابو میں کیا اور دس قدم پیچھے ہٹ کر دوڑتا ہوا آیا اور دیوار کے پاس آتے ہی پوری طاقت سے اوپر کو اچھلا۔ عاطون کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ اس کی چھلانگ عام انسانوں سے کئی گنا زیادہ طاقت ور تھی۔ پہلی ہی کوشش میں اس کے ہاتھ روزن کے پتھروں میں اٹک گئے۔ اب وہ نیچے نہیں گر سکتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اچھالا اور روزن کے درمیان

کڑھاؤ کے پاس دبک کر بیٹھ گیا۔ دوسری طرف اندھیرے میں دیکھا۔ قلعے کی فصیل کی دوسری جانب پانی سے بھری ہوئی ایک کھائی تھی۔ عاطون نے اس میں چھلانگ لگا دی۔ وہ پانی میں اگی ہوئی لمبی گھاس میں گرا جس کی وجہ سے آواز پیدا نہ ہوئی۔

عاطون کھائی کے دوسرے کنارے پر جا نکلا۔ اس کے ذہن میں ایک منصوبہ تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا نام شمعار ہے اور وہ فرعون رعمیس کے حامیوں میں سے ہے۔ اور اس کا خاص آدمی ہے۔ چنانچہ اس نے فرعون کے شاہی محل کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شاہی محل قلعے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں تک ایک شاہراہ بھی جا رہی تھی مگر عاطون اس سے ہٹ کر، کھجور کے درختوں میں سے گزرتا، شاہی محل کے باغ کی عقبی دیوار کے پاس پہنچ گیا۔ محل کے باغ کی دیوار بہت اونچی تھی۔ اس دیوار کے اردگرد کسی جگہ کھجور کا درخت نہیں تھا کہ عاطون اس پر چڑھ کر دیوار کو پھاند لیتا..... رات گزرتی جا رہی تھی۔ اگر دن نکل آیا تو اسے گرفتار کر لیا جائے گا..... اور فرعون کے دربار میں پیش کرنے سے پہلے اسے سپہ سالار کے حضور ہی پیش کیا جانا تھا اور پھر عاطون کے لیے مشکل پیدا ہو سکتی تھی..... عاطون ویسے توحید پرست فرعون رعمیس کی مدد بھی کرنا چاہتا تھا اور اسے کاہن اعظم اور سپہ سالار کی خونیں سازش سے بچانا چاہتا تھا اس لیے مزید ضروری ہو گیا تھا کہ جیسے بھی ہو، وہ بادشاہ کے پاس پہنچنے کی کوشش کرے مگر سامنے پہاڑ جیسی دیوار کھڑی تھی۔

عاطون کا ذہن بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا مگر اسے کوئی ترکیب نہیں سوجھ رہی تھی۔ دیوار اتنی اونچی تھی کہ وہ چھلانگ لگا کر اسے پار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کچھ ناامید سا ہو کر دیوار کے ساتھ اگی ہوئی ایک جھاڑی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ عین اسی وقت جھاڑی میں سے ایک سیاہ کالا کوبرا سانپ پھنکارتا ہوا نکلا اور عاطون کی پنڈلی پر ڈس لیا۔

کوبرا، ڈسنے کے بعد ایک طرف کو دوڑا تو عاطون نے سانپ کی زبان میں اسے آواز دی۔ کوبرا سانپ وہیں جیسے سکتے میں آ گیا۔ یہ کون شخص ہے جس نے اسے سانپوں کی زبان میں پکارا ہے۔ عاطون لپک کر سانپ کے پاس پہنچ گیا۔ سانپ نے اپنا پھن اٹھا لیا تھا تاکہ خطرے کا مقابلہ کر سکے۔

عاطون نے اس کے قریب جاتے ہی کہا۔ "میرے دوست! میں عاطون ہوں۔ تمہارے پدم ناگ دیوتا کا بھائی..... اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں تمہاری زبان میں بات کر سکتا ہوں۔ یہ زبان مجھے تمہارے پدم ناگ دیوتا ہی نے سکھائی تھی۔ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ تمہارے ڈسنے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔"

کوبرا سانپ نے باریک سیٹی جیسی آواز میں کہا۔ "میرا زہر اتنا مہلک ہے کہ جس کو

ڈس دوں' وہ ایک پل بھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ تم ابھی تک زندہ ہو اور ہماری زبان بھی جانتے ہو..... بے شک' تم پدم ناگ دیوتا کے بھائی ہی ہو سکتے ہو۔ بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

عاطون نے دیوار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "کیا تم کسی طرح مجھے اس دیوار کے پار پہنچا سکتے ہو؟"

سانپ نے کہا۔ "یہ کام میں اکیلا نہیں کر سکتا۔ تم یہیں ٹھہرو' میں ابھی اپنے ساتھیوں کو لے کر آتا ہوں۔"

سانپ چلا گیا۔ عاطون بے چینی سے دیوار کے سائے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر میں کوبرا سانپ اس عالم میں آیا کہ اس کے پیچھے پیچھے پندرہ سولہ سانپ رینگتے چلے آ رہے تھے۔ کوبرا سانپ نے عاطون سے کہا۔ "ہم سارے سانپ' دیوار کے ساتھ ایک دوسرے سے چمٹ کر ایک رسی کی طرح لٹک جائیں گے..... تم ہمیں پکڑ کر دیوار پر چڑھ جانا۔"

عاطون کے دیکھتے ہی دیکھتے سارے سانپ دیوار کی طرف لپکے۔ انہوں نے فوراً" ہی دیوار کے ساتھ ایک رسی بنا دی۔ کوبرا سانپ نے سب سے اوپر دیوار کے کنگرے کو جکڑ لیا تھا' باقی سانپ ایک دوسرے کی دموں کو اپنے منہ میں تھامے نیچے لٹک رہے تھے..... عاطون نے سانپوں کی کمند کو تھاما اور دیوار کے ساتھ پاؤں ٹکا کر آہستہ آہستہ اوپر چڑھتا چلا گیا۔ دیوار کے اوپر پہنچ کر وہ کنگروں کے درمیان بیٹھ گیا۔ باقی تمام سانپوں نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا تھا۔ کوبرا سانپ کنگرے کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ عاطون نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ کوبرا سانپ نے تعظیم سے اپنا پھن تین بار جھکایا اور نیچے اتر گیا۔

عاطون نے دوسری جانب نگاہ ڈالی۔ اندھیرے میں شاہی باغ کی جھاڑیاں' درخت اور پھولوں کے تختے' جیسے ہلکی سیاہ رنگ کی چادر اوڑھے گہری نیند سو رہے تھے۔ عاطون نے اوپر سے ایک درخت پر چھلانگ لگا دی۔ وہ نیچے بھی چھلانگ لگا سکتا تھا۔ درخت کی جھاڑیوں کو پکڑتا وہ باغ میں پہنچ گیا۔ اس کا بچپن شاہی محلوں میں گزرا تھا اور خوب جانتا تھا کہ بادشاہ کی خواب گاہ محل میں عام طور پر کہاں ہوا کرتی ہے۔ وہ باغ میں سے چھپ کر گزرتا' شاہی محل کے عقب میں آ گیا۔ اس نے اوپر نگاہ اٹھائی۔ ایک جگہ دریچے میں سفید ریشمی پردوں میں سے کافوری روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔

یہی بادشاہ کی خواب گاہ ہو سکتی تھی۔ اگر یہ خواب گاہ نہ بھی ہو' تب بھی عاطون بادشاہ رعمیس کے قریب پہنچ سکتا تھا.... شاہی دریچے تک پہنچنا بہت مشکل کام تھا۔ کیونکہ

یہاں بھی کوئی درخت نہیں تھا اور دریچہ کافی بلندی پر تھا۔ عاطون دیوار کے ساتھ ساتھ ذرا آگے بڑھا تو اسے دو زرہ پوش سپاہی' نیزے لیے پہرہ دیتے دکھائی دیے۔ وہاں کوئی مشعل روشن نہیں تھی۔ سپاہیوں کے عقب میں ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ یقیناً" یہ شاہی محل کا عقبی دروازہ تھا جو عام طور پر اس وقت استعمال کیا جاتا تھا جب محل کے بڑے دروازے کی جانب سے دشمن یلغار کر دے۔

یہ دروازہ شاہی دریچے کے نیچے ہی تھا۔ یقیناً" اوپر شاہی خواب گاہ تھی۔ عاطون ایک زرہ پوش سپاہیوں کے سامنے آ گیا۔ سپاہی نیزے سنبھال کر اس کی طرف لپکے تو اس نے بلند آواز میں کہا۔ "سورج کے دیوتا رعمیس کا اقبال بلند ہو' میں سوڈان سے ایک ضروری پیغام لایا ہوں میرا نام شمعار ہے۔"

زرہ پوش سپاہیوں نے شمعار کو شاید پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے کوئی باغی یا ڈاکو سمجھے اور نیزے سے حملہ کر دیا۔ نیزے عاطون کے جسم کے آر پار نہ ہو سکے۔ کیونکہ اس بار عاطون نے اپنے جسم کو پتھر بنا لیا تھا۔ نیزے اس کے جسم سے ٹکرا کر اچٹ گئے۔ سپاہی ششدر سے ہو کر رہ گئے۔ عاطون نے ان سے کہا۔ "مجھے بادشاہ کے حضور پہنچا دو' میں ان کے لئے ایک اہم پیغام لے کر آیا ہوں جس کا کسی دوسرے کو علم نہیں ہونا چاہیے۔"

مگر سپاہی تو اپنی ذمے داری پوری کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر عاطون پر حملہ کیا۔ اس دفعہ بھی نیزے اچٹ کر رہ گئے۔ عاطون کو غصہ آ گیا۔ اس نے دونوں سے نیزے چھین کر توڑ ڈالے..... عاطون کی اس غیر معمولی طاقت سے سپاہی خائف ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ وہ اسے کوئی دیوتا سمجھ رہے تھے۔ اس قسم کے توہمات اس زمانے میں عام ہوا کرتے تھے۔

عاطون جان بوجھ کر اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ اوپر دریچے کا سفید پردہ ہٹا اور کسی کنیز نے نیچے جھانک کر پوچھا۔ "یہ کون گستاخ بادشاہ اعظم کی نیند میں خلل ڈالنے کی جرات کر رہا ہے؟"

عاطون نے چہرہ اوپر اٹھا کر بلند آواز میں کہا۔ "نیک دل کنیز! مجھے معاف کر دینا..... مگر میرا بادشاہ سلامت سے ملنا بہت ضروری ہے۔ انہیں میری طرف سے عرض کرو کہ شمعار سوڈان سے ضروری پیغام لے کر آیا ہے۔"

کنیز پردہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی ... پھر فوراً" ہی دریچے میں سے سر باہر نکال کر تیز تیز لہجے میں سپاہیوں سے مخاطب ہوئی۔ "اسے اوپر لے کر آؤ۔"

زرہ پوش سپاہی فوراً" عاطون کو ساتھ لے کر خفیہ دروازے میں داخل ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد عاطون شاہی خواب گاہ میں ادب سے کھڑا تھا۔ اس کی سامنے چند قدموں کے فاصلے پر سونے کے پلنگ پر زمرد اور عقیق لگی مسہری پر مصر کا توحید پرست حکمران رعمیس دو زانو بیٹھا تھا۔ اس کے کندھوں پر نیلی شال تھی اور بالوں میں کنول کا پھول بندھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں' خواب گاہ کی شمعوں کی خواب انگیز روشنی میں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ چہرے پر ایک خاص قسم کا جلال اور ملائمت تھی۔ اس نے عاطون کی طرف دیکھ کر کہا۔ "شمعار! تم حیران کیوں ہو؟ اور وہاں کیوں کھڑے ہو؟ کیا بھول گئے ہو کہ تم ہمارے دوست ہو اور ہمیشہ ہمارے قریب آ کر باتیں کیا کرتے ہو؟"

بادشاہ رعمیس خود ہی بتائے جا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے..... عاطون نے چند قدم اٹھائے اور فرعون رعمیس کی مسہری کے پاس آ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ فرعون نے کنیزوں اور شاہی غلاموں کو وہاں سے بھجوا دیا۔ جب وہاں فرعون اور عاطون اکیلے رہ گئے تو فرعون نے کہا۔ "شمعار! اس بار تم نے سوڈان میں بڑی دیر کر دی' ہمیں تمہارے بارے میں تشویش ہونے لگی تھی مگر تمہاری تلاش میں ہم سپاہی روانہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ سپہ سالار گوپاز کو علم ہو جاتا۔ اب بتاؤ کہ تم سوڈان سے کیا خبر لائے ہو؟ کیا جنگ کی صورت میں سوڈان کی حکومت ہماری مدد کرے گی؟"

"اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا' میرے آقا!" عاطون نے کہا۔ "لیکن اس وقت آپ کی جان شدید خطرے میں ہے..... سوڈان میں مجھے میرے جاسوسوں نے بتایا ہے کہ مصر کے شاہی محل کے اندر آپ کے خلاف ایک گھناؤنی سازش کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس سازش میں کاہن اعظم اور سپہ سالار' دونوں شریک ہیں۔"

فرعون رعمیس کے چہرے پر فکر و تردد کے تاثرات ابھر آئے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر چھت کی طرف چہرہ اٹھا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "اے خدائے واحد ولاشریک! میری حفاظت کر کہ میں تیری ذات میں کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ تو واحد ہے' تیرا کوئی ثانی نہیں..... سورج' چاند' ستارے تیرے ادنیٰ غلام ہیں۔"

عاطون' فرعون رعمیس کے ان خیالات سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے بادشاہ سے کہا۔ "انہوں نے مجھے گرفتار کر کے تہہ خانے کے فرش میں دفن کر دیا تھا۔ میں نے یہ ساری سازش کی تفصیل ان کی زبانی خود سنی ہے۔ خدائے واحد نے میری مدد کی اور میں ان کے جانے کے بعد گڑھے میں سے زندہ باہر نکل آیا اور کسی طرح آپ کے حضور پہنچ گیا۔"

فرعون رعمیس بولا۔ "شمعار! ہم اپنا محل نہیں چھوڑیں گے' نہ ہی ہم ایک خدا کی

عبادت کرنے سے منہ پھیریں گے۔"

عاطون نے عرض کی۔ "شہنشاہ ذی وقار! پھر بھی ہمیں آپ کی جان کی حفاظت کرنی ہو گی۔ آپ کی زندگی' ہمارے لیے روشنی کا ایک مینار ہے۔"

فرعون رعمیس نے عاطون کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "شمعار! اب تمہارا اپنے محل والی حویلی میں جانا مناسب نہیں کیونکہ سپہ سالار گوپاز اور کاہن اعظم تمہیں اپنی طرف سے ہلاک کر چکے ہیں' ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ہی خاص محل کی ایک چاردیواری میں قیام کرو۔"

"مگر حضور انور! محل کے لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔" عاطون نے کہا وہ گوپاز اور کاہن اعظم کو بتا دیں گے اور ویسے بھی دونوں مجھے یہاں محل میں دیکھ سکتے ہیں۔"

فرعون رعمیس نے شمعار کی یعنی عاطون کی طرف ایک نگاہ ڈالی..... کچھ دیر سکوت کیا پھر بولا۔ "ہم مشورہ دیں گے کہ تم ملک بابل کے سفیر کی حیثیت سے ہمارے شاہی محلات کے ایک محل میں رہو' ملک بابل والوں کی لمبی چوکور داڑھیاں ہوتی ہیں اور گردن تک بال ہوتے ہیں ان کا لباس بھی مصریوں سے مختلف ہے۔ یوں تم پہچانے بھی نہیں جاؤ گے اور ہمارے شاہی محل میں بھی رہو گے۔"

عاطون کو فرعون رعمیس کی یہ تجویز بہت پسند آئی۔ فرعون نے عاطون کو اپنے خاص کمرے میں بھجوا دیا۔ جہاں ہر قسم کا سازو سامان پڑا تھا۔ عاطون نے وہیں بیٹھ کر بھیس بدلا' منہ پر لمبی داڑھی مونچھیں لگائیں' سر پر نقلی بالوں کی وگ جمائی اور جب بابل والوں کی طرح' اونچی دیوار والی ٹوپی پہن کر' فرعون رعمیس کے سامنے آیا تو وہ بھی اس کے بھیس پر دنگ رہ گیا۔

عاطون شاہی محلات میں سے دریائے نیل کے کنارے والے ایک چھوٹے سے خوبصورت محل میں رہنے لگا۔ محل کے ایک جانب دریا بہتا تھا' دوسری طرف زیتون' انجیر اور انگور کا باغ تھا۔ دوسرے روز طے شدہ منصوبے کے مطابق' عاطون بابل کے سفیر کے بھیس میں شاہی رتھ پر سوار ہو کر فرعون کے محل میں گیا۔ فرعون کے سامنے اسناد سفارشات پیش کیں۔ دربار میں سپہ سالار گوپاز اور کاہن اعظم بھی موجود تھے مگر وہ عاطون کو پہچان نہ سکے۔

عاطون دن کے وقت تو بابل کے سفیر کے بھیس میں رہتا تھا مگر رات کو اپنے اصلی حلیے میں آ جاتا تھا۔ اس نے اپنے محل میں کوئی ملازم نہیں رکھا تھا' وہ بالکل اکیلا رہتا تھا۔ ایک رات وہ' پدم ناگ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسے سانپ کی سیٹی سنائی دی۔ عاطون

خواب گاہ سے نکل کر باغ میں دریا کے کنارے آیا تو دیکھا کہ کنول کے پھولوں کے درمیان ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا اسے سرخ آنکھوں سے تک رہا ہے۔ آسمان پر گول زرد چاند نکلا ہوا تھا جس کی چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ عاطون خاموشی سے سانپ کی طرف دیکھنے لگا وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں بولنا چاہتا تھا۔

سانپ نے کہا۔ "عظیم پدم ناگ دیوتا کے بھائی کو میرا نمسکار۔"

اب عاطون نے کہا۔ "تم آدھی رات کو کیسے آئے ہو؟"

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔" سانپ نے کہا "میں ان سانپوں میں سے ایک سانپ ہوں' جنہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر کمند بنائی تھی اور آپ محل کی دیوار پر چڑھے تھے' مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ کو پدم ناگ دیوتا کی تلاش ہے۔"

"کیا تم میرے دوست کی کوئی خبر لائے ہو؟" عاطون نے جلدی سے پوچھا۔

سانپ بولا۔ "میں نے سنا ہے کہ پدم ناگ دیوتا' ملک مصر کی طرف بڑھ رہے ہیں' بعض سانپوں نے یہ بھی خبر دی ہے کہ وہ اہراموں کے پیچھے کسی غار میں اترے ہوئے ہیں' بس مجھے آپ کی خدمت میں یہی پیغام پہنچانا تھا۔"

سانپ عاطون کی تعظیم بجا لا کر چلا گیا۔ عاطون اس وقت اپنے اصلی حلیے میں تھا مگر اسے اس کا خیال نہ رہا۔ اس نے اصطبل سے گھوڑا نکالا' اس پر سوار ہوا اور سرپٹ دوڑاتا ہوا اہراموں کی طرف روانہ ہو گیا۔ اہرام مصر' شاہی محلات سے کافی دور صحرا میں واقع تھے مگر عاطون بھی گھوڑا دوڑاتا چلا جا رہا تھا۔ اہراموں کے قریب پہنچ کر اس نے گھوڑے کو ایک طرف باندھا اور اہراموں کے عقب میں پدم ناگ کی تلاش شروع کر دی۔ چاندنی صحرا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بڑا پر اسرار منظر تھا۔ عاطون نے سانپ کی سیٹی کی آواز میں پدم ناگ کو بار بار پکارا مگر پدم ناگ کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا' عاطون کو یقین ہو گیا کہ پدم ناگ ابھی مصر نہیں پہنچا ہے۔

وہ واپس اہراموں کی طرف چلا۔ اپنے گھوڑے کے قریب پہنچا تو اسے ایک اہرام کی جانب ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی کسی شمع کی تھی' جو ایک پل کے لیے نظر آ کر غائب ہو گئی۔ عاطون کو تجسس ہوا کہ یہ روشنی کیسی تھی' وہ ریتلے ٹیلوں اور چٹانوں کی اڑ لیتا۔ اس مقام پر پہنچا' جہاں اسے روشنی کی جھلک نظر آئی تھی تو اس نے دیکھا کہ ایک اہرام کے اونچے مگر تنگ دروازے میں سے پراسرار آوازیں آ رہی ہیں۔ اس نے دیوار کے ساتھ لگ کر' دروازے سے اندر جھانکا۔

یہ ایک ادھورا اہرام تھا۔ جس کا کام کسی وجہ سے روک دیا گیا تھا۔ اس کے اندر

گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آوازیں' جو عاطون کے قیاس کے مطابق انسانی آوازیں تھیں' اب غائب ہو چکی تھیں۔ عاطون' اہراموں کی اندرونی بناوٹ سے خوب واقف تھا' اسے شک ہوا کہ اس ادھورے اہرام میں ضرور کوئی گڑبڑ ہے اور یہاں کوئی سازش ہو رہی ہے۔ اہرام کے اندر شروع میں ہی ایک گہرا کنواں کھدا ہوا تھا' جس کے پہلوؤں میں ایک تنگ راستہ' دیوار کے ساتھ ساتھ اندر جاتا تھا۔ یہ کنوئیں' ان چوروں اور ڈاکوؤں کے لیے بنائے جاتے تھے جو مردہ فرعونوں کے خزانے لوٹ آتے تھے اور اہرام کی دیوار توڑ کر جب اندھیرے میں اندر بڑھتے تھے تو کنوئیں میں گر جاتے تھے' جس کی تہ میں نوکیلے نیزے گڑے ہوئے تھے' لیکن عاطون اس بناوٹ سے خوب واقف تھا۔ ابھی کنوئیں میں نیزے بھی نہیں گاڑے گئے تھے' کیونکہ یہ اہرام ابھی زیر تعمیر ہی تھا کہ اسے ادھورا چھوڑ دیا گیا تھا۔

اندھیرے میں عاطون اندر بڑھا تو اسے انسانی آوازوں کی ہلکی سی بھنبھناہٹ سنائی دی' وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ چند قدم کے بعد' کنوئیں کی دوسری جانب اہرام کی ٹھنڈی اور اندھیری راہ داری بائیں جانب مڑ گئی۔ یہاں ایک تابوت گھر کے اندر سے موم بتی کی روشنی آ رہی تھی۔ اب عاطون کو آوازیں صاف سنائی دینے لگی تھیں۔ اس نے ان آوازوں میں سے ایک آواز کو پہچان لیا۔ یہ کاہن اعظم کی آواز تھی۔

کاہن اعظم کہہ رہا تھا۔ "گوپاز نے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا ہے۔"

ایک دوسری آواز ابھری۔ "تو پھر ہم کس کا انتظار کر رہے ہیں' ہمیں مرتد فرعون کا تختہ الٹ دینا چاہیے۔ اسے مزید زندہ نہیں رہنے دینا چاہیے۔"

تیسری آواز آئی۔ "فرعون نے سورج دیوتا کے مندر میں بھی جانا چھوڑ دیا ہے' یہ ہمارے عظیم دیوتا کی توہین ہے۔"

"کاہن اعظم بولا' "تشویش کی بات یہی ہے کہ مصر کے کچھ با اثر طبقے' فرعون کی توحید پرستی کے قائل ہو کر' اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ چنانچہ جب بغاوت ہو گی تو آدھی کے قریب رعایا۔ ان با اثر لوگوں کے ساتھ ہو گی۔"

"کاہن اعظم! یہ محض آپکا وہم ہے' مصر کے لوگ سورج دیوتا کے پجاری ہیں' وہ اپنے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتے۔" ایک آواز آئی۔

"مجھے اس بارے میں کوئی تردد نہیں ہے۔" کاہن اعظم نے کہا۔

"اگر مجھے فکر ہے تو صرف فوج کے اس حصے کی ہے' جو نائب سپہ سالار کے ماتحت ہے۔ نائب سپہ سالار' فرعون کا وفادار ہے' اور پھر سوڈان سے بھی فرعون کو مدد مل سکتی ہے۔"

"سپہ سالار گوپاس سے کہو' کہ وہ سب سے پہلے نائب سپہ سالار کو راستے سے صاف کرے۔" ' دوسری آواز نے کہا' "سوڈان کی جانب سے جب تک فوج آئے گی' اس وقت تک ہم لوگ تخت پر قبضہ کر چکے ہوں گے' اور فوج ہمارے ساتھ ہوگی۔"

تیسری آواز آئی۔ "کاہن اعظم! آپ وقت ضائع نہ کریں' اور فرعون رعمیس کو کل زہر دے دیں۔ کنیز رامطہ ہماری اپنی عورت ہے۔ وہی فرعون کو صبح مشروب پیش کرتی ہے۔"

سب نے پرزور انداز میں اس خیال کی تائید کی۔ یہاں تک کہ کاہن اعظم کو اس تجویز پر فوری عمل کا اعلان کرنا پڑا۔ اس نے کہا' "ٹھیک ہے' میں آج صبح ہی فرعون کا کام تمام کیے دیتا ہوں۔ میں ابھی جا کر سپہ سالار گوپاز کو اپنے منصوبے سے آگاہ کر دوں گا۔ آپ لوگ اپنی اپنی جگھوں پر چوکس رہیں۔ جونہی فرعون کی موت کا شور مچے' فوراً درباری سپاہیوں اور فرعون کے دوسرے وفاداروں کا بے دریغ قتل شروع کر دیں۔ دوسری طرف سپہ سالار گوپاز' چھاؤنی پر قبضہ کر کے شاہی محل پر ہلہ بول دے گا۔

عاطون نے یہ سنا تو چوکس ہوگیا اور فوراً وہاں سے نکل گیا' پھر گھوڑے پر بیٹھ کر واپس اپنے دریا والے محل کی طرف روانہ ہوگیا۔

اپنے محل میں گھوڑے کو چھوڑ کر وہ دریائے نیل کے کنارے پہنچ گیا اور کنارے کی دلدل میں اگی ہوئی بعض جڑی بوٹیاں اکٹھی کرنے لگا۔ کچھ جری بوٹیاں جمع کر کے وہ اپنے محل میں لایا۔ انہیں کیتلی میں ڈال کر ابالا' پھر اس مشروب کو ٹھنڈا کر کے ایک پیالے میں ڈالا اور شمع کی روشنی میں اسے غور سے دیکھا۔ یہ تیل کی قسم کا ایک مشروب بن گیا تھا۔

عاطون نے اسے ایک چھوٹی سی شیشی میں بند کر کے رکھ لیا۔ سورج طلوع ہوا تو غسل کر کے لباس تبدیل کیا' بابل کے سفیر کا حلیہ بنایا اور فرعون کے محل میں پہنچ گیا۔

فرعون رعمیس غسل کے بعد' ایک آبنوسی چوکی پر بیٹھا' ہاتھ سینے پر باندھے' چہرہ چھت کی طرف اٹھائے' اپنے خدائے واحد کی عبادت کر رہا تھا۔ عاطون ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ فرعون' عبادت سے فارغ ہوا تو بالا' "شمعار! صبح صبح کیسے آنا ہوا؟ کہیں لوگ شک نہ کریں کہ بابل کا سفیر' بار بار ہمارے محل میں کیوں آتا ہے؟ کوشش کرو کہ دربار ہی میں ملاقات ہوا کرے۔"

عاطون نے آداب بجا لا کر کہا' "عظیم رعمیس! میں ہنگامی صورت حال میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔"

"خیریت.....؟" فرعون نے چوکی پر سے اٹھتے ہوئے کہا:

عاطون نے رات ادھورے اہرام میں سنی ہوئی تمام باتیں' اس کے گوش گزار کر دیں..... اور بتایا کہ اس کی کنیز خاص رامطہ بھی باغیوں کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور وہ اسے آج مشروب میں زہر دینے والی ہے۔ فرعون کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا۔ عاطون نے کہا' "اس کا تریاق میرے پاس موجود ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" فرعون نے سوال کیا۔

عاطون بولا' "عظیم رعمیس! میرے پاس ایک خاص جڑی بوٹیوں کا تیل ہے۔ آپ ابھی اس کے چھ گھونٹ پی لیں۔ اس کے بعد اگر زہریلا ہلاہل بھی آپ کو پلا دیا جائے تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔" پھر عاطون نے جیب سے جڑی بوٹیوں کے تیل والی شیشی نکال کر فرعون کی طرف بڑھائی۔ فرعون رعمیس نے شیشی کی ڈاٹ کھول کر اسے سونگھا اور بولا۔

"اس میں سے تو دریائے نیل کے دلدل کی بو آ رہی ہے۔"

عاطون نے فرعون کو بتایا کہ یہ دریائے نیل کے دلدل کے کنارے پر اگی ہوئی جڑی بوٹیوں کا تیل ہے۔ "آپ اسے پی جائیں' اس کے بعد کم از کم ایک مہینے تک آپ پر کوئی زہر اثر نہ کر سکے گا۔"

فرعون رعمیس نے شیشی' منہ سے لگائی اور سارا تیل پی گیا' پھر عرق زعفران سے حلق صاف کیا اور بولا' "شمعار! تمہاری پیشگی اطلاع اور اس تیل کا شکریہ..... اب میں رامطہ کا پیش کیا ہو مشروب ضرور پیوں گا۔"

عاطون بولا' "عظیم رعمیس! اجازت دیں کہ میں بھی اس وقت آپ کے پاس موجود ہوں۔"

فرعون نے کچھ سوچنے کے بعد کہا' "ٹھیک ہے' ہم کہہ دیں گے کہ بابل کے سفیر کو ہم نے خاص طور پر ناشتے کی دعوت دی ہے' مگر اب ناشتے میں دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔ تم ایسا کرو کہ طعام کے کمرے میں جا کر ہمارا انتظار کرو۔"

عاطون' فرعون کی خواب گاہ سے نکل کر طعام کے کمرے میں آگیا۔ یہاں ایک بیضوی میز کے گرد' سونے کی چار کرسیاں بھی رکھی تھیں۔ میز پر رکھے' زمرد کے گل دان میں کنول کے تازہ پھول کھڑکی سے آتی صبح کی روشنی میں مسکرا رہے تھے۔ عاطون' بابل کے سفیر کی حیثیت سے کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں رامطہ' چاندی کے دو گل دان لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے عاطون کو دیکھا' تو ٹھٹک سی گئی..... عاطون' رامطہ کی پریشانی کو خوب سمجھتا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "عزیز بہن! مجھے عظیم بادشاہ نے آج خاص طور پر ناشتے پر بلایا ہے۔"

رامطہ نے دل ہی دل میں کہا "کہ پھر آج تمہاری بھی خیر نہیں ہے' کیونکہ وہ جانتی تھی کہ کاہن اعظم اپنے منصوبے کو کسی صورت بھی ملتوی نہیں کرے گا" وہ مسکرا کر بولی' "عظیم سفیر! یہ ہماری خوش نصیبی ہے۔"

وہ بڑے آرام سے کونے کی میزوں پر گل دان رکھ کر خاموشی سے قدم اٹھاتی کمرے سے نکل گئی۔ چند لمحوں کے بعد فرعون رعمیس اپنی ملکہ اور غلاموں کی معیت میں آ گیا۔ عاطون نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ اس وقت رامطہ' میز کی ایک جانب ادب سے سر جھکائے کھڑی تھی۔

فرعون نے بڑی خندہ پیشانی سے عاطون کو دیکھا' اور ہاتھ آگے بڑھایا۔ عاطون نے شاہی رسوم کے مطابق ہاتھ کی پشت پر ہلکا سا بوسہ دیا اور جب فرعون رعمیس اور اس کی ملکہ کرسیوں پر بیٹھ گئے تو وہ بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ عاطون پہلی بار فرعون رعمیس کی ملکہ کو دیکھ رہا تھا۔ فرعون نے عاطون کو اپنی بیوی سے یہ کہہ کر تعارف کروایا کہ وہ بابل کا سفیر اول ہے۔ ملکہ مصر کا چہرہ بڑا نازک اور حساس تھا' اور لگتا تھا کہ اس پر ہوا کے ہلکے سے جھونکے کا بھی اثر ہو جاتا ہے۔

فرعون رعمیس نے عاطون سے ملک بابل کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔ اتنے میں رامطہ' سونے کے جڑاؤ طشت میں دو بلوریں گلاس اور ایک بلوریں صراحی رکھے داخل ہوئی' وہ جانتی تھی کہ صبح کے وقت ملکہ مصر مشروب استعمال نہیں کرتی۔ دوسرا گلاس' رامطہ نے خاص طور پر بابل کے سفیر کے لیے رکھا تھا۔ عاطون اور فرعون نے مشروب سے بھری صراحی کو بغور دیکھا' پھر مسکرا کر فرعون نے عاطون سے کہا' "محترم سفیر.... یہ مشروب ہمارے دریائے نیل میں اگنے والے نیلوفر سے بنایا جاتا ہے۔ آپ اسے پی کر بہت فرحت محسوس کریں گے۔"

عاطون نے آہستہ سے سرہلا کر کہا' "عظیم شہنشاہ! مجھے یہ مشروب پی کر یقیناً" خوش ہوگی۔"

فرعون نے کنیز رامطہ کو اشارہ کیا' رامطہ تو پہلے ہی تیار بیٹھی تھی۔ اس نے بڑی نفاست اور شائستگی کے ساتھ دونوں گلاسوں میں ہلکے گلابی رنگ کا مشروب ڈال دیا۔ اس میں کاہن اعظم نے جو زہر ملایا تھا۔ اس کی کوئی بو ور ذائقہ نہیں تھا۔ رامطہ بڑی ہیجانی کیفیت کے ساتھ' ایک طرف ادب سے کھڑی تھی' اور نگاہیں زمین پر لگی تھیں مگر کسی وقت وہ ترچھی نظر سے فرعون کی طرف دیکھ لیتی تھی کہ وہ مشروب پی رہا ہے یا نہیں۔ فرعون رعمیس نے مشروب حلق میں انڈیل لیا۔ رامطہ کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نمودار ہوئی'

کیونکہ اس مذموم کام کے عوض اسے بہت بڑا انعام ملنے والا تھا۔ اس کی دانست میں فرعون نے زہر پی لیا تھا' اور اب تھوڑی ہی دیر بعد وہ مردہ ہو کر فرش پر گرنے والا تھا۔

عاطون نے مشروب کا گلاس ابھی اپنے ہونٹوں سے نہیں لگایا تھا' وہ رامطہ کی طرف دیکھ کر بولا' "عظیم شہنشاہ! ہمارے ملک بابل میں رواج ہے کہ جب پہلی بار کسی کے ہاں دعوت پر جاتے ہیں تو جو خادم یا کنیز پہلی بار مشروب پیش کرتی ہے' ہم اس مشروب سے اس خادم یا کنیز کو بھی ضرور شامل کرتے ہیں۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے مشروب سے دو گھونٹ آپ کی کنیز کو بھی پیش کر دوں۔"

رامطہ کنیز کا تو رنگ زرد ہوگیا۔ ٹانگیں کانپنے لگیں' وہ جانتی تھی کہ فرعون کسی حالت میں بھی بابل کے سفیر کی خواہش کو رد نہیں کرے گا' اور یہ کوئی ایسی خواہش بھی نہیں تھی' وہ وہاں سے بھاگ ہی نہیں سکتی تھی۔

فرعون نے کہا' "محترم سفیر کو اجازت ہے۔" پھر فرعون نے رامطہ کو اشارے سے بلایا ور کہا' "ہمارے محترم سفیر کے ملک کی رسم کا احترام کرو اور ان کے مشروب میں سے دو گھونٹ پہلے خود پیئو۔"

رامطہ کے پاؤں لرز رہے تھے۔ زبان سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی' حلق سوکھ گیا تھا۔ ہونٹوں پر جیسے مہر لگ گئی تھی۔ عاطون جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور زہریلے مشروب کا پیالہ کنیز کے ہونٹوں سے لگا کر بولا' "کنیز ہمارے ملک کی رسم کا احترام کرتے ہوئے' دو گھونٹ پی لو۔"

ے رامطہ نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس تھام لیا۔ فرعون کے رعب اور گلاس سے جھانکتی موت کے خوف سے وہ شاخ ناتواں کی طرح کانپ رہی تھی۔ عاطون اور فرعون کی نظریں رامطہ پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانکہ رامطہ نے گلاس ہاتھ سے چھوڑ دیا اور چلائی۔ "نہیں.... نہیں' میں مرنا نہیں چاہتی۔"

عین اسی وقت کھلی کھڑکی سے ایک تیر سنسناتا ہوا آیا.... اور رامطہ کنیز میں گھس کر پسلیاں توڑتا ہوا' سینے سے نکل گیا۔ رامطہ ایک ہچکی لے کر گر پڑی۔ عاطون جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف لپکا۔ فرعون اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کے باہر شاہی باغ خالی تھا۔ عاطون کو قاتل کہیں دکھائی نہ دیا' وہ ضرور فرار ہو چکا تھا۔

اس نے رامطہ کی لاش کو جھک کر دیکھا اور فرعون سے بولا' "عظیم رعمیس! آپ کے دشمن اس کنیز کی نقل و حرکت کو دیکھ رہے تھے۔ اسے ہلاک کر کے انہوں نے اپنی دانست میں اس خونین سازش کے راز کو مہربند کر دیا ہے۔"

فرعون نے کہا' "انہیں یہ بھی علم ہو گیا ہو گا کہ زہر نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا۔"

"ہاں...." عاطون بولا' اب وہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں گے' لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ اس سے پہلے ہی سپہ سالار گوپاز اور کاہن اعظم کی گرفتاری کا حکم دے دیجئے۔"

فرعون رعمیس انصاف پسند اور معتدل مزاج کا بادشاہ تھا۔ اس نے کہا' "شمعار! ہمارے پاس ان دونوں کی گرفتاری کے لیے ان کے جرم کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

عاطون سٹ پٹا گیا۔ "عظیم رعمیس! آپ کن باتوں میں پڑے ہوئے ہیں' کبھی کسی شہنشاہ نے اپنے دشمنوں کے بارے میں اس طرح بھی سوچا ہے؟"

فرعون نے کہا' "لیکن شمعار! ہم اس طرح کے شہنشاہ نہیں ہیں' ہم ایک خالق کل.... کی عبادت کرتے ہیں جو سچا اور عادل ہے.... پھر ہم سچائی اور عدل سے کیسے روگردانی کر سکتے ہیں۔"

عاطون سمجھ گیا کہ یہ فرعون زندہ نہیں بچے گا' تاہم وہ اس نیک اور توحید پرست بادشاہ کو بچانا چاہتا تھا۔ توحید کا تصور' اس کے عمل سے اپنا ترقی پذیر اور انقلابی سفر جاری رکھ سکتا تھا' اگر یہ بادشاہ بھی مارا گیا تو مصر ایک بار پھر بتوں کی پوجا شروع کر دے گا۔

عاطون نے کہا' "عظیم رعمیس! آپ کے لیے کیا اتنا ثبوت کافی نہیں ہے کہ اس مشروب میں رامدہ کے ذریعے آپ کو زہر دینے کی کوشش کی گئی ہے؟"

فرعون رعمیس چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ قالین پر ادھر ادھر ٹہلتا رہا' پھر عاطون سے مخاطب ہو کر بولا۔ "مجھے اپنی کنیز کی موت کا افسوس ہے' شمعار! میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی موت اس طرح ہو' لیکن جب تک مجھے ثبوت اور موقعے کے گواہ نہیں ملیں گے' میں سپہ سالار اور کاہن اعظم کے خلاف کوئی بھی کارروائی نہیں کروں گا۔"

عاطون نے کہا' "لیکن حضور! آپ سپہ سالار اور کاہن اعظم کی نگرانی تو کروا سکتے ہیں۔"

فرعون نے جواب دیا' "یہ بات بھی' دوسرے انسان کے معاملات میں دخل اندازی کے برابر ہے' ہر شہری کو مکمل آزادی سے زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔" یہ کہہ کر فرعون رعمیس' ناشتے کے کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

عاطون کچھ دیر کمرے میں اکیلا بیٹھا غور کرتا رہا۔ اس وقت وہ بابل کے سفیر والے حلیے میں تھا اور اس کا کوئی ساتھی بھی اسے بہ مشکل پہچان سکتا تھا' وہ واپس اپنے سفارتی محل میں آ گیا۔

فرعون رعمیس کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی سازش جب ناکام ہو گئی تو سپہ سالار

گوپاز اور کاہن اعظم خفیہ جگہ پر ملے اور کسی نئے منصوبے پر غور کرنے لگے۔ کاہن اعظم نے کہا' "مجھے یقین ہے کہ بابل کے سفیر نے فرعون کو کوئی خاص عرق پلا دیا تھا۔ یہ بابل کے لوگ جڑی بوٹیوں کے بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ ورنہ یہ ناممکن ہے کہ میرے تیار کیے ہوئے زہر کا اثر نہ ہو۔"

گوپاز نے کہا' "یہ تو اچھا ہوا کہ ہم نے درخت پر اپنے تیز انداز کو تعینات کر دیا تھا' ورنہ رامدہ ہمارا بھانڈا پھوڑ دیتی۔"

کاہن اعظم گہری سانس لے کر بولا "میں تو تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ کسی طرح نائب سپہ سالار کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لو اور شاہی محل پر حملہ کر دو۔ سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

گوپاز نے کہا' "نائب سپہ سالار کے پیچھے شاہی امراء کی ایک جماعت ہے' جو اسے اپنے سیاسی عزائم کے لیے استعمال کر رہی ہے' اور اسے رشوت میں بھاری رقم فراہم کی جاتی ہے۔"

کاہن اعظم نے جھنجھلا کر کہا' "گوپاز! میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔ ہمیں فرعون کا کام تمام کرنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا "دو روز بعد' پورے چاند کی رات ہے' فرعون ہر چاند رات کو محل سے اکیلا نکل کر دور صحرا میں مقدس ٹیلے کے پاس اپنے خدائے واحد کی عبادت کرنے جاتا ہے۔ بس اسی جگہ اسے تہ تیغ کر دیا جائے۔ اس سے آگے میں کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔"

سپہ سالار گوپاز بھی اس جھنجٹ کو ختم کرنے کے لیے بے تاب تھا' کیونکہ اسے قوی امید تھی کہ کاہن اعظم اپنے اثر و رسوخ سے اسے فرعون کے تخت پر بٹھانے میں مدد دے سکتا ہے.... چنانچہ اس نے حامی بھر لی۔

عاطون اس سازش سے بے خبر تھا' مگر اس نے فرعون رعمیس کی نگرانی شروع کر دی تھی۔ چنانچہ پورے چاند کی رات کو جب فرعون ایک دیہاتی آدمی کا بھیس بدل کر محل کے خفیہ دروازے سے گھوڑے پر سوار ہو کر' صحرا کی طرف نکلا تو عاطون بھی اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنے گھوڑا کافی فاصلے پر رکھا تھا۔

صحرا میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ زرد چاند' آسمان کے وسط میں چمک رہا تھا۔ عاطون سوچ رہا تھا کہ فرعون آدھی رات کو محل سے خفیہ طریقے سے نکل کر کہاں جا رہا ہے۔ محل سے کافی دور صحرا میں ایک مخروطی ٹیلہ تھا۔ فرعون اس ٹیلے کے پاس گھوڑے سے اتر کر ریت پر بیٹھ گیا اور سینے پر ہاتھ باندھ کر' آنکھیں بند کر کے عبادت میں محو ہو گیا۔

عاطون نے اس سے دور ٹیلے کے عقب میں اپنے گھوڑے کو چھوڑ دیا اور خود ایک طرف بیٹھ کر، چاندنی رات میں فرعون کو عبادت کرتے دیکھنے لگا۔

دوسری طرف گوپاز نے کاہن اعظم کے ایما پر اپنے دو وفادار سپاہیوں کو تیر، کمان دے کر صحرا کی طرف روانہ کر دیا تھا، وہ زبردست نشانچی تھے اور اندھیرے میں بھی ان کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا تھا، وہ دونوں سپاہی صحرا میں چکر کاٹ کر ٹیلے کی طرف جنوب کی جانب سے بڑھے۔

عاطون نے ٹیلے کے پیچھے بائیں جانب دور دو سیاہ دھبے ابھرتے دیکھے تو اسے شک ہوا، وہ جلدی سے اٹھا۔ گھوڑے پر بیٹھ کر ایڑ لگائی اور اوپر سے ہو کر ان سیاہ دھبوں کے عقب میں پہنچ گیا۔ یہ دو سپاہی تھے جو اپنے گھوڑوں کو بہت پیچھے چھوڑ کر، ریت پر جھکے جھکے، مقدس ٹیلے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے پیچھے گھوڑے کے ہنہنانے کی ہلکی سی آواز سنی، تو بجلی کی تیزی کے ساتھ پلٹے اور کمانوں میں تیر جوڑ کر دیکھا کہ ایک آدمی، گھوڑے پر سے کودا ہے۔ سپاہی اس کی طرف دوڑے۔ عاطون ان کی زد میں آگیا، تو نشانے باز سپاہیوں نے تیر چھوڑ دیے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ ان کے تیر عاطون کو نہ لگتے۔ دونوں تیر، عاطون کے جسم سے ٹکرا کر نیچے گر پڑے، مگر تیروں کو گرتے سپاہی نہ دیکھ سکے تھے۔ عاطون جان بوجھ کر ریت پر گر پڑا۔

سپاہی، اس کی طرف لپکے کہ معلوم کریں، یہ کون شخص تھا، جو ان کا پیچھا کر رہا تھا۔

جونہی وہ عاطون کے قریب پہنچے، عاطون نے اچھل کر دونوں کو ایک ایک لات رسید کی، وہ بوکھلا کر پیچھے کو گرے، عاطون اس وقت، بابل کے سفیر کے بھیس میں نہیں تھا۔ سپاہی جلدی سے اٹھے اور پیچھے ہٹ کر انہوں نے عاطون پر تیروں کی ایک باڑھ ماری۔ تیر عاطون کے سینے اور گردن پر لگے مگر لگتے ہی اچٹ کر نیچے گر پڑے۔ سپاہی یہ سمجھے کہ اس نے کوئی آہنی صدر پہن رکھی ہے۔ انہوں نے کمانیں پھینک کر خنجر نکال لیے اور عاطون کی گردن پر وار کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ عاطون نے دونوں کی گردنیں دبوچ کر، ان کے سروں کو اتنی زور سے آپس میں ٹکرا دیا کہ ان کی کھوپڑیاں چٹخ گئیں۔

عاطون ان دونوں کی بے جان لاشوں کو وہیں چھوڑ کر ٹیلے کی طرف چلا تو اچانک ایک جانب سے گول طشتری گھومتی ہوئی آ کر، عاطون سے ٹکرائی۔ یہ طشتری چھوٹے سائز کی تھی اور اس میں سے عجیب سی آواز نکل رہی تھی۔ عاطون سے ٹکراتے ہی طشتری اس کے سامنے ریت پر گر گئی۔ عاطون اسے اٹھانے کے لیے جھکا تو وہ منہ کے بل ریت پر گر پڑا۔ اس نے ہڑبڑا کر اٹھنا چاہا، مگر جیسے اس کے جسم کی ساری طاقت جواب دے گئی ہو۔ اسے

اپنے عقب میں انسانی سرگوشیاں سنائی دیں۔ "اسے ابھی یہیں پڑا رہنے دو۔"

عاطون نے آواز پہچان لی۔ یہ کاہن اعظم کی آواز تھی۔ دوسرے آدمی نے کہا، "میں فرعون کا کام تمام کیے دیتا ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو۔"

کاہن اعظم نے آہستہ سے کہا، "یہ کم بخت وہی شمعار ہے، جس کو ہم نے زمین میں دفن کیا تھا۔ اس کے پاس ضرور کوئی طلسم ہے۔ خیر میں نے اسے اپنے طلسم میں جکڑ لیا ہے، تم فوراً جا کر فرعون کا سر اڑا دو، وہ اس وقت عبادت میں مصروف ہے۔"

عاطون نے اٹھنا چاہا، لیکن وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی حرکت نہ کر سکا۔ اس کا سارا بدن جیسے مفلوج ہو گیا تھا۔ یہ کاہن اعظم کے طلسم کا اثر تھا۔

سپہ سالار، تلوار کھینچ کر ٹیلے کی اوٹ لیتا، فرعون کو ہلاک کرنے کے لیے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے دیکھا کہ خوب کھلی ہوئی چاندنی میں فرعون ریت پر سجدہ ریز ہے۔ اس کی گردن اڑانے کا یہ سنہرا موقع تھا، وہ تلوار بلند کیے فرعون کے عقب میں آیا۔ جونہی وہ تلوار کا وار کرنے لگا، ایک سانپ پھن اٹھائے اس کے سامنے آگیا۔ پہلے تو گوپاز خوف زدہ ہو کر پیچھے کو ہٹا، پھر یہ دیکھ کر اسے حوصلہ ہوا کہ اس کے ہاتھ میں تلوار ہے، اور وہ سانپ کے دو ٹکڑے کر سکتا ہے۔ اسے خبر نہیں تھی کہ وہ کوئی معمولی سانپ نہیں، بلکہ وہ پدم ناگ تھا، جو روئے زمین اور سمندر کے سانپوں کا دیوتا تھا۔

جونہی سپہ سالار نے تلوار کا وار کیا۔ سانپ غائب ہو گیا۔ گوپاز ہکا بکا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پدم ناگ، عقاب کا روپ بدل کر فضا میں پرواز کر رہا تھا۔ اس نے اوپر سے غوطہ لگایا اور کسی فائٹر ہوائی جہاز کی طرح گوپاز کی گردن پر گرا۔ گوپاز اس حملے کی تاب نہ لا سکا اور مر گیا۔ کاہن اعظم نے ٹیلے کی اوٹ سے یہ منظر دیکھا، تو عقاب پر اپنا طلسم پھینکا، مگر پدم ناگ خود دیوتا تھا۔ اس پر کاہن کے قدیم مصری طلسم کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ چنانچہ کاہن اعظم نے اس میں عافیت سمجھی کہ وہاں سے بھاگ جائے، چنانچہ وہ دوڑ کر اپنے گھوڑے کے قریب آیا۔ اور اس پر سوار ہو کر مصر کے شہر تھینز کی طرف روانہ ہو گیا۔ پدم ناگ، کاہن کو نہ دیکھ سکا۔ اس کی توجہ فرعون کی جانب تھی جو ابھی تک سجدے میں گرا ہوا تھا۔

جب فرعون سجدے سے اٹھا تو دائیں بائیں دیکھ کر بولا.... "یہاں یہ کیسا شور سا تھا؟" پھر اس کی نگاہ پدم ناگ پر پڑی جو اس کے قریب ریت پر دوزانوں ہو کر بیٹھا تھا۔

اس نے پوچھا، "تم کون ہو، بھائی؟ اور یہ آدمی تمہیں کس لیے مارنا چاہتا تھا؟"

"کون سا آدمی؟" فرعون نے آہستہ سے پوچھا۔

تب پدم ناگ نے بتایا کہ ایک سرمنڈا آدمی جس نے سیاہ لبادہ اوڑھ رکھا تھا، اسے

قتل کرنے آیا تھا۔ فرعون سمجھ گیا کہ وہ سوائے کاہن اعظم کے اور کوئی نہیں ہو سکتا' مگر پدم ناگ ابھی تک اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ اس کے سامنے جو دیہاتی بیٹھا ہے' وہ مصر کا فرعون رعمیس ہے۔

فرعون اٹھ کھڑا ہوا' اور یہ کہہ کر اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا کہ میں ایک دیہاتی آدمی ہوں۔ ہم چاند کی پوجا کرتے ہیں۔ میرے پاس کچھ زمین ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ہمارا کوئی رشتے دار ہو اور مجھے مار کر میری زمین پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اچھا بھائی! تمہارا بہت بہت شکریہ' "یہ کہہ کر فرعون' گھوڑے پر سوار ہوا اور یہ جا' وہ جا۔"

پدم ناگ پیچھے کو مڑا ہی تھا کہ اچانک اسے ناگ کی خوشبو آئی' وہ چوکنا ہوگیا اور جدھر سے خوشبو کا جھونکا آیا تھا' اس طرف کو دوڑا۔ ایک جگہ چاندنی میں اسے عاطون کو ریت پر اوندھے منہ پڑے دیکھا۔ پدم ناگ نے اس کا چہرا اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا اور بولا' "میرے دوست عاطون کیا تم میری آواز سن رہے ہو۔"

عاطون کے نہ تو لب ہلے اور نہ ہی اس کے حلق سے کوئی آواز نکلی۔ پدم ناگ سمجھ گیا کہ اس پر طلسم کا اثر شدید ہے' لیکن پدم ناگ دیوتا تھا۔ اپنے دوست کو اس حالت میں دیکھ کر اسے جوش آگیا۔ اس نے اپنا چہرہ ایک دم سے بدل لیا۔ عاطون نے دیکھا' کہ پدم ناگ کی گردن کے اوپر ایک ایسا سر نمودار ہوگیا تھا' جس پر بہت سی آنکھیں تھیں۔ درمیان والی آنکھ کا رنگ سبز تھا۔ اچانک اس آنکھ سے ایک سبز شعاع نکل کر عاطون کے چہرے پر پڑی اور اسے اپنے جسم میں گرم خون کی گردش محسوس ہونے لگی۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن سنائی دینے لگی اور وہ طلسم سے آزاد ہوگیا۔

دوسرے لمحے پدم ناگ کا یہ محیرالعقول سر غائب تھا اس کی جگہ اس کا اپنا سر واپس آ چکا تھا۔ عاطون مسکرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں دوست ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر ملے۔ پدم ناگ نے اسے بتایا کہ ایک ادھیڑ عمر منڈے ہوئے سر والے آدمی نے ادھر ایک دیہاتی کو ہلاک کرنا چاہا تھا۔ میں نے اسے بچایا تو منڈے ہوئے سر والے نے مجھ پر طلسم پھونکا' مگر جب مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا تو وہ خوف زدہ ہو کر رفو چکر ہوگیا۔

عاطون نے کہا' "پدم ناگ! تم جس کو دیہاتی سمجھ رہے تھے' وہ مصر کا بادشاہ فرعون رعمیس تھا' اور جس نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی' وہ کاہن اعظم تھا۔ اسی نے مجھے بھی اپنے طلسم میں جکڑ لیا تھا۔"

"یہ سب قصہ کیا ہے؟" پدم ناگ نے پوچھا۔

عاطون نے پدم ناگ نے ساری رام کہانی سنا ڈالی۔

پدم ناگ بولا' "پھر تو ہمیں فرعون کی ہر حالت میں جان بچانی چاہیے' مجھے اپنے ساتھ لے چلو' میں فرعون کے دشمنوں کو سمجھ لوں گا۔"

عاطون بولا' "اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ناگ دیوتا ہو اور تم پر طلسم کا بہت ہی کم اثر ہوتا ہے' مگر یہ کاہن اعظم بہت بڑا ساحر لگتا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں تم کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔"

پدم ناگ مسکرا کر بولا' "تم مجھے اپنے محل میں نہیں ٹھہراؤ گے؟"

"کیوں نہیں.... آؤ میرے ساتھ۔" عاطون' پدم ناگ کو ساتھ لے کر اپنے سفارتی محل میں آگیا۔ اس نے پدم ناگ سے کہا' "اب مجھے سفیر کا حلیہ بدلنے کی ضرورت نہیں رہی' کیونکہ کاہن اعظم نے مجھے پہچان لیا ہے کہ میں شمعاز ہوں۔ سپہ سالار کی موت' اس کے لئے صدمہ کا باعث نہیں ہوگی۔ اب وہ نائب سپہ سالار کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے گا' کیونکہ فوج کے تعاون کے بغیر کاہن اعظم فرعون کے خلاف کامیاب سازش نہیں کر سکتا۔"

پدم ناگ بولا' "عاطون! میں اب بھی یہی کہوں گا کہ مجھے اجازت دو کہ میں اس نیک دل بادشاہ کے سب سے بڑے دشمن کاہن کو ہمیشہ کے لئے اس کے راستے سے ہٹا دوں۔"

عاطون سنجیدگی سے سوچنے لگا۔

پدم ناگ نے کہا' "اس میں سوچنے کی کون سی بات ہے' عاطون! کاہن صرف توحید پرست بادشاہ ہی کا دشمن نہیں' تمہارا بھی دشمن ہے۔ اس نے تمہیں بھی ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی.... یہ تو تمہاری غیر معمولی طاقت تھی جس نے تمہاری جان بچا لی۔"

"مجھے تو صرف ایک ہی ڈر ہے کہ کہیں تم کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔" عاطون بولا۔

پدم ناگ نے کہا' "تم میری فکر نہ کرو۔ کاہن میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

عاطون نے پدم ناگ کو بتایا کہ کاہن اعظم رات کو پوجا کے بعد دیر تک مندر میں منتروں کا جاپ کرتا رہتا ہے۔

پدم ناگ مسکرایا۔ "میں اس کے منتروں سے واقف ہوں' ہم گگن منڈل کے رہنے والے ہیں' اس کے منتر' ہمارے منتروں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ میں آج رات ہی اس ٹونی اور سازشی کاہن کی خبر لینے مندر جاؤں گا۔"

عاطون نے کہا کہ وہ بھی اس کے ساتھ جائے گا' جس پر پدم ناگ نے اسے ساتھ

چلنے سے منع کر دیا اور کہا، کہ وہ اپنے محل ہی میں آرام کرے۔ اسی رات، پدم ناگ نے ایک چھوٹے سے عقاب کا روپ دھارا اور فضا میں پرواز کرتا ہوا، تھینز کے سب سے بڑے مندر میں پہنچ گیا۔ اس مندر میں دیوی عصیری اور بلی کے ایک بت کی پوجا ہوتی تھی۔ ایک بت سانپ کا بھی رکھا ہوا تھا، ان کے اوپر، سورج کا ایک تھال، دیوار سے لٹک رہا تھا، یہ بہت بڑا تھال سونے کا تھا۔

اس وقت مندر میں پوجا ہو رہی تھی۔ کاہن اعظم، دیو عصیری کے بت کے آگے بیٹھا منتر پڑھ رہا تھا۔ دوسرے پجاری باری باری آ کر ماتھا ٹیکتے اور ایک بہت بڑے مرتبان میں سونے چاندی کے سکے ڈال کر پیچھے ہٹ جاتے۔ پدم ناگ نے اپنی اصلی انسانی شکل بدلی اور مندر کے ایک ستون کے پیچھے سے نکل کر عصیری دیوی کے بت کی طرف بڑھا.... اس نے بت کے آگے ماتھا ٹیکا، چونکہ پدم ناگ، ہندی دیو مالا کا دیوتا تھا۔ اس لیے وہ ایسا کر سکتا تھا۔ ماتھا ٹیکنے کے بعد وہ مرتبان کی طرف گیا، اور اس میں ہاتھ ڈال کر کچھ سکے نکالے اور پجاروں کی طرف اچھال دیئے، اور بولا، "یہ عصیری دیوی کی طرف سے تمہیں دیئے جاتے ہیں۔"

کاہن اعظم آنکھیں بند کیے منتروں کا جاپ کر رہا تھا۔ اس نے یہ جملہ سنا تو آنکھیں کھول دیں۔ اپنے سامنے صحرا والے شخص کو دیکھ کر ایک بار تو وہ اپنی جگہ سے ہل گیا، مگر پھر فوراً سنبھل کر گرج دار آواز میں بولا۔ "تم نے عصیری دیوی کے مال میں خیانت کی ہے۔ دیوی تم سے بھیانک بدلہ لے گی۔"

پدم ناگ، کاہن اعظم کے قریب آ گیا، اور آہستہ سے بولا، "اس وقت میں تیری موت بن کر یہاں آیا ہوں، اور میرے چنگل سے تیری عصیری دیوی بھی تجھے نہیں بچا سکے گی۔"

کاہن اعظم اٹھ کھڑا ہوا، اس کا جسم غصے سے کانپ رہا تھا، چہرہ آگ بگولا ہو رہا تھا، اور آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ آج تک کسی کو جرات نہیں ہوئی تھی کہ اس سے ایسی بات کہہ سکے، لیکن وہ اندر ہی اندر پدم ناگ سے خائف بھی تھا، کیونکہ ایک بار اس کا طلسم، اس پر بے کار ثابت ہو چکا تھا۔ دوسرے پجاروں نے کاہن اعظم اور ایک اجنبی کو دشمنوں کی طرح آمنے سامنے مقابلے پر کھڑے دیکھا تو پہلے تو حیرت کا اظہار کیا، اور پھر ڈر کر ادھر ادھر ہو گئے، کیونکہ کاہن اعظم نے ایک منتر پڑھ کر، پدم ناگ پر چنوں کی ایک مٹھی پھینک دی تھی جو چنگاریاں اور انگارے بن کر اس پر گری۔ پدم ناگ دوسرے ہی لمحے اپنی جگہ سے غائب تھا۔

ہر طرف بھگدڑ سی مچ گئی، لیکن کاہن اعظم اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا دشمن وہیں موجود ہے۔ پدم ناگ اس وقت ایک چھوٹا سا بھورے رنگ کا زہریلا صحرائی سانپ بن کر، اس کی گردن سے چمٹ گیا۔ کاہن اعظم نے ایک مانتر کا جاپ کیا، جس سے اس کی گردن اتنی گرم ہو گئی کہ.... پدم ناگ اس کی گردن سے سے اچھل کر دو جا گرا۔

سانپ کے گرتے ہی کاہن اعظم نے پانی کی کٹوری میں سے ایک چلو بھرا اور نیا منتر پڑھ کر، اس کا چھینٹا، پدم ناگ پر مارا۔ پانی کھولتا ہوا، لاوا بن کر گرا، مگر اس سے پہلے ہی پدم ناگ ایک بار پھر غائب ہو چکا تھا، اور اب وہ ایک چھوٹی سی چڑیا کے روپ میں دیوی کے بت کے پیچھے چھپا کسی نئے حملے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

آخر گگن منڈل کے دیوتاؤں نے اس کی مدد کی اور اس کے کان میں ایک خاص بات پھونکی۔ پدم ناگ اب ایک ایسے راکھشش راوان کی شکل میں ظاہر ہوا جس کے دس سر تھے اور ہر سر پر ایک سانپ بیٹھا پھنکار رہا تھا۔ اس کا قد مندر کی چھت کو چھو رہا تھا۔ اس کے دس بازو تھے اور ہر بازو کے چار چار ہاتھ تھے۔ ہر ہاتھ میں کوئی نہ کوئی خطرناک نوکیلا اور تیز دھار والا ہتھیار تھا، وہ بھاری بوجھل قدم اٹھاتا، کاہن اعظم کی طرف بڑھا۔ کاہن نے کئی طلسم پھونکے، کئی منتروں کا جاپ کیا، مگر پدم ناگ نے جو روپ بدل رکھا تھا، وہ گگن منڈل کے دیوتاؤں کا عطا کردہ تھا۔ اس کو مٹانا ایک فانی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اب کاہن اعظم کے سامنے فرار کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔

اس نے اپنے پیروں میں پہنی ہوئی کھڑاویں اتار کر بغل میں دبائیں اور زمین سے پندرہ فٹ بلند ہو کر فضاء میں پرواز کرتا ہوا، مندر کی محرابوں سے نکل کر صحرا کی طرف اڑنے لگا۔ پدم ناگ بھی فضا میں اچھلا اور ایک ہیبت ناک بادل کی طرح، اس کے اوپر سایہ کیے، اس کے ساتھ ساتھ اڑنے لگا، دیکھتے ہی دیکھتے وہ لق و دق صحرا میں پہنچ گئے۔ پدم ناگ نے نیچے دیکھا۔ کاہن اعظم فضا میں نہیں تھا۔ پدم ناگ چونک کر وہیں صحرا میں اتر گیا۔ گگن منڈل کے روان کا روپ بدل کر، اس نے یک لخت ایک کالے سانپ کی شکل اختیار کی اور ریت میں چھپ کر چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا، وہ بار بار اپنی زبان باہر نکال کر فضا میں کاہن اعظم کی بو سونگھ رہا تھا۔

کاہن اعظم اپنے ایک خاص طلسم سے چھپکلی بن کر ریت پر ایک جانب رینگتا چلا جا رہا تھا۔ پدم ناگ کو تشویش ہوئی۔ کاہن اعظم کی بو کہیں نہیں تھی۔ پدم ناگ اپنے طلسم کے زور سے سانپ ہی کی شکل میں فضا میں بلند ہوا اور اس کی گول گول سرخ آنکھیں، دور بین کی طرح صحرا میں دور و نزدیک کی خبر لانے لگیں۔ اچانک اس کی نظر ریت پر تیزی سے

رینگتی ہوئی ایک چھپکلی پر پڑی' وہ اڑتا ہوا چھپکلی کے عین اوپر آگیا۔ یہاں پہلی بار اسے کاہن اعظم کی بو محسوس ہوئی' وہ سمجھ گیا کہ یہ چھپکلی ہی اصل میں کاہن اعظم ہے۔

پدم ناگ نے اوپر سے ایک تیز پھنکار' چھپکلی کے اوپر پھینکی۔ اس پھنکار نے چھپکلی کے جسم میں آگ لگا دی۔ آگ لگتے ہی کاہن اعظم اپنی اصلی شکل میں آگیا۔ اس کے جسم میں آگ لگ چکی تھی' اور اس کا گوشت جل رہا تھا۔ کاہن اعظم تڑپ تڑپ کر زمین سے دو دو فٹ بلند ہوتا اور پھر نیچے گر پڑتا۔ پدم ناگ اس کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ آخر کاہن اعظم کو شعلوں نے چاٹ لیا' اور اس کی سیاہ ہڈیوں کا ہیبت ناک پنجر ریت پر پڑا رہ گیا۔

پدم ناگ اڑتا ہوا' واپس عاطون کے پاس اس کے سفارتی محل میں آیا اور کاہن اعظم کی موت کی خبر سنائی۔ عاطون اسی وقت فرعون کے پاس' شاہی محل پہنچا۔ فرعون رعمیس کو ابھی کاہن اعظم کی موت کی اطلاع نہیں ملی تھی۔ فرعون نے کاہن اعظم کی موت پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا' کہ اگرچہ وہ میرا دشمن تھا' لیکن اس کی موت سے مجھے دکھ پہنچا۔ یہ رویہ اس عہدے کے ایک روایتی بادشاہ یا فرعون کے رویے سے بالکل مختلف تھا۔ عاطون کو اب پورا پورا یقین ہو گیا کہ یہ فرعون قدرتی موت نہیں مرے گا' اگرچہ عاطون تاریخ کے ساتھ ہزاروں برس کا سفر کر چکا تھا' مگر اسے ہر بادشاہ کے انجام کی خبر نہیں تھی۔ کئی گم شدہ کڑیاں بھی تھیں..... فرعون رعمیس کے راستے کے دونوں پتھر صاف ہوگئے۔ چنانچہ اس نے ایک خدا کی عبادت کا حکم دے دیا' اور عصیری دیوی کے معبد کو بند کرا دیا۔ رعایا کے دلوں میں عصیری دیوی کی محبت کافی گہری ہو چکی تھی' یہ محبت کئی ہزار برسوں سے جاری تھی۔ ایک لمحے میں یہ محبت ان کے دلوں سے کیسے دور کی جا سکتی تھی۔

چنانچہ اسے یہ انقلابی قدم اٹھائے ابھی چند روز ہی گزرے تھے' کہ ایک روز جبکہ فرعون رعمیس' صبح کی عبادت کے لیے مقدس ٹیلے کی طرف جا رہا تھا کہ پیچھے سے ایک تیر آ کر' اس کی پیٹھ میں لگا۔ یہ زہر میں بجھا ہوا تیر تھا۔ تیر کے لگتے ہی فرعون گھوڑے سے گر پڑا۔ محافظ دستے کے سپاہی گھوڑے دوڑاتے اس کی طرف بڑھے' لیکن فرعون مر چکا تھا۔

عاطون اور پدم ناگ کو فرعون کی موت کا سخت افسوس ہوا۔ عاطون بولا' "پدم! میں نے ایسے کئی بادشاہوں کی لاشیں تاریخ کے اوراق پر بکھری ہوئی دیکھی ہیں۔ ایسے فرعون کی دل سے کوئی بھی قدر نہیں کرتا۔ لوگ جابر بادشاہوں کو قتل بھی کرتے ہیں اور پھر یاد بھی انہی کو کرتے ہیں۔ ان کی بہادری کے قصے قلم بند کرتے ہیں۔

مگر دل کی گہرائیوں میں عاطون کو رعمیس کی المناک موت کا افسوس تھا۔ اس روز وہ بہت اداس رہا۔ رات کو وہ پدم ناگ کو سوتا چھوڑ کر' سفارتی محل سے نکلا اور صحرا کی طرف

چل دیا۔ ٹھنڈی پرسکون چاندنی اور صحرا کی پرسکوت رات نے جیسے اس کے اداس دل پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھ دیا۔

وہ پیدل ہی چلا جا رہا تھا' اور اسے اپنے سارا گزرا ہوا زمانہ یاد آ رہا تھا۔ ہزاروں برس کے واقعات کسی فلم کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ اسے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آیا' وہ دریائے نیل کے کنارے کھیلا کرتا تھا' دریا میں اپنے باپ کے ساتھ کشتی چلایا کرتا تھا۔ عاطون کا وہ گھر اور محلہ باقی نہیں رہا تھا' مگر اہرام اور دریائے نیل موجود تھے۔ دریا اسی روانی سے بہہ رہا تھا۔ اس کے کنارے کنول کے پھول اسی طرح اگتے تھے۔

عاطون کا دل بوجھل سا ہو گیا تھا۔ اس کے قدم خود بخود اہراموں کی طرف اٹھنے لگے۔ چاند مغرب کی طرف صحرا میں کافی نیچے کھسک آیا تھا اور پھیکی زرد روشنی صحرا میں رینگتی ہوئی چاند کی طرف سمٹ رہی تھی۔ اہرام اس وسیع و عریض صحرا میں سربفلک مخروطی پہاڑوں کی طرح اوپر کو اٹھے' مہر بہ لب کھڑے تھے۔ انہی اہراموں میں سے عاطون کی ہزاروں برس کی زندگی کا دھارا بہنا شروع ہوا تھا۔

خاندان فراعنہ کے اجڑے ہوئے ویران' شاہی قبرستان کے پہلو سے گزرتے ہوئے' عاطون کو کچھ سرگوشیاں سنائی دیں' وہ رک گیا۔ اس نے قبرستان کی طرف دیکھا۔ وہاں سناٹے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ قبروں کے کچھ باقی بچے ہوئے پتھر ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ کوئی قبر سلامت نہیں تھی۔ کبھی اس قبرستان میں اس کے آباء و اجداد کی قبریں ہوا کرتی تھیں۔ عاطون نے ان سرگوشیوں کو اپنا وہم سمجھا اور اہرام کی طرف قدم اٹھایا۔

سرگوشیوں کی آوازیں اسے ایک بار پھر سنائی دیں۔ اب وہ چونکا' اس نے قبرستان کی طرف نگاہیں جما دیں۔ آوازیں اسی جانب سے آ رہی تھیں۔ زرد چاندنی میں تباہ حال قبرستان' داستان عبرت سنا رہا تھا۔ عاطون نے دو انسانی ہیولوں کو قبروں کے پتھروں کے درمیان سے گزرتے دیکھا' وہ عورتیں تھیں' جن کے لباس قدیم مصر کی لڑکیوں جیسے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے ڈنٹھلوں والے' کنول کے پھول تھے' وہ ایک دوسری سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں..... پھر ان میں سے ایک نے عاطون کی طرف دیکھ کر اپنی سہیلی کو اشارہ کیا۔ اس نے بھی گردن گھما کر عاطون کو دیکھا۔ چاندنی میں ان کے جسم دھندلے نظر آ رہے تھے۔ دونوں مسکرائیں اور چاندنی میں چند قدم چلنے کے بعد غائب ہو گئیں۔

عاطون اسے آسیب سمجھ کر آگے چل پڑا' کیونکہ اس کے خیال میں پرانے قبرستانوں میں روحیں کبھی کبھی آدھی رات کو آ جایا کرتی ہیں۔

اہرام چند قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ عاطون کو اپنے ہزاروں سال پرانے خاندان

کے لوگ یاد آنے لگے۔ ان کی کبھی اداس' اور کبھی مسکراتی شکلیں آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگیں پھر ایک طرف سے ٹھنڈی آہ بھرنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ عاطون نے جلدی سے اس طرف گھوم کر دیکھا۔ اسے اپنی بائیں جانب ایک سایہ نظر آیا' جو ایک مخروطی چٹان کے پاس کھڑا تھا' وہ کوئی عورت تھی۔ عاطون کا دل دھڑکنے لگا' وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑا رہا' پھر اس نے آہستہ سے پوچھا' "تم کون ہو؟"

"عاطون! تم نے مجھے پہچانا نہیں؟" عورت کی آواز سنائی دی۔ "میں تمہاری محبوبہ کولسری ہوں جس سے تم کبھی بے پناہ محبت کیا کرتے تھے۔"

عاطون کا دل جیسے کسی نے اپنی مٹھی میں لے لیا' وہ بے اختیار ہو کر اپنی محبوبہ کولسری کی طرف بڑھا اور قریب جا کر' اسے غور سے دیکھا واقعی وہ اس کی محبوبہ کولسری ہی تھی' جس سے ملنے کے لیے وہ آدھی رات کو اپنے مکان کی چھت پھلانگ کر ان کے کوٹھے پر جایا کرتا تھا' وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کے ریشمی لباس میں تر و تازہ پھول ٹکے ہوئے تھے' اور ان میں سے آسمانی خوشبو آ رہی تھی' اس کی سیاہ آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ عاطون نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ گرم تھا' زندگی اور نوجوانی کی حرارت سے بھرپور۔

عاطون نے پوچھا' "کولسری! تم یہاں کیسے آ گئیں؟ تمہیں تو مرے ہوئے ہزاروں برس بیت چکے ہیں۔"

کولسری نے مسکرا کر کہا' "اگر تم ہزاروں برس سے زندہ ہو تو کیا میں زندہ نہیں رہ سکتی؟"

عاطون نے پھر پوچھا' "لیکن تم آج سے پہلے مجھے کیوں نہیں ملیں؟ آج اس ملاقات کا کیا مقصد ہے؟"

کولسری نے اہرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا' "میں تمہیں لینے آئی ہوں۔ اس اہرام میں تمہارے کچھ دوست بھی ہیں۔"

عاطون کا ماتھا ٹھنکا۔ واقعات کچھ عجیب سا رخ اختیار کر رہے تھے۔ اس نے کہا' "وہاں میرے کون دوست ہیں؟"

کولسری بولی' "تم خود چل کر دیکھ لو گے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

عاطون اس کے ساتھ اہرام کی طرف بڑھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا' جیسے وہ خواب میں چل رہا ہو۔ دیوقامت مخروطی اہرام کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ یہ بہت پرانا اہرام تھا۔ اب کولسری نے عاطون کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ عاطون نے دیکھا کہ اہرام کی دیوار میں ایک

محراب بن گئی ہے۔ یہ دھیمی دھیمی روشنی کی محراب تھی۔ کولسری نے سرگوشی میں عاطون سے کہا' "میں ہزاروں برس سے تیری راہ دیکھ رہی تھی۔ اس لمحے کا میں نے ہزاروں برس انتظار کیا ہے۔"

عاطون کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کولسری اسے ساتھ لے کر اہرام کے محرابی دروازے سے گزر گئی۔ سامنے ان گنت ستونوں والا ایک دالان تھا۔ دیواروں کے بوسیدہ طاقوں میں کہیں کہیں بہت دھیمی روشنی والی شمعیں روشن تھیں۔ عاطون نے کولسری سے کچھ پوچھنا چاہا' لیکن خاموش رہا۔ وہاں بے حد مقدس اور ہیبت ناک سکوت طاری تھا' وہ ستونوں کے درمیان سے گزرتے' سامنے والی دیوار کے قریب پہنچ کر رک گئے۔

یہاں دیوار میں ایک تابوت سیدھا کھڑا تھا۔ کولسری نے اس کا ڈھکنا کسی دروازے کی طرح کھول دیا۔ تابوت میں ممی کی جگہ ایک دروازہ تھا' جس کے دوسری طرف ایک زینہ نظر آ رہا تھا۔ کولسری' عاطون کا ہاتھ تھام کر زینے طے کرنے لگی' زینوں کے اختتام پر ایک سرسبز و شاداب باغ تھا۔ جہاں سرو کے اونچے اونچے درختوں کے درمیان پھولوں کے تختے' چاندنی میں مہک رہے تھے۔ آسمان پر نیلے ستارے چمک رہے تھے۔ عاطون یہ سب کچھ دیکھتا ہوا' سحر زدہ انداز میں کولسری کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ باغ کے وسط میں ایک سفید گنبد والی عمارت تھی' جس کے چبوترے پر سنگ مرمر کے تخت رکھے تھے۔ ان تختوں پر ریشمی قالین بچھے ہوئے تھے' اور پھولوں کے ڈھیروں میں عود و عنبر سلگ رہے تھے۔ اس کی مہک چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ عاطون نے آہستہ سے پوچھا۔ "یہ کون سی جگہ ہے' کولسری؟"

"یہ تمہارا نیا گھر ہے۔" کولسری نے سرگوشی میں بتایا۔

"نیا گھر...." عاطون کچھ نہ سمجھ سکا۔ اچانک ایک طرف سے کچھ عورتیں ہنستی ہوئی آئیں۔ ان کے ساتھ معصوم بچے بھی تھے۔ عاطون کے قریب آ کر انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا' "ہمارا بھائی آیا ہے' مبارک ہو۔" یہ کہہ کر وہ باغ کے دوسرے حصے کی طرف چلی گئیں۔

عاطون نے کولسری سے پوچھا' "یہ کون تھیں؟"

کولسری نے مسکرا کر کہا' "تم انہیں ابھی نہیں پہچانو گے۔ یہ تمہارے خاندان کی خواتین ہیں' مگر کچھ تم سے پہلے کی ہیں اور کچھ تمہارے بعد کی۔"

"کیا مطلب؟" عاطون نے تعجب سے پوچھا۔

کولسری بولی' "کچھ خواتین وہ ہیں' جو تمہاری پیدائش سے سو برس پہلے تمہارے

خاندان میں پیدا ہو کر مرگئی تھیں اور کچھ وہ ہیں جو تمہاری طبعی عمر پوری ہونے کے بعد پیدا ہوئیں اور اپنی زندگی گزار کر مرگئیں۔"

"تو کیا یہ مرنے کے بعد کی سرزمین ہے؟"

کولسری نے عاطون کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی۔ کولسری کے ہاتھ میں سے حنا کی عجیب سحرانگیز خوشبو آ رہی تھی۔" خاموش رہو..... عاطون! یہ تمہاری ہزاروں برس پرانی زندہ دنیا نہیں ہے.... یہ ابدی دنیا ہے، جہاں ایک ہزار برس، ایک سیکنڈ سے بھی کم مدت کی حیثیت رکھتا ہے۔"

عاطون نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے وہ اہرام نظر نہ آیا، جس کے دروازے سے گزر کر وہ یہاں آیا تھا۔ اب پہلی بار عاطون کو محسوس ہوا کہ اس کی زندگی کے طویل کھیل کا پردہ گرنے والا ہے۔ ہزاروں برس سے زندہ رہتے ہوئے اسے زندگی سے پیار ہوگیا تھا، وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ کسی طرح وہاں سے فرار ہو جانا چاہیے۔

کولسری نے اس کی طرف دیکھا، اور محبت بھرے لہجے میں بولی۔

"کیا تم مجھے بھی چھوڑ کر چلے جاؤ گے، عاطون! ابھی تو تمہیں اپنے بیوی بچوں سے بھی ملنا ہے، وہ بھی تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔"

اپنی بیوی کا خیال آتے ہی عاطون کے دل میں گداز سا پیدا ہوگیا۔ اسے اپنی پیاری بیوی کا ایثار، محبت اور شناسی یاد آنے لگی۔ دنیا میں شاید ہی کوئی اور ایسی ہستی ہوگی کہ جس نے اس کے ساتھ اتنا ایثار کیا ہو، اتنی قربانیاں دی ہوں، اس کے اور اس کے بچوں کے لیے اتنی تکلیفیں اٹھائیں ہوں.... پھر اسے اپنے معصوم اور پیارے بچے یاد آئے جو اس کی آنکھوں کے سامنے پختہ عمر کو پہنچے اور پھر بوڑھے ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

وہ گنبد کے چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ چبوترہ دائرے کی شکل میں گنبد کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ گنبد کا صرف ایک ہی دروازہ تھا، جس سے ہلکی سبز روشنی باہر آ رہی تھی۔ "اس کے اندر کیا ہے کولسری؟" عاطون نے سوال کیا۔

کولسری نے کہا، "اس کے اندر وہ دوشیزہ ہے جو ہزاروں برس سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔"

عاطون کے منہ سے نکل گیا، "کیا وہ میری بیوی ہے؟"

"نہیں....." کولسری نے کہا۔

"کیا وہ تم ہو؟" عاطون نے پوچھا۔

کولسری مسکرا کر بولی۔ "نہیں..... میں تو تمہارے ساتھ ہوں۔"

"پھر کون ہے، وہ دوشیزہ، جو ہزاروں برس سے میرے انتظار میں ہے؟"

کولسری نے عاطون کا ہاتھ آہستہ سے دبایا اور سرگوشی میں بولی۔ "وہ حسین دوشیزہ موت ہے۔"

عاطون کا دل جیسے ایک دم اچھل کر سینے سے باہر آنے لگا ہو۔ یہ خوف کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ ایک حیرت انگیز تجسس کے باعث تھا۔ موت ایک ایسی شے تھی، جس کو عاطون بالکل ہی بھلا بیٹھا تھا۔ اب وہ اس کے سامنے تھی اور وہ اس کی پھیلی ہوئی بانہوں کی طرف جا رہا تھا۔ عاطون کے دل سے موت کا تجسس بھی جاتا رہا۔ اس کے قدم خودبخود گنبد کی طرف اٹھنے لگے۔ اب وہ خود موت کی حسینہ کو گلے لگانے کے لیے بے تاب تھا، وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ گنبد میں داخل ہوگیا۔

گنبد میں داخل ہوتے ہی کولسری نے عاطون کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ عاطون نے دیکھا، کہ گنبد کے نیچے، فرش کے وسط میں ایک تابوت کھلا پڑا تھا۔ کولسری کی آواز آئی۔ "میرے دوست! اس تابوت میں آ جاؤ۔ میں تابوت میں تمہاری منتظر ہوں۔"

عاطون کسی طلسمی طاقت کے زیر اثر تابوت کی طرف بڑھنے لگا۔ ہر قدم پر اس کے جسم میں ایک تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ تابوت اس سے چار قدم کے فاصلے پر تھا۔ پہلے قدم پر اس کے بال سفید ہوگئے۔ دوسرے قدم پر اس کا جسم جھریوں سے بھر گیا۔ تیسرے قدم پر اس کی کمر جھک گئی اور ہڈیاں ٹیڑھی ہو کر مڑ گئیں۔ چوتھے قدم پر وہ اتنا بوڑھا ہو گیا تھا کہ اس کا سارا بدن رعشے سے لرزنے لگا تھا۔ پھر جیسے کسی نے اسے آہستہ سے اٹھا کر تابوت میں لٹا دیا۔ تابوت میں لیٹتے ہی اس کے جسم میں زبردست شکست وریخت شروع ہوگئی۔ پہلے اس کا جسم نیلا پڑا، پھر کھال کے نیچے سارا گوشت گل کر نرم ہوگیا، پھر کھال بھی گل سڑ گئی، اور اس کے بعد سارا جسم مٹی بن کر تابوت کی تہ میں بیٹھ گیا..... اب وہاں عاطون کی جگہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ پڑا تھا۔

عاطون مر چکا تھا، مگر زندہ تھا۔ یہ زندگی مادی زندگی سے مختلف اور مستقل تھی۔ عاطون کو پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ ان چیزوں کو بھی دیکھ سکتا ہے، جو بظاہر اس کی نگاہ سے اوجھل ہیں، ان لوگوں کو بھی دیکھ سکتا ہے جو وہاں موجود نہیں ہیں۔ اسے قسم قسم کے پھولوں کی خوشبوئیں آ رہی تھیں.... پھر وہ تابوت سے نکل کر گنبد کی چھت کی طرف اٹھنے لگا، وہ گنبد کی پتھریلی چھت میں سے گزر کر باہر نکل گیا۔ باہر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں نہ مصر کا دارالحکومت تھا، اور نہ اس کے شاہی محل تھے۔ ہر طرف ویرانہ اور کھنڈرات تھے۔ عاطون اوپر ہی اوپر پرواز کرتا چلا گیا۔ اس کی رفتار، خیال کی رفتار سے بھی

زیادہ برق آسا تھی۔ پلک جھپکنے کے ایک کروڑویں حصے سے بھی پہلے وہ ایک مرغزار میں تھا' جس کے پھولوں بھرے تختوں کے درمیان زمرد کی سبز تہ والی نہریں بہہ رہی تھیں۔ ایسا شفاف اور چمکیلا پانی' عاطون نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی سفیدی' سورج کی کرن سے بھی زیادہ نورانی تھی۔

نہروں کے کنارے سبز پتوں میں سفید اور سرخ پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہ پھول لعل و گہر کو بھی شرمندہ کر رہے تھے۔ سامنے عقیق کا ایک محل تھا' جس کا در موتیوں جڑا تھا۔

یہ در کھلا اور چند عورتیں ہاتھوں میں تھال لیے اور ان کے سنہرے پھول لٹاتی' عاطون کی طرف بڑھیں۔ عاطون نے اپنے ہاتھوں اور جسم کو پہلی بار دیکھا' اس کا لباس زرق برق تھا۔ قریب ہی بہتی نہر کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا' وہ سولہ سترہ برس کا ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کی آنکھیں زمرد اور سیاہ عقیق سے تراشی ہوئی لگتی تھیں' اور سر پر سیاہ گھنگریالے بال' سیاہ انگوروں کے گچھوں کی یاد تازہ کر رہے تھے۔

عورتیں پھول لٹاتی اس کے قریب آ گئیں۔ ان کی عمریں بھی سولہ سترہ برس کی تھیں۔ انہوں نے عاطون کو اپنے ساتھ لیا اور زمردیں محل میں داخل ہو گئیں۔

اس کے بعد عاطون کو وقت کے سبزہ زاروں' ریگ زاروں' میدانوں اور کہساروں میں پھر کسی نے نہ دیکھا۔ ہزاروں برس کی کہانی اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔